فتح

ذی الجلال والاکرام

شرح

بلوغ المرام

من ادلۃ الاحکام

www.KitaboSunnat.com

تالیف: حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ

جلد دوم

شرح: فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: مولانا آصف نسیم

دار المعرفۃ
پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی

کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے

درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ

کے نام سے شروع کرتا ہوں
جو بڑا مہربان
نہایت رحم کرنے والا ہے

www.KitaboSunnat.com

فتح

ذي الجلال والإكرام

شرح بلوغ المرام

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ

مترجم: مولانا آصف نسیم

جلد دوم

دار المعرفۃ پاکستان
الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور
0321
4210145
WWW.DARULMARIFA.COM

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ادارہ تمام کتب معاشرتی اصلاح وتربیت اور نیک نیتی سے شائع کرتا ہے، البتہ مصنف ومترجم کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں، تاہم فنی وطباعتی خرابی کی صورت میں کتاب کسی بھی وقت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ (ادارہ)

244.9
ع ث ی ۔ ف

فتح ذي الجلال والإكرام
شرح بلوغ المرام

المكتبة الرحمانية
99 .. جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
22673

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ
مترجم: مولانا آصف نسیم

ڈیلرز

مکتبہ اسلامیہ
لاہور: بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 042-37244973 - 37232369
فیصل آباد: بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد 041-2631204 - 2641204

مکتبۃ الکتاب حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0300 98 88 629

سعودی عرب

- دار الوحيين للنشر والتوزيع ...... مركز الجامع التجاري شارع باخشب، جده ـ 026336640
- دار القبس للنشر والتوزيع ...... شارع امير سطام، البيعه، رياض، ت ـ 02681045 ـ ف: 4351395
- مكتبه دار الفرقان ...... رياض، هاتف: 0507419921,0563064736,01-4358646
- مكتبه بيت السلام ...... هاتف: 0502033260,0505440147,01-4460129

ملنے کے پتے

- مکتبہ قدوسیہ ــــ اردو بازار لاہور 0321-44 60 487
- نعمانی کتب خانہ ــــ اردو بازار لاہور 042 373 21 865
- اسلامی اکیڈمی ــــ اردو بازار لاہور 042 373 57 587
- دار الکتب السلفیہ ــــ اردو بازار لاہور 042 373 61 505
- کتاب سرائے ــــ اردو بازار لاہور 042 373 20 318
- مکتبہ بیت السلام ــــ اردو بازار، لاہور 042 373 20 422

DAR-UL-MARIFA
+92-321-4210145 +92-42-37361321
www.facebook.com/darulmarifa
darulmarifa@gmail.com
WWW.DARULMARIFA.COM

دار المعرفۃ
پاکستان
الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فہرست مضامین

7..... كِتَابُ الْبُيُوْعِ
بیوع کے احکام ومسائل کا بیان

بیع کا حکم ---------- 27

1۔ بَابُ شُرُوطِهِ وَمَا نُهِيَ عَنْهُ
بیع کی شروط اور ممنوعہ بیوع کا بیان

سب سے پاکیزہ کمائی ---------- 28
شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے ---------- 29
خرید وفروخت میں متعاقدین کے درمیان اختلاف ہو جانے کا حکم ---------- 35
ثمن میں اختلاف کی صورتیں اور ان کا حکم ---------- 36
مبیع میں اختلاف کا حکم ---------- 37
کتے کی قیمت، رنڈی کا معاوضہ اور کاہن کی اجرت لینے کی ممانعت کا بیان ---------- 38
بائع کا مبیع سے نفع اٹھانے کی شرط رکھنا جائز ہے ---------- 40
اگر مدبر غلام کا مالک مقروض ہو تو مدبر غلام کو بیچنا جائز ہے 46
جس گھی میں چوہا گر جائے اس کو کھانے اور بیچنے کا حکم -- 47
شریعت کی مخالفت باطل ہے ---------- 50
ام ولد کا بیان ---------- 56
زائد پانی اور سانڈ کے نطفہ کو بیچنا منع ہے ---------- 59
سانڈ، اونٹ اور بکرے وغیرہ کو کرائے پر لینے کی صورتیں اور ان کا حکم ---------- 62
حمل کا حمل بیچنا بھی منع ہے ---------- 62
ولاء کو بیچنا اور ھبہ کرنا منع ہے ---------- 64
کنکری مار کر بیچنا اور غرر کے ساتھ بیچنا ناجائز ہے ---------- 64
بیع حصاۃ کی صورتیں ---------- 65
بیع غرر کی تعریف، حکم اور ممانعت کی علت اور حکمت ---- 66
جہالت کی بیع کا بیان ---------- 67
ایک سودے میں دو سودے کرنے کی ممانعت کا بیان --- 68
ایک سودے میں دو سودوں کے واقع ہونے کی صورتیں اور ان کا حکم ---------- 69
سَلَم اور بیع دونوں کو ایک ساتھ کرنے کا بیان ---------- 71
حلت کی نفی تحریم کو مقتضی ہے ---------- 71
بیع سَلَم اور بیع کو ایک عقد میں جمع کرنا حرام ہے ---------- 72
ایک بیع میں دو شرطیں اکٹھی رکھنا حرام ہے ---------- 73
جو شے ضمان میں داخل نہ ہو اس کا نفع اٹھانا حرام ہے --- 74
غیر موجود شے کی بیع حرام ہے ---------- 74
بیعانہ کی بیع کا حکم ---------- 76
بیعانہ کا حکم ---------- 76
جہاں مال خریدا ہے اسے وہیں بیچنے کا حکم ---------- 77
سونے چاندی کی باہم بیع کا بیان ---------- 79
محض قیمت بڑھانے کے لیے بولی لگانے کا بیان ---------- 82
نجش کی تعریف اور حکم ---------- 82
محاقلہ، مزابنہ اور اس جیسے عقود منع ہیں ---------- 82
چند مزید ناجائز عقود کا بیان ---------- 84
قافلوں کو پہلے جا ملنے کی ممانعت کا بیان ---------- 85
اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا کرنا منع ہے ---------- 88
بیع میں ذو رحم رشتہ داروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا حرام ہے ---------- 92
منڈی میں نرخوں کے مقرر کرنے کا یعنی نرخنامہ طے کرنے کا بیان ---------- 93

ذخیرہ اندوزی کا بیان ---------- 96
اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ جمع کر کے ان کو بیچنے کا بیان ---------- 97
خرید وفروخت میں دھوکا اور ملاوٹ حرام ہے ---------- 100
ناجائز کام میں صرف کرنے کے لیے مبیع کو روک رکھنا حرام ہے ---------- 102
خراج کے ضمان کا حکم ---------- 104
جس کا خراج ہو ضمان بھی اسی پر آتی ہے ---------- 104
بیع وشراء میں توکیل جائز ہے ---------- 105
بیع غرر کا حکم ---------- 107
پانی میں تیرتی مچھلی کی بیع کا حکم ---------- 108
بیع غرر کی چند اور صورتیں ---------- 109
مضامین کی بیع کا حکم ---------- 110
اقالہ کا بیان ---------- 110

2۔ بَابُ الْخِيَار

خیار کا بیان

خیار مجلس کا حکم اور صورتیں ---------- 112
خیارِ غبن کا بیان ---------- 115

3۔ بَابُ الرِّبَا

سود کا بیان

سود کا حکم ---------- 116
سود حرام اور اس کی لعنت عام ہے ---------- 117
سود کی قسمیں ---------- 119
اموالِ ربویہ کے علاوہ میں ربا کے جاری ہونے کا بیان 121
کھجوروں کی کھجوروں سے بیع اور ان کی شروط کا بیان - 124
سونے کی سونے کے بدلے بیع کا حکم ---------- 126
حیوان کی حیوان کے بدلے بیع کا حکم ---------- 127
صورتِ مسئلہ ---------- 127
بیع عینہ کا بیان ---------- 128
حرام سفارش کا بیان ---------- 129
رشوت کا بیان ---------- 131
حیوان کو حیوان کے بدلے نسیئہ کے ساتھ بیچنے کا حکم -- 132
بیع مزابنہ کا بیان ---------- 134
عرایا کی بیع جائز ہے ---------- 135
تازہ کھجور کو خشک کھجور کے بدلے بیچنے کا حکم ---------- 135
دَین کو دَین کے بدلے بیچنے کا حکم ---------- 137
درایۃ الحدیث اور دَین کی دَین کے بدلے بیع کی صورت اور اس کا حکم ---------- 137

4۔ بَابُ الرُّخْصَةِ فِي الْعَرَايَا وَبَيْعِ الْأُصُوْلِ وَالثِّمَارِ

بیع عرایا میں، اور اصول اور پھلوں کے بیچنے میں رخصت کا بیان

بیع عرایا جائز ہے ---------- 138
عرایا کی بیع کتنے وزن تک جائز ہے ---------- 139
پھلوں کی بیع کا بیان ---------- 142
کھجور کا پھل کب پک جاتا ہے؟ ---------- 144
انگور کا پھل کب پکتا ہے؟ ---------- 145
آفتِ سماوی کی وجہ سے ضائع ہونے والے پھل کے نقصان کو منہا کرنے کا حکم ---------- 146
کھجور کی قلم کاری اور اسے گابھا دینے کے بعد اترنے والی کھجور کا حکم ---------- 148

5۔ أَبْوَابُ السَّلَمِ وَالْقَرْضِ وَالرَّهْنِ

بیع سلم، قرض اور رہن کا بیان

سلم کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ---------- 150
قرض کی تعریف ---------- 150
رہن کی تعریف ---------- 150

سلم، رہن اور قرض کا حکم ---- 151
عقدِ سلم کی شروط کا بیان ---- 151
عقدِ سلم کرتے وقت مسلم فیہ کا موجود ہونا ضروری نہیں- 153
بیع سلم میں مسلم فیہ کی ادائیگی کی نیت شرط ہے ---- 154
بیع سلم کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے ---- 155
رہن کا بیان ---- 157
رہن کو ضبط کر لینے کا کا حکم ---- 159
غلقِ رہن کی صورتیں ---- 160
قرض کو عمدہ طریق سے ادا کرنے کی ترغیب ---- 161
نفع کے ساتھ قرض واپس لینا سود ہے ---- 162
سود کا شرعی حکم ---- 163
قرض کی شرعی صورت اور اس میں سود کے امکان کا بیان 163
حدیث سے اخذ شدہ فوائد ---- 163

6۔ بَابُ التَّفْلِيْسِ وَالْحَجْرِ
مفلس قرار دیے جانے اور بندش لگائے جانے کا بیان

تفلیس کا اصطلاحی معنی ---- 164
حجر کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---- 164
حجر کی اقسام ---- 164
حجر کی وجوہات ---- 164
مفلس کے پاس اپنا مال پائے جانے کا حکم ---- 165
غنا کے باوجود حق ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ---- 168
مبتلائے مصیبت کی مدد کی جائے ---- 169
دوسروں کی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان ---- 170
مقروض اور حالات اور بندش کی صورت ---- 171
اپنی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان ---- 171
بلوغت کی چند علامات ---- 173
عورت کے مالی تصرفات کا بیان ---- 175
سوال کرنا کب جائز ہوتا ہے ---- 177

7۔ بَابُ الصُّلْحِ
صلح کا بیان

کون سی صلح جائز ہے ---- 180
پڑوسی کے حقوق ---- 182
دوسرے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر لینا منع ہے ---- 184

8۔ بَابُ الْحَوَالَةِ وَالضَّمَانِ
حوالہ اور ضمان کا بیان

ضمان ---- 186
میت کے دَین کے ضمان کا بیان ---- 187
مقروض میت کے قرض ادا کرنے کی تفصیل ---- 190
کفالت کا بیان ---- 193
کفالت اور ضمانت میں فرق ---- 193
کفالت کن امور میں جائز ہے ---- 194

9۔ بَابُ الشَّرِكَةِ وَالْوَكَالَةِ
شرکت اور وکالت کا بیان

شرکت و وکالت کا حکم ---- 195
شراکت میں امانت لازم ہے ---- 195
نبی کریم ﷺ نے بھی شریک بن کر تجارت کی ہے ---- 196
شرکتِ ابدان کا بیان ---- 197
وکالت کا بیان ---- 198
وکالت کے احکام اور شروط ---- 199
زکوٰۃ وصول کرنے میں وکیل بنانا جائز ہے ---- 200
ہدی اور اُضحیہ کو ذبح کرنے اور ان کے گوشت کو تقسیم کرنے میں وکیل بنانا جائز ہے ---- 200
حدود کے اثبات اور تنفیذ میں وکیل بنانے کا حکم ---- 201

10۔ بَابُ الْإِقْرَارِ ..... اقرار کا بیان

حق بات ہی کہی جائے چاہے اپنے خلاف ہی ہو ---- 203

11۔ بَابُ الْعَارِيَةِ
عاریت کا بیان

عاریت کا حکم ---------- 204
عاریت اور اجارہ میں فرق ---------- 205
عاریت کی حفاظت ضروری اور عاریت کا لوٹانا لازم ہے 205
امانت کا ادا کرنا واجب ہے ---------- 206
عاریت کی اقسام ---------- 208

12۔ بَابُ الْغَصْبِ
غصب کا بیان

غصب کا حکم ---------- 210
بالشت بھر زمین بھی غصب کرنے کا انجام ---------- 210
غصب کی گئی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کا حکم ---------- 214
دوسرے کی زمین میں محنت کرنے کا حکم ---------- 214
جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت کا بیان ---------- 217

13۔ بَابُ الشُّفْعَةِ
شفعہ کا بیان

شفعہ کن چیزوں میں ہوتا ہے ---------- 218
پڑوسی کے شفعہ کا اور اس کی شروط کا بیان ---------- 222
شفعہ کی حقیقت ---------- 224

14۔ بَابُ الْقِرَاضِ
قراض یعنی مضاربہ کا بیان

قراض کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 225
مضاربہ کی فضیلت ---------- 225
مضاربہ کی شروط ---------- 227

15۔ بَابُ الْمُسَاقَاةِ وَالْإِجَارَةِ
باغبانی اور اجارہ کا بیان

مساقات کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 228
اجارہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 228
مساقات کا حکم ---------- 229
زمین کے اجارہ کا بیان ---------- 230
مزارعت کا بیان ---------- 233
پچھنے لگانے کی اجرت لینے کا حکم ---------- 234
پچھنے لگانے کی اجرت کیسی ہے؟ ---------- 235
مزدور کی مزدوری روکنے کی تحذیر اور ممانعت ---------- 236
قرآن پڑھانے پر اجرت لینا جائز ہے ---------- 238
قرآنِ کریم پر اجرت لینے کی تفصیل اور اس کے احکام 238
مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے قبل ہی اس کی مزدوری دے دو ---------- 240
مزدور کی مزدوری معلوم ہونا لازم ہے ---------- 241

16۔ بَابُ إِحْيَاءِ الْمَوَاتِ
بنجر زمینوں کو آباد کرنے کا بیان

بے آباد زمین کا مالک کون ہے؟ ---------- 242
کسی چراگاہ کو اپنے لیے خاص کر لینے کا حکم ---------- 244
نقصان اٹھانا اور دینا دونوں منع ہیں ---------- 245
بے آباد زمین کو چار دیواری کر لینے کا حکم ---------- 246
کنواں کھودنے سے ارد گرد کی کتنی زمین ملکیت شمار ہوتی ہے ---------- 247
جاگیر دینے کا بیان ---------- 248
اِقطاع کا حکم ---------- 248
تین قدرتی مشترکہ چیزیں ---------- 250
حدیث سے اخذ شدہ فوائد ---------- 251
وقف کا بیان ---------- 251
وقف کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 251
وقف مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے ---------- 251
اسلام کا پہلا وقف ---------- 253
راہِ خدا میں وقف کرنا ---------- 257

17۔ بَابُ الهِبَةِ وَالعُمْرٰى وَالرُّقْبٰي
ہبہ، عمریٰ اور رقبیٰ کا بیان

ہبہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 258
عمریٰ اور رقبیٰ ---------- 259
ہبہ کے ضوابط ---------- 259
ہبہ واپس لینے کا حکم ---------- 262
اولاد کو کیے ہبہ کے واپس لینے کا حکم ---------- 264
قبولِ ہدیہ کی شروط ---------- 265
ہدیہ کا بدلہ دینا ---------- 266
عمریٰ اور رقبیٰ کی صورت ---------- 267
عمریٰ اور رقبیٰ کا معنی، صورتیں اور حکم ---------- 268
عمریٰ اور رقبیٰ کا حکم ---------- 268
اپنے کیے ہبہ کو خریدنے کا حکم ---------- 270
دوسروں کو ہدیہ کرنے کی ترغیب کا بیان ---------- 271
ہدیہ دینا کینہ کو ختم کر دیتا ہے ---------- 272
ایک دوسرے کی ہدیہ کی قدر کی جائے ---------- 273
ہدیہ ثواب واپس لینے کا استحقاق کب تک ہے ---------- 274

18۔ بَابُ اللُّقَطَةِ
لقطہ کا بیان

لُقَطَة کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 274
لقطہ کی اقسام ---------- 275
لقطہ کا حکم ---------- 275
صدقہ کی گری پڑی کھجور کا حکم ---------- 275
لقطہ کی تشہیر کا طریقہ اور مدت ---------- 276
بغیر تشہیر کے گم شدہ جانور کو ٹھکانا دینے کا حکم ---------- 281
لقطہ پر گواہ بنانا ---------- 281
مکہ کے لقطہ کا حکم ---------- 284
معاہد کے لقطہ کا حکم ---------- 284

19۔ بَابُ الفَرَائِضِ
فرائض کا بیان

فرائض کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 286
اصحابِ فروض کون ہیں ---------- 286
مسلمان اور کافر کے ایک دوسرے کا وارث بننے کا حکم 288
موانع اِرث ---------- 288
بیٹی، بھتیجی اور بہن کا حصہ ---------- 289
بیٹی کا حصہ ---------- 290
بھتیجی کا حصہ ---------- 290
بہن کا حصہ ---------- 290
اختلافِ ملت کا حکم ---------- 291
دادا کی میراث ---------- 292
جدہ کی میراث ---------- 293
ماموں اور ذوی الارحام کی میراث ---------- 293
ماموں کی میراث ---------- 294
حمل کی میراث کا حکم ---------- 295
قاتل کی میراث کا حکم ---------- 296
قاتل کی میراث کے مسائل ---------- 296
عصبہ کب حصہ پائیں گے ---------- 297
ولاء کا حکم ---------- 298
علم الفرائض کا سب سے بڑا عالم ---------- 299

20۔ بَابُ الوَصَايَا
وصایا کا بیان

وصایا کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 300
وصیت کا حکم ---------- 300
وصیت لکھوانے کا حکم ---------- 301
وصیت کرنے کے قواعد و ضوابط ---------- 302
جس نے کوئی وصیت نہ کی ہو، اس کی طرف سے صدقہ کرنے

کا حکم ---------- 306
وارث کے لیے وصیت کرنے کا حکم ---------- 308
ایک تہائی مال کی وصیت کا بیان ---------- 310

21 ۔ بَابُ الْوَدِيْعَةِ

ودیعت کا بیان

ودیعت کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 311
ودیعت رکھوانے کا حکم ---------- 311
مودَع ضامن نہیں ہوتا ---------- 312
ودیعت کے لوٹانے میں اختلاف کا حکم ---------- 312

8..... كِتَابُ النِّكَاحِ

نکاح کے احکام ومسائل کا بیان

نکاح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------- 314
نکاح کا حکم ---------- 314
بے نکاحی زندگی گزارنے کی ممانعت کا بیان ---------- 318
زیادہ بچے جننے والی اور بہت محبت کرنے والی عورتوں سے نکاح کرنے کی ترغیب ---------- 320
عورت سے نکاح کیے جانے کے چار اسباب ---------- 322
شادی کرنے والے کے لیے دعائے نبوی ---------- 323
خطبہ حاجت ---------- 325
رشتہ کا پیغام بھیجنے کے آداب ---------- 327
مخطوبہ کی طرف ایک نظر دیکھنے کا حکم اور اس کے قواعد و ضوابط ---------- 327
دوسرے کے پیغامِ نکاح پر اپنا پیغامِ نکاح بھیجنے کا حکم - 329
خود کو سونپنے والی عورت کا حکم ---------- 331
نکاح کا اعلان کرنے کا بیان ---------- 337
نکاح کے اعلان کی حکمتیں ---------- 338
اعلانِ نکاح کا حکم ---------- 338
عقدِ نکاح کی تمامیت کی شرط ---------- 338
نکاح میں ولی کا شرط ہونا ---------- 339
بنا ولی کے عدمِ صحت نکاح کی حکمت ---------- 339
ولی کی اجازت کے بغیر عورت کے نکاح کرنے کا حکم - 340
نکاح میں عورت کی رضا شرط ہے ---------- 342
ادلے بدلے کی شادی کا بیان ---------- 345
زبردستی بیاہی گئی عورت کے اختیار کا بیان ---------- 347
اگر کسی عورت کے دو ولی ہوں اور دونوں اپنی اپنی مرضی سے دو آدمیوں سے عورت کا نکاح کر دیں ---------- 348
تو ایسی عورت کے عقدِ نکاح کا کیا حکم ہے؟ ---------- 348
آقا کی اجازت کے بغیر غلام کے نکاح کرنے کا حکم -- 349
ایک عورت کو اس کی پھوپھی یا خالہ یا بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے کا حکم ---------- 350
کن دو عورتوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے ---- 350
احرام والے کے پیغامِ نکاح بھیجنے اور نکاح کرنے کا حکم 350
نکاح کی شروط ---------- 353
نکاح کی شروط ---------- 353
شروط نکاح کی اقسام ---------- 354
متعہ کا حکم ---------- 355
متعہ کب حرام ہوا ---------- 356
متعہ کی حقیقت ---------- 356
متعہ کی وجہ تسمیہ اور دیگر متعلقات ---------- 356
متعہ کا شرعی حکم ---------- 357
روافض اور متعہ ---------- 357
متعہ کے مفاسد اور اس کی معاشرتی و روحانی خرابیاں - 357
حلالہ کا حکم ---------- 360
مشروط حلالہ زوجِ اول کے لیے عورت کی حلت کا سبب ہے یا نہیں؟ ---------- 362
شرعی حلالہ کے بعد پہلا خاوند کتنی طلاقوں کا مستحق بنتا ہے؟ 362

زانی اور زانیہ کے نکاح کا حکم ---------- 363
طلاق یافتہ عورت پہلے خاوند کے پاس کب لوٹ کر آ سکتی ہے؟ ---------- 364

1۔ بَابُ الْكَفَاءَةِ وَالْخِيَارِ

کفاءت اور خیار کا بیان

کفاءت کا لفظی اور اصطلاحی معنی ---------- 365
نکاح میں کفاءت کے حکم کی تفصیل ---------- 366
(1) دین میں کفاءت ---------- 366
(2) عدالت میں کفاءت ---------- 366
(3) نسب میں کفاءت ---------- 366
خیار کا حکم ---------- 367
آزاد عربوں کی موالی کے ساتھ شادی کا حکم ---------- 367
موالی اور عربوں میں نکاح ---------- 369
موالی سے نکاح کا حکم ---------- 369
خیار کی اقسام ---------- 371
آزاد کی باندی بیوی اگر آزاد ہو جائے تو اس کا حکم ---------- 372
جس کے نکاح میں دو بہنیں ہوں اور وہ اسلام لے آئے تو اس کا حکم کیا ہے؟ ---------- 372
دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کا حکم ---------- 373
جس کے نکاح میں اسلام قبول کرتے وقت چار سے زیادہ بیویاں ہوں، اس کا حکم ---------- 374
خاوند مسلمان ہو جائے تو اس کی مسلمان ہونے والی بیوی اس کی طرف لوٹائی جائے گی ---------- 375
خاوند اور بیوی کے اسلام لے آنے کی صورتیں اور ان کے احکام ---------- 375
مسلمان ہو جانے والا اپنی بیوی کا زیادہ مستحق ہے ---------- 377
عیب کی وجہ سے فسخ نکاح کا حکم ---------- 378
عنین یعنی نامرد کا حکم ---------- 383
نامردی کا ثبوت اور زوال ---------- 383
بانجھ پن کا حکم ---------- 384

2۔ بَابُ عِشْرَةِ النِّسَاءِ

عورتوں کے ساتھ کیسے رہا سہا جائے

بیوی کی دبر میں جماع کرنے کا حکم ---------- 385
عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت ---------- 388
مسافر گھر والوں کے پاس رات کو نہ آئے ---------- 390
خاوند بیوی کا باہمی صنفی تعلقات کے اِفشاء کرنے کا حکم 393
بیوی کے حقوق ---------- 394
بیوی کے حقوق ---------- 394
اس بات کا بیان کہ عورت کے پیچھے سے آ کر شرمگاہ میں جماع کرنا جائز ہے ---------- 396
جماع کے وقت کی دعا ---------- 399
خاوند کی نافرمان عورت یعنی جماع سے انکار کرنے والی عورت پر لعنت کا ذکر ---------- 401
بالوں میں دوسرے بال ملانے اور بدن گدوانے کا حکم 403
زمانہ حمل میں دودھ پلانے، عزل کرنے اور مانع حمل وسائل اختیار کرنے کا حکم ---------- 405
بنا غسل کے دوبارہ جماع کرنے کا جواز ---------- 412

3۔ بَابُ الصَّدَاقِ

مہر کا بیان

مہر کتنا ہو؟ ---------- 414
مہر دراصل کس کا حق ہے؟ ---------- 414
مہر کا مال ہونا لازم ہے ---------- 414
"مَنَافِع" مہر بن سکتے ہیں یا نہیں؟ ---------- 414
آزاد کرنے کو مہر مقرر کرنے کا حکم ---------- 415
نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات ؓ کے مہروں کا بیان ---------- 416
نبی ﷺ کی لختِ جگر سیدہ فاطمہ ؓ کے مہر کا بیان 417

مہر، ہدیہ اور وعدہ کا حکم ---------- 418

جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو، اس کا مہر کیا ہوگا؟ ------- 419

مہر کی مقدار کیا ہے؟ ---------- 422

کیا جوتیوں کا ایک جوڑا مہر ہوسکتا ہے؟ ---------- 423

مہر میں لوہے کی انگوٹھی ---------- 424

دس درہم سے کم مہر نہ ہونے کا حکم ---------- 424

مہر کم مقرر کیا جائے ---------- 425

مطلقہ کو کیا دے کر رخصت کیا جائے ---------- 425

4۔ بَابُ الْوَلِيمَةِ

ولیمہ کا بیان

ولیمہ کا حکم اور اس کا وقت ---------- 427

دعوتِ ولیمہ قبول کرنے کی شروط ---------- 429

دعوت کی اقسام ---------- 430

دعوت قبول کرنے کی شروط ---------- 430

سب سے برا کھانا ---------- 431

روزہ دار پر دعوتِ ولیمہ قبول کرنا لازم نہیں ---------- 432

ولیمہ کتنے دنوں تک کر سکتے ہیں ---------- 434

ولیمہ کی اقسام ---------- 434

نبی کریم ﷺ کی بعض ازواج مطہرات کے ولیموں کا بیان ---------- 435

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا ولیمہ ---------- 435

دو سے دعوت ملے تو کس کے ہاں جایئے؟؟ ---------- 437

لطیفہ ---------- 438

ٹیک لگا کر کھانے کا حکم ---------- 438

کھانا کھاتے وقت "بسم اللہ" پڑھنا ---------- 439

کھانے کے آداب ---------- 441

کھانے میں سے عیب ہرگز نہ نکالا جائے ---------- 442

بائیں ہاتھ سے کھانا منع ہے ---------- 443

پینے کے آداب ---------- 444

5۔ بَابُ الْقَسْمِ بَيْنَ الزَّوْجَاتِ

ایک سے زائد بیویوں کے درمیان شب باشی کی اور زمانہ کی باریاں مقرر کرنے کا بیان

نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات میں تقسیم میں عدل فرمانا ---------- 445

بیویوں میں باریوں اور وقت کی تقسیم کا حکم ---------- 446

محبت کے اسباب ---------- 446

بیوی سے محبت کا حکم ---------- 447

دو میں سے ایک بیوی کی طرف زیادہ مائل ہونا حرام ہے ---------- 448

بیویوں میں عدل کیونکر ہو؟ ---------- 449

شادی کے وقت کنواری اور شوہر دیدہ میں تقسیم میں فرق کرنے کا بیان ---------- 449

ایک بیوی کو حق ہے کہ وہ دوسری کی خاطر اپنی باری چھوڑ دے ---------- 452

نبی کریم ﷺ کا ازواجِ مطہرات سے حسن سلوک -- 453

نبی کریم ﷺ کا بے پناہ عدل وانصاف ---------- 455

سفر میں کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لیے قرعہ ڈالنا 457

بیوی کے ساتھ سخت رویہ رکھنے کی ممانعت کا بیان ---- 458

6۔ بَابُ الْخُلْعِ

خلع کا بیان

خلع کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 459

خلع کے جواز کی اصل ---------- 460

خلع طلاق نہیں ---------- 460

خلع کا اور بیوی نے جو کچھ لیا ہے، اس کے لوٹانے کا بیان ---------- 460

خلع لینے والی عورت کی عدت کا بیان ---------- 462

اسلام میں پہلا خلع ---------- 463

9.....كِتَابُ الطَّلَاقِ
طلاق کے احکام ومسائل کا بیان

سب سے برا حلال ---------- 468
طلاق کے مفاسد، برائیاں اور خرابیاں ---------- 468
طلاق کی اقسام ---------- 469
(1) واجب طلاق ---------- 469
(2) حرام طلاق...... ---------- 469
(3) مستحب طلاق ---------- 469
(4) مباح طلاق ---------- 469
(5) مکروہ طلاق ---------- 469
حیض والی کو طلاق دینے کا حکم ---------- 469
حرام طلاقیں ---------- 475
حیض میں طلاق ---------- 475
دورِ فارقی میں تین طلاقیں اکٹھی دینے کے حکم میں اختلاف ---------- 475
یکبارگی تین طلاقیں دینے کا حکم ---------- 477
اکٹھی تین طلاقیں دینا یہ اللہ کی کتاب سے کھلواڑ ہے - 478
تین طلاقوں کے بعد رجوع کا حکم ---------- 480
ایک کی نیت سے تین طلاقیں اکٹھی دینے کا حکم ---------- 482
مذاق مذاق میں طلاق دینے کی تحذیر اور اس سے ڈرانے کا بیان ---------- 483
طلاق کے خیال یا وسوسہ کا حکم ---------- 486
غلطی سے طلاق دے بیٹھنے کا اور زبردستی طلاق دلوانے کا حکم ---------- 487
جبر و اکراہ اور بھول چوک کی قسمیں اور ان کا حکم ---------- 488
خود پر بیوی کو حرام کر لینے کا حکم ---------- 489
کنایہ کے الفاظ سے طلاق کا حکم ---------- 491
نامبارک عورت ---------- 491
نکاح ثابت ہوگا تو طلاق بھی ثابت ہوگی ---------- 493
اجنبیہ سے طلاق کو معلق کرنے کا حکم ---------- 494
غیر ملک میں نذر، عتق اور طلاق کا حکم ---------- 494
نابالغ، دیوانے اور نشہ والے کی دی طلاق کا حکم ---------- 495
سوتے پر سے رفع قلم ---------- 496
نابالغ پر سے رفع قلم ---------- 496

1۔ بَابُ الرَّجْعَةِ
رجعت کا بیان

رجعت کی شروط ---------- 498
طلاق اور رجعت میں گواہ بنانے کا حکم ---------- 499
نکاح سے متعلق تین باتیں ---------- 499

2۔ بَابُ الْإِيْلَاءِ وَالظِّهَارِ وَالْكَفَّارَةِ
ایلاء، ظہار اور کفارہ کا بیان

ظہار کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 501
کفارہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 502
ایلاء ظہار اور کفارہ کا حکم ---------- 502
ایلاء کے جواز کا حکم ---------- 502
ایلاء کی مدت کتنی ہے؟ ---------- 503
ظہار میں جماع کرنے والے کا حکم ---------- 506
ظہار کا کفارہ ---------- 508

3۔ بَابُ اللِّعَانِ
لعان کا بیان

لعان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------- 511
لعان کا حکم ---------- 513
پہلا لعان کیونکر ہوا ---------- 513
لعان کا نتیجہ ---------- 518
لعان کے بعد حد نہیں گو پیدا ہونے والا بچہ باپ کے مشابہ نہ

بھی ہو ---------------- 520
آخری وقت تک لعان سے روکنے کی کوشش کی جائے - 521
لعان کے بعد طلاق دینے کا حکم ---------------- 522
جہاں تک ہو سکے بیوی کو نہ چھوڑا جائے ---------- 524
جھوٹا لعان کرنے کا انجام ---------------- 526
رنگت کے فرق کا حکم ---------------- 528

4۔ بَابُ الْعِدَّةِ وَالْإِحْدَادِ وَالْإِسْتِبْرَاءِ وَغَيْرَ ذَلِكَ

عدت، سوگ اور استبراء رحم وغیرہ کا بیان

عدت ---------------- 530
عدت کی شروط ---------------- 531
عدت وفات کا حکم ---------------- 532
طلاق کی اور فسخ نکاح کی عدت کا بیان ---------- 533
فسخ نکاح کا حکم ---------------- 534
مطلقہ بائنہ کے سکنی اور نفقہ کا اور اس کی عدت کا بیان -- 535
مطلقہ کے سکنی اور نفقہ کے حکم کی تفصیل ---------- 535
خاوند کے سوا کسی کے مرنے کا تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے ---------------- 536
سوگ کے دوران خوشبو لگانے اور مہندی لگانے کا بیان 538
سوگ میں سرمہ لگانے کا حکم ---------------- 538
حدیث ام عطیہ رضی اللہ عنہا کے فوائد ---------- 539
حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فوائد ---------- 540
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث دوم کے فوائد ------ 541
عدت طلاق والی کے گھر سے نکلنے کا حکم ---------- 541
معتدۂ وفات کے گھر سے نکلنے کا حکم ---------- 542
مطلقہ بائنہ کی عدت کا حکم ---------------- 544
اُم ولد کی عدت کا بیان ---------------- 545
قرآن کی تفسیر "حدیث" سے ---------------- 546
باندی کی طلاق اور عدت کا بیان ---------------- 546
طلاق میں اعتبار بیوی کا ہے یا کہ خاوند کا؟ -------- 547
باندی کی عدت ---------------- 547
استبراء اور اس کے احکام ---------------- 548
اپنی بیوی کا غیر سے حاملہ ہونا ---------------- 548
گم شدہ کی بیوی کی عدت وغیرہ کے احکام ---------- 549
کسی نا محرم عورت کے ساتھ تنہا رات گزارنے کی ممانعت ---------------- 550
اجنبیہ کے ساتھ خلوت کی ممانعت ---------------- 551
استبراء کے باب میں قیدی عورتوں کے احکام ------- 552
بچہ بستر والے کا ہوتا ہے ---------------- 553

5۔ بَابُ الرَّضَاعِ

رضاعت کا بیان

رضاع کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------------- 555
رضاعت کے احکام ---------------- 555
رضاعت کیسے ثابت ہوتی ہے ---------------- 556
معتبر رضاعت اس وقت کی ہے جب بچہ پلتا ہی صرف دودھ پر ہو ---------------- 557
بالغ کو دودھ پلانے کا حکم ---------------- 558
رضاعی چچا کا حکم ---------------- 561
کتنی دفعہ دودھ پینے سے تحریم ثابت ہوتی ہے ------ 563
رضاعت سے بھی وہی رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں ---------------- 564
کس قسم کی رضاعت سے تحریم ثابت ہوتی ہے؟ ----- 565
دو سال تک کی رضاعت کا بیان ---------------- 567
رضاعت وہ ہے جو بچے کی ہڈیوں کو جوڑے اور مضبوط کرے ---------------- 567
رضاعت ثابت ہو جانے کا حکم ---------------- 568

نادان عورت سے بچے کو دودھ پلوانے کی ممانعت کا بیان ---------- 569

6۔ بَابُ النَّفَقَاتِ

نفقات (یعنی واجب خرچ) کا بیان

نفقہ کی لغوی واصطلاحی تعریف ---------- 569
نفقہ کی شروط ---------- 570
نفقہ کے اسباب اور ضوابط ---------- 570
زوجیت میں نفقہ کے وجوب کی تفصیل ---------- 570
قرابت میں نفقہ کے وجوب کی تفصیل ---------- 571
ولاء یعنی مِلک کی وجہ سے نفقہ کے وجوب کی تفصیل -- 571
بیوی اور اولاد پر خرچ کرنے کے احکام ---------- 572
خرچ میں ترتیب ---------- 574
مملوک پر خرچ کرنے کے احکام ---------- 576
نفقہ میں بیوی کا حق ---------- 577
اپنے دست نگروں کا خیال نہ رکھنے کا گناہ ---------- 578
حاملہ بیوہ کے نفقہ کا بیان ---------- 580
نفقہ نہ دے سکنے والے خاوند سے طلاق مانگ لینے کا حکم ---------- 581
بیویوں کو خرچہ نہ دینے والوں کا حکم ---------- 583
خرچ کرنے میں اَوْلَوِیَّت اور اَوَّلِیَّت کی ترتیب ---- 584
والدین پر خرچ کرنے کے احکام ---------- 585

7۔ بَابُ الْحَضَانَةِ

حضانت یعنی پرورش کا بیان

حضانت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------- 586
عورت حضانت کی کب مستحق ہوتی ہے ---------- 587
سن تمیز والے بچے کی حضانت کا حکم ---------- 589
کافر والدین میں سے ایک کے ایمان لے آنے پر حضانت کے استحقاق کا مسئلہ ---------- 591
ماں کے بعد حضانت کی مستحق خالہ ہے ---------- 592
غلام کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے ---------- 593
جانوروں تک سے رعایت کی جائے ---------- 594

10..... کِتَابُ الْجِنَایَاتِ

جنایتوں کے احکام ومسائل کا بیان

جنایات کی لغوی وشرعی تعریف ---------- 595
جنایت کا حکم ---------- 595
جنایات کے مراتب واقسام ---------- 595
جنایت عمد ---------- 596
جنایت شبہ العمد ---------- 596
جنایت خطا ---------- 596
مسلمانوں کے خونوں کی حرمت اور تعظیم ---------- 596
کافر کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم ---------- 598
عورت کے بدلے مرد کے قتل کا حکم ---------- 599
بیٹے کے بدلے باپ کا قتل ---------- 599
غلام کے بدلے آزاد کے قتل کا حکم ---------- 599
وہ حالات جن میں ایک مسلمان کا قتل جائز ہوتا ہے -- 602
سولی کیسے دی جاتی ہے؟ ---------- 604
مخالف جانب سے ہاتھ پیر کاٹے جانا ---------- 604
خونوں کی حرمت کا بیان ---------- 605
غلام کا قصاص آزاد سے لینے کا بیان ---------- 605
بیٹے کے قتل کا والد سے قصاص لینے کا حکم ---------- 607
کافر کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم ---------- 607
روافض کا ایک باطل عقیدہ اور اس کا رد ---------- 608
معاہد کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم ---------- 610
جان پر جنایت کرنے کا حکم ---------- 612
نابالغ اور مجنون کی جنایت کا حکم ---------- 613
زخم جب تک گھل نہ جائیں ان میں قصاص جاری نہ کیا

جائے ---------- 614
حمل پر جنایت کا حکم ---------- 616
دانت توڑنے میں قصاص ہے ---------- 619
جنایت علی النفس کی اقسام ---------- 621
دیت خطا کیا ہے؟---------- 622
دیتِ شبہ عمد ---------- 622
مل کر جنایت کرنے کا حکم ---------- 623
کسی کو مل کر قتل کرنے کی صورتیں اور ان کا حکم---------- 623
معاہد کو قتل کر دینے کا حکم ---------- 625
ایک کے بدلے جماعت کا قتل ---------- 625
دیت اور قصاص میں تخییر اور اس کی شروط ---------- 626

1۔ بَابُ الدِّیَاتِ

دیتوں کا بیان

زخموں میں دیتوں کی مقداریں ---------- 627
دو اہم ضابطے ---------- 630
دو اور اہم ضابطے ---------- 631
جس جنابت میں دیت نہ آتی ہو ---------- 631
زخموں میں دیت ---------- 631
قتل خطا کی دیت ---------- 632
قتلِ عمد اور شبہ عمد کی دیت ---------- 634
تین سرکش ترین آدمی ---------- 634
حرم میں قصاص لینے کا حکم ---------- 635
قتلِ شبہ عمد کی دیت کو قتلِ خطا کی دیت سے ملانا ---------- 636
انگلیوں اور دانتوں کی دیت ---------- 637
طبیب پر ضمان آنے کا بیان ---------- 638
سر کے زخموں کی دیت ---------- 639
اہل کتاب کی دیت ---------- 640
مرد اور عورت کی دیت کا بیان ---------- 640
دیت کی تغلیظ اور اس کے ضوابط کا بیان ---------- 641
دیت مغلظہ کیا ہے؟ ---------- 642
دراہم سے دیت ---------- 643
دیت کے تحمل میں اصل عاقلہ ہے ---------- 643
تحملِ دیت میں اصل "عاقلہ" ہے ---------- 644

2۔ بَابُ دَعْوَی الدَّمِ وَالْقَسَامَةِ

خون کے دعویٰ اور قسامت کا بیان

قسامت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------- 644
دعوائے دم---------- 645
قسامت کا ایک عبرت انگیز واقعہ ---------- 645
اب قسامت ایک شرعی حکم ہے ---------- 649

3۔ بَابُ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ

باغیوں سے قتال کا بیان

بغی یعنی بغاوت کی تعریف اور باغی کے حال کا بیان -- 651
باغیوں کا حکم ---------- 652
مسلمانوں پر اسلحہ اٹھانے والے سے قتال کیا جائے گا - 652
جماعت مسلمین کو چھوڑنے کا حکم ---------- 653
باغی جماعت کون ہے؟---------- 653
باغیوں کے ساتھ برتاؤ کے ضوابط ---------- 654
اجتماعیت کی اور تفرقہ چھوڑ دینے کی ترغیب ---------- 657

4۔ بَابُ قِتَالِ الْجَانِي وَقَتْلِ الْمُرْتَدِّ

جانی سے قتال اور مرتد کے قتل کا بیان

حملہ آور کو قتل کر دینا جائز ہے ---------- 659
جان کی مدافعت کرتے ہوئے کسی جان کے یا جان سے کم
کے اتلاف کا ضمان نہ آئے گا ---------- 660
مسلمانوں کے گھروں میں تاک جھانک کرنے والے کا ضمان
ساقط ہے ---------- 662
تاک جھانک کرنے والے کو کنکری مارنے کا حکم ----- 663

کون سا جھانکنا قابل عقوبت ہے ---------- 663
چوپایوں کے اِتلاف کے احکام ---------- 664
مرتد کے قتل کا حکم ---------- 666
مرتد قتل کرنے کی شروط ---------- 667
مرتد کی تعریف ---------- 667
شاتمِ رسول ﷺ کو اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کرنے والے کو قتل کر دینے کا بیان ---------- 669

11..... كِتَابُ الْحُدُوْدِ
حدود کے احکام ومسائل کا بیان

حد کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------- 673
حدود کا حکم ---------- 674

1۔ بَابُ حَدِّ الزَّانِيْ
زانی کی حد کا بیان

زانی غیر محصن کی سزا ---------- 674
جلد اور رجم کو جمع کرنے کا بیان ---------- 679
اقرار سے زنا کے ثبوت کا بیان ---------- 680
زنا کے اثبات میں تحقیق واجب ہے ---------- 683
زنا کس کس طرح ثابت ہوتا ہے؟ ---------- 684
زانیہ کنیز کی حد کا بیان ---------- 689
غلام پر حد آقا جاری کرے گا ---------- 690
حاملہ زانیہ پر حد قائم کرنے میں مہلت دینے کا بیان ---------- 691
رجم کا ثبوت ---------- 694
کمزور مریض پر سے حد میں تخفیف کرنے کا بیان ---------- 695
لواطت کی سزا ---------- 697
کنوارے زانی کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی دونوں ہیں ---------- 699
[illegible] زانی کی سزا ---------- 699
ہیجڑوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت کا بیان ---------- 699
ایک نحوی نکتہ ---------- 700
حدود کو شبہات سے دور کرنے کا حکم ---------- 701
زنا ثابت ہو جانے پر حد زنا قائم کرنا واجب ہے ---------- 702

2۔ بَابُ حَدِّ الْقَذْفِ
حد قذف کا بیان

قصہ افک ---------- 704
قذف کی حد کیا ہے اور اس پر مرتب ہونے والے احکام 705
حد قذف کی شروط ---------- 707
لعان کا بیان ---------- 707
غلام قاذف کی حد کا بیان ---------- 708
غلام کی حد قذف ---------- 708

3۔ بَابُ حَدِّ السَّرِقَةِ
حد سرقہ کا بیان

انڈے کی چوری ---------- 713
برتنے کو دی چیز کو واپس دینے سے انکار کرنے کا بیان - 714
اچک لینے اور لوٹ لینے کا حکم ---------- 717
قطع ید کی عقوبت کے لازم ہونے کے لیے حرز سے مال لینا شرط ہے ---------- 718
سرقہ اقرار کے ذریعے بھی ثابت ہوتا ہے ---------- 718
قطعِ ید کے بعد چور مالِ مسروقہ کا ضامن نہ ہوگا ---------- 722
ضمان اور قطع کو جمع کرنے کا حکم ---------- 723
کھجوریں لے لینے کی صورتیں اور ان کے احکام ---------- 723
حدود میں سفارش کرنے کا، اور اس کے ضوابط کا بیان - 725
بار بار چوری کرنے والے کا حکم ---------- 726

4۔ بَابُ حَدِّ الشَّارِبِ وَ بَيَانِ الْمُسْكِرِ
شراب پینے والے کی حد کا اور نشہ آور شے کا بیان

شارب اور مسکر کی تعریف ---- 727
شراب نوشی کا حکم ---- 728
مے نوش کی سزا ---- 729
شراب کی سزا میں چالیس کوڑے بھی سنت ہے اور اسّی کوڑے بھی سنت ہے ---- 730
بار بار شراب پینے والے کا حکم ---- 731
چہرے پر ضرب لگانے سے گریز کیا جائے ---- 732
مساجد میں حد قائم نہ کی جائے ---- 733
شراب پاک ہے یا ناپاک؟ ---- 733
شراب کتنی چیزوں سے بنتی ہے؟ ---- 734
ہر نشہ لانے والی شے شراب کے حکم میں داخل ہے ---- 734
نشہ لانے والی شے تھوڑی ہو یا زیادہ حرام ہے ---- 735
پانی یا دودھ میں کشمش ملانے کا حکم ---- 736
حرام شے سے دوا دارو کرنے کا حکم ---- 737
شراب کے ذریعے علاج کرنے کا حکم ---- 738
شراب میں شفاء نہیں ---- 738

5۔ بَابُ التَّعْزِيْرِ وَحُكْمِ الصَّائِلِ
تعزیر کا بیان اور حملہ آور کا حکم

تعزیر کی تعریف ---- 739
تعزیر کی حد ---- 739
تعزیر کا حکم ---- 740
تعزیر کہاں واجب ہے؟ ---- 740
تعزیر کی مقدار اور اس کے ضوابط ---- 740
تعزیر کی مقدار کتنی ہے ---- 740
غلطیوں کو معاف کرنا اور اس کے ضوابط کا بیان ---- 741
مے خواری کڑی سزا کا مستحق ہے ---- 742
حملہ آور کا حکم ---- 743
جان کا دفاع کرنے کا حکم ---- 744

12..... كِتَابُ الْجِهَادِ
جہاد کے احکام و مسائل کا بیان

جہاد کی لغوی اور شرعی تعریف ---- 746
جہاد کی اقسام ---- 746
دفاعی جہاد کا وجوب اور اس کی شروط ---- 747
جہاد میں ''قدرت'' کی شرط اور اس کے ضوابط ---- 748
جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب ---- 749
مشرکوں سے ہر قیمت پر جہاد کیجیے! ---- 751
عورتوں کا جہاد ---- 752
والدین کے ساتھ نیکی، حسنِ سلوک اور ان کی خدمت جہاد پر مقدم ہے ---- 753
دار الکفر میں اقامت اختیار کرنے کا حکم ---- 755
دار الکفر سے ہجرت کرنے کے احکام ---- 756
جہاد میں اخلاص واجب ہے ---- 757
جنگ بندی اور صلح کا جواز ---- 758
دشمن کو خبر کیے بغیر دھاوا بول دینے کا حکم ---- 759
لشکروں کے امیروں اور جرنیلوں کو نبی کریم ﷺ کی وصیتیں ---- 761
جزیہ ---- 765
جنگ میں توریہ کرنے کا حکم ---- 769
دن کے آغاز اور اختتام پر قتال کا بیان ---- 770
قتال کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرنا ---- 770
رات کے حملہ کے وقت عورتوں اور بچوں کے قتل کا جواز ---- 771
جنگ میں مشرکوں سے مدد نہ لی جائے گی ---- 772
جنگوں میں عورتوں اور بچوں کا قتل منع ہے ---- 773
مشرکوں کے بڑی عمر والوں کے قتل کا جواز ---- 774

جنگوں میں مبارزت یعنی للکارنے اور چیلنج کرنے کا بیان ---------------------------------- 775
کفار کی صفوں پر عمومی حملہ کرنے کا اور اس کے ضوابط کا بیان ---------------------------------- 776
دشمن محاربین کے مالوں کو ضائع کر دینے کا بیان ---- 778
غلول کی ممانعت کا بیان------------------------------- 779
سلب قاتل کا ہے ------------------------------- 780
منجنیق کے ذریعے گولے چلانے کا حکم ------------ 781
مرتد کا حرم میں بھی قتل کر دینا جائز ہے ---- -------- 783
قید میں قتل کرنے کا حکم ----------------------- 785
قیدی اور اس کے احوال کا بیان-------------------- 786
قیدی کے احکام----------------------------------- 786
کافر کا مسلمان ہو جانا اور اس کے نتائج کا بیان ----- 786
کافروں کے مسلمان ہو جانے کی صورتیں اور ان کے احکام ---------------------------------- 787
احسان کرنے والوں کے احسان کو پہچاننا----------- 787
گرفتار عورتیں جب تک بچہ نہ جنم دیں یا ان کا استبراءِ رحم نہ حاصل کر لیا جائے ان سے وطی کرنا منع ہے-------- 788
مال غنیمت کی تقسیم کے بعد مجاہدین کو "نفل" (زائد انعام) دینے کا حکم ---------------------------------- 790
گھڑ سوار، پیادہ اور گھوڑے کا حصہ ---------- 791
تنفیل کا حکم------------------------------------ 792
تقسیم سے پہلے دشمنوں کے کھانے سے لینے کا حکم---- 793
مال فے کی حفاظت واجب ہے ----------------- 794
مسلمانوں میں سے ادنیٰ کی پناہ بھی سب مسلمانوں پر چلے گی ---------------------------------- 795
یہود و نصاریٰ کے جزیرۂ عرب سے نکال دینے کا حکم-- 797
جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کی بے دخلی -------- 798
بنی نضیر کی مدینہ سے جلاوطنی ------------------ 798
غنائم خیبر کی تقسیم کا بیان -------------------- 800
نبی کریم ﷺ نہ تو قاصدوں کو قید کیا کرتے تھے اور نہ عہد شکنی ہی کیا کرتے تھے ---------------------- 801
مفتوحہ زمینوں کا حکم---------------------------- 802

1۔ بَابُ الْجِزْيَةِ وَالْهُدْنَةِ

جزیہ اور جنگ بندی و صلح کا بیان

جزیہ کا لغوی و شرعی معنی - ------------------- 802
جنگ بندی کی مدت ---------------------- 803
مجوس سے جزیہ لینے کا حکم ------------------- 803
عربوں سے جزیہ لینے کا حکم-------------------- 804
ہر بالغ سے لیے جانے والے جزیہ کی مقدار -------- 805
اسلام کی سربلندی اس پر عمل کرنے سے ہے------- 805
کافروں کو سلام کرنے کا حکم ------------------ 807
صلح حدیبیہ کا بیان------------------------------ 808
معاہد کا قتل ناجائز اور منع ہے ------------------ 811

2۔ بَابُ السَّبْقِ وَالرَّمْيِ

گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کا بیان

گھوڑوں کی دوڑ کا مقابلہ ------------------- 812
شرط لگانا کہاں جائز ہے ------------------------ 813
گھڑ دوڑ کو حلال کرنے والا --------------------- 815
قوت پیدا کرنے کی مشق کرنے یعنی جنگی مشقیں کرانے اور فوجی تربیت دینے کی مشروعیت کا بیان ---------- 816

13..... كِتَابُ الْأَطْعِمَةِ

کھانے پینے کے احکام و آداب کا بیان

طعام کا حکم------------------------------------ 818
تحریم کے اصول -------------------------- 818
ہر کچلی والا درندہ حرام ہے ------------------- 819

کون سا جانور حرام ہے ---- 819
حرام جانور کی تحریم کی حد ---- 820
قواعد تحریم ---- 820
پھاڑ کھانے والے درندے کی تحریم کی حکمت ---- 820
پنجہ سے شکار کر کے کھانے والا ہر پرندہ حرام ہے ---- 820
پالتو گدھوں اور گھوڑوں کے کھانے کا حکم ---- 821
حرام جانوروں کی تیسری ---- 821
کیا گھوڑے حلال ہیں؟ ---- 821
گھریلو گدھوں کا حکم ---- 822
ٹڈی کھانے کا حکم ---- 822
خرگوش کا حکم ---- 823
چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور لٹورے کا حکم ---- 824
چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور لٹورے کا حکم ---- 825
بجو کھانے کا حکم ---- 825
سیہی کا کھانے کا حکم ---- 826
جلالہ کا حکم ---- 829
جنگی گدھا اور گھوڑا حلال ہے ---- 830
گوہ کھانا حلال ہے ---- 831
مینڈک کا حکم ---- 832

1۔ بَابُ الصَّيْدِ وَالذَّبَائِحِ

شکار اور ذبیحوں کا بیان

شکار کا حکم ---- 833
کتا رکھنے کا حکم ---- 833
سدھائے کتے کا شکار حلال ہے ---- 834
شکار میں دو کتے شریک ہو جانے کا حکم ---- 836
نیزے اور بے پر کے تیر سے مرنے والے شکار کا حکم - 839
تیر سے شکار کرنے کا حکم ---- 841
جس جانور پر ذبح کے وقت بسم اللہ نہیں پڑھی گئی اس کو کھاتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم ---- 842
ذبح کے وقت تسمیہ شرط ہے ---- 842
شکار کو کنکری اور ٹھیکری پھینک مارنے کی ممانعت کا بیان 843
کسی جاندار کو زندہ باندھ کر اس پر نشانہ کی مشق کرنا حرام ہے ---- 844
پتھر کے ذریعے ذبح کرنے اور حیض والی عورت کے ذبح کرنے کا حکم ---- 84[illegible]
ذبح کی شروط کا بیان ---- 846
جانور کو باندھ کر قتل کرنا منع ہے ---- 848
جانور کو مارنے میں بھی احسان کیجیے! ---- 849
ماں کی ذکاۃ جنین کی بھی ذکاۃ ہے ---- 851
ذبح کے وقت تسمیہ بھول جانے کا حکم ---- 852

2۔ بَابُ الْاَضَاحِيْ

قربانیوں کا بیان

قربانی کا حکم ---- 854
قربانی کی شروط ---- 854
نبی کریم ﷺ قربانی کے جانور کو کیسے ذبح فرمایا کرتے تھے ---- 856
قربانی کا حکم ---- 860
قربانی کا وقت ---- 862
قربانی کے جانور کے اُن عیوب کا بیان جو قربانی میں مانع ہوتے ہیں ---- 863
قربانی میں مُسِنَّہ یعنی دوندے کو ذبح کرنے کا حکم ---- 866
قربانی کے جانور کے چند مزید عیوب کا بیان ---- 867
قصاب کی اجرت قربانی کے گوشت سے نہ دی جائے ---- 868
ایک اونٹ اور گائے سات آدمیوں کی طرف سے قربان کر سکتے ہیں ---- 870

3- بَابُ الْعَقِيقَةِ
عقیقہ کا بیان

عقیقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 871
عقیقہ کا حکم ---------- 871
بچہ اور بچی کی طرف سے عقیقہ ---------- 872
ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہے ---------- 873

14..... كِتَابُ الْأَيْمَانِ وَالنُّذُوْرِ
قسموں اور نذروں کے احکام و مسائل کا بیان

ایمان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ---------- 876
قسم اٹھاتے ہوئے ان شاءاللہ ساتھ میں کہنا مستحب ہے 876
غیر اللہ کی قسم کھانا حرام ہے ---------- 877
قسم کا کفارہ ---------- 877
غیر اللہ کے نام پر قسم کھانے کا حکم ---------- 878
قسم میں قسم اٹھوانے والے کی نیت کا اعتبار ہے ---------- 881
صورت مسئلہ ---------- 881
اگر قسم توڑنے میں خیر ہو تو اس کو توڑ کر کفارہ دے دے 883
قسم توڑنے کی اقسام ---------- 884
قسم میں ان شاءاللہ کہنے کا حکم اور اس کی تحقیق ---------- 885
نبی کریم ﷺ کن الفاظ کے ساتھ قسم اٹھایا کرتے تھے 886
یمین غموس کبیرہ گناہ ہے ---------- 887
یمین لغو کا بیان ---------- 889
رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ---------- 890
ادراج ---------- 891
ادراج کی غرض ---------- 891
نیکی کرنے والے کے لیے خیر کی دعا کرنا ---------- 892
نذر یعنی منت ماننے کا حکم ---------- 892
نذر کا کفارہ ---------- 895
گناہ کی اور بساط سے باہر کسی کام کی نذر ماننے کا حکم - 896
کفارۂ یمین ---------- 896
گناہ کی نذر کا حکم ---------- 897
بیت اللہ تک پیدل جانے کی نذر ماننے کا حکم ---------- 898
مرنے والے کی نذر پوری کرنے کا حکم ---------- 900
معین جگہ کی نذر کا حکم ---------- 901
مفضول نذر سے افضل نذر کی طرف منتقل ہونے کا حکم - 903
مساجد ثلاثہ کی طرف رختِ سفر باندھنے کا حکم ---------- 904
مسلمان ہو جانے کے بعد حالتِ کفر کی نذر پوری کرنے کا بیان ---------- 905

15..... كِتَابُ الْقَضَاءِ
قضاء کے احکام و مسائل کا بیان

قضی کا لغوی و اصطلاحی معنی اور مفتی اور قاضی میں فرق 906
قضاء کا حکم ---------- 906
قاضی کی صفات ---------- 907
نیکوکار قاضی کی صفت ---------- 907
قضاء قبول کرنے سے بچنا واجب ہے ---------- 908
امارت کی مشقتیں اور اس کا انجام ---------- 909
مجتہد حاکم یا مفتی یا قاضی کا حکم ---------- 910
غصہ کی حالت میں فیصلہ کرنا منع ہے ---------- 911
قاضی جب تک دونوں متخاصمین کی بات سن نہ لے فیصلہ نہ دے ---------- 912
اگر حاکم کا فیصلہ ظاہر دلیل کو دیکھ کر غلط ہو تب بھی محکوم لہ کے لیے وہ فیصلہ جائز نہیں ہو جاتا ---------- 914
عدل کرنے کا اہتمام ---------- 915
قضا کے عہدے کی سنگینی، نزاکت اور عظیم ذمہ داری کا بیان ---------- 916
مسلمانوں کے امور عامہ پر عورت کے حاکم بن بیٹھنے کا حکم 917

والی کا مسلمانوں کی حاجات سے اوجھل ہو جانا جائز نہیں 918
رشوت، ہدیہ اور قاضی ---------- 920
رشوت---------- 920
قاضی کو مجلس میں متخاصمین کے درمیان برابری کرنا واجب ہے ---------- 921

1- بَابُ الشَّهَادَاتِ

گواہیوں کا بیان

شہادت کی تعریف اور اس کے ذرائع ---------- 922
شہادت کا اطلاق اور اس کا حکم ---------- 922
شہادت کے ردّ و قبول کا حکم ---------- 923
چند اصطلاحات---------- 923
شہادت کی شرطیں ---------- 923
سب سے اچھا گواہ وہ ہے جو گواہی کے مطالبہ سے پہلے خود گواہی دے دے ---------- 923
سب سے بہتر زمانے پہلے تین زمانے ہیں ---------- 924
خائن، دشمن اور دست نگر کی شہادت کا حکم ---------- 926
شروطِ شہادت ---------- 927
موانعِ شہادت---------- 928
دیہاتی کی شہر والے کے خلاف شہادت غیر مقبول ہے 928
گواہ کی عدالت میں اعتبار اس کے ظاہر کا ہے ---------- 929
جھوٹی گواہی کا بیان---------- 930
شہادت زور ---------- 930
شاہد زُور کی اقسام ---------- 930
شہادت صرف یقینی، حتمی اور قطعی بات کی ہے یا پھر اس بات کی ہے جو زبانِ زد خلائق ہو ---------- 931
قسم اور ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ کرنے کا بیان ---------- 932
اثباتِ حقوق میں شہادت کے مراتب ---------- 933

2- بَابُ الدَّعَاوَىٰ وَالْبَيِّنَاتِ

دعاوی اور بینات کا بیان

دعویٰ کی تعریف---------- 934
مدعی کے ذمہ بینہ لانا ہے اور منکر پر قسم آتی ہے ---------- 935
دعویٰ کی اقسام ---------- 936
(1) ناممکن دعویٰ ---------- 936
(2) کسی ممکن بات کا دعویٰ ---------- 936
متعدد خصوم کے درمیان قسم کے لیے قرعہ ڈالنا ---------- 936
دوسرے کا مال ناحق لینے والے پر اللہ کا غضب ہے -- 937
فیصلہ گواہوں کے اعتبار سے ہوگا ---------- 940
زمان یا مکان کے ساتھ قسم کو اور زیادہ سخت اور مؤکد کرنے کا بیان ---------- 941
وہ بدنصیب لوگ جن سے رب تعالیٰ روزِ قیامت نہ تو بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا ہی ---------- 942
قبضہ شہادت کو راجح بنانے والا اور اس کے موافق ہوتا ہے 943
جب مدعا علیہ قسم نہ اٹھائے تو قسم مدعی سے لی جائے گی 944
نسب کے ثبوت میں قیافہ کا اعتبار ہے ---------- 944

16..... كِتَابُ الْعِتْقِ

عتق کے احکام و مسائل کا بیان

عتق کی تعریف اور اس کے اسباب---------- 947
آزادی کے اسباب ---------- 948
عتق کی ترغیب ---------- 948
باندی کو آزاد کرنے کی فضیلت ---------- 949
مہنگا غلام آزاد کرنا سستے غلام کو آزاد کرنے سے افضل ہے ---------- 949
مشترک غلام میں سے اپنے حصہ کے غلام کو آزاد کرنے کا حکم ---------- 950
سعایت کا بیان ---------- 951

والدین یا کسی ذی رحم محرم کا مالک بن جانے کا حکم --- 951
مرض الموت میں صدقہ خیرات کرنے کا حکم -------- 952
عتق کو معلق کرنے کا حکم -------------------- 953
غلام کی ولاء اسی کی ہے جو اسے آزاد کرے -------- 954
ولاء کی بیع کا اور اس کو ہبہ کرنے کا بیان ---------- 954

1۔ بَابُ الْمُدَبَّرِ وَ الْمُكَاتَبِ وَ أُمِّ الْوَلَدِ

مدبر، مکاتب اور ام ولد کا بیان

مدبر کا حکم ------------------------------ 955
مکاتب جب تک مالِ کتابت کو ادا کرنہیں دیتا وہ غلام ہی ہے ------------------------------ 955
جب مکاتب عقد کتابت کے بقدر مال کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد جیسا ہے ------------------------------ 956
مکاتبت کی دیت کا بیان ---------------------- 957
نبی کریم ﷺ کے ترکہ کا بیان ---------------- 957
ام ولد اپنے آقا کی وفات کے وقت آزاد ہو جاتی ہے 958
مکاتب غلام کی اعانت کا اجر وثواب -------------- 959

17..... كِتَابُ الْجَامِع

آداب واخلاق، زہد وورع، بر وصلہ اور ذکر ودعا وغیرہ کے احکام ومسائل کو جامع ایک کتاب

1۔ بَابُ الْأَدَبِ

ادب کا بیان

اسلامی ادب کا معنی اور اس کی اقسام --------------- 960
ہر قوم کے اخلاق جدا جدا ہیں -------------------- 961
ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کیا کیا حقوق ہیں - 961
رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری سے بچنے کا طریقہ --- 964
نیکی وبدی اور ان کی ضوابط کا بیان ---------------- 965
کوئی دو، اپنے ساتھ بیٹھے تیسرے کو چھوڑ کر آپس میں کوئی سرگوشی نہ کریں ------------------------------ 966
مجلس کے آداب واحکام ---------------------- 967
کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کو اور برتن کو چاٹ لینا -- 969
سلام کے آداب واحکام ---------------------- 970
اکیلے کا جماعت کی طرف سے سلام کرنا ---------- 971
اہل کتاب کو سلام کرنے کا حکم ------------------ 972
چھینکنے والے کو جواب دینا ---------------------- 972
کھڑے ہو کر پینے کا حکم ------------------------ 974
پہلے دایاں جوتا پہننا مستحب ہے ------------------ 975
ایک جوتا پہن کر چلنا منع ہے -------------------- 976
کپڑوں میں اِسبال کا حکم ------------------------ 977
بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت کا بیان ------ 978
اِسراف ہر چیز میں منع ہے ---------------------- 979

2۔ بَابُ الْبِرِّ وَ الصِّلَةِ

نیکی اور صلہ رحمی کا بیان

صلہ رحمی عمر اور رزق میں برکت کا باعث ہے ------- 981
قطع رحمی کی ممانعت ------------------------- 982
والدین کی نافرمانی منع ہے --------------------- 983
والدین کے ساتھ نیکی کرنے کے ضوابط کا بیان ------ 983
پڑوسی کے حقوق ---------------------------- 984
اللہ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ ------------ 985
کسی کے باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے ----------- 987
دو بھائیوں کے درمیان ترکِ تعلق کیونکر ختم کیا جا سکتا ہے ------------------------------ 989
ہر نیکی صدقہ ہے ---------------------------- 990
پڑوسی کے ساتھ نیکی کرنا، چاہے معمولی سی ہی ہو ----- 991
کسی مسلمان سے کوئی تکلیف دوسرے کرنے اور اس پر آسانی کرنے کا بیان -------------------------- 991
نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا نیکی کرنے والے جیسا

ہے -- 993
نیکی کا بدلہ دینا ---------------------------------- 994

3۔ بَابُ الزُّهْدِ وَالْوَرَعِ

زہد و ورع کا بیان

حلال، حرام اور مشتبہ باتوں کا بیان ---------------- 996
دنیا کی محبت سے بچو ------------------------------ 997
دنیا ایک مسافر خانہ ہے ---------------------------- 998
نیکوں جیسا بننے کی ترغیب-------------------------1000
اللہ کی حدود کی حفاظت رب تعالیٰ کی حفاظت کا ذریعہ
ہے ---1002
بندہ دوسرے لوگوں میں محبوب کیونکر بنتا ہے؟ -----1003
بندہ رب تعالیٰ کا محبوب کیونکر بنتا ہے؟ -----------1005
لایعنی باتوں کا ترک اسلام کی خوبی میں سے ہے ---1006
کھانے میں اسراف منع ہے -------------------------1007
توبہ کی فضیلت اور اس کی شروط -------------------1007
توبہ کی تعریف اور شروط --------------------------1008
خاموش رہنے اور کم بولنے کی فضیلت -------------1009
خاموشی ہی بہتر ہے -------------------------------1009
کیا خاموشی حکمت ہے؟ ----------------------------1009

4۔ بَابُ التَّرْهِيبِ مِنْ مَسَاوِئِ الْأَخْلَاقِ

برے اخلاق سے ڈرانے کا بیان

حسد منع ہے ------------------------------------1010
حسد کی تعریف اور اقسام --------------------------1010
غصہ کی مذمت -----------------------------------1011
ظلم اور بخل کی ممانعت ----------------------------1012
ظلم کی لغوی اور شرعی تعریف ---------------------1013
شح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف -----------------1014
ریاکاری --1014
ریاء کی لغوی اور شرعی تعریف --------------------1015
چند منافقانہ عادات --------------------------------1015
خیانت --1016
دشنام طرازی کی ممانعت --------------------------1017
بدگمانی سے بچا جائے ----------------------------1018
رعایا کو دھوکا دینے کی ممانعت ---------------------1018
والی کو حکم ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ نرمی کرے -----1020
چہرہ پر مارنا منع ہے ------------------------------1020
غصہ کرنے کی ممانعت ----------------------------1021
غصہ کافور کرنے کی تدابیر ------------------------1021
لوگوں کے مال ناجائز طریق سے ہتھیانا منع ہے ---1022
خبر واحد میں عورت کا اعتبار ----------------------1022
رب تعالیٰ نے ظلم کو خود اپنے اوپر بھی اور اپنے بندوں پر حرام
کیا ہے ---1024
حدیث قدسی کی تعریف اور اقسام -----------------1024
غیبت اور اس کی سختی کے ساتھ ممانعت -----------1025
مسلمانوں کے درمیان بغض پیدا کرنے کے اسباب کی
ممانعت --1027
نبی کریم ﷺ نے برے اخلاق، اعمال اور خواہشات سے
پناہ مانگی ہے ------------------------------------1030
مسلمانوں کے درمیان خوش طبعی کرنے اور اس کے ضوابط کا
بیان --1031
بخل اور برے اخلاق کی مذمت --------------------1032
مجرم گالی دینے میں پہلے کرنے والا ہے ------------1033
مسلمان کو مضرت پہنچانا منع ہے -------------------1034
مسلمان نہ تو بد زبان ہوتا ہے، نہ فحش گو اور نہ لعن طعن کرنے
والا ہوتا ہے ------------------------------------1036
مردوں کو برا بھلا مت کہو --------------------------1037

چغلی ------------------------------ 1038
چغلی کیا ہے؟--------------------------- 1038
طیش پر قابو پانا ----------------------- 1039
فریب دینے اور بخل کرنے کی مذمت ------------ 1040
ٹوہ رکھنا اور ٹوہ لگانا حرام ہے------------------- 1041
تکبر سے بچو --------------------------- 1043
جلد بازی کی مذمت ----------------------- 1044
بداخلاقی براشگون اور منحوس عادت ہے ----------- 1044
بہت لعنت کرنے سے بچیں-------------------- 1045
اپنے مسلمان بھائی کو عار دلانے کی ممانعت ------- 1046
لوگوں کو ہنسانے کے لیے بھی جھوٹ بولنا حرام ہے -- 1047
غیبت کا کفارہ----------------------------- 1048
مبغوض ترین آدمی------------------------- 1048

5- بَابُ التَّرْغِيبِ فِيُ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ

مکارمِ اخلاق کی ترغیب

سچ کی ترغیب---------------------------- 1049
راستے کے حقوق ------------------------- 1052
دین میں فقاہت پیدا کرنے کی ترغیب ----------- 1054
حسنِ اخلاق کی ترغیب -------------------- 1055
حیا------------------------------------ 1056
دین میں مضبوطی اختیار کرنے کی ترغیب ------- 1057
تواضع کی ترغیب------------------------- 1059
اپنے بھائی کی آبرو کی پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے کی
فضیلت-------------------------------- 1060
صدقہ کی ترغیب ------------------------- 1061
جنت میں داخلہ کیسے؟ ------------------- 1062
اللہ، اس کے رسول اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی - 1063
اللہ کے ساتھ نصیحت ---------------------- 1064
کتاب کے ساتھ نصیحت -------------------- 1064
رسول ﷺ کے ساتھ نصیحت ---------------- 1064
علماء اور والیانِ امر کے ساتھ نصیحت ------------ 1065
عوام کے ساتھ نصیحت --------------------- 1065
رب تعالیٰ کے تقویٰ کی ترغیب ----------------- 1065
حسنِ اخلاق --------------------------- 1065
مومن مومن کا آئینہ ہے -------------------- 1066
لوگوں میں گھل مل کر رہنا اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنا 1066
حسن اخلاق نصیب ہونے کی دعا -------------- 1067

6۔ بَابُ الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ

ذکر و دعا

ذکر کی حقیقت ---------------------------- 1068
ذکر کی انواع ---------------------------- 1068
دعا کی حقیقت اور قبولیت دعا کی شروط----------- 1069
دعا کے آداب---------------------------- 1069
ہمیشہ ذکر کرنے کی فضیلت ------------------ 1069
حدیث سے اخذ شدہ فوائد-------------------- 1070
ذکر جہنم سے نجات دلاتا ہے ----------------- 1070
لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی فضیلت اور
معنی ---------------------------------- 1071
سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ کہنے کی فضیلت اور معنی- 1072
چار کلمات کی فضیلت --------------------- 1072
باقیات صالحات -------------------------- 1074
رب تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب کلام ------- 1075
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کی فضیلت ------ 1076
دعا بھی عبادت ہے------------------------ 1076
اذان کے بعد دعا کی فضیلت ----------------- 1077
دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے ----------------- 1077

دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنا ---------- 1079
نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے کی فضیلت ---------- 1080
حدیث سے اخذ شدہ فوائد ---------- 1080
سید الاستغفار اور اس کا معنی ---------- 1080
دین، دنیا، اہل اور مال میں عافیت کا سوال ---------- 1082
رب تعالیٰ کی ناراضی سے پناہ مانگنا ---------- 1085
قرض اور دشمن کے غالب آنے سے اور دشمنوں کے خوش ہونے سے پناہ مانگنا ---------- 1086
الصمد کا معنی ---------- 1087
صبح وشام کی دعائیں ---------- 1088
دنیا اور آخرت میں نیکی ملنے کی دعا ---------- 1089
استغفار کے متعدد الفاظ ---------- 1090
دارین کی خیر کی دعا مانگنا ---------- 1092
علمِ نافع کی دعا ---------- 1093
نبی کریم ﷺ کی ایک دعا ---------- 1094
دو محبوب کلمے ---------- 1096

7
كِتَابُ الْبُيُوعِ
بیوع کے احکام و مسائل کا بیان

تمہید: کِتَابُ الْبُيُوعِ: بیوع: یہ بیع کی جمع ہے۔ بیع یہ مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں لائی جاتی۔ البتہ جب نوع مقصود ہو تو مصدر کی جمع لا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بیع کی جمع اس کی انواع کے اعتبار سے ہے۔

بیع کا حکم

بیوع میں اصل حلت ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ (البقرة: 275) ''اللہ نے بیع کو حلال کیا۔'' لہٰذا جو آدمی بیع کی جس صورت کو حرام کہے گا اس کی دلیل لانا بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ بیع میں اصل حلت ہے اور رب تعالیٰ نے بیع کو بندوں کی ضرورت کی بنا پر حلال کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات یہ بیع تنعم کے لیے بھی کی جاتی ہے۔ غرض بیع کو حلال کرنے میں رب تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں ہیں۔

1۔ بَابُ شُرُوطِهِ وَمَا نُهِيَ عَنْهُ
بیع کی شروط اور ممنوعہ بیوع کا بیان

غریب الحدیث:...... بَابُ شُرُوطِهِ: یہاں مناسب تو یہ تھا کہ ضمیر کو مونث لا کر ''شروطھا'' کہا جاتا۔ کیونکہ ضمیر کا مرجع لفظ ''بیوع'' ہے۔ جو جمع ہے اور مونث کے حکم میں ہے لیکن امام موصوف یہاں ضمیر کو باعتبار جنس بیع کے لائے ہیں نہ کہ باعتبار انواع کے۔

شروط: یہ شرط کی جمع ہے۔ یہ علامت کو کہتے ہیں لیکن شرع شریف میں شرط اس شے کو کہتے ہیں جس کے عدم یا وجود پر کسی دوسری شے کا عدم یا وجود موقوف ہو۔

وَمَا نُهِيَ عَنْهُ: مراد ممنوعہ بیوع ہیں۔ یاد رہے کہ ممنوعہ بیوع بہ نسبت مباح بیوع کے بے حد کم ہیں۔ کیونکہ ممنوعہ بیوع گنتی کی چند یعنی معدود بیوع ہیں۔ جب کہ مباح بیوع محدود ہیں، اور معدود ہمیشہ محدود سے کم ہوتا ہے، اور ممنوعہ بیع اللہ کی منع

کردہ بیوع کو بھی شامل ہے اور رسول اللہ ﷺ کی منع کردہ بیوع کو بھی شامل ہے۔

سب سے پاکیزہ کمائی

768۔ عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ ؟ قَالَ : ((عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ ، وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ)).

حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ: سب سے پاکیزہ (اور حلال) کمائی کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کا اپنے ہاتھ سے محنت کر (کے کما) نا اور ہر نیک خرید وفروخت [1] (کہ یہ سب سے حلال اور پاکیزہ کمائیاں ہیں)۔''

رَوَاهُ الْبَزَّارُ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ .

اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے، اور امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......سُئِلَ: یہاں سائل مجہول ہے اور کسی صحابی کے نام کی جہالت صحت حدیث پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ کیونکہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں۔

أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟: کسب: ہر وہ کمائی کا ذریعہ جس سے آدمی نفع کمائے جیسے تجارت، اجارہ، شرکت وغیرہ کہ آدمی ان سب ذرائع سے روزی اور نفع کماتا ہے۔

أَطْيَبُ؟: رہا یہ سوال کہ ان سب میں سے آدمی کی سب سے پاکیزہ اور حلال روزی کون سی ہے؟ تو فرمایا:

عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ: آدمی کا اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمانا کہ یہ سب سے پاکیزہ کمائی ہے۔ کیونکہ غالب یہ ہے کہ ہاتھ کی کمائی شبہ سے پاک ہوتی ہے۔ جیسے خود جا کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ لانا، اور گھاس پھوس کاٹ کر بیچنا اور روزی کمانا وغیرہ۔ کیونکہ اس نے وہ چیز حاصل کی ہے جسے رب تعالیٰ نے سب کے لیے اگایا اور مباح کیا ہے۔

کسی نہ کسی طرح پیشے، صنعت وحرفت، دست کاریاں اور بیع وشراء بھی اس حدیث کے مصداق میں داخل ہیں، لیکن اس پر جی پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان چیزوں میں نسیان، غلط اور ملاوٹ اور خیانت وغیرہ داخل ہو ہی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ پیشے اور تجارت شبہ سے خالی نہیں ہوتے۔ ہاں اگر کاریگر محنتی، مخلص اور دیانت دار ہے تو پیشوں، ہنروں، تجارتوں اور ملازمتوں کو بھی اس حدیث کے مصداق میں داخل کر سکتے ہیں۔

غرض حقیقت یہ ہے کہ پیشے، صنعت وحرفت اور دستکاریاں اس حدیث کے مصداق میں کبھی داخل ہوتے ہیں اور کبھی نہیں داخل ہوتے۔ البتہ کھیتی باڑی اس حدیث کے مصداق میں داخل ہے۔ کیونکہ یہ ہاتھ کا عمل ہے۔

وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ: اس کی تفسیر خود ایک حدیث میں آ گئی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر وہ دونوں (خرید وفروخت کرنے والے باہم) سچ بولیں اور (اپنی اپنی شے کے عیب وہنر کو) کھول کر بیان کر دیں تو ان دونوں کی بیع میں

---

[1] مسند البزار: 3731۔ المستدرك للحاكم: 13/2۔ مسند احمد: 141/4۔ المعجم الاوسط للطبرانی: 7918۔ علامہ منذری رحمہ اللہ (334/2) فرماتے ہیں: بزار کی روایت کے رجال صحیح ہیں سوائے مسعودی کے کہ اسے اختلاط ہو جایا کرتا تھا اسی لیے مسعودی سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ البتہ متابع لانے میں ان سے حجت پکڑنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ دیکھیں: "التلخيص الحبير: 3/3".

انہیں برکت دی جاتی ہے۔'' تب پھر بیع مبرور وہ ہوگی جو صدق و بیان پر مبنی ہو کہ شے کے وصف میں صداقت ہو جبکہ اس کی خامیوں اور کمیوں کو کھول کر بیان کر دیا جائے۔ ایسی بیع ''بیع مبرور'' کہلائے گی۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں دو باتوں کو بیان کیا گیا ہے:

(1) اپنے ہاتھ کی کمائی سب سے پاکیزہ ہے۔

(2) نیکی والی بیع سب سے پاکیزہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حصول علم پر بے حد حرص کرنا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل کرنے کے لیے علم حاصل کیا کرتے تھے نہ کہ صرف معلومات اکٹھی کرنے کے لیے۔

◈ معلوم ہوا کہ محنتیں، پیشے، ہنر اور ملازمتیں مختلف ہیں۔ کوئی طیب تو کوئی خبیث۔ اس کی دلیل: "أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ" کے الفاظ ہیں۔

◈ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم عطا کیے گئے تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رب تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مختصر دو کلمات میں بے شمار باتوں کا حصر فرما دیا۔

◈ جو بھی بیع اور معاملہ ان شروط پر مشتمل ہو تو وہ بیع مبرور کے مصداق میں داخل ہے:

(1) وہ بیع موافق شرع ہو۔

(2) وصف کے بیان میں صدق ہو۔

(3) اور عیب کے عیاں کرنے میں دیانت ہو۔

◈ مذکورہ فضیلت مرد کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی شامل ہے۔

شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے

769- وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رضي الله عنهما أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ عَامَ الْفَتْحِ ، وَهُوَ بِمَكَّةَ: ((إِنَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ ، وَالْخِنْزِيْرِ وَالْأَصْنَامِ)) فَقِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ شُحُوْمَ الْمَيْتَةِ؟ فَإِنَّهَا تُطْلَى بِهَا السُّفُنُ ، وَيُدْهَنُ بِهَا الْجُلُوْدُ ، وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ ، فَقَالَ: ((لَا ، هُوَ حَرَامٌ)) ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عِنْدَ ذٰلِكَ ((قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ ، إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهَا جَمَلُوْهُ ثُمَّ بَاعُوْهُ فَأَكَلُوْا ثَمَنَهُ)) .

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ: ''بے شک اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام ٹھہرایا ہے۔'' عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسول! ذرا مردار کی چربیوں کے بارے میں بھی بتلایئے (کہ ان کا حکم کیا ہے) کہ ان کے ذریعہ کشتیوں (کے پیندوں وغیرہ) پر روغن ملا جاتا ہے اور کھالوں کو ان کے ذریعے تیل لگایا جاتا ہے اور لوگ ان کو چراغوں میں (بھی) جلا (تے اور ان سے روشنی کر) تے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں یہ (چربیاں) حرام (ہی) ہیں۔'' پھر اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ

(ان) یہود کا ستیاناس کرے کہ رب تعالیٰ نے جب ان پر چربیوں کو حرام ٹھہرایا تو انہوں نے ان چربیوں کو پگھلایا، پھر ان کو بیچا اور پھر ان کی قیمت کھائی۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :...... سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ عَامَ الْفَتْحِ، وَهُوَ بِمَكَّةَ: اس میں زمان ومکان دونوں کا بیان ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ: خمر اس شے کو کہتے ہیں کہ جو عقل پر پردہ ڈال دے،[2] اور ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ واضح لفظ آتے ہیں کہ: ''ہر وہ شے جو نشہ لائے وہ خمر ہے۔''[3]

تب پھر خمر ہر وہ شے ہے جو نشہ لائے چاہے وہ گندم سے بنے یا انگور سے، کھجور سے بنے یا کسی بھی اور شے سے بنے۔

رہا یہ سوال کہ سکر کس کو کہتے ہیں تو سکر اور نشہ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو لذت اور طرب کے طور پر عقل پر پردہ ڈال دے نہ کہ غبوبت اور خمور کے طور پر عقل پر پردہ ڈالے۔

پس اِسکار یعنی نشہ لانا یہ آدمی کی عقل پر پردہ تو ڈالتا ہے لیکن فرحت اور سرور کے طور پر، چنانچہ اس کیفیت میں آدمی بسا اوقات ایسی بات بھی کرتا ہے جسے وہ عقل کے ٹھکانے ہونے کی حالت میں نہیں کرتا، اور اس حال میں آدمی خود کو دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ اور سب سے بڑا بہادر تک سمجھنے لگتا ہے۔

جب آدمی شراب پی کر خاص اس حالت میں پہنچ جاتا ہے تو متعدد فقہی احکام اس کے متعلق ہو جاتے ہیں۔ جن کے ذکر کا یہ محل نہیں۔ البتہ مذکورہ حدیث میں جو اہم اور بنیادی حکم مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ جب شراب پینا حرام ہے تو شراب حرام ٹھہری۔ لہٰذا اس کی خرید وفروخت اور اس کی قیمت اور اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی حرام ٹھہرا۔

وَالْمَيْتَةِ: یہ دوسری شے ہے جس کا مذکورہ حدیث میں بیان ہے کہ اس کی خرید وفروخت حرام ہے۔ میتہ یعنی مردار ہر اس مردہ جانور کو کہتے ہیں جو شرعی طریقہ سے ذبح ہوئے بغیر مر گیا ہو۔ لہٰذا جو از خود مر گیا وہ بھی مردار اور جو غیر شرعی طریقہ سے مارا گیا وہ بھی مردار کہلائے گا۔

غیر شرعی طریقہ سے جانور کا مارنا دو صورتوں پر مشتمل ہے:

(1) یا تو جانوروں کو ذبح کرنے والا ذبح کرنے کا اہل نہ ہو جیسے مرزائی، کافر، ہندو، بت پرست، آتش پرست اور مجوسی وغیرہ ہو جن کا ذبیحہ مردار اور حرام ہوتا ہے۔

(2) یا پھر خود اس جانور کو غیر شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو جیسے گدی سے گردن کاٹنا، پیٹ پھاڑ کر مار ڈالنا گردن گھونٹ کر یا غرق کر کے یا جھٹکے سے مار ڈالنا وغیرہ۔

---

[1] صحيح البخاري: 2236۔ صحيح مسلم: 1581.

[2] دیکھیں: صحيح البخاري: 4619۔ صحيح مسلم: 3032.

[3] صحيح البخاري: 5575۔ اور یہ لفظ صحیح بخاری کے ہیں۔ صحيح مسلم: 2003.

تب پھر مردار کی تین قسمیں ہوگئیں:

(1) اپنی موت آپ مرنے والا۔

(2) غیر اہل جیسے مشرک وغیرہ کے ہاتھوں ذبح ہونے والا۔

(3) غیر شرعی طریقہ سے مارا جانے والا۔

غرض جب ایک جانور ان تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی بنا پر مردار بن گیا تو اس کا بیچنا حرام ہوگا۔

وَالْخِنْزِيرِ: سور۔ ایک مشہور جانور۔ یہ سراپا حرام ہے لہٰذا اس کی بیع وشراء بھی حرام ہوگئی۔

وَالْأَصْنَامِ: یہ صَنَم کی جمع ہے۔ صَنَم ہر وہ شے ہے جس کو مشرک لوگ اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہیں، چاہے وہ کوئی مورتی ہو یا چاہے کوئی شجر وحجر ہی ہو کہ جن کی عبادت کر کے ان کو شرک کا ذریعہ بنایا جائے۔

شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا شرک کا ذریعہ بننے والی مورتیوں کو بیچنا اور خریدنا حرام ہوگا۔ ہاں اگر کسی نے مورتیوں کو ضائع کرنے کے لیے ان کو خریدا ہے تو یہ خریدنا جائز ہوگا۔

علماء نے ان چاروں چیزوں کے حرام ہونے اور مزید ان کی بیع وشراء کے منع اور حرام ہونے کی حکمتوں پر از حد طول بیانی سے کام لیا ہے۔ ہمارا یہ مختصر رسالہ اس تفصیل کے اختصار کا بھی متحمل نہیں۔ البتہ ان جملہ حکمتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ: یہ چاروں چیزیں عقل، بدن، مال اور معاشرے کی تباہی وبربادی کے بنیادی اسباب میں سے ہیں اور یہ عقل وغیرہ چاروں چیزیں انسانی زندگی جو فرد سے معاشرے تک پھیلی اور افراد اور معاشرہ سے ہی تعبیر ہے، قوام ہیں تو جب کسی شے کا قوام ہی برباد ہو جائے تو اس کی بقاء ممکن نہیں رہتی۔

فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَرَأَيْتَ شُحُومَ الْمَيْتَةِ، فَإِنَّهَا تُطْلَى بِهَا السُّفُنُ: قِيْلَ: یہ قائل مبہم ہے۔ لیکن مقصود پر اس ابہام سے کوئی زد نہیں پڑتی۔

أَرَأَيْتَ: یہ "اَخْبِرْنَا" کے معنی میں ہے جیسا کہ بارہا مذکور ہوا ہے۔

اگرچہ لفظوں میں یہ ترکیب ایک مفعول کی طرف مضاف ہے جو "شُحُوْمَ الْمَيْتَةِ" ہے۔ لیکن معنی کے اعتبار سے یہ دو مفعولوں کی طرف مضاف ہے۔ پس یہاں دوسرا مفعول محذوف ہے جو اکثر جملہ استفہامیہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تقدیری عبارت یوں ہوگی: "اَرَأَيْتَ شُحُوْمَهَا اَتَحِلُّ" یعنی ہمیں بتلایئے تو کیا مردار کی چربیاں حلال ہیں؟ اور مراد یہ ہے کہ کیا ان کی بیع وشراء اور ان کے دیگر استعمالات حلال ہیں؟ جیسے ان سے چراغوں میں روشنی کرنا، کھالوں کی دباغت کرنا اور کشتیوں کے پیندوں کو روغن کرنا وغیرہ۔

صحیح قول یہ ہے کہ ان چربیوں کی بیع حلال نہیں۔ کیونکہ مذکورہ حدیث مردار کی بیع کی حرمت کے سیاق میں ہے۔ دوسرے سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذات شریفہ اس بات سے بلند تر ہے کہ آپ ﷺ کو مردار کی چربیوں کی حرمت کا علم نہ ہو اور آپ ﷺ سے اس کی حلت یا حرمت کا سوال کیا جائے؟ چنانچہ یہاں بات ان اشیاء کے منافع کی نہیں بلکہ ان کی بیع کی حرمت کی ہے۔

رہا یہ امر کہ مردار کی چربیوں کے حرام ہونے کو جاننے کے باوجود ان کی بیع کی بابت سوال کیوں کیا گیا؟ تو شاید ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چربیوں کے یہ منافع کہیں ان کی بیع کی حلت کو مقتضی نہ ہوں۔ اسی لیے ان حضرات نے چربیوں کی بیع کا حکم دریافت کیا تھا۔

شُحُوْمَ: شحم کی جمع ہے۔شحم یہ چربی کو کہتے ہیں جو معروف ہے۔
تُطْلَى بِهَا السُّفُنُ: یہ "اَطْلَى يُطْلِي اِطْلاءً" سے فعل مجہول کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو ملنا اور پالش کرنا۔ اکثر اس سے مراد روغن یا تیل کی کسی چیز پر پالش ہوتی ہے۔

چربیوں کو کشتیوں کے پیندوں پر اس لیے ملا جاتا ہے کیونکہ اس سے ان کے پشتوں کے بیچ کی درزیں بھر جاتی ہیں اور پانی رِس کر کشتی کے اندر داخل نہیں ہوتا۔

وَتُدْهَنُ بِهَا الْجُلُوْدُ: ایسا دباغت دی جانے والی کھالوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ان پر چربیوں کو ملتے ہیں جس سے وہ خوب نرم ہو جاتی ہیں اور ان کو دباغت دینا آسان ہو جاتا ہے۔

وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ: یعنی ان کو چراغوں میں ڈال کر جلاتے ہیں اور روشنی کی جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے چربی پگھلا کر اس کا تیل بنایا جاتا ہے۔ جسے چراغ میں ڈالتے ہیں، پھر چراغ کے فتیلے کو اس میں بھگوتے ہیں۔ جب فتیلا تر ہو جاتا ہے تو اس کو آگ دکھاتے ہیں۔ آگ لگتے ہی فتیلہ بھڑک اٹھتا ہے اور ایک تو دینے لگتا ہے جس سے روشنی ہونے لگتی ہے۔

فَقَالَ لَا هُوَ حَرَامٌ: یہ حرمت آپ ﷺ نے کس چیز کی بیان فرمائی؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ مراد ان تینوں کاموں کی حرمت کا بیان ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہاں ان کی بیع کی حرمت کا بیان ہے کیونکہ حدیث شریف موضوع بیوع کے ضمن میں آئی ہے۔

رہی ان چربیوں کی بیع کی حرمت کی حکمت؟ تو وہ یہ ہے کہ اگر چربیوں کی بیع جائز ٹھہرے تو مردار کی بیع وشراء عام ہونے لگے، اور لوگ مردار کی بیع کو معمولی اور بے وقعت سمجھنے لگیں گے۔ مشہور محاورہ ہے کہ: جب ایک کام زیادہ کیا جائے تو اس کا احساس کم ہونے لگتا ہے۔

پھر ٹھیک اسی موقع پر نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ: **قَاتَلَ:** یہ "اَهْلَكَ" کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ لعنت کرنے، پھٹکارنے اور دھتکارنے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ معنی مراد لینا بعید ہے کیونکہ "لعنت" کے حروف کسی بھی طرح "قتل" کے حروف میں سے نہیں ہیں، اور ان دونوں کلمات کے درمیان کسی بھی قسم کا اشتقاق بھی نہیں۔ لہٰذا "قَاتَلَ" سے مراد اَهْلَكَ لینا یہ اولیٰ ہے کہ اللہ کا ستیاناس کرے اور ان کو تباہ و برباد کرے۔

يَهُوْدَ: سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار اپنی بدفطرتی، ہٹ دھرمی، نافرمانی اور بد اطواری میں مشہور ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ قوم دغابازی، فریب کاری، دھوکا دہی، وعدہ خلافی، عہد شکنی، غداری اور منافقت میں ضرب المثل ہے۔

رب تعالیٰ نے ان یہود نامسعود و بے بہود پر چربیوں کو حرام کیا تھا۔ یہ حکم مردار اور غیر مردار دونوں کی چربیوں کو عام ہے۔ اس کا ذکر اس ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ﴾
(الانعام: 146)

"اور ان لوگوں پر جو یہودی بن گئے، ہم نے ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا اور گائیوں اور بکریوں میں سے ہم

ان پر دونوں کی چربیاں حرام کردیں۔"

جَمَلُوهُ: یعنی اس کو پگھلاتے تھے تاکہ یہ کہہ سکیں کہ ہم تو تیل بیچ رہے ہیں نہ کہ چربی۔ بلاشبہ یہ حرام چیزوں کو حلال بنانے کا ایک حیلہ تھا جو بذاتِ خود حرام تھا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے انہیں بددعا دی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام بتلایا گیا ہے۔

ایک نکتہ:...... ترجمۃ الباب اور سیاقِ حدیث میں لف ونشر غیر مرتب ہے کیونکہ باب میں بیع کی شروط کا بیان پہلے اور ممنوعہ بیوع کا ذکر بعد میں ہے۔ جبکہ سردِ احادیث میں ممنوعہ بیوع کا ذکر پہلے ہے۔

الا یہ کہ ہم یہ کہیں کہ "كُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ" میں شروطِ بیوع کا ذکر اجمالاً آجاتا ہے۔ فافهم

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ موقع پر امت کو احکامات شرعیہ پہنچائے ہیں، اور آپ ﷺ اس کے بے حد حریص تھے۔
- ان چاروں چیزوں کی بیع کی حرمت بے حد عظیم ہے کیونکہ یہ حرمت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف منسوب ہے، اور اس میں صریح حرمت کا بیان بھی ہے جس میں کسی بھی قسم کا استثناء نہیں لہٰذا کافر کو بھی یہ چیزیں بیچنا حرام ہے۔
- معلوم ہوا کہ شراب، خنزیر، مردار اور بت حرام ہیں کیونکہ جن کی بیع حرام ہو لامحالہ وہ خود بھی حرام ہوتے ہیں۔
- شریعت اسلامیہ میں عقل، بدن، مال، دین اور اخلاق سب کی حفاظت وصیانت کا بے حد اہتمام ہے۔
- مردار ہر قسم کا حرام ہے اور اس کا بیچنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ جو مفرد الف لام کے ساتھ ہو وہ عام ہوتا ہے۔ لہٰذا "الْمَيْتَةِ" سے ہر قسم کا مردار مراد ہے۔
- مچھلی اور ٹڈی کا مردار اس عموم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس بارے میں خود نص آگئی ہے۔ دوسرے ایک حدیث میں وارد ہے کہ "رب تعالیٰ جب ایک شے کو حرام ٹھہراتے ہیں تو اس کے ثمن کو بھی حرام ٹھہراتے ہیں۔" یہیں سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے جس میتہ کی بیع کو حرام ٹھہرایا ہے وہ حرام میتہ ہے۔ کیونکہ حرام میتہ قابل انتفاع نہیں ہوتا جبکہ حلال میتہ قابل انتفاع ہوتا ہے۔
- میتہ کے عموم سے دوسرا استثناء میتہ کے وہ اجزائے بدن ہیں جن میں حیات نہیں ہوتی۔ جیسے اون، پر، بال، ریشے، ناخن، کھر اور بڑھے ہوئے دانت (مثلاً ہاتھی دانت)۔ لہٰذا ان چیزوں کی بیع بالاتفاق حلال ہے۔ کیونکہ یہ اجزاء "میتہ" کے اطلاق میں داخل ہی نہیں۔ اسی لیے ان کو میتہ کے بدن سے کاٹ کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ (النحل: 80)

"اور ان کی اونوں سے اور ان کی پشموں سے اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانے کی چیزیں بنائیں۔"

- امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک مردار کی ہڈیاں بھی اس عموم سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ ہڈیاں بھی محل حیات نہیں ہوتیں کیونکہ ان میں خون نہیں ہوتا، اور جس شے میں خون نہ ہو وہ مردار کی بھی ہو تو پاک ہوتی ہے۔ تب ان کی بیع حلال ہوئی۔
- البتہ مردار کی کھال اس حرمت کے عموم میں داخل ہے کیونکہ اس میں خون بھی ہوتا ہے اور یہ محل حیات بھی ہے۔ لہٰذا مردار کی بے رنگی ہوئی کھال کا بیچنا بھی جائز نہ ہوگا۔

◈ رہی مردار کی کھال کی دباغت اور دباغت کے بعد بیچنے کی حلت تو اس کا مدار اس اختلاف پر ہے کہ آیا مردار کی کھال دباغت دینے سے پاک بھی ہو جاتی ہے یا نہیں۔ تو صحیح قول یہ ہے کہ مردار کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے اور اس کا خشک اور تر چیزوں میں استعمال جائز ہے۔ لہٰذا دباغت شدہ کھال کے مشکیزہ کا پانی پاک ہوگا۔ یہ اس کھال کا تر چیز میں استعمال ہے۔

◈ ضرورت اور مجبوری کے وقت مردار کا بیچنا بھی جائز نہ ہوگا۔ لیکن اگر مردار والا سامنے کے مضطر کی حاجت کو تب ہی دور کرنے پر آمادہ ہو جبکہ وہ اس سے مردار خریدے تو مضطر کو مردار خریدنا مباح ہوگا۔ جبکہ اس کا گناہ بائع پر ہوگا۔

◈ مروار کے سینگ ناخنوں کے حکم میں داخل ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہوں گے کیونکہ سینگوں میں بھی دم سائل اور حیات نہیں ہوتی۔

◈ بت، مورتیاں، عبادت کیے جانے والے خاکے، فحش تصاویر اور بے حیائی پر مبنی لٹریچر، مجلّے، رسالے اور اخباریں وغیرہ کہ ان سب کی بیع حرام ہے۔

◈ بتوں اور عبادت کے نام پر پوجی جانے والی ہر شے کی بیع کے حرام ہونے کی علت ادیانِ سماویہ اور بالخصوص دین اسلام کی حفاظت وحمایت ہے۔ کیونکہ جملہ ادیانِ سماویہ شرک کے سخت مخالف رہے ہیں۔ البتہ دو صورتوں میں بتوں اور مورتیوں کو خریدنا مباح ہے:

(1) ایک یہ کہ وہ مورتی کسی قابل انتفاع مادہ کی بنی ہو۔ جیسے لوہا لکڑی وغیرہ اور خریدنے والے کی غرض اس کو توڑ کر اس لکڑی سے یا لوہے سے نفع اٹھانا ہو۔

(2) دوسری یہ کہ وہ بت خریدے ہی اس لیے کہ اس کو خرید کر ضائع کر دے گا اور اپنے تئیں دنیا کو شرک سے پاک کرنے کی کوششوں میں عملی حصہ لے گا۔

◈ بدعت، گمراہی، بے حیائی اور فحاشی کو پھیلانے والی کتابوں کی بیع بھی اس حکم میں داخل یعنی حرام ہے کیونکہ اس میں افراد اور معاشرے کے اخلاق اور مال کی بربادی اور تباہی ہے۔ البتہ اگر کوئی گمراہانہ تحریروں کو اس لیے خریدے تاکہ اسے رائج گمراہی کا چلن اور گمراہوں کے پھیلائے جانے والے ہتھکنڈوں کی بابت معلومات حاصل ہوں تاکہ وہ دوسرے لوگوں کو ان گمراہیوں سے بچانے میں اپنا کردار ادا کر سکے تو ان مبتدعانہ تحریروں پر مبنی لٹریچر کو خریدنا اس کے لیے مباح ہوگا۔

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ ان ممنوعہ اور حرام چیزوں کا کاروبار کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے کسی جگہ کرائے پر کوئی دوکان حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ایسے لوگوں کو ان جیسے حرام اور ممنوعہ کاروباروں کو شروع کرنے کے لیے دوکانیں کرایہ پر دینا حرام اور ناجائز ہوگا۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فقاہت کہ وہ ان چیزوں کے مباح استعمال سے ان چیزوں کی بیع تک پہنچنا چاہتے تھے۔

◈ معلوم ہوا کہ انسانی عقل ہر شے کے حقیقی نفع ونقصان تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ یہ رب تعالیٰ کی شریعت ہی تو ہے جو بندوں کے لیے کامل احکامات لے کر اترتی ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ مردار کی چربیوں سے کشتیوں کے روغن کرنے کا یا ان سے چراغ جلانے وغیرہ کا مباح کام لیا جا سکتا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ نجس شے سے اس طور پر فائدہ اُٹھانا جائز ہے کہ اس کی نجاست کا اثر آدمی کے بدن اور کپڑوں تک متعدی نہ

ہو، اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ انتفاع ناجائز ہوگا۔ چونکہ چراغ میں جلنے والے تیل کا اثر انسانی بدن اور کپڑوں تک نہیں پہنچا۔اس لیے وہ تیل چاہے نجس بھی ہو، تب بھی اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

- کسی گنہگار قوم کو علی سبیل العموم بددعا دے سکتے ہیں۔اس کی دلیل "قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ یہودیت نافرمانی اور فریب کا دوسرا نام ہے۔
- جولوگ محارم کو حلال کرنے کے حیلے کرتے ہیں، وہ یہودیوں کے جیسے ہیں۔
- جو شے حرام ہو، اس کی قیمت بھی حرام ہوتی ہے۔
- معلوم ہوا کہ کفار کے مالی تصرفات جائز ثابت اور نافذ ہیں۔اس کی دلیل "ثُمَّ بَاعُوهُ، فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اکل ثمن اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بیع صحیح تھی۔ کیونکہ کسی شے کا ثمن تب ہی حلال ہوتا ہے، جب اس کی بیع شرعاً درست ہو۔
- بڑوں، بزرگوں، سربرآوردہ مذہبی و دنیاوی شخصیات اور امراء و روسا کے سامنے "أَرَأَيْتَ" (یعنی "ذرا بتلایئے تو") کا صیغہ استعمال کرنا جائز ہے اور ایسا کہنا بے ادبی نہیں۔
- کسی حکم کو مؤکد کرکے بیان کرنا جائز ہے۔اس کی دلیل "لَا هُوَ حَرَامٌ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ مذکورہ سوال کے جواب میں صرف "لَا" کا کلمہ کافی تھا۔ تب پھر "هُوَ حَرَامٌ" یہ نفی کی تاکید ہوگا۔

خرید و فروخت میں متعاقدین کے درمیان اختلاف ہو جانے کا حکم

770- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((إِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَايِعَانِ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ، فَالْقَوْلُ مَا يَقُولُ رَبُّ السِّلْعَةِ أَوْ يَتَتَارَكَانِ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: "جب دو خرید و فروخت کرنے والوں میں (بیع یا ثمن کی بابت) اختلاف ہو جائے اور دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی گواہ نہ ہو تو قول سامان والے کا (معتبر) ہوگا یا (پھر دوسری صورت یہ ہے کہ) دونوں (اس سودے کو ہی) چھوڑ دیں۔" [1]

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......إِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَايِعَانِ: مُتَبَايِعَانِ: سے مراد بائع اور مشتری ہیں۔البتہ دونوں پر متابع کا اطلاق بطور تغلیب کے ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3511۔ جامع الترمذی: 1270۔ سنن النسائی: 302/7۔ سنن ابن ماجه: 2186۔ مسند احمد: 466/1۔ المستدرك للحاكم: 52/2۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے "السنن: 332/5" میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔امام بیہقی فرماتے ہیں: یہ حدیث متعدد طرق سے مرسل اسانید کے ساتھ مروی ہے۔لیکن جب ان سب طرق کو اکٹھا کیا جائے تو یہ حدیث قوی ہو جاتی ہے، ابن عبدالبر کہتے ہیں: اہل علم کے نزدیک یہ اسناد حجت نہیں۔لیکن یہ حدیث ان کے ہاں مشہور اور معلوم ہے، واللہ اعلم۔ دیکھیں: "التمهيد: 292/24".

وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ: مراد وہ امر ہے جو حقیقت حال کو کھول دے، اور احوال یعنی امور حالیہ میں یہ ''بینہ'' دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک آدمی اور مدعی کی قسم ہے۔

فَالْقَوْلُ مَا يَقُولُ رَبُّ السِّلْعَةِ: رَبُّ السِّلْعَةِ سے مراد بائع ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری روایت میں اس کی تفسیر آتی ہے نہ کہ مشتری۔

ثمن میں اختلاف کی صورتیں اور ان کا حکم

حدیث کا ظاہر عموم پر مشتمل ہے۔ جو جملہ اختلاف کو شامل اور عام ہے چاہے بائع مدعی ہو یا مدعا علیہ۔ تب پھر مذکورہ حدیث میں اور اس ارشادِ نبوی میں کہ: ''بینہ لانا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ پر آتی ہے۔''❶ عموم خصوص مِن وجہٍ کی نسبت ہوگی۔ وہ یوں کہ "البينة على المدعى" والی حدیث ہر سامان کو عام ہے، اور قسم مدعا علیہ کے ساتھ خاص ہوگی۔ جبکہ مذکورہ حدیث متبایعین کے ساتھ خاص ہے جو ان کے درمیان ہونے والے ہر قسم کے اختلاف کو عام ہے۔ تب پھر دونوں حدیثوں میں عموم خصوص مِنْ وجہٍ کی نسبت ہوگی۔

تب پھر اگر یہ دونوں احادیث کسی صورت میں متفق نظر آئیں تو کوئی اشکال نہ ہوگا۔ جیسے کسی صورت میں مدعا علیہ بائع ہی ہو تو دونوں حدیثوں کے مطابق قسم کے ساتھ قول بائع کا معتبر ہوگا۔ جیسے مشتری یہ دعویٰ کرے کہ تم نے بکری دودھ دینے والی کہی تھی اور یہ تو دودھ دیتی ہی نہیں اور بائع یہ کہے کہ میں نے تو ایسی کوئی بات کہی ہی نہ تھی تو دونوں حدیثوں کے مطابق یہاں اعتبار بائع کے قول کا ہوگا۔ کیونکہ یہاں بائع مدعا علیہ ہے۔ پس حدیث الباب کا مقتضی بھی یہ ہے معتبر قول بائع کا ہو اور ''مدعی کے ذمہ گواہ ہے'' والی حدیث کا مقتضی بھی یہی ہے کہ بائع کا قول ہی اس کی قسم کے ساتھ معتبر ہو کیونکہ مذکورہ صورت میں وہ مدعا علیہ ہے۔

یہ صورت واضح اور متفق علیہ ہے۔

البتہ اشکال اس اختلافی صورت میں ہوتا ہے جہاں مدعا علیہ مشتری بنتا ہو۔ جیسے بائع کا دعویٰ ہو کہ اس نے بکری ہزار روپے میں بیچی تھی اور مشتری یہ کہے کہ تم نے مجھے آٹھ سو روپوں میں بکری بیچی تھی۔ اب یہاں مدعی بائع بنتا ہے کیونکہ آٹھ سو روپے کے ثمن ہونے پر تو دونوں متفق ہیں۔ البتہ بائع دو سو روپے زائد کا مدعی ہے جبکہ مشتری اس کا انکاری ہے تو یہاں مدعی بائع اور مدعا علیہ مشتری ٹھہرا۔

اب حدیث الباب کا تقاضا تو یہ ہے کہ معتبر قول بائع کا ہو، جبکہ "البينة على المدعى" والی حدیث کا تقاضا ہے کہ معتبر قول مشتری کا ہو کیونکہ یہاں مدعا علیہ وہ یعنی مشتری ہے۔

چنانچہ اس صورت میں بعض علماء نے "البينة على المدعى" والی حدیث کو ترجیح دی ہے اور قسم مدعا علیہ یعنی مشتری کے ذمہ ٹھہرا کر اس کے قول کو معتبر کہا ہے۔ جبکہ بعض نے حدیث الباب کو راجح قرار دے کر معتبر قول بائع ہی کا قرار دیا ہے۔ اور اس کی توجیح یہ پیش کی ہے کہ یہاں بھی مدعا علیہ بائع ہی ہے۔ نہ کہ مشتری کہ وہ اب بھی مدعی ہے۔ وہ یوں کہ مشتری دراصل اس بات کا مدعی ہے کہ بائع نے اس بکری کو آٹھ سو روپے کے عوض اپنی ملک سے نکالا ہے اور اصل بائع کی ملک کا بقا ہے۔ جبکہ بائع کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ بکری ہزار روپے میں بیچی ہے۔ تب پھر مدعی مشتری ہوا جبکہ بائع مدعا علیہ ہوا۔ اس توجیہ سے

❶ اس کی تخریج آگے "كتاب الفرائض" میں آرہی ہے۔

دونوں حدیثوں میں اس صورت میں بھی تطبیق ہو جائے گی۔

مذکورہ صورت کی بابت ایک تیسرا قول بھی ہے وہ یہ کہ بائع اور مشتری دونوں حلف اٹھائیں گے۔ کیونکہ دونوں میں سے ہرایک مدعی بھی ہے اور مدعا علیہ بھی ہے۔

غرض اگر تو حدیث الباب کے عموم کو دیکھا جائے تو اختلاف کی ہر صورت میں معتبر قول بائع ہی کا ہوگا چاہے وہ مدعی ہو یا مدعا علیہ، اور وہ ساتھ کے ساتھ قسم بھی اٹھائے گا، اور اگر بائع قسم اٹھانے سے انکار کر دے تو دونوں بیع کو ایک دوسرے پر رد یعنی فسخ کر دیں گے۔ لیکن علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مذکورہ حدیث اس اطلاق پر نہیں اور یہ کہ ہر صورت میں بائع ہی کا قول معتبر نہیں۔ کیونکہ بعض صورتوں میں بالاتفاق بائع کا قول غیر مقبول ہے، اور بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں مشتری کا قول بالاتفاق مقبول ہے۔ تب پھر یہ حدیث مطلق نہ ہوگی بلکہ اس کو اس اصل کی طرف لوٹا جایا جائے گا کہ: ''بینہ لانا مدعی کے ذمے ہے اور قسم وہ اٹھائے جو منکر ہو۔''

پھر یہ کہ اگر دونوں میں سے ہر ایک مدعی ہو تو فقہاء کے نزدیک دونوں اس بات کی قسم اٹھائیں گے کہ وہ دوسرے کے دعویٰ کی نفی کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ کا اثبات کرتے ہیں اور جب تحالف ہو جائے تو دونوں میں سے ہر ایک بیع کو فسخ کر سکتا ہے۔

مبیع میں اختلاف کا حکم

اب تک کی تفصیل ثمن میں اختلاف کی تھی لیکن اگر اختلاف مبیع میں ہو، جیسے مشتری کا دعویٰ ہو کہ مبیع معیب (عیب والی) تھی جیسے مبیع بکری ہو اور مشتری یہ دعویٰ کرے کہ بائع نے جو بکری مجھے بیچی ہے وہ کانی ہے۔ جبکہ بائع کا دعویٰ ہو کہ مبیع اس عیب سے خالی تھی تو اس صورت میں حدیث الباب کا مقتضی یہ ہے کہ قول بائع کا معتبر ہوگا اور یہ ''اصول'' کے بھی مطابق ہے۔ کیونکہ یہاں دو اصل ہیں:

(1) عیب کا نہ ہونا۔ (2) اور مبیع کا عیب سے خالی ہونا۔

جب کہ ایک قول مشتری کے قول کے مقبول ہونے کا بھی ہے۔

اور اگر اختلاف حدوث عیب میں ہو تو معتبر و مقبول قول مشتری کا ہوگا۔ کیونکہ اصل عیب کی وجہ سے فوت ہو جانے والے جز کا عدم قبض ہے۔ اب کیونکہ عیب مبیع میں نقص ہے اور اصل یہ ہے کہ مشتری نے عیب کی وجہ سے فوت ہو جانے والے مبیع کے اس جز پر قبضہ نہیں کیا۔

لیکن یہ تعلیل بے حد علیل ہے اور زیادہ قوی دلیل وہی ہے جو ذکر ہوئی کہ اصل مبیع کا عیب سے سلامت ہونا ہے۔

پھر اگر عیب کسی عضو زائد کا ہو۔ جیسے بکری کی پانچویں ٹانگ ہونے کا دعویٰ ہو تو قول مشتری کا معتبر ہوگا کیونکہ یہاں دعویٰ اصل سے زائد کسی چیز کی خلقت کا ہے جو عیب ہے۔

اور اگر مثلاً چار دن بعد خون کے بہتے رہنے کا دعویٰ ہو تو معتبر قول بائع کا ہوگا کیونکہ عادۃً اتنے دن خون بہتا نہیں رہتا، اور اصل مبیع کا عیب سے سلامت ہونا ہے۔

پھر اگر دونوں اس بات پر تو متفق ہوں کہ مبیع میں یہ عیب اس وقت بھی تھا جب یہ بائع کے قبضہ میں تھی لیکن اختلاف اس امر میں ہو کہ بائع تو یہ کہے کہ میں نے بیع کے وقت اس عیب کو شرط کر کے بیچا تھا۔ جبکہ مشتری اس بات کا مدعی ہو کہ بائع نے

اس عیب کو شرط نہیں کیا تھا۔ تو اس صورت میں مشتری کا قول معتبر ہوگا۔ کیونکہ اصل بیوع میں شرط کا نہ ہونا ہے۔ الا یہ کہ کوئی قرینہ بائع کے قول کے صادق ہونے کا ہو، وہ یوں کہ بائع دیانت اور حسن معاملہ میں جبکہ مشتری دروغ گوئی اور بد معاملگی میں معروف ہو تو معتبر قول بائع ہی کا ہوگا۔

تنبیہ:...... یاد رہے کہ یہ جملہ تفصیل اس وقت ہے جب دونوں میں سے کسی کے پاس اپنی اپنی بات کا گواہ نہ ہو۔ ہاں جہاں گواہ پیش ہو گئے تو فیصلہ بینہ کی شہادت پر ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل تین اہم مسائل کو بیان کیا گیا ہے:

(1) متعاقدین میں واقع ہونے والے اختلاف کا تصفیہ و دفعیہ بینہ سے ہوگا۔

(2) گواہ نہ ہوں تو معتبر قول مدعا علیہ کی قسم کے ساتھ اس کا ہوگا۔ جیسا کہ اس کی تفصیل بیان ہو چکی کہ مذکورہ بالا حدیث مطلق نہیں۔

(3) اور یہ کہ جہاں دونوں قسم اٹھالیں تو انہیں بیع کے فسخ کا اختیار ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بینہ پر عمل جائز ہے اور ضروری نہیں کہ بینہ گواہ ہی ہوں بلکہ ہر وہ بات بینہ کے مصداق میں داخل ہے جو حق بات کو کھول کر واضح کر دے اور اختلاف کی صورت میں پیدا ہونے والے اشتباہ کو رفع کر دے۔
- رَبُّ السِّلْعَةِ: معلوم ہوا کہ لفظ رب کی اضافت آدمی کی طرف جا سکتی ہے۔
- معلوم ہوا کہ اختلاف کی صورت میں اصل کی طرف رجوع کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ اس کی دلیل "اَلْقَوْلُ مَا قَالَ رَبُّ السِّلْعَةِ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ مبیع بائع کی ملک میں ہی ہو۔ اس کی مزید تفصیلی صورتیں اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔
- اختلاف کی صورت میں جس کے پاس بینہ ہو اسی کا قول معتبر ہوگا۔
- جملہ اختلافات میں معتبر قول بائع کا ہے۔ لیکن یہ قول مطلق اور متفق علیہ نہیں۔ جس کی تفصیل بیان ہو چکی۔

کتے کی قیمت، رنڈی کا معاوضہ اور کاہن کی اجرت لینے کی ممانعت کا بیان

771۔ وَعَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدِ الْأَنْصَارِيِّ رضی اللہ عنہ ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ ، وَمَهْرِ الْبَغِيِّ ، وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے کتے کی قیمت، رنڈی کا معاوضہ اور کاہن کی اجرت سے منع فرمایا ہے۔ [1]
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:...... نَهَى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ: ثمن: یہ مبیع کی قیمت کو کہتے ہیں۔ البتہ فقہاء کے ہاں لفظ ثمن اور لفظ قیمت میں ایک اصطلاحی فرق ہے، وہ یہ کہ ثمن اس قیمت کو کہتے ہیں جس پر متعاقدین راضی ہو جائیں جبکہ قیمت کسی شے کی "بازار کی قیمت" (Market Value) کو کہتے ہیں کہ ایسی صفات والی چیز عموماً بازار میں کتنے میں بکتی ہے، اس قیمت کو

[1] صحيح البخاري: 2237۔ صحيح مسلم: 1567 .

''قیمت'' کہتے ہیں۔

کتے کے ثمن لینے کی ممانعت کتے کی بیع کے عقد کی ممانعت کو بھی متضمن ہے، اور "الکلب" کا الف لام عموم کے لیے ہے جو سب کتوں کو شامل ہے۔

یاد رہے کہ کتا ایک معروف جانور ہے جو حرام اور غیر ماکول اللحم ہے۔ بے حد خبیث اور بدترین نجس ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ تک دھویا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل نجاستوں کے بیان میں گزر چکی ہے۔

وَمَهْرِ الْبَغِيِّ: البغیّ: یہ فعیل کے وزن پر اسم فاعل کا صیغہ ہے، مراد جسم فروش زانیہ، بدکار اور رنڈی عورت ہے۔ چونکہ یہ پیشہ عورت ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لیے مذکورہ صیغہ "البغی" سے تانیث کی تاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ البِغاء یہ زنا کو کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ﴾ (النور: 33)

''اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔''

اور مہر البغی سے مراد جسم فروشی اور زنا کاری کی اجرت ہے۔ مہر یہ عوض کو کہتے ہیں اور اس قیمت کو مہر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ معاوضہ اس رنڈی کو اس کے جسم سے فائدہ اُٹھانے کے عوض دیا جاتا ہے۔

وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ: حلوان: یہ عطیہ، نذرانہ، اجرت، بخشش اور رشوت وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ پس حلوان اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو کاہن کو اس کی کہانت پر دیا جاتا ہے۔ کاہن کی کہانت کے اس معاوضہ کو حلوان اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ ''حلو'' (مٹھاس) سے ماخوذ ہے۔ چونکہ کاہن کو تنکا ہلائے بغیر محض دوسروں کو سچی جھوٹی باتوں کے شیشے میں اتار کر رقم ملتی ہے، اس لیے اس کمائی کو ''حلوان'' (یعنی مفت کی کمائی) کا نام دیا گیا ہے۔

الْكَاهِنِ: یہ کہانت کرنے والے کو کہتے ہیں، اور کہانت یہ اٹکل سے آئندہ کی خبریں دینے کو کہتے ہیں۔ جاہلیت میں لوگ اپنے جھگڑے ان کاہنوں کے پاس لے جاتے تھے۔ یہ کاہن اپنے پاس پالے ہوئے شیطان جن آسمان پر بھیجتے اور وہ وہاں سے کوئی ایک آدھ بات سن آتے اور ایک میں سو ملا کر ان کاہنوں کو لا سناتے، انہی جھوٹ کے پلندوں کو بنیاد بنا کر یہ کاہن لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں، جس پر لوگ انہیں نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ یہی نذرانے "حُلْوَانِ الْكَاهِنِ" کہلاتے ہیں۔

غرض نبی کریم ﷺ نے ان تینوں باتوں سے منع فرمایا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ممانعت باذل (خرچ کرنے والے) کے لیے ہے یا آخذ (لینے والے) کے لیے ہے؟ تو بالذات تو یہ ممانعت آخذ کو شامل ہے۔ کیونکہ کتا بیچ کر اس کی قیمت سے نفع ''ثمن لینے والا'' یعنی بائع اٹھاتا ہے۔ البتہ مشتری بھی اس ممانعت میں بایں طور پر شامل ہے کہ وہ ایک حرام شے کے کھانے میں دوسرے کے معاون و مددگار بنا ہے۔

جبکہ زنا بذاتِ خود حرام ہے، گناہ میں شامل ہونے میں دونوں یکساں ہے۔ البتہ گناہ کر کے اس کا معاوضہ لینے کا اصل گناہ زانیہ کو ہوگا کیونکہ زنا کے عوض سے منتفع وہ ہوگی۔ البتہ خاص اس گناہ میں معاون بننے کا گناہ اجرت دینے والے کو بھی ہوگا۔

یہی حکم کاہن کی اجرت کا بھی ہے۔

تنبیہ:...... مضمونِ حدیث واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مذکورہ نہی تحریم کے لیے ہے۔
◈ کتے کا ثمن حرام ہے، اور حدیث کا عموم ہر قسم کے کتے کے ثمن کو شامل ہے کیونکہ حدیث میں کسی خاص کتے کا استثناء نہیں۔
◈ معلوم ہوا کہ کتا غیر متقوم ہے۔ یعنی اگر کسی نے دوسرے کا کتا تلف کر دیا، چاہے وہ حراست کے کام آتا تھا یا شکار کے، تو اس پر کوئی ضمان نہ آئے گا۔ کیونکہ کتے کے ثمن کے حرام ہونے سے لازم آتا ہے کہ کتے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔
◈ کتا بے حد خبیث ہے حتیٰ کہ اس کی قیمت بھی خبیث اور حرام ہے۔
◈ عصمت فروشی حرام اور اس کی اجرت بھی حرام ہے۔
◈ معلوم ہوا کہ ناموس کی حفاظت مال کی حفاظت سے اولیٰ ہے۔ اسی لیے بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ زنا میں ملوث دیکھ کر اسے فوراً مار ڈالنا جائز ہے۔
◈ کہانت حرام ہے کہ جب کہانت کا معاوضہ حرام ہے تو کہانت بدرجہ اولیٰ حرام ٹھہری۔
◈ کہانت کی اجرت دینا حرام ہے۔
◈ کاہن کے پاس جانا بھی حرام ہے۔ کیونکہ اس کے پاس جانے کا فائدہ تب ہی ہے جب اس کی باتوں کی تصدیق کی جائے، اور کاہن کی اٹکل کی غیب کی خبروں کی تصدیق کرنا حرام ہے اور بعض صورتوں میں کفر بھی ہے۔
◈ ان تینوں کاموں کی اجرت لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی حرام ہے۔

بائع کا مبیع سے نفع اٹھانے کی شرط رکھنا جائز ہے

772۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ كَانَ يَسِيرُ عَلَى جَمَلٍ لَهُ قَدْ أَعْيَا، فَأَرَادَ أَنْ يُسَيِّبَهُ، قَالَ: فَلَحِقَنِيَ النَّبِيُّ ﷺ، فَدَعَا لِيْ، وَضَرَبَهُ. فَسَارَ سَيْرًا لَمْ يَسِرْ مِثْلَهُ، قَالَ: ((بِعْنِيهِ بِأُوْقِيَّةٍ)) قُلْتُ: لَا، ثُمَّ قَالَ: ((بِعْنِيهِ)) فَبِعْتُهُ بِأُوْقِيَّةٍ، وَاشْتَرَطْتُ حُمْلَانَهُ إِلَى أَهْلِيْ، فَلَمَّا بَلَغْتُ أَتَيْتُهُ بِالْجَمَلِ، فَنَقَدَنِيْ ثَمَنَهُ، ثُمَّ رَجَعْتُ، فَأَرْسَلَ فِيْ أَثَرِيْ. فَقَالَ: ((أَتُرَانِي مَاكَسْتُكَ لِآخُذَ جَمَلَكَ؟ خُذْ جَمَلَكَ وَدَرَاهِمَكَ، فَهُوَ لَكَ)).

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: وہ اپنے اونٹ پر (سوار سفر میں) چلے جا رہے تھے جو تھک چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس اونٹ کو چھوڑ (کر پیدل چل) نے (اور اسے آزاد کر دینے) کا ارادہ کیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس نبی کریم ﷺ مجھے (پیچھے سے) آ ملے اور آپ ﷺ نے میرے لیے دعا فرمائی اور اس اونٹ کو ایک ضرب لگائی تو وہ اسی رفتار (اور چال) کے ساتھ چلنے لگا کہ (اس سے پہلے کبھی) ایسی رفتار (اور چال) کے ساتھ چلا نہ تھا۔ آپ ﷺ نے (مجھے) ارشاد فرمایا: ''(کیا) تم مجھے یہ اونٹ ایک اوقیہ کے بدلے بیچتے ہو۔'' میں نے عرض کیا: جی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے (مجھے دوبارہ) ارشاد فرمایا: ''یہ اونٹ مجھے بیچ دو'' تو میں نے ایک اوقیہ کے بدلے وہ اونٹ آپ ﷺ کو بیچ دیا، اور میں نے (بیچتے وقت) اس بات کی

(بھی) شرط رکھی کہ اپنے گھر والوں تک پہنچنے تک یہ اونٹ مجھے اپنے اوپر سوار کرے گا۔ پس جب میں (اپنے گھر والوں کے پاس مدینہ نبویہ) پہنچ گیا تو میں وہ اونٹ لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے مجھے اس کی قیمت عطا فرما دی۔ پھر میں (خدمت نبوی سے) لوٹ آیا تو آپ ﷺ نے (مجھے طلب فرمانے کے لیے) میرے پیچھے (کسی کو) روانہ فرمایا (یعنی مجھے گئے پیچھے بلوا بھیجا) اور (میرے حاضر خدمت ہونے پر مجھے) ارشاد فرمایا کہ: ''کیا تم میرے بارے میں یہ گمان کرتے ہو کہ میں نے تیرا اونٹ لینے کے لیے اس کی قیمت کو کم کر دیا ہے، تو (ایسا ہرگز بھی گمان نہ کرو۔ پس) تم اپنا اونٹ اپنے دراہم سمیت (دوبارہ) لے لو۔ پس یہ اونٹ (اور اس کا ثمن) اب تیرا ہوا۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَهَذَا السِّيَاقُ لِمُسْلِمٍ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے، اور حدیث کی یہ عبارت صحیح مسلم کی روایت کی ہے۔

غریب الحدیث:......عَلٰی جَمَلٍ: جمل: یہ مذکر اونٹ کو کہتے ہیں۔ غالب یہ ہے کہ نر اونٹ مادہ سے زیادہ قوی اور تگڑا ہوتا ہے۔

كَانَ يَسِيرُ: ایک قول یہ ہے کہ یہ غزوۂ تبوک کا قصہ ہے۔ جبکہ ایک قول غزوۂ ذات الرقاع ہونے کا بھی ہے، اور یہی صحیح قول ہے، امام ابن حجر رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ کیونکہ یہ غزوہ غزوۂ احد کے ایک سال بعد کا ہے۔ غزوۂ احد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جام شہادت نوش فرما گئے اور اپنے پیچھے بیٹیاں چھوڑ گئے تھے۔ جناب جابر رضی اللہ عنہ نے انہی کم سن بہنوں کی پرورش اور نگہداشت کے لیے ایک شادی شدہ خاتون سے شادی کی تھی۔ اسی بات کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس سفر میں نبی کریم ﷺ کے اس سوال کہ ''تم نے کنواری سے شادی کی ہے یا خاوند دیدہ سے'' کے جواب میں عرض کیا تھا کہ انہوں نے ایک خاوند دیدہ سے شادی کی ہے تاکہ وہ ان کی کم سن بہنوں کا خیال رکھے۔ غرض نبی کریم ﷺ کے سوال و جواب کا یہ قرینہ بتلاتا ہے کہ یہ غزوۂ ذات الرقاع کا قصہ ہے نہ کہ غزوۂ تبوک کا، اور یہ مدینہ نبویہ کی طرف واپسی کا قصہ ہے۔

بہرحال اس بات کا تعین پھر بھی چنداں اہمیت کا حامل نہیں کہ یہ قصہ کس غزوہ کا ہے۔ گو قرائن سے تعین ہو جائے تو قاری کے علم میں اضافہ کا باعث ضرور ہے۔

قَدْ أَعْيَا: یعنی وہ اونٹ تھک گیا کیونکہ وہ کمزور تھا۔

فَأَرَادَ أَنْ يُسَيِّبَهُ: تسیب یہ کسی کو جانے دینے اور جانے دینے کے لیے آزاد چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ غرض حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ اب اس اونٹ پر سواری کرنے کا چنداں فائدہ نہیں تو انہوں نے اس کو چھوڑ کر پیدل چلنے کا ارادہ کر لیا۔

---

[1] صحيح البخاري: 2861۔ صحيح مسلم: 715.

فَلَحِقَنِي النَّبِيُّ ﷺ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ سفر میں لوگوں سے پیچھے رہتے تھے۔ تاکہ آپ ﷺ کمزوروں اور محتاج کی نگہداشت کرتے چلے آئیں۔

فَدَعَا لِي وَضَرَبَهُ: یہاں قدرے اختصار ہے، وہ یوں کہ پہلے آپ ﷺ نے ان سے سواری کا حال پوچھا ہوگا۔ معلوم ہونے پر آپ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی کہ رب تعالیٰ انہیں اس اونٹ میں برکت عطا فرمائے پھر ایک لاٹھی لے کر اس تھک جانے والے اور چلنے سے کمزور پڑ جانے والے اونٹ کو ایک ضرب لگائی۔

فَسَارَ سَيْراً لَمْ يَسِرْ مِثْلَهُ: پس بعد میں وہی سب سے آگے آگے تھا۔

فَقَالَ بِعْنِيهِ بِأُوقِيَّةٍ، قُلْتُ: لَا: مراد یہ ہے کہ جناب جابر رضی اللہ عنہ اس اونٹ کو خدمت نبوی ﷺ میں بطور ھبہ کے پیش کرنا چاہتے تھے نہ کہ قیمۃً فروخت کرنا چاہتے تھے۔

ثُمَّ قَالَ: بِعْنِيهِ: لیکن آپ ﷺ نے ان سے دوبارہ وہ اونٹ بیچ دینے کا مطالبہ کر دیا، اور مذکورہ "بِعْ" کا صیغہ اصطلاحی امر کے معنی میں نہیں بلکہ عرض کے معنی میں ہے کہ: "کیا تم مجھے اپنا یہ اونٹ بیچتے ہو؟" یاد رہے کہ امر کا عرض کے معنی میں آنا معروف اور شائع وذائع ہے۔

فَبِعْتُهُ بِأُوقِيَّةٍ: اوقیہ: یہ چالیس دراہم کے برابر چاندی کو کہتے ہیں۔ (کتاب الزکوٰۃ میں اوقیہ کی تحقیق مفصل مذکور ہو چکی ہے)۔

وَاشْتَرَطْتُ حُمْلَانَهُ إِلَى أَهْلِي: حملان: یہ "حَمَلَ يَحْمِلُ" سے مصدر ہے۔ جیسے شکران، غفران اور کفران کہ یہ مصادر بھی اسی وزن پر ہیں، اور مذکورہ مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: "واشترطت حمله اياي" یعنی میں نے یہ بات شرط کر لی کہ یہ اونٹ مجھے اپنے اوپر سوار کر کے مجھے میرے گھر والوں تک لے جائے گا۔

فَلَمَّا بَلَغْتُ: مراد مدینہ نبویہ پہنچنا ہے۔

أَتَيْتُهُ بِالْجَمَلِ: تو میں یہ اونٹ لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہو گیا۔

فَنَقَدَنِي ثَمَنَهُ: مراد ثمن کا ادا کرنا ہے۔

ثُمَّ رَجَعْتُ: یعنی میں خدمت نبوی سے قیمت لے کر چلا آیا۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مبیع حوالہ کر کے اس کی قیمت وصول کر لی تھی اور متعاقدین میں سے کسی کے ذمہ کچھ نہ رہا گیا تھا۔

فَأَرْسَلَ فِي أَثَرِي: یعنی آپ ﷺ نے میرے پیچھے کسی کو روانہ کر کے مجھے بلوا بھیجا۔

فَقَالَ: یہاں عبارت میں اختصار اور حذف ہے جسے علم بلاغت میں ایجاز بالحذف کہتے ہیں۔ کیونکہ تقدیری عبارت یوں ہے کہ: آپ ﷺ نے میرے پیچھے کسی کو روانہ فرمایا۔ اس آنے والے نے مجھے پیغام رسالت پہنچایا تو میں لوٹ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا:

أَتُرَانِي: مذکورہ استفہام نفی کا نہیں بلکہ تقریر کا ہے۔ یعنی کیا تم میرے بارے میں یہ گمان کرتے ہو۔ یاد رہے کہ یہاں ظن کا تو اثبات ہے البتہ مابعد مذکور مماکست کی نفی ہے۔ "تُرَانِيْ" یہ دو مفعولوں کی طرف مضاف ہے۔ (1) یائے متکلم کی ضمیر۔ (2) اور دوسرے "مَاكَسْتُكَ لِآخُذَ جَمَلَكَ" کا جملہ کہ یہ مفعول ثانی ہے۔

مَا كَسْتُكَ لِآخُذَ جَمَلَكَ: غرض یہاں دو باتیں ہیں:
(1) ایک حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا گمان تو وہ ثابت ہے۔
(2) دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مماکست تو وہ غیر ثابت ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ استفہام اونٹ حاصل کرنے کے لیے مماکست پر وارد نہیں ہو رہا بلکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گمان پر وارد ہو رہا ہے۔
مَا كَسْتُكَ: یہ بیع میں لڑ جھگڑ کر مبیع کی قیمت کم کرانے کو کہتے ہیں۔
لِآخُذَ جَمَلَكَ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ اونٹ بیچ چکے تھے، تب پھر اس ارشاد کی توجیہ کیا ہے؟ تو علمائے بلاغت کے نزدیک یہ ارشاد "مَاكَانَ" کے اعتبار سے ہے۔ دوسرے اس لیے بھی کہ مماکست ہمیشہ تمام بیع سے قبل ہوتی ہے نہ کہ بیع کی تکمیل کے بعد۔
خُذْ جَمَلَكَ: یہ بھی "مَاكَانَ" کے اعتبار سے ہے ورنہ اس ارشاد کے وقت اس اونٹ کے شرعی مالک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔
وَدَرَاهِمَكَ: یہ حاضر کے اعتبار سے ہے۔
فَهُوَ لَكَ: "هو" ضمیر کا مرجع جَمَل ہے۔
هٰذَا السِّيَاقُ لِمُسْلِمٍ: اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کا سیاق اس حدیث کی بابت صحیح مسلم کے سیاق سے مختلف ہے۔

مناسبت حدیث:...... مذکورہ حدیث کو یہاں لانا دو اعتبار سے ہے:
(1) ایک یہ کہ اس میں بیع کا ذکر ہے۔
(2) دوسرا یہ کہ اس میں بیع کے وقت بائع کے شرط رکھنے کا ذکر ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ بائع بیع کرتے وقت کسی بات کو شرط رکھ سکتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ تھکے اونٹ پر بھی سواری جائز ہے۔ اس کی دلیل "كَانَ عَلَى جَمَلٍ لَّهُ قَدْ اَعْيَا" کے لفاظ ہیں۔ البتہ دیگر قواعد شرعیہ یہ بتلاتے ہیں کہ اس میں یہ بات شرط ہے کہ جانور کو مشقت نہ ہو۔
◈ جو مال بے کار، غیر مفید اور ناکارہ ہو گیا ہو اس کو پھینک دینا یا یونہی ترک کر دینا جائز ہے، اور یہ وہ ممنوعہ تسییب نہیں جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے:
﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ﴾ (المائدة: 103)
''اللہ نے نہ کوئی کان چھٹی اونٹنی مقرر فرمائی ہے اور نہ کوئی سانڈ چھٹی ہوئی۔''
کیونکہ قرآن کریم میں جس سائبہ کی مشروعیت کی نفی ہے یہ وہ اونٹ یا اونٹنی ہوتی تھی جس کو جاہلی عرب خوب کام لینے اور

بچے جنوانے کے بعد بے کار چھوڑ دیتے تھے پھر اس کی سواری کو اور اس کے کھانے، دونوں کو حرام سمجھتے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک حلال کو حرام ٹھہرانا ہے۔ اس لیے رب تعالیٰ نے سائبہ کی مشروعیت کی نفی فرمائی ہے۔

- معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ سفر میں سب سے پیچھے رہتے تھے اس کی دلیل "فَلَحِقَنِي النَّبِيُّ ﷺ" کے الفاظ ہیں۔ حتیٰ کہ اس سفر میں آپ ﷺ جابر رضی اللہ عنہ کے تھک کر پیچھے رہ جانے والے اونٹ سے بھی پیچھے تھے۔ بلاشبہ یہ آپ ﷺ کی اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے ساتھ بے حد شفقت اور حسن رعایت بھی تھی اور آپ ﷺ کی بے حد تواضع بھی تھی۔
- معلوم ہوا کہ امیر لشکر کو پیچھے ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے احوال کی نگرانی اور ان کی خیر خبر معلوم کرتا ہوا آئے۔
- دوسروں کو دعا دے کر بھی ان پر احسان کیا جا سکتا ہے۔ چاہے پیٹھ پیچھے دعا کی جائے اور چاہے منہ در منہ دعا دی جائے۔
- اگر جانور چل نہ رہا ہو تو اس کو ضرب لگا سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضرب اذیت رساں نہ ہو۔
- نبی ﷺ کے ایک معجزہ کا ظہور کہ آپ ﷺ کے دعا فرماتے ہی وہ اونٹ یکا یک چست، سب رفتار اور طاقتور ہو گیا۔
- البتہ معجزہ کو آیت کہنا اولیٰ ہے کیونکہ قرآنی تعبیر یہی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ۝﴾ (یٰسین: 41)

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔''

- سواری وغیرہ میں اپنے رفقائے سفر کی اعانت سنت نبوی ہے، اور ایسے کاموں میں صدقہ کرنے کا اجر ملتا ہے۔
- کسی دوسری غیر مقصود بات کو پیش کر کے اگلے کا امتحان لینا جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے محض یہ جاننے کے لیے کہ جناب جابر رضی اللہ عنہ اس اونٹ سے بے رغبت ہیں یا اس سے جان خلاصی ہی چاہتے ہیں اس لیے اس کو آزاد چھوڑ رہے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو اونٹ بیچنے کی پیش کش فرمائی۔
- معلوم ہوا کہ اکابر اصاغر سے کسی چیز کو خرید سکتے ہیں۔ جیسا کہ سرورِ دو جہاں حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے ایک امتی سے اونٹ خریدا تھا۔
- بائع کا اپنی مبیع پر حق ہے کہ وہ چاہے تو بیچے اور چاہے تو نہ بیچے۔ لہٰذا بائع کا اپنی مبیع کو بیچنے سے انکار کرنا گناہ نہیں۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اول وہلہ میں اپنے اونٹ کو بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔
- بھاؤ تاؤ کرتے وقت مبیع کی قیمت لگائی جائے، اٹکل سے نہ بیچی جائے۔ اس کی دلیل "بِأُوْقِيَةٍ" کا لفظ ہے۔
- کسی کو بیچنے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک سے زائد مرتبہ بھی بیچنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ بیچنے کو دو بار ارشاد فرمایا تھا۔
- معلوم طریق پر مبیع کی منفعت کی شرط لگائی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اونٹ بیچتے وقت اس بات کی شرط رکھ دی تھی کہ وہ بعد میں گھر پہنچنے تک اس پر سواری کرتے رہیں گے۔ شرط کا معلوم ہونا زمان، مکان، عمل اور مسافت کی وضاحت کے ساتھ ممکن ہے۔

جیسے گاڑی بیچتے وقت ایک دن پاس رکھنے کی شرط رکھ دینا، یا غلام بیچتے وقت کپڑا سی کر دینے کی شرط رکھ لینا۔ یا گھوڑا بیچتے وقت ایک دن کے لیے گھر پر رکھنے کو شرط ٹھہرانا وغیرہ کہ یہ جائز ہے۔ جبکہ دوسرا فریق راضی ہو۔

◈ شرط کے معلوم ہونے پر تو بیع کا صحیح ہونا متفق علیہ ہے۔ لیکن غیر معلوم ہونے پر بیع کے صحیح ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جیسے: اس شرط پر گھر بیچنا کہ جب تک مجھے کوئی دوسرا گھر مل نہیں جاتا۔ میں اسی مکان میں رہوں گا کہ یہاں شرط کی مدت مجہول ہے۔ بلاشبہ یہاں غیر معین مدت کی شرط ہے۔ لہٰذا اس بیع کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ البتہ مدت کی تعیین اس اختلاف کو قطع کر دیتی ہے۔

◈ بیع میں منفعت کی شرط لگانا جائز ہے۔

◈ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت کہ انہوں نے لگائی شرط کو فوراً پورا کیا اور گھر پہنچتے ہی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اونٹ پیش کرنے حاضر ہو گئے۔

◈ معہود فی الذھن مذکور کے حکم میں ہوتا ہے۔ جیسے یہاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مدینہ نبویہ کا نام لیے بغیر اپنے گھر والوں تک سواری کو شرط رکھا تھا۔ تو چونکہ مخاطبین جانتے تھے کہ ان کے گھر والے مدینہ میں رہتے ہیں، اس لیے مدینہ تک کا سفر مذکور نہ ہونے کے باوجود شرط ٹھہرا کیونکہ مخاطبین کے ذہن میں مدینہ کا نام مستحضر تھا۔

◈ ادھار پر چیز خریدنا جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے راستے میں اونٹ خرید کر اس کی قیمت مدینہ نبویہ میں جا کر ادا فرمائی تھی۔

◈ کسی چیز کے خریدنے کی قیمت نہ ہو تو اس کو ادھار پر نہ خریدے۔ یہی وجہ ہے کہ مہر نہ ہونے کی صورت میں نبی کریم ﷺ نے نکاح جیسی اہم عبادت کے لیے بھی ادھار اٹھانے کی طرف امت کی رہنمائی نہیں فرمائی۔

◈ دوسرے کو وکیل بنانا جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بلوانے کے لیے اپنا ایک قاصد ان کے پیچھے روانہ فرمایا تھا۔

◈ اپنے سے بڑے کو "نہیں" کے ساتھ جواب دینا جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب میں "نہیں" عرض کیا تھا۔

◈ وفا اور استیفاء دونوں میں وکیل بنانا جائز ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ کیا واقعی نبی کریم ﷺ کا ارادہ اونٹ خریدنے کا تھا یا آپ اس ظاہری عقد کے واسطہ سے ان پر نال صدقہ کرنا چاہتے تھے؟ تو علماء اس بابت دونوں طرف گئے ہیں۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے واقعی اونٹ خریدا تھا لیکن جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ جابر رضی اللہ عنہ کے جی میں یہ بات ہے کہ ان کے اونٹ کی قیمت زیادہ تھی تو آپ ﷺ نے اونٹ سمیت وہ رقم انہیں مرحمت فرما دی۔

اگرچہ یہ قول دوسرے قول سے عمدہ ہے لیکن حدیث کے ظاہری الفاظ بتلاتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ارادہ اونٹ کو واقع میں خریدنے کا نہ تھا۔ جس کی دلیل "أَتُرَانِي" کے الفاظ ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک بظاہر آپ ﷺ کا مقصود حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے جی کے خیال کا اندازہ کرنا تھا۔

◈ نبی کریم ﷺ کی بے پناہ کرم نوازی اور جود وعطاء کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو ثمن بھی دے دیا اور معوض بھی۔

◈ ثمن کو تاخیر سے ادا کرنا جائز ہے۔

◈ عقد جس پر دلالت کر رہا ہو اس پر منعقد ہو جاتا ہے گو لفظوں میں اس کی صراحت نہ بھی ہو۔ جیسے نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا

کہ: ''اپنا اونٹ اپنے درہموں سمیت لے لو کہ یہ اونٹ تیرا ہوا''، یہ عقد کے ''عقدِ ھبہ'' ہونے پر دلالت کر رہا ہے گو نہ تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''میں نے یہ اونٹ اور اس کی رقم تمہیں ھبہ کی'' اور نہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ہی یہ کہا کہ: ''میں نے قبول کیا'' تب بھی چونکہ عقد کا ظاہر اس کے عقدِ ھبہ ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ عقد عقدِ ھبہ بن کر منعقد ہو جائے گا۔

اگر مدبر غلام کا مالک مقروض ہو تو مدبر غلام کو بیچنا جائز ہے

773۔ وَعَنْهُ قَالَ: ((أَعْتَقَ رَجُلٌ مِنَّا عَبْدًا لَهُ عَنْ دُبُرٍ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُ. فَدَعَا بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَبَاعَهُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم میں سے ایک آدمی نے اپنا ایک غلام اپنے مرنے کے پیچھے آزاد کر دیا (یعنی اس کو مدبر بنا دیا) جس کے سوا اس کے پاس اور کوئی مال نہ تھا۔ اس پر نبی ﷺ نے اس غلام کو بلوا کر اس کو بیچ ڈالا۔ ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......أَعْتَقَ: آزاد کرنا۔ یہ عتق سے مشتق ہے۔ عتق کے متعدد معانی آتے ہیں۔ جن کی تفصیل مذکور ہو چکی ہے۔

عتق کے بے پناہ فضائل ہیں۔ عتق کے متعدد اسباب ہیں۔ جیسے لفظوں کے ساتھ کسی کو آزاد کرنا۔ اسی طرح اشارہ کے ساتھ کسی کو آزاد کرنا۔ یا شریک کے اپنا حصہ آزاد کرنے سے باقی کا غلام بھی آزاد ہو جاتا ہے۔

رَجُلٌ مِنَّا: یہ صاحب ایک انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

عَبْدًا لَهُ عَنْ دُبُرٍ: لفظ دُبر کا اطلاق کسی شے کے آخر پر بھی ہوتا ہے اور ما بعد الشيء پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں ''عَنْ دُبُر'' سے مراد یہی مابعد الشيء ہے، اور مراد مابعد الحياة ہے۔ یعنی وہ غلام جس کی آزادی کو اپنی زندگی کے ختم ہونے کے بعد سے معلق کر دیا جائے اس کو مدبر کہتے ہیں۔ جیسے اپنے غلام کو یوں کہنا کہ: ''تم میرے مرنے کے بعد آزاد ہو'' تو اس غلام کو مدبر کہیں گے۔ لہٰذا یہ غلام اپنے آقا کی زندگی تک غلام ہی رہے گا البتہ آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہو جائے گا۔ الا یہ کہ خود آقا ہی اسے اپنے جیتے جی آزاد کر دے۔

اب یہ غلام ایک ایسے شخص نے آزاد کیا تھا جس کے پاس اس غلام کے سوا اور کوئی مال نہیں تھا۔

فَدَعَا بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَبَاعَهُ: مذکورہ روایت مختصر ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ صاحب مقروض تھے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس غلام کو بلوا کر اسے بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے ان صاحب کا قرض ادا کیا۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض اتارنے کے لیے اپنے مدبر غلام کو بیچ ڈالے تو یہ جائز ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اسلام میں غلامی کا ثبوت ہے۔ کتاب وسنت میں اس کے احکام صاف اور واضح مذکور ہیں۔

❶ صحيح البخاري: 2573۔ صحيح مسلم: 997.

- غلام کو مدبر بنانا جائز ہے۔ مدبر کی تعریف بیان ہو چکی ہے۔
- اگر آدمی مقروض ہو تو اس کی تدبیر نافذ نہیں ہوتی۔ یعنی اس کا مدبر بنایا ہوا غلام مدبر نہیں بنتا۔
- یہیں سے قرض کی بے پناہ اہمیت بھی معلوم ہوگئی کہ وہ غلام آزاد کرنے پر مقدم ہے۔
- اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، کہ مفلس کا تصرف نافذ نہیں ہوتا، چاہے اسے مفلس قرار نہ بھی دیا جائے، یعنی جس کے مال کو قرض نے گھیرا ہوا ہو اس کا تصرف نافذ نہیں ہوتا۔
- امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقروض کا قرض ادا کرنے کے لیے اس کا مال بیچ سکتا ہے۔

جس گھی میں چوہا گر جائے اس کو کھانے اور بیچنے کا حکم

774- وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ رضي الله عنها زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّ فَأْرَةً وَقَعَتْ فِيْ سَمْنٍ، فَمَاتَتْ فِيْهِ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْهَا، فَقَالَ: ((أَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوْهُ)).
رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.
وَزَادَ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ: ((فِيْ سَمْنٍ جَامِدٍ)).

زوجہ رسول سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ایک چوہا (کسی کے) گھی میں گر کر مر گیا۔ نبی کریم ﷺ سے اس کا مسئلہ پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''چوہا اور اس کے آس پاس کا گھی نکال کر پھینک دو اور (باقی کا) گھی کھالو۔''[1]
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔
جبکہ مسند احمد اور سنن النسائی کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں: ''جمے ہوئے گھی میں''۔

غریب الحدیث:...... زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ: زوج کا لفظ بیوی کے لیے زیادہ فصیح ہے، جب کہ زوجہ کا لفظ ہلکا ہے۔ البتہ فرائض کے بیان میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ کیونکہ علم الفرائض کی اصطلاح میں زوجہ کا لفظ انثی کے لیے خاص ہے۔

أَنَّ فَأْرَةً: چوہا۔ ایک معروف جانور۔ یہ فاسق جانور ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وَقَعَتْ فِي سَمْنٍ، فَمَاتَتْ: بظاہر یہ چوہا پگھلے ہوئے گھی میں گر کر مرا تھا۔ کیونکہ اگر گھی جما ہوا ہوتا تو اس میں گر کر چوہا مر نہ سکتا تھا۔ بلکہ گھی کی سطح پر گر کر باہر نکل آتا۔ اسی لیے مسند احمد اور سنن النسائی کی روایت کے الفاظ محل نظر ہیں کہ وہ چوہا جمے ہوئے گھی میں گرا تھا۔ ہاں اگر جمود نسبتی مراد ہو تو ممکن ہے۔

فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْهَا: یعنی چوہے کے گھی میں گرنے کی حالت کے بارے میں پوچھا گیا۔ تب یہ عبارت درست بنے گی ورنہ صحیح عبارت فسئل النبي عنه ہونی چاہیے تھی۔

أَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا: اس پر آپ ﷺ نے اس چوہے کو اور اس کے آس پاس کے گھی کو نکال کر گرا دینے کا اور باقی کے گھی کے کھا لینے کا حکم ارشاد فرمایا۔

زاد احمد والنسائی: اس پر کلام اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

مناسبتِ حدیث:...... بظاہر یہ حدیث "كتاب الاطعمة" کے مناسب تھی۔ لیکن یہاں یہ حدیث اس مناسبت سے لائے ہیں کہ ایسے گھی کو بیچنا جائز ہے۔ کیونکہ جب اس کا کھانا جائز ہے تو اس کا بیچنا بھی جائز ہوا۔ کیونکہ جو شے

[1] صحيح البخاري: 235۔ مسند احمد: 330/6۔ سنن النسائي: 178/7.

مباح ہو، اس کا ثمن بھی مباح ہوتا ہے اور جو شے حرام ہو، اس کا ثمن بھی حرام ہوتا ہے۔

مضمون حدیث :......اگر چوہا گھی میں گر کر مر جائے تو وہ سارا گھی نجس نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے آس پاس کے گھی کے علاوہ باقی کا گھی پاک اور قابل انتفاع واستعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کو بیچ بھی سکتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ چوہا نجس ہے، اسی لیے تو اس کے آس پاس کے گھی کو پھینک دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ باقی کا گھی پاک ہوتا ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علم کے بے حد طالب تھے۔
- امور علمیہ میں حیاء مناسب نہیں۔
- معلوم ہوا کہ جب اذی یعنی گندگی ونجاست زائل ہو جائے تو اس کا حکم بھی زائل ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل "أَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا، وَكُلُوْهُ" کے الفاظ ہیں۔

775۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا وَقَعَتِ الْفَأْرَةُ فِي السَّمْنِ، فَإِنْ كَانَ جَامِدًا فَأَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا، وَإِنْ كَانَ مَائِعًا فَلَا تَقْرَبُوْهُ)). رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَقَدْ حَكَمَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيُّ وَأَبُوْ حَاتِمٍ بِالْوَهْمِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جب چوہا گھی میں گر (کر) جائے تو اگر تو وہ گھی جما ہوا ہے تو اس کو اور اس کے آس پاس کے گھی کو نکال کر پھینک دو اور اگر وہ گھی پگھلا ہوا ہو تو اس کے قریب مت جاؤ۔" ❶ اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری اور ابو حاتم نے اس روایت پر وہم ہونے کا حکم لگایا ہے۔

شرح :......اگرچہ اس حدیث میں گھی کی تفصیل ہے کہ جما ہوا ہو تو کیا حکم ہے، اور پگھلا ہوا ہو تو کیا حکم ہے۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے وہم ہونے کا حکم لگایا ہے۔

پھر اگر تو گھی اچھی طرح جما ہو تو اس میں چوہے کے مرنے کا کوئی احتمال نہیں، اور اگر درمیانی جما ہو تو چوہا اس میں گر کر مر سکتا ہے جس کا حکم بیان ہو چکا ہے۔

اس حدیث کے وہم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں چوہے کے گھی میں گرنے کا ذکر تو ہے پر گر کر مرنے کا ذکر نہیں، اور یہ بات معلوم ہے کہ چوہا اگر گر کر زندہ نکل جائے تو گھی نجس نہیں ہوتا۔ کیونکہ چوہا ان طوافین میں سے ہے جن سے بچنا ممکن نہیں۔ لہٰذا اگر چوہا پانی میں گر کر نکل بھاگے تو پانی پاک شمار ہو گا۔

غرض یہ تفصیل اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ روایت وہم ہے اور صحیح روایت گزشتہ ہے۔

776۔ وَعَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ قَالَ: ((سَأَلْتُ جَابِرًا رضي الله عنه عَنْ ثَمَنِ السِّنَّوْرِ وَالْكَلْبِ. فَقَالَ:

ابو زبیر سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بلے اور کتے کے ثمن کے بارے میں پوچھا؟ تو

❶ مسند احمد: 265/2۔ سنن ابی داؤد: 3842۔ صحیح ابن حبان: 1393۔ امام ترمذی (256/2) امام بخاری سے نقل کے فرماتے ہیں: یہ روایت خطا ہے۔ صحیح سیّدہ میمونہ رضی اللہ عنہا والی روایت ہے۔

زَجَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ)).
انہوں نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے اس سے روکا ہے۔ ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالنَّسَائِيُّ.
اس حدیث کو امام مسلم اور امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

وَزَادَ: ((إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ)).
اور امام نسائی نے اپنی روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں: ''مگر شکاری کتا۔''

غریب الحدیث:......**سَأَلْتُ جَابِرًا** رضی اللہ عنہ: ابوزبیر کے جناب جابر رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے سے مذکورہ روایت سے تدلیس کا شبہ اور احتمال جاتا رہا۔ کیونکہ ابوزبیر میں قدرے تدلیس پائی جاتی ہے۔ البتہ ظاہر یہ ہے کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب صحیحہ میں ابوزبیر کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو روایات ہیں وہ معتمد ومعتبر ہیں اور یہ سماع پر محمول ہیں۔

عَنْ ثَمَنِ السِّنَّوْرِ: سنور: بلا۔ ایک معروف جانور ہے۔ یہ پالتو بھی ہوتا ہے اور جنگلی بھی۔ بلا گھر کو کیڑے مکوڑوں اور چھپکلیوں وغیرہ سے پاک رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ ان کو پکڑ کر کھالیتا ہے۔ عجب بات ہے کہ بلا اور بلی پہلے مرغیاں پکڑ کر کھا جاتے تھے پر آج کل یہ مرغیوں کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے ہیں۔

وَالْكَلْبِ: کتے کے احکام مذکور ہو چکے ہیں۔

زَجَرَ النَّبِيُّ عَنْ ذٰلِكَ: ذلک سے مراد بلے اور کتے کا ثمن ہے۔

حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ بلی بیچنا حرام ہے۔ اس میں پالتو اور جنگلی بلی دونوں کا حکم ایک ہے۔ کیونکہ بظاہر حدیث میں عموم ہے۔ لیکن علماء کا اس میں اختلاف ہے: ایک قول یہ ہے کہ جب بلی پال پوس کر نافع بنا دی جائے تو اس کا بیچنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ بلی مباح نفع والی ہے اور جب کوئی شے مباح ہو تو اس کا ثمن بھی مباح ہوتا ہے، اور کسی چیز کے کھانے کا حرام ہونا اس کی بیع کے حرام ہونے کو مستلزم نہیں۔ جیسے گدھا کہ اس کا کھانا حرام ہے لیکن اس کا بیچنا حرام نہیں۔

البتہ جب بلی پالتو اور نافع نہ ہو تو اس کا بیچنا جائز نہ ہوگا۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ ❷ لہٰذا جمہور کی بلی کی بیع کے منع ہونے سے مراد غیر نافع بلی کی بیع ہے۔

لیکن پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ بلی جیسی بھی ہو، اس کو بیچا نہ جائے۔ لہٰذا اگر پالتو بلی کی ضرورت نہ رہے اور کوئی دوسرا مانگ لے تو اسے بدون ثمن کے دے دے۔

جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ بلی کی بیع حدیث کے عموم کی وجہ سے ناجائز ہے۔ دوسرے لوگ بلی کو کوئی خاطر خواہ شے نہیں سمجھتے۔ لہٰذا یہ اس پانی کے مشابہ ہوگی جس کی بیع منع ہے۔

◈ مذکورہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جواب میں صرف دلیل بھی ذکر کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بجائے حکم کے بیان کرنے کے اس کے دلیل ذکر فرمائی ہے کہ: ''نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔''

---

❶ صحيح مسلم: 1569- سنن النسائي: 190/7.

❷ المبدع: 10/4- كشاف القناع: 153/3- المجموع: 528/2- المبسوط للسرخسي: 235/11.

رہا یہ سوال کہ پہلے حکم اور پھر اس کی دلیل ذکر کی جائے کہ یہ اولیٰ ہے، تو اس کا مدار مخاطب پر ہے کہ اگر تو وہ حکم جانتا ہے تو اس کے سامنے حکم کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے حکم اور دلیل دونوں بیان کرنے میں طوالت ہے۔ البتہ جو نہ جانتا ہو، اس کے سامنے حکم بھی بیان کیا جائے اور دلیل بھی۔

◈ امام موصوف رحمہ اللہ کے نزدیک سنن نسائی کی روایت کا یہ اضافہ: ''سوائے شکاری کتے کے'' منکر ہے، اس لیے یہ استثناء درست نہیں، اور یہی قول راجح ہے۔ کیونکہ اگر کتے کے ثمن کی ممانعت ہے تو اسی کتے کے ثمن کی ممانعت ہے جس کا پالنا مباح ہے۔ کیونکہ غیر پالتو کتے کی تو بیع کی ہی نہیں جاتی۔ لہٰذا یہ استثناء درست نہ ہوگا اور یہ اضافہ منکر ہے۔

شریعت کی مخالفت باطل ہے

777۔((وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ : جَاءَتْنِي بَرِيرَةُ ، فَقَالَتْ: إِنِّي كَاتَبْتُ أَهْلِي عَلَى تِسْعِ أَوَاقٍ ، فِي كُلِّ عَامٍ أُوقِيَّةٌ ، فَأَعِينِينِي! قُلْتُ: إِنْ أَحَبَّ أَهْلُكِ أَنْ أَعُدَّهَا لَهُمْ ، وَيَكُونُ وَلَاؤُكِ لِي فَعَلْتُ ، فَذَهَبَتْ بَرِيرَةُ إِلَى أَهْلِهَا ، فَقَالَتْ لَهُمْ ، فَأَبَوْا عَلَيْهَا ، فَجَاءَتْ مِنْ عِنْدِهِمْ ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ جَالِسٌ ، فَقَالَتْ : إِنِّي قَدْ عَرَضْتُ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ فَأَبَوْا ، إِلَّا أَنْ يَكُونَ الْوَلَاءُ لَهُمْ ، فَسَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ ، فَأَخْبَرَتْ عَائِشَةُ النَّبِيَّ ﷺ ، فَقَالَ: خُذِيهَا وَاشْتَرِطِي لَهُمُ الْوَلَاءَ ، فَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ)) ، فَفَعَلَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا ، ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي النَّاسِ خَطِيبًا فَحَمِدَ اللهَ ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ ، ثُمَّ قَالَ: ((أَمَّا بَعْدُ ، فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُونَ شُرُوطًا لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ؟ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللهِ فَهُوَ بَاطِلٌ ، وَإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ ، قَضَاءُ اللهِ أَحَقُّ ، وَشَرْطُ اللهِ أَوْثَقُ ، وَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ)) .

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میرے پاس بریرہ آئیں اور کہنے لگیں کہ میں نے اپنے آقاؤں کے ساتھ نو اوقیہ چاندی پر عقد کتابت کر لیا ہے۔ (کہ) ہر سال ایک اوقیہ چاندی (ان کو کما کر دینا) ہے۔ سو آپ (اس بارے) میری مدد کیجئے۔ اس پر سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر تیرے مالکوں کو یہ پسند ہو (یعنی انہیں یہ منظور ہو) کہ میں ان کو یہ رقم (یک مشت) گن کر (پوری کی پوری) دے دوں اور تمہاری ولاء میری ہو تو میں ایسا کرنے پر تیار ہوں۔ چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اپنے مالکوں کے پاس گئیں اور ان سے (سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پیش کش کی بابت) بات کی تو انہوں نے حضرت عائشہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس سے چلی آئیں (اور سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں) اس وقت نبی کریم ﷺ بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے عرض کیا: میں نے یہ بات ان لوگوں پر پیش کی ہے پر وہ نہیں مانتے مگر یہ کہ ولاء ان کی ہو (یہ بات) نبی کریم ﷺ نے بھی سن لی۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کو (اس ساری بات کی) خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم بریرہ کو (مال کتابت دے کر) لے لو اور ان کے لیے ولاء کی شرط رکھ دو، بے شک ولاء تو اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے۔ چنانچہ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا ہی کیا، پھر نبی کریم ﷺ لوگوں میں خطبہ ارشاد فرمانے کھڑے ہوئے۔ پس آپ ﷺ نے رب تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی، پھر ارشاد فرمایا:

''اما بعد! لوگوں کو کیا ہوا کہ وہ ایسی شرطیں رکھتے ہیں جو رب تعالیٰ کی کتاب میں نہیں۔ پس جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے چاہے وہ سو شرطیں بھی ہوں۔ اللہ کا فیصلہ (تسلیم کیے جانے کا) زیادہ (مستحق) ہے اور برحق ہے اور اللہ کی شرط زیادہ مضبوط ہے. ولاء تو اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے۔''❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، وَعِنْدَ مُسْلِمٍ قَالَ: ((اشْتَرِيهَا، وَأَعْتِقِيهَا، وَاشْتَرِطِي لَهُمُ الْوَلَاءَ)).

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے، اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں، اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں: تم اسے خرید لو اور اسے آزاد کر دو اور ان پر ولاء کی شرط رکھ دو۔

غریب الحدیث:...... جَاءَتْنِي بَرِيرَةُ: حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا انصار کے ایک گھرانے کی باندی تھیں۔

كَاتَبْتُ أَهْلِي: یہاں اہل سے مراد سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے آقا ہیں۔ مکاتبت: یہ غلام کا اپنے آقا سے خود اپنے آپ کو خریدنا ہے۔ چنانچہ یہ آقا کا اپنے غلام سے ایک مالی معاہدہ ہے کہ جب غلام اسے مقررہ مال قسط وار ادا کر دے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس معاہدے کو مکاتبت اور کتابت کہتے ہیں۔

البتہ اس عقد کے لازم یا جائز ہونے میں اختلاف ہے کہ آیا آقا اور غلام اس عقد کو فسخ کر سکتے ہیں یا یہ عقد دونوں پر لازم ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ عقد آقا کی جانب سے لازم ہے اسے اس کے فسخ کا حق نہ ہوگا۔ البتہ غلام کی جانب سے یہ عقد جائز ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس عقد کو پورا نہ کر سکے۔ لہٰذا عاجز ہونے کی صورت میں وہ دوبارہ غلام بن جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ اگر غلام مکاتبت کا مطالبہ کرے تو کیا آقا پر اس عقد کو پورا کرنا لازم ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو آقا اس میں خیر دیکھے تو یہ عقد قائم کر دے اور اگر اسے اس عقد میں خیر نظر نہ آئے تو اس پر یہ عقد قائم کرنا لازم نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: 33)

''اور وہ لوگ جو مکاتبت (آزادی کی تحریر) طلب کرتے ہیں، ان میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہیں تو ان سے مکاتبت کر لو، اگر ان میں کچھ بھلائی معلوم کرو۔''

مذکورہ آیت میں راجح قول کے مطابق امر استحباب کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے ہے۔

عَلَى تِسْعِ أَوَاقٍ: اَوَاق: یہ ''اوقیہ'' کی جمع ہے، اوقیہ کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

فِي كُلِّ عَامٍ أُوقِيَّةٌ: اس اعتبار سے یہ نو سال کا عقد ٹھہرا۔ اسی لیے سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا مدد مانگنے سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ إِنْ أَحَبَّ أَهْلُكِ أَنْ أَعُدَّهَا لَهُمْ وَيَكُونَ وَلَاؤُكِ لِي فَعَلْتُ: مذکورہ اِنْ شرطیہ ہے لہٰذا ''اِنْ اَحَبَّ'' جملہ شرطیہ ہوگا اور ''فعلتُ'' یہ جملہ جزائیہ ہوگا۔

أَنْ أَعُدَّهَا لَهُمْ: یعنی میں ان کو گن کر اور پورے کر کے نو اوقیہ چاندی یکمشت دے دوں۔

وَيَكُونَ وَلَاؤُكِ لِي: ولاء کا لغوی معنی ولایت اور درستی ہے۔ شرع شریف میں اس کے متعدد معانی ہیں۔

---

❶ صحيح البخاري: 2563- صحيح مسلم: 1504.

چنانچہ ولاء عتق کا معنی یہ ہوگا کہ جب آدمی کسی غلام کو آزاد کر دے تو وہ اس کا عصبہ بن جاتا ہے۔ البتہ یہ عصوبت عصوبت نسبی سے کم درجہ کی ہوتی ہے۔ اسی لیے عصبہ نسبی کے ہوتے ہوئے عصبہ عتاقہ ترکہ میں سے کسی شے کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس کی مزید تفصیل کتاب الفرائض میں آ جائے گی۔ **فَأَبَوْا عَلَيْهَا**: سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنے آقاؤں کو جا کر یہ بتلایا تو انہوں نے ولاء سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دینے سے انکار کر دیا۔

وَرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ جَالِسٌ: سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا یہ بتلانے سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئیں تو نبی کریم ﷺ اس وقت سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں موجود تھے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ یا تو گھر والوں کے کام کاج میں لگے ہوتے تھے یا پھر مسجد میں ہوتے تھے یا مسلمانوں کے امور میں مشغول ہوتے تھے۔

فَقَالَتْ: إِنِّي قَدْ عَرَضْتُ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ فَأَبَوْا إِلَّا أَنْ يَكُونَ الْوَلَاءُ لَهُمْ: یعنی وہ سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں نقد بیچنے کو تو تیار تھے پر ولاء دینے کو تیار نہ تھے۔

خُذِيهَا وَاشْتَرِطِي لَهُمُ الْوَلَاءَ: یعنی ان کو خرید لو اور جیسا کہ وہ کہتے ہیں ولاء کے ان کے لیے ہونے کو شرط کر دو، مذکورہ امر امر اباحت ہے نہ کہ وجوب یا استحباب کا امر ہے۔ کیونکہ یہ ایک سوال کے جواب میں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے حسب منشا ولاء ان کے لیے ہونے کو اس لیے فرمایا تا کہ بعد میں ایک اہم بات کو واضح فرمائیں۔

لَهُمْ: مذکورہ لام میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ تملیک کے لیے ہے، یا استحقاق کے لیے ہے یا یہ "عَلٰی" کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ لام "عَلٰی" کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾ (الاسراء: 7) ''اور اگر برائی کی تو انھی کے لیے۔''

کہ یہاں بھی "فَلَهَا" میں لام "عَلٰی" کے معنی میں ہے۔ ان علماء نے یہ قول اس لیے کیا ہے تا کہ یہ لازم نہ آئے کہ نبی کریم ﷺ نے سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے آقاؤں کو ایک فاسد شرط کی اجازت دے دی تھی۔ کیونکہ ولاء ان کے ہونے کی شرط مخالف شرع تھی، اور نبی کریم ﷺ سے یہ ممکن نہیں کہ آپ ﷺ کسی کو خلاف شرع بات کی اجازت دیں۔ لہٰذا لازم آیا کہ یہ لام "عَلٰی" کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ لام اکثر "عَلٰی" کے معنی میں آتا رہتا ہے۔

لیکن تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہ درست نہیں۔ کیونکہ اس بات سے تو وہ پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔ لہٰذا وہی بات دوبارہ ان پر شرط رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہم لام کو اس کے اصلی معنی کی طرف ہی لے جائیں اور وہ تملیک واستحقاق ہے۔

تب پھر جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں ایک غیر شرعی امر کی اجازت ہرگز بھی نہیں دی، اور نہ اس کو نافذ ہی کیا ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے اس کی اجازت اس لیے دی تا کہ اس بات کو شروط ٹھہرا دیے جانے کے بعد باطل قرار دیں جو زیادہ اشد ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے بعد میں حکم شرعی کو بیان اور پختہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ: کہ ولاء تو اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے۔ مذکورہ "فَا" عاطفہ ہے اور "انما" یہ اداۃ حصر میں سے ہے۔ "الْوَلَاءُ" یہ مبتداء ہے، "لِمَنْ أَعْتَقَ" اور یہ خبر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ولاء تو اس کی ہے کہ جو آزاد کرے اور نہ کہ کسی اور کی۔

فَفَعَلَتْ عَائِشَةُ: یعنی سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رقم دے کر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو خرید لیا اور ولاء ان کے لیے ٹھہرا دی۔

ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي النَّاسِ خَطِيباً: پھر آپ ﷺ نے لوگوں میں کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ عارضی تھا نہ کہ خطبہ راتبہ۔

فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ: حمد وثناء کے معنی پر کتاب کے آغاز میں کلام گزر چکا ہے۔

ثُمَّ قَالَ: یعنی حمد وثناء کے بعد ارشاد فرمایا۔

أَمَّا بَعْدُ: اس کی ترکیب بیان ہو چکی ہے۔

فَمَا بَالُ رِجَالٍ: "بال" یہ "شأن" کے معنی میں ہے۔ یعنی لوگوں کا کیا حال ہے۔ مذکورہ "مَا" استفہامیہ ہے اور یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔

رجال کا ذکر بطور قید کے نہیں۔ لہٰذا یہ حکم اور خطاب عورتوں کو بھی شامل ہے۔

يَشْتَرِطُونَ شُرُوطاً: شرط کا لغوی اور شرعی معنی بیان ہو چکا ہے، اور اس کی اقسام اور احکام کی تفصیل گزر چکی ہے۔

لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ: ان الفاظ پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ان کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس شرط کا ذکر کتاب اللہ میں ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ بعض شروط مذکور اور بعض غیر مذکور ہیں۔ تب پھر "لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ" سے مراد "لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ حِلُّهَا" ہے۔ یعنی بعض لوگ ایسی باتوں کی شرط رکھتے ہیں جن کو رب تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال نہیں ٹھہرایا۔

یہ مطلب بیان کرنے والے علماء کا استدلال اس حدیث سے ہے: ''مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں سوائے اس شرط کے جو کسی حرام کو حلال کر دے یا کسی حلال کو حرام کر دے۔'' جو اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی جو بات شرط رکھے وہ ثابت ہے سوائے اس شرط کے جو اللہ کی شرط کے خلاف ہو، وہ یوں کہ وہ کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے۔

فِي كِتَابِ اللّٰهِ: کتاب اللہ سے مراد قرآن ہے۔ اسی طرح سنت بھی کتاب اللہ کے حکم میں داخل ہے۔ گو کہ اس کا متکلم جنابِ رسول اللہ ﷺ ہوتے ہیں لیکن سنت میں وارد حکم کتاب اللہ کے حکم کے جیسا ہے۔

پس جو سنت میں آئے وہ کتاب اللہ ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ہمیں اس بات کی خبر دی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس بات کو کھول کر بیان کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں اترے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: 44)

''اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔''

مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ، وَإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ: مذکورہ "مَا" شرطیہ ہے۔ لہٰذا "كَانَ مِنْ شَرْطٍ" یہ جملہ شرطیہ ہوگا، اور "فَهُوَ بَاطِلٌ" میں "فا" جزائیہ اور مذکورہ جملہ جوابِ شرط ہوگا۔

مِنْ شَرْطٍ: یہ "كَانَ" فعل ناقص کا اسم ہے اور مذکورہ "مِنْ" حرف جر زائدہ ہے۔

لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ: یہ جملہ "كَانَ" فعل ناقص کی خبر بھی ہو سکتا ہے اور "شرط" کی صفت بھی ہو سکتا ہے۔ تب پھر

یہ "کَانَ تَامَّہ" ہوگا۔لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ "کَانَ" فعل ناقص کی خبر ہے۔

بَاطِلٌ: یہ اس بے کار، برباد اور ضائع شے کو کہتے ہیں جس پر کوئی حکم مرتب نہ ہوتا ہو اور نہ اس کا کوئی اعتبار ہی ہو۔یعنی وہ شرط لغو اور غیر معتبر ہوگی۔

وَإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ: یعنی چاہے ایسی باطل شروط جتنی بھی جمع ہو جائیں وہ باطل ہی ہوں گی۔

قَضَاءُ اللّٰهِ أَحَقُّ: قضاء سے مراد مقضی ہے۔یعنی جو فیصلہ اللہ کر دے وہ زیادہ برحق ہے۔کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ﴾ (غافر: 20)

''اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔''

یہاں قضاء سے شرعی قضاء مراد ہے کیونکہ ملحدین وغیرہ قضاءِ شرعیہ کا معارضہ کر سکتے ہیں۔چنانچہ وہ کسی بھی جھوٹ موٹ بات کو اپنے تئیں اللہ کے قانون سے زیادہ بہتر بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔البتہ رب تعالیٰ کی قضاءِ کونیہ کا معارضہ ممکن نہیں کیونکہ وہ واقع ہو کر رہتی ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔

أَحَقُّ: مراد زیادہ مبنی برعدل اور زیادہ مبنی بر صداقت ہونا ہے، اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ رب کا فیصلہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

وَشَرْطُ اللّٰهِ أَوْثَقُ: شرط اور قضا میں فرق یہ ہے کہ شرط وہ وصف ہے جو حکم کا مدار و مناط ہوتا ہے۔جبکہ قضا یہ نفس حکم ہوتا ہے۔پس جس کی وجہ سے حکم ثابت ہوتا ہے وہ وصف ہوتا ہے۔پس رب تعالیٰ نے اپنے احکام میں جن باتوں کو شرط رکھا ہے وہ بہ نسبت دوسری باتوں کے زیادہ مضبوط ہیں۔

وَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ: یہ جملہ دراصل گزشتہ سارے کلام کا ثمرہ اور خلاصہ ہے، اور وہ ثمرہ ہے کتاب اللہ کے منافی شرط کا ابطال، اور دوسرے یہ کہ اللہ کی قضا زیادہ برحق اور اس کی شرط زیادہ مضبوط ہے، اور انہی ثمرات میں سے ایک بات یہ ہے کہ ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔لہٰذا جو اس کے خلاف شرط کرے گا وہ باطل ہوگی۔

مضمونِ حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں دراصل تو یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جو بات بھی خلافِ شرع وہ باطل ہے اور اللہ کا حکم زیادہ برحق اور اس کی شرط زیادہ مضبوط ہے جبکہ اس کے ذیل میں متعدد مسائل بھی مذکور ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مکاتبت جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کو برقرار رکھا تھا۔پھر غلام کا آقا سے مکاتبت کا مطالبہ جائز ہے جبکہ آقا کے حق میں اس مطالبہ کی منظوری خیر کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔
- مالِ کتابت تھوڑا ہو یا زیادہ دونوں صورتوں میں عقد جائز ہے۔
- دوسرے کی مکاتبت میں مدد کرنا جائز ہے۔
- موجل دَین کو نقد ادا کر دینا بھی جائز ہے اس کی دلیل سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ ہیں: "إِنْ أَحَبَّ أَهْلُكِ أَنْ أَعُدَّهَا لَهُمْ...... فعلتُ".
- دورِ نبوی میں باہمی معاملات اور لین دین وزن اور عدد سے ہوتے تھے۔

- آقا اور سید پر "اھل" کے لفظ کا اطلاق جائز ہے۔
- غلام کو آزاد کر دینے سے ولاء ثابت ہو جاتی ہے۔ ولاء کا معنی مذکور ہو چکا ہے۔
- عقد جس بات پر دلالت کر رہا ہو اسی پر منعقد ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔
- نبی کریم ﷺ کو علم غیب حاصل نہ تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ کو سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا اور ان کے آقاؤں کے درمیان ہونے والے معاملہ کی خبر نہ تھی۔
- معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے اور ان کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔
- معلوم ہوا کہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں تصرف کر سکتی ہے۔ جیسا کہ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جناب رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں نو اوقیہ کا تصرف کیا تھا۔
- حرام شرط کو واضح کرنے اور اس کو باطل قرار دینے کے لیے اس کو مقرر کیا جا سکتا ہے۔
- امر اصل میں وجوب یا استحباب کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات کسی حال یا لفظی قرینہ کی وجہ سے اپنی اصل سے نکل جاتا ہے۔ جیسے "خُذِيْهَا" یہ امر ہے لیکن یہ وجوب یا استحباب کے لیے نہیں بلکہ اباحت کے لیے ہے۔ جیسا کہ لفظی قرینہ اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ یہ اِخبار کے بعد ہے۔
- ولاء اسی کی ہوتی ہے جو غلام کو آزاد کرے۔
- لفظوں میں لگائی گئی شرط شرعی معنی کو نہیں بدل دیتی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے "اشتـرطـي لهـم" کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ پس چاہے وہ لوگ سو بھی لفظی شرطیں لگا دیتے پر وہ شرطیں شرعی معنی کو نہ بدل سکتی تھیں۔
- امام اور خطیب کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو پیش آمدہ امور کی بابت حق بات کو واضح کرتا رہے۔
- شریعت اسلامیہ عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات کی طرف بھی بے حد توجہ دیتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت اسلامیہ صرف عبادات تک محدود ہے، ان کا قول مردود اور باطل ہے۔
- خطبہ کو حمد و ثناء سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کی دلیل "فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ" کے الفاظ ہیں۔
- خطبہ کھڑے ہو کر دیا جائے۔ اس کی دلیل "ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي النَّاسِ خَطِيباً" کے الفاظ ہیں۔
- خطبہ میں "اَمَّا بَعْدُ" کے کلمہ کا استعمال مسنون ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ اپنے خطبوں میں یہ الفاظ استعمال فرمایا کرتے تھے۔
- جناب رسول اللہ ﷺ کا خطاب بے پناہ عمدہ اور احسن ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ اپنے خطبہ میں لوگوں کا نام صراحۃً لینے سے گریز فرمایا کرتے تھے۔ بلاشبہ اس میں لوگوں کی عزت نفس کی حفاظت ہے۔ اس کی دلیل "مـا بـال رجال" کے الفاظ ہیں۔
- جو شرط کتاب اللہ کے بیان کردہ احکام سے خارج ہوں وہ مردود اور غیر مقبول ہیں۔ چاہے ان کی تعداد سینکڑوں ہی کیوں نہ ہو۔
- معلوم ہوا کہ جملہ امور میں کتاب اللہ کی طرف رجوع واجب ہے۔ یہی حکم سنت رسول ﷺ کا بھی ہے۔
- جو شرط کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے خلاف نہ ہو اس کو پورا کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل "وَشَـرْطُ الـلّٰهِ

أَوْثَقُ" کے الفاظ ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کی مقرر کردہ شرطیں زیادہ مستحکم ہیں۔

◈ اللہ کا فیصلہ کسی بھی دوسرے فیصلے سے زیادہ عادلانہ اور مبنی برحق ہے۔ اسی لیے اللہ کی قضاء اتباع واقتداء کی زیادہ مستحق ہے۔ اس لیے اگر کسی پارلیمنٹ، کونسل، مجلس شوریٰ، کانگرس، مشاورتی کمیٹی، سینٹ، قائمہ کمیٹی وغیرہ نے کوئی خلافِ شرع بات طے کی تو وہ بلاشبہ مردود اور لغو ہوگی۔ کیونکہ اللہ کا حکم زیادہ عادلانہ، برحق، قائم، مضبوط اور مستحکم ہے۔

اسی لیے علماء نے "أَحَــقُّ" کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ایسا مضبوط اور مستحکم ہے کہ کوئی عارضہ اس کو متزلزل نہیں کر سکتا۔

◈ معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کے احکامات مبنی برحکمت ہیں۔ کیونکہ حق فیصلہ اور حکم وہی ہوتا ہے جو حکمت پر مشتمل ہو۔

◈ یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر اللہ کا فیصلہ ہر حال میں باطل نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر وہ موافق شرع ہو تو جائز ہے۔ البتہ غیر اللہ کا فیصلہ جتنا بھی برحق ہو رب تعالیٰ کا فیصلہ بہرحال اس سے زیادہ مبنی برحق ہی ہوتا ہے۔

◈ ولاء صرف آزاد کرنے والے کو ہی ملتی ہے۔ پس "وَإِنَّـمَـا" کے کلمہ حصر سے یہ ثابت ہوا کہ ولاء آزاد کرنے والے سے آگے متعدی نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ولاء میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔

◈ اور یہ کہ غیر مُعْتِق کے لیے ولاء کو شرط کرنا باطل ہے۔

◈ اگر تکلف کا ارتکاب نہ کیا جائے تو کلام میں سجع لانا جائز ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ باطل شرط رکھنے والے کو خیار ہے یا نہیں تو اس میں تفصیل ہے۔ اگر تو وہ حکم کو جانتا تھا تو اسے کوئی خیار حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک طرح سے اس نے حکم شریعت کا مذاق اڑایا ہے۔ البتہ اگر وہ جانتا نہ تھا تو اسے بیع کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا خیار ہوگا۔

◈ صحیح مسلم کی روایت کے ان الفاظ میں کہ: "اشتریها واعتقیها واشترطی لهم الولاء" تینوں مذکورہ اوامر وجوب یا استحباب کے لیے نہیں بلکہ اباحت کے لیے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

ام ولد کا بیان

778- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((نَهَى عُمَرُ عَنْ بَيْعِ أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ، فَقَالَ: لَا تُبَاعُ، وَلَا تُوهَبُ، وَلَا تُورَثُ، يَسْتَمْتِعُ بِهَا مَا بَدَا لَهُ، فَإِذَا مَاتَ فَهِيَ حُرَّةٌ)). ❶

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امہات اولاد کو بیچنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ام ولد کو نہ تو بیچا جائے اور نہ (کسی دوسرے کو) ھبہ کیا جائے اور نہ اس کو ترکہ میں ہی دیا جائے تاکہ جب (بھی) اس کے (مالک کے) جی میں آئے وہ اس سے استمتاع کر سکے، اور جب وہ (یعنی اس ام ولد کا آقا) مرجائے گا تو وہ آزاد (شمار) ہوگی۔ ❶

❶ المؤطا: 766/2۔ سنن البيهقي: 342/10۔ سنن الدار قطني: 134/4۔ امام دارقطنی اور امام بیہقی نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے اور خطیب بغدادی اور عبدالحق نے ان کی موافقت کی ہے۔ سوائے ابن قطان کے کہ انہوں نے اس کے مرفوع ہونے کو صحیح یا حسن کہا ہے، اور کہتے ہیں کہ: اس حدیث کے سب رواۃ ثقہ ہیں۔ ابن قطان یہ بھی کہتے ہیں کہ: میرے نزدیک جس نے اس حدیث کو مسند روایت کیا ہے وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جس نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے۔ دیکھیں: "خلاصة البدر المنير: 464/2"۔

رَوَاهُ مَالِكٌ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَقَالَ: رَفَعَهُ بَعْضُ الرُّوَاةِ فَوَهِمَ. اس حدیث کو امام مالک اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض راویوں نے اس حدیث کو مرفوع روایت کیا ہے۔ سو انہیں وہم ہوا ہے۔

غریب الحدیث :...... **نَهَى عُمَرُ**: اس مقام پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شریعت میں امر و نہی کا اختیار حاصل تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ منع فرمانا مقتضائے خلافت کے اعتبار سے تھا نہ کہ تشریع کے اعتبار سے تھا۔ کیونکہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ بحیثیت خلیفۃ المسلمین ہونے کے ''ذوسلطان'' تھے اور سلطان کو خلافت و ریاست کی مصلحت کے مقتضی کے مطابق امر و نہی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: 59)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں۔''

غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ منع فرمانا بطور خلیفہ اور حاکم کے تھا نہ کہ بطور شارع کے۔ دوسرے حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت پر عمل کرنے کا حکم خود دربار رسالت سے جاری ہوا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔'' [1] اور فرمایا: ''میرے بعد ان دو کی اقتداء کرو، ابوبکر اور عمر۔'' [2]

عَنْ بَيْعِ أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ: ام ولد کی تعریف علماء نے یہ بیان کی ہے کہ یہ اس باندی کو کہتے ہیں جو اپنے آقا سے اس کی زندہ اولاد کو جنم دے۔ جبکہ وہ اولاد کامل الخلقت بھی ہو۔ یعنی اس کا آقا اس سے جماع کرے اور وہ اس سے حاملہ ہو جائے اور پھر وہ ایک زندہ اور کامل بچہ جنم دے، اور کم از کم جس مدت میں خلقت انسانی کا ظہور ہوتا ہے، وہ چالیس دن ہوتے ہیں۔ چالیس دن کے بعد عورت کے بطن میں نطفہ علقہ بن جاتا ہے۔ پھر مضغہ بنتا ہے۔ غرض چالیس سے کم دنوں میں خلقت کا ظہور نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں مراد سر اور ہاتھوں پاؤں کی خلقت کا ظہور ہے۔ لہٰذا اگر کسی باندی نے اپنے آقا سے ایسا بچہ جنم دیا جس کے ابھی اعضاء ظاہر نہ ہوئے تھے، یعنی نامکمل بچہ جنم دیا تو وہ شرعی اور اصطلاحی ام ولد نہ کہلائے گی جو آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔

فَقَالَ لَا تُبَاعُ: رہا یہ سوال کہ بیع کی یہ ممانعت کس کو ہے؟ تو یہ اس کے آقا کو ہے۔ اسی کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''لَا تُبَاعُ''۔ لہٰذا آقا کے لیے اپنی ام ولد کو بیچنا ناجائز اور منع ہے۔

یاد رہے کہ ''لَا تُبَاعُ'' یہ نفی کا صیغہ ہے جو معنی کے اعتبار سے نہی ہے۔

وَلَا تُوهَبُ وَلَا تُورَثُ: یہ ایک شے کی زیادہ عام معنی کے ساتھ تفسیر بیان کرنے کی قبیل سے ہے۔ لہٰذا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف ''لَا تُبَاعُ'' کہنے پر اقتصار فرماتے تو یہاں مُفَسَّر اور مُفَسِّر میں کامل تطبیق ہوتی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''لَا تُبَاعُ'' کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ نہ اس کو ھبہ میں دیا جائے اور نہ اس میں ترکہ اور وراثت ہی جاری کی جائے۔ یعنی ام ولد وراثت کی بنا پر اگلے ورثاء کی طرف منتقل نہیں ہوتی۔ اسی لیے فرمایا کہ مرنے کے بعد اگرچہ مرنے والے کے مال میں وراثت جاری ہوتی ہے لیکن ام ولد ترکہ نہیں بنتی بلکہ آزاد ہو جاتی ہے۔ ''فَإِذَا مَاتَ فَهِيَ حُرَّةٌ'' کا یہی معنی ہے۔

---

[1] مسند احمد: 126/4۔ سنن ابی داؤد: 4583.

[2] جامع الترمذی: 3742۔ عن حذیفہ رضی اللہ عنہ وحَسَّنَهُ، مسند احمد: 382/5.

هبه: یہ مال کو بلاعوض کسی کو دے دینے کو کہتے ہیں۔تب پھر مطلب یہ بنا کہ ام ولد کسی کو بلاعوض نہ دی جائے۔

لِيَسْتَمْتِعُ بِهَا مَا بَدَا لَهُ: تب پھر آقا ام ولد سے صرف اپنی حیات میں ہی متمع ہوسکتا ہے۔اس کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہوگی۔پس آقا ایسی باندی کے ساتھ اپنی بیوی کی طرح متمتع ہوگا۔

فَإِذَا مَاتَ فَهِيَ حُرَّةٌ: ام ولد آقا کے مرتے ہی آزاد ہو جائے گی چاہے آقا کا اور کوئی مال نہ بھی ہو۔پس جیسے مدبر غلام آقا کے مال کے ثلث سے آزاد ہوتا ہے، ام ولد ایسی نہیں، وہ کل مال سے آزاد ہوگی۔لہٰذا اگر کسی کا کل مال یہی ام ولد ہو تب بھی وہ آزاد ہو جائے گی۔

رَفَعَهُ بَعْضُ الرُّوَاةِ فَوَهِمَ: وہم کسی خلاف واقع بات کو حقیقت سمجھ لینے کو کہتے ہیں۔چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے اس حدیث کو "مرفوع" سمجھا ہے اسے وہم ہوا ہے۔کیونکہ اس حدیث کا مرفوع ہونا خلاف واقع ہے۔صحیح یہ ہے کہ یہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور یہ روایت موقوف ہے۔

مضمونِ حدیث:......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ام ولد کی بیع منع ہے۔اس لیے اس کو هبہ کرنا بھی منع ہے، اور اس میں وراثت بھی جاری نہیں ہوتی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- میراث جبری اور قہری مِلک ہے کہ آدمی چاہے یا نہ چاہے مگر ایک شے زبردستی اس کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے۔اسی لیے علماء نے میراث کو مِلک جبری کہا ہے۔
- پھر بیع یہ اختیاری معاوضہ کے عقد کا نام ہے۔جبکہ هبہ اختیاری تبرع کا نام ہے۔جناب عمر رضی اللہ عنہ نے ان تینوں باتوں کا ذکر فرما کر دراصل یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ ام ولد کی ملک آقا سے کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتی نہ تو معاوضہ کے ذریعے نہ تبرع کے ذریعے اور نہ ملک جبری کے ذریعے۔چنانچہ امہات اولاد کی بیع، هبہ اور توریث کی ممانعت سنت عمری ہے، اور یہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کی فقاہت اور حسن سیاست میں سے تھا۔
- بیٹا اپنے باپ کو اس کے نام کے ساتھ ذکر کر سکتا ہے اس کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے: "نَهَى عُمَر" لہٰذا بیٹے کا باپ کا نام لے کر اسے یاد کرنا جائز ہے۔
- آقا جب چاہے اپنی ام ولد سے زوجہ جیسا استمتاع کر سکتا ہے۔
- ام ولد آقا کے مرتے ہی آزاد ہو جاتی ہے، چاہے کل مال میں سے ہی کیوں نہ آزاد ہو۔
- ام ولد کی بیع، هبہ اور توریث کی ممانعت سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں باتیں مطلق باندی اور غلاموں میں جائز ہیں۔
- وھم: یہ راوی میں طعن کے اسباب میں سے ہے، اور اس بنا پر حدیث کو رد کیا جاتا ہے۔وہم ایک بشری کمزوری ہے جو کسی کو بھی لاحق ہوسکتی ہے۔رہا اس بات کا معیار اور کسوٹی کہ کب کسی راوی کی بات وہم کی نسبت درست ہے اور کب نہیں، یہ ایک مشکل بات ہے۔سو اس بارے میں اصل معیار یہ ہے کہ شریعت کے قواعد ثابت اور اس کی نصوص واضح وقوی ہیں۔لہٰذا جو بات ان قواعد ونصوص کے مخالف ہوگی، وہ راوی کا وہم ہوگا اور اس مخالف بات پر وہم اور شذوذ کا حکم لگایا جائے گا۔

اس بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر امام ابو داؤد مثلاً ایک ایسی روایت لے کر آئیں جو صحیحین کے ایسی مخالف ہو کہ دونوں

روایتوں میں جمع کی صورت ممکن نہ ہو تو صحیحین کی روایت کو مقدم کریں گے۔ اسی لیے امام موصوف رحمہ اللہ نے اس روایت کے رفع کو وہم قرار دیا ہے۔

◈ یہیں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ راوی پر وہم کا امکان ممکن ہے۔

779۔ وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((كُنَّا نَبِيعُ سَرَارِيَنَا أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ حَيٌّ، لَا يَرَى بِذَلِكَ بَأْسًا)).
رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں اپنی باندیوں اور امہات اولاد کو بیچ دیا کرتے تھے۔ جبکہ آپ ﷺ اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ [1]
اس حدیث کو امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام دارقطنی نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... **السَّرَارِي:** یہ سُرِیَّہ کی جمع ہے۔ سُرِیَّہ اس باندی کو کہتے ہیں جس سے آقا جماع تو کرے لیکن ضروری نہیں کہ وہ آقا سے بچہ بھی جنم دے۔ پس جس باندی نے آقا سے بچہ جنم دیا وہ ام ولد کہلائے گی اور آقا کے جماع کرنے کے باوجود اس سے بچہ نہ جنے وہ سُرِیَّہ کہلائے گی۔ لیکن کبھی سُرِیَّہ باندی بھی بچہ جنم دیتی ہے۔ جیسا کہ سیّدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کو نبی کریم ﷺ نے اپنی سُرِیَّہ بنایا تھا، اور انہوں نے جنابِ ابراہیم رضی اللہ عنہ کو جنم دیا تھا۔

وَالنَّبِيُّ ﷺ حَيٌّ، لَا نَرَى بِذَلِكَ بَأْسًا: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "كُنَّا نَبِيعُ" فعل کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

مذکورہ جملہ ''اقرار رسول'' کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ جاننے کے باوجود اس سے منع نہ فرماتے تھے، اور دورِ نبوی میں آپ ﷺ کا کسی بات پر انکار نہ فرمانا اور رب تعالیٰ کا بھی اس کی ممانعت کو نازل نہ فرمانا اس کے جواز کی دلیل ہے۔

بظاہر یہ روایت گزشتہ مذکورہ روایت کے معارض ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دورِ نبوی میں ام ولد کو اس کی اولاد سے جدا کر کے نہ بیچا جاتا تھا۔ اس لیے جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ام ولد کی بیع سے منع نہ فرمایا تھا۔ لیکن دورِ فاروقی رضی اللہ عنہ میں امہاتِ اولاد کو ان کی اولادوں سے جدا کر کے بیچنے کا چلن عام ہونے لگا تھا جس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام ولد کو بیچنے سے ہی منع فرما دیا۔

مضمون حدیث واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دورِ نبوی میں ام ولد کی بیع جائز تھی جس کی وجہ اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ حالات کے تغیر کا حکم کی تغییر میں بڑا دخل ہے۔ لہٰذا جب کوئی امر پہلے حکم کی تغییر کو مقتضی ہو تو حکم کے بدلنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ کسی حکم کو مستقل طور پر نئی شرع کی طرف بدلنا منع ہے کہ دورِ نبوی کے بعد ایسا کرنا ناممکن، ناجائز، الحاد اور حرام ہے۔

زائد پانی اور سانڈ کے نطفہ کو بیچنا منع ہے

780۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

---

[1] السنن الکبری للنسائی: 5039۔ سنن ابن ماجہ: 2517۔ سنن الدارقطنی: 135/4۔ صحیح ابن حبان: 4323۔ امام نووی رحمہ اللہ نے "المجموع: 230/9" میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ)).
نبی کریم ﷺ نے زائد (از ضرورت) پانی کو بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.
اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: ((وَعَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ)).
اور (صحیح مسلم کی ہی) ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں: اور اونٹ کے نطفہ کو بیچنے سے (بھی منع فرمایا)۔

غریب الحدیث ......**عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ**: فضل زیادتی کو کہتے ہیں۔ مراد زائد از ضرورت پانی ہے کہ اس کو بیچنا ناجائز ہے اور اس کی ممانعت پر نص آ گئی ہے۔ کیونکہ عموماً آدمی وہی بیچتا ہے جو اس کی ضرورت سے زائد ہو اور جس شے سے آدمی کی ضرورت اور حاجت وابستہ ہو، آدمی اسے بیچا نہیں کرتا۔

رہا یہ سوال کہ یہاں فضل ماء سے کون سا پانی مراد ہے؟ تو اس سے دو قسم کے پانی مراد ہیں:

(1) ایک وہ پانی جو رب تعالیٰ کے امر سے بارشوں اور سیلابوں کی وجہ سے زمین کے کسی مباح قطعہ میں جوہڑ اور تالاب وغیرہ کی شکل میں جمع ہو جاتا ہے۔ ایسے پانی کی بابت کسی کو یہ جائز نہیں کہ وہ اس پر قبضہ کر کے آتے جاتے مسافروں اور ضرورت مندوں کو بیچنا شروع کر دے۔ یہ حرام ہے کیونکہ اس پانی کو اس آدمی نے خود محنت کوشش کر کے جمع نہیں کیا۔ لہٰذا یہ پانی سب کے لیے مباح اور جائز ہے اور کسی ایک کو بھی اس پر قبضہ کرنا اور قبضہ کر کے ضرورت مندوں کو بیچنا ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ تین چیزوں میں سب شریک ہوتے ہیں پانی، گھاس اور آگ۔ ❷

(2) دوسرا وہ پانی ہے جو آدمی کنواں کھود کر حاصل کرے اور وہ کنواں چشمہ والا ہو جس میں سے پانی خود ہی ابل ابل کر نکلتا ہو۔ ایسے کنویں کا پانی بیچنا حرام ہے کیونکہ کنویں کا چشمہ والا ہونا رب تعالیٰ کے امر سے ہے کہ یہ بندہ کے فعل سے نہیں۔ ہاں بندے نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ وہ کنواں کھود کر اس پانی تک پہنچا ہے۔ لہٰذا اپنے پانی کو بیچنا جائز نہیں۔ کنواں کھودنے والا اور دوسرے لوگ اس کنویں کے پانی میں برابر کے شریک ہیں۔ البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اس پانی کا پہلا اور زیادہ مستحق یہی کنواں کھودنے والا ہی ہے۔ لہٰذا ضرورت کے وقت کوئی دوسرا اس کے مزاحم نہیں ہو سکتا۔ البتہ جب حاجت اور ضرورت نہ ہو تو اس کنویں کا پانی بیچنا جائز نہ ہوگا۔

(3) البتہ پانی کی ایک تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی کسی مباح جگہ سے اپنے کسی خاص برتن، ٹینکی یا تالاب وغیرہ میں پانی کو جمع کر لے تو بلاشبہ یہ پانی اس کی ملک کہلائے گا۔ جسے وہ بیچ بھی سکتا ہے۔ کیونکہ اس پانی کو آدمی نے اپنے فعل سے کسی ایک خاص برتن یا جگہ میں جمع کیا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا بیچنے والے کی تعریف فرمائی ہے۔ حالانکہ جنگل کی گھاس پھوس اور لکڑی میں سب لوگ شریک ہیں۔ چنانچہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جب آدمی کسی مباح شے کو اپنی کاوش سے حاصل کرتا ہے تو وہ شے اس کی ملک بن جاتی ہے جسے بیچنا اسے جائز ہوتا ہے۔

تب پھر پانی کی کل تین قسمیں ٹھہریں جن میں پہلی دو قسموں کے پانیوں کو بیچنا اور ان سے دوسروں کو روکنا جائز نہ ہوگا۔ البتہ تیسری قسم کے پانی کو بیچنا جائز ہوگا۔

---

❶ صحیح مسلم: 1565. ❷ یہ حدیث آگے "کتاب احیاء الموات" میں آ رہی ہے۔

عَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ: ضراب سے مراد عسب یعنی نطفہ ہے۔لہٰذا اگر کسی کے پاس ایسا نر اونٹ ہو جو جفتی کرنے کے قابل ہو تو اس کے جفتی کرنے کی رقم اور قیمت لینا جائز نہ ہوگا، اور نہ آدمی کو دوسرے کی ضرورت کے باوجود اپنے نر اونٹ کو جفتی سے روکنا جائز ہوگا۔ البتہ اگر اس کا نر اونٹ اتنا کمزور ہے کہ اس کے جفتی کرنے سے اونٹ کو کسی ضرر کے لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو آدمی، اپنے اونٹ کو جفتی کے لیے دینے سے روک بھی سکتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو اہم مسائل مذکور ہیں:

(1) زائد از ضرورت پانی سے دوسروں کو روکنا اور اسے بیچنا دونوں کام حرام ہیں۔

(2) جفتی کرنے کے قابل اونٹ کو پیسے لے کر جفتی کے لیے دینا جائز نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ضرورت سے زائد وہ پانی بیچنا حرام ہے جو آدمی کی ملک میں داخل نہ ہو اور دوسرے سب کے لیے مباح بھی ہو اور وہ اس پانی کے محتاج بھی ہوں، اور یہیں سے اس بیع کے باطل ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے لہٰذا ایسی صورت میں ثمن مشتری کو واپس دلوایا جائے گا۔

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا جو آدمی زائد پانی سے منتفع ہونا چاہے، اسے اس انتفاع سے روکنا ناجائز اور حرام ہے۔ چاہے وہ پانی آدمی کی زمین میں جاری کنویں کی شکل میں ہو یا چاہے کسی قدرتی جوہڑ یا تالاب کی شکل میں ہو۔

◈ سانڈ، نر اونٹ اور اسی طرح نر بکرے کے نطفہ کو بیچنا حرام ہے۔لہٰذا یہ بیع غیر صحیح ہوگی اور اس میں مشتری کو ثمن واپس دلوایا جائے گا۔

◈ بلاشبہ یہ بات شریعت کی حکمت میں سے ہے کہ ایسی معمولی اور اتنی گھٹیا چیزوں کی کوئی قیمت اور اجرت مقرر نہیں کی جن کا استعمال اکثر اور عام ہوتا ہے۔

◈ اگر کوئی زائد پانی خریدنے پر یا عسب فحل کے خریدنے پر مجبور ہو تو بیچنے کا گناہ بائع پر ہوگا۔

781- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ)). رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے سانڈ کے نطفہ (کی بیع) سے منع فرمایا ہے۔[1] اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **نَهَى عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ:** عسب: اس کے معنی میں دو قول ہیں:

(1) ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو حمل ٹھہراتا ہے۔

(2) جبکہ ایک قول یہ ہے کہ یہ نر جانور کا جفتی کے لیے مادہ پر اچھل کر چڑھنا ہے۔

لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ نر کا مادہ پر چڑھنا یہ اس کے پانی کے حصول کا ذریعہ ہے جس سے مادہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں جفتی کرانے کی رقم لینا اور جفتی کرانے کو بیچنا حرام ہوگا، اور یہ حدیث مطلق ہے جو بیع اور اجارہ دونوں کو شامل ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2284.

سانڈ، اونٹ اور بکرے وغیرہ کو کرائے پر لینے کی صورتیں اوران کا حکم

علماء نے اس کی دوصورتیں لکھی ہیں:

(1) ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کسی نر جانور کو ایک ہی بار مادہ پر چڑھانے کے لیے کرایہ پر لے۔ بلاشبہ یہ حرام ہے، کیونکہ اس میں جہالت بھی ہے اور غرر بھی، کیونکہ اس بات کا علم کسی کو نہیں کہ نر جانور کے ایک بار کی جفتی کرنے سے مقصود حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔

(2) جبکہ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی نر کو چند دنوں کے لیے جیسے ہفتہ بھر کے لیے کرایہ پر لے لے، پھر چاہے اس سے مادہ کی جفتی کرائے یا نہ کرائے، یہ اس کی مرضی ہے۔

اس صورت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ صورت بھی نادرست ہے۔ وہ یوں کہ جانے اس عرصہ میں نر جفتی کرے یا نہ کرے؟ اور یہ کہ جانے مادہ بھی جفتی پر آمادہ ہو یا نہ ہو؟ تیسرے یہ کہ کیا معلوم کہ جفتی حمل ٹھہرنے کا سبب بنے یا نہ بنے؟ غرض یہاں مقصود بالعقد امر ''مجہول'' ہے۔

غرض پہلی صورت بالاتفاق ناجائز ہے۔ جبکہ دوسری صورت کا جواز بھی محل نظر ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں گزشتہ مضمون کا اعادہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شریعت اسلامیہ لوگوں کے اموال کی حفاظت وصیانت کی بے حد حریص ہے کہ ان اموال کو وہیں خرچ کیا جائے جہاں فائدہ محقق ہو۔

◈ شریعتِ اسلامیہ ہر اس اقدام سے گریزاں ہے جس کا نتیجہ شرمندگی، خسارہ، جھگڑا یا عداوت کی صورت میں نکلتا ہو۔

حمل کا حمل بیچنا بھی منع ہے

782۔ وَعَنْهُ ((أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ، وَكَانَ بَيْعًا يَتَبَايَعُهُ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ، كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ إِلَى أَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ، ثُمَّ تُنْتَجُ الَّتِي فِي بَطْنِهَا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے (حاملہ کے حمل کو یا) حمل کے حمل کو بیچنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ ایک بیع تھی جو اہل جاہلیت (باہم) کیا کرتے تھے۔ (جس کی صورت یہ تھی) کہ آدمی ایک اونٹ اس مدت تک خریدتا کہ اونٹنی بچہ جن دے پھر اس کے پیٹ کا بچہ بھی آگے بچہ جن دے۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے، اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:...... حَبَلِ [2]: یہ حمل کو کہتے ہیں۔

اَلْحَبَلَةِ: یہ ''فَعَلَةٌ'' کے وزن پر اسم فاعل کی جمع کا صیغہ ہے جیسے ساحر کی جمع سَحَرَةٌ اور کاہن کی جمع كَهَنَةٌ آتی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2143۔ صحيح مسلم: 1514.

[2] حَبَل: ہر وہ روشنی جو کسی ظرف میں ہو، تخم حمل۔ (القاموس الوحيد، ص: 308) (نسیم)

لہٰذا یہ ''حابل'' کی جمع ہے اور یہاں تانیث کی ''تا'' لانے کی ضرورت اس لیے نہیں کیونکہ یہ معنی صرف مونث کے ساتھ ہی خاص ہے۔ جیسے ''حامل'' اور حائض کہ حمل اور حیض کا معنی چونکہ صرف مونث کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اس لیے ان صیغوں میں بھی تانیث کی "تا" لانے کی ضرورت نہیں۔

نَهَى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ: علماء نے اس کے دو معانی بیان کیے ہیں:

(1) ایک یہ کہ کسی بھی حاملہ جانور کے پیٹ کا حمل بیچنا جائز نہیں کیونکہ یہاں جہالت ہے۔ کیونکہ حمل کے نر یا مادہ ہونے کا پھر اس کے زندہ پیدا ہونے یا مرا ہوا پیدا ہونے کا کوئی علم نہیں۔

(2) جبکہ دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ ممانعت ''حمل الاحمال'' کی ہے یعنی حاملہ جانور کے بطن میں جو حمل ہے، جب وہ پیدا ہو جائے گا تو آگے اس کے حمل کو ابھی سے بیچنا۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ: میں اس اونٹنی کے حمل کے حمل کو بیچتا ہوں۔ یہ دہرا ناجائز اور ممنوع کام ہے۔ کیونکہ یہاں جہالت در جہالت ہے، اور یہ بالکل واضح ہے کہ ایک تو خود حمل کے نر یا مادہ ہونے کا ہی علم نہیں، دوسرے اس کے زندہ یا مردہ پیدا ہونے کا علم، تیسرے زندہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کے بلوغت تک پہنچنے کا علم نہیں، چوتھے بالغ ہو جانے کے باوجود اس کے حاملہ ہی ہو جانے کا علم نہیں۔ پھر حاملہ ہو جانے کے باوجود اس کے حمل کے نر یا مادہ ہونے پھر زندہ یا مردہ پیدا ہونے تک کا علم نہیں۔

غرض حاملہ کے حمل کے بیچنے کے منع ہونے کی علت دونوں صورتیں میں جہالت ہے۔

وَكَانَ بَيْعاً يَتَبَايَعُهُ.... الَّتِي فِي بَطْنِهَا: یہاں سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ "حبل الحبله" کی تفسیر بیان فرما رہے ہیں۔ یہاں چند باتیں قابل وضاحت ہیں:

(1) ایک یہ کہ بیع کا یہ طریقہ اہل جاہلیت کا تھا۔ اہل جاہلیت کا یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کیونکہ ان کے جملہ معاملات اور لین دین کے طریقے جہالت پر ہی مبنی ہوتے تھے۔

(2) جزور مطلق اونٹ کو کہتے ہیں چاہے وہ نر ہو یا مادہ، بالغ ہو یا نابالغ۔

(3) إِلَى أَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ: "تُنْتَجَ" فعل مضارع مجہول ہے اور "النَّاقَةُ" اس کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور "اِلَـى" یہاں انتہائے غایت کے لیے ہے۔ اس بیع میں یہ دوسری جہالت ہے کہ آدمی ایک شے کو جو خود مجہول ہے ایک نامعلوم مدت تک کے لیے خرید لیتا تھا۔ وہ یہ کہ یہ بات حتمی طور پر کسی کے علم میں نہیں ہوتی کہ حاملہ اپنا بچہ کب جنم دے گی۔

پھر یہ کہ جنم لینے والا یہ بچہ خود آگے چل نہ جانے کب حاملہ ہو کر بچہ جنے گا۔ غرض چونکہ یہ دونوں امر مجہول ہیں اس لیے یہ بیع بھی ناجائز اور منع ہوگی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ایسی بیع جو جہالت یا غرر پر مبنی ہو وہ منع اور ناجائز ہے۔ اس تناظر میں مذکورہ بیان کردہ مسئلہ کی چار صورتیں بنتی ہیں جو یہ ہیں:

(1) اونٹنی کا حمل بیچنا۔

(2) حمل کے حمل کو بیچنا۔ یہ دونوں صورتیں معقود علیہ کی جہالت پر مبنی ہونے کی وجہ سے منع ہیں۔

(3) مبیع مؤجل ہو۔ یعنی مشتری مبیع کی خرید کو ایک نامعلوم مدت تک مؤخر و مؤجل کر دے۔ اس صورت میں مبیع مشتری کی ملک میں ایک نامعلوم مدت کے بعد داخل ہوگی۔

(4) اور چوتھی صورت یہ ہے کہ بیع تو متعین ہو لیکن ثمن نامعلوم مدت تک مؤجل ہو، جیسے بائع کو ثمن اس وقت ملے گا جب اونٹنی بچہ جنے گی یا اس کے حمل کا آگے حمل جنم لے گا۔ غرض یہ دونوں صورتیں مبیع یا ثمن کی غیر معین تاجیل کی بنا پر ناجائز اور منع ہیں۔

تنبیہ:......جن بیوع میں جہالت در آئے چاہے معقود علیہ میں وہ جہالت داخل ہو یا ثمن یا مبیع میں، اس کے منع ہونے کی علت یہ ہے کہ کیونکہ یہ جہالت متعاقدین کو نزاع تک لے جاتی ہے، اور ہر وہ بیع جو نزاع تک لے جائے منع ہوتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ حمل کی یا حمل کے حمل کی بیع منع ہے کیونکہ اس میں متعدد جہالتیں ہیں جن کو اوپر مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔
- جہالت پر مبنی ہر عقد منع ہے، چاہے وہ جہالت عین مبیع میں ہو یا عین ثمن میں، اور چاہے اجل میں ہو۔
- معلوم ہوا کہ اہل جاہلیت کے معاملات نری جہالت پر مبنی ہوتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات تو جہالت در جہالت پر مبنی ہوتے ہیں۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عہد جاہلیت کے جس معاملہ پر شرعی نکیر وارد نہ ہو وہ جائز ہوتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ بیع کے صحیح ہونے کے لیے تین باتیں بنیادی طور پر شرط ہیں:

(1) مبیع معلوم ہو۔ (2) ثمن معلوم ہو، اور (3) اَجَل معلوم ہو۔

ولاء کو بیچنا اور ھبہ کرنا منع ہے

783۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہما ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ، وَعَنْ هِبَتِهِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ولاء کو بیچنے سے اور اس کو ھبہ کرنے سے (دونوں سے) منع فرمایا ہے۔[1] یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:......وَلاء کا لغوی اور شرعی معنی اور اس کے مفصل احکام ذکر کر دیے گئے ہیں۔ جہاں یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ غلام کی وَلاء اسے ملتی ہے جو اس کو آزاد کرے۔ اس کے بعد آزاد کرنے والے کو یہ حق نہیں کہ وہ اس وَلاء کو بیچ دے یا کسی دوسرے کو ھبہ کر دے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ولاء بھی نسبی رشتہ کی طرح ایک رشتہ ہے۔''[2] تو جیسے کسی کے لیے نسب بیچنا درست نہیں ہوتا اسی طرح وَلاء بیچنا بھی منع ہے۔

کنکری مار کر بیچنا اور غرر کے ساتھ بیچنا ناجائز ہے

784۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ، وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے کنکری مار کر بیچنے سے اور غرر کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري: 2535۔ صحيح مسلم: 1506.

[2] یہ حدیث "كتاب الفرائض" کے آخر میں آرہی ہے۔

[3] صحيح مسلم: 1513.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ . اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......نَهَى عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ: بَيْعِ الْحَصَاةِ: یہ اضافت ''لام'' کی تقدیر کے ساتھ نہیں کہ جس کا مطلب یہ بنتا ہو کہ اگر کسی کے پاس کوئی کنکری (جیسے تعمیراتی کاموں میں استعمال ہونے والی بجری یا روڑا) ہو تو اسے اس کا بیچنا جائز ہو۔ بلکہ یہ اضافت ''مِنْ'' کی تقدیر کے ساتھ ہے جس کا مطلب ہے کہ کنکریوں کے ذریعے کی جانے والی بیع منع ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ اَنْوَاعِ الْبُيُوْعِ الَّتِىْ لِلْحَصَاةِ .)) ''یعنی نبی کریم ﷺ نے بیع کی قسموں میں سے اس قسم سے منع فرمایا ہے جو کنکریاں کے ذریعے کی جاتی ہے۔''

حَصَاةِ: یہ سنگریزے اور کنکری کو کہتے ہیں، اس کی جمع حَصًى اور حُصِيٌّ آتی ہے۔

بیع حصاۃ کی صورتیں

یہ دورِ جاہلیت میں رائج بیع کا ایک طریقہ تھا۔ اس کی متعدد صورتیں تھیں جو یہ ہیں:

پہلی صورت :......اس کی ایک صورت یہ تھی کہ آدمی دوسرے سے یہ کہتا تھا کہ: ''تم یہ کنکری لو اور سامنے پڑے کپڑے کے تھانوں پر پھینکو، جس تھان پر بھی یہ کنکری جا گرے گی وہ مثلاً سو روپے میں تمہارا ہوا'' اب چاہے وہ کنکری اتنی ہی قیمت کے تھان پر جا گرتی اور چاہے اس سے کم یا زیادہ قیمت کے تھان پر گرتی، وہ تھان سو روپے میں کنکری مارنے والے کا ہو جاتا تھا۔

اب مساوی قیمت کے تھان پر گرنے سے طرفین کا کوئی نقصان نہ ہوتا تھا۔ جبکہ کم قیمت والے تھان پر گرنے سے مشتری کا اور زیادہ قیمت والے تھان پر کنکری کے گرنے سے بائع کا نقصان ہوتا تھا۔ بلاشبہ یہ ضرر پر مبنی بیع ہے۔ کیونکہ ہر عقد جو غُنم (نفع) اور غرم (چٹی اور نقصان) کے درمیان ہو، وہ ''عقد غرر'' کہلاتا ہے۔

دوسری صورت :......اس کی دوسری صورت یہ تھی کہ آدمی دوسرے سے یہ کہتا تھا کہ تم کنکری پھینکو، وہ جتنی دور جا گرے گی اتنی زمین مثلاً دو لاکھ روپے میں تمہاری ہوئی۔ یہاں بھی غُنم اور غرم کی وہی تین صورتیں ممکن و متوقع ہیں۔ لہٰذا بیع کا یہ طریقہ بھی بیع غرر ہونے کی بنا پر ناجائز ٹھہرے گا، اور ایک لحاظ سے یہ جوا بھی ہے۔

تیسری صورت :......اس کی تیسری صورت یہ تھی کہ آدمی دوسرے کو یہ کہتا تھا کہ تم بکریوں کے گلے پر کنکری پھینکو جس بکری پر بھی یہ کنکری جا گری مثلاً وہ دو ہزار میں تمہاری ہوئی۔ یہاں بھی غرم اور غُنم کی وہی تین صورتیں ممکن ہیں۔

چوتھی صورت :......اس کی چوتھی صورت یہ ہوتی تھی کہ لوگ زمین پر کنکریوں اور سنگریزوں کا ایک ڈھیر رکھ کر یہ کہتے تھے کہ تم ہاتھ مار کر کنکریاں اٹھاؤ۔ ایک بار میں جتنی کنکریاں تمہاری مٹھی میں آگئیں میں سامنے پڑے تھانوں میں سے اتنے تھان تمہیں مثلاً دس ہزار میں بیچ دوں گا۔ یہ صورت بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ

- ⊙ ...... ہوسکتا ہے کہ وہ اتنی ہی کنکریاں اٹھا پائے کہ جن کی تعداد کے بقدر تھان دس ہزار کے برابر ہوں۔
- ⊙ ......اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کم تعداد میں کنکریاں آئیں۔
- ⊙ ......اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زیادہ تعداد میں کنکریاں اٹھانے میں کامیاب ہو جائے۔

غرض بیع کی یہ صورت بھی غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ البتہ اس صورت میں مبیع میں جہالت ہے۔

پانچویں صورت :......لیکن اگر اسی صورت میں یہ کہا جائے کہ تم ہاتھ مار کر کنکریاں اٹھاؤ۔ جتنی کنکریاں تمہارے ہاتھ

میں آ گئیں، اتنے درہموں میں یہ تھان تمہارا ہوا۔ یہ صورت بھی ناجائز ہے کیونکہ یہاں ثمن میں جہالت ہے، اور یہ جہالت بھی غرر پر مشتمل ہے۔لہٰذا بیع حصاۃ کی یہ صورت بھی ناجائز ہے۔

چھٹی صورت:......اس کی چھٹی صورت یہ تھی کہ آدمی دوسرے کو یہ کہتا تھا کہ تم کنکریاں اٹھاؤ، ان کنکریوں کا وزن جتنے دیناروں کے برابر بنا اتنے دیناروں کے بدلے یہ زمین یا کپڑا یا بکری تمہاری ہوئی۔ یہاں بھی کنکریوں کی تعداد اور ان کا وزن غیر معین اور مجہول ہے، اس لیے یہ طریقہ بھی غرر اور جہالت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے منع ہے۔

وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ: غرر: دھوکا دینے، بہکانے، خطرہ اور ہلاکت زدگی کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں بیع غرر ان چیزوں کی فروخت کو کہتے ہیں جن کا پورا علم بائع اور خریدار کو نہ ہو اور نہ اس میں مبیع یا ثمن کے حصول کا پورا یقین ہو، جیسے پانی میں موجود مچھلیوں کی بیع یا ہوا میں اڑتے پرندوں کی بیع۔ [1]

مذکورہ بالا تعریف کی رو سے بیع حصاۃ ''بیع غرر'' میں داخل ہے۔ چنانچہ یہ قاعدہ طے ہوا کہ: ''ہر وہ بیع جس میں غرر ہو، وہ منع ہے'' اور غرر ہر اس شے کو کہتے ہیں جس میں جہالت ہو۔ تب پھر ''وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ'' یہ ''عَطْفُ الْعَامِّ عَلَى الْخَاصِّ'' کے باب میں سے ہوا۔

بیع غرر کی تعریف، حکم اور ممانعت کی علت اور حکمت

بیع غرر ہر وہ معاملہ ہے جس میں جہالت ہو اور نفع یا نقصان کا احتمال ہو، یہ بیع منع ہے کیونکہ یہ جوئے کے حکم میں داخل ہے۔ کیونکہ جوئے کی حقیقت یہی ہے کہ جوا کھیلنے والے لوگ اس احتمال پر جوا کھیل رہے ہوتے ہیں کہ کیا معلوم نفع اسے ہی ہو جبکہ احتمال ہارنے اور نقصان اٹھانے کا بھی ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ بیع غرر کی ممانعت کی علت جہالت اور نفع یا نقصان کا احتمال ہے۔

بیع غرر کی ممانعت کی حکمت یہ ہے کہ ایسے معاملات کرنے والے کو بغیر محنت کیے زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے اور جمع کرنے کا لالچ پڑ جائے گا، اور وہ ہر طریقہ سے مال اینٹھنے میں مست ہو جائے گا۔ جبکہ نقصان اٹھانے کی صورت میں بے پناہ حسرت وندامت کا شکار ہوگا جو اسے نفرت، انتقام اور تعطل کے دروازے تک لے جائے گی۔ پس جوئے کے طرز پر مال کمانے والا یا تو جنونی لالچی بنتا ہے یا کینہ پرور منتقم بنتا ہے، اور یہ دونوں باتیں ہی معاشرے کی اخلاقیات اور اقتصادیات کو تباہ و برباد کر دینے کا قوی ذریعہ ہیں۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ عقد جو جہالت اور غرر پر مبنی ہو، اور اس میں نفع یا نقصان کا احتمال ہو، وہ منع اور حرام ہے۔ جس کی ایک صورت بیع حصاۃ ہے۔ ایسی بیوع فاسد اور ان کے مرتکبین گنہگار ہیں۔ ان بیوع کو توڑنا واجب ہے۔ علماء نے اس کی بے شمار قسمیں ذکر کی ہیں جیسے ہوا میں اڑتا پرندہ بیچنا، پانی میں تیرتی مچھلی بیچنا، بھاگے غلام کو بیچنا، حمل کو بیچنا، حمل کے حمل کو بیچنا وغیرہ وغیرہ۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بیع حصاۃ اور اس جیسی دیگر تمام بیوع منع ہیں جن میں جہالت اور غرر کا احتمال ہو۔ ایسی تمام بیوع فاسد اور واجب الرّد ہیں۔ کیونکہ ایسی بیوع فساد کو مقتضی ہیں۔

---

[1] دیکھیں: القاموس الوحید، ص: 1161۔ (نسیم)

◈ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمائے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے "وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ" کے چند کلمات میں بے شمار ممنوعہ، فاسد اور حرام بیوع کے ذکر کو سمو دیا ہے۔

◈ شریعت اسلامیہ اس بات کی بے حد حریص ہے کہ وہ متدین کو باہمی عداوت اور بغض کا شکار ہونے سے کوسوں دور رکھے۔ اسی لیے جہالت اور نفع یا نقصان کے احتمال پر مبنی جملہ بیوع کو منع فرما دیا۔

◈ شریعت نے ہر اس بات سے منع فرمایا ہے جو آدمی کو بے حد حریص، کمینہ درجہ کا لالچی، دنیا کا کتا اور پرلے درجے کا بخیل بنا دے۔

◈ کُل کے بیان میں اس کے بعض افراد کا ذکر بھی بلاغت میں سے ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بیع غرر کے افراد میں سے بیع حصاۃ کو ذکر فرمایا۔

◈ جس اجارہ کے عقد میں جہالت ہو وہ بھی منع ہوگا۔ کیونکہ عقد اجارہ بھی بیع کی ایک قسم ہے۔

◈ مشک کو اس کے نافہ میں بیچنا بیع غرر کے حکم میں داخل نہیں۔ کیونکہ لوگ نافہ کی مشک کو پہچانتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جاننے والے کو ہی نافہ کی مشک بیچی جائے۔

جہالت کی بیع کا بیان

785- وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَنِ اشْتَرَى طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتَّى يَكْتَالَهُ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس نے غلہ خریدا تو وہ اسے (آگے) نہ بیچے یہاں تک کہ (پہلے) خود اس کو ناپ (کر پورا کر) لے۔" [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنِ اشْتَرَى: مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔

فَلَا يَبِعْهُ: مذکورہ "فَا" جزائیہ ہے اور یہ جملہ جزائیہ اور جوابِ شرط ہے۔

حَتَّى يَكْتَالَهُ: اکتیال کسی سے اپنے لیے خود ناپ کر لینے کو کہتے ہیں۔ جبکہ کیل دوسرے کو ناپ کر دینے کو کہتے ہیں۔

ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ حکم اس وقت ہے جب بیع کیل کے ساتھ ہو رہی ہو، اور اگر بیع انکل سے ہو رہی ہو تو تب غلہ کو ناپنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

طَعَامًا: اگرچہ لفظ طعام کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جو کھائے جانے کے لائق ہو لیکن کیل کے ذکر کا قرینہ بتلاتا ہے کہ یہاں طعام سے مراد وہ شے ہے جو ناپ تول کر خریدی اور بیچی جاتی ہے جیسے غلے اور میوے وغیرہ۔

مضمون حدیث :......مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ جب آدمی کسی سے کوئی غلہ خرید لے تو پہلے اس کو ناپ کر خود پورا کرے پھر اس کو آگے بیچے۔ لہٰذا خود ناپنے سے پہلے اسے آگے بیچنا جائز نہ ہوگا، اور یہ ممانعت جہالت کی وجہ سے ہے کہ ابھی اسے خود نہیں معلوم کہ وہ غلہ کتنا ہے، لہٰذا مجہول المقدار غلہ آگے بیچنا جائز نہ ہوگا۔ یوں طرفین کو نقصان پہنچنے کا احتمال جاتا رہے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ خریدا ہوا غلہ جب تک ناپ کر پورا نہ کر لے اس کو آگے بیچنا جائز نہ ہوگا۔

[1] صحیح مسلم: 1528.

◈ اگر خریدنے والا یہ کہے کہ تم مجھے بیچ دو، میں خود ہی اس کو تمہاری طرف سے وکیل بن کر ناپ لوں گا تو یہ بھی درست نہ ہوگا۔ ہاں البتہ اگر یہ آدمی خریدنے سے قبل اس غلہ کو اس کا وکیل بن کر تولے اور اس کے بعد غلہ موکل کے حوالے کر دے، تب اس سے خریدے تو یہ صورت بالاتفاق جائز ہوگی۔

◈ غلوں کے وزن اور مقدار میں موسمی اثرات کی وجہ سے پڑے پڑے کمی واقع ہونے کا قوی احتمال ہوتا ہے۔ کیونکہ غلہ وقت کے ساتھ ساتھ سوکھتا ہے۔ اس لیے پہلے غلہ ناپ کر اس کی مقدار متعین کر لی جائے پھر اس کو بیچا جائے تاکہ جہالت رفع ہو جائے جو بیع کی ممانعت کی علت تو یہ ہے۔

◈ اگر غلہ ناپے بغیر اندازے سے بیچا تو مقدار کم نکلنے کی صورت میں مشتری کا اور مقدار زیادہ نکلنے کی صورت میں بائع کا نقصان ہے۔

◈ جو حکم ناپ کر بیچی جانے والی اشیاء کا ہے وہی حکم وزن کر کے تولی جانے والی اشیاء کا بھی ہے کہ ان کو بھی وزن کیے بنا آگے بیچنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہاں بھی ممانعت کی علت وہی جہالت ہے۔

◈ پیمائش کر کے بیچی جانے والی چیزوں کا بھی یہی حکم ہے کہ جب تک پیمائش کر کے یہ معلوم نہ کر لیا کہ یہ شے کتنے میٹر یا کتنے گز ہے، اس وقت تک اس کی بیع درست نہیں۔

◈ خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ میں آنے سے قبل کسی بھی چیز کو بیچنا جائز نہیں، چاہے وہ مکیلی ہو یا موزونی اور چاہے مذروعی ہو۔ اس کی تائید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کے عموم سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان اسی جگہ پہنچنے سے منع فرمایا ہے۔ جہاں خریدا گیا ہے یہاں تک کہ تاجر اس کو اپنے ٹھکانے پر لے جا کر محفوظ نہ کر لے۔ [1] یعنی اس سامان کو ایسی جگہ محفوظ نہ کر لے جو بائع کے ساتھ خاص نہ ہو۔

اس باب میں یہ سب سے راجح قول ہے کہ قبضہ میں کر لینے سے قبل چیزوں کو آگے نہ بیچا جائے۔ بے شک اسی میں زیادہ احتیاط ہے۔

◈ مذکورہ نہی تحریم پر دلالت کرتی ہے۔

◈ شریعت اسلامیہ کا منشا یہ ہے کہ متعاقدین حتی الامکان اختلاف اور شقاق و نزاع سے دور رہیں۔

◈ جب تک آدمی کا ایک شے پر مکمل قبضہ نہ ہو جائے، اس میں کسی قسم کا تصرف منع ہے۔

ایک سودے میں دو سودے کرنے کی ممانعت کا بیان

786۔ وَعَنْهُ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودے کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [2]

---

[1] یہ حدیث آگے آرہی ہے۔

[2] مسند احمد: 174/2۔ سنن النسائی: 295/7۔ جامع الترمذی: 1231۔ صحیح ابن حبان: 4973۔ امام نووی رحمہ اللہ نے المجموع: 320/9۔ 323 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام احمد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

وَلِأَبِي دَاوُدَ ((مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْكَسُهُمَا أَوِ الرِّبَا)) .

اور سنن ابی داؤد کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: جس نے ایک سودے میں دو سودے کیے تو (یا تو) اسے دونوں میں سے کم قیمت والا سودا ملے گا یا پھر (وہ) سود [1] (میں جا پڑے گا)۔

غریب الحدیث:......اَوْ کَسُهُمَا: اَوْكَس: یہ وکس سے ہے۔اس کا معنی نقصان اور گھاٹا ہے۔

ایک سودے میں دوسودوں کے واقع ہونے کی صورتیں اور ان کا حکم

حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایک سودے میں دو سودے کرے۔ جس کی یہ صورتیں ہیں:

پہلی صورت:......اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مثلاً دوکاندار چینی کے خریدار سے یہ کہے کہ میں تمہیں اس شرط پر چینی بیچوں گا کہ تم مجھ سے چاول بھی خریدو۔

ایک بیع میں دو بیع کی ایک صورت یہ ہے۔

دوسری صورت:......اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ تم اپنا گھر مجھے بیچ دو۔ اس پر وہ دوسرا کہے کہ تم اپنی گاڑی مجھے بیچ دو تو میں اپنا یہ گھر تمہیں بیچ دیتا ہوں۔

یہ بھی ایک سودے میں دو سودے کرنے کی ہی صورت ہے۔ البتہ پہلی صورت اور اس صورت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں ایک میں دو سودے ایک ہی شخص سے واقع ہو رہے ہیں۔ جبکہ دوسری صورت میں ایک میں دو سودے دو افراد سے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ متعاقدین سے واقع ہو رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ حدیث الباب میں ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت مراد ہے؟ تو سنن ابی داؤد کی روایت بتلاتی ہے کہ مذکورہ دونوں صورتیں ہی یہاں غیر مراد ہیں۔ کیونکہ یہاں ان دونوں صورتوں میں کوئی شرعی محذور لازم نہیں آ رہا۔ لہٰذا نہ تو ان دونوں صورتوں میں کہیں کوئی سود ہے اور نہ کم یا زیادہ نفع والے سودے کی ہی کوئی صورت ہے۔

غرض ابو داؤد کی روایت ان صورتوں کو مراد ہونے سے نکال دیتی ہے۔ کیونکہ ایک شے کو دوسری شے کے خریدنے کے ساتھ مشروط کرنے میں کوئی ممانعت نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں اگر آدمی راضی ہے تو عقد کرے گا وگرنہ ترک کر دے گا۔

تب پھر یہ سوال اٹھنا بدیہی ہے کہ پھر یہاں وہ کون سی صورت مراد ہے کہ اگر دو سودے ایک سودے میں کیے جا رہے ہوں تو یہ منع ہوگا کیونکہ یہ صورت دو حال سے خالی نہیں ہوگی۔

(1) یا تو وہ دو سودوں میں سے کم قیمت والا سودا کرے گا۔ تب یہ درست ٹھہرے گا۔

(2) یا پھر وہ زیادہ قیمت والا سودا کرے گا۔ تب پھر وہ سود میں جا پڑے گا۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3461۔ امام حاکم: (52/2) نے اس حدیث کو صحیح قرار دے کر کہا ہے کہ یہ حدیث ''صحیح مسلم'' کی شرط پر ہے۔ ابن حزم "المحلی: 16/9" میں یہ کہہ کر اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں کہ: یہ خبر صحیح ہے۔

تو علماء نے اس کی دوصورتیں لکھی ہیں:

پہلی صورت: ......اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی مثلاً ایک گھڑی بیچتے ہوئے یہ کہے کہ اگر تم اس کو نقد خریدتے ہو تو یہ پانچ ہزار کی ہے، اور اگر تم ادھار میں لیتے ہو تو یہ سات ہزار کی ہے۔ اب اگر تو خریدار وہ گھڑی پانچ ہزار میں خرید لیتا ہے تو اس میں کوئی سود نہیں۔ جبکہ سات ہزار میں ادھار خریدنا سود ہے۔

اور یہاں ایک بیع میں دو بیع ہونے کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی شے پانچ کی بھی ہے اور سات کی بھی۔ چنانچہ یہاں ایک مبیع کی دو بیعیں ہیں اور دو ثمن ہیں۔ چنانچہ نقد کی بیع میں اس کی قیمت پانچ ہزار ہے جبکہ ادھار کی بیع میں اس کی قیمت سات ہزار ہے۔

دوسری صورت: ......دوسری صورت بیع عینہ کی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی ایک ہی شے کو پہلے ادھار بیچے پھر اس شے کو کم قیمت پر نقد خرید لے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک سودے میں دو سودے کرنے کی قبیل سے ہے۔ یعنی یہ ایک بیع کی بابت دو سودے ہیں۔ ایک سودا اس شے کو ادھار زیادہ قیمت پر بیچنے کا ہے جبکہ دوسرا سودا اسی شے کو نقد کم قیمت پر خریدنے کا ہے۔

اب ہم اس صورت میں بائع کو یہ کہیں گے کہ یا تو تیرے لیے دونوں میں سے کم قیمت ہے یا پھر تم سود میں جا پڑو گے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ بائع یہ کہے کہ میں تم کو یہ گھڑی دس ہزار میں ایک سال کی مدت کے لیے ادھار بیچتا ہوں۔ اب یہاں مؤجل ثمن دس ہزار روپے ہے اور اس کی ادائیگی کی مدت ایک سال ہے۔ پھر بائع مشتری سے دوبارہ کہے کہ میں یہی گھڑی اب تم سے آٹھ ہزار کی خرید لیتا ہوں۔

اب بائع اول مثلاً زید نے جب عمرو کو گھڑی دس ہزار ادھار میں بیچی تھی تو عمرو کے ذمہ زید کے دس ہزار تھے۔ پھر جب بائع اول نے یہی گھڑی عمرو سے آٹھ ہزار میں خرید کر عمرو کو آٹھ ہزار نقد دے دیے تو عمرو کے ذمہ اب بھی زید کے دس ہزار ہی ذمہ میں ہیں۔ تو اب گویا کہ زید نے عمرو کو آٹھ ہزار روپے دس ہزار روپوں کے بدلے دیے ہیں جو سود ہے۔

چنانچہ زید سے یہ کہا جائے گا کہ یا تو تم آٹھ ہزار روپے ہی لو جو کم قیمت ہے۔ کیونکہ تم نے آٹھ ہزار اسے دیا ہے تو واپس بھی آٹھ ہی ہزار لو تو اس صورت میں سود نہ ہوگا، اور اگر تم نے عمرو سے دس ہزار روپے لیے جو کہ زیادہ ہیں تو تم سود میں جا پڑو گے کیونکہ تم نے آٹھ دے کر اس کے بدلے دس لیا ہے۔

مضمون حدیث :......مذکورہ حدیث میں ایک سودے میں دو سودے کرنے کی ممانعت کا بیان ہے اور ایک سودے میں دو سودے کرنے کی راجح تفسیر اور متفق علیہ دو صورتیں یہی ہیں کہ:

(1) یا تو یہ مراد ہے کہ ایک شے کو نقد اگر پانچ میں دے رہا ہو تو اس کو ادھار میں سات کی دے رہا ہو۔

(2) یا پھر اس سے بیع عینہ مراد ہے کہ ایک شے کو ادھار پر زیادہ قیمت کے ساتھ بیچ کر اسی شے کو نقد کم قیمت پر خرید لیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ سود حرام ہے اس کی دلیل ''اَوْ كَسُهُمَا اَوِ الرِّبَا'' کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کم قیمت لے کر نقصان نہیں اٹھاتا سوائے اس صورت کے جب زیادہ قیمت منع ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ سود جو یہاں زیادہ قیمت ہے، حرام اور منع ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ حیلے اختیار کرنا حرام ہے اور یہ کہ حیلے اختیار کرنے سے شرعی حکم رفع نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا حیلہ حرام کو مباح نہیں کر دیتا۔

◈ جب کوئی سودی معاملہ درپیش ہو تو اس سے بچنا واجب ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ احکاماتِ شرعیہ بے حد مضبوط ہیں۔ ہمیں بھی ان کو مضبوط و مستحکم رکھنا چاہیے اور شرعی احکام کے ساتھ کھلواڑ اور مذاق نہیں کرنا چاہیے۔

سَلَم اور بیع دونوں کو ایک ساتھ کرنے کا بیان

787۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ ، وَلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ ، وَلَا رِبْحُ مَا لَمْ يُضْمَنْ ، وَلَا بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سلف اور بیع دونوں کو اکٹھا کرنا اور ایک بیع میں دو شرطیں رکھنا حلال نہیں، اور نہ غیر مضمون شے کا نفع اور نہ اپنے پاس غیر موجود شے کا بیچنا (ہی حلال ہے)۔'' ❶

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ . وَأَخْرَجَهُ فِيْ عُلُوْمِ الْحَدِيْثِ ، مِنْ رِوَايَةِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ عَنْ عَمْرٍو وَالْمَذْكُوْرِ ، بِلَفْظِ ((نَهٰى عَنْ بَيْعٍ وَّشَرْطٍ)) وَمِنْ هٰذَا الْوَجْهِ أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ ، وَهُوَ غَرِيْبٌ .

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی، امام ابن خزیمہ اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام حاکم نے ''علوم الحدیث'' میں ابو حنیفہ کی مذکورہ عمرو سے مروی روایت میں اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: '' نبی کریم ﷺ نے بیع اور شرط کو اکٹھا کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' امام طبرانی نے اسی طریق سے یہ حدیث "المعجم الاوسط" میں روایت کی ہے۔ یہ حدیث ''غریب'' ہے۔ ❷

حلت کی نفی تحریم کو مقتضی ہے

شرح :...... مذکورہ حدیث متعدد مسائل کو متضمن ہے۔ اس لیے ہر مسئلہ کو جدا جدا ذکر کیا جاتا ہے اور اسی کے تحت غریب الحدیث کو بھی بیان کیا جائے گا۔

لَا يَحِلُّ: حلت کی نفی تحریم کو مقتضی ہے۔ اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ حلت کی نفی کبھی کراہت کو بھی مقتضی ہوتی ہے۔ کیونکہ حلت دو چیزوں کی ضد ہوتی ہے: (1) تحریم (2) اور کراہت۔ لیکن یہ قول خلافِ ظاہر ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے حلت کو حرمت کے بالمقابل ذکر کیا ہے نا کہ کراہت کے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3504۔ جامع الترمذی: 1234۔ سنن النسائی: 288/7۔ سنن ابن ماجه: 2188۔ مسند احمد: 174/2۔ المستدرك للحاكم: 21/2۔ امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے اور اس حدیث کو متعدد ائمہ مسلمین کی شرط پر قرار دیا ہے۔

❷ مسند ابی حنیفه لابی نعیم، ص: 160۔ المعجم الاوسط للطبرانی: 4361۔ علوم الحدیث للحاکم، ص: 128 ابن قطان کہتے ہیں: اس حدیث میں علت ابو حنیفہ کا حدیث میں ضعیف ہونا ہے۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے "مجمع الزوائد: 85/4" میں ابو حنیفہ کے حدیث میں ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دیکھیں: نصب الراية: 17/4 .

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ﴾ (النحل: 116)

''اور اس کی وجہ سے جو تمھاری زبانیں جھوٹ کہتی ہیں، مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔''

پس جب ایک ضد کی نفی ہو تو اس کی دوسری ضد ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں بظاہر حلت کی نفی حرمت کو مقتضی ہے۔

بیع سَلَم اور بیع کو ایک عقد میں جمع کرنا حرام ہے

سَلَفٌ وَبَيْعٌ: سلف کا معنی تقدیم ہے، یہ شیء مقدم کو کہتے ہیں۔ البتہ سلف "تسلیف" مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ بیع دو چیزوں کے ہمیشہ کے باہمی تبادلے کو کہا جاتا ہے۔ مذکورہ واؤ جمع کے لیے ہے۔ مراد یہ ہے کہ سلف اور بیع دونوں کو یکجا ایک عقد میں نہ کیا جائے۔ وگرنہ جدا جدا سلف بھی جائز ہے اور بیع بھی۔

علماء نے اس کی صورت یہ بیان کی ہے کہ آدمی دوسرے سے یہ کہے کہ میں تمہیں ایک سو درہم نقد دیتا ہوں تاکہ تم مجھے ایک سال تک دس سیر گندم دے دینا، مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تم مجھے اپنا گھر اتنی اتنی رقم میں بیچو۔ بلاشبہ یہ صورت سلف اور بیع دونوں کو ایک عقد میں جمع کرنے کی ہے، اور یہی وہ صورت ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔

یاد رہے کہ علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ بیع سلف کا دوسرا نام بیع سَلَم ہے۔ بیع سَلَم یا سَلَف کی تعریف یہ ہے:

''ایسی چیز کی بیع جس کی قیمت تو فوری طور پر ادا کی جائے اور وہ چیز مخصوص صفت کے ساتھ کسی کے ذمہ واجب الاداء ہو، اس کو بیع سَلَم یا سلف کہتے ہیں۔'' ❶

تب پھر مذکورہ حدیث کے مضمون میں دراصل گزشتہ حدیث کے مضمون کا اعادہ ہی ہے کہ ایک بیع میں دو بیع کرنا منع ہے، اور دراصل یہ ایک عقد میں دوسرے عقد کو شرط کر دینے کا نام ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ سَلَف کا معنی قرض ہے۔ تب پھر حدیث کا مطلب یہ بنے گا کہ قرض اور بیع کو ایک عقد میں یکجا نہ کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو مثلاً اپنا گھر اس شرط پر بیچے کہ تم مجھے اتنا اتنا قرض دو گے، ایسا کرنا منع ہے اور یہ قرض اور بیع کو ایک عقد میں جمع کرنا ہے۔ اس ممانعت کی علت یہ ہے کہ عموماً اس میں قرض دینے والا اپنا کوئی نفع یا مصلحت سامنے رکھ کر قرض دیتا ہے اور یہ قاعدہ مسلم ہے کہ ہر وہ قرض جو کسی نفع کو کھینچے، وہ سود کے حکم میں داخل ہے۔ کیونکہ قرض دوسرے پر احسان ہوتا ہے نہ کہ اس سے مصلحت کیشی ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ''سلف اور بیع'' کو یکجا کرنے کی تین صورتیں سامنے آتی ہیں جو یہ ہیں:

پہلی صورت:...... یہ ہے کہ سلف سے مراد بیع سَلَم ہو۔ تب پھر یہ ایک بیع میں دو بیع کی صورت ہوگی جو منع ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

دوسری صورت:...... یہ ہے کہ سلف سے مراد قرض ہو، تب پھر یہ قرض اور بیع کو ایک عقد میں جمع کرنا ہوگا جو منع ہے۔ جیسے بائع یہ کہے کہ میں تمہیں اپنا گھر اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم مجھے اتنا اتنا قرض دو۔ یہ منع ہے۔ کیونکہ یہاں قرض دینے والا اپنے قرض کی آڑ میں بائع سے اپنا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، وہ یوں کہ وہ قرض دینے پر آمادگی ظاہر کر کے مکان کی قیمت گرا

---

❶ القاموس الوحید، ص: 796. (نسیم)

دے۔ یوں وہ اپنے قرض دینے کی آڑ میں کم قیمت پر مکان خرید کر نفع کما سکتا ہے۔ جبکہ قرض دوسرے پر احسان کرنے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اس کا استحصال کرنے کے لیے۔ اسی لیے ایسا قرض جو قرض دینے والے کو نفع دے وہ سود کے حکم میں ہے۔

تیسری صورت:......اور اس کی تیسری صورت اس کے بالعکس ہے، وہ یوں کہ مشتری بائع سے یہ کہے کہ میں اس شرط پر یہ مکان خریدتا ہوں کہ تم مجھے اتنا اتنا قرض دو۔ اب بائع یہاں یہ نفع کما سکتا ہے کہ وہ قرض دینے کی آڑ میں مکان کی قیمت بڑھا دے۔

ایک بیع میں دو شرطیں اکٹھی رکھنا حرام ہے

وہ کون سی دو شرطیں ہیں جن کو بیع میں اکٹھا رکھ دینے سے بیع حرام ہو جاتی ہے۔ اس کی صورت بیان کرنے سے قبل بیع کی دو شروط کی بابت ایک تمہیدی مضمون کا جان لینا فائدہ سے خالی نہیں۔ جان لیجئے کہ بیع میں شرط کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایک شرط وہ ہوتی ہے جو عقد کے لیے ہوتی ہے۔ یہ وہ شرط ہوتی ہے جس پر عقد کی صحت موقوف ہوتی ہے اور اس کو خود شریعت مقرر کرتی ہے جس میں خلل ڈالنے کا کسی بندے کو حق حاصل نہیں ہوتا۔

(2) ایک شرط وہ ہوتی ہے جو عقد میں رکھی جاتی ہے۔ اس پر عقد کا لزوم موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے فوت ہو جانے پر شرط رکھنے والے کو اس عقد کے باقی رکھنے کا یا فسخ کر دینے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ شرط عقد کرنے والوں کی طرف سے رکھی جاتی ہے اور دونوں میں سے ہر ایک کو اس شرط کے باقی رکھنے یا باطل کر دینے کا اختیار ہوتا ہے۔

اب اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مذکورہ حدیث میں شرط کی پہلی قسم مراد نہیں۔ کیونکہ ہر عقد خود شارع علیہ السلام کی طرف سے متعدد شروط کو متضمن ہوتا ہے۔ جیسے ثمن معلوم ہو، مبیع معلوم ہو، اجل معلوم ہو، مبیع موجود ہو، عیب سے سالم ہو وغیرہ وغیرہ جن کی تعداد مشہور مذہب کے مطابق سات تک شمار کی گئی ہے۔

رہی عقد کرنے والوں کی طرف سے رکھی جانے والی شرطیں تو وہ بھی بالاتفاق علی الاطلاق حرام نہیں ہوتیں۔ ایسی متعدد شروط ہیں جن کا رکھنا متعاقدین میں سے ہر ایک کے لیے جائز ہوتا ہے۔ جیسے بائع کہے کہ میں فروخت شدہ چیز تب دوں گا جب تم پہلے مجھے ثمن دو گے۔ یا مشتری کہے کہ میں ثمن تب دوں گا جب تم پہلے فروخت شدہ چیز کو میرے حوالے کرو گے کہ یہ دونوں شرطیں بالاجماع صحیح ہیں۔

بلکہ اگر دو شرطیں خود بائع بھی رکھ دے تو جائز ہے۔ جیسے میں یہ گھڑی تب بیچوں گا جب تم ثمن بھی ابھی دو گے اور گھڑی پر قبضہ بھی ابھی ہی کرو گے تو ایک ہی عاقد کی طرف سے یہ دونوں شرطیں رکھنا جائز ہے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں مذکورہ شرطیں عقد کے مقتضٰی کے عین مطابق ہیں۔ کیونکہ یہ بات خود شریعت کا مقتضٰی ہے کہ مبیع قبضہ میں نقد دی جائے اور ثمن پر بھی اسی وقت قبضہ کیا جائے۔ اب چاہے متعاقدین یا ایک ہی عاقد ان باتوں کو شرط رکھے یا نہ رکھے، شریعت کا مقتضٰی یہی ہے۔ ہاں متعاقدین کا ان باتوں کو شرط رکھنا تاکید مزید کا فائدہ دیتا ہے۔

تب پھر یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ بالآخر وہ دو شرطیں کون سی ہیں کہ جب ایک عقد میں وہ دونوں جمع ہو جائیں تو ہم ایک محظورِ شرعی میں جا پڑتے ہیں اور اگر ہم ان میں سے کسی ایک بات کو علی الانفراد شرط کرتے ہیں تو محظور سے محفوظ رہتے ہیں۔

اس کے لیے ہمیں قواعد شرعیہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، وہ یہ کہ اگر تو کوئی دو شرطیں شرط رکھنے والے کو کسی شرعی محظور میں مبتلا کر دیں تو وہ دونوں شرطیں حرام ہوں گی اور اگر کوئی دو شرطیں کسی محظورِ شرعی میں مبتلا نہ کریں تو مذکورہ حدیث ان دو

شرطوں کو شامل نہ ہوگی۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مراد بیع عینہ ہے جس کی تفصیلی صورت مذکور ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی دوسرے سے یوں کہے کہ میں تمہیں یہ گھڑی ایک ہزار روپے میں اس شرط پر ادھار بیچتا ہوں کہ تم بعد میں اسے مجھے نقد آٹھ سو روپوں میں بیچ دو۔

اب یہاں دو شرطوں کو ایک عقد میں جمع کر دیا گیا ہے کہ:

(1) ادھار میں یہ چیز ہزار کی بیچوں گا۔ (2) اور بعد میں نقد میں آٹھ سو کی خریدوں گا۔

چنانچہ اگر وہ صرف پہلی شرط کی حد تک رہتا تو یہ عقد درست تھا لیکن جب اس نے اس ہی عقد میں دوسری شرط کو بھی داخل کر دیا تو اس شرط نے عقد کو فاسد کر دیا۔

یہی وہ معنی ہے جس پر اس حدیث کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی محمول کیا ہے کہ مذکورہ عبارت سے مراد بیع عینہ ہے کہ یہی وہ بیع ہے جس میں دو شرطیں جمع ہو جانے پر عقد فاسد اور حرام ہو جاتا ہے۔

جو شے ضمان میں داخل نہ ہو اس کا نفع اٹھانا حرام ہے

مذکورہ حدیث میں ایک ناجائز اور حرام عقد کی یہ تیسری صورت کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایسی شے سے نفع کمانے کو حرام ٹھہرایا ہے جو ابھی تک بندے کے قبضے میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ بسا اوقات ایسی شے کو دوسرے کے سپرد کرنے اور ثمن وصول کر لینے کے بعد اس پر قبضہ دینے میں رکاوٹ آ جاتی ہے اور یہ صورت ضرر پر مشتمل ہے۔ لہٰذا خریدے غلہ کو وصول کرنے سے قبل اسے آگے بیچنا جائز نہ ہوگا کیونکہ استیفاء سے قبل وہ غیر مضمون ہوتا ہے اور جو شے ناپ یا تول کر، یا گن کر یا پیمائش کر کے بیچی جاتی ہے اس کو جب تک ناپ تول کر یا گن کر اور پیمائش کر کے وصول نہ کر لیا جائے وہ مضمون نہیں بنتی۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے کسی نے سامنے پڑے گندم کے ڈھیر کو یوں خریدا کہ اس کا ہر صاع ایک درہم کا ہے۔ تو اب جب تک اس گندم کو ناپ کر معلوم نہ کر لیا جائے کہ یہ کتنے صاع ہے اس وقت تک وہ مشتری کے ضمان میں داخل نہ ہوگی بلکہ بائع کے اختیار میں رہے گی چاہے بائع نے اس کا ثمن بھی وصول کر لیا ہو۔ چنانچہ ایسی گندم کو ناپے بنا آگے نفع پر بیچنا حرام ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات بائع مشتری کو نفع میں جاتے دیکھ کر وہ گندم حوالہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ ظلم اور حسد تو ہر ایک کی فطرت میں ہے ہی۔ ایسی صورت میں جب بائع مبیع کو حوالہ کرنے سے انکاری ہو جائے مشتری کے لیے اپنی اس مبیع کو آگے حوالہ کرنا ممکن نہ رہے گا۔ اسی لیے جب تک مشتری گندم کو ناپ کر اپنے گودام میں داخل نہ کر لے اس وقت تک اسے یہ گندم آگے بیچنا جائز نہ ہوگا۔ تو جب ایسی گندم کو بیچنا جائز نہ ہوگا تو اس پر نفع کمانا بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگا۔

غیر موجود شے کی بیع حرام ہے

یہ ناجائز عقد کی چوتھی صورت کا بیان ہے کہ جو شے اپنے پاس ہی نہ ہو اس کی بیع حرام ہے۔ یہ مسئلہ دو باتوں پر مشتمل ہے:

(1) آدمی کوئی ایسی چیز بیچے جو اس کی ہے ہی نہیں جیسے عمرو نے زید کی موٹر سائیکل کا سودا کر دیا تو یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ وہ موٹر سائیکل اس کی ملک میں داخل ہی نہیں۔

اسی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ شے آدمی کی ملک میں داخل تو ہو، پر اس پر کسی ایسے ظالم کا قبضہ ہو کہ وہ اپنی شے کو اس کے قبضہ سے چھڑانے کی سکت نہ رکھتا تو اپنی ملک پر غیر قادر ہونا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ لہٰذا جو شے آدمی دوسرے کے حوالہ کر نہیں سکتا

وہ بھی ''غیر موجود'' کی بیع میں داخل ہے۔ بھاگا ہوا لاپتا غلام اور بدک کر جنگل کی طرف بھاگا ہوا جانور بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

(2) غیر موجود کی بیع کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے ذمہ دیون کو بیچے۔ یہ بھی ناجائز ہے کیونکہ وہ دین اس کے پاس موجود نہیں۔ جیسے آدمی دوسرے سے یہ کہے کہ میں فلاں سے سو صاع گندم لے کر تمہیں بیچتا ہوں۔ تو یہ ناجائز ہے کیونکہ:

ایک تو ابھی تک اس نے وہ گندم ناپ کر اپنے قبضہ میں نہیں لی۔ لہٰذا یہ بیع غیر مضمون کی بیع میں داخل ہوگی۔ دوسرے جانے یہ آدمی اس گندم کو کس قیمت پر خریدے۔ مثلاً خریدے تو نوے روپے میں جبکہ گندم سو روپے کی ہو تو اس صورت میں سو کی گندم کو نوے میں وصول کر کے نفع میں رہے گا، اور اگر وہ مقروض سے گندم واپس نہ لے سکا تو اس کے نوے روپے اکارت جائیں گے۔

پس اگر تو مشتری نے نوے دیے تو یہ عقد جائز ٹھہرے گا۔ کیونکہ اب بائع نے غیر مضمون پر نفع نہیں لیا، اور اگر مشتری نے سو دیے تو یہ حرام ہوگا کیونکہ یہ غیر مضمون پر نفع اٹھانے کے حکم میں داخل ہے اور اگر بائع نے مشتری سے نوے سے کم لیا تو یہ بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا کیونکہ جب مساوی قیمت پر بیچنا جائز ہے تو کم قیمت پر بیچنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ جیسے کسی نے سو صاع قرض دینا ہو اور دائن اس کے بدلے نوے صاع لینے پر راضی ہو جائے تو کیا یہ جائز نہ ہوگا۔

غرض غیر موجود کی بیع کی کل تین صورتیں ہیں:

(1) دوسرے کی چیز بیچنا۔ (2) اپنی ایسی چیز بیچنا جو قبضہ میں نہیں اور اس کا دوسرے کو قبضہ دلوانا بھی ممکن نہیں۔

(3) دوسروں کے ذمہ دیون کو بیچنا۔

اور غیر موجود کی بیع اس لیے ناجائز ہے کیونکہ یہ غرر اور جہالت پر مبنی ہے، اور ہر وہ معاملہ جو غرر اور جہالت پر مبنی ہو وہ حرام ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اس جوئے کے حکم میں داخل ہے جو باہمی بغض و عداوت کا سبب بنتا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ۝﴾ (المائدۃ: 91)

''شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والے ہو۔''

اس آیت کے عموم سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ شریعت کا ہم بندوں سے منشا و مطالبہ یہ ہے کہ ہم خرید و فروخت میں ناپ تول کو ملحوظ رکھیں اور کسی بھی شے کو جہالت کے ساتھ نہ بیچیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں ممنوعہ بیوع کی چار قسموں کو بیان کیا گیا ہے:

(1) بیع اور سلف کو اکٹھا کر کے عقد کرنا منع ہے۔

(2) کسی بیع میں ایسی دو باتیں شرط رکھنا منع ہے جن کے اکٹھا ہونے پر وہ عقد حرام ہو جائے۔

(3) غیر مضمون شے کو نفع کے ساتھ بیچنا ناجائز ہے۔ (4) اور غیر موجود شے کی بیع ناجائز ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بیع سَلَم اور سلف جائز ہے۔ اس کی دلیل "لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ منع سلف اور بیع کو یکجا کرنا

ہے۔جس سے متبادراً معلوم ہوا کہ صرف سلم اور صرف بیع جائز ہے۔

◈ سلف اور بیع کو یکجا کرنا منع ہے۔

◈ کسی بھی عقد میں ایسی دو شرطیں یکجا کرنا منع ہے جن کے جمع ہونے سے کوئی شرعی محظور لازم آتا ہو۔اس کی دلیل "وَلَا شَرْطَانِ فِي بَيْعٍ" کے الفاظ ہیں۔

◈ غیر مضمون شے پر نفع اٹھانا ناجائز ہے اور اس کی علت غرر ہے۔جبکہ کبھی کبھی بائع کا حسد بھی اس کی ممانعت کی علت بن جاتا ہے۔جو شے پاس نہ ہو اس کی بیع ناجائز ہے۔اس کی جملہ صورتیں اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔

◈ ہر وہ عقد جو غرر و جہالت پر مبنی ہو وہ حرام ہے۔

◈ شریعت اسلامیہ کی یہ بے حد حکمت ہے کہ وہ معاملات سے ہر اس امر کو دور کرنے کی از حد حریص ہے جو باہمی بغض و عداوت پر مشتمل ہو یا بغض و عداوت کا باعث یا اس کی طرف لے جانے والا ہو۔

بیعانہ کی بیع کا حکم

788۔ وَعَنْهُ رضي الله عنه قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے "عُرْبَان"[1] (بیعانہ) کی بیع سے منع فرمایا ہے۔[2]

رَوَاهُ مَالِكٌ، قَالَ: بَلَغَنِيْ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ بِهِ.

اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت "عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" کی اسناد کے ساتھ پہنچی ہے۔

بیعانہ کا حکم

شرح:...... بیعانہ کسی شے کی قیمت سے دیا جانے والا وہ پیشگی حصہ ہے جسے یہ کہہ کر بائع کو دیا جاتا ہے کہ اگر تو یہ سودا پورا ٹھہرا تو یہ رقم ثمن سے منہا ہو جائے گی وگرنہ یہ تمہاری۔

بیعانہ کے جواز یا عدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔بعض کے نزدیک یہ حرام ہے کیونکہ اس میں غرر اور جہالت ہے کیونکہ یہ سودا پایہ تکمیل کو بھی آ پہنچ سکتا ہے اور نامکمل بھی رہ سکتا ہے۔لہٰذا یہ جہالت اور غرر ہے جو منع ہے۔

اس قول کے قائل علماء کا استدلال اس مذکور بالا حدیث سے ہے۔لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ فرما رہے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عمرو بن شعیب کے واسطہ سے پہنچی ہے۔لیکن یہ حدیث عمرو سے امام مالک تک کس

---

[1] عربان یا عربون: بیعانہ، قیمت کا وہ پیشگی دیا جانے والا حصہ جو بعد میں وضع کر لیا جاتا ہے۔(القاموس الوحید: 1063). نسیم۔

[2] المؤطا لمالك: 609/2۔ سنن ابی داؤد: 3502۔ سنن ابن ماجه: 2192۔ اس حدیث کو امام مالک نے ایک ثقہ راوی کے ذریعہ عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے۔ایسی روایت اصح روایت پر حجت نہیں ہوا کرتی۔جبکہ ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایات کی اسناد منقطع ہیں۔ابن ماجه (2193) نے اس روایت کو متصل بھی ذکر کیا ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔ابن عدی الکامل: 153/4 میں کہتے ہیں: امام مالک کے نزدیک وہ ثقہ راوی ابن لہیعہ ہے۔ابن ملقن کہتے ہیں: اس حدیث کو ابومصعب زہری نے امام مالک سے روایت کیا ہے، ان سے ربیعہ نے اور آگے "عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده" کی اسناد ہے۔یہ اسناد عمدہ ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔دیکھیں: التمهيد: 176/24۔ خلاصة البدر المنير: 63/2.

نے پہنچائی ہے؟ وہ طریق مجہول ہے۔ اس لیے یہ حدیث غیر صحیح ہے۔

جبکہ دوسرا قول بیعانہ کے لینے دینے کے درست ہونے کا ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے، اور یہی امام احمد رحمہ اللہ کا قول بھی ہے کہ بیعانہ لینے دینے میں کوئی حرج نہیں۔ رہی اس میں پائی جانے والی جہالت تو وہ جوئے کی جہالت جیسی نہیں کیونکہ جوا کھیلنے والے دونوں شخص نفع اور ضرر کے لاحق ہونے میں یکساں ہیں جبکہ یہاں بائع کو نفع ملنے کی امید تو ہے جبکہ نقصان کا اندیشہ نہیں لہٰذا وہ غرم اور غنم کے درمیان نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بائع کا سامان اسے واپس کر دیا جائے گا۔ تب بھی اسے بیعانہ کی رقم کا نفع تو یقینی ہے ہی۔ یوں بیعانہ اپنے حکم میں شرط خیار کے جیسا ہوتا ہے جو بالاتفاق جائز ہے۔

پس راجح قول یہی ہے اور اسی پر آج سب کا عمل ہے کہ بیعانہ لینا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں اور یہ جوئے کے باب میں سے نہیں جو غرم اور غنم کے درمیان دائر ہوتا ہے۔

جہاں مال خریدا ہے اسے وہیں بیچنے کا حکم

755۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ: ابْتَعْتُ زَيْتًا فِي السُّوْقِ ، فَلَمَّا اسْتَوْجَبْتُهُ لَقِيَنِيْ رَجُلٌ فَأَعْطَانِيْ بِهِ رِبْحًا حَسَنًا ، فَأَرَدْتُّ أَنْ أَضْرِبَ عَلَى يَدِ الرَّجُلِ ، فَأَخَذَ رَجُلٌ مِنْ خَلْفِيْ بِذِرَاعِيْ ، فَالْتَفَتُّ ، فَإِذَا هُوَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ ، فَقَالَ : لَا تَبِعْهُ حَيْثُ ابْتَعْتَهُ ، حَتَّى تَحُوْزَهُ إِلَى رَحْلِكَ ، ((فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى أَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ ، حَتَّى يَحُوْزَهَا التُّجَّارُ إِلَى رِحَالِهِمْ)) .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک دفعہ) میں نے بازار میں زیتون کا تیل خریدا۔ پس جب میں نے (عقد پورا کر کے) اپنا حق (یعنی خریدا ہوا تیل قبضہ میں) لے لیا تو (ابھی میں نے اس جگہ سے اپنا وہ تیل اٹھایا نہ تھا کہ) مجھے ایک آدمی ملا اس نے مجھے اس تیل کا بہت اچھا نفع پیش کیا۔ سو جب میں نے (وہ تیل) اس کو بیچنے کا ارادہ کیا تو ایک آدمی نے میرے پیچھے سے میرے بازو کو پکڑا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے (مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر یہ) کہا: اسے اسی جگہ نہ بیچو جہاں تم نے اسے خریدا ہے یہاں تک کہ تم اس کو اپنے ٹھکانے پر لے (جا کر اسے اپنے قبضہ میں نہ لے) لو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ سامان کو اسی جگہ بیچا جائے جہاں اسے خریدا گیا ہے۔ یہاں تک تاجر لوگ اسے اپنے ٹھکانے پر (سمیٹ کر نہ) لے جائیں۔ [1]

www.KitaboSunnat.com

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ ، وَاللَّفْظُ لَهُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ .

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ سنن ابی داؤد کے ہیں۔ جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے

---

[1] مسند احمد: 191/5۔ سنن ابی داؤد: 3499۔ صحیح ابن حبان: 4484۔ المستدرك للحاكم: 46/2۔ امام نووی رحمہ اللہ "المجموع: 258/9" میں فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ البتہ یہ "محمد بن اسحاق بن یسار عن ابی الزناد" کے طریق سے ہے۔ ابن اسحاق کے مدلس ہونے کی وجہ سے اس سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ ابن اسحاق نے اس روایت میں "عن ابی الزناد" کہا ہے یاد رہے کہ جب کوئی مدلس راوی کس جگہ "عن" کے ساتھ سند بیان کرتا ہے تو اس سے حجت پکڑنا صحیح نہیں ہوتا۔ البتہ ابو داؤد نے اس حدیث کو ضعیف نہیں کہا۔ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ابو داؤد جس روایت کو ضعیف نہ کہیں وہ روایت حجت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :...... اِسْتَوْجَبْتُهُ: استجاب اپنا حق وصول کر لینے کو کہتے ہیں۔ مراد عقد کا تمام ہو کر اس کا لازم ہونا ہے جو مبیع پر قبضہ کرنے کو لازم ہے۔ اس لیے ایک روایت میں "فَلَمَّا قَبَضْتُهُ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔

أَنْ أَضْرِبَ عَلَى يَدِ الرَّجُلِ: یہ بیع کو پورا کرنے اور اس کو پکا کرنے کی طرف اشارہ اور اس سے کنایہ ہے کیونکہ وہ لوگ ایجاب وقبول کے بعد ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بیع کے مزید مؤکد ہونے کی طرف کنایۃً اشارہ کرتے تھے۔ اسی لیے بیع کو "صفقہ" (یعنی ہاتھ پر ہاتھ مارنا) بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر سودے کی تکمیل کی طرف اشارہ کرنے کی قدیم علامت ہے۔

فَأَخَذَ رَجُلٌ مِنْ خَلْفِي بِذِرَاعِي: ذراع کہنی کے سرے سے درمیانی انگلی کے سرے تک کے درمیانی عضو کو کہا جاتا ہے۔ (اردو میں عموماً اسے بازو سے تعبیر کر دیتے ہیں)۔ ❶

گویا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے پیچھے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہاتھ اوپر کر کے ان کو بازو سے پکڑ لیا تھا۔

لَا تَبِعْهُ حَيْثُ ابْتَعْتَهُ: لا تبع: یہ امر حاضر کا واحد مذکر کا صیغہ ہے۔

حَيْثُ: یہ ظرف مکان ہے۔

اِبْتَعْتَهُ: یہ بات افْتِعَال سے فعل ماضی واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے جو خریدنے کے معنی میں آتا ہے۔

يَحُوْزَهَا: "حوز" خریدے ہوئے مال کو اکٹھا کر کے اپنے قبضہ میں لے لینے کو کہتے ہیں۔

إِلَى رِحَالِهِمْ: مراد وہ جگہ ہے جہاں تاجر اپنا خریدا ہوا سامان رکھتے ہیں، یہ دوکان، مکان اور گودام وغیرہ میں سے کوئی بھی جگہ ہو سکتی ہے۔

التُّجَّارُ: وہ لوگ جو کاروبار اور تجارت کرتے ہیں۔ یہ اغلب کے اعتبار سے ہے۔ وگرنہ مراد یہ ہے کہ جو بھی کسی جگہ ایک شے خریدے تو جب تک اس شے کو وہاں سے لے کر اپنے گھر وغیرہ میں اس کو محفوظ نہ کر لے اس کو آگے نہ بیچے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ علماء اور فقہاء بھی خرید وفروخت کر سکتے ہیں اور یہ ان کے علمی مقام ومرتبہ کے خلاف نہیں۔ جیسا کہ حضرتِ ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے فقیہ اور جلیل القدر صحابی سے خرید وفروخت کرنا ثابت ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دینے کے بے حد حریص تھے۔ جیسا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ایک منکر کو دیکھ کر فوراً اس پر تنبیہ فرمائی۔

◈ معلوم ہوا کہ منکر کو دفع کرنے میں جلدی کی جائے۔ کیونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جنابِ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہاتھ تھام کر انہیں روکا تھا۔

◈ خرید وفروخت میں حرام امر پر تنبیہ بائع یا مشتری پر حسد نہیں کہلاتا۔

---

❶ دیکھیں فیروز اللغات اردو، ص: 690۔ (نسیم)

◈ جہاں کوئی شے خریدی ہو، اسے وہیں بیچنا جائز نہیں۔ جب تک کہ اس شے کو سمیٹ کر وہاں سے اٹھا نہ لیا جائے۔ اس باب میں اٹکل سے بیچی جانے والی شے اور کیل، وزن، گنتی، اور پیمائش کے ساتھ بیچی جانے والی اشیاء دونوں کا حکم ایک ہے۔

◈ شریعت اسلامیہ کی ان امور پر گہری نظر ہے جو عقد بیع کرنے والوں کے درمیان کینہ، نفرت اور بغض وغیرہ جیسے مذموم جذبات کو ختم کرتے ہیں۔

سونے چاندی کی باہم بیع کا بیان

790۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنِّيْ أَبِيْعُ الْإِبِلَ بِالْبَقِيْعِ، فَأَبِيْعُ بِالدَّنَانِيْرِ، وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ، وَأَبِيْعُ بِالدَّرَاهِمِ، وَآخُذُ الدَّنَانِيْرَ، آخُذُ هَذَا مِنْ هَذِهِ، وَأُعْطِيْ هَذِهِ مِنْ هَذَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَتَفَرَّقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ)).

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بقیع میں اونٹ بیچتا ہوں۔ سو میں دیناروں کے عوض بیچ کر دراہم اور دراہم کے عوض بیچ کر دینار لے لیتا ہوں اور اس کو اس کے بدلے میں لے لیتا ہوں جبکہ (کبھی) اُس کو اس کے بدلے میں دے دیتا ہوں۔ (تو کیا میرا یہ سب کرنا ٹھیک ہے)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ تم اِسے اُس کے اس دن کے بھاؤ کے بدلے میں لے لو جب تک کہ تم دونوں اس حال میں جدا نہ ہو جاؤ کہ تمہارے درمیان کچھ (لین دین باقی) ہو۔'' ❶

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **اَلْبَقِيعِ**: مراد اہل مدینہ کا مشہور قبرستان بقیع الغرقد ہے۔

فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ: دنانیر سونے کے سکوں کو جبکہ دراہم چاندی کے سکوں کو کہتے ہیں۔

جنابِ ابن عمر رضی اللہ عنہما کبھی ایک شے کو دیناروں کے عوض بیچ کر ثمن دراہم کی شکل میں لے لیتے تھے اور کبھی اس کے برعکس بھی کر دیتے تھے۔

آخُذُ هَذَا مِنْ هَذِهِ وَأُعْطِي هَذِهِ مِنْ هَذَا: مذکورہ ''مِنْ'' یہاں بدل کے معنی میں ہے۔ یعنی کبھی میں درہم کے بدلے دینار اور کبھی دینار کے بدلے درہم لے اور دے دیتا تھا۔ جیسے اونٹ کو پانچ دینار کا بیچ کر بدلے میں پانچ دینار کی بجائے بیس درہم لے لیے یا بیس درہم کا اونٹ بیچ کر قیمت میں پانچ دینار لے لیے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3354۔ جامع الترمذی: 1442۔ سنن النسائی: 281/7۔ سنن ابن ماجه: 2262۔ مسند احمد: 139/2۔ المستدرك للحاكم: 50/2۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: اس حدیث کو مرفوع روایت کرنے میں سماک منفرد ہیں۔ جبکہ اکثر رواۃ نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف کہا ہے۔ ''تحفة المحتاج: 233/2'' میں لکھا ہے: ہم کہہ سکتے ہو کہ سماک مسلم کے مستقل رجال میں سے ہے جبکہ بخاری رحمہ اللہ کے تعلیقات کے رواۃ میں سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سماک کو ثقہ کہا ہے تو پھر مذکورہ روایت کو وقف کے تعارض میں سے کیوں نہ لیا جائے، اصح یہ ہے کہ اس روایت کا مرفوع ہونا مقدم ہے۔ جیسا کہ ابن حبان (الموارد: 1128) نے کہا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ''المجموع: 260/9'' میں اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

لَا بَأْسَ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مراد گناہ کی نفی ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔
أَنْ تَأْخُذَهَا: "هَا" کا مرجع وہ عوض ہے جو اُس عوض کے بدلے لیا ہے جو ذمہ میں ثابت ہوا ہے۔ چاہے وہ دراہم کے بدلے دینار ہوں یا دیناروں کے بدلے دراہم ہوں۔

غرض نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ البتہ یہ جواز دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ جو یہ ہیں:

بِسِعْرِ يَوْمِهَا: پہلی شرط یہ ہے کہ لیا جانے والا عوض عوضِ ثابت کی اس دن کی بازار کی قیمت کے برابر ہو۔ مثلاً ایک اونٹ کی قیمت میں طے پانچ دینار ہوئے تھے۔ اب ان دیناروں کی بجائے دراہم لینا جائز ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جتنے دراہم لیے ہیں، وہ پانچ دیناروں کی اس دن کی قیمت کے برابر ہوں۔ کم نہ زیادہ۔ حدیث کے ظاہر کا مقتضی یہی ہے۔ لہٰذا اس دن پانچ دینار پچاس درہم کے برابر تھے تو ساٹھ درہم لینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اوپر کے دس درہم غیر مضمون شے کا نفع کہلائیں گے جس کی ممانعت کی نص آ گئی ہے، اور اگر وہ پچاس درہم کی بجائے جو اس دن کے پانچ دیناروں کی قیمت تھی، چالیس دراہم لیتا ہے تو یہ بھی جائز نہ ہوگا۔ بظاہر حدیث سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ کم دراہم لینا بھی جائز نہ ہوگا لیکن یہ معنی نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اگر کسی شے کی قیمت پانچ دینار طے ہوئی تھی جن کی قیمت پچاس دراہم بنتی ہے تو پچاس کی بجائے چالیس دراہم لینا جائز ہوگا کیونکہ اس میں مشتری کی مصلحت ہے۔

مَا لَمْ تَتَفَرَّقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ: یہ دوسری شرط کا بیان ہے کہ ایسا کرنا تب جائز ہے جب دونوں متعاقدین اس حال میں جدا ہوں کہ دونوں کا ایک دوسرے کے ذمے کچھ باقی نہ ہو۔ یعنی یہ جواز اس وقت کے ساتھ مشروط ہے جب دونوں کے درمیان ایسی تفریق پائی جائی جس میں دونوں کے ذمہ کچھ نہ باقی ہو۔ کیونکہ دراصل یہ سونے کی چاندی کے ساتھ اور چاندی کی سونے کے ساتھ بیع کی صورت ہے، اور جب سونے چاندی کی باہم بیع ہو رہی ہو تو ان میں تفاضل تو جائز ہے لیکن نسیئہ جائز نہیں۔ لہٰذا متعاقدین کا اسی مجلس میں عوضین پر قبضہ کر کے ایک دوسرے سے جدا ہونا شرط ہے۔ اس کی دلیل حدیث عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ میں یہ ارشاد ہے کہ جب یہ اصناف (ربویہ) مختلف ہوں تو ان کو (کمی بیشی کے ساتھ) جس طرح چاہے بیچو جب کہ وہ دست بدست ہوں۔ [1]

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے جس نقدی کے لین دین پر عقد منعقد ہوا ہے، مطالبہ کے وقت اس کے علاوہ دوسری نقدی بھی لے سکتے ہیں، اور ایسا کرنا دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

(1) ایک یہ کہ دوسری نقدی کی قیمت اس دن طے شدہ نقدی کی "مارکیٹ ویلیو" کے مساوی ہو۔

(2) دوسری یہ کہ آدمی نے اسی مجلس میں دوسری نقدی پر قبضہ کر لیا ہو اور مجلس سے جدا ہوتے وقت دونوں کا ایک دوسرے کے ذمہ کچھ باقی نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے معاملات میں احکاماتِ شرعیہ کے معلوم کرنے کے بے حد حریص رہتے تھے۔

◈ آدمی جو بھی لین دین اور عقد یا معاملہ کرنے لگے تو اس کی بابت حکم شرعی کو بالتفصیل معلوم کر لے تاکہ وہ کسی شرعی محظور

[1] یہ حدیث آگے "باب الربا" میں آ رہی ہے۔

میں نہ جا پڑے۔

◈ اگر جانور کو اور اسی طرح کسی بھی دوسری چیز کو نقد کے عوض بیچا جائے تو اس میں تقابض شرط نہیں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا دراہم کے بدلے بیچ کر دراہم کی جگہ دنانیر لینا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ دراہم و دنانیر مشتری کے ذمہ میں باقی رہتے ہیں۔

◈ دین کی بیع اس کے ساتھ بھی جائز ہے جس کے ذمہ میں وہ دین ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما دیناروں کے عوض اونٹ بیچتے تھے جس سے مشتری کے ذمہ میں دنانیر واجب ہو جاتے تھے، پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مشتری کے ذمہ انہی دیناروں کو دراہم کے عوض بیچ بھی دیتے تھے۔ بلاشبہ یہی دین کی اس شخص کے ساتھ بیع کی صورت ہے جس کے ذمہ وہ دین ہوتا ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ کیا دین کو، جس کے وہ ذمہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ کسی کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ لیکن مذہب یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے۔ جیسے زید کے ذمے عمرو کی سو صاع گندم ہو تو اب عمرو کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ زید کے ذمہ اپنی گندم کسی تیسرے مثلاً بکر کو بیچ کر اسے یہ کہے کہ جا کر یہ گندم زید سے لے لو کہ اس نے میری اتنی اتنی گندم دینی ہے۔ ایسا کرنا ناجائز ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ دوسرا مشتری یعنی بکر زید سے وہ گندم وصول کر پائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وصول نہ کر پائے۔ تب پھر اس عقد میں غرر اور ایک نوع کی جہالت ہے، اور جس عقد میں غرر آ جائے وہ ناجائز اور حرام ہوتا ہے۔

جبکہ ایک قول اس کے جواز کا بھی ہے اور شرط یہ ہے کہ دوسرے کے ذمہ ایسی مبیع تیسرے کو تب بیچی جائے جب اس کی مقدار، وزن، پیمائش یا گنتی اور نوع اور جنس وغیرہ کو اور مؤجل ہونے کی صورت میں اجَل کو بھی بیان کر دیا جائے، اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ تیسرا اس مبیع کو حاصل کرنے پر قادر بھی ہو۔

چنانچہ ان شروط کے ساتھ دین کی بیع کسی دوسرے کو جائز ہوگی۔

کیونکہ اب غرر اور جہالت جاتی رہی ہے اور یہ قول صحیح ہے۔

تب پھر دین کی بیع مدین کے علاوہ کو ان شرط کے ساتھ جائز ہوگی۔

⊙ ...... اس دَین کی وصولی ممکن ہو۔

⊙ ...... اس دَین کی جنس، قدر، وصف اور اَجَل معلوم ہو۔

⊙ ...... اس بیع میں ربائے نسیئہ جاری نہ ہو۔

⊙ ...... اور بائع اس میں نفع نہ اٹھا رہا ہو۔

⊙ ...... جبکہ پانچویں شرط یہ ہے کہ مدین اس دَین کو حوالہ کرنے پر تیار بھی ہو۔

⊙ ...... تب پھر چھٹی شرط یہ بھی رکھی جا سکتی ہے کہ مدین اس دَین کا یا تو اقراری ہو یا پھر وہ دَین اس پر بینہ سے ثابت بھی ہو۔

◈ آدمی جب نقدیوں کی بیع کر رہا ہو تو دونوں نقدیوں کی قیمت اس دین کی مارکیٹ ویلیو کے مطابق باہم مساوی ہو۔

◈ جب عقود میں نقدی پر قبضہ کرنا شرط ہو تو اس عقد کے جائز ہونے کے لیے نقدی پر قبضہ کرنا شرط اور واجب ہوگا۔

محض قیمت بڑھانے کے لیے بولی لگانے کا بیان

791- وَعَنْهُ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ النَّجْشِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے نَجْش سے (یعنی مبالغہ وفریب سے کام لیتے ہوئے محض قیمت بڑھانے کے لیے بولی لگانے سے) منع فرمایا ہے۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

نجش کی تعریف اور حکم

شرح:...... یہ ''نَجَشَ يَنْجُشُ نَجْشًا'' سے مصدر ہے۔ اس کا معنی کھیتی باڑی کرنا ہے۔ اصطلاح میں بیع کو نہ خریدنے کے ارادہ کے بغیر بولی لگا کر مبیع کی قیمت بڑھانے کو کہتے ہیں۔ اس میں دراصل بائع کی ہمدردی، خریدار کی ترغیب اور اسے فریب دینا مقصود ہوتا ہے۔

شرعاً ایسی بیع مکروہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ فعل باہمی بغض و عداوت لازم دیتا ہے۔ کیونکہ بولی لگانے والے کا مقصود دراصل مشتری کا ضرر ہوتا ہے۔ گو اس میں بائع کا نفع اور اس کی ہمدردی و چاپلوسی بھی ہو یا دونوں باتیں ہی مقصود ہوں لیکن مشتری کے ضرر کا ارادہ باعثِ عداوت ضرور ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت اسلامیہ فرزندانِ اسلام کے دلوں کو پاک صاف کر کے، نفس سے ہر قسم کے کھوٹ، کینہ اور بغض کو نکال دینا چاہتی ہے۔
- شریعت اسلامیہ ہر ایک انسان کے حقوق کی محافظ ونگران ہے۔
- نجش حرام ہے کیونکہ نہی میں اصل تحریم ہے۔
- البتہ نجش کے ذریعہ ہونے والی بیع بذاتِ خود جائز اور صحیح ضرور ہے۔ کیونکہ نجش یہ فعل ہے نہ کہ عقد۔ لہٰذا حرام یہاں فعل ہے نہ کہ عقد۔ پس نجش کے حرام ہونے کے باوجود بیع ضرور صحیح ہوگی۔

محاقلہ، مزابنہ اور اس جیسے عقود منع ہیں

792- وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: نَهَى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَعَنِ الثُّنْيَا، إِلَّا أَنْ تُعْلَمَ)).

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے محاقلہ سے، مزابنہ سے، مخابرہ سے اور (بیع میں) استثناء سے منع فرمایا سوائے اس کے کہ وہ استثناء معلوم ہو۔ [2]

---

[1] صحيح البخاري: 2142- صحيح مسلم: 1516.

[2] سنن ابی داؤد: 3405- جامع الترمذي: 1290- سنن النسائي: 37/7- مسند احمد: 364/3- امام نووی رحمہ اللہ ''شرح صحيح مسلم: 195/10'' میں فرماتے ہیں: اس کی اسناد صحیح ہے اور امام موصوف رحمہ اللہ ''فتح الباري: 315/5'' میں اس حدیث کا ایک متابع لے کر آئے ہیں۔ اس حدیث کی اصل ''صحيح مسلم: 1536'' میں ہے۔

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے سوائے ابن ماجہ کے، اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث الْمُحَاقَلَةِ: یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور حَقْل سے مشتق ہے۔ حقل کھیتی کو یا کھیتی باڑی کی زمین یعنی کھیت کو کہتے ہیں۔ باب مفاعلہ فعل میں اشتراک کو بتلاتا ہے۔ تب پھر محاقلہ کا لغوی معنی دو آدمیوں کا مل کر کھیتی باڑی کرنا ہوگا۔

شریعہ اصطلاح میں کھیتی کو بٹائی پر دینے کو محاقلہ کہا جاتا ہے۔ اس میں وہ آدمی کھیتی کرتا ہے جس کو زمین دی جاتی ہے جبکہ زمین کا مالک اس میں سے اپنا ایک مقررہ حصہ لیتا ہے۔

یہ عقد ناجائز ہے کیونکہ یا تو محاقلہ کی صورت یہ ہوگی کہ ایک آدمی مثلاً اپنے کھیت کی گندم کو دوسرے کے کھیت کی گندم کے بدلے بیچے۔ یہ ناجائز ہے، کیونکہ یہ گندم کی گندم کے بدلے بیع ہے جس میں کیل کا طرفین میں مساوی ہونا شرط ہے۔ جبکہ یہ تساوی کھڑی فصل میں یعنی دانوں کے بالیوں میں ہوتے ہوئے ناممکن ہے اس بنا پر یہ صورت سود سے خالی نہیں۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کھڑی کھیتی کو کٹی اور سوکھی گندم کے بدلے بیچے۔ یہ بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ کٹی فصل تو معلوم المقدار ہو سکتی ہے لیکن کھڑی فصل کتنی نکلتی ہے اس کا علم کسی کو نہیں۔ لہٰذا یہ معلوم گندم کی غیر معلوم گندم کے بدلے بیع ہوگی جو ناجائز ہے۔

وَالْمُزَابَنَةِ: یہ بھی بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے اور اَلزَّبْنَ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دھکے دینا۔ گویا کہ متعاقدین میں سے ہر ایک اپنا عوض دوسرے کو دھکے دے کر یعنی جلدی سے ادا کرتا ہے۔

اصطلاح میں مزابنہ معلوم المقدار شے کو اٹکل اور اندازہ والی شے کے بدلے بیچنے کو کہتے ہیں۔ جیسے بیلوں پر لگے انگوروں کو کشمش کے بدلے بیچنا کہ اس میں اگرچہ کشمش کی مقدار معلوم ہو سکتی ہے لیکن بیلوں پر لگے انگوروں کی مقدار بہرحال مجہول ہے۔ چونکہ اس بیع میں بھی ربا کا عنصر ہے اس لیے یہ بھی منع ہے۔ کیونکہ یہاں عوضین انگور ہے جن میں تماثل اور مساوات ممکن نہیں۔

وَالْمُخَابَرَةِ: یہ بھی بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے اور "الْخُبْرُ" سے مشتق ہے۔ جس کا معنی کھیتی ہے اور کاشت کار کو خبیر کہا جاتا ہے، اور دراصل یہ "خِبَارَة" سے مشتق ہے جو نرم زمین کو کہتے ہیں۔ جس میں بیج وغیرہ بو کر غلہ اگایا جاتا ہے۔

شرعی اصطلاح میں مخابرہ بٹائی پر کھیتی دینے کو کہتے ہیں، وہ یوں کہ مالک کسان کو کھیتی کے لیے زمین دے اور کسان کے لیے پیداوار کا کچھ حصہ مثلاً تہائی یا چوتھائی مقرر کر دے۔

عقد اور مزارعت کی یہ صورت بھی فاسد اور باطل ہے۔ کیونکہ مزارعت کی صورتوں میں غرر اور جہالت ہوتی ہے۔ رہی مزارعہ کی جائز صورت تو وہ یہ ہے کہ: یہ عقد پیداوار کے معلوم جز میں ہو چاہے وہ مشاع یعنی زمین کے تمام اجزاء میں پھیلا ہو، جیسے دسواں، چوتھا آدھا یا تیسرا حصہ وغیرہ، کہ دوسرے کو یہ کہہ کر زمین دی جائے تم اس زمین میں کھیتی باڑی کرو جبکہ اس کی پیداوار کا مثلاً چوتھا حصہ تمہارا ہوگا۔ مزارعت کی یہ صورت جائز ہے کیونکہ اس صورت میں دونوں نفع اور نقصان میں شریک ہوں۔

غرض جس عقد میں بھی غرر اور جہالت ہو وہ فاسد اور ناجائز ہے۔

وَعَنِ الثُّنْيَا: یہ لفظ "ثا" کے ضم اور نون کے سکون کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جس نے اس لفظ کو "ثُرَيَّا" کے وزن پر قرار دیا

ہے اس کا قول خطا ہے۔ پس یہ لفظ صغریٰ اور کبریٰ کے وزن پر ہے نہ کہ ''ثریا'' کے وزن پر، اور اس سے مراد استثناء ہے۔

مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیع میں استثناء سے منع فرمایا ہے، البتہ اگر وہ استثناء معلوم ہو تو جائز ہوگا۔ وہ اس لیے کہ اگر استثناء نامعلوم ہوگا تو عقد بیع غرر اور جہالت میں داخل ہو جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ استثناء معلوم کب ہوتا ہے اور نامعلوم کب ہوتا ہے؟ تو اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو یہ کہے کہ میں نے تمہیں یہ چیز بیچ دی مگر اس کا نصف کہ وہ نہیں بیچا۔ یہ معلوم استثناء کی مثال ہے اور جب یہ کہا جائے کہ میں نے تمہیں کھجور کے یہ دس درخت بیچے مگر ایک کہ وہ نہیں بیچا۔ تو یہ نامعلوم استثناء کی مثال ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں یہ معلوم نہیں کہ بیچنے والے نے دس درختوں میں سے کس ایک کا استثناء کیا ہے۔ بلاشبہ اس میں غرر ہے اور جہالت بھی ہے۔ اس لیے یہ نامعلوم استثناء ناجائز ہوگا۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ محاقلہ، مزابنہ اور مخابرہ کے عقود ضرر اور جہالت کے پائے جانے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ البتہ مخابرہ کی ایک صورت جائز ہے کہ جب بٹائی کل کٹائی کے ایک معین اور مشائع حصہ میں مقرر کی جائے۔

دوسرا اہم مسئلہ اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بیع میں استثناء جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ استثناء معلوم اور معین ہو تو جائز ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- محاقلہ، مزابنہ، مخابرہ اور نامعلوم استثناء ناجائز اور منع ہیں، اور یہ بات اصولِ شرع میں مُسلّم ہے کہ نہی عقود کے فساد کو مستلزم ہوتی ہے۔ لہٰذا جو عقود شرعی محظور پر مشتمل ہوں گے وہ فاسد ہوں گے۔
- مذکورہ معاملات غرر اور جہالت پر مبنی ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ کیونکہ غرر اور جہالت باہمی نزاع تک لے جاتے ہیں اور جو بات بھی نزاع اور باہمی کینہ وعداوت تک لے جائے وہ حرام ہوتی ہے۔
- عقود ہوں یا بیوع اور چاہے معاملات ہوں، ان سب میں معلوم استثناء جائز ہے۔

چند مزید ناجائز عقود کا بیان

793- وَعَنْ أَنَسٍ ﷺ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُخَاضَرَةِ وَالْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ وَالْمُزَابَنَةِ)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے محاقلہ، مخاضرہ، ملامسہ، منابذہ اور مزابنہ (کے عقود) سے منع فرمایا ہے۔ [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح :...... مذکورہ حدیث میں ناجائز بیوع اور عقود کی چند مزید قسموں کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بیوع اس لیے ناجائز ہیں کیونکہ ان میں غرر اور جہالت یا سود کا احتمال پایا جاتا ہے۔

غریب الحدیث:...... **اَلْمُحَاقَلَةِ**: اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

اَلْمُخَاضَرَةِ: یہ بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے اور ''الخَضَار'' سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا سبز اور ہرا ہونا۔ اصطلاح میں مخاضرہ کسی کو پکنے سے قبل ہی ہرا پھل بیچ دینے کو کہتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے کیونکہ یہ بیع غرر تک لے جاتی

---

[1] صحيح البخاری: 2707.

ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کچے اور ہرے پھل کو کوئی زمینی یا آسمانی آفت آ لے اور وہ پکنے کی حالت تک پہنچنے سے قبل ہی برباد اور خراب ہو جائے، اور یہ امر بائع اور مشتری کے درمیان نزاع کو پیدا کر سکتا ہے۔

غرر کے اسی احتمال کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے مخاضرہ سے یعنی پھل کو پکنے سے قبل شاخوں پر لگے ہونے کی حالت میں بیچنے سے منع فرمایا ہے۔

الْمُلَامَسَةِ: یہ "لـمس" یعنی چھونے سے مشتق ہے اور باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اصطلاح میں یہ چھو کر بیع کرنے کو کہتے ہیں۔ جیسے بائع مشتری سے یہ کہے کہ جس کپڑے یا بکری وغیرہ کو تو نے چھوا وہ اتنی اتنی رقم میں تیری ہوئی۔ یہ مجہول کی بیع ہے۔ اس لیے ناجائز ہے کیونکہ بیع میں مبیع، ثمن اور اجل وغیرہ کا معلوم ہونا شرط ہے۔ لہٰذا یہ بیع غرر و جہالت پر مشتمل ہونے اور مُفْضِی الی النزاع ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

الْمُنَابَذَةِ: یہ "النبذ" سے مشتق ہے اور باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس کا معنی کسی چیز کو دوسری چیز پر پھینکنا ہے۔ اصطلاح میں یہ کسی دوسرے پر اپنی شے پھینک کر بیچنے کو کہتے ہیں جیسے بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں تمہاری طرف جو کپڑا ابھی پھینکوں گا، وہ تمہیں اتنی اتنی رقم میں لینا ہوگا۔ یہ بیع بھی ناجائز ہے کیونکہ یہاں مبیع مجہول ہے، نہ جانے بائع کیسا کپڑا پھینکے، گھٹیا، مساوی قیمت کا یا زیادہ قیمت کا، اور یہ غرر اور جہالت ہے جو نزاع کا باعث ہے۔ لہٰذا یہ بیع بھی ناجائز ہوگی۔ چاہے اس میں مبیع پھینکی جائے یا مبیع پر کوئی چیز پھینک ماری جائے۔ دونوں صورتیں جہالت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوں گی۔

الْمُزَابَنَةِ: اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں حرام اور ناجائز عقود کی چند مزید قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ عقود حرام اور فاسد ہیں اور ان کا ارتکاب بھی حرام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ محاقلہ اور مخاضرہ کی بیوع ناجائز ہیں۔ کیونکہ کھیتی اور پھل پکنے سے قبل معرض ہلاکت میں ہوتے ہیں لہٰذا ان کا پک کر تیار ہو جانے کی حالت تک پہنچنا خطرات و آفات سے خالی نہیں، اور جس امر و عقد یا بیع میں خطرہ کا اندیشہ ہو وہ شرعاً ناجائز ہوتا ہے۔

◈ ملامسہ اور منابذہ کی بیوع، مبیع میں جہالت کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

قافلوں کو پہلے جا ملنے کی ممانعت کا بیان

794۔ وَعَنْ طَاوُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ، وَلَا يَبِيْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ))، قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما: مَا قَوْلُهُ لَا يَبِيْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ؟ قَالَ: لَا يَكُوْنُ لَهُ سِمْسَارًا)).

طاؤس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "(سامانِ تجارت بیچنے والے) قافلوں کو (شہر میں داخل ہونے سے قبل) پہلے ہی نہ جا ملو اور نہ کوئی شہری کسی دیہاتی (یعنی نو وارد اجنبی) کے لیے بیچے۔" (طاؤس کہتے ہیں کہ): میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ: کوئی شہری کسی (باہر کے) دیہاتی کے لیے نہ بیچے؟ اس بات کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: (مطلب یہ ہے کہ) وہ

اس کے لیے دلال (اور ایجنٹ) نہ بنے۔" ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. یہ حدیث "متفق علیہ" ہے اور یہ لفظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:...... **لَا تَلَقَّوُا:** مذکورہ جملہ "نہی" پر مشتمل ہے۔ تلقی استقبال کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد تجارتی قافلوں کو شہر میں داخل ہونے سے قبل ہی جا ملنا اور وہیں پر ان سے سامان کا بھاؤ تاؤ کرنا ہے، جو منع ہے۔

الرُّكْبَانَ: یہ راکب کی جمع ہے۔ مراد ہر وہ آدمی ہے جو اپنا سامان بیچنے شہر آیا ہو چاہے سوار ہو یا پیدل۔ اکیلا ہو یا ایک قافلہ ہو، سب کا حکم ایک ہے۔ البتہ "رکبان" کا لفظ اغلب کے اعتبار سے ہے۔

وَلَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ: حاضر سے مراد اسی شہر یا بستی کا رہنے والا ہے اور بادی سے مراد اجنبی نو وارد ہے۔

مذکورہ "لا" ناھیہ ہے کیونکہ مابعد مذکور مضارع لائے نہی کی وجہ سے مجزوم ہے۔

لَا يَكُونُ لَهُ سِمْسَارًا: سمسار دلال یعنی ایجنٹ کو کہتے ہیں۔ یہ فارسی کا لفظ ہے جو مُعَرّب بنا کر عربی میں داخل کیا گیا ہے۔ سمسار یا دلال اجرت لے کر دوسرے کا مال بکواتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو اہم مسائل کو بیان کیا گیا ہے:

(1) ایک یہ کہ باہر سے آنے والے قافلوں کو شہر سے باہر ہی نہ ملا جائے تاکہ ان سے ان کی بے خبری میں اپنی مرضی کے بھاؤ پر چیزیں خرید لی جائیں کیونکہ وہ شہر کی منڈی کے موجودہ نرخوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس میں آنے والوں کو ان کے متوقع نفع سے محروم کرنا ہے۔ دوسرے شہر والوں کو بھی ان کے نفع سے محروم کرنا ہے کیونکہ عموماً بیرونی تاجر سستی چیز بیچ کر لوٹ جانا چاہتا ہے جبکہ یہ پہلے جا ملنے والا اکیلا وہ چیز من پسند بھاؤ پر خرید کر باقی سب شہر والوں کو مہنگے داموں بیچے گا۔ اسی لیے تجارتی قافلوں کو ان سے ان کا سامان خریدنے کے لیے شہر سے باہر جا ملنا منع ہے۔ البتہ ان کی ضیافت اور خاطر داری کرنے کے لیے جا ملنا منع نہیں۔

(2) دوسرا یہ کوئی شہر والا کسی اجنبی نو وارد کی دلالی اور آڑھت کا کام نہ کرے۔ کیونکہ شہر والا شہر کے نرخوں کو جانتا ہوتا ہے جبکہ اجنبی عموماً ان سے ناواقف ہوتا ہے، اس طرح دلال اپنی اجرت کے حصول کے لیے اس کی شے کو مہنگا بکوائے گا جس میں شہر والوں کا نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ عموماً نو وارد اپنی چیز کو سستا بیچ کر اپنی حاجت پوری کر کے لوٹ جانا چاہتا ہے۔ لیکن اگر بیچ میں ایجنٹ پڑ جائے تو وہ محض اپنا معاوضہ بنانے کے لیے اس شے کو مہنگا بکوانے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے شہری کے لیے اجنبی کی دلالی کرنا منع ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قافلوں سے ان کا سامان خریدنے کے لیے انہیں شہر سے باہر ہی جا ملنا منع ہے، اور ایسا کرنا حرام ہے کیونکہ نہی میں اصل تحریم ہے۔ البتہ اصح قول یہ ہے کہ یہ تحریم فعل کی ہے۔ لہٰذا عقد پھر بھی صحیح ہوگا۔
- شریعت اسلامیہ افراد واشخاص اور جماعت و معاشرہ سب کے مصالح کی نگران ونگہبان ہے۔
- شہری کے لیے نو وارد کی دلالی کرنا حرام ہے۔
- یہ ممانعت طرفین کے حق میں ہے کیونکہ حدیث کا ظاہر اس کو مقتضی ہے۔ لہٰذا شہری اور نو وارد میں کوئی ایک بھی دوسرے کی

❶ صحيح البخاري: 2158۔ صحيح مسلم: 1521.

دلالی نہ کرے گا۔

◈ نو وارد کو شہر کے نرخوں کا علم ہو یا نہ ہو، اور اس کے لائے سامان کی اہل بلد کو ضرورت ہو یا نہ ہو، مذکورہ ممانعت اور نہی ان سب صورتوں کو شامل ہے، اور انہی جملہ صورتوں سمیت قافلوں یا اشخاص کو ملنے کا حکم بھی یہی ہے۔

◈ مذکورہ حکم اس وقت ہے جب دلال یہ کام اجرت لے کر کرے۔ یعنی وہ دوسرے کی چیز اپنی مصلحت کے لیے بکوائے۔ البتہ جب وہ یہ کام نیکی خیر خواہی اور دوسرے کی بھلائی کے لیے رضا کارانہ طور پر کرے گا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق یہ جائز ہوگا۔ البتہ حدیث کے ظاہر کے مطابق جائز نہ ہوگا کیونکہ حدیث مطلق ہے، اور ہمیں نص کے ظاہر کو ہی لینا چاہیے تاکہ ذمہ سے بری ہوں۔

◈ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دلال کی نو وارد کے لیے کی جانے والی بیع ناجائز ہوگی، اور یہ عدم جواز ان شروط کے ساتھ مشروط ہے۔

⊙ ...... دلالی شہری کرے۔

⊙ ...... اجنبی کو شہر والوں کا بھاؤ معلوم نہ ہو۔

⊙ ...... اور لوگوں کو اس کے لائے سامان کی ضرورت ہو۔

غرض جب یہ شروط پائی جائیں گی تو شہری کی نو وارد کے لیے بیع ناجائز ہوگی۔ لیکن اگر خود مشتری اس بات پر راضی ہو تو یہ بیع جائز ہوگی کیونکہ شہری کی اجنبی کے لیے بیع کی ممانعت اسی مشتری کی مصلحت کے لیے ہے۔ تو جب وہ خود راضی ہے تو ممانعت بھی باقی نہ رہے گی۔

795- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ . فَمَنْ تُلُقِّيَ فَاشْتُرِيَ مِنْهُ ، فَإِذَا أَتَى سَيِّدُهُ السُّوْقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ)) .

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''سامانِ تجارت لانے والوں کو پہلے نہ جا پہنچو، پس جسے پہلے جا ملا گیا اور اس سے (کچھ) خرید لیا گیا، پھر جب اس سامان کا مالک بازار آئے گا تو اسے (اس بیع کے باقی رکھنے کا یا ختم کر دینے کا) اختیار ہوگا۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا تَلَقَّوْا: اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔ مراد شہر سے باہر جا کر آنے والے قافلوں سے ان کے سامان کو شہر لانے سے قبل خریدنے کے لیے جا ملنا ہے۔

اَلْجَلَبَ: جَلَب سامانِ تجارت کو بھی کہتے ہیں تب یہ ''جَلَب'' بمعنی ''مَجْلُوْبٌ'' ہوگا اور یہ آنے والے تجارتی قافلہ کو بھی کہتے ہیں۔

فَمَنْ تُلُقِّيَ فَاشْتُرِيَ مِنْهُ: منه: مذکورہ ضمیر کا مرجع ''الجلب'' ہے جو بمعنی مجلوب ہے۔

فَإِذَا أَتَى سَيِّدُهُ: سید سے مراد اس شے کا پہلا مالک ہے جو تجارتی قافلہ کا ایک تاجر ہے جس سے بازار میں بکنے والی یہ

[1] صحیح مسلم: 1519.

چیز پہلے خریدی گئی تھی۔ پس سید سے مراد سید جلب اور اس شے کا پہلا مالک ہے، اور لفظ سید کا اطلاق کسی شے کے مالک پر بھی ہوتا ہے، اور "السوق" سے مراد سوقِ تجارت ہے۔ لہٰذا مذکورہ الف لام عہد ذہنی ہوگا۔

فَهُوَ بِالْخِيَارِ: یعنی اس شے کی گزشتہ بیع کو باقی رکھنے یا فسخ کرنے کا اسے اختیار ہوگا۔ تب پھر حدیث میں مذکورہ تلقی رکبان کی ممانعت ان سے ان کا مال خریدنے کی نیت سے جا ملنے کو شامل ہے نا کہ محض جا ملنے کو۔

الْخِيَارِ: یہ "اِخْتَارَ" فعل کا اسم مصدر ہے۔ کیونکہ "اِخْتَارَ" فعل کا مصدر جو بابِ افتعال سے ہے "اختیار" ہے۔ تب پھر یہ مصدر نہیں اسم مصدر ہے۔

اسم مصدر وہ ہوتا ہے جو معنی میں تو موافق ہو البتہ اس کے حروف موافق نہ ہوں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے، اور تلقی رکبان کی ممانعت کی علت وحکمت کو گزشتہ صفحات میں بیان کر دیا گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعتِ اسلامیہ کی توجہ وعنایت عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات پر بھی ہے۔
- شریعت اسلامیہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت ونگہداشت کی بے حد حریص ہے۔ کیونکہ تلقی رکبان کی ممانعت کی علت بائع اور اہل بلد کو حاصل ہونے والے ضرر کو دفع کرنا ہے۔
- جو قافلہ تجارت کو پہلے جا ملے اور خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کرے تو اس کے اس فعل کے منع ہونے کے باوجود وہ بیع صحیح ہوگی۔ لیکن اس بیع کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا بائع اول کو اختیار ہے، اور خیار کا اثبات بیع کی صحت کا ایک فرد ہے۔
- خیارِ غبن ثابت ہے۔ کیونکہ عموماً نو وارد تاجروں سے شہر سے باہر ہی خرید وفروخت کرنے سے ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر شہر کی منڈی میں پہنچ کر اس پہلے مالک کو اپنے مغبون ہونے کا اندازہ ہوتا ہے تو اسے بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔
- لفظِ سید کا اطلاق مالک پر کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل "فَإِذَا أَتَى سَيِّدُهُ السُّوقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ" کے الفاظ ہیں۔
- مذکورہ ممنوعہ تلقی کا اطلاق سامانِ تجارت کے منڈی میں پہنچنے سے قبل تک ہے۔ چاہے یہ ملاقات شہر کے اندر ہی کیوں نہ ہو، اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ [1]

اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا کرنا منع ہے

796۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَنْ يَبِيْعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا يَبِيْعُ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ أَخِيْهِ، وَلَا يَخْطُبُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيْهِ، وَلَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَكْفَأَ مَا فِيْ إِنَائِهَا)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شہری کسی نو وارد کے لیے بیع نہ کرے اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ) محض قیمت بڑھانے کے ارادہ سے بولی نہ لگاؤ اور کوئی آدمی اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے اور نہ وہ اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام بھیجے اور کوئی عورت اپنی (دینی) بہن کو طلاق دے دینے کا مطالبہ

---

[1] دیکھیں: المهذب للشيرازي: 292/1۔ كشاف القناع للبهوتي: 211/3.

نہ کرے کہ جس کے نتیجہ میں وہ اس کے برتن کی چیز کو انڈیل دے۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: ((لَا يَسُمِ الْمُسْلِمُ عَلَى سَوْمِ أَخِيهِ)). اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں: ''کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے۔''

غریب الحدیث:......أَنْ يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ: وَلَا تَنَاجَشُوا: شہری کی نو وارد کے لیے بیع اور نجش کی بیع پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔

لَا يَبِيعُ الرَّجُلُ: لَا يَبِيعُ کا کلمہ دو طرح سے پڑھا گیا ہے: (1) جزم کے ساتھ بھی جیسے "لَا يَبِع" تب یہ "لَا" ناھیہ ہوگا اور مذکورہ عبارت پر کوئی اشکال بھی نہ ہوگا۔ (2) اور "لَا يَبِيعُ" رفع کے ساتھ۔ تب یہ "لَا" لفظوں میں تو نافیہ ہوگا، البتہ معنی کے اعتبار سے ناھیہ ہوگا اور نفی سے نہی مراد لینا اور جملہ خبریہ سے جملہ انشائیہ مراد لینا لغت عرب میں عام ہے۔

اور لفظ رجل کا ذکر اغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ یہ ممانعت مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے۔

عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ: یہاں اخوت سے نسبی یا انسانی اخوت مراد نہیں، بلکہ دینی اخوت مراد ہے۔ کیونکہ اخوتِ انسانیہ شرعاً غیر مقصود ہے۔ البتہ لوگوں میں جنسیت انسانیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک کافر کسی مسلمان کا بھائی تو نہیں ہو سکتا البتہ جنس انسانیت میں اس کے شریک ضرور ہے۔

غرض مسلمان بھائی کی بیع پر اپنی بیع کرنا منع ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ الف نے ب سے ایک گھڑی ہزار روپے میں خریدی۔ اتنے میں ج نے آ کر الف سے کہا کہ ایسی ہی گھڑی میرے پاس نوسو روپے میں بھی مل سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ بیع پر بیع ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ میں ہزار روپے میں تمہیں اس سے بھی اچھی گھڑی دے سکتا ہوں۔ یہ بھی منع اور حرام ہے اور یہ بیع باطل ہوگی۔ کیونکہ حدیث میں وارد نہی اسی بیع کے بارے میں ہے۔

اسی طرح یہی حکم شراء کا بھی ہے کہ ایک مسلمان کی خرید پر اپنی خرید نہ کرے جیسے ایک شخص ایک گھڑی سو روپے میں خرید رہا ہو اتنے میں دوسرا آ کر یہ کہے کہ میں یہ گھڑی دوسو روپوں میں خریدنے کو تیار ہوں یہ بھی منع اور حرام ہے۔

شراء کو بیع کے ملحق کرنے کی درج ذیل وجوہات ہیں:

(1) کبھی بیع پر شراء کا بھی اطلاق کر دیا جاتا ہے۔

(2) شراء بیع کے معنی میں ہے اور شارع نے متماثلین میں فرق نہیں کیا۔ لہٰذا جب ایک کی بیع پر بیع کرنا حرام ہے تو ایک کی شراء پر شراء کرنا بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا۔

(3) تیسری وجہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں شراء کا ذکر صراحۃً آتا ہے۔ جیسا کہ متن میں مذکور ہے۔

پھر چونکہ اجارہ یہ منافع کی بیع ہے، لہٰذا اجارہ بھی بیع کے حکم میں داخل ہوگا، اور اپنے بھائی کے اجارہ پر اجارہ کرنا حرام ہوگا۔

وَلَا يَخْطُبُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ: خطبہ پیغام نکاح کے بھیجنے کو کہتے ہیں۔ ایک کے پیغام نکاح پر اپنا پیغام نکاح بھیجنا حرام ہے۔ کیونکہ اس میں اپنے بھائی کے حق پر ظلم کرنا ہے، اور جب مسلمان کے پیغام نکاح پر نکاح کا پیغام بھیجنا حرام ہے تو

❶ صحيح البخاري: 2140- صحيح مسلم: 1515.

ایک نصرانی کے کسی نصرانیہ کو بھیجے پیغام نکاح پر اپنا پیغام نکاح بھیجنا بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا۔

یہ حکم عورتوں کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا اگر کسی عورت نے کسی مرد کو نکاح کا پیغام بھیجا ہے تو دوسری عورت کو اس پر اپنا پیغام بھیجنا حرام ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ اس باب میں عورت کا حکم مرد سے جدا ہے، وہ یوں کہ دوسری عورت کے پیغام نکاح بھیجنے سے ضروری نہیں کہ پہلی کا بھیجا پیغام اکارت ہی جائے کیونکہ مرد کے لیے دونوں کو بیک وقت نکاح میں لینا ممکن ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بھلا اس بات کا قائل کون ہے کہ ایسا ہر مرد کے لیے ممکن ہے؟؟!!

عَلٰى خِطْبَةِ أَخِيهِ: یہ الفاظ بتلاتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو کسی طرف سے بھی پیغام نکاح نہ ملا ہو، اسے پیغام نکاح بھیج سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی کو ایک عورت کی طرف بھیجے گئے نکاح کے پیغام کا علم ہی نہ ہو تو اس کے لیے بھی اس عورت کو پیغام نکاح بھیجنا جائز ہے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کسی کے پیغام نکاح کا علم ہو پر اس بات کا علم نہ ہو کہ وہ پیغام نکاح رد ہو گیا ہے یا قبول ہو گیا تو اس وقت تک اپنا خطبہ جائز نہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ کیونکہ ابھی تک پہلا پیغام نکاح قائم ہے۔

پھر اگر پہلے پیغام نکاح والا دوسرے کو پیغام نکاح کرنے کی اجازت دے دے تو یہ جائز ہوگا۔ کیونکہ اس پہلے نے اپنے حق سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کا وہ مختار ہے۔

وَلَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ: یہاں عورت کے عورت پر حق کا بیان ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک عورت اپنی دوسری دینی بہن کو طلاق دے دیے جانے کا مطالبہ نہ کرے۔ جیسے زید سلمی سے شادی کرنا چاہے اور سلمی یہ شرط رکھ دے کہ جب تک تم اپنی پہلی بیوی جمیلہ کو طلاق نہ دو گے، میں تمہارے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہیں۔ ایسا کہنا یہ حرام ہے۔

عَلٰى أُخْتِهَا: مراد مسلمان بہن ہے۔ لیکن یہ اغلب کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا ایسا کرنا کسی نصرانیہ کے ساتھ بھی جائز نہ ہوگا۔

لَا يَسُومُ: ان کلمات میں بھی دو اعراب کا احتمال ہے، جن کی تفصیل "لَا يَبِيعُ" کے کلمات کی تحقیق میں گزر چکی ہے۔

لَا يَسُومُ: یہ "اَلسَّوْم" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: گاہک کا سودا لینے کے لیے اس کا بھاؤ اور نرخ طے کرنا۔

معلوم ہوا کہ جب بائع اور مشتری سامان کے کسی ایک بھاؤ پر باہم متفق ہو جائیں تو اس کے بعد کسی تیسرے کا آگے بڑھ کر اپنا بھاؤ پیش کرنا منع اور حرام ہوگا۔

لِتَكْفَأَ مَا فِي إِنَائِهَا: مذکورہ لام تعلیل کا بھی ہو سکتا ہے اور عاقبت ❶ کا بھی۔ پس اگر تو یہ لام تعلیل کا ہو تو یہ تحریم خاص اس عورت کے لیے ہوگی اور اگر اس لام کو عاقبت کا مانیں تو یہ تحریم عام ہوگی۔ چنانچہ نصوص کے عموم میں تأمل سے راجح یہی لگتا ہے کہ یہ لام عاقبت کا ہے، اور برتن کو اوندھا کرنے سے مراد اسے طلاق دلوا کر اس کی روزی قطع کرنا اور اسے ضرر پہنچانا ہے جو حرام ہے۔

---

❶ لام عاقبت وہ لام ہے جو کسی شے کے آخری حال اور انجام کو بتلانے کے لیے آتا ہے۔ اسے لام صیرورت اور لام المآل بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا﴾ (القصص: 8) ''تو فرعون کے گھر والوں نے اسے اٹھا لیا، تاکہ آخر ان کے لیے دشمن ہو اور غم کا باعث ہو۔'' ''ان کو آلِ فرعون نے اٹھا لیا جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ آل فرعون کے لیے دشمن اور باعث غم بن گئے۔'' (نسیم)

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں متعدد مضامین کا بیان ہے جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے۔ مزید مضامین کی تفصیل یوں ہے:

- ...... اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا کرنا حرام ہے۔
- ...... دوسرے کے پیغام نکاح پر اپنا پیغام بھیجنا حرام ہے۔
- ...... کسی عورت کا پہلی بیوی کی طلاق کی شرط پر نکاح کے لیے آمادہ ہونا حرام ہے۔
- ...... دوسرے کے بھاؤ پر اپنا بھاؤ پیش کرنا حرام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ایک مسلمان کے سودے پر سودا کرنا حرام ہے جس کی دلیل "لا یَبِیعُ" کے الفاظ ہیں۔
- اخیہ کی قید سے ذمی نکل جاتا ہے، اور یہی راجح قول ہے۔ لہٰذا کسی ذمی کے سودے پر سودا کرنا جائز ہے۔
- بیع میں شراء اور اجارہ بھی داخل ہے۔ بلکہ اس حکم میں جملہ عقود داخل ہیں۔ جس کے دلائل اوپر ذکر کر دیے گئے ہیں۔
- مسلمان کے خطبہ پر خطبہ حرام ہے۔ البتہ اس حکم میں ذمی داخل نہیں۔ ہاں نصرانی اور نصرانیہ اس حکم میں داخل ہیں۔
- اگر پہلا خطبہ رد ہو جائے یا صاحب خطبہ دوسرے کو خطبہ کی اجازت دے دے یا دوسرے خاطب کو پہلے خطبہ کا علم نہ ہو تو ان صورتوں میں خطبہ حرام نہ ہوگا۔
- پہلی بیوی کو طلاق دینے کے مطالبہ پر نکاح پر راضی ہونا حرام ہے۔ اس کی دلیل "وَلَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا" کے الفاظ ہیں۔ چاہے اس کا ارادہ پہلی بیوی کی روزی قطع کرنے کا ہو اور چاہے محض اس کی ایذا رسانی مقصود ہو، دونوں صورتوں میں ایسا کرنا حرام ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسی شرط باطل ہے کہ یہ قول ضعیف ہے۔

لیکن اگر فرض کیا کہ ایسی شرط باطل ہوتی ہے اور شادی کے بعد خاوند پہلی بیوی کو طلاق دینے کے لیے تیار نہ ہو کہ یہ شرط باطل تھی تو کیا دوسری بیوی کو اس صورت میں فسخ نکاح کا اختیار ہوگا یا نہیں؟ تو اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ: اگر تو وہ اس حکم کو نہ جانتی تھی تو اسے فسخ نکاح کا اختیار ہوگا کیونکہ اس عورت کو ایک ایسی بات کی سزا نہیں دی جا سکتی جسے وہ جانتی بھی نہیں، اور اگر وہ جانتی تھی اور پھر بھی اس نے یہ شرط رکھی تھی تو اسے خاوند سے جدائی اختیار کرنے کا حق نہ ہوگا۔

- اور اگر کسی عورت نے پہلی بیوی کی مصلحت کی خاطر یہ مطالبہ رکھا تھا۔ جیسے پہلی بیوی خاوند سے تنگ تھی اور اس سے خلاصی چاہتی تھی اور اس دوسری عورت نے اس کی مدد کرنے کے لیے یہ بات شرط رکھ دی تو یہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ محمود بھی ہوگا۔ کیونکہ اس طرح یہ نئی بیوی پہلی کو اس کی تنگ زندگی سے نجات دلوا دے گی۔

اور اگر اس عورت کا یہ مطالبہ خود خاوند کی کسی مصلحت کے لیے ہو جیسے پہلی بیوی اس پر ظلم ڈھاتی ہو اور اس سے بیگار لیتی ہو تو بھی پہلی کی طلاق کا مطالبہ جائز ہوگا بلکہ مستحسن بھی ہوگا۔ کیونکہ اس میں ایک دبے اور پسے ہوئے خاوند کو ظالم بیوی سے نجات دلانا ہے۔

اور اگر یہ مطالبہ محض پہلی بیوی کی ایذاء رسانی اور اس کی روزی کے منقطع کر دینے کے لیے ہو تو ناجائز اور حرام ہوگا۔

بیع میں ذو رحم رشتہ داروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا حرام ہے

797- وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رضي الله عنه قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: ((مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ وَالِدَةٍ وَوَلَدِهَا فَرَّقَ اللهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَحِبَّتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)).

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''جو ماں اور اس کے بچے کو ایک دوسرے سے جدا کرے گا تو رب تعالیٰ روزِ قیامت اس کے اور اس کے عزیزوں کے درمیان جدائی کر دے گا۔''❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَلَكِنْ فِي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ.

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ البتہ اس حدیث کی اسناد میں کلام ہے اور اس کا ایک شاہد بھی ہے۔

798- وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضي الله عنه قَالَ: ((أَمَرَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ أَبِيعَ غُلَامَيْنِ أَخَوَيْنِ، فَبِعْتُهُمَا، فَفَرَّقْتُ بَيْنَهُمَا. فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: ((أَدْرِكْهُمَا فَارْتَجِعْهُمَا، وَلَا تَبِعْهُمَا إِلَّا جَمِيعًا)).

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک دفعہ) نبی کریم ﷺ نے مجھے دو ایسے غلاموں کو بیچنے کا حکم دیا جو (سگے) بھائی تھے۔ سو میں نے ان دونوں کو جدا جدا کر کے بیچ دیا۔ پھر خدمت نبوی میں (حاضر ہوکر) یہ بات گوش گزار کر دی۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان دونوں کو جا کر تلاش کرو، اور ان دونوں (کی بیع) کو واپس کراؤ، اور انہیں بیچو تو اکٹھا ہی بیچو۔''❷

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَقَدْ صَحَّحَهُ،

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔

---

❶ جامع الترمذی: 1283- مسند احمد: 412/5- المستدرك للحاكم: 63/2- حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے۔ لیکن حاکم کا کلام محل نظر ہے۔ کیونکہ حی بن عبداللہ سے صحیح مسلم میں کوئی حدیث مروی نہیں۔ بلکہ بعض محدثین نے اس راوی میں کلام بھی کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں نظر ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: اس کی احادیث منکر ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں: اس کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ امام نسائی فرماتے ہیں: یہ راوی قوی نہیں۔ ابن قطان کہتے ہیں: اس راوی کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح نہیں کہا۔ ابن قطان کا یہ قول امام موصوف رحمہ اللہ کے متن میں مذکورہ کلام کے منافی و خلاف ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جامع الترمذی کے کسی نسخہ میں اس حدیث کی تصحیح مذکور ہو یا امام موصوف رحمہ اللہ سے کوئی سبقت نظر ہوگئی ہو۔ واللہ اعلم۔ دیکھیں: المجموع: 434/9- نصب الراية: 23/4- رہا وہ شاہد جس کا ذکر امام موصوف رحمہ اللہ نے کیا ہے تو وہ "شعب الایمان للبیهقی: 484/7" میں ہے۔ لیکن وہ روایت منقطع ہے۔

❷ مسند احمد: 126/1- المنتقى لابن جارود: 575- المستدرك للحاكم: 63/2- هيثمی: (107/4) کہتے ہیں: امام احمد کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ جامع الترمذی: 1284- سنن ابن ماجه: 2249- امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث مقبول نہیں۔ کیونکہ اس حدیث کا مدار حجاج بن ارطاۃ پر ہے جو ضعیف ہے۔ دوسرے یہ روایت مرسل ہے کیونکہ میمون بن ابی شبیب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: المجموع: 343/9- یہی بات ابو حاتم نے بھی کی ہے جسے ان کے بیٹے نے "العلل: 386/1" میں نقل کیا ہے۔

ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ الْقَطَّانِ.

ابن خزیمہ، ابن جارود، ابن حبان، حاکم، طبرانی اور ابن قطان (جیسے ائمہ) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :...... مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں ایک ہی مضمون ذکر ہے، وہ یہ کہ ذورحم قرابتداروں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے بیچنا حرام ہے۔ لہٰذا بھائی بھائی کو، ماں بیٹے کو اور باپ بیٹے کو جدا کر کے بیچنا حرام ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے پر وعید مذکور ہے اور وعید کسی شے کی تحریم کو بتلاتی ہے۔

پس اگرچہ پہلی روایت ضعیف ہے لیکن دوسری روایت کے مضمون سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایسا کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے، اور صحیح قول یہ ہے کہ یہ بیع بھی غیر صحیح اور فاسد ہوتی ہے۔ بلکہ حرام اور کبیرہ گناہ ہوگی۔ لہٰذا اس بیع کا فسخ واجب ہوگا۔ جیسا کہ حدیث علی رضی اللہ عنہ کا یہی مقتضی ہے۔ کیونکہ علماء کے ہاں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جب شارع سے نہی نفس عقد پر واقع ہو تو وہ عقد غیر صحیح اور فاسد ہوتا ہے جس کا ختم کرنا واجب ہوتا ہے۔

مذکورہ دونوں حدیثوں کا مضمون واضح ہے کہ قرابتداروں میں تفریق کر کے ان کو بیچنا حرام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بیع میں قرابتداروں میں تفریق حرام ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔
- یہ رب تعالیٰ کی بندوں پر رحمت ہے کہ اس نے قرابتداروں میں تفریق کو حرام قرار دیا ہے۔
- معلوم ہوا کہ جس بیع میں قرابتداروں میں تفریق واقع ہو اس کا رد واجب ہے۔ اس کی دلیل "أَدْرِكْهُمَا فَارْتَجِعْهُمَا" کے الفاظ ہیں، اور یہ حکم ہر باطل عقد کا بھی ہے کہ اس کا رد واجب ہوتا ہے۔
- مذکورہ حکم چھوٹے اور بڑے دونوں کو شامل ہے۔ حدیث کے ظاہر کا مقتضی یہی ہے۔ لہٰذا بیٹا چاہے بالغ اور اپنے امور کا ذمہ دار بھی ہو تب بھی اس کو اس کی ماں سے جدا کر کے بیچنا جائز نہ ہوگا۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ یہ حکم نابالغ بچے کے ساتھ خاص ہے۔ لہٰذا بالغ بچے کو اس کی ماں سے جدا کر کے بیچ سکتے ہیں۔ اس کی دلیل "غلامین" کا لفظ بھی ہے جس کا اطلاق عموماً نابالغ پر ہوتا ہے۔ الا یہ کہ مجازاً بالغ مراد لیا جائے اور یہی قول اقرب ہے کہ جب تک ایک بچہ اپنی ماں وغیرہ کی شفقت و رحمت کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے ماں سے جدا کر کے بیچنا جائز نہ ہوگا۔ البتہ جب وہ بالغ اور اپنے امور میں مستقل ہو جائے تو دونوں میں تفریق کر کے بیچ سکتے ہیں۔
- البتہ یاد رہے کہ یہ حکم صرف بیع کا ہے۔ لہٰذا عتق میں بچے کے بالغ یا نابالغ ہونے کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ کسی نابالغ بچے کو اکیلے بھی آزاد کر سکتے ہیں، اور اس کے برعکس بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے میں دونوں پر ضرر نہیں کیونکہ آزاد ہونے کے بعد بچہ یا ماں ایک دوسرے کی طرف لوٹ سکتے ہیں کیونکہ اب وہ کسی کی ملکیت نہیں رہے۔

منڈی میں نرخوں کے مقرر کرنے کا یعنی نرخنامہ طے کرنے کا بیان

799- وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ﷺ قَالَ: غَلَا السِّعْرُ فِي الْمَدِيْنَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ النَّاسُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! غَلَا السِّعْرُ،

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: دورِ نبوی میں (ایک دفعہ) مدینہ منورہ میں (چیزوں کے) نرخ بڑھ گئے تو لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! (چیزوں کے) نرخ

فَسَعِّرْ لَنَا ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ ، وَإِنِّيْ لَأَرْجُوْ أَنْ أَلْقَى اللّٰهَ تَعَالَى وَلَيْسَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِيْ بِمَظْلِمَةٍ فِيْ دَمٍ وَلَا مَالٍ)).

گراں ہو گئے ہیں تو (کیوں نہ) آپ ﷺ ہمارے لیے چیزوں کا ایک نرخ مقرر فرما دیجئے (تاکہ کوئی کم زیادہ کر کے نہ بیچے)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بے شک وہی اللہ ہے جو (چیزوں کے) بھاؤ مقرر کرتا ہے (یعنی چیزوں کے نرخوں کا اتار چڑھاؤ اس ایک اکیلے اللہ کے ہاتھ میں ہے) (وہی ہے جو چیزوں کو) قبضہ میں لیتا ہے (یعنی ان کو کم کرتا ہے اور) پھیلاتا ہے (یعنی ان کو زیادہ کرتا ہے اور وہی) روزی رساں ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ رب تعالیٰ سے اس حال میں جا ملوں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے نہ کسی خونِ (ناحق) کا اور نہ کسی (ناحق) مال کا مطالبہ ہی کرنے والا ہو۔“ ❶

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث ......غَلَا السِّعْرُ: غَلَا يَغْلُوْ کا معنی ہے کسی شے کا اونچا ہونا اور بڑھنا۔ سعر یہ بازار میں چیزوں کی قیمتِ فروخت اور قیمتِ خرید کو کہتے ہیں۔ (اردو میں اسے چیزوں کا بھاؤ اور نرخ کہا جاتا ہے)۔

فَسَعِّرْ لَنَا: یعنی اگر آپ بازار میں بکنے والی چیزوں کا ایک نرخ مقرر فرما دیں تو پھر کسی کو کوئی چیز مہنگے داموں بیچنے کی گنجائش نہ رہے گی۔

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ: جس پر نبی کریم ﷺ نے یہ جواب عنایت فرمایا کہ یہ بات آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ امر اس ذاتِ پاک کے ہاتھ میں ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق مالک اور بادشاہ ہے۔ چیزوں کے نرخوں کا اتار چڑھاؤ اسی اللہ رب العزت کے دستِ مبارک میں ہے۔ وہ یوں کہ مہنگائی کا سبب یا تو لوگوں کی طلب میں زیادتی ہوتی ہے یا پھر رسد میں کمی ہوتی ہے یا پھر حرصِ نفس کی طمع اور حصولِ زر کا جذبہ ہوتا ہے اور یہ باتیں صرف اور صرف رب تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ جب رسد میں کمی ہوتی ہے تو مہنگائی بڑھتی ہے اسی طرح زیادہ کمانے کا لالچ اور ڈھیروں مال اکٹھا کرنے کا جذبہ بھی مہنگائی کا کوئی سبب ہوتی ہے۔ تو رب تعالیٰ جہاں بندوں کا خالق ہے وہیں ان کے افعال کا بھی خالق ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بھاؤ مقرر کرنے والی ذات رب تعالیٰ کی ہے کہ وہ مہنگائی کے بڑھنے اور کم ہونے کے اسباب کا خالق ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3415۔ جامع الترمذی: 1314۔ سنن ابن ماجہ: 2200۔ مسند احمد: 85/3۔ صحیح ابن حبان: 4935۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ علامہ عجلونی رحمہ اللہ ”کشف الخفاء: 474/2“ میں فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد صحیح مسلم کی شرط پر ہے اور اس باب میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں۔ دیکھیں: الدرایۃ لابن حجر: 234/2۔ مجمع الزوائد للہیثمی: 99/4 - 100۔

الْقَابِضُ الْبَاسِطُ: قابض یہ قبض سے ہے جس کا معنی کسی چیز کو قبضہ میں لینا اور اسے کم کرنا ہے اور باسط یہ بسط سے ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو پھیلانا اور زیادہ کرنا۔ مراد روزی کو گھٹانا اور بڑھانا ہے، اور ان الفاظ کو اس ارشاد باری تعالیٰ سے اخذ کیا گیا ہے:

﴿وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُطُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ٥﴾ (البقرة: 245)

''اور اللہ بند کرتا اور کھولتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

الرَّازِقُ: مراد روزی رساں ہے۔ بلاشبہ ساری کی ساری مخلوقات کو روزی دینے والا صرف اور صرف ایک اکیلا اللہ ہی ہے۔
پھر رزق کی دو قسمیں ہیں:

(1) حیاتِ جسمانی کے مادہ کا رزق۔

(2) حیاتِ روحانی کے مادہ کا رزق۔

پہلی قسم کا رزق کھانے پینے اور پہننے اور رہنے کی اشیاء سے پورا ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم کا رزق علم اور ایمان کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔

تب پھر حرام کمانے والے کا رازق بھی اللہ ہی ہے اور یہاں رزق اپنے پہلے معنی میں ہے۔ جبکہ دوسرے معنی میں حرام کمانے والا کمزور ایمان والا ہے۔ کیونکہ اگر اس کا ایمان مضبوط ہوتا تو وہ کبھی حرام کمانے کی طرف نہ جاتا۔

اسی طرح کافر بھی رب تعالیٰ سے رزق کے پہلے معنی کے اعتبار سے روزی پاتا ہے۔ جبکہ اس کا دل ایمان اور یقین سے خالی ہوتا ہے۔

وَاِنِّي لَأَرْجُو..... فِي دَمٍ وَلَا مَالٍ: اَرْجُوْ یہ "رَجَاءٌ" مصدر سے فعل مضارع کا صیغہ واحد متکلم ہے۔

رجا مطلوب کے حصول کے اسباب کے پائے جانے کے وقت دل کی طلب کو کہا جاتا ہے۔ تب پھر رجاء ان امور میں ہوتی ہے جن کا حصول ممکن اور آسان ہو جبکہ تمنا ایسے امور میں ہوتی ہے جن کا حصول متعذر بلکہ بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے۔

البتہ طلب کے معنی میں رجاء اور تمنا دونوں مشترک ہیں۔ ہاں رجاء امور قریبہ میں جبکہ تمنا امور بعیدہ میں ہوتی ہے۔

اَلْقَى: یہ لِقَاء سے فعل مضارع کا صیغہ واحد متکلم ہے۔ لقاء کا معنی ہے ملاقات کرنا اور دوسرے کو جا ملنا۔ مراد مرنے کے بعد روزِ قیامت رب تعالیٰ کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

تَعَالَى: یہ "عُلُوّ" سے فعل ماضی کا صیغہ واحد غائب ہے اور یہ بابِ تفاعل سے ہے۔ علو کا معنی بلندی ہے۔ پس رب تعالیٰ کو اپنی تمام مخلوقات پر حسی اور معنوی ہر طرح کی بلندی اور برتری حاصل ہے۔

بِمَظْلِمَةٍ: مَظْلِمَة: مظلوم کے مطالبہ کو اور مظلوم سے چھینی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ مظالم اسی مظلمہ کی جمع ہے نہ کہ ظلم کی جمع ہے۔

مذکورہ حدیث میں مظلوم کے اس مطالبہ کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: (1) خونِ ناحق کا مطالبہ۔ (2) اور دوسری مالِ ناحق کا مطالبہ۔

خونِ ناحق کا مطالبہ یہ ہے کہ کسی نے دوسرے کو بنا کسی حق کے مار دیا کہ ایک مظلوم وارث اس خون ناحق کے انصاف کا مطالبہ کرے۔ اور مالِ ناحق کا مطالبہ یہ ہے کہ کسی سے زور زبردستی کے ساتھ اس کا مال چھین لیا جائے اور وہ مظلوم

چھینے جانے والے اس مال کی واپسی کا مطالبہ کرے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ چیزوں کے نرخوں کا بڑھنا اور گھٹنا اور نرخوں کے بڑھنے گھٹنے کے اسباب کا پیدا کرنا سب رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ کیونکہ وہی خالق مالک، رب اور رازق ہے۔

مذکورہ احادیث میں دوسرا اہم مضمون یہ ہے کہ جب چیزوں کے بھاؤ رب تعالیٰ کے امر سے طے ہوتے ہیں تو لوگوں پر چیزوں کے بھاؤ طے کرنا گویا کہ ایک طرح کا ظلم ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ میں رب تعالیٰ سے اس حال میں جا ملنا چاہتا ہوں کہ میرے ذمہ کسی کا حق نہ ہو، مال سے متعلق اور نہ جان سے متعلق۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ مہنگائی دل کے قلق اور اضطراب کا سبب ہے۔ جبکہ چیزوں کے نرخوں کے گرنے میں لوگوں پر وسعت اور آسانی ہے۔ البتہ بسا اوقات چیزوں کے نرخ گرانے میں دوسروں کا ضرر ہوتا ہے لیکن اعتبار عموم کا ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باعثِ تشویش امور کی شکایت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس امید پر کیا کرتے تھے کہ یا تو آپ ﷺ خود اس مسئلہ کا کوئی حل نکالیں گے یا پھر ان کے حق میں دعا ہی کر دیں گے۔
- مذکورہ حدیث میں اس بات کا اثبات ہے کہ امور سب کے سب صرف رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اس کی دلیل "اَلْقَابِضُ" کا لفظ ہے۔
- رب تعالیٰ کی ایک صفت تسعیر بھی ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ ہی چیزوں کے نرخوں کے گھٹنے اور بڑھنے کے اسباب پیدا فرماتا ہے جن کا تفصیلی تذکرہ اوپر غریب الحدیث کے تحت کیا جا چکا ہے۔
- قابض اور باسط رب تعالیٰ کے صفاتی اسمائے حسنیٰ ہیں۔
- اسی طرح رازق بھی رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔
- بلاوجہ نرخوں کا بڑھانا اور مہنگائی پیدا کرنا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے ظلم قرار دے کر اس سے پناہ مانگی ہے۔
- اگر تو مہنگائی کا سبب ذخیرہ اندوزی ہو تو یہ حرام ہے۔ ایسی صورت میں والی اور حاکم لوگوں کو مصنوعی مہنگائی سے بچانے کے لیے اشیاء کے نرخ مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا سبب طلب کی کثرت اور رسد کی قلت ہو تو تسعیر درست نہیں۔ کیونکہ یہ بات بندوں کی قدرت میں نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں حاکم اور والی کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی اشیاء ضرر یہ بہم مہیا کرنے کے انتظامات کرے۔

ذخیرہ اندوزی کا بیان

800۔ وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ)).

حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ذخیرہ اندوزی خطا کار ہی کرتا ہے۔''[1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم: 1605.

غریب الحدیث :...... **لَا یَحْتَکِرُ**: یہ احتکار (باب افتعال) سے مشتق ہے اور فعل مضارع منفی واحد غائب کا صیغہ ہے۔ یہ کسی شے کے روکنے کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد کسی شے کو بیچنے سے روکنا ہے، اور اسی کو ذخیرہ اندوزی کہتے ہیں۔

احتکار کی دو قسمیں ہیں:

(1) مطلق احتکار کہ ہر آنے والے کو نہ بیچا جائے۔

(2) مفید احتکار کہ من چاہے داموں پر چیز بیچنے کے لیے اس کو روک رکھا جائے۔

الخَاطِیءُ: خطا کار، لیکن خاطی اس خطا کار کو کہتے ہیں جو قصداً اور جانتے بوجھتے خطا کا مرتکب ہوتا ہے۔ البتہ جس سے بلا قصد وارادہ خطا ہو اس کو مُخْطِی کہا جاتا ہے۔ تب پھر محتکر (ذخیرہ اندوز) وہ خطا کار ہو گا جو ایسا جان بوجھ کر اور دوسروں کے ضرر کے ارادے سے کرے۔

ایسے ذخیرہ اندوز کو اس فعل سے باز رکھنا واجب ہے اور اگر وہ نہ مانے تو اس کو ذخیرہ شدہ اشیاء کے بیچنے پر مجبور کیا جائے گا، اور اگر وہ من چاہے بھاؤ پر چیزیں بیچنے کے لیے ایسا کر رہا ہے تو اسے بازار کی رائج قیمت پر چیزیں بیچنے پر مجبور کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ یہاں مذموم احتکار سے وہ احتکار مراد ہے جن کا تعلق لوگوں کی روز مرہ کی ضروریات سے ہو۔ لیکن پھر بھی درست قول یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی مطلق حرام ہے چاہے اس کا تعلق لوگوں کی ضروریات سے ہو یا آسائشوں اور سہولتوں سے ہو۔ غرض بازار میں جو شے بھی بکتی ہے اسے ذخیرہ کرنے والا محتکر خاطی کہلائے گا۔ یہی قول درست اور راجح ہے۔

پھر حدیث کا عموم اس بات کو بھی مقتضی ہے کہ چاہے احتکار فردِ واحد سے ہو تب بھی مذموم ہے اور چاہے یہ احتکار چند لوگوں کی ملی بھگت سے ہو تب بھی مذموم ہے۔

مناسبتِ حدیث :...... مذکورہ حدیث کو حدیث انس رضی اللہ عنہ کے بعد یہ بتلانے کے لیے لایا گیا ہے کہ اگر مہنگائی کا سبب لوگوں کی پیدا کردہ مصنوعی قلت اور ذخیرہ اندوزی ہو تو والی پر واجب ہے کہ وہ چیزوں کے نرخ مقرر کرے اور انہیں مناسب نفع کے ساتھ بیچنے پر مجبور کرے۔

مضمون حدیث:...... ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔ مذکورہ حدیث میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ذخیرہ اندوزی حرام ہے اس کی دلیل "لَا یَحْتَکِرُ إِلَّا خَاطِیءٌ" کے الفاظ ہیں، اور یہ تحریم عام ہے کیونکہ مذکورہ حدیث مطلق ہے نہ کہ مقید۔
- مسلمانوں کی خیر خواہی واجب ہے۔ کیونکہ ذخیرہ اندوزی خیر خواہی کے بالکل منافی ومخالف ہے۔
- معلوم ہوا کہ جو لوگ بازار کے رائج نرخوں پر بیچتے ہیں وہ درستی پر بھی ہیں اور عنداللہ ماجور بھی ہیں۔

اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ جمع کر کے ان کو بیچنے کا بیان

801- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((لَا تَصُرُّوا الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ، فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدُ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْلُبَهَا. إِنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اونٹنیوں اور بکریوں کے تھنوں کو (اس غرض سے) باندھ کے نہ رکھو (تاکہ بچہ دودھ پی نہ سکے اور

شَاءَ أَمْسَكَهَا . وَإِنْ شَاءَ رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ)).

تھنوں میں دودھ جمع ہو کر جانور زیادہ دودھ دینے والا لگنے لگے)۔ پس جس نے ایسا کرنے کے بعد جانور خریدا تو اسے اس جانور کا دودھ دوہنے کے بعد دو باتوں میں سے بہتر کا اختیار ہوگا۔ چاہے تو اس جانور کو اپنے پاس رکھ لے اور چاہے تو اس کو ایک صاع کھجور سمیت واپس کر دے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: ((فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ)) .

اور صحیح مسلم کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: وہ تین دن تک اختیار کے ساتھ ہے۔ ❷

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ عَلَّقَهَا الْبُخَارِيُّ ((وَرَدَّ مَعَهَا صَاعًا مِنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ)) . قَالَ الْبُخَارِيُّ : وَالتَّمْرُ أَكْثَرُ .

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ: ''اور وہ اس جانور کے ساتھ کھانے کا ایک صاع بھی واپس کرے جو گندم نہ ہو۔'' امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اکثر روایات میں ''تمر'' کا لفظ ہی آیا ہے۔ ❸

802۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((مَنِ اشْتَرَى مُحَفَّلَةً فَرَدَّهَا فَلْيَرُدَّ مَعَهَا صَاعًا)) .

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: جس نے ایسی بکری خریدی جس کے تھنوں میں (چند دن تک) دودھ جمع کیا گیا ہو اور وہ اسے واپس کرنا چاہے تو اسے ایک صاع کے ساتھ واپس کرے۔ ❹

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

وَزَادَ الْإِسْمَاعِيلِيُّ: مِنْ تَمْرٍ .

اسماعیلی نے اپنی روایت میں یہ الفاظ زائد روایت کیے: ''(ایک صاع) کھجور کا۔''

غریب الحدیث:..... **لَا تَصُرُّوا**: مذکورہ ''لا'' نہی کا ہے۔ لہٰذا یہ فعل نہی کا جمع مذکر حاضر کا معروف کا صیغہ ہے۔ یہ معنی ثلاثی مجرد کے باب سے بھی آتا ہے اور باب تفعیل سے بھی آتا ہے۔ راجح باب تفعیل سے آنا ہے۔ لہٰذا یہ تصریہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔ مذکورہ نہی تحریم کے لیے ہے۔

الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ: یہاں مضاف حذف ہے جو لفظ ''لبن'' ہے۔ مراد اونٹنی اور بکریوں کا دودھ روک کر ان کے تھنوں میں جمع کرنا ہے۔ جاہلیت میں لوگ ایسا اس لیے کرتے تھے تاکہ دیکھنے والا جانور کو زیادہ دودھیل سمجھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا

---

❶ صحيح البخاري: 2148- صحيح مسلم: 1515 .

❷ صحيح مسلم: 1524 .

❸ صحيح البخاري: باب النهي للبائع ألَّا يُحَفِّلَ الإبِلَ...... دیکھیں: فتح الباري: 363/4 .

❹ صحيح البخاري: 2149- اور مذکورہ زیادتی صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ لہٰذا فتح الباري: 368/4 میں امام ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ ''اسماعیلی نے اس حدیث کو مرفوع روایت کیا ہے'' غلط ہے۔ واللہ اعلم۔

کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دھوکا، خیانت اور جعل سازی ہے۔

فقہاء کی اصطلاح میں ایسے فعل کو تدلیس کہتے ہیں۔ تدلیس فریب دہی کو کہتے ہیں۔ یہ بائع کا گھٹیا شے کو عمدہ بنا کر دکھلانا اور فروخت ہونے والی شے کے عیب کو چھپانا ہے۔

الْإِبِل: یہ اسم جمع ہے، اس کا واحد انہی لفظوں سے نہیں آتا۔ البتہ غیر لفظوں سے اس کا واحد ''بعیر'' آتا ہے۔

الْغَنَم: اس کی واحد غنمة آتی ہے۔ یہ لفظ بھیڑ اور بکری دونوں کو شامل ہے۔

فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدُ: ابتاع: اس کا معنی خریدنا ہے۔ "بعدُ" یہ مضاف الیہ کے حذف ہونے کی وجہ سے مبنی بر ضم ہے، اور مضاف الیہ لفظ ''تصریہ'' ہے، اور مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔

فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ: مذکورہ ''فا'' جزائیہ اور جملہ جوابِ شرط ... ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایسے آدمی کو جب دودھ دوہنے کے بعد اس بات کا علم ہوگا کہ یہ جانور اتنا دودھ نہیں دیتا جتنا خریدتے وقت نظر آتا تھا تو اسے دو باتوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا خیار ہوگا چنانچہ وہ جس بات کو بہتر سمجھے اس کو اختیار کرسکتا ہے، اور وہ دو باتیں یہ ہیں:

(1) چاہے تو وہ جانور اسی صفت کے ساتھ رکھ لے۔

(2) اور چاہے تو لوٹا دے۔ البتہ وہ اس کے ساتھ صاع کھجور بھی دے گا۔ ''إِنْ شَاءَ أَمْسَكَهَا، وَإِنْ شَاءَ رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ'' کا یہی مطلب ہے۔

فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ: صحیح مسلم کی روایت کے ان الفاظ کو یہ بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ یہ خیار تین دن تک ہے۔ کیونکہ صحیح بخاری کی روایت میں مدتِ خیار کا ذکر موجود نہیں تھا۔

رَدَّ مَعَهَا صَاعاً مِنْ طَعَامٍ، لَا سَمْرَاءَ: سمراء سے مراد گندم ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے ان الفاظ کو موصول جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے معلق ذکر کیا ہے، اور مقصد یہ بتلانا ہے کہ بعض روایات میں اگرچہ کھانے کے ایک صاع کا بھی ذکر ہے لیکن اکثر روایات میں ''تمر'' کا ہی ذکر ہے۔ ''وَالتَّمْرُ أَكْثَرُ'' کا یہی مطلب ہے۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ مبیع میں خلافِ حقیقت وصف بتا کر بیچنا حرام ہے۔ لہٰذا مبیع بیچتے وقت دھوکا دینے کی بجائے صاف صاف بتلایا جائے کہ یہ مبیع اتنی اتنی صفات اور خصوصیات کی حامل ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بیع وشراء میں تدلیس حرام ہے۔ لہٰذا ابل اور غنم میں تصریہ تدلیس کہلائے گا۔ اس پر قیاس کر کے ہر اس شے کو حرام کہیں گے جس میں تدلیس ہو۔ جیسے پرانے گھر کو رنگ کروا کر نیا باور کروانا، زیادہ عمر کی باندی کے بال سیاہ کر کے اسے کم عمر کا ظاہر کر کے بیچنا، حادثہ کا شکار ہونے والی گاڑی کو رنگ اور مرمت کروا کر بیچنا وغیرہ۔ البتہ اگر بیع کرتے وقت مبیع کی خامی بتلا دی جائے تو بیع جائز ہو جائے گی۔
- اونٹ اور بکری پر قیاس کر کے گائے اور بھینس وغیرہ میں بھی تدلیس اور تصریہ حرام ہوگا۔
- بظاہر یہ حکم حلال جانوروں کے دودھ کا ہے۔ رہے حرام جانور جیسے گدھی تو ان میں تصریہ کے حرام ہونے میں علماء کا

اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ حرام جانور کے دودھ کو بھی اس حکم کے ملحق کیا جائے گا کیونکہ اگر چہ انسان اس کو پیتا نہیں لیکن گدھی کا بچہ تو اس کو پیتا ہے جو مقصود ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ گدھی کا دودھ تصریہ کے حکم میں داخل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے دودھ کا کوئی عوض نہیں۔ جبکہ نبی کریم ﷺ نے یہاں ایک صاع کھجور کو تصریہ کے دودھ کا عوض قرار دیا ہے۔

راجح قول پہلا ہے کہ یہ حکم حلال اور مباح دودھ کے ساتھ خاص ہے۔ ہاں اگر یہ بات گدھی میں عیب شمار ہوتی ہو تو مشتری کو بیع کے فسخ کا حق حاصل ہوگا۔

- جانور کے کم دودھ والا ظاہر ہونے کے بعد حاصل ہونے والا خیار تین دن کا ہے۔جس کی ابتداء پہلی دفعہ کے دودھ دوہنے سے ہوگی۔

اور تین دن کا خیار اس لیے ہے کیونکہ اس مدت میں جانور کی حقیقی طبیعت عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ دودھ جمع شدہ تھا یا حقیقی تھا۔ دوسرے اکثر احکام شرعیہ میں تین کی تعلیق کا اعتبار ہے۔

- جانور میں دودھ کے کم ہونے کا عیب ظاہر ہونے کے بعد مشتری کو دو باتوں کا خیار ہوگا۔ چاہے تو اس جانور کو اسی وصف کے ساتھ رکھ لے، تب پھر وہ اس جانور کو کسی چٹی یا تاوان کے بغیر رکھے گا۔ کیونکہ بہر حال یہ عیب نہیں البتہ ایک دکھائی گئی صفت کا فوات ہے۔ چنانچہ فواتِ وصف کی صورت میں مشتری کو بیع کے فسخ کا اختیار تو ہوتا ہے لیکن اگر وہ مبیع کو رکھے گا تو کسی قسم کی چٹی کے بغیر رکھے گا۔

اور اگر واپس کرے گا تو ایک صاع کھجور بھی ساتھ دے گا، اور یہ اس دودھ کا عوض ہے جو عقد کے وقت جانور کے تھنوں میں تھا۔ نہ کہ بعد میں اترنے والے دودھ کا۔ کیونکہ بعد والا دودھ مشتری کی ملکیت میں پیدا ہوا ہے۔ البتہ بیع کے وقت جمع شدہ دودھ بائع کی ملک میں تھا۔ یہ کھجوریں اس دودھ کا عوض ہیں۔ عوض میں کھجوریں اس لیے مقرر فرمائیں کیونکہ کھجوریں اس اعتبار سے دودھ کے مشابہ ہیں کہ دونوں کو پکائے بنا کھایا جاتا ہے۔ اور ایک صاع قطع نزاع کے لیے مقرر فرمایا تاکہ بائع یا مشتری دودھ کے کم یا زیادہ ہونے کے مدعی نہ بن سکیں۔ رہا یہ سوال کہ کیا عوض میں کھجور ہی دیں گے؟ تو جواب یہ ہے کہ ایک صاع کھجور کے بقدر طعام بھی دے سکتے ہیں، اور یہ قول صحیح ہے۔ کیونکہ اگر مقصود صرف دودھ ہی ہوتا تو دودھ ہی واپس کرنے کا حکم ہوتا۔

- تصریہ کے حرام ہونے کی علت جہاں تدلیس ہے وہیں جانور کی ایذاء رسانی بھی ہے۔ کیونکہ تھنوں میں دودھ روکنے سے جانور کو ایذاء ہوتی ہے، اور ایذاء ظلم ہے۔ یہیں سے ظلم کے حرام ہونے کا بھی علم ہوگیا۔
- شریعت اسلامیہ انسانی حقوق کی محافظ ہے اسی لیے تصریہ منع ہے کیونکہ اس میں مشتری کے مغبون ہونے کا احتمال ہے۔
- خیار کے اثبات میں مشہور گمراہ فرقہ جبریہ کا رد ہے جو انسان کو مجبور محض باور کرتے ہیں۔
- شریعتِ اسلامیہ قطع نزاعات کی بے حد خواہش مند ہے۔ اسی لیے شریعت نے شراء کے وقت کے دودھ کا عوض مقرر کیا ہے۔

خرید و فروخت میں دھوکا اور ملاوٹ حرام ہے

803- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةٍ مِنْ طَعَامٍ، فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهَا. فَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلًا، فَقَالَ: ((مَا هٰذَا يَا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ (بازار میں) کھانے کے ایک ڈھیر کے پاس گزرے۔ آپ ﷺ نے اس ڈھیر میں اپنا دست مبارک داخل

صَاحِبَ الطَّعَامِ!)) قَالَ: أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ، يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: ((أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ؟ مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کیا تو آپ ﷺ کی انگلیوں کو تری لگ گئی (یعنی وہ غلہ نیچے سے گیلا اور اوپر سے سوکھا تھا) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے غلہ والے! یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ بارش میں گیلا ہو گیا تھا اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر تم نے اس گیلے غلہ کو اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیتے (اور جان لیتے کہ یہ غلہ تو گیلا ہے) (پھر فرمایا:) ''جس نے (خرید وفروخت میں) دھوکا دیا وہ مجھ سے نہیں۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **صُبْرَة:** غلہ کا ڈھیر۔ یہ ''صبر'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے روکنا۔ مراد جمع کیا ہوا ڈھیر ہے۔

فَأَدْخَلَ يَدَهُ: مراد نبی کریم ﷺ کا اپنا دست مبارک اس ڈھیر میں داخل کرنا ہے۔ اب یا تو آپ ﷺ نے اس غلہ کا معیار معلوم کرنے کے لیے اس میں اپنا دست مبارک داخل کیا تھا یا پھر آپ ﷺ کو اس غلہ سے نمی کی بو آ گئی تھی۔ غرض آپ ﷺ نے بلا وجہ اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں داخل نہ فرمایا تھا۔

فِيهَا: ''هَا'' ضمیر کا مرجع ''صُبْرَة'' ہے۔

فَنَالَتْ: یہ ''أَصَابَتْ'' کے معنی میں ہے۔

مَا هَذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ: مذکورہ ''مَا'' استفہامیہ ہے، اور یہ استفہام انکاری ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ اے غلہ والے! تم نے ایسا کیوں کیا ہے کہ گیلا غلہ نیچے چھپا کر رکھا ہے۔

أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ: السَّمَاءُ سے مراد بارش ہے۔ بارش پر لفظ سماء کا اطلاق عربی زبان میں عام ہے۔

أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ: مذکورہ استفہام ارشاد کے لیے ہے نہ کہ انکار کے لیے۔ یعنی آپ ﷺ نے اس غلہ والے کی اس بات کی طرف رہنمائی فرمائی کہ اگر غلہ گیلا ہو جائے تو اس کو اوپر رکھا کرے تاکہ خریدنے والے کو اس بات کا علم ہو جائے اور وہ جان لے کہ اس غلہ میں یہ عیب ہے ''كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ'' کا یہی مطلب ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ غلہ کو ڈھیر کی شکل میں بیچ سکتے ہیں، چاہے اس کی مقدار یا وزن معلوم نہ بھی ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس غلہ کو دیکھ کر اسے برقرار رکھا۔ اگر ایسا کرنا حرام ہوتا تو آپ ﷺ اس سے منع فرما دیتے۔ غرض اٹکل سے ڈھیر کی صورت میں غلہ بیچ سکتے ہیں۔ البتہ جہاں کھٹکا اور خطرہ ہو وہاں جائز نہیں۔ جیسے نقدیاں کہ ان کا لین دین اٹکل سے جائز نہیں۔ جیسے دراہم بھری تھیلی دکھا کر یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ یہ شے میں نے اس تھیلی میں بھرے دراہم کے عوض خرید لی کہ نہ معلوم اس تھیلی میں کتنے دراہم ہوں۔ بلاشبہ ایسا کرنا جہالت عظیمہ اور خطرہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

[1] صحيح مسلم: 102.

◈ قابل فروخت شے کو جانچنا پرکھنا اور دیکھ بھال کر لینا جائز ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا غلہ میں ہاتھ ڈال کر اس کے معیار کو جانچنا ہے۔

◈ منکر پر انکار واجب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے گیلے غلہ کو چھپا کر رکھنے پر انکار فرمایا تھا۔

◈ جس شخص کا نام معلوم نہ ہو اسے اس کے پیشہ، ہنر، کام اور سامان کے حوالہ سے پکار سکتے ہیں۔ جیسے نام معلوم نہ ہونے پر کسی کو او سبزی والے، او پاپڑ والے، اور ریڑھی والے، اور رکشہ والے وغیرہ کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''اے غلہ والے۔''

◈ بارش پر لفظ سماء کا اطلاق جائز ہے۔

◈ اگر قابل فروخت شے میں کوئی عیب ہو تو گاہک کو اس عیب کی خبر دینا واجب ہے۔ اس کی دلیل: "أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوقَ الطَّعَامِ: كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ" کے الفاظ ہیں۔ اب عیب کی اطلاع قول سے بھی دی جا سکتی ہے اور فعل سے بھی۔ لیکن فعل سے اطلاق اولیٰ ہے کیونکہ بسا اوقات گاہک بیچنے والے کی بات کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا۔

پھر فعل کے ذریعے عیب کی اطلاع دینے میں ضروری نہیں کہ گھٹیا شے کو اوپر ہی رکھا جائے۔ کیونکہ بسا اوقات اس سے گاہک یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید سارا غلہ یا سارا سامان ہی ایسا ہے۔ اس لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ گھٹیا یا عیب والی شے الگ سے رکھ دی جائے۔ بلاشبہ یہ صورت بائع کے حق میں زیادہ عدل پر مبنی ہے۔ جبکہ مشتری کا اس میں کوئی ضرر نہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر نبی کریم ﷺ نے یہ صورت کیوں نہ بتلائی تو اس کے دو جواب ہیں: (1) یا تو وہاں دونوں قسم کا غلہ واضح تھا۔ (2) یا پھر اس آدمی کے پاس دو برتن نہ تھے جن میں دونوں قسم کا غلہ جدا جدا کر کے رکھ سکتا۔

◈ دھوکا دینا حرام ہے۔ چاہے یہ دھوکا دہی مسلمان کے ساتھ ہو یا کافر کے ساتھ، اور کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر "فَلَيْسَ مِنَّا" کی وعید بھی آئی ہے۔ کیونکہ اس میں نبی کریم ﷺ کا اظہار براءت فرمانا ہے اور یہ کسی کام کے کبیرہ گناہ ہونے کی علامت ہے۔

◈ جب تک کسی بیع میں دھوکا باقی ہے، وہ بیع جائز نہ ہوگی۔

ناجائز کام میں صرف کرنے کے لیے مبیع کو روک رکھنا حرام ہے

804۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ حَبَسَ الْعِنَبَ أَيَّامَ الْقِطَافِ حَتَّى يَبِيعَهُ مِمَّنْ يَتَّخِذُهُ خَمْرًا فَقَدْ تَقَحَّمَ النَّارَ عَلَى بَصِيرَةٍ)).

عبداللہ بن بریدہ اپنے والد ماجد (حضرت بریدہ ﷛) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''جس نے (پھلوں کی) تڑائی کے دنوں میں انگوروں کو (توڑ کر بیچنے سے) روکے رکھا تاکہ اس کو انگور بیچے جو اس کی شراب بناتا ہو تو وہ جان بوجھ کر جہنم میں جا گھسا ہے۔''❶

---

❶ المعجم الاوسط: 5356۔ علامہ ہیثمی "مجمع الزوائد: 90/4" میں کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں عبدالکریم بن عبدالکریم ہے۔ ابو حاتم اس کے بارے میں کہتے ہیں: اس کی حدیث کذب پر دلالت کرتی ہے۔ امام ابن حبان نے "المجروحین: 236/1" میں حسن بن مسلم [illegible] میں کہا ہے: یہ حدیث بے اصل ہے۔ لہٰذا اس منکر حدیث کو روایت کرنے کی وجہ سے یہ چاہیے کہ حسن کو عادل رواۃ کی بجائے مجروح رواۃ میں شمار [illegible]

رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ . اس حدیث کوامام طبرانی نے حسن اسناد کے ساتھ "المعجم الاوسط" میں روایت کیا۔

غریب الحدیث: ......**مَنْ حَبَسَ**: مذکورہ مَنْ شرطیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے، اور حَبَسَ یہ مَنَعَ کے معنی میں ہے۔مراد انگوروں کو بیلوں پر لگے رہنے دینا ہے۔

أَيَّامَ الْقِطَافِ: قطاف پھلوں کی تڑائی اور کٹائی کو کہتے ہیں۔مراد وہ دن ہیں جن میں انگوروں کوان کی بیلوں سے توڑ کر منڈیوں میں لے جا کر بیچا جاتا ہے۔

اب لوگ تازہ انگور بھی کھاتے ہیں اوراس کوسکھا کر اس کی کشمش بنا کر بھی کھاتے ہیں۔جبکہ بعض اس کی شراب بناتے ہیں۔مذکورہ حدیث میں انہی لوگوں کو بیچنے کی ممانعت ہے۔

حَتَّى يَبِيعَهُ مِمَّنْ يَتَّخِذُهُ خَمْراً: مذکورہ "حتّٰى" تعلیل کے لیے ہے، اور مِنْ "عَلَى" کے معنی میں ہے۔

اوراتخاذ سے مراد "صُنع" ہے۔مراد شراب بنانا اور تیار کرنا ہے۔

تَقَحَّمَ: یہ کسی کام میں انجام سوچے بغیر جا گھسنے کو کہتے ہیں۔لیکن یہاں مطلق گھسنا مراد ہے جس کا قرینہ "عَلَى بَصِيرَةٍ" کے الفاظ ہیں۔

عَلَى بَصِيرَةٍ: یعنی علم کے ساتھ۔مراد یہ ہے کہ جوشراب بنانے والے کوانگور بیچے گا تو وہ خود کوایک سبب کی وجہ سے جہنم میں داخل کرے گا جس کی بابت وہ جانتا ہے کہ وہ دخولِ جہنم کا باعث ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب بنانے والے کوانگور بیچ کر وہ کبیرہ گناہ کا معاون و مددگار بنے گا، اور گناہ میں مددگار برابر کا گنہگار ہوتا ہے۔

مضمون حدیث: ......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جانتے بوجھتے گناہ میں معاونت کرنا جہنم میں جا گھسنا ہے۔لہٰذا گناہ اور گناہ میں معاونت دونوں سے اجتناب واجب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کسی شراب بنانے والے کوانگور بیچنا حرام ہے۔لہٰذا اس غرض کے لیے انگوروں کو جمع کر رکھنا بھی حرام ہے، اور یہ کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر جہنم کی وعید ہے۔
- یہیں سے شراب کا معاملہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ یہ کتنا اہم ہے۔تو جب اس کے بنانے والے کوانگور بیچنے والا جہنمی ہے تو بنانے والا کس قدر گنہگار ہوگا اور خود پینے والا کس قدر گنہگار ہوگا!!!

الامان و الحفیظ: نبی کریم ﷺ نے شراب پینے والے کوملعون اور جنت کی شرابوں سے محروم قرار دیا ہے۔اسی لیے شراب کو ہر شر کی چابی اورام الخبائث کہا گیا ہے۔

- وسائل مقاصد کے حکم میں داخل ہیں۔ [1] یہ قاعدہ متفق علیہا ہے۔جیسے یہاں انگوروں کا جمع کرنا شراب بنانے کا وسیلہ تھا تو اس فعل کوحرام، کبیرہ گناہ اور دخولِ نار کا سبب قرار دیا گیا۔پس جوحرام کا سبب بنے وہ حرام اور جومکروہ کا سبب بنے وہ مکروہ ہوگا۔

---

[1] دیکھیں: القواعد النورانية لابن تيمية، ص: 169۔ البحر المحيط للزركشي: 223/1.

◈ حرام کا معاون بھی عقوبت کا مستحق ہے چاہے وہ حرام کا مرتکب نہ بھی ہوا ہو۔ کیونکہ گناہ پر معاون بھی گنہگار ہے۔
◈ گناہ کی غرض سے کسی شے کو بیچنا حرام ہے۔ جیسا کہ یہاں شراب بنانے کی غرض سے انگور بیچنا حرام کہا گیا ہے۔
◈ بسا اوقات کسی دوسرے امر کی وجہ سے مباح لذاتہ شے بھی حرام ہو جاتی ہے۔ جیسے بیع اپنی اصل میں حلال ہے لیکن یہاں شراب بنانے کی غرض سے کی جانے والی یہ بیع حرام ہوگئی ہے۔

خراج کے ضمان کا حکم

805۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ)).

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''خراج ضمان کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' ❶

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَضَعَّفَهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ، وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ وَابْنُ الْقَطَّانِ.

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف جبکہ امام ترمذی، امام ابن خزیمہ، امام ابن جارود، امام ابن حبان، امام حاکم اور امام ابن قطان رحمہم اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **اَلْخَرَاجُ**: یہ نفع، کمائی اور فائدہ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (المؤمنون: 72)
''یا تو ان سے کسی آمدنی کا مطالبہ کرتا ہے تو تیرے رب کی آمدنی بہتر ہے اور وہ سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے۔''
چنانچہ خراج یہ کسی چیز کی افزائش اور اس کے نفع کو کہتے ہیں۔ پس جانور کا خراج اس کا دودھ، اون، اور اس کے بچے ہوں گے۔ اسی طرح کھجور کا خراج اس کا پھل، شاخیں اور اس کی قلم ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔
بِالضَّمَانِ: مذکورہ ''با'' سببیہ بھی ہو سکتی ہے اور بائے عوض بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی خراج یہ ضمان کا بدل اور اس کا سبب ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جسے بھی کسی شے کا خراج ملتا ہو تو اس کا ضمان بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔ البتہ یہ نہیں کہ جس کسی پر کسی شے کا ضمان آتا ہو تو اس کا خراج بھی اسی کا ہوگا۔ کیونکہ غاصب پر شے مغضوب کا ضمان آتا ہے۔ پر اس شے کا خراج اس کا نہیں ہوتا۔

جس کا خراج ہو ضمان بھی اسی پر آتی ہے

علماء نے اس کی صورت یہ بیان کی ہے کہ مشتری پر عقد کے انعقاد کے وقت سے مبیع کی ضمان واجب ہوتی ہے تو اسی وقت سے اس کا خراج بھی اسی کا ہی ہوگا۔ جیسے کسی نے دس ہزار کا غلام خریدا اس نے تین دن میں آقا کو پانچ ہزار کما کر دیے۔ اس دوران مشتری کو معلوم ہوا کہ وہ تو چوری کرنے کا عادی ہے اور مشتری نے اس عیب کی بنا پر چور کو واپس کرنا چاہا تو وہ اس غلام

---

❶ سنن ابی داؤد: 3508۔ جامع الترمذی: 1285۔ سنن النسائی: 254/7۔ سنن ابن ماجه: 2243۔ المستدرك للحاكم: 15/2۔ المنتقی لابن جارود: 627۔ الاحسان لابن حبان: 4928۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ''الاحسان'' میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اس کی سند میں مخلد بن خفاف ہے۔ جن کو ابن وضاح نے ثقہ کہا ہے، اور امام ابن حبان نے ان کا ذکر ''الثقات'' میں کیا ہے۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''التاریخ: 243/1'' میں اور ابن حزم نے ''المحلّٰی: 136/8'' میں ان کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 22/3۔

کے کمائے روپوں کو ہرگز واپس نہ کرے گا۔ یہ مشتری کے ہی ہوں گے۔ کیونکہ اس دوران اگر غلام ہلاک ہو جاتا ہے تو مشتری کی ملک سے ہلاک ہوتا نہ کہ اس کا ضمان بائع پر آتا۔ کیونکہ جب اس غلام کا ضمان مشتری کے ذمہ ہے تو اس کا خراج یعنی غلام سے حاصل ہونے والی منفعت اور اس کی کمائی بھی اسی مشتری کی ہوگی۔

بیع وشراء میں توکیل جائز ہے

806، 807- وَعَنْ عُرْوَةَ الْبَارِقِيِّ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْطَاهُ دِينَارًا لِيَشْتَرِيَ بِهِ أُضْحِيَةً أَوْ شَاةً، فَاشْتَرَى بِهِ شَاتَيْنِ، فَبَاعَ إِحْدَاهُمَا بِدِينَارٍ، فَأَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِينَارٍ، فَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ فِي بَيْعِهِ، فَكَانَ لَوِ اشْتَرَى تُرَابًا لَرَبِحَ فِيهِ)).

حضرت عروہ البارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک دینار مرحمت فرمایا تاکہ وہ اس سے قربانی کا جانور یا ایک بکری خریدیں۔ سو انہوں نے اس ایک دینار سے دو بکریاں خرید لیں۔ پھر ایک بکری کو ایک دینار میں بیچ بھی دیا اور بکری دینار سمیت لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہو گئے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ان کے لیے ان کی بیع میں برکت کی دعا فرمائی۔ (آگے حدیث کے راوی ذکر کرتے ہیں) چنانچہ (نبی کریم ﷺ کی اس دعا کا انہیں یہ ثمرہ ملا کہ) وہ مٹی بھی خریدتے تو انہیں اس میں بھی نفع ملتا تھا۔ ❶

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ .

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے۔

وَقَدْ أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ فِي ضِمْنِ حَدِيثٍ، وَلَمْ يَسُقْ لَفْظَهُ.

جبکہ اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک حدیث کے ضمن میں روایت کیا ہے۔ ❷ البتہ یہ الفاظ ذکر نہیں کیے۔

وَأَوْرَدَ التِّرْمِذِيُّ لَهُ شَاهِدًا مِنْ حَدِيثِ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ .

اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے اس کا ایک شاہد بھی ذکر کیا ہے۔ ❸

غریب الحدیث:...... أُضْحِيَةً، أَوْ شَاةً: دونوں لفظوں میں کوئی منافات نہیں۔ کیونکہ بکری قربانی کے لیے بھی خریدی جا سکتی ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3384- جامع الترمذی: 1258- سنن ابن ماجہ: 2402- مسند احمد: 375/4- امام نووی رحمہ اللہ (249/9) فرماتے ہیں: جامع ترمذی کی اسناد صحیح ہے، اور امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ کی اسناد حسن ہے۔ پس یہ حدیث صحیح ہے، اور ابن حزم نے "المحلی: 436/8" میں اس حدیث کو معلول کہا ہے۔ جبکہ ابن عبدالبر نے "التمهید: 107/19" میں اس حدیث کو قوی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

❷ صحیح البخاری مرسلًا: 3642- ابن قطان کہتے ہیں: اس حدیث کی امام بخاری کی طرف نسبت خطا ہے۔ کیونکہ ایسی اسناد کی تصحیح بیان کرنا امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب نہیں جس میں کوئی نامعلوم راوی ہو۔ امام منذری اپنی "المختصر" میں کہتے ہیں: اگر یہ حدیث امام بخاری کی شرط پر ہوتی تو وہ اس کو اپنی صحیح کی کتاب البیوع اور کتاب الوکالة میں حسب عادت روایت کرتے۔ لہٰذا امام بخاری کا اس کو حدیث الخیل کے بعد ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی مراد صرف حدیث الخیل ہی ہے۔ دیکھیں: نصب الرایة: 91/4.

❸ جامع الترمذی: 1257- امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ یہ حدیث سنن ابی داؤد: 3386- میں بھی ہے، اور امام خطابی کا یہ کہنا کہ "یہ حدیث متصل ہے کیونکہ اس کی اسناد میں ایک مجہول راوی ہے" اس پر رد ہے جو اس حدیث کے منقطع ہونے کا قائل ہے۔ آگے فرماتے ہیں: ایسی حدیث سے حجت قائم نہیں ہوتی۔

فَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ: چونکہ حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ بکری بھی خرید لائے اور ایک دینار کا نفع بھی کما لائے تو ان کے اس احسان کا بدلہ دینے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برکت کی دعا فرمائی۔

لَوِ اشْتَرَى تُرَابًا: تراب یعنی مٹی سے مراد بے قیمت، معمولی اور حقیر چیز ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی برکت سے وہ کسی حقیر شے کو بھی خریدتے تھے تو رب تعالیٰ انہیں اس میں برکت عطا فرماتے تھے۔

مناسبتِ حدیث:...... مذکورہ حدیث کا مضمون تو واضح ہے۔ البتہ بیع اور توکیل کے بیان پر مشتمل ہونے کی وجہ سے امام موصوف اس حدیث کو یہاں لے آئے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بیع وشراء میں توکیل جائز ہے۔ چاہے یہ توکیل قربانی کے جانوروں کی بیع وشراء کی ہی ہو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو اُضحیہ کی شراء کا وکیل بنایا تھا، اور شراء یہ بیع کے معنی کو بھی شامل ہے۔

◈ توکیل توکل، اخلاص اور رب تعالیٰ پر اعتماد کے منافی نہیں۔

◈ اگر کسی امر میں مؤکل کا نفع ہو تو اس میں وکیل کا تصرف جائز ہے۔

◈ فضولی کا تصرف جائز ہے، اور یہ دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ہے۔ لہٰذا اگر مالک اس تصرف کو جائز قرار دے دے تو وہ تصرف جائز ہو جائے گا۔ البتہ اگر مالک اجازت نہ دے تو وہ تصرف فاسد ہوگا۔ لہٰذا فضولی کے تصرف کے اصل میں ناجائز ہونے کا قول فاسد اور غیر صحیح ہے۔

◈ بظاہر یہ حدیث قربانی کے جانور کے متعین ہو جانے کے بعد بھی اس کی بیع کے جواز کی دلیل ہے۔ [1] جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو قربانی کی تعیین کا اختیار حاصل نہ تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے دو بکریاں خریدی تھیں، اور وہ جانتے تھے کہ ان میں سے قربانی کی تعیین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود کریں گے۔

◈ کسی کے احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہیے، چاہے دعا دے کر ہی سہی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے احسان کے بدلے انہیں دعا دی تھی اور بدلہ ویسا ہی دیا جائے جیسا احسان کیا گیا ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے بیع میں احسان کا بدلہ ان کی بیع میں برکت کی دعا دے کر دیا تھا۔

◈ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ کا ظہور کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو تمام عمر اپنی ہر بیع وشراء میں نفع ہی ملتا رہا۔ چاہے وہ سودا کسی معمولی سی چیز کا ہی کیوں نہ رہا ہو۔

◈ کسی شے پر نفع لینے کی کوئی حد نہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں غبن نہ ہو۔ اگر اس میں غبن پایا گیا تو عادت سے بڑھ کر نفع حرام ہوگا۔

◈ وکیل شراء اگر وہ چیز کم قیمت میں لے آئے تو باقی کی رقم واپس کرنا اس کو لازم ہوگا۔ کیونکہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے بکری خریدنے کے بعد بچ جانے والا دینار خدمت نبوی میں واپس کیا تھا۔

---

[1] دیکھیں: كشاف القناع: 16/3۔ روضة الطالبين: 225/3.

◈ شاہد اور متابع کا معنی بیان کیا جا چکا ہے۔

بیع غرر ❶ کا حکم

808۔ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ شِرَاءِ مَا فِي بُطُونِ الْأَنْعَامِ حَتَّى تَضَعَ، وَعَنْ بَيْعِ مَا فِي ضُرُوعِهَا، وَعَنْ شِرَاءِ الْعَبْدِ وَهُوَ آبِقٌ، وَعَنْ شِرَاءِ الْمَغَانِمِ حَتَّى تُقْسَمَ، وَعَنْ شِرَاءِ الصَّدَقَاتِ حَتَّى تُقْبَضَ، وَعَنْ ضَرْبَةِ الْغَائِصِ)).

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے (مادہ) چوپایوں کے پیٹوں کے حملوں کو بیچنے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ وہ بچہ جنم دیں اور تھنوں میں موجود دودھ کی بیع سے اور بھاگے غلام کی (بیع و) شراء سے، اور اموالِ غنیمت کی بیع سے (منع فرمایا ہے) یہاں تک کہ غنائم کو تقسیم کر دیا جائے، اور زکوۃ کی شراء سے یہاں تک کہ ان کو قبضہ میں لے لیا جائے اور غوطہ خور کے ایک دفعہ کے غوطہ (سے نکلنے والی چیز کے خریدنے) سے (منع فرمایا ہے)۔ ❷

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْبَزَّارُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

اس حدیث کو ابن ماجہ، بزار اور دارقطنی نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... مَا فِي ضُرُوعِهَا: مراد تھنوں کا دودھ ہے۔

الْعَبْدِ: مراد مملوک غلام ہے۔ الْآبِقُ: بھاگے ہوئے غلام کو کہتے ہیں۔

الْمَغَانِمِ: یہ مغنم کی جمع ہے۔ یہ قتال کے وقت حاصل ہونے والے کافروں کے مالوں کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے۔

الصَّدَقَاتِ: مراد زکوتیں ہیں۔

الْغَائِصِ: غوطہ خور۔ ضربۃ الغائص یہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں ایک غوطہ لگاتا ہوں اس غوطہ میں جو موتی یا زیور وغیرہ نکالا وہ اتنے میں تیرا ہوا۔ یہ ناجائز ہے کیونکہ اس میں غرر ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں چھ معاملات کا ذکر ہے جو ناجائز ہیں۔ کیونکہ ان سب میں غرر پایا جاتا ہے۔ ان کی تفصیل فوائد کے ضمن میں بیان کی جاتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حاملہ جانوروں کو ان کے حمل سمیت بیچا جا سکتا ہے کیونکہ ممانعت صرف اکیلے حمل کی بیع کی ہے۔ اس پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔

---

❶ غرر کا لغوی اور اصطلاحی معنی مفصل بیان ہو چکا ہے۔ نسیم

❷ سنن ابن ماجہ: 2196۔ مسند احمد: 42/3۔ مسند ابی یعلی: 1093۔ جامع الترمذی: 1563۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ جبکہ امام بیہقی (338/5) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ابن حزم المحلی: 390/8 میں کہتے ہیں: جہضم، محمد بن ابراہیم، محمد بن زید العبدی یہ سب مجہول ہیں۔ جبکہ شہر متروک ہے۔ دیکھیں العلل لابن ابی حاتم: 373/1۔ نصب الرایۃ: 10/4۔

◈ جو شے تبعاً ثابت ہو وہ استقلالاً ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ابن رجب حنبلی نے اس قاعدہ کو بیان کیا ہے [1] اور جو بات تابع میں معاف ہوتی ہے وہ متبوع میں معاف نہیں ہوتی۔

◈ تھنوں میں دودھ کی بیع ناجائز ہے۔ کیونکہ اس کی مقدار مجہول ہے کیونکہ اس کی سپردگی غیر مقدور ہے۔ دوسرے تھنوں کے دودھ کی مقدار غیر معلوم ہے، اور یہی غرر ہے اور جہاں غرر ہو وہ بیع ناجائز ہے۔

◈ بھاگا غلام خریدنا ناجائز ہے۔ جب تک کہ وہ بھاگا ہوا ہو، چنانچہ "وَهُوَ آبِقٌ" یہ جملہ حالیہ ہوگا۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس پر قبضہ غیر مقدور ہے۔ البتہ بھاگا غلام آجائے تو اس کو خریدنا اور بیچنا جائز ہے۔

◈ اموالِ غنیمت کو تقسیم سے قبل بیچنا جائز نہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ نہی فساد کو شامل ہے اور یہ کہ غنائم ملک میں لیے جا سکتے ہیں اور یہ کہ غنائم اس امت کے لیے حلال ہیں۔ جبکہ پہلی امتوں کے لیے حرام تھے۔

◈ غنائم اموالِ مشترکہ ہیں۔ اس کی دلیل "حَتّٰى تُقْسَمَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ مستحق سے زکوٰۃ کی چیز خریدنا تب ہی جائز ہے جب وہ اس پر قبضہ کر لے۔ لہٰذا مستحق سے زکوٰۃ کی چیز خریدنے کی ممانعت کی علت عدم ملک ہے، اور ملک کسی شے پر قبضہ کر کے تمام ہوتی ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ سمندر سے موتی تلاش کرنے کے لیے غوطہ لگانا جائز ہے۔ البتہ اس میں جان سلامتی کی شرط ہے۔ لہٰذا اگر جان کو خطرہ ہو تو سمندر میں غوطہ زنی ناجائز ہے۔ اگر دونوں احتمال مساوی ہوں تو احتیاط غوطہ نہ لگانے میں ہے۔

◈ سمندر سے نکالی چیزوں کی بیع جائز ہے۔ اس کی دلیل "وَعَنْ ضَرْبَةِ الْغَائِصِ" کے الفاظ ہیں کہ یہاں مجہول کی بیع کی نفی ہے۔ لہٰذا اگر سمندر سے نکالی جانے والی شے معلوم ہو تو اس کی بیع جائز ہے۔

◈ شریعتِ اسلامیہ لوگوں کو باہمی تنازعات سے بچانے کی بے حد حریص ہے۔ اسی لیے باہمی بغض وعداوت کو پیدا کرنے والے اسباب حرام ہیں۔

◈ ہر وہ شے جو جوئے تک لے جائے وہ حرام ہے۔

پانی میں تیرتی مچھلی کی بیع کا حکم

809۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَشْتَرُوا السَّمَكَ فِي الْمَاءِ ، فَإِنَّهُ غَرَرٌ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ ، وَأَشَارَ إِلَى أَنَّ الصَّوَابَ وَقْفُهُ .

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''پانی میں (تیرتی) مچھلی کو مت خریدو (اور بیچو) کیونکہ یہ غرر ہے۔'' [2]

یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے اور انہوں نے اس حدیث

---

[1] مجموع فتاوی ابن تیمیة: 480/29۔ قواعد ابن رجب، قاعدہ رقم: 133۔ الاشباہ والنظائر للسیوطی، ص: 133.

[2] المسند احمد: 388/1۔ سنن البیہقی: 340/5۔ موقوفاً و مرفوعاً۔ امام بیہقی کہتے ہیں اس حدیث کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ امام دارقطنی نے بھی اپنی "العلل" میں یہی کہا ہے۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ (80/4) کہتے ہیں: امام احمد نے اس حدیث کو مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت کیا ہے۔ موقوف روایت کے رجال صحیح کے رجال ہیں جبکہ انہوں نے مرفوع روایت کو ضعیف کہا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے المجموع: 270/9۔ میں کہا ہے کہ: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر صحیح اور موقوف ہے۔ دیکھیں: "العلل للدارقطنی: 275/5" "خلاصة البدر المنیر: 52/2".

کے موقوف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شرح :...... پانی میں تیرتی مچھلی کی بیع ناجائز ہے کیونکہ اس میں غرر ہے کہ جانے وہ مچھلی ہاتھ میں آتی ہے یا نہیں، اور جس عقد میں غرر ہو وہ ناجائز ہوتا ہے۔ کیونکہ غرر بغض اور عداوت تک لے جاتا ہے۔ البتہ اگر غرر نہ ہو تو جائز ہے۔ جیسے مچھلی کسی چھوٹے تالاب، ٹب یا شیشے کے جار میں ہو اور اس پر قبضہ ممکن ہو تو ایسی مچھلی کو پانی میں ہوتے ہوئے بھی بیچنا جائز ہے۔

بیع غرر کی چند اور صورتیں

810- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ تُبَاعَ ثَمَرَةٌ حَتّٰى تُطْعَمَ ، وَلَا يُبَاعَ صُوفٌ عَلَى ظَهْرٍ ، وَلَا لَبَنٌ فِي ضَرْعٍ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ پھل کو بیچا جائے۔ یہاں تک کہ اس کو کھایا جائے (یعنی وہ کھانے کے قابل ہو جائے) اور (یہ کہ) پیٹھ پر لگی اون کو نہ بیچا جائے اور نہ تھنوں میں دودھ کو (ہی بیچا جائے)۔ ❶

رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ وَالدَّارَقُطْنِيُّ.

اس حدیث کو امام طبرانی رحمہ اللہ نے "المعجم الاوسط" میں اور امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

وَأَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيلِ لِعِكْرِمَةَ ، وَهُوَ الرَّاجِحُ ، وَأَخْرَجَهُ أَيْضًا مَوْقُوْفًا عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ بِإِسْنَادٍ قَوِيٍّ ، وَرَجَّحَهُ الْبَيْهَقِيُّ .

امام ابوداؤد نے اس کو عکرمہ کی مراسیل میں روایت کیا ہے اور یہی راجح ہے۔ جبکہ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو قوی اسناد کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر موقوف بھی روایت کیا ہے، اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کے موقوف ہونے کو راجح کہا ہے۔ ❷

غریب الحدیث :...... **حَتّٰى تُطْعَمَ**: مراد یہ ہے کہ جب تک کوئی پھل کھانے کے قابل نہ ہو جائے اس کو نہ بیچا جائے کیونکہ اس میں متعدد وجوہ سے غرر پایا جاتا ہے۔ جیسے:

- ⊙ اس پر قدرتی آفات آسکتی ہیں۔
- ⊙ وہ خوب پک سکتا ہے اور ایسی عمدگی اور ذائقہ آسکتا ہے جو عقد کے وقت نہ تھا۔
- ⊙ اور اس کی نگرانی اور سینچائی کا معاملہ فریقین میں نزاع کا سبب بن سکتا ہے۔

لَا يُبَاعَ صُوفٌ عَلَى ظَهْرٍ: اس میں بھی غرر ہے۔ لہٰذا جب تک اون کو بھیڑ بکری وغیرہ کے بدن سے اتار کر اندازہ نہ کر لیا جائے کہ یہ کتنی ہے تب تک اس کا بیچنا ناجائز ہے۔ کیونکہ اون کتنی اور کہاں سے کٹے گی یہ امر مجہول ہے۔ کیا معلوم بائع اوپر اوپر سے کاٹے اور مشتری بالوں کو جڑوں سے کٹوانا چاہتا ہو۔ غرض یہ امر غرر پر مبنی ہے اور مفضی الی النزاع ہے۔ اس لیے ایسا کرنا ناجائز ہے۔

---

❶ المعجم الاوسط للبطرانی: 3708- المعجم الکبیر للطبرانی: 338/11- علامہ ہیثمی رحمہ اللہ (102/4) فرماتے ہیں: طبرانی کے رجال ثقہ ہیں۔ جبکہ امام بیہقی (340/5) فرماتے ہیں: اس حدیث کے روایت کرنے میں عمر متفرد ہے جو قوی راوی نہیں ہے۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ "التلخیص الحبیر" میں فرماتے ہیں: ابن معین وغیرہ نے عمر کو ثقہ کہا ہے۔ دیکھیں: المجموع: 308/9- ابن سکن نے اس حدیث کے مرفوع ہونے کو صحیح کہا ہے۔ جیسا کہ خلاصۃ البدر المنیر: 52/2 میں ہے۔

❷ مراسیل لابی داؤد: 182 - 183- سنن البیہقی: 340/5- سنن الدار قطنی: 15/3 .

البتہ بعض علماء نے اون کے معلوم ہونے اور اس کے فی الفور کاٹ لینے کی صورت میں اس کو جائز کہا ہے، اور یہ کہ اس میں جو غرر یسیر ہے وہ معاف ہے۔ کیونکہ بسا اوقات اس کی حاجت ہوتی ہے۔ البتہ اس صورت میں اون کا کٹوانا مشتری کے ذمہ ہوگا۔

البتہ اگر وہ بائع پر اس کو شرط کر دے تو جائز ہوگا۔

درایۃ الحدیث:...... مذکورہ حدیث موقوف ہے، اور یہی راجح قول ہے۔ تب پھر یہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا قول ہوا اور قول صحابی کی بابت راجح مذہب یہ ہے کہ جن امور میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو ان میں صحابی رضی اللہ عنہ کا قول حجت ہوتا ہے، اور وہ رفع کے حکم میں ہوتا ہے۔

تب پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کو قول صحابی ہونے کی حیثیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے اور کوئی چاہے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ قول اس لیے حجت ہے کہ یہ معاملہ غرر پر مشتمل ہے اس لیے منع ہے۔

رہا تھنوں میں دودھ بیچنے کا مسئلہ تو وہ مفصل بیان ہو چکا ہے۔

مضامین کی بیع کا حکم

811- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْمَضَامِيْنِ وَالْمَلَاقِيْحِ)). رَوَاهُ الْبَزَّارُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے مضامین اور ملاقیح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ ❶

اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے، اور اس کی اسناد میں گرچہ ضعف ہے۔

غریب الحدیث:...... اَلْمَلَاقِيْح: یہ ملقوحہ کی جمع ہے۔ ملقوحہ یہ نر جانور کے گابھن اور حاملہ کرنے کے مادہ کو کہتے ہیں۔ ملاقیح کی بیع کی صورت یہ ہے کہ نر جانور والا آدمی یہ کہے کہ میرا جانور تمہارے مادہ جانور کی ایک مرتبہ جفتی کرے گا تا کہ وہ حاملہ ہو جائے اور میں اس کے اتنے اتنے روپے لوں گا۔ یہ ناجائز ہے کیونکہ یہاں جہالت بلکہ حمل کی بیع سے بھی زیادہ جہالت ہے کہ حمل تو بطن میں متحقق ہے۔ جبکہ مادہ منویہ کے جا کر مادہ جانور کو گابھن کرنے میں جہالت در جہالت ہے، جانے وہ بار آور ہوتا ہے یا ضائع جاتا ہے۔

غرض چونکہ حمل کی بیع جہالت کی وجہ سے منع ہے اور ملاقیح کی بیع میں اشد جہالت ہے تو یہ بیع بدرجہ اولیٰ منع ہوگی۔

درایۃ الحدیث:...... باوجودیکہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن چونکہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہے اس لیے یہ حدیث حجت ہے۔

اقالہ کا بیان

812- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا بَيْعَتَهُ أَقَالَ اللهُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی مسلمان سے اس کی بیع

---

❶ مسند البزار: 1267- امام بزار اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: صالح بن ابی الاخضر قوی راوی نہیں۔ دیکھیں: مجمع الزوائد: 104/4- الموطا لمالک: 654/2- عن سعید بن المسیب مرسلا۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے۔ دیکھیں خلاصۃ البدر المنیر: 56/2۔

عَثْرَتَهُ)). کا اقالہ کیا تو رب تعالیٰ اس کی لغزشوں کو معاف فرمائے گا۔'' ❶

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ. اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**مَنْ أَقَالَ مُسْلِماً بَيْعَتَهُ:** مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔

اور أَقَالَ یہ إِقَالَةٌ سے ہے، یہ باب اِفعال اجوف یائی سے فعل ماضی کا واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔

اِقالہ بیع یا عہد کے توڑنے یا فسخ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں بیع توڑنا منع ہے۔یعنی اِقالہ یہ عقد بیع کے ختم کرنے کا مطالبہ کرنے کو کہتے ہیں۔

اور بیعۃ یہ بیع یعنی خرید و فروخت کا عقد ہے۔

اب یہ اقالہ کبھی بائع تو کبھی مشتری کرتا ہے۔ چنانچہ کبھی مشتری آ کر یہ کہتا ہے کہ میں یہ شے خرید کر شرمندہ ہوں برائے مہربانی آپ اسے واپس لے کر میری رقم لوٹا دیں، اور کبھی بائع یہ کہتا ہے کہ میں یہ چیز بیچ تو بیٹھا ہوں پر آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ اپنی رقم لے کر میری شے واپس کر دیں۔

"مَنْ أَقَالَ مُسْلِماً بَيْعَتَهُ" کے کلمات ان دونوں صورتوں کو شامل ہے۔البتہ مسلم کا لفظ اغلب کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا مذکورہ فضیلت ذمی کے ساتھ کیے عقد کے اقالہ کو بھی شامل ہوگی۔

أَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهُ: عثرت لغزش اور کوتاہی کو کہتے ہیں۔ یہ رب تعالیٰ کا کسی کی لغزشوں کو معاف کرنا ہے۔ چاہے یہ معاف کرنا امورِ دنیا سے متعلق ہو یا امورِ آخرت سے متعلق ہو، مذکورہ حدیث ان دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

اور رب تعالیٰ کا فضل بے حد وسیع ہے۔ اس کی رحمت دنیا و آخرت دونوں کو وسیع ہے۔

اور مذکورہ جملہ جوابِ شرط ہونے کی وجہ سے جزائیہ جملہ ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اِقالہ جائز بلکہ محمود، مطلوب اور مستحسن ہے۔ کیونکہ شارع نے اِقالہ پر ثواب ملنے کو مرتب کیا ہے۔البتہ اس کا واجب یا مستحب ہونا دلائل کے مقتضی کے اعتبار سے ہے۔
- اِقالہ گزشتہ عقد کا فسخ ہے نہ کہ عقد جدید ہے۔
- چونکہ اقالہ بیع نہیں لہٰذا اِقالہ مسجد میں بھی ہو سکتا ہے۔
- اِقالہ اسی ثمن کے ساتھ ہی ہوگا۔لہٰذا اگر کسی نے ثمن سے قیمت کم کر کے اِقالہ کیا تو یہ ناجائز ہوگا۔ یہ صورت بائع سے ممکن ہے، اور اگر کسی نے اِقالہ ثمن بڑھا کر کیا تو یہ بھی ناجائز ہوگا اور یہ صورت مشتری سے ممکن ہے۔
- جزا بھی ویسی ہی ملتی ہے جیسا کہ عمل ہو۔ چنانچہ جو اِقالہ کر کے مسلمان بھائی کی ندامت دور کرے گا، رب تعالیٰ اس کی

---

❶ سنن ابی داؤد: 3460۔ سنن ابن ماجه: 2199۔ صحیح ابن حبان: 5030۔ المستدرك للحاكم: 52/2۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔ اس حدیث کی اصل صحیح مسلم: 2699 میں ہے۔

لغزشوں کو معاف فرما کر اس کی ندامت کا ازالہ کرے گا۔

2۔ بَابُ الْخِيَارِ......خیار کا بیان

تمہید:......خیار یہ "اِخْتَـار" (بابِ افتعال) فعل کا اسم مصدر ہے۔ کیونکہ "اِخْتَـار" فعل کا مصدر "اختیار" ہے۔ لہٰذا "خیار" یہ اسم مصدر ہوگا۔

اسم مصدر کی تعریف بیان ہو چکی ہے۔ خیار کی متعدد قسمیں ہیں جن میں سے ایک خیار مجلس ہے۔ ذیل کی احادیث میں اسی کا بیان ہے۔

خیار مجلس کا حکم اور صورتیں

813- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِذَا تَبَايَعَ الرَّجُلَانِ، فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا وَكَانَا جَمِيْعًا، أَوْ يُخَيِّرُ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ، فَإِنْ خَيَّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ فَتَبَايَعَا عَلَى ذٰلِكَ فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ، وَإِنْ تَفَرَّقَا بَعْدَ أَنْ تَبَايَعَا وَلَمْ يَتْرُكْ وَاحِدٌ مِنْهُمَا الْبَيْعَ فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جب دو آدمی باہم خرید وفروخت کریں تو دونوں میں سے ہر ایک کو (اس عقد کے باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا) اختیار ہے۔ جب تک کہ دونوں باہم جدا نہ ہوں اور اکٹھے ہوں یا دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو خیار دے دے پس اگر دونوں میں سے ایک نے دوسرے کو خیار دے دیا اور دونوں نے اسی خیار پر عقد کر لیا تو (یہ) بیع واجب (یعنی لازم) ہو جائے گی، اور اگر وہ باہم خرید وفروخت کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور دونوں میں سے کسی ایک نے بھی بیع کو ترک نہ کیا تو (بھی) وہ بیع لازم ہو گئی۔" ❶

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے، اور یہ لفظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:......**إِذَا تَبَايَعَ الرَّجُلَانِ:** تَبَايَعَ بابِ تفاعل سے ہے جو اشتراک کے معنی کو شامل ہے۔ یعنی جب دو آدمی باہم عقد بیع کریں۔

رجل کا لفظ اغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ یہ حکم عورت کو بھی شامل ہے۔

فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا: مراد بائع اور مشتری ہیں۔

بِالْخِيَارِ: یہ "خیار" عقد کو نافذ کرنے یا فسخ کرنے کا ہے۔

مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا: مراد جائے عقد سے بدنوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔ نہ کہ عقد بیع سے جدا ہونا ہے کہ جمہور اہل علم کے نزدیک یہی صحیح قول ہے۔

وَكَانَا جَمِيعاً: گویا کہ مذکورہ جملہ ماقبل کی تفسیر ہے۔ تب پھر معلوم ہوا کہ اگر دونوں اکٹھے ہیں اور جائے عقد سے الگ ہو گئے ہیں تو بھی یہ تفریق نہ کہلائے گی۔ لہٰذا جب تک دونوں اکٹھے ہیں چاہے دونوں سو بھی جائیں تب بھی بیدار ہو کر

❶ صحيح البخاري: 2112۔ صحيح مسلم: 1531.

ایک کے دوسرے سے جدا ہونے تک دونوں غیر متفرق کہلائیں گے۔

بیع کے نفاذ یا رد میں خیار کے حاصل ہونے کی یہ ایک صورت ہے۔ لیکن اس صورت میں دونوں کو مساوی خیار حاصل ہوتا ہے۔

أَوْ يُخَيِّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ: یہ خیار کے حاصل ہونے کی دوسری صورت ہے کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو خیار دے دے اور اپنے حق خیار سے دست بردار ہو جائے۔ اس صورت میں خیار صرف اس کو حاصل ہوگا جسے دوسرا خیار دے۔

فَتَبَايَعَا عَلَى ذَلِكَ فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ: یعنی دونوں نے جس شرط پر بیع کی ہے۔ اس پر وہ بیع لازم ہو جائے گی۔ اب چاہے یہ خیار بائع کو مشتری دے یا مشتری کو بائع دے، بیع اسی پر واقع ہوگی۔

وَإِنْ تَفَرَّقَا بَعْدَ أَنْ تَبَايَعَا..... فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ: وَجَبَ یہاں لزوم کے معنی میں ہے۔

پس بیع کے لازم ہونے کی یہاں دو صورتیں مذکور ہیں:

(1) دونوں میں سے ایک دوسرے کو خیار دے دے تو خیار دینے والے کے حق میں بیع لازم ہو جائے گی، اور اگر دونوں ایک دوسرے کو خیار دے دیں تو دونوں کے حق میں بیع لازم ہو جائے گی۔

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ایجاب و قبول کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو بھی بیع لازم ہو جائے گی۔

رہی ''جدائی'' کی حد تو اس کی کوئی شرعی حد نہیں، اس کا مدار عرف پر ہے۔

مضمون حدیث:..... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر دو باتیں کی گئی ہیں:

(1) اگر دونوں متعاقدین ایجاب و قبول کے بعد کسی قسم کا خیار رکھے بغیر بدنوں سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو بیع لازم ہو جاتی ہے اور جب تک وہ جدا نہ ہوں تو ہر ایک کو بیع کے باقی رکھنے یا ختم کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

(2) اگر دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو خیار دے دے تو خیار دینے والے کے حق میں بیع لازم ہو جاتی ہے اور اگر دونوں ہی ایک دوسرے کو خیار دے دیں تو دونوں کے حق میں بیع لازم ہو جاتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جب تک متبایعین جدا نہ ہوں تو ان کے لیے خیار ثابت ہے۔ اس کی دلیل "فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا" کے الفاظ ہیں۔
- شریعتِ مطہرہ لوگوں کے احوال کی خوب رعایت کرتی ہے۔
- معلوم ہوا کہ دونوں متعاقدین میں سے ایک یا دونوں اپنا یہ خیار ختم کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل "أَوْ يُخَيِّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ" کے الفاظ ہیں، اور خیار ختم کرنے کا یہ احتمال دونوں طرف سے ہو سکتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ آدمی اپنا خاص حق ختم کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل: "أَوْ يُخَيِّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ" کے الفاظ ہیں۔
- بیع عقودِ لازمہ میں سے ہے اس کی دلیل "فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ" کے الفاظ ہیں، اور اس عقد کے لازم ہونے میں ہی بندوں کی مصلحت ہے۔ کیونکہ اگر بیع صرف جائز ہوتی تو کوئی بھی اطمینان قلب کے ساتھ بیع کے نفع سے چاہے وہ ثمن ہو یا مبیع مستفید نہ ہو سکتا۔
- اپنا حق ساقط کرنا آدمی کا حق ہے چاہے دوسرا راضی نہ بھی ہو، اس کی دلیل "وَلَمْ يَتْرُكْ وَاحِدٌ مِنْهُمَا الْبَيْعَ" کے الفاظ ہیں۔

814- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ رضي الله عنهما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : ((الْبَائِعُ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ حَتَّى يَتَفَرَّقَا ، إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَفْقَةَ خِيَارٍ ، وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يُفَارِقَهُ خَشْيَةَ أَنْ يَسْتَقِيْلَهُ)) .

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بائع اور مشتری خیار کے ساتھ ہیں جب تک کہ دونوں باہم جدا نہ ہو جائیں سوائے اس کے کہ وہ سودا ہی خیار والا ہو اور اس کو (یعنی بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کو) اس ڈر سے (سودا پورا ہونے سے قبل ہی مجلس عقد سے) جدا ہو جانا جائز نہیں کہ (مبادا) دوسرا اس سے بیع توڑ دے۔''[1]

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَهُ، وَرَوَاهُ الدَّارُقُطْنِيُّ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ .

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے سوائے ابن ماجہ کے، اور اس حدیث کو امام دارقطنی ، امام ابن خزیمہ اور امام ابن جارود نے (بھی) روایت کیا ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ ((حَتَّى يَتَفَرَّقَا مِنْ مَّعَانِهِمَا))

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''یہاں تک کہ دونوں اپنی جگہ سے جدا ہو جائیں۔''

غریب الحدیث :...... مذکورہ حدیث میں گزشتہ حدیث کا ہی اعادہ ہے۔ البتہ ''حَتَّى يَتَفَرَّقَا مِنْ مَكَانِهِمَا'' کے الفاظ اس بارے صریح نص میں کہ مراد بدنوں کے ساتھ جدائی ہے نہ کہ عقد کی جدائی ہے۔

إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَفْقَةَ خِيَارٍ: یہ وہی معنی ہے جو گزشتہ حدیث میں ''أَوْ يُخَيِّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ'' کے کلمات میں ذکر ہوا ہے، اور صفقہ خیار سے صفقہ شرط بھی مراد ہو سکتا ہے جس میں ''خیار'' تفریق کے بعد تک شرط ہو۔ تب پھر اس حدیث میں خیارِ مجلس کے ساتھ ساتھ خیارِ شرط کا بھی اثبات ہوگا۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يُفَارِقَهُ خَشْيَةَ أَنْ يَسْتَقِيلَهُ: یہ حکم بائع اور مشتری دونوں کو شامل ہے۔ یہاں استقالہ عقد فسخ کرنے کے معنی میں ہے۔ کیونکہ اگر یہاں مراد وہ اقالہ ہوتا جو طرفین کی رضامندی سے ہوتا ہے تو وہ مفارقہ کے ساتھ مقید نہ ہوتا۔ کیونکہ اقالہ مجلس سے مفارقت سے قبل بھی جائز ہے اور بعد میں بھی جائز ہے۔ اس لیے یہاں استقالہ سے مراد فسخ عقد ہوگا۔

وَلَا يَحِلُّ: یہ حکم بائع اور مشتری دونوں کو شامل ہے، اور مذکورہ حدیث اس باب میں صریح ہے کہ یہاں مفارقت سے مفارقت ابدان مراد ہے۔ یعنی بائع اور مشتری کو اس ڈر سے مفارقت جائز نہیں کہ کہیں دوسرا عقد کو توڑ نہ دے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں بھی خیارِ مجلس کا اور ساتھ ہی خیارِ شرط کا بھی ثبوت ہے۔
- دوسرے کے فسخ کر دینے کے خوف سے مجلس عقد سے اٹھ جانا حرام ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3456- جامع الترمذی: 1247- سنن النسائی: 251/7- المنتقی لابن جارود: 620- سنن الدارقطنی: 50/3- مسند احمد: 183/2- امام ابن حزم نے المحلّٰی: 368/8- میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ جبکہ امام نووی رحمہ اللہ نے المجموع: 175/9 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

◈ عمل میں نیت کا اعتبار ہوتا ہے کیونکہ مجلس عقد سے مفارقت کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ مقصود پورا ہو گیا ہے اور کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ کہیں دوسرا عقد توڑ نہ دے۔ لہٰذا اس کے ایسا کرنے سے قبل ہی مجلس سے اٹھ جایا جائے۔ چنانچہ پہلی نیت کے مطابق مفارقت جائز جبکہ دوسری نیت کے مطابق مفارقت ناجائز ہوتی ہے۔

خیارِ غبن ❶ کا بیان

815- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((ذَكَرَ رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ يُخْدَعُ فِي الْبُيُوْعِ فَقَالَ: إِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے خدمت نبوی میں یہ ذکر کیا کہ اسے خرید و فروخت کے معاملات میں (اکثر) دھوکا ہو جاتا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرو تو (دوسرے پر یہ شرط رکھ کر) کہہ دیا کرو کہ: ''دھوکا نہ ہوگا۔'' ❷
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... أَنَّهُ يُخْدَعُ: یہ خدیعہ سے مشتق ہے جس کا معنی دھوکا ہے کبھی یہ دھوکا ایک پر تو مخفی ہوتا ہے جبکہ دوسروں پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ دھوکا عام بھی ہے اور خاص بھی۔

اب ہوسکتا ہے کہ ان صاحب کو مبیع میں دھوکا ہوتا ہو کہ ردی شے کو عمدہ سمجھ کر خرید بیٹھتے ہوں یا عیب والی مبیع کو صحیح اور سالم سمجھ بیٹھتے ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ دھوکا قیمت میں ہوتا ہو کہ سستی چیز کو مہنگا خرید بیٹھتے ہوں۔ غرض یہ حدیث عام ہے اور ہر اس صورت کو شامل ہے جس کو عرف میں خدیعہ، غبن اور دھوکا کہا جاسکتا ہو۔ پھر جب ان صاحب رضی اللہ عنہ نے دھوکا کھائے جانے کی شکایت کی تو نبی کریم ﷺ نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ جب تم کسی سے خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو یہ شرط رکھ لیا کرو:

لَا خِلَابَةَ: ''خِلَابَةَ'' خدیعہ کو کہتے ہیں۔ یعنی اگر بعد میں مبیع یا ثمن میں دھوکا ثابت ہوا تو عقد فسخ شمار ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ عاقدین کو خیارِ غبن حاصل ہے۔ یعنی اگر مبیع یا ثمن میں خدیعہ ظاہر ہوگئی تو فسخ عقد کا خیار حاصل ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جس آدمی سے خرید و فروخت میں دھوکا ہو جاتا ہو اسے بھی بیع و شراء کا تصرف کرنا جائز ہوتا ہے۔ البتہ وہ دھوکا نہ دیے جانے کی شرط رکھ سکتا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ ''خیار غبن'' شرط رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر خیار غبن بدون شرط رکھنے کے حاصل ہوتا تو ''لا خِلَابَةَ'' کی شرط رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہ قول محل نظر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے متعدد قضایا میں غبن کی شرط کے بغیر بھی خیار کو ثابت فرمایا ہے۔ جیسا کہ تلقی جلب کی حدیث میں گزرا ہے کہ اگر پہلا مالک بازار میں اپنی چیز بکتے دیکھے تو اسے خیار حاصل ہوگا، اور یہ خیار بدون شرط رکھے ثابت ہے۔

---

❶ غبن تجارت میں دھوکا اور نقصان کو کہتے ہیں۔ القاموس الوحید، ص: 1153. نسیم۔
❷ صحیح البخاری: 2414- صحیح مسلم: 1533.

تب پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ غبن کی دو قسمیں ہیں: (1) عام۔ (2) اور خاص۔ عام غبن میں شرط رکھے بنا بھی خیار حاصل ہے۔ یہ وہ غبن ہے جو ہر ایک پر مخفی رہتا ہے۔ جبکہ غبن خاص وہ ہے جس کا شکار کوئی فرد واحد ہی ہوتا ہے۔ ایسے غبن میں "لَا خِلَابَةَ" کی شرط رکھنے کی احتیاج ہوتی ہے۔

یا پھر اس حدیث کی توجیہ یہ ہے کہ مذکورہ شرط تاکید اور قطع نزاع کے باب سے ہے۔

- خیارِ غبن ہر مغبون کے لیے ثابت ہے، اور ہر قسم کے غبن میں ثابت ہے۔
- مسلمانوں کے درمیان معاملہ خیر خواہی کا ہونا چاہیے۔
- بیع پر قیاس کر کے جملہ عقود میں غبن اور دھوکا ناجائز ہوگا۔ کیونکہ یہ ممانعت اس ارشاد باری تعالیٰ کے عموم میں داخل ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (المائدۃ: 1)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو۔''

- معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ لوگوں کے دین و دنیا کے جملہ احوال کی اصلاح کی ضامن ہے۔
- معلوم ہوا کہ ناسمجھ کی اس کی بھلائی کی طرف رہنمائی کرنا واجب ہے۔

3۔ بَابُ الرِّبَا ......سود کا بیان

تمہید:......سود کا لغوی اور شرعی معنی:...... ربا کا لغوی معنی زیادتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ (فصلت: 39)

''پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور پھولتی ہے۔''

جبکہ شرع شریف میں ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو دو ایسی چیزوں میں پائی جائے جن میں عوض کے ساتھ تفاضل کو شرع شریف نے حرام قرار دیا ہو یا ان میں قبضہ کرنے کی تاخیر کو شریعت نے حرام قرار دیا ہو جبکہ وہ دونوں چیزیں ایسی ہوں جن پر فی الفور قبضہ کرنا شرط ہوتا ہو۔

سود کا حکم

سود کتاب وسنت اور امت کے اجماع سے حرام ہے۔ یہ کبیرہ گناہ ہے اور یہ ان سات ہلاکت آفرین باتوں میں سے ایک ہے جن کی بابت نبی کریم ﷺ نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ: ''سات ہلاکت آفرین باتوں سے بچو۔'' [1] علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس قدر وعید سود کے معاملہ پر آئی ہے شرک کے سوا ایسی وعید اور کسی معاملہ پر نہیں آئی۔ کیونکہ یہ معاشرہ کے دین و دنیا دونوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

مسلمانوں کا اس کی حرمت پر اجماع ہے چاہے سود لینے والا محتاج ہو یا غیر محتاج۔ پھر سود کا حکم اشیائے معینہ میں جاری ہوتا ہے جن کا ذکر آگے احادیث میں آ رہا ہے۔ کتاب اللہ کی متعدد نصوص سود کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا

[1] صحيح البخاري: 2766۔ صحيح مسلم: 89.

النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَo﴾ (آل عمران: 130 ـ 131)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مت کھاؤ سود کئی گنا، جو دگنے کیے ہوئے ہوں اور اللہ سے ڈرو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

سود حرام اور اس کی لعنت عام ہے

816، 817- عَنْ جَابِرٍ ﷺ قَالَ: ((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ: ((هُمْ سَوَاءٌ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے سود کھانے والے پر، اور اس کے کھلانے والے پر اس کے (معاملہ کے) لکھنے والے پر اور اس (معاملہ) کے گواہ بننے والوں پر (سب پر) لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ: (اس لعنت کے مستحق ہونے میں) یہ سب برابر ہیں۔ ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ- وَلِلْبُخَارِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ جُحَيْفَةَ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور صحیح بخاری میں بھی ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ❷

شرح:...... مذکورہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے سود میں ملوث پانچ افراد پر لعنت فرمائی ہے، جو یہ ہیں:

(1) سود کھانے والا: چونکہ سود سے بلاواسطہ مستفید یہی ہوتا ہے اسی لیے پہلے اسی کا ذکر فرمایا اور یہ ان سب سے زیادہ ملعون ہے کیونکہ یہ سود جیسا حرام ترین اور ناپاک ترین مال کھاتا ہے۔ سود کھانے کے حکم میں سود کی رقم سے حاصل کردہ لباس، مکان، سواری وغیرہ سب چیزوں کو برتنا بھی شامل ہے۔

یہی حکم پینے کا بھی ہے۔ کھانے کا ذکر اس لیے کیا کیونکہ یہ سود کی رقم سے انتفاع کی سب سے خاص اور اکثر صورت ہے۔ پھر چاہے اپنے کھانے کے لیے سود لے یا دوسروں کو کھلانے کے لیے لے دونوں کا حکم ایک ہے۔

(2) سود کھلانے والا: یہ دوسرے کو سود دینے والا ہے اور سود جیسے حرام فعل میں معین و مددگار بننے پر مستحق لعنت ہوا ہے۔

(3) سودی معاملہ کی دستاویز لکھنے والا اس لیے مستحق لعنت ہوا ہے کیونکہ سودی معاملہ لکھ کر دینے سے اس نے اس معاملہ کو اور زیادہ پکا کر دیا ہے۔ دوسرے اس کا لکھنا اس کے سود پر راضی ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا یہ بھی اس سودی معاملہ میں سود کھانے والے کا شریک کہلائے گا۔ پھر یہ گناہ پر اعانت بھی ہے۔

(4-5) دو گواہ کہ یہ بھی لعنت کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کی شہادت بھی ان کے سود پر راضی ہونے کی دلیل ہے اور حرام پر راضی حرام کے مرتکب جیسا ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سود کھانا، کھلانا، اس کا گواہ بننا اور اس کو لکھنا وغیرہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔ کیونکہ ان افعال پر لعنت کی وعید آتی ہے اور لعنت ہمیشہ کبیرہ گناہ پر مرتب ہوتی ہے۔

❶ صحيح مسلم: 1597. ❷ صحيح البخاري: 2086.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حرام میں معاون حرام کے مرتکب جیسا ہے۔ چاہے وہ مظلوم ہی ہو۔ کیونکہ سود کھلانے والا ایک طرح سے مظلوم ہے لیکن اس کے باوجود گنہگار ہے کیونکہ وہ حرام کا معاون ہے، اور حرام پر معاونت اور اس پر راضی ہونا دونوں حرام ہیں۔
- حرام پر گواہ بننا بھی حرام ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سودی معاملہ پر گواہ بننے والوں کو بھی ملعون کہا ہے۔ یہی حکم سود کی دستاویز لکھنے والے کا بھی ہے۔ کیونکہ یہ گواہ اور کاتب دونوں حرام پر راضی ہیں لہٰذا برابر کے گنہگار ہیں۔
- حرام میں معاون گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ اس کی دلیل "هُمْ سَوَاءٌ" کے الفاظ ہیں۔
- "وللبخاری نحوه" امام موصوف رحمہ اللہ نے یہ اس لیے فرمایا کیونکہ حدیث ابی جحیفہ رضی اللہ عنہ میں کاتب اور شاہدین کا ذکر نہیں۔

818- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((الرِّبَا ثَلَاثَةٌ وَسَبْعُونَ بَابًا، أَيْسَرُهَا مِثْلُ أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ، وَإِنَّ أَرْبَى الرِّبَا عِرْضُ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سود کی تہتر قسمیں ہیں جن میں سب سے ہلکی قسم آدمی کے اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرنے کے جیسی (اشد) ہے اور سود کی سب سے بڑی قسم کسی مسلمان کی عزت (کے درپے ہونا) ہے۔''[1]

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ مُخْتَصَرًا، وَالْحَاكِمُ بِتَمَامِهِ، وَصَحَّحَهُ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے مختصر جبکہ امام حاکم نے پورا روایت کیا ہے، اور اس کو صحیح بھی کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... الرِّبَا ثَلَاثَةٌ وَسَبْعُونَ بَابًا: باب سے یہاں صنف اور جنس مراد ہے۔ اسی معنی میں علماء کا یہ قول ہے: "لم یصح فی ھذا الباب شیٔ" یعنی علمی مسائل کی اس صنف میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں۔

تہتر قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو سود کو متضمن ہوں۔ طلباء کو چاہیے کہ وہ سود کی قسموں کو شمار کریں۔

وَأَيْسَرُهَا: ایسر سے مراد سب سے ہلکی قسم ہے، اور "هَا" ضمیر کا مرجع "ثَلَاثَةٌ وَسَبْعُونَ بَابًا" کا لفظ ہے۔ اعراب کے اعتبار سے یہ لفظ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

مِثْلُ أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ: یہ خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اس میں سود کی بے حد شناعت وقباحت کا بیان ہے۔ کہ جب اس کی سب سے ہلکی قسم اس قدر اشد ہے تو باقی قسموں کا حال کیا ہوگا۔

وَإِنَّ أَرْبَى الرِّبَا: اربی سے مراد اعلیٰ ہے۔ یعنی کسی مسلمان کی عزت سے کھلواڑ کرنا سود کی بدترین قسم ہے۔

درایۃ الحدیث:...... مذکورہ حدیث کا مضمون تو بالکل واضح ہے۔ البتہ متن کے اعتبار سے حدیث میں کلام ہے کہ مذکورہ متن میں نکارت ہے۔ وہ یوں کہ یہاں ماں سے نکاح کرنے کو سب سے ہلکا جبکہ مسلمان کی عزت کو سب سے اہم اور

---

[1] سنن ابن ماجہ: 2274۔ المستدرك للحاكم: 43/2۔ حاکم کے طریق سے یہ روایت امام بیہقی نے بھی روایت کی ہے اور فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ جبکہ اس کا متن اس اسناد کے ساتھ منکر ہے۔ میرے علم میں یہ وہم ہے۔ گویا کہ اس کے کسی راوی نے ایک اسناد میں دوسری اسناد کو داخل کر دیا ہے۔ دیکھیں: سنن البیہقی: 150/7.

اشد قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ ماں سے نکاح کرنا عقل وشرع اور عرف وعادت میں سب سے بدترین گناہ ہے جو کسی امت کے نزدیک روا نہیں سوائے مجوسیوں کے جو خلق خدا میں سے بدترین اور غلیظ ترین لوگ ہیں۔ اب سود کی ہلکی ترین صورت مثلاً ایک صاع گندم کو دو صاع گندم کے بدلے میں بیچنا ہے۔ لیکن کیا یہ معمولی ترین صورت ماں کے ساتھ نکاح کرنے جیسی اشد ہے؟!!! بہر حال ایسی بات سے جی میں ایک کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے کہ جب مثال مُمَثَّل سے زیادہ اشد ہو۔

دوسرے یہاں سود کی سب سے بڑی صورت مسلمان کی آبروریزی جیسی قرار دی گئی ہے تو کیا پھر ایک مسلمان کی آبروریزی سگی ماں سے نکاح کرنے سے بھی زیادہ اشد ہے!! لیکن حدیث کے ظاہر کا مقتضیٰ بہر حال یہی ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں حدیث کی صحت کی بابت جی میں قلق ضرور پیدا کرتی ہیں کیونکہ ایسی باتوں کا جناب رسول اللہ ﷺ سے صدور عجب ضرور ہے۔ البتہ اس کی یہ توجیہ پیش کی جاسکتی ہے کہ یہاں ربا سے لغوی ربا مراد ہو جس کا معنی زیادتی ہے نا کہ حرام ربا۔ یعنی اس سے لوگوں کی آبروریزی میں بڑھتے جانا مراد ہے کہ بسا اوقات آدمی دوسروں کی آبروریزی کرتے کرتے دنیا بھر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ لوگوں کی عزتوں پر حملہ نہ کر لے اسے چین نہیں ملتا۔

پس اگر تو یہ حدیث صحیح ہو تو تب پھر اس کی یہی قابل قبول توجیہ ہو سکتی ہے کہ اربی الربا سے مراد ربا کا لغوی معنی ہو۔

سود کی قسمیں

819۔ وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ ﷛ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا تَبِيْعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ، وَلَا تَبِيْعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ، وَلَا تَبِيْعُوْا مِنْهَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو مگر ایک جیسا اور ایک کو دوسرے پر زیادہ نہ کرو، اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر ایک جیسا اور ایک کو دوسرے سے زیادہ نہ کرو اور ان میں سے غیر موجود کو موجود کے بدلے نہ بیچو۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

820۔ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَدًا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ)).

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے، گندم کو گندم کے بدلے، جَو کو جَو کے بدلے، کھجور کو کھجور کے بدلے، اور نمک کو نمک کے بدلے ایک جیسا، برابر سرابر اور دست بدست (بیچو) پس جب یہ اصناف مختلف ہوں تو ان کو (باہم) جیسے چاہو (کمی بیشی کے ساتھ) بیچو جبکہ یہ بیچنا دست بدست ہو۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري: 2177- صحيح مسلم: 1584.

[2] صحيح مسلم: 1587.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کوامام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

821- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَزْنًا بِوَزْنٍ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَزْنًا بِوَزْنٍ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَهُوَ رِبًا)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سونے کو سونے کے بدلے ایک جیسے وزن کے ساتھ ایک جیسا (بیچو) اور چاندی کو چاندی کے بدلے ایک جیسے وزن کے ساتھ ایک جیسا (بیچو) پس جس نے زیادہ کیا یا زیادتی چاہی تو یہ سود ہے۔'' [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کوامام مسلم نے روایت کیا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ تینوں احادیث میں دواہم باتیں مذکور ہیں:

(1) ربا کن چیزوں میں جاری ہوتا ہے۔

(2) ربا کی کتنی قسمیں ہیں۔

تو ربا سونا، چاندی، گندم، جَو، کھجور اور نمک میں جاری ہوتا ہے۔

اور ربا کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: (1) ربائے فضل۔ (2) اور ربائے نسیئہ۔ ربائے فضل کو ربائے خفی بھی کہتے ہیں، یہ زیادتی کا ربا ہے۔ جبکہ ربائے نسیئہ کو ربائے جلی بھی کہتے ہیں۔

ربا الفضل حرام ہے کیونکہ یہ ربا النسیئہ کا ذریعہ ہے۔ نسیئہ کا معنی مؤخر ہے، اور یہ سونے کو سونے کے بدلے میں تاخیر کے ساتھ بیچنے کا نام ہے۔ اور اکثر اس میں فضل یعنی زیادتی ہی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ آدمی دینار کے بدلے دینار بعد میں لینے پر تب ہی تیار ہوتا ہے جب اسے دینار سے زیادہ مل رہا ہو۔

ربا الفضل بھی اکثر واقع ہوتا ہے۔ البتہ ربا النسیئہ دو جنسوں کے درمیان جبکہ ربا الفضل ایک ہی جنس میں جاری ہوتا ہے۔

پس جب جنس ایک ہو تو دو باتیں شرط ہیں: (1) دونوں عوض برابر سرابر ہوں۔ (2) اور دونوں پر قبضہ دست بدست ہو، اور اگر قبضہ تو نقد ہو پر دونوں عوضین میں باہم تفاضل ہو تو یہ ربا الفضل ہے، اور اگر دونوں میں سے ایک عوض پر قبضہ بدون فضل کے مؤخر ہو تو یہ ربا النسیئہ ہے، اور اگر اس صورت میں زیادتی بھی ہو تو یہ ربا الفضل بھی ہے اور ربا النسیئہ بھی۔

تب پھر ربا کی یہ دونوں قسمیں کبھی اکٹھی بھی ہو جاتی ہیں جبکہ عوضین کی جنس ایک ہو گو کہ جدا جدا تو پائی ہی جاتی ہیں۔ جبکہ عوضین دو جنس کے ہوں کہ اس صورت میں ربا الفضل تو نہیں پایا جاتا البتہ ربا النسیئہ ضرور پایا جاتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ ربا کے یہ احکام اموال ربویہ میں جاری ہوں گے، اور اگر عوضین اموالِ ربویہ میں سے نہ ہوں تو ان میں ربا کی دونوں قسمیں جاری نہ ہوں گی۔

اس تمہید کے بعد اب تینوں احادیث پر سلسلہ وار کلام ملاحظہ فرمائیے۔

غریب الحدیث:...... مِثْلًا بِمِثْلٍ: مراد وزن میں ایک جیسا ہونا ہے نہ کہ وصف میں۔ لہٰذا جب سونے کو سونے کے بدلے میں بیچا جائے گا تو دونوں کا وزن برابر ہونا چاہیے خواہ وصف میں مختلف ہوں۔ لہٰذا عمدہ سونے کو گھٹیا سونے کے

[1] صحیح مسلم: 1588.

بدلے بیچ سکتے ہیں جبکہ دونوں وزن میں برابر ہوں۔

غرض یہاں کیت کی مماثلت اور برابری مراد ہے نہ کہ کیفیت اور وصف کی۔

وَلَا تُشِفُّوا: یہ اِشفاف سے مشتق ہے، اور باب افعال سے امر کا جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ یہ کمی اور زیادتی دونوں معنی میں آتا ہے۔ اس لیے یہ اضداد کی قبیل میں سے ہے۔ البتہ جب اس کا صلہ "عَلَی" ہو تو یہ زیادتی کے معنی میں آتا ہے اور جب اس کا صلہ "عَنْ" ہو تو یہ کمی کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ کلمہ زیادتی کے معنی میں ہے کیونکہ عَلَی کے ساتھ مشتق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سونے کو سونے کے ساتھ بیچا جائے تو ایک کو دوسرے سے زیادہ نہ کیا جائے۔ نہ تو خود سونے کی جنس سے اور نہ غیر جنس سے۔ مثلاً کسی نے ایک دینار بیچا جس کی قیمت بیس درہم ہے تو اب وہ اس کے عوض میں آدھا دینار اور دس درہم نہ لے۔ کیونکہ حدیث کے ظاہر سے اس صورت کا ناجائز ہونا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں دونوں طرف سونے کا وزن برابر نہیں، ایک طرف دینار ہے تو دوسری طرف آدھا دینار ہے۔

اسی طرح اگر کسی نے ڈھلے سونے کو سونے کی ڈلیوں کے عوض بیچا اور ساتھ میں ڈھلائی کی قیمت بھی لے لی تو یہ ناجائز ہوگا۔

وَلَا تَبِيعُوا مِنْهَا غَائِباً بِنَاجِزٍ: غائب سے مراد غیر موجود اور ناجز سے مراد موجود اور منقود ہے۔ اس جملہ میں دراصل سونے کی سونے کے ساتھ اور چاندی کی چاندی کے ساتھ بیع میں اور دونوں کی باہم مختلف بیع میں ربا النسیئہ کی حرمت کا بیان ہے کہ سونے چاندی کی باہم بیع کی تینوں صورتوں میں نسیئہ حرام اور سود ہے۔ چاہے ایسا نفع کمانے کی غرض سے کیا جائے اور چاہے محتاج کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کے لیے کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں حرام ہے۔

اب ذیل میں حدیث عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ پر کلام ملاحظہ ہو:

الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ: مذکورہ "بَا" بدل کے لیے ہے۔ اس کے بعد نبی کریم نے ﷺ چھ اموالِ ربویہ کو شمار کر کے یہ فرمایا ہے کہ جب ان کی ہم جنس کے ساتھ بیع ہو تو دونوں وزن اور کیت میں بھی برابر ہوں اور دونوں کا لین دین بھی دست بدست ہو۔

سَوَاءً بِسَوَاءٍ: یہ "مِثْلًا بِمِثْلٍ" کی تاکید معنوی ہے۔ چونکہ لوگ اس معاملہ میں بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس امر کو تاکید کے ساتھ بیان فرمایا۔

مذکورہ دونوں تاکیدات ربا الفضل کی تحریم کو بیان کر رہی ہیں۔

يَدًا بِيَدٍ: ان کلمات میں ربا النسیئہ کی تحریم کا بیان ہے۔ لہٰذا جب اموالِ ربویہ کی ہم جنس کے ساتھ بیع ہو تو عوضین پر قبضہ نقد ہو۔ دونوں میں سے کوئی عوض ادھار نہ ہو۔

فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ: یعنی جب اموال ربویہ کی باہم بیع جنس کے اختلاف کے ساتھ ہو تو اس میں ربا الفضل تو جائز ہے البتہ ربا النسیئہ جائز نہیں۔ جس کا بیان "يَدًا بِيَدٍ" کے کلمات میں ہے۔ پس گندم اور جو کو باہم کمی بیشی کے ساتھ لیکن نقد اور دست بدست بیچنا جائز ہوگا۔

اموالِ ربویہ کے علاوہ میں ربا کے جاری ہونے کا بیان

اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ ربا کا یہ حکم انہی چھ اموال تک محدود ہے جن کا ذکر نص میں آ گیا ہے، اور ان پر دوسرے اموال کو قیاس کرنا یہ اللہ کے بندوں پر تنگی کرنا ہے۔ اس لیے ہم اس حکم کو انہی اشیائے ستہ تک محدود رکھیں گے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کا حسن تعلیم کہ آپ ﷺ کلام کو انواع واقسام میں تقسیم کر کے بیان فرماتے تھے۔

◈ بسا اوقات شارع علیہ السلام ایک شے کو مجمل بیان کر کے اس کے تفصیلی علم کو لوگوں کے حوالہ کر دیتے ہیں تا کہ وہ تتبع اور تحقیق و جستجو میں لگے رہیں۔ البتہ ایسا آپ ﷺ نے انہی امور میں کیا جن کا ادراک تتبع کے ساتھ ہو سکتا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ''سود کی تہتر قسمیں ہیں'' فرما کر ان کو بیان نہیں فرمایا۔لیکن علماء ان کو جاننے کے لیے ان کا تتبع کرتے رہے۔

◈ شرک کے بعد سود بدترین اور سب سے بڑا کبیرہ گناہ ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کی سب سے ہلکی صورت کو بھی ماں کے ساتھ نکاح کرنے کے مساوی برا قرار دیا ہے۔ یہیں سے سود کی سخت تحذیر بھی معلوم ہوگئی۔

◈ مسلمانوں کی آبروریزی کے درپے ہونا بدترین سود کے برابر ہے۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی آبروریزی سے بچنا واجب ہے۔

◈ سونے چاندی کی ایک جنس کے ساتھ بیع میں تفاضل اور نسیئہ دونوں حرام ہیں۔ البتہ اختلاف جنس کی صورت میں نسیئہ حرام ہے۔

◈ سونے چاندی کی باہم بیع میں تقابض میں تاخیر حرام ہے۔ چاہے سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے اور چاہے سونے کو چاندی کے بدلے بیچا جائے۔

◈ جناب رسول اللہ ﷺ کا حسن بیان اور کمال بلاغت کہ آپ ﷺ نے سونے چاندی کی بیع کو بالتفصیل بیان فرمایا ہے۔

◈ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ اس بات کی دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں جو تفاضل کرے یا تفاضل کا مطالبہ کرے، دونوں سود خور ہیں۔

◈ مذکورہ تینوں احادیث میں حدیث عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنے دلائل کے اعتبار سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ لہٰذا حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ بظاہر باقی کی دونوں احادیث سے مستغنی کر دیتی ہے۔

822، 823- وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ وَأَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنهما، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلَى خَيْبَرَ، فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيبٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((أَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هٰكَذَا؟)) فَقَالَ: لَا، وَاللهِ! يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالثَّلَاثَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَفْعَلْ، بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ، ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا)).

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ایک صاحب رضی اللہ عنہ کو خیبر کا عامل (زکوٰۃ) بنایا۔ پس وہ صاحب (واپسی میں) جنیب نامی کھجور لے کر آئے۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی (عمدہ) ہوتی ہیں؟'' ان صاحب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم نہیں! (ہوتا یوں ہے کہ) ہم اس کھجور کے ایک صاع کو (دوسری کھجوروں کے) دو اور تین صاع کے عوض (خرید) لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا مت کرو، ساری کھجور کو دراہم کے بدلہ بیچ دیا کرو پھر ان دراہم سے (یہ) جنیب کھجور خرید لیا کرو۔''[1]

وَقَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلَ ذٰلِكَ.

(آگے راوی کہتے ہیں) آپ ﷺ نے موزونی اشیاء (یعنی

[1] صحیح البخاری: 2202- صحیح مسلم: 1593.

سونے اور چاندی) کے بارے میں بھی ایسا ہی فرمایا۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . وَلِمُسْلِمٍ "وَكَذَلِكَ الْمِيزَانُ" . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔ اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور موزونی اشیا بھی (حکم میں) اسی طرح ہیں۔

غریب الحدیث :......اِسْتَعْمَلَ رَجُلًا: یہ صاحب حضرت سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ تھے۔ صحابی رسول ﷺ کے نام کے مجہول ہونے سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔

مراد عامل زکوۃ بنانا ہے۔

بِتَمْرٍ جَنِيبٍ: جنیب ایک سخت قسم کی کھجور ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض کھجوریں نرم ہوتی ہیں۔ جنیب بہت عمدہ قسم کی کھجور ہوتی ہے۔

أَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هَكَذَا؟: کیونکہ نبی کریم ﷺ ان باتوں کو نہ جانتے تھے اور نہ آپ ﷺ خیبر کی کھجوروں کی سب قسموں کو ہی جانتے تھے، اسی لیے یہ استفسار فرمایا۔ جس کے جواب میں حضرت سواد رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ خیبر کی سب کھجوریں ایسی عمدہ نہیں ہوتیں۔ اچھی اور عمدہ کھجوروں کے ساتھ ساتھ ردی کھجوریں بھی ہوتی ہیں۔ پھر یہ بتلایا کہ ہم جنیب کھجور کیونکر حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا: وَإِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالثَّلَاثَةِ: صاعین اور ثلاثہ سے مراد خیبر کی کھجوریں ہیں کہ وہ جنیب کے ایک صاع کو دوسری کھجوروں کے دو یا تین صاع کے بدلے خریدتے تھے۔

لَا تَفْعَلُ هٰذَا: مذکورہ ''لا'' ناھیہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمادیا کہ آدمی کم شے کو زیادہ شے کے بدلے میں خرید لے کہ یہ سود ہے۔

بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ: جب آپ ﷺ نے سود پر مشتمل اس صورت سے منع فرمایا تو سود سے پاک دوسری صورت کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ جمع سے مراد ملی جلی کھجوریں ہیں۔ عموماً ملی جلی کھجوروں میں ردی کھجوریں بھی ہوتی ہیں۔ یعنی ساری کھجوریں اکٹھی کر کے ان کو دراہم کے عوض بیچ دو۔

ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا: پھر ان دراہم سے جنیب کھجوریں خریدو۔ صحیح مسلم کی روایت میں ''رُدُّوْهُ'' کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی پہلی بیع واپس کردو۔ جس سے معلوم ہوا کہ عاقد کو چاہے کسی عقد کے حرام ہونے کا علم نہ بھی ہو تب بھی وہ عقد باطل اور حرام ہے اور وہ عقد واپس کرنا واجب ہے۔ کیونکہ ایسے عقد کے نافذ کرنے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہے۔

وَقَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلَ ذَلِكَ: میزان سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو وزن کیا جاتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ میزان سے مراد سونا چاندی ہے کیونکہ ان کو بھی وزن کر کے خریدا اور بیچا جاتا ہے۔

یعنی آپ ﷺ نے سونے چاندی کے بارے میں بھی وہی فرمایا جو کھجور کی کھجور کے ساتھ بیع کی بابت فرمایا تھا۔

مضمون حدیث :......مذکورہ حدیث میں یہ اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اموال ربویہ کی ایک جنس کی باہم بیع کی جائے تو ردی اور عمدہ دونوں کو تفاضل اور نسیئہ دونوں کے ساتھ بیچنا حرام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اموال صدقات کی وصولی کے لیے اور شرکاء کے محاسبہ کے لیے صرف ایک آدمی کو بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ خیبر کے

پھل مسلمانوں اور یہودیوں میں نصفا نصف کے عقد پر تھے۔ البتہ عامل میں دو باتوں کا پایا جانا شرط ہے۔

(1) ایک یہ کہ وہ متعلقہ امر کا ماہر ہو۔ (2) دوسرے یہ کہ وہ امانتدار ہو۔

◈ ایک جنس کی عمدگی اور گھٹیا پن سود کا حکم جاری ہونے میں مؤثر نہیں۔ لہٰذا گھٹیا کو اگر عمدہ کے ساتھ تفاضل کے ساتھ بیچا تو یہ بھی سود ہوگا۔ جیسا کہ ایک روایت میں "عَيْنُ الرِّبَا" کے الفاظ بھی آتے ہیں، اگرچہ عمدہ اور گھٹیا اشیاء اپنی بازار کی قیمت میں مختلف ہوتی ہیں۔

◈ نوع کا اختلاف بھی ربا کے حکم میں مؤثر نہیں۔ لہٰذا کھجوروں کی مختلف انواع کی باہم تفاضل کے ساتھ بیع رباء کا حکم جاری ہونے میں مانع نہ ہوگا۔

◈ حرام پر مشتمل عقد کو جاری رکھنا ناجائز ہے۔ بلکہ اس عقد کو توڑنا واجب ہے۔

◈ مفتی کو چاہیے کہ اگر وہ لوگوں کو ایک حرام بات سے منع کرتا ہے تو وہ انہیں دوسرے حلال رستے کی طرف رہنمائی بھی کرے۔

◈ مذکورہ حدیث حیلہ کے جواز کی دلیل نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ: ''ساری کھجوروں کو دراہم کے بدلے بیچ دو، پھر دراہم سے جنیب خرید لو'' مطلق ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پھر بعد میں ان دراہم سے اسی کھجور والے سے ہی کھجوریں خرید لینا۔ پس یہ حدیث مطلق ہے۔ دوسرے یہ کہ خود نص میں حیلہ اختیار کرنے کی مذمت وارد ہے۔ چنانچہ یہود کے بارے میں فرمایا: ''اللہ ان یہود کا ستیاناس کرے کہ جب رب تعالیٰ نے ان پر جانوروں کی چربیوں کو حرام کر دیا تو انہوں نے ان چربیوں کو پگھلا کر بیچا اور اس کا ثمن کھایا۔'' [1] یہ بددعا یہود کی حیلہ گری پر تھی۔

◈ عمدہ غذا لینا اور کھانا زہد کے منافی نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سواد رضی اللہ عنہ کے عمدہ کھجوریں خریدنے کو برقرار رکھا۔ البتہ سود پر مشتمل عقد پر نکیر فرمائی۔

◈ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر سودی معاملہ ظلم سے پاک ہو تو جائز ہے، مذکورہ حدیث ان لوگوں پر رد ہے۔

◈ رب تعالیٰ جب بندوں پر ایک شے کو حرام فرماتے ہیں تو کسی دوسری شے کو حلال بھی فرماتے ہیں۔ پھر حلال چیزیں زیادہ اور حرام کم ہیں، اور یہ رب تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے بندوں پر تنگی نہیں کی۔

کھجوروں کی کھجوروں سے بیع اور ان کی شروط کا بیان

824۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ الَّتِيْ لَا يُعْلَمُ مَكِيْلُهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمَّى مِنَ التَّمْرِ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے کھجور کے ایسے ڈھیر کو، جس کا ناپ معلوم نہ ہو، ایسی کھجوروں کے بدلے بیچنے سے منع فرمایا جس کا ناپ معلوم ہو۔ [2]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......الصُّبْرَةِ: کسی چیز کا ڈھیر۔ اس کی لغوی تحقیق بیان کی جا چکی ہے۔

لَا يُعْلَمُ مَكِيْلُهَا: یعنی اس کا ناپ معلوم نہ تھا کہ مثلاً یہ معلوم نہ ہو کہ یہ ڈھیر کتنے صاع کا ہے۔

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ [2] یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی روایت کی ہے۔ اس کی تخریج آگے آ رہی ہے۔

بِالْكَيْلِ الْمُسَمَّى: کھجوریں جن کا وزن معلوم ہو کہ یہ اتنے اتنے صاع ہے۔یعنی نبی کریم ﷺ نے معلوم المقدار کھجور کو نامعلوم المقدار کھجوروں کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ کھجور اموالِ ربویہ میں سے ہے جن میں مساوات شرط ہے اور یہ شرط یہاں ایک طرف کی کھجوروں کی مقدار کے مجہول ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔

مضمونِ حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اموالِ ربویہ میں ایک جنس کی باہمی بیع میں وزن میں مساوی ہونا شرط ہے اور کمی بیشی ربا الفضل کے حکم میں داخل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ کھجور کے ڈھیر کو معلوم المقدار کھجوروں کے بدلے بیچنا حرام ہے۔ کیونکہ نہی میں اصل تحریم ہے۔لہٰذا اگر ڈھیر کا ناپ معلوم ہے تو اس کو دوسری کھجوروں کے بدلے بیچنا جائز ہوگا جن کا وزن معلوم ہو۔

◈ جب ممانعت عین کی ہو تو عقد فاسد ہوتا ہے۔

◈ ربا کا معاملہ بے حد سخت ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ مکیلی شی کو عقد سے قبل کے کیے ہوئے کیل کی بنا پر قبضہ میں لینا جائز ہے۔ البتہ اس میں اتنا وقت نہ گزرنا شرط ہے جس میں مبیع میں تغیر آ جائے۔لہٰذا اگر کسی نے دوسرے کے سامنے ایک شے کو ناپا تو وہ اسے خرید سکتا ہے۔ چاہے خریدتے وقت دوبارہ کیل نہ بھی کرے اور آنکھوں دیکھے گزشتہ کیل پر ہی اعتماد کرلے۔

◈ معلوم ہوا کہ دو ڈھیروں کو بھی باہم بیچنا جائز نہیں۔کیونکہ یہاں عوضین کی مقدار نامعلوم ہے۔

825- وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: إِنِّي كُنْتُ أَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((الطَّعَامُ بِالطَّعَامِ مِثْلًا بِمِثْلٍ))، وَكَانَ طَعَامُنَا يَوْمَئِذٍ الشَّعِيرَ.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کرتا تھا کہ: کھانے کو کھانے کے بدلے برابر سرابر (بیچو) اور ان دنوں ہمارا کھانا جَو ہوا کرتا تھا۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... إِنِّي كُنْتُ أَسْمَعُ: یہ ماضی کی حکایت فعل مضارع کے ساتھ ہے جو حال پر دلالت کرتا ہے۔گویا کہ اس میں اپنے ضبط کی تاکید کی طرف اشارہ ہے کہ مجھے یہ بات ابھی کی کسی بات کی طرح خوب یاد ہے۔

مِثْلًا بِمِثْلٍ: مراد وزن اور مقدار میں برابری ہے۔نہ کہ صفت میں جیسا کہ بیان ہوا۔

وَكَانَ طَعَامُنَا يَوْمَئِذٍ الشَّعِيرَ: طعام فعل ناقص کا اسم اور شعیر فعل ناقص کی خبر ہے۔مذکورہ جملہ میں کھانے کی بابت خبر ہے کہ وہ جَو بھی ہوتا تھا نہ کہ اس بات کی خبر ہے کہ جَو ہی کھانا ہوتا تھا۔لہٰذا یہ کھانے کی بابت خبر ہے نہ کہ جَو کے بارے میں۔

مذکورہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جَو کو جَو بدلے تفاضل اور نسیئہ کے ساتھ بیچنا حرام اور ناجائز ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ غلہ کی بیع غلہ سے ہو تو دونوں کا ہم وزن ہونا شرط ہے۔

---

[1] صحيح مسلم: 1592.

◈ معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی بے حد درویشانہ، زاہدانہ، فقیرانہ اور مشقت والی تھی۔ حتیٰ کہ جَو کھا کر بھی گزران کر لیتے تھے جو فی زمانہ بے حد مشکل ہے۔

◈ آدمی اپنے بارے میں دوسرے کو خبر دے سکتا ہے چاہے وہ اپنے تنگ حالات کی خبر ہی ہو۔ البتہ اس میں رب تعالیٰ کی شکایت کا پہلو نہ ہو۔

سونے کی سونے کے بدلے بیع کا حکم

826۔ وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رضي الله عنه قَالَ: اشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلَادَةً بِاثْنَيْ عَشَرَ دِينَارًا، فِيهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ. فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيهَا أَكْثَرَ مِنَ اثْنَيْ عَشَرَ دِينَارًا، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: ((لَا تُبَاعُ حَتَّى تُفَصَّلَ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: خیبر (کی فتح) کے دن میں نے بارہ دینار میں ایک ہار خریدا جس میں سونا اور نگینے تھے۔ سو میں نے (جب) سونے کو ہار سے جدا کیا تو میں نے اس میں بارہ دینار سے زیادہ کا سونا پایا۔ میں نے یہ بات خدمتِ نبوی میں عرض کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سونے کو نہ بیچا جائے۔ یہاں تک کہ اس کو الگ کر لیا جائے۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **يَوْمَ خَيْبَرَ**: مراد فتح خیبر کا دن ہے۔ اس دن خیبر کے غنائم تقسیم ہوئے تھے۔ حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے یہ ہار انہی اموالِ غنائم سے خریدا تھا۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق اس کی قیمت بارہ دینار تھی۔

قِلَادَةً: گلے میں ڈالے جانے والا ہار۔ **فِيهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ**: خَرَزٌ: یہ خَرَزَةٌ کی جمع ہے۔ نگینہ، پتھر کا منقش سوراخ دار دانہ۔ عموماً ہاروں میں نگینے اور سونے کا استعمال کیا جاتا ہے۔

فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيهَا أَكْثَرَ مِنَ اثْنَيْ عَشَرَ دِينَارًا: دونوں جگہ "ھا" ضمیر کا مرجع ''قلادۃ'' ہے اور مراد اس میں سے بارہ دینار سے زیادہ وزن کا سونا ہونا ہے۔

اب چونکہ یہ ہار بارہ دینار کے بدلے خریدا گیا تھا۔ جبکہ اس میں موجود سونا وزن میں بارہ دینار سے زیادہ تھا، اور سونے کی جب سونے سے بیع کی جاتی ہے تو دونوں کا وزن میں مساوی ہونا شرط ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لَا تُبَاعُ حَتَّى تُفَصَّلَ: کہ جب تک سونے کو ہار کے دانوں اور نگینوں سے جدا نہ کر لیا جائے اس کو نہ بیچا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے لا تفعل کی بجائے لا تباع فرمایا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس بیع کو توڑنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ سود پر مشتمل ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے کہ اموالِ ربویہ کی جب باہم ایک جنس کے ساتھ بیع وشراء کی جائے تو عوضین کا ہم وزن ہونا واجب ہے وگرنہ ربا الفضل میں داخل ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ کفار سے حاصل ہونے والے غنائم کے مالک مجاہدین مسلمین ہیں۔ اسی لیے تو اس ہار کی بیع جو یہود کا مال اور غنیمت میں

[1] صحيح مسلم: 1591.

سے تھا، درست بن کر واقع ہوئی تھی۔

◈ تساوی کی شرط میں دست کاری اور کاری گری مؤثر نہیں۔ لہٰذا اموالِ ربویہ جب ہم جنس کے ساتھ بیچے جائیں تو چاہے ان پر کوئی کام بھی کیا گیا ہو تب بھی ان میں تفاضل کی صورت میں ربا کا حکم جاری ہوگا۔ پھر جب شریعت نے مصنوع میں زیادتی کو منع کیا ہے تو غیر مصنوع میں تو بدرجہ اولیٰ زیادتی منع ہوگی۔

◈ معلوم ہوا کہ اگر اموالِ ربویہ میں ہم جنس کے ساتھ غیر جنس بھی ہو تب بھی تفاضل جائز نہیں۔ جیسے گندم کو گندم اور کھجور کے بدلے بیچنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ گندم تو گندم کے بالمقابل ہوگئی جبکہ کھجور زیادتی ہے۔ کہ یہ بیع مذکورہ حدیث کی رو سے منع ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احکام شرعیہ کے جاننے کے بے حد حریص تھے۔

◈ غیر شرعی طریق پر ہونے والے **عقد** کو رد کرنا واجب ہے اس کی دلیل "لَا تُبَاعُ" کے الفاظ ہیں۔

◈ ربا تک لے جانے والے ذرائع بھی منع ہیں جس سے معلوم ہوا کہ سود کا معاملہ بے حد سنگین ہے۔

حیوان کی حیوان کے بدلے بیع کا حکم

827- وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضی اللہ عنہ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ نَسِيئَةً)). رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ الْجَارُودِ

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے حیوان کی حیوان کے بدلے ادھار بیع کو منع فرمایا ہے۔ [1] اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی اور ابن جارود نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......**اَلْحَيَوَانُ**: چوپایہ، اور مذکورہ حدیث میں زندہ جانور کو زندہ کے بدلے ادھار بیچنے کی ممانعت کا بیان ہے۔ کیونکہ ذبح کے بعد جانور کو حیوان نہیں بلکہ "لحم" (گوشت) کہا جاتا ہے۔

نَسِيئَةً: مراد بدون قبض کے بیچنا ہے۔

صورتِ مسئلہ

مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ حیوان کو حیوان کے بدلے نسیئہ کے طور پر بیچنا ناجائز ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی اونٹ کو اونٹ کے بدلے بیچے اور اونٹ پر قبضہ نہ کرے۔ ظاہر حدیث اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ حکم ایک جنس کے جانوروں کی باہم بیع نسیئہ کو بھی شامل ہے۔ جیسے اونٹ کو اونٹ کے ساتھ بیچنا اور دو جنس کے جانوروں کی باہم بیع نسیئہ کو بھی شامل ہے۔ جیسے اونٹ کو گائے کے بدلے میں بیچنا۔

لیکن بعض علماء نے اس مسئلے میں یہ اختلاف کیا ہے کہ اونٹ کی اونٹ سے بیع گندم کی گندم سے بیع کی مانند ہے اور اونٹ

---

[1] سنن ابی داؤد: 3356- جامع الترمذی: 1237- سنن النسائی: 292/7- سنن ابن ماجہ: 2270- مسند احمد: 310/3- المنتقی لابن جارود: 611- سنن البیہقی: 288/5- امام بیہقی فرماتے ہیں: اکثر حفاظ کا قول ہے کہ حسن بصری کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ سوائے حدیث عقیقہ کے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے المجموع: 127/3 میں نقل کیا ہے کہ امام شافعی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

کی گائے سے بیع گندم کی جَو کے ساتھ بیع کے جیسی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں نسیئہ کی بیع میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جب کھانے کی دوجنسوں کی بیع میں ربا جاری نہیں ہوتا تو حیوان کی دوجنسوں میں بدرجہ اولیٰ جاری نہ ہوگا۔ کیونکہ حیوان کا کیل یا وزن کر کے اس کو بیچا نہیں جاتا۔ لہٰذا اس میں ربا النسیئہ کی علت ہی نہیں پائی جاتی۔

پھر اگر یہ حدیث غیر صحیح یعنی منقطع قرار پائے تو حیوانوں میں بیع بالنسیئہ بھی جائز ہوگی۔

فائدہ:...... اگر یہ حدیث صحیح ہو تو حیوان کی حیوان کے ساتھ بدون قبض کے بیع منع ہوگی۔ جبکہ قبضہ کرنے کے ساتھ جائز ہوگی۔ مثلاً چاہے ایک اونٹ کی ایک اونٹ کے ساتھ بیع ہو یا ایک کی دو کے ساتھ ہو، کیونکہ حدیث کے ظاہر کا مقتضی یہی ہے۔

بیع عینہ کا بیان

828۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِيْنَةِ، وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ، وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ، وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ، سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوْا إِلٰى دِيْنِكُمْ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''جب تم باہم بیع عینہ کرنے لگو گے اور بیلوں کی دموں کو پکڑ لو گے (اور ان سے چمٹ جاؤ گے) اور کھیتی باڑی پر راضی ہو رہو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو رب تعالیٰ تم لوگوں پر ایسی ذلت کو مسلط کر دے گا جس کو (اس وقت تک) نہ ہٹائے گا یہاں تک کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ۔'' [1]

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ مِنْ رِوَايَةِ نَافِعٍ عَنْهُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ مَقَالٌ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے نافع کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جبکہ اس حدیث کی اسناد میں کلام ہے۔

وَلِأَحْمَدَ نَحْوُهُ مِنْ رِوَايَةِ عَطَاءٍ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْقَطَّانِ.

اور مسند احمد میں ایسی ہی حدیث عطاء کی روایت سے ہے۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں اور ابن قطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... تَبَايَعْتُمْ: یہ باب تفاعل سے ماضی مطلق کا جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ بابِ تفاعل اشتراک کے معنی کو شامل ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب تم بیع عینہ کا عقد کرنے لگو گے۔

بِالْعِيْنَةِ: بیع عینہ پر مفصل کلام مذکور ہو چکا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی طرف سے امت مسلمہ پر ذلت کے مسلط کیے جانے کا ایک سبب ہے۔

وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ، وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ: أَذْنَابَ: ذَنَبٌ کی جمع ہے۔ جانور کی دم۔

مذکورہ دونوں جملے ایک دوسرے کو لازم ہیں کیونکہ بیلوں کی دموں سے چمٹ جانے اور ان کو تھام لینے کا مطلب ہے ان کو کھیتی باڑی کے لیے پکڑنا۔ کیونکہ کسان ہل چلاتے ہوئے بیل کو پیچھے سے ہانکتا اور اس کی دم کو جھلاتا ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3462۔ مسند احمد: 28/2۔ ابن قطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جیسا کہ التلخیص الحبیر: 19/3 میں ہے۔ جبکہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے المیزان: 393/7 میں اس حدیث کو منکر کہا ہے۔

پھر اس کے بعد "وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ" کا جملہ ہے جو اس کھیتی باڑی میں مگن اور مست ہو جانے کو بتلا رہا ہے۔ تب پھر دونوں جملے ایک معنی کو بیان کرنے کے لیے ہیں۔

یہ ذلت مسلط ہو جانے کا دوسرا سبب ہے کہ امت اپنی کمائیوں، تجارتوں، دکانوں اور کھیتوں میں لگ کر غافل ہو جائے گی تو ان پر ذلت مسلط کر دی جائے گی۔

وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ: یہ ذلت مسلط ہونے کا تیسرا سبب ہے کہ جب امت اپنی جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنا چھوڑ دے گی تو ذلتوں کا شکار ہو جائے گی۔ کیونکہ اغلب یہ ہے کہ جب لوگ حصولِ دنیا میں لگ کر دین کی نصرت وحمایت کو ترک کر دیتے ہیں تو دنیا کے حصول کے لیے ہر ممکن وسیلہ اختیار کرتے ہیں چاہے وہ حرام ہی ہو۔ تب لوگ جہاد سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوا إِلٰى دِينِكُمْ ذلت یہ عزت کی ضد ہے۔ یعنی امت جب ان چار کاموں میں لگ جائے گی:

(1) سود پر مبنی تجارت، جیسے بیع عینہ میں لگنا۔

(2) بیلوں سے چمٹ جانا۔

(3) کھیتی باڑی پر راضی رہنا۔

(4) اور جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دینا۔

تو یہ لوگوں کے سامنے ذلیل ہو کر رہ جائیں گے، اور رب تعالیٰ ان پر سے یہ ذلت اس وقت تک نہیں ہٹائے گا جب تک کہ وہ اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آئیں گے۔ مراد دین کی اس منہج پر اقامت ہے جس پر اللہ اور اس کا رسول راضی ہوں۔ کیونکہ ان باتوں میں لگنے سے آدمی اسلام سے تو خارج نہیں ہوتا۔ البتہ کمالِ اسلام سے محروم ہو جاتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں اس بات کی وعید شدید کا بیان ہے کہ ان صفات کا حامل ہونا رب تعالیٰ کی ناراضی کو مول لینا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بیع عینہ حرام ہے۔ اس لیے مذکورہ حدیث میں بیع عینہ میں لگنے سے روکا گیا ہے، اور یہ تحذیر علی سبیل التحریم ہے۔
- جہاد چھوڑ کر کھیتی میں لگنے کی تحذیر۔
- جہاد واجب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ترکِ جہاد سے روکا اور ڈرایا ہے۔
- دنیا میں منہمک ہو جانا مسلمانوں کو زیبا نہیں کیونکہ اس سے آدمی آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔
- دین کی حفاظت اور دفاع میں کیا جانے والا کام جہاد ہے۔ چاہے یہ جہاد اسلحہ سے ہو یا علم اور قلم سے ہو۔

حرام سفارش کا بیان

829- وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ شَفَعَ لِأَخِيهِ شَفَاعَةً ، فَأَهْدَى لَهُ هَدِيَّةً عَلَيْهَا ، فَقَبِلَهَا ، فَقَدْ أَتَى بَابًا عَظِيمًا مِنْ

حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی مسلمان بھائی کی سفارش کی اور اس نے اس کو (اس کی سفارش کے بدلے) کوئی

أَبْوَابِ الرِّبَا)).

ہدیہ پیش کیا جسے اس نے قبول کر لیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے پر جا پہنچا۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی اسناد میں کلام ہے۔

غریب الحدیث :...... مَنْ شَفَعَ: یہ شَفْع سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے ایک کو دو کرنا۔ یہ وتر کی ضد ہے۔ اصطلاح میں شفع یعنی سفارش اور شفاعت کسی دوسرے کے لیے جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے واسطہ بننے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کسی کی کسی عہدے پر تعیناتی کی سفارش جلب منفعت کی سفارش ہوگی۔ جبکہ کسی ظالم کو دوسرے پر ظلم کرنے سے روکنے کی کوشش دفع مضرت کی سفارش کہلائے گی۔

پھر شفاعت اور سفارش مشفوع فیہ (جس بات کی سفارش کی گئی ہے) کے اعتبار سے خیر یا شر ہوگی۔ لہٰذا اگر تو وہ کام خیر کا تھا تو شفاعت خیر کی ہوگی اور وہ کام شر کا تھا تو شفاعت شر کی ہوگی۔ پس سفارش کبھی حَسَنَہ تو کبھی سیئہ ہوگی۔ مذکورہ حدیث میں جس شفاعت وسفارش کا ذکر ہے، اس سے مراد سفارشِ حسنہ ہے۔

پھر شفاعت کبھی واجب ہوگی۔ جیسے دوسرے مسلمان پر سے ظلم کو دور کرنا حتی المقدور ہر ایک پر واجب ہے اور چاہے اس سے شفاعت کا مطالبہ نہیں بھی کیا گیا تب بھی واجب ہوگی۔ البتہ اگر مظلوم ظلم سہنے پر راضی ہو تو شفاعت واجب نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ راضی نہیں تو شفاعت واجب ہوگی۔

پھر اگر شفاعت دفع مضرت کے لیے نہ ہو بلکہ جلب منفعت کے لیے ہو اور امر بھی خیر کا ہو تو وہاں شفاعت واجب نہیں۔ البتہ مستحسن اور ماجور ضرور ہے۔ ایسے خیر کے کام میں شفاعت مسنون کہلائے گی۔

اور اگر یہ شفاعت کسی گناہ کے کام میں معاونت کے لیے ہو تو حرام ہوگی۔ کیونکہ گناہ میں معاون بننا کسی کے لیے بھی جائز نہیں۔

غرض شفاعت کا مدار امر مشفوع فیہ پر ہے۔ اگر وہ خیر ہے تو شفاعت خیر کی ہوگی اور اگر وہ شر ہے تو شفاعت شر کی ہوگی۔

لِأَخِيهِ: مراد اخوت دینی ہے، اور یہ بھی اغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ بسا اوقات شفاعت واجبہ کسی غیر مسلم کے لیے بھی کرنی پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ذمی بھی حمایت وحفاظت کا حق رکھتا ہے اور کسی دوسرے کو اس پر ظلم کرنے کا حق نہیں۔ لہٰذا اس پر ظلم ہوتے دیکھ کر اس کی مدد کرنا سب پر واجب ہے۔

فَأَهْدَى لَهُ هَدِيَّةً: مراد اس کی شفاعت کے عوض میں اسے کوئی تحفہ بھیجنا ہے۔

فَقَدْ أَتَى بَابًا عَظِيمًا مِنْ أَبْوَابِ الرِّبَا: یہاں ربا سے لغوی ربا مراد ہے نہ کہ شرعی ربا کیونکہ شرعی ربا کی تعریف یہاں منطبق نہیں ہوتی۔ البتہ ربا کی لغوی تعریف منطبق ہوتی ہے، وہ یوں کہ سفارش کرنے والے نے سفارش کر کے اجر اور نیک شہرت حاصل کر لی ہے۔ اب قبولِ ہدیہ ایک امر زائد ہے، اور یہی زیادتی کا معنی لغوی ربا ہے۔

---

[1] مسند احمد: 261/5۔ سنن ابی داؤد: 3541۔ سنن البیهقی: 169/3۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: اس حدیث کے روایت کرنے میں حسین بن قیس ابوعلی الرحبی المعروف بہ حنش متفرد ہے۔ جو اہل نقل کے نزدیک ضعیف ہے۔ اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

یہ توجیہ اس وقت ہے جب ہم اس حدیث کو صحیح سمجھیں۔ لیکن اگر یہ حدیث صحیح نہیں تو ہم اس توجیہ کے بیان سے بے نیاز ہیں۔

پھر اگر شفاعت واجب ہو تو اس کے بدلے قبول ہدیہ حرام ہے۔ کیونکہ شفاعت کر کے اس نے ایک واجب کو ادا کیا ہے، اور اس کے لیے قیام واجب پر مال عوض میں لینا جائز نہیں۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں شفاعت واجبہ پر جو خیر کے امر میں ہو، معاوضہ، بدلہ اور ہدیہ لینے کی ممانعت کا ذکر ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شفاعت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ اس کا خیر کے کاموں میں ہونا واجب ہے۔ وگرنہ گناہ کے کام کی شفاعت حرام ہوگی۔
- واجب شفاعت میں معاوضہ اور ہدیہ لینا جائز نہیں۔ ایسے ہدیہ کو نبی کریم ﷺ نے ربا کے مشابہ قرار دیا ہے۔

رشوت کا بیان

830۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي)). رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے (دونوں) پر لعنت کی ہے۔ [1]

اس حدیث کو امام ابوداود رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... لَعَنَ: یہ لعنت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دھتکارنا اور دور کرنا۔ مذکورہ فعل لفظوں میں خبر ہے۔ لیکن معنی کے لحاظ سے بددعا ہے جو انشاء ہے۔

مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رشوت دینے اور لینے والے دونوں کو بددعا دی ہے۔

الرَّاشِي: رشوت دینے والا۔

الْمُرْتَشِي: رشوت لینے والا۔ یہ دونوں لفظ ''رشوت'' سے ماخوذ ہیں۔ اس کی راء پر ضم، فتح اور کسر تینوں طرح کے اعراب پڑھے جاتے ہیں۔

رشوت اصل میں اس رقم کو کہتے ہیں جو ابطال حق یا احقاق باطل یا اپنے مفاد کو پورا کرنے کے لیے کسی کو دی جاتی ہے۔ کیونکہ ''رشوت'' کا لفظ اصل میں ''رشاء'' سے ماخوذ ہے جو پانی نکالنے کے ڈول کی رسی کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس رسی کے

---

[1] سنن ابی داؤد: 3580۔ جامع الترمذی: 1337۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح اور حسن ہے۔ امام ابن حبان (5077) اور امام حاکم (115/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ سنن ابن ماجه: 2313۔ مسند احمد: 164/2۔ ابن حزم نے اس حدیث کو غریب کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے، اور کہتے ہیں کہ: اس حدیث کی اسناد میں عبدالرحمن بن حارث ہے جو حدیث میں قوی نہیں۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ نسائی اور ابن حبان نے اس کو قوی کہا ہے۔ اس باب میں متعدد صحابہ سے روایات ہیں۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 189/4۔ خلاصة البدر المنیر: 430/2۔ المحلی: 157/9.

ذریعے آدمی اپنے مقصود تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح رشوت کے ذریعے بھی آدمی اپنے مفاد اور مقصود تک پہنچتا ہے۔ لیکن یہاں باعث لعنت رشوت سے مراد وہ رشوت ہے جو احقاقِ باطل یا ابطالِ حق کے لیے دوسرے کو دی جاتی ہے اور یہی وہ رشوت ہے جو حرام ہے۔

اس بنا پر اگر کوئی ظلم کو ہٹانے کے لیے یا اپنے قرار واقعی حق کو ظالم، قاہر اور جابر و غاصب سے حاصل کرنے کے لیے کوئی رقم خرچ کرتا ہے تو وہ حرام اور باعث لعنت رشوت کے زمرہ میں داخل نہیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- راشی اور مرتشی دونوں پر علی سبیل العموم لعنت کرنا جائز ہے۔ البتہ علی سبیل التخصیص جائز نہیں۔
- رشوت کا معاملہ بے حد سنگین اور خطرناک ہے۔ کیونکہ یہ باعث لعنت امر ہے۔
- لوگوں میں عدل قائم کرنا واجب ہے۔ کیونکہ رشوت عدل کو ختم کرتی ہے۔ اسی لیے اس کو ملعون قرار دیا گیا تاکہ کوئی رشوت لے دے کر عدل کو ختم کرنے کے درپے نہ ہو۔

حیوان کو حیوان کے بدلے نسیئہ کے ساتھ بیچنے کا حکم

831- وَعَنْهُ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يُجَهِّزَ جَيْشًا، فَنَفِدَتِ الْإِبِلُ، فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ عَلَى قَلَائِصِ الصَّدَقَةِ. قَالَ: فَكُنْتُ آخُذُ الْبَعِيرَ بِالْبَعِيرَيْنِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ)).

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں اونٹ ختم ہو گئے تو آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ صدقہ کی اونٹنیوں کی شرط پر (بازار سے اونٹوں کو) لے لیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: پس میں صدقہ کے اونٹوں (کے آنے) تک ایک اونٹ کو دو اونٹوں کے بدلے لینے لگا۔ ❶

رَوَاهُ الْحَاكِمُ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام حاکم اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے، اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث :...... **أَمَرَهُ أَنْ يُجَهِّزَ**: یعنی اس بات کا حکم دیا کہ وہ لشکر کی ضروریات کا انتظام و انصرام کریں، اور جن چیزوں کا خریدنا ضروری ہے ان کو خریدیں۔

جَيْشًا: یہ چار سو سے زیادہ غازیوں پر مشتمل فوجی دستے کو کہتے ہیں۔

فَنَفِدَتِ الْإِبِلُ: مراد یہ ہے کہ جہاد کی غرض سے تیار کیے جانے والے اونٹ ختم ہو گئے۔

---

❶ المستدرك للحاكم: 65/2۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔ سنن البيهقي: 287/5۔ سنن ابي داؤد: 3357۔ امام نووی رحمہ اللہ "المجموع: 385/9" میں فرماتے ہیں: ابوداؤد نے اس حدیث پر سکوت کیا ہے۔ یہ حدیث ان کے نزدیک حسن ہے جیسا کہ بیان ہوا، چاہے اس کی اسناد محل نظر ہے۔ لیکن بیہقی (287/5) کہتے ہیں کہ اس حدیث کا ایک شاہد ہے جو صحیح ہے۔ پھر انہوں نے اس شاہد کو صحیح اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کو امام دارقطنی (69/2۔70) نے بھی صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام ابن حجر "فتح الباری: 419/4" میں فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد قوی ہے۔ البتہ ابن قطان نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے۔ دیکھیں: "تحفة المحتاج: 247/2".

قَــلَائِص: یہ "قَـلُوص" ❶ کی جمع ہے۔ یہ اونٹنی کو کہتے ہیں۔ ان کی نسبت صدقہ کی طرف اس لیے کی کیونکہ ان کو اونٹوں والوں سے زکوٰۃ کی مد میں لے کر مدینہ لایا جاتا تھا۔ پس آپ ﷺ نے اونٹوں کے ختم ہونے پر اس بات کا حکم دیا کہ ضرورت کے باقی اونٹ صدقہ کے اونٹوں کے عوض میں خرید لیے جائیں جو بعد میں آئیں گے۔

فَكُنْتُ آخُذُ الْبَعِيرَ بِالْبَعِيرَيْنِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ: بلاشبہ یہ یقینی شراء یعنی خرید ہے نہ کہ قرض۔ یعنی یہ دو اونٹوں کے بدلے میں ایک اونٹ کو قرض پر لینے کا معاملہ نہ تھا بلکہ دو کے بدلے ایک اونٹ خریدنے کا معاملہ تھا۔ کیونکہ "بِالْبَعِيرَيْنِ" میں ''با'' عوض کے لیے ہے جو شراء کے معنی کو ستلزم ہے نہ کہ قرض کے معنی پر مشتمل ہے۔

دوسرے یہ بات معلوم ہے کہ اس طور پر قرض لینا نرا سود ہے۔ کیونکہ ایک اونٹ قرض کے بدلے دو اونٹ لوٹانا ناجائز اور حرام ہے اور یہ سود ہے۔ کیونکہ جو قرض بھی نفع لائے وہ سود کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔

إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ: یعنی اس اونٹ کی قیمت دو اونٹ تب دی جائے گی جب صدقہ کے اونٹ آ جائیں گے تو ان میں سے ادا کر دیے جائیں گے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ حیوان کو ادھار حیوان کے بدلے بیچ بھی سکتے ہیں اور خرید بھی سکتے ہیں، اور دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ قسطوں کی بیع وشراء میں ثمن سے زیادہ رقم لے سکتے ہیں کیونکہ یہ زیادتی اس مدت کے عوض میں ہوتی ہے جو مشتری بائع سے لیتا ہے نہ کہ رقم کے عوض میں ہوتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ معلوم ہوا کہ لشکر کی تیاری کے لیے کسی کو بیع وشراء کا اور انتظام وانصرام کا وکیل بنا سکتے ہیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو اس بات کا وکیل بنایا تھا۔
- ◈ مذکورہ روایت جنابِ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی عظیم منقبت کا بیان بھی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے انہیں امین سمجھا اور یہ عظیم ذمہ داری ان کے سپرد فرمائی۔
- ◈ لشکروں کو لے جانے سے قبل ان کی ہر قسم کی تیاری کر لی جائے۔
- ◈ جانور کو جانور کے بدلے ادھار خرید اور بیچ سکتے ہیں۔ مذکورہ حدیث اصح بھی اور اقوی بھی ہے۔ لہٰذا حدیث سمرہ رضی اللہ عنہ کے بالمقابل یہ حدیث راجح ہوگی کیونکہ یہ حدیث قواعد شرعیہ کے زیادہ قریب ہے۔
- ◈ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بیع نسیئہ میں زیادتی جائز ہے۔ جیسے یہاں دو ادھار اونٹوں کے بدلے ایک نقد اونٹ خریدنے کا ذکر ہے۔
- ◈ قسطوں کی بیع وشراء میں زیادتی جائز ہے۔ کیونکہ یہاں زیادتی اس مدت کے عوض میں ہے جو مشتری ثمن ادا کرنے کے واسطے بائع سے مانگتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات سب پر عیاں ہے۔ حتیٰ کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تو اس کے جواز پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔

---

❶ قَلُوص: جھکے ہوئے جسم کی جوان اونٹنی۔ نو سال تک کی عمر کی اونٹنی کو قلوص کہتے ہیں اور جو دس سال کی ہو جائے اسے ''ناقہ'' کہا جاتا ہے۔ "القاموس الوحید، ص: 1347"۔ نسیم۔

پھر یہ فطرت کے عین مطابق بھی ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی آدمی کسی شے کو ادھار میں بھی اتنے کا ہی بیچے جتنا کہ وہ نقد میں بیچتا ہے، یہ ناممکن ہے۔ ہاں کوئی دوست، عزیز، رشتہ دار ہو تو کوئی ایسا کرنے کو تیار ہو سکتا ہے وگرنہ نہیں۔ کہ عادی خرید و فروخت میں ایسا ممکن نہیں۔

بیع مزابنہ کا بیان

832- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُزَابَنَةِ: أَنْ يَبِيعَ ثَمَرَ حَائِطِهِ إِنْ كَانَ نَخْلًا بِتَمْرٍ كَيْلًا ، وَإِنْ كَانَ كَرْمًا أَنْ يَبِيعَهُ بِزَبِيْبٍ كَيْلًا ، وَإِنْ كَانَ زَرْعًا أَنْ يَبِيْعَهُ بِكَيْلِ طَعَامٍ ، نَهَى عَنْ ذٰلِكَ كُلِّهِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ اگر تو وہ کھجوریں ہوں تو کھجوروں کو کیل کر کے ان کے بدلے اپنے باغ کی کھجوریں (جن کا کیل معلوم نہیں) بیچ دے، اور اگر وہ انگور ہوں تو انگوروں کی بیلوں پر لگے انگوروں کو ''کیل کیے انگوروں'' کے بدلے بیچ دے اور اگر وہ کھیتی ہو تو غلہ کے ایک (متعین) کیل کے بدلے کھیتی (کے غلہ) کو بیچ دے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے اس سب سے منع فرمایا ہے۔ ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

مزابنہ ❷ کی تعریف، اس کی صورتیں اور ان کا حکم

شرح:......مزابنہ: یہ باب مفاعلہ سے ہے جو اشتراک پر دلالت کرتا ہے۔ چاہے یہ اشتراک دو افراد میں ہو یا زیادہ افراد میں ہو۔ البتہ یہ معنی اغلب اور اکثری ہے۔

مزابنہ یہ اَلزَّبن سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دھکیلنا اور دفع کرنا۔ بعد میں یہ لفظ دو افراد کے درمیان منعقد ہونے والے ایک مخصوص نوعیت کی بیع پر بولا جانے لگا۔ وگرنہ دینے اور دفع کرنے کا معنی تو جملہ بیوع میں پایا جاتا ہے کہ بائع مبیع کو دفع کرتا ہے اور مشتری کے حوالے کرتا ہے۔ جبکہ مشتری ثمن کو دفع کرتا ہے اور بائع کے حوالہ کرتا ہے۔

یاد رہے کہ کسی لفظ کے عام معنی سے اس کے کسی ایک فرد کو خاص کرنے میں کوئی ممانعت نہیں۔

اب مزابنہ سے بیع کی وہ کون سی خاص صورت مراد ہے؟ اس کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما آگے خود "ان يبيع ثمر حائطه'' کے الفاظ کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں۔

یہاں ''اَنْ'' مصدر یہ ہے جو جر کے محل میں ہے اور مزابنہ کا بیان ہے۔ کیونکہ لفظ مزابنہ ''عن'' کی وجہ سے مجرور ہے۔

أَنْ يَبِيعَ: مراد بائع ہے۔ کہ وہ اپنے باغ کی کھجوروں کو اٹکل کے ساتھ کسی متعین کھجوروں کے بدلے میں نہ بیچے۔

مذکورہ حدیث میں مزابنہ کی صورت کو تین چیزوں کے بیچنے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے نہ کہ یہ خود مزابنہ کی تین صورتیں ہیں۔

---

❶ صحيح البخارى: 2171- صحيح مسلم: 1542.

❷ مزابنہ یہ معلوم [illegible] چیز کو [illegible] اندازہ [illegible] چیز کے بدلے میں بیچنے کو کہتے ہیں۔ ''القاموس الوحید، ص: 697'' نسیم۔

جو یہ ہیں:

(1) متعین کھجوروں کے بدلے درختوں پر لگی کھجوروں کو اٹکل سے بیچنا۔

(2) متعین انگوروں کے بدلے بیلوں پر لگے انگوروں کو اٹکل سے بیچنا۔

(3) متعین غلہ کے بدلے کھیتی کے غلہ کو اٹکل سے بیچنا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مزابنہ یہ کسی متعین ناپ اور وزن کو اٹکل کے ماپ اور وزن کے بدلے میں بیچنے کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بیع کے اس طریقہ سے منع فرمایا ہے کیونکہ دراصل یہ کہ ایک جنس کو نقد اسی کے جنس کے بدلہ بیچنے کی صورت ہے۔ جس میں تساوی اور برابری شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔ لہٰذا بیع کی یہ صورت سود کے حکم میں داخل ہونے کی وجہ سے منع ہوگی۔ کیونکہ یہاں ایک عوض متعین اور دوسرا غیر متعین یعنی اندازہ اور اٹکل کے ساتھ ہے جو تساوی اور برابری کے مفقود ہو جانے کا قوی بلکہ قطعی سبب ہے۔ کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ درختوں پر لگی کھجور، بیلوں پر لگے انگور اور کھیتی میں کھڑے غلے کا کیل معلوم کرنا ناممکن ہے۔ تو جب کیل کی تعیین ممکن نہ رہی تو تساوی بھی متحقق نہ ہو سکی۔ لہٰذا یہ بیع ناجائز ہوگی۔

عرایا کی بیع جائز ہے

البتہ اس صورت سے عرایا کی بیع جائز ہے کیونکہ اس کی تخصیص خود سنت میں آ گئی ہے، اور صحیح قول یہ ہے کہ عرایا کی بیع انگور اور کھجور دونوں میں جائز ہے۔

عرایا یہ عریہ کی جمع ہے۔ یہ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھل مالک نے دوسرے کو کھانے کے لیے دے دیا ہو۔ عرایا میں آدمی متعین کھجوروں کے بدلے درخت پر لگی کھجوروں کو خرید سکتا ہے۔ البتہ اس کی چند شروط ہیں:

(1) مشتری کے پاس دینے کو کھجوریں نقد ہوں۔

(2) وہ تازی کھجوریں کھانے کا محتاج ہو۔

(3) یہ لین دین پانچ وسق وزن یا اس سے کم میں ہو۔

(4) تازہ کھجوریں اندازہ سے دی جانے والے کھجوروں کے مساوی ہوں۔ یعنی وہ تازہ کھجوریں بھی خشک ہو کر تقریباً اتنی ہی بنتی ہوں جتنی سوکھی کھجوریں دی ہیں۔

(5) اور آخری شرط یہ ہے کہ مشتری تازہ کھجوریں اسی وقت کھانے کو اتارے۔ یہ نہ ہو کہ ان کو اندازہ سے خرید کر درختوں پر ہی لگا رہنے دے کہ یوں یہ بیع باطل ہو جائے گی۔

غرض بیع عرایا کا جواز غریب کی حاجت کے پیش نظر ہے جو ان پانچ شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ لہٰذا کسی ایک شرط کے نہ پائے جانے کے وقت بھی یہ بیع ناجائز ہو جائے گی۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ شریعتِ اسلامیہ سود سے بچنے اور بچانے کا کس قدر اہتمام کرتی ہے۔

تازہ کھجور کو خشک کھجور کے بدلے بیچنے کا حکم

833۔ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يُسْأَلُ عَنِ اشْتِرَاءِ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ سے تازہ

الرُّطَبِ بِالتَّمْرِ . فَقَالَ: ((أَيَنْقُصُ الرُّطَبُ إِذَا يَبِسَ؟)) قَالُوا : نَعَمْ فَنَهَى عَنْ ذَلِكَ .

کھجور کو خشک کھجور کے بدلے خریدنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تازہ کھجور خشک ہو جانے پر (وزن میں) کم ہو جاتی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں! تو اس پر آپ ﷺ نے اس (بیع) سے منع فرما دیا۔''[1]

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِيْنِيِّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ .

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ ابن المدینی، ابن حبان، ترمذی اور حاکم رحمہم اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......**يُسْئَلُ** : یہ جملہ حالیہ ہے اور لفظ رسول اللہ سے حال ہے۔ یعنی میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا اس حال میں آپ ﷺ سے سوال کیا جا رہا تھا۔

عَنِ اشْتِرَاءِ الرُّطَبِ بِالتَّمْرِ : یہ ہم جنس کے ساتھ خرید وفروخت کے باب میں سے ہے۔ رطب اور تمر میں فرق معروف ہے۔ رطب تازی کھجور کو جبکہ تمر خشک کھجور کو کہتے ہیں۔ ان دونوں میں تساوی ممکن نہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا رطب کھجور خشک ہو جانے پر وزن میں کم ہو جاتی ہے؟

نبی کریم ﷺ کا یہ سوال استخبار کے لیے نہ تھا۔ کیونکہ یہ بات تو آپ ﷺ بھی جانتے تھے۔ بلکہ یہ سوال حکم کی تقریر کے لیے تھا اور اس بیع کے منع ہونے کی علت کی طرف اشارہ کرنا بھی مقصود تھا۔ وہ یہ کہ کھجور کی کھجور کے ساتھ بیع میں برابری شرط ہے۔ جبکہ رطب خشک ہو جانے پر وزن میں کم ہو جاتی ہے جو تساوی کے مفقود ہو جانے کا ذریعہ ہے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جب دو ہم جنس چیزوں میں بیع وشراء کی جائے تو ان میں حقیقی تساوی شرط ہے۔ لہٰذا اگر کھجور کو ایسی کھجور کے بدلے بیچا جو آگے چل کر خشک ہو جانے کی وجہ سے وزن میں کم ہو جائے گی تو یہ بیع بھی حقیقی تساوی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ علم کے حصول میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حرص اور جناب رسول اللہ ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ نے حکم کو علت کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا کہ اس سے مکلّف کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شریعت حکمتوں پر مشتمل ہے اور بے حد بلند ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3359۔ جامع الترمذی: 1225۔ سنن النسائی: 268/7۔ سنن ابن ماجه: 2264۔ مسند احمد: 175/1۔ صحیح ابن حبان: 5003۔ ابن حزم نے "الاحکام: 447/7" میں اس حدیث کو ایک راوی کی وجہ سے ضعیف کہا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی زید بن ابی عیاش مجہول ہے۔ خطاب کہتے ہیں: بعض لوگوں نے اس حدیث میں کلام کیا ہے اور زید بن ابی عیاش کو مجہول کہا ہے۔ لیکن بات یہ نہیں جس کا خطابی وغیرہ کو وہم ہوا ہے۔ کیونکہ زید بنی زہرہ کا آزاد کردہ غلام اور معروف ہے نہ کہ مجہول ہے۔ امام مالک نے "الموطا: (624/2))" میں مذکورہ زید کا ذکر کیا ہے، اور امام مالک کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی بھی وجہ سے متروک راوی سے حدیث کو روایت نہیں کرتے۔ یہ امام مالک کی شان ہے۔ جبکہ علامہ منذری فرماتے ہیں کہ بھلا زید کیونکر مجہول ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس سے دو ثقہ روایت کرنے والے ہیں: (1) ایک عبداللہ بن یزید جو اسود بن سفیان کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ (2) اور دوسرے عمران بن ابی انس۔ ان دونوں سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں استدلال کیا ہے۔ چنانچہ ضیا مقدسی نے "المختارة: 155/3" میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: "نصب الرایة: 41/4".

◈ جو حکم علت کے ساتھ ملا ہوا اس پر قیاس ممکن ہوتا ہے۔
◈ مذکورہ حکم کہ رطب کو تمر کے ساتھ بیچنا منع ہے کہ یہ حکم ''ربویات'' میں سے ہے۔

دَین کو دَین کے بدلے بیچنے کا حکم

834۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْكَالِئِ بِالْكَالِئِ، يَعْنِي الدَّيْنَ بِالدَّيْنِ)).
رَوَاهُ إِسْحَاقُ وَالْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے مؤخر قرض کو مؤخر قرض کے بدلے یعنی دَین کو دَین کے بدلے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ [1]

اس حدیث کو امام اسحاق اور امام بزار نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......اَلْكَالِئُ: یہ مؤخر کو کہتے ہیں۔ مراد قرض کی ادائیگی میں تاخیر ہے۔ یعنی دَین مؤخر۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں بعد میں ادا کیے جانے والے قرض کو قرض کے بدلے بیچنے کی ممانعت کا بیان ہے۔

درایۃ الحدیث اور دَین کی دَین کے بدلے بیع کی صورت اور اس کا حکم

درایتی اعتبار سے اس حدیث پر ان نکات کے تناظر میں کلام ہے:

(1) ایک یہ کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔

(2) دوسرے یہ حدیث نہ تو مطلق ہے اور نہ عام۔ بلکہ یہ ممانعت صرف ان صورتوں کو شامل ہے جو کسی شرعی محظور کو متضمن ہوں۔ جیسے: دوسرے پر دَین کے بدلے اپنا دَین بیچنا، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص آ کر یہ کہے کہ تو فلاں سے ایک سال کے ادھار پر دوسو روپے کے بدلے دس کلو گندم لے لے، جو میں تجھے سال بعد ادا کر دوں گا۔ یہ ناجائز ہے کیونکہ یہ غیر کے ذمہ دَین کو بیچنا ہے کیونکہ معلوم نہیں کہ وہ اس کو ادا کر پائے گا یا نہیں۔

دوسرے اس میں غیر مضمون مال پر نفع کمانا ہے۔ جس کی شافی تفصیل بیان کی جا چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ غیر کے ذمہ دَین آدمی کی ضمان میں تب ہی داخل ہوتا ہے جب وہ اس کو قبضہ میں لے لے، اور یہ بات معلوم ہے کہ ادھار بیچنے میں ثمن بڑھ جائے گا۔ تب پھر آدمی نے ایک ایسی شے بیچی جو ابھی تک اس کے ضمان اور اس کی قدرت میں داخل نہیں ہوئی۔ جبکہ اس کا قدرت میں داخل ہونا بھی مشکوک ہے۔

غرض یہ حدیث دَین کو دَین کے بدلے بیچنے کی ممانعت کو بیان کرتی ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جس کی ممانعت پر دیگر صحیح نصوص دلالت کرتی ہیں نہ کہ یہ بات کہ ہر دَین کو دَین کے

---

[1] امام ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخيص الحبير: 62/3" میں اس حدیث کو امام حاکم (65/2) اور امام دارقطنی (71/3) کی طرف منسوب کیا ہے۔ امام بیہقی (290/5) اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ہمیں اپنے شیخ امام حاکم پر حیرت ہے کہ کیسے انہوں نے موسیٰ بن عقبہ سے اپنی روایت کی بابت، حالانکہ یہ خطا ہے، یہ تو موسیٰ بن عبیدہ ہے، یہ کہا ہے کہ: امام احمد فرماتے ہیں: میرے نزدیک اس سے روایت جائز نہیں، اور ابن سعد کہتے ہیں یہ ثقہ اور کثیر الحدیث ہے۔ لیکن حجت نہیں۔ دیکھیں: "العلل المتناهية: 601/2".

بِخَرْصِهَا: خرص اندازہ وتخمینہ کو کہتے ہیں۔غلوں اور میووں کو درختوں اور بیلوں پر لگا دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کہ اس کی مقدار کتنی ہوگی، یہ ہر کس ناکس کا کام نہیں بلکہ یہ کام کوئی ماہر ہی سرانجام دے سکتا ہے۔اس لیے ہر ایک کو اس پر مقرر بھی نہ کرنا چاہیے۔

رہا یہ سوال کہ یہ اندازہ کس وقت کا معتبر ہوتا ہے؟ کیا حالت رطب میں؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔کیونکہ کھجور کا وزن رطب اور تمر کی حالت میں مختلف ہوتا ہے۔جیسا کہ گزشتہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے۔

یاد رہے کہ ''خرص'' کا ذکر بطور قید کے ہے۔لہٰذا یہ بیع ''خرص'' کر کے ہوگی نہ کہ ''جزاف'' کے ساتھ۔

اب خرص اور جزاف دونوں کا معنی اٹکل اور اندازہ وتخمینہ کرنا ہے۔البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ خرص خوب غور کر کے اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔جبکہ جزاف بے سوچے سمجھے اور بے تکے پن سے غفلت ولا پروائی کے ساتھ اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔

وَلِمُسْلِمٍ: صحیح مسلم کی یہ روایت بتلاتی ہے کہ یہ اندازہ ان کے تمر ہونے کی حالت کے ساتھ کیا جائے گا یعنی کھجوریں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جائے کہ یہ کھجوریں خشک ہو کر کتنے وزن کی ہوں گی۔

يَأْكُلُونَهَا رُطَبًا: کیونکہ اگر ان کھجوروں کو تازہ تازہ نہ کھایا جائے گا تو عنقریب یہ خشک ہو کر تمر بن جائیں گی۔تب پھر اس تمر میں اور اُس تمر میں فرق ہی کیا رہا جن کے بدلے یہ تازہ کھجوریں لی تھیں، اور جس وجہ سے یہ بیع جائز قرار دی گئی تھی۔ یوں عرایا میں رخصت دیے جانے کا فائدہ ختم ہو جائے گا۔

اس اعتبار سے عرایا کی بیع کے جواز کی یہ دوسری قید کا بیان ہے کہ یہ بیع تب ہی جائز ہوگی جب تمر دے کر رطب کو لیا اور ان کو رطب ہونے کی حالت میں ہی کھایا جائے۔لہٰذا اگر اتنی تاخیر کی کہ وہ کھجوریں خشک ہو گئیں تو یہ بیع باطل ہو جائے گی۔ کیونکہ جس فائدہ کے پیش نظر یہ بیع جائز ٹھہرائی گئی تھی وہ فائدہ ضائع ہو گیا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ دونوں روایات کا مضمون واضح ہے کہ عرایا میں بیع کی رخصت حاجت مند کی منفعت کے پیش نظر ہے۔لہٰذا ایک تو اس میں تخمینہ محتاط اور ماہرانہ ہوگا۔دوسرا تخمینہ رطب کے تمر ہو جانے کے پیش نظر ہوگا، اور تیسرے تمر دے کر اندازہ سے لی جانے والی رطب کو خشک ہونے سے قبل استعمال کر لیا جائے گا۔

عرایا کی بیع کتنے وزن تک جائز ہے

836- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَخَّصَ فِي بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ، أَوْ فِيْ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے عرایا کی بیع میں رطب کو اندازہ کے ساتھ بیچنے کی رخصت اتنی تمر میں دی جو پانچ وسق سے کم ہو یا پانچ وسق ہو۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح: ...... **بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ**: یعنی وہ رطب ایک اندازہ کے مطابق خشک ہو کر دی جانے والی تمر کے مساوی ہو جائے۔

فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ، أَوْفِي خَمْسَةِ أَوْسُقٍ: "مَا" سے مراد ''تمر'' ہے، اور "دُوْنَ" سے مراد اقل ہے۔جبکہ "أَوْ" شک کے لیے ہے نہ کہ تنویع کے لیے، اور یہ شک راوی کی طرف سے ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2190- صحيح مسلم: 1541.

بِخَرْصِهَا: خرص اندازہ وتخمینہ کو کہتے ہیں۔غلوں اور میووں کو درختوں اور بیلوں پر لگا دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کہ اس کی مقدار کتنی ہوئی، یہ ہر کس ناکس کا کام نہیں بلکہ یہ کام کوئی ماہر ہی سرانجام دے سکتا ہے۔اس لیے ہر ایک کو اس پر مقرر بھی نہ کرنا چاہیے۔
رہا یہ سوال کہ یہ اندازہ کس وقت کا معتبر ہوتا ہے؟ کیا حالت رطب میں؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔کیونکہ کھجور کا وزن رطب اور تمر کی حالت میں مختلف ہوتا ہے۔جیسا کہ گزشتہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے۔
یادرہے کہ ''خرص'' کا ذکر بطور قید کے ہے۔لہٰذا یہ بیع ''خرص'' کر کے ہوگی نہ کہ ''جزاف'' کے ساتھ۔
اب خرص اور جزاف دونوں کا معنی اٹکل اور اندازہ وتخمینہ کرنا ہے۔البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ خرص خوب غور کر کے اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔جبکہ جزاف بے سوچے سمجھے اور بے تکے پن سے غفلت ولاپروائی کے ساتھ اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔
وَلِمُسْلِمٍ: صحیح مسلم کی یہ روایت بتلاتی ہے کہ یہ اندازہ ان کے تمر ہونے کی حالت کے ساتھ کیا جائے گا یعنی کھجوریں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جائے کہ یہ کھجوریں خشک ہوکر کتنے وزن کی ہوں گی۔
یَأْكُلُونَهَا رُطَبًا: کیونکہ اگر ان کھجوروں کو تازہ تازہ نہ کھایا جائے گا تو عنقریب یہ خشک ہوکر تمر بن جائیں گی۔تب پھر اس تمر میں اور اس تمر میں فرق ہی کیا رہا جن کے بدلے یہ تازہ کھجوریں لی تھیں، اور جس وجہ سے یہ بیع جائز قرار دی گئی تھی۔ یوں عرایا میں رخصت دیے جانے کا فائدہ ختم ہو جائے گا۔
اس اعتبار سے عرایا کی بیع کے جواز کی یہ دوسری قید کا بیان ہے کہ یہ بیع تب ہی جائز ہوگی جب تمر دے کر رطب کو لیا اور ان کو رطب ہونے کی حالت میں ہی کھایا جائے۔لہٰذا اگر اتنی تاخیر کی کہ وہ کھجوریں خشک ہوگئیں تو یہ بیع باطل ہو جائے گی۔ کیونکہ جس فائدہ کے پیش نظر یہ بیع جائز ٹھہرائی گئی تھی وہ فائدہ ضائع ہوگیا ہے۔
مضمون حدیث:...... مذکورہ دونوں روایات کا مضمون واضح ہے کہ عرایا میں بیع کی رخصت حاجت مند کی منفعت کے پیش نظر ہے۔لہٰذا ایک تو اس میں تخمینہ محتاط اور ماہرانہ ہوگا۔دوسرا تخمینہ رطب کے تمر ہو جانے کے پیش نظر ہوگا، اور تیسرے تمر دے کر اندازہ سے لی جانے والی رطب کو خشک ہونے سے قبل استعمال کرلیا جائے گا۔

عرایا کی بیع کتنے وزن تک جائز ہے

836۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه ((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَخَّصَ فِي بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ، أَوْ فِي خَمْسَةِ أَوْسُقٍ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے عرایا کی بیع میں رطب کو اندازہ کے ساتھ بیچنے کی رخصت اتنی تمر میں دی جو پانچ وسق سے کم ہو یا پانچ وسق ہو۔ [1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح...... **بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ**: یعنی وہ رطب ایک اندازہ کے مطابق خشک ہوکر دی جانے والی تمر کے مساوی ہو جائے۔
فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ، أَوْ فِي خَمْسَةِ أَوْسُقٍ: "مَا" سے مراد "تمر" ہے، اور "دُوْنَ" سے مراد اقل ہے۔جبکہ "اَوْ" شک کے لیے ہے نہ کہ تنویع کے لیے، اور یہ شک راوی کی طرف سے ہے۔

---
[1] صحیح البخاری: 2190۔ صحیح مسلم: 1541۔

أَوْسُقٍ: یہ وسق کی جمع ہے۔ایک وسق میں ساٹھ نبوی صاع کے بقدر غلہ ہوتا ہے۔یوں پانچ وسق تین سو صاع کا وزن ٹھہرے گا۔

وسق کا لفظی معنی ایک بوجھ اور لدان ہے۔ چونکہ یہ بوجھ اور لدان مضبوطی کے ساتھ باندھا جاتا ہے اسی لیے اتنے وزن کے لدان کو "وسق" کہا جانے لگا۔

مضمون حدیث ...... یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عرایا کی یہ بیع پانچ یا پانچ وسق سے کم میں جائز ہوگی۔اب اس کی تین صورتیں ہیں:

(1) یا تو وہ کھجوریں پانچ وسق سے کم ہوں گی۔ مذکورہ حدیث اس صورت کو قطعاً شامل ہے۔

(2) اور یا وہ کھجوریں پانچ وسق سے زیادہ ہوں گی۔ یہ صورت قطعاً منع ہے۔

(3) یا وہ کھجوریں پانچ وسق ہی ہوں گی تو اس کے جواز میں شک ہے۔اس موقع پر علماء نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ مشکوک کو امر محقق کی طرف پھیرا جائے۔

تب پھر اس مسئلہ میں یقینی امر رطب کی تمر کے ساتھ بیع کا ناجائز ہونا ہے۔

اور دوسرا یقینی امر عرایا میں پانچ وسق سے کم میں اس بیع کا جائز ہونا ہے۔

جبکہ پانچ وسق میں اس بیع کا جائز ہونا مشکوک ہے۔ پس امر مشکوک کو امر محقق و یقینی کی طرف پھیرا جائے گا اور وہ پانچ وسق سے کم میں عرایا میں رطب کی تمر کے بدلے بیع کا جواز ہے۔

تب پھر عرایا میں رطب کی تمر کے بدلے بیع کی جواز کی شرطیں تین ہوئیں، اور ان شروط کو ان الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے:

پہلی شرط:......اس بیع میں محتاط اندازہ ہوگا۔اس شرط کو "أَنْ تُبَاعَ بِخَرْصِهَا" کے الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے۔

دوسری شرط:......اس بیع میں کھجوروں کو رطب تناول کیا اور کھایا جائے گا۔ یہ شرط "ان يأكلوها رطبا" کے الفاظ سے اخذ کی گئی ہے۔

تیسری شرط:...... یہ بیع پانچ وسق سے کم میں ہوگی۔اس کی دلیل "فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ" کے الفاظ ہیں۔جبکہ مزید چند شرطیں اور ان کے دلائل یہ ہیں:

چوتھی شرط:......رطب اور تمر برابر ہوں گے۔اس کی دلیل "اَيَنْقُصُ الرُّطَبُ إِذَا يَبِسَ قَالُوْا نَعَمْ فَنَهَى عَنْ ذٰلِكَ" کے الفاظ ہیں، اور یہ برابری اس اعتبار سے ہے کہ رطب خشک ہو کر تمر کے برابر نکلے۔

پانچویں شرط:...... پانچویں شرط یہ ہے کہ مشتری رطب کھجوروں کا محتاج ہو۔اس کی دلیل "رَخَّصَ" کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا اگر مشتری محتاج نہ ہوا تو یہ بیع ناجائز ہوگی۔

چھٹی شرط:...... یہ کہ مشتری کے پاس رطب خریدنے کو نقدی نہ ہو تبھی تو وہ عوض میں تمر پیش کرے گا۔

ساتویں شرط:......طرفین دونوں عوضین پر قبضہ کرلیں کہ یہ ہر بیع کے جواز کی لازمی شرط ہے، اور یہ قبضہ رطب میں یوں ہوگا کہ مشتری کو کھجوریں توڑنے کی اجازت دے دی جائے گی اور چنانچہ رطب کا مالک مشتری سے یوں کہے گا کہ یہ درخت اور اس کا پھل تمہارا ہوا تم چاہو تو جتنی کھجور طے ہوئی ہے وہ لے لو، اور تمر میں قبضہ اس کو کیل کر کے ہوگا۔

آٹھویں شرط:...... یہ ہے کہ وہ رطب درخت پر لگی ہو نہ کہ اتری ہو۔ کیونکہ حدیث میں "علی رؤوس النخل" کے الفاظ آتے ہیں۔ لہٰذا اگر رطب پہلے سے کاٹ کر رکھی ہوں گی تو جمہور کے نزدیک تمر کے ساتھ ان کی بیع جائز نہ ہوگی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بیع عرایا کی یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ یہ بیع پانچ وسق سے کم میں جائز ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مشقت تیسیر کو لاتی ہے۔ چنانچہ جب تنگدست کے لیے رطب سے تفکہ دشوار ٹھہرا تو اس کے لیے اس بیع کی رخصت دے دی گئی۔

◈ دین اسلام میں حرج نہیں نہ عبادات میں اور نہ معاملات میں۔ بلکہ یہ دین یسر، سہولت اور سماحت پر مبنی ہے۔

◈ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ حرام شے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ حرام شے ضرورت کے وقت اس شرط کے ساتھ مباح ہے کہ اس سے ضرورت رفع ہو جائے۔

علماء نے ضرورت کی یہ شروط لکھی ہیں:

(1) اس حرام کے سوا اور کوئی مباح میسر نہ ہو۔

(2) اس کے ساتھ ضرورت رفع ہوتی ہو۔ لہٰذا اگر اس حرام سے ضرورت ہی رفع نہ ہوتی ہو تو اس کو برتنا جائز نہ ہوگا۔

◈ کھجور کے پھل میں عرایا جائز ہے۔ رہی دیگر اشیاء جیسے انگور، انجیر وغیرہ کہ آیا وہ بھی اس باب میں کھجور کے ملحق کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ اب جو علماء دیگر اشیاء کو کھجور پر قیاس کرنے کو ناجائز کہتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ نص میں مزابنہ کی نہی وارد ہے۔ جس میں سے عرایا کا استثناء کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ استثناء اپنے عموم پر باقی رہے گا اور اس میں قیاس کر کے مزید تخصیص پیدا نہ کی جائے گی۔ پس اگر عرایا کھجور کے علاوہ میں جائز ہوتا تو یہ غلوں اور کھیتوں میں بھی جائز ہوتا۔

رہے وہ علماء جو انجیر اور انگور جیسے فواکہ میں بھی عرایا کے جواز کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ شریعت ایک طرز ونہج کی حامل ہے۔ لہٰذا وہ دو متماثل مسائل میں تفریق نہیں کرتی، اور نہ دو متفرق چیزوں کا حکم ایک کرتی ہے۔

اب رہا نصوص میں عرایا کے باب میں صرف کھجور کا ذکر تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کشمش وغیرہ کم ہوتی تھی جو شام سے آتی تھی۔ یہی حال انجیر کا بھی تھا۔ مدینہ میں کثرت کے ساتھ صرف کھجور ہی ہوتی تھی۔ اسی لیے عرایا کے جواز کا ذکر بھی صرف کھجور کے حوالہ سے ہی آیا۔ امام ابن تیمیہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور یہی قول صحیح ہے۔

◈ عرایا پانچ وسق سے کم میں جائز ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ تنگی ایک سودے میں ہے یا متعدد سودوں میں ہے؟ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول "ایک سودے" میں اس کے شرط ہونے کا ہے، اور ایک سب سودوں میں اس کے شرط ہونے کا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ:

ایک شخص کا کنبہ بڑا ہے۔ اسے دس وسق رطب کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے ایک سے تین، دوسرے سے تین اور تیسرے سے چار وسق خریدے۔ اگر چہ یہ کل دس وسق ہوا۔ لیکن ہر سودا پانچ وسق سے کم میں تھا۔

اب جن کے نزدیک اس شرط کے ایک سودے میں ہونے کا اعتبار ہے ان کے نزدیک یہ تینوں سودے جائز ٹھہریں گے۔

کیونکہ تینوں میں سے کوئی سودا بھی پانچ وسق سے زیادہ کا نہیں، اور جن کے نزدیک یہ شرط مجموعہ کے حق میں ہے ان کے نزدیک یہ تینوں سودے باطل ٹھہریں گے۔

لیکن صحیح قول حاجت کے معتبر ہونے کا اور ایک سودے میں پانچ وسق سے کم کی شرط ہونے کا ہے۔

◈ عرایا کی بیع کے جواز میں اعتبار مشتری کی حاجت ہے۔ رہی بائع کی حاجت؟ جیسے اسے اپنے غلام یا خادموں کو تمر کھلانے کی ضرورت ہو اور تمر اس کے پاس ہو۔ تو کیا وہ بھی تمر کے بدلے رطب کی بیع کر سکتا ہے یا نہیں؟

علماء کے اس بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مسئلہ قیاس اور عموم سے خارج ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں نص سے تجاوز نہ کیا جائے گا، اور نص میں مشتری کی حاجت کا ذکر ہے۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے مشتری اور بائع کی حاجت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ لہٰذا جب تفکہ کی وجہ سے عرایا کی بیع مشتری کو جائز ہے تو یہ بیع تمر کی حاجت کی وجہ سے بائع کے حق میں بدرجہ اولی جائز ہوگی۔

◈ جہاں یقین متعذر رہو، وہاں غلبہ ظن کو اختیار کیا جاتا ہے اور یہ قاعدہ فقہ میں معروف ہے۔ [1]

پھلوں کی بیع کا بیان

837- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا، نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا پک جانا ظاہر ہو جائے (اور) آپ ﷺ نے (اس بات سے) بائع اور مشتری (دونوں) کو منع فرمایا۔ [2]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ: وَكَانَ إِذَا سُئِلَ عَنْ صَلَاحِهَا قَالَ: ((حَتَّى تَذْهَبَ عَاهَتُهَا)).

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور نبی کریم ﷺ سے جب پھل کی ''صلاح'' (یعنی اس کے پکنے) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہاں تک کہ اس کی آفت (کا امکان اور توقع) جاتی رہے۔''

غریب الحدیث ...... نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ: الثمار: یہ ''ثمرة'' کی جمع ہے اور مراد ہر وہ چیز ہے جس کو ثمرہ یعنی پھل کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ درختوں پر لگے یا بیلوں پر، جیسے انگور، کھجور، انار، انجیر اور آڑو وغیرہ۔ کہ عرف میں ان سب کو پھل کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

حَتَّى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا: نبی کریم ﷺ نے پھلوں کے بیچنے سے اس وقت تک منع فرمایا ہے جب تک ان کی ''صلاح'' ظاہر نہ ہو جائے۔ اب ہر پھل کی صلاح اس کے اعتبار سے مختلف ہے۔ چنانچہ کسی کی صلاح اس کا رنگ ہوتا ہے تو کسی کا ذائقہ اور کسی کی صلاح کا یعنی اس کے پک کر تیار ہو جانے کا علم اس کو چھونے سے ہوتا ہے اور بعض کی صلاح ان کی خوشبو سے معلوم

---

[1] دیکھیں "قواعد السعدی، ورق: 11"۔

[2] صحیح البخاری: 2194، صحیح مسلم: 1534.

ہوتی ہے۔ غرض ہر شے کی صلاح مختلف ہے، اور مقصود یہ ہے کہ جب بھی کوئی پھل کھانے کے لائق ہو جائے اور آپ اس سے منتفع ہو سکتے ہیں تو یہ اس کی صلاح ہے۔

نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ: مراد بیچنے والا اور خریدنے والا ہے۔ دونوں کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ممانعت صرف کھجوروں والے کے لیے ہے۔ کیونکہ یہاں غابن بائع ہے جبکہ مشتری مغبون ہے، اور مشتری کے لیے بھی اس کی ممانعت اس لیے ہے کہ جب تک ایک پھل پک کر کاٹ لیے جانے کے قابل نہیں ہو جاتا، وہ آفات اور امراض کی زد میں رہتا ہے۔ لہٰذا پھلوں کو پکنے سے قبل خریدنا مال کو فساد پر پیش کرنا ہے، اور یہاں مشتری کو زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

غرض بائع کو ممانعت اس لیے ہے کہ بیع کی یہ صورت دوسرے کے مال کو ناحق کھانے کی ایک صورت ہے۔ جبکہ مشتری کو اس لیے یہ ممانعت ہے کیونکہ اس میں اپنے مال کو بے فائدہ ضائع کرنا ہے۔ چنانچہ اگر کچے خریدے ہوئے پھل پکنے سے پہلے کیڑا وغیرہ لگنے سے خراب ہو جائیں تو یہ امر متعاقدین کے درمیان خصومت و رنجش کا سبب بن سکتا ہے۔

حَتَّى تَذْهَبَ عَاهَتُهَا: یہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ درختوں وغیرہ پر لگے پھلوں کو بیچنے کی یہ ممانعت کب تک ہے؟ تو یہ ممانعت تب تک ہے جب تک ان پر کوئی آفت یا مصیبت واقع ہونے کا امکان باقی رہے اور جب یہ امکان جاتا رہے تو ان کو بیچ سکتے ہیں۔

عاهه: یہ پھلوں اور کھیتوں کو پہنچنے والی مصیبت کو کہتے ہیں چاہے یہ آسمانی ہو جیسے آندھی، طوفان، بارش ژالہ باری وغیرہ اور چاہے یہ آفت زمینی ہو جیسے خشک سالی، کیڑے لگنا، قبل از وقت پھلوں کا سوکھ کر ردی ہو جانا وغیرہ۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں پھلوں کو ان کے پکنے سے قبل بیچنے کی ممانعت کا بیان ہے کہ یہ ممانعت بائع اور مشتری دونوں کے لیے ہے اور یہ ممانعت تب تک باقی ہے جب تک پھل پک کر تیار نہیں ہو جاتے، اور پھلوں کی تیاری ہر پھل کے اعتبار سے مختلف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی پھل کھانے اور نفع اٹھائے جانے کے لائق ہو جائے تو یہ اس کا پک کر تیار ہو جانا شمار کیا جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- پھلوں کو ان کے پکنے سے قبل بیچنا حرام ہے۔ اس کی دلیل پکنے سے قبل بیچنے کی ممانعت کی مذکورہ نص ہے۔
- اس بنا پر پکنے سے قبل پھلوں کی بیع کا عقد فاسد ہوگا۔ کیونکہ یہ ممانعت منہی عنہ کی ذات یعنی پھلوں پر واقع ہے، اور جب نہی منہی عنہ کی ذات پر واقع ہو تو اس کا فعل فاسد ہوتا ہے۔ [1]
- البتہ دو صورتیں اس ممانعت سے مستثنیٰ ہیں:

(1) ایک یہ کہ کچے پھل کو اُسی وقت توڑ لینے کی شرط کر لی جائے۔ کیونکہ اب وہ آئندہ کی کسی آفت سے مامون ہو جائے گا۔

(2) دوسری یہ کہ وہ پھل خود اصلی مالک کو ہی بیچ دیا جائے۔ جیسے کوئی باغبانی کی شرط پر باغ میں کام کرتا تھا۔ تو وہ اپنے حصہ کے پھل کو مالک کو بیچ سکتا ہے۔

---

[1] ... المسامع للزركشي: 636/2.

لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہاں استثناء کی صرف پہلی صورت ہی جائز ہے۔ کیونکہ اس میں آفت سے حفاظت ہے۔

- شریعتِ اسلامیہ کے احکام حکمت پر مبنی ہیں۔ جن میں متعاقدین کے اموال کی ضیاع سے حفاظت بھی ہے، اور خود متعاقدین کی بھی کسی نزاع میں جا پڑنے سے حفاظت ہے۔
- اگر کسی کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کے کلام کو خلافِ مراد پر محمول کر لیا جائے گا تو اسے لازم ہے کہ وہ اپنی مراد پر نص یعنی صریح عبارت لے کر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پھلوں کو پکنے سے قبل بیچنے کی ممانعت کے ذکر کے بعد اس بات کی صراحت فرمائی کہ یہ ممانعت بائع اور مشتری دونوں کے لیے ہے۔ حالانکہ اس امر پر دلالت کرنے کے لیے پہلی نص ہی کافی تھی کہ بیع دو کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ تو جب یہ بیع ہی منع ہے تو بائع اور مشتری دونوں کو منع ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے بائع اور مشتری دونوں کا صراحۃً نام لے کر اس بیع سے منع فرمایا، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ یہ ممانعت صرف بائع کے لیے ہی ہے کیونکہ ضرر کا اندیشہ مشتری کو بھی ہے۔
- نبی کریم ﷺ نے مذکورہ ممانعت کی علت درختوں پر لگے پھلوں کے آفتوں کی زد میں ہونے کو بیان فرمایا ہے۔
- جس عقد میں خدشات اور خطرات، اور اندیشے اور کھٹکے ہوں۔ اس عقد کو کرنے سے اجتناب اولیٰ ہے۔

کھجور کا پھل کب پک جاتا ہے؟

838- وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى تَزْهُوَ. قِيلَ: وَمَا زَهْوُهَا؟ قَالَ: ((تَحْمَارُّ وَتَصْفَارُّ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے پھلوں کو بیچنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ پک کر اس کا رنگ نکھر جائے۔ عرض کیا گیا کہ یہ پھلوں کے رنگ کا نکھرنا کیا ہے؟ تو ارشاد فرمایا: ”(یہ کہ) وہ (پک کر) سرخ ہو جائے اور زرد ہو جائے۔“ [1]

یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے، اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:...... تَحْمَارُّ وَتَصْفَارُّ: سرخ یا زرد ہونا۔

مذکورہ حدیث میں بھی وہی مضمون ذکر ہے جو گزشتہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ پھلوں کو ان کے پکنے سے قبل بیچنا منع ہے۔ البتہ اس حدیث میں یہ مزید بیان ہے کہ پھل سے مراد کھجور ہے۔ کیونکہ پک کر سرخ یا زرد کھجور ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

حَتَّى تُزْهِيَ: یہ إزهاء سے مشتق ہے۔ یہ عمدہ اور لذیذ ہونے کو کہتے ہیں اور ایسا تب ہوتا ہے جب پھل اور کھجور پک جاتی ہے اور اس کا رنگ سرخ یا زرد ہو کر نکھر جاتا ہے۔

گزشتہ حدیث میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر پھل کا پکنا اس کے اعتبار سے ہے، چنانچہ یہ رنگ، ذائقہ، بو اور لمس وغیرہ میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جو بات معلوم نہ ہو اس کا سوال جائز ہے۔ جیسا کہ یہاں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ازھاء کا معنی دریافت کیا تاکہ امر واضح ہو جائے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2195- صحيح مسلم: 1555.

◈ کھجور کے پکنے کا علم اس کے رنگ سے ہوتا ہے اور یہ اس کا سرخ یا زرد ہونا ہے۔
◈ اگر کھجور کے متعدد درخت ہوں جن میں سے ایک کی کھجوریں سرخ ہو چکی ہوں جبکہ دوسرے کی کھجوریں ابھی سرخ نہ ہوئی ہوں تو جس کی کھجوریں سرخ ہو چکی ہیں، ان کو بیچ سکتے ہیں۔ جبکہ دوسرے کی کھجوریں نہ بیچی جائیں گی۔ کیونکہ حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے۔

انگور کا پھل کب پکتا ہے؟

839۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: نَهَى عَنْ بَيْعِ الْعِنَبِ حَتَّى يَسْوَدَّ، وَعَنْ بَيْعِ الْحَبِّ حَتَّى يَشْتَدَّ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے انگوروں کو بیچنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ (پک کر) سیاہ ہو جائیں اور غلہ کو بیچنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ (پک کر) سخت ہو جائے۔ ❶

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے۔ سوائے امام نسائی رحمہ اللہ کے، جبکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :......اس حدیث میں بھی گزشتہ مضمون ہی مذکور ہے۔ البتہ یہاں ایک اور پھل کو بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے، اور وہ ہے انگور، اور بتلایا گیا ہے کہ اس کا پکنا اس کے رنگ کا سیاہ ہو جانا ہے، اور یہ بھی بطور واقع کا بیان ہے کیونکہ انگوروں کی بھی متعدد قسمیں ہیں اور ہر انگور پک کر سیاہ ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو انگور رنگ نہیں بدلتے یا سیاہ کے علاوہ کسی اور رنگ میں منتقل ہو جاتے ہیں ان میں پکنے کا مدار ان کا کھانے اور نفع اٹھائے جانے کے قابل ہو جانے پر ہوگا۔

لہٰذا جب انگور پک کر کھانے کے قابل ہو جائیں تو ان کو بیچنا جائز ہوگا۔

دوسری مثال یہاں غلوں کی پیش کی گئی ہے۔ جیسے چاول، گندم لوبیا، دالیں اور جَو وغیرہ۔ ان کا پکنا ان کے دانوں کا سخت ہو جانا ہے۔ لہٰذا جب تک ان غلوں کے دانے نرم ہیں ان کا بیچنا جائز نہ ہوگا کیونکہ ابھی ان کی صلاح ظاہر نہیں ہوئی اور یہ معرض خطر میں ہیں۔

فائدہ :......اس مقام پر ایک نحوی قاعدہ ملاحظہ ہو، وہ یہ کہ جب "حتّٰی" کا کلمہ نہی یا نفی کے سیاق میں آتا ہے تو اس کا مابعد حکم میں ماقبل کے مخالف ہوتا ہے۔

اس بنا پر گندم کو ان کی بالیوں میں بیچنا جائز ہوگا۔ کیونکہ "یشتدّ" یہ "حتّٰی" کے مابعد ہے اور ماقبل میں نہی مذکور ہے۔ لہٰذا یہ مابعد، ماقبل کے حکم کے مخالف ہوگا۔ پس دانے پکتے ہی ان کا بیچنا جائز ہوگا۔

چاہے وہ ابھی بالیوں میں ہی ہوں۔ کیونکہ "حتّٰی" کے ماقبل یہ حکم مذکور ہے کہ گندم اور غلوں کو ان کے پکنے سے قبل بیچنا جائز نہیں۔ لہٰذا پک جانے کے بعد ان کا بیچنا جائز ہوگا چاہے وہ ابھی بالیوں میں ہی ہوں۔

❶ سنن ابی داؤد: 3371۔ جامع الترمذی: 1228۔ سنن ابن ماجه: 2218۔ مسند احمد: 221/3۔ صحیح ابن حبان: 4993۔ المستدرك للحاكم: 23/2۔ امام نووی رحمہ اللہ نے "المجموع: 289/9" میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

آفتِ سماوی کی وجہ سے ضائع ہونے والے پھل کے نقصان کو منہا کرنے کا حکم

840- وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَوْ بِعْتَ مِنْ أَخِيْكَ ثَمَرًا، فَأَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ، فَلَا يَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا، بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِيْكَ بِغَيْرِ حَقٍّ؟)).

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر تم نے اپنے بھائی کو پھل بیچا (جو ابھی درختوں پر لگا ہے) اتنے میں وہ کسی سماوی آفت کی زد میں آ گیا تو تیرے لیے جائز نہیں کہ تو اپنے بھائی سے کچھ لے۔ بھلا تم اپنے بھائی کا مال ناحق کیونکر لو گے۔''[1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهُ: ((أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ أَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ)).

اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے آسمانی آفتوں (سے ہونے والے نقصانات) کو (اصل قیمت سے) وضع (یعنی منہا) کرنے کا حکم دیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **لَوْ**: یہ حرف شرط ہے۔ لٰہذا مابعد کا جملہ شرطیہ ہوگا۔

بِعْتَ مِنْ أَخِیْكَ: یہاں ''مِنْ'' یہ ''عَلَی'' کے معنی میں ہے، اور ''اخوت'' کا ذکر تغلیب کے باب میں سے ہے وگرنہ یہ حکم کافر کے ساتھ خرید وفروخت کرنے کا بھی ہے۔

ثَمَرًا: مراد عام ہے جو ہر اس شے کو شامل ہے جس پر ثمر یعنی پھل کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں یہ لفظ نکرہ ہے جو شرط کے سیاق میں آیا ہے۔ اس لیے عموم اور شمول کا فائدہ دے رہا ہے۔

فَأَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ: جَائِحَةٌ:[2] یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ جائحہ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو کسی دوسری شے کو بالکلیہ تباہ و برباد کر دے۔ اس سے لفظ اجتیاح ہے جو کسی شے کو جڑ سے اکھیڑ دینے اور اس کا قلع قمع کر دینے کو کہتے ہیں۔ تب پھر جائحہ اس آسمانی آفت کو کہیں گے جو پھلوں اور کھیتوں کو تباہ و برباد کر دے جیسے تیز آندھیاں، طوفانِ باد وباراں، سخت سردی یا گرمی، ژالہ باری وغیرہ۔

فَلَا یَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ: مذکورہ ''فَا'' جزائیہ ہے۔ لٰہذا یہ جملہ جوابِ شرط ہے۔ ''منه'' میں ضمیر کا مرجع لفظ ''اخیك'' ہے، اور اس سے مراد مشتری ہے۔

یاد رہے کہ حلت کے بالمقابل تحریم ہوتی ہے اور جہاں حلت کی نفی ہو جائے وہاں تحریم کا اثبات ہوتا ہے، کیونکہ حلت اور حرمت یہ دونوں شرعاً ایک دوسرے کے متضاد ہیں، نہ تو یہ کسی جگہ یکجا ہوتے ہیں اور نہ کسی جگہ سے اکٹھے مرتفع ہی ہوتے ہیں۔ لٰہذا ایک کا وجود دوسرے کی نفی کو، اور ایک کی نفی دوسرے کے اثبات کو مستلزم ہوتی ہے۔

شَیْئًا: کیونکہ جب آفت سماوی کی وجہ سے سارا پھل برباد ہو گیا تو اب اس کے بدلے مشتری سے کچھ بھی لینا جائز نہ ہوگا۔

بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِیْكَ بِغَیْرِ حَقٍّ: مذکورہ ''بَا'' تعلیلیہ ہے اور یہ گزشتہ مذکورہ حکم کی علت کا بیان ہے، اور مذکورہ

---

[1] صحیح مسلم: 1554.

[2] جَائِحَةٌ: مصیبت، آفت، حادثہ، وہ مصیبت جو آدمی کے مال کو بالکلیہ تباہ کر دے۔ فقہائے اسلام کے نزدیک جائحہ اس آسمانی مصیبت کو کہتے ہیں جس کے باعث کل یا بعض پھل ضائع ہو جائیں۔ (القاموس الوحید، ص: 295)...... (نسیم)

"مَا" استفہامیہ ہے اور یہ استفہام انکاری ہے، اور یہ توبیخ اور سرزنش کا بیان ہے۔

(یاد رہے کہ اس حرف استفہام پر اگر حرفِ جر داخل ہو جائے تو اس کے الف کو حذف کرنا اور اس کے فتح کو باقی رکھنا واجب ہوتا ہے۔ جیسے یہاں یہ لفظ "بِمَ" ہے جس میں "ما" استفہامیہ کی الف حذف اور فتح باقی ہے۔ ❶

مذکورہ استفہام میں انکار و توبیخ یوں ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ اس مال کو لینے پر بائع کو سرزنش فرما رہے ہیں کہ جس کے بدلے اس نے پھل بیچا تھا۔ کیونکہ اس کا یہ مال لینا ناحق ہے اور حق کی ضد باطل ہوتا ہے لہٰذا اس مال کا لینا باطل ہوگا۔ کیونکہ جو پھل اس نے مشتری کو بیچا تھا اس نے تو ابھی اس سے کوئی فائدہ اٹھایا ہی نہ تھا کہ آسمانی آفت کی نذر ہو کر وہ پھل تباہ و برباد ہو گیا۔

مضمون حدیث :...... مضمونِ حدیث واضح ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کو ایک مال کے بدلے کوئی پھل بیچا اور ابھی مشتری کو اس پھل سے استفادہ کرنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی کہ آسمانی آفت نے اس پھل کو برباد کر دیا تو اب بائع کو مشتری سے اس برباد پھل کے بدلے ایک دھیلہ لینا بھی جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ "بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِيكَ" کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ ابھی وہ ثمن بائع کی ملک میں منتقل ہی نہ ہوا تھا۔ اسی لیے تو "مَالَ أَخِيْكَ" فرمایا، کیونکہ اگر وہ ثمن بائع کی ملکیت میں منتقل ہو چکا ہوتا تو اسے "مَالَ اَخِيكَ" کے لفظ سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ تب پھر وہ ثمن ابھی تک مشتری کا ہی ہے۔ جس سے بائع کو کچھ بھی لینا حلال نہیں۔ لہٰذا وہ پھل بائع کی ملک سے برباد ہوا ہے۔ اس بات کو مسلم شریف کی دوسری روایت میں "وضع الجوائح" کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے، جس کی تفصیل فوائد کے تحت آ جاتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ وضع الجوائح سے مراد یہ ہے کہ پھل کو توڑنے سے قبل اگر وہ کسی آفت کا شکار ہو گیا تو اس کی قیمت کو ثمن سے وضع کر لیا جائے گا۔ البتہ یہ مسئلہ علماء کے ہاں اختلافی ہے۔ ❷ چنانچہ بعض علماء کے ہاں جائحہ کو مشتری کے ذمہ کیا جائے گا کیونکہ مشتری نے یہ پھل صحیح عقد کے ساتھ اور معلوم ثمن کے عوض خریدا تھا۔ لہٰذا اب یہ مشتری کی ملک میں داخل ہو چکا تھا اور اسے پھل کی سپردگی بھی حاصل ہو چکی تھی۔ وہ یوں کہ لگے پھل کی سپردگی یہ درخت کو پھل توڑنے کے لیے مشتری کے لیے خالی کر دینا ہے۔ نہ کہ مشتری کا پھل توڑ لینا ہی تسلیم مبیع ہے۔ تو جب بائع نے پھل توڑنے کے لیے مشتری کو درخت حوالے کر دیا تھا تو اب کوئی آسمانی آفت بیع کو فسخ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس کا ثمن بائع کو حلال ہوگا اور مصیبت کا شکار ہونے والا پھل مشتری کا شمار ہوگا۔

اس مسئلہ کی بابت یہ ایک قول ہے۔ جس کی تعلیل یہ ہے کہ مشتری اس پھل کا شرعی اور صحیح عقد کے ساتھ مالک بن چکا ہے، اور یہ پھل کامل طور پر مشتری کے سپرد ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کا ضمان مشتری پر ہی آئے گا۔

جبکہ اس مسئلہ کی بابت دوسرا قول یہ ہے کہ یہ جائحہ بائع کے ذمہ ہوگی کیونکہ اس بات کی صریح نص آ گئی ہے جس کے ہوتے ہوئے قیاس کو دخل نہیں اور ہمارے درمیان حاکم اور فیصل قول رسول ﷺ اور سنت نبوی ﷺ ہے، اور قولِ رسول حاکم ہے نہ کہ محکوم۔ لہٰذا جو رائے اور نظر بھی مخالفتِ سنت پر مبنی ہوگی، وہ باطل ہوگی۔ اس بنا پر اس قول کی دلیل زیادہ قوی، بابرکت اور سعید ہے اور قولِ رسول ﷺ ہے۔

---

❶ الفتاویٰ: 255/30.　❷ القاموس الوحید، ص: 1518"۔ (نسیم)

- معلوم ہوا کہ آفت آنے کی صورت میں بائع کو اس پھل کی قیمت میں سے کچھ بھی لینے کا حق نہیں۔
- البتہ اگر پھل کی آفت مشتری کے فعل سے آئے تو اس کا ضمان مشتری پر ہوگا۔ جیسے اگر مشتری نے سلیقہ سے پھل نہ چنا، یا چننے میں تاخیر کر دی اور پھل طبعی طور پر متاثر ہو گیا تو اس نقصان کا تاوان مشتری کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ اب بائع کی تعدی ثابت نہیں۔
- اور اگر پھل کو نقصان نہ تو کسی آفت سے پہنچا اور نہ بائع یا مشتری کی تعدی سے پہنچا تو دیکھا جائے گا کہ اس غیر کو رد کنے کی کسی میں سکت تھی یا نہیں جیسے کسی گزرتے فوجی دستے نے پھل توڑ توڑ کر برباد کر دیے تو یہ آفت سماویہ کے حکم میں ہوگا۔ ❶ کیونکہ یہاں پھل توڑنے اور برباد کرنے والے کے ذمہ چٹی ڈالنا ممکن نہیں، اور اگر اس غیر کے ذمہ چٹی ڈالی جا سکتی ہے تو علماء کا اس صورت کی بابت قول یہ ہے کہ مشتری کو اختیار ہوگا کہ چاہے وہ اس نقصان دہندہ پر لوٹے اور چاہے تو بائع پر لوٹے۔ پس اگر تو اس نے پھل لینے سے رجوع کیا تو اس سے حاصل ہونے والی رقم بائع کو دے گا، اور اگر بائع پر لوٹے گا تو بائع وہ رقم پھل برباد کرنے والے سے لے گا۔
- اور اگر پھل جزوی طور پر برباد ہوا ہے تو اس صورت میں برباد ہونے والے اور سلامت بچ جانے والے پھل کا حکم جدا جدا ہے۔ لہٰذا اب اگر بائع صحیح پھل کی رقم لیتا ہے تو یہ رقم برحق ہوگی۔ البتہ برباد ہونے والے پھل کی رقم نہ لے گا۔ اس کی دلیل حدیث کے یہ الفاظ ہیں: "بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِيكَ بِغَيْرِ حَقٍّ"
- اسلام دین عدل ہے جو کسی کے خلاف ظلم کا فیصلہ نہیں دیتا۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ حکم کو علت کے ساتھ ملا کر بیان فرماتے تھے۔
- یہ شریعت بے حد بلند ہے کہ یہ حکمتوں اور علتوں پر مشتمل ہے۔

کھجور کی قلم کاری اور اسے گابھا دینے کے بعد اترنے والی کھجور کا حکم

841- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنِ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ أَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ الَّذِي بَاعَهَا، إِلَّا أَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کھجور کا درخت اسے گابھا دینے کے بعد بیچا تو اس کا (بعد میں اترنے والا) پھل اس کے بیچنے والے کا ہوگا سوائے اس کے کہ خریدنے والا (اس پھل کے اپنے لیے ہونے کی) شرط کر لے'' (کہ تب پھر وہ بعد میں اترنے والا پھل خریدنے والے کا ہوگا)۔'' ❷

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......مَنِ ابْتَاعَ: مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے، اور "اِبْتَاعَ" یہ اشتراء کے معنی میں ہے۔

---

❶ كشاف القناع: 242/3.

❷ صحيح بخاري: 2204- صحيح مسلم: 1543.

نَخْلًا: مراد خود کھجور کا درخت ہے نہ کہ اس کا پھل۔
بَعْدَ أَنْ تُؤَبَّرَ: تابیر: یہ پیوند کاری، قلم کاری اور گابھا دینے کو کہتے ہیں۔
فَثَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ جزائیہ ہوگا۔یعنی پھل توڑنے کے وقت تک باقی رہنے والا یہ پھل بائع کا ہوگا۔

إِلَّا أَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ: لہٰذا اگر مشتری نے اس بات کی شرط لگادی کہ وہ پھل اس کا ہوگا اور بائع بھی مان گیا تو یہ مشتری کا حق ہوگا اور اس بات کے شرط کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی درخت کی قلم کاری بائع نے کی پھر اس کے بعد اسے بیچ ڈالا تو بعد میں اترنے والا پھل بائع کا ہوگا۔کیونکہ یہ پھل اس کی سابقہ محنت کا نتیجہ ہے، اور یہ پھل اسے نہ دینے میں باہمی عداوت اور کینہ کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔

البتہ اگر مشتری کے کہنے پر بائع اس کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے تو وہ پھل مشتری کا ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قلم کاری کے بعد اترنے والا پھل بائع کا ہے، اس بابت مذکورہ نص صریح ہے۔کیونکہ اس پھل پر اس کی محنت ہوئی ہے اور اس کا جی اس میں اٹکا رہتا ہے۔لہٰذا یہ پھل اسے نہ دینے میں باہمی رنجش کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔
- پس معلوم ہوا کہ اگر کسی نے کھجور کا درخت قلم کاری سے قبل بیچا تو بعد کا پھل مشتری کا ہوگا۔کیونکہ یہ پھل اب اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔چاہے بائع نے وہ درخت شگوفے پھوٹ نکلنے کے بعد ہی بیچا تھا کہ یہی صحیح قول ہے۔
- شریعت نے بندوں کے جذبات واحساسات کی پوری پوری رعایت کی ہے۔
- کھجور کا درخت خالی، تابیر سے قبل، تابیر کے بعد، اور شگوفے نکل آنے کے بعد غرض ہر حال میں بیچنا جائز ہے۔حتیٰ کہ اس پر پھل لگے ہوں تب بھی بیچ سکتے ہیں۔
- رہا یہ سوال کہ کھجور کے درخت کی بیع کس کس چیز کو شامل ہے۔صرف درخت کو یا اتنی زمین کو بھی جس میں وہ اگا ہوا ہے؟ لہٰذا اگر کھجور کی بیع اتنی زمین کو بھی شامل ہے تو درخت کے ضائع ہو جانے کے بعد اتنی زمین مشتری کی ہوگی۔

غرض اس بابت صحیح قول کیا ہے؟ تو راجح قول یہ ہے کہ اس باب میں مدار عرف ہے۔پس اگر عرف میں کھجور کی بیع زمین کو بھی شامل سمجھی جاتی ہے تو بات یہی ہے، اور اگر عرف اس کے برخلاف ہے تو مشتری کا صرف درخت ہوگا اور درخت ضائع ہو جانے کے بعد وہ اس زمین کا اور کچھ نہ کر سکے گا۔

- مشتری کے لیے تابیر کے بعد پھل کا اپنے لیے شرط کر دینا جائز ہے جس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے۔
- جو شے مستقل طور پر ثابت نہ ہو وہ بالتبع ثابت ہو جاتی ہے۔جیسے تابیر کے بعد کا پھل درخت کے تابع ہو کر بیع میں شامل ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی چاہے وہ ابھی پکا نہ بھی ہو۔جبکہ صرف پھل کو اس کے پکنے سے قبل بیچنا اور خریدنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔
- بیع میں شرط رکھنا جائز ہے۔یا زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہیے کہ شرط کے ساتھ بیع کرنا جائز ہے۔

5۔ أَبْوَابُ السَّلَمِ وَالْقَرْضِ وَالرَّهْنِ

بیع سلم، قرض اور رہن کا بیان

تمہید:......**أَبْوَابُ**: امام موصوف نے "أَبْـوَابُ السَّـلَمِ" کہا حالانکہ ''سلم'' کا تو ایک ہی باب ہے؟ تو یہ مذکورہ باب کے تین علمی مسائل کے بیان پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے ہے، اور وہ سلم، رہن اور قرض کے مسائل ہیں۔ امام موصوف نے سب سے پہلے سلم سے متعلق احادیث کو ذکر کیا ہے۔ اس لیے ذیل میں اختصار کے ساتھ عقدِ ''سلم'' کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

سلم کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ

سَلَمَ یہ تسلیم کا اسم مصدر ہے۔ چنانچہ "سَـلَّمَ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا وَسَلَمًا" کہا جاتا ہے۔ جبکہ اہل عراق کی لغت میں یہ لفظ "سَـلَفَ" ہے یہ "اَسْـلَفَ" (پیش کرنا) سے ماخوذ ہے اور مراد عوض کو پیشگی دے کر معوّض کو مؤخر کرنا ہے اور یہی معنی 'سَلَم' کا بھی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری بائع سے مثلاً: سوکلو گندم مانگے اور بائع یہ عذر کر دے کہ ابھی گندم منڈی میں آئی نہیں کیونکہ ابھی کٹائیاں چل رہی ہیں جس پر مشتری اسے آئندہ کسی مقررہ وقت پر گندم دینے کا معاہدہ کرنے کے بعد اس کی رقم پیشگی دے دے تو اس کو عقدِ سلم کہا جائے گا۔ فقہا کی اصطلاح میں عقدِ سلم کی تعریف یوں ہے: ''یہ وہ عقد ہے جو کسی ''موصوف'' شے پر جو بعد میں دینی ہے، واقع ہو، اور اس کی قیمت کو مجلس عقد میں نقد ادا کر کے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔'' لہٰذا یہ عقد کسی شیءِ معین پر واقع نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک تو یہ عقد معین پر جو مشارٌ الیہ ہو، واقع نہ ہوگا، دوسرے یہ معین موصوف پر بھی واقع نہ ہوگا اور اس میں تاجیل لازم ہے۔ جبکہ اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں ثمن یعنی عوض نقد ہو کیونکہ سلف کے جواز کی یہی حکمت ہے کہ اس میں ایک فریق کی نقد حاجت بر آری ہے۔ لہٰذا اگر ثمن ہی نقد نہ ہوا تو سلف بھی جائز نہ ہوگا۔

یاد رہے کہ بیع سلم کو فقہاء نے بیع الآجل بالعاجل کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں صاحب مال کو مُسْلِم یا رب السلم، عاقد ثانی کو مُسْلَم الیہ، مبیع یعنی آجل کو مُسْلَم فیہ اور ثمن یعنی عاجل کو رأس المال کہتے ہیں۔ [1]

قرض کی تعریف

قرض یہ دوسرے کو نفع اٹھانے کے لیے اس شرط پر مال دینے کو کہتے ہیں کہ وہ اس کا بدل واپس کرے گا۔ (ہمارے اردو محاورہ میں اس کو ادھار دینا کہتے ہیں)۔ قرض (یعنی ادھار) یہ "الْقَـرْضُ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کترنا اور کاٹنا کیونکہ قرض دینے والا دوسرے کے منتفع ہونے کے لیے اپنے مال کا ایک حصہ کاٹ کر اسے دیتا ہے۔ دوسرے کو قرض دینے کا محرک و باعث صرف رب تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں سود لینا (یعنی دی رقم سے زیادہ لینا) جائز نہیں ہوتا۔

رہن کی تعریف

رہن یعنی گروی رکھنا، یہ اپنے قرض کو کسی ایسی عین کے عوض پکا کرنے کا نام ہے جس سے استفادہ ممکن ہو۔ یعنی قرض واپس نہ ملنے کی صورت میں اس عین کے ذریعے اپنا کل یا بعض قرض وصول کرنا ممکن ہو۔ رہن کا لفظ "اَلرَّهْنُ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی روکنا ہے۔ (یاد رہے کہ اس میں گروی رکھنے والے کو راہن، جس کے پاس مال یا غیر مال کو گروی رکھا ہے اسے مرتہن اور جو چیز گروی رکھی ہے اسے مرہون کہتے ہیں۔) [2]

---

[1] معدن الحقائق: 62/2. (نسیم)
[2] معدن الحقائق: 357/2. (نسیم)

سلم، رہن اور قرض کا حکم

یہ تینوں عقود حلال ہیں کیونکہ عقود ومعاملات میں اصل ان کا حلال ہونا ہے جب تک کہ اس کے خلاف پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔ چونکہ سنت ان کے جواز پر دلالت کرتی ہے اس لیے ہمارے لیے اس کے خلاف قول کرنے کی اجازت نہیں۔

اب ذیل میں ترتیب وار ان تینوں عقود کی بابت احادیث ملاحظہ کیجیے۔

عقدِ سلم کی شروط کا بیان

842۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَدِينَةَ، وَهُمْ يُسْلِفُونَ فِي الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ، فَقَالَ: ((مَنْ أَسْلَفَ فِي تَمْرٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ، وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ، إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِلْبُخَارِيِّ ((مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ (ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے جبکہ لوگ اس وقت ایک سال یا دو سال کے لیے پھلوں میں عقدِ سلم کیا کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کھجوروں میں عقدِ سلم کرے تو اسے چاہیے کہ وہ معلوم ناپ اور معلوم وزن میں معلوم مدت تک یہ عقد کرے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''جو کسی شے میں عقدِ سلم کرے۔'' [2]

غریب الحدیث :...... قَدِمَ الْمَدِينَةَ: مراد ہجرت کر کے مدینہ تشریف لانا ہے۔ ہجرت بعثت کے تیرہ سال بعد ہوئی تھی۔ ہجرت کے اسباب و واقعات اہل اسلام کے ہاں معروف ہیں۔

وَهُمْ يُسْلِفُونَ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ ''النَّبِيُّ'' کے لفظ سے حال ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ اس حال میں مدینہ تشریف لائے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عقدِ سلف کیا کرتے تھے۔

فِي الثِّمَارِ: یعنی وہ لوگ یہ عقد پھلوں سے کیا کرتے تھے۔ کہ مشتری پھلوں کی رقم پیشگی دے دیا کرتا اور معین وقت پر بائع سے پھل وصول کر لیتا تھا۔

عقدِ سلم میں طرفین کا فائدہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جس کسان کو رقم کی ضرورت ہوتی تھی اور وہ بطور قرض کے رقم مانگتا تھا تو قرض دہندہ اسے پھل یا غلہ کے عوض قرض دے دیتا تھا۔ یوں قرض مل جانے پر کسان اپنی ضرورت پوری کر لیتا تھا جبکہ مشتری زیادہ پھل لے کر نفع میں رہتا تھا۔ کیونکہ آدمی عادۃً رائج قیمت پر ایک ماہ بعد کوئی شے نہیں خریدتا اس کی مصلحت اور منفعت اسی میں ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی شے کی قیمت ایک ماہ قبل دے رہا ہے تو ایک ماہ بعد وہ شے اسے رائج قیمت پر ملنے والی شے سے زیادہ ملے۔

فَقَالَ: یعنی نبی کریم ﷺ نے اہل مدینہ کے لین دین کے اس طریقہ کو برقرار رکھا تبھی تو آگے ایسا کرتے رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ البتہ آپ ﷺ نے اس عقد کو شرعی اصولوں کے عین مطابق کرنے کے لیے چند شروط بیان فرمائیں جن کی تفصیل ذیل میں آرہی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2239۔ صحيح مسلم: 1604.

[2] صحيح البخاري: 2253.

مَنْ أَسْلَفَ فِي تَمْرٍ: ایک روایت میں "ثَمْرٍ" کا لفظ بھی آتا ہے جبکہ امام موصوف نے صحیح بخاری کی ایک روایت میں "فِي شَيْءٍ" کا لفظ بھی ذکر کیا ہے۔ تب پھر معلوم ہوا کہ یہ عقد عام ہے اور یہ تمر اور ثمر کے علاوہ ہر شے میں ہو سکتا ہے۔

مذکورہ "مَـــنْ" شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو نقد ثمن کو مؤخر مبیع کے عوض دے یہ جائز ہوگا۔ اس کی دلیل "إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ" کے الفاظ ہیں کہ اس عقد میں ثمن نقد اور مثمن موخر ہوگا۔

فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ، وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ، إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ جزائیہ اور جوابِ شرط ہے۔ جبکہ مذکورہ "لام" امر کا ہے اور یہ امر واجب کے لیے ہے۔ تب پھر اگر مابعد مذکورہ شروط مفقود ہوئیں تو یہ عقد باطل ہو جائے گا۔

کیل اور وزن کی شرط سے یہ معلوم ہوا کہ مسلم فیہ یا تو مکیلی ہوگی یا موزونی۔ لیکن آیا یہ حصر کا بیان ہے کہ بیع سلم صرف انہی اشیاء میں ہوگی جو مکیلی یا موزونی ہوں گی یا مکیلی کو وزن کر کے بھی اس میں بیع سلم جائز ہے؟ تو مذکورہ حدیث میں دونوں باتوں کا ہی احتمال ہے، مسئلہ بہر حال علماء کے ہاں اختلافی ہے۔

إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ: یعنی بیع سلم آئندہ کی ایک مدت تک جائز ہے۔ البتہ یہ مدت معلوم ہو نا کہ مجہول۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نقد قیمت وصول کر کے مبیع کو بعد میں دینے کی شرط پر بیع کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں پر معاملات میں وسعت کرنا مقصود ہے۔ البتہ یہ عقد چند شروط کے ساتھ مشروط ہے جو یہ ہیں:

- ...... مسلم فیہ یعنی مبیع ادھار ہو۔
- ...... رأس المال یعنی ثمن نقد ہو۔
- ...... مسلم فیہ مکیلی ہو یا موزونی ہو۔
- ...... مسلم فیہ کا کیل اور وزن معلوم ہو۔
- ...... اور جس وقت مسلم فیہ کو رب المال یعنی مشتری کے حوالہ کرنا ہے وہ مدت بھی معلوم ہو، مجہول نہ ہو۔
- ...... اور یہ کہ یہ عقد نقد مبیع کے بدلے نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بیع سلم جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت کر کے تشریف فرما ہونے کے بعد اس عقد کو ہوتے دیکھا اور اس کو جائز قرار دیا۔
- معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ میں معاملات اور عقود میں بے حد وسعت ہے اور یہ کہ معاملات میں اصل حلت ہے، لہٰذا جب تک کسی معاملہ کی حرمت پر دلیل قائم نہ ہو وہ جائز متصور ہوگا۔
- مصلحت پر مبنی معمولی جہالت معاف ہے۔ وہ یوں کہ بیع سلم میں بہر حال ایک گونہ جہالت ہے اور وہ یہ کہ جانے مسلم فیہ وقت پر دستیاب ہوتا بھی ہے یا نہیں یا ملتا تو ہے پر جتنا درکار ہے اتنا دستیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر موصوف مشاہد کی طرح نہیں ہوتا۔ (یعنی جس شے کی ہیئت کو لفظوں سے بیان کیا جائے وہ عیاناً موجود شے جیسی ہرگز نہیں ہو سکتی)۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے: "خبر معاینہ جیسی نہیں ہوتی۔" لیکن شرع شریف نے عقدِ سلم کی مصلحت اور وسعت کے پیش نظر اس قدر جہالت کی طرف مطلق التفات نہیں کیا۔ اسی لیے پیاز، آلو، گاجر، مولی، شلجم وغیرہ کو ان کے اکھاڑنے سے قبل

بھی بیچنا جائز ہوگا کہ یہاں بھی معمولی جہالت معاف ہے۔

- مسلم فیہ کیل یا وزن کے ساتھ معلوم ہو۔
- اگر بیع سلم کی مدت معلوم نہ ہوئی تو یہ عقد باطل ہوگا اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ عقد اودھار پر ہی جائز ہوگا نہ کہ نقد پر۔
- استصناع کے جواز کا بھی اس حدیث سے علم ہوگیا۔ استصناع یہ کسی شے کو آرڈر دے کر بنوانے کو کہتے ہیں جیسے مثلاً: ہم لوہار کو جا کر نقد رقم دے کر مخصوص پیمائش، وزن اور نمونہ کی کھڑی بنا دینے کا آرڈر دیں جو وہ بعد میں بنا کر دے گا کہ یہ جائز ہے۔
- مسلم فیہ کی صفت معلوم ہونا بھی شرط ہے۔ لہٰذا جو غلہ یا پھل سلم کے طور پر لینا ہے، اس کا وزن یا کیل اور صفت بیان کی جائے۔ کیونکہ حدیث میں مقدار کے علم کی شرط مذکور ہے اور صفت کے علم کی شرط مقدار پر قیاس کر کے اخذ کی گئی ہے۔
- مجہول کا معاوضہ لینا منع ہے کیونکہ مال کا ریہ جہالت نزاع کا سبب بنتی ہے اور جو شے بھی سبب نزاع بنے وہ شرعاً منع ہوتی ہے۔
- صحیح بخاری کی روایت بتلاتی ہے کہ عقدِ سلم ہر شے میں جائز ہے۔ لہٰذا یہ عقد صرف موزونی یا مکیلی شے کے ساتھ ہی خاص نہیں۔ جیسا کہ یہ عموم خود نص میں آ گیا ہے لہٰذا راجح قول یہی ہے۔ اس بنا پر گاڑیوں میں بھی بیع سلف جائز ٹھہرے گی جس کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں ''بکنگ کروانا'' کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی نے گاڑی کا نام ماڈل، رنگ اور برانڈ وغیرہ کی تعیین کے ساتھ اس کی رقم نقد دے کر مقررہ مدت پر اس کی حوالگی کا معاملہ کیا تو یہ جائز ہوگا۔

عقدِ سلم کرتے وقت مسلم فیہ کا موجود ہونا ضروری نہیں

843، 844۔ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبْزَى وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رضي الله عنهما قَالَا: ((كُنَّا نُصِيبُ الْمَغَانِمَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَكَانَ يَأْتِيْنَا أَنْبَاطٌ مِنْ أَنْبَاطِ الشَّامِ، فَنُسْلِفُهُمْ فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالزَّبِيْبِ)). وَفِي رِوَايَةٍ: ((وَالزَّيْتِ)) إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى، قِيلَ: أَكَانَ لَهُمْ زَرْعٌ؟ قَالَا: ((مَا كُنَّا نَسْأَلُهُمْ عَنْ ذَلِكَ)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ دونوں فرماتے ہیں کہ: ہمیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ (غزوات میں شریک ہونے پر) اموالِ غنیمت ملتے تھے اور ہمارے پاس شام کے نبطی آیا کرتے تھے۔ پس ہم ان کے ساتھ گندم، جو اور کشمش میں، اور ایک روایت میں زیتون کا ذکر بھی آیا ہے۔ ایک مقررہ مدت تک بیع سلم کر لیا کرتے تھے۔ عرض کیا گیا کہ: کیا ان کی کھیتی ہوا کرتی تھی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: ہم ان لوگوں سے اس بابت پوچھا نہ کرتے تھے۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......**اَلْمَغَانِمَ** : یہ ''مَغْنَم'' کی جمع ہے۔ لغت میں یہ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو آدمی کو کسی معاوضہ کے بغیر حاصل ہو، جبکہ شرع شریف کی اصطلاح میں اسے اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے قتال کر کے ان سے حاصل کیا گیا ہو۔ لہٰذا چوری، لوٹ اور ڈاکہ وغیرہ سے حاصل کیے گئے مال کو غنیمت نہ کہا جائے گا۔

اَلْأَنْبَاطُ : یہ نبطی کی جمع ہے، نبطی ہر اس غیر عرب کو کہتے ہیں جس نے خود کو عربوں میں داخل کر لیا ہو۔ نبطیوں کا یہ نام

---

[1] صحيح البخاري: 2255.

اس لیے ہے کیونکہ یہ لفظ استنباط (زمین کھود کر پانی نکالنے) سے مشتق ہے۔ کیونکہ یہ قوم پانیوں کی تلاش اور کنویں کھود کر اس کو نکالنے کی ماہر تھی، اس لیے نبطی کہلائے۔ یہ لوگ زیادہ تر شام میں آباد تھے۔

فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالزَّبِيبِ وَالزَّيْتِ: زیتون شام میں کثرت سے ملتا تھا۔ یہاں چار چیزوں میں بیع سلم کے کرنے کا ذکر ہے۔

إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى: یہ بیع سلم کے جواز کی شروط اولین میں سے ہے۔

مَا كُنَّا نَسْأَلُهُمْ عَنْ ذَلِكَ: معلوم ہوا کہ عین عقدِ سلم کرتے وقت یہ بات شرط نہیں مسلَّم فیہ پر مسلم الیہ کی قدرت ہے یا نہیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اموالِ غنیمت اس امت کے لیے حلال ہیں جس کی دلیل "كُنَّا نُصِيبُ الْمَغَانِمَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ" کے الفاظ ہیں۔
- عقدِ سلم دوسرے شہر کے آدمی کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے اور اسے مال کا ضیاع یا اس کے حق میں کوتاہی باور نہ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شامی نبطیوں کے ساتھ عقدِ سلم کرنا ہے۔
- مذکورہ چاروں چیزوں میں عقدِ سلم کر سکتے ہیں اور ان میں اس عقد کی معروف شروط کا لحاظ واجب ہوگا جیسے موت کا مقرر ہونا۔
- پھلوں، غلوں اور میووں کے اترنے اور ان کے حصول سے قبل بھی ان میں عقدِ سلم جائز ہے۔
- کسی شے کا سوال نہ کرنا اس شے کے شرط نہ ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر وہ شے شرط ہوتی تو اس کی بابت سوال واجب ہوتا۔

بیع سلم میں مسلم فیہ کی ادائیگی کی نیت شرط ہے

845- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ أَدَاءَ هَا أَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ، وَمَنْ أَخَذَهَا يُرِيْدُ إِتْلَافَهَا أَتْلَفَهُ اللّٰهُ تَعَالَى)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے لوگوں کا مال لیا جبکہ وہ اس کو ادا (بھی) کرنا چاہتا ہے تو (اگر وہ کسی وجہ سے اس مال کو ادا کرنے پر قادر نہ رہا تو) اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے (دنیا میں یا آخرت میں) اس مال کو ادا کرے گا اور جس نے لوگوں کا مال لیا جبکہ وہ اس کو ضائع کرنا چاہتا ہے تو رب تعالیٰ اس کو ضائع کرے گا۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

مناسبت حدیث:...... امام موصوف رحمہ اللہ مذکورہ حدیث کو اس مقام پر اس مناسبت سے لائے ہیں کہ مسلم الیہ بھی لوگوں سے ان کے مال لیتا ہے اور ان کے عوض میں مبیع یا ثمن کو ایک مقررہ مدت کے بعد ادا کرتا ہے۔ اب کبھی وہ دھوکا دینے کی نیت سے بھی لوگوں کا مال لے لیتا ہے۔ تب پھر اس حدیث کی مذکورہ باب سے مناسبت واضح ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2387.

غریب الحدیث :......مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ: مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے اس لیے یہ جملہ شرطیہ ہے۔ لوگوں سے یہ مال لینا قرض، امانت رہن اور مبیع کے ثمن وغیرہ کی صورتوں کو شامل ہے۔ غرض جب آدمی نے کسی بھی وجہ سے دوسرے کا مال لے لیا تو اسے یہ بات حلال نہیں کہ وہ اس رقم کو دبا جائے۔ اب اگر تو اس کی نیت دینے کی تھی اور کسی وجہ سے وہ دینے سے قاصر ہو گیا تو رب تعالیٰ اس رقم کو اس کی طرف سے ادا کرنے کا غیبی سبب پیدا فرما دے گا یا پھر آخرت میں اس کی طرف سے یہ رقم دے کر اس بندے کو دوسرے کے حق سے بری فرما دے گا اور اگر اس کی نیت اس مال کو ضائع کرنے کی تھی تو رب تعالیٰ اس کو ضائع فرما دے گا۔

نبی کریم ﷺ نے یہاں جائے اتلاف اور وقت اتلاف کا ذکر نہیں فرمایا اور یہ بھی نہیں بتلایا کہ یہ اتلاف دنیا میں ہوگا یا آخرت میں۔ غرض اس تعیین کا ترک اس مسئلہ کی سنگینی کو اور زیادہ واضح کرتا ہے۔

أَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ: مذکورہ جملہ جزائیہ ہے اور یہی ترکیب اگلے دونوں جملوں میں بھی ہے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کا لیا مال ان کو لوٹانا واجب ہے۔ چاہے اس مال کو یا اس کے بدل کو، لہٰذا جس کی نیت درست ہوگی اس کے لیے یہ امر من جانب اللہ سہل ہوگا اور جس کی نیت دوسری ہوگی تو وہ دنیا میں یا آخرت میں رب تعالیٰ کی گرفت سے نہ بچ سکے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ معلوم ہوا کہ بندہ کے لیے ارادہ ثابت ہے جس کی دلیل یہ ارشادِ نبوی ہے: "يُرِيدُ أَدَاءَهَا" اور اس میں مشہور بدعتی فرقہ جبریہ کا رد ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کے لیے نہ تو ارادہ ثابت ہے اور نہ اختیار۔ پس بندہ بغیر اختیار کے مجبورِ محض ہو کر اپنا فعل کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ قول دین میں ضلالت اور گمراہی ہے اور یہ قول خلافِ واقع بھی ہے۔
- ◈ نیت کا معاملہ بے حد بلند ہے۔ یہ نیت ہی ہے جو آدمی کی نجات یا ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔
- ◈ جو ادا کی نیت سے کسی کا مال لیتا ہے تو رب تعالیٰ اس مال کے ادا کرنے میں اس کا مددگار بھی بنتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ دنیا میں اس کو ادا نہ کر سکے تو رب تعالیٰ آخرت میں اپنی جناب سے اس کو ادا کر کے اس بندہ کو مال کے مطالبہ سے بری فرما دے گا۔
- ◈ رب تعالیٰ کے لیے افعالِ اختیاریہ ثابت ہیں۔ ◈ نیک نیت آدمی پر رب تعالیٰ کا بے حد کرم و احسان ہوتا ہے۔
- ◈ نیک نیتی اپنانے کی ترغیب۔ ◈ معاملات میں بد نیتی کی ترہیب و تحذیر۔
- ◈ بد نیتی بندے کو دنیا و آخرت میں لے ڈوبتی ہے۔

بیع سلم کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے

846۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: ((قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، إِنَّ فُلَانًا قَدِمَ لَهُ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ، فَلَوْ بَعَثْتَ إِلَيْهِ، فَأَخَذْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ نَسِيئَةً إِلَى مَيْسَرَةٍ، فَبَعَثَ إِلَيْهِ، فَامْتَنَعَ)).

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! فلاں صاحب (دیارِ غیر سے) آئے ہیں ان کے پاس شام کا کپڑا ہے۔ اگر آپ ﷺ ان کے پاس قاصد بھیجتے اور ان سے دو کپڑے سہولت ہو جانے تک ادھار لے لیتے (تو بہتر تھا)۔ اس پر آپ ﷺ نے ان کے پاس پیغام بھیجا، پر

انہوں نے (کپڑا ادھار دینے سے) احتراز کیا۔ ❶

أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ وَالْبَيْهَقِيُّ ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ . اس حدیث کو امام حاکم اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث :......إِنَّ فُلَاناً: ممکن ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان صاحب کا نام ذکر کیا ہو، مگر بعد کے رواۃ نے ان کے نام کو چھپاتے ہوئے ان کے نام کے ذکر سے گریز کیا ہو اور احتمال یہ بھی ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو ان صاحب کا نام لیا ہو پر حدیث روایت کرتے وقت ان صاحب کا نام نہ لیا ہو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو ان صاحب کا نام لینا ضروری تھا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو جاتا کہ شام سے کپڑا لانے والے وہ صاحب کون ہیں۔

لَـهُ بَـزٌّ: بز ایک خاص قسم کا کپڑا۔ مِـنَ الشَّـامِ: کیونکہ شام اس وقت تجارت کا ایک عظیم مرکز تھا۔ دوسرے شام جزیرۂ عرب کے بہت قریب بھی تھا۔ چنانچہ عرب سال میں دو بار تجارت کی غرض سے ملک شام آتے جاتے تھے۔

فَلَوْ بَعَثْتَ: یعنی کسی شخص کو اس شامی کے پاس بھیج دیتے جو اس سے ادھار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو کپڑے لے لیتا۔ جس کی قیمت بعد میں سہولت ہو جانے پر ادا کر دی جاتی۔

فَـامْتَنَعَ: ممکن ہے کہ اس قاصد نے یہ بتلایا ہی نہ ہو کہ وہ قاصدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ وکالت میں وکیل کے لیے موکل کا نام لینا شرط نہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے اس شامی کو بتلا دیا ہو کہ وہ قاصدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ لیکن بہر حال اس شامی تاجر نے ادھار پر کپڑے دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ تاجر اپنا مال نقد بیچنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اس سے حاصل ہونے والی رقم سے دوبارہ سامانِ تجارت خرید کر ایک اور تجارتی سفر کر سکیں۔ دوسرے یہ امر بھی مجہول ہے کہ جانے خدا کب سہولت دے۔ اس لیے بھی اس تاجر نے ادھار پر کپڑے دینے سے انکار کر دیا ہو۔

مضمون حدیث :......مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ جہاں ادھار مبیع پر معاملہ کیا جا سکتا ہے وہیں ادھار ثمن پر بھی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔

اور دوسری بات یہ مذکور ہے کہ بائع کو اختیار ہے کہ وہ ادھار پر مال دے یا نہ دے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت زاہدانہ اور فقر و تنگدستی کی زندگی گزارتے تھے۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کے ساتھ بے حد متواضع تھے اسی لیے تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہایت بے تکلفی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادھار کپڑے لے لینے کا مشورہ دیا تھا۔
- کسی شرعی غرض کے لیے کسی معین شخص کا نام مخفی کر کے اشارہ کنایہ سے بھی اس کا ذکر کرنا جائز ہے۔
- معلوم ہوا کہ ضرورت سے زائد ایک یا دو کپڑے خرید کر پاس رکھے جا سکتے ہیں۔

---

❶ المستدرك للحاكم: 28/2۔ سنن البيهقي: 25/6۔ جامع الترمذي: 1213۔ مسند احمد: 147/6۔ سنن النسائي: 294/7۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث امام بخاری کی شرط پر ہے۔ اس حدیث کو امام عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے "الزھد، ص: ١٦" پر اپنی زیادات میں بھی روایت کیا ہے۔ جبکہ امام اسحاق بن راھویہ (264/3) نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

◈ اور یہ بھی جائز ہے کہ سر دست اگر قیمت نہ بھی ہو تو بھی ادھار لینا جائز ہے۔البتہ یہ امر دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔

(1) آدمی کو کوئی ایسی ضرورت لاحق ہو جو اسے ادھار اور قرض لینے پر مجبور کر دے۔

(2) دوسرے یہ کہ اس بات کی پوری امید ہو کہ آدمی وہ قرض یا ادھار مستقبل قریب میں چکا بھی دے گا۔

لہٰذا اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو قرض یا ادھار لینا جائز نہ ہوگا کیونکہ قرض اصل میں ذلت ہے۔جس سے جتنا بھی گریز کیا جائے کم ہے۔یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اکثر لوگوں کی ضروریات و حاجات سن کر انہیں قرض لے لینے کی اجازت یا ترغیب نہ دیا کرتے تھے بلکہ انہیں کسب و تجارت یا محنت مزدوری کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

◈ آسودگی ہو جانے تک کسی کو مہلت دینا جائز ہے۔جس کی دلیل "إِلَى مَيْسَرَةٍ" کے الفاظ ہیں اور یہ جواز اس نص کی وجہ سے ہے کیونکہ عاقد کو دوسرے فریق کے احوال کا علم ہوتا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ قوم کے معزز، سربر آوردہ شخصیت اور بڑے سے لین دین نہ کرنے کی بھی اجازت ہے۔جیسا کہ اس شامی تاجر نے فخر موجودات حضرت رسالت مآب ﷺ کے ساتھ ادھار پر معاملہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

◈ لوگوں کو ان کے مزاجوں اور طبیعتوں پر چھوڑ دیا جائے۔چنانچہ جب اس شامی تاجر نے ادھار پر معاملہ کرنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے اس کی ہرگز بھی سرزنش نہ فرمائی اور نہ اس پر کوئی عتاب ہی فرمایا بلکہ اسے اس کی طبیعت کے حوالے کر دیا جو ادھار پر عقد کرنے پر آمادہ نہ تھی۔پس لوگ اپنے معاملات، لین دین، بیع و شراء اور نکاح و ازدواج میں آزاد ہیں۔

◈ اس حدیث کو مذکورہ باب کے تحت لانے کی مناسبت عقد سلم سے اس کی ادنیٰ مشابہت ہے کہ عقدِ سلم میں مثمن ادھار ہوتا ہے جبکہ اس حدیث میں ثمن کے ادھار ہونے کا ذکر ہے۔

رہن کا بیان

847- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((الظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا، وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا، وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سواری جب رہن ہو تو اس پر کیے جانے والے (گھاس چارہ کے) خرچ کے عوض اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور (دودھ دینے والا) چوپایہ جب وہ رہن ہو تو اس پر کیے جانے والے خرچ کے عوض اس کا دودھ پیا جا سکتا ہے، جبکہ وہ آدمی جو (رہن میں رکھے چوپائے پر خرچ کرنے سے قبل اس پر) سوار ہوتا ہے یا (اس کا) دودھ پیتا ہے اس کے ذمہ (اس جانور کا) خرچ ہوگا۔'' [1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**الظَّهْرُ**: مراد حیوان کی پیٹھ یعنی سواری کا جانور ہے۔جیسے گدھا، خچر، گھوڑا، اونٹ وغیرہ۔

[1] صحيح البخاري: 2512.

يُرْكَبُ: یہ فعل مجہول ہے۔لہٰذا راکب یہاں ''مرتہن' ہوگا جس کے پاس وہ سواری رہن رکھی ہوگی۔
بِنَفَقَتِهِ: مذکورہ "با" عوض کے لیے ہے، مراد مقدارِ نفقہ کے بقدر سواری کرنے کا استحقاق ہے۔لہٰذا جس قدر جس نے سواری کو کھلایا پلایا ہوگا اسی قدر وہ اس پر سواری کرنے کا حق رکھتا ہوگا۔
إِذَا كَانَ مَرْهُونًا: یہ مسئلہ اس جانور کا ہے جس کو رہن رکھا گیا ہو۔
لَبَنُ الدَّرِّ: "الدَّرِّ" سے مراد وہ چوپایہ ہے جو دودھ دیتا ہو اور اسے رہن رکھا گیا ہو اور دودھ دینے والے جانور کو "الدَّرِّ" اس لیے کہا کیونکہ اس کا دودھ دوہا جاتا ہے۔
يُشْرَبُ: یہ بھی مجہول فعل ہے اور شارب یہاں مرتہن ہے۔
بِنَفَقَتِهِ: اس کی تفصیل حسب سابق ہے۔
وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ: یہ دونوں فعل معروف ہیں اور ان کا فاعل یہاں مرتہن ہے اور ترکیب کے اعتبار سے یہ خبر مقدم ہے۔چنانچہ "يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ" یہ "الَّذِي" اسم موصول کا صلہ ہوں گے جبکہ یہ موصول صلہ "عَلَى" حرف جر کا مجرور ہوں گے اور یہ دونوں جار مجرور خبر مقدم ہوں گے جبکہ "النَّفَقَةُ" یہ مبتدا مؤخر ہوگا۔
یاد رہے کہ اگرچہ یہ جملہ ترکیبی اعتبار سے خبر یہ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے حکم ہے۔
مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو مسائل ذکر کیے گئے ہیں:
(1) ایک یہ کہ اگر کسی نے رہن میں رکھے چوپائے کو گھاس دانہ ڈالا اور کھلایا پلایا، تو گھاس چارہ پر اٹھنے والے خرچ کے بقدر وہ اس جانور سے استفادہ کرسکتا ہے۔چنانچہ اگر وہ جانور سواری کے لائق ہے تو حسب دستور وعرف اس پر سواری کرسکتا ہے اور اگر وہ جانور دودھ دینے والا ہے تو حسب دستور اس کا دودھ پی سکتا ہے۔
(2) دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس مرہون جانور سے استفادہ کرنے میں پہل اس نے کی، جیسے اس کی سواری کرلی یا اس کا دودھ پی لیا تو اب اس جانور پر استفادہ کے بقدر خرچ کرنا بھی اس کے ذمہ ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حیوان کو رہن میں دے سکتے ہیں۔اس کی دلیل "يُرْكَبُ"، "يُشْرَبُ" اور "بِنَفَقَتِهِ" وغیرہ کے الفاظ ہیں۔
◈ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ مرتہن مرہون شے پر قبضہ کرے گا۔اس کی دلیل بھی "يُرْكَبُ" اور "يُشْرَبُ" وغیرہ کے الفاظ ہیں، کیونکہ یہاں راکب وشارب مرتہن ہے، تب پھر مرتہن کا مرہون پر قبضہ لازم ہوگا کہ قبضہ ہوگا تو رکوب اور شرب بھی متحقق ہوگا۔
لیکن رہن کے مقبوض ہونے کی بابت علماء میں اس بات کا اختلاف ہے کہ یہ عقدِ رہن کی شرط لازم ہے یا شرطِ کمال؟
تو اس بابت راجح قول یہ ہے کہ عقدِ رہن میں مرہون پر مرتہن کا قبضہ شرط نہیں۔لہٰذا یہ آیت کریمہ:
﴿وَ إِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ (البقرۃ: 283)
''اور اگر تم کسی سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو ایسی گروی لازم ہے جو قبضے میں لے لی گئی ہو۔''
رہن کے مقبوض ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔البتہ صرف خیانت کے اندیشہ کے وقت اس کا لزوم ثابت ہے جس کی دلیل

اسی آیت کا اگلا یہ حصہ ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ﴾ (البقرة: 283)

''پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ادا کرے۔''

آیت کا یہ حصہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو رہن پر قبضہ کی ضرورت نہیں اور رہی یہ مذکورہ حدیث تو اس میں قبضہ کے لازم ہونے کا **مطلق** ذکر نہیں بلکہ اس میں واقع کا بیان ہے کہ اگر کسی کے پاس رہن میں جانور رکھا ہو اور وہ اس پر خرچ کرے تو وہ اس پر خرچ کے بقدر سواری بھی کرسکتا ہے۔

◈ شریعت اسلامیہ نے جانوروں کے حقوق کی بھی بے حد رعایت فرمائی ہے۔لہٰذا جانور جس کے پاس بھی ہو وہ اس کے گھاس چارہ اور دانہ پانی کا خیال رکھے۔اس کی دلیل "بِنَفَقَتِهِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ دوسرے کے مال کی مصلحت، درستی اور بقا کے لیے اس میں تصرف جائز ہے۔

◈ مرتہن رہن پر سواری بھی کرسکتا ہے اور اس کا دودھ دوہ کر پی بھی سکتا ہے۔ چاہے وہ دوسرے کی ملک ہی ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ غیر کے مال میں تصرف ہے لیکن یہ تصرف اس مال کی مصلحت کے لیے ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا اس کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے تو راجح قول یہ ہے کہ اس باب میں مالک کی اجازت لینا لازم نہیں۔

◈ مرہون جانور سے سواری یا شرب لبن کا استفادہ اس پر کیے جانے والے نفقہ سے زائد نہ ہوگا۔ چنانچہ جتنا خرچ کرے گا عرف کے مطابق اتنی ہی اس پر سواری بھی کرے گا۔

◈ شرع شریف کی لوگوں کے اموال کی طرف بے حد توجہ ہے۔لہٰذا وہ اُن کو ضائع ہونے سے بچاتی ہے۔ چنانچہ شریعت نے مرہون کو یوں ہی بے کار نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس سے استفادہ کا حکم دیا ہے تاکہ وہ پڑی پڑی ضائع نہ ہو جائے۔

علماء نے اس بارے ضابطہ یہ ذکر کیا ہے کہ رہن کو بے کار چھوڑنا درست نہیں اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ رہن کو معطل چھوڑ دینے میں اس کی مصلحت ومنفعت کا ضیاع ہے۔لہٰذا اگر رہن قابل انتفاع تھا جب کہ مرتہن نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہوا تو اس سے انتفاع واجب ہوگا پس یا تو راہن کے کھاتے سے اسے کرایہ پر دیا جائے گا یا راہن خود اس سے مستفید ہوگا یا پھر مرتہن ہی مستفید ہوگا۔

رہن کو ضبط کر لینے کا حکم

848۔ وَعَنْهُ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهَنَهُ، لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رہن اپنے مالک سے جس نے اسے (مرتہن کے پاس) رہن رکھا ہے ضبط نہ ہوگا، اس کا نفع مالک کا ہوگا اور اس کی چٹی بھی اسی پر ہوگی۔'' [1]

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ،

اس حدیث کو امام دارقطنی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے اور اس

[1] سنن الدار قطني: 32/3- المستدرك للحاكم: 58/2- امام دارقطنی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے ابن عبدالبر (438/6) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور عبدالحق نے اپنی کتاب "الاحکام" میں ابن عبدالبر کے قول کی متابعت کی ہے جیسا کہ "نصب الراية: 320/4" میں ہے۔ دیکھیں "المراسیل لابی داؤد: 187,186."

إِلَّا أَنَّ الْمَحْفُوظَ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ إِرْسَالُهُ. کے رجال ثقہ ہیں البتہ امام ابوداؤد وغیرہ کے نزدیک اس حدیث کا مرسل ہونا ''محفوظ'' ہے۔

غریب الحدیث :......غلقِ رہن: ...... یہ رہن رکھی چیز کے ضبط ہو جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی جب رہن رکھنے والا مقررہ مدت میں اپنا رہن نہ چھڑا سکے تو وہ رہن کی واپسی کے حق سے محروم ہو جاتا ہے، اس کو زمانۂ جاہلیت میں غلقِ رہن کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ صورت زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی، اسلام نے آ کر اس جاہلی رسم کو ختم کر دیا۔ ❶

غلق لغت میں آدمی کے اور کسی شے کے درمیان حائل ہو جانے کو کہتے ہیں۔ إغلاق الباب کی اصطلاح اسی سے ہے کیونکہ دروازہ بند کر دینے سے آدمی گھر کے اندر کے اور باہر کے لوگوں کے درمیان ایک آڑ کھڑی کر دیتا ہے۔ تب پھر ''لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ'' کا مطلب یہ ہوگا کہ رہن والے کو اس کے رہن تک پہنچنے سے روکا نہ جائے۔

غلقِ رہن کی صورتیں

اس کی دو صورتیں ہیں:

(1) ایک یہ کہ مرتھن رہن کو اپنے استعمال میں لا کر اس کی اجرت کو کھائے اور اس سے منتفع ہو، پر راہن کو اس نفع میں سے کچھ بھی نہ دے۔ یہ طریق دورِ جاہلیت میں رائج تھا جبکہ رہن کے منافع بلاشبہ، راہن کے ہوتے ہیں۔

(2) اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ عقدِ رہن کی مدت پوری ہونے پر مرتہن قرض کی رقم نہ ملنے پر رہن کا مالک بن بیٹھے۔

بلاشبہ غلقِ رہن کی یہ دونوں صورتیں باطل ہیں کیونکہ بظاہر یہ جملہ خبریہ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے نہی ہے۔ لیکن اگر مرتہن خود اس بات کو شرط کر لے کہ مدت پوری ہونے پر اگر میں قرض نہ دے سکا تو مرتہن کو اختیار ہوگا کہ وہ اس رہن کو عوض میں رکھ لے۔ علماء کا اس صورت کے جواز میں اختلاف ہے۔

بعض نے مذکورہ حدیث کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے اس صورت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ لیکن درست قول یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ❷ اور امام احمد رحمہ اللہ سے مروی دوسری روایت یہی ہے کیونکہ ایک روایت میں مسلمانوں کی شرطوں کے پورا کرنے کا حکم ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث کے مضمون کو غریب الحدیث کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- دوسرے کی رضا کے بغیر اس کا مال لے لینا جائز نہیں۔
- معلوم ہوا کہ عقدِ رہن مرہون کی ملک کو مالک سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں کرتا۔
- غلق رہن کی دو صورتیں حرام ہیں جبکہ تیسری صورت جائز ہے جیسا کہ بیان ہوا۔
- اس حدیث میں اس مشہور قاعدہ کا بیان ہے کہ وہی نفع اٹھائے گا جو چٹی بھرے گا۔ ❸ تب پھر اگر راہن رہن کی چٹی اٹھاتا ہے تو اس کا نفع بھی اسے ملے گا۔

---

❶ القاموس الوحيد، ص: 1178. (نسيم)

❷ المغنى لابن قدامة: 4/ 21.

❸ الاشباه والنظائر للسيوطى، ص: 136.

قرض کو عمدہ طریق سے ادا کرنے کی ترغیب

849- وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَسْلَفَ مِنْ رَجُلٍ بَكْرًا ، فَقَدِمَتْ عَلَيْهِ إِبِلٌ مِنْ إِبِلِ الصَّدَقَةِ ، فَأَمَرَ أَبَا رَافِعٍ أَنْ يَقْضِيَ الرَّجُلَ بَكْرَهُ ، فَقَالَ : لَا أَجِدُ إِلَّا خِيَارًا رَبَاعِيًا، فَقَالَ: ((أَعْطِهِ إِيَّاهُ . فَإِنَّ خِيَارَ النَّاسِ أَحْسَنُهُمْ قَضَاءً)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ایک صاحب سے ایک جوان اونٹ قرض لیا۔ اسی دوران آپ ﷺ کے پاس صدقہ کے اونٹ آئے تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ ان صاحب کو ان کا اونٹ واپس کر دیں۔ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ مجھے (صدقہ کے اونٹوں سے) صرف عمدہ اونٹ ہی مل رہا ہے (جو لیے اونٹ سے عمدہ ہے)۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان صاحب کو وہی (عمدہ) اونٹ ہی دے دو، بے شک لوگوں میں سب سے بہتر وہی ہے جو (قرض وغیرہ) ادا کرنے میں سب سے بہتر ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... اِسْتَسْلَفَ: یعنی قرض میں لیا۔ کیونکہ سلف کے لفظ کا اطلاق جہاں سَلَم پر ہوتا ہے، وہیں قرض پر بھی ہوتا ہے۔

بَكْرًا: یہ جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔

مِنْ إِبِلِ الصَّدَقَةِ: مراد زکوٰۃ کے اونٹ ہیں۔

يَقْضِيَ الرَّجُلَ: یعنی اس آدمی کے قرض لیے اونٹ کو اسے ادا کر دیا جائے۔

بَكْرَهُ: مراد وہی لیا اونٹ نہیں بلکہ لیے اونٹ کے بدلے اس جیسا اونٹ دے دیا جائے۔

خِيَارًا رُبَاعِيًا: مراد عمدہ اونٹ ہے۔ اب اونٹ میں رباعی ساتویں سال میں لگے اونٹ کو، گائیوں میں پانچویں سال میں لگی گائے کو اور بھیڑ بکریوں میں چوتھے سال میں لگی بھیڑ بکری کو کہتے ہیں۔

خِيَارَ النَّاسِ: مراد اپنے ذمہ واجب حقوق کو ادا کرنے والے لوگ ہیں کہ ان میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنے ذمے واجب حق کو اچھے طریق سے ادا کرتے ہیں۔ غرض یہاں مطلق اچھے لوگ مراد نہیں بلکہ ذمہ میں واجب حقوق کو اچھے طریق سے ادا کرنے والے لوگ مراد ہیں۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے ذمہ واجب کو اچھے طریق سے ادا کیا جائے جس کی متعدد صورتیں ہیں جیسے:

(1) اپنے ذمہ دین کو بروقت ادا کیا جائے۔ (2) لیے ہوئے سے بہتر لوٹایا جائے۔ وغیرہ

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ تنگدستی والی تھی، اِسی لیے آپ ﷺ کو بسا اوقات اپنی

---

[1] صحیح مسلم: 1600.

ضروریات وحوائج کے لیے قرض بھی لینا پڑتا تھا۔

- قرض میں جانور کو بھی لینا جائز ہے۔اسی طرح دوسروں سے گاڑیاں بھی قرض میں لے سکتے ہیں۔
- قرض وغیرہ کے ادا کرنے کے لیے دوسرے کو وکیل بنا سکتے ہیں۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کو قرض لوٹانے کا وکیل بنایا تھا۔البتہ قرض لینے میں دوسرے کو وکیل بنانا درست نہیں۔ یہ جواز صرف ادائے قرض میں وکیل بنانے کا ہے۔
- وکیل کے ذمہ جس قدر کام لگایا جائے وہ اتنے کام کے کرنے کا ہی پابند ہوتا ہے۔البتہ اگر وہ ذمہ لگے کام سے زیادہ کرنا چاہتا ہے تو ایسا موکل سے مراجعت کرنے کے بعد ہی کرے گا۔جیسا کہ یہاں حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے مراجعت کے بعد زیادہ بہتر اونٹ دیا۔
- قرض میں لیے سے زیادہ دینا جائز ہے۔
- مثلیت حیوان میں جاری ہوگی۔لہٰذا حیوان کا ضمان مثل سے دیا جائے گا نہ کہ قیمت سے۔
- حسن قضاء کی بے حد فضیلت ہے۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم تھی کہ آپ ﷺ حکم کی علت ساتھ ہی بیان فرما دیا کرتے تھے۔
- معلوم ہوا کہ لوگوں کے اخلاق باہم متفاضل ہوتے ہیں۔جس کی دلیل "فَإِنَّ خِيَارَ النَّاسِ" کے الفاظ ہیں۔
- عقود انہی باتوں پر منعقد ہوتے ہیں جن پر وہ دلالت کر رہے ہوتے ہیں۔اُس کی دلیل "أَعْطِهِ إِيَّاهُ" کے الفاظ ہیں کیونکہ عطا میں وفا کے معنی سے زیادہ وسعت ہے۔کیونکہ عطا ہدیہ کے معنی کو بھی شامل ہے۔لیکن یہاں قرینہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں عطاء سے مراد وفا ہے۔جس سے معلوم ہوا کہ عقود انہی باتوں پر دلالت کرتے ہیں جن پر وہ منعقد ہوتے ہیں،اور یہی قول راجح ہے۔
- معلوم ہوا کہ والی، حاکم، خلیفہ وغیرہ جو بیت المسلمین کا نگران ہوتا ہے، وہ قرض لے سکتا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ذمہ میں واجب اونٹ کو زکوٰۃ کی مد کے مال سے لے کر ادا کیا تھا اور یہ بات معروف ہے کہ نبی کریم ﷺ پر صدقہ اور زکوٰۃ حرام تھا۔لہٰذا آپ ﷺ نے یہ اونٹ لازماً قرض کے طور پر لیا ہوگا۔وگرنہ تو اس اونٹ کے لینے کا آپ ﷺ کے لیے جواز نہ تھا۔

نفع کے ساتھ قرض واپس لینا سود ہے

850، 852۔ وَعَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا)).

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہر وہ قرض جو (اپنے ساتھ) کسی قسم کا نفع کھینچ لائے وہ سود ہے۔''[1]

رَوَاهُ الْحَارِثُ بْنُ اَبِيْ اُسَامَةَ، وَاِسْنَادُهُ

اس حدیث کو حارث بن ابی اسامہ نے روایت کیا ہے، اور اس کی

---

[1] مسند الحارث: 437۔ زوائد۔ اس حدیث کی سند میں سوار بن مصعب ہے جو ضعیف ہے۔امام موصوف "التمییز" میں فرماتے ہیں: اس کی سند ساقط ہے جبکہ یہ حدیث زبانِ زدخلائق ہے۔دیکھیں: "کشف الخفاء: 164/2.

سَاقِطٌ. — اسناد ساقط ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيفٌ عَنْ فُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ ﷺ عِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ. — اور "سنن البيهقی" میں حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث اس کا شاہد ہے جو ضعیف ہے۔ [1]

وَآخَرُ هُوَ مَوْقُوفٌ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ سَلَامٍ ﷺ عِنْدَ الْبُخَارِيِّ. — جبکہ "صحیح البخاری" میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی اس کا ایک اور شاہد بھی ہے جو موقوف ہے۔ [2]

سود کا شرعی حکم

شرح :......سود حرام ہے جو سب کو معلوم ہے۔ قرض کی تعریف بھی بیان ہو چکی ہے۔ اب وہ قرض جو قرض دہندہ کو نفع دلائے وہ سود ہے۔ لیکن سود کا یہ حکم قرض دہندہ کے لیے ہے نہ کہ قرض لینے والے کے لیے۔ کیونکہ لینے والے کو تو قرض بہر صورت نفع ہی دیتا ہے کہ قرض اس کی وقتی ضرورت و حاجت کو پورا کرتا ہے۔

قرض کی شرعی صورت اور اس میں سود کے امکان کا بیان

روایت الحدیث :...... یہ حدیث ضعیف ہے اور نبی کریم ﷺ سے یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس کی اسناد ساقط ہے۔ اب اس کی مرفوع روایت تو ضعیف ہے جبکہ موقوف روایت قولِ صحابی رضی اللہ عنہ ہے۔ تب پھر اس حدیث سے حجت قائم نہیں ہوتی البتہ دیگر قواعد عامہ شرعیہ سے اس حدیث کا حکم ثابت ہے۔ وہ یوں کہ قرض دینا ایک نیکی ہے جس سے رب تعالیٰ کی رضا مقصود ہوتی ہے اور یہ قرض لینے والے پر ایک احسان ہوتا ہے۔ اسی لیے سو روپے ادھار لے کر ان کو ایک ماہ بعد لوٹانا جائز ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہی معاملہ معاوضہ یا بیع کے طریق پر ہو تو حرام ہوگا کیونکہ یہ ربائے نسیئہ کی صورت بنتی ہے جو بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن قرض کے معاملہ میں اس صورت کی رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ اس میں ضرورت مند کی حاجت روائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قرض دینے والے نے اس معاملہ سے کسی قسم کا نفع اٹھانا چاہا تو یہ امر رخصت کے خلاف ہونے کی وجہ سے حرام ٹھہرے گا کیونکہ اب قرض دینے سے مقصود دوسرے پر احسان نہ رہے گا بلکہ نفع اٹھانا ہوگا اور یہ معاملہ شرعی رخصت کے مقصود کے خلاف ہونے کی وجہ سے اپنے اصلی حکم یعنی سود کی طرف لوٹ جائے گا۔ جیسے کسی نے دوسرے کو ایک ہزار روپیہ اس شرط پر قرض دیا کہ وہ ایک دن کے لیے اسے اپنی گاڑی استعمال کرنے دے گا تو یہ معاملہ "معاوضہ" ٹھہرے گا اور گویا کہ اس نے ایک ہزار روپے کو ایک ہزار اور دن بھر کے گاڑی کے استعمال کے بدلے بیچا ہے۔ جس کے سود ہونے میں کوئی شک نہیں۔ غرض اگرچہ یہ حدیث روایتی اعتبار سے صحیح نہیں لیکن درایتی اعتبار سے دیگر قواعد عامہ شرعیہ کے موافق ہونے کی وجہ سے صحیح ہے لہٰذا یہ حدیث حجت ٹھہرے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نفع پر قرض دینا سود اور حرام ہے۔
- نفع کی صورت جو بھی ہو یہ مطلق اور عام ہے۔ لہٰذا یہ بدنی، مالی، عینی وغیرہ نفع کی سب صورتوں کو شامل ہوگا۔ کیونکہ جب قرض کے بالمقابل مالی نفع اٹھانا منع ہے تو عین سے نفع اٹھانا بدرجہ اولیٰ منع اور حرام ہوگا۔
- نفع چاہے جتنا بھی قلیل اور کم ہو حرمت کا حکم اس کو بھی شامل ہوگا۔

---

[1] سنن البیهقی: 350/5۔ موقوفاً علی فضالة ﷺ.

[2] صحیح البخاری: 3814.

◈ البتہ قرض کے ساتھ نفع کی دوصورتیں نہی کے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں:

(1) ایک وہ نفع جو عین ادائے قرض کے وقت حاصل ہو، اور

(2) ایک وہ نفع جو ادائے قرض کے بعد حاصل ہو۔

◈ اور وہ نفع جو قرض کا معاملہ طے کرتے وقت شرط کرلیا جائے چاہے اسے قرض ادا کرتے وقت دینا شرط ہو اور وہ نفع جو قرض ادا کرنے سے قبل اٹھایا جائے چاہے اس کو شرط نہ بھی کیا جائے، کہ قرض کے ساتھ نفع اٹھانے کی یہ دوصورتیں منع اور حرام ہیں اور یہ سود کے حکم میں داخل ہیں۔

6۔ بَابُ التَّفْلِيْسِ وَالْحَجَرِ

مفلس قرار دیے جانے اور بندش لگائے جانے کا بیان

تمہید: تفلیس کا لغوی معنی:...... یہ ''فلس'' سے باب تفعیل کا صیغہ ہے۔ یہ تنگدست اور محتاج وفقیر ہوجانے کو کہتے ہیں کیونکہ محتاج اور فقیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس ''فلوس'' (پیسے اور روپے) نہیں ہوتے۔ لہٰذا ''مفلس'' خالی ہاتھ کو کہیں گے۔

تفلیس کا اصطلاحی معنی

یہ اس شخص کے مفلس قرار دیے جانے کے حکم کو کہتے ہیں جس پر قاضی مفلس ہونے کا حکم لگادے یعنی جب قاضی کسی کے بارے میں اس بات کا حکم جاری کردے کہ وہ مفلس ہے تو اس کو ''تفلیس'' کہا جائے گا۔

حجر کا لغوی اور اصطلاحی معنی

لغت میں حجر روکنے اور منع کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں کسی کو اپنی اشیائے مملوکہ میں تصرف کرنے سے روکنے کا نام ''حجر'' ہے۔

حجر کی اقسام

اس کی دوقسمیں ہیں:

(1) ایک وہ حجر اور بندش ہے جو غیر کی مصلحت کے لیے ہو۔

(2) اور ایک وہ حجر اور بندش ہے جو خود مجور علیہ کی مصلحت کے لیے ہو۔

حجر کی وجوہات

کسی پر بندش لگانے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہوتی ہیں:

(1) عقل کی ناپختگی (2) کم سنی (3) اور دیوانگی

اب اگر تو بندش ان مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر ہو تو اس کو مجور علیہ (جس پر بندش لگائی گئی ہے، اس) کی مصلحت کے پیش نظر بندش کہیں گے اور اگر یہ بندش اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کے پیش نظر لگائی گئی ہے تو اس کو دوسروں کی مصلحت کے پیش نظر لگائی جانے والی بندش کہیں گے۔

مندرجہ بالا مذکورہ حجر کی اقسام کے اعتبار سے حجر کی چند انواع یہ ہیں:

(1) جیسے راہن کو رہن میں تصرف سے روکنا کہ یہ غیر کی مصلحت کے پیش نظر بندش ہے اور اس میں مرتھن کی مصلحت ملحوظ ہے۔

(2) مقروض کو قرض خواہوں کی مصلحت کے لیے تصرف سے روکنا۔

(3) کسی کو نادان یا کم سن ہونے کی وجہ سے روکنا۔

مذکورہ باب میں امام موصوف رحمہ اللہ کی مراد حجر کی یہی دو آخری مذکورہ صورتیں ہیں جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

مفلس کے پاس اپنا مال پائے جانے کا حکم

853- عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْنَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: ((مَنْ أَدْرَكَ مَالَهُ بِعَيْنِهِ عِنْدَ رَجُلٍ قَدْ أَفْلَسَ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ)).

ابوبکر بن عبدالرحمن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: ''جس نے اپنے مال کو بعینہ (یعنی اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدیلی کے واقع ہوئے بغیر) کسی ایسے شخص کے پاس دیکھا جس کو مفلس قرار دیا جا چکا ہے تو اس مال کا وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ مستحق ہے۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَرَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَمَالِكٌ مِنْ رِوَايَةِ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمنِ مُرْسَلًا، بِلَفْظِ: ((أَيُّمَا رَجُلٍ بَاعَ مَتَاعًا، فَأَفْلَسَ الَّذِي ابْتَاعَهُ، وَلَمْ يَقْضِ الَّذِي بَاعَهُ مِنْ ثَمَنِهِ شَيْئًا، فَوَجَدَ مَتَاعَهُ بِعَيْنِهِ، فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ، وَإِنْ مَاتَ الْمُشْتَرِي فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ أُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ)).

جبکہ امام ابوداؤد اور امام مالک نے یہ حدیث ابوبکر بن عبدالرحمن کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ مرسل روایت کی ہے: جس آدمی نے بھی ایک سامان بیچا، اتنے میں اس سامان کو خریدنے والا مفلس ہو گیا اور ابھی تک اس نے بیچنے والے کو اس سامان کی قیمت میں سے کچھ بھی ادا نہ کیا تھا اور بیچنے والے کو اپنا سامان بعینہ (اسی حالت میں خریدنے والے کے پاس) مل گیا تو اس سامان کا زیادہ مستحق وہی ہے اور اگر (اس دوران) مشتری وفات پا گیا تو اب بیچنے والا بھی (اس سامان میں) دیگر قرض خواہوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوگا۔

www.KitaboSunnat.com

وَوَصَلَهُ الْبَيْهَقِيُّ. وَضَعَّفَهُ تَبَعًا لِأَبِي دَاوُدَ.

اس حدیث کو امام بیہقی نے موصول روایت کیا ہے البتہ امام ابوداؤد رحمہ اللہ کی اتباع میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔[2]

وَرَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ رِوَايَةِ عُمَرَ بْنِ خَلْدَةَ، قَالَ: "أَتَيْنَا أَبَاهُرَيْرَةَ رضي الله عنه فِي صَاحِبٍ لَنَا قَدْ أَفْلَسَ، فَقَالَ: لَأَقْضِيَنَّ فِيكُمْ بِقَضَاءِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: ((مَنْ أَفْلَسَ أَوْ مَاتَ، فَوَجَدَ

جبکہ امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو عمر بن خلدہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ہم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنے ایک مفلس ساتھی کے معاملہ میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: میں تم لوگوں میں نبی کریم ﷺ والا فیصلہ

---

[1] صحيح البخاري: 2402- صحيح مسلم: 1559.

[2] الموطا لمالك: 678/2- ومن طريقه رواه ابو داؤد: 3520- سنن البيهقي: 46/6- امام بیہقی فرماتے ہیں: یہ روایت موصول صحیح نہیں ہے۔

رَجلٌ مَتَاعَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ .))

کروں گا (وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے): ''جو آدمی مفلس ہو گیا یا مر گیا اور ایک آدمی نے (اس کے پاس) اپنا سامان بعینہٖ پالیا تو وہ اس سامان کا زیادہ مستحق ہے۔'' ❶

وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمْ، وَضَعَّفَهُ أَبُوْدَاوُدَ هٰذِهِ الزِّيَادَةَ فِيْ ذِكْرِ الْمَوْتِ .

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام ابو داؤد نے ''موت'' کے ذکر کے اضافہ کو ضعیف کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... پہلے صحیحین کی روایت کے معانی مضمون اور فوائد کو بیان کیا جاتا ہے۔

مَنْ أَدْرَكَ: مذکور "مَنْ" شرطیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہوگا۔

مَالَهُ: اگرچہ مال کا اطلاق نقود، عروض اور منافع سب پر ہوتا ہے۔لیکن یہاں مراد اعیان ہیں۔

بِعَيْنِهِ: یعنی ابھی تک اس میں کوئی تغیر یا تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اسے اپنا وہ مال اسی حالت میں ملا جیسا کہ وہ تھا۔

عِنْدَ رَجُلٍ قَدْ أَفْلَسَ: رجل سے مراد بظاہر مرد ہے لیکن یہ حکم عورتوں کو بھی شامل ہے۔پس ایسے مواقع پر مرد کا ذکر اس کی تعظیم وتشریف کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ قید کے اعتبار سے۔

اور "قَدْ أَفْلَسَ" یہ "رَجُلٍ" کی صفت ہے۔

فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ جوابِ شرط اور جزائیہ ہے۔

أَحَقُّ: یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور یہ ''استحقاق'' سے ماخوذ ہے۔یعنی ایسی شے کا یہ آدمی دوسروں سے زیادہ مستحق ہے۔ چاہے اس مفلس کے پاس اس مال کے سوا اور کوئی دوسرا مال نہ ہو۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں ذکر کردہ مسئلہ واضح ہے۔البتہ اس کی صورت یہ ہے کہ جیسے کسی نے اپنی گاڑی بیچی اور ابھی خریدار نے قیمت ادا نہ کی تھی کہ وہ مفلس ہو گیا اور وہ گاڑی بعینہٖ اس حالت میں ابھی اس کے پاس موجود تھی تو گاڑی بیچنے والے سے یہ کہا جائے گا کہ اس گاڑی کے دوسرے اصحابِ حقوق سے زیادہ حق دار تم ہو۔لہٰذا اس خریدار کے ذمہ جتنا بھی قرض ہو، اگر اس کے پاس اس گاڑی کے سوا اور کچھ نہ ہو تو اس گاڑی میں دوسرے قرض دہندہ شریک نہ ہوں گے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مقروض کے مفلس ہو جانے کی صورت میں سامان والا دوسرے غرماء پر مقدم ہوگا بشرطیکہ وہ سامان مقروض کے پاس بعینہٖ پہلی حالت میں موجود ہو جیسا کہ حدیث میں یہ شرط مذکور ہے۔

◈ اور اگر وہ سامان متغیر ہو گیا جیسے اس میں کمی یا زیادتی واقع ہو گئی تو اب وہ سامان والا دوسرے غرماء کے ساتھ اس سامان میں برابر کا شریک ہوگا۔

◈ بائع جو صاحب حق ہے، وہ چاہے تو مشتری پر رحم کرتے ہوئے اپنے حقِ تقدیم سے دست بردار ہو کر دوسرے غرماء کے ساتھ خود کو برابر کا ایک شریک ٹھہرا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحب حق ہے اور صاحب حق اپنا حق چھوڑ سکتا ہے۔

تنبیہ:...... اب ذیل میں سنن ابی داؤد اور مؤطا امام مالکؒ کی روایت پر کلام درج کیا جاتا ہے۔

❶ سنن ابی داؤد: 3523۔ سنن ابن ماجہ: 2358۔ المستدرك للحاكم: 58/2۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث اونچی اور صحیح الاسناد ہے۔

غریب الحدیث:......**مُرْسَلًا**: یہ حدیث اس لیے مرسل ہے کیونکہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن تابعی ہیں نا کہ صحابی رضی اللہ عنہ۔
مذکورہ مرسل روایت کے تذکرہ سے دراصل یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بائع کو مشتری کے مفلس ہو جانے کی صورت میں اپنی مبیع کے بعینہٖ موجود ہونے پر اس کے لینے کا استحقاق تب ہے جب اس نے مشتری سے اپنی مبیع کے ثمن کی مد میں کچھ بھی نہ لیا ہو اور اگر اس نے مشتری سے کچھ لیا ہو چاہے وہ ایک روپیہ بھی ہو۔ تو اس صورت میں بائع کا بعینہٖ موجود مبیع میں تقدیمی حق باقی نہ رہے گا۔ غرض اس حدیث میں مذکورہ اس شرط کو بھی گزشتہ مذکورہ شرط کے ساتھ ملایا جائے گا اور یہ شرط گزشتہ متصل صحیح حدیث میں مذکورہ شرط کے منافی نہیں۔ کیونکہ "بِعَيْنِهٖ" کا کلمہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نے اپنی مبیع کے ثمن میں سے کچھ نہیں لیا۔
وَإِنْ مَاتَ الْمُشْتَرِي: یہ تیسری شرط کا بیان ہے اور وہ یہ کہ تقدیم استحقاق کا یہ جواز تب ہے جب مشتری زندہ بھی ہو۔ لہٰذا اگر مشتری مر گیا ہو تو اب بائع اور دیگر غرماء برابر ہوں گے۔
یاد رہے کہ مذکورہ شرط کو گزشتہ حدیث کے الفاظ "عِنْدَ رَجُلٍ" سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مشتری کے مرنے کے بعد "مَنْ أَدْرَكَ مَتَاعَهُ بِعَيْنِهِ عِنْدَ رَجُلٍ" کے الفاظ اپنے مدلول کے مطابق واقع نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس صورت میں درست الفاظ "عِنْدَ الْوَرَثَةِ" کے ہوتے۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں اپنی شے بعینہٖ پانے کی صورت میں تقدیم استحقاق کے جواز کی تیسری شرط کا بیان ہے کہ یہ استحقاق تب ہے جب مشتری زندہ بھی ہو۔ کیونکہ مشتری چاہے مفلس بھی ہو لیکن اس کے مر جانے کے بعد اس کی ہر شے ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس صورت میں یہ بائع اور دوسرے غرماء سب ایک برابر شمار ہوں گے۔
تَنْبِیْه:......اب ذیل میں تیسری روایت (سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد کی روایت) پر کلام ملاحظہ ہو۔

غریب الحدیث:......**أَتَيْنَا أَبَا هُرَيْرَةَ** رضی اللہ عنہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کسی زمانہ میں مدینہ نبویہ کے امیر بھی رہے تھے، یہ قصہ ان کے دورِ ولایت کا ہے۔
لَأَقْضِيَنَّ فِيكُمْ بِقَضَاءِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: اس میں جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی بے حد فضیلت و منقبت کا بیان ہے کہ وہ خود بھی ہر بات میں سنت نبویہ کی پیروی فرماتے تھے، اور لوگوں کو بھی اسی بات پر آمادہ فرماتے تھے۔
مَنْ أَفْلَسَ أَوْ مَاتَ: مذکورہ روایت اِفلاس کے مسئلہ میں تو گزشتہ احادیث کے موافق ہے لیکن مشتری کے مرنے کی صورت میں گزشتہ روایات کے مخالف ہے۔ کیونکہ گزشتہ روایات بتلاتی ہیں کہ مشتری کے مر جانے کی صورت میں بائع اور دیگر غرماء استحقاق میں برابر ہوں گے۔ جبکہ یہ روایت اس صورت میں بھی بائع کو سب سے زیادہ مستحق قرار دیتی ہے۔ اسی لیے اگر ایک طرف امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے تو دوسری طرف امام ابوداؤد نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے اور مزید یہ کہ انہوں نے موت کے اضافہ کو بالخصوص ضعیف کہا ہے۔ اس لیے یہ حدیث گزشتہ حدیث صحیح کے مخالف ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔
اس باب میں علمِ مصطلح الحدیث کا یہ ضابطہ یاد رکھا جائے کہ جب دو الفاظ ایک دوسرے کے متعارض ہوں تو ترجیح ان الفاظ کو ہوتی ہے جو اصح ہوں اور وہ روایت متن اور سند دونوں اعتبار سے اصح ہو۔ تب پھر مرنے کے بعد بھی بائع کا اس شے کے استحقاق میں دوسرے یا دوسروں پر مقدم ہونے کا قول مرجوح کہلائے گا۔
مذکورہ روایت کا مضمونِ حدیث اور فوائد بھی حسب سابق ہیں البتہ چند دیگر فوائد یہ ہیں:

◈ قاضی کو چاہیے کہ وہ متخاصمین کو مطمئن کیا کرے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان لڑنے والوں میں فیصلہ سناتے ہوئے انہیں مطمئن کرنے کے لیے دلیل میں یہ کہا تھا کہ: ''میں تم میں وہ فیصلہ کروں گا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے کیا تھا۔'' اور ایسا ہی مفتی کو بھی چاہیے کہ وہ مستفتی کو مطمئن کیا کرے۔

◈ مذکورہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت ومنقبت کو بھی بیان کرتی ہے کہ وہ خود بھی سنت کے زبردست پابند تھے اور دوسروں کو بھی سنت کا پابند بناتے تھے۔

غنا کے باوجود دوسرے کا حق ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے کا حکم

854۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ أَبِيْهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوْبَتَهُ)). رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

عمرو بن شرید اپنے والد (ماجد حضرت شرید رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ادا پر قادر کا ٹال مٹول اس کی عزت اور اس کی عقوبت کو حلال کر دیتا ہے۔''[1]
اس حدیث کو امام ابو داؤد رحمہ اللہ اور امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو معلق روایت کیا ہے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَيُّ الْوَاجِدِ: "اللي" "ٹال مٹول کرنے کو کہتے ہیں اور "وَاجِدِ" (پانے والے) سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ذمہ واجب حق کو ادا کرنے پر قادر ہو۔

يُحِلُّ: مراد مباح کر دینا ہے۔

الْعِرْضَ: مراد اس کے بارے میں دوسروں کے آگے بات کرنا ہے کہ ''جی ذرا دیکھو تو کہ فلاں میرے پیسے واپس نہیں کر رہا۔ حالانکہ وہ دے سکتا ہے۔'' نہ کہ اس کی آبروریزی کرنا مراد ہے۔

عُقُوبَتَهُ: یعنی اگر حاکم مناسب سمجھے تو ایسے ٹال مٹول کرنے والے کو سزا دے سکتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے ذمہ دوسرے کے حق کو ادا کرنے میں جلدی کی جائے اور اس میں بلاوجہ تاخیر اور ٹال مٹول سے کام نہ لیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے سے تحذیر اور یہ کہ غنی کے لیے ٹال مٹول کرنا حرام ہے۔

◈ جو قدرت کے باوجود قرض نہ دے اس کی بابت باتیں کرنا جائز ہے، جس سے معلوم ہوا کہ جو ابھی ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کی بابت اس کی پیٹھ پیچھے باتیں کرنا جائز نہیں ہے۔

◈ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تنگدست ٹال مٹول سے کام لے سکتا ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3628۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 6288۔ سنن ابن ماجہ: 2427۔ صحیح ابن حبان: 5089۔ صحیح البخاری تعلیقا: باب، لصاحب الحق مقال، قال: ویذکر عن النبی ﷺ...... امام ابن حجر نے "فتح الباری: 62/5" میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

◈ ٹال مٹول مطالبہ کے وقت ہی ثابت ہوتا ہے اور اگر قرض خواہ خاموش ہے تو مقروض کا قرض ادا نہ کرنے کو ٹال مٹول نہ کہا جائے گا۔
◈ ٹال مٹول کرنے والے کو سزا دے سکتے ہیں۔
◈ صاحب حق بول سکتا ہے۔
◈ شرع شریف کی لوگوں کے مالوں کی حفاظت وصیانت کی طرف بے حد توجہ ہے۔

مبتلائے مصیبت کی مدد کی جائے

855- وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: أُصِيبَ رَجُلٌ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا، فَكَثُرَ دَيْنُهُ، فَأَفْلَسَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((تَصَدَّقُوا عَلَيْهِ))، فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَبْلُغْ ذَلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِغُرَمَائِهِ: ((خُذُوا مَا وَجَدْتُمْ، وَلَيْسَ لَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: دورِ نبوی میں ایک صاحب کو اپنے پھلوں میں جو اس نے خرید رکھے تھے ایک حادثہ پیش آ گیا۔ سو وہ بہت مقروض ہو گیا اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان صاحب پر صدقہ کرو۔'' جس پر لوگوں نے ان صاحب پر صدقہ کیا۔ پر وہ صدقہ (کامال) اتنا نہ ہوا جو اس کے قرض کو ادا کر پاتا تو نبی کریم ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے ارشاد فرمایا: ''جو تمہیں (اس سے) ملے وہ لے لو اور تمہارے لیے (سردست) سوائے اس کے اور (کسی بات کا حق) نہیں۔''[1]
اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... أُصِيبَ: یعنی اسے مصیبت نے آلیا۔
فِي ثِمَارٍ: بظاہر واللہ اعلم کہ یہ کھجوریں تھیں کیونکہ مدینہ نبویہ میں کثرت سے پایا جانے والا پھل تو کھجور ہی ہے۔
فَكَثُرَ دَيْنُهُ: یعنی وہ شخص پھلوں میں حادثہ کا شکار ہونے کی وجہ سے قرضوں کے بوجھ تلے دب کر مفلس ہو گیا۔
فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: یعنی آپ ﷺ نے حاضرین مجلس سے ارشاد فرمایا۔
تَصَدَّقُوا عَلَيْهِ: تاکہ اس کے ہونے والے نقصان کی کچھ تلافی ہو سکے۔ لوگوں نے حکم رسالت کے امتثال میں ان صاحب پر صدقہ کیا۔
وَلَمْ يَبْلُغْ ذَلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ: یعنی صدقہ سے اکٹھی ہونے والی رقم اتنی نہ ہوئی کہ جس سے اس کے سارے قرض کو ادا کیا جا سکتا۔
خُذُوا مَا وَجَدْتُمْ، وَلَيْسَ لَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ: یعنی جتنا صدقہ اکٹھا ہوا ہے اس کو اپنے اپنے قرض کے اعتبار سے لو اور اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ صاحب مفلس ہو چکے ہیں اور اب ان کے پاس صدقہ کی یہی رقم ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں مفلس ہو جانے کی ایک صورت یہ مذکور ہے کہ آدمی کا مال یا سامانِ تجارت کسی حادثہ وغیرہ کا شکار ہو کر برباد ہو جائے اور اب اس کے پاس کچھ نہ رہ جائے۔ دوسری اہم بات یہ مذکور ہے کہ ایسے

[1] صحيح مسلم: 1556.

شخص پر یعنی مفلس پر زکوٰۃ خیرات، صدقات اور عطیات وغیرہ خرچ کیے جا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنے قرض کے اتار دینے کی کوئی تدبیر کر سکے۔

اور تیسری اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس صدقہ کی رقم بھی اس قدر نہ آئے کہ جس سے وہ اپنا سارا قرضہ اتار سکے تو جس قدر رقم اس کے پاس آئے قرض خواہ اس سے اسی قدر رقم کے مطالبہ کے مستحق ہیں اس سے زیادہ کے نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قصہ کے بیان میں صاحب قصہ کا نام لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اس روایت میں "أُصِيبَ رَجُلٌ" کے الفاظ ہیں، پر ان صاحب کا نام مذکور نہیں۔ کیونکہ نام کے جاننے پر کسی حکم شرعی کا موقوف ہونا لازم نہیں۔
- درختوں پر لگے پھلوں کو خریدنا جائز ہے۔ اس کی دلیل "فِي ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا" کے الفاظ ہیں۔
- قوم کے سربرآوردہ اور مقتداء و پیشواء کو چاہیے کہ وہ حاجت مندوں کی دوسرے کے سامنے سفارش کیا کرے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کی سفارش کی اور ان پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حکم رسالت پر عمل کرنے میں جلدی کیا کرتے تھے۔ اس کی دلیل "فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ" کے الفاظ ہیں۔
- غرماء کا مفلس کے پاس موجود رقم سے زیادہ کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ اس کی دلیل "وَلَيْسَ لَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ" کے الفاظ ہیں۔

دوسروں کی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان

856۔ وَعَنِ ابْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ رضی اللہ عنہما ((أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ حَجَرَ عَلَى مُعَاذٍ مَالَهُ، وَبَاعَهُ فِي دَيْنٍ كَانَ عَلَيْهِ)) .

ابن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے والد (ماجد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر ان کے مال کی بندش لگا دی اور اس کو ان کے اوپر چڑھے قرض کے بدلے فروخت کر دیا۔ [1]

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ مُرْسَلًا، وَرَجَّحَ إِرْسَالَهُ .

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا اور امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے جبکہ امام ابو داؤد نے اس کو مرسل روایت کر کے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث: ......حضرت کعب بن مالک: ......یہ مشہور اور ایک جلیل القدر صحابی رسول ہیں جن کا غزوۂ تبوک کے حوالہ سے مشہور قصہ ہے۔

حَجَرَ عَلَى مُعَاذٍ: یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔

مَالَهُ: نبی کریم ﷺ نے ان پر اپنے مال میں کسی قسم کا تصرف کرنے کی بندش لگا دی تھی کیونکہ وہ اتنے مقروض ہو گئے

[1] سنن الدارقطني: 230/4- المستدرك للحاكم: 67/2- مراسيل ابى داؤد: 172 .

تھے کہ اپنے مال سے اس قرض کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ان پر اپنے مال پر بیع وشراء وغیرہ کے تصرفات کی بندش لگا دی تھی۔

وَبَاعَهُ فِي دَيْنٍ كَانَ عَلَيْهِ: اوراس مال کوان کے اوپر چڑھے قرض کو اتارنے کے لیے فروخت کر دیا۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ مذکور ہے کہ ایسے مقروض پر جو قرض ادا نہ کر سکتا ہو، اس کی مرضی کے برخلاف اس کے مال پر تصرف کی بندش لگائی جاسکتی ہے۔

مقروض اور حالات اور بندش کی صورت

رہا یہ سوال کہ مقروض پر بندش کیا لگائی جاسکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مقروض کے چار حالات ہو سکتے ہیں:

(1) یا تو اس کے پاس قرض کی رقم سے زیادہ مال ہوگا۔

(2) یا قرض کے برابر مال ہوگا۔

(3) یا قرض کی رقم سے کم مال ہوگا۔

(4) اور یا پھر اس کے پاس سرے سے کوئی مال ہوگا ہی نہیں۔

اب اگر تو اس کے پاس کوئی مال ہے ہی نہیں تو اس سے تعرض حرام ہے اور اس سے قرض کا مطالبہ بھی ناجائز ہے اور نہ اس کو قرض خواہوں کے مطالبہ پر قید میں ہی ڈال سکتے ہیں۔ بلکہ اسے چھوڑ دینا واجب ہے اور اگر اس کے پاس قرض سے زیادہ مال ہے تو اب بھی اس پر بندش لگانا جائز نہیں۔ البتہ اگر ایسا آدمی پھر بھی ٹال مٹول سے کام لیتا ہے تو اس کی بابت بات کرنا اور حاکم کو اسے سزا دینا جائز ہو جائے گا جیسا کہ گزشتہ حدیث میں بیان ہوا۔ پس اسے قرض ادا کرنے کو کہا جائے گا اور انکار کی صورت میں اسے پس دیوارِ زنداں کیا جائے گا۔

جس صورت میں اس کی رقم اور قرض دونوں برابر ہوں تو اس پر بھی اوّل اوّل بندش نہ لگائی جائے گی بلکہ اسے قرض اتار دینے کو کہا جائے گا اور بصورتِ انکار نذرِ زنداں ہوگا۔ پھر بھی اگر وہ انکار پر مصر ہے تو اس کے مال کو بیچ دیا جائے گا۔ جبکہ چوتھی صورت قرض کی رقم کے اس کے مال سے زیادہ ہونے کی ہے۔ اسے نہ تو قید کیا جائے گا اور نہ مارا ہی جائے گا۔ البتہ چھوڑا بھی نہ جائے گا۔ ہاں اس پر اپنے پاس موجود مال میں تصرف کرنے کی بندش لگا دی جائے گی اور شرعی حاکم اس کی رقم یا مال کو نیلام کر کے اسے قرض خواہوں میں ہر ایک کے حصہ کے بقدر تقسیم کر دے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جو بندش لگائے جانے کا مستحق ہو جائے اس پر بندش لگانا جائز ہے اور اس کی صرف ایک ہی صورت ہے جو ابھی بیان ہوئی ہے۔

◈ اگر دوسرے کا مال بیچنا مباح ہو جائے تو اس کو اس کی مرضی کے برخلاف بھی بیچا جاسکتا ہے۔

◈ جب موجود مال کو قرض کے بدلے بیچنا جائز ٹھہرا تو بلا وجہ قرض لینے کا حکم کیا ہوگا؟؟!!!!

اپنی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان

857- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((عُرِضْتُ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: احد کے

عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ ، وَأَنَا ابْنُ أَرْبَعَ عَشْرَةَ سَنَةً ، فَلَمْ يُجِزْنِي ، وَعُرِضْتُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْخَنْدَقِ ، وَأَنَا ابْنُ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً ، فَأَجَازَنِي)) .

دن مجھے نبی کریم ﷺ کے حضور پیش کیا گیا جبکہ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی سو آپ ﷺ نے مجھے (غزوۂ احد میں شرکت کرنے کی) اجازت مرحمت نہ فرمائی۔ پھر میں خندق کے دن آپ ﷺ کے حضور پیش کیا گیا، اس وقت میں پندرہ سال کا ہو چکا تھا تو آپ ﷺ نے مجھے (غزوۂ خندق میں شریک ہونے کی) اجازت مرحمت فرما دی۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبَيْهَقِيِّ : ((فَلَمْ يُجِزْنِي وَلَمْ يَرَنِي بَلَغْتُ)) .

اور سنن بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: سو آپ ﷺ نے مجھے (غزوۂ احد میں شرکت کی) اجازت نہ دی۔ آپ ﷺ نے مجھے (اس وقت) بالغ نہ سمجھا تھا۔ ❷

وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ .

اس روایت کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔

شرح :...... گزشتہ روایت میں دوسروں کی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان تھا۔ جبکہ اس روایت میں اپنی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان ہے۔ پس حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں دوسروں کی وجہ سے بندش لگائے جانے کا، اور اس حدیث میں کم سنی کی وجہ سے بندش لگائے جانے کا بیان ہے۔ پس کم سن کو اس کا مال حوالہ نہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ ان آیات میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا﴾ (النسآء: 5)

''اور بے سمجھوں کو اپنے مال نہ دو، جو اللہ نے تمھارے قائم رہنے کا ذریعہ بنائے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ﴾ (النسآء: 6)

''اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان سے کچھ سمجھداری معلوم کرو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو۔''

پس ان آیات میں رب تعالیٰ نے یتیم کو اس کا مال حوالہ کرنے کی دو شرطیں بیان کی ہیں:

(1) ایک بلوغت (2) اور دوسری سمجھ داری

جبکہ مذکورہ حدیث یہ بتلاتی ہے کہ بلوغت کی عمر پندرہ سال ہے۔

---

❶ صحیح البخاری: 2664۔ صحیح مسلم: 1868.

❷ سنن البیہقی: 55/6۔ صحیح ابن حبان: 4728۔ امام ابن حجر "فتح الباری: 279/5" میں فرماتے ہیں: یہ اضافہ صحیح ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

غریب الحدیث :...... عُرِضْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ: غزوۂ احد شوال تین ہجری میں ہوا تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس وقت چودہ سال کے تھے، اس لیے اس غزوہ میں شرکت سے روک دیے گئے۔

وَعُرِضْتُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْخَنْدَقِ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے غزوہ خندق کے موقع پر اپنے آپ کو دوبارہ پیش کیا۔ اس مرتبہ انہیں غزوہ میں شرکت کی اجازت مل گئی کیونکہ اب وہ پندرہ سال کے ہو چکے تھے۔

مذکورہ حدیث پر بظاہر ایک اشکال وارد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق پانچ ہجری میں جبکہ غزوہ احد تین ہجری میں ہوئی تھی۔ اب جو تین ہجری میں چودہ سال کا تھا اسے پانچ ہجری میں سولہ سال کا ہونا چاہیے نہ کہ پندرہ سال کا؟

تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دونوں مواقع پر حذف کر کے ساتھ عمر بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ غزدۂ احد کے موقع پر وہ چودہ سال کے ہونے والے تھے جبکہ غزوۂ خندق کے موقع پر وہ پندرہویں سال کے آغاز میں تھے۔ یوں دونوں باتوں میں جمع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس بات کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ''میں اس وقت پندرہ سال کا تھا'' سے مراد بالغ ہو جانا ہو۔ یعنی غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بالغ ہو چکے تھے، قطع نظر اس سے کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی یا سولہ سال۔ مذکورہ روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نابالغ کو قتال میں شرکت کی اجازت نہ ہو گی۔ کیونکہ:

⊙ ...... وہ قتال کا متحمل نہیں ہوتا۔

⊙ ...... نابالغ دشمنوں کی قید میں آ سکتا ہے۔

⊙ ...... کم سنی کی وجہ سے وہ دشمنوں پر ہلا بولنے کا اہل نہیں ہوتا۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ کم سن پر اپنے مال میں تصرفات کی بندش ہو گی اور یہ بندش اس کے بالغ ہو جانے تک باقی رہے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ پندرہ سال کی عمر میں آدمی بالغ ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں آدمی قتال کا اہل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر پندرہ سال کی عمر بلوغت کی علامت ضرور ہے لیکن بلوغت پر نص نہیں۔

◈ امیر لشکر کو چاہیے کہ لشکریوں کے احوال کی جستجو اور خبر گیری رکھے اور جو قتال کا اہل نہ ہو اسے واپس کر دیا کرے۔

◈ پندرہ سال کی عمر سے بلوغت کا کمال حاصل ہو جاتا ہے۔

◈ غزوۂ خندق پانچ ہجری میں ہوا تھا۔

◈ بالغ ہو جانے پر تصرفات سے بندش کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔

◈ جو آدمی اس بات کا قائل ہے کہ بلوغت کا تعلق عمر سے نہیں، مذکورہ حدیث اس پر رد ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے مجھے (اس وقت جبکہ میں چودہ سال کا تھا) بالغ نہ سمجھا تھا۔

بلوغت کی چند علامات

858۔ وَعَنْ عَطِيَّةَ الْقُرَظِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((عُرِضْنَا　　عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (غزوہ) قریظہ کے دن ہمیں

عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ قُرَيْظَةَ ، فَكَانَ مَنْ أَنْبَتَ قُتِلَ ، وَمَنْ لَمْ يُنْبِتْ خُلِّيَ سَبِيلُهُ ، فَكُنْتُ مِمَّنْ لَمْ يُنْبِتْ فَخُلِّيَ سَبِيلِي)).

(جبکہ ہم نوعمر لڑکے تھے) نبی کریم ﷺ کے حضور پیش کیا گیا۔ پس جس کے تو (زیر ناف) بال اُگ آئے تھے اسے (بالغ ہونے کی بنا پر) قتل کر دیا گیا اور جس کے ابھی تک (زیر ناف) بال نہ اُگے تھے، اس کی راہ چھوڑ دی گئی پس میں ان لڑکوں میں سے تھا جن کے ابھی تک (زیر ناف) بال نہ اُگے تھے، اس لیے میرا رستہ (بھی) چھوڑ دیا گیا۔ ❶

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو آئمہ خمسہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔

معرفة الصحابة :......حضرت عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ یہ بنو قریظہ سے تھے جو یہود کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ نبی کریم ﷺ جب مدینہ نبویہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو اس وقت مدینہ نبویہ میں یہود کے تین مشہور قبائل آباد تھے۔ یہ لوگ شام کے علاقہ "اَذْرُعَاء" سے ہجرت کر کے مدینہ آ کر آباد ہوئے تھے کیونکہ ان لوگوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں یہ بات پڑھ رکھی تھی کہ رب تعالیٰ عنقریب آخری پیغمبر کو مبعوث فرمانے والے ہیں اور یہی جگہ ان کا مقامِ ہجرت ہوگا۔ پس یہ بات پڑھ کر یہود کے یہ قبائل شام چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔ یہ تین قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد سب سے اوّل ان لوگوں کے ساتھ باہم مل کر رہنے کا معاہدہ کیا تھا جس کو ''میثاقِ مدینہ'' کے مشہور نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ صدیوں سے بگڑے یہ یہودی، یہودی ہی نکلے اور رفتہ رفتہ تینوں قبائل بدعہدی کرتے گئے اور اپنے کیے کی سزا پاتے گئے جس کی تفصیل کتبِ سیرت میں مذکور ہے۔

مذکورہ حدیث میں ان تین نامراد قبائل میں سے بنو قریظہ کے انجام بد کا ذکر ہے کہ جب انہوں نے بدعہدی کی تو ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا گیا جبکہ بالغ لوگوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ یہ تقریباً سات سو یہودی تھے جو سب کے سب مارے گئے تھے۔ مذکورہ حدیث میں یہ اہم بات مذکور ہے کہ ان کے نابالغوں اور بالغوں میں فرق کیونکر معلوم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جس کے تو زیر ناف بال اُگے ہوتے اس کو بالغ تصور کر کے اس کی گردن ماردی جاتی تھی البتہ جس کے زیر ناف بال نہ اُگے ہوتے تھے ان کو نابالغ قرار دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ انہی خوش نصیبوں میں سے ایک حضرت عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اس وقت نابالغ تھے، اس لیے چھوڑ دیے گئے۔ بعد میں حضرت عطیہ رضی اللہ عنہ اسلام لا کر پکے سچے مسلمان اور نبی کریم ﷺ کے وفادار و جاں نثار صحابی رضی اللہ عنہ بنے۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ بلوغت کی ایک علامت زیر ناف بالوں کا اُگ آنا بھی ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 4404۔ جامع الترمذی: 1584۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 8621۔ سنن ابن ماجہ: 2541۔ امام ابن حبان (4780) اور امام حاکم (494/1) نے اس حدیث کو صحیح کہا۔ امام حاکم کہتے ہیں کہ: ''یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔'' اور یہ حدیث ایسی ہی ہے جیسا کہ امام حاکم نے کہا ہے۔ البتہ صحیحین میں حضرت عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ سے مروی یہی ایک حدیث ہے۔ دیکھیں: "التلخیص: 40/3".

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ جس پر چاہے کرم فرما کر اسے ہدایت سے نواز دے۔
- ضرورت کے وقت دوسرے کا ستر کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔
- قتال کرنے کے قابل دشمنوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔
- مذکورہ حدیث کو لے آنے کا مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ بلوغت کی ایک علامت زیر ناف بال اُگ آنا بھی ہے۔

عورت کے مالی تصرفات کا بیان

859- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يَجُوزُ لِامْرَأَةٍ عَطِيَّةٌ إِلَّا بِإِذْنِ زَوْجِهَا)).

وَفِي لَفْظٍ: ((لَا يَجُوزُ لِلْمَرْأَةِ أَمْرٌ فِي مَالِهَا إِذَا مَلَكَ زَوْجُهَا عِصْمَتَهَا)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَصْحَابُ السُّنَنِ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عورت کے لیے اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر عطیہ کرنا جائز نہیں۔'' [1]

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''کسی عورت کے لیے اپنے مال میں کسی تصرف کا جواز نہیں جب اس کا خاوند اس کی ناموس کا مالک بن گیا ہو۔''

اس حدیث کو امام احمد نے اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے، سوائے امام ترمذی کے، اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :...... **لَا يَجُوزُ**: عدمِ جواز سے عدمِ نفاذ بھی مراد ہو سکتا ہے اور ناجائز بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اب اگر پہلا معنی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر عورت اپنے مال میں سے کچھ دے دے تو وہ دینا نافذ ہی نہیں ہوتا۔ جبکہ دوسرے معنی کی رو سے مطلب یہ بنے گا کہ اسے دینا حلال نہیں۔ جس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس کا دیا غیر نافذ بھی ہے۔

لِامْرَأَةٍ: یہ نکرہ ہے جو نفی کے تحت واقع ہے۔ لہٰذا یہ عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔

عَطِيَّةٌ: یہ بھی نفی کے تحت واقع نکرہ ہے۔ عطیہ یہ مالی تبرع اور عطا ہے چاہے صحت میں ہو یا بیماری میں ہو۔ البتہ فقہاء کے ہاں عطیہ مرض الموت میں کیے جانے والے مالی تبرع کو کہتے ہیں۔

غرض عطیہ صحت و بیماری دونوں حالتوں کی عطا کا نام ہے۔ چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یعنی یہ عطیہ ثلث، ثلث سے کم اور ثلث سے زیادہ مال کو بھی شامل ہے۔

إِلَّا بِإِذْنِ زَوْجِهَا: اذن سے مراد اس کی رضا اور اس کی موافقت ہے۔

إِذَا مَلَكَ عِصْمَتَهَا: مراد عقدِ نکاح کے ذریعے اس کی ناموس کا مالک بننا ہے۔ تب پھر عورت کے حق میں یہ حکم عقدِ نکاح کے ہوتے ہی ثابت ہو جائے گا۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3547۔ سنن النسائی: 278/6۔ سنن ابن ماجۃ: 2388۔ مسند احمد: 179/2۔ المستدرك للحاکم: 54/2۔ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ جبکہ ابن حزم نے "المحلی: 71/6" میں یہ کہہ کر اس حدیث پر رد کیا ہے کہ: ''یہ روایت منقطع ہے۔'' ہم کہتے ہیں کہ شعیب نے اس روایت میں تحدیث کی تصریح کی ہے۔ دیکھیں: "تحفة المحتاج: 261/2".

أَمْرٌ: یہ دوسری روایت کا لفظ ہے جس میں عطیہ کی بجائے "أَمْرٌ" کا لفظ مذکور ہے۔ اس میں عطیہ سے بھی زیادہ عموم ہے۔ کیونکہ ایک تو خود لفظ امر نفی کے تحت نکرہ ہے جو تعمیم کو متضمن ہے۔ دوسرے لفظ امر بیع وشراء، رہن، ہدیہ، اجارہ وغیرہ دیگر سب معاملات اور لین دین کو بھی شامل ہے۔ غرض جب نکاح کر کے خاوند بیوی کی ناموس کا مالک بن جائے گا تو عورت کا کوئی امر اس کے مال میں جائز نہ ہوگا یعنی نافذ اور حلال نہ ہوگا۔ کیونکہ نکاح کر لینے کے بعد آدمی عورت کا نگران بن جاتا ہے اور اب وہ عورت کے باپ سے بھی زیادہ اس پر اپنا حق رکھتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث کا معنی واضح ہے کہ کوئی عورت خاوند کی اجازت کے بغیر صدقہ، بیع، تجارت، اجارہ تبرع حتیٰ کہ زکوٰۃ بھی نہیں دے سکتی ہے جیسا کہ حدیث کا ظاہر اس کا مقتضی ہے۔ کیونکہ اب خاوند اس کی عصمت کا مالک بن چکا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ خاوند کا بیوی پر بے حد حق ہے۔
- خاوند کی اجازت کے بغیر عورت کے لیے کوئی مالی تصرف جائز نہیں۔ چاہے وہ تصرف عطیہ کا ہو یا غیر عطیہ کا۔
- خاوند بیوی کو مالی تصرف سے روک سکتا ہے۔
- جس بات کے منع کا حق بندے کو ہو تو اس کی اجازت پر وہ ممانعت بھی جاتی رہتی ہے۔ البتہ جو بات اللہ کے حق کی وجہ سے منع ہو، اس کی ممانعت اللہ کے حکم سے ہی جاتی ہے۔
- خاوند عورت کو مالی تصرفات سے روک سکتا ہے یا نہیں، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض نے مذکورہ حدیث کو محکم قرار دیتے ہوئے خاوند کے حق میں اس حق کو تسلیم کیا ہے۔ جبکہ بعض نے اس حق کو ثلث مال سے زیادہ میں مقبول کہا ہے۔ لہٰذا عورت ثلث یا اس سے کم مال میں تصرف کر سکتی ہے۔ ثلث سے زیادہ میں نہیں۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب مرض الموت کے مریض کے لیے ثلث میں تصرف جائز ہے حالانکہ اس مال کے ساتھ ورثاء کا حق بھی متعلق ہوتا تو اس عورت کے لیے یہ جواز بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا۔

ایک قول یہ ہے کہ اگرچہ "امْرَأَةٍ" کا کلمہ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور وہ نادان عورت ہے۔ جو اپنے مال میں تصرف کا سلیقہ نہ جانتی ہو۔ کیونکہ نکاح کر لینے کی وجہ سے اس نادان عورت پر باپ کی ولایت خاوند کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ پھر خاوند باپ پر مقدم بھی ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ قول قوی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ان دیگر احادیث کی وجہ سے منسوخ ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دور نبوی میں عورتیں اپنے مالوں میں خاوندوں کی اجازت کے بغیر بھی تصرف کیا کرتی تھیں۔ تب پھر اس حدیث کی بابت لوگوں نے متعدد طریق اختیار کیے ہیں۔ جو یہ ہیں:

(1) یہ حدیث محکم اور عام ہے لہٰذا یہ عورت اور اس کے مال میں تصرف کی بابت عام ہوگی۔

(2) یہ حدیث محکم ہے لیکن مال کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ ثلث سے کم مال ہے۔ یعنی عورت ثلث سے زیادہ میں تصرف کرتے وقت خاوند کی اجازت کی پابند ہے۔

(3) یہ حدیث عام ہے لیکن مراد خاص ہے اور وہ نادان عورت ہے۔
(4) اور چوتھا طریق یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔
تب پھر اس بارے راجح قول میرے نزدیک یہ ہے کہ یہاں عورت سے نادان عورت مراد ہے اور مال سے وہ مال مراد ہے جس میں خاوند کی رغبت ہو جیسے زیور وغیرہ۔ یوں مذکورہ حدیث پر کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔

تنبیه:...... مذکورہ حدیث کا حجر کے باب کے تحت لانا بدیہی ہے۔

سوال کرنا کب جائز ہوتا ہے

860- وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ مُخَارِقِ الْهِلَالِيِّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ إِلَّا لِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ: رَجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيْبَهَا ثُمَّ يُمْسِكَ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيْبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ حَتَّى يَقُوْلَ ثَلَاثَةٌ مِنْ ذَوِي الْحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت قبیصہ بن مخارق الہلالی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سوال کرنا (ان) تین میں سے ایک کے سوا اور کسی کے لیے حلال نہیں (وہ تین آدمی یہ ہیں): (1) (ایک) وہ آدمی جس نے کوئی خون بہا (یا تاوان وغیرہ) اپنے ذمہ لیا تو اس کے لیے (خون بہا یا تاوان کی اس رقم کو ادا کرنے کے لیے دوسروں سے) مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ اس (خون بہا کی رقم) تک پہنچ جائے (اور اتنی رقم اسے مل جائے تو) پھر (اب) وہ (مزید سوال کرنے سے) رک جائے۔ (2) اور (دوسرے) وہ آدمی جسے کوئی ایسی (زمینی یا سماوی) آفت پہنچی جس نے اس کے مال کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تو (اب) اس کے لیے (بھی) سوال کرنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ قابل گزران رقم کو پا لے (تو اب وہ بھی مزید سوال کرنے سے رک جائے۔) (3) اور (تیسرے) وہ آدمی جسے فاقہ آ پہنچا یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین دانش و بینش والے لوگوں نے (اس کے بارے میں گواہی دیتے ہوئے) یہ کہا کہ ''تحقیق فلاں کو فاقہ پہنچا ہوا ہے'' تو اس آدمی کے لیے (بھی) سوال کرنا حلال ہے۔ [1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... إِنَّ الْمَسْأَلَةَ: مسئلة: مراد سوال کرنا ہے یعنی لوگوں سے کچھ دینے کے لیے سوال کرنا۔
إِلَّا لِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ: اس عبارت میں اجمال ہے۔ جبکہ اگلی عبارت اسی اجمال کا بیان اور تفصیل ہے کہ جن تین آدمیوں کے لیے مانگنا حلال ہوتا ہے وہ کون کون ہیں، جن کو نبی کریم ﷺ نے تفصیل کے ساتھ ایک ایک کر کے بیان فرما دیا۔ اجمال کے بعد تفصیل بلاغت کے اسالیب میں سے ایک ہے اور یہ اسلوب نفس میں بات کو زیادہ جاگزیں کرتا ہے۔ جبکہ اس اسلوب

[1] صحيح مسلم: 1044.

سے نفس تفصیل جاننے کا زیادہ مشتاق ہو جاتا ہے۔

رَجُلٍ تَحَمَّلَ: مذکورہ لفظ مجرور ہے اور یہ بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور یہ بدل کی دوسری قسم "بدل البعض من الکل" ہے اور یہ "ثَلاثَةٍ" سے بدل ہے۔

اور "تَحَمَّلَ" سے مراد کسی بات کو اپنے ذمہ لینا ہے اور یہ کسی مصلحت عامہ میں سے کسی بات کے التزام کو کہتے ہیں۔

حَمَالَةً: اپنے ذمہ لیے ہوا تاوان یا خون بہا۔ ایسے آدمی کے لیے جو کس کے خون بہا یا تاوان کو اپنے ذمہ لے اسے یہ تاوان وغیرہ کی رقم کو ادا کرنے کے لیے دوسروں سے تاوان کی رقم پوری ہونے تک سوال کرنا جائز ہے، چاہے وہ غنی بھی ہو۔ البتہ تاوان کی رقم اکٹھی ہو جانے پر مزید سوال کرنے سے رک جائے۔

أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ: جائحہ کا بیان مفصل گزر چکا ہے۔ غرض یہ دوسرا آدمی ہے جس کے لیے سوال کرنے کا جواز ہے جس کا مال کسی حادثہ کا شکار ہو کر تباہ ہو گیا ہو۔

حَتَّى يُصِيبَ قِوَامًا: قوام! یہ قابل گزران رقم کو کہتے ہیں۔ یعنی ایسے آدمی کو قابل گزران رقم اکٹھی ہونے تک سوال کرنا جائز ہے اور قابل گزران رقم سے مراد اتنی رقم ہے جس سے حاجت پوری ہو جائے۔ یہ آدمی بھی ضرورت پوری ہو جانے پر مزید سوال کرنے سے رک جائے۔

أَصَابَتْهُ الفَاقَةُ: فاقہ شدید بھوک اور فقر و تنگدستی کو کہتے ہیں۔ یہ تیسرے آدمی کا بیان ہے جسے سوال کرنا جائز ہے کہ جس کو فاقہ آ پہنچے اور اس کے گلی محلے کے تین سمجھ دار آدمی اس کے مبتلائے فاقہ ہونے کی گواہی بھی دے دیں تو اس کو بھی سوال کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ سوال کرنا جائز نہیں البتہ ایسے تین آدمیوں کے لیے سوال کرنا جائز ہے۔

دوسری اہم بات اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتی ہے کہ سوال بہر حال ندامت ہی ہے، اس سے بچا جائے، ہاں بہت مجبوری میں سوال کرنے کی اجازت ہے۔

مناسبت حدیث :...... چونکہ مذکورہ باب تفلیس اور حجر سے متعلقہ ہے اور سوال کرنے کا جواز بھی شدید مفلس کے لیے ہی ہوتا ہے، اسی ادنیٰ مناسبت کی بنا پر یہ حدیث اس باب کے تحت لے کر آئے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- دوسرے سے سوال کرنا حرام ہے جس کی دلیل "لَا تَحِلُّ الْمَسْأَلَةُ" کے الفاظ ہیں۔ تو جب کسی امر کی بابت حلت کی نفی ہو جائے تو تحریم ثابت ہو جاتی ہے۔
- شریعت انسان کی عزت نفس کی حفاظت کرتی ہے، اسی لیے شریعت نے آدمی کو حتی الامکان سوال کرنے سے منع کیا ہے۔
- امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ مال کے علاوہ بھی دوسرے سے کسی بات کا سوال کرنا منع ہے۔ لہٰذا کسی دوسرے سے دعا کرنے کا سوال کرنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ مال کے سوال میں جو معنی ہے وہ غیر مال کے سوال میں بھی موجود ہے۔ البتہ یاد رہے کہ مصلحتِ عامہ کے لیے دوسرے سے سوال کرنا شیخ الاسلام کی مذکورہ عبارت کے مصداق میں داخل

نہیں۔ کیونکہ ایک عورت نے اپنی مرگی کی بیماری سے متعلق دعا کرنے کی درخواست خود نبی کریم ﷺ سے کی تھی جس کو نبی کریم ﷺ نے قبول فرمایا تھا۔

◈ سوال کرنا حدیث کے ضمن میں مذکور تین آدمیوں کے سوا اور کسی کو جائز نہیں۔

◈ سوال کے جائز ہونے پر سوال کے مقتضی سے تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا۔ پس اگر کسی نے قرض ادا کرنے کے لیے زکوٰۃ مانگی ہے تو وہ صرف قرض ادا کرنے میں ہی اس رقم کو خرچ کرے گا اور اُس کے لیے اِس رقم کو کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنا جائز نہ ہوگا۔

◈ ضرورات کے احکام حالتِ اختیار کے احکام سے جدا ہوتے ہیں۔ جیسے حالتِ اختیار میں سوال حرام ہے جبکہ حالتِ ضرورت میں حلال ہے۔

◈ شرع شریف نے لوگوں کی مصالح عامہ کی بے حد رعایت کی ہے۔ اسی لیے جو دوسرے کا خون بہا اپنے ذمہ لے اس کے لیے سوال کی اجازت ہے۔

◈ سوال ضرورت کے بقدر کیا جائے نہ کہ زائد از ضرورت کا بھی سوال کرلیا جائے۔

◈ غنا کے بعد فقر وفاقہ کا شکار ہونے والے کے لیے اس وقت تک سوال جائز نہیں جب تک کہ اس کے محلہ داروں میں سے تین آدمی اس کے فقیر وفاقہ زدہ ہو جانے کی شہادت نہ دے لیں۔ کیونکہ اہل محلہ اس کی بابت بہ نسبت دوسروں کے زیادہ جانتے ہیں۔

◈ جس کے لیے جو شے لینا مباح ہو، اس کے لیے اس شے کا سوال بھی مباح ہو جاتا ہے۔

7۔ بَابُ الصُّلُحِ ......صلح کا بیان

تمہید:...... **صلح کی تعریف اور مواقع:**......صلح دو جھگڑا کرنے والوں کے درمیان جھگڑا ختم کرنے یا کرانے کو کہتے ہیں۔ صلح کے متعدد مواقع ہیں جیسے زوجین میں صلح کرانا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا﴾ (النسآء: 35)

''اور اگر ان دونوں کے درمیان مخالفت سے ڈرو تو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔''

دو جھگڑا کرنے والے گروہوں میں صلح کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا﴾ (الحجرات: 9)

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔''

اسی طرح اگر کسی موقع پر کفار سے لڑنا ممکن نہ ہو تو ان کے ساتھ بھی صلح کی جاسکتی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کے ساتھ صلح کی تھی۔

یاد رہے کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان بوقت حاجت صلح کرنا جائز ہے۔ پھر اگر تو یہ کفار نقضِ عہد نہیں کرتے تو ان

کے ساتھ کھڑا ہونا واجب ہے، اور اگر نقضِ عہد کا صرف اندیشہ ہو جب کہ ابھی عہد توڑا نہ ہو تو انہیں آگاہ کر دیا جائے کہ ہم تمہارے ساتھ کیے عہد کو توڑ رہے ہیں اور اگر وہ عہد توڑ دیں تو ان سے قتال واجب ہے۔ صلح کی ان سب صورتوں کا ذکر کتاب اللہ میں موجود ہے۔ پھر دو متخاصمین میں صلح مال کے معاملہ پر بھی ہو سکتی ہے اور بیع و شراء، رہن و اجارہ وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ ان سب امور میں اصل جواز ہے۔ لیکن صلح کبھی واجب اور کبھی مستحب ہوتی ہے۔

کون سی صلح جائز ہے

861، 862- عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمُزَنِيِّ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((اَلصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ إِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا، وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلَى شُرُوْطِهِمْ، إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا، أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا)).

حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دو مسلمانوں کے درمیان صلح (کرنا یا کرانا) جائز ہے سوائے اس صلح کے جو کسی حلال کو حرام ٹھہرائے یا کسی حرام کو حلال ٹھہرائے، اور مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں (جن کو تسلیم کرنا ان کو لازم ہے) سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام بناتی ہو یا کسی حرام کو حلال کرتی ہو۔'' [1]

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. وَأَنْكَرُوْا عَلَيْهِ، لِأَنَّ رِوَايَةَ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ ضَعِيْفٌ، وَكَأَنَّهُ اعْتَبَرَهُ بِكَثْرَةِ طُرُقِهِ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے اس کو صحیح کہا ہے، جبکہ دیگر محدثین نے اس روایت پر انکار کیا ہے۔ کیونکہ کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف کی روایت ضعیف ہے۔ گویا کہ امام ترمذی نے اس حدیث کے کثرتِ طرق کا اعتبار (کر کے اس حدیث کو صحیح باور) کیا ہے۔

وَقَدْ صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه.

اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس روایت کو جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، صحیح کہا ہے۔ [2]

غریب الحدیث: ...... **جَائِزَةٌ**: مراد جوازِ تکلیفی ہے۔ یعنی صلح کرنا حرام نہیں بلکہ جائز ہے۔ پھر وضعی اعتبار سے بھی صلح جائز ہے۔ یعنی کی جانے والی صلح نافذ ہوتی ہے نہ کہ فاسد۔ لہٰذا اس کو پورا کرنا واجب اور اس کو باطل ٹھہرانا ناجائز ہوگا۔

بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ: یہ قید اغلب کے اعتبار سے ہے لہٰذا اس کا کوئی مفہوم مخالف نہ ہوگا۔ تب پھر صلح مسلمانوں اور کافروں کے درمیان بھی جائز ہوگی جیسا کہ صلح حدیبیہ ہے جو کفارِ قریش اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھی۔

---

[1] جامع الترمذی: 1352- سنن ابن ماجه: 2353- المستدرك للحاكم: 113/4- امام حاکم نے اس روایت پر سکوت کیا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں: یہ حدیث واہی ہے اور یہ کثیر بن عبداللہ کی وجہ سے واہی ہے۔ اکثر کے نزدیک کثیر ضعیف ہے۔ حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو جھوٹ کا ایک ستون قرار دیا ہے۔ جبکہ ابن قطان نے اسے اور اس کے والد دونوں کو مجہول کہا ہے۔ دیکھیں: "خلاصة البدر المنير: 87/2" ابن رجب حنبلی کہتے ہیں: امام ترمذی کثیر کی حدیث کو صحیح کہتے ہیں اور امام بخاری اپنی ایک حدیث کے ضمن میں کہتے ہیں کہ اس باب میں یہ سب سے صحیح حدیث ہے اور ابراہیم بن منذر حزامی نے کثیر کی حدیث کو حسن کہا ہے اور کہتے ہیں کہ ابن مسیب کی مراسیل سے یہ حدیث پھر بہتر ہے۔ اس طرح ابن ابی عاصم نے بھی اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: "جامع العلوم، ص: 563".

[2] سنن ابی داؤد: 3594- سنن البيهقي: 79/6- امام ابن حبان (5091) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

إِلَّا صُلْحاً حَرَّمَ حَلالاً وَأَحَلَّ حَرَاماً: کہ ایسی صلح ناجائز اور حرام ہوگی۔ کیونکہ ایسی صلح اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف ہوتی ہے۔ جیسے کوئی اس بات پر صلح کرے کہ تم اپنی باندی کی شرمگاہ ایک ہفتہ کے لیے مجھ پر حلال کر دو، کہ ایسی صلح حرام ہے کیونکہ یہ ایک حرام کو حلال ٹھہرانے پر صلح ہے۔

غرض ان الفاظ میں ایک قاعدہ مذکور ہے کہ جو صلح بھی کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرتی ہو وہ جائز نہ ہوگی۔

الْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ: یعنی مسلمان جن باتوں کو شرط کر دیں وہ لازم ہوں گی۔ جس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (المائدة: 1)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو۔''

کیونکہ ''وفاءِ عقد'' اصل عقد اور وصفِ عقد دونوں کو شامل ہے اور ''شرط'' یہ عقد کی صفت ہوتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ ارشاد شروط کے وفا کرنے کو بھی شامل ہوگا۔ لہٰذا جب بھی دو متعاقدین کے درمیان کوئی شرط پائی گئی تو اس کو پورا کرنا لازم ہوگا۔

إِلَّا شَرْطاً حَرَّمَ حَلالاً وَأَحَلَّ حَرَاماً: یہاں بھی وہی کلام ہے جو ابھی اوپر ذکر ہوا۔

روایۃ الحدیث :...... امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اب صحیح حدیث تو حجت ہوتی ہے۔ جبکہ دیگر آئمہ حدیث نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر انکار کیا ہے۔ کیونکہ حدیث کے صحیح ہونے کی شروطِ خمسہ میں سے ایک شرط اس کے تمام رواۃ کا عادل ہونا بھی ہے اور اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف ہے جو ضعیف ہے، تو بھلا اُس کے سند میں ہوتے ہوئے یہ حدیث کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔

البتہ یہ امر ضرور ملحوظ رہے کہ کسی حدیث کی اسناد میں ایک ضعیف راوی دیکھتے ہی اس پر ضعیف ہونے کا حکم لگا دینا صحیح نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اس حدیث کا کوئی اور طریق بھی ہو جو صحیح ہو۔ تب پھر ایسی حدیث پر مطلق ضعیف ہونے کا حکم لگانے کی بجائے یوں کہا جائے گا کہ یہ حدیث اس طریق سے ضعیف ہے۔ یوں ہم ذمہ داری سے بری ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا اور دیگر مشائخ نے اس روایت کو کثیر کی وجہ سے ضعیف کہا تو امام ابن حجر رحمہ اللہ نے امام ترمذی رحمہ اللہ کی طرف سے عذر پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ گویا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے دیگر طرق کا اعتبار کرتے ہوئے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

تب پھر ہمیں یہ حدیثی فائدہ بھی حاصل ہوا کہ بسا اوقات ایک ضعیف حدیث اپنے کثرتِ طرق کی بنا پر بھی صحیح کہلاتی ہے لیکن یہ بات بھی محل نظر ہے کیونکہ ضعیف حدیث کثرتِ طرق کی وجہ سے ''حسن'' کے درجہ تک پہنچتی ہے جو صحیح سے نیچے کا درجہ ہے۔ اس بارے یہ امر یاد رہے کہ امام ترمذی بسا اوقات کسی حدیث کو صحیح کہہ کر مراد اس کا ''حسن'' ہونا لیتے ہیں اور یہ خاص امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ہے۔ تب پھر امام ترمذی رحمہ اللہ کا ایسی حدیث کو صحیح کہنے کا مطلب اس کو حجت قرار دینا ہے نہ کہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ حدیث درجہ میں عالی ہے۔ بلکہ یہ حجت اور مقبول ہونے کے اعتبار سے صحیح ہے۔ پھر امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی طریق کو صحیح کہا ہے۔ یوں یہ طریق اس حدیث کا شاہد کہلائے گا۔ کیونکہ یہ حدیث ایک دوسرے صحابی سے بھی مروی ہے۔

مضمون حدیث:...... جائز امور میں دو فریقوں کے درمیان صلح کرا دینی چاہیے اور جائز شروط کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- صلح کی متعدد انواع ہیں جیسے اموال، حروب اور امن میں صلح۔
- اموال میں صلح ''اقرار'' پر بھی جائز ہے اور ''انکار'' میں بھی جائز ہے۔
- عقود میں جائز شروط مقبول ہیں۔
- جو صلح یا شرط کسی حلال کو حرام، یا کسی حرام کو حلال ٹھہراتی ہو، وہ ناجائز اور حرام ہوگی کیونکہ تحلیل وتحریم کا اختیار صرف اللہ رب العزت کو ہے۔
- صلح جہاں مسلمانوں کے مابین کرنا اور کرانا جائز ہے اس طرح کافروں کے ساتھ بھی جائز ہے۔
- معلوم ہوا کہ بندہ کے کسی حکم کو بدلنے سے رب تعالیٰ کا مقرر کردہ حکم نہ بدلے گا۔ لہٰذا اللہ رب العزت کی حرام کردہ شے بندہ کے حلال کرنے سے حلال نہ ہوگی اسی طرح کوئی حلال شے بندہ کے حرام کرنے سے حرام نہ بنے گی۔
- معاملات میں جائز شروط رکھنا جائز ہے۔
- خلاف شرع شرط اور صلح باطل ہے۔ کیونکہ شریعت کا حکم سب پر فائق ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا خلاف شرع جملہ قوانین اور نظام باطل اور مردود ہیں۔

پڑوسی کے حقوق

863۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لَا يَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرِزَ خَشَبَةً فِي جِدَارِهِ))، ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: مَالِي أَرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ؟ وَاللّٰهِ! لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو اس بات سے منع نہ کرے کہ وہ اس کی دیوار میں لکڑی ٹھونکے۔'' پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے کیا ہوا کہ میں تم لوگوں کو اس بات سے اعراض کرتے دیکھتا ہوں؟ اللہ کی قسم میں اس (سنت) کو تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کر رہوں گا۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا يَمْنَعُ: اس کو فعل مضارع کا صیغہ بھی قرار دے سکتے ہیں اور نہی غائب کا صیغہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تب پھر پہلی صورت میں یہ ''لا'' نافیہ اور دوسری صورت میں یہ ''لا'' ناہیہ ہوگا۔

اب نہی کی صورت میں تو اس حدیث کا معنی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پڑوسی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جبکہ نفی کی صورت میں یہ نفی نہی کے معنی میں ہوگی اور ایسا تاکید کی غرض سے کیا جاتا ہے اور نفی کو نہی کے معنی میں مراد لینا صریح نہی سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرِزَ خَشَبَةً فِي جِدَارِهِ: ''خَشَبَةً'' یہ مفرد اور نکرہ ہے جو نہی اور نفی کے سیاق میں ہے۔ اس لیے یہ عموم پر دلالت کر رہا ہے جو ہر قسم کی لکڑی (کھونٹی) کو شامل ہے اور ''یَغْرِزَ'' سے مراد ''یَغْرِسَ'' ہے۔ یعنی دیوار

[1] صحيح البخاري: 2463۔ صحيح مسلم: 1609.

میں سوراخ کر کے اس میں کسی چیز کو ٹھونکنا مراد ہے۔

یہاں ''غرز'' بطور شرط کے نہیں۔ تو جب اس حدیث میں دیوار میں سوراخ کر کے کسی چیز کے ٹھونکنے سے منع کرنے کی ممانعت ہے تو دیوار پر کسی چیز کے رکھنے سے منع کرنے کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہوگی۔ کیونکہ دیوار میں سوراخ کرنا یہ اشد ہے۔ تو جب اشد کی ممانعت ہے تو اخف کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

فِي جِدَارِهِ: مراد اپنی دیوار ہے یا پڑوسی کی دیوار ہے؟ تو اصح قول یہ ہے کہ اس سے پڑوسی کی دیوار مراد ہے۔ کیونکہ اپنی دیوار تو آدمی کی ملک ہے جس میں اسے ہر طرح کا تصرف کرنے کی اجازت اور اختیار ہے جبکہ خود پڑوسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے پڑوسی کو اس کی ملک میں کسی تصرف سے روکے۔ مَا لِي: یہ "ايُّ شَيْءٍ لِيْ" کے معنی میں ہے۔ (جس کا اردو میں عام ترجمہ ان الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ''مجھے کیا ہوا''؟)

عَنْهَا مُعْرِضِينَ: عنها سے مراد یہ مذکورہ سنت ہے جس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث میں بیان فرما رہے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کیا بات ہے کہ میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ اس سنت سے اعراض کر رہے ہو اور اس پر عمل نہیں کر رہے۔

وَاللّٰهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ: "بِهَا" سے مراد یہ سنت بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی میں اس سنت پر تم لوگوں کو عمل پیرا بنا کر چھوڑوں گا۔

جبکہ ایک قول یہ ہے کہ "بِهَا" سے مراد "خَشَبَةٌ" بھی ہو سکتی ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ اگر ایک پڑوسی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار پر کوئی لکڑی وغیرہ رکھنے نہ دے گا تو میں وہی لکڑی اس کے کندھوں کے بیچ میں گاڑ دوں گا۔

رہا یہ سوال کہ "بِهَا" کی ضمیر کا مرجع ''سنت'' قرار دینا زیادہ مناسب ہے یا "خَشَبَةٌ" تو بعض علماء نے دوسرے قول کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث اپنے دورِ امارت میں سنائی تھی، جب وہ مروان کی طرف سے مدینہ نبویہ کے والی تھے اور امیر کو ولایت و سلطنت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے سنت کی نسبت یہ کہنا کہ ''میں اسے تمہارے کندھوں کے بیچ میں ماروں گا'' جنابِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بعید ہے کیونکہ سنت کی بابت "أَرْمِيَنَّ" کی بجائے "أَلْقِيَنَّ" کا لفظ زیادہ مناسب تھا۔ اس لیے بھی "بِهَا" کا مرجع "خَشَبَةٌ" ہونا زیادہ مناسب ہے کہ سنت پھینکی نہیں جاتی کہ پیٹھ پیچھے جا پڑے بلکہ سامنے رکھی جاتی ہے تا کہ لوگ اس پر عمل کریں۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ پڑوسی کی، اور بالخصوص ساتھ کے پڑوسی کی بے حد رعایت کی جائے۔

مناسبت حدیث :...... صلح کے باب کے تحت مذکورہ حدیث کو اس مناسبت سے لائے ہیں کہ بسا اوقات دیوار پر لکڑی رکھنے یا دیوار میں لکڑی ٹھونکنے کے لیے سوراخ کرنے میں دو پڑوسیوں میں جھگڑا ہو سکتا ہے۔ گویا کہ اس روایت میں پڑوسی کے حق کی تاکید بیان کر کے خصومت و نزاع کو قطع کر کے صلح کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ واللہ اعلم!

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ پڑوسی کے بے حد حقوق ہیں، حتیٰ کہ وہ پڑوسی کی ملک سے اسے نقصان پہنچائے بغیر بھی منتفع ہو سکتا ہے۔ پس پڑوسی کو چاہیے کہ وہ دوسرے کو اپنی ملک سے منتفع ہونے سے نہ روکے جبکہ اس بات کی اجازت دینے میں اسے کوئی ضرر بھی نہ

پہنچ رہا ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر اس میں طرفین کی مصلحت بھی ہے۔ دیوار والے کی مصلحت یہ ہے کہ دیوار سے دیوار ملنے سے، یا اسے کسی چیز کی ٹیک ملنے سے اس کی مضبوطی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جبکہ پڑوسی کی مصلحت خود واضح ہے۔

◈ مذکورہ حدیث پڑوسی کی عظمت بھی بتلاتی ہے۔ چنانچہ "جَارَہُ" کی تعبیر اور اضافت میں پڑوسی پر لطف واحسان کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

◈ اور اگر کوئی دیوار دونوں میں مشترک ہو تو اس صورت میں پڑوسی کو اس دیوار سے منتفع ہونے سے روکنا جائز نہ ہوگا۔ کہ اپنی ملک میں انتفاع سے روکنا منع ہے تو خود اس کی ملک میں اسے منتفع ہونے سے روکنا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

◈ امیر اور والی امر کو قوی ہونا چاہیے تاکہ وہ امور کی تنفیذ کر سکے۔ اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے: "وَاللّٰهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ".

◈ وعید سنانے میں مبالغہ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ مذکورہ جملہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ مراد نہ تھی کہ وہ منع کرنے والے کے کندھے میں ہی وہ کھونٹا ٹھونک دیں گے۔ پس یہ وعید میں مبالغہ کے باب میں سے ہے جس کی مزید تاکید قسم کھا کر کی گئی ہے۔

دوسرے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر لینا منع ہے

864- وَعَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ أَنْ يَأْخُذَ عَصَا أَخِيهِ بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ)). رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ فِي صَحِيحَيْهِمَا.

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کسی آدمی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی لاٹھی کو بھی اس کے دل کی خوشی کے بغیر لے لے۔''[1] اس حدیث کو امام ابن حبان اور امام حاکم نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا يَحِلُّ: اس پر کلام ہو چکا ہے۔

لِامْرِئٍ: یہ اسم جنس ہے جو مردوں کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ عورتوں کے لیے اسم جنس "اِمْرَأَةٌ" ہے۔ مردوں کا ذکر تعظیم اور اغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ یہ جملہ احکام عورتوں کو بھی شامل ہیں۔

عَصَا أَخِيهِ: چاہے یہ دینی بھائی ہو یا نسبی بھائی ہو، دونوں کا حکم ایک ہے۔

بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ: مراد کسی دوسرے کی شے کو اس کی مرضی کے بغیر لینا ہے کہ یہ حرام ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ دوسرے کی معمولی ترین شے کو بھی اس کی مرضی، اجازت اور خوشی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے۔

مناسبتِ حدیث:...... چونکہ دوسرے کی شے کو اس کی مرضی کے بغیر لینا خصومت کا سبب بن سکتا ہے اس لیے

---

[1] مسند احمد: 425/5- سنن البیهقی: 100/6- ''امام ابن حبان'' (5978) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام بیہقی "المعرفة" میں فرماتے ہیں: اس باب میں یہ سب سے صحیح حدیث ہے۔ دیکھیں: تحفة المحتاج: 265/2- علامہ ہیثمی "مجمع الزوائد" (171/4) میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو احمد اور بزار نے روایت کیا ہے اور ان سب کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

ایسا کرنے سے منع کرنا گویا کہ دونوں کے درمیان متوقع خصومت کو قطع کرنا ہے اور صلح قطع خصومت ہی کو تو کہا جاتا ہے۔غرض اسی مناسبت کی وجہ سے مذکورہ حدیث کو صلح کے باب کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دوسرے کی چیز کو اس کی مرضی کے بغیر لینا منع اور ناجائز ہے کیونکہ یہ اس پر عدوان ہے جو حرام ہے جیسا کہ اس آیت میں بھی اس بات کی ممانعت کی طرف اشارہ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النسآء: 29)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضامندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو۔''

◈ لاٹھی کا ذکر اس سے زیادہ اہم پر تنبیہ کے باب سے ہے کہ جب اتنی معمولی شے دوسرے کی اجازت کے بغیر لینا حرام ہے تو اس سے بہتر چیزیں مرضی کے بغیر لینا بدرجہ اولیٰ حرام ہوں گی۔

◈ معلوم ہوا کہ دوسرے کی مرضی سے اس کی شے لے سکتے ہیں۔

8۔ بَابُ الْحَوَالَةِ وَالضَّمَانِ ......حوالہ اور ضمان کا بیان

تمہید:...... مذکورہ باب دو نوع کے مسائل کے بیان پر مشتمل ہے: (1) حوالہ (2) اور ضمان۔

ذیل میں دونوں عناوین پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حوالہ کا لغوی معنی:......حوالہ یہ نقل وزوال کہتے ہیں، یہ کسی شے کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے یا کر دینے کو کہتے ہیں۔

حوالہ کا اصطلاحی معنی:...... یہ حق کو ایک کے ذمہ سے دوسرے کے ذمہ کی طرف منتقل کرنے کو کہتے ہیں۔اس میں پانچ ارکان کا پایا جانا ضروری ہے۔

(1) مُحِيل: یہ وہ شخص ہے جو مدیون ہے اور یہ اپنے دَین کو دوسرے کے حوالہ کرتا ہے۔

(2) مُحَال: یہ وہ شخص ہے جس کا حق ہے اور وہ اس کا مطالب ہے۔اسے مُحتَال، محتال لَهٗ، مُحَال لَهٗ اور حَوِيل بھی کہتے ہیں۔

(3) مُحَال عَلَيه: یہ وہ شخص ہے جو حوالہ قبول کرے اور دوسرے کے ذمہ دَین کو اپنے ذمہ میں لے لے۔اسے محتال علیہ بھی کہتے ہیں۔

(4) مُحَال بِه: یہ اس مال اور دَین کو کہتے ہیں جسے ایک کے ذمہ سے دوسرے کے ذمہ میں منتقل کیا جاتا ہے۔

(5) حوالہ کے صیغے: ان سے وہ کلمات مراد ہیں جن کے ادا کرنے سے عقدِ حوالہ منعقد ہوتا ہے۔[1]

حوالہ کا حکم:

یہ عقد ارفاق میں سے ہے جس میں طرفین کے ساتھ نرمی سہولت اور شفقت ہے۔

---

[1] دیکھیں: معدن الحقائق: 93,94/2۔ (نسیم)

ضمان

یہ دوسرے کے ذمے حق کو اپنے ذمہ لینے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی عقدِ اِرفاق میں سے ہے۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ دوسرے کا وہی حق اپنے ذمہ لیا جائے جس کی ضمان صحیح ہو۔ ضمان کو ضمان اِس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مضمون کا ذمہ ضامن کے ذمہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

امام موصوف نے ان دونوں قسم کے مضامین کو ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ایک باب کے تحت جمع کیا ہے۔

حوالہ کا حکم اور اس کی شروط

865- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ، وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيْءٍ فَلْيَتْبَعْ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''غنی کا ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کو کسی غنی و قادر کے پیچھے ہو لینے کو کہا جائے تو وہ اس کے پیچھے ہو لے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ. ((وَمَنْ أُحِيلَ فَلْيَحْتَلْ)).

اور مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور جسے (دوسرے کے) حوالہ کیا جائے تو وہ یہ حوالہ قبول کر لے۔ ❷

غریب الحدیث:......**مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ**: اس جملہ پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔

وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيْءٍ فَلْيَتْبَعْ: ان الفاظ سے جو مراد ہے اس کو امام موصوف رحمہ اللہ نے مسند احمد کی مذکورہ دوسری روایت سے بیان کر دیا ہے، وہ یہ کہ "أُتْبِعَ" سے مراد "أُحِيلَ" ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تم میں سے کسی سے اس بات کا مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس حق کے لیے دوسرے کے پیچھے جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے پیچھے جائے اور یہی مطلب ہے "مَنْ أُحِيلَ فَلْيَحْتَلْ" کا۔

مَلِيْءٍ: مراد وہ شخص ہے جو بدن، مال اور حالت کی رو سے کسی دوسرے کے قرض کے ذمہ کو پورا کر سکے۔ یعنی جب محیل محال کو اپنے ذمہ واجب حق کی وصولی کے لیے کسی کی طرف بھیجے تو وہ (یعنی محتال علیہ) ایسا شخص ہو کہ جس سے محال اپنا حق وصول بھی کر سکے۔ چنانچہ محتال علیہ ایسا فقیر و تنگدست نہ ہو کہ وہ محال کے حق کو ادا کرنے سے قاصر ہو۔

فَلْيَتْبَعْ: مذکورہ لام امر کا ہے جو ماقبل حرفِ عطف "فا" ہونے کی وجہ سے ساکن ہو گیا ہے۔

یہ امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب وارشاد کے لیے؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض کے نزدیک یہ امر استحباب کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے۔ کیونکہ محال کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ دوسرے کا دَین اپنے ذمہ لے یا نہ لے جبکہ بعض کے نزدیک یہ امر وجوب کے لیے ہے کیونکہ یہ جملہ "مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ" کے ارشاد کے بعد مذکور ہے۔ گویا کہ اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ مال دار قادر علی الوفاء کی طرف دَین کا پھیرنا عدل ہے اور عدل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا محال علیہ کا اس حوالہ کو قبول کرنا واجب ہوگا۔

---

❶ صحيح البخاري: 2287۔ صحيح مسلم: 1564۔ ❷ مسند احمد: 463/2۔

دوسرا قول امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔ جبکہ پہلا قول جو عدمِ وجوب کا ہے، وہ جمہور اہل علم کا ہے اور وہ یہ ہے کہ حوالہ حسن اقتضاء کے باب سے ہے اور ایک نیکی ہے لہٰذا اگر کوئی حوالہ قبول نہ کرے تو وہ آزاد ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں اہل ثروت ووسعت کو اس بات کی ترغیب ہے کہ وہ دوسرے کے دَین کے حوالہ کو قبول کرلیا کریں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ غنی کا ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے اور یہ حرام ہے۔ کیونکہ ظلم حرام ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (الشوریٰ: 42)
''راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

◈ معلوم ہوا کہ اگر غیر غنی ٹال مٹول سے کام لیتا ہے تو یہ حرام نہیں۔
◈ لوگوں میں قصاص کا حکم ثابت ہے۔ کیونکہ ظلم کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔
◈ صاحبِ حق اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔
◈ وسعت کے باوجود ٹال مٹول کرنے والے غنی کے حق میں بددعا کرنا جائز ہے۔
◈ حوالہ جائز ہے اور یہ عقد سود نہیں بلکہ یہ عقدِ اِرفاق ہے۔ پھر یہ کہ یہ عقد تب سود بنتا جب یہ خاص اموالِ ربویہ میں ہی جاری ہوتا۔ لیکن چونکہ اس سے دوسرے پر نرمی کرنا مقصود ہے اس لیے جائز ہے۔
◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر حوالہ کمی یا زیادتی کے ساتھ یعنی معاوضہ کے ساتھ ہو تو حرام ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں حوالہ کا مقصود فوت ہوجائے گا اور وہ اِرفاق کے باب سے نکل کر اکتساب کے باب میں داخل ہوجائے گا۔
◈ معلوم ہوا کہ اگر حوالہ کسی غیر قادر علی الوفاء کی طرف ہو تو اس کو تسلیم کرنا لازم نہیں۔
◈ معلوم ہوا کہ شریعت دوسروں کے حقوق کی کس قدر رعایت کرتی ہے۔
◈ معلوم ہوا کہ حوالہ میں محتال علیہ کی رضا شرط ہے لہٰذا اگر وہ کسی کا حوالہ قبول کرنے کو تیار نہیں تو اسے جبراً اس حوالہ کے قبول کرنے پر آمادہ نہ کیا جائے گا۔

میت کے دَین کے ضمان کا بیان

866۔ وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: تُوُفِّيَ رَجُلٌ مِنَّا، فَغَسَّلْنَاهُ، وَحَنَّطْنَاهُ، وَكَفَّنَّاهُ، ثُمَّ أَتَيْنَا بِهِ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَقُلْنَا: تُصَلِّي عَلَيْهِ، فَخَطَا خُطًى، ثُمَّ قَالَ: ((أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟)) قُلْنَا: دِينَارَانِ، فَانْصَرَفَ، فَتَحَمَّلَهُمَا أَبُو قَتَادَةَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہمارے ایک (انصاری) صاحب وفات پاگئے۔ پس ہم نے ان کو غسل دیا اور خوشبو لگائی اور کفن پہنایا۔ پھر ہم نے ان (کے جنازہ) کو خدمت نبوی میں لے جا کر عرض کیا کہ آپ ﷺ اس کا جنازہ پڑھ دیجیے!۔ آپ ﷺ (ان صاحب کا جنازہ پڑھنے اٹھے اور

فَأَتَيْنَاهُ، فَقَالَ أَبُوْ قَتَادَةَ: الدِّيْنَارَانِ عَلَيَّ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: حَقُّ الْغَرِيْمِ، وَبَرِئَ مِنْهُمَا الْمَيِّتُ؟ قَالَ: نَعَمْ فَصَلَّى عَلَيْهِ)).

ابھی آپ ﷺ) نے چند قدم ہی اٹھائے تھے (کہ) پھر ارشاد فرمایا: ''کیا اس کے ذمہ کوئی قرض ہے''؟ ہم نے عرض کیا کہ دو دینار (قرض ہے)۔ اس پر آپ ﷺ پلٹ آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے وہ دو دینار ذمہ میں لے لیے۔ پس ہم (دوبارہ) خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: وہ دو دینار میرے ذمہ میں ہوئے۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(کیا) قرض خواہ کا حق ثابت ہوا اور میت ان دو دینار (کے مطالبہ) سے بری ہو گئی؟'' حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی ہاں! تب پھر آپ ﷺ نے ان صاحب کا جنازہ پڑھایا۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......رَجُلٌ مِنَّا: مراد یہ کہ وہ صاحب انصار میں سے تھے۔

غَسَّلْنَاهُ: مراد وہ غسل ہے جو مسنون طریق سے میت کو دیا جاتا ہے میت کو غسل دینے کا مسنون طریقہ اپنے مقام پر مفصل بیان کیا جا چکا ہے۔

حَنَّطْنَاهُ: یعنی ہم نے اس میت کو غسل دینے کے بعد خوشبو لگائی۔

وَكَفَّنَّاهُ: پھر کفن دیا۔ خوشبو لگانے اور کفن دینے کی تفصیل غسل میت کے باب میں گزر چکی ہے۔

تُصَلِّي عَلَيْهِ: بظاہر یہ جملہ خبریہ ہے لیکن واقع میں طلبیہ ہے۔ یعنی یہ جملہ معنی کے اعتبار سے امر ہے اور یہ امر التماس کے معنی میں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا مقام ان لوگوں سے بلند تھا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ استفہامیہ ہو اور لفظوں سے حرف استفہام کو حذف کر دیا گیا ہو اور تقدیری عبارت ''اَتُصَلِّي عَلَيْهِ'' تب پھر یہ جملہ از خود التماس اور التجاء کے معنی میں ہو جائے گا اور خدمت نبوی ﷺ میں جنازوں کے لے آنے کا مقصد آپ ﷺ کی شفاعت کا حصول تھا۔ کہ آپ ﷺ کی شفاعت سب سے بلند رتبہ ہے۔

فَخَطَا: یعنی آپ ﷺ اٹھے اور جنازہ پڑھانے کے لیے قدم اٹھانے لگے اور ابھی آپ ﷺ نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ دریافت فرما لیا کہ ''کیا اس کے ذمہ میں کوئی قرض تو نہ تھا۔''

دِيْنَارَانِ: یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیری عبارت ''عليه ديناران'' ہے۔ دینار یہ سونے کے سکوں کو کہتے ہیں۔ جبکہ چاندی کے سکے درہم کہلاتے ہیں۔

---

[1] مسند احمد: 330/3۔ سنن ابی داؤد: 3343۔ سنن النسائی: 65/4۔ صحیح ابن حبان: 3058۔ المستدرك للحاكم: 66/2۔ ''علامہ منذری''(377/2) نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور ''علامہ ہیثمی''(93/3) نے بھی ان کی اتباع میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

فَانصَرَفَ: یعنی آپ ﷺ نے ان انصاری صاحب کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور پلٹ آئے۔ غرض پہلے تو آپ ﷺ ان کا جنازہ پڑھانے اٹھے تھے لیکن ان کے مقروض ہونے کا علم ہونے پر لوٹ آئے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا کسی کی نمازِ جنازہ پڑھنا اس کے حق میں شفاعت ہے۔ لیکن مقروض کے حق میں آپ ﷺ کی شفاعت بے فائدہ ہے۔ کیونکہ بندہ کا حق ادا کرنا لازم ہے جو کسی کی شفاعت سے ساقط ہونے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت کا درجہ بھی قرض کے سوا ہر شے کا کفارہ بن جاتا ہے۔ ہاں صاحبِ حق ہی معاف کر دے تو کر دے۔ یا رب تعالیٰ اپنی جناب سے صاحب حق کو دے کر راضی کر دے۔!!!

نبی کریم ﷺ نے اپنے اس مبارک فعل سے دراصل لوگوں کو اس بات کی بے حد بلیغ ترغیب دی کہ وہ کم سے کم قرض لیا کریں نہ کہ یہ بات ہے کہ مقروض کا جنازہ پڑھنا ہی نہیں چاہیے، وگرنہ آپ ﷺ دوسروں کو ان صاحب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کی ترغیب بلکہ حکم نہ دیتے۔

فَتَحَمَّلَهُمَا أَبُو قَتَادَةَ: جب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو پلٹتے دیکھا تو ان دو دیناروں کو اپنے ذمہ میں لے لیا۔ پھر لوگ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ وہ دو دینار میں نے اپنے ذمہ میں لے لیے ہیں۔ مقروض میت کی طرف سے اس قرض کو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے قرض خواہ کے لیے اپنے ذمہ میں لیا تھا۔

حَقَّ الْغَرِيمِ: "حَقَّ" یہ جملہ خبریہ کے مضمون کا مصدر ہے جو تاکید کے لیے ہے اور وہ جملہ خبریہ "الدِّينَارَانِ عَلَيَّ" ہے۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ ارشاد فرمایا ہے: "تَلْتَزِمُهُمَا اِلْتِزَامَ حَقٍّ ثَابِتٍ لَا يَتَغَيَّرُ"۔ یعنی "تم نے ان دو دیناروں کو اپنے ذمہ ایسا لیا ہے جیسے ایک ثابت حق کو اپنے ذمہ لیا جاتا ہے جو غیر متبدل ہوتا ہے۔" جس پر حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جی ہاں! اور یہ اقرار جہاں التزام کو متضمن ہے وہیں میت کی براءت کو بھی متضمن ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے آگے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا: "وَبَرِءَ مِنْهُمَا الْمَيِّتُ".

تنبیہ:...... یاد رہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں قرض کے معاملہ کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں کسی کی بھی شفاعت کام نہیں آتی۔

دوسرے یہ کہ جنازہ ادا کیا جانا مقروض کا بھی حق ہے۔

تیسرے یہ کہ مقروض میت کی طرف سے زندہ آدمی قرض ادا کر کے اسے قرض سے بری کر سکتا ہے اور اس کے قرض کو اپنے ذمہ لے سکتا ہے۔ کہ یہ ضمان صحیح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- میت کا غسل، تکفین اور جنازہ کی ادائیگی اس کے حقوقِ واجبہ میں سے ہے۔
- میت کو خوشبو لگانا مشروع ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کے بے حد حریص تھے کہ ان کے مرنے والوں کے جنازے جناب رسول اللہ ﷺ ادا کیا کریں۔ اس بنا پر ہمیں بھی صلحاء سے جنازے پڑھوانے کی حرص کرنی چاہیے۔
- کسی شرعی مانع کی بابت یہ پوچھنے میں کوئی حرج نہیں کہ آیا وہ پایا جا رہا ہے یا نہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے میت

کے مقروض ہونے کی بابت پوچھ لیا تھا۔

- نبی کریم ﷺ سے عرض معروض کرتے وقت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے حد ادب سے کام لیا کرتے تھے۔ اسی لیے ان حضرات نے نمازِ جنازہ ادا کرنے کی گزارش کرنے کے لیے جملہ خبریہ کا اسلوب اختیار کیا نہ کہ امر کا صیغہ استعمال کیا۔
- جنازے اپنے مقام پر رکھے جائیں۔ لہٰذا یہ جگہیں مساجد سے الگ ہوں جس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس جنازہ کو ادا کرنے اس کی طرف چلے تھے اور چند قدم بھی اٹھائے۔ پھر میت کے مقروض ہونے کا سن کر مزید آگے نہ بڑھے۔ غرض معلوم ہوا کہ جنازہ ادا کرنے کی جگہ علیحدہ ہو۔
- معلوم ہوا کہ قرض کا معاملہ بے حد سنگین اور اہم ہے اور قرض صرف اسی وقت اٹھایا جائے جب بہت لاچار کر دینے والی مجبوری ہو۔ سو جو لوگ قرض کو معمولی معاملہ سمجھتے ہیں وہ ہوشیار ہو جائیں۔
- نبی کریم ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے امام چاہے تو مقروض کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر سکتا ہے۔
- میت کی طرف سے ضمان اٹھا سکتے ہیں اور اس کا قرض اپنے ذمہ لے سکتے ہیں۔
- حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کہ انہوں نے اس میت کے ساتھ ایسا حسن سلوک کیا۔
- قاضی، حاکم اور مفتی کے لیے جائز ہے کہ وہ مقِر سے تحقیق کر سکتا ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے تاکید کے ساتھ استفسار فرمایا کہ کیا تم نے اس میت کا قرض کسی ثابت حق کی طرح اپنے ذمہ لیا ہے جس سے یہ میت اب بری ہو جائے گی؟ جس پر انہوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! بات ایسی ہی ہے۔
- ضامن کے بری کر دینے سے مضمون (جس کے ذمہ ضمان ہو) بری ہو جاتا ہے اور کامل بری ہو جاتا ہے کہ اب دنیا و آخرت میں اُس سے اِس ضمان کا مطالبہ نہ ہوگا۔
- صرف ''ہاں'' کہہ کر بھی جواب دے سکتے ہیں۔

مقروض میت کے قرض ادا کرنے کی تفصیل

867- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُؤْتَى بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفَّى، عَلَيْهِ الدَّيْنُ، فَيَسْأَلُ هَلْ: ((تَرَكَ لِدَيْنِهِ مِنْ قَضَاءٍ؟)) فَإِنْ حُدِّثَ أَنَّهُ تَرَكَ وَفَاءً، صَلَّى عَلَيْهِ، وَإِلَّا قَالَ: ((صَلُّوْا عَلَى صَاحِبِكُمْ)) فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْفُتُوْحَ قَالَ: أَنَا أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، فَمَنْ تُوُفِّيَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (جب) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایسا جنازہ لایا جاتا جس کے ذمہ کوئی قرض ہوتا تھا۔ تو (پہلے) آپ ﷺ یہ دریافت فرماتے کہ: ''کیا اس نے اپنے قرض کے (ادا کرنے کے) لیے کچھ (مال اپنے ترکہ میں) چھوڑا ہے؟'' پس اگر تو (خدمت نبوی میں) یہ بتلایا جاتا کہ اس نے (قرض کی) ادائیگی کے بقدر رقم چھوڑی ہے تو آپ ﷺ اس کا جنازہ ادا فرماتے، وگرنہ یہ ارشاد فرماتے کہ: ''تم لوگ اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ دو۔'' پھر جب رب تعالیٰ نے آپ ﷺ پر (دنیاوی) فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو (ایسے مقروض مرنے والوں کے بارے میں) آپ ﷺ یہ ارشاد فرماتے: ''میں

ایمان والوں کی جانوں سے زیادہ ان پر حق رکھتا ہوں پس جو اس حال میں مر جائے کہ اس پر قرض ہو تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ رہا۔''❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: ((فَمَنْ مَاتَ وَلَمْ يَتْرُكْ وَفَاءً)).

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''پس جو اس حال میں مر گیا کہ وہ (اپنے پیچھے اپنے قرض کے) ادا کے بقدر رقم نہ چھوڑ گیا۔''

غریب الحدیث ......**يُؤْتَى بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفَّى**: یعنی میت کے گھر والے میت لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوتے اور "الْمُتَوَفَّى" یہ "فَا" کے فتح کے ساتھ ہے اور یہی صحیح ہے۔

عَلَيْهِ الدَّيْنُ: یہ جملہ یا تو "الرَّجُلِ" سے حال ہے یا پھر "الْمُتَوَفَّى" صیغہ صفت کا نائب فاعل ہے۔ یہ دونوں احتمالات ہی صحیح ہیں۔

فَيَسْأَلُ: گزشتہ روایت میں آپ ﷺ کے میت کے حال کے بارے میں دریافت کرنے کا ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے اس مقروض میت کے بارے میں یہ پوچھا ہو کہ آیا اس نے قرض کی ادائیگی کے بقدر رقم ترکہ میں چھوڑی ہے یا نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا مقروض میتوں کے بارے میں تین قسم کا رویہ تھا جو یہ ہے:

(1) کسی کی بابت آپ ﷺ دریافت فرماتے۔

(2) اور کسی کے بارے میں دریافت نہ فرماتے۔

(3) جبکہ کسی کا قرض خود ادا فرما دیتے تھے۔

اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ حدیث ابی قتادہ رضی اللہ عنہ میں مذکور مقروض میت کی بابت شاید آپ ﷺ کو اس بات کا علم تھا کہ اس نے ترکہ میں کچھ نہیں چھوڑا۔ یوں دونوں حدیثوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

غرض جب آپ ﷺ کو معلوم ہو جاتا اور آپ ﷺ کو اس بات کی خبر دے دی جاتی کہ اس مقروض نے ترکہ میں قرض کے ادا کرنے کے بعد رقم چھوڑی ہے تو آپ ﷺ اس کا جنازہ ادا فرما دیتے وگرنہ دوسروں کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دے دیتے۔

هَلْ تَرَكَ لِدَيْنِهِ مِنْ قَضَاءٍ: اس میں "مِنْ" زائدہ ہے اور "قَضَاءٍ" یہ "تَرَكَ" فعل کا مفعول بہ ہے۔

وَإِلَّا: یہاں فعل شرط محذوف ہے۔ البتہ حرف شرط مذکور ہے جس کو "لا" نافیہ میں مدغم کر دیا گیا ہے اور وہ حرف شرط "إِنْ" ہے۔ پس تقدیری عبارت یوں ہے۔ "وَإِنْ لَمْ يُحَدَّثْ انه ترك وَفَاءً قال......".

فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْفُتُوحَ: یعنی فتوحات کی کثرت ہوگئی اور آپ ﷺ کے پاس بہت سارا مال غنیمت بھی جمع ہو گیا بالخصوص صلح حدیبیہ کے بعد تو رب تعالیٰ نے آپ پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چنانچہ غزوۂ خیبر اور غزوۂ حنین کے بعد

❶ صحيح البخاري: 5371- صحيح مسلم: 1619.

مسلمانوں کے پاس بہت سارا مالِ غنیمت آ گیا تھا۔ غرض ان حالات میں آپ ﷺ مقروض میتوں کے بارے میں ارشاد فرماتے تھے۔

أَنَا أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ: یعنی آپ ﷺ اہل ایمان سے بھی زیادہ خود ان کی جانوں کی رعایت فرماتے تھے۔ تب پھر اہل ایمان کے ذمہ میں بھی تو یہ بات بنتی ہے کہ وہ اپنے ہر امر میں جنابِ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنی جانوں پر مقدم رکھا کریں۔

فَمَنْ تُوُفِّيَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ: آپ ﷺ کی یہ پیش کش اس مقروض کے بارے میں تھی جس کے ترکہ میں قرض ادا کرنے کے بقدر رقم نہ ہوتی تھی۔ اس لیے ایک روایت میں یہ بات صریح آتی ہے کہ یہ حکم اس کے بارے میں ہے جو ''وفا'' چھوڑ کر نہ مرا ہو۔ کہ نبی کریم ﷺ ایسے مقروض مرنے والے کے قرض کے ضامن بن جاتے تھے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔ البتہ اس میں یہ بات مزید مذکور ہے کہ امام بیت المال سے ان مرنے والوں کے قرض ادا کر سکتا ہے جو اپنے ترکہ میں اس قدر رقم چھوڑ کر نہ مرے ہوں کہ جس سے ان کے ذمہ کے قرض کو ادا کیا جا سکے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مستجاب الدعا سے جنازہ پڑھوانے کے لیے میت کو اس کے پاس لے جانا جائز ہے۔
- میت کو جامع مسجد لے جانا مشروع ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے جنازہ میں شریک ہوں۔
- نبی کریم ﷺ عالم الغیب نہ تھے۔ اسی لیے تو آپ ﷺ نے میت کے مقروض ہونے یا نہ ہونے اور ترک وفا کے بارے میں دریافت فرمایا تھا۔
- خبر واحد مقبول ہے۔ جس کی دلیل "فَإِنْ حُدِّثَ أَنَّهُ تَرَكَ وَفَاءً صَلَّى عَلَيْهِ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ''حُدِّثَ'' واحد مذکر مجہول کا صیغہ ہے۔
- نبی کریم ﷺ بے حد کریم تھے۔ اسی لیے فتوحات کے زمانہ میں مقروض مرنے والے لوگوں کا قرض اپنے ذمہ لے لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ آپ ﷺ کے کریمانہ اخلاق تھے وگرنہ علماء نے لکھا ہے کہ والی کے ذمہ یہ بات نہیں کہ وہ بیت المال سے مقروض کا قرض ادا کرے۔ [1]
- میت کا قرض زکوۃ کی مد سے ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے [2] بلکہ ابن عبدالبر اور ابوعبیدہ قاسم بن سلام نے تو اس پر علماء کا اجماع کا نقل کیا ہے۔ [3]
- میت کی طرف سے دین کا ضمان جائز ہے۔ البتہ "عَلَيَّ" کے کلمہ میں دو باتوں کی طرف اشارہ کا احتمال ہے۔

(1) یا تو یہ التزام ہے۔ یعنی اگر تو آپ ﷺ نے اپنے کریمانہ اخلاق کے مقتضی کے تحت یہ فرمایا ہے تو یہ التزام ہے۔
(2) اور یا یہ تشریع کا بیان ہے۔ تب بھی والی کے ذمہ ہوگا کہ وہ میت کی طرف سے مقروض میتوں کا قرض ادا کرے۔

---

[1] المبدع: 326/4. [2] المغني: 280/2.
[3] المجموع: 199/6.

کفالت کا بیان

868- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لا كَفَالَةَ فِي حَدٍّ)).
رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ .

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''حد میں کوئی کفالت نہیں ہے۔'' ❶
اس حدیث کو امام بیہقی نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

شـــرح :......اس حدیث میں امام موصوف نے کفالت کے مسئلہ کو ذکر کیا ہے۔ ذیل میں پہلے کفالت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ملاحظہ ہو۔

کفالت کی لغوی تعریف:

لغت میں کفالت ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ ملانے کو کہتے ہیں۔

اصطلاحی تعریف:

جبکہ اصطلاحِ شرع میں کفالت کفیل کے ذمہ کو اصیل کے ذمہ کے ساتھ ملانے کو کہتے ہیں۔ چاہے یہ ذمہ عین کا ہو یا دَین کا۔ البتہ عین کا ذمہ کفالت میں درست نہیں جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اصطلاحاتِ کفالت:

(1) دائن یا قرض خواہ کو عقدِ کفالت میں مکفول لہ کہتے ہیں جو قرض کا مدعی ہوتا ہے۔
(2) مدعا علیہ یعنی مقروض کو مکفول عنہ کہا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام اصیل بھی ہے۔
(3) جس چیز کی ضمانت ہو اس کو مکفول بہ کہتے ہیں۔
(4) اور کفالت کی وجہ سے جس سے مطالبہ لازم ہو اسے کفیل، ضامن اور ضمین کہتے ہیں، اس کے اور بھی متعدد نام ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ ❷

کفالت اور ضمانت میں فرق

ضمانت یہ حق کی ہوتی ہے جو مال اور دَین ہوتا ہے۔ جبکہ کفالت یہ عین کی ہوتی ہے اس میں صاحب حق کو قاضی کی مجلس میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ پس کفالت بدن اور عین کی ہوگی جبکہ ضمانت حق اور مال کی ہوگی۔ ان دونوں میں فرق کو اس مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص نے دوسرے کو ہزار روپے قرض دیے اور ایک تیسرے نے اس بات کا ذمہ اٹھا لیا کہ اگر مدیون یہ قرض اپنی مدت پر نہ دے تو میرے ذمہ رہا۔ اب وقت آنے پر اگر دائن اسی ضامن سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے تو ضامن یہ کہہ کر بری نہیں ہو سکتا کہ جاؤ جا کر مدیون سے اپنا قرض لے لو۔

---

❶ سنن البیھقی: 6/77۔ امام بیہقی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے اور فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابو محمد عمر بن ابی عمر الکلاعی سے روایت کرنے میں بقیہ متفرد ہے اور ابو محمد بقیہ کے مجہول مشائخ میں سے ہے، جس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ ابن عدی نے ''الکامل'' میں ابو محمد کے ترجمہ میں اسے مجہول کہا ہے۔ دیکھیں: "الکامل: 5/22"۔

❷ معدن الحقائق: 2/79۔ (نسیم)

اگر یہی صورت یوں ہو کہ وہ تیسرا شخص دائن سے یہ کہے کہ وقت آنے پر اسے کھینچ کر تمہارے پاس لے آنا میرے ذمہ رہا اور دائن ادائے قرض کے وقت آ کر اس کفیل سے مکفول عنہ کو لے آنے کا مطالبہ کرے اور کفیل یہ کہہ دے کہ یہ لو مدیون اور اس سے اپنا قرض لے لو تو وہ بری ہو جائے گا کیونکہ اس نے مدیون کے بدن کو پیش کرنے کا ذمہ لیا تھا نہ کہ اس کے قرض ادا کرنے کا ذمہ لیا تھا کہ یہ صورت کفالت کی ہے۔

کفالت کن امور میں جائز ہے

ہر وہ حق جس کا کفیل سے استیفاء ممکن ہو اس میں کفالت جائز ہو گی اور جس حق کا کفیل سے استیفاء ممکن نہ ہو اس میں کفالت بھی جائز نہیں۔ لہٰذا دَین کی کفالت جائز ہو گی کہ اس کا کفیل سے استیفاء ممکن ہے۔ لہٰذا اگر مدیون نہیں آتا تو قرض کفیل سے لے لیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی حد سرقہ میں کسی کے پیش کرنے میں کفیل بنے تو یہ کفالت جائز نہ ہو گی کیونکہ چور کے نہ آنے کی صورت میں کفیل کے ہاتھ کاٹ کر اس حد کو وصول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ امر ہے جو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک بے گناہ پر حد جاری ہو گی جو جائز نہیں۔ پس اگرچہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے لیکن دیگر قواعد شرعیہ کے لحاظ سے اس کا معنی ٹھیک ہے۔

9۔ بَابُ الشَّرِكَةِ وَالْوَكَالَةِ ...... شرکت اور وکالت کا بیان

شرکت کا لغوی معنیٰ:...... یہ لفظ "نعمةٌ" کے وزن پر ہے۔ "شِرْكٌ" اور "شَرِكَةٌ" بروزن "سَرِقَةٌ" کہ ان سب کا معنی دو آدمیوں کا کسی کام میں شریک ہونا اور ساجھا کرنا ہے۔

اصطلاحی معنیٰ:...... اصطلاح میں شرکت یہ استحقاق یا تصرف میں شریک ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ راس المال اور منفعت دونوں میں ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر تو شرکت صرف راس المال میں ہو تو اس کو مضاربت اور اگر صرف منفعت میں ہو تو اس کو بضاعت کہتے ہیں۔ [1]

پھر اگر یہ شرکت استحقاق میں ہو تو اس کو شرکت املاک کہتے ہیں جیسے دو آدمی ترکہ میں شریک ہوں، اور اگر یہ شرکت تصرف میں ہو تو اس کو شرکت عقود کہتے ہیں جیسے دو آدمی عقدِ مضاربہ میں شرکت ہوں۔ شرکت املاک کا حکم یہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے حصہ میں ایک دوسرے کے حق میں اجنبی ہوں گے لہٰذا دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی اجازت کی بغیر اس کی ملک میں تصرف کا مجاز نہ ہو گا۔ جبکہ شرکت عقد میں دونوں کسی گزشتہ ملک میں ایک دوسرے کے شریک نہیں ہوتے، البتہ تصرف میں شرکت کی بنیاد پر اب آئندہ دونوں کسی چیز کی ملکیت میں شریک بنیں گے، اور وہ عقدِ مضاربت سے حاصل ہونے والی منفعت میں شرکت ہے۔

وکالت کی لغوی تعریف:...... وکالت یہ دوسرے پر اعتماد کر کے اپنے کام کو اس پر چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا وکیل جو بمعنی مفعول یعنی مَوْكُول ہے، اس شخص کو کہا جائے گا جس کے ذمہ دوسرا آدمی اپنا کام چھوڑ دے۔

اصطلاحی تعریف:...... اصطلاح شرع میں یہ کسی مجبوری یا اپنی سہولت کے لیے کسی دوسرے کو ایک جائز اور معلوم تصرف میں اپنا قائم مقام بنانے کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرا یعنی وکیل تصرف کا مالک ہو۔ [2]

---

[1] معدن الحقائق: 1/461۔ (نسیم) [2] معدن الحقائق: 2/141۔ (نسیم)

جیسے کوئی دوسرے کو یہ کہے کہ میں نے تمھیں اس بات کا وکیل بنایا کہ تم میرے لیے فلاں شے خرید لاؤ۔ یہ وکالت کہلائے گی اور اس میں وکیل کو اس بیع میں تصرف کا اختیار ہوگا اور اگر وکیل کو اس بیع میں تصرف کا حق نہ ہوگا تو یہ وکالت درست نہ ہو گی۔ اسی طرح اگر کسی نے دوسرے کو اپنی طرف سے نمازیں ادا کرنے کا وکیل بنایا تو یہ وکالت بھی درست نہ ہوگی کیونکہ یہ امر ہر شخص کی عین سے متعلق ہے جس میں دوسرا داخل نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس میں وکالت اور وکیل بھی نہ ہوگا۔

شرکت و وکالت کا حکم:

عقود کی یہ دونوں قسمیں جائز ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا﴾

(الزمر: 29)

''اللہ نے ایک آدمی کی مثال بیان کی جس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے والے کئی شریک ہیں اور ایک اور آدمی کی جو سالم ایک ہی آدمی کا ہے، کیا دونوں مثال میں برابر ہیں۔''

یہ آیت شرکت کے جواز کو ثابت کرتی ہے۔ جبکہ وکالت کا اثبات احادیث صحیحہ سے ہے جن کا ذیل میں بیان آ جائے گا۔

شراکت میں امانت لازم ہے

869- عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ((أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيْكَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَإِذَا خَانَ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: رب تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''میں دو شریکوں کا تیسرا (شریک) ہوتا ہوں جب تک کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت کا مرتکب نہ ہو، پس جب دونوں میں سے ایک (اپنے ساتھی کے ساتھ) خیانت کرتا ہے تو میں ان دونوں کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔'' [1]

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......قَالَ اللّٰهُ: حضرات محدثین کی اصطلاح میں ایسی حدیث کو حدیث قدسی ﷺ کے موقر لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کی تعریف اور احکام وغیرہ کو مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيْكَيْنِ: رب تعالیٰ نے ''ثَانِي الشَّرِيْكَيْنِ'' نہیں فرمایا کیونکہ لغت عربیہ میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ

---

[1] سنن ابی داؤد: 3383- المستدرك للحاكم: 60/2- سنن البيهقي: 78/6- امام دارقطنی فرماتے ہیں: درست یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ جبکہ ابن قطان نے سعید بن حیان کے حال کے مجہول ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے۔ لیکن ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ اس باب میں اصبہانی نے ''الترغيب'' میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث نقل کی ہے۔ دیکھیں: ''التلخيص: 49/3- نصب الرايه: 474/3.

جب دو کا تیسرا شریک غیر جنس سے ہو تو اس کو مطابق لفظ سے ذکر نہیں کیا جاتا اور جب وہ اسی جنس میں سے ہو تو اس کو اس مطابق لفظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ (المجادلة: 7)

''کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔''

یہ غیر جنس سے ہونے کی مثال ہے اسی لیے "رَابِعُهُمْ" فرمایا نہ کہ "ثَالِثهم" فرمایا۔

اور فرمایا:

﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ﴾ (التوبة: 40)

''جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا۔''

یہ شریک کے ہم جنس ہونے کی مثال ہے اِس لیے "ثَانِيَ اثْنَيْنِ" فرمایا: اب چونکہ رب تعالیٰ کی ذات وراء الوراء اور بے مثل و بے نظیر ہے اس لیے اس کی جنس میں سے کوئی نہیں تو "ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ" فرمایا۔

مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ: "مَا" یہ مصدر یہ ہے جو مابعد کے فعل کو مصدر کی تاویل میں کر کے مفرد بنا رہا ہے اور یہ ظرفیہ بھی ہے کیونکہ یہ مفرد مصدر ماقبل کے لیے ظرف ہے۔ پس تقدیری عبارت یوں ہوگی: "أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ مُدَّةَ انْتِفَاءِ خِيَانَةِ اَحَدِهِمَا صَاحِبَهُ" یعنی ''میں دو میں سے ایک کے اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرنے کی مدت تک ان دو کا تیسرا ہوتا ہوں۔''

خیانت:...... یہ امانت کے خلاف کرنے کو کہتے ہیں، جیسے حقیقت حال کو چھپانا، حاصل ہونے والے نفع کی صحیح رقم نہ بتلانا، بڑے مال کی صحیح مقدار نہ بتلانا وغیرہ وغیرہ کہ یہ سب باتیں خیانت میں شامل ہیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر دو باتیں مذکور ہیں:

(1) شرکت سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔

(2) عقدِ شرکت میں امانت کو ملحوظ رکھنا لازم ہے، وگرنہ عقدِ شرکت برکت سے خالی ہو جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ شرکت جائز ہے۔ جس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے۔

◈ عقدِ شرکت میں امانت کی بے حد بلیغ ترغیب کہ رب تعالیٰ امین کی حاجات پوری فرماتا ہے۔

◈ خیانت کی تحذیر: کہ خیانت شرکت کی برکت کو فنا کر دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی شریک بن کر تجارت کی ہے

870۔ وَعَنِ السَّائِبِ الْمَخْزُوْمِيِّ ﷛ ((أَنَّهُ كَانَ شَرِيْكَ النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَ الْبِعْثَةِ. فَجَاءَ يَوْمَ الْفَتْحِ، فَقَالَ: ((مَرْحَبًا بِأَخِيْ وَشَرِيْكِيْ)).

حضرت سائب مخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: وہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل آپ ﷺ کے (کسی تجارتی معاملہ میں) شریک رہے تھے۔ پس (جب) وہ فتح مکہ کے دن (خدمت نبوی میں) حاضر ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے (انہیں دیکھ کر فرط مسرت سے)

ارشاد فرمایا: ''میرے بھائی اور میرے شریک کو خوش آمدید۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......قَبْلَ الْبُعْثَةِ: نبی کریم ﷺ عمر شریف کے چالیسویں سال میں نبوت سے سرفراز ہوئے تھے، سو یہ واقعہ آپ ﷺ کی چالیس سال کی عمر مبارک سے قبل کا ہے۔ نبوت سے قبل آپ ﷺ کا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مالِ تجارت شام لے کر جانا معروف تھا۔

يَوْمَ الْفَتْحِ: مراد فتح مکہ کا دن ہے۔ مکہ مکرمہ رمضان آٹھ ہجری میں فتح ہوا تھا۔

مَرْحَباً بِأَخِي وَشَرِيكِي: مرحبا: یہ رحب سے مشتق ہے۔ یہ کھلی اور سہل و نرم جگہ کو کہتے ہیں۔ تب پھر مرحبا کا معنی ہوگا کہ تم ایک کشادہ جگہ میں آٹھہرے ہو۔ اکثر کے نزدیک یہ بھی ایک تحیہ ہے۔

وَشَرِيكِي: امام موصوف نے ان الفاظ سے استدلال کر کے مذکورہ حدیث کو باب الشرکۃ کے تحت ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے شرکت کا اثبات، اس کی تقریر اور جواز مذکور ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ شرکت کا جواز احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شرکت جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے شرکت کو برقرار رکھا ہے۔

◈ بیع وشراء کرنا خلافِ مروت نہیں۔

◈ نبی کریم ﷺ کا حسن اخلاق کہ آپ ﷺ نے اپنے سابقہ شریک کا بے حد خندہ پیشانی سے استقبال فرمایا۔

شرکتِ ابدان کا بیان

871۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ ﷺ قَالَ: ((اشْتَرَكْتُ أَنَا وَعَمَّارٌ وَسَعْدٌ فِيمَا نُصِيبُ يَوْمَ بَدْرٍ)). الْحَدِيثَ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں، عمار اور سعد بدر میں ملنے والے مالِ غنیمت میں شریک تھے۔ ❷ ......الحدیث

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَغَيْرُهُ.

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......يَوْمَ بَدْرٍ: غزوہ بدر سترہ رمضان المبارک دو ہجری میں پیش آیا تھا۔ اس غزوہ کے اسباب و

---

❶ مسند احمد: 425/3۔ سنن ابی داؤد: 4836۔ سنن ابن ماجہ: 2287۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 10144۔ علامہ سہیلی ''روض الانف'' میں فرماتے ہیں: حدیث سائب رضی اللہ عنہ بے حد مضطرب ہے۔ سو کسی نے اس کو سائب بن ابی سائب سے، تو کسی نے قیس بن سائب سے، تو کسی نے عبداللہ بن سائب سے روایت کیا ہے۔ یہ ایسا اضطراب ہے جس سے نہ تو کچھ ثابت ہوتا ہے اور نہ اس سے حجت ہی قائم ہوتی ہے۔ پھر اس کے متن میں بھی اضطراب ہے وہ یہ کہ کسی نے اس کو قولِ رسول قرار دیا ہے اور کسی نے اس کو حضرت ابوسائب کا کلام کہا ہے۔ یہ بحث ''امام زیلعی'' (474/3) نے بیان کی ہے۔

❷ سنن النسائی: 57/7۔ سنن ابی داؤد: 3388۔ سنن ابن ماجہ: 2288۔ سنن البیہقی: 79/6۔ الطبقات: 210/6۔ المحلّٰی: 123/8۔

محرکات اور واقعات معروف ہیں جن کو کتب سیرت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

غزوۂ بدر تک اموالِ غنیمت کی تقسیم کے تفصیلی احکام نہ اترے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر آپ ﷺ نے حسب مصلحت مالِ غنیمت کو تقسیم فرما دیا تھا۔ اس جنگ میں ستر صنادید قریش مارے گئے اور ستر ہی قید میں آئے تھے۔ اسی بات کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرما رہے ہیں کہ اس دن میں اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بدر کے قیدیوں میں شریک تھے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ تو کچھ نہ لائے جبکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ دو قیدی گرفتار کر کے لے آئے۔ جن میں بعد میں ان دو حضرات کو بھی شریک کر دیا گیا تھا۔ یوں ایک تو یہ شرکت ابدان بنی اور دوسرے دو قیدی تین میں "اثلاثا" تقسیم ہوئے۔ البتہ بعد میں اموالِ غنیمت کی تقسیم کے تفصیلی احکام نازل ہو گئے۔

مضمون حدیث:...... یہ حدیث شرکت اور شرکتِ ابدان کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ کہ اگر چند لوگ جنگلی شکار، قدرتی گھاس اور مباح لکڑیوں وغیرہ میں شریک ہوں جو ان کے بدنی عمل کا نتیجہ ہے تو یہ شرکت جائز ہو گی اور یہ مالِ مشترکہ ان کے درمیان حسب شروط تقسیم ہو گا جو وہ آپس میں طے کریں گے اور یہ نفع "فیصدی" تقسیم ہو گا نہ کہ شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- دو آدمی اپنے کیے شکار، حاصل کیے قیدی وغیرہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ شرکت ان امور میں ہو گی جن کے حصول کا وسیلہ بدنی عمل ہو نہ کہ مال۔
- شریعت میں بے حد وسعت ہے۔ کہ اس نے رزق روزی کے حصول کے متعدد قسم کے ذرائع مقرر کیے ہیں۔ چنانچہ بسا اوقات اکیلا آدمی کمانے پر قادر نہیں ہوتا لیکن جب کوئی دوسرا اس کے ساتھ مل جائے تو اس کے لیے اپنی روزی کمانی آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے شریعت نے شرکتِ ابدان کو جائز قرار دیا ہے۔
- مباح طریقوں سے مال کمانا جائز ہے۔
- یاد رہے کہ اموالِ غنیمت کے تفصیلی احکام نازل ہو جانے کے بعد اب قیدیوں میں شرکت جائز نہیں رہی۔

وکالت کا بیان

872۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہما قَالَ: أَرَدْتُ الْخُرُوجَ إِلَى خَيْبَرَ، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: إِذَا أَتَيْتَ وَكِيلِي بِخَيْبَرَ، فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقًا)).

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے خیبر کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ پس آپ ﷺ نے (مجھ سے) ارشاد فرمایا: "جب تم خیبر میں میرے وکیل کے پاس پہنچو تو اس سے پندرہ وسق (کھجوریں) لے لینا۔" ❶

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کر کے صحیح کہا ہے۔

---

❶ امام بخاری رحمہ اللہ نے "کتاب فرض الخمس باب: ومن الدليل على ان الخمس لنوائب المسلمين" میں اس حدیث کے ایک طرف کو تعلیقاً روایت کیا ہے۔ سنن ابی داؤد: 3632۔ سنن البيهقي: 80/6۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخيص: 51/3" میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ جبکہ ابن قطان نے اس حدیث کو ابن اسحاق کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے۔ دیکھیں: "التغليق: 473/3".

غریب الحدیث:...... إِلَى خَيْبَرَ : خیبر مدینہ نبویہ کے شمال مغرب میں سو میل کی مسافت پر واقع ایک مشہور بستی ہے۔ یہ یہود کا گڑھ تھا۔ مضبوط قلعوں اور سرسبز و شاداب کھیتوں والی سرزمین تھی۔ حسب دستور غداریوں کے مرتکب ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے یہودِ خیبر سے جہاد کر کے اس بستی کو فتح کر لیا۔ جس پر ان لوگوں نے خدمت نبوی میں درخواست کی کہ انہیں ان کی زمینوں پر رہنے دیا جائے۔ پس آپ ﷺ نے نصف پیداوار پر انہیں ان کی زمینوں پر رہنے دیا۔

غرض پیداوار کی نگرانی اور اس کو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان نصفا نصف تقسیم کرنے کے امر کو سنبھالنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے خیبر میں اپنا ایک وکیل مقرر کر رکھا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جب نبی کریم ﷺ کو اپنے خیبر جانے کے ارادہ سے باخبر کیا تو آپ ﷺ نے انہیں اپنے وکیل سے ملنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ وکیل بنانا جائز ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے خیبر کی پیداوار کی نگرانی پر اپنا ایک وکیل مقرر فرمایا تھا اور یہ حزم و احتیاط کے باب سے ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے جملہ امور سے بالخصوص مسلمانوں سے متعلقہ امور کی بابت جناب رسول اللہ ﷺ کو باخبر رکھا کرتے تھے۔ تاکہ اگر آپ ﷺ کوئی حکم ارشاد فرمائیں تو بلا تاخیر اس پر عمل کر سکیں۔

وکالت کے احکام اور شروط

873- وَعَنْ عُرْوَةَ الْبَارِقِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَهُ بِدِيْنَارٍ يَشْتَرِيْ لَهُ أُضْحِيَةً)).

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک دینار دے کر بھیجا تاکہ وہ آپ ﷺ کے لیے قربانی کا جانور خرید یں۔ [1] ......الحدیث

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِيْ أَثْنَاءِ الْحَدِيْثِ، وَقَدْ تَقَدَّمَ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک حدیث کے اثنا میں روایت کیا ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔

شـــرح:...... امام موصوف رحمہ اللہ نے یہ حدیث وکالت کے جواز پر استدلال کرنے کے لیے ذکر کی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو قربانی کا جانور خریدنے کے لیے وکیل بنایا تھا۔ کتاب البیوع میں یہ حدیث اور اس پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شراء کی توکیل جائز ہے۔

◈ جب کسی کو شراء کا وکیل بنایا تو اس میں یہ شرط نہیں کہ وکیل کو وہ شے کسی معین ثمن کے ساتھ خریدنے کا پابند بنایا جائے۔ کیونکہ وکیل جائے امانت ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ مبیع کو امید ہے کہ ثمن مثلی کے ساتھ ہی خرید لے گا اور زیادہ ثمن کے ساتھ نہ خریدے گا۔

◈ قربانی مشروع ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو قربانی کا جانور خریدنے کا وکیل بنایا تھا اور وکالت

---

[1] صحیح البخاری: 3643۔ یہ حدیث "کتاب البیوع" کے اوّل میں گزر چکی ہے۔

جائز امور میں جائز ہوتی ہے۔

زکوٰۃ وصول کرنے میں وکیل بنانا جائز ہے

874- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: ((بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ)). الْحَدِيثَ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عامل زکوٰۃ بنا کر بھیجا۔ ❶ ......الحدیث

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح :...... **بَعَثَ**: یہ اس سال کا قصہ ہے جب نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا تھا۔ تب پھر یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ قبض زکوٰۃ کے لیے کسی کو وکیل بنا کر بھیجنا جائز ہے اور والی کو زکوٰۃ کی وصولی کا وکیل بنانا جائز ہے اور جب عامل زکوٰۃ یعنی زکوٰۃ کی وصولی کا وکیل لوگوں سے زکوٰۃ لے لیتا ہے تو وہ لوگ زکوٰۃ کے فریضہ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور رہا وکیل تو اگر تو وہ مالِ زکوٰۃ میں کوئی تعدی یا کوتاہی کرتا ہے تو وہ اس مال کا ضامن بنے گا۔ وگرنہ نہیں۔

عُمَرَ: یہ جلیل القدر صحابی رسول، خلیفۃ المسلمین، اور دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ **عَلَى الصَّدَقَةِ**: یعنی صدقہ کی وصولی پر مقرر کر کے بھیجا اور یہاں صدقہ سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔

الْحَدِيثَ: اس لفظ کے اعراب میں تین اقوال ہیں۔ رفع، نصب اور جر۔ اگر نصب پڑھیں تو یہ فعل محذوف کا مفعول بہ ہوگا اور تقدیری عبارت یہ ہوگی "اِقْرَأِ الْحَدِيثَ" (یعنی یہ حدیث (پوری) پڑھ لو) اور رفع کی صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگا اور تقدیری عبارت یہ ہوگی "هٰذَا الْحَدِيثُ" جبکہ خبر کی صورت میں حرف جر محذوف ہوگا اور تقدیری عبارت ہوگی "الى آخر الحديث". مشہور اعراب نصب کے ہیں۔

غرض یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ امام اموالِ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے کسی کو وکیل بنا سکتا ہے۔ اسی طرح ایسے آدمی کو بھی وکیل بنا سکتے ہیں جو اموالِ زکوٰۃ کو اس کے مستحقین میں تقسیم کر دے۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

ہدی اور اُضحیہ کو ذبح کرنے اور ان کے گوشت کو تقسیم کرنے میں وکیل بنانا جائز ہے

875- وَعَنْ جَابِرٍ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَحَرَ ثَلَاثًا وَسِتِّينَ، وَأَمَرَ عَلِيًّا رضي الله عنه أَنْ يَذْبَحَ الْبَاقِيَ)). الْحَدِيثَ.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (حجۃ الوداع کے موقع پر) نبی کریم ﷺ نے قربانی کے (سو اونٹوں میں سے) تریسٹھ جانوروں کو خود ذبح فرمایا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کا حکم دیا کہ باقی کے (اونٹ) وہ ذبح کریں۔ ❷ ......الحدیث۔

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح :...... مذکورہ حدیث کتاب الحج میں پوری تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔ اسی پر اعتماد کر کے امام موصوف رحمہ اللہ نے اس موقع پر یہ حدیث از حد اختصار کے ساتھ ذکر کی ہے اور یہ اتنا اختصار ہے کہ حدیث کے مضمون میں باعث خلل بن کر واقع ہوا ہے۔ وہ یوں کہ اس قدر متن سے ان باتوں کا مطلق علم نہیں ہوتا:

---

❶ صحيح البخاري: 1468- صحيح مسلم: 983. ❷ صحيح مسلم: 1218.

⊙...... یہ واقعہ کہاں کا ہے؟ ⊙......کس موقع کا ہے؟ ⊙......کس وقت کا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ حجۃ الوداع کا موقع تھا اور یوم نحر تھا۔ اس دن آپ ﷺ کے پاس قربانی کے سو جانور تھے۔ آپ ﷺ نے تریسٹھ کو تو اپنے دستِ مبارک سے خود ذبح فرمایا: جبکہ باقی کے اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے فرما دیئے کہ وہ ان کو ذبح بھی کریں اور ان کی کھالوں، جھولوں، اور گوشت کو بھی لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ اس کے بعد ہر اونٹ کے گوشت کو ہانڈی پر چڑھایا گیا۔ آپ ﷺ ہر اونٹ کے گوشت میں سے کچھ لیتے اور اس کا کچھ شوربا پیتے تا کہ رب تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کیا جا سکے:

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ (الحج: 28)

''سو ان میں سے کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو کھلاؤ۔''

غرض امام موصوف نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کا بھی وکیل بنا سکتے ہیں اور اس کے گوشت کو تقسیم کرنے کا وکیل بھی بنا سکتے ہیں۔

تنبیہ:...... ہدی اور اضحیہ میں یہ فرق ہے کہ ہوتے تو یہ دونوں جانور قربانی کے ہی ہیں، لیکن ہدی قربانی کا وہ جانور ہے جس کو سفر حج میں قربانی کے لیے ساتھ لے جایا جاتا ہے جبکہ اضحیہ مطلق قربانی کے جانور کو کہتے ہیں چاہے اسے اپنے شہر میں قربان کیا جائے یا حج پر قربان کیا جائے۔

حدود کے اثبات اور تنفیذ میں وکیل بنانے کا حکم

876- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه فِيْ قِصَّةِ الْعَسِيْفِ، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ عَلَى امْرَأَةِ هَذَا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا))، الْحَدِيْثَ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ''خادم کے قصہ'' میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (سارا واقعہ سن کر) ارشاد فرمایا: ''اے اُنیس! اس عورت کے پاس جاؤ۔ پس اگر تو وہ (اس نوجوان خادم کے ساتھ اپنے زنا کرنے کا) اقرار کر لے تو اسے رجم کر دینا۔'' [1] ......الحدیث۔

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......فِيْ قِصَّةِ الْعَسِيْفِ: عسیف، بے گار اور خدمت گار کو کہتے ہیں۔ یہ اجیر کی طرح ہوتا ہے۔ پس یہ لفظ معنی اور وزن دونوں میں ''اجیر'' کی طرح ہے۔

قصۂ حدیث:...... مذکورہ حدیث کا قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک نوجوان کو اپنے ہاں مزدوری پر رکھا۔ اس نے ایک موقع پر اس کی بیوی کے ساتھ زنا کر لیا۔ لوگوں نے جا کر اس باپ سے کہا کہ اب تو تیرا بیٹا رجم ہوگا۔ اس نے بدلے میں ایک باندی اور فدیہ میں سو بکریاں بھی پیش کیں۔ جس کو آنے والے نے جو اس مسئلہ سے مطلق جاہل تھا، قبول کر لیا۔ لیکن جب باپ نے دوسرے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے بتلایا کہ تیرے بیٹے کو سو کوڑے لگیں گے جبکہ وہ عورت رجم ہوگی۔ اس قصہ کا نبی کریم ﷺ نے جو فیصلہ دیا وہ یہ ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ (سو سنو، وہ فیصلہ یہ ہے کہ) وہ باندی اور بکریاں تمہیں واپس ہوں گی اور

[1] صحيح البخاري: 2725- صحيح مسلم: 1697.

تیرے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا ہو گی۔''

بکریاں اور باندی اس لیے واپس ہوئیں کیونکہ ان کو ناحق لیا گیا تھا اور کوڑوں اور جلا وطنی کی سزا اس لیے تھی کیونکہ ابھی تک وہ نوجوان کنوارا اور غیر شادی شدہ تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے جو فرمایا: وہ اوپر متن میں مذکور ہے۔ انیس یہ بنو اسلم کے ایک صاحب تھے۔ امام موصوف رحمہ اللہ کا استدلال اسی جملہ سے ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں حد کے اثبات کے لیے وکیل بنا کر بھیجا اور بعد میں یہ بھی فرمایا کہ: ''اگر وہ عورت تسلیم کر لے تو اسے رجم کر دینا'' کہ یہ حد کی تنفیذ میں کسی کو وکیل بنانے کا جواز ہے۔ غرض امام کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حد کے اثبات اور تنفیذ کے لیے کسی کو وکیل بنا کر بھیج سکتا ہے۔

مضمونِ حدیث واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ امام کے لیے جائز ہے کہ وہ اقرار کے ذریعے حد کے اثبات کا کسی کو وکیل بنائے۔

◈ اقرار کے ذریعے حد کے اثبات میں ایک دفعہ سے زیادہ کا اقرار لازم نہیں۔ جیسا کہ اس روایت میں بھی ''فَإِنِ اعْتَرَفَتْ'' کے الفاظ ہیں، جو یہ بتلاتے ہیں کہ اس باب میں ایک دفعہ کا اقرار کافی ہے۔ ایسا ہی غامدیہ کے ساتھ بھی ہوا کہ ان کے ایک دفعہ کے اقرار پر ان پر حد جاری کر دی گئی تھی۔

رہا حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا قصہ جنہوں نے چار بار اقرار کیا تھا جس پر بعض علماء نے یہ قول کیا ہے کہ چونکہ زنا چار گواہوں کے بغیر ثابت نہیں ہوتا اس لیے اقرار کا بھی چار بار ہونا لازم ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس باب میں بھی ایک بار کا اقرار کافی ہے۔ رہا حضرت ماعز کا چار بار کا اقرار؟ تو ایک تو یہ قضیہ شخصیہ ہے۔ دوسرے نبی کریم ﷺ کا ایسا کوئی ارشاد نہیں کہ ''جو چار بار اقرار کرے گا ہم اس پر حد جاری کر دیں گے۔''

رہے حضرت ماعز تو آپ ﷺ نے ان سے اس بات کی اچھی طرح چھان بین ضروری سمجھی تھی۔ اسی لیے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ ''کیا تمہیں جنون تو نہیں''۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اقرار کے تکرار سے غرض مسئلہ کی خوب تحقیق تھی۔

◈ کسی کو مزدوری پر رکھنا جائز ہے۔

◈ نوجوان ملازموں کو گھریلو خدمات پر رکھنا بے حد نازک اور سنگین معاملہ ہے۔ اس میں از حد احتیاط لازم ہے۔ بالخصوص جب گھر میں نوجوان بیوی یا جوان اولاد ہو۔ کہ دورِ صحابہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا تو ہمارے اس گئے گزرے دور کا کیا حال ہو گا؟؟!!!

◈ ناجائز لیا گیا مال واپس کرنا واجب ہے۔

◈ زانی غیر شادی شدہ ہو تو اس کی سزا سو کوڑے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک سال کے لیے جلا وطن بھی کیا جائے گا۔

◈ جو زانی شادی شدہ ہو اس کی سزا رجم ہے۔ رجم کا طریقہ معروف ہے کہ امام ''زانی'' کو سب کے سامنے کھڑا کرے گا پھر سب لوگ اسے اسکے مرنے تک ایسے پتھر ماریں گے جو نہ تو چھوٹے ہوں اور نہ بڑے ہوں۔ محصن یعنی شادی شدہ سے مراد وہ ہے جس نے نکاح کے بعد بیوی سے ہم بستری بھی کی ہو۔ لہٰذا جسے ابھی تک ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو، وہ ''محصن'' نہیں۔

غرض محصن ہونے کے لیے ہم بستری شرط ہے اور اگر ابھی تک ہم بستری نہیں کی تو وہ محصن نہیں چاہے بیوی ہو یا نہ ہو۔

10۔ بَابُ الْإِقْرَارِ ......اقرار کا بیان

اقرار کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

اقرار لغت میں اعتراف کرنے کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میں اقرار اپنے اوپر کسی حق کے تسلیم کرنے کو کہتے ہیں چاہے وہ مالی ہو یا غیر مالی ہو۔

اقرار کی اقسام اور ان کے احکام:

اقرار کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

(1) یا تو آدمی اپنے اوپر کسی حق کے واجب ہونے کا اقرار کرے گا۔ یہ اپنے اوپر گواہ ہے۔

(2) یا آدمی اپنے لیے کسی حق کا اقرار کرے گا، یہ دوسرے پر اپنے حق کا اقرار ہے۔ اسے دعویٰ کہتے ہیں۔

(3) اور یا آدمی کسی دوسرے کے لیے کسی پر کسی حق کا اقرار کرے گا۔ اسے شہادت کہتے ہیں۔ اب یہ شخص دوسرے کے لیے کسی کے خلاف کسی حق کے اثبات کا گواہ کہلائے گا۔

اب اپنے اوپر کسی کے حق ہونے کا حکم یہ ہے کہ آدمی پر اس کا اقرار شرعاً واجب یعنی ثابت و لازم ہوتا ہے، اور اقرار کرتے ہی وہ شے اس پر لازم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ شے تھوڑی ہو یا زیادہ۔ کہ اقرار کا مقتضیٰ یہی ہے۔ البتہ اقرار علیٰ نفسہ میں یہ شرط ہے کہ اقرار کرنے والا ان لوگوں میں سے ہو کہ اس کا اقرار اس امر میں جاری اور نافذ ہو سکے جس کا وہ اقرار کر رہا ہے۔ تب پھر مقر علیٰ نفسہ کا بالغ اور عاقل ہونا شرط ہوگا۔ پس بالغ کا تو اپنے مال میں کسی کے حق میں اقرار جائز اور نافذ ہوگا جبکہ نا بالغ کا اقرار نافذ نہ ہوگا۔ کیونکہ ابھی اس پر اپنے مال میں تصرف کی بندش ہے۔

پھر اگر یہ شخص اپنے اقرار سے رجوع کرتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ آیا اس کا اقرار کسی آدمی کے حق میں تھا یا رب تعالیٰ کی ذات کے حق میں تھا۔ پس اگر تو اس کا یہ اقرار کسی آدمی کے حق میں تھا تو اب اس کا یہ رجوع غیر مقبول ہوگا کیونکہ اس میں ایک آدمی کے حق کا انکار ہے جو خصومت کا باعث ہے۔ اس لیے یہ اقرار غیر مقبول ہوگا۔ ہاں اگر وہ دوسرا آدمی اس رجوع میں اس کی موافقت کر لے تو اس کا یہ رجوع مقبول ہوگا اور اگر اس کا اقرار رب تعالیٰ کی ذات کے بارے تھا تو اس کا رجوع مقبول ہو گا۔ جیسے کوئی اس بات کا اقرار کرے کہ میں نے زکوٰۃ نہیں دی لیکن پھر رجوع کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تو زکوٰۃ دے دی ہوئی ہے تو اس کا یہ رجوع مقبول ہوگا اور اس کے باطن کو ہم اللہ کے سپرد کر دیں گے اور اسے زکوٰۃ دینے پر مجبور نہ کریں گے۔ البتہ حدود میں...... ان کے حقوق اللہ میں سے ہونے کے باوجود...... اقرار کے بعد رجوع کے مقبول ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بدیہی بات ہے کہ بعض کے نزدیک حدود میں بھی اقرار کے بعد رجوع مقبول ہے اور بعض کے نزدیک مطلق غیر مقبول ہے۔ جبکہ بعض نے اس میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر تو کوئی قرینہ یہ بتلائے کہ یہ اپنے رجوع میں جھوٹا ہے تو اس کا رجوع غیر مقبول ہوگا اور اگر ایسا کوئی قرینہ نہ ہو تو اس کا رجوع مقبول ہوگا۔

حق بات ہی کہی جائے چاہے اپنے خلاف ہی ہو

877۔ عَنْ أَبِي ذَرٍّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی

اللّٰهِ ﷺ: قُلِ الْحَقَّ وَلَوْ كَانَ مُرًّا)). | کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا: ''حق بات کہو چاہے وہ بات کڑوی (ہی) ہو۔''❶

صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ. | امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں اس کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... قُلْ: یہ امر ہے اور وجوب کے لیے ہے۔

وَلَوْ كَانَ مُرًّا: مراد ''قول'' ہے اور یہ تعبیر بجائے یہ کہنے کے کہ ''چاہے وہ حق کڑوا ہی ہو'' زیادہ بہتر ہے کہ یہ مراد ہو کہ: ''چاہے وہ بات کڑوی ہی ہو۔'' کیونکہ حق بات چاہے اوّل وہلہ میں کڑوی ہی لگے لیکن انجام کار میٹھی ہوتی ہے۔ چنانچہ قول مراد لینے سے مرارت (کڑواہٹ) کا وصف قول کے لیے قرار پائے گا نہ کہ مقول کے لیے جو کہ حق ہے۔

قُلِ الْحَقَّ: حق یہ واقع کے مطابق بات کو کہتے ہیں کیونکہ واقع کے مطابق بات ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ حق ہوتی ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کو ہر حال میں حق بات کہنی چاہیے، چاہے اس راہ میں اسے کتنی ہی تلخی کیوں نہ سہنی پڑے۔ اس لیے ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنے کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا ہے۔

مناسبت حدیث :...... رہا یہ سوال کہ مذکورہ حدیث کی ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے خلاف کسی حق بات کو تسلیم کرنا بھی ایک اقرار ہے اور یہ اقرار یقیناً تلخ ہوتا ہے۔ پس بسا اوقات حق کے اقرار میں آدمی کو کسی قسم کی تلخی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ حدیث کو اسی مناسبت سے اس باب کے تحت لے کر آئے ہیں۔

11۔ بَابُ الْعَارِيَةِ ..... عاریت کا بیان

عاریت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:...... یہ لفظ ''یاء'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ ایک مقررہ مدت تک کسی کو اپنی کوئی چیز برتنے کے لیے دینے کو کہتے ہیں۔ پس عاریت عارضی طور پر لی ہوئی چیز کو کہا جائے گا۔❷

جبکہ شرع شریف کی اصطلاح میں بلاعوض کسی شے کی منفعت کا دوسرے کو مالک بنا دینا عاریت کہلاتا ہے۔❸ پس عاریت میں دوسرے کو کسی چیز کے نفع کا مالک تو بنایا جاتا ہے پر اس کی عین آدمی کی ملک میں باقی رہتی ہے۔ تب پھر اگر عاریت میں کسی چیز سے انتفاع کے بعد اس کی عین باقی نہ رہے تو اس پر عاریت کا اطلاق درست نہ ہوگا جیسے کسی کو ادھار کھانے کے لیے روٹی دینا عاریت نہ کہلائے گا کیونکہ اس میں روٹی سے انتفاع کے بعد روٹی کی عین ہی باقی نہ رہے گی۔

عاریت کا حکم

عاریت سنت ہے اور یہ دوسرے پر احسان ہے۔ احسان کرنے کی ترغیب خود رب تعالیٰ نے دی ہے۔

---

❶ صحیح ابن حبان: 361۔ الثقات لابن حبان: 121/2۔ ابن حبان نے اس بابت ابن جوزی کی مخالفت کی ہے جنہوں نے اس حدیث کو ''الموضوعات'' کے ضمن میں درج کیا ہے اور اس بارے ابراہیم بن ہشام کو متہم قرار دیا ہے۔ متعدد ائمہ جرح وتعدیل نے اس حدیث کی وجہ سے ابراہیم کی بابت کلام کیا ہے دیکھیں: ''الترغیب: 340/3''.

❷ القاموس الوحید، ص: 1140,1075. (نسیم)

❸ معدن الحقائق: 219/2. (نسیم)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرة: 195)

''اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

البتہ جو شدید مجبوری اور احتیاج میں ہو، اس کے ساتھ عاریت بسا اوقات واجب ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو شدید سردی میں برتنے کو گرم کپڑے دینا واجب ہوگا تاکہ وہ بیمار یا ہلاک نہ ہو جائے۔ یہی حکم شدید پیاسے کا بھی ہے۔

عاریت کے ارکان:

عاریت دینے والے کو جو منفعت کا دوسرے کو مالک بناتا ہے، معیر اور عاریت لینے والے کو مستعیر اور جو شے عاریت میں دی جائے اس کو مستعار اور عاریت کہا جاتا ہے۔ ❶

عاریت اور اجارہ میں فرق

عاریت میں منافع کی تملیک بلاعوض ہوتی ہے جبکہ اجارہ میں انہی منافع کی تملیک بالمعاوضہ ہوتی ہے۔ ❷

عاریت کی حفاظت ضروری ہے اور عاریت کا معیر کو لوٹانا لازم ہے

878۔ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((عَلَى الْيَدِ مَا أَخَذَتْ حَتّٰى تُؤَدِّيَهُ)).

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہاتھ کے ذمے (اس چیز کا ضمان) ہے جو اس نے لیا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو لوٹا دے (جو اس نے لیا ہے)۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... عَلَى الْيَدِ: ''عَلَى'' یہاں وجوب اور ضمان کے اثبات کے لیے ہے۔

مَا أَخَذَتْ: یعنی ایک ہاتھ نے (مراد ذات ہے یعنی جس آدمی نے کسی سے) جو کچھ لیا ہے جب تک وہ اسے مالک تک لوٹا نہیں دیتا اس کی رعایت وعنایت اس کے ذمہ ہے اور اگر وہ شے کسی تعدی یا کوتاہی کی وجہ سے ہلاک ہوگئی تو اس کا ضمان بھی اس کے ذمہ ہوگا۔ اسی کو ''حَتّٰى تُؤَدِّيَهُ اِلٰى صَاحِبِه'' کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ عاریت لی گئی شے کی حفاظت کرنا

---

❶ معدن الحقائق: 219/2. (نسیم)

❷ معدن الحقائق: 219/2. (نسیم)

❶ سنن ابی داؤد: 3561۔ جامع الترمذی: 1266۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5783۔ سنن ابن ماجه: 2400۔ مسند احمد: 8/5۔ المستدرك للحاكم؛ 55/2۔ امام حاکم نے اس حدیث کو امام بخاری کی شرط پر کہا ہے۔ صاحب ''الالمام'' نے اس بابت امام حاکم سے نزاع کیا ہے جبکہ امام ابن حزم نے ''المحلى: 172/9'' میں یہ کہہ کر امام حاکم پر رد کیا ہے کہ حسن کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ یہ حسن کی بابت تین مذاہب میں سے ایک ہے۔ جبکہ امام بخاری اور ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ حسن کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع مطلق ثابت ہے۔ دیکھیں: ''تحفة المحتاج: 279/2''.

اوراسے صحیح سلامت معیر تک لوٹانا واجب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عاریت لی ہوئی شے کی حفاظت وصیانت اور رعایت وعنایت لازم ہے اور اس کو بحفاظت واپس کرنا واجب ہے۔
- معلوم ہوا کہ عاریت ایک امانت ہے اور شریعت اسلامیہ امانت کے ادا پر بے حد زور دیتی ہے۔
- عاریت لی ہوئی شے سے جب انتفاع پورا ہو جائے تو اس کو واپس کرنا لازم ہے۔
- معلوم ہوا کہ اگر کسی نے عاریت اور امانت میں تعدی کی اور کوتاہی کر کے اس کو ضائع کر دیا تو اس پر ضمان واجب ہوگا۔

امانت کا ادا کرنا واجب ہے

879۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ، وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ)).

Www.KitaboSunnat.com

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ الرَّازِيُّ. وَأَخْرَجَهُ جَمَاعَةٌ مِنَ الْحُفَّاظِ وَهُوَ شَامِلٌ لِلْعَارِيَةِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اسے (اس کی) امانت لوٹاؤ جس نے تیرے پاس امانت رکھی ہے (اور تجھے اپنی امانت کی بابت امین بنایا ہے) اور جو تیرے ساتھ خیانت کرے تو اس کے ساتھ خیانت نہ کر۔'' ❶

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام ابوحاتم رازی نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے اور حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ یہ حدیث عاریت کو شامل ہے۔

غريب الحديث :......**أَدِّ**: یہ واحد مذکر حاضر امر کا صیغہ ہے جو بظاہر ایک کو خطاب ہے لیکن مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی شی کا امین ہو۔ اس بنا پر پوری امت ہی اس خطاب کی مخاطب ہے اور یہاں امر وجوب کے لیے ہے۔

الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ: یعنی امانت اسے لوٹائی جائے جس نے امانت سپرد کی جائے اور امانت کسی قسم کی کمی بیشی اور تعدی وکوتاہی کے بغیر واپس کی جائے۔

وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ: خیانت یہ امانت کے محل اور موقع پر غدر اور دھوکے سے کام لینے کو کہتے ہیں۔ اب نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد اس لیے فرمایا کیونکہ بسا اوقات آدمی کا نفس خیانت کرنے والے کے ساتھ خیانت کرنے پر اسے آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو یاد رہے کہ ایک کے گناہ کے مرتکب ہونے سے دوسرے کے لیے اس کے ساتھ گناہ کرنے کا جواز پیدا نہیں ہو جاتا۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3535۔ جامع الترمذی: 1264۔ مسند احمد: 414/3۔ المستدرك للحاكم: 46/2۔ امام حاکم نے اس حدیث کو مسلم کی شرط پر قرار دیا ہے اور اس کا ایک شاہد بھی ہے جسے امام حاکم نے ذکر کیا ہے۔ جبکہ ابن حزم نے ''المحلى'' (181/8) میں، اور ابن قطان نے اور امام بیہقی (271/10) نے اس حدیث کو معلول کہا ہے اور ابوحاتم اس حدیث کو منکر کہتے ہیں۔ ابن ملقن کہتے ہیں: یہ حدیث چھ طرق سے مروی ہے جو سب مل ملا کر اس حدیث کو قوی بنا دیتے ہیں۔ دیکھیں: ''العلل لابن ابی حاتم: 375/1۔ خلاصة البدر المنير: 150/2

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دواہم باتیں مذکور ہیں:

(1) ایک یہ کہ امانت والے کو اس کی امانت لوٹانا واجب ہے اور بغیر کسی کمی بیشی اور نقص وضرر کے واپس کرنا واجب ہے۔

(2) دوسری یہ کہ آدمی کو کسی حال میں بھی دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی اجازت نہیں چاہے دوسرے نے اس پر ظلم بھی کیا ہو۔ اسی لیے خیانت کرنے والے کے ساتھ بھی خیانت کرنا جائز نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ امانت کو ادا کرنا واجب ہے اور یہی حکم عاریت کا بھی ہے اور اسی مناسبت سے امام موصوف اس حدیث کو عاریت کے باب کے تحت لے آئے ہیں۔

◈ امانت اسی کو واپس کی جائے گی جس نے رکھوائی ہے نہ کہ کسی اور کو۔ البتہ اگر کوئی دوسرا شخص اس بات پر بینہ پیش کر دے یا کوئی قرینہ یہ بتلائے کہ اسے امانت والے نے ہی امانت وصول کرنے کے لیے بھیجا ہے تو اس دوسرے کو امانت دی جائے گی وگرنہ نہیں۔

◈ خیانت مطلق حرام ہے، حتی کہ خیانت کے مرتکب کے ساتھ بھی خیانت کرنا حرام ہے۔

◈ البتہ بیوی کا خاوند کے مال سے بقدر ضرورت لے لینا خیانت کے زمرہ میں داخل نہیں۔ کیونکہ معقول خرچ نہ دینے والے خاوند کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر مال لینا خیانت نہیں بلکہ اپنا حق وصول کرنا ہے۔ یوں اس حدیث میں اور سیدہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں تطبیق ہو جاتی ہے جن کی شکایت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے خاوند حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مال سے بقدر ضرورت ان کے بتائے بغیر لے لینے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی کہ یہ امانت میں خیانت کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ اپنا حق لینے کی اجازت تھی۔

◈ رہا "مسئلہ ظفر [1]" تو اس بابت علماء کے چار اقوال ہیں۔ اقوال کے ذکر سے قبل اس مسئلہ کی تعریف ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ:

اگر کسی نے دوسرے سے اپنا قرض لینا ہے۔ اتنے میں وہ اپنے مقروض کے کسی مال پر قادر ہو گیا تو آیا اسے اپنے مقروض کے اس مال کو ضبط کر لینا جائز ہے؟ اور اس میں سے اپنے قرض کے بقدر مال رکھ لینا درست ہے؟

علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف چار اقوال میں دائر ہے جو یہ ہیں:

(1) پہلا قول:...... ایسا کرنا مطلق منع ہے جس کی دلیل مذکورہ حدیث الباب ہے۔

(2) دوسرا قول:..... ایسا کرنا مطلق جائز ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (البقرة: 194)

"پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔"

اور ابن حزم تو اس کے وجوب تک کے قائل ہیں کہ ایسا آدمی مقروض کے جس مال پر قادر ہوا ہے اس پر اپنے مال کے بقدر اس میں سے لے لینا واجب ہے۔ لیکن بہر حال ایسا کرنا واجب نہیں پس "فَاعْتَدُوْا" کا ارشاد اباحت اور اجازت کے طور پر ہے۔

---

[1] اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: اعلام الموقعین: 418/2.

(3) تیسرا قول یہ ہے کہ اگر تو قرض خواہ اپنے قرض کی جنس میں سے کسی مال کو لیتا ہے تو کوئی حرج نہیں اور اگر وہ اپنے قرض کی جنس کے علاوہ سے لیتا ہے تو یہ منع ہوگا۔

(4) جبکہ چوتھا قول یہ ہے کہ اگر تو حق کا سبب ظاہر ہے تو قرض خواہ اپنے حق کے بقدر لے سکتا ہے اور اگر سبب باطل ہو تو لینے کا اختیار نہ ہوگا جیسے سیدہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا کا سبب حق ظاہر تھا اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خاوند کے مال میں سے لینے کی اجازت مرحمت فرمادی تھی کیونکہ بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے اور وجوب نفقہ کا سبب ظاہر ہے، اور وہ ہے زوجیت۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی چوتھے قول کو اس باب یعنی ''مسئلہ ظفر'' میں اختیار فرمایا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔

عاریت کی اقسام

880۔ وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا أَتَتْكَ رُسُلِيْ فَأَعْطِهِمْ ثَلَاثِيْنَ دِرْعًا قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَعَارِيَةٌ مَضْمُوْنَةٌ، أَوْ عَارِيَةٌ مُؤَدَّاةٌ؟ قَالَ: ((بَلْ عَارِيَةٌ مُؤَدَّاةٌ)).

حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا: ''جب میرے قاصد تمہارے پاس پہنچیں تو انہیں تیس زرہیں دے دینا۔'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ قابل ضمانت عاریت ہوگی یا پھر (باقی ہونے کی صورت میں) قابل واپسی عاریت ہوگی؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(نہیں) بلکہ (یہ) قابل واپسی عاریت (ہوگی)۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ، وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... رُسُلِي: یعنی وہ لوگ جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس بھیجیں گے۔

عَارِيَةٌ مُؤَدَّاةٌ: عاریت مضمونہ کا مطلب واضح ہے کہ جب عاریت لی کسی شے کو استعمال کرتے وقت وہ تلف ہو جائے تو اس کا ضمان لازم ہے۔ رہی عاریت موداۃ تو یہ اس عاریت کو کہتے ہیں جو باقی ہونے کی صورت میں بعینہٖ لوٹائی جائے اور اگر وہ تلف ہو جائے تو مستعیر پر کوئی ضمان نہیں آتا۔ جبکہ عاریت مضمونہ وہ ہوتی ہے جس کے تلف ہو جانے کی صورت میں مستعیر پر ضمان آتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ بیان کیا گیا ہے کہ عاریت کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہوتی ہیں جن کی تفصیل اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ زرہیں عاریت لی اور دی جا سکتی ہیں۔
- معلوم ہوا کہ عاریت دینے میں اعتبار اس شرط کا ہوگا جو معیر مقرر کرتا ہے لہٰذا اگر وہ اسے مضمونہ قرار دے تو مضمونہ ہوگی

---

[1] مسند احمد: 222/4۔ سنن ابی داؤد: 3566۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5776۔ صحیح ابن حبان: 4720۔ ابن حزم "المحلی" (173/9) میں فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے اور عاریت کے باب میں اس کے علاوہ دوسری کوئی صحیح حدیث نہیں۔ اس لیے اس کے سوا دیگر احادیث میں مشغول ہونا صحیح نہیں۔ ضیاء مقدسی نے "المختارہ" (22/8) میں اس کی متابعت کی ہے۔ دیکھیں: "تحفۃ المحتاج: 279/2"۔

اور اگر موداۃ قرار دے تو موداۃ ہوگی۔

◈ رہا یہ سوال کہ اگر عاریت کی شرط مفقود ہو جائے تو آیا وہ مضمونہ بنے گی یا موداۃ رہے گی۔ تو اس بارے علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض نے اس کو موداۃ قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مستعیر پر اس عاریت کا ضمان نہ آئے گا۔ البتہ تعدی اور کوتاہی کی صورت میں ضمان آئے گا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے عاریت کو امانت قرار دیا ہے اور امانت کا حکم یہی ہے کہ اگر تعدی اور کوتاہی کے بغیر امانت تلف ہو جائے تو وہ مضمون نہیں ہوتی۔

جبکہ ایک قول یہ ہے کہ عاریت مشروط کر دینے سے تو مضمون ہوتی ہے وگرنہ نہیں۔ ان علماء کا استدلال حدیث الباب سے ہے۔ جبکہ تیسرا قول یہ ہے کہ جب تک عاریت کے غیر مضمون ہونے کو شرط نہ کر لیا جائے تو یہ مضمون ہی ہوتی ہے۔ البتہ صحیح قول یہ ہے کہ عاریت مضمون نہیں ہوتی الا یہ کہ اس کے مضمون ہونے کو شرط کر لیا جائے۔ کیونکہ عاریت یہ امانت کے عموم میں داخل ہے جو عدمِ تعدی اور عدمِ تفریط کی صورت میں غیر مضمون ہی ہوتی ہے۔

881، 882۔ وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَعَارَ مِنْهُ دُرُوعًا يَوْمَ حُنَيْنٍ، فَقَالَ: ((غَصْبٌ يَا مُحَمَّدُ)) قَالَ: ((بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُونَةٌ)).

حضرت صفوان ابن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: غزوۂ حنین کے دن نبی کریم ﷺ نے ان سے چند زرہیں ادھار مانگیں جس پر انہوں نے (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) عرض کیا: اے محمد! کیا یہ غصب ہوں گی؟ (یعنی کیا آپ ﷺ مجھ سے یہ زرہیں زبردستی لے رہے ہیں جن کو واپس نہ کیا جائے گا) جس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "(نہیں) بلکہ یہ مضمون بن کر عاریت ہوں گی۔"

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَخْرَجَ لَهُ شَاهِدًا ضَعِيفًا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما.

اس حدیث کو امام ابو داؤد، امام احمد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا ایک ضعیف شاہد بھی روایت کیا ہے۔

قصۂ حدیث :......اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے ان کے مسلمان ہونے سے قبل زرہیں عاریت لینے کا قصہ مذکور ہے۔

غریب الحدیث :......أَغَصْبٌ: آپ ﷺ کے زرہیں عاریت مانگنے پر انہوں نے یہ عرض کیا تھا کہ: "أَغَصْبٌ" یعنی "أهي غصبٌ".

عَارِيَةٌ مَضْمُونَةٌ: یعنی اگر وہ زرہیں ہم سے تلف ہو گئیں تو ہم ان کا ضمان ادا کریں گے اور آپ ﷺ نے ایسا ان کی تالیف قلب کے لیے ارشاد فرمایا تھا کیونکہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ ابھی تک مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے۔ جس پر انہوں نے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور ان زرہوں کو اللہ کے واسطے وقف کر دیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ کافر سے بھی جنگی آلات اور سامانِ حرب وضرب ادھار لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت

صفوان رضی اللہ عنہ سے یہ زرہیں ان کے مسلمان ہو جانے سے قبل لی تھیں۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ ہم ان کفار کے دھوکا، فریب اور غداری سے مامون ومحفوظ ہوں۔ لہٰذا اگر تو ان سے اسلحہ ادھار لینے میں ان سے کسی قسم کے غدر کا اندیشہ ہے تو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ بہرحال کافر مسلمانوں کا دشمن ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ (الممتحنة: 1)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔''

اور فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ﴾ (المائدة: 51)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔''

◈ مذکورہ حدیث کا حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک کمزور شاہد روایت کرنے والے امام حاکم ہیں۔ کیونکہ ضمیر کا مرجع ہمیشہ قریب ترین مذکور ہوتا ہے۔ البتہ اگر کسی بعید مذکور کے مرجع ہونے کا کوئی قرینہ ہو تو اور بات ہے۔

12۔ بَابُ الْغَصْبِ ......غصب کا بیان

غصب کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:......لغت میں غصب کسی سے کوئی چیز زبردستی لے لینے کو کہتے ہیں۔ چاہے وہ شے مال ہو یا غیر مال جیسے اولاد، اور زوجہ وغیرہ۔ جبکہ اصطلاح شرع میں غصب حق دار کو بے دخل کر کے اس پر ناحق قبضہ کر لینے کو کہتے ہیں۔

ناحق کی قید لگانے سے خود اپنے مال کو جو کسی چور کے پاس موجود ہو، اس سے زبردستی لے لینا اس حکم میں داخل نہیں۔ بلکہ یہ اپنا حق لے لینا ہے۔ زبردستی کی قید سے دھوکا سے اور لاعلمی سے کسی سے کچھ لے لینا، اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔

غصب کا حکم

غصب کرنا حرام ہے کتاب وسنت اس پر ناطق ہیں اور امت کا اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ﴾ (النسآء: 29)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضا مندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو۔''

اس آیت میں رب تعالیٰ نے باطل طریق سے دوسرے کا مال کھانے سے منع فرمایا ہے۔ بلاشبہ چھین کر کھانا باطل طریق سے کھانا ہے جو اس آیت میں مذکور تحریم میں داخل ہے۔

جبکہ اس بارے احادیث متواتر ہیں کہ دوسرے سے زبردستی چھین کر کوئی شے استعمال کرنا حرام ہے۔ گو یہ تواتر معنوی ہی سہی اور کتاب وسنت کی ان صریح نصوص کے بعد غصب کے حرام ہونے پر امت کا اجماع منعقد ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

بالشت بھر زمین بھی غصب کرنے کا انجام

883۔ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

اللّٰہِ ﷺ قَالَ: ((مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ))۔
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ارشاد ہے: ’’جس نے ظلم کر کے بالشت بھر زمین بھی (ہتھیا) لی، روزِ قیامت رب تعالیٰ اس بالشت کا سات زمینوں (تک) سے طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالیں گے۔‘‘ ❶
یہ حدیث ’’متفق علیہ‘‘ ہے۔

غریب الحدیث:......مَنِ اقْتَطَعَ: مذکورہ ”مَنْ“ شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے اور ”اقْتَطَعَ“ سے مراد زمین کا ایک قطعہ لے لینا ہے۔

ظُلْماً: یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ ”اقْتَطَعَ“ کی ضمیر سے حال ہے۔

شِبْرًا: ایک بالشت: یہ چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کو مخالف جانب پھیلانے سے ان کے سروں کے درمیان بننے والی پیمائش کو کہتے ہیں صحیح بخاری کی ایک روایت میں ”شِبْرًا“ کی بجائے ”شيئًا“ کا لفظ آتا ہے جو از حد عموم پر دلالت کرتا ہے۔ تب پھر مذکورہ وعید بالشت سے کم اور زیادہ ہر قسم کی مقدار کو شامل ہوگی۔ بہر حال یہ دونوں لفظ قلت میں مبالغہ پر دلالت کرنے کے لیے آئے ہیں۔

طَوَّقَهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: ”إِيَّاهُ“ کی ضمیر کا مرجع ”شِبْرًا“ ہے اور ”طَوَّقَهُ“ کا مطلب ہے کہ اس بالشت بھر کا سات زمین تک طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا جیسے عورتیں گلے میں زینت کے لیے کوئی ہار نما زیور پہنتی ہیں۔

مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ: یہ دونوں جار مجرور ”طَوَّقَ“ فعل سے متعلق ہیں۔ بالشت بھر زمین ناجائز قبضہ کرنے پر اتنی زمین کا سات زمینوں تک طوق بنا کر پہنانے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی جب زمین کے کسی حصہ کا مالک ہو جاتا ہے تو سات زمینوں تک کا مالک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے غصب کی زمین بھی سات زمینوں تک طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالی جائے گی۔ گویا کہ اس نے صرف اوپر کی سطح کی زمین چھین لینے کا ہی ظلم نہیں کیا بلکہ اس کا یہ ظلم سات زمینوں تک سرایت کرتا ہے۔ مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- دوسرے کی زمین غصب کر لینے کی بے حد سخت وعید آئی ہے۔
- البتہ برحق زمین لینا کوئی جرم نہیں جیسا کہ ”ظلما“ کی قید سے یہ مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔
- نیک یا بد جیسا عمل ہوگا روزِ قیامت اس کی جزا یا سزا بھی اسی کی جنس سے ہوگی۔
- معلوم ہوا کہ زمینیں بھی آسمانوں کی طرح سات ہیں اور یہ زمینیں تہ بہ تہ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ تہ اوپر کی زمین کے اور فضا نیچے کی زمین کے تابع ہوتی ہے۔ ❷
- روزِ قیامت کے واقعات کو دنیاوی شب و روز کے واقعات پر قیاس کرنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ دنیا میں کسی کے گلے میں سات زمینوں تک کو کھود کر ان کا طوق بنا کر کسی کے گلے میں ڈالنا از حد ناممکن ہے لیکن روزِ قیامت ایسا ہوگا۔

---

❶ صحيح البخاري: 2452۔ صحيح مسلم: 1610.
❷ دیکھیں: المبدع: 369/1۔ شرح العمدة لابن تيمية: 476/4.

ادلے کا بدلہ

884- وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهِ، فَأَرْسَلَتْ إِحْدَى أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ مَعَ خَادِمٍ لَّهَا بِقَصْعَةٍ فِيْهَا طَعَامٌ، فَضَرَبَتْ بِيَدِهَا فَكَسَرَتِ الْقَصْعَةَ فَضَمَّهَا، وَجَعَلَ فِيْهَا الطَّعَامَ، وَقَالَ: ((كُلُوْا)) وَدَفَعَ الْقَصْعَةَ الصَّحِيْحَةَ لِلرَّسُوْلِ، وَحَبَسَ الْمَكْسُوْرَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ اپنی ایک زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے کہ اتنے میں ایک دوسری ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اپنے خادم کے ہاتھ ایک برتن (بڑے پیالے) میں کوئی کھانا دے کر بھیجا۔ پس ان زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا نے ہاتھ کی ضرب لگائی جس سے وہ پیالہ (گرکر) ٹوٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس برتن (کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر ان) کو ملایا اور اس میں وہ کھانا ڈالا اور ارشاد فرمایا: ''(اس کھانے کو) کھاؤ۔'' اور لانے والے خادم کو ایک صحیح پیالہ (بدلے میں) عنایت فرمایا: جبکہ وہ ٹوٹا ہوا پیالہ اپنے پاس رکھ لیا۔ ❶

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَسَمَّى الضَّارِبَةَ عَائِشَةَ، وَزَادَ: فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((طَعَامٌ بِطَعَامٍ، وَإِنَاءٌ بِإِنَاءٍ)). وَصَحَّحَهُ.

اس حدیث کو امام بخاری اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کا نام سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ذکر کیا ہے اور یہ مزید روایت کیا ہے۔ پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کھانے کے بدلے کھانا اور برتن کے بدلے برتن (دینا لازم ہے)۔'' اور انہوں نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

مناسبت حدیث:......امام موصوف مذکورہ حدیث کو غصب کے باب کے تحت اس مناسبت سے لائے ہیں کہ دوسرے کی شے کو تلف کر دینا بھی غصب کی اصطلاحی تعریف میں داخل ہے جو یہ ہے کہ: ''غصب یہ دوسرے کے مال پر زبردستی اور ناحق قبضہ کرنا ہے۔''

البتہ یاد رہے کہ مذکورہ قصہ غصب کے مصداق میں واضح نہیں ہے، ہاں یہ اعتداء ضرور ہے۔

قصۂ حدیث:...... یہ واقعہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پیش آیا جو نبی کریم ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کرنے کے معاملہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دوسری بیگمات کے حق میں شدید غیرت والی بھی تھیں۔ پھر سب سے کم سن بھی تھیں اسی لیے جب ان کی باری کے دن ایک دوسری زوجہ مطہرہ نے نبی کریم ﷺ کی خوشنودی کے لیے ان کے گھر میں کھانا بھیجا تو انہیں اس بات پر بے حد غیرت آئی۔ چنانچہ شدت غیرت کی وجہ سے انہوں نے ہاتھ مار کر وہ پیالہ بھی توڑ دیا اور وہ کھانا بھی گرا دیا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر دو مسائل ذکر کیے گئے ہیں:

(1) اگر کسی کی کوئی چیز تلف کی ہے تو اس کا مثل یا ضمان دینا واجب ہے۔

❶ صحيح البخاري: 481- جامع الترمذي: 1359- امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

(2) سوکنوں کا ایک دوسرے پر غیرت کھانا طبعی امر ہے البتہ اس جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسری سوکن پر ظلم کرنا جائز نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ غیرت یہ غضب کی طرح کا ایک جذبہ ہے جس میں بسا اوقات انسان اپنے بس میں نہیں رہتا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے نہ تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ڈانٹا اور نہ کوئی سرزنش فرمائی بلکہ ٹوٹے پیالے کے ٹکڑے جمع کیے اور انہی ٹکڑوں میں وہ کھانا دوبارہ رکھ دیا۔

◈ بظاہر وہ کھانا ایسا نہ تھا کہ نیچے گر کر خراب ہوتا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے کھانا اکٹھا کرنے کے بعد فرمایا کہ: ''(اسے) کھالو۔'' شاید وہ کھجوریں ہی ہوں۔

◈ نبی کریم ﷺ نے ٹوٹے پیالے کے بدلے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر کا ایک صحیح پیالہ لانے والے خادم کو دیا۔ یہی ''پیالے کے بدلے پیالہ'' کا معنی ہے۔

◈ وہ کھانا سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے بھیجا تھا۔

◈ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کھانا زمین پر گر کر خراب ہو گیا جس کو سمیٹ کر نبی کریم ﷺ نے ٹوٹے پیالے میں رکھ دیا اور فرمایا: ''اس کو کھاؤ'' یوں ''کھانے کے بدلے کھانا'' کا معنی بھی پورا ہو گیا۔ وہ یوں کہ سیدہ زینب کے بھیجے کھانے کو نبی کریم ﷺ نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کھانا بنا دیا تاکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا کھانا گویا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا کھانا بنے۔ یوں آپ ﷺ نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا کھانا کھایا نہ کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا۔

◈ یاد رہے کہ صاحب قصہ کے نام کو مبہم رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا، اسے کتمانِ علم نہیں کہتے۔ جب تک کہ کوئی شرعی حکم صاحب قصہ سے متعلق نہ ہو۔

◈ حضرات اسلاف اکابر کی اصل توجہ معنی اور قصہ کی روایت پر ہوتی تھی نہ کہ ناموں کے ذکر اور ان کی تعیین پر۔ اس کی دلیل "كَانَ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ خادم کو خدمت کے لیے رکھنا جائز ہے۔

◈ دوسروں کو پکے ہوئے کھانے کا ہدیہ بھیجنا جائز ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور اہل بیت کو ہدیہ دینا اور آپ ﷺ اور حضرات اہل بیت کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔

◈ غیرت کے مقتضی کے مطابق کیے فعل پر آدمی قابل ملامت نہیں ہوتا۔

◈ اگر کسی نے دوسرے کے ہاتھ پر یا پیٹھ پر ہاتھ کی کوئی ضرب لگائی ہے اس میں کوئی قصاص نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہاتھ پر ضرب مارنے والی زوجہ مطہرہ سے قصاص لینے کا حکم نہ دیا تھا۔

◈ نبی کریم ﷺ بے حد حلیم اور بردبار تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان تھپٹر مارنے والی زوجہ مطہرہ پر کوئی سرزنش نہ فرمائی تھی۔

◈ مثلی کا تاوان اس کے مثل سے ہی دیا جائے گا چاہے وہ موزونی ہو یا مکیلی اور معدودی ہو یا مذروعی اور یہ حکم مصنوعی کا بھی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ٹوٹا پیالہ تو پاس رکھ لیا اور بدلے میں اس کے جیسا دوسرا پیالہ دے دیا۔

غصب کی گئی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کا حکم

885۔ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : ((مَنْ زَرَعَ فِي أَرْضِ قَوْمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِمْ فَلَيْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ شَيْءٌ ، وَلَهُ نَفَقَتُهُ)) .
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ . وَيُقَالُ: إِنَّ الْبُخَارِيَّ ضَعَّفَهُ .

حضرات رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے دوسرے لوگوں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کھیتی کی تو اسے کھیتی (کی پیداوار) سے کچھ بھی نہ ملے گا البتہ اسے (کھیتی پر کیا) اپنا خرچ (ضرور) ملے گا۔'' [1]
اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی رحمہ اللہ کے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

شرح :...... دوسرے کی اجازت کی بغیر اس کے کھیت میں کوئی کھیتی کرنا یہ بھی غصب ہے۔ اسی لیے غصب کی زمین میں کی گئی کھیتی اور اس میں اگنے والی پیداوار کی بابت نبوی فیصلہ یہ ہے کہ اس غصب کرنے والے کو پیداوار میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ دراصل یہ زمین اس کی نہیں بلکہ غصب شدہ ہے۔ البتہ اس نے جتنا خرچ کیا ہے وہ اس کو ملے گا۔ جس میں کھیتی کرنے کی رائج اور معروف مزدوری، بیج کی قیمت اور دیگر اخراجات شامل ہیں۔ البتہ پیداوار اس کی نہ ہوگی کیونکہ وہ زمین سے اور پانی کے ذریعے پیدا ہوئی ہے اور یہ دونوں چیزیں اس کی نہیں تھیں۔

البتہ بعض علماء نے یہ قول بھی کیا ہے کہ پیداوار غاصب کی ہوگی اور زمین کے مالک کو اتنے عرصہ تک زمین کو اپنے تصرف میں رکھنے کی اجرت غاصب کی طرف سے دی جائے گی۔

لیکن یہ قول حدیث کے ظاہر کے خلاف ہے جو ایک دوسرے پر ظلم و تعدی کرنے کے دروازے تک لے جائے گا۔ کہ یوں کوئی بھی اٹھے گا اور دوسرے کی زمین پر جبری قبضہ کر کے کاشت کر لے گا اور اپنی فصل اٹھا کر زمین والے کو اتنے عرصہ کا کرایہ تھما کر چلتا بنے گا۔ جبکہ زمین والا زمین پر کچھ کاشت کر کے نفع اٹھانے سے محروم رہے گا۔ یوں ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کا وہ دروازہ کھلے گا جو بند ہونے میں نہ آئے گا۔ اس لیے صحیح قول وہی ہے جو خود حضرتِ رسالت مآب ﷺ کا ارشاد بابرکات ہے کہ ایسے غاصب کی یہی سزا ہے کہ اسے کچھ بھی نہ ملے تاکہ دوسروں کو اس سے عبرت ہو۔ اس بابت ایک تیسرا قول بھی ہے جس کی تفصیل ذیل کی حدیث میں آ رہی ہے۔

دوسرے کی زمین میں محنت کرنے کا حکم

886۔ وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

---

[1] مسند احمد: 465/3- سنن ابی داؤد: 3403- جامع الترمذی: 1366- سنن ابن ماجہ: 2466- سنن البیہقی: 136/6- امام بیہقی فرماتے ہیں: اس حدیث کو روایت کرنے میں شریک متفرد ہے جو ایک مختلف فیہ راوی ہے۔ یحییٰ بن قطان شریک سے روایت نہ کیا کرتے تھے اور ان کی حدیث کو بے حد ضعیف کہا کرتے تھے۔ پھر یہ بھی منقول ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منقطع کہا ہے جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ کی تضعیف "علل الترمذی، ص: 211" میں مذکور ہے۔

رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ أَرْضٍ غَرَسَ أَحَدُهُمَا فِيْهَا نَخْلًا وَالْأَرْضُ لِلْآخَرِ ، فَقَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْأَرْضِ لِصَاحِبِهَا ، وَأَمَرَ صَاحِبَ النَّخْلِ أَنْ يُّخْرِجَ نَخْلَهُ ، وَقَالَ: ((لَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ)).

کریم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے ایک صاحب بیان فرماتے ہیں کہ: دو آدمی ایک زمین کی بابت جھگڑا لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے جن میں سے ایک نے تو زمین میں کھجور کا ایک درخت لگایا تھا۔ جبکہ زمین دوسرے کی تھی۔ سو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں میں یہ فیصلہ فرمایا کہ زمین تو مالک کی ہوگی اور کھجور والے کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ (زمین سے) اپنا کھجور کا درخت نکال لے اور یہ بھی فرمایا: ''ظالم (یعنی ناحق) جڑوں کا کوئی حق نہیں۔'' ❶

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔

وَآخِرُهُ عِنْدَ أَصْحَابِ السُّنَنِ مِنْ رِوَايَةِ عُرْوَةَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ

اصحاب سنن نے اس حدیث کے آخر کو ''عن عروۃ عن سعید بن زید'' کی روایت سے روایت کیا ہے۔

وَاخْتُلِفَ فِيْ وَصْلِهِ وَإِرْسَالِهِ ، وَفِيْ تَعْيِيْنِ صَحَابِيِّهِ.

علماء کا اس حدیث کے مرسل اور موصول ہونے میں اور اس حدیث کے صحابی کی تعیین میں اختلاف ہے جن سے یہ حدیث مروی ہے۔ ❷

غریب الحدیث :......قَالَ رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ: صحابی رسول کے نام کے مجہول ہونے سے حدیث کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔ جیسا کہ یہ مضمون بارہا گزر چکا ہے۔

إِنَّ رَجُلَيْنِ: یہاں بھی ان دو آدمیوں کے مجہول ہونے سے حدیث میں کوئی قدح واقع نہیں ہوتی۔

اِخْتَصَمَا إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: ''إِلَى'' یہاں انتہائے غایت کے لیے ہے۔ یعنی وہ دونوں اپنا جھگڑا لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان دونوں حضرات کا جھگڑا نبی کریم ﷺ تک پہنچ گیا۔

اور ''اِخْتَصَمَا'' کا مطلب یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ حجت میں غالب ہے نہ کہ یہ مراد ہے کہ وہ دونوں حضرات ایک دوسرے سے الجھ پڑے یا دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔

ان دونوں حضرات میں جھگڑا اس بات کا تھا کہ ایک کی زمین میں دوسرے نے اپنا کھجور کا درخت لگا رکھا تھا۔

فَقَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْأَرْضِ لِصَاحِبِهَا: نبی کریم ﷺ نے ان دونوں میں فیصلہ فرمایا کہ زمین تو مالک کی ہی رہے گی۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3074۔ مؤطا مالك: 743/2۔ امام دارقطنی ''العلل'' (415/4) میں کہتے ہیں: یہ حدیث اصح ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث ''باب من احیا ارضا مواتا'' میں حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے تعلیقاً روایت کی ہے۔ دیکھیں: ''تغلیق التعلیق: 308/3''۔

❷ سنن ابی داؤد: 3073۔ جامع الترمذی: 1378۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب کہا ہے۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5761۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' (19/5) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: ''التلخیص: 54/3''۔

یادرہے کہ یہ جھگڑا زمین کی ملکیت کی بابت نہ تھا کیونکہ یہ بات وہ دونوں مانتے تھے کہ زمین اس کے مالک کی ہی ہے۔ جھگڑا اس بات میں تھا کہ مالک دوسرے کو یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنا درخت میری زمین سے اکھاڑ کر لے جاؤ۔ جس پر آپ ﷺ نے فیصلہ کی ایک شق تو یہ سنائی کہ یہ زمین اس کے مالک کی ہوگی۔ جبکہ دوسری شق یہ تھی۔

وَأَمَرَ صَاحِبَ النَّخْلِ أَنْ يُخْرِجَ نَخْلَهُ: کہ کھجور والا اپنا درخت نکال کر کہیں اور لے جائے۔ لیکن چونکہ ایسا کرنے میں بسا اوقات کھجور کے درخت کے ضائع ہوجانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اسی لیے وہ آدمی جھگڑ رہا تھا اور درخت کو وہیں لگے رہنے پر مصر تھا۔ کھجور والے کے اسی اصرار پر آپ ﷺ نے آخر میں یہ ارشاد فرمایا:

لَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ: یعنی کھجور کی وہ جڑیں جو کسی زمین میں بلا استحقاق لگی ہوں، ان کو اسی زمین میں لگے رہنے کا کوئی حق نہیں۔

مضمون حدیث :...... حدیث کا مضمون واضح ہے کہ زمین کے مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے سے جب چاہے اپنی زمین خالی کرا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی زمین میں دوسرے نے جو کچھ کر رکھا ہوگا اسے اس سب کو ہٹا لینا لازم ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی جھگڑوں کے ہوجانے کی دلیل ہے اور نبی کریم ﷺ نے جھگڑا ہو جانے پر کوئی نکیر نہیں فرمائی کہ یہ فطرت کا مقتضی ہے۔ البتہ جھگڑے میں عدل کا فیصلہ شرعاً مطلوب اور واجب ہے اور عادلانہ فیصلہ تسلیم کرنا بھی واجب ہے اور یہ کہ جھگڑا کسی کی عدالت کے منافی نہیں۔
- اگر کسی نے دوسرے کی زمین میں کچھ لگا رکھا ہے تو مالک کے مطالبہ پر اس کو وہاں سے ہٹا لینا واجب ہوگا۔
- دوسرے کی زمین میں لگائے درخت یا بنائی عمارت کو ہٹانے میں اگر زمین میں کوئی گڑھا وغیرہ ہو جاتا ہے تو اس کو بھروانا یا اس کا ضمان دینا اس دوسرے کے ذمہ ہوگا کیونکہ یہ اس کے فعل کا اثر ہے۔
- اور اگر زمین کا مالک کھجور کے مالک سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ یہ درخت یہیں لگا رہنے دو اور مجھ سے اس کی قیمت لے لو تو کھجور یا عمارت والے کو یہ بات ماننا لازم نہیں۔ [1]
- معلوم ہوا کہ اگر دوسرے کی زمین لگی جڑ برحق ہو تو مالک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اسے اکھڑوائے۔ جیسے کسی نے کرائے پر زمین لے کر اس میں گندم کاشت کی تو اجارہ کی مدت پوری ہونے پر مالک کھیتی کو زبردستی نہیں اکھڑوا سکتا۔ ہاں اپنے وقت پر اس کو کاٹ لیا جائے گا۔

دوسرے اگر خود کھیتی کا مالک کاٹنا چاہتا ہے یا وہاں سے اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ لے جا کر بونا چاہتا ہے تو اسے بھی ایسا کرنے سے نہ روکا جائے گا۔ لیکن اگر وہ ایسا کر کے زمین کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے روکا جائے گا۔ کیونکہ اس میں اپنا بھی نقصان ہے اور دوسرے کا بھی۔ جبکہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں باتوں سے ہی منع فرمایا ہے کہ ''نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ۔'' [2]

---

[1] المغنی لابن قدامۃ: 199/5.

[2] قال النبی ﷺ: "لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ"، سنن ابی داؤد: 3073.

◈ آخر میں امام موصوف رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کی بابت دو اضطرابات کو ذکر کیا ہے:
(1) مذکورہ حدیث کے راوی صحابی کی تعیین میں اختلاف ہے۔
(2) اس حدیث کے وصل اور وقف میں اختلاف ہے۔

تو یاد رہے کہ صحابی رضی اللہ عنہم کی تعیین نہ ہونے سے حدیث کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا جیسا کہ یہ بات بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔ البتہ حضرات محدثین میں وصل و وقف کے اختلاف کے صحتِ حدیث پر اثر انداز ہونے میں ضرور اختلاف ہے۔ لیکن صحیح قول اس باب میں بھی یہی ہے کہ اگر وصل کرنے والا راوی ثقہ ہو تو یہ حدیث میں قدح نہیں کیونکہ ایک تو وصل میں ''زیادہ علم'' ہے۔ دوسرے وصل یہ ارسال کے منافی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی حدیث کے وصل وارسال میں اختلاف ہو تو ہم وصل کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ وصل کرنے والا راوی ثقہ ہو۔

جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت کا بیان

887۔ وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنًى: ((إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ، عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هَذَا، فِيْ بَلَدِكُمْ هَذَا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عید قرباں کے دن منیٰ میں اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تم پر (اسی طرح) حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن کی تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینہ میں حرمت ہے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح: ...... نبی کریم ﷺ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ ہر موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے اور امت مسلمہ کی دنیا و آخرت کی سعادت و بھلائی کی سعی فرماتے تھے اور موقع بہ موقع انہیں ایسی باتوں کی وصیت فرماتے رہتے تھے جن میں ان کی دنیا و آخرت کا بھلا ہو۔ ایسے ہی مواقع میں سے ایک یہ موقع بھی تھا جو حجۃ الوداع کا موقع ہے۔ اس موقع پر تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک میدان میں ایک آواز پر پوری یکسوئی اور قلبی توجہ کے ساتھ کان دھرے کھڑے اور اللہ اور رسول ﷺ کے حکم پر سب کچھ لگا دینے کو تیار کھڑے تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس انتہائی قیمتی موقع پر انہیں از حد بنیادی اور اساسی باتوں کی تعلیم فرمائی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس دن، اس شہر اور اس مہینہ کی حرمت وعظمت کو بیان فرما کر مسلمانوں کو تین اہم ترین باتوں کی تاکیدی وصیت فرمائی، جو یہ ہیں:

(1) مسلمانوں پر ایک دوسرے کی جانیں حرام ہیں۔
(2) مسلمانوں پر ایک دوسرے کے مال حرام ہیں۔
(3) مسلمانوں پر ایک دوسرے کی آبرو حرام ہے۔

پس خونوں کا اطلاق قتل اور قتل سے کم جرائم یعنی زخموں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ قتل ہو یا زخم دونوں میں خون بہایا جاتا ہے اس لیے یہ دونوں جرم حرام ہیں۔ البتہ یہ حکم ناحق جان لینے کا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو قصاص میں جان سے مارا یا کوئی زخم لگایا، اسی

[1] صحيح البخاري: 1741۔ صحيح مسلم: 1679.

طرح اگر کسی شادی شدہ زانی کو حد میں جان سے مارا یا اس سے کم زخم لگایا جیسے چوری کی حد میں ہاتھ کاٹے تو یہ صورتیں اس مذکورہ حکم سے مستثنیٰ ہوں گی۔ اسی طرح کسی مسلمان بھائی کا مال ناحق لے لینا حرام ہے، اپنے اوپر واجب حق کا انکار یا کتمان بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ کیونکہ ناحق مال لینے کی دو ہی صورتیں ہیں:

(1) یا تو جو خرچ کرنا واجب ہے اس کا چھپانا ناحق مال لینا کہلاتا ہے۔

(2) اور یا پھر اس مال کا لینا ناحق لینا کہلاتا ہے جس کے لینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

اور کسی مسلمان کی آبروریزی کا حرام ہونا بدیہی ہے۔ البتہ ہر مقام کے کچھ شرعی استثناءات ضرور ہوتے ہیں۔

غریب الحدیث: ...... كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا: یہ تاکید کے باب میں سے ہے۔ یہ یوم نحر کا بیان ہے جو ماہِ ذوالحجہ کا جو خود حرمت والا مہینہ ہے، سب سے افضل دن ہوتا ہے۔ البتہ اس دن کی فضیلت حدودِ حرم اور منیٰ میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے اور ''باب الغصب'' کے تحت اس حدیث کو لانے کی مناسبت کسی کا ناحق مال لینا ہے، کہ یہ بھی غصب کے حکم میں ہے جو حرام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ امت تک احکام شرعیہ پہنچا دینے کے بے حد خواہش مند تھے۔

◈ امام یا اس کے نائب کے لیے قربانی کے دن خطبہ دینا مستحب ہے۔

◈ دوسروں کی جان، مال اور عزت وآبرو حرام ہے۔

13۔ بَابُ الشُّفْعَةِ ...... شفعہ کا بیان

شفعہ کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

تمہید: ...... لغت میں ''شفعہ'' یہ "الشَّفْعَ" سے ماخوذ ہے جو ملانے اور ضم کرنے کو کہتے ہیں چنانچہ شفعہ یہ وتر کی ضد ہے اور یہی معنیٰ شفاعت کا ہے کہ اس سے مذنبین فائزین سے جا ملیں گے۔ ❶

اور شفعہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ اس میں شفیع مبیع کے باقی رکھنے میں مشتری سے سفارش کرتا ہے۔ یعنی چونکہ شفیع شفعہ کے ذریعے مبیع کو اپنی ملک کے ساتھ ملاتا ہے اس لیے اسے شفعہ کا نام دیا گیا ہے۔ ❷

اصطلاح میں شفعہ یہ مشتری پر زبردستی کر کے اس مال کے بدلے زمین یا مکان کا مالک بننا ہے جتنے میں اس مشتری نے اس زمین یا مکان کو خریدا ہوتا ہے۔

شفعہ کا حکم:

شفعہ احادیث صحیحہ ثابتہ سے ثابت ہے۔ اس لیے آدمی کو دوسرے پر شفعہ کا دعویٰ کرنا جائز ہے۔

شفعہ کن چیزوں میں ہوتا ہے

888۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضي الله عنهما قَالَ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

((قَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَا نبی کریم ﷺ نے ہر اس (جائیداد) میں شفعہ (کرنے کے

---

❶ معدن الحقائق: 290/2۔ (نسیم) ❷ معدن الحقائق: 290/2۔ (نسیم)

لَمْ يُقْسَمْ . فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ ، وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ فَلا شُفْعَةَ)).

جواز) کا حکم دیا (یعنی فیصلہ سنایا) جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی ہو، پس جب حدود قائم ہو جائیں اور راستے جدا کر لیے جائیں تو اب (اس جائیداد میں) کوئی (حقِ) شفعہ نہیں۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

وَفِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ: ((الشُّفْعَةُ فِي كُلِّ شِرْكٍ ، فِي أَرْضٍ ، أَوْ رَبْعٍ ، أَوْ حَائِطٍ لَا يَصْلُحُ ، وَفِيكَ لفظ: لا يَحِلُّ أَنْ يَبِيعَ حَتَّى يَعْرِضَ عَلَى شَرِيكِهِ)).

جبکہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''شفعہ ہر مشترک (جائیداد) میں (کیا جا سکتا) ہے (جیسے مشترکہ) زمین یا گھر یا باغ میں۔ ❷ (ایک شریک دوسرے شریک پر شفعہ کر سکتا ہے) پھر آگے صحیح مسلم کو ایک روایت میں ''لَا يَصْلُحُ'' کے جبکہ ایک روایت میں ''لا یحل'' کے الفاظ آتے ہیں۔ (یعنی کسی شریک کے لیے) یہ بات مناسب نہیں یا حلال نہیں کہ وہ (اپنا حصہ) بیچ دے یہاں تک کہ (پہلے اسے) اپنے شریک پر پیش (نہ) کر لے۔''

وَفِي رِوَايَةِ الطَّحَاوِيِّ: ((قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ شَيْءٍ)). وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ .

اور امام طحاوی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: نبی کریم ﷺ نے ہر شے میں شفعہ کرنے کے حق ہونے) کا فیصلہ فرمایا۔ ❸

اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث :......**قَضَى**: یعنی فیصلہ فرمایا اور حکم سنایا۔ یہاں قضا سے قضاءِ شرعیہ مراد ہے نہ کہ قضاءِ کونیہ۔ لہٰذا ''قَضَى بِالشُّفْعَةِ'' کا معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا شرعی فیصلہ فرمایا کہ ایک شریک دوسرے شریک پر شفعہ کر کے اس کے حصہ کو اس شخص سے لے سکتا ہے جس کو اس نے اپنا حصہ فروخت کیا ہوتا ہے۔

فِي كُلِّ مَا لَمْ يُقْسَمْ: ان الفاظ میں دو ''عموم'' کا ذکر ہے۔ ایک عموم لفظ ''كُلِّ'' میں ہے جبکہ دوسرا عموم لفظ ''مَا'' میں ہے اور مذکور ''ما'' موصولہ ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔

غرض آپ ﷺ نے ہر اُس شے میں شفعہ کے جواز کا فیصلہ فرمایا جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی اور مذکورہ عموم جائیداد مکان، زمین، حیوان، جماد وغیرہ سب چیزوں کو شامل ہے۔ لیکن جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ:

فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ: تو ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ شفعہ کا تعلق صرف اور صرف زمین اور جائیداد سے ہی ہے۔ کیونکہ حدود اور طرق کے وصف کا اطلاق صرف زمین اور جائیداد پر ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ رستے اور حدود زمین اور جائیداد کے سوا اور کسی چیز میں نہیں پائے جا سکتے۔ اسی بنا پر اکثر فقہاء کا قول یہی ہے کہ شفعہ صرف مشترکہ زمین اور جائیداد میں ہی ہو سکتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ شفعہ صرف اموالِ غیر منقولہ میں ہی ہوتا ہے نہ کہ اموالِ منقولہ میں بھی ہوتا ہے۔ جیسے گاڑیاں، غلے، میوے، مصنوعات وغیرہ۔

---

❶ صحيح البخاري: 2257۔ صحيح مسلم: 1608 .
❷ صحيح مسلم: 1608 .
❸ شرح معاني الآثار للطحاوي: 126/4 .

پھر بعض فقہاء نے ان الفاظ سے ایک اور بھی زیادہ خاص مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ شفعہ جائیدادوں اور زمینوں میں سے بھی، صرف ان جائیدادوں اور زمینوں میں ہوسکتا ہے جن کو تقسیم کرنا ممکن ہو، جیسے بہت چھوٹے گھر یا باغ جن کو تقسیم نہ کیا جا سکتا ہو، ان میں شفعہ نہ ہوگا۔ اب یہ کل تین اقوال ہو گئے:

(1) شفعہ ہر چیز میں ہوسکتا ہے۔

(2) شفعہ صرف زمین جائیداد میں ہی ہوسکتا ہے خواہ وہ کیسی ہی ہو۔

(3) شفعہ صرف قابل تقسیم زمین یا جائیداد میں ہوسکتا ہے۔

لیکن غور و تامل کے بعد صحیح قول پہلا نظر آتا ہے کہ شفعہ ہر شے میں ہوسکتا ہے خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔ کیونکہ اس باب میں راجح قول یہ ہے کہ یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جب ایک عموم کو ذکر کیا جاتا ہے پھر اس کی تفریع ذکر کی جائے تو یہ تفریع تخصیص کا حکم نہیں رکھتی لہٰذا وہ عموم باقی رہے گا۔ تب پھر صحیح قول یہ ہے کہ شفعہ ہر شے میں ہوسکتا ہے چاہے شفیع اور مشفوع کسی بھی چیز میں شریک ہوں۔

مذکورہ الفاظ سے علماء و فقہاء نے ایک مسئلہ یہ اخذ کیا ہے کہ پڑوسی کو حق شفعہ نہیں۔ کیونکہ جب تقسیم کے بعد حدود اور رستے متعین اور مقرر ہو جاتے ہیں تو اب وہ شریک کی بجائے پڑوسی بن جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ حق شفعہ ایک دوسرے کا پڑوسی بننے سے قبل قبل ہے۔ پس جب مشترکہ جائیداد کی تقسیم اور حدود و طرق کی تعیین کے بعد وہ پڑوسی بن گئے تو حقِ شفعہ باقی نہ رہے گا۔ البتہ یہاں دو امر قابل وضاحت ہیں:

مذکورہ حدیث میں حقِ شفعہ باقی نہ رہنے کو دو باتوں کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے:

(1) حدود متعین ہو جائیں۔ (2) اور راستے مقرر ہو جائیں۔

اس سے بعض علماء نے یہ قول بھی کیا ہے کہ حدود متعین ہو جانے کے بعد بھی اگر ابھی تک رستے مقرر و متعین نہیں ہوئے تو حقِ شفعہ باقی سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اگر ابھی تک رستے الگ الگ نہیں ہوئے تو نئے شریک سے اذیت کا امکان اب بھی باقی ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ نیا شریک مشترکہ رستے میں کوئی بڑی شے کھڑی کر کے اذیت پہنچائے۔ تب پھر پڑوسی کا حق شفعہ اس وقت تک باقی رہے گا۔ جب تک کہ رستہ جدا نہیں ہوتا۔

اب ذیل میں صحیح مسلم کی دوسری روایت پر کلام پیش خدمت ہے:

فِي كُلِّ شِرْكٍ: شرک سے مراد مشترکہ شے ہے۔

فِي أَرْضٍ أَوْ رَبْعٍ أَوْ حَائِطٍ: یہ "بدل البعض من الكل" کی قبیل میں سے ہے اور یہاں عامل کا تکرار بھی ہے۔ اسی لیے یہ دو وجہ سے مجرور ہے۔ بدل ہونے کی وجہ سے بھی اور تکریرِ عامل کی وجہ سے بھی۔

ارض: یہ واضح ہے۔

رَبْعٌ: یہ چھوٹے مکان یا حویلی کو کہتے ہیں جس میں متعدد چھوٹے چھوٹے مکانات ہوں۔ [1]

حائط: یہ باغ کو کہتے ہیں۔

ان تینوں جائیدادوں میں شریک کو شفع کا حق حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] القاموس الوحيد، ص: 592۔ (نسیم)

لَا یَصْلُحُ اَوْ لَا یحلّ: مذکورہ "اَوْ" شک کے لیے ہے اور یہ شک راوی کا ہے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ صلاح کی نفی حلت کی نفی کو شامل نہیں۔ اسی لیے علماء نے ارشاد نبوی "ھذا الصلوٰۃ لا یصلح فیھا شیء من کلام الناس" میں "لَا یَصْلُحُ" سے مراد "لا یحل" لیا ہے۔ یعنی نماز میں کلام الناس جائز نہیں۔

اَنْ یَبِیعَ: اس فعل کی ضمیر کا مرجع ''شریک'' ہے اور مشترکہ شے کے بیچنے کا حلال نہ ہونا ہے۔

حَتّٰی یَعْرِضَ عَلٰی شَرِیکِهٖ: لہٰذا اپنے شریک پر مشترکہ شے کو پیش کرنے سے قبل کسی دوسرے سے اس کا بھاؤ تاؤ کرنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں پڑوسی کے حق کا لحاظ ہے۔ جبکہ شریک پڑوس سے زیادہ حق والا ہوتا ہے۔ تو جب پڑوسی کا یہ حق ہے تو شریک کا حق بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر شریک کی اس حصہ میں رغبت نہ ہو تو دوسرا شریک اس حصہ کو آگے بیچ سکتا ہے اور اگر مشتری نے مشترکہ زمین خرید کر شفعہ سے قبل ہی اسے وقف کر دیا تو اب دوسرے شریک کا حق شفعہ باقی نہ رہے گا۔ کیونکہ وقف کی بیع جائز نہیں اور یہ کہ جب شریک پر مشترکہ حصہ پیش ہوا اور اس نے خریدنے میں رغبت کا اظہار کر دیا تو وہ اس حصہ کو کسی کی منازعت کا سامنا کیے بغیر ہی خرید سکتا ہے۔ یعنی اس صورت میں وہ مشتری کے جھگڑا کرنے سے محفوظ رہے گا کیونکہ ابھی تک نوبت دوسرے خریدار تک نہ آئی تھی۔ کیونکہ بسا اوقات اگلا خریدار اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اس سے اپنا حق وصول کرنا بے حد دشوار بن جاتا ہے۔ یوں اوّل وہلہ میں ہی مشترک حصہ کو قبول کر کے وہ ایک متوقع جھگڑے سے بچ جاتا ہے۔ انہی مصالح کی بنا پر نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ مشترکہ حصہ بیچنے سے قبل اس کو شریک پر پیش کیا جائے اور شریک پر پیش کرنے سے قبل ہی مشترکہ حصہ بیچ دینا جائز نہ ہوگا۔

رہی امام طحاوی رحمہ اللہ کی روایت تو اس میں "فِی کُلِّ شِرْكٍ" کی بجائے "فِی کُلِّ شَیْءٍ" کے الفاظ ہیں۔

وَرِجَالُهٗ ثِقَاتٌ: حضرات محدثین کے نزدیک رجال سے مراد رواۃ حدیث ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر فرض کیا کہ کسی سند میں سب راوی عورتیں ہی ہوں تب بھی "رِجَالُهٗ" کہا جائے نا کہ "نساؤہ" کہا جائے گا کیونکہ یہاں رواۃ مراد ہیں نہ کہ مرد یا عورت۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر یہ مسائل مذکور ہیں:

(1) شفعہ ہر چیز میں ہے۔
(2) شفعہ تقسیم سے قبل ہے۔
(3) جب رستے اور حدود متعین ہو جائیں تو حق شفعہ باقی نہ رہے گا۔
(4) پڑوسی کو حق شفعہ حاصل نہیں الا یہ کہ رستہ ابھی تک مشترک ہو۔
(5) شریک پر مشترکہ حصہ پیش کرنے سے قبل اس کو بیچنا حلال نہیں۔
(6) شریک کو ردّ وقبول کا اختیار ہے۔ البتہ ایک دفعہ رد کر دینے کے بعد اب اسے شفعہ کا اختیار باقی نہ رہے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شفعہ مشترک شے میں اور ہر شے میں ثابت ہے۔ جس کی دلیل "فِی کُلِّ مَا لَمْ یُقْسَمْ" کے الفاظ ہیں۔
- جب رستہ جدا ہو تو پڑوسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔ البتہ اگر ابھی تک رستہ مشترک ہو تو پڑوسی کو بھی شفعہ کا حق حاصل ہے۔

◈ یہی حکم مشترکہ منفعت کا بھی ہے لہٰذا مشترکہ کنویں یا وادی کو شریک کی اجازت کے بغیر یعنی اس پر پیش کیے بغیر بیچنا جائز نہ ہوگا۔ وگرنہ باہمی بغض وعداوت کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

◈ اگر مشترکہ جائیداد پیش ہونے پر شریک اس کو ردّ کر دے تو کیا بعد میں اسے شفعہ کا حق رہے گا یا نہیں؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اسے اب بھی شفعہ کا حق باقی رہے گا کیونکہ اس نے شفعہ کے سبب کے وجود سے قبل حق شفعہ ساقط کیا ہے اور وہ سبب بیع ہے جو ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔

جبکہ ایک قول حق شفعہ کے مطلق ساقط ہو جانے کا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔ البتہ اکثر علماء [1] کا یہ قول ہے کہ بیع سے قبل مشترکہ حصہ رد کر دینے سے بھی بیع کے وقت شفعہ کا حق باقی رہے گا۔

رہے وہ علماء جو مشترکہ حصہ کے ردّ کر دینے کے بعد بیع کے وقت حق شفعہ کے ساقط ہونے کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ شریک پر مشترکہ حصہ پیش کرنے کا فائدہ یہی ہے کہ اس کے رد کر دینے کے بعد آدمی اس کو بیچ سکتا ہے "بلوغ المرام" کی مشہور شرح "سبل السلام" کے مؤلف نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ کہ ایک دفعہ مشترکہ حصہ ردّ کر دینے کے بعد، بعد میں شفعہ کا حق باقی نہیں رہتا۔

◈ شفعہ کا حق صرف بیع کی صورت میں ہی ہوتا ہے لہٰذا میراث، ہبہ وغیرہ کی صورت میں شفعہ کا حق حاصل نہ ہوگا۔ اس کی دلیل "لا يحل ان يبيع" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ میراث انتقال اضطراری ہے جس پر شریک کا اختیار نہیں لہٰذا اس میں شفعہ کا اختیار بھی نہ ہوگا۔ البتہ ہبہ کی صورت میں راجح قول یہ ہے کہ شریک کو شفعہ کا حق باقی رہے گا۔

◈ یہ بات شریعت اسلامیہ کی حکمت میں سے ہے کہ اس نے متوقع ، ممکنہ ہر قسم کے جھگڑے کا دروازہ نہایت حکمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ بند کر دیا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ ہر شریک کا دوسرے شریک پر حق ہوتا ہے۔ البتہ علماء کا اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ حق مالک کو ہے یا ملک کی وجہ سے ہے۔ [2] اب جن کے نزدیک یہ حق مالک کو ہے تو ان کے نزدیک کافر کو مسلمان پر شفعہ کا حق نہ ہوگا اور جن کے نزدیک یہ حق ملک میں ہے تو ان کے نزدیک شفیع کے کافر یا مسلمان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پڑوسی کے شفعہ کا اور اس کی شروط کا بیان

889- وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ﷛ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((جَارُ الدَّارِ أَحَقُّ بِالدَّارِ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "گھر کا پڑوسی گھر کا زیادہ حق دار ہے۔" [3]

---

[1] الكافى فى فقه ابن حنبل: 242/2.

[2] دیکھیں: الفتاویٰ: 383/30- المغنى: 197/5- احكام اهل الذمة، ص: 278.

[3] یہ حدیث سنن النسائی میں موجود نہیں۔ صحیح ابن حبان: 5182- اور اس حدیث میں یہ علت ہے کہ اس حدیث کو ائمہ حفاظ کی ایک جماعت نے "عن قتادة عن انس" کے طریق سے روایت کیا ہے جبکہ دوسروں نے "عن الحسن عن سمرة" کے طریق سے اس کو روایت کیا ہے اور انہوں نے اس طریق کو محفوظ کہا ہے، جبکہ ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں طریق ہی صحیح ہیں۔ یہ ابن قطان کا قول ہے اور یہ قول اولیٰ ہے۔ جامع الترمذى: 368- المختارة للمقدسى: 122/7- علل الترمذى للقاضى، ص: 214- نصب الراية: 172/4- كشف الخفاء: 392/1.

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.
اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

وَلَهُ عِلَّةٌ.
البتہ اس حدیث میں ایک علت ہے۔

شرح:......جَارُ: یہ گھر کی تین اطراف میں سے کسی بھی ایک طرف سے ملنے والے کو کہتے ہیں۔

اسنادی بحث:......امام موصوف نے اس حدیث میں ایک علت کے ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو ذیل کے حاشیہ میں مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن ابن قطان نے دونوں طریق کو صحیح کہا ہے، اگرچہ "عن الحسن عن سمرة" کے طریق میں حسن بصری کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع کے اثبات میں اختلاف ہے۔

اب پڑوسی کے زیادہ حق دار ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا وہ شفعہ کا زیادہ حق دار ہے یا یہ حقیت اَوْلَـوِیَّت میں ہے؟ یعنی زیادہ بہتر یہ ہے کہ گھر بیچنے سے قبل پڑوسی پر اسے پیش کر دیا جائے؟ چنانچہ بعض علماء پہلے قول کے قائل ہیں کہ پڑوسی شفعہ کا زیادہ حق دار ہے۔ چنانچہ پڑوس کا گھر بکنے کی صورت میں وہ شفعہ کر کے اس گھر کو لے سکتا ہے۔ جبکہ بعض کے نزدیک پڑوسی اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ گھر بیچنے سے قبل ایک مرتبہ اس کو پوچھ لیا جائے اور یہی صحیح قول ہے۔ لہٰذا گھر بک جانے کے بعد اب اس گھر کا پڑوسی سے زیادہ خود مشتری حق دار ہے۔ کیونکہ دو پڑوسیوں میں صرف حقِ جوار کا تعلق ہی ہوتا ہے۔ جبکہ ملک دونوں کی الگ الگ اور مستقل ہوتی ہے۔

890- وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((الْجَارُ أَحَقُّ بِصَقَبِهِ)).
حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:❷ ''پڑوسی اپنے پاس والے کا زیادہ حق دار ہے۔''❸

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَفِيهِ قِصَّةٌ.
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ اس بارے ایک قصہ (بھی مروی) ہے۔

غریب الحدیث:......بِصَقَبِهِ: صقب: یہ مصدر ہے جو وصف کے معنی میں ہے، یہ قرب اور جوار کو کہتے ہیں اور اس پر داخل "بـا" یا تو تعدیہ کے لیے ہے۔ تب پھر یہ تعدیہ حق کے معنی میں ہوگی اور یا پھر یہ ''سببیہ'' ہے، تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ پڑوسی اپنے جوار کی وجہ سے زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ قریب ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس احقیت سے کون سی احقیت مراد ہے؟ تو اس کو گزشتہ حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ احقیت شفعہ کی ہے۔ مزید تفصیل مذکور ہو چکی ہے۔

891- وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((الْجَارُ أَحَقُّ بِشُفْعَةِ جَارِهِ، يُنْتَظَرُ بِهَا، وَإِنْ كَانَ غَائِبًا، إِذَا كَانَ طَرِيقُهُمَا
حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''پڑوسی پڑوسی کے شفعہ کا زیادہ مستحق ہے۔ اس کا انتظار کیا جائے گا چاہے وہ غیر موجود ہو، جبکہ دونوں کا

---

❷ ترجمہ از "القاموس الوحید، ص: 932"۔ یہ حق شفعہ کے لیے کہا جاتا ہے۔ (نسیم)

❸ صحیح البخاری: 2258.

وَاحِدًا)).
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

رستہ ایک ہو۔'' [1]
اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:......إِذَا كَانَ طَرِيقُهُمَا وَاحِدًا: مذکورہ حدیث اس باب میں صریح ہے کہ احقیت سے مراد احقیت شفعہ ہے۔ البتہ مذکورہ حدیث گزشتہ دو مروی احادیث سے مختلف ہے۔ کیونکہ وہ احادیث اس باب میں مطلق ہیں۔ جبکہ اس حدیث میں اس احقیت کا مشروط اثبات ہے کہ جب دونوں کا رستہ ایک ہو تو پڑوسی شفعہ کا زیادہ مستحق ہو گا۔ لیکن اس اختلاف سے یہ حدیث گزشتہ مذکورہ دو احادیث کے مخالف نہیں بن جاتی جیسا کہ پیچھے "بـاب الشفعة" کی پہلی حدیث (رقم: 888) میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

يُنْتَظَرُ بِهَا وَإِنْ كَانَ غَائِبًا: معلوم ہوا کہ طولِ مدت سے حق شفعہ ساقط نہیں ہو جاتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- پڑوسی کا بے حد حق ہے اور اس کی رعایت واجب ہے۔ اس لیے پڑوس کے اکرام کو ایمان باللہ والیوم الآخر کا مقتضی قرار دیا گیا ہے اور اس شخص سے ایمان کی نفی کی گئی ہے جس کے شر سے پڑوسی محفوظ نہ ہوں۔
- اگر دو پڑوسی رستہ میں مشترک ہوں تو پڑوسی کو شفعہ کا حق ہو گا جیسا کہ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

شفعہ کی حقیقت

892- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((الشُّفْعَةُ كَحَلِّ الْعِقَالِ)).
رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْبَزَّارُ، وَزَادَ: ((وَلَا شُفْعَةَ لِغَائِبٍ)).
وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''شفعہ یہ (اونٹ کے پیروں میں باندھی) رسّی (کی گرہ) کو کھولنے کے جیسا ہوتا ہے۔'' [2]
اس حدیث کو ابن ماجہ اور بزار نے روایت کیا ہے۔ بزار کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے: '' اور غیر موجود کے لیے کوئی شفعہ نہیں۔'' اس روایت کی اسناد ضعیف ہے۔

غریب الحدیث:......الْعِقَالِ: یہ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کے پیر باندھے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ رسی ایسے طور پر باندھی جاتی ہے کہ ہلکا سے کھینچنے سے بھی وہ کھل جاتی ہے۔ کیونکہ اونٹ کے پیروں میں رسی کو بہت نرمی سے

---

[1] مسند احمد: 303/3- سنن ابی داؤد: 3518- جامع الترمذی: 1369- سنن ابن ماجه: 2494- سنن البیهقی: 206/6- امام بیہقی رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کے اس اضافہ کہ: "إذا كان طريقهما واحد" کی بابت ائمہ محدثین کی تضعیف نقل کی ہے۔ کیونکہ اس اضافہ کو نقل کرنے میں عبدالمالک بن سلیمان ثقہ اور مامون ہونے کے باوجود متفرد ہیں جبکہ ابن عبدالهادی نے "التنقيح" میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے جیسا کہ: "نصب الراية: 37/4" میں ہے۔

[2] سنن ابن ماجه: 2500- ابن حزم نے "المحلى" (211/9) میں اس حدیث کو بزار کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس طریق کو ضعیف کہا ہے۔ ابوزرعہ اس حدیث کو منکر کہتے ہیں۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت نہیں۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 479/1- سنن البیهقی: 108/6.

باندھا جاتا ہے۔ اسی لیے ذرا سا بھی کھینچنے سے وہ فوراً کھل جاتی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اگر کسی نے شفعہ کرنا ہی ہے تو اس میں دیر نہ کرے بلکہ فوراً کر ڈالے اور دوسرا مضمون یہ مذکور ہے کہ غیر موجود کا کوئی شفعہ نہیں کیونکہ اسے بیع کا ہی علم نہیں ہو پاتا چہ جائیکہ وہ شفعہ بھی کرے۔

روایت حدیث:...... لیکن چونکہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لیے حجت نہیں۔

درایت حدیث:...... مذکورہ حدیث میں سند اور متن دونوں اعتبار سے ضعف ہے۔ متن کا ضعف ان الفاظ کی وجہ سے ہے: ''غائب کا کوئی شفعہ نہیں۔'' جبکہ ماقبل کی حدیث غیر موجود کے انتظار کرنے کو بتلاتی ہے اور وہ حدیث اس مذکورہ حدیث سے اصح بھی ہے۔ اس بنا پر مذکورہ حدیث سے مستفاد حکم ضعیف اور باطل ہوگا جس پر اعتماد کرنا درست نہ ہوگا

یاد رہے کہ شفعہ بھی دیگر حقوق کی طرح ایک حق ہے جو تب ہی ساقط ہوتا ہے جب آدمی اپنے کسی قول یا فعل سے اس کو ساقط کر دے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مشتری کے مطالبہ پر شریک اس بات کی وضاحت ضرور کرے گا کہ وہ شفعہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں اور اگر وہ مہلت مانگتا ہے تو اسے مہلت دی جائے گی۔ البتہ یہ مدت اتنی نہ ہوگی جس میں مشتری کو ضرر پہنچے۔ تب پھر مہلت کی اس مدت کی تحدید عرف پر محمول ہوگی۔

14۔ بَابُ الْقِرَاضِ ...... قراض یعنی مضاربہ کا بیان

قراض کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

تمہید:...... لفظ قراض ''قَارَضَ يُقَارِضُ مُقَارَضَةً وَقِرَاضًا'' کا مصدر ہے جو ''القرض'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کاٹنا۔ جبکہ [1] اصطلاح میں یہ دوسرے کو تجارت کے لیے مال دے کر متعینہ شروط کے ساتھ منافع میں شرکت کرنے کو کہتے ہیں (اور مضاربہ میں شریکین نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتے ہیں) اور نفع کا وہ جز جس میں شرکت ہوتی ہے مشاع اور عام ہوتا ہے۔ جو نہ تو تعیین کے ساتھ معلوم ہوتا ہے اور نا مطلق مجہول ہوتا ہے۔

اس عقد کا دوسرا نام مضاربت بھی ہے اور یہ ''الضرب فی الارض'' (زمین میں چل پھر کر سفر کرنے) کو کہتے ہیں اور مضاربہ کو مضاربہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اکثر مضاربت پر مال لینے والا تجارت کی غرض سے سفر پر نکل جاتا ہے تاکہ دوسرے شہر سے مال خرید کر وطن لے آ کر اسے بیچے اور نفع کمائے۔ غرض اس عقد کو مضاربہ بھی کہتے ہیں اور قراض بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے مضاربہ کے خلاف قیاس ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ مضاربہ قیاس کے عین موافق ہے اور اس میں طرفین کی مصلحت ہے۔

مضاربہ کی فضیلت

893۔ عَنْ صُهَيْبٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((ثَلَاثٌ فِيهِنَّ الْبَرَكَةُ ، الْبَيْعُ إِلَى أَجَلٍ ، وَالْمُقَارَضَةُ ، وَخَلْطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيرِ لِلْبَيْتِ ،

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تین باتوں میں برکت ہے: (1) (مقررہ) مدت تک (ادھار کی) بیع، (2) مضاربہ اور (3) گھر کے لیے گندم کو جَو کے

---

[1] القاموس الوحید، ص: 1298۔ (نسیم)

لَا لِلْبَيْعِ)). ساتھ ملانا نہ کہ بیع کے لیے۔“❶

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ . اس حدیث کوامام ابن ماجہ نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......ثَلَاثٌ: یہ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

فِيهِنَّ الْبَرَكَةُ: یہ جملہ خبریہ ماقبل مذکور مبتدا کی خبر ہے۔

اَلْبَرَكَةُ: یہ خیر کثیر کو کہتے ہیں۔

اَلْبَيْعُ إِلَى أَجَلٍ: یہ ثمن اور مبیع دونوں کے ادھار ہونے کی صورتوں کو شامل ہے۔اس کی جائز صورتیں اور اس میں عاقدین کے جو فوائد و مصالح ہیں ان کو مفصل بیان کیا جا چکا ہے۔

اَلْمُقَارَضَةُ: یہ مضاربہ کا دوسرا نام ہے جس کا تعارف تمہید کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ارشاد نبوی ہے کہ اس میں برکت ہے۔صاحب مال کے لیے بھی کیونکہ وہ بغیر کسی تعب و تکان کے اپنے مِلک سے منتفع ہوتا ہے اور عامل کے لیے بھی یہ عقد باعث برکت ہے، کیونکہ مضاربہ کے ذریعے اس کو تجارت کرنے کو مال مل جاتا ہے اور اگر یہ مال نہ ملتا تو وہ یوں ہی بے کار پڑا رہتا۔ غرض مضاربہ طرفین کے لیے باعث برکت ہے۔

خَلْطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيرِ لِلْبَيْتِ لَا لِلْبَيْعِ: یہ بات معلوم ہے کہ گندم بہ نسبت جَو کے عمدہ بھی ہوتی ہے اور مہنگی بھی ہوتی ہے۔اب اگر گندم کا ایک کلو چالیس روپوں کا آتا ہے اور جَو کا ایک کلو پچیس روپوں میں ملتا ہے تو گندم اور جَو کے آٹے کو ملا کر گھر میں استعمال کرنے سے ماہانہ خرچ کم اٹھے گا اور یہی وہ برکت ہے جس کو حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔البتہ گندم اور جَو کا یہ ملانا ذاتی اعتبار سے ہونا شرط ہے کیونکہ اگر ایسا تجارت اور بیع کے لیے کیا جائے تو یہ غرر اور دھوکا ہے جو حرام ہے۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے اور مضاربہ میں برکت کی بشارت اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مذکورہ بالا تینوں عقود بابرکت ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں یہ بات واضح ہے۔
- برکت اور بہتر ہونے میں چیزوں میں باہم تفاوت ہے۔لیکن اس امر کا ادراک عقل سلیم اور صحیح حس و شعور سے ہوتا ہے۔
- برکت کے حصول کے لیے ادھار پر بیع کر لینی چاہیے۔
- مضاربہ جائز ہے جس کے جواز کی شروط معروف ہیں اور یہ ایک بابرکت عقد ہے۔
- گندم کو جَو کے ساتھ ملا کر کھانا باعث برکت اور جائز ہے۔البتہ بیچنے کی غرض سے ایسا کرنا ناجائز ہے۔کیونکہ تب پھر یہ ملاوٹ کرنے کے حکم میں داخل ہوگا جو حرام ہے۔
- اگرچہ مذکورہ حدیث اسناد کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن دیگر نصوص صحیحہ کی رو سے یہ حدیث اپنے معنی میں صحیح ہے۔

---

❶ سنن ابن ماجہ: 2289۔ ابن جوزی نے "الموضوعات" میں اس حدیث کو صالح بن صہیب کے طریق سے روایت کیا ہے جو مجہول راوی ہے۔پھر اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی عبدالرحیم بن داؤد بھی ہے، جس کی حدیث منکر ہوتی ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی نے "المیزان" (335/4) میں کہا ہے۔دیکھیں: الضعفاء للعقیلی: 80/3.

مضاربہ کی شروط

894- وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يَشْتَرِطُ عَلَى الرَّجُلِ، إِذَا أَعْطَاهُ مَالًا مُقَارَضَةً، أَنْ لَا تَجْعَلَ مَالِي فِي كَبِدٍ رَطْبَةٍ، وَلَا تَحْمِلَهُ فِي بَحْرٍ، وَلَا تَنْزِلَ بِهِ فِي بَطْنِ مَسِيلٍ، فَإِنْ فَعَلْتَ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ، فَقَدْ ضَمِنْتَ مَالِي.

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: وہ جب کسی شخص کو مضاربہ پر اپنا مال دیتے تھے تو اس پر اس بات کی شرط رکھتے تھے کہ تم میرے مال کو کسی تر جگر والی شے (یعنی حیوان کی بیع وشراء) میں استعمال نہ کرو گے اور نہ اس کو سمندر (ی سفر) میں لے نکلو گے اور نہ کسی سیلابی وادی کے دامن میں ہی لے اترو گے۔ پس اگر تم نے ان (تین ممنوعہ باتوں) میں سے کسی بات کا ارتکاب کیا (جس کے نتیجہ میں میرا مال تلف ہو گیا) تو تم میرے مال کا ضمان بھرو گے۔ ❶

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

895- وَقَالَ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّإِ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْقُوبَ، عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ: أَنَّهُ عَمِلَ فِي مَالٍ لِعُثْمَانَ، عَلَى أَنَّ الرِّبْحَ بَيْنَهُمَا. وَهُوَ مَوْقُوفٌ صَحِيحٌ.

اور امام مالک نے "الموطا" میں علاء بن عبدالرحمٰن بن یعقوب سے انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ: حضرت حکیم رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مال سے (مضاربہ کے طور پر) اس شرط پر کام کیا کہ نفع دونوں کے درمیان (آدھوں آدھ) ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ ❷

غریب الحدیث:...... كَبِدٍ رَطْبَةٍ: مراد زندہ حیوان ہیں۔ یعنی وہ عامل مضاربہ میں زندہ جانور کی بیع وشراء نہ کرے گا اور اس کی دو وجوہات ہیں:

(1) ایک تو زندہ جانور معرضِ ہلاکت میں ہوتا ہے۔

(2) دوسرے فروخت ہونے تک اس پر خرچ بہت اٹھتا ہے۔

غرض زندہ جانور کی ذمہ داری نبھانا یہ بے جان چیزوں کی ذمہ داری اٹھانے سے اشد اور مشکل ہے۔

وَلَا تَحْمِلَهُ فِي الْبَحْرِ: کیونکہ اس زمانہ میں بحری سفر بے حد دشوار اور خطرات سے گھرا ہوا تھا کیونکہ اس زمانہ میں ایک تو کشتیاں بادبانی ہوتی تھیں جو بے حد آہستہ چلتی تھیں دوسرے وہ سمندروں کے طوفانوں کا زیادہ مقابلہ بھی نہ کر پاتی تھیں اس لیے سمندری سفر میں بھی مال معرضِ ہلاکت میں ہی ہوتا ہے۔ البتہ فی زمانہ سمندری تجارت بے حد محفوظ ہے۔

وَلَا تَنْزِلَ بِهِ فِي بَطْنِ مَسِيلٍ: مراد سیلابی ریلے کی گزرگاہ ہے۔ ایسی جگہ اترنے میں بسا اوقات اچانک طوفانِ باد وباراں آ گھیرتا ہے اور آدمی کا سامان ہلاکت کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ اس بات کی بھی شرط رکھتے

❶ سنن الدارقطني: 63/3- دیکھیں: نصب الراية: 144/4.

❷ المؤطا: 688/2- سنن البيهقي: 111/6- الدراية: 181/2.

تھے کہ مضارب نشیبی اور سیلابی وادی میں مالِ مضاربت لے کر نہ اترے گا بالخصوص پہاڑوں کے بیچ کی وادی میں۔ کیونکہ پہاڑی دروں کے رستے تنگ ہوتے ہیں جہاں سے سیلابی ریلا زیادہ قوت کے ساتھ گزرتا اور زیادہ تباہی پھیلاتا ہے۔

فَإِنْ فَعَلْتَ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ فَقَدْ ضَمِنْتَ مَالِي: حضرت حکیم رضی اللہ عنہ ایک مشہور تاجر بھی تھے۔ اس ضمن میں وہ مضاربت پر بھی تجارت کرتے تھے۔ اسی لیے وہ کسی کو تجارت کی غرض سے مال دیتے وقت ان تین مذکورہ بالا باتوں کی شرط رکھ دیتے اور خلاف ورزی کی صورت میں عامل کو ضامن ٹھہراتے تھے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ مضارب اپنی شروط پر عامل کو مال دے سکتا ہے۔ تب پھر ان شروط کی خلاف ورزی پر وہ عامل ضامن ہوگا۔

فائدہ:...... عقدِ مضاربت میں مضارب اپنی شروط رکھ سکتا ہے۔ رہی خلاف ورزی کی صورت اور اس میں ضمان کا الزام تو اس بابت یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ اگر تو عامل سے تفریط اور تعدی ثابت ہے تو وہ ضامن بنے گا وگرنہ نہیں۔

اب المؤطا کی روایت کا ایک سرسری جائزہ ملاحظہ ہو۔

موقوف: یعنی یہ روایت خلیفہ راشد سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے مالدار اور وسیع د عریض تجارت کے مالک تھے۔ چنانچہ وہ عامل کو نفع کی باہمی تقسیم پر مال دے دیا کرتے تھے۔ البتہ اس نفع کا مشاع اور معلوم ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ تمہید میں یہ بات مفصل ذکر کی جا چکی ہے۔

15۔ بَابُ الْمُسَاقَاةِ وَالْإِجَارَةِ ...... باغبانی اور اجارہ کا بیان

تمہید:...... کاش کہ امام موصوف ایک تو مساقات کی بجائے مزارعت کا عنوان قائم کرتے، دوسرے اجارہ کو الگ سے ایک مستقل باب کے تحت ذکر فرماتے ہیں کیونکہ مزارعت و مساقات اور اجارہ میں متعدد فرق ہیں۔ البتہ مزارعت و مساقات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ان دونوں میں مشابہت اور مناسبت یہ ہے کہ مزارعت میں سینچائی وغیرہ کے ذریعے کھیت کی خبر گیری ہوتی ہے اور مساقات میں درختوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ ❶

مساقات کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

مساقات:...... یہ "السقی" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے سینچائی کرنا اور سیراب کرنا۔ یعنی زمین کو پانی لگانا۔

اور اصطلاح میں دوسرے شخص کو اس غرض سے اپنا باغ دینا تاکہ وہ درختوں کی پرورش کرے اور باغ کی دیکھ بھال کرتا رہے اور بعد میں اترنے والا پھل دونوں کے درمیان مشاع تقسیم کے تحت مشترک رہے۔

اجارہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

اِجارہ یہ اجر سے ماخوذ ہے۔ اس کا لغوی معنی دوسرے کے عمل کا بدلہ دینا ہے۔ اجارہ یہ اجرت کا اسم ہے، اور اجرت اس مزدوری کو کہتے ہیں جس کا استحقاق کسی خیر کے کام کی وجہ سے ہو۔ جبکہ اصطلاح میں اجارہ کسی شے کی منفعت کو معلوم عوض کے بدلے فروخت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ عوض مالی ہو یا غیر مالی۔ اجارہ کبھی کسی عمل پر ہوتا ہے، کبھی کسی عین میں عمل پر ہوتا ہے اور کبھی کسی عین کے نفع پر ہوتا ہے۔ اجارہ کی یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔

---

❶ معدن الحقائق: 315/2. (نسیم)

اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ﴾ (القصص : 26)

''کیونکہ سب سے بہتر شخص جسے تو اجرت پر رکھے طاقتور، امانت دار ہی ہے۔''

مساقات کا حکم

896- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَامَلَ أَهْلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْزَرْعٍ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ ان کی زمینوں کی پھلوں یا کھیتی کی پیداوار کے نصف پر معاملہ کیا۔ ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا: ((فَسَأَلُوهُ أَنْ يُقِرَّهُمْ بِهَا عَلَى أَنْ يَكْفُوهُ عَمَلَهَا، وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلَى ذَلِكَ مَا شِئْنَا)) فَقَرُّوا بِهَا، حَتَّى أَجْلَاهُمْ عُمَرُ رضي الله عنه.

اور صحیحین کی ایک روایت میں ہے: پس انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کا سوال کیا کہ آپ ﷺ ان لوگوں کو خیبر کی زمینوں پر اس شرط پر رہنے دیں کہ وہ ان زمینوں میں کام کرنے سے (مسلمانوں کو) کافی ہو جائیں گے (یعنی خیبر کی زمینوں میں کام وہ کریں گے) اور انہیں پھلوں (کی پیداوار) کا نصف ملے گا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا: ''ہم اس بات پر تمہیں ان زمینوں پر باقی رکھتے ہیں جب تک ہم چاہیں گے۔'' یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (آ کر جب خلافت سنبھالی تو) انہیں (خیبر سے) جلاوطن کر دیا۔''

وَلِمُسْلِمٍ: ((أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ دَفَعَ إِلَى يَهُودِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا عَلَى أَنْ يَعْتَمِلُوهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ، وَلَهُمْ شَطْرُ ثَمَرِهَا)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''نبی کریم ﷺ نے خیبر کے یہود کو خیبر (کی زمین) کے کھجور کے درخت اور اس کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اپنے مالوں سے ان (زمینوں) میں کام کریں گے جبکہ انہیں ان کے پھلوں کا نصف ملے گا۔ ❷

غریب الحدیث:......عَامَلَ: یعنی ان کو اس شرط پر زمین دی کہ وہ اس میں کام کریں گے۔

بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا: شطر سے مراد نصف ہے۔ چاہے وہ پھلوں کا ہو یا کھیتی کا ہو۔

أَهْلَ خَيْبَرَ: یہ یہودی تھے۔ خیبر کی بستی کا تعارف گزر چکا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کو لڑ کر فتح کیا تھا، اس لیے یہود کے لیے وہاں باقی رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کی گزارش کی کہ انہیں اس شرط پر اپنی زمینوں میں رہنے کی اجازت دی جائے کہ ان میں کھیتی باڑی تو وہ کریں گے جبکہ پیداوار میں نصف کے حق دار ہوں

❶ صحيح البخاري: 2338- صحيح مسلم: 1551 .

❷ صحيح مسلم: 1551 .

گے۔ نبی کریم ﷺ اس شرط کو اپنی پر موقوف فرما کر منظور فرمالیا۔اس بات کا ذکر صحیحین کی مذکورہ بالا دوسری روایت میں ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں دراصل یہ فرمایا تھا کہ جب تک ہمیں تم لوگوں کو ان زمینوں پر باقی رکھنے میں کوئی مصلحت دکھائی دیتی رہی ہم تم لوگوں کو ان زمینوں پر باقی رکھیں گے وگرنہ بے دخل کر دیں گے اور اس تمام دورانیہ میں پیداوار نصفا نصف ہوگی اور کام صرف یہودی کریں گے۔ چنانچہ یہودیوں نے اس شرط کی موافقت کی اور ایسا کرنے پر راضی ہو گئے۔ پس یہود اپنی زمینوں پر خیبر کے فتح ہو جانے کے بعد بھی تقریباً چودہ سال تک باقی رہے۔ چار سال نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں، پورے خلافتِ صدیقی کے دور میں اور بیس ہجری تک خلافتِ فاروقی کے دور میں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو خیبر سے نکال کر فدک کی طرف جلا وطن کر دیا۔ خیبر کے یہود بے بہبود نا مسعود کے جلا وطن کیے جانے کے اسباب معروف ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ان کو کتب سیرت و تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا: یہ صحیح مسلم کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔ نخل کھجور کا درخت اور ارض سے مراد قابل کاشت زمین ہے۔ **عَلَى أَنْ يَعْتَمِلُوهَا فِيهَا**: یعنی ان زمینوں میں کام بھی وہی یہودی کریں گے اور بیج وغیرہ کا خرچ بھی وہی اٹھائیں گے البتہ پیداوار میں آدھے کے مستحق ہوں گے۔ چاہے وہ پیداوار پھل ہو یا غلہ۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں دراصل مزارعت اور مساقات دونوں کے جواز کا ذکر ہے اور یہ کہ یہ عقد مسلم اور غیر مسلم دونوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس میں پیداوار کی تقسیم بطریق مشاع ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہود کے ساتھ بھی معاملات کیے جا سکتے ہیں۔
- کافر پر اعتبار کرنا جائز ہے جب تک کہ اس کا خائن ہو کر کھل کر سامنے نہ آ جائے۔
- مزارعت اور مساقات دونوں جائز عقد ہیں۔
- اس عقد کے نتیجہ میں پیداوار متعاقدین کے درمیان طے پا جانے والی شرط کے مطابق تقسیم ہوگی۔
- نفع اور نقصان دونوں میں شرکت جائز ہے۔
- مزارعت اور مساقات میں یہ شرط نہیں کہ بیج رب الارض ہی دے گا۔ بلکہ یہ عامل کی طرف سے ہوگا جس پر صریح نص ہے۔
- مزارعت اور مساقات میں عقد کی مدت کے مجہول ہونے سے کوئی ضرر نہیں۔ یعنی اس عقد کو مجہول مدت پر منعقد کرنا بھی جائز ہے۔ اس کی دلیل "تقدکم ما شئنا" کے الفاظ ہیں اور مشیئت کا مجہول ہونا معلوم امر ہے۔
- معلوم ہوا کہ یہ عقد جائز ہے جس میں مدت کی تعیین جائز نہیں لہٰذا متعاقدین میں سے جو چاہے اس عقد کو فسخ کر کے اس سے دست بردار ہو سکتا ہے۔
- سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ حق کے معاملات میں بے حد قوی اور مضبوط ایمان اور عقیدہ والے تھے، اسی لیے انہوں نے یہود بے بہبود کو خیبر سے فدک جلا وطن کر دیا تھا۔

زمین کے اجارہ کا بیان

897۔ وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ قَالَ: ((سَأَلْتُ حضرت حنظلہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

رَافِعَ بْنَ خَدِيْجٍ ﷺ عَنْ كِرَاءِ الْأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، فَقَالَ: لَا بَأْسَ بِهِ، إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُؤَاجِرُوْنَ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْمَاذِيَانَاتِ، وَأَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ، وَأَشْيَاءَ مِنَ الزَّرْعِ، فَيَهْلِكُ هٰذَا وَيَسْلَمُ هٰذَا، وَيَسْلَمُ هٰذَا وَيَهْلِكُ هٰذَا، وَلَمْ يَكُنْ لِلنَّاسِ كِرَاءٌ إِلَّا هٰذَا، فَلِذٰلِكَ زَجَرَ عَنْهُ، فَأَمَّا شَيْءٌ مَعْلُوْمٌ مَضْمُوْنٌ فَلَا بَأْسَ بِهِ)).

میں نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے سونے اور چاندی کے بدلے زمین کو کرائے پر دینے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ بے شک لوگ دور نبوی میں (نالیوں، کھالیوں اور) ندیوں (وغیرہ) کے کناروں پر اگنے والی پیداوار اور پیداوار کے چند متعین حصوں پر اجارہ کا عقد کیا کرتے تھے پھر (کبھی ایسا ہوتا کہ) یہ (ایک) حصہ (جس کی پیداوار کو اجرت کے طور پر طے کیا تھا) تو ہلاک ہو جاتا اور یہ (دوسرا) حصہ سلامت رہتا اور (کبھی) وہ (ایک) حصہ تو سلامت رہتا اور وہ (دوسرا) حصہ ہلاک ہو جاتا اور لوگوں کے لیے اس کے سوا (جو حصہ مقرر ہو گیا تھا چاہے وہ اگتا یا نہ اگتا) اور کوئی کرایہ نہ ہوتا (یعنی زمین میں پیداوار کرنے کی اجرت نہ ہوتی)۔ پس اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس (طرح کا عقدِ اجارہ کرنے) سے منع فرما دیا۔ البتہ رہی معلوم اور مضمون شے (یعنی مقررہ کرایہ) تو اُس (پر عقدِ اجارہ کرنے) میں کوئی حرج نہیں۔ ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

وَفِيْهِ بَيَانٌ لِمَا أُجْمِلَ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ مِنْ إِطْلَاقِ النَّهْيِ عَنْ كِرَاءِ الْأَرْضِ.

اس روایت میں اس متفق علیہ مجمل روایت کا بیان ہے جس میں زمین کو کرایہ پر دینے کی مطلق نہی وارد ہے۔ ❷

غریب الحدیث :......حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ انصار میں سے تھے جن کے متعدد کھیت تھے اور یہ لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کر کے ہی گزر بسر کرتے تھے۔ اس لیے ان حضرات میں مزارعت کا چلن بھی بہت زیادہ تھا۔

سَأَلْتُ عَنْ كِرَاءِ الْأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ: یعنی آیا ایسا درست اور جائز ہے یا نہیں؟ جیسے مثلاً زمین والا کسی دوسرے کو اس شرط پر زمین کرائے پر کاشت کے لیے دے کہ وہ ہر سال سو درہم دے گا۔ یعنی کھیتی تو کاشت کرنے والے کی ہو گی اور یہ مقرر کرایہ زمین کے مالک کا ہو گا۔

بلاشبہ یہ مشارکہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک مستقل عقدِ اجرت ہے۔ جس میں کاشتکار کو زمین کا مقررہ کرایہ ہر حال میں دینا ہے چاہے وہ کھیتی کرے یا نہ کرے اور اسے نفع ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے اس سوال کا جواب ہاں میں دیا کہ ایسا عقد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ......: بعض علماء حضرت رافع رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں زمین کو اجرت پر دینے کے قائل نہ تھے، ان کا کہنا

---

❶ صحيح مسلم: 1547.

❷ صحيح البخاري: 2637- صحيح مسلم: 1547.

تھا کہ ہو سکے تو خود کاشت کرے ورنہ اپنے بھائی کو دے دے کہ وہ کاشت کرے۔ البتہ زمین کو اجرت پر نہ دے۔ اس پر حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔

(1) ایک تو یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں

(2) دوسری یہ کہ ایسا تو لوگ دورِ نبوی میں بھی کیا کرتے تھے۔

الْمَاذِيَانَاتِ: یہ جوہڑوں، تالاب، کھالیوں اور ندی نالوں کے کناروں پر واقع زمین کو کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک آدمی جس کی زمین کسی کھالے یا نالے وغیرہ کے کنارے پر ہوتی تھی، وہ دوسرے سے یہ کہتا تھا کہ زمین کے اطراف پر اگنے والی گھاس وغیرہ تمہاری جبکہ باقی کی میری اور اس شرط پر وہ دوسرے کو اپنی زمین کاشت کے لیے دے دیتا تھا۔ یہ عقد ناجائز تھا۔ کیونکہ کبھی تو زمین کے کناروں کی پیداوار زیادہ جبکہ باقی حصہ میں کم ہوتی تھی اور کبھی صورت اس کے برعکس ہوتی تھی اور یہ غرر ہے اور اس کو اشتراک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں زمین کا مالک اور مزارع نفع اور نقصان میں شریک نہیں ہیں۔

أَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ: "أَقْبَالِ" یہ قُبُل یا قَبَل کی جمع ہے اور یہ ہر چیز کے اگلے حصہ کو کہتے ہیں جبکہ جَدَاوِلِ یہ جَدْوَل کی جمع ہے۔ یہ چھوٹی نہر کو کہتے ہیں۔ یعنی آدمی دوسرے سے یہ کہے کہ اس کھالی یا نالی کا اگلا حصہ تیرا اور پچھلا میرا یا اس کے برعکس کہے۔

أَشْيَاءَ مِنَ الزَّرْعِ: یہ پیداوار کا ایک متعین حصہ ہوتا تھا۔ یعنی پیداوار چاہے جتنی ہو پر اس میں سے مثلاً دس من میرا باقی کم ہو یا زیادہ یا ہو یا نہ ہو، وہ تیرا۔ جبکہ اس کی دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ مثلاً کھیت کا شمالی کونہ میرا اور جنوبی تیرا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں غرر ہے کہ جانے کسی ایک حصہ میں پیداوار نہ اٹھے اور اس حصہ والے کو خسارہ کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی لیے حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

فَيَهْلِكُ هَذَا.........: یعنی کیا معلوم کہ زمین کا وہ حصہ جو مالک کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ تو پیداوار دے جبکہ عامل کے نام کا حصہ کوئی پیداوار نہ دے یا صورت اس کے برعکس ٹھہرے۔

فَلِذَلِكَ: مذکورہ لام تعلیل کا ہے۔ یعنی اس جہالت اور غرر کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طور پر زمین کو کرایہ یا ٹھیکہ پر دینے سے منع فرمایا۔

فَأَمَّا شَيْءٌ مَعْلُومٌ مَضْمُونٌ فَلَا بَأْسَ بِهِ: معلوم مضمون سے مراد اجرت ہے کیونکہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ سے زمین کو درہم و دینار کے بدلے کرائے پر دینے کی بابت سوال کیا گیا تھا اور زمین کو درہم و دینار کے بدلے کرایہ پر دینا سب کے نزدیک معلوم بھی ہے اور مضمون بھی اور یہ مضمون زمین کے مالک کے لیے ہے کیونکہ اس نے زمین کو مثلاً سو درہم کے عوض کرایہ پر دیا ہے جو مضمون ہے۔

وَفِيهِ بَيَانٌ لِمَا أُجْمِلَ .... عَنْ كِرَاءِ الْأَرْضِ: امام موصوف رحمہ اللہ کی یہ مراد ہے کہ جب صحیحین میں یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے تو اس ممانعت کو اس کرایہ کے عقد پر محمول کیا جائے گا جو جہالت تک لے جائے وگرنہ معلوم کرایہ کے عقد کا جواز صحیحین کی اور دیگر روایات سے ثابت ہے۔ کیونکہ معاملات میں اصل حلت ہے جب تک کہ کسی عقد کی حرمت پر دلیل قائم نہ ہو۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو مسائل کو بیان کیا گیا ہے:

(1) زمین کو معلوم اجرت پر کرایہ کے لیے دینا جائز ہے۔

(2) مجہول عوض کے ساتھ زمین کو کرایہ پر یعنی ٹھیکہ پر دینا ناجائز ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات اسلاف دین کا صحیح علم سیکھنے کے بے حد حریص تھے۔
- زمین کو درہم دینار اور روپے پیسے کے عوض ٹھیکہ پر دینا جائز ہے۔
- اسی طرح دراہم و دنانیر کے علاوہ غلوں اور میووں کے معاوضہ پر ٹھیکہ پر دینا بھی جائز ہے البتہ اس میں یہ بات شرط نہ کرے کہ زمین کی پیداوار سے اٹھنے والے غلہ یا میوہ سے اتنا معاوضہ میرا باقی تیرا۔ کہ یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ پیداوار کے ایک متعین حصہ پر اجارہ کرنا ہے جو ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں غرر ہے جبکہ مشارکہ یہ نفع اور نقصان دونوں میں برابر کی شرکت پر ہوتا ہے۔
- شریعت اسلامیہ ایک کامل شریعت ہے جو غرر پر مبنی جملہ عقود و معاملات کو ناجائز قرار دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ لوگوں کو باہمی نزاع و اختلاف کی جملہ صورتوں سے دور رکھنے کی بے حد حریص ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ ہی اس لائق ہے کہ اسے جملہ امور حیات میں ایک اساسی دستور قرار دیا جائے۔
- مفتی وغیرہ کو چاہیے کہ وہ سائل کو جائز اور ناجائز امور تفصیل سے بیان کرے۔
- امام موصوف رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بابت یہ فائدہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی ایک مجمل حدیث کا بیان بھی ہے۔

مزارعت کا بیان

898۔ وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ رضي الله عنه ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُزَارَعَةِ، وَأَمَرَ بِالْمُؤَاجَرَةِ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ أَيْضًا.

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا اور اجارہ کا عقد کرنے کا حکم فرمایا۔[1]

یہ حدیث بھی امام مسلم نے روایت کی ہے۔

شرح:...... مزارعت کا معنی بیان کیا جا چکا ہے۔ اس حدیث میں دو اہم بنیادی باتیں مذکور ہیں:

(1) ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا۔

(2) اور دوسری یہ کہ نبی کریم ﷺ نے عقدِ اجارہ قائم کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

اب مذکورہ حدیث میں مزارعت کی ممانعت ہے جبکہ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث مزارعت کے جواز کو بتلاتی ہے۔ تب پھر ان دونوں احادیث میں جمع کی صورت کیا ہوگی؟ علماء کا اس بارے اختلاف ہے۔

چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ یہ ممانعت مزارعت کی اجازت سے قبل تھی۔ اس قول کی بنا پر مزارعت کی ممانعت کا قول منسوخ ٹھہرے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر جب مدینہ تشریف لائے تو حضرات مہاجرین رضی اللہ عنہم اس وقت بے سرو سامان اور بے خان و مان تھے اور انہیں گزر بسر کے لیے کھیتی باڑی کی احتیاج تھی اسی لیے نبی کریم ﷺ نے مزارعت

[1] صحيح مسلم: 1549.

کی ممانعت فرمائی تا کہ حضرات مہاجرین کے لیے بھی کھیتی باڑی کرنے کا دروازہ کھلا رہے۔لیکن یہ قول محل نظر ہے کیونکہ نسخ میں ناسخ کا قطعی طور پر مؤخر ہونے کا علم ہونا شرط ہے۔ جو یہاں دونوں روایات میں مفقود ہے۔

ایک قول ❶ یہ ہے کہ ممنوعہ مزارعت وہ ہے جو لوگ دورِ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔اس بنا پر "المزارعة" میں الف لام عموم کے لیے نہیں بلکہ عہد ذہنی ہوگا اور یہی وہ مزارعت ہے جس کی طرف حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے "عَلَى الْمَاذِيَانَاتِ ، وَأَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ ، وَأَشْيَاءَ مِنَ الزَّرْعِ" کے الفاظ کے ساتھ گزشتہ روایت میں اشارہ فرمایا ہے۔

تب پھر ممنوعہ مزارعت سے وہ مزارعت مراد ہو گی جو غرر اور جہالت پر مبنی ہوتی ہے اور یہی اصح قول ہے۔ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ نہی تحریم کے لیے نہیں بلکہ کراہت کے لیے ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مزارعت کی یہ نہی اس شخص کے حق میں ہے جس کے پاس زائد از ضرورت زمین ہو اور اسے زمین مزارعت پر دینے کی ضرورت نہ ہو۔ایسے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کو کھیتی کرنے کے لیے زمین ہدیہ میں دے دے کہ وہ کاشت کر کے اپنی وقتی ضرورت کو پورا کر لے۔لیکن اصح قول وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ ممنوعہ مزارعت سے وہی مزارعت مراد ہے جو غرر اور جہالت پر مبنی ہو اور اجارہ پر دینے کا امر اس کے جواز کی دلیل ہے۔لہٰذا اگر کوئی زمین اجارہ پر لیتا ہے تو وہ زمین کا کرایہ زمین کے مالک کو دے گا۔چاہے اجارہ پر لینے کے بعد وہ زمین کھیتی کرے یا نہ کرے جس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

پچھنے لگانے کی اجرت لینے کا حکم

899- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ : ((احْتَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ، وَأَعْطَى الَّذِي حَجَمَهُ أَجْرَهُ ، وَلَوْ كَانَ حَرَامًا لَمْ يُعْطِهِ)) .

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نے پچھنے لگوائے اور پچھنے لگانے والے کو اس کی اجرت (بھی) دی، اور اگر یہ (اجرت دینا) حرام ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس کو یہ اجرت (ہرگز بھی) نہ دیتے۔ ❷

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... اِحْتَجَمَ: یعنی آپ ﷺ نے پچھنے لگانے والے کو طلب فرمایا۔"حجامت" یعنی پچھنے لگوانا یہ بدن سے فاسد خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ یہ بے حد مفید عمل ہے اور پچھنے لگوانے کا طریقہ معروف ہے۔شہد اور داغ لگوانے کی طرح آپ ﷺ نے اس میں بھی شفا بتلائی ہے۔ ❸

امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر خون میں ہیجان اور جوش زیادہ ہو تو روزہ کی حالت میں بھی پچھنے لگوا سکتے ہیں۔ ❹

پھر پچھنے لگانے کا طریقہ، اس کے ماہرین اور بدن کے وہ مواقع جہاں پر پچھنے لگائے جاتے ہیں اور اس کے زیادہ مفید اوقات معروف ہیں۔امام ابن قیم رحمہ اللہ نے "زادالمعاد" ❺ میں پچھنے لگوانے کے نہایت مفید اوقات ذکر کیے ہیں جو چاہے وہاں دیکھ لے اور مناسب ہے کہ وہ انہی اوقات میں پچھنے لگوانے کی کوشش کرے

---

❶ الفتاوى: 355/20 . ❷ صحيح البخاري: 2279 .
❸ دیکھیں: صحيح البخاري: 5680 . ❹ الفروع: 109/1- الانصاف: 527/1 .
❺ زادالمعاد: 58/4 .

وَأَعْطَى الَّذِی حَجَمَهُ أَجْرَهُ: وہ اجرت کیا تھی، مذکورہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں اور اسے بیان کرنے کا فائدہ بھی نہیں۔

وَلَوْ كَانَ حَرَاماً لَمْ يُعْطِهِ: یعنی اگر پچھنے لگوانے کی اجرت حرام ہوتی تو آپ ﷺ اسے وہ اجرت ادا نہ فرماتے۔ کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی حرام فعل کا ارتکاب فرمائیں اور پھر اس کی اجرت بھی عطا فرمائیں۔ کیونکہ آپ ﷺ تو خود شریعت بتلانے والے تھے، بھلا آپ ﷺ خود شریعت کے خلاف کیونکر چل سکتے تھے۔ پھر قرآن کی اس بات پر نص ہے کہ آپ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ رب تعالیٰ سے ڈرنے والے اور خوف کھانے والے تھے۔

پچھنے لگانے کی اجرت کیسی ہے؟

900- وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((كَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِيثٌ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''پچھنے لگانے والے کی کمائی خبیث (یعنی گندی اور بری) ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **كَسْبُ الْحَجَّامِ:** مراد یہ نہیں کہ حجام جو بھی کمائے وہ خبیث ہے چاہے وہ گندم بیچ کر ہی کمائے، بلکہ مراد ہے کہ اس کی وہ کمائی خبیث ہے جو وہ خاص دوسروں کو پچھنے لگا کر کماتا ہے۔

خبیث: اس لفظ کا اطلاق متعدد معانی پر ہوتی ہے۔ جو یہ ہیں:

(1) حرام (2) گھٹیا

(3) مکروہ جو قابل نفرت ہو

چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (الاعراف: 157)

''اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔''

کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں لفظِ خبیث کا اطلاق حرام پر کیا گیا ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ (البقرۃ: 267)

''اور اس میں سے گندی چیز کا ارادہ نہ کرو، جسے تم خرچ کرتے ہو۔''

اس ارشاد باری میں خبیث سے مراد گھٹیا اور رڈی و نکما مال ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں اس لفظ کا اطلاق ''قابل نفرت شئ'' کے معنی پر کیا گیا ہے۔ چنانچہ پیاز کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے: ((اِنَّهَا شَجَرَةٌ خَبِيثَةٌ)) [2] ''یہ پیاز ایک ناپسندیدہ (گندا) پودا ہے۔'' (جس کی بو سے لوگ گھن کھاتے ہیں)۔

رہا یہ سوال کہ مذکورہ حدیث میں لفظ خبیث کے ان تین معانی میں سے کون سا معنی مراد ہے؟ تو بہر حال حرام تو مراد ہو نہیں سکتا کیونکہ اگر حجام کی اجرت حرام ہوتی تو نبی کریم ﷺ اسے کبھی ادا نہ فرماتے جیسا کہ گزشتہ روایت میں یہ بحث بالتفصیل گزر چکی ہے۔ اس لیے ترتیب کے اعتبار سے مناسب تو یہ تھا کہ امام موصوف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گزشتہ مذکورہ

---

[1] صحيح مسلم: 568. [2] صحيح البخاري: 855- صحيح مسلم: 564.

حدیث کو حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے بعد لاتے۔

غرض بظاہر یہ تعارض اس توجیہ کے بعد اٹھ جاتا ہے کہ یہاں خبیث سے مراد قابل نفرت اور ناپسندیدہ کمائی ہے جس سے لوگ کتراتے ہیں نہ کہ یہ مراد ہے کہ حجام کی کمائی حرام ہوتی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ حجام پچھنے لگانے کی اجرت نہ لے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حجام کی کمائی کو خبیث فرمانا اس سے نفرت دلانے میں مبالغہ کرنے کی قبیل سے ہے۔ اس بنا پر جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ حجام کی اجرت حرام ہے، ان کا یہ قول ضعیف ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

(1) حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما اس قول کو ضعیف قرار دیتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجام کو اجرت دینے کا ذکر ہے۔

(2) پھر لفظ خبیث کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک کے مراد ہونے کا احتمال ہے اور یہ قاعدہ معروف اور مسلم ہے کہ جہاں احتمال آجائے وہاں استدلال باطل ہو جاتا ہے۔

(3) پھر یہ قول قواعدِ شرعیہ کے بھی مخالف ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ شرعاً مسلم ہے کہ جس بات کی اجرت لینا حلال ہوتا ہے، وہ بات بذاتِ خود بھی حلال ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ رب تعالیٰ جب ایک شے کو حرام قرار دیتے ہیں تو اس کی قیمت (یا اجرت) کو بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ [1] جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ جب کسی شے کو مباح اور جائز قرار دیتے ہیں تو اس کی قیمت (یا اجرت) بھی مباح اور جائز ہوتی ہے۔

غرض حجامت یعنی پچھنے لگانے کی بابت کم از کم یہ ہے کہ یہ کام حلال اور اس کی اجرت جائز اور حلال ہے گو ناپسندیدہ ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ روایت کا مضمون واضح اور صحیح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- پچھنے لگوانا جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے تھے اور یہ عمل طب نبوی میں شمار ہوتا ہے۔
- پچھنے لگانے والے کی اجرت حلال ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجام کو اس کے کام کی اجرت عطا فرمائی تھی۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل مبارک سے استدلال جائز ہے۔ کیونکہ اصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ''اسوہ'' ہونا ہے۔
- سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی منقبت کہ رب تعالیٰ نے انہیں بے پناہ فقاہت اور قوتِ استدلال عطا فرما رکھی تھی چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حدیث روایت کرنے کے بعد ایک منطقی دلیل لے کر آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: اگر حجام کی اجرت حرام ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے وہ اجرت ہرگز عطا نہ فرماتے۔

مزدور کی مزدوری روکنے کی تحذیر اور ممانعت

901- وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: ((ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا، فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِیْرًا، فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُعْطِهِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: تین (بندے) ہیں کہ روزِ قیامت میں ان سے جھگڑوں گا (وہ تین آدمی یہ ہیں): (1) (ایک) وہ آدمی جس نے میرے نام پر (کسی سے) عہد کیا پھر (اس میں) خیانت (و غدر) کا ارتکاب کیا

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

أَجْرَهُ)). | (2) اور (دوسرا) وہ آدمی جس نے (دھوکا سے یا زبردستی سے) کسی آزاد کو (غلام بنا کر) بیچ دیا پھر اس کی قیمت کھا (پی کر اڑا) لی (3) اور (تیسرا) وہ آدمی جس نے کسی مزدور سے مزدوری لی اور اس سے (اپنا کام تو) پورا پورا وصول کیا۔ جبکہ اسے اس کی مزدوری نہ دی۔“ ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ. | اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ایسی حدیث کو حدیث قدسی کہتے ہیں۔

ثَلَاثَةٌ: مراد ان تین اوصاف کے مالک لوگ ہیں جن کی تعداد لاکھوں کروڑوں تک بھی ہو سکتی ہے۔

أَنَا خَصْمُهُمْ: خصم: جو دوسرے کے ساتھ کسی بات کے استحقاق یا احقاق کے لیے جھگڑے۔ یعنی رب تعالیٰ ایسے مذکورہ تین قسم کے آدمیوں سے روزِ قیامت جھگڑا کریں گے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ رب تعالیٰ جس سے جھگڑیں گے اسے ہلاکت سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

رَجُلٌ أَعْطَى بِي: مراد وہ شخص ہے جو دوسرے کو اللہ کے نام پر کسی بات کا عہد دے پھر اس کے خلاف کر کے خیانت کا مرتکب ہو۔ جیسے کوئی دوسرے سے یہ کہے کہ میں تمہیں اللہ کے نام پر اس بات کا عہد دیتا ہوں کہ میں تمہاری یہ بات کسی کو نہ بتلاؤں گا، اور پھر دوسرے کو بتلاتا پھرے کہ یہی وہ غدر ہے جس پر یہ مذکورہ وعید آئی ہے۔

رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ: یعنی کسی کو زور زبردستی سے ڈرا دھمکا کر غلام بنا کر بیچ ڈالے اور اس کی قیمت کھا پی کر اڑا دے ایسے آدمی کو بھی روزِ قیامت رب تعالیٰ کی مخاصمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ بندوں کی حریت یہ حقوق اللہ میں سے ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے سب بندوں کو آزاد پیدا فرمایا ہے۔ لہٰذا جب کوئی کسی دوسرے انسان کو بغیر کسی سبب شرعی کے غلام بنائے گا در اصل وہ رب تعالیٰ کی حرمت کو پامال کرے گا۔ اس بنا پر باپ کا بیٹے کو بھی غلام بنا کر بیچنا حرام ہے۔ لہٰذا ارشادِ نبوی: ((أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ)) ❷ ”تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔“ کہ یہ ارشاد منافع کی بابت ہے نہ کہ غلام بنانے کی بابت ہے۔

رَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ: یعنی وہ شخص جس نے کسی کو ایک خاص کام کے لیے مزدوری پر رکھا پھر اس سے کام تو پورا پورا لے لیا پر اس کی اجرت اسے نہ دی کہ اس کو بھی روزِ قیامت رب تعالیٰ کی مخاصمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر کام لینے والا مزدوری دینے سے انکار کر دے تو عموماً مزدور کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی گواہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کسمپرس اور دل شکستہ کا مقدمہ روزِ قیامت رب تعالیٰ خود لڑیں گے۔

مناسبتِ حدیث:...... امام موصوف اجارہ کے ذکر کی مناسبت سے اس حدیث کو اس باب کے تحت لے کر آئے ہیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں خیانت کرنے، بدعہدی کرنے، آزاد لوگوں کو زبردستی غلام بنا کر بیچنے اور مزدور کو اس کی اجرت نہ دینے کی زبردست وعید آئی ہے۔

---

❶ ہمیں یہ حدیث صحیح مسلم میں نہیں ملی۔ شاید امام موصوف رحمہ اللہ سے سبقت قلم ہو گئی ہو، البتہ یہ حدیث ”صحیح البخاری“ (2227) میں ہے۔

❷ سنن ابن ماجه: 2291.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حدیث قدسی ثابت ہے اور اس کی تعریف معروف ہے جو بارہا بیان ہو چکی ہے۔
- رب تعالیٰ کے لیے صفت ''قول'' ثابت ہے جس کی دلیل "قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی" کے الفاظ ہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا متفق علیہ مذہب ہے کہ رب تعالیٰ ازل سے متکلم ہے۔
- رب تعالیٰ اور ان تین قسموں کے لوگوں کے درمیان روزِ قیامت جھگڑا ضرور ہوگا جس کی کیفیت رب تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں البتہ اس بات پر ایمان لانا ایک مسلمان کے ذمہ واجب ہے۔
- یہ تینوں قسم کے گناہ بے حد سنگین اور از حد خطرناک ہیں۔
- عہد کا پورا کرنا واجب ہے۔
- آزاد کا بیچنا حرام ہے کہ اس میں حقوق اللہ کی پامالی ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آزاد کو قتل کرنا حرام ہے کہ جب اس کو غلام بنا کر بیچنا اس قدر حرام ہے تو اسے جان سے ہی مار دینا کس قدر حرام اور جرم ہوگا۔
- معلوم ہوا کہ جب مزدور کام کر لے تو اس کی مزدوری مستاجر پر لازم و واجب ہو جاتی ہے۔

قرآن پڑھانے پر اجرت لینا جائز ہے

902۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تمہیں سب سے زیادہ جس بات پر اجرت لینے کا حق ہے وہ کتاب اللہ (کی تعلیم دینے پر اجرت لینا) ہے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

قرآنِ کریم پر اجرت لینے کی تفصیل اور اس کے احکام

شرح:......سب سے پہلے تو یہ معلوم ہو کہ ''اَجْرًا'' کیوں منصوب ہے۔ تو یہ "اَخَذْتُمْ" فعل کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے نہ کہ "اَحَقُّ" اسم تفضیل کی تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ امام موصوف مذکورہ حدیث کو اس بات پر دلالت کرنے کے لیے اس باب کے تحت لائے ہیں کہ کتاب اللہ پر اجرت لینا جائز ہے۔

اب کتاب اللہ پر اجرت لینے کی تین صورتیں ہیں:

(1) قرآنِ کریم کی تلاوت پر اجرت لینا۔ (2) تعلیم قرآن پر اجرت لینا۔

(3) قرآنِ کریم کے ذریعے دم کرنے کی اجرت لینا۔

تو دیگر نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مذکورہ حدیث سے دوسری اور تیسری صورت مراد ہے یعنی تعلیم اور دم کرنے کی اجرت لینا جائز ہے۔ جبکہ دیگر دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ محض تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا حرام ہے۔ چنانچہ

[1] صحیح البخاری: 5737.

مرنے والوں کو ایصالِ ثواب کے لیے پڑھائے جانے والے قرآن پر اجرت لینا حرام اور ناجائز ہوگا۔ پھر ایسا کرنا بدعت بھی ہے۔ پھر اس میں مال کی اضاعت تو ہے ہی، خود میت کو بھی اجر نہیں ملتا۔ کیونکہ جب خود قاری ایک بدعت کا مرتکب ہونے کی وجہ سے ثواب سے محروم رہا تو میت تو بدرجہ اولیٰ ثواب سے محروم رہی۔

رہا قرآنِ کریم کی تعلیم پر اجرت لینا کہ مثلاً ہر پارہ کی تعلیم پر ہزار روپے لینا تو راجح قول اس کے جواز کا ہے اور یہ صورت مذکورہ حدیث کے عموم میں داخل ہے۔ چنانچہ جب ایک آدمی نے یہ عرض کیا تھا کہ میرے پاس مہر میں دینے کو کچھ بھی نہیں تو نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا: ''کیا تمہیں کچھ قرآن آتا ہے۔'' ان صاحب نے عرض کیا کہ مجھے فلاں فلاں سورت یاد ہے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے جتنا قرآن تمہیں آتا ہے اس کے بدلے میں تیرا نکاح اس عورت سے کر دیا۔''[1]

رہا قرآنِ کریم کے ذریعے شفا حاصل کرنے اور دم کرنے پر اجرت لینا تو یہ بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس میں قاری اس قراءت پر اجرت لیتا ہے جس سے مقصود شفا حاصل کرنا ہے نہ کہ تلاوت کرنا ہے کہ یہ بھی ایک دنیوی غرض کا عوض لینا ہے اور وہ مریض کا شفا چاہنا ہے۔

یہ تو اس صورت کے جواز کی تعلیل کا بیان ہوا جبکہ اس کی دلیل صحیح بخاری میں مروی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں ان کے ایک قصہ سفر کا ذکر ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ایک رستے کی بستی میں اترے پر وہاں کے بے مروت لوگوں نے ان مسافروں کی مہمان نوازی کرنے سے انکار کر دیا۔ رب کا کرنا کیا ہوا کہ بستی کے سردار کو ایک بچھو ڈنک مار گیا اور کئی ٹوٹکوں کے آزمانے کے باوجود بھی اسے شفا نہ ملی۔ بالآخر کسی کے مشورہ پر لوگ ان پردیسی مسافروں کے پاس پہنچے کہ شاید ان کے پاس اس تکلیف کے رفع کی کوئی تدبیر ہو۔ غرض ان لوگوں کے پوچھنے پر ایک صاحب نے بتلایا کہ وہ ایسی تکالیف میں دم کرنا جانتے ہیں۔ یہ صاحب خود حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ وہ بستی کے سردار کے پاس تشریف لے گئے اور دم کرنے کے لیے یہ بات شرط رکھ دی کہ وہ بدلے میں چند بکریاں لیں گے۔ بستی والوں نے یہ شرط منظور کر لی جس پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بستی کے سردار پر سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا، بس پھر کیا تھا کہ وہ سردار یوں بھلا چنگا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے کہ اس کو کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ یہ بکریاں لے کر قافلے میں لوٹے اور فرمایا کہ پہلے اس بات کی نبی کریم ﷺ کو جا کر خبر دیں گے پھر ان بکریوں کو آپس میں بانٹیں گے۔ واپسی پر سارا قصہ سننے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگوں نے درست کیا اور (اب ان بکریوں کو آپس میں) تقسیم کرو اور اپنے ساتھ ایک حصہ میرا بھی رکھنا۔'' اور پھر ہنسے۔ یہ قصہ اس بات کی دلیل ہے کہ دم کرنے کی غرض سے قرآن کریم پڑھ کر اس کی اجرت لینا جائز ہے۔

غرض مذکورہ حدیث کا حاصل اور مضمون یہی ہے کہ تعلیم قرآن اور آیات وغیرہ کے دم پر اجرت لینا جائز ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قرآن پر اجرت لینا جائز ہے جس کی صورتوں کو اوپر مفصل ذکر کر دیا گیا ہے۔
- معلوم ہوا کہ اعمال میں باہمی تفاضل ہوتا ہے جس کی دلیل "إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- اجرت کا استحقاق منفعت کے بقدر ہوتا ہے۔

---

[1] یہ روایت آگے کتاب النکاح میں آرہی ہے۔

◈ بے شک قرآنِ کریم رب تعالیٰ کی کتاب ہے جس کی دلیل مذکورہ روایت کے آخری الفاظ "كِتَابُ اللّٰهِ" ہیں۔
◈ قرآنِ کریم کی تعظیم واجب ہے کیونکہ یہ رب تعالیٰ کی کتاب ہے۔

مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے قبل ہی اس کی مزدوری دے دو

903، 905۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَعْطُوا الْأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهُ)).

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ.

وَفِي الْبَابِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عِنْدَ أَبِي يَعْلَى وَالْبَيْهَقِيِّ، وَجَابِرٍ عِنْدَ الطَّبَرَانِيِّ، وَكُلُّهَا ضِعَافٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی دے دو۔'' [1]

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اس باب میں مسند ابی یعلی اور سنن بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے [2] جبکہ طبرانی کی معجم صغیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے اور یہ سب کی سب روایات ضعیف ہیں۔ [3]

غریب الحدیث:...... **الْأَجِيرَ**: یہ فعیل کے وزن پر ہے اور مفعول یعنی ''ماجور'' کے معنی میں ہے۔

أَعْطُوا أُجُرَهُ: یعنی اس کا معاوضہ اسے دے دو۔ جو اس کی منفعت اور اس کے عمل کا عوض ہے۔ لیکن کب؟

قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ: یعنی مزدور کو مزدوری سے فارغ ہونے کے بعد کام کی وجہ سے جو اسے پسینہ آیا ہے، اس کے خشک ہونے سے قبل ہی مزدوری دے دو اور یہ بات معروف ہے کہ آیا پسینہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا۔ تب پھر اس ارشاد نبوی سے مقصود یہ ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری فوراً ادا کر دی جائے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسی مزدوری ہوتی ہے جس میں پسینہ بھی آتا ہے اور بسا اوقات ایسی مزدوری بھی ہوتی ہے جس میں پسینہ سرے سے آتا ہی نہیں۔ غرض اس ارشاد سے مقصود یہ ہے کہ مزدور کو اس کو مزدوری ادا کرنے میں عجلت سے کام لیا جائے۔ مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ مزدور کو اس کی مزدوری جلد ادا کرنا مستحب ہے۔
◈ کام پورا ہوتے ہی مزدور اپنے معاوضہ کا مستحق ہو جاتا ہے اور اگر اس نے ابھی تک اپنا کام پورا نہیں کیا تو دیکھیں گے کہ اگر تو اس نے کسی عذر کے بغیر ایسا کیا ہے تو وہ ابھی مزدوری کا مستحق نہ ہوگا اور اگر ایسا کسی عذر کی وجہ سے تھا تو کام کے بقدر اجرت کا مستحق ٹھہرے گا۔

---

[1] سنن ابن ماجه: 2443۔ امام بوصیری نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ علامہ منذری فرماتے ہیں: امام ابن ماجہ نے یہ حدیث عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے روایت کی ہے جو ثقہ راوی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: عبدالرحمٰن بن زید کی احادیث حسن ہیں۔ اس کی احادیث لکھے جانے کے قابل ہیں۔ امام عجلونی نے "کشف الخفاء" (1/160) میں اس حدیث کی اسناد کو عمدہ کہا ہے۔ دیکھیں: الترغیب: 14/3.

[2] مسند ابی یعلی: 6682۔ سنن البیهقی: 120/6۔ ''علامہ ہیثمی'' (97/4) لکھتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں علی ابن المدینی کے والد عبداللہ بن جعفر بن نجیح ہے جو ضعیف ہے۔

[3] المعجم الصغیر للطبرانی: 43/1۔ اس حدیث کی اسناد میں شرقی بن خطام ہے جس کو علامہ ہیثمی نے ضعیف کہا ہے۔

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر اجیر اور مستاجر میں اجرت کا معاملہ ''ماہانہ'' کی بنیاد پر طے ہو جائے تو یہ بھی جائز ہے۔ جیسا کہ فی زمانہ اکثر دفاتر اور دکانوں وغیرہ پر مزدوروں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔

◈ اگر چہ امام موصوف نے اس باب سے متعلقہ جملہ نصوص کو ضعیف کہہ دیا ہے لیکن جب ضعیف حدیث کے طرق متعدد ہو جاتے ہیں تو وہ حسن کے درجہ تک ترقی کر جاتی ہے لہٰذا من حیث المجموع یہ روایت حسن ہے۔

مزدور کی مزدوری معلوم ہونا لازم ہے

906- وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((مَنِ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَلْيُسَمِّ لَهُ أُجْرَتَهُ)).

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی مزدور کو مزدوری پر رکھا تو وہ اسے اس کی مزدوری (ضرور) بتلا دے۔''[1]

رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَفِيْهِ انْقِطَاعٌ، وَوَصَلَهُ الْبَيْهَقِيُّ مِنْ طَرِيقِ أَبِي حَنِيفَةَ.

اس حدیث کو عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں انقطاع ہے، جبکہ امام بیہقی نے اس حدیث کو ابوحنیفہ کے طریق سے موصول روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **فَلْيُسَمِّ لَهُ أُجْرَتَهُ**: یعنی وہ مزدور کو بتلا دے کہ اس کی مزدوری کی جنس، قدر اور وصف کیا ہو گا۔ تا کہ اختلاف کے وقت نزاع نہ ہو۔

علماء نے اجرت کی تعیین کو اجارہ کی شرط قرار دیا ہے کیونکہ اجارہ بھی بیع کی قسم ہے، تو جیسے بیع میں ثمن اور مبیع کا معلوم ہونا شرط ہے اس طرح اجارہ میں بھی اجرت کا اور اسی طرح جو مزدوری لینی ہے، اس کا معلوم ہونا شرط ہے۔ البتہ علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ کبھی اجرت کا معلوم ہونا عرف کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی لفظوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ جیسے کوئی جتلا کر مزدوری پر مزدور کو رکھے کہ تم مثلاً فلاں کام کرو میں تمہیں اس کی اتنی اتنی مزدوری دوں گا اور کبھی مزدوری عرف پر چھوڑ دی جاتی ہے۔ جیسے ایک درزی کی اجرت معلوم اور معروف ہے تو آدمی اس کو ایک جوڑا یہ کہہ کر سینے کے لیے دے سکتا ہے کہ اسے سی دینا۔ چاہے یہ نہ بھی بتلائے کہ تمہیں اس کی مزدوری کتنی ملے گی کیونکہ اس درزی کا معاوضہ سب کے ہاں معروف ہوتا ہے۔

یہی حکم ان دھوبیوں کا بھی ہے جن کا معاوضہ معروف ہوتا ہے کہ وہاں معاوضہ کا ذکر ضروری نہیں۔ البتہ ایسے مزدوروں سے بھی اگر اجرت کی تعیین میں نزاع ہو جائے تو ان کو اجرت مثلی دی جاتی ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ مزدور کے ساتھ پہلے سے ہی اجرت طے کر لی جائے اور اگر عرف کا قرینہ مزدوری کی تعیین کرتا ہو تو مزدوری کو عرف پر چھوڑ دینا بھی درست ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مزدور کی مزدوری طے کرنا مشروع ہے۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق: 15024- ابونعیم نے "مسند ابی حنیفة" (89) میں اور امام بیہقی نے بھی "السنن" (120/6) میں اس حدیث کو موصول روایت کیا ہے۔ جبکہ دوسروں کے ہاں یہ حدیث "فَلْيُعْلِمْهُ أَجْرَهُ" کے الفاظ کے ساتھ ہے۔ (یعنی جو کسی کو مزدوری پر رکھے تو وہ اسے بتلا دے کہ وہ اس کو کتنی مزدوری دے گا)۔

◈ نبی کریم ﷺ اس بات کے بے حد حریص تھے کسی بھی دو آدمیوں کے درمیان کسی بھی طرح کا نزاع نہ ہونے پائے۔
◈ اسی طرح مناسب ہے کہ مزدوری کی نوعیت بھی طے کر لی جائے تاکہ بعد میں نزاع نہ ہو۔

16۔ بَابُ إِحْيَاءِ الْمَوَاتِ

بنجر زمینوں کو آباد کرنے کا بیان

تمہید:...... علماء نے بے آباد اور بنجر زمین کو ''موات'' کا نام دیا ہے۔ کیونکہ دراصل اس میں کسی بھی قسم کی حیات نہیں ہوتی اور اس میں چونکہ حیات اس کے زندہ کرنے یعنی آباد کرنے یا اس میں کھیتی باڑی وغیرہ کرنے سے آتی ہے۔ اسی لیے بے آباد زمین کو آباد کرنے کو احیاء الارض المیتة یا احیائے موات کا نام دیا گیا ہے۔

لفظ موات یہ موت سے ماخوذ ہے۔ مراد وہ زمین ہے جو اختصاصات اور ملک معصوم سے الگ ہو۔ یعنی خالی ہو جیسے وہ زمین جس کا مالک کوئی نہ ہو، اور نہ وہ کسی کے ساتھ خاص ہو۔ جیسے جنگل اور ویرانے کی زمین۔ اس اعتبار سے وہ زمین جو کسی کی ملک میں ہو اس کو موات کا نام نہ دیا جائے گا چاہے وہ آباد نہ بھی ہو۔ اسی طرح وہ زمین جو شہر کی مصالح سے متعلق ہونے کی بنا پر خاص ہو جیسے نالے، کھالے، میدان، چراگاہیں، پارک وغیرہ کہ اصطلاح میں ان زمینوں کو موات نہ کہا جائے گا۔ کیونکہ ان زمینوں کے ساتھ غیر کا حق مل گیا ہوا ہے۔

بے آباد زمین کا مالک کون ہے؟

907۔ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ عَمَّرَ أَرْضًا لَيْسَتْ لِأَحَدٍ، فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا))، قَالَ عُرْوَةُ: وَقَضَى بِهِ عُمَرُ فِي خِلَافَتِهِ.

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی کی نہ تھی تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔'' عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اسی بات کا فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ [1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... مَنْ عَمَّرَ: اس روایت میں زمین کے آباد کرنے کو نبی کریم ﷺ نے مطلق ارشاد فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ امر عرف کی راجع ہوگا۔ پس عرف میں جس کو آباد کاری اور تعمیر سمجھا جائے گا وہ ہی آباد کرنا کہلائے گا اور جس کو لوگ عرف میں آباد کرنا نہیں کہتے اس کو آباد کرنا نہ کہا جائے گا۔ اس بنا پر جنگل کی کسی زمین کا محض پتھروں یا باڑ وغیرہ کے ذریعے اِحاطہ کر لینا تعمیر نہ کہلائے گا۔ البتہ اگر وہ اس میں کوئی کھیتی بھی کرتا ہے تو اس کو احیاء الارض اور تعمیر کا نام دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے کسی خالی اور ویران جگہ پر کوئی عمارت تعمیر کرنا چاہی تو محض اس کا احاطہ کر لینے سے وہ زمین اس کی نہ ہو جائے گی اور نہ یہ احیاء الارض ہی کہلائے گا۔ البتہ جب وہ اس زمین پر کوئی عمارت بنا لے گا تو اس کو آباد کرنا کہیں گے۔

فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا: یعنی جب وہ کسی خالی زمین میں کاشت کر کے یا اس میں کوئی تعمیر کر کے اس کو آباد کر لے گا تو اب اس زمین کا زیادہ حق دار وہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی اس کے ساتھ اس زمین کے استحقاق میں مزاحمت کرنے کا مجاز نہ

[1] صحيح البخاري: 2335.

ہوگا اور نہ وہ اس زمین کی کاشت یا عمارت کو تلف کرنے کا ہی حق رکھتا ہوگا۔

وَقَضَى بِهِ عُمَرُ فِي خِلَافَتِهِ: اس اثر کے لانے کا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ یہ حکم اب بھی باقی ہے، اور منسوخ نہیں ہوا۔

لَيْسَتْ لِأَحَدٍ: آخر میں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ حق اس زمین کی آبادکاری میں ہے جو کسی کی ملکیت نہ ہو، لہٰذا اگر پہلے کسی نے اس زمین کو آباد کر کے اس کو ترک کر دیا تھا، پھر بعد میں کسی اور نے آکر اس کو آباد کر دیا۔ اتنے میں وہ پہلا شخص آگیا تو ان الفاظ کی رو سے لامحالہ وہ پہلا شخص اس زمین کا زیادہ مستحق ہوگا۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں دو اہم مسائل بیان کیے گئے ہیں:

(1) بے آباد زمین اس کی بنے گی جو اس کو کاشت کر کے یا اس پر کوئی تعمیر کر کے اس کو آباد کرے گا۔ لہٰذا محض اس پر قبضہ کر لینے سے وہ اس کی نہ بنے گی۔

(2) وہی بے آباد زمین آباد کرنے سے کسی کی ملک میں آئے گی جو پہلے سے کسی کی نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ تعمیر کے بغیر ویران زمین کا احیاء مصور نہ ہوگا۔

◈ تعمیر سے کیا مراد ہے؟ حدیث میں اس کو مطلق رکھا گیا ہے لہٰذا اس کی تعیین عرف سے ہوگی۔

◈ اگر دو آبادکار جمع ہو جائیں تو زمین پہلے آبادکار کی ہوگی۔ چاہے پہلا اس کو آباد کر کے چھوڑ بھی گیا تھا۔

908- وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ)).

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا تو وہ اسی کی ہوگی۔'' ❶

رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: رُوِيَ مُرْسَلًا، وَهُوَ كَمَا قَالَ، وَاخْتُلِفَ فِي صَحَابِيِّهِ، فَقِيْلَ: جَابِرٌ، وَقِيْلَ: عَائِشَةُ، وَقِيْلَ: عَبْدُاللهِ بْنُ عُمَرَ، وَالرَّاجِحُ الْأَوَّلُ.

اس حدیث کو آئمہ ثلاثہ نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل مروی ہے اور یہ حدیث ویسی ہی ہے جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ کس صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس بابت تین اقوال ہیں: (1) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، (2) سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے، (3) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے۔ راجح پہلا قول ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيْتَةً: ''أَحْيَا'' سے مراد وہی ہے جو ''عَمَّرَ'' سے گزشتہ حدیث میں

---

❶ سنن ابی داؤد: 3073- جامع الترمذی: 1378- السنن الکبریٰ للنسائی: 5761- جامع الترمذی میں یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (دیکھیں رقم: 1379)۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور ''السنن الکبریٰ للنسائی'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی رقم: 5756 ہے۔ مسند احمد: 338/3- امام ابن حبان (5205) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ حدیث عائشہ کی ''السنن الکبریٰ للنسائی'' میں رقم: 5759 ہے۔ اس حدیث کی اصل صحیح بخاری میں ہے جہاں ''مَنْ أَعْمَرَ'' کے الفاظ ہیں۔

مراد ہے۔ "أَرْضاً مَيْتَةً" سے بھی وہی مراد ہے جو گزشتہ حدیث میں "لَيْسَتْ لِأَحَدٍ" سے مراد ہے۔
جبکہ "فهی لہ" کا معنی بھی وہی ہے جو "فَهُوَ اَحَقُّ بِہٖ" کا معنی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ میں مفصل ذکر ہوا۔ تب پھر یہ حدیث معنی کے اعتبار سے پہلی حدیث کی طرح ہے۔

البتہ یہاں ایک امر کی وضاحت باقی ہے، وہ یہ کہ کیا بے آباد زمین کے آباد کرنے کے لیے امام یعنی مملکت کے رئیس اعلیٰ سے اجازت لینا بھی ضروری ہے؟ یعنی کیا اس کی ملکیت کے لیے سرکاری اجازت نامہ بھی ضروری ہے یا نہیں؟

تو حدیث کے ظاہر الفاظ میں اس کی کوئی قید مذکور نہیں۔ لیکن علماء کا پھر بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کے اس بارے دونوں ہی اقوال ہیں۔

(1) چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ارض میتہ کے احیاء کے بعد بھی آدمی امام کی اجازت کے بغیر اس زمین کا مالک نہیں بنتا۔ لہٰذا قول نبوی "فھی لہ" یہ اذن یعنی اجازت کے باب میں سے ہے۔ لہٰذا امام کی اجازت بہر حال ضروری ہے۔

(2) جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اذن اذنِ شرعی ہے۔ لہٰذا یہ باب تشریع میں سے ہوگا اور اس سے تملیک شرعی حاصل ہوگی اور یہ اذنِ سلطانی کے باب میں سے نہیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول تشریعی ہوگا نہ کہ تنظیمی۔ اس بنا پر جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے گا وہ اسی کی ہوگی کیونکہ وہ پہلے سے کسی کی ملک میں نہ تھی۔

کسی چراگاہ کو اپنے لیے خاص کر لینے کا حکم

909- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ الصَّعْبَ بْنَ جَثَّامَةَ اللَّيْثِيَّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لَا حِمَى إِلَّا لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ)). رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان سے حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کوئی (مخصوص) چراگاہ نہیں مگر اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔'' [1]
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......حِمَی: لغت میں حمی روکنے اور منع کرنے کو کہتے ہیں، جبکہ اصطلاح میں اس سے وہ مخصوص سرسبز زمین مراد ہے جس کو قوم کا سردار صرف اپنے جانوروں کے لیے خاص کر لیتا تھا اور وہاں قبیلہ کے دوسرے لوگوں کے جانوروں کو چرنے نہ دیتا تھا۔ لوگ ایسا جاہلیت میں کیا کرتے تھے، اسلام نے آکر اس کو منع کر دیا۔ کیونکہ اس بات کا ظلم ہونا بالکل واضح تھا۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو باطل قرار دیا اور فرمایا:

لَا حِمَى إِلَّا لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ: یہاں رب تعالیٰ کا اسم مبارک برکت کے لیے ہے کیونکہ رب تعالیٰ کو کسی چراگاہ کی ضرورت نہیں وہ ہر شے سے غنی ہے، وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ اسی لیے علماء کا قول ہے کہ ایسے امور میں رب تعالیٰ کے اسم کی طرف اضافت سے مراد مصالح عامہ ہوتے ہیں جیسے صدقہ کے اونٹ اور جہاد کے گھوڑے وغیرہ کہ یہ مصالح عامہ کے لیے ہیں لہٰذا کسی چراگاہ کو ان کے لیے خاص کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا امام ان اغراض کے لیے کسی چراگاہ کو مختص کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے ان چراگاہوں کو اللہ کے لیے خاص کیا ہے اور ان کی مصالح عام مسلمانوں کو پہنچ رہی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ''اللہ کے رسول کے لیے'' ہونے سے کیا مراد ہے؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ نبی

---

[1] صحیح البخاری: 2370.

کریم ﷺ کے لیے یہ جائز تھا کہ آپ ﷺ زمین کے کسی خطہ کو اپنے لیے خاص فرما دیتے۔ پھر اس قول کی بابت علماء میں مزید اختلاف ہے کہ آیا یہ بات اور یہ امر خصائص نبوی میں سے تھا کہ آپ ﷺ کے سوا اور کسی کو اس بات کا حق نہ تھا اور نہ بعد کے والیوں کو اس کا حق ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ اس کا آپ ﷺ کو بھی حق تھا اور آپ ﷺ کے بعد والیوں کو بھی حق تھا جن کے پاس ولایت عامہ تھی۔ غرض اس پہلے قول میں بھی علماء کے دو اقوال ہیں۔

جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ لفظ رسول کا لفظ اللہ پر عطف یہ شریعت والے اتارنے اور مبلغ شرع کے عطف کے باب میں سے ہے اور مراد یہ ہے کہ جو اللہ کے رسول کا ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ کیونکہ اللہ کا رسول وہ زمین میں اللہ کا خلیفہ اور اس کی شریعت کا مبلغ و شارع ہوتا ہے۔ اس قول کی بنا پر رسول سے مراد رسول کی شخصیت نہ ہوگی اور مطلب یہ ہوگا یہ چراگاہیں اللہ کی ہیں۔ یعنی صدقہ کے اونٹوں اور جہاد کے گھوڑوں وغیرہ کے لیے ہیں اور یہی قول صحیح ہے۔

مناسبتِ حدیث:...... چونکہ احیاء موات میں بھی آدمی ایک زمین میں ایک نوع کا اختصاص پیدا کرتا ہے اور یہی معنی حمی میں بھی پایا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے یہ حدیث اس باب کے تحت لے کر آئے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ حمی ثابت ہے البتہ چند شروط کے ساتھ مشروط ہے۔
- ◈ کسی خاص آدمی کے لیے حمی جائز نہیں۔
- ◈ حمی مصالح عامہ کے لیے جائز ہے۔

نقصان اٹھانا اور دینا دونوں منع ہیں

910، 911۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''نہ تو نقصان (اٹھانا) ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ۔ وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ مِثْلُهُ، وَهُوَ فِي الْمُوَطَّأ مُرْسَلٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور سنن ابن ماجہ میں ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ جبکہ یہ روایت ''موطا'' میں مرسل آئی ہے۔ ❷

غریب الحدیث:...... لَا ضَرَرَ: ''ضَرَرٌ'': یہ اس بات کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے جان، مال یا عزت و آبرو میں کمی اور نقص واقع ہو۔ یہ نفع کی ضد کو کہتے ہیں۔ کیونکہ چیزیں تین قسم کی ہی ہو سکتی ہیں: (1) یا تو نافع ہوں گی۔ (2) یا نقصان دہ ہوں گی۔ (3) یا پھر ان میں نہ تو نفع ہوگا اور نہ وہ نقصان کی حامل ہی ہوں گی۔ پھر ان تینوں کا اثر یا تو جان و مال میں ہوگا یا پھر عزت و آبرو پر ہوگا۔

---

❶ مسند احمد: 313/1۔ سنن ابن ماجہ: 2341۔

❷ المؤطا: 745/2۔ سنن الدارقطنی: 77/3۔ سنن البیہقی: 92/6۔ امام حاکم نے "المستدرك" (57/2) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ "مسند احمد" (327/5) میں اور "سنن ابن ماجہ" (2340) میں اس کا ایک شاہد بھی ہے جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

غرض اس حدیث میں ضرر کی نفی ہے اور یہ نفی نفیِ شرعی ہے۔ کیونکہ یہ نفی وجود کی نفی نہیں۔ کیونکہ ضرر کا وجود تو بہر حال ہے تب پھر یہ ضرر کی شرعی نفی ہے۔

لَا ضِرَارَ: ضرار: یہ دوسرے کو نقصان پہنچانے کا نام ہے۔ یہ نفی بھی نفیِ شرعی ہے یعنی یہ بات شرع شریف میں منع ہے کہ کوئی کسی دوسرے کو نقصان اور ضرر پہنچائے۔

یاد رہے کہ یہاں ضرار مبالغہ کے لیے نہیں کیونکہ تب پھر یہ ماقبل کی تاکید بنے گا اور تاکید کا عطف کے ساتھ آنا درست نہیں ہوتا۔ لہٰذا مذکور ضرار مبالغہ کے لیے نہ ہو گا بلکہ اس میں ضرر کے ایک اور معنی کا بیان ہے اور وہ دوسرے کو نقصان پہنچانا۔ کیونکہ عطف ہمیشہ مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مذکورہ حدیث میں ضرر کی نفی ہے جو ضرر کے رفع کے وجوب کو بتلاتی ہے چاہے وہ جان میں ہو یا مال میں، عزت میں ہو یا جاہ ومنصب میں۔ غرض ضرر کو باقی رکھنا حرام ہے۔
- اور دوسروں کو تکلیف پہنچانا بھی حرام ہے۔ خواہ اس کی جو بھی صورت ہو۔
- مذکورہ حدیث کو "باب احیاء الموات" کے تحت لانے کی مناسبت یہ ہے کہ یہ حدیث گویا کہ اس بات کو بتلا رہی ہے کہ حمی کی مذکورہ ممانعت عدمِ ضرر کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی اگر تو حمی سے عامۃ المسلمین کو ضرر پہنچ رہا ہو تو یہ حرام ہو گا۔
- اگرچہ یہ روایت الموطا میں مرسل آئی ہے لیکن امام احمد اور امام ابن ماجہ نے اس کو موصول ذکر کیا ہے۔ پھر فرض کیا کہ اس حدیث میں کوئی ضعف ہے بھی، تب بھی یہ حدیث معنی کے اعتبار سے کتاب وسنت کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ پوری کی پوری شریعت اس بات کے سخت خلاف ہے کہ کسی کو کوئی ضرر پہنچایا جائے یا ضرر کو باقی رکھا جائے۔

بے آباد زمین کو چار دیواری کر لینے کا حکم

912- وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ)).

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُوْدِ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس نے کسی (ویران اور بے آباد) زمین کی چار دیواری کر لی تو وہ زمین اسی کی ہو گی۔" [1]

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور ابن جارود نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**مَنْ:** یہ شرطیہ ہے لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہو گا۔ **أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ:** ان الفاظ میں اس دیوار کی اونچائی کا بیان نہیں کہ وہ کتنی اونچی ہو۔ تب پھر یہ امر عرف کے حوالے ہو گا۔ پس عرف میں جتنی دیوار اٹھانے کو دیوار کہا جاتا ہے، اتنی دیوار کر لینے سے "احیاء ارضِ موات" کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

عَلَى أَرْضٍ: یہاں "ارض" کا لفظ نکرہ آیا ہے۔ جو بظاہر عموم پر دلالت کر رہا ہے لیکن گزشتہ روایت سے معلوم ہوتا ہے

[1] سنن ابی داؤد: 3077۔ المنتقی لابن جارود: 1015۔ مسند احمد: 12/5۔ اس روایت میں بھی حسن بصری کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع کی بابت اختلاف ہے جو مشہور ہے۔ دیکھیں: التحقیق: 225/2۔ التلخیص: 62/3.

کہ یہ حکم اس بات کے ساتھ مقید ہے کہ وہ کسی کی مملکت نہ ہو۔

فَهِيَ لَهُ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ جزائیہ اور جوابِ شرط ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ عرف کے مطابق جو کسی ویران زمین کی چار دیواری کر لے تو وہ زمین اس کی ہو جائے گی۔
- جس ویران زمین کی چار دیواری کی ہے، اس میں کوئی کھیتی کرنا یا کنواں بنانا یا اس پر کچھ تعمیر کرنا احیاء ارض موات کے لیے شرط نہیں۔
- کسی زمین پر محض مٹی کا ڈھیر ڈلوانے سے یہ اس کا احاطہ کرنا نہ کہلائے گا۔ یہی حکم محض چند پتھر رکھ دینے کا بھی ہے۔
- لہٰذا پوری چار دیواری بنانا لازم ہے۔

کنواں کھودنے سے اردگرد کی کتنی زمین ملکیت شمار ہوتی ہے

913- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ حَفَرَ بِئْرًا فَلَهُ أَرْبَعُونَ ذِرَاعًا عَطَنًا لِمَاشِيَتِهِ)).
رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کوئی کنواں کھودا تو (اس کے اردگرد کی) چالیس ہاتھ زمین اس کے چوپایوں کے بیٹھنے کے لیے اس کی ہوگی۔'' [1]
اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......مَنْ حَفَرَ بِئْرًا: مراد چوپایوں کے لیے کنواں کھودنا ہے جیسا کہ اہل بادیہ کیا کرتے تھے۔ اب نبی کریم ﷺ نے ہر بستی اور قبیلہ والوں کے لیے اس بات کی حد بندی فرما دی کہ اگر ایک قبیلہ کے لوگ کسی جگہ اپنے چوپایوں کے لیے کنواں کھودتے ہیں تو اس کے اردگرد چاروں طرف چالیس چالیس ہاتھ زمین کا احاطہ بھی اس کنواں کھودنے والوں کا ہوگا تاکہ اتنی جگہ پر ان کے چوپائے پانی پینے کے بعد بیٹھ سکیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ ہر کنواں کا ایک حریم یعنی حرمت وممانعت والا حصہ ہوتا ہے جس سے کوئی تجاوز نہیں کر سکتا۔
- اور کنویں کا چوپایوں کے لیے حریم چالیس مربع ہاتھ ہوگا۔
- رہا وہ کنواں جو کھیتوں کو پانی لگانے کے لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کا حریم کتنا ہوگا تو اس کو لوگوں کے عرف اور عادت کے حوالہ کیا جائے گا۔ چنانچہ کوئی کنواں بڑا، گہرا اور وافر پانی والا ہوتا ہے اس کو زیادہ حریم چاہیے ہوتا ہے جبکہ کسی کنویں کو تھوڑا سا حریم بھی کافی ہوتا ہے۔

---

[1] یہ سنن ابن ماجہ: 2486 میں ہے۔ اس روایت کا مدار اسماعیل بن مسلم مکی پر ہے، جس کو ابن مہدی، ابن مبارک یحییٰ بن قطان اور نسائی نے ترک کر دیا ہے جبکہ امام بخاری، امام عقیلی اور امام ابن جارود نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ جبکہ مسند احمد اور طبرانی کی معجم میں مختلف الفاظ کے ساتھ حضرت ابوہریرہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے متعدد روایات مروی ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں۔ دارقطنی فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ یہ روایت حضرت سعید بن مسیب سے مرسل روایت ہے اور جس نے اس کو موصول روایت کیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔
ہم کہتے ہیں کہ یہ مرسل روایت مراسیل "ابی داؤد" (4020) میں مروی ہے جس کے رجال ثقہ ہیں۔ دیکھیں: دارقطنی کی "العلل: 163/9" اور "مجمع الزوائد: 125/4"۔

جاگیر دینے کا بیان

914- وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ أَبِيهِ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَقْطَعَهُ أَرْضًا بِحَضْرَمَوْتَ)).

رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

علقمہ بن وائل اپنے والد ماجد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حضر موت میں ایک زمین عطا فرمائی۔ ❶

اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

915- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما أَنَّ ((النَّبِيَّ ﷺ أَقْطَعَ الزُّبَيْرَ حُضْرَ فَرَسِهِ، فَأَجْرَى الْفَرَسَ حَتَّى قَامَ، ثُمَّ رَمَى بِسَوْطِهِ، فَقَالَ: ((أَعْطُوهُ حَيْثُ بَلَغَ السَّوْطُ)).

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو گھوڑے کے جہاں تک وہ دوڑ سکتا ہے، اس جگہ تک زمین عطا فرمائی۔ پس انہوں نے اپنا گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ (دوڑ دوڑ کر ایک جگہ پر جا کر) ٹھہر گیا۔ پھر انہوں نے (مزید آگے) اپنا کوڑا پھینک دیا۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انہیں وہاں تک زمین دو جہاں تک (ان کا) کوڑا پہنچا ہے۔'' ❷

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس حدیث میں ضعف ہے۔

غریب الحدیث :...... **أَقْطَعَهُ**: یہ دونوں حدیثیں اِقطاع یعنی کسی کو جاگیر الاٹ کرنے کے بارے میں مروی ہیں۔ اِقطاع یعنی کسی کو جاگیر دینا یہ امام یا ولی امر کا کسی شخص کو ایک زمین دینا ہے اور وہ شخص اس زمین کا کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ حق دار ہوتا ہے لہٰذا کوئی اس بارے اس سے مزاحمت نہیں کر سکتا اور بعض علماء نے تو امام کے جاگیر دینے کو اِحیاء موات کے حکم میں شمار کیا ہے۔

امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی کو بھی جاگیر دے سکتا ہے۔ اس باب میں امام موصوف نے یہ دو احادیث روایت کی ہیں پہلی علقمہ بن وائل سے، جو حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ یہ حضرمی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں حضرموت میں جاگیر عطا فرمائی تھی۔ اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں کہ وہ جاگیر کتنی تھی اور اس بات کا جاننا چنداں ضروری بھی نہیں۔

حضرموت:...... یہ یمن کا ایک معروف صوبہ ہے۔

اِقطاع کا حکم

اقطاع کی بابت علماء کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ یہ تملیک ہے کہ امام یا ولی جاگیر دے کر اس شخص کو اس جاگیر کا مالک بنا دیتا ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3058- جامع الترمذی: 1381- امام ابن حبان (7205) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث: مسند احمد: 399/6- اور "سنن البیهقی" (144/6) میں بھی ہے۔

❷ سنن ابی داؤد: 3072- مسند احمد: 156/2- المعجم الکبیر للطبرانی: 13352- اس حدیث کی اسناد میں عبداللہ بن عمر بن حفص عاصم بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہے جس کی بابت محدثین حضرات نے کلام کیا ہے۔ اس حدیث کی اصل صحیح بخاری میں سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے ہے جس میں وہ ارشاد فرماتی ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو حضرموت کی جاگیر عطا فرمائی تھی۔

جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ امام کی طرف سے محض ایک امداد ہے تا کہ وہ اس جاگیر سے منتفع ہو سکے۔ لہٰذا وہ جاگیر اس کی قطعی ملک نہ بنے گی۔ البتہ جب تک اس جاگیر کا اجازت نامہ اس کے نام پر ہے وہ جاگیر اسی کی شمار ہوگی اور وہ اس جاگیر کا زیادہ حق دار شمار ہوگا اور جب امام یا والی اس کے لیے جاری کردہ اس اجازت نامہ کو منسوخ کر دیں گے تو وہ جاگیر دوبارہ سرکاری جائیداد سمجھی جائے گی۔ پھر اگر زمین کے اجراء کے بعد وہ اس زمین کو زندہ نہیں کرتا تو بھی اس کی ملکیت اس زمین پر باقی نہ رہے گی۔

غرض ایک قول یہ ہے کہ اقطاع یعنی جاگیر دینا یہ ملک تام ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اِقطاع ملک اِرفاق (احسان اور شفقت کے طور پر دیا جانا) ہے۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب ہے۔

اس اختلاف کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ ایک شخص کو والی کی طرف سے ایک جاگیر ملی۔ اب پہلے قول کے مطابق وہ اس زمین کو آباد کرے یا نہ کرے ہر صورت میں اسی کی رہے گی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق اگر ایک دوسرا آدمی اس زمین کو آباد کرنے کی رغبت ظاہر کرتا ہے تو اس پہلے آدمی کو یہ کہا جائے گا کہ یا تو تم یہ زمین چھوڑ دو یا پھر اسے آباد کر کے دکھلاؤ اور اسے ایک مدت تک کی مہلت دے گا جس میں اس زمین کو آباد کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ اب اگر اس نے اتنی مدت میں وہ زمین آباد کر کے دکھا دی تو وہ جاگیر اسی کی رہے گی وگرنہ اس سے لے کر دوسرے شخص کو دے دی جائے گی۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ امام اور ولی امر حسب مصلحت کسی کو جاگیر دے سکتے ہیں اور یہ جائز ہے۔

فائدہ :...... امام کے لیے اس شخص کو کوئی جاگیر دینا جائز ہے جو اس زمین کو زندہ کر دے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا فعل ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ آپ ﷺ کا فعل تشریع ہوتا ہے۔ البتہ یہ جواز ایک عام قاعدہ کے ساتھ مقید ہے وہ یہ کہ امام کسی مصلحت کے پیش نظر ہی کسی کو جاگیر دے سکتا ہے جس میں محض جنبہ داری نہ ہو۔ کیونکہ امام پر عدل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا جو زمین کو آباد کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو، اسے زمین بطور جاگیر کے دینا جائز نہ ہوگا۔

اب ذیل میں دوسری حدیث پر کلام ملاحظہ ہو:

أَقْطَعَ الزُّبَيْرَ: یہ اقطاع بطور تملیک کے تھا۔

حُضْرَ فَرَسِهِ: یعنی جہاں تک گھوڑا دوڑ سکے یا دوڑے وہاں تک کی زمین ان کی ہوئی۔

حَتَّى قَامَ: یعنی جب نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ گھوڑے کو ایڑ لگاؤ یہ جہاں تک دوڑ کر جا پہنچے اتنی زمین تمہاری۔ تو انہوں نے اپنا گھوڑا دوڑایا جو ایک جگہ تک جا کر رک گیا۔

ثُمَّ رَمَى سَوْطَهُ: یہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی زمین کی اور زیادہ حرص تھی کہ جب گھوڑا رک گیا تو انہوں نے اس کے آگے اپنا کوڑا پھینک مارا تا کہ کچھ اور زمین ان کی ملک میں داخل ہو جائے۔

أَعْطُوهُ حَيْثُ بَلَغَ السَّوْطُ: بلاشبہ یہ نبی کریم ﷺ کے حسن اخلاق میں سے تھا کہ آپ ﷺ نے اس بات کا مطلق برا نہ منایا بلکہ اس قدر جاگیر بھی عطا فرما دی۔

درایۃ الحدیث :...... گو کہ مذکورہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن قواعد شرعیہ کے مخالف نہیں۔ کیونکہ جاگیر دینا ایک تبرع ہے اور تبرع میں جہالت جائز ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حکم فی زمانہ گاڑیوں وغیرہ کا نہیں ہوسکتا کیونکہ آدمی گاڑی چلاتے ہوئے تھکتا نہیں۔ لہٰذا امام کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ جہاں تک تم گاڑی چلا کر جا سکتے ہو، اتنی جاگیر تمہاری، کیونکہ فی الواقع اس اِعطاء کی کوئی انتہاء نہیں۔
- انسان فطرۃً لالچی ہے۔ چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ افضل صحابہ میں سے ہونے کے باوجود زمین کی حرص سے خالی نہ تھے، مگر یہ ناجائز حرص نہ تھی۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن اخلاق کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے ٹھہرنے کے بعد ان کے کوڑے کے پھینکنے کو ناپسند نہ فرمایا۔

تین قدرتی مشترکہ چیزیں

916- وَعَنْ رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رضي الله عنه قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: ((النَّاسُ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثَةٍ: فِي الْكَلَإِ، وَالْمَاءِ، وَالنَّارِ)).
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: ''(سب کے سب) لوگ تین چیزوں میں (ایک دوسرے کے) شریک ہیں، گھاس میں، پانی میں اور آگ میں۔''[1]
اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے رجال (یعنی رواۃ) ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:...... **عَنْ رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رضي الله عنهم**: صحابی رسول کا نام مجہول ہونے سے روایت کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غَزَوْتُ: غزوہ یہ قتال کے لیے نکلنے کا نام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب غزوات جہاد فی سبیل اللہ تھے۔

اَلنَّاسُ: یہ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

شُرَكَاءُ: یہ مبتداء کی خبر ہے۔ یعنی سب لوگ آگے مذکورہ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور یہ حکم حکم شرعی ہے اور وہ تین چیزیں یہ ہیں:

اَلْكَلَأُ: یہ قدرتی اگنے والی گھاس کو کہتے ہیں۔

اَلْمَاءُ: پانی، چاہے زمین سے ابلا ہو یا آسمان سے برسا ہو۔

اَلنَّارُ: آگ، لیکن آگ سے کیا مراد ہے؟ علماء کا اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے آگ کی لکڑیاں یعنی جنگلی لکڑیاں مراد ہیں۔ جبکہ ایک قول نفسِ آگ کا بھی ہے اور یہ لفظ سن کر متبادر اذہن میں اس کا یہی مفہوم آتا ہے۔ تب پھر یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ لوگ آگ میں شریک کیونکر ہو سکتے ہیں؟ وہ یوں کہ یہ آگ بھی تو رب تعالیٰ کے امر

---

[1] سنن ابی داؤد: 3477۔ مسند احمد: 364/5۔ سنن البیهقی: 150/6۔ سنن بیہقی کی روایت کی اسناد عمدہ ہے۔ ابو عبید نے "کتاب الاموال" (372) میں یہ روایت امام ابن حجر کی روایت کے الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ "سنن ابن ماجه" (2473) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ امام بوصیری نے اس شاہد کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: التلخیص: 65/3.

سے جلتی ہے۔ اللہ نہ چاہے تو ہم یہ آگ نہیں جلا سکتے۔ تب پھر لوگ اس میں شریک ٹھہریں گے۔
حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- لوگ آگ پانی اور گھاس میں جو قدرتی ہو اور اب تک کسی نے ان کو اپنی ملک میں نہ لیا ہو، شریک ہیں۔ لہٰذا اگر کسی نے یہی جنگلی گھاس کاٹ کر گھر میں ذخیرہ کر لی یا پانی بھر کر گھر میں رکھ لیا تو اب یہ اس کی ملک ہوگا جس میں کوئی دوسرا اس کی اجازت کے بغیر شریک نہیں ہوسکتا۔ یہی حکم آگ کی لکڑیوں کا ہے۔
- مذکورہ حدیث بدنامِ زمانہ گمراہ ترین نظریہ ''اشتراکیت'' کی ہرگز بھی دلیل نہیں جس کے تحت ہر آدمی کے جملہ وسائل حیات سب میں مشترک ہیں اور ان کی تقسیم حکومت وقت کی صوابدید پر ہے۔
- وہ چیزیں جن کی تخلیق میں آدمی کے کسی فعل کا کوئی دخل نہ ہو، لوگ ان چیزوں میں شریک ہوں گے اور ان مشترکہ اشیاء پر خاص کسی کو حق جمانے کا حق نہ ہوگا۔
- ذاتی زمین میں اگنے والی قدرتی گھاس میں اگرچہ دوسرے لوگ بھی شریک ہیں لیکن اس کا پہلا اور زیادہ مستحق خود زمین کا مالک ہے۔
- وہ آگ جو قدرتی گیس کی صورت میں حکومت کی بچھائے پائپ لائنوں کے جال کے ذریعے ہر گھر میں پہنچتی ہے گزشتہ مذکورہ قاعدہ کی رو سے وہ لوگوں کے درمیان مشترک تصور نہ ہوگی۔

وقف کا بیان

وقف کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

تمہید:......الوقف: یہ "وَقَفَ يَقِفُ وَقْفًا وَ وُقُوْفًا" سے مصدر ہے۔ اس کا لغوی معنی چلنے کو بند کرنا ہے جبکہ اصطلاح میں وقف کسی شے کی اصل کو روک کر اس کی منفعت کو وقف کر دینے کو کہتے ہیں۔ جیسے کوئی اپنے گھر کو فقراء کے لیے وقف کر دے جبکہ اس کی اصل کو محفوظ رکھے البتہ اس اصل میں بیع، ہبہ اور میراث وغیرہ کا تصرف نہ کرے۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ اس قسم کے مالی تصرف سے واقف نہ تھے اور اسلام میں پہلا وقف جناب عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ جس کا ذکر ذیل میں دوسری حدیث کے تحت آ رہا ہے۔ وقف کرنے سے اصل مقصود تبرع اور تقرب الی اللہ ہوتا ہے کیونکہ آدمی کسی جائیداد وغیرہ کو اس لیے وقف کرتا ہے تا کہ مرنے کے بعد بھی اس کا عمل باقی اور جاری رہے۔ یوں آدمی وقف کر کے رب تعالیٰ سے اجر و ثواب حاصل کرتا ہے۔ تب پھر ناجائز اور حرام وقف جائز نہ ہوگا جیسے اولاد میں سے کسی ایک کے لیے کچھ وقف کرنا اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنا کہ یہ اولاد میں تفضیل یعنی ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا ہے جو ناجائز اور حرام ہے اور اسی طرح کسی گناہ کے کام میں وقف کرنا بھی حرام ہوگا کیونکہ یہ حصولِ ثواب کے مقصود کے خلاف ہے۔

وقف مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے

917- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَنْهُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ابن آدم جب مر جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے ختم ہو جاتا

عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ)).

ہے سوائے تین چیزوں کے (جو یہ ہیں): (1) صدقہ جاریہ (2) یا وہ علم جس سے (اس کے مرنے کے بعد بھی) نفع اٹھایا جاتا رہے، (3) یا وہ نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔" [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ : مذکورہ "إِذَا" شرطیہ ہے لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔

انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ: کیونکہ دارالعمل صرف دنیا ہے۔ مرنے کے بعد آدمی دارالآخرت منتقل ہو جاتا ہے جو دارالجزاء ہے نہ کہ دارالعمل۔ پس موت کے بعد کوئی عمل نہیں۔

إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: کہ ان باتوں میں اس کا عمل اس سے منقطع اور ختم نہیں ہوتا اور وہ تین باتیں یہ ہیں۔

صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ: اس سے مراد ہر وہ خرچ ہے جو مرنے کے بعد بھی جاری رہے اور وہ خرچ اللہ کی راہ میں ہو۔ یعنی اس سے اللہ کا تقرب مقصود ہو، تب پھر صدقہ جاریہ کا تعلق صرف فقیروں، محتاجوں اور مسکینوں پر ہی خرچ کرنے کے ساتھ خاص نہ ہوگا۔ چنانچہ رستوں پر ٹھنڈے پانی کی ٹینکی وغیرہ لگوا دینا بھی صدقہ جاریہ میں شمار ہوگا۔ چاہے اس سے پینے والے فقیر ہوں یا اغنیاء۔

اور جاریہ کا معنی ہے، جو چلتا رہے بخلاف صدقہ منقطعہ کے جو کسی ایک پر کیا اور اس کی منفعت اسی کی ذات تک رہ کر ختم ہوگئی اور اس کی مثال کسی فقیر کو سو دو سو روپے دینا ہے جن کو وہ کھا پی کر ختم کر دے۔ جبکہ صدقہ جاریہ یہ ہے کہ اس صدقہ کی منفعت غریب مسکین پر جاری رہے جیسے کسی فقیر کے رہنے کے لیے گھر وقف کر جانا کہ اس کا ثواب اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ گھر باقی رہے گا۔

عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ: اگر آدمی ایسا علم چھوڑ جائے جس کا نفع اس کے مرنے کے بعد بھی لوگوں کو ملتا رہے تو اس کا اجر اسے مر جانے کے بعد بھی ملتا رہے گا۔ کیونکہ جس بات کی نیکی دنیا میں ملتی ہو تو مرنے کے بعد وہ نیکی اور بھی زیادہ ملتی ہے۔ جیسے کوئی اپنے پیچھے علوم شرعیہ ودینیہ پر مشتمل کوئی کتاب لکھ کر چھوڑ جائے کہ اس کا اجر اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے کوئی ایسا دنیوی علم چھوڑا جس سے لوگ بعد میں نفع اٹھاتے رہے تو اس کا اجر بھی اسے مرنے کے بعد ملتا رہے گا۔ البتہ یہ اجر علم شرعی کے اجر کے جیسا نہ ہوگا۔ جیسا کوئی کھیتی اگا کر مر گیا تو جب تک اس کھیتی سے لوگ منتفع ہوتے رہیں گے اسے اجر ملتا رہے گا اور یہ بات یہاں بھی ہے کہ اگر کوئی نقصان دہ اور ضرر رساں علم چھوڑ گیا تو اس کا مرنے کے بعد بجائے اجر کے گناہ ملے گا۔

وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ: نیک اولاد کی دعا بھی مرنے کے بعد کام آتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ "نیک" کا ذکر بطور قید کے ہے یا یہ واقع کا بیان ہے۔ تو بعض کے نزدیک یہ شرط اور قید ہے کیونکہ غیر صالح کی تو اپنی دعا غیر مستجاب ہے چہ جائیکہ کسی دوسرے کے حق میں مستجاب ہو۔

جبکہ ایک قول یہ ہے کہ یہ واقع کا بیان ہے کہ ماں باپ کے لیے دعا اکثر وہی اولاد کرتی ہے جو نیک ہو۔ غیر صالح کو تو مرے ہوئے والدین کا خیال تک نہیں آتا اور لفظ "وَلَدٍ" لغت عربیہ کے اعتبار سے مذکر اور مونث دونوں جنسوں کو شامل ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل اس بات کی نہایت بلیغ ترغیب ہے کہ آدمی دنیا میں رہتے

---

[1] صحيح مسلم: 2282.

ہوئے ایسے کام کر جائے کہ رہتی دنیا تک اسے اس کام کا اجر و ثواب ملتا رہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نیک عمل اور اس میں جلدی کرنے کی ترغیب۔ اس کی دلیل "إِذَا مَـــاتَ ابْــنُ آدَمَ" کے الفاظ ہیں کیونکہ موت اچانک آ جاتی ہے۔ اس لیے جو کرنا ہے جلدی جلدی کر لیا جائے۔
- صدقہ جاریہ کی بے حد فضیلت ہے۔ اسی کے ضمن میں علم کی فضیلت کا بھی علم ہو گیا اور یہ کہ علم کی نشر و اشاعت بے حد بزرگی اور فضیلت والا عمل ہے۔
- وقف کرنا مشروع اور جائز ہے اور یہ امور بدعیہ میں سے نہیں۔
- علم کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بہت سارا ہو۔ کیونکہ ''علم'' کا لفظ مذکورہ حدیث میں نکرہ آیا ہے جو اطلاق پر دلالت کرتا ہے اور یہ قلیل و کثیر دونوں کو شامل ہے۔
- اولاد کی نیکی پر تربیت کرنا بہت ضروری ہے تاکہ وہ ہمارے مرنے کے بعد آخرت میں ہمارے درجات کے بلند ہونے کا ذریعہ بنے۔ کہ غیر صالح اولاد دنیا و آخرت دونوں جگہ کام نہیں آتی۔
- مرنے والے کے لیے دعا کرنا اس کی طرف سے کسی نیکی کے کرنے سے افضل ہے۔

اسلام کا پہلا وقف

918- وَعَـنِ ابْـنِ عُـمَـرَ رضی اللہ عنہما قَـالَ: أَصَـابَ عُـمَرُ رضی اللہ عنہ أَرْضًـا بِـخَيْبَـرَ، فَـأَتَـى النَّبِيَّ ﷺ يَسْتَـأْمِـرُهُ فِيهَـا، فَـقَـالَ: يَـا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّي أَصَبْتُ أَرْضًـا بِـخَيْبَـرَ لَمْ أُصِبْ مَالًا قَطُّ هُوَ أَنْـفَسُ عِنْدِيْ مِنْهُ، فَقَالَ: ((إِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَصْـلَهَـا وَتَـصَـدَّقْتَ بِهَا)) قَالَ: فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ رضی اللہ عنہ، أَنَّـهُ لَا يُبَاعُ أَصْلُهَا، وَلَا يُوْرَثُ، وَلَا يُـوْهَـبُ، فَتَصَدَّقَ بِهَا فِي الْفُقَرَاءِ، وَفِي الْـقُـرْبَـى، وَفِي الرِّقَابِ، وَفِيْ سَبِيلِ اللّٰهِ، وَابْـنِ السَّبِيلِ، وَالضَّيْفِ، لَا جُنَاحَ عَلَى مَنْ وَلِيَهَـا أَنْ يَـأْكُـلَ مِـنْهَـا بِالْمَعْرُوفِ، وَيُطْعِمَ صَدِيْقًا غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ مَالًا.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر کی ایک زمین ملی تو انہوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اس کی بابت آپ ﷺ سے مشورہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے خیبر کی ایک زمین ملی ہے مجھے اپنے نزدیک اس سے عمدہ کوئی مال کبھی نہیں ملا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو اس کی اصل کو اپنے پاس رکھ لو اور اس (کی منفعت) کو (راہِ خدا میں) صدقہ کر دو۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کی اس زمین کو صدقہ کر دیا کہ اس کی اصل کو فروخت نہ کیا جائے گا اور نہ اس میں میراث جاری ہوگی اور نہ اسے ہبہ ہی کیا جائے گا۔ پس انہوں نے اس زمین کو فقراء، اور قرابت داروں میں، غلاموں (کے چھڑانے) میں اور جہاد فی سبیل اللہ میں اور مسافروں اور مہمانوں (کی خدمت) میں صدقہ (یعنی وقف) کر دیا۔ (اور یہ کہ) اس کے نگران پر اس بات میں کوئی حرج نہ ہوگا کہ وہ اس میں سے دستور کے مطابق (کچھ لے کر) کھا لے اور اپنے دوست

کو (بھی اس میں سے دستور کے مطابق) کھلا دے البتہ وہ اس کو مال بنانے والا نہ ہو۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ . وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ : ((تَصَدَّقْ بِأَصْلِهَا : لَا يُبَاعُ وَلَا يُوْهَبُ وَلَكِنْ يُنْفَقُ ثَمَرُهُ)) .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔ اور صحیح بخاری کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں: ''اس کی اصل کو صدقہ کردے کہ نہ تو وہ فروخت کی جائے اور نہ ہبہ کی جائے البتہ اس کے پھل کو (فقراء ومساکین پر) خرچ کیا جائے۔''

غریب الحدیث:......أَصَبْتُ: یعنی میں نے حاصل کیا ہے۔

يَسْتَأْمِرُهُ: یعنی اس بارے آپ ﷺ کا امر اور مشورہ حاصل کریں۔

قَطُّ: زمانہ ماضی کے لیے ظرف زمان ہے جومبنی بر ضم ہوتا ہے اور اعراب کے اعتبار سے یہ نصب کے محل میں ہوتا ہے اور اکثر یہ نفی کے بعد آتا ہے۔

أَنْفَسُ عِنْدِي مِنْهُ: انفس سے مراد زیادہ قیمتی، مہنگا، عمدہ اور محبوب ہے۔ پس نفیس مال وہ ہوگا جو صاحب مال کو تو محبوب ہو اور لوگوں کے نزدیک قیمتی اور عمدہ ہو۔

إِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَصْلَهَا: یہ نبی کریم ﷺ نے مشورہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا نہ کہ ایسا کرنے کا صریح حکم دیا تھا۔ تاکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ نہ گمان کریں کہ ایسا کرنا واجب ہے۔

اور ''حَبَسْتَ أَصْلَهَا'' کا معنی ہے کہ اس کی اصل کو وقف کردو۔ چنانچہ بعد میں نہ تو اس کو بیچا جائے اور نہ اس میں میراث جاری کی جائے اور نہ کسی کو ہبہ ہی کیا جائے۔ البتہ!

وَتَصَدَّقْتَ بِهَا: یعنی اس کے پھل یا پیداوار کو مستحقین پر صدقہ کردو۔ کیونکہ یہاں خود اصل زمین کو صدقہ کرنے کو مراد لینا ممکن نہیں کیونکہ کسی شے کو صدقہ کرتے ہوئے اسے وقف کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس شے کو صدقہ کردینا اس کے وقف کرنے کے منافی ہے۔ پس یہاں صدقہ کرنے سے مراد اس کے پھل اور پیداوار کو صدقہ کرنا ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں اس کی یہی تفسیر مذکور ہے۔

اس کے بعد جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما یہی روایت کرتے ہیں کہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا کہ اس کی اصل کو تو وقف کردیا اور اس کے پھل کو صدقہ کردیا اور اس کی خرید وفروخت، اس کے ہبہ کرنے اور اس میں میراث کے جاری ہونے کو منع فرمادیا۔ بیع اور ہبہ میں جو فرق ہے، وہ معروف ہے کہ بیع یہ عقدِ معاوضہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک شے دے کر اس کا بدل لیتا ہے۔ جبکہ ہبہ عقدِ تبرع ہے کہ آدمی اس میں کچھ دیتا ضرور ہے لیکن اس کا بدل نہیں لیتا اور وراثت یہ میت کے ترکہ کا اس کے پس ماندگان کی طرف منتقل ہونا ہے۔ تب پھر یہ زمین خود جناب عمر رضی اللہ عنہ کی ملک میں داخل نہ رہی تھی کہ بعد میں اس میں میراث بھی جاری ہوتی۔

فَتَصَدَّقَ بِهَا فِي الْفُقَرَاءِ: یہاں سے جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما وقف کے مصارف کو بیان فرما رہے ہیں جو یہ ہیں:

(1) فقراء (2) ذوی القربیٰ یعنی قرابت دار اور صحیح قول یہ ہے کہ ان سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قرابت دار مراد ہیں نہ

❶ صحيح البخاري: 2737۔ صحيح مسلم: 1633 .

کہ نبی کریم ﷺ کے قرابت دار۔ (3) **الرقاب**: مراد غلام ہیں۔ (4) **فی سبیل اللہ**: مراد راہِ خدا میں جہاد ہے۔ (5) **ابن سبیل**: یعنی مسافر جو بے خاں و ماں ہو جائے یا اس کا زادِ راہ ختم ہو جائے۔ (ان کی سب کی تفصیل "کتاب الزکوٰۃ" میں بیان کر دی گئی ہے) (6) **الضیف**: مراد وہ مہمان ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا آلِ عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں آ ٹھہرا ہو۔ کہ اس وقف سے مستفید ہونے کا حق اسے بھی ہے۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کی یہ زمین ان چھ مصارفِ وقف تک محدود رکھی اور اپنی اولاد کو اس میں شریک نہ فرمایا۔ کہ کہیں بعد میں یہ وقف ان کی اولاد اور ذریت میں ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ وقف عام رہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَى مَنْ وَلِيَهَا أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوفِ: **جُنَاح** سے مراد گناہ اور حرج ہے اور ولی سے مراد اس وقف کی زمین کا نگران اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ اگرچہ اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کی اس ارضِ موقوفہ کا ولی و نگران کس کو بنایا تھا۔ البتہ ایک دوسری روایت میں ذکر ہے کہ وہ جنابِ عمر رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوفِ: یعنی وہ نگران اس کے پھل میں سے لے کر کھا سکتا ہے البتہ اس زمین کو بیچ نہیں سکتا اور معروف سے مراد لوگوں کا دستور اور غالب عادت ہے جو ان میں جاری ہو۔

البتہ جاری عرف سے مراد نفقہ ہے یا اجرت؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ پس اگر تو ہم اس سے نفقہ مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ارضِ موقوفہ کا والی اس کے پھل سے اپنی گزران کے بقدر لے سکتا ہے۔ چاہے وہ عرفی اجرت سے زیادہ کی رقم ہو اور اگر اس سے مراد اجرت لیں تب پھر ایسا والی عرفی اجرت سے زیادہ رقم نہ لے گا چاہے وہ اس کے نفقہ سے کم ہی ہو۔

وَيُطْعِمَ صَدِيقاً: ارضِ موقوفہ کا والی اگر اس کے پھل میں سے آنے جانے والے اپنے ملاقاتیوں یا دوستوں کو کچھ کھلاتا ہے جو دستور اور عرف کے مطابق ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ مَالًا: یعنی وہ مال دار بننے کے قصد و ارادہ سے اس کی اصل سے نہ کھائے، وہ یوں کہ اس کا کوئی حصہ بیچ نہ ڈالے۔ اسی طرح مال دار بننے کی غرض سے دوست کو بھی نہ کھلائے۔

تَصَدَّقْ بِأَصْلِهِ: یہ صحیح بخاری کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں اور یہاں اصل سے مراد اصل ارض ہے۔ جبکہ زمین کے درخت بھی اس حکم میں داخل ہیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل تین اہم اور بنیادی مسائل بیان کیے گئے ہیں جو یہ ہیں:

(1) زمین کو وقف کر سکتے ہیں۔

(2) وقف کردہ زمین کی بیع و شراء اور ہبہ و میراث منع ہے۔ البتہ اس کی پیداوار اس کے مصارف پر خرچ کی جائے گی۔

(3) وقف کا نگران بھی دیگر مصارفِ وقف کی طرح اس کی پیداوار سے حسبِ دستور مستفید ہو سکتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ مسلمان خیبر کی سرزمین کے مالک بن گئے تھے کیونکہ وقف صرف اپنی ملک میں ہی جاری ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرزمین خیبر کے مالک بنے تھے تبھی تو اس میں ان کا وقف بھی جاری اور جائز تسلیم کیا گیا تھا۔

- اہل علم و فضل سے مشاورت با برکت ہے اور مذکورہ حدیث اس کی مشروعیت کی دلیل ہے۔
- سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کہ بے پناہ عقل و فہم کا مالک ہونے کے باوجود درِ رسالت پر آ کر ہی عجز و نیاز کرتے تھے۔
- خود کو عقل کل نہ سمجھنا چاہیے بلکہ دوسرے لوگوں سے اور بالخصوص اہل علم و فضل سے مشاورت کرتے رہنا چاہیے۔
- حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت بھی ہے کہ انہوں نے اپنا بے انتہا محبوب مال بھی اللہ کے نام پر محتاجوں میں وقف کر دیا۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جی کو کس چیز کا محبوب ہونا مذموم اور تقویٰ و زہد کے خلاف نہیں۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعبیر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے کہنے کے مطابق مشورہ نہ دیا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم طلب کیا تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بجائے مشورہ عنایت فرمایا تا کہ یہ امر ان کے اور ان کے علاوہ کسی بھی دوسرے کے حق میں واجب نہ ٹھہرے۔
- وقف یعنی اپنے مال میں اس طرح کا تصرف مشروع اور جائز ہے کہ اس کی اصل تو روک لی جائے البتہ اس کی منفعت صدقہ کر دی جائے۔
- اگر آدمی کے پاس صرف ایک ہی مال ہو تب بھی وہ اس کو وقف کر سکتا ہے۔
- وقف یہ نیکی پر مبنی ہوتا ہے جیسا کہ لفظ صدقہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
- وقف کا طاعت ہونا لازم ہے۔ لہٰذا معصیت میں اور ایسے کاموں میں وقف جائز نہیں ہوگا جو نہ تو نیکی ہوں اور نہ گناہ۔
- املاکِ موقوفہ کی بیع درست نہیں۔ اس کی دلیل "لَا يُبَاعُ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ بیع یہ وقف کے معنی کے خلاف ہے۔ تب پھر املاکِ موقوفہ میں تبادلہ (ایک شے کو دوسری سے بدلنا) ومناقلہ (ایک شے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا) بھی جائز نہ ہوگا حتی کہ خود مالک و واقف کے لیے بھی جائز نہ ہوگا۔ چنانچہ اگر کسی نے اپنے باغ کا مشرقی حصہ وقف کر دیا، پھر اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے شرقی حصہ کے بدلے باغ کا غربی حصہ وقف کرنا چاہا تو یہ بھی جائز نہ ہوگا۔ البتہ ضرورت کے تحت ایسا کر سکتے ہیں وہ یوں کہ اگر اس کے منافع تعطل کا شکار ہو رہے ہوں تو اس کو فروخت کر کے اس کی جگہ دوسری جگہ کو وقف کر سکتے ہیں۔ جیسے کسی جگہ مسجد بنائی تھی پھر لوگ وہاں سے منتقل ہو گئے اور وہ مسجد ویران ہو گئی۔ تو اس جگہ کو بیچ کر دوسری جگہ مسجد بنا سکتے ہیں۔
- املاکِ موقوفہ کو ہبہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ حتیٰ کہ خود واقف بھی املاکِ موقوفہ کو خود وقف کے مصارف پر بھی ہبہ نہیں کر سکتا۔
- ہبہ اور بیع دو الگ الگ چیزیں ہیں کیونکہ دونوں کے درمیان عطف آیا ہے جو مغایرت کو مقتضی ہے۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرزمین خیبر کو وقف کرنے میں نہایت حسن تدبیر سے کام لیا کہ اس کو چھ جہات میں وقف فرمایا اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان جہات میں وقف کرنا افضل ہے۔
- املاکِ موقوفہ میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس جائیداد کو وقف کے مصارف نے واقف سے حاصل کیا ہے۔ تب پھر اگر کسی نے کوئی جائیداد خود اپنی اولاد پر دقف کی اور وہ تین تھے تو وہ اس جائیداد کے اثلاثا مستحق ہوں گے۔ پھر اگر ان میں سے ایک والد کی زندگی میں فوت ہو گیا تو اب وہ جائیداد دو باقی بھائیوں میں نصفا نصف ہو گی اور اگر دو مر گئے تو وہ تیسرا اکیلا ہی اس جائیداد کا مستحق ہو گا۔ رہے وہ دو مرنے والے تو ان کو اپنا حصہ نہ ملے گا کیونکہ وقف میں میراث جاری نہیں ہوتی۔

- جنابِ عمر رضی اللہ عنہ کی دقت فہمی اور بے حد بصیرت کہ انہوں نے خیبر کی جائیداد کو ان چھ اصناف میں بطور مشاع کے وقف فرمایا۔
- رہا یہ سوال کہ یہ چھ اصناف بطور مجموع کے ہیں یا جمیع کے ہیں؟ یعنی کیا ان سب اصناف پر خرچ لازم ہے یا دیگر اصناف کے نہ ہونے کی صورت میں کسی ایک پر اکتفاء کرنا بھی جائز ہے؟ تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر بعض اصناف نہ ملیں تو مالِ وقف کے ثمرہ کو باقیوں پر خرچ کرنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ یہی مسئلہ مصارفِ زکوٰۃ میں بھی ہے۔
- املاکِ موقوفہ پر کسی کو نگران ووالی بنانا ثابت اور مشروع ہے تاکہ وہ املاک ضائع اور برباد نہ ہوں۔
- اور وقف کرنے والا نگران پر کسی بات کو شرط بھی رکھ سکتا ہے جس کی دلیل "لا جُنَاحَ عَلَى مَنْ وَلِيَهَا أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوفِ" کے الفاظ ہیں۔
- عرف کی رجوع جائز ہے۔ جس کی دلیل "بِالْمَعْرُوفِ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ یہ جائز امور میں ہوگا جیسے وکالت، انتظام و انصرام وغیرہ۔ رہے امورِ لازمہ جیسے اجارہ جو طرفین پر لازم ہوتا ہے تو صحیح قول یہ ہے کہ ان میں بھی عرف کی طرف رجوع جائز ہے۔
- املاکِ موقوفہ کا نگران مالِ وقف میں سے دوست کی خاطر داری کر سکتا ہے۔ جبکہ واقف نے اس کی شرط کر دی ہو۔ اب چاہے کسی کے دوست کم ہوں یا زیادہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
- معلوم ہوا کہ شہر والوں پر مہمان کا حق ہوتا ہے۔
- وقف کرنے میں جائیداد کی تحدید لازم نہیں جبکہ وہ خود معلوم ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر سننے کے بعد کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خیبر کی جائیداد وقف کرنا چاہتے ہیں، یہ دریافت نہ فرمایا کہ کیا تم نے اس کی حدود بھی متعین کر دی ہیں یا نہیں؟
- آدمی اپنے باپ کا نام لے کر ایک بات بیان کر سکتا ہے جیسا کہ جنابِ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد ماجد خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر یہ قصہ بیان فرمایا ہے۔
- املاکِ موقوفہ سے مہمان کی خاطر تواضع بھی کی جاسکتی ہے۔
- املاکِ موقوفہ کا نگران عورت کو بھی بنایا جاسکتا ہے۔
- وقف کرنے والے کو چاہیے کہ وہ وقف کی جملہ شرائط بیان کر دے تاکہ کسی قسم کا التباس یا اشتباہ باقی نہ رہے۔

راہِ خدا میں وقف کرنا

919- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: ((بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ)) الْحَدِيثَ، وَفِيهِ: ((وَأَمَّا خَالِدٌ فَقَدِ احْتَبَسَ أَدْرَاعَهُ وَأَعْتَادَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صدقہ کا عامل بنا کر بھیجا۔ الحدیث۔ اس حدیث میں آگے یہ مذکور ہے "اور رہے خالد تو انہوں نے اپنی زرہوں اور جنگی آلات کو راہِ خدا میں وقف کر دیا ہوا ہے۔" [1]
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 1468- صحيح مسلم: 983.

غریب الحدیث :...... عَلَى الصَّدَقَةِ: یعنی صدقہ کا والی اور عامل بنا کر بھیجا اور یہاں صدقہ سے مراد واجب زکوٰۃ ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا۔

نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ اپنے عمال کو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک سال جب آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اموالِ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا تو انہوں نے آکر یہ بتلایا کہ تین اشخاص نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن جمیل رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ۔ یہ قصہ کتاب الزکوٰۃ میں مفصل گزر چکا ہے اور وہاں اس روایت پر تفصیلی گفتگو بھی کی جا چکی ہے۔ امام موصوف رحمہ اللہ اس روایت کو دوبارہ یہاں صرف وقف کے جواز کا شاہد بنا کر لائے ہیں۔ کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی زرہوں اور آلاتِ حربیہ کو راہِ خدا میں وقف کر دیا تھا تاکہ مجاہدین ان کو غزوات و جہاد میں دشمنوں کے مقابلہ میں کام میں لے آئیں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے راہِ خدا میں وقف کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(1) ایک یہ کہ انہوں نے اپنی زکوٰۃ کو اس صورت میں راہِ خدا میں دے دیا ہوا تھا اس لیے انہوں نے زکوٰۃ کے مطالبہ پر یہ عذر کر دیا کہ وہ تو اس صورت میں زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں۔

(2) دوسرا یہ کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان اشیاء کو مجاہدین پر وقف کر دیا ہوا تھا۔ گویا کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو آدمی راہِ خدا میں یوں بے دریغ خرچ کرتا ہو جو مستحب ہے بھلا وہ آدمی واجب دینے سے کیونکر انکاری ہو سکتا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس اس وقت اتنا مال ہی نہ تھا کہ جس کی زکوٰۃ نکلتی ہو کہ وہ تو اپنا سارا مال وقف کر چکے ہوئے تھے۔ مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عاملین کو بھیجنا مشروع ہے۔
- سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نگاہِ رسالت میں بے حد قابل اعتماد فرد تھے۔ اسی لیے ایسے نازک امر پر نبی کریم ﷺ نے انہیں تعینات کیا تھا۔
- اموالِ منقولہ کا وقف بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جنگی سامان کو وقف کیا تھا جو اموالِ منقولہ میں سے ہیں۔

17۔ بَابُ الْهِبَةِ وَالْعُمْرٰى وَالرُّقْبٰى
ہبہ، عمریٰ اور رقبیٰ کا بیان

ہبہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

لغت میں لفظ ہبہ "هَبَّتِ الرِّيحُ" سے ماخوذ ہے۔ یہ ہوا کے کسی مقابل کے بغیر چلنے کو کہتے ہیں۔ جبکہ اصطلاح میں ہبہ تملیک بلاعوض کو کہتے ہیں جس میں اس کی منفعت ملحوظ ہے جس کو دیا جا رہا ہے۔ پس تملیک بلاعوض میں کبھی تو اس سے مقصود محض رب تعالیٰ کا تقرب ہوتا ہے تب اس کو صدقہ کہا جاتا ہے اور کبھی باہمی الفت و محبت مقصود ہوتی ہے، تب اس کا نام ہدیہ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جب تملیک بلاعوض سے، قطع نظر تقرب و مودت کے، صرف لینے والے کی منفعت مقصود ہو تو اسے ہبہ کہا جاتا

ہے۔ البتہ تملیک بلاعوض ہونے میں ہدیہ، صدقہ اور ہبہ تینوں مشترک ہوتے ہیں۔

ہبہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ جمیع عقود میں اصل ان کی حلت ہے جب تک کہ کسی عقد کی حرمت پر دلیل قائم نہ ہو۔

عمریٰ اور رقبیٰ

یہ بھی ہبہ کی ہی دو اقسام ہیں جو عمر کے ساتھ مقید ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل آگے آ جاتی ہے۔

ہبہ کے ضوابط

920۔ ((عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رضي الله عنهما أَنَّ أَبَاهُ أَتَى بِهِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: إِنِّيْ نَحَلْتُ ابْنِيْ هٰذَا غُلَامًا كَانَ لِيْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَهُ مِثْلَ هٰذَا؟)) فَقَالَ: لَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فَارْجِعْهُ))

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کے والد ماجد (حضرت بشیر رضی اللہ عنہ) نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: میں نے اپنے اس بیٹے کو اپنا ایک غلام (عطیہ میں) دیا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے اپنے ہر ہر بیٹے کو ایسا ہی ایک غلام دیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس دیے ہوئے کو واپس لے لو۔''

وَفِيْ لَفْظٍ: فَانْطَلَقَ أَبِيْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ لِيُشْهِدَهُ عَلَى صَدَقَتِيْ، فَقَالَ: ((أَفَعَلْتَ هٰذَا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ؟)) قَالَ: لَا، قَالَ: ((اتَّقُوا اللّٰهَ، وَاعْدِلُوْا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ))، فَرَجَعَ أَبِيْ، فَرَدَّ تِلْكَ الصَّدَقَةَ)).

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: پس میرے والد خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تاکہ وہ آپ ﷺ کو میرے اوپر کیے جانے والے صدقہ پر گواہ بنائیں۔ اس پر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کے ساتھ ایسا کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل سے کام لو۔'' پس (یہ ارشاد سن کر) میرے والد صاحب رضی اللہ عنہ لوٹے اور انہوں نے (مجھ پر کیا) وہ صدقہ واپس لے لیا۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: قَالَ: ((فَأَشْهِدْ عَلَى هٰذَا غَيْرِيْ))، ثُمَّ قَالَ: ((أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُوْنُوْا لَكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟)) قَالَ: بَلَى، قَالَ: ((فَلَا إِذَنْ)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: ''تب پھر تم اس بات پر میرے سوا (کسی اور) کو گواہ بناؤ۔'' پھر ارشاد فرمایا: ''کیا تمہیں اس بات سے خوشی نہیں کہ یہ سب نیکی کرنے میں تیرے لیے برابر ہوں؟ (یعنی تم ان سب کے ساتھ برابر کا نیک سلوک کرو)۔'' انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تب پھر (اس ایک اکیلے کو عطیہ دینا درست) نہیں۔'' [1]

---

[1] صحيح البخاري: 2586- صحيح مسلم: 1623.

غریب الحدیث :...... نَحَلْتُ : یہ "اَعْطَیْتُ" کے معنی میں ہے۔ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ بتلانے کیوں حاضر ہوئے تھے تو اس کو دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ دراصل وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عطیہ پر گواہ بنانا چاہتے تھے۔ تب پھر یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ کیا ہبہ پر کسی کو گواہ بنانا لازم ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہبہ پر کسی کو گواہ بنانا شرط نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ جنابِ نعمان رضی اللہ عنہ ان کی دوسری اہلیہ عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا سے تھے جو جلیل القدر صحابی رسول حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ہم شیرہ تھیں۔ چنانچہ جب حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے اس بیٹے کو غلام ہبہ کیا تو ان کی والدہ حضرت عمرہ رضی اللہ عنہا نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ اس بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ کر لیں کیونکہ انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس ہبہ میں ان کے دوسرے سوتیلے بھائی بعد میں جھگڑیں گے۔

غرض حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت عمرہ رضی اللہ عنہا کے کہنے پر جناب بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے خدمت نبوی میں جا کر یہ سارا قصہ گوش گزار کر دیا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا تم نے اپنی باقی اولاد کو بھی ایسا ہی ہبہ کیا ہے؟ نفی میں جواب ملنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر اپنے اس بیٹے سے بھی یہ غلام واپس لے لو۔

رہا یہ سوال کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کیوں فرمایا کہ اس کے اور بھی بھائی ہیں کیا تم نے ان کو بھی ایسا ہبہ کیا ہے؟ اور کیا یہ سوال کرنا ضروری ہے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس بیٹے سے بھی ہبہ واپس لینے کو کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کیونکہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے یہ بات خود بتلائی تھی کہ میرے اس بیٹے کے دوسرے سوتیلے بھائی بھی ہیں اور اس کی ماں کو اندیشہ ہے کہ اس کے دوسرے بھائی بعد میں اس ہبہ میں اس سے جھگڑیں گے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ باقی بھائیوں کو ایسا ہبہ نہیں ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کو خلاف عدل جانتے ہوئے اس ایک بیٹے سے بھی وہ ہبہ واپس لینے کو ارشاد فرمایا: غرض کوئی قرینہ ہو تو ایسا سوال کرنا جائز ہوتا ہے۔ جبکہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس امید پر پوچھی تھی کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاص اس بیٹے کو ہبہ کر دینے کی کوئی رخصت عنایت فرما دیں۔

أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَهُ مِثْلَ هٰذَا: لفظ "کُلُّ" یہ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ اس کے بعد کا عامل اس کی ضمیر میں عمل کرنے میں مشغول ہے اور وہ "نَحَلْتَهُ" میں منصوب متصل کی واحد غائب کی ضمیر "ھا" ہے لیکن اگر یہ مابعد کا فعل اس کی ضمیر میں عمل کرنے میں مشغول نہ ہوتا تو لفظ "کُلَّ" کا منصوب ہونا واجب ہوتا اور یہ "ما اضمر عامله علی شریطة التفسیر" کی قبیل میں سے ہوتا اور یہ ہر وہ مفعول بہ ہوتا ہے جس کے عامل ناصب کو اس بنا پر حذف کر دیا جاتا ہے کہ اس کی تفسیر آگے آ رہی ہے۔ یہاں اگر عامل کو حذف نہ کیا جائے گا تو مفسر اور تفسیر کا اجتماع لازم آئے گا جو منع ہے۔ ❶

اور مذکورہ ہمزہ استفہامیہ ہے۔ یاد رہے کہ ادواتِ استفہام زیادہ تر افعال پر داخل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب ادواتِ ہمزہ کے بعد ما اضمر عامله علی شریطة التفسیر مذکور ہو تو اس کا منصوب ہونا راجح ہوتا ہے۔ لہٰذا جب حرفِ استفہام کسی اسم پر داخل ہوگا تو اس کا ما اضمر عامله علی شریطة التفسیر میں سے ہونا راجح ہوگا۔

پس اب اگرچہ "اکلُّ ولدك" میں رفع بھی جائز ہے لیکن راجح اس کا منصوب ہونا ہے اور "ولد" سے مراد مطلق اولاد ہے چاہے وہ مذکر ہو یا مؤنث۔ پھر یہ لفظ یہاں مفرد اور مضاف ہے لہٰذا عموم پر دلالت کرے گا اور یہ ساری اولاد کو شامل ہوگا۔

---

❶ دیکھیں: "التسهيل السامي في حل شرح الجامي: 287,286/1". (نسیم)

فَارْجِعْهُ: یعنی جب تم نے اپنی باقی کی اولاد کو بھی ایسا ہی غلام ہبہ نہیں کیا تو اس بیٹے سے بھی یہ ہبہ واپس لے لو اور اس کیے ہبہ کو لغو جانو۔ کسی چیز کو واپس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی موجودہ حالت کو باطل جانو اور اسے اس کی پہلی حالت پر واپس لے جاؤ۔

فَانْطَلَقَ أَبِي إِلَى النَّبِيِّ ﷺ لِيُشْهِدَهُ عَلَى صَدَقَتِي: یہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔ یعنی حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ سیدہ عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا کی تجویز پر نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ ﷺ کو اس صدقہ پر گواہ بنائیں جو انہوں نے یعنی میرے والد نے مجھ پر کیا تھا۔ تب پھر "صَدَقَتِي" میں "صَدَقَةٌ" مصدر مفعول بہ کی طرف مضاف ہے اور یہاں ہبہ پر صدقہ کا اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ ہبہ صدقہ کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے پھر دونوں بلاعوض بھی ہوتے ہیں۔ پھر اگر ہبہ میں رب کی رضا مقصود ہو تو یہ صدقہ بھی ہوتا ہے۔

أَفَعَلْتَ هَذَا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ: معنی کے اعتبار سے یہ جملہ گزشتہ روایت کے جملہ جیسا ہے البتہ ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ جملہ گزشتہ جملہ سے دو باتوں میں مختلف ہے:

(1) ایک یہ کہ یہاں "ما اضمر عامله علی شریطة التفسیر" مذکور نہیں۔

(2) دوسری یہ کہ یہاں ہمزہ استفہام اپنے اصل استعمال کے مطابق فعل پر داخل ہے نہ کہ اسم پر۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ: یعنی جب حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے اس بات کی خبر دی کہ انہوں نے اپنی ساری اولاد کو غلام ہبہ نہیں کیا تب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ "اللہ سے ڈرو۔" یعنی اس کے عذاب اور عتاب سے بچنے کی کوئی تدبیر کرو اور یہ اس کی طاعت کے کرنے سے اور اس کی معصیت سے بچنے سے ہی ممکن ہے اور یہاں تقویٰ اختیار کرنے سے مراد معصیت سے بچنے کی طرف اشارہ ہے اور وہ اپنی ساری اولاد میں عدل نہ کرنا ہے جو واجب کا ترک ہے اور اس کے گناہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ: یعنی ان پر احسان کرنے میں برابری کرو۔ اس حکم میں چھوٹی بڑی اور مذکر مونث اولاد دونوں برابر ہیں۔ **فَرَجَعَ أَبِي فَرَدَّ تِلْكَ الصَّدَقَةَ:** یعنی حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ پر لوٹے اور ان سے وہ غلام واپس لے لیا۔ یہاں بھی ہبہ پر صدقہ کا اطلاق کیا گیا ہے جس کی تفصیل گزشتہ میں مذکور ہو چکی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ غلام نہیں بلکہ ایک باغ تھا۔ دونوں روایات میں تطبیق کی صورت یوں ہو سکتی ہے کہ وہ ایک باغ تھا جس میں ایک غلام بھی تھا۔

فَأَشْهِدْ عَلَى هَذَا غَيْرِي: یہ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں نبی کریم ﷺ نے یہ اس لیے فرمایا تھا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کو اس بات پر گواہ بنانے آئے تھے اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "فَإِنِّي لَا أَشْهَدُ عَلَى جَوْرٍ" (بے شک میں ظلم پر گواہ نہ بنوں گا) تب پھر "فَأَشْهِدْ عَلَى هَذَا غَيْرِي" یہ ارشاد زجر وتوبیخ کے لیے ہوگا نہ کہ اباحت اور جواز کے لیے۔

أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا لَكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً: مذکورہ ہمزہ استفہامیہ ہے جو فعل پر داخل ہے۔

يَسُرُّ: یہ سرور سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی معروف ہے اور یہ قلب کی راحت وطمانیت کو کہتے ہیں۔

أَنْ يَكُونُوا: مراد اولاد ہے۔ یعنی کیا تمہیں اس بات سے خوشی نہیں کہ تیری اولاد نیکی کرنے میں تیرے لیے برابر ہو؟

بَلٰی: یہ حرفِ جواب ہے جو "نَعَم" کے معنی میں ہے۔ کیونکہ اثبات کا جواب "نَعَم" سے اور نفی کے حال کا جواب "لا" سے دیا جاتا ہے نہ کہ "بلی" سے۔ کیونکہ "بلی" کے ساتھ جواب تب ہی دیا جاتا ہے جب استفہام نفی پر داخل ہو۔ البتہ جب استفہام اثبات پر داخل ہو تو اس کا جواب "نعم" کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ ہاں بسا اوقات "بلی" یہ "نعم" کی جگہ بھی واقع ہوتا ہے۔

(البتہ اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ یہاں استفہام کے بعد حرفِ نفی مقدر ہو، تب پھر "بَلٰی" کا آنا برمحل ہوگا اور ہمیں یہ توجیہ نہ کرنی پڑے گی کہ یہاں "بلی" یہ "نعم" کے قائم مقام ہے۔ نسیم)

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر یہ مسائل مذکور ہیں:

- ......اولاد کو ہبہ کیا جاسکتا ہے۔
- ......اولاد میں برابری اور عدل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یا تو سب کو ہبہ کیا جائے یا کسی کو بھی نہ کیا جائے گا اور اگر کسی کو ہبہ کیا ہے اور باقی کو نہیں کیا تو اس ایک سے بھی ہبہ واپس لیا جائے گا۔
- ......ہبہ پر صدقہ کا اطلاق بھی کر سکتے ہیں۔
- ......بے انصافی اور ظلم وجور پر گواہ نہ بنا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- باپ اولاد کو عطیہ اور ہبہ دے سکتا ہے اور اس کا نام عطیہ ہے۔ یہ جائز ہے۔ بخلاف نفقہ کے کہ وہ باپ پر واجب ہے۔
- غلام کا مالک بن سکتے ہیں۔
- جس کو ہبہ کرنا ہے اس کی تعیین جائز ہے اور یہ تعیین نام لے کر بھی ہوسکتی ہے اور اشارہ سے بھی جیسا کہ یہاں یہ تعیین اشارہ سے ہے۔
- تعیین کے عمل میں اشارہ یہ عبارت کا قائم مقام ہوتا ہے۔
- مفتی کو اگر تفصیل جاننے کی حاجت ہو تو اس پر تفصیل کا جاننا واجب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے اپنی باقی کی ساری اولاد کو بھی ایسا ہی عطیہ دیا ہے۔
- عطیہ دینے اور ہبہ کرنے میں اولاد میں برابری کرنا واجب ہے اور یہ عطیہ محضہ میں ہے۔ البتہ واجب نفقہ میں برابری شرط نہیں کہ وہ ہر ایک پر اس کی حاجت کے مطابق خرچ کیا جائے گا۔ جیسے ایک اولاد بالغ ہو جو نکاح کی محتاج ہو جبکہ دوسری اولاد ابھی نابالغ ہو تو بالغ اولاد کا نکاح کرنا واجب ہے اور یہاں یہ مراد نہیں کہ نابالغ اولاد کا بھی ساتھ ہی نکاح کر دیا جائے تاکہ برابری ہو جائے۔
- معلوم ہوا کہ واجب التعظیم اور سربرآوردہ شخصیت کو "نہیں" کے ساتھ جواب دینا بے ادبی پر محمول نہیں۔

ہبہ واپس لینے کا حکم

921- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((الْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَقِيْءُ ثُمَّ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهِ)).

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "اپنے ہبہ کو واپس لینے والا اس کتے کے جیسا ہے جو پہلے قے کرے پھر اپنی ہی قے کو دوبارہ چاٹ لے۔" [1]

[1] صحیح البخاری: 2589۔ صحیح مسلم: 1622.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: ((لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ، الَّذِي يَعُودُ فِي هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَقِيءُ ثُمَّ يَرْجِعُ فِي قَيْئِهِ))

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہمارے لیے (کسی بات میں اس سے زیادہ) بری مثال (یعنی ناقص صفت) نہیں ہے جو شخص اپنا ہبہ دے کر واپس لے لیتا ہے وہ اس کتے کی طرح ہے جو پہلے قے کرتا ہے پھر اپنی قے کو چاٹ لیتا ہے۔[1]

غریب الحدیث:...... **كَالْكَلْبِ**: مذکورہ ''کاف'' حرف تشبیہ ہے۔تشبیہ میں چند باتوں کا ہونا لازم ہے۔

(1) مشبَّہ:...... جس کو کسی شے کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور وہ یہاں ہبہ کر کے واپس لینے والا ہے۔

(2) مشبَّہ بہ:...... جس کے ساتھ کسی دوسری شے کو تشبیہ دی گئی ہو اور وہ یہاں کتا ہے۔

(3) حرفِ تشبیہ:...... جس کے ذریعے ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور وہ یہاں ''کاف'' حرفِ تشبیہ ہے۔

(4) وجہِ تشبیہ:...... وہ معنی جس کے تناظر میں ایک شے کو دوسری شے سے تشبیہ دینا ہوتا ہے اور وہ یہاں کتے کا قے کر کے خود اپنی قے کو دوبارہ چاٹ لینا اور آدمی کا ہبہ کر کے واپس لے لینا ہے کہ ہبہ کر کے واپس لینے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک کتا اپنی کی ہوئی قے کو دوبارہ چاٹ لے۔یعنی دونوں نے اس شے کو دوبارہ لے لیا جو اس نے نکالی تھی۔ چنانچہ کتے نے قے نکال کر واپس لے لی اور آدمی نے ہبہ کر کے واپس لے لیا۔مراد یہ ہے کہ جیسے کتے کا قے کر کے واپس چاٹ لینا نہایت قابل نفرت فعل ہے، ایسے ہبہ کر کے واپس لینا بھی بے حد قابل نفرت فعل ہے۔

لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ: سوء سے یہاں مراد نقص اور عیب ہے اور مثل سے مراد صفت ہے۔یعنی ہم مسلمانوں میں کوئی بری اور ناقص صفت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اسلام کے پیروکار ہیں کیونکہ اسلام عبادت اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے سب سے اونچا مذہب ہے بھلا اس میں کسی ناقص صفت کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے۔

اَلَّذِي يَعُودُ فِي هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِي قَيْئِهِ: یہ عبارت معنی کے اعتبار سے گزشتہ روایت کے جیسی ہے۔ البتہ یہاں ''العائد'' اسم کی بجائے ''یعود'' فعل مذکور ہے اور آگے ''یعود'' کی جگہ ''یرجع'' کا لفظ ہے ان دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے کہ ہبہ کر کے واپس لے لینا بے حد قابل نفرت فعل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ہبہ کر کے واپس لینا بے حد گھناؤنا فعل ہے۔لیکن کیا ایسا کرنا حرام ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب موہوب لہ ہبہ کو اپنے قبضہ میں لے لے اور ہبہ واہب کے قبضہ سے نکل جائے تب اِس کا واپس لینا حرام ہو گا۔ کیونکہ حدیث میں ہبہ واپس لینے کو کتے کے قے کر کے اسے دوبارہ چاٹ لینے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور قے میں قے کا مواد جسم سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔تب پھر یہ تشبیہ کامل تب بنے گی جب واہب ہبہ کو اپنے سے جدا کر دے اور پھر واپس لے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔پس موہوب لہ کے ہبہ قبضہ کر لینے کے بعد اسے واپس لینا حرام ہو گا البتہ اس کے قبضہ کرنے سے قبل واپس

[1] صحیح البخاری: 2622.

لینا حرام نہ ہوگا گو نہایت قابل نفرت ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہ وعدہ خلافی ہے۔

- ہبہ واپس لینے والا چاہے غنی ہو یا فقیر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چاہے واہب فقیر اور محتاج ہی ہو، پھر صراحۃ واپس لینا اور حیلہ سے واپس لینا دونوں کا حکم ایک ہے۔ جیسے ہبہ کو حیلہ سے کم یا زیادہ قیمت پر خریدنے کی کوشش کرنا وغیرہ۔
- معلوم ہوا کہ کتا بے حد خسیس اور گھٹیا جانور ہے جو ایسی نا قابل برداشت مکروہ حرکت بھی کر جاتا ہے۔

یاد رہے کہ ہر جانور کے گوشت میں اس کے اخلاق کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کتا حرام اور بے حد نجس جانور ہے کیونکہ وہ ایسے کمینے اور گھٹیا اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔

افسوس کہ فی زمانہ کفار اشرار کتے کا گوشت بے حد رغبت سے کھاتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی بعض بے دین ملحد اور خدا بے زار مسلمانوں نے بھی کتے اور سور کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔ رب تعالیٰ ہم مسلمانوں کو کافروں کے گھٹیا اور مکروہ اخلاق اپنانے سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اولاد کو کیے ہبہ کے واپس لینے کا حکم

922، 923۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ، وَابْنِ عَبَّاسٍ ﷺ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَا: ((لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ مُسْلِمٍ أَنْ يُعْطِيَ الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعَ فِيهَا إِلَّا الْوَالِدَ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کسی مسلمان آدمی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ (کسی کو پہلے) عطیہ دے پھر اس کو واپس لے لے سوائے والد کے جو وہ اپنی اولاد کو عطیہ کرتا ہے۔''[1] (کہ وہ اگر چاہے تو اولاد کو کیا عطیہ واپس لے سکتا ہے)۔

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور آئمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی، امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **لَا يَحِلُّ:** اس کا معنی بارہا بیان کیا جا چکا ہے۔ مراد جائز اور حلال نہ ہونا ہے۔

لِرَجُلٍ مُسْلِمٍ: مراد بالغ مسلمان ہے اور مسلمان کی قید اس بات پر ابھارنے کے لیے ہے کہ ایک مسلمان ہو کر ایسا کرنا روا نہیں۔ کہ وہ کسی کو کوئی شے دے کر اس سے واپس لے لے جبکہ وہ اس پر قبضہ بھی کر چکا ہو جیسا کہ بیان ہوا۔ بلکہ ایسا کرنے سے اجتناب کرنا لازم اور واجب ہے۔

أَنْ يُعْطِيَ الْعَطِيَّةَ: "عَطِيَّة": یہ "فعيلة" کے وزن پر ہے اور مفعولہ کے معنی میں ہے۔

إِلَّا الْوَالِدُ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ: والد: اسم فاعل ہے جو ماں اور باپ دونوں کو شامل ہے۔ اسی طرح ولد سے بھی بیٹا اور

---

[1] مسند احمد: 27/2۔ سنن ابی داؤد: 3539۔ جامع الترمذی؛ 1298۔ سنن النسائی: 265/6۔ سنن ابن ماجہ: 2377۔ ''امام ابن حبان'' (5123) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ''امام حاکم'' (53/2) نے یہ حدیث "عن عمرو بن شعیب، عن طاوس عن ابن عمرو ابن عباس" کے طریق سے روایت کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ میں عمرو بن شعیب کی تعدیل کی بابت کوئی اختلاف نہیں جانتا۔ اختلاف ہے تو اس بات میں ہے کہ آیا ان کے والد کا ان کے دادا سے سماع ثابت ہے یا نہیں۔

بیٹی دونوں مراد ہیں۔

غرض والدین کے لیے اولاد کو ہبہ کی ہوئی شے واپس لینا جائز ہے کیونکہ والدین تو خود اولاد کے مال سے بلاعوض جو چاہے لے سکتے ہیں تو پھر اپنا دیا کیوں نہیں لے سکتے۔ چاہے دے کر اس کو اس شے کا مالک ہی کیوں نہ بنا دیا ہو۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عطیہ دے کر واپس لینا حرام ہے۔ جس کی دلیل "لَا يَحِلُّ" کے الفاظ ہیں۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کا قول باطل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہبہ دے کر واپس لینا مباح اور جائز ہے۔
- رجل کی قید اغلب اور اکثر کے اعتبار سے ہے وگرنہ یہ حکم عورت کو بھی شامل ہے۔
- اسلام اخلاقِ کریمہ کی ترغیب دیتا ہے۔
- ہبہ دے کر واپس نہ لینا اسلام کے کریمانہ اخلاق کے مقتضیات میں سے ہے۔
- والد اولاد سے اپنا دیا عطیہ اور ہبہ واپس لے سکتا ہے جس کی دلیل اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔
- سوائے والد کے کوئی اپنا ہبہ واپس لینے کا مجاز نہیں۔

قبولِ ہدیہ کی شروط

924۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ ، وَيُثِيْبُ عَلَيْهَا)) .

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: نبی کریم ﷺ ہدیہ قبول بھی فرماتے تھے اور اس کا بدلہ بھی دیا کرتے تھے۔ [1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... كَانَ: یہ فعل ناقص ہے اور جب یہ فعل مضارع کے ساتھ آتا ہے تو استمرار مراد ہوتا ہے۔ لیکن استمرار سے مراد اغلب واکثر ہوتا ہے نہ کہ دوام جیسا کہ اس کی تفصیل بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ: یعنی آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے چاہے جس نے بھی دیا ہوتا اور جیسا بھی ہدیہ ہوتا تھا۔ تھوڑا ہوتا یا زیادہ پر آپ ﷺ اس کو قبول فرماتے تھے۔

وَيُثِيْبُ عَلَيْهَا: چونکہ آپ ﷺ سب سے زیادہ کریم الاخلاق تھے، اس لیے ہدیہ دینے والے کو اس کا بدلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ البتہ علماء نے قبولِ ہدیہ کی چند شروط ذکر کی ہیں، جو یہ ہیں:

(1) ہدیہ دینے والے نے خجالت اور شرمندگی کے مارے وہ ہدیہ نہ دیا ہو کہ ایسا ہدیہ قبول کرنا ناجائز ہے۔ [2]

(2) وہ ہدیہ رشوت کے مواقع میں نہ ہو کہ ایسا ہدیہ قبول کرنا بھی ناجائز ہے جیسے سرکاری افسران اور قاضیوں کا ہدیہ قبول کرنا

---

[1] صحيح البخاري: 2585 . [2] نهاية الزين ، ص: 370 .

ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ رشوت کے حکم میں داخل ہے۔

(3) ہدیہ دینے والا اس کا احسان نہ جتلاتا ہو کہ ایسے آدمی سے بھی ہدیہ لینا جائز نہیں۔

(4) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ ہدیہ کوئی حرام شے نہ ہو چاہے حرام لعینہٖ ہو اور چاہے حرام لحق الغیر ہو۔ جیسے مثلاً کوئی شراب ہدیہ میں دے تو اس کا قبول کرنا حرام ہوگا کیونکہ شراب بذاتِ خود حرام ہے۔

اسی طرح اگر کوئی مشہور غاصب اور ڈاکو ہو تو اس کا یہ لینا بھی ناجائز ہوگا کیونکہ اس کا مال لوٹ کا مال ہوگا جو دوسرے کا حق ہے اور دوسرے کے حق کو اس کی اجازت کے بغیر لینا حرام ہے۔ غرض قبولِ ہدیہ کے جواز کی یہ شروط دیگر دلائل ونصوص سے ماخوذ ہیں۔

- رہا ہدیہ کا بدلہ دینا تو اگرچہ یہ واجب نہیں لیکن مکارمِ اخلاق میں سے ضرور ہے۔ البتہ اگر قرینہ سے معلوم ہو جائے کہ ہدیہ کرنے والا بدلے کا بھی طلب گار ہے تو پھر بدلہ دینا واجب ہوگا۔
- رہا ہدیہ مانگنا تو کسی دینی یا شرعی مصلحت کی بنا پر ایسا کرنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ایک سریہ کا مفصل واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے مہمان نوازی نہ کرنے والے بستی کے لوگوں کے سردار پر جب بچھو کے کاٹے کا دم کیا تو بدلے میں چند بکریاں مانگیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے وہ بکریاں لے تو لیں پر تقسیم نہ کیں اور یہ فرمایا کہ پہلے لوٹ کر ان کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے پھر ان کو تقسیم کریں گے اور کھائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا قصہ سننے کے بعد ان بکریوں کے لینے کو جائز بھی قرار دیا اور یہ بھی فرمایا کہ: ان میں میرا حصہ بھی رکھنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ہدیہ اس مصلحت کے لیے طلب فرمایا تھا کہ دوسروں کے جی بھی اس بات سے مطمئن ہو جائیں کہ یہ مال حلال ہے۔

ہدیہ کا بدلہ دینا

925- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: وَهَبَ رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ نَاقَةً، فَأَثَابَهُ عَلَيْهَا، فَقَالَ: ((رَضِيْتَ؟)) قَالَ: لَا، فَزَادَهُ، فَقَالَ: ((رَضِيْتَ؟)) قَالَ: لَا، فَزَادَهُ، فَقَالَ: ((رَضِيْتَ؟)) قَالَ: نَعَمْ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک اونٹنی ہدیہ میں پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کا بدلہ عنایت فرمایا اور دریافت فرمایا کہ: ''کیا تم (اس قدر بدلہ پر) راضی ہو؟'' اس نے عرض کیا: نہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اور دیا اور فرمایا: ''کیا تم (اب) راضی ہو؟'' اس نے عرض کیا: نہیں! تو آپؐ نے اسے اور دیا اور فرمایا: کیا تم (اب) راضی ہو؟ جی ہاں! [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......وَهَبَ رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: چونکہ اس آدمی نے بدلہ کی امید پر ہی وہ اونٹنی خدمت

[1] مسند احمد: 295/1- صحیح ابن حبان: 6384- المعجم الکبیر للطبرانی: 18/11- دیکھیں: التلخیص الحبیر: 72/3.

نبوی میں ہدیہ کر کے پیش کی تھی، اس لیے یہ ہدیہ بمنزلہ بیع کے تھا۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کو بدلہ میں اتنا دیا حتی کہ وہ راضی ہو گیا۔ غرض چونکہ ان صاحب نے معاوضہ کی غرض سے اونٹنی ہدیہ کی تھی اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان کو معاوضہ بھی دیا اور اتنا دیا کہ وہ راضی ہو گیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اگر ہبہ میں بدلہ مقصود ہو تو واہب کو راضی کرنا ضروری ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کو بدلہ دے کر راضی کیا تھا۔ البتہ اگر وہ اپنے ہدیہ سے زیادہ کا طالب ہو تو اس کا ہدیہ لینا اور بدلے میں کچھ لینا ضروری نہیں بلکہ آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ میاں! اپنا یہ ہدیہ واپس لے لو۔

◈ نبی کریم ﷺ بے حد حسن اخلاق کے مالک تھے۔

عمریٰ اور رُقبیٰ کی صورت

926- وَعَنْ جَابِرٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْعُمْرَى لِمَنْ وُهِبَتْ لَهُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِمُسْلِمٍ: ((أَمْسِكُوْا عَلَيْكُمْ أَمْوَالَكُمْ، وَلَا تُفْسِدُوْهَا، فَإِنَّهُ مَنْ أَعْمَرَ عُمْرَى، فَهِيَ لِلَّذِي أُعْمِرَهَا حَيًّا وَمَيِّتًا وَلِعَقِبِهِ)). وَفِي لَفْظٍ: ((إِنَّمَا الْعُمْرَى الَّتِي أَجَازَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يَقُوْلَ: هِيَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ، فَأَمَّا إِذَا قَالَ: هِيَ لَكَ مَا عِشْتَ، فَإِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى صَاحِبِهَا)).

وَلِأَبِي دَاوُدَ، وَالنَّسَائِيِّ، ((لَا تُرْقِبُوْا، وَلَا تُعْمِرُوْا، فَمَنْ أُرْقِبَ شَيْئًا أَوْ أُعْمِرَ شَيْئًا فَهُوَ لِوَرَثَتِهِ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”عمریٰ اسی کا ہے جس کے لیے وہ ہبہ کیا گیا ہے۔“

یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”اپنے مالوں کو اپنے پاس روکے رکھو اور انہیں برباد نہ کرو، پس جس نے کسی چیز کو بطور عمریٰ کے ہبہ کیا تو وہ اسی کی ہو گی جس کے لیے عمریٰ ٹھہرایا گیا ہے زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اور اس کے پس ماندگان کے لیے بھی۔

اور ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں: وہ عمریٰ جس کو نبی کریم ﷺ نے جائز قرار دیا ہے یہ ہے کہ آدمی (دوسرے سے) یہ کہے کہ: یہ تیرے اور تیری اولاد کے لیے ہے، البتہ جب اس نے یہ کہا کہ ”یہ تیرا ہے جب تک تو زندہ رہے“ تو وہ شے (اس آدمی کے مرنے پر) مالک کی طرف لوٹ آئے گی۔ [1]

اور سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”نہ تو کسی شے کو بطور رقبیٰ ہبہ کرو اور نہ بطور عمریٰ ہبہ کرو۔ پس جس کے لیے کوئی چیز رقبیٰ یا عمریٰ کی گئی تو وہ اس کے وارثوں کی ہو گی۔“ [2]

---

[1] صحيح البخاري: 2625- صحيح مسلم: 1625.

[2] سنن ابی داؤد: 3556- سنن النسائی: 269/6- ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ یہ روایت شیخین کی شرط پر ہے۔ دیکھیں: تحفة المحتاج: 305/2.

عمریٰ اور رقبیٰ کا معنی، صورتیں اور حکم

شرح:...... **اَلْعُمْرَی وَالرُّقْبٰی**: عمریٰ اور رقبیٰ کے بیان میں یہی ایک حدیث ہے۔ لفظ عمری یہ عمر سے ماخوذ ہے اور لفظ رقبیٰ یہ مراقبہ سے ماخوذ ہے اور یہ دونوں لفظ فعلی کے وزن پر بھی ہیں اور راجح قول یہ ہے کہ دونوں لفظ مترادف المعنی بھی ہیں اور وہ معنی یہ ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے شخص کو اس کی عمر کی قید کے ساتھ کوئی شے ہدیہ کردے جیسے وہ یوں کہے کہ جب تک تیری زندگی ہے یہ مکان تمہارا، تم اس میں رہ سکتے ہو۔ تب پھر یہ بھی ہبہ کی ایک قسم ہوئی جس کی تین صورتیں ہیں:

(1) پہلی صورت:...... اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی صاف صاف یہ کہے کہ یہ شے تیری اور تیری اولاد کی ہے۔

(2) دوسری صورت:...... دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی صاف یہ کہے کہ یہ شے تیری زندگی تک تیری ہے۔ پھر یہ دوبارہ میری ہو جائے گی۔ ان دونوں صورتوں کا حکم واضح ہے کہ آدمی یہ کہے کہ جب تک تیری زندگی ہے یہ تیری ہے پھر یہ میری ہوئی یا یہ کہے کہ پھر تیری اولاد کو نہ ملے گی۔ اس صورت میں بھی وہ شے عمری کرنے والے کی طرف لوٹ آئے گی۔ ان دو صورتوں کا حکم یہ ہے:

عمریٰ اور رقبیٰ کا حکم

ہبہ کی یہ دونوں صورتیں عاریت کے زیادہ مشابہ ہیں البتہ یہ ہے کہ تلف ہو جانے کی صورت میں معمر (جس کو عمری کیا گیا ہے) ضامن نہ ہوگا کیونکہ اپنی زندگی تک بہر حال وہ شے اسے ہبہ ہے اور ہبہ مضمون نہیں ہوتا۔

(3) تیسری صورت:...... اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی عمری اور رقبیٰ مطلق کرے مثلاً یوں کہے کہ میں نے یہ گھر تمہیں بطور عمریٰ کے دیا۔ اس صورت کا حکم پہلی صورت کا ہے کہ وہ گھر اس کا اور اس کی اولاد کا ہوگا۔ لہٰذا یہ عمریٰ معمر کی طرف نہ لوٹے گا۔ مذکورہ حدیث اس معنی پر دلالت کرتی ہے اور قواعد عامہ کے بھی موافق ہے کیونکہ یہ بات قاعدہ میں سے ہے کہ مسلمان اپنی شروط پر ہیں۔ البتہ وہ شرط کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال نہ کرتی ہو۔

اس تفصیل کے بعد اب ذیل میں مذکورہ حدیث پر حسب دستور کلام عرض کیا جاتا ہے:

غریب الحدیث:...... **اَلْعُمْرَی**: وہ ہدیہ جو زندگی کے ساتھ مقید ہو۔ **لِمَنْ وُهِبَتْ لَهُ**: یعنی وہ موہوب لہ کی ملکیت ہوگا۔ تو جب یہ اس کی ملکیت ہوگا تو اس میں میراث بھی جاری ہوگی۔ یعنی جب معمر وفات پا جائے گا تو عمری حسب میراث اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ غرض یہ حدیث اس بارے صریح نص ہے کہ عمری اسی کا ہوگا جس کو وہ ہبہ کیا گیا ہو۔

البتہ یہ حکم اس وقت ہے جب عمری مطلق ہو اور اسے عمر یا بعد کے ورثاء کے ساتھ مقید نہ کیا گیا ہو اور اگر عمری کو عمر کے ساتھ یا اولاد کے ساتھ مقید کر دیا گیا تو بھی یہی حکم ہے اور اگر عمری کو زندگی تک مقید کیا تو یہ معمر کی زندگی تک اس کا ہوگا اور اس کے مرنے پر معمر کو واپس مل جائے گا۔

أَمْسِكُوا عَلَيْكُمْ أَمْوَالَكُمْ: یہ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں اور یہ خطاب عمری اور رقبی کرنے والوں کو ہے۔ کہ اپنی جائیدادوں اور چیزوں کو اپنے پاس رکھو۔

وَلَا تُفْسِدُوهَا: یعنی اپنی جائیدادوں اور مالوں کو اپنی ملکیت سے نکال کر ان کو برباد نہ کرو۔ تب پھر یہاں افساد کا وہ معنی مراد نہیں جو اصلاح کی ضد ہے۔ بلکہ مراد مال جائیداد کو عمریٰ اور رقبیٰ بنا کر اپنی ملک سے نکالنا ہے اور تقدیری عبارت یہ ہو

گی کہ اپنے مالوں کو اپنے پاس روکے رکھو اور ان کو اپنی ملک سے مت نکالو۔ کیونکہ عمری اور رقبیٰ یہ مال کو اپنی ملک سے نکالنا ہے۔ اسی لیے اس پر تفریع بٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَإِنَّهُ مَنْ أُعْمِرَ عُمْرَى فَهِيَ لِلَّذِيْ أُعْمِرَهَا حَيًّا وَمَيِّتًا، وَلِعَقِبِهِ: کہ جو کسی کو عمری کے طور پر کچھ دیتا ہے، وہ زندگی اور موت دونوں صورتوں میں معمر کا ہو جاتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کا ہو جاتا ہے اور عمریٰ کرنے والا یہ گمان نہ رکھے کہ معمر کے مرنے کے بعد وہ عمریٰ اسے دوبارہ مل جائے گا اس لیے اپنے مالوں کو اپنے پاس حفاظت سے رکھو اور انہیں حتی الامکان اپنی ملک سے نکلنے نہ دو۔

گویا کہ اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے اپنے مالوں اور جائیدادوں میں بصیرت کے ساتھ تصرف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اب زندگی میں عمریٰ معمر کا ہوگا یہ بات واضح ہے، لیکن مرنے کے بعد تو اس کے ورثاء کا ہوگا، تب پھر مرنے کی حالت میں بھی وہ عمری معمر کا کیونکر ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ عمری میں کوئی وصیت کر گیا ہو جو ایک ثلث میں جاری ہوتی ہے۔ جیسے وہ اس کے ایک ثلث کو وقف کر گیا ہو جس کا ثواب اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہے۔ یوں یہ عمریٰ مرنے کی حالت میں بھی اس کا کہلائے گا۔

غرض یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ عمریٰ معمر کی ملک تام ہوتا ہے جس میں میراث اور وصیت تک جاری ہوتی ہے۔

إِنَّمَا الْعُمْرَى الَّتِي أَجَازَهَا.........: یہ تیسری روایت کے الفاظ ہیں جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ عمریٰ کیا کیسے جاتا ہے۔ وہ یوں کہ عمریٰ کرنے والا یہ کہے کہ "میں نے یہ گھر مثلاً تمہیں اور تمہاری اولاد کے لیے عمری ٹھہرایا۔" اور یہ بعینہٖ وہی پہلی صورت ہے جو مقید ہے جس میں اس بات کی قید مذکور ہے کہ عمری کو کسی آدمی اور اس کی اولاد کے لیے ٹھہرایا جائے۔

فَأَمَّا إِذَا قَالَ: هِيَ لَكَ مَا عِشْتَ، فَإِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى صَاحِبِهَا: عمری کی اس صورت میں اس بات کی تصریح ہے کہ عمری معمر کے لیے اس کی زندگی تک ہوگا، اس کے مرنے کے بعد وہ معمر کی طرف لوٹ جائے گا۔ تب پھر مذکورہ حدیث میں عمری کی دو صورتیں مذکور ہوئیں:

(1) ایک یہ کہ عمری معمر اور اس کی اولاد کے لیے ٹھہرایا جائے۔ یہ صورت مقید ہے۔

(2) دوسری یہ کہ عمری معمر کی زندگی تک مقرر کیا جائے۔ یہ بھی مقید صورت کا بیان ہے۔

البتہ تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے عمری کو مطلق ٹھہرانا جس میں نہ تو "اس کی زندگی تک" کا ذکر ہو اور نہ اس بات کا ذکر ہی ہو کہ یہ عمری تیرے اور تیری اولاد کے لیے ہے اور بس یہ کہے کہ "میں نے مثلاً یہ گھر تیرے لیے عمری ٹھہرایا۔"

لَا تُرْقِبُوا، وَلَا تُعْمِرُوا: یہ سنن نسائی اور سنن ابی داؤد کی روایت کے الفاظ ہیں۔ اس روایت میں عمری کے ساتھ ساتھ رقبی کا ذکر ہے اور یہ بتلایا جا چکا ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ البتہ عمری کو رقبیٰ کے نام سے اس لیے یاد کیا جاتا ہے کہ ہبہ کی اس قسم میں معمِر اور معمَر دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر ہوتا ہے۔

فَمَنْ أُرْقِبَ شَيْئًا أَوْ أُعْمِرَ شَيْئًا فَهُوَ لِوَرَثَتِهِ: یعنی معمر کے مرنے کے بعد وہ عمری اس کے ورثاء کا ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ مذکور ہے کہ عمری بھی ہبہ کرنے کی ایک قسم کا نام ہے۔ جس کی تین صورتیں ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عمریٰ اور رقبیٰ شرعاً جائز ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کی اجازت دی ہے۔
- عقد میں شروط کا اعتبار ہے۔
- اپنی جائیدادوں اور مالوں کی حفاظت کی جائے۔
- جب عمریٰ مطلق ہو تو صرف معمَر کا ہوتا ہے البتہ جب اسے مقید کر دیا جائے تو اس کی اولاد میں بطور میراث کے جاری ہوتا ہے۔

اپنے کیے ہبہ کو خریدنے کا حکم

927- وَعَنْ عُمَرَ ﷺ قَالَ: حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ، فَأَضَاعَهُ صَاحِبُهُ ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ بَائِعُهُ بِرُخْصٍ . فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ ، فَقَالَ: ((لَا تَبْتَعْهُ ، وَإِنْ أَعْطَاكَهُ بِدِرْهَمٍ)) . الْحَدِيثُ .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) ایک گھوڑا (ایک غازی کو) سواری کے لیے دیا، پر اس گھوڑے والے نے اسے ضائع کر دیا (یعنی اس کے گھاس چارہ اور پانی وغیرہ کا خیال نہ رکھا)۔ میں نے گمان کیا کہ یہ اس گھوڑے کو معمولی داموں پر بیچنا چاہتا ہے۔ پس میں نے اس بارے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے مت خریدنا چاہے وہ تمہیں ایک درہم کے بدلے ہی دے۔'' [1] ......الحدیث۔

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ**: یہاں ایک مفعول محذوف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: "حَمَلْتُ رجلا عَلَى فَرَسٍ" یعنی میں نے ایک آدمی کو صدقہ میں ایک گھوڑا دیا تاکہ وہ اس کے ذریعے اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔

فَأَضَاعَهُ: یعنی اس آدمی نے گھوڑے کو یوں ہی بے کار چھوڑ دیا اور اس کی بھوک پیاس کا مطلق خیال نہ رکھا جس سے وہ گھوڑا کمزور ہو گیا۔

أَنَّهُ بَائِعُهُ بِرُخْصٍ: مراد کم قیمت ہے۔ یعنی میں نے گمان کیا کہ شاید اب یہ اس گھوڑے کو معمولی داموں پر بیچنا چاہتا ہے۔

فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ: گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بارے تردد تھا کہ آیا اپنا ہبہ کیا ہوا کوئی مال موہوب لہ سے خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ جب ایک شے جہاد فی سبیل اللہ میں دے دی تو آیا اب اس کو خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

لَا تَبْتَعْهُ: یعنی اسے مت خریدنا۔ "اِبْتَاعَ" کا معنی خریدنا جبکہ "بَاعَ" کا معنی بیچنا ہوتا ہے۔

وَإِنْ أَعْطَاكَهُ بِدِرْهَمٍ: مراد بے حد معمولی قیمت ہے نہ کہ ایک درہم ہی مراد ہے۔

[1] صحيح البخاري: 2623- صحيح مسلم: 1620 .

مضمون حدیث :......مذکورہ حدیث میں بھی دراصل یہی مسئلہ مذکور ہے کہ اپنا کیا ہبہ کسی صورت واپس لینا درست نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حیوان کو بھی اللہ کی راہ میں وقف کر سکتے ہیں۔ کیونکہ "حَمَلْتُ عَلٰی فَرَسٍ" سے بظاہر مراد اس کا وقف کرنا ہے۔
- آدمی کے لیے اپنا کیا صدقہ، دیا ہبہ اور کیا وقف خریدنا مناسب نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صدقہ کیا گھوڑا خریدنے سے منع فرمایا تھا۔
- اپنا ہبہ خریدنا بھی ایک طرح سے ہبہ کر کے واپس لینا ہی ہے۔ کیونکہ عموماً ایسے مواقع پر متصدق علیہ صدقہ کرنے والے کو وہی شے کم قیمت پر بیچتا ہے۔ لیکن اگر کوئی زیادہ قیمت پر بھی اپنا کیا ہبہ یا صدقہ خریدنا چاہے تو بھی ہم اس کو سد ذرائع کے طور پر ایسا کرنے سے منع کریں گے تاکہ لوگ اس باب میں جری ہو کر جواز کی حدود کو پامال نہ کر بیٹھیں۔
البتہ اگر متصدق علیہ نے وہ صدقہ آگے کسی دوسرے شخص کو بیچ دیا ہوا ہے تو صدقہ کرنے والا اس کو اس دوسرے آدمی سے خرید سکتا ہے۔
- سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ بے حد متورع تھے چنانچہ جب تک نبی کریم ﷺ سے اس بارے دریافت نہ فرما لیا، مطمئن نہ ہوئے تھے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریعت کا علم سیکھنے کے بے حد حریص تھے۔

دوسروں کو ہدیہ کرنے کی ترغیب کا بیان

928- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((تَهَادَوْا تَحَابُّوْا)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک دوسرے کو ہدیہ دو، کہ (اس سے) تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے۔''[1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِي الْأَدَبِ الْمُفْرَدِ ، وَأَبُوْ يَعْلَى بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الادب المفرد'' میں اور ابو یعلی موصلی نے (المسند میں) حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......تَهَادَوْا: یہ "اَلْهَدِيَّةُ" سے باب تفاعل کا امر حاضر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کیونکہ بابِ تفاعل فعل میں اشتراک پر دلالت کرتا ہے۔

ہدیہ کی تعریف ذکر کی جا چکی ہے کہ یہ بھی ہبہ کی ایک قسم ہے البتہ اس سے مقصود باہمی الفت ومودت ہوتی ہے۔

تَحَابُّوا: یہ بھی باب تفاعل سے فعل امر ہے۔ اس کی اصل "تَحَابُّوْنَ" ہے۔ جوابِ امر ہونے کی وجہ سے اس کی نون گر گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایک دوسرے کو ہدیہ دینا تمہاری باہمی مودت والفت کے پیدا ہونے کا سبب بنے گا۔ بلاشبہ یہ بات عین فطرت ہے کہ ہدیہ دینا دوسرے کی محبت کو کھینچتا ہے۔

---

[1] الادب المفرد للبخاری: 594- مسند ابی یعلی: 6148- الکامل لابن عدی: 104/4- سنن البیہقی: 169/6- شعب الایمان: 479/6- علامہ عراقی نے اس حدیث کو عمدہ کہا ہے۔ جیسا کہ "فیض القدیر" (271/3) میں ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ایک دوسرے کو ہدیہ دینا مستحب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کا حکم فرمایا ہے۔ البتہ دوسروں کو ہدیہ دینا چند باتوں کے ساتھ مشروط ہے، جو یہ ہیں:

(1) ہدیہ دینے کی قدرت ہو۔

(2) ہدیہ دینے سے لینے والے کی گناہ پر اعانت نہ ہو۔

◈ ہدیہ قبول کرنا مشروع ہے اس کی تفصیل مذکور ہو چکی ہے۔

◈ ایک دوسرے کو ہدیہ دینا باہمی محبت والفت کے پیدا ہونے اور اس کے بڑھنے کا ذریعہ ہے۔

◈ جو باتیں باہمی محبت پیدا کرتی ہیں، آدمی کو چاہیے کہ وہ ان امور کو اختیار کرے۔

◈ الادب المفرد : یہ بھی امام بخاری رحمہ اللہ کی ایک مایہ ناز کتاب ہے جو امام صاحب کی "الصحیح" کے علاوہ ہے۔ امام موصوف نے اس کتاب میں اخلاق اور سلوک کی بابت نہایت عمدہ احادیث جمع کی ہیں البتہ وہ احادیث مجموعی طور پر صحت کے اس درجہ پر نہیں جو درجہ "الصحیح" کی احادیث کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے اس حدیث کو روایت کرنے کے باوجود امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابو یعلی موصلی نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

ہدیہ دینا کینہ کو ختم کر دیتا ہے

929۔ وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((تَهَادَوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تَسُلُّ السَّخِيْمَةَ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کہ یہ (ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں موجود) کینہ (اور بغض اور کھوٹ) کو نکال باہر کرتا ہے۔''[1]

رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيْفٍ.

اس حدیث کو امام بزار نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... تَهَادَوْا: یہ امر ہے اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ: یہ مذکورہ امر کی علت کا بیان ہے۔

تَسُلُّ: باہر کھینچ نکالنا۔

السَّخِيمَةَ: یہ بغض اور کینہ کو کہتے ہیں۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں بھی ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کی ترغیب ہے اور اس کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ اس سے دلوں کا کھوٹ اور ایک دوسرے سے نفرت و کراہت ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ دوسرے کو ہدیہ دینے میں پہلی شرط یہ ہے کہ اس سے کسی واجب کا ترک یا کسی حرام کا ارتکاب لازم نہ آتا ہو۔

---

[1] مسند البزار: 1937۔ المعجم الاوسط للطبرانی: 1526۔ مسند الدارمی: 2271۔ تاریخ اصبهان لابی نعیم: 91/2۔ مسند الشهاب للقضاعی: 658۔ الکامل لابن عدی: 278/2۔ اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے کیونکہ اس کی اسناد میں عائذ بن شریح ہے جو ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: فیض القدیر: 273/3

ایک دوسرے کی ہدیہ کی قدر کی جائے

930- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا نِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ ، لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا ، وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اے مسلمان عورتو! (خبردار!) کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن (کے بھیجے ہدیہ) کی تحقیر نہ کرے چاہے وہ بکری کا کھر ہی ہو۔'' ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......يَا نِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ: یہ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے اور خاص مسلمان عورتوں کو اس لیے مخاطب فرمایا کہ یہ اسلام ہی ہے جس نے ان عورتوں کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آنے اور نبی کریم ﷺ کے جملہ اوامر ونواہی کو من وعن قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

لَا تَحْقِرَنَّ: یہ نہی کا صیغہ ہے جو نون تاکید کے ساتھ ہے۔

جَارَةٌ: مراد پڑوسن ہے نا کہ سوکن۔

فِرْسِنَ شَاةٍ: فِرْسَن کھر کو کہتے ہیں۔ مراد قلیل وحقیر شے ہے۔ یعنی ایک پڑوسن اگر دوسری کو کوئی معمولی اور حقیر شے بھیجتی ہے تو اس کی بھی قدر کی جائے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ آدمی اپنے پڑوسیوں کو ہدیہ دیتا رہے چاہے دینے کو کوئی معمولی شے ہی میسر آئے۔ اس سے پڑوسیوں میں باہمی الفت و مودت پیدا ہوتی ہے جس کے متعدد فوائد ہیں جیسے:

اس سے ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون حاصل ہوتا ہے۔

اور ایک پڑوسی دوسرے کی حفاظت ورعایت کرتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

◈ اس سے ایک دوسرے کے حقوق سے چشم پوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔

◈ اس سے کمال ایمان حاصل ہوتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا اکرام کرے۔'' بلاشبہ پڑوسی کو ہدیہ دینا اس کے اکرام میں داخل ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے پڑوسی کو ہدیہ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے چاہے وہ ہدیہ معمولی سا ہی ہو۔

◈ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے مال سے تھوڑی شے کو ہدیہ دے سکتی ہے۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ شوہر بخیل نہ ہو۔ ❷ چنانچہ بخیل خاوند کے مال سے کچھ بھی دینا جائز نہیں جب تک کہ وہ خود اس کی اجازت نہ دے دے۔

◈ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر اپنے مال سے صدقہ کر سکتی ہے۔ اس باب میں یہی راجح قول ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 2566- صحيح مسلم: 1030.

❷ كشاف القضاع: 460/3.

ہدیہ ثواب واپس لینے کا استحقاق کب تک ہے

931- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ وَهَبَ هِبَةً فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا مَا لَمْ يُثَبْ عَلَيْهَا)).
رَوَاهُ الْحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ، وَالْمَحْفُوظُ مِنْ رِوَايَةِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ عُمَرَ قَوْلُهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شخص کوئی ہبہ کرے تو اس کا زیادہ مستحق وہی ہے جب تک اسے اس ہدیہ کا بدلہ نہ دے دیا جائے۔'' [1]
امام حاکم نے اس حدیث کو روایت کر کے اس کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ محفوظ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ ان کا قول ہے۔ (یعنی یہ روایت موقوف ہے۔ مراد یہ ہے کہ محفوظ روایت موقوف ہے نہ کہ مرفوع)

غریب الحدیث:......**مَنْ وَهَبَ هِبَةً فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا**: یہ ارشاد مطلق نہیں۔ بلکہ مراد یہ کہ ہبہ ثواب (وہ ہبہ جس کا بدلہ لینا مقصود ہو) کا آدمی اس وقت تک زیادہ مستحق ہے جب تک کہ اس کا بدلہ نہ دیا جائے۔ کیونکہ ہبہ کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایک ہبہ ثواب:...... یہ وہ ہبہ ہے جو بدلہ کے قصد و ارادہ سے دیا جائے۔ یہ بیع کے حکم میں ہے۔ لہٰذا اگر اس کا بدل نہ ملے تو آدمی اس کو واپس لے سکتا ہے۔

(2) دوسرا ہبہ تبرع:...... جو محض نیکی کے طور پر دیا جائے۔ ایسا ہبہ آدمی دے کر واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ موہوب لہ اس ہبہ کا مالک بن جاتا ہے اور گزشتہ احادیث میں ایسا ہبہ واپس لینے کی شدید مذمت بھی بیان کی گئی ہے۔

اور رہا یہ سوال کہ دوسرے کو اس بات کا علم کیونکر ہوگا کہ یہ ہدیہ اور ہبہ تبرع ہے یا ہدیہ ثواب ہے تو اس کا علم آدمی کو قرائن سے ہوگا۔ جیسے کسی فقیر کا کسی غنی کو ہبہ کرنا اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ فقیر اس غنی سے بدلہ کا خواہش مند ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ہبہ ثواب کا جب تک بدلہ نہ ملے تو واہب اس کے واپس لے لینے کا حق دار ہوتا ہے۔ [2]
- قرائن پر عمل کرنا جائز ہے۔

18۔ بَابُ اللُّقَطَةِ..... لقطہ کا بیان

لُقَطَة کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

تمہید:......**لُقَطَةُ**: یہ فعَلَة کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے۔ یعنی لقطہ یہ "ملقوط" کے معنی میں ہے۔ یہ زمین پر پڑی اس چیز کو کہتے ہیں جس کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ جبکہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی اصطلاح میں لقطہ ''اس مال یا مختص کو کہتے ہیں جو اپنے مالک سے گم ہو گیا ہو یا اس کے مالک نے اسے ضائع اور گم کر دیا ہو۔''

---

[1] المستدرك: 60/2- سنن البيهقي: 180/6- امام بیہقی فرماتے ہیں کہ محفوظ روایت ''موقوف'' ہے۔ سنن الدارقطني: 44/3- اور امام دارقطنی نے بھی اس حدیث کی بابت وہی بات کہی ہے جو امام بیہقی نے فرمائی ہے۔ دیکھیں: العلل للدار قطني: 57/2.

[2] المحلى لابن حزم: 128/9.

اب مال سے مراد ہر وہ شے ہے جس پر عقدِ بیع منعقد ہو سکے اور مختص اس شے کو کہتے ہیں جس پر عقدِ بیع منعقد نہ ہو سکے جیسے سدھایا ہوا کتا۔ لہٰذا اگر کسی کو کسی کا سدھایا ہوا کتا ملے تو وہ بھی لقطہ شمار ہوگا۔ پھر خاص گم شدہ جانور کو ضال یا ضالہ کا نام دیا جاتا ہے گو معنی عام میں اس کو بھی لقطہ کہہ سکتے ہیں۔

لقطہ کی اقسام:

لقطہ کی تین اقسام ہیں:

(1) ایک قسم وہ ہے جس کو پاتے ہی آدمی اس کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ وہ معمولی چیز ہوتی ہے کہ اگر وہ گر جائے تو اس کا مالک اسے ڈھونڈتا نہیں پھر رہا ہوتا۔ پس ایسی چیز پاتے ہی آدمی اس کا مالک بن جاتا ہے جب تک کہ اس کے مالک کا علم نہ ہو۔

(2) دوسری قسم حیوان ہے جو بھٹکا پھر رہا ہو۔

(3) جبکہ لقطہ کی تیسری وہ ہے جو ان دونوں کے علاوہ ہو۔ جیسے قیمتی کتابیں، زیورات، قیمتی آلات، کاغذات وغیرہ۔

لقطہ کا حکم:

لقطہ کی پہلی قسم کا حکم بیان ہو چکا ہے۔ جبکہ تیسری قسم کا حکم یہ ہے کہ یہ جس کو ملے وہ ایک سال تک اس کی تشہیر کرے۔ اگر تو اس دوران اس کا مالک آ جائے تو اسے لوٹا دے وگرنہ وہ لقطہ اس کی ملک میں داخل ہو جائے گا۔ رہی لقطہ کی دوسری قسم یعنی حیوان تو خود اس کی تین قسمیں ہیں:

(1) ایک حیوان وہ ہوتا ہے جو اپنی علامات سے آوارہ لگتا ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس کے مالک نے چھوڑ دیا ہوا ہے جیسے بے حد کمزور بکری یا آوارہ کتا وغیرہ کہ ایسا جانور جس کو بھی ملے وہ اس کا مالک تصور ہوگا۔

(2) دوسرا وہ حیوان جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے مالک نے اسے چھوڑ رکھا ہے البتہ وہ چھوٹے درندوں سے اپنی حفاظت کر سکتا ہے جیسے اونٹ تو ایسے جانور سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ یہ جدھر جاتا ہے، اسے جانے دیا جائے۔

(3) تیسری قسم کا جانور وہ ہے کہ جس کے بارے میں یہ تو معلوم نہ ہو کہ آیا اس کے مالک نے اسے بے رغبتی کی بنا پر چھوڑ دیا ہوا ہے۔ البتہ وہ جانور چھوٹے درندوں سے اپنی حفاظت نہ کر سکتا ہو، جیسے بکری، مرغی وغیرہ تو ایسے جانور کا تفصیلی حکم آگے رہا ہے۔

صدقہ کی گری پڑی کھجور کا حکم

932۔ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِتَمْرَةٍ فِي الطَّرِيقِ فَقَالَ: ((لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَأَكَلْتُهَا)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ راستہ میں پڑی ایک کھجور کے پاس سے گزرے تو ارشاد فرمایا: ''اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کی ہو تو میں اس کو ضرور (اٹھا کر) کھا لیتا۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......فِي الطَّرِيقِ: مراد مدینہ کی کوئی گلی ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 2431۔ صحيح مسلم: 1071.

أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ: چونکہ مدینہ میں زکوٰۃ کی کھجوریں اکثر لائی جاتی تھیں، اس لیے ہوسکتا تھا کہ یہ گری ہوئی کھجور کہیں صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ کی نہ ہو۔

معلوم ہوا کہ یہاں صدقہ سے صدقہ واجبہ مراد ہے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ پر زکوٰۃ کا مال حرام تھا اور راجح قول یہ ہے کہ آپ ﷺ پر مستحب صدقہ کا مال بھی حرام تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس اندیشہ کے ڈر سے وہ کھجور نہ اٹھائی کہ مبادا صدقہ واجبہ کی ہو۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو بنیادی باتیں مذکور ہیں:

(1) ایک یہ کہ ایک آدھ کھجور اگر رستہ میں پڑی ہو تو اس کو اٹھا کر کھا لینے میں کوئی حرج نہیں اور یہ لقطہ کی پہلی قسم میں داخل ہے کہ جس کی اس کے مالک کو پروا نہیں ہوتی۔

(2) اور دوسری اہم بات یہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ہر قسم کا صدقہ حرام تھا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ اگر کسی کو راستے میں گری پڑی کوئی معمولی سی شے ملے تو وہ اس کو اٹھا کر اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "لَوْ لَا اَنِّیْ اَخَافُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَاَکَلْتُهَا."
- نبی کریم ﷺ بے حد تقویٰ وورع کے مالک تھے۔
- اگر کسی سے کھانے کی چیز بدون قصد کے راستہ میں گر جائے تو وہ آدمی اس سے گنہگار نہ ہوگا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے گری ہوئی کھجور پر کوئی نکیر نہ فرمائی تھی۔
- امام موصوف رحمہ اللہ اس حدیث کو دراصل اس بات پر دلالت کرنے کے لیے لائے ہیں کہ راستے میں پڑی معمولی چیز اگر کسی کو ملے تو وہ اس کو اٹھا کر اپنی مِلک میں داخل کرسکتا ہے۔

لقطہ کی تشہیر کا طریقہ اور مدت

933- وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلَهُ عَنِ اللُّقَطَةِ، فَقَالَ: ((اعْرِفْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا، ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً، فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا، وَإِلَّا فَشَأْنُكَ بِهَا))، قَالَ: فَضَالَّةُ الْغَنَمِ؟ قَالَ: ((هِيَ لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذِّئْبِ))، قَالَ: فَضَالَّةُ الْإِبِلِ؟ قَالَ: ((مَا لَكَ وَلَهَا؟ مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا، تَرِدُ الْمَاءَ، وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا)).

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے لقطہ کے (حکم کے) بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اس کے سر بند (اور تھیلی) اور اس کی بندش کو بتلاؤ پھر ایک سال تک اس کی تشہیر کرو۔ پس اگر تو اس (دوران اس) کا مالک آ جائے (تو اسے اس کی چیز حوالہ کر دو) وگرنہ تم جانو اور وہ شے (یعنی جو تمہاری مرضی ہو اس کے ساتھ کرو۔ چاہو تو اس کو اپنی ملک میں لے آؤ اور چاہے تو مالک کے نام پر صدقہ کر دو)۔'' اس آدمی نے عرض کیا: اور گم شدہ بکری؟ (اگر کسی کو ملے تو اس کا حکم کیا ہے)۔ آپ ﷺ فرمایا: ''وہ تیری یا تیرے بھائی کی یا بھیڑیے

کی ہے۔'' اس آدمی نے عرض کیا: اور گم شدہ اونٹ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بھلا تیرا اس سے کیا واسطہ؟ اس کے ساتھ اس کی پانی کی مشک اور اس کا جوتا ہے، وہ پانیوں (کے گھاٹوں) پر آتا (جاتا) ہے اور درختوں (کے پتے وغیرہ) کھاتا ہے یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... جَاءَ رَجُلٌ: صحابی رسول کے نام کے مجہول ہونے سے حدیث یا قصہ حدیث کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا جیسا کہ یہ بات بارہا گزر چکی ہے۔

فَسَأَلَهُ عَنِ اللُّقَطَةِ: یعنی لقطہ کے حکم کے بارے میں پوچھا۔

عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا: عفاص: اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں وہ لقطہ رکھا ہوا اور وکاء اس ڈوری کو کہتے ہیں جس سے اس کا سر بندھا ہو۔

اب عفاص کی تشہیر سے یہ مراد ہے کہ وہ بتلائے گا کہ وہ تھیلی چمڑے کی ہے یا کسی اور چیز کی۔ موٹی ہے یا پتلی اور کس حجم یا رنگت کی ہے اور ڈوری کی تشہیر وتعریف سے یہ مراد ہے کہ وہ یہ بھی بتلائے کہ وہ ڈوری کس چیز کی ہے، سوتی ہے یا اونی، اور یہ کہ ڈھیلی بندھی ہے یا سختی سے اور یہ کہ کتنی گرہیں لگی ہیں ایک یا دو یا تین، وغیرہ، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اس سے اس شے کو ضبط بیان میں لانا آسان ہو جاتا ہے۔

ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً: یعنی ایک سال تک اس کی تشہیر کر کے اس کے مالک کو تلاش کرتا رہے اور اعلان یوں کرے گا:

- ...... کسی کی کوئی چیز گم ہوئی ہو؟
- ...... یا کسی کی رقم گری ہو؟
- ...... یا کسی کی کوئی کتاب گم ہوئی ہو؟ وغیرہ وغیرہ تو وہ مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے اور نشانی بتلا کر مجھ سے لے سکتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا آدمی لقطہ کا اعلان کرتے وقت اس کی پوری صفت بھی بیان کرے گا یا نہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ ایسا اعلان کرتے وقت نہ کرے گا تا کہ ہر سننے والا اس شے کا مالک ہونے کا مدعی نہ بن بیٹھے۔ اس لیے اعلان کرتے وقت اس شے کا ذکر مجمل کرے گا نہ کہ تفصیلی۔

اور سال سے اسلامی اور قمری سال مراد ہے نہ کہ شمسی سال مراد ہے اور رہا یہ سوال کہ کیا سال کے ہر دن یا ہر ہفتہ یا ہر مہینہ اس کی تشہیر کرے گا تو یہ امر عرف کے حوالہ ہے۔

فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا: یعنی اگر سال بھر کی اس مدت کے دوران اس لقطہ کا مالک اپنی شے تلاش کرتا کرتا آ نکلے تو وہ شے اس کے حوالہ کر دی جائے کیونکہ اپنی شے کا پہلا حق دار اس کا مالک ہی ہوتا ہے۔

وَإِلَّا: اس کی تقدیری عبارت یوں ''وَإِنْ لَا يَأْتِي صَاحِبُهَا'' (اور اگر اس کا مالک نہیں آتا) اور یہاں صرف حرف شرط مذکور ہے جبکہ فعلِ شرط محذوف ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے اور فعل شرط کو حذف کرنا تب جائز ہوتا ہے جب وہ معلوم ہو اور

[1] صحیح البخاری: 2430۔ صحیح مسلم: 1723.

یہاں فعل شرط کا معلوم ہونا ماقبل مذکور عبارت "فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا" کے قرینہ سے ہے۔

فَشَأْنُكَ بِهَا: لفظ "شأن" میں دو طرح کے اعراب پڑھے گئے ہیں رفع کے بھی اور نصب کے بھی۔ اگر اس کو مرفوع پڑھیں تو یہ مبتداء ہو گا اور مابعد مذکور جار مجرور اس کی خبر ہوں گے۔ لیکن اگر اس کو منصوب پڑھیں گے تو یہ فعل محذوف کا مفعول ہو گا اور تقدیری عبارت یہ ہوگی "اِلْزَمْ شَأْنَكَ بِهَا" یعنی اس کی بابت اپنے ارادہ کو لازم پکڑو اور مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ جوابِ شرط اور جزائیہ ہو گا اور مراد یہ ہے کہ اگر سال بھر میں اس گم شدہ شے کا مالک نہیں آتا تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے چاہو تو اس کے مالک بن بیٹھو اور اس میں مالکانہ تصرف کرو اور چاہو تو اس کے مالک کی طرف سے کسی پر اس کو صدقہ کر دو۔

فَضَالَّةُ الْغَنَمِ: یہ صفت کی موصوف کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔ مراد "الغنم الضالة" ہے۔ یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر مجھے کوئی بھٹکی ہوئی بکری ملے تو میں اس کا کیا کروں اور ضالہ سے مراد وہ بکری ہے جسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ جائے گی کدھر۔؟ چنانچہ وہ بکری جو اپنے مالک کے گھر کا راستہ پہچانتی ہے اور وہ اسی راستے پر چلی جا رہی ہے تو اسے ضالہ نہ کہا جائے گا۔

هِيَ لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذِّئْبِ: "لَكَ": یہ گم شدہ بکری پانے والے کو خطاب ہے اور "أَخِيْكَ" سے مراد اس کا اصلی مالک ہے جبکہ مالک اور اسے بکری پانے والے کے علاوہ تیسرا کوئی آدمی بھی ہو سکتا ہے تب پھر لفظ "أَخِيْكَ" میں عموم ہو گا اور بھیڑیا ایک معروف جانور ہے جو اکیلی بکری کو کھا جاتا ہے۔ مراد درندہ ہے جو بکری کو چیر پھاڑ کر کھا جائے۔ تب پھر بھیڑیے کا ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ جزیرۂ عرب میں یہ جانور زیادہ پایا جاتا تھا۔ اب مراد یہ ہے کہ گم شدہ بکری اگر تم نے روک لی تو تیری وگرنہ تمہارے بعد جو روکے گا اس کی ٹھہرے گی وگرنہ اسے کوئی درندہ پھاڑ کھائے گا۔

حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ گم شدہ بکری اگر اس نے رکھ لی اور ذبح کر کے کھالی، اسی طرح اس کے چھوڑ دینے پر اگر کسی دوسرے نے پکڑ کر کھالی تو دونوں پر ضمان نہ آئے گا۔ کیونکہ "لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ" دونوں میں لام تملیک کا ہے۔ دوسرے ان دونوں کا اس بکری کو کھا لینا یہ اس کو بھیڑیے کے کھا لینے سے پھر بہتر ہے۔ پھر اگر تو اس بکری کا مالک معلوم ہو تو وہ قطعی طور پر مالک کی ہو گی اور اس پانے والے کے ذمہ ہو گا کہ یا تو وہ مالک کا انتظار کرے یا اس لے جا پہنچائے۔

مَا لَكَ وَلَهَا: نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد گم شدہ اونٹ کی بابت سوال کے جواب میں فرمایا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمہیں کون سی بات اس کے ساتھ اکٹھا کر رہی ہے تا کہ تو اس کو پکڑ کر اپنے پاس روک لے۔ ایسی ترکیب سے مراد اس سے براءت کا اظہار ہوتا ہے یعنی نہ تو اس کے قریب جاؤ اور نہ اسے پکڑو۔ اسی لیے ایک روایت میں "دَعْهَا" (اسے چھوڑ دے) کے الفاظ بھی آتے ہیں۔

مذکورہ ترکیب میں "مَا" استفہامیہ ہے جو مبتداء ہے اور جار مجرور خبر ہیں اور مذکورہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی "اسے جانے دو تیرا اس سے کیا واسطہ۔"

مَعَهَا سِقَاؤُهَا........: اور یہ بات صحیح ہے کہ اس کے ساتھ اس کی پانی کی مشک ہوتی ہے اور وہ اس کا پیٹ ہے۔ چنانچہ اونٹ ایک بار اپنا پیٹ پانی سے بھر لیتا ہے تو وہ کافی دنوں تک اس کے کام آتا رہتا ہے۔ جس کو وہ پیتا رہتا ہے حتیٰ کہ گرمیوں میں بھی یہ پانی اس کے کام آتا رہتا ہے۔

اور ''حذاء'' سے مراد اس کا خف یعنی کھر یا پیر ہے۔ یہ بے حد مضبوط ہوتا ہے، ان پیروں کی مدد سے اونٹ کو سخت تپتی ریتلی اور پتھریلی زمین پر بھی چلنا آسان ہوتا ہے۔ اس بناء پر اونٹ پانی کے گھاٹوں تک با آسانی پہنچ بھی جاتا ہے اور گھاس اور جھاڑ وغیرہ بھی کھالیتا ہے۔ یوں اس کی بھوک اور پیاس دونوں سے حفاظت رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں صرف بھوک اور پیاس کی وجہ سے اس کے ہلاک ہو جانے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے گم شدہ اونٹ کو نہ پکڑا جائے۔

حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا: یعنی یا تو مالک ڈھونڈ تا ڈھونڈ تا اس تک جا پہنچے گا؟ یا اونٹ خود ہی مالک کو جا ملے گا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی کو کوئی گم شدہ شے ملے تو وہ کیا کرے۔ چنانچہ فرمایا کہ وہ سال بھر اس کی تشہیر کرے گا اور اگر وہ گم شدہ شے کوئی جانور ہو تو دیکھے کہ اگر تو اس کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اپنے پاس روک لے اور اگر وہ جانور خود کو بھوک پیاس اور درندوں وغیرہ سے بچا سکتا ہے تو اس سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علم سیکھنے کے بے حد حریص تھے اسی لیے جن باتوں کا حکم معلوم نہ ہوتا ان کا حکم بلا تامل دریافت کرتے تھے۔
- دین اسلام نے عبادات اور معاملات دونوں کا ایک نہایت منظم دستور پیش کیا ہے۔
- گم شدہ چیز ملنے پر اس کی تشہیر واجب ہے۔ جس کا طریقہ مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔
- رہا یہ سوال کہ کیا لقطہ اٹھانا واجب ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ مستحب ہے البتہ بسا اوقات لقطہ اٹھا لینا واجب ہو جاتا ہے کہ جب اس کے تلف ہونے کا امکان غالب ہو۔ جیسے اس شے کے چوروں کے اڑا لے جانے اندیشہ ہو تو اسے اٹھا لیا جائے۔ اور آدمی کو اگر خود پر بھروسہ نہ ہو اور اندیشہ ہو کہ وہ اسے اٹھا کر خود استعمال کرے گا تو ایسی صورت میں اس کا اٹھانا حرام اور ناجائز ہوگا۔ اسی طرح مکہ کے لقطہ کو بھی اٹھانا حرام ہے سوائے اس کے جو اس کی تشہیر کا ارادہ رکھتا ہو۔
  غرض لقطہ اٹھانا اپنی اصل میں مباح ہے البتہ کبھی واجب تو کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔ [1]
- لقطہ کی ایک سال تک تشہیر واجب ہے اور تشہیر کرنے کا طریقہ اور یہ کہ سال بھر میں تشہیر کرنے سے کیا مراد ہے تو یہ سب مفصل مذکور ہو چکا ہے۔
- لقطہ کی تشہیر مسجد میں کرنا منع ہے۔ البتہ مساجد کے دروازوں پر اس کی تشہیر کی جا سکتی ہے۔ [2]
- مدتِ تشہیر کے دوران اگر لقطہ کا مالک آ گیا تو وہی اس کا پہلا حق دار ہوگا اس کی دلیل "وَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا" کے الفاظ ہیں اور لقطہ کا مالک بینہ پیش کر کے اپنا مالک ہونا ثابت کرے گا۔
- سال گزرنے پر وہ لقطہ پانے والے کا شمار ہوگا۔ اس کی دلیل "فَشَأْنُكَ بِهَا" کے الفاظ ہیں جو یہ بتلاتے ہیں کہ وہ لقطہ اب اس کی ملک میں داخل ہو گیا ہے۔
- لقطہ پانے پر کسی کو گواہ بنانا لازم نہیں، کیونکہ اس بات کا نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں حکم نہیں دیا۔

---

[1] المغني: 3/6۔ روضة الطالبين: 391/5.

[2] الاقناع للشربيني: 372/2۔ حواشي الشرواني: 333/6.

- سال بھر کی تشہیر یومیہ ہو یا ہفتہ واری یا پھر ماہوار، یہ امر عرف کے سپرد ہوگا۔
- اگر کسی کو لقطہ کے مالک کا علم ہو تو پھر اس کی تشہیر کی ضرورت نہیں بلکہ اسے مالک کے سپرد کرے۔ چنانچہ یا تو اس تک خود لے جائے یا اسے خبر کر دے تاکہ وہ آکر لے جائے۔
- لقطہ کی چیز تھوڑی ہو یا زیادہ اس کی تشہیر کرے۔ ظاہر حدیث سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔ البتہ اگر وہ اس قدر معمولی ہو کہ عموماً اتنی چیز کے گر جانے کی یا گم ہو جانے کی مالک کو پروا نہیں ہوتی تو ایسی چیز کی تشہیر بھی ضروری نہیں۔
- لقطہ کی تشہیر پر جو بھی خرچ اٹھے گا وہ لقطہ اٹھانے والے کے ذمہ ہوگا جس کی دلیل "عَرِّفْهَا" کے الفاظ ہیں کہ یہ امر لقطہ اٹھانے والے کی طرف متوجہ ہے۔ کیونکہ تشہیر کرنے کا مطالبہ اسی سے کیا گیا ہے لہٰذا تشہیر کی اجرت بھی اسی کے ذمے ہو گی امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے متاخرین فقہاء اسی طرف گئے ہیں۔ [1]

جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ اجرت لقطہ کے مالک پر آئے گی کیونکہ یہ تشہیر اسی کی مصلحت کے لیے کی گئی تھی اور غانم وہی ہے لہٰذا غارم بھی وہی ٹھہرے گا اور یہی قول صحیح ہے کہ تشہیری مہم کی اجرت لقطہ کا مالک ادا کرے گا۔

- گم شدہ بکری کو چھوڑ دینے یا روک لینے کا بندہ کو اختیار ہے۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں "اَوْ" مذکور ہے جو تخییر کے لیے ہوتا ہے اور یہ تخییر "تخییرِ مصلحت" ہے۔
- سال گزرنے پر جب لقطہ اٹھانے والا اس کا مالک بن جائے گا تو اب اگر وہ اس کو تلف کر دیتا ہے تو کیا اس پر ضمان آئے گا یا نہیں؟ اکثر علماء کا یہ قول ہے کہ اگر تو اس نے اس لقطہ کو تصرف میں لا کر تلف کر دیا ہوا تھا تو اب اس کا مالک آنے پر وہ کسی شے کا ضامن نہ ہوگا۔ [2] لیکن اگر لقطہ کی عین ابھی موجود ہے تو مالک کے آنے پر وہ اس کے لے لینے کا مستحق ہوگا۔
- معلوم ہوا کہ جو بکری ضالہ نہ ہو اس سے تعرض کا کسی کو حق نہیں۔
- اور یہ بھی معلوم ہوا کہ گم شدہ بکری کا آدمی تشہیر کے بغیر ہی مالک بن جاتا ہے جس کی دلیل "هِيَ لَكَ" کے الفاظ ہیں۔
- بھیڑیا مار ڈالنا مسنون ہے کیونکہ وہ مال کو تلف کرتا ہے۔
- گم شدہ اونٹ کو روک لینا حرام ہے۔ جس کی دلیل "مَا لَكَ وَلَهَا" کے الفاظ ہیں اور اس کو چھوڑ دینا واجب ہے کیونکہ قدرت کی طرف سے اس کے پاس اپنے کھانے پینے کا بندوبست ہوتا ہے جبکہ کسی بھی متوسط درجے کے درندے کے لیے اس کو ہلاک کرنا از حد دشوار ہوتا ہے۔ پس اونٹ خود کو درندے سے بچا سکتا ہے۔ یہی حکم گائے کا بھی ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گم شدہ اونٹ اگر متعدد درندوں کے نرغے میں ہو کہ اس کے لیے بیک وقت ان سب کا مقابلہ دشوار ہو تو ایسے اونٹ کو پکڑ کر بچانا جائز ہوگا۔
- لقطہ کے طور پر ہرن پکڑنا جائز نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے بھیڑیے وغیرہ درندے سے بچ سکتا ہے۔ یہی حکم گم شدہ پرندے جیسے کبوتر وغیرہ کا ہے۔
- لفظ رب کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے اس کی دلیل "حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا" کے الفاظ ہیں۔
- جنگلی گدھے اور گائے وغیرہ کو بطور لقطہ کے پکڑنا حرام ہوگا۔ کیونکہ یہ جانور خود کو متوسط درجہ کے درندے سے بچا سکتے ہیں۔

---

[1] المبدع: 282/5۔ المهذب: 430/1.
[2] المبدع: 286/5۔ الانصاف: 421/6.

علماء نے پالتو گدھے کو اونٹ کے حکم میں شمار کیا ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ اگر کسی نے بھٹکی ہوئی بکری کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے پکڑ لیا تو سال بھر کی تشہیر تک اس کے گھاس وغیرہ کا خرچ کس کے ذمہ ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک سال تک کا خرچ تو مالک دے گا۔ سال کے بعد کا خرچ اس کو پانے والے کے ذمہ ہوگا۔

رہا اس کا دودھ اور اس کے ہونے والے بچے، تو سال کی تکمیل سے قبل تک تو وہ بکری کے مالک کے ہوں گے کیونکہ ایک سال تک تو وہ اس کی ملکیت شمار ہوگا۔ البتہ سال پورا ہونے کے بعد اس کا دودھ اور ہونے والے بچے اس کو اٹھانے والے کے ہوں گے۔

◈ ایک ہی نوع کی مختلف چیزوں کے متفرق احکام مقرر کرنا یقیناً شریعت اسلامیہ کی حکمت میں سے ہے۔

بغیر تشہیر کے گم شدہ جانور کو ٹھکانا دینے کا حکم

934۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ آوَى ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ، مَا لَمْ يُعَرِّفْهَا)).

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی بھٹکے جانور کو ٹھکانا دیا تو جب تک وہ اس کی تشہیر نہیں کرتا وہ گم شدہ جانور (کے حکم میں ہی) ہے۔'' [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ آوَى: مذکورہ ''مَنْ'' شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے اور ''اٰوَى'' یہ ''اِيْوَاءٌ'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کسی کو پناہ دینا اور اپنے پاس ٹھہرانا۔ یہاں اپنی ملک میں ملانا مراد ہے۔ یعنی جس نے کسی گم شدہ جانور کو دیکھ کر پکڑ لیا اور اسے اپنی ملک میں داخل کر لیا تو وہ اس وقت تک ''ضال'' کے حکم میں ہی رہے گا جب تک کہ وہ اس کی تشہیر نہ کرے۔

مَا لَمْ يُعَرِّفْهَا: لہٰذا جب وہ اس کی تشہیر کر دے گا تو وہ ضال کے حکم میں نہ رہے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ چاہے کوئی بکری کو پناہ دے یا اونٹ کو، جب تک کہ وہ اس کی تشہیر نہ کرے، وہ ''ضال'' کے حکم میں داخل ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم اونٹ کے لیے نہیں کیونکہ اونٹ کو پناہ دینے کے بعد چاہے اس کی تشہیر کرے یا نہ کرے تب بھی وہ ''ضال'' کے حکم میں ہی رہے گا۔

◈ گم شدہ جانور کو ٹھکانا دینا اسی کے لیے ہی جائز ہے جو اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہو۔ لہٰذا تشہیر کے قصد کے بغیر گم شدہ بکری کو پکڑ کر رکھ لینا حرام ہوگا اور اس صورت میں وہ جانور کے تلف ہو جانے پر اس کا ضامن بھی ہوگا۔

لقطہ پر گواہ بنانا

935۔ وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ وَجَدَ لُقَطَةً فَلْيُشْهِدْ

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جسے کوئی لقطہ ملے تو وہ (اٹھانے سے

[1] صحيح مسلم: 1725.

ذَوَیْ عَدْلٍ ، وَلْيَحْفَظْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا ، ثُمَّ لَا يَكْتُمْ ، وَلَا يُغَيِّبْ ، فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا ، وَإِلَّا فَهُوَ مَالُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ)) .

قبل) دو عادل آدمیوں کو (اس پر) گواہ کر لے اور اس کی تھیلی اور بندش کو محفوظ کر لے۔ پھر نہ تو (اس کو) چھپائے (بلکہ اس کی تشہیر کرے) اور نہ (اس کی کسی چیز کو) چھپائے۔ پھر اگر تو لقطہ کا مالک آ گیا تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے وگرنہ وہ اللہ کا مال ہے وہ جسے چاہے دے۔“ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ وَابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام احمد نے اور آئمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ترمذی کے۔ جبکہ امام ابن خزیمہ، امام ابن جارود اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **مَنْ وَجَدَ لُقَطَةً:** مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔

لُقَطَةً: یہ نکرہ ہے جو معمولی شے کو بھی شامل ہے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ معمولی شے اسی کی ہوتی ہے جس کو ملی ہو۔

فَلْيُشْهِدْ ذَوَیْ عَدْلٍ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ جوابِ شرط ہے۔ کیونکہ جب جوابِ شرط جملہ طلبیہ ہو تو اس پر "فا" کا داخل ہونا واجب ہوتا ہے۔ تب پھر "فَلْيَشْهِدْ" میں مذکورہ لام "امر" کا ہے۔

ذَوَیْ عَــدْلٍ: "ذَوَی": یہ "ذُوْ" کی تثنیہ ہے جو حالت نصبی میں ہے۔ مراد صاحب عدل دو گواہ ہیں۔ عدل یہ دین و مروت میں استقامت کو کہتے ہیں۔ دین میں استقامت یہ کبائر سے اجتناب اور صغائر کے اصرار سے گریز کرنے کا نام ہے۔ جبکہ مروت میں استقامت یہ خلاف مروت افعال کا ترک ہے۔

گواہ بنانے کا یہ حکم اس لیے ہے تاکہ لقطہ اٹھانے والے اور لقطہ کے مالک کے درمیان اس کے آنے پر کوئی نزاع نہ ہو۔ کہ مبادا لقطہ کا مالک اس شے کی تعداد یا صفت میں کسی اضافہ کا مدعی بن بیٹھے اور لقطہ اٹھانے والا کچھ نہ کر سکے۔ چنانچہ گواہ بنا لینے سے وہ ممکنہ جھگڑے اور دعویٰ سے بچ جائے گا اور نہیں تو قسم اٹھانے کی زحمت سے تو محفوظ رہے گا۔ کیونکہ گواہ ہونے کی صورت میں اسے قسم نہ اٹھانی پڑے گی اور گواہوں کا عادل ہونا اس لیے شرط ہے کیونکہ فاسق کی شہادت مردود ہوتی ہے۔

وَلْيَحْفَظْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا: حفاظت سے مراد لقطہ کے اوصاف کی حفاظت ہے۔ عفاص اور وکاء پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔

ثُمَّ لَا يَكْتُمْ وَلَا يُغَيِّبْ: "لَا يَكْتُمْ" مراد یہ ہے کہ وہ لقطہ کی تشہیر کرے۔ کیونکہ تشہیر نہ کرنا بھی کتمان میں داخل ہے اور "لَا يُغَيِّبْ" سے مراد یہ ہے کہ وہ لقطہ کی کسی چیز کو چھپائے نہیں۔ بلکہ اس کو ظاہر کرے۔

فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا: مراد لقطہ کا اصلی مالک یا اس کا قائم مقام ہے۔

فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا: یعنی وہ لقطہ مالک کا شمار ہوگا۔ کیونکہ جب اس لقطہ کا زیادہ حق دار وہ ہے تو کوئی دوسرا اس سے اس لقطہ کی بابت منازعت نہ کر سکے گا۔

---

❶ مسند احمد: 161/4۔ سنن ابی داؤد: 1709۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5808۔ سنن ابن ماجہ: 2505۔ المنتقی لابن جارود: 671۔ صحیح ابن حبان: 4894.

وَإِلَّا: اس کی ترکیب بیان ہو چکی ہے۔یعنی اگر تشہیر کی مدت کے دوران لقطہ کا مالک نہیں آتا۔
فَهُوَ مَالُ اللّٰهِ: یہاں بھی مذکورہ "فا" جوابِ شرط پر داخل ہوا ہے کیونکہ جب جوابِ شرط جملہ شرطیہ ہوتو اس پر ''فا'' کا داخل ہونا واجب ہوتا ہے۔
"هُوَ" ضمیر یہاں مذکر کی ہے جبکہ پیچھے مذکور اسم ''لقطہ'' ہے جو مونث ہے تب پھر اس ضمیر کا مرجع معنوی ہوگا۔یعنی ''تب پھر وہ موجود شی.''
مَالُ اللّٰهِ: اللہ کا مال ہے۔یعنی اب یہ کس کے تصرف میں جائے گا، اس کا فیصلہ رب تعالیٰ فرمائیں گے۔اسی لیے آگے فرمایا: يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ: اور اس صورت میں رب تعالیٰ جس کو عطا فرمائیں گے وہ لقطہ کو پانے والا ہے۔
مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں ایک اور اہم مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جسے لقطہ ملے وہ اس کو اٹھانے سے قبل اس پر دو عادل لوگوں کو گواہ بنالے تا کہ بعد میں لقطہ کی کمیت، کیفیت اور صفت وغیرہ میں نزاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ لقطہ اٹھانے سے قبل دو عادل لوگوں کو اس پر گواہ بنالیا جائے۔اس کی دلیل "فَلْيُشْهِدْ" کے الفاظ ہیں۔رہا یہ سوال کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب و ارشاد کے لیے؟ تو علماء اس باب میں دونوں طرف گئے ہیں۔وجوب کے قائل علماء کی دلیل یہ ہے کہ امر اصل میں وجوب کے لیے ہوتا ہے۔جب تک کہ عدمِ وجوب کی کوئی دلیل قائم نہ ہو۔[1]
جبکہ دوسرے علماء اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔[2] کیونکہ حدیث زید بن خالد رضی اللہ عنہ میں نبی کریم ﷺ نے لقطہ اٹھانے والے کو گواہ کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔چنانچہ اگر یہ واجب ہوتا تو نبی کریم ﷺ وہاں بھی اس کو ضرور ذکر فرماتے۔
◈ جب بھی گواہ بنانے ہوں تو ان کا عادل ہونا لازم ہے۔کیونکہ ان کی شہادت مقبول ہوتی ہے۔
◈ رہی عورت تو مالی معاملات میں اس کی شہادت مرد کے مقابلہ میں نصف ہوتی ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ (البقرة: 282)
''اور اپنے مردوں میں سے دو گواہوں کو گواہ بنالو، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو۔''
◈ لقطہ کی کمیت و کیفیت کو ضبط کرنا اور اس کی حفاظت کرنا واجب ہے۔اس کی دلیل "وَلْيَحْفَظْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا" کے الفاظ ہیں۔
◈ لقطہ کو چھپانا حرام ہے۔اس کی دلیل "لَا يَكْتُمْ" کے الفاظ ہیں۔

---

[1] المبدع: 293/5۔ الكافي في فقه ابن حنبل: 365/2.
[2] علامہ مرداوی اس کے عدمِ استحباب کے قائل ہیں کہ یہی صحیح مذہب ہے۔علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: تا کہ شیطان اسے لقطہ کی بابت بہکائے نہیں۔ الفتاویٰ: 34/33.

◈ مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کی امانتوں کو ادا کرنا اوران کی حفاظت کرنا واجب ہے۔
◈ مالک کے آجانے پر لقطہ کا اصلی اور زیادہ مستحق وہی ہوتا ہے اور مالک نہ آئے تو وہ لقطہ اس کے اٹھانے والے کا ہوگا جیسا کہ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔
◈ مال کی اضافت رب تعالیٰ کی طرف کرنا جائز ہے۔
◈ رب تعالیٰ کے لیے مشیت ثابت ہے، اس کی دلیل "مَنْ يَشَاءُ" کے الفاظ ہیں۔
◈ رب تعالیٰ کبھی آدمی کو کسی سبب اور کسب کے بغیر بھی مال عطا فرماتا ہے۔

مکہ کے لقطہ کا حکم

936- وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمَنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: نَهَى عَنْ لُقَطَةِ الْحَاجِّ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حاجی کے لقطہ (کو اٹھانے) سے منع فرمایا ہے۔ [1] اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... نَهَى: مذکورہ ممانعت تحریم کی ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ لہٰذا یہ نہی کراہت کی نہ ہوگی۔

عَنْ لُقَطَةِ: لقطہ کی تفصیلی تعریف تمہید میں گزر چکی ہے۔

الْحَاجِّ: حاجی: یہ وہ شخص ہے جو مناسک کے ادا کے ارادہ سے مکہ کی طرف عازم سفر ہوا ہو۔ اب اگر تو مراد میقات سے احرام باندھنے والا ہو تو پھر یہ ممانعت مطلق ہوگی اور مراد یہ ہوگا کہ حاجی احرام والا جہاں کہیں فروکش ہوا اور اس کا کوئی سامان کوچ کے وقت پڑا رہ گیا تو اس کو اٹھانا منع ہوگا چاہے وہ جگہ حل تھی یا حرم، اور مکہ تھی یا غیر مکہ کہ حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے۔

لیکن بظاہر یہ مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم! کہ حاجی کا لقطہ اٹھانا اس لیے منع نہیں کہ وہ حاجی ہے۔ بلکہ یہ ممانعت اس لیے ہے کہ وہ مکہ میں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مکہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا: ''اس کی گری ہوئی چیز (اٹھانا) حلال نہیں سوائے اس کے جو اس کی تشہیر کرے۔'' تب پھر حاجی کے لقطہ کو اٹھانے کی ممانعت اس لیے نہیں کہ وہ حاجی ہے بلکہ یہ لقطہ اٹھانے کی ممانعت اس لیے ہے کہ یہ مکہ میں پڑا ہوا ملا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ مکہ کا لقطہ اٹھانا منع ہے۔ البتہ جو اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہو، وہ اس کو اٹھا سکتا ہے۔

فائدہ:...... مکہ کا لقطہ اٹھانا حرام ہے اور اس کی حکمت اس بزرگ مقام کا احترام ہے۔

معاہد کے لقطہ کا حکم

937- وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِ يكَرِبَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَلَا لَا يَحِلُّ ذُو نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَلَا الْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ، وَلَا اللُّقَطَةُ مِنْ مَالِ مُعَاهَدٍ، إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا)).

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''خبردار! (سن لو) کہ نہ تو کوئی کچلیوں والا درندہ (کھانا) حلال ہے، نہ پالتو گدھا اور نہ معاہد کا لقطہ ہی (لے لینا حلال ہے) سوائے اس کے کہ وہ اس

[1] صحيح مسلم: 1724.

سے بے نیاز ہو (جائے)۔'' ❶

رَوَاهُ أَبُو دَاوُد. اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **مَعْدِ يَكْرِبَ**: یہ لفظ غیر منصرف ہونے کی وجہ سے حالت جری میں بھی لفظی فتح کے ساتھ ہے اور اس میں منع حرف کے دو اسباب موجود ہیں۔ (1) ایک علمیت (2) اور دوسرا ترکیب۔

أَلَا: یہ حرف استفہام ہے جو تنبیہ اور تاکید کے لیے آتا ہے۔ اسے حرف آغاز بھی کہتے ہیں۔

ذُو نَابٍ: نَاب کی جمع انیاب آتی ہے۔ یہ سامنے کے چار دانتوں کے پہلو میں واقع اطراف کے دونوں نوکیلے دانتوں کو کہتے ہیں۔ (اردو زبان میں ان کو کچلیاں کہتے ہیں) اور یہاں مطلق کچلی کے دانت مراد نہیں بلکہ وہ دانت مراد ہیں جن کے ذریعے درندہ جھنجھوڑ کر اور چیر پھاڑ کر کھاتا ہے۔

مِنَ السِّبَاعِ: یہ مذکورہ جانور کا دوسرا وصف ہے۔ پھر جو کچلیوں والا ہوگا وہ یقیناً درندہ ہوگا اور ہر درندہ کچلیوں والا ضرور ہوتا ہے۔ پس مراد وہ جانور ہے جو ضرر رساں بھی ہو۔ معلوم ہوا کہ درندوں کا گوشت کھانا حلال نہیں جیسے کتا، بھیڑیا، شیر، چیتا، تیندوا وغیرہ۔ کیونکہ ہر غذا انسانی فطرت کو ضرور متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درندوں کا گوشت کھانے والے سفاک، خون آشام، ظلم و ستم کے رسیا، اور انتقام و عدوان کے عادی ہوتے ہیں۔ غرض درندوں کا گوشت کھانا حرام ہے۔

اَلْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ: پالتو گدھا کھانا بھی حرام ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ جنگلی گدھے کا گوشت حلال ہے۔ پس پالتو یعنی وہ گدھا جو جنگلوں اور بیابانوں میں نہ رہتا ہو اس کا گوشت حلال نہیں چاہے وہ وحشی ہی ہو۔ یہ گدھے پہلے حلال تھے، بعد میں ان کو ان کے نجس ہونے کی وجہ سے حرام کر دیا گیا۔ البتہ تحریم سے قبل ان کو طاہر شمار کیا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں تفصیلی کلام پہلے گزر چکا ہے۔

وَلَا اللُّقَطَةُ مِنْ مَالِ مُعَاهِدٍ، إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا: معاہد: یہ ان کفار کو کہتے ہیں جن کے ساتھ ہمارا امن کا معاہدہ ہو گیا ہو اور اس کی رو سے اب ان کی جان مال اور عزت و آبرو دوسرے مسلمانوں کی طرح محفوظ ہوگی۔ اسی رو سے معاہد کا لقطہ بھی کسی کو لینا حلال نہیں۔ آپ ﷺ نے یہ اس لیے ارشاد فرمایا تاکہ کوئی ذمی معاہد کو کافر سمجھتے ہوئے اس کے مال کو لے لینا جائز نہ سمجھے۔ **إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا**: علماء نے اس کے دو معانی بیان کیے ہیں:

(1) ایک مطلب یہ ہے کہ عموماً اس شے کے بغیر کام نکلتا ہو اور لوگوں کو اس کے ہونے یا نہ ہونے کی پروا نہ ہو جیسے بہت معمولی اور بے قیمت شے۔ کہ اگر وہ کہیں گر جائے یا گم ہو جائے تو اس کی جستجو میں اس کے پیچھے نہ نکلے۔

(2) جبکہ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ ذمی معاہد خود یہ کہے کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، تب پھر یہ استثناء مسلمان کے حق میں بھی ہوگا۔

پس جب بلاد اسلامیہ میں کوئی لقطہ ملے تو اس کا احترام واجب ہے جب تک کہ اس سے استغناء کا علم نہ ہو جائے۔ یا تو اس کے مالک کی طرف سے اجازت کی صورت میں یا اس صورت میں کہ وہ شے معمولی اور بے قیمت ہو۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3803۔ سنن الدار قطنی: 287/4۔ سنن البیهقی: 332/9۔ مسند احمد: 130/4۔ مطولاً۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

رہا یہ سوال کہ لقطہ کی بابت یہ کیونکر علم ہوگا کہ یہ تو ذمی کا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو وہ مال کفار کے خصائص میں سے ہوگا جیسے صلیب کہ اس سے اس کے ذمی کا مال ہونے کا علم ہوگا یا پھر وہ لقطہ امن معاہدہ کے بعد بلاد کفار میں آتے جاتے ملا ہوگا۔

غرض ذمی کا مال ہونے کا علم کسی قرینہ سے ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں چند چیزوں کی بابت بتلایا گیا ہے کہ وہ حرام ہیں، جو یہ ہیں:

(1) ہر قسم کے درندوں کا گوشت۔

(2) پالتو گدھے کا گوشت، اس سے مراد وہ گدھے ہیں جو جنگلوں اور بیابانوں میں نہ رہتے ہوں۔

(3) ذمی معاہدہ کا لقطہ۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جملہ درندے حرام ہیں بالخصوص کچلیوں سے چیر پھاڑ کر کھانے والے۔ اس کی دلیل "أَلَا لَا يَحِلُّ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ جو درندہ ہو پر اس کی کچلیاں نہ ہوں اور وہ پھاڑ نہ کھاتا ہو، وہ حلال ہوگا۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں درندے کے حرام ہونے کی دو شرطیں مذکور ہیں:

(1) ایک تو وہ کچلیوں والا ہو۔

(2) دوسرا وہ ان کے ذریعے پھاڑ کھاتا ہو۔

تب پھر بجو حلال ہوگا۔ کیونکہ اس کی کچلیاں نہیں ہوتیں اور وہ بوقت ضرورت ہی حیوان کھاتا ہے بخلاف بھیڑیے کہ وہ ہر وقت ہی جانور شکار کر کے اور اس کو چیر پھاڑ کر کھاتا ہے۔

◈ پالتو گدھا حرام ہے۔

◈ معاہد ذمی کا لقطہ حرام ہے کیونکہ اس کی جان، مال اور عزت وآبرو امن معاہدہ کی وجہ سے محفوظ ہے۔

19۔ بَابُ الْفَرَائِضِ ...... فرائض کا بیان

فرائض کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

تمہید:......فرائض: فریضہ کی جمع ہے اور یہ مفعول کے معنی میں ہے یعنی فریضہ بمعنی مفروضہ ہے۔ یہ فرض سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کاٹنا جیسے چھری سے گوشت کاٹ کر اس کا ایک پارچہ الگ کرنا۔

جبکہ فقہاء کی اصطلاح میں فرض اس کو کہتے ہیں جس کا امتثال واجب ہو۔ جبکہ یہاں مراد شرع شریف کی طرف سے ملنے والا وہ مقررہ حصہ ہے جو وارث کو مورث کی میراث سے ملتا ہے۔

اب اصحاب فروض یعنی جن کے میراث میں حصے مقرر ہیں وہ محدود ومحصور ہیں جن کو شمار کیا اور گنا جا سکتا ہے اور وہ صرف دس ہیں جبکہ اصحابِ تعصیب یعنی عصبہ کی کوئی حد نہیں۔ یہ ہزاروں تک بھی جا سکتے ہیں۔

اصحابِ فروض کون ہیں

938۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ | حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

اللّٰهِ ﷺ: ((أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا ، فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ)).

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(میراث کے) فرائض (یعنی حصوں) کو فریضہ والوں (یعنی میراث کے مستحقوں) سے ملادُ (یعنی ان کو دو)۔ پس جو (مال تقسیم ترکہ کے اور اہل فرائض کو دینے کے بعد) بچ رہے تو وہ قریب ترین بالغ مذکر (وارث) کا ہوگا۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ: یعنی دو۔ یعنی میراث میں جن جن کا حصہ مقرر ہے وہ انھیں دو۔ کیونکہ ان کو رب تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ اس بارے قرآن کریم میں متعدد آیات آتی ہیں۔ ذیل میں چند آیات ذکر کی جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ (النسآء: 11)

''تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے ان میں سے کون فائدہ پہنچانے میں تم سے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ حصے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (النسآء: 13)

''یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔''

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ (النسآء: 176)

''اللہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔''

تب پھر جو اس بیان کی مخالفت کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔ پس سورۂ نساء کی ان تین مذکورہ آیات کی رو سے اصحاب فرائض کو ان کا میراث کا حصہ پہنچانا فرض ہوگا۔

بِأَهْلِهَا: یعنی فرائض والے اور یہ دس ہیں: زوجین (یہ دو ہوئے) والدین (ان دو کو ملا کر یہ چار ہو گئے) بیٹیاں، پوتیاں، سگی بہنیں، باپ شریک بہنیں، ماں شریک بہنیں اور دادیاں۔ یہ دس قسم کے ورثاء اصحاب فروض ہیں جن کا میراث میں ایک مقرر حصہ ہے اور ان کو ملے گا۔ پھر اگر کسی کے ورثاء میں سے اصحاب فروض کو دینے کے بعد بھی ترکہ بچ رہے تو اس بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ: ''أَوْلَى'' سے مراد ''أَقْرَبُ'' ہے۔ چاہے وہ غنی ہی ہو اور اس سے دور کا وارث فقیر ہی ہو۔ لہٰذا اگر کسی کے ورثاء میں باقی مال کے حق میں ایک بے حد امیر چچا اور ایک بڑا تنگدست چچا زاد ہو۔ تو باقی کے ترکہ کا زیادہ مستحق چچا ہوگا چاہے وہ غنی بھی ہے کیونکہ وہ بہ نسبت چچا زاد کے میت کے زیادہ قریب ہے۔

❶ صحيح البخاري: 6732- صحيح مسلم: 1615.

رَجُلٍ ذَکَرٍ: پھر "رَجُلٍ" سے مراد بالغ ہے اور "ذَکَرٍ" سے مراد مؤنث کی ضد ہے۔ پس "ذَکَرٍ" کا ذکر یہ "رَجُلٍ" کی تعلیل کے طور پر ہوگا۔ یعنی بچ جانے والا ترکہ قریبی ترین بالغ شخص کو اس کے مذکر ہونے کی وجہ سے دیا جائے گا۔ غرض اصحاب فروض دس ہیں جن کو گنوا دیا گیا ہے اور باقی کا ترکہ اس بالغ مرد کا ہوگا جو میت کے سب سے زیادہ قریب ہوگا۔ اس کو عصبہ یا عاصب کہتے ہیں۔ ان کے حصوں کی تفصیل اور ان میں میراث کی تقسیم کے قواعد وضوابط کو فرائض کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

مسلمان اور کافر کے ایک دوسرے کا وارث بننے کا حکم

939۔ وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ، وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "نہ تو مسلمان کافر کا وارث بنے گا اور نہ کافر مسلمان کا ہی وارث بنے گا۔" [1]
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا يَرِثُ: مذکورہ نفی یہ نہی کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ بات جائز نہیں اور منع ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث بنے چاہے وہ اس کا قریبی ہی ہو اور نہ کوئی کافر کسی مسلمان کا ہی وارث بنے گا چاہے وہ اس کا قریبی ہی ہو اور اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ میراث کی بنیاد موالات اور نصرت پر ہے جبکہ کافر اور مسلمان کے درمیان سرے سے نہ تو موالات ہے اور نہ نصرت ہی ہے۔ بلکہ دونوں میں سے ہر ایک میں عداوت کا پایا جانا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ (الممتحنة : 1)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔"

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی تعلق اور صلہ نہیں۔ اب چاہے وہ کافر اصلی ہو یا مرتد دونوں سے نفس مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں کافر کے ذکر میں عموم ہے۔

البتہ بعض علماء نے اس مسئلہ سے منافقین کو مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ مسلمانوں والا معاملہ کیا تھا اور راجح قول یہ ہے کہ یہ استثناء صحیح ہے۔

موانع إرث

علماء نے اس حدیث کو "موانع ارث" کا نام دیا ہے۔ یعنی وراثت کا سبب تو پایا جاتا ہے پر ایک مانع بھی پایا جاتا ہے اور احکام تب ہی ثابت ہوتے ہیں جب اس کے اسباب اور شروط بھی پائی جائیں اور موانع بھی منتفی ہوں۔

علماء نے ارث کے موانع تین شمار کیے ہیں، جو یہ ہیں: [2]

(1) اختلاف دین (2) قتل اور
(3) رقیت

مذکورہ حدیث میں جس مانع کا ذکر ہے، وہ اختلاف دین ہے جس کی دلیل یہی حدیث ہے۔

رہے کافر تو اگر تو دونوں کا دین ایک ہو تو وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث بنیں گے اور اگر ان کا دین مختلف ہو تو دونوں

---

[1] صحيح البخاري: 6764۔ صحيح مسلم: 1614. [2] عمدة الفقه: 79.

ایک دوسرے کے وارث نہ بنیں گے۔ چنانچہ یہودی اور نصرانی ایک دوسرے کے وارث نہ بنیں گے۔ ارث کا دوسرا مانع قتل ہے لہٰذا اگر کسی وارث نے اپنے مورث کو قتل کر ڈالا تو وہ اس کا وارث نہ بنے گا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ''قاتل مقتول کی کسی شے کا وارث نہ بنے گا۔'' ❶

ارث کا تیسرا سبب رقیت ہے۔ یعنی اگر وارث غلام ہو تو وہ وارث نہ بنے گا۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی ارث کا ذکر فرمایا ہے تو اس ''لام'' کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے جو ملک پر دلالت کرتی ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (النسآء: 11)

''مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ہے۔''

تو پھر وارث ارث کا مستحق تب ہی بنتا ہے جب اس کے لیے ملک ثابت ہو اور غلام کے لیے ملک ثابت نہیں ہوتی تو وہ وارث بھی نہ بنے گا۔ غرض غلامی یہ ارث کا تیسرا مانع ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کافر اور مسلمان ایک دوسرے کا وارث نہیں بن سکتے۔
- مسلمان اور کافر میں مکمل مباینت اور جدائی ہے حتیٰ کہ میراث میں بھی جدائی ہے۔
- موالات (ایک دوسرے سے محبت اور ولاء) اور مناصرت (ایک دوسرے کی مدد اور اعانت) میں مدار اور کسوٹی دین کا ایک ہونا ہے۔ حتیٰ کہ میراث جو جبراً جاری ہوتی ہے دین کے مختلف ہونے کی صورت میں وہ بھی جاری نہ ہو گی۔
- مسلمان مسلمان کا اور کافر کافر کا وارث بنے گا۔ البتہ کفار کی باہمی میراث میں اختلاف ہے کہ آیا ان میں بھی دین میں متفق ہونا ضروری ہے یا کفر ملت واحدہ شمار ہو گا اور کفر میں اختلاف دین ہونے کے باوجود میراث جاری ہو گی۔

تو علماء کے اس بارے دو اقوال ہیں۔ ❷ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ کفر ملتِ واحدہ ہے لہٰذا اختلاف ملل کے باوجود وہ ایک دوسرے کے وارث بنیں گے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اختلاف ملل کی صورت میں وہ ایک دوسرے کے وارث نہ بنیں گے۔ ❸

بیٹی، بھتیجی اور بہن کا حصہ

940۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ فِيْ بِنْتٍ، وَبِنْتِ ابْنٍ، وَأُخْتٍ۔ فَقَضَى النَّبِيُّ ﷺ ((لِلابْنَةِ النِّصْفُ، وَلابْنَةِ الابْنِ السُّدُسُ۔ تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ۔ وَمَا بَقِيَ فَلِلْأُخْتِ)).

حضرت ابن مسعود ؓ سے بیٹی، بھتیجی اور بہن کے بارے میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا فیصلہ فرمایا کہ بیٹی کو نصف ملے گا، اور بھتیجی کو دو ثلث کا تکملہ کرنے کے لیے سدس ملے گا اور جو باقی رہ گیا ہو بہن کا ہو گا۔ ❹

---

❶ یہ حدیث عنقریب آگے آجائے گی اور وہاں اس پر تفصیلی کلام بھی ذکر کیا جائے گا۔

❷ المبدع: 94/2۔ المغنی: 247/6.

❸ علامہ ابن قیم ؒ نے "احکام اهل الذمة" (829/2) میں اسی قول کو راجح قرار دیا ہے اور ان شاء اللہ یہی قول صحیح ہے۔

❹ صحیح البخاری: 6742.

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. اس حدیث کوامام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

قصۂ حدیث:......اس حدیث کا قصہ یہ ہے کہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں اس بات کا فتویٰ دیا تھا کہ اگر میت کی ایک بیٹی اور ایک بھتیجی اور ایک بہن وارث ہوتو نصف بیٹی کو اور نصف بہن کو ملے گا جبکہ بھتیجی کو کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ مذکورہ صورت میں بیٹی اور بہن کے ساتھ کوئی عصبہ نہیں۔ بیٹی کے لیے نصف کی دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ (النسآء: 11) ''اور اگر ایک عورت ہوتو اس کے لیے نصف ہے۔''

اور بہن کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ (النسآء: 176) ''اور اس کی ایک بہن ہوتو اس کے لیے اس کا نصف ہے۔''

غرض یہ مسئلہ بتلا کر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے سائل سے ارشاد فرمایا کہ اب تم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ، امید ہے کہ وہ اس مسئلہ میں میری موافقت کریں گے۔ پس جب اس سائل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر وہ مسئلہ بیان کیا جو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا تھا تو انہوں نے فرمایا: تب تو میں گمراہ ہو جاؤں اور ہدایت والوں میں سے نہ رہوں (جو اگر اس مسئلہ کی موافقت کروں) اور میں اس بارے وہ فیصلہ سناؤں گا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ اس کے بعد وہ فرمایا جو اوپر حدیث میں مذکور ہے۔ یہ قصہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی ادب کو بھی بتلاتا ہے کہ جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے مجتہد ہونے کے باوجود مسئلہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دیا۔ کیونکہ وہ ان سے زیادہ علم والے تھے۔

بیٹی کا حصہ

بیٹی کو ترکہ کا نصف ملتا ہے۔ البتہ اس کے لیے ان شروط کا پایا جانا ضروری ہے کہ وہ اکیلی ہو۔ یعنی نہ تو اس کے ساتھ کوئی عصبہ ہو اور نہ کوئی دوسری بہن ہی ہو اور نہ اس کے ساتھ کسی عصبہ کا بیٹا ہی ہو۔ تب اس کو نصف ملے گا۔ اس کی دلیل سورۂ نساء کی گزشتہ مذکورہ یہ آیت ہے:

﴿وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ (النسآء: 11) ''اور اگر ایک عورت ہوتو اس کے لیے نصف ہے۔''

بھتیجی کا حصہ

مذکورہ صورت میں بھتیجی کا حصہ سدس ہوگا تا کہ دوثلث مکمل کیا جا سکے۔ کیونکہ بھتیجی ان بیٹیوں میں سے ہوتی ہے جو دادا کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے بھی بیٹی سمجھا جائے گا۔ البتہ اس کا درجہ صلبی بیٹی سے کم ہوگا۔ اسی لیے اس کو ترکہ سے سدس ملے گا نہ کہ ثلث، اور جب نصف کے ساتھ سدس ملتا ہے تو وہ کل ترکہ کا دوثلث بن جاتا ہے، اور یہی مطلب ہے دوثلث کے مکمل کرنے کا۔

بہن کا حصہ

مذکورہ صورت میں بہن کو جو باقی رہ گیا، وہ ملے گا اور وہ تیسرا ثلث ہے۔ کیونکہ وارثِ فرع کے ہوتے ہوئے جو بیٹی ہے، بہن کو نصف نہیں مل سکتا۔ کیونکہ بہنوں کو اولاد کے ہوتے ہوئے فرض حصہ نہیں ملتا کیونکہ اس صورت میں بہن کلالہ کے حکم میں ہوتی ہے جس کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ (النسآء: 176)

''وہ تجھ سے فتویٰ مانگتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی آدمی مر جائے، جس

کی کوئی اولاد نہ ہو۔''

جبکہ مذکورہ صورت میں میت کی اولاد ہے اور وہ اس کی بیٹی اور بھتیجی ہے۔لہٰذا آگے ارشاد ہے کہ:

﴿وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ (النساء: 176)

''اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کا نصف ہے جو اس نے چھوڑا۔''

بہن کو تب نصف ملے گا جب میت کی اولاد نہ ہو، لہٰذا ہماری مذکورہ صورت میں بہن کو نصف فرض حصہ نہ ملے گا بلکہ اسے تعصیب کا حصہ ملے گا اور وہ باقی ہے جو اس صورت میں تیسرا ثلث ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ اگر کسی میت کے ورثاء کی یہی صورت ہو تو ان میں ترکہ اسی مذکورہ صورت کے ساتھ تقسیم ہوگا۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حسن ادب۔
- ان عورتوں کا حصہ جو فروع میں سے ہوں، دو ثلث سے زیادہ نہ ہوگا۔ چاہے ان کی تعداد جتنی بھی ہو جائے۔
- بھتیجیاں اگر ایک بیٹی کے ساتھ وارث بنیں تو ان کا حصہ دو ثلث سے زیادہ نہ ہوگا۔
- مذکورہ حدیث اس ارشاد نبوی کے عموم میں تخصیص پیدا کرتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ: ''فرائض کو ان کے اہل تک پہنچاؤ پس جو بچ رہے وہ قریب ترین بالغ مرد کا ہوگا۔''

اختلاف ملت کا حکم

941۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ)).

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہ بنیں گے۔''

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، سوائے امام ترمذی کے۔

وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ بِلَفْظِ أُسَامَةَ.

جبکہ امام حاکم نے اس روایت کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لفظوں سے بیان کیا ہے۔

وَرَوَى النَّسَائِيُّ حَدِيْثَ أُسَامَةَ بِهٰذَا اللَّفْظِ.

اور امام نسائی نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو انہی لفظوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ [1]

شرح:...... یہ حدیث بتلاتی ہے کہ کفر میں متعدد ملتیں ہیں اور یہ کہ دو ملتوں والے کافر ہونے کے باوجود ایک دوسرے

---

[1] مسند احمد: 2/178۔ سنن ابی داؤد: 2911۔ جامع الترمذی: 2108۔ السنن الکبریٰ للنسائی، 4/82۔ سنن ابن ماجہ: 2731۔ المستدرك للحاکم: 2/262۔ المنتقی لابن جارود: 967۔ سنن الدار قطنی: 4/72۔ ان سب روایات کا طریق ضعیف ہے سوائے امام ابوداؤد کے طریق کے کہ وہ حسن ہے اور اس حدیث کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے شواہد بھی ہے، پر ان سب میں کلام ہے۔ دیکھیں: نصب الرایۃ: 4/330۔ التلخیص: 3/84.

کے وارث نہ بنیں گے اور یہی قول راجح ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا۔

فائدہ: ...... جب خود ''کافر'' ملتوں کے اختلاف سے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے تو بھلا مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث کیونکر بن سکتے ہیں۔

دادا کی میراث

942۔ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضي الله عنه قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: إِنَّ ابْنَ ابْنِي مَاتَ، فَمَا لِي مِنْ مِيرَاثِهِ؟ فَقَالَ: ((لَكَ السُّدُسُ)) فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ، فَقَالَ: ((لَكَ سُدُسٌ آخَرُ))، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ، فَقَالَ: ((إِنَّ السُّدُسَ الْآخَرَ طُعْمَةٌ)).

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: میرا پوتا وفات پا گیا ہے تو میرا اس کی میراث میں سے کتنا حصہ ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تیرا حصہ سدس (چھٹا) ہے۔'' جب وہ (جانے کو) مڑا تو نبی کریم ﷺ نے اسے بلا کر ارشاد فرمایا: ''تمہیں ایک دوسرا سدس بھی ملے گا۔'' پس جب وہ (دوبارہ جانے کو) مڑا تو نبی کریم ﷺ نے اسے (دوبارہ) بلا کر ارشاد فرمایا: ''بے شک وہ دوسرا سدس روزی ہے۔''

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ عَنْ عِمْرَانَ، وَفِي سَمَاعِهِ خِلَافٌ

اور یہ حدیث حسن بصری کی حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جن کے حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے۔

روایۃ الحدیث: ...... چونکہ حسن بصری کے حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے اس لیے یہ حدیث منقطع ٹھہرے گی۔

غریب الحدیث: ...... إِنَّ ابْنَ ابْنِي: معلوم ہوا کہ مذکورہ جد باپ کی جہت سے تھا اور باپ کی طرف سے جد باپ کے نہ ہونے کی صورت میں باپ کے بمنزلہ ہوتا ہے۔ طُعْمَةٌ: یہ روزی کو کہتے ہیں۔

صورت مسئلہ: ...... مذکورہ حدیث میں یہ صورتِ مسئلہ مذکور ہے کہ ایک فوت شدہ اپنے پیچھے دو بیٹیاں اور دادا چھوڑ مرا تو دو بیٹیوں کو دو ثلث ملے گا جبکہ دادا کو ایک سدس ملے گا جو فرض حصہ ہے۔ جبکہ باقی جو دوسرا سدس ہے تعصیب کی وجہ سے ملے گا اور یہی معنی ہے اس ارشاد نبوی ﷺ کا کہ: ''وہ دوسرا سدس (رب تعالیٰ کی طرف سے) روزی ہے۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جد یعنی باپ کا باپ وارث ہوتا ہے اور وہ فرض حصہ بھی پاتا ہے اور اسے تعصیب بھی ملتی ہے۔
- ہم عاصب کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا نصف یا ثلث یا سدس حصہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے: ''لَكَ سُدُسٌ آخَرُ''، لیکن اس صورت میں یہ بتلانا لازم ہے کہ یہ سدس یا ثلث یا نصف فرض حصہ نہیں بلکہ تعصیب ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علم حاصل کرنے کے لیے بے حد حریص تھے۔

◈ نبی کریم ﷺ نے امت تک رب تعالیٰ کے احکام پورے پورے بیان فرما دیے تھے۔
◈ مفتی کے ذمہ لازم نہیں کہ وہ کسی امر کے موانع کو بھی دریافت کرے۔

جدہ کی میراث

943- وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ ﷺ عَنْ أَبِيهِ ﷺ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَعَلَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسَ، إِذَا لَمْ يَكُنْ دُونَهَا أُمٌّ)).

ابن بریدہ اپنے والد ماجد (حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے جدہ کے لیے سدس مقرر فرمایا جبکہ اس کے نیچے کی ماں نہ ہو۔ ❶

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ، وَقَوَّاهُ ابْنُ عَدِيٍّ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ابن عدی نے اس حدیث کو قوی قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث :......**اَلْجَدَّةِ**: یہ ماں کی ماں اور باپ کی ماں دونوں کو کہتے ہیں چاہے اوپر تک چلی جائیں۔ یہ دونوں دادیاں بالاجماع وارث ہیں۔ لہٰذا اگر کسی میت کی دادی ہو تو اسے سدس ملے گا۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ اس کے نیچے کی ماں نہ ہو ورنہ یہ وارث نہ بنے گی۔ کیونکہ ماں میت کے بہ نسبت دادی کے زیادہ قریب ہے اور وہ اوپر کی ماں کے لیے حاجب بن جائے گی۔ لہٰذا نیچے کی ماں کے ہوتے ہوئے دونوں قسم کی دادیوں کو حصہ نہ ملے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دادی کو حصہ ملے گا چاہے وہ ماں کی طرف سے ہو یا باپ کی طرف سے ہو۔
◈ دادی کا حصہ سدس ہے۔
◈ اور نیچے کی ماں اوپر کی ماں کے لیے حاجب ہے۔ لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے اوپر کی ماں کو حصہ نہ ملے گا۔

ماموں اور ذوی الارحام کی میراث

944- وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِ يَكْرِبَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ)).

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس کا کوئی وارث نہ ہو، اس کا وارث (اس کا) ماموں ہوتا ہے۔'' ❷

---

❶ سنن ابی داؤد: 2895- السنن الکبریٰ للنسائی: 6338- المنتقی لابن جارود: 960- الکامل لابن عدی: 416/3- ترجمة ابی مجاهد هشام بن سفیان- ابن عدی کہتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں، اور ترجمة ابی المنیب: 329/4- ابن عدی کہتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس حدیث کی اسناد میں عبیداللہ العتکی ہے۔ ابن معین نے اس کو ثقہ کہا ہے اور ابوحاتم اس کو صالح الحدیث کہتے ہیں اور امام بخاری کے ان کو "کتاب الضعفاء" میں داخل کرنے پر ان پر انکار کرتے ہیں۔ ابن حزم نے اس کو غریب کہا ہے اور کہتے ہیں کہ عبیداللہ مجہول ہے۔ دیکھیں: المحلی: 273/9.

❷ مسند احمد: 131/4- سنن ابی داؤد: 2899- السنن الکبریٰ للنسائی: 6354- سنن ابن ماجه: 2634- صحیح ابن حبان: 6035- المستدرك للحاکم: 382/4- ابوزرعہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے جیسا کہ ابن حاتم کی "العلل" (50/2) میں ہے۔ امام بیہقی نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ وہ اس حدیث کو باطل کہا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس باب میں کوئی قوی حدیث نہیں۔

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَالْأَرْبَعَةُ سِوَى التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ أَبُو زُرْعَةَ الرَّازِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ترمذی کے اور ابو زرعہ رازی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے جبکہ حاکم اور ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

945۔ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلٍ قَالَ: كَتَبَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ إِلَى أَبِي عُبَيْدَةَ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مَوْلَى مَنْ لَا مَوْلَى لَهُ، وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ)).

حضرت ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ اور اس کا رسول اس کے مولی ہیں جس کا کوئی مولی نہ ہو اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ سِوَى أَبِي دَاوُدَ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ابو داؤد کے اور امام ترمذی نے اس روایت کو حسن اور امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔

ماموں کی میراث

شرح :...... یہ دونوں احادیث ماموں کی میراث کے بارے ہیں، حدیث میں ''خال'' کا لفظ آتا ہے۔ اس کا اطلاق ان رشتوں پر ہوتا ہے۔

- ...... ماں کا بھائی
- ...... جدہ کا بھائی
- ...... جدہ کی ماں کا بھائی اور
- ...... جدہ کی جدہ کا بھائی چاہے اوپر تک چلے جائیں۔ پس جو شخص کسی کا ماموں ہوگا وہ اس کی قیامت تک کی اولاد کا بھی ماموں ہوگا۔

الْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ: یعنی جس کے ترکہ کا فرض حصہ یا تعصیب کے حصہ کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا وارث اس کا ماموں ہوتا ہے۔ کیونکہ وارث تین قسم کے ہیں:

(1) ذوالفرض (2) ذوالتعصیب اور

(3) ذورحم

ہم یہ جان چکے ہیں کہ ذوالفرائض دس ہیں اور ذوالعصبہ پانچ جہات سے ہیں اور وہ بنوت، ابوت، اخوت، عمومت اور ولاء ہے اور باقی کے سب رشتہ دار ذورحم کہلائیں گے۔ رحم یہ قرابت داری کو کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (الانفال: 75)

---

[1] مسند احمد: 28/1۔ جامع الترمذی: 2103۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 6351۔ سنن ابن ماجہ: 2737۔ مسند البزار: 253۔ امام بزار فرماتے ہیں: اس باب میں نبی کریم ﷺ سے مروی یہ سب سے عمدہ اسناد والی روایت ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے (الموارد: 1227 میں) اور ضیاء مقدسی نے (المختارۃ: 167/1 میں) اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

''اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

پس ہر وہ قریبی رشتہ دار جو نہ تو ذوالفریضہ ہو اور نہ عصبہ ہی ہو، وہ ذوی الارحام میں سے ہوگا۔ اس تفصیل کی روشنی میں ''خال'' (یعنی ماموں) کا فرض حصہ نہیں اور نہ وہ عصبہ ہی ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی میت کا سوائے ماموں کے اور کوئی وارث نہ ہو تو مذکورہ دونوں احادیث کی رو سے میت کے کل ترکہ کا وارث یہی ''خال'' (یعنی ماموں) بنے گا۔

اگرچہ علماء کا ذوی الارحام کے وارث بننے میں اختلاف ہے لیکن جو علماء اس کے قائل ہیں کہ ذوی الارحام بھی بعض صورتوں میں وارث بن سکتے ہیں اور یہی قول صحیح بھی ہے، ان کی دلیل یہی دونوں کا احادیث ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ میت کے ورثاء میں نہ تو فرض والا موجود ہو اور نہ عصبہ، تب ماموں وارث بن سکتا ہے۔

اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ مَوْلَى مَنْ لَا مَوْلَى لَهُ: یہاں مولی سے مراد مولی عتاقہ بھی ہوسکتا ہے اور مولی قرابت بھی۔ پس مراد وارث ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث اللہ اور اس کا رسول ہوتے ہیں۔ اب رب تعالیٰ تو ہر شے سے غنی ہے لہٰذا رب تعالیٰ کا نام برکت کے طور پر ہے۔ رہے نبی کریم ﷺ تو آپ ﷺ اپنی حیات میں تو دوسرے انسانوں کی طرح احتیاج رکھتے تھے لیکن وفات پا جانے کے بعد آپ ﷺ کا حصہ رب تعالیٰ کے حصہ کی طرح ہے۔ یعنی آپ ﷺ کے حصہ کو بیت المال کے حوالہ کیا جائے گا۔ یعنی اس کو مصالح عباد میں صرف کیا جائے گا۔ تب پھر مطلب یہ بنے گا کہ جو آدمی اس حال میں مر جائے کہ اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا مال بیت المال میں جمع کرا دیا جائے گا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس کا کوئی وارث ہو اس کے مال میں سے بیت المال کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور اس کا مال گزشتہ مذکورہ ترتیب کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔ یعنی پہلے ذوالفرائض میں، پھر عصبہ میں اور اگر دونوں نہ ہوں تو ذوالارحام میں۔

حمل کی میراث کا حکم

946- وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا اسْتَهَلَّ الْمَوْلُودُ وَرِثَ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب پیدا ہونے والا بچہ رو پڑا تو وہ وارث بھی بنے گا۔'' [1]

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**اِسْتَهَلَّ:** یہ ''اِہلال'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب ماں بچہ جنم دے اور وہ پیدا ہونے کے بعد روئے بھی تو وہ اس کے زندہ پیدا ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا وہ وارث بھی بنے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حمل بھی وارث بنتا ہے۔ جیسے کوئی اس حال میں مر گیا کہ اس کی بیوی حمل سے تھی تو اگر اس نے بعد میں زندہ بچہ جنم دیا تو وہ اپنے مرحوم باپ کا وارث بنے گا۔ البتہ یہ مسئلہ دو شروط کے ساتھ مشروط ہے:

---

[1] سنن ابی داؤد: 2920۔ سنن ابن ماجہ: 2750۔ امام بیہقی (257/6) اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف مائل ہیں۔ جبکہ امام ترمذی (1032) اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موقوف بھی ہے اور مرفوع بھی اور گویا کہ موقوف روایت اصح ہے۔

(1) ایک یہ کہ میت کے مرنے کے وقت اس کی بیوہ کا حاملہ ہونا متیقن ہو۔

(2) دوسری یہ کہ وہ بچہ پیدا ہونے کے بعد رد ئے بھی تا کہ یہ بات بھی متیقن ہو جائے کہ وہ زندہ پیدا ہوا تھا۔

◈ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو بچہ پیدا ہو کر روئے وہ وارث بنتا ہے۔

◈ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو بچہ باپ کی وفات کے وقت چار ماہ کا جنین بھی نہ تھا وہ بھی پیدا ہونے کے بعد وارث بنے گا۔

◈ معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ بشری زندگی کے جملہ معاملات کے احکام پر مشتمل ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ اس بات کا یقین کیونکر حاصل ہو گا کہ میت کے مرنے کے وقت عورت کو حمل ٹھہر چکا تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورت خاوند کی وفات کے بعد اگر حمل کی کم از کم مدت کے اندر اندر بھی بچہ جنم دیتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بچہ اس خاوند سے تھا۔ کیونکہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔

قاتل کی میراث کا حکم

947- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَيْسَ لِلْقَاتِلِ مِنَ الْمِيْرَاثِ شَيْءٌ)).

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَقَوَّاهُ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ، وَأَعَلَّهُ النَّسَائِيُّ، وَالصَّوَابُ وَقْفُهُ عَلَى عَمْرٍو.

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "قاتل کو میراث میں سے کچھ بھی نہ ملے گا۔"[1]

اس حدیث کو امام نسائی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام نسائی اس روایت کو معلول کہتے ہیں۔ پر درست یہ ہے کہ یہ روایت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔

روایۃ الحدیث: ......امام موصوف نے اس روایت کو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے کہ اس روایت کا ان پر موقوف ہونا اصح ہے۔ تب پھر چونکہ یہ قولِ رسول نہیں اس لیے حجت بھی نہیں۔

قاتل کی میراث کے مسائل

اگر تو یہ حدیث صحیح ہے تو اس بات کو مقتضی ہے کہ قاتل میراث سے محروم رہے گا چاہے وہ میت کا جتنا بھی قریبی رہا ہو۔ چنانچہ اگر کسی بیٹے نے باپ کو قتل کر ڈالا تو اسے باپ کے ترکہ سے کچھ نہ ملے گا۔ حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہاں قتل سے مراد قتل عمد ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے دوسرے کو قصاص میں قتل کیا جو قتل حق ہے تو وہ میراث سے محروم نہ ہو گا۔ اس لیے بظاہر حدیث سے برحق قتل کرنے والا مراد نہیں کیونکہ وہ جنایت کرنے والا شمار نہیں ہوتا۔

اس بنا پر اس بات کی تفصیل بیان کرنا لازم ہے کہ یہاں قاتل سے کون سا قتل مراد ہے۔ پس قتل کی تین اقسام ہیں:

---

[1] السنن الکبریٰ للنسائی: 6367- سنن الدار قطنی: 94/4- التمھید لابن عبدالبر: 443/23- ابن قطان نے اس بنا پر اس حدیث کو ضعیف کہا ہے کیونکہ یہ اسماعیل بن عیاش کی شامیوں سے روایت ہے جو ضعیف ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: جب ابن عیاش شامیوں سے روایت کرتے ہیں تو وہ روایت غلطی سے خالی نہیں ہوتی، چنانچہ یا تو وہ مرسل کو موصول اور یا موصول کو مرسل بنا دیتے ہیں۔ یہی حال موقوف اور مرفوع کی تعیین میں ہوتا ہے۔ البتہ ان کی شامیوں سے روایت کو کوئی ثقہ ان سے روایت کرتا ہے تو وہ مستقیم ہوتی ہے۔ الکامل: 297/1.

(1) قتلِ برحق جیسے قصاص یا رجم میں کسی دوسرے کو قتل کرنا۔ یہ قتل میراث سے بالکل بھی محروم نہیں کرتا۔

(2) قتلِ عمد: یہ قتل میراث سے بالکل محروم کر دیتا ہے۔ جیسے تین بھائی ہوں اور منجھلا بڑے کو مار ڈالے تو یہ منجھلا وارث نہ بنے گا۔ لیکن اگر چھوٹا اس منجھلے کو قصاص میں مار ڈالے تو یہ قتلِ برحق ہے لہٰذا یہ وارث بنے گا۔

(3) قتلِ خطا: جیسے ماں نے سوتے میں کروٹ بدلی اور بچہ نیچے دب کر مر گیا۔ اس قاتل کے وارث ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حنابلہ کا مشہور مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ سد ذرائع کے طور پر قاتلِ خطا کو بھی میراث سے محروم رکھا جائے گا۔ لیکن صحیح اور راجح قول اس کے برخلاف ہے کہ قاتلِ خطا وارث بنے گا۔ اس کی دلیل وہ عام دلائل ہیں جو میراث کو ثابت کرتے ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے اور اسی قول کو امام ابن قیم نے "اعلام الموقعین" میں بھی اختیار کیا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل موانع ارث میں سے دوسرا مانع بیان کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ قاتل عمد میراث کا مستحق نہیں ہوتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قاتلِ عمد کسی شے کا بھی وارث نہیں بنتا خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، اس کی دلیل مذکورہ حدیث کا عموم ہے۔
- شریعت اسلامیہ نے سد ذرائع کو بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جو شے کسی حرام کا ذریعہ بن رہی ہو یا بن سکتی ہو شریعت اسلامیہ اس کو بھی حرام قرار دیتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے قاتل کو میراث سے محروم رکھا ہے تاکہ کوئی میراث کے حصول کے لیے کسی کو قتل نہ کرے۔

عصبہ کب حصہ پائیں گے

948۔ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((مَا أَحْرَزَ الْوَالِدُ أَوِ الْوَلَدُ فَهُوَ لِعَصَبَتِهِ مَنْ كَانَ)). رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِيْنِيِّ وَابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''باپ یا بیٹا جو اکٹھا کرتا ہے (یعنی کماتا ہے) وہ اس کے عصبہ کے لیے ہے۔'' [1] اس حدیث کو امام ابو داود، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے جبکہ ابن المدینی اور ابن عبدالبر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... أَحْرَزَ: یہ "کَسَبَ" اور "اَخَذَ" کے معنی میں ہے۔ یعنی والد جو کما کر اکٹھا اور جمع کرتا ہے وہ اس کے عصبہ کے لیے ہے۔ اس طرح بیٹا جو کچھ کماتا ہے، وہ بھی اس کے عصبہ کے لیے ہے۔ لیکن ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ میراث کے حصے ان کے حق داروں تک پہنچائے جائیں۔ تب پھر وہ گزشتہ مذکورہ حدیث اس حدیث کی مخصص ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ باپ یا بیٹے کی کمائی یعنی اس کا ترکہ اس کے عصبہ کے لیے تب ہوگا جبکہ اس کے ورثاء میں اصحاب فرائض نہ ہوں۔ لہٰذا اگر اس کے ورثاء میں اصحابِ فرائض ہوں گے تو وہ عصبہ پر مقدم ہوں گے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 2917۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 6348۔ سنن ابن ماجہ: 2732۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: میں نے علی بن المدینی کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہمارے نزدیک عمرو بن شعیب ثقہ ہے اور اس کی کتاب صحیح ہے۔ التمہید: 61/3.

فائدہ:...... یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ باپ اور بیٹے کے درمیان وراثت جاری ہوگی۔ ہاں اگر موانع ارث میں سے کوئی سبب پایا جائے گا تو یہ وراثت جاری نہ ہوگی۔ جیسے اگر کسی کا باپ غلام تھا اور وہ مرگیا تو باپ کے غلام ہونے کی وجہ سے وہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ کا وارث نہ بنے گا۔ کیونکہ اگر ہم اس غلام باپ کو وارث بناتے بھی ہیں، تب بھی وہ سارا مال اس کا آقا لے اڑے گا۔ لہٰذا غلام اپنے مورث کا وارث نہ بنے گا چاہے وہ باپ ہو یا بیٹا۔ اور دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے ورثاء میں اصحاب الفرائض نہ ہوں تو اس کے ترکہ کے حق دار اس کے عصبہ ہوں گے چاہے دور کے ہوں یا قریب کے۔

ولاء کا حکم

949۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْوَلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوْهَبُ)).
رَوَاهُ الْحَاكِمُ مِنْ طَرِيْقِ الشَّافِعِيِّ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ الْبَيْهَقِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ولاء بھی نسبی رشتہ کی طرح ایک رشتہ ہے جو نہ تو بیچا جاتا ہے اور نہ کسی کو ہبہ ہی کیا جاتا ہے۔''[1]
اس حدیث کو امام حاکم نے ''عن الشافعی عن محمد بن الحسن عن ابی یوسف'' کے طریق سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام بیہقی نے اس حدیث کو معلول کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **اَلْوَلَاءُ**: یہ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

لُحْمَةٌ: یہ مبتداء کی خبر ہے۔ ولاء: یہ آزاد کرنے والے کو آزادی دینے پر غلام پر اس کی ثابت ہونے والی ولایت کو کہتے ہیں۔ لہٰذا جب ایک آدمی کسی غلام کو آزاد کرتا ہے اس کی ایک ولایت اس غلام پر ثابت ہو جاتی ہے۔ چاہے یہ آزاد کرنا کسی بھی نوعیت کا ہو۔ چنانچہ چاہے اسے تقرب کے طور پر آزاد کرے، چاہے کفارہ میں آزاد کرے اور چاہے اسے زکوٰۃ کی مد میں آزاد کرے۔ غرض جب بھی کوئی کسی غلام کو آزاد کرے گا اسے اس غلام پر ایک قسم کی ولایت حاصل ہو جائے گی۔

اور اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ)) ''ولاء اسی کی ہے جو آزاد کرے۔''

لُحْمَةٌ: یہ التحام سے ماخوذ ہے جس کا معنی اتحاد ہے۔ مراد رشتہ داری ہے۔

كَلُحْمَةِ النَّسَبِ: یعنی ولاء بھی نسبی رشتہ کی طرح کا ایک رشتہ ہے۔ جبکہ نسب ایک ایسا شرعی حق ہے جو نہ تو بیچا جا سکتا ہے، نہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے اور نہ اس کو ہبہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کسی دوسرے کو یہ کہے کہ ''میں نے اپنا آپ تم کو بخشا تاکہ میں تم لوگوں میں شمار ہونے لگوں'' تو اس شخص کا موہوب لہ کے نسب سے نسب ثابت نہ ہوگا۔ اسی طرح اپنا نسب کسی کو بیچا بھی نہیں جا سکتا۔

---

[1] مسند الشافعی: 338/1۔ المستدرك للحاكم من طریق الشافعی: 379/4۔ صحیح ابن حبان: 4950۔ سنن البیهقی: 292/10۔ امام بیہقی نے اس طریق کو ضعیف کہا ہے۔ جبکہ محفوظ طریق وہ ہے جس کو عبدالرزاق (5/9) نے ''عن الثوری، عن داؤد بن ابی هند، عن سعید بن المسیّب'' کے طریق سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے طریق سے بھی مروی ہے جس کے جملہ رجال ثقہ ہیں۔ امام طبرانی نے ''تهذیب الآثار'' میں اس کو روایت کیا ہے۔ جیسا کہ: ''خلاصة البدر المنیر'' (456/2) میں ہے۔ دیکھیں: فتح الباری: 44/12.

غرض اسی طرح ولاء بھی ایک ایسا شرعی حق ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں اور نہ تو اس میں بیع اور ہبہ درست ہے اور نہ میراث کا جاری ہونا۔ کیونکہ اگر بیع اور ہبہ کے ذریعے اس کی ملک کا انتقال درست ہوتا تو ارث کے ذریعے بھی اس کی ملک کا انتقال درست ہوتا۔ چنانچہ اگر کسی نے دوسرے سے اس کے غلام کی ولاء بیچنے کو کہا یا ہبہ کرنے کو کہا تو یہ درست نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی ایک گھر چھوڑ مرا اور اس نے ایک غلام کو بھی آزاد کر رکھا تھا جس کی ولاء اس کی زندگی میں اس کی تھی، اور اس کے پس ماندگان میں دو بیٹے تھے۔ تو اب اس آدمی کا ترکہ یوں تقسیم ہوگا کہ وہ گھر تو دونوں بیٹوں میں نصفا نصف تقسیم ہوگا جبکہ اس غلام کی ولاء ان کو ورثہ میں ملے گی۔ یہ ہے مطلب ولاء میں میراث کے جاری نہ ہونے کا۔ غرض ولاء نسبی رشتہ کی طرح ایک رشتہ ہے جو بیع یا ہبہ یا ارث کی وجہ سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔

علم الفرائض کا سب سے بڑا عالم

950۔ وَعَنْ أَبِي قِلَابَةَ عَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَفْرَضُكُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ)).

ابو قلابہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں علم الفرائض کا سب سے زیادہ جاننے والا زید بن ثابت ہے۔''[1]

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ سِوَى أَبِيْ دَاوُد، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَالْحَاكِمُ، وَأُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ابو داؤد کے اور امام ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ اس حدیث میں ''ارسال'' کی علت بیان کی گئی ہے۔

روایۃ الحدیث:...... مذکورہ حدیث امام موصوف رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق مرسل ہے جو حدیث میں قدح کا ایک سبب ہے۔ کیونکہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ شاذ اور معلل نہ ہو۔ تب پھر یہ حدیث ضعیف ہوگی۔

درایۃ الحدیث:...... اور اگر ہم اس حدیث کو صحیح مان بھی لیں تو یہ چند مخصوص لوگوں کو خطاب ہے نہ کہ ساری امت کو اور قیامت تک کی امت کو خطاب ہے۔ کیونکہ مذکورہ روایت میں "اعلم امتی بالفرائض" وغیرہ جیسے الفاظ نہیں بلکہ "افرضکم" کے الفاظ ہیں جو ایک خاص قوم کو خطاب ہے۔ پس یہ حدیث اس بات کو مقتضی نہیں کہ جناب زید رضی اللہ عنہ علم فرائض کے اس امت کے سب سے بڑے عالم ہوں۔ دوسرے اگر انہیں ''اَعْلَم'' مان بھی لیا جائے تب بھی ان کے معصوم عن الخطاء ہونے کا اس حدیث سے اثبات نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ''فلاں فلاں سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔'' تو یہ اس کے معصوم ہونے کی دلیل نہیں۔

غرض ایک تو یہ حدیث ضعیف ہے، دوسرے بفرضِ صحت، اس میں چند مخصوص لوگوں کو خطاب ہے اور تیسرے یہ کہ بالفرض اگر اس خطاب میں عموم بھی ہو تب بھی یہ حدیث حضرت زید رضی اللہ عنہ کے معصوم عن الخطاء ہونے کی دلیل نہیں۔

---

[1] جامع الترمذی: 3791۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 8242۔ سنن ابن ماجه: 154۔ مسند احمد: 281/3۔ صحیح ابن حبان: 7131۔ المستدرك للحاکم: 372/4۔ علامہ ذہبی "سیر اعلام النبلاء" (474/4) میں کہتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے اور خود امام موصوف رحمہ اللہ نے بھی "فتح الباری" (20/12) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور فرماتے ہیں: اس حدیث کے متعدد متابع اور شواہد ہیں جن کو میں نے "احادیث الرافعی" کی تخریج میں ذکر کیا ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 79/3.

20۔ بَابُ الْوَصَایَا ..... وصایا کا بیان

امام موصوف رحمہ اللہ نے وصایا کو فرائض کے بعد ذکر کیا ہے جبکہ فقہائے حنابلہ وصایا کو فرائض سے قبل رکھتے ہیں اور فقہائے حنابلہ کی ترتیب درستی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ:

(1) ایک تو وصیت موت سے قبل ہوتی ہے جبکہ فرائض کی تقسیم موت کے بعد ہوتی ہے۔

(2) دوسرے وصیت کو میراث پر مقدم رکھا جاتا ہے۔

وصایا کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ

وصایا یہ وصیت کی جمع ہے۔ یہ اس بات کو کہتے ہیں جس کی تاکید اور اہتمام کے ساتھ تکمیل کی جاتی ہے اور اسے پورا کیا جاتا ہے۔ اسی معنیٰ میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (النسآء: 131)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔''

جبکہ وصیت کا اصطلاحی معنیٰ یہ ہے کہ یہ موت کے بعد مال کو بطور تبرع کے اللہ کی راہ میں دینے کو کہتے ہیں۔ یا وصیت یہ مرنے کے بعد مال میں تصرف کرنے کو کہتے ہیں۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ ''میرے مرنے کے بعد میرے مال کے ایک ثلث کو نیکی کے کاموں میں لگا دینا'' جبکہ وصیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ''میرے مرنے کے بعد میری کم سن اولاد کے امور کا نگران ونگہبان فلاں ہوگا۔''

وصیت کا حکم

علماء کا کہنا ہے کہ وصیت میں پانچ حکم جاری ہوتے ہیں واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام۔ جن کے دلائل کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کا تعارف درج کیا جاتا ہے۔

(1) **واجب وصیت:**..... جیسے واجب دَین کی وصیت چاہے یہ دَین اللہ کا ہو جیسے زکوٰۃ اور نذر وغیرہ اور چاہے وہ واجب بندوں کا ہو، جیسے مبیع کی قیمت، مکان کی اجرت اور قرض وغیرہ۔ کیونکہ اگر مرنے والا ان باتوں کی وصیت کیے بنا مر جائے تو حق والوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

(2) **مندوب وصیت:**..... یہ وہ وصیت ہے جس کی تنفیذ ورثاء کے لیے سہل ہے اور یہ اس واجب دَین کی وصیت ہے جس پر بینہ قائم ہو۔ کیونکہ موصی اگر اس کی وصیت نہ بھی کرے تب بھی اس کی تنفیذ شہود کے ذریعے ممکن ہے لہٰذا ایسے دَین کی وصیت مستحب ومندوب ہوگی۔

(3) **حرام وصیت:**..... یہ وارث کے لیے یا ایک ثلث سے زائد کی وصیت کرنا ہے۔

(4) **مکروہ وصیت:**..... یہ ایسے شخص کا وصیت کرنا ہے جس کے ترکہ میں مال بھی کم ہو اور اس کے ورثاء تنگدست بھی ہوں کہ اس صورت میں وصیت کرنا مکروہ ہے۔

(5) **مباح وصیت:**..... یہ ثلث تک کی وصیت کرنا ہے جبکہ اس کے ورثاء تنگدست نہ ہوں یا اس کا مال یعنی ترکہ زیادہ ہو، یا یہ کہ کسی کا کوئی وارث ہو ہی نہ اور وہ کل مال کی وصیت کر دے کہ یہ وصیت مباح ہے۔

وصیت لکھوانے کا حکم

951- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُرِيْدُ أَنْ يُوْصِيَ فِيْهِ يَبِيْتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوْبَةٌ عِنْدَهُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک مسلمان آدمی کو یہ حق نہیں کہ اس کے پاس ایک ایسی شے ہو جس میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو کہ وہ دو راتیں بھی (اس شے میں وصیت کیے بنا) گزار دے مگر یہ اس کی (اس شے کے بارے میں) وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی (موجود) ہو۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......مَا: یہ "مَا وَلَا الْمُشَبَّهَتَيْنِ بِلَيْسَ" میں سے ہے اور یہ "ما" نافیہ ہے جو مبتدا اور خبر میں "لیس" والا عمل کرتا ہے۔

حَقُّ: یہ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور "امْرِءٍ" یہ مضاف الیہ ہے جس کی صفت "مُسْلِمٍ" ہے اور یہ اس کی صفت اولیٰ ہے، اور "لَهُ شَيْءٌ" یہ جملہ خبریہ ہوکر "امْرِءٍ" کی صفت ثانیہ ہے۔

يُرِيدُ أَنْ يُوصِيَ فِيهِ: یہ جملہ "شَيْءٌ" کی صفت ہے۔

يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ: یہ "امْرِءٍ" کی صفت بھی ہوسکتا ہے اور ''حق'' مبتداء کی خبر بھی ہوسکتا ہے۔ تب پھر تقدیری عبارت یوں ہوگی "مَا حَقُّهُ أَنْ يَبِيتَ لَيْلَتَيْنِ"۔

إِلَّا: یہ کلمہ حصر ہے۔

وَوَصِيَّتُهُ: مذکورہ واو حالیہ ہے۔ "وَصِيَّتُهُ" یہ مبتداء ہے اور

مَكْتُوبَةٌ: یہ خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

لَيْلَتَيْنِ: یہ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ایک مسلمان آدمی کو یہ مناسب نہیں کہ اگر اس کے پاس وصیت کر جانے کے لائق کوئی شے ہو تو وہ دو راتیں بھی ایسی گزارے کہ جن میں اس نے اس شے کے بارے میں وصیت نہ کی ہو۔

اور "مُسْلِمٍ" کی قید اغلب اور اکثر کے اعتبار سے ہے۔ وگرنہ یہ حکم عورت کے لیے بھی ہے۔

شَيْءٌ: یہ نکرہ ہے اور عموم پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا یہ مال، تصرف اور منافع وغیرہ سب کو شامل ہے۔

اور "لَيْـلَتَيْـنِ" سے مراد دو راتیں ہی نہیں بلکہ مراد قلیل سے قلیل زمانہ ہے۔ البتہ اس میں زمانہ کی تحدید بھی ہے کہ شریعت اسے دو دن کی مہلت دے رہی ہے تاکہ وہ اس دوران غور وفکر کر لے البتہ اس سے زیادہ تاخیر نہ کرے وگرنہ وہ کوتاہ اندیش شمار ہوگا۔

اور "مَكْتُوبَةٌ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چاہے وہ خود لکھے یا کسی دوسرے سے لکھوائے، دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے اور کتابت سے یہاں کتابت معروفہ مراد ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2738- صحيح مسلم: 1627.

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کو ہر وقت موت کی تیاری کر رکھنی چاہیے اور قابل وصیت امور کی وصیت کر لینی چاہیے کہ مبادا اچانک موت آ لے اور آدمی ضروری باتوں کی وصیت بھی نہ کر پائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت اسلامیہ ہر بندے کو حزم واحتیاط کی وصیت کرتی ہے اور یہ کہ آدمی کرنے والے کاموں میں تاخیر سے کام نہ لے۔
- معلوم ہوا کہ وصیت کرنا واجب نہیں۔ اس کی دلیل "یُرِیْدُ اَنْ یُّوْصِیَ فِیْهِ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ جو بات ارادہ کے ساتھ معلق ہو، وہ واجب نہیں ہوا کرتی۔
- پھر بسا اوقات کسی واجب کی تعمیل کو ارادہ کے ساتھ معلق کر دیا جاتا ہے جیسے نماز جو کہ واجب ہے، کے بارے میں یہ کہا جائے کہ "جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو" کہ یہاں وجوب نماز کو ارادہ کے ساتھ معلق نہیں کیا گیا بلکہ فعل صلوٰۃ کو ارادہ کے ساتھ معلق کیا گیا ہے۔
- وصیت کسی بھی شے کے بارے میں ہو سکتی ہے، وہ مال بھی ہو سکتا ہے اور منافع اور تصرف بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی دلیل "شَیْءٌ" کا لفظ ہے جو نکرہ ہے اور اس میں عموم ہے۔
- وصیت میں اس بات کا اختیار ہے کہ اس کو دو دن سے زیادہ موخر نہ کیا جائے۔
- تحریر پر عمل جائز ہے اور تحریر ثبوت اور بینہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی دلیل "وَوَصِیَّتُهٗ مَکْتُوْبَةٌ عِنْدَهٗ" کے الفاظ ہیں۔
- کتابت حفظ میں سماع سے زیادہ ابلغ ہے۔
- آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی دستاویزات، کاغذات اور ضروری خطوط کو سنبھال کر رکھا کرے۔
- اس حدیث میں جبریہ کے مشہور گمراہ عقیدہ کا رد بھی ہے کہ انسان کے لیے مشیت ثابت نہیں اور انسان مجبور محض ہے اور اس عقیدہ کے رد کی دلیل "یُرِیْدُ أَنْ یُوْصِیَ فِیْهِ" کے الفاظ ہیں کہ ان میں انسان کے لیے مشیت وارادہ کا اثبات ہے۔
- ایک مسلمان کو از حد محتاط، ہوشیار، دانا، فہیم، معاملہ شناس، زیرک اور دور رس نگاہ کا مالک ہونا چاہیے۔ اس کی دلیل یہ الفاظ ہیں: "مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ"۔

وصیت کرنے کے قواعد وضوابط

952۔ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِیْ وَقَّاصٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَا ذُوْ مَالٍ، وَلَا یَرِثُنِیْ إِلَّا ابْنَةٌ لِیْ وَاحِدَةٌ، أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَیْ مَالِیْ؟ قَالَ: لَا قُلْتُ: أَفَأَتَصَدَّقُ بِشَطْرِهِ؟ قَالَ: لَا قُلْتُ: أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهِ؟ قَالَ: ((اَلثُّلُثُ، وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ، إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ)).

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں مال دار آدمی ہوں اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے۔ تو کیا میں اپنے مال کا دو ثلث صدقہ کر دوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں"۔ میں نے عرض کیا: تو کیا میں اپنے مال کا نصف صدقہ کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں"۔ میں نے عرض کیا: تو کیا میں اپنے مال کا ایک ثلث صدقہ کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''(ہاں) ایک ثلث (صدقہ کر دو) اور ایک ثلث بھی بہت ہے (اور یاد رکھو کہ) تمہارا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جانا یہ انہیں (ایسا) تنگدست چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

معرفة الصحابة :......حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ، یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کے بے شمار عظیم اور جلیل القدر جہادی قصے، معرکے اور کارنامے ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بیمار ہو گئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لے گئے تو وہ رو رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت فرمایا: تو عرض کرنے لگے کہ اپنے دوستوں کے چلے جانے سے میں مکہ میں ہی رہ جاؤں گا۔ دراصل یہ حضرات اسی سرزمین میں مر جانے کو سخت ناپسند کرتے تھے جہاں سے یہ لوگ ہجرت کر گئے ہوئے تھے اور جنابِ سعد رضی اللہ عنہ حضرات مہاجرین میں سے تھے۔ جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم ہرگز پیچھے نہ رہو گے۔'' یعنی تمہیں مکہ میں موت نہ آئے گی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بشارت سنائی تھی اور آگے فرمایا: ''شاید تم زندہ رہو گے یہاں تک کہ کئی لوگ تم سے نفع پائیں گے اور چند دوسرے لوگ تیری وجہ سے نقصان اٹھائیں گے۔''

گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں لمبی عمر پانے کی بشارت سنائی تھی۔ اس گفتگو کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور جنابِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وہ مکالمہ ہوا جو اوپر مذکور ہے۔

غریب الحدیث :......أَنَا ذُو مَالٍ: لفظ "مَالٍ" یہاں نکرہ ہے اور اس پر آنے والی تنوین تکثیر پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی میں بے حد مال دار آدمی ہوں۔

لَا يَرِثُنِي إِلَّا ابْنَةٌ لِي وَاحِدَةٌ: یعنی میری اولاد اور ذریت میں سے سوائے میری ایک بیٹی کے اور کوئی میرا وارث نہیں ہے۔ نہ کہ یہ مراد ہے کہ عصبہ میں سے سوائے میری ایک بیٹی کے کوئی وارث نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بنی عم میں سے متعدد عصبہ رشتہ دار تھے۔

پھر یاد رہے کہ جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا یہ قول خاص اس موقع پر تھا۔ پر اللہ کی شان کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب اس دارِ فانی کو الوداع کہا تو اپنے پس ماندگان میں سے سترہ بیٹے اور بارہ بیٹیاں چھوڑیں۔

أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَيْ مَالِي؟: حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس وقت تھا جب وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں اپنے پیچھے صرف ایک بیٹی چھوڑ مروں گا۔ مذکورہ ہمزہ استفہام کے لیے ہے۔ جبکہ "فا" عاطفہ ہے۔ اب اس "فا" کو ہمزہ سے قبل ہونا چاہیے یا نہیں؟ تو علماء نحو کے اس بارے میں دو قول ہیں۔

(1) ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ "فا" اپنے محل میں ہے اور مذکورہ ہمزہ ایک مقدر عبارت پر داخل ہے اور اس "فا" کا اس مقدر عبارت پر عطف ہے اور مقدر عبارت سیاقِ کلام کے مطابق ہوگی۔ جیسے مثلاً: "أَأَتَبَرَّعُ بِشَيْءٍ مِنْ مَالِي فَأَتَصَدَّقُ

[1] صحيح البخاري: 2742۔ صحيح مسلم: 1628.

بِثُلُثَيْ مَالِيْ" (کیا میں اپنے مال میں سے کچھ صدقہ کردوں اور میں اپنے مال کا دوثلث صدقہ کردوں)۔

(2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ "فـا" اپنے محل میں نہیں اور یہ ہمزہ سے پہلے تھی لیکن ہمزہ کو اس لیے اس پر مقدم کیا گیا کیونکہ ہمزہ استفہام صدارتِ کلام کو مقتضی ہوتا ہے۔

صدقہ وہ بلاعوض تبرع ہوتا ہے جس میں رب تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہوتی ہے۔ کلام کا ظاہر یہ بتلاتا ہے کہ جناب سعد رضی اللہ عنہ اسی وقت یہ صدقہ کردینا چاہتے تھے۔ جبکہ بعض روایات میں یہ الفاظ آتے ہیں: "أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَيْ مَالِي؟" تب پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دوتہائی مال کی وصیت کرنے کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا نہ کہ صدقہ کرنے کے بارے میں۔

رہا صدقہ اور وصیت میں فرق، تو وہ واضح ہے کہ صدقہ کا نفاذ زندگی میں ہی ہوتا ہے جبکہ وصیت کا نفاذ مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ تب پھر یہ حدیث وصیت کے باب میں صریح ہے۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا: پھر نصف مال کی وصیت سے بھی منع فرمایا۔ البتہ ایک تہائی مال کی وصیت کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ: اور بعض روایات میں "وَالثُّلُثُ كَبِيْرٌ" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی کل مال کے اعتبار سے ایک ثلث کی وصیت بہت بڑی ہے۔

إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً: یہ دوثلث اور نصف مال کی وصیت کرنے سے منع فرمانے کی علت کا بیان ہے۔ پھر "أَنْ تَذَرَ" میں "أَنْ" کے اعراب میں دو اقوال ہیں:

(1) ایک یہ کہ یہ ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ ہے تب پھر یہ مصدریہ ہوگا اور یہ مابعد فعل کو نصب دے گا۔

(2) جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ہمزہ مکسورہ کے ساتھ ہے تب پھر یہ اِنْ شرطیہ ہوگا اور مابعد فعل کو جزم دے گا۔

پھر "اَنْ" کے مصدریہ ہونے کی صورت میں یہ مبتدا کے محل میں ہوگا اور یہ ماقبل مذکور "کاف" ضمیر منصوب متصل سے بدل الاشتمال ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: "اِنَّ وَزْرَكَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ" یعنی "تیرا اپنے ورثاء کو اغنیاء چھوڑ جانا" انہیں تنگدست چھوڑ جانے سے بہتر ہوگا۔

اور "خَيْرٌ" یہ انَّہ کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔

جبکہ "اِنْ" کے مکسورۃ الہمزہ یعنی شرطیہ ہونے کی صورت میں مابعد مذکور فعل جملہ شرطیہ ہوگا اور "خَيْرٌ" یہ جواب شرط ہوگا۔

البتہ یہاں "خَيْرٌ" مبتداء محذوف "فھو" کی خبر ہوگا اور یہ مبتداء خبر پر مشتمل جملہ خبر یہ جواب شرط ہوگا۔

یاد رہے کہ "أَغْنِيَاءَ" اور "عَالَةً" یہ دونوں الفاظ اپنے محل میں مفعول ثانی ہیں۔

عَالَةً: یہ "عائل" کی جمع ہے جو تنگدست اور محتاج کو کہتے ہیں۔ تب پھر غنی چھوڑ جانے سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے اتنا ترکہ چھوڑ مرے کہ وہ لوگوں کے محتاج نہ رہیں۔

يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ: مراد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرنا ہے۔ کہ اے بھائی! مجھے کچھ دے دو، اے چچا! مجھے کچھ دے دو! وغیرہ وغیرہ۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر دو اہم باتیں مذکور ہیں، جو یہ ہیں:

(1) ایک یہ کہ ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔

(2) دوسری یہ کہ اولاد کو کھاتا پیتا چھوڑ جانا انہیں تنگدست چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ پیچھے لوگوں سے سوال کرتے پھریں، پھر کوئی چاہے تو دے اور کوئی چاہے تو نہ دے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کا حسن اخلاق اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہ کے احوال کی رعایت اور ان کی خبر گیری کہ آپ ﷺ اپنے بیمار اصحاب رضی اللہ عنہم کی اہتمام کے ساتھ عیادت فرمایا کرتے تھے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین میں فقاہت پیدا کرنے کے بے حد حریص تھے۔

◈ ظاہر پر بنا کرنا جائز ہے اور یہ کہ خبر کو جھٹلایا نہ جائے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس خبر کو تسلیم فرمایا کہ میری وارث صرف میری ایک بیٹی ہے۔

◈ سائل کو فتویٰ یا علاج پوچھنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ حقیقت حال کو صحیح صحیح بتلائے۔

◈ حالت مرض میں ایک ثلث تک کے مال کو صدقہ کر دینے میں یا اس کی وصیت کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مریض کا تصرف نافذ ہے چاہے وہ مرض الوفات میں ہی ہو۔

◈ مرض الوفات میں مبتلا مریض کے لیے ایک ثلث سے زیادہ مال صدقہ کرنا حرام ہے۔

◈ جواب میں ''نہیں'' کہنا کسی کے ساتھ بے رخی نہیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو دو مرتبہ جواب میں ''نہیں'' فرمایا۔

◈ مطلوب سے نیچے اترنے میں کوئی حرج نہیں اور اس میں مایوس بھی نہ ہوا جائے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب آدمی کی رغبت زیادہ میں پوری نہ ہو تو کم میں پوری ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ دو ثلث صدقہ کرنا چاہتے تھے لیکن منع کیا جانے پر وہ ایک ثلث صدقہ کرنے پر راضی ہو گئے۔

◈ مرض الوفات میں ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت یا صدقہ نہ کیا جائے۔

◈ نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ایک ثلث کی وصیت پر تیار فرمایا پھر ان کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی کے لیے فرمایا کہ ''ایک ثلث بہت ہوتا ہے۔''

◈ شریعت اسلامیہ بندوں کی مصالح پر مبنی ہے۔

◈ حکم کی علت و حکمت سن کر آدمی بے حد مطمئن ہو جاتا ہے۔

◈ جس بات پر قیاس کیا جاسکتا ہے اس پر کسی دوسرے شے کو قیاس کر سکتے ہیں۔

◈ اگر علت جاتی رہے تو حکم بھی جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ حکم ''علت منصوصہ'' کے تابع ہوتا ہے بخلاف ''علت مستنبطہ'' کے۔ لہٰذا ہم اس حدیث کی رو سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی کا کوئی وارث نہ ہو تو وہ ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت کر سکتا ہے۔

◈ اگر کوئی اپنے ورثاء کے لیے مال چھوڑ جائے تو وہ عنداللہ ماجور ہوگا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ورثاء کو اغنیاء چھوڑ جانا نیکی

کا کام قرار دیا ہے۔

- حکم ظاہر پر لگتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: "تمہارا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جانا" کہ یہ انہیں بظاہر بیمار دیکھ کر فرمایا تھا ورنہ احتمال اس بات کا بھی تھا کہ جناب سعد رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی ان کا کوئی وارث عالم آخرت کو چل بستا۔
- احتمالات عقلیہ احکام شرعیہ کے معارض نہیں ہوتے۔
- کیا مریض کا کسی شخص کے لیے کسی مال کا اقرار کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مریض کا اقرار یہ صدقہ کرنے کی طرح ہے۔ لہٰذا اگر تو وہ مرض الوفات میں ایک ثلث تک کا کسی کے لیے اقرار کرے تو ہم اس اقرار کو قبول کریں گے جبکہ ثلث سے زیادہ کے اقرار کو قبول نہ کریں گے۔ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ثلث سے زیادہ کا اقرار ورثاء کی اجازت سے معتبر اور نافذ ہوگا۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ ثلث سے زائد کا اقرار مطلق مقبول ہے۔ کیونکہ اقرار بہ نسبت ایک سابقہ استحقاق کے ہے جبکہ عطیہ یہ ابھی جاری کرنا ہے۔ اور وہ ثلث سے زیادہ میں جاری نہیں ہوتا۔ جبکہ اقرار یہ عطیہ کے جیسا نہیں بلکہ یہ ایک سابقہ استحقاق کا اقرار کرنا ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں جائیداد کی اتنی رقم ابھی ادا کرنی ہے۔ چاہے وہ سارے مال کو ہی محیط ہو کہ یہ کسی کے سابقہ استحقاق کا اقرار ہے نہ کہ اسے بلا استحقاق کچھ دینا ہے۔

- معلوم ہوا کہ اعمال میں تفاضل ہوتا ہے جس کی دلیل "أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ.........." کے الفاظ ہیں۔
- اگر ورثاء ثلث سے زائد کی وصیت کو نافذ کر دیں تو یہ جائز ہوگا کیونکہ اس میں ان کا حق تھا جس کو انہوں نے اپنی مرضی سے ساقط کر دیا ہے اور آدمی اپنے حق سے دست بردار ہونے کا حق رکھتا ہے۔

جس نے کوئی وصیت نہ کی ہو، اس کی طرف سے صدقہ کرنے کا حکم

953۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَلَمْ تُوصِ، وَأَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، أَفَلَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ: ((نَعَمْ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میری والدہ اچانک وفات پا گئی ہیں اور وہ وصیت بھی نہیں کر سکیں۔ جبکہ میرا گمان ہے کہ اگر وہ (موقع پاتیں اور) بات کرتیں تو صدقہ کرنے کو کہتیں۔ تو آیا اگر میں ان کی طرف سے کوئی صدقہ کروں تو کیا انہیں اس کا اجر ملے گا؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جی ہاں!" [1]

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں

غریب الحدیث:...... أَنَّ رَجُلًا: صحابی رسول کا نام مجہول ہونے سے صحت حدیث پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

اُفْتُلِتَتْ: یعنی انہیں اچانک موت نے آلیا۔ یعنی وہ بیمار بھی نہ تھیں پر اچانک وفات پا گئیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 2760۔ صحيح مسلم: 1004.

وَلَمْ تُوصِ: یعنی وہ کسی کو یہ وصیت نہ کرسکیں کہ میرے مرنے کے بعد میری طرف سے کوئی صدقہ کردینا۔ گویا کہ ان حضرات میں یہ بات معروف تھی کہ وہ مرنے کے بعد کے لیے کوئی وصیت کیا کرتے تھے۔ **أَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ:** یہ بات ان صاحب نے اپنی والدہ کی عادت اور ظاہر حال کو دیکھ کر کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی والدہ کو صدقہ کرنا محبوب ہے۔ پس اگر انہیں فرصت ملتی تو وہ صدقہ کی وصیت ضرور کر جاتیں۔ پھر اچانک موت نے انہیں اس بات کی فرصت بھی نہ دی۔

أَفَلَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟: یہ ہمزہ استفہام کا ہے اور ''فا'' عاطفہ ہے۔ اس کی ترکیب متعدد بار بیان کی جا چکی ہے اور اجر سے مراد عنداللہ ملنے والا اجر ہے۔ یعنی اب اگر میں ان کے کہے بغیر ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا رب تعالیٰ ان کو اس صدقہ کا اجر دے گا؟ جس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''ہاں''۔ یعنی اسے اجر ملے گا۔

إِنْ: یہ حرفِ شرط ہے اس بنا پر یہ جملہ شرطیہ ہوا۔ تب پھر جوابِ شرط کا ہونا لازم ہوا اور وہ کلام میں مذکور نہیں۔ علماء نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی ترکیب میں جواب کی ضرورت نہیں کیونکہ ماقبل کا کلام جوابِ شرط کے ذکر سے مستغنی کر رہا ہے۔ جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ جوابِ شرط مقدر ہوگا اور وہ ماقبل کی جنس سے ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا جواب زیادہ صحیح اور بے غبار ہے۔

نَعَمْ: یہ حرفِ جواب ہے جو ماسبق کے اثبات کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی استفہام کے مابعد کے اثبات کا فائدہ دیتا ہے۔ پس اگر تو استفہام کے بعد نفی مذکور ہو تو اس کا اثبات کرتا ہے اور اگر اس کے بعد اثبات ہو تو یہ حرفِ جواب اثبات کا اثبات کرتا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون مذکور ہے کہ اگر کسی قرینہ سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ مرنے والا صدقہ کرنے کی وصیت کرنا چاہتا تھا مگر اچانک موت نے اسے ایسا کرنے کی مہلت نہ دی تو اس کی طرف سے صدقہ کر سکتے ہیں اور اسے اس کا اجر بھی ملے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احکامِ شرعیہ سیکھنے کے بے حد حریص تھے۔
- سمجھ دار اور ہوشیار آدمی کو چاہیے کہ وہ وصیت کے قابل امور کی وصیت میں جلدی کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ موت اس کی مہلت ہی نہ دے۔ وصیت کرنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں معروف تھا۔
- ظن اور گمان پر عمل جائز ہے۔ البتہ اس کے لیے قرائن کا ہونا ضروری ہے۔ پس اگر قرائن نہ ہوں تو سب سے جھوٹی بات گمان اور ظن ہوتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ ماں اور باپ کو بیٹے کے صدقہ کرنے کا نفع پہنچتا ہے۔
- نبی کریم ﷺ کا جواب میں ''نَعَمْ'' فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جواب سوال کے جواب میں سوال کے اعادہ سے مستغنی کر دیتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ اگر کوئی کسی دوسرے کے لیے کوئی عمل کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ البتہ ہم ایسا کرنے کی ترغیب نہ دیں گے۔ لیکن اگر کسی نے ایسا کر دیا تو اس پر نکیر بھی نہ کریں گے اور اس کو بدعت نہ قرار دیں گے۔ کیونکہ اگر ایسا کرنا بدعت ہوتا تو نبی کریم ﷺ ایسا کرنے کی اجازت مرحمت نہ فرماتے۔ چنانچہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کے

ماں کی طرف سے صدقہ کرنے کو برقرار رکھا لیکن اپنی امت کو ایسا کرنے کا حکم نہ ارشاد فرمایا۔ ❶

◈ "أَظُنُّهَا" علمائے نحو کے ہاں معروف ہے کہ "ظَنَّ يَظُنُّ" کا فعل دو مفعولوں کو نصب دیتا ہے جبکہ یہاں صرف ایک ہی مفعول مذکور ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دوسرا مفعول مقدر ہے۔

◈ "لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ" معروف ہے کہ "لَوْ" شرطیہ کا جواب اگر مثبت کلام ہو تو جواب پر لام کا داخل ہونا ضروری ہے۔ جبکہ یہاں جوابِ شرط لام کے بغیر ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا﴾ (الواقعة: 70) کہ یہاں "لَوْ" کا جواب مثبت ہے پر اس کے باوجود اس پر لام داخل نہیں ہوا۔

◈ میت کے حق میں افضل اس کے لیے دعا کرنا ہے نا کہ اس کے لیے کوئی عمل کرنا ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی ﷺ ان تین اعمال کو گنواتے ہوئے جو مرنے کے بعد بھی جاری رہتے ہیں یہ فرماتے ہیں: یا وہ نیک اولاد جو (والدین کے لیے) دعا کرتی رہے۔ جبکہ حضرات انبیائے کرام بھی والدین کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ والدین کے لیے دعا کرنا زیادہ افضل ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام یہ دعا مانگتے ہیں:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا﴾ (نوح: 28)

''اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اس کو جو مومن بن کر میرے گھر میں داخل ہو۔''

اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام یہ دعا مانگتے ہیں:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ (ابراهيم: 41)

''اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا۔''

وارث کے لیے وصیت کرنے کا حکم

954، 955۔ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: ((إِنَّ اللهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ)).

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''بے شک رب تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق عنایت فرما دیا ہے۔ اس لیے وارث کے لیے کوئی وصیت نہ ہوگی۔'' ❷

---

❶ یہ ایک استثنائی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق ماں باپ کی طرف سے اولاد کے نیک عمل کرنے سے ہے جس کی اصل کتاب وسنت سے ملتی ہے۔ اس لیے دوسرے لوگوں کو فوت شدگان کے لیے نیک اعمال کی اجازت نہیں دی جاسکتی سوائے ان کاموں کے جن کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً حج بدل وغیرہ...... کیونکہ دورِ نبوت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ (ناشر)

❷ مسند احمد: 267/5۔ سنن ابی داؤد: 3565۔ جامع الترمذی: 2120۔ سنن ابن ماجه: 2713۔ المنتقی لابن جارود: 949۔ اس حدیث کی اسناد میں اسماعیل بن عیاش ہے۔ ائمہ کی ایک جماعت نے جن میں امام احمد اور امام بخاری رحمہ اللہ بھی ہیں، اسماعیل کی شامیوں سے روایت کو قوی کہا ہے اور یہ حدیث ان کی شرحبیل بن مسلم سے روایت ہے جو شامی اور ثقہ ہیں اور جامع ترمذی میں ان کی شرحبیل سے تحدیث کی تصریح ہے۔ اس باب میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں جن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی ہیں جن کی حدیث "سنن ابن ماجه" (2714) میں مروی ہے۔ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں: یہ متن متواتر ہے۔ ہم نے اصحاب فتویٰ اور ان لوگوں سے جن سے ہم نے مغازی کو یاد کیا ہے جو قریش میں سے ہیں کہ ان کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن یہ ارشاد فرمایا: ((لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ)) ''وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے''۔ دیکھیں: الرسالة للشافعي: 139.

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ ، وَحَسَّنَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ ، وَقَوَّاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ ، وَابْنُ الْجَارُوْدِ۔ وَرَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما وَزَادَ فِي آخِرِهِ: ((إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ الْوَرَثَةُ)) . وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ .

اس حدیث کو امام احمد اور آئمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے۔ امام احمد اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ جبکہ ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اس حدیث کو قوی کہا ہے اور امام دارقطنی نے یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے بیان کی ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ زائد ہیں: ''سوائے اس کے کہ (باقی کے) ورثاء چاہیں''[1] (تو کسی ایک وارث کے حق میں وصیت جاری ہوسکتی ہے)۔ اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔

غریب الحدیث :...... إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ: یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمی کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں سے حق والے کو اس کا حق اپنی حکمت کے تحت عطا فرما دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ (النسآء: 11)

''تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے ان میں سے کون فائدہ پہنچانے میں تم سے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ حصے ہیں، بے شک اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

غرض رب تعالیٰ نے ماں، باپ، اولاد وغیرہ سب کو اس کا حصہ دے دیا ہے۔

فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ: مذکورہ ''لا'' لائے نفی جنس کا ہے۔ اسی لیے اس کا مابعد مبنی بر فتح ہے۔ لفظ وصیت یہاں نکرہ ہے جو قلیل وکثیر دونوں کو شامل ہے۔

اور وارث سے وہ وارث بھی مراد ہے بالفعل وارث ہے اور وہ بھی جو بالتقدیر وارث ہے۔ اسی طرح وہ وارث بھی مراد ہے جو اصحاب فرائض میں سے ہو اور وہ وارث بھی مراد ہے جو عصبہ میں سے ہو۔

إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ الْوَرَثَةُ: یہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں اور اس بات میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ یہاں وہ وارث مراد ہے جس کی مشیت شرعاً معتبر ہو، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا تبرع معتبر اور صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا نادان، نابالغ اور دیوانے کی مشیت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ نے ہر ایک وارث کا حصہ خود مقرر کر دیا ہے لہٰذا اس کے بعد کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس میں دراصل دوسرے ورثاء کی حق تلفی ہے۔ ہاں اگر دوسرے ورثاء اس وصیت کو قبول کر لیں تو وہ وصیت جاری ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ دینے والی ذات درحقیقت اللہ ہی ہے۔
- وارث کے لیے تھوڑے یا زیادہ مال کی وصیت کر جانا حرام ہے۔ لہٰذا مذکورہ نفی یہ نہی کے معنی میں ہوگی جو تحریم کے لیے ہوتی ہے۔

---

[1] سنن الدار قطنی: 97/4۔ امام بیہقی نے ''السنن'' (263/6) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: نصب الرایۃ: 404/4.

- غیر وارث کے لیے وصیت جائز ہے چاہے وہ قریبی ہی ہو۔اس کی دلیل "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ" کے الفاظ ہیں اور جب کوئی حکم کسی صفت کے ساتھ معلق ہو تو صفت کے انتفاع کے وقت وہ حکم بھی منتفی ہو جاتا ہے۔لہٰذا جو وارث نہ ہوگا، اس کے حق میں وصیت نہ کرنے کا حکم بھی منتفی ہو جائے گا۔تب پھر غیر وارث کے لیے وصیت جائز ہوگی۔
- جب اللہ کے حکم کے آگے جانے کی اجازت نہیں جیسا کہ "لَا وَصِيَّةَ لِـوَارِثٍ" میں آگیا تو اللہ کے احکام کے آگے وضعی قوانین پر عمل کیونکر جائز ہوگا؟!!
- وارث کے لیے وصیت کی نفی دراصل دوسرے ورثاء کے حق کی حفاظت کے لیے ہے۔
- اگر دوسرے ورثاء کسی ایک کے لیے کی جانے والی وصیت کو جائز قرار دے دیں تو وہ وصیت جاری ہو جائے گی۔اس کی دلیل "إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْوَرَثَةُ" کے الفاظ ہیں۔

ایک تہائی مال کی وصیت کا بیان

956، 957۔ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((إِنَّ اللّٰهَ تَصَدَّقَ عَلَيْكُمْ بِثُلُثِ أَمْوَالِكُمْ عِنْدَ وَفَاتِكُمْ زِيَادَةً فِيْ حَسَنَاتِكُمْ)).

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَالْبَزَّارُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي الدَّرْدَاءِ، وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، وَكُلُّهَا ضَعِيفَةٌ، لَكِنْ قَدْ يُقَوِّيْ بَعْضُهَا بِبَعْضٍ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری وفات کے وقت تمہارے ثلث مال کو تمہاری نیکیوں میں اضافہ کرنے کے لیے تم پر صدقہ کر دیا ہے۔''[1]

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔جبکہ امام احمد اور امام بزار نے اس روایت کو حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔[2] یہ سب کی سب روایات ضعیف ہیں، البتہ یہ سب مل کر ایک دوسرے کو قوی کر دیتی ہیں۔واللہ اعلم!

غریب الحدیث :......تَصَدَّقَ: یہ رخصت دینے کے معنی میں ہے۔یعنی رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس بات کی رخصت دی ہے کہ وہ اپنے ایک تہائی مال کو حالت مرض میں صدقہ کر سکتے ہیں۔کیونکہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ، زندگی میں ہو یا موت کے وقت ہے تو سب ہی اللہ کا فضل۔

زِيَادَةً: اس کے اعراب میں دو احتمال ہیں:

(1) ایک یہ کہ ''ثلث'' سے حال ہو۔ (2) دوسرا یہ کہ یہ مفعول لہ ہو۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

---

[1] مسند احمد: 441/6۔ "مسند البزار" جیسا کہ "مجمع الزوائد" میں ہے اور اس حدیث کی اسناد میں ابوبکر بن ابی مریم ہے جس کو اختلاط ہو جایا کرتا تھا۔

[2] سنن ابن ماجه: 2709۔ اس حدیث کی اسناد میں طلحہ بن عمرو حضرمی مکی ہے جس کو امام احمد، ابن معین ابو حاتم، ابوزرعہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔دیکھیں: "نصب الراية: 400/4".

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- آدمی موت کے وقت اپنے ثلث مال کی وصیت بھی کرسکتا ہے اور اسے صدقہ بھی کرسکتا ہے۔اس کی دلیل "عِنْدَ وَفَاتِكُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- یہ حدیث رب تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر صدقہ کرنے کو ثابت کرتی ہے اور یہ بندوں پر رب تعالیٰ کا فضل و احسان ہے۔
- قریب المرگ مریض کے لیے ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت اور صدقہ کرنا جائز نہیں ہے۔
- موت کے وقت کا تبرع جائز ہے اس کی دلیل "عِنْدَ وَفَاتِكُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- آدمی اپنی زندگی میں جو عمل کر کے آگے بھیجتا ہے، مرنے کے بعد اسے اس کا اجر دیا جاتا ہے۔اس کی دلیل "زِيَادَةً فِي حَسَنَاتِكُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ جب ایک حدیث متعدد طرق سے مروی ہو جو ضعیف ہوں تو وہ جملہ طرق ایک دوسرے کو قوی کرتے ہیں اور وہ حدیث حسن کے درجہ تک ترقی کر جاتی ہے۔البتہ ایسی حدیث "حسن لغیرہ" ہوتی ہے نہ کہ "حسن لذاتہ".

20۔ بَابُ الْوَدِيْعَةِ ..... ودیعت کا بیان

ودیعت کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

ودیعت یہ فعلیہ کے وزن پر مفعولۃ کے معنی میں ہے۔کیونکہ فعیل کے وزن کا اطلاق اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں پر ہوتا ہے جس کی تعیین قرینہ سے ہوتی ہے۔چنانچہ سلیم ''سالم'' کے جبکہ جریح ''مجروح'' کے معنی میں ہے۔اب ودیعت کو ودیعت اس لیے کہتے ہیں کہ ودیعت والا اس کو دوسرے کے پاس محض رضا کارانہ طور پر حفاظت کرنے کے لیے رکھتا ہے۔

جبکہ اصطلاح شرع میں ودیعت یہ مال کو کسی ایسے آدمی کے حوالے کرنے کو کہتے ہیں جو اس کی حفاظت کرے۔چاہے وہ مال درہم و دینار ہو یا کوئی اور شے، منقول ہو یا غیر منقول۔پھر اگر یہ رکھوالی اور حفاظت کسی اجرت اور معاوضہ کے بدلے ہو تو مودَع (جس کے پاس ودیعت رکھوائی گئی ہے) اجیر کہلائے گا اور اگر یہ حفاظت محض رضا کارانہ طور پر ہو تو مودَع محسن کہلائے گا۔

ودیعت رکھوانے کا حکم:

یہ جائز ہے کہ بسا اوقات آدمی کو ایسا کرنے کی ضرورت پیش آجایا کرتی ہے۔یاد رہے کہ اس میں ذلت و عار کی کوئی بات نہیں اور یہ اس مذموم سوال کے زمرہ میں بھی داخل نہیں جس کی متعدد احادیث میں ممانعت آتی ہے۔

رہا کسی کی امانت رکھنا یعنی استیداع، تو یہ مستحب ہے کیونکہ یہ احسان ہے۔کیونکہ بسا اوقات کسی آدمی کو اپنے پاس ایک چیز رکھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کو اپنے پاس امانت رکھ لے، لہٰذا یہ اس پر احسان ہوگا جو شرعاً و عرفاً مطلوب اور محمود ہے۔کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرۃ: 195) ''اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

تب پھر تودیع یعنی امانت رکھوانا مباح اور استیداع یعنی امانت رکھنا یہ مستحب ہوگا۔

پھر ودیع یا مودَع کے ہاتھ میں وہ شے امانت ہوگی نہ کہ مضمون۔ لہٰذا اگر کسی قسم کی تعدی اور کوتاہی کے بغیر وہ امانت ودیع کے پاس تلف ہو جاتی ہے تو وہ اس کا ضامن نہ بنے گا۔

تعدی:...... یہ اس فعل کے کرنے کو کہتے ہیں جو جائز نہیں ہوتا جبکہ کوتاہی اس فعل کے ترک کو کہتے ہیں جس کا کرنا واجب ہو۔

مودَع ضامن نہیں ہوتا

959۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ أُودِعَ وَدِيعَةً فَلَيْسَ عَلَيْهِ ضَمَانٌ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس کے پاس کوئی امانت رکھوائی گئی تو اس پر اس کا کوئی ضمان نہ ہوگا۔'' [1]

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعِيفٌ .

اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔

غریب الحدیث ......مَنْ أُودِعَ: یہ "أُعْطِيَ" کے معنی میں ہے۔ یعنی جس کے پاس ایک امانت حفاظت کی خاطر رکھوائی گئی۔

فَلَيْسَ عَلَيْهِ ضَمَانٌ: کیونکہ وہ ودیعت اس کے پاس امانت ہے نہ کہ مضمون۔ کیونکہ ودیع صرف تعدی اور تفریط کی صورت میں ہی ضامن بنتا ہے۔ کیونکہ تعدی اور تفریط یہ امانت کے خلاف ہیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

ودیعت کے لوٹانے میں اختلاف کا حکم

اگر مودِع (یعنی امانت رکھوانے والا) ایک زمانہ بعد آ کر امانت مانگے اور ودیع یہ کہے کہ وہ تو میں تم کو واپس کر چکا ہوں تو دیع کا قول مقبول ہوگا کیونکہ ودیعت کے حق میں وہ امین تھا اور خود مودِع نے اسے امین سمجھ کر ہی تو اس کے پاس یہ امانت رکھوں تھی، اور امین بلاشبہ محسن ہوتا ہے اور احسان کرنے والوں پر دار و گیر کا کوئی راستہ نہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾ (التوبة: 91) ''نیکی کرنے والوں پر (اعتراض کا) کوئی راستہ نہیں۔''

رہے عصر حاضر کے رائج ''بینک لاکرز'' جن میں اجرت لے کر امانتیں رکھی جاتی ہیں تو وہاں اختلاف کی صورت میں امانت رکھنے والے کا (یعنی بینک کے عملہ کا) یہ قول مقبول نہ ہوگا کہ اس نے تو امانت واپس کر دی تھی۔ کیونکہ یہاں ودیع محسن نہیں جس نے ودیعت کے مالک کی مصلحت کے لیے وہ ودیعت حفاظت کے لیے پاس رکھی تھی۔ بلکہ اس نے اپنی مصلحت کے لیے وہ ودیعت پاس رکھی تھی۔ پس جب وہ محسن نہیں تو اس کا امانت لوٹانے کا دعویٰ بینہ کا محتاج ہوگا۔

مضمونِ حدیث واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دوسرے کے پاس امانت رکھنا جائز اور مباح ہے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ: 2401۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے "السنن" (289/6) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے جبکہ ابن حبان نے اس حدیث کو "المجروحين" (73/2) میں روایت کیا ہے۔ دیکھیں: خلاصة البدر المنير: 150/2 .

◈ دوسرے کی امانت رکھنا بھی جائز اور مستحب ہے۔ کیونکہ یہ محض احسان ہے اور احسان کرنے والے رب تعالیٰ کو محبوب ہیں۔

◈ ودیعت کے تلف ہو جانے پر ودیع پر کوئی ضمان نہ ہوگا جبکہ اس نے تعدی یا تفریط نہ کی ہو۔

آگے امام موصوف فرماتے ہیں:

وَبَابُ قَسْمِ الصَّدَقَاتِ تَقَدَّمَ فِيْ آخِرِ الزَّكَاةِ . وَبَابُ قَسْمِ الْفَيْءِ وَالْغَنِيْمَةِ يَأْتِيْ عَقِبَ الْجِهَادِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى .

(رہا) تقسیم صدقات کا باب (تو) وہ "کتاب الزکوٰۃ" کے آخر میں گزر چکا ہے جبکہ فئي اور صدقات کی تقسیم کا باب "کتاب الجہاد" کے بعد آ جائے گا۔

فائدہ: ...... گویا کہ امام موصوف نے اس بات پر متنبہ فرمایا ہے کہ حضرات شافعیہ نے ان سب ابواب کو اپنی کتابوں میں اس مقام پر ذکر کیا ہے۔ گویا کہ امام موصوف نے اس بات کی معذرت کی ہے کہ صدقات کی تقسیم گزر چکی ہے اور فئي اور غنیمت کی تقسیم کا ذکر کتاب الجہاد میں آگے آ جائے گا۔

8
كِتَابُ النِّكَاحِ
نکاح کے احکام ومسائل کا بیان

کتاب اور اسی طرح فصل وغیرہ کے معانی کو گزشتہ میں بار ہا ذکر کیا جا چکا ہے۔
مذکورہ کتاب میں سب سے پہلے نکاح کے حکم کو بیان کیا جا رہا ہے۔ البتہ اس سے قبل نکاح کی تعریف کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نکاح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

نکاح کا لغوی معنی ہے اکٹھا ہونا، ملنا، جمع ہونا۔ چنانچہ جب لوگ مل بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں "تَنَاكَحَ الْقَوْمُ" یعنی لوگ باہم مل بیٹھے۔

جبکہ اصطلاحِ شرع میں نکاح ایک مرد اور عورت کا ایک مخصوص طرح سے ملنے کو کہتے ہیں اور یہ مخصوص طریقہ وہ ہے جو شرع شریف نے مقرر کیا ہے۔ جس کی شروط معروف ہیں۔

نکاح کا حکم

960۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمایا: "اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور نکاح کرے کہ یہ نگاہ کو بہت زیادہ پست کرنے والا اور شرمگاہ کو بہت زیادہ محفوظ کرنے والا ہے اور جو (سر دست نکاح کی) استطاعت نہیں رکھتا تو اس پر روزے رکھنا لازم ہے کیونکہ یہ روزے رکھنا اس کے لیے شہوت کو روکنے والا ہے۔" ❶

❶ صحیح البخاری: 1905۔ صحیح مسلم: 1400.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......لَنَا: یعنی ہم نوجوانوں کو نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: کیونکہ ہم صغار صحابہ میں سے تھے۔

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ: معشر یہ گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں اور "شباب" یہ "شابٌّ" کی جمع ہے۔ مراد بالغ نوجوان ہے اور شباب کا اطلاق بلوغت کی عمر سے لے کر تیس سال تک کی عمر پر ہوتا ہے۔ جبکہ بعض نے چالیس سال تک کی عمر کو شباب کا مصداق بتلایا ہے۔ پھر اس کے بعد کی کہولت اور اس کے بعد شیخوخت کی عمر شروع ہو جاتی ہے۔ اس ارشاد میں نکاح کے حوالہ سے خاص نوجوانوں کو خطاب اس لیے ہے کیونکہ وہی اس بات کے یعنی نکاح کے محتاج ہوتے ہیں جس کی طرف جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں متوجہ فرمایا ہے۔ کیونکہ ان میں بہ نسبت بوڑھوں کے شہوت زیادہ ہوتی ہے۔

مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ: الباءة: اس کے دو معانی ہیں: (1) نکاح (2) اور جماع۔ پس یہاں نکاح مراد ہے اور استطاعت سے استطاعت بدنی اور مالی دونوں مراد ہیں۔ کیونکہ جس میں استطاعت بدنیہ ہی نہ ہو تو اسے نکاح کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور رہی استطاعت مالیہ تو جس کے پاس یہ استطاعت نہ ہو وہ مالی استطاعت کے حاصل ہونے تک نکاح پر قدرت نہیں رکھتا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ مذکورہ حدیث میں استطاعت سے مراد یہی استطاعت مالیہ ہی ہے۔ اس کی دلیل حدیث کے اگلے یہ الفاظ ہیں: ''اور جسے استطاعت حاصل نہ ہو تو اس پر روزے رکھنے لازم نہیں۔'' یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب میں نکاح کی استطاعت بدنیہ موجود ہے اور مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے۔ اس لیے یہ جملہ شرطیہ ہے۔

فَلْيَتَزَوَّجْ: یہ جملہ جواب شرط ہے اور مذکور "فا" جزائیہ ہے۔

فَإِنَّهُ: مراد زواج اور نکاح ہے۔ لہٰذا "ھو" ضمیر کا مرجع معنوی ہے جو "فَلْيَتَزَوَّجْ" سے ماخوذ ہے۔

أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ: یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ "اکثر للولد" (یہ نکاح زیادہ اولاد ہونے کا سبب ہے)۔ حالانکہ نکاح ہی اولاد کا کثرت کا سبب بھی ہے۔ کیونکہ ان نوجوانوں کو اس عمر میں جس بات کی زیادہ احتیاج اور ضرورت ہوتی ہے اور اس عمر میں انہیں جس بات کی فکر زیادہ دامن گیر رہتی ہے وہ نگاہ کی حفاظت اور شرمگاہ کی حفاظت ہے۔ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ: یعنی "اشدُّ غضًّا للبصر" (کہ یہ نکاح نگاہ کو بہت زیادہ پست کرنے والا ہے۔) یعنی نکاح یہ نگاہ کو اجنبی عورتوں کی طرف اٹھنے سے بچانے والا ہے اور بہت زیادہ بچانے والا ہے۔ بلاشبہ یہ بات مجرب بھی ہے اور مشاہد بھی ہے۔

أَحْصَنُ لِلْفَرْجِ: مراد شرمگاہ کو گناہ کی طرف اور حرام شہوت کی طرف جانے سے بہت زیادہ روکنے والا ہے۔ اسی معنی میں قلعہ کو بھی ''حصن'' کہتے ہیں کیونکہ وہ اندر موجود لوگوں کو دشمن کی یورش و یلغار سے روکتا اور بچاتا ہے۔ پس نکاح شرمگاہ کو بے حیائی سے بہت زیادہ روکنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اجنبیہ کی طرف دیکھنے والے کو اپنی بیوی کے پاس آنے کو فرمایا ہے اور اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی ہے: "اِنَّ مَا مَعَهَا مِثْلُ الَّذِيْ مَعَهَا" کہ ''اپنی بیوی کے پاس بھی تو وہی کچھ ہے جو اس اجنبیہ کے پاس ہے۔''

وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ: یہاں فعل کا مفعول بہ محذوف ہے اور وہ "الْبَاءَةَ" ہے۔

فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ: علیہ: یہ اغراء یعنی ابھارنے کے باب میں سے ہے نہ کہ ایجاب کے باب میں سے ہے۔ یعنی جو بھی

سر دست نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، وہ روزے رکھے اور روزہ سے شرعی روزہ مراد ہے جو طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع کرنے سے رکنے کا نام ہے۔

فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ: "إِنَّهُ" اس میں "هو" ضمیر کا مرجع "الصَّوْمِ" ہے اور "له" سے مراد وہ نوجوان ہے جو ابھی نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا اور "وِجَـــاءٌ" سے مراد ایسا مانع ہے جو شہوت کی قوت اور جوش کو روکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ روزہ شہوت کو توڑتا ہے۔ جس سے آدمی کو شہوت کی زیادہ طلب اور بے قراری نہیں ہوتی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے نوجوانوں کو نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے کیونکہ نوجوان بوڑھوں سے زیادہ نکاح کے لائق اور مستحق ہوتے ہیں۔

اور دوسری اہم بات اس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ نکاح میں نگاہ اور شرمگاہ دونوں کی زبردست حفاظت ہے جس سے گناہ، بے حیائی اور بدکاری سے حفاظت رہتی ہے اور یہی امر ایمان کی تکمیل میں بے حد مؤثر ہے۔

اور تیسری اہم بات یہ ہے کہ اگر سر دست نکاح پر قدرت نہیں تو پھر روزوں کا التزام کیا جائے تا کہ شہوت کا زور اور جوش کسی قدر ٹوٹے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کا حسن خطاب کہ آپ ﷺ نے انہی لوگوں سے خطاب فرمایا جو اس کے اہل تھے اور وہ خطاب ان کے زیادہ لائق بھی تھا۔

◈ جو نوجوان نکاح پر قادر ہو، اس پر نکاح کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل "فَلْيَتَزَوَّجْ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اس میں مذکورہ لام امر کا ہے جو وجوب کے لیے ہوتا ہے اور ''اوامر'' میں اصل یہی ہے کہ وہ وجوب کے لیے ہوتے ہیں۔

بعض علماء نے مذکورہ امر کو استحباب کے لیے قرار دیا ہے اور اس کی علت یہ ہے کہ نکاح کی مصلحت فاعل کی طرف لوٹتی ہے اور یہ جسمانی مصلحت ہے جو شہوت سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ امر ارشاد یعنی استحباب کے لیے ہوگا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ کیونکہ نکاح کرنا عبادت ہے۔ کیونکہ اس کا نبی کریم ﷺ نے حکم دیا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ تمام انبیاء و مرسلین کی سنت ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً﴾ (الرعد: 38)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے کئی رسول تجھ سے پہلے بھیجے اور ان کے لیے بیویاں اور بچے بنائے۔''

پھر نبی کریم ﷺ خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي.)) [1]

''اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، پس جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں۔''

◈ فقہاء نے نکاح کی چند قسمیں بیان کی ہیں، جو یہ ہیں:

واجب، حرام، مکروہ، مباح اور مسنون۔ لیکن فقہاء کے نزدیک اس کی اصل اس کا مسنون ہونا ہے نہ کہ واجب۔ جب

[1] یہ حدیث آگے متن میں آ رہی ہے۔

تک کہ وجوب کا کوئی سبب نہ ہو۔

⊙ ...... واجب نکاح: یہ تب ہے جب ترکِ نکاح میں زنا میں جا پڑنے کا اندیشہ ہو۔ لہٰذا جس کو ترکِ نکاح میں زنا کے ارتکاب کا اندیشہ ہو، اس پر نکاح کرنا واجب ہے۔ تا کہ وہ حرام میں جا پڑنے سے بچے۔ اب حرام سے بچنا واجب ہے اور جس چیز کے ذریعے واجب کی تکمیل ہوتی ہو، وہ بھی واجب ہوتی ہے لہٰذا جسے خود پر زنا میں جا پڑنے کا اندیشہ ہو، اس پر نکاح کرنا واجب ہوگا۔

⊙ ...... حرام نکاح: یہ دارالحرب میں نکاح کرنا ہے۔ لہٰذا دارالحرب میں کفار اشرار سے قتال کے دوران نکاح حرام ہے۔ کیونکہ دارالحرب میں اولاد کے غلام بنا لیے جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

⊙ ...... مکروہ نکاح: یہ اس تنگدست کا نکاح کرنا ہے جس پر شہوت کا غلبہ نہ ہو۔ کیونکہ ایسا آدمی نکاح کر کے صرف اپنے آپ کو اور اپنی بیوی اور آئندہ نسل کو سوائے تنگی میں ڈالنے کے اور کچھ نہ کر پائے گا۔

⊙ ...... مباح نکاح: یہ وہ شخص ہے جس پر شہوت کا غلبہ تو ہو لیکن اس کے پاس مال نہ ہو تو ایسے آدمی کے لیے نکاح مباح ہے نہ کہ واجب یا مستحب۔

⊙ ...... مسنون نکاح: اور یہ اصل ہے۔

◈ نبی کریم ﷺ حکم کے بیان کے ساتھ اس کی علت بھی بیان فرماتے تھے۔ بے شک یہ آپ ﷺ کی حسن تعلیم میں سے ہے۔

◈ بلاشبہ شریعت اسلامیہ بے حد بلند ہے کیونکہ اس کا ہر حکم مصالح کی رعایت پر مشتمل ہے۔

◈ نگاہیں پست رکھنا مطلوب ہے۔

◈ شرمگاہ کی حفاظت مشروع اور واجب ہے۔

◈ ہر اس امر سے بچنا واجب ہے جس میں بدنظری کا صدور اور شرمگاہ کا گناہ میں وقوع ہوتا ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے انہی دو اہم مقاصد کے حصول کے لیے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے۔

◈ اگر ایک حکم کی متعدد حکمتیں ہوں تو ان میں سے بعض کے بیان پر اقتصار بھی جائز ہے۔ جیسے نکاح کی ایک عظیم حکمت نسل انسانی کا بقا اور تکثیر اولاد بھی ہے لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے صرف دو حکمتوں غض بصر اور حفاظت فرج کے بیان پر اقتصار فرمایا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ خطاب نوجوانوں کو تھا جن کو اوّلِ امر میں شہوت پر قابو پانا مقصود اور مطلوب ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے نکاح کی وہی علت نوجوانوں کے سامنے بیان فرمائی جو ان کے حسب حال تھی۔

◈ تعلیماتِ نبویہ کی حکمت کہ جب کوئی امر حسًا یا شرعًا متعذر رہتا تو آپ ﷺ نے اس کا بدل بیان فرمایا۔ اس کی دلیل "وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ نکاح کے لیے قرض لینا مناسب نہیں کیونکہ نکاح پر عدمِ استطاعت کی صورت میں نبی کریم ﷺ نے روزے رکھنے کا حکم فرمایا نہ کہ قرض لے کر نکاح کرنے کو تجویز فرمایا۔

◈ یہیں سے استمناء بالید یعنی مشت زنی کا حرام ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

بے نکاحی زندگی گزارنے کی ممانعت کا بیان

961- وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ، وَقَالَ: ((لٰكِنِّيْ أَنَا أُصَلِّيْ، وَأَنَامُ، وَأَصُوْمُ وَأُفْطِرُ ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک موقع پر) نبی کریم ﷺ نے (پہلے) رب تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور (پھر) فرمایا: ''البتہ میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں اور (رات کو) سوتا بھی ہوں اور روزہ بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جس نے میری سنت سے منہ موڑا، وہ مجھ سے نہیں۔'' ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

سببِ حدیث: ......اس حدیث کا ایک سبب ہے، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کے تین صحابہ رضی اللہ عنہم خیر کی شدید رغبت میں ازواجِ مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نجی زندگی کے ان اعمال کے بارے میں دریافت کیا جو آپ ﷺ اپنے دولت کدہ پر ان اوقات میں ادا فرمایا کرتے تھے جب دوسرے لوگ آپ ﷺ کو نہ دیکھ پاتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے آپ ﷺ کے نجی معمولات کا سنا تو گویا کہ ان کو کم جانا۔ جس پر وہ باہم کہنے لگے کہ آپ ﷺ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہیں جبکہ ہم تو ایسے ہیں نہیں اس لیے ہمیں تو خوب اعمال کرنے پڑیں گے۔ چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں تو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ دوسرے صاحب کہنے لگے اور میں ہمیشہ شب بیداری کروں گا اور رات کو کبھی نہ سوؤں گا۔ جبکہ تیسرے صاحب یہ کہنے لگے کہ میں تو عورتوں سے نکاح نہ کروں گا۔ یعنی عبادت میں ہی مشغول رہوں گا اور بے نکاحی زندگی گزاروں گا۔ یہ باتیں ان تینوں حضرات نے (نیکی کے جذبے کے تحت) اپنے اپنے اجتہاد سے کہی تھیں۔ نبی کریم ﷺ کو جب اس قصہ کا علم ہوا تو آپ ﷺ (سخت ناراض ہوئے اور آپ) نے لوگوں میں خطبہ ارشاد فرمایا اور رب تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ جس کے بعد وہ حدیث ارشاد فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔

غریب الحدیث: ......لٰكِنِّيْ أَنَا أُصَلِّيْ وَأَنَامُ: یہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ رات کو کچھ دیر نماز کی عبادت میں مشغول رہتے اور ساتھ ہی سو کر استراحت بھی فرماتے تھے۔ البتہ حیات طیبہ میں شاذ و نادر ایسے مواقع بھی آئے کہ آپ ﷺ ساری رات بیداری بھی فرماتے تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ نوافل کو مصلحت کے مطابق ادا فرماتے تھے سوائے فرائض کے کہ ان میں کوئی کمی واقع نہ ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات آپ ﷺ اپنی نفلی عبادت کو مہمان نوازی اور وفود کی ملاقات وغیرہ کی مشغولیت کی بنا پر ترک فرما دیتے تھے۔

غرض فرائض کے علاوہ یہ امر ''اصلح'' (یعنی زیادہ مناسب بات) کی طرف لوٹتا ہے۔

وَأَصُوْمُ وَأُفْطِرُ: نبی کریم ﷺ ہر ماہ تین دن کے روزے رکھا کرتے تھے۔ چاہے وہ مہینہ کے شروع میں ہوتے، یا درمیان میں یا آخر میں۔ ثابت یہی ہے اور کبھی آپ ﷺ سوموار اور جمعرات کا روزہ بھی رکھتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ ان ایام کا روزہ بھی رکھتے تھے جن میں روزہ رکھنا مستحب ہوتا تھا جیسے عرفہ اور عاشورا کا روزہ۔

---

❶ صحيح البخاري: 5063- صحيح مسلم: 1401.

غرض آپ ﷺ نفلی روزے رکھتے بھی تھے اور ان میں ناغہ بھی کیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ سب سے افضل روزہ صومِ داودی ہے۔ جناب داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن کا ناغہ فرمایا کرتے تھے۔

وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ: یعنی میں بے نکاحی زندگی بسر نہیں کرتا بخلاف ان لوگوں کے جو بیویوں کے بغیر زندگی گزارتے تھے۔ آپ ﷺ نے بھی گزشتہ پیغمبروں اور رسولوں کی طرح شادیاں بھی کیں اور آپ ﷺ کو رب تعالیٰ نے اولاد سے بھی نوازا۔

پھر آپ ﷺ نے کوئی بھی نکاح شہوت پوری کرنے کی غرض سے نہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے آپ ﷺ کی کوئی زوجہ مطہرہ کنواری نہ تھیں اور اگر آپ ﷺ چاہتے تو آپ ﷺ کے لیے شادی کی غرض سے کنواری عورتوں کو حاصل کرنا ہرگز بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے جتنی بھی شادیاں فرمائیں وہ سب کی سب عظیم ترین شرعی مصالح کے حاصل کرنے کے لیے فرمائیں۔ غرض عورتوں سے نکاح کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت و سیرت ہے۔

فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي: یعنی جس نے گزشتہ باتوں، جو کہ نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقہ ہیں، جن میں سے ایک عورتوں سے نکاح کرنا بھی ہے زہد اختیار کیا اور ان سے بے رغبتی کی روش اختیار کی تو وہ مجھ سے نہیں۔ یعنی میں اس سے بری ہوں۔ بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے سچ فرمایا ہے کیونکہ فطرت کا مقتضی بھی یہی ہے۔ لہٰذا جو ان باتوں سے منہ موڑے گا بلاشبہ وہ نبی کریم ﷺ کی سنت کو چھوڑنے والا ہے۔ رَغِبَ: اس کا صلہ اگر "فِی" کے ساتھ آئے تو یہ طلب کے معنی میں ہوتا ہے اور اگر اس کا صلہ "عن" کے ساتھ آئے تو یہ کسی چیز سے راہِ فرار اختیار کرنے اور اس سے منہ موڑنے کے معنی میں آتا ہے۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سیرت ہی فطرت کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا سچے اور صحیح دین پر وہی ہوگا جو نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزارتا ہوگا۔ انہی باتوں میں سے تین اہم باتیں یہ ہیں:

(1) ساری ساری رات جاگ کر عبادت نہ کی جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ ایسا نہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ اگر رات کے کسی حصہ میں عبادت کرتے تھے تو آرام بھی فرمایا کرتے تھے۔

(2) مسلسل روزے نہ رکھے جائیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ ایسا نہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ ہر ماہ تین دن روزے رکھتے تھے اور باقی دنوں میں ناغہ فرمایا کرتے تھے۔

(3) بے نکاحی زندگی نہ گزاری جائے کہ یہ عیسائیت کی خودساختہ رہبانیت کی بنیاد ہے جو رب تعالیٰ نے ان لوگوں پر مقرر نہ فرمائی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے تئیں رب تعالیٰ کی خوشنودی پانے کے لیے خود پر یہ سختی کی کہ عورتوں کو اور لذتوں اور عمدہ چیزوں کو ترک کر دیا جس نے آگے چل کر بے شمار اخلاقی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی برائیوں کو جنم دیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اسلام رہبانیت اور بے نکاحی زندگی کے سخت خلاف ہے۔ اسی طرح اسلام عباداتِ شاقہ اور ترکِ لذات سے بھی برسرِ پیکار ہے۔

- نبی کریم ﷺ باطل کے اِبطال میں بے حد عجلت سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان تین حضرات کی یہ باتیں سنتے ہی، جو اجتہادی خطا پر مبنی تھیں، خطبہ ارشاد فرمایا اور سب کے سامنے ان تینوں باتوں کا رد فرمایا۔
- ضرورت پڑنے پر منکر پر علی الاعلان انکار کیا جا سکتا ہے۔
- خطبہ چاہے وقتی ہو یا مسنون و واجب لیکن اس کا رب تعالیٰ کی حمد وثنا سے شروع کرنا مستحب ومندوب ہے۔
- نبی کریم ﷺ نفلی عبادات میں سہولت وآسانی کو پسند فرماتے تھے۔
- عباداتِ نفلیہ میں خود پر سختی اور شدت سے کام لینا خلافِ فطرت وسنت ہے۔
- مطلق روزہ رکھنا اور نکاح کرنا مشروع ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ ہیں۔
- نبی کریم ﷺ کی سنت سے منہ موڑنا خلافِ فطرت بھی ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ ایسے شخص سے بری بھی ہیں۔ تب پھر سنت کو مضبوطی سے تھامنے والا ہی نبی کریم ﷺ کا سچا پیروکار ہے۔
- لفظِ سنت کا اطلاق طریقہ پر بھی ہوتا ہے۔

زیادہ بچے جننے والی اور بہت محبت کرنے والی عورتوں سے نکاح کرنے کی ترغیب

962، 963۔ وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُ بِالْبَاءَةِ، وَيَنْهَى عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْيًا شَدِيْدًا، وَيَقُوْلُ: تَزَوَّجُوْا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ. فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأَنْبِيَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمیں نکاح کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور بڑی سختی کے ساتھ بے نکاحی زندگی گزارنے سے منع فرمایا کرتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے: ''زیادہ بچے جننے والی اور بڑی محبت کرنے والی عورت سے نکاح کرو، بے شک میں روزِ قیامت تم لوگوں (کی کثرتِ تعداد) کی وجہ سے دوسرے انبیاء پر فخر کروں گا۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا جبکہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُد، وَالنَّسَائِيِّ وَابْنِ حِبَّانَ مِنْ حَدِيْثِ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ.

جبکہ سنن ابی داود، سنن نسائی اور صحیح ابن حبان میں بھی حضرت معقل بن یسار کی حدیث سے اس کا ایک شاہد ہے۔ [2]

غریب الحدیث :......وَيَنْهَى عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْيًا شَدِيْدًا: تبتل: یہ نکاح سے کٹ کر زندگی گزارنے کو کہتے ہیں۔ "نَهْيًا شَدِيْدًا" یعنی آپ ﷺ اس کی ممانعت میں بے حد سختی فرماتے تھے۔

وَيَقُوْلُ: مراد نکاح کرنے کی بابت ارشاد فرمانا ہے۔

---

[1] مسند احمد: 158/3۔ صحیح ابن حبان: 4028۔ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ضیاء مقدسی نے "المختارة" (261/5) میں اس کو حسن کہا ہے اور علامہ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" (258/4) میں ضیاء مقدسی کی متابعت میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] سنن ابی داؤد: 2050۔ سنن النسائی: 65/6۔ صحیح ابن حبان: 4056۔ المستدرك للحاكم: 176/2۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

تَزَوَّجُوا: یہ امران لوگوں کو ہے جو عورتوں سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اَلْوَلُودَ :زیادہ بچے جننے والی۔
اَلْوَدُودَ: زیادہ محبت کرنے والی جو خاوند سے بے حد محبت کرتی ہو۔ چنانچہ وہ گفتگو میں، رہن سہن میں، حسن وتجمل میں اپنے خاوند کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہو جبکہ بعض خواتین اس کے برعکس تلخ گفتاری اور بدسلیقگی سے اور میلی کچیلی رہ کر خاوند کا دل اچاٹ کر دیتی ہیں۔

اب ملنسار، خوش گفتار اور محبت کرنے والی بیوی میں صرف یہی حقیقت پنہاں نہیں کہ وہ ایک سعادت مند، خوش بخت اور لذت دسرور سے بھری زندگی کا سبب بنتی ہے بلکہ اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ ایسی بیوی سے ملنے، اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور اس سے جماع کرنے کا خاوند کو اشتیاق رہتا ہے جو بلاشبہ نسل کی کثرت کا باعث ہے۔

رہا یہ سوال کہ زیادہ بچے جننے والی عورت کی پہچان کیونکر حاصل ہوگی؟ تو جو عورت پہلے سے شادی شدہ ہے اس کی اولاد سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ جبکہ کنواری کا اندازہ اس کے خاندان کی دیگر خواتین سے ہوگا۔ کیونکہ وراثت جس طرح ظاہری خلقت میں چلتی ہے اسی طرح باطنی خلقت میں بھی چلتی ہے۔

اِنِّی مُکَاثِرٌ: مراد فخر کرنا ہے کہ روزِ قیامت آپ ﷺ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام پر اس بات میں فخر فرمائیں گے کہ آپ ﷺ کے پیروکار دیگر انبیائے کرام علیہم السلام سے زیادہ ہوں گے۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ: میں اس بات کی امید کرتا ہوں کہ اہل جنت میں سے نصف تم ہوگے۔ [1]

لہٰذا اس کے ظاہری اسباب کا اختیار کرنا بھی ناگزیر ہے، اور وہ نسل کی کثرت ہے کہ جب امت میں نسل کی کثرت ہوگی تو امت بھی لامحالہ کثیر ہوگی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو اہم باتوں کو بیان کیا گیا ہے:

(1) ایک یہ کہ بے نکاحی زندگی گزارنے کی سختی سے ممانعت ہے۔

(2) دوسری یہ کہ نکاح کے لیے ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو زیادہ بچے جننے والی ہو اور خاوند کی زیادہ عزت کرنے والی اور اس سے محبت کرنے والی ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نکاح کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل "يَأْمُرُ بِالْبَاءَةِ" کے الفاظ ہیں اور امر میں اصل وجوب ہے اور اس کی دوسری دلیل "وَيَنْهَى عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْيًا شَدِيدًا" کے الفاظ ہیں۔ یہی قول راجح ہے کہ آدمی پر قدرت کے وقت نکاح کرنا واجب ہے۔

◈ بے نکاحی زندگی گزارنے کی شرع شریف میں ممانعت ہے جس کی دلیل پچھلے فائدہ میں بیان کر دی گئی ہے۔

◈ نہی کی دو قسمیں ہیں خفیف اور شدید۔ خفیف نہی کراہت کو اور شدید نہی تحریم کو متضمن ہوتی ہے۔

◈ اوامر ونواہی میں تاکید کے اعتبار سے باہمی تفاضل ہوتا ہے۔

◈ نکاح کے لیے ودود اور ولود عورت کا انتخاب مشروع ہے البتہ دین داری کو ہر حال میں ترجیح حاصل ہے جیسا کہ دیگر نصوص

---

[1] صحیح البخاری: 3348۔ صحیح مسلم: 222.

سے مستفاد ہوتا ہے۔

- خاوند سے زیادہ محبت کرنے والی عورت کی ازدواجی زندگی زیادہ سعادت منداور آسودہ ہوتی ہے۔
- نبی کریم ﷺ روزِ قیامت اپنی امت کی کثرت پر دیگر انبیائے کرام علیہم السلام پر فخر فرمائیں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ امت کی کثرت کے شدید آرزومند تھے۔شرع شریف کی اولاد کی کثرت کی طرف خصوصی توجہ ہے۔
- معلوم ہوا کہ امت کی کثرت ایک پیغمبر کے لیے باعث فخر وافتخار ہے۔
- اس حدیث کا ایک شاہد بھی ہے۔ یاد رہے کہ شواہد اور متابعات حدیث کی قوت کا باعث ہوتے ہیں۔

عورت سے نکاح کیے جانے کے چار اسباب

964- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”عورت سے چار باتوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے خاندان کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، پس تو دیندار کو کوشش کر کے (تلاش کر اور) حاصل کر تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔“ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ مَعَ بَقِيَّةِ السَّبْعَةِ.

یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے اور اسے باقی کے ائمہ سبعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **تُنْكَحُ** : یہ جملہ خبریہ ہے نہ کہ امر۔ یعنی لوگوں کی نکاح سے اغراض مختلف ہوتی ہیں البتہ اکثر یہ چار اغراض ہی ہوتی ہیں۔ مال، جمال، حسب ونسب اور دین۔

لِمَالِهَا: جیسے کوئی عورت ہو تو عمر رسیدہ لیکن بے شمار مال و دولت کی مالک ہو تو ایک نوخیز نوجوان اس وجہ سے بھی اس عمر رسیدہ خاتون سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے کہ اس طرح وہ بے شمار دولت کا مالک بن جائے گا۔ چنانچہ اب وہ دن رات اس کے مرنے کے انتظار میں رہتا ہے کہ ترکہ میں جتنا بھی ملے گا کم نہ ہوگا۔

لِحَسَبِهَا: حسب سے مراد قوم قبیلہ اور خاندان ہے۔ چنانچہ بعض کم ذات اور کمینے لوگ مال و دولت کی بنیاد پر شریف اور معزز خاندانوں میں اس لیے بھی نکاح کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ اس سے وہ معاشرے میں لوگوں کی نگاہوں میں بڑے بنیں گے۔ **لِجَمَالِهَا**: حسن و جمال مرد کی فطری کمزوری ہے۔ اس کی بنا پر کسی عورت سے نکاح کو ترجیح دینا عام ہے چاہے وہ عورت دین دار نہ بھی ہو۔

لِدِينِهَا: یہ کسی عورت سے نکاح کرنے کی چوتھی اغلب و اکثر وجہ ہے کہ وہ دیندار اور صاحب علم و عمل ہو اور ایسی عورت سے نکاح کی خواہش وہی رکھ سکتا ہے جو یہ چاہتا ہو کہ اس کی بیوی رب تعالیٰ کی طاعت میں اس کی معین و مددگار بنے۔

فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ: ”ظَفَرَ بِشَيْءٍ“ کا معنی ہے کسی شے کو کوشش کر کے حاصل کرنا۔ مراد یہ ہے کہ دین دار عورت کو

---

[1] صحيح البخاري: 5090- صحيح مسلم: 1466.

مالِ غنیمت سمجھ۔ بلاشبہ یہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کی نصیحت ہے جو انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں اور اس میں جو خیر وبرکات ہیں ان کو وہی جانتے ہیں جن کی زندگیوں میں دین دار عورتیں داخل ہیں۔

تَـرِبَتْ يَدَاكَ: یعنی تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔ بظاہر یہ بد دعا ہے لیکن مراد اس سے دعا ہی ہوتی ہے۔ نہ کہ اس کا مدلول۔ لہٰذا اس میں اس بات کی ترغیب ہے کہ دین دار سے نکاح کرو گرنہ فقر وفاقہ کا منہ دیکھے گا۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ دراصل یہاں ایک عبارت محذوف ہے اور تقدیر یوں ہے: "تَـرِبَـتْ يَـدَاكَ إِنْ لَّـمْ تَظْفَرْ بِهَا" یعنی اگر تمہیں دیندار عورت نہ ملی تو بالآخر مفلس وقلاش ہو جائے گا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل اس بات کی نہایت بلیغ ترغیب ہے کہ نکاح کے لیے ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو دیندار ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نکاح کے پس منظر میں اکثر مردوں کی اغراض انہی چار باتوں میں محصور ہوتی ہیں: مال، جمال، حسب نسب اور دینداری۔
- مال کی غرض سے کسی عورت سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسی خواہش کو برقرار رکھا ہے اور اس پر نکیر نہیں فرمائی البتہ دین کو ترجیح دینے کی ترغیب ضرور دی ہے۔
- اسی طرح کسی عورت کے حسب نسب اور حسن وجمال کی وجہ سے بھی اس سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- جبکہ محض کسی عورت کی دینداری کو دیکھ کر نکاح کرنا جائز بھی ہے اور محمود بھی ہے۔
- امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کی وصیت کو حرزِ جاں بنانے کی زبردست کوشش کرے۔
- لوگ اپنی اغراض میں مختلف ہو سکتے ہیں۔

شادی کرنے والے کے لیے دعائے نبوی

965- وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَفَّأَ إِنْسَانًا، إِذَا تَزَوَّجَ، قَالَ: ((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ، وَبَارَكَ عَلَيْكَ، وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی شادی کرتا تو نبی کریم ﷺ اسے شادی کی مبارک باد دیتے ہوئے یہ فرماتے تھے: ((بارك الله لك......)) "اللہ تمہیں (یعنی تمہارے اہل کو) برکت دے اور (تمہارے اہل کے لیے) تم پر برکت نازل فرمائے اور تم دونوں کو خیر پر جمع کرے)۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی، امام ابن حبان اور امام ابن خزیمہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

---

[1] مسند احمد: 381/2- سنن ابی داؤد: 2130- جامع الترمذی: 1091- السنن الکبریٰ للنسائی: 10089- سنن ابن ماجہ: 1905- امام بوصیری فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد صحیح ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں، جبکہ ابن حبان (4052) اور حاکم (199/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے اور خود امام ابن حجرؒ نے "فتح الباری" (222/9) میں اس حدیث کو قوی کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... إِذَا رَفَّأَ: یہ کسی کو "بِالرَّفَاءِ وَالْبَنِيْنَ" کہہ کر دعا دینے کو کہتے ہیں۔ یہ دعا شادی کرنے والے کو دی جاتی ہے یعنی تم دونوں خاوند بیوی میں رب تعالیٰ اتفاق ومحبت قائم رکھے اور اولاد عطا کرے۔ [1] یہ "رَفَأَ الثَّوْبَ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کپڑے کو رفو کرنا اور پھٹی ہوئی جگہ کو ملا کر سینا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم تمہیں اس بات کی دعا دیتے ہیں کہ تم دونوں خاوند بیوی میں اسی طرح تعلق قائم رہے جیسے کپڑے کو باہم ملا کر سی دیا جاتا ہے کہ پھر وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتا اور ہم تمہیں اولاد کی دعا دیتے ہیں۔

إِذَا تَزَوَّجَ: یعنی جب عقدِ نکاح ہو جاتا تھا چاہے ابھی رخصتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ: مراد آدمی کی بیوی ہے۔ یعنی رب تعالیٰ تمہیں اور تمہاری بیوی میں برکت دے اور یہ برکت جان مال، علم، عمل، عزت وآبرو اور اولاد کاروبار سمیت اخلاق عادات اور دین وعبادات سب کو شامل ہے۔ یعنی ہر وہ شے جس میں برکت اتر سکتی ہے، وہ سب اس میں داخل ہیں۔ برکت کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کیا جا چکا ہے۔

بَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ: یعنی رب تعالیٰ تم پر تمہارے اہل کی بابت برکت نازل فرمائے۔ تب پھر نبی کریم ﷺ کی یہ دعا دوطرفہ ہے ایک خود آدمی کے لیے اور دوسرے اس کی خاطر اس کے اہل میں برکت کی دعا ہے۔ یعنی رب تعالیٰ تمہیں ہر شے میں برکت دے اور تیرے اوپر ہر شے میں برکت دے۔

پھر ایک قول یہ ہے کہ یہ دعا عام ہے اور ایک قول اس کے خاص ہونے کا بھی ہے اور یہی راجح قول ہے کیونکہ یہاں دعا کی تخصیص حال کا قرینہ ہے کیونکہ شادی کرنے والے کو دعا دینے والے کے دل میں یہ بات نہیں ہوتی کہ رب تعالیٰ اس کے مال میں برکت دے بلکہ اس کا قصد وارادہ اس کے اہل یعنی بیوی میں برکت کی دعا دینا ہوتا ہے۔

وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ: یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اور تمہاری بیوی کو دینی ودنیاوی ہر قسم کی خیر پر اکٹھا کرے۔ لہٰذا یہ دعا ہر ممکنہ خیر کو شامل ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے کہ شادی کرنے والے کو ان مسنون کلمات کے ساتھ دعا دی جائے جو دین ودنیا کی جملہ خیر وبرکات کو شامل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعتِ اسلامیہ نے جاہلیت کی تمام باتوں کی اصلاح کی ہے۔ چنانچہ جاہلیت میں شادی کرنے والے کو جن الفاظ کے ساتھ دعا دی جاتی تھی شریعتِ اسلامیہ نے ان سے زیادہ جامع اور بلیغ کلمات کے ساتھ دعا دینے کا طریقہ تلقین کیا ہے۔
- یہ دعا دینا شادی کرنے والے کے لیے مشروع ہے نہ کہ منگنی کرنے والے کے لیے اور دعا مطلق نکاح ہونے پر بھی دی جاسکتی ہے چاہے ابھی اس کی رخصتی نہ بھی ہوئی ہو۔
- شادی کی مبارک دیتے وقت ہاتھ ملانا مشروع نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ سے ایسا کرنا ثابت نہیں۔ گویا اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مصافحہ کرنے کے مشروع ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں۔
- معلوم ہوا کہ شرعی مبارکبادیں سب سے زیادہ خیر وبرکات کے معانی پر مشتمل ہیں۔ اس لیے مروجہ غیر شرعی رسوم اور

---

[1] القاموس الوحید، ص: 646۔ (نسیم)

الفاظ کو استعمال کرنے کی بجائے شرعی طریقہ اور نبوی کلمات کو استعمال کیا جائے۔

◈ ہر حال میں اللہ رب العزت ہی کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

خطبہ حاجت

966۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ التَّشَهُّدَ فِي الْحَاجَةِ ((إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ، وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، وَيَقْرَأُ ثَلَاثَ آيَاتٍ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں حاجت کے وقت یہ تشہد سکھلایا ہے: ((إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ ...... عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ)) ''بے شک سب تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں، ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں اور اس سے مدد کے خواستگار ہیں اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش کے طلب گار ہیں، اور ہم اپنے نفس کی شرارتوں سے رب تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں، جسے اللہ سیدھی راہ دکھلائے اسے کوئی بہکانے والا نہیں، اور جسے اللہ بے راہ کر دے اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔'' اور (اس کے بعد) تین آیات کی تلاوت فرماتے تھے۔ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور آئمہ اربعہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی اور امام حاکم نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... عَلَّمَنَا: نبی کریم ﷺ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ اپنے اصحاب کو کسی سبب کی بنا پر بھی احکامات تعلیم فرمایا کرتے تھے اور ابتداءً بھی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

التَّشَهُّدَ فِي الْحَاجَةِ: تشہد کا اطلاق ہر قسم کے ذکر پر ہوتا ہے اور چونکہ ہر ذکر میں سب سے اہم اور خاص الخاص تذکرہ توحید و رسالت کی شہادت کا ہوتا ہے، اس مناسبت سے توحید و رسالت پر مشتمل ذکر کو تشہد بھی کہہ دیتے ہیں۔ تب پھر مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ حاجات و ضروریات کے وقت یہ ذکر تعلیم فرمایا کرتے تھے جو اوپر مذکور ہے۔

البتہ یہاں حاجات سے مراد اہم حاجات ہیں نہ کہ ہر ایک حاجت جیسے کھانا پینا بھی تو ایک حاجت ہے، تو یہاں یہ مراد نہیں کہ آدمی کھانا شروع کرنے سے قبل بھی توحید و رسالت کی شہادت پر مشتمل اس دعا کو پڑھنے لگے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جب کوئی اہم کام درپیش ہو اور اس کے کرنے کا ارادہ ہو جیسے وعظ، جمعہ اور نکاح کا خطبہ وغیرہ تو یہ دعا پڑھی جائے۔

---

❶ مسند احمد: 350/1۔ سنن ابی داؤد: 2130۔ جامع الترمذی: 1091۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 750۔ سنن ابن ماجہ: 1905۔ المستدرك للحاکم: 199/2۔ "عن ابی عبیدة بن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عن ابیہ" جبکہ ابوعبیدہ کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں۔ دیکھیں: "العلل للدارقطنی: 313/5".

إِنَّ الْحَمْدَ..... وَرَسُولُهُ: اس خطبہ پر بارہا تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔

وَيَقْرَأُ ثَلَاثَ آيَاتٍ: یعنی آپ ﷺ نکاح کے خطبہ میں مذکورہ بالا خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد قرآن کریم کی تین آیات کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، جو یہ ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: 102)

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾

(النسآء: 1)

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (الاحزاب: 70-71)

مضمونِ حدیث واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ تبلیغ رسالت اور امت کی ہدایت کے بے حد حریص تھے جس کی دلیل "عَلَّمَنَا" کے الفاظ ہیں۔
- کسی شے میں آنے والی افضل شے کی وجہ سے اس پوری شے کا بھی وہی نام رکھ سکتے ہیں جیسے جن دعاؤں میں تشہد مذکور ہو ان کو تشہد کے نام پر پکار سکتے ہیں۔
- اہم کاموں سے پہلے یہ خطبہ پڑھنا مستحب ہے۔
- ساری کی ساری حمد اللہ کے ساتھ خاص اور ثابت ہے اور وہی اس کا حق رکھتا ہے۔
- مغفرت اور مدد اسی ایک اکیلے اللہ سے ہی مانگی جائے۔
- استعاذہ یعنی شرور و آفات سے پناہ مانگنا صرف اور صرف اللہ کے نام پر ہی جائز ہے۔
- رب تعالیٰ ہم پر ہماری جانوں سے زیادہ رحیم و کریم ہے۔ اس کی دلیل "مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا" کے الفاظ ہیں اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نفسوں میں شرور ہوتے ہیں۔
- جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی نہیں بہکا سکتا اور جسے اللہ ہی بے راہ کر دے اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔
- مذکورہ خطبہ میں اس بات کی طرف بلیغ اشارہ ہے کہ بندہ ہدایت پانے کے لیے صرف اور صرف اللہ کا محتاج ہے۔
- دل کے اعتقاد کو زبان پر برملا لانا واجب ہے۔ لہٰذا آدمی برملا یہ عقیدہ بیان کرے وہ صرف ایک اکیلے اللہ کو ہی الوہیت و عبادت کے قابل سمجھتا ہے، اسی سے مغفرت و مدد طلب کرتا ہے اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کا ماننے والا ہے۔
- سچا الٰہ صرف اللہ ہی ہے۔
- نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے بندے اور بشر ہیں۔
- نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے سب سے جلیل القدر رسول ہیں۔
- رب تعالیٰ کی مخلوق پر رحمت ثابت ہے۔

رشتہ کا پیغام بھیجنے کے آداب

مخطوبہ کی طرف ایک نظر دیکھنے کا حکم اور اس کے قواعد وضوابط

967، 969- وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا خَطَبَ أَحَدُكُمُ الْمَرْأَةَ، فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَنْظُرَ مِنْهَا إِلَى مَا يَدْعُوْهُ إِلَى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے تو اگر اس کے بس میں ہو (یعنی اگر اسے اس بات کا موقع ملے) کہ وہ اس کی وہ چیز دیکھ لے جو اسے اس کے ساتھ نکاح کرنے کا داعی (اور محرک) ثابت ہو تو وہ ایسا ضرور کرے۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......**إِذَا خَطَبَ أَحَدُكُمْ**: یہاں فعل سے مراد ارادۂ فعل ہے۔ خطبہ اصل میں نکاح طلب کرنے کو (دوسرے لفظوں میں یعنی ہمارے اردو محاورہ کے مطابق رشتہ مانگنے کو) کہتے ہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے ایک آدمی لڑکی والوں کی طرف رشتہ کا پیغام دے کر بھیجا جاتا تھا۔

یاد رہے کہ رشتہ مانگنے اور رشتہ کا پیغام بھیجنے کا اسلوب ہر زمانہ، معاشرہ اور لوگوں میں مختلف رہا ہے۔ اس میں اصل مدار عرف کا ہے۔ پس جو اسلوب عرف میں معیوب سمجھا جاتا ہو، وہ منع ہوگا اور جس اسلوب کو لوگ بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں، وہ مباح اور جائز بلکہ محمود ہوگا۔

فَإِنِ اسْتَطَاعَ: مراد قدرت پانا ہے کیونکہ پردہ نشین کو دیکھنا اور دیکھ سکنے میں کامیاب ہونا ایک مشکل امر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کر سکتا ہو تو اسے یہ کوشش کر لینی چاہیے۔

إِلَى مَا يَدْعُوْهُ إِلَى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ: رہا یہ سوال کہ یہاں اس عورت سے نکاح کی طرف رغبت دلانے والی وہ چیز کون سی ہے؟ تو وہ عورت کا چہرہ ہے جو جملہ محاسن کا مرکز ہوتا ہے۔ جبکہ باقی کے اعضاء اس کے تابع ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدمی خوبرو عورت کو دیکھ کر اس سے نکاح کرنے میں پیش رفت کرتا ہے۔

یاد رہے کہ یہاں دیکھنے سے عورت کے اعضاء مستورہ کی طرف دیکھنا مراد نہیں کہ وہ اشد حرام ہے اور جنابِ رسول اللہ ﷺ سے ایک حرام کے ارتکاب کی تحریک معاذ اللہ ممکن نہیں۔

فَلْيَفْعَلْ: مذکورہ لام امر کا ہے، یہ امر اباحت کے لیے ہے یا وجوب کے لیے؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ لام امر اباحت کے لیے ہے کیونکہ مذکورہ امر ممانعت اور نہی کے بعد آیا ہے کہ پہلے عورت کے چہرہ

---

[1] مسند احمد: 334/3- سنن ابی داؤد: 2082- المستدرك للحاكم: 179/2- حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔ ابن حزم نے "المحلی" (31/10) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور خود امام موصوف نے "فتح الباری" (181/9) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ جبکہ ابن قطان نے اس حدیث کو ایک علت کی بنا پر معلول کہا ہے دیکھیں: "نصب الرایة: 240/4".

کی طرف دیکھنے کی ممانعت آئی ہے اور جو امر ممانعت کے بعد آتا ہے وہ اباحت کے لیے ہوتا ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ امر ارشاد واستحباب کے لیے ہے۔ البتہ میں نے اس باب میں کسی کو اس بات کا قائل نہیں دیکھا کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ غرض اس باب میں صرف دو اقوال ہیں: (1) یہ امر اباحت کے لیے ہے۔ (2) یہ امر ارشاد واستحباب کے لیے ہے۔ پہلے قول کی دلیل بیان ہو چکی، جبکہ دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ نکاح کی غرض سے عورت کا چہرہ دیکھنے پر متعدد مصالح مرتب ہوتی ہیں۔ جیسے دونوں میں دائمی الفت کا مرتب ہونا، یا بعد میں اپنے انتخاب پر ملامت یا افسوس کا نہ ہونا وغیرہ۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جس عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ ہو، اگر ہو سکے تو اس کا چہرہ ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مناسب یہ ہے کہ جس کو نکاح کا پیغام بھیجا ہے اس کا چہرہ ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ البتہ یہ حکم مطلق نہیں بلکہ چند شروط کے ساتھ مقید ہے جو یہ ہیں:

(1) دونوں کے درمیان حرام خلوت نہ ہونے پائے۔

(2) اور یہ کہ اس کا ارادہ رشتہ کی بات کو آگے بڑھانے کا ہو، لہٰذا اگر ایسا ارادہ نہ ہو تو اجنبیہ کے چہرہ کو دیکھنے کی کوشش ناجائز اور حرام ٹھہرے گی۔

(3) تیسری شرط یہ ہے کہ آدمی کو اس بات کا گمان غالب ہو کہ اس کے پیغامِ نکاح کو قبول کر لیا جائے لہٰذا اگر معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہو تو چہرہ دیکھنے کی کوشش ناجائز ہوگی۔

(4) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ چہرہ دیکھنے کا مقصود تلذذ اور حظِ نفس نہ ہو۔ تب پھر یہ دیکھنا بقدر ضرورت وحاجت اور بقدر گنجائش ہوگا نہ کہ مطلق وبے محابا۔

(5) اور آخری شرط یہ ہے کہ اجنبیہ کے دیکھنے سے شہوت میں انگیخت اور ہیجان پیدا نہ ہونے پائے وگرنہ یہ حرام ہوگا۔

◈ شریعت اسلامیہ کے احکام کی یہ سماحت وبلندی ہے کہ وہ بندوں کو کسی بھی معاملہ میں داخل ہونے سے قبل حزم واحتیاط اور بصیرت وفراست کا حکم دیتی ہے۔

◈ شریعتِ اسلامیہ نے قلق وافسوس اور حسرت وندامت کے جملہ دروازوں کو بند کر دیا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ حزن وملال اور حسرت وندامت کا دروازہ بند کرنے کی اپنے تئیں پوری کوشش کرے۔

◈ عورتوں کی طرف دیکھنا حرام ہے۔ اس لیے صرف ضرورت وحاجت کے وقت ہی اور بقدرِ ضرورت دیکھنے کی اجازت ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ الْمُغِيرَةِ. وَعِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ وَابْنِ حِبَّانَ مِنْ

اس حدیث کا ایک شاہد جامع ترمذی اور سنن نسائی میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے [1] جبکہ ایک شاہد سنن ابن ماجہ اور صحیح ابن

---

[1] جامع الترمذي: 1087۔ سنن النسائي: 69/6۔ اس حدیث کو امام ابن حبان (4043) اور امام حاکم (179/2) نے صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔ اس حدیث کا مدار بکر بن عبداللہ المزنی پر ہے۔ امام دارقطنی نے "العلل" (137/7) میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے ان کے سماع کو ثابت کیا ہے۔

حَدِيثِ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ.

حبان میں حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔ ❶

970- وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً: ((أَنَظَرْتَ إِلَيْهَا؟)) قَالَ: لَا، قَالَ: ((اذْهَبْ فَانْظُرْ إِلَيْهَا)).

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی سے جو ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا، یہ دریافت فرمایا: ''کیا تم نے اسے (ابھی تک) ایک نگاہ دیکھا ہے؟'' اس نے عرض کیا کہ: نہیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جاؤ اور (جا کر) اسے ایک نظر دیکھ لو۔'' ❷

غریب الحدیث ......تَزَوَّجَ: یہاں بھی فعل بمعنی ارادۂ فعل ہے۔ کیونکہ جو نکاح کر چکا ہو اسے اب عورت کو نکاح کا فیصلہ کرنے کیلیے دیکھنے کی حاجت باقی نہیں رہی۔

أَنَظَرْتَ إِلَيْهَا؟: معلوم ہوا کہ نکاح سے قبل، وہ عورت جس کی طرف پیغام نکاح بھیجا ہے، کو ایک نظر دیکھنا جائز ہے۔

اِذْهَبْ فَانْظُرْ إِلَيْهَا: جب ان صاحب نے عرض کیا کہ انہوں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا، تب نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے جس کو ہم نے گزشتہ حدیث کے حوالہ سے راجح قرار دیا ہے کہ یہاں امر استحباب و ارشاد کے لیے ہے کہ جب آدمی کسی خاندان میں نکاح کرنا چاہے تو مناسب ہے کہ پہلے مخطوبہ کو ایک نظر دیکھ لے بالخصوص جن لوگوں کی خواتین میں کوئی موروثی جسمانی عیب مشہور ہو اور اس بات کی تاکید بہ نسبت اس خاندان کی عورتوں کو دیکھنے سے زیادہ ہے جن کی خواتین حسن و جمال میں مشہور ہوں۔ ❸

رہا یہ سوال کہ جو کوشش کے باوجود بھی ایک نظر دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ کیا کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا آدمی یہ کام کسی دوسرے کے ذمہ لگا دے۔ چنانچہ اس کے کسی قریبی محرم رشتہ دار سے اس بابت معلوم کرے۔ وغیرہ۔

دوسرے کے پیغامِ نکاح پر اپنا پیغامِ نکاح بھیجنے کا حکم

971- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا يَخْطُبُ أَحَدُكُمْ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ حَتَّى يَتْرُكَ الْخَاطِبُ قَبْلَهُ، أَوْ يَأْذَنَ لَهُ الْخَاطِبُ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے پیغامِ نکاح پر اپنا پیغام نہ بھیجے یہاں تک وہ پیغام بھیجنے والا اس سے پہلے (اپنا پیغام) ترک کر دے یا اسے (اپنا پیغام بھیجنے کی) اجازت دے دے۔'' ❹

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث ......لَا يَخْطُبُ: ایک روایت میں یہ الفاظ ''با'' کے سکون کے ساتھ بھی ہیں، تب پھر مذکورہ

---

❶ سنن ابن ماجه: 1864- مسند احمد: 226/4- صحيح ابن حبان: 4042- سنن البيهقي: 85/7- امام بیہقی کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں اختلاف ہے۔ اس اسناد کا مدار حجاج بن ارطاۃ پر ہے۔ حاکم (492/3) نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

❷ صحيح مسلم: 1424.

❸ جیسے ہمارے پاک و ہند میں کشمیری اور بٹ خاندان کی عورتیں خوبرو اور خوش رنگ ہوتی ہیں۔ (نسیم)

❹ صحيح البخاري: 5142- صحيح مسلم: 1412.

"لا" ناہیہ ہوگا جبکہ "با" کے "ضم" کی روایت میں یہ "لا" نافیہ ہوگا۔ نفی اور نہی میں جو فرق ہے وہ معروف ہے۔ البتہ نافیہ ہونے کی صورت میں یہ خبر بمعنی طلب ہوگی جو صریح طلب سے زیادہ ابلغ ہے۔

عَلٰی خِطْبَةِ أَخِيهِ: خِطْبَه کے معنی بیان ہو چکے ہیں اور بھائی سے مراد دینی بھائی ہے جیسا کہ بار ہا بیان ہو چکا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب تک ایک بھائی کے رشتہ کی بات چل رہی ہو، وہاں دوسرے بھائی کو اپنی بات نہ چلانی چاہیے۔

حَتّٰی یَتْرُكَ الْخَاطِبُ: خاطب سے وہی پہلا بھائی مراد ہے اور ترکِ خطبہ سے مراد اس بات کی صراحت کرنا ہے کہ اب میرا اس خاندان میں شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

أَوْ يَأْذَنَ لَهُ: یعنی وہی بھائی خاص خود اس بات کی دوسرے کو اجازت دے دے کہ وہ اسی جگہ رشتہ کی بات چلا لے۔

یہ الفاظ بتلاتے ہیں کہ جب ایک کی بات چل رہی ہو تو اس کی اجازت کے بغیر اسی جگہ رشتہ کی بات چلانا جائز نہیں اور اگر اس نے کسی دوسرے کو اجازت دے دی ہے تب بھی اس کے حق میں یہ غیر مفید ہے کیونکہ بسا اوقات خاطب اوّل کسی ایک کو تو بات کرنے کی اجازت دے دیتا ہے پر دوسرے کو نہیں دیتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ خاص اس کو رشتہ کی بات چلانے کی اجازت دے۔ تب جائز ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ اہم ترین اخلاقی مسئلہ اور پیغامِ نکاح بھیجنے کا ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تک کسی جگہ ایک کی بات چل رہی ہے کوئی دوسرا دہاں اپنی بات نہ چلائے۔ البتہ اگر وہ صراحۃً دست بردار ہو جائے یا اسے اپنی بات چلانے کی اجازت دے دے تو اس دوسرے کو اس جگہ بات چلانے کی اجازت ہوگی وگرنہ رشتہ کی بات چلانا منع ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعتِ اسلامیہ اس بات کی بے حد حریص ہے کہ مسلمانوں کے درمیان باہمی اخوت ومحبت بہر صورت قائم رہے اور ان میں کسی بھی طرح کینہ اور بغض پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لیے جب تک ایک کی نکاح کی بات چل رہی ہو، دوسرے کو اس جگہ بات نہ چلانی چاہیے۔
- معلوم ہوا کہ ایک کی بات کے دوران اپنی بات چلانا حرام ہے۔
- یہی حکم عورت کی بات چلانے کا بھی ہے۔ چنانچہ اگر ایک عورت کی کسی جگہ بات چل رہی ہو، دوسری عورت کو جائز نہیں کہ وہ اسی جگہ اپنا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرے۔
- معلوم ہوا کہ کسی ذمی یا حربی کے پیغام پر پیغام بھیج سکتے ہیں جس کی صورت یہ ہے کہ اسلام میں یہودیہ یا نصرانیہ کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو یہ معلوم بھی ہو کہ فلاں یہودی کی فلانی یہودیہ کے ساتھ نکاح کی بات چل رہی ہے تو ایک مسلمان ان کی بات کو منطقی انجام تک پہنچنے سے قبل بھی اس یہودیہ کو اپنا پیغامِ نکاح بھیج سکتا ہے۔
- اور اگر کسی کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں کے رشتہ کی بات چلی تھی، اس کا انجام کیا ہوا؟ تو حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی کسی دوسرے کو پیغامِ نکاح بھیجنا جائز نہیں۔ پس اس کی ممکنہ تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(1) دوسرے کو معلوم ہو کہ پہلے نے رشتہ چھوڑ دیا ہے یا لڑکی والوں نے رد کر دیا ہے، اس صورت میں اپنا پیغامِ نکاح بھیج سکتے ہیں۔

(2) یہ معلوم ہو کہ اس پہلے کا رشتہ طے ہو گیا۔ اس صورت میں پیغام نکاح بھیجنا صراحۃً منع اور حرام ہوگا۔

(3) یہ معلوم نہ ہو کہ اس رشتہ کا انجام ہوا کیا؟ رشتہ طے ہو گیا ہے یا ردّ ہو گیا ہے؟ تو یہ تیسری صورت میں بھی تین احوال سے خالی نہیں۔

(i)...... غالب گمان ہے یہ رشتہ طے ہو گیا ہوگا، اس صورت کا حکم واضح ہے۔

(ii)...... غالب گمان یہ ہو کہ رشتہ ردّ ہو گیا ہوگا۔ اس صورت کا بھی حکم واضح ہے۔

(iii)...... دونوں باتوں کا احتمال برابر برابر ہو۔ اب بعض علماء نے ان تینوں صورتوں کا ایک ہی حکم بیان کیا ہے کہ جب تک کسی رشتہ کی بابت حتمی بات معلوم نہ ہو جائے، اپنی بات چلانا منع ہے اور یہی راجح قول ہے کیونکہ ممانعت کا تعلق خطبہ سے ہے نہ کہ ردّ یا قبول سے، اور یہی ظاہر حدیث ہے۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ تیسری صورت میں بات چلانے کا جواز ہے کیونکہ ابھی تک اس خاطب کا عورت کے ساتھ حق قائم نہیں ہوا۔

خود کو سونپنے والی عورت کا حکم

972، 973- وَعَـنْ سَهْـلِ بْـنِ سَـعْـدٍ السَّاعِدِيِّ رضي الله عنه قَالَ: جَاءَ تِ امْرَأَةٌ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ، فَقَالَتْ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! جِئْتُ أَهَبُ لَكَ نَفْسِي ، فَنَظَرَ إِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ، فَصَعَّدَ النَّظَرَ فِيْهَا، وَصَوَّبَهُ ، ثُمَّ طَأْطَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَأْسَهُ ، فَلَمَّا رَأَتِ الْمَرْأَةُ أَنَّهُ لَمْ يَقْضِ فِيْهَا شَيْئًا جَلَسَتْ ، فَقَامَ رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِهِ ، فَقَالَ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنْ لَّمْ تَكُنْ لَكَ بِهَا حَاجَةٌ فَزَوِّجْنِيْهَا ، قَالَ : ((فَهَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ؟)) فَقَالَ : لَا ، وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَقَالَ : ((اذْهَبْ إِلَى أَهْلِكَ ، فَانْظُرْ هَلْ تَجِدُ شَيْئًا؟)) فَذَهَبَ ، ثُمَّ رَجَعَ ، فَقَالَ : لَا وَاللّٰهِ! مَا وَجَدْتُ شَيْئًا ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أُنْظُرْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ)) فَذَهَبَ ، ثُمَّ رَجَعَ ، فَقَالَ : لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَلَا خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ ، وَلٰكِنْ هٰذَا إِزَارِيْ- قَالَ سَهْلٌ : مَا لَهُ رِدَاءٌ- فَلَهَا نِصْفُهُ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَا تَصْنَعُ بِإِزَارِكَ؟ إِنْ لَبِسْتَهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهَا مِنْهُ شَيْءٌ ، وَإِنْ لَبِسَتْهُ لَمْ يَكُنْ

سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں (اس لیے) حاضر ہوئی ہوں تا کہ اپنا آپ آپ ﷺ کے سپرد کر دوں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس کی طرف دیکھا۔ پس آپ ﷺ نے اس پر نگاہ اٹھائی پھر جھکا لی پھر نبی کریم ﷺ نے اپنا سر مبارک جھکا لیا۔ پس جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تو بیٹھ گئی۔ اتنے میں آپ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک آدمی نے کھڑے ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ ﷺ کو اس کی حاجت نہیں تو اسے میرے نکاح میں دے دیجیے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے پاس (اسے مہر میں دینے کے لیے) کچھ ہے؟ ان صاحب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! (کچھ بھی) نہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ اور دیکھو کیا تمہیں کوئی چیز ملتی ہے؟'' پس وہ آدمی چلا گیا پھر لوٹ کر آیا اور عرض کرنے لگا۔ نہیں اللہ کی قسم! مجھے کچھ نہیں ملا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دیکھو (اور کچھ تلاش کر کے لے آؤ) چاہے لوہے کی کوئی انگوٹھی ہی ہو۔'' پس وہ آدمی (دوبارہ) چلا گیا پھر لوٹ کر عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسول! نہیں اللہ کی قسم! (مجھے) لوہے کی کوئی انگوٹھی

عَـلَيْكَ مِـنْهُ شَيْءٌ))، فَجَلَسَ الرَّجُلُ، حَتَّى إِذَا طَـالَ مَـجْـلِسُهُ قَامَ، فَرَآهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُـوَلِّيًـا فَـأَمَـرَ بِـهِ فَدُعِيَ لَهُ، فَلَمَّا جَاءَ، قَالَ: ((مَـاذَا مَـعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ؟)) قَالَ: مَعِي سُوْرَةُ كَـذَا، وَسُـوْرَةُ كَذَا، عَدَّدَهَا، فَقَالَ: تَقْرَأُهُنَّ عَـنْ ظَهْرِ قَلْبِكَ؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: اذْهَبْ، فَقَدْ مَلَّكْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ)).

بھی نہیں (ملی)۔ البتہ میری یہ تہبند ہے۔ حضرت سہل فرماتے ہیں: ان صاحب کے پاس (اوپر کے بدن کی) چادر بھی نہ تھی۔ (بس صرف تہبند ہی تھی۔ آگے وہ عرض کرنے لگے) سو یہ آدھی اس عورت کی ہوئی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بھلا تم اپنی (ایک) تہبند کا (اسے مہر مقرر کر کے) کیا کرو گے؟ اگر اسے تم پہنو گے تو اس پر اس کا کچھ نہ ہو گا اور اگر اسے یہ پہنے گی تو اس کا کچھ تم پر نہ ہو گا۔'' اس پر وہ آدمی بیٹھ گیا حتیٰ کہ جب اس کو بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پس نبی کریم ﷺ نے جب اسے مڑ کر جاتے دیکھا تو اسے بلانے کا حکم ارشاد فرمایا: چنانچہ اس آدمی کو بلایا گیا۔ پس جب وہ آیا تو آپ ﷺ نے (اس سے) دریافت فرمایا: ''کیا تمہیں کچھ قرآن آتا ہے؟'' اس آدمی نے عرض کیا: مجھے فلاں فلاں سورت آتی ہے اور اس نے ان سورتوں کو گنوا دیا اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم ان سورتوں کو زبانی پڑھ لیتے ہو؟'' اس نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جاؤ تحقیق میں نے اس قرآن کے بدلے تمہیں یہ عورت ملکیت میں (یعنی تمہارے نکاح میں) دے دی جو تمہیں آتا ہے۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث :......جَاءَتِ امْرَأَةٌ: یہ لفظ نکرہ ہے۔ یعنی وہ آنے والی خاتون غیر معروف تھی۔ یہ بات بارہا ذکر کی جا چکی ہے کہ صحابی رسول کے نام کے مجہول ہونے سے نفس قصہ اور حکم حدیث پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ البتہ حافظ دمیاطی نے "عیون الاثیر" (392/2) میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ خاتون حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا تھیں۔

أَهَبُ لَكَ نَفْسِي: ہبہ یہ بلاعوض دوسرے کو کچھ دینے کو کہتے ہیں۔ یعنی اس عورت نے مہر کے عوض کے بغیر خود کو نکاح میں دینے کی پیش کش کی۔ یاد رہے کہ یہ بات صرف نبی کریم ﷺ کے لیے خاص تھی کہ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو آپ ﷺ کو ہبہ کرنا چاہتی تو یہ جائز تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الاحزاب: 50)

''اور کوئی بھی مومن عورت اگر وہ اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے، اگر نبی چاہے کہ اسے نکاح میں لے لے۔ یہ خاص تیرے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔''

[1] صحيح البخاري: 5087۔ صحيح مسلم: 1425.

صَعَّدَ النَّظَرَ: یعنی اس پر نگاہ اٹھائی۔

وَصَوَّبَهُ: یعنی نگاہ نیچی فرمالی۔ کیونکہ اس وقت آپ ﷺ خاطب (نکاح کی بات کرنے والے) تھے اور خاطب کے لیے عورت کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھنا جائز ہے جس کی کافی تفصیل گزشتہ میں بیان ہو چکی ہے۔ دوسرے یہ بات آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھی کہ آپ ﷺ کے لیے عورتوں کو دیکھنا جائز تھا کیونکہ آپ ﷺ ہر قسم کے فتنہ سے محفوظ و مامون تھے۔ ثُمَّ طَأْطَأَ رَأْسَهُ: یعنی آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک جھکا لیا اور مراد یہ ہے کہ ایک دفعہ دیکھنے کے بعد اب آپ ﷺ نے اس عورت سے مستقل نگاہ اٹھالی تھی۔

فَلَمَّا رَأَتِ الْمَرْأَةُ أَنَّهُ لَمْ يَقْضِ فِيهَا شَيْئًا جَلَسَتْ: یہ بات آپ ﷺ کے حسن اخلاق میں سے تھی کہ آپ ﷺ اپنی مجلس سے کسی کو اٹھاتے نہ تھے اور نہ کسی بات سے اس کی دل آزاری ہی کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس خاتون سے یہ کہنا بھی پسند نہ فرمایا کہ میں تم سے نکاح نہیں کرنا چاہتا کہ مبادا اس کے دل کو اس سے ٹھیس پہنچے بلکہ آپ ﷺ نے کمال اخلاق سے سکوت فرمایا۔ لیکن بہرحال وہ خاتون اپنی سمجھ سے یہ بات سمجھ گئیں اور بیٹھ گئیں۔

فَزَوِّجْنِيهَا: "زَوِّجْ" بظاہر یہ امر ہے لیکن یہاں یہ وجوب کے لیے نہیں بلکہ التماس کے لیے ہے کیونکہ ایک امتی سے یہ بات متصور نہیں ہو سکتی کہ وہ پیغمبر کو امر کرے۔ البتہ یہ التماس اور امید کے باب میں سے ہے۔ یعنی ان صاحب نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کی گزارش کی کہ آپ ﷺ اس عورت کا نکاح میرے ساتھ کر دیجیے۔

فَهَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ؟: یہ "مِنْ شَيْءٍ" مبتداء موخر ہے اور اس پر "مِنْ" حرف جر زائدہ ہے البتہ اس حرف جر کی وجہ سے مبتدا میں ظاہری جر ہے جبکہ مبتدا ہونے کے اعتبار سے اس کا رفع محذوف ہے۔ پھر "شَيْءٍ" نکرہ ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن اس عموم میں یہ قید ہے کہ وہ شے مہر بننے کے قابل ہو۔ جبکہ "عِنْدَكَ" خبر مقدم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی شے ہے جو مہر بننے کے لائق ہو۔ لہٰذا اس سے مٹھی بھر جو مراد نہ ہوگا جیسا کہ ظاہریہ کا مذہب ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ شے مہر بننے کے لائق ہو۔

لَا وَاللّٰهِ: ان صاحب نے قسم کھا کر جواب دیا کہ ان کے پاس مہر کے لائق دینے کو کچھ بھی نہیں۔ اب اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ان صاحب کے پاس کچھ نہ کچھ تو تھا البتہ وہ اس لائق نہ تھا کہ وہ اس کو مہر کے طور پر اس عورت کو پیش کر سکتے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ان کو ارشاد فرمایا: کہ ایک بار گھر جا کر دیکھ لو کہ شاید مہر میں دینے کو کچھ مل جائے۔ وہ صاحب گھر گئے اور لوٹ کر بتلایا کہ انہیں گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔

اُنْظُرْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ: ان صاحب کا جواب سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جا کر دیکھو کہ شاید لوہے کی ایک انگوٹھی ہی مل جائے۔ مراد لوہے کی انگوٹھی ہی نہ تھی بلکہ مراد یہ تھی کہ کوئی تھوڑی سی شے ہی مل جائے تو وہی لے آؤ۔ ان صاحب نے لوٹ کر بتلایا کہ ایسی بھی کوئی شے نہیں ملی۔ البتہ میری یہ تہبند ہے اس خاتون کو مہر میں اس کا نصف دے سکتا ہوں۔ کیونکہ وہ صاحب تنگدست تھے۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے پاس اوپر اوڑھنے کو چادر بھی نہ تھی۔

مَا تَصْنَعُ بِإِزَارِكَ: یعنی اگر تم اسے مہر میں یہ تہبند نصف دے بھی دو تو یہ چادر تمہارے کس کام کی رہے گی۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے آگے فرمایا:

إِنْ لَبِسْتَهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهَا مِنْهُ شَيْءٌ: یعنی خود پہنو گے تو اسے اوڑھنے کو کچھ نہ ملے گا اور اگر وہ اوڑھے گی تو تم اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکو گے۔

مَاذَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ: یعنی تم کو قرآن کا کتنا حصہ آتا ہے؟ انہوں نے بتلا دیا کہ انہیں فلاں فلاں سورت آتی ہے۔ جس پر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تمہیں وہ سورتیں زبانی بھی یاد ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یاد ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: **اِذْهَبْ فَقَدْ مَلَّكْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ:** "مَلَّكْتُ": یہ "زَوَّجْتُ" کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ بعض دوسری روایات میں یہ لفظ صراحۃً آتا ہے جبکہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں "اَمْكَنَّاكَهَا" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ البتہ یاد رہے کہ الفاظ کا یہ اختلاف اس اضطراب کا سبب نہیں جو حدیث کو ضعیف بنا دیتا ہے کیونکہ یہ تینوں کلمات ایک دوسرے کے متعارض نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ کیونکہ اضطراب کے پائے جانے کی یہ شرط ہے کہ ان مختلف کلمات میں جمع ممکن نہ ہو جبکہ مترادف الفاظ کا تو ایک دوسرے پر اطلاق ممکن ہوتا ہے۔

ان کلمات میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ "بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ" میں "با" کی بابت اختلاف ہے کہ یہ "با" سببیہ ہے یا عوض کے لیے ہے؟ تو راجح قول یہ ہے کہ یہ "با" عوض کے لیے نہ کہ سببیہ ہے اور اس کی دو وجوہات ہیں:

(1) ایک یہ کہ رب تعالیٰ نے عورتوں کو مردوں کے لیے مال کے عوض حلال کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ (النسآء: 24)

''اور تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو۔''

(2) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک روایت میں "فَعَلِّمْهَا" کے الفاظ ہیں جو بتلاتے ہیں کہ یہاں "با" عوض کے لیے ہے نہ کہ سببیہ۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں یہ اہم مضامین مذکور ہیں:

⊙ ......کوئی عورت اپنا آپ کسی کو بخش نہیں سکتی۔ یہ بات صرف نبی کریم ﷺ کے لیے خاص تھی۔

⊙ ......مخطوبہ کو ایک نظر دیکھنا گزشتہ مذکورہ شروط کے ساتھ جائز ہے۔

⊙ ......نکاح کسی نہ کسی مہر کے عوض ہونا لازم ہے چاہے وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔

⊙ ......تعلیم قرآن کو مہر قرار دے سکتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ عورت خود کو نبی کریم ﷺ کو بخش سکتی تھی۔

◈ مبہم کی بابت گفتگو کر سکتے ہیں جیسا کہ اس حدیث میں حضرت سہل رضی اللہ عنہ ایک مبہم خاتون کا قصہ سنا رہے ہیں۔

◈ البتہ اگر کوئی عورت نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی سے بغیر مہر کے نکاح کرے تو اس کا نکاح تو منعقد ہو جائے گا البتہ مرد پر مہر مثل واجب ہوگا۔

اس مسئلہ کی یہ صورتیں ہیں:

(1) مہر متعین کے ساتھ نکاح کیا جائے۔

(2) مہر تو معین ہو پر نا معلوم ہو جیسے مٹھی میں بند دراہم پر نکاح کرے کہ اب یہ تو متعین ہے کہ وہ مہر ہاتھ میں بند دراہم ہیں البتہ یہ معلوم نہیں کہ وہ کتنے ہیں کہ اس قدر جہالت انعقادِ نکاح اور ثبوت مہر میں مضر نہیں۔

(3) نکاح کرے پر مہر کا ذکر نہ کرے۔ اس صورت میں بالاتفاق مہر مثل آئے گا۔

(4) مہر نہ ہونے کی شرط پر نکاح کرے۔ اس مسئلہ کی بابت دو قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا کیونکہ رب تعالیٰ نے مہر کو مال کے عوض کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں مذکور ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مختار مذہب یہی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نکاح تو صحیح ہوگا البتہ مہر مثل واجب ہوگا۔ لیکن صحیح قول پہلا ہے جو امام ابن تیمیہ کا مختار مذہب ہے۔

- مخطوبہ کو ایک نظر دیکھنا جائز ہے۔
- البتہ گزشتہ مذکورہ قیود کے ساتھ بار بار دیکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کی دلیل "فَصَعَّدَ وَصَوَّبَ" کے الفاظ ہیں۔
- بظاہر یہ حدیث بتلاتی ہے کہ عورت پر اجانب سے چہرہ کا ستر واجب نہیں لیکن یہ حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہرگز بھی نہیں۔ کیونکہ یہاں چہرہ کھولنے کا ذکر مجمل ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ چہرہ کبھی بطور جواز کے کھولا جاتا ہے اور کبھی حالت منع میں۔ یعنی عورت پر پہلے حجاب واجب نہ تھا یہ حکم پانچ یا چھ ہجری میں لازم ہوا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ واقعہ حکم حجاب کے نزول سے قبل کا ہو۔ لہٰذا اس حدیث سے چہرہ کھولنے پر استدلال محتمل ہے اور علماء کے ہاں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ احتمال کے وقت استدلال باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ حدیث سے عورت کے اجنبیوں کے سامنے چہرہ کھولنے کے جواز پر استدلال باطل ہوگا۔
- نبی کریم ﷺ کا حسن سلوک کہ آپ ﷺ نے اس خاتون کو صراحۃً یہ تو نہ فرمایا کہ میں تم سے نکاح نہیں کرنا چاہتا البتہ آپ ﷺ نے سر جھکا کر سکوت فرما لیا۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حسن ادب کہ ان صاحب نے اپنے نکاح کی خواہش کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کیا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ ﷺ کو اس عورت سے نکاح کی ضرورت نہیں تو پھر اسے میرے نکاح میں دے دیجیے۔
- نبی کریم ﷺ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ ﷺ ولی کے بغیر نکاح کر سکتے تھے۔ کیونکہ آنے والی عورت سے آپ ﷺ نے اس کے ولی کے بارے میں نہ پوچھا تھا بلکہ اس نے بلا واسطہ یہ عرض کیا کہ میں نے خود کو آپ ﷺ کے سپرد کیا۔
- پھر نبی کریم ﷺ کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ ﷺ کسی کا نکاح اس کے ولی کی طرف رجوع کیے بغیر بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب ان صاحب نے یہ عرض کیا کہ اس عورت سے میرا نکاح کر دیجیے تو آپ ﷺ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ میں تو اس کا ولی نہیں۔
- مہر تھوڑا ہو یا زیادہ جائز ہے جس کی دلیل "شَيْءٍ" کا کلمہ ہے جو نکرہ اور استفہام کے سیاق میں آیا ہے۔ جو عموم کا فائدہ دے رہا ہے اور جو قلیل و کثیر سب کو شامل ہے۔

لیکن کیا اس میں اتنا عموم ہے کہ یہ غیر متمول کو بھی شامل ہے جیسا کہ ظاہریہ کا مذہب ہے کہ جن کے نزدیک انڈے کے چھلکے

پر بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ قول بے حد ضعیف ہے۔ کیونکہ جو شے غیر متمول ہو وہ "شَـیْءٌ" کے مصداق میں داخل نہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے مال کے بدلے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مہر "مال" اور متمول ہو۔

- بنا مطالبہ کے بھی قسم اٹھا کر بات کر سکتے ہیں جیسا کہ ان صاحب نے قسم کھا کر بتلایا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔
- سربرآوردہ شخصیات کو "نہیں" کے ساتھ بھی جواب دے سکتے ہیں۔
- نبی کریم ﷺ کی حکمت کہ آپ ﷺ نے ان صاحب کو اس احتمال پر گھر بھیجا کہ ممکن ہے کہ گھر میں کوئی شے موجود ہو جو مہر بن سکے لیکن ان صاحب کو اس کا علم نہ ہو۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ادب کہ باوجود یہ بتلانے کے کہ گھر میں کچھ نہیں ملا لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ کے دوبارہ بھیجنے پر وہ صاحب چلے گئے اور آ کر بتلایا کہ اب کی بار بھی کچھ نہیں ملا اور وہ اس لیے دوبارہ گئے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ میرے تلاش کرنے پر تو کچھ نہ ملا ہو لیکن درحقیقت گھر میں کچھ ہو جس کا نبی کریم ﷺ کو بذریعہ وحی علم ہو گیا ہو۔
- لوہے کی انگوٹھی پہن سکتے ہیں۔ جس کی دلیل "اُنْظُرْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ انگوٹھی سے مقصود اس کا پہننا ہے وگرنہ اس کا کیا فائدہ۔
- معلوم ہوا کہ لوہے کی ایک انگوٹھی بھی مہر میں رکھی جاسکتی ہے۔
- معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے حد تنگدست تھے حتیٰ کہ بعض کے پاس سوائے تن کے لباس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ ان صاحب کے پاس پہننے کو معمولی سی انگوٹھی بھی نہ تھی اور صرف ایک لباس تھا۔
- معلوم ہوا کہ بدن کے اوپری حصہ کا ستر واجب نہیں۔ کیونکہ ان صاحب کے پاس بقولِ حضرت سہل کے اوپر لینے کو چادر بھی نہ تھی بس زیریں ستر ڈھانپنے کو ایک تہبند ہی تھا۔
- اپنی اشیائے ضرورت کا دوسروں پر خرچ لازم نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان صاحب سے یہ فرمایا تھا کہ اگر تم اپنی تہبند آدھی اس کو دے ڈالو گے تو خود کیا کرو گے؟
- معلوم ہوا کہ صبر وسیلہ ظفر ہے۔ کیونکہ یہ صاحب خاموشی سے بیٹھ گئے اور دیر تک صبر کیے بیٹھے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں بلا کر مہر ٹھہرانے کی ایک اور تجویز پیش کی جو کارآمد ثابت ہوئی۔ یوں ان صاحب کو صبر کے نتیجہ میں کامیابی ملی۔
- معلوم ہوا کہ مال کی بجائے منفعت کو بھی مہر مقرر کر سکتے ہیں۔ جس کی دلیل "مَلَّكْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ" کے الفاظ ہیں جن سے ثابت ہوا کہ مہر عین بھی ہوسکتا ہے اور منفعت بھی۔
- معلوم ہوا کہ تعلیم قرآن کی اجرت لے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ مفصل گزر چکا ہے۔
- مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مہر کو سپرد کرنے کی قدرت بھی شرط ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان صاحب سے یہ پوچھا تھا کہ کیا تمہیں وہ سورتیں زبانی بھی یاد ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات مصحف میسر نہیں آتا۔ لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی کو قرآن زبانی یاد نہ ہو اور دیکھ کر تعلیم دینے کی غرض سے مصحف بھی نہ ہو۔ تب پھر اگر مہر قرآن کی تعلیم تھا تو گویا کہ اس صورت میں وہ آدمی مہر کے سپرد پر قادر نہیں ہوگا۔ یوں اس بات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ مہر کا

سپرد کرنا بھی شرط ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ نکاح ان سب الفاظ سے منعقد ہو جاتا ہے جو نکاح پر دلالت کرتے ہیں جیسے: مَلَّكْتُ، زَوَّجْتُ، اَمْكَنَّاكَ۔ وغیرہ کہ ان سب کلمات سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سب الفاظ انعقادِ نکاح پر دلالت کرتے ہیں۔

وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهُ: ((انْطَلِقْ فَقَدْ زَوَّجْتُكَهَا فَعَلِّمْهَا مِنَ الْقُرْآنِ)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''جاؤ کہ میں نے تیرا اس کے ساتھ نکاح کر دیا۔ پس (اب) اسے قرآن کی تعلیم دو۔''

وَفِی رِوَایَةٍ لِلْبُخَارِیِّ ((أَمْكَنَّاكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ)).

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ہم نے اس قرآن کے بدلے جو تمہیں آتا ہے اس عورت کو تیری قدرت میں دے دیا۔''

وَلِأَبِیْ دَاوُدَ عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((مَاتَحْفَظُ؟)) قَالَ: سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَالَّتِیْ تَلِیْهَا. قَالَ: ((قُمْ فَعَلِّمْهَا عِشْرِیْنَ آیَةً)).

اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ (نبی کریم ﷺ نے ان صاحب سے دریافت فرمایا کہ) ''تمہیں (قرآن میں سے) کیا یاد ہے؟'' ان صاحب نے عرض کیا کہ سورۂ بقرہ اور اس کے ساتھ والی سورت (یعنی سورۂ آل عمران)۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اٹھو اور اس عورت کو (بطور مہر کے) بیس آیتیں سکھلا دو۔''[1]

غریب الحدیث: ......مَا: یہ ''مَا'' استفہامیہ ہے۔ یعنی ''ایّ شَیْءٍ تَحْفَظُهُ مِنَ الْقُرْآنِ'' کہ تمہیں قرآن سے کیا یاد ہے؟

سُوْرَةَ: مذکورہ لفظ کا نصب اس لیے ہے تاکہ جواب سوال کے مطابق ہو جائے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرة: 219)

''اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں، کہہ دے جو بہترین ہو۔''

کہ یہاں ''مَاذَا'' محل کے اعتبار سے منصوب ہے جس کی بابت سوال ہو رہا ہے تو جواب میں ''عفو'' کے اعراب بھی سوال کے مطابق کرنے کے لیے نصب کے آئے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ ''مَا'' محل کے اعتبار سے منصوب ہے تو اس کے جواب میں ''سورۃ'' کے اعراب بھی نصب کے ساتھ ہیں۔

بظاہر مذکورہ روایت کے الفاظ صحیحین کی روایت کے الفاظ کے معارض ہیں کہ وہاں ''بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ ہیں جبکہ یہاں ''عشرین آیۃ'' کے الفاظ ہیں۔ تب پھر محفوظ روایت صحیحین کی ہے اور سنن ابی داؤد کی روایت شاذ کہلائے گی۔

نکاح کا اعلان کرنے کا بیان

974۔ وَعَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ أَبِیْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((أَعْلِنُوا

عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے والد (ماجد حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''نکاح کا

[1] سنن ابی داؤد: 2112۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5506۔ اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 60/3.

النِّكَاحَ)). — اعلان کیا کرو۔" ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. — اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......أَعْلِنُوا : یہ خطاب اس پوری امت کو ہے اور اعلان سے مراد اظہار ہے یعنی برملا کہنا جو اِسرار یعنی پوشیدہ رکھنے کی ضد ہے۔

نکاح کے اعلان کی حکمتیں

یہ اعلان کرنا نفسِ نکاح کے اعلان کو بھی شامل ہے اور رخصتی کے اعلان کو بھی شامل ہے۔ علماء نے اعلانِ نکاح کے متعدد فوائد وحکم بیان کیے ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(1) اس سے نکاح اور اس سفاح (یعنی محض شہوت رانی) میں فرق ہو جاتا ہے جو زنا ہی ہے۔ کیونکہ سفاح یعنی زنا ہمیشہ چھپ کر کیا جاتا ہے۔

(2) ایک شرعی اور فطری شعیرہ لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ کیونکہ فطرت اور شریعت دونوں نکاح کو مقتضی ہیں۔ یوں نکاح کا اعلان دراصل شعائرِ فطرت واسلام کا اعلان ہے۔

(3) نکاح کے اعلان میں اس پاکیزہ عمل کی ترغیب اور اس کی اقتداء پر ابھارنا ہے۔

(4) اور یہ کہ نکاح کے اعلان سے منعقد ہونے والے نکاح سے، شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اس عقد کے جائز نہ ہونے کی صورت کا سد باب بھی ہو جاتا ہے۔ جسے اگر متعاقدین کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ان دونوں میں رشتہ رضاعت بھی ہے تو ان کے درمیان نکاح کے انعقاد کے اعلان سے ممکن ہے کہ وہ شخص آ کر اس عقد کو رکوا دے جس کے علم میں یہ بات ہو کہ ان متعاقدین میں تو رشتہ رضاعت ہے۔ یوں نکاح کا اعلان کرنے سے اس عقد کی ناجائز صورت کا سد باب ممکن ہو جاتا ہے۔

اعلانِ نکاح کا حکم

نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم امر کے صیغہ "أَعْلِنُوا" کے ساتھ دیا ہے اور امر میں اصل وجوب ہے۔ لیکن اہل علم میں سے کوئی اس کا قائل نہیں۔ اس لیے مذکورہ امر استحباب کے لیے ہوگا۔

عقدِ نکاح کی تمامیت کی شرط

علماء نے اس کے لیے دو باتیں شرط بتلائی ہیں: (1) اشہاد اور (2) اعلان۔

کہ اس سے عقدِ نکاح تام ہو جاتا ہے۔ پھر اگر اشہاد تو ہو پر اعلان نہ ہو یعنی نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں تو ہو لیکن لوگوں سے چھپ کر ہو تو اس نکاح کی صحت میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض نے اس کو صحیح قرار دیا ہے تو بعض نے اس میں توقف اختیار کیا ہے کیونکہ اسرار کے ساتھ اشہاد چنداں مفید نہیں۔ جبکہ اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ اعلان تو ہو پر اشہاد نہ ہو۔

❶ مسند احمد: 5/4- مسند البزار: 2214- صحیح ابن حبان: 4066- علامہ ہیثمی: (289/4) کہتے ہیں کہ: امام احمد کے رجال ثقہ ہیں اور امام حاکم نے "المستدرك" (200/2) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

جیسے ولی کے سامنے بدون اعلان کے ایجاب وقبول ہو جائے اور اعلان بعد میں ہو تو اس عقد کی صحت میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔البتہ راجح قول اس کے صحیح ہونے کا ہے اور یہی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مختار مذہب ہے۔

نکاح میں ولی کا شرط ہونا

975، 976- وَعَنْ أَبِيْ بُرْدَةَ بْنِ أَبِيْ مُوسَى عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ)).

ابو بردہ بن حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد رضی اللہ عنہ (جناب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بنا ولی کے کوئی نکاح نہیں۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِينِيِّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَأُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ ابن المدینی، ترمذی اور ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔البتہ اس حدیث میں ارسال کی علت بیان کی گئی ہے۔

وَرَوَى الْإِمَامُ أَحْمَدُ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ مَرْفُوْعًا ((لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَشَاهِدَيْنِ)).

جبکہ امام احمد نے حسن کے واسطے سے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ''ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' ❷

غریب الحدیث :......لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ: مذکورہ "لا" نفی جنس کا ہے اور یہاں نفی وجود کی نفی نہیں۔ کیونکہ ولی کے بغیر ہونے والا نکاح بحیثیت نکاح کے تو پایا گیا ہے۔پس یہاں نفی حسی تو پائی نہیں گئی لہٰذا پھر نفی سے مراد نفی شرعی ہوگی جس سے مراد نفی صحت ہے اور مذکورہ نفی کو نفیِ کمال پر محمول کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ جب اس نفی کو صحت کی نفی پر محمول کرنا ممکن ہے تو کمال کی نفی کی طرف منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔تب پھر اس ولی کے بغیر نکاح درست نہ ہوگا جو اس عقد کا ذمہ دار اور نگران ہو۔ ولی کے لیے شرط ہے کہ وہ عصبہ میں سے یعنی قریبی عصبہ میں سے ہو، اس بنا پر ذوالارحام یا ماں شریک بھائی ولی نہ بنیں گے کیونکہ وہ عصبہ میں سے نہیں ہوتے۔

بنا ولی کے عدمِ صحت نکاح کی حکمت

اس میں حکمت یہ ہے کہ ولی نفع ونقصان کو بہتر سمجھتا ہے، اس کی نگاہ ان نتائج وعواقب تک جاتی ہے جہاں تک ایک کم سن لڑکی کی نہیں جاسکتی۔

دوسرے جو صبر وتحمل، غور وتدبر، اور سنجیدگی ومتانت ایک ولی میں ہوتی ہے عموماً ایک عورت میں مفقود ہوتی ہے۔ کیونکہ عورت سطحی عقل ونظر کی مالک ہوتی ہے جو معمولی سی چکنی چپڑی باتوں کے بھی جھانسے میں آجاتی ہے جس سے وہ اپنا نقصان کر

---

❶ مسند احمد: 413/4- سنن ابی داؤد؛ 2085- جامع الترمذی: 1101- سنن ابن ماجہ: 1881- صحیح ابن حبان: 4077- امام ترمذی رحمہ اللہ "العلل" (ص:155) پر فرماتے ہیں۔میرے نزدیک حدیث ابی بردہ اصح ہے۔امام بیہقی رحمہ اللہ (108/7) نے ابراہیم بن جبلہ تک اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن المدینی کو یہ کہتے سنا ہے کہ "لا نکاح الا بولی" والی حدیث صحیح ہے۔

❷ مجھے حضرت عمران رضی اللہ عنہ والی یہ حدیث مسند احمد میں نہیں ملی البتہ اس حدیث کو عبدالرزاق (10473) نے روایت کیا ہے اور عبدالرزاق کے طریق سے طبرانی نے "المعجم الکبیر" (299,142/18) میں یہ حدیث روایت کی ہے۔علامہ ہیثمی (287/4) فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں عبداللہ بن محرز ہے جو متروک راوی ہے۔

بیٹھتی ہے۔اس لیے ایک عورت کے حق میں رب تعالیٰ کی رحمت اور عنایت ورعایت یہی ہے کہ وہ ولی کو بیچ میں ڈالے بنا اپنا نکاح نہ کرے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بنا ولی کے نکاح درست نہیں ہوتا۔تب پھر ولی کی موجودگی صحت نکاح کے لیے شرط ہوگی۔اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ (البقرة: 221) ''اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

یہاں رب تعالیٰ نے عورتوں سے خطاب کر کے یہ نہیں فرمایا:"وَلَا يَنْكِحْنَ الْمُشْرِكِيْنَ" کہ یہ عورتیں مشرکوں سے نکاح نہ کریں بلکہ یہ فرمایا کہ عورتوں کے ولی ان عورتوں کے نکاح مشرکوں سے نہ کریں۔ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔کہ یہاں رب تعالیٰ نے ''اِنکاح'' (نکاح کرانے) کو منکوح کے علاوہ کی طرف مضاف کر کے ذکر فرمایا ہے اور وہ ولی ہے۔

◈ ولی کا عاقل بالغ اور سمجھ دار ہونا شرط ہے کیونکہ ولی کی وساطت سے نکاح کرنے کی مصلحت تب ہی محقق ہوسکتی ہے جب خود ولی بھی سلیم العقل اور فہیم ورشید ہو۔

◈ اور یہ کہ اس ولی کو عورت پر ولایت بھی حاصل ہو۔تب پھر کوئی کافر کسی مسلمان عورت کا ولی نکاح نہیں بن سکتا۔کیونکہ کسی کافر کو کسی مسلمان پر کوئی ولایت نہیں۔

◈ جب دو ولی اکٹھے ہو جائیں تو مقدم وہ ہوگا جو عورت کے زیادہ قریب ہو چنانچہ باپ اور دادا کے زندہ ہونے کی صورت میں مقدم باپ ہوگا کیونکہ وہ زیادہ قریب ہے۔

◈ جو روایت امام احمد نے مرفوعاً ذکر کی ہے وہ ''شاہدین'' کے اضافہ کے حق میں ضعیف ہے۔جبکہ "لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ" کے الفاظ صحیح ہیں کیونکہ حدیث ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اس کا شاہد ہے۔

ولی کی اجازت کے بغیر عورت کے نکاح کرنے کا حکم

977- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ ، فَإِنْ دَخَلَ بِهَا فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا ، فَإِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهُ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرتی ہے تو اس کا نکاح باطل ہے، پھر اگر مرد نے اس سے دخول کر لیا ہے تو مرد نے اس کی شرمگاہ کو جو حلال کیا ہے اس کے عوض اس کو مہر ملے گا۔ پھر اگر (لڑکی کے اولیاء) وہ (استحاقِ ولایت میں) باہم جھگڑیں تو جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی حاکم ہوتا ہے۔'' ❶

❶ مسند احمد: 47/6- سنن ابی داؤد: 2083- جامع الترمذی: 1102- سنن ابن ماجه: 1879- صحیح ابن حبان: 4074- المستدرك للحاكم: 182/2- اور خود امام موصوف نے "فتح الباری" (494/9) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَبُوْ عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے۔ جبکہ ابوعوانہ، ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث......**أَيُّمَا امْرَأَةٍ**: اَيُّ: یہ مبتدا اور مضاف ہے اور "مَا" یہ زائدہ ہے اور "امْرَأَةٍ" یہ مضاف الیہ ہے۔ پھر یہ مذکورہ "اَيُّ" شرطیہ بھی ہے۔ اس لیے "امْرَأَةٍ" میں عموم ہوگا۔ کیونکہ "امْرَأَةٍ" نکرہ ہے اور نکرہ جب شرط کے تحت آتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ لہٰذا یہ لفظ کنواری اور شوہر دیدہ دونوں عورتوں کو شامل ہوگا۔

بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا: یہاں "بِغَيْرِ وَلِيِّهَا" کے الفاظ نہیں بلکہ "بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا" کے الفاظ ہیں کیونکہ بسا اوقات ولی توکیل کے واسطے سے بھی اجازت دے دیتا ہے۔ گو مباشرت بالنفس (یعنی خود بیٹھ کر نکاح کرانا) یہ اجازت سے اقوی ہوتا ہے۔

فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ: باطل: لغت عربیہ میں باطل محض بے کار اور رائیگاں جانے والی چیز کو کہتے ہیں لہٰذا باطل عقد وہ کہلائے گا جس کا کوئی اثر مرتب نہ ہو۔ اب چونکہ نکاح سے بے حد عظیم اثرات عالم آشکارا ہوتے ہیں، جیسے ایک عورت کا دوسرے کے لیے حلال ہونا، اس کے بطن سے اولاد ہونا، ان کے نان نفقہ اور سکنی وغیرہ کا واجب ہونا وغیرہ۔ پس اگر نکاح باطل ہوا تو نکاح پر مرتب ہونے والے یہ تمام احکام ثابت نہ ہوں گے۔

فَإِنْ دَخَلَ بِهَا: دَخَلَ کا فاعل اس کی ضمیر ہے جس کا مرجع خاوند ہے اور وہ معہود فی الذہن ہے کیونکہ سیاق کلام اس کو مقتضی ہے اور "دَخَلَ بِهَا" سے مراد جماع کرنا ہے۔

فَلَهَا الْمَهْرُ: مراد مدخول بہا عورت ہے کہ جس کا نکاح باطل تھا اور اس سے زوج نے دخول کر لیا تو وہ مہر کی مستحق ٹھہرے گی۔

بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا: مذکورہ "با" عوض کے لیے ہے۔ یعنی اس زوج نے اس کی شرمگاہ کو جو حلال کیا ہے اس کے بدلے میں وہ عورت مہر کی مستحق ٹھہرے گی۔

یہاں نبی کریم ﷺ نے "فَإِنْ دَخَلَ بِهَا فَهِيَ زَوْجَتُهُ" نہیں فرمایا کہ ایسے نکاح کی صورت میں اگر اس عورت کے ساتھ دخول ہو جائے تو وہ اس شخص کی بیوی قرار پائے گی۔ لیکن چونکہ وہ عورت اس پر حرامی تھی اس لیے وہ اس کی بیوی تو نہ کہلائے گی البتہ ایک عقد فاسد میں شرمگاہ حلال کیے جانے کے عوض مہر کی مستحق ٹھہرے گی۔ کیونکہ نکاح یا اس کے ملحق عقد کے عوض عورت مہر کی مستحق بن جاتی ہے۔

فَإِنِ اشْتَجَرُوا: مذکورہ فعل کا فاعل جمع مذکر غائب کی ضمیر ہے جو 'اولیاء' کی طرف لوٹتی ہے اور یہ مرجع گو مذکور نہیں لیکن سیاق کلام اس کو مقتضی ضرور ہے اور وہ سیاق یہ الفاظ ہیں: "بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا".

رہا یہ سوال کہ اولیاء میں عورت کے نکاح کی بابت جھگڑا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ باپ ایک جگہ بیاہنا چاہتا ہو جبکہ چچا دوسری جگہ اور اس بات پر دونوں میں جھگڑا ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے دیہاتوں میں ایسے جھگڑے آئے دن کا معمول ہیں۔

فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهُ: یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اولیاء میں نکاح کی بابت جھگڑا ہو جائے تو ایسی عورت کا نکاح سلطان کرائے گا۔ بلکہ آپ ﷺ نے ایک عام قاعدہ بیان فرما دیا۔

یہاں سلطان سے مراد وہ شخص ہے جسے مکانِ عقد میں سلطنت و اختیار حاصل ہو، البتہ بلادِ کفار میں وہاں کے حکام کو مسلمانوں پر سلطنت و اختیار حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ وہاں کی مسلم آبادی کا بڑا یا خاندان کا بڑا سلطان کہلائے گا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر تین مسائل بیان کیے گئے ہیں:

(1) ولی کی موجودگی یا اجازت کے بغیر نکاح باطل ہوتا ہے۔

(2) فاسد نکاح کی صورت میں اگر عورت سے دخول ہو جائے تو وہ مہر کی مستحق تو بنے گی پر اس کی بیوی نہ کہلائے گی۔

(3) اولیاء میں اختلاف کی صورت میں عورت کے نکاح کا اختیار سب سے اقرب ولی کو ہوگا۔ ورنہ سلطانِ وقت ولی ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ولی کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح کرنا باطل ہے۔ یہی حکم عورت کی توکیل کا بھی ہے۔
- البتہ ولی کے وکیل کا نکاح کروانا جائز ہے کیونکہ یہ اذن پر مشتمل ہے۔
- شریعت کی زبان اور اصطلاح میں باطل اور فاسد دونوں کا حکم ایک ہے۔
- جس نے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے والی عورت کو دخول سے قبل چھوڑ دیا تو ایسی صورت میں وہ عورت مہر کی مستحق نہ ہوگی۔ رہا خلوتِ صحیحہ کی بنا پر نصف مہر کا استحقاق تو علماء کا اس بارے اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چونکہ خلوت جماع کے مشابہ ہے لہٰذا وہ شبہ کی بنا پر نصف مہر کی مستحق ٹھہرے گی۔
  جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ خلوت کی صورت میں وہ نصف مہر کی مستحق نہ ہوگی کیونکہ حدیث دخول کے ساتھ مقید ہے۔ لیکن اقرب قول پہلا ہے۔
- اولیاء میں اختلاف کی صورت میں عورت کے نکاح کا حق سلطان کو ہوگا اور مراد یہ نہیں کہ تب پھر وہ خود عقدِ نکاح کا انعقاد کروائے گا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا اگر سب ہی پیچھے ہٹ گئے تو پھر خود ولی آگے بڑھے گا یا اپنے نائب کے ذریعے نکاح منعقد کروائے گا۔
- مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف نہایت بلیغ اشارہ ہے کہ یہ امت کبھی سلطان کے بغیر نہ رہے گی۔

نکاح میں عورت کی رضا شرط ہے

978- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَأْمَرَ، وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ))، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَكَيْفَ إِذْنُهَا؟ قَالَ: ((أَنْ تَسْكُتَ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس عورت کا خاوند نہ ہو اس کا نکاح نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس سے پوچھ لیا جائے اور کنواری کا نکاح نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس سے اجازت لے لی جائے۔'' لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بھلا کنواری کی طرف سے اجازت کیونکر ہو گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(کنواری کی طرف سے اجازت یوں ہوگی) کہ وہ (پوچھنے پر) خاموش رہے۔'' [1]

[1] صحيح البخاري: 5136- صحيح مسلم: 1419.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

979- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((الثَّيِّبُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَأْمَرُ وَإِذْنُهَا سُكُوتُهَا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے آپ کی مستحق ہوتی ہے اور کنواری سے پوچھا جائے گا اور اس کی اجازت اس کا سکوت ہے۔'' ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

وَفِي لَفْظٍ: ((لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيِّبِ أَمْرٌ، وَالْيَتِيمَةُ تُسْتَأْمَرُ)).

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''ولی کو شوہر دیدہ کی بابت کوئی اختیار نہیں اور یتیم بچی سے پوچھا جائے گا۔'' ❷

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

980- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ، وَلَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی عورت کسی عورت کو نہ بیاہے اور نہ عورت خود کو ہی بیاہے۔'' ❸

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ اور امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کے حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔

شرح :...... یہ تینوں احادیث ایک مسئلہ کے گرد دائر ہیں کہ آیا نکاح میں منکوحہ کی اجازت شرط ہے یا نہیں یہ تینوں اس مسئلہ کے حکم کو بیان کرتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے پہلی حدیث پر کلام درج کیا جاتا ہے:

غریب الحدیث :...... **لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ**: "لَا تُنْكَحُ" یہ "لَا تُزَوَّجُ" کے معنی میں ہے اور "اَيِّم" سے مراد وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ ہو چاہے پہلے شادی کی تھی یا نہیں۔

حَتّٰى تُسْتَأْمَرَ: مراد یہ ہے کہ اس کی رائے معلوم کر لی جائے کہ وہ اس بارے کیا کہتی ہے اور اس کی رائے اور امر کو اس کے قول سے لیا جائے گا۔ جیسے وہ یہ کہے کہ ہاں! میری شادی فلاں سے کر دو۔

اَلْبِكْرُ: یہ کنواری کو کہتے ہیں جس نے ابھی تک شوہر نہ دیکھا ہو۔

حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ: جس کی صورت یہ ہے کہ ہم اس سے یہ کہیں گے کہ ہم فلاں فلاں سے تیری شادی کرنے والے ہیں اور یوں نہ پوچھا جائے گا کہ کیا تمہیں یہ رشتہ پسند ہے؟ کیا تم اس پر راضی ہو؟ یا کیا تم اس کی اجازت دیتی ہو؟ کہ یوں نہ کہا

---

❶ صحیح مسلم: 1421.

❷ سنن ابی داؤد: 2100- سنن النسائی: 6/85- صحیح ابن حبان: 4089- امام بیہقی "الخلافیات" میں کہتے ہیں: اس روایت کے رجال ثقہ ہیں اور صاحب "الاقتراح" کہتے ہیں: یہ روایت شیخین کی شرط پر ہے۔ دیکھیں: "خلاصۃ البدر المنیر: 2/188.

❸ سنن ابن ماجہ: 1882- سنن الدار قطنی: 3/227- اس حدیث کی اسناد میں محمد بن مروان ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: اس کی حدیث کا ضعیف ہونا واضح ہے۔ دیکھیں: الکامل: 6/263.

جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہم فلاں سے تیری شادی کرنے والے ہیں۔
وَكَيْفَ إِذْنُهَا: البتہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اشکال اس بات پر ہوا کہ ایک کنواری کس طرح اجازت دے گی۔ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: کہ اس کا سکوت ہی اس کی اجازت ہوگا اور اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اس پر تو حیاء اور خجالت کا غلبہ رہتا ہے بھلا وہ کیونکر صراحتہ یہ کہے گی کہ ہاں میری شادی فلاں سے کردو۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ شوہر دیدہ سے اس کی رائے لی جائے گی جبکہ کنواری کی خاموشی ہی اس کی رائے کا اظہار ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شوہر دیدہ سے اس کی رائے لیے بغیر اس کا نکاح کرنا حرام ہے۔ کیونکہ "لَا تُنْكَحُ" یہ نفی بمعنی نہی ہے۔
- شریعت کی یہ حکمت ہے کہ اس نے کنواری اور شوہر دیدہ کے احکام میں فرق رکھا ہے۔
- احکام میں علل ومعانی کی رعایت شریعت اسلامیہ کا امتیازی وصف ہے۔
- منکوحہ کی رضا معلوم کرنا صحت نکاح کے لیے شرط ہے چاہے نکاح کرنے والا ولی باپ ہی ہو۔
- اسی پر قیاس کر کے یہ حکم بھی معلوم ہو گیا کہ زوج کی رضا بھی شرط ہے لہٰذا اگر اس کا نکاح زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔

اب دوسری حدیث پر کلام ملاحظہ ہو۔

غریب الحدیث :......**الثَّيِّبُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا**: یعنی نکاح کے باب میں شوہر دیدہ کی طرف رجوع کیا جائے گا، اس کی رائے لی جائے گی اور اس سے خوب خوب مشاورت کی جائے گی اور صرف اتنا کہنا کافی نہ ہوگا کہ فلاں کا رشتہ آیا ہے کیا تم اس پر راضی ہو، نہیں بلکہ اس سے پوری تفصیلی بات ہوگی کہ وہ نوجوان ہے یا عمر رسیدہ، عالم ہے یا جاہل، غنی ہے یا فقیر وغیرہ۔

غرض اس پر اس رشتہ کا ہر پہلو آشکارا کیا جائے گا۔ کیونکہ شوہر دیدہ عورت اپنی جان کی زیادہ مختار ہوتی ہے۔

دوسرا مسئلہ اس روایت میں کنواری سے اجازت لینے کا ہے، وہ گزشتہ روایت میں مفصل ذکر ہو چکا ہے۔

لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيِّبِ أَمْرٌ: یہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں جو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شوہر دیدہ کی شادی کرانے میں ولی کو اختیار نہیں بلکہ اس کا اختیار خود اسے ہے۔ چنانچہ اگر وہ ایک رشتہ پر تیار ہو جائے تو ولی اس نکاح کو کرا دے گا اور اگر وہ چاہے تو وہ کسی رشتہ کو رد بھی کر سکتی ہے چاہے ولی اس رشتہ پر مصر بھی ہو۔

وَالْيَتِيمَةُ تُسْتَأْمَرُ: یتیمہ اس نابالغ لڑکی کو کہتے ہیں جس کا باپ وفات پا چکا ہو۔ بظاہر اس سے کنواری لڑکی مراد ہے جو بلوغت کے قریب ہو تو اس سے اجازت لی جائے گی جس کا طریقہ مذکور ہو چکا ہے۔ وگرنہ نابالغ لڑکی کی تو اجازت بھی معتبر نہیں کیونکہ نابالغہ کا نکاح اولیاء میں سے کوئی بھی نہیں کرا سکتا۔ اس لیے کہ اس کی اجازت معتبر نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہاں یتیمہ سے وہ لڑکی مراد ہوگی جو بالغ ہونے کے قریب اور شادی کے لائق ہو گئی ہو۔

رہی تیسری روایت تو اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: کہ ایک عورت کسی دوسری عورت کے نکاح کی ذمہ دار

نہیں بن سکتی۔

لَا تُـزَوِّجُ الْـمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ: "لَا تُزَوِّجُ" یہ جملہ خبریہ ہے اور مذکورہ نفی نہی کے معنی میں ہے۔ تب پھر ماں کو بھی اپنی بیٹی کی شادی کرانے کا اختیار نہ ہوگا۔

لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا: عورت خود اپنی شادی بھی نہ کرائے گی چاہے وہ عاقلہ ہی ہو۔ لہٰذا اس بات پر عورت کی توکیل اور وکیل عورت کا نکاح کرانا بھی درست نہ ہوگا۔ کیونکہ جب خود اس کا اپنا نکاح کرانا درست نہیں تو دوسری کسی عورت کا نکاح کرانا بدرجہ اولیٰ درست نہ ہوگا۔

یہ حدیث بھی دراصل اسی مسئلہ کو بیان کر رہی ہے کہ عورت کا نکاح اس کا ولی کرائے گا۔ جیسا کہ قرآن وسنت اس بات کے شرط ہونے کو بیان کرتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یتیمہ سے مراد وہ لڑکی ہے جس کی ابھی تک شادی نہ ہوئی ہو، اس سے اجازت لینا ضروری ہے جس کی صورت مذکور ہو چکی۔
- عورت کا خود اپنا یا کسی دوسری عورت کا نکاح کروانا منع ہے۔
- شریعتِ اسلامیہ بے حد حکمت پر مبنی ہے۔
- شریعتِ اسلامیہ عورت کے حقوق کی سب سے زیادہ محافظ ہے جبکہ جاہلیت میں عورت کو اس باب میں بے حد جبر وتشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔
- ولایت جیسا امر کسی اہل کو ہی سونپا جائے گا جو اس امر کی ذمہ داری کو بہتر طور پر نبھا سکے۔
- یہ تینوں روایات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ عورت عقل وفہم میں ناقص ہوتی ہے۔

ادلے بدلے کی شادی کا بیان

981- وَعَـنْ نَـافِـعٍ عَـنِ ابْنِ عُمَـرَ رضی اللہ عنہما قَـالَ: ((نَهَـى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَـنِ الشِّغَارِ وَالشِّغَارُ أَنْ يُـزَوِّجَ الـرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلَى أَنْ يُزَوِّجَهُ الْآخَرُ ابْنَتَهُ ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا صَدَاقٌ)) .

نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے "شِغار" سے منع فرمایا۔ اور شغار یہ ہے کہ آدمی اپنی بیٹی (یا بہن) کی شادی اس شرط پر کرے کہ وہ دوسرا اپنی بیٹی (یا بہن) اس کے نکاح میں دے گا اور دونوں کے درمیان کوئی مہر نہ ہوگا۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

وَاتَّـفَـقَـا مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَلَى أَنَّ تَفْسِيرَ الشِّغَارِ مِنْ كَلَامِ نَافِعٍ .

اور ایک دوسرے طریق سے شیخین رحمہ اللہ یہ بات بھی بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ شغار کی یہ مذکورہ تفسیر نافع کا کلام ہے۔

غریب الحدیث:......**نَهَى عَنِ الشِّغَارِ**: شغار یہ "شَاغَرَ يُشَاغِرُ شِغَارًا" کا مصدر ہے اور یہ بابِ مفاعلہ سے ہے جو فعل میں طرفین کے اشتراک کو بتلاتا ہے۔ تب پھر یا تو یہ شغور سے مشتق ہے جس کا معنی "خالی ہونا" ہے اور یا پھر یہ

[1] صحيح البخاري: 5112- صحيح مسلم: 1415.

"شَغَرَ الکلبُ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کتے کا ایک ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا۔غرض یہ لفظ ان دونوں معانی سے ہی ماخوذ ہوسکتا ہے اوراس بات میں کوئی مانع نہیں۔

اب رہی شغار کی مذکورہ تفسیر جو بقول شیخین رحمہ اللہ کے نافع نے بیان کی ہے، یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کلام بھی ہوسکتا ہے، خود نافع کا بھی ہوسکتا ہے اور نافع سے روایت کرنے والے راوی مالک کا بھی ہوسکتا ہے جس کو وہ نافع سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں یہ کلام مرفوع مروی نہیں ہے۔ البتہ یہ تعارض بہر حال نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ پہلے یہ تفسیر جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کی ہو، پھر ان سے نافع نے، اور پھر ان سے مالک نے بیان کی ہو اور بعد کے رواۃ نے یہ تفسیر بیان کرتے ہوئے اس کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب نہ کیا ہو۔

وَالشِّغَارُ أَنْ يُزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلَى: ..... یہ شغار کی تفسیر ہے (جس کو ہماری اردو زبان میں "بٹے" کی شادی یعنی ادلے بدلے کی شادی کہتے ہیں [1]) اور مذکورہ "عَلَى" شرط کے معنی کو بیان کرتا ہے۔ یعنی دوسرا نکاح یہ پہلے نکاح کے لیے شرط ہوگا۔ کہ پہلا آدمی دوسرے کو اپنی بیٹی اس شرط پر نکاح میں دے گا کہ وہ دوسرا اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے اور "اِبْنَتَهُ" کا لفظ بطور مثال کے ہے۔ ایسا بہن کی بابت شرط کر کے بھی کیا جاسکتا ہے۔ البتہ بیٹی کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ زیادہ واضح مثال بنتی ہے۔

وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا صَدَاقٌ: صداق سے مراد مہر ہے۔غرض جب دو آدمیوں کے درمیان اس طور پر نکاح اس شرط پر ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی اپنی منکوحہ کو مہر نہ دے گا تو یہ منع ہوگا اور یہ ممانعت بالکل ظاہر ہے جیسا کہ مفصل گزرا کہ مہر دینا واجب ہے اور مہر مقرر کرنے کی کتنی صورتیں ہیں؟ ان کو ذکر کر دیا گیا ہے مذکورہ صورت میں ہر ایک نے اپنی عورت کی شرمگاہ کو دوسرے کے لیے مہر مقرر کیا ہے۔ یہ جائز نہیں کیونکہ نکاح کو مال کے عوض کرنے کا حکم ہے اور عورت کی شرمگاہ مال نہیں۔ پھر اگر اس صورت کو جائز قرار دے بھی دیا جائے تو یہ طریق بسا اوقات اپنی بیٹی یا بہن کو غیر کفو میں بیاہنے کا سبب بن جاتا ہے۔ جو "ولایت اب" یعنی باپ کی ضمانت کی امانت کو ضائع کرنا ہے۔

پھر بسا اوقات نکاح کا یہ طریق جبری نکاح کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ ولی کبھی اپنی غرض کے حصول کے لیے بیٹی یا بہن زبردستی دوسرے کے نکاح میں دے دیتا ہے۔

اور ممانعت کی چوتھی وجہ تو بالکل بدیہی ہے کہ نکاحِ شغار دو قبیلوں اور خاندانوں میں نزاع وخصومت کا اکثر سبب بن جاتا ہے اور یہ بات ہر کس و ناکس کے مشاہدے میں ہے۔ چنانچہ نکاحِ شغار میں اگر ایک رشتہ بگڑتا ہے تو بدلے میں دوسرا رشتہ بلا وجہ اور زبردستی بگاڑ دیا جاتا ہے۔

غرض انہی مذکورہ بالا مفاسد اور خرابیوں کی بنا پر شریعتِ اسلام نے نکاحِ شغار کی ممانعت بیان کی ہے۔ البتہ مذکورہ حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ مذکورہ شغار تب ثابت ہوتا ہے جب یہ دو باتیں یعنی شرطیں پائی جائیں:

(1) ایک یہ کہ پہلے نکاح کو دوسرے نکاح کے انعقاد کی شرط رکھا جائے۔

(2) اور دونوں نکاح بغیر مہر کے ہونے شرط رکھے جائیں۔

---

[1] پنجابی زبان میں اسے "وٹہ سٹہ" کی شادی کہتے ہیں۔ (نسیم)

تب پھر ایک رشتہ ہو جانے کے بعد دوسرے نے محض اپنی رضا سے دوسرا رشتہ کر دیا تو یہ شغار نہ کہلائے گا اور یہ دونوں نکاح درست ہوں گے۔ البتہ یہاں دونوں نکاح مہر کے بدلے ہونا شرط ہوں گے۔

جبکہ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ادلے بدلے کی شادی تو کریں البتہ مہر بھی مقرر کریں تو بھی یہ ممنوعہ شغار کی تعریف میں داخل نہ ہوگا۔ البتہ یہاں ایک دوسری شرط بھی ہے، وہ یہ کہ دونوں منکوحہ بچیاں اس نکاح پر راضی بھی ہوں۔ جیسا کہ یہ شرط گزشتہ روایات سے ماخوذ ہے۔

اور تیسری شرط یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک زوج عورت کا کفو بھی ہو۔ لہٰذا اگر ایک عورت کا خاوند اس کا کفو نہ ہوگا تو یہ نکاح درست نہ ہوگا۔ تب پھر اگر یہ شروط متحقق ہوں تو نکاحِ شغار درست ہوگا۔ لیکن اس سب کے باوجود نکاحِ شغار مفاسد سے خالی نہیں کیونکہ اگر ایک رشتہ میں تلخی آتی ہے تو دوسرے میں لامحالہ تلخی آتی ہے اور بالآخر اس رشتہ کا انجام بھی تفریق پر ہوتا ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس لیے فی زمانہ نکاحِ شغار سے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نکاحِ شغار حرام ہے۔ کیونکہ نہی میں اصل تحریم ہے۔
- اگر نکاحِ شغار منعقد کر لیا جائے تو یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ یہ نکاح منع ہے۔
- یہاں سے بھی یہ امر خوب واضح ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ عورت کے حقوق کی زبردست علم بردار اور محافظ ونگہبان ہے۔
- شریعتِ اسلامیہ نے خصومت ونزاع کے سب دروازے بند کر دیے ہیں۔

زبردستی بیاہی گئی عورت کے اختیار کا بیان

982- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما ((أَنَّ جَارِيَةً بِكْرًا أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ، فَخَيَّرَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ)).

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کر دیا جبکہ اسے (یہ رشتہ) ناپسند ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے اسے (اس نکاح کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا) اختیار دے دیا۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَأُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس روایت میں یہ علت بیان کی گئی ہے کہ یہ روایت مرسل ہونے کی علت بیان کی گئی ہے۔

غریب الحدیث :...... الْجَارِيَةُ: اس لفظ کا اطلاق کم سن لڑکی پر بھی ہوتا ہے اور باندی پر بھی ہوتا ہے۔ جبکہ مطلق عورت ذات پر بھی اس لفظ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ بِكْرًا: یہ عطفِ بیان ہے۔ یعنی وہ لڑکی ابھی تک کنواری تھی نہ کہ شوہر دیدہ۔ وَهِيَ كَارِهَةٌ: یہ جملہ حالیہ ہے۔ یعنی والد نے اس حال میں یہ نکاح کیا کہ اس لڑکی کو یہ رشتہ پسند نہ تھا اور وہ اس نکاح

---

[1] مسند احمد: 273/1، سنن ابی داود: 2096، سنن ابن ماجہ: 1875، سنن البیہقی: 234/3 امام بیہقی فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔

پرراضی نہ تھی۔

فَخَيَّرَهَا: یہ تخییر اس نکاح کو باقی رکھنے یا ختم کرنے کی تھی۔

وَأُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ: کسی حدیث میں "علت" اس وصف کو کہتے ہیں جو بے حد خفی ہوتی کہ ہر ایک اس پر مطلع نہ ہو۔ ایسی علت حدیث میں قدح کا باعث ہوتی ہے اور امام ابن حجر رحمہ اللہ نے "نخبة الفكر" میں اس کو غامض ترین علت کہا ہے۔

بلاشبہ ارسال حدیث میں علت ہے کیونکہ اس سے سند کا اتصال ختم ہو جاتا ہے۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں یہ اہم ترین مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نکاح چاہے ولی ہی کراتا ہے لیکن بہر حال وہ منکوحہ پر زور زبردستی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا منکوحہ کی رضا ضروری ہے اور اگر اس کا جبری نکاح کر دیا گیا تو اسے یہ نکاح باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- آدمی اپنے خاص حقوق کی بابت قاضی کے سامنے اپنے باپ کی بھی شکایت کر سکتا ہے۔
- اگر چہ کنواری لڑکی کے نکاح کا ولی اس کا باپ ہی ہے لیکن بہر حال امرِ نکاح لڑکی کی رضا اور مرضی کی طرف ہی لوٹتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ ولی کا دوسرے کے حق میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز ہے البتہ اس کی تنفیذ یا ردّ دوسرے کی اجازت یا رد پر موقوف ہوگا۔
- شریعتِ اسلامیہ ہر مظلوم کو اس کا حق دلواتی ہے۔

اگر کسی عورت کے دو ولی ہوں اور دونوں اپنی اپنی مرضی سے دو آدمیوں سے عورت کا نکاح کر دیں تو ایسی عورت کے عقدِ نکاح کا کیا حکم ہے؟

983۔ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ زَوَّجَهَا وَلِيَّانِ فَهِيَ لِلْأَوَّلِ مِنْهُمَا)).

حسن بصری حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس عورت کے دو ولی (اپنی اپنی مرضی کی دو جگہ) اس کا نکاح کر دیں تو یہ عورت ان دونوں (خاوندوں) میں سے پہلے کی (بیوی) ہوگی۔" [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... أَيُّمَا: اس کی ترکیب بیان کی جا چکی ہے اور چونکہ مذکورہ "أيّ" شرطیہ ہے۔ لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہے۔

---

[1] مسند احمد: 8/5۔ سنن ابی داؤد: 2088۔ جامع الترمذی: 1110۔ سنن النسائی: 314/7۔ سنن ابن ماجہ: 2190۔ اور رہی سنن ابن ماجہ کی وہ روایت جو "عن الحسن عن سمرة او عقبة بن عامر" کے طریق سے ہے تو ابو زرعہ اور ابو حاتم نے اس کو صحیح کہا ہے اور حاکم (41/2) نے بھی اس کو صحیح کہا ہے۔ امام موصوف رحمہ اللہ "التلخیص الحبیر" میں کہتے ہیں: اس روایت کی صحت حسن بصری کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع کے ثبوت پر موقوف ہے اور اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔ دیکھیں: "التلخيص الحبير: 165/3"۔

فَهِيَ لِلْأَوَّلِ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ جوابِ شرط اور جزائیہ ہے۔

مِنْهُمَا: مراد وہ دونوں آدمی ہیں جن سے ایک عورت کے دو ولیوں نے اپنی اپنی جگہ اس عورت کا نکاح کر دیا تھا۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دو ولی اس کا دو جگہ نکاح کر دیں تو یہ عورت پہلے عاقد یعنی زوج کی زوجہ شمار ہوگی۔ جبکہ دوسرے ولی کا کیا نکاح کالعدم شمار ہوگا کیونکہ وہ پہلے ولی کے نکاح پر وارد ہوا ہے۔ جیسے کسی عورت کے دو بھائی اس کے ولی ہوں اور دونوں اس کا نکاح اپنے اپنے علم کے مطابق کر دیں جبکہ دونوں میں سے کسی کو دوسرے کے بھی نکاح کر دینے کا علم نہ ہو تو اب وہ نکاح معتبر مانا جائے گا جو پہلے منعقد ہوا تھا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ دوسرا نکاح پہلے نکاح پر وارد ہوا ہے۔لہٰذا وہ دوسرا نکاح صحیح نہ ہوگا اور اگر دونوں نے بیک وقت نکاح کیا تھا تو دو نکاح فاسد ٹھہریں گے۔اور اگر پہلے نکاح کا علم نہ ہو تو عورت سے اس کی رضا پوچھی جائے گی، جیسا کہ دیگر روایات سے کنواری یا شوہر دیدہ کی اجازت انعقاد نکاح کے لیے لازمی شرط ہے۔

غرض اگر تو ترتیب معلوم ہو تو پہلا نکاح معتبر ہوگا اور بیک وقت ہونے کی صورت میں دونوں نکاح فاسد ہوں گے کیونکہ کسی ایک عقد کو دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ جبکہ لاعلمی کی صورت میں عورت سے مرضی پوچھی جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عورت کے اولیاء کو چاہیے کہ اگر ان میں سے ایک نے کہیں نکاح کی پیش رفت کی ہے یا نکاح کر دیا ہے تو وہ باقی کے اولیاء کو اس کی خبر کر دے تاکہ شبہ اور التباس باقی نہ رہے۔
- جب ایک ولی نے دوسرے سے پہلے عقد کر لیا تو حکم پہلے ولی کے لیے ثابت ہوگا۔
- شریعتِ اسلامیہ میں اسبقیت کا اعتبار ہے۔

آقا کی اجازت کے بغیر غلام کے نکاح کرنے کا حکم

984- وَعَنْ جَابِرٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَيُّمَا عَبْدٍ تَزَوَّجَ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهِ أَوْ أَهْلِهِ فَهُوَ عَاهِرٌ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَكَذٰلِكَ ابْنُ حِبَّانَ.

سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس غلام نے بھی اپنے موالی کی یا اپنے اہل کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو وہ زانی ہے۔''[1]

اس حدیث کو امام احمد، امام ابو داود، اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے اور اسی طرح امام ابن حبان نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... أَيُّمَا: یہ کلمہ شرطیہ ہے۔ تَزَوَّجَ: یہ فعل شرط ہے۔

بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهِ: موالی: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس غلام کو آزاد کیا ہو، البتہ اس لفظ کا اطلاق غلام کے آقا پر بھی ہوتا ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔

أَوْ أَهْلِهِ: مذکورہ "أَوْ" شک کے لیے ہے اور یہ شک راوی کا ہے اور اہل سے مراد آقا ہے۔تب پھر اصل اور مولی دونوں

[1] مسند احمد: 307/1۔ جامع الترمذی: 2516۔ مسند ابی یعلی: 2556۔

سے مراد ایک ہوگا اور وہ غلام کا آقا ہے۔

فَهُوَ عَاهِرٌ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ جوابِ شرط اور جزائیہ ہے اور عاہر سے مراد زانی ہے۔ کیونکہ اس کا نکاح ہی صحیح نہ تھا۔ کیونکہ غلام اپنا نکاح کرانے کا مالک نہیں۔ مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

فائدہ:......غلام کے نکاح کے درست ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ آقا کی اجازت سے ہوا ہو۔لہٰذا اگر آقا اجازت دے دیتا ہے تو حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اب وہ اپنا نکاح خود کرا سکتا ہے۔اب خود آقا کے ہی نکاح کرانے کی ضرورت نہیں رہی۔

ایک عورت کو اس کی پھوپھی یا خالہ یا بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے کا حکم

985- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا ، وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عورت اور اس کی پھوپھی کو اور عورت اور اس کی خالہ کو (ایک آدمی کے نکاح میں) جمع نہ کیا جائے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **لَا يُجْمَعُ:** مذکورہ "لا" نافیہ ہے۔لیکن یہ نہی کے معنی میں ہے۔یعنی بھتیجی اور پھوپھی کو اور اسی طرح بھانجی اور خالہ کو جمع نہ کیا جائے یعنی ایسے رشتہ کی دو عورتوں کو ایک مرد کے نکاح میں اکٹھا نہ کیا جائے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

کن دو عورتوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے

اس بابت علماء نے ایک قاعدہ لکھا ہے کہ ایسی دو عورتوں کو ایک آدمی کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو بھی مرد تصور کیا جائے تو خود ان دونوں میں نکاح جائز نہ ٹھہرتا ہو۔ جیسے بھتیجی اور پھوپھی کہ یہاں اگر بھتیجی کو مرد مانیں تو آدمی کا اپنی پھوپھی سے نکاح جائز نہیں ہوتا اور اگر پھوپھی کو مرد مانیں تو آدمی کا اپنی بھتیجی سے نکاح حرام ہوتا ہے۔

یہی صورت خالہ اور بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی ہے کہ یہ حرام ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر آدمی کسی عورت سے نکاح کر لے تو کیا اس کی بہن، پھوپھی یا خالہ یا بھانجی یا بھتیجی سے اس کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حرمت ابدی نہیں بلکہ جب تک یہ عورت اس کے نکاح میں ہے یہ حرمت تب تک کے لیے ہے۔ چنانچہ اگر یہ عورت کسی وجہ سے اس کے نکاح میں نہیں رہتی تو اب آدمی اس کی بہن وغیرہ میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔

یاد رہے کہ جو حکم حقیقی بہن، خالہ، پھوپھی وغیرہ کا ہے وہی حکم رضاعی بہن، رضاعی خالہ اور رضاعی پھوپھی وغیرہ کا بھی ہے۔ کیونکہ جو حکم نسب کا ہے، وہ رضاعت کا بھی ہے۔

احرام والے کے پیغامِ نکاح بھیجنے اور نکاح کرنے کا حکم

986- وَعَنْ عُثْمَانَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

[1] صحيح البخاري: 5109- صحيح مسلم: 1408.

اللهِ ﷺ: ((لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكِحُ)).

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''احرام والا نہ تو خود نکاح کرے اور نہ (کسی دوسرے کا) نکاح کرائے۔'' ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: ((وَلَا يَخْطُبُ)).

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور نہ وہ نکاح کا پیغام بھیجے۔

زَادَ ابْنُ حِبَّانَ: ((وَلَا يُخْطَبُ عَلَيْهِ)).

اور صحیح ابن حبان کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: اور نہ اسے نکاح کا پیغام بھیجا جائے۔

987، 988- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((تَزَوَّجَ النَّبِيُّ ﷺ مَيْمُونَةَ، وَهُوَ مُحْرِمٌ))

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالتِ احرام میں نکاح فرمایا تھا۔ ❷

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: ((عَنْ مَيْمُونَةَ نَفْسِهَا ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهُوَ حَلَالٌ))

جبکہ صحیح مسلم میں خود سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ان سے اس حال میں نکاح فرمایا تھا کہ آپ ﷺ اپنا احرام کھول چکے تھے۔ ❸

شرح :..... مذکورہ تینوں احادیث احرام والے کے نکاح کرنے، اس کا نکاح کرانے، اسے پیغام نکاح بھیجنے اور خود اس کے پیغام نکاح بھیجنے کے بارے میں ہیں۔

غریب الحدیث :..... **لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ**: مراد ''لَا يَتَزَوَّجُ'' ہے اور یہ حکم مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے۔ کیونکہ حالت احرام میں نکاح کرنا دو حال سے خالی نہیں۔

(1) یا تو پھر آدمی عورت سے دخول کرنے میں عجلت کرے گا۔ جس سے اس کا فریضہ حج فاسد ہو جائے گا۔ جبکہ رب تعالیٰ نے حج اور عمرہ دونوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (البقرة: 196) ''اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔''

(2) یا پھر نکاح کرنے کے بعد اس کا جی بیوی میں اٹکا اور لٹکا رہے گا۔ جس سے اس کی مناسک حج کی طرف قلبی توجہ خراب ہو جائے گی۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حالتِ احرام میں نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔

وَلَا يُنْكِحُ: مراد دوسرے شخص کا نکاح کرانا ہے جیسے ولی کہ وہ حالت احرام میں کسی کا نکاح نہ کرائے۔ چنانچہ اگر باپ حالتِ احرام میں ہے تو وہ اس حالت میں اپنی بیٹی کا نکاح نہ کرائے چاہے اس کی بیٹی حالتِ احرام میں نہ بھی ہو۔

وَلَا يَخْطُبُ: یعنی حالت احرام میں کسی کو پیغامِ نکاح نہ بھیجے کہ پھر جی اس میں اٹکا رہے گا۔

وَلَا يُخْطَبُ عَلَيْهِ: مراد احرام والی عورت ہے کہ اسے اس حال میں پیغامِ نکاح نہ بھیجا جائے۔

---

❶ صحيح مسلم: 1409. ❷ صحيح البخاري: 5114- صحيح مسلم: 1410.
❸ صحيح مسلم: 1411.

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے احرام والے کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ عقدِ نکاح قائم کرے یا اس کے وسائل و ذرائع کو ہی اختیار کرے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- احرام والے کا نکاح کرنا حرام ہے اس کی دلیل "لَا یَنْکِحُ" کے الفاظ ہیں کہ یا تو یہ صریح نہی ہے یا پھر نفی بمعنی نہی ہے اور نہی میں اصل تحریم ہے۔ لہٰذا جب تک کوئی احرام میں ہے اس کا نکاح کرنا صحیح نہیں، چاہے ابھی اس کا تحلل ثانی باقی ہی ہو۔
- جو امور عبادت سے توجہ ہٹاتے ہوں ان سے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔
- احرام والے کو پیغام نکاح بھیجنا حرام ہے۔ چاہے وہ خود بھیجے یا کوئی اس کو بھیجے۔
- مذکورہ حدیث میں سد ذرائع کی طرف بھی اشارہ ہے کہ حرام تک لے جانے والے وسائل و ذرائع کی بھی شریعت میں ممانعت ہے۔

اب ذیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پر کلام ملاحظہ ہو:

وَهُوَ مُحْرِمٌ: یہ جملہ حالیہ ہے اور "تَزَوَّجَ" فعل کے فاعل کی ضمیر سے حال ہے جو لفظ "النبیّ" کی طرف راجع ہے یعنی نبی کریم ﷺ نے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے اس حال میں نکاح فرمایا کہ آپ ﷺ احرام کی حالت میں تھے اور یہ احرام عمرہ کا تھا۔ ام المؤمنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا بنت حارث یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ ہیں۔

پھر آگے صحیح مسلم کی ہی ایک روایت میں خود سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا یہ بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جب ان سے نکاح کیا تو آپ ﷺ حلال ہو چکے تھے اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں بھی یہی مضمون مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تھا تو آپ ﷺ حلال تھے اور جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ اس نکاح کے سفیر بھی تھے۔

اب بظاہر دونوں احادیث میں تعارض واقع ہے۔ جن میں سے ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو متفق علیہ ہے جبکہ دوسری حدیث سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے اور جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو صحیح مسلم کی ہے۔ اب علماء کا ان دونوں میں سے کسی ایک حدیث کو ترجیح دینے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ترجیح دی ہے کیونکہ وہ متفق علیہ ہے۔ ان کے پاس اس حدیث کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہی ہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انہیں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

جبکہ بعض علماء نے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو ترجیح دی ہے اور ان کے پاس ترجیح کے ایک سے زیادہ دلائل ہیں جو یہ ہیں:

(1) سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ ہیں۔ وہ صاحب قصہ ہیں اور صاحب قصہ بہ نسبت دوسروں کے اپنے قصہ کو زیادہ جانتا ہوتا ہے۔

(2) سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی تائید جنابِ ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جو اس رشتہ کے کروانے میں سفیر تھے۔

(3) اور تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے موافق ہے کہ "محرم نکاح نہ کرے" اور اصل عدمِ خصوصیت ہے۔ اس بنا پر نبی کریم ﷺ نے بھی حالت احرام میں نکاح نہ کیا تھا۔ کیونکہ اس باب

میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ جو بات آپ ﷺ کی امت کے حق میں ثابت ہے، وہ آپ ﷺ کے حق میں بھی ثابت ہے۔ہاں تخصیص کی کوئی دلیل ہوتو اور بات ہے۔

طرفین کے مذکورہ دلائل کے موازنہ سے دوسرا قول ہی راجح نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ نے جب سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تھا تو آپ ﷺ اپنا احرام کھول چکے تھے۔

اور رہی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاید جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس بات کا پورا علم نہ تھا۔چنانچہ انہوں نے وہی روایت کر دیا جس کا انہیں علم تھا۔

نکاح کی شروط

989- وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ أَحَقَّ الشُّرُوْطِ أَنْ يُوَفَّى بِهِ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوْجَ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''شروط میں سے سب سے زیادہ پوری کیے جانے کی مستحق شرط وہ ہے کہ جس کے ذریعے تم (عورتوں کی) شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّ: یہ حرفِ مشبہ بالفعل ہے جو جملہ اسمیہ پر داخل ہو کر اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے۔

أَحَقَّ: یہ "إِنَّ" کا اسم ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور "الشُّرُوطِ" یہ مضاف الیہ ہے اور "أَحَقَّ" اسم تفضیل کے صیغہ صفت کا فاعل ہے۔

أَنْ يُوَفَّى بِهِ: مذکورہ "أَنْ" ناصبہ مصدریہ ہے جو مابعد فعل کو مصدر بنا کر مفرد کی تاویل کر دیتا ہے اور یہ مذکورہ مفرد مصدر "أَحَقَّ" اسم تفضیل کا مفعول بہ ہے۔اب "أَحَقَّ" اسم تفضیل اپنے مضاف الیہ فاعل اور مفرد مصدر مفعول بہ سے مل کر شبہ جملہ ہوا اور یہ شبہ جملہ "إِنَّ" حرفِ مشبہ بالفعل کا اسم ہوا۔مَا: یہ "مَا" موصولہ ہے اور "إِنَّ" کی خبر ہے۔

اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ: یہ جملہ "مَا" کا صلہ ہے اور موصول صلہ مل کر "إِنَّ" کی خبر ہوئے۔

مراد یہ ہے کہ لڑکی والوں نے جب ایک بات شرط کر دی کہ جب تک اس کو پورا نہ کیا جائے گا اس وقت تک اس لڑکی کی شرمگاہ مرد یعنی خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔تو ایسی شرط کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے۔کیونکہ اب اس شرمگاہ کی حلت اس شرط کے قبول کرنے پر موقوف ہوگئی ہے۔اسی لیے "اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ" فرمایا ورنہ عورت کی شرمگاہ تو نفس عقد سے ہی حلال ہو جاتی ہے۔

نکاح کی شروط

شروط یہ شرط کی جمع ہے۔اب نکاح میں شرط کی دو قسمیں ہیں:

(1) شرطِ صحت (2) شرطِ لزوم

پس جو تو نکاح کی صحت کی شروط ہیں ان کو شروطِ عقد کا نام دیا جاتا ہے اور جو نکاح کے لزوم کی شروط ہیں ان کو "شرط

[1] صحیح البخاري: 5151- صحیح مسلم: 1418.

فی العقد" کا نام دیا جاتا ہے۔علماء اس فرق "شروط النکاح" اور "شروط فی النکاح" کی تعبیر کے ساتھ فرق کرتے ہیں۔ پس شرطِ عقد وہ ہو گی جس پر عقد کی صحت موقوف ہو گی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شرط مفقود ہوئی تو سرے سے عقد ہی صحیح نہ ہو گا جیسے نکاح کے عقد میں ولی ہونا صحت کی شرط ہے لہٰذا اگر نکاح ولی کے بغیر ہوا تو سرے سے نکاح ہی درست نہ ہو گا اور شرطِ لزوم وہ ہوتی ہے کہ جس کے نہ ہونے سے عقد تو صحیح ہو جاتا ہے لیکن اس عقد کا التزام اس پر موقوف ہوتا ہے۔ ان دونوں شروط میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ شروطِ صحت کو خود شریعت مقرر کرتی ہے جن کے ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ جبکہ "شروط فی العقد" عاقدین کی جانب سے مقرر کی جاتی ہیں۔ لہٰذا ان شروط کو جو رکھتا ہے، اسے ان کے ساقط کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔

تب پھر یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ مذکورہ حدیث میں نکاح کی کن شروط کا ذکر ہے، شروطِ عقد کا یا شروط فی العقد کا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نکاح کی دوسری قسم کی شروط کا ذکر ہے۔

رہا ان شروط کے پورا کرنے کا لزوم تو اس کی دلیل اس ارشاد باری تعالیٰ کا عموم ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (المائدة: 1)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو۔''

انہی عقود میں سے ایک ''عقد نکاح'' بھی ہے۔ لہٰذا نکاح میں لگائی جانے والی شروط کا حق ہے کہ ان کو پورا کیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ ان شروط کے پورے کرنے کو ''احقیت'' کے وصف کے ساتھ کیوں ذکر کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیع وغیرہ کی شروط میں مبیع سے انتفاع کو حلال کیا جاتا ہے۔ جبکہ نکاح میں لگائی جانے والی شروط سے شرمگاہوں کو حلال کیا جاتا ہے اور شرمگاہوں کا معاملہ ساز وسامان وغیرہ سے انتفاع اور ان کی ملکیت سے زیادہ اہم، نازک اور سنگین ہے۔ تو جب شرمگاہ کا معاملہ زیادہ نازک اور اہم ہے تو اس کو حلال کرنے کے لیے لگائی جانے والی شرط بھی ضرور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اس کو پورا کیا جائے۔

شروط نکاح کی اقسام

اب مذکورہ حدیث کی رُو سے شروط فی النکاح کی تین قسمیں ہیں:

(1) ایک قسم وہ ہے جو عقد کا مقتضیٰ ہو۔ یہ شرط ذکر کی جائے یا نہ کی جائے دونوں کا حکم ایک ہے جیسے زوجہ کے نان ونفقہ اور سکنیٰ کا شرط ہونا کہ یہ عقدِ نکاح کا مقتضیٰ ہے۔ لہٰذا اس بات کو شرط رکھا جائے یا نہ رکھا جائے یہ شرط ہر صورت میں ثابت اور لازم ہے اور ایسی باتوں کو شرط رکھنا تاکید محض ہوتا ہے۔

(2) دوسری قسم وہ ہے جس میں عاقدین کی مصلحت ہو اور وہ عقد نکاح کے منافی بھی نہ ہو۔ ایسی شروط مباح ہوتی ہیں جب تک کہ ان کے منع پر کوئی شرعی دلیل قائم نہ ہو۔ جیسے عورت کا اس بات کی شرط رکھ دینا کہ اسے ایک ہزار روپے مہر دیا جائے گا۔ یا خاوند یہ شرط رکھ دے کہ بیوی اسی گھر میں رہے گی جہاں وہ رہتا ہے۔ بلاشبہ یہ شروط جائز اور مباح ہیں۔

(3) اور تیسری قسم کی شروط وہ ہیں جو عقدِ نکاح کے منافی ہوں جیسے خاوند اس بات کی شرط رکھ دے کہ اس کی بیوی اسے حیض کے دنوں میں بھی جماع کرنے سے منع نہ کرے گی۔ بلاشبہ حیض میں جماع منع اور حرام ہے لہٰذا اس شرط کو پورا کرنا ناجائز

ہوگا اور واجب نہ ہوگا۔

مضمونِ حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر عاقدین نکاح میں کسی ایسی بات کو شرط رکھ دیں جو یا تو عقد کا مقتضی ہو یا پھر عقد کے منافی نہ ہو اور اس میں عاقدین کی مصلحت ہو تو ایسی شرط پورا کیے جانے کے زیادہ لائق ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عقود میں شرطیں رکھنا جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے شروط کو مطلق ذکر فرمایا ہے۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ شروط کتاب وسنت کے اور عقود کے مقتضی کے مخالف نہ ہوں۔
- شریعتِ اسلامیہ کی وسعت وسماحت کہ اس نے عاقدین پر شرطیں رکھنے کی بابت کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔
- عقد نکاح کے مقتضی کے منافی شرط رکھنا عقد نکاح میں تنگی پیدا کرنا ہے لہٰذا ایسی شرط منع ہوگی۔
- جو بات کسی شرط کے ساتھ معلق ہو، تو جب تک وہ شرط نہ پائی جائے گی وہ شے بھی متحقق نہ ہوگی۔
- شرطوں کو پورا کرنے کا حکم خود رب تعالیٰ نے دیا ہے۔
- فروج میں اصل یہ ہے کہ وہ دوسروں پر حرام ہیں جس کی دلیل "اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ" کے الفاظ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عورت کی بابت اس بات کا شبہ پیدا ہو جائے کہ آیا یہ اجنبیہ ہے یا بہن تو اس کے ساتھ نکاح حرام ہوگا۔ گو یہ صورت نادر ہے لیکن اس کا وقوع ممکن ہے اور اس کا حکم بھی یہی ہے جیسے کسی لڑکی کے رضاعی بہن ہونے میں شبہ ہو تو اس سے نکاح حرام ہوگا۔

اسی طرح اگر دو لڑکیوں کے رضاعی بہن ہونے میں یا دو عورتوں میں رشتہ رضاعت کے اثبات میں اشتباہ ہو جائے تو ان دونوں عورتوں سے ایک ساتھ نکاح کرنے سے اجتناب واجب ہوگا۔

متعہ کا حکم

990۔ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ ﷛ قَالَ: ((رَخَّصَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَامَ أَوْطَاسٍ فِي الْمُتْعَةِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ نَهَى عَنْهَا)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (غزوۂ) اوطاس کے سال تین دن کے لیے نکاح متعہ کی رخصت عنایت فرمائی پھر اس سے منع فرما دیا۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

قصۂ حدیث:...... ''عامِ اوطاس'' یہ وہی طائف کے فتح کا سال ہے اور یہی فتح مکہ کا سال بھی ہے چنانچہ اس واقعہ کو کبھی فتح مکہ کے سال کا قصہ بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ اس سال میں ہونے والا یہ سب سے عظیم واقعہ تھا اور کبھی اسے طائف کا یا اوطاس کے سال کا قصہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس حدیث میں اس قصہ کو اوطاس کے سال کا واقعہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مکہ رمضان میں فتح ہوا تھا جبکہ غزوۂ اوطاس اسی سال ماہِ ذی القعدہ میں ہوا تھا۔

رَخَّصَ عَامَ أَوْطَاسٍ: رخصت دینے کی تعبیر بتلاتی ہے کہ اس سے قبل نکاحِ متعہ حرام تھا۔ کیونکہ رخصت ہمیشہ حرام کے بالمقابل ہوتی ہے۔ غرض متعہ کو حرام قرار دیے جانے کے بعد اس غزوہ میں تین دن کے لیے متعہ کی رخصت دی گئی اور بعد

میں اسے پھر حرام کر دیا گیا۔ یوں متعہ دو دفعہ حرام قرار دیا گیا، ایک رخصت سے قبل اور دوسرے رخصت کے بعد۔

متعہ کب حرام ہوا

991- وَعَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُتْعَةِ عَامَ خَيْبَرَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے سال متعہ کرنے سے منع فرمادیا۔ [2] یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:......غزوۂ خیبر یہ غزوۂ اوطاس سے دو سال پہلے واقع ہوا تھا۔ کیونکہ غزوۂ خیبر 6ھ میں جبکہ غزوۂ اوطاس 8ھ میں ہوا تھا۔ تب پھر متعہ پہلے خیبر کے سال حرام قرار دیا گیا پھر اوطاس کے سال تین دن کے لیے اس میں رخصت دی گئی، اس کے بعد اس کو پھر حرام قرار دے دیا گیا۔

یہ اکثر علماء کی رائے ہے۔ جبکہ بعض علماء کا قول ہے کہ متعہ صرف ایک بار ہی حرام کیا گیا ہے اور وہ فتح مکہ کا سال تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس مذکورہ روایت کا یہ علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ ایک دوسرے طریق سے اس روایت میں دو باتیں مذکور ہیں:

(1) ایک متعہ کی حرمت (2) دوسری گھریلو گدھوں کے گوشت کی حرمت۔

خیبر کے سال میں یہ دو باتیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ تب پھر اصل گھریلو گدھوں کے گوشت کی حرمت ہے جو خیبر کے سال کی گئی اور رہی متعہ کی حرمت تو وہ راوی کا وہم ہے کہ اس نے متعہ کی حرمت کو بھی اسی سال کا قصہ قرار دے دیا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

متعہ کی حقیقت

متعہ یہ ایک محدود عرصہ تک ازدواجی تعلقات قائم کرنے کے لیے نکاح کرنے کا نام ہے۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ ''تم ایک ہفتہ کے لیے اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو'' اور وہ دوسرا آدمی اس کو مان جائے تو ہم اس نکاح کو ''متعہ'' کہیں گے۔

متعہ کی وجہ تسمیہ اور دیگر متعلقات

متعہ کو متعہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس سے مقصود ایک عرصہ تک محض تلذذ حاصل کرنا اور لطف اندوز ہونا ہوتا ہے نہ کہ اس منکوحہ کو مرتے دم تک کے لیے اپنی شریک حیات اور زوجہ بنانا ہوتا ہے کہ وہ اسی کے دم کے ساتھ جیے، اس کی اولاد جنے اور اسی کے نام پر مر جائے۔ (اگر بیوی کا انتقال پہلے ہو جائے تو، وگرنہ بیوہ ہو جانے کی صورت میں اسے دوسرے نکاح کا شرعی حق ہوتا ہے)۔ جبکہ متعہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ گویا کہ متعہ میں لڑکی کا ولی کرائے کا ایک سانڈ چند دنوں کے لیے حاصل کرتا ہے اور جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو یہ نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے اور باہمی لطف اندوزی کا یہ سلسلہ اس سانڈ کے ساتھ منتہی ہو جاتا ہے۔ پھر جب متعہ کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو خاوند کی خواہش کے باوجود بھی عورت کو اس کے نکاح میں باقی نہیں رکھا جاتا۔ پھر عورت اس میں عدت بھی نہیں گزارتی، بس استبراء رحم حاصل کرتی ہے تاکہ نسب خلط ملط نہ ہو جائے کیونکہ یہ عقد متعہ ہی ہے نہ کہ عقد نکاح۔

پھر اس میں نہ تو عورت کے لیے نفقہ ثابت ہوتا ہے، نہ متعہ کے دوران دیگر ازواج کے ساتھ باری مقرر ہوتی ہے اور نہ

---

[1] صحیح مسلم: 1405.

[2] صحیح البخاری: 5115- صحیح مسلم: 1407.

متعہ کے نام پر نکاح میں داخل کی جانے والی کی عورتوں کی کوئی تعداد ہی محدود ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک وقت میں چار سے زائد عورتوں کو بھی متعہ کے نام پر اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ متعہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد کا نسب اس کے باپ کے ساتھ نہیں ملایا جاتا۔ ہاں اگر پہلے سے یہ شرط کر لی جائے تو وہ اولاد باپ کی شمار ہوگی وگرنہ اولادِ سفاح یعنی زنا کی اولاد قرار دی جائے گی۔

متعہ کا شرعی حکم

چونکہ جاہلیت میں متعہ کا رواج کثرت سے تھا اور ابتداء میں شریعت اس کے حکم سے خاموش رہی۔ اس لیے اس وقت تک متعہ اپنی جاہلی صورت کے ساتھ باقی اور رائج رہا، جیسے شریعتِ اسلامیہ ابتدا میں شراب کی بابت خاموش رہی تھی۔ پھر فتح مکہ کے سال بالاتفاق نبی کریم ﷺ نے متعہ کو حرام قرار دے دیا اور یہ حرمت ابدی تھی اور اس اشکال اور اختلاف کے باوجود کہ متعہ اس سے قبل حلال تھا یا مسکوت عنہ کے حکم میں تھا، یا ایک بار حرام ہوکر چند دن کے لیے پھر اس میں رخصت ملی اور دوبارہ پھر حرام ہو گیا کہ بہر حال اس اختلاف کے باوجود فتح مکہ کے سال متعہ کو قیامت تک کے لیے حرام اور زنا قرار دے دیا گیا ہے اور یہ حکم قطعی ہے۔ اس پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے اور یہ اجماع سلفاً عن خلف اور متواتر چلا آ رہا ہے۔

اگرچہ جنابِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک متعہ حلال تھا لیکن جنابِ علی رضی اللہ عنہ نے ان سے مفصل مناظرہ کیا اور اس بارے ان پر بے حد سختی فرمائی اور ان پر یہ امر واضح فرمایا کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کو سختی کے ساتھ اور قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا ہے۔

روافض اور متعہ

روافض کا مشہور مذہب متعہ کے جواز کا ہے اور یہ امر بہر حال جائے تعجب اور تشنہ جواب ضرور ہے کہ حضرات روافض جنابِ علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے قائل ہونے کے باوجود اس مبنی پر لذت وشہوت مسئلہ میں اپنے تئیں اپنے امام معصوم اور خلیفہ اول بلافصل سے صریح اختلاف کرتے بلکہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن ائمہ امت متعہ کی حرمت کے قائل ہیں حتیٰ کہ بعض متاخرین روافض علماء نے بھی اس مسئلہ کے جواز سے صاف انکار کر دیا ہے اور اسے عورت کی ذات پر صریح ظلم قرار دیا ہے اور اس بات کا واشگاف اقرار کیا ہے کہ متعہ کو جائز قرار دینا گویا کہ عورتوں کو شہوت سے بھرے بکروں کے آگے بکریوں کی طرح ڈال دینا ہے اور یہ سوال بھی شدت کے ساتھ اٹھایا ہے کہ کیا متعہ کی شکار عورت سے کوئی نکاح کرنے میں رغبت کرے گا؟ یوں وہ عورت برباد، نسل تباہ اور معاشرہ بدترین جنسی انارکی کا شکار ہوکر چوپایوں کا ایک بھٹکا ریوڑ بن کر رہ جاتا ہے۔ بلاشبہ ان متاخرین روافض علماء کی رائے ہی مبنی برصواب اور درستی اور راستی پر ہے۔

بہر حال متعہ کی حرمت پر متقدمین ومتاخرین سب علماء متفق ہیں اور ان سب کا اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ اس بنا پر پوری امت کے اجماع کے آگے معدودے چند روافض کی رائے ہوگی۔

متعہ کے مفاسد اور اس کی معاشرتی وروحانی خرابیاں

(1) رب تعالیٰ نے نکاح کو زوجین کے درمیان قلبی سکون اور جسمانی وذہنی استقرار واستحکام کا ذریعہ اور عفت وعصمت کا نہایت مضبوط اور قوی وسیلہ قرار دیا ہے اور یہ کہ نکاح معاشرے سے بے حیائی کے بالکلیہ خاتمہ کا واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً﴾

(الروم: 21)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تم ہی سے بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کی طرف (جا کر) آرام پاؤ اور اس نے تمھارے درمیان دوستی اور مہربانی رکھ دی۔''

اور یہی وہ نکاح کا اہم ترین اور عظیم ترین مقصود ہے جس کا متعہ میں نام ونشان تک نہیں ملتا۔ کیونکہ متعہ کرنے والا بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہوتا ہے کہ وہ محض شہوت رانی کر رہا ہے، اور عورت کو بھی اس بات کا آفتاب نیم روز کی طرح ادراک ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس وقتی خاوند کی محض شہوت کی آگ کو ٹھنڈا کر رہی ہے۔ للہٰذا یہ وقتی جنسی اختلاط کسی قلبی و ذہنی سکون وطمانیت اور استقرارِ نفس کا ذریعہ نہیں بنتا اور نہ دونوں میں کسی رحمت ومحبت اور انس ومودت کی رمق ہی پائی جاتی ہوتی ہے، وہ دونوں چند دنوں کے لیے بس جانوروں اور چوپایوں کی طرح مل کر چلتے بنتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو ایک عورت پسند نہیں آتی تو وہ شام ڈھلنے سے قبل کسی دوسری عورت کو متعہ کے نام پر اپنی آغوش میں لیے ہوتا ہے۔

(2) اور چونکہ متعہ محض جنسی عیاشی اور عورت کی جوانی کا استحصال ہوتا ہے اس لیے ہزار میں سے ہزار مردوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ متعہ والی بیوی اس کے بچے کی ماں نہ بنے کہ وہ اولاد کا جھنجھٹ کہاں پالتا پھرے گا یوں مردوں کا وہ پانی جو محترم ہے اور نسل انسانی کے جاری رہنے کا ذریعہ ہے، وہ نہایت بے دردی سے بہا کر ضائع کر دیا جاتا ہے جو عین خلاف فطرت ہے کہ چوپائے بھی اپنے جنسی اختلاط میں اپنا پانی ضائع نہیں کرتے بلکہ اولاد حاصل کرتے ہیں۔

(3) بے شمار عورتیں متعہ کے نام پر نہایت بے رحمی اور سنگدلی سے برباد کر دی جاتی ہیں اور ان کی بکارت کے ضیاع کے بعد کوئی انہیں اپنا حرم بنانے کو تیار نہیں ہوتا۔

(4) بندہ عاجز کی رائے میں متعہ سے زیادہ عورت ذات کی اور کوئی اہانت نہیں، جس میں عورت کے وقار، عفت وعصمت، عزت وآبرو، اور اس کی نزاکت ولطافت کو بے پناہ بے دردی سے پامال کر دیا جاتا ہے۔ ایسی عورت کی قدر وقیمت معاشرے میں پیروں تلے روندے جانے والے کوڑا کرکٹ جیسی بھی نہیں رہ گئی ہوتی۔ گویا کہ وہ ایک ''پوچا'' ہوتی ہے جس سے لوگ آ کر اپنے گندے ہاتھ صاف کر کے پھر اسے پھینک کر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ (عصر حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ متعہ کو حلال جاننے والے معاشروں میں عورت کی حیثیت اس ٹشو پیپر جیسی بھی نہیں رہ جاتی جس سے لوگ ناک صاف کر کے اسے ''ڈسٹ بن'' میں پلٹ کر دیکھے بغیر چھوڑ بلکہ پھینک جاتے ہیں)۔

(5) اور متعہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عظیم احکام، مصالح اور حقوق جو نکاح پر مرتب ہوتے ہیں، متعہ کی بھینٹ چڑھنے والی عورت ان تمام مؤقر ومحترم اور بے پناہ فوائد ومصالح پر مبنی احکام سے یکسر محروم رہتی ہے اور سوائے لٹنے اور رسوا ہونے کے اس کے ہاتھ میں اور کچھ نہیں آتا۔

(6) اور آخری بات یہ ہے کہ متعہ کو جائز کہنے والے دراصل جناب رسول اللہ ﷺ حضرت ختمی مرتبت محمد ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں جنہوں نے قیامت تک کے لیے متعہ کو حرام قرار دیا ہے۔ "اعاذنا الله من ذلك".

992- وَعَنْهُ رضي الله عنه اَنَّ النَّبِیَّ نَهٰی عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ، وَعَنْ أَكْلِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ يَوْمَ خَيْبَرَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے متعہ کرنے سے اور خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ ❶

أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ اِلَّا اَبَادَاوُدَ.

اس حدیث کو ائمہ سبعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے۔

شرح:......امام موصوف رحمہ اللہ گویا کہ یہ حدیث یہ بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ عورتوں سے متعہ کی ممانعت یہ خیبر کے دن گھریلو گدھوں کے گوشت کی ممانعت سے جدا ہے کہ یہ ممانعت خیبر کے دن کی گئی تھی۔ جبکہ متعہ کی ممانعت کا موقع اور تھا۔ جس کی تعیین دیگر روایات سے ہوتی ہے کہ بالاتفاق وہ فتح مکہ کا موقع تھا۔

مُتْعَةِ النِّسَاءِ: میں نساء کی تصریح اس لیے کی تا کہ "متعة الحج" اور "متعة النساء" میں فرق ہو جائے۔ متعۃ الحج کا تفصیلی ذکر کتاب الحج میں گزر چکا ہے۔

اور رہی گھریلو گدھوں کے گوشت کی حرمت تو اس کو بھی گزشتہ ابواب میں مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔ بہر حال اس روایت سے مندرجہ ذیل فوائد مستفاد ہوتے ہیں۔

(1) گھریلو گدھوں کا گوشت حرام ہے۔ (2) نکاحِ متعہ حرام ہے۔

993- وَعَنْ رَبِيعِ بْنِ سَبْرَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((اِنِّیْ كُنْتُ اَذِنْتُ لَكُمْ فِی الْاِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ، وَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَمَنْ كَانَ عِنْدَهٗ مِنْهُنَّ شَیْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيْلَهَا، وَلَا تَأْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا)).

ربیعہ بن سبرہ اپنے والد ماجد (حضرت سبرہ رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک میں نے تم لوگوں کو (اس سے قبل) عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور بے شک (اب) رب تعالیٰ نے متعہ کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ پس جس کے پاس ان عورتوں میں سے (جن کے ساتھ وہ متعہ کر رہا ہے) کوئی ہے تو وہ ان کی راہ چھوڑ دے، اور جو تم لوگوں نے ان کو دے دیا ہوا ہے اس میں سے کچھ بھی (ان سے واپس) نہ لو۔'' ❷

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَأَحْمَدُ وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام احمد اور امام ابن حبان نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......اَذِنْتُ: یہ "رَخَّصْتُ" کے معنی میں ہے اور یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ پہلے متعہ منع تھا۔ پھر اس کی اجازت مل گئی گو وقتی ہی سہی۔ کیونکہ ''اذن'' کبھی قول سے ہوتا ہے تو کبھی اقرار سے۔

---

❶ صحیح البخاری: 4216- صحیح مسلم: 1407.

❷ صحیح مسلم: 1406- سنن ابی داؤد: 2072- سنن النسائی: 126/6- سنن ابن ماجه: 1962- مسند احمد: 405/3- صحیح ابن حبان: 4147.

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ: اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے تحریم کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا ہے تا کہ لوگ اس حکم کو زیادہ یقین واذعان اور قوت واطمینان کے ساتھ قبول کریں۔ اگر چہ جو بات اللہ کے رسول ﷺ حرام قرار دیتے ہیں اس کا حکم بھی وہی ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کے کسی بات کو حرام قرار دینے کا ہوتا ہے۔

فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ.....: یعنی جس کسی نے عقد متعہ کر کے کسی عورت کو اپنے پاس اب تک رکھا ہوا ہے، وہ اب اس کو چھوڑ دے۔

فَلْيُخَلِّ سَبِيْلَهَا:...... تا کہ متعہ کی تحریم کے بعد اب کوئی متعہ کی غرض سے عورتوں کو پاس نہ رکھے بلکہ ان کو چھوڑ دے۔

وَلَا تَأْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا: کیونکہ جب عقدِ متعہ سے ان کی شرمگاہوں کو حلال کر لیا گیا تو وہ اس کے عوض کی مستحق بن چکیں۔ لہٰذا اب اگر ان کو کچھ دے دِلا رکھا تھا تو متعہ کے بعد اس کے واپس لینے کا کوئی استحقاق باقی نہیں رہا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ متعہ کی تحریم اب ابدی ہے اور اس میں نسخ کا کوئی امکان نہیں جس کی دلیل "اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ اگر کوئی آدمی کوئی فاسد عقد کر بیٹھا ہے تو اسے اس عقد سے فی الفور علیحدہ ہونا واجب ہے اس کی دلیل "فَلْيُخَلِّ سَبِيْلَهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ عقد فاسد کی بنا پر اگر کسی عورت کی شرمگاہ کو حلال کیا گیا ہے تو وہ معاوضہ کی مستحق ٹھہرے گی اور اگر اس کا عوض اس کو مل چکا ہے تو وہ واپس نہ لیا جائے گا جیسا کہ یہ مسئلہ مفصل بیان ہو چکا ہے۔

حلالہ کا حکم

994، 995۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے اس پر (یعنی دونوں پر) لعنت فرمائی ہے۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

اس حدیث کو امام احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

وَفِي الْبَابِ عَنْ عَلِيٍّ، أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

اور اس باب میں ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ سوائے امام نسائی کے۔ [2]

شرح:...... حدیث کی شرح سے قبل حلالہ سے متعلق چند اصطلاحات کا جان لینا ضروری ہے۔ ذیل میں ان کا اختصار کے ساتھ تذکرہ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

---

[1] مسند احمد: 450/1۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5536۔ جامع الترمذی: 1120۔ امام موصوف "الدرایۃ" (73/2) میں کہتے ہیں: اس حدیث کے رواۃ ثقات ہیں اور شیخ تقی الدین کہتے ہیں: یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط پر ہے۔ جبکہ ابن قطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جیسا کہ "التلخیص الحبیر" (170/3) میں ہے۔

[2] سنن ابی داؤد: 2076۔ جامع الترمذی: 1119۔ امام ترمذی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے، سنن ابن ماجہ: 1935۔ یہ حدیث حارث کی وجہ سے معلول ہے۔ دیکھیں: نصب الرایۃ: 239/3.

اَلْمُحَلِّلَ: یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو گزشتہ خاوند کی ایک تین طلاق یافتہ بیوی سے اس غرض کے لیے نکاح کرتا ہے تا کہ اس سے نکاح کر کے اسے طلاق دے دے اور تا کہ یہ عورت بعد میں اپنے اسی پہلے طلاق دینے والے خاوند کے لیے حلال ہو جائے۔ کیونکہ جب ایک آدمی اپنی بیوی کو اس طرح طلاق دے دے کہ ہر طلاق کے بعد رجوع بھی کر لیا ہو تو اب یہ عورت اس تین طلاق دینے والے کے لیے صرف اسی صورت میں حلال ہو سکتی ہے کہ کوئی دوسرا اس سے نکاح کرے۔ پھر اگر اتفاقات سے اس عورت کی دوسرے خاوند سے بھی نہ نبھے اور وہاں بھی تین طلاق ہو جائے یا اس سے بیوہ ہو جائے تو عدت کے بعد اب یہ اس پہلے خاوند کے عقد میں دوبارہ آ سکتی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

(البقرة: 229)

''یہ طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہیں۔''

آگے ارشاد ہے: (دیکھیں سورۂ بقرہ: رقم الآیۃ: 230)

فَاِنْ طَلَّقَهَا: پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے۔ یہ تیسری طلاق کا ذکر ہے۔ کیونکہ گزشتہ میں دو طلاق دینے کا ذکر ہے۔ لہٰذا اب یہ تیسری طلاق دینے کا بیان ہوا۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ: تو اس کے بعد وہ (عورت) اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ یعنی اس تین طلاقیں دینے والے کے لیے حلال نہ ہوگی۔

حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ: یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔ یہاں مطلق نکاح کا ذکر ہے اور نکاح کا جب مطلق ذکر ہو تو اس کا اطلاق عقد پر ہوتا ہے نہ کہ جماع پر۔ لیکن یہاں اس لفظ کا اطلاق نکاح کے عقد پر نہیں بلکہ جماع پر ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں نکاح کی اضافت ''زوج'' کے لفظ کی طرف کی گئی ہے اور آدمی زوج وطی کرنے کے بعد ہی بنتا ہے۔ وگرنہ صرف ''رَجُلًا غَيْرَهٗ'' ہی کہہ دینا کافی تھا۔ چنانچہ یہاں نکاح سے مراد عقد نکاح نہیں بلکہ جماع ہے۔ پس ''حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ'' میں زوجیت نکاح پر سابق ہے۔

تب پھر اس آیت میں نکاح کو وطی پر محمول کیا جائے گا اور مطلب یہ ہے کہ عورت تین طلاق دینے والے خاوند کے لیے اس وقت تک دوبارہ حلال نہیں ہوتی جب تک کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہ کر لے اور وہ اس کے ساتھ جماع بھی نہ کر لے۔ پھر اگر یہاں بھی طلاق ہو جائے یا وہ بیوہ ہو جائے تو وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔ اب یہاں محلل سے مراد وہ شخص

ہے کہ جس کے پاس تین طلاق دے چکنے والا آ کر اسے یہ پیش کش کرے کہ تم اس شرط پر اس مطلقہ سے نکاح کرو کہ نکاح اور جماع کے بعد تم اسے طلاق دے دو گے۔ یعنی اسے میرے لیے حلال بنا دینے کے بعد طلاق دے دو گے۔ کہ ایسے شخص کو محلل کہتے ہیں۔ مذکورہ ارشادِ نبوی کی رو سے ایسا شخص ملعون ہے یعنی رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے۔

اَلْمُحَلَّلَ لَهُ: وہ شخص جس کے لیے اس کی طلاق یافتہ بیوی کو حلال کیا گیا ہے۔ یعنی پہلا خاوند جس کے لیے یہ حلالہ کیا گیا تھا۔ یہ بھی ملعون ہے۔ کیونکہ یہ رسواء فعل اس کی مرضی اور باہمی اتفاق کے ساتھ کیا گیا تھا اور وہ اس کو جانتا تھا۔ البتہ اگر اس کے علم میں ہی نہ تھا اور نہ اس کی مرضی ہی شامل تھی تو اس صورت میں وہ عورت چاہے دوسرے خاوند کے طلاق دینے کے بعد پہلے والے کے لیے حلال بھی ہو جاتی ہے، تب بھی وہ ملعون نہ ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ جب یہ حلالہ باہمی رضامندی، تجویز اور اتفاق سے ہو تو دوسرے خاوند کے طلاق دینے کی صورت میں وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ اب بھی حلال نہ ہوگی جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ تب پھر ان دونوں کو سوائے مستحق لعنت بننے کے اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

غریب الحدیث :...... **لَعَنَ الْمُحَلِّلَ**: یعنی آپ ﷺ نے "لعنة الله عليه" فرمایا۔ یہ جملہ خبریہ ہے جو دعا کے معنی میں ہے۔ جبکہ یہ خبر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ حقیقی خبر ہو اس کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ وہ یوں کہ رب تعالیٰ نے نبی ﷺ کو وحی کے ذریعہ اس بات کی خبر دے دی ہو۔ بہر حال ایسا شخص مستحق لعنت ہی ہے کیونکہ لعنت کرنے پر اگر دوسرا مستحق لعنت نہ ہو تو لعنت لوٹ کر کرنے والے پر آ اترتی ہے اور یہ بات نبی ﷺ کے حق میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصور بھی نہیں کی جا سکتی تب پھر نبی کریم ﷺ نے صرف انہی لوگوں پر لعنت فرمائی ہے جو لعنت کے قرار واقعی مستحق ہی ہوتے ہیں۔

مشروط حلالہ زوجِ اوّل کے لیے عورت کی حلت کا سبب ہے یا نہیں؟

عورت پہلے طلاق دینے والے خاوند کے لیے دو شرطوں کے ساتھ حلال ہوتی ہے:

(1) ایک یہ کہ اس کا دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح صحیح ہو۔ وہ یوں کہ وہ نکاحِ رغبت ہو نہ کہ کسی دوسرے کے لیے اس عورت کو حلال کرنے کے لیے نکاح ہو اور نہ نکاحِ متعہ ہی ہو۔ لہٰذا اگر یہ بات سامنے آئی کہ وہ دوسرا نکاح صحیح نہ تھا تو اس نکاح کی طلاق کی صورت میں بھی یہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔ یہی حکم بغیر ولی کے نکاح کا بھی ہے۔

(2) اور دوسری شرط یہ ہے کہ دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ نکاح کے بعد جماع بھی کیا ہو۔ جس کی کافی تفصیل ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت رقم 230 کے تحت بیان کر دی ہے۔

شرعی حلالہ کے بعد پہلا خاوند کتنی طلاقوں کا مستحق بنتا ہے؟

رہا یہ سوال کہ جب طلاق یافتہ عورت مذکورہ بالا دونوں شروط کے پائے جانے کی صورت میں پہلے خاوند کے پاس لوٹ آئے تو کیا اب اس پہلے خاوند کو پھر از سرِ نو تین طلاقوں کا حق ملے گا یا نہیں؟ تو اس بارے راجح قول یہی ہے کہ پہلا خاوند اس صورت میں تین نئی طلاقوں کا مالک بن جائے گا اور وہ گزشتہ دی گئی طلاقیں اس نئے نکاح میں شمار نہ ہوں گی۔ لیکن اگر کسی نے تین سے کم طلاقیں دی تھیں، اور اس کے بعد وہ عورت شرعی حلالہ کے مراحل سے گزر کر اس کے نکاح میں دوبارہ آتی ہے تو کیا اب بھی اسے تین ہی طلاقوں کا حق ملتا ہے؟ تو علماء کا اس صورت میں اختلاف ہے۔

چنانچہ علماء کا قول ہے کہ دوسرے نکاح نے پہلے خاوند کی دی طلاقوں کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ لہٰذا اب یہ تین نئی طلاقوں کے استحقاق کے ساتھ پہلے خاوند کے نکاح میں داخل ہوگی۔ ❶

جبکہ بعض علماء کے نزدیک وہ دوسرا نکاح پہلے خاوند کی تین سے کم طلاقوں کو ختم نہ کرے گا۔ لہٰذا شرعی حلالہ کے بعد یہ عورت پہلے خاوند کے نکاح میں ماقبی طلاقوں کے ساتھ داخل ہوگی۔ امام احمد کا مشہور مذہب یہی ہے اور یہی صحیح قول بھی ہے۔

وَفِي الْبَابِ عَنْ عَلِيٍّ: روایات میں جب لفظ "عَلِیّ" مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد خلیفہ راشد امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی ہوتے ہیں۔

زانی اور زانیہ کے نکاح کا حکم

996- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَنْكِحُ الزَّانِي الْمَجْلُوْدُ إِلَّا مِثْلَهُ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "(سزا یافتہ) زانی جس کو (زنا کی پاداش میں) کوڑے لگے ہوں، وہ اپنے جیسے کے ساتھ (یعنی زانیہ کے ساتھ) ہی نکاح کرتا ہے۔" ❷

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث: ...... **لَا يَنْكِحُ:** قرآنِ کریم کی سورۂ نور میں ایسے ہی الفاظ آتے ہیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً﴾ (النور: 3)

"زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے۔"

اب "لَا يَنْكِحُ" سے کیا مراد ہے؟ حضرات مفسرین کا اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے اور مطلب یہ ہے کہ زانی زانیہ کے ساتھ ہی جماع کرتا ہے۔ لیکن یہ قول بے حد ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ بات رب ذوالجلال والاکرام کی حکیم ذات سے بے حد بعید ہے کہ وہ نکاح جیسے عظیم ترین مبنی بر مصالح فعل کا اطلاق مطلق جماع پر کرے جو زنا کا حاصل ہے۔ لہٰذا نکاح سے مراد جماع ہو، یہ کسی صورت بھی درست نہیں۔

دوسرے یہ کہ بسا اوقات زانی کسی ایسی عورت کو بھی اپنے دامِ تزویر میں پھنسا لیتا ہے جو کنواری ہو اور ابھی تک اسے صنفی تعلقات کا شعور بھی نہ ہو اور نہ اس کا ارادہ زنا کا ہی تھا اور اگر زانیہ سے معروف پیشہ ور جسم فروش عورت ہی مراد ہو تو اس تعبیر کا چنداں فائدہ نہیں جیسے کوئی یہ کہے کہ زمین ہمارے قدموں تلے ہے اور آسمان سروں پر ہے۔ تو دوسرا جملہ تحصیل حاصل ہے کہ جب زمین نیچے ہے تو لامحالہ آسمان اوپر ہی ہوگا۔ تب پھر یہاں نکاح سے نکاح ہی مراد ہے اور یہی قول صحیح ہے کہ زانی زانیہ

---

❶ الام للشافعی: 162/7- مغنی المحتاج للشربینی: 293/3.

❷ مسند احمد: 324/2- سنن ابی داؤد: 2053- الکامل لابن عدی: 409/2- ترجمہ حبیب ابی محمد، ابن عدی کہتے ہیں: ابومحمد کی احادیث مستقیم ہیں، اور حاکم نے "المستدرك" (180/2) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

سے ہی نکاح کرتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اب اس کی صورت کیا ہے؟ اور کیونکر ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ زانی پر کسی پاک دامن عورت کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ اب اگر کوئی پاک دامن عورت اس زانی مرد سے نکاح پر تیار ہوگی تو یا تو وہ جانتی ہوگی کہ رب تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں کہ: ﴿حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (النور: 3) ''اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔'' زانی کے ساتھ نکاح حرام کو قرار دے دیا ہوا ہے لیکن وہ اس تحریم کو نہ مانے اور اس بات کو رب تعالیٰ کا حکم تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو تو لامحالہ وہ مشرکہ ٹھہرے گی کیونکہ اس نے رب تعالیٰ کے ایک صریح حکم کو حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اس کا یہ اعتقاد ہے کہ ایک مرد نے اس کے ساتھ ایک حلال عقد کے واسطے جماع کیا ہے۔

یا پھر وہ اس کے ساتھ نکاح کو حرام تو جانتی ہوگی لیکن اسے اس حکم کی پروا نہ ہوگی اور اس کا یہ بھی اعتقاد ہوگا کہ یہ مرد میرے ساتھ ایک حرام عقد کے واسطے سے جماع کر رہا ہے۔ تب پھر اس صورت میں وہ زانیہ ہوگی۔ غرض مذکورہ آیت کو اگر اس معنی پر محمول کیا جائے تو پھر کسی تکلف کی یا دور از کار تاویل کی مطلق ضرورت نہ رہے گی۔ کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اسی معنی کی طرف گئے ہیں [1] اور میرا گمان ہے کہ ان کے شیخ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان سے پہلے اس بات کے قائل رہے ہوں گے۔

اَلْمَجْلُوْدُ: یہ قید تحقیق کے لیے ہے کہ ایسے شخص کا زانی ہونا متحقق ہو اور کسی پر یہ امر مخفی نہ ہو۔

إِلَّا مِثْلَهُ: ہم اس بات کو بیان کر چکے ہیں کہ جو خاتون زنا کے حرام ہونے کو جانتی ہو اور یہ بھی جانتی ہو کہ اس زانی سے جس کا زنا آشکارا ہو چکا ہو کیونکہ اسے علی رؤوس الاشہاد زنا کے جرم میں کوڑے لگے تھے، نکاح حرام ہے وہ کبھی بھی اس سے نکاح کو آمادہ نہ ہوگی اور جو آمادہ ہوگی وہ حرام کی مرتکب ہوگی، تب پھر وہ بھی اسی جیسی زانیہ کہلائے گی۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ زانی جب تک سچی توبہ نہ کر لے، اس سے نکاح جائز نہیں اور اگر اس نے نکاح کے بعد زنا کیا تھا تو اس سے اس کا نکاح فسخ نہ ہوگا۔
- کسی نیکوکار خاتون کو زانی سے بیاہنا حرام ہے۔
- شریعتِ اسلامیہ مکارمِ اخلاق کی از حد پابند اور ان کی پاسدار ہے۔
- زانی کو شادی کرنے سے روکنا جائز بلکہ واجب ہے چاہے وہ اپنے باقی دین میں امین و مستقیم ہی کیوں نہ ہو۔

طلاق یافتہ عورت پہلے خاوند کے پاس کب لوٹ کر آسکتی ہے؟

997۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: طَلَّقَ رَجُلٌ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا، فَتَزَوَّجَهَا رَجُلٌ، ثُمَّ طَلَّقَهَا قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا، فَأَرَادَ زَوْجُهَا الْأَوَّلُ أَنْ

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، اس عورت سے آگے دوسرے مرد نے نکاح کر لیا پھر اس دوسرے

---

[1] اعلام الموقعین: 343/4.

يَتَزَوَّجَهَا، فَسَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: ((لَا حَتّٰى يَذُوْقَ الْآخَرُ مِنْ عُسَيْلَتِهَا مَا ذَاقَ الْأَوَّلُ)).

خاوند نے بھی اسے اس کے ساتھ دخول کرنے سے قبل طلاق دے دی۔ اب اس پہلے خاوند نے اس عورت سے (دوبارہ) نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ پس اس نے نبی کریم ﷺ سے اس بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں (تم اس صورت میں اس عورت سے نکاح نہیں کر سکتے) یہاں تک کہ دوسرا خاوند اس کی وہ مٹھاس (نہ) چکھ لے جو اس کے پہلے خاوند نے چکھی ہے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:...... طَلَّقَ رَجُلٌ اِمْرَأَتَهُ: یعنی باری باری ایک ایک طلاق دی حتیٰ کہ تین طلاقیں پوری کر لیں۔

قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا: مراد نکاح کے بعد جماع کرنے سے قبل ہی طلاق دے دینا ہے۔

مِنْ عُسَيْلَتِهَا: عسیلہ: یعنی مٹھاس۔ کیا اس سے مراد انزال ہے یا صرف جماع ہے؟ تو صحیح قول یہ ہے کہ اس سے صرف جماع مراد ہے، چاہے انزال ہو اور چاہے نہ ہو، البتہ انزال ہونے کی صورت میں جماع کا حکم اتم ہو جائے گا۔ پس مجرد جماع کرنے سے بھی عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے جماع کیے بغیر طلاق دے دی تو وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی چاہے خلوتِ صحیحہ بھی ہوگئی ہو اور چاہے اس سے بوس و کنار بھی کیا ہو، غرض پہلے خاوند کے لیے حلال ہونے کی شرط جماع ہے۔ اس مسئلہ کی باقی کی تفصیل و تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قابل حیا باتوں کو اشارہ کنایہ سے بیان کرنا اولیٰ ہے چنانچہ یہاں راوی نے جماع کو ''دخول'' کے کنایہ سے بیان کیا ہے۔
- معلوم ہوا کہ اگر عورت دوسرے خاوند کے پاس سال بھر بھی رہے پھر وہ اس کے ساتھ جماع کیے بغیر اسے طلاق دے دے تو بھی وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔
- معلوم ہوا کہ خلافِ شرع تصرف کو صحیح اعتقاد کر کے کرنے سے بھی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے صراحت فرما دی کہ جب تک دوسرے خاوند کا جماع ثابت نہ ہو جائے عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی چاہے اپنے تئیں وہ یہ سمجھے کہ صرف نکاح ہو جانے سے وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہوگئی ہے۔

1۔ بَابُ الْكَفَاءَةِ وَالْخِيَارِ ..... کفاءت اور خیار کا بیان

کفاءت کا لفظی اور اصطلاحی معنیٰ:

تمہید:..... لفظ کفاءت یہ مکافات سے ماخوذ ہے جو کسی شے کا بدلہ دینے کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میں یہ کسی کے ہم رتبہ، ہم پلہ اور برابر ہونے کو کہتے ہیں۔

---

❶ صحيح البخاري: 5261۔ صحيح مسلم: 1433.

نکاح میں کفاءت کے حکم کی تفصیل

(1) دین میں کفاءت:

اس قدر بات تو بالاتفاق ہے کہ نکاح میں دینی کفاءت اصل ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی کافر کے ساتھ کسی مسلمان خاتون کی شادی جائز نہیں اور اس پر قرآنی نص بھی ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾
(الممتحنة: 10)

''پھر اگر تم جان لو کہ وہ مومن ہیں تو انھیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ یہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان کے لیے حلال ہوں گے۔''

(2) عدالت میں کفاءت:

پھر عدالت میں بھی کفاءت لازم ہے یعنی خاوند ایسا فاسق نہ ہو کہ وہ اسے اسلام سے ہی نکال دے۔ لہٰذا عادل کے ساتھ نکاح کے امکان کے ہوتے ہوئے کسی فاسق کے ساتھ نکاح کرنا کفاءت نہ ہوگا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ: جب تمہارے پاس ایسا رشتہ آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کر دو۔ [1]

غرض دین میں کفاءت لازم ہے البتہ مسلمان کے کتابیہ کے ساتھ نکاح کا جواز اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں زوج دین میں زوجہ سے اعلیٰ ہے اور یہ استثناء اس ارشاد باری تعالیٰ میں مذکور ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ (المائدة: 5)

''آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔''

لیکن اس کے باوجود علماء نے دو وجوہات کی بنا پر اس نکاح کو بھی مکروہ قرار دیا ہے۔

(1) اس میں آدمی کے دین کو خطرہ ہے، بالخصوص جب اسے اپنی کتابیہ بیوی سے بے حد محبت ہو، کہ اس صورت میں مرد پر عورت کے اثر انداز ہونے کا خدشہ ہے۔

(2) کتابیہ عورتوں سے مسلمانوں کے نکاح کا رواج مسلمان عورتوں کے بیاہنے میں کمی کا سبب بنے گا۔ یوں اکثر مسلمان عورتیں بے نکاحی رہ جائیں گی۔

(3) نسب میں کفاءت:

نسب میں کفاءت اور برابری یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں خاندانی شرافت میں یکساں ہوں، لہٰذا عورت کا عرب ہونا اور مرد کا غیر عرب یعنی عجمی ہونا کفاءت تسلیم نہ کیا جائے گا۔

---

[1] جامع الترمذی: 1084۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔ امام ترمذی نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

پھر علماء کا اس بارے اختلاف ہے کہ آیا یہ کفاءت صحت نکاح کی شرط ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض علماء نے اس کفاءت کو صحت نکاح کی شرط قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی قبیلہ اور خاندان والی عورت کی کسی ایسے مرد سے شادی ہوگئی جس کا قوم قبیلہ نہ تھا یعنی وہ یا تو غیر عرب تھا یا موالی میں سے تھا تو یہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا اس عورت کے اولیاء یہ نکاح فسخ کرا سکتے ہیں۔

لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ بھلا ایک عالم دین، متدین اور عادل آدمی محض موالی ہونے کی بنا پر کسی عرب عورت کا کفو کیونکر نہیں ہوسکتا؟ بلاشبہ یہ قول بے حد عجیب ہے اور جن علماء نے کفاءتِ نسبی کو لزومِ نکاح کی شرط قرار دیا ہے، وہ بھی غیر درست قول ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگر لڑکا دین دار ہے تو وہ عرب عورت کا بھی کفو ہے۔

خیار کا حکم:

خیار سے مراد نکاح باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے اور مراد نکاح میں کسی عیب کے پائے جانے کے وقت نکاح کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے۔

اب نکاح میں خیار کے دو سبب ہیں:

(1) خیارِ عیب اور یہ اکثر اور اغلب ہے۔ کہ عاقدین میں سے کوئی دوسرے کو کسی عیب والا پائے۔

(2) نکاح میں رکھی گئی کسی صفت اور شرط کا نہ پایا جانا کہ ان دونوں باتوں کی وجہ سے نکاح میں خیار ملتا ہے۔ مثلاً عورت کے کنوارے ہونے کی شرط رکھی تھی، وہ شوہر دیدہ نکلی یا خوبصورت کی شرط رکھی تھی مگر وہ بدصورت نکلی۔

رہا اسلام تو وہ تو شرط ہے ہی، لہٰذا اگر عاقدین میں سے کوئی غیر مسلم نکل آیا تو بھی فسخ نکاح کا خیار ہوگا۔

رہا خیارِ شرط کہ آیا عقدِ نکاح میں خیارِ شرط معتبر ہے یا نہیں تو علماء کا اس بارے اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ عقد کے وقت اگر شرط رکھ دی ہے تو تین دن تک نکاح کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا خیار ملے گا۔ جبکہ بعض کے نزدیک یہ خیار ثابت نہیں اور خیارِ شرط عقدِ نکاح میں غیر صحیح ہے۔ کیونکہ عورت کے پسند نہ آنے کی صورت میں آدمی اس کو طلاق دے سکتا ہے۔ یوں وہ خیارِ شرط سے مستغنی ہے۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔ اگر تو خیار کسی مقصود غرض کے لیے ہے تو وہ معتبر ہوگا۔ جیسے عورت یہ شرط رکھ دے کہ اگر تو جس گھر میں یہ مجھے رکھنا چاہتا ہے، میں وہاں سکھی رہی تو ٹھیک وگرنہ مجھے فسخ نکاح کا اختیار ہوگا اور وہ گھر ایسا ہو کہ وہاں چار یا پانچ بھائی (مثلاً) بیویوں سمیت رہتے ہوں اور ہر ایک کی بیوی کی زبان گز گز بھر لمبی ہو اور وہ اس نئی دلہن کا جینا دوبھر کر دیں تو اسے فسخ نکاح کا خیار ہوگا۔ غرض مذکورہ بالا تفصیل سے خیار کی تین صورتیں سامنے آئیں۔

(1) خیارِ عیب (2) صفتِ مشروطہ کے فوات کا خیار

(3) خیارِ شرط

آزاد عربوں کی موالی کے ساتھ شادی کا حکم

998، 999۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَلْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ، وَالْمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ، إِلَّا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں اور موالی ایک دوسرے کے کفو ہیں۔ سوائے جولاہے اور پچھنے

حَائِكًا أَوْ حَجَّامًا)).

لگانے والے کے۔'' ❶

رَوَاهُ الْحَاكِمُ ، وَفِي إِسْنَادِهِ رَاوٍ لَمْ يُسَمَّ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ.

اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے۔ البتہ اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی کا نام مذکور نہیں اس لیے ابو حاتم نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ الْبَزَّارِ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ.

جبکہ مسند بزار میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی اس کا ایک شاہد بھی ہے اور وہ روایت منقطع ہے۔ ❷

غریب الحدیث:...... **اَلْعَرَبُ**: جب یہ لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے عرب مستعربہ مراد ہوتے ہیں نہ کہ عرب عاربہ ❸۔ کیونکہ اصل عرب یہی ہیں جبکہ عرب مستعربہ وہ ہیں جو جناب اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں کیونکہ جناب اسماعیل کی زبان غیر عربی تھی جو ان کے والد ماجد جد الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زبان تھی۔ پھر جب عربوں کا قبیلہ جرہم مکہ میں آ کر فروکش ہوا جو اصل عرب تھے تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ذریت نے ان میں نکاح کیے اور وہ بھی عرب بن گئے۔ اس بنا پر بنو اسماعیل عرب مستعربہ کہلاتے ہیں (یعنی وہ غیر عرب جو عربوں میں مل کر عرب بن گئے)۔ یاد رہے کہ عرب مستعربہ یہ عرب عاربہ سے افضل ہیں کیونکہ عربِ مستعربہ یہ انبیاء کرام کی اولاد ہیں۔

بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ: لہٰذا قریش اور بنو تمیم یہ بنو ہاشم اور آلِ بیت رسول کے کفو ہوں گے۔

وَالْمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ: موالی کی تعریف گزر چکی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

إِلَّا حَائِكٌ أَوْ حَجَّامٌ: حائک جولاہے کو کہتے ہیں۔ عرب اس پیشہ کو قابل عار سمجھتے تھے۔ ایسا ہی حجام بھی ہے عربوں کے نزدیک یہ کوئی قابل احترام پیشہ نہ تھا حتیٰ کہ ایک روایت میں اس کی کمائی کو خبیث تک کہا گیا ہے جیسا کہ مفصل گزرا۔

معلوم ہوا کہ جولاہا اور حجام موالی میں بھی کفو کا رشتہ نہیں۔

وَفِي اَسْنَادِهِ رَاوٍ لَمْ يُسَمَّ: تب پھر وہ راوی مجہول ہوا اور مجہول راوی کی حدیث مردود اور ضعیف ہوتی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں تین اہم مسائل مذکور ہیں:

(1) جملہ عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

(2) جملہ غیر عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

(3) معیوب پیشوں والے لوگ کفو نہیں ہوتے۔

---

❶ مجھے یہ روایت "المستدرك" میں نہیں ملی البتہ یہ روایت "سنن البیهقی" (134/7) میں حاکم کے طریق سے مروی ہے، اور امام بیہقی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے اور اس روایت کو ایک اور طریق سے "عن سعید بن المسیب عن عائشة" کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو بھی ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم نے اس روایت کو منکر کہا ہے جیسا کہ "العلل لابن ابی حاتم" (423/1) میں ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: یہ حدیث منکر اور موضوع ہے۔ دیکھیں: التمهید: 165/19.

❷ مسند البزار: 2677۔ امام موصوف رحمہ اللہ نے "فتح الباری" (133/9) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

❸ عرب عاربہ: خالص عرب لوگوں کو کہتے ہیں۔ جبکہ "عرب مستعربہ" حضرت اسماعیل کی اولاد کو کہتے ہیں کیونکہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی زبان عربی نہ تھی بلکہ عبرانی تھی۔ (القاموس الوحید: 1062-1063) (نسیم)

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جملہ عرب رشتہ کرنے میں ہم پلہ ہیں، چاہے بعض دوسرے بعض سے افضل ہی ہوں۔ لہٰذا کسی ہاشمی کا کسی تمیمی کو مثلاً اپنا کفو نہ سمجھنا غلط ہوگا۔
- جولاہا کسی غیر جولاہے کا کفو نہ ہوگا۔ اسی طرح پچھنے لگانے والا بھی کسی دوسرے کا کفو نہ ہوگا۔ البتہ جولاہا جولاہوں میں اور حجام حجاموں میں رشتہ کر سکتا ہے۔
- لیکن اگر یہ حدیث ضعیف ٹھہرے جیسا کہ اوپر بیان ہوا تو یہ فوائد ساقط ہوں گے۔ البتہ جو بات دیگر نصوص سے ثابت ہو وہ معتبر ہوگی جیسے دین میں کفاءت۔
- مسند بزار کا منقطع الاسناد شاہد ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ شاہد بھی سند کے منقطع ہونے کی وجہ سے غیر مقبول ہے کیونکہ منقطع راوی کی بابت جرح و تعدیل میں سے کچھ معلوم نہیں۔ پس پہلی اسناد میں ایک مجہول راوی مذکور ہے، جب دوسری اسناد منقطع ہے۔ لہٰذا یہ مذکورہ شاہد بھی، بلکہ یہ دونوں روایات ایک دوسرے کو قوی نہ کریں گے۔
- ابو حاتم نے مذکورہ روایت کو منکر کہا ہے اور یہ نکارت متن میں بھی ہے اور سند میں بھی۔

موالی اور عربوں میں نکاح

1000- وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: ((انْكِحِيْ أُسَامَةَ)). رَوَاهُ مُسْلِم.	حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا: ''اسامہ (بن زید) سے نکاح کر لو۔''[1] اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

موالی سے نکاح کا حکم

سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا اصل عرب تھیں جبکہ حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ کا خاندان اگر چہ عرب تھا لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ آزاد کردہ غلام تھے۔ وہ یوں کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کے والد جناب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو جوان کے غلام تھے نبی کریم ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ جب کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا۔ یوں وہ آپ ﷺ کے مولی بن گئے ہوئے تھے۔ اگر چہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے مولی تھے لیکن نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ اور ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بے حد محبت کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ ان دونوں باپ بیٹے کا بے حد احترام و اکرام بھی کرتے تھے۔

اب سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا اپنے نکاح کے بارے میں آپ ﷺ سے مشورہ کرنے حاضر ہوئی تھیں، انہیں تین آدمیوں نے نکاح کا پیغام بھیجا تھا۔ (1) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، (2) حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ، (3) اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ۔ جس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے شادی کر لیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رہے ابوجہم تو وہ عورتوں کو بہت مارتے ہیں۔'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ لاٹھی کو اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتے۔ اور رہے معاویہ تو وہ تنگدست ہیں، ان کے پاس کوئی مال نہیں اور فرمایا کہ: ''تم اسامہ سے نکاح کر لو۔''

سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اسامہ سے شادی کر لی اور آج مجھے ان پر رشک ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ

[1] صحيح مسلم: 1480.

کے مشورہ کی برکت سے آج مجھے اس شادی پر رشک آتا ہے کہ اسامہ میرے لیے بے حد فرحت و شادمانی کا سبب ہیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ خالص عرب آزاد کردہ غلاموں سے بھی نکاح کر سکتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جس سے کسی کے بارے میں مشورہ لیا جائے، اس پر واجب ہے کہ وہ اس شخص کے جملہ عیوب ضرور بیان کر دے جو اس میں پائے جاتے ہوں اور وہ ان کو جانتا ہو اور وہ اس پر ماجور ہوگا کیونکہ اس نے ایک واجب پر عمل کیا ہے اور یہ پیٹھ پیچھے مذموم غیبت کے زمرہ میں داخل نہیں۔
- آدمی کو اپنے اردگرد کے لوگوں کی خبر رکھنی چاہیے تاکہ کسی شرعی امر میں دوسروں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔
- آزاد عورت آزاد کردہ غلام سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ غیر کفو شمار نہ ہوگا۔
- معلوم ہوا کہ دین و اخلاق کو دیگر سب باتوں پر فوقیت حاصل ہے۔
- یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی وسعت بھی ترجیح کی ایک وجہ ہے۔
- اگر ایک خاطب کو معلوم نہ ہو تو دوسرے کے پیغامِ نکاح بھیجنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ گزشتہ اوراق میں یہ مضمون مفصل مذکور ہو چکا ہے۔
- معلوم ہوا کہ اہل خیر و صلاح اور ارباب علم و فضل سے مشورہ باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ جیسا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کی خیر و برکات کا مشاہدہ ہوا تھا۔
- جہاں تک ہو سکے دوسرے کا بھلا کیا جائے اور اسے بہتر سے بہتر بات کی راہ دکھائی جائے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

1001۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((يَا بَنِي بَيَاضَةَ ، أَنْكِحُوْا أَبَا هِنْدٍ ، وَانْكِحُوْا إِلَيْهِ، وَكَانَ حَجَّامًا)) .
رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ ، وَالْحَاكِمُ بِسَنَدٍ جَيِّدٍ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اے بنی بیاضہ! ابو ہند سے نکاح کر لو اور اس کی طرف نکاح کے پیغام بھی بھیجو۔'' اور ابو ہند حجام تھے۔ [1]
اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام حاکم نے عمدہ اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... بَنِي بَيَاضَةَ: یہ عرب کا ایک قبیلہ ہے۔
أَبَا هِنْدٍ: یہ موالی میں سے تھے اور بظاہر یہ کسی عرب قبیلہ سے نہ تھے۔
أَنْكِحُوا: یعنی ابو ہند سے نکاح کر دو یعنی اپنی بیٹی کا اس سے نکاح کر دو۔
انْكِحُوا إِلَيْهِ: یعنی ان کی بیٹیوں سے بھی نکاح کرو۔ مراد یہ ہے کہ ان کو رشتہ دو بھی اور ان سے رشتہ لو بھی۔

فائدہ:...... یہ حدیث حجام سے رشتہ کرنے اور اس سے رشتہ لینے کے جواز کو بتلاتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ گزشتہ

[1] سنن ابی داؤد: 2102۔ المستدرك للحاكم: 2/178۔ صحيح ابن حبان: 4067۔ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ ابن عبدالبر (19/165) نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔

مذکورہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما ضعیف ہے جس میں "إِلَّا حَائِكٌ أَوْ حَجَّامٌ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خود ہی بیاضہ کو ابو ہند نامی شخص کو رشتہ دینے اور اس سے رشتہ لینے کا حکم دیا ہے، جو حجام تھے۔

خیار کی اقسام

1002، 1003- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: خُيِّرَتْ بَرِيرَةُ عَلَى زَوْجِهَا حِينَ عُتِقَتْ))

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: بریرہ جب آزاد ہوئی تھی تو اُن کو اپنے خاوند کی بابت (ان کی زوجیت میں رہنے یا نہ رہنے کا) اختیار ملا تھا۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

یہ ایک طویل متفق علیہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهَا: ((أَنَّ زَوْجَهَا كَانَ عَبْدًا)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بریرہ کا خاوند غلام تھا۔

وَفِي رِوَايَةٍ عَنْهَا: ((كَانَ حُرًّا))، وَالْأَوَّلُ أَثْبَتُ. وَصَحَّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنه عِنْدَ الْبُخَارِيِّ أَنَّهُ كَانَ عَبْدًا)).

اور سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ آزاد تھا۔ جبکہ پہلی روایت اثبت ہے اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح ثابت ہے کہ وہ غلام تھا۔ [2]

قصۂ حدیث:......سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا باندی تھیں، ان کے آقا نے ان کے ساتھ نو اوقیہ چاندی پر نو سال کی مدت تک کے لیے عقدِ مکاتبت کر لیا تھا۔ سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا مکاتبت کی رقم کی ادائیگی میں مدد مانگنے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ولاء کے اپنے لیے ہونے کی شرط پر ان کی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کی حامی بھر لی جس کو ان کے آقاؤں نے منظور نہ کیا۔ سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا نے لوٹ کر اپنے آقاؤں کو منشا بتلایا۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سارا ماجرا خدمت نبوی ﷺ میں عرض کیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم بریرہ لے لو اور ان کے لیے ولاء کی شرط کر لو اور ولاء تو اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔'' پھر نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ فرما کر اس شرط کو باطل قرار دیا کہ: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی شرطیں رکھتے ہیں جو کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہوتیں، ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے، چاہے وہ سو شرطیں بھی ہوں،......(اور آگے فرمایا) ولاء تو اسی کی ہے جو آزاد کرے۔

پھر جب سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کتابت کی رقم ادا ہو جانے کے بعد آزاد ہو گئیں تو نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے پہلے خاوند کے پاس رہنے یا نہ رہنے میں اختیار عنایت فرمایا اور یہی وہ امر ہے جو امام موصوف رحمہ اللہ کا اس حدیث سے محل استدلال ہے۔

غرض سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا نے اپنے سابقہ نکاح کے فسخ کرنے کو اختیار کیا۔ سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے خاوند کو ان سے بے حد محبت تھی جبکہ وہ ان کو بے حد ناپسند کرتی تھیں۔ چنانچہ جب انہوں نے نکاح کے فسخ کا اعلان کیا تو ان کا خاوند مدینہ کی گلیوں میں ان کے پیچھے روتا ہوا چلتا جا رہا تھا اور منت کر رہا تھا کہ وہ اس رشتہ کو نہ توڑیں۔ لیکن سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو اپنے خاوند پر ترس نہ آیا کیونکہ انہیں اس سے ذرا محبت نہ تھی اور کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنا، بہر حال مشکل ہوتا ہے جس سے محبت نہ ہو۔

سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے خاوند نے جناب رسول اللہ ﷺ کو بیچ میں ڈالا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں بلا کر سفارش بھی فرمائی

---

[1] صحیح البخاری: 5097- صحیح مسلم: 1504.
[2] صحیح البخاری: 5280-5281.

جس کے جواب میں انہوں نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! اگر تو یہ آپ ﷺ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر، اور اگر یہ آپ ﷺ کا مشورہ ہے تو مجھے ان کی (یعنی اپنے خاوند کی) کوئی ضرورت نہیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں میں تو (صرف) مشورہ دے رہا ہوں۔'' اس پر انہوں نے انکار کرتے ہوئے یہ رشتہ نکاح ختم کر دیا۔ اس کے بعد سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دولت کدہ پر خادمہ بن کر رہنے لگیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا جب آزاد ہوئی تھیں تو انہیں اپنے گزشتہ نکاح کی بابت اس کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا خیار ملا تھا۔

آزاد کی باندی بیوی اگر آزاد ہو جائے تو اس کا حکم

اس کے بعد امام موصوف نے تین روایات اور ذکر کی ہیں جن میں اس اختلاف کو ذکر کیا ہے کہ سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے آزاد ہونے کے وقت ان کا خاوند آزاد تھا یا غلام۔ پھر ان کے غلام ہونے کو راجح اور اثبت قرار دیا ہے۔ کہ اصح روایت ان کے غلام ہونے کی ہے۔ لیکن اس اختلاف نے علماء کے ہاں ایک اور اختلاف کو جنم دے دیا ہے وہ یہ کہ اگر کسی آزاد کی بیوی آزاد ہو جائے تو کیا اس کو بھی خیار ملتا ہے یا نہیں؟ اس بارے علماء کے دو اقوال ہیں۔ لیکن اگر آزاد ہونے والی باندی کا خاوند غلام ہو تو مسئلہ بالکل واضح ہے کہ اسے خیار ملے گا۔ کیونکہ آزاد ہو جانے کے بعد وہ خاوند سے اعلیٰ بن جاتی ہے، اس لیے اس کو خیار ملتا ہے۔

لیکن اگر خاوند آزاد ہو، تو ایک قول یہ ہے کہ باندی کو آزاد ہو جانے پر فسخ نکاح کا خیار نہ ملے گا۔ کیونکہ آزاد ہو جانے پر زیادہ سے زیادہ وہ خاوند کے برابر ہو گئی ہے۔ لہٰذا اسے کوئی خیار نہ ملے گا اور یہی راجح قول ہے۔

جبکہ ایک قول اس کو بھی خیار ملنے کا ہے، اور اس کی دلیل اس حدیث کی وہ روایت بیان کی جاتی ہے جس میں بریرہ رضی اللہ عنہا کے خاوند کے آزاد ہونے کا ذکر ہے اور اس کی علت یہ ہے کہ آزاد ہونے پر عورت اپنی جان کی مالک بن جاتی ہے، اس لیے اس کو اپنے بارے خیار ملتا ہے۔ کیونکہ نکاح کے وقت وہ باندی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب آقا نے اس کی رضا اور اس کے اختیار سے اس کا نکاح کیا تھا تو اس کو کوئی ضرر نہ تھا۔ لیکن بسا اوقات بعد کے حالات اسے جدائی اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس لیے آزاد ہونے کے وقت اس کو خیار ملتا ہے۔ بہر حال راجح قول یہ ہے کہ خاوند کے غلام ہونے کی صورت میں تو آزاد ہونے پر بیوی کو خیار ملتا ہے جبکہ خاوند کے آزاد ہونے کی صورت میں اسے خیار نہیں ملتا۔ اس بنا پر جس روایت میں سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے خاوند کے آزاد ہونے کا ذکر ہے، وہ روایت شاذ ہوگی۔ کیونکہ وہ محفوظ اور راجح قول کے خلاف ہے۔

جس کے نکاح میں دو بہنیں ہوں اور وہ اسلام لے آئے تو اس کا حکم کیا ہے؟

1004۔ وَعَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ فَيْرُوْزَ الدَّيْلَمِيِّ عَنْ أَبِيْهِ رضي الله عنه قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ أَسْلَمْتُ وَتَحْتِيْ أُخْتَانِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((طَلِّقْ أَيَّتَهُمَا شِئْتَ)).

ضحاک بن فیروز دیلمی اپنے والد (ماجد حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (اپنے اسلام لے آنے کے وقت خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں مسلمان ہو گیا ہوں جبکہ (اس وقت) میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دونوں میں سے جس

(ایک) کو چاہو (اسے) طلاق دے دو (اور دوسری کو نکاح میں رکھو)۔“ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَأَعَلَّهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے۔ امام ابن حبان، امام دارقطنی اور امام بیہقی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے۔

دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کا حکم

شرح :...... یہ مسئلہ تو بالکل واضح ہے کہ دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں رکھنا حرام ہے، تب پھر جو آدمی اس حال میں مسلمان ہو کہ اس کے نکاح میں دو بہنیں تھیں تو دونوں میں سے ایک کو رکھنا اور دوسری کو چھوڑنا لازم ہوگا۔ لیکن کس کو چھوڑے اور کس کو رکھے؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ اس کا پہلا عقد صحیح تھا اور دوسرا باطل، تب پھر اسے دوسری کو چھوڑنا لازم ہوگا، یا یہ کہیں گے کہ دوسرا عقد صحیح تھا تب پھر پہلی کو چھوڑنا لازم ہوگا یا دونوں میں قرعہ ڈالے گا یا اسے خیار ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے دونوں میں خیار ہوگا، چاہے تو پہلی منکوحہ کو پاس رکھے اور چاہے تو دوسری منکوحہ کو پاس رکھے اور یہ نہ کہیں گے کہ پہلی کو پاس رکھے گا اور دوسری کو چھوڑے گا کیونکہ دوسری کا نکاح پہلی کے نکاح پر وارد ہوا تھا لہٰذا پہلا نکاح درست ہوگا نہ کہ دوسرا، کیونکہ یہ دونوں نکاح اس کے زمانہ کفر میں ہوئے تھے اور وہ اس وقت احکاماتِ اسلامیہ کا پابند نہ تھا لہٰذا اس زمانہ میں اس کا دوسرا نکاح بھی درست تھا۔ لیکن جب وہ اسلام لے آیا تو اب اس نے اسلام کے احکام کا التزام قبول کر لیا اور اب شریعت اسلامیہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنے سے مانع ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں تفریق واجب ہوگی۔ البتہ اسے کسی ایک کو رکھنے میں خیار ہوگا جیسا کہ مذکور ہوا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ دونوں میں سے جس کو بھی طلاق دے دے گا تو گویا کہ اس نے دوسری کو اختیار کر لیا۔

فائدہ:... معلوم ہوا کہ کافروں کے نکاح کے عقود صحیح ہیں اور ان کے درپے نہ ہوا جائے گا الا یہ کہ اسلام قبول کرتے وقت نکاح کو باقی رکھنے کا کوئی مانع پایا جائے تب پھر اس نکاح کو فسخ کر دیں گے۔ جیسے:

(1) کسی نے اپنی بہن سے نکاح کر رکھا تھا جیسے مجوسی کرتے ہیں یا:

(2) کسی نے اپنی بیوی کی بہن کو بھی نکاح میں لے رکھا تھا تو اسلام قبول کرتے وقت سالی کو نکاح سے نکال دینا واجب ہوگا کیونکہ اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح دو بہنوں میں سے ایک کو طلاق دینا واجب ہوگا جیسا کہ اس حدیث میں وارد ہے۔

---

❶ مسند احمد: 232/4۔ سنن ابی داؤد: 2243۔ جامع الترمذی: 1129۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ سنن ابن ماجہ: 1951۔ صحیح ابن حبان: 55/4۔ سنن الدار قطنی: 273/3۔ سنن البیہقی: 184/7۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "التاریخ" (248/3) میں اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ ابو وہب جیشانی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد میں نظر ہے۔ دیکھیں: "تحفة الطالب: 346" اور جیشانی کا نام دیلم بن ہیلع ہے۔

جس کے نکاح میں اسلام قبول کرتے وقت چار سے زیادہ بیویاں ہوں، اس کا حکم

1005- وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ رضی اللہ عنہ ((أَنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ أَسْلَمَ ، وَلَهُ عَشْرُ نِسْوَةٍ ، فَأَسْلَمْنَ مَعَهُ ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَتَخَيَّرَ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا)).

جناب سالم اپنے والد ماجد (سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے روایت کرتے ہیں کہ: غیلان بن سلمہ اسلام لے آئے جبکہ اس وقت ان کی دس بیویاں تھیں، سو وہ بھی ان کے ساتھ ہی اسلام لے آئیں تو نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ان (دس) میں سے چار کو اختیار کر لیں (اور باقی کی چھ کو طلاق دے کر چھوڑ دیں)۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ ، وَأَعَلَّهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُوزَرْعَةَ وَأَبُوحَاتِمٍ .

اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے، اور امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام بخاری، امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے۔

شرح :...... یہ حدیث بھی پہلی حدیث کے مشابہ ہے کہ اگر نکاح میں موجود عورتوں کو قبول اسلام کے وقت احکاماتِ اسلام باقی نہ رہنے دیں تو ان عورتوں کو چھوڑنا واجب ہوگا۔ چنانچہ جناب غیلان رضی اللہ عنہ نے زمانۂ کفر میں دس عورتوں کو نکاح میں لے رکھا تھا۔ لیکن چونکہ اسلام ایک مسلمان کو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نکاح میں رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے اسلام قبول کرنے پر چار کے علاوہ باقی بیویوں کو طلاق دے کر اپنے نکاح سے الگ کرنا واجب ہوگا اور اسے چار کے رکھنے میں اختیار ہوگا جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

درایة الحدیث :......اگرچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے لیکن چونکہ یہ حدیث قواعد شرعیہ کے عین مطابق ہے، اس لیے غیر محفوظ ہونے کے باوجود مقبول ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ زمانہ کفر میں ہونے والے نکاحِ فاسد پر فاسد ہونے کا حکم نہ لگایا جائے گا۔ کیونکہ اگر ان نکاحوں کو فاسد سمجھا جاتا تو نبی کریم ﷺ بجائے دس میں اختیار دینے کے یہ ارشاد فرماتے کہ پہلی چار کو رکھ کر بعد کی چھ کو طلاق دے دو۔
- ◈ اسلام لے آنے کے بعد جب نکاح کی بقاء میں مانع زائل ہو جائے تو وہ نکاح درست ہو جاتا ہے۔ جیسے مذکورہ صورت میں چھ کو طلاق دے دینے سے رہ جانے والی باقی چار کے نکاح میں مانع زائل ہو گیا۔ لہٰذا باقی چار کا نکاح درست ہوگا۔
- ◈ ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز نہیں۔ اس کی دلیل مذکورہ حدیث بھی ہے اور یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:
﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾ (النسآء: 3)

---

[1] مسند احمد: 13/2۔ جامع الترمذی: 1128۔ سنن ابن ماجہ: 1953۔ صحیح ابن حبان: 4157۔ المستدرك للحاكم: 209/2۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "التاریخ الکبیر: 248/6" اور "التاریخ الصغیر" (297/1) میں اس حدیث کو معلول کہا ہے۔
"العلل لابن ابی حاتم: 400/1" ابوحاتم کہتے ہیں: اس حدیث کی مرسل روایت اصح ہے۔
ہم کہتے ہیں کہ امام ابوداؤد نے "المراسیل" (234) میں اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

''تو (اور) عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں، ان سے نکاح کرلو، دو دو سے اور تین تین سے اور چار چار سے۔''

اگر چار سے زیادہ بیویوں کے ساتھ بیک وقت نکاح کرنا جائز ہوتا تو رب تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے: ﴿فَانْكِحُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ ''جتنی عورتوں سے تم چاہو نکاح کرلو۔''

◈ رہا نبی کریم ﷺ کی کثرتِ ازواج تو وہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔

خاوند مسلمان ہو جائے تو اس کی مسلمان ہونے والی بیوی اس کی طرف لوٹائی جائے گی

1006- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((رَدَّ النَّبِيُّ ﷺ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيعِ بَعْدَ سِتِّ سِنِينَ بِالنِّكَاحِ الْأَوَّلِ وَلَمْ يُحْدِثْ نِكَاحًا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی لختِ جگر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو چھ سال بعد (ان کے خاوند) جناب ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کو (ان کے مسلمان ہو جانے پر) پہلے نکاح پر ہی واپس فرمایا اور نیا نکاح نہ فرمایا۔ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ، وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، سوائے امام نسائی رحمہ اللہ کے اور امام احمد اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

1007- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَدَّ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي الْعَاصِ بِنِكَاحٍ جَدِيدٍ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی نورِ نظر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو نکاحِ جدید کے ساتھ (ان کے خاوند) جناب ابو العاص بن ربیع کو (ان کے مسلمان ہو جانے پر) واپس فرمایا۔ ❷

قَالَ التِّرْمِذِيُّ: حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ أَجْوَدُ إِسْنَادًا، وَالْعَمَلُ عَلَى حَدِيثِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ.

امام ترمذی فرماتے ہیں: حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اسناد (اگرچہ) عمدہ ہے مگر عمل عمرو بن شعیب کی حدیث پر ہے۔

خاوند اور بیوی کے اسلام لے آنے کی صورتیں اور ان کے احکام

شرح :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر خاوند اور بیوی ایک دوسرے کے آگے پیچھے اسلام لے آئیں تو اس کا حکم کیا ہے۔ تو اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے:

◈ اگر تو بیوی پہلے اسلام لے آتی ہے تو اس کی عدت تک خاوند کے اسلام قبول کرنے کا انتظار کیا جائے گا۔ پس اگر تو دورانِ عدت خاوند اسلام لے آتا ہے تو یہ اس کی بیوی ہے اور اگر وہ عدت پوری ہونے تک بھی اسلام نہیں لاتا تو اس نکاح کو فسخ سمجھا

---

❶ مسند احمد: 261/1- سنن ابی داؤد: 2240- جامع الترمذی: 1143- امام ترمذی رحمہ اللہ نے "العلل" (166) میں اس حدیث کی بابت امام بخاری رحمہ اللہ کی تصحیح نقل کی ہے اور حاکم (740/3) کہتے ہیں: یہ حدیث امام مسلم کی شرط پر ہے۔

❷ جامع الترمذی: 1142- سنن ابن ماجه: 2010- سنن الدار قطنی: 253/3- امام دار قطنی فرماتے ہیں: حجاج سے استدلال نہیں کیا جاتا اور درست روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔

جائے گا اور یہ انفساخ عورت کے مسلمان ہو جانے کے وقت سے تصور کیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾ (الممتحنة: 10)

''(پھر اگر تم جان لو کہ وہ مومن ہیں) تو انھیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ یہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان کے لیے حلال ہوں گے۔''

◈ اور رہی یہ صورت کہ خاوند، مسلمان ہو جانے والی بیوی کی عدت کے دوران اسلام لے آئے تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اس کی بیوی ہے اور اسے اس کے نکاح پر برقرار رکھا جائے گا۔

◈ اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ آ گئی کہ اگر خاوند نے ابھی تک دخول بھی نہ کیا تھا اور نہ ان دونوں میں خلوتِ صحیحہ ہی ہوئی تھی تو عورت کے اسلام لے آتے ہی دونوں میں تفریق ہو جائے گی کیونکہ غیر مدخول بہا زوجہ پر طلاق یا فسخ نکاح کی صورت میں عدت نہیں آتی۔ لہٰذا عورت کے مسلمان ہوتے ہی دونوں کا نکاح فی الفور فسخ ہو جائے گا۔ جبکہ دخول اور خلوتِ صحیحہ ہو جانے کے بعد عورت کے مسلمان ہو جانے کی صورت کا حکم وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا اور تینوں صورتوں کی بابت جمہور علماء کی رائے بھی یہی ہے۔

◈ اور اگر زوجین میں سے پہلے خاوند اسلام لے آیا تو دیکھا جائے گا کہ ابھی دخول اور خلوت ہوئی تھی یا نہیں۔ پس اگر تو ابھی خلوت اور دخول نہ ہوا تھا تو دیکھا جائے گا کہ بیوی کتابیہ ہے یا غیر کتابیہ۔ پس اگر تو وہ کتابیہ ہے تو خاوند کے اسلام لے آنے سے یہ عقد فسخ نہیں ہوا کیونکہ مسلمان کا کتابیہ کے ساتھ نکاح جائز ہے اور وہ مسلمان کے لیے حلال ہے۔ لہٰذا یہ نکاح غیر باطل ہوگا۔ چاہے اس کے ساتھ دخول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور اگر وہ بیوی غیر کتابیہ تھی اور ابھی دخول نہ ہوا تھا تو خاوند کے اسلام لے آتے ہی یہ نکاح فسخ ہو جائے گا اور اگر وہ دخول کر چکا تھا اور بیوی غیر کتابیہ تھی تو انتظار کیا جائے گا۔ پس اگر تو وہ بھی مسلمان ہو جاتی ہے تو یہ اس کی بیوی ہے اور اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتی تو دونوں کے درمیان نکاح فسخ ہو جائے گا اور یہ نکاح کا فسخ ہونا خاوند کے مسلمان ہونے کے وقت سے سمجھا جائے گا۔

اس باب میں یہی قاعدہ ہے اور یہ جمہور علماء کے نزدیک حکم ہے۔ جبکہ بعض علماء کے نزدیک اگر عورت مسلمان ہو جائے اور عدت کے ختم تک خاوند اسلام قبول نہ کرے تو اب اپنے نفس کی وہ خود مالک ہے۔ لہٰذا اب اگر اختتامِ عدت کے بعد اس کا خاوند بھی اسلام لے آتا ہے تو اسے خیار ہوگا۔ ان دونوں اقوال میں فرق یہ ہے کہ:

پہلے قول کے مطابق عورت کے مسلمان ہو جانے کے بعد اگر خاوند عدت ختم ہونے تک مسلمان نہیں ہوتا تو اب بعد میں عورت کو خیار نہ ہوگا اور یہ عقد فسخ شمار ہوگا اور اب یہ عورت خاوند کے مسلمان ہو جانے پر نئے عقد کے ساتھ خاوند کے نکاح میں داخل ہوگی۔

جبکہ دوسرے قول کے مطابق اس صورت میں اسے خیار ملے گا۔ کہ یا تو:

(1) اس تفریق کو باقی اور جاری رکھے۔

(2) چاہے تو بدون عقدِ جدید کے اس خاوند کے پاس لوٹ جائے۔

(3) اور چاہے تو اسی خاوند کے ساتھ عقدِ جدید کر کے دوبارہ اس کے نکاح میں لوٹ جائے۔

اس تفصیل کے بعد ہم مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کی طرف آتے ہیں۔ تاکہ ان دونوں احادیث پر علماء کے ان دونوں اقوال کو منطبق کر سکیں۔

بَعْدَ سِتِّ سِنِينَ : یعنی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی عدت بھی گزر چکی تھی اور اس بات کو چھ برس بھی بیت گئے تھے۔ اس کے بعد سیدنا ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ ایمان لا کر مسلمان ہوئے تھے۔

وَلَمْ يُحْدِثْ نِكَاحًا : یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مسلمان ہو جانے پر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو دوبارہ ان کے پاس بھیج دیا اور نکاح کے عقد کی تجدید نہ فرمائی۔

یہ حدیث علماء کے دوسرے قول کی موید ہے کہ جب خاوند بیوی کی عدت ختم ہونے تک مسلمان نہ ہو تو بعد میں مسلمان ہونے پر بیوی کو خیار ہوگا اور وہ اپنی جان کی خود مالک ہوگی اور چاہے تو نیا عقد کر کے خاوند کے پاس لوٹ جائے اور چاہے تو بدون عقد کے لوٹ جائے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو عقدِ جدید کے بغیر حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا اور یہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا مختار مذہب ہے کہ عدت کا ختم ہونا عورت کے لیے خیار کے ثابت ہونے یا نہ ہونے میں فارق و فاصل ہے کہ اگر خاوند عدت ختم ہونے سے قبل مسلمان ہو جائے تو عورت کو خیار نہ ہوگا اور اگر وہ عدت ختم ہو جانے کے بعد مسلمان ہو تو اسے خیار ہوگا اور پہلے قول کے مطابق عدت ختم ہو جانے کے بعد بیوی عقدِ جدید کے بغیر مسلمان ہو جانے والے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔

اور رہی دوسری حدیث تو علماء کا اس کے مرسل (یعنی منقطع) یا متصل ہونے میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث متصل ہے اور علماء محدثین نے عمرو کی حدیث سے استدلال کیا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے عمرو بن شعیب کی احادیث کو نقل کیا ہے اور رہی وہ علت جو "عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" میں بیان کی جاتی ہے تو علماء محققین نے اس علت کی نفی کی ہے۔ اس اسناد پر تفصیلی بحث پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کو عمدہ اسناد والا قرار دیا ہے جس میں اس بات کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو جناب ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے اسلام لے آنے پر نکاحِ جدید کے بغیر ان کی طرف رخصت فرمایا۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ جب عورت اپنے خاوند سے قبل اسلام لے آئے اور اس کا خاوند اس کی عدت کے بعد اسلام لے آئے تو وہ اپنے خاوند کی طرف لوٹ سکتی ہے۔ اب حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مطابق اسے تجدید نکاح کی ضرورت نہیں جبکہ عمرو بن شعیب والی روایت کے مطابق وہ تجدید نکاح کر کے اپنے نومسلم خاوند کے پاس جا سکتی ہے۔

مسلمان ہو جانے والا اپنی بیوی کا زیادہ مستحق ہے

1008۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: ((أَسْلَمَتِ امْرَأَةٌ، فَتَزَوَّجَتْ، فَجَاءَ زَوْجُهَا، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنِّي كُنْتُ أَسْلَمْتُ، وَعَلِمَتْ بِإِسْلَامِي فَانْتَزَعَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ زَوْجِهَا الْآخِرِ، وَرَدَّهَا إِلَى زَوْجِهَا الْأَوَّلِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک عورت مسلمان ہوگئی اور اس نے (عدت کے گزرنے کے بعد دوسرے خاوند سے) شادی کر لی۔ پس اس کے خاوند نے حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں (بھی) مسلمان ہو گیا ہوں اور وہ (یعنی میری بیوی) میرے مسلمان ہو جانے کو جانتی ہے

(اس لیے اپنی بیوی کا پہلا مستحق میں ہوں) اس پر نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو اس کے دوسرے خاوند سے واپس لے لیا، اور اسے دوبارہ پہلے خاوند کی طرف لوٹا دیا۔ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَأَبُو دَاوُدَ، وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح:......اس حدیث میں بھی زوجین میں سے ایک کے پہلے اسلام لے آنے کا ذکر ہے اور یہاں بیوی پہلے اسلام لے آئی تھی۔ گو اس کا خاوند بعد میں اسلام لایا اور اسے اس کے مسلمان ہو جانے کا علم بھی تھا لیکن اس نے پھر بھی کسی اور سے نکاح کر لیا تھا۔ جس پر خاوند نے دربار نبوی میں اپنے استحقاق کی دہائی دی۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس کی بیوی کو دوسرے خاوند سے واپس کرا کے اسے دوبارہ پہلے خاوند کے نکاح میں دے دیا۔ کیونکہ اس کا پہلا نکاح ابھی باقی تھا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ منکوحہ عورت کا دوسرے مرد سے نکاح درست نہ ہوگا۔ یعنی جب تک وہ ایک مرد کے نکاح میں ہے، اس کا دوسرے کے ساتھ نکاح درست نہ ہوگا۔
- جو نکاح شبہ کے ساتھ ہو وہ فاسد ہوتا ہے۔ البتہ شبہ کے ساتھ نکاح کرنے والے پر حد یا عقوبت نہ آئے گی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ قصہ میں نبی کریم ﷺ نے اس دوسرے شخص سے اس عورت کو واپس لے کر خاوند کی طرف تو لوٹایا تھا مگر اس پر حد جاری نہ فرمائی تھی اور نہ کوئی عقوبت ہی دی تھی۔
- رہا یہ سوال کہ نبی کریم ﷺ نے اس خاوند کے قول کو بدون بینہ کے کیونکر قبول فرما لیا کہ یہ میرے مسلمان ہونے کو جانتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے آگے نکاح کر لیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس عورت نے خاوند کے اس دعویٰ کو رد نہ کیا تھا، اس لیے بینہ کی ضرورت نہ تھی۔

عیب کی وجہ سے فسخ نکاح کا حکم

1009- وَعَنْ زَيْدِ بْنِ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: تَزَوَّجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْعَالِيَةَ مِنْ بَنِي غِفَارٍ، فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَيْهِ، وَوَضَعَتْ ثِيَابَهَا، رَأَى بِكَشْحِهَا بَيَاضًا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((الْبَسِي ثِيَابَكِ، وَالْحَقِي بِأَهْلِكِ))، وَأَمَرَ لَهَا بِالصَّدَاقِ.

زید بن کعب بن عجرہ اپنے والد (ماجد حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے بنی غفار کی "عالیہ" نامی ایک عورت سے نکاح فرمایا۔ پس جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئی اور اس نے اپنے کپڑے اتارے تو آپ ﷺ نے اس کے پہلو میں (یعنی کوکھ اور پسلیوں کی درمیان کی جگہ میں) سفیدی دیکھی (یعنی ایک سفید نشان دیکھا)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اپنے کپڑے پہن لو اور اپنے گھر

---

❶ مسند احمد: 323/1- سنن ابی داؤد: 2239- سنن ابن ماجہ: 2008- صحیح ابن حبان: 4159- المستدرک للحاکم: 218/2- اس حدیث کا مدار سماک پر ہے اور یہ اس کی عکرمہ سے روایت ہے جو مضطرب ہے۔

والوں کے پاس چلی جاؤ۔‘‘ اور اسے مہر دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ ❶

رَوَاهُ الْحَاكِمُ ، وَفِي إِسْنَادِهِ جَمِيلُ بْنُ زَيْدٍ، وَهُوَ مَجْهُولٌ، وَاخْتُلِفَ عَلَيْهِ فِي شَيْخِهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا.

اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد میں جمیل بن زید نامی ایک راوی ہے جو مجہول ہے اور اس پر آ کر اس کے شیخ میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔

غریب الحدیث:...... عالیہ:...... یہ قبیلہ بنی غفار کی ایک خاتون کا نام ہے۔ بنی غفار عربوں کا ایک معروف قبیلہ ہے۔

وَضَعَتْ ثِيَابَهَا: کیونکہ اس وقت اس خاتون کے پاس سوائے اس کے خاوند کے اور کوئی نہ تھا اور خاوند اور بیوی دونوں ایک دوسرے کا بدن دیکھ سکتے ہیں۔

بِكَشْحِهَا: كَشْح: یہ کوکھ اور پسلیوں کے درمیان کی جگہ کو کہتے ہیں (اردو زبان میں اس کو ’’پہلو‘‘ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں)۔

بَيَاضًا: مراد برص کا داغ یا سفید دھبہ ہے، جو جذام کی وجہ سے بدن کو لگتا ہے۔ برص اور جذام یہ دونوں معروف جلدی بیماریاں ہیں اور برص زیادہ بری بیماری ہے اور انسانی طبیعت ان دونوں بیماریوں سے ہی گھن کھاتی ہے۔

اِلْبَسِي ثِيَابَكِ: مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ اس کو نہ چاہتے تھے۔

اِلْحَقِي بِأَهْلِكِ: یہ الفاظ اگر طلاق کی نیت سے کہے جائیں تو یہ طلاق سے کنایہ ہیں۔

أَمَرَ لَهَا بِالصَّدَاقِ: کیونکہ نکاح کے بعد جب خاوند بیوی سے خلوت کر لیتا ہے تو عورت پورے مہر کی مستحق ٹھہرتی ہے۔

روایۃ الحدیث:...... علم مصطلح الحدیث کی روشنی میں یہ حدیث ضعیف ہے۔ جس کی دو وجوہات ہیں:

(1) ایک یہ کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے۔

(2) دوسری یہ کہ اس حدیث میں اضطراب ہے کیونکہ جمیل بن زید کے شیخ میں شدید اختلاف ہے۔

درایۃ الحدیث:...... رہا یہ سوال کہ کیا ضعیف السند ہونے کی وجہ سے یہ روایت ضعیف المتن بھی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کا متن ضعیف نہیں، جس کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

⊙ ...... خاوند کے سامنے کپڑے اتارنا اصولِ شرع کے خلاف نہیں کیونکہ زوجین کے لیے ایک دوسرے کے ستر کو دیکھنا جائز ہے۔

⊙ ...... بدن پر سفید داغ دیکھ کر اسے کپڑے پہننے کو کہنا بھی خلاف اصول نہیں کیونکہ خاوند کو حق ہے کہ وہ بدنی عیب کی وجہ سے بیوی کو رد کر سکتا ہے اور لباس پہننے کو کہنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ اس کو نہ چاہتے تھے۔

⊙ ...... کنایہ سے طلاق دینا بھی خلاف اصولِ شرع نہیں۔

⊙ ...... خلوتِ صحیحہ کے بعد مہر کی ادائیگی بھی خلاف اصولِ شرع نہیں۔

---

❶ المستدرك للحاكم: 4/36۔ ابن حزم (10/115) کہتے ہیں: جمیل بن زید متروک اور مجہول راوی ہے اور زید بن کعب سے جو بھی روایت ہے وہ متروک ہے۔ کیونکہ زید بن کعب مجہول ہے۔ کیونکہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے زید نامی کسی بیٹے کا علم نہیں اور آگے فرماتے ہیں: پھر یہ روایت مرسل ہے۔

غرض مذکورہ حدیث کے جملہ مندرجات صحیح ہیں۔ پس گو کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن متن کے اعتبار سے صحیح ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں نکاح کی بابت خیارِ عیب کا بیان ہے چونکہ اس کا بیان باقی تھا اس لیے اس روایت میں اسے ذکر کر دیا گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مذکورہ روایت میں عورت کے خاوند کی طرف بھیجے جانے کا ذکر ہے جبکہ آج کل مرد کے عورت کے پاس داخل ہونے کا رواج ہے۔ یہ بھی خلافِ سنت نہیں۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ امور عادات میں سے ہے نہ کہ امورِ عبادات میں سے ہے۔ تب پھر یہ امر عرف کی راجع ہوگا جب تک کہ خلافِ شرع نہ ہو۔

◈ خاوند اور بیوی کا ایک دوسرے کے سامنے بے ستر ہونا جائز ہے۔

◈ بیوی میں کسی خلقی عیب کو دیکھ کر اس سے علیحدگی اختیار کرنا جائز ہے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ عیب تو رب تعالیٰ کی طرف سے ہے، بھلا اس میں بیوی کا کیا قصور۔ کیونکہ جب ایک آدمی کا جی ہی اپنی بیوی سے راحت نہ پائے گا تو اس رشتہ کو باقی رکھنا بے سود ہے۔

◈ لازم سے ملزوم پر استدلال جائز ہے۔ جیسے "اِلْبَسِی ثِیَابَكِ" کہ یہ قول بیوی کی مفارقت کو ملزوم ہے۔ لہٰذا یہ جملہ بول کر مفارقت مراد لینا جائز ہے۔ کیونکہ یہ لازم سے ملزوم پر استدلال ہے۔ کہ مفارقت کو زوجین کے مابین ستر لازم ہے۔ لہٰذا اس لازم کو بول کر ملزوم مراد لیا ہے جو جائز ہے۔

◈ تم اپنے گھر والوں سے جا ملو۔ یہ فراق کے الفاظ میں سے ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ الفاظ خود طلاق کے حکم میں ہیں یا الفاظِ طلاق سے کنایہ ہیں؟ تو اس میں دونوں باتوں کا ہی احتمال ہے۔ وہ یوں کہ اگر تو ہم سبب کو دیکھیں جو عیب جسمانی ہے تو یہ فسخ نکاح سے کنایہ ہے اور اگر ہم نبی کریم ﷺ کے ادائے مہر کے حکم کو دیکھیں تو یہ الفاظ طلاق ہیں۔

اب بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ یہ الفاظ ہیں تو طلاق سے کنایہ، مگر نبی کریم ﷺ کا ادائے مہر کا حکم یہ اکرام کے باب میں سے ہے کیونکہ یہ مہر دینا آپ ﷺ پر واجب نہ تھا۔ کیونکہ اس خاتون کے جسمانی عیب سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی تھی۔

غرض اگر تو ہم مہر کے حکم کو ان الفاظ کے الفاظِ طلاق ہونے کی بنا پر سمجھیں تب تو امر واضح ہے کیونکہ یہ طلاق خلوتِ صحیحہ کے بعد تھی، اس لیے وہ عورت مہر کی مستحق تھی اور اگر ان الفاظ سے فسخ نکاح مراد لیا جائے تب پھر مہر کے امر میں اشکال ہے۔ کیونکہ جب خاوند نکاح کے بعد بیوی کے کسی عیب کی بنا پر نکاح کو فسخ کرتا ہے تو اسے مہر واپس لینے کا اختیار ہوتا ہے، اور اس اشکال کا جواب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ آپ ﷺ کا یہ امر مہر آپ ﷺ کے جود و کرم کے باب میں سے تھا۔

◈ غرض اس حدیث کے صحیح ہونے کی صورت میں یہ مسئلہ متعین ہوگا کہ بیوی میں کوئی جسمانی عیب دیکھ کر خاوند کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوگا اور یہ کہ برص اور جذام یہ ان جسمانی عیوب میں سے ہے جن کی وجہ سے نکاح فسخ کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ چاہے یہ عیب بدن کے اعضائے مستورہ میں ہو یا اعضائے منکشفہ میں ہو جیسے ہاتھوں یا پیروں میں ہو۔ اب نبی کریم ﷺ نے اس خاتون کو بدن کے اعضائے مستورہ میں یہ عیب دیکھ کر اپنے سے جدا کیا تھا تو اعضائے منکشفہ میں

اس عیب کے پائے جانے کے وقت بدرجہ اولیٰ فسخ نکاح کا استحقاق ہو گا۔

◈ یہ حدیث خیارِ عیب کی دلیل ہے۔ کہ عیب دیکھ کر نکاح فسخ کر سکتے ہیں۔ پھر اگر شوہر مہر دے چکا ہو اور بعد میں عیب ظاہر ہو تو دیکھا جائے گا کہ آیا اس نے مہر دخول کے بعد دیا تھا اور اس کے بعد عیب پر اطلاع بعد میں ملی تھی تو دخول کی وجہ سے عورت مستحق مہر تو بن جائے گی البتہ خاوند اس کے ولی پر لوٹے گا جس نے اسے دھوکا دیا تھا اور اگر ولی اس عیب سے بے خبر تھا تو خاوند مہر کے لیے بیوی پر لوٹے گا اور اگر اسے دخول سے قبل ہی عیب پر اطلاع ہو گئی تھی تو فسخ کی صورت میں عورت مہر کی مستحق نہ ہو گی کیونکہ اس نے خاوند کو دھوکا دیا تھا اور اگر اس عیب کی خبر نہ تو ولی کو تھی اور نہ عورت کو ہی تھی جیسے برص کا داغ اس کی پیٹھ پر تھا اور کسی دوسرے سے اسے اس کی خبر بھی نہ ملی تھی تو اب خاوند دیا مہر واپس نہ لے سکے گا کیونکہ اب اس صورت میں خاوند کو ولی یا بیوی میں سے کسی نے بھی دھوکا نہیں دیا۔

◈ رہا یہ سوال کہ وہ عیب کیا ہوتا ہے جس کی وجہ سے نکاح کے فسخ کا اختیار ملتا ہے۔

پھر علماء کا عیب کی وجہ سے فسخ کے خیار میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ عیب کی وجہ سے فسخ نکاح کا خیار نہ ملے گا اور خاوند سے کہا جائے گا کہ یا تو اسی عیب پر راضی رہ کر بیوی پاس رکھو یا پھر اسے طلاق دے دو اور طلاق اور فسخ میں جو فرق ہے وہ اہل علم پر عیاں ہے۔ لیکن اگر عیب فسخ نکاح کے استحقاق کا سبب نہیں تو مشکل تب ہو گی جب کوئی عیب خاوند میں پایا جائے تو کیا اس وقت بیوی سے یہ کہا جائے گا کہ صبر کرو اور اس مصیبت پر اللہ سے اجر کی امیدوار ہو کیونکہ عیب کی وجہ سے نکاح فسخ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ظاہریہ کا مذہب ہے، جن کی دلیل یہ ہے کہ عیب کی وجہ سے فسخ کے استحقاق کی بابت وارد آثار ضعیف ہیں جن پر احکامِ شرعیہ کی بنا نہیں کی جا سکتی اور نکاح کو بیع پر قیاس کرنا بھی غیر صحیح ہے کیونکہ ظاہریہ کے نزدیک ''قیاس'' کرنا باطل ہے۔ تب پھر ایک تو عیب کی بنا پر فسخ کی بابت وارد آثار ضعیف ٹھہرے دوسرے قیاس بھی باطل ٹھہرا تو خاوند میں یا بیوی میں عیب پائے جانے کے وقت ظاہریہ کے نزدیک نکاح فسخ نہ ہو گا۔

جبکہ جمہور علماء [1] کا قول یہ ہے کہ عیب فسخ نکاح کو جائز بنا دیتا ہے چاہے وہ عیب بیوی میں ہو یا خاوند میں۔ رہا یہ اعتراض کہ اس بابت وارد جملہ آثار ضعیف ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات محدثین کے ہاں یہ امر مسلم ہے کہ احادیث ضعیفہ اگرچہ علی الانفراد ضعیف ہیں لیکن ان کا مجموعہ ایک دوسرے کی تقویت کا سبب ضرور ہوتا ہے یوں من حیث المجموع روایات ضعیفہ حسن درجہ میں صحیح ہوتی ہیں گو "حسن لغیرہ" ہوتی ہیں۔ رہا قیاس کا عدمِ جواز تو جب گدھا جو صرف سواری کا جانور ہوتا ہے، اسے عیب کی بنا پر واپس کرنے کا خیار ہوتا ہے تو بیوی جو شریک حیات اور دکھ سکھ کی ساتھی اور خلوت و جلوت کی ہم راز اور ہم دم و ہم ساز ہوتی اسے عیب کی بنا پر رد کرنے کا اختیار کیونکر نہ ہو گا۔ پھر نکاح کا اصل مقصود باہمی رحمت و مودت ہے اور عیب اس مقتضائے زوجیت کے منافی ہوتا ہے۔ زوجیت کے اس مقتضی کا بیان اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَ جَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّ رَحۡمَۃً﴾

(الروم: 21)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تم ہی سے بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کی طرف

[1] المبدع: 90/4- المنثور: 50/3.

(جا کر) آرام پاؤ اور اس نے تمھارے درمیان دوستی اور مہربانی رکھ دی۔‘‘

آخری بات یہ ہے کہ فسخ نکاح کے موجب عیوب معدود ہیں یا محدود؟ تو بعض کے نزدیک ان کی تعداد چودہ ہے، جب کہ بعض نے انہیں محدود قرار دیا ہے، اور یہی قول صحیح ہے۔

949۔ وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ﷺ قَالَ: ((أَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً، فَدَخَلَ بِهَا، فَوَجَدَهَا بَرْصَاءَ أَوْ مَجْنُونَةً أَوْ مَجْذُومَةً فَلَهَا الصَّدَاقُ بِمَسِيسِهِ إِيَّاهَا، وَهُوَ لَهُ عَلَى مَنْ غَرَّهُ مِنْهَا.))

سعید بن میتب سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس آدمی نے بھی کسی عورت سے نکاح کیا پھر اس سے دخول بھی کرلیا، پھر اس نے اس عورت کو برص والا پایا (اسے) دیوانی یا جزام والی پایا تو اس عورت کو مرد کے اس سے جماع کرنے کے عوض میں مہر ملے گا اور مرد کو وہ مہر اس شخص پر لوٹنے سے ملے گا جس نے اسے اس کی عورت بابت دھوکا دیا ہے۔ [1]

أَخْرَجَهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ وَمَالِكٌ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو سعید بن منصور، امام مالک اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:...... **بَرْصَاءَ**: یہ ”أَبْرَصُ“ کی مونث ہے۔ برص والی۔ **مَجْنُونَةً**: دیوانی۔

مَجْذُومَةً: وہ عورت جسے جذام ہو گیا ہو۔ جذام یہ ایک متعدی، موذی اور مہلک مرض ہے۔

اسی لیے علماء کا قول ہے کہ امام پر لازم ہے کہ وہ جذام کے مریضوں کو عوام سے جدا کسی خاص عمارت میں رہنے کا پابند کرے اور صحت یاب ہونے تک ان پر عوام کے ساتھ اختلاط رکھنے کی بندش لگائے رکھے۔

بِمَسِيسِهِ إِيَّاهَا: مسیس سے مراد جماع ہے۔ کیونکہ عورت جماع یا خلوت صحیحہ کی وجہ سے مہر کی مستحق ہو جاتی ہے۔

وَهُوَ: اس ضمیر کا مرجع ”الصداق“ یعنی مہر ہے۔ **لَهُ**: اس ضمیر کا مرجع ”رَجُل“ یعنی خاوند ہے

مَنْ غَرَّهُ مِنْهَا: ”مَنْ“ سے مراد عورت کا ولی ہے اور منہا کی ضمیر کا مرجع ”امرأة“ یعنی بیوی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو اہم مسائل مذکور ہیں:

(1) ایک یہ کہ برص، جذام اور دیوانگی ایسے عیوب ہیں جن سے فسخ نکاح کا استحقاق ملتا ہے۔

(2) دوسرا یہ کہ اگر کسی کو دخول کے بعد عورت کے عیب پر اطلاع ہوئی تو عورت تو اس مہر کی حق دار ٹھہرے گی ہی۔ البتہ خاوند فسخ نکاح کی صورت میں اس مہر کے لیے اس شخص پر لوٹے گا جس نے اسے اس عورت کی بابت دھوکا دیا ہے اور یہ نکاح کا ولی ہوتا ہے۔ لہٰذا خاوند وہ مہر عورت کے ولی سے وصول کرے گا اور اگر ولی فقیر ہے تو بھی اس کے غنی ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔

فائدہ:...... مذکورہ حدیث سے متعلق اکثر مسائل کو پیچھے بالتفصیل ذکر کر دیا گیا ہے البتہ ”وَهُوَ لَهُ عَلَى مَنْ غَرَّهُ“ کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ولی نے دھوکا سے کام نہ لیا ہو وہ یوں کہ وہ اس عیب سے بے خبر تھا، تو خاوند بیوی پر لوٹے گا اور اگر بیوی بھی اس عیب سے بے خبر ہو تو خاوند کو کچھ نہ ملے گا جیسا کہ بیان ہوا۔

1010، 1011۔ وَرَوَى سَعِيدٌ أَيْضًا عَنْ عَلِيٍّ

سعید بن میتب سے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی ایک روایت

[1] سنن سعید بن منصور: 820۔ المؤطا لمالك: 526/2۔ مصنف ابن ابی شیبة: 486/3.

نَحْوَهُ ، وَزَادَ: ((وَبِهَا قَرَنٌ ، فَزَوْجُهَا بِالْخِيَارِ ، فَإِنْ مَسَّهَا فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا)).

ہے جس میں یہ الفاظ زائد ہیں: اور (اگر) اس کی شرمگاہ میں ورم ہو تو اس کے خاوند کو خیار ہے۔ پس اگر تو اس نے اس کے ساتھ جماع کر لیا ہوا ہے تو اس عورت کو مہر ملے گا جو اس کی شرمگاہ حلال کرنے کا عوض ہے۔ ❶

شرح :...... یہ عورت میں پائے جانے والے ایک اور عیب کا ذکر ہے جس کے ہوتے ہوئے خاوند کو فسخ نکاح کا خیار ملتا ہے۔

قَرَن : یہ شرمگاہ میں پائے جانے والے ایسے ورم کو کہتے ہیں جس کے ہوتے ہوئے مرد عورت کے ساتھ وطی نہیں کر سکتا۔ اس مسئلہ کی باقی کی تفصیلات حسب سابق ہیں جس کی ایک شق اوپر متن میں مذکور ہے۔

عنین یعنی نامرد کا حکم

1012۔ وَمِنْ طَرِيقِ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَيْضًا قَالَ: ((قَضَى بِهِ عُمَرُ رضي الله عنه فِي الْعِنِّينِ أَنْ يُؤَجَّلَ سَنَةً)).

وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ .

سعید بن میتب کے ہی طریق سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ: سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نامرد کے بارے میں اس بات کا فیصلہ کیا کہ اسے ایک سال تک کی مہلت دی جائے گی۔ ❷

اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث :...... عنین:...... یہ اس نامرد کو کہتے ہیں جو کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے عورت کے ساتھ جماع پر قادر نہیں ہو پاتا۔ یہ مرد میں پائے جانے والے عیب کا ذکر ہے، ایسے مرد کو ایک قمری سال کی مہلت دی جائے گی کہ وہ اس دوران علاج معالجہ کے ذریعے اپنے اس عیب کو دور کر لے اور ایک سال کی مدت اس حکمت کے پیش نظر ہے کہ سال بھر میں چار موسم ہوتے ہیں۔ پس اگر کوئی خاص موسم اس کی شہوت میں انگیخت پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ موسم گزر جائے اور اس کا علاج مکمل ہو جائے۔ پھر اگر پورا قمری سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کی طبیعت بحال نہ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ واقعی اس مرد میں یہ عیب اور آفت ہے۔

قمری سال کی قید اس لیے لگائی کہ اسلام میں قمری سال کا اعتبار ہے نہ کہ شمسی سال کا۔ جبکہ بعض علماء نے اس بابت شمسی سال کا اعتبار کیا ہے ❸ کیونکہ اس مسئلہ کا مدار سال بھر کے چار موسموں پر ہے اور چار موسم پورے کے پورے شمسی سال میں ہی ہوتے ہیں جبکہ قمری سال میں چوتھے موسم کے تقریباً بارہ دن باقی رہ جاتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ اختلاف مسئلہ کی تحقیق اور حکم کے ثبوت میں چنداں موثر نہیں۔

نامردی کا ثبوت اور زوال

جب ایک دفعہ نامرد ہونا ثابت ہو جائے تو یہ حکم کب ختم متصور ہوگا؟ تو ایک قول یہ ہے کہ اگر آدمی سے ایک بار بھی عورت سے وطی کرنا ثابت ہو جائے تو عنین ہونے کا حکم جاتا رہے گا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ درست قول یہ ہے کہ اگر ایک آدمی

---

❶ سنن سعید بن منصور: 821. ❷ سنن سعید بن منصور: 2009.
❸ المبدع: 102/7۔ بدائع الصنائع: 323/2.

جماع پر قادر تھا پھر کسی حادثہ کی وجہ سے اس سے یہ قدرت جاتی رہی۔ اب یا تو ہمیں اس بات کا قطعی علم ہو جائے کہ اب یہ دوبارہ جماع پر قادر نہ ہو سکے گا یا ہمیں اس میں یہ قدرت لوٹ آنے کی امید ہوگی۔ پس اگر تو اطباء یہ فیصلہ دے دیں کہ اس کی جماع کی قدرت لوٹ کر نہ آئے گی تو عورت کو فی الفور فسخ نکاح کا اختیار ہوگا اور اگر اطباء جماع کی قدرت لوٹ آنے کی امید ظاہر کریں تو عورت پر ایک سال تک انتظار کرنا واجب ہوگا اور وہ فی الفور فسخ نکاح کی مختار نہ ہوگی۔

بانجھ پن کا حکم

علماء کا بانجھ پن کے عیب ہونے یا نہ ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ اس کو بعض علماء نے موجب فسخ نکاح عیب شمار کیا ہے۔ لہٰذا یہ عیب مرد میں ہو یا عورت میں نکاح کے فسخ کا باعث ہوگا۔ جبکہ بعض کے نزدیک یہ فسخ نکاح کا موجب عیب نہیں۔ البتہ اگر نکاح کے وقت عاقدین میں سے کسی نے اولاد ہونے کو شرط رکھ دیا تو اب بانجھ پن مشروط صفت کے فوات کی بنا پر عیب شمار ہوگا۔ بلاشبہ یہ ایک قول اور مذہب ہے لیکن صحیح قول پہلا ہے کہ بانجھ پن عیب ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مختار مذہب بھی یہی ہے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا استدلال اس بات سے ہے کہ نکاح کا سب سے بڑا مقصد اولاد کا حصول ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں عاقدین دوا دارو اور علاج معالجہ کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے عورت کی اجازت کے بغیر عزل کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ اولاد کا حصول اس کا حق ہے جس سے اسے محروم کرنا ہرگز بھی جائز نہیں۔ تب پھر صحیح قول یہ ہے کہ بانجھ پن عیب ہے۔

2۔ بَابُ عِشْرَةِ النِّسَاءِ
عورتوں کے ساتھ کیسے رہا سہا جائے

تمہید:...... **عشرة النساء**: عشرت سے مراد معاشرت ہے، اور یہ دو آدمیوں کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے جس کی بنا پر ایک آدمی دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ خاوند بیوی کے ساتھ کیسے رہے سہے تو اس کا مدار اور مرجع عرف ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النسآء: 19) ''اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو۔''

اور فرمایا:

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة: 228)

''اور معروف کے مطابق ان (عورتوں) کے لیے اسی طرح حق ہے جیسے ان کے اوپر حق ہے۔''

غرض معاشرت یہ کسی بھی دو کے درمیان معاملہ، اختلاط اور رہن سہن کا نام ہے۔ اب عرف کے مطابق عورتوں کے ساتھ رہنا سہنا امر ربانی ہے جو واجب ہے اور حکمت بھی اس کو مقتضی ہے۔ پس اگر عاقدین ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ایک دوسرے سے عرف کے مطابق سلوک کرنے سے منہ موڑیں گے تو نکاح کا یہ رشتہ بہت جلد ٹوٹ جائے گا۔

اب ایک خاوند کو بیوی کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے اور بیوی کو خاوند کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے اس کا مدار عرف پر ہے اور اس کی جملہ تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ جن میں سے ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ بیوی کی شرمگاہ میں آنا اس کے ساتھ

عرفی معاشرتی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے اور اس کی دبر میں آنا بدترین حرام ہے۔ چنانچہ امام موصوف رحمہ اللہ پہلی حدیث اسی کے متعلق ہی لا رہے ہیں۔

بیوی کی دبر میں جماع کرنے کا حکم

1013 ـ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: ((مَلْعُوْنٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ملعون ہے وہ شخص جو (اپنی) بیوی کی دبر میں جماع کرتا ہے۔'' [1]

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَالنَّسَائِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، لَكِنْ أُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ امام نسائی رحمہ اللہ کی روایت کے ہیں۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں البتہ اس حدیث میں ارسال کی علت ہے۔

غریب الحدیث:...... **مَلْعُونٌ**: یہ لفظ خبر مقدم ہونے کی وجہ سے معروف ہے۔ کیونکہ جب مقدم لفظ صیغہ صفت ہو تو عموماً وہ خبر ہی ہوتا ہے۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ افراد تثنیہ اور جمع میں اور تذکیر و تانیث میں مابعد کے مطابق ہو اور اس نے کسی حرف استفہام وغیرہ کا سہارا نہ لیا ہو۔ وگرنہ وہ صیغہ صفت مبتداء اور مابعد مذکور اسم یا لفظ اس کا فاعل ہوگا اور یہ جملہ خبر سے بے نیاز ہوگا۔ جیسے اگر صرف ''قَائِمٌ زَيْدٌ'' کی ترکیب ہو تو ''قائم'' خبر مقدم اور ''زید'' مبتداء موخر ہوگا اور اگر یہ ترکیب ''أَقَائِمٌ زَيْدٌ'' کی صورت میں ہو کہ ''قائم'' صیغہ صفت نے حرف استفہام کا سہارا لیا ہوا ہے تو یہ صیغہ مبتداء ہوگا اور لفظ ''زَيْدٌ'' اس کا فاعل ہوگا جبکہ یہ ترکیب خبر سے مستغنی ہوگی۔

ملعون سے مراد وہ شخص ہے جو رب تعالیٰ کی رحمت سے دھتکارا اور پھٹکارا ہو۔ یہ بد دعا بھی ہو سکتی ہے اور حقیقی خبر بھی جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اِمْرَأَةً: یہ لفظ نکرہ ہے جو اثبات کے سیاق میں آیا ہے لہٰذا یہ لفظ مطلق ہوگا نہ کہ عام۔ کیونکہ نکرہ تبھی عموم پر دلالت کرتا ہے جب وہ نفی کے تحت آئے اور یہاں ''امْـرَأَةً'' سے مراد یا تو بیوی ہے یا باندی ہے۔ کیونکہ شریعت کسی حکم کو حرام کے ساتھ ملا کر بیان نہیں کرتی۔ لہٰذا یہاں اجنبیہ عورت کا مراد لینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اجنبیہ کو تو دیکھنا بھی حرام ہے چہ جائیکہ چھونا اور پھر اس سے حرام شہوت پورا کرنا۔ کہ بھلا یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو صریح زنا اور متفق علیہ کبیرہ ترین گناہ ہے۔ بلکہ یہ امور تو بدرجہ اولیٰ حرام ہوں گے۔ پس ''امْرَأَةً'' سے مراد یا تو بیوی ہے یا شرعی باندی نہ کہ کوئی اجنبیہ۔ **فِي دُبُرِهَا**: دبر: یہ معروف ہے۔

مضمون حدیث:...... عورت کی دبر سے شہوت پوری کرنا حرام ہے اور یہ قوم لوط کا خبیث ترین فعل ہے اور ایسا کرنے والا بدترین ملعون ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بیوی کی دبر میں شہوت پوری کرنا بدترین حرام اور کبائر میں سے ہے۔ کیونکہ اس فعل کے ارتکاب پر لعنت مرتب ہوئی

---

[1] سنن ابی داؤد: 2162۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 9015۔ مسند احمد: 444/2۔ من طریق الحارث بن مخلد عن ابی ھریرۃ۔ جبکہ حارث کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع معروف نہیں۔

ہے۔ گویا کہ لعنت کی وعید میں اس کی شدید ترین تحذیر کا بیان بھی ہے۔

◈ اس فعل کے ملعون ہونے میں شریعتِ اسلامیہ کی عظیم حکمت بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ ملعون اور رسوائے زمانہ فعل نہایت عظیم مصالح کے فوات کا اور بدترین مفاسد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مفسدہ یہ ہے کہ اس میں آدمی عورت کی گندگی کی جگہ میں شہوت پوری کرتا ہے جس میں عورت کو شدید تکلیف بھی سہنی پڑتی ہے۔ جبکہ منفعت کا ضیاع یوں ہے کہ وہ اپنے پانی کو بے محل بہاتا ہے جہاں سے اس پانی سے مطلوب اور مقصود اولاد حاصل نہیں ہو پاتی۔

◈ مرسل کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے:

(1) ایک یہ کہ تابعی کے بعد صحابیِ رسول ﷺ کا نام مذکور نہ ہو اور تابعی حدیث کو بلا واسطہ نبی کریم ﷺ تک بیان کرے۔

(2) دوسرا یہ کہ یہ سند میں مطلق انقطاع پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ سند متصل نہیں ہے۔ اس لیے حضرات محدثین کے ہاں ''مرسل و منقطع'' کی اصطلاح بھی ہے۔ لہٰذا جب راوی یہ اصطلاح استعمال کرے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ یہاں ساقط راوی صحابی ہے۔ چنانچہ یا تو تابعی نے اس کو مرفوع بیان کیا ہے یا کسی ایسے صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی ہے جس کو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے خود نہیں سنا ہوتا۔

1014۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلَى رَجُلٍ أَتَى رَجُلًا أَوِ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ (روزِ قیامت) اس شخص کو (نگاہِ رحمت سے) نہ دیکھے گا جو کسی مرد سے شہوت پوری کرتا ہے یا بیوی کی دبر میں جماع کرتا ہے۔''[1]

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ ، وَأُعِلَّ بِالْوَقْفِ .

اس حدیث کو امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن حبان نے روایت کیا ہے اور اس روایت میں اس کے موقوف ہونے کی علت ہے۔

غریب الحدیث :...... **لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ**: مراد نظرِ رحمت و رافت ہے۔ وگرنہ رب تعالیٰ سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی پوشیدہ نہیں۔

إِلَى رَجُلٍ أَتَى رَجُلًا: لفظ رجل اغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ یہ حکم نابالغ اور کم سن بچے کے ساتھ ایسا کرنے کا بھی ہے۔

أَوِ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا: اس کا مفصل بیان ابھی گزر چکا ہے۔

أُعِلَّ بِالْوَقْفِ: یعنی بعض رواۃ نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے۔ یاد رہے کہ وقف حدیث میں قدح اور علت نہیں جبکہ وقف کرنے والا ثقہ ہو۔ جیسا کہ یہ بحث بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ دبر کے مقام میں شہوت پوری کرنا

---

[1] جامع الترمذی: 1165۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 9001۔ صحیح ابن حبان: 4418۔ ابن حزم نے ''المحلی'' (70/10) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اس حدیث میں اختلاف ہے۔ چنانچہ یہ مرفوع بھی مروی ہے اور موقوف بھی۔ چنانچہ وکیع نے اس حدیث کو ''عن الضحاك عن ابن عباس'' کے طریق سے موقوف روایت کیا ہے، جبکہ ابو خالد نے اس کو ''عن الضحاك عن ابن عباس'' کے طریق سے مرفوع روایت کیا ہے۔ مذکورہ ابو خالد یہ الاحمر ہے۔ ابن معین کہتے ہیں: یہ صدوق ہے البتہ حجت نہیں۔ دیکھیں: ''الکامل لابن عدی: 282/3''.

حرام ہے اور ایسا شخص ملعون ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

(1) یا تو ایسا مرد مرد کے ساتھ کرے گا تو اس کو ہم جنس پرستی، اغلام بازی یا لواطت کہا جائے گا جو بدترین ملعون فعل ہے۔

(2) اور یا آدمی ایسا بیوی یا کنیز کے ساتھ کرے گا۔ یہ بھی حرام، کبیرہ گناہ اور باعث لعنت فعل ہے۔ ایسے دونوں افراد رحمت الٰہی سے دور اور رب تعالیٰ کی نگاہِ رحمت سے محروم ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ رب تعالیٰ کے لیے "نظر" ثابت ہے کیونکہ "لَا يَنْظُرُ" میں ان لوگوں سے نظر کی نفی ان کے علاوہ کے لیے نظر کو ثابت کرتی ہے۔

◈ مرد کا مرد کے ساتھ شہوت پورا کرنا بدترین کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے اور وعید ہمیشہ کبیرہ گناہ پر مرتب ہوتی ہے اور ایسا فعل حرام ہوتا ہے۔

◈ اغلام بازی کی سزا:...... اغلام یہ مرد کے ساتھ بدفعلی کرنے کو کہتے ہیں، یہ بدترین خلاف فطرت فعل ہے جس کو عرف میں لواطت کہا جاتا ہے۔ اس نامراد فعل کی سزا کیا ہے، مذکورہ حدیث میں اس فعل بد پر وعید تو مذکور ہے لیکن اس کی سزا مذکور نہیں۔ علماء کا اس فعل کی سزا میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس پر حد سے کم کی تعزیر آئے گی۔ ایک قول حد زنا کا بھی ہے۔ لہٰذا کنوارے کو کوڑے لگیں گے جبکہ شادی شدہ کو رجم کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو ہر صورت میں قتل کیا جائے گا چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ [1] اور سب سے عجیب قول یہ ہے کہ اس میں نہ حد ہے اور نہ تعزیر۔ بس ایسے آدمی کی ڈانٹ ڈپٹ کر سرزنش کر دی جائے جیسے پیشاب پینے والا کہ اس پر نہ حد ہے، نہ تعزیر البتہ ایسے آدمی کی سرزنش ضرور ہے۔

بلاشبہ یہ قول غلط بھی ہے اور از حد باطل بھی ہے۔ اس لیے راجح قول یہ ہے کہ یہاں فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ جس کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

(1) یہ سزا خود ایک حدیث میں مذکور ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جسے تم قومِ لوط جیسا فعل کرتے پائے تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔'' اکثر ائمہ حدیث نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (جیسا کہ آگے کتاب الحدود میں یہ حدیث آ رہی ہے)۔

(2) اس بات پر امت کا اجماع منقول ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے البتہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قتل کرنے کی نوعیت و کیفیت میں اختلاف تھا۔ اس بارے چند اقوال یہ ہیں:

⊙ ......تلوار سے گردن ماردی جائے۔

⊙ ......رجم کر کے موت کے گھاٹ اتارا جائے۔

⊙ ......شہر کی سب سے اونچی عمارت سے اوندھے منہ گرا کر کیفر کردار کو پہنچایا جائے اور اوپر سے پتھروں کی بارش بھی کی جائے۔

---

[1] الوسیط للغزالی: 6/441۔ مغنی المحتاج: 4/144.

⊙ ...... زندہ جلا کر خاکستر کر دیا جائے جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وغیرہ حضرات خلفائے راشدین سے منقول ہے۔
لیکن اس بارے اصح قول یہ ہے کہ یہ امر امام کی رائے کے سپرد ہے۔ چنانچہ امام کو جس صورت میں لوگوں کے لیے زیادہ عبرت وتنبیہ نظر آئے، امام وہی صورت اختیار کرے۔ البتہ فاعل اور مفعول کے قتل میں یہ شرط ہے کہ وہ عاقل بھی ہوں اور بالغ بھی ہوں اور دونوں کا یہ رسوائے زمانہ فعل اختیار سے ہو۔ لہٰذا نابالغ کی سزا تعزیر ہوگی نہ کہ حد اور مجنون اور زبردستی کیا گیا قتل نہ کیا جائے گا جبکہ وہ مفعول ہو۔

رہا فاعل کہ اگر کوئی آ کر اسے زبردستی اور ڈرا دھمکا کر اس فعل پر آمادہ کرے کہ اگر تم نے میرے ساتھ لواطت نہ کی تو تمہیں قتل کر دوں گا اور اس کے ہاتھ میں پستول وغیرہ جیسا اسلحہ بھی ہو جو ہلاکت آفرین ہو اور اس کے چلنے سے موت یقینی ہو، تو ایسے شخص کی سزا میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ لواطت پر اِکراہ اور جبر وزبردستی ممکن نہیں کیونکہ لواطت بدون شرمگاہ کے انتشار کے ممکن نہیں اور انتشار اکراہ کے ہوتے ہوئے طبعاً ممکن نہیں کیونکہ یہ حالت خوف ہے اور خوف میں انتشار خلافِ عادت ہے۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں۔ کیونکہ جب آدمی کی جان پر بنی ہو تو انتشار (کیا، کچھ بھی) ممکن ہے۔ اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ بدفعلی پر زبردستی کیا گیا قتل نہ کیا جائے گا چاہے وہ فاعل ہو یا مفعول۔ (یہ مضمون تمام ہوا)

◈ بیوی کی دبر میں قضائے شہوت حرام ہے۔
◈ اگر خاوند زبردستی ایسا کرے تو اگرچہ نکاح فسخ تو نہیں ہوتا لیکن بیوی ایسے خاوند سے فسخ کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا عورت کے ساتھ اس بدسلوکی سے رہنے سہنے کے زمرہ میں داخل ہے جس سے فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق ملتا ہے۔
اور جو ایسا کرنے میں معروف ہو جائے تو بقول شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ایسے خاوند سے تفریق کر دینا واجب ہے۔ کیونکہ یہ فعل معصیت ہے اور عورت کو معصیت بھری زندگی گزارنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔
◈ مذکورہ حدیث ماقبل مذکور حدیث کی شاہد ہے کیونکہ دونوں احادیث میں اس فعل بد پر وعید کا مضمون مذکور ہے۔

عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت

1015۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ، وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو نہ ستائے اور عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ ان کو پسلی (کی ہڈی) سے پیدا کیا گیا ہے اور سب سے ٹیڑھی پسلی سب سے اوپر والی ہوتی ہے۔ پس اگر تم اسے سیدھا کرنے چلو گے تو اس کو توڑ بیٹھو گے اور اگر اسے چھوڑ دو گے (اور اسی حال میں رہنے دو گے) تو یہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس تم عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔“ ❶

---

❶ صحيح البخاري: 5186۔ صحيح مسلم: 1468.

مُتَفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

وَلِـمُسْـلِـمٍ ((فَإِن اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِـوَجٌ ، وَإِنْ ذَهَبْـتَ تُـقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا، وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: پس اگر تم اس سے متمتع ہونا چاہتے ہو تو اس کی اسی کجی کے ساتھ اس سے متمتع ہو اور اگر تم اسے سیدھا کرنے چلو گے تو اس کو توڑ بیٹھو گے اور اس کو توڑنا اس کو طلاق دینا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ: یہ شرطیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ شرطیہ ہوگا۔

فَلَا يُـؤْذِي جَارَهُ: مذکورہ ''فَا'' جزائیہ ہے اور یہ جملہ جواب شرط ہوگا۔ ''يُؤْذِي'' کے اعراب دو طرح کے ہیں۔ پس اگر تو اس کو ''یـا'' کے حذف کے ساتھ پڑھیں تو مذکورہ ''لا'' ناہیہ ہوگا جو جزم دیتا ہے اور اگر اس کو ''یـا'' کے اثبات کے ساتھ پڑھیں تو یہ ''لا'' نافیہ ہوگا۔

اور ''يُؤْذِي'' یہ ''اذیت'' سے ماخوذ ہے۔ اذیت یہ ضرر سے کم درجہ کی تکلیف کو کہتے ہیں۔ جبکہ جار کی تعریف وتفصیل بیان ہو چکی ہے۔

وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا: یعنی عورتوں کے بارے میں نیکی، بھلائی اور خیر کی وصیت کو قبول کرو۔

فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ: مذکورہ ''فا'' تعلیلیہ ہے۔ یعنی یہ عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرنے کی علت کا بیان ہے۔

ضِلَعٍ: اس کی لام پر سکون اور فتح دونوں پڑھا گیا ہے۔ البتہ فتح پڑھنا زیادہ مشہور ہے یہ سینے کے پنجرے کی خم دار ہڈی کو کہتے ہیں۔ جس کا معروف نام پسلی کی ہڈی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہاں پسلی سے کس کی پسلی مراد ہے؟ تو یہاں مراد سیدنا آدم علیہ السلام کی پسلی ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کی پسلی سے اماں حواء کو پیدا کیا گیا تھا جس کا قصہ کتب سیرت میں معروف اور زبانِ زد خلائق ہے اور محتاجِ بیان نہیں۔ رب تعالیٰ نے جب سیدنا آدم علیہ السلام سے اماں حوا کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ان پر نیند طاری کر دی اور ان کی سب سے چھوٹی پسلی کی ہڈی سے اماں حوا کو پیدا فرمایا۔ [1] واللہ اعلم!

بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ دنیا کی پہلی عورت کو مرد کی پسلی کی ہڈی سے پیدا کیا گیا تھا۔

وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ: یہی وجہ ہے کہ عورت میں برداشت کی قوت بے حد کم ہوتی ہے اور اس کی یہی کمزوری ہی اس کی کجی ہے۔

فَإِنْ ذَهَبْتَ...... لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ: مذکورہ ''فا'' تفریعیہ ہے۔ تب پھر عورت سے اگر نفع اٹھانا ہے تو اس کی اسی کجی کے ہوتے ہوئے ہی اٹھایا جائے گا۔ لہٰذا جو اس کی کجی دور کرنے میں لگے گا، وہ اس کو درست کرنے کی بجائے اس کو توڑ بیٹھے گا۔

فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا: یہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا تکرار ہے جو تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: صحیح مسلم کی اس روایت کے ان الفاظ کہ ''فَـإِن اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ وَبِهَا عِوَجٌ'' کا معنی وہی ہے جو ''وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ'' کے الفاظ کا معنی ہے۔

وَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا: گویا کہ صحیح مسلم کی یہ روایت بتلا رہی ہے کہ گزشتہ روایت میں

---

[1] دیکھیں: تفسیر الطبری: 229/1۔ تاریخ الطبری: 69/1.

مذکورہ لفظ "کسر" سے مراد طلاق دینا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ عورت کے ساتھ نرمی، عفوو درگزر، حلم و برداشت، نیکی، بھلائی اور خیر کا سلوک کیا جائے اور اس کی فطری کجیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے کیونکہ کجی عورت کا خلقی وصف ہے اور اگر کسی نے عورت سے نفع اٹھانا ہے تو اس کی اس فطری صفت کے ہوتے ہوئے اٹھائے اور اگر وہ اس کو سدھارنے چلے گا تو اس کو ضائع تو کر بیٹھے گا لیکن وہ سدھرے گی نہیں اور آدمی بجائے اس کو سیدھا کرنے کے اس کو توڑ بیٹھے گا اور یہ توڑنا اس کو طلاق دینا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- پڑوسی کو ستانے کی ممانعت آئی ہے، اس کی دلیل "فَلا يُوْذِيْ جَارَهُ" کے الفاظ ہیں اور یہ حرام ہے۔ اس لیے پڑوسی کے ستانے کو کبیرہ گناہ شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ستانے پر ایمان کے منتفی ہونے کی وعید آئی ہے جو اس کے کبیرہ ہونے کو بتلاتی ہے۔ اس کی دلیل ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے تین بار اللہ کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا کہ جس کے شرور سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو وہ ایمان والا نہیں۔ [1]
- دین اسلام ایک کامل دین ہے جس نے انسانوں کے کمزور طبقوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کا تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے۔
- جاہلیت میں لوگ عورتوں کو بہت ستاتے تھے، لیکن اس امت پر رب تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے عورتوں کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں خیر اور نیکی کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عورتیں دین اور عقل دونوں میں ناقص ہیں اس لیے یہ حسن رعایت اور نیک سلوک کی مستحق ہیں۔
- نبی کریم ﷺ کا حسن تعلیم کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ اشیائے معنویہ کو اشیائے محسوسہ کے ساتھ مثال دے کر سمجھایا۔
- عورت اصل میں پسلی کی ہڈی سے پیدا کی گئی ہے۔
- انسان اپنی اصل کی طرف لوٹتا ہے بلکہ ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے عورتوں کی فطرت، مزاج اور عادات کو ان کی اصل کی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ ان کی پہلی خلقت ایک پسلی سے ہے جو ٹیڑھی ہوتی ہے، اور اسی کا اثر آج تک عورتوں کے مزاج میں باقی ہے اور قیامت تک رہے گا۔
- مرد کو چاہیے کہ وہ عورتوں کی کجی پر صبر کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ یہ عورتیں کج ہی رہیں گی۔
- طلاق عورت کے حق میں بے حد سخت بات ہے اور گویا کہ یہ اس کو توڑ کر چکنا چور کر دینا ہے اور ایک دفعہ طلاق کے بعد عورت یوں بکھرتی ہے کہ پھر مرتے دم تک خود کو سمیٹ نہیں پاتی۔

مسافر گھر والوں کے پاس رات کو نہ آئے

1016۔ وَعَنْ جَابِرٍ ﷛ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ غَزْوَةٍ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ، ذَهَبْنَا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم ایک غزوہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، پس جب ہم (واپسی پر)

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

لِنَدْخُلَ . فَقَالَ: ((أَمْهِلُوْا حَتَّى تَدْخُلُوْا لَيْلًا- يَعْنِيْ عِشَاءً- لِكَيْ تَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ ، وَتَسْتَحِدَّ الْمُغَيَّبَةُ)) .

مدینہ کے قریب پہنچے تو (مدینہ میں) داخل ہونے کے لیے جانے لگے، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ذرا ٹھہرو! (اور اپنے گھر والوں کو استقبال کی تیاری کرنے کی کچھ مہلت دو) یہاں تک کہ تم (گھروں میں) رات کو...... یعنی عشاء کے وقت میں...... داخل ہو، تا کہ وہ بکھرے بالوں میں کنگھی کر لے اور پوشیدہ جگہوں کے بال صاف کر لے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ : ((إِذَا أَطَالَ أَحَدُكُمْ الْغَيْبَةَ ، فَلَا يَطْرُقْ أَهْلَهُ لَيْلًا)) .

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: جب تم میں سے ایک (اپنے گھر سے) زیادہ دیر تک غیر موجود رہے تو (پھر) وہ (جب لوٹے تو) رات کو گھر والوں کے پاس نہ جائے۔ ❷

غریب الحدیث :......**فِی غَزْوَةٍ**: یہاں اس غزوہ کی تعیین مذکور نہیں اور یہ عدمِ تعیین مضر بھی نہیں کیونکہ مقصود حکم کا بیان ہے۔

فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ: یہاں قدوم سے مراد قربِ قدوم ہے۔ یعنی جب ہم مدینہ پہنچنے کے قریب ہوئے، اور اس کی دلیل حدیث کے اگلے یہ الفاظ ہیں: ''ذَهَبْنَا لِنَدْخُلَ'' (ہم مدینہ میں داخل ہونے چلے) کیونکہ قدوم تب ہی متحقق ہوتا ہے جب دخولِ بلد ہو گیا ہو۔ لہٰذا قدوم کے بعد دخول کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی قدوم نہیں ہوا۔ پس یہاں فعل بمعنی قربِ فعل ہے۔

أَمْهِلُوا: یعنی انہیں مہلت دو اور انتظار کرو۔ یہ مہلت کس بات کی ہے؟ اور کب تک کی ہے؟ تو:

حَتَّى تَدْخُلُوا لَيْلًا: اس میں مہلت کی مدت کا بیان ہے۔

لِكَيْ تَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ، وَتَسْتَحِدَّ الْمُغِيبَةُ: میں اس بات کا بیان ہے جس کے لیے مدت و مہلت دی جارہی ہے۔

اب ''لیــــل'' سے مراد وقت عشا ہے جیسا کہ راوی نے اس کی تصریح کی ہے اور نمازِ عشا اوّلِ لیل میں ہوتی ہے نہ کہ نصف لیل یا آخر لیل میں اور یہ وقت شفق احمر کے غروب ہو جانے کے بعد کا وقت ہے اور ''شَـعِثَةُ'' سے مراد پراگندہ، بکھرے اور کنگھی نہ کیے بال ہیں۔ یعنی گھر تب جاؤ جب تک کہ گھر والی بالوں میں کنگھی کر لے اور اپنا ظاہری حلیہ درست کر لے۔ کیونکہ جب خاوند گھر میں نہ ہو تو عورت اپنے حلیہ کا زیادہ خیال نہیں رکھتی اور ذرا میلی میلی سی رہتی ہے۔ لیکن اگر خاوند گھر میں ہو تو وہ اپنا آپ سنوار کر رکھتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

اور استحداد کا معنی ازالہ یعنی دور کرنا ہے اور ''مُـــغِيْبَةُ'' سے مراد بدن کے مستور حصے ہیں۔ اب مستور حصوں سے ازالہ سے مراد وہاں کے فالتو اور گندے بالوں کو صاف کرنا ہے۔ تب پھر اس سے بغلوں کے اور شرمگاہ کے بال مراد ہیں۔ اسی میں ہاتھوں پیروں کے ناخنوں کا تراشنا بھی داخل ہے۔ غرض مراد بدن کی فالتو اور بڑھی ہوئی اور گندی چیزوں کو خود سے دور کرنا ہے

❶ صحيح البخاري: 5079- صحيح مسلم: 715.

❷ صحيح البخاري: 5244.

اور یہ تجمل اور بناؤ سنگھار کے باب سے ہے۔

إِذَا أَطَالَ أَحَدُكُمُ الْغَيْبَةَ: یہ صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں اور گویا کہ گزشتہ روایت کے اس مفہوم کی تصریح ہے جس کو بطریق لزوم سمجھا گیا تھا۔ کیونکہ عورت کا پراگندہ بال اور میلا کچیلا رہنا خاوند کی غیر موجودگی کے طویل ہو جانے کو لازم ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ تصریح یہ مفہوم لازم سے زیادہ دلالت کرنے والی ہے۔ شاید امام موصوف اس دوسری روایت کو اسی تصریح کے بیان کے لیے لائے ہیں۔

فَلَا يَطْرُقْ أَهْلَهُ لَيْلًا: طروق یہ رات کے وقت آنے کو کہتے ہیں اور رات کے وقت آنے والے کو طارق کہا جاتا ہے۔ تب پھر "لَيْلًا" کا لفظ تاکید مزید کے لیے ہوگا اور اگر طروق سے مراد مطلق آنا ہو تو پھر "لَيْلًا" کا لفظ تاسیس کے لیے ہوگا نہ کہ تاکید کے لیے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر دو باتیں مذکور ہیں:

(1) اگر آدمی کچھ عرصہ بعد کسی سفر وغیرہ سے گھر لوٹے تو رات کے وقت گھر نہ جائے تاکہ گھر والے اچانک آمد پر کسی بوکھلاہٹ یا پریشانی کا شکار نہ ہوں۔

(2) اور ایسے آدمی کو چاہیے کہ وہ پہلے گھر والوں کو اپنے پہنچ جانے کی اطلاع بھیج دے، پھر گھر داخل ہو تاکہ اس دوران گھر والے اس کے استقبال کی مناسب تیاری کر لیں۔ جیسے بال سنوار لیں، ناخن تراش لیں، لباس بدل لیں، نہا دھو لیں وغیرہ وغیرہ اور اس کے لیے کھانے پینے کا مناسب بندوبست بھی کر لیں۔

www.KitaboSunnat.com

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ خود بھی غزوات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ جس کی دلیل "كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةٍ" کے الفاظ ہیں۔
- نبی کریم ﷺ نے امت کی تعلیم و تربیت میں از حد تادیب اور حسن رعایت سے کام لیا حتیٰ کہ انہیں گھروں کو لوٹنے تک کے آداب سکھلائے۔
- عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے خاوند کے لیے بناؤ سنگھار کیا کرے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اس بات کی تعلیم دی ہے۔
- اگرچہ الجھے بالوں کے ساتھ رہنا جائز ہے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ آدمی اپنا ظاہری حلیہ ٹھیک رکھے تاکہ دوسرے اس سے گھن نہ کھائیں۔ کیونکہ بسا اوقات دوسرا آدمی پراگندہ حلیہ دیکھ کر اس سے بات تک کرنے سے گریز کرتا ہے۔
- جس کے بال ہوں اسے چاہیے کہ ان کا خیال رکھا کرے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بال رکھے تھے تو آپ ﷺ ان میں تیل لگاتے اور ان میں کنگھی کیا کرتے تھے۔ پھر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ: ''جس کے بال ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ ان کا اکرام کیا کرے۔'' (یعنی ان کا خیال رکھا کرے۔)
- گھر والوں کی حسن رعایت۔ لہٰذا ان کے پاس اچانک جا کر ان کو متشوش اور حیرت زدہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ بسا اوقات گھر والی گندی مندی ہوتی ہے اور اچانک پہنچ جانے سے اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملتا اور آدمی بیوی کو گدلا اور گندا دیکھ کر گھن کھانے لگتا ہے جو باہمی مودت و محبت کے خلاف ہے۔

◈ اگر آدمی زیادہ عرصہ تک گھر سے دور رہے تو لوٹنے پر رات کو گھر نہ جائے۔ البتہ اگر انہیں اس کے آنے کی خبر ہو تو رات کو بھی گھر جانے میں کوئی حرج نہیں۔

خاوند بیوی کا باہمی صنفی تعلقات کے اِفشاء کرنے کا حکم

1017- وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلُ يُفْضِيْ إِلَى امْرَأَتِهِ، وَتُفْضِيْ إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ کے نزدیک روزِ قیامت سب سے برے مرتبہ والا شخص وہ ہوگا کہ جو اپنی بیوی سے ملے اور بیوی اس سے ملے پھر (صبح اٹھ کر) وہ اس کے راز کو (لوگوں میں) پھیلاتا پھرے۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... شَرَّ: یہ خیر کی ضد ہے اور یہ یہاں اسم تفضیل ہے جس کا ہمزہ حذف ہے۔ پس اس کی اصل ''اَشَرُّ'' ہے۔

النَّاسِ: یہ صیغہ اسم تفضیل کا فاعل ہے۔ اگر چہ لفظوں میں یہاں تعمیم ہے لیکن مراد خصوص ہے۔

مَنْزِلَةً: یہ تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ معلوم ہوا کہ لوگوں کے رب تعالیٰ کے ہاں مختلف درجات ہیں۔

عِنْدَ اللّٰهِ: یہ صیغہ اسم تفضیل کا ظرف ہے اور یہ ظرف مکان ہے۔

يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اور یہ ظرف زمان ہے۔

الرَّجُلُ: یہ ''إِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل کی خبر ہے۔ جبکہ اس کا اسم ''شَرَّ النَّاسِ'' ہے۔

يُفْضِيْ: مراد جماع کرنا ہے۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد خلوت ہے چاہے اس میں جماع نہ بھی ہو۔ چنانچہ ''اَفْضَى اِلَيْهِ بِكَذَا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے اور دوسرے کے درمیان ایک خاص امر مقرر کیا (یا ایک خاص کام کیا)۔ تب پھر یہ دوسرا معنی پہلے سے زیادہ عام ہوگا۔

إِلَى امْرَأَتِهِ: اس سے مراد بیوی ہے۔

ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا: یعنی اس آدمی نے اپنی بیوی کے ساتھ خلوت میں جو خاص کام کیا تھا، یہ اسے لوگوں میں پھیلا دے۔ چاہے عام لوگوں میں پھیلائے اور چاہے خاص دوستوں میں پھیلائے، دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ خاوند بیوی کو اپنے مابین صنفی تعلقات کی نوعیت وکیفیت دوسروں کے سامنے بیان کرنا بے حد برا اور گناہ ہے اور یہ حرام ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ خاوند بیوی کا باہمی ایسے صنفی تعلقات کا افشاء حرام ہے جن کے ذکر سے حیاء آتی ہو۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں ایسا کرنے

[1] صحيح مسلم: 1437.

پر وعید آئی ہے جو اس کے کبیرہ اور حرام ہونے کی دلیل ہے۔

◈ البتہ اگر کسی شرعی حکم کے بیان کی ضرورت ہو تو کوئی حرج نہیں۔ جیسے نبی کریم ﷺ سے جب سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں اس آدمی کے بارے میں شرعی حکم پوچھا گیا جو بیوی سے جماع تو کرے پر انزال نہ کرے کہ اس کی بابت غسل کا حکم کیا ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اور یہ (یعنی سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) ایسا کیا کرتے تھے پر پھر ہم غسل بھی کرتے تھے، اگر چہ اس میں قدرے افشاء ہے لیکن یہاں اس افشاء کی ایک شرعی حاجت ہے اور وہ ہے حکم شرعی کا بیان۔

◈ معلوم ہوا کہ لوگوں کے رب تعالیٰ کے حضور اچھے اور برے دونوں طرح کے درجات مختلف ہیں۔

◈ بہر حال اس حدیث سے خاوند بیوی کے صنفی تعلقات کا حکم معلوم ہو گیا کہ ان کا اخفاء واجب اور افشاء حرام ہے۔

بیوی کے حقوق

1018۔ وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ عَنْ أَبِيهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ زَوْجِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((تُطْعِمُهَا إِذَا أَكَلْتَ وَتَكْسُوْهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ، وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ)).

حکیم بن معاویہ اپنے والد ماجد (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس پر کیا (کیا) حق ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(بیوی کا شوہر پر یہ حق ہے کہ) جب تو کھائے تو اسے بھی کھلائے اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنائے، اور (جھگڑا ہو جانے کی صورت میں اس کے) چہرہ پر نہ مارے اور (اس کو) بدصورت نہ کہے اور (اس سے) دوری نہ اختیار کرے مگر صرف گھر میں۔''[1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَعَلَّقَ الْبُخَارِيُّ بَعْضَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کے بعض کو تعلیقاً ذکر فرمایا ہے، اور امام حاکم اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

بیوی کے حقوق

شرح :...... مذکورہ روایت میں بیوی کے پانچ حقوق بیان کیے گئے ہیں جن میں سے تین کا تعلق منہیات سے ہے اور دو کا مامورات سے تعلق ہے۔ ذیل میں اس کی اختصار کے ساتھ تفصیل اور غریب الحدیث کو بیان کیا جاتا ہے۔

غریب الحدیث :...... قُلْتُ: یہ پوچھنے والے جناب معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ تھے اور انہوں نے یہ سوال صرف معلومات حاصل کرنے کی غرض سے نہیں کیا تھا بلکہ اس کی عملی تطبیق اور اس کو دستور حیات بنانے کے لیے پوچھا تھا۔

---

[1] مسند احمد: 446/4۔ سنن ابی داؤد: 2142۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 9171۔ سنن ابن ماجہ: 1850۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب ھجرۃ النبی ﷺ نساء ہ بیوتھن" میں اس روایت کو معلق ذکر کیا ہے۔ دیکھیں: تغلیق التعلیق: 430/4۔ جبکہ امام ابن حبان (4175) اور امام حاکم (204/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

مَا حَقُّ زَوْجِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ: زوج کے لفظ کا اطلاق خاوند اور بیوی دونوں پر ہوتا ہے یہاں مراد بیوی ہے۔ یعنی ایک خاوند پر اس کی بیوی کے کیا کیا حقوق ہیں؟

یاد رہے کہ لغت عربیہ میں "زَوْجہ" کا لفظ متبذل لفظ شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے فصحاء بیوی کی تعبیر "زَوْج" کے لفظ کے ساتھ کیا کرتے تھے اور اس کے معنی میں بیوی کی تعیین قرینہ سے کی جاتی تھی۔

تُطْعِمُهَا إِذَا أَكَلْتَ: یہاں سے نبی کریم ﷺ بیوی کے حقوق کو بیان فرما رہے ہیں۔ جس کی ابتداء آپ ﷺ نے ماموروات کے بیان سے فرمائی۔

مراد یہ ہے کہ ایسا مت کرنا کہ خود تو کھا پی کر پیٹ بھر لو اور اسے بھوکا رکھو۔ معلوم ہوا کہ بیوی کو معروف طریق سے روزانہ کھانا مہیا کرنا واجب ہے اور کھانے کی عمدگی کا مدار عرف اور خود خاوند کی حالت پر ہوگا۔ لہٰذا اگر خاوند عمدہ کھانا دے سکتا ہے تو دے وگرنہ درمیانہ درجہ کا دے اور اگر یہ بھی بس میں نہ ہو تو جس قدر وہ دے سکتا ہے وہی دے چاہے دیکھنے والا اس کو معمولی ہی سمجھے۔

وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ: یہ بیوی کے دوسرے حق کا بیان ہے کہ آدمی بیوی کو بے لباس نہ رکھے کہ یہ حرام ہے۔ چنانچہ جیسے وہ خود اپنے لباس کا اہتمام کرتا ہے ایسے ہی بیوی کو بھی لباس مہیا کرے اور اس کی عمدگی وغیرہ کی تفصیل بھی کھانے کے معیار کے جیسی ہے۔ یہاں تک بیوی کے ان حقوق کا بیان ہے جن کا تعلق ماموروات سے ہے۔ اب ذیل میں ان حقوق کو بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق منہیات سے ہے۔

وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ: یہاں مطلق "لَا تَضْرِبِ" نہیں ارشاد فرمایا۔ بلکہ صرف چہرہ پر مارنے کو منع فرمایا ہے کیونکہ بسا اوقات بیوی کو مارنا مباح بلکہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے باوجود چہرے پر مارنا دو وجہ سے منع ہے:

(1) چہرے پر مارنا عورت کی بلکہ ہر ایک کی از حد توہین ہے۔ جس کا مضروب کے دل پر بے حد اثر ہوتا ہے۔

(2) اور بسا اوقات چہرہ پر ضرب چہرہ میں کسی بڑی تغیر کا سبب بن جاتی ہے جو تغییر فی خلق اللہ میں داخل ہو جاتی ہے جس کا ضرر بلاشبہ بے حد زیادہ ہے۔

وَلَا تُقَبِّحْ: منہیات میں سے بیوی کا دوسرا حق یہ ہے کہ اسے بدصورت وغیرہ نہ کہے اور یہ الفاظ سیرت و صورت دونوں کو برائی کے وصف کے ساتھ متصف کرنے کی ممانعت کو شامل ہیں۔ کیونکہ "لَا تُقَبِّحْ" کا مطلب ہے کہ اسے قبیح کے ساتھ موصوف نہ کرے اور قبح صورت اور کردار دونوں میں سے ہر ایک کی برائی کو شامل ہے۔ جیسے اس کی خلقت کی برائی بیان کرتے ہوئے بدشکل، بدصورت، (دَندل، تھُنّل، پھینی، چُنی، ٹھگنی، بھینگی وغیرہ ❶) نہ کہے اور کردار کی برائی بیان کرتے ہوئے اسے پھوہڑ، بدسلیقہ، احمق، پگلی، کم عقل وغیرہ نہ کہے۔ کیونکہ عورت کو برا بھلا کہنا اس کی طبیعت پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے۔

وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ: یہ تیسری ممنوعہ بات ہے جو ایک بیوی کا حق ہے کہ خاوند اس سے ناراض ہونے پر چھوڑ کر گھر سے نکل نہ جائے یا اسے ہی گھر سے نہ نکال دے۔ پس اس سے ناراض ہو کر اسے چھوڑنا ہی ہے تو اسے گھر میں چھوڑے۔ یعنی خود گھر چھوڑ کر نہ جائے اور نہ اسے گھر سے نکالے بلکہ گھر میں رہتے ہوئے اسے بلائے نہیں اور یہ ترک کلام بھی تین دن سے زیادہ کا نہ ہو، جس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے

---

❶ پنجابی زبان میں دندل اونچے دانتوں والی کو، تھنّل موٹے ہونٹوں والی کو اور پھینی چپٹی ناک والی کو کہتے ہیں۔ (نسیم)

مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ تک نہ چھوڑے رکھے۔'' ❶

غرض یہ گھر میں رہتے ہوئے بیوی کو چھوڑنے کی ایک صورت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اس کے ساتھ سونا بھی چھوڑ دے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اس سے جماع کرنا موقوف کر دے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ اس کی طرف پیٹھ کر کے سوئے۔

اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ اپنا بستر یا کمرہ الگ کر لے۔ وغیرہ۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں اس بات کی زبردست تاکید ہے کہ ایک خاوند اپنی بیوی کے حقوق اہتمام سے ادا کرے چاہے ان کا تعلق مامورات سے ہے یا منہیات سے ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ کسی شرعی سبب سے بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں جس کی تفصیل مذکور ہو چکی ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حصول علم کے بے حد حریص تھے۔

◈ بیوی کو کھانا اور لباس مہیا کرنا خاوند پر واجب ہے۔

◈ بیوی کا نان نفقہ خاوند کی استطاعت و بساط کے مطابق ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّآ آتَاهُ اللَّهُ﴾ (الطلاق : 7)

''لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت میں سے خرچ کرے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔''

لہٰذا تنگی والا خاوند اپنے حساب سے اور وسعت والا خاوند اپنے حساب سے خرچ کرے گا۔

◈ بیوی کے چہرہ پر مارنا منع ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دیگر اعضاء پر مارنا جائز ہے۔

◈ بیوی کو مارنے کا جواز مطلق نہیں کہ جب جی چاہا اسے پیٹ ڈالا، بلکہ اگر اس کا کوئی شرعی سبب ہو تو مارنا جائز ہوگا۔ وگرنہ نہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ چہرہ واجب التکریم عضو انسانی ہے جس کی توہین جائز نہیں۔

◈ عورت کی حسی اور معنوی دونوں طرح تقبیح یعنی برائی بیان کرنا جائز نہیں۔

◈ بیوی سے ناراضی پر گھر چھوڑ جانا منع ہے البتہ گھر میں رہتے ہوئے اس سے کھانا پینا اور بات چیت کرنا ترک کیا جا سکتا ہے۔

◈ شریعتِ اسلامیہ نے انسانوں کی معیشت و معاد کی صلاح و فلاح سے متعلق کسی امر کو ترک نہیں کیا۔

اس بات کا بیان کہ عورت کے پیچھے سے آ کر شرمگاہ میں جماع کرنا جائز ہے

1019۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

❶ صحيح البخاري: 6077- صحيح مسلم: 2560.

كَانَتِ الْيَهُودُ تَقُولُ : إِذَا أَتَى الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ مِنْ دُبُرِهَا فِي قُبُلِهَا كَانَ الْوَلَدُ أَحْوَلَ ، فَنَزَلَتْ ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ﴾ الْآيَةُ .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ .

(مدینہ کے) یہود کا کہنا تھا کہ جب ایک آدمی اپنی بیوی کی پچھلی طرف سے آکر اس کی شرمگاہ میں ملتا ہے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ (البقرة: 223) ''تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں، سو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث :...... **كَانَتِ الْيَهُودُ:** یہود مدینہ کے قدیم باسی تھے، یہ بنی اسرائیل سے تھے جو بے حد سرکش، ظالم، جاہل اور نادان تھے۔ مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں ان کے تین بڑے اور مشہور قبائل تھے جن کے نام بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر تھے۔ یہ لوگ آسمانی کتابیں پڑھتے پڑھاتے تھے۔ جن میں ان لوگوں نے نبی آخر الزمان کا تذکرہ پڑھا اور یہ بھی پڑھا کہ وہ ایک وادی میں آکر آباد ہوں گے۔ چنانچہ یہ لوگ اس نبی آخر الزمان کی تلاش میں مدینہ آکر آباد ہو گئے تھے تاکہ اس پیغمبر کے ظہور کے وقت اس پر پہلے ایمان لانے والے بنیں اور اس کی مدد و نصرت پر کمر بستہ ہوں۔ لیکن افسوس کہ نبی کریم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اور ان لوگوں نے آپ ﷺ کو خوب پہچان بھی لیا تو محض اس بنیاد پر ''یہودی'' بن بیٹھے کہ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ وہ آخری پیغمبر بنی اسرائیل سے آئے گا لیکن یہ تو بنی اسماعیل میں سے آ گیا ہے۔ چنانچہ نہ تو یہ یہودی آپ ﷺ پر ایمان لائے اور نہ آپ ﷺ کے اعوان و انصار، اور یار و مددگار بنے بلکہ آپ ﷺ کے بدترین دشمن بنے اور اپنی اصلی خصلت کا ثبوت دیتے ہوئے ہر نازک موقع پر بدعہدی اور غداری کا ارتکاب کیا اور آپ ﷺ کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ یہ ہیں ''یہود''۔

إِذَا أَتَى الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ مِنْ دُبُرِهَا فِي قُبُلِهَا كَانَ الْوَلَدُ أَحْوَلَ: غرض یہ یہود کہا کرتے تھے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کی شرمگاہ میں اس کے پیچھے کی طرف سے ہو کر جماع کیا تو اسکا بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ یعنی اس کے سامنے سے آکر جماع کرنے کی بجائے اس کی پیٹھ کی طرف سے جماع کیا۔ البتہ جماع شرمگاہ میں ہی کیا نہ کہ عورت کی دبر میں جماع کیا، تو اس کا بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ بھینگا اس شخص کو کہتے ہیں جس کی دونوں آنکھیں سیدھی نہ ہوں اور کوئی ایک آنکھ دوسری طرف کو مڑی ہو۔ بھینگا پن یہ ایک جسمانی عیب ہے۔ لہٰذا اگر کوئی علاج کے ذریعے اس کو دور کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔

فَنَزَلَتْ: اس پر سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تھی۔ ذیل میں اس آیت کی اختصار کے ساتھ تفسیر ذکر کی جاتی ہے۔

حَرْثٌ لَّكُمْ: یعنی عورتیں تمہارا محل حرث ہیں کہ جیسے زمین انسان کی کھیتی ہوتی ہے جس میں وہ بیج بو کر اس سے غلہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی مرد کی کھیتی ہے جس میں وہ اپنا نطفہ ڈال کر اللہ کے حکم سے اس عورت سے پیداوار یعنی اولاد حاصل کرتا ہے۔

فَأْتُوا حَرْثَكُمْ: یعنی اب چونکہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تو تم بھی ان کی کھیتی کی جگہ کی طرف آؤ اور وہ عورت کی شرمگاہ ہے نہ کہ دبر۔ کیونکہ اس جگہ یعنی قُبُل (شرمگاہ) میں ہی کھیتی ہوتی ہے یعنی عورت کے آگے کے راستے سے ہی نطفہ ڈال

[1] صحيح البخاري: 4528۔ صحيح مسلم: 1435.

کر اس سے اولاد حاصل کی جاتی ہے نہ کہ پیچھے کے رستے سے۔ اس لیے اگر عورت جیسی کھیتی سے پیداوار یعنی اولاد حاصل کرنی ہے تو ان کے آگے کے رستے سے آؤ۔

اَنّٰی شِئْتُمْ : "اَنّٰی" یہ ظرف مکان ہے۔ یعنی تم اپنی اس کھیتی میں جس طرف سے مرضی چاہو آؤ، چاہے آگے سے آؤ اور چاہو تو پیچھے سے آؤ۔ پر آؤ کھیتی میں ہی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ بیوی کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ اس کی شرمگاہ میں جماع کیا جائے تا کہ اسے اولاد حاصل ہو اور عورت کے ساتھ اس کے پیچھے کے رستے سے جماع کرنا جہاں بدترین اور ملعون ترین فعل ہے وہیں یہ عورت کی حق تلفی بھی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہود کے متعدد دعاوی ایسے تھے جو سراسر بے بنیاد تھے۔ انہی دعاوی میں سے ایک یہ مذکورہ مسئلہ بھی تھا جس کی قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ اور نہایت بلیغ تردید کی۔

◈ قرآن کریم رب تعالیٰ کا کلام ہے جس کی دلیل "نَزَلَتْ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ یہاں آیت اترنے کا ذکر ہے۔ تو یہ آیت اور اسی طرح پورا قرآن کس جگہ سے اترا ہے؟ تو وہ اوپر آسمانوں سے اترا ہے۔ کیونکہ نزول ہمیشہ اوپر سے ہوتا ہے۔ تو جب یہ کلام اترا اوپر سے ہے تو پھر رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہوا کیونکہ رب تعالیٰ آسمانوں سے اوپر ہے۔

◈ قرآن کریم کی آیات بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں:

(1) ایک قسم کی آیات وہ ہیں جو ابتداءً یعنی بغیر کسی سبب کے اتری ہیں۔ قرآنِ کریم کی اکثر آیات ایسی ہی ہیں۔

(2) اور دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کے نزول کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ ان آیات کے اسباب نزول جاننے کے علماء نے متعدد فوائد ذکر کیے ہیں جو اپنے مواقع پر مذکور ہیں۔

مذکورہ آیت آیتِ سببیہ ہے یعنی اس کے نزول کا ایک خاص سبب اور واقعہ ہے جس کا ذکر اسی حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ بیوی خاوند کے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ".

◈ معلوم ہوا کہ جماع کا امر خاوند کی طرف لوٹتا ہے۔ کہ وہ چاہے تو جماع کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ جیسے کھیتی کا امر کاشتکار کی طرف لوٹتا ہے۔ چنانچہ اگر خاوند بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے تو صبح ہونے تک فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ اگر بیوی خاوند کو جماع کی خواہش سے بلائے اور خاوند آنے سے انکار کر دے تو اسے کوئی گناہ نہ ہوگا۔ البتہ خاوند کے ذمہ ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ دستور کے مطابق جماع کرتا رہے۔ اب خاوند بیوی سے کب اور کتنی مدت بعد جماع کرے تو اس بارے متعدد اقوال ہیں:

⊙...... ایک قول یہ ہے کہ ہر چار ماہ میں ایک بار جماع کرے اور یہ حکم اس وقت ہے جب عورت جوان ہو اور اسے مرد کے ملنے کی خواہش بھی ہو۔

⊙...... لیکن یہ قول بے حد ضعیف ہے۔ اس بارے صحیح قول یہ ہے کہ اس کا مدار عرف پر ہے اور بیوی سے جماع کرنا بھی اس ارشاد باری تعالیٰ کے ضمن میں داخل ہے:

﴿وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النسآء: 19)

''اوران کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو۔''

⊙ ......البتہ یہ بات طے ہے کہ جماع بیوی کی خواہش پر خاوند کے ذمے نہیں ہو جاتا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

◈ رب تعالیٰ کی بندوں پر بے حد وسعت ہے کہ اس نے لوگوں کو اپنی بیوی سے ملنے کی آزادی دی ہے کہ وہ اپنی کھیتی میں اپنے مزاج، مذاق اور خواہش کے مطابق جس طرف سے چاہے داخل ہوں۔

◈ اس حدیث میں بھی دبر میں خواہش پوری کرنے کی حرمت کا بیان ہے۔

◈ مذکورہ حدیث میں مشہور بدعتی اور گمراہ فرقہ ''جبریہ'' کا ردّ ہے جو بندے کو مجبور محض جانتے اور مانتے ہیں اور وہ بندے سے مشیت کے اثبات کی نفی کرتے ہیں۔ کہ مذکورہ حدیث میں قرآنِ کریم کی آیت کے حوالہ سے بندہ کے لیے مشیت کا اثبات ہے۔

جماع کے وقت کی دعا

1020- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: بِسْمِ اللّٰهِ ، اللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا ، فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِيْ ذَلِكَ ، لَمْ يَضُرَّهُ الشَّيْطَانُ أَبَدًا)) .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر تم میں سے ایک اپنی بیوی سے جماع کرنے کا ارادہ کرے تو وہ یہ دعا پڑھے: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ......'' (اللہ کے نام سے میں اپنی بیوی سے جماع کرتا ہوں، اے اللہ! تو شیطان کو ہم سے دور رکھ اور جو اولاد تو ہمیں عطا فرمائے اس سے بھی تو شیطان کو دور رکھ)۔ تو تحقیقی بات ہے کہ اگر ان دونوں کے مقدر میں اس جماع کی وجہ سے کوئی اولاد ہوگی تو شیطان اس کو کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......لَوْ: یہ حرفِ شرط ہے جو جزم نہیں دیتا۔ البتہ یہ جملہ فعلیہ پر داخل ہوتا ہے نہ کہ جملہ اسمیہ پر۔ تب پھر مذکورہ حدیث پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ یہاں پر ''لَوْ'' جملہ اسمیہ پر داخل ہوا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ''لَوْ'' یہاں بھی جملہ فعلیہ پر ہی داخل ہے جس کی دلیل ''اَنَّ'' حرفِ مشبہ بالفعل کا ہمزہ ہے کیونکہ اگر ''لَوْ'' جملہ اسمیہ پر داخل ہوا ہوتا تو ''اِنَّ'' میں ہمزہ کا کسر واجب ہوتا۔ تب پھر یہاں فعل مقدر ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے: ''لَوْ ثَبَتَ اَنَّ اَحَدَكُم'' یا ''لَوْ حَصَلَ اَنَّ اَحَدَكُم'' اور ''اَنَّ'' مابعد مذکور اسم اور خبر سے مل کر مفرد کی تاویل میں فعل مقدر ''ثَبَتَ'' یا ''حَصَلَ'' کا فاعل ہوگا۔ غرض ''لَوْ'' حرفِ شرط ہے اور فعل مقدر فعل شرط ہوگا اور جوابِ شرط ''فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا'' کا جملہ ہے جو آگے آرہا ہے۔

أَنَّ: یہ حرفِ تاکید ہے جو اسم اور خبر پر داخل ہوتا ہے اور مذکورہ ''أَنَّ'' مابعد کے اسم اور خبر کو مفرد بنا دیتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: 5165- صحیح مسلم: 1434 .

أَحَدَكُمْ: یہ "أَنَّ" کا اسم ہے۔

إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: یہ "أَنَّ" کی خبر ہے اور یہ خبر خود شرط اور جزا پر مبنی ہے۔ وہ یوں کہ "إِذَا" یہ حرف شرط ہے "أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ" یہ جملہ فعلیہ خبریہ فعل شرط ہے۔جس میں "أَرَادَ" فعل ضمیر اس کا فاعل ہے جو "أَحَدَكُمْ" کی طرف راجع ہے۔ "أَنْ" ناصبہ، "يَأْتِيَ" فعل، ضمیر اس کا فاعل جو "أَحَدَكُمْ" کی طرف راجع ہے، "أَهْلَهُ" یہ مفعول بہ، فعل اپنے فاعل اور مفعول بہ سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر "أَنْ" ناصبہ کی تاویل میں "أَرَادَ" فعل کا مفعول بہ، اور "أَرَادَ" فعل اپنے فاعل اور مفعول بہ سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر شرط۔

اور "قَالَ" فعل، ضمیر اس کا فاعل، جو راجع ہے أَحَدَكُمْ کی طرف اور فعل اپنے فاعل سے مل کر "قول" اور مابعد مذکور دعا "بِسْمِ اللّٰهِ...... الی آخرہ" یہ مقولہ۔قول اپنے مقولہ سے مل کر جملہ قولیہ ہو کر جزاء، اور شرط اور جزاء مل کر "أَنَّ" کی خبر اور "أَنَّ" اپنے اسم اور خبر سے مل کر فعل مقدر ثَبَتَ یا حَصَلَ کا فاعل۔فعل اپنے فاعل سے مل کر جملہ شرطیہ ہوا، اور "فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا" یہ جملہ جواب شرط ہوا۔یوں شرط اور جزا مل کر یہ جملہ شرطیہ ہوا اور یوں یہ اشکال جاتا رہا کہ یہاں "لَوْ" جملہ اسمیہ پر داخل ہوا ہے۔ بلکہ "لَوْ" جملہ فعلیہ پر ہی داخل ہے اور یہ شرط کے معنی میں ہی ہے۔

فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِي ذَلِكَ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے۔لہٰذا مابعد کی عبارت جواب شرط ہے۔ "إِنَّ" یہ حرف تاکید ہے اور "هو" منصوب متصل کی ضمیر جو ضمیر شان ہے اس کا اسم ہے، اور مابعد کی عبارت اس کی خبر ہے جو خود شرط اور جزا پر مشتمل ہے۔ پس إِنْ یہ حرف شرط ہے۔ "يُقَدَّرْ" یہ فعل مجزوم اور مجہول ہے۔ "بَيْنَهُمَا" یہ مفعول فیہ ہے "وَلَدٌ" یہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہے اور "فِي ذَلِكَ" یہ جار مجرور فعل مجہول کے متعلق ہوں گے۔اس میں "ذَلِكَ" اسم اشارہ ہے جس کا مشارٌ الیہ محذوف ہے اور وہ معنوی ہے جس کو "أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ" سے حاصل کیا جائے گا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی "فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِي ذَلِكَ الاتيان" پس اسم اشارہ اپنے مشارٌ الیہ مقدر سے مل کر "فِيْ" جار کے لیے مجرور اور یہ دونوں جار مجرور "يُقَدَّرْ" فعل کے متعلق ہوں گے۔پس فعل اپنے نائب فاعل جار مجرور اور مفعول فیہ سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر شرط اور "لَمْ يَضُرَّهُ الشَّيْطَانُ أَبَدًا" یہ جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر جزاء، پس شرط اور جزاء مل کر جملہ شرطیہ ہو کر إِنَّ حرفِ تاکید کی خبر اور إِنَّ اپنے اسم اور خبر سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر گزشتہ مذکورہ جملہ شرطیہ "لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ" کی جزاء ہوا۔

اب ذیل میں مذکورہ الفاظ کے معنوی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے:

لَوْ: یہ حرف تحضیض (ابھارنے) اور ترغیب دینے کے لیے آتا ہے گویا کہ نبی کریم ﷺ اس بات کی ترغیب دے رہے ہیں کہ جب بھی ایک خاوند اپنی بیوی سے جماع کا ارادہ کرے تو اس سے قبل یہ دعا ضرور پڑھ لیا کرے۔ یوں وہ شیطانی اثرات سے محفوظ ہو جائے گا۔**أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ**: یہ جماع سے کنایہ ہے۔معلوم ہوا کہ حیاء سے متعلقہ بات کو کنایہ سے بیان کرنا لغت عربیہ کا نہایت عمدہ اسلوب ہے۔**أَهْلَهُ**: اہل سے مراد زوجہ ہے۔ کیونکہ انسان بیوی کے پاس آ کر ٹھکانا پکڑتا اور سکون حاصل کرتا ہے۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" اور "اَللّٰهُمَّ" کی ترکیب بھی بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔**جَنِّبْنَا**: یعنی ہم سے دور کر دے۔

الشَّيْطَانَ: اس کی لغوی اور معنوی ترکیب کو بیان کیا جا چکا ہے اور یہاں شیطان سے مراد ابلیس ہی نہیں بلکہ یہ سرکش جنوں اور انسانوں کا اسم جنس ہے۔

مَا رَزَقْتَنَا : مراد اولاد ہے اور رزق یہاں اعطاء کے معنی میں ہے۔یعنی اس جماع کے نتیجہ میں تو ہمیں جو اولاد عطا فرمائے اس کو بھی شیطان مردود کے ملعون اثرات سے محفوظ اور دور فرما۔

إِنْ يُقَدَّرْ : یہ فعل مجہول ہے اور اس کے فاعل کو معلوم ہونے کی وجہ سے محذوف کیا گیا ہے اور وہ ''اللہ'' ہے کیونکہ اولاد اور رزق روزی دینے والا صرف اللہ ہی ہے۔

وَلَدٌ : یہ بچہ اور بچی دونوں کو شامل ہے۔

لَمْ يَضُرَّهُ : ضرر سے یہاں دینی، حسی، معنوی، بدنی اور خلقی ہر طرح کا ضرر مراد ہے۔تب پھر یہ حدیث عام ہے کہ شیطان اس بچے کو دینی، حسی، معنوی، بدنی اور خلقی غرض کسی بھی قسم کا ضرر نہ پہنچا سکے گا۔

أَبَدًا : یہ ''لَمْ يَضُرَّهُ'' میں مذکور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ بات کھول کر بیان کی گئی ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی سے جماع کا ارادہ کرے تو یہ دعا ضرور پڑھے تاکہ اگر اس جماع کے نتیجہ میں اس کے مقدر میں اولاد ہے تو وہ شیطان کے ہر قسم کے شر اور ضرر سے محفوظ رہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جماع کے وقت اس دعا کے پڑھنے کی ترغیب۔

◈ بندہ کے لیے مشیت کا اثبات۔جس کی دلیل ''إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ'' کے الفاظ ہیں اور اس میں مشہور بدعتی فرقہ جبریہ کا ردّ ہے۔

◈ ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنے کی از حد برکت کہ اس سے وہ کام شیطانی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ بسا اوقات شیطان پیدا ہونے والے بچے پر مسلط ہو جاتا ہے۔اس کی دلیل ''لَمْ يَضُرَّهُ'' کے الفاظ ہیں۔

◈ اسباب کے منکرین پر رد، جو جہمیہ اور اشعریہ ہیں، جو اس بات کے قائل ہیں کہ اسباب کی کوئی شرعی یا حسی تاثیر نہیں ہوتی۔ بلاشبہ یہ قول باطل ہے کیونکہ ایمان اور عمل یہ جنت میں داخل ہونے کا شرعی سبب ہیں۔اس طرح جماع یہ اولاد کے پیدا ہونے کا حسی سبب ہے۔

◈ اگر فاعل بدیہی اور معلوم ہو تو اس کو عبارت سے حذف کرنا جائز ہے۔

◈ ننگے آدمی کے لیے بھی اللہ کا ذکر کرنا جائز ہے۔کیونکہ مذکورہ حدیث میں جماع سے قبل اس دعا کے پڑھنے کی ترغیب ہے اور اس وقت آدمی عموماً ننگا ہوتا ہے۔

خاوند کی نافرمان عورت یعنی جماع سے انکار کرنے والی عورت پر لعنت کا ذکر

1021- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : ((إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ ، فَأَبَتْ أَنْ تَجِيءَ ، فَبَاتَ غَضْبَانَ ، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے جس سے خاوند رات بھر (اس سے) ناراض رہے تو فرشتے صبح ہونے تک اس پر لعنت

کرتے رہتے ہیں۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ . وَلِمُسْلِمٍ: ((كَانَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ سَاخِطًا عَلَيْهَا، حَتَّى يَرْضَى عَنْهَا)).

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کے الفاظ کے ہیں۔ اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''تو وہ ذات جو آسمانوں میں ہے اس پر ناراض ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ خاوند اس عورت سے راضی ہو جائے۔''

غریب الحدیث:...... **دَعَا**: مراد جماع یا بوس وکنار کے لیے اپنے بستر پر طلب کرنا ہے۔ تب پھر یہ حدیث عام ہے جو جماع اور بوس وکنار دونوں کو شامل ہے۔

فَأَبَتْ: مراد رکنا ہے۔ یعنی بیوی رک جائے اور آنے پر تیار نہ ہو۔ چاہے ''نہیں'' کہہ کر ''قول'' سے آنے سے انکار کرے اور چاہے شدید ناگواری کا اظہار کر کے اور پیچھے اور علیحدہ ہو کر ''فعل'' سے انکار کرے۔

فَبَاتَ غَضْبَانَ: معلوم ہوا کہ اگر خاوند عاقل، سمجھ دار، بردبار اور عورت سے درگزر کرنے والا ہوا اور انکار کرنے پر وہ عورت پر اسے نادان سمجھتے ہوئے اس پر ناراض نہ ہو تو فرشتے بھی ایسی عورت سے تعرض نہیں کرتے اور اس پر لعنت نہیں کرتے۔ لیکن اگر اس کے انکار پر خاوند ناراض ہو گیا تو جب تک خاوند راضی نہ ہو جائے فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔

اب خاوند کے بیوی کے انکار پر ناراض ہونے کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔ جیسے:

⊙ ...... بیوی نے انکار کر کے اس کی شہوت ضائع کر دی۔

⊙ ...... یا بیوی نے اس کو حقیر جانتے ہوئے اس کے پاس آنے سے انکار کیا تھا۔

⊙ ...... یا آدمی خود سریع الغضب تھا۔

غرض بیوی کے انکار پر خاوند کے غصہ میں آنے کی وجہ جو بھی ہو فرشتے صبح ہونے تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔

لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ: یعنی اس پر لعنت بھیج کر بددعا کرتے ہیں اور یہاں برا بھلا کہنا مراد نہیں بلکہ صریح لفظوں کے ساتھ لعنت کرنا مراد ہے۔

حَتَّى تُصْبِحَ: اور یہ سلسلہ صبح ہونے تک جاری رہتا ہے اور یہ فجر طلوع ہونے تک کا وقت ہے۔ افسوس کہ اگر یہ رات سردیوں کی ہوئی تو اس عورت کو کتنی دیر تک یہ وعید جھیلنی پڑتی ہو گی۔

وَلِمُسْلِمٍ: صحیح مسلم کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اس کا خاوند اس سے راضی نہیں ہوتا آسمانوں میں موجود رب بھی اس سے ناراض رہتا ہے اور یہ بہت بڑی وعید ہے۔

سَاخِطًا عَلَيْهَا: یہ ''كَانَ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور سخط اور غضب یہ دونوں متقارب الفاظ ہیں۔ یہ دونوں اپنے سبب کے پائے جانے کے وقت صفاتِ کمال میں سے ہیں، کیونکہ یہ دونوں صفات قوت کے کمال پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ ساخط یعنی ناراض ہونے والا خوب جانتا ہے کہ وہ انتقام پر قادر ہے۔ یہی حال غضبان یعنی غصہ والا کا بھی ہے۔

یاد رہے کہ اہل تعطیل رب تعالیٰ کے لیے افعالِ اختیاریہ کے قیام کے منکر ہیں، اسی لیے وہ رب تعالیٰ کے لیے سخط و

❶ صحيح البخاري: 5193- صحيح مسلم: 1436.

غضب کے اثبات کا انکار کرتے ہیں البتہ ان کا یہ انکار تاویل کے ساتھ نہ کہ تکذیب کے ساتھ۔ لہٰذا یہ رب تعالیٰ کے لیے سخط سے مراد انتقام یا ارادۂ انتقام لیتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی یہ تفسیر رائے کے ساتھ ہے اور یہ تحریف کے زمرہ میں داخل ہے۔ کیونکہ ان کی یہ تاویل لغت وشرع دونوں کے مقتضیٰ کے خلاف ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں بھی یہ مضمون مذکور ہے کہ جماع کا امر خاوند کی طرف راجع ہے۔
- حیا والی باتوں کو کنایہ سے بیان کرنا زیادہ مناسب ہے جیسے اس حدیث میں جماع کے لیے بلانے کو "إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ" کے لفظوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔
- بیوی کا خاوند کی جماع کی خواہش پوری کرنے سے انکار کرنا کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر لعنت ملائکہ جیسی وعید مرتب ہو رہی ہے جو اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی دلیل ہے۔
- البتہ یہ وعید تب مرتب ہوگی جب عورت کے انکار پر خاوند ناراض ہو، لہٰذا اگر وہ ناراض نہیں ہوتا تو یہ وعید مرتب نہ ہوگی۔
- فرشتوں کا اثبات۔
- رب تعالیٰ کے آسمانوں میں ہونے کا اثبات۔
- رب تعالیٰ کے لیے سخط اور غضب کا اثبات۔
- اگر بیوی جماع کی خواہش کا اظہار کرے اور خاوند انکار کر دے تو اسے گناہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں یہ مسئلہ مفصل مذکور ہوا ہے۔

بالوں میں دوسرے بال ملانے اور بدن گدوانے کا حکم

1022- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ وَالْوَاشِمَةَ، وَالْمُسْتَوْشِمَةَ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے (بالوں میں) بال لگانے والی، اور لگوانے والی پر، اور گودنے والی اور گدوانے والی پر (چاروں پر) لعنت فرمائی ہے۔ ❶

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:...... لَعَنَ النَّبِيَّ ﷺ: یعنی آپ ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت کے لفظ کے ساتھ بددعا فرمائی۔

الْوَاصِلَةَ: اصلی بالوں میں نقلی یا دوسرے کے بال لگانے والی عورت۔

وَالْمُسْتَوْصِلَةَ: اپنے بالوں کو لمبا یا خوبصورت بنانے کی غرض سے نقلی یا دوسرے کے بال لگوانے والی عورت۔ پس واصلہ یہ فاعل اور مستوصلہ یہ مفعول ہوگی۔

الْوَاشِمَةَ: اسی طرح یہ بھی فاعل ہے۔ اور

❶ صحيح البخاري: 5937- صحيح مسلم: 2124.

اَلْمُسْتَوْشِمَةَ: یہ مفعول ہے۔ وشم یہ سوئی کے ذریعے بدن گود کر اس میں سرمہ یا کوئی دوسرا رنگ بھرنے کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ گدوانے کے بعد یہ رنگ ہمیشہ رہتا ہے اور کبھی زائل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ رنگ کھال کے نیچے تک پیوست ہو جاتا ہے اس لیے پانی اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں زمانہ جاہلیت کے دو افعال کو باعث لعنت قرار دیا گیا ہے، ایک بالوں میں بال ملانا اور دوسرے بدن کو گدوانا کیونکہ ایسا کرنے والے دونوں آدمی خود کو زیادہ خوبصورت بنانے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور چونکہ عموماً ایسا عورتیں کرتی ہیں اس لیے خاص عورتوں کو خطاب فرمایا وگرنہ یہ حکم مردوں کو بھی شامل ہے اور لعنت اس لیے فرمائی کیونکہ دراصل ان دونوں عورتوں نے رب تعالیٰ کے تقدیری حکم کی مخالفت کی کوشش کی ہے، وہ یوں کہ ان دونوں نے خود کو زیادہ کامل بنانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ پہلی نے اپنے بال پورے کرنے چاہے جبکہ دوسری نے ان نقوش کو بنوا کر اپنی جلد کو زیادہ مکمل کرنا چاہا تھا۔ اسی لیے دونوں کی دونوں لعنت کی مستحق ٹھہریں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جاہلیت میں عورتیں لمبے بالوں کو حسن میں اضافہ باور کرتی تھیں تاکہ ان کی وجہ سے دوسری عورتوں پر فخر کر سکیں۔ اس لیے وہ اس مصنوعی اور عارضی حسن کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے بال حاصل کر کے اپنے بالوں میں لگوا لیتیں تھیں۔ لیکن حدیث میں اس فعل کو باعث لعنت قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی۔
- فی زمانہ بازاروں میں دستیاب مصنوعی "وگیں" اس وعید کے تحت داخل ہیں۔
- بظاہر یہ حدیث بالوں اور سوتی پراندوں کو بھی شامل ہے جن کو عورتیں چٹیا میں بٹ کر بظاہر بالوں کو لمبا بنا لیتی ہیں۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ وعید سوتی پراندوں کو شامل نہیں جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔
- بالوں میں وگ لگانا اور بدن گدوانا دونوں کبیرہ گناہ ہے کیونکہ ان پر لعنت کی وعید آئی ہے۔
- جو بھی قدرتی خلقت سے ہٹ کر خود کو آراستہ و زیبا کرنے کی کوشش کرے گا یہ وعید اس کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہ "تغییر فی خلق اللّٰہ" میں داخل ہے جو اوامر شیطان میں سے ہے۔
- اب جو عورت بالوں میں دوسرے بال لگائے گی جس سے اس کے بال لمبے لگیں وہ تو اس حدیث کی وعید کے تحت داخل ہے چاہے وہ کسی دوسرے کے اصلی بال ہوں یا مصنوعی بال ہوں جیسے وگ ہو، دونوں کا حکم ایک ہے۔

رہے بالوں کے علاوہ دھاگوں وغیرہ کے بنے پراندے تو اصح قول یہ ہے کہ ان کا بالوں میں جوڑنا اس وعید کے تحت داخل نہیں۔ کیونکہ ان کے بالوں میں لگانے سے تغییر فی خلق اللہ حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا فی زمانہ عورتیں بالوں میں اگر کوئی پونی، یا رومال وغیرہ لگاتی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی حکم پراندوں کو بالوں میں بٹنے کا ہے۔

- وگ لگانا حرام ہے، گو دورِ نبوی میں یہ متعارف نہ تھی لیکن چونکہ دیکھنے والا اس کو اصل بال سمجھتا ہے اس لیے وگ اس وعید میں داخل ہے۔
- بدن گدوانا حرام ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔ لہٰذا یہ کبیرہ گناہ ہے اور اس میں زینت کی غرض سے گدوانا اور علامت اور پہچان کی غرض سے گدوانا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ عورت یا مرد فلاں قوم یا قبیلہ کا ہے، دونوں کا حکم ایک ہے۔ کیونکہ

حدیث میں مذکور وعید عام ہے جو دونوں صورتوں کو شامل ہے۔
رہا علامت کی غرض سے گدوانے کو جانوروں کے داغنے پر قیاس کرنا تو یاد رہے کہ انسان اور جانور دونوں میں فرق ہے۔ کیونکہ چوپایہ اپنا تعارف کروانے سے قاصر ہے اس لیے اس کی علامت مقرر کرنے کے لیے اسے داغنا اور گودنا جائز ہے۔ جبکہ انسان اس سے بے نیاز ہے، وہ بول کر اپنا نام پتا اور قوم قبیلہ بتلا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ قیاس مع الفارق ہوگا۔

◈ گو گودنے والی اور بالوں میں بال لگانے والی تو مستحق لعنت ہے ہی لیکن گدوانے والی اور بال لگوانے والی بھی لعنت کی مستحق اس لیے ہیں کہ وہ ان دونوں گناہوں کی طلب گار تھیں اور گناہ میں معاونت بھی اتنی ہی حرام ہے جتنا اس گناہ کو کرنا حرام ہے۔

تب پھر اگر کسی نے کسی نابالغہ اور غیر مکلف کم سن بچی یا بچے کو گووایا وہ دیوانہ تھا تو ایسا گدوانے والا اس لعنت کی وعید میں داخل نہ ہوگا۔

◈ رہا گدائی کے نشان کے ازالہ کا حکم؟ تو اگر تو اس کے مٹوانے میں ضرر لاحق نہیں ہوتا تو اس کو مٹوانا اور صاف کروانا واجب ہوگا۔ لیکن اگر اس کو مٹوانے میں زیادہ خون بہہ جانے یا گہرا زخم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو مٹوانا واجب نہ ہوگا۔

ہاں اگر وہ اپنی زندگی میں کبھی ایسی دوا یا آپریشن کے کسی ایسے طریقہ کے بارے میں یہ سنے کہ اس کے ذریعے بے ضرر طریقہ سے گدائی کا نشان مٹانا آسان ہے تو اس وقت اس کو مٹوانا واجب ہو جائے گا۔

◈ زینت و آرائش اور تجمل کی خاطر تغییر فی خلق اللہ حرام ہے۔ البتہ اگر یہ تغییر کسی عیب کے ازالہ کے لیے ہو تو جائز ہوگی جیسے کوئی زائد انگلی کٹوائے تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔

◈ مذکورہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فی زمانہ لوگوں کی عادات اور طبائع میں زبردست انقلاب آچکا ہے۔ چنانچہ کبھی لمبے بالوں کو حسن و جمال سمجھا جاتا تھا۔ پر آج کل کی یورپی خواتین چھوٹے بالوں کو رکھنا حسن باور کرتی ہیں۔ لیکن انہیں اللہ ہی سمجھائے کہ یہ بھی تغییر خلق اللہ میں داخل ہے۔

مناسبتِ حدیث :......امام موصوف اس حدیث کو مذکورہ باب کے تحت اس لیے لائے ہیں کیونکہ عورت طبعًا حسن و جمال کو پسند کرتی ہے اور وہ خاوند کے لیے زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کو پسند کرتی ہے۔ اس لیے اگر وہ بال لمبے کرنے یا بدن گدوانے کو حسن سمجھ کر ایسا کرتی ہے تو اس حدیث نے بتلا دیا کہ ایسا کرنا حرام ہے۔

زمانہ حمل میں دودھ پلانے، عزل کرنے اور مانع حمل وسائل اختیار کرنے کا حکم

1023۔ وَعَنْ جُذَامَةَ بِنْتِ وَهْبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: حَضَرْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فِيْ أُنَاسٍ ، وَهُوَ يَقُوْلُ: ((لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَنْهَى عَنِ الْغِيلَةِ فَنَظَرْتُ فِي الرُّوْمِ وَفَارِسَ ، فَإِذَا هُمْ يُغِيْلُوْنَ أَوْلَادَهُمْ ، فَلَا يَضُرُّ ذَٰلِكَ أَوْلَادَهُمْ شَيْئًا)).

حضرت جدامہ بنت وہب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ آپ ﷺ اس وقت چند لوگوں میں تشریف فرما تھے، اور آپ ﷺ یہ ارشاد فرما رہے تھے: ''تحقیق میں نے جی میں اس بات کا خیال کیا کہ ''غیلہ'' سے (یعنی زمانہ حمل میں دودھ پلانے کے عمل سے) منع کر دوں، پھر میں نے (اہل) روم و فارس (کے لوگوں) کو (اور

ان کے اس بارے طرزِ عمل کو) دیکھا تو کیا دیکھا کہ وہ لوگ زمانہ حمل میں اپنی اولادوں کو دودھ پلاتے ہیں اور یہ بات ان کی اولادوں کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔'' [1]

ثُـمَّ سَـأَلُوْهُ عَنِ الْعَزْلِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((ذٰلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

پھر لوگوں نے آپ ﷺ سے عزل کرنے کے بارے میں پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ بچوں کو مخفی زندہ درگور کرنا ہے۔'' اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......فِي أُنَاسٍ: سیدہ جدامہ رضی اللہ عنہا نے یہاں یہ نہیں بتلایا کہ یہ لوگ مسجد میں بیٹھے تھے یا یہ مجلس مسجد سے باہر کسی جگہ منعقد تھی۔ لیکن مذکورہ قصہ اور حدیث میں بیان کردہ حکم اس بات کے جاننے پر موقوف نہیں۔

وَهُوَ يَقُولُ: یہ جملہ حالیہ ہے اور لفظ ''رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ'' سے حال ہے۔

لَقَدْ هَمَمْتُ: ''هَمٌّ'' یہ دل کے خیال کو کہتے ہیں۔

أَنْ أَنْهَى عَنِ الْغِيلَةِ: یعنی میں نے اپنے دل میں یہ بات سوچی کہ میں لوگوں کو اس بات کا حکم دوں کہ وہ ''غیلہ'' چھوڑ دیں۔ علماء نے غیلہ کے دو معانی بیان کیے ہیں:

(1) ایک قول یہ ہے کہ یہ حاملہ عورت کے ساتھ جماع اور وطی کرنے کو کہتے ہیں۔

(2) اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حاملہ عورت کے دودھ پلانے کو کہتے ہیں۔

پہلے قول کے مطابق مطلب یہ ہوا کہ غیلہ یہ آدمی کا اپنی بیوی سے اس حال میں جماع کرنا ہے جبکہ وہ دودھ پلا رہی ہو، اور دوسرے قول کے مطابق مطلب یہ بنے گا کہ یہ عورت کا حاملہ ہوتے ہوئے اپنے بچے کو دودھ پلانے کا نام ہے۔ تب پھر پہلے قول کے مطابق غیلہ سے ممانعت یہ سبب سے ممانعت کا نام ہوگا کیونکہ جب آدمی اپنی دودھ پلاتی بیوی سے جماع کرے گا تو ممکن ہے کہ اس جماع کے نتیجہ میں وہ پھر حاملہ ہو جائے کہ پھر وہ حاملہ ہوتے ہوئے اپنے بچے کو دودھ پلائے گی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق یہ غایت سے ممانعت ہوگی اور وہ یہ ہے کہ عورت حاملہ ہوتے ہوئے بچے کو دودھ پلائے۔ کیونکہ عرب اس بات کے قائل تھے کہ حاملہ عورت کے بچے کو دودھ پلانے سے بچے کو نقصان پہنچتا ہے۔

فَنَظَرْتُ فِي الرُّومِ وَفَارِسَ فَإِذَا هُمْ يُغِيلُونَ أَوْلَادَهُمْ: یہ فرمانِ نبوی ہے:

روم:...... یہ جزیرہ عرب کے شمال میں آباد قوم کا نام ہے۔ یہ لوگ نصرانیت کے پیروکار تھے۔

فارس:...... یہ جزیرہ عرب کے مشرق میں آباد تھے اور آتش پرست مجوسی تھے۔ اس وقت یہ دونوں قومیں کافر تھیں، پس نبی کریم ﷺ نے ان کے حال میں غور فرمایا تو کیا دیکھا کہ وہ لوگ اپنی اولادوں کے ساتھ غیلہ کرتے ہیں اور اس سے ان کی اولادوں کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچتا اور مطلب یہ ہے کہ جب میں نے روم اور فارس کے لوگوں کو دیکھا کہ انہیں اس عمل سے کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑتا تو میں نے غیلہ سے منع کرنے کو ترک کر دیا اور اس ممانعت کے ترک کی وجہ یہ ہے کہ بحیثیت بشر ہونے کے روم اور فارس کے سب لوگ ایک ہیں اور انسانی طبیعت میں دین کے اختلاف سے کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔

[1] صحيح مسلم: 1442.

کیونکہ سب انسانوں کا ایک طبیعت و مزاج کا ہونا یہ خلقت و فطرت کا مقتضی ہے۔ چنانچہ کام کرنے سے سب تھکتے ہیں، بھوک سب کو لگتی ہے۔ سردی گرمی سب کی طبیعتوں پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسانی طبیعت میں اور فطری قوی وصلاحیتوں میں ایمان زبردست قوت، اضافہ اور جلا پیدا کرتا ہے۔ وگرنہ اصل یہ ہے کہ انسانی طبائع سب ایک ہیں چاہے لوگ مسلمان ہوں یا کافر۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اہل روم و فارس کو غیلہ کرتے دیکھا تو اپنی امت کو بھی اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔

عَنِ الْعَزْلِ: پھر جب لوگوں نے آپ ﷺ سے عزل کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ یہ مخفی طور پر اولادوں کو زندہ درگور کرنا ہے۔

عزل، عین انزال کے وقت بیوی سے جدا ہو جانے کو کہتے ہیں تا کہ مرد کی منی عورت کی شرمگاہ میں نہ گرے اور عورت کو حمل نہ ٹھہرے۔ نبی کریم ﷺ نے اس فعل کو مخفی طور پر اولادوں کو زندہ درگور کرنا قرار دیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ بیٹی پیدا ہونے پر جاہلی معاشرہ کے طعنہ دینے اور عار دلانے سے بچنے کے لیے، اس کو زندہ دفن کر کے ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ عزل کو وادِ خفی اس لیے فرمایا کہ بچی کو زندہ دفن کرنا تو سب کو دکھائی دیتا تھا لیکن عزل کرنے والا، جو ایک اعتبار سے آنے والی نسل کو پیدا ہونے سے روک کر انہیں گویا کہ قتل ہی کر رہا ہے، اس کو ایسا کرتے کوئی نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ تو گویا کہ یہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر اپنی اولاد کو زندہ درگور کر رہا ہوتا ہے۔

غرض زندہ درگور کرنا یہ حیات کو ختم کرنا تھا جبکہ عزل کرنا یہ حیات کی راہ میں حائل ہونا ہے اور حیات کے ختم کرنے اور اس کو منع کرنے میں جو فرق ہے وہ سب پر عیاں ہے، البتہ علماء یہ ضرور کہتے ہیں کہ حیات کو روکنا یہ حیات کو ختم کرنے سے سہل ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو اہم مسائل کو بیان کیا گیا ہے، جو یہ ہیں:

(1) زمانہ حمل میں اولاد کو دودھ پلانے سے اولاد کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔

(2) دوسرا یہ کہ عزل کرنا یہ گویا کہ اولاد کو چھپ کر زندہ درگور کرنا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ بے حد حسن اخلاق والے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ لوگوں کی دلجوئی کی خاطر ان میں گھل مل کر بیٹھا کرتے تھے، اس کی دلیل "فِی أُنَاسٍ" کے الفاظ ہیں۔
- شریعتِ اسلامیہ کے جملہ احکام، چاہے ان کا تعلق عبادات سے ہے یا معاملات سے، سب کا مدار نفع کے حصول اور دفع ضرر پر ہے۔ وہ یوں کہ نبی کریم ﷺ نے ضرر کے اندیشہ سے غیلہ سے منع فرمایا تھا، لیکن جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ رومیوں اور ایرانیوں کو ایسا کرنے سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت کے احکام جہاں وحی پر مبنی ہیں، وہیں آپ ﷺ کے اجتہاد پر بھی مبنی ہیں۔
- اگر کافروں کا کوئی رویہ، روش، طرزِ بود و باش، اور ان کی برتنے کی کوئی چیز بظاہر نافع ہے اور وہ دین و اسلام کے مسلمات اور عقائد و عبادات کے منافی بھی نہیں تو اس کے اخذ و اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی دلیل "فَنَظَرْتُ فِی الرُّومِ وَفَارِسَ" کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا کافروں کی مفید باتوں کو لینے میں اور جن مضرات سے وہ بچتے ہیں، ان کے ترک

کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

◈ خلقی جبلت وطبیعت اور فطرت کے اعتبار سے مسلمان اور کافر سب ایک ہیں، البتہ اختیاری اخلاق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں۔لہٰذا ایک مومن کے اخلاق ایک کافر کے اخلاق سے بہر حال بہتر ہوتے ہیں۔لہٰذا کفار کی کسی طبعی یا فطری بات کی پیروی یہ اتباعِ کفار یا تشبہ بالکفار کے باب میں سے نہیں بلکہ یہ مجرب امورِ عادیہ میں کفار کی اتباع کی پیروی کے باب میں سے ہے۔

◈ دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لیے حیا سے متعلقہ باتوں کے سوال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔جیسا کہ سائلین نے عزل کے بارے میں سوال کیا تھا جو قابل حیاء باتوں میں سے ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ عزل کرنا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس فعل کو اولاد کا مخفی زندہ درگور کرنا قرار دیا ہے اور اولاد کو زندہ درگور کرنا حرام ہے۔ابن حزم اور علماء کی ایک جماعت اسی طرف گئے ہیں کہ عزل کرنا حرام ہے چاہے بیوی راضی ہو یا نہ ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس فعل کو ''وأد'' قرار دیا ہے اور خفی وأد ہونے سے حکم تحریم پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ البتہ یہ صریح قتل نفس کے حکم میں داخل نہیں کہ جس کی سزا قصاص ہوتی ہے۔جس کے حرام اور کبیرہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔لیکن عزل اس درجہ کا وأد نہیں جس کی کوئی سزا بھی ہو، البتہ اولاد کی حیات میں حائل ہونے کے اعتبار سے حرام ضرور ہے اور اس کو وادِ خفی بایں معنی فرمایا کہ عزل لوگوں کے دیکھنے میں نہیں آتا۔

لیکن اکثر علماء اس کے جواز کی طرف گئے البتہ انہوں نے اس کے جواز کی دو شرطیں بیان کی ہیں:

(1) ایک یہ کہ عزل زوجین کی باہمی رضامندی سے ہو۔

(2) دوسری یہ کہ ایسا کرنے میں زوجین میں سے کسی کو ضرر لاحق نہ ہو۔اس ضرر کی وضاحت صرف زوجین ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ بسا اوقات لذت کی تکمیل سے قبل جدا ہو جانے میں خاوند اور بیوی دونوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اولاد پیدا نہ کرنے کی کوشش کرنا اور اس کے لیے عزل کے علاوہ دیگر تدابیر اختیار کرنا، یہ بھی وأدِ خفی میں داخل ہے۔جیسے مانع حمل گولیاں کھانا اور نس بندی کروانا وغیرہ۔پھر ان میں سے بعض صورتوں کو اطباء نے مرد اور عورت کے اعضاء تولید یہ کے لیے بے حد مضر بھی قرار دیا ہے۔منع حمل کی ایک صورت رحم مادر میں ''ایک خاص طرح کا چھلا'' رکھنا بھی ہے جو مرد کے پانی کو رحم تک جانے سے روکتا ہے۔اگرچہ یہ بھی عزل کے حکم میں ہی داخل ہے لیکن یہ فعل مانع حمل گولیاں وغیرہ کھانے سے زیادہ ہلکی صورت والا فعل ہے۔کیونکہ اس صورت میں خاوند اور بیوی دونوں کامل لذت بھی حاصل کر پاتے ہیں البتہ عورت کو حمل نہیں ٹھہرتا۔

حمل سے روکنے کی چوتھی صورت ''کنڈوم'' کا استعمال ہے۔یہ مرد کے عضو تناسل پر چڑھایا جانے والا ایک غبارہ سا ہوتا ہے۔اس میں مرد کا سارا مادہ منویہ اسی غبارے میں رہ جاتا ہے اور عورت کے رحم تک نہیں پہنچتا۔اس صورت میں بھی زوجین کو لذت تو ملتی ہے البتہ عورت حاملہ نہیں ہوتی اور اس میں ایک نقص اور بھی ہے، وہ ہے زوجین کو کامل لذت نہیں ملتی۔کیونکہ ملامستِ ختانین کے ساتھ جماع کرنے اور حائل کے ساتھ جماع کرنے میں فرق ضرور ہے۔

غرض عزل کی یہ چاروں صورتیں مذکورہ بالا دو شرطوں کے ساتھ تو جائز ہوں گی البتہ ضرر کی صورت میں ناجائز ہوں گی۔

اب ان میں سے کون سی صورت زوجین کے لیے یا کسی ایک کے لیے مضر ہے اس کو اطباء ہی بہتر بتلا سکتے ہیں۔

1024۔ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ ﷺ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ لِيْ جَارِيَةً، وَأَنَا أَعْزِلُ عَنْهَا، وَأَنَا أَكْرَهُ أَنْ تَحْمِلَ، وَأَنَا أُرِيْدُ مَا يُرِيْدُ الرِّجَالُ، وَإِنَّ الْيَهُوْدَ تَحَدَّثُ أَنَّ الْعَزْلَ الْمَوْءُوْدَةُ الصُّغْرَى، قَالَ: كَذَبَتْ الْيَهُوْدُ، لَوْ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَخْلُقَهُ مَا اسْتَطَعْتَ أَنْ تَصْرِفَهُ)).

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری ایک باندی ہے، میں اس کے ساتھ عزل کرتا ہوں اور مجھے یہ پسند نہیں کہ وہ حاملہ ہو، اور میں (اس سے) وہ چاہتا ہوں جو مرد لوگ (عورتوں سے) چاہتے ہیں اور یہودی یہ بات کرتے ہوتے ہیں کہ عزل کرنا یہ ''موء ودہ صغریٰ'' ہے، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہود غلط کہتے ہیں، اگر اللہ نے اس (نطفہ سے بچہ) کو پیدا کرنا چاہا تو تو اس کو (پیدا ہونے سے) پھیر نہیں سکتا۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالنَّسَائِيُّ وَالطَّحَاوِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے، اور یہ الفاظ سنن ابی داؤد کی روایت کے ہیں۔ جبکہ امام نسائی اور امام طحاوی نے (بھی اس حدیث کو) روایت کیا ہے۔ اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث :......أَنَّ رَجُلًا: یہ جملہ معروضات پیش کرنے والے صحابی رسول ﷺ کا نام مجہول ہے، پر صحابی کے نام کے مجہول ہونے سے نفس حدیث اور قصہ حدیث پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

إِنَّ لِي جَارِيَةً: بظاہر یہ باندی اور کنیز تھی۔ لہٰذا مراد کم سن بچی نہ ہوگی۔

وَأَنَا أَعْزِلُ عَنْهَا: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "جارية" سے حال ہے۔ جبکہ یہ "لی" میں مذکور متکلم کی ضمیر مجرور متصل سے بھی حال ہو سکتا ہے۔

وَأَنَا أَكْرَهُ أَنْ تَحْمِلَ: باندی کے حاملہ ہونے کو ناپسند کرنے کی یہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔

(1) حاملہ ہونے کی صورت میں وہ بچہ جن کر اس کی ام ولد بن جائے گی۔ پھر وہ اپنے بچے سے بندھ کر رہ جائے گی اور اسے بیچا بھی نہ جا سکے گا اور نہ اس کے بچے کو ہی بیچا جا سکے گا کیونکہ ماں کو اس کے بچے سے جدا کرنا جائز نہیں۔

(2) دوسرے یہ کہ حاملہ ہونے اور بچہ جنم دینے کی صورت میں یہ باندی اس کے مرنے کے بعد آزاد ہو جائے گی۔ یوں یہ باندی اس کے ورثاء کو ترکہ میں نہ مل سکے گی۔

(3) اور تیسرے یہ کہ حاملہ ہونے اور بچہ جننے کی صورت میں اس کی قیمت کم پڑ جائے گی۔

غرض واللہ اعلم کہ شاید یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر ان صاحب کو اپنی باندی کا حاملہ ہونا پسند نہ تھا۔

وَأَنَا أُرِيدُ مَا يُرِيدُ الرِّجَالُ: یہ جماع سے کنایہ ہے۔ یعنی میں اس باندی سے لطف اندوز بھی ہونا چاہتا ہوں اور یہ

---

[1] مسند احمد: 51/3۔ سنن ابی داؤد: 2171۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 9082۔ شرح معانی الآثار للطحاوی: 32/3۔ اسی معنی میں اس حدیث کا ایک شاہد ''صحیح مسلم'' (1439) میں بھی ہے۔ دیکھیں: فتح الباری: 308/9۔

بھی چاہتا ہوں کہ وہ حاملہ نہ ہو، اس لیے عزل کر لیتا ہوں۔

وَإِنَّ الْيَهُودَ تُحَدِّثُ أَنَّ الْعَزْلَ الْمَوْءُ وْدَةُ الصُّغْرَى: یہود کے نامسعود کردار کا تعارف گزر چکا ہے۔

تَحَدَّثُ: یہ باب تفعل سے فعل مضارع کا صیغہ ہے، اس کی اصل "تَتَحَدَّثُ" ہے اور ایک تاء کو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا ہے۔

الْمَوْءُ وْدَةُ الصُّغْرَى: گزشتہ حدیث میں اس پر تفصیلی کلام کیا جا چکا ہے کہ ایک وأدِ حقیقی ہے، یہ بچی کو حقیقت میں زندہ درگور کر دینا ہے۔ اس بچی کو "الْمَوْءُ وْدَةُ الْكُبْرٰى" کہا جاتا ہے، جبکہ دوسرا "وأدِ خفی" ہے۔ یہ عزل کرنا ہے اس کو یہود "الْمَوْءُ وْدَةُ الصُّغْرَى" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

كَذَبَتْ يَهُودُ: لیکن نبی کریم ﷺ نے یہود بے بہبود کی اس بات کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہود کی یہ بات غلط ہے۔ یعنی عزل کرنا یہ واد نہیں ہے۔

لَوْ أَرَادَ اللّٰهُ.....: یہ یہود کے قول کے غلط ہونے کی دلیل کا بیان ہے اور بلاشبہ حضرتِ رسالت مآب ﷺ کا ارشادِ مبارک سراسر سچ اور درست ہے کہ اگر رب تعالیٰ نے کسی کے پیدا کرنے کا ارادہ کر لیا تو آدمی کا پانی اس کے عزل کرنے سے پہلے ہی نکل کر عورت کے رحم میں داخل ہو جائے گا۔ تب پھر آدمی اس بچے کو پیدا ہونے سے نہ روک سکے گا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ نے یہود کے اس دعویٰ کو کہ عزل کرنا یہ "الْمَوْءُ وْدَةُ الصُّغْرَى" ہے، غلط قرار دیا۔ جبکہ پچھلی حدیث میں ہم نے پڑھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عزل کرنے کو "وأدِ خفی" قرار دیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ بظاہر بھی کوئی تعارض نہیں ہے وہ یوں کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اس بات میں جھٹلایا ہے کہ وہ عزل کرنے کو حرام سمجھتے تھے، لیکن عزل کرنا وأد بہرحال ہے۔ البتہ یہ وأدِ خفی ہے۔ کیونکہ آدمی عزل کر کے گویا کہ چھپ چھپ کر اولاد کو پیدا ہونے سے روکتا ہے۔
- حکم شرعی کو معلوم کرنے کی غرض سے حیاء والی بات کو بھی صراحۃً ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- زوجین کا اپنے مابین منفی تعلقات کا افشاء کرنا حرام ہے البتہ کسی شرعی حاجت کی بنا پر ایسا کرنا جائز ہے۔
- اگر کسی امر میں مالی نقصان ہوتا دکھائی دے تو آدمی کے لیے اس کو ناپسند کرنا جائز ہے۔
- اگر کسی شرعی وجہ سے آدمی زیادہ اولاد کرنے سے گریز کرے تو یہ جائز ہے۔
- قابل حیاء بات کو بہرحال کنایہ سے بیان کرنا اولیٰ ہے۔
- اہل علم کا قول معتبر ہے چاہے وہ کافر ہی ہوں۔ جیسا کہ ان صاحب نے یہود کے ایک قول کا حوالہ خدمت نبوی میں پیش کیا۔ اگر یہ لوگ یہود کی علمی حیثیت سے متاثر نہ ہوتے تو ان کی بات کو نقل بھی نہ کرتے۔
- اگر کسی کی بات میں کوئی شک لاحق ہو تو اس کی بابت فتویٰ پوچھ کر اپنا شک دور کر لینا واجب ہے۔
- اس حدیث میں عزل کے جائز ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہود کی بات کو غلط قرار دیا تھا۔

◈ جب رب تعالیٰ ہی کسی بات کا ارادہ فرمالیں تو اسباب ظاہر یہ کام نہیں آتے۔

1025۔ وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((كُنَّا نَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَالْقُرْآنُ يُنْزَلُ، وَلَوْ كَانَ شَيْئًا يُنْهَى عَنْهُ لَنَهَانَا عَنْهُ الْقُرْآنُ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ عہد نبوی میں عزل کرلیا کرتے تھے حالانکہ اس وقت قرآن نازل ہورہا ہوتا تھا۔ اگر یہ ایسی بات ہوتی جس سے روک دیا جانا چاہیے تھا تو قرآن (نازل ہوکر) ہم لوگوں کو اس سے روک دیتا۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: فَبَلَغَ ذٰلِكَ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُ.

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: پس یہ بات نبی کریم ﷺ کو بھی پہنچی لیکن آپ ﷺ نے ہم لوگوں کو اس سے منع نہ فرمایا۔

غریب الحدیث:......عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: یعنی نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں۔

وَالْقُرْآنُ يُنْزَلُ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ ''نعزل'' کی ضمیر سے حال ہے، اور معنی کے اعتبار سے ماسبق کی تاکید ہے، کیونکہ جب یہ بات زمانہ نبوی کی ہے تو لامحالہ اس زمانہ میں ابھی قرآن نازل ہورہا تھا۔ تب پھر یہ جملہ ماسبق کی تاکید ہے کہ ابھی قرآن نازل ہونا بند نہ ہوا تھا، یہ اس زمانہ کی بات ہے۔

وَلَوْ كَانَ شَيْئًا......: ''كَانَ'' فعل ناقص کا اسم اس کی ضمیر ہے جس کا مرجع معنوی ہے جو ''نَعْزِلُ'' فعل سے مستفاد ہے اور تقدیری عبارت ''ولو كان العزل شيئًا......'' یعنی اگر عزل کوئی ایسی بات ہوتی کہ جس سے منع کردیا جانا چاہیے تو قرآن ہمیں اس سے ضرور منع کردیتا۔

یاد رہے کہ علم مصطلح الحدیث میں ایسی عبارت کو ادراج کہتے ہیں کیونکہ یہ عبارت آخر تک جناب جابر رضی اللہ عنہ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی سفیان ثوری کا کلام ہے۔ تب پھر یہ جملہ ''مدرج'' ہوگا نہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا کلام۔

لَنَهَانَا عَنْهُ الْقُرْآنُ: اس جملہ میں نہی کو قرآنِ کریم کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کلام ہے جو کہ ایک صفت ہے۔ نہ کہ کلام کرنے والی کوئی ذات۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فعل کو قرآن کی طرف مضاف کرنا جائز ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ﴾ (النمل: 76)

''بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے بیان کرتا ہے۔''

حالانکہ یہ قصہ بیان کرنے والی ذات خود رب تعالیٰ کی ہے جس نے قرآن کے واسطہ سے یہ قصہ بیان فرمایا ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: صحیح مسلم کی اس روایت سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مذکورہ روایت صریح مرفوع ہے کیونکہ یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی، پر آپ ﷺ نے اس پر انکار نہ فرمایا بلکہ اس کو برقرار رکھا۔

[1] صحيح البخاري: 5208- صحيح مسلم: 1440.

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بھی دراصل عزل کا جواز بیان کیا گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ عزل کرنا جائز ہے جس کے یہ دلائل ہیں:

(1) پہلی روایت بتلاتی ہے کہ یہ حدیث حکما مرفوع ہے کیونکہ اس کو عہد نبوی کی طرف منسوب تو کیا گیا ہے لیکن اس بات کی تصریح نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے علم میں یہ بات تھی یا نہیں۔

(2) جبکہ دوسری روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئی تھی۔ تب پھر یہ دوسری روایت صریح مرفوع ٹھہری۔

◈ رب تعالیٰ کے نزولِ وحی کے زمانہ میں کسی بات کو برقرار رکھنے سے کسی حکم پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دلیل "وَلَوْ كَانَ شَيْئًا يُنْهَى عَنْهُ لَنَهَانَا عَنْهُ الْقُرْآنُ" کے الفاظ ہیں۔ پس فرض کیا کہ اگر اس بات کا نبی کریم ﷺ کو علم نہیں بھی تھا تب بھی رب تعالیٰ کے علم میں تو یہ بات تھی۔ سو رب تعالیٰ کا اس بات کو برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ رب تعالیٰ کا کسی بات کو برقرار رکھنا اس کا اثبات ہے چاہے وہ بات نبی کریم ﷺ پر مخفی بھی تھی۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے اس بات پر انکار نہیں فرمایا۔ کیونکہ جو بات قابل انکار ہوتی ہے لوگ اسے جتنا بھی چھپانا چاہیں رب تعالیٰ اس کو ضرور سب پر آشکار فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ﴾ (النسآء: 108)

"وہ لوگوں سے چھپاؤ کرتے ہیں اور اللہ سے چھپاؤ نہیں کرتے، حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا۔"

پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو بات لوگوں پر مخفی رہ جائے، اگر رب تعالیٰ اس پر نکیر نہ فرمائیں تو وہ بات حق اور ثابت ہوتی ہے۔ پس اگر تو اس کا تعلق عبادت سے ہو تو وہ عبادت ہوتی ہے اور اگر وہ مباح ہو تو مباح ہوتی ہے۔

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے نہ کہ کسی بندے کا بنایا ہوا ہے اور یہ کہ یہ منزل من اللہ اور غیر مخلوق ہے۔ اہل سنت والجماعت کا مذہب یہی ہے اور یہی حق ہے۔

◈ قرآن کا کسی بات کو برقرار رکھنا بھی کسی حکم پر استدلال کرنے کا ایک طریق ہے۔

◈ حضرات محدثین کے نزدیک صریح مرفوع روایت کسی غنیمت سے کم نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ صریح مرفوع روایت کو ضرور ذکر کرتے ہیں۔

◈ نبی کریم ﷺ کا اقرار اور سکوت بھی محل استدلال ہے۔ اس کی دلیل "فلم ينهنا" کے الفاظ ہیں۔

بنا غسل کے دوبارہ جماع کرنے کا جواز

1026۔ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَطُوْفُ عَلَى نِسَائِهِ بِغُسْلٍ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (بسا اوقات) نبی کریم ﷺ ایک ہی غسل کے ساتھ اپنی بیویوں کے پاس سے ہو

وَاحِدٍ)). لیا کرتے تھے۔ ❶

أَخْرَجَاهُ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث: ...... **كَانَ يَطُوفُ عَلَى نِسَائِهِ**: گوکہ ''كَانَ'' جب فعل مضارع کے ساتھ آئے تو استمرار کا فائدہ دیتا ہے لیکن اس میں دوام شرط نہیں۔ لہٰذا اکثر اور اغلب کی تعبیر بھی فعل ناقص اور مضارع کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی اغلب اور اکثر مراد ہے نہ کہ دوام واستمرار۔

تب پھر یہ لازم نہیں کہ آپ ﷺ ہمیشہ ہی ایسا کیا کرتے تھے۔

يَطُوفُ عَلَى نِسَائِهِ: مراد جماع کرنا ہے۔ جس کی دلیل حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ قول ہے: ''وَاللّٰهِ لَا طُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلَى تِسْعِيْنَ امْرَأَةً تَلِدُ كُلُّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ غُلَامًا يُقَاتِلُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ'' ❷ ''اللہ کی قسم میں آج رات (اپنی) بیویوں کے پاس چکر لگاؤں گا (یعنی ان سے جماع کروں گا) جس سے ان میں سے ہر ایک ایک بیٹا جنے گی جو اللہ کی راہ میں لڑے گا۔''

کہ یہاں بھی ''لَا طُوْفَنَّ عَلَى تِسْعِيْنَ امْرَأَةً'' سے مراد ان سے جماع کرنا ہے۔ کیونکہ آدمی بیوی کے پاس جماع کی غرض سے ہی چکر لگاتا ہے۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ بنا غسل اور وضو کے اعادہ کے آدمی بیوی کے ساتھ یا ایک کے بعد دوسری بیوی کے ساتھ جماع کر سکتا ہے۔ تو جب متعدد بیویوں کے ساتھ کر سکتے ہیں تو ایک بیوی کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ کر سکتے ہیں۔ البتہ جماع کے اعادہ سے قبل اگر وضو کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ غسل جنابت میں تاخیر جائز ہے اور اس میں مبادرت واجب نہیں۔
- ◈ نبی کریم ﷺ پر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی باریاں واجب نہ تھیں گو آپ ﷺ سب کے ہاں باری باری تشریف لے جایا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ پر اگر باری کی تقسیم واجب ہوتی تو آپ ﷺ ایک ہی رات میں سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ہاں تشریف نہ لے جاتے۔

3۔ بَابُ الصَّدَاقِ ...... مہر کا بیان

تمہید: ...... الصداق یعنی مہر کا لغوی اور شرعی معنی: ...... **الصَّدَاقِ**: یہ ''اَصْدَقَ يُصْدِقُ إِصْدَاقًا'' کا اسم مصدر ہے۔ اس کا لغوی معنی عورت کا مہر ہے۔ اصطلاحِ شرع میں یہ اس عوض کو کہتے ہیں جو نکاح یا نکاح سے ملحق عقد کی وجہ سے عورت کو دیا جاتا ہے۔ لہٰذا باندی کے ثمن کو صداق نہ کہا جائے گا کیونکہ یہ عقد بیع کا عوض ہے نہ کہ عقد نکاح کا، اگرچہ باندی استمتاع کے لیے ہی خریدی جاتی ہے اور باندی کے خریدنے سے بھی وہی غرض ہوتی ہے جو نکاح کرنے سے ہوتی ہے اور نکاح کے ملحقات سے مراد عورت کے ساتھ شبہ میں وطی کا ہونا ہے کہ اس میں بھی مہر مثل واجب ہوتا ہے اگرچہ وہ عقد نکاح نہیں ہوتا۔

---

❶ صحیح البخاری: 284۔ صحیح مسلم: 309. ❷ صحیح البخاری: 2819۔ صحیح مسلم: 1654.

یہی حکم زبردستی زنا کرنے کا بھی ہے کہ اس میں بھی مہر مثل آتا ہے۔

مہر کتنا ہو؟

اس بارے صحیح قول یہ ہے کہ اس کی کوئی شرعی حد نہیں۔ لہٰذا جس پر بھی اور جتنے پر عورت کا دل راضی ہو جائے وہی کافی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کم ہی ہو۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا٥﴾

(النسآء: 4)

''اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو، پھر اگر وہ اس میں سے کوئی چیز تمھارے لیے چھوڑنے پر دل سے خوش ہو جائیں تو اسے کھالو، اس حال میں کہ مزے دار، خوشگوار ہے۔''

تب پھر اگر عورت ایک درہم پر بھی راضی ہو، وہی کافی ہوگا۔

مہر دراصل کس کا حق ہے؟

یاد رہے کہ مہر کا امر عورت کے سپرد ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ مہر صرف عورت کا ہی حق ہے اور یہ ایک مسلم شرعی قاعدہ ہے کہ آدمی چاہے تو اپنا خالص حق معاف بھی کر سکتا ہے اور چاہے تو اس کے تھوڑے پر بھی راضی ہو سکتا ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔

مہر کا مال ہونا لازم ہے

البتہ مہر کا ایسی چیز ہونا لازم ہے جس پر لفظ ''مال'' کا اطلاق جائز ہو اور یہ کہ نکاح کسی نہ کسی عوض کے بدلے ضرور ہو، لہٰذا تبرع محض سے اور ہبہ سے نکاح منعقد نہ ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں نکاح بلا عوض ہے۔ جبکہ مہر کے قلیل ہونے کی صورت میں اس کو کم از کم عوض تو ضرور کہا جاتا ہے۔ اس لیے مہر کا ایسی کوئی چیز ہونا ضروری ہے جو ثمن یا اجرت بن سکے اور وہ مال ہوتا ہے۔ تب پھر اگر جَو یا چنے کے چند دانوں پر نکاح کرنے پر راضی بھی ہو جائے تو بھی یہ درست نہ ہوگا کیونکہ جَو یا چنے کے چند دانے یہ مال نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ کسی شے کا ثمن یا کسی منفعت کی اجرت نہیں بن سکتے۔

''مَنَافِع'' مہر بن سکتے ہیں یا نہیں؟

رہے منافع، تو ان کو مہر مقرر کیا جا سکتا ہے جیسے کوئی آٹھ یا دس سال تک بکریاں چرانے کو، جو کہ مزدوری یعنی منفعت ہے، مہر مقرر کرے تو یہ جائز ہوگا جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے صاحب مدین کی بیٹی کے ساتھ اسی شرط پر نکاح کیا تھا کہ آپ اتنی مدت تک ان کی بکریاں چرائیں گے۔

البتہ خاص بیوی کی خدمت کو ہی مہر مقرر کرنے کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کیونکہ یہ بھی منفعت سے استفادہ کے حکم میں داخل ہے اور جن کے نزدیک یہ صورت ناجائز ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ بھلا ایک خاوند کو بیوی کا خادم بنانا کیونکر جائز ہوگا جبکہ گھر کا سربراہ اور نگران ونگہبان خاوند ہی تو ہوتا ہے۔ رہا تعلیم کو مہر مقرر کرنا تو اگر تو یہ تعلیم تعلیم قرآن ہے تو اس کو مہر مقرر کرنا جائز ہوگا۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ تعلیم کو مہر مقرر کر سکتے ہیں چاہے وہ تعلیم قرآن کی ہو یا کسی دوسری شے کی۔

اب ذیل میں اس باب سے متعلقہ احادیث کو ذکر کیا جاتا ہے۔

آزاد کرنے کو مہر مقرر کرنے کا حکم

1027۔ عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: ((أَنَّهُ أَعْتَقَ صَفِيَّةَ، وَجَعَلَ عِتْقَهَا صَدَاقَهَا)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد فرمایا اور ان کے آزاد کرنے کو ہی ان کا مہر مقرر فرمایا۔ ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

قصۂ حدیث:......سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا یہود کے مشہور قبیلہ بنی نضیر کے سردار حیي بن اخطب کی بیٹی تھیں اور سیدہ رضی اللہ عنہا سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بھائی جناب ہارون علیہ السلام کی ذریت سے تھیں۔ یہ غزوہ خیبر کے دوران کا قصہ ہے جب آپ ﷺ نے بنو نضیر پر فتح پائی تو گرفتار ہو کر آنے والے بچوں اور عورتوں میں سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے محض ان کی دلجوئی اور غم خواری فرمانے کیلیے انہیں اپنے لیے اختیار فرما لیا، پھر آزاد کر کے انہیں اپنے نکاح میں لے لیا اور یوں انہیں امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی پاکیزہ ترین جماعت میں شامل کر لیا۔ جس سے ان کی زبردست دلجوئی ہوئی اور ایک سردار کی بیٹی ہونے کے ناطے انہیں گرفتار ہو کر باندی بنائے جانے کا جو غم لاحق ہوا تھا، وہ کافور ہو گیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں ایک سردار یا سردار زادے کا غلام بنا لیا جانا بے حد ذلت وتوہین کی بات تھی۔

تب پھر نبی کریم ﷺ نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا پر متعدد احسانات فرمائے:

(1) ایک تو انہیں کسی دوسرے کی غلامی میں نہ رہنے دیا۔

(2) دوسرے انہیں آزاد فرما دیا۔

(3) تیسرے انہیں اپنے عقد میں لے کر امہات المومنین کے عظیم ترین دینی منصب سے سرفراز فرمایا۔

مضمونِ حدیث:......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی عورت کے آزاد کرنے کو ہی اس کا مہر بھی مقرر کر سکتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کی از حد حکمت کہ آپ ﷺ نے پہلے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے لیے چنا، پھر انہیں آزاد فرمایا اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں داخل فرما لیا۔

◈ معلوم ہوا کہ آدمی کو دوسرے کے دل کی رعایت کرنی چاہیے۔ لہٰذا اگر کسی کا دل ٹوٹ گیا ہو تو اس کو جوڑنے کی بھرپور کوشش کرے۔ بلاشبہ یہ بے حد عظیم کام ہے۔

◈ باندی کو آزاد کر کے اس کی آزادی کو ہی اس کا مہر مقرر کر کے اسے نکاح میں لینا جائز ہے۔

◈ نکاح کے انعقاد کے لیے کوئی خاص الفاظ نہیں بلکہ نکاح ان سب الفاظ سے منعقد ہو جاتا ہے جو عقد نکاح پر دلالت کریں۔

◈ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی از حد فضیلت کہ آپ امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سے ہیں۔

---

❶ صحيح البخاري: 5086- صحيح مسلم: 1365.

نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے مہروں کا بیان

1028۔ وَعَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ رضي الله عنها ، كَمْ كَانَ صَدَاقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَتْ : كَانَ صَدَاقُهُ لِأَزْوَاجِهِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ أُوْقِيَّةً وَنَشًّا ، قَالَتْ أَتَدْرِيْ مَا النَّشُّ ؟ قَالَ : قُلْت : لَا ، قَالَتْ: نِصْفُ أُوْقِيَّةٍ ، فَتِلْكَ خَمْسُمِائَةِ دِرْهَمٍ ، فَهَذَا صَدَاقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لِأَزْوَاجِهِ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ: میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کا (اپنی ازواجِ مطہرات کے لیے مقررہ کیا ہوا) مہر کتنا تھا؟ تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا مہر بارہ اوقیہ اور ''نش'' تھا، (پھر) فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ ''نش'' کیا (اور کتنا) ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: نہیں۔ تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (نش یہ) نصف اوقیہ (چاندی ہوتی) ہے، پس (اب ایک اوقیہ چاندی چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ یوں بارہ اوقیہ 480 درہم ہوئے جبکہ نصف اوقیہ کے بیس درہم بھی ساتھ ملائے تو) یہ (کل) پانچ سو درہم بنے۔ سو یہ ہے نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا مہر۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

معرفة الصحابة:......ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن یہ تابعین میں سے ہیں جبکہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ سو اگر انہوں نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا زمانہ پایا ہے تو ان کا شمار اَواسط تابعین میں سے ہوگا۔

غریب الحدیث :...... **كَانَ صَدَاقُهُ لِأَزْوَاجِهِ**: ازواج یہ زوج کی جمع ہے اور یہاں مضاف ہے اور جمع جب مضاف ہو تو عموم کا فائدہ دیتی ہے، تب پھر یہ عام ہے لیکن مراد اس سے خاص ہے۔ کیونکہ یہ مذکورہ مہر نبی کریم ﷺ کی سب ازواجِ مطہرات کا نہ تھا۔ جیسا کہ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا مہر ان کی آزادی تھا۔

ثِنْتَيْ عَشْرَةَ أُوْقِيَّةً: اثنتان اور ثنتان یہ دو لغتیں ہیں جن کا معنی ایک ہی ہے۔ ان کی حالت رفعی الف کے ساتھ جبکہ حالت نصبی اور جری یا کے ساتھ آتی ہے۔

وَنَشًّا: چونکہ ابوسلمہ نش کا معنی نہ جانتے تھے، اس لیے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

أَتَدْرِي مَا النَّشُّ: کہ کیا تم نش کا مطلب جانتے ہو؟ تو جب انہوں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یہ آدھے اوقیہ چاندی کو کہتے ہیں جو بیس درہم کے برابر ہوتا ہے۔ یوں یہ کل پانچ سو درہم کی مقدار بن گئی (جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے)۔

غرض نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا مہر پانچ سو درہم تھا، جو فی زمانہ بھی ایک معمولی رقم ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی ازواج کا مہر بہت معمولی مقرر فرمایا کرتے تھے تاکہ نکاح میں آسانی پیدا ہو۔

---

[1] صحيح مسلم: 1426 .

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حضرات اسلاف علم کے حاصل کرنے کے بے حد حریص تھے۔
◈ اگر کوئی دینی مصلحت ہو تو مرد بھی عورت سے مخاطب ہو سکتا ہے۔

رہا عورت کا تدریس کرنا یعنی اس کا خود کو مردوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دینا تو ان دونوں باتوں میں فرق ہے کہ:

(1) ایک ہے مرد کا کسی عورت سے کوئی شرعی مسئلہ دریافت کرنا۔

(2) اور ایک ہے عورت کا خود کو مردوں کی تعلیم و تدریس کے لیے وقف کرنا۔

کیونکہ دوسری صورت لا محالہ مردوں اور عورتوں کے بے جا اور بے محابا اختلاط کے دروازے تک لے جاتی ہے۔ پھر عورت کا معلّمہ ہونا اسے غیر مردوں کے ساتھ کثرت کے ساتھ گفتگو کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ اس لیے مذکورہ حدیث سے عورت کے معلّمہ اور مدرسہ بننے کے جواز پر استدلال کرنا بہر حال محل نظر ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ عورت کی آواز ستر نہیں۔ کیونکہ اگر عورت کی آواز ستر ہوتی تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جناب ابو سلمہ کو کبھی جواب نہ دیتیں۔
◈ معلوم ہوا کہ مطلق اور عام بول کر خاص مراد لینا جائز ہے۔
◈ اگر مفتی کو معلوم ہو کہ مستفتی فلاں بات سے لاعلم ہے تو اسے چاہیے کہ وہ مستفتی کو اس بات پر متنبہ کر دے بالخصوص جبکہ اس بات کا تعلق خود اس کے استفتاء سے ہو۔
◈ معلوم ہوا کہ تعلیم کا ایک طریق سوال کر کے سکھلانا بھی ہے۔ جیسا کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نش کے بارے میں بتلانا تھا تو پہلے سوال فرمایا تھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ ''نش'' کیا ہوتا ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مہر کا بیان

1029- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ : لَمَّا تَزَوَّجَ عَلِيٌّ فَاطِمَةَ رضی اللہ عنہا ، قَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَعْطِهَا شَيْئًا)) قَالَ: مَا عِنْدِي شَيْءٌ . قَالَ: ((فَأَيْنَ دِرْعُكَ الْحُطَمِيَّةُ ؟)) .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جناب علی رضی اللہ عنہ کی جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: ''انہیں (یعنی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مہر میں) کچھ دے دو۔'' انہوں نے عرض کیا: میرے پاس تو کچھ بھی نہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (دریافت فرمایا: ''تمہاری (وہ) حُطَمِیّہ زرہ کہاں ہے؟''[1] (وہ ہی مہر میں دے دو)۔

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ .

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح:...... جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل ومناقب معروف ہیں جو محتاج بیان نہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 2125۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5567۔ امام ابن حبان: (6945) نے، اور ضیاء مقدسی نے ''المختارۃ'' (231/2) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **أَعْطِهَا شَيْئًا**: نبی کریم ﷺ کی مراد مہر میں کچھ دینا تھی۔

مَا عِنْدِي شَيْءٌ: معلوم ہوا کہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عام زندگی فقر و درویشی اور زہد و قناعت سے تعبیر تھی۔

أَيْنَ دِرْعُكَ الْحُطَمِيَّةُ: درع سے مراد جنگی زرہ بھی ہو سکتی ہے اور پہننے کا کرتا بھی مراد ہو سکتا ہے اور "حُطَم" یہ عربوں کے مشہور قبیلہ بنی عبد قیس کی ایک شاخ ہے۔ وہاں کی بنی زرہ کو "حُطَمِيَّة" کہا جاتا تھا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جناب علی رضی اللہ عنہ کی بے حد فضیلت و منقبت کہ انہیں حضرت رسالت مآب ﷺ کی سب سے لاڈلی بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نکاح میں لینے کی سعادت اور شرف حاصل ہوا۔
- معلوم ہوا کہ نکاح میں مہر بہر حال لازم ہے۔
- مقتداء اور پیشواء کو چاہیے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے نجی احوال کی بھی خبر گیری رکھا کرے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے احوال سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے آپ ﷺ کو اس بات کا علم تھا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک زرہ بھی ہے۔
- ظن پر مبنی خبر کذب نہیں ہوتی چاہے وہ خلاف واقع ہی ہو جیسا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے گمان کے تئیں یہ عرض کر دیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ان کی اس بات کو قبول فرمایا لیکن ساتھ ہی انہیں یاد دلا دیا کہ ان کے پاس ایک زرہ ہے۔
- ہر وہ شے جو مال ہو وہ مہر بن سکتی ہے۔
- اور یہ بات بھی جائز ہے کہ عورت کو مہر میں ایسی چیز دے دی جائے جو عورت ہونے کے اعتبار سے اس کے مناسب حال نہ ہو، جیسے زرہ کہ یہ ایک جنگی لباس ہے جو عورت کی فطری نزاکت و لطافت کے برعکس ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کے مہر ہونے کو قبول اور منظور فرمایا۔

مہر، ہدیہ اور وعدہ کا حکم

1030۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ نُكِحَتْ عَلَى صَدَاقٍ أَوْ حِبَاءٍ أَوْ عِدَةٍ قَبْلَ عِصْمَةِ النِّكَاحِ، فَهُوَ لَهَا، وَمَا كَانَ بَعْدَ عِصْمَةِ النِّكَاحِ، فَهُوَ لِمَنْ أُعْطِيَهُ، وَأَحَقُّ مَا أُكْرِمَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ ابْنَتُهُ أَوْ أُخْتُهُ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ.

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس عورت نے بھی مہر یا ہدیہ یا عقدِ نکاح سے قبل کے کسی وعدہ پر نکاح کیا تو وہ اسی عورت کا ٹھہرے گا اور جو عقد نکاح کے بعد ہو وہ اسی کا ہوا جس کو وہ دیا گیا ہے اور سب سے حق بات جس پر آدمی کا اکرام کیا جاتا ہے، وہ اس کی بیٹی یا اس کی بہن ہے۔" [1]

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام

---

[1] مسند احمد: 182/2۔ سنن ابی داؤد: 2129۔ سنن النسائی: 120/6۔ سنن ابن ماجہ: 1955۔ اس حدیث کی اسناد میں ابن جریج ہے جو معروف مدلس راوی ہے اور انہوں نے اس حدیث کو معنعن روایت کیا ہے۔

ترمذی کے۔

غریب الحدیث:......أَيُّمَا امْرَأَةٍ: یہ ترکیب گزشتہ میں بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

عَلٰى صَدَاقٍ: صداق کا لغوی اور شرعی معنی بیان کیا جا چکا ہے۔

أَوْ حِبَاءٍ: حباء: ہدیہ، عطیہ تکریم اور عورت کے مہر کو کہتے ہیں۔

حباء ان تحفوں کو کہتے ہیں جو خاوند بیوی کو مہر کے علاوہ دیتا ہے جیسے انگوٹھی، ہار وغیرہ۔ پھر یہ تحفے کبھی تو عقدِ نکاح سے قبل دیے جاتے ہیں اور کبھی نکاح کے بعد۔ اگر چہ یہ تحفے مہر سے خارج ہوتے ہیں لیکن ان کا حکم مہر کا ہی ہے۔

أَوْ عِدَةٍ: "عِدَةٍ" سے مراد وعدہ ہے۔ جیسے کوئی اس بات کا وعدہ کرے کہ میں تمہیں نکاح کے بعد دس ہزار روپے دوں گا۔

قَبْلَ عِصْمَةِ النِّكَاحِ: "عِصْمَةٌ" سے مراد عقد ہے اور عقد کو عصمت سے اس لیے تعبیر کیا کیونکہ آدمی عقد نکاح کی بدولت اپنی بابت گناہ اور شر میں پڑنے کے جملہ خدشات اور اندیشوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

فَهُوَ لَهَا: یعنی عقدِ نکاح سے قبل کے وعدے منکوحہ کا حق ہوتے ہیں اور وہ منکوحہ کے سوا اور کسی کو نہ دیے جائیں گے۔ چاہے وہ وعدے خود ولی نکاح کے لیے ہی کیوں نہ کیے گئے ہوں۔

وَأَحَقُّ مَا أُكْرِمَ......: یہ جملہ تعلیل کے حکم میں ہے کہ جو آدمی کسی کو اپنی بیٹی یا بہن نکاح میں دیتا ہے، وہ اکرام اور احترام کیے جانے کا مستحق ہے اور یہ بات حق ہے نہ کہ باطل۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مہر، اس کے تابع تحفے اور جن چیزوں کے دینے کا نکاح سے قبل وعدہ کیا تھا، وہ سب بیوی کے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر خود بیوی نے بھی اس بات کی شرط رکھی تھی کہ وہ تحفے یا چیزیں فلاں فلاں کو دینے ہوں گے تو بھی وہ سب کچھ بیوی کا ہی ہوگا اور اگر عورت کے اولیاء میں سے کسی نے اپنے لیے کسی چیز کو شرط رکھا تھا تو ان کے لیے بھی وہ لینا حرام ہوگا۔ کیونکہ ان کے لیے اپنے لیے کسی چیز کو شرط کرنا جائز ہی نہ تھا۔ چنانچہ نہ تو وہ اس مشروط شے کے شرعاً مالک بنیں گے اور نہ محاکمہ کی صورت میں ہی ان چیزوں کے مالک بنیں گے۔

◈ عقد نکاح کے بعد باپ یا بیٹے کی تکریم کرنے کو شرط کرنا جائز ہے اور اگر زوج نے اس کا التزام کر لیا اور اس پر راضی ہو گیا تو اس کے لیے وہ تکریم واجب ولازم ہو جائے گی۔ البتہ اسے مہر میں سے اعتبار نہ کیا جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی نے پانچ ہزار روپے مہر پر نکاح کیا اور نکاح کے بعد بیوی کے باپ اور ماں کو ان کے اکرام میں دو دو ہزار روپے دیے۔ پھر بالفرض اگر اس نے دخول سے قبل طلاق دے دی تو بیوی کو نصف مہر ملے گا اور خاوند نصف مہر کو بیوی سے واپس لے گا۔ البتہ جو رقم اس نے ساس سسر کو ان کی تکریم میں دی تھی وہ واپس نہ لے گا۔ کیونکہ وہ رقم مہر میں شمار نہ تھی۔

◈ بسا اوقات آدمی کی اس کی بیٹی یا بہن کی وجہ سے بھی عزت کی جاتی ہے۔ اس عزت وتکریم کو رشوت نہ سمجھا جائے گا بلکہ یہ تکریم شرعاً جائز اور حق ہے۔

جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو، اس کا مہر کیا ہوگا؟

1031۔ وَعَنْ عَلْقَمَةَ عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ: أَنَّهُ — علقمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: جناب ابن

سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً، وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا صَدَاقًا، وَلَمْ يَدْخُلْ بِهَا، حَتَّى مَاتَ، فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: ((لَهَا مِثْلُ صَدَاقِ نِسَائِهَا، لَا وَكْسَ، وَلَا شَطَطَ، وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ، وَلَهَا الْمِيرَاثُ)) فَقَامَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ الْأَشْجَعِيُّ، فَقَالَ: قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي بِرْوَعَ بِنْتِ وَاشِقٍ- امْرَأَةٍ مِنَّا- مِثْلَ مَا قَضَيْتَ، فَفَرِحَ بِهَا ابْنُ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ)).

مسعود رضی اللہ عنہما سے ایک آدمی کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اس نے ایک عورت سے شادی کی، پر اس کا مہر مقرر نہ کیا، پھر (رب کی مرضی یہ ہوئی کہ) وہ (ابھی) اس سے دخول بھی نہ کر پایا تھا کہ (بقضائے الٰہی) وفات پا گیا (کہ ایسے شخص کا حکم کیا ہے، کیا اس کے ذمہ بیوی کا مہر بنتا ہے)؟ تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس عورت کو اپنے خاندان کی عورتوں کے مہر جیسا مہر (یعنی مہر مثل) ملے گا، نہ کم اور نہ زیادہ، اور اس پر عدت (وفات) واجب ہو گی اور اسے میراث (بھی) ملے گی۔ اس پر حضرت معقل بن سنان اشجعی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر (یہ) کہا: (بے شک) نبی کریم ﷺ نے (بھی) ہمارے خاندان کی ایک عورت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں بھی ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا جیسا آپ نے فیصلہ کیا ہے۔ اس بات پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما (بے حد) خوش ہوئے۔ [1] (کہ ان کا فیصلہ عین سنت کے مطابق تھا)۔

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ جَمَاعَةٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح اور محدثین کی ایک جماعت نے حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ**: کسی صحابی کے نام کے مبہم ہونے سے حدیث کی صحت اور قصہ کے حکم پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وَلَمْ يَفْرِضْ: یہ "لَم يُقَدِّرْ" کے معنی میں ہے۔ یعنی اس نے مہر کو مقرر نہ کیا تھا۔

وَلَمْ يَدْخُلْ بِهَا حَتَّى مَاتَ: اس شخص نے ابھی بیوی سے دخول نہ کیا تھا کہ وہ مر گیا۔ بلاشبہ ایسے شخص کا نکاح درست تھا۔ رہا یہ سوال کہ کیا اس کی بیوی کو مہر ملے گا یا نہیں تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس بابت جو فیصلے سنائے، وہ یہ تھے:

لَهَا مِثْلُ صَدَاقِ نِسَائِهَا: ایسی عورت کو مہر مثل ملے گا اور یہ خاندان کی دیگر عورتوں کو ملنے والے مہر کے جیسا ہوتا ہے اور مہر مثل تب ملتا ہے جب مہر مقرر نہ کیا گیا ہو، البتہ جب مہر مقرر ہو تو وہی ملتا ہے۔

اور خاندان کی عورتوں سے مراد عمر، جمال، مال، دین، اخلاق اور خاندانی شرافت میں مثل عورتیں ہیں۔ لہٰذا جو عورتیں ان

---

[1] مسند احمد: 447/1- سنن ابی داؤد: 2114- جامع الترمذی: 1145- سنن النسائی: 121/6- سنن ابن ماجہ: 1891- امام ابن حبان (4100) اور امام حاکم (196/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں کہ: یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے۔ امام بیہقی (245/7) فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد کے صحیح ہونے کی وجہ سے اس حدیث میں کوئی عیب نہیں ہے۔ دیکھیں: التلخیص: 192/3.

چھ باتوں میں اس کے جیسی ہوں گی ان کے مہر جیسا مہر اس کو بھی ملے گا۔
لَا وَكْسَ: وکس یہ کمی کو کہتے ہیں۔
وَلَا شَطَطَ: شطط یہ زیادتی کو کہتے ہیں۔
یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا دوسرا فیصلہ تھا کہ اس عورت کو ایک تو مہر مثل ملے گا، دوسرے اس سے نہ کم ملے گا اور نہ زیادہ۔
وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ: یہ "غير مدخول بها" کے جس کا مہر بھی مقرر نہ تھا، بیوہ ہو جانے کی بابت تیسرے حکم کا بیان ہے کہ وہ عدتِ وفات گزارے گی۔ جو چار ماہ دس دن ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ (البقرة: 234)
''اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس راتیں انتظار میں رکھیں۔''
اب چونکہ یہ عورت "غير مدخول بها" تھی تب پھر لامحالہ غیر حاملہ بھی تھی۔ جبکہ حاملہ اگر بیوہ ہو جائے تو اس کی عدتِ وفات وضع حمل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ حاملہ عورت اگر خاوند کی تجہیز و تکفین وغیرہ سے بھی پہلے بچہ جنم دے تو اس کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔
وَلَهَا الْمِيرَاثُ: اور چوتھا حکم یہ بیان فرمایا کہ ایسی عورت خاوند کی وارث بھی بنے گی کیونکہ اگرچہ مہر مقرر نہ تھا لیکن نکاح بہر حال صحیح تھا اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ (النساء: 4)
''اور ان کے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے جو تم چھوڑ جاؤ۔''
اور نکاح کے صحیح منعقد ہو جانے کی بنا پر یہ اس کی زوجہ تھی لہٰذا یہ عورت بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہوگی۔
فَقَامَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ الْأَشْجَعِيُّ فَقَالَ.....: یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے دریافت کیے گئے اس مسئلہ سے متعلق ان چار فیصلوں کو سن کر حضرت معقل رضی اللہ عنہ فرطِ مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے فیصلوں کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ ﷺ کے یہ فیصلے نبی کریم ﷺ کے اس فیصلہ کے عین موافق ہیں جو آپ ﷺ نے ہمارے خاندان کی ایک خاتون بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا۔
بِرْوَعَ بِنْتِ وَاشِقٍ: بروع: یہ کلمہ تانیث معنوی اور علیت (منع صرف کے دو اسباب) کے پائے جانے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ اسی لیے اس پر حالت جری میں بھی لفظی فتح آیا ہے۔
امْرَأَةٍ مِنَّا: یہ ''بروع بنت واشق'' کا، جو معرفہ ہے، عطف بیان ہے نہ کہ صفت۔ کیونکہ "امْرَأَةٍ مِنَّا" یہ نکرہ ہے اور نکرہ کبھی معرفہ کی صفت بن کر نہیں آسکتا اور حضرت معقل رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا مسئلہ کی تائید اور اس کی تاکید کے لیے تھا کیونکہ جب یہ عورت ان کی قوم کی تھی تو یقیناً یہ اس کے حال کو زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔
مِثْلَ مَا قَضَيْتَ: "قَضَيْتَ" یہاں "حَكَمْتَ" کے معنی میں ہے اور حکم سے یہاں حکم شرعی مراد ہے۔
وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْجَمَاعَةُ: کیونکہ یہ حدیث نصوصِ شرعیہ کے عین مطابق ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں ایک خاص صورت کا حکم بیان کیا گیا ہے، وہ یہ کہ: اگر کسی نے بغیر مہر مقرر کیے کسی عورت سے نکاح کیا اور ابھی دخول کرنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ وفات پا گیا تو:

(1) ایک تو اس عورت کو مہر مثل ملے گا، نہ اس سے کم نہ زیادہ۔

(2) دوسرے وہ عورت عدتِ وفات گزارے گی جو چار ماہ دس دن ہے۔

(3) تیسرے وہ اپنے مرحوم خاوند کی وارث بھی بنے گی کیونکہ نکاحِ صحیح کی بنا پر وہ اس کی شرعی بیوی تھی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی بے پناہ فضیلت ومنقبت اور دینی علم وفقاہت کہ انہیں ایک اجتہادی مسئلہ میں درستی اور صواب کی توفیق نصیب ہوئی جو سنت نبوی کے عین مطابق تھا۔

◈ کسی کام کے درست ہو جانے پر خوش ہونا جائز اور فطرت کے عین مطابق ہے اور یہ اس مذموم خوش ہونے میں داخل نہیں جس کا ذکر اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾ (القصص : 76)

''جب اس کی قوم نے اس سے کہا مت پھول، بے شک اللہ پھولنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

◈ مہر مقرر کیے بغیر بھی نکاح کرنا جائز ہے اور نکاح منعقد بھی ہو جاتا ہے، البتہ اس سے مہر ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ اس صورت میں اس عورت کو مہر مثل ملتا ہے۔

◈ موت مہر کو پکا کر دیتی ہے۔ یعنی مرد یا عورت کے مرنے سے مہر ثابت ہو جاتا ہے چاہے دخول نہ بھی ہوا ہو۔

مہر کی مقدار کیا ہے؟

1032- وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : ((مَنْ أَعْطَى فِي صَدَاقِ امْرَأَةٍ سَوِيقًا أَوْ تَمْرًا فَقَدِ اسْتَحَلَّ)).
أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ ، وَأَشَارَ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ .

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے عورت کے مہر میں ستو یا کھجوریں دیں تو تحقیق اس نے (عورت کی شرمگاہ کو اس مہر کے عوض) حلال کر لیا۔'' ❶
اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس حدیث کا موقوف ہونا راجح ہے۔

غریب الحدیث :...... مَنْ : یہ شرطیہ ہے۔ لہٰذا ''أَعْطَى'' یہ فعل شرط ہوگا اور ''فَقَدِ اسْتَحَلَّ'' یہ جواب شرط ہوگا۔ جبکہ مذکورہ ''فا'' جزائیہ ہوگی۔

سَوِيقًا : ستو، یہ گندم اور جَو کے دانوں کو کوٹ کر تیار کیا جاتا ہے اور اسے ٹھنڈے شیریں پانی میں گھول کر پیتے ہیں اور چونکہ یہ نکرہ ہے اور شرط کے تحت مذکور ہے لہٰذا یہ عموم کے لیے ہوگا یعنی یہ قلیل وکثیر دونوں مقداروں کو شامل ہوگا۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 2110- اس حدیث کی اسناد میں مسلم بن رومان ایک ضعیف راوی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا نام صالح ہے، جو مجہول ہے۔ عبدالحق کہتے ہیں: جس نے اس حدیث کو مسند نقل کیا ہے، وہ روایت مدار نہیں۔ ابن حزم نے ''المحلی'' (500/9) میں اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے۔

فَقَدِ اسْتَحَلَّ: یعنی ستو اور کھجور کو مہر میں دینے والے کے لیے عورت کی شرمگاہ حلال ہوگئی۔

وَأَشَارَ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ: یعنی اس روایت کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونا راجح ہے اور موقوف وہ روایت ہوتی ہے جس کی سند صحابی رسول پر آ کر ختم ہو جاتی ہے اور ایسی روایت مرفوع کے حکم میں نہیں ہوتی۔ جبکہ اس روایت کا تعلق امورِ اجتہادیہ میں سے ہو جیسا کہ یہ روایت ہے۔ لہٰذا اس روایت کو مرفوع نہ کہیں گے کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ صحابی رسول ﷺ نے یہ بات اپنے تفقہ واجتہاد سے کہی ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اگرچہ اس روایت کا مرفوع ہونا صحیح نہیں لیکن اس روایت سے یہ ضرور مستفاد ہوتا ہے کہ ہر تھوڑی زیادہ چیز کو مہر مقرر کر سکتے ہیں جس کی دلیل "مَنْ أَعْطَى فِي صَدَاقِ امْرَأَةٍ سَوِيقًا أَوْ تَمْرًا" کے الفاظ ہیں جیسا کہ غریب الحدیث کے تحت بیان ہوا۔
- مہر غلوں اور کھانوں میں سے بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا نقود یعنی درہم و دینار اور روپے پیسوں میں سے ہونا ہی لازم نہیں۔ اس کی دلیل "سَوِيقًا أَوْ تَمْرًا" کے الفاظ ہیں۔
- عورت تو مہر دینے یا مقرر کرنے سے ہی حلال ہوتی ہے اس کی دلیل "فَقَدِ اسْتَحَلَّ" کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا اگر مہر مقرر نہ بھی کیا تھا تب بھی دینا ضرور واجب ہوتا ہے۔ جس کی پوری تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

کیا جوتیوں کا ایک جوڑا مہر ہو سکتا ہے؟

1033۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ عَنْ أَبِيهِ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَجَازَ نِكَاحَ امْرَأَةٍ عَلَى نَعْلَيْنِ)).
أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ ، وَصَحَّحَهُ ، وَخُولِفَ فِي ذٰلِكَ .

عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اپنے والد (ماجد حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے جوتیوں کے ایک جوڑے پر (بھی) عورت کے نکاح کو جائز قرار دیا۔ [1]
اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے اس کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ اس بابت ان سے اختلاف کیا گیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **أَجَازَ**: یعنی آپ ﷺ نے اس کے جواز کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ نافذ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہ دونوں معانی صحیح ہیں کیونکہ جو بات جائز ہو وہ نافذ بھی ہوتی ہے۔

عَلَى نَعْلَيْنِ: اگرچہ یہاں نعلین کا ذکر مطلق ہے لیکن اس کا زوجین کو معلوم ہونا ضروری ہے۔

وَخُولِفَ فِي ذٰلِكَ: یعنی دیگر حضرات محدثین اور ائمہ علماء نے اس حدیث کی تصحیح کی بابت امام ترمذی کی موافقت نہیں کی۔ یہ حدیث صحیح ہو یا نہ ہو لیکن نعلین بہرحال مال ہیں۔ لہٰذا ان کو مہر میں مقرر کرنا جائز ہوگا۔

---

[1] جامع الترمذی: 1113۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے ابن جوزی کہتے ہیں: عاصم بن عبداللہ کے بارے میں ابن معین کہتے ہیں کہ یہ ضعیف راوی ہے جس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ابن حبان فرماتے ہیں: یہ بڑی فاش غلطیاں کر جاتا تھا اس لیے متروک ہے جبکہ ابو حاتم نے اس کو منکر جانا ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 424/9۔ التحقیق: 280/2۔ یہ حدیث: مسند احمد: 445/3 اور سنن ابن ماجہ: 1888 وغیرہ میں بھی ہے۔

مضمونِ حدیث بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث تھوڑی چیز کو بھی مہر مقرر کرنے کے جواز کی دلیل ہے جیسے جوتیوں کا ایک جوڑا۔ کیونکہ اس کو نبی کریم ﷺ نے جائز قرار دیا ہے۔
- اور یہ کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا کسی بات کو برقرار رکھنا قابل استدلال حکم شرعی ہے۔

مہر میں لوہے کی انگوٹھی

1034- وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ ﷺ قَالَ: ((زَوَّجَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا امْرَأَةً بِخَاتَمٍ مِنْ حَدِيْدٍ)).

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے ایک مرد اور عورت کی لوہے کی ایک انگوٹھی پر شادی کی تھی۔ [1]

أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ، وَهُوَ طَرَفٌ مِنَ الْحَدِيْثِ الطَّوِيْلِ الْمُتَقَدِّمِ فِيْ أَوَائِلِ النِّكَاحِ.

اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور یہ "کتاب النکاح" کے اوائل میں گزرنے والی ایک طویل حدیث کا طرف ہے۔

شرح:......اس حدیث پر مفصل کلام اس عورت کے قصہ کے ضمن میں گزر چکا ہے جس نے خود کو نبی کریم ﷺ کو بخش دیا تھا۔ لیکن دونوں روایات میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ: گزشتہ مذکورہ صحیحین کی روایت میں اس بات کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے ان صاحب سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: "(جاؤ اور جا کر کسی چیز کو گھر میں) ڈھونڈو (تاکہ اس کو مہر میں مقرر کر سکو) چاہے لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔" پھر جب ان صاحب کو ایک انگوٹھی بھی نہ ملی تو آپ ﷺ نے ان صاحب کی اس بات پر شادی کر دی تھی کہ انہیں جتنا قرآن زبانی یاد ہے، وہ اسے بیوی کو سکھائیں گے اور یہی اس کا مہر ہوگا۔ تب پھر اگر تو یہ قصہ ایک ہی ہے جیسا کہ امام موصوف کے کلام سے ظاہر ہے تو پھر "زَوَّجَهُ" کا معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے ان صاحب کو اس بات کی اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ ایک لوہے کی انگوٹھی کے مہر پر اس عورت سے شادی کر لیں۔ البتہ عقدِ نکاح تعلیم قرآن پر ہوا تھا۔ کیونکہ انہیں انگوٹھی مہر مقرر کرنے کی اجازت تو ملی تھی پر دینے کو انگوٹھی نہ ملی تھی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث بھی تھوڑی چیز کو مہر مقرر کرنے کے جواز کو بتلاتی ہے چاہے وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔
- معلوم ہوا کہ لوہے کی انگوٹھی پہننا جائز ہے۔ کیونکہ لوہے کی انگوٹھی کو مہر ٹھہرانا اسی لیے تو تھا کہ اس کو پہنا جائے۔
- یہ روایت اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے جس میں لوہے کی انگوٹھی اتار پھینکنے کا ذکر ہے اور وہاں اس کی علت یہ مذکور ہے کہ یہ جہنمیوں کا زیور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے اس حدیث کو قطعی طور پر شاذ قرار دیا ہے جس میں لوہے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت کا ذکر ہے۔ کیونکہ وہ حدیث صحیح اور راجح حدیث کے خلاف ہے۔

دس درہم سے کم مہر نہ ہونے کا حکم

1035- وَعَنْ عَلِيٍّ ﷺ قَالَ: ((لَا يَكُوْنُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: مہر دس درہم

---

[1] یہ حدیث اوّل باب میں گزر چکی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے، دیکھیں: المستدرك للحاكم: 195/2.

الْمَهْرُ أَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ)).
سے کم (مالیت کا) نہ ہوئے۔ ❶

أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْقُوفًا ، وَفِي سَنَدِهِ مَقَالٌ.
اس حدیث کو امام دار قطنی نے موقوف روایت کیا ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے۔

شرح :......اگر چہ یہ حدیث خلیفہ راشد سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے لیکن یہ حدیث سند کے اعتبار سے غیر صحیح ہے۔ کیونکہ اس حدیث کا ایک راوی حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ حضرات محدثین کے نزدیک وضاعین (جعلسازوں) کی حدیث مردود ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ ایک کوڑی برابر بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی بعض علماء نے اس حدیث کو لے کر یہ حکم لگایا ہے کہ مہر دس درہم سے کم نہ ہو، لیکن چونکہ یہ حدیث موضوع اور مردود ہے اس لیے یہ حکم بھی مردود ہوگا۔

مہر کم مقرر کیا جائے

1036- وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رضي الله عنه قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : ((خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ)).
حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”سب سے بہتر مہر وہ ہے جو زیادہ سہولت والا ہو۔“ ❷

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.
اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :...... نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں اس مہر کو سب سے بہتر قرار دیا ہے جو "ایسر" یعنی اَخَفّ ہو۔ کہ جس کا ادا کرنا سہل ہو۔ کیونکہ آسان مہر مقرر کرنے میں نکاحوں کو رواج دینے اور عام کرنے میں اعانت ہوتی ہے۔ کیونکہ مہر جتنے آسان ہوں گے شادیاں کرنا اتنا ہی آسان ہوگا۔ دوسرے تھوڑا اور آسان مہر زوجین کے لیے خوش گوار زندگی گزارنے کا ایک قوی سبب ہے۔ کیونکہ زیادہ اور بھاری مہر زوجین کی زندگی کو مکدر اور تلخ کر دیتا ہے۔

پھر اگر زوجین میں کوئی اختلاف ہو جائے اور نوبت تفریق تک آ جائے تو بھی زوجین کی مفارقت مہر کم ہونے کی صورت میں بطریق احسن سرانجام پاتی ہے۔ ان چند مصالح اور فوائد کے تناظر میں یہ حدیث کس قدر سچی ہے کہ سب سے بہتر مہر وہ ہے جو زیادہ آسان اور ہلکا ہو۔

مطلقہ کو کیا دے کر رخصت کیا جائے

1037، 1038- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَنَّ عَمْرَةَ بِنْتَ الْجَوْنِ تَعَوَّذَتْ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ حِيْنَ
سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: جب عمرہ بنت جون کو نبی کریم ﷺ کے پاس (رخصت کر کے) بھیجا گیا۔ یعنی

❶ امام دار قطنی: (246,245/3) نے اس حدیث کو دو ضعیف طریق سے روایت کیا ہے۔ امام دار قطنی "العلل" (320/8) میں کہتے ہیں: داؤد بن یزید لأ ودی ضعیف ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو روایت کرنے والا یہی ہے۔ آگے فرماتے ہیں: غیاث بن ابراہیم نے یہ بات داؤد الاودی کو تلقین کی تھی، اس نے اس کو لے لیا یوں آگے چل کر غیاث کی داؤد کو یہ وصیت ونصیحت حدیث بن گئی۔ ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: داؤد اودی کی حدیث کچھ بھی نہیں۔ دیکھیں: "التحقيق لابن الجوزی: 282/2".

❷ سنن ابی داؤد: 2117- المستدرك للحاكم: 198/2- امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔ امام عجلونی نے "كشف الخفاء" (466/1) میں اس حدیث کی اسناد کو عمدہ کہا ہے۔

أُدْخِلَتْ عَلَيْهِ تَعْنِي لَمَّا تَزَوَّجَهَا، فَقَالَ: لَقَدْ عُذْتِ بِمَعَاذٍ، فَطَلَّقَهَا)) وَأَمَرَ أُسَامَةَ فَمَتَّعَهَا بِثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ.

جب آپ ﷺ نے اس سے شادی کی۔ تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے (اللہ کی) پناہ مانگی۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تحقیق تو نے ایک پناہ گاہ (یعنی اللہ کی ذات) کی پناہ مانگی ہے۔'' (اور اللہ کی ذات سے پناہ مانگنے والے کو پناہ ملتی ہے)۔ پس آپ ﷺ نے اس عورت کو طلاق دے دی اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس کو تین کپڑوں کا متعہ دے دو۔ [1]

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَفِي إِسْنَادِهِ رَاوٍ مَتْرُوكٌ، وَأَصْلُ الْقِصَّةِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أُسَيْدٍ السَّاعِدِيِّ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد میں ایک متروک راوی ہے اور اس قصہ کی اصل صحیح بخاری میں حضرت ابو اسید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے۔ [2]

غریب الحدیث:...... فَمَتَّعَهَا بِثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ: متعہ کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایک متعہ زواج: یہ حرام ہے جس کا تفصیلی ذکر گزر چکا ہے اور!

(2) دوسرے متعہ مرأۃ: یہ طلاق کے بعد عورت کو دیے جانے والے سامانِ ضرورت کو کہتے ہیں اور اس کا دوسرا نام متعہ طلاق بھی ہے۔ مذکورہ روایت میں متعہ دینے سے یہی متعہ دینا مراد ہے۔

روایۃ الحدیث:...... امام موصوف رحمہ اللہ نے اس مقام پر اس بات کو خود ذکر کیا ہے کہ مذکورہ روایت کا ایک راوی متروک ہے۔ علم مصطلح الحدیث میں متروک راوی اس کو کہتے ہیں جو متہم بالکذب ہو۔ ایسا راوی اسم بامسمّی یعنی متروک ہوتا ہے کہ اس کی روایت کو نہیں لیا جاتا۔

جائے تعجب ہے کہ امام موصوف نے اس حدیث کو ایسے طریق سے روایت کیا جس میں ایک متروک راوی ہے۔ جبکہ اس روایت کو چھوڑ دیا جو صحیح بخاری میں آتی ہے۔ جبکہ امام موصوف نے خود اس روایت کو ''باب الطلاق'' میں ذکر بھی کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی علم کے جس مقام و مرتبہ تک کیوں نہ پہنچ جائے خطا و نسیان کی زد میں رہتا ضرور ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ روایت میں دراصل یہ قصہ بیان کیا گیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے اس عورت کو طلاق دے دی تو اس کو متعہ طلاق دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اگر کوئی آدمی کسی سے اللہ کے نام پر پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دینی چاہیے البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ کسی ایسی بات سے پناہ نہ مانگے جو اس کے ذمہ واجب ہو، جیسے نماز اور زکوۃ وغیرہ۔ لہٰذا اگر کسی نے اللہ کا نام لے کر بھی کسی سے نمازوں سے یا زکوۃ ادا کرنے سے پناہ مانگی تو ایسی پناہ نہ دی جائے گی۔ کیونکہ رب تعالیٰ فرض اور واجب کے تارک کو

---

[1] سنن ابن ماجه: 2037۔ امام بوصیری فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں عبید بن قاسم ہے جس کے بارے میں ابن معین کہتے ہیں کہ: یہ کذاب اور خبیث تھا، صالح بن محمد کہتے ہیں: یہ کذاب تھا جو جھوٹی احادیث بنایا کرتا تھا ابن حبان کہتے ہین: یہ ثقہ راویوں سے موضوع احادیث روایت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہشام بن عروہ سے ایک موضوع نسخہ روایت کیا ہے۔

[2] صحيح البخاري: 5255

پناہ نہ دے گا تو بھلا ہم کس طرح پناہ دے سکتے ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مطلقہ کو متعہ طلاق دیا جائے گا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو یا حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو علی حسب اختلاف الروایات اس بات کا حکم دیا تھا۔

البتہ متعہ طلاق کی دو قسمیں ہیں: (1) ایک واجب (2) اور دوسرا غیر واجب یعنی سنت۔

واجب متعہ وہ ہے جو مہر مقرر نہ کرنے کی صورت میں اور دخول اور خلوتِ صحیحہ سے قبل طلاق دینے کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر تو مہر مقرر کیا ہوا تھا اور دخول نہیں کیا تھا تو اس کو نصف مہر ملے گا اور اگر دخول کر لیا تھا تو پورا مہر ملے گا اور اگر مہر مقرر نہیں تھا اور دخول کر لیا تو مہر مثل ملے گا اور اگر مہر مقرر نہ تھا اور دخول اور خلوت سے قبل طلاق دے دی تو متعہ واجب ہوگا۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَّ مَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ﴾ (البقرة: 236)

''تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو، جب تک تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو، یا ان کے لیے کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو اور انھیں سامان دو، وسعت والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگی والے پر اس کی طاقت کے مطابق ہے۔''

اس آیت میں اسی متعہ واجبہ کا بیان ہے اور متعہ مستحبہ وہ ہے کہ جب طلاق دخول اور خلوت کے بعد ہو تو تب دیا جائے، کیونکہ اب چاہے مہر مقرر تھا یا نہیں، مہر ہی واجب ہوگا گو مقرر کی صورت میں مقرر اور غیر مقرر ہونے کی صورت میں مہر مثل۔ ایسی صورت میں اکثر علماء کے نزدیک متعہ طلاق دینا غیر واجب یعنی مستحب ہے۔

4۔ بَابُ الْوَلِيمَةِ ..... ولیمہ کا بیان

تمہید:.....ولیمہ:..... یہ فعلیہ کے وزن پر ''مفعولۃ'' کے معنی میں ہے اور یہ ''اَوْلَمَ يُوْلِمُ'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جمع اور اکٹھا کرنا ہے۔ اس کی اصل کسی شے پر اکٹھا ہونا ہے لیکن پھر یہ عام معنی شادی کے کھانے پر جمع ہونے کے لیے بولا جانے لگا۔ جو ایک خاص معنی ہے۔ یہ کھانا خاوند کی طرف سے اور کبھی عورت کے اولیاء کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی دونوں کی طرف سے ہوتا ہے۔

ولیمہ کا حکم اور اس کا وقت

1039۔ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى عَلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ أَثَرَ صُفْرَةٍ، فَقَالَ: ((مَا هٰذَا؟)) قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً عَلَى وَزْنِ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ، قَالَ: ((فَبَارَكَ اللّٰهُ لَكَ، أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (ایک دفعہ) نبی کریم ﷺ نے جناب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (کے کپڑوں) پر زرد رنگ کا اثر دیکھا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''(اے عبدالرحمٰن!) یہ (زرد رنگ) کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے گٹھلی کے وزن کے برابر سونے پر ایک عورت سے شادی کر لی ہے۔ (یہ رنگ اس موقع پر لگائی جانے والی خوشبو کا اثر

ہے)۔ اس پر آپ ﷺ نے (دعا دیتے ہوئے) ارشاد فرمایا:
''اللہ تمہیں (اس شادی میں) برکت دے، (اب) ولیمہ کرو چاہو
ایک بکری کا ہی سی۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

معرفة الصحابة :...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرات مہاجرین میں سے تھے۔ ہجرت کے بعد ان کا ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ یہ انصار کی بے پناہ رواداری اور حسن سلوک تھا کہ انہوں نے اپنی بیویاں تک حضرات مہاجرین پر پیش کردی تھیں۔ چنانچہ ان انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی کیا اور اس بات کی پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو یہ اپنی ایک بیوی کو طلاق دے کر ان کے نکاح میں دے دیتے ہیں۔ لیکن جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا اور یہ کہا کہ مجھے تو بازار کا رستہ دکھا دو، غرض حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بازار میں جا کر کاروبار کرنے لگے، رب تعالیٰ نے انہیں بے پناہ برکت سے نوازا حتی کہ وہ سب سے مالدار صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار ہونے لگے تھے۔

غريب الحديث :...... **أَثَرَ صُفْرَةٍ**: حضرت عبدالرحمٰن نے بعد میں شادی کرلی۔ صفرہ سے مراد خوشبو ہے جو زعفران کی طرح زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب شادی کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے خوشبو لگائی تو اس کے رنگ کا اثر باقی رہ گیا جس کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ان سے اس بابت دریافت فرمایا تھا۔

مَا هَذَا: آپ ﷺ کے دریافت فرمانے کا مقصد اس خوشبو اور اس کے اثر کی ماہیت ونوعیت کو معلوم کرنا نہ تھا بلکہ آپ ﷺ کا مقصد اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے احوال کی خبر گیری رکھنا اور ان کی خیر خیریت دریافت کرنا تھا۔ دوسرے آپ ﷺ کا مقصد ان کے شادی کر لینے پر اس امر کی مزید تاکید تھا۔

إِنِّي تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً: حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کی تعیین نہ کی تھی کیونکہ اس کی حاجت نہ تھی۔

عَلَى وَزْنِ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ: نواۃ: یہ کھجور کے اندر موجود گٹھلی کو کہتے ہیں۔ حدیث کے ظاہر سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ یہاں نواۃ سے مراد وہی کھجور کی گٹھلی ہے۔ جبکہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ ''نواۃ'' یہ مثقال وغیرہ کی طرح سونا تولنے کا ایک وزن اور معیار ہے لیکن زیادہ ظاہر پہلا قول ہی ہے کہ یہاں مراد کھجور کی گٹھلی ہی ہے۔

فَبَارَكَ اللّٰهُ لَكَ: نبی کریم ﷺ نے انہیں اس بات کی دعا دی کہ رب تعالیٰ انہیں اس عورت میں برکت دے جس کے ساتھ انہوں نے شادی کی ہے۔

أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ: یعنی ولیمہ کا کھانا دو اور اس کو تیار کر کے لوگوں کو اس پر بلاؤ چاہے ایک بکری کا کھانا ہی تیار کرو ''شَاةٍ'' مراد خاص بکری ہی نہیں بلکہ یہ تھوڑی شے سے کنایہ ہے کیونکہ غنی کے اعتبار سے بکری ایک معمولی اور تھوڑی شے ہے۔ اگرچہ فقیر کے اعتبار سے بکری کا کھانا ''زیادہ'' ہے۔ یعنی ولیمہ کا کھانا ضرور دو چاہے وہ کوئی تھوڑا سا کھانا ہی ہو۔

مضمون حديث :...... مذکورہ حدیث میں ولیمہ کرنے اور اس کا کھانا پکا کر لوگوں کو اس پر بلانے کے حکم کا ذکر ہے۔ اس کی مزید تفصیل ذیل میں آجاتی ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 5155۔ صحيح مسلم: 1427.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ اپنے اصحاب کے احوال کی زبردست خبر گیری فرماتے تھے۔
- دوسرے کے پوچھے بغیر بھی اسے کسی بات سے باخبر کرنا جائز ہے جیسے نبی کریم ﷺ نے پوچھا تو صرف خوشبو کے اثر کے بارے میں تھا لیکن انہوں نے یہ بھی بتلا دیا کہ میں نے شادی میں گٹھلی کے وزن برابر سونا مہر میں دیا ہے۔
- یہ قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ شادی کرنے والا خوشبو لگایا کرتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔
- سونے کو ایسی چیز سے بھی تولنا جائز ہے جس کا وزن مختلف لیکن قریب قریب ہو۔ جیسا کہ یہ امر معلوم ہے کہ ہر گٹھلی کا وزن دوسری سے مختلف ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ سب گٹھلیوں کا وزن قریب قریب ہوتا ہے ان میں زیادہ اختلاف نہیں ہوتا۔
- زوجین کو برکت کی دعا دینا مشروع ہے۔
- کسی مسنون اور مشروع دعا کے بعض پر اقتصار کرنا بھی جائز ہے۔ جیسے: "بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ" کی مذکورہ دعا ہے۔ جبکہ پوری دعا یوں ہے: "بارك الله لكما و بارك عليكما وجمع بينكما فى خير" جس سے معلوم ہوا کہ اس باب میں وسعت ہے۔
- ولیمہ دینا مشروع ہے۔ اس کی دلیل "أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ" کے الفاظ ہیں۔
- ولیمہ دینا بعض کے نزدیک واجب ہے کیونکہ مذکورہ حکم امر کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے اور امر اصل میں وجوب کے لیے ہوتا ہے۔
- شرع شریف نکاح کے اظہار پر از حد حریص ہے۔ اسی لیے سب کو ولیمہ پر بلانے کا حکم بھی ہے تاکہ سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے۔
- ولیمہ کتنا ہو؟ ایک قول یہ ہے کہ غنی کا ولیمہ ایک بکری ہے۔ [1] اس کی دلیل: "وَلَوْ بِشَاةٍ" کے الفاظ ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ یہاں "لَوْ" تکثیر کے لیے ہے لیکن یہ قول محل نظر ہے کیونکہ یہ "لَوْ" کا لغوی معنی نہیں۔ اس بارے راجح قول یہ ہے کہ ولیمہ ہر ایک کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔

دعوتِ ولیمہ قبول کرنے کی شروط

1040۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْوَلِيْمَةِ فَلْيَأْتِهَا)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جب تم میں سے کسی کو ولیمہ پر بلایا جائے تو ولیمہ پر ضرور جائے۔" [2]
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ: ((إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُجِبْ، عُرْسًا كَانَ أَوْ نَحْوَهُ)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو (کھانے پر) بلائے تو وہ (اس کی) دعوت قبول کرے

[1] المبدع: 180/7۔ الفروع: 226/5۔ الانصاف: 316/8۔ [2] صحيح البخاري: 5173۔ صحيح مسلم: 1429۔

چاہے (وہ دعوت) شادی کی ہو یا ایسی ہی کوئی اور دعوت ہو۔

غریب الحدیث:......إِلَى الْوَلِيمَةِ: ولیمہ کا کھانا دخول کے بعد دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی حدیث بتلاتی ہے۔ پس شادی کے دنوں میں جو کھانا بھی پکایا جائے اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔

فَلْيَأْتِهَا: مذکورہ "لام" امر کا ہے یعنی ولیمہ کو ضرور جائے اور پیچھے نہ رہے۔ کیونکہ امر میں اصل وجوب ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ أَخَاهُ: یہاں بھائی سے دینی بھائی مراد ہے۔ تب پھر ذمی اور معاہد کی ولیمہ کی دعوت قبول کرنا واجب نہ ہوگا۔

فَلْيُجِبْ عُرُسًا: عرس زفاف، رخصتی، شادی، ولیمہ کا کھانا اور دعوتِ ولیمہ کو کہتے ہیں۔

أَوْ نَحْوَهُ: مراد وہ موقع ہے جس میں دوسروں کو کھانے پر بلانا مسنون ہو، جیسے عقیقہ کی دعوت اور جن میں دوسروں کو دعوت دینا مسنون نہیں، ان کا قبول کرنا بھی واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

فَلْيَأْتِهَا: بظاہر یہ امر ہے اور اس میں عموم ہے لیکن آگے یہ بات آجائے گی کہ یہ وجوب صرف پہلی مرتبہ کی دعوت میں ہے، دوسری اور تیسری مرتبہ کی دعوت میں نہیں۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ دعوتِ ولیمہ کو قبول کرنا چاہیے۔

دعوت کی اقسام

دعوت کی متعدد اقسام ہیں، لہٰذا ہر ایک کا حکم بھی جدا جدا ہے۔ چنانچہ:

- ......اگر تو کسی حرام کی طرف دعوت دی جائے تو اس کا قبول کرنا بھی حرام ہوگا۔
- ......اگر دعوت کسی مکروہ کی طرف ہو تو اس کا قبول کرنا مکروہ ہوگا۔
- ......اسی طرح مباح کی دعوت کا قبول کرنا مباح۔
- ......واجب کی دعوت کا قبول کرنا واجب اور
- ......مستحب کی دعوت کا قبول کرنا بھی مستحب ہوگا۔

دعوت قبول کرنے کی شروط

دعوت قبول کرنے کی درج ذیل شروط ہیں:

(1) ایک یہ کہ وہ دعوت کسی جائز، مباح، مستحب یا واجب امر کی ہو۔

(2) دوسری یہ کہ دعوت ایسی جگہ پر نہ ہو جہاں منکرات کا ارتکاب کیا جا رہا ہو۔ مگر خود دعوت مباح، جائز، مستحب یا واجب ہی ہو۔ لہٰذا اگر جائز دعوت میں کسی منکر کا ارتکاب کیا جا رہا ہو تو اگر تو اس منکر کا ازالہ کرنا ممکن ہو تو اس دعوت کو قبول کرنا واجب ہوگا، وگرنہ نہیں۔

(3) تیسری یہ کہ دعوت دینے والا مسلمان ہو، لہٰذا ذمی اور معاہد کی دعوت قبول کرنا جائز ہوگا نہ کہ واجب۔

(4) چوتھی یہ کہ دعوت دینے والا بدعتی اور فاسق و فاجر نہ ہو تا کہ اس کی دعوت میں شرکت کسی بدعت کی تائید یا کسی مرد فساد اور

فسق وفجور کی اعانت کا سبب نہ بنے۔

(5) پانچویں یہ کہ وہ دعوت حلال مال سے ہو، پس اگر تو دعوت حرام مال سے ہوئی تو اس کا قبول کرنا واجب نہ ہوگا۔

پھر یا تو وہ حرام مال حرام کمائی سے ہوگا جیسے وہ سودی لین دین کرتا ہو یا شراب وغیرہ صریح حرام چیزوں کا بیوپاری ہو یا رشوت لینے کا عادی ہو، یعنی وہ حرام معاملات کے ذریعے کماتا ہو، تو ایسے شخص کی دعوت قبول کرنا نہ تو واجب ہے اور نہ حرام، البتہ جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک یہودی کی دعوت قبول فرمائی تھی حالانکہ یہود کا رشوت لینا اور سود کا کاروبار کرنا معروف تھا۔ لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اس کی دعوت کو قبول فرمایا۔ یا پھر وہ مال بعینہٖ حرام ہوگا، جیسے چوری کی بکری پکا کر دعوت کرے، یا میخواری کی مجلس جمانے کے لیے بلائے یا جوا کھیلنے کو بلائے تو یہ سب باتیں بعینہٖ حرام ہیں۔ لہٰذا ان باتوں کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔

تب پھر کسی چیز کے بعینہٖ حرام ہونے میں اور حرام معاملہ کی کمائی میں فرق ہوگیا۔ لہٰذا اگر وہ شے بعینہٖ حرام ہوئی تو دعوت قبول کرنا ناجائز ہوگا، اور اگر حرام معاملہ کی کمائی ہوئی تو اس کی دعوت قبول کرنا جائز ہوگا۔ البتہ واجب یا حرام نہ ہوگا۔ بلکہ اگر ایسی کمائی والے کی دعوت قبول نہ کرنے میں کوئی دینی مصلحت ہو جیسے انکار سے آزردہ ہوکر وہ حرام سے توبہ کرنے پر تیار ہو جائے تو ایسے شخص کی دعوت قبول نہ کرنا متعین ہو جائے گا۔

(6) چھٹی شرط یہ ہے کہ وہ دعوت پہلی مرتبہ ہو نہ کہ دوسری یا تیسری مرتبہ ہو۔

پس ظاہریہ کے نزدیک اگر یہ چھ شروط پائی جائیں تو داعی کی دعوت قبول کرنا واجب ہوگا۔ چاہے وہ دعوت ولیمہ کی ہو یا کسی اور موقع کی ہو۔ جبکہ دیگر علماء کے نزدیک ان شروط کے پائے جانے کے وقت صرف ولیمہ کی دعوت قبول کرنا واجب ہے البتہ دیگر دعوتوں کا قبول کرنا مستحب ہے۔

فائدہ:..... اگر کسی دعوت کے قبول کرنے میں کسی قسم کا جانی یا مالی ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو اس دعوت کا قبول کرنا ضروری نہیں۔ چاہے اس دعوت کی اجابت واجب ہی ہو۔ کیونکہ ضرر لاحق ہونے پر واجب ساقط ہو جاتا ہے۔

سب سے برا کھانا

1041- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَأْتِيْهَا، وَيُدْعَى إِلَيْهَا مَنْ يَأْبَاهَا، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سب سے برا کھانا ولیمہ کا کھانا ہے کہ اس کھانے سے اسے روکا جاتا ہے جو اس کو آتا ہے، جب کہ اس کی طرف اسے بلایا جاتا ہے جو اس کھانے پر آنے سے انکار کرتا ہے اور جو (اپنے مسلمان بھائی کی) دعوت کو قبول نہ کرے تو تحقیق اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:..... شَرُّ الطَّعَامِ: یہ مبتدا بھی ہوسکتا ہے اور خبر مقدم بھی ہوسکتا ہے۔

[1] صحیح مسلم: 1432.

طَعَامُ الْوَلِيمَةِ: یہ خبر بھی ہوسکتی ہے اور مبتداء موخر بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جب جملہ اسمیہ کے دونوں جز معرفہ ہوں تو دونوں میں سے ہر ایک کا مبتداء یا خبر بننا جائز ہوتا ہے جیسا کہ اس ترکیب میں دونوں جز معرفہ ہیں۔

يُمْنَعُهَا مَنْ يَأْتِيهَا: مراد فقراء اور نادار لوگ ہیں۔

وَيُدْعَى إِلَيْهَا مَنْ يَأْبَاهَا: مراد اغنیاء ہیں جو ولیمہ جیسی دعوتوں پر آنے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے برا کھانا ولیمہ کا کھانا ہوتا ہے لیکن یہ حکم مطلق نہیں بلکہ مراد وہ ولیمہ ہے جس میں آنے سے حاجت مندوں کو تو روکا جائے مگر غنی اور آسودہ حال لوگوں کو بلایا جائے، جو شریعت میں دوسروں کو کھلانے کے موضوع کے برعکس ہے۔ کہ شریعت میں فقراء مساکین اور حاجت مندوں کو کھلانے پلانے اور ان پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ یوں عموماً ولیمہ جیسی دعوتوں میں شریعت اسلامیہ کے اس مقصود موضوع کے بالکل برعکس رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔

تب پھر جس ولیمہ کو سنت کے مطابق کیا جائے گا وہ سب سے بہتر کھانا کہلائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ جس ولیمہ سے فقراء کو تو آنے سے روکا جائے جبکہ اس پر اغنیاء کو بلایا جائے تو وہ ولیمہ سب سے برا شمار ہوگا۔ تب پھر اگر وہ فقراء شدید حاجت مند ہوئے تو صاحب ولیمہ گنہگار بھی ہوگا وگرنہ نہیں۔
- ◈ دعوتِ ولیمہ قبول کرنا واجب ہے اس کی دلیل "وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُولَهُ" کے الفاظ ہیں۔
- ◈ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا امر بھی اللہ کا ہی امر ہے اس کی دلیل "فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُولَهُ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ دعوتِ ولیمہ کو قبول کرنے کا حکم اللہ نے قرآن میں نہیں دیا بلکہ نبی کریم ﷺ نے دیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم بھی اللہ کا حکم ہے۔
- ◈ احکامِ شرعیہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے ساتھ ملا کر ذکر کرنا جائز ہے۔

روزہ دار پر دعوتِ ولیمہ قبول کرنا لازم نہیں

1042، 1043۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِرًا فَلْيَطْعَمْ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کسی ایک کو دعوت دی جائے تو چاہیے کہ وہ اس کو قبول کرے، پھر اگر وہ روزہ سے ہو تو (ان کے لیے) دعا کر دے، اور اگر اس کا روزہ نہ ہو تو (دعوت کا کھانا) کھا لے۔''[1]

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ أَيْضًا.

اس حدیث کو بھی امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **إِذَا دُعِيَ:** نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں یہ نہیں بیان فرمایا کہ اسے کس چیز کی دعوت دی جائے۔ تب پھر یہاں دعوت سے مطلق دعوت مراد ہوگی۔ چاہے وہ ولیمہ کی دعوت ہو یا غیر ولیمہ کی۔

---

[1] صحيح مسلم: 1431.

فَلْیُجِبْ: یعنی وہ دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرے اور مذکورہ لام امر کا ہے جو وجوب کو بتلاتا ہے۔

فَإِنْ كَانَ صَائِمًا: مراد مدعو کا روزہ سے ہونا ہے۔

فَلْیُصَلِّ: مراد دعا کرنا ہے نہ کہ معروف نماز ادا کرنا ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان الفاظ کو نماز کی بجائے دعا پر کیوں محمول کیا گیا تو اس کا لفظی قرینہ بھی موجود ہے اور معنوی قرینہ بھی موجود ہے۔ لفظی قرینہ سنن ابی داؤد کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: "فَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيَدْعُ" ❶ (پھر اگر وہ روزہ سے ہو تو (ان کے لیے) دعا کر دے)۔ کہ یہ روایت "فَلْیُصَلِّ" کے لفظوں کی "فَلیَدع" کے ساتھ تفسیر بیان کر رہی ہے۔ کہ اس نبوی تفسیر کے بعد کسی اور تفسیر کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

جبکہ معنوی قرینہ یہ ہے کہ شرعی نماز کا اور مدعو کے روزہ دار ہونے کا باہم کوئی تعلق نہیں۔ پھر آپ ﷺ یہ حکم دے بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ آپ ﷺ نے کھانا پیش ہونے کے وقت نماز ادا کرنے سے خود منع فرمایا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "لَا صَلٰوةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ" کھانا حاضر ہو جانے پر کوئی نماز نہیں۔ تب پھر یہاں صلوٰۃ سے مراد "دعا" متعین ہے۔

فَلْیَطْعَمْ: مراد کھانا اور پینا ہے۔ کیونکہ طعم کا اطلاق کھانے پر بھی ہوتا ہے اور پینے پر بھی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ﴾ (البقرة: 249)

''پس جس نے اس میں سے پیا تو وہ مجھ سے نہیں اور جس نے اسے نہ چکھا تو بے شک وہ مجھ سے ہے۔''

اور یہ امر ہے جو وجوب کے لیے ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے اور اس کے فوائد بالتفصیل مذکور ہو چکے ہیں۔ البتہ چند مزید فوائد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

⊙ ...... مذکورہ حدیث میں یہ بیان نہیں کہ روزہ دار ہونے کی صورت میں آدمی داعی کو کیا دعا دے؟ تو وہ اس حال کے مناسب دعا دے۔ جیسے: اللہ تمہیں اور دے، اللہ تمہیں برکت دے وغیرہ۔

⊙ ...... دعوت قبول کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل "فَلْیُجِبْ" کے الفاظ ہیں جن میں عموم ہے اور یہ ولیمہ اور غیر ولیمہ ہر قسم کی دعوت کو شامل ہے۔ لیکن اس بارے صحیح قول غیر ولیمہ کی اجابت کے غیر واجب ہونے کا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا۔

⊙ ...... ولیمہ کی دعوت روزہ دار کو قبول کرنا بھی واجب ہے چاہے وہاں جا کر کچھ کھائے نہیں، ہاں دعا دے دے۔

⊙ ...... اگر روزہ دار دیکھے کہ نہ کھانے میں خرابی ہے تو افضل کھا لینا ہے۔ وگرنہ اپنے روزہ کو باقی رکھنا افضل ہے۔

⊙ ...... غیر صائم کے لیے ولیمہ کی دعوت سے کھانا مشروع ہے اس کی دلیل "فَلْیَطْعَمْ" کے الفاظ ہیں۔

⊙ ...... البتہ یاد رہے کہ ان دونوں احادیث میں ''روزہ'' سے نفلی روزہ مراد ہے۔ وگرنہ واجب روزہ کو کسی حال میں بھی توڑنا جائز نہیں۔

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ نَحْوَهُ، وَقَالَ: ((فَإِنْ شَاءَ طَعِمَ ، وَإِنْ شَاءَ تَرَكَ)) .	اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی ایک حدیث مروی ہے جس میں یہ ارشاد ہے: ''پس اگر وہ چاہے تو کھا لے اور

❶ سنن ابی داؤد: 3737۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما۔ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔

چاہے تو ترک کر دے۔'' ❶

شرح :...... بظاہر اس روایت سے ''صائم'' مراد ہے کہ اگر اسے دعوتِ ولیمہ پر بلایا جائے تو چاہے تو روزہ افطار کر کے وہاں کچھ کھا لے اور چاہے تو دعوت ترک کر دے۔ اگر چہ خود امام موصوف بظاہر یہ حدیث ''غیر روزہ دار'' کے اختیار کو بیان کرنے لائے ہیں تا کہ "فَلْيَطْعَمْ" کے امر کو وجوب سے استحباب کی طرف پھیر سکیں۔

رہا یہ سوال کہ یہاں روزہ دار سے کون سا روزہ دار مراد ہے؟ تو اس سے نفلی روزہ والا مراد ہے جیسا کہ گزشتہ حدیث کے فوائد کے تحت بیان ہوا۔ اب اگر کسی کا نفلی روزہ تھا اور اسے دعوتِ ولیمہ پر بلایا گیا تو اس کے لیے کھانے یا نہ کھانے میں سے افضل کیا ہے؟ تو افضل مصلحت کی رعایت ہے۔ لہٰذا اگر مصلحت نہ کھانے میں ہو تو نہ کھانا افضل ہوگا وگرنہ کھانا افضل ہوگا۔

ولیمہ کتنے دنوں تک کر سکتے ہیں

1044، 1045۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ أَوَّلُ يَوْمٍ حَقٌّ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّانِيْ سُنَّةٌ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّالِثِ سُمْعَةٌ، وَمَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(شادی کے بعد) پہلے دن ولیمہ کا کھانا (دینا) حق (یعنی واجب) ہے اور دوسرے دن کا کھانا سنت ہے اور تیسرے دن کا کھانا (نام ونمود اور) دکھلاوا ہے اور جس نے شہرت کے لیے ولیمہ کیا تو رب تعالیٰ بھی اسے (صرف) شہرت (ہی) دیں گے ❷ (اجر وثواب نہ دیں گے)۔

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ وَرِجَالُهُ رِجَالُ الصَّحِيْحِ، وَلَهُ شَاهِدٌ عَنْ أَنَسٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو غریب کہا ہے، اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں جبکہ سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ ❸

روایة الحدیث :...... سند کے اعتبار سے یہ حدیث محل نظر ہے۔ اگر چہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کے سب رجال کو صحیح کے رجال کہہ دیا ہے لیکن خود امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ❹

ولیمہ کی اقسام

اگر چہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے لیکن حدیث کے صحیح ہونے کی تقدیر پر نبی کریم ﷺ نے ولیمہ کی تین

---

❶ صحیح مسلم: 1430.

❷ جامع الترمذی: 1097۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: زیاد بن عبداللہ البکائی بہت زیادہ منکر اور غریب احادیث روایت کیا کرتا تھا اور امام ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنے قول: ''اس حدیث کے رجال صحیح کے رجال ہیں'' پر خود استدراک کرتے ہوئے "التلخیص" (195/3) میں کہا ہے۔ زیاد ایک مختلف فیہ راوی ہے جبکہ اس کے شیخ عطاء کو اختلاط ہو گیا تھا اور زیاد کا اپنے اس شیخ سے سماع ان کو اختلاط لاحق ہو جانے کے بعد کا ہے۔

❸ سنن ابن ماجہ: 19/5۔ لیکن وہاں یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی سند میں ایک روی عبدالملک بن حسین ہے جو ضعیف ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث "الکامل لابن عدی" (25/2) میں بکر بن خنیس کے ترجمہ کے تحت مذکور ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: یہ نیک آدمی ہے لیکن اس کی حدیث قابل احتجاج نہیں۔

❹ دیکھیں: فتح الباری: 2289/2.

اقسام بیان فرمائی ہیں:

(1) ولیمہ حق یعنی واجب ولیمہ: کیونکہ بظاہر لفظ حق سے وجوب مراد ہے۔ یہ وہ ولیمہ ہے جو دخول کے بعد پہلے دن دیا جاتا ہے۔

(2) سنت ولیمہ: یہ دوسرے دن دی جانے والی دعوت ہے۔ یہ واجب نہیں۔

(3) ریاکاری کا ولیمہ: یہ وہ دعوت ہے جو تیسرے دن بھی دی جائے۔ اگر کوئی یہ دعوت دکھلاوے، شہرت اور ریاکاری کے لیے کرے تو حدیث میں اس پر وعید آئی ہے۔

تب پھر ولیمہ کی دعوت قبول کرنے کا حکم خود ولیمہ کی اقسام کے اعتبار سے ہوگا۔ لہٰذا اگر تو ولیمہ کی دعوت پہلے دن کی ہے تو اس کو قبول کرنا بھی واجب ہوگا اور اگر ولیمہ کی دعوت دوسرے دن کی ہے تو اس کی اجابت بھی مسنون ہوگی اور اگر ولیمہ کی دعوت تیسرے دن کی ہے تو اس میں شرکت بھی مکروہ یا حرام ہوگی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں عبادات اور معاملات میں ریاکاری اور دکھلاوا اختیار کرنے پر تحذیر اور وعید کا بیان ہے۔

نبی کریم ﷺ کی بعض ازواج مطہرات کے ولیموں کا بیان

1046۔ وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: ((أَوْلَمَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى بَعْضِ نِسَائِهِ بِمُدَّيْنِ مِنْ شَعِيرٍ)).

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی ایک زوجہ مطہرہ کا ولیمہ دو مُد جو کے ساتھ دیا۔ [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... بِمُدَّيْنِ: ایک نبوی صاع میں چار مد ہوتے تھے۔ تب پھر دو مد نصف نبوی صاع ہوا (ایک صاع اہل حجاز کے حساب سے ایک سو بیس درہم وزن کے بقدر ہوتا ہے، اور یہ تقریباً چار پونڈ کے برابر وزن ہوتا ہے [2])۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ولیمہ جو سے بھی کم تر چیز کے ساتھ دیا جا سکتا ہے اور نبی کریم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ایک بکری کا ولیمہ دینے کا جو حکم ارشاد فرمایا تھا، وہ زیادہ سے زیادہ کا بیان ہے نہ کہ کم کا، جیسا کہ بعض علماء نے یہ سمجھا ہے۔ یہ قول غیر صحیح ہے۔

◈ ولیمہ دینا مشروع ہے۔ رہا اس کا وجوب، تو مذکورہ روایت میں صرف فعل رسول ﷺ مذکور ہے جو جواز اور استحباب پر دلالت کرتا ہے۔ رہا ولیمہ کا وجوب تو اس کو دیگر روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا ولیمہ

1047۔ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: ((أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ خَيْبَرَ وَالْمَدِينَةِ ثَلَاثَ لَيَالٍ، يُبْنَى عَلَيْهِ بِصَفِيَّةَ، فَدَعَوْتُ الْمُسْلِمِينَ إِلَى وَلِيمَتِهِ،

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (غزوۂ خیبر سے واپسی پر) حضرت رسالت مآب ﷺ نے خیبر اور مدینہ کے درمیان (ایک جگہ پر) تین (دن) رات کے لیے قیام فرمایا: جہاں

[1] صحيح البخاري: 5172.
[2] دیکھیں: القاموس الوحيد: 951۔ (نسیم)

فَمَا كَانَ فِيهَا مِنْ خُبْزٍ وَلَا لَحْمٍ، وَمَا كَانَ فِيهَا إِلَّا أَنْ أَمَرَ بِالْأَنْطَاعِ فَبُسِطَتْ ، فَأُلْقِيَ عَلَيْهَا التَّمْرُ وَالْأَقِطُ وَالسَّمْنُ)).

آپ ﷺ نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ (نکاح کے بعد) بنا فرمائی۔ پھر میں نے مسلمانوں کو آپ ﷺ کے ولیمہ کی دعوت پر بلایا، پس اس دعوت میں نہ روٹی تھی اور نہ گوشت، اس میں جو بھی تھا نبی کریم ﷺ نے (اس کو) دستر خوانوں (پر بچھا دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دستر خوانوں) کے بچھانے کا حکم دیا جو بچھا دیے گئے، پھر ان پر کھجور، پنیر اور گھی کو رکھ دیا گیا۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث :......بَيْنَ خَيْبَرَ: ''يُبْنَى عَلَيْهِ بِصَفِيَّةَ'' خیبر کا اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا قدرے تعارف گزشتہ میں ہو چکا ہے۔

رہا یہ سوال کہ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا تو باندی تھیں تو پھر ان کے ساتھ بنا کا کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں آزاد فرما کر ان کے ساتھ نکاح فرما لیا تھا اور اسی آزادی کو ان کا مہر مقرر فرمایا تھا جیسا کہ یہ روایت اور اس کی مفصل تشریح گزر چکی ہے اور آپ ﷺ کی بنا کے لیے آپ ﷺ کے لیے ایک علیحدہ خیمہ نصب کیا گیا تھا۔

ثَلَاثَ لَيَالٍ: مراد لیل اور یوم دونوں ہیں۔ عرب رات بول کر دن اور رات دونوں مراد لے لیا کرتے ہیں اور اس کی تعیین قرینہ سے ہوتی ہے۔

فَدَعَوْتُ الْمُسْلِمِينَ إِلَى وَلِيمَتِهِ: مراد انہیں طلب کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ بے حد کریم و جواد تھے چنانچہ جنابِ انس رضی اللہ عنہ جس کو بھی ملتے تھے، اسے نبی کریم ﷺ کے ولیمہ میں شریک ہونے کو کہتے تھے۔

فَمَا كَانَ فِيهَا مِنْ خُبْزٍ وَلَا لَحْمٍ: یعنی وہ ایک مختصر سا ولیمہ تھا۔ جس میں روٹی اور گوشت تیار کرنے تک کا تکلف نہ کیا گیا تھا۔

مِنْ خُبْزٍ: اس میں ''مِنْ'' زائدہ ہے اور ''خُبْزٍ'' اور ''لَحْمٍ'' یہ دونوں معطوف علیہ اور معطوف ''كَانَ'' فعل ناقص کے اسم ہیں۔

بِالْأَنْطَاعِ: ''أَنْطَاع: یہ نَطْع کی جمع ہے۔ کھانا رکھنے کے لیے بچھایا جانے والا چرمی دستر خوان۔

فَأُلْقِيَ عَلَيْهَا...... : بظاہر یہ کھجور، پنیر اور گھی دستر خوان پر علیحدہ علیحدہ رکھے گئے تھے اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ ان تینوں چیزوں کو ایک ہنڈیا میں ڈال کر پکایا گیا ہو، پھر اسے دستر خوان پر پیش کیا گیا ہو۔ اب کھجور اور گھی تو معروف ہیں۔ البتہ پنیر یہ دودھ کو سکھا کر بنایا جاتا ہے۔

مضمون حدیث :......گزشتہ روایت میں دو مد جو کے ساتھ ولیمہ کا بیان تھا جبکہ اس روایت میں ان مذکورہ اشیاء کے ساتھ ولیمہ دینے کا بیان ہے۔ تب پھر ولیمہ کیسا ہو؟ اس کا مدار حاضر صورتِ حال پر ہے۔ پس جیسی کسی کی حالت ہوگی، وہ ویسا ہی ولیمہ دے دے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5085۔ صحيح مسلم: 1365.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بیوی کے ساتھ سفر میں بھی دخول کر سکتے ہیں اس کی دلیل نبی ﷺ کا سفر میں سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خلوت فرمانا ہے۔
◈ مناسب یہ ہے کہ اگر زفاف اور بنا سفر میں ہو تو زوجین کے لیے کوئی الگ سے جگہ بنائی جائے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ کی بنا کے لیے آپ ﷺ کے لیے ایک الگ خیمہ نصب فرمایا تھا۔
◈ اگر چند لوگوں کے درمیان زوجین کو الگ جگہ دینی ہے تو سب کے بیچ میں خیمہ لگنا مانع حیاء نہیں۔
◈ دعوتِ ولیمہ میں توکیل جائز ہے جیسا کہ جناب انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی طرف سے لوگوں کو ولیمہ پر بلایا تھا۔
◈ نبی کریم ﷺ کے ولیمے بے حد سہل، اخف اور مختصر ہوتے تھے جن میں تکلیف، گرانی اور تنوع کا نام ونشان تک نہ ہوتا تھا۔
◈ ولیموں میں اسراف اور فضول خرچی غیر مناسب ہے جیسا کہ "فَمَا كَانَ فِيهَا مِنْ خُبْزٍ وَلَا لَحْمٍ" کے الفاظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

دو سے دعوت ملے تو کس کے ہاں جایئے؟؟

1048- وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا اجْتَمَعَ دَاعِيَانِ فَأَجِبْ أَقْرَبَهُمَا بَابًا، فَإِنْ سَبَقَ أَحَدُهُمَا فَأَجِبِ الَّذِيْ سَبَقَ)).

نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، (وہ فرماتے ہیں) کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب دو دعوت دینے والے یکجا ہو جائیں (یعنی جب تم میں سے کسی ایک کو دو آدمی بیک وقت دعوت پر بلائیں) تو اس کی دعوت قبول کرو جس کا دروازہ دونوں میں سے (تمہارے) زیادہ قریب ہو، اور اگر دونوں میں سے ایک پہلے دعوت دے تو اس کی دعوت (پہلے) قبول کرو جس نے سبقت کی ہے۔''[1]

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَسَنَدُهُ ضَعِيْفٌ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ جبکہ اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

غریب الحدیث:......إِذَا اجْتَمَعَ دَاعِيَانِ: مراد یہ ہے کہ جب کسی کو دو آدمی بیک وقت دعوت دیں، تو وہ کیا کرے؟!!

فَأَجِبْ أَقْرَبَهُمَا بَابًا: تو وہ اس کی دعوت کو قبول کرے جس کا دروازہ ان دونوں میں اس کے زیادہ قریب ہو۔ کیونکہ جس کا دروازہ زیادہ قریب ہوگا، وہ زیادہ قریب کا پڑوسی ہوگا اور پڑوسی جتنا قریب ہوتا جاتا ہے، اس کا حق بہ نسبت دوسروں کے بڑھتا جاتا ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3756- مسند احمد: 408/5- اس حدیث کی اسناد میں ابوخالد یزید بن عبدالرحمٰن ہے جو دالانی کے لقب سے معروف ہے۔ ابوحاتم رازی نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی قول ان کے بارے میں ابن معین کا بھی ہے۔ جبکہ ابن حبان کا قول ہے کہ اس سے استدلال جائز نہیں اور ابن عدی نے اس کو نرم راوی کہا ہے البتہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: اس کی حدیث لکھی جاسکتی ہے۔ شریک سے مروی ہے کہ یہ مرجئہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ البتہ "صحیح البخاری" (2259) میں سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث اس روایت کی شاہد ہے۔

فَإِنْ سَبَقَ أَحَدُهُمَا فَأَجِبِ الَّذِي سَبَقَ: کیونکہ اب اس صورت میں پہلے دعوت دینے والا بہ نسبت دوسرے کے اجابت کا زیادہ مستحق بن گیا ہے۔

لطیفہ

بسا اوقات ایک آدمی جوار میں تو قریب ہوتا ہے لیکن اس کا دروازہ دور ہوتا ہے جبکہ کبھی اس کا دروازہ قریب ہوتا۔ یہ مسئلہ متعدد صورتوں پر مبنی ہے۔ اب ایک روایت میں "فَإِنَّ أَقْرَبَهُمَا بَابًا أَقْرَبُهُمَا جِوَارًا" [1] کے الفاظ آتے ہیں اور مذکورہ روایت میں "أَقْرَبُهُمَا بَابًا" کے الفاظ ہیں۔ غرض یہ مسئلہ ایک مستقل تحریر کا متقاضی ہے جس کا یہ محل نہیں۔ [2]

ٹیک لگا کر کھانے کا حکم

1049- وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا آكُلُ مُتَّكِئًا)). رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔'' [3]
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح :...... یہ سہارا لینے کو کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، ہاتھ کا سہارا لینا اور پیٹھ کا سہارا لینا۔ اب ہاتھ کا سہارا یا تو داہنے ہاتھ پر ہوگا یا بائیں پر، اور جس ہاتھ پر بھی سہارا ہوگا، بدن اس طرف کو ایک گونہ جھک جائے گا۔ جبکہ پشت کا سہارا لینے میں بدن کسی جانب مائل نہ ہوگا۔ تب پھر یہ کامل استراحت کی حالت بنے گی اور جی بھر کے اور شکم سیر ہو کر کھایا بھی جائے گا اور شکم سیری کوئی محمود وصف نہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے: ''ابن آدم کو کمر سیدھا کرنے کے لیے چند لقمے کھا لینا کافی ہوتا ہے اور اگر اسے (پیٹ بھرنا) ناگزیر ہی ہے تو (پیٹ کا) ایک تہائی کھانے کو، اور ایک تہائی پینے کو اور ایک تہائی اپنے سانس لینے کو رکھے۔'' [4]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" میں اتکاء کی چوتھی صورت ''تربع'' یعنی چوکڑی مار کر بیٹھنا ذکر کی ہے۔ یہ بھی استراحت کی ایک صورت ہے جس میں زیادہ کھایا جاتا ہے۔ زیادہ کھانا خلاف سنت ہے البتہ بعض صورتوں میں زیادہ کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ ٹیک لگا کر کھانا ناپسند فرمایا کرتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ کیا ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت بایں معنی ہے کہ یہ ممانعت کراہت پر مبنی ہے یا تحریم پر؟ تو میرے نزدیک مذکورہ الفاظ نہی کو مقتضی نہیں۔ لیکن یہ کھانے کے آداب میں سے ہے کہ نبی کریم ﷺ اس طرح کھانے سے اجتناب فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ اگر آپ ﷺ اس کی ممانعت کا ارادہ

---

[1] شیخ رحمہ اللہ نے مذکورہ مسئلہ میں متعدد اقسام کے احتمال کی طرف اشارہ تو فرمایا ہے، پر اسی اشارہ پر اکتفاء کر کے مزید کچھ نوک قلم نہیں فرمایا۔ کاش موصوف رحمہ اللہ کچھ لکھ جاتے......؟؟ (نسیم)

[2] مسند احمد: 408/5، سنن ابی داؤد: 3756

[3] صحیح البخاری: 5398.

[4] مسند احمد: 132/4- جامع الترمذی: 2380- سنن ابن ماجہ: 3349- السنن الکبریٰ للنسائی: 6768- امام موصوف نے "فتح الباری" (528/9) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ یہ حدیث آگے "کتاب الجامع" میں آ رہی ہے۔

فرماتے تو اس کی نہی کو صراحۃً بیان فرماتے۔

◈ اب اگر کوئی کسی ایک ہاتھ سے ٹیک لگا کر کھاتا ہے تو حکماء بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں کھانا کھانے کی نالی سے بسہولت گزر کر معدہ میں نہیں پہنچتا۔

◈ رہا یہ سوال کہ کھانے کی اس ناپسندیدہ حالت میں پینے کا حکم بھی داخل ہے یا نہیں؟ تو ظاہر یہ کے نزدیک اس حکم میں پینا داخل نہیں کیونکہ حدیث میں خاص صرف کھانے کا ذکر ہی آیا ہے اور کھانا یہ پینے سے جدا ایک شے ہے۔ لہٰذا یہ تغایر اور تخصیص ذکر اس بات کو مقتضی ہے کہ ٹیک لگا کر پینا مکروہ اور ناپسندیدہ نہ ہو۔

لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ پینا یہ بھی کھانے کے جیسا ہے بالخصوص جب کسی ایک ہاتھ پر بہت زیادہ سہارا لے کر پیا جائے کہ اس طرح پانی کے سانس کی نالی میں داخل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ کھانے کی طرح پینا بھی سہارا لے کر نہ ہو۔ لیکن یہ قیاس درست نہیں کیونکہ پینا بہرحال کھانے سے زیادہ سہل ہوتا ہے۔

◈ رہا چوکڑی مار کر کھانا کہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس کو اتکاء میں شمار کیا ہے لیکن اکثر فقہاء کے نزدیک یہ اتکاء میں داخل نہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ چوکڑی مارنے والا ٹیک لگانے والا نہیں کیونکہ وہ اپنے بدن کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ لہٰذا وہ اس حدیث کے مصداق میں داخل نہیں نہ لفظ کے اعتبار سے اور نہ لغت کے اعتبار سے، اس لیے چوکڑی مارنے کو متکی کے تحت داخل کرنے میں ہی احتیاط ہے کیونکہ غیر عبادات میں اصل حلت واباحت ہے جب تک کہ اس کے خلاف پر دلیل قائم نہ ہو۔

کھانا کھاتے وقت ''بسم اللّٰہ'' پڑھنا

1050- وَعَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِيْ سَلَمَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ، وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ)).

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک موقع پر انہیں) ارشاد فرمایا: ''اے لڑکے! (پہلے) بسم اللہ پڑھ اور (پھر) اپنے داہنے ہاتھ سے کھا اور اپنے سامنے سے کھا۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

معرفة الصحابة :...... عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ربیب تھے کیونکہ یہ آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کے والد کے وفات پانے اور والدہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے جناب رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آنے کا قصہ معروف ہے اور اسی رسالہ میں کسی جگہ یہ قصہ گزر بھی چکا ہے۔

غريب الحديث :...... **يَا غُلَامُ**: غلام نابالغ لڑکے کو کہتے ہیں جبکہ نابالغ بچی کو "جاریہ" کہا جاتا ہے۔

سَمِّ اللّٰهَ: یعنی "بِسْمِ اللّٰه" پڑھو۔ یہ امر ہے اور اکثر علماء اصول کے نزدیک امر میں اصل اس کا وجوب کے لیے ہونا ہے۔ لیکن بعض علماء اس بات کے بھی قائل ہیں کہ یہاں امر استحباب کے لیے ہے۔

اس بابت ایک اہم قاعدہ ذہن نشین رہے کہ جب امر کا تعلق عبادات سے ہو تو وہ وجوب کے لیے ہوتا ہے اور اگر اس کا تعلق آداب سے ہو تو یہ استحباب کے لیے ہوتا ہے۔ گو اکثر علماء نے مذکورہ امر کو یہاں بھی وجوب کے لیے قرار دے کر اس کو اصح

---

❶ صحيح البخاري: 5376- صحيح مسلم: 2022.

قول کہا ہے لیکن دل کا اطمینان اسی مذکورہ قاعدہ پر ہی ہوتا ہے۔

البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ کھانا بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا جائے تا کہ شیطان کھانے میں شریک نہ ہو سکے اور اگر ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا یاد نہیں رہا تو جب یاد آ جائے اس کو یوں پڑھ لیا جائے۔ "بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ" یا صرف "بِسْمِ اللّٰه" ہی پڑھ لی جائے۔ پھر نبی کریم ﷺ کا اس بچے کو بسم اللہ پڑھنے کی تاکید و تلقین فرمانا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کسی ایک کا بسم اللہ پڑھ لینا یہ سب کی طرف سے کافی نہیں ہو جاتا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تو لامحالہ بسم اللہ پڑھی ہوگی لیکن اس کے باوجود بھی نبی کریم ﷺ نے اس نوجوان کو بسم اللہ پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ پھر تسمیہ میں کیا صرف ''بسم اللہ'' پڑھنے پر ہی اکتفاء کر لینا کافی ہے یا نہیں؟ تو بلاشبہ کافی ہے۔ تب پھر پوری بسم اللہ پڑھنے والے پر انکار کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔

كُلْ بِيَمِينِكَ: یہ امر ہے اور یمین سے مراد داہنا ہاتھ ہے۔ تب پھر کھانا داہنے سے کھانا واجب ہے یا نہیں؟ یہ اختلاف بھی گزشتہ مذکورہ اختلاف کے جیسا ہے۔ لیکن اصح قول اس کے وجوب کا ہے، کیونکہ ایک تو داہنے ہاتھ سے کھانے کا امر ہے، دوسرے بائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے کی ممانعت بھی ہے اور یہ کہ بنا ضرورت کے بائیں ہاتھ سے کھانا اور پینا ناجائز ہے اور اگر کوئی محض کبر، ریاکاری اور غیر قوموں کی نقالی میں بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے تو یہ اور بھی زیادہ بدتر ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے منع فرمانے کے باوجود بھی جب ایک شخص نے محض کبر کے طور پر یہ کہا تھا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا تو نبی کریم ﷺ نے اس پر بددعا کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب تو (کبھی) نہ کھا سکے گا۔ چنانچہ پھر وہ آدمی اپنے داہنے ہاتھ کو اپنے منہ تک کبھی نہ لے جا سکا۔ بلاشبہ اس کا یہ فعل گناہ اور معصیت تھا تبھی تو آپ ﷺ نے اس پر بددعا فرمائی تھی۔

وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ: یعنی اپنے سامنے سے کھانا کھایا جائے نہ کہ دوسرے کے سامنے سے۔ اس امر کا استحباب کے لیے ہونا ظاہر ہے۔ جیسا کہ جمہور علماء کا بھی یہ مسلک ہے۔ البتہ دوسرے کے سامنے سے کھانا اس کے لیے باعث اذیت اور تنگی کا سبب ضرور ہے، الا یہ کہ دوسرے کو اس سے خوشی ہو جیسے خاوند کا بیوی کے سامنے سے یا بیوی کا خاوند کے سامنے سے کھانا۔

البتہ یہ حکم اس وقت ہے جب کھانا ایک ہی ہو اور ایک برتن میں ہو، پس اگر کھانے متعدد اور متنوع ہوں اور یہ متنوع کھانے متعدد جگہوں پر چنے ہوں تو اس صورت میں جو دوسرا کھانا ہمارے سامنے سے دور ہو، اس کو وہاں سے لے کر کھا سکتے ہیں۔ پھر بظاہر ان الفاظ میں عموم ہے۔ لہٰذا یہ امر متعدد لوگوں کے ساتھ مل کر کھانے کے لیے بھی ہے اور اکیلے کھانے والے کے لیے بھی ہے۔ کہ وہ بھی اپنے سامنے سے ہی کھائے کہ یہی افضل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کی تواضع کہ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ بھی کھانا تناول فرما لیا کرتے تھے۔
- مخاطب کی تنبیہ کے لیے اسے حرف ندا کے ساتھ پکار سکتے ہیں چاہے وہ قریب ہی بیٹھا ہو جیسا کہ آپ ﷺ نے سامنے بیٹھے لڑکے سے فرمایا۔ اے لڑکے!
- بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جائے۔
- کھانا بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا جائے۔
- صرف ''بسم اللہ'' کے الفاظ پر بھی اکتفاء جائز ہے۔

- داہنے ہاتھ کے ساتھ کھانا واجب ہے۔
- البتہ عذر کی حالت میں بائیں ہاتھ سے کھا سکتے ہیں۔
- داہنے ہاتھ کی فضیلت۔
- معلوم ہوا کہ دونوں ہاتھوں سے کھانا مناسب نہیں۔ جس کی دلیل "كُلْ بِيَمِينِكَ" کے الفاظ ہیں۔
تب پھر دونوں ہاتھوں سے کھانا غیر مسنون بلکہ خلافِ سنّت ہوگا۔
- البتہ دونوں ہاتھوں سے پینے کا برتن تھام کر پینا اگر تو حاجت کی بنا پر ہے تو بلاشبہ جائز ہے جیسے پینے کا برتن بڑا اور بھاری ہو اور حاجت نہ ہونے کے وقت ایک ہاتھ یعنی داہنے ہاتھ سے ہی پینا اصل ہے۔
- اپنے سامنے سے کھانا واجب ہے البتہ متنوع کھانے ہونے کی صورت میں اپنے سامنے کے علاوہ سے بھی کھا سکتے ہیں۔

تنبیہ:...... یاد رہے کہ ان امور کے مستحب یا واجب ہونے میں جو اختلاف ہے اس بابت قاعدہ ذکر کر دیا گیا ہے۔

کھانے کے آداب

1051- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِقَصْعَةٍ مِنْ ثَرِيْدٍ، فَقَالَ: ((كُلُوْا مِنْ جَوَانِبِهَا، وَلَا تَأْكُلُوْا مِنْ وَسَطِهَا، فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِيْ وَسَطِهَا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے حضور ثرید کا ایک بڑا پیالہ پیش کیا گیا۔ تو آپ ﷺ نے (حاضرین کو اس میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''اس کی اطراف سے کھاؤ اور اس کے بیچ سے نہ کھاؤ، کیونکہ برکت کھانے کے بیچ میں اترتی ہے۔''[1]

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ، وَهٰذَا لَفْظُ النَّسَائِيِّ، وَسَنَدُهُ صَحِيْحٌ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ سنن النسائی کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے۔

غریب الحدیث:...... أُتِيَ بِقَصْعَةٍ: قصعہ: یہ بڑے پیالے کو کہتے ہیں۔

مِنْ ثَرِيدٍ: یہ گوشت کے سالن میں روٹی بھگو کر تیار کیے جانے والے کھانے کو کہا جاتا ہے۔

كُلُوا مِنْ جَوَانِبِهَا: مذکورہ ارشاد دو باتوں کو متضمن ہے: (1) ایک یہ کہ پیالے میں کھانا اور ثرید کھانا مباح ہے۔ (2) اور دوسری یہ کہ برتن کے اطراف وجوانب اور اپنی اپنی طرف کے کنارے سے کھانا چاہیے۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِنْ وَسَطِهَا: مراد کھانے کے اوپر سے اور بیچ سے کھانے کی ممانعت ہے۔

فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِي وَسَطِهَا: بعض علماء نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ بظاہر یہ ممانعت کی علت کا بیان ہے لیکن یہ علت خود مذکورہ حکم کے متناقض ہے کہ جب برکت بیچ میں اترتی ہے تو پھر حصولِ برکت کے لیے بیچ سے کھانا منع کیوں ٹھہرا۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 3772- جامع الترمذی: 1805- السنن الکبریٰ للنسائی: 6762- سنن ابن ماجہ: 3277- مسند احمد: 270/1- امام ابن حبان (5245) اور امام حاکم (129/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ابن حزم "المحلی" (423/7) میں کہتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ، شعبہ اور حماد کا عطاء سے سماع ان کو اختلاط کے لاحق ہونے سے قبل کا ہے۔

تو اس کا جواب بالکل بدیہی ہے کہ اگر اوّل امر میں ہی بیچ سے کھا کر اس جگہ کے کھانے کو ختم کر دیا تو پھر باقی کے کھانے میں برکت کہاں باقی رہے گی۔ اسی لیے اطراف سے کھانے کا حکم اپنے حال پر باقی رہے گا۔

مضمونِ حدیث:...... مذکورہ حدیث میں کھانے کے دو اہم آداب مذکور ہیں:

(1) اگر کھانا ایک برتن میں متعدد لوگوں کے سامنے پیش ہو تو ہر ایک اپنی اپنی طرف سے کھائے۔

(2) دوسرے یہ کہ کھانے کو اس کے بیچ سے کھا کر جلد ختم نہ کر دیا جائے کہ یہ مقام نزولِ برکت کا ہے۔ کہ یوں کھانے میں اتری برکت یا اترنے والی برکت جلد ختم ہو جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ عادتِ شریفہ تھی کہ وہ لوگ خدمت اقدس میں ہدیے پیش کرتے رہتے تھے۔ انہی ہدایا میں سے ایک یہ ثرید کا پیالہ بھی تھا۔

◈ بڑے برتن کی جوانب سے کھانا مشروع ہے بلکہ واجب ہے۔ جس کی دلیل "كُلُوا مِنْ جَوَانِبِهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ البتہ اگر اطراف کا کھانا گرم اور بیچ کا کھانا ٹھنڈا ہو تو بیچ سے بھی کھا سکتے ہیں کہ اب اس کی حاجت ہے۔ تب پھر بیچ سے کھانے کی ممانعت کی علت کہ ''بیچ میں برکت اترتی ہے'' غیر حاجت کی حالت پر محمول ہوگی۔

◈ کھانے کے بیچ میں برکت کے نزول کا تعلق امور غیر معقولہ سے ہے کہ یہ بات صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتی ہے عقل و قیاس اور ظن وتخمین اس کا اندازہ وادراک نہیں کر سکتے۔

◈ معلوم ہوا کہ اگرچہ کھانا اور پینا طبعی اور جبلی امور میں سے ہے لیکن اس کے بھی شریعت نے آداب مقرر فرمائے ہیں تاکہ انسانوں اور محض بہائم میں ایک واضح فرق قائم ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ شریعتِ اسلام نے انسان اشرف المخلوقات قرار دیا ہے اور اسے آداب وسنن سے مزین کر کے سب سے ممتاز اور جدا کر دیا ہے۔

◈ برکت کی تلاش، جستجو، حصول کی کوشش اور اس کے باقی رکھنے کی تدابیر اختیار کرنا وصف ایمان کا مقتضی ہے۔

کھانے میں سے عیب ہرگز نہ نکالا جائے

1052- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((مَا عَابَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَعَامًا قَطُّ، كَانَ إِذَا اشْتَهَى شَيْئًا أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی کھانے کی کمی بیان نہ فرمائی تھی اور جب آپ ﷺ کو کوئی کھانا اچھا لگتا تھا تو اس کو تناول فرما لیتے اور اگر ناپسند ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ [1] (پر اس میں عیب نہ نکالا کرتے تھے)

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... مَا عَابَ: یعنی اس کھانے کا عیب، کمی، اور برائی کے ساتھ ذکر نہ فرمایا کرتے تھے۔ جیسے، اس میں نمک کم ہے، یہ تو کھٹا ہے، آج مرچیں زیادہ ہیں، کیا پھیکا سا سالن ہے۔ ارے چاولوں کا تو بھت بنا دیا ہے۔ دغیرہ

---

[1] صحيح البخاري: 3097- صحيح مسلم: 2973.

وغیرہ۔غرض آپ ﷺ کھانے کا عیب بیان نہ فرمایا کرتے تھے چاہے اس عیب کا تعلق کھانا پکانے سے ہو یا خود کھانے سے ہو۔

طَعَامًا: رہا یہ سوال کہ آیا اس عیب جوئی کا تعلق کھانے بنانے سے ہے یا خود کھانے سے ہے؟ تو جناب رسول اللہ ﷺ کی سیرت تو بے حد بلند تھی۔آپ ﷺ دونوں قسم کی عیب جوئی سے گریز فرمایا کرتے تھے۔البتہ صحیح قول یہ ہے کہ یہاں بظاہر عیب بیانی سے گریز کا تعلق نفس طعام سے ہے۔

لہٰذا اگر کوئی گھر والوں سے یہ کہتا ہے کہ آج تو جلتا سلگتا کھانا ہی سامنے رکھ دیا ہے۔یا کھانے میں بڑی دیر کر دی ہے چائے بڑی کڑوی کر دی ہے وغیرہ وغیرہ کہ ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کا تعلق کھانا پکانے سے اور پکانے والے سے ہے نہ کہ نفس طعام سے ہے۔اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كَانَ إِذَا اشْتَهَى شَيْئًا أَكَلَهُ: چنانچہ وہ جیسی بھی ہوتی تناول فرما لیتے تھے۔

وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ: اور اگر اس کا کھانا پسند نہ ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور نہ کھانے بنانے والے کو کچھ فرماتے اور نہ کھانے کی بابت ہی کچھ فرماتے۔بلاشبہ اس اسوہ مبارکہ میں نفس کی راحت کا بے حد سامان ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں کھانے کے مزید دو آداب مذکور ہیں:

(1) کھانے میں سے کسی قسم کا عیب نہ نکالا جائے۔ (2) اور پسند ہو تو کھا لیجیے وگرنہ بنا کچھ کہے اس کو چھوڑ دیجیے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کھانے میں سے کوئی عیب نہ نکالنا یہ سنت وسیرت نبویہ ہے۔اس کی دلیل "مَا عَابَ طَعَامًا قَطُّ" کے الفاظ ہیں۔
- مناسب یہ ہے کہ آدمی وہ کھائے جس کی اشتہا ہو اور جس کے کھانے کو جی نہ چاہے اس کو زبردستی نہ کھائے۔لہٰذا جس کی اشتہا نہ ہو اس کو ترک کر دے۔چاہے یہ عدمِ اشتہاء شکم سیری کے سبب سے ہو یا چاہے خود کسی خاص کھانے کی جی میں اشتہاء نہ ہونے کے سبب سے ہو۔
- کھانے کی طرف ناپسندیدگی کو منسوب کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ نعمت کی ناقدری اور اس کی بے وقعتی شمار نہیں ہوتی۔

بائیں ہاتھ سے کھانا منع ہے

1053- وَعَنْ جَابِرٍ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((لَا تَأْكُلُوْا بِالشِّمَالِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِالشِّمَالِ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بائیں ہاتھ سے مت کھاؤ، کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... اس امر پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔البتہ چند مزید فوائد ذیل میں رقم کیے جاتے ہیں:

- معلوم ہوا کہ شیطان کا بھی جسم ہے اور وہ کھاتا اور پیتا بھی ہے۔اس کی دلیل "فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ خبیث فطرت، خبیث کاموں کی طرف ہی مائل ہوتا ہے چنانچہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے جو ایک خبیث فعل ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: 2019.

- رہی شیطان کی خوراک تو جس جس چیز پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا، وہ اس کی خوراک ہے۔
- معلوم ہوا کہ شیطان کی مشابہت اختیار کرنا منع ہے تو اس کی طاعت و پیروی تو بدرجہ اولیٰ منع ہوگی۔
- تعلیم نبوی کی حکمت کہ آپ ﷺ حکم کو اس کی علت کے ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے۔
- معلوم ہوا کہ شیطان کے بھی دو ہاتھ ہیں، ایک دایاں اور دوسرا بایاں۔
- شیاطین یہ اجسام ہیں نہ کہ قوتیں یا خیالات جیسا کہ بعض ملحدین کا مذہب ہے۔

پینے کے آداب

1054، 1055۔ وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ ثَلَاثًا)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کوئی پیئے تو وہ برتن میں تین مرتبہ سانس نہ لے۔'' [1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......إِذَا شَرِبَ: یہ ہر قسم کے مائع کو شامل ہے جیسے دودھ، پانی، رس، شیرہ وغیرہ۔
فَلَا يَتَنَفَّسُ: یعنی جب ایک آدمی پانی پیئے تو وہ اپنا سانس اسی برتن میں نہ نکالے جس میں سے وہ پی رہا ہے۔ چاہے یہ سانس لینا برتن کو منہ لگاتے ہوئے ہو، یا بیچ میں، یا بعد میں۔

بیچ میں سانس لینے کی ممانعت اس لیے ہے کہ بسا اوقات پانی سانس کی نالی میں اتر جاتا ہے جو اچھو لگ جانے کا باعث بن جاتا ہے، دوسرے یہ چوپایوں کے پانی پینے کے جیسا ہے اور ابتداء یا انتہا کے وقت سانس لینے سے بسا اوقات منہ کی ریزش گرنے سے پانی گندا ہو جاتا ہے، جو دوسرے کے لیے کراہت کا سبب بن جاتا ہے۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں پانی پینے کا ایک اہم ادب مذکور ہے کہ پانی پیتے وقت برتن میں سانس نہ لیا جائے اور دوسرا یہ کہ پانی پیتے پیتے سانس نہ لیا جائے۔ بلکہ سانس لینا ہو تو برتن سے منہ الگ کر کے اور پینا موقوف کر کے سانس لے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- تین سانس میں پانی پینا مسنون ہے اور ہر دفعہ برتن کو منہ سے ہٹا کر سانس لے۔
- البتہ یہ امر خود مشروب کی حالت کے سپرد بھی ہے۔ لہٰذا اگر مشروب ایسا ہو کہ اسے تین سانس سے زیادہ میں پیا جا سکتا ہو جیسے گرم چائے تو اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پیئے۔ یا جیسے بہت ٹھنڈا شربت کہ جسے تین سانس میں پینا دشوار ہو تو اس کو بھی حسب مقتضائے حال تین سے زیادہ بار پیئے۔
- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ شریعتِ اسلامیہ ایک کامل ترین شریعت ہے جس نے کھانے اور پینے تک کے آداب تعلیم کیے ہیں۔
- پینے کے برتن میں سانس لینا منع ہے۔ البتہ یہ نہی کراہت پر محمول ہے۔ لیکن اگر برتن میں سانس لینا کسی دوسرے کی

---

[1] صحيح البخاري: 5630- صحيح مسلم: 267.

اذیت کا سبب بنے تو یہ نہی تحریم پر محمول ہوگی۔

◈ پیتے وقت اگر سانس لینا ہو تو اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ برتن کو منہ سے ہٹا کر سانس لیا جائے۔

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ﷺ نَحْوُهُ، وَزَادَ: ((وَيَنْفُخُ فِيهِ)).

اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسی ہی ایک حدیث مروی ہے۔ البتہ اس روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: یا اس میں (سانس لے کر) پھونکے۔ [1]

وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح: ......یعنی ایک تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تم میں سے جو پانی پیئے وہ برتن میں سانس نہ لے اور دوسرے یہ فرمایا کہ ''یا اس میں پھونک نہ مارے۔'' جس کی علت گزشتہ میں ذکر کر دی گئی ہے کہ بسا اوقات برتن میں پھونک مارنے سے منہ کی ریزش سانس کے ساتھ نکل کر مشروب میں مل جاتی ہے جو دوسرے کی اذیت و کراہت کا اور گھن کھانے کا سبب بن جاتی ہے۔

البتہ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ حکم ہر قسم کے مشروب کو شامل ہے یا اس حکم سے وہ مشروب مستثنیٰ ہے جس میں پھونک مارنے کی ضرورت ہو، جیسے وہ مشروب گرم ہو، کہ اسے پھونک مارنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے لیکن ہم پھر بھی یہی کہیں گے کہ اگر تو پھونک مارنے کے بعد مشروب کے گندا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھونک نہ ہی مارے چاہے وہ مشروب معتدل ہو یا گرم۔

رہا ماں کا بچہ کے لیے لقمہ یا کسی مشروب کو پھونک مار کر اسے ٹھنڈا کرنا، تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ حاجت کی بنا پر ہے۔ البتہ اگر ماں کو معلوم ہو کہ وہ ایک متعدی مرض میں مبتلا ہے اور اس بات کا خدشہ ہے کہ سانس کے رستے اس مرض کے جراثیم بچے کے کھانے میں شامل ہو سکتے ہیں تو اس کے لیے ایسا کرنے سے بچنا اولیٰ ہے۔

5۔ بَابُ الْقَسْمِ بَيْنَ الزَّوْجَاتِ

ایک سے زائد بیویوں کے درمیان شب باشی کی اور زمانہ کی باریاں مقرر کرنے کا بیان

تمہید:......**اَلْقَسْمُ**:......اس کا معنی اصل میں کسی شے کی قسمیں بنانا ہے۔ البتہ یہاں اس باب سے مراد ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان زمانہ کی تقسیم کرنا ہے۔ جیسے ہر ایک کے لیے ایک ایک دن یا دو دو دن مقرر کرنا۔ یہ زمانہ باہمی اتفاق سے طے ہوگا، البتہ اس زمانہ کی مدت سب کے لیے مساوی ہوگی۔

نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات میں تقسیم میں عدل فرمانا

1056۔ عَنْ عَائِشَةَ ﷺ قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْسِمُ بَيْنَ نِسَائِهِ، فَيَعْدِلُ، وَيَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا أَمْلِكُ، فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: نبی کریم ﷺ (اپنی ازواجِ مطہرات میں زمانہ کی مساوی) تقسیم فرمایا کرتے تھے اور عدل فرمایا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ! یہ میری اس چیز میں تقسیم ہے جس پر میرا اختیار ہے، پس تو مجھے اس امر میں ملامت نہ کرنا جو تیرے اختیار

[1] سنن ابی داؤد: 3828۔ جامع الترمذی: 1888۔ مسند احمد: 220/1.

میں ہے، اور میرے اختیار میں نہیں۔'' ❶

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ ، وَلٰكِنْ رَجَّحَ التِّرْمِذِيُّ إِرْسَالَهُ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔

بیویوں میں باریوں اور وقت کی تقسیم کا حکم

شرح:...... **كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقْسِمُ**: نبی کریم ﷺ نے اپنی سب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے باریاں مقرر فرما رکھی تھیں، وہ یوں کہ سب کے پاس ایک ایک دن کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ یہ باری مساوی تھی جس میں چھوٹی بڑی اور بیوہ اور کنواری سب برابر تھیں۔

فَيَعْدِلُ: یعنی آپ ﷺ اس تقسیم میں عدل فرمایا کرتے تھے اور کسی ایک کی طرف اپنے ظاہری رویے اور سلوک میں زیادہ مائل نہ ہوا کرتے تھے بلکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک فرمایا کرتے تھے اور کسی ایک کی طرف ظاہری میلان زیادہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن آپ ﷺ کے اس بے پناہ عدل فرمانے کے باوجود آپ ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي......: یعنی اے اللہ! اس عدل و مساوات کے باوجود جو بات میرے بس میں نہیں اور وہ تیرے اختیار میں ہے اس پر مجھے عتاب وعقاب نہ فرمانا۔ یعنی ظاہری باریاں مقرر کرنا اور ظاہری رویہ میں عدل سے کام لینا، کہ اس بات پر سب کو اختیار ہوتا ہے۔ رہا وہ امر جس پر کسی کو اختیار اور بس نہیں ہوتا تو وہ دل کی محبت ہے۔ جو صرف اور صرف رب تعالیٰ کے اختیار میں ہوتی ہے۔ پس یہ محبت ہی ہے کہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان عدل اور مساوات کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں بھی یہ بات معروف تھی کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کو قلبی محبت سب سے زیادہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہے حتیٰ کہ جب آپ ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کو مردوں میں سے سب سے زیادہ محبت کس سے ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر سے۔'' عرض کیا گیا کہ: (اور) عورتوں سے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عائشہ سے۔'' ❷ پس سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی سب سے محبوب زوجہ مطہرہؓ تھیں اور یہ بات سب کے ہاں معروف تھی۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

محبت کے اسباب

ذیل میں اس مضمون کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ محبت کے اسباب یہ ہیں:

- ......باہم سلام پھیلانا۔
- ......ایک دوسرے کو ہدیے تحفے دینا۔
- ......ایک دوسرے کے ساتھ جان، مال اور جاہ و منصب کے ذریعے احسان کرنا۔
- ......ایک دوسرے سے ملتے رہنا۔
- ......بیمار ہو جانے پر مریض کی عیادت کرنا۔

---

❶ صحيح البخاري: 3662۔ صحيح مسلم: 2384.　❷ سنن ابي داود: 2134، سنن النسائي: 63/3، جامع الترمذي: 114، سنن ابن ماجه: 1971، صحيح ابن حبان: 4205، المستدرك للحاكم: 204/2

لیکن اس سب کے باوجود دوسرے کے دل میں محبت ڈالنا یہ محض رب تعالیٰ کے قبضہ وقدرت اور اختیار میں ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ایک آدمی محبت پیدا کرنے کے یہ جملہ اسباب اختیار کرتا ہے لیکن رب تعالیٰ دوسرے کے دل میں محبت پیدا نہیں فرماتے۔

بیوی سے محبت کا حکم

اس مسئلہ میں جبر نہیں۔ رہا یہ سوال کہ محبت کے نتیجہ میں جماع کے جذبہ میں بھی برابری کرنا کیا واجب ہے یا نہیں۔ [1] تو علماء کا اس بارے یہ قول ہے کہ یہ واجب نہیں۔ کیونکہ جماع قلبی محبت کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ایک بیوی سے زیادہ محبت ہوگی تو اس سے جماع کرنے کی رغبت بھی دوسری سے زیادہ ہوگی۔ پس جماع میں عدل کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ یہ محبت کے تابع ہوتا ہے اور محبت جبر اور زبردستی نہیں کرائی جاسکتی البتہ کسی بیوی سے جانتے بوجھتے اور طبعی رغبت کی بنا پر جماع کو بالکل ترک کر دینا حرام ہے۔ کیونکہ جماع بہرحال عورت کا حق ہے اور ترکِ جماع میں اس کی حق تلفی ہے اور یہ مسئلہ اس حدیث کے معارض نہیں کہ ''مجھے اس پر ملامت نہ کیجیو جو تیرے اختیار میں ہے اور میرے میں نہیں۔'' کیونکہ بیوی سے جماع کرنا بہرحال خاوند کے بس میں ہے۔ لہٰذا کسی بیوی سے ترک جماع جائز نہ ہوگا۔

یہی قول صحیح ہے جسے امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں رقم کیا ہے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ باریوں میں سب بیویوں میں عدل کیا جائے۔ البتہ کسی ایک بیوی کی طرف قلبی میلان کا زیادہ ہونا عدل کے خلاف نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کا حسن اخلاق کہ آپ ﷺ نے سب ازواجِ مطہرات میں باریاں بھی مقرر فرما رکھی تھیں اور آپ ﷺ ان میں عدل بھی فرماتے تھے۔
- میاں بیوی کے درمیان باہمی رشتہ میں تب ہی دوام آتا ہے جب وہ رشتہ عدل ومساوات پر مبنی ہو۔ کیونکہ بیویوں میں ظلم وستم اور جور وجفا کو روا رکھنا دلوں کی کدورت اور دوری کو جنم دیتا ہے۔
- ایک سے زیادہ بیویوں میں زمانہ کی تقسیم میں عدل واجب ہے۔
- کیا نبی کریم ﷺ پر بھی زمانہ کی یہ مساوی تقسیم اور ظاہری عدل واجب تھا یا نہیں تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ [2] تو اس بارے اصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بھی اس خطاب کے عموم میں داخل ہیں۔

جبکہ ایک قول عدل کے غیر واجب ہونے کا بھی ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ﴾ (الاحزاب: 51)

''ان میں سے جسے تو چاہے مؤخر کر دے اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے دے اور تو جسے بھی طلب کر لے، ان

---

[1] امام شربینی کہتے ہیں: جماع کا تعلق طبیعت کے نشاط اور شہوت سے ہے اور شہوت کا ہر وقت آنا ضروری نہیں۔ دیکھیں: مغنی المحتاج: 251/3.

[2] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کتاب وسنت کے زیادہ قریب اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان باریوں میں عدل کرنا اور سب کے نفقہ وسکنیٰ میں مساوات کرنا آپ ﷺ پر بھی واجب تھا۔

عورتوں میں سے جنھیں تو نے الگ کر دیا ہو تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔''

اس آیت میں رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اختیار دیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ اگرچہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اس بابت اختیار عنایت فرمایا تھا لیکن آپ ﷺ نے زیادہ کامل صورت کو اختیار فرمایا تھا۔

- جو بات آدمی کے بس میں نہ ہو اس پر اسے ملامت کرنا روا نہیں۔ اس کی دلیل "فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ" کے الفاظ ہیں۔
- کسی انسان سے حکم دے کر محبت نہیں کرائی جا سکتی۔
- جس غیر عدل امر کا منشا محبت ہو اس پر آدمی کو ملامت نہ کی جائے گی۔

دو میں سے ایک بیوی کی طرف زیادہ مائل ہونا حرام ہے

1057۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ إِلَى إِحْدَاهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ مَائِلٌ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ دوسری کو چھوڑ کر ان میں سے ایک طرف (زیادہ) مائل ہو گیا تو وہ روزِ قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو جھکا ہو گا۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَسَنَدُهُ صَحِيحٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور اس روایت کی سند صحیح ہے۔

غریب الحدیث:......**مَنْ**: یہ شرطیہ ہے۔ اس لیے مابعد کا جملہ شرطیہ ہے۔

كَانَتْ: یہ جملہ شرطیہ ہے۔ **جَاءَ**: یہ جوابِ شرط ہے۔ **يَوْمَ الْقِيَامَةِ**: یہ ظرفِ زمان ہے۔

وَشِقُّهُ مَائِلٌ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "جَاءَ" فعل کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ **امْرَأَتَانِ**: مراد دو بیویاں ہیں۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دو بیویوں میں سے ایک کی طرف زیادہ مائل ہونے کی تحذیر ہے۔ تب پھر یہاں میلان سے وہ میلان مراد ہے جو قابل ملامت ہو اور وہ میلان مراد نہیں جو آدمی کے بس میں ہی نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- دو بیویوں میں سے ایک کی طرف ایسا میلان کرنا منع جو قابل ملامت ہو، جیسے کسی ایک سے جماع کو یا بوس و کنار کو بالکلیہ ترک کر دینا کہ ایسا میلان حرام ہے۔
- بیویوں میں عدل واجب ہے۔ کیونکہ عدل کے ترک پر وعید آئی ہے اور جس فعل کے ترک پر وعید ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ تب پھر بیویوں میں عدل نہ کرنا کبائر میں سے ہو گا۔

---

❶ مسند احمد: 295/2۔ سنن ابی داؤد: 2133۔ جامع الترمذی: 1141۔ سنن النسائی: 63/7۔ سنن ابن ماجہ: 1969۔ المنتقی لابن جارود: 722۔ امام ابن حبان (4207) اور امام حاکم (203/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے اور صاحب "الاقتراح" نے اس کی متابعت کی ہے۔ جیسا کہ "تحفة المحتاج: 390/2" میں ہے، ابن حزم "المحلی" (41/10) میں کہتے ہیں۔ یہ خبر ثابت ہے۔

◈ جیسا عمل ہوگا جزاء بھی اسی کی جنس سے ملے گی۔ چنانچہ یہ شخص ایک بیوی کی طرف ناجائز طریق سے زیادہ جھکا تھا تو روزِ قیامت اس کو سزا بھی ویسی ہی ملے گی کہ اس کا ایک پہلو جھکا ہوگا۔

بیویوں میں عدل کیونکر ہو؟

علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ واجب میں عدل واجب ہے البتہ مستحب اور مباح میں غیر واجب ہے اور ایک قول یہ ہے کہ واجب، مستحب اور مباح تینوں قسم کے امور میں عدل واجب ہے۔ جیسے نفقہ اور سکنی دینا واجب ہے لہٰذا اس میں عدل بھی واجب ہوگا۔ لیکن واجب نفقہ سے زائد دینے میں عدل واجب ہوگا یا نہیں تو یہ مذکورہ بالا اختلاف کے مطابق ہوگا۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ زائد از واجب میں عدل واجب نہیں۔ البتہ بلانے، مخاطب کرنے اور بات کرنے میں عدل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ جائز نہ ہوگا کہ ایک کو تو پیار سے پکارے جبکہ دوسری کو درشتی سے بلائے۔

شادی کے وقت کنواری اور شوہر دیدہ میں تقسیم میں فرق کرنے کا بیان

1058- وَعَنْ أَنَسٍ ﷺ قَالَ: ((مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعًا، ثُمَّ قَسَمَ، وَإِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا، ثُمَّ قَسَمَ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: یہ بات سنت میں سے ہے کہ جب آدمی کسی شوہر دیدہ پر کسی کنواری کو بیاہ لائے تو کنواری کے ساتھ سات دن تک رہے، پھر (پھر دونوں میں ایک دستور کے مطابق دنوں کی باریاں) تقسیم کرے، اور جب کسی شوہر دیدہ کو بیاہ لائے تو اس کے پاس تین دن تک قیام کرے پھر (دونوں میں معروف طریق سے باریاں) تقسیم کرے۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث :......مِنَ السُّنَّةِ: جب ایسی بات ایک صحابی رسول کہے تو مراد نبی کریم ﷺ کی سنت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک صحابی یہ الفاظ کسی حکم پر استدلال کرنے کے موقع پر ہی ذکر کرتا ہے اور احکام میں قول رسول اور فعل رسول ہی تو دلیل ہوتا ہے اور جب یہ الفاظ ایک تابعی کہے تو اس بارے علماء کے دو اقوال ہیں:

(1) ایک قول یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی صحابی کے قول کی طرح حکماً مرفوع ہیں۔ تب پھر یہ حدیث سند سے ایک صحابی کا نام ساقط ہونے کی وجہ سے مرسل ہوگی۔

(2) اور دوسرا قول یہ ہے کہ تابعی کے ان کلمات سے مراد حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت ہوتی ہے۔ تب پھر یہ روایت موقوف ہوگی۔

رہا یہ سوال کہ پھر تابعی کا یہ قول حجت ہوگا یا نہیں؟ تو اگر تو یہ قول رفع کے حکم میں ہوگا تو سند کے متصل نہ ہونے کی وجہ سے غیر حجت ہوگا اور اگر یہ قول موقوف ہو تو پھر اس بارے وہ اختلاف ہے جو ایک صحابی کے قول کے حجت ہونے کی بابت ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک قول صحابی حجت ہے۔

رہی مذکورہ روایت اور اس میں ''مِنَ السُّنَّةِ'' کے کلمات کا حکم؟ تو یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور ابوقلابہ راوی کے

---

❶ صحيح البخاري: 5214- صحيح مسلم: 1461.

بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسے صریح رفع کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور سنت سے یہاں مراد ''طریق'' ہے نہ کہ وہ سنت جو علماء اصول کے نزدیک واجب کے بالمقابل ہوتی ہے۔ تب پھر صحابی کا قول ''مِنَ السُّنَّةِ'' یہ واجب ومستحب دونوں کو شامل ہوگا۔

إِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ.....: اگر کسی نے اپنی شوہر دیدہ بیوی کے ہوتے ہوئے کسی کنواری سے نکاح کیا تو پہلے اس کے ساتھ سات دن اور رات گزارے گا، پھر دونوں میں باریاں مقرر کرے گا۔ لیکن اگر کنواری پر کنواری کو بیاہا، جیسے نکاح کے بعد ابھی اس کے ساتھ جماع کی نوبت نہ آئی تھی کہ اس پر دوسری کنواری کے ساتھ بیاہ کر لیا، تو دونوں کا حکم ایک ہے۔

رہا یہ سوال کہ نبی کریم ﷺ نے کنواری اور شوہر دیدہ میں فرق کیوں کیا؟ تو اس کی دو وجوہات ہیں:

(1) ایک وجہ یہ ہے کہ آدمی کی بہ نسبت شوہر دیدہ کے کنواری کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے کنواری سے زیادہ متمتع ہونے کے لیے اس کے ساتھ رہنے کی زیادہ مہلت مرحمت فرمائی ہے۔

(2) دوسرے اس میں کنواری کے ساتھ زیادہ شفقت ہے۔ کیونکہ ابھی تک اس کی طبیعت سے اجنبی مرد کی وحشت اور خجالت رفع نہیں ہوئی ہوتی اور اسے خاوند کے ساتھ مانوس ہونے میں دیر لگتی ہے۔

وَإِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا: ثیب شوہر دیدہ کو کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ نکاح میں اس کا حق تین راتیں ہے بعد میں معروف کے مطابق باریوں کی تقسیم ہوگی اور اگر کسی نے دو کنواریوں کے ساتھ ایک شوہر دیدہ پر نکاح کیا تو ہر ایک کو سات سات راتیں ملیں گی اور اگر دونوں کنواریوں سے اکٹھا نکاح کیا تھا تو دونوں میں پہلے باری کے لیے قرعہ ڈالا جائے گا۔ پھر دستور کے مطابق کنواریوں اور شوہر دیدہ میں باریاں تقسیم ہوں گی۔

''ثَلَاثًا'' اور اسی طرح ''سَبْعًا'' کا کلمہ یہ ''لیالی'' کے اعتبار سے ہے۔ تب پھر بیویوں کی باری کی تقسیم میں عمدہ رات ہے۔ البتہ اگر کسی کی نوکری اور ملازمت ہی رات کو ہو تو اس کے حق میں باری کی تقسیم میں عمدہ دن ہے۔

مضمون حدیث:..... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی ایک یا دو یا تین بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک اور شادی کرتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اگر تو وہ کنواری ہے تو اس کا حق سات دن ہے اور اگر وہ شوہر دیدہ جیسے مطلقہ یا بیوہ ہے تو اس کا حق تین رات ہے۔ پھر سب بیویوں میں دن اور رات کی مساوی تقسیم واجب ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ تقسیم استمراری کی طرح جو ایک دن اور ایک رات ہوتی ہے، تقسیم ابتدائی بھی واجب ہوتی ہے۔ اس کی دلیل ''مِنَ السُّنَّةِ......'' الی آخرہ۔ کے الفاظ ہیں۔
- اگر ''مِنَ السُّنَّةِ'' کے الفاظ ایک صحابی رضی اللہ عنہ روایت کرے تو یہ واجب اور مستحب دونوں کو شامل ہوتے ہیں۔
- کنواری اور شوہر دیدہ میں فرق ہے جو بالکل ظاہر ہے۔
- صفات کا حکم میں اثر ہوتا ہے، وہ یوں کہ ہر ایک کو اس کے مرتبہ پر اتارا جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کنواری اور شوہر دیدہ میں فرق کیا ہے اور یہ صفات اور مراتب کا فرق ہے جس کا حکم میں اثر ہے۔
- کنواری کے لیے سات دن اس لیے ہیں کہ اس سے زیادہ مدت میں دوسری بیویوں کی حق تلفی، اور ان کے ساتھ جفا ہے۔ جبکہ اس سے کم مدت میں کنواری کے ساتھ کمال عشرت حاصل نہیں ہو پاتا۔

◈ کسی کی صفت کو ملحوظ رکھ کر اس کے ساتھ رویہ اختیار کرنا یہ دوسروں کے حق میں ظلم وجور اور ناانصافی نہیں۔

1059۔ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ ؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا تَزَوَّجَهَا أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا، وَقَالَ: ((إِنَّهُ لَيْسَ بِكِ عَلَى أَهْلِكِ هَوَانٌ ، إِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ وَإِنْ سَبَّعْتُ لَكِ سَبَّعْتُ لِنِسَائِي)).

سیدہ ام سلمہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب ان کے ساتھ نکاح فرمایا تو ان کے پاس تین دن گزارے اور فرمایا: ’’بے شک تم اپنے اہل پر بے وقعت نہیں ہو، اگر تم چاہو تو میں تیرے لیے سات دن کر دیتا ہوں اور اگر میں نے تمہارے لیے سات دن کیے تو اپنی (دوسری) ازواج کے لیے بھی سات دن کروں گا۔‘‘ [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......**لَمَّا تَزَوَّجَهَا**: سیدہ ام سلمہ ؓ بھی نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے کے وقت شوہر دیدہ تھیں۔ یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ کی جملہ ازواجِ مطہرات شوہر دیدہ تھیں سوائے سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ کے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنے نکاح کے وقت سیدہ صدیقہ ؓ کنواری تھیں۔

أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا: کیونکہ سیدہ ام سلمہ ؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکاح کے وقت شوہر دیدہ تھیں اور شوہر دیدہ کے لیے ابتدائی تقسیم کے ایام تین دن رات ہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے سیدہ ام سلمہ ؓ کے ساتھ نکاح فرمانے کے بعد ان کے پاس تین دن رات تک قیام فرمایا۔

إِنَّهُ لَيْسَ بِكِ عَلَى أَهْلِكِ هَوَانٌ: ”عَلَى أَهْلِكِ“ سے مراد خود حضرت رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

هَـــوَانٌ: یہ بے وقعت شے کو کہتے ہیں۔ یعنی تم ہمارے نزدیک بے وقعت نہیں ہو بلکہ بڑی ذی وقار اور عزت وکرامت والی ہو۔ لہٰذا اگر ہم تین دن کے بعد آپ کے اور دیگر ازواج کے درمیان باریاں مقرر کرتے ہیں تو اس کا سبب آپ کا ہمارے نزدیک بے وقعت ہونا نہیں ہوگا بلکہ یہ باریاں مقرر کرنا شریعت کا حق ہے۔ پھر آگے ارشاد فرمایا:

إِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ، وَإِنْ سَبَّعْتُ لَكِ سَبَّعْتُ لِنِسَائِي: یعنی اگر میں تمہارے سات دن کروں گا تو دیگر ازواج کے لیے بھی سات سات دن مقرر کروں گا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں ایک مضمون زائد مذکور ہے، وہ یہ کہ شوہر دیدہ کو اختیار ہے کہ خاوند اس کے ساتھ تین دن تک رہے، پھر دیگر ازواج کے ساتھ اس کی باری مقرر ہو جائے اور اگر وہ چاہے تو اس کے لیے سات دن مقرر کر دیے جائیں۔ تب پھر دیگر ازواج کے لیے بھی سات سات مقرر ہوں گے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کا حسن اخلاق کہ آپ ﷺ نے سیدہ ام سلمہ ؓ سے تین دن کے بعد باریاں مقرر ہو جانے کا عذر پیش فرمایا۔ تب پھر ہم پر لازم ہے کہ اگر ہمارے اقارب اور خویش وتبار میں سے کوئی امر شریعت پر خوش نہ ہو تو اس سے عذر کر دیا جائے۔

◈ معلوم ہوا کہ امر واجب میں کسی کی جانبداری نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: 1460.

- لفظ اہل کا اطلاق جہاں زوجہ پر ہوتا ہے، وہیں زوج پر بھی ہوتا ہے۔
- اگر شوہر دیدہ اپنے لیے تقسیم ابتدائی میں سات دن کا چناؤ کرتی ہے تو پھر خاوند دیگر ازواج کے پاس بھی سات سات دن گزارے گا۔ لہٰذا فرض کیا کہ اگر کسی کی تین بیویاں پہلے سے تھیں اور چوتھی شوہر دیدہ نے نکاح کے بعد ابتدائی تقسیم میں سات دن اختیار کیے تو خاوند اس کے پاس اکیس دن کے بعد آیا کرے گا۔

البتہ یہ تخییر واجب نہیں بلکہ اس کا مرجع ومنشا خاوند کا ارادہ ہے۔ چنانچہ شوہر چاہے گا تو شوہر دیدہ بیوی کو ابتدائی تقسیم میں سات دن کے قیام کا اختیار دے گا، اور چاہے گا تو نہیں دے گا۔

- آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسرے کو امر واقع سے باخبر کر دے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو باخبر فرما دیا کہ اگر وہ سات دن اختیار کریں گے تو دیگر ازواج کو بھی سات سات دن کا قیام ملا کرے گا۔

ایک بیوی کو حق ہے کہ وہ دوسری کی خاطر اپنی باری چھوڑ دے

1060۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا ((أَنَّ سَوْدَةَ بِنْتَ زَمْعَةَ وَهَبَتْ يَوْمَهَا لِعَائِشَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْسِمُ لِعَائِشَةَ يَوْمَهَا وَيَوْمَ سَوْدَةَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا نے اپنا دن سیدہ صدیقہ کو (یعنی انہیں) ہبہ کر دیا تھا۔ یوں نبی کریم ﷺ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کی باری کا دن بھی اور سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باری کا دن بھی گزارتے تھے۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

معرفة الصحابة: ......سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا ازواجِ مطہرات میں سب سے زیادہ کبیر السن تھیں اور ایک قول یہ ہے کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد نبی کریم ﷺ نے پہلا نکاح انہیں سے فرمایا تھا۔ یوں سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی دوسری زوجہ مطہرہ تھیں۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد آپ ﷺ نے دوسرا نکاح سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا البتہ ان کے ساتھ رخصتی مدینہ منورہ ہجرت فرما جانے کے بعد کی تھی۔

غرض سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی دوسری بیوی تھیں لیکن چونکہ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کبیر السن تھیں، اس لیے انہوں نے خوب سوچ بچار کے بعد اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا اور یوں اپنی بے پناہ راسخ اور صحیح وصواب عقل اور ذہانت وذکاوت کا ثبوت دیا۔ وہ یوں کہ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کا دن نبی کریم ﷺ کی سب سے محبوب بیوی کو ہبہ کیا۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس پر سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے بات کی کہ اے اللہ کے رسول! میں آپ ﷺ کی ازواج میں شمار ہو کر رہنا چاہتی ہوں البتہ میں اپنی باری کا دن عائشہ کو ہبہ کرتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کی اس پیش کش کو قبول فرما لیا۔

مضمون حدیث: ......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون مذکور ہے کہ ایک بیوی کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی باری کا دن دوسری کو ہبہ کر دے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5212۔ صحيح مسلم: 1463.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عورت اپنی باری کے حق سے دست بردار ہوسکتی ہے اور اپنا یہ حق کسی متعین سوکن کو دے سکتی ہے۔ جیسا کہ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو برقرار رکھا۔ کیونکہ اگر یہ بات ناجائز ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کبھی باقی نہ رکھتے۔
- ہبہ کے لفظ سے بھی ابراء (یعنی کسی دوسرے کو بری قرار دینا یا خود کے حق سے خود کو بری کرنا) جائز ہے۔
- سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کی عقل کے کمال کا بیان کہ انہوں نے کمال بصیرت سے کام لیتے ہوئے اپنی باری سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دے دی۔
- مذکورہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کو طلاق دے دیں تو پھر وہ عورت امہات المومنین میں سے نہیں رہتی۔ جیسے وہ عورت بھی امہات المومنین میں نہ رہی جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح اور زفاف کے بعد تب طلاق دے دی تھی جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پناہ مانگی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواجِ مطہرات کے ساتھ حسن سلوک

1061، 1062۔ وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ: ((قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: يَا ابْنَ أُخْتِي! كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا يُفَضِّلُ بَعْضَنَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْقَسْمِ مِنْ مُكْثِهِ عِنْدَنَا، وَكَانَ قَلَّ يَوْمٌ إِلَّا هُوَ يَطُوْفُ عَلَيْنَا جَمِيْعًا فَيَدْنُوْ مِنْ كُلِّ امْرَأَةٍ، مِنْ غَيْرِ مَسِيْسٍ، حَتَّى يَبْلُغَ الَّتِي هُوَ يَوْمُهَا. فَيَبِيْتُ عِنْدَهَا)).

عروہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے (انہیں) ارشاد فرمایا: اے میرے بھانجے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اپنی باری میں قیام کرنے میں ہم ازواج میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دیا کرتے تھے، اور کم ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کے پاس چکر نہ لگایا کرتے، (اس میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنی) ہر زوجہ کے قریب ہوتے البتہ (جس کی اس دن باری نہ ہوتی اس سے) جماع نہ کرتے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (سب ازواج کے پاس سے ہوتے ہوئے اپنی) اس زوجہ کے پاس جا پہنچتے جس کی باری کا وہ دن ہوتا تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم شب کو اسی کے پاس قیام فرماتے۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے، اور یہ الفاظ سنن ابی داؤد کی روایت کے ہیں۔ جبکہ امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......عَنْ عُرْوَةَ: حضرات محدثین کی اصطلاح میں ''ترضی'' صرف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہے۔ جبکہ تابعین کے لیے ''رحمہ اللہ'' کے کلمہ کے ساتھ دعا کی جاتی ہے۔ اب چونکہ جنابِ عروہ اجل تابعین اور مدینہ نبویہ

[1] سنن ابی داؤد: 2135۔ المستدرك للحاكم: 203/2۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح اسناد والی ہے۔ مسند احمد: 107/6۔ اس حدیث کی سند میں عبدالرحمٰن بن ابی زناد متکلم فیہ راوی ہے جس کی بابت متعدد محدثین نے کلام کیا ہے۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ نے اس کو ثقہ کہا ہے، اور امام بخاری رحمہ اللہ نے تو اس سے استشہاد بھی کیا ہے۔ جیسا کہ امام منذری نے کہا ہے۔

کے فقہائے سبعہ میں سے ایک ہیں، اس لیے ان کے نام نامی اور اسم سامی کے ساتھ بھی "رضی اللہ عنہ" کی بجائے "رحمہ اللہ" کے کلمات آئیں گے۔

یَا ابْنَ أُخْتِي: اے میری بہن کے بیٹے۔ یعنی اے میرے بھانجے۔ جنابِ عروہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے اور سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان کی سگی خالہ تھیں۔ رہا یہ سوال کہ جنابِ عروہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کس بہن کے بیٹے تھے؟ تو یہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند تھے۔

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يُفَضِّلُ بَعْضَنَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْقَسْمِ: یہ بحث ذکر ہو چکی ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ پر اپنی سب ازواج میں عدل کرنا واجب نہ تھا لیکن آپ ﷺ ایسا اپنے کمالِ اخلاق کی وجہ سے کرتے تھے۔

قَلَّ يَوْمٌ: یعنی آپ ﷺ بلا ناغہ سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ ایسا ان کے درمیان محبت ومودت کو باقی رکھنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ کیونکہ اگر آپ ﷺ ہر زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کے پاس صرف اس کی باری کے دن ہی تشریف لے جاتے ہوتے تو آپ ﷺ اس زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا سے تقریباً آٹھ دن تک جدا رہتے اور یہ امر نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے درمیان بے رخی کا باعث بن سکتا تھا۔

پھر آپ ﷺ کے روزانہ جملہ ازواجِ مطہرات کے پاس جانے میں یہ شرعی فائدہ بھی حاصل ہوتا تھا کہ آپ ﷺ انہیں تعلیم وتذکیر فرماتے رہتے تھے اور تیسرے یہ کہ آپ ﷺ اپنی ہر زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کو اپنے قرب کے ذریعے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ غرض انہی حکمتوں کے پیش نظر آپ ﷺ بلا ناغہ نمازِ عصر کے بعد اپنی سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔

مِنْ غَيْرِ مَسِيسٍ: البتہ آپ ﷺ اس روز کی ملاقات میں اس زوجہ سے جس کی باری نہ ہوتی تھی جماع نہ فرمایا کرتے تھے۔ البتہ اس کے قریب ہوتے، اس کو چومتے، چھوتے، ہم آغوش ہوتے اور اس کو مانوس کرتے۔

حَتَّى يَبْلُغَ الَّتِي هُوَ يَوْمُهَا، فَيَبِيتُ عِنْدَهَا: یعنی رات آپ ﷺ اسی زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارتے جن کی باری کا وہ دن ہوتا تھا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاملہ۔
- ہمیں بھی چاہیے کہ ہم نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں اپنی بیویوں کے ساتھ نہایت نرم گو، نرم خو شفیق اور رحیم ہوں۔
- اگر کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو باری میں چاہے انصاف کرے، پر ہر بیوی کے پاس روزانہ اس سے ملنے ضرور جائے کہ یہ امر باہمی محبت ومودت کا سبب ہے اور ان کے پاس بلا ناغہ جانا کسی ایک بیوی کے حق میں جس کی باری کا وہ دن ہو، ظلم وجور نہ ہوگا۔
- معلوم ہوا کہ آدمی بیوی کے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان محبت ومودت کا جذبہ اور زیادہ ترقی کرتا ہے اور جتنا آدمی اپنی بیوی سے دور رہتا ہے، اتنا اس سے بے تعلقی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے۔

◈ جس بیوی کی باری کا دن نہ ہو، اس دن اگر آدمی اس بیوی کے پاس جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اس کے ساتھ اس دن جماع نہ کرے۔

◈ بیویوں میں تقسیم کا مدار شب باشی پر ہے۔ نہ کہ اس بیوی کے پاس دن گزارنا باری کی تقسیم کا مدار ہے۔ اس کی دلیل: "حَتّٰی یَبْلُغَ الَّتِی هُوَ یَوْمُهَا، فَیَبِیتُ عِنْدَهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ جناب رسول اللہ ﷺ بے پناہ مشاغل کے باوجود اپنے گھر والوں سے نہ تو بے اعتنائی فرمایا کرتے تھے اور نہ انہیں چھوڑے ہی رکھتے تھے۔ بلکہ ان کا خیال رکھتے اور ان کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا صَلَّى الْعَصْرَ دَارَ عَلَى نِسَائِهِ، ثُمَّ يَدْنُوْ مِنْهُنَّ)). الْحَدِيْثَ.

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی کریم ﷺ جب عصر کی نماز ادا فرمالیا کرتے تھے تو اپنی (سب) ازواجِ مطہرات کے پاس چکر لگاتے تھے، پھر ان کے قریب ہوتے تھے [1] ......الحدیث۔

تَنْبِيه: ..... "الْحَدِيثَ" کے لفظ کے اعراب کی بابت احتمالات کو مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا بے پناہ عدل و انصاف

1063- وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَسْأَلُ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ: ((أَيْنَ أَنَا غَدًا؟)) يُرِيْدُ يَوْمَ عَائِشَةَ، فَأَذِنَ لَهُ أَزْوَاجُهُ يَكُوْنُ حَيْثُ شَاءَ، فَكَانَ فِيْ بَيْتِ عَائِشَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ اپنے مرض الوفات میں (جب حالت بے حد نازک ہوگئی تھی تو بار بار) پوچھتے تھے کہ میں کل کہاں ہوں گا؟ (یعنی کل باری کس زوجہ مطہرہ کی ہوگی)۔ آپ ﷺ کی مراد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے دن کو معلوم کرنا تھی۔ اس پر سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے آپ ﷺ کو اس بات کی اجازت دے دی کہ (ان ایام میں) آپ ﷺ جہاں چاہیں رہیں اور آپ ﷺ (اس وقت) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے۔ [2]

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

شرح: ..... بلاشبہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سچ فرمایا کہ آپ ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں بھی کسی بیوی کی حق تلفی نہ کی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دیگر ازواجِ مطہرات کی دلی رضا کے بغیر مرض الوفات کے یہ ایام سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گزارنے پسند نہ فرمائے۔ اسی لیے آپ ﷺ اس حالت میں بار بار یہ فرماتے تھے کہ "کل میں کہاں ہوں گا"؟ گویا کہ آپ ﷺ اس بات کی طرف اشارہ فرماتے تھے کہ آپ ﷺ بیماری کے یہ ایام سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے آپ ﷺ کی اس خواہش کو دیکھا تو اس امر کی اجازت دے دی۔ پس

---

[1] صحيح مسلم: 1474.

[2] صحيح البخاري: 1389- صحيح مسلم: 2443.

آپ ﷺ نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں، ان کے پاس، ان کی گود میں اور ان کی باری کے دن انتقال فرمایا اور آپ ﷺ نے اس دنیا میں سے جو چیز سب سے آخر میں چکھی، وہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لعاب تھا۔

بلاشبہ یہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے وہ فضائل ومناقب ہیں جن میں آپ ﷺ کی کوئی اور زوجہ مطہرہ ان کی شریک نہ ہو سکیں۔ مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کو بحیثیت ایک بندہ بشر ہونے کے وہ عوارض لاحق ہوتے تھے جو دوسرے بندوں کو لاحق ہوتے تھے جیسے بیمار ہونا وغیرہ اور اس میں نبی کریم ﷺ کے نور ہونے اور آپ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کے باطل عقائد کا ردّ ہے۔
- نبی کریم ﷺ کو بھی دیگر انسانوں کی طرح حقیقی موت لاحق ہوئی تھی اس کی دلیل "فِی مَرَضِهِ الَّذِی مَاتَ فِیهِ" کے الفاظ ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن کریم کی بھی اس بابت صریح نص ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ﴾ (آل عمران: 144)

''اور نہیں ہیں محمد مگر ایک رسول، بے شک ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے تو کیا اگر وہ فوت ہو جائیں، یا قتل کر دیے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے؟''

اور اس میں ہر سال ''جشن آمد رسول'' منانے والوں کے لیے غور وفکر کے بے شمار پہلو ہیں۔

- نبی کریم ﷺ کی اپنی جملہ ازواج کے ساتھ حسن معاشرت کہ آپ ﷺ نے مرضِ وفات میں بھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کی۔
- معلوم ہوا کہ قرائن پر عمل جائز ہے کیونکہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کہ: میں کل کہاں ہوں گا؟ سے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ آپ ﷺ کی مراد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا دن ہے۔ پس قرائن پر عمل شرعاً ثابت ہے۔ [1]
- خود ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسن معاشرت اور حسن معاملہ کہ جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کی منشا دیکھی تو سب نے آپ ﷺ کو اپنے آخری ایام سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزارنے کی اجازت دے دی۔
- سیدہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی از حد عظیم فضیلت ومنقبت۔
- اگر کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ انہیں اشاروں کنایوں میں یہ سمجھائے کہ کسی خاص موقع پر وہ ایک خاص بیوی کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایامِ علالت گزارنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کل میں کہاں ہوں گا۔

---

[1] یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور علماء کا قول ہے کہ احکام میں قرائن پر عمل کرنا جائز ہے۔ دیکھیں: اعلام المو قعین: 9/3۔ فصل الاخذ بالقرائن و شواهد الاحوال.

سفر میں کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لیے قرعہ ڈالنا

1064- وَعَنْهَا قَالَتْ: ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ سَفَرًا أَقْرَعَ بَيْنَ نِسَائِهِ ، فَأَيَّتُهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا خَرَجَ بِهَا مَعَهُ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی سفر (پر روانہ ہونے) کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنی ازواج رضی اللہ عنہن کے درمیان قرعہ ڈالا کرتے تھے، چنانچہ جس کا بھی قرعہ نکل آتا آپ ﷺ اس کو (سفر میں) اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......إِذَا أَرَادَ سَفَرًا: سفر سے مراد محل اقامت کی مفارقت ہے۔اس کی حدود اور احکام کو قصر صلوٰۃ کے تحت مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔

أَقْرَعَ بَيْنَ نِسَائِهِ: یعنی آپ ﷺ ان کے درمیان قرعہ ڈالتے۔ چنانچہ جن کے نام کا بھی قرعہ نکل آتا، آپ ﷺ سفر میں انھیں ساتھ لے جاتے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ ہر سفر میں اپنی ازواج رضی اللہ عنہن میں سے کسی ایک کو ساتھ ضرور رکھتے تھے۔ جبکہ بسا اوقات ایک سے زیادہ ازواج بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ کیونکہ شریعتِ اسلامیہ کی بعض ایسی پوشیدہ سنتیں بھی ہیں جن پر سوائے ازواج رضی اللہ عنہن کے اور کوئی مطلع نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ امت کی اس تعلیم اور شریعت کی اسی تکمیل کی خاطر آپ ﷺ کسی ایک یا ایک سے زیادہ زوجات کو ہر سفر میں ضرور ساتھ لے کر نکلتے تھے۔

رہا سوال یہ کہ قرعہ کیونکر ڈالا جاتا تھا، یا کیسے ڈالا جائے؟ تو اس کا کوئی خاص طریق متعین نہیں چاہے پرچیاں ڈال دی جائیں اور چاہے کنکریاں ڈالی جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض جس کے نام کا قرعہ نکل آتا وہ تو سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ جاتی تھیں جبکہ دیگر ازواج نبی کریم ﷺ کے سفر سے لوٹنے تک اپنے اپنے گھروں میں رہتی تھیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواج کے ساتھ بے حد عدل و انصاف کہ سفر میں بھی انہیں اپنے عدل سے محروم نہ رکھتے چنانچہ لے تو کسی ایک کو جاتے لیکن اس طور سے لے جاتے کہ سب کے قلوب راضی اور مطمئن رہتے۔
- قرعہ ڈالنا مشروع اور ثابت ہے اور اس میں جس کا نام نکل آئے اس کا حق شرعاً ثابت ہو جاتا ہے۔
- قرعہ میں جس بیوی کا نام نکل آئے تو دوسری بیویوں کے ایام کی قضاء لازم نہ ہوگی کہ اس میں قرعہ والی بیوی کا ضرر ہے۔
- اور اگر دوبارہ سفر کا ارادہ بنے تو قرعہ دوبارہ ڈالا جائے گا۔ البتہ اب کی بار پہلی بیوی کو جس کا پہلے سفر میں قرعہ میں نام نکلا تھا، اس قرعہ میں شامل نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ گزشتہ سفر میں اپنا حق وصول کر چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ دوسری مرتبہ قرعہ

❶ صحيح البخاري: 2593۔ صحيح مسلم: 2770.

میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس کا نام دوبارہ نکل آئے کہ جس سے باقی ازواج کی حق تلفی ہوتی ہے۔

بیوی کے ساتھ سخت رویہ رکھنے کی ممانعت کا بیان

1065۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَمْعَةَ ﷺ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَجْلِدُ أَحَدُكُمْ امْرَأَتَهُ جَلْدَ الْعَبِيْدِ)).
رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی (سرزنش وتنبیہ کے وقت) اپنی بیوی کو (ایسے) نہ مارے جیسے غلام کو مارا جاتا ہے۔''[1]
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**لَا يَجْلِدُ**: مذکورہ ''لا'' ناہیہ ہے۔ لہٰذا ''يَجْلِدُ'' فعل مضارع لائے نہی کی وجہ سے مجزوم ہوگا۔

اِمْرَأَتَهُ: مراد بیوی ہے۔

جَلْدَ الْعَبِيْدِ: ''جَلْدَ'' یہ مصدر ہے جو مصدر کی نوع کو بتلانے کے لیے ہے اور اس کا عامل ''یجلد'' فعل مضارع ہے جو لائے نہی کے ساتھ ہے اور یہ نوع کے بیان کے لیے اس وجہ سے ہے کہ اس کی اضافت ''عبید'' کی طرف ہے جو اس کی نوع کی تعیین کر رہا ہے۔

اور عبید سے مراد غلام ہے۔ کیونکہ آدمی غلام کی تادیب تو کر سکتا ہے، مگر اپنی بیوی کی تادیب نہیں کر سکتا۔ مراد کسی بات پر سرزنش کرتے ہوئے اسے مارنا بھی ہے کہ ایسا غلام کے ساتھ تو کر سکتے ہیں لیکن بیوی کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ غلام کی تادیب کے بعد اس کے ساتھ خدمت کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جبکہ اگر بیوی کو مارا تو شاید اسی رات اس سے جماع کی نوبت بھی آ جائے تب پھر دن کو مار کر رات کو کس منہ سے اس سے جماع کرے گا؟!!!

دوسرے غلام کی طرح مارنا یہ اشد ہے جو بیوی کے دل میں نفرت پیدا کرتا ہے۔ تب پھر بیوی کو مارنے کے بعد زوجین کے درمیان ایک خوشگوار، پرسکون اور پراعتماد زندگی خواب بن کر رہ جاتی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں سرزنش اور عقاب وعتاب کے وقت بیوی کو غلام کی طرح مارنے کی سختی کے ساتھ اور نہایت بلیغ ممانعت آئی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ بیوی کو ڈانٹا اور مارا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرب چہرے کے علاوہ پر ہو، اور دوسرے سخت اور اذیت ناک نہ ہو۔ جیسا کہ اس پر مفصل گفتگو کی جا چکی ہے۔
- مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف بھی نہایت بلیغ اشارہ ہے کہ استاذ کو تلامذہ کی سرزنش وتادیب کرنے سے روکنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ البتہ استاذ کو چاہیے کہ وہ بھی ایک تو تلامذہ کے چہروں پر تھپڑ نہ مارے، دوسرے تلامذہ کی اذیت ناک تادیب نہ کرے۔
- معلوم ہوا کہ بیوی کی تادیب کرنے میں خاوند کو بیوی پر ایک گونہ سلطنت واختیار حاصل ہے۔ البتہ غلام کی تادیب کی طرح تادیب نہ کرے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5204.

- دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنے غلام پر اختیار حاصل ہے۔
- معلوم ہوا کہ افعال کے عدم ووجود میں حکمت ہر حال میں ملحوظ ہے۔

6۔ بَابُ الْخُلْعِ ..... خلع کا بیان

خلع کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

تمہید:..... خلع یہ "خَلَعَ يَخْلَعُ خَلْعًا" سے مصدر ہے۔اس کی خا پر فتح اور ضم دونوں کا پڑھنا جائز ہے۔خلع اصل میں کسی شے کو فسخ کرنے اور اس سے چھٹکارا پانے کو کہتے ہیں۔جیسے کہا جاتا ہے "خَلَعَ الثَّوْبَ" (اس نے کپڑے اتارے یعنی ان سے چھٹکارا پایا)"خَلَعَ النَّعْلَ" (اس نے جوتے اتارے) پھر یہ لفظ بیوی کے چھوڑنے کے لیے مستعار لے لیا گیا اور خاص یہ اصطلاحی معنی حضرات فقہائے کرام استعمال کرنے لگے۔ان دونوں معانی (لغوی معنی اور جدید اصطلاحی معنی) میں مناسبت یہ ہے کہ خاوند بیوی دونوں ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔پس دونوں میں جدائی گویا کہ جسم اور لباس کے درمیان جدائی ہے۔لیکن اس کو "باب فراق الافتداء" کہنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ زوجین کے درمیان تفریق کی اس صورت کو قرآن نے انہی لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾ (البقرة: 229)

''تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔''

اس آیت میں رب تعالیٰ نے زوجین کے درمیان کی تفریق کو افتداء کہا ہے۔کیونکہ بیوی خاوند سے جان چھڑانے کے لیے اسے فدیہ میں مال پیش کرتی ہے۔

اس جملہ تفصیل کے تناظر میں خلع کی اصطلاحی تعریف یہ ہوگی۔خلع یہ بیوی کا معلوم الفاظ کے ساتھ ایک مالی عوض کے بدلے میں خاوند سے جدائی اختیار کرنا ہے۔

عورت یہ عوض اپنے مال میں سے بھی دے سکتی ہے اور والدین یا اولاد کے مال میں سے بھی دے سکتی ہے۔جبکہ بسا اوقات کوئی اجنبی بھی اس عورت کو شدید مصیبت میں دیکھ کر یہ عوض پیش کر سکتا ہے۔البتہ بیوی کے علاوہ جو بھی یہ عوض دے گا، اس میں یہ بات شرط ہوگی کہ اس میں زوجین کی مصلحت ہو، اور کسی ایک کا ضرر نہ ہو کہ ضرر کی صورت میں یہ مال خرچ کرنا ناجائز ہوگا۔

علماء نے خلع میں خرچ کیے جانے والے عوض کی چار قسمیں لکھی ہیں، جو یہ ہیں:

(1) یہ عوض خاوند کی مصلحت کے لیے ہو۔

(2) یا بیوی کی مصلحت کے لیے ہو۔

(3) یا دونوں کی مصلحت کے لیے ہو۔

ان تینوں صورتوں میں اجنبی کی طرف سے عوض کا دیا جانا جائز ہوگا۔

(4) جبکہ چوتھی صورت یہ ہے کہ اس میں زوجین کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا ضرر ہو یا پھر خود اس اجنبی کی اپنی کوئی مصلحت ہو، تو اس صورت میں اجنبی کی طرف سے خلع کا عوض پیش کرنا جائز نہ ہوگا۔کیونکہ یہ صورت عدوان پر مشتمل ہے۔

خلع کے جواز کی اصل

خلع کی اصل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ (البقرة: 229)

''اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔''

خلع طلاق نہیں

یاد رہے کہ خلع طلاق نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے پہلے خاوند کے دو دفعہ طلاق دینے کو ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ (البقرة: 229) ''یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے۔''

اس کے بعد خلع کا ذکر ہے جو ''وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ'' سے لے کر آخر آیت تک ہے۔ پھر اس کے بعد تیسری طلاق کا ذکر ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ (البقرة: 230) ''پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے۔''

تب پھر خلع کا دو طلاقوں اور تیسری طلاق کے بیچ میں ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خلع طلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر خلع بھی طلاق ہوتا تو پھر دو طلاقوں اور خلع کے بعد کی مذکور طلاق چوتھی طلاق بنتی۔ جبکہ طلاقیں صرف تین ہیں۔ تب پھر پہلے دو طلاقوں کا ذکر ہے۔ پھر زوجین کے درمیان فراق اور علیحدگی کا ذکر ہے جو کہ خلع ہے اس کے بعد تیسری طلاق کا ذکر ہے۔

غرض خلع کو طلاق شمار نہ کیا جائے گا۔

خلع کا اور بیوی نے جو کچھ لیا ہے، اس کے لوٹانے کا بیان

1066- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا ((أَنَّ امْرَأَةَ ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ثَابِتُ بْنُ قَيْسٍ مَا أَعِيْبُ عَلَيْهِ فِيْ خُلُقٍ وَلَا دِيْنٍ، وَلٰكِنِّيْ أَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَتَرُدِّيْنَ عَلَيْهِ حَدِيْقَتَهُ؟)) فَقَالَتْ: نَعَمْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اقْبَلِ الْحَدِيْقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيْقَةً)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں ثابت بن قیس کے اخلاق یا دین میں سے تو کسی برائی کو ذکر نہیں کرتی، البتہ مجھے اسلام میں کفر (یعنی خاوند کی نافرمانی و ناشکری) پسند نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے (استفسار) فرمایا: ''کیا تم اسے اس کا باغ لوٹاتی ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! (میں انہیں ان کا باغ واپس کرنے کو تیار ہوں)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(اے ثابت! اس سے اپنا) باغ قبول کرو اور اسے ایک طلاق دے دو۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5273.

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: ((وَأَمَرَهُ بِطَلَاقِهَا)).
اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور آپ ﷺ نے انہیں اپنی بیوی کو طلاق دے دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔

معرفة الصحابة :...... یہ حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ ہیں جن کا شمار نبی کریم ﷺ کے خطیبوں میں کیا جاتا ہے ان کی آواز زبردست بلند اور گونج دار تھی۔ چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ (الحجرات: 2)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو اور نہ بات کرنے میں اس کے لیے آواز اونچی کرو، تمھارے بعض کے بعض کے لیے آواز اونچی کرنے کی طرح، ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم شعور نہ رکھتے ہو۔''

تو حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ گھر بیٹھ گئے اور محض اس ڈر سے ہر وقت روتے رہتے تھے کہ کہیں بلند آواز ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال بے خبری میں اکارت نہ جائیں۔

نبی کریم ﷺ نے جب چند دن تک انہیں اپنی مجلس اقدس میں نہ پایا تو بالآخران کے بارے میں پرسشِ احوال فرمائی جس پر لوگوں نے اس آیت کے نازل ہونے اور اس کے بعد ان کے اپنے اوپر خوف زدہ ہو کر گھر بیٹھ رہنے کا قصہ گوش گزار کر دیا یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے انہیں بلوا بھیجا اور انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''تم ایسے نہیں ہو، تم تو قابل تعریف زندگی گزارو گے اور شہادت سے سرفراز ہو گے اور جنت میں جاؤ گے۔''[1]

سبحان اللہ! یہ ہیں شہید اور جنت کی خوشخبری پانے والے صحابی رسول حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ جنہیں نبوی بشارت کے مطابق ''یمامہ'' میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں عظیم الشان شہادت بھی نصیب ہوئی تھی لیکن ان کی اہلیہ اس سب کے باوجود انہیں ناپسند کرتی تھی اور ان سے محبت نہ کرتی تھی۔ یہی وہ قصہ ہے جس کا بیان اس حدیث میں ہے۔

غریب الحدیث:...... مَا أَعِيبُ عَلَيْهِ: یہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کی طرف سے ان کے حق میں اس بات کی شہادت ہے کہ میں نے ان کے دین یا اخلاق میں کسی قسم کا کوئی عیب نہیں دیکھا۔ البتہ اسے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی شکل وصورت پسند نہ تھی۔[2] رہا حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کا دین تو اس کی بابت اوپر ذکر کردہ واقعہ ہی ان کے کمالِ ایمان کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے تو ان کے لیے شہادت اور جنت کی بشارت بھی دی تھی۔

وَلَٰكِنِّي أَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْإِسْلَامِ: کفر سے یہاں خاوندوں کا کفران یعنی ان کی ناشکری مراد ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ارشاد ہے کہ: البتہ تم عورتیں لعنت زیادہ بھیجتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو، یعنی اس کی فضیلت، مرتبہ اور بڑائی کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسلام لا کر کہیں میں اپنے خاوند کی ناشکری نہ کروں اور گنہگار ہو جاؤں۔

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی: 42۔ اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔
[2] جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ دیکھیں حدیث رقم: 1067۔ (نسیم)

ایک قول یہ ہے کہ یہاں کفر سے مراد وہی کفر ہے جو اسلام کے بالمقابل ہوتا ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اسلام لا کر مرتد ہو جانا سخت ناپسند ہے۔ لیکن یہ تفسیر بے حد ضعیف ہے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بات بہت بعید ہے کہ ایک صحابیہ محض اپنے خاوند کو ناپسند کرنے کی وجہ سے اسلام چھوڑنے پر تیار ہو جائے "حَاشَا وَكَلَّا" اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ یہاں کفر سے مراد خاوند کی ناشکری اور اس کے احسانات کا کفران ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خاوند کی ناشکری گناہ ہے اور اس پر اصرار کبائر میں سے ہے۔

أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ: حدیقہ سے مراد نخلستان ہے۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں مہر میں کھجوروں کا ایک باغ دے رکھا تھا۔ اس مسئلہ کی وضاحت آگے آ جاتی ہے۔

مذکورہ استفہام استفہامِ استعلام ہے نہ کہ استفہامِ انکاری۔ یعنی آپ ﷺ نے اس خاتون سے یہ دریافت فرمایا کہ اگر تم اپنے خاوند سے علیحدگی چاہتی ہو تو کیا پھر تم فدیہ میں اسے اس کا وہ باغ لوٹانا چاہو گی جو اس نے تمہیں مہر میں دیا تھا؟ جس پر اس خاتون نے عرض کیا کہ جی ہاں! میں اس بات پر تیار ہوں۔

حَدِيقَتَهُ: اگرچہ یہ باغ مہر میں دے دیے جانے کے بعد اب حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی کی ملک تھا، اس کے باوجود حدیقہ کی اضافت حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف "مَا كَانَ" کے اعتبار سے ہے۔ یعنی وہ باغ جو پہلے کبھی حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کا ہوتا تھا۔

قَالَتْ: نَعَمْ: اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "نَعَمْ وَأَزِيْدُهُ" [1] جی ہاں! اور میں ساتھ میں کچھ اور بھی دینے کو تیار ہوں۔

یاد رہے کہ "نَعَمْ" حرفِ جواب ہے جو ماقبل کے کلام کے اثبات کے لیے آتا ہے۔ چاہے وہ کلام منفی ہو یا مثبت۔ چنانچہ مثبت ہو تو اثبات کا اثبات کرتا ہے اور منفی ہو تو نفی کا اثبات کرتا ہے اور یہاں حرفِ جواب میں سوال کا اعادہ نہیں کیونکہ سوال، یہ جواب میں سوال کے اعادہ سے مستغنی کر دیتا ہے۔

اِقْبَلِ الْحَدِيقَةَ: کلام کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس ساری گفتگو کے دوران حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ بھی اسی مجلس میں موجود تھے۔ کیونکہ خطاب کو غیب کی طرف نہیں پھیرا جاتا اور "الْحَدِيقَةَ" میں الف لام عہد ذکر کا ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے انہیں یاد دلایا کہ بات تمہارے اس باغ کی ہو رہی ہے جسے تم نے مہر میں دیا تھا۔

وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً: یعنی ایک ہی طلاق دو نہ کہ ایک سے زیادہ، لہٰذا یہ نہ کہو کہ تمہیں طلاق، تمہیں طلاق، تمہیں طلاق بلکہ صرف ایک طلاق دو کہ طلاق دینے کا سنت طریق یہی ہے۔

وَأَمَرَهُ بِطَلَاقِهَا: یہ صحیح بخاری کی دوسری روایت کے الفاظ ہیں اور ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ اسے ایک طلاق دے دو۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔ [2]

خلع لینے والی عورت کی عدت کا بیان

وَلِأَبِي دَاوُدَ، وَالتِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ: ((أَنَّ امْرَأَةَ اور سنن ابی داود اور جامع ترمذی کی روایت میں ہے کہ: حضرت

---

[1] سنن الدار قطنی: 254/3۔ اس روایت کی اسناد صحیح نہیں جیسا کہ ابن جوزی کی "التحقیق" (288/2) میں ہے۔
[2] شیخ رحمہ اللہ نے اس حدیث کے فوائد آگے چل کر ذکر فرمائے ہیں۔ (نسیم)

ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ اخْتَلَعَتْ مِنْهُ ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ عِدَّتَهَا حَيْضَةً)).

ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے خلع کیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی عدت ایک حیض مقرر فرمائی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ❶

شرح :..... نبی کریم ﷺ نے خلع لینے والی عورت کی عدت ایک حیض استبراءِ رحم کے لیے مقرر فرمائی تھی۔ کیونکہ حاملہ کو حیض نہیں آتا۔ لہٰذا حیض آ جانا اس بات کی دلیل ہوگا کہ اس عورت کا رحم فارغ اور حمل سے بری ہے اور ایسی عورت حیض ختم ہو جانے کے بعد دوسرے مردوں کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ آپ ﷺ نے طلاق کی عدت تین حیض جبکہ خلع کی عدت ایک حیض کیوں مقرر فرمائی؟ تو عدت طلاق کو تین حیض تک لمبا کرنے میں حکمت یہ ہے تاکہ اس دوران زوجین کو مراجعت کی بابت خوب غور وفکر کی مہلت مل جائے۔ جبکہ خلع والی کے لیے رجعت ہے ہی نہیں اور اس کا خاوند عقدِ جدید کے بغیر اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ اس لیے خلع کی عدت کو تین حیض لمبا کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

اسلام میں پہلا خلع

1067- وَفِي رِوَايَةِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رضی اللہ عنہ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ: ((أَنَّ ثَابِتَ بْنَ قَيْسٍ كَانَ دَمِيمًا ، وَأَنَّ امْرَأَتَهُ قَالَتْ: لَوْلَا مَخَافَةُ اللّٰهِ إِذَا دَخَلَ عَلَيَّ لَبَصَقْتُ فِي وَجْهِهِ)).

اور سنن ابن ماجہ میں عمرو بن شعیب کی روایت میں ہے کہ وہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: حضرت ثابت بن قیس (خلقۃً) بدصورت تھے اس لیے ان کی بیوی نے یہ کہا تھا کہ: اگر مجھے اللہ کا ڈر نہ ہوتا تو جب (پہلی رات) یہ میرے پاس آئے تھے (اور میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا) تو (مجھے ان کی شکل وصورت اس قدر بری لگی تھی کہ) میں ان کے چہرے میں تھوک دیتی۔ ❷

1068- وَلِأَحْمَدَ مِنْ حَدِيثِ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَثْمَةَ: ((وَكَانَ ذَلِكَ أَوَّلَ خُلْعٍ فِي الْإِسْلَامِ)).

جبکہ مسند احمد میں حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ مذکور ہیں: ''اور یہ اسلام میں پہلا خلع تھا۔'' ❸

غریب الحدیث :...... **دَمِيمًا**: دمیم بدصورت کو کہتے ہیں۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ گو صورت کے اعتبار سے بدصورت تھے لیکن سیرت واخلاق اور ایمان کے اعتبار سے بے حد اونچے تھے۔ پھر حضرت ثابت رضی اللہ عنہ زبردست خطیب اور دندان شکن شاعر بھی تھے۔

لَوْلَا مَخَافَةُ اللّٰهِ..... : حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی نے یہ بات ان کی صورت کو سخت ناپسند کرتے ہوئے کہی تھی۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 2229- جامع الترمذی: 1185- امام حاکم رحمہ اللہ (224/2) نے اس حدیث کو صحیح جبکہ امام بیہقی رحمہ اللہ (450/7) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ "مصنف عبدالرزاق" (12246) میں اس حدیث کا مرسل طریق بھی مذکور ہے۔

❷ سنن ابن ماجہ: 2057- اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے کیونکہ اس میں حجاج بن ارطاۃ کی تدلیس ہے۔

❸ مسند احمد: 3/4- المعجم الکبیر للطبرانی: 5637/103/6- اس حدیث کی سند میں بھی حجاج بن ارطاۃ ہے جو ضعیف ہے- دیکھیں: مجمع الزوائد: 4/5.

حقیقت یہ ہے کہ وہ ظاہری صورت کی گرویدہ تھیں اگر وہ عمدہ اخلاق اور ایمان کو چاہنے والی ہوتیں تو انہیں اس بات کی مطلق پروا نہ ہوتی کہ جناب ثابت رضی اللہ عنہ کی صورت حسین ہے یا قبیح۔

أَوَّلَ خُلْعٍ فِي الْإِسْلَامِ: معلوم ہوا کہ جاہلیت کے لوگ خلع سے واقف تھے۔لیکن اسلام میں ہونے والا پہلا خلع یہ تھا۔
اب ذیل میں مذکورہ بالا تینوں روایات کے فوائد نوکِ قلم کیے جاتے ہیں:

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- خلع کی اصل قرآن وسنت دونوں سے ثابت ہے جیسا کہ خلع کے تمہیدی بیان میں گزرا ہے۔
- اگر عورت کو خاوند کے ساتھ رہنا دوبھر ہو جائے تو وہ خلع طلب کر سکتی ہے۔تب پھر ان تینوں احادیث کا اس ارشاد نبوی سے کوئی تعارض نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''جس عورت نے اپنے خاوند سے بغیر کسی حرج (اور ضرر) کے طلاق مانگی اس پر جنت کی خوشبو حرام ہوگی۔[1] کیونکہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ایک ظاہری حرج کی بنا پر طلاق مانگی تھی۔
- تب پھر کسی کے بے حد بداخلاق ہونے کی وجہ سے بھی عورت خلع یا طلاق مانگ سکتی ہے۔
- اور پھر کسی کے بے دین ہونے کی وجہ سے طلاق یا خلع کا مطالبہ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔
- کسی ناگوار امر میں جا پڑنے سے بچنا اور اس بابت احتیاط کرنا یہ آدمی کی حزم واحتیاط میں شمار ہوتا ہے۔جیسا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اس بنا پر خلع مانگ لیا تھا کہ کہیں میں کسی ناجائز فعل میں نہ جا پڑوں اور ایسا کرنا قابل ملامت نہیں جب تک کہ شریعت کے مطابق ہو۔
- جب بیوی کسی وجہ سے خلع طلب کرے تو خاوند کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا دیا مہر واپس مانگ لے۔اس کی دلیل ''أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ'' کے الفاظ ہیں۔
- رہا خلع کی صورت میں خاوند کا عورت سے مہر سے زیادہ کا مطالبہ کرنا؟ تو اس بارے علماء کے دو اقوال ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ وہ بیوی سے مہر سے زیادہ کا مطالبہ کر سکتا ہے،دوسرے عنقریب بیوی اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گی،اس لیے خاوند کو جائز ہے کہ وہ کسی عوض کے بغیر اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو۔

جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اسے دیے مہر سے زیادہ کا مطالبہ جائز نہیں۔کیونکہ اس عورت کی فرج کو حلال کر کے اور اس سے متمتع ہو کر دراصل وہ اپنے مہر کا عوض وصول کر چکا ہے۔اب مروت کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی مہر سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرے۔اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے اس بارے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آدمی کو مہر سے زیادہ لینا مکروہ ہے البتہ حرام نہیں ہے اور یہ سب سے زیادہ مبنی بر عدل قول ہے۔

- اگر عورت خلع مانگے اور مہر بھی واپس کرے تو خاوند کو خلع کرنا واجب ہو جاتا ہے۔اس کی دلیل ''اِقْبَلِ الْحَدِيقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً'' کے الفاظ ہیں۔
- حرف جواب پورا جواب دینے سے غنی کر دیتا ہے جیسا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ''کیا تم انہیں ان کا باغ واپس

---

[1] جامع الترمذی: 1187۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔سنن ابن ماجہ: 2054۔ مسند احمد: 5/277۔ امام ابن حبان (4184) اور امام حاکم (2/218) نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

کرتی ہو' کے جواب میں صرف 'ہاں' کہا تھا۔

◈ اگر ولی امر کسی امر کو زیادہ مفید اور صلح کن سمجھے تو وہ فریقین میں سے ایک کو اس کا مشورہ دے سکتا ہے۔ اس کی دلیل "اِقْبَلِ الْحَدِيقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ بیوی کی اس شدتِ کراہت کی حالت میں خاوند کا اس کے ساتھ رہنا ٹھیک نہ تھا، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ثابت رضی اللہ عنہ کو باغ واپس لے کر خلع کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔

◈ جب جھگڑا زوجین میں سے کسی ایک کی طرف سے ہو تو اس وقت دونوں میں سے ہر ایک کی طرف سے ایک حکم (یعنی پنچ) مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسے مذکورہ صورت میں تفریق کا مطالبہ بیوی کی طرف سے تھا جبکہ خاوند اسے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

◈ خلع طلاق کے لفظ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اس کی دلیل "وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً" کے الفاظ ہیں۔

◈ رہا یہ سوال کہ اگر خلع لفظ طلاق کے ساتھ کیا جائے گا تو کیا اس کا حکم بھی طلاق کا ہی ہوگا؟ تو علماء کے اس بارے دو اقوال ہیں:

(1) ایک قول یہ ہے کہ خلع مطلق فسخ ہے چاہے لفظ طلاق سے کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ تب پھر اس کا حکم فسخ کا ہوگا جو یہ ہے:

⊙ ...... خلع سے عدد طلاق کم نہیں ہوتا۔

⊙ ...... خلع سے تین طلاقیں پوری نہیں ہوتیں۔ یعنی اگر پہلے سے دو طلاقیں دے رکھی تھیں تو خلع تیسری طلاق بنکر واقع نہ ہوگا۔

یہی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسخ ہے۔ چاہے لفظ طلاق سے ہی کیا جائے۔

⊙ ...... خلع کی عدت ایک حیض ہے۔ جو اس کے فسخ ہونے کی دلیل ہے۔

پھر یہ کہ اعتبار الفاظ کا نہیں بلکہ مقاصد کا ہوتا ہے تو جب طلاق سے مقصود خلع تھا تو اعتبار مقصود کا ہوگا اور یہ خلع فسخ ہوگا نہ کہ طلاق چاہے یہ خلع لفظ طلاق سے ہی ہو۔

(2) اور ایک قول یہ ہے کہ خلع طلاق ہی ہے چاہے جن الفاظ کے ساتھ بھی کیا جائے۔ لیکن یہ قول بے حد ضعیف ہے اگر خلع طلاق ہوئی تو "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" کے بعد جب خلع کا ذکر ہوا تھا تو اس کے بعد "فَإِنْ طَلَّقَهَا" کے الفاظ کا کوئی معنی نہ تھا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی اس آیت پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔

(3) جبکہ تیسرا قول تفصیل کا ہے کہ اگر تو خلع طلاق کے لفظ کے ساتھ ہوا ہے تو یہ طلاق ہے اور اگر خلع، یا فسخ یا فدیہ کے الفاظ کے ساتھ ہوا ہے تو یہ فسخ ہے اور مشہور مذہب بھی یہی ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے طلاق کے لفظ کے ساتھ جب خلع کرنے کا حکم دیا تھا تو ایک طلاق دینے کا حکم بھی دیا تھا کیونکہ طلاق دینے کا سنت طریقہ یہی ہے کہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری الگ الگ حیض سے پاک ہونے کے بعد دی جائے۔

لیکن تینوں اقوال میں سے مختار قول وہی ہے جو شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا ہے۔

◈ علماء کو چاہیے کہ وہ عوام کو طلاق دینے کا مشروع طریقہ سمجھایا کریں۔

◈ خلع کی عدت ایک حیض ہے۔

◈ عورت کو چاہیے کہ وہ خلع مانگنے کا سبب بھی بیان کیا کرے۔ جیسا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اس کا سبب یہ بتلایا تھا

کہ وہ بے حد بدصورت ہیں اوران کی شکل دیکھ کر مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں میں خاوند کی ناشکری میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔

- بیوی کوکسی وجہ سے خاوند سے بغض ہوسکتا ہے جیسا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی کوان کی بدصورتی کی وجہ سے ان سے بغض تھا۔
- یہ خوف باری تعالیٰ ہی ہے جو آدمی کو محاسن اخلاق اور مکارمِ اخلاق پر ابھارتا ہے جیسا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے خوفِ خدا کی وجہ سے خلع مانگا تاکہ کسی بداخلاقی، گناہ یا برائی میں مبتلا نہ ہوں۔
- کسی پر تھوکنا بے حد برا اور سخت عدوان ہے اور بعض کے نزدیک یہ مارنے سے بھی اشد ہے۔
- یہ اسلام کا پہلا خلع تھا۔

9

كِتَابُ الطَّلَاقِ

طلاق کے احکام و مسائل کا بیان

تمہید:......طلاق کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:......لفظ طلاق "طَلَّقَ يُطَلِّقُ تَطْلِيْقًا" کا اسم مصدر ہے۔اس کا لغوی معنی رہائی، آزادی اور چھٹکارا دینا ہے۔

جبکہ اصطلاحِ شرع میں طلاق یہ نکاح کی یا بعض نکاح کی قید سے آزاد کرنا اور اسی قید کو کھولنا ہے۔بعض نکاح کا لفظ اس لیے بولا کیونکہ طلاق کبھی بائنہ ہوتی ہے اور یہ تین طلاقیں دینا ہے جس میں عورت دوسرے خاوند سے نکاح کیے بغیر پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوتی اور کبھی رجعی ہوتی ہے۔ یہ وہ طلاق ہے، جو تین سے کم ہو، کہ اس میں نکاح کی بعض قید تو کھل جاتی ہے جبکہ بعض نہیں کھلتی۔ کیونکہ خاوند اس حال میں رجوع کرسکتا ہے۔اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌo وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌo﴾ (البقرة: 226۔227)

"ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں سے قسم کھا لیتے ہیں، چار مہینے انتظار کرنا ہے، پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔"

کہ یہاں "فَاِنْ فَآءُوْ" کا معنی "فَاِنْ رَجَعُوْا" ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ بسا اوقات طلاق سے کل نکاح کی قید نہیں کھل جاتی۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: ان الفاظ میں رجوع کی ترغیب ہے کہ مغفرت و رحمت کا خواستگار ہر انسان ہوتا ہے۔

اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: ان کلمات میں ایک گونہ دھمکی بھی ہے۔یعنی ان لوگوں کے دل میں طلاق کا جو عزم و ارادہ ہے، رب تعالیٰ اس کو سنتے ہیں اور ان کے احوال کو جانتے ہیں۔ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ

کرتی ہے کہ طلاق رب تعالیٰ کو محبوب نہیں۔

اب ذیل میں طلاق سے متعلقہ احادیث ملاحظہ کیجیے۔

سب سے برا حلال

1069- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ)).

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَرَجَّحَ أَبُوْ حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال طلاق ہے۔'' ❶

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ ابوحاتم نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث :......رَجَّحَ أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ: مرسل حدیث بھی ضعیف احادیث کی ایک قسم ہے۔لیکن ہم اس حدیث کی تشریح اس کے مقبول ہونے کی بنا پر کریں گے۔

أُبْغَضُ: یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور بغض یہ محبت کی ضد ہے۔

الْحَلَالِ: حلال اس شے کو کہتے ہیں جس کو رب تعالیٰ نے حلال کیا ہو۔

مضمون حدیث :......یہ حدیث بتلاتی ہے کہ بعض حلال برے اور ناپسندیدہ بھی ہوتے ہیں اور سب سے مبغوض حلال طلاق ہے۔ کیونکہ طلاق یہ امر نکاح کے منافی ہے۔ کیونکہ نکاح بیویوں کو قریب کرنے کا جبکہ طلاق انہیں دور کرنے کا نام ہے۔

طلاق کے مفاسد، برائیاں اور خرابیاں

ذیل میں اختصار کے ساتھ طلاق کے مفاسد ذکر کیے جاتے ہیں:

⊙......طلاق دینے سے اولاد بکھر جاتی ہے اور اولاد اس امر میں شدید تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہ طلاق کے بعد ماں اور باپ میں سے کس کے ساتھ رہے۔

⊙......اگر عورت اور اس کے میکے والے تنگدست ہوئے تو طلاق اس کی معاشی زندگی کو اس پر بے حد تنگ کر دیتی ہے۔

⊙......مطلقہ عورت میں دوسرے لوگوں کی نکاح کی رغبت بے حد کم ہوتی ہے۔

⊙......طلاق دینے سے مرد بیوی پر خرچ کرنے کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔

روایۃ ودرایۃ الحدیث:......علماء کا اس حدیث کی سند میں اختلاف ہے کہ آیا یہ حدیث مرسل ہے یا متصل؟ پھر

❶ سنن ابی داؤد: 8178- سنن ابن ماجه: 2018- مسند عبدالله بن عمر للطرسوسي: 14- المستدرك للحاكم: 214/2- ان سب نے یہ حدیث "محارب بن دثار عن ابن عمر" کے طریق سے مرفوع روایت کی ہے۔ ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے اور بیہقی نے بھی ان کی پیروی کی ہے۔ خطابی کہتے ہیں: یہ حدیث مشہور ہے اور "سنن الدار قطني" (35/4) میں حدیث معاویہؓ سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: اور نہ رب تعالیٰ نے روئے زمین پر طلاق سے مبغوض کوئی شے پیدا ہی کی ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 431/1- سنن البیهقي: 322/7.

اس حدیث کے معنی میں بھی نکارت ہے کیونکہ کوئی حلال شے عنداللہ مبغوض ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر رب تعالیٰ کو ایک شے مبغوض ہوتی تو رب تعالیٰ اس کو حلال ہی نہ کرتے۔

البتہ حدیث کی صحت کی صورت میں متن کی اس نکارت کی توجیہ یوں کی جاسکتی ہے کہ یہاں مبغوض سے مراد غیر محبوب ہے۔

طلاق کی اقسام

علماء نے طلاق کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں:

(1) واجب طلاق:

یہ وہ طلاق ہے جس کا دینا ایلاء کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ایک آدمی اس بات کی قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی سے جماع نہ کرے گا تو ہم اس سے اس بات کا مطالبہ کریں گے کہ یا تو وہ بیوی کو طلاق دے دے یا پھر رجوع کرلے۔

(2) حرام طلاق:......

یہ بدعی طلاق ہے۔ یہ حیض میں یا ایسے طہر میں دی جانے والی طلاق ہے جس میں اس نے بیوی سے جماع بھی کیا ہو۔ کہ ان دونوں صورتوں میں طلاق دینا حرام ہے۔

(3) مستحب طلاق:

یہ وہ طلاق کہ جب بیوی کو خاوند کے ساتھ رہتے ہوئے ضرر ہوتا ہو۔ لہٰذا اگر بیوی کی مصلحت اور اس سے ضرر کو دفع کرنا اسے طلاق دینے سے ہی ممکن ہو تو تب اسے طلاق دینا مستحب ہوگا۔

(4) مباح طلاق:

اگر طلاق دینے کا داعیہ کوئی شرعی حاجت ہو تو طلاق دینا مباح ہوگا جیسے تنگدستی فقر و فاقہ وغیرہ کہ اس وجہ سے بھی بیوی کو طلاق دینا مباح ہے۔

(5) مکروہ طلاق:

وہ طلاق جو ان مذکورہ بالا چاروں اقسام میں سے نہ ہو۔ غرض طلاق کا سبب ہونا ضروری ہے وگرنہ طلاق دینا مکروہ یا حرام ہوگا۔

حیض والی کو طلاق دینے کا حکم

1070۔ وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ، وَهِيَ حَائِضٌ، فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَسَأَلَ عُمَرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: ((مُرْهُ، فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لْيُمْسِكْهَا حَتّٰى تَطْهُرَ، ثُمَّ تَحِيْضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِيْ أَمَرَ اللّٰهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے عہد رسالت میں اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس بارے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا؟ (کہ ایسی حالت میں بیوی کو طلاق دینے کا شرعی حکم کیا ہے؟) تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے حکم دو کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے، پھر اسے اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ (حیض ختم ہو جانے پر) پاک ہو جائے، پھر اسے (دوبارہ) حیض آئے (اور) پھر وہ (اس حیض سے بھی دوبارہ) پاک ہو جائے، پھر اگر

چاہے تو اس کے بعد اسے اپنے پاس رکھ لے اور چاہے تو (اس سے) جماع کرنے سے پہلے (اسے) طلاق دے دے۔ پس یہ وہ عدت ہے جس کا رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس عدت کے وقت عورتوں کو طلاق دی جائے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......وَهِيَ حَائِضٌ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "امْرَأَتَهُ" سے حال ہے۔

حیض کی لغوی، اصطلاحی اور فقہی تعریفات کو کتاب الحیض میں مفصل ذکر کر دیا گیا ہے۔

فَسَأَلَ عُمَرُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ: مراد اپنے بیٹے کی اس طلاق کے بارے میں دریافت کرنا ہے جو انہوں نے بیوی کو حالت حیض میں دی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس طلاق کے بارے میں دریافت کرنا اس لیے تھا کہ انہیں یہ بات بے حد عجیب لگی تھی کیونکہ وہ لوگ بیویوں کو حالت حیض میں طلاقیں دینے کے عادی نہ تھے۔

غرض ہر سوال کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ احتمال ہے کہ اس سوال کا سبب یہی امر ہو جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اور ہم نے اس احتمال کو اس لیے ذکر کیا تا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حالت حیض میں دی جانے والی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ حائض کی طلاق کا حکم آگے آ رہا ہے۔

مُرْهُ: یعنی ان سے کہو۔

فَلْيُرَاجِعْهَا: مذکورہ لام امر کا ہے۔ یعنی ان سے کہو کہ وہ اس طلاق سے رجوع کر لیں اور مراجعت سے یہاں لغوی مراجعت مراد ہے یا شرعی؟ تو علماء اس بابت دونوں طرف گئے ہیں۔ چنانچہ بعض علماء کا قول ہے کہ یہاں مراجعت سے شرعی مراجعت مراد ہے جو طلاقِ شرعی کے بعد ہوتی ہے۔ تب پھر حالت حیض میں دی جانے والی طلاق معتبر شمار ہو گی اور بعض کے نزدیک لغوی مراجعت مراد ہے یعنی بیوی کو اپنی پہلی حالت پر واپس لے آؤ۔

اب پہلا قول جمہور علماء کا ہے جبکہ دوسرا قول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم نوا علماء کا ہے۔ جان لیجیے کہ یہ مسئلہ بے حد اہم سنگین اور بڑے اختلافی مسائل میں سے ہے۔ اسی لیے شیخ ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" میں اس مسئلہ پر مفصل کلام کیا ہے جس کے ذکر کا یہ مختصر رسالہ متحمل نہیں، جو چاہے اس بحث کو وہاں دیکھ لے۔

ثُمَّ لِيُمْسِكْهَا حَتّٰى تَطْهُرَ، ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ: یعنی جس حیض میں طلاق دی ہے، اس کے بعد اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر اسے دوبارہ حیض آئے، اور پھر وہ اس سے بھی پاک ہو جائے، اور اس تمام عرصہ میں اس سے جماع نہ کرے۔ تا کہ جس حیض میں طلاق دی ہے، وہ مکمل ہو جائے، پھر ایک طہر مکمل ہو جائے، پھر دوسرا حیض بھی مکمل ہو جائے۔ پھر جب دوسرا طہر آئے تو اسے اختیار ہو گا کہ چاہے تو اپنے پاس رکھ لے اور اسے طلاق نہ دے اور چاہے تو طلاق دے دے۔ اسی بات کو "ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ" کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 5252- صحيح مسلم: 1471.

رہا یہ سوال کہ یہ طلاق نئی طلاق ہوگی یا وہی پہلے والی طلاق ہوگی؟ تو یہ اختلاف بھی اسی اختلاف پر مبنی ہے جو مراجعت میں ہے۔ لہٰذا اگر تو حیض میں طلاق دینے کے بعد مراجعت کا حکم اس کے شرعی مراجعت ہونے کا ہے تو یہ دوسری طلاق ہوگی اور اگر وہ مراجعت لغوی تھی تو یہ پہلی طلاق شمار ہوگی۔ پھر اگر اس نے دو حیض گزرنے اور دوسرے کے آجانے پر اسے طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر یہ طلاق اس سے اس طہر میں جماع کیے بغیر دے گا۔ وگرنہ اسے دوبارہ انتظار کرنا پڑے گا کہ پہلے یہ طہر ختم ہو جس میں طلاق دی ہے اور جماع بھی کیا ہے، پھر اسے حیض آئے گا، پھر وہ دوبارہ پاک ہوگی تب پھر طلاق دے گا۔ کیونکہ جس طہر میں عورت سے جماع کر لیا ہو اس میں طلاق دینا جائز نہیں ہوتا۔

فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللّٰهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ: "تِلْكَ" یہ اسم اشارہ ہے اور اس کا مشارٌ الیہ ماسبق کے کلمات یا حکم ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس عدت اور طلاق کا ذکر کس سورت میں آیا ہے تو وہ سورۂ طلاق ہے جس میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ (الطلاق: 1)

''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو۔''

تب پھر عورتوں کی عدت یہ ہوگی کہ انہیں ایسے طہر میں طلاق دی جائے جس میں ان کے ساتھ جماع نہ کیا گیا ہو، البتہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی طلاق میں سنت یا بدعت کی کوئی تقسیم نہیں۔ لہٰذا حاملہ کو اگر جماع کرتے ہی طلاق دے دے تب بھی اس طلاق کو طلاقِ بدعی نہ کہیں گے اور مطلب یہ ہے کہ حاملہ کو دی جانے والی طلاق کو طلاقِ بدعی شمار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسے اس کی عدت کے وقت میں ہی طلاق دی گئی ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: ((مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لِيُطَلِّقْهَا طَاهِرًا أَوْ حَامِلًا)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''ان سے کہو کہ وہ اس سے رجوع کر لے پھر اسے طہر کی حالت میں یا حاملہ ہونے کی حالت میں طلاق دے۔''

وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرٰى لِلْبُخَارِيِّ: ((وَحُسِبَتْ عَلَيْهِ تَطْلِيقَةٌ)).

اور صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اور اسے ایک طلاق سمجھا جائے گا۔'' [1]

شرح :...... صحیح مسلم کی پہلی روایت میں، جو متفق علیہ ہے اور اس روایت میں یہ فرق ہے کہ پہلی روایت میں اس صورت کا بیان ہے جب وہ عورت کو اس حیض سے پاک ہونے کے بعد طلاق دے گا جس حیض میں اس نے پہلے طلاق دی تھی۔ جبکہ یہ روایت اس بات کو مقتضی ہے کہ جب آدمی نے بیوی کو اس طہر میں طلاق دی جو اس حیض کے بعد تھا جس میں اس نے طلاق دی تھی تو وہ طلاق جائز ہوگی کیونکہ اس طلاق پر یہ بات صادق آرہی ہے کہ اس نے بیوی کو حالت طہر میں طلاق دی ہے۔

اب علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں لفظ "طَاهِرًا" یہ مطلق ہے۔ لہٰذا اس کو ماقبل کی روایت پر بھی حمل کر سکتے ہیں جس میں دوسرے حیض سے پاک ہونے کے بعد آنے والے دوسرے طہر میں طلاق دینے کا حکم ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس آدمی کا دوسرے حیض تک انتظار کرنا سنت ہے یعنی دوسرے حیض کے بعد آنے

[1] صحيح البخاري: 5253.

والے دوسرے طہر تک انتظار کرنا سنت ہے۔ جبکہ اس پہلے طہر تک انتظار واجب ہے جو اس حیض کے بعد آتا ہے جس میں طلاق دی ہے۔ تب پھر یہ روایات کا اختلاف دو حکموں کے اختلاف پر محمول کیا جائے گا۔

دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر تو کسی نے جان بوجھ کر بیوی کو حیض میں طلاق دی ہے تو وہ دوسرے حیض سے پاک ہونے تک انتظار کرے گا اور اگر اس نے جان بوجھ کر طلاق نہیں دی تھی تو وہ صرف اسی حیض کے ختم ہونے تک انتظار کرے گا جس میں طلاق دی ہے اور یہ قول عمدہ ہے۔ پھر ان دونوں روایات میں یوں بھی ترجیح دے سکتے ہیں کہ پہلی روایت متفق علیہ ہے جبکہ دوسری روایت میں امام مسلم منفرد ہیں، پھر پہلی روایت میں زیادہ تفصیل ہے جبکہ دوسری روایت از حد اختصار ہے۔ تب پھر اقرب قول یہ ہے کہ دوسرے حیض کے بعد آنے والے طہر میں ہی طلاق دینا جائز ہوگا۔

رہی صحیح بخاری کی دوسری روایت جس میں امام بخاری منفرد ہیں تو ایک تو اس میں حُسِبَت فعل مجہول ہے اور یہ نہیں معلوم کہ یہ طلاق گنے گا کون؟ نبی کریم ﷺ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یا ان سے روایت کرنے والا؟ اس بنا پر بعض محدثین نے اس کلام کو مدرج شمار کیا ہے کہ یہ کلام اصلِ حدیث میں سے نہیں بلکہ اسے بعض رواۃ نے مذکورہ دونوں روایات سے سمجھ کر اس حدیث میں درج کیا ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ: لِمُسْلِمٍ: قَالَ ابْنُ عُمَرَ: أَمَّا أَنْتَ طَلَّقْتَهَا وَاحِدَةً أَوِ اثْنَتَيْنِ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَمَرَنِيْ أَنْ أُرَاجِعَهَا، ثُمَّ أُمْسِكَهَا حَتَّى تَحِيْضَ حَيْضَةً أُخْرٰى، ثُمَّ أُمْهِلَهَا حَتَّى تَطْهُرَ، ثُمَّ أُطَلِّقَهَا، قَبْلَ اَنْ أَمَسَّهَا، وَاَمَّا اَنْتَ طَلَّقْتَهَا ثَلَاثًا، فَقَدْ عَصَيْتَ رَبَّكَ فِيمَا أَمَرَكَ بِهٖ مِنْ طَلَاقِ امْرَأَتِكَ.

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: البتہ (اگر) تم نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوتیں (تو تم اس سے رجوع کر سکتے تھے) کیونکہ (میرے ساتھ بھی جب ایسا ہوا تھا تو) نبی کریم ﷺ نے مجھے اس بات کا حکم دیا تھا کہ میں اس سے رجوع کر لوں، پھر اس کو اپنے پاس روکے رکھوں۔ یہاں تک کہ اسے (اس حیض سے جس میں میں نے اسے طلاق دی تھی پاک ہو جانے کے بعد) ایک اور حیض آئے۔ پھر میں اسے چھوڑے رکھوں یہاں تک کہ وہ (اس دوسرے حیض سے بھی) پاک ہو جائے، پھر میں (اگر چاہوں تو) اسے جماع کرنے سے پہلے طلاق دے دوں، اور رہے تم (تو) تم نے اسے تین طلاقیں دے دی ہیں۔ پس تحقیق تم نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بابت رب تعالیٰ نے تمہیں جو حکم دیا تھا اس میں تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے۔ ❶

غریب الحدیث: .....أَمَّا أَنْتَ طَلَّقْتَهَا.....: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ بات اس شخص کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہے ہیں جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں کہ اگر تم نے دو یا ایک طلاق دی ہوتی تو تم رجوع کر سکتے تھے جیسے میں نے صرف ایک طلاق دی تھی تو نبی کریم ﷺ نے مجھے رجوع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا۔ کیونکہ ایک طلاق یا دو طلاقیں دینے

❶ صحیح مسلم: 1471.

والا رجوع کر سکتا ہے۔اس کی دلیل سورۂ بقرہ کی یہ مشہور آیت ہے:﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ (البقرۃ: 229) ''یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے۔''

أَوِ اثْنَتَيْنِ: بظاہر ان الفاظ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جس طرح ایک طلاق دینا جائز ہے اسی طرح بیک وقت دو طلاقیں دینا بھی جائز ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں کیونکہ دو اکٹھی طلاقیں دینا مکروہ یا حرام ہے کیونکہ اس میں بیوی بائنہ کرنے کی جلدی مچانا ہے۔ کیونکہ ایک طلاق دینے کے بعد دو طلاقیں باقی ہوتی ہیں، جبکہ دو طلاقیں دے دینے کے بعد ایک ہی طلاق باقی رہ جاتی ہے۔ یوں یہ آدمی بیوی کو چھوڑنے میں عجلت کرنے والا اور خود کو رب کی نعمت سے محروم کرنے والا بن جاتا ہے۔

وَأَمَّا أَنْتَ طَلَّقْتَهَا ثَلَاثًا: مراد تیسری طلاق دینا نہیں بلکہ بیک وقت تین طلاقیں دینا مراد ہے۔ چاہے: ''تمہیں تین طلاق'' کہے، اور چاہے یہ کہے کہ ''تمہیں طلاق، طلاق، طلاق ہے۔''

فَقَدْ عَصَيْتَ رَبَّكَ: کیونکہ رب تعالیٰ نے اکٹھی تین طلاقیں دینے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ پہلے ایک طلاق دی جائے، پھر دوسری اور پھر تیسری۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ احادیث کا مضمون واضح ہے کہ:

(1) ایک تو یکبارگی تینوں طلاقیں نہ دی جائیں۔

(2) دوسرے حالت حیض میں طلاق نہ دی جائے۔

(3) تیسرے جس طہر میں جماع کر لیا ہے، اس میں طلاق نہ دی جائے۔ بلکہ اب طہر اور پھر اس کے بعد حیض کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے اور پھر طہر میں بنا جماع کیے طلاق دی جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بسا اوقات اہل علم پر بھی شریعت کا کوئی حکم مخفی رہ جاتا ہے جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر یہ بات مخفی رہ گئی تھی کہ حالت حیض میں طلاق نہیں دی جاتی۔
- حکم شرعی کے پہنچانے میں کسی کو نائب بنا سکتے ہیں۔ اس دلیل "مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا" کے الفاظ ہیں۔ تب پھر مفتی کسی کے ہاتھ چند لوگوں تک کسی حلال یا حرام کی بابت پیغام پہنچا سکتا ہے۔
- حالتِ حیض میں طلاق دینا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس طلاق کے رد کا حکم دیا تھا۔
- حرام بات شرعاً نافذ نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل "مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا" کے الفاظ ہیں۔
- حالتِ حیض میں طلاق دینے والے پر واجب ہے کہ وہ دوسرے حیض کے ختم ہونے کے بعد تک انتظار کرے۔
- جس طہر میں جماع کیا ہے اسی میں طلاق دینا جائز نہیں۔ اس کی دلیل "إِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ سنت قرآن کی تفسیر کرتی ہے۔ اس کی دلیل "فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللّٰهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ" کے الفاظ ہیں۔
- حاملہ کو جماع کر کے بھی طلاق دے سکتے ہیں۔
- معلوم ہوا کہ جس کو نابالغ ہونے کی وجہ سے یا عمر رسیدہ ہو جانے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو اس کو بھی جماع کر کے طلاق

دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں عورتوں کی عدت طلاق ملتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

◈ ان جملہ مذکورہ روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ طلاق کی کل چار قسمیں ہیں جن میں سے دو حلال اور دو حرام ہے۔

دو حلال طلاقیں یہ ہیں:

(1) ایسے طہر میں طلاق دے جس میں بیوی سے جماع نہ کیا ہو۔

(2) اور اگر بیوی حاملہ ہو تو اس کو جماع کر کے بھی طلاق دے سکتے ہیں۔

دو حرام طلاقیں یہ ہیں:

(1) حالتِ حیض میں طلاق دے۔

(2) یا ایسے طہر میں طلاق جس میں اس کے ساتھ جماع بھی کیا ہو۔

البتہ یہ حکم مدخول بہا بیوی کا ہے اور اگر بیوی غیر مدخول بہا ہو تو اسے حیض اور طہر دونوں حالتوں میں طلاق دے سکتے ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ (الطلاق: 1)

''تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو۔''

یہ آیت اس بات کی مقتضی ہے کہ طلاق عدت کے لیے ہوتی ہے اور غیر مدخول بہا کی کوئی عدت نہیں۔

◈ مذکورہ احادیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مطلقہ کی دو قسمیں ہیں: (1) مدخول بہا (2) غیر مدخول بہا۔

⊙ ...... اب ان دونوں کو تین اکٹھی طلاقیں دینا تو جائز نہیں۔

⊙ ...... پھر غیر مدخول بہا کو طہر اور حیض دونوں حالتوں میں طلاق دے سکتے ہیں۔

⊙ ...... پھر مدخول بہا کو حیض اور نفاس میں طلاق دینا حرام ہے۔

⊙ ...... پھر اگر وہ طاہر ہو اور اس کا حمل ظاہر ہو تو اسے جماع سے قبل اور بعد دونوں حالتوں میں طلاق دینا جائز ہے۔

⊙ ...... اور اگر وہ پاک ہے اور غیر حاملہ بھی ہے تو اس کو جماع کر کے طلاق دینا حرام ہے۔

یہ سب صورتیں رب تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی زبانی مشروع فرمائی ہیں اور امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس طلاق کی اجازت ہے، اگر اسے ایک مکلف، مختار اور اپنے الفاظ کا مدلول جاننے والا دے اور اس کا قصد بھی طلاق دینا ہو تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

◈ نابالغ سے وقوعِ طلاق میں اختلاف ہے۔ مذہب یہ ہے کہ اگر وہ طلاق کو سمجھتا ہے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ تب پھر مجنون کی طلاق واقع نہ ہو گی کیونکہ وہ طلاق کو نہیں سمجھتا۔

◈ مختار کی طلاق واقع ہو جائے گی تب پھر مکرہ (زبردستی کیے گئے) کی طلاق واقع نہ ہو گی۔

◈ طلاق دینے والا اپنے الفاظ کے مدلول کو جانتا ہو۔ تب پھر اگر کسی عجمی کو لفظ طلاق کا معنی نہ آتا ہو یا کسی عربی نے غیر زبان کا ایسا لفظ ادا کیا جس کی بابت اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس سے مراد طلاق ہوتی ہے تو ایسے دونوں شخصوں کی طلاق واقع نہ ہو گی۔

◈ اور اگر کسی نے بلا قصد ''انت طالق'' کہہ دیا تو طلاق واقع نہ ہو گی۔ البتہ عدالت میں مقدمہ لے جانے کی صورت میں

طلاق کا حکم نافذ ہوگا۔ کیونکہ قضا ظاہر پر نافذ ہوتی ہے اور نیت ایک باطنی امر ہے۔

حرام طلاقیں

حرام طلاقیں تین ہیں:

(1) حیض میں (2) یا اس طہر میں طلاق دینا جس میں جماع بھی کیا ہو۔

(3) تین طلاقیں اکٹھی دینا۔

حیض میں طلاق

یہ طلاق حرام اور غیر ثابت ہے، سلف اور خلف کا مذہب یہی ہے اور جو اس طلاق کے وقوع پر اجماع کا مدعی ہے، اسے وہم ہوا ہے۔ حتیٰ کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اجماع کے اس مدعی کو کاذب تک کہا ہے۔

اس بارے علماء میں جو اختلاف ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، اس لیے اس طلاق کے وقوع پر اجماع کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ اسی طرح جس طہر میں جماع کیا ہوا اس میں بھی طلاق دینا حرام ہے اور اکٹھی تین طلاقیں دینا بدعت اور حرام ہے۔ اس کی مزید تفصیل ذیل میں ایک روایت کے بعد آ رہی ہے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ أُخْرٰى: قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: فَرَدَّهَا عَلَيَّ، وَلَمْ يَرَهَا شَيْئًا، وَقَالَ: إِذَا طَهُرَتْ فَلْيُطَلِّقْ، أَوْ لِيُمْسِكْ.

اور صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے میری بیوی مجھ پر واپس فرما دی اور اسے (یعنی حالت حیض میں میں نے جو طلاق دی تھی اسے) کچھ نہ سمجھا اور ارشاد فرمایا کہ: ''جب یہ پاک ہو جائے تو (چاہے تو) اسے طلاق دے دینا اور یا (چاہے تو) اسے رکھ لینا۔'' [1]

غریب الحدیث :......وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى: کلام کا ظاہر سیاق یہ بتلاتا ہے کہ یہ روایت بھی صحیح مسلم کی ہے (جیسا کہ تخریج سے ظاہر ہے اسی لیے بندہ مترجم نے صراحتہً صحیح مسلم کے حوالہ سے ترجمہ کر دیا ہے) کیونکہ گزشتہ روایت میں ''وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ'' کے اور اس روایت میں ''وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى'' کے الفاظ ہیں۔

وَلَمْ يَرَهَا شَيْئًا: یعنی آپ ﷺ نے حیض میں دی جانے والی اس طلاق کو حکم شرعی میں سے کچھ نہ سمجھا۔ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔

دورِ فاروقی میں تین طلاقیں اکٹھی دینے کے حکم میں اختلاف

1071- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: ((كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً ، فَقَالَ عُمَرُ : إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِيْ أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ أَنَاةٌ ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: دورِ نبوی میں اور دورِ صدیقی میں اور دورِ فاروقی کے پہلے دو سال میں تین طلاقوں کو ایک (کے حکم میں) سمجھا جاتا تھا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (لوگوں کا حال دیکھ کر) ارشاد فرمایا: لوگوں نے اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لیا جس میں انہیں غور و فکر (تحمل، اور

[1] صحیح مسلم: 1471.

عَلَيْهِمْ ، فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ)) . | بردباری) سے کام لینا چاہیے تھا۔ پس اگر ہم نے اس مسئلہ کو لوگوں پر جاری کیا ہے تو خود لوگوں نے بھی اس مسئلہ کو اپنے اوپر جاری کیا ہے۔ [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ . | اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: یہ بحث مفصل گزر چکی ہے کہ جب یہ الفاظ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ادا کرے تو پھر وہ روایت مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔

وَأَبِي بَكْرٍ: خلافت صدیقی کی مدت دو سال اور چند ماہ تھی۔

وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ: اور اگر اس مدت کو خلافتِ صدیقی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ملا لیا جائے تو یہ چار سال اور چند ماہ بنتے ہیں۔

طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً: "طَلَاقُ الثَّلَاثِ" یا تو یہ لفظ "كَانَ الطَّلَاقُ" میں مذکورہ "اَلطَّلَاقُ" سے بدل ہے یا پھر اس کا عطف بیان ہے۔ اب اس کی صورت کیا تھی؟

⊙ ...... یا تو آدمی یہ کہتا تھا کہ تمہیں تین طلاق۔

⊙ ...... یا پھر یوں کہتا تھا کہ تمہیں طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔

تو بظاہر یہاں دوسرا صیغہ مراد ہے۔ جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ اس نے تین بار سبحان اللہ کہا تو مراد سبحان اللہ، سبحان اللہ اور سبحان اللہ کہنا ہے نہ کہ سبحان اللہ تین بار۔ پس معروف صیغہ وہی ہے جو دوسرا ہے۔

غرض دورِ نبوی میں اور خلافت راشدہ کے ابتدائی چار سال اور چند ماہ تک اس طرح دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا۔ بعد میں لوگ اسی دستور پر رہے کہ تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں۔ کیونکہ ایسا کرنا حرام تھا اور اس کی تحریم کی وجہ یہ ہے کہ بیوی کو ایک طلاق دینے کے بعد فوراً دوسری طلاق دینا اس کی غیر عدت میں طلاق دینا ہے۔ کیونکہ ابھی اس کی نئی عدت تو شروع نہیں ہوئی۔ کیونکہ ابھی تو یہ پہلی طلاق کی عدت میں ہے۔ جبکہ فوراً بعد ہی تیسری طلاق دینا اس سے بھی اشد ہے۔ کہ ابھی تو دوسری طلاق کی عدت کا وقت شروع نہیں ہوا اور اس نے تیسری طلاق دے دی ہے۔ یوں یہ شخص رب تعالیٰ کی حدود میں جلدی مچانے والا بن گیا اور یہی رب تعالیٰ کی نافرمانی ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی گزشتہ حدیث میں ہے کہ انہوں نے ایسا کرنے والے کو رب تعالیٰ کا نافرمان قرار دیا ہے:

فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: إِنَّ النَّاسَ...... : اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے حد دقیق فہم و بصیرت کے مالک تھے اور آپ لوگوں کو زیادہ تر سختی والے امور پر چلاتے تھے اور رب تعالیٰ کے احکام میں نرمی سے کام نہ لیتے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر آپ نے حکمت اسی بات میں دیکھی کہ لوگوں کو انہی باتوں کا پابند بنایا جائے جن کی پابندی وہ از خود اختیار کرتے تھے۔ چاہے وہ بات شرعاً حرام اور ممنوع بھی تھی۔ اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کا اسوہ تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے لوگوں کو صومِ وصال سے منع فرمایا، لیکن لوگ یہ سمجھے کہ شاید آپ ﷺ کی یہ ممانعت شفقت کے طور

---

[1] صحیح مسلم: 1472 .

پر ہے اور یہ کہ وہ صوم وصال رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے صوم وصال رکھنا نہ چھوڑا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے بھی انہیں لگا تار تین دن تک روزے رکھوائے پھر چاند نکل آیا، تب لوگوں نے روزہ رکھنا چھوڑا اور آپ ﷺ نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: ''اگر چاند نہ نکلتا تو میں تم لوگوں کو مزید روزے رکھواتا۔'' گویا کہ آپ ﷺ نے ان کی تنبیہ اور سرزنش کے طور پر ایسا کیا تھا حالانکہ صوم وصال یا تو مکروہ ہے یا پھر حرام ہے۔ لیکن جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ خود اس بات کا التزام کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے بھی انہیں اسی بات کا پابند بنا دیا۔

بالکل اسی طرح تین طلاقیں دینے میں رب تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عقوبت کا یہ معاملہ فرمایا کہ جب انہوں نے خود سے تین طلاقیں بیک وقت دی ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان تین طلاقوں کو ان پر نافذ اور جاری وساری فرمایا اور ان لوگوں کے حق میں یہی سزا کافی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو بیویوں سے رجوع کرنے سے منع فرما دیا۔ تب پھر ایک آدمی کو جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ اگر اس نے تین طلاقیں اکٹھی دے دیں تو رجوع کا امکان اب نہیں ہوگا تو لامحالہ وہ سوچ سمجھ کر یہ اقدام کرے گا اور اب طلاق دینے کے اس کھلواڑ کی جرأت نہ کرے گا۔ تب پھر دورِ فاروقی میں تین طلاقوں کو تین قرار دینا بابِ سیاست میں سے تھا۔ لہٰذا اگر تو یہ آئے روز کا قصہ بن جائے تو بلاشبہ ان لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان کی تین طلاقوں کو تین ہی کہا جائے۔ لیکن اگر ایسا واقعہ شاذ و نادر ہو تو اس کو دورِ نبوی کے حکم پر رکھا جائے۔

قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ: ''أَنَاةٌ'' سے مراد سنجیدگی متانت، تاخیر، توقف، آہستگی سکون اور غور و تدبر کے ساتھ کام کرنا ہے۔

یعنی طلاق کے امر میں یہ سہولت، وسعت، گنجائش اور مہلت تھی کہ آدمی ایک طلاق دینے کے بعد عدت گزر جانے پر مختار ہوتا تھا کہ چاہے تو بیوی سے رجوع کر لے اور چاہے تو دوسری طلاق دے دے۔ لیکن یکبارگی تین طلاق دینے والے نے اس مبنی بر سہولت امر میں جلد بازی سے کام لے کر خود پر تنگی کر لی اور خود کو رجوع کے اختیار سے محروم کرنے کی کوشش کی۔

فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ: یعنی آج اگر ہم یکبارگی تین طلاقیں دینے والے پر تین طلاقوں کا حکم جاری کرتے ہیں تو یہ کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔

یکبارگی تین طلاقیں دینے کا حکم

یکبارگی تین طلاقوں کی دو صورتوں کو ہم نے ابھی اوپر ذکر کر دیا ہے۔ اب ایسی تین طلاقیں جاری ہوتی ہیں یا نہیں تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔

چنانچہ ائمہ اربعہ سمیت اکثر امت اس بات کی قائل ہے کہ تین طلاقیں تین ہیں، اور عورت ان سے بائنہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ طلاقیں اس نے اپنے اختیار سے دی ہیں، دوسرے اس باب میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سنت بھی تین کے تین ہونے کی دلیل ہے اور سنت فاروقی سنت متبعہ ہے جس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ رہی مذکورہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ جس میں تین طلاقوں کو ایک کہا گیا ہے تو ان علماء نے اس حدیث کے دو جواب دیے ہیں:

(1) بعض نے تو اس حدیث کی سند میں طعن کیا ہے۔

(2) جبکہ بعض نے اس کی دلالت میں طعن کیا ہے اور اس کی یہ تاویل بیان کی ہے کہ یہاں غیر مدخول بہا کا مسئلہ مذکور ہے۔

غیر مدخول بہا کا مسئلہ معروف ہے کہ وہ پہلی طلاق سے ہی بائنہ ہو جاتی ہے لہٰذا اس کے حق میں باقی کی دو طلاقیں اکارت اور لغو ہیں اور وہ گویا کہ اجنبیہ پر پڑ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی تو عدت بھی نہیں ہوتی کہ اس کے بعد دوسری یا تیسری طلاق کی نوبت آئے۔ لہٰذا مذکورہ حدیث غیر مدخول بہا پر وارد ہے۔

لیکن اس تاویل پر سبحان اللہ نہ کہیے تو اور کیا کہیے! یہ حضرات خود بتلائیں کہ طلاق کا وقوع اکثر مدخول بہا میں ہوتا ہے یا غیر مدخول بہا میں!! بھلا ایک کثیر الوقوع صورت کو چھوڑ کر ایک حدیث کو کسی نادر صورت پر محمول کرنا کیونکر روا ہو سکتا ہے؟؟؟ گویا کہ ہم نے حدیث کو مسائل نادرہ پر تو محمول کر لیا پر مسائل کثیرہ کو چھوڑ دیا۔ پس صحیح یہ ہے کہ یہاں طلاق سے مدخول بہا کی طلاق مراد ہے اور دورِ نبوی میں طلاقِ ثلاث کو ایک قرار دیا جاتا تھا۔ چاہے یہ تین طلاقیں مذکورہ دونوں صورتوں میں سے جس صورت کے ساتھ بھی دے اور یہ تین طلاقیں ایک اس لیے شمار کی جاتی ہیں کیونکہ ایک کے بعد دوسری غیر عدت میں پڑی ہے اسی لیے دورِ نبوی میں تین اکٹھی طلاقوں کو ایک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ لوگ یہ بات جانتے تھے کہ غیر عدت میں طلاق دینا حرام اور مردود ہے۔ تب پھر اجماع اس امر پر ہوگا کہ تین طلاقیں ایک ہیں۔ اسی لیے دورِ فاروقی کے پہلے دو سال بھی یہی امر رہا۔ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ ایسا کرنے سے باز نہیں آرہے تو انہیں سزا دینے کے لیے انہوں نے تین کو تین قرار دے دیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- تین اکٹھی طلاقیں واقع تو ہو جاتی ہیں لیکن اس میں اعتبار اصل کا ہوتا ہے نہ کہ وصف کا۔ لہٰذا طلاق جو کہ اصل ہے وہ تو واقع ہوگی جو کہ ایک ہوتی ہے لیکن وصف واقع نہ ہوگا جو کہ طلاق کا تین ہونا ہے۔
- تین طلاقوں کے ایک ہونے کی بابت اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ اجماع قدیم ہے تو یہ قول صحیح ہوگا۔
- ولی امر کو یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کی تعزیر اور اصلاح کے لیے انہیں کسی حق سے محروم کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تین اکٹھی طلاقوں کے بعد رجوع کے حق سے محروم کیا تاکہ وہ اس امر میں جلدی سے نہیں بلکہ تامل سے کام لیں۔
- طلاق پر طلاق دینا حماقت ہے اور یہ جلد بازی بھی ہے۔
- آدمی اپنی طرف تعظیم کے صیغہ کی اضافت کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "فَلَوْ أَمْضَيْتُه" کی بجائے "فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ؟" فرمایا کہ یہ تکبر اور بڑائی نہیں ہے۔

اکٹھی تین طلاقیں دینا یہ اللہ کی کتاب سے کھلواڑ ہے

1072۔ وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيدٍ رضي الله عنه قَالَ: أُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعًا، فَقَامَ غَضْبَانَ ثُمَّ قَالَ: ((أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ، وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟)) حَتّٰى قَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَلَا أَقْتُلُهُ؟)).

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کو ایک صاحب کے بارے میں بتلایا گیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں یکبارگی دے دی تھیں تو آپ ﷺ غصہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ارشاد فرمایا: ''کیا کتاب اللہ سے کھلواڑ کیا جا رہا ہے حالانکہ ابھی میں تم لوگوں کے درمیان موجود ہوں۔'' یہاں تک کہ ایک صاحب نے (آپ ﷺ کے اُن صاحب پر اس قدر غصہ کو دیکھتے ہوئے) اٹھ کر یہ عرض کیا کہ: اے

اللہ کے رسول! (ارشاد ہو تو) کیا میں اس کو جان سے نہ مار دوں؟'' ❶ اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے، اس حدیث کے رواۃ ثقہ ہیں۔

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَرُوَاتُهُ مُوَثَّقُوْنَ.

غریب الحدیث :......أُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: یہاں یہ نہیں بتلایا گیا کہ یہ خبر دینے والے کون تھے؟ تو جان لیجیے کہ صحابی رسول کے نام کے مجہول ہونے سے حدیث اور اس کے حکم پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔

عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ اِمْرَأَتَهُ: یہاں بھی طلاق دینے والے صاحب اور ان کی مطلقہ اہلیہ کا نام مجہول ہے لیکن نفس حکم پر اس سے کوئی زد نہیں پڑتی۔

ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا: اس کی ممکنہ دونوں صورتیں ذکر کی جا چکی ہیں۔ یعنی ان صاحب نے ایک ہی جملہ میں تین طلاقیں دے دیں۔

فَقَامَ: مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔

غَضْبَانَ: یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ غصہ اگر حظ نفس کے لیے ہو تو مذموم ہے وگرنہ محمود ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ذاتی انتقام کے لیے غصہ میں نہ آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی غصہ میں آتے تھے تو رب تعالیٰ کی حرمتوں کے توڑے جانے پر غصہ میں آتے تھے۔

أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى، وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ: مذکورہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنے والے پر انکار فرما رہے ہیں۔

وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ کتاب اللہ سے حال ہے اور کتاب اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ مذکورہ استفہام اس لیے انکار کے لیے ہے کہ ابھی میں موجود ہوں اور کتاب اللہ کے ساتھ یوں کھلواڑ کیا جا رہا ہے تو میرے مر جانے کے بعد تو اس سے بھی سخت معاملہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ نبوی میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت یہ بعد کے زمانوں میں کی جانے والی مخالفتوں سے اشد تھی۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انکار و تعجب پر مبنی کلام ارشاد فرمایا۔

رہا یہ امر کہ تین طلاقوں کا یکبارگی دینا کتاب اللہ سے مذاق کیونکر ہے؟ تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب رب تعالیٰ نے تین طلاقوں کو الگ الگ طہر میں دینے کا صریح حکم ارشاد فرمایا ہے تو یکبارگی تینوں طلاقیں دینا اس حکم الٰہی کے ساتھ مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟؟

حَتَّى قَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، أَلَا أَقْتُلُهُ: ان صاحب نے یہ بات جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے حد غصہ کو دیکھ کر کہی تھی۔ کیونکہ بظاہر کافر ہی کتاب اللہ کو مذاق اور کھیل تماشا بناتا ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون بھی بالکل واضح ہے، اس میں اکٹھی تین طلاقیں دینے کے از حد مذموم ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

❶ سنن النسائی: 142/6۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5594۔ امام ابن کثیر اپنی تفسیر (278/1) میں ارشاد فرماتے ہیں۔ اس حدیث کی اسناد میں انقطاع ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ کسی برے کام کی خبر دینا اس غرض سے جائز ہے تاکہ اس کا حکم معلوم ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس خبر کے دینے والے پر کوئی انکار نہیں فرمایا تھا۔

◈ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینا حرام ہے اس کی دلیل "أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک وقت میں ایک طلاق دینا جائز ہے اور علماء نے اس کو سنت طلاق کا نام دیا ہے۔ ❶ جبکہ اکٹھی دو طلاقیں دینا مکروہ اور اکٹھی تین طلاقیں دینا حرام ہے۔ جبکہ دو اکٹھی طلاقوں کی بابت بھی صحیح قول ان کے حرام ہونے کا ہی ہے۔

◈ وعظ کے وقت جوش اور غضب میں آنا جائز ہے۔ اس کی دلیل "فَقَامَ غَضْبَانَ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ غضب شدید نہ ہو۔

◈ مناسب یہ ہے کہ منکر پر بلا تاخیر اور برملا نکیر کی جائے۔ اس کی دلیل "فَقَامَ" کے الفاظ ہیں کہ جس میں ''فا'' ترتیب اور تعقیب کے لیے ہے اور حکمت کا مقتضیٰ بھی یہی ہے۔ کیونکہ بسا اوقات منکر پر نکیر میں تاخیر اس کے امر میں تخفیف پیدا کر دیتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی نکارت ہلکی اور سرد پڑ جاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو منکر پر نکیر میں تاخیر آدمی کو یہ فریضہ بھلا ہی دیتی ہے۔

◈ یکبارگی تین طلاقیں دینے والے پر شدید انکار۔ کہ ایسا کرنے والے کو کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنے والا کہا گیا ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شدید غیرت دینی کہ انہوں نے اس شخص پر جناب رسول اللہ ﷺ کو بے حد غصہ ہوتے دیکھا اور یہ سنا کہ ایسا شخص تو کتاب اللہ سے کھلواڑ کرنے والا ہوتا ہے تو انہوں نے اس شخص کی گردن مار دینے کی اجازت مانگی۔

◈ البتہ یاد رہے کہ ایسے افعال کا ارتکاب کسی کے خون کو مباح یا ہدر نہیں بنا دیتا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت مرحمت نہ فرمائی تھی۔

تین طلاقوں کے بعد رجوع کا حکم

1073۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: طَلَّقَ أَبُوْ رُكَانَةَ أُمَّ رُكَانَةَ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((رَاجِعِ امْرَأَتَكَ)) فَقَالَ: إِنِّيْ طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا، قَالَ: ((قَدْ عَلِمْتُ، رَاجِعْهَا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے (اپنی اہلیہ) ام رکانہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ: ''اپنی بیوی سے رجوع کر لو۔'' انہوں نے عرض کیا کہ (بھلا میں کیسے رجوع کر لوں جبکہ) میں (تو) اسے تین طلاقیں (یکبارگی) دے چکا ہوں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں (یہ بات) جانتا ہوں (پر) تم اس سے رجوع کر لو۔'' ❷

---

❶ الانصاف للمرداوی: 8/455۔ الاقناع للماوردی، ص: 148۔
❷ سنن ابی داؤد: 2196۔ امام حاکم (2/533) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

1073- وَفِيْ لَفْظٍ لِأَحْمَدَ: طَلَّقَ أَبُوْ رَكَانَةَ امْرَأَتَهُ فِيْ مَجْلِسٍ وَاحِدٍ ثَلَاثًا، فَحَزِنَ عَلَيْهَا، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فَإِنَّهَا وَاحِدَةٌ)).

اور مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ابورکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں (یکبارگی) تین طلاقیں دے دیں جس پر انہیں اپنی بیوی پر (بے حد) غم ہوا، تو نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا: ''یہ تینوں طلاقیں (جو تم نے ایک ہی مجلس میں دی ہیں حکم کے اعتبار سے) ایک ہیں۔ [1]

وَفِيْ سَنَدِهِمَا ابْنُ إِسْحَاقَ، وَفِيْهِ مَقَالٌ.

سنن ابی داؤد اور مسند احمد کی ان دونوں روایات کی سندوں میں ابن اسحاق ہے، جس میں (حضرات محدثین نے) کلام (کیا) ہے۔

معرفة الرواة :......ابن اسحاق، مشہور صاحب سیرت و مغازی ہیں جن کی شہرت حضرات محدثین کے ہاں تدلیس کرنے کے حوالہ سے ہے۔ مدلس وہ راوی ہوتا ہے جو اپنے سے اوپر کے راوی سے یوں حدیث روایت کرتا ہے جیسے اس سے بلا واسطہ یہ حدیث سنی ہو، حالانکہ اس نے اس اوپر کے راوی سے وہ حدیث بلا واسطہ نہیں سنی ہوتی۔ بلکہ اس راوی اور اس کے درمیان ایک اور شخص کا واسطہ ہے جس کو اس مدلس راوی نے ذکر نہیں کیا ہوتا۔ یوں ایک معروف مدلس کی اسناد منقطع ہوتی ہے جس میں ایک راوی ساقط ہوتا ہے۔ مدلس کی روایت کی بابت حضرات محدثین نے یہ حکم بیان کیا ہے کہ اگر تو وہ تحدیث کی صراحت کر دے تو اس کی روایت مقبول ہوگی وگرنہ مردود ہوگی۔ پھر اس کی روایت کے مقبول ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ثقہ رواۃ ہی سے ارسال کرتا ہو، یا اس کے بارے میں یہ معروف ہو کہ وہ صرف اسی صورت میں ارسال کرتا ہے کہ جب اسے اپنے اور اوپر کے راوی کے درمیان کے واسطہ کی وثاقت اور صحت کا علم ہو۔

روایة الحدیث :......اگرچہ یہ حدیث منقطع یا مرسل ہے اور ایسی حدیث ضعیف ہوتی ہے لیکن ان دونوں روایات کا ایک شاہد صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے موجود ہے اور یہ وہی پہلی حدیث (رقم: 1071) ہے جس میں یہ مضمون مذکور ہے کہ دورِ نبوی میں اور خلافتِ راشدہ کے پہلے چار سال اور چند ماہ تک یکبارگی دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا اور اس حدیث پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔

غریب الحدیث :......رَاجِعِ امْرَأَتَكَ: یعنی اگرچہ تم نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں، تب بھی اسے اپنے نکاح میں واپس لے آؤ۔

قَدْ عَلِمْتُ: یعنی نبی کریم ﷺ کو اس بارے میں علم ہو چکا تھا کہ جنابِ ابورکانہ رضی اللہ عنہ نے یکبارگی تین طلاقیں دے دی ہوئی ہیں۔ تبھی تو آپ ﷺ نے یہ حکم ارشاد فرمایا اور تفصیل طلب نہ فرمائی تھی وگرنہ آپ ﷺ پہلے طلاق دینے کے

---

[1] مسند احمد: 265/1- مسند ابی یعلی: 2500- من طریق ابن اسحاق عن داود بن الحصین عن عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ...... آگے یہ حدیث مروی ہے۔ ابن اسحاق ایک مجروح راوی ہے، اور داؤد جس سے انہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے، وہ ان سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ ثقہ رواۃ سے ایسی احادیث روایت کرتا ہے جو ثبت رواۃ کی احادیث نہیں لگتیں۔ اس لیے اس کی روایت سے بچنا واجب ہے۔

طریقہ کی بابت استفسار فرماتے۔

وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ: اس روایت کو لانے کا فائدہ یہ جتلا تا ہے کہ حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے یہ تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں دی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک قرار دے کر رجوع کا حکم ارشاد فرمایا تا کہ اُس بات کی تاکید ہو جائے جو حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں مذکور ہے کہ دورِ نبوی میں بیک وقت دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا۔

فَحَزِنَ عَلَيْهَا: یعنی جب انہوں نے اپنے تئیں یہ گمان کر لیا کہ میں تو تین طلاقیں دے بیٹھا ہوں، اب میری یہ بیوی میرے لیے حلال نہیں رہی تو بے حد افسردہ ہوئے۔ اسی لیے مسئلہ دریافت کرنے دربارِ نبوی میں جا پہنچے لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ تم اس سے رجوع کر سکتے ہو کہ یہ ایک طلاق ہے تو ان کا غم کافور ہو گیا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون بھی واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اگر مفتی کو کسی تفصیل طلب قضیہ کی بابت معلومات پہلے سے معلوم ہوں تو اس پر اس قضیہ کی تفصیل پوچھنا لازم نہیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔
- تین اکٹھی طلاقیں، ایک کے حکم میں ہیں۔ اس لیے اس صورت میں رجوع جائز ہے۔
- اگر مستفتی کو ضروری محسوس ہو کہ مفتی تک یہ بات بھی پہنچانا لازم ہے تو وہ معاملہ کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے وہ بات مفتی کو ضرور بتلائے۔ جیسا کہ حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے یہ بتلانا ضروری سمجھا کہ میں نے یہ تینوں طلاقیں ایک مجلس میں دی تھیں، اسی لیے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مراجعت کی اور عرض کیا کہ میں نے یہ تینوں طلاقیں یکبارگی دی ہیں۔
- اکٹھی تین طلاقیں دینا گو حرام ہے لیکن وہ واقع ضرور ہو جاتی ہیں البتہ ایک بن کر واقع ہوتی ہیں بخلاف روافض کے کہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ اکٹھی دی تین طلاقیں سرے سے واقع ہی نہیں ہوتیں، نہ ایک نہ تین۔

ایک کی نیت سے تین طلاقیں اکٹھی دینے کا حکم

1074۔ وَقَدْ رَوَى أَبُوْدَاوُدَ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ، أَحْسَنُ مِنْهُ: "أَنَّ أَبَا رُكَانَةَ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ سُهَيْمَةَ الْبَتَّةَ، فَقَالَ: وَاللّٰهِ! مَا أَرَدْتُ بِهَا إِلَّا وَاحِدَةً، فَرَدَّهَا إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ."

اور امام ابوداؤد نے ایک اور طریق سے جو گزشتہ طریق سے زیادہ بہتر ہے، یہ روایت کیا ہے کہ: جنابِ رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت سہیمہ رضی اللہ عنہا کو طلاقِ بتہ (یعنی بائنہ) دے دی اور (خدمت نبوی میں حاضر ہو کر) یہ عرض کیا کہ: اللہ کی قسم! میری اس طلاقِ بتہ سے مراد ایک ہی طلاق تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو انہیں لوٹا دیا۔ [1]

---

[1] سنن ابی داؤد: 2206۔ المستدرك للحاكم: 218/2۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث اس اسناد کے ساتھ صحیح ہے کیونکہ امام شافعی نے یہ حدیث اپنے گھر والوں سے یاد کی ہے، اور وہ اس حدیث کو اپنی "المسند" (268/1) میں اس اسناد کے ساتھ بیان کرتے ہیں: حدثني عمّي محمد بن علي ابن شافع، عن عبدالله بن علي بن السائب، عن نافع ابن عُجَيْر بن عبد يزيد، اور آگے مذکورہ حدیث ذکر فرماتے ہیں۔ مذکورہ محمد بن علی بن شافع یہ قریش کے شیخ ہیں جبکہ سائب یہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ لیکن امام احمد فرماتے ہیں: حدیث رکانہ کچھ بھی نہیں اور ابن عبدالبر نے بھی "التمهيد" (79/15) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

غریب الحدیث :...... طَلَّقَ امْرَأَتَهُ الْبَتَّةَ: مذکورہ حدیث پہلی احادیث سے قدرے مختلف ہے کیونکہ اس حدیث میں طلاقِ بتہ کا ذکر ہے۔ یہ وہ قطعی طلاق ہے جس کے بعد کوئی صلہ باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ''الْبَتَّةَ'' کا معنی کاٹنا ہے۔ تب پھر طلاقِ بتہ وہ طلاق ہوگی جس کے بعد کوئی صلہ باقی نہیں رہتا اور طلاقِ بتہ یہ طلاقِ بائنہ ہی ہے کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم طلاقِ بتہ کا اطلاق ان تین طلاقوں پر کیا کرتے تھے جن کو ایک لفظ کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ یعنی ایک ہی مجلس میں دیا جاتا تھا اور ایسی طلاق کو بتہ اس لیے کہا جاتا تھا کیونکہ ایسی طلاق خاوند اور بیوی کے درمیان کے تعلق کو بالکلیہ ختم کر دیتی تھی۔

وَاللّٰهِ مَا أَرَدْتُ بِهَا إِلَّا وَاحِدَةً: حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس لیے بیان کی کیونکہ وہ گمان کیے ہوئے تھے کہ طلاقِ بتہ کا سن کر نبی کریم ﷺ انہیں ان کی اہلیہ واپس نہ کریں گے۔ اس لیے انہوں نے قسم کھا کر یہ عرض کیا کہ اس طلاقِ بتہ سے ان کی نیت صرف ایک طلاق کی ہی تھی۔ رہا یہ سوال کہ بھلا تین دفعہ کہی طلاق طلاق طلاق ایک کیونکر باور کی جاسکتی ہے؟ تو وہ یوں کہ آدمی تاکید کے طور پر بھی تو ایک بات کو تین مرتبہ دہراتا ہے۔ البتہ اگر کسی نے یہی طلاق تین بار حرفِ عطف کے ساتھ دی جیسے یہ کہا: ''انتِ طالق'' وَانْتِ طَالِقٌ، ثُمَّ طَالِقٌ اور پھر یہ کہا کہ ان کلمات سے میری مراد ایک طلاق تھی تو اب یہ نیت معتبر نہ ہوگی۔ کیونکہ عطف مغایرت کو مقتضی ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسری طلاق پہلی کے علاوہ اور تیسری دوسری کے علاوہ تھی اور یہ تاکید نہ ہوگی بلکہ تاسیس ہوگی۔ کیونکہ تاکید بدونِ حرفِ عطف کے ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی صحیح قول یہ ہے کہ حرفِ عطف کے ہوتے ہوئے بھی ایک طلاق ہی واقع ہوگی۔

مذاق مذاق میں طلاق دینے کی تحذیر اور اس سے ڈرانے کا بیان

1075، 1076- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان کا مذاق بھی سنجیدگی ہے، (اور وہ تین باتیں یہ ہیں) نکاح، طلاق اور رجوع۔'' ❶

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِابْنِ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيفٍ((الطَّلَاقُ وَالْعِتَاقُ وَالنِّكَاحُ)).

اور ابن عدی کی ایک اور ضعیف طریق سے روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں: (وہ تین باتیں یہ ہیں) طلاق، عتاق اور نکاح۔ ❷

روایۃ الحدیث :...... یہ حدیث دو طریق سے مروی ہے، اور ان دونوں احادیث میں ہنسی مذاق میں طلاق دینے

---

❶ سنن ابی داؤد: 2194- جامع الترمذی: 1184- سنن ابن ماجه: 2039- المستدرك للحاكم: 216/2- امام حاکم فرماتے ہیں: عبدالرحمٰن بن حبیب یہ ابن اروک ہے جو مدنی ثقات میں سے ہے۔ لیکن امام نسائی نے انہیں منکر حدیث والا کہا ہے۔ دیکھیں: الدرایۃ لابن حجر: 90/2- فیض القدیر: 300/2.

❷ الکامل لابن عدی: 5/6- ترجمہ: ''غالب بن عبید اللہ الجزری۔ ابن عدی کہتے ہیں: اس کی احادیث کے متن میں نکارت ہوتی ہے۔''

والے کا حکم بیان ہے۔

غریب الحدیث :......جِدُّهنَّ جِدٌّ: "جِدٌّ" اس کلام کو کہتے ہیں جو متکلم کا مقصود ہوتا ہے، اور اس کے قصد میں اس کلام کے الفاظ اور معانی دونوں داخل ہوتے ہیں۔

وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: ہزل: یہ وہ کلام ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ تو متکلم کے قصد میں داخل ہوتے ہیں البتہ ان کے معانی متکلم کے قصد میں داخل نہیں ہوتے۔ یعنی متکلم وہ کلام قصد کے ساتھ کرتا ہے نہ کہ خطا اور نسیان سے، البتہ اس کا مقصود ان الفاظ کے معانی نہیں ہوتے۔

علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی ان تینوں باتوں (جو دراصل چار ہیں نکاح، طلاق، عتاق اور رجعت) کو کرے البتہ ارادہ کے ساتھ ان کے معانی اس کا مقصود نہ ہوں یعنی وہ محض دل لگی اور ہنسی مذاق میں یہ باتیں کر جائے تو آیا ان کا حکم ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اَلنِّكَاحُ: مراد عقد نکاح ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے لوگوں کی مجلس میں کسی سے یہ کہہ دیا کہ میں نے اپنی بیٹی تیرے نکاح میں دے دی اور اس نے قبول کر لیا تو یہ نکاح منعقد ہو جائے گا۔ کیونکہ نکاح کے انعقاد کی جملہ شروط پائی گئی ہیں۔

الطَّلَاقُ: یعنی اگر کسی نے مذاق مذاق میں بھی بیوی سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں طلاق تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

الرَّجْعَةُ: یہ تیسری بات ہے جو چاہے سنجیدگی سے کی جائے یا مذاق سے، ثابت ہو جاتی ہے۔

ان تینوں باتوں کے مذاق کو بھی سنجیدگی کے حکم میں اس لیے شمار کیا گیا ہے کیونکہ یہ تینوں باتیں بے حد عظیم بھی ہیں اور سنگین بھی، ان کا معاملہ بے حد نازک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ لہٰذا ان تینوں امور میں کسی کو بھی ہنسی مذاق تک کی اجازت نہ دی جائے گی اور اگر کوئی ان کی بابت مذاق بھی کرے گا تو ان کا حکم ثابت ہو جائے گا۔ اسی لیے شارع علیہ السلام نے ان کے مذاق کو بھی سنجیدگی کے حکم میں داخل رکھا ہے اور الفاظ کے ظاہر کو مراد لیا ہے، رہی اس کی نیت کہ وہ تو مذاق کر رہا تھا تو وہ رب کے حوالے ہے۔ بخلاف بیع، اجارہ، رہن اور وقف وغیرہ جیسے عقد کے۔ کہ ان عقود و معاملات کا معاملہ ہلکا ہے۔ تب پھر ہزل کی تفسیر یہ ہو گی کہ متکلم کی مراد میں ان الفاظ کے صیغے اور معانی دونوں مراد ہوں گے۔ البتہ اس کے مذاق کے عذر کو قبول نہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ان الفاظ سے میری مراد فلاں فلاں معنی تھا جیسے طلاق سے مراد اس کو رسیوں سے آزاد کرنا تھا نہ کہ عقدِ نکاح کی قید سے آزاد کرنا تھا اور تزویج سے مراد انعقادِ نکاح نہ تھا بلکہ ایک قسم قرار دینا تھا جیسا کہ اس ارشاد میں رب تعالیٰ نے لفظ زوج سے قسم مراد لی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ﴾ (صٓ: 58)

''اور دوسری اس کی ہم شکل کئی قسمیں۔''

کہ یہاں ازواج سے مراد قسمیں ہیں نہ کہ نکاح میں دینا۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ رجعت سے میری مراد اپنے کلام سے رجوع کرنا تھی نہ کہ یہ مراد تھی کہ میں اپنے ہر حال سے رجوع کرتا ہوں جن میں سے ایک حال میرا طلاق دینا بھی تھا، سو میں اس سے بھی رجوع کرتا ہوں۔ تب پھر ان دونوں صورتوں میں فرق ہوگا۔

(1) ایک یہ کہ آدمی ایک لفظ بولے لیکن اس کی مراد اس کا معنی نہ ہو۔

(2) دوسری یہ کہ آدمی ایک لفظ بولے اور اس کی مراد اس کا معنی بھی ہو، البتہ وہ مذاق کر رہا ہو۔ کہ پہلی صورت میں الفاظ کا حکم ثابت نہ ہوگا جبکہ دوسری صورت میں لفظ کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

اَلْعِتَاقُ: اس کی تفصیل بھی حسب سابق ہے۔

مضمون حدیث :......ان دونوں روایات میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نکاح، طلاق، عتاق اور رجعت ہنسی مذاق میں بھی کیے جائیں تو ہو جاتے ہیں تب پھر سنجیدگی سے تو بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ سوائے ان چار عقود کے دوسرے عقود ہنسی مذاق کی صورت میں منعقد نہ ہوں گے۔ لہٰذا بیع، اجار، رہن اور وقف وغیرہ اگر مذاق سے کیے ہیں تو منعقد نہ ہوں گے۔

◈ نبی کریم ﷺ کا حسن تعلیم کہ آپ ﷺ بسا اوقات حصر اور تقسیم کے طور پر بھی بعض اشیاء کو ذکر فرماتے تھے جیسے اس حدیث میں فرمایا کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ جن کی سنجیدگی اور مذاق دونوں کا حکم ایک ہے۔

◈ نکاح، طلاق، عتاق اور رجعت میں سنجیدگی اور دل لگی دونوں کا حکم ایک ہے اور یہی اکثر علماء کا مذہب ہے۔

جبکہ بعض کے نزدیک مذاق کی صورت میں یہ چار عقود منعقد نہ ہوں گے، ان کی دلیل یہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' جبکہ مذاق کرنے والے کی نیت میں یہ عقود شامل نہ تھے لہٰذا مذاق کی صورت میں یہ عقود منعقد نہ ہوں گے۔ لیکن جمہور کے نزدیک یہ عقود مذاق میں بھی ثابت ہو جائیں گے کہ زیادہ احتیاط اسی میں ہے اور اس میں ہنسی مذاق سے حفاظت وسلامتی بھی ہے۔ کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے کہ یہ باتیں تو مذاق مذاق میں بھی ثابت ہو جاتی ہیں تو وہ مذاق تک سے رک جائیں گے۔

◈ ابن عدی کی روایت میں عتاق کا بھی ذکر ہے اور اس کے مذاق کو سنجیدگی کے حکم میں اس لیے داخل فرمایا کیونکہ شارع علیہ السلام اس بات کے از حد خواہش مند تھے کہ غلاموں کو زیادہ سے زیادہ آزاد کیا جائے۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس کی ہر ممکن صورت کو حکم قرار دیا جن میں سے ایک مذاق کی صورت بھی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے مذاق کے عتاق کو بھی عتاق قرار دیا ہے۔

وَلِلْحَارِثِ بْنِ أَبِي أُسَامَةَ، مِنْ حَدِيْثِ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ۔ رَفَعَهُ: ((لَا يَجُوْزُ اللَّعْبُ فِيْ ثَلَاثٍ: الطَّلَاقِ، وَالنِّكَاحِ، وَالْعِتَاقِ، فَمَنْ قَالَهُنَّ، فَقَدْ وَجَبْنَ)).

وَسَنَدُهُ ضَعِيْفٌ.

مسند حارث بن ابی اسامہ میں حضرت عبادہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ الفاظ ہیں، جن کو وہ مرفوع بیان کرتے ہیں کہ: تین باتوں میں (ہنسی) کھیل (کرنا) جائز نہیں۔ (1) طلاق، (2) نکاح (3) اور عتاق۔ پس جس نے ان باتوں کو (مذاق کے طور پر بھی) کہا تو یہ (اسے) لازم ہو جائیں گی۔ [1]

اس کی سند ضعیف ہے۔

---

[1] مسند الحارث: 503- زوائد، المعجم الکبیر للطبرانی: 304/18- عن فضالۃ بن عبید الانصاری۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس روایت کی اسناد میں ابن لہیعہ ہے۔ اس کی حدیث حسن ہے، جبکہ اس کے باقی کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ دیکھیں: مجمع الزوائد: 335/4.

شرح :...... گو کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے لیکن معنی میں یہ حدیث ابن عدی کی دوسری روایت کے موافق ہے۔ البتہ اس روایت میں اور ابن عدی کی روایت میں رجعت کا ذکر نہیں۔

رَفَعَهُ: حدیث مرفوع کی تعریف بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

فَقَدْ وَجَبْنَ: "وَجَبْنَ" یہ "لَزِمْنَ" اور "ثَبَتْنَ" کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ باتیں اگر مذاق مذاق میں بھی کی جائیں تو بھی ان کا حکم ثابت ہو جاتا ہے۔

طلاق کے خیال یا وسوسہ کا حکم

1077۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِيْ مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ ، أَوْ تَكَلَّمْ)) . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "رب تعالیٰ نے میری امت سے ان کے نفس کے خیالوں سے درگزر فرمایا ہے جب تک کہ وہ (ان باتوں پر) عمل نہ کریں یا (ان کو) بول نہ دیں۔" ❶

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث :...... **عَنْ أُمَّتِي**: یہاں امت سے مراد امت اجابت ہے جو ایمان لے آئی ہے نہ کہ امت دعوت جو ابھی تک ایمان نہیں لائی۔

مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا: مذکورہ مسئلہ کو "حدیث النفس" کا مسئلہ کہتے ہیں (جسے ہماری اردو زبان میں "جی کے خیالات" کہتے ہیں)۔ یہ دل کے ان خیالات کو کہتے ہیں جو یا تو غور وفکر کرنے کے نتیجہ میں دل پر سے گزرتے ہیں یا وسوسہ کی صورت میں دل میں آتے ہیں۔ چاہے یہ خیالات ووساوس بحث ونظر کے طور پر جی میں آئیں اور چاہے اثبات واقرار کے طور پر جی میں آئیں دونوں کا حکم ایک ہے کہ:

مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَكَلَّمْ: آدمی جب تک ان خیالات ووساوس کے مقتضی پر عمل نہ کرلے یا زبان سے ان کو ادا نہ کرلے، وہ معاف ہیں اور رب تعالیٰ نے اس امت سے ایسی باتوں کو درگزر فرمایا ہے۔ بلاشبہ یہ رب تعالیٰ کا بے حد کرم ہے اور اس امت کی یہ خصوصیت بھی ہے۔

مناسبتِ حدیث :...... امام موصوف مذکورہ حدیث کو کتاب الطلاق کے تحت اس مناسبت سے لائے ہیں کہ اگر کسی کے دل میں بیوی کو طلاق دینے کا خیال گزرے یا وہ اس کو طلاق دینے کی بابت سوچے اور غور وفکر کرے تو محض اس حد تک رہنے سے طلاق واقع نہ ہوگی ہاں البتہ اگر وہ زبان سے طلاق کے کلمات ادا کر دیتا ہے یا ان الفاظ کو ضبط تحریر میں لے آتا ہے یا ہاتھ وغیرہ کے اشارہ سے طلاق کو سمجھا دیتا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور یہی اس حدیث کا مضمون ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بلاشبہ اس امت پر رب تعالیٰ کا یہ عظیم فضل وکرم ہے کہ اس ذاتِ اقدس نے اس امت کے دل کے خیالات وساوس کو معاف فرما دیا ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 5269- صحيح مسلم: 127 .

◈ دل کے وساوس وخیالات قابل مواخذہ نہیں چاہے وہ جیسے بھی ہوں اور جتنے بھی ہوں۔

◈ معلوم ہوا کہ اعتبار زبان کے قول کا ہے لہٰذا گرفت، دارو گیر اور مواخذہ زبان کے بول کا ہوگا۔

◈ یہی حال عمل کا بھی ہے کہ جزا وسزا اسی پر مرتب ہوگی نہ کہ دل کے خیال پر۔

◈ جب قول کو عمل کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جائے تو معنی اور ہوتا ہے لیکن جب مطلق عمل کو اکیلے ذکر کیا جائے تو وہ قول کو بھی شامل ہوتا ہے۔ کیونکہ قول یہ زبان کا عمل ہے۔ لیکن جب قول کو عمل کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جائے تو مراد جوارح اور اعضاء کا عمل ہوتا ہے۔

غلطی سے طلاق دے بیٹھنے کا اور زبردستی طلاق دِلوانے کا حکم

1078۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ ، وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک رب تعالیٰ نے میری امت سے چوک اور بھول کو اور جس بات پر انہیں زبردستی مجبور کیا جائے اس کو معاف فرما دیا ہے۔''[1]

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْحَاكِمُ ، وَقَالَ أَبُوْ حَاتِمٍ: لَا يَثْبُتُ .

اس حدیث کو امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ یہ حدیث (نبی کریم ﷺ سے) ثابت نہیں۔

غریب الحدیث:...... **اَلْخَطَأ**: یہ کسی درست بات کو یا کسی درست پہلو کو بلا قصد وارادہ کے چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ **اَلنِّسْيَانَ**: یہ دماغ سے کسی معلوم بات کے اتر جانے کو کہتے ہیں۔ **مَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ**: یہ "مَا أُكْرِهُوْا عَلَيْهِ" کے معنی میں ہے۔ پس اِستکراہ یا اِکراہ یہ آدمی کو کسی قول پر یا کسی فعل کے کرنے یا اس کے ترک کرنے پر مجبور کرنے کو کہتے ہیں۔

لَا يَثْبُتُ: یعنی یہ روایت نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔ اگرچہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ثابت نہیں لیکن معنی کے اعتبار سے ضرور ثابت ہے۔ چنانچہ خطا اور نسیان کے معاف ہونے کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (البقرة: 286)

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

اور رہا اکراہ کہ یہ امت اس باب میں بھی معاف ہے تو اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (النحل: 106)

''جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر

---

[1] سنن ابن ماجه: 2045۔ المستدرك للحاكم: 216/2۔ سنن البيهقى: 356/7۔ المعجم الاوسط للطبرانى: 8273۔ كتاب الضعفاء للعقيلى: 145/4۔ امام احمد نے اس حدیث پر سختی کے ساتھ انکار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں صرف حسن بصری کی نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت ہی ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں: یہ روایت "مصنف عبدالرزاق" (11416) اور "سنن سعید بن منصور" (1145) میں بھی ہے۔ دیکھیں: العلل و معرفة الرجال: 227/1 اور العلل لابن ابی حاتم: 431/1۔ ہم نے "جامع العلوم" میں اس حدیث کے جمیع طرق کو اکٹھا کیا ہے۔

مطمئن ہو اور لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے تو ان لوگوں پر اللہ کا بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ اس امت کی بھول چوک کو یا اس پر ہونے والے جبر و اکراہ کو معاف فرما دے گا۔

جبر و اکراہ اور بھول چوک کی قسمیں اور ان کا حکم

اگرچہ رب تعالیٰ نے اس امت کو بھول چوک کو اور اس پر ہونے والے جبر و اکراہ کو معاف کر دیا ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی تشنۂ جواب ہے کہ کیا بھول چوک کے مرتکب پر یا جبر و اکراہ کا شکار ہونے والے پر کوئی شے لازم آتی ہے یا نہیں؟ تو اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ اگر تو ان تینوں امور کا تعلق منہیات سے ہے تو اس کے ذمہ کچھ نہ آئے گا اور اگر ان امور کا تعلق مامورات سے ہے تو بعد میں یہ دیکھا جائے گا کہ آیا ان مامورات کا اتمام ممکن ہے یا نہیں۔ پس اگر تو ان مامورات کا اتمام ممکن ہے تو ان کو پورا کرے گا اور اگر ان کا اتمام ممکن نہ ہو لیکن ان کا بدل ہو تو بدل ادا کرے گا اور اگر بدل بھی نہ ہو تو وہ ساقط ہو جائیں گے۔ جیسے کسی نے چار رکعت نماز بھول کر تین رکعت پڑھ لی۔ اگرچہ اس بھول پر اسے گناہ نہ ہو گا لیکن کیا صرف بھول جانے سے وہ چوتھی رکعت معاف بھی ہو جائے گی یا نہیں؟ تو لامحالہ وہ معاف نہ ہو گی کیونکہ یہ مامورات کے باب میں سے ہے اب اگر تو وہ رکعت سلام پھیرنے سے قبل یا بعد میں یاد آئی تو وہ صرف چوتھی رکعت ادا کر کے سجدۂ سہو کرے گا۔ کیونکہ یہ ایک رکعت اس بھول جانے والی چوتھی رکعت کا بدل ہے۔

رہے محذورات تو بھول چوک سے کرنے پر یا زبردستی کروائے جانے پر اس فعل کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ پھر خطا چاہے حکم میں ہو جیسے اجتہادی خطا اور چاہے حال میں ہو جیسے کسی نے فجر طلوع ہو جانے کی بے خبری میں کھا پی لیا کہ ان دونوں کا حکم ایک ہے۔ نسیان کی تعریف بیان ہو چکی ہے اور اکراہ کی صورتیں معروف ہیں۔

مناسبت حدیث:...... امام موصوف رحمہ اللہ اس حدیث کو کتاب الطلاق کے تحت اس لیے لے کر آئے ہیں کہ طلاق کے متعدد مسائل بھول چوک اور اکراہ سے متعلق ہیں، جیسے:

⊙ ...... کسی نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ اگر میں نے فلاں فلاں کام کیا تو تمہیں طلاق۔ پھر اس نے وہ کام بھول کر لیا تو اس کی بیوی پر طلاق واقع نہ ہو گی۔

⊙ ...... اسی طرح اگر اس نے بیوی سے یہ کہا کہ اگر تم فلاں کے گھر میں داخل ہوئی تو تمہیں طلاق اور بیوی یہ سمجھی کہ خاوند کی مراد رات کو اس کے گھر میں داخل ہونا ہے لہٰذا اس نے اس گھر میں دن میں قدم رکھ دیا تو طلاق واقع نہ ہو گی کیونکہ اس نے ایسا خطا سے یا تاویل سے کیا ہے۔

⊙ ...... اسی طرح اگر بیوی نے خاوند پر کوئی ہلاکت آفرین اور جان لیوا ہتھیار تان کر اسے طلاق دینے پر مجبور کیا اور خاوند نے جان بچانے کی غرض سے طلاق دے دی تو یہ طلاق بھی واقع نہ ہو گی کیونکہ اس میں اکراہ شامل تھا جو معاف ہے۔

غرض امام موصوف مذکورہ باب کے تحت یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لے کر آئے ہیں کہ طلاق کے باب میں بھی جہل اور نسیان اور خطا اسی طرح عذر ہیں جس طرح دیگر معاملات میں عذر ہیں۔ لیکن مشہور مذہب یہی ہے کہ اس

باب میں جہل ونسیان کوئی عذر نہیں لہٰذا جب بھی طلاق کی شرط پائی جائے گی طلاق واقع ہو جائے گی۔ [1]

اور اکراہ کے معتبر ہونے میں جان یا کسی عضو کے تلف ہو جانے کا اندیشہ لازم ہے۔ لہٰذا خالی دھمکی اکراہ نہ کہلائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ رب تعالیٰ کی اس امت پر خاص رحمت کہ گزشتہ امتوں کے بوجھوں اور طوقوں کو ان پر نہیں ڈالا گیا لہٰذا ان پر سے بھول چوک اور جبر واکراہ کو معاف کر دیا گیا۔

◈ حاکم صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے اس کی دلیل: "إِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ" کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ وہ کسی پر سے حکم کو رفع یا وضع کر دے۔

◈ جہل ونسیان اور خطا واکراہ کی صورتوں میں دی جانے والی طلاق نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ مذکورہ حدیث عام ہے اور طلاق بھی دیگر باتوں کی طرح اس حدیث کے عموم کے تحت داخل ہے۔

خود پر بیوی کو حرام کر لینے کا حکم

1079۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: إِذَا حَرَّمَ امْرَأَتَهُ، لَيْسَ بِشَيْءٍ. وَقَالَ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: جب کسی نے (اپنے اوپر) اپنی بیوی کو حرام کر لیا تو یہ کچھ بھی نہیں، (یعنی اس کے حرام کر دینے سے وہ اس پر حرام نہ ہوگی) اور (دلیل میں) یہ آیت پڑھی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: 21) [2] "بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے۔"

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: معلوم ہوا کہ یہ حدیث موقوف ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کو نبی کریم ﷺ تک مرفوع نہیں بیان کیا۔ لہٰذا یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہوا۔

قولِ صحابی جب ان کے استنباط واجتہاد سے ہو تو وہ دوسروں کے اقوال جیسا ہوتا ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قولِ صحابی بہ نسبت دوسروں کے اقوال کے، درستی اور راستی کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ مذکورہ قول ان کے تفقہ واجتہاد سے ہے کیونکہ اس قول میں وہ سورۂ احزاب کی مذکورہ بالا آیت سے استدلال فرما رہے ہیں۔

إِذَا حَرَّمَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ امْرَأَتَهُ: یعنی ایک آدمی خود پر اپنی بیوی کو حرام کر لے، اس کی چند صورتیں ہیں، جو یہ ہیں:

⊙ ......آدمی یہ خبر دیتے ہوئے کہے کہ رب تعالیٰ نے زوجہ کو حرام قرار دیا ہے۔ تو ہم اس قول میں اسے جھوٹا کہیں گے اور اس کا یہ قول کچھ بھی نہیں کیونکہ وہ یہ بتلا رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے بیوی حرام کی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے بیوی حرام نہیں کی۔ ایسے کہنے والے کے ذمہ کچھ نہیں سوائے اس لغو اور جھوٹی بات سے توبہ کرنے کے۔

---

[1] الانصاف: 149/9. [2] صحیح البخاری: 5266.

⊙ ...... دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی امتناع کے طور پر بیوی کو حرام کہے اور مراد یہ ہو کہ تو مجھ پر حرام ہے پس اس آدمی کا بیوی کو خود پر حرام کرنا یہ رب تعالیٰ کے حکم کو بدلنا نہیں اور صحیح قول کے مطابق اس بات کا حکم یمین کا حکم ہے۔

لَيْسَ بِشَيْءٍ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول سے بظاہر یہ مراد ہے کہ ایسا کہنا ظہار نہیں اور اس کی دلیل سورۂ احزاب کی مذکورہ آیت ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی ازواج رضی اللہ عنہن کو خود پر حرام کر لیا اور ان سے ایلاء کر لیا تو رب تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ (التحریم: 2)

''بے شک اللہ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔''

اس آیت کی بابت دو اقوال میں سے ایک قول یہی ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ مراد لیا ہو کہ اگر چہ اس نے خود پر بیوی کو حرام کر لیا ہے لیکن اس کے حرام کرنے سے یہ حرام نہ ہوگی۔ گویا کہ یہ بیوی کی تحریم کی خبر دے رہا ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔

جبکہ تیسرا احتمال یہ ہے کہ اس کی تحریم سے مراد تحریم حکمی کا انشاء ہو۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ ''روٹی حرام ہے'' اور اس کی مراد یہ ہو کہ رب تعالیٰ نے روٹی کو حلال نہیں بنایا۔ بلاشبہ یہ آسمانی سند کے بغیر ایک حکم لگانا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے تو نکاح کے واسطے سے عورتوں کو حلال بنایا ہے اور یہ انہیں حکمی حرام بنانا چاہتا ہے۔ اس شخص کا حکم وہی ہے جو اس شخص کا ہے جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال ٹھہراتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات بے حد سنگین اور خطرناک ہے اور کفر کی دہلیز تک لے جانے والی ہے۔

اور چوتھی صورت یہ ہے کہ اس کی مراد تحریم سے طلاق ہو۔ تب پھر یہ طلاق سے کنایہ ہوگا اور عورت کو طلاق پڑ جائے گی۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ یہ کلمات اس کے منہ سے بلا ارادہ ونیت نکل گئے ہوں تو اس بابت دو اقوال ہیں:

(1) ایک یہ کہ یہ ظہار ہے (2) دوسرا یہ کہ یہ یمین ہے

کیونکہ آدمی جب رب تعالیٰ کی حلال کردہ کسی شے کو امتناع کی نیت سے خود پر حرام کرتا ہے تو وہ یمین کے حکم میں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس پانچویں صورت کو ظہار کی بجائے یمین پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے۔ کہ نہ تو یہ ظہار ہے اور نہ طلاق۔ بلکہ یہ یمین ہے۔ اس کی تائید صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: إِذَا حَرَّمَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ امْرَأَتَهُ ، فَهُوَ يَمِينٌ يُكَفِّرُهَا .

اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: جب ایک آدمی خود پر اپنی بیوی کو حرام کر لیتا ہے تو یہ یمین ہے جس کا وہ کفارہ دے گا۔ ❶

شرح :...... معنی کے اعتبار سے یہ حدیث اس بات کی تائید کرتی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول ''لَيْسَ بِشَيْءٍ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کا یہ قول طلاق یا ظہار میں سے کچھ بھی نہیں۔ بلکہ یہ یمین ہے جس کا وہ کفارہ دے گا اور یہی قول صحیح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال میں سے اصل یہ ہے کہ ان کو نمونہ بنایا جائے۔

---

❶ صحيح مسلم: 1473 .

اس کی دلیل رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: 21)

◈ نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی یہ ہے کہ اس پر کسی قسم کی کمی زیادتی کے بغیر عمل کیا جائے۔

کنایہ کے الفاظ سے طلاق کا حکم

1080- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَنَّ ابْنَةَ الْجَوْنِ لَمَّا أُدْخِلَتْ عَلَى رَسُوْلِ اللَّهِ ﷺ ، وَدَنَا مِنْهَا قَالَتْ: أَعُوْذُ بِاللَّهِ مِنْكَ ، فَقَالَ : ((لَقَدْ عُذْتِ بِعَظِيْمٍ ، الْحَقِيْ بِأَهْلِكِ)) .

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: بنت جون جب (نکاح کے بعد) نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجی گئی اور آپ ﷺ اس کے قریب ہوئے تو وہ کہنے لگی: میں تجھ سے اللہ کی پناہ میں آتی ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم نے ایک عظیم ذات کی پناہ لی ہے (سواب) تو اپنے گھر والوں سے جامل۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

نامبارک عورت

شرح:...... یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے۔ رب تعالیٰ نے اس عورت کی قسمت میں ام المومنین رضی اللہ عنہا بننا نہ لکھا تھا۔ اگر وہ نبی کریم ﷺ کے عقدِ نکاح میں رہتی تو یقیناً آپ ﷺ کے ساتھ جنت میں ہوتی۔ لیکن یہ رب تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عنایت کرے۔

غریب الحدیث:...... **أَعُوْذُ بِاللَّهِ مِنْكَ**: یعنی میں تجھ سے اللہ کی عصمت وحفاظت میں آتی ہوں۔ دراصل وہ عورت یہ کہہ کر آپ ﷺ سے دور ہونا چاہتی تھی اور اس عورت نے خود پر بے حد ناز اور غرور ہونے کی بنا پر یہ بات کہی تھی۔ اب جو آدمی کسی کے سامنے اس سے اللہ کی پناہ مانگے تو اس کے لیے اس کو اپنے سے پناہ دینا مشروع ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو اللہ کے نام پر پناہ مانگے اسے پناہ دو۔''

لَقَدْ عُذْتِ بِعَظِيْمٍ: عظیم سے مراد رب تعالیٰ کی عظیم ذات ہے۔

اِلْحَقِيْ بِأَهْلِكِ: آپ ﷺ کی مراد اسے طلاق دینا تھی۔ یعنی تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ کہ تمہیں طلاق ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے اور اس پر بھی کلام کیا جا چکا ہے۔ چند مزید فوائد درج ذیل ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بسا اوقات آدمی منہ سے نکالی ایک بات کی وجہ سے کسی بہت بڑی خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ عورت صرف ایک بات ''أَعُوْذُ بِاللَّهِ مِنْكَ'' کہنے کی وجہ سے ام المومنین بننے کی عظیم سعادت اور خیر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

◈ نبی کریم ﷺ اپنے رب کی بے حد تعظیم کرنے والے تھے کیونکہ اس عورت کی بات سن کر آپ ﷺ نے ''لَقَدْ عُذْتِ بِعَظِيْمٍ'' فرمایا تھا۔

---

[1] صحيح البخاري: 5254.

◈ اگر کوئی طلاق کی نیت سے اپنی بیوی کو "اِلْحَقِي بِأَهْلِكِ" کہے تو یہ طلاق ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے: ''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ لفظ نیت کا احتمال رکھتا ہو، لہٰذا اگر کسی نے ''اللہ کی قسم! میں کپڑے نہ پہنوں گا، بول کر پھر کپڑے پہن لیے اور جب اسے یہ کہا گیا کہ تم تو حانث ہو گئے ہو اور وہ جواب میں یہ کہے کہ میری مراد اور نیت تو کپڑوں سے روٹی تھی یعنی میں تو ان الفاظ سے دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ اللہ کی قسم! میں روٹی نہ کھاؤں گا تو یہاں اس نیت کو نہیں لیا جائے گا کیونکہ جو الفاظ اس نے ادا کیے ہیں وہ نیت کا احتمال نہیں رکھتے کیونکہ کپڑوں کے لفظ میں روٹی کے معنی کا احتمال نہیں۔ تب پھر نیت کا اعتبار وہاں کیا جائے گا جہاں لفظ میں نیت کا احتمال بھی ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ چونکہ ''تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ'' کے الفاظ میں طلاق کا احتمال ہے، اس لیے اگر ان الفاظ سے طلاق کی نیت تھی تو طلاق ہو جائے گی۔

◈ یہیں سے علماء نے یہ مشہور مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ طلاق کی دو قسمیں ہیں:

(1) صریح طلاق (2) اور کنایہ سے طلاق

صریح طلاق وہ ہے جو ایسے الفاظ کے ساتھ دی جائے جن میں سوائے طلاق کے اور کسی معنی کا احتمال نہ ہو اور ان الفاظ سے ذہن متبادراً صرف طلاق کی طرف ہی جائے۔ جیسے انتِ طالق کے الفاظ کہ ان الفاظ سے ذہن متبادراً صرف اور صرف طلاق کی طرف ہی جاتا ہے اور کنایہ کی طلاق وہ ہے جو ایسی لفظوں سے دی جائے جن میں الفاظ کے ظاہری معنی کے علاوہ طلاق کے معنی کا احتمال بھی ہو، گو ذہن متبادراً طلاق کے معنی کی طرف ہی نہ جائے۔ لیکن اس بات کا احتمال ہو کہ شاید نیت میں ان الفاظ سے طلاق مراد تھی۔ جیسے "اِلْحَقِي بِأَهْلِكِ" کے الفاظ کہ ان الفاظ کو سن کر ذہن متبادراً طلاق کی طرف نہیں جاتا گو نیت ہو تو طلاق بھی مراد لی جا سکتی ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ کیا کنایہ کے الفاظ بولتے ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟ تو جواب واضح ہے کہ چونکہ یہ الفاظ سن کر متبادراً ذہن طلاق کی طرف نہیں جاتا کیونکہ یہ الفاظ طلاق دینے کے لیے نہیں بنائے گئے۔ لہٰذا ان الفاظ کے ادا کرتے ہی طلاق واقع نہ ہوگی پس اگر کسی نے کسی سبب کے بغیر بیوی کو یہ الفاظ کہے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ جب تک کہ ان الفاظ میں طلاق کی نیت بھی شامل نہ ہو۔

◈ رہی مذکورہ حدیث کہ کیا کنایہ کے ان الفاظ کے ساتھ طلاق دینے کا بھی کوئی سبب تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں! ان الفاظ میں طلاق دینے کا سبب تھا اور وہ سبب اس عورت کا آپ ﷺ سے ناز دغرور کی بنا پر پناہ مانگنا تھا۔

◈ غرض کنایہ کے الفاظ سے ایک تو اس وقت طلاق پڑ جاتی ہے جب کوئی سبب پایا جائے اور نیت میں طلاق ہو، دوسرے جب خود عورت طلاق مانگے یا طلاق کا مذاکرہ ہو رہا ہو اور اس وقت کنایہ کے الفاظ ادا کیے جائیں تو اس وقت بھی کنایہ کے الفاظ طلاق بن کر واقع ہو جاتے ہیں۔ جیسے بیوی یہ کہے کہ تم مجھے طلاق دے دو اور خاوند یہ کہے کہ ''ٹھیک ہے تم میکے چلی جاؤ'' تو یہ طلاق ہوگی۔ کیونکہ جواب کا حکم سوال کے حکم پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر کوئی یہ کہے کہ اس وقت بھی ان الفاظ سے میری نیت طلاق دینے کی نہ تھی تو تب بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔

◈ غرض کنایہ کے الفاظ وہ ہیں جو زوجین کے درمیان فراق کا احتمال رکھتے ہوں اور طلاق کی نیت بھی ان میں شامل ہو تو

ایسے الفاظ سے نیت پائے جانے کے وقت طلاق واقع ہو جائے گی۔

نکاح ثابت ہوگا تو طلاق بھی ثابت ہوگی

1081، 1082- وَعَنْ جَابِرٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا طَلَاقَ إِلَّا بَعْدَ نِكَاحٍ ، وَلَا عِتْقَ إِلَّا بَعْدَ مِلْكٍ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''طلاق تو نکاح کے بعد ہی ہے اور عتاق بھی ملک کے بعد ہی ہے۔'' [1]

رَوَاهُ أَبُو يَعْلَى ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ ، وَهُوَ مَعْلُوْلٌ ، وَأَخْرَجَ ابْنُ مَاجَهْ عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ مِثْلَهُ ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ ، لٰكِنَّهُ مَعْلُوْلٌ أَيْضًا .

اس حدیث کو امام ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ یہ حدیث معلول ہے اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی ایک حدیث روایت کی ہے جس کی اسناد حسن ہے لیکن وہ روایت بھی معلول ہے۔

شرح :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ طلاق کا ثبوت نکاح کے ثبوت پر مبنی ہے۔ لہٰذا نکاح ثابت ہوگا تو اس کے بعد طلاق بھی ثابت ہوگی۔ کیونکہ طلاق یہ نکاح کی فرع ہے اور فرع کا ثبوت اصل کے ثبوت پر مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے نکاح سے قبل کسی کو طلاق دے دی تو وہ طلاق لغو ہوگی۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں جن کو ذیل میں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

(1) کسی اجنبیہ کو اس کے ساتھ نکاح ہونے سے پہلے یہ کہہ دے کہ تمہیں طلاق ہے۔ تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ طلاق یہ نکاح کی فرع ہے اور ابھی تک اصل ثابت نہیں تو فرع بدرجہ اولیٰ ثابت نہ ہوگی۔

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں جس عورت سے بھی نکاح کروں اسے طلاق۔ تو یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی کیونکہ اس نے یہ ''طلاق'' طلاق کا مالک بننے سے قبل دی ہے۔ کیونکہ طلاق کا مالک تو عقد نکاح کے بعد ہی بنتے ہیں۔

(3) تیسری صورت یوں کہنا ہے کہ اگر میں فلاں قبیلہ کی عورتوں سے نکاح کروں تو ان کو طلاق۔ یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی اور اس کی علت بھی وہی گزشتہ مذکورہ علت ہے۔ البتہ یہ صورت پہلی صورت سے اخص ہے۔

(4) اور چوتھی صورت ان سب سے اخص ہے، وہ یہ کہ آدمی کسی متعین عورت سے یہ کہہ دے کہ اگر تم سے نکاح کروں تو تمہیں طلاق۔ یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

اور اس سب کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ (الاحزاب: 49)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ انھیں

---

[1] امام موصوف رحمہ اللہ نے "التغلیق" (448/4) میں اپنی سند کے ساتھ ابو یعلی کے طریق سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ امام موصوف اس کی سند یوں بیان کی ہے: "حدثنا محمد بن المنهال ، حدثنا ابوبكر الحنفي ، عن ابن ابي ذئب عن عطاء عن جابر ﷺ مرفوعا" المستدرك للحاكم: 455/2، امام ابو حاتم نے اس حدیث میں مرسل ہونے کی علت بیان کی ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابي حاتم: 448/1۔ امام ہیثمی نے "مجمع الزوائد" (334/2) میں اس حدیث کو بزار کی طرف منسوب کیا ہے۔ امام ہیثمی فرماتے ہیں: اس حدیث کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

ہاتھ لگاؤ۔"

کہ یہاں طلاق دینے کو "ثُمَّ" کے حرف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو ترتیب کے لیے ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ طلاق نکاح کے بعد ہی ہوگی۔ تب پھر اگرچہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن نص قرآنی اس کے معنی کی موید ہے۔

اجنبیہ سے طلاق کو معلق کرنے کا حکم

اگرچہ نص قرآنی اس مسئلہ کو دوٹوک بیان کرتی ہے کہ طلاق تو ثبوت نکاح کے بعد ہی ہوگی لیکن اس کے باوجود علماء کا اجنبیہ کے ساتھ طلاق کو معلق کر دینے کی بابت اختلاف ہے کہ آیا معلق طلاق کے بعد اس سے نکاح کی صورت میں اس کو طلاق پڑے گی یا نہیں؟ جیسے کسی نے کسی متعین عورت مثلاً فریدہ کو یہ کہا کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تمہیں طلاق۔ تو اس بارے علماء کے دو اقوال ہیں: (1) ایک قول یہ ہے کہ ایسی طلاق وقوع شرط کے حال کا اعتبار کرتے ہوئے واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ یہاں شرط تزوج ہے۔ لہٰذا جب شرط یعنی تزوج پایا جائے گا تو مشروط یعنی طلاق بھی پائی جائے گی۔ کیونکہ علماء کے ہاں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جب شرط پائی جائے گی تو مشروط بھی پایا جائے گا اور جب شرط فوت ہو جائے گی تو مشروط بھی فوت ہو جائے گا۔ (2) جبکہ دوسرا قول ایسی تعلیق کے بعد بھی نکاح کے وقت طلاق واقع نہ ہونے کا ہے۔

رہا پہلا قول اور اس کی دلیل تو اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ قول غیر صحیح ہے کیونکہ ایک اجنبی تنجیز طلاق یعنی طلاق واقع کرنے کا مالک نہیں ہوتا، تب پھر وہ تعلیق طلاق یعنی طلاق کو معلق کرنے کا بھی مالک نہ ہوگا کیونکہ طلاق کو نکاح کے ساتھ معلق کرنا صریح تناقض ہے۔ کیونکہ نکاح یہ امساک یعنی منکوحہ کو اپنے پاس روک رکھنے کا نام ہے جبکہ طلاق یہ تسریح اور تخلی یعنی اسے چھوڑ دینے کا نام ہے اور امساک اور تسریح میں صریح تناقض ہے۔ لہٰذا طلاق کو نکاح کے ساتھ معلق کرنا یہ ایک شے اور اس کی نقیض کو آنِ واحد میں جمع کرنا ہے اور قواعد عامہ جمع نقیضین کا انکار کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک سرے سے یہ تعلیق ہی باطل ہے تب پھر شرط کیا اور مشروط کیا؟؟

وَلَا عِتْقَ إِلَّا بَعْدَ مِلْكٍ: یعنی غلام کا آزاد کرنا اس کا مالک بننے کے بعد ہی ہوگا۔

مذکورہ مسئلہ کی صورتیں بھی طلاق قبل از نکاح کی صورتوں کی طرح ہی ہیں تو جیسے ان سب صورتوں میں طلاق واقع نہ ہوگی یہاں بھی ان سب صورتوں میں عتق واقع نہ ہوگا۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ نے عتق کی تعلیق کی صورت کو جائز قرار دیا ہے جیسے اگر کوئی کسی متعین غلام کو یہ کہے کہ اگر میں تمہارا مالک بن گیا تو تم آزاد۔ کہ یہ صورت امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور یہاں نکاح کی چوتھی صورت اور عتاق کی چوتھی صورت میں فرق یہ ہے کہ غلام کو آزاد کرنے کی حرص پر اس کی آزادی کو ملک کے ساتھ مشروط کرنا مشاہد و مجرب ہے جبکہ طلاق دینے کا تجربہ کرنے کے لیے نکاح کرنا مجرب ومشاہد نہیں ہے۔ اس لیے امام احمد رحمہ اللہ نے عتق کو ملک کے ساتھ معلق کرنے کی صورت کو درست قرار دیا ہے۔

غیر ملک میں نذر، عتق اور طلاق کا حکم

1083۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا نَذْرَ لِابْنِ آدَمَ فِيمَا لَا يَمْلِكُ، وَلَا عِتْقَ لَهُ فِيمَا لَا

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "ابن آدم جس شے کا مالک نہیں اس میں اس کی (مانی جانے والی نذر) کوئی

يَمْلِكُ ، وَلَا طَلَاقَ لَهُ فِيمَا لَا يَمْلِكُ)) .

نذر نہیں، اور جس غلام (کی رقبہ) کا وہ مالک نہیں اس میں اس کا کوئی عتق نہیں اور جس عورت (کی ناموس) کا وہ مالک نہیں اس میں اس کی کوئی طلاق نہیں۔'' ❶

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ، وَنُقِلَ عَنِ الْبُخَارِيِّ أَنَّهُ أَصَحُّ مَا وَرَدَ فِيهِ .

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ اس باب میں وارد یہ اصح ترین حدیث ہے۔

شرح :...... غیر ملک رقبہ میں عتاق اور غیر ملک نکاح میں طلاق کے مسائل پر گزشتہ میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے جبکہ اس روایت میں تیسرا مسئلہ غیر ملک میں نذر ماننے کا مذکور ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی نذر منعقد نہیں ہوتی چاہے اس نے نذر کو اپنی ملک پر معلق کیا ہو اور چاہے اس کو مطلق رکھا ہو، جیسے اگر کسی نے ایک غلام کی بابت یہ نذر مانی کہ وہ اس کو آزاد کرے گا جبکہ وہ غلام اس کی ملک میں نہ تھا تو یہ نذر منعقد نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ اس غلام کا مالک ہی نہ تھا۔ البتہ اس پر یمین کا کفارہ آئے گا۔

جبکہ بعض علماء کا قول ہے کہ اس پر کفارہ یمین بھی نہ آئے گا کیونکہ وہ نذر منعقد ہی نہیں ہوئی اور نہ وہ غلام نذر کا محل تھا۔ کیونکہ وہ غلام دوسرے کی ملک تھا۔

نابالغ، دیوانے اور نشہ والے کی دی طلاق کا حکم

1084۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : ((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ ، وَعَنِ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبُرَ ، وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتَّى يَعْقِلَ ، أَوْ يُفِيقَ)) .

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تین لوگوں پر سے قلم اٹھا لیا گیا ہے، سوتے پر سے یہاں تک کہ بیدار ہو جائے، نابالغ پر سے یہاں تک کہ بالغ ہو جائے اور دیوانے پر سے یہاں تک کہ سمجھنے لگے یا اسے افاقہ ہو جائے۔'' ❷

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ ، وَأَخْرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ترمذی کے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا اور امام ابن حبان نے (بھی) یہ حدیث روایت کی ہے۔

غریب الحدیث :...... رُفِعَ الْقَلَمُ: قلم سے تقدیر کا قلم مراد ہے یا تکلیف کا قلم مراد ہے؟ تو یہ تکلیف کا قلم ہے

---

❶ سنن ابی داؤد: 2190۔ جامع الترمذی: 1181۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے، اور اس باب میں یہ سب سے صحیح روایت ہے: مسند احمد: 2/190۔ امام ترمذی رحمہ اللہ: "العلل لابی طالب القاضی" (ص:173) میں فرماتے ہیں: میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اس باب میں اصح حدیث کون سی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: "عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده" والی حدیث۔

❷ مسند احمد: 6/100۔ سنن ابی داؤد: 4398۔ سنن النسائی: 6/156۔ سنن ابن ماجه: 2041۔ المستدرك للحاكم: 2/67۔ صحیح ابن حبان: 142۔ امام ترمذی رحمہ اللہ "العلل لابی طالب القاضی" (225) میں نقل فرماتے ہیں: اس روایت کے بارے میں امام بخاری کا یہ قول ہے کہ میں امید کرتا ہوں کہ یہ روایت محفوظ ہوگی اور اس باب میں اصحاب سنن کے ہاں حدیث علی رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ جس کو ایک اور جگہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔

کیونکہ تقدیر کا قلم تو کسی پر سے بھی نہیں اٹھایا جاتا اور یہ ہر ایک پر جاری رہتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ قلم اٹھانے والی ذات کون سی ہے؟ تو وہ رب تعالیٰ کی ذات ہے۔

عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ: سوتا ہوا آدمی غیر مکلف شمار ہوتا ہے، اس پر سے تکلیف کا قلم مرفوع ہوتا ہے۔ البتہ اس کے بیدار ہو جانے پر دیکھا جائے گا کہ وہ بالغ ہے یا نابالغ۔ لہٰذا اگر تو وہ نابالغ ہوا تو وہ مابعد مذکور دو آدمیوں میں داخل ہو گا جو نابالغ اور مجنون ہیں، اور وہ عاقل و بالغ ہوا تو اب سے تکلیف کا قلم اس پر چلنا شروع ہو جائے گا۔

وَعَنِ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبُرَ: بڑے ہو جانے سے اس کا بالغ ہو جانا مراد ہے۔

وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ أَوْيُفِيقَ: لہٰذا جب تک کسی کا جنون زائل نہ ہو جائے یا اس میں افاقہ نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ مکلّف نہیں۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی رحمت کی بدولت سوتے کو، نابالغ کو اور مجنون کو احکام تکلیفیہ سے معاف رکھا ہے۔

سوتے پر سے رفع قلم

یہاں سونے سے وہ سونا مراد ہے جس میں ادراک واحساس زائل ہو جائے۔ لہٰذا اگر نیند ابھی اتنی گہری نہ ہو کہ احساس پوری طرح زائل نہ ہوا ہو تو ایسی نیند احکامِ تکلیفیہ کے ارتفاع کا سبب نہیں ہوتی۔

نابالغ پر سے رفع قلم

جب تک کوئی نابالغ ہے وہ احکام شرعیہ کا مکلّف نہیں۔ جبکہ بلوغت کے حاصل ہو جانے پر وہ مکلّف قرار دے دیا جاتا ہے۔

علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ بلوغت تین میں سے ایک امر سے حاصل ہوتی ہے۔

(1) یا تو شہوت کے ساتھ اس سے منی کا خروج ہو، تب ایک نابالغ بالغ تصور کیا جاتا ہے۔

(2) یا پھر اس کے زیر ناف بال اُگ آئیں۔

(3) یا پھر پندرہ سال عمر پوری ہونے پر اسے بالغ تصور کیا جائے گا۔

(4) جبکہ عورتوں میں حیض آنے لگنا یا اس کا حاملہ ہو جانا بھی بلوغت کی علامات میں سے ہے۔

پس جب مرد یا عورت میں ان علامات میں سے کوئی علامت پائی جائے گی تو اسے بالغ تصور کیا جائے گا چاہے اس کا جسم چھوٹا ہو یا بڑا۔ پس جب تک کوئی نابالغ ہے اس پر سے قلم تکلیف مرفوع ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نابالغ بچہ اگر کسی محذور کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کو کوئی عقاب نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ مرفوع القلم ہے۔
- چنانچہ حج کے دوران محذور کے ارتکاب پر نابالغ پر کوئی فدیہ بھی نہ آئے گا۔
- نابالغ کی طلاق بھی واقع نہ ہوگی کیونکہ وہ مرفوع القلم ہے۔ دوسرے اس کے عقدِ نکاح کا ولی اس کا باپ ہے لہٰذا طلاق کا امر اس کے والد کے سپرد ہوگا۔ پھر جب اس کے مال میں اس کا تصرف نافذ نہیں تو اس کی زوجہ سے اس کا تصرف بدرجہ اولیٰ نافذ نہ ہوگا۔

◈ جو جو باتیں کسی مکلّف سے جہل ونسیان کی وجہ سے ساقط ہوتی ہیں وہ نابالغ پر سے بھی ساقط ہوں گی کیونکہ وہ مرفوع القلم ہے۔
لیکن اگر کسی نابالغ نے غلطی سے کسی کی جنایت کردی جیسے کار کی ٹکر مار کر کسی کو ہلاک کر دیا، تو اس پر کفارہ کے واجب ہونے میں اگرچہ علماء میں اختلاف ہے لیکن مشہور مذہب یہ ہے کہ اس پر کفارہ آئے گا۔ کیونکہ بچے کا قتل عمد مکلف کے قتل خطا کی طرح ہے لہٰذا اس پر کفارہ آئے گا۔
جبکہ دوسرا قول کفارہ نہ آنے کا ہے کیونکہ ابھی وہ نابالغ اور غیر مکلف ہے۔

◈ اگر کسی نے گہری نیند میں بیوی کو طلاق دے دی اور لوگوں نے سن بھی لیا تب بھی طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ اس وقت وہ غیر مکلف ہے۔

◈ سونے والے کی طرف اس کی نیند کی حالت کا فعل منسوب نہ کیا جائے گا۔ لہٰذا نیند میں جو فعل اس سے خطا سرزد ہوتا ہے اس پر وہ گنہگار نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اصحاب کہف کے کروٹیں بدلنے کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے حالانکہ کروٹیں وہ بدل رہے تھے، لیکن نیند میں تھے، اس لیے نیند کے فعل کو ان کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (الکھف: 18)

''اور ہم دائیں اور بائیں ان کی کروٹ پلٹتے رہتے ہیں۔''

پس سونے والا جب تک بیدار ہو کر اپنے قول وفعل کو ضبط نہ کرنے لگ جائے، اس وقت تک وہ مرفوع القلم ہے۔

◈ مجنون کا مسئلہ واضح ہے، وہ مرفوع القلم ہے کیونکہ اس میں عقل، ادراک، احساس اور شعور وغیرہ سب کا فقدان ہے۔ لہٰذا مجنون کی دی طلاق غیر نافذ ہوگی۔

◈ نشہ والے کی طلاق بھی بلاشبہ اسی مسئلہ کے ملحق ہے۔ کیونکہ وہ بھی احساس وادراک سے عاری ہوتا ہے اور وہ نہیں جانتا ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النسآء: 43)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم جانو جو کچھ کہتے ہو۔''

اس آیت کا قصہ مشہور ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو اونٹ جناب حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جو اس وقت شراب کے نشے میں تھے اور دو لونڈیاں ان کے پاس گیت گا رہی تھیں تو انہوں نے اپنے گیت میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھڑکایا۔ جس پر انہوں نے اٹھ کر دونوں اونٹوں کے کوہان بھی کاٹ دیے اور ان کے پیٹ بھی چاک کر دیے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے دربار نبوی میں جا کر اس بات کی دہائی دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ وہ نشہ کی حالت میں تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو کہنے لگے کہ تم لوگ تو میرے باپ کے غلام ہو۔ یہ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض کیا اور اس حالت میں کوئی مواخذہ نہ فرمایا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مواخذہ فرماتے تو ان پر ارتداد کا حکم جاری فرماتے کیونکہ انہوں نے ایک پیغمبر کی توہین کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ نشہ میں تھے اور نشہ والے کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ منہ سے کیا کہتا جا رہا ہے اس پر

آپ ﷺ نے انہیں جانے دیا۔ اسی طرح نشہ والے کی طلاق بھی نافذ نہ ہوگی کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہی قول صحیح ہے جو امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے اور یہی صحیح قیاس بھی ہے۔ رہا یہ مشہور مذہب کہ یہ طلاق اس لیے نافذ ہوگی کیونکہ اس پر طاری ہونے والا نشہ ایک حرام شے کا نشہ ہے لہٰذا اسے رخصت کا محل نہ ہونا چاہیے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ نشہ والے کی طلاق نافذ نہیں ہوتی۔

1۔ بَابُ الرَّجْعَةِ ..... رجعت کا بیان

تمہید:.....رجعت کا لغوی اور اصطلاحی معنی:..... **رَجْعَةٌ:** یہ "رَجَعَ یَرْجِعُ" سے فعلة کے وزن پر اسم مرۃ کا صیغہ ہے۔ جس کا لغوی معنی ہے لوٹنا۔ جبکہ اصطلاح میں رجعت یہ طلاق دینے والے کا اپنی مطلقہ کے پاس واپس جانے کے اعلان کرنے کو کہتے ہیں یعنی بلا نکاح زوجیت کے تعلق کی بحالی کو رجعت کہتے ہیں۔ جبکہ مطلقہ غیر بائنہ ہو۔

رجعت کی شروط

علماء نے رجعت کے درست ہونے کی مندرجہ ذیل شروط بیان کی ہیں:

(1) زوجین میں فراق کی وجہ طلاق ہو، پس فسخ کی صورت میں رجوع نہ ہوگا۔

(2) مطلقہ بیوی مدخول بہا ہو۔ لہٰذا اگر طلاق غیر مدخول بہا کو دی تھی تو اس سے بھی رجوع نہ ہوگا۔

(3) زوجین کا نکاح شرعاً صحیح ہو۔ لہٰذا غیر صحیح نکاح میں اور بالخصوص متعہ میں کوئی رجوع نہ ہوگا۔

(4) زوجین میں طلاق کسی عوض کے بدلے نہ ہو کہ وہ فسخ ہوتا ہے اور فسخ میں رجوع نہیں ہوتا۔

(5) اور یہ رجوع تین طلاقیں ہونے سے قبل ہو۔ لہٰذا اگر کسی نے تین طلاقیں دے دی ہیں تو اب رجوع نہ ہوگا کیونکہ اب یہ مطلقہ بائنہ اور اس پر حرام ہو چکی ہے۔

اب پہلی چار شروط کا حکم یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی شرط میں خلل واقع ہو تو رجوع تو نہ ہو سکے گا البتہ عقدِ جدید ہو جائے گا۔ جبکہ پانچویں شرط کا حکم یہ ہے کہ اس میں دوسرے خاوند سے نکاح کیے بغیر وہ مطلقہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔

(6) جبکہ چھٹی شرط یہ ہے کہ یہ مراجعت عدت کے دوران ہو، لہٰذا عدت پوری ہونے کے بعد وہ عورت بائنہ ہو جائے گی۔

(7) رہا یہ سوال کہ کیا یہ بات بھی شرط ہے کہ مراجعت سے شوہر کی نیت اصلاح کی ہو نہ کہ مضرت رسانی کی؟ تو بعض علماء نے اس بات کو بھی مراجعت کی شرط قرار دیا ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ (البقرة: 228)

''اور ان کے خاوند اس مدت میں انہیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ (معاملہ) درست کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔''

پس معلوم ہوا کہ اگر خاوند کی نیت اصلاح کی نہ ہو تو اسے مراجعت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ لیکن مشہور مذہب یہی ہے کہ اصلاح کی نیت مراجعت میں شرط نہیں اور یہ کہ اگر مراجعت سے اس کی نیت ضرر رسانی کی تھی تو وہ عنداللہ گنہگار ہوگا۔ البتہ رجعت پھر بھی ثابت ہو جائے گی۔

لیکن امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ آیت کا ظاہر اس بات کو مقتضی ہے کہ مراجعت کے درست ہونے کے لیے اصلاح کی نیت شرط ہے۔

طلاق اور رجعت میں گواہ بنانے کا حکم

1085۔ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يُطَلِّقُ ثُمَّ يُرَاجِعُ، وَلَا يُشْهِدُ، فَقَالَ: ((أَشْهِدْ عَلَى طَلَاقِهَا، وَعَلَى رَجْعَتِهَا)).

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ان سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا کہ جو اپنی بیوی کو طلاق دے دے پھر اس سے رجوع کرے پر (اس پر) گواہ نہ بنائے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: اس کی (یعنی بیوی کی) طلاق اور اس کی مراجعت پر گواہ بناؤ۔ ❶

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ هٰكَذَا مَوْقُوفًا، وَسَنَدُهُ صَحِيحٌ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے اسی طرح موقوف روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

نکاح سے متعلق تین باتیں

شرح:.... مذکورہ حدیث میں نکاح کے احکام سے متعلقہ تین باتوں کا ذکر ہے، جو یہ ہیں:

(1) عقدِ نکاح (2) طلاق (3) اور رجعت

ان تینوں باتوں پر گواہ بنانا شرط ہے یا نہیں؟ تو اکثر علماء کا یہ مذہب ہے کہ انعقادِ نکاح پر گواہ بنانا صحتِ نکاح کی شرط ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے نکاح پر گواہ نہ بنایا تو نکاح باطل ٹھہرے گا۔ جبکہ طلاق پر گواہ بنانا سنت تو ہے پر شرط نہیں ہے۔ لہٰذا طلاق بغیر گواہ کے بھی واقع ہو جائے گی اور صحیح ہوگی۔ البتہ افضل اس میں بھی گواہ بنانا ہے اور طلاق دینے پر گواہ بنانے کے شرط نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دی مگر اس بارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت نہ کیا کہ آیا میں اس پر کسی کو گواہ بناؤں یا نہ بناؤں؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے گواہ نہ بنانے پر نکیر نہ فرمائی۔ اگر طلاق میں اشہاد شرط ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم ضرور فرماتے۔

تیسری بات جو اس حدیث میں مذکور ہے، وہ رجعت ہے۔ اس پر بھی گواہ بنانا مسنون تو ہے لیکن شرط نہیں۔ یہی اکثر علماء کا قول ہے۔ اگرچہ ایک قول رجعت پر اشہاد کے وجوب کا بھی ہے کیونکہ رجعت بھی ابتدائے نکاح کی طرح عورت کو اپنے پاس لانا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾

(الطلاق: 2)

''پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنالو۔''

اس آیت میں رجعت پر اشہاد کا امر ہے۔ لہٰذا یہ سنت موکدہ ہوگا کیونکہ رجعت پر یہ امور اور احکام مرتب ہوتے ہیں:

---

❶ سنن ابی داؤد: 2186۔ سنن ابن ماجہ: 2025۔ "تحفة المحتاج" (402/2) میں ہے کہ اس حدیث کی اسناد جید ہے۔

(1) عورت رجعت کا انکار بھی کر سکتی ہے۔اس لیے بھی رجعت پر اشہاد سنت ہے۔
(2) پھر رجعت پر میراث اور انساب کے مسائل بھی مرتب ہوتے ہیں۔اس لیے بھی رجعت پر گواہ بنالیا جائے تو بہتر ہوگا۔

وَأَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ بِلَفْظِ: أَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ ﷺ سُئِلَ عَمَّنْ رَاجَعَ امْرَأَتَهُ، وَلَمْ يُشْهِدْ، فَقَالَ: فِي غَيْرِ سُنَّةٍ؟ فَلْيُشْهِدِ الْآنَ.

جبکہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے اپنی بیوی سے رجوع کرنے والے شخص کے بارے میں (جب) پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: (اس کا یہ عمل کہ اس نے گواہ بنائے بغیر رجوع کر لیا ہے) غیر مسنون ہے پس چاہیے کہ وہ اب (اس پر) گواہ بنالے۔ ❶

وَزَادَ الطَّبَرَانِيُّ فِي رِوَايَةٍ: ((وَيَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ))

اور طبرانی نے ایک روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں: اور وہ (رجعت پر گواہ نہ بنانے پر) رب تعالیٰ سے استغفار (بھی) کرے۔ ❷

غریب الحدیث:......**فِيْ غَيْرِ سُنَّةٍ**: اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: "عَمَلُهُ هٰذَا عَلَى غَيْرِ السُّنَّةِ" یعنی بنا اشہاد کے اس کا مراجعت کر لینے کا عمل غیر مسنون ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے رجعت پر اشہاد کا حکم دیا ہے۔تو جب اس نے اس امر کا امتثال نہیں کیا تو اس کا عمل غیر مسنون ٹھہرا۔

فَلْيُشْهِدِ الْآنَ: یعنی جو ہوا سو ہوا، اس رجعت پر اب گواہ بنالے۔یعنی عین رجعت کے وقت اشہاد شرط نہیں، اس پر گواہ بعد میں بھی بنائے جا سکتے ہیں۔

وَيَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ: یہ طبرانی کی روایت کے الفاظ ہیں۔

یہ الفاظ بتلاتے ہیں کہ جنابِ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے نزدیک رجعت پر اشہاد واجب تھا کہ جس کے ترک پر آدمی گنہگار ہو جاتا ہے۔اسی لیے فرمایا کہ یہ آدمی اشہاد کے ترک پر استغفار کرے۔

1086۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ ﷺ أَنَّهُ لَمَّا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِعُمَرَ: ((مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: جب انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو نبی کریم ﷺ نے (ان کے والد ماجد) جنابِ عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ: "ان سے کہو کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کر لیں۔"

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔ ❸

تنبیہ:...... یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے اور اس پر تفصیلی بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔امام موصوف اس حدیث کو یہاں

❶ سنن البیہقی: 373/7۔ ابن ملقن (226/2) نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔
❷ المعجم الکبیر للطبرانی: 181/18۔ مصنف عبدالرزاق: 10255.
❸ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

اس بات پر استدلال کرنے کے لیے لائے ہیں کہ رجعت پر اشہاد واجب نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے رجوع کرنے کا حکم تو ارشاد فرمایا مگر اس پر گواہ بنانے کا حکم ارشاد نہ فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ان سب احادیث وآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق اور رجعت پر اشہاد مشروع ہے۔
◈ جنابِ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ رجعت پر اشہاد کو واجب سمجھتے تھے۔ اس کی دلیل "وَيَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ" کے الفاظ ہیں۔
◈ اگر مافات کی تلافی ممکن ہو تو کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔ اس کی دلیل "فَلْيُشْهِدِ الْآنَ" کے الفاظ ہیں۔
◈ ابلاغ علم میں توکیل جائز ہے۔ اس کی دلیل "مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا" کے الفاظ ہیں۔

2۔ بَابُ الْإِيْلَاءِ وَالظِّهَارِ وَالْكَفَّارَةِ

ایلاء، ظہار اور کفارہ کا بیان

ایلاء کا لغوی اور اصطلاحی معنی:......لفظ ایلاء یہ "اٰلٰى يُؤْلِيْ اِيْلَاءً" کا مصدر ہے جس کا لغوی معنی قسم کھانا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ (البقرۃ: 226)

''ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں سے قسم کھا لیتے ہیں، چار مہینے انتظار کرنا ہے۔''

جبکہ علماء نے ایلاء کا اصطلاحی معنی یہ بیان کیا ہے کہ یہ آدمی کا اس بات پر قسم کھانا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے جماع نہ کرے گا۔ چاہے یہ قسم مطلق ہو یا کسی کم یا زیادہ مدت کے ساتھ مقید ہو۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ: ''اللہ کی قسم! اب میں تم سے جماع نہ کروں گا۔'' یہ مطلق قسم ہے، اور اگر یہ کہے کہ مثلاً میں تم سے چار ماہ تک جماع نہ کروں گا تو یہ مقید قسم ہے۔ البتہ چار ماہ سے کم کے ایلاء کو لغوی ایلاء تو کہیں گے، اصطلاحی ایلاء نہ کہیں گے۔ اصطلاحی ایلاء چار ماہ سے کم کا نہیں ہوتا۔ نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے ایک پورے ماہ تک ایلاء کرنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔

ظہار کا لغوی اور اصطلاحی معنی

ظہار یہ ظہر (پیٹھ یعنی کمر) سے مشتق ہے۔

اصطلاحِ علماء میں ظہار یہ آدمی کا اپنی بیوی کو کسی ایسی عورت کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جو اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو جیسے ماں، بہن، بیٹی، نانی، پھوپھی خالہ وغیرہ اور اس تشبیہ دینے سے اس کی مراد بیوی کو خود پر ان رشتوں کی طرح حرام کر لینا ہو۔ جیسے آدمی اپنے بیوی سے یہ کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔

لیکن اگر کوئی اپنی بیوی کو کسی ایسی عورت کے ساتھ تشبیہ دے جو اس پر ہمیشہ کو تو حرام نہ ہو البتہ ایک خاص مدت تک حرام ہو جیسے بیوی کی بہن مثلاً یوں کہے کہ تو مجھ پر اپنی بہن کی پیٹھ کی طرح ہے، تو ایک قول یہ ہے کہ یہ بھی ظہار ہے کیونکہ بیوی کی بہن بھی خاوند پر حرام ہے گو ایک مدت تک ہی سہی۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ ظہار نہیں۔ ظہار اسی عورت کے ساتھ تحریم کی نیت سے تشبیہ دینے سے ثابت ہوتا ہے جو آدمی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔ لیکن اگر کسی نے تکریم کی نیت سے بیوی کو مثلاً ماں

کے ساتھ تشبیہ دی تو یہ ظہار نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی نے مثلاً ماں کے کسی ایسے عضو کے ساتھ بیوی کو تحریم کی نیت سے تشبیہ دی جو بدن سے کبھی جدا نہیں ہوتا جیسے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، پیٹھ وغیرہ تو یہ بھی ظہار ہے جیسے یہ کہ ''تو مجھ پر میری ماں کے ہاتھ کی طرح ہے'' تو یہ بھی ظہار ہے۔ لیکن اگر ایسے کسی عضو سے تشبیہ دی جو بدن سے منفصل ہو جایا کرتا ہے جیسے ناخن اور بال تو یہ ظہار نہ ہوگا کیونکہ ظہار میں ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دینا لازم ہے جو بدن سے جدا نہ ہوتا ہو۔

کفارہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی

کفارہ: یہ الـکُـفْـر سے ماخوذ ہے جس کا لغوی معنی چھپانا ہے۔ جبکہ شریعت کی اصطلاح میں کفارہ یہ فدیہ کی رقم ہے جو آدمی کسی گناہ کی پاداش میں اپنی جان کے بدلے دیتا ہے۔ پس کفارہ یہ گناہ کے بالمقابل ہوتا ہے چاہے یہ کفارہ ظہار کا ہو یا یمین کا اور آدمی کفارہ اس لیے دیتا ہے تاکہ رب تعالیٰ اس کے فعل کی ستاری فرمادے۔

ایلاء ظہار اور کفارہ کا حکم

ایلاء کرنا حرام ہے کیونکہ یہ کسی کے حق کو پامال کرنے کی قسم اٹھانا ہے اور وہ بیوی ہے جس کا یہ حق ہے کہ خاوند اس سے دستور کے مطابق جماع کرے۔

ظہار کا بھی یہی حکم ہے کہ یہ حرام ہے۔ کیونکہ ظہار کرنے والوں کے بارے میں رب تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا﴾ (المجادلہ: 2)

''اور بلاشبہ وہ یقیناً ایک بری بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔''

اور رہا کفارہ تو جب اس کا سبب پایا جائے تو کفارہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔ ان تینوں باتوں کی مزید تفصیل آگے آ جاتی ہے۔

ایلاء کے جواز کا حکم

1087۔ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: ((آلَى رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ نِسَائِهِ، وَحَرَّمَ، فَجَعَلَ الْحَرَامَ حَلَالًا، وَجَعَلَ لِلْيَمِينِ كَفَّارَةً)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے ایلاء فرمایا اور (ایک شے یعنی شہد کو اپنے اوپر) حرام کرلیا۔ پس آپ ﷺ نے ایک حلال کو حرام کرلیا اور یمین کے لیے کفارہ مقرر فرمایا۔ ❶

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث: ...... آلَى مِنْ نِسَائِهِ: یہ ایلاء کتنی مدت کا تھا؟ تو یہ ایک ماہ تک کا تھا اور آپ ﷺ انتیس تاریخ کو اپنے غرفہ سے نیچے اترے اور ارشاد فرمایا کہ مہینہ (کبھی) انتیس دنوں کا (بھی) ہوتا ہے۔

---

❶ جامع الترمذی: 1201۔ سنن ابن ماجہ: 2072۔ امام ابن حبان (1317۔ موارد) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام بوصیری نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور صحیحین میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے اس حدیث کا ایک شاہد بھی ہے۔

وَحَرَّمَ: آپ ﷺ نے خود پر کس چیز کو حرام فرمایا تو اس بارے دو اقوال ہیں:
(1) ایک یہ کہ آپ ﷺ نے اپنے اوپر شہد کو حرام کر لیا تھا اور یہی قول صحیح بھی ہے۔
(2) جبکہ ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خود پر سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا کو حرام کر لیا تھا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

فَجَعَلَ الْحَرَامَ حَلَالًا: یعنی آپ ﷺ نے ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا۔

وَجَعَلَ فِي الْيَمِينِ كَفَّارَةً: یعنی آپ ﷺ نے اپنی قسم کا کفارہ ادا فرمایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ جب آدمی امتناع کے ارادہ سے کسی شے کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے تو یہ ''تحریم'' یمین کے حکم میں ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی اس یمین کا کفارہ ادا فرمایا کیونکہ یہی رب تعالیٰ کا آپ ﷺ کو فرمان تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ o قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ o﴾ (التحریم: 2-1)

''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟ تو اپنی بیویوں کی خوشی چاہتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ بے شک اللہ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور اللہ تمھارا مالک ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

مضمونِ حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ایلاء کرنا جائز ہے۔ البتہ ایلاء کا کوئی سبب ہونا اس کے جواز کی شرط ہے۔ کیونکہ جماع کرنا جس طرح خاوند کا حق ہے اسی طرح بیوی کا بھی حق ہے۔ لہٰذا بلا سبب ترکِ جماع کی قسم کھانا جائز نہ ہوگا۔ البتہ سبب پائے جانے کے وقت بطور تعزیر کے بیوی سے ترکِ جماع جائز ہوگا اور دوسری شرط یہ ہے کہ یہ ایلاء چار ماہ سے زیادہ کا نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ کسی شے سے امتناع کے قصد سے اس کو اپنے اوپر حرام کر لینا یہ یمین کے حکم میں ہے۔ تب پھر وہ شے بذاتِ خود تو حرام نہ ہوگی البتہ اس یمین کا کفارہ ذمہ میں آئے گا۔ جیسے یہ قسم کھانے سے کہ: اللہ کی قسم! میں روٹی نہ کھاؤں گا۔ وہ روٹی تو حرام نہ ہوگی۔ البتہ یہ یمین بن جائے گی اور اس کا کفارہ لازم ہوگا۔

◈ اب امتناع کے ارادہ سے کسی شے کو اپنے اوپر حرام کر لینا یمین ہے اور اس کا کفارہ بھی لازم ہے۔ تو کیا اگر ایسا طلاق یا عتاق یا نذر میں کیا جائے تو یہ بھی یمین بنے گا یا طلاق یا عتاق یا نذر بنے گی؟ جیسے کوئی امتناع کے ارادہ سے یہ کہے کہ اگر میں نے فلاں فلاں کام کیا تو میری بیوی کو طلاق۔ جبکہ اس کا قصد طلاق کا نہ ہو بلکہ بیوی سے امتناع کا ارادہ ہو، تو صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ یہاں بھی یمین بنے گی نہ کہ طلاق۔

اسی طرح اگر امتناع کے ارادہ سے غلام کے عتاق کی قسم اٹھائی تو وہ بھی یمین بنے گی نہ کہ عتاق اور یہی راجح قول ہے۔

ایلاء کی مدت کتنی ہے؟

1088۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: إِذَا مَضَتْ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ وَقَفَ الْمُولِي حَتَّى يُطَلِّقَ ، وَلَا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جب چار ماہ گزر جائیں تو مولی (یعنی ایلاء کرنے والا) رک جائے

يَقَعُ عَلَيْهِ الطَّلَاقُ حَتَّى يُطَلِّقَ)).

یہاں تک کہ (بیوی کو) طلاق دے دے اور اس پر طلاق واقع نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ (خود) طلاق دے۔ ❶

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... وَقَفَ: یعنی چار ماہ گزرنے پر اسے یہ کہا جائے کہ اب مزید ایلاء کرنے سے رک جاؤ اور بیوی کو طلاق دے دو اور اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے تو جب تک وہ خود طلاق نہ دے اس پر طلاق دینے کا حکم جاری نہ ہوگا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ حکم اس لیے لگاتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ چار ماہ پورے ہوتے ہی از خود طلاق پڑ جائے گی اور اس بارے خاوند کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ٥﴾ (البقرة: 226_227)

''ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں سے قسم کھا لیتے ہیں، چار مہینے انتظار کرنا ہے، پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس لیے درست یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد بھی جب تک وہ خود طلاق نہ دے طلاق واقع نہ ہوگی، چاہے چار تو کیا پانچ یا چھ ماہ بھی گزر جائیں۔ پس صرف چار ماہ گزرنا وقوع طلاق کا سبب نہیں۔

رہا یہ سوال کہ چار ماہ گزرنے کے بعد نہ تو خاوند طلاق دے اور نہ رجوع کرے اور بیوی اپنے حق کا مطالبہ بھی کرے تو قاضی اس پر یہ لازم کرے گا کہ یا تو وہ طلاق دے دے یا پھر رجوع کر لے۔ پس اگر وہ ان دونوں باتوں سے انکاری ہو جائے تو قاضی بیوی پر سے ضرر کو دور کرنے کے لیے طلاق کا حکم جاری کر دے گا۔ اسی لیے علماء کا قول ہے کہ ایلاء کی وجہ سے طلاق واجب ہو جاتی ہے نہ کہ خود ایلاء طلاق ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ایلاء کی مدت چار ماہ ہے۔ اس کے بعد یا تو وہ طلاق دے دے یا پھر رجوع کر لے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ایلاء کی مدت ختم ہونے پر خاوند کو صرف طلاق دینے ہی پر مجبور نہ کیا جائے گا۔
◈ ایلاء کی مدت پوری ہوتے ہی طلاق نہیں پڑ جاتی۔

1089۔ وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: أَدْرَكْتُ بِضْعَةَ عَشَرَ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كُلُّهُمْ يَقِفُوْنَ الْمُوْلِيَ.

حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں تیرہ سے کچھ اوپر اصحاب نبی ﷺ سے ملا ہوں، وہ سب کے سب (چار ماہ گزرنے پر) مولی (یعنی ایلاء کرنے والے) کو (مزید ایلاء کیے رکھنے سے) روک دیتے تھے۔ ❷

---

❶ صحيح البخاري: 5291. ❷ مسند الشافعي: 248/1.

اس حدیث کو امام شافعی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... بِضْعَةَ عَشَرَ: "بِضْعَةَ" اس لفظ کا طلاق تین سے نو تک کے عدد پر ہوتا ہے۔

يَقِفُوْنَ الْمُوْلِيَ: یعنی وہ مولی سے یہ کہتے تھے کہ یا تو اب رجوع کرلو یا پھر طلاق دے دو۔

یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ایلاء کی مدت پوری ہو جانے کے بعد خاوند سے رجعت یا طلاق میں سے کسی ایک بات کا مطالبہ کیا جائے گا۔

1090- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ إِيلَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ فَوَقَّتَ اللّٰهُ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ، فَإِنْ كَانَ أَقَلَّ مِنْ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَلَيْسَ بِإِيلَاءٍ.
أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جاہلیت میں ایلاء ایک اور دو سال تک بھی کرلیا جاتا تھا۔ پس رب تعالیٰ نے (ایلاء کی) مدت چار ماہ (تک) مقرر فرمائی۔ پس اگر ایلاء چار ماہ سے کم مدت کا ہو تو وہ ایلاء نہ ہوگا۔ [1]

اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... یعنی جاہلیت میں خاوند بیوی کو ضرر پہنچانے کے ارادہ سے ایک یا دو سال تک بھی ایلاء کیے رکھتا تھا جیسے جاہلیت میں لوگ تین سے زیادہ طلاقیں دینے کے عادی تھے۔ تو جیسے رب تعالیٰ نے جاہلیت کی اس غلط رسم کو توڑنے کے لیے طلاق کی حد تین مقرر فرمائی، اسی طرح ایلاء کے باب میں بھی اس غلط روش کو ختم کرنے کے لیے ایلاء کی مدت چار ماہ تک مقرر فرمائی۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ (البقرة: 226)

"ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں سے قسم کھا لیتے ہیں، چار مہینے انتظار کرنا ہے۔"

فَإِنْ كَانَ أَقَلَّ مِنْ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَلَيْسَ بِإِيلَاءٍ: یعنی وہ لغوی ایلاء تو کہلائے گا مگر شرعی ایلاء نہ کہلائے گا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ کی عورتوں کے ساتھ از حد رعایت اور ان پر بے پناہ عنایت کہ رب تعالیٰ نے شریعتِ اسلامیہ کے ذریعے عورتوں کو ان کے قرار واقعی حقوق عنایت فرمائے۔
- معلوم ہوا کہ جاہلیت میں مردوں کا رویہ عورتوں کے ساتھ بے حد متشددانہ اور بے رحمانہ تھا، اسلام نے آکر جاہلیت کے ان سب مبنی بر ظلم رویوں کو یکسر ختم فرمایا۔
- رب تعالیٰ نے ایلاء کی مدت چار ماہ مقرر فرمائی ہے، جو سال بھر کا ایک تہائی ہے۔ جبکہ شریعت نے متعدد احکام میں ثلث کا اعتبار کیا ہے جیسے بیوہ کی عدت جبکہ وہ حاملہ نہ ہو، چار ماہ دس دن ہے یہ بھی سال کا ایک ثلث ہے۔
- بسا اوقات اصطلاحاتِ شرعیہ یہ اصطلاحاتِ لغویہ سے مختلف بھی ہوتی ہیں۔ یعنی جہاں حقائق شرعیہ ہوتے ہیں، وہیں حقائق لغویہ بھی ہوتے ہیں جبکہ حقائق کی ایک تیسری قسم حقائق عرفیہ بھی ہے۔ لہٰذا اگر کسی لفظ کا شرعی مدلول بھی ہو اور

[1] سنن سعید بن منصور: 1884- سنن البیہقی: 381/7.

لغوی بھی۔ تو اوّل اس لفظ کو اس کے شرعی مدلول پر محمول کیا جائے گا وگرنہ لغوی مدلول پر محمول کریں گے۔ جیسے چار ماہ سے کم مدت کے ایلاء کو اس کے شرعی مدلول کی بجائے اس کے لغوی مدلول پر محمول کیا جائے گا۔

ظہار میں جماع کرنے والے کا حکم

1091۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلًا ظَاهَرَ مِنَ امْرَأَتِهِ، ثُمَّ وَقَعَ عَلَيْهَا، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: إِنِّي وَقَعْتُ عَلَيْهَا قَبْلَ أَنْ أُكَفِّرَ، قَالَ: ((فَلَا تَقْرَبْهَا حَتَّى تَفْعَلَ مَا أَمَرَكَ اللّٰهُ بِهِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے اپنی بیوی سے (پہلے) ظہار کیا پھر اس سے جماع بھی کر لیا، پھر خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ: میں نے اپنی بیوی سے (پہلے ظہار کیا پھر) قبل اس کے کہ میں (اُس ظہار کا) کفارہ دیتا، (اس سے) جماع کر لیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اب اس کے قریب مت جانا۔ یہاں تک کہ جس بات کے کرنے کا رب تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے تم وہ نہ کر لو۔'' [1]

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ إِرْسَالَهُ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام نسائی نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

وَرَوَاهُ الْبَزَّارُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما، وَزَادَ فِيهِ "كَفِّرْ، وَلَا تَعُدْ")).

اور بزار نے ایک اور طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے جس میں یہ الفاظ زائد ہیں: ''کفارہ دو اور ایسا پھر مت کرنا۔'' [2]

شرح :...... یہ حدیث ظہار کی بابت ہے۔ ظہار کی تعریف اور حکم بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ اس حدیث میں اس اہم مسئلہ کو ذکر کیا گیا ہے کہ کیا ظہار کرنے والا ظہار کے دوران اور ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے قبل بیوی سے جماع و استمتاع کر سکتا ہے۔ یا نہیں؟

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ظہار کرنے والے پر جب تک کہ وہ اپنے ظہار کا کفارہ نہ دے لے بیوی سے دور رہنا اور اس کے ساتھ جماع سے اجتناب کرنا واجب ہے اور وہ کفارہ ایک گردن کا آزاد کرنا ہے جیسا کہ کتاب و سنت نے خود یہ کفارہ بیان کیا ہے اور اگر آزاد کرنے کو کوئی گردن میسر نہ ہو تو دو ماہ کے لگا تار روزے رکھے، وگرنہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ ظہار کے

---

[1] سنن ابی داؤد: 2221۔ جامع الترمذی: 1199۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5653۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درستی کے زیادہ قریب ہے۔ سنن ابن ماجہ: 2065۔ ابن حزم (55/10) کہتے ہیں: یہ خبر صحیح ہے جو ثقہ رواۃ کی روایت ہے۔ حاکم (222/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ علامہ منذری اپنی "المختصر" میں کہتے ہیں۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے سماع مشہور ہے اور حافظ ابن حجر نے ابن عربی کے اس قول کو رد کیا ہے کہ ظہار کے باب میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے۔ دیکھیں: فتح الباری: 433/9۔ اور فرماتے ہیں کہ ان احادیث کی اسانید حسن ہیں۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 435/1۔

[2] سنن البیهقی: 386/7۔ التلخیص الحبیر: 22/3۔

کفارہ میں عتقِ رقبہ یا دو ماہ کے لگاتار روزے تو منصوص ہیں البتہ ساٹھ مساکین کے کھانا کھلانے کا حکم قیاس سے اخذ کیا گیا ہے جس میں علماء کا اختلاف بھی ہے۔

اب ذیل میں غریب الحدیث کو بیان کیا جاتا ہے۔

أَنَّ رَجُلًا ظَاهَرَ مِنِ اِمْرَأَتِهِ: حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ صاحب ظہار اور اس کے حکم سے لاعلم نہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ ظہار کا کفارہ دینے سے پہلے بیوی سے جماع جائز نہیں۔

فَلَا تَقْرَبْهَا حَتَّى تَفْعَلَ مَا أَمَرَكَ اللّٰهُ بِهِ: اور رب تعالیٰ کا وہ امر ظہار کے کفارہ میں ایک غلام کو آزاد کرنا ہے یا پھر دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا ہے۔ یا پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اور یہ کفارہ اسی ترتیب سے ہوگا کیونکہ آیت میں اس کفارہ کی ترتیب اسی طرح مذکور ہے۔

اب "فَلَا تَقْرَبْهَا" سے جماع سمیت ہر قسم کے بوس وکنار اور استمتاع کی ممانعت بھی مراد ہوسکتی ہے اور صرف جماع کی ممانعت بھی مراد ہوسکتی ہے۔ جس کی دلیل دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں: "وَلَا تَعُدْ" یعنی جو جماع تم نے کیا ہے وہ دوبارہ مت کرنا۔ یہاں تک کہ کفارہ دے لو۔

غرض اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ ممانعت صرف جماع کی ہے یا جماع سمیت استمتاع وتلذذ کی دوسری انواع کی بھی ہے۔ جو علماء صرف جماع کی ممانعت کے قائل ہیں، ان کی دلیل ایک تو "وَلَا تَعُدْ" کے الفاظ ہیں اور دوسری دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاسَّا﴾

(المجادلة: 3)

"اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اس سے رجوع کر لیتے ہیں جو انھوں نے کہا، تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔"

اور مُمَاسَّہ یہ "جماع" ہی ہے۔ پس یہ آیت بتلاتی ہے کہ ظہار کے کفارہ سے قبل جو بات منع ہے وہ صرف جماع ہے۔ اگرچہ مذکورہ روایت اس مسئلہ پر واضح اور صریح نص نہیں لیکن راجح قول صرف جماع کے منع ہونے کا ہی ہے اور یہی مذکورہ آیت کا ظاہر بھی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر یہ مسئلہ مذکور ہے کہ ظہار کرنے والا ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے قبل بیوی کے قریب نہ جائے اور راجح قول کے مطابق اس سے مراد جماع نہ کرنا ہے۔

رہا یہ سوال کہ ظہار کا کفارہ ہے کیا؟ تو اس کا بیان اگلی حدیث میں آرہا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کامل ایمان کی بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ حق بات تک پہنچنے کے لیے بات صاف صاف، پوری پوری اور بلاکم وکاست اور کسی قسم کے تکلف وتصنع کے بغیر بیان کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ان صاحب نے خدمت نبوی میں حاضر ہوکر ہونے والے واقعہ کی بعینہ خبر دے دی۔

- حق بات کے بیان میں حیاء نہیں۔
- جو آدمی ظہار کے بعد کفارہ سے قبل بیوی سے جماع کرے، اس پر دو کفارے نہیں آتے بلکہ وہی ایک کفارہ آتا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی شخص کو نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ وہ کرو جس بات کا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ جبکہ اس صورت میں بعض علماء دو کفارے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن صریح نص کے ہوتے ہوئے اس قول کی کوئی وجہ نہیں۔

ظہار کا کفارہ

1092۔ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَخْرٍ ﷺ قَالَ: دَخَلَ رَمَضَانُ فَخِفْتُ أَنْ أُصِيبَ امْرَأَتِي، فَظَاهَرْتُ مِنْهَا، فَانْكَشَفَ لِي شَيْءٌ مِنْهَا لَيْلَةً، فَوَقَعْتُ عَلَيْهَا، فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((حَرِّرْ رَقَبَةً))، فَقُلْتُ: مَا أَمْلِكُ إِلَّا رَقَبَتِي . قَالَ: ((فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ)) قُلْتُ: وَهَلْ أَصَبْتُ الَّذِي أَصَبْتُ إِلَّا مِنَ الصِّيَامِ، قَالَ: ((أَطْعِمْ فَرَقًا مِنْ تَمْرٍ سِتِّينَ مِسْكِينًا)).

حضرت سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک دفعہ جب) رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ (مبادا) میں (روزہ کے دوران) اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھوں گا تو میں نے (اس بات کا حل یہ نکالا کہ میں نے) اپنی بیوی سے ظہار کر لیا۔ پھر (اسی دوران یہ ہوا کہ) ایک رات میرے سامنے بیوی (کے ستر کا) کوئی حصہ کھل گیا تو میں نے اس سے جماع کر لیا (صبح کو جب میں نے یہ ماجرا خدمت نبوی میں گوش گزار کیا) تو نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ: ''ایک گردن آزاد کرو۔'' میں نے عرض کیا کہ میرے قبضہ میں سوائے اپنی گردن کے اور کوئی گردن نہیں (یعنی میرے پاس کوئی غلام نہیں)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(تو) پھر دو ماہ کے لگاتار روزے رکھو۔'' میں نے عرض کیا کہ: یہ جو میں کر بیٹھا ہوں، یہ روزوں کی وجہ سے ہی تو کر بیٹھا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(پھر) ساٹھ مسکینوں کو کھجوروں کا ایک ٹوکرا کھلا دو۔'' [1]

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَابْنُ الْجَارُودِ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے جبکہ امام ابن خزیمہ اور امام ابن جارود نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

روایة الحدیث :......کاش امام موصوف ظہار کے مسئلہ میں ان احادیث کی بجائے ان سے زیادہ صریح احادیث لے آتے۔ لیکن بہرحال اس حدیث پر کلام تو کرنا ہے۔ اس لیے ذیل میں اس حدیث کے تشریحی متعلقات ملاحظہ کیجیے!

غریب الحدیث:......**فَظَاهَرْتُ مِنْهَا**: حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ یوں ظہار کر کے وہ رمضان میں بیوی

[1] مسند احمد: 37/4۔ سنن ابی داؤد: 2213۔ جامع الترمذی: 1200۔ سنن ابن ماجہ: 2062۔ المنتقی لابن جارود: 744۔ صحیح ابن خزیمۃ: 2387.

سے دور رہنے میں کامیاب رہیں گے۔

یاد رہے کہ یہ رمضان کی فرضیت کے اوّل امر کا قصہ ہے کہ جب آدمی پر رمضان کی راتوں میں بھی بیوی کے قریب جانے اوراس سے جماع کرنے کی ممانعت تھی۔ لیکن جب یہ حکم لوگوں پر گراں گزرا تو رب تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ فرما دیا، اس کی پوری تفصیل اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ﴾ (البقرة: 187)

''تمھارے لیے روزے کی رات اپنی عورتوں سے صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنی جانوں کی خیانت کرتے تھے تو اس نے تم پر مہربانی فرمائی اور تمھیں معاف کر دیا، تو اب ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمھارے لیے لکھا ہے۔''

فَانْکَشَفَ لِیْ شَیْءٌ مِنْهَا لَیْلَةً فَوَقَعْتُ عَلَیْهَا: اگرچہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے رمضان میں بیوی کے ساتھ جماع کرنے سے بچنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ بیوی سے ظہار کر لیا لیکن ایک رات اس کے بدن کا ایک مستور حصہ ان کے سامنے کھل گیا تو وہ اپنے اوپر ضبط نہ کر سکے اور بیوی سے جماع کر بیٹھے۔

رہا یہ سوال کہ اس صورت میں کیا واجب ہوتا ہے؟ تو وہ کفارہ ہے جس کا علی الترتیب بیان یہ ہے:

حَرِّرْ رَقَبَةً: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ ہو سکے تو پہلے ایک گردن آزاد کرو۔ لفظ رقبہ یہ مذکر ومونث، کافر ومسلمان، نیک وبد سب کو شامل ہے۔ لہٰذا یہ حکم باندی آزاد کرنے سے بھی پورا ہو جائے گا اور کافر غلام آزاد کرنے سے بھی پورا ہو جائے گا۔ غرض یہ رقبہ مطلق ہے کیونکہ خود رب تعالیٰ نے اس کو اپنے اطلاق پر باقی رکھا ہے اور اس رقبہ کو ایمان کے ساتھ مقید نہیں فرمایا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا﴾ (المجادلة: 3)

''تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔''

یہاں رقبہ ''ایمان'' کے وصف کے ساتھ مقید نہیں بلکہ مطلق ہے جو نیک وبد اور کافر ومسلمان سب کو شامل ہے۔

پس یہ اطلاق مذکر ومونث، نیک وبد، کافر ومسلمان، صغیر وکبیر اور معیب وسلیم (عیب والا غلام یا عیب سے سالم غلام) سب کو شامل ہے۔

فَقُلْتُ: مَا اَمْلِكُ اِلَّا رَقَبَتِیْ: یعنی میرے پاس روپے پیسے، درہم ودینار اور ساز وسامان میں سے کچھ بھی نہیں اور نہ کوئی غلام ہی میری ملک میں ہے۔ البتہ میں صرف اپنی جان کا مالک ہوں کیونکہ ہر آدمی اپنی جان کا مالک ضرور ہوتا ہے اور یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ﴾ (المائدة: 25)

''اے میرے رب! بے شک میں اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں۔''

فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ: یعنی تو پھر کسی بھی دو روزوں کے درمیان ناغہ کیے بغیر لگا تار دو ماہ کے روزے رکھو۔ مذکورہ "فا" تفریعیہ ہے یعنی اس "فا" کا مابعد اس کے ماقبل پر مفرع ہے اور مطلب یہ بنے گا کہ اگر آزاد کرنے کو غلام نہیں تو پھر دو ماہ کے لگا تار روزے رکھو۔

("فا" تفریعیہ کا اردو میں ترجمہ عموماً ''تب پھر'' یا ''تو پھر'' کے الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نسیم)

وَهَلْ أَصَبْتُ الَّذِيْ أَصَبْتُ إِلَّا مِنَ الصِّيَامِ: یعنی میں دو ماہ کے لگا تار روزے کیونکر رکھ سکتا ہوں حالانکہ میں تو ایک ماہ کے روزوں سے ہی عاجز آ گیا۔

أَطْعِمْ فَرَقًا: "فَرَق" فا اور را کے فتح کے ساتھ۔ یہ بڑے ٹوکرے کو یا بڑے تھیلے یعنی زنبیل کو کہتے ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس ٹوکرے میں سے ساٹھ مسکینوں کو کھلانے کا حکم دیا تھا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔ کہ اس میں ظہار کے کفارہ کا اور اس میں جو ترتیب ہے اس کا بیان ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شدتِ ورع کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے محض اس اندیشہ سے بیوی سے ظہار کر لیا کہ کہیں رمضان کی راتوں میں اس سے جماع نہ کر بیٹھوں۔
- معلوم ہوا کہ وقتی ظہار کرنا بھی جائز ہے اور یہ قسم کے حکم میں نہیں۔
- بیوی کے ساتھ ظہار کر کے پھر ظہار ختم کرنے اور جماع کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔
- اگر ظہار میں کفارہ ادا کرنے سے قبل جماع کر لیا تو بھی ایک ہی کفارہ لازم آتا ہے بخلاف ان کے جو اس صورت میں دو کفاروں کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ درست یہ ہے کہ ایک ہی کفارہ لازم آتا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔
- کفارۂ ظہار میں مطلق گردن آزاد کرنا کافی ہے جس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔
- ظہار کے کفارہ میں ترتیب واجب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تین باتوں کو علی الترتیب ایک دوسرے کے بعد بیان فرمایا ہے۔
- چنانچہ آزاد کرنے کو گردن نہ ہو تو دو ماہ کے لگا تار روزے رکھے گا۔ رہا یہ سوال کہ یہ دو ماہ چاند کے اعتبار سے ہوں گے یا دِنوں کے اعتبار سے یعنی ساٹھ دن ہوں گے؟ تو علماء اس میں دونوں طرف گئے ہیں۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ اس میں اعتبار چاند کا ہے، چاہے مہینہ کے آغاز سے روزے رکھنے شروع کرے یا بیچ سے۔
- پھر اگر دو ماہ کے روزے رکھنے کے دوران کسی شرعی عذر مثلاً مرض یا سفر وغیرہ کی وجہ سے تتابع یعنی روزوں کا لگا تار رکھنا قطع ہو جائے تو کیا شرعاً اس کو قطع تتابع تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ تو صحیح قول یہ ہے کہ اگر تو فطر کو مباح کر دینے والا کوئی عذر پیش آ گیا ہے تو اس کو قطع تتابع نہ سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جب عذر کی وجہ سے رمضان کا روزہ افطار کرنا جائز ہے تو بھلا اس تتابع کا قطع کرنا کیوں نہ مباح ہو گا۔ اس بنا پر اگر اس تتابع کے دوران شرعی سفر پیش آ گیا تو اتنے ایام کے روزے نہ رکھے اور بعد میں مابعد کے ایام پر بنا کرے گا۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق بات کو صاف بیان فرما دیتے تھے اور اس میں حیاء سے کام نہ لیتے تھے۔

◈ کفارۂ ظہار میں تیسرا امر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے نہ کہ ساٹھ مسکینوں کے بقدر کھانا کھلانا ہے۔ تب پھر ساٹھ کا عدد پورا کرنا واجب ہوگا۔ تب پھر صحیح قول یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھلائے جانے والے کھانے کی مقدار غیر متعین ہوگی۔

◈ پھر آیا انہیں کھلانا ہی ضروری ہے یا کھانا دے دینا بھی کافی ہے۔ جیسے انہیں ایک وقت کو کفایت کر جانے کے بقدر غلہ دے دیا جائے۔ اب چاہے تو اس کو کھالے اور چاہے تو بیچ کھائے۔

تو اس بارے صحیح قول یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اِطعام کو مطلق ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا﴾ (المجادلة: 4)

''پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

اطعام واجب ہوگا نہ کہ طعام کی تملیک۔

اور جہاں رب تعالیٰ مقدار کو ذکر فرماتے ہیں وہاں تملیک ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ (البقرة: 196)

''پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزے یا صدقے یا قربانی میں سے کوئی ایک فدیہ ہے۔''

یہاں رب تعالیٰ نے اِطعام کا ذکر نہیں فرمایا: بلکہ ''صَدَقَةٍ'' کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ لہٰذا صدقہ دینے میں تملیک واجب ہو گی۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس کی مقدار تین صاع بیان فرمائی ہے جس میں ہر مسکین کو نصف صاع دیا جائے گا۔

◈ فقیر اور مسکین یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے۔

◈ مذکورہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو کفارہ ظہار ادا کرنے سے قبل جماع کر بیٹھے، اسے چاہیے کہ اب کفارہ ادا کرنے تک دوبارہ جماع نہ کرے۔

◈ نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ پر کوئی سختی نہ فرمائی اور نہ ان کی سرزنش کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ جو تائب ہو کر آ جائے، اس کی سرزنش نہ کی جائے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

3۔ بَابُ اللِّعَانِ ..... لعان کا بیان

لعان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

لعان یہ ''لَاعَنَ يُلَاعِنُ'' کا مصدر ہے اور لعان یہ لعن سے ماخوذ ہے جس کا معنی لعنت کرنا، رب تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنا، اور دھتکارنا ہے۔

جبکہ اصطلاح شرع میں لعان یہ زوجین میں سے ہر ایک کا چار دفعہ قسم کھا کر شہادت دینا ہے۔ چنانچہ خاوند چار دفعہ قسم کھا کر یہ کہے گا کہ وہ اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگانے میں سچا ہے، جبکہ بیوی چار دفعہ قسم کھا کر یہ کہے کہ اس الزام لگانے میں میرا

خاوند جھوٹا ہے۔

جبکہ خاوند پانچویں قسم یوں اٹھائے گا کہ اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو، اور بیوی پانچویں قسم یوں اٹھائے گی کہ اگر اس کا خاوند اس دعویٰ میں سچا ہو تو اس پر (یعنی بیوی پر) اللہ کا غضب اترے۔ اگر چہ لعنت کرنے کا صدور صرف خاوند سے ہوتا ہے لیکن یہاں لعان کہا جو باب مفاعلہ کا مصدر ہے جو اشتراک پر دلالت کرتا ہے حالانکہ لعان میں بیوی لعنت نہیں بھیجتی تو یہ بابِ تغلیب میں ہے۔ پھر اس کا ایک سبب ہونا بھی ضروری ہے اور وہ خاوند کا بیوی پر زنا کی صریح تہمت لگانا ہے جو اگر ایک اجنبی لگائے اور اس پر گواہ نہ لائے تو اس پر حد واجب ہو، البتہ خاوند پر حد نہ آئے گی کیونکہ اپنی بیوی پر زنا کی تہمت کوئی بلاوجہ یا جلد بازی میں نہیں لگائے گا کیونکہ اس میں ایک تو اس کے بستر کی تدنیس (اسے گندا کرنا) ہے، دوسرے اس میں اپنی اولاد کے نسب کو مشکوک بنانا ہے۔ لہٰذا ایسی بات کی جرأت کوئی خاوند تب ہی کر سکتا ہے، جب اسے اس بات کا قرار واقعی یقین ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمومی حالات میں ایک خاوند سے بیوی پر بدکرداری کی تہمت لگانا از حد بعید ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَo﴾ (النور: 4)

''اور وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لائیں تو انھیں اسی (80) کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان لوگ ہیں۔''

تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بے اختیار عرض کرنے لگے، اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنی بیوی پر ایک مرد کو سوار دیکھ کر انہیں اسی حال میں چھوڑ کر چار گواہ ڈھونڈنے نکل پڑوں گا، اللہ کی قسم! میں تو اسی وقت ان کی گردنیں تلوار کے سیدھے وار سے ماردوں گا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم لوگ سعد کی غیرت پر حیرت کرتے ہو، اللہ کی قسم! میں سعد سے زیادہ غیرت والا ہوں اور رب تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرت والے ہیں۔'' [1]

اسی لیے رب تعالیٰ نے ایسے خاوندوں کے لیے سہولت کی یہ راہ نکالی اور انہیں لعان کرنے کی اجازت عنایت فرما کر ان کے جوشِ غیرت کی تلافی کا سامان پیدا فرمایا کہ اگر کوئی اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ لانے سے قاصر ہو تو وہ لعان کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصَّادِقِيْنَo وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَo﴾ (النور: 6-7)

''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس کوئی گواہ نہ ہوں مگر وہ خود ہی تو ان میں سے ہر ایک کی شہادت اللہ کی قسم کے ساتھ چار شہادتیں ہیں کہ بلاشبہ یقیناً وہ سچوں سے ہے۔ اور پانچویں یہ کہ بے شک اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹوں سے ہو۔''

تب پھر لعان کا سبب وہ بیوی پر زنا کی تہمت لگانا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 6846۔ صحيح مسلم: 1499.

لعان کا حکم

اگر آدمی اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے تو اس سے یہ کہا جائے گا کہ یا تو وہ اس بات پر چار گواہ لائے تا کہ اس کی بیوی پر حد جاری کی جائے اور خود خاوند پر حد جاری نہ ہوگی۔ اگر خاوند کے پاس گواہ نہ ہوں، لیکن بیوی خود مان جاتی ہے کہ خاوند کا یہ الزام درست ہے تب بھی اس پر حد جاری ہوگی اور خاوند پر جاری نہ ہوگی پھر اگر خاوند کے پاس گواہ بھی نہ ہوں اور بیوی بھی اس تہمت سے انکار کرتی ہے تو پھر بیوی سے یہ کہا جائے گا کہ یا تو تم لعان کرو دگرنہ تم پر حد جاری کی جائے گی۔ پھر اگر وہ لعان کر لیتی ہے تو اس سے وہ احکام ثابت ہو جائیں گے جو آگے آ رہے ہیں۔ پھر اگر خاوند تو لعان کر لیتا ہے پر بیوی نہیں کرتی تو ایک قول یہ ہے کہ اسے مرتے دم تک کے لیے زنداں میں ڈال دیا جائے گا یا پھر لعان کرے گی۔

اور ایک قول یہ ہے کہ لعان سے انکار پر اس پر حد جاری کی جائے گی اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ اب خاوند کا لعان بمنزلہ چار گواہوں کے ہے۔ لعان کے مزید مسائل واحکام آگے آ رہے ہیں۔

پہلا لعان کیونکر ہوا

1093۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ: سَأَلَ فُلَانٌ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ أَنْ لَوْ وَجَدَ أَحَدُنَا امْرَأَتَهُ عَلَى فَاحِشَةٍ كَيْفَ يَصْنَعُ؟ إِنْ تَكَلَّمَ تَكَلَّمَ بِأَمْرٍ عَظِيْمٍ، وَإِنْ سَكَتَ سَكَتَ عَلَى مِثْلِ ذٰلِكَ، فَلَمْ يُجِبْهُ، فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ أَتَاهُ، فَقَالَ: ((إِنَّ الَّذِيْ سَأَلْتُكَ عَنْهُ قَدِ ابْتُلِيْتُ بِهِ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ الْآيَاتِ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ، فَتَلَاهُنَّ عَلَيْهِ، وَوَعَظَهُ، وَذَكَّرَهُ، وَأَخْبَرَهُ أَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ))، قَالَ: لَا، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا كَذَبْتُ عَلَيْهَا، ثُمَّ دَعَاهَا، فَوَعَظَهَا كَذٰلِكَ، قَالَتْ: لَا، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ إِنَّهُ لَكَاذِبٌ، فَبَدَأَ بِالرَّجُلِ، فَشَهِدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ، ثُمَّ ثَنَّى بِالْمَرْأَةِ، ثُمَّ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک) فلاں (فلاں صاحب) نے نبی کریم ﷺ سے پوچھتے ہوئے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! ذرا یہ تو بتلائیے کہ اگر ہم میں سے ایک اپنی بیوی کو بدکاری کرتے دیکھے تو وہ کیا کرے؟ اگر وہ اس بات کو زبان پر لائے گا تو ایک بڑی بات کو زبان پر لائے گا اور اگر چپ رہے گا تو بھی اسی جیسی (ایک بڑی) بات پر چپ رہے گا۔ (غرض وہ کرے تو کیا کرے کیا اس حال میں دیکھ کر اسے جان سے مار دے اور اگر وہ اس قصہ کو پی جائے تو دل پر یہ بوجھ لیے کیسے پھرے گا اور اگر وہ کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کرے تو کس حوصلے سے اتنی بڑی بات کو زبان پر لائے گا)۔ مگر نبی کریم ﷺ نے (اس مجلس میں) اس سائل کو (اس بات کا) کوئی جواب عنایت نہ فرمایا، پھر جب وہ اس کے بعد (ایک دوسرے موقع پر) خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا تو عرض کرنے لگا کہ: (اے اللہ کے رسول!) وہ بات جس کی بابت میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تھا (افسوس کہ) اب میں حقیقت میں (یہ "قَدْ" کا ترجمہ ہے۔نسیم) اس میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس پر رب تعالیٰ نے سورۂ نور کی (وہ) آیات نازل فرمائیں (جو لعان کے بارے میں ہیں) پس آپ ﷺ نے وہ آیات اس سائل کو

پڑھ سنائیں اور پھر اسے وعظ و تذکیر فرمائی اور اسے بتلایا کہ بے شک دنیا کا عذاب یہ آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ اس آدمی نے (یہ سن کر) عرض کیا: نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے! میں نے اس پر جھوٹ نہیں بولا، پھر نبی کریم ﷺ نے اس کی بیوی کو بلوا بھیجا اور اسے بھی اسی طرح وعظ (وتذکیر) فرمائی۔ وہ بولی: نہیں! اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے، بے شک یہی جھوٹا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے (آیت کے مطابق دونوں میں لعان کروایا اور) ابتداء مرد سے کی۔ سو اس نے اللہ کی قسم کھا کر چار گواہیاں دیں، پھر آپ ﷺ (عورت کی طرف مڑے اور آپ ﷺ) نے دوسری گواہیاں عورت سے لیں، پھر (اس کے بعد) آپ ﷺ نے دونوں میں تفریق کر دی۔ [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **سَأَلَ فُلَانٌ**: جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پردہ پوشی کی غرض سے اس سائل کا نام ذکر نہیں فرمایا وگرنہ ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس سائل کو اور اس کے نام کو جانتے تھے اور پھر نام معلوم نہ ہونے سے نفس قصہ پر کوئی زد بھی تو نہیں پڑتی۔

أَرَأَيْتَ: یہ "أَخْبِرْنِي" کے معنی میں ہے۔

أَنْ: یا تو یہ مصدریہ ہے یا پھر أَنَّ مثقلہ سے مخففہ ہے۔

كَيْفَ يَصْنَعُ: یہ جملہ "أَرَأَيْتَ" کے متصل ہے اور یہ محل استفہام میں ہے اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: "أَرَأَيْتَ كَيْفَ يَصْنَعُ......"

إِنْ تَكَلَّمَ تَكَلَّمَ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ: اس بات کا کرنا اس لیے بہت بڑا ہے کیونکہ اس میں اپنے فراش اور اپنے اہل کو گندا کرنا ہے۔

وَإِنْ سَكَتَ سَكَتَ عَلَى مِثْلِ ذَلِكَ: کیونکہ بیوی کو کسی بے حیائی میں مبتلا دیکھ کر چپ رہنے والا بے غیرت اور دیوث ہوتا ہے۔

فَلَمْ يُجِبْهُ: کیونکہ اس آدمی نے یہ عرض کیا تھا "أَرَأَيْتَ" (ذرا مجھے بتلایئے) اور چونکہ سائل نے علی سبیل المفروض یہ سوال کیا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے ایک فرضی صورت کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ غیر واقعی امر کے سوال کی بابت جواب نہ دینے کی گنجائش ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض اسلاف ایسی مفروضہ صورتوں کے بارے میں یہ سوال کر دیا کرتے تھے کہ کیا یہ

[1] صحیح مسلم: 1493.

بات واقع میں ہوئی ہے۔تو جواب نفی میں سن کروہ اس سوال کا جواب بھی نہ دیا کرتے تھے۔

فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ أَتَاهُ..... بِهِ: اس عبارت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، جو یہ ہیں:

(1) ایک یہ کہ یہ ایک ہو جانے والی بات کی خبر ہو،، گویا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے پہلے جو بات پوچھی تھی وہ کوئی فرضی بات نہ تھی بلکہ میرے ساتھ واقعی ایسا ہوا بھی تھا۔

(2) جبکہ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اب کی بار وہ ایک نئی بات کی خبر دے رہا ہو کہ کل تو میں نے ایک فرضی سوال کیا تھا لیکن سوئے اتفاق سے آج میرے ساتھ واقعی ایسا ہو گیا ہے۔

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ الْآيَاتِ فِي سُوْرَةِ النُّوْرِ: اور وہ یہ آیات ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَo وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَo﴾ (النور: 6-7)

''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس کوئی گواہ نہ ہوں مگر وہ خود ہی تو ان میں سے ہر ایک کی شہادت اللہ کی قسم کے ساتھ چار شہادتیں ہیں کہ بلاشبہ یقیناً وہ سچوں سے ہے۔اور پانچویں یہ کہ بے شک اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹوں سے ہو۔''

ان آیات کو ''آیاتِ تلاعن'' کہا جاتا ہے۔

فَتَلَاهُنَّ عَلَيْهِ: ان آیات کو تلاوت کرنے والے جناب رسول اللہ ﷺ خود تھے۔

وَعَظَهُ وَذَكَّرَهُ: یعنی آپ ﷺ نے اسے جھوٹ بولنے کے انجام بد سے اور کسی پاک دامن پر الزام لگانے کے بڑے گناہ سے ڈرایا۔کیونکہ جو تذکیر تخویف اور یا ترغیب سے ملی ہو اس کو وعظ کہتے ہیں۔

أَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ: عذابِ دنیا یہ مجرم کو دی جانے والی شرعی سزا ہے۔چاہے یہ عورت پر حد جاری کرنے کی صورت میں ہو اور چاہے مرد پر حد قذف جاری کرنے کی صورت میں ہو۔

رہا عذابِ دنیا کا عذابِ آخرت سے ہلکا ہونا تو یہ دو اعتبار سے ہے:

(1) ایک کیفیت کے اعتبار سے، کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے شدت میں بے حد کم ہوتا ہے۔

(2) دوسرے مدت کے اعتبار سے کہ دنیا کا عذاب بے حد وقتی ہوتا ہے جبکہ آخرت کا عذاب یا تو بے حد طویل ہوتا ہے یا پھر ابدی اور سرمدی ہوتا ہے۔

لَا وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ: مذکورہ ''لا'' زائدہ ہے جو تاکید کے لیے ہوتا ہے۔کیونکہ یہاں مقسم علیہ (یعنی جس بات پر قسم کھائی جا رہی ہے، وہ) منفی ہے۔جس کی تاکید قسم کی نفی سے لائی گئی ہے۔یہ ''لا'' نافیہ نہیں ہو سکتا۔کیونکہ اگر یہ ''لا'' نافیہ ہو تو یہ قسم ہی ٹھیک نہ بنے اور حق کے ساتھ بھیجنے والی ذات رب تعالیٰ کی ہے۔

بِالْحَقِّ: کے علماء نے دو معانی بیان کیے ہیں:

(1) ایک یہ کہ آپ ﷺ کی بعثت ''حق'' ہے۔

(2) دوسرا یہ کہ جو کچھ آپ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا ہے، وہ سب کا سب برحق ہے۔

حقیقت میں یہ دونوں معانی صحیح اور حق ہیں۔ بلکہ ایک معنی دوسرے کو لازم ہے۔

لغت میں حق کسی ثابت اور جمی ہوئی یعنی استقرار پکڑے ہوئی شے کو کہتے ہیں جس کی ضد ''زائل'' ہے۔ یعنی جوٹل یا ڈھل جائے وہ حق اور ثابت نہیں۔ اسی لیے باطل جو حق کا بالمقابل ہوتا ہے، اسے ''زائل'' کہا جاتا ہے۔ پس جو ثابت ہو وہ حق ہے اور جو زائل ہو، وہ باطل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائل نے ان الفاظ کے ساتھ قسم کھائی تھی کیونکہ وہ جو کہہ رہا تھا وہ حق تھا، تا کہ مقسم اور مقسم علیہ میں تناسب پیدا ہو جائے۔

مَا كَذَبْتُ عَلَيْهَا: یعنی میں نے اپنی بیوی کی بابت جو بتلایا ہے وہ جھوٹ، خلاف واقع اور الزام نہیں ہے۔ تو جب جھوٹ کا امکان منتفی ہو گیا تو صدق کا محل ہی باقی رہ گیا اور وہ آدمی یہ کہنے کا محتاج نہ رہا کہ ''میں سچا ہوں'' کیونکہ جب اس نے اپنی کہی بات کے دفاع میں کذب کی نفی کر دی تو لازم آیا کہ وہ صادق ہے۔

ثُمَّ دَعَاهَا فَوَعَظَهَا كَذَلِكَ: یعنی آپ ﷺ نے اسے بھی ترغیب و ترہیب پر مبنی باتیں ارشاد فرمائیں۔

لَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ إِنَّهُ لَكَاذِبٌ: عورت کا یہ قول خاوند کے قول کے متناقض تھا۔ کہ خاوند نے یہ کہا تھا کہ اس نے اپنی بیوی پر جھوٹ نہیں بولا، جبکہ عورت کا یہ کہنا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے اور اپنے دعویٰ کو پورا کرنے کے لیے اس کی قسم کے بالمقابل قسم لے کر آئی۔ پھر بیوی کے کلام میں تین تاکیدات ہیں:

(1) ایک قسم (2) دوسری تاکید انَّ حرف تاکید

(3) اور تیسری تاکید لام مفتوحہ

جبکہ خاوند کے کلام میں یہ تیسری تاکید نہیں پائی جاتی۔

فَبَدَأَ بِالرَّجُلِ فَشَهِدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ: چونکہ دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کی بات کو تسلیم نہیں کیا تھا تو اس لیے آپ ﷺ نے دونوں میں لعان شروع کروایا۔ چنانچہ پہلے مرد نے اللہ کی قسم کھا کر چار بار اس بات پر شہادت دی کہ وہ سچا ہے، پھر آپ ﷺ نے عورت سے قسمیں لیں اور اس نے بھی چار بار اللہ کی قسم کھا کر اس بات کی شہادت دی کہ وہ یعنی اس کا خاوند جھوٹا ہے۔

لیکن یہاں دونوں میں سے ہر ایک کا پانچویں قسم کھانا بھی ضروری ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں آتا ہے۔ وہ یوں کہ مرد اس بات کی قسم اٹھائے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو، اور بیوی یہ قسم اٹھائے کہ اگر یہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔

ثُمَّ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا: جب دونوں میں لعان ہو چکا تو آپ ﷺ نے ان دونوں میں تفریق کر دی اور یہ تفریق فسخ تھی نہ کہ طلاق۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اگر ایک آدمی کسی ایسی غیر واقع بات کی بابت سوال کرے جس کے وقوع کی اسے توقع ہو تو وہ شاہد کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور اگر کسی پیش آمدہ بات کی بابت پوچھے لیکن اس کی تصریح نہ کرے تو یہ اس کا ادب شمار ہوگا۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے محارم کے معاملہ میں بے حد غیرت کے مالک تھے۔ بلاشبہ غیرت یہ ایمانی اخلاق میں

سے ہے۔

- اگر مفتی مصلحت دیکھے تو وہ فتویٰ دینے سے رک بھی سکتا ہے۔ جیسا کہ یہاں نبی کریم ﷺ نے ایک دینی مصلحت کے پیش نظر سائل کو اس کے سوال کا جواب عنایت نہ فرمایا تھا۔
- بسا اوقات آدمی پوچھی بات میں خود بھی مبتلا ہو جایا کرتا ہے۔
- قرآن اس بات کے سب سے زیادہ لائق ہے کہ اس کے ذریعے وعظ کیا جائے۔ اس کی دلیل "فَتَلاهُنَّ عَلَيْهِ" کے الفاظ ہیں۔
- قرآن رب تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی دلیل: "فَأَنْزَلَ اللّٰهُ الْآيَاتِ" کے الفاظ ہیں اور یہی الفاظ اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ رب تعالیٰ اوپر آسمانوں میں ہے کیونکہ نزول اوپر سے ہوتا ہے۔ تو رب تعالیٰ کا اوپر سے آیات اتارنا اس بات کی دلیل ہے کہ رب تعالیٰ اوپر آسمانوں سے اور سب سے بلند ہے۔
- سب سے بڑی دلیل قرآن ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس قصہ میں قرآن کریم سے استدلال فرمایا۔
- اگر والی، قاضی، حاکم یا مفتی خاوند بیوی میں لعان کروائے تو پہلے انہیں خوب وعظ ونصیحت کرے اور انہیں اللہ سے اور اس کی گرفت سے ڈرائے۔
- عذابِ آخرت ثابت ہے جیسا کہ "عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ" کے الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ دنیا کے ابتلاءات ایک نوع کے عذاب ہیں البتہ یہ عذاب آخرت کے عذابوں سے ہلکے ہیں۔
- دوسرے کے کہے بغیر اپنی بات کی تاکید وتوثیق کے لیے قسم اٹھانا جائز ہے۔ اس کی دلیل "لَا وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ" کے الفاظ ہیں۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بلاغت کہ سائل نے قسم کے لیے وہ الفاظ چنے جو مقسم علیہ کے عین مطابق تھے۔ اس کی دلیل "لَا وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ" کے الفاظ ہیں۔
اور یہی بات نبی کریم ﷺ کے نبی برحق ہونے کی بھی دلیل ہیں۔
- بسا اوقات آدمی کسی جھوٹی بات پر بھی قسم کھا جاتا ہے کیونکہ اس قصہ میں یہ بات تو حتمی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک ضرور جھوٹا تھا اس کے باوجود دونوں قسم اٹھا گئے۔
- اگر لعان ناگزیر ٹھہرے تو اس کی ابتداء مرد سے کی جائے اور یہ بات دعاوی کے عین مطابق بھی ہے کیونکہ دعویٰ میں جو پہلے بولے، اسے مدعی کہا جاتا ہے اور مذکورہ قصہ میں یہ مدعی ''خاوند'' تھا۔ لہٰذا اگر لعان کا آغاز بیوی سے کیا جاتا تو وہ ملغیٰ (یعنی کچھ بھی نہ) ہوتا اور خاوند کے لعان کے بعد اس سے دوبارہ لعان کروایا جاتا۔ اس کی دلیل "ثُمَّ ثَنَّى بِالْمَرْأَةِ" کے الفاظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لعان پہلے مرد سے کروایا پھر عورت سے کروایا۔
- لعان میں قسم کھا کر چار شہادتیں دینا واجب ہیں تا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی پیروی ہو جائے:

﴿فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ﴾ (النور: 6۔7)

''تو ان میں سے ہر ایک کی شہادت اللہ کی قسم کے ساتھ چار شہادتیں ہیں۔''

◈ رہی پانچویں شہادت جس میں لعنت کا ذکر ہے، کیا اس میں رب کے نام کے ساتھ شہادت دینا لازم ہے یا صرف اتنا ہی کہہ لینا کہ ''اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہو'' کافی ہے۔

تو بعض علماء کا قول ہے کہ یہاں بھی شہادت باللہ کے ساتھ یہ شہادت دینا لازم ہوگا۔ لہٰذا وہ یوں کہے گا کہ ''میں اللہ کے نام پر اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ یہ زانیہ ہے، یا اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔''

اور ایک قول یہ ہے کہ اس پانچویں شہادت میں شہادۃ باللہ کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پہلی چار شہادتیں بمنزلہ چار گواہوں کے ہیں۔ تب پھر یہ پانچویں شہادت اپنے اوپر بددعا کے حکم میں ہے۔

◈ لعنت کرتے وقت اپنا نام صریح ذکر کرنا ضروری نہیں بلکہ ضمیر لا کر بھی لعنت کر سکتے ہیں۔

◈ لعان کے اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات زوجین کے درمیان نزاع اس حد تک بھی پہنچ جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر بدکاری کی تہمت لگانے پر تل جاتے ہیں۔

◈ لعان کے بعد زوجین میں فرقت ہو جاتی ہے۔

لعان کا نتیجہ

1094۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِلْمُتَلاعِنَيْنِ: ((حِسَابُكُمَا عَلَى اللّٰهِ ، أَحَدُكُمَا كَاذِبٌ ، لا سَبِيْلَ لَكَ عَلَيْهَا)) قَالَ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَالِي؟ فَقَالَ: ((إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا ، فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا ، وَإِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا فَذَاكَ أَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا)) .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے دونوں لعان کرنے والے (یعنی خاوند بیوی) سے فرمایا: ''(اب) تم دونوں کا حساب اللہ کے ذمے ہے (اور یاد رکھو! کہ) تم دونوں میں سے ایک جھوٹا (ضرور) ہے۔ (پھر خاوند کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا کہ اب) تمہارا اس پر (رجوع کرنے کا یا نیا عقد کرنے کا) کوئی راستہ نہیں۔'' اس آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! (اور وہ) میرا مال (کیا ہوا جو میں نے اسے مہر میں دیا تھا)؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تو تم نے اس کے خلاف سچ کہا ہے تو وہ مال، تم نے جو اس کی شرمگاہ کو حلال کیا تھا، اس کے بدلے ہوا، اور اگر تم نے اس کے خلاف جھوٹ کہا ہے تو اب وہ مال تم سے اس عورت سے بھی زیادہ دور ہے۔'' ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :...... حِسَابُكُمَا: مراد گناہ کا حساب ہے۔ چنانچہ اگر خاوند جھوٹا تھا تو اس کا آخرت میں محاسبہ ہوگا اور اسے اس دروغ بیانی کا گناہ بھی ملے گا اور اس پر سزا بھی ملے گی اور اگر عورت جھوٹی تھی تو اسے اس بدکاری میں مبتلا ہونے کا گناہ بھی ملے گا اور عذاب بھی ہوگا۔

أَحَدُكُمَا كَاذِبٌ: اور یہ بات متعین ہے۔ چنانچہ یا تو خاوند بیوی کے زانیہ ہونے کے دعویٰ میں جھوٹا ہے یا پھر بیوی

❶ صحيح البخاري: 5312- صحيح مسلم: 1493.

اس دعویٰ کے انکار میں جھوٹی ہے۔کذب یہ کسی خلاف واقع بات کی خبر دینے کو کہتے ہیں۔

لَا سَبِيلَ لَكَ عَلَيْهَا: یعنی تم کسی طریق سے اس کے ساتھ نہ تو رجوع کر سکتے ہو اور نہ عقد جدید کر سکتے ہو۔ کیونکہ لعان کے بعد زوجین میں ہونے والی تفریق ابدی ہوتی ہے۔

فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَالِيْ: خاوند کی مراد بیوی کو دیا مہر تھا۔

إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا......: یعنی اگر تو تم سچے ہو تو تم اس مہر کے بدلے اس کی شرمگاہ کو حلال کر چکے ہو، کیونکہ بیوی کے ساتھ جماع کرنے سے بیوی کامل مہر کی مستحق ہو جاتی ہے۔

وَإِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا فَذَاكَ أَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا: اگر تم جھوٹے ہو تو لعان کے بعد اب یہ عورت تم سے مکمل طور پر دور ہو چکی ہے کیونکہ تم نے اس پر زنا کی تہمت لگا کر اس پر ظلم ڈھایا ہے۔ اب تمہیں اس پر دوبارہ ظلم کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی کہ ایک تو تم اس پر زنا کاری کا الزام بھی دھرو اور ساتھ کے ساتھ دیا مہر بھی واپس لو، حالانکہ تم اس کی شرمگاہ بھی حلال کر چکے ہو۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں بنیادی طور پر تین مسائل ذکر کیے گئے ہیں:

(1) لعان کرنے والوں میں سے ایک نہ ایک ضرور جھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے فیصلہ گو ظاہر پر ہو گا لیکن باطن کا حساب رب تعالیٰ کے ذمے رہے گا۔

(2) لعان کے بعد خاوند کا بیوی پر کوئی حق نہیں رہتا، دونوں کے درمیان ابدی فرقت واقع ہو جاتی ہے لہٰذا اب نہ تو وہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ حلالہ کے بعد عقدِ جدید ہی کر سکتا ہے۔

(3) لعان کے بعد خاوند کا دیے مہر پر کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ وہ اسے نہ ملے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ عالم الغیب نہیں۔ اسی لیے فرمایا: "حِسَابُكُمَا عَلَى اللّٰهِ" اور "أَحَدُكُمَا كَاذِبٌ".
- جب نقیضین میں سے ایک کی نفی ہو جائے تو دوسری نقیض ثابت ہو جاتی ہے جیسے دن اور رات میں سے اگر مثلاً رات کی نفی کی جائے تو دن ضرور ثابت ہو جائے گا۔

یہ قاعدہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد: "أَحَدُكُمَا كَاذِبٌ" سے اخذ کیا گیا ہے۔ کہ اگر کذب زوج کے حق میں منتفی ہو گا تو زوجہ کے حق میں ضرور ثابت ہو گا۔ "وكذلك بالعكس".

- لعان سے زوجین کے درمیان ابدی فرقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی دلیل "لَا سَبِيلَ لَكَ عَلَيْهَا" کے الفاظ ہیں۔
- لعان کے بعد خاوند کو مہر واپس نہ کیا جائے گا چاہے وہ بیوی کو زانیہ ہی سمجھتا ہو۔ اس کی دلیل "إِنْ كُنْتَ صَادِقًا...... الی آخر" کے الفاظ ہیں۔
- نبی کریم ﷺ لوگوں کو کمال احسن طریق سے احکام پر تیار فرما لیا کرتے تھے۔ چنانچہ خاوند نے لعان کے بعد اپنے مہر کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے یہ فرما کر کہ: "إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ......" اس آدمی کو کمال احسن طریق سے اس بات پر آمادہ فرما لیا کہ اب تمہارا اس مہر پر شرعاً کوئی استحقاق باقی نہیں۔

◈ جب مہر شرعاً ایک بار ثابت ہو جائے تو عورت کے زانیہ ہو جانے سے بھی ساقط نہیں ہوتا۔اس کی دلیل: "فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ یہیں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مہر کے استقرار کے لیے شرمگاہ کو حلال کرنا لازم ہے لہٰذا محض خلوت سے مہر مستقر نہ ہوگا۔ اس کی دلیل "فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ اگر کسی حکم کو دو علتیں ثابت کر رہی ہوں تو وہ حکم زیادہ قوی ہوتی ہے۔اس کی دلیل "وَإِنْ كَذَبْتَ عَلَيْهَا فَهُوَ أَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا" کے الفاظ ہیں۔یعنی جب سچا ہو کر بھی تم مہر کے مستحق نہیں ہو تو جھوٹا ہونے پر تو بدرجہ اولیٰ اس کے مستحق نہ ہوں گے۔

لعان کے بعد حد نہیں گو پیدا ہونے والا بچہ باپ کے مشابہ نہ بھی ہو

1095- وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((أَبْصِرُوْهَا، فَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَبْيَضَ سَبِطًا، فَهُوَ لِزَوْجِهَا، وَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَكْحَلَ جَعْدًا، فَهُوَ لِلَّذِيْ رَمَاهَا بِهِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک لعان ہو جانے کے بعد) فرمایا: ''اس عورت کو دیکھنا کہ اگر تو اس نے سفید (اور) سیدھے نرم بالوں والا بچہ جنا تو یہ اس کے خاوند کا ہوگا اور اگر اس نے گھنی پلکوں اور گھنگھریالے بالوں والا بچہ جنا تو اس کا ہوگا جس کی بابت یہ اپنی بیوی پر تہمت لگا رہا ہے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......أَبْصِرُوْهَا: یہ انظروھا کے معنی میں ہے۔یعنی اس کو دیکھتے رہنا اور اس کی جستجو میں رہنا کہ لعان کے بعد یہ کیسا بچہ جنتی ہے۔کیونکہ اس خاوند نے اپنی جس بیوی پر تہمت لگائی تھی وہ حاملہ تھی۔

سَبِطًا: یہ لفظ بَا کے سکون، اور فتح اور کسر تینوں کے ساتھ آتا ہے۔اگر تو یہ متحرک با کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے سیدھے اور نرم بالوں والا، اور اگر یہ لفظ با کے سکون کے ساتھ ہو تو مطلب کامل الخلقت، خوش قامت اور خوبرو ہونا ہے۔

تب پھر "اَبْيَضُ" کا تعلق رنگت سے اور "سَبِطًا" کا تعلق روپ اور نین نقش سے ہوگا۔

فَهُوَ لِزَوْجِهَا: کیونکہ اس کا خاوند سفید رنگت والا اور خوبرو تھا، اور غالب یہی ہے کہ بچہ باپ کے مشابہ ہوتا ہے۔

أَكْحَلَ: جس کی پلکیں از حد سیاہ اور گھنی ہوں کہ یوں لگے جیسے آنکھوں میں سرمہ ڈالا ہوا ہے۔

جَعْدًا: گھنگھریالے بالوں والا۔البتہ اگر سبط سے مراد کامل الخلقت لیا جائے تب پھر جعد کا معنی کمزور اور دبلا ہوگا جس کی خلقت کامل نہ ہو۔

مضمون حدیث: ......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار لعان ہو جانے کے بعد اگر قرائن سے یا مابعد کے واقعات سے خاوند کی تہمت صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی اس عورت پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ کسی امر کی تحقیق کرنا جائز اور مشروع ہے۔اس کی دلیل "أَبْصِرُوْهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ مشابہت پر عمل جائز ہے۔اس کی دلیل "فَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَبْيَضَ" کے الفاظ ہیں، اور نبی کریم ﷺ نے اس پر عمل

[1] ہمیں یہ حدیث صحیح البخاری میں نہیں ملی۔البتہ یہ حدیث صحیح مسلم: 1496 میں آتی ہے۔

بھی فرمایا اور شکل وصورت کی مشابہت کونسب کو ثابت کرنے والا قرار دیا تھا۔ جیسا کہ حضرت عبد بن زمعہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ایک لڑکے کی بابت جھگڑے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشابہت پر ہی حکم فرمایا تھا۔

چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! یہ بچہ میرے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کا ہے اس نے مجھے اس بارے وصیت کی تھی اور یہ زمعہ کی باندی سے ہے۔ جبکہ عبد بن زمعہ رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ بچہ میرے باپ کا ہے اور اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ تب پھر یہ عتبہ بن ابی وقاص کا کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! ذرا اس بچے کی شکل وصورت تو دیکھئے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس بچہ کو غور سے دیکھا تو اس کی شکل وصورت عتبہ بن ابی وقاص سے بڑی ملتی جلتی تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاوفرمایا: ''بچہ بستر (والے) کا ہوتا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہے'' ❶ اور وہ بچہ زمعہ سے ملحق کیا اور فرمایا: اے عبد بن زمعہ! یہ لڑکا تیرا ہوا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ مطہرہ سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اس بچہ سے پردہ کرنا۔''

یعنی اگر چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کو دیکھ کر وہ بچہ عبد بن زمعہ کے حوالے کر دیا اور اسے زمعہ کا بچہ قرار دے دیا جو عبد کا اور سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا کا بھائی بنتا تھا لیکن پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچہ کی شکل وصورت کی مشابہت کا اعتبار فرمایا جو حضرت عتبہ بن ابی وقاص سے ملتی تھی۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا کو احتیاطاً اس بچہ سے پردہ کرنے کا حکم بھی ارشاد فرمایا تھا۔

آخری وقت تک لعان سے روکنے کی کوشش کی جائے

1096۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَمَرَ رَجُلًا أَنْ يَضَعَ يَدَهُ عِنْدَ الْخَامِسَةِ عَلَى فِيْهِ، وَقَالَ: ((إِنَّهَا مُوْجِبَةٌ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (لعان کے ایک واقعہ کے دوران) ایک شخص سے فرمایا کہ وہ پانچویں شہادت پر (جس میں لعنت کا ذکر ہے) اپنا ہاتھ اس (لعان کرنے والے خاوند) کے منہ پر رکھ دے اور ارشاد فرمایا کہ: یہ پانچویں شہادت (لعان کے حکم کو) واجب کرنے والی ہے۔ ❷

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:......**أَمَرَ رَجُلًا:** یہ صاحب کون تھے؟ معلوم نہیں، لیکن ان کا نام جاننا ضروری بھی نہیں۔ کہ نفس قصہ اور حکم پر اس نام کے معلوم نہ ہونے سے کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

أَنْ يَضَعَ يَدَهُ عِنْدَ الْخَامِسَةِ عَلَى فِيْهِ: غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچویں شہادت کے وقت اس آدمی کو حکم دیا کہ وہ خاوند کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دے کہ شاید وہ لعان کو پورا کرنے سے باز آ جائے۔

تب پھر "عَلَى فِيْهِ" سے مراد "عَلَى فِي الزَّوْجِ" ہوگا۔

إِنَّهَا مُوْجِبَةٌ: "هَا" ضمیر کا مرجع "الخامسة" ہے۔ یعنی یہ پانچویں شہادت موجبہ (واجب کر دینے والی) ہے۔

---

❶ صحیح البخاری: 2218۔ صحیح مسلم: 1457.

❷ سنن ابی داؤد: 2255۔ سنن النسائی: 6/175۔ ابن ملقن: (2/237) کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کو واجب کرنے والی ہے۔ تو ایک قول یہ ہے کہ یہ لعنت کو واجب کرنے والی ہے کیونکہ اس پانچویں شہادت میں خاوند اپنے اوپر اس طرح لعنت کرے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر لعنت ہو، اور ایک قول یہ ہے یہ پانچویں شہادت عورت پر حد کو واجب کرنے والی ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ﴾ (النور: 8)

''اور اس (عورت) سے سزا کو یہ بات ہٹائے گی کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار شہادتیں دے۔''

اور عورت پر عذاب خاوند کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن- واللہ اعلم- صحیح قول یہ ہے کہ یہ حدیث عام ہے اور یہ ان دونوں مذکورہ معانی کو شامل ہے۔ البتہ اگر عورت بھی شہادتیں دے دے تو پھر اس پر حد نہ آئے گی۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل اس بات کی زبردست اور نہایت بلیغ ترغیب ہے کہ جہاں تک ہو سکے خاوند کو لعان کرنے سے روکا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حدود سے متعلقہ امور میں بھی توکیل جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے پانچویں شہادت پر خاوند کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا ایک شخص کو حکم دیا تھا۔

◈ معلوم ہوا کہ پانچویں شہادت پر خاوند کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا مشروع ہے۔ شاید کہ وہ لعان کرنے سے باز رہے۔ کیونکہ لعان سے باز آنے پر زیادہ سے زیادہ حد قذف آئے گی لیکن یہ سزا بہر حال عذاب آخرت سے ہلکی ہے۔

◈ جو آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، پھر بھی اپنے اوپر لعنت وغیرہ کے ذریعے بددعا کرے تو وہ واقعی اس لعنت کا مستحق ہے۔

لعان کے بعد طلاق دینے کا حکم

1097- وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضي الله عنه فِي قِصَّةِ الْمُتَلَاعِنَيْنِ- قَالَ: فَلَمَّا فَرَغَا مِنْ تَلَاعُنِهِمَا، قَالَ: كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنْ أَمْسَكْتُهَا، فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے لعان کے ایک قصہ کی بابت مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: جب وہ دونوں (ایک دوسرے پر) لعان کر کے فارغ ہو چکے تو خاوند کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس پر جھوٹ بولا ہے کاش کہ میں نے اسے (اپنے پاس) روک لیا ہوتا (اور یوں لعان کر کے اسے اپنے سے جدا نہ کرتا) پھر اس نے نبی کریم ﷺ کے اس حکم ارشاد فرمانے سے قبل ہی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح :...... یہ مسئلہ صراحتاً بیان کیا جا چکا ہے کہ لعان کے بعد زوجین میں ابدی فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اب نہ تو رجوع ہو سکتا ہے اور نہ یہ بیوی دوسرے خاوند کے پاس سے ہو کے آنے کے بعد ہی اس کے لیے حلال ہوتی ہے۔ تب

❶ صحيح البخاري: 5308- صحيح مسلم: 1492.

پھر اس شخص کا لعان کے بعد بھی تین طلاقیں دینا تاکید کے باب میں سے ہوگا نہ کہ یہ برمحل طلاق ہوگی کیونکہ لعان کر کے اس کی بیوی اس سے بائنہ ہو چکی ہے، اور یہ بیونت کبریٰ ہے بلکہ یہ تو اکبر البینونات ہے، تب پھر وہ تو طلاق کا محل ہی نہ تھی۔ تب پھر یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ حدیث یکبارگی تین طلاقیں دینے کے جواز کی دلیل نہ ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ لعان کے بعد تین طلاقیں دینا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے اس فعل کو برقرار رکھا اور اس پر نکیر نہ فرمائی۔ پس اگر ایسا کرنا حرام ہوتا تو آپ ﷺ اس شخص پر ضرور نکیر فرماتے۔

◈ رہے وہ علماء جنہوں نے اس حدیث کو دلیل بنا کر بیک وقت تین طلاقیں دینے کو جائز قرار دیا ہے تو ان علماء کا یہ استدلال باطل ہے کیونکہ یہ تینوں طلاق بے محل اور اکارت تھیں جن کی سرے سے کوئی تاثیر ہی نہ تھی۔ البتہ یہ محقق تاکید تھی۔ کیونکہ مجرد لعان سے ہی وہ عورت ابدی طور پر بائنہ ہو چکی تھی۔ اس لیے صحیح قول یہی ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا حرام ہے۔

◈ لعان کے بعد کی اولاد کس کے ملحق کی جائے گی؟ خاوند کے یا اس کے جس پر زانی ہونے کی تہمت ہے؟ اس بارے ایک قول تو یہ ہے کہ دیکھا جائے گا کہ پیدا ہونے والا بچہ کس کے زیادہ مشابہ ہے۔ لہٰذا بچہ باپ اور متہم زانی میں سے جس کے زیادہ مشابہ ہوگا اس کے ملحق کیا جائے گا جیسا کہ حدیث رقم 1095 میں یہ مضمون گزرا ہے۔

لیکن اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ بچہ نہ تو باپ کے ساتھ ملایا جائے گا اور نہ زانی متہم کے۔ [1] کیونکہ باپ نے تو خود اس سے اپنے نسب کی نفی کر دی ہے اور رہا زانی تو گزشتہ مذکورہ حدیث کے مطابق زانی کے لیے پتھر ہے۔ اس لیے یہ بچہ نہ تو باپ کے ملحق کیا جائے گا اور نہ متہم زانی کے بلکہ اسے ماں کے سپرد کیا جائے گا اور وہ ماں کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا نہ کہ زانی کے باپ کی طرف منسوب کر کے۔

◈ پھر کیا محض لعان سے ہی بچہ باپ سے منتفی ہو جائے گا یا باپ کا خود سے اس کے نسب کی نفی کرنا ضروری ہے؟ جمہور علماء کا قول ہے کہ اس کے نسب کی نفی ضروری ہے۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ: اگر تو عورت حمل سے ہو تو وضع حمل سے قبل تک اس کی نفی درست مانی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم یہ قول کریں کہ خاوند کا نفی کرنا ضروری ہے تب پھر یہ مسئلہ مذکورہ ذیل تفصیل کے مطابق ہے:

⊙ ...... اگر تو زنا کی تہمت لگانے سے قبل عورت کو حمل ٹھہر چکا تھا تو خاوند کے لیے بچے کی اپنے سے نفی کرنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ حمل زنا کی تہمت یعنی زنا سے قبل ٹھہر چکا ہے۔ لہٰذا یہ بچہ خاوند کا ہوگا اور اس کی نفی جائز نہ ہوگی۔

⊙ ...... اور اگر خاوند نے زنا کے بعد بچہ کی اپنے سے ہونے کی نفی کی ہے اور عورت نے تہمت لگائے جانے کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنم دیا تو بھی اس بچہ سے اپنی نفی جائز نہ ہوگی کیونکہ جب عورت نے چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنم دیا تو ہم نے جان لیا کہ وہ زنا سے پہلے کا حمل تھا اور وہ حمل خاوند سے ہے۔ کیونکہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے جس کے بعد ایک زندہ بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ غرض ان دونوں صورتوں میں بچہ خاوند کے ملحق کیا جائے گا اور اس کی نفی جائز نہ ہوگی۔

⊙ ...... البتہ اگر عورت نے زنا کی تہمت کے بعد اتنے عرصہ میں بچہ جنا کہ اتنی مدت میں اس بچے کا زانی سے ہونا ممکن

---

[1] المغني: 225/6۔ البحر الرائق: 130/4۔

ہوسکتا ہے تو خاوند سے ہونے کا امکان تو ہے ہی۔ تو دیکھا جائے گا کہ اگر تو خاوند بیوی پر زنا کی تہمت لگانے سے قبل اس سے استبراء رحم کرلیا تھا۔ یعنی زنا کی تہمت لگائے جانے سے قبل اسے حیض آ گیا ہوا تھا تو اب یہ بچہ خاوند کے ملحق نہ کیا جائے گا اور خاوند کو اس بچہ سے نفی کو درست مانا جائے گا۔

◈ فِيْ قِصَّةِ الْمُتَلَاعِنَيْنِ: یہ تغلیب کے باب سے ہے حالانکہ لعنت کا صیغہ صرف خاوند بولتا ہے۔

جہاں تک ہوسکے بیوی کو نہ چھوڑا جائے

1098- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: إِنَّ امْرَأَتِيْ لَا تَرُدُّ يَدَ لَامِسٍ، قَالَ: ((غَرِّبْهَا)) قَالَ: أَخَافُ أَنْ تَتْبَعَهَا نَفْسِيْ. قَالَ: ((فَاسْتَمْتِعْ بِهَا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: (اے اللہ کے رسول!) میری بیوی کسی چھونے والے (مرد) کے ہاتھ کو (چھونے سے) روکتی نہیں؟ (میں اس کا کیا کروں)؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے کسی دوسرے شہر لے جاؤ۔'' اس آدمی نے عرض کیا کہ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ میرا دل اس کے پیچھے پیچھے رہے گا۔ (یعنی پردیس بھیج دینے پر دل اسی میں اٹکا رہے گا)۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تب پھر اس سے متمتع ہوتے رہو۔''

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالْبَزَّارُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام ابوداود، امام ترمذی اور امام بزار نے روایت کیا ہے، اور اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔

وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما بِلَفْظِ قَالَ: ((طَلِّقْهَا)) قَالَ: لَا أَصْبِرُ عَنْهَا، قَالَ: ((فَأَمْسِكْهَا)).

اس حدیث کو امام نسائی نے ایک اور طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: نبی کریم ﷺ نے (اس کی بات سن کر) فرمایا: ''اسے طلاق دے دو۔'' اس آدمی نے عرض کیا: میں اس کے بغیر صبر نہیں کرسکتا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو پھر اسے (اپنے پاس) روک کے رکھو۔'' [1]

غریب الحدیث: ......أَنَّ رَجُلًا جَاءَ: یہ آنے والے صاحب کون تھے؟ مذکورہ حدیث میں اس کی تصریح نہیں۔ البتہ قصہ حدیث یا بیان حکم میں نام کی اس جہالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 2049۔ سنن النسائی: 169/6۔ امام نسائی نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ "تهذيب الاسماء" میں فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے اور ہمارے امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عمدہ کہا ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں: علماء کا اس حدیث کے بارے اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض نے اس کو ضعیف تو بعض نے منکر کہا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: یہ حدیث منکر ہے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے امام احمد کے اس قول کو لیا ہے اور اسی بنا پر انہوں نے اس حدیث کو "الموضوعات" میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ خود امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دیکھیں تهذيب الاسماء: 307/3۔ تفسير ابن كثير: 265/3۔ التلخيص الحبير: 226/3۔ رہا اس حدیث کا امام ترمذی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہونا تو سوائے اس جگہ کے ہم نے کسی اور جگہ اس حدیث کے امام ترمذی رحمہ اللہ کی طرف نسبت نہیں دیکھی۔ حتیٰ کہ خود امام ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی "التلخيص الحبير" میں اس حدیث کی نسبت امام ترمذی کی طرف نہیں کی۔

لَا تَـرُدُّ يَدَ لَامِـسٍ: کس چیز کے چھونے کو رد نہیں کرتی؟ تو وہ اس کا جسم ہے۔یعنی وہ مردوں سے چھو جانے اور ان سے ملامست میں لا پروا ہے۔ نہ کہ یہ مراد ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ اگر کوئی مرد اسے شہوت کی غرض سے چھوتا ہے تو اسے اس بات کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ یہ ہرگز بھی مراد نہیں ہے۔

غَـــرِّبْهَـــا: نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کو بیوی کو طلاق دے دینے کا مشورہ نہ دیا کیونکہ یہ بات جناب رسول اللہ ﷺ سے بعید ہے کہ آپ ﷺ کسی شخص کو محض بیوی کے لا پروا ہونے کی بنا پر طلاق دے دینے کو ارشاد فرمائیں۔

غرض آپ ﷺ نے ان صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی پردیس لے جائے کہ جب اجنبیوں اور غیروں میں رہے گی تو اس عادت سے از خود باز آ جائے گی۔ کیونکہ مسافر پردیس میں جھجک کر اور سمٹ سمٹ کر رہتا ہے، نہ کہ مقیم باشندے کی طرح کھل کر رہتا ہے۔

پھر پردیس لے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی خود بھی اس کے ساتھ وہیں رہ پڑے۔ چنانچہ آدمی بیوی کو اس کے کسی محرم رشتہ دار کے ساتھ پردیس رہنے کو بھی بھیج سکتا ہے۔

أَخَافُ أَنْ تَتْبَعَهَا نَفْسِيْ: یعنی اگر میں نے اسے پردیس بھیج دیا تو میرا جی اسی میں اٹکا رہے گا۔

فَاسْتَمْتِعْ بِهَا: یعنی پاس رکھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے رہو اور اس کی اس عادت پر صبر کرو۔

طَـلِّقْهَـا: یہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔طلاق دینے کا حکم اس لیے ارشاد فرمایا کہ طلاق آدمی کو شک وشبہ سے زیادہ دور کرنے والی ہے۔ کیونکہ اس کے مزاج کی لا پروائی اسے کسی فتنہ میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔

لَا أَصْبِرُ عَنْهَا: کیونکہ اس کا جی اپنی بیوی کے ساتھ بے حد لگا ہوا تھا۔

فَـأَمْسِكْهَا: تب پھر مسئلہ واضح ہو گیا کہ یہ عورت پوری محتاط نہ تھی بلکہ غیر مردوں کے چھو جانے کے معاملہ میں ذرا لا پروا تھی۔اس پر نبی کریم ﷺ نے اسے حکم دیا کہ یا تو اس کو طلاق دے دے یا پھر پردیس بھیج دے۔لیکن جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تو آپ ﷺ نے اسے بیوی اپنے پاس ہی روک کے رکھنا کا حکم دیا۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ: آدمی کو اپنے اہل کے بارے میں غیرت مند ہونا چاہیے۔اسی لیے "لَا تَرُدُّ يَدَ لَامِسٍ" کو زنا پر محمول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسی حالت میں بیوی کو اپنے پاس رکھنا دیاثت و بے غیرتی ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ کسی کو بے غیرت بن جانے کا حکم نہیں دے سکتے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق بات جاننے کے لیے صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔اس کی دلیل "إِنَّ امْـرَأَتِـى لَا تَرُدُّ يَدَ لَامِسٍ" کے الفاظ ہیں کہ انہوں نے اس حیاء والی بات کو بھی صاف صاف کہہ دیا۔
- فتویٰ حاصل کرنے کے لیے کسی کی کوئی ناگوار بات ذکر کر دینے میں کوئی حرج نہیں، اور یہ غیبت کے زمرہ میں داخل نہیں۔
- بعض عورتیں مردوں سے ہاتھ ملانے میں بے پروا ہوتی ہیں چاہے وہ صالحین کی عورتیں ہی ہوں۔
- فتویٰ کے باب میں مدعی کے دعویٰ پر بنا کی جا سکتی ہے۔البتہ حکم اور قضاء میں دعویٰ کے لیے بینہ ضروری ہے۔ کیونکہ فتویٰ کے باب میں قضا سے زیادہ وسعت ہے۔ کیونکہ مفتی فتویٰ دے دیتا ہے اور اس کی ساری ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے۔

جبکہ قضا کی بنیاد جھگڑے پر ہوتی ہے اسی لیے قاضی غیر موجود کے خلاف کسی بات کا فیصلہ نہیں دے سکتا۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے حد غیرت والے تھے۔

◈ اگر آدمی بیوی میں ایسی لا پروائی دیکھے اور وہ یہ جانتا ہو کہ وہ ایسی بیوی کی حفاظت کرنے سے قاصر ہے تو اسے چاہیے کہ ایسی بیوی کو طلاق دے دے تاکہ اس پر بے غیرتی اور دیوثیت کی تہمت نہ رہے۔

◈ اگر کسی مسئلہ میں متعدد مفاسد ہوں تو ایک مفسدہ کو دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ جیسے مذکورہ مسئلہ میں ایک طرف عورت کی لاپروائی تھی تو دوسری طرف خاوند کی بے صبری اور بیوی کے بغیر اس کا نہ رہ سکنا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس آدمی کو حکم دیا کہ وہ بیوی کو اپنے پاس رکھے۔

◈ جب امر ''اِذن'' کے مقام پر ہو تو وہ وجوب پر دلالت نہیں کرتا بلکہ استحباب پر بھی نہیں دلالت کرتا۔ اس کی دلیل "فَاسْتَمْتِعْ بِهَا فَأَمْسِكْهَا" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ان الفاظ کا معنی یہ ہے: "فَلَكَ اَنْ تَسْتَمْتِعَ بِهَا" اور "فَلَكَ اَنْ تُمْسِكَهَا" یعنی تمہیں اس سے متمتع ہونا جائز ہے اور تمہیں اسے اپنے پاس روک رکھنا جائز ہے۔

◈ یاد رہے کہ یہ مشہور اور مسلم فقہی قاعدہ ہے کہ جو امر نہی کے بعد ہو یا جو امر استیذ ان کے بعد ہو وہ اباحت کا فائدہ دیتا ہے۔ ❶

◈ بسا اوقات بیان کرنے کو کسی دوسرے وقت پر بھی مؤخر کر دیا جاتا ہے اور سوال کے جواب سے خاموش رہا جاتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ان صاحب کو بیوی پاس رکھنے کے حکم دینے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ تم اپنی بیوی کو اسی حال میں رکھ لو بلکہ مراد یہ تھی کہ اس کی اصلاح کرو اور پھر اسے اپنے پاس رکھ لو۔

جھوٹا لعان کرنے کا انجام

1099- وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ- حِيْنَ نَزَلَتْ آيَةُ الْمُتَلَاعِنَيْنِ: ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ أَدْخَلَتْ عَلَى قَوْمٍ مَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ فَلَيْسَتْ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ ، وَلَنْ يُدْخِلَهَا اللّٰهُ جَنَّتَهُ ، وَأَيُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَدَهُ ، وَهُوَ يَنْظُرُ إِلَيْهِ ، احْتَجَبَ اللّٰهُ عَنْهُ ، وَفَضَحَهُ عَلَى رُءُوْسِ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت لعان نازل ہوئی تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ''جس عورت نے کسی قوم میں ایک ایسے (بچے) کو داخل کیا جو ان میں سے نہیں۔ تو وہ اللہ (کی عقوبت) سے کسی بات پر نہیں، اور رب تعالیٰ اسے ہرگز بھی اپنی جنت میں داخل نہ کرے گا، اور جس آدمی نے بھی اپنے بچے کا (اپنا بچہ ہونے کا) انکار کیا جبکہ وہ اسے دیکھ رہا ہو تو رب تعالیٰ اس سے (روز قیامت) حجاب فرمائیں گے اور اسے اولین وآخرین کے سامنے رسوا کریں گے۔'' ❷

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ ، وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ ،

اس حدیث کو امام ابوداود، امام نسائی اور امام بن ماجہ نے روایت کیا

---

❶ الوصول الى الاصول لابن برهان: 159/1- المستصفى: 435/1- البحر المحيط: 178/2 .

❷ سنن ابی داؤد: 2263- سنن النسائی: 176/6- سنن ابن ماجه: 2743- صحيح ابن حبان: 4108- المستدرك للحاكم: 220/2- امام دارقطنی نے اس اعتراف کے باوجود اس حدیث کو صحیح کہا ہے کہ اس حدیث کو سعید مقبری سے روایت کرنے میں عبداللہ بن یونس متفرد ہے اور عبداللہ کی معرفت اسی ایک حدیث کے حوالہ سے ہے۔ دیکھیں التلخیص الحبیر: 226/3 .

وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ. | ہے۔جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......أَيُّمَا امْرَأَةٍ: "ایُّ" یہ حرف شرط ہے اوراس میں "مَا" زائدہ ہے۔تب پھر مابعد مذکورہ جملہ "أَدْخَلَتْ" یہ جملہ شرطیہ ہے۔

عَلٰى قَوْمٍ مَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ: اس کی صورت یوں ہے کہ اس کے پیٹ میں زنا کا بچہ ہو اور وہ اسے اپنے خاوند کی طرف منسوب کرے۔کیونکہ زانی جب کسی شادی شدہ عورت سے زنا کرتا ہے یا زنا تو کنواری سے کرے لیکن وہ زنا کے فوراً بعد نکاح کر لے تو بعد میں پیدا ہونے والے زانی کے اس بچے کو بظاہر اس عورت کے خاوند کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔یوں یہ عورت جو یہ جانتی ہے کہ اس کا یہ بچہ زانی سے ہے نہ کہ اس کے خاوند سے، اس بچے کو اس خاندان میں یعنی خاوند کے خاندان میں شامل کر دیتی ہے حالانکہ وہ بچہ اس خاندان سے ہوتا نہیں۔

فَلَيْسَتْ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ: مذکورہ "فَا" جزائیہ ہے۔لہٰذا یہ جملہ جواب شرط ہے، اور مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ ایسی عورت سے بری ہے اور اسے رب تعالیٰ کے اخروی عذاب سے کوئی امان نہیں۔ بلاشبہ وہ عورت عقوبت دعذاب کی زد میں ہے۔

وَلَمْ يُدْخِلْهَا اللّٰهُ جَنَّتَهُ: اس جملہ کا جواب شرط پر عطف ہے۔اس جملہ میں دراصل رب تعالیٰ کی اس عقوبت کا بیان ہے جو اس عورت کو آخرت میں دی جائے گی، اور وہ اسے جنت میں داخل کرنے سے محروم کرنا ہے۔

جَنَّتَهُ: یہ مخلوق کی اپنے خالق کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔

نہ کہ مسکون کے ساکن کے لیے ہونے کے باب میں سے ہے۔کیونکہ رب تعالیٰ تو عرش کے اوپر ہے، اور عرش جنت کے اوپر ہے تو رب تعالیٰ سب سے اوپر ہوا۔لہٰذا یہ مخلوق کی اپنی خالق کی طرف اضافت کے باب سے ہوا۔

وَأَيُّمَا رَجُلٍ ...... وَالْاٰخِرِيْنَ: یہ ترکیب بھی حسب سابق ہے۔البتہ "وَهُوَ يَنْظُرُ إِلَيْهِ" یہ جملہ حالیہ ہے اور "رَجُلٍ" سے حال ہے۔

یہ بھی وعید ہے البتہ پہلی وعید کی ضد ہے اور بچے کو دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ یہ بات پکی ہے کہ وہ بچہ اس کا ہے لیکن وہ عورت پر لگنے والی تہمت کی وجہ سے اس بچہ سے انکار کر رہا ہوتا ہے۔یا پھر جی میں پڑ جانے والے شک کی وجہ سے وہ اس بچہ کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔

اِحْتَجَبَ اللّٰهُ عَنْهُ: یہ جملہ جواب شرط ہے۔یہ روزِ قیامت کو ہوگا اور مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ اسے نگاہِ رحمت سے نہ دیکھے گا۔یہ ایک فضیحت و رسوائی اور عذاب ہوا، جبکہ دوسرا عذاب یہ ہے:

وَفَضَحَهُ عَلٰى رُءُوْسِ الْأَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ: یعنی کہ رب تعالیٰ اس کے عیب کی پردہ پوشی نہ فرمائے گا اور اس کے گناہ کو اولین و آخرین کے سامنے طشت از بام کر دے گا اور سب پر اس کی خطا کو آشکار کر دے گا۔

1100- وَعَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: مَنْ أَقَرَّ بِوَلَدِهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ فَلَيْسَ لَهُ أَنْ يَنْفِيَهُ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جس نے پلک جھپکنے کے بقدر بھی اپنے بچے کا اقرار کر لیا تو اب اسے اس بات کا حق نہیں کہ وہ اس کی (اپنے سے) نفی کرے۔ [1]

---

[1] سنن کبری للبیھقی: 411/7- خود امام موصوف رحمہ اللہ نے بھی "التلخیص الحبیر: 231/3" میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَهُوَ حَسَنٌ مَوْقُوفٌ.

اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن اور موقوف ہے۔

شرح:......اب ذیل میں گزشتہ حدیث اور اس اثر کے فوائد ملاحظہ کیجیے!

- کسی عورت کا غیر خاندان کے بچے کو خاوند کے خاندان میں داخل کرنا کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس فعل پر وعید ہے اور وعید ہمیشہ کبیرہ گناہ پر آتی ہے۔
- رب تعالیٰ کا کسی کے فعل سے خود کو بری قرار دینا بھی اس فعل کی بہت بڑی سزا ہے۔
- جنت اور جہنم ثابت ہے۔
- آدمی کا اپنی اولاد سے خود کو بری قرار دینا کبیرہ گناہ ہے۔ کیونکہ اس فعل پر بھی عقوبت مرتب ہوئی ہے۔
- اگر آدمی یقین کے ساتھ اولاد سے بری نہ ہوا ہوتو اس حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ وہ بچہ اسی کا کہلائے گا۔
- جب ایک دفعہ آدمی اپنے بچے کا اقرار کر لیتا ہے تو اب اس کو اس بچے سے بری ہونے کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔ اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ اثر ہے۔ کیونکہ اگر یہ حکم مقرر نہ کیا جائے تو اولاد اور انساب لوگوں کا کھیل بن کر رہ جائے کہ آج کسی کو بیٹا کہہ دیا تو کل اس سے مکر گئے۔ اس لیے جس نے ایک بار بلکہ ایک لمحے کے لیے بھی کسی بچے کو اپنا بچہ کہہ دیا تو وہ اس بچے سے مکر نہیں سکتا۔

رنگت کے فرق کا حکم

1101- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ امْرَأَتِيْ وَلَدَتْ غُلَامًا أَسْوَدَ، قَالَ: ((هَلْ لَكَ مِنْ إِبِلٍ؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَمَا أَلْوَانُهَا؟)) قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: ((هَلْ فِيْهَا مِنْ أَوْرَقَ؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَأَنّٰى ذٰلِكَ؟)) قَالَ: لَعَلَّهُ نَزَعَهُ عِرْقٌ، قَالَ: ((فَلَعَلَّ ابْنَكَ هٰذَا نَزَعَهُ عِرْقٌ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میری بیوی نے ایک کالا بچہ جنا ہے؟ (حالانکہ میرا رنگ بھی سفید ہے اور اس کا بھی)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسے بات سمجھاتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں''؟ اس آدمی نے عرض کیا: جی ہاں (موجود ہیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے رنگ کیسے ہیں؟ اس آدمی نے عرض کیا: (وہ سب) سرخ (رنگ کے ہیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا ان میں کوئی خاکستری رنگت کا بھی ہے؟'' اس آدمی نے عرض کیا: جی ہاں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو پھر وہ (خاکستری اونٹ ان سرخ اونٹوں میں) کہاں سے آ گیا؟'' وہ کہنے لگا: شاید کسی (اوپر کی) رگ نے اس رنگ کو کھینچ لیا ہو؟ (یعنی شاید اس اونٹ کی پچھلی پشتوں میں کوئی اونٹ خاکستری رنگ کا رہا ہو اور اس اونٹ نے اس رگ کو کھینچ لیا ہو)۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شاید (یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہو)

کہ تیرے اس بیٹے کو بھی (اوپر کی پشتوں کے) کسی (دادا کے رنگ اور اس کی) رگ نے کھینچ لیا ہو۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: ((وَهُوَ يُعَرِّضُ بِأَنْ يَنْفِيَهُ)) وَقَالَ فِي آخِرِهِ: ((وَلَمْ يُرَخِّصْ لَهُ فِي الْاِنْتِفَاءِ مِنْهُ)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''دراصل وہ آدمی اشاروں کنایوں میں اپنے بچے کی (اپنے سے ہونے کی) نفی کر رہا تھا''، اور اسی روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''اور آپ ﷺ نے اسے اس بات کی اجازت مرحمت نہ فرمائی کہ وہ اپنے سے اس بچے کی نفی کر دے۔

غریب الحدیث:......**أَنَّ رَجُلًا**: یہ ایک دیہاتی صاحب تھے جنہوں نے اونٹ بھی پال رکھے تھے وہ نبی کریم ﷺ سے ایک عجیب سوال کرنے حاضر ہوئے تھے، وہ یہ کہ میں بھی سفید رنگت کا ہوں اور میری بیوی کا رنگ بھی سفید ہے۔ پر اس کے باوجود اس نے سیاہ رنگ کا بچہ جنا ہے۔

ان صاحب کے سوال کرنے کی غرض دراصل اشارہ اشارہ میں یہ کہنا تھا کہ شاید یہ میرا بچہ نہیں کہ میرا ہوتا تو سیاہ رنگ والا نہ ہوتا۔ گویا کہ ان صاحب نے تعریض کے طور پر اپنی بیوی پر تہمت لگائی تھی۔

هَلْ لَكَ مِنْ إِبِلٍ: ابل یہ محل کے اعتبار سے مرفوع اور مبتداء مؤخر ہے۔ لہٰذا مذکورہ ''مِنْ'' یہ زائدہ ہے جس کا آنا لغت عرب میں عام ہے۔ تب پھر هل حرف استفہام اور لك جار مجرور یہ خبر مقدم ہوگی۔

حُمْرٌ: یہ میم کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ احمر کی جمع ہے۔ جبکہ جو لفظ میم کے پیش اور ضم کے ساتھ ہوتا ہے، وہ حمار کی جمع ہوتی ہے۔ عامة الناس اس لفظ کے بولنے میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں۔

هَلْ فِيهَا مِنْ أَوْرَقَ: مذکورہ ترکیب بھی حسب سابق ہے ''اورق'' یہ ورق سے ہے، ورق چاندی کو کہتے ہیں، اورق یہ سیاہی مائل سفید کو کہتے ہیں۔ عموماً اس رنگ کو بھورا یا خاکستری کہہ دیتے ہیں۔

فَأَنَّى ذَلِكَ: یعنی سرخ اونٹوں میں یہ بھورا اونٹ کہاں سے آ گیا۔

لَعَلَّهُ نَزَعَهُ عِرْقٌ: نَزَعَ سے مراد جَذَبَ ہے۔ یعنی شاید اس کے باپ دادا کی کسی رگ نے اس کو کھینچ لیا ہو۔ وہ اعرابی اس بات کو خوب سمجھ گیا کیونکہ وہ تو اونٹوں کو پالنے والا تھا اور اسے اس بات کا تجربہ بھی ہوتا رہتا تھا۔

فَلَعَلَّ ابْنَكَ هَذَا نَزَعَهُ عِرْقٌ: تب پھر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ شاید تمہارے اس بچے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو، کہ اس کے دادوں یا دادیوں میں سے کوئی سیاہ رنگ والا رہا ہو، اور اس کی رگ نے اس بچے کو بھی کھینچ لیا ہو۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ محض ظن و تخمین سے نسب کی نفی نہیں ہوتی اور نہ محض کسی معمولی بات پر اولاد کی خود سے نفی کرنا جائز ہی ہے۔ البتہ کسی سبب کے پائے جانے پر شک ہو جانا طبعی اور فطری امر ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] صحیح البخاری: 5305- صحیح مسلم: 1500.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اگر شک کے اسباب پائے جاتے ہوں تو کسی بات میں شک کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور یہ مذموم ظن کے باب میں سے نہیں۔
- بچے کی رنگت مختلف ہونا بہر حال شک اور تہمت کے اسباب میں سے ہے۔ کیونکہ اولاد میں اصل اس کا والدین کی رنگت سے مختلف نہ ہونا ہے۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ نے اس اعرابی کو ایک ایسی مثال دے کر سمجھایا جس کا مشاہدہ خود اسے بھی ہوتا رہتا ہے۔
- مفتی کو چاہیے کہ مستفتی کے حال کی رعایت رکھ کر مسئلہ بیان کرے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے اونٹوں والے سائل کے حال کو دیکھ کر مسئلہ بیان فرمایا۔
- صرف "نعم" کہہ کر بھی جواب دینا کافی ہے۔
- آدمی کو چاہیے کہ وہ شک کو یقین کے ساتھ دور کرے، اور کسی مسئلہ میں متردد اور متذبذب نہ پھرتا رہے۔ جیسے اس اعرابی نے سیاہ بچہ پیدا ہونے پر اپنا شک دور کرنے کے لیے سوال کیا تھا۔
- صحیح مسلم کی روایت سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ وہ اعرابی اپنی بیوی پر زنا کی تعریض نہ کر رہا تھا۔ البتہ اپنے سے اس بچے کی نفی پر تعریض کر رہا تھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اسے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اس بچہ کی اپنے سے نفی کرے، اور آپ ﷺ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے دادوں اور دادیوں میں سے کسی کی رگ نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔
- آدمی اپنی بیوی کے جنے بچے کی خود سے نفی کر سکتا ہے۔ البتہ یہ مسئلہ مطلق نہیں ہے۔ لہٰذا اگر خاوند بیوی کو زنا کرتے دیکھے اور بیوی اتنی مدت میں بچہ جنے کہ اس کا زانی سے ہونا ممکن ہو تو اس بچہ کی نفی جائز ہے، اور اگر وہ بیوی کو زنا کرتے دیکھے اور بیوی اتنی مدت میں بچہ جنے کہ اس کا خاوند سے ہونا ممکن ہی نہ ہو تو اس صورت میں خاوند پر واجب ہوگا کہ وہ خود سے اس بچہ کی نفی کرے۔ جیسے خاوند کی غیر موجودگی میں بچہ جن دینا، اور اگر عورت نے زنا کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنا تو یہ زانی کا نہ ہوگا کیونکہ بچہ چھ ماہ سے کم مدت میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا زنا کا گناہ اپنی جگہ لیکن یہ بچہ زانی کا نہ ہوگا۔ لہٰذا اس بچہ کی خود سے نفی جائز نہ ہوگی، اور اگر بچہ کے زانی اور زوج دونوں سے ہونے کا امکان برابر ہو تو اگر تو خاوند کو غالب گمان اس کے زانی سے ہونے کا ہو تو خاوند لعان کرے گا۔ البتہ اس پر لعان واجب نہ ہوگا۔ ہاں کر سکتا ہے۔ کیونکہ فراش کی دلیل غلبہ ظن سے زیادہ قوی ہے۔

4۔ بَابُ الْعِدَّةِ وَالْإِحْدَادِ وَالْاِسْتِبْرَاءِ وَغَيْرَ ذٰلِكَ

عدت، سوگ اور استبراء رحم وغیرہ کا بیان

عدت:

عدت یہ عدد سے ماخوذ ہے کیونکہ عدت یا تو مہینوں کے اعتبار سے گنی اور شمار کی جاتی ہے، یا پھر حیض کے اعتبار سے اس کو

گنا جاتا ہے۔ لہٰذ عدت کا لفظ معدودہ کے معنی میں ہوگا اور یہی گننا ہی عدت کی وجہ تسمیہ ہے۔ جبکہ اصطلاح شرع میں یہ ایک مخصوص مدت تک شرعاً رکنا ہے۔ جس کا سبب یا تو نکاح کی فرقت ہوگا یا پھر شبہ نکاح کی فرقت ہوگا جیسے شبہ کی وطی کی فرقت کہ یہ بھی عدت واجب کرتی ہے۔

شرعی محدود مدت کی قید سے وہ رکنا اور ٹھہرنا نکل گیا جس کی کوئی شرعی حد نہیں۔ جیسے ایلاء جس میں آدمی ایک مخصوص وقت تک بیوی سے رکا اور ٹھہرا رہتا ہے۔

اور فرقت نکاح کے سبب ہونے کی قید لگانے سے وہ محدود ٹھہرا رہنا نکل گیا جس کا سبب فرقت نکاح نہیں ہوتا جیسے خاوند کے علاوہ کسی کے مرنے پر تین دن تک ٹھہرے رہنا اور سوگ منانا۔

اِحداد:...... احداد کا لفظی معنیٰ سوگ منانا ہے۔ لغت میں احداد یہ رکنے اور امتناع کو کہتے ہیں۔ جبکہ اصطلاح شرع میں احداد یہ بیوہ ہو جانے والی عورت کا ہر اس بات سے رکنا ہے جو دوسرے کو جماع کی دعوت دے یا اس کی طرف رغبت دلائے، جیسے بناؤ سنگھار اور زیب وزینت کرنا اور خوشبو لگانا وغیرہ۔

استبراء:...... یہ براءت سے ماخوذ ہے۔ اصطلاحِ شرع میں یہ اتنی مدت تک انتظار کرنا ہے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ عورت کا رحم نکاح یا غیر نکاح کے سبب سے حمل سے ہے یا نہیں۔

وغیر ذالك:......اس کو امام موصوف آگے خود بیان فرما دیں گے۔

عدت کی شروط

(1) عدت کی پہلی شرط یہ ہے کہ عقد نکاح صحیح ہو باطل نہ ہو، اور باطل نہ ہونا یہ صحیح اور فاسد دونوں قسم کے نکاحوں کو شامل ہے۔ پس باطل نکاح میں کوئی عدت نہ ہوگی۔

اب فاسد اور باطل نکاح میں فرق یہ ہے کہ باطل وہ نکاح ہے جس کے فاسد ہونے پر سب علماء کا اجماع ہو اور فاسد نکاح وہ ہے جس کے فساد میں علماء کا اختلاف ہو۔

جیسے محارم سے نکاح باطل ہے کہ اس کی حرمت پر پوری امت کا اجماع ہے۔ جبکہ ولی کے بغیر ہونے والا نکاح فاسد ہے کیونکہ علماء میں اس نکاح کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے۔ [1]

(2) عدت کی دوسری شرط یہ ہے کہ طلاق دینے والے نے ایسی عورت سے وطی کی ہو یا اس سے خلوت کی ہو کہ اس جیسی عورت بچہ جن سکتی ہو۔

یاد رہے کہ یہ شرط خاص فرقت نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والی عدت کی ہے۔ نہ کہ عدت وفات کی۔ لہٰذا اگر نابالغہ کا خاوند وفات پا گیا تو اس پر بھی عدت آئے گی...... گو کہ ایسی عورت بچہ نہیں جن سکتی...... چاہے اس کے ساتھ دخول اور خلوت نہ بھی کی ہو۔ کیونکہ عدت وفات میں صرف یہ شرط ہے کہ نکاح باطل نہ ہو۔

لہٰذا: (1) اگر کسی نے دخول اور خلوت سے پہلے طلاق دے دی تو عورت پر عدت نہ آئے گی۔

(2) اور اگر کسی نے نابالغہ کو طلاق دے دی تو بھی اس پر عدت نہ آئے گی چاہے اس کے ساتھ خلوت کی بھی ہو کیونکہ یہ

[1] المغنی لابن قدامة: 78/8.

عورت ابھی بچہ جننے کے قابل نہیں ہوئی۔ عدت کا حکم دراصل رحم کی براءت جاننے کے لیے ہے۔

عدت وفات کا حکم

1102۔ عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ أَنَّ سُبَيْعَةَ الْأَسْلَمِيَّةَ رضي الله عنها نُفِسَتْ بَعْدَ وَفَاةِ زَوْجِهَا بِلَيَالٍ، فَجَاءَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَاسْتَأْذَنَتْهُ أَنْ تَنْكِحَ، فَأَذِنَ لَهَا، فَنَكَحَتْ)).

حضرت مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ: حضرت سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے خاوند کی وفات کی چند راتوں کے بعد نفاس آ گیا (یعنی ابھی ان کی عدتِ وفات شروع ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ انہوں نے بچہ جنم دیا اور اس کے بعد نفاس جاری ہو گیا)۔ پس وہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئیں اور آپ ﷺ سے نکاح کر لینے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔ سو انہوں نے (نیا) نکاح کر لیا۔ ❶

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

وَفِي لَفْظٍ: ((أَنَّهَا وَضَعَتْ بَعْدَ وَفَاةِ زَوْجِهَا بِأَرْبَعِينَ لَيْلَةً)).

اور صحیح بخاری کی ایک اور روایت کے یہ الفاظ ہیں: انہوں نے اپنے خاوند کی وفات کے چالیس راتوں کے بعد بچہ جنم دیا۔ ❷

وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: قَالَ الزُّهْرِيُّ: ((وَلَا أَرَى بَأْسًا أَنْ تَزَوَّجَ وَهِيَ فِي دَمِهَا، غَيْرَ أَنَّهُ لَا يَقْرَبُهَا زَوْجُهَا حَتَّى تَطْهُرَ)).

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے، امام زہری فرماتے ہیں: میں اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ وہ نفاس کے خون کے دوران ہی نکاح کر لے۔ البتہ یہ ہے کہ ایسی عورت کا (نیا) خاوند جب تک کہ یہ (نفاس سے) پاک نہیں ہو جاتی، اس کے قریب نہ آئے۔ ❸

غریب الحدیث:...... نُفِسَتْ: مراد بچہ جنم دینا ہے کہ نفاس کا خون بچہ کی ولادت کے بعد آتا ہے۔

فَاسْتَأْذَنَتْهُ: مراد یا تو اور نکاح کرنے کی اجازت طلب کرنا ہے یا پھر مسئلہ دریافت کرنا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وضع حمل کے بعد ایک بار وہ بناؤ سنگھار کیے بیٹھی تھیں کہ ان کے پاس سے ابو سنابل بن بعکک گزرا، اس نے جب حضرت سبیعہ رضی اللہ عنہا کو یوں بناؤ سنگھار کیے بیٹھے دیکھا تو کہنے لگا کہ کیا بات ہے کہ تم تجمل کیے بیٹھی ہو؟ اللہ کی قسم! جب تک تمہاری عدت وفات جو چار ماہ دس دن ہے نہ گزر جائے گی تم ہرگز نکاح نہ کرو گی۔ حضرت سبیعہ رضی اللہ عنہا نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر سارا ماجرا گوش گزار کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابو سنابل غلط کہہ رہا ہے'' جس پر حضرت سبیعہ رضی اللہ عنہا نے عدت وفات کے پورا ہونے سے قبل ہی نیا نکاح کر لیا۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ بیوہ حاملہ کی مدت عدت ''وضع حمل'' ہے۔ چنانچہ وہ جس وقت بھی بچہ جنم دے گی اس کی عدت پوری ہو جائے گی چاہے اس کے خاوند کو مرے چند دن یا چند لمحے ہی کیوں نہ گزرے ہوں۔

❶ صحيح البخاري: 5320۔ صحيح مسلم: 1484. ❷ صحيح البخاري: 4909. ❸ صحيح مسلم: 1484.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علم حاصل کرنے کے لیے بے حد حریص تھے اور حضرات عمل کرنے کے لیے علم حاصل کرتے تھے نا کہ معلومات اکٹھی کرنے کے لیے۔
- عورت مردوں کے ساتھ بات کر سکتی ہے جیسا کہ سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا نے ابو سنابل سے گفتگو کی۔
- حاملہ بیوہ اگر بچہ جنم دے تو اس کی عدت اسی وقت پوری ہو جاتی ہے چاہے ابھی چار ماہ دس دن نہ بھی گزرے ہوں، البتہ حاملہ بیوہ کی عدت بچہ جنم دے کر ہی پوری ہوگی چاہے اس کے بچے کی ولادت خاوند کی وفات کے نو ماہ بعد ہی ہوئی ہو، اور یہی قول صحیح ہے۔ لہٰذا اس بارے میں اگرچہ علماء کا اختلاف ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے چاہے وہ جب بھی ہو جائے۔
- رہا امام زہری کا قول تو وہ صحیح ہے کہ جیسے حیض والی سے نکاح درست ہے، اسی طرح نفاس والی سے بھی نکاح درست ہے۔ البتہ جب تک وہ نفاس اور حیض سے پاک نہ ہو جائے اس کے قریب نہ ہوا جائے۔
- رہا یہ سوال کہ آیا حیض اور نفاس والی کے پاس اس کے خاوند کو جانے بھی دیا جائے یا نہیں؟ تو دیکھا جائے گا کہ اس کا خاوند متدین، اور حلال وحرام کو سمجھنے والا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اگر تو وہ سمجھتا ہے کہ اس حال میں بیوی سے جماع جائز نہیں تو اسے بیوی کے پاس بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر نوجوان اور دین میں متساہل ہے تو اسے بیوی کے پاک ہو جانے تک اس کے پاس جانے سے روکا جائے گا۔

طلاق کی اور فسخ نکاح کی عدت کا بیان

1103- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: أُمِرَتْ بَرِيرَةُ أَنْ تَعْتَدَّ بِثَلَاثِ حِيَضٍ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ: بریرہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ تین حیض عدت گزارے۔ ❶

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ، لٰكِنَّهُ مَعْلُوْلٌ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے رواۃ ثقہ ہیں لیکن یہ حدیث معلول ہے۔

معرفة الصحابة:......سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا انصار کے ایک خاندان کی باندی تھیں۔

قصۂ حدیث:......انہوں نے اپنے آقاؤں کے ساتھ نو اوقیہ چاندی پر عقد مکاتبت کر لیا۔ پھر یہ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت مدد مانگنے کو حاضر ہوئیں۔ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ولاء کی شرط پر ان کی مدد کو تیار ہو گئیں اور نبی کریم ﷺ نے بھی انہیں ایسا کرنے کی اجازت رحمت فرما دی۔ یہ قصہ پہلے ہی بالتفصیل گزر چکا ہے۔

غرض سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عقد کتابت کی رقم ادا کر کے انہیں لے لیا اور لے کر انہیں آزاد کر دیا تھا۔ سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے خاوند کا نام مغیث تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان کے آزاد ہو جانے کے بعد انہیں اس بات کا اختیار دیا کہ وہ چاہے

---

❶ سنن ابن ماجه: 2077۔ امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اسناد صحیح ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں امام ابن قیم فرماتے ہیں: باوجودیکہ یہ اسناد صحیحین والی ہے، سوائے امام ابن ماجہ کے یہ حدیث کسی نے بھی روایت نہیں کی۔ اور تین حیض کے حکم کا محفوظ ہونا بعید ہے۔ دیکھیں: حاشیه ابن القیم: 224/6۔

تو مغیث کے ساتھ رہ لے اور چاہے تو اس سے اپنا نکاح فسخ کر لے تو انہوں نے نکاح فسخ کر لینے کو اختیار کیا۔ کیونکہ وہ اپنے خاوند کو سخت ناپسند کرتی تھیں۔ اگر چہ مغیث کی ان کے ساتھ بے پناہ محبت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے انہیں اس بات کا مشورہ دیا کہ وہ مغیث کے ساتھ رہ لیں اور اس کو نہ چھوڑیں لیکن حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی بات نہ مانی اور عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! اگر تو یہ آپ ﷺ کا حکم ہے تو بسروچشم اور اگر یہ آپ ﷺ کا مجھے مشورہ ہے تو مجھے مغیث میں کوئی رغبت نہیں۔ یوں نبی کریم ﷺ نے دونوں کے نکاح کو فسخ فرما دیا۔

فسخ نکاح کا حکم

کیا فسخ نکاح سے عدت واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف اس حدیث کی بنا پر ہے۔ چنانچہ جن کے نزدیک یہ حدیث ہے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ فسخ نکاح سے بھی عدت واجب ہوتی ہے اور وہ تین حیض ہے۔ کیونکہ یہ زندگی میں فراق ہے تو واجب ہوگا کہ یہ عورت طلاق کی عدت کی طرح تین حیض کی عدت گزارے۔

جبکہ دوسرے علماء کے نزدیک فسخ میں تین حیض کی عدت نہیں کیونکہ اس میں رجعت نہیں ہوتی، اور قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ تین حیض کی عدت وہاں ہے جہاں رجعت ممکن ہو، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾ (البقرة: 228)

''اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے، اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں اور ان کے لیے حلال نہیں کہ وہ چیز چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے، اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ فسخ میں خاوند کو بیوی سے رجوع کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اس بنا پر فسخ نکاح کی عدت صرف ایک حیض ہوگی تا کہ استبراء رحم حاصل ہو جائے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مختار مذہب ہے کہ نکاح کے فسخ کی جملہ صورتوں میں عدت ایک حیض ہی ہے۔ [1]

لیکن اس حدیث کے متعدد دیگر طرق اس کی صحت کے شاہد ہیں اور جب کسی حدیث کے متعدد طرق ہو جائیں تو وہ حدیث ضعیف بھی ہو تو ترقی کر کے حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور ایسی حدیث قیاس پر مقدم ہوتی ہے۔

اور رہی مذکورہ آیت، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حکم کا عموم کے بعض افراد کی طرف عود کرنا یہ تخصیص کی دلیل نہیں ہوا کرتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حدیث کے صحیح ہونے کی شرط پر فسخ نکاح کی عدت تین حیض ہے۔
- اگر فاعل کا علم ہو تو اس کو عبارت سے حذف کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس کی دلیل "أُمِرَتْ بريرة" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو امر کرنے والے جناب رسول اللہ ﷺ ہیں۔

---

[1] دیکھیں: الفروع لابن مفلح: 5/414۔ الانصاف: 9/279.

◈ صاحب قصہ ''قصہ'' کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہوتا ہے۔ جیسے یہاں صاحب قصہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں جنہوں نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو خرید کر آزاد کیا تھا۔

مطلقہ بائنہ کے سکنی اور نفقہ کا اور اس کی عدت کا بیان

1104۔ وَعَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمُطَلَّقَةِ ثَلَاثًا لَيْسَ لَهَا سُكْنَى، وَلَا نَفَقَةٌ.

امام شعبی سیّدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے مطلقہ ثلاث کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ (نبی کریم ﷺ نے مطلقہ ثلاث کے بارے میں ارشاد فرمایا): ''اس کے لیے نہ تو سکنٰی ہے اور نہ نفقہ ہی ہے۔'' [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

مطلقہ کے سکنی اور نفقہ کے حکم کی تفصیل

شرح :......اگر تو مطلقہ ایک یا دو طلاق والی ہو تو اس کو نفقہ اور سکنی دونوں ملتے ہیں بلکہ ایسی مطلقہ کو عدت پورا ہونے تک اپنے گھر میں رکھنا واجب ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾ (الطلاق : 1)

''نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔''

اور اگر کسی کو تیسری طلاق بھی دے دی ہے تو وہ خاوند سے بائنہ اور اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کے بعد اس کے نکاح میں دوبارہ نہ آ جائے۔ لہٰذا مطلقہ ثلاث پر عدت کے دوران اپنے خاوند کے لیے اپنا ستر کھولنا یا اس کے ساتھ خلوت کرنا حرام ہوتا ہے۔ کیونکہ اب وہ مکمل طور پر بائنہ ہو چکی ہے اور اسے ''بینونت کبریٰ'' کہا جاتا ہے۔

تب پھر مطلقہ ثلاث کے لیے فیصلہ نبوی ﷺ کے مطابق نہ تو سکنی ہوگا اور نہ نفقہ کیونکہ اب وہ زوجہ کے حکم میں نہیں رہی۔

اور ایک قول یہ ہے کہ اس مطلقہ ثلاث کو بھی سکنی اور نفقہ ملے گا کیونکہ عدت کے پورا ہونے تک وہ خاوند کے حق کی وجہ سے محبوس اور رکی ہوئی ہے۔ لہٰذا مطلقہ مادون الثلاث کی طرح اس کو بھی سکنی اور نفقہ ملے گا۔ لیکن یہ نص کے مقابلہ میں قیاس ہے، لہٰذا یہ قیاس رد ہوگا۔

جبکہ تیسرا قول یہ ہے کہ مطلقہ ثلاث کو سکنی تو ملے گا البتہ نفقہ نہ ملے گا۔ کیونکہ یہ خاوند کے حق کی وجہ سے محبوس ہے لہٰذا اسے سکنی ملے گا اور چونکہ خاوند اس سے رجوع نہیں کر سکتا اس لیے اسے نفقہ نہ ملے گا۔ لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے جو نص حدیث ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معتدہ بائنہ کو سکنی اور نفقہ میں سے کچھ نہ ملے گا۔

◈ معلوم ہوا کہ تیسری طلاق بھی دے سکتے ہیں۔

[1] صحیح مسلم: 1480.

خاوند کے سوا کسی کے مرنے کا تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے

1105۔ وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تُحِدُّ امْرَأَةٌ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثٍ، إِلَّا عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا، وَلَا تَلْبَسُ ثَوْبًا مَصْبُوْغًا، إِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ، وَلَا تَكْتَحِلُ، وَلَا تَمَسُّ طِيْبًا، إِلَّا إِذَا طَهُرَتْ، نُبْذَةً مِنْ قُسْطٍ، أَوْ أَظْفَارٍ))

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی عورت کسی کے مرنے پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ کرے سوائے خاوند (کے مرنے) پر سوگ کرنے کے کہ وہ چار ماہ دس دن ہے (اس دوران) وہ رنگا ہوا کپڑا نہ پہنے سوائے رنگین کپڑے کے (ان دونوں لفظوں میں جو فرق ہے وہ آگے بیان کیا جائے گا) اور نہ وہ سرمہ لگائے اور نہ کسی قسم کی خوشبو لگائے۔ سوائے تھوڑی سی (قسط نامی) خوشبو کے یا اظفار کے کہ جب وہ (حیض سے) پاک ہوتی ہے (تو تب لگا سکتی ہے تاکہ حیض کے دوران بدن میں پیدا ہونے والی ناگوار بو دور ہو سکے)۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ وَلِأَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ مِنَ الزِّيَادَةِ، ((وَلَا تَخْتَضِبُ)) وَلِلنَّسَائِيِّ، ((وَلَا تَمْتَشِطُ)).

اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔ جبکہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: اور خضاب نہ لگائے [2] (یعنی ہاتھوں پیروں کو مہندی وغیرہ کے ذریعے نہ رنگے، اسی حکم میں سر میں مہندی لگا کر بالوں کو رنگنا بھی داخل ہے) اور (صرف) سنن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: ''اور (اپنے بالوں میں) کنگھی (بھی) نہ کرے۔ [3]

غریب الحدیث: ......**لَا تَحُدُّ**: مذکورہ ''لا'' نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور ناہیہ بھی۔ چنانچہ نافیہ کی تقدیر پر دال پر ضم آئے گا۔ جبکہ ناہیہ کی تقدیر پر دال ساکن ہوگی۔ پھر اگر یہ لا ناہیہ ہے تو اس جملہ کا ''نہی'' ہونا واضح ہے۔ لیکن اگر یہ ''لا'' نافیہ ہو تو تب یہ جملہ خبریہ ہوگا جو طلبیہ کے معنی میں ہوگا۔

علماء نے طلب کی جگہ خبر لانے کا یہ فائدہ ذکر کیا ہے کہ اس سے کلام میں تاکید بلیغ پیدا ہوتی ہے۔

امْرَأَةٌ: یہ نکرہ ہے جو ہر قسم کی عورت کو شامل ہے چاہے وہ ماں ہو یا بیٹی، بہن ہو یا خالہ، پھوپھی ہو یا نانی غرض بیوی کے علاوہ کوئی بھی عورت ہو۔

عَلٰى مَيِّتٍ: یہاں بھی میت نکرہ ہے اور سوائے خاوند کے سب مردوں کو شامل ہے۔

فَوْقَ ثَلَاثٍ: مراد فوق ثلاث لیالٍ ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 313۔ صحيح مسلم: 1126/2۔ رقم الحديث: 938.

[2] سنن ابی داؤد: 2302۔ سنن النسائی: 203/6.

[3] سنن النسائی: 202/6.

إِلَّا عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا: یہ فعل محذوف کی تقدیر پر ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے: "إِلَّا تَحُدُّ عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا" اور مراد یہ ہے "سوائے اس کے کہ خاوند پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرے گی۔" اور چار ماہ سے قمری چار ماہ مراد ہیں۔ جیسا کہ یہ مسئلہ بارہا ذکر کیا جاچکا ہے۔

ثَوْبًا مَصْبُوغًا: دورنبوی میں رنگا ہوا کپڑا زینت اور جمال سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے بیوہ کو سوگ کے دوران رنگا ہوا کپڑا پہننے کی ممانعت فرمائی۔ لہٰذا جو کپڑا اونی سوتی، سرخ سفید، جیسا بھی ہے، اسے اس کے اسی حال میں رہنے دیا جائے اور اس اسے رنگوا کر نہ پہنا جائے۔

إِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ: دورنبوی میں یہ کپڑا معروف تھا۔ یہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کے ریشے یعنی اس کا تانا بانا رنگین دھاگوں کا ہو، تب پھر اس سے بننے والا کپڑا رنگیں ہوگا۔

اور یہی فرق ہے رنگین کپڑے میں اور کپڑا رنگوانے میں کہ اس دور میں کپڑا رنگوا کر پہننے کو زینت سمجھتے تھے البتہ بُنا ہوا رنگ دار کپڑا معمول کا استعمالی کپڑا سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے سوگ کی ممانعتوں میں سے اس قسم کے کپڑے کو مستثنیٰ فرمایا۔

وَلَا تَكْتَحِلُ: سرمہ نہ لگائے۔ سرمہ آنکھ میں لگایا جاتا ہے۔ حدیث کا ظاہر بتلاتا ہے کہ بیوہ اپنی عدت اور سوگ کے دوران نہ تو دن میں سرمہ لگائے گی اور نہ رات کو، اور نہ تو زینت کے لیے لگائے گی اور نہ دوا کے لیے ہی لگائے گی۔

وَلَا تَمَسُّ طِيبًا: یعنی استعمال کے طور پر اس کو نہ لگائے گی۔

نُبْذَةً مِنْ قُسْطٍ أَوْ أَظْفَارٍ: قُسط ایک قسم کی خوشبو کا نام ہے اور ایک قول یہ ہے یہ بخور میں سے ہے جس کی دھونی لی جاتی ہے۔

اور "اظفار" یہ ناخنوں کے مشابہ ایک خوشبودار بوٹی ہوتی ہے جس کو خوشبو لینے کے لیے اور خوشبو بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اور نبذۃ یہ تھوڑی سی شے کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ معتدۂ وفات کو اگر عدت کے دوران حیض آجاتا ہے تو اس سے پاک ہونے کے وقت ان معمولی خوشبوؤں کی تھوڑی سی مقدار کو وہ استعمال کرسکتی ہے تاکہ حیض کے دوران بدن میں پیدا ہونے والی ناگوار بو کا ازالہ کیا جاسکے۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ نے حاجت اور ضرورت کے لیے اس قدر خوشبو کے استعمال کی رخصت عنایت فرمائی۔

وَلَا تَخْتَضِبُ: یہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کی روایت کے الفاظ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مہندی وغیرہ کے ذریعے ہاتھوں پیروں یا سر کے بالوں کو نہ رنگے۔

وَلَا تَمْتَشِطُ: یہ سنن نسائی کی روایت کے الفاظ ہیں۔ بیوہ کو عدت کے دوران بالوں میں کنگھی کرنے کی بھی ممانعت ہے کیونکہ کنگھی کرنا بھی زینت میں سے ہے۔

مضمون حدیث :......ان روایات میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ معتدۂ وفات اپنی عدت کے دوران زیب وزینت اور بناؤ سنگھار کے جملہ ذرائع ووسائل اور اسباب سے دور رہے گی۔

سوگ کے دوران خوشبو لگانے اور مہندی لگانے کا بیان

1106۔ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: جَعَلْتُ عَلَى عَيْنِي صَبِرًا، بَعْدَ أَنْ تُوُفِّيَ أَبُو سَلَمَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّهُ يَشِبُّ الْوَجْهَ، فَلَا تَجْعَلِيهِ إِلَّا بِاللَّيْلِ، وَانْزِعِيهِ بِالنَّهَارِ، وَلَا تَمْتَشِطِي بِالطِّيبِ، وَلَا بِالْحِنَّاءِ، فَإِنَّهُ خِضَابٌ)) قُلْتُ: بِأَيِّ شَيْءٍ أَمْتَشِطُ؟ قَالَ: ((بِالسِّدْرِ)).

سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد (عدت کے دوران ایک دفعہ) میں نے اپنی آنکھوں پر ایلوا (یعنی اس کا عرق) لگایا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ چہرے کو خوبصورت کر دیتا ہے۔ اس لیے اسے رات کو ہی لگانا اور دن میں اسے (آنکھوں پر سے) اتار دینا، اور خوشبو اور مہندی لگا کر بالوں میں کنگھی نہ کرنا کہ یہ خضاب ہے۔ میں نے پوچھا: (تو پھر) میں کس چیز سے بالوں میں کنگھی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیری کے ساتھ۔'' [1]

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے، اور اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔

شرح:......سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیوگی کا اور ان کے نبی کریم ﷺ کے عقد میں آ کر امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے زمرہ میں داخل ہونے کا واقعہ مشہور ہے۔

صَبِرًا: یہ ایلواء کو کہتے ہیں، یہ ایک کڑوا پودا ہوتا ہے، اس کا عرق متعدد طبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

إِنَّهُ يَشِبُّ الْوَجْهَ: يَشِبُّ یعنی یہ چہرہ کو روشن اور خوبصورت بناتا ہے۔

إِلَّا بِاللَّيْلِ: "با" یہاں "فی" کے معنی میں ہے۔ یعنی "الا فی اللیل" کے معنی میں ہے۔

وَلَا تَمْتَشِطِي بِالطِّيبِ، وَلَا بِالْحِنَّاءِ، فَإِنَّهُ خِضَابٌ: یعنی نہ تو کسی خوشبودار شے کے ساتھ اور نہ خود خوشبو سے ہی کنگھی کرنا۔ یعنی ان چیزوں کو بالوں میں لگا کر کنگھی نہ کرنا۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں بھی اس دور میں رائج چند مزید چیزوں کے استعمال کی عدتِ وفات میں ممانعت بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں وہ چیزیں زینت سمجھی جاتی ہیں اور آج بھی یہ چیزیں زینت اور تجمل میں سے ہی ہیں۔

سوگ میں سرمہ لگانے کا حکم

1107۔ وَعَنْهَا أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ ابْنَتِي مَاتَ عَنْهَا زَوْجُهَا، وَقَدِ اشْتَكَتْ

سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ایک عورت نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میری بیٹی کا خاوند

---

[1] سنن ابی داؤد: 2305۔ سنن النسائی: 204/6۔ ابن حزم نے المحلی: 277/10 میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس کی اسناد میں ابراہیم بن طہمان ہے۔ لیکن موصوف کی تضعیف لائق التفات نہیں۔ کیونکہ ابراہیم بن طہمان تو صحیحین کے رجال میں سے ہے۔ ہاں ضعیف کہنے والوں نے عقیدۂ ارجاء کے حوالہ سے انہیں ضعیف کہا ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی نے اس پر جزم کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ ابراہیم نے ارجاء سے رجوع کرلیا تھا۔ دیکھیں: "معرفة علوم الحديث، ص: 136".

عَيْنَهَا ، أَفَنَكْحُلُهَا ؟ قَالَ : ((لَا)) .

وفات پا گیا ہے اور اب اس کی آنکھیں دکھنے لگی ہیں تو کیا وہ اس کی آنکھوں میں سرمہ ڈال لیا کرے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:......اس حدیث میں بھی سوگ کے دوران سرمہ لگانے کی ممانعت کا بیان ہے۔

اب ذیل میں ہم سوگ سے متعلق ان تینوں مذکورہ احادیث کے فوائد قارئین کی نذرِ نظر کرتے ہیں۔

حدیث ام عطیہ رضی اللہ عنہا کے فوائد

◈ عورت کے لیے سوائے خاوند کے کسی کے لیے بھی تین دن سے زیادہ کا سوگ منانا حرام ہے اور یہی حکم مردوں کے لیے بھی ہے اور سوگ منانا بھی جائز ہے نہ کہ جواز۔ اس کے جواز کی حکمت شریعت کی تیسیر اور آسانی ہے کیونکہ طبعی بات ہے کہ دکھ میں مبتلا انسان کا جی گھٹا ہوتا ہے اور نئے کپڑے پہننے اور زینت و جمال اختیار کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ اسی لیے شریعت نے نفس انسانی کو اس کا حصہ دیتے ہوئے اسے تین دن تک سوگ کرنے کی اجازت دی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ نفس کی تربیت کے باب سے ہے کہ غم منا لینا یہ جی میں غم دبائے رکھنے سے بہتر ہے۔

◈ البتہ یہ سوگ بار بار منانا جائز نہیں ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ یہ تین روزہ سوگ کس طرح منایا جائے۔ کیا یہ گھر کی چیزیں اوندھا کرنے، اور دروازوں پر سیاہ پردے لٹکانے وغیرہ کے ذریعے منایا جائے گا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ سوگ کا تعلق خود آدمی کی ذات سے ہے۔ لہٰذا سوگ یہ ہے کہ آدمی زینت کے کپڑوں میں باہر نہ نکلے۔ البتہ اپنی ذات سے الگ ایسا کوئی کام نہ کرے جو رب کے فیصلے پر ناراض ہونے کی غمازی کر رہا ہو کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

◈ یہ شریعت تیسیر پر مبنی ہے۔ چنانچہ جہاں اس نے نفس کو غم منانے کی اجازت دی ہے اسی طرح سال بھر میں دو عیدوں کے مواقع پر اور اسی طرح اپنی شادی کے موقع پر نفس کو تفریح کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ یوں شریعت نے مواقع کی مناسبت سے احکام جاری فرمائے ہیں۔

◈ تین کے عدد کا شریعت کے اکثر احکام میں اعتبار کیا گیا ہے۔

◈ عدتِ وفات جب تک پوری نہیں ہو جاتی عورت پر سوگ کرنا واجب ہوتا ہے اور اس کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ تین دن کے سوگ کی اجازت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سوگ منانا اپنی اصل میں حرام ہے اور حرام کو وہی شے مباح کرتی ہے جو اس سے زیادہ قوی ہو اور وہ وجوب ہے۔ لہٰذا اگر بیوی کو خاوند پر سوگ منانا مباح کیا گیا ہے تو یہ اباحت وجوب کے ذریعے ہی ممکن ہوگی۔ لہٰذا بیوی کے حق میں سوگ واجب ہوگا۔

گو یہ دلیل قدرے ضعیف ہے لیکن دوسری روایت میں صراحت کے ساتھ رنگے کپڑے پہننے اور سرمہ خوشبو وغیرہ لگانے کی ممانعت صاف بتلاتی ہے کہ یہ سوگ منانا واجب ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 5336- صحيح مسلم: 1488 .

- البتہ حاملہ عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ وہ صرف مدتِ حمل تک سوگ منائے گی چاہے یہ مدت چندون کی ہی ہو۔
- معلوم ہوا کہ خاوند پر بیوی کا بے حد حق ہے۔
- سوگ والی عورت زینت و جمال والے کپڑے نہ پہنے گی۔ زینت کے زیور کا بھی یہی حکم ہے۔ چاہے وہ بدن کے کسی بھی حصہ میں پہنا جاتا ہو۔ اس کی دلیل "وَلَا تَلْبَسُ ثَوْبًا مَصْبُوْغًا" کے الفاظ ہیں۔
- سوگ والی آنکھوں میں سرمہ نہ ڈالے گی۔ چاہے آنکھوں میں تکلیف بھی ہو اور ابن حزم رحمہ اللہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ چاہے اس کی بینائی بھی جاتی رہے تب بھی نہ لگائے گی۔

رہی حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا جس میں آنکھوں پر ایلواء لگانے کی اجازت مذکور ہے تو ان دونوں احادیث میں جمع کی صورت یہ ہوگی کہ سرمہ آنکھوں کو جمال عطا کرتا ہے جبکہ ایلواء آنکھوں کی زینت و جمال کا سبب نہیں ہوتا، اور سوگ میں زینت منع ہے۔

- فی زمانہ آنکھوں میں مختلف رنگوں کے لینزز لگانے کا حکم بھی سرمہ لگانے کا ہی ہے۔
- سوگ والی عورت پر ہر قسم کی خوشبو لگانا منع ہے۔ اس کی دلیل "وَلَا تَمَسُّ طِيْبًا" کے الفاظ ہیں جن میں عموم ہے۔ جیسا کہ غریب الحدیث کے تحت بیان ہوا۔
- البتہ ضرورت و حاجت کے وقت کسی معمولی خوشبو کی تھوڑی سی مقدار لگائی جاسکتی ہے اس کی دلیل "اِلَّا اِذَا طَهُرَتْ نُبْذَةً مِنْ قُسْطٍ اَوْ اَظْفَارٍ" کے الفاظ ہیں۔
- سوگ والی عورت کو خضاب لگانا منع ہے جس کی دلیل "لَا تَخْتَضِبُ" کے الفاظ ہیں۔ اسی حکم میں مہندی بھی شامل ہے۔
- ضرورت پڑنے پر سوگ والی عورت کے لیے ایلواء کا استعمال جائز ہے۔
- سوگ والی عورت پر خوشبو لگا کر بال دھونے اور ان میں کنگھی کرنا منع ہے۔ البتہ بیری کے پتوں والے پانی سے بالوں کو دھو کر کنگھی کرنا جائز ہے۔ یہی حکم فی زمانہ رائج شیمپو وغیرہ کے استعمال کا بھی ہے کہ سوگ والی عورت بالوں کو شیمپو لگا کر دھوسکتی ہے۔
- آنکھیں دکھنے پر بھی آنکھوں میں سرمہ لگانا منع ہے۔ کیونکہ شریعت میں تداوی بالحرام منع ہے۔ کیونکہ ایک تو خود سرمہ لگانے سے آنکھوں کی تکلیف کے جاتے رہنے کا کوئی یقین نہیں۔ دوسرے کسی دوسری دوا سے آنکھوں کی تکلیف دور کرنا ممکن ہے۔

حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فوائد

- ضرور پڑنے پر ایلواء کا پانی آنکھوں میں لگا سکتے ہیں البتہ دن چڑھے آنکھوں کو دھولیا جائے۔
- عورتیں بالوں میں خوشبو لگا کر کنگھی کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اسی بات سے منع فرمایا جو عورتوں میں رائج اور معمول تھی۔
- اسی طرح عورتیں بالوں میں مہندی لگانے کی بھی عادی ہوتی ہیں۔ اسی لیے سوگ میں اس سے بھی منع فرما دیا گیا۔
- سوگ والی عورت کو خضاب لگانا منع ہے۔

◈ سوگ والی عورت کو سر کے بال دھونا جائز ہے۔ کیونکہ جب کنگھی کرنا جائز ہے تو دھونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔
اسی پر قیاس کر کے سوگ والی عورت کے لیے نظافت کے لیے اور ٹھنڈک کے لیے نہانا جائز ہوگا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث دوم کے فوائد

◈ حرام کے ذریعے تداوی حرام ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے آنکھوں کے دکھتے ہونے کے باوجود ان میں سرمہ لگانے کی اجازت مرحمت نہ فرمائی تھی۔

عدتِ طلاق والی کے گھر سے نکلنے کا حکم

1108- وَعَنْ جَابِرٍ ﷺ قَالَ : طُلِّقَتْ خَالَتِيْ ، فَأَرَادَتْ أَنْ تَجُدَّ نَخْلَهَا ، فَزَجَرَهَا رَجُلٌ أَنْ تَخْرُجَ ، فَأَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ ، فَقَالَ: ((بَلْ ، جُدِّيْ نَخْلَكِ ، فَإِنَّكِ عَسَى أَنْ تَصَدَّقِيْ ، أَوْ تَفْعَلِيْ مَعْرُوْفًا)) .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میری خالہ کو طلاق ہوگئی (اور وہ اپنی عدت میں بیٹھ گئیں) اس دوران انہوں نے اپنے کھجور کے درختوں کے پھل (خود جا کر) توڑنے کا ارادہ کیا تو (ان کے گھر کے) ایک آدمی نے انہیں (باہر) نکلنے سے منع کر دیا۔ اس پر وہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوگئیں (اور ماجرا گوش گزار کر دیا)۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(نہیں) بلکہ تم (خود جا کر) اپنے کھجوروں کا پھل توڑو کہ قریب ہے کہ تم (اس کے پھل سے) کوئی صدقہ کر دو یا کوئی نیکی کرو۔'' [1]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح: ...... یہ حکم معتدۂ طلاق کا ہے جس کے بارے میں رب تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:
﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ (الطلاق : 1)
''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے، نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔''
یہاں رب تعالیٰ نے دو حکم دیے ہیں:
(1) ایک یہ کہ ہم ان کو گھروں سے نہ نکالیں۔
(2) دوسرا یہ کہ وہ خود بھی نہ نکلیں۔
البتہ اگر وہ کھلی بے حیائی کریں تو ان کو گھر سے نکال سکتے ہیں۔ علماء کرام نے کھلی بے حیائی کی تفسیر بدزبانی وغیرہ سے کی ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ ''مطلقہ'' عدت کے دوران گھر سے نہ نکلے۔ لیکن یہ نہیں کہ ایسی عورتیں کبھی نکلیں ہی نہ بلکہ وہ ضرورت پڑنے پر نکلیں گی اور لوٹ کر گھروں کو آ جائیں گی۔ کیونکہ اگر تو انہیں رجعی طلاق ہے تو وہ ابھی تک بیویوں کے حکم میں ہیں جو گھروں میں سے جا اور آ سکتی ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم: 1483 .

غرض ہم یہ کہتے ہیں کہ مطلقہ رجعیہ کے گھروں سے جانے آنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ وہ خاوندوں کے گھروں میں رہیں گی اور سوگ کے ساتھ نہیں رہیں گی تا کہ خاوند کے رجوع کرنے کا امکان زیادہ سے زیادہ رہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خالہ نے جب عدت طلاق کے دوران اپنے پھل توڑنے کے لیے نکلنا چاہا اور گھر کے کسی فرد نے نکلنے کی ممانعت کو مطلق سمجھتے ہوئے جب انہیں روکنا چاہا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور انہیں جا کر اپنے پھل توڑنے کی اجازت مرحمت فرما دی، اور اس کی مصلحت یہ بیان فرمائی کہ شاید اس دوران وہ فقیروں مسکینوں پر پھل کا کوئی صدقہ کر دیں یا اغنیاء کے ساتھ انہیں تحفہ وغیرہ دے کر کوئی نیکی کر دیں۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ عدتِ طلاق والی ضرورت کے وقت گھر سے نکل سکتی ہے البتہ وہ رہے گی خاوند کے گھر میں ہی اور زینت وغیرہ کے ساتھ رہے گی تا کہ رجوع کا امکان قوی رہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ معروف تھا کہ عدت کے دوران مطلقہ گھر سے نہیں نکلا کرتی تھیں اس لیے گھر کے ایک مرد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خالہ کو عدت کے دوران نکلنے سے منع کر دیا تھا۔
- بسا اوقات کسی صحابی رضی اللہ عنہ پر بھی حکم الٰہی مخفی رہ جاتا ہے۔ جیسے ان صحابی پر یہ حکم مخفی رہ گیا کہ مطلقہ عدت کے دوران ضرورت پڑنے پر گھر سے نکل سکتی ہے۔
- عورت باغ وغیرہ میں جا کر اپنے درختوں کے پھل خود توڑ سکتی ہے۔ گو اپنے سامنے دوسروں سے بھی اپنے پھل اتروا سکتی ہے۔
- اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب آدمی پھل یا فصل اتار رہا ہو تو صدقہ بھی کرے اور دوست احباب کو ہدیہ بھی دے۔
- معلوم ہوا کہ صدقہ کرنا مستحب ہے نہ کہ واجب۔ اس کی دلیل "فَإِنَّكَ عَسَى أَنْ تَصَدَّقِيْ" کے الفاظ ہیں۔

معتدۂ وفات کے گھر سے نکلنے کا حکم

1109۔ وَعَنْ فُرَيْعَةَ بِنْتِ مَالِكٍ أَنَّ زَوْجَهَا خَرَجَ فِيْ طَلَبِ أَعْبُدٍ لَهُ، فَقَتَلُوْهُ. قَالَتْ: فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَنْ أَرْجِعَ إِلَى أَهْلِي، فَإِنَّ زَوْجِيْ لَمْ يَتْرُكْ لِيْ مَسْكَنًا يَمْلِكُهُ، وَلَا نَفَقَةً، فَقَالَ: ((نَعَمْ)) فَلَمَّا كُنْتُ فِي الْحُجْرَةِ نَادَانِي، فَقَالَ: ((امْكُثِيْ فِيْ بَيْتِكِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ)) قَالَتْ: فَاعْتَدَدْتُ فِيهِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا، قَالَتْ: فَقَضَى بِهِ بَعْدَ ذٰلِكَ عُثْمَانُ.

حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ان کے خاوند اپنے غلاموں کی تلاش میں نکلے (جو بظاہر بھاگ گئے تھے) انہوں نے (پکڑ کر) انہیں (اکیلے کو) قتل کر دیا۔ فریعہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ (کیا) میں اپنے میکے چلی جاؤں کہ میرے شوہر نے (اپنے پیچھے) میرے رہنے کو نہ اپنا کوئی ملکیتی گھر چھوڑا ہے اور نہ کوئی نفقہ (کا سلسلہ ہی) چھوڑا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں!"۔ پس جب میں اپنے حجرہ میں تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (باہر سے) آواز دے کر فرمایا: "اپنے گھر ٹھہری رہو۔ یہاں تک کہ (عدتِ وفات کی)

مدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔ پس میں نے چار ماہ اور دس دن اسی گھر میں گزارے۔ حضرت فریعہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پس اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے (ایک موقع پر انہی سیدہ فریعہ رضی اللہ عنہا کی شہادت پر) اس بات کا فیصلہ جاری فرمایا تھا۔" ❶

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالذُّهْلِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ وَغَيْرُهُمْ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی، امام ذہلی، امام بن حبان اور امام حاکم وغیرہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

معرفة الصحابة:...... حضرت فریعہ رضی اللہ عنہا یہ صحابیات میں سے ہیں۔

غریب الحدیث :...... أَنَّ زَوْجَهَا: بظاہر ان کے خاوند کے غلام بھاگ گئے اور یہ انہیں پکڑنے نکلے تھے اور انہوں نے ان کو اکیلا دیکھ کر گھیر کر مار ڈالا تھا۔

أَنْ أَرْجِعَ إِلَى أَهْلِي: حضرت فریعہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کی اجازت مانگی کہ کیا وہ اپنے خاوند کے گھر کی بجائے اپنے میکے جا کر عدت گزار سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا خاوند اپنا کوئی ذاتی مکان نہ چھوڑ گئے تھے، اور نہ اپنے پیچھے خرچ کا کوئی مستقل بندوبست کر گئے تھے۔

فَقَالَ نَعَمْ: پہلے آپ ﷺ نے انہیں اس بات کی اجازت مرحمت فرما دی۔ پھر بعد میں جب عدت وفات کا حکم آ گیا تو انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا اور اس بات کی اطلاع خ۔ ان کے حجرہ پر جا کر دی اور باہر سے آواز دے کر فرمایا کہ اسی گھر میں عدت ختم ہونے تک ٹھہری رہو۔

الْكِتَابُ أَجَلَهُ: کتاب یہاں مکتوب کے معنی میں ہے اور مکتوب بمعنی مفروض ہے اور یہ عدت ہے، اور "أَجَلَهُ" سے مراد اس عدت کی مدت کی انتہاء ہے۔ یعنی اجل بمعنی مدت ہے۔

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا: یہ عدتِ وفات کا ذکر ہے۔ جبکہ متوفی عنہا یعنی بیوہ حاملہ نہ ہو۔ وگرنہ عدت وضع حمل تک ہے چاہے وہ جب بھی ہو جائے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ آدمی کو چاہیے کہ وہ خود کو خطرات میں اندھا دھند نہ ڈال دیا کرے۔ جیسے اس صحابیہ رضی اللہ عنہا کے خاوند مفرور غلاموں کی تلاش میں اکیلے ہی نکل کھڑے ہوئے اور نتیجہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی صورت میں نکلا۔ کیونکہ وہ غلام غصہ میں اور تنگ آ کر بھاگے تھے اور ان کے جی انتقام سے بھرے تھے۔ ایسی صورت میں ان کا اکیلے ایسے غلاموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہونا ٹھیک نہ تھا۔

---

❶ مسند احمد: 370/6- سنن ابی داؤد: 2300- جامع الترمذی: 1204- السنن الکبری للنسائی: 5726- سنن ابن ماجہ: 2031- صحیح ابن حبان: 4292- ابن عبدالبر کہتے ہیں: یہ حدیث حجاز اور عراق کے علماء کے ہاں معروف ہے۔ دیکھیں التمہید: 31/21- المستدرک للحاکم: 226/2- امام ذہلی کی تصحیح کو امام حاکم نے نقل کیا ہے اور امام بیہقی (435/7) فرماتے ہیں: یہ حدیث مشہور ہے۔

- بیوہ ہو جانے والی عورت کو خاوند کے گھر سے نکلنا جائز نہیں بلکہ وہ عدتِ وفات کے ختم ہونے تک اسی گھر میں رہے گی۔ البتہ اس میں شرط ہے کہ جان کو کسی قسم کے خطرہ کا اندیشہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر کسی کے ظلم و زیادتی کا یا گھر کی حالت کے مخدوش ہونے کی وجہ سے کسی حادثہ کا شکار ہونے کا اندیشہ ہو تو کسی دوسری جگہ منتقل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ عاجز آ جانے پر واجبات ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: 286) ''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔''
- بیوہ کو عدت میں کوئی نفقہ نہ ملے گا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نفقہ کی بابت سکوت فرمایا تھا۔ لہٰذا بیوہ عدت وفات کے دوران کے نفقہ کا انتظام خود کرے گی۔
- نبی کریم ﷺ بھی اجتہاد کر کے کوئی حکم ارشاد فرمادیا کرتے تھے اور ہر وہ حکم جو آپ ﷺ اجتہاد کر کے لگاتے تھے، وہ حکم وحی کے حکم میں نہ ہوتا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اول آپ ﷺ نے اس عورت کو میکے جا کر عدتِ وفات گزارنے کی اجازت عنایت فرمادی۔ لیکن بعد میں آپ ﷺ نے وحی آ جانے پر اسے ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔
- احکام شرعیہ میں عورت کا قول بھی مقبول ہے۔ چنانچہ دورِ عثمانی میں جب کسی موقع پر انہی سیدہ فریعہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ساتھ ہونے والے واقعہ کی شہادت دی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے قول کو لے کر اس بات کا فیصلہ فرمایا کہ بیوہ عدتِ وفات شوہر کے گھر میں گزارے گی۔
- بیوہ خاوند کے گھر میں عدت گزارے گی چاہے وہ کرائے کا ہی ہو۔ اس کی دلیل ''لَمْ يَتْرُكْ لِي مَسْكَنًا يَمْلِكُهُ'' کے الفاظ ہیں۔ البتہ اگر مالک مکان اسے نکلنے پر مجبور کر دے تو وہ جہاں چاہے جا کر عدت گزارے گی۔

مطلقہ بائنہ کی عدت کا حکم

1110۔ وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ : قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّ زَوْجِي طَلَّقَنِي ثَلَاثًا، وَأَخَافُ أَنْ يُقْتَحَمَ عَلَيَّ، قَالَ: فَأَمَرَهَا فَتَحَوَّلَتْ .

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: (میں نے خدمت نبوی ﷺ میں عرض کیا کہ) اے اللہ کے رسول! میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دی ہیں اور مجھے اپنے اوپر حملہ کا ڈر ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے انہیں (کسی اور جگہ عدت گزارنے کا) حکم دیا سو وہ کسی اور جگہ چلی گئیں۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... طَلَّقَنِي ثَلَاثًا: یعنی اس نے مجھے تیسری طلاق بھی دے دی ہے، نہ کہ یہ مطلب ہے کہ اس نے مجھے بیک وقت تین طلاقیں دے دی ہیں۔

أَخَافُ أَنْ يُقْتَحَمَ عَلَيَّ: یعنی مجھے اس بات کا ڈر ہے کوئی گھر میں گھس کر مجھ پر حملہ کر دے گا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر عدت والی عورت کو کسی جگہ یعنی خاوند کے گھر میں جان کو خطرہ ہو تو اس کا وہاں ہی عدت پورا کرنا ضروری نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: 1482.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- سیّدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا مطلقہ ثلاث تھی جو زوجات کے حکم میں نہیں ہوتی۔ اس کا نہ سکنی ہوتا ہے اور نہ نفقہ جب تک کہ وہ حاملہ نہ ہو، لہٰذا اگر تو وہ حاملہ ہو تو اسے وضع حمل تک سکنی اور نفقہ دونوں ملیں گے اور یہ خاوند کے ذمہ ہوگا۔ لیکن چونکہ مذکورہ فاطمہ حاملہ نہ تھیں، اس لیے ان کے لیے نہ سکنی تھا اور نہ نفقہ۔
- افضل یہ ہے کہ مطلقہ ثلاث عدت کو خاوند کے گھر میں رہ کر پورا کرے۔ کیونکہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نبی کریم ﷺ سے کسی اور جگہ چلے جانے کی اجازت مانگنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مطلقہ ثلاث ہونے کے باوجود ابھی تک خاوند کے گھر میں تھیں۔ شر دورِ صحابہ میں بھی پایا جاتا تھا کیونکہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول کہ مجھے اپنے اوپر کسی کے حملہ کر دینے کا اندیشہ ہے محض وہم نہ تھا البتہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ شر بے حد کم تھا۔
- شر کے اسباب سے بچنا آدمی پر واجب ہے۔ اس کی دلیل "فَأَمَرَهَا فَتَحَوَّلَتْ" کے الفاظ ہیں۔
- کسی عذر کی وجہ سے عدت والی جائے عدت کو بدل بھی سکتی ہے، اور جہاں اسے شر سے امن ہو وہاں عدت گزارے گی۔

اُم ولد کی عدت کا بیان

1111۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہ قَالَ: لَا تُلْبِسُوْا عَلَيْنَا سُنَّةَ نَبِيِّنَا: عِدَّةُ أُمِّ الْوَلَدِ إِذَا تُوُفِّيَ عَنْهَا سَيِّدُهَا أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ وَعَشْرٌ.
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَعَلَّهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْاِنْقِطَاعِ.

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم پر ہمارے پیغمبر کی سنت کو مشتبہ نہ کرو، (چنانچہ) جب ام ولد کا آقا وفات پا جائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ [1]
اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام دارقطنی نے اس حدیث میں انقطاع کی علت بیان کی ہے۔

شرح :...... مذکورہ حدیث میں دو علتوں کا بیان ہے: (1) ایک یہ کہ یہ حدیث منقطع ہے، اور "انقطاع" ردِ حدیث کا موجب ہوتا ہے۔ (2) دوسری یہ کہ اس میں مذکورہ سنت پیغمبر کیا ہے؟ راوی نے اس کو بیان نہیں کیا۔ جبکہ قرآنِ کریم اس روایت کے خلاف کو بیان کرتا ہے۔ کیونکہ جس بیوہ کو عدتِ وفات لازم ہوتی ہے وہ آزاد عورت ہے اور بیوی ہے نہ کہ باندی اور ام ولد۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ (البقرة: 234)
"اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس راتیں انتظار میں رکھیں۔"

اور رہی باندی تو اس کی عدت استبراء رحم تک محدود ہے۔ جو ایک حیض سے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔

[1] مسند احمد: 204/4، سنن ابی داود: 2308، سنن ابن ماجہ: 2083، ابن حبان (4300)، حاکم: 228/2 اور دارقطنی: 309/3 نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: قبیصہ کا حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ اور درست یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اور اس میں "سنة" کا لفظ مذکور نہیں۔ امام احمد سے منقول ہے کہ وہ اس حدیث کو منکر جانتے تھے۔ دیکھیں: تفسیر ابن کثیر: 286/1، حاشیہ ابن القیم: 299/6۔

قرآن کی تفسیر ''حدیث'' سے

1112- وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّمَا الْأَقْرَاءُ الْأَطْهَارُ.

أَخْرَجَهُ مَالِكٌ فِيْ قِصَّةٍ، بِسَنَدٍ صَحِيْحٍ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: بے شک "اَقْرَاء" سے مراد یہ "اَطْهار" ہیں۔ [1]

اس حدیث کو امام مالک رحمہ اللہ نے ایک قصہ میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

شرح:......سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مراد اس سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ (البقرة: 228) ''اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔''

قُرُوْءٌ: یہ "الْقُرْءُ" کی جمع ہے۔ اس کا معنی اور مراد میں علماء میں اختلاف ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اضداد کی قبیل میں سے ہے جس کا معنی حیض بھی آتا ہے اور حیض سے پاکی بھی۔

اب بعض علماء نے مذکورہ آیت میں "قرء" سے مراد حیض کو لیا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک "ثلثة قروء" سے مراد "ثلاثُ حیض" ہے۔

جبکہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد طہر ہے اور "ثلثة قروء" سے "ثلاثة اطهار" مراد ہے۔ جیسا کہ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی مذکورہ آیت میں ''قرء'' سے مراد طہر کو لیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ قرء سے مراد حیض ہے نا کہ طہر۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستحاضہ کو یہ ارشاد فرمانا ہے: ((اُتْرُكِي الصَّلٰوةَ قَدْرَ مَا تَحْبِسُكِ اَقْرَاؤُكِ.)) ''جب تک تیرے حیض تمہیں روکے رکھیں اتنی مدت تک تو نماز کو چھوڑے رکھ۔'' کہ اس میں صراحتاً یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ''قرء'' سے مراد حیض ہے نا کہ طہر، اور یہی درست قول ہے۔

باندی کی طلاق اور عدت کا بیان

1113، 1114- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: طَلَاقُ الْأَمَةِ تَطْلِيقَتَانِ، وَعِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ.

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَخْرَجَهُ مَرْفُوْعًا، وَضَعَّفَهُ، وَأَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَخَالَفُوْهُ، فَاتَّفَقُوْا عَلَى ضَعْفِهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''باندی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔'' [2]

اس حدیث کو امام دارقطنی نے مرفوع روایت کر کے اس کو ضعیف کہا ہے جبکہ ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو سیّدہ عائشہ سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دوسرے حضرات نے (اس بارے) ان کی مخالفت کی ہے اور وہ اس حدیث کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں۔ [3]

---

[1] المؤطا لمالك: 576/2. [2] سنن دار قطنی: 38/4- امام دارقطنی فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ یہ خود قاسم بن محمد کا قول ہے۔

[3] سنن ابی داؤد: 2189- امام ابوداؤد فرماتے ہیں: یہ حدیث مجہول ہے۔ جامع الترمذی: 1182- امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ سنن ابن ماجه: 2080- المستدرك للحاكم: 223/2- اس حدیث کی اسناد میں مظاہر بن اسلم ہے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے التاريخ الكبير: 73/8، اور التاریخ الصغیر: 128/2 میں ضعیف کہا ہے۔

روایة الحدیث:...... یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ جیسا کہ متن حدیث سے ظاہر ہے۔

غریب الحدیث:...... طَلَاقُ الْأَمَةِ تَطْلِيقَتَانِ: یعنی باندی کی طلاقیں آزاد عورت کی طرح تین نہیں ہیں۔ لہٰذا باندی کو صرف دو طلاقیں ہی دی جاتی ہیں اور وہ دوسری طلاق کے بعد ہی بائنہ ہو جاتی ہے، اور اب جب تک وہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے اس پر حلال نہیں ہوتی۔

وَعِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ: اسی طرح باندی کی عدت طلاق بھی دو حیض ہے اور آزاد عورت کی طرح تین حیض نہیں۔ اصولی طور پر تو باندی کی طلاق اور حیض دونوں کو آزاد عورت سے آدھا آدھا ہونا چاہیے تھا یعنی طلاق ڈیڑھ طلاق ہوتی اور عدت ڈیڑھ حیض ہوتی۔ لیکن چونکہ طلاق اور حیض میں تجزو تبعض (یعنی جز اور بعض بعض بنانا) نہیں ہوتا اس لیے جبر کسر کے طور پر طلاق اور حیض دونوں کو دو دو کر دیا۔ مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

طلاق میں اعتبار بیوی کا ہے یا کہ خاوند کا؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے مذکورہ اثر سے یہ مستفاد ہوا کہ طلاق کے عدد میں اعتبار عورت کا ہے نہ کہ خاوند کا۔ اگرچہ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، لیکن اس اختلاف کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوگا جب خاوند آزاد ہو اور بیوی کنیز ہو کہ آیا اب خاوند آزاد ہونے کی بنا پر تین طلاقوں کا مالک ہوگا یا بیوی کے کنیز ہونے کی وجہ سے دو طلاقوں کا مالک ہوگا، اور اگر صورت اس کے برعکس ہو جیسے خاوند غلام ہو اور بیوی آزاد ہو، تو کیا وہ غلام ہونے کی وجہ سے دو طلاقوں کا مالک ہوگا یا پھر بیوی کے آزاد عورت ہونے کی وجہ سے اسے تین طلاقیں دے سکنے کا حق دار ہوگا؟

اب جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ طلاق دینے میں اعتبار خاوند کا ہے۔ لہٰذا اگر خاوند آزاد ہوگا تو تین طلاقوں کا مالک ہوگا۔ چاہے بیوی کنیز ہی ہو، اور اگر غلام ہوگا تو دو طلاقوں کا مالک ہوگا چاہے بیوی آزاد ہی ہو۔ جبکہ ظاہریہ اس مسئلہ میں اطلاق کے قائل ہیں کہ خاوند آزاد ہو یا غلام، وہ ہر حال میں تین طلاقیں دینے کا حقدار ہے آگے چاہے بیوی آزاد ہو یا باندی۔

لیکن صحیح قول جمہور علماء کا ہے کیونکہ طلاق میں اعتبار اس کا ہوگا جس کے قبضہ میں طلاق ہوتی ہے اور وہ خاوند ہے۔ جبکہ جو طلاق دینے کا مالک ہی نہیں اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور وہ بیوی ہے، یہی قول راجح ہے۔

باندی کی عدت

مذکورہ حدیث میں جس دوسرے مسئلہ کا ذکر ہے وہ باندی کی عدت ہے کہ وہ کتنی ہے۔ دو حیض یا تین حیض؟ تو آزاد عورت کی عدت طلاق تین حیض ہے، جبکہ باندی کی عدت طلاق دو حیض ہے، اور اگر باندی ان عورتوں میں سے ہو جن کو حیض نہیں آتا جیسے ابھی وہ نابالغہ ہے یا سن ایاس کو پہنچ چکی ہے تو اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہوگی۔ کیونکہ زمانہ کی تجزی اور اس کا تبعض کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا آزاد عورت کی عدت طلاق تین ماہ اور ایسی باندی کی عدت ڈیڑھ ماہ ہوگی۔ اگرچہ ایک قول دو ماہ کا بھی ہے لیکن اصح قول پہلا ہی ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اگرچہ طلاق میں حریت اور رقیت کے اختلاف کا اعتبار ہے لیکن اس باب میں معتبر خاوند ہے نہ کہ بیوی کیونکہ طلاق کا مالک خاوند ہوتا ہے نہ کہ بیوی۔

◈ اور عدتِ طلاق بھی حریت اور رقیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے لیکن اس میں اعتبار بیوی کا ہے نہ کہ خاوند کا۔ لہٰذا آزاد عورت کی عدت تین حیض اور باندی کی عدت دو حیض ہوگی۔

◈ فَاتَّفَقُوا عَلَى ضَعْفِهِ: مراد حدیث عائشہ ہے کہ جس کے ضعیف ہونے پر ائمہ جرح وتعدیل کا اتفاق ہے۔

استبراء اور اس کے احکام

1115۔ وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((لَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ)).

حضرت رویفع بن ثابت نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو آدمی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی کھیتی کو اپنا پانی دے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَحَسَّنَهُ الْبَزَّارُ.

اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے اور بزار اس کو حسن کہتے ہیں۔

غریب الحدیث:..... لَا يَحِلُّ: یہ ''لا تجوز'' کے معنی میں ہے اور جب جواز منتفی ہو گیا تو تحریم ثابت ہو گئی۔

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: ان کلمات کے ذریعے انگیخت اور مہمیز کرنا مراد ہوتا ہے۔ یعنی اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ایک آدمی کو ایسا کوئی کام کرنا زیبا نہیں ہے۔

أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ: حدیث کے ظاہر سے دوسرے پر احسان کرنے کی ممانعت مستفاد ہوتی ہے کیونکہ دوسری کھیتی کو پانی لگا دینا بہرحال نیکی ہے۔ لیکن حدیث کا سیاق بتلاتا ہے کہ یہاں پانی سے مراد نطفہ ہے اور کھیتی سے مراد حمل ہے، اور اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ ''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔''

اور حرث ہی کھیتی کی جگہ کا نام ہے۔ تب پھر مطلب یہ بنا کہ آدمی کسی ایسی عورت کے ساتھ جماع نہ کرے جس کے پیٹ میں کسی دوسرے کا حمل ہو۔ چاہے وہ اس کی اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

اپنی بیوی کا غیر سے حاملہ ہونا

اس کی صورت یہ ہو سکتی کہ فرض کیا کہ کسی کی بیوی سے شبہ سے کوئی وطی کر لے اور وہ اس وطی سے حاملہ بھی ہو جائے تو پیدا ہونے والا وہ بچہ اس وطی کرنے والے کا ہوگا، اور خاوند پر واجب ہوگا کہ بچہ جنم دینے تک وہ اپنی بیوی سے دور رہے۔ البتہ وہ ایسی بیوی کے ساتھ سو سکتا ہے اور اس سے بوس وکنار بھی کر سکتا ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کسی مطلقہ سے اس کی عدت کے بعد نکاح کر لیتا ہے۔ بعد میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورت تو حمل سے ہے۔ جو اس کے پہلے خاوند کا ہے تو اب اس دوسرے خاوند پر واجب ہے کہ وہ اپنی اس بیوی سے

❶ سنن ابی داؤد: 2158۔ جامع الترمذی: 1131۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ صحیح ابن حبان: 4850۔ مسند احمد: 108/4.

فائدہ: اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے حنابلہ نے زنا سے حاملہ کو نکاح سے روکا ہے جبکہ احناف نے اس حدیث سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔ زنا سے حاملہ کے ساتھ جماع کرنا منع ہے۔ شافعیہ نے اس حدیث کا یہ جواب دیا کہ یہ حکم قیدی عورتوں کے بارے میں ہے نہ کہ مطلق عورتوں کے بارے میں ہے۔ شافعیہ کے اس قول پر یوں گرفت کی گئی ہے کہ عدت کا بیان لفظ کے عموم کے ساتھ آیا ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 232/2.

جماع کرنے سے دور رہے۔ اب ان دونوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ خاوند وضع حمل تک اپنی بیوی سے دور رہے گا۔ جبکہ دوسری صورت میں وضع حمل کے بعد نکاح کا اعادہ کرے گا کیونکہ پہلا عقد صحیح نہ تھا۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی کی بیوی غیر کے وطی کرنے سے حاملہ ہو جائے تو جب تک وہ بچہ نہ جنم دے اس کے ساتھ جماع نہ کیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اگر عورت کا حمل غیر سے ہو تو اس کے ساتھ وضع حمل تک وطی کرنا حرام ہے۔ اس کی دلیل مذکورہ حدیث کے الفاظ ہیں۔
- دوسرے کو انگیخت کر کے کلام کرنا یہ بلاغت کے اسلوب میں سے ہے۔
- عقیدہ کے صحیح ہونے کے لیے اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھنا واجب ہے۔
- قرآن وسنت کی نصوص میں ایمان کی ترغیب کثرت کے ساتھ آئی ہے۔
- مذکورہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جماع حمل کو اور زیادہ تقویت دیتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ اگر حمل اپنا ہی ہو تو بیوی سے جماع کر سکتے ہیں۔

گم شدہ کی بیوی کی عدت وغیرہ کے احکام

1116- وَعَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ فِي امْرَأَةِ الْمَفْقُودِ ((تَرَبَّصُ أَرْبَعَ سِنِينَ، ثُمَّ تَعْتَدُّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا.))

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گم شدہ کی بیوی کے بارے میں مروی ہے کہ: وہ چار سال تک (خاوند کے لوٹ آنے کا) انتظار کرے گی پھر وہ (خاوند کو مرا ہوا قرار دے کر) چار ماہ دس دن کی (وفات کی) عدت گزارے گی۔ [1]

أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ.

اس حدیث کو امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......**الْمَفْقُودِ**: اس سے وہ شخص مراد ہے جس کی کوئی خیر خبر نہ ہو کہ آیا وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔ جیسے کسی سفر یا جہاد پر نکلا اور لوٹ کر نہ آیا اور نہ اس کی کوئی خیر خبر ہی آئی۔ اب ایسے آدمی کی بیوی پیچھے کیا کرے؟

تَرَبَّصُ أَرْبَعَ سِنِينَ: تو جناب امیر المؤمنین، خلیفہ راشد ملہم بالصواب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایسی عورت کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ وہ چار سال تک اس کے آنے کا انتظار کرے گی۔ چنانچہ اگر تو وہ اس دوران آ گیا تو ٹھیک، وگرنہ:

تَعْتَدُّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا: وہ عورت عدت میں بیٹھ جائے گی اور چار ماہ دس دن جو عدتِ وفات ہے، وہ گزارے گی۔ گویا کہ اس کے لاپتا خاوند کو اس کے حق میں مردہ قرار دے دیا جائے گا، اور یہ اس کی بیوہ شمار ہوگی اور بیوگی کی عدت گزار کر نئے نکاح کے لیے حلال ہو جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ مفقود الخبر کی بابت یہ مسئلہ منصوص ہے یا اجتہادی؟ تو صحیح قول یہ ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ اس لیے ہر قضیہ کا حکم اسی کے حساب سے ہوگا اور چار سال کی مدت اجتہادی ہوگی نہ کہ منصوص۔ لہٰذا حاکم ہر قضیہ کو دیکھ کر اسی کے حساب سے مدت مقرر کر کے مفقود کے ہلاک ہونے کا حکم لگائے گا۔

---

[1] الموطا: 575/2۔ الام للشافعی: 67/4.

1117۔ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((امْرَأَةُ الْمَفْقُوْدِ امْرَأَتُهُ حَتّٰى يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ)).

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''گم شدہ کی بیوی (اس وقت تک) اس کی بیوی (کے حکم میں) ہے یہاں تک کہ اس کے پاس (اپنے خاوند کے بارے) صاف خبر آ جائے۔''[1] (کہ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے اور کہیں پھنسا ہے)۔

أَخْرَجَهُ الدَّارَ قُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيْفٍ.

اس حدیث کو امام دارقطنی نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

شرح:...... مذکورہ حدیث مفقود الخبر کی بیوی کے بارے میں ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو یہ اس مسئلہ کی بابت نزاع میں فیصل و ناطق ہوتی، وہ یوں کہ جب تک اس لاپتا کی خبر نہیں آ جاتی ہے یہ عورت اسی کی بیوی سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف اور متن کے اعتبار سے شاذ ہے، وہ یوں کہ اگر ہم اس عورت کو لاپتا شخص کی خبر آنے تک اسی کی بیوی قرار دیں تو اس صورت میں اس عورت کو از حد ضرر اور عظیم نقصان ہے۔ جبکہ ایک حدیث میں نقصان اٹھانے اور نقصان پہنچانے دونوں کی ممانعت آئی ہے اور خود رب تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ (البقرة: 231)

''اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو۔''

رب تعالیٰ نے اس آیت میں عورت کو تکلیف دینے کی نفی فرمائی ہے۔

تب پھر مفقود الخبر کے باب میں مذکورہ حدیث حجت نہ ہوگی اور عمل اس اثر پر ہوگا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح ثابت ہے۔

کسی نامحرم عورت کے ساتھ تنہا رات گزارنے کی ممانعت

1118۔ وَعَنْ جَابِرٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَبِيْتَنَّ رَجُلٌ عِنْدَ امْرَأَةٍ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ نَاكِحًا، أَوْ ذَا مَحْرَمٍ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی مرد کسی عورت کے پاس (تنہا) رات نہ گزارے مگر یہ کہ (یا تو) وہ اس کا خاوند ہو یا محرم رشتہ دار ہو۔''[2]

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا يَبِيْتَنَّ: مذکورہ ''لا'' ناہیہ ہے اور یہ فعل مجزوم ہے جو نون تاکید کے متصل ہونے کی وجہ سے ظاہر میں مجزوم نظر نہیں آ رہا اور یہ ترکیب گزشتہ صفحات میں بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

رَجُلٌ: یہ نکرہ ہے جو نفی کے تحت واقع ہونے کی وجہ سے عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔ لہٰذا یہ اپنے پرائے، نیک بد، بوڑھے جوان، قریبی اور دور کے ہر مرد کو شامل ہے۔

اور رجل سے مراد بالغ مرد ہے جو عورتوں کے بھیدوں سے واقف ہو۔ لہٰذا نابالغ بچہ اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔

---

[1] سنن الدارقطنی: 312/3۔ مذکورہ روایت میں (البیان کی بجائے) الخبر کا لفظ ہے (اور مطلب دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے)۔ اور ابو حاتم نے اس حدیث کو ضعیف اور منکر کہا ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 431/1.

[2] صحیح مسلم: 2171.

عِنْدَ امْرَأَةٍ: یہ بھی نکرہ اور نفی کے تحت ہے اور اس کے عموم میں بھی وہی تفصیل ہے، اور یہاں بھی بالغہ عورت مراد ہے۔

إِلَّا أَنْ يَكُونَ نَاكِحًا: مراد خاوند ہے جس نے نکاح کر لیا ہو۔ چاہے اس نے ابھی تک بیوی کے ساتھ دخول نہ بھی کیا ہو اور چاہے ابھی تک متعاقدین میں رخصتی بھی نہ ہوئی ہو۔

ذَا مَحْرَمٍ: یعنی "صاحب حرمة" اور ذومحرم سے مراد ہر وہ شخص ہے جو عورت پر نسب، رضاعت یا مصاہرت کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔ نہ کہ وہ حرمت والا مراد ہے جس کی حرمت وقتی ہو نہ کہ ابدی۔

مناسبتِ حدیث:......امام موصوف مذکورہ حدیث شاید اس مناسبت سے یہاں لے کر آئے ہیں کہ عدت گزارنے والی عورت کو بسا اوقات رات کے وقت کسی کے اپنے پاس موجود ہونے کی احتیاج ہوتی ہے۔ تو خیال رہے کہ وہ رات گزارنے والا یا تو خود خاوند ہو جس نے ابھی طلاق رجعی دی ہے یا پھر عدت وفات کی صورت میں وہ شخص اس معتدہ کا کوئی ذومحرم رشتہ دار ہو۔

مضمونِ حدیث:......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کے پاس ایک گھر میں رات گزارنے والا مرد اس کا غیر محرم یا غیر شوہر نہ ہونا چاہیے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ اجنبی مرد اور عورت کا تنہا کسی جگہ اکٹھا ہونا بے حد خطرناک اور سنگین مسئلہ ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ دونوں کسی جگہ رات گزار رہے ہوں۔ بلاشبہ شریعت نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ عورت کے پاس رات کو خاوند یا محرم رشتہ دار کے علاوہ کوئی اجنبی ہو، اور شریعت اسی بات سے منع فرماتی ہے جس میں بے حد مفاسد اور خطرات ہوں۔

◈ شوہر اور محرم کے علاوہ کسی اجنبی مرد کا کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں اکٹھا ہونا حرام ہے۔

◈ محرم رشتہ دار عورت کے ساتھ ایک گھر میں رات گزار سکتا ہے جیسے بھائی اپنی بہن کے گھر میں رات کو رہ سکتا ہے۔ البتہ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ اس محرم رشتہ دار سے امن ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص فسق و فجور میں مشہور ہو وہ بھی اپنی محرم خاتون کے ساتھ تنہا کسی جگہ رات نہ گزارے۔ معاذ اللہ کہ اب تو محرم عورتوں کے ساتھ بھی زنا کے واقعات بسا اوقات سننے میں آرہے ہیں۔

◈ شریعت اسلامیہ نے اخلاق پر ازحد توجہ دی ہے۔

◈ رات گزارنے کا ذکر بطور مثال کے ہے کیونکہ اس میں طویل خلوت میسر آتی ہے وگرنہ غیر محرم کے ساتھ گھڑی بھر کو بھی اکیلے بیٹھنا منع ہے۔

اجنبیہ کے ساتھ خلوت کی ممانعت

1119- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ)). أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں اکیلا نہ بیٹھے مگر یہ کہ کوئی ذومحرم رشتہ دار (بھی) ساتھ ہو۔'' [1] اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 3006.

غریب الحدیث :......مذکورہ حدیث میں "لَا"، "رجل" اور "امرأة" میں وہی تفصیل ہے جو گزشتہ حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ خلوت سے کیا مراد ہے؟ تو خلوت اس کیفیت اور حالت کو کہتے ہیں جو کسی تیسرے کے آ جانے سے ختم ہو جائے۔لہٰذا جیسے ہی ان دو مرد اور عورت کے ساتھ کوئی تیسرا آ گیا تو یہ خلوت ختم ہو جائے گی۔

البتہ اس تیسرے میں یہ بات شرط ہے کہ اس میں احساس، ادراک، سمجھ اور شر کے دفعیہ کی قوت بھی ہو۔لہٰذا نابالغ بچہ یا معذور آدمی کے ہونے سے خلوت کا حکم ختم نہ ہوگا کیونکہ بچہ احساس سے عاری ہوتا ہے اور معذور یا ضعیف آدمی شر کے سر اٹھانے کی صورت میں اس کے دفعیہ کی قوت سے محروم ہوتا ہے۔

إِلَّا مَعَ ذِی مَحْرَمٍ: ذو محرم کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں شوہر کا ذکر نہیں کیونکہ شوہر خلوت میں بیوی کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے۔
- خلوت کا یہ حکم گاڑی، جہاز وغیرہ سب جگہوں کو شامل ہے لہٰذا کوئی مرد ریل یا جہاز وغیرہ کے اپارٹمنٹ میں بھی اجنبیہ عورت کے ساتھ اکیلا اکٹھا نہ ہو۔

استبراء کے باب میں قیدی عورتوں کے احکام

1120، 1121- وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي سَبَايَا أَوْطَاسٍ: ((لَا تُوطَأُ حَامِلٌ حَتَّى تَضَعَ، وَلَا غَيْرُ ذَاتِ حَمْلٍ حَتَّى تَحِيضَ حَيْضَةً)).

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اوطاس کی قیدی عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "کسی حاملہ (قیدی) عورت کے ساتھ وطی نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ وہ بچہ جنم دے اور نہ کسی غیر حاملہ کے ساتھ (ہی وطی کی جائے) یہاں تک کہ اسے ایک حیض آ جائے [1] (اور اس کے رحم کی براءت معلوم ہو جائے)۔"

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَلَهُ شَاهِدٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما فِي الدَّارَقُطْنِيِّ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور سنن دارقطنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ [2]

غریب الحدیث :......سَبَایَا: یہ سَبِیَّة کی جمع ہے جیسے: "عطایا" کہ یہ "عطیة" کی جمع ہے۔ یہ وہ عورتیں ہیں

---

[1] سنن ابی داؤد: 2157۔ المستدرك للحاکم: 212/2۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے۔ مسند احمد: 28/3۔ ابن قطان نے اس حدیث کو شریک کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے اور بتلایا ہے کہ شریک مدلس بھی تھا اور اس کا حافظہ بھی خراب تھا۔ دیکھیں: نصب الرایة: 252/4۔ اسی طرح ابن حزم نے بھی المحلی: 319/10۔ میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ جبکہ خود امام موصوف نے التلخیص: 171/1۔ میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] سنن الدارقطنی: 257/3۔ طبرانی نے المعجم الاوسط میں اس حدیث کو روایت کیا ہے جیسا کہ مجمع الزوائد: 4/5 میں اس کی تصریح ہے، اور اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔

جو دشمنان اسلام سے قتال کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور محض قید کر لیے جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی ملک میں داخل ہو جائیں، اوراب مسلمانوں کی مملوکہ باندیاں کہلائیں گی۔ یہی حکم کفار اشرار سے جنگ کے دوران قید ہونے والے بچوں کا بھی ہے۔

رہے قتال کرنے والے اور جنگ کرنے والے مرد جو جنگ میں مسلمانوں کے قیدی بن جاتے ہیں تو امام کو ان کی بابت حسب مصلحت چار میں سے ایک بات کا اختیار ہے:

(1) یا تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ (2) یا محض احسان کر کے چھوڑ دیا جائے۔

(3) یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ (4) یا انہیں غلام بنالیا جائے۔

أُوطَاسٍ: یہ ثقیف کی ایک وادی کا نام ہے۔ یہ طائف کے راستے میں ہے۔ یہ فتح مکہ کے بعد کے غزوہ کا قصہ ہے۔ یہ غزوہ بھی 8 سنہ میں ہوا تھا۔ اس کا واقعہ مشہور ہے اور غزوۂ اوطاس کے نام سے جانا جاتا ہے۔

لَا تُوطَأُ حَامِلٌ حَتَّى تَضَعَ: حاملہ کے ساتھ وطی کرنا منع ہے کیونکہ اس کے پیٹ میں دوسرے کا بچہ ہے اور آپ ﷺ نے دوسرے کی کھیتی کو پانی لگانے سے منع فرمایا ہے جس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ لہٰذا حاملہ قیدی عورت کے ساتھ جماع کرنا حرام ہوگا۔ البتہ جب وہ بچہ جنم دے لے تو اس سے وطی کرنا حلال ہو جاتا ہے اور اس میں نفاس سے پاک ہونا شرط ہوگا۔

وَلَا غَيْرُ ذَاتِ حَمْلٍ حَتَّى تَحِيضَ: اور جو قیدی عورت غیر حاملہ ہو جب تک اسے ایک حیض نہ آ جائے اس سے وطی کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ حیض آنے سے اس کے رحم کی براءت معلوم ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا رحم بچے سے خالی ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ وطی حلال ہو جاتی ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث انساب کی عظمت واہمیت کو بیان کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ شریعت نے کافروں تک کے نسب کی کس قدر حفاظت ورعایت کی ہے۔
- معلوم ہوا کہ جو عورت حاملہ ہو، اسے حیض نہیں آتا۔
- صرف ایک حیض کے آنے سے ہی رحم کی براءت معلوم ہو جاتی ہے۔
- حاملہ کو اگر ضرر نہ پہنچے اور حمل میں مزید ثقل پیدا نہ ہو تو اس کے ساتھ جماع کر سکتے ہیں بشرطیکہ حمل اس وطی کرنے والے کا ہی ہو۔
- قیدی عورت سے نکاح کے بغیر بھی وطی کرنا جائز ہے حتیٰ کہ دارالحرب میں بھی اس سے وطی کر سکتے ہیں۔

بچہ بستر والے کا ہوتا ہے

1122، 1125۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((الْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ ، وَلِلْعَاهِرِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”بچہ بستر (والے) کا ہوتا ہے اور

الْحَجَرُ)).
زانی کے لیے پتھر ہے۔‘‘

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ مِنْ حَدِيثِهِ . وَمِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا فِي قِصَّةٍ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ عِنْدَ النَّسَائِيِّ، وَعَنْ عُثْمَانَ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ .

یہ حدیث صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ [1] جبکہ ایک قصہ کے ضمن میں سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ [2] جبکہ سنن النسائی میں یہ حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے، [3] اور سنن ابی داؤد میں یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ [4]

غریب الحدیث:...... لِلْفِرَاشِ: فراش یہ سوتی یا اونی اس چادر کو کہتے ہیں جو انسان نیچے بچھا کر اس پر سوتا ہے۔ اس لیے زمین کو بھی فراش کہتے ہیں۔

جبکہ مذکورہ حدیث میں فراش سے مراد بیوی ہے یا باندی ہے۔ البتہ بیوی عقد کے ذریعے ہی فراش بن جاتی ہے چاہے اس سے جماع نہ بھی کیا ہو۔ جبکہ باندی سے جب تک جماع نہ کیا جائے وہ فراش نہیں بنتی۔ وہ باندی ہی رہتی ہے۔

لِلْعَاهِرِ: عاہر یہ زانی کو کہتے ہیں۔

الْحَجَرُ: یعنی اگر زانی اس بات کا دعویٰ کرے کہ یہ بچہ میرے وطی کرنے سے پیدا ہوا ہے لہٰذا یہ بچہ مجھے دیا جائے تو اس کے منہ میں پتھر ڈالے جائیں گے اور اس کے اس دعویٰ ومطالبہ کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جائے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ حجر سے مراد رجم کے پتھر ہیں۔ یعنی زانی کو رجم کر کے مار دیا جائے گا۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے کیونکہ ہر زانی رجم نہیں کیا جاتا۔ اس لیے صحیح معنی پہلا ہی ہے۔ یعنی زانی کے دعویٰ کو ٹھکرا دیا جائے گا۔

مناسبت حدیث:...... اس حدیث کو عدتوں اور استبراء کے باب کے تحت اس مناسبت سے لایا گیا ہے کہ جب عورت طلاق کے بعد بچہ جنم دیتی ہے چاہے وہ بچہ زنا کا ہی کیوں نہ ہو تو اس کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جب صاحبِ فراش اور دوسرے میں بچے کی بابت نزاع ہو جائے، چاہے وہ نکاح کے ذریعے صاحب فراش ہو یا آقا ہونے کی وجہ سے صاحب فراش ہو تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا۔ جبکہ دوسرے یعنی زانی کو کچھ نہ ملے گا، اور وہ بچہ صاحب فراش کے ملحق کیا جائے گا چاہے وہ خاوند ہے یا آقا۔

◈ جب حکم کونی اور حکم شرعی میں تعارض ہو جائے تو حکم شرعی کو مقدم کیا جائے گا۔ جبکہ حکم کونی کو لغو قرار دے دیا جائے۔ لہٰذا اگر پیدا ہونے والا بچہ شکل وصورت میں زانی کے مشابہ ہی کیوں نہ ہو جو کہ حکم کونی ہے، پھر بھی حکم شرعی کو اس پر مقدم کیا جائے گا۔ لہٰذا بچہ فراش والے کا کہلائے گا۔

◈ اگر عورت کسی کا فراش نہ ہو اور زانی اس کا دعویٰ کر دے تو بچہ زانی کے ملحق کر دیا جائے گا۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں تنازع کی صورت میں زانی کے دعویٰ کے رد کا حکم ہے۔ جبکہ یہاں زانی کے ساتھ کسی صاحب فراش کا نزاع نہیں۔ لہٰذا بچہ اس سے ملا دیا جائے گا۔ کیونکہ یہاں حکم کونی کے کوئی حکم شرعی معارض نہیں۔

---

[1] صحیح البخاری: 6818۔ صحیح مسلم: 1458 . [2] صحیح البخاری: 2053۔ صحیح مسلم: 1457 .
[3] سنن النسائی: 181/6 . [4] سنن ابی داؤد: 2275 .

دوسرے اس صورت میں اس لیے بھی بچے کو زانی سے ملا دیا جائے گا تا کہ بچے کا نسب ضائع نہ ہو۔

- امام موصوف نے چند مزید حوالہ جات ذکر کر کے یہ بتلایا ہے کہ یہ حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے۔
- سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں جس قصہ کا حوالہ ہے وہ سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبد بن زمعہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک بچے کی بابت ہونے والے نزاع کا قصہ ہے جو پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بھائی کے مشابہ ہونے کے باوجود یہ فرماتے ہوئے اسے عبد بن زمعہ کے حوالے کر دیا کہ بچہ تو بستر والے کا ہوتا ہے۔
- حدیث عائشہ سے معلوم ہوا کہ شکل وصورت کی ظاہری مشابہت حکم شرعی کے معارض نہ ہو سکے گی۔
- اور یہ کہ جب شرعی دلیل اور قیافہ شناسی جمع ہو جائیں تو مقدم شرعی دلیل ہوگی نہ کہ قیافہ شناسی۔
- زانی پر عاہر کا لفظ بھی بولا جاتا ہے کیونکہ عہر زنا کو کہتے ہیں۔
- کنایات کا استعمال جائز ہے، اور یہ کہ جب کوئی دلیل معنی مقصود پر دلالت کرتی ہو تو لفظ کا اس معنی میں استعمال حقیقت بن جاتا ہے۔ اس کی دلیل "لِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ یہ بات بدیہی ہے کہ یہاں پتھر ہی مراد نہیں بلکہ اس کے دعویٰ کا رد مقصود ہے۔ تب پھر پتھر کو دعویٰ کے رد کے معنی میں بطور کنایہ کے استعمال کرنا جائز ہوگا۔

5۔ بَابُ الرَّضَاعِ ..... رضاعت کا بیان

رضاع کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

رَضاع، یہ "رَضَعَ يَرْضَعُ رَضْعًا" سے اسم مصدر ہے، اور یہ بچے کے کسی بھی پستان سے دودھ پینے کو کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر بچہ بکری کے تھن کو منہ لگا کر اس سے دودھ پیتا ہے تو اس پر بھی رضاعت کا لغوی اطلاق ہوگا۔ تب پھر اگر عورت ایک برتن میں اپنا دودھ نکال کر بچے کو پلاتی ہے تو اس پر رضاعت کا لغوی اطلاق نہ ہوگا۔

جب کہ اصطلاح شرعی میں یہ بچے کا عورت کا دودھ پینا ہے۔ چاہے وہ عورت اس کی ماں ہو یا کوئی اور ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا اس میں بچے کا عورت کے پستان کو اپنے منہ میں لینا شرط ہے یا نہیں؟ تو جمہور کے نزدیک رضاعت کے اثبات میں پستان کو منہ میں لینا شرط نہیں لہٰذا یہ برتن میں نکالے دودھ کو پینے سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ جبکہ ظاہریہ اس کو رضاعت نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک یہ شرب یعنی پینا ہے یا پھر لغوی رضاعت تو ہے لیکن شرعی رضاعت نہیں۔ اس کی مزید تفصیل آگے آ جائے گی۔

رضاعت کے احکام

رضاعت حرمت کو ثابت کرتی ہے۔

اور نسب کے ذریعے ثابت ہونے والے وہ چار احکام جو رضاعت سے بھی ثابت ہوتے ہیں، یہ ہیں:

(1) حرمت نکاح (2) دیکھنے کی اور خلوت کی اباحت

(3) محرمیت (4) اور ساتھ سفر کی اباحت

یہ سب احکام محرمیت کی فرع ہیں۔ البتہ رضاعت سے نسب کے باقی احکام ثابت نہیں ہوتے اور صرف یہی چار احکام ہی

ثابت ہوتے ہیں۔

رہا نفقہ، تحمل دیت اور وراثت تو وہ رضاعت سے ثابت نہیں ہوتے۔ لہٰذا مثلاً رضاعی ماں کا نفقہ واجب نہ ہوگا، اس طرح آدمی کسی رضاعی رشتہ میں وارث نہ بنے گا، اور کسی رضاعی رشتہ کے قتل میں بطور عاقلہ کے دیت کی ادائیگی کا مکلّف نہ بنایا جائے گا۔ وغیرہ۔

رضاعت کے احکام کے اثبات کی چند شروط ہیں جنہیں قرآن وسنت نے بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا ذکر مطلق آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ (النساء: 23)

''اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں۔''

کہ یہاں رضاعت کا اثبات مطلق ہے۔ البتہ سنت نے اس کے اثبات کی چند شرطیں ذکر کی ہیں۔ ذیل کی احادیث میں انہی شروط کا بیان آ رہا ہے۔

رضاعت کیسے ثابت ہوتی ہے

1126۔ عَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَلَا الْمَصَّتَانِ)). أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(بچے کا کسی عورت کے پستان کو) ایک یا دو بار کا چوسنا یہ حرمت کو ثابت نہیں کرتا۔'' [1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **لَا تُحَرِّمُ**: مذکورہ ''لا'' نافیہ ہے۔ لہٰذا مابعد مذکور فعل ''فعل مضارع منفی'' ہے۔

اَلْمَصَّةُ: یہ معروف ہے۔ یہ بچے کا دودھ پینے کے لیے عورت کے پستان کو منہ میں لینا ہے۔ یعنی ایک دفعہ کا چوسنا، چسکی لگانا اور گھونٹ پینا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر بچہ کسی عورت کے پستان کو منہ میں لے کر ایک یا دو بار چسکی لگاتا ہے تو یہ لغوی رضاعت تو کہلائے گا البتہ شرعاً اس کا کوئی اثر نہ ہوگا اور اس سے وہ شرعی رضاعت جو حرمت محرمیت کو ثابت کرتی ہے، ثابت نہ ہوگی۔

البتہ حدیث کا مفہوم بتلاتا ہے کہ اگر بچہ اس سے زیادہ چسکیاں لگاتا ہے تو ان کا شرعی اثر ہوگا اور شرعی محرمیت ثابت ہو جائے گی۔ [2] علماء نے اسی قول کو لے کر یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایک یا دو دفعہ کا پستان چوسنا رضاعت کے اثبات میں مؤثر نہیں، ہاں تین دفعہ یا اس سے زیادہ ہو تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

غرض اس حدیث میں رضاعت کی ایک شرط کا بیان ہے اور وہ یہ کہ چسکیاں دو سے زیادہ ہوں۔

---

[1] صحیح مسلم: 1450.

[2] ان علماء میں امام مالک، داؤد ظاہری اور بعض شافعیہ کا نام آتا ہے۔ دیکھیں: المدخل لابن بدران، ص: 277۔ المحرر فی الفقہ: 112/2.

معتبر رضاعت اس وقت کی ہے جب بچہ پلتا ہی صرف دودھ پر ہو

1127۔ وَعَنْهَا رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((اُنْظُرْنَ مَنْ إِخْوَانُكُنَّ، فَإِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ذرا دیکھ لینا (یعنی اس امر میں خوب غور کر لینا) کہ تمہارے (رضاعی) بھائی کون ہیں۔ بے شک (معتبر) رضاعت تو وہ ہے جو بھوک سے (بے نیاز کر دینے والی) ہو۔'' ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :...... **اُنْظُرْنَ**: یہ فعل امر ہے اور یہ خطاب اگرچہ سب عورتوں کو ہے لیکن جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا تو یہ خطاب سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف تھا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ جب سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو اس وقت سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یہ میرا رضاعی بھائی ہے۔ جس پر آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ذرا دیکھ لیا کرو کہ یہ تمہارے رضاعی بھائی کون ہیں۔

مَنْ إِخْوَانُكُنَّ: مذکورہ مَنْ استفہامیہ ہے۔ یعنی یہ دیکھ لیا کرو کہ کون تمہارا بھائی ہے یا نہیں ہے؟

پھر فرمایا: **فَإِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ**: یعنی وہ رضاعت جو محرمیت کے اثبات میں موثر ہے وہ رضاعت ہے جو بچے کو بھوک سے بے نیاز کر دے۔ تب پھر مراد وہ بچہ ہوگا جس کی غذا ہی دودھ ہو اور وہ دودھ پر پلے۔ کیونکہ بھوک سے بے نیاز وہی شے کرتی ہے جس پر بچہ پل رہا ہو۔

لہٰذا رضاعت وہ معتبر ہوگی جب بچہ دودھ پر پلتا ہو۔ یعنی معتبر رضاعت اس عمر کی ہے جب بچے کی غذا صرف دودھ ہی ہو۔ لہٰذا جس عمر میں بچہ دودھ بھی پیتا ہو اور دوسری خوراک بھی لیتا ہو، اس عمر کی رضاعت یعنی اس عمر میں کسی بچے کو اپنا دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اس عمر میں صرف دودھ ہی بچے کی بھوک مٹانے کا واحد ذریعہ نہیں ہوتا۔

تب پھر مذکورہ حدیث میں شرعی رضاعت کی دو اور شرطوں کو بیان کیا گیا ہے، جو یہ ہیں:

(1) ایک یہ کہ بچہ بار بار دودھ پیے۔

(2) دوسری یہ کہ بچہ ایسی عمر میں دودھ پیے جب اس کی غذا صرف دودھ ہو۔ لہٰذا جب بچے کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے یا اس عمر میں دوسری چیزیں بھی شروع کرا دی جاتی ہیں تو اس عمر میں دودھ پلانے کا شرعی رضاعت کے اثبات میں کوئی اثر نہ ہوگا، اور یہی راجح قول اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا مختار قول ہے کہ معتبر رضاعت وہ ہے جو دودھ چھڑانے کے زمانہ سے قبل کی ہو۔

اور رہے وہ علماء جنہوں نے عمر کا اعتبار کیا ہے اور ان کا قول ہے کہ دو سال کی عمر تک کی رضاعت شرعاً معتبر ہے، اور وہ دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (البقرة: 233)

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے۔''

---

❶ صحيح البخاري: 2647۔ صحيح مسلم: 1455.

اس آیت میں رب تعالیٰ نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ رضاعت دو سال کے عرصہ میں تمام ہوگی۔ دوسرے دو سال کی مدت کا احاطہ ممکن ہے کیونکہ یہ معلوم ہے جبکہ دودھ چھڑانا ایک ایسا امر ہے جس میں لوگوں کی عقلیں مختلف ہیں لہٰذا کسی ایک بچے میں متعین طور پر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اب اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ آ گیا ہے یا نہیں۔ اس لیے فطام یعنی دودھ چھڑانے کو معیار بنانے کی بجائے دو سال کے عرصہ کو معیار بنانا زیادہ سہل ہے کیونکہ اس کا ضبط ممکن ہے۔

لیکن اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ عرف میں فطام معروف ہے۔

پھر بعض علماء اس طرف بھی گئے ہیں کہ اعتبار اکثر مدت کا ہے۔ لہٰذا اگر فطام دو سال سے کم میں ہو جائے تو اعتبار دو سال کا ہوگا اور اگر فطام دو سال کے بعد ہو تو اعتبار فطام کا ہوگا۔ یہ قول گویا کہ دونوں دلائل میں جمع کی ایک صورت پیدا کر رہا ہے۔

اب ذیل میں سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دونوں احادیث کے فوائد درج کیے جاتے ہیں:

⊙ ...... رضاعت کی احکام شرعیہ میں تاثیر ہے۔ چنانچہ دو سے زیادہ چسکیاں لگانے سے حرمت محرمیت ثابت ہو جاتی ہے۔

⊙ ...... تین سے کم چسکیاں لگانے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

⊙ ...... مَصہ یعنی چوسنے سے مراد دودھ پلانا ہے۔ لہٰذا برتن میں نکالا دودھ بھی حرمت رضاعت کو ثابت کر دیتا ہے۔

⊙ ...... خلوت وغیرہ کے مسائل میں احتیاط افضل ہے۔ اس کی دلیل "اُنْظُرْنَ مَنْ إِخْوَانُكُنَّ" کے الفاظ ہیں۔

⊙ ...... نبی کریم ﷺ گھر کی عفت و عصمت کی حمایت کے بے حد حریص تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھائی کو بھی گھر میں دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا: "اُنْظُرْنَ مَنْ إِخْوَانُكُنَّ" بلاشبہ نبی کریم ﷺ کا یہ اسوہ ہمارے لیے رہنما ہے۔

⊙ ...... رضاعت سے اخوت، ابوت اور امومت جیسے القاب ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ (النساء: 23)

''تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں۔''

⊙ ...... معلوم ہوا کہ سنت یہ کتاب اللہ کی تخصیص کر سکتی ہے۔ وہ یوں کہ قرآن میں رضاعت کا بیان مطلق ہے۔ لیکن سنت نے اس میں دو تخصیصات پیدا کی ہیں:

(1) زمانہ کی تحدید (2) دوسرے عدد کی تخصیص

⊙ ...... ان احادیث میں اس قول کا رد ہے کہ بالغ کو دودھ پلانے سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔

⊙ ...... زمانہ رضاعت میں اعتبار فطام کا ہے نہ کہ عمر کا۔

بالغ کو دودھ پلانے کا حکم

1128- وَعَنْهَا رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ سَهْلَةُ بِنْتُ سُهَيْلٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ سَالِمًا مَوْلَى أَبِيْ حُذَيْفَةَ مَعَنَا، فِيْ بَيْتِنَا، وَقَدْ بَلَغَ مَا يَبْلُغُ الرِّجَالُ، فَقَالَ: ((أَرْضِعِيْهِ تَحْرُمِيْ

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: سہلہ بنت سہیل نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! ابوحذیفہ کا آزاد کردہ غلام سالم ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہتا ہے اور اب وہ بلوغت کی اس عمر

عَلَيْهِ)). کو پہنچ گیا ہے جس کو مرد لوگ پہنچ جایا کرتے ہیں۔اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اسے اپنا دودھ (نکال کر) پلا دو تو تم اس پر حرام ہو جاؤ گی۔'' ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

معرفة الصحابة و قصة حديث :......حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا یہ حضرت ابوحذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں اور سالم حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے ایک آزاد کردہ غلام تھے جن کو انہوں نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا، اور وہ گھر میں رہتا سہتا تھا اور گھر کے کام کاج کر دیا کرتا تھا۔اسی دوران وہ بالغ ہو گیا جس سے حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا بے حد پریشان ہو گئیں کہ اب ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اس سے پردہ کیونکر کیا جائے۔دوسرے وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اس عمر میں ان کو دودھ پلا کر ان سے رضاعت کا رشتہ بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔اسی بات کی جا کر انہوں نے خدمت نبوی ﷺ میں شکایت کی کہ اب سالم بالغ ہو گیا ہے۔سو میں کیا کروں؟ جس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ ارشاد فرمایا:

أَرْضِعِيهِ تَحْرُمِي عَلَيْهِ: یعنی اسے اپنا دودھ پلانے سے اس کا اور تمہارا نکاح حرام ہو جائے گا۔یوں تم اس کے محارم میں سے ہو جاؤ گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث بتلاتی ہے کہ رضاعت محرمیت کو ثابت کرتی ہے چاہے یہ دودھ پلانا بالغ کو ہی کیوں نہ ہو۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔

اب ظاہریہ نے اس قول کو لیا ہے۔ان کے نزدیک رضاعت عدد اور زمانہ کے بغیر علی الاطلاق حرمت کو ثابت کرتی ہے۔ ان کا استدلال آیت کریمہ ﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّتِيْ أَرْضَعْنَكُمْ﴾(النساء: 23) سے اور مذکورہ حدیث سے ہے۔

اسی طرح سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب کسی کو اپنا محرم بنانا چاہتی تھیں تو سیّدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے کہتی کہ وہ اسے دودھ پلا دیں تاکہ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس کی خالہ بن جائیں۔یوں سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اس شخص سے پردہ کرنا لازم نہ رہتا۔ ❷

لیکن جمہور علماء جن میں سوائے سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جملہ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن بھی شامل ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص تھا۔

پھر بعض کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہے۔لیکن یہ دونوں دعوے دلیل کے محتاج ہیں۔چنانچہ احکام شرعیہ میں اصل یہ ہے کہ وہ سب کے حق میں ایک ہوں۔لہٰذا خصوصیت کا دعویٰ بنا دلیل کے غیر مقبول ہوگا کہ جب خصوصیت کا دعویٰ بنا دلیل کے خود حضرت رسالت مآب ﷺ کے حق میں مقبول نہیں تو دوسرے کس شمار قطار میں ہیں۔

اور رہا نسخ کا دعویٰ تو یہ بھی دلیل کا محتاج ہے۔چنانچہ یہاں ناسخ کا یقینی طور پر مؤخر ہونا معلوم ہونا لازمی ہے۔چنانچہ اس قول کا قائل کون ہے کہ ارشاد نبوی: "إِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ" یہ اس مذکورہ حدیث سے مؤخر ہے، لہٰذا مذکورہ حدیث

---

❶ صحيح مسلم: 1453.

❷ دیکھیں: المؤطا: 603/2۔ کتاب الام: 224/7۔ التمهيد: 268/8۔ المحلّى: 10/10.

کو منسوخ مان لیا جائے؟!

البتہ بعض علماء اس حدیث کی بابت تخصیص کی طرف گئے ہیں اور انہوں نے اس کی نہایت دقیق ولطیف وجہ بیان کی ہے، وہ یہ کہ جس شخص کا حال ان جیسا ہو تو اس شخص کا حکم اُس شخص کے لیے بھی ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ احکام شرعیہ میں کسی خاص کے لیے کوئی تخصیص ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں کوئی سبب ہو تو تخصیص ثابت ہو جاتی ہے۔

ان علماء کا یہ کہنا ہے کہ ضرورت وحاجت یہ بالغ کو بھی دودھ پلانے کو مباح کر دیتی ہے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ بھی ایک موقع پر اسی قول کی طرف گئے ہیں۔ ❶ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ جب کسی عورت کو ایک مرد کے ہر وقت اپنے پاس آنے جانے کی حاجت ہو تو وہ اسے اپنا دودھ پلا کر اپنا محرم بنا سکتی ہے۔ چنانچہ جس کا حال ہر اعتبار سے سالم کے حال جیسا ہو، اس کے حق میں یہ حکم ثابت ہو جاتا ہے وگرنہ نہیں، اور یہی قول صحیح ہے۔

◈ لیکن یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ امر مقرر تھا کہ بالغ کو دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، اسی لیے تو سیدہ سہلہ رضی اللہ عنہا مسئلہ دریافت کرنے حاضر خدمت ہوئی تھیں۔

◈ عورت مردوں سے بات کر سکتی ہے چاہے وہ غیر محرم ہی ہوں۔ جیسا کہ حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی۔ البتہ یہ جواز فتنہ سے اطمینان ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔ لہٰذا جہاں فتنہ کا اندیشہ ہو تو عورت کا غیر محرم مردوں سے بات کرنا منع ہوگا۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کیا مرد اور کیا عورتیں سب ہی علم کے حصول کے بے حد حریص تھے۔

◈ عورت کی آواز ستر نہیں۔

◈ بالغ کی رضاعت حکم کے اثبات میں موثر ہے یا نہیں، اس بارے علماء کے تین اقوال ہیں:

(1) بالغ کی رضاعت غیر معتبر اور غیر مؤثر ہے۔ (2) یہ رضاعت بھی معتبر ہے۔

(3) ضرورت کے وقت معتبر ہے۔

پہلے قول کے قائلین کا استدلال گزشتہ مذکورہ حدیث "إِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ" سے ہے۔ دوسرے قول کے قائلین کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت: ﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ﴾ ہے جو مطلق ہے۔ دوسرے ان حضرات کا استدلال مذکورہ حدیث سے بھی ہے جس کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

جبکہ تیسرے قول کے قائلین کی دلیل بھی یہی حدیث ہے کہ یہ ضرورت پر محمول ہے۔ جس کی تفصیل مذکور ہو چکی۔ یاد رہے کہ صحیح اور راجح قول پہلا ہی ہے کہ بالغ کی رضاعت غیر معتبر اور غیر مؤثر ہے۔

رہی سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کہ یہ مطلق ہے لہٰذا یہ بالغ کی رضاعت کو بھی شامل ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات مطلق مذکور ہیں جن کو سنت مقید کرتی ہے۔ ایسے ہی مطلق آیت کو "إِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ" جیسی احادیث مقید کرتی ہیں کہ یہاں وہ رضاعت مراد ہے جس میں بچہ پلتا ہی دودھ پر ہو۔ نہ کہ بالغ کی رضاعت مراد ہے۔

رہی حدیث سالم تو اس کی تفصیلی بحث مذکور ہو چکی۔ لہٰذا یہ حدیث بھی بالغ کی رضاعت کے معتبر ہونے کی دلیل نہیں بن

---

❶ الفتاویٰ: 60/34.

سکتی۔لہٰذا یہ حدیث صرف سالم رضی اللہ عنہ کے حق میں خاص تھی کسی دوسرے کو اس حدیث اور اس کے حکم کے ملحق نہ کیا جائے گا۔

اور رہی ضرورت کے وقت بالغ کی رضاعت کے معتبر ہونے کے قائلین کی دلیل تو وہ یہ ہے کہ قضیہ سالم ضرورت کے وقت کا قضیہ کا ہے۔اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کو یہ حکم دیا تھا کہ تم سالم کو دودھ پلا دو، جبکہ ان کے علاوہ کسی اور کو یہ حکم نہ دیا۔ کیونکہ کسی دوسرے کو ویسی حاجت پیش نہ آئی تھی جیسی حاجت سیّدہ سہلہ رضی اللہ عنہا کو پیش آئی تھی۔ کیونکہ سالم ان کے خاوند کے منہ بولے بیٹے تھے اور وہ گویا کہ ان کے حق میں اولاد کی طرح تھے،اور سالم سے پردہ کرنا ان کے حق میں بے حد مشقت کا سبب تھا۔اسی لیے سالم کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس بات کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا مختار مذہب یہی ہے اور یہی قول سب دلائل کو جمع بھی کر دیتا ہے۔

- کسی شے کو اس کے لازم کے ذکر سے بھی کنایہ کے طور پر بیان کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ سیّدہ سہلہ رضی اللہ عنہا نے یہ عرض کیا کہ: سالم اس عمر کو پہنچ گئے ہیں جس کو بالغ لوگ پہنچ جاتے ہیں، اور یہ نہ کہا کہ سالم اب اس عمر کو پہنچ گئے ہیں کہ وہ عورت کو شہوت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔لیکن سیّدہ سہلہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات نہایت عمدہ کنایہ سے کہی۔
- فتویٰ لینے والے کو چاہیے کہ وہ صورت مسئلہ کو پوری طرح بیان کرے تا کہ فتویٰ صحیح دیا جا سکے۔
- اگرچہ اس حدیث میں رضاعت کے معتبر ہونے کے لیے عدد کی شرط مذکور نہیں۔بس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق یہ فرما دیا کہ "اَرْضِعِیْهِ" تم اس کو دودھ پلا دو،لیکن یاد رہے کہ سنت ایک دوسرے کی قید کو بیان کرتی ہے۔لہٰذا اگر یہ حدیث عدد کے حق میں مطلق ہے تو دوسری حدیث عدد کی قید کو بیان کرتی ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا۔
- جو آدمی رضاعت کی وجہ سے کسی عورت پر حرام ہو جاتا ہے، وہ اس عورت کو دیکھ سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اباحت نظر اور تحریم نکاح ایک دوسرے کو لازم ہیں۔لہٰذا جس کو دیکھنا مباح ہے اس سے نکاح حرام ہے۔

البتہ یہ مسئلہ نکاح کی وجہ سے اباحت نظر پر مقدم ہے۔

رضاعی چچا کا حکم

1129- وَعَنْهَا: أَنَّ أَفْلَحَ أَخَا أَبِي الْقُعَيْسِ- جَاءَ يَسْتَأْذِنُ عَلَيْهَا بَعْدَ الْحِجَابِ ، قَالَتْ: فَأَبَيْتُ أَنْ آذَنَ لَهُ ، فَلَمَّا جَاءَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَخْبَرْتُهُ بِالَّذِيْ صَنَعْتُ ، فَأَمَرَنِيْ أَنْ آذَنَ لَهُ عَلَيَّ ، وَقَالَ: ((إِنَّهُ عَمُّكِ)) .

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ابوالقعیس کے بھائی افلح نے حکم حجاب کے نازل ہونے کے بعد سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس (حجرہ کے اندر) جانے کی اجازت مانگی۔ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے ان کو (اندر آنے کی) اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے جو کیا تھا وہ خدمت نبوی میں گوش گزار کر دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس بات کا حکم ارشاد فرمایا کہ میں ان کو اپنے پاس آنے دیا کروں اور (اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے) فرمایا کہ: بے شک وہ تیرے (رضاعی) چچا ہیں۔ [1]

---

[1] صحيح البخاري: 2644- صحيح مسلم: 1445.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......أَخَا أَبِي الْقُعَيْسِ :لفظ "اخَا" یہ اَنَّ حرف مشبہ بالفعل کا اسم ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ "افلح" سے بدل "الكل من الكل" ہے لہٰذا جو اعراب افلح کے ہوں گے وہی اعراب أَخَا أَبِي الْقُعَيْسِ کے بھی ہوں گے۔

یہ مذکورہ افلح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی تھے، تب پھر یہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا ٹھہرے۔

بَعْدَ الْحِجَابِ : اول اسلام میں یا اول ہجرت میں پردہ کا حکم ابھی تک نازل نہ ہوا تھا۔ اس لیے عورتیں اجنبیوں کے سامنے چہرہ اور ہاتھ پیر بھی کھول لیتی تھیں۔ لیکن جب آیت حجاب نے نازل ہو کر عورتوں پر پردہ فرض کر دیا تو عورتوں نے چہرہ کھول کر اجنبیوں کے سامنے آنا ترک کر دیا۔

اس بنا پر وہ جملہ احادیث جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے چہرہ اور ہاتھوں پیروں کے اجنبیوں کے سامنے کھولنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں، ان سب احادیث کو نزول حجاب سے قبل پر محمول کیا جائے گا۔ اس بات پر سب علماء کا اتفاق ہے۔

چونکہ افلح نزولِ حجاب سے قبل سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے جاتے تھے تو نزولِ حجاب کے بعد سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے انہیں غیر محرم سمجھتے ہوئے گزشتہ دستور کے مطابق اندر آنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے تشریف لا کر جب معاملہ سنا تو حکم دیا کہ انہیں آنے جانے دیا کرو۔ کیونکہ وہ تو رشتہ میں تمہارے رضاعی چچا ہیں۔ اس لیے وہ تمہارے محرم کے حکم میں ہیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ رضاعی چچا محرم کے حکم میں ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ گھر کسی کا بھی ہو، اجازت لیے بغیر اندر داخل ہونا جائز نہیں اور کسی گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت لینا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝﴾ (النور: 27)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو، یہاں تک کہ انس معلوم کر لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام کہو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

◈ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حق بات میں بے حد حزم و احتیاط اور قوت کی مالک تھیں اور حق بات میں کسی کی پروا نہ کرتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے رضاعی چچا کو اندر داخل ہونے سے روکنے میں ذرا دریغ سے کام نہ لیا۔

◈ نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواج رضی اللہ عنہن کے ساتھ از حد حسن سلوک کہ آپ ﷺ انہیں ہو جانے والی باتوں پر نہایت شفقت سے سمجھاتے تھے۔

◈ سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دین کی سمجھ حاصل کرنے کی بے حد حریص تھیں، اسی لیے انہوں نے جنابِ رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھا۔

◈ یہ بات نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم میں سے تھی کہ آپ ﷺ ہمیشہ حکم کو علت کے ساتھ ملا کر بیان فرماتے تھے۔

◈ رضاعت سے محرمیت ثابت ہوتی ہے۔

کتنی دفعہ دودھ پینے سے تحریم ثابت ہوتی ہے

1130۔ وَعَنْهَا ﷺ قَالَتْ: ((كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ: عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ، ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهِيَ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: قرآن میں نازل ہونے والی آیات میں سے ایک آیت یہ بھی تھی: ﴿عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ﴾ "دس دفعہ کا معلوم دودھ پلانا تحریم کو ثابت کرتا ہے" پھر یہ حکم منسوخ کر کے پانچ دفعہ کا دودھ پلانا کر دیا گیا۔ پس نبی کریم ﷺ نے اس حال میں وفات پائی کہ یہ آیت تلاوت کیے جانے والے قران میں سے تھی۔ ❶

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ: یہ اتارنے والی ذات رب تعالیٰ کی تھی۔ رب تعالیٰ کی ذات کے معروف ہونے کی وجہ سے اس کو حذف کر کے فعل کو مجہول لایا گیا ہے۔

عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ: "معلوم" سے حسی اور حکمی دونوں اعتبار سے معلوم ہونا مراد ہے۔ حسی اعتبار سے معلوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس بچے کو دس دفعہ دودھ پلا دیا گیا ہے۔

اور حکماً معلوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم شریعت نے بیان کیا ہے اور یہ حکم سنت میں آیا ہے۔

ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ: نسخ سے مراد اس کے حکم کا رفع ہے۔ بلکہ یہ آیت لفظوں سے بھی اٹھالی گئی۔ کیونکہ ہمیں پورے قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی۔ لہٰذا یہ آیت لفظ اور حکم دونوں اعتبار سے منسوخ ہے۔

تُوُفِّيَ: یعنی آپ ﷺ کی جان کو قبض کر لیا گیا۔ یہاں بھی فاعل حذف ہے۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ ہر ذی روح کی جان کو رب تعالیٰ ہی قبض فرماتے ہیں۔

وَهِيَ: "هی" ضمیر کا مرجع "خمس" ہے۔

فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ: یعنی لوگ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی اس کی قراءت کیا کرتے تھے، اور یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ لفظ "رسول اللہ ﷺ" سے حال ہے۔

درایۃ الحدیث:...... اس حدیث کے روایت کرنے میں امام مسلم منفرد ہیں۔ بلاشبہ اس حدیث کے متن میں ایک طرح کی غرابت و نکارت ہے۔ اسی لیے متعدد متاخرین محدثین نے اس حدیث پر طعن کیا ہے، اور انہوں نے اس حدیث کو غیر صحیح کہا ہے۔ وہ یوں کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ ایک آیت میں وفاتِ نبوی کے بعد بھی نسخ جاری ہوا ہو، جبکہ پورے قرآن میں از اول تا آخر یہ پانچ رضعات والی آیت نظر نہیں آتی۔ تب پھر یہ حدیث منکر ہے۔ کیونکہ یہ حدیث ضروریاتِ دین کے مخالف ہے۔ کیونکہ قرآن کو محفوظ اعتقاد کرنا ضروریات دین میں سے ہے۔

لیکن بعض علماء نے اس حدیث کے دفاع میں یہ کہا ہے کہ نسخ متاخر تھا نہ کہ بعد میں۔ البتہ بے شمار لوگوں کو اس آیت کے

---

❶ صحيح مسلم: 1452.

منسوخ ہوجانے کا علم نہ تھا۔اس لیے وہ اس آیت کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔لیکن بعد میں ان لوگوں کو بھی اس آیت کے منسوخ ہونے کا علم ہوگیا۔یہی وجہ ہے کہ جب بعد میں دورِ صدیقی اور دورِ عثمانی میں مصاحف تیار کیے گئے تو اس آیت کو ختم کردیا گیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قرآن کریم کا نزول رب تعالیٰ سے ہے۔
- قرآن رب تعالیٰ کا کلام ہے،اور یہ کہ یہ قرآن رب تعالیٰ کے پاس سے نازل ہوا ہے۔
- شریعت میں نسخ ثابت ہے،اور علماء کا حقیقت اور معنی دونوں اعتبار سے نسخ کے ثبوت پر اجماع ہے۔
- نسخ کبھی لفظ اور حکم دونوں کا ہوتا ہے اور کبھی صرف حکم کا نسخ ہوتا ہے البتہ لفظ باقی ہوتے ہیں۔مذکورہ حدیث میں ذکر کردہ آیت ان آیات میں سے ہے جو لفظ اور حکم دونوں اعتبار سے منسوخ تھیں۔لہٰذا قرآن کے لفظوں کا نسخ بھی ثابت ہوا۔
- رضاعت میں اعتبار عورت کا ہے چاہے وہ بوڑھی ہو یا جوان۔لہٰذا عورت کے دودھ پلانے سے محرمیت ثابت ہوجائے گی۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی بچے کو بکری کا دودھ پلا کر پالے تو وہ اس کی ماں نہ کہلائے گی اور نہ اس کو شرعی رضاعت ہی کہیں گے۔
- رضاعت میں عدد شرط ہے۔
- بسا اوقات نسخ کئی لوگوں پر مخفی بھی رہ جاتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ قرآن بھی قرآن کا ناسخ ہوتا ہے۔

رضاعت سے بھی وہی رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں

1131۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُرِيدَ عَلَى ابْنَةِ حَمْزَةَ ، فَقَالَ : ((إِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِي ، إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ ، وَيَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ سے بنت حمزہ کی بابت (ان کو نکاح میں لے لینے کا) پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''وہ تو میرے لیے حلال ہی نہیں۔کیونکہ وہ تو میرے رضاعی بھائی کی بیٹی (یعنی میری رضاعی بھتیجی) ہے اور رضاعت سے بھی وہی رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......أُرِيدَ: یعنی آپ ﷺ سے اس بات کو طلب کیا گیا کہ آپ ﷺ اپنی چچازاد جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں،سے نکاح فرمالیں۔جس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِي: یعنی ان سے نکاح کرنا میرے لیے حلال نہیں۔

إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ: یہ تحریم نکاح کی علت کا بیان ہے۔یعنی وہ میری رضاعی بھتیجی ہے۔کیونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔تب پھر ان کی بیٹی گو نسب کے اعتبار سے آپ ﷺ کی چچازاد تھیں۔لیکن رضاعت کے اعتبار سے رضاعی بھتیجی تھیں۔تو جیسے نسبی بھتیجی سے نکاح حرام ہوتا ہے،اسی طرح رضاعی بھتیجی سے بھی نکاح حرام ہوتا ہے۔

[1] صحیح البخاری: 2645۔ صحیح مسلم: 1447.

وَيَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ: یہ گزشتہ مسئلہ اوراس کی علت کے لیے ایک قاعدہ کلیہ کا بیان ہے، اوراس کی تفصیل ابھی اوپر ذکر کی گئی ہے۔اب نسب کے اعتبار سے کتنے رشتے حرام ہیں، ان کا بیان اس آیت میں ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ﴾ (النساء: 23)

''حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں۔''

یہ کل سات رشتے ہیں جن میں بھتیجی بھی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ سے بے حد محبت تھی حتیٰ کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو آپ ﷺ پر پیش کیا کرتے تھے۔
- نبی کریم ﷺ کی یہ حکمت تھی کہ آپ ﷺ جب کسی امر کو رد فرماتے تھے تو اس کا سبب بھی بیان فرماتے تھے۔
- اور آپ ﷺ حکم کو علت کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا کرتے تھے۔
- بلاشبہ یہ ایک عظیم قاعدہ ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہو جاتے ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔
- غذا کا انسان پر بے حد اثر ہوتا ہے۔اسی لیے جب کسی بچے کو دودھ پلا دیتے ہیں تو وہ اہل میں سے بن جاتا ہے اور نکاح اور تقارب میں احتیاط کی بابت اس کا بے حد اثر ہوتا ہے۔اسی لیے علماء نے یہ قول کیا ہے کہ کسی بچے کو ناوان عورت کا دودھ نہ پلایا جائے۔

کس قسم کی رضاعت سے تحریم ثابت ہوتی ہے؟

1132۔ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعِ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ، وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ)).

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''وہی رضاعت حرمت لاتی ہے جو انتڑیوں کو پھاڑ دے (یعنی اس کی دیواروں کو کھول دے) اور (وہ) دودھ چھڑانے (کے زمانے) سے پہلے (کی) ہو۔''[1]

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ هُوَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......**لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ إِلَّا:** ''لَا'' اور ''اِلَّا'' کے ساتھ جملہ میں حصر پیدا کیا جاتا ہے۔

---

[1] جامع الترمذی: 1152۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔السنن الکبری للنسائی: 5465۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے اس کا ایک شاہد موجود ہے۔اس کی اسناد میں ابن لہیعہ ہے جو ضعیف راوی ہے۔مسند بزار میں یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حدیث السنن الکبری للنسائی: 5461 میں بھی ہے۔ابن حزم نے المحلی: 13/10 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

یاد رہے کہ حصر کا معنی پیدا کرنے کے متعدد طریق ہیں جن میں سب سے قوی طریقہ لا اور الّا کے ذریعے حصر پیدا کرنا ہے۔ جیسے "لا الٰہ الا اللّٰہ" میں اسی طریق سے حصر پیدا کیا گیا ہے۔

مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ: اَمْعَاء یہ "اَلْمِعَی" کی جمع ہے۔ یہ آنت اور انتڑی کو کہتے ہیں اور فتق کا معنی چیرنا اور پھاڑنا ہے۔ ولادت کے وقت بچے کی انتڑیاں کھلی نہیں ہوتی ہیں بلکہ اس کی دیواریں ایک دوسرے سے چپکی ہوتی ہیں کیونکہ بچے کو ماں کے پیٹ میں ناف کے ذریعے غذا پہنچتی ہے اور وہ درخت کی جڑ کی طرح ماں کے خون سے اپنی غذا کھینچ لیتا ہے اور جب تک رب تعالیٰ کی طرف سے اس کے پیدا ہونے کا وقت نہیں آ جاتا، ماں کے پیٹ میں بچہ یوں ہی پلتا ہے۔ بلاشبہ یہ رب تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا زبردست مظہر ہے۔

پھر پیدا ہونے کے بعد منہ کے راستے سے جانے والی پہلی غذا اس کی انتڑیوں کو اندر سے کھول دیتی ہے جو ابھی تک باہم چپکی ہوئی تھیں۔ "مَافَتَقَ الْاَمْعَاءَ" سے یہی مراد ہے۔ وہ ''رضاعت'' حرمت کا حکم ثابت کرتی ہے جو بچے کی انتڑیاں کھولے۔ تب پھر معتبر رضاعت وہ ہوگی جو بچے کی غذا بنے اور اسے پالے اور بچہ اس رضاعت سے نمو پائے، اور یہی حدیث کا ظاہر بتلا رہا ہے کہ حرمت کا حکم اول رضاعت سے ثابت ہوتا ہے۔

لیکن آپ ﷺ نے آگے یہ بھی ارشاد فرمایا:

وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ: تب پھر اول رضاعت فتق حقیقی ہوگی اور فطام سے قبل تک کی رضاعت فتق حکمی ہوگی۔ کیونکہ بھوک لگنے کے وقت انتڑیاں ایک دوسرے سے جڑ جایا کرتی ہیں اور جب ان میں غذا پہنچتی ہے تو وہ کھل جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں جس معتبر رضاعت کا ذکر ہے وہ فطام سے قبل تک کی ہے جس کا آغاز اول رضاعت سے ہو کر فطام تک ہوتا ہے اور فطام میں اصل دو سال کی مدت ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف: 15)

''اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔''

لیکن بعض بچے جلدی پرورش پا لیتے ہیں اور انہیں دو سال تک کی رضاعت کی حاجت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جس کا دودھ دو سال سے پہلے چھڑوایا جائے اس کا فطام مکمل سمجھا جائے گا۔ جبکہ جو بچے موروثی طور پر یا کسی بیماری سے یا دودھ کی قلت کی وجہ سے کمزور ہوتے ہیں ان کا دودھ بسا اوقات دو سال بعد تک بھی نہیں چھڑایا جاتا۔ غرض حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ حکم میں مؤثر رضاعت وہی ہے جو فطام سے پہلے پہلے کی ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رضاعت سے تحریم یعنی محرمیت ثابت ہوتی ہے اس کی دلیل "لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ" کے الفاظ ہیں۔
- رضاعت سے محرمیت کے اثبات کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ فطام سے قبل کی ہو۔ اس کی دلیل "وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ" کے الفاظ ہیں۔

رہا دو سال اور فطام کے مابین علماء کا اختلاف تو اس کو مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

◈ جناب رسول اللہ ﷺ بے حد حسن بیان کے مالک تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ بے حد واضح، روشن، مکمل، مدلل اور فصیح و بلیغ کلام ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

دو سال تک کی رضاعت کا بیان

1133- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((لَا رَضَاعَ إِلَّا فِي الْحَوْلَيْنِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''رضاعت وہی ہے جو دو سال میں ہو۔'' ❶

رَوَاهُ الدَّارَ قُطْنِيُّ وَابْنُ عَدِيٍّ مَرْفُوعًا وَمَوْقُوفًا، وَرَجَّحَا الْمَوْقُوفَ.

اس حدیث کو امام دارقطنی اور امام ابن عدی نے مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت کیا ہے۔ البتہ ان دونوں بزرگوں نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

شرح :...... یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اجتہاد ہے کہ محرمیت کا حکم ثابت کرنے والی رضاعت وہی معتبر ہے جو دو سال کے اندر اندر ہو۔ یہ مسئلہ مفصل بیان ہو چکا ہے۔

البتہ مذکورہ حدیث کی اسنادی بحث ذکر کرنا باقی ہے، جو یہ ہے:

یہ حدیث مرفوع اور موقوف دونوں طرح مروی ہے۔ مرفوع اور موقوف روایت کی تعریف بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ہم ان دونوں روایتوں میں سے کس کو کس پر مقدم کریں اور کس کو لیں۔ تو دونوں میں سے جس کا راوی ارجح ہوگا، اس کو لیں گے، اور اگر دونوں کے رواۃ برابر درجہ کے ثقہ ہوں تو ہم مرفوع روایت کو لیں گے کیونکہ مرفوع روایت میں زیادہ علم ہوتا ہے۔

رضاعت وہ ہے جو بچے کی ہڈیوں کو جوڑے اور مضبوط کرے

1134- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا رَضَاعَ إِلَّا مَا أَنْشَزَ الْعَظْمَ، وَأَنْبَتَ اللَّحْمَ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رضاعت تو وہی (مؤثر و معتبر) ہے جو (نومولود کی) ہڈیوں کو جوڑے (اور ان کی نمو کرے) اور گوشت پیدا کرے۔'' ❷

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......**مَا أَنْشَزَ الْعَظْمَ**: ہڈیوں کو جوڑنا اور ان میں نشوونما کرنا یہ اعصاب کے واسطے سے ہوتا ہے، اور اعصاب یہ ریشوں کا ایک جال ہے جس نے عضلات کو جکڑا ہوتا ہے۔

معنی کے اعتبار سے یہ حدیث ''لَا رَضَاعَ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ'' کی طرح ہے۔

---

❶ سنن الدارقطنی: 174/4۔ الکامل لابن عدی: 103/7۔ سنن البیهقی: 462/7۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: موقوف روایت صحیح ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ موقوف روایت سنن سعید بن منصور: 980 میں ''عمرو بن دینار عن ابن عباس'' کے طریق سے مروی ہے۔ اسی طرح یہ موقوف روایت ''مصنف عبدالرزاق: 13901'' میں بھی ہے۔

❷ سنن ابی داؤد: 2059۔ مرفوعاً و موقوفاً۔ ابن عبدالبر نے ''التمہید: 261/8'' میں مرفوع روایت کے راجح ہونے کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا ہے۔

رضاعت ثابت ہو جانے کا حکم

1135۔ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ أَنَّهُ تَزَوَّجَ أُمَّ يَحْيَى بِنْتَ أَبِي إِهَابٍ ، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ ، فَقَالَتْ : لَقَدْ أَرْضَعْتُكُمَا ، فَسَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ ، فَقَالَ: ((كَيْفَ؟ وَقَدْ قِيلَ)) فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ ، وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ.

حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: انہوں نے ام یحییٰ بنت ابی اہاب سے شادی کی، اتنے میں ایک عورت آ کر کہنے لگی کہ: میں نے تو تم دونوں کو دودھ پلا رکھا ہے (تب پھر بھلا تم دونوں میں نکاح کیونکر ہو سکتا ہے)۔ اس پر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے (اس صورت کا حکم) دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(بھلا اب) کیونکر (تم ام یحییٰ کو اپنے نکاح میں باقی رکھ سکتے ہو) جبکہ بات نکل چکی؟ اس پر حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے ام یحییٰ رضی اللہ عنہا کو چھوڑ دیا اور انہوں نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور سے نکاح کر لیا۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ .

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ: لفظ ''امْرَأَةٌ'' نکرہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا ہیں، اس لیے ہمیں ان کے نام کی تعیین کی ضرورت نہیں۔

قَدْ أَرْضَعْتُكُمَا: اس عبارت میں تین تاکیدات ہیں، دو بارز اور ایک مخفی۔ بارز تاکیدات لام اور قد ہیں جبکہ مخفی تاکید قسم ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: ''واللّٰه لقد أَرْضَعْتُكُمَا''۔

كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ: حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے دراصل یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ کیا وہ ام یحییٰ کو اس عورت کی شہادت کے بعد اپنے نکاح میں باقی رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اس بات کا سوائے اس کے اور کوئی گواہ بھی نہیں۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: كَيْفَ یعنی ''كَيْفَ تُمْسِكُهَا'' (تم اس کو اپنے پاس کیونکر روکے رکھ سکتے ہو)۔

وَقَدْ قِيلَ: جبکہ یہ بات لوگوں میں اڑ چکی ہے کہ تم دونوں میں رضاعت کا رشتہ ہے۔

کیف یہاں استفہام انکاری کے لیے ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ حضرت عقبہ پر اس بات پر نکیر فرما رہے تھے کہ جب ایک عورت نے شہادت دے دی کہ وہ تمہاری رضاعی بہن ہے پھر بھی تم اسے اپنے پاس روکنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کے اسی انکار کو دیکھتے ہوئے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے ام یحییٰ رضی اللہ عنہا سے مفارقت اختیار کر لی۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ رضاعت کے ثابت ہو جانے کے بعد اس کے احکام بھی ثابت ہو جاتے ہیں اور رضاعت کا سب سے بڑا حکم ''محرمیت'' ہے۔ لہٰذا اگر اس سے قبل کسی رضاعی رشتہ کی عورت کو لاعلمی میں اپنے نکاح میں لے رکھا تھا تو اسی وقت اس سے فرقت اختیار کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اگر آدمی کسی رضاعی یا نسبی محرم سے لاعلمی میں نکاح کر بیٹھے تو علم ہو جانے کے فوراً بعد فرقت واجب ہو جاتی ہے۔

[1] صحیح البخاری: 88

◈ جس کی عدالت معروف ہو اس کے حال کی بابت معلوم کرنا واجب نہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس شہادت دینے والی عورت کے حال کو دریافت نہ فرمایا۔

اسی طرح جس کی بدی اور اس کا فسق مشہور ہو اس کی شہادت بھی بلا تحقیق رد ہوگی۔ رہا مجہول الحال، تو اس کا حال دریافت کرنا واجب ہوتا ہے۔ پس جیسا اس کا حال نکلے گا وہی حکم اس کی شہادت کا بھی ہوگا۔

◈ رضاعت کے باب میں ایک عورت کی شہادت بھی مقبول ہے کیونکہ رضاعت ایسا امر ہے جس پر سوائے عورت کے اور کوئی مطلع نہیں ہوسکتا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریعت پر عمل پیرا ہونے میں بے حد سخت تھے۔

نادان عورت سے بچے کو دودھ پلوانے کی ممانعت کا بیان

1136۔ وَعَنْ زِيَادٍ السَّهْمِيِّ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ تُسْتَرْضَعَ الْحُمْقَى)).

حضرت زیاد سہمی رحمہ اللہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ نادان عورت کو (اپنے بچہ کو) دودھ پلوانے پر رکھا جائے۔ [1]

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ، وَهُوَ مُرْسَلٌ، وَلَيْسَتْ لِزِيَادٍ صُحْبَةٌ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے، اور زیاد سہمی کی صحابیت ثابت نہیں ہے۔

شرح ......اس حدیث میں احمق اور نادان عورت کو بچے کی انا رکھنے کی ممانعت ہے کیونکہ ایک تو وہ کم عقل ہوتی ہے دوسرے وہ بدسلیقہ بھی ہوتی ہے اور ہر کام کو بھونڈے طریقے سے کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ تب پھر اس کے دودھ پلانے کا بچے کی نفسیات اور عقل و شعور پر یقیناً اثر ہوگا۔ کیونکہ غذا کا بدن پر اثر یقیناً ہوتا ہے۔ اس لیے تو شریعت نے حرام، خبیث اور نجس جانوروں کو، اور موذی، درندے، زہریلے اور دیوث جانوروں کو کھانے سے بھی منع فرمایا ہے۔

اور تو اور خود حلال جانوروں کے مزاجوں تک کا انسان پر اثر ہوتا ہے۔ اس لیے اونٹوں میں رہنے والے لوگ اکثر غصیلے، اکھڑ، منتقم اور رعونت پسند ہوتے ہیں۔ جبکہ بکریاں پالنے والوں میں عاجزی، فروتنی، مسکنت اور ملنساری ہوتی ہے۔ اسی لیے پھوہڑ عورت سے دودھ پلوانا منع ہے کہ مبادا اس کے اخلاق بچے میں سرایت کر جائیں۔

روایة الحدیث:......امام موصوف فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ مرسل حدیث کی تعریف اور اس کے حکم کی تفصیل بار ہا مذکور ہو چکی ہے۔

6۔ بَابُ النَّفَقَاتِ ..... نفقات (یعنی واجب خرچ) کا بیان

نفقہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

نفقات یہ نفقہ کی جمع ہے۔ لغت میں نفقہ خرچ کی جانے والی شے کو کہتے ہیں۔

اصطلاح شرح میں نفقہ یہ اس شخص کے کھانے پینے کو، لباس پوشاک، ٹھکانے کو اور عفت و صیانت کو میسر کرنے کا نام ہے

[1] المراسیل لابی داؤد: 182۔ سنن البیهقی: 464/7۔ من طریق ابی داؤد۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: ایک تو یہ حدیث مرسل ہے، دوسرے زیاد کی صحابیت بھی ثابت نہیں۔ امام ذہبی نے المیزان: 108/8۔ میں زیاد کے بارے میں ابن قطان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: زیاد قطعی طور پر مجہول ہے۔

اوراس باب میں اس کوکفایت کرنا ہے جس کی کفالت ہمارے ذمے ہو۔غرض یہ پانچ چیزیں کھانا، پینا،لباس،ٹھکانا اورعزت و آبرو کی حفاظت ان کومہیا کرنا آدمی کے ذمہ واجب ہے۔جن کی کفالت اس کے ذمہ ہو۔

نفقہ کی شروط

البتہ فقہاء نے نفقہ واجب ہونے کی چند شروط کوذکر کیا ہے، جو یہ ہیں:

(1) پہلی شرط یہ ہے کہ مُنْفَق علیه (جس پرخرچ کیا جاتا ہے) وہ خودکمانے سے عاجز ہو،لہٰذا اگر وہ غنی ہے تو اس کا نفقہ ہمارے ذمہ واجب نہ ہوگا۔البتہ اگر وہ اقارب میں سے ہے تو غنی ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا واجب ہوگا۔

اور اگر منفق علیہ کمانے پر قادر ہواور کما بھی سکتا ہوتو اس کا نفقہ بھی واجب نہیں کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ کام کر کے غنی ہوسکتا ہے۔

اور جو عفت اختیار کرے اللہ اسے عفیف بنا بھی دیتا ہے۔

(2) دوسری شرط یہ ہے کہ مُـنْـفِـق (یعنی خرچ کرنے والا) وہ غنی بھی ہو،لہٰذا اگر وہ فقیر اور تنگدست ہے تو اس پر نفقہ واجب نہیں۔

پھر اس کے ذمہ کما کر خرچ کرنا بھی واجب نہیں۔جیسے زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے مال کمانا اور اس کونصاب کے بقدر جمع کرنا واجب نہیں۔

(3) تیسری شرط یہ ہے کہ منفِق اور مُنْفَق علیه دونوں کا دین بھی ایک ہو،لہٰذا اگر دونوں کے دین میں اختلاف ہوا تو نفقہ واجب نہ ہوگا۔جیسے اختلاف دین کی وجہ سے وراثت جاری نہیں ہوتی ۔لہٰذا کافر والدین پرخرچ کرنا واجب نہ ہوگا۔

(4) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ منفِق یہ مُنْفَق علیه کا وارث بھی بنتا ہو۔چاہے فرض حصہ کا اور چاہے وہ عصبہ ہو۔

نفقہ کے اسباب اور ضوابط

علماء نے وجوب نفقہ کے تین اسباب ذکر کیے ہیں:

(1) دونوں میں زوجیت ہو۔ (2) دونوں میں قرابت ہو۔

(3) اور دونوں میں ولاء ہو۔

زوجیت میں نفقہ کے وجوب کی تفصیل

اب زوجیت میں ایک جانب سے نفقہ واجب ہوتا ہے اور وہ خاوند کے ذمہ ہے کہ وہ بیوی پرخرچ کرے۔البتہ اگر خاوند فقیر ہوتو بیوی پر بھی خاوند پرخرچ کرنا واجب ہوگا۔جبکہ وہ خود بھی غنیہ ہو۔یہ امام ابن حزم رحمہ اللہ کی رائے ہے۔

ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ (البقرة: 233)

''اور وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے۔''

لیکن اہل علم نے اس مسئلہ میں ابن حزم کی مخالفت کی ہے۔اس لیے درست قول یہ ہے کہ بیوی پر خاوند پرخرچ کرنا مطلق واجب نہیں۔

پھر زوجیت کا نفقہ مطلق نکاح منعقد ہونے سے واجب نہیں ہوتا۔ بلکہ رخصتی ہو جانے سے واجب ہوتا ہے۔لہٰذا اگر نکاح کے بعد لڑکی کے اولیاء لڑکی رخصت کرنے سے انکار کردیں تو خاوند کے ذمہ اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔

لیکن اگر اولیاء تو رخصت کرنے پر تیار ہوں اور خاوند ابھی تیار نہ ہو تو خاوند پر بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔

پھر رخصتی ہو جانے کے بعد خاوند بیوی سے دخول کرے یا نہ کرے اور چاہے وہ بالغہ ہو یا نابالغہ تب بھی نفقہ واجب ہوگا۔ کیونکہ نابالغہ ہونے کی صورت میں اگر وہ جماع نہیں کرسکتا تو کم از کم اس سے استمتاع تو کرسکتا ہے۔

قرابت میں نفقہ کے وجوب کی تفصیل

یہ وجوبِ نفقہ کا دوسرا سبب ہے۔اس میں بھی چند باتیں شرط ہیں:

(1) ایک یہ کہ مُنفِق غنی ہو۔

(2) دوسری یہ کہ منفَق علیہ حاجت مند ہو۔ کہ وہ فقیر بھی ہو اور کمانے سے قاصر بھی ہو۔یعنی مال بھی نہ ہو اور بدن بھی کمانے سے قاصر ہوگا۔لہٰذا اگر مال تو نہ ہو پر کمانے کے قابل ہو تو بھی اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا کما کر غنی ہو جانا ممکن ہے۔

(3) تیسری شرط یہ ہے کہ دونوں کا دین ایک ہو۔

(4) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ دونوں میں وراثت بھی جاری ہوتی ہو۔

ولاء یعنی مِلک کی وجہ سے نفقہ کے وجوب کی تفصیل

آدمی انسانوں اور جانوروں میں سے جن کا بھی مالک ہو اس پر ان پر خرچ کرنا واجب ہوتا ہے۔اس نفقہ کے وجوب کا متعدد احادیث میں ذکر آتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جس کی روزی اس کے ذمہ ہے، اس کو ضائع کردے۔''[1] لہٰذا آدمی پر واجب ہے کہ آدمی چوپایوں میں سے جو اس کے مملوک ہوں ان پر خرچ کرے۔ پھر اگر وہ ان پر خرچ کرنے سے قاصر ہو جائے تو اسے مجبور کیا جائے گا کہ ان کو اپنی ملک سے نکال دے۔ چنانچہ اگر غلام ہیں تو ان کو بیچ دینے کا حکم دیا جائے گا، اور اگر وہ چوپایہ ہے تو یا تو اسے بیچ دے اور اگر وہ ماکول اللحم ہے تو اسے ذبح کردے۔

اور اگر وہ ماکول اللحم بھی نہیں اور وہ بیچا بھی نہیں جاتا جیسے حفاظت کا کتا اور یہ اس پر خرچ کرنے سے بھی عاجز ہے تو اسے جنگل میں چھوڑ دے اور رب کے حوالے کردے۔

اور اگر وہ بیچنے کے قابل بھی نہ ہو اور جنگل میں چھوڑ دینے کے بھی قابل نہ ہو جیسے وہ گدھا جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو تو اسے قتل کردے کیونکہ اسے تکلیف اور عذاب دے کر پاس رکھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ اسے جان سے مار ڈالے اور اس مصیبت سے اسے نجات دے دے۔ کیونکہ اگر اس پر خرچ کے بقدر مال بھی ہوتا تو بھی یہ اضاعتِ مال کے زمرہ میں تھا اور شریعت میں رضاعتِ مال کی ممانعت ہے۔ پھر جب محض تفکہ کے طور پر تیتر، بٹیر، مرغی، کبوتر، ہرن وغیرہ کو ذبح کر دینا جائز ہے تو مال کو ضائع کرنے سے بچانے کے لیے کسی چوپائے کو مار ڈالنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

---

[1] یہ حدیث آگے آرہی ہے۔

بیوی اور اولاد پر خرچ کرنے کے احکام

1137- عَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ: دَخَلَتْ هِنْدُ بِنْتُ عُتْبَةَ امْرَأَةُ أَبِي سُفْيَانَ. عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيحٌ لَا يُعْطِينِي مِنَ النَّفَقَةِ مَا يَكْفِينِي وَيَكْفِي بَنِيَّ، إِلَّا مَا أَخَذْتُ مِنْ مَالِهِ بِغَيْرِ عِلْمِهِ، فَهَلْ عَلَيَّ فِي ذَلِكَ مِنْ جُنَاحٍ؟ فَقَالَ: ((خُذِي مِنْ مَالِهِ بِالْمَعْرُوفِ مَا يَكْفِيكِ وَ يَكْفِي بَنِيكِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان ایک کنجوس آدمی ہیں وہ مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے جو مجھے کافی ہو جائے اور میرے بچوں کو کافی ہو جائے سوائے اس رقم کے جو میں ان کے مال سے ان کی بے خبری میں لے لیتی ہوں تو کیا مجھے ایسا کرنے پر کوئی گناہ ہوگا؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے مال میں دستور کے موافق اتنا لے لیا کرو جو تمہیں کافی ہو جائے اور تیرے بچوں کو (بھی) کافی ہو جائے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... هِنْدُ: یہ کلمہ تانیث اور علمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے۔

شَحِيحٌ: یہ اس کنجوس کو کہتے ہیں جو مال کا حریص ہو، حتیٰ کہ جس پر مال خرچ کرنا واجب ہے اس کو بھی نہ دے۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے سیّدہ ہند رضی اللہ عنہا عرض کرتی ہیں کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ مجھے اور میری اولاد کی ضروریات کے بقدر خرچ نہیں دیتے۔

إِلَّا مَا أَخَذْتُ: یہ استثناء منقطع ہے۔ کیونکہ یہ مستثنیٰ منہ میں داخل نہیں۔

مِنْ جُنَاحٍ: مذکورہ مِنْ لفظوں میں زائدہ ہے۔ لہٰذا لفظ جُنَاح محل کے اعتبار سے مرفوع اور مبتداء مؤخر ہے۔ البتہ یہ مِنْ معنی کے اعتبار سے زائدہ نہیں۔ کیونکہ یہ مِنْ تاکید کے لیے ہے، اور جناح سے مراد گناہ ہے۔

خُذِي: اگرچہ یہ امر ہے لیکن اس سے مراد الزام یعنی لازم کرنا یا استحباب نہیں بلکہ اباحت مراد ہے۔ کیونکہ سوال کا جواب اباحت کے لیے ہوتا ہے، اور یہ امر یہاں سوال کے جواب میں ہے لہٰذا یہ امر اباحت کے لیے ہوگا۔

بِالْمَعْرُوفِ: مذکورہ ''با'' مصاحبت کے لیے ہے۔ لہٰذا تقدیری عبارت ''خُذِي أَخْذًا مَصْحُوبًا بِالْمَعْرُوفِ'' ہوگی۔ یعنی ایسا لینا لو جو معروف کے ساتھ ملا ہو۔

اور معروف سے مراد دستور اور رائج عادت ہے۔ یعنی جتنا عام طور پر تمہیں اور تمہاری اولاد کو کافی ہو جایا کرتا ہے، اتنا لے لیا کرو۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو اہم مسائل کا ذکر ہے:

(1) ایک یہ کہ آدمی پر اپنے بیوی بچوں پر بقدر کفایت خرچ کرنا واجب ہے۔

(2) دوسرا یہ کہ اگر کوئی منفق علیہ پر واجب خرچ نہیں کرتا تو وہ حسب دستور اس کے مال سے اپنا خرچ لے سکتا ہے اور اسے بتلانا بھی ضروری نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 2460- صحيح مسلم: 1714.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- فتویٰ طلب کرنے مفتی کے گھر بھی جاسکتے ہیں، اور گھر کے اندر بھی جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ فتویٰ لینے دراقدس میں داخل ہوگئی تھیں۔
- اگر کسی کی کنیت مشہور ہوگئی تو اسے اسی نام سے پکار سکتے ہیں۔ جیسے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اپنی کنیت سے مشہور تھے، اس لیے ان کی اہلیہ نے انہیں اسی نام سے پکارا۔
- ضرورت پڑنے پر کسی کا ذکر کسی ناگوار بات کے حوالے سے بھی کر سکتے ہیں۔ جیسے حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے خرچ کی مجبوری کی بنا پر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا ذکر ان کے کنجوس ہونے کے حوالے سے کیا تھا۔
- اسی طرح ضرورت پڑنے پر بیوی خاوند کے کسی عیب کو ذکر کرسکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے کیا تھا۔
- اجمال کے بعد تفصیل اور یہ کہ اگر اجمال کے بعد تفصیل ذکر نہ کی جائے تو اجمال بے فائدہ رہتا ہے۔ چنانچہ پہلے حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے مجمل یہ کہا کہ ابوسفیان مجھے خرچ نہیں دیتے۔ پھر اس کی یہ تفصیل بیان کی کہ اتنا خرچ نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کافی رہے۔
- ماں کو اولاد پر ایک گونہ ولایت ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ہند رضی اللہ عنہا کی بات سن کر یہ نہیں فرمایا کہ تم تو بچوں کے خرچ کی مکلف ہی نہیں۔ ان کا خرچ تو ان کے باپ کے ذمہ ہے۔ لہٰذا پریشان مت ہو۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے حد سچے تھے اس لیے ہر بات سچ سچ اور واقعہ کے عین مطابق بیان کر دیتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے سب کے سامنے برملا کہہ دیا کہ وہ ابوسفیان کے مال سے بقدر ضرورت ان کی بے خبری میں لے لیتی ہیں۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل کے لیے حق بات جاننے کے حریص ہوتے تھے نہ کہ معلومات اکٹھی کرنے کے لیے۔
- عورت بلا اجازت خاوند کے مال سے صرف بقدر ضرورت ہی لے سکتی ہے۔
- قضاء علی الغائب جائز ہے۔ جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی غیر موجودگی میں ان کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ یہ حدیث اس مسئلہ کے قائلین کی دلیل ہے۔

لیکن ادنی تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اس مسئلہ کی دلیل نہیں۔ کیونکہ یہ حدیث محاکمہ کے باب سے نہیں بلکہ استفتاء کے باب سے ہے۔ لہٰذا صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ افتاء علی الغائب تو جائز ہے البتہ قضاء علی الغائب جائز نہیں۔

- ضرورت کے وقت عورت اجنبی مرد سے بات کرسکتی ہے۔
- مذکورہ حدیث ''مسئلہ ظفر'' کی بھی دلیل ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی کسی کے حق کو ادا نہ کر رہا ہو تو صاحب حق کو جب موقع ملے، وہ اس کے مال سے اپنے حق کے بقدر لے لے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ قصاص لے رہا ہے (یعنی اپنا حق برابر وصول کر رہا ہے) نہ کہ دوسرے پر ظلم وعدوان کر رہا ہے۔
- عرف کی طرف رجوع کا اعتبار ہے، اور عرف اس کو کہتے ہیں جس کے لوگ عادی ہوں۔ پھر اگر لوگوں کی عادت کسی مسئلہ میں مختلف رہی ہو تو اعتبار اکثر اور اغلب کا ہوگا۔

◈ وجوبِ نفقہ میں اصل بقدرِ کفایت ہے، اور زائد از کفایت واجب نہیں۔

خرچ میں ترتیب

1138۔ وَعَنْ طَارِقٍ الْمُحَارِبِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ، فَإِذَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَائِمٌ عَلَى الْمِنبَرِ، يَخْطُبُ النَّاسَ، وَيَقُولُ: ((يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ: أُمَّكَ وَأَبَاكَ، وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ)).

حضرت طارق محاربی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ مدینہ آئے تو کیا دیکھا کہ نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے لوگوں میں خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اور یہ ارشاد فرما رہے تھے: ''دینے والے کا ہاتھ ہی اونچا ہے اور (خرچ کرنے میں) آغاز اس سے کر جس کسی کی کفالت تیرے ذمے ہے۔ (اور تو اپنا مال) اپنی ماں کو، اور اپنے باپ کو، اور اپنی بہن کو اور اپنے بھائی کو (دے)۔ پھر جو تیرا سب سے قریبی ہو پھر جو تیرے (اس کے بعد) سب سے قریبی ہو۔''[1]

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ.

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ ابن حبان اور دارقطنی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......اَلْمَدِينَةَ: اس میں الف لام عہد ذہنی کا ہے اور یہ مدینہ نبویہ ہے۔

فَإِذَا: علمائے نحو اس کو ''اذا'' مفاجاتیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ یہ کلمہ مفاجات پر یعنی کسی غیر متوقع، اچانک اور ناگہانی امر کے وقوع کو بتلاتا ہے۔ خواہ وہ کوئی واقعہ ہو یا حالت یا حادثہ ہی ہو۔

مراد یہ ہے کہ ہم جب مدینہ پہنچے تو ناگہاں ہمیں نبی کریم ﷺ لوگوں میں خطبہ ارشاد فرماتے نظر آئے۔

قَائِمٌ عَلَى الْمِنبَرِ يَخْطُبُ النَّاسَ: بظاہر یہ جمعہ کے دن کا واقعہ اور جمعہ کے خطبہ کا تذکرہ لگتا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ منبر پر خطبہ زیادہ تر جمعہ کے روز ہی ارشاد فرماتے تھے۔

اَلْمِنبَر: یہ اسم آلہ کا صیغہ ہے جو النَّبر سے مِفْعَلٌ کے وزن پر ہے جس کا معنی اونچا ہونا ہے تب پھر اسم آلہ کے اعتبار سے منبر کا معنی ہوگا ''بلند ہونے کا ایک آلہ''۔

يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا: نبی کریم ﷺ نے یہ اس لیے ارشاد فرمایا کیونکہ ایک حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے: ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى)) ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے'' تو یہاں آپ ﷺ نے اس بات کو واضح فرمایا کہ الید العلیا سے مراد کیا ہے۔ تو فرمایا کہ وہ دینے والے کا ہاتھ ہے کیونکہ وہ دیتے وقت اوپر ہوتا ہے اور نیچے والا ہاتھ وہ لینے والے کا ہوتا ہے کیونکہ وہ لیتے ہوئے نیچے ہوتا ہے۔

اب آدمی کس کو دے اور کس کو نہ دے اور یہ کہ دینے کا آغاز کس سے کرے، تو اس کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ: تب پھر سب سے پہلے آدمی پر جس کی مدد کرنا واجب ہے، وہ خود اس کی ذات ہے۔ پھر ان پر خرچ

---

[1] سنن النسائی: 61/5۔ صحیح ابن حبان: 3341۔ سنن الدارقطنی: 44/3۔ المستدرك للحاكم: 668/2 مطولاً۔ ابن حزم ''المحلی: 106/10'' میں اس حدیث کو اور دیگر احادیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ سب اخبار صحیح ہیں اور ثقہ راویوں سے ہیں۔

کرے جن کی کفالت اس کے ذمہ ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''سب سے پہلے خود پر خرچ کر پھر ان پر جن کی کفالت تیرے ذمے ہے۔''❶

أُمَّكَ وَأَبَاكَ وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ: حدیث کے سیاق کا مقتضی تو یہ تھا کہ ان کلمات پر کسر کے اعراب آتے کیونکہ یہ کلمات بِمَنْ میں مذکور مَنْ سے بدل ہیں اور یہ بَدَلُ الْبَعْضِ مِنَ الْكُلِّ ہے، اور بدل کے اعراب بھی وہی ہوتے ہیں جو مبدل منہ کے ہوتے ہیں۔

لہٰذا جب "مَنْ حرف جر "بـا" کی وجہ سے مُحَلًّا مجرور تھا تو ان کلمات کو بھی بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہاں جر کے اعراب سے عدول کر کے ان پر نصب لایا گیا ہے تو یاد رہے کہ اعراب میں عدول مخاطب کے انتباہ کے لیے لایا جاتا ہے۔ کیونکہ جب سننے والا متوقع اعراب کے علاوہ دوسرے اعراب سنتا ہے تو چونک اٹھتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ بھلا اس کلمہ پر یہ اعراب کس نے دیے۔ تو ایسا ہی یہاں بھی ہے کہ یہاں ان کلمات پر بجائے جر کے نصب کے اعراب فعل محذوف نے دیے ہیں، اور وہ فعل محذوف اَعْطِ ہے۔ یعنی اَعْطِ أُمَّكَ.......... (اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بہن اور اپنے بھائی کو دے)۔

نبی کریم ﷺ نے دینے میں عورت ذات سے ابتداء کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ عورتیں بہ نسبت مردوں کے زیادہ محتاج ہوتی ہیں اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بہ نسبت باپ کے ماں حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہوتی ہے۔ کیونکہ اولاد کی پرورش میں جو مشقت ماں اٹھاتی ہے، وہ باپ کی اٹھائی جانے والی مشقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

ثُمَّ أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ: ادنی یہاں اقرب کے معنی میں ہے۔

غرض پہلے تو ماں باپ اور بہن بھائیوں پر خرچ کرے پھر دوسرے قرابتداروں پر، اور ترجیح اسے دے جو زیادہ قریبی ہو، اور اگر مال میں وسعت ہو تو سب پر برابر خرچ کرے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں خرچ کرنے کی ترتیب ذکر کی گئی ہے کہ آدمی کے ذمہ سب سے پہلے اس کے والدین اور بہن بھائی ہیں پھر وہ جو سب سے قریبی ہیں۔ یوں درجہ بدرجہ سب پر خرچ کرتا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا مشروع ہے۔
- دینے والا فضیلت میں لینے والے سے زیادہ ہے۔
- اس اسلوبِ بیان میں سوال سے بچنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔
- صلہ رحمی کرنے اور خرچ کرنے میں اقرب کو مقدم کیا جائے۔ اس کی دلیل "أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ" کے الفاظ ہیں۔
- جب سجع ❶ طبیعت وفطرت کے مطابق وموافق ہو تو اس کا استعمال جائز ہے۔ یعنی تکلف اور تصنع سے خالی سجع جائز ہے۔ جیسے "أُمَّكَ وَأَبَاكَ وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ" میں سجع ہے۔

---

❶ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 184/2.

❶ سجع: یہ اس منثور کلام کو کہتے ہیں جس کے جملوں یا کلمات کے آخری حرفوں پر حرکت اور سکون میں یکسانیت ملحوظ ہو۔ دوسرے لفظوں میں سجع اس قافیہ بند کلام کو کہتے ہیں جس میں وزنِ شعر ملحوظ نہ ہو۔ دیکھیں: القاموس الوحید، ص: 745۔نسیم

مملوک پر خرچ کرنے کے احکام

1139۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ، وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''غلام کے لیے اس کا کھانا اور اس کا لباس (اس کا حق) ہے اور اسے اتنے ہی کام کا مکلّف بنایا جائے گا جس کی اس میں سکت ہو۔'' ❶

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **لِلْمَمْلُوكِ**: مراد غلام ہے۔ چاہے وہ غلام ہو یا باندی۔

طَعَامُهُ: یہ شراب کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ لفظ طعام کا اطلاق طعام اور شراب (پینے کی چیز) دونوں پر ہوتا ہے۔

لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ: یہ جملہ خبریہ ہے اور اس میں خبر مبتداء پر مقدم ہے۔ البتہ یہاں نحوی قاعدہ کے مطابق خبر کی تقدیم سے حصر مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں غلام کے بارے میں ہی گفتگو ہو رہی ہے لہٰذا یہاں کسی دوسرے سے احتراز مقصود ہی نہیں۔ اس لیے یہ حصر کا بیان نہیں بلکہ مطلق خبر ہے۔

وَكِسْوَتُهُ: مراد لباس ہے۔ کیونکہ انسان ستر چھپانے کے لیے اور گرمی سردی دور کرنے کے لیے لباس کا بھی از حد محتاج ہوتا ہے، اور یہ بات مجرب و مشاہد ہے کہ گرمیوں میں اگر بدن بے لباس تو گرم لُو مار ڈالے اور سردیوں میں یخ بستہ ہوائیں جان لے لیں۔ اس لیے انسان لباس کا بھی محتاج ہوتا ہے۔

وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ: مراد یہ ہے کہ اس کے ذمہ ایسا کام نہ لگایا جائے جس کی مشقت کو وہ سہار نہ سکے۔ لہٰذا غلام سے وہی اور اتنا ہی کام لیا جائے جو اس کی قدرت و طاقت کی دسترس میں ہو۔ پس غلام سے اس کی ہمت سے بڑھ کر کام لینا حرام ہوگا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- انسانوں میں بھی ملکیت ثابت ہے۔ یعنی شرعاً و عقلاً غلامی ثابت ہے۔ اس کی دلیل "لِلْمَمْلُوكِ" کے الفاظ ہیں اور اسی ملکیت پر یہ مذکورہ احکام مرتب ہوتے ہیں۔
- غلام کو کھانا پینا اور لباس دینا واجب ہے۔ اس کی دلیل "لِلْمَمْلُوكِ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ یہ لام استحقاق کے لیے ہے۔ (اور بندہ عاجز نے بھی استحقاق والا ترجمہ کیا ہے)۔
- غلام سے اس کی ہمت کے بقدر کام لے سکتے ہیں۔ اس کی دلیل "وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ......" کے الفاظ ہیں۔
- اور انہی الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غلام سے اس کی ہمت سے زیادہ کام لینا حرام ہے۔ تب پھر "لَا يُكَلَّفُ" میں مذکور نفی یہ نہی کے معنی میں ہے۔
- شریعت نے آقا اور غلام دونوں کے حقوق بیان فرمائے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ شرع شریف کی عنایت و رعایت آقا

❶ صحيح مسلم: 1662.

دغلام دونوں کے ساتھ ہے۔

نفقہ میں بیوی کا حق

1140۔ وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْقُشَيْرِيِّ عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا حَقُّ زَوْجَةِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحْ)) الْحَدِيثَ.

حکیم بن معاویہ القشیری اپنے والد (ماجد حضرت معاویہ القشیری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ایک کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''(ایک بیوی کا اپنے خاوند پر) یہ (حق ہے) کہ جب تو کھائے تو (اسی میں سے) اسے بھی کھلائے اور جب تو (نیا لباس) پہنے تو اسے بھی (اس کے مطابق نیا لباس) پہنائے......'' [1] الحدیث

وَتَقَدَّمَ فِي عِشْرَةِ النِّسَاءِ.

یہ حدیث باب عشرة النساء میں (حدیث رقم: 976 کے تحت) گزر چکی ہے۔

تنبیہ:......اس حدیث پر مفصل کلام کے لیے دیکھیں، حدیث رقم: 976۔

1141۔ وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِي حَدِيثِ الْحَجِّ بِطُولِهِ۔ قَالَ فِي ذِكْرِ النِّسَاءِ: ((وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ)).
أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کی طویل حدیث میں ذکر کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''ان کا کھانا پینا اور ان کا لباس دستور کے مطابق تمہارے (یعنی تم مردوں کے) ذمے ہے۔'' [2]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح:......حدیث جابر رضی اللہ عنہ حج کی بابت سب سے مفصل اور اصح روایت ہے۔

غریب الحدیث:......رِزْقُهُنَّ: رزق یہ عطاء کو کہتے ہیں۔ جبکہ یہاں کھانا اور پینا مراد ہے۔

كِسْوَتُهُنَّ: لباس کو کہتے ہیں۔

بِالْمَعْرُوفِ: اس کی لغوی واصطلاحی تعریف بارہا بیان ہو چکی ہے۔ مراد کھانے پینے اور کپڑے کی وہ مقدار ہے جو لوگوں میں معروف اور رائج ہو۔ لہٰذا اگر بیوی رائج دستور سے زیادہ کا مطالبہ کرے گی تو خاوند اس کے مطالبہ کو رد کر سکتا ہے۔

پھر اس میں خاوند کا حال ملحوظ رکھنا بھی لازم ہے۔ لہٰذا غنی کے ذمہ غناء والا کھانا پینا اور کپڑا ہوگا۔ جبکہ متوسط الحال کے ذمہ متوسط اور فقیر کے ذمہ فقیرانہ طعام وشراب اور لباس پوشاک ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا﴾ (الطلاق : 7)

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔
[2] صحیح مسلم: 1218.

''لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت میں سے خرچ کرے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کی جو اس نے اسے دیا ہے۔''

مضمون حدیث :......اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عورتوں کے حال پر بے حد توجہ تھی حتیٰ کہ آپ ﷺ نے حج اکبر میں عرفہ کے دن سب مسلمانوں کے سامنے عورتوں کے حقوق کو بیان فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بیوی کا کھانا پینا، لباس پوشاک اور ٹھکانا وغیرہ خاوند کے ذمہ ہے۔ البتہ اس وجوب میں عرف ملحوظ ہے جس کی تفصیل اوپر مذکور ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ نفقہ کے وجوب میں کسی کے حال کا اعتبار ہے؟ تو علماء کے اس بارے تین اقوال ہیں:

(1) خاوند کے حال کا اعتبار ہے۔ (2) بیوی کے حال کا اعتبار ہے۔

(3) دونوں کے حال کا اعتبار ہے۔

اب اگر تو دونوں غنی ہوں تو کوئی اشکال نہیں کہ اب غناء والا نفقہ واجب ہوگا، اور اگر دونوں فقیر ہوں تو فقیرانہ نفقہ کے وجوب میں بھی کوئی اشکال نہیں۔

لیکن اگر خاوند غنی اور بیوی فقیر ہو تو جن کے نزدیک بیوی کے حال کا اعتبار ہے، خاوند کے ذمہ فقیرانہ نفقہ آئے گا اور جن کے نزدیک خاوند کے حال کا اعتبار ہے، خاوند کے ذمہ نفقہ غنا آئے گا، اور اگر صورت اس کے برعکس ہو کہ خاوند فقیر اور بیوی غنی ہو تو جو بیوی کے حال کا اعتبار کرتے ہیں ان کے نزدیک فقیر خاوند پر غنیہ بیوی کا نفقہ غناء واجب ہوگا، اور جن کے نزدیک خاوند کے حال کا اعتبار ہے، فقیر خاوند پر غنیہ بیوی کا فقیرانہ نفقہ آئے گا۔

رہا تیسرا قول کہ اس میں دونوں کے حال کا اعتبار ہوگا۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں خاوند پر متوسط نفقہ آئے گا۔ تو امام احمد کا مشہور مذہب یہی ہے۔ لیکن صحیح قول خاوند کے حال کے معتبر ہونے کا ہے، اور یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ اس کی دلیل سورۂ طلاق کی مذکورہ بالا آیت ہے۔

اپنے دست نگروں کا خیال نہ رکھنے کا گناہ

1142۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يُضَيِّعَ مَنْ يَقُوْتُ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جن کی (پرورش و) کفالت اس کے ذمہ ہے، ان کو ضائع کردے۔'' ❶

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ بِلَفْظِ ((أَنْ يَحْبِسَ عَمَّنْ يَمْلِكُ قُوْتَهُ)).

اور صحیح مسلم میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: (آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے) کہ وہ اپنے زیردستوں

❶ السنن الكبرى للنسائي: 9177۔ سنن ابی داؤد: 1692۔ مسند احمد: 160/2۔ صحيح ابن حبان: 4240۔ المستدرك للحاكم: 575/1۔ امام نووی رحمہ اللہ الرياض: 294 میں فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے۔

سے ان کی روزی روک دے۔ ❶

غریب الحدیث:...... **كَفَى:** یہ وَسِعَهُ کے معنی میں ہے۔

إِثْمًا: یہ تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور تمیز دراصل فعل کا فاعل ہوتی ہے۔ کیونکہ تمیز اسم ہوتی ہے جو مِنْ بیانیہ کے معنی میں ہوتی ہے کیونکہ یہ کسی مجہول ذات یا حال کو بیان کر رہی ہوتی ہے۔

چنانچہ یہاں بھی "اثمًا" جو کہ تمیز ہے، ایک مجہول کو بیان کر رہی ہے۔ وہ یوں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کے لیے کافی ہے؟ اور وہ کافی کون سی چیز ہے؟ اس کو اس لفظ "اثمًا" نے بیان کیا۔ تب پھر یہ تمیز ہے جو فاعل کی جگہ ہے۔

أَنْ يُضَيِّعَ: مذکورہ اَنْ ناصبہ مصدریہ ہے۔

مَنْ يَقُوتُ: مراد مُنْفَقٌ علیہ ہے جس پر روزی اور خوراک کو خرچ کیا جاتا ہے۔ بے شک زیر کفالت کی خوراک ضائع کرنا عظیم ترین گناہوں میں سے ہے۔

أَنْ يَحْبِسَ: یہ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں اور معنی کے لحاظ سے یہ حدیث مختلف بھی ہے اور اشد اور اعظم بھی ہے۔ کیونکہ پہلی حدیث آدمی کے لاپروا ہونے کی بتلاتی ہے کہ جن کو کما کر کھلانا ذمہ میں ہے، آدمی ان کو بے کار چھوڑ دے اور ان کا خیال نہ رکھے۔ جبکہ صحیح مسلم کی روایت یہ بتلاتی ہے کہ آدمی زیر پرورش لوگوں کو ان کا نان نفقہ ہونے کے باوجود نہ دے اور روک لے۔ بلاشبہ یہ امر تضیع قوت (یعنی نان نفقہ ضائع کرنے) سے زیادہ اشد ہے۔ جیسا کہ اہل علم پر یہ بات خوب عیاں ہے کہ جب اضاعت (یعنی روزی ضائع کرنا) گناہ ہے تو اساءت (یعنی نان ونفقہ دینے میں برا سلوک کرنا) تو بدرجہ اولیٰ گناہ ہوگی۔

مضمون حدیث:...... ان روایات میں یہ اہم ترین مسئلہ مذکور ہے کہ جس کی پرورش وکفالت ذمہ میں ہے، اس کی ضروریات سے عدم توجہ اور لاپروائی گناہ ہے اور ہونے کے باوجود نہ دینا اور ان کی ضروریات بہم نہ پہنچانا بدرجہ اولیٰ گناہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- زیر دستوں اور زیر کفالت لوگوں کی روزی کا ضیاع اور اس کا برباد کرنا گناہ ہے۔ چاہے وہ دست نگر روزی مانگیں یا نہ مانگیں دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے، اور یہ کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔
- رہا یہ سوال کہ زیر دست کی روزی ضائع کرنے سے آدمی گنہگار کب ہوتا ہے۔ تو اس کے تین احوال ہیں:

(1) نفقہ اس کا حق ہو اور وہ حق کا مطالبہ بھی کرے۔

(2) اس کا حق تو ہو پر وہ اپنا حق ساقط کر دے۔

(3) یا پھر وہ خاموش رہے۔

تو آدمی پہلی اور تیسری صورت میں گنہگار ہوگا کیونکہ صاحب حق کو مطالبہ پر اس کا حق نہ دینا گناہ ہے۔ جبکہ صاحب حق کے خاموش ہو جانے سے اس کا حق ساقط نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ حق میں اصل اس کا واجب ہونا ہے۔

- آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے ذمے واجبات کی بابت ہوشیار اور بیدار رہے۔
- شریعت اسلامیہ نے اہل حقوق کے حقوق کی پوری پوری رعایت کی ہے۔

---

❶ صحیح مسلم: 996.

حاملہ بیوہ کے نفقہ کا بیان

1143۔ وَعَنْ جَابِرٍ يَرْفَعُهُ، فِي الْحَامِلِ الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا۔ قَالَ: ((لَا نَفَقَةَ لَهَا)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حاملہ بیوہ کے بارے میں روایت ہے جس کو وہ مرفوع بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''اس کے لیے کوئی نفقہ نہ ہوگا۔'' ❶

أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، لٰكِنْ قَالَ: الْمَحْفُوظُ وَقْفُهُ۔ وَثَبَتَ نَفْيُ النَّفَقَةِ فِي حَدِيْثِ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رضي الله عنها كَمَا تَقَدَّمَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ لیکن امام بیہقی یہ فرماتے ہیں کہ محفوظ اس حدیث کا موقوف ہونا ہے، اور حدیث فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا میں بھی بیوہ کے نفقہ کی نفی ثابت ہے جیسا کہ گزرا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ❷

غریب الحدیث:...... يَرْفَعُهُ: یعنی نبی کریم ﷺ تک لے جا کر اس حدیث کو بیان کرتے ہیں۔

الْمَحْفُوظُ: یہ شاذ کی ضد ہے۔

روایانِ حدیث نے اس حدیث کو دو طرح روایت کیا ہے:

(1) مرفوع طریق سے (2) موقوف طریق سے

پہلی صورت میں یہ کلام نبوی ﷺ بنے گا۔ جبکہ دوسری صورت میں یہ کلام جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بنے گا۔ تب پھر اس کا موقوف طریق محفوظ جبکہ مرفوع طریق شاذ ٹھہرے گا۔

فِي الْحَامِلِ الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا لَا نَفَقَةَ لَهَا: اگرچہ اس حدیث کا مرفوع ہونا صحیح نہیں لیکن یہ حدیث قواعد شرعیہ اور حکم شریعت کے موافق ومطابق ہے۔ پس اگرچہ یہ قول صحابی ہے لیکن چونکہ قواعد شرع کے مطابق ہے، اس لیے یہ حدیث قول صحابی رضی اللہ عنہ ہونے کے باوجود حجت ہے۔

مذکورہ حدیث میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ حاملہ بیوہ کو بیوگی کی عدت کے دوران نفقہ نہ ملے گا۔ کیونکہ خاوند کے وفات پا جانے سے اس کا اپنے خاوند سے تعلق بالکلیہ ختم ہوگیا ہے۔ لہٰذا خاوند کے ترکہ سے اسے صرف اپنا حصہ تو ملے گا پر نفقہ نہ ملے گا۔

البتہ خاوند کے ترکہ سے جو حصہ اس حمل کے نصیب میں آئے گا اس میں اس عورت پر اس کے حمل کے لیے خرچ کیا جائے گا اور یہ حصہ ترکہ کی تقسیم کے بعد نکلے گا۔

البتہ اگر بیوہ غیر حاملہ ہے تو اس کا نفقہ خود اسی کے ذمہ ہے۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ بیوہ کو عدت کے دوران کوئی نفقہ نہ ملے گا چاہے وہ حاملہ ہے یا غیر حاملہ۔ البتہ حاملہ ہونے کی

---

❶ سنن البیھقی: 430/7۔ سنن الدارقطنی: 22/4۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محفوظ اس حدیث کا موقوف ہونا ہے۔ [illegible] کہ یہ موقوف روایت مصنف عبدالرزاق: 12085 میں موجود ہے، اور دیکھیں: المحلی: 285/10۔ امام سحنون المدونۃ 339/5 میں فرماتے ہیں: بیوہ حاملہ کے بارے میں متعدد صحابہ وتابعین اہل علم سے، جیسے حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابوامامہ، حضرت سلیمان بن یسار، سعید بن مسیب اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہم یہ مروی ہے کہ اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں۔ اس کے لیے اس کا ترکہ ہی کافی ہے۔

❷ دیکھیں: حدیث رقم: 1104۔

صورت میں اسے حمل کے حصہ کا نفقہ ملے گا۔

رہا صحیح مسلم کی روایت کا حوالہ جس میں فاطمہ بنت قیس کے لیے نفقہ کی نفی کا بیان ہے تو وہ حدیث مطلقہ ثلاث کے بارے میں ہے نہ کہ بیوہ کے بارے میں۔

اس حدیث پر تفصیلی کلام حدیث رقم 1104 کے تحت گزر چکا ہے۔

نفقہ نہ دے سکنے والے خاوند سے طلاق مانگ لینے کا حکم

1144۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى ، وَيَبْدَأُ أَحَدُكُمْ بِمَنْ يَعُوْلُ، تَقُوْلُ الْمَرْأَةُ: أَطْعِمْنِيْ أَوْ طَلِّقْنِيْ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اور تم میں سے ایک (خرچ کرنے کا) آغاز اس سے کرے جس کی کفالت اس کے ذمہ ہے (پھر آپ ﷺ نے مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ) بیوی کہتی ہے کہ (یا تو) مجھے کھلا وگرنہ مجھے طلاق دے (کر آزاد کر) دے۔'' ❶

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ .

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے، اور اس کی اسناد حسن ہے۔

غریب الحدیث:...... اَلْيَدُ الْعُلْيَا، اَلْيَدِ السُّفْلَى اور وَيَبْدَأُ أَحَدُكُمْ بِمَنْ يَعُوْلُ کہ ان سب کلمات پر کافی گفتگو کی جا چکی ہے۔

تَقُوْلُ الْمَرْأَةُ: **أَطْعِمْنِي أَوْ طَلِّقْنِي**: عورت یعنی بیوی بھی ان لوگوں میں سے ہے جس کی کفالت مرد کے ذمہ ہوتی ہے۔ بلکہ بیوی کی کفالت کی تاکید سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ مرد اس کفالت کا عوض اس سے وصول کر چکا ہوتا ہے اور وہ اس سے استمتاع ہے اور اس سے بھی بڑھ کر جماع ہے جو اس انفاق اور کفالت کا عوض ہے۔

پس جب خاوند بیوی سے عوض لے کر بھی اس پر خرچ نہ کرے گا تو یہ اقارب پر خرچ نہ کرنے سے زیادہ برا ہوگا۔ کیونکہ اقارب پر خرچ کا وجوب صلہ رحمی کی وجہ سے ہے جبکہ بیوی پر خرچ کا وجوب عوض وصول کرنے کی بنا پر ہے۔ اسی لیے بیوی یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ یا تو میرا خرچہ دو یا پھر مجھے طلاق دے دو، جبکہ قرابت دار زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یا تو مجھ پر خرچ کرو وگرنہ تو گنہگار ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ بیوی کے نفقہ کا وجوب سب سے مؤکد ہے۔ لہٰذا بیوی خرچ نہ ملنے پر طلاق تک کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

---

❶ سنن الدارقطنی: 296/3۔ صحیح البخاری: 5355۔ شاید "تقول المرأة" الخ کی عبارت یہ ''کلام مدرج'' ہو اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہو، ابو حاتم نے دارقطنی کی روایت کو معلول قرار دیا ہے۔ جیسا کہ "العلل لابن ابی حاتم: 430/1" میں ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 430/1۔ ابن حزم "المحلی: 94/1" میں کہتے ہیں: جب ہم نے اس حدیث میں غور کیا تو ہم نے پایا کہ یہ زائد کلام نبی کریم ﷺ کا نہیں ہے۔

فائدہ:...... آدمی کے ذمہ سب سے زیادہ تاکید کے ساتھ جس کا خرچ واجب ہے وہ بیوی ہے کیونکہ وہ خرچ نہ ملنے پر طلاق کے مطالبہ کی دھمکی دے سکتی ہے کہ ایسی صورت میں یہ اس کا حق ہے

اب جو تو انفاق پر قادر ہے اور پھر بھی وہ خرچ نہ کرے تو اس کی بیوی کا طلاق کا مطالبہ تو واضح ہے کہ یہ جائز ہے۔ لیکن جو انفاق پر قادر نہیں کیا اس کی بیوی بھی طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے یا نہیں؟

تو حدیث کے ظاہر سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اس شخص کی بیوی بھی طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے کیونکہ بیوی کا نفقہ استمتاع کا معاوضہ ہے۔ لہٰذا جب اسے معاوضہ نہ ملے گا چاہے اس کا کوئی عذر ہی کیوں نہ ہو، وہ طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی سبب سے عورت طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو برقرار رکھا اور اس پر نکیر نہ فرمائی۔

1145- وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ فِي الرَّجُلِ لَا يَجِدُ مَا يُنْفِقُ عَلَى أَهْلِهِ قَالَ: يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا .

حضرت سعید بن میتب سے اس آدمی کے بارے میں جو اپنے اہل (یعنی بیوی) پر خرچ نہ کر پائے، یہ مروی ہے کہ: ''ان دونوں میں تفریق کر دی جائے۔''

أَخْرَجَهُ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُوْرٍ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنْهُ قَالَ : قُلْت لِسَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ: سُنَّةٌ؟ فَقَالَ: سُنَّةٌ))، وَهَذَا مُرْسَلٌ قَوِيٌّ .

اس حدیث کو سعید بن منصور نے سفیان کے واسطہ سے ابوزناد سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت سعید بن میتب سے (ان کی یہ بات سن کر) عرض کیا کہ: (کیا یہ) سنت (سے ثابت ہے)؟ تو انہوں نے فرمایا: (ہاں یہ) سنت (سے ثابت ہے)۔ [1] یہ حدیث مرسل اور قوی ہے۔

غریب الحدیث:...... **الْمُسَيِّبِ:** اس کو یا کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ پڑھایا گیا ہے۔

يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا: حضرت سعید بن میتب مشہور تابعی ہیں۔ ان سے ایک ایسے شخص کے بارے میں مسئلہ پوچھا گیا جو اپنی بیوی پر خرچ کرنے سے عاجز ہو، تو انہوں نے فرمایا کہ ان دونوں میں تفریق کر دی جائے جبکہ اس کا مطالبہ بیوی کرے۔ البتہ اگر بیوی خاوند کے حال پر راضی ہو اور وہ صبر کر رہی ہو اور تفریق نہ چاہتی ہو تو اس میں اسے زیادہ اجر ملے گا اور یہ افضل بھی ہے۔ جس کی دو وجوہات ہیں:

(1) ایک یہ کہ اس میں خاوند پر بھی احسان ہے اور اس کی اولاد پر بھی احسان ہے جبکہ اس کی اولاد ہو۔

(2) دوسری یہ کہ بھوک اور کسمپرسی جھیلنے پر اور لباس پوشاک اچھا نہ ملنے پر صبر کرنے کا اسے اجر ملے گا۔ اس لیے

---

[1] سنن سعید بن منصور: 2022- عن ابی الزناد قال: سألت سعید بن مسیب...... مسند الشافعی: 266/1- امام شافعی فرماتے ہیں: زیادہ مناسب یہی ہے کہ سعید بن میتب کے قول "سنة" سے مراد سنت نبوی ہو۔ مصنف عبدالرزاق: 12357- مصنف ابن ابی شیبة: 169/4- سنن البیهقی: 469/7- ابن قطان نے اس حدیث کو معلول کہا ہے جیسا کہ التلخیص الحبیر: 8/4 میں ہے۔ ابن حزم المحلی: 59/1 میں کہتے ہیں: سعید بن میتب سے دو قول مروی ہیں اور یہ مذکورہ بالا قول ان دو میں سے ایک ہے۔ جبکہ دوسرا قول جواز کا ہے کہ ایسے زوجین میں تفریق کر دی جائے۔ تب پھر دونوں میں سے کون سی بات سنت ٹھہری؟ اس کے بعد ابن حزم یہ تعلیل بیان کرتے ہیں کہ سعید کی سنت سے مراد سنت رسول نہ تھی بلکہ سنت عمر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ سعید بن میتب کی مراسیل معمول بہا ہیں۔ کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ سعید صرف ثقہ رواۃ سے ہی ارسال کرتے تھے۔

عورت کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ تنگدست خاوند سے علیحدگی کا مطالبہ نہ کرے۔ البتہ اگر فقیر خاوند کی بیوی تفریق پر بضد ہو جائے تو تفریق واجب ہوگی۔

سُنَّةٌ: پھر جب حضرت سعید سے یہ پوچھا گیا کہ کیا یہ سنت ہے تو انہوں نے کہا کہ ہاں یہ سنت ہے۔ البتہ یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ یہ سنت کس کی ہے؟ تو جب ایک صحابی رضی اللہ عنہ یہ لفظ بولے تو اس سے مراد سنت نبوی ہوتی ہے اور وہ حدیث ''مرفوع'' شمار ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء اصطلاح نے بیان کیا ہے۔

البتہ جب یہ لفظ کوئی تابعی ادا کرے تو اس کے مرفوع مرسل یا موقوف ہونے میں علماء کا اختلاف ہے کیونکہ تابعی نے دورِ نبوی نہیں پایا ہوتا۔ لہٰذا اگر ہم تابعی کے قول "من السنة" کو مرفوع مانیں تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ تابعی ایک ایسی بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا رہا ہے جس کا زمانہ اس نے نہیں پایا۔ لہٰذا دور نبوی کی طرف ایک تابعی کی ایک حدیث کی اضافت، یہ اس حدیث کے مرسل ہونے کی دلیل ہے۔

لیکن اس کے باوجود بعض علماء نے اس حدیث کو غیر مرسل کہا ہے۔ البتہ وہ اسے موقوف کہتے ہیں کیونکہ تابعی کی سنت سے مراد سنت صحابی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ تابعی نے صحابہ کے دور کو پایا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث موقوف متصل کے باب میں سے ہوگی۔

وَهَذَا مُرْسَلٌ قَوِيٌّ: چنانچہ امام موصوف رحمہ اللہ کے طرز سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ دوسرے قول کی طرف مائل ہیں کہ مرسل وہ روایت ہوتی ہے جسے ایک تابعی یا ایسے صحابی جس نے وہ حدیث خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو، لیکن وہ اسے مرفوع بیان کرے۔

بیویوں کو خرچہ نہ دینے والوں کا حکم

1146- وَعَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ كَتَبَ إِلَى أُمَرَاءِ الْأَجْنَادِ فِي رِجَالٍ غَابُوا عَنْ نِسَائِهِمْ: أَنْ يَأْخُذُوهُمْ بِأَنْ يُنْفِقُوا، أَوْ يُطَلِّقُوا، فَإِنْ طَلَّقُوا بَعَثُوا بِنَفَقَةِ مَا حَبَسُوا.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: انہوں نے لشکروں کے امیروں کو ان مردوں کے بارے میں یہ لکھ بھیجا جو اپنی بیویوں سے (کافی عرصہ سے) غیر موجود تھے کہ: وہ ان لوگوں کو (ڈھونڈ کر) پکڑیں (اور اس بات پر ان کا مواخذہ کریں) کہ (یا تو) وہ (اپنی بیویوں پر) خرچ کریں (یعنی یا تو ان کا خرچہ دیں) یا پھر انہیں طلاق دے دیں، پھر اگر وہ طلاق دیتے ہیں تو جن (بیویوں) کو انہوں نے (اب تک) روک رکھا تھا ان کا (اب تک کا) خرچ بھیجیں۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

اس حدیث کو امام شافعی اور امام بیہقی نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... أُمَرَاءِ: یہ امیر کی جمع ہے۔ مراد لشکر کا جرنیل اور کمانڈر ہے۔

---

[1] كتاب الام للشافعي: 91/5- مسند الشافعي: 267/1- ومن طريق الشافعي رواه البيهقي في سننه: 469/7- ابن ملقن کہتے ہیں: اس حدیث کو امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی شرط پر صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ خلاصة البدر المنير: 257/2- ابن منذر کہتے ہیں: یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے "المغنی: 163/8" کے مصنف نے نقل کیا ہے۔ ابن حزم "المحلی: 94/10" میں کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت سے ثابت ہے کہ جب خاوند تنگدست ہو جائے تو بیوی کا نفقہ کا مطالبہ ساقط ہو جاتا ہے۔

اَلْأَجْنَادِ: یہ جند کی جمع ہے۔ مراد لشکر ہے۔ لشکر یہ ان غازیوں پر مشتمل ہوتا، جن کو راہ خدا میں کفار سے قتال کے لیے بھیجا جاتا اور وہ اپنی بیویوں کو بنا خرچ دیے چھوڑ جایا کرتے تھے۔

كَتَبَ إِلَى أُمَرَاءِ الْأَجْنَادِ: انہی غازیوں اور مجاہدوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکروں کے امیروں کو یہ لکھ بھیجا تھا کہ ان غازیوں کو پکڑو کہ یا تو وہ اپنی بیویوں پر خرچ کریں یعنی ان کا خرچہ بھیجیں یا پھر ان کو طلاق دے دیں۔

أَوْ: یہاں "اَوْ" تشکیک کے لیے نہیں بلکہ تنویع کے لیے ہے کہ دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کیا جائے، اور یہاں دو باتیں انفاق یا طلاق ہیں۔ لہٰذا اگر یہ خرچ کرتے ہیں تو انہیں طلاق دینے کا پابند نہ بنایا جائے گا، اور وہ خرچ نہیں کرتے تو انہیں پابند بنایا جائے کہ وہ بیویوں کو طلاق دے کر انہیں آزاد کردیں۔ **فَإِنْ طَلَّقُوا بَعَثُوا بِنَفَقَةِ مَا حَبَسُوا:** یعنی ان کے طلاقیں دینے سے ان پر سے ماضی کا نفقہ ساقط نہ ہوگا لہٰذا اب تک کا ان کا جو خرچہ بنتا ہے وہ ادا کریں۔

بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ: یہ اثر امام شافعی اور امام بیہقی نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ لہٰذا یہ حجت ہوگا کیونکہ یہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے ایک کی سنت ہے اور وہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا یہ اثر حجت بھی ہوگا اور معمول بہا بھی ہوگا۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ خاوند پر واجب ہے کہ وہ بیوی پر خرچ کرے وگرنہ اسے طلاق دے دے، اور اگر وہ کچھ عرصہ خرچہ نہ دینے کے بعد طلاق دیتا ہے تو گزشتہ دنوں کا خرچ ادا کرے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- امام کو چاہیے کہ ضروری امور کی بابت لشکروں، غازیوں اور مجاہدین کے ساتھ رابطہ رکھے، چاہے اس کی صورت جو بھی ہو، جیسے مراسلہ، قاصد کا بھیجنا، اور فی زمانہ ٹیلی فونک رابطہ وغیرہ رکھنا۔
- جنابِ عمر رضی اللہ عنہ رعایا کی بے حد رعایت رکھتے اور ان کے احوال کی زبردست خبر گیری فرماتے تھے۔ بالخصوص عورتوں سے متعلق معاملات کو ترجیحی بنیادوں پر دیکھتے تھے۔
- آدمی سے بیوی کے نفقہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ پس اگر وہ انکار کرتا ہے تو اس پر طلاق دے دینے کو لازم کیا جائے گا۔ اس کی دلیل "يَأْخُذُوهُمْ" کے الفاظ ہیں اور راجح قول کے مطابق بیوی کو ایسے خاوند سے طلاق کے مطالبہ کا حق ہوگا۔
- معلوم ہوا کہ وقت گزر جانے سے بیوی کا نفقہ ساقط نہیں ہوتا۔ جیسے اگر ایک ماہ کا خرچ نہیں دیا تو اگلا ماہ چڑھ جانے سے پچھلے مہینے کا خرچ ساقط نہ ہوگا۔ بیوی کے مطالبہ پر اسے وہ سابقہ خرچ دلوایا جائے گا۔ اس کی دلیل "فَإِنْ طَلَّقُوا بَعَثُوا بِنَفَقَةِ مَا حَبَسُوا" کے الفاظ ہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بیوی کا خرچ یہ استمتاع کا معاوضہ ہے اور عوض وصول کر لینے کے بعد معاوضہ ساقط نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا اگر کسی نے چند ماہ خرچ نہ دینے کے بعد طلاق دے دی تو اب تک اس نے بیوی کو جو اپنے نکاح کی قید میں باندھے رکھا تھا اس کا خرچ دینا اس پر واجب ہوگا۔

خرچ کرنے میں اَوْلَوِيَّتُ اور اَوَّلِيَّت کی ترتیب

1147۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! عِنْدِيْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے

دِيْنَارٌ، قَالَ: ((أَنْفِقْهُ عَلَى نَفْسِكَ)) قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ؟ قَالَ: ((أَنْفِقْهُ عَلَى وَلَدِكَ)) قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: ((أَنْفِقْهُ عَلَى أَهْلِكَ)) قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: ((أَنْفِقْهُ عَلَى خَادِمِكَ)) قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: ((أَنْتَ أَعْلَمُ)).

رسول! میرے پاس ایک دینار ہے؟ (اور میں اس کا کیا کروں کہ پہلے کس پر خرچ کروں)؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(اس دینار کا پہلا مستحق تو خود ہے لہٰذا) اسے اپنے اوپر خرچ کر۔'' اس آدمی نے عرض کیا: میرے پاس ایک اور (دینار) بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اپنی بیوی پر خرچ کر۔'' اس آدمی نے عرض کیا: میرے پاس ایک اور بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اپنی اولاد پر خرچ کر۔'' اس آدمی نے عرض کیا: میرے پاس ایک اور (دینار) بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اپنے خادم پر خرچ کر۔'' اس آدمی نے عرض کیا: میرے پاس ایک اور (دینار) بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(اس پانچویں دینار کو کہاں خرچ کرنا ہے اسے) تم زیادہ جانتے ہو (اس لیے اس دینار کو جہاں مناسب سمجھ خرچ کر دو)۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الشَّافِعِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالْحَاكِمُ بِتَقْدِيْمِ الزَّوْجَةِ عَلَى الْوَلَدِ.

اس حدیث کو امام شافعی اور امام ابوداود نے روایت کیا ہے۔ اور یہ لفظ سنن ابی داود کے ہیں۔ جب کہ امام نسائی اور امام حاکم نے یہ حدیث زوجہ کے ذکر کو ولد کے ذکر پر مقدم کر کے روایت کی ہے۔

شرح:...... یہ حدیث باب صدقة التطوع، رقم الحدیث: 605 کے تحت گزر چکی ہے اور وہاں اس پر تفصیلی گفتگو بھی کی جا چکی ہے۔ البتہ یہاں چند مزید فوائد رقم کیے جاتے ہیں: (1) جب انفاق کے مستحق متعدد لوگ یکجا ہو جائیں تو اولیٰ کو مقدم کیا جائے گا۔ (2) زیادہ مستحق اور پھر اس کے بعد زیادہ مستحق کا شریعت میں اعتبار ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سوال کے مطابق انفاق کی ترتیب کو ذکر اور مقرر فرمایا۔ (3) جب آدمی واجب اِنفاق کر چکے تو باقی کے مال میں اسے تصرف کی اجازت ہے کہ وہ جیسے چاہے خرچ کرے۔

والدین پر خرچ کرنے کے احکام

1148۔ وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنْ أَبَرُّ؟ قَالَ: أُمَّكَ قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((أُمَّكَ)) قُلْت: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((أُمَّكَ)) قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((أَبَاكَ))،

بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں: وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں (خرچ کرنے میں سب سے پہلے) کس کے ساتھ نیکی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ''

---

[1] یہ حدیث باب صدقة التطوع میں گزر چکی ہے۔ لیکن وہاں امام موصوف نے اس حدیث کو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ یہ حدیث مسند الشافعی: 266/1۔ کتاب الام: 87/5۔ الادب المفرد للبخاری: 197۔ اور المستدرك للحاکم: 575/1 میں ہے۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔

ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَالْأَقْرَبَ)).

میں نے عرض کیا: پھر (اس کے بعد) کس سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (پھر بھی) ''اپنی ماں کے ساتھ'' میں نے عرض کیا: پھر کس سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(اب بھی) اپنی ماں کے ساتھ۔ میں نے عرض کیا: پھر کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (پھر) اپنے باپ کے ساتھ، پھر جو زیادہ قریبی ہو پھر جو (اس کے بعد) زیادہ قریبی ہو۔'' [1]

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......مَنْ أَبَرُّ: یہ فعل مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ تب پھر مَنْ یہ استفہامیہ ہوگا، اور تقدیری عبارت یہ ہوگی مَنْ اَبَرُّ مِنَ النَّاسِ۔

نبی کریم ﷺ نے اس سوال کے جواب میں کہ میری نیکی کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ تین بار یہ فرمایا کہ ماں کے ساتھ نیکی کرو، کیونکہ ماں اپنے بچے کے لیے سب سے زیادہ مشقت اٹھاتی ہے، اور کسی آدمی پر ماں سے زیادہ کسی کا بھی احسان اور شفقت نہیں ہوتی۔ اس لیے سب سے زیادہ نیکی کرنے اور حسن سلوک کرنے کی مستحق صرف ماں ہے۔ باقی سب کا مرتبہ اور درجہ اس کے بعد ہے۔

أَبَاكَ: والد کا نام نبی کریم ﷺ نے چوتھی بار لیا۔ کیونکہ ماں کے بعد انسان کے سب سے زیادہ قریب اس کا باپ ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَالْأَقْرَبَ: والدین کے بعد انسان کے سب سے زیادہ قریب اس کی اولاد ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ آدمی کے جسم کا ٹکڑا ہوتی ہے۔

والدین اور اولاد کے ساتھ نیکی کے اس اولیت کے فرق کو ان لفظوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کو بِرّ کہا گیا ہے۔ جبکہ اولاد کے ساتھ نیکی کرنے کو صلہ رحمی کہتے ہیں اور برّ یہ صلہ رحمی سے اخص ہے۔

فائدہ: ...... یہ حدیث بتلاتی ہے کہ اولویات میں ایک ترتیب ہے، اور اولیت میں لوگ مختلف ہیں۔ پس جو انسان کسی کے جتنا زیادہ قریب ہوگا، وہ نیکی کیے جانے کا اتنا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔

7۔ بَابُ الْحَضَانَةِ ......حضانت یعنی پرورش کا بیان

حضانت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

لفظ حضانت یہ حضن سے ماخوذ ہے اور یہ گود کو کہتے ہیں۔ چنانچہ جب آدمی کسی بچے کو گود میں لے کر اسے اپنے سینے سے لگاتا ہے تو کہتے ہیں "اِحْتَضَنَهُ" (اس نے اسے گود میں لے لیا)۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 5139۔ جامع الترمذی: 1897۔ حاکم: (166/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور کہتے ہیں: پھر ہمیں اس حدیث کے متعدد شواہد بھی ملے ہیں...... مسند احمد: 3/5۔ الادب المفرد للبخاری: 3.

جبکہ اصطلاح میں حضانت یہ کم سن دیوانے اور نادان کو ضرر رساں چیزوں سے بچانے کا اور اس کے مفادات اور مصالح کو قائم کرنے کا نام ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا حضانت واجب ہے یا نہیں؟ تو تزاحم کے وقت کہ جب ایک سے زیادہ حضانت کے طلب گار ہوں، حاضن یعنی پرورش ونگہداشت کرنے والے کے حق میں حضانت واجب ہے۔ البتہ جب بچے وغیرہ کی حضانت سے سب ہی دست کش ہو جائیں اور اسے بے آسرا چھوڑ دیں تو حضانت جملہ قرابت داروں پر بطور فرض کفایہ کے واجب ہوتی ہے۔

پھر اگر قرابت داروں میں سے کوئی حضانت کا ذمہ اٹھا لے تو باقیوں پر سے ساقط ہو جاتی ہے۔

عورت حضانت کی کب مستحق ہوتی ہے

1149۔ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ ابْنِيْ هٰذَا كَانَ بَطْنِيْ لَهُ وِعَاءً، وَثَدْيِيْ لَهُ سِقَاءً، وَحِجْرِيْ لَهُ حِوَاءً، وَإِنَّ أَبَاهُ طَلَّقَنِيْ وَأَرَادَ أَنْ يَنْتَزِعَهُ مِنِّيْ، فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ، مَا لَمْ تَنْكِحِيْ)).

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت (خدمت نبوی میں حاضر ہو کر) عرض کرنے لگی: اے اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کا برتن تھا (جس میں اس کی تخلیق کے مراحل طے ہوئے)، اور میری چھاتی اس کا مشکیزہ تھی (جس سے یہ دودھ پیتا تھا اور اپنا پیٹ بھرتا تھا) اور میری گود (اس کے گرمی سردی سے بچ کر سمٹ آنے کی) پناہ گاہ تھی اور (اب جبکہ) اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اسے مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے؟ (تو میں یہ بچہ کیونکر اس کے حوالے کر دوں)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے ارشاد فرمایا: ''تم اس بچے (کو اپنی پرورش میں لینے) کی (اس کے باپ سے) زیادہ مستحق ہو جب تک کہ تم (دوسرا) نکاح نہیں کر لیتی۔''[1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث ......وِعَاءً: وعاء برتن کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جاتا ہے، اور مراد ہر وہ معنوی یا حسی شے بھی ہو سکتی ہے جس میں کوئی چیز محفوظ کی جاتی ہو۔ تو جیسے برتن میں کھانا محفوظ رکھا جاتا ہے، اسی طرح اس بچے نے میرے پیٹ میں پرورش پائی تھی۔ بلاشبہ یہ وصف سو فیصد حقیقت کے مطابق ہے۔

اس عورت نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر مسجع کلام کے ساتھ اپنی شکایت اور طلاق دینے والے خاوند کے زیادتی کے ارادے کو عرض کیا تھا۔

---

[1] مسند احمد: 182/2- سنن ابی داؤد: 2276- المستدرك للحاكم: 225/2- امام احمد کی حدیث کے رجال ثقہ ہیں جیسا کہ علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد: 323/4- میں کہا ہے۔ ابن حزم نے المحلی: 320/10 میں اس اسناد کو (جو "عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده" کے طریق سے ہے۔ ضعیف کہا ہے۔ (اس کی مفصل بحث گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔ نسیم)

سِقَاءٌ: یہ پانی کی مشک یا پانی وغیرہ کو رکھنے کے برتن کو کہتے ہیں۔تو جیسے مشک سے آدمی پیتا ہے اسی طرح ماں کی چھاتیاں بچے کے لیے دودھ کی ایک مشک کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ وصف بھی حقیقت کے عین مطابق ہے۔

حِوَاءٌ: حِواء اس جگہ کو کہتے ہیں جو کسی شے کو اپنے احاطہ میں لیے ہوتی ہے۔تو ماں کی گود بھی گویا کہ ایک ایسی ہی جگہ ہوتی ہے جس نے بچے کا احاطہ کیا ہوتا ہے اور ماں بچے کو اس احاطہ میں لے کر اسے اپنی پناہ میں لیتی اور سینے سے لگاتی ہے۔ بے شک یہ وصف بھی حقیقت کے عین مطابق ہے۔

وَإِنَّ أَبَاهُ طَلَّقَنِي وَأَرَادَ أَنْ يَنْتَزِعَهُ مِنِّي: جیسا کہ لوگوں کو عموماً یہی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ گود کا بچہ بھی ماں سے چھین کر اسے گھر سے نکال دیں۔ اگرچہ بسا اوقات ایسا کرنے سے باپ کا ارادہ کم سن اولاد پر شفقت کا بھی ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا کرنے سے صرف بیوی کو ضرر پہنچانا ہی مقصود ہوتا ہے۔غرض اس باب میں لوگوں کی نیتیں مختلف ہوتی ہیں۔

أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ: مراد حضانت میں زیادہ مستحق ہونا ہے۔

مَالَمْ تَنْكِحِي: یہ استحقاق کی انتہا کا بیان ہے کہ جب تک تم دوسرا نکاح نہ کرو گے، اس بچے پر زیادہ حق تمہارا ہوگا۔ کیونکہ جہاں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ دوسرا خاوند اس بچے کے ساتھ حسن سلوک کرے وہیں اس بات کا بھی امکان ہے کہ بیوی کا یہ دوسرا خاوند پہلے کے بچے کے ساتھ بدسلوکی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرا نکاح کرتے ہی عورت کا حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے۔

دوسرے صرف نکاح کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دوسرے شہر میں بچہ لے جانے سے عورت کا حق حضانت ساقط نہ ہوگا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نہ تو اس بات کا استفسار فرمایا اور نہ اس قید کو ذکر ہی فرمایا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ مذکور ہے کہ والدین میں تفریق ہو جانے کی صورت میں جب تک بچہ نابالغ ہے اور عورت دوسرا نکاح نہیں کرتی اس کی حضانت کا زیادہ حق ماں کو ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- تکلف وتصنع کے بغیر کلام میں سجع جائز ہے، اور اگر مقصود بیان حق ہو تو مذموم نہیں۔
- طلاق سے ماں کا حق حضانت ساقط نہیں ہو جاتا۔
- حضانت کا زیادہ مستحق وہی ہے جو بچے کو گود میں لے۔
- جھگڑے کے دوسرے فریق کی ایسی بات ذکر کرنا جائز ہے جس سے اپنا دعویٰ مضبوط اور راجح ہوتا ہے۔
- طلاق کے بعد ماں تب تک حضانت کی زیادہ مستحق ہے جب تک وہ نیا نکاح نہیں کرتی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے زیادتِ استحقاق میں اس شرط کو ذکر فرمایا ہے۔
- خاوند اور بیوی کسی حق کی بابت باہم مخاصمت کر سکتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے آنے والی اس عورت پر خاوند کی خصومت کے خلاف شکایت پر کوئی نکیر نہ فرمائی اور نہ اس عورت کے مخاصمت کرنے پر انکار ہی فرمایا۔
- حضانت میں ماں کو باپ پر مقدم کیا جائے گا۔
- یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضانت میں ملحوظ امر بچے کی رعایت وعنایت اور اس پر شفقت ومہربانی ہے۔

جو بہ نسبت باپ کے ماں میں فطرۃً زیادہ ہوتی ہے۔

◈ اگر دوسرا خاوند طلاق یافتہ بیوی کی پہلے خاوند سے بچے کی پرورش کرنے پر راضی بھی ہو جائے تو بھی اس کا حق حضانت نکاح کرتے ہی ساقط ہو جائے گا۔اس کی دلیل مَا لَمْ تَنْكِحِي کے الفاظ ہیں۔

◈ حدیث کے ظاہر سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ نیا خاوند چاہے بچے کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو جیسے چچا کہ اس سے بھی نکاح کرتے ہی عورت کا حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ نکاح کرتے ہی حضانت ماں سے باپ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔البتہ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ اس انتقالِ حضانت میں بچے کا ضرر نہ ہو، وہ یوں کہ باپ بچے کو اپنی دوسری بیوی کے حوالے نہ کرے۔

سن تمیز والے بچے کی حضانت کا حکم

1150۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ زَوْجِيْ يُرِيْدُ أَنْ يَّذْهَبَ بِابْنِي، وَقَدْ نَفَعَنِيْ وَسَقَانِيْ مِنْ بِئْرِ أَبِيْ عِنَبَةَ، فَجَاءَ زَوْجُهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((يَا غُلَامُ، هٰذَا أَبُوكَ، وَهٰذِهِ أُمُّكَ، فَخُذْ بِيَدِ أَيِّهِمَا شِئْتَ فَأَخَذَ بِيَدِ أُمِّهِ، فَانْطَلَقَتْ بِهِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت (خدمت نبوی میں حاضر ہوکر) کہنے لگی: میرا خاوند میرے بیٹے کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے جبکہ میرا بیٹا مجھے (کما کر) نفع پہنچاتا ہے اور وہ مجھے بیر ابی عنبہ سے (پانی لا کر بھی) پلاتا ہے۔اتنے میں اس عورت کا خاوند بھی آ گیا (اور اس نے بھی اپنی بات عرض کی اور بچے کو اس کے حوالے کیے جانے کا مطالبہ کیا) تو نبی کریم ﷺ نے (اس لڑکے سے مخاطب ہوکر) فرمایا: اے لڑکے! یہ رہا تیرا باپ اور یہ رہی تیری ماں پس تو دونوں میں سے جس کا چاہے ہاتھ تھام لے (یعنی تو دونوں میں سے جس کے ساتھ جانا چاہتا ہے تمہیں اس کی اجازت ہے)۔اس پر اس لڑکے نے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا۔سو اس کی ماں اسے لے کر چل دی۔“ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّ زَوْجِي يُرِيدُ أَنْ يَذْهَبَ بِابْنِي: ان الفاظ سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ عورت طلاق یافتہ تھی۔وگرنہ خاوند کا اس کے بیٹے کو ساتھ لے جانا دراصل اسی کے گھر میں لے جانا ہوتا۔

وَقَدْ نَفَعَنِي: مذکورہ فعل کا فاعل ”الا بن“ ہے۔

بِئْرِ أَبِي عِنَبَةَ: یہ مدینہ نبویہ کا ایک معروف کنواں تھا جس کو نبی کریم ﷺ بخوبی جانتے تھے۔

---

❶ مسند احمد: 246/2۔ سنن ابی داؤد: 2277۔ جامع الترمذی: 1357۔ سنن النسائی: 185/6۔ سنن ابن ماجہ: 2351۔ المستدرك للحاكم: 108/4۔ ابن قطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔جیسا کہ الدرایۃ: 82/2 میں ہے۔یہ حدیث الموارد لابن حبان: 1200 میں بھی ہے۔ابن حزم نے المحلی: 326/10 میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اس حدیث میں بھی حضانت کا مسئلہ مذکور ہے کہ زوجین کی تفریق کے بعد اگر بچہ نابالغ ہو تو معروف شروط کے ساتھ اس بچے کی حضانت کی زیادہ مستحق اس کی ماں ہوتی ہے۔

◈ مدعی کو اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے دعویٰ کو بخوبی ثابت کر سکے۔

◈ جب بچہ سن تمیز کو پہنچ جائے کہ اب وہ اپنے نفع ونقصان کو بخوبی سمجھ سکتا ہے تو اسے ماں اور باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ جانے کا اختیار دیا جائے گا۔

◈ لیکن اگر بچہ دونوں میں سے کسی ایک کے پاس رہنے کو اختیار کرتا ہے تو بھی اسے دوسرے سے ملنے سے منع نہ کیا جائے گا۔ مثلاً اگر وہ باپ کے پاس رہنے کو چنتا ہے تو بعد میں اسے ماں سے ملنے سے نہ روکا جائے گا۔

◈ بچے کو اختیار تمیز کی بنا پر ملتا ہے۔ لیکن کیا اس میں عمر بھی شرط ہے یا نہیں؟ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ [1] بعض نے تمیز میں عمر کا اعتبار کیا ہے اور اس کو سات سال کی عمر قرار دیا ہے لہٰذا ان علماء کے نزدیک تمیز کی معتبر عمر سات سال ہے۔ لہٰذا اس سے کم عمر سن تمیز نہ کہلائے گی۔ جبکہ بعض کے نزدیک تمیز کا تعلق وصف سے ہے نہ کہ عمر سے۔ لہٰذا جو نفع ونقصان سمجھتا ہے اس کو متمیز بچہ کہا جائے گا۔ چاہے اس کی عمر سات سال سے کم ہی ہو، اور جس میں نفع ونقصان سمجھنے کی اہلیت ابھی تک پیدا نہیں ہوئی وہ متمیز نہ کہلائے گا چاہے وہ سات سال سے زیادہ عمر کا ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ [2]

◈ یہ مسئلہ تو لڑکے کا ہے۔ رہی لڑکی کہ کیا اسے بھی سات سال کی ہو جانے پر ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنے کا اختیار دیا جائے گا؟ تو علماء کا اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ [3]

ایک قول یہ ہے کہ لڑکی کو بھی لڑکے کی طرح اختیار دیا جائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ لڑکی کو باپ لے جائے گا۔ کیونکہ اتنی بچی قریب البلوغ ہوتی ہے اور اس پر فتنہ کا اندیشہ رہتا ہے جس کا دفعیہ عموماً ماں نہیں کر پاتی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ بچی بالغ ہونے تک ماں کے ساتھ رہے گی۔

البتہ اصح قول تیسرا ہے کہ وہ ماں کے پاس رہے گی۔ کیونکہ بچی کا ماں کے ساتھ بہ نسبت لڑکے کے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ پھر ماں، بہ نسبت باپ کے زیادہ رحم دل ہوتی ہے۔ پھر ماں کی بچی کو گھریلو کام کاج سکھلانے کی طرف توجہ بہ نسبت باپ کے زیادہ ہوتی ہے، اور ان امور میں ماں زیادہ ماہر بھی ہوتی ہے۔

لہٰذا اصح قول یہی ہے کہ بالغ ہونے اور شادی ہو جانے تک وہ ماں کے ساتھ رہے گی۔ البتہ اگر بچی پر فسق وفجور کا شکار ہونے یا اس میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے باپ کے حوالے کیا جائے گا۔

---

[1] الابهاج للسبکی: 160/1۔ فتح الوهاب لزکریا الانصاری: 323/1

[2] شیخ ﷾ نے اس بابت راجح قول کو ذکر نہیں فرمایا لیکن بندہ عاجز مترجم کے نزدیک راجح قول سات سال کی عمر کا لگتا ہے کیونکہ احادیث میں اس بات کا حکم ہے، کہ اتنی عمر کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ اعلم۔ نسیم

[3] امام احمد سے مشہور قول یہ ہے کہ لڑکی سات سال کی بھی ہو جائے تب بھی ماں کے ساتھ رہے گی۔ دیکھیں: المبدع: 239/8 اور امام ابن قیم ﷫ نے "زاد المعاد" میں اس قول کو صحیح کہا ہے۔

کافر والدین میں سے ایک کے ایمان لے آنے پر حضانت کے استحقاق کا مسئلہ

1151- وَعَنْ رَافِعِ بْنِ سِنَانٍ رضي الله عنه أَنَّهُ أَسْلَمَ، وَأَبَتِ امْرَأَتُهُ أَنْ تُسْلِمَ، فَأَقْعَدَ النَّبِيُّ ﷺ الْأُمَّ نَاحِيَةً وَالْأَبَ نَاحِيَةً، وَأَقْعَدَ الصَّبِيَّ بَيْنَهُمَا، فَمَالَ إِلَى أُمِّهِ، فَقَالَ: ((اللّٰهُمَّ اهْدِهِ)) فَمَالَ إِلَى أَبِيهِ، فَأَخَذَهُ.

حضرت رافع بن سنان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (وہ اپنے اسلام لانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) کہ: ''وہ اسلام لے آئے مگر ان کی بیوی نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا۔ تو (بچہ کی حضانت کا فیصلہ کرنے کے لیے) نبی کریم ﷺ نے ایک طرف ماں کو اور دوسری طرف باپ کو بٹھلا دیا۔ جبکہ بچے کو ان دونوں کے درمیان بٹھلایا۔ (کہ اب وہ دونوں میں سے جس کے پاس چاہے چلا جائے) پس بچہ اپنی (کافرہ) ماں کی طرف مائل ہوا (اور اس کے پاس جا بیٹھا) اس پر نبی ﷺ نے (دعا کرتے ہوئے) فرمایا: ''اے اللہ! اس بچے کو ہدایت سے نواز دے۔'' جس پر وہ (اٹھ کر) اپنے باپ کی طرف چلا گیا پس والد نے بچے کو لیا (اور چل دیا)۔'' ❶

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ

اس حدیث کو امام ابوداود، امام نسائی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... یہ حدیث پہلی حدیث کے مشابہ ہے۔ البتہ اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد مستفاد ہوتے ہیں:

◈ اگر باپ کافر ہو اور بچہ اس کو اختیار بھی کر لے تب بھی اسے باپ کی حضانت میں نہ رہنے دیا جائے گا۔ یہی حکم کافر ماں کا بھی ہے۔ کیونکہ اس قصہ میں بچہ اپنی کافرہ اور مشرکہ ماں کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے وہ اپنے مسلمان ہو جانے والے باپ کے پاس چلا گیا۔

◈ اگرچہ ابتداء میں بچہ کافرہ ماں کی طرف مائل ہوا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے اس بات سے روک دیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعا مستجاب تھی۔ لہٰذا وہ صریح ممانعت کے حکم میں ہوگی۔ اس لیے بچے کو والدین میں دین کے اختلاف ہو جانے کی صورت میں کافر کی حضانت میں نہ دیا جائے گا چاہے وہ ماں ہو یا باپ۔

◈ معلوم ہوا کہ اگر محضون (زیر پرورش) مسلمان ہو تو حاضن (پرورش کرنے والے) کا بھی مسلمان ہونا شرط ہے۔ البتہ جب حاضن اور محضون دونوں کافر ہوں تو دونوں میں سے کسی سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے:

''اور اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

پس کافر کو اپنی کافر اولاد پر تو ولایت حاصل ہے لیکن مسلمان اولاد پر ولایت حاصل نہیں ہے۔

◈ اس حدیث میں حضانت کے اہم ترین مقصود کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ محضون کی پرورش و تربیت اور اس کی ہدایت ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 2244- سنن النسائی: 185/6- مسند احمد: 447/5- المستدرك للحاكم: 225/2- ابن حزم کہتے ہیں: یہ خبر صحیح نہیں۔ کیونکہ اس خبر کے رواۃ میں اختلاف ہے۔ دوسرے کافر اور مسلمان میں سرے سے اختیار دینا ہی جائز نہیں۔ ابن منذر کہتے ہیں: اہل نقل اس حدیث کو ثابت نہیں مانتے، پھر اس کی اسناد میں کلام بھی ہے۔ دیکھیں: المحلی: 327/10- التلخیص الحبیر: 11/4.

ماں کے بعد حضانت کی مستحق خالہ ہے

1152، 1153- وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضَى فِي ابْنَةِ حَمْزَةَ لِخَالَتِهَا، وَقَالَ: ((الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ)).

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی (پرورش کی بابت) ان کی خالہ کے حق میں فیصلہ فرمایا (کہ اس بچی کی پرورش اب اس کی خالہ کرے گی)۔اور فرمایا:''خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ. وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ مِنْ حَدِيثِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((وَالْجَارِيَةُ عِنْدَ خَالَتِهَا، فَإِنَّ الْخَالَةَ وَالِدَةٌ)).

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام احمد نے یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔جس میں ارشاد ہے: اور بچی اپنی خالہ کے پاس رہے گی کیونکہ خالہ ماں (کے حکم میں) ہے۔ [2]

شرح :......حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے چچا تھے اور انہوں نے غزوۂ احد میں بڑے مرتبہ اور فضیلت کی شہادت پائی تھی۔جس پر انہیں سیّد الشہداء اور افضل الشہداء کا لقب ملا۔

مذکورہ قصہ انہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا ہے کہ ان کی شہادت کے بعد اس بچی کی پرورش کا مسئلہ اُٹھا اور تین آدمیوں نے اس بچی کو اپنی پرورش میں لینا چاہا، (1) حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ (2) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہی بھائی سیّدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جو بچی کی خالہ کے خاوند بھی تھے۔ (3) اور تیسرے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اس بچی کے رضاعی چچا ہیں۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی بابت حضانت کے اس تنازع کا فیصلہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ بچی کو اس کی خالہ کے سپرد کیا جائے کیونکہ خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جب کسی بچے کی حضانت میں ایک سے زیادہ لوگ ایک دوسرے سے نزاع کریں چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی تو اس کو اس کے حوالے کیا جائے گا جو حضانت کا زیادہ مستحق ہوگا، اور اس میں زیادتِ استحقاق کا کوئی سبب بھی پایا جائے۔

جیسے اس قصہ میں آپ ﷺ نے تین نزاع کرنے والوں میں سے فیصلہ خالہ کے حق میں دیا اور اس کے استحقاق کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے۔

- نبی کریم ﷺ کا عدل کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان تینوں میں سے افضل ہونے کے باوجود فیصلہ خالہ کے حق میں دیا۔

نبی کریم ﷺ نے حضانت میں عورت کو مرد پر مقدم فرمایا، اسی لیے بچی کی خالہ کو پرورش کرنے کا زیادہ مستحق قرار دیا۔

---

[1] صحيح البخاري: 1781.

[2] مسند احمد: 98/1- یہ حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔دیکھیں: مجمع الزوائد: 323/4- نصب الراية: 267/3- علل الدارقطني: 194/6.

◈ خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔ یہ قاعدہ عام ہے، اور اس کا تعلق صرف حضانت سے ہی نہیں۔ تب پھر یہاں عام بول کر خاص مراد لیا گیا ہے۔

◈ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے مسند احمد کی روایت بطور شاہد کے ذکر کی ہے اور یہ پہلی روایت کے ہم معنی ہے۔

غلام کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے

1154- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((إِذَا أَتَى أَحَدَكُمْ خَادِمُهُ بِطَعَامِهِ، فَإِنْ لَمْ يُجْلِسْهُ مَعَهُ فَلْيُنَاوِلْهُ لُقْمَةً أَوْ لُقْمَتَيْنِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے پاس اس کا کھانے لے کر آئے تو اگر وہ اسے اپنے ساتھ (کھانے پر) نہیں بٹھاتا تو (کم از کم) اسے ایک دو لقمے ہی دے دے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں۔

غریب الحدیث:...... أَحَدَكُمْ: یہ مفعول مقدم ہے اور مفعول کو فاعل پر مقدم لانا جائز ہے۔

بِطَعَامِهِ: اس میں "ھو" ضمیر کا مرجع أَحَدَكُمْ ہے۔ یعنی اگر کسی کا خادم اس کا یعنی آقا کا کھانا لائے۔

فَإِنْ لَمْ يُجْلِسْهُ: اس سے معلوم ہوا کہ افضل خادم کو ساتھ بٹھلا کر کھانا کھلانا ہے، اور اس کے دو فائدے ہیں:

(1) ایک تو اس سے اپنی طبیعت میں عاجزی وانکساری پیدا ہوتی ہے۔

(2) دوسرے اس میں خادم کی دلداری ہے۔

لیکن اگر کوئی خادم کو ساتھ بٹھلا کر نہیں کھلاتا تو یہ بھی جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں، گو یہ فعل افضل نہیں۔ البتہ اس صورت میں خادم کو اپنے کھانے میں سے ایک دو لقمے ضرور دے دے تا کہ اس کے جی میں اپنے آقا کی بابت کوئی کبیدگی و آزردگی نہ پیدا ہونے پائے۔

مناسبت حدیث:...... امام موصوف مذکورہ حدیث کو باب حضانت کے تحت اس مناسبت سے لائے ہیں کہ جب خادم کے ساتھ اس قدر نرمی و ملاطفت کرنے کا حکم ہے تو محضون کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ شفقت و رحمت اور نرمی و ملاطفت کی جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دوسرے سے خدمت لینا جائز ہے۔

◈ خادم اپنے آقا کے کھانے کی بابت امین ہے۔ اس کی دلیل "بطعامه" کے الفاظ ہیں۔ رہا یہ سوال کہ کیا اپنے کھانوں کے بارے میں ہم خدام پر مطلق بھروسہ رکھیں؟ تو جواب یہ ہے کہ اصل ان پر بھروسہ کرنا ہی ہے۔ البتہ اگر کوئی سبب بدگمانی کا پایا جائے تو احتیاط کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

❶ صحيح البخاري: 2557- صحيح مسلم: 1663.

◈ آدمی کو عاجز مزاج ہونا چاہیے۔
◈ اور چاہیے کہ وہ دوسروں کی دلجوئی اور خاطرداری کیے رکھے۔

جانوروں تک سے رعایت کی جائے

1155۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ، سَجَنَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ، فَدَخَلَتِ النَّارَ فِيهَا، لَا هِيَ أَطْعَمَتْهَا وَسَقَتْهَا إِذْ هِيَ حَبَسَتْهَا، وَلَا هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(گزشتہ امتوں کا قصہ ہے کہ) ایک عورت کو (محض) ایک بلی کی وجہ سے عذاب میں گرفتار کیا گیا جس کو اس نے قید کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ (بھوکی پیاسی اس قید میں) مر گئی۔ پس وہ اس بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی۔ (کہ) نہ تو اس نے اسے خود کچھ کھانے پینے کو دیا کیونکہ اس نے اس بلی کو باندھ رکھا تھا اور نہ اسے چھوڑ (کر آزاد) ہی (کر) دیا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :...... امْرَأَةٌ: یہ نکرہ ہے لیکن مقصود حکم کا بیان ہے، اس لیے اس عورت کا نام معلوم نہ ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ فِي هِرَّةٍ: مذکورہ "فی" سببیہ ہے نہ کہ ظرفیہ (اس لیے بندہ عاجز نے ترجمہ بھی سببیہ والا کیا ہے)۔ سَجَنَتْهَا: مراد باندھ رکھنا ہے۔ فَدَخَلَتِ النَّارَ فِيهَا: یعنی وہ عورت اس بلی کو بھوکا پیاسا رکھ کر مارنے کی وجہ سے جہنم رسید ہوئی۔ یہاں بھی "فی" سببیہ ہے۔ خَشَاشِ الْأَرْضِ: خشاش: یہ حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں کو کہتے ہیں۔

مناسبت حدیث :...... مذکورہ حدیث کو باب حضانت کے تحت یہ بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ جب آدمی اپنے زیر قبضہ جانوروں کی بابت غفلت برتنے میں مبتلائے عذاب ہو سکتا ہے۔ تو اپنے زیر پرورش ایک انسان کو ضائع کرنے اور اس سے لاپروائی برتنے پر بدرجہ اولیٰ مبتلائے عذاب ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جہنم کا اثبات۔
◈ نبی کریم ﷺ اس مبتلائے عذاب عورت پر یا تو وحی کے ذریعے مطلع ہوئے یا آپ ﷺ کو یہ واقعہ الہام کیا گیا یا پھر صلوۃ کسوف کے دوران جب آپ ﷺ پر جہنم کو منکشف کیا گیا تھا تو اس وقت آپ ﷺ نے اس عورت کو مبتلائے عذاب دیکھا ہوگا۔ جبکہ خواب کے ذریعے بھی یہ عذاب دکھایا جانا بعید از امکان نہیں۔
◈ معلوم ہوا کہ چوپایوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر باندھے رکھنا حرام ہے۔ البتہ اگر آدمی جانوروں کی بھوک پیاس کا خیال رکھے تو جانوروں کو باندھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 2365۔ صحيح مسلم: 2619.

10
كِتَابُ الْجِنَايَاتِ
جنایتوں کے احکام ومسائل کا بیان

جنایات کی لغوی وشرعی تعریف

جنایات: یہ جنایۃ کی جمع ہے۔ یہ قابل سزا جرم، گناہ اور بدعنوانی کو کہتے ہیں۔ تب پھر جان مال یا بدن پر کی جانے والی زیادتی کو جنایت کہا جائے گا۔

جبکہ جنایت کا اصطلاحی معنی یہ اس کے لغوی معنی سے اخص ہے۔ یعنی جنایت بدن پر کی جانے والی ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جو قصاص یا دیت کو واجب کرے۔

جنایت کا حکم

جنایت جو بھی ہو اور جتنی بھی ہو حرام ہے۔ چاہے بدن میں ہو یا جان و مال میں ہو، اور چاہے یہ جنایت وتعدی کسی کی عزت وآبرو پر ہو، سب کی سب حرام ہیں۔ اس کی دلیل حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ کا وہ مشہور اور زبانِ زدِ خلائق ارشاد ہے کہ: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔''

جنایات کے مراتب واقسام

جنایت کی سب سے بڑی قسم جان پر جنایت ہے۔ یعنی کسی کو جان سے ہی مار ڈالنا۔

اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ﴾ (الفرقان : 68)

''اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ زنا کرتے ہیں۔''

کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے آبرو پر جنایت جو زنا ہے، سے بھی پہلے جان پر جنایت کو ذکر فرمایا ہے۔ کسی کو مار ڈالنا یہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔

علماء نے جنایات کی تین اقسام بیان کی ہیں، جو یہ ہیں:

(1) جنایت عمد (2) جنایت شبہ العمد (3) اور جنایت خطا

جنایت عمد

یہ کسی معصوم الدم کو جان بوجھ کر مار ڈالنا ہے جس کے بارے میں وہ جانتا بھی ہے کہ یہ معصوم ہے۔ چاہے وہ ذمی ہو یا مسلمان، اور یہ کسی کو جان لیوا ہتھیار سے مار ڈالنا ہے جیسے تلوار، خنجر، چاقو، پستول وغیرہ۔ بلاشبہ یہ قتل ''عمد'' بھی ہے اور ''عدوان'' بھی۔ کیونکہ اس آدمی کے خون کے معصوم ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔

جنایت شبہ العمد

یہ بھی دراصل معصوم الدم پر ہی جنایت ہے لیکن یہ اس کی ایسے آلہ سے جان لینا ہے جس سے عموماً لوگوں کی جان لی نہیں جاتی، جیسے لاٹھی، لوہے کا راڈ، خاردار کوڑا بھاری پتھر وغیرہ کہ ان کو مار کر کسی جان لے لینے کو جنایت شبہ العمد کہتے ہیں۔

جنایتِ خطا

اور یہ وہ جنایت ہے جس میں دوسرے کی جان لینا مقصود نہ تھا۔ جیسے کسی پر غلطی سے گولی چل جانا اور اس سے دوسرے آدمی کا ہلاک ہو جانا کہ یہ شبہ عمد کہلائے گا۔

اب علماء نے ان تینوں قسموں کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ جنایت عمد میں قصاص آئے گا۔ جبکہ باقی کی دونوں قسموں میں قصاص نہیں۔ ان میں دیت اور کفارہ ہے جبکہ جنایت عمد میں صرف قصاص ہے، دیت اور کفارہ نہیں۔ البتہ اگر اولیائے قصاص ہی دیت لینے پر آمادہ ہو جائیں تو جائز ہے۔

مسلمانوں کے خونوں کی حرمت اور تعظیم

1156- عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ، إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: الثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِيْنِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو مسلمان بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تو اس کا خون (کر دینا کسی کے لیے) حلال نہیں سوائے تین میں سے ایک بات کی وجہ سے، (اور وہ تین شخص جن کا خون کر دینا حلال ہے، یہ ہیں): (1) شادی شدہ ہو کر زنا کرنے والا۔ (2) جان کے بدلے جان۔ (3) اور اپنے دین کو ترک کرنے والا (اور) جماعت (مسلمین) کو چھوڑنے والا۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا يَحِلُّ: یعنی جائز نہیں، اور یہ تحریم کو مستلزم ہے۔

دَمُ امْرِءٍ: مراد اس کا قتل کرنا ہے۔

[1] صحيح البخاري: 6878- صحيح مسلم: 1676.

مُسْلِمٍ: یہ امری کی تاکید ہے۔ وگرنہ قتل تو کسی کا بھی جائز نہیں۔ البتہ مسلمان کا قتل اشد ہے۔

یَشْهَدُ: یہ مسلم کی تفسیر ہے کہ مسلمان وہی ہوتا ہے جو توحید ورسالت کی شہادت دیتا ہو۔

إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: یہ مستثنیٰ متصل ہے، اور مذکورہ "با" سببیہ ہے کہ اگر ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے گی تو وہ اس کے خون کے حلال ہو جانے کا سبب ہوگی۔

الثَّيِّبُ: اس پر رفع اور جر کے دونوں اعراب پڑھنا درست ہے۔ جر کی صورت میں یہ بِإِحْدَى ثَلَاثٍ سے بدل ہوگا۔ جبکہ رفع کی صورت میں یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور یہ مبتداء محذوف "ھو" کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔

الثَّيِّبُ: یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس نے نکاح صحیح کے ساتھ اپنی بیوی سے جماع کیا ہو، جبکہ اس وقت دونوں یعنی زوجین عاقل بھی ہوں اور بالغ اور آزاد بھی ہوں، اور ان پانچ شروط کے جمع ہونے کو صفتِ احصان کہتے ہیں۔ تب پھر رجم کی سزا اسی زانی کو ملے گی جو محصن ہو یعنی اس میں زنا کرتے وقت یہ پانچ صفت پائی جاتی ہوں:

(1) اس کا نکاحِ صحیح ہو چکا ہو (2) وہ بیوی سے جماع کر چکا ہو

(3) جماع کے وقت دونوں بالغ ہوں (4) عاقل ہوں

(5) اور آزاد ہوں

غرض جب کسی زانی میں صفتِ احصان پائی جائے تو اس کو رجم کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے موت آ جائے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے ثابت اور صحیح ہے۔

النَّفْسُ بِالنَّفْسِ: یہ قصاص کا بیان ہے۔ لہٰذا جب کوئی کسی دوسرے شخص کو قتل کرے گا تو بدلے میں وہ بھی قتل کیا جائے گا، اور یہی عدل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (البقرة: 194)

"پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔"

غرض جان کے بدلے جان ہے۔ جس کی شروط معروف ہیں۔

رہا یہ سوال کہ قصاص لیا کس طرح جائے۔ آیا قاتل کو تلوار سے قتل کیا جائے یا جس طرح اس نے قتل کیا ہے، اس طرح اسے بھی قتل کیا جائے؟

اس بارے علماء کے دو اقوال ہیں:

(1) ایک قول تو د کا ہے یعنی اسے صرف تلوار سے ہی قتل کیا جائے گا۔ ان علماء کا استدلال اس حدیث سے ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ((لَا قَوَدَ إِلَّا بِالسَّيْفِ .)) ❶ "قصاص صرف تلوار سے ہوگا۔" امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ تلوار کے ذریعے کسی کو قتل کرنا اسہل ہے، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے کرو۔" ❷

---

❶ سنن ابن ماجه: 2668۔ امام بوصیری نے "المصباح" میں اس حدیث کو مبارک بن فضالہ کے مدلس ہونے کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔

❷ یہ حدیث آگے کتاب الاطعمة میں آ رہی ہے۔

(2) اور دوسرا قول یہ ہے کہ جانی (جنایت کرنے والے) کو بھی اس طریق سے قتل کیا جائے گا جس طرح اس نے مقتول کو مارا تھا۔ لہٰذا اگر اس نے تلوار سے مارا تھا تو اسے بھی تلوار سے مارا جائے گا اور اگر اس نے گولی ماری تھی تو اسے بھی گولی مار کر مارا جائے گا۔

ان لوگوں کا استدلال کتاب وسنت اور صحیح قیاس سے ہے، اور قصاص تب ہی تمام ہوگا جب قاتل بھی اس طریق سے مارا جائے جس طریق سے اس نے مقتول کو مارا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ (البقرۃ: 194)

''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

جبکہ ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے ایک یہودی کو بھی اسی طرح پتھر سے سر کچل کر مارا تھا جس طرح اس نے انصار کی ایک لڑکی کا سر پتھر سے کچل کر مارا تھا اور اس کا زیور بھی لوٹ لیا تھا۔ ❶

اور قیاس صحیح کا مقتضی بھی یہی ہے اور یہی عدل بھی ہے کہ جس طرح جانی نے ظلم و جنایت کی ہے، اس سے بدلہ بھی اسی طرح کا لیا جائے۔ غرض یہ نص عام ہے اور اس کو لیا جائے گا کہ جان کے بدلے جان ہے لہٰذا اگر مرد نے عورت کو مارا ہے تو عورت کے بدلے مرد کو مارا جائے گا۔ اسی طرح غلام کے آزاد قاتل کو بدلے میں مارا جائے گا، اور کافر کے قتل کے بدلے مسلمان قاتل کو مارا جائے گا۔ البتہ ذیل میں چند مسائل کو قدرے تفصیل کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

کافر کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم

کیا کسی مسلمان کو ذمی کافر کے بدلے قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ تو اس بارے اگرچہ عمومی ضابطہ تو یہی ہے کہ جان کے بدلے جان ہے، اور یہ ضابطہ اس صورت کو بھی شامل ہے۔ لیکن پھر بھی علماء کے اس بارے تین اقوال ہیں:

(1) مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا اور اس کی دلیل حدیث علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ کیونکہ کافر حربی ہوتا ہے اور حربی کا خون بالاجماع رائیگاں ہے۔ اس لیے کافر ذمی یا حربی کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے گا۔

(2) دوسرا قول قتل کیے جانے کا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان کو ایک ذمی کے قتل کے بدلے قتل کرایا تھا، اور فرمایا کہ: ''جو اپنے ذمہ کو پورا کرتا ہے میں اس کا والی ہوں۔'' ❷

دوسرے ذمی کا خون اور مال مسلمان کے خون اور مال کی طرح معصوم ہے۔ جبکہ دین کا تعلق ہر ایک کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ جبکہ امن وامان کی حفاظت عام ہے۔

(3) تیسرا قول یہ ہے کہ اگر تو مسلمان نے کسی کافر کو دھوکا سے اور بے خبری میں مار ڈالا ہے تو قصاص میں یہ بھی مارا جائے گا، اور اگر اس نے قتل عمد کیا ہے تو بدلے میں قتل نہ کیا جائے گا اور غزوۂ خیبر میں آپ ﷺ نے ایک کافر کے قتل کے بدلے میں جو ایک مسلمان کو قتل کروایا تھا اس کو بھی ''غیلہ'' (دھوکا سے قتل کرنے) پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ غیلہ نقض امن کا باعث ہے۔ اس لیے حفظِ امن کی خاطر ایسے قاتل کو مارا جائے گا۔

---

❶ یہ حدیث آگے آرہی ہے۔

❷ یہ حدیث کتاب الجنایات کے آخر میں آرہی ہے۔

دوسرے قتل غیلہ سے بچنا عموماً ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں قاتل مقتول کی بے خبری میں حملہ آور ہوتا ہے۔ بخلاف دست بدست آمنے سامنے حملہ آور ہونے کے۔ لہٰذا کافر کے بدلے میں مسلمان کے قتل کا مطلق قول ضعیف ہے، اور غزوۂ خیبر کا واقعہ معینہ شخصیہ ہے۔ پھر بعض علماء نے اس کو تعذیر (عذر پیش کرنے) کے باب سے بھی شمار کیا ہے۔ یعنی صرف نبی کریم ﷺ کے لیے یہ عذر ہے کہ آپ ﷺ نے ایک ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کروا دیا۔ کیونکہ آپ ﷺ اس بات سے معصوم تھے کہ آپ ﷺ کسی کی جان قصد و ارادہ سے لیں۔ اس لیے راجح قول یہ ہے کہ کافر ذمی کے بدلے مسلمان کے قتل کا قول مطلق نہیں۔

عورت کے بدلے مرد کے قتل کا حکم

اس بارے میں دو اقوال ہیں:

(1) ایک قول یہ ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا۔

(2) جبکہ دوسرا قول اس کے برعکس ہے۔ البتہ اس صورت میں عورت کے قاتل مرد کے اولیاء کو اس کے قصاص میں قتل کر دیے جانے کے بعد نصف دیت بھی دیں گے۔ کیونکہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہے۔

لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انصار کی ایک لڑکی کے قتل کے بدلے ایک یہودی کو قتل کیا، اور بلاشبہ یہ عورت کے بدلے میں مرد کا قتل ہے۔

بیٹے کے بدلے باپ کا قتل

بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ بیٹے کے قتل کے بدلے باپ کو قتل کیا جائے گا۔ ان کی دلیل "اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" کا عموم اور مذکورہ حدیث کا عموم ہے۔ دوسری یہ کہ بیٹے کو قتل کرنا یہ کسی بھی اجنبی کو قتل کرنے سے زیادہ اشد اور بڑا ہے۔ تب پھر اولاد کا قتل بڑا جرم ہونے کے باوجود حکم قصاص سے مستثنیٰ کیونکر ہو سکتا ہے۔

جبکہ جو علماء اس باب میں قصاص کے قائل نہیں، ان کا استدلال جس اثر سے ہے وہ ضعیف ہے، اور ''ضعیف اثر'' قوی حدیث کے بالمقابل نہیں آ سکتا، اور اگر ہم اس حدیث کو صحیح مان بھی لیں کہ: ''باپ کو بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا۔'' تب پھر یہ حدیث قتلِ خطا پر محمول ہوگی کہ باپ اولاد پر سب سے زیادہ رحیم و شفیق ہوتا ہے، ممکن نہیں کہ وہ اولاد کو مار ڈالے سوائے اس کے کہ اس سے قتل اولاد کا فعل خطاءً سرزد ہو جائے تو ہو جائے۔ تو جب قتل عمد کی علت ''عدوان'' منتفی ہوگئی ہوگی تو گویا کہ معنی کے اعتبار سے یہاں قتل کا فعل بھی منتفی ہو گیا جو قصاص کو مقتضی ہوتا ہے۔ لہٰذا باپ کے اولاد کے قتل کر دینے کو قتل خطا پر محمول کیا جائے گا۔ یہی امام مالک رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔

البتہ باپ کو بھی قصاص میں قتل کر دیے جانے کے قائل علماء معدودے چند ہیں۔ غرض اس مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ:

(1) قتل عمد میں باپ ضرور قتل کیا جائے گا، اور یہی صحیح قول بھی ہے۔ جبکہ شبہ عمد نہ پایا جائے۔

(2) وگرنہ باپ کے قتل کرنے کو قتلِ خطا پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ باپ اولاد سے سب سے زیادہ محبت کرنے والا ہوتا ہے۔

غلام کے بدلے آزاد کے قتل کا حکم

اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ آقا کو بھی غلام کے قتل کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ اس بارے نصوص میں عموم ہے۔

جبکہ دوسرا قول اس کے برعکس ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد ہے کہ: ''آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہ کیا

جائے گا۔"

دوسرے غلام مالِ متقوَّم ہوتا ہے، تب پھر یہ مثل "بہائم" کے ہوا۔

اور رہا قیاس تو جب غلام کے اطراف بدن کے اتلاف کے بدلے آزاد کے اعضاء کا اتلاف بالا جماع جائز نہیں ہے، تو ایسے ہی اس کے قتل کے بدلے آزاد کا قتل بھی جائز نہ ہوگا۔

ان دلائل کا جواب یہ ہے کہ: "النَّفْسُ بِالنَّفْسِ" میں عموم ہے جو غلام کو بھی شامل ہے۔

پھر غلام مالِ محترم ہے، اس لیے یہ بہائم سے جدا ہے۔

پھر غلام کے قتلِ خطا میں کفارہ ہے جبکہ بہیمہ کے قتلِ خطا میں ضمان ہے۔ تب بھی غلام اور بہائم میں فرق ہو گیا۔

رہا اَطراف کے اِتلاف میں فرق تو غلام کے اَطراف کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ جبکہ آزاد کے اطراف کی دیت ہوتی ہے اور یہ فرق اس کی جان کے اِتلاف کو شامل نہیں۔

تب پھر راجح قول یہ ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ جیسا کہ بیٹے کے قتل میں راجح قول باپ کے قتل کر دیے جانے کا ہے۔

وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ: یہ اس تیسرے شخص کا بیان ہے جس کا قتل مباح ہے، اور دین کا تارک مرتد ہے۔ اس کو بھی قتل کیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ارشادِ نبوی ہے: "جس نے اپنا دین بدلا اس کو قتل کر ڈالو۔" [1]

رہا یہ سوال کہ کیا کسی کو مرتد ہوتے ہی مار دیا جائے گا یا اسے تین دن تک غور و فکر کرنے اور توبہ تائب ہونے کا موقع دیا جائے گا؟ اور اس سے تائب ہو جانے کا مطالبہ کیا جائے گا؟

یا یہ کہ ارتداد دو قسم کا ہے، ایک وہ جس میں مہلت دی جاتی ہے اور دوسرا وہ جس میں مہلت اور توبہ کا موقع نہیں دیا جاتا اور نہ اس سے تائب ہونے کا مطالبہ ہی کیا جائے گا۔

غرض یہ تین احتمال ہیں: (1) صرف مرتد ہو جانے پر ہی قتل کر دیا جائے۔ (2) تین دن تک مہلت دی جائے اور توبہ طلب کی جائے۔ (3) یا یہ کہ ارتداد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں توبہ طلب کی جاتی ہے اور دوسری وہ جس میں توبہ طلب نہیں کی جاتی۔

اب بعض علماء پہلے قول کے قائل ہیں کہ مرتد کو مرتد ہوتے ہی قتل کر دیا جائے ان کی دلیل حدیث الباب ہے جو عام ہے۔

اور یہ حدیث شرط اور مشروط پر مشتمل ہے، اور مشروط یہ شرط کے پیچھے بلا تاخیر چلا آتا ہے۔ لہٰذا جب بھی دین کا بدلنا پایا جائے گا جو کہ شرط ہے تو اس کا قتل کیا جانا بھی بلا تاخیر پایا جائے گا جو کہ مشروط ہے۔

دوسرے قول کے قائلین علماء کی دلیل یہ ہے کہ جب ہر گناہ میں تین دن تک توبہ مانگی جاتی ہے تو یہاں بھی تین دن تک توبہ طلب کی جائے۔ شاید کہ وہ توبہ تائب ہو کر لوٹ آئے، اور رحمت و رافت یہ عقوبت سے بہتر ہے۔ لہٰذا اس کا تائب ہو کر مرنا یہ مرتد ہو کر اور قتل ہونے کے بعد مرنے سے پھر بہتر ہے کہ یوں تو وہ دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ میں رہے گا۔

جبکہ تفصیل کے قائل علماء کا کہنا کہ جس کفر میں توبہ مانگی جاتی ہے اس میں تین دن کی مہلت دی جائے اور جس کفر میں توبہ مقبول نہیں وہاں طلبِ توبہ بے فائدہ ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ توبہ کر بھی لے تب بھی بے فائدہ ہے۔

---

[1] یہ حدیث آگے "باب قتال الجانی" میں آ رہی ہے۔

تب پھر وہ کفر جس میں توبہ غیر مقبول ہے وہ جادو کی وجہ سے کفر ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو بلا تاخیر قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ شیاطین سے مدد مانگتا ہے۔ اس کی بقا میں لوگوں کی اذیت ہے۔ دوسرے اس کے پھر بگڑ جانے کی کوئی ضمانت نہیں۔

اس طرح رب تعالیٰ کو برا بھلا کہنا بھی وہ کفر ہے جس کی توبہ غیر مقبول ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کو برا بھلا کہنا سب سے بڑا گناہ ہے جس کی مغفرت نہیں۔ لہٰذا نہ تو اس میں توبہ مقبول ہے اور نہ اس سے توبہ ہی مانگی جائے گی۔ بلکہ وہ فی الفور قتل کیا جائے گا۔ یہی حکم نبی کریم ﷺ کو معاذ اللہ گالیاں دینے والے کا بھی ہے کہ اس کی توبہ غیر مقبول ہوگی اور وہ اسی وقت قتل کیا جائے گا۔ ایسا آدمی اگر توبہ کرتا بھی ہے تو وہ جانے اور اس کا رب، ہم تو اسے قتل ہی کریں گے۔ [1]

اس منافق اور زندیق کا بھی یہی حکم ہے جو اپنے کفر و زندقہ کا داعی ہو۔ کیونکہ یہ لوگ دراصل فساد فی الارض کے مرتکب ہیں۔

لیکن ان سب کی بابت صحیح قول یہ ہے کہ ان کی توبہ مقبول ہے۔ اس کی دلیل قرآن کریم کی ان آیات کا عموم ہے۔

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۝﴾ (الزمر: 53)

''کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝﴾ (الفرقان: 68 - 70)

''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو یہ کرے گا وہ سخت گناہ کو ملے گا۔ اس کے لیے قیامت کے دن عذاب دگنا کیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس میں ذلیل کیا ہوا رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا، نیک عمل تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

اگرچہ یہ قول اصح ہے۔ لیکن جس کی بابت شک ہو اس کے امر میں غور کیا جائے۔ اگر تو قرینہ سے معلوم ہو کہ اس کی توبہ سچی ہے، تو ٹھیک، جیسے ایک منافق کا حال بتلائے کہ اس کی توبہ سچی ہے تو ہم اس کی توبہ قبول کریں گے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ (النساء: 145 - 146)

''بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔ مگر

---

[1] اللہ تعالیٰ شیخ صالح عثیمین پر رحم و کرم فرمائیں۔ شاتم رسول کے مسئلے پر کیا ہی عمدہ ایمانی غیرت اور نبی کریم ﷺ کی محبت سے سرشار ان کا موقف ہے۔ بلاشبہ اہل نجد عقیدہ توحید اور نبی کریم ﷺ کی محبت میں پختگی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ (ناشر)

وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر لیا۔''
غرض یہ قول صحیح ہے کہ اگر منافق سچی توبہ کرے تو وہ مقبول ہوگی، اور اسے قتل نہ کیا جائے گا سوائے پیغمبر ﷺ کی گستاخی کرنے والے کے اور پیغمبر ﷺ کو گالی دینے والے کے کہ ایسے شخص کی سچی توبہ بھی غیر مقبول ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مسلمان کی جان، مال اور عزت و آبرو محترم ہے اس کی دلیل "لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ" کے الفاظ ہیں۔
- اسلام کی فضیلت کہ اسلام لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا ضامن و محافظ ہے۔
- اسلام یہ توحید و رسالت کی شہادت کا نام ہے لہٰذا یہ دونوں شہادتیں دینے والا مسلمان باور کیا جائے گا۔
- مسلمان کے قتل کے جواز کی صرف یہی تین صورتیں ہیں۔ ان کے علاوہ کسی صورت میں کسی مسلمان کا قتل جائز نہیں۔
- رجم مشروع ہے۔ اس کی دلیل اَلثَّيِّبُ الزَّانِي کے الفاظ ہیں۔
- جان کے بدلے جان ہے اس کی دلیل اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ کے الفاظ ہیں۔

البتہ یہ قتل علی سبیل الجواز ہے نہ کہ بطور وجوب کے۔ کیونکہ قصاص واجب نہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرة: 178)
''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر مقتولوں میں بدلہ لینا لکھ دیا گیا ہے، آزاد (قاتل) کے بدلے وہی آزاد (قاتل) اور غلام (قاتل) کے بدلے وہی غلام (قاتل) اور (قاتلہ) عورت کے بدلے وہی (قاتلہ) عورت (قتل) ہوگی، پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے پیچھا کرنا اور اچھے طریقے سے اس کے پاس پہنچانا ہے۔''
پس اگر قصاص واجب ہوتا تو معافی کا ذکر بے محل تھا۔

- مرتد کا قتل جائز ہے۔ اس کی دلیل "وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ" کے الفاظ ہیں۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مرتد یہ مفارقِ جماعت ہوتا ہے اور اس میں اس بات کی بلیغ ترین ترغیب بھی ہے کہ آدمی جماعتِ حقہ کے ساتھ ملا اور جڑا رہے اور شکوک و شبہات کا اور الحاد و بدعات کا شکار ہو کر جماعت حقہ یعنی اہل السنۃ والجماعۃ سے الگ نہ ہو۔

وہ حالات جن میں ایک مسلمان کا قتل جائز ہوتا ہے

1157۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يَحِلُّ قَتْلُ مُسْلِمٍ إِلَّا فِيْ إِحْدَى ثَلَاثِ خِصَالٍ: زَانٍ مُحْصَنٌ فَيُرْجَمُ، وَرَجُلٌ يَقْتُلُ مُسْلِمًا مُتَعَمِّدًا فَيُقْتَلُ، وَرَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ الْإِسْلَامِ، فَيُحَارِبُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ، فَيُقْتَلُ، أَوْ يُصْلَبُ، أَوْ يُنْفَى مِنَ الْأَرْضِ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کسی مسلمان کا قتل جائز نہیں مگر تین باتوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے (1) محصن زانی کہ وہ رجم کیا جائے گا (2) وہ آدمی جو کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو (بدلے میں) وہ بھی قتل کیا جائے گا۔ (3) وہ آدمی جو اسلام سے نکل جائے اور اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ کرنے لگے کہ اسے (یا تو) قتل کیا

جائے گا یا سولی چڑھایا جائے گا یا جلا وطن کیا جائے گا۔" [1]

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**زَانٍ مُحْصَنٌ فَيُرْجَمُ**: یہ "الثَّيِّبُ الزَّانِي" کے معنی میں ہے۔

رَجُلٌ يَقْتُلُ مُسْلِمًا مُتَعَمِّدًا: یہ "النَّفْسُ بِالنَّفْسِ" کے معنی میں ہے۔ البتہ یہاں عمد کی قید مذکور ہے۔ کیونکہ قصاص قتل عمد کے بغیر نہیں آتا ہے۔

قتل عمد کی تعریف بیان ہو چکی ہے کہ یہ آدمی کا کسی معصوم الدم کو ایسے آلہ سے مار ڈالنا ہے جس کا جان لیوا ہونا غالب ہو۔ البتہ قتل عمد میں چند مزید شروط بھی ہیں، جو یہ ہیں:

⊙ ...... قاتل مکلّف ہو، یعنی عاقل اور بالغ ہو۔ لہٰذا قتلِ عمد اگر نابالغ سے ہو تو اس میں قصاص کیا قتل نہ ہوگا کیونکہ وہ غیر مکلّف ہے۔ اسی طرح قاتل اگر مجنون ہو تو اس پر بھی قصاص نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ مرفوع القلم ہے۔ لہٰذا اس کا "قتلِ خطا" تصور ہوگا۔ لہٰذا اس میں عاقلہ پر دیت آئے گی۔ البتہ بچے اور مجنون دونوں پر کفارہ واجب نہ ہوگا۔

⊙ ...... قتلِ عمد میں قصاص آنے کی یہ بھی شرط ہے کہ خود مقتول معصوم الدم ہو۔ لہٰذا غیر معصوم کے قتل میں قصاص نہ آئے گا۔ لہٰذا حربی، زانی محصن جس کے رجم کا فیصلہ ہو چکا ہو کہ ان کے قتل میں قصاص نہیں۔ البتہ جب تک کسی زانی کا رجم حاکم کے نزدیک ثابت نہیں ہو جاتا، اس سے پہلے پہلے تک زانی محصن بھی معصوم الدم ہے۔

غرض ہم "يَقْتُلُ مُسْلِمًا مُتَعَمِّدًا" کے ساتھ ان مذکورہ بقیہ شروط کو بھی ملائیں گے۔

يَخْرُجُ مِنَ الْإِسْلَامِ...... أَوْ يُنْفَى مِنَ الْأَرْضِ: کیا یہاں یہ مراد ہے کہ اس میں کفر و محاربہ دونوں جمع ہوں یا یہ مطلب ہے کہ جو بھی اسلام سے نکل جاتا ہے، گویا وہ اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ پر اتر آیا ہے؟

مذکورہ حدیث میں ان دونوں ہی معانی کا احتمال ہے۔ البتہ معروف یہی ہے کہ جو کافر تو ہوا ہو البتہ اس سے محاربہ ثابت نہ ہو تو اس کے حق میں یہ تین باتیں ثابت نہ ہوں گی۔

(1) قتل یا (2) سولی یا (3) جلا وطنی۔

تب پھر صرف کفران سزاؤں کا موجب نہیں۔ ان سزاؤں کا موجب محاربہ ہے جس کا ذکر اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوٓا أَوْ يُصَلَّبُوٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ﴾ (المائدة: 33)

"ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے

---

[1] سنن ابی داؤد: 4353۔ سنن النسائی: 101/7۔ المستدرك للحاكم: 408/4۔ سنن الدارقطنی: 81/3۔ اس حدیث کا مدار ابراہیم بن طہمان پر ہے۔ دارقطنی نے ابوبکر نیشاپوری کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے محمد بن یحییٰ سے پوچھا کہ کیا ابن طہمان کی حدیث حجت ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔ پھر دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ ابو اسحاق طالقانی تک روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن مبارک کو یہ کہتے سنا ہے کہ: ابن طہمان حدیث میں "ثبت" ہے۔ جبکہ ابن حزم نے المحلی: 303/11 میں ابن طہمان کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: العلل للدارقطنی: 255/5۔ اور زیلعی نے ابن عبدالهادی کا قول نقل کیا ہے کہ: یہ حدیث صحیح کی شرط پر ہے۔ دیکھیں: نصب الراية: 355/4.

کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں یا انھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔''

اور رہا یہ سوال کہ محاربہ کیا ہے کہ جس کی یہ سزا ہے۔ تو علماء نے بیان کیا ہے کہ محاربہ سے مراد راستہ لوٹنا، ڈاکہ مارنا، راہ گیروں سے ان کے اموال چھین لینا، مسافروں کی راہ روک کر ان کو لوٹ لینا یا اسی کوشش کے دوران مسافروں، راہ گیروں کو اسلحہ کے ذریعے جان سے مار ڈالنا ہے۔

ایسے لوگوں کی سزا مذکورہ آیات کے مطابق یہ ہے:

⊙ ...... یا تو قتل کیے جائیں۔

⊙ ...... یا ان کو سولی دے دی جائے۔

⊙ ...... یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں۔

⊙ ...... یا ان کو جلاوطن کر دیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذکورہ آیت اور حدیث الباب میں مذکور ''اَوْ'' تنویع کے لیے ہے یا تخییر کے لیے۔ تو حضرات مفسرین و فقہاء کا اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اب حضرات علماء اس میں دونوں طرف گئے، اور فرق دونوں اقوال میں یہ ہے کہ اگر ہم اس اَوْ کو تخییر کے لیے کہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ امام کو ان چاروں سزاؤں میں سے کسی ایک سزا کے دینے کا اختیار ہوگا اور اگر ہم اس کو تنویع کے لیے مانیں تو پھر یہ سزائیں حسب درجاتِ جرم ہوں گی۔ لہٰذا محاربہ کے جرم میں جس قدر سنگینی آتی جائے گی، اسی قدر اس کی سزا میں بھی سنگینی آتی جائے گی اور اب امام کو اختیار نہ ہوگا۔ بلکہ ہر جرم کی نوع کے لیے سزا کی ایک نوع ہوگی۔

⊙ ...... تب پھر اگر تو ڈاکوؤں نے صرف مسافروں کو قتل کیا تو یہ بھی قتل ہوں گے۔

⊙ ...... اور اگر ساتھ میں مال بھی لوٹا تو قتل اور سولی کی دونوں سزائیں ملیں گی۔

⊙ ...... اور اگر صرف مال لوٹا تو مخالف جانب سے ہاتھ پیر کاٹے جائیں گے۔

⊙ ...... اور اگر یہ صرف آنے جانے والوں کو خوف زدہ کرتے ہیں تو جلاوطن کیے جائیں گے۔

سولی کیسے دی جاتی ہے؟

یاد رہے کہ سولی ایک لکڑی گاڑ کر دی جاتی ہے جس کی دو شاخیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ مجرم کے دونوں بازو اس سولی پر باندھ دیے جاتے ہیں اور لوگوں میں اس کے عبرت بننے اور مشہور ہونے تک اسے سولی پر لٹکایا جائے گا۔ پھر اتار لیا جائے گا۔

مخالف جانب سے ہاتھ پیر کاٹے جانا

اگرچہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں لیکن قرآن کریم میں یہ لکھا ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، اور ہاتھ اور پیر دونوں کو گٹے سے کاٹا جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اسلام میں مسلمان کی جان محترم ہے۔

◈ حلت کی نفی تحریم کو مستلزم ہے۔

- یہ تینوں باتیں کسی کی جان لینے کو مباح کر دیتی ہیں۔
- رجم مشروع ہے، اور یہ پتھروں کے مارنے کے ذریعے جو نہ تو بڑے ہوں اور نہ چھوٹے، کسی کی جان لینے کو کہتے ہیں۔
- قصاص صرف قتل عمد میں آتا ہے۔
- مرتد ہو جانے والے کا خون مباح اور ہدر ہوتا ہے۔
- محارب کو یہ کڑی سزائیں ملیں گی جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

خونوں کی حرمت کا بیان

1158۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فِي الدِّمَاءِ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''روزِ قیامت سب سے پہلے لوگوں میں جس بات کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خونوں کے بارے میں ہوگا۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......فِي الدِّمَاءِ: اس کی تقدیری عبارت ''اَلْقَضَاءُ فِي الدِّمَاءِ'' ہے، اور مراد قتل ہے۔ یعنی روزِ قیامت لوگوں میں سب سے پہلے جس بات کا فیصلہ کیا جائے گا وہ فیصلہ قتلوں کے بارے میں ہوگا۔

غرض روزِ قیامت رب تعالیٰ ہر ظلم کا فیصلہ فرمائیں گے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں اور کافروں میں بھی فیصلہ فرمائیں گے، اور خونوں اور قتلوں کا فیصلہ سب سے پہلے اس لیے کیا جائے گا کیونکہ یہ سب سے بڑی جنایت ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- روز قیامت لوگوں میں انصاف کیا جائے گا۔ اس کی دلیل ''أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ'' کے الفاظ ہیں۔
- لوگوں میں قتل کے فیصلے کیے جائیں گے۔
- خونوں اور جانوں کی حرمت اور احترام۔
- رب تعالیٰ کے لیے عدل کا اثبات۔ کیونکہ رب تعالیٰ لوگوں میں فیصلہ کریں گے اور ہر حق والے کو اس کا حق دیں گے۔
- جس سے دنیا میں کسی کا حق وصول نہ کیا جا سکا، اس سے وہ حق آخرت میں وصول کیا جائے گا، اور قیامت میں حق کی وصولی زیادہ اشد اور زیادہ رسوائی کا باعث ہوگی کیونکہ یہ سب کے سامنے ہوگی۔

غلام کا قصاص آزاد سے لینے کا بیان

1159۔ وَعَنْ سَمُرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَ

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو ہم (بدلے میں)

---

[1] صحيح البخاري: 6864- صحيح مسلم: 1678.

عَبْدَهُ جَدَعْنَاهُ)).

اسے قتل کریں گے اور جس نے اپنے غلام کی ناک کاٹی تو (بدلے میں) ہم بھی اس کی ناک کاٹیں گے۔" ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ عَنْ سَمُرَةَ، وَقَدِ اخْتُلِفَ فِي سَمَاعِهِ مِنْهُ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، اور یہ حسن بصری کی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں سے ہے۔ اور حسن بصری کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ بِزِيَادَةِ ((وَمَنْ خَصَى عَبْدَهُ خَصَيْنَاهُ)). وَصَحَّحَ الْحَاكِمُ هَذِهِ الزِّيَادَةَ.

اور سنن ابی داود اور سنن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "اور جس نے اپنے غلام کو خصی کیا، ہم بھی اسے خصی کریں گے،" امام حاکم نے اس اضافہ کو صحیح قرار دیا ہے۔

روایة الحدیث :......اس روایت میں انقطاع کی علت بیان کی گئی ہے کیونکہ حسن بصری کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع کے ثبوت میں اختلاف ہے۔ تب پھر بیچ میں ایک مجہول راوی بھی ضرور ہوا، اور یہی مجہول راوی اس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ ہے۔ لیکن اکثر علماء نے حسن بصری کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع کو ثابت اور صحیح کہا ہے۔ گو ایک قول یہ ہے کہ حسن بصری نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے صرف عقیقہ سے متعلق ہی ایک حدیث سنی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حسن بصری حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے جو بھی روایت کرتے ہیں اس کو سماع پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ اگرچہ حسن بصری میں تدلیس ہے لیکن وہ تدلیس محتمل ہے۔ جبکہ ان کی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کثرت کے ساتھ ہے۔ اس لیے درست یہ ہے کہ یہ روایت متصل ہے نہ کہ منقطع۔ اسی لیے امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح جبکہ امام ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ: مراد اپنا مملوکہ غلام ہے، تب پھر لازم آیا کہ قاتل آزاد اور مقتول غلام ہو۔

مَنْ جَدَعَ: یہ ناک کاٹنے کو کہتے ہیں۔ یہ الفاظ اس بات کو مقتضی ہیں کہ ناک کاٹنے والا آقا اور جس کی ناک کاٹی گئی ہے، وہ اس کا اپنا غلام ہو۔

وَمَنْ خَصَى: یہ سنن ابی داود اور سنن نسائی کی روایت کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ بھی اس بات کو مقتضی ہیں کہ خصی کرنے والا خود آقا ہو اور وہ اپنے غلام کو خصی کرے۔ پچھلے صفحات میں یہ اختلاف مفصل ذکر کیا جا چکا ہے کہ کیا آقا کو اپنے غلام کو قتل کر دینے کے بدلے قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ آقا کو اپنے غلام کے قتل کے بدلے قتل کیا جائے گا، تب پھر دوسرے کے غلام کو قتل کر دینے کے بدلے بدرجہ اولیٰ قتل کیا جائے گا۔

فائدہ:......معلوم ہوا کہ غلام کو اطراف بدن کی بابت بھی آزاد سے قصاص دلوایا جائے گا۔ اس کی دلیل "مَنْ جَدَعَ

---

❶ مسند احمد: 10/5- سنن ابی داؤد: 4515- جامع الترمذی: 1414- سنن النسائی: 21/8- سنن ابن ماجہ: 2663- المستدرك للحاكم: 408/4- امام ترمذی العلل لابی طالب، ص: 223 میں فرماتے ہیں: میں نے اس حدیث کے بارے میں جب امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ابن المدینی یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرا مذہب بھی یہی ہے۔ (کہ یہ حدیث بیان کیے جانے کے لائق ہے)۔ ابن حزم نے المحلی: 213/4 میں اس حدیث کا زبردست دفاع کیا ہے۔

عَبْدَهُ جَدَعْنَاهُ" کے الفاظ ہیں۔

اگرچہ بعض علماء نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ آقا اور غلام میں اور آزاد اور غلام میں قتل کے سوا میں کوئی قصاص نہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ آزاد اور غلام میں دونوں قسم کا قصاص ہے۔ کیونکہ جب آزاد سے غلام کی جان کا قصاص لیا جا سکتا ہے تو جان سے کم میں قصاص بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا۔

بیٹے کے قتل کا والد سے قصاص لینے کا حکم

1160۔ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا يُقَادُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُوْدِ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ مُضْطَرِبٌ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''بیٹے کے قتل کا والد سے قصاص نہ لیا جائے گا۔''[1]

اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے جبکہ ابن جارود اور بیہقی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ روایت مضطرب ہے۔

شرح :...... یہ مسئلہ مفصل مذکور ہو چکا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر باپ اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ تو صحیح یہ ہے کہ اولاد کے قتل کا باپ سے قصاص لیا جائے گا۔

رہا قصاص نہ لینے کا قول تو اس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے جو ضعیف ہے۔

پھر ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ باپ تو اولاد کے وجود کا سبب ہے، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ یہی اولاد باپ کے اِعدام کا سبب بنے۔ لیکن یہ دلیل بے حد علیل اور ساقط ہے۔ وہ یوں کہ اولاد کو قتل کر دینے کے نتیجہ میں باپ کا قصاص میں مارا جانا کہ اس میں اولاد اپنے باپ کے اِعدام کا سبب نہیں بنی بلکہ اِعدام کا سبب خود باپ کا فعل ہے جو نفسِ قتل ہے۔

کافر کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم

1161۔ وَعَنْ أَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ: قُلْتُ لِعَلِيٍّ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ مِنَ الْوَحْيِ غَيْرَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ: لَا، وَالَّذِيْ فَلَقَ الْحَبَّةَ، وَبَرَأَ النَّسَمَةَ، إِلَّا فَهْمٌ يُعْطِيْهِ اللّٰهُ تَعَالَى رَجُلًا فِي الْقُرْآنِ، وَمَا فِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ. قُلْتُ: وَمَا فِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ؟ قَالَ: الْعَقْلُ وَفِكَاكُ الْأَسِيْرِ، وَأَنْ لَا يُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ)).

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا تم لوگوں (یعنی اہل بیت) کے پاس قرآن کے سوا بھی وحی کی کوئی بات ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جو دانہ کو پھاڑ (کر اس کو اگا) تی ہے اور جو ہر جاندار کو پیدا کرتی ہے۔ نہیں (ہمارے پاس قرآن کے علاوہ وحی کی کوئی بات نہیں) سوائے اس سوجھ بوجھ کے جو رب تعالیٰ قرآن کی بابت کسی بندے کو عطا فرماتا ہے اور (سوائے) ان باتوں کے جو اس صحیفہ میں (لکھی) ہیں۔ میں نے پوچھا: (تو پھر) اس

---

[1] مسند احمد: 16/1- جامع الترمذی: 1400- سنن ابن ماجه: 2662- المنتقى لابن جارود: 788- سنن البيهقي: 38/8- امام دارقطنی نے العلل: 107/2- میں اس روایت کے مرسل ہونے کو درست قرار دیا ہے۔

صحیفہ میں کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: دیت (کے احکام ہیں) اور قیدی کو چھڑانے کا حکم ہے اور یہ کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا۔ [1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

اس اثر کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

روافض کا ایک باطل عقیدہ اور اس کا رد

شرح:......حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ کے اس سوال کا سبب روافض کا یہ باطل عقیدہ تھا کہ حضرات اہل بیت کے پاس قرآن کریم کے علاوہ بھی ایک صحیفہ ہے جس میں کچھ خاص احکام ہیں جو یا تو اہل بیت کے ساتھ خاص ہیں یا بزعم خویش اس میں اہل بیت کے لیے امامت و وصیت اور خلافت وغیرہ کے خصوصی احکام ہیں۔

چنانچہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے قسم کھا کر اس بات کا رد فرمایا۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرات اہل بیت کے پاس کسی خاص مصحف ہونے کا دعویٰ جناب علی رضی اللہ عنہ کی شانِ عالی مقام میں زبردست قدح ہے کیونکہ جناب علی رضی اللہ عنہ تو قسم کھا کر اس عقیدہ کا رد فرما رہے تھے۔ لہٰذا اگر تو یہ دعویٰ صحیح ہے تب پھر جناب علی رضی اللہ عنہ کا یہ قسم کھانا کذب و افتراء ہوگا، اور جھوٹی قسم کھانا بلاشبہ کبائر میں سے ہے۔

پھر اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اس خاص صحیفہ سے ناواقف تھے جو اہل بیت کے پاس تھا تو بھی یہ کیونکر ممکن ہے کہ اہل بیت کا سب سے افضل فرد اس صحیفہ سے لاعلم ہو جو ان کے پاس تھا۔

غریب الحدیث:......لَا وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ: "لا" یہ حرف نفی ہے جو ہمیشہ قسم سے پہلے لایا جاتا ہے۔ البتہ یہ قسم کی نفی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ یہ تاکید کے لیے ہوتا ہے اور اس سے مخاطب کی تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔

اور حبہ سے مراد جنس ہے اور یہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى﴾ (الانعام: 95)

''بے شک اللہ دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔''

پس پھر "حبة" سے مراد جملہ غلے ہوں گے کہ رب تعالیٰ ان کو پھاڑ کر ان سے اگاتا ہے۔

وَبَرَأَ النَّسَمَةَ: نسمہ یہ ہر جاندار مخلوق کو کہتے ہیں، اور بَرَأَ کا معنی پیدا کرنا ہے۔

إِلَّا فَهْمٌ: اس کو منصوب اور مرفوع دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ منصوب ہونے کی صورت میں یہ مستثنیٰ ہوگا جبکہ مرفوع ہونے کی صورت میں یہ "شیءٌ" سے بدل ہوگا، اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: "الا شیءٌ هو الفهم الذی......" یعنی سوائے ایک شے کے جو وہ فہم ہے جسے رب تعالیٰ......

يُعْطِيهِ اللّٰهُ رَجُلًا فِي الْقُرْآنِ: فہم کی بابت صرف قرآن کا ذکر کیا حالانکہ اس کا تعلق سنت سے بھی ہے۔ تو یہ سوال کے مطابق تھا کیونکہ سائل کا سوال تھا ہی قرآن کے بارے میں کہ آپ لوگوں کے پاس قرآن کا کوئی زائد علم بھی ہے تو جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس قرآن کا صرف زائد علم ہے، اور یہ بات بدیہی ہے کہ فہم قرآن میں سب لوگ برابر نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 6915.

چنانچہ بعض لوگوں کو من جانب اللہ قرآن کا زائد فہم نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے ایک ہی آیت سے دس مسائل اخذ کیے جبکہ بعض پانچ سے بھی زیادہ مسائل اخذ نہ کر سکے۔

وَمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ: یہ احادیث پر مشتمل ایک صحیفہ تھا جو جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا۔ تب پھر مذکورہ "مَا" موصولہ ہے۔ **قُلْتُ: وَمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ:** یہاں مذکورہ "مَا" استفہامیہ ہے۔

الْعَقْلُ: مراد دیت ہے، اور یہ اس دیت کو کہتے ہیں جس کا تحمل عاقلہ کرتی ہے، اور یہ قتل خطا میں آتی ہے، اور لفظ عقل عقال سے مشتق ہے جو چوپائے اور بالخصوص اونٹ کو باندھنے کی رسی کو کہتے ہیں۔ کیونکہ دیت بھرنے والا دیت کے اونٹ کو لا کر اس کے مستحقین کے پاس باندھ دیتا ہے، اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اور مراد یہ ہے کہ فہم قرآنی کے علاوہ ایک یہ صحیفہ ہے جس میں ایک تو دیت کے مسائل مذکور ہیں۔

فِكَاكُ الْأَسِيرِ: یہ دوسری بات ہے جو اس صحیفہ میں لکھی تھی۔ اسیر سے مراد مسلمان اسیر ہے۔ پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ جیسے بھی بن پڑے مسلمان قیدیوں کو کفار کی قید سے چھڑائیں۔ چاہے فدیہ دے کر یا مال دے کر یا بدلے میں کافروں کے قیدی دے کر مسلمان قیدی چھڑائے جائیں۔

وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ: اس صحیفہ میں مذکور یہ تیسری بات تھی کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے گا۔

لفظ مسلم یہاں نکرہ ہے جو نفی کے تحت آیا ہے لہٰذا یہ عموم پر دلالت کر رہا ہے اور یہ نیک اور بد دونوں مسلمانوں کو شامل ہے۔

اسی طرح لفظ کافر میں بھی عموم ہے اور یہ یہودی، نصرانی، مجوسی، صابی، وثنی، دہریہ، کیمونسٹ غرض ہر قسم کے کافر کو شامل ہے۔ اسی طرح یہ لفظ ذمی اور مستامن کافر کو بھی شامل ہے۔

غرض ایک مسلمان کو کسی کافر کے بدلے کسی حال میں قتل نہ کیا جائے گا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مذکورہ حدیث کا محل استدلال اور شاہد وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ کے الفاظ ہیں۔
- اہل سنت والجماعت پر یہ رب تعالیٰ کا بے حد احسان ہے کہ اس نے امت پر روافض کے کذب وافتراء کو خود حضرات اہل بیت کے ہاتھوں جن کے یہ نام لیوا ہیں، اور بالخصوص جناب علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے عالم آشکار فرمایا جن کو یہ لوگ بزعم خویش امام الائمہ اور معصوم سمجھتے ہیں۔
- بنا دوسرے کے کہے بھی قسم اٹھا سکتے ہیں جبکہ معاملہ نازک، اہم اور سنگین ہو۔
- قسم میں مقسم علیہ کے مناسب الفاظ لانا بلاغت کے اسلوب میں سے ہے۔
- اللہ تعالیٰ بندوں میں سے جس کو چاہے فہم وفراست کی نعمت سے نواز دے۔
- جناب علی رضی اللہ عنہ سنت کی حفاظت کا بے حد اہتمام فرماتے تھے۔ اس لیے انہوں نے نہایت اہم باتوں کو ایک صحیفہ میں لکھ کر محفوظ کر رکھا تھا۔
- اس حدیث میں ان لوگوں پر بھی رد ہے جو صحیفہ پڑھ کر حدیث روایت کرنے والوں پر طعن کرتے ہیں۔ جبکہ صحیفہ سے

روایت روایت من الصدر سے احفظ اور اضبط ہوتی ہے۔

- جنابِ ابی جحیفہ رضی اللہ عنہ دین کا علم سیکھنے کے بے حد حریص تھے، اور یہ ان کی بے حد عظیم فضیلت ومنقبت ہے۔
- دیت ثابت ہے اور یہ عاقلہ پر واجب ہے جس کی تفصیل دیات کے بیان میں آ جائے گی۔
- مسلمان قیدی کو کفار اشرار کے دستِ ستم کیش سے چھڑانا واجب ہے۔ گو کہ مذکورہ حدیث میں اس کی صورت مذکور نہیں لیکن جیسے بھی بن پڑے مسلمان قیدی کو چھڑایا جائے۔
- کافر کے بدلے مسلمان کا قتل منع ہے۔
- روافض کے اس دعویٰ کا رد کہ حضرات اہل بیت کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی تھی جو ان کے پاس موجود صحیفوں میں محفوظ تھی۔

معاہد کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم

1162۔ وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ ، وَقَالَ فِيْهِ: ((الْمُؤْمِنُونَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ، وَيَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ، وَهُمْ يَدٌ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ، وَلَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ، وَلَا ذُو عَهْدٍ فِيْ عَهْدِهِ)).

امام احمد، امام ابو داؤد، اور امام نسائی نے ایک اور طریق سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں کہ: سب ایمان والوں کے خون (عفت وعصمت میں) یکساں ہیں اور ان کے (دیے) ذمہ (عہد اور امان) کے لیے ان میں کا ایک بھی کوشش کرے گا اور یہ اپنے غیروں پر ایک ہاتھ ہیں، اور کسی مومن کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا اور نہ کسی عہد والے کو اس کے عہد کی مدت کے دوران (ہی قتل کیا جائے گا)۔ [1]

وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ**: یعنی مومنوں کے خون باہم یکساں حرمت والے ہیں، لہٰذا جس نے کسی بھی مسلمان کو قتل کیا، اس کا قصاص لیا جائے گا۔

وَيَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ: ذمہ سے مراد دیا ہوا عہد وامان ہے، اور ادنیٰ سے مراد ایک ہے۔ یعنی اگر مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی کسی کو کوئی عہد، ذمہ یا امان دے دیا ہے تو سب مسلمان اس کی پاسداری کریں گے۔ کیونکہ اس کا دیا عہد اور امان سب مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے۔

وَهُمْ يَدٌ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ: سِوَاهُمْ سے مراد کفار ہیں، اور يَدٌ سے مراد قوت ہے۔ یعنی مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ کفار اشرار کے مقابلہ میں یک جان بن کر رہیں اور دشمنوں کے مقابلہ میں کندھے سے کندھا ملا کر سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہوں۔

ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ: ذُو یہ صاحب کے معنی میں ہے۔ گویا کہ یہ جملہ "وَيَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ" کی تاکید

---

[1] مسند احمد: 119/1۔ سنن ابی داؤد: 4530۔ سنن النسائی: 19/8۔ المستدرك للحاكم: 153/2۔ امام حاکم نے اس حدیث کے متعدد شواہد ذکر کیے ہیں۔ جبکہ ابن حزم نے المحلی: 354/10۔ میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

ہے۔ کیونکہ جس کو عہد دے دیا گیا، اس کا قتل اس کے عہد کے زمانہ تک جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اب وہ معصوم ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر کسی عہد والے کو کسی نے قتل کر دیا تو کیا قصاص میں اس کے قاتل کو قتل کیا جائے گا؟ تو اگر تو اس کا قاتل کافر ہوا تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا لیکن اگر وہ مسلمان ہوا تو قتل نہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں، وہ واضح ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ سب ایمان والوں کے خون حرمت وعصمت میں باہم یکساں ہیں۔ لہٰذا نیک مومن کے بدلے میں بد، بد کے بدلے میں نیک، جاہل کے بدلے عالم اور مجنون کے بدلے عاقل، نابالغ کے بدلے بالغ اور عورت کے بدلے مرد کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور ایسا ہی اس کے برعکس بھی ہے۔ البتہ بعض علماء کے ہاں چند صورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں: غلام کے بدلے آزاد اور اولاد کے بدلے باپ کو قتل نہ کیا جائے گا۔ اس پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے کہ صحیح قول ان صورتوں میں بھی یہی ہے کہ قصاص آئے گا۔

◈ اگر کوئی ایک مسلمان کسی کو عہد دے دے تو اس کا احترام اور پاسداری سب پر واجب ہوگی۔

◈ امت مسلمہ پر واجب ہے کہ وہ اپنے مشترک دشمن کے سامنے یکجا ہو جایا کریں۔ اس کی دلیل "وَهُمْ يَدٌ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اتفاق واتحاد سے باہر نکل جانے والا ان میں سے شمار نہ ہوگا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں سب مسلمانوں کا یک جان ہونا واجب ہے لہٰذا جسے مسلمانوں کی پروا نہیں اور دشمنوں کے مقابلہ میں ان کا ساتھ نہیں دیتا، وہ ان میں شمار نہ ہوگا۔

◈ معلوم ہوا کہ ایمان واسلام کو دوسرے امور پر برتری حاصل ہے۔ اسی لیے تو کافر کے بدلے مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا۔

◈ جس کافر کو عہد دے دیا گیا، اس کا خون محفوظ ہو گیا۔ لہٰذا جب تک اس کا عہد باقی ہے، اسے قتل نہ کیا جائے گا۔ البتہ اگر وہ خود ہی عہد توڑ دے تو اس کے خون کی عصمت جاتی رہے گی۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کافر کو بھی عصمت مل جایا کرتی ہے۔ اس کی دلیل "وَلَا ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ یاد رہے کہ عصمت والے کل چار لوگ ہیں: مسلمان، ذمی، معاہد اور مستامن۔

مسلمان کی تعریف ظاہر ہے، اور ذمی وہ ہوتا ہے جو دارالاسلام کی حفاظت وحمایت کے تحت رہ رہا ہوتا ہے، وہ ہمارے ذمہ میں ہے، اس کو پہنچنے والی کسی بھی قسم کی تکلیف کے اہلِ اسلام جوابدہ ہیں، اور ہم اس سے اس حفاظت کے بدلے جزیہ لیں گے اور معاہد وہ ہے جو ہماری زیر ولایت وحکومت تو نہ رہتا ہو اور ہم سے جدا ہو، البتہ وہ ہمارے ساتھ امن کا معاہدہ کر کے اپنے ملک اور علاقہ میں رہ رہا ہو، اور نہ تو وہ ہم پر زیادتی کرتا ہو، اور نہ اس معاہدہ کی رو سے ہم اس پر کوئی زیادتی کریں گے۔

بظاہر یہی صورت مستامن کی بھی ہے۔ البتہ معاہد و مستامن میں یہ فرق ہے کہ عہد دو جماعتوں میں ہوتا ہے۔ جیسے مسلمانوں اور کافروں کی جماعتوں میں ہونے والے عقد کو معاہدہ کہا جائے گا۔ جبکہ مستامن ایک فرد کے ساتھ خاص ہے۔ یہ وہ

شخص ہے جسے ہم وقتی طور پر امان دے دیں تا کہ وہ ہمارے علاقوں میں آ کر خرید وفروخت اور تجارت کر سکے۔

جان پر جنایت کرنے کا حکم

1163۔ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه: ((أَنَّ جَارِيَةً وُجِدَ رَأْسُهَا قَدْ رُضَّ بَيْنَ حَجَرَيْنِ، فَسَأَلُوهَا، مَنْ صَنَعَ بِكِ هٰذَا؟ فُلَانٌ؟ فُلَانٌ؟ حَتَّى ذَكَرُوا يَهُودِيًّا فَأَوْمَأَتْ بِرَأْسِهَا، فَأُخِذَ الْيَهُودِيُّ، فَأَقَرَّ، فَأَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُرَضَّ رَأْسُهُ بَيْنَ حَجَرَيْنِ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (ایک مرتبہ) ایک لڑکی اس حال میں (جاں بلب) پائی گئی کہ اس کا سر دو پتھروں میں کچل دیا گیا تھا۔ لوگوں نے اس لڑکی سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ (ظلم) کس نے کیا ہے؟ (کیا) فلاں نے (یا) فلاں نے، یہاں تک لوگوں نے ایک یہودی کا نام لیا۔ تو اس لڑکی نے سر کا اشارہ کر دیا (کہ ہاں! میرے ساتھ یہ سلوک اسی یہودی نے کیا ہے)۔ سو وہ یہودی گرفتار ہو گیا، اور اس نے اقبال جرم کر لیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا کہ اس کا سر (بھی اسی طرح) دو پتھروں کے درمیان کچل دیا جائے۔ (جس طرح اس نے اس لڑکی کا سر کچلا تھا)۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ لفظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:...... جَارِيَةٌ: اس لفظ کا اطلاق کم سن بچی پر بھی ہوتا ہے اور کنیز اور باندی پر بھی ہوتا ہے۔

قَدْ رُضَّ بَيْنَ حَجَرَيْنِ: یعنی اس کا سر دو پتھروں میں رکھ کر اوپر والا پتھر مار کر کچل دیا گیا تھا۔ یہ لڑکی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی کہ لوگوں نے اسے جان کنی کی اس حالت میں دیکھ لیا۔

فَسَأَلُوهَا: یا تو لڑکی کے اہل نے اس قاتل کا پتا پوچھا تھا یا ان لوگوں نے پوچھا تھا جن کو وہ لڑکی ملی تھی۔ اب لوگوں نے اندازوں سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ تو نہیں، یا وہ تو نہیں۔

لازم ہے کہ انہوں نے یا تو کسی قریبی کے بارے پوچھا ہوگا یا اس کے بارے پوچھا ہوگا جس کی بابت انہیں شبہ تھا۔

فَأَوْمَأَتْ بِرَأْسِهَا: غرض جب اس یہودی کا نام آیا جس نے یہ ظلم ڈھایا تھا تو اس جاں بلب لڑکی نے سر کے اشارہ سے بتلا دیا کہ ہاں یہی ہے۔ چنانچہ وہ یہودی گرفتار کر لیا گیا اور اس نے اقرار بھی کر لیا کہ واقعی یہ ظلم اسی نے ڈھایا ہے۔

فَأَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُرَضَّ رَأْسُهُ بَيْنَ حَجَرَيْنِ: شاید یہ سزا بعض لوگوں کے نازک دلوں پر بے حد گراں گزرے لیکن اس آدمی کے لیے یہ سزا ذرا بھی لرزہ خیز نہیں جسے اس بات کا قرار واقعی شعور ہو کہ اس ظالم قاتل نے بھی تو ایک ننھی اور معصوم بچی کو اس ظالمانہ طریق سے مارا تھا۔ لہٰذا ظلم کے بدلے کا عقلی تقاضا یہی ہے کہ اس ظالم کو بھی ویسی ہی سزا دی جائے جیسا اس نے دوسرے پر ظلم کیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں مدینہ میں یہودی باقی اور رہتے تھے۔

[1] صحيح البخاري: 6876- صحيح مسلم: 1672.

◈ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دخولِ کفار کی ممانعت کے حکم کی بابت مدینہ کی حرمت مکہ کی حرمت جیسی نہیں۔
◈ معلوم ہوا کہ یہودی مال کے بے حد حریص ہیں اور وہ مال کے حصول کے لیے نہایت گھناؤنی اور از حد شرمناک حرکت کرنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے۔ چنانچہ اس کمینہ یہودی نے محض چند زیور چھیننے اور ہتھیانے کے لیے اس بچی کو ایسی بے دردی سے مار ڈالا۔
◈ معلوم ہوا کہ جان کنی میں مبتلا شخص کا قول بھی معتبر ہے۔ اسی لیے اس لڑکی کے قول کو لیا گیا جو جان کنی کے عالم میں مبتلا تھی۔ البتہ یہ شرط ہے کہ ابھی تک اس کے فکر میں تغیر نہ آیا ہو۔ (یعنی ہوش وحواس سلامت ہوں)
◈ اشارہ یہ عبارت کا قائم مقام ہے۔ چنانچہ لڑکی کے سر کے اشارہ کو قول کے درجہ میں لیا گیا۔
◈ متہم کو تہمت اور الزام کے تحت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر تو تہمت ثابت ہو جائے تو سزا دی جائے گی وگرنہ اسے بری کر دیا جائے گا۔
◈ عموماً خون کبھی چھپتا نہیں۔ رب تعالیٰ کی قدرت کی عجب نیرنگی ہے کہ خونی نے جتنا بھی چھپ کر خون کیا ہو، لیکن خون بولتا ہے اور آخر قاتل پکڑا جاتا ہے۔
◈ جنایت کرنے والے کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا جائے گا جیسی اس نے جنایت کی تھی۔
◈ عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک لڑکی کے بدلے مرد کو قتل کیا۔

نابالغ اور مجنون کی جنایت کا حکم

1164- وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضي الله عنه: ((أَنَّ غُلَامًا لِأُنَاسٍ فُقَرَاءَ قَطَعَ أُذُنَ غُلَامٍ لِأُنَاسٍ أَغْنِيَاءَ، فَأَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ، فَلَمْ يَجْعَلْ لَهُمْ شَيْئًا)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: چند غریب لوگوں کے ایک لڑکے نے بعض امیر لوگوں کے ایک لڑکے کا کان کاٹ ڈالا، وہ خدمت نبوی میں (اس بات کی شکایت لے کر) حاضر ہوئے (اور قصاص کا مطالبہ کیا)۔ پس نبی کریم ﷺ نے ان (امیروں کے لڑکے) کے لیے (دیت یا ضمان میں سے) کچھ بھی مقرر نہ فرمایا۔ ❶

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ ثلاثہ نے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:..... غُلَامًا: اس لفظ کا اطلاق نابالغ لڑکے پر ہوتا ہے۔

قَطَعَ: بظاہر یہ کان کاٹنا عمداً تھا۔ کیونکہ حدیث میں اس کا ذکر مطلق ہے، اور افعال میں اصل یہ ہے کہ جب ان کا ذکر مطلق ہو تو ان کا صدور قصد وارادہ سے ہوتا ہے۔

فَأَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ: یعنی ان امیر لوگوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اپنے بچے پر ہونے والی زیادتی کی دادرسی چاہی اور دیت یا قصاص کا مطالبہ کیا۔

---

❶ مسند احمد: 438/4۔ سنن ابی داؤد: 4590۔ من طریق احمد، سنن النسائی: 25/8۔ امام ابن کثیر "تفسیر القرآن العظیم: 63/2" میں فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد قوی ہے، اور اس کے رجال سب کے سب ثقہ ہیں۔

فَلَمْ يَجْعَلْ لَهُمْ شَيْئًا: یعنی آپ ﷺ نے ان امیر لوگوں کو دیت یا قصاص میں سے کچھ نہ دلوایا۔ کیونکہ جنایت کرنے والا نابالغ تھا، اور نابالغ سے قصاص معتذر ہے، اور جب قصاص معتذر ہو تو دیت واجب ہوتی ہے۔لیکن یہاں دیت بھی معتذر تھی۔ کیونکہ دیت جانی کے عاقلہ پر آتی ہے اور مذکورہ صورت میں وہ تنگدست تھے۔اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان فقراء پر سے دیت کو ساقط فرما دیا۔

رہا یہ سوال کہ اگر عاقلہ پر سے دیت ان کے فقیر ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جائے تو کیا بیت المال کے ذمہ آئے گی یا نہیں؟ تو مذکورہ حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔اس لیے علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ دیت یا تو دفاع عن النفس کے باب سے ہے یا تحمیلِ عاقلہ (عاقلہ پر دیت ڈالنے) کے باب سے ہے۔لہٰذا اگر تو یہ تحمیل عاقلہ کے باب سے ہے تو عاقلہ کے تنگدست ہونے کی صورت میں دیت ساقط ہو جائے گی کیونکہ اب دیت کو ان پر ڈالا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ تنگدست ہیں۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دو اہم مسائل مذکور ہیں:

(1) ایک یہ کہ نابالغ سے قصاص معتذر ہے۔

(2) دوسرا یہ کہ اگر عاقلہ تنگدست ہو تو اس پر سے دیت ساقط ہو جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نابالغ سے کوئی قصاص نہیں۔ کیونکہ وہ غیر مکلف ہے۔
- دیت کی بابت دو احتمال اوپر ذکر کیے گئے ہیں کہ دراصل دیت ہے کس باب سے۔لیکن اگر ہم دوسرے احتمال کو لیں کہ دیت تحمیل عاقلہ میں سے ہے تو نابالغ کے فعل عمد کی صورت میں عاقلہ پر دیت آئے گی۔
- عاقلہ کے تنگدست ہونے کی صورت میں ان پر سے دیت ساقط ہو جائے گی۔

زخم جب تک گھل نہ جائیں ان میں قصاص جاری نہ کیا جائے

1165۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ: أَنَّ رَجُلًا طَعَنَ رَجُلًا بِقَرْنٍ فِي رُكْبَتِهِ، فَجَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: أَقِدْنِي، فَقَالَ: ((حَتَّى تَبْرَأَ))، ثُمَّ جَاءَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: أَقِدْنِي، فَأَقَادَهُ، ثُمَّ جَاءَ إِلَيْهِ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! عَرَجْتُ، فَقَالَ: ((قَدْ نَهَيْتُكَ فَعَصَيْتَنِي، فَأَبْعَدَكَ اللّٰهُ، وَبَطَلَ عَرَجُكَ)) ثُمَّ نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُقْتَصَّ مِنْ جُرْحٍ حَتَّى يَبْرَأَ صَاحِبُهُ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک آدمی نے ایک سینگ دوسرے کے گھٹنے پر مار کر اسے زخمی کر دیا۔ پس اس زخمی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! مجھے (اس سینگ مارنے والے سے) قصاص دلوائیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(نہیں) یہاں تک کہ تم صحت یاب ہو جاؤ۔'' پھر وہ آدمی (دوبارہ) حاضر خدمت ہوا اور عرض کرنے لگا کہ: مجھے قصاص دلوائیے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اسے قصاص دلوایا۔ پھر (کچھ دنوں بعد) اس زخمی نے حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں تو لنگڑا ہو گیا ہوں۔ (اس لیے جتنا قصاص لیا گیا وہ تو تھوڑا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ محض ایک چوٹ ہے پر اس چوٹ نے تو مجھے لنگڑا بنا دیا ہے۔

اس لیے اب میرا قصاص بھی اس قدر لیا جائے۔ یعنی جیسے میں لنگڑا ہوا ہوں اسے بھی لنگڑا بنایا جائے) اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے تمہیں (اس وقت جب زخم تازہ تازہ تھا، قصاص لینے سے) روکا تھا (کہ ذرا اس زخم کا نتیجہ دیکھ لو، پھر اس کے مطابق قصاص لیں گے) پر تم نے میری بات نہ مانی، سو (اب) اللہ تمہیں (اپنی رحمت سے) دور کرے اور تیرا یہ لنگڑا پن اکارت گیا (کہ جانی سے قصاص لیا جا چکا ہے، اور ایک مرتبہ قصاص لینے کے بعد دوبارہ قصاص نہیں لیا جاتا) پھر نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرما دیا کہ زخم کا قصاص (نہ) لیا جائے یہاں تک کہ زخمی صحت یاب ہو جائے۔''[1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيّ، وَأُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام دار قطنی نے روایت کیا ہے، اور اس حدیث میں مرسل ہونے کی علت بیان کی گئی ہے۔

غریب الحدیث:...... بِقَرْنٍ: بھیڑ وغیرہ کا سینگ۔

طَعَنَهُ: یعنی اس کے گھٹنے میں وہ سینگ دے مارا اور اسے زخمی کر دیا۔

أَقِدْنِي: یعنی مجھے اس کا قصاص دلوایئے۔

حَتَّى تَبْرَأَ: یعنی ایک دفعہ اس زخم کا اثر اور نتیجہ دیکھ لیا جائے تاکہ پھر اس کے مطابق اس کا قصاص لیا جائے۔

فَأَقَادَهُ: یعنی آپ ﷺ نے اسے قصاص دلوا دیا۔ رہا یہ سوال کہ یہ قصاص کس طرح دلوایا؟ تو جیسے اس نے سینگ مارا تھا، اسے بھی سینگ سے یا اس سے ملتی جلتی کس چیز کے ذریعے اس کے گھٹنے میں زخم لگوایا گیا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (البقرة: 194)

''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

ثُمَّ جَاءَ إِلَيْهِ: یعنی قصاص لے لیے جانے کے کچھ عرصہ بعد وہ پہلا زخمی پھر آ گیا اور کہنے لگا کہ وہ زخم تو بگڑتے بگڑتے یہاں تک پہنچ گیا کہ اب میں مستقل لنگڑا ہو گیا ہوں۔ اس لیے میرا قصاص پورا لیا جائے اور اسے بھی لنگڑا بنایا جائے۔

قَدْ نَهَيْتُكَ: یہ نہی "حَتَّى تَبْرَأَ" کے الفاظ میں موجود ہے۔ کیونکہ اس کی تقدیری عبارت یہ ہے کہ ((لَا أُقِيدُكَ حَتَّى تَبْرَأَ)) ''میں تمہارا قصاص نہ لوں گا۔ یہاں تک تم صحت یاب ہو جاؤ۔''

فَأَبْعَدَكَ اللّٰهُ: یہ خبر بھی ہو سکتی ہے اور بددعا بھی۔ اس کی تفصیل بارہا بیان ہو چکی ہے۔

---

[1] مسند احمد: 217/2۔ سنن الدارقطنی: 88/3۔ اس حدیث میں یہ علت ہے کہ اس حدیث کو ابان اور سفیان نے عمرو بن دینار سے اور وہ محمد طلحہ بن یزید بن رکانہ سے روایت کرتے ہیں اور محمد بن طلحہ اسے بلا واسطہ نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت کرتے ہیں۔ (کیونکہ محمد بن طلحہ صحابی نہیں ہیں)۔ دیکھیں: تهذيب السنن لابن قيم: 212/12۔ التحقيق لابن الجوزي: 316/2.

لہٰذا اگر تو یہ بددعا ہے تو نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کی بنا پر ہے اور اگر خبر ہے تو مطلب یہ ہے کہ اب اللہ نے تمہیں اس جانی سے دور کر دیا ہے۔ کیونکہ تم اس سے قصاص لے چکے ہو۔

ثُمَّ نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُقْتَصَّ مِنْ جُرْحٍ حَتَّى يَبْرَأَ صَاحِبُهُ : پھر نبی کریم ﷺ نے ایک مستقل ضابطہ مقرر فرما دیا کہ جب تک زخم گھل نہیں جاتے قصاص نہ لیا جائے۔ تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ زخم دراصل تھا کتنا؟ اور اس نے کتنا سرایت کیا؟ تب معلوم ہوگا کہ دیت یا قصاص میں سے کیا واجب ہوتا ہے۔

مضمونِ حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ زخم جب تک گھل نہیں جاتے، ان کی وجہ سے واجب ہونے والی دیت یا قصاص کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اس لیے جب تک زخم گھل نہیں جاتے، اس وقت تک قصاص نہ لیا جائے اور نہ دیت ہی واجب کی جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جان سے کم میں قصاص لینا جائز ہے۔ یعنی قصاص فیما دون النفس جائز ہے۔
- زخموں میں قصاص میں ان کے گھلنے تک کا انتظار واجب ہے تا کہ دیت یا قصاص کی تعیین ممکن ہو سکے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے زخموں کے گھلنے سے قبل قصاص لینے سے منع فرمایا ہے۔
- اگر زخم گھلنے سے قبل قصاص لے لیا گیا تو بعد میں زخم کا سرایت کر جانا اور پھیل کر مزید نقصان پہنچا دینا غیر مضمون ہوگا۔ اس کی دلیل بَطَلَ عَرَجُكَ کے الفاظ ہیں۔ جبکہ یہ آدمی قصاص لے لیے جانے کے بعد آیا تھا اور بتلا رہا تھا کہ اس کا زخم تو اور زیادہ پھیل گیا ہے۔ اس لیے گزشتہ قصاص تھوڑا تھا۔ چنانچہ اس مزید نقصان کا بھی قصاص لیا جائے۔
لیکن نبی کریم ﷺ نے قصاص لے لیے جانے کے بعد زخم کے سرایت کر جانے کو اکارت، باطل اور غیر مضمون قرار دے دیا۔
- معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ نہ ماننے کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے۔ جیسے اس شخص نے نبی کریم ﷺ کی بات نہ مانی تو نتیجہ میں لنگڑا ہو گیا۔
- زخموں کے قصاص میں تاخیر کی حکمت اس واقعہ سے بخوبی سمجھ میں آ گئی۔

حمل پر جنایت کا حکم

1166، 1167۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: اقْتَتَلَتِ امْرَأَتَانِ مِنْ هُذَيْلٍ، فَرَمَتْ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى بِحَجَرٍ، فَقَتَلَتْهَا وَمَا فِي بَطْنِهَا، فَاخْتَصَمُوا إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَضَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنَّ دِيَةَ جَنِينِهَا غُرَّةٌ: عَبْدٌ أَوْ وَلِيدَةٌ، وَقَضَى بِدِيَةِ الْمَرْأَةِ عَلَى عَاقِلَتِهَا وَوَرَّثَهَا وَلَدَهَا وَمَنْ مَعَهُمْ، فَقَالَ حَمَلُ بْنُ النَّابِغَةِ الْهُذَلِيُّ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، كَيْفَ يَغْرَمُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: قبیلہ ہذیل کی دو خواتین آپس میں لڑ پڑیں، (یہ دونوں ایک دوسرے کی سوکنیں تھیں) اتنے میں ایک نے دوسری کو ایک پتھر مار کر مار ڈالا، اور ساتھ میں اس کے پیٹ کا بچہ بھی مار ڈالا۔ پس وہ لوگ (اپنا) جھگڑا لے کر خدمت نبوی حاضر ہوئے۔ سو (سارا ماجرا سن کر) نبی کریم ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جنین (یعنی پیٹ کے بچے) کی دیت میں غُرّہ آئے گا (اور غُرّہ یہ) غلام یا باندی (ہے) اور اس بات کا فیصلہ فرمایا کہ اُس (مقتولہ) عورت کی دیتِ اس

مَنْ لَا شَرِبَ وَلَا أَكَلَ؟ وَلَا نَطَقَ وَلَا اسْتَهَلَّ، فَمِثْلُ ذَلِكَ يُطَلُّ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّمَا هَـذَا مِـنْ إِخْـوَانِ الْكُهَّـانِ، مِنْ أَجْلِ سَجْعِهِ الَّذِي سَجَعَ)).

(قاتلہ) عورت کے عاقلہ پر آئے گی، اور اس دیت کا وارث اس عورت کی اولاد کو اور جو ان کے ساتھ تھا، اس کو (یعنی عورت کے خاوند کو) ٹھہرایا۔ اس پر حمل بن نابغہ ہذلی کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! بھلا جس نے نہ پیا اور نہ کھایا، اور نہ بولا اور نہ رویا، وہ ضمان کا باعث کیونکر ہوسکتا ہے۔ سو ایسے کی تو کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی۔ (یہ سن کر) نبی کریم ﷺ نے (حمل بن نابغہ کو) اس مسجَّع کلام کی وجہ سے جو اس نے کیا تھا، یہ فرمایا: "یہ تو کاہنوں کے جیسا ہے۔" ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:......اِقْتَتَلَتْ: یہ اقتتال سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک دوسرے کو ضرب لگانے کو کہتے ہیں نہ کہ قتل کرنے کو (دوسرے لفظوں میں اقتتال سے مراد جھگڑا کرنا ہے چاہے اس میں دست و گریباں ہونا ہو یا ہاتھا پائی ہو)۔

وَمَا فِي بَطْنِهَا: مراد جنین ہے۔ چنانچہ جب پتھر کھانے سے وہ عورت مرگئی تو اس دوران اس کے پیٹ سے مردہ بچہ بھی باہر نکل آیا۔ **فَاخْتَصَمُوا إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ**: یعنی وہ لوگ اس جھگڑے کو لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے کیونکہ رب تعالیٰ کی شریعت کے فیصلے سنانے والے اور حاکم آپ ﷺ ہی تھے۔

غُرَّةٌ: یہ ہر چیز کے عمدہ حصہ کو کہتے ہیں، اور غرۃ المتاع عمدہ مال کو کہتے ہیں۔ جبکہ دیت کے باب میں غرّہ سے مراد غلام یا باندی ہے۔ تب پھر "عَبْدٌ أَوْ وَلِيدَةٌ" یہ غرّہ کا عطفِ بیان ہوگا کہ غرّہ سے مراد غلام یا باندی ہے، اور ان پر غرّہ کا اطلاق اسی لیے کیا جاتا ہے کیونکہ غلام یا باندی مال کا عمدہ اور افضل جز ہوتے ہیں۔ بے شک غلام یہ اونٹ، چوپایوں اور درہم و دینار سے عمدہ ہوتے ہیں۔

عَبْدٌ أَوْ وَلِيدَةٌ: یہ غرّہ کی تفسیر اور عطف بیان ہے، اور اَوْ یہ تخییر کے لیے ہے نہ کہ تشکیک یا تنویع کے لیے۔

وَقَضَى بِدِيَةِ الْمَرْأَةِ: مراد مقتولہ خاتون کی دیت ہے۔

عَلَى عَاقِلَتِهَا: مراد قاتلہ خاتون کا عاقلہ ہے۔ عاقلہ: یہ عاقل کی جمع ہے۔ مراد مذکر عصبہ ہیں۔

چاہے وہ ولاء کی وجہ سے ہوں یا نسب کی وجہ سے ہوں، اور ان کو عاقلہ اس لیے کہتے ہیں کہ قاتل کے یہی عصبی نسبی رشتہ دار دیت کے اونٹوں کو لا لا کر مقتول کے ورثاء کے دروازے پر باندھتے جاتے ہیں۔ تو اونٹوں کے اسی باندھنے کے (یعنی عقل کے) فعل کی وجہ سے انہیں عاقلہ کہا جانے لگا: کیونکہ عقل کا معنی ہے چوپائے کو باندھنا۔

وَوَرَّثَهَا وَلَدَهَا وَمَنْ مَعَهُمْ: "ھَا" ضمیر کا مرجع دیت ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے اس دیت کا وارث اس عورت کی اولاد کو قرار دیا، اور "وَمَنْ مَعَهُمْ" سے مراد مقتولہ عورت کا خاوند ہے جو مقتولہ کی اولاد کے ساتھ جھگڑا لے کر حاضر خدمت ہوا تھا۔ کیونکہ دیت یہ جان کا عوض ہے جو مال ہے، تو جب یہ نفس کا عوض ٹھہرا تو مقتول کے دوسرے مالوں کی طرح اس میں ترکہ

❶ صحيح البخاري: 6910- صحيح مسلم: 1681.

جاری ہوگا اور مقتول کے ورثاء اس دیت کے وارث بنیں گے۔

لَا شَرِبَ، وَلَا أَكَلَ: حمل بن نابغہ کا اشارہ جنین کی طرف تھا جو مردہ پیدا ہوا تھا۔

وَلَا نَطَقَ: مراد زبان سے بولنا ہے۔

وَلَا اسْتَهَلَّ: مراد پیدا ہو کر بچے کا رونا ہے۔

يُطَلُّ: یعنی رائیگاں جاتا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

كَيْفَ يَغْرَمُ: تو جو مردہ پیدا ہوا، نہ اس نے کھایا نہ پیا، نہ بولا نہ رویا۔ غرض اس میں زندہ لوگوں والی کوئی بات نہ تھی تو بھلا وہ اس چٹی کے واجب ہونے کا باعث کیونکر بن سکتا ہے جس کا باعث عموماً ایک زندہ شخص بنا کرتا ہے۔

إِنَّمَا هَذَا: یہ اشارہ حمل بن نابغہ ھذلی کی طرف ہے۔

مِنْ إِخْوَانِ الْكُهَّانِ: اخوان سے مراد نظیر اور مثل ہے۔ یعنی یہ کاہنوں کی طرح کلام کرنے والا ہے۔ نہ کہ کاہنوں کا نسبی یا رضاعی بھائی ہونا مراد ہے، اور ابن نابغہ کو کاہنوں کے جیسا اس لیے فرمایا کیونکہ کاہن عموماً مسجع عبارتیں لا کر لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے ہیں۔

مضمون حدیث ...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی نے کسی حاملہ عورت کو قتل کیا اور اس کے ساتھ اس کے پیٹ کا بچہ بھی مر گیا یا کسی عورت کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ تو نہ مری لیکن اس کا حمل ضائع ہو گیا تو جنین میں دیت واجب ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ سوکنوں میں ایک فطری بغض وعداوت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ان دو عورتوں میں تھی یہ دونوں سوکنیں تھیں حتیٰ کہ ایک نے جی کی جلن سے مشتعل ہو کر دوسری کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی جان سے گئی اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی ہلاک ہو گیا۔
- معلوم ہوا کہ اگر آلہ قتل تیز دھار نہ ہو اور عموماً اسے دوسروں کی جان لینے کے لیے استعمال نہ کیا جاتا ہو تو اس میں قصاص نہیں آتا۔ جیسا کہ ابتداء باب میں ذکر ہوا۔
- جنین کی دیت غرّہ یعنی ایک غلام یا ایک باندی ہے۔ لیکن اگر غرّہ نہ ملے تو پانچ اونٹ دیت دلائی جائے گی کیونکہ پانچ اونٹ ماں کی دیت کا عشر ہے۔ تب پھر ماں کی دیت پچاس اونٹ ٹھہری جو مرد کی دیت کا نصف ہے، اور اونٹ نہ میسر ہونے کی صورت میں اونٹوں کی قیمت واجب ہوگی۔
- دیت عاقلہ پر واجب ہوتی ہے، اور یہ قتل خطا اور قتل شبہ عمد میں واجب ہوتی ہے۔ البتہ قتل عمد میں دیت صرف قاتل پر ہی واجب ہوتی ہے۔ جبکہ مقتول کے اولیاء قصاص کو معاف کر دیں۔
- شریعت نے احکام میں نہایت خوب درجہ بندی کی ہے، اور ہر ایک کو اس کے درجہ میں رکھا ہے۔ اسی لیے قتل عمد کا خمیازہ قاتل کے سر رکھا ہے جبکہ قتل خطا یا قتل شبہ عمد کی دیت عاقلہ پر رکھی ہے۔
- دیت میں بھی دوسرے اموال کی طرح ورثہ جاری ہوتا ہے۔
- سجع کی تعریف بیان ہو چکی۔ سجع اگر تکلف وتصنع کے بغیر ہو تو جائز ہے ورنہ مذموم ہے۔

◈ جو حق سے معارضہ کرنے پر اتر آئے اس کی سرزنش جائز ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حمل بن نابغہ کی جسارت پر اسے کاہنوں کا ساتھی فرمایا۔

◈ معلوم ہوا کہ کاہنوں کی باتیں ملمع کی ہوتی ہیں اور وہ چکنی چپڑی باتوں سے صرف لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

وَأَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ عُمَرَ رضی اللہ عنہ سَأَلَ: مَنْ شَهِدَ قَضَاءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْجَنِيْنِ؟ قَالَ: فَقَامَ حَمَلُ بْنُ النَّابِغَةِ، فَقَالَ: كُنْتُ بَيْنَ امْرَأَتَيْنِ، فَضَرَبَتْ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى)). فَذَكَرَهُ مُخْتَصَرًا.

وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

امام ابوداود اور امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ: (ایک موقع پر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ (تم میں سے) کون جنین کی بابت نبی کریم ﷺ کے فیصلہ فرمانے کے وقت موجود تھا؟ اس پر حمل بن نابغہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ: میں ان دونوں عورتوں کے پاس تھا جب وہ دونوں باہم لڑ پڑیں...... آگے مختصر حدیث ہے۔ [1]

امام حاکم اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

دانت توڑنے میں قصاص ہے

1168۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ: أَنَّ الرُّبَيِّعَ بِنْتَ النَّضْرِ- عَمَّتَهُ- كَسَرَتْ ثَنِيَّةَ جَارِيَةٍ، فَطَلَبُوْا إِلَيْهَا الْعَفْوَ، فَأَبَوْا، فَعَرَضُوا الْأَرْشَ، فَأَبَوْا، فَأَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، فَأَبَوْا إِلَّا الْقِصَاصَ، فَأَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْقِصَاصِ، فَقَالَ أَنَسُ بْنُ النَّضْرِ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَتُكْسَرُ ثَنِيَّةُ الرُّبَيِّعِ؟ لَا، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ، لَا تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا أَنَسُ! كِتَابُ اللّٰهِ الْقِصَاصُ)) فَرَضِيَ الْقَوْمُ فَعَفَوْا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: ((إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ان کی پھوپھو ربیع بنت نضر نے ایک لڑکی کے سامنے والا دانت توڑ دیا۔ حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کے گھر والوں نے اس لڑکی والوں سے معاف کر دینے کی درخواست کی پر وہ نہ مانے، انہوں نے ضمان پیش کیا مگر وہ نہ مانے، اور خدمت نبوی میں حاضر ہو گئے اور قصاص لینے پر ہی بضد ہو گئے۔ جس پر نبی کریم ﷺ نے قصاص لینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اس پر (حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا) حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! کیا ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟ نہیں! اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! ربیع کا دانت نہ توڑا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے انس! (دیکھو کیا کہتے ہو، یہ) اللہ کا فرض کیا فیصلہ (ہے جو) قصاص (لینے کا) ہے۔ اس پر (لڑکی والے) لوگ راضی ہو گئے اور انہوں نے (حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کو) معاف کر دیا۔ تب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا لیں تو اللہ ان کی قسم ضرور

---

[1] سنن ابی داؤد: 4572۔ سنن النسائی: 21/8۔ سنن ابن ماجہ: 2641۔ صحیح ابن حبان: 6021۔ المستدرک للحاکم: 666/3۔ ابن حزم نے المحلی: 383/10 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

پوری کرتا ہے۔''❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:...... عَمَّتَهُ: یہ ''ربیع بنت نضر'' کا عطف بیان ہے۔

جَارِيَةٍ: مراد نوجوان لڑکی ہے۔

اَلْأَرْشَ: زخم کا تاوان۔ یہاں دانت کی قیمت مراد ہے۔

إِلَّا الْقِصَاصَ: یعنی نہ تو اس لڑکی والے معاف کرنے پر تیار ہوئے اور نہ چٹی لینے پر ہی آمادہ ہوئے اور اس بات پر بضد ہو گئے کہ ہم تو بس دانت کے بدلے دانت توڑیں گے۔

أَتُكْسَرُ ثَنِيَّةُ الرُّبَيِّعِ؟: یہ استفہام استعظام ہے۔ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ بن نضر نے اپنی بہن کے دانت توڑے جانے کو بہت بڑی بات سمجھا۔ کیونکہ انہیں اپنی بہن بڑی عزیز تھیں۔

لَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ، لَا تُكْسَرُ: یہ قسم دانت نہ توڑنے جانے پر تھی نہ کہ حکم رسالت پر اعتراض یا اس سے معارضہ تھا۔ بلکہ ایک نیک فال کے طور پر قسم تھی اور اس میں اللہ کے ساتھ حسن ظن تھا کہ اللہ ضرور اولیائے قصاص کے دل کو نرم کر دے گا اور وہ معاف کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا۔ وگرنہ یہ بات معلوم ہے کہ حکم رسالت کے امتثال سے امتناع یا اس پر اعتراض یا اس سے معارضہ بے حد عظیم بات ہے۔ جس کا انس بن نضر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر اور جاں نثار صحابی رسول سے تصور محال ہے۔

كِتَابُ اللهِ: مراد یہ ہے کہ قصاص کو رب تعالیٰ نے فرض کیا ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ﴾ (المائدة: 45)

''اور ہم نے اس میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان۔''

یعنی قصاص رب تعالیٰ نے فرض فرمایا ہے۔ لہٰذا جب بھی صاحب حق اس کا مطالبہ کرے گا یہ نافذ ہو گا اور اس کی یہ تنفیذ واجب ہو گی۔ غرض یہ بات سنتے ہی جناب انس بن نضر رضی اللہ عنہ سراپا تسلیم و رضا ہو گئے، اور یہ دیکھ کر اولیائے قصاص معاف کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ: مذکورہ مِن تخصیص کے لیے ہے۔ یعنی سب بندے ایسے نہیں کہ وہ اللہ پر قسم کھائیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دے۔

مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ: مذکورہ مَنْ موصولہ ہے اور اِنَّ کا اسم مؤخر ہے جبکہ مِنْ عِبَادِ اللهِ اس کی خبر مقدم ہے، اور أَقْسَمَ کا معنی حَلَفَ ہے۔ جبکہ اَبَرَّ کا معنی اَوْفَی یعنی پورا کرنا ہے۔

❶ صحيح البخاري: 2703۔ صحيح مسلم: 1675.

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

مناسبتِ حدیث:...... مذکورہ حدیث کو دانت کے قصاص کے قصہ کی مناسبت سے یہاں لے کر آئے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ چھوٹے بچے ایک دوسرے سے لڑتے لڑتے اس حد تک بھی اتر آتے ہیں کہ ایک نے دوسرے کا دانت توڑ دیا۔
- جس پر جنایت واقع ہوا سے قصاص یا دیت یا عفو میں سے ایک بات کا اختیار ہوتا ہے۔
- مجنی علیہ (جس پر جنایت ہوئی ہے، اس) سے معافی طلب کر سکتے ہیں، اور یہ ناپسندیدہ سوال کے زمرہ میں داخل نہیں۔
- قصاص وغیرہ کا حق کم سن بچے کے اولیاء کو ہوتا ہے کیونکہ معافی کا مطالبہ یا چٹی کی پیش کش حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کے اولیاء نے کی تھی۔
- اگر رب تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن ہو اور نیک فال کی نیت ہو تو رب تعالیٰ پر کسی بات کے نہ ہونے کی قسم کھا سکتے ہیں۔
- وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ ۔ ایسے کلمات کے ساتھ قسم اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ حق کے ساتھ بھیجنے والی ذات اللہ کی ہے گویا کہ یہ رب تعالیٰ کی صفت ٹھہری۔ تو معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کی صفات کے ساتھ قسم اٹھا سکتے ہیں۔
- جب تک سابقہ شریعت ہماری شریعت کے صریح خلاف نہ ہو تو اس کے احکام ہمارے لیے بھی مشروع ہیں۔ جیسے دانتوں میں حکمِ قصاص کہ جو پہلی شریعتوں پر تھا قرآنِ کریم میں نہیں یعنی قرآن کریم نے اس حکم کو سابقہ شریعتوں کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ جبکہ قرآنِ کریم نے اس امت کے لیے "والجروح قصاص" کو بیان کیا ہے۔ اب چونکہ السن بالسن کا حکم والجروح قصاص کے موافق ہے۔ اس لیے یہ حکم ہمارے لیے بھی مشروع ہے۔
- دانتوں میں بھی قصاص ہے، لیکن اس وقت جبکہ اس کو توڑ کر مسوڑھوں سے الگ کر دیا گیا ہو اور اگر دانت کا صرف ایک کنارہ توڑا ہے تو فقہاء کا مشہور قول یہ ہے کہ اس میں کوئی قصاص نہیں۔ ہاں اَرش یعنی چٹی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مقدارِ کسر اور محل کسر کا ضبط ممکن نہیں۔ یہی حکم ہڈیوں کا بھی ہے کہ اگر ان میں ضبطِ قصاص ممکن نہ ہو تو قصاص نہ آئے گا۔
- اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ جو اللہ پر قسم اٹھا لیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔
- اللہ بندے کے گمان کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے۔
- مِنْ عِبَادِ اللهِ: یہ مِنْ تبعیضیہ ہے اس لیے مذکورہ حدیث میں رب تعالیٰ پر ایسی قسم کھانے کی کوئی ترغیب یا انگیخت نہیں۔
- بندوں کے دل رب تعالیٰ کی انگلیوں میں ہیں وہ جب چاہے ان دلوں کو جدھر چاہے موڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر پہلے قصاص پر بضد تھے، اچانک معاف کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بلاشبہ ان کے دلوں کو رب تعالیٰ نے ہی موڑا تھا۔
- رب تعالیٰ کی ذات کے لیے قدرت ثابت ہے۔ اس کی دلیل لَأَبَرَّهُ کے الفاظ ہیں۔

جنایت علی النفس کی اقسام

1169- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ قُتِلَ فِي عِمِّيًّا أَوْ رِمِّيًّا بِحَجَرٍ أَوْ سَوْطٍ أَوْ عَصًا، فَعَقْلُهُ عَقْلُ الْخَطَإِ، وَمَنْ قُتِلَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو کسی اندھی جنگ میں یا تیر اندازی کے مقابلہ میں کسی پتھر یا کوڑے یا لاٹھی (وغیرہ) کے ذریعے مارا

عَمْدًا، فَهُوَ قَوَدٌ، وَمَنْ حَالَ دُونَهُ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ)).

گیا تو اس کی دیت (قتل) خطا کی دیت ہوگی اور جو عمداً مارا گیا تو یہ قصاص (والی صورت) ہے اور جو (حکم) قصاص (کی تنفیذ) میں آڑے آیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے۔''[1]

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ قَوِيٍّ.

اس حدیث کو امام ابوداود، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے قوی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......مَنْ قُتِلَ فِي عِمِّيًّا: یہ لفظ العَمَی سے ماخوذ ہے۔ یہ اس اندھی لڑائی کو کہتے ہیں جس میں نہ تو قاتل کو اس بات کا علم ہو کہ وہ دوسرے کو کیوں مار رہا ہے اور نہ مقتول کو اس بات کی خبر ہو کہ وہ کس لیے مارا جا رہا ہے۔ اسے اندھی لڑائی اور اندھی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

أَوْ رِمِّيًّا: لوگوں کا تیراندازی کرنا جس میں کسی کو قتل کر دینے کا ارادہ نہ ہو۔ لیکن بلا قصد وارادہ کوئی کسی اندھے تیر کا نشانہ بن کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بِحَجَرٍ أَوْ سَوْطٍ، أَوْ عَصًا: حجر معروف ہے۔ سوط: یہ بٹی ہوئی چمڑے کی رسی کو کہتے ہیں۔ (اردو میں اس کا نام کوڑا ہے) یہ دوسرے کو مارنے کے کام آتا ہے۔ البتہ اس کی ضرب عموماً جان لیوا نہیں ہوتی۔ یہ بیل کی دم جیسا ہوتا ہے۔ البتہ موٹائی میں اس سے باریک ہوتا ہے اور عصا بھی معروف ہے۔

فَعَلَيْهِ عَقْلُ الْخَطَإِ: عقل سے مراد دیت ہے۔ یعنی اندھی جنگ میں مارے جانے والے بے قصور میں قتل خطا والی دیت آئے گی۔ اس میں قصاص نہیں ہوتا۔ وہ اس لیے کہ عِمِّيٌّ اور رِمِّيٌّ میں تو دوسرے کو قتل کا ارادہ نہیں ہوتا۔ جبکہ حجر، سوط اور عصا یہ آلات قتل شمار نہیں ہوتے گو ان کی ضرب ناگہاں جان لیوا ہی ثابت ہو جائے۔

لہٰذا ایسے مقتول کا قتل قتل خطا شمار ہوگا اور اس میں دیت بھی قتلِ خطا والی آئے گی۔

وَمَنْ قُتِلَ عَمْدًا فَهُوَ قَوَدٌ: یعنی قتل عمد میں اصل وجوبِ قصاص ہے البتہ اولیاء کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قصاص کی بجائے دیت لینے پر راضی ہو جائیں۔

دیت خطا کیا ہے؟

یہ سو اونٹ ہیں، جن کی تفصیل مشہور مذہب کے مطابق یہ ہے کہ اس میں:

(1) بیس بنات مخاض۔ (2) بیس بنات لبون۔ (3) بیس حقے۔

(4) بیس جذعے اور (5) بیس بنی مخاض یعنی مذکر اونٹ ہوں گے۔

دیتِ شبہ عمد

فقہاء نے اس کو ارباعاً ذکر کیا ہے۔ یعنی اس میں:

(1) پچیس بنات مخاض۔ (2) پچیس بنات لبون۔

(3) پچیس حقے اور (4) پچیس جذعے آئیں گے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 4539۔ سنن النسائی: 39/8۔ سنن ابن ماجہ: 2635۔ ابن حزم (380/10) نے اس حدیث میں مرسل ہونے کی علت بیان کی ہے۔ دیکھیں: سنن الدار قطنی: 95/3۔

اور دونوں دیتوں میں یہ فرق حنابلہ کا مشہور مذہب ہے۔ پھر!

کیا اولیائے قصاص دیت سے زیادہ بھی لے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو اس میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ سو ایک قول یہ ہے کہ انہیں دیت سے زیادہ لینے کا استحقاق نہیں لہٰذا یا تو وہ قصاص لیں گے یا پھر منصوص دیت ہی لیں گے۔ جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ دیت سے زیادہ مال پر صلح کر سکتے ہیں کیونکہ اس وقت حق والے اولیاء قصاص ہیں۔ لہٰذا اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم دیت سے زیادہ نہ ملنے کی صورت میں صرف قصاص لیں گے تو وہ یہ کہہ سکتے ہیں، یہ امام احمد کا مذہب ہے۔

وَمَنْ حَالَ دُونَهُ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ: دونه میں ضمیر کا مرجع القود ہے۔ یعنی جب کسی پر قصاص کا اجراء واجب ہو گیا تو جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- افراتفری، بھگدڑ، بدامنی، انارکی اور ہنگاموں میں جو لوگ اندھی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں ان کے قتل میں دیت خطا واجب ہوتی ہے۔ جیسے دو جماعتوں میں ہنگامہ اور تصادم ہو گیا، بعد میں کسی ایک کی لاش ملی اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اسے کس نے مارا ہے تو اس کے قتل میں دیت خطا واجب ہوگی۔
- جو شے عموماً آلہ قتل تصور نہ کی جاتی ہو، اس سے کسی کو مار ڈالنے سے قصاص واجب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں قتلِ شبہ عمد والی دیت آتی ہے جس کو پیچھے ذکر کر دیا گیا ہے۔
- قصاص کے اجراء کی راہ میں رکاوٹ بننا باعث لعنت فعل ہے۔

مل کر جنایت کرنے کا حکم

1170- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا أَمْسَكَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ، وَقَتَلَهُ الْآخَرُ، يُقْتَلُ الَّذِي قَتَلَ، وَيُحْبَسُ الَّذِي أَمْسَكَ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب ایک آدمی کو ایک نے جکڑا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا تو قتل کرنے والا تو (بدلے میں) قتل کیا جائے گا جبکہ جکڑنے والا قید میں ڈالا جائے گا۔''[1]

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْصُولًا وَمُرْسَلًا، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْقَطَّانِ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ إِلَّا أَنَّ الْبَيْهَقِيَّ رَجَّحَ الْمُرْسَلَ.

امام دارقطنی نے اس حدیث کو موصول روایت کیا ہے۔ ابن قطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔ البتہ امام بیہقی نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

کسی کو مل کر قتل کرنے کی صورتیں اور ان کا حکم

شرح :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ایک نے کسی کو دبوچا اور دوسرے نے اسے مار ڈالا تو یہ دونوں جنایت کرنے والے ہیں البتہ دونوں کی جنایت میں فرق ہے، وہ یہ کہ:

(1) ایک کی جنایت دبوچنا ہے۔ (2) اور دوسرے کی جنایت قتل کرنا ہے۔

---

[1] سنن الدار قطنی: 140/3- سنن البیہقی: 50/8- حلیۃ الاولیاء لابی نُعَیم: 110/7- ابو نعیم کہتے ہیں: اس حدیث کو سفیان ثوری سے روایت کرنے میں ابو داؤد حفری متفرد ہے۔ ابن قطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جیسا کہ تحفۃ المحتاج: 443/2 میں ہے۔

اب آیا دونوں کی جنایت کا حکم ایک ہے یا مختلف، تو اس حدیث میں دونوں کا حکم مختلف بیان کیا گیا ہے، وہ یہ کہ دبوچنے والے کو قید میں ڈالا جائے گا کیونکہ اس نے مقتول کو باندھا، روکا اور دبوچا تھا۔ اسی لیے اس کو بھی قید میں بند کیا جائے گا۔ جبکہ قصاص مباشر بالقتل پر آئے گا۔ رہا یہ سوال کہ وہ قید میں کب تک پڑا رہے گا تو یہ موت تک قید رکھا جائے گا جیسے اس نے مرجانے تک مقتول کو روکے اور دبوچے رکھا تھا۔ البتہ اگر مقتول کے اولیاء دونوں کو معاف کردیں تو ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

پھر اگر دونوں قتل کرنے پر متفق ہوں تو قصاص میں دونوں قتل کیے جائیں گے۔ کیونکہ یہ دونوں اس جرم میں شریک بھی تھے اور ایک دوسرے کے مددگار بھی تھے۔ چنانچہ ایک شخص کو چند یمنیوں نے جب مار ڈالا تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر پورا صنعاء بھی اس جرم میں شریک ہوتا تو میں سب کو قصاص میں مار ڈالتا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک کام سب نے مل کر کیا تو ہر ایک دوسرے کے لیے قوت اور مدد ثابت ہوا۔

مناسب ہے کہ حدیث میں مذکورہ صورت پر ذرا تفصیل کے ساتھ مزید کلام کیا جائے۔

سب سے پہلے ایک قاعدہ شرعیہ [1] ملاحظہ ہو، وہ یہ کہ جب ایک مسئلہ میں مباشر اور سبب دونوں پائے جائیں تو ضمان مباشر پر آتا ہے نہ کہ سبب پر۔ لیکن اگر مباشرتِ فعل سبب پر مبنی ہو تو ضمان سبب پر آئے گا۔ یا اگر مباشر پر ضمان نہ ڈالی جاسکے تو ضمان متسبب (سبب بننے والے) پر آئے گا۔ ان تینوں صورتوں کو ذیل کی امثلہ سے سمجھتے ہیں۔

مثلاً ایک آدمی نے کنواں کھودا اور دوسرے نے کسی راہ چلتے کو اس میں دھکا دے کر مار گرایا تو اس صورت میں ضمان مباشر بالفعل یعنی دھکا دینے والے پر آئے گا نہ کہ متسبب یعنی کنواں کھدوانے والے پر۔

البتہ اگر کنواں کھدوانے والے نے کسی غیر مناسب جگہ پر کنواں کھدوایا تھا، جہاں اس میں لوگوں کے گرنے کے امکانات زیادہ تھے تو کنواں کھدوانے والی کی تعزیر ضرور کی جائے گی۔ یہ پہلی صورت کی مثال تھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر مباشرت سبب پر مبنی ہو تو ضمان متسبب (سبب بننے والے) پر آئے گا۔ جیسے چند لوگوں نے کسی کے قاتل ہونے کی شہادت دی۔ پھر ان کی شہادت پر اسے قصاص میں مار دیا گیا، لیکن اس کے مارے جانے کے بعد یہ لوگ اپنی شہادت سے پھر گئے اور کہنے لگے کہ: ''ہم نے جان بوجھ کر یہ گواہی اس لیے دی تھی تا کہ اسے قصاص میں مار دیا جائے۔ حالانکہ قاتل یہ نہ تھا بلکہ کوئی اور تھا'' تو اگرچہ یہ لوگ اس قصاص میں مارے جانے والے کے مارنے میں مباشر نہیں لیکن یہ مباشرت سبب پر مبنی ہے کہ یہ لوگ اس کے مارے جانے کا سبب بنے تھے اور اب اس کے قتل کا بدلہ لینے کا اور کوئی وسیلہ نہیں۔ لہٰذا انہی جھوٹی گواہی دینے والوں کو اس مارے جانے والے کے بدلے میں مارا جائے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر مباشر پر ضمان نہ ڈالی جاسکی تو ضمان سبب پر آئے گی جیسے: کوئی شیر کے سامنے کھڑا تھا کہ اتنے میں کسی دوسرے نے بٹہ مار کر شیر کو بھڑکا دیا اور شیر نے اس سامنے والے آدمی چیر پھاڑ کر ہلاک کر ڈالا۔ تو ضمان اس بٹہ مارنے والے پر آئے گا، اگرچہ یہاں یہ آدمی سبب ہے کہ اس آدمی نے خود نہیں مارا بلکہ مارا شیر نے ہے جو مباشر بالفعل ہے لیکن اس پر ضمان ڈالنا ممکن نہیں۔ اس لیے یہ ضمان شیر کی بجائے متسبب یعنی شیر کو چھیڑنے والے پر آئے گا۔

---

[1] دیکھیں: قواعد ابن رجب، ورق 127۔ المنثور فی القواعد للزرکشی: 133/1۔ الاشباہ والنظائر للسیوطی، ص: 162۔

معاہد کو قتل کر دینے کا حکم

1171۔ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْبَيْلَمَانِيِّ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَتَلَ مُسْلِمًا بِمُعَاهِدٍ، وَقَالَ: ((أَنَا أَوْلَى مَنْ وَفَى بِذِمَّتِهِ)).

عبدالرحمن بن بیلمانی سے روایت ہے کہ: نبی کریم نے ایک معاہد کے (قتل کے) بدلے (اس کے) مسلمان (قاتل) کو قتل کیا، اور (پھر) ارشاد فرمایا: ''جو اپنا ذمہ پورا کرے میں ان پر زیادہ حق رکھتا ہوں۔'' ❶

أَخْرَجَهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ هٰكَذَا مُرْسَلًا، وَوَصَلَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِذِكْرِ ابْنِ عُمَرَ فِيهِ، وَإِسْنَادُ الْمَوْصُولِ وَاهٍ.

اس حدیث کو عبدالرزاق نے یوں ہی مرسل روایت کیا ہے جبکہ امام دارقطنی نے اس اسناد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ذکر کر کے موصول روایت کیا ہے اور اس کی موصول اسناد واہی ہے۔

غریب الحدیث :......وَاهٍ: واہی کمزور حدیث کو کہتے ہیں۔یعنی اس حدیث کی موصول اسناد واہی ہے جبکہ منقطع اسناد بھی واہی ہے۔ کیونکہ اس میں صحت حدیث کی ایک شرط مفقود ہے اور وہ سند کا اتصال ہے۔

غرض یہ حدیث جہاں سند کے اعتبار سے واہی ہے، وہیں معنی کے اعتبار سے بھی واہی ہے، وہ یوں کہ جب ایک صحیح حدیث میں آ گیا ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے میں نہ مارا جائے گا، اور معاہد کا کافر ہونا معلوم ہے تب پھر یہ حدیث سند ومتن دونوں اعتبار سے ضعیف ہوئی۔ لہٰذا ایک مسلمان کو کسی معاہد کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے گا۔

البتہ معاہد کے قاتل کو تعزیری سزا ضرور ملے گی۔ جو قید، کوڑے، جلاوطنی، جرمانہ، سرکاری عہدے سے برطرفی، جائیداد کی ضبطی، تنخواہ کی بندش وغیرہ کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ تعزیر کی کوئی حد نہیں۔ یہ امام کی رائے اور اجتہاد کے سپرد ہوتی ہے۔

ایک کے بدلے جماعت کا قتل

1172۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قُتِلَ غُلَامٌ غِيلَةً، فَقَالَ عُمَرُ: ((لَوِ اشْتَرَكَ فِيهِ أَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ بِهِ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ایک لڑکا دھوکا سے (اور اچانک بے خبری میں حملہ کر کے) قتل کر دیا گیا (یہ چند لوگ تھے جو یمن کے رہنے والے تھے) اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر اس کے قتل میں (سب) صنعا والے بھی شریک ہوتے تو میں ان (سب) کو اس لڑکے کے (قتل کے) بدلے قتل کر دیتا۔ ❷

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

---

❶ مصنف عبدالرزاق: 101/10، سنن الدارقطنی: 134/3۔ امام دارقطنی نے مرسل روایت کو درست کہا ہے، اور فرماتے ہیں: ابن بیلمانی ضعیف ہے، یہ تو تب بھی حجت نہیں جب حدیث کو موصول روایت کرے تو بھلا اس کی مرسل روایت کیونکر حجت ہو سکتی ہے۔ جوزجانی کہتے ہیں: ربیعہ نے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے، انہوں نے ابن منکدر سے اور انہوں نے ابن بیلمانی سے اس روایت کو لیا ہے۔ جبکہ ابن ابی یحییٰ متروک ہے۔ اس بات کو ابن رجب نے جامع العلوم: 14/2، ص: 223 پر لکھا ہے۔

❷ صحیح البخاری: 6896.

شرح :......غیلہ کا معنی بیان کیا جاچکا ہے، یہ کسی کی بے خبری میں اس پر اچانک وار کر کے قتل کر دینے کو کہتے ہیں جس میں وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر پاتا۔

جمہور علماء کا قول ہے کہ قتل غیلہ میں بھی اولیائے مقتول کو قصاص، دیت اور عفو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ جبکہ امام مالک کا قول ہے کہ اس میں صرف قصاص ہے۔ کیونکہ اس میں بدامنی کا انتشار ہے۔ چنانچہ اس میں امام اولیائے مقتول کے معاف کر دینے کے باوجود بھی قاتل کو قصاص میں قتل ہی کرے گا۔ بلاشبہ امام مالک کا یہ قول بے حد قوی ہے کہ قتل غیلہ میں اولیائے قصاص کو کوئی خیار نہیں۔ اس میں قاتل کو ہر حال میں قتل ہی کیا جائے گا۔

لَوْ اشْتَرَكَ فِيهِ أَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ بِهِ: یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غیلہ کے جرم میں شریک چار یمنیوں کو قصاص میں قتل کروایا، اور یہ تک فرمایا کہ اگر اس جرم میں پورا صنعائے یمن بھی شریک ہوتا تو اسے بھی یہی سزا ملتی۔

بِهِ: میں "با" بدلیت کا ہے، اور تقدیری عبارت یہ ہوگی۔ "لَقَتَلْتُهُمْ قَتْلًا مُقَابِلًا لِهَذَا الْقَتْلِ" (جیسا کہ بندہ ناچیز مترجم نے اس "با" کا ترجمہ بدلیت والا کیا ہے)۔

بلاشبہ یہ ایک خلیفہ راشد جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے جس کی اقتداء واجب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ایک بدلے میں متعدد کو صرف اس صورت میں قتل کیا جائے گا جب سب شرکاء اس قتل میں ایک دوسرے کے باہم مددگار بھی ہوں اور اس کے قتل پر متفق بھی ہوں۔ یا یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فعل علی الانفراد بھی اس کے قتل کو کافی رہے۔
- تب پھر اگر ایک قتل کر چکے اور دوسرے اس کے بعد حملہ آور ہوں تو قاتل صرف وہی پہلا ایک ہی متصور ہوگا۔

دیت اور قصاص میں تخییر اور اس کی شروط

1173,1174- وَعَنْ أَبِي شُرَيْحٍ الْخُزَاعِيِّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((فَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ بَعْدَ مَقَالَتِي هَذِهِ، فَأَهْلُهُ بَيْنَ خِيَرَتَيْنِ، إِمَّا أَنْ يَأْخُذُوا الْعَقْلَ، أَوْ يَقْتُلُوا)). أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِمَعْنَاهُ.

حضرت ابو شریح الخزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "میری اس بات کے بعد جن کا مقتول مارا گیا تو اس کے اولیاء کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے یا تو وہ دیت لے لیں، (اور) یا (قاتل کو قصاص میں) قتل کر دیں۔" [1]
اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے، اور اس کی اصل صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے جو اس کے ہم معنی ہے۔

غریب الحدیث :......**بَعْدَ مَقَالَتِي هَذِهِ**: یہ فتح مکہ کے موقع کا ارشاد ہے۔ کیونکہ اسی وقت آپ ﷺ نے

---

[1] سنن ابی داؤد: 4504- جامع الترمذی: 4505- مسند احمد: 384/6- ابن حزم نے المحلی: / 168/8 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور سنن النسائی کی طرف اس حدیث کی اضافت بظاہر سبقت قلم ہے۔ وگرنہ امام موصوف نے فتح الباری: 207/12 اور الدرایۃ: 26/2 میں اس حدیث کو امام ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔

قصاص کے احکامات کو مقرر اور متعین فرمایا تھا۔

فَأَهْلُهُ: اہل سے مراد مقتول کے وہ اولیاء ہیں جو اس کے وارث بھی بنتے ہیں۔

بَيْنَ خِيَرَتَيْنِ: یہ قصاص اور دیت ہے۔ جبکہ تیسری بات عفو ہے۔ جس کا اس حدیث میں ذکر نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ فتح مکہ کے بعد اب یہ حکم تشریع بن کر مقرر ہو چکا ہے۔ اس کی دلیل "بَعْدَ مَقَالَتِي هَذِهِ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ احکام شریعت میں تجدد رفتہ رفتہ آیا تھا۔ حتیٰ کہ اخیر میں جا کر مکمل ہو گیا۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدة: 3)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔''

- قتل عمد کے اولیاء کو دیت، قصاص اور عفو میں تخییر ہوتی ہے۔
- مقتول کا معاوضہ دو ہی چیزیں ہیں ایک قصاص اور ایک دیت۔ البتہ عفو اس میں شامل نہیں۔ کیونکہ عفو مفت میں ہوتا ہے جس کا کوئی عوض نہیں ہوتا۔

1- بَابُ الدِّيَاتِ...... دیتوں کا بیان

شرح ...... **دِيَاتٌ**: ...... یہ دیت کی جمع ہے، یہ جان یا اعضا کے اتلاف کا لیا جانے والا عوض ہے، تب پھر کامل دیت وہ ہے جو جان کی ہے اور غیر کامل دیت وہ ہے جو اعضاء و اطراف میں آتی ہے۔

دیت کی مقداروں کو نبی کریم ﷺ نے خود مقرر فرمایا ہے۔ اگر چہ اس کی اصل جاہلیت میں موجود تھی لیکن نبی کریم ﷺ نے اس اصل کو برقرار رکھا۔

زخموں میں دیتوں کی مقداریں

1175- عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رضی اللہ عنہ: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَتَبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ۔ فَذَكَرَ الْحَدِيثَ . وَفِيهِ: أَنَّ مَنِ اعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتْلًا عَنْ بَيِّنَةٍ ، فَإِنَّهُ قَوَدٌ ، إِلَّا أَنْ يَرْضَى أَوْلِيَاءُ الْمَقْتُولِ ، وَإِنَّ فِي النَّفْسِ الدِّيَةَ: مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ ، وَفِي الْأَنْفِ إِذَا أُوعِبَ جَدْعُهُ الدِّيَةُ ، وَفِي الْعَيْنَيْنِ الدِّيَةُ ، وَفِي اللِّسَانِ الدِّيَةُ ، وَفِي الشَّفَتَيْنِ الدِّيَةُ ، وَفِي الذَّكَرِ الدِّيَةُ ، وَفِي الْبَيْضَتَيْنِ الدِّيَةُ ، وَفِي الصُّلْبِ الدِّيَةُ ، وَفِي الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّيَةِ .

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اہل یمن کو لکھ بھیجا...... آگے وہ طویل حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ: (نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا): ''جس نے کسی مسلمان کو ظلم کرتے ہوئے ایسے قتل کیا کہ وہ قتل گواہوں سے ثابت ہو تو وہ (یعنی اس میں) قصاص ہے۔ مگر یہ کہ اولیائے مقتول (قصاص نہ لینے پر) راضی ہوں (تو پھر ایسے قتل میں بھی قصاص نہ آئے گا، اور (دیت کی تفصیل) یہ (ہے) کہ جان کی دیت میں سو اونٹ ہیں، اور ناک (کی دیت) میں جب اس کو پورا کاٹ دیا جائے تو (پوری) دیت ہے، اور دونوں آنکھوں میں (جبکہ ان کو پھوڑ کر ان کی بینائی ضائع کر دی جائے پوری) دیت ہے، اور زبان میں

(جبکہ اس کو کاٹ کر اس کی قوتِ نطق کو ضائع کر دیا جائے، پوری) دیت ہے، اور دونوں ہونٹوں میں (جبکہ ان کو کاٹ کر ان کے ذریعے قوتِ تلفظ کو ختم کر دیا جائے، پوری) دیت ہے، اور عضو تناسل میں (جبکہ اس کو کاٹ کر جماع کرنے کی اور توالد و تناسل کی قوت ختم کر دی جائے، پوری) دیت ہے، اور خصیتین میں پوری دیت ہے، اور پیٹھ میں پوری دیت ہے، اور ایک پیر میں نصف دیت ہے۔

وَفِی الْمَأْمُوْمَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ ، وَفِی الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ ، وَفِی الْمُنَقِّلَةِ خَمْسَ عَشْرَةَ مِنَ الْإِبِلِ ، وَفِی كُلِّ أُصْبُعٍ مِنْ أَصَابِعِ الْيَدِ وَالرِّجْلِ عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ ، وَفِی السِّنِّ خَمْسٌ مِنَ الْإِبِلِ ، وَفِی الْمُوْضِحَةِ خَمْسٌ مِنَ الْإِبِلِ ، وَإِنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ ، وَعَلَى أَهْلِ الذَّهَبِ أَلْفُ دِيْنَارٍ)) .

اور (زخموں میں دیت کی تفصیل یہ ہے کہ) مأمومہ میں ثلث دیت ہے، اور جائفہ میں ثلث دیت ہے اور منقلہ میں پندرہ اونٹ ہیں (مامومہ، جائفہ اور منقلہ کی تعریف و تفصیل آگے آ جاتی ہے) اور ہاتھوں پیروں کی انگلیوں میں سے ہر انگلی میں دس اونٹ ہیں اور ایک دانت میں پانچ اونٹ ہیں، اور موضحہ میں پانچ اونٹ ہیں، اور یہ کہ مرد کو عورت کے (قتل کے) بدلے میں قتل کیا جائے گا، اور جن کے پاس سونا ہو ان پر ہزار دینار (دیت) واجب ہوگی۔ [1]

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ فِی الْمَرَاسِيْلِ ، وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ وَابْنُ حِبَّانَ وَأَحْمَدُ ، وَاخْتَلَفُوْا فِیْ صِحَّتِهِ .

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے (اپنی) مراسیل میں اور امام نسائی امام ابن خزیمہ، امام ابن جارود، امام ابن حبان اور امام احمد نے روایت کیا ہے، اور ان (ائمہ محدثین) میں اس حدیث کی صحت کی بابت اختلاف ہے۔

روایة الحدیث:......اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس کو امت میں تلقی بالقبول کا درجہ حاصل ہے اور اب یہ حدیث ''متواتر'' کے درجہ میں ہے۔ علماء نے اس مرسل حدیث کے احکام کو لیا ہے۔ یاد رہے کہ جب ایک مرسل روایت دوسری مرسل روایت کے مل جانے سے یا مسلمانوں کے اس پر عمل کرنے اور تلقی بالقبول کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہے تو وہ حجت ٹھہرتی ہے۔

تعارفِ حدیث :...... یہ ایک طویل حدیث ہے جو نبی کریم ﷺ نے اہل یمن کو لکھ بھیجی تھی، یہ طہارت، زکوٰۃ اور دیتوں کے احکام پر مشتمل ہے۔ چنانچہ امام موصوف نے اس مقام پر مذکورہ حدیث کے، ترجمۃ الباب کی مناسبت سے صرف اتنے حصہ کو ہی لیا ہے جس کا تعلق دیتوں اور ان کے احکام سے ہے۔ اب ذیل میں غریب الحدیث کے عنوان سے مذکورہ حدیث کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

غریب الحدیث:...... كَتَبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ: مراد کسی کو لکھنے کا حکم دینا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔

اِعْتَبَطَ: اعتباط یہ کسی سے ظلماً کسی شے کے لے لینے کو کہتے ہیں چاہے وہ جان ہو یا مال اور بسا اوقات اس کا اطلاق

---

[1] مراسیل ابی داؤد: 225۔ السنن الکبری للنسائی: 7508۔ الموارد لابن حبان: 793۔ المستدرك للحاكم: 55381 .

ضرب پر بھی ہوتا ہے۔

قَتْلاً: اس لیے نبی کریم ﷺ نے آگے اعتباط کی تفسیر بیان فرمادی کہ یہاں اعتباط سے مراد کسی کی ظلماً جان لینا اور اس کو قتل کرنا ہے۔

عَنْ بَيِّنَةٍ: یعنی وہ قتل گواہوں سے ثابت بھی ہوتو اس میں قصاص آتا ہے۔ یہاں تک قصاص آنے کا بیان ہے۔آگے اس بات کا بیان ہے کہ دیت کب آتی ہے۔

إِلَّا أَنْ يَرْضَى أَوْلِيَاءُ الْمَقْتُولِ: تب پھر قصاص واجب نہ ہوگا۔ چنانچہ اگر اولیائے مقتول دیت لینے یا معاف کرنے پر راضی ہو جائیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔

یہ دیت کے وجوب کی صورت ہے۔اب ذیل میں دیت کی مقادیر ذکر کی جاتی ہیں۔ پہلے پوری دیت آنے کی صورتیں ذکر کی جاتی ہیں، جو یہ ہیں:

إِنَّ فِي النَّفْسِ الدِّيَةَ: جان میں پوری دیت ہے۔لہٰذا اگر کسی نے کسی کو قتل کر دیا تو اس میں پوری دیت آئے گی جو یہ ہے:مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ: یعنی کسی مرد کو قتل کر دینے سے پوری دیت آئے گی، اور پوری دیت سو اونٹ ہیں چاہے یہ اَخْمَاسًا ہوں اور چاہے اَرْبَاعًا ہوں جس کی تفصیل مذکور ہو چکی، اور "مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ" یہ "الدِّيَةَ" کا عطف بیان ہے۔

البتہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہوتی ہے۔اسی طرح کافروں کی دیتیں بھی باہم مختلف ہیں۔

اب جان کے بعد اَطراف یعنی اعضائے بدن ہیں، ان میں کس کس عضو میں پوری دیت آتی ہے، تو وہ یہ ہیں:

وَفِي الْأَنْفِ إِذَا أُوعِبَ جَدْعُهُ الدِّيَةُ: اُوْعِبَ یہ اُسْتُوْعِبَ کے معنی میں ہے، اور جدع یہ قطع کے معنی میں ہے۔

یہ اطراف میں سے پہلا عضو بدن ہے۔لہٰذا اگر کسی نے دوسرے کی پوری ناک کاٹ دی تو اس میں پوری دیت آئے گی۔

ناک چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے، بانسا، دو نتھنے اور دونوں کے درمیان نرم ہڈی کی دیوار۔لہٰذا اگر کسی نے ناک کو اگلے تینوں حصوں سمیت جہاں تک نرم حصہ ہوتا ہے وہاں تک کاٹ دیا تو اس میں پوری دیت آئے گی۔ کیونکہ اس نے بدن کے ایک حصہ کو کاٹ ڈالا جو پورے بدن میں صرف ایک ہوتا ہے۔

وَفِي اللِّسَانِ الدِّيَةُ: اگر کسی نے دوسرے کی زبان اس طرح کاٹی کہ اس کی قوت گویائی جاتی رہی تو اس میں پوری دیت آئے گی کیونکہ زبان بھی ایک ایسا عضو ہے جو پورے میں ایک ہی ہوتا ہے۔

وَفِي الشَّفَتَيْنِ الدِّيَةُ: جب دونوں ہونٹوں میں پوری دیت ہے تو پھر ایک ہونٹ میں آدھی دیت آئے گی۔

الشَّفَة: ہونٹ: یہ وہ گوشت ہے جو دانتوں کے اوپر ڈھلکا ہوتا ہے اور اس نے دانتوں کو مسوڑھوں کی جڑ سے لے کر آخر تک ڈھانپا ہوتا ہے۔اسی طرح نچلا ہونٹ ہے جو نیچے کے دانتوں کو مسوڑھوں سے لے کر اوپر تک ڈھانپتا ہے اور ہونٹ صرف اتنے ہی ہوتے ہیں جو سرخ رنگت کے ہوتے ہیں۔

وَفِي الذَّكَرِ الدِّيَةُ: کیونکہ پورے بدنِ انسانی میں یہ ایک ہی ہوتا ہے۔لہٰذا اس کے کاٹنے میں پوری دیت آئے گی۔

وَفِي الْبَيْضَتَيْنِ الدِّيَةُ: بیضتین سے مراد خصیتین ہیں۔تب پھر ایک خصیہ کو ضائع کرنے میں آدھی دیت آئے گی۔

وَفِي الصُّلْبِ الدِّيَةُ: صلب سے مراد پیٹھ ہے۔لہٰذا اگر کسی کی کمر توڑ دی تو اس میں پوری دیت آئے گی۔ کیونکہ کمر

پورے بدن میں ایک ہی ہے۔

وَفِي الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّيَةِ: کیونکہ بدن انسانی میں دو پیر ہوتے ہیں، اس لیے ایک پیر کو کاٹنے میں نصف دیت آئے گی۔ یہی حکم دونوں ہاتھوں کا ہے۔

دو اہم ضابطے

اب تک کی دیتوں سے ایک ضابطہ شرعیہ یہ سامنے آیا کہ کسی عضو بدن کی منفعت کو ضائع کرنا یہ پوری جان کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ تو جیسے پوری جان ضائع کرنے میں کامل دیت ہے اسی طرح کسی پورے عضو کی منفعت کو ضائع کرنے پر بھی پوری دیت ہے۔ چاہے یہ ضائع کرنا اس عضو کے اِعدام سے ہو یا اس کو بیکار کر دینے سے ہو۔ جیسے آنکھوں کی منفعت کی ضیاع کی دو صورتیں ہیں:

(1) ایک یہ کہ دونوں آنکھوں کو ان کے خول سے ہی نکال دیا جائے۔ ضیاع کی یہ صورت اِعدام کی صورت ہے۔

(2) دوسری یہ کہ آنکھوں میں سلائی پھیر کر ان کی بینائی ختم کر دی جائے کہ ضیاع کی یہ صورت آنکھوں کی بینائی کو اکارت کر دینے کی ہے۔

جبکہ دوسرا اہم قاعدہ شرعیہ یہ بیان ہوا ہے کہ بدن میں جو اعضاء ایک ایک ہیں جیسے ناک، زبان، ذَکر، اور کمر کہ ان کے ضیاع میں پوری دیت ہے۔ جبکہ جو اعضاء دو دو ہیں جیسے دو پیر، دو ہاتھ دو آنکھیں، دو ہونٹ، عورت کے دو پستان کہ ان دونوں کے اتلاف میں تو پوری دیت آئے گی جبکہ ایک کے اتلاف میں نصف دیت آئے گی۔

رہے وہ اعضاء جو تین اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں، اس پورے عضو میں تو پوری دیت آئے گی۔ جبکہ اس کے ایک جز کے اتلاف میں ایک ثلث دیت آئے گی۔ جیسے ناک کہ یہ دو نتھنوں اور ایک بانسے پر مشتمل ہوتی ہے تو ایک نتھنے کے کاٹنے میں یا صرف ناک کا بانسا کاٹنے میں ثلث دیت آئے گی، اور دو نتھنوں میں دو ثلث جبکہ پوری ناک کو نرم حصے تک کاٹنے میں پوری دیت آئے گی۔ پھر جو عضو چار اجزاء پر مشتمل ہو، اس کے ایک جز کے اتلاف میں ربع دیت آئے گی۔ جیسے پلکیں کہ یہ دونوں آنکھوں میں کل چار ہیں۔ ان میں کل دیت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ لہٰذا جو جتنی پلکیں کاٹے گا، اسی حساب سے اس پر دیت آ جائے گی۔ اس کے بعد بدنِ انسانی میں ایسا عضو نہیں پایا جاتا جو پانچ یا چھ، یا سات، یا آٹھ، یا نو اجزاء مشتمل ہو۔ البتہ دس اجزاء پر مشتمل عضو ہاتھ اور پیر ہیں کہ دونوں کی دس دس انگلیاں ہیں۔

لہٰذا دونوں ہاتھوں کے کاٹنے میں پوری دیت ہے۔ ایک ہاتھ کاٹنے میں نصف دیت ہے، ایک انگلی کے کاٹنے میں دیت کا دسواں ہے۔ اسی حساب سے باقی انگلیوں میں بھی دیت کا آنا ہے۔ پھر اگر کسی نے دونوں ہاتھوں کی صرف انگلیاں ہی کاٹیں اور ہتھیلیاں رہنے دیں تو بھی پوری دیت آئے گی۔ کیونکہ ہاتھ کی اصل منفعت انگلیاں ہی ہیں، تو جیسے کسی عضو کے اِعدام میں دیت ہے۔ اس طرح اس کی منفعت کے اتلاف میں بھی دیت ہے۔ جیسا کہ پہلے ضابطہ میں بیان ہوا۔

یہی جملہ تفصیل پیروں کی انگلیوں کی بھی ہے۔

پھر ہر انگلی کے تین حصے ہوتے ہیں لہٰذا ہر انگلی کی دیت آگے مزید تین ثلث پر مشتمل ہوگی۔ لہٰذا اگر کسی نے ایک انگلی کا ایک پورا کاٹا تو اس پر دیت کے دسویں کا تہائی آئے گا، اور دو پوروں میں عشر دیت کے دو تہائی آئیں گے۔

البتہ انگوٹھے کی دیت کے دو حصے کیے جائیں گے کیونکہ انگوٹھے میں دو پورے ہوتے ہیں۔لہٰذا اس کے ایک پورے کے کاٹنے میں عشر دیت کا نصف آئے گا۔

دو اور اہم ضابطے

رہا کسی عضو کو ضرب لگا کر شل کر دینا تو اس میں بھی پوری دیت آئے گی۔سوائے ناک اور کان کے کہ اگر وہ شل کر دیے گئے اور اب وہ حرکت کرنے سے قاصر ہیں تو ان میں دیت نہ آئے گی۔کیونکہ ناک کی بڑی منفعت جمال ہے۔جس پر ناک کے بے حس ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اسی طرح کان کی اصل منفعت اس کی قوتِ سماعت ہے۔لہٰذا اس کی حرکت کے ختم ہو جانے سے سماعت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔غرض یہ ایک اہم ضابطہ ہے کہ اگر ضرب لگا کر کسی عضو کو شل کر دیا تو اس میں دیت آئے گی سوائے ناک اور کان کے۔

دوسرا اہم ضابطہ یہ ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کے کسی شل عضو پر جنایت کی تو اس میں بھی دیت نہیں۔چنانچہ اگر کسی نے دوسرے کا شل ہاتھ کاٹ دیا تو اس میں کوئی دیت نہیں۔کیونکہ اپنی منفعت کے معدوم ہونے کی وجہ سے وہ عضو نہ ہونے کے برابر تھا لہٰذا اس کے حق میں قطع اور عدم قطع دونوں برابر تھے۔البتہ کان اور ناک یہاں بھی اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہیں۔لہٰذا اگر کسی نے شل کان یا ناک کاٹ ڈالی تو دیت آئے گی۔کیونکہ ان دونوں اعضاء کی منفعت میں جمال بھی داخل ہے۔جو ان کے قطع کر دینے کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔غرض ناک اور کان ان دونوں ضابطوں میں باقی اعضاء سے مختلف ہیں۔

جس جنابت میں دیت نہ آتی ہو

رہا یہ سوال کہ جس جنایت میں دیت نہیں آتی تو پھر اس جنایت میں کیا واجب ہوتا ہے؟

تو اس میں ایک عادل کا فیصلہ جاری ہوتا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ مجنی علیہ (جس پر جنابت ہوئی ہے) کو جنایت سے قبل اور بعد میں ایک غلام تصور کر کے اندازہ کیا جائے گا کہ اگر یہ غلام ہوتا تو جنایت سے قبل اس کی قیمت کیا ہوتی اور اس جنایت کے بعد اس کی قیمت کیا ہوتی، قیمت کا یہی فرق چٹی بن کر جانی پر واجب ہوگا۔

اب ذیل میں ان جنایات اور زخموں کو بیان کیا جاتا ہے جن میں پوری دیت واجب نہیں ہوتی۔اس کی تفصیل یہ ہے:

زخموں میں دیت

وَفِي الْمَأْمُومَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ: مامومہ اس زخم اور چوٹ کو کہتے ہیں جو دماغ کی جڑ تک جا پہنچے۔اس مقام پر ایک فقہی و اصطلاحی فرق بھی ملحوظ رہے۔علماء کے نزدیک "شجّہ" اس زخم کو کہتے ہیں جو صرف چہرے اور سر پر لگے جبکہ باقی اعضائے بدن میں لگنے والے زخم کو جرح کہتے ہیں۔

اب دماغ قدرتی طور پر ایک خول میں بند ہے۔اگر کسی نے سر پر چوٹ مار کر اس خول کو توڑ ڈالا اور اس زخم کا اثر دماغ تک جا پہنچا تو اس کو "ماموم" کہا جائے گا۔پس اگر تو زخم ماموم ہو تو اس میں ثلث دیت ہے،اور یہ حکم بھی تب ہے جب یہ چوٹ موت کا باعث نہ ہو،لہٰذا اگر یہی چوٹ کسی کی موت کا سبب بن گئی تو اس میں پوری دیت آئے گی۔

اور ثلث دیت میں تینتیس اونٹ اور ایک اونٹ کا ثلث ہے۔اور چونکہ اونٹ کی تبعیض ممکن نہیں اس لیے ثلثِ ابل کی دراہم ودنانیر سے قیمت لگا کر اس کو باقی کی دیت میں شامل کیا جائے گا۔

وَفِي الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ: جائفہ اس چوٹ کو کہتے ہیں جو پیٹ کے اندر تک جا پہنچے۔ تب پھر لامحالہ یہ جنایت پیٹ پھاڑ کر اندر تک جائے گی۔ اس میں بھی ثلث دیت ہے۔ بشرطیکہ یہ زخم موت کا باعث نہ ہو کہ پھر پوری دیت آئے گی۔

وَفِي الْمُنَقِّلَةِ خَمْسَ عَشْرَةَ مِنَ الْإِبِلِ: منقلہ اس ضرب کو کہتے ہیں جو ہڈی کو توڑ کر اسے بدن کے باقی حصہ میں گھسا دے۔ اس کی دیت پندرہ اونٹ ہیں۔

خَمْسَ عَشْرَةَ: یہ مرکب بنائی ہونے کی وجہ سے مبنی بر فتح ہے۔ وگرنہ یہ کلمہ مبتدا کے محل میں ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ محلاً مرفوع ہے۔

وَفِي كُلِّ إِصْبَعٍ مِنْ أَصَابِعِ الْيَدِ وَالرِّجْلِ عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ: اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔

وَفِي السِّنِّ خَمْسٌ مِنَ الْإِبِلِ: لہٰذا ہر دانت کی دیت پانچ اونٹ ہوگی چاہے اس کی منفعت دوسرے دانت سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کوئی دانت پکڑنے یا نوچنے یا کاٹنے کے کام آتا ہے تو کوئی دانت غذا کو پیسنے، چبانے، توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے کام آتا ہے۔ اسی طرح کوئی دانت جھنجھوڑنے کے بھی کام آتا ہے۔ جبکہ کوئی دانت جمال کا باعث ہوتا ہے۔

غرض کسی دانت کی منفعت جو بھی ہو، اس کی دیت پانچ اونٹ ہی ہے۔ اب دانت عموماً بتیس ہوتے ہیں، تب پھر پوری بتیسی توڑنے کی دیت ایک سو ساٹھ اونٹ بنے گی۔ حدیث کے ظاہر سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔ لہٰذا جن علماء نے بتیسی میں سو اونٹ دیت کا قول کیا ہے، وہ حدیث کے ظاہر اور جمہور علماء کی رائے کے خلاف ہے۔

وَفِي الْمُوضِحَةِ خَمْسٌ مِنَ الْإِبِلِ: موضحہ یہ سر اور چہرے کے اس زخم کو کہتے ہیں جس میں ہڈی ننگی ہو جائے۔ چاہے وہ سوئی کی نوک کے بقدر ہی کیوں نہ ہو۔ غرض جو جنایت موضحہ ہو، اس میں پانچ اونٹ ہیں۔

ان تین مذکورہ زخموں کے علاوہ ہاشمہ اور دامغہ نامی زخم بھی ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

وَإِنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ: یہ مسئلہ بارہا مفصل مذکور ہو چکا ہے۔ اس باب میں راجح قول اور واضح دلائل یہ ہیں کہ عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے گا۔

وَعَلَى أَهْلِ الذَّهَبِ أَلْفُ دِينَارٍ: یعنی اگر تو دیت ان لوگوں پر آتی ہو جن کے پاس اونٹ ہیں تو وہ گزشتہ مذکورہ تفصیل کے مطابق اونٹوں سے دیت دیں گے، اور جن کے پاس دراہم و دنانیر ہیں یعنی وہ تجارت پیشہ یا ملازم یا دست کار د کاریگر لوگ ہیں تو ان پر دیت ایک ہزار دینار ہے، اور یہ لوگوں پر تسہیل کی غرض سے ہے۔ تاکہ دراہم و دنانیر والوں کو اونٹ خریدنے کا اور اونٹوں والوں کو اونٹ بیچنے کا پابند نہ بنایا جائے۔

قتل خطا کی دیت

1176,1177- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((دِيَةُ الْخَطَإِ أَخْمَاسًا، عِشْرُونَ حِقَّةً، وَعِشْرُونَ جَذَعَةً، وَعِشْرُونَ بَنَاتِ مَخَاضٍ، وَعِشْرُونَ بَنَاتِ لَبُونٍ، وَعِشْرُونَ بَنِي لَبُونٍ)).
أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''قتل خطا کی دیت اخماساً ہے (جس کی تفصیل یہ ہے کہ دیت تو سو اونٹ ہے جس میں) بیس حقے، بیس جزعے، بیس بنات مخاض، بیس بنات لبون اور بیس بنی لبون ہوں گے۔''

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

وَأَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ بِلَفْظِ: ((وَعِشْرُوْنَ بَنِيْ مخاض)) بَدَلَ ((بَنِيْ لَبُوْنٍ)).

جبکہ ائمہ اربعہ نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: (کہ وہاں) ''بنی لبون'' کی جگہ ''بیس بنی مخاض'' کے الفاظ ہیں۔

وَإِسْنَادُ الْأَوَّلِ أَقْوَى، وَأَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ مَوْقُوْفًا، وَهُوَ أَصَحُّ مِنَ الْمَرْفُوْعِ.

پہلی روایت کی اسناد زیادہ قوی ہے، اور ابن ابی شیبہ نے ایک اور طریق سے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے۔ جو مرفوع سے زیادہ صحیح ہے۔ ❶

غریب الحدیث :......**دِيَةُ الْخَطَأِ أَخْمَاسًا**: اخماسًا یہ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے، اور تقدیری عبارت "تَجِبُ اَخْمَاسًا" ہوگی۔ تب پھر دِيَةُ الْخَطَأِ یہ مبتداء ہے اور "تَجِبُ اَخْمَاسًا" یہ جملہ فعلیہ خبریہ مذکورہ مبتداء کی خبر ہے۔ **عِشْرُونَ حِقَّةً**: یہ تفصیل بعد الاجمال ہے۔ یاد رہے کہ حقہ، جذعہ، بنت مخاض اور بنت لبون وغیرہ پر تفصیلی کلام زکوۃ کے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔

پس جب کسی نے خطا قتل کر دیا تو اس کے عاقلہ پر اسی ترتیب سے دیت واجب ہوگی۔ پھر دیت میں اصل اونٹ دینا ہے۔ لیکن اگر کسی کے پاس اونٹ نہ ہوں تو وہ دراہم و دنانیر سے دیت دے گا۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔ اب ذیل میں ان دونوں احادیث کے فوائد ذکر کیے جاتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کتابت (یعنی تحریر، وثیقہ، دستاویز، پروانہ، حکم نامہ، خط وغیرہ) پر عمل جائز ہے اس کی دلیل "كَتَبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ" کے الفاظ ہیں، اور یہیں سے حدیث کی کتابت کا جواز بھی معلوم ہو گیا۔
- قتل عمد میں قود ہے۔ اس کی دلیل مَنِ اعْتَبَطَ کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ قصاص بینہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کی دلیل "قَتْلًا عَنْ بَيِّنَةٍ" کے الفاظ ہیں۔
- اگر اولیائے قصاص دیت پر لینے پر راضی ہو جائیں تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے، اور اس کے لیے سب اولیاء کا راضی ہونا شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اگر بعض نے قتل و قصاص کو ساقط کر دیا تو باقیوں کی طرف سے بھی ساقط ہو جائے گا۔
- دیتوں میں اصل اونٹ ہے۔ اس کی دلیل "فِي النَّفْسِ الدِّيَةَ" کے الفاظ اور ان کے بعد "مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ" کی تفسیر ہے۔
- جان میں پوری ایک دیت ہے۔ لہٰذا اگر قتل میں ایک سے زائد لوگ شریک تھے تو اس پوری دیت کو ان پر تقسیم کر دیا جائے گا، اور ایک سے زائد دیت نہ آئے گی۔

---

❶ جب مرفوع اور موقوف روایت میں تعارض ہو جائے تو حکم مرفوع کا ہوتا ہے کیونکہ اس میں زیادہ علم ہوتا ہے اور وہ حدیث کی نبی کریم ﷺ کی طرف نسبت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ادنیٰ تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل مرفوع اور موقوف روایت میں سرے سے کوئی تعارض ہوتا ہی نہیں۔ کیونکہ صحابی رسول حدیث کو یا تو راوی بن کر روایت کرتا ہے یا پھر اس پر حکم لگا کر حدیث کو روایت کرتا ہے۔ پھر اگر وہ حکم لگاتے ہوئے حدیث روایت کرتا ہے تو سامع اس کو صحابی کا قول سمجھ بیٹھتا ہے، اور اگر وہ اس حدیث کو راوی بن کر روایت کرتا ہے تو وہ اسے نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کر کے روایت کرے گا۔ تب پھر واقع میں وقف اور رفع میں کوئی فرق نہیں ہے، اور ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، اور ہم سند کے صحیح ہونے کے وقت مرفوع حدیث کو لیں گے۔ کیونکہ حدیث میں اصل اس کو روایت کرنا ہے نہ کہ اس پر حکم لگانا۔

◈ بدن کا جو عضو ایک ہے جیسے زبان، ناک، کمر، ذکر وغیرہ کہ ان کے اتلاف میں پوری دیت ہے۔ کیونکہ ان کی نظیر بدن میں نہیں ہوتی۔لہٰذا ان کا اتلاف بدن کی ایک پوری منفعت کا اتلاف ہے۔
◈ جو اعضاء جوڑا جوڑا ہیں۔ ان دونوں میں پوری دیت، جبکہ ایک میں آدھی دیت واجب ہوگی۔ جیسے دو آنکھیں، دو ہونٹ، دو کان، دو ہاتھ، دو پیر وغیرہ۔
◈ دو دو اجزاء والے عضو میں داہنے اور بائیں کا فرق نہ کیا جائے گا۔ جیسے مثلاً ہاتھ کہ اگر کسی نے دوسرے کا ایک ہاتھ کاٹا تو نصف دیت آئے گی چاہے وہ ہاتھ دایاں تھا یا بایاں۔ کیونکہ "فِي الرِّجْلِ" کے الفاظ میں عموم ہے جو یمین و یسار دونوں کو شامل ہے۔
◈ سر کے زخموں میں دیت ہے۔جس کی تفصیل زخموں کی اقسام کے اعتبار سے بیان کی جا چکی ہے۔
◈ ایک دانت کی دیت پانچ اونٹ ہے چاہے پوری بتیسی کی دیت ایک سو ساٹھ اونٹ ہی کیوں نہ ہو جائے۔
◈ عورت کے بدلے مرد سے قصاص لیا جائے گا۔
◈ دیت خطا اونٹوں کی پانچ عمروں میں تقسیم کی جائے گی۔ جو حقہ، جزعہ، بنت مخاض، بنت لبون اور بنی لبون ہیں۔

قتلِ عمد اور شبہ عمد کی دیت

وَأَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ مِنْ طَرِيْقِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ رَفَعَهُ ((الدِّيَةُ ثَلاثُوْنَ حِقَّةً، وَثَلاثُوْنَ جَذَعَةً، وَأَرْبَعُوْنَ خَلِفَةً فِيْ بُطُوْنِهَا أَوْلادُهَا)).

امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے جس کو عمرو بن شعیب کے جد مرفوع بیان کرتے ہیں، روایت کیا ہے کہ: دیت (یہ) تیس حقے، تیس جذعے اور چالیس حاملہ اونٹنیاں ہیں جن کے پیٹ میں بچہ ہو۔ ❶

غریب الحدیث :...... خَلِفَةً: مراد حاملہ اونٹنی ہے۔اگر چہ اس روایت میں یہ دیت مذکور ہے۔لیکن مشہور دیت وہی ہے جو اخماساً ہے جس کا ذکر گزشتہ روایت میں ہے، اور وہ قتل خطا کی دیت ہے جبکہ قتل عمد یا شبہ کی دیت ارباعاً ہے۔ یعنی اس میں پچیس پچیس بنت مخاض، بنت لبون، حقے اور جزعے آئیں گے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہی ہے۔

تین سرکش ترین آدمی

1178۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ أَعْتَى النَّاسِ عَلَى اللهِ ثَلاثَةٌ: مَنْ قَتَلَ فِيْ حَرَمِ اللّٰهِ، أَوْ قَتَلَ غَيْرَ قَاتِلِهِ، أَوْ قَتَلَ لِذَحْلِ الْجَاهِلِيَّةِ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ کی سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے لوگ تین ہیں: (1) جس نے اللہ کے حرم میں قتل کیا۔ (2) یا جس نے اپنے قاتل کے علاوہ کو قتل کر ڈالا۔ (3) یا جس نے جاہلی کینہ (وتعصب) کی وجہ سے (کسی کو) مار ڈالا۔'' ❷

---

❶ سنن ابی داؤد: 4541۔ جامع الترمذی: 1378۔ سنن ابن ماجہ: 2626۔ سنن البیهقی: 74/8۔ سنن الدار قطنی: 177/3۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: محمد بن راشد ضعیف ہے۔
❷ صحیح ابن حبان: 5996.

أَخْرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي حَدِيثٍ صَحَّحَهُ.
اس حدیث کو امام ابن حبان نے ایسی حدیث میں روایت کیا ہے جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... أَعْتَى: یہ "عتو" سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ عتو کا معنی ہے سرکشی۔ یعنی رب تعالیٰ پر سب سے زیادہ سرکش لوگ یہ تین ہیں۔

مَنْ قَتَلَ فِي حَرَمِ اللّٰهِ: یہ پہلا از حد سرکش شخص ہے جو اللہ کے حرم میں کسی کو مار ڈالے، اور اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (آل عمران: 97)

"جو کوئی اس میں داخل ہوا، امن والا ہو گیا۔"

نبی کریم ﷺ نے مکہ کے حرم میں کسی کا خون بہانا منع فرمایا ہے۔ لہٰذا حرم مکہ میں کسی کو قتل کرنے والا رب کے سامنے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والا شمار ہو گا، اور یہ سرکشی قتل کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قتلوں میں سب سے زیادہ سرکشی والا قتل وہ ہے جو حرم میں کیا جائے۔ کیونکہ جس حرم میں شکار، درخت، جھاڑ جھنکار اور گھاس پھوس تک محفوظ ہوں وہاں کسی کو ناحق مار دینا از حد اشد ہو گا۔

حرم میں قصاص لینے کا حکم

رہا قصاص میں کسی کو حرم میں قتل کرنا کہ اگر کوئی کسی کو مار کر حرم میں پناہ لے لے تو کیا اسے بھی قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ تو علماء کا اس میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اسے حرم میں قتل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ حرم میں کسی کو قصاص میں قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ اس نے حرم کی حرمت نہیں توڑی۔ ہاں اس نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی ہے جو اسے ملے گی۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اب اس پر سے قصاص بھی ساقط ہو جائے گا۔ ہاں جو حرم میں ہی کسی کو قتل کرے اسے ضرور قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ اب قتل ناحق کر کے خود اس نے حرمت کو توڑ ڈالا ہے۔

غرض راجح قول کے مطابق یہ مسئلہ تفصیل پر مشتمل ہے جو یہ ہے:

⊙ ...... حرم سے باہر قتل کر کے حرم میں پناہ لینے والا حرم میں قتل نہ کیا جائے گا۔ البتہ اس پر سے قصاص ساقط نہ ہو گا۔ تب پھر اس کے ساتھ مکمل مقاطعہ کیا جائے گا۔ نہ تو کوئی اس سے بات کرے گا اور نہ کوئی اس سے خرید وفروخت ہی کرے گا حتیٰ کہ تنگ آ کر وہ خود ہی حرم سے نکل بھاگے گا تب اسے پکڑ کر اس سے قصاص لے لیا جائے گا۔

⊙ ...... اور جو حرم میں ہی کسی کو مارے گا تو حرم کی حرمت توڑنے کی پاداش میں اسے حرم میں قتل کیا جائے گا۔

أَوْ قَتَلَ غَيْرَ قَاتِلِهِ: غیر قاتل کو قتل کرنے سے مراد کسی کو عمداً قتل کرنا ہے۔ البتہ یہ صورت بھی مراد ہے کہ اگر اولیائے قصاص کو اپنے مقتول کا متعین قاتل نہ ملے تو ان کے لیے اپنے مقتول کے بدلے میں قاتل کے باپ، بیٹے یا بھائی وغیرہ کو مار دینا جائز نہیں۔ جیسا کہ فی زمانہ لوگوں نے اس بات کا دستور بنا لیا ہے۔ بلاشبہ یہ شخص بھی بے حد سرکش ہے کیونکہ اس نے ایسی صورت میں ظلم ڈھایا ہے جو بظاہر حق لگتی ہے کیونکہ بظاہر اس نے ایک کو قصاص میں مارا ہے لیکن دراصل وہ بے قصور تھا اور یہ

حقیقی قصاص نہ تھا۔اسی لیے اس قتل کو بھی سب سے زیادہ سرکشی والا قتل قرار دیا گیا ہے۔

أَوْ قَتَلَ لِذَحْلِ الْجَاهِلِيَّةِ: ذَحْل: کینہ اور جی کے بغض کو کہتے ہیں۔ جاہلیت کے کینہ کی بنا پر قتل کو اس لیے سب سے زیادہ سرکشی والا قتل قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس نے اپنے لیے اس قتل کو اس جاہلیت کی طرف منسوب کیا ہے جس کو مٹانے کے لیے جناب حضرت رسالت مآب ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تھے، اور یہ شخص اسی جاہلیت کے آثار ورسوم کو زندہ کرنے چلا ہے۔گویا کہ یہ جناب رسول اللہ ﷺ کے مقاصد بعثت کے خلاف کمر بستہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ گناہوں میں بھی باہم تفاضل ہے کہ کوئی زیادہ بڑا گناہ ہے اور کوئی کم بڑا ہے۔
- مکہ مکرمہ کی حرمت کی عظمت کہ وہاں قتل کا ارتکاب کرنے والا بدترین اور اشدترین سرکش ہے۔
- اپنے کسی قول وفعل کو جاہلیت کی طرف منسوب کرنا حرام ہے۔
- انتقام میں کسی بے گناہ کو مار ڈالنا بدترین حرام ہے۔

قتلِ شبہ عمد کی دیت کو قتلِ خطا کی دیت سے ملانا

1179۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ((أَلَا إِنَّ دِيَةَ الْخَطَإِ وَشِبْهِ الْعَمَدِ مَا كَانَ بِالسَّوْطِ وَالْعَصَا ، مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ ، مِنْهَا أَرْبَعُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهَا أَوْلَادُهَا)).

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنِّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’خبردار سن لو کہ (قتل) خطا کی دیت اور (قتل) شبہ عمد (کی دیت) جو (کسی کو) کوڑے اور ڈنڈے کے ذریعے (مار دینا) ہے، سو اونٹ ہے۔جن میں سے چالیس اونٹنیاں ایسی ہوں گی جن کے پیٹ میں بچے ہوں گے۔‘‘ ❶

اس حدیث کو امام ابو داؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :...... بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے عین مطابق اور اس کی تفسیر ہے۔البتہ یہ حدیث شبہ عمد کی یہ تفسیر بیان کر رہی ہے کہ یہ کسی کو کوڑے یا ڈنڈے سے مار ڈالنا ہے اور چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں گی تو معلوم ہوا کہ باقی ساٹھ اونٹ حمل والے نہ ہوں گے۔غرض یہ حدیث بتلاتی ہے کہ دیت کے وجوب میں قتل خطا اور قتل شبہ عمد دونوں کا حکم ایک ہے۔لیکن بظاہر یہ حدیث گزشتہ مذکورہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ (حدیث رقم: 1176) کے خلاف ہے جس میں قتل خطا کی دیت اخماساً بتلائی گئی ہے۔لیکن اگر اُس حدیث میں خطا کو غیر عمد پر محمول کیا جائے تو تب وہ حدیث اس حدیث کے خلاف نہ ٹھہرے گی، اور مطلب یہ بنے گا کہ دیت کی تغلیظ میں عمد اور شبہ عمد ایک ہیں، اور حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں جس دیت کا ذکر ہے وہ قتل خطا کی دیت نہیں بلکہ شبہ عمد کی دیت ہے۔

اب حنابلہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ دیت عمد اور دیت شبہ عمد دونوں مقدار میں ایک ہیں کہ یہ ارباعاً واجب ہوگی۔جبکہ

---

❶ سنن ابی داؤد: 4547۔ سنن النسائی: 41/8۔ سنن ابن ماجہ: 2627۔ اس حدیث کو ابوزرعہ نے صحیح کہا ہے جیسا العلل لابن ابی حاتم: 462/1 میں ہے، اور امام ابن حبان (60/1) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

بعض علماء اس طرف گئے کہ شبہ عمد کی دیت کو خطا کی دیت سے ملایا جائے گا۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں قاتل کا ارادہ قتل کر دینے کا نہ تھا۔ لہٰذا دونوں کا حکم بھی ایک ہوگا۔ بلاشبہ یہ قول پہلے قول کی بہ نسبت درستی کے زیادہ قریب ہے کہ شبہ عمد کو خطا سے ملایا جائے نا کہ عمد سے۔ پھر جب شبہ عمد اور خطا دونوں میں قصاص نہیں تو مناسب یہ ہے کہ شبہ عمد کو دیت میں بھی خطا سے ملایا جائے۔

رہا یہ سوال کہ اب چالیس حاملہ اونٹنیوں کو دیت میں واجب کرنے میں ہم عمرو بن شعیب کی یا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث کو لیں یا پھر حضرت عمرو بن حزم کی حدیث (رقم: 1175) کو لیں؟

تو امام احمد نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی حدیث کو لیا ہے اور دیت میں چالیس حاملہ اونٹنیوں کے واجب ہونے کو نہیں لیا۔ جبکہ بعض علماء نے حدیثِ عمرو بن شعیب کو لیا ہے کیونکہ اس میں زیادتِ علم ہے اور وہ چالیس حاملہ اونٹنیوں کی قید ہے۔ لیکن راجح قول پہلا ہے کیونکہ حدیث عمرو بن حزم کو تلقی بالقبول حاصل ہے۔ اس حدیث کو علماء نے لیا ہے اور اسی پر عمل کیا ہے کہ دیت میں چالیس حاملہ اونٹنیاں نہ ہوں گی۔

انگلیوں اور دانتوں کی دیت

1180- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((هٰذِهِ وَهٰذِهِ سَوَاءٌ، يَعْنِي الْخِنْصَرَ وَالْإِبْهَامَ)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''یہ اور یہ دونوں برابر ہیں۔'' یعنی چھنگلیا اور انگوٹھا۔ ❶ (کہ ان دونوں کے کاٹنے میں ایک جیسی دیت ہے)۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:.....سَوَاءٌ: یعنی دیت میں برابر ہیں۔

اَلْخِنْصَرَ: یہ ہاتھ کی ایک طرف کی آخری انگلی ہے جسے چھنگلیا کہتے ہیں۔

اَلْإِبْهَامَ: ہاتھ کی دوسری طرف کی آخری انگلی ہے۔ یعنی انگوٹھا۔

معلوم ہوا کہ جب دیت میں اطراف کا حکم ایک ہے تو درمیانی انگلیوں کا بھی وہی حکم ہوگا۔ یہیں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ دیت میں تقویم یعنی اعضاء کی منفعت کو دیکھ کر ان کی قیمت لگانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں بوڑھا جوان سب ایک ہیں۔ پس اگر مدار تقویم ہوتا تو انگوٹھے اور چھنگلیا کی قیمت میں عظیم فرق ہوتا۔ لیکن دیت میں دونوں کا حکم ایک ہے۔

1180- وَلِأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ: ((الْأَصَابِعُ سَوَاءٌ، وَالْأَسْنَانُ سَوَاءٌ، الثَّنِيَّةُ وَالضِّرْسُ سَوَاءٌ)).

اور سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: (سب) انگلیوں کی دیت یکساں ہے اور (سب) دانت (دیت کے وجوب میں) برابر ہیں (چنانچہ) سامنے کا دانت اور داڑھ (دیت میں) ایک ہیں۔ ❷

---

❶ صحيح البخاري: 9895.

❷ سنن ابی داؤد: 4558- جامع الترمذی: 1392- سنن ابن ماجه: 2650- ابن حزم "الاحكام: 446/7" میں کہتے ہیں داڑھوں کی بابت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح حدیث مروی ہے۔ جیسا کہ انگلیوں کے بارے میں اصح اور اجود اسناد کے ساتھ حدیث مروی ہے۔

1180- وَلابْنِ حِبَّانَ ((دِيَةُ أَصَابِعِ الْيَدَيْنِ وَالرِّجْلَيْنِ سَوَاءٌ، عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ لِكُلِّ أُصْبُعٍ)).

اور صحیح ابن حبان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ہاتھوں پیروں کی انگلیوں میں دیت ایک ہے (اور وہ) ہر انگلی کی دس اونٹ (دیت) ہے۔ ❶

ان دونوں احادیث میں جو مضمون مذکور ہے اس پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

طبیب پر ضمان آنے کا بیان

1181- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رَفَعَهُ قَالَ: ((مَنْ تَطَبَّبَ، وَلَمْ يَكُنْ بِالطِّبِّ مَعْرُوفًا، فَأَصَابَ نَفْسًا فَمَا دُونَهَا، فَهُوَ ضَامِنٌ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں، وہ اس حدیث کو مرفوع بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: (نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے): ''جو طبیب بن بیٹھا (یعنی عطائی معالج بن گیا) حالانکہ وہ علاج معالجہ میں (حاذق طبیب کی حیثیت سے) معروف نہ تھا۔ پھر وہ (الٹے سیدھے علاج کرتے ہوئے) کسی کی جان لے بیٹھا یا اس سے کم کا نقصان کر بیٹھا تو وہ (اس جان کے اتلاف کا، یا جان سے کم کے اتلاف کا) ضامن ٹھہرے گا۔'' ❷

أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَهُوَ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ وَغَيْرِهِمَا، إِلَّا أَنَّ مَنْ أَرْسَلَهُ أَقْوَى مِمَّنْ وَصَلَهُ.

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، یہ حدیث سنن نسائی اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں بھی ہے۔ البتہ جن کی روایت مرسل ہے، وہ موصول روایت کرنے والوں کی روایت سے زیادہ قوی ہے۔

غریب الحدیث:...... **مَنْ تَطَبَّبَ**: یعنی جس نے طب کے پیشہ کی مشق کی۔

وَلَمْ يَكُنْ بِالطِّبِّ مَعْرُوفًا: یعنی وہ فن طب میں معروف نہ تھا اور اس کا حاذق طبیب ہونا معلوم نہ تھا۔

فَأَصَابَ نَفْسًا: یہ أَتْلَفَ کے معنی میں ہے۔ یعنی اس نے فن طب میں اناڑی ہونے یا عطائی طبیب ہونے کی وجہ سے کسی کا علاج کیا جس کے نتیجہ میں وہ مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

فَمَا دُونَهَا: مراد اعضاء و جوارح کا اتلاف ہے۔ جیسے کسی کی غلط جراحی کر کے اس کے ہاتھ یا پیر کو شل کر بیٹھا۔

فَهُوَ ضَامِنٌ: کیونکہ اس فن میں طاق نہ ہونے کی وجہ سے شرعاً اسے دوسروں کے علاج معالجہ کی اجازت ہی نہ تھی۔

رہا یہ سوال کہ ہمیں اس بات کا علم کیونکر ہوگا کہ فلاں شخص واقعی طبیب، معالج، ڈاکٹر یا حکیم ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو وہ کسی طبی ادارہ کا باضابطہ فارغ التحصیل ہوگا یا پھر اسے علاج معالجہ کا قابل اعتماد تجربہ ہوگا کہ ان دو ذرائع سے ہم کسی کے

---

❶ صحيح ابن حبان: 6512- جامع الترمذي: 1391.

❷ سنن الدارقطني: 195/3- المستدرك للحاكم: 236/4- سنن ابي داؤد: 4586- سنن النسائي: 52/8- سنن ابن ماجه: 3466- كتاب الديات لابن ابي عاصم، ص: 64- امام دارقطنی فرماتے ہیں: اس حدیث کو ولید بن مسلم کے سوا کسی نے بھی ابن جریج سے مسند روایت نہیں کیا۔ جبکہ دوسرے اس حدیث کو ابن جریج سے عمرو بن شعیب کے واسطے سے مرسل روایت کرتے ہیں۔

طبیب ہونے کو جان سکتے ہیں۔

مضمونِ حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص فن طب میں اناڑی ہو یا مکمل تعلیم یافتہ نہ ہو اور پھر بھی وہ کسی پر علاج کرنے کی طبع آزمائی کرے جس کے نتیجہ میں وہ مریض ہلاک ہو جائے یا اس کا کوئی عضو تلف ہو جائے تو یہ عطائی طبیب اس اِتلاف کا ضامن ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جس طبیب کو لوگوں کا علاج کرنے کی قانونی اجازت ہو، اس سے ہونے والے کسی نقصان کے نتیجہ میں وہ ضامن نہ ہوگا۔ یہ حکم مذکورہ حدیث کے مفہوم سے اخذ کیا گیا ہے کہ جب غیر معروف طبیب اتلاف کا ضامن ہوگا تو معروف طبیب کا غیر ضامن ہونا بدیہی امر ہوا۔
- جبکہ اناڑی طبیب کا نفس یا مادون النفس کے اتلاف میں ضامن ہونا مذکورہ حدیث کا منطوق ہے۔
- معلوم ہوا کہ طب کا پیشہ سیکھنا جائز ہے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار طبیب سے ہونے والا جانی نقصان شرع میں غیر مضمون ہے۔ کیونکہ اگر طب ناجائز اور حرام ہوتی تو جانی نقصان پر ضمان مطلق ہوتا اور اس میں معروف طبیب اور غیر معروف کا فرق نہ ہوتا۔
- بلاشبہ شریعت اسلامیہ ایک کامل دین ہے اور وہ لوگوں کی صحت کی حفاظت کی بھی ضامن ہے۔ اسی لیے تو شریعت نے ماہر طبیبوں کو لوگوں کے علاج معالجہ کی اجازت دی ہے اور ہونے والے ناگہاں جانی نقصانات سے ان طبیبوں کو بری قرار دیا ہے۔

سر کے زخموں کی دیت

1182۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((فِي الْمَوَاضِحِ خَمْسٌ خَمْسٌ مِنَ الْإِبِلِ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''موضحہ زخموں (کی دیت) میں پانچ اونٹ ہیں۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ. وَزَادَ أَحْمَدُ: ((وَالْأَصَابِعُ سَوَاءٌ كُلُّهُنَّ، عَشْرٌ عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ)).

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، اور امام احمد نے (اپنی روایت میں) یہ الفاظ زائد روایت کیے ہیں: انگلیاں سب کی سب (دیت کے وجوب میں) برابر ہیں، اور ہر ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہیں۔''

وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ.

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ اور ابن جارود نے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... اَلْمَوَاضِحِ: یہ موضحہ کی جمع ہے۔ موضحہ خاص سر اور چہرے میں لگنے والے زخم کو کہتے ہیں، اور یہ وہ زخم ہے جو کھال کو پھاڑ کر ہڈی کو ننگا کردے چاہے سوئی کی نوک کے برابر ہی ننگا کرے۔ اسی لیے اس زخم کو موضحہ کہا جاتا ہے۔

---

[1] مسند احمد: 215/2۔ سنن ابی داؤد: 4566۔ جامع الترمذی: 1390۔ سنن الکبری للنسائی: 7045۔ سنن ابن ماجہ: 2655۔ المنتقی لابن جارود: 785۔ امام بوصیری رحمہ اللہ نے المصباح میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

موضحہ کی دیت پانچ اونٹ ہے۔ چاہے وہ سر یا چہرے کی کسی بھی جانب میں لگے، اور اگر یہ زخم ایک سے زائد ہوں تو اتنی ہی دیتیں آئیں گی۔

رہے بدن کے دوسرے حصوں پر لگنے والے زخم جیسے ران، پنڈلی، سینہ، کمر وغیرہ تو ان کو موضحہ نہ کہا جائے گا۔ ان میں ایک عادل آدمی کا فیصلہ آئے گا۔ جس کی تفصیل ذکر کر دی گئی ہے، اور ان زخموں پر موضحہ کا اطلاق اس لیے درست نہیں کیونکہ لغت اس اطلاق کی تائید نہیں کرتی۔ رہے انگلیوں میں دیت کے مسائل تو ان کا شافی بیان گزر چکا ہے۔

اہل کتاب کی دیت

1183۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((عَقْلُ أَهْلِ الذِّمَّةِ نِصْفُ عَقْلِ الْمُسْلِمِيْنَ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اہل ذمہ کی دیت مسلمانوں کی دیت سے آدھی ہے۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ. وَلَفْظُ أَبِيْ دَاوُدَ ((دِيَةُ الْمُعَاهَدِ نِصْفُ دِيَةِ الْحُرِّ)).

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، اور سنن ابی داؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: معاہد کی دیت آزاد کی دیت سے نصف ہے۔

غریب الحدیث :...... الذِّمَّةِ: ذمی، معاہد، کافر، مستامن اور حربی وغیرہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریفات بیان کی جا چکی ہیں۔ عَقْلُ أَهْلِ الذِّمَّةِ نِصْفُ عَقْلِ الْمُسْلِمِيْنَ: تب پھر ذمی مرد کی دیت پچاس اونٹ اور ذمی عورت کی دیت پچیس اونٹ ہوگی۔ سنن ابی داؤد کی روایت بھی اسی سے قریب المعنی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ اہل ذمہ کے خون بھی محترم ہیں کیونکہ ان کے قتل میں دیت لازم ہے جو ان کے خون کے محترم ہونے کی دلیل ہے۔
- البتہ معاہد کی دیت مرتبہ میں مسلمان کی دیت سے آدھی ہے۔

مرد اور عورت کی دیت کا بیان

وَلِلنَّسَائِيِّ: ((عَقْلُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ عَقْلِ الرَّجُلِ حَتَّى يَبْلُغَ الثُّلُثَ مِنْ دِيَتِهَا)).

سنن النسائی کی روایت کے الفاظ ہیں کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کی طرح ہے۔ یہاں تک کہ مرد کی دیت عورت کی دیت کے ثلث کو پہنچ جائے۔ [2]

---

[1] مسند احمد: 183/2۔ سنن ابی داؤد: 4583۔ جامع الترمذی: 1413۔ سنن النسائی: 45/8۔ سنن ابن ماجه: 2644۔ التمهيد لابن عبدالبر: 360/17۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: اس باب میں روایت کی جانے والی احادیث و آثار میں سے یہ سب سے عمدہ روایت ہے۔

[2] سنن النسائی: 44/8۔ اس کی اسناد میں اسماعیل بن عیاش ہے۔ اس کی حجازیوں سے روایت ضعیف ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں: امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ یہ سنت ہے۔ میں ان کی متابعت کیا کرتا تھا جبکہ میرے جی میں ایک بات ہوا کرتی تھی۔ پھر میں نے جانا کہ سنت سے ان کی مراد اہل مدینہ کی سنت ہے۔ تو میں نے اس سے رجوع کر لیا۔ دیکھیں: فيض القدير للمناوی: 319/4.

وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ .

امام ابن خزیمہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... مذکورہ حدیث میں عقل سے مراد دیت ہے۔

حَتَّى يَبْلُغَ الثُّلُثَ مِنْ دِيَتِهَا: لہٰذا جب مرد کی دیت عورت کی دیت کے ثلث تک پہنچ جائے تو عورت کی دیت اپنی اصل کی طرف لوٹ آتی ہے اور وہ عورت کی دیت کا مرد کی دیت سے نصف ہونا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ مرد اور عورت اتنی دیت میں برابر ہے جس میں ثلث دیت یا اس سے کم دیت آتی ہے۔ پس جب کسی چیز کی دیت ثلث تک پہنچ جائے تو مرد اور عورت اپنی اپنی اصل دیت کو لوٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ عورت نہ تو مصالح عامہ میں مرد کے مساوی ہے اور نہ مصالح خاصہ میں ہی مرد کے مساوی ہے۔ اسی لیے عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔

◈ تب پھر عورت کی ایک انگلی کی دیت دس اونٹ دو انگلیوں کی دیت بیس اونٹ اور تین انگلیوں کی دیت تیس اونٹ ہوگی۔ کیونکہ تیس اونٹ مرد کی کل دیت کے ثلث سے کم ہیں۔ اس لیے جب کسی نے عورت کی چار انگلیاں کاٹ دیں تو اگرچہ اب کی مصیبت زیادہ ہوگئی ہے لیکن اس کی دیت کم ہو جائے گی، اور وہ بیس اونٹ ہوگی۔

کیونکہ چار انگلیوں میں مرد کی دیت چالیس اونٹ ہے اور عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے۔ لہٰذا جس صورت میں مرد کی دیت کل دیت کے ثلث سے زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے اس صورت میں چالیس اونٹ جو ثلث دیت سے زیادہ ہے۔ تو اس صورت میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوگی۔

لہٰذا چار انگلیوں کے قطع میں مرد کی دیت چالیس اونٹ جبکہ عورت کی دیت بیس اونٹ ہوگی۔

◈ رہا یہ سوال کہ اگر کوئی اس فرق کو شر کا حیلہ بنا لے تو اس کا حکم کیا ہے۔ جیسے مثلاً کسی نے کسی عورت کی تین انگلیاں کاٹ دیں، پھر یہ سوچ کر اس کی چوتھی انگلی بھی کاٹ ڈالی کہ یوں مجھ پر تیس کی بجائے بیس اونٹ دیت آئے گی۔

تو اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ حیلہ اس کے کام نہ آئے گا۔ تب پھر ایسے شریر کی دیت تو تیس اونٹ ہی رہے گی البتہ چوتھی انگلی کے بدلے اس کی بھی انگلی کاٹی جائے گی۔

◈ مرد اور عورت کی دیت میں فرق کرنا شریعت اسلامیہ کی حکمتوں میں سے ہے۔

دیت کی تغلیظ اور اس کے ضوابط کا بیان

1184۔ وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((عَقْلُ شِبْهِ الْعَمْدِ مُغَلَّظٌ مِثْلُ عَقْلِ الْعَمْدِ، وَلَا يُقْتَلُ صَاحِبُهُ، وَذٰلِكَ أَنْ يَنْزُوَ الشَّيْطَانُ فَتَكُوْنَ دِمَاءٌ بَيْنَ النَّاسِ فِيْ غَيْرِ ضَغِينَةٍ، وَلَا حَمْلِ سِلَاحٍ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(قتل) شبہ عمد کی دیت (قتلِ) عمد کی طرح مغلظ ہے، اور اس دیت والے (یعنی شبہ عمد کے قاتل) کو (قصاص میں) قتل نہ کیا جائے گا، اور یہ (یعنی شبہ عمد کے قتل کی صورت یہ ہے کہ) شیطان کا (لوگوں کے دل و دماغ پر) حملہ کرنا ہے (یوں لوگ شیطان کے چوکے میں آ کر باہم دست و گریبان ہو جاتے ہیں) سو لوگوں میں بغیر کسی عداوت

کے اور اسلحہ کے اٹھانے کے (جھگڑا اور) قتال ہونے لگتا ہے۔

(جس کے نتیجہ میں کوئی نہ چاہتے ہوئے بھی مارا جاتا ہے)۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

اس حدیث کوامام دارقطنی نے روایت کر کے اس کوضعیف کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... شِبْهِ الْعَمْدِ: قتل عمد، قتلِ شبہ عمد اور قتل خطا میں جوفرق ہے وہ بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ یہ کہ:

⊙ ...... قتل عمد قصد وارادہ کے ساتھ ایسے آلہ کے ذریعے کیا جاتا ہے جو عموماً ہلاکت آفرین اور جان لیوا ہوتا ہے۔ جیسے تلوار، بھالا، خنجر، چاقو، نیزا، تیر، پستول وغیرہ۔

⊙ ...... قتل شبہ عمد بھی قصد وارادہ سے ہوتا ہے لیکن اس میں آلہ ضرب عموماً جان لیوا نہیں ہوتا۔ جیسے لاٹھی، سوٹی، کوڑا، جوتا وغیرہ۔

⊙ ...... جبکہ قتل خطا سرے سے ارادہ اور قصد کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس لیے آلہ قتل کے جان لیوا ہونے یا نہ ہونے کا اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تب پھر قتل شبہ عمد، قتل عمد اور قتل خطا کے بین بین ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ہم اس کو اصل جنایت کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو سے قتل عمد سے ملاتے ہیں کیونکہ اس میں بھی قتل عمد کی طرح فعل عمد ہوتا ہے۔

لیکن جب ہم اس کو اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ جانی نے اسے جان سے ہی مار دینے کا ارادہ نہ کیا تھا وگرنہ وہ اسے کسی جان لیوا آلہ سے مارتا تو ہم اسے قتل خطا سے ملاتے ہیں۔

اس لیے قتل شبہ عمد کے دو پہلو ہیں:

(1) ارادۂ قتل نہ ہونے کی وجہ سے اس میں قتل خطا کی طرح قصاص نہیں۔

(2) جبکہ فعلِ عمد ہونے کے اعتبار سے اس میں قتل عمد والی (دیت) آتی ہے جو دیت مغلظہ ہے۔

دیت مغلظہ کیا ہے؟

یہ سو اونٹ ہی ہیں لیکن اگر ان کو ارباعاً واجب کیا جائے تو یہ دیت مغلظہ کہلاتی ہے اور اگر اس کو اخماساً واجب کیا جائے تو یہ دیت غیر مغلظہ کہلائے گی۔

مذکورہ حدیث کی بنا پر قتل شبہ عمد میں دیت مغلظہ آئے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قتلِ شبہ عمد میں قصاص نہیں بلکہ دیت ہے۔ اس کی دلیل "وَلَا يُقْتَلُ صَاحِبُهُ" کے الفاظ ہیں۔

◈ قتل شبہ عمد کو شیطانی انگیخت اور مہمیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کی دلیل "أَنْ يَنْزُوَ الشَّيْطَانُ" کے الفاظ ہیں۔

---

[1] سنن الدارقطنی: 95/3 مختصراً۔ یہ پوری حدیث سنن ابی داؤد: 4565۔ اور مسند احمد: 183/2۔ میں ہے، امام موصوف رحمہ اللہ نے الدرایة: 261/2 میں اس حدیث کو سنن ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس حدیث کی اسناد میں محمد بن راشد ہے جس کو امام احمد، ابن معین اور امام نسائی رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: محمد بن راشد سے جب کوئی ثقہ راوی حدیث بیان کرے تو وہ حدیث مستقیم ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ حدیث کو مفتی دمشق محمد بن بلال العاملی نے محمد بن راشد سے روایت کیا ہے جن کے بارے میں ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ یہ صدوق ہے۔ دیکھیں: التاریخ الکبیر للبخاری: 44/1.

دراہم سے دیت

1185- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((قَتَلَ رَجُلٌ رَجُلًا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ دِيَتَهُ اثْنَيْ عَشَرَ أَلْفًا)). رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ وَأَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: عہد نبوی میں ایک آدمی نے دوسرے کو مار ڈالا۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس کی دیت بارہ ہزار (دراہم) مقرر فرمائی۔ ❶
اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، اور امام نسائی اور امام ابو حاتم نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث:......اِثْنَيْ عَشَرَ أَلْفًا: مراد بارہ ہزار درہم ہیں۔

اس حدیث میں سو اونٹوں کے دیت ہونے کے علاوہ یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ بارہ ہزار دراہم بھی ہو سکتی ہے جیسے پہلے یہ بتلایا گیا ہے کہ دیت ایک ہزار دینار بھی ہو سکتی ہے۔

اب کیا یہ دیت کے باب میں ایک اور اصل کا بیان ہے یا یہ حدیث باب تقویم میں سے ہے کہ اصل تو سو اونٹ ہی ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں سو اونٹ ہزار دینار یا بارہ ہزار دراہم کے آجاتے تھے۔

تو علماء کے اس بارے دو اقوال ہیں:

(1) ایک یہ کہ اونٹوں والا اونٹوں سے اور دراہم و دنانیر والا ان سے دیت دے۔

(2) جبکہ دوسرا قول جو اصح ہے، یہ ہے کہ اصل دیت میں اونٹ ہی ہیں لیکن امام چاہے تو وہ عاقلہ کے احوال کی رعایت کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر تو وہ اونٹوں والے ہیں تو ان پر اونٹ واجب کرے بصورتِ دیگر دراہم و دنانیر واجب کرے۔

دیت کے تحمل میں اصل عاقلہ ہے

1186- وَعَنْ أَبِي رِمْثَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، وَمَعِي ابْنِي، فَقَالَ: ((مَنْ هَذَا؟ فَقُلْتُ: ابْنِي وَأَشْهَدُ بِهِ، فَقَالَ: ((أَمَا إِنَّهُ لَا يَجْنِي عَلَيْكَ، وَلَا تَجْنِي عَلَيْهِ)).

حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک دفعہ) میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا جبکہ میرا بیٹا (اس وقت) میرے ساتھ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا: ''یہ کون ہے؟'' میں نے عرض کیا: (یہ) میرا بیٹا ہے، اور میں اس (کے بیٹا ہونے) کی گواہی دیتا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''سنو! نہ تو یہ تیری جنایت کا تحمل کرے گا اور نہ تم اس کی جنایت کا تحمل کرو گے۔'' ❷

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ.

اس حدیث کو امام نسائی اور امام ابو داود نے روایت کیا ہے، اور امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 4546۔ جامع الترمذی: 1388۔ سنن النسائی: 44/8۔ سنن ابن ماجه: 2629۔ امام نسائی فرماتے ہیں: محمد بن میمون حدیث میں قوی نہیں اس لیے درست اس حدیث کا مرسل ہونا ہے۔

❷ سنن ابی داؤد: 4495۔ سنن النسائی: 53/8۔ مسند احمد: / 226/2۔ المنتقی لابن جارود: 770۔ اس حدیث کو امام ابن حبان (5995) اور امام حاکم (461/2) نے صحیح کہا ہے۔ ابن حزم "المحلی: 45/11" میں دوسری احادیث کو ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: اگر چہ ان احادیث کی اسانید پر اعتراض ہے لیکن ان کے معانی صحیح ہیں۔

غریب الحدیث :......مَنْ هٰذَا؟: اس سوال کا کوئی سبب ضرور تھا، اسی لیے حضرت ابورمثہ رضی اللہ عنہ نے بھی مؤکد جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ:

اِبْنِي أَشْهَدُ بِهِ: "اِبْنِي" یہ مبتدا محذوف "ھذا" کی خبر ہے۔ واللہ اعلم کہ ان دونوں باپ بیٹا کی رنگت یا شکل وصورت میں کوئی فرق تھا، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے یہ سوال فرمایا تھا۔ وگرنہ محض سوال کا جواب تاکید کے ساتھ دینا بعید ہے۔

إِنَّهُ لَا يَجْنِي عَلَيْكَ: مراد یہ ہے کہ یہ تمہارا بیٹا تمہاری کسی جنایت کا تحمل نہ کرے گا نہ کہ یہ مراد ہے کہ یہ تم پر کوئی جنایت نہ کرے گا۔ ایسے ہی:

وَلَا تَجْنِي عَلَيْهِ: کا مطلب ہے کہ اس کی کسی جنایت کا تحمل تم نہ کرو گے۔ وگرنہ باپ بیٹے کی سرزنش کرتے ہوئے کبھی اس کو چوٹ بھی لگا دیا کرتا ہے۔ غرض مراد جنایت کا عدم تحمل نہ کہ عدم جنایت ہے۔

تحملِ دیت میں اصل ''عاقلہ'' ہے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصول وفروع جنایت کی دیت کا تحمل نہ کریں گے بلکہ دیت عاقلہ پر آئے گی، اور عاقلہ یہ اصول وفروع کے علاوہ مذکر عصبہ ہیں۔ چنانچہ جانی کے اصول وفروع دیت میں سے کچھ بھی نہ دیں گے۔

لیکن راجح قول اصول وفروع کے بھی تحملِ دیت کا ہے، اور یہ کہ وہ بھی دوسرے عاقلہ کے ساتھ دیت میں یکساں شریک ہوں گے بلکہ دوسرے رشتہ داروں کی بہ نسبت اصول وفروع تحمل دیت کے زیادہ حقدار ہیں۔

رہی مذکورہ حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں جنایت سے مراد وہ جنایت ہے جو قصاص کو واجب کرتی ہے۔ لہٰذا بیٹے کی واجب القصاص جنایت کا قصاص باپ سے اور اسی طرح باپ کی واجب القصاص جنایت کا قصاص بیٹے سے نہ لیا جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے احوال کی خبر گیری کے بے حد شائق تھے۔ اس کی دلیل "من ھذا" کے الفاظ ہیں۔
- اگر ایک آدمی کسی کو اپنا بیٹا کہتا ہے تو یہ اسی کا بیٹا سمجھا جائے گا، اور نہ تو اس سے اس پر قسم دلوائی جائے گی اور نہ گواہ ہی مانگے جائیں گے بلکہ محض دعویٰ پر بچہ اس کے سپرد کر دیا جائے گا جبکہ کوئی اس دعویٰ کے مزاحم ومنازع نہ ہو۔
- اقرار پر لفظ شہادت کا اطلاق درست ہے۔ اس کی دلیل "وَأَشْهَدُ بِهِ" کے الفاظ ہیں کہ یہاں شہادت سے مراد اقرار ہے۔
- کسی کا قصاص اس کی نیابت میں کسی دوسرے سے نہ لیا جائے گا حتیٰ کہ نہ تو باپ کی نیابت میں بیٹے سے اور نہ بیٹے کی نیابت میں باپ سے قصاص لیا جائے گا۔ لہٰذا جس پر قصاص آتا ہے، وہی قصاص میں مارا جائے گا۔

2۔ بَابُ دَعْوَى الدَّمِ وَالْقَسَامَةِ

خون کے دعویٰ اور قسامت کا بیان

قسامت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

قسامت یہ قسم سے ماخوذ ہے اس کا لغوی معنی ہے قسم اٹھانا۔

جبکہ اصطلاح میں یہ حلف برداری کو کہتے ہیں۔ جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ اگر مقتول کے ورثاء کسی قبیلہ میں اپنا مقتول

پاتے اور انہیں اس کا قاتل معلوم نہ ہوتا تو اس کے خون کا وارث ثابت کرنے کے لیے پچاس آدمی قسم کھاتے تھے۔ اگر پچاس پورے نہ ہوتے تو جتنے ہوتے وہ پچاس قسمیں کھاتے تھے، اور شرط یہ تھی کہ ان میں بچہ، غلام، دیوانہ اور عورت نہ ہو۔ یا وہ قبیلہ والے جن پر الزام ہوتا تھا، وہ قسم کھاتے تھے کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیا۔ پس اگر تو مدعی قسم اٹھاتے تو وہ دیت کے حقدار ہو جاتے اور اگر متہم (مدعا علیہ) قسم کھاتے تو ان پر دیت واجب نہ ہوتی تھی۔

قسامت دراصل دعویٰ کی ایک قسم ہے اور دعویٰ کا شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اس میں بینہ مدعی پر جبکہ قسم مدعا علیہ پر آتی ہے۔ تب پھر قسامت کا دعویٰ دیگر دعاوی سے تین باتوں میں مختلف ہے:

(1) ایک یہ کہ یہاں خود مدعی قسمیں کھا رہے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ قسم مدعا علیہ پر آتی ہے۔

(2) دوسرے یہاں قسموں میں تکرار ہے حالانکہ قسم میں اصل یہ ہے کہ وہ صرف ایک بار اٹھائی جائے نہ کہ بار بار۔

(3) تیسرے یہاں بن دیکھی بات پر قسم ہے۔ حالانکہ قسم ایک شہادت ہے، اور شہادت بن دیکھے درست نہیں۔

لیکن چونکہ اس پر نص آ گئی ہے لہٰذا قسامت جائز ہے۔

دعوائے دم

اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے پر اس بات کا دعویٰ کرے کہ اس نے میرے ساتھی کو قتل کر ڈالا ہے۔

قسامت کا ایک عبرت انگیز واقعہ

1187۔ عَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَثْمَةَ عَنْ رِجَالٍ مِنْ كُبَرَاءِ قَوْمِهِ: ((أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ سَهْلٍ وَمُحَيِّصَةَ بْنَ مَسْعُودٍ خَرَجَا إِلَى خَيْبَرَ مِنْ جَهْدٍ أَصَابَهُمْ، فَأُتِيَ مُحَيِّصَةُ، فَأُخْبِرَ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ سَهْلٍ قَدْ قُتِلَ، وَطُرِحَ فِي عَيْنٍ، فَأَتَى يَهُودَ، فَقَالَ: أَنْتُمْ وَاللّٰهِ! قَتَلْتُمُوهُ. قَالُوا: وَاللّٰهِ! مَا قَتَلْنَاهُ، فَأَقْبَلَ هُوَ وَأَخُوهُ حُوَيِّصَةُ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ سَهْلٍ، فَذَهَبَ مُحَيِّصَةُ لِيَتَكَلَّمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((كَبِّرْ كَبِّرْ)) يُرِيدُ السِّنَّ. فَتَكَلَّمَ حُوَيِّصَةُ، ثُمَّ تَكَلَّمَ مُحَيِّصَةُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِمَّا أَنْ يَدُوا صَاحِبَكُمْ، وَإِمَّا أَنْ يَأْذَنُوا بِحَرْبٍ))، فَكَتَبَ إِلَيْهِمْ فِي ذَلِكَ، فَكَتَبُوا: إِنَّا وَاللّٰهِ! مَا قَتَلْنَاهُ، فَقَالَ لِحُوَيِّصَةَ وَمُحَيِّصَةَ وَعَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ سَهْلٍ: ((أَتَحْلِفُونَ وَتَسْتَحِقُّونَ

حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے بزرگوں سے روایت کرتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن سہل اور محیصہ بن مسعود، یہ دونوں اپنے گھر والوں کو پہنچنے والے فقر و مشقت کی وجہ سے (کوئی محنت مزدوری کرنے) خیبر کی طرف نکل گئے (کیونکہ خیبر ایک زرخیز وادی اور اچھی کاروباری جگہ تھی) (یہ دونوں حضرات ابھی خیبر میں ہی تھے) کہ کسی نے محیصہ کو آ کر خبر دی کہ عبداللہ بن سہل کو قتل کر کے ان (کی لاش) کو ایک کنویں میں پھینک دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی محیصہ (خیبر کے) یہودیوں کے پاس گئے اور کہا: اللہ کی قسم! تم ہی لوگوں نے عبداللہ کو قتل کیا ہے۔ وہ بولے کہ اللہ کی قسم! انہیں ہم نے قتل نہیں کیا۔ اس پر محیصہ، ان کے بھائی حویصہ اور (حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ مقتول کے بھائی) عبدالرحمن بن سہل رضی اللہ عنہ (مدینہ نبویہ) چلے آئے (اور خدمت نبوی میں یہ واقعہ گوش گزار کرنا چاہا) پس محیصہ (جب) بات کرنے لگے تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی بڑے کو آگے کرو، کسی بڑے کو آگے کرو''۔ آپ ﷺ کی مراد عمر میں بڑا تھا۔ اس پر (پہلے)

دَمَ صَاحِبِكُمْ؟)) قَالُوْا: لَا، قَالَ: فَتَحْلِفُ لَكُمْ يَهُوْدُ؟ قَالُوْا: لَيْسُوْا مُسْلِمِيْنَ، فَوَدَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ عِنْدِهِ، فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ مِائَةَ نَاقَةٍ، قَالَ سَهْلٌ: فَلَقَدْ رَكَضَتْنِيْ، مِنْهَا نَاقَةٌ حَمْرَاءُ.))

حویصہ نے بات کی پھر محیصہ نے قصہ سنایا۔ ساری بات سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یا تو وہ لوگ تمہارے ساتھی کی دیت دیں گے یا پھر وہ جنگ کا اعلان کر دیں (یعنی یا پھر ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔) پھر آپ ﷺ نے اس (قتل) کی بابت خیبر کے یہود کو خط لکھ بھیجا (کہ وہ صحیح صورت حال سے آگاہ کریں اور اگر عبداللہ کا قاتل انہی یہودیوں میں سے کوئی ہے تو اسے ہمارے حوالہ کیا جائے یا پھر دیت دی جائے۔غرض جو بھی صورت ہے اس سے آگاہ کریں)۔ ان لوگوں نے (جوابی خط) لکھ بھیجا کہ: اللہ کی قسم! عبداللہ کو ہم نے قتل نہیں کیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے حویصہ، محیصہ اور عبدالرحمٰن بن سہل سے ارشاد فرمایا: ''کیا تم لوگ قسمیں اٹھاتے ہو، اور اپنے ساتھی کے خون (کی دیت) کے مستحق بنتے ہو'' وہ بولے: نہیں (ہم قسم نہ اٹھائیں گے کیونکہ ہم نے کسی کو انہیں قتل کرتے دیکھا نہیں) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تب پھر تمہارے لیے یہودی قسمیں کھائیں گے۔'' وہ بولے: وہ لوگ تو غیر مسلم ہیں (ان کا کیا اعتبار کہ جھوٹی قسمیں کھا جائیں)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں (یعنی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے وارث کو) اپنے پاس سے (یعنی بیت المال سے) دیت ادا فرمائی (یعنی یا تو ادا کرنے کا وعدہ فرمایا کہ جب کہیں سے مال آ گیا تو عبداللہ کی دیت دے دی جائے گی۔ یا پھر اگر اس وقت مال موجود تھا تو اس میں سے دیت دے دی)۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو (یعنی حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے ورثاء کو) سو اونٹنیاں بھیجیں۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: انہی اونٹنیوں میں سے ایک سرخ اونٹنی نے مجھے لات مار کر زخمی کیا تھا۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:......قسامت کے باب میں اصل یہی حدیث ہے اور یہ حدیث متعدد الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں وارد ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس حدیث کے جملہ پہلوؤں کو بیان کیا جائے۔ اس تفصیل کو غریب الحدیث کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

غریب الحدیث......عَنْ سَهْلٍ: یہ صحابی رسول ہیں۔

---

❶ صحيح البخاري: 6898- صحيح مسلم: 1669.

عَنْ رِجَالٍ مِنْ كُبَرَاءِ قَوْمِهِ: بظاہر یہ سب لوگ بھی صحابی رضی اللہ عنہم تھے۔ کیونکہ ایسے قصہ میں کسی یہودی یا غیر مسلم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

مِنْ جَهْدٍ: جَهْدٍ: مشقت اور فقر وفاقہ کو کہتے ہیں۔

أَصَابَهُمْ: یہاں اصابھما نہیں کہا۔ تب پھر مراد ان دونوں حضرات کے اہل خانہ ہیں کہ یہ لوگ اپنے گھر والوں کے فقر وفاقہ اور مشقت وتنگی کو دیکھ کر خیبر جیسے تجارتی اور زرعی مرکز کی طرف گئے تاکہ وہاں کوئی محنت مزدوری کر کے موجودہ ناگفتہ بہ حالت کا تدارک کرسکیں۔

فَأُتِيَ مُحَيِّصَةُ: یہ عبارت بتلاتی ہے کہ ان دونوں حضرات کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جس نے آ کر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کر دیے جانے کی محیصہ رضی اللہ عنہ کو خبر دی تھی وگرنہ یہودی اتنے اچھے کہاں تھے کہ کسی کا کوئی بھلا کرتے۔

فِي عَيْنٍ: مراد جاری کنواں ہے۔

فَأَتَى يَهُودَ: اَتَى کا فاعل حضرت محیصہ ہیں، اور ''یہود'' یہاں اسم جنس ہے، مراد خیبر کے یہودی ہیں۔

وَاللّٰهِ مَا قَتَلْنَاهُ: حضرت محیصہ نے جب ان پر قتل کی تہمت لگائی تو ان یہودیوں نے فوراً قسم اٹھا کر اس الزام کی تردید کردی۔

اب بظاہر یہاں ایک مدعی اور دوسرا مدعا علیہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مدعی بینہ لاتا۔ لیکن حضرت محیصہ کے پاس گواہ نہ تھے اس لیے انہوں نے اپنے غالب گمان کی بنا پر قسم اٹھالی جبکہ یہودیوں نے مدعا علیہ ہونے کے اعتبار سے یہ قسم اٹھائی تھی، یا وہ سچے تھے یا جھوٹے، کہ یہ قتل ہم نے نہیں کیا۔ ان کی مراد یہ تھی کہ خیبر میں صرف یہودی ہی تو نہیں رہتے، اور لوگ بھی تو ہیں، جانے ان میں سے کس نے مارا ہو؟ لیکن یہود کی کذب بیانی کا احتمال بھی مردود نہیں۔ ان کے کاذب ہونے کی شہادت خود قرآن نے بھی دی ہے کہ کذب بیانی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہوئی ہے۔

كَبِّرْ: یہودیوں کے قسم اٹھانے پر حضرت محیصہ اپنے بھائی حویصہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ نبویہ چلے آئے تاکہ یہ قضیہ دربار نبوی میں رکھا جاسکے۔ غرض خدمت نبوی میں حاضر ہونے کے بعد حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ نے بات کرنی چاہی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ بات کرنے کو اس لیے آگے بڑھے تھے کیونکہ موقع پر وہی موجود تھے گو نفس قتل کے گواہ نہ تھے وگرنہ بات کرنے کے اصل مستحق تو عبدالرحمٰن بن سہل تھے۔ کیونکہ وہ مقتول کے بھائی اور ان کے وارث تھے، لیکن چونکہ وہ موقع پر موجود نہ تھے یا عمر میں چھوٹے تھے اس لیے وہ بات کرنے کو آگے نہ بڑھے تھے۔ یا اس لیے بھی حضرت محیصہ آگے بڑھے تھے کیونکہ اس وقت مقصود واقعہ گوش گزار کرنا تھا نہ کہ قصاص یا دیت کا مطالبہ کرنا، اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ عبدالرحمٰن نے جناب محیصہ کے بات کرنے کو کافی سمجھا ہو۔ اس لیے خود بات کرنا مناسب نہ سمجھا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس لیے ارشاد فرمایا تھا کیونکہ ان کے بھائی حویصہ ان سے عمر میں بڑے تھے، اور چونکہ قوم تک یہ ساری خبر پہنچ چکی تھی، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے کو بات کرنے کو فرمایا وگرنہ جسے واقعہ کی خبر ہی نہ ہو وہ کیونکر بات کرسکتا ہے۔

فَتَكَلَّمَ حُوَيِّصَةُ، ثُمَّ تَكَلَّمَ مُحَيِّصَةُ: غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے امتثال میں پہلے حضرت حویصہ رضی اللہ عنہ نے بات کی۔ پھر جو بات مزید کرنے کو رہ گئی تھی اس کو حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر پورا کر دیا کیونکہ وہ صاحبِ قصہ تھے۔

إِمَّا أَنْ يَدُوا صَاحِبَكُمْ، وَإِمَّا أَنْ يَأْذَنُوا بِحَرْبٍ: یعنی تمہیں دیت لینا قبول ہے تو تمہیں ان لوگوں سے دیت

دلوائی جائے گی، اور اگر تم قاتل متعین کرتے ہو اور قتل شہادت سے ثابت ہو جائے تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ وگرنہ ان یہود کے خلاف عہد شکنی کی پاداش میں اعلانِ جنگ ہوگا۔

لیکن اس مقام پر یہ امر ضرور ملحوظ رہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ایک فتویٰ تھا کہ نہ کہ حکم اور قضاء کیونکہ قضا علی الغیب جائز نہیں۔ اسی لیے تو نبی کریم ﷺ نے اہل خیبر کو خط لکھ کر واقعہ کی حقیقت کا ان سے استفسار فرمایا تھا۔ نہ کہ قصاص یا دیت یا جنگ کا اعلان فرمایا تھا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ابھی تک مدعا علیہ سے کوئی بات نہ کی تھی۔

فَكَتَبَ إِلَيْهِمْ فِي ذَلِكَ: مراد خط لکھوانا ہے۔ نہ کہ خود لکھنا، کیونکہ آپ ﷺ تو لکھنا پڑھنا جانتے نہ تھے۔

فَكَتَبُوا: إِنَّا وَاللّٰهِ مَا قَتَلْنَاهُ: لیکن یہود نے حسب دستور اس جرم سے اقراری ہونے کا قسم کھا کر انکار کر دیا۔

فَقَالَ: یعنی یہود خیبر کے جوابی خط آ جانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے حویصہ، محیصہ اور عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہم کو بلوا کر ارشاد فرمایا کہ:

أَتَحْلِفُونَ: یعنی کیا تم اس بات کی قسم کھانے کو تیار ہو کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قاتل یہی خیبر کے یہودی ہیں۔

یہ خطاب بظاہر ان تینوں حضرات کو ہے۔ اب حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو خطاب فرمانا تو واضح ہے کیونکہ وہ اس خون کے وارث تھے۔ جبکہ باقی دونوں حضرات کا اس خون میں کوئی حق نہ تھا، تب پھر ان کو خطاب فرمانے میں اشکال ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تغلیب کے باب سے ہے، اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں بھائی بھی خون کے بدلہ کا مطالبہ لے کر آئے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے انہیں بھی خطاب میں شامل فرمایا۔ یوں ان حضرات کو بھی خطاب میں توجیہ درست ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ وہ وارثِ دم نہ تھے۔

اور تیسرا جواب یہ ہے کہ جب بالفعل قسمیں اٹھوانے کی باری آئی تو قسم اٹھانے والوں میں صرف حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے بھائی اور ان کے دوسرے ورثاء تھے۔ تب بھی حویصہ اور محیصہ کو خطاب کیے جانے سے پیدا ہونے والا اشکال جاتا رہا۔ غرض آپ ﷺ نے پہلے سب کو خطاب فرمایا، کیونکہ وہ سب لوگ قصاص یا دیت کا مطالبہ لے کر آئے تھے لیکن جب حلف برداری کا موقعہ آیا تو وہ حلف صرف مقتول کے ورثاء نے اٹھانے تھے نہ کہ سب مخاطبین نے۔

وَتَسْتَحِقُّونَ دَمَ صَاحِبِكُمْ: یعنی کیا تم ان کے خون کا مطالبہ کرتے ہو؟

قَالُوا: لَا: یعنی ہم قسم نہ اٹھائیں گے، اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "بھلا ہم ایک ایسی بات پر کیونکر قسم اٹھالیں جس کے نہ ہم گواہ ہیں اور نہ ہم نے وہ واقعہ دیکھا ہی ہے۔" اور یہ ان لوگوں کے حلف سے امتناع کی علت کا بیان ہے کہ جو بات دیکھی نہیں بھلا اس کی قسم کیونکر اٹھائی جا سکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے اس جائز عذر کو قبول فرمایا اور ان کے قسم نہ اٹھانے کو برقرار رکھا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اچھا اگر تم لوگ قسم نہیں اٹھاتے:

فَتَحْلِفُ لَكُمْ يَهُودُ: تو پھر تمہارے لیے قسمیں یہودی اٹھائیں گے۔ اگرچہ اس روایت میں یہ ذکر نہیں کہ کتنے یہودی قسمیں اٹھائیں گے لیکن ایک دوسری روایت میں پچاس یہودیوں کے قسمیں کھانے کا ذکر ہے۔

رہا یہ سوال کہ وہ یہودی کس بات کی قسم اٹھائیں گے؟ تو وہ اس بات کی قسم اٹھائیں گے کہ ہم نے جناب عبداللہ کو نہیں

قتل کیا اور نہ ہم ان کے قاتل کو جانتے ہی ہیں۔

لیکن ان مطالبہ کرنے والوں نے یہ کہہ کر یہود کے قسمیں اٹھانے سے انکار کر دیا کہ:

لَيْسُوا مُسْلِمِينَ: کہ وہ تو مسلمان نہیں، ان کا کیا بھروسہ، وہ کون سا جھوٹ بولتے وقت اللہ سے ڈریں گے۔ یہ جواب سن کر نبی کریم ﷺ نے یہود سے قسمیں اٹھوانے کا ارادہ ترک فرما دیا۔

فَوَدَاهُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مِنْ عِنْدِهِ: اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی دیت اپنے پاس سے ادا فرما دی۔

مراد ذاتی مال سے نہیں کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس تو مال ہوتا ہی نہ تھا۔ کیونکہ مال کو بچا رکھنا آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ نہ تھی۔ تب پھر اس مال سے دیت ادا کرنا مراد ہے جو آپ ﷺ کے زیر ولایت تھا، اور یہ بیت المال ہے، جس پر تصرف کا حاکم اور والی کو حق ہوتا ہے نہ کہ وہ اس مال کو مسلمانوں کی مصالح میں خرچ کر سکے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے بیت المال سے ان لوگوں کو جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی دیت سے سو اونٹنیاں ادا فرما دیں، اور یہ اونٹنیاں یا تو اس وقت موجود تھیں یا بعد میں جب آئیں تو دے دی گئیں۔

رہا یہ سوال کہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ کی دیت خود کیوں ادا فرمائی؟ تو اس لیے کہ کسی پر قتل کا دعویٰ ثابت نہ ہو سکا تھا۔ کیونکہ مدعیوں نے خود بھی قسمیں کھانے سے انکار کر دیا تھا اور خود مدعا علیہم کی قسموں پر بھی راضی نہ ہوئے تھے، اور نبی کریم ﷺ یہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ ایک مسلمان کا خون یوں ضائع اور اکارت چلا جائے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے ان کی دیت اپنے اہتمام سے ادا کروا دی۔

قَالَ سَهْلٌ: بظاہر یہ حدیث کے راوی حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

رَكَضَتْنِي مِنْهَا نَاقَةٌ حَمْرَاءُ: اس جملہ میں اس بات کی تاکید ہے کہ واقعی نبی کریم ﷺ نے دیت میں سو اونٹنیاں دی تھیں کہ انہی اونٹنیوں میں سے ایک نے مجھے لات مار کر زخمی بھی کیا تھا۔

اور آخری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ فتح خیبر کے بعد کا ہے، اور یہ زمانہ یہودِ خیبر کے ساتھ صلح و امن اور معاہدہ کا زمانہ تھا۔

تنبیہ:......اس حدیث کے فوائد کو آگے ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ قسامت ایک شرعی حکم ہے

1188- وَعَنْ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ ﷺ ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَقَرَّ الْقَسَامَةَ عَلَى مَا كَانَتْ عَلَيْهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَقَضَى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ النَّاسِ مِنَ الْأَنْصَارِ فِيْ قَتِيْلٍ ادَّعَوْهُ عَلَى الْيَهُوْدِ)).
رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے قسامت کو اسی طرح برقرار رکھا (یعنی اس پر فیصلہ فرمایا) جس طرح وہ جاہلیت میں تھی، اور آپ ﷺ نے انصار کے ایک مقتول کا، جس کا انہوں نے یہود کے خلاف دعویٰ کیا تھا (کہ یہ انہوں نے مارا ہے) اسی قسامت پر لوگوں میں فیصلہ فرمایا۔[1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**عَنْ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ:** کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے نام کے معلوم نہ ہونے سے حدیث کی

[1] صحیح مسلم: 1670.

صحت اور حکم پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔

أَقَرَّ الْقَسَامَةَ: یعنی اس پر فیصلہ فرمایا اور اس کا حکم جاری فرمایا۔

عَلَى مَا كَانَتْ عَلَيْهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ: تب پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ دورِ نبوی میں قسامت کا فیصلہ کیونکر تھا۔ تو وہ طریق جاہلیت میں بھی رہا ہوگا۔ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام میں بھی برقرار رکھا۔

قسامت کے اس طریق کو تمہید میں مفصل ذکر کر دیا گیا ہے۔

وَقَضَى بِهَا......: یہ کوئی اور قصہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ جنابِ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے قتل کے واقعہ میں ہونے والے قسامت کے فیصلہ کا ذکر ہی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جمہور علماء قسامت پر فیصلہ کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، بعض تابعین عظام اور بعد کے بعض علماء قسامت پر انکار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ قسامت کا دعاوی کے قواعد سے نکلا ہوا ہونا ہے۔ (یعنی قسامت تین اعتبار سے عام دعاوی سے ہٹ کر ہے جن کو گزشتہ تمہید میں ذکر کر دیا گیا ہے)۔
- یہود بے بہبود نامسعود ہرگز بھی بھروسہ، اعتبار اور اطمینان کے لائق نہیں۔
- حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے قتل کے واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی ایسا مقتول پایا جائے جس کا قاتل معلوم نہ ہو اور ایسی کسی عداوت کا بھی علم نہ ہو جو کسی پر تہمت کو واجب کرتی ہو تو ایسے مقتول میں کوئی قسامت نہ ہوگی۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انصار اور یہود میں عداوت معروف تھی، اسی لیے یہود کے ہاں ایک انصاری کے مقتول پائے جانے پر قسامت کو جاری کیا گیا۔

اب ذیل میں گزشتہ حدیث کے فوائد ملاحظہ ہوں:

- یہود بھی رب تعالیٰ کے نام کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اسی لیے وہ اللہ کے نام کی قسم کھایا کرتے تھے۔
- احکام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سب کا مرجع ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر بات کا فیصلہ کرانے کے لیے خدمت نبوی میں حاضر ہوا کرتے تھے۔
- مناسب یہ ہے کہ بات بڑی عمر والا کیا کرے، اس کی دلیل "كَبِّرْ كَبِّرْ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ اگر حکومت وخصومت کے وقت بڑی عمر والا بخوبی بات کرنے سے قاصر ہو تو کم سن کو آگے بڑھ کر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تاکہ کسی کا حق ضائع اور برباد نہ ہو۔
- گزشتہ صفحات میں یہ مسئلہ بیان کیا جا چکا ہے کہ غیر موجود کے خلاف فتویٰ تو دے سکتے ہیں، البتہ اس کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتے۔ یعنی قضاء علی الغائب ناجائز ہے۔
- اگر اہل ذمہ کسی مسلمان پر ظلم کر کے اسے مار ڈالیں تو ان کے ساتھ کیا جانے والا عہد ختم سمجھا جائے گا۔
- اور اگر قاتل ذمی قتل کا ضمان دے دے تو عہد باقی سمجھا جائے گا۔ اس کی دلیل "اِمَّا اَنْ يَدُوْا صَاحِبَكُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- البتہ ایک قول یہ بھی ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کر دینے سے ذمیوں کا عہد مطلق ٹوٹ جائے گا چاہے وہ دیت اور ضمان دیں

یا نہ دیں۔ کیونکہ مسلمان پر اعتداء ہی عہد شکنی کا موجب ہے کیونکہ اس میں ایک مسلمان کی حرمت کو پامال کرنا ہے۔

◈ قضاء میں دوسروں کے ساتھ مکاتبت جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس قتل کا فیصلہ کرنے کے لیے اہل خیبر کے ساتھ خط وکتابت فرمائی۔

◈ قسامت میں پہلے مدعیوں سے قسمیں لی جائیں گی۔ اس کی دلیل "اَتَحْلِفُوْنَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ قسامت میں قصاص لیا جائے گا۔ اس کی دلیل "تَسْتَحِقُّوْنَ دَمَ صَاحِبِكُمْ" کے الفاظ ہیں۔ جمہور علماء اس کے قائل ہیں اور یہی قول صحیح ہے۔

◈ خصم (یعنی جھگڑے کے دوسرے فریق) کی قسم کا اعتبار ہے۔ چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی دلیل "فَتَحْلِفُ لَكُمْ يَهُوْدُ" کے الفاظ ہیں۔ لہٰذا اگر کسی دعویٰ میں بینہ نہ ہونے کی صورت میں اگر کافر مدعا علیہ قسم کھا گیا تو وہ دعویٰ سے بری ہو جائے گا۔

◈ قسامت میں اگر مدعیان مدعا علیہم کی قسموں پر راضی نہ ہوں تو انہیں قسمیں نہ دلوائی جائیں گی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس قضیہ میں مدعیان کو یہود خیبر سے قسمیں ہی لینے پر مجبور نہ فرمایا تھا۔

◈ اگر کسی مسلمان کے قاتل کا علم نہ ہو سکے اور قصاص اور دیت میں سے کچھ نہ آ رہا ہو تو ایک مسلمان کے خون کو اکارت جانے سے بچانے کے لیے اس کی دیت بیت المال سے دی جائے گی۔ جیسا کہ اس قضیہ میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی دیت بیت المال سے دلوائی۔

◈ دیت میں اصل اونٹ ہیں۔ اس کی دلیل "فَبَعَثَ اِلَيْهِمْ مِائَةَ نَاقَةٍ" کے الفاظ ہیں۔ اس کی پوری تفصیل "باب الدیات" میں گزر چکی ہے۔

◈ آدمی اپنی بات کو پکا کر کے بیان کر سکتا ہے۔ جیسا کہ راوی حدیث حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے سرخ اونٹنی کے لات مارنے کے قصہ کو اپنی بات کو مزید پکا کرنے کے لیے سنایا تھا۔

3۔ بَابُ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ ..... باغیوں سے قتال کا بیان

بغی یعنی بغاوت کی تعریف اور باغی کے حال کا بیان:

لغت میں البغی یہ ظلم، قانون شکنی، حق سے تجاوز، بغاوت اور تکبر کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی سے اہل بغی کا لفظ ہے۔

فقہاء نے اہلِ بغی یعنی باغیوں کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ، یہ وہ لوگ ہیں جن کو قوت و دبدبہ (شوکت) اور غلبہ پانے کی طاقت (مَنَعَةٌ) حاصل ہو اور انہوں نے مباح تاویل کی بنا پر امام کے خلاف خروج کیا ہے۔

لہٰذا اگر کسی جماعت میں ان مذکور شروط میں سے ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو وہ اہلِ بغی نہیں بلکہ خوارج کہلائیں گے۔ چنانچہ:

اگر انہیں قوت و منعت حاصل نہ ہو یا

امام کے علاوہ کسی اور کے خلاف خروج کریں یا

ملک کے کسی حصہ پر دھاوا بول دیں یا

ان کے پاس خروج کی کوئی مباح تاویل نہ ہو، تو یہ لوگ خوارج کہلائیں نہ کہ باغی۔ خوارج کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا اس کا بیان آگے آ جائے گا۔

باغیوں کا حکم

باغیوں سے قتال واجب ہے اور رعایا پر واجب ہے کہ وہ اس بات میں امام کی مساعدت و معاونت کریں۔ البتہ باغیوں سے قتال سے قبل ان سے مراسلت ضرور کی جائے گی اور ان سے ناراض ہونے اور بغاوت پر اتر آنے کی وجہ ضرور پوچھی جائے گی۔ چنانچہ اگر تو وہ اپنی کسی حق تلفی کا دعویٰ کریں تو دفع ظلم اور رفع فتنہ کے لیے انہیں ان کا حق دلوایا جائے گا، اور اگر انہیں کسی امر میں اشکال ہو تو اس کو دور کیا جائے گا۔ لیکن اس سب کے بعد بھی اگر وہ لڑنے مرنے پر ہی اڑے رہیں تو ان سے قتال واجب ہوگا اور رعایا کے ذمہ ہوگا کہ وہ اس قتال میں حاکم اور امیر کے دست و بازو بنیں اور جان و مال کے ساتھ ان باغیوں سے لڑیں۔

اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (الحجرات: 9)

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

اور جب باغی بغاوت پر بضد ہوں تو ان سے قتال سے ہاتھ کھینچنا جائز نہیں ہے کیونکہ ان سے بیعت لینا بے فائدہ ہے۔

مسلمانوں پر اسلحہ اٹھانے والے سے قتال کیا جائے گا

1189۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے ہم (مسلمانوں میں سے کسی) پر اسلحہ اٹھایا تو وہ ہم میں سے نہیں۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا: یعنی ناحق قتل کرنے کی غرض سے اسلحہ اٹھایا۔

فَلَيْسَ مِنَّا: یہ اسلحہ اٹھانے والے سے براءت کا اظہار ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ براءت اس کے کافر ہو جانے کی بنا پر ہے یا گنہگار ہونے کے اعتبار سے ہے۔ جیسے ملاوٹ کرنے والے کے بارے میں یہ ارشاد ہے کہ ''وہ ہم میں سے نہیں۔'' تو اس میں تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ:

اگر تو اس نے مسلمانوں کے قتلِ ناحق کو حلال سمجھ کر اسلحہ اٹھایا ہے تو یہ ایسے کفر کا مرتکب ہے جو اسے ملت سے خارج کر دیتا ہے۔

اور اگر وہ باغی ہے، اور مسلمانوں کے خون کو مباح اور حلال نہیں سمجھتا۔ البتہ تاویلِ مباح کے ساتھ اسلحہ اٹھاتا ہے تو بلاشبہ وہ ملت سے خارج اور کافر تو نہیں، البتہ اس کا یہ فعل کبائر الذنوب میں سے ضرور ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں پر ناجائز اور ناحق اسلحہ

---

[1] صحيح البخاری: 674۔ صحيح مسلم: 98.

اٹھانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اور اگر اس کو حلال سمجھا تو یہ کفر ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مسلمانوں پر ناجائز اسلحہ چاہے کوئی جماعت بن کر اٹھایا جائے یا اکیلے۔ دونوں صورتوں میں حرام اور گناہ ہے۔
- مسلمانوں سے قتال حرام ہے کیونکہ اس فعل پر وعید مرتب ہے اور ایسا فعل جس پر وعید آئی ہو، وہ حرام ہوتا ہے۔

جماعتِ مسلمین کو چھوڑنے کا حکم

1190- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ، وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ، وَمَاتَ فَمِيتَتُهُ مِيتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ)). أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو (امیر کی) اطاعت سے نکل گیا اور اس نے جماعتِ (مسلمین) کو چھوڑ دیا اور (اسی حال میں) مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' [1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ: مراد ولی امر کی طاعت سے نکلنا ہے۔ البتہ یہ امر مطلق نہیں بلکہ مراد غیر معصیت میں طاعت نہ کرنا ہے۔ لہٰذا معصیت کے امر میں امیر کی مخالفت واجب ہے۔

وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ: مراد جماعتِ مسلمین ہے۔ کیونکہ یہ جماعت امیر کے اردگرد ہوتی ہے اور غیر معصیت میں امیر کی طاعت کرتی ہے۔

مِيتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ: یعنی جو اس حال میں مر گیا تو وہ گویا کہ ایسا ہے جیسے بعثتِ نبوی سے قبل کے زمانہ میں مرا ہے اور اس نے اسلام کا زمانہ پایا ہی نہیں۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- امام کی اطاعت سے نکلنا حرام ہے۔ البتہ یہ تحریم مقید ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔
- جو جائز امور میں تکبر کی وجہ سے امام اور ولی امر کی طاعت سے نکل کر مر گیا تو وہ ایسا ہے جیسے جاہلیت کے زمانہ میں مرا ہے۔ کیونکہ جاہلیت میں سب لوگ من مرضی کی زندگی گزارتے تھے، نہ ان کا کوئی امیر تھا نہ ولی امر کہ جس کی مانتے، اور نہ کوئی دین ہی تھا کہ جس پر چلتے۔

باغی جماعت کون ہے؟

1191- وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((تَقْتُلُ عَمَّارًا الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔'' [2] اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... عَمَّارًا: مراد حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: 1848.
[2] صحیح مسلم: 2916.

اَلْفِئَةُ: مراد ایک گروہ اور جماعت ہے۔ اَلْبَاغِيَةُ: وہ گروہ جو امام کی طاعت سے نکل گیا ہو۔

بلاشبہ یہ حدیث نبی کریم ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ہے کیونکہ اس میں مستقبل کے ایک امر کی یقینی خبر ہے۔ پھر ویسا ہی ہوا جیسا کہ آپ ﷺ نے بتلایا تھا، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کے پاس مستقبل کی خبریں وحی کے ذریعے آتی تھیں۔ کیونکہ آپ ﷺ تو عالم الغیب نہ تھے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ (الانعام: 50)

''کہہ دے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔''

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے اس لڑائی میں شہادت پائی تھی جو جناب علی المرتضی اور سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی تھی۔ جناب عمار رضی اللہ عنہ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ایک آدمی کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔

اس حدیث کی بنا پر علماء نے یہ قول کیا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کا گروہ اور لشکر جماعت عادلہ تھا۔ جبکہ سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر جماعت باغیہ تھا۔ کیونکہ باغی کی ضد عادل ہے، اور باغی وہ ہوتے ہیں جو امام عادل سے لڑائی کرتے ہیں۔ تب پھر سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو اس وصف کے ساتھ پکارنا جائز ٹھہرا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کی خبر دی تھی کہ جناب عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک آدمی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

البتہ ہم اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج تاویل کے ساتھ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تاویل خطا تھی، اور جناب علی رضی اللہ عنہ صواب اور درستی کے زیادہ قریب تھے۔ کیونکہ بلاشبہ جناب علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ راشد اور امیر المؤمنین تھے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت فئہ عادلہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت فئہ باغیہ کہلائی۔

دوسرے یہ کہ ان پاکباز ہستیوں اور نیک طینت بزرگوں کے درمیان ہونے والی اس لڑائی کی بابت ہمارا موقف وہی ہے جو جناب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا تھا کہ:

''یہ وہ مقدس خون ہیں کہ جن سے رنگین ہونے سے رب تعالیٰ نے ہماری تلواروں کو محفوظ رکھا، اس لیے واجب ہے کہ ہم اپنی زبانوں کو ان (کے برے تذکروں) سے محفوظ رکھیں۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث نبی کریم ﷺ کا ایک معجزہ ہے کہ اس میں مستقبل کے ایک امر کی بابت غیب کی خبر ہے جو بعینہ واقع ہوئی۔
- معلوم ہوا کہ تمام نبوی پیش گوئیاں معجزات میں داخل ہیں۔ کیونکہ ان کا تخلف ناممکن ہے۔
- معلوم ہوا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ جس جماعت میں شامل تھے وہ جماعت عادلہ تھی اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت تھی۔
- اور اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ دوسرا گروہ جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت تھی وہ گروہ باغیہ تھا۔

باغیوں کے ساتھ برتاؤ کے ضوابط

1192,1193۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((هَلْ تَدْرِيْ يَا ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ! كَيْفَ حُكْمُ اللّٰهِ فِيْمَنْ بَغَى مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ؟)) قَالَ: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: لَا يُجْهَزُ عَلَى جَرِيْحِهَا، وَلَا يُقْتَلُ أَسِيْرُهَا، وَلَا يُطْلَبُ هَارِبُهَا، وَلَا يُقْسَمُ فَيْئُهَا)).

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اے ابن ام عبد! کیا تم جانتے ہو کہ اس امت میں بغاوت کرنے والے کی بابت رب تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(وہ حکم یہ ہے کہ) ان کے زخمیوں کو جان سے نہ مارا جائے، اور ان کے قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے، ان کے بھاگ جانے والوں کا پیچھا نہ کیا جائے اور نہ ان کے مالوں کو (غنیمت کے طور پر) تقسیم ہی کیا جائے۔'' ❶

رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ فَوَهِمَ، لِأَنَّ فِيْ إِسْنَادِهِ كَوْثَرَ بْنَ حَكِيْمٍ، وَهُوَ مَتْرُوْكٌ.

اس حدیث کو بزار اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، لیکن یہ ان کا وہم ہے۔ کیونکہ اس حدیث کی اسناد میں کوثر بن حکیم ہے جو متروک ہے۔

وَصَحَّ عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ مِنْ طُرُقٍ نَحْوُهُ مَوْقُوْفًا، أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ وَالْحَاكِمُ.

البتہ یہ حدیث متعدد طریق کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت ہے جو صحیح ہے۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ ❷

روایۃ الحدیث: ......سند کے اعتبار سے اس حدیث میں ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ اس کو روایت کرنے والے جنابِ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ جبکہ اس میں خطاب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ہے۔ کیونکہ اس کنیت کے ساتھ وہی مشہور ہیں۔ علماء نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیے ہیں: ایک جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ کنیت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بھی رہی ہو، لیکن وہ اس کنیت کے ساتھ مشہور نہ ہوئے ہوں۔ مگر یہ جواب ضعیف ہے۔

ایک جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی روایت کیا ہو، مگر روایت کرتے وقت اس واسطہ کو حذف کر دیا ہو۔

لیکن ان دونوں سے بہتر جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متروک ہے۔ تب پھر ہمیں اس اشکال کے جوابات کی جستجو کی تعب و تکان سے راحت مل جاتی ہے۔

البتہ اگر ہم اس حدیث کو صحیح مان لیں تو پہلے دونوں جوابات بعید ہیں۔

غریب الحدیث: ...... كَيْفَ حُكْمُ اللّٰهِ فِيْمَنْ بَغَى مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ: یعنی باغی گروہ کی بابت رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں کیا حکم دیا ہے، تو وہ یہ ہے:

﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى

---

❶ اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے جیسا کہ: مجمع الزوائد: 243/6۔ میں ہے، المستدرك للحاكم: 168/2۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے کوثر بن حکیم کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

❷ مصنف ابن ابی شیبة: 498/6۔ مصنف عبدالرزاق: 123/10۔ المستدرك للحاكم: 168/2۔

﴿فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (الحجرات : 9)

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

غالب یہ ہے کہ جب جمع کے صیغہ کے ساتھ ایسا خطاب کیا جاتا ہے تو اس کے مخاطب اہل حل وعقد ہوتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات باغی جماعت خود امام یا خلیفہ شرعی کے ساتھ ہوتی ہے جو اس کے خلاف بغاوت پر اتری ہوتی ہے۔

غرض باغی جو بھی ہوں ان کا حکم وہ ہے جو آگے آرہا ہے۔

اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ : اَعْلَمُ: یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ جب یہ مِنْ کی تقدیر سے آئے تو اس میں اِفراد اور تذکیر لازم ہوتی ہے۔ اسی لیے یہاں بھی ''اعلم'' اسم تفضیل کا صیغہ مفرد اور مذکر ہے۔ کیونکہ یہ مِنْ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ جو یہ ہے: ((اللّٰہ ورسولہ اعلم من کل الناس)) ''اللہ اور اس کا رسول سب لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں۔''

البتہ جب اسم تفضیل کا صیغہ مِـنْ کی تقدیر کے ساتھ نہ ہو تو یہ اِفراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر وتانیث میں اپنے موصوف کے مطابق ہوتا ہے جیسے ''زید و عمرو افضلان'' جبکہ یہ مِنْ کی تقدیر سے نہ ہو۔

اور اعلمیت سے مراد یہاں امورِ شرعیہ کا جاننا ہے۔ لہٰذا کسی شرعی مسئلہ کی بابت آدمی یہ کہہ سکتا ہے اس کو اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ جبکہ امورِ کونیہ کو صرف اللہ کی ذات ہی زیادہ جاننے والی ہے۔ کیونکہ امورِ کونیہ محض علم غیب ہیں جن کو اللہ کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا۔

لَا يُجْهَزُ عَلٰى جَرِيحِهَا : اِجھاز: یہ زخمی کو فوراً قتل کر کے اس کا کام تمام کر دینے کو کہتے ہیں، اور زخمی سے مراد باغیوں کا زخمی ہے۔

یہ امام سے برسرِ پیکار ہونے والے باغیوں کی بابت پہلا حکم ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر اگر ان کا کوئی زخمی مقتولوں میں پڑا ملتا ہے تو اس کو دیگر کفار کی طرح قتل نہ کیا جائے گا۔

وَلَا يُقْتَلُ أَسِيرُهَا : یہ دوسرے حکم کا بیان ہے کہ جنگ کے دوران ان کے جو لشکری ہاتھ لگیں، ان کو بھی قتل نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ بہر حال یہ ابھی تک مسلمان ہے اور مسلمان کے خون کی حرمت باقی ہے۔ رہا ان سے قتال کا جواز تو وہ صرف ان کے شر کے دفعیہ کے لیے ہے۔

وَلَا يُطْلَبُ هَارِبُهَا : اور تیسرا حکم یہ ہے کہ جو ان میں سے جنگ کے دوران فرار ہو جانے اور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کا پیچھا نہ کیا جائے گا، کیونکہ باغیوں سے قتال کا جواز ان کے شر کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے ہے۔ سو جو ان میں سے زخمی ہو گیا یا گرفتار ہو گیا یا بھاگ نکلا تو اس سے کسی قسم کے شر کا اندیشہ نہیں۔ لیکن جو بھاگ کر باغیوں سے جا ملے اور ان کی تقویت ومساعدت کا باعث بنے، اس کی بابت علماء کے دو مختلف اقوال ہیں۔ سو:

جن علماء نے اس حدیث کے ظاہر کو دیکھا ہے، وہ اب بھی اسی بات کے قائل کے ہیں کہ ایسے باغی کا بھی پیچھا نہ کیا جائے۔

اور جنہوں نے حدیث کے معنی میں غور وتدبر کیا ہے، وہ ایسے باغی کا پیچھا کرنے کے قائل ہیں کیونکہ باغیوں سے قتال کا جواز ان کے شر کے خاتمہ کے لیے ہے اور یہ باغیوں سے جا ملنے والا اسی شر کے اِحیاء اور تقویت کا باعث ہے۔

صحیح قول یہی دوسرا قول ہے۔ کیونکہ یہ بھاگ کر جماعت سے جاملنے والا انہیں پھر مسلمانوں کی جماعت پر لا چڑھائے گا، اس لیے اس کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اس کا شر دم توڑ جائے۔

وَلَا يُقْسَمُ فَيْئُهَا: فئی سے مراد باغیوں کا ملنے والا سامان ہے۔ جیسے اسلحہ، خیمے، گھوڑے، نقدیاں وغیرہ۔ تو اس سامان کو اموالِ کفار کی طرح غنیمت بنا کر تقسیم نہ کیا جائے گا۔ یہ مال ان ہی کا ہے اور ان کے شر کی قلع قمع کرنے کے بعد انہیں لوٹا دیا جائے گا۔ چنانچہ اگر تو کسی سامان کا مالک مل گیا تو یہ اس کا وگرنہ اسے بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

فَوَهِمَ: یعنی امام حاکم اس حدیث کی تصحیح میں وہم کا یعنی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔

فَهُوَ مَتْرُوْكٌ: متروک سے مراد متروک الروایہ ہے۔ کیونکہ ایسے راوی پر کذب کی تہمت ہوتی ہے۔ چنانچہ متہم بالکذب راوی کو متروک کہا جاتا ہے۔ ایسا راوی فسق کی تہمت والے راوی سے اشد ہوتا ہے۔

موقوفًا: یعنی وہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور وہ محض قیاس ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر چہ یہ احکام ثابت ہیں لیکن حدیثِ موقوف سے ثابت ہیں جو خلیفہ راشد سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے قیاس سے ثابت ہیں، اور سیّدنا علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی سنت کی اتباع کی جاتی ہے۔ مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جس بات کا کسی کو شرعی حکم معلوم نہ ہو، اس بارے اس کا یہ کہنا کہ: ''اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں'' یہ کہنے سے زیادہ بہتر ہے کہ ''میں نہیں جانتا''۔ کیونکہ اللّٰـه ورسوله اعلم کہنے میں علم شرعی کی نسبت ان کے جاننے والے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔
- باغیوں کے زخمیوں کا قتل جائز نہیں۔ اس کی دلیل "لَا يُجْهَزُ عَلَى جَرِيحِهِمْ" کے الفاظ ہیں۔ پھر یہ کہ یہ لوگ کافر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ایک مباح تاویل کے ساتھ خروج کیا ہے۔
- باغیوں کا قیدی قتل نہ کیا جائے گا اور جب تک وہ بغاوت سے تائب نہیں ہو جاتا، اسے پابند سلاسل رکھا جائے گا۔
- باغیوں کا بھاگ جانے والا پیچھا کر کے پکڑا نہ جائے گا۔
- باغیوں کے اموال تقسیم نہ ہوں گے۔ چنانچہ مالک مل جائے تو اسے دے دیا جائے گا۔ وگرنہ بیت المال میں جمع کرا دیا جائے گا۔
- یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باغیوں سے ہونے والی جنگ کے دوران طرفین سے ہونے والا جانی و مالی نقصان غیر مضمون ہوگا۔ جنابِ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا تھا۔
- تاویل کو حکم کی تغییر میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ تاویل کے ساتھ خروج کرنے والوں کے احکام اور ہیں اور تاویل کے بغیر نکلنے والوں کے احکام اور ہیں۔

اجتماعیت کی اور تفرقہ چھوڑ دینے کی ترغیب

1194۔ وَعَنْ عَرْفَجَةَ بْنِ شُرَيْحٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((مَنْ أَتَاكُمْ، وَأَمْرُكُمْ

حضرت عرفجہ بن شریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''جو تمہارے پاس

جَمِيعٌ يُرِيْدُ أَنْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْهُ)). یہ خواہش لے کر آیا کہ تمہاری جماعت کو متفرق کر دے جبکہ تمہارا امر (ایک آدمی پر) یکجا ہے تو اسے قتل کر دو۔'' [1]

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. اس حدیث کوامام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ أَتَاكُمْ: مراد کوئی بھی آدمی ہے۔ مذکورہ مَنْ شرطیہ ہے اور یہ جملہ شرطیہ ہے۔

وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ: یعنی تمہارا امر حکومت وولایت اور امارت وخلافت ایک آدمی پر یکجا ہے۔ یعنی اس وقت تمہارا ایک حاکم، امیر یا خلیفہ ہے۔

یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ أَتَاكُمْ کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

يُرِيدُ أَنْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ: یعنی وہ اپنی بیعت کا مطالبہ کر کے تمہاری اجتماعیت اور اتفاق واتحاد کو توڑنا چاہتا ہو۔

فَاقْتُلُوهُ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے اور یہ جملہ جوابِ شرط ہے، اور یہ قتل کر دینا بطورِ حد کے ہوگا۔ یعنی اس کو فوراً قتل کر دو اور کسی بات کا انتظار نہ کرو۔ تاکہ اس کے شر کا دفعیہ ہو۔

علماء نے اس حدیث کی رو سے یہ قول کیا ہے کہ پوری امت اسلامیہ کا ایک ہی امیر ہونا لازم نہیں۔ کیونکہ یہ ''امر'' خلافتِ عباسیہ کے اختتام سے ختم ہو چکا ہے، اور اب اس امر کو صدیاں بیت چکی ہیں کہ امت مسلمہ ایک امیر اور خلیفہ کے تحت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا جو ایک علاقہ کا خلیفہ ہو، اور لوگ اس کی طاعت کرتے ہوں۔ اس کا عام حکم خلیفہ ہونے کا ہے۔ اب اسی پر عمل ہے اور سب علماء کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کیونکہ اگر ہم سب کا امیر ایک ہونا لازم کر دیں تو امت مسلمہ کا ایک بڑا حصہ بنا امیر کے رہ جائے گا، اور موجودہ دور میں یہ امر معتذر ہے کہ سب کا امیر ایک ہو۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں امت کی وحدت وجمعیت کو توڑنے پر سخت سرزنش آئی ہے اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ جو امت میں انتشار پھیلانا چاہتا ہو اس کو قتل کر دیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت نے اتفاق واتحاد قائم کرنے اور تفرقہ وانتشار سے بچنے کی زبردست ترغیب دی ہے۔
- جو امام کی طاعت سے نکل جائے اس کا قتل حلال ہے اس کی دلیل "فَاقْتُلُوْهُ" کے الفاظ ہیں۔
- حدیث کا ظاہر بتلاتا ہے کہ طاعتِ امام سے نکلنے والا ایک ہو یا جماعت، سب واجب القتل ہیں۔

4۔ بَابُ قِتَالِ الْجَانِيْ وَقَتْلِ الْمُرْتَدِّ
جانی سے قتال اور مرتد کے قتل کا بیان

تمہید:......امام موصوف رحمہ اللہ نے یہاں دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں، (1) قتال (2) اور دوسرا قتل، ان دونوں میں فرق بدیہی ہے۔ قتل جانب واحد سے ہوتا ہے اور اس میں مغالبہ (یعنی ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش) نہیں ہوتا۔ جبکہ قتال میں مغالبہ ہوتا ہے جو جانبین سے ہوتا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم: 1852.

تب پھر مطلب یہ ہے کہ مرتد کو بغیر مقاتلہ کے قتل کیا جائے گا یعنی چاہے وہ اہل اسلام سے برسر پیکار نہ بھی ہو تب بھی قتل کیا جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ جانی سے کیا مراد ہے؟ تو یہ ہر وہ آدمی ہے جو دوسرے پر زیادتی کا مرتکب ہو، جیسے کسی کی جان لینے یا اس کا مال چھیننے کی کوشش کرنے کے لیے اس پر حملہ آور ہونے والا کہ یہ جانی ہے۔ ایسے آدمی سے مقاتلہ یعنی جوابی کاروائی جائز ہے۔

البتہ اس میں شرط ہے کہ چھوٹتے ہی اسے جان سے نہ مار دے بلکہ پہلے بطریق احسن اس کو اعتداء سے باز رہنے کو کہے۔ پھر اگر وہ نہیں مانتا اور قتل کر کے جان لینے پر ہی بضد ہے تو تب اس سے بھی قتال جائز ہوگا اور اگر اپنی جان بچانے میں اس کی جان لینی پڑی تو یہ جائز ہوگا۔

حملہ آور کو قتل کر دینا جائز ہے

1195۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ ﷺ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهِ ، فَهُوَ شَهِيْدٌ)) .

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ ، وَصَحَّحَهُ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو آدمی اپنے مال کی (حفاظت کی) خاطر مارا گیا وہ شہید ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام ابو داؤد، امام نسائی اور امام ترمذی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

درایۃ الحدیث :...... کاش کہ امام موصوف رحمہ اللہ اس کی بجائے وہ حدیث لاتے جو اس سے زیادہ مکمل ہے، اور اس میں یہ ذکر ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے یہ دریافت کیا کہ جو میرا مال چھیننا چاہے یا میری جان لینا چاہے میں اس کے ساتھ کیا کروں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اس سے لڑو'' اس نے عرض کیا: ذرا یہ بتلائیے کہ اگر (اس لڑائی میں) وہ مجھے قتل کر دے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تب پھر تم شہید ہو گئے۔'' اس آدمی نے عرض کیا: ذرا بتلائیے کہ (ایسی صورت میں) اگر اسے میں قتل کر دوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جہنم میں جائے گا۔''

غرض یہ حدیث حدیث الباب سے زیادہ مکمل ہے۔ کیونکہ اس میں صرف مال کی خاطر مارے جانے والے کا ذکر ہے۔ جبکہ ہماری ذکر کردہ حدیث میں جان بچاتے ہوئے مارے جانے والے کا بھی ذکر ہے کہ وہ شہید ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اپنے مال کا دفاع کرنا جائز ہے، اور جواز سے مراد تحریم کی نفی ہے جو وجوب کو بھی شامل ہے نہ کہ مراد صرف حکماً جائز ہونا ہے۔ تب پھر اپنے مال کی مدافعت و حفاظت واجب ہوگی۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ مال کی مدافعت صرف جائز ہے نہ کہ واجب، کیونکہ مال تو آدمی کسی کو ویسے بھی دے دیتا ہے۔ اگر مال کی حفاظت یوں واجب ہوتی تو کسی کو تبرع کے طور پر مال دینا حرام ہوتا۔

---

[1] یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ہمیں یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نہیں ملی۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث آگے "باب التعزیر و حکم الصائل" میں آجائے گی، اور حدیث عبداللہ بن عمرو متفق علیہ ہے۔ (دیکھیں: صحیح البخاری: 2480۔ صحیح مسلم: 641) جبکہ حدیث بریدہ رضی اللہ عنہ السنن الکبری للنسائی: 3555 میں ہے۔

البتہ پھر بھی اگر کوئی مال چھیننے کی کوشش کرے اور جان لے کر ہی ٹلے تو مال کی خاطر مارا جانے والا شہید ہوگا اور اگر اس دوران وہ لٹیرا مارا گیا تو وہ جہنمی ہوگا۔

◈ اور جب مال کی خاطر مارا جانے والا شہید ہے تو جان کی خاطر مارا جانے والا بدرجہ اولیٰ شہید ہوگا۔ البتہ فتنہ کے زمانہ میں قتال لازم نہیں۔ کیونکہ بسا اوقات یہ امر اور بہت ساری جانوں کے ضیاع کا باعث بن جاتا ہے۔

اسی لیے جب باغیوں کے محاصرہ کے دوران سیّدنا عثمان بن عفان امیر المؤمنین سے ان کی خاطر لڑنے کی اجازت مانگی گئی تو انہوں نے اس اندیشہ کی بنا پر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ کہیں مدینہ رسول خونِ مسلم سے رنگین نہ ہو جائے۔

ہاں زمانہ امن میں جان کا دفاع واجب ہے۔

◈ امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ ظلماً مقتول ایسا شہید ہے جیسا کہ معرکہ کارزار کا شہید لہٰذا اسے بھی تجہیز و تکفین اور غسل وصلوٰۃ کے بغیر دفن کیا جائے گا۔ یعنی ظلماً مقتول شہیدِ دنیا بھی ہے اور شہیدِ آخرت بھی۔

جبکہ ایک قول یہ ہے کہ وہ شہیدِ آخرت تو ہے لیکن شہیدِ دنیا نہیں۔ لہٰذا اس کا حکم معرکہ کارزار کے شہید جیسا نہ ہوگا کیونکہ ان دونوں شہیدوں میں فرق ہے، وہ یہ کہ مجاہد فی سبیل اللہ نے اپنے اختیار سے اللہ کی راہ میں جان دی ہے۔ جبکہ ظلماً مقتول جان دینے پر مضطر تھا۔ اس لیے درست یہ ہے کہ ظلماً مقتول صرف شہیدِ آخرت ہے۔ لہٰذا اسے غسل بھی دیا جائے گا اور کفن بھی، اور اس کی نمازِ جنازہ بھی ادا کی جائے گی۔

◈ اگر ظالم جانی اس مقاتلہ میں مارا جائے گا تو وہ جہنمی ہوگا۔

◈ اگر جانی مقتول کے اولیاء اور جان کا دفاع کرنے والے قاتل میں اختلاف ہو جائے کہ جانی کا دوسرے کی جان لینے کا کوئی ارادہ نہ تھا لہٰذا دفاعی قاتل اس ''قتل'' میں مجرم ہے۔

تو علماء کا اس بارے یہ قول ہے کہ دفاعی قاتل کی صرف اس کے اس دعویٰ کی بنیاد پر تصدیق نہ کی جائے گی کہ وہ تو میری جان لینا چاہتا تھا۔ اگر میں اسے نہ مارتا تو خود مارا جاتا کہ اس طرح تو جس نے بھی اپنی عداوت نکالنی ہوگی، وہ دوسرے کے جان لیوا حملہ کرنے کے دعویٰ کی آڑ میں اسے قتل کر دے گا۔

لہٰذا دفاعی قاتل کے دعویٰ کی بغیر بینہ کے تصدیق نہ کی جائے گی۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے قتل کا گواہ لانا مشکل ہے کیونکہ کوئی دن دیہاڑے دوسرے کو مارنے نہ آئے گا۔ [1] تب پھر بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ قرائن دیکھے جائیں گے۔ اگر تو مقتول حملہ آور اس قماش کا آدمی تھا تو اس کے شر اور فساد میں معروف ہونے کی وجہ سے دفاعی قاتل کے دعویٰ کی تصدیق کر دی جائے گی وگرنہ دفاعی قاتل کا دعویٰ رد کر دیا جائے گا۔

جان کی مدافعت کرتے ہوئے کسی جان کے یا جان سے کم کے اتلاف کا ضمان نہ آئے گا

1196۔ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضي الله عنه قَالَ: قَاتَلَ يَعْلَى بْنُ أُمَيَّةَ رَجُلًا ، فَعَضَّ أَحَدُهُمَا

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کا ایک آدمی سے جھگڑا ہوا اور ایک نے

---

[1] لیکن افسوس کہ اب یہ بھی آئے روز کا قصہ ہے۔ لوگ دن دیہاڑے سب کے سامنے دوسرے کو گولیاں مار کر اسلحہ لہراتے، ڈراتے دھمکاتے نکل جاتے ہیں، اور سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من انقلاب القلوب. نسیم۔

صَاحِبَهُ ، فَانْتَزَعَ يَدَهُ مِنْ فَمِهِ ، فَنَزَعَ ثَنِيَّتَهُ ، فَاخْتَصَمَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ : ((يَعَضُّ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ كَمَا يَعَضُّ الْفَحْلُ ؟ لَا دِيَةَ لَهُ)) .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ .

دوسرے کو دانت سے کاٹ لیا، جب دوسرے نے کاٹنے والے کے منہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا تو (اس زورا زوری میں) اس نے کاٹنے والے کے سامنے کا دانت نکال دیا۔ پس دونوں جھگڑا لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم میں سے ایک اپنے بھائی کو اس طرح کاٹتا ہے جس طرح (نر اونٹ یعنی) سانڈ کاٹتا ہے۔'' (لہٰذا اس لو کہ) اس کی کوئی دیت نہیں۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور اس حدیث کے الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث:......**قَاتَلَ**: مقاتلہ باہم دست وگریبان ہونے کو کہتے ہیں۔ جس میں اسلحہ اٹھانا لازم نہیں۔

فَعَضَّ: یہ دانتوں سے کاٹنے کو کہتے ہیں۔

فَانْتَزَعَ يَدَهُ مِنْ فَمِهِ: فَانْتَزَعَ کا فاعل معضوض ہے (یعنی جسے کاٹا جا رہا تھا) اسی طرح یدہ کی ضمیر بھی فاعل کی طرف راجع ہے جبکہ مِنْ فَمِهِ میں ضمیر عاض (کاٹنے والے) کی طرف راجع ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی کاٹے جانے کو برداشت نہ کر سکا۔ جیسا کہ عموماً لوگ دوسرے کے کاٹنے کو جھیل نہیں پاتے۔ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ زور سے کھینچا۔ اس کھینچنے میں کاٹنے والے کا سامنے کا دانت ٹوٹ گیا۔

فَاخْتَصَمَا: دونوں اپنا جھگڑا خدمت نبوی میں لے گئے۔ خصومت یہ دلیل کے ساتھ دوسرے پر غالب آنے کو کہتے ہیں۔

أَيَعَضُّ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ.....: مذکورہ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے۔ اس لیے یہ جملہ انشائیہ ہے، اور یہ انکار زجر و توبیخ کے لیے ہے، اور یہ دو اعتبار سے ہے۔

(1) ایک یہ کہ یہ انکار شفقت و مہربانی کو مقتضی ہے جس پر لفظ ''أَخَاهُ'' دلالت کر رہا ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ انکار اس قابل نفرت فعل سے تنفیر اور بعد کو مقتضی ہے اس کی دلیل لفظ الفَحل ہے۔

كَمَا يَعَضُّ الْفَحْلُ: حیوان سے تشبیہ تقبیح اور تنفیر (یعنی اس فعل کی قباحت بتلانے اور اس سے نفرت دلانے) کی غرض سے ہے تاکہ آدمی ایسا کرنے سے گھن کھائے۔ فحل ہر طاقتور نر چوپائے کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں مراد نر اونٹ یعنی سانڈ ہے۔

اور خاص سانڈ سے اس لیے تشبیہ دی کیونکہ سانڈ غصہ اور انتقام میں مشہور ہے اور سانڈ بدلہ لینے کے لیے عموماً دوسرے کو دانتوں میں بھینچ کر اور پٹخ کر مار دیتا ہے۔

لَا دِيَةَ لَهُ: چونکہ دوسرے کے دانت کا یہ اتلاف اپنی جان کی مدافعت کرتے ہوئے ہوا ہے اس لیے اس کی کوئی دیت نہ ہوگی۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اگر اپنی جان کی مدافعت کرتے ہوئے دوسری کی جان کا یا ما دون النفس کا اتلاف ہو جائے تو وہ مضمون نہ ہوگا۔

---

[1] صحيح البخاری: 6892۔ صحیح مسلم: 1673.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شیطان لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے میں اور ایک دوسرے کے دست وگریبان کرنے میں لگا رہتا ہے، حتیٰ کہ انہیں جانوروں جیسی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
- اگر کسی نے اپنی تکلیف دور کرنے میں کسی کا اتلاف کر دیا تو وہ غیر مضمون ہوگا۔ جیسے اس دانت توڑنے والے نے دراصل اپنا دفاع کیا تھا اور کاٹے جانے کی شدید تکلیف سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنا ہاتھ زور سے کھینچا تھا جس کے نتیجہ میں دانت گاڑنے والے کا ایک اگلا دانت ٹوٹ گیا۔
اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس دانت کا کوئی ضمان نہ دلوایا، اور فرمایا کہ اس کی کوئی دیت نہیں۔
- مذکورہ حدیث میں اپنے بھائی کو دانتوں سے کاٹنے پر شدید انکار ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے ایسا کرنے والے کو سانڈ سے تشبیہ دی ہے، اور یہ اس فعل سے نفرت دلانے کے لیے ہے۔
یاد رہے کہ حیوان سے تشبیہ ہمیشہ ذم کے مقام پر آتی ہے۔
- معلوم ہوا کہ جان کا دفاع جائز ہے چاہے اس میں حملہ آور کا کوئی جانی یا مالی نقصان ہی ہو جائے۔

مسلمانوں کے گھروں میں تاک جھانک کرنے والے کا ضمان ساقط ہے

1197۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ أَبُو الْقَاسِمِ ﷺ: ((لَوْ أَنَّ امْرَأً اطَّلَعَ عَلَيْكَ بِغَيْرِ إِذْنٍ، فَخَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ، فَفَقَأْتَ عَيْنَهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْكَ جُنَاحٌ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو القاسم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر کسی نے بلا اجازت تمہیں (یعنی تمہارے گھر میں) جھانکا اور تم نے اسے (ایسا کرنے پر) ایک کنکری دے ماری جس نے اس کی آنکھ پھوڑ ڈالی تو تم پر (اس کا) کوئی گناہ (بھی) نہ ہوگا (اور اس کا کوئی ضمان بھی نہ آئے گا)۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ: ((فَلَا دِيَةَ لَهُ، وَلَا قِصَاصَ)).

اور مسند احمد، سنن نسائی اور صحیح ابن حبان کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: ''تو نہ تو اس کی کوئی دیت ہوگی اور نہ قصاص ہی ہوگا۔'' [2]
ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......أَبُو الْقَاسِمِ ﷺ: یہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی مبارک اور محبوب ترین کنیت ہے۔ علماء نے اس کنیت کی دو وجہ تسمیہ بیان کی ہیں:

(1) ایک یہ کہ آپ ﷺ کا قاسم نامی ایک فرزند ارجمند تھا، اور یہی ظاہر اور زیادہ صحیح قول ہے۔

(2) دوسری یہ کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ((إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ مُعْطِ)) ''میں تو صرف بانٹنے والا ہوں، دینے

---

[1] صحيح البخاري: 6902- صحيح مسلم: 2158.

[2] مسند احمد: 385/2- سنن النسائي: 61/8- صحيح ابن حبان: 6004.

والا تو صرف اللہ ہے۔"
لیکن اس وجہ کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

لَوْ أَنَّ امْرَأً اِطَّلَعَ عَلَيْكَ بِغَيْرِ إِذْنٍ: مذکورہ لَوْ شرطیہ ہے اور یہ صرف افعال پر ہی داخل ہوتا ہے، اور جب لفظوں میں فعل مذکور نہ ہو تو اس کو محذوف مانتے ہیں۔ جیسا کہ یہ ترکیب مفصل ذکر کی جا چکی ہے، اور وہ فعل ثَبَتَ ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: "لَوْ ثَبَتَ اَنَّ امْرَاً......" تب پھر "لم یکن علیك......" یہ جواب شرط ہوگا۔

اِطَّلَعَ عَلَيْكَ: مراد "اِطَّلَعَ عَلَى بَيْتِكَ" ہے۔ (جیسا کہ بندہ عاجز نے ترجمہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔)
مراد یہ ہے کہ اگر کوئی دروازے کے پیچھے تاک جھانک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا جائے۔

بِغَيْرِ إِذْنٍ: یہ گزشتہ اور آئندہ کی دونوں اجازتوں کو شامل ہے۔ یعنی ایسا کرنے کی تم نے نہ تو پہلے اجازت دی تھی اور نہ بعد میں۔ **فَحَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ**: اگرچہ حذف کنکری کو انگوٹھے پر رکھ کر درمیانی انگلی سے مارنے کو کہتے ہیں لیکن یہاں خاص یہی صورت ہی مراد نہیں بلکہ مطلق کنکری دے مارنا مراد ہے، اور مقصود اسے ایسا کرنے سے روکنا اور ٹوکنا اور اسے یہ بات بتلانا ہے کہ اس کی اس حرکت کو صاحب بیت دیکھ رہا ہے۔

فَفَقَأْتَ عَيْنَهُ: یعنی کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ ڈالی جس سے اس کی بینائی جاتی رہی۔

لَمْ يَكُنْ عَلَيْكَ جُنَاحٌ: یہ جملہ جواب شرط ہے۔ جناح سے مراد گناہ ہے، اور گناہ کی نفی یہ ضمان کی نفی کو لازم ہے کہ جب گناہ نہ رہا تو معلوم ہوا کہ یہ فعل حرام نہیں تب پھر مضمون بھی نہیں۔

تاک جھانک کرنے والے کو کنکری مارنے کا حکم

امام موصوف اس حدیث کو مذکورہ باب کے تحت یہ بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ اگر چوری چھپے جھانکنے والے کے شر سے اسے کنکری مارے بغیر بچنا ممکن ہو تو کنکری مارنے سے گریز ہی کیا جائے۔ چنانچہ بعض علماء نے اسے دفعِ صائل (حملہ آور کو روکنے) کے باب سے شمار کیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ چوری تاکنے والے کو کنکری مارنا یہ معتدی کی عقوبت کے باب سے ہے۔ جیسے کوئی اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو بدکاری کرتے دیکھے تو اس کے لیے اس زانی کو بدون آگاہ کیے، مار ڈالنا جائز ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ مذکورہ حکم کنکری یا اس جیسی کسی چیز کو مارنے تک ہی محدود ہے۔ کیونکہ اس پر نص آ گئی ہے۔ لہٰذا کسی کو گھر میں جھانکنے پر گولی مار دینا جائز نہ ہوگا۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ عدم ضمان صرف آنکھ پھوٹنے کی حد تک ہی ہے لہٰذا اگر کسی نے چوری جھانکنے والے کو کنکری ماری اور اس سے اس کا ماتھا یا رخسار زخمی ہو گئے تو ضمان آئے گا۔ کیونکہ محل جنایت آنکھ تھی اور اس نے غیر محل کو مجروح کیا ہے۔

کون سا جھانکنا قابل عقوبت ہے

اِطَّلَعَ کا لفظ بتلاتا ہے کہ یہ حکم اس صورت پر مشتمل ہے جب دروازہ بند ہو اور کوئی اس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو یا اس کی کسی درز یا سوراخ میں نگاہ ٹکا کر اندر دیکھنے کی کوشش کرے۔ تب اسے کنکری مارنا جائز ہے چاہے اسے جہاں بھی جا لگے۔ لیکن اگر کسی نے گھر کا دروازہ خود چوپٹ کھول رکھا ہو اور کوئی راہ چلتا کھڑے ہو کر اندر جھانکے تو اسے کنکری مارنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اب کوتاہی گھر والے کی ہے۔

صورت مسئلہ اور مضمونِ حدیث واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- لوگوں کے گھروں میں بن پوچھے تاک جھانک کرنا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو مباح کیا ہے۔
- اگر کسی کے گھر کی دیوار چھوٹی ہو جس سے دوسروں کی نگاہ اندر پڑتی ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے گھر کی دیوار اونچی کرے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دوسروں کے گھروں میں جھانکنا حرام قرار دیا ہے، اور چھوٹی دیواریں اس حرام کے ارتکاب کا وسیلہ ہیں اور حرام کا وسیلہ بننا بھی حرام ہے۔ لہٰذا ان دیواروں کو اونچا کرنا واجب ہوگا۔
- آدمی دوسرے کو گھر کے اندر آنے اور جھانکنے کی اجازت دے سکتا ہے اس کی دلیل "بِغَيْرِ إِذْنِهِ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ حجاب صاحبِ بیت کا حق ہے۔ تو جب وہ خود دوسرے کے اندر دیکھنے پر راضی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔
- کنکری مارتے وقت جھانکنے والے کو خبردار کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس جواز کو خبردار کرنے کے ساتھ مشروط نہیں کیا۔
- اگر کسی نے ایک آنکھ سے جھانکا جبکہ صاحب بیت نے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں تو وہ ایک آنکھ کی دیت کا ضامن بنے گا۔ کیونکہ دوسری آنکھ محل جنایت نہ تھی۔
- جھانکنے والے کو ایسی شے دے مارنا جائز نہیں جس سے وہ ہلاک ہی ہو جائے۔
- شریعت اسلامیہ لوگوں کے پردہ کی چیزوں کی حفاظت وعنایت کی بے حد حریص ہے۔

چوپایوں کے اِتلاف کے احکام

1198- وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضي الله عنه قَالَ: قَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَنَّ حِفْظَ الْحَوَائِطِ بِالنَّهَارِ عَلَى أَهْلِهَا، وَأَنَّ حِفْظَ الْمَاشِيَةِ بِاللَّيْلِ عَلَى أَهْلِهَا، وَأَنَّ عَلَى أَهْلِ الْمَاشِيَةِ مَا أَصَابَتْ مَاشِيَتُهُمْ بِاللَّيْلِ)).

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا کہ دن میں باغوں کی حفاظت ان کے مالکوں کے ذمہ ہے، اور رات کو مویشیوں کی حفاظت ان کے مالکوں کے ذمہ ہے، اور مویشیوں نے رات کے وقت (کسی کا) کوئی نقصان کیا تو وہ (یعنی اس کا ضمان) ان کے مالکوں کے ذمہ ہوگا۔" [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ اخْتِلَافٌ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام ترمذی کے، اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ

---

[1] مسند احمد: 326/5- سنن ابی داؤد: 3570- السنن الکبری: 5784- سنن ابن ماجه: 2332- المستدرك للحاكم: 55/2- حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس اختلاف کے باوجود صحیح ہے کہ اس حدیث کو زہری سے معمر نے روایت کیا ہے یا اوزاعی نے۔ ابن حزم "المحلی: 4/11" میں کہتے ہیں: یہ خبر مرسل ہے۔ ابن عبدالبر "التمهيد: 82/11" میں کہتے ہیں: اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اسے ثقہ رواۃ نے روایت کیا ہے۔ یہ مشہور خبر ہے اور اہل حجاز کے فقہاء کا اس پر عمل ہے، اور انہوں نے اس حدیث کو قبول کیا ہے۔ جبکہ مدینہ میں بھی اس پر عمل ہے۔

اس کی اسناد میں اختلاف ہے۔

مناسبت حدیث:......سب سے پہلے ہم یہ امر واضح کریں گے کہ یہ حدیث اس باب میں کیونکر لائی گئی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کو مویشیوں کو باندھے بنا کھلے مہار چھوڑ دینا اہل بساتین پر جنایت ہے۔ اسی لیے اس حدیث کو مذکورہ باب کے تحت لے کر آئے ہیں۔

غریب الحدیث:......قَضَی: مراد حکم شرعی کو جاری کرنا ہے۔ چاہے آپ ﷺ نے یہ حکم خود سنایا ہو یا کسی قضیہ کے پاس آنے پر یہ فیصلہ فرمایا ہو، دونوں صورتوں میں حکم ایک ہی ہے۔

أَنَّ حِفْظَ الْحَوَائِطِ: حوائط: یہ حائط کی جمع ہے، مراد باغات و بساتین ہیں، اور باغ کو حائط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ باغ کی حفاظت کے لیے اس کے چاروں اطراف میں ایک دیوار بنادی جاتی ہے۔

بِالنَّهَارِ عَلَى أَهْلِهَا: اب دن میں باغوں کی حفاظت خود مالکان کے ذمہ ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ بیدار اور ہوشیار ہوتے ہیں لہٰذا وہ چوپایوں وغیرہ سے باغ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

دوسرے لوگ دن میں جانوروں کو چرنے کے لیے چھوڑ دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی باغ والوں کو ان متوقع حملہ آوروں سے خبردار رہنا لازم ہے۔ لہٰذا دن میں باغوں کی حفاظت کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔

اور بالنہار میں مذکورہ "باء" ظرفیت کے لیے ہے، یعنی یہ کلمہ "فی" کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ بارہا ذکر کیا جا چکا ہے۔

وَأَنَّ حِفْظَ الْمَاشِيَةِ بِاللَّيْلِ عَلَى أَهْلِهَا: اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کے وقت جانوروں کو چرنے کے لیے چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کو اپنے باڑوں میں رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے آگے یہ فرمایا کہ:

وَأَنَّ عَلَى أَهْلِ الْمَاشِيَةِ مَا أَصَابَتْ مَاشِيَتُهُمْ بِاللَّيْلِ: اَصَابَتْ سے مراد اَتْلَفَتْ ہے۔ یعنی رات کے وقت اگر مویشیوں نے باڑوں سے نکل کر کسی کا کوئی نقصان کر دیا تو اس کا ضمان ان کے مالکان پر آئے گا۔ کیونکہ رات کے وقت باغوں کے مالکان معذور ہیں۔ اسی لیے رات کے وقت باغوں کی ذمہ داری نبی کریم ﷺ نے ان پر نہیں ڈالی۔

جبکہ دوسری طرف رات کو جانوروں کو چرنے کے لیے چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے ان کو ان کے باڑوں میں باندھ رکھنا ان کے مالکوں کا ذمہ تھا۔ لہٰذا رات کو چوپایوں کا باڑوں سے نکل کر کسی کا نقصان کرنا، یہ ان کے مالکوں کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس اتلاف کا ضمان بھی انہی پر آئے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- احکام شرعیہ مناسب علتوں پر مبنی ہیں۔
- چوپائے رات کے وقت باغوں اور کھیتوں کا جو نقصان کریں گے، اس کا ضمان ان کے مالکوں پر آئے گا۔
- البتہ چوپائے دن میں جو نقصان کرتے ہیں، اس کا ضمان ان کے مالکوں پر نہ آئے گا۔ کیونکہ دن میں کھیتوں اور باغوں کی حفاظت کی ذمہ داری اور مسئولیت باغوں وغیرہ کے مالکان پر ہے۔
- عرف کا شریعت میں اعتبار ہے۔ کیونکہ دن رات کے کن اوقات میں چوپایوں کا اتلاف ان کے مالکوں کے سر ہوگا اور کب باغوں وغیرہ کے مالکان کے ذمہ ہوگا اس کا فیصلہ ہر جگہ کا عرف اور لوگوں کا عمل و عادت کرے گی۔

مرتد کے قتل کا حکم

1199- وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ﷺ - فِي رَجُلٍ أَسْلَمَ، ثُمَّ تَهَوَّدَ - لا أَجْلِسُ حَتَّى يُقْتَلَ، قَضَاءُ اللهِ وَرَسُوْلِهِ، فَأُمِرَ بِهِ فَقُتِلَ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِيْ دَاوُدَ: وَكَانَ قَدِ اُسْتُتِيْبَ قَبْلَ ذٰلِكَ)).

ایک آدمی جو مسلمان ہو جانے کے بعد پھر یہودی ہو گیا تھا، اس کے بارے میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (وہ فرماتے ہیں) کہ: میں (اس تکیہ پر) نہ بیٹھوں گا۔ یہاں تک کہ اس (سامنے بندھے یہودی) کو قتل نہ کر دیا جائے، (کہ ایسے لوگوں کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ (یہی ہے) سو اس کے بارے میں حکم دیا گیا اور وہ یہودی قتل کر دیا گیا۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور اس (مرتد ہو جانے والے) سے اس سے قبل توبہ کرنے کو بھی کہا گیا تھا۔ [2] (مگر اس نے پھر بھی توبہ نہ کی تھی اور مارا گیا)۔

قصۂ حدیث:......حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے اور ان کا قاضی اور حاکم بنا کر یمن روانہ کیا تھا۔

جبکہ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بھیجنے کے بعد ان کے پیچھے یمن روانہ فرمایا تھا۔ چنانچہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن پہنچے تو جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کے احترام میں ایک تکیہ آگے کو کیا کہ اس پر تشریف رکھیے۔ اتنے میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نگاہ ایک بندھے ہوئے آدمی پر پڑی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے استفسار فرمایا کہ یہ کون ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ ایک سابقہ یہودی ہے۔ مسلمان بن کر دوبارہ یہودی بن گیا ہے۔ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے وہ فرمایا تھا جو اوپر متن حدیث میں مذکور ہے۔

غریب الحدیث:......**لَا أَجْلِسُ**: یعنی جو تکیہ آپ نے مجھے پیش کیا ہے میں اس پر نہ بیٹھوں گا۔

حَتَّى يُقْتَلَ: اور یہ آدمی مرتد تھا کیونکہ مسلمان ہو جانے کے بعد دوبارہ یہودی بننا اب کفر نہیں بلکہ ارتداد ہے۔

قَضَاءُ اللهِ وَرَسُوْلِهِ: یعنی مرتد کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم یہی ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے، اور قضاء سے یہاں شرعی قضاء مراد ہے جیسے امر، نہی اور ان کے متعلقہ احکام نہ کہ قضائے کونیہ۔ جیسا کہ اس بات کو بارہا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یاد رہے کہ یہاں ''قَضَاءُ اللهِ ثُمَّ قَضَاءُ رَسُوْلِهِ'' نہیں فرمایا۔ کیونکہ شرعی احکام سب کے سب حق ہیں چاہے وہ اللہ کی طرف سے ہوں اور چاہے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے ہوں۔ لہٰذا پیغمبر سے صادر ہونے والا حکم اللہ کے حکم کی طرح ہے۔

فَأُمِرَ بِهِ: ہوسکتا ہے کہ یہ حکم جناب معاذ رضی اللہ عنہ نے دیا ہو اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ یہ حکم حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے دیا ہو۔ لیکن بہرحال اس مرتد یہودی کو قتل کر دیا گیا۔

---

[1] صحيح البخاري: 6923- صحيح مسلم: 1733.

[2] سنن ابی داؤد: 4355.

وَكَانَ قَدِ اسْتُتِيْبَ قَبْلَ ذٰلِكَ: یہ سنن ابی داؤد کی روایت کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس سے توبہ کرنے اور اسلام کی طرف لوٹ آنے کو کہا گیا۔ لیکن وہ اپنے ارتداد پر اڑا رہا۔ جس پر بالآخر اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ اور اگلی حدیث قتل مرتد کے باب میں اصل اور اساس ہیں۔ اس لیے ان دونوں احادیث کے فوائد اخیر میں اکٹھے ذکر کیے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے ذیل میں قتل مرتد کی بابت دوسری حدیث ملاحظہ کیجئے!

مرتد قتل کرنے کی شروط

1200۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنا دین (یعنی جس مسلمان نے دین اسلام) بدل ڈالا (اور کسی اور دین میں داخل ہو گیا) تو اسے قتل کر ڈالو۔''[1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ: مراد دین اسلام کو بدل کر کسی اور دین کو اختیار کرنا ہے۔

فَاقْتُلُوْهُ: معلوم ہوا کہ جو ہندو سے عیسائی ہو گیا، اسلام اس سے کوئی تعرض نہ کرے گا اور جو دوسرا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوا، ہم اسے خوش آمدید کہیں گے۔

مرتد کی تعریف

مرتد مسلمان ہو کر کافر ہو جانے والے کو کہتے ہیں۔ مرتد کا لغوی معنی پیچھے مڑ جانے اور لوٹ جانے والا ہے، اور یہ اِرْتَدَّ سے ماخوذ ہے جس کا معنی لوٹنا ہے۔ جبکہ اصطلاحِ شرع میں مرتد اسلام لانے کے بعد کافر بن جانے والے کو کہتے ہیں اور کفر چاہے کفرِ انکار ہو یا کفرِ جحود، دونوں کا حکم ایک ہے۔ البتہ جب ایک آدمی مرتد ہو جاتا ہے اور وہ وصف اسلام سے وصف کفر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو اس ارتداد کے اثبات کی بھی چند شروط ہیں، جو یہ ہیں:

(1) پہلی بات یہ ہے کہ وہ جانتا ہو کہ میں نے جو کیا ہے وہ کفر ہے۔ لہٰذا جسے علم نہ ہو، وہ کافر و مرتد نہ کہلائے گا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (الاسراء: 15)

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

وہ رسول آ کر لوگوں کو بتلائے کہ اللہ پر ایمان لانا اور توحید کیا ہے اور اس کا کفر اور انکار کیا ہے اور فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النسآء: ۱۶۵)

''ایسے رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جب لوگوں کے پاس رسول اور رسالت نہ پہنچی ہو تو لوگ حجت پر ہوں گے اور وہ کافر نہ

[1] صحيح البخاري: 6922.

کہلائیں گے۔

غرض جب لوگوں تک رسالت نہ پہنچی ہو اور انہوں نے ایمان کا پیغام نہ سنا ہو تو وہ اہل نار نہیں کیونکہ اس وقت تک وہ جاہل ہیں۔

(2) دوسری شرط یہ ہے کہ اس نے کفر کا قصد کر کے کفر کو اختیار کیا ہو، چاہے اس نے مذاق میں ایسا کیا ہو اور چاہے وہ اس امر میں سنجیدہ ہو، وہ کافر ہوگا، لہٰذا جس نے بنا قصد کے کفر کا بول بولا وہ کافر نہ کہلائے گا۔

(3) تیسری شرط یہ ہے کہ خود ہمیں بھی اس قول یا فعل کا کفر ہونا معلوم ہو، یعنی ہم جانتے ہوں کہ شرع شریف نے اس بات کو کفر کہا ہے۔ تب پھر اگر ہمیں کسی بات کے کفر یا غیر کفر ہونے میں شک ہو تو اصل عدم کفر ہے، اور یہ کہ اصل ہر انسان کا مسلمان ہونا ہے۔

پھر اگر ہمیں ایک بات کے کفر ہونے کا تو علم ہو لیکن اس کے مرتکب کا حال معلوم نہ ہو کہ آیا وہ جہل کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے یا کسی تاویل سے اس کفر کا مرتکب ہے۔ تو ایسے شخص پر بھی ہم کفر کا حکم نہ لگائیں گے۔ پس جب تک کسی سے کفر بواح (کھلے کفر) کا صدور نہ ہو ہم اس کو کافر نہ کہیں گے۔ اب ذیل میں دونوں احادیث کے فوائد ملاحظہ کیجیے!

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ امام کے ذمے بلاد وامصار اور اطراف واقطار میں مبلغین بھیجنا لازم ہے۔
- مبلغین کا ایک دوسرے کی مدد کرنا اور ان سے مدد لینا مشروع ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پیچھے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بھی یمن بھیج دیا۔
- تب پھر امام پر لازم ہے کہ وہ متعدد مبلغین کو ایک دوسرے کی معاونت کرنے کی وصیت بھی کرے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک دوسرے کے ساتھ ازحد ادب واحترام اور حسن سلوک۔
- اپنے ساتھی کا اکرام کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے احترام میں انہیں تکیہ پیش کیا تھا۔
- قوم کے سربرآوردہ اور معزز آدمی کا کسی بچھونے یا تکیے پر بیٹھنا جائز ہے، اور یہ مذموم تکبر میں داخل نہیں۔
- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مضبوط قوتِ ارادہ کہ جب تک مرتد یہودی مار نہ دیا گیا، وہ اپنی سواری سے نیچے نہ اترے۔
- مرتد کو اس کے ارتداد پر باقی نہ رکھا جائے گا یا تو وہ توبہ کرے گا یا پھر مارا جائے گا۔
- عالم چاہے علم وفضل اور فتویٰ واجتہاد میں جتنا بھی قوی ہو، پھر بھی اسے نص سے ہی استدلال کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بایں فقہ واجتہاد نص سے استدلال کیا اور فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ یہی ہے۔''
- معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا حکم اور فیصلہ یہ اللہ کا ہی حکم ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی یہ اللہ کی نافرمانی ہے۔
- مسائلِ شرعیہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے ساتھ واوِ عطف کے ذریعے ملانا جائز ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔
- اگر سنن ابوداؤد کی روایت کو نہ دیکھا جائے تو مرتد سے توبہ طلب کیے بنا ہی اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

اب دوسری حدیث کے فوائد ملاحظہ ہوں!

◈ مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ: مذکورہ مَنْ شرطیہ ہے جو عموم کے لیے ہے۔ "فَاقْتُلُوهُ" یہ جواب شرط ہے، اور چونکہ یہ جملہ طلبیہ یعنی امر ہے اس لیے اس پر "فا" کا لانا واجب ہے۔

اور "فَاقْتُلُوهُ" میں خطاب بظاہر پوری امت کو ہے۔ لیکن مراد حکام اور ولاۃ امر ہیں۔

چنانچہ حدود، قصاص اور قتل وغیرہ میں امر کی توجیہ جب بھی جماعت کی طرف ہو تو اس سے مراد والیانِ امر اور حکام و سلاطین ہوتے ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ دین اسلام کو بدل دینے والا واجب القتل ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ البتہ اس کا بالغ ہونا شرط ہے۔ کیونکہ نابالغ مرفوع القلم ہے۔

◈ یہ بھی معلوم ہو گیا ایک ملتِ کفر کو چھوڑ کر دوسری ملتِ کفر میں شامل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ سارے کا سارا کفر خواہ یہودیت ہو یا نصرانیت، وثنیت ہو یا شرک، سب ایک ملت ہے۔ اگرچہ بعض کا یہ قول بھی ہے کہ اگر ایک عیسائی یہودی بن گیا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ ایک مذہب کو جس کو وہ اپنا دین سمجھتا تھا، چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہوا ہے۔ یوں جن آیات ربانی کو وہ دین اور حق سمجھتا تھا، ان کا مذاق اڑانے والا بن گیا۔

لیکن زیادہ معقول بات یہ ہے کہ نصرانی بننے والا یہودی زیادہ بہتر دین میں داخل ہوا ہے۔ کیونکہ نصرانیت یہودیت کی ناسخ ہے، اور ناسخ کا منسوخ سے افضل اور بہتر ہونا بدیہی ہے۔

لیکن درست یہ ہے کہ یہ قول بھی ضعیف ہے۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں عموم نہیں۔ وگرنہ یہ حدیث مسلمان ہونے والے کو بھی شامل ہوگی۔ کیونکہ بظاہر اس نے بھی اپنا دین بدلا ہے۔ لہٰذا یہ بھی واجب القتل ہوگا۔ حالانکہ اس کا قائل کوئی بھی نہیں۔

تب پھر مسلمان ہو جانے والا کافر بالاجماع واجب القتل نہ ہوگا، اور رہا ایک ملت چھوڑ کر دوسری ملت میں داخل ہونے والا، تو اگرچہ اس کے قتل میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ قتل نہ کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ حکم صرف اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جانے والے کا ہے۔

شاتم رسول ﷺ کو اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کرنے والے کو قتل کر دینے کا بیان

1201۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہما أَنَّ أَعْمَى كَانَتْ لَهُ أُمُّ وَلَدٍ تَشْتُمُ النَّبِيَّ ﷺ وَتَقَعُ فِيهِ، فَيَنْهَاهَا، فَلَا تَنْتَهِي، فَلَمَّا كَانَ ذَاتَ لَيْلَةٍ أَخَذَ الْمِعْوَلَ، فَجَعَلَهُ فِي بَطْنِهَا وَاتَّكَأَ عَلَيْهَا، فَقَتَلَهَا، فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: ((أَلَا اشْهَدُوا، أَنَّ دَمَهَا هَدَرٌ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ایک نابینا کی ایک ام ولد باندی تھی، وہ (نامراد) نبی کریم ﷺ پر سب وشتم کیا کرتی تھی اور آپ ﷺ پر ہرزہ سرائی کرتی تھی، اور وہ نابینا اپنی اس باندی کو (ایسا کرنے سے) روکا کرتا تھا۔ پر وہ باز نہ آتی تھی۔ پس جب ایک رات ہوئی تو اس نے کدال لے کر اسے اس (زبان دراز باندی) کے پیٹ پر رکھا اور اس کدال سے اس پر اپنا آپ ڈال دیا (یعنی اس کدال پر اپنا پورا وزن ڈال دیا) اور اس (کا پیٹ پھاڑ کر اس) کو قتل کر ڈالا۔ سو (جب) یہ خبر نبی کریم ﷺ

کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”خبردار! (آگاہ رہو اور) گواہ رہو کہ اس باندی کا خون رائیگاں گیا۔“ ❶

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ. اس حدیث کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:...... أُمُّ وَلَدٍ: اس کی تعریف اور تفصیلی احکام بیان ہو چکے ہیں۔

أَعْمَى: یہ نابینا کون تھے؟ اس بات کے مجہول ہونے سے نفسِ حدیث اور حکم پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

تَشْتُمُ النَّبِيَّ ﷺ وَتَقَعُ فِيهِ: یعنی آپ ﷺ کو برا بھلا کہتی اور آپ ﷺ پر زبان درازی کرتی تھی۔

اب یہ باندی اصلی کافرہ تھی یا اس فعل بد کی وجہ سے مرتد ہو چکی تھی؟ اس بات کو اللہ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ لیکن بہر حال وہ کافرہ تھی۔

فَيَنْهَاهَا، فَلَا تَنْتَهِي: اور وہ اس نامراد اور شقیانہ فعل سے روکنے کے باوجود باز نہ آتی تھی۔

فَلَمَّا كَانَ ذَاتَ لَيْلَةٍ أَخَذَ الْمِغْوَلَ: مِغْوَل: یہ کدال کو کہتے ہیں جس سے زمین کی کھدائی کا کام لیا جاتا ہے۔

فَقَتَلَهَا: اُن نابینا صحابی رضی اللہ عنہ نے ایک رات اللہ اور اس کے رسول کی غیرت میں آکر کدال سے اس کا پیٹ پھاڑ کر اسے قتل کر دیا۔ ایسی بد بخت عورت کی سزا یہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

أَلَا اشْهَدُوا أَنَّ دَمَهَا هَدَرٌ: أَلَا: یہ تنبیہ اور استفتاح کا کلمہ ہے (عموماً اس کا ترجمہ خبردار کے لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے)۔

اِشْهَدُوا: نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بات پر گواہ بنایا کہ اس عورت کا خون بے کار، اکارت، رائیگاں اور ضائع ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ کیونکہ اس نے اللہ کے نبی پر سب وشتم کی تھی۔ جو بلاشبہ کفر بھی ہے اور ارتداد بھی ہے۔ جیسے اللہ اور قرآن پر سب وشتم کرنا اور ان کی تحقیر وتوہین کرنا کفرِ ارتداد ہے۔

اسی طرح جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ سب صحابہ کافر ہیں ❷ یا سوائے چند کے سب فاسق ہیں تو بلاشبہ یہ اعتقاد ملت اسلام سے نکال باہر کرنے والا کفر ہے۔ اسی طرح حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ازواجِ مطہرات کی مقدس اور پاکباز ہستیوں کو گالیاں دینے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا محقق ومختار قول ومذہب یہی ہے۔ ❸ اور یہی قرآن وسنت کی نصوص قطعیہ کی رو سے حق ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 4361- سنن النسائی: 107/7- سنن الدارقطنی: 112/3- سنن البیہقی: 60/7- المستدرک للحاکم: 394/4- حاکم کہتے ہیں کہ: یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے۔

❷ افسوس کہ فی زمانہ بعض نام نہاد بزدل قسم کے ”صلح جو“ مبلغ اور واعظ اس ”بد“ عقیدہ کا برملا پرچار کر کے کفر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں لگے ہیں کہ جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر کفر نہیں۔ ان لوگوں سے یہ پوچھا جائے گا کہ اگر سب صحابہ ہی معاذ اللہ کافر تھے تو پھر اسلام کہاں ہے اور کن کے واسطہ سے ہم تک پہنچا ہے؟ اور خود ہمارے ایمان واسلام کی سند کیا ہے؟ ((اعاذنا الله من سوء الفهم وَسِفْسَافِ الامور ومن انقلاب القلوب اللّٰهم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه .)) آمین۔ نسیم

❸ الفتاوی: 198/35- اس عمدہ قول پر شیخ الاسلام پر لا تعداد رحمتیں نازل ہوں۔ (ناشر)

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ: ''شاتم رسول مرتد اور واجب القتل ہے، اور ایسے نامراد کا خون بے کار، بے قیمت اور اکارت ہے۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ شاتم رسول کا خون هدر ہے، اور حدیث کے ظاہر سے یہ بھی مستفاد ہے کہ شاتم رسول سے توبہ طلب نہ کی جائے گی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے شاتم رسول سے توبہ طلب کرنے کا حکم نہیں دیا۔

◈ یہی حکم اللہ، قرآن، اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر سب وشتم کرنے والا کا بھی ہے۔

◈ اگر شاتم رسول وصحابہ توبہ کر لے تو اگر چہ اس کی توبہ کے مقبول ہونے میں اختلاف ہے لیکن مشہور مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ مقبول نہ ہوگی۔

اس مسئلہ کی شافی تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

◈ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر اور بالخصوص ان کی عزت وآبرو اور عفت وعصمت کے پاک دامن پر زبانِ طعن دراز کرنے والا بد بخت بلاشبہ مرتد ہے بالخصوص سیّدہ عفیفہ صدیقہ عائشہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا کی بابت تہمت لگانے والا...... جس سے رب تعالیٰ نے انہیں بری قرار دے دیا ہے...... بلاشبہ مرتد اور واجب القتل ہے۔

کیونکہ وہ تین نا قابل معافی جرائم کا مرتکب ہوا ہے، جو یہ ہیں:

(1) ایک یہ کہ اس نے قرآن کریم کی تکذیب کی ہے۔

(2) دوسرا یہ کہ اس نے ام المومنین پر زبانِ طعن دراز کی ہے۔

(3) تیسرا یہ کہ اس نے حضرت رسالت مآب ﷺ کے دامنِ عفت وعصمت پر چھینٹا اڑایا ہے اور اس نے نبی کریم ﷺ کے پاک بستر کو گندا کرنے کی گندی اور ناپاک کوشش کی ہے۔

اس لیے امہات المؤمنین اور بالخصوص سیّدہ عفیفہ صدیقہ بنت صدیق ام المؤمنین سیّدنا عائشہ سلام اللہ علیہا پر تہمت لگانے والا بلاشبہ مرتد، کافر اور واجب القتل ہے۔

◈ رہے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو جو سیاہ رو اس بات کا قائل ہے کہ نبی کریم ﷺ کے یہ جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور آپ ﷺ کی خاطر دونوں جہان تج دینے والے یہ محیر العقول فدایانِ رسول معاذ اللہ آپ ﷺ کے وفات پا جانے کے بعد سب کے سب، سوائے چند کے، مرتد ہو گئے تھے، تو بلاشبہ یہ اعتقاد رکھنا صریح کفر وارتداد ہے۔ کیونکہ یہ اعتقاد:

خود رب تعالیٰ کی ذات بابرکات میں قدح ہے (معاذ اللہ) کہ کیا رب تعالیٰ نے اپنے سب سے محبوب پیغمبر کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا تھا جنہوں نے آپ ﷺ کے دنیا سے منہ موڑتے ہی آپ ﷺ سے کیے سب عہد و پیان توڑ ڈالے!؟ معاذ اللہ۔ یہ الزام تو سراسر رب تعالیٰ کی حکمت پر کھلا اعتراض ہے۔

پھر یہ اعتقاد نبی کریم ﷺ کی شان میں نہایت سخت گستاخی اور آپ ﷺ کی اعلیٰ وارفع شان پر نہایت سخت ہرزہ سرائی ہے۔

پھر یہ اعتقاد رب تعالیٰ کی شریعت پر اعتراض اور سخت قدح ہے۔

اور خود ان صحابہ پر بھی قدح ہے جن کی تعریفوں سے اور ان کے ایمان، اسلام، قربانیوں اور اخلاص کے تذکروں سے قرآن بھرا پڑا ہے۔

اور کیا اس سے بڑھ کر بھی رب تعالیٰ سے کوئی جھگڑا ہوسکتا ہے کہ رب تعالیٰ تو ایک طبقہ سے راضی اور خوش ہو اور کوئی اس لیے رب تعالیٰ سے برسرِ پیکار اور ستیزہ کار ہو کہ مجھے یہ طبقہ پسند نہیں!

ذرا سوچیے! ان لوگوں کو روزِ قیامت کہاں پناہ ملے گی!!!

کون ان کی بابت لب کشائی کرنے کی جسارت کرے گا!!!

کون ان کی سفارش کرے گا!!!

کہ یہ اعتقاد رکھنے والا ان لوگوں سے ناراض ہے، جن سے اللہ راضی ہے۔

اے اللہ! تو ہمیں اپنی پناہ میں رکھ، اپنا پروانہ رضا عنایت فرما، ان کی محبت نصیب فرما جن سے تو راضی اور خوش ہے، ان کی راہ نصیب فرما جن پر تیرے بے شمار انعام ہیں۔ آمین ثم آمین۔

- شاتم رسول مباح الدم ہے۔
- معلوم ہوا کہ آقا اپنے غلام پر حد جاری کرسکتا ہے۔
- جس کا قتل مباح ہو جاتا ہے، اسے کسی بھی طرح جان سے مار سکتے ہیں۔
- احکام اور فیصلوں پر دوسروں کو گواہ بنانا جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس فیصلہ پر لوگوں کو گواہ بنایا کہ اس شاتم رسول باندی کا خون رائیگاں گیا۔

11

کِتَابُ الْحُدُوْدِ

حدود کے احکام و مسائل کا بیان

تمہید:...... کتاب الحدود کو قتل مرتد کے بعد ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قتل مرتد کی سزا حدود میں سے نہیں۔ لہٰذا بعض مصنفین کا قتل مرتد کو حدود میں شمار کرنا وہم ہے۔ کیونکہ حد جب سلطان تک پہنچ جاتی ہے تو اس کی تنفیذ ہر حال میں واجب ہوتی ہے اور سلطان یا کسی اور کو اس کے اسقاط کا حق نہیں ہوتا جبکہ قتل مرتد کی سزا بسا اوقات تائب ہونے پر ساقط بھی ہو جاتی ہے۔

حد کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

حدود: یہ حد کی جمع ہے۔ حد لغت میں دو چیزوں کے درمیان فصل کر دینے والی شے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ حد کو حد اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ ایک شے کو دوسری شے میں ملنے نہیں دیتی۔ اسی معنی میں زمین کی حدود کی اصطلاح ہے کہ یہ وہ علامات ہیں جو مثلاً زید کی زمین کو عمرو کی زمین سے جدا کرتی ہیں۔

البتہ شرع شریف کی اصطلاح میں حد کا اطلاق متعدد معانی پر ہوتا ہے جیسے:

واجبات کہ ان سے مراد نواہی اور اوامر ہیں۔ چنانچہ جب کسی شے سے تجاوز کرنے سے روکا جائے تو وہ اوامر ہیں، اور جب کسی شے میں داخل ہونے سے روکا جائے تو یہ نواہی ہیں۔ چنانچہ جب یہ ارشاد ہو کہ:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ (البقرۃ: 187) ''یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان کے قریب نہ جاؤ۔''

تو یہ نواہی ہیں کہ یہاں کسی شے میں داخل ہونے سے روکا گیا ہے، اور جب یہ ارشاد ہو کہ:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (البقرۃ: 229) ''یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو۔''

تو یہ اوامر ہیں کہ یہاں کسی شے سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔

پھر شرع شریف میں حد کا اطلاق عقوبت پر بھی ہوتا ہے، اور مذکورہ باب سے یہی اصطلاحی معنی مراد ہے۔ تب پھر حد کی

اصطلاحی تعریف یہ ہوگی:

''حد: یہ کسی نافرمانی پر ملنے والی سزا ہے جو خود شریعت مقرر کرتی ہے تا کہ وہ سزا ایک تو معصیت کے مرتکب کے لیے کفارہ بن سکے، دوسرے اوروں کو اس فعل کے ارتکاب سے ڈرا کر روکنے والی بنے۔''

جیسے چوری کی سزا قطع ید ہے۔ پس جب ایک آدمی کسی چور کو یہ سزا ملتے دیکھے گا تو وہ کبھی چوری کرنے کا سوچے گا بھی نہیں۔ اسی طرح زانی کو رجم ہوتے دیکھ کر لوگ زنا کرنے کا تصور بھی نہ کریں گے، اور یہی حدود مقرر کرنے کی شرعی حکمت بھی ہے۔

حدود کا حکم

حد قائم کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدۃ: 38)

''اور جو چوری کرنے والا اور جو چوری کرنے والی ہے سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔''

یہ امر ہے اور امر میں اصل وجوب ہے، اور اس کے وجوب کا یہ قرینہ بھی ہے کہ کسی معصوم کا ہاتھ کاٹنا حرام ہے اور حرام کو کسی واجب کے ذریعے ہی توڑا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (النور: 2)

''جو زنا کرنے والی عورت ہے اور جو زنا کرنے والا مرد ہے، سو دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

یہ آیت بھی اقامتِ حد کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ حد کی اقامت کس پر واجب ہے؟ تو یہ ولی امر پر واجب ہے۔ پھر اقامتِ حد میں امیر غریب، معزز، کم تر، آزاد غلام، مرد عورت، قریبی عزیز اور اجنبی سب برابر ہیں۔

1۔ بَابُ حَدِّ الزَّانِيْ ......زانی کی حد کا بیان

زنا جہاں ایک آدمی کے حق میں نہایت گرا ہوا فعل ہے وہیں ایک معاشرہ کے لیے از حد شر و فساد کا باعث بھی ہے۔ اس لیے زنا کے بیان سے ہی اس باب کا آغاز زیادہ مناسب تھا۔

زنا یہ قُبُل یا دبر میں کی جانے والی بے حیائی کا نام ہے۔ البتہ زنا کے اطلاق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انسان کے ساتھ ہو۔ لہٰذا جانوروں اور چوپائے کے ساتھ کی جانے والی بدفعلی پر زنا کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی لیے چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنے والے پر حد بھی نہیں آتی۔

زانی غیر محصن کی سزا

1202,1203۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ وَزَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ رضی اللہ عنہما، أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَعْرَابِ أَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنْشُدُكَ اللّٰهَ إِلَّا قَضَيْتَ لِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، فَقَالَ الْآخَرُ۔ وَهُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔: نَعَمْ، فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ، وَأْذَنْ لِيْ، فَقَالَ: ((قُلْ)) قَالَ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں آپ ﷺ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیجیے! اس پر دوسرا...... جو اس بدوی سے زیادہ سمجھ دار تھا...... عرض کرنے لگا کہ: جی ہاں! (ضرور) سو آپ ﷺ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے

إِنَّ ابْـنِـيْ كَانَ عَسِيفًا عَلَى هٰذَا، فَزَنَى بِامْرَأَتِهِ ، وَإِنِّـيْ أُخْبِـرْتُ أَنَّ عَـلَـى ابْـنِـيْ الـرَّجْـمَ ، فَافْتَدَيْت مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَوَلِيْدَةٍ، فَسَأَلْتُ أَهْلَ الْـعِلْمِ ، فَأَخْبَرُوْنِي أَنَّ مَا عَلَى ابْنِيْ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَـغْـرِيْبُ عَامٍ، وَأَنَّ عَلَى امْرَأَةِ هٰذَا الرَّجْمَ . فَـقَـالَ رَسُـوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَالَّـذِيْ نَـفْسِيْ بِيَدِهِ لَأَقْـضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ، الْوَلِيْدَةُ وَالْغَنَمُ رَدٌّ عَـلَيْكَ، وَعَـلَـى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَـامٍ، وَاغْـدُ يَـا أُنَيْـسُ! إِلَـى امْرَأَةِ هٰذَا فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا)).

مطابق ہی فیصلہ کیجیے! اور مجھے اجازت دیجیے (کہ میں اپنا مدعا بیان کروں)۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہو (کیا کہتے ہو)'' اس آدمی نے عرض کیا: میرا بیٹا اس کا مزدور تھا (یعنی اس کے ہاں کام کرتا تھا) اور اس نے اس کی بیوی کے ساتھ زنا کرلیا ہے۔ مجھے بتلایا گیا کہ (اس جرم کی پاداش میں) میرا بیٹے کو رجم کیا جائے گا۔ اس پر میں نے اس کے فدیہ میں سو بکریاں اور ایک باندی پیش کی۔ پھر میں نے اہل علم سے پوچھا (کہ کیا میرا ایسا کرنا ٹھیک تھا) تو انہوں نے مجھے بتلایا کہ میرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے، اور اس کی بیوی رجم ہوگی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا، (اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ) وہ باندی اور بکریاں تمہیں واپس کی جائیں گی، اور تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا آئے گی، اور اے اُنیس! تم اس عورت کے پاس جاؤ، سو اگر تو وہ (اپنے زانیہ ہونے کا) اقرار کرلیتی ہے تو اسے رجم کردینا۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا اللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غـريـب الـحـديـث:...... أَنَّ رَجُلًا: گو مذکورہ رجل مبہم ہے لیکن اس سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر مرتب نہ ہوگا کیونکہ یہ صحابی ہے۔

مِنَ الْأَعْرَابِ: اعراب یہ اعرابی کا اسم جمع ہے۔ یہ دیہات میں رہنے والے کو کہتے ہیں۔ جن پر جہالت غالب ہوتی ہے۔

أَنْشُـدُكَ بِـاللّٰهِ إِلَّا قَضَيْتَ لِي بِكِتَابِ اللّٰهِ: اس بدوی نے یہ بہت بڑی بات کہی تھی۔ یہ بات کرنے والا ایک دیہاتی تھا جس کی نظر میں سب لوگ ایک ہوتے ہیں اور اسے فرقِ مراتب کی مطلق سمجھ نہیں ہوتی۔

اور اس کے مخاطب جناب رسول اللہ ﷺ تھے جو سب سے زیادہ حلیم، رحیم، شفیق، بردبار اور صبر و برداشت والے تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس دیہاتی کی ایسی دلیری کو بھی کمال حلم کے ساتھ برداشت فرمایا۔

أَنْشُـدُكَ الـلّٰـهَ: یعنی آپ ﷺ کو اللہ یاد دلاتا ہوں کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق ہی فیصلہ کیجیے گا۔ بلاشبہ اس دیہاتی کو یہ بات کہنے کی مطلق ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ ﷺ نے تو کتاب اللہ کے مطابق ہی فیصلہ کرنا تھا۔

إِلَّا قَضَيْتَ: مذکورہ إلَّا استثناء کے لیے ہے۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ یہ مثبت کلام میں آیا ہے۔ تب پھر مذکورہ جملہ کی تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ ''ما انشدك الا القضاء بكتاب الله'' اور اب یہ استثناء مفرغ ہوگا۔

---

[1] صحيح البخاري: 2695- صحيح مسلم: 1698.

اور قَضَيْتَ یہاں حَكَمْتَ کے معنی میں ہے۔

اور بِكِتَابِ اللّٰهِ سے مراد بِمُقْتَضٰی كِتَابِ اللّٰهِ ہے۔ چاہے وہ فیصلہ قرآن سے ہو یا جنابِ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہو۔

وَهُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ: یہ جملہ معترضہ ہے۔ جو دوسرے آدمی کا حال بیان کر رہا ہے، اور راوی کو اس کے زیادہ سمجھ دار ہونے کا علم اس بات سے ہوا کہ اس نے اس بدوی جیسا کلام نہ کیا تھا۔ یا پھر اس آدمی کا ظاہری حلیہ شہریوں والا تھا، اور شہر والے عموماً دیہاتیوں سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔

نَعَمْ: یہ حرفِ جواب ہے اور یہ سابقہ کلام کو پکا کرنے کے لیے آتا ہے۔

فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ: فَاقْضِ: گو یہ امر ہے لیکن یہاں وجوب کے لیے نہیں۔ کیونکہ ایک امتی کا یہ مرتبہ نہیں کہ وہ پیغمبر کو امر کرے۔ لہٰذا یہ التماس اور درخواست کے معنی میں ہے۔

وَأْذَنْ لِي: یعنی مجھے بات کرنے کی رخصت عنایت کیجئے! بلاشبہ یہ ان کے ادب میں سے تھا کہ انہوں نے مدعا کے بیان سے قبل اجازت لی۔ جبکہ اس بدوی نے اجازت لیے بغیر جو کہنا تھا کہہ ڈالا۔

قُلْ: یہ بات کرنے کی اجازت کا بیان ہے۔

كَانَ عَسِيفًا عَلٰى هٰذَا: عسیف یہ مزدور اور خادم کو کہتے ہیں، اور عَلٰى هٰذَا سے مراد وہ اعرابی تھا۔ شاید وہ نوجوان اس اعرابی کے اونٹ وغیرہ چرانے کی مزدوری پر مامور تھا۔

فَزَنٰى بِامْرَأَتِهِ: ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ نوجوان تھا۔

وَإِنِّي أُخْبِرْتُ: بلاشبہ اسے یہ بات کسی پرلے درجے کے جاہل نے ہی بتلائی ہوگی کہ تیرے بیٹے کی سزا رجم ہے۔ حالانکہ وہ تو غیر محصن تھا۔ لہٰذا یہ بات بالکل ناحق تھی۔

فَافْتَدَيْتُ مِنْهُ.....: اس پر میں نے فدیہ میں سو بکریاں اور ایک باندی دے دی۔

فَسَأَلْتُ أَهْلَ الْعِلْمِ، فَأَخْبَرُونِي.....: اور ان لوگوں نے بالکل صحیح بتلایا تھا کہ غیر محصن ہونے کی وجہ سے اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ جبکہ اس عورت کو شادی شدہ ہونے کی وجہ سے رجم کیا جائے گا۔

رہے کوڑے تو کوڑے لگانے میں ایسا کوڑا استعمال کیا جائے گا جو نہ نیا ہو اور نہ پرانا کہ نیا زیادہ تکلیف دیتا ہے جبکہ پرانا غیر موثر ہوتا ہے۔

اور جلاوطنی یہ اپنے شہر سے نکال دینا ہے۔ جس کی مدت ایک سال ہوگی۔

اور رجم یہ زانی محصن کو ایسی کنکریوں سے مارنا ہے جو نہ چھوٹی ہوں اور نہ بڑی یہاں تک کہ اسے موت آ جائے۔

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ: نبی کریم ﷺ نے خصمین کو مطمئن کرنے کے لیے یہ قسم اٹھائی تھی، اور ہر نفس کی جان رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ جب چاہے اس کو قبضہ میں لیتا ہے اور جب چاہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

لَأَقْضِيَنَّ: یہ جوابِ قسم ہے۔ اسی لیے اس پر لام داخل ہے۔

الْوَلِيدَةُ وَالْغَنَمُ رَدٌّ عَلَيْكَ: ولیدہ سے مراد باندی ہے۔ رَدٌّ یہ مبتداء کی خبر ہے، اور یہ مصدر ہے اور مفعول یعنی

مردود کے معنی میں ہے۔

رہا یہ سوال کہ آپ ﷺ نے یہ حکم اس ارشاد کے بعد فرمایا تھا کہ:''میں تم دونوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا''تو پھر یہ حکم کتاب اللہ میں کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اس ارشاد باری تعالیٰ میں موجود ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (البقرۃ: 188)

''اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ۔''

اور یہ مال لینا ناحق اور باطل تھا۔اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اسے واپس دلوایا۔غرض اگر چہ یہ قضیہ بعینہٖ تو کتاب اللہ میں موجود نہ تھا۔لیکن اساسی طور پر ضرور موجود تھا۔وہ یہ کہ کسی کا مال ناحق کھانا حرام ہے۔

وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ: کیونکہ وہ ابھی تک کنوارا تھا،اور کنوارے زانی کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہوتی ہے۔

وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ: غدوۃ: یہ دن کے شروع میں کسی کے پاس جانے کو کہتے ہیں،اور کبھی مطلق جانا بھی مراد ہوتا ہے، چاہے وہ شام کو ہی کیوں نہ ہو،اور اُنیس حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب کا نام ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے تحقیقِ احوال کے لیے بھیجنا منتخب فرمایا تھا۔

إِلَى امْرَأَةِ هَذَا: مراد اس بدوی کی بیوی ہے کہ اس کے پاس جاؤ۔اگر وہ اپنے زنا کرنے کا اقرار کر لے تو اسے رجم کر دینا۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ اگر زانی غیر شادی شدہ ہو تو اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے چاہے وہ دونوں زانیوں میں سے مرد ہو یا عورت۔جبکہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے۔چاہے وہ زنا غیر شادی شدہ کے ساتھ ہی کیوں نہ کرے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ دیہاتیوں میں روکھا پن اور جہالت غالب ہوتی ہے۔
- نبی کریم ﷺ بے حد حلیم و بردبار تھے کہ آپ ﷺ نے اس دیہاتی کی ایسی روکھی بات بھی کمال صبر کے ساتھ برداشت فرمائی۔
- قرائن کے ذریعے حکم لگا سکتے ہیں۔اس کی دلیل راوی کے یہ الفاظ ''وَهُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ'' ہیں۔
- بڑے اور سردار سے بات ادب کے ساتھ کی جائے۔جیسے دوسرے صاحب نے جنابِ رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر بات کی تھی،جو ادب کا سلیقہ ہے۔
- گھروں کے نوکروں اور خادموں کا معاملہ بے حد سنگین اور نازک ہے۔بالخصوص گھر میں اگر نوجوان عورتیں ہوں تو کسی کو خادم رکھتے وقت خوب سوچ لیا جائے اور بالخصوص نوجوانوں کو نوکر رکھنے میں از حد احتیاط سے کام لیا جائے۔ذرا دیکھ لیجئے کہ دورِ نبوی میں ایک نوجوان خادم گھر کی مالکن سے ملوث ہو گیا۔

تب پھر ہمارے اس دور کا حال کیا ہوگا؟؟!!!!!

- ضرورت کے وقت ناگوار بات کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کی دلیل "فَزَنَى بِامْرَأَتِهِ" کے الفاظ ہیں۔
- بے علم کا فتویٰ بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی بے علم کا یہ فتویٰ تو اس کے کنوارے بیٹے کی جان لے چلا تھا کہ اسے رجم کیا جائے۔
- یہیں سے اہل علم کی فضیلت واہمیت کا بھی بخوبی علم ہو جاتا ہے۔
- فاضل کے ہوتے ہوئے بھی مفضول فتویٰ دے سکتا ہے۔ جیسے ان صاحب کو کسی نے نبی کریم ﷺ کے موجود ہوتے ہوئے بھی یہ فتویٰ دیا تھا کہ تمہارے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ملے گی۔
- نبی کریم ﷺ اپنے فیصلوں اور تعلیم میں نہایت عمدہ اسلوب اختیار فرماتے تھے جس سے مخاطب مطمئن ہو جاتا تھا۔ جیسے آپ ﷺ نے یہاں فیصلہ سنانے سے قبل قسم کھا کر طرفین کو مطمئن فرما دیا کہ تمہارے درمیان فیصلہ مبنی برحق ہوگا۔
- وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ: ان الفاظ سے قسم اٹھانے میں اس حکمت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آدمی کو موت یاد رہے اور وہ جھوٹ بولنے اور غلط فیصلہ کرنے سے گریزاں رہے۔
- سنت کے فیصلے بھی کتاب اللہ سے ہی ماخوذ ہیں۔ جیسا کہ غریب الحدیث کے تحت مفصل مذکور ہوا۔
- ناحق لیا مال واپس کرنا واجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں باندی اور سو بکریاں واپس دلوائیں جو ناحق لے لی گئی تھی۔
- زانی غیر محصن کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے جبکہ زانی محصن کی سزا رجم ہے۔ یہ حکم آزاد اور غلام دونوں کے حق میں ایک ہے۔
- حدود کے اثبات واقامت میں توکیل جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت انیس کو حد کے اثبات واقامت کا وکیل بنا کر بھیجا تھا۔
- توکیل میں تعیین شرط ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے نام لے کر حضرت انیس کو بھیجا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ: ''کوئی چلا جائے اور......''
- دوسرے کے خلاف نہ دعویٰ مقبول ہے اور نہ اقرار۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کے اس دعویٰ کو قبول نہ فرمایا کہ فلاں کی بیوی نے زنا کیا ہے۔ بلکہ حضرت انیس کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کرنا۔
- محاکمہ کے وقت یعنی قضیہ کی سماعت کے وقت کسی کا دوسرے پر تہمت لگانا براءت ثابت ہونے سے قبل قابلِ حد جرم نہیں۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کے اس کہنے پر کہ اس کی بیوی زانیہ ہے، اس پر حد قذف جاری نہ فرمائی۔ کیونکہ ابھی تک مقذوف کی براءت ثابت نہ ہوئی تھی۔
- یاد رہے کہ زنا کے اقرار میں تکرار شرط نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی ایک مرتبہ بھی اقرار کر لے تو زنا ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل "فَاعْتَرَفَتْ" کے الفاظ ہیں کہ فعل تکرار کو مقتضی نہیں ہوتا۔

دوسرے اگر اقرار میں تکرار اور کوئی معین عدد واجب ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس کو ضرور بیان فرماتے۔

◈ رجم اور جلد کو ایک وقت میں جمع نہ کیا جائے گا، اور یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے آخری امر ہے کہ آپ ﷺ نے رجم اور جلد کو جمع نہ فرمایا تھا۔

◈ رہا رجم کا ثبوت تو اس کا مفصل بیان آگے آرہا ہے۔

جلد اور رجم کو جمع کرنے کا بیان

1204۔ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((خُذُوْا عَنِّيْ، خُذُوْا عَنِّيْ، فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا، الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ)).

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مجھ سے لے لو، مجھ سے (یہ اللہ کا حکم) لے لو، تحقیق کہ رب تعالیٰ نے ان (بدکاری کرنے والی) عورتوں کے لیے راستہ بنا دیا ہے (اور وہ یہ ہے کہ اگر) کنوارا کنواری کے ساتھ (زنا کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ دونوں کو) سو کوڑے (لگائے جائیں) اور ایک سال کی جلاوطنی (بھی) ہے اور (اگر) شادی شدہ شادی شدہ کے ساتھ (زنا کرے تو ان دونوں کی سزا یہ ہے کہ) سو کوڑے (بھی لگائے جائیں) اور (ان دونوں کا) رجم کیا جانا (بھی) ہے۔''❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... خُذُوا عَنِّي: خُذُوا یہ امر ہے، مراد یہ ہے کہ جو میں بیان کر رہا ہوں اس کو لے لو اور آپ ﷺ نے اس بات کو دو دفعہ تکرار کے ساتھ اس لیے ارشاد فرمایا تا کہ موضوع کی اہمیت میں مزید تاکید پیدا ہو جائے۔

فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلاً: جَعَلَ یہ صَيَّرَ کے معنی میں ہے اور افعالِ تصییر دو مفعولوں کو نصب دیا کرتے ہیں جیسا کہ یہاں ہے۔

اس ارشاد نبوی میں رب تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے:

﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا﴾ (النساء: 15)

''اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں، ان پر اپنے میں سے چار مرد گواہ طلب کرو، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو انھیں گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے، یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے۔''

چنانچہ اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ پر وحی نازل فرما کر ان بدکاری کرنے والی عورتوں کے لیے راستہ مقرر فرما دیا ہے اور وہ وحی یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (النور: 2)

❶ صحیح مسلم: 1690.

''جو زنا کرنے والی عورت ہے اور جو زنا کرنے والا مرد ہے، سو دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

اور یہ راستہ بتلاتا ہے کہ:

اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَةٍ، وَنَفْيُ سَنَةٍ: یہ زنا کی چار ممکنہ صورتوں میں سے ایک صورت ہے، کہ جب زنا کرنے والے مرد اور عورت دونوں کنوارے ہوں تو ان کی سزا یہ ہے کہ دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیا جائے۔ زنا کی دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ:

اَلثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ، وَالرَّجْمُ: زنا کرنے والے دونوں شادی شدہ ہوں۔ تب دونوں کو سو سو کوڑے بھی لگیں گے اور دونوں کو رجم بھی کیا جائے گا۔

اور جب دونوں میں سے ایک کنوارا ہو اور دوسرا شادی شدہ تو حکم بٹ جائے گا۔ چنانچہ مثلاً اگر کنوارا مرد ہے تو اس کی سزا سو کوڑے اور جلا وطنی ہوگی جبکہ عورت کی سزا جو کہ شادی شدہ ہے سو کوڑے اور رجم ہوگی اور جب صورت اس کے برعکس ہو جو کہ زنا کی ممکنہ چوتھی صورت ہے کہ عورت کنواری ہو جبکہ مرد شادی شدہ ہو تو تب بھی کنوارے کو کنوارے والی اور شادی شدہ کو شادی شدہ والے کی سزا ملے گی۔

رہا یہ سوال کہ کیا شادی شدہ زانی کو دونوں سزائیں ملیں گی؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ اوّل امر میں تھا جبکہ اخیر میں جا کر نبی کریم ﷺ نے صرف رجم کی سزا دینے پر اکتفاء فرمایا تھا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ اس میں کنوارے اور شادی شدہ زنا کرنے والوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے احکامات کو امت تک پہنچا دینے کے بے حد حریص تھے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا دو دفعہ ''خذوا عنی'' فرمانا ہے۔
- سنت نبوی کی اتباع میں واعظ اور مبلغ بھی سامعین ومخاطبین سے ایسی بات کر سکتا ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ ''مجھ سے سیکھ لو''۔
- احکام شرعیہ کبھی تو اس وقت اتر آیا کرتے تھے، جب کوئی قضیہ پیش آیا کرتا تھا اور بسا اوقات قدرے تاخیر سے بھی اترا کرتے تھے۔ جیسے بدکار عورتوں کا حکم بعد میں نازل ہوا تھا۔
- اگرچہ مذکورہ حدیث رجم اور جلد (کوڑے لگانے کی سزا) کو اکٹھا دینے کو ذکر کر رہی ہے لیکن نبی کریم ﷺ کا آخری امر صرف رجم کی سزا دینے پر تھا۔ (یہ حکم صرف زانی محصن کے لیے ہے)

اقرار سے زنا کے ثبوت کا بیان

1205۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَى رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ۔ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ۔ فَنَادَاهُ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنِّيْ زَنَيْتُ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ، فَتَنَحّٰى تِلْقَاءَ وَجْهِهِ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ زَنَيْتُ، فَأَعْرَضَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک مسلمان خدمت نبوی میں حاضر ہوا جبکہ آپ ﷺ اس وقت مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ پس اس مسلمان نے نبی کریم ﷺ کو آواز دیتے ہوئے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں زنا کر بیٹھا ہوں (مجھے میری سزا دیجیے!) نبی کریم ﷺ نے ان سے

عَنْهُ، حَتَّى ثَنَّى ذَلِكَ عَلَيْهِ أَرْبَعَ مَرَّاتٍ ، فَلَمَّا شَهِدَ عَلَى نَفْسِهِ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ دَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ، فَقَالَ : ((أَبِكَ جُنُوْنٌ؟)) قَالَ : لَا ، قَالَ: ((فَهَلْ أَحْصَنْتَ؟)) قَالَ : نَعَمْ ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : ((اذْهَبُوا بِهِ فَارْجُمُوْهُ)).

اعراض فرمایا اور روئے مبارک دوسری طرف فرما لیا۔ اس پر ان صاحب نے (دوسری جانب آ کر دوبارہ) عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں زنا کر بیٹھا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے (اب بھی) اعراض فرمایا (اور رخ انور دوسری طرف فرما لیا) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ان صاحب سے چار مرتبہ ایسا کیا۔ پس جب ان صاحب نے چار بار خود پر (زنا کے مرتکب ہونے کی) شہادت دے لی۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کو بلا کر (فہمائش کرتے ہوئے) فرمایا: ''کیا تمہیں دیوانگی تو نہیں؟'' انہوں نے عرض کیا: جی نہیں! (میں بالکل ہوش و حواس کے ساتھ ہوں)۔ آپ ﷺ نے (دریافت) فرمایا: ''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: 'انہیں لے جاؤ اور رجم کر دو۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

قصۂ حدیث:...... یہ جناب ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، وہ زنا کر بیٹھے تھے، سو انہوں نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تا کہ خود کو مرنے سے قبل ہی اس گناہ کی آلائش سے پاک کر دیں۔ اس لیے انہوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر ہر بات کا اقرار کر لیا۔

غریب الحدیث:...... **وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ**: یہ جملہ حالیہ ہے اور لفظ "رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ" سے حال ہے۔

فَنَادَاهُ: یعنی آپ ﷺ کو بلند آواز سے پکارا۔ کیونکہ نداء بلند آواز سے پکارنے کو کہتے ہیں۔

إِنِّي زَنَيْتُ: یہ زنا کا صریح اقرار ہے۔

فَتَنَحَّى تِلْقَاءَ وَجْهِهِ: یعنی جنابِ رسول اللہ ﷺ نے روئے انور دوسری طرف موڑ لیا۔ لیکن وہ صاحب ادھر چلے آئے اور دوبارہ اپنے زنا کے مرتکب ہونے کا اقرار کیا۔

حَتَّى ثَنَّى ذَلِكَ عَلَيْهِ أَرْبَعَ مَرَّاتٍ: "ثَنَّى" یہ "كَرَّرَ" کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے ان صاحب کے ساتھ ایسا چار بار کیا کہ وہ آ کر اپنے ارتکابِ زنا کا اقرار کرتے اور آپ ﷺ انہیں بنا کچھ کہے روئے مبارک دوسری طرف پھیر لیتے۔

غرض جب ایسا چار بار ہو گیا تو آپ ﷺ نے انہیں اپنے پاس بلا کر دریافت فرمایا:

أَبِكَ جُنُونٌ؟: مذکورہ استفہام استعلام (جاننے) کے لیے ہے نہ کہ انکار کے لیے۔

جنون یہ عقل پر پردہ پڑ جانے کو کہتے ہیں اور جنون کو جنون اسی لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ اجتنان سے ماخوذ ہے جس کا معنی پردہ

❶ صحيح البخاري: 6815- صحيح مسلم: 1691 .

ڈالنا ہے۔ جنون کی علامت یہ ہے کہ اس کے کام، اس کے تصرفات اور اس کا کلام سوجھ بوجھ والے آدمیوں جیسے نہیں ہوتے۔

فَهَلْ أَحْصَنْتَ: یہ "هَلْ كُنْتَ مُحْصِنًا" کے معنی میں ہے۔ تب پھر متعدی کے باب سے ہونے کے باوجود فعل لازم ہے۔ اِحصان یہ اس جماع کو کہتے ہیں جو آدمی نکاحِ صحیح کے ذریعے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔ اِحصان کی تعریف اور شروط کا تفصیلی بیان گزر چکا ہے۔

غرض جب آپ ﷺ نے ان صاحب سے یہ پوچھا کہ کیا تم صفتِ احصان والے ہو اور انہوں نے اس کا اقرار کر لیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

اِذْهَبُوا بِهِ فَارْجُمُوهُ: "بِهِ" میں "با" تعدیہ کا ہے۔ غرض اس ارشاد کے بعد لوگوں نے انہیں لے جا کر رجم کر دیا۔

روایات میں آتا ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم کرنا شروع کیا تو تکلیف کی شدت سے انہوں نے بھاگ جانا چاہا لیکن لوگوں نے انہیں بھاگنے نہ دیا اور انہیں رجم کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی جان نکل گئی۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انہیں بھاگنے کا موقع اس لیے نہ دیا اور انہیں دوبارہ پکڑ لائے اور رجم کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہو گئی، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے رجم کرنے کا حکم دیتے وقت کسی قسم کا استثنائیہ کلمہ ارشاد نہ فرمایا تھا جیسے ''انہیں رجم کر دو، ہاں البتہ یہ بھاگ جائے تو جانے دینا۔'' وغیرہ۔ تب پھر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صریح حکم نبوی کے امتثال میں انہیں دوبارہ پکڑ لیا اور رجم کرتے رہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے۔ لیکن جب یہ بات نبی کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: ''تم لوگوں نے انہیں چھوڑ کیوں نہ دیا کہ وہ توبہ کر لیتے کہ اللہ بھی ان کی توبہ قبول فرما لیتا۔'' البتہ آپ ﷺ نے انہیں کسی قسم کا ضمان ادا کرنے کو بھی ارشاد نہ فرمایا: کیونکہ وہ لوگ تاویل کے ساتھ تھے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا شادی شدہ ہونے کی صورت میں رجم ہے اور زنا جس طرح گواہوں سے ثابت ہوتا ہے، اسی طرح اقرار سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اگر کسی موقع پر کسی کا نام لیے بغیر مسئلہ کی تحقیق ہو جاتی ہے تو نام کی پردہ پوشی کرنا مناسب ہے۔ اس کی دلیل "أَتَـــى رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ گو مسجد کی بنا اصل میں ذکر اللہ کے لیے ہے لیکن مسجد میں اقرارات جائز ہیں۔ اب اگر کسی اقرار کا تعلق دین کے مسئلہ سے ہو تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں۔ انہی میں سے ایک یہ اقرار ہے جس کا ذکر مذکورہ حدیث میں ہے۔ کیونکہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے مسجد میں اقرار کیا تھا اور نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ ارشاد نہ فرمایا تھا کہ ذرا ٹھہرو! پہلے مسجد سے نکل لیں پھر تمہارے اقرار کو سنتے ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ نے مسجد میں ہی ان کے اقرار کو قبول فرمایا تھا۔

اور اگر کسی اقرار کا تعلق دنیاوی امور سے ہو جیسے کسی کے حق کا اقرار ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ اسی طرح مسجد میں اپنے حق کا تقاضا بھی جائز ہے۔ البتہ مسجد میں بیع وشراء جائز نہیں، چاہے بالفعل ہو یا محض اس کا قول وقرار ہو، یہ دونوں امر ناجائز ہیں۔

◈ مسجد میں ضرورت وحاجت کے وقت آواز بلند کرنا جائز ہے اس کی دلیل "فَنَادَاهُ" کے الفاظ ہیں۔

◈ ضرورت وحاجت ہو تو ایسی بات کی تصریح بھی جائز ہے جو خود اپنے حق میں قابلِ ملامت ہو۔ جیسے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے

خود کو گناہ سے پاک کرنے کے لیے برملا زنا کا اقرار کیا تھا۔

◈ نبی کریم ﷺ کا اپنے اصحاب کے ساتھ حسن سلوک کہ آپ ﷺ ہر ایک کو اس کے مرتبہ پر اتارتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جناب ماعز رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں متشکک ہونے کی وجہ سے ان سے اعراض فرمایا: لیکن عسیف کے معاملہ میں چونکہ بات واضح تھی، اس لیے آپ ﷺ نے وہاں ایسا نہ کیا تھا۔

◈ جنابِ ماعز رضی اللہ عنہ کی فضیلت کہ انہوں نے ایسی پکی توبہ کی کہ جان دے کر ہی مطمئن ہوئے اور جنابِ رسول اللہ ﷺ ان سے اعراض فرماتے رہے لیکن وہ اپنی بات پر مصر رہے۔

◈ مذکورہ حدیث میں یہ بات مذکور ہے کہ اگر زنا کا اثبات اقرار سے ہو تو اقرار کا چار بار ہونا لازم ہے کیونکہ اقرار بمنزلہ شہادت کے ہے، اسی لیے چار گواہوں کی طرح اقرار کا بھی چار بار ہونا ضروری ہے، اور اس لیے بھی کہ زنا کے باب میں چار سے کم شہادتیں تہمت کہلاتی ہیں۔ مذکورہ حدیث کا ظاہر یہی بتلاتا ہے اور امام احمد کے اصحاب کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ لیکن علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے قصہ میں نبی کریم ﷺ کو ان کے امر میں شک تھا، اس لیے آپ ﷺ کو ان کی بات کو چار بار پکا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اسی لیے آپ ﷺ نے بار بار ان سے اعراض فرمایا اور گمان کیا کہ شاید ان کی عقل میں کچھ خلل آ گیا ہے لیکن جب آپ ﷺ کو اس بات کا یقین آ گیا کہ ان کی عقل میں کوئی خلل نہیں تو انہیں رجم کر دینے کا حکم فرما دیا۔

تب پھر چار بار اقرار ایک اتفاقی امر تھا اور مقصود نہ تھا کہ اگر یہ اقرار کر رہے ہیں تو ضرور ہی چار بار کریں۔ غرض جب ایک امر میں احتمال واقع ہو جاتا ہے تو اس سے استدلال ساقط اور باطل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ علماء کے ہاں یہ ضابطہ ہے، کہ جب بھی احتمال آ جائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے۔ پس راجح قول کہ جو جمہور کا مذہب ہے، یہ ہے کہ اگر ایک عاقل اور بالغ زنا کا ایک بار بھی اقرار کر لے تو اس پر حد ثابت ہو جاتی ہے۔

◈ اپنا حال بیان کرنے میں آدمی امین ہے اور اس باب میں اسی پر بھروسہ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کہ ''کیا تمہیں جنون تو نہیں''؟ پر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا ''ناں'' کہنا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ دیوانے کے جملہ اقرارات غیر معتبر ہیں۔ اس کی دلیل بھی ''أَبِكَ جُنُونٌ'' کے الفاظ ہیں۔

◈ اقامتِ حد میں توکیل معتبر ہے۔ اس کی دلیل ''اِذْهَبُوا بِهِ فَارْجُمُوهُ'' کے الفاظ ہیں۔

◈ خطاب میں عموم جائز ہے۔ جیسا کہ ''اِذْهَبُوا'' اور ''فَارْجُمُوهُ'' کے کلمات میں خطاب میں عموم ہے۔

زنا کے اثبات میں تحقیق واجب ہے

1206- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: لَمَّا أَتَى مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَهُ: ((لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ، أَوْ غَمَزْتَ، أَوْ نَظَرْتَ؟ ((قَالَ: لَا، يَا رَسُولَ اللّٰهِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جب حضرت ماعز رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تھے (اور انہوں نے اپنے گناہ کا اقرار کیا تھا) تو نبی کریم ﷺ نے (ان کی بات کو سنتے ہی تسلیم نہ فرما لیا تھا بلکہ معاملہ کی تحقیق فرمائی کہ آیا یہ جو

کچھ کہہ رہے ہیں، واقعی وہی ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے) ارشاد فرمایا: ''شاید تم نے بوسہ لیا ہو گا یا ہاتھ لگایا ہو گا یا (صرف) دیکھا ہو گا؟'' (اور تم ان باتوں کو زنا سمجھ بیٹھے ہو گے) انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! نہیں [1] (ان میں سے کوئی بات بھی نہیں بلکہ مجھ سے صریح زنا ہوا ہے)۔

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. — اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **لَعَلَّكَ** : یہ حروفِ مشبہ بالفعل میں سے ہے اور یہ حرفِ توقع کہلاتا ہے تب پھر تقدیری عبارت یہ ہوگی: ''اَتَوَقَّعُ اَنَّكَ فَعَلْتَ كَذَا'' (یعنی مجھے توقع اور امید ہے کہ تم نے ایسا ایسا کیا ہوگا)۔

قَبَّلْتَ : یعنی تم نے کسی عورت کا بوسہ لیا ہوگا جبکہ تم اسے زنا سمجھ بیٹھے ہوگے اور بوسہ لینا بلا شبہ زنا نہیں۔

أَوْ غَمَزْتَ : غمز: یہ کسی کو ہاتھ سے ٹٹولنا اور اسے اچھی طرح پرکھنا ہے۔ یعنی شاید تم نے کسی عورت کو ہاتھ لگایا ہوگا۔

أَوْ نَظَرْتَ : یہ آپ ﷺ نے تیسری بات ارشاد فرمائی کہ شاید تم نے کسی عورت کو صرف دیکھا ہو اور تم اس دیکھنے کو بھی زنا سمجھ بیٹھے ہوگے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دیکھنا اور چھونا بھی صریح زنا کے حکم میں داخل نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے یہ تینوں سوالات صرف اس بات کی تحقیق کے لیے فرمائے تھے کہ کیا جناب ماعز رضی اللہ عنہ یہ بات خوب سوچ سمجھ کر اور پورے یقین واذعان کے ساتھ کر رہے ہیں یا محض ظن تخمین سے کر رہے ہیں اور یہ کہ آیا انہیں اس بات کی پوری معرفت بھی ہے یا نہیں کہ زنا در اصل کہتے کس چیز کو ہیں۔ کہ مبادا وہ صرف چومنے یا چھونے یا دیکھنے کو ہی زنا سمجھے بیٹھے ہوں۔

لیکن جب حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے ان تینوں باتوں کی نفی فرمادی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں رجم کر دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔

مضمون حدیث :...... اس حدیث میں در اصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ زنا کے اثبات میں خوب حزم و احتیاط اور تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اگر امام، حاکم، والی، خلیفہ یا قاضی کو کسی امر میں تردد ہو تو اس پر اس امر کے بارے میں خوب تحقیق واجب ہے۔
- اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اجنبیہ کو چومنا، چھونا اور دیکھنا بھی ایک گونہ زنا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے انہیں گویا کہ یہ ارشاد فرمایا کہ شاید تم نے تقبیل یا غمز یا نظر کا زنا کیا ہو۔

زنا کس کس طرح ثابت ہوتا ہے؟

1207۔ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضي الله عنه أَنَّهُ خَطَبَ، فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ، وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ، فَكَانَ فِيمَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ آيَةُ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) انہوں نے خطبہ ارشاد فرمایا اور (اس میں) یہ ارشاد فرمایا: بے شک رب تعالیٰ نے جناب محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا

---

[1] صحیح البخاری: 6824.

الـرَّجْـمِ قَـرَأْنَـاهَـا وَوَعَيْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا فَرَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ، فَأَخْشَى إِنْ طَـالَ بِـالـنَّـاسِ زَمَـانٌ أَنْ يَقُوْلَ قَائِلٌ: مَا نَجِدُ الـرَّجْـمَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، فَيَضِلُّوْا بِتَرْكِ فَرِيْضَةٍ أَنْـزَلَهَـا الـلّٰهُ، وَإِنَّ الرَّجْمَ حَقٌّ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى: عَلَى مَنْ زَنَى، إِذَا أَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ، إِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ، أَوْ كَانَ الْحَبَلُ، أَوِ الْاِعْتِرَافُ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور آپ ﷺ پر (اپنی سچی) کتاب اتاری ہے، اس اتاری جانے والی (وحی و) کتاب میں رجم کی آیت بھی تھی، جسے ہم نے پڑھا، اس کو یاد کیا اور اسے سمجھا، پس نبی کریم ﷺ نے (زنا کے ثابت ہو جانے پر مرتکبین زنا کو) رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی (زنا ثابت ہو جانے پر بدکاروں کو) رجم کیا۔ سو اب مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ لوگوں پر جب ایک لمبا عرصہ گزر جائے گا تو کوئی کہنے والا یہ (نہ) کہنے لگے کہ: رجم کا ذکر تو ہمیں کتاب اللہ میں نہیں ملتا۔ یوں وہ ایک ایسے فریضہ کے ترک کر دینے سے راہِ حق سے بھٹک جائیں گے جس کو رب تعالیٰ نے (اپنی کتاب میں) اتارا تھا اور (بے شک) مرد یا عورت میں سے صفت احصان والا جب زنا کرے تو اس کو رجم کرنا کتاب اللہ میں حق (اور ثابت) ہے۔ جبکہ بینہ قائم ہو گیا یا حمل پایا جائے یا اعتراف پایا جائے [1] (کہ جب زنا ان تینوں باتوں میں سے کسی ایک بات سے ثابت ہو جائے اور زنا کا مرتکب صفتِ احصان والا بھی ہو تو کتاب اللہ کا حکم ہے کہ اس کو رجم کر دیا جائے)۔

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **أَنَّهُ خَطَبَ:** بظاہر یہ خلافتِ فاروقی کے کسی جمعہ کے خطبہ کی بات ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ، وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ: گویا کہ یہ کلمات مابعد مذکور کلام کی تاکید و توثیق کے لیے ہیں اور بجائے "رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ" کہنے کے "مُحَمَّدًا" کہنا اس لیے ہے کہ یہ خبر کے باب سے ہے۔ کیونکہ خبر کے باب میں نبی کریم ﷺ کا ذکر مبارک آپ ﷺ کے نام نامی اسم سامی کے ساتھ جائز ہے۔ بخلاف آپ ﷺ کو بالمشافہ پکارنے کے کہ اس وقت آپ ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ بلانا منع ہے کیونکہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ (النور: 63)

''رسول کے بلانے کو اپنے درمیان اس طرح نہ بنا لو جیسے تمھارے بعض کا بعض کو بلانا ہے۔''

بِالْحَقِّ: ان کلمات کا تفصیلی معنی ذکر کیا جا چکا ہے۔

وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ: مراد قرآنِ کریم ہے۔ قرآنِ کریم کو کتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ یہ لوحِ محفوظ میں مکتوب (لکھا ہوا) ہے۔

فَكَانَ فِيمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ آيَةُ الرَّجْمِ: "فِيْمَا" میں "فِي" ظرفیت کے لیے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ پر جو کچھ

[1] صحيح البخاري: 6830- صحيح مسلم: 1691.

اترا، وہ آیت رجم سے زیادہ وسیع تر ہے۔ کیونکہ ظرف کا مظروف سے اوسع اور زیادہ کشادہ ہونا لازم ہے۔تب پھر آیت رجم کا "مَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ" کا مظروف ہونا صحیح ٹھہرا۔

قَرَأْنَاهَا وَوَعَيْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا: یعنی ہم نے اس کو زبانوں سے پڑھا۔کانوں سے سن کر دلوں میں محفوظ کیا جیسا کہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد میں ذکر ہے کہ وعی کا تعلق کانوں سے ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾ (الحاقة: 12)

''اور یادر کھنے والا کان اسے یادر کھے۔''

اور ہم نے دلوں کے ساتھ اس آیت کو سمجھا۔گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرمارہے ہیں کہ اس آیت کے ثبوت کی تینوں شروط ثابت ہیں:

(1) قول (2) سمع (3) فہم

فَرَجَمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ: نبی کریم ﷺ نے اپنے دور مبارک میں اپنے امر سے پانچ افراد کو رجم فرمایا تھا، جو یہ ہیں:

- ⊙ ......دو یہودی
- ⊙ ...... جنابِ ماعز رضی اللہ عنہ
- ⊙ ......حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا
- ⊙ ......اور صاحب عسیف کی بیوی۔(یعنی نوجوان مزدور والے کی بیوی)

وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ: کیونکہ جنابِ فاروق اعظم خلیفہ اور سلطان تھے اور حدود کو قائم کرنا یہ خلیفہ اور سلطان کی ذمہ داری ہے۔

فَأَخْشَى إِنْ طَالَ بِالنَّاسِ..... فِي كِتَابِ اللّٰهِ: "أَخْشَى" مراد از حد خوف کرنا ہے اور جنابِ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ شدید خوف اس لیے تھا کیونکہ لوگ جوں جوں کسی بھی نبی کے عہد سے دور ہوتے جاتے ہیں تو زمانہ طویل ہو جانے اور دین کے کمزور ہو جانے سے ان کا فہم دین بھی کمزور ہوتا جاتا ہے۔جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''سب سے بہتر زمانہ میرا ہے، پھر اس کے بعد والا، پھر اس کے بعد والا، پھر ایسے لوگ آئیں گے جو بن کہے گواہیاں دیں گے، امانتوں میں خیانتیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا۔''

تب پھر عہد نبوی سے دوری سے امرِ دین میں خلل آجانا بدیہی تھا۔انہی خللوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہمیں تو فلاں فلاں بات کتاب اللہ میں نہیں ملتی۔ جیسے کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ''جی ہمیں تو کتاب اللہ میں آیت رجم نہیں ملتی، اس لیے ہم اس کو ماننے کو تیار نہیں۔'' کیونکہ آیت رجم اگرچہ لفظوں میں منسوخ ہے لیکن اس کا حکم باقی ہے اور یہ نسخ کی تین صورتوں میں سے ایک صورت ہے کہ لفظ تو منسوخ ہو جائیں لیکن حکم باقی ہو۔جبکہ نسخ کی باقی کی دو صورتیں یہ ہیں کہ:

لفظ تو باقی ہوں مگر حکم منسوخ ہو، یہ مذکورہ پہلی صورت کی ضد ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ لفظ اور حکم دونوں منسوخ ہوں۔

یادر ہے کہ نسخ صرف اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور رب تعالیٰ کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

فَیَضِلُّوا بِتَرْكِ فَرِیضَةٍ أَنْزَلَهَا اللّٰهُ: ضلال سے یہاں مراد جانتے بوجھتے ترک کرنا ہے کیونکہ ضلال سے، بسا اوقات عدم علم بھی مراد ہوتا ہے اور کبھی عدم عمل بھی مراد ہوتا ہے۔

اور فریضہ سے یہاں مراد رجم ہے۔ "وَإِنَّ الرَّجْمَ حَقٌّ فِی كِتَابِ اللّٰهِ" رجم حق ہے، اس بات کو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے "إِنَّ" حرفِ تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے کیونکہ یہ مقام مقامِ تاکید و تحقیق ہے اور حق سے مراد ثابت و واجب ہے اور یہ کہ یہ حکم کتاب اللہ میں نازل ہوا تھا۔

رہا یہ سوال کہ رجم کے بارے میں اترنے والی وہ آیت کون سی تھی جو بعد میں لفظوں میں منسوخ ہوگئی تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو بیان نہیں فرمایا۔ البتہ ایک دوسری روایت میں اس منسوخ آیت کا ذکر آتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ."

''بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جب دونوں زنا کریں تو ان دونوں کو ضرور بہ ضرور رجم کر دو کہ یہ رب تعالیٰ کی طرف سے (ان دونوں کو) عبرت ناک سزا ہے اور اللہ قوت والا اور حکمت والا ہے۔''

لیکن یہ الفاظ جناب عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ حکم کے موافق، مطابق نہیں [1] کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کردہ حکم بتلاتا ہے کہ وہ منسوخ آیت یہ نہیں ہے جس کا ذکر روایات میں آتا ہے۔ اس لیے جناب عمر رضی اللہ عنہ نے آگے ارشاد فرمایا۔

عَلٰی مَنْ زَنٰی، إِذَا أُحْصِنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ: زنا اور احصان کی تعریف بیان کی جا چکی ہے۔ مذکورہ "مَنْ" موصولہ ہے اور "مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ" میں مذکورہ "مِنْ" اسی اسم موصول کا بیان ہے۔

یہ رجم کی پہلی شرط کا بیان ہے کہ رجم اس مرد یا عورت کو کیا جائے گا جسے صفتِ احصان حاصل ہو اور یہ حکم کے ثبوت کی شرط ہے جو رجم ہے۔

إِذَا قَامَتِ الْبَیِّنَةُ، أَوْ كَانَ الْحَبَلُ، أَوِ الِاعْتِرَافُ: یہ زنا کے ثبوت کی تین شروط کا بیان ہے کہ یا تو زنا بینہ سے ثابت ہو۔ اس کا ذکر اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿لَوْلَا جَاءُوْا عَلَیْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ﴾ (النور: 13)

''وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔''

اور یہ چاروں گواہ مرد ہوں گے کیونکہ جب تین سے لے کر نو تک کا عدد مونث ہو تو معدود کا مذکر ہونا واجب ہے جیسے یہاں اربعة کا عدد مونث ہے تو شہداء جو شہید کی جمع ہے مذکر ہے۔ یا پھر یہ کہ ایسی عورت حاملہ ہو جائے جس کا نکاح نہ ہوا ہو اور نہ وہ کسی کی باندی ہی ہو تو لامحالہ اس کا حمل زنا سے ہوگا۔ یہ زنا کے ثبوت کی دوسری شرط ہے۔

زنا کے ثبوت کی تیسری شرط یہ ہے کہ یا پھر زانی خود اپنے مرتکب زنا ہونے کا اعتراف کرے غرض زنا کے ثبوت کے یہ

---

[1] شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کیونکہ مذکورہ آیت شیخوخت کے ساتھ معلق ہے۔ جس سے متبادر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بیس سالہ محصن نے زنا کر لیا تو اسے رجم نہ کیا جائے گا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ محصن اگر بیس سالہ بھی ہو تب بھی زنا کرنے پر اسے رجم کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ساٹھ سالہ غیر محصن زنا کرے تو اس منسوخ آیت کا مقتضی یہ ہے کہ وہ رجم کیا جائے گا۔ جبکہ حدیث عمر رضی اللہ عنہ بتلاتی ہے کہ غیر محصن رجم نہ ہوگا چاہے وہ ساٹھ سالہ ہی کیوں نہ ہو۔ تب پھر معلوم ہوا کہ اس منسوخ اور مروی آیت کے الفاظ حدیث عمر رضی اللہ عنہ کے موافق نہیں۔

تین طریق ہیں اور یہ حجت ہیں کیونکہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے ان تینوں باتوں کو برسرِ منبر بیان فرمایا ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو اہم مسائل ذکر کیے گئے ہیں:

(1) ایک یہ کہ زنا کیونکر ثابت ہوتا ہے، تو اس کے تین طریقے ہیں جو اوپر ذکر کر دیے گئے ہیں۔

(2) دوسرا یہ کہ زنا کا حکم کیا ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر زنا ثابت ہو جائے اور زانی محصن ہو تو چاہے مرد ہو یا عورت اس کو رجم کر دیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات اسلاف کی یہ مبارک عادت تھی کہ جمعہ خود ولی امر اور خلیفہ پڑھایا کرتا تھا۔
- رب تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ایسا سچا دین دے کر بھیجا ہے کہ جس کے کسی حکم میں ادنی سے شک و شبہ کی بھی گنجائش نہیں۔
- معلوم ہوا کہ رجم کی آیت پہلے قرآن میں موجود تھی جو بعد میں لفظوں میں تو منسوخ کر دی گئی لیکن اس کا حکم اب بھی ہے اور قیامت تک باقی ہے۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو تین بلیغ تاکیدات کے ساتھ بیان کیا ہے کہ آیت رجم پہلے قرآن میں موجود تھی اور وہ تین تاکیدات یہ ہیں کہ:

⊙...... ہم نے اس آیت کو زبان سے پڑھا۔

⊙...... کانوں سے سنا۔

⊙...... دلوں سے سمجھا۔

- رجم کا حکم غیر منسوخ ہے اس کی دلیل "فَرَجَمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کو جس بات کا اندیشہ تھا، وہ جستہ جستہ ہوتی نظر آنے لگی تھی کہ اب لوگوں کی زبانوں پر یہ بات آنے لگی تھی کہ جب رجم کا حکم ہمیں قرآن میں نہیں ملتا تو ہم بھی رجم نہ کریں گے۔

اس لیے جناب عمر رضی اللہ عنہ نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زانیوں کو رجم کیا، لہٰذا ہم بھی رجم کریں گے اور کوئی اس بات کو بہانہ نہ بنائے کہ یہ حکم قرآن میں نہیں۔ یہ حکم قرآن میں تھا۔ ہم نے اس کو پڑھا، سنا اور سمجھا۔

- معلوم ہوا کہ حدود کو قائم کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل 'بِتَرْكِ فَرِيضَةٍ' کے الفاظ ہیں۔

جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو صراحت کے ساتھ فرمایا کہ رجم کرنا فریضہ ہے۔

- رجم کرنے کا حکم حق اور ثابت ہے نہ کہ باطل۔
- رجم کی حد صفتِ احصان کے پائے جانے کے وقت ہے۔ اس کی دلیل "عَلَى مَنْ زَنَى إِذَا أُحْصِنَ" کے الفاظ ہیں۔
- زنا تین میں سے کسی ایک طریق سے ثابت ہوتا ہے: (1) بینہ (2) حمل (3) یا پھر اعتراف۔

بینہ:...... یہ چار عادل مردوں کی گواہی کا نام ہے اور چاروں ایک بیان دیں۔ لہٰذا اگر دو گواہ اس بات کی شہادت دیں کہ ان دونوں نے کل شام زنا کیا تھا اور دو اس بات کی شہادت دیں کہ یہ واقعہ آج صبح کا ہے تو شہادت کا یہ عدد مکمل نہ سمجھا جائے گا۔

غرض اسی طرح زنا کے وقت، مکان اور زنا کی کیفیت وغیرہ میں چاروں کا بیان ایک ہونا شرط ہے۔

حمل:...... یہ بھی زنا کے ثبوت کا ایک طریق ہے۔لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ حمل ایسی عورت کا ہو جس کا نہ خاوند ہو اور نہ آقا۔لہٰذا خاوند والی کے صرف حمل ہو جانے پر اس پر حد رجم جاری نہ کی جائے گی کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ حمل خود اسی کے خاوند سے ہو۔

الاعتراف:......اس میں الف لام بیانِ حقیقت کے لیے ہے اور یاد رہے کہ اعتراف میں تکرار شرط نہیں۔جیسا کہ مفصل مذکور ہوا۔

◈ جمعہ کے خطبہ میں مسائل فقہیہ کے بیان میں کوئی مانع نہیں۔

زانیہ کنیز کی حد کا بیان

1208۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((إِذَا زَنَتْ أَمَةُ أَحَدِكُمْ ، فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا ، فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ ، وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا ، ثُمَّ إِنْ زَنَتْ فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ ، وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا ، ثُمَّ إِنْ زَنَتِ الثَّالِثَةَ ، فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا ، فَلْيَبِعْهَا ، وَلَوْ بِحَبْلٍ مِنْ شَعْرٍ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''جب تم میں سے ایک کی باندی زنا کر لے اور اس کا زنا آشکارا بھی ہو جائے تو (آقا) اس پر حد جاری کرے البتہ اسے لعنت ملامت نہ کرے، پھر اگر وہ (دوبارہ) زنا کرے تو اس پر حد جاری کرے اور (اب بھی) اسے لعنت ملامت نہ کرے، پھر اگر وہ (سہ بارہ) زنا کرے اور اس کا زنا آشکارا (بھی) ہو جائے تو اسے بیچ دے چاہے بالوں کی ایک رسی کے بدلے ہی سہی۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث :......**إِذَا زَنَتْ أَمَةُ أَحَدِكُمْ**: مراد مملوکہ باندی ہے۔اس کی دلیل لفظ ''أَحَدِكُمْ'' کی طرف اس کی اضافت ہے۔

فَتَبَيَّنَ: یعنی آقا پر اچھی طرح یہ امر واضح ہو جائے کہ وہ زنا کر چکی ہے، گو چار گواہوں سے نہ بھی ثابت ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کے زنا پر چار مرد گواہی دیں۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس کے آقا کو اس کے ارتکابِ زنا کا بخوبی علم ہو جائے۔**فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ، وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا**: مذکورہ لام امر کا ہے اور یہ وجوب کے لیے ہے البتہ آقا چاہے تو اپنے حق سے دست بردار بھی ہوسکتا ہے اور حد جاری کرنے کے امر کو ولی امر کے حوالے کر دے۔

وَلَا يُثَرِّبْ: مراد زجر و توبیخ کرنا اور سخت ڈانٹنا ہے کہ ایسا نہ کرے۔کیونکہ جب اس پر حد قائم کر دی تو یہ اس کی سرزنش کے لیے کافی ہے، اب اسے مزید لعنت ملامت کرنے سے گریز کیا جائے۔

اسی طرح اگر وہ دوسری بار زنا کرتے ہوئے پکڑی جائے تو اب پھر اس پر حد جاری کرے۔تا کہ اسے تیسری مرتبہ مرتکب زنا ہونے کی جرأت نہ ہو۔لیکن اگر وہ تیسری مرتبہ بھی زنا کرے تو آقا کیا کرے؟

[1] صحيح البخاري: 6839۔ صحيح مسلم: 1703.

فَلْيَبِعْهَا : تو اسے بیچ دے چاہے بالوں والی ایک رسی کے بدلے ہی سہی۔ مراد یہ ہے کہ اگر کسی معمولی سی قیمت کے بدلے بھی بیچنی پڑے تو بیچ دے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ باندی پر حد خود آقا جاری کرے گا۔ کیونکہ باندی پر آقا کی ملک والی کی ملک سے زیادہ ہے۔ البتہ خاوند بیوی پر حد جاری نہیں کر سکتا کیونکہ بیوی آزاد ہے اور اس پر خاوند کو ملک رقبہ حاصل نہیں۔
- حد جاری کرنے کے لیے زنا کے ارتکاب کا کھل کر سامنے آنا لازم ہے لہٰذا صرف تہمت کی بنا پر حد جاری نہ کی جائے گی۔
- آقا کے باندی پر حد جاری کرنے میں چار گواہوں کے ذریعے زنا کا ثابت ہونا ضروری نہیں۔
- باندیوں کو رجم نہ کیا جائے گا اس کی دلیل "فَلْيَجْلِدْهَا" کے الفاظ ہیں۔
- باندیوں کی حد کا بیان اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:
  ﴿فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (النسآء: 25)
  ''پھر جب وہ نکاح میں لائی جا چکیں تو اگر کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں پر ہے۔''
- حد جاری کر دینے کے بعد باندی کی زجر و توبیخ نہ کی جائے گی اور نہ اسے اس گناہ کا عار ہی دلایا جائے گا کیونکہ اقامت حد گناہ کا کفارہ ہے۔ لہٰذا باندی پر دو عقوبتیں جمع نہ کی جائیں گی۔
- متعدد مسائل میں تین کے عدد کا اعتبار ہے۔
- اگر باندی تیسری مرتبہ بھی زنا کی مرتکب ہو تو اس کو بیچ دیا جائے۔ اس کی دلیل "فَلْيَبِعْهَا" کے الفاظ ہیں۔
  البتہ علماء کا اس امر میں اختلاف ہے۔ کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب یا ارشاد کے لیے ہے۔ تو بظاہر یہ امر وجوب کے لیے ہے البتہ اس میں اس بات کی قید ضرور ہے کہ اسے بیچ دینے سے اس کے سدھر جانے کی امید ہو۔ البتہ اگر اس کے بیچ دینے سے اس کے مزید بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو اسے بیچنا جائز نہ ہو گا۔
- ایسی باندی کو بالوں کی ایک رسی کے بدلے بھی بیچ دینے کا حکم بطور مبالغہ کے ہے ورنہ بالوں کی رسی کے بدلے باندی بیچنے کا دستور نہیں۔

غلام پر حد آقا جاری کرے گا

1209- وَعَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَقِيْمُوا الْحُدُوْدَ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ)).

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں (یعنی جو تمہارے غلام ہیں، اگر وہ قابل حد کسی جرم کا ارتکاب کریں تو) ان پر حد جاری کرو۔''[1]

---

[1] سنن ابی داؤد: 4473- السنن الکبریٰ للنسائی: 7239- مسند احمد: 95/1- اس حدیث کی اسناد میں عبدالاعلی بن عامر ثعلبی ہے جن کے بارے میں امام نسائی کا یہ قول ہے کہ یہ قوی راوی نہیں ہے۔

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ.
اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وَهُوَ فِيْ مُسْلِمٍ مَوْقُوْفٌ.
جبکہ صحیح مسلم میں یہ روایت موقوف مروی ہے۔ [1]

غریب الحدیث :......أَقِيمُوا: یہ امر ہے اور وجوب کے لیے ہے۔ کیونکہ امر میں اصل وجوب ہے۔ پھر حد قائم کرنا رب تعالیٰ کے فرائض میں سے بھی ہے۔

عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ: یہ الفاظ مرد اور عورت یعنی غلام اور باندی دونوں کو شامل ہیں۔

اَلْحُدُودَ: یہ حد کی جمع ہے اور بظاہر یہ زنا، سرقہ اور قذف وغیرہ سب حدود کو شامل ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث حدود قائم کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔

◈ غلام پر آقا حد جاری کرے گا چاہے وہ حد کوڑوں کی ہو یا قطع ید کی۔ کیونکہ "الحدود" میں الف لام جمع کے لیے ہے اور یہ عموم پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ آقا صرف کوڑوں کی سزا دے سکتا ہے البتہ وہ غلام پر قطع ید کی حد جاری نہیں کرسکتا۔ لیکن درست قول یہ ہے کہ یہاں عموم ہی ہے اور یہ حدیث قطع ید کی حد جاری کرنے کو بھی شامل ہے۔ البتہ اس میں یہ بات شرط ہے کہ آقا یہ بات جانتا ہو کہ ہاتھ کو کاٹنا کہاں سے ہے کہ مباداوہ ہاتھ کو محل سے زیادہ کاٹ بیٹھے یا کم کاٹ بیٹھے۔ لہٰذا اگر آقا محلِ قطع سے بخوبی واقف ہے تو اس کے حد جاری کرنے میں کوئی مانع نہیں۔

◈ یہ حدیث آدمی کے لیے ملک کو ثابت کرتی ہے۔

◈ جز کا کل پر اطلاق جائز ہے جیسا کہ "عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ" ایمان (جو کہ یمین کی جمع ہے) جو بدن کا جز ہے اس کو بول کر کُل مراد لیا گیا ہے۔

◈ صحیح مسلم کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے اور جنابِ علی رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے ایک ہیں اور علم وفقہ میں بھی معروف ہیں، لہٰذا جب تک یہ قول کسی نص کے یا کسی دوسرے صحابی کے قول کے مخالف نہیں، حجت ہے۔

حاملہ زانیہ پر حد قائم کرنے میں مہلت دینے کا بیان

1210- وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضي الله عنه، أَنَّ امْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، وَهِيَ حُبْلَى مِنَ الزِّنَا، فَقَالَتْ: يَا نَبِيَّ اللهِ! أَصَبْتُ حَدًّا، فَأَقِمْهُ عَلَيَّ، فَدَعَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَلِيَّهَا، فَقَالَ: أَحْسِنْ إِلَيْهَا، فَإِذَا وَضَعَتْ فَأْتِنِيْ بِهَا فَفَعَلَ، فَأَمَرَ بِهَا فَشُكَّتْ عَلَيْهَا ثِيَابُهَا، ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَرُجِمَتْ، ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهَا، فَقَالَ عُمَرُ:

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جھینہ قبیلہ کی ایک عورت خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئی جبکہ وہ اس وقت زنا سے حاملہ تھی، پس وہ عرض کرنے لگی کہ: اے اللہ کے نبی! میں حد کو پہنچ گئی ہوں (یعنی میں ایسا کام کر بیٹھی ہوں جو حد کو واجب کرتا ہے) سو آپ ﷺ مجھ پر حد کو قائم کیجیے! نبی کریم ﷺ نے اس کے ولی کو بلوایا اور اسے ارشاد فرمایا: ''(اسے لے جاؤ اور) اس کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ پس جب یہ بچہ جَن لے تو اسے میرے

---

[1] صحیح مسلم: 1705- حاکم (410/4) نے اس حدیث کو غریب کہا۔ لیکن اس پر ان کی گرفت کی گئی ہے۔

أَتُصَلِّي عَلَيْهَا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! وَقَدْ زَنَتْ ؟ فَقَالَ : ((لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ قُسِّمَتْ بَيْنَ سَبْعِيْنَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَوَسِعَتْهُمْ ، وَهَلْ وَجَدْتَ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلّٰهِ تَعَالَى ؟))

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

پاس لے آنا۔ چنانچہ اس (عورت کے) ولی نے ایسا ہی کیا۔ (اور جب اس نے بچہ جن لیا تو اسے لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہو گیا) سو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں حکم دیا (کہ اس پر رجم کی سزا کو جاری کیا جائے) چنانچہ اس کے کپڑے اس پر کس کر باندھ دیے گئے (تاکہ رجم کے دوران اس کا ستر نہ کھل جائے)۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے بارے حکم دیا تو اسے رجم (کر کے ہلاک) کر دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! کیا آپ ﷺ اس عورت کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے تو زنا کا ارتکاب کیا تھا؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تحقیق اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ وہ توبہ اگر مدینہ کے ستر لوگوں میں بھی بانٹ دی جاتی تو ان سب کو (اپنے اندر سمو لیتی اور انہیں) کافی رہتی اور کیا تم نے اس سے افضل بھی کوئی بات دیکھی ہے کہ اس عورت نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی جان دے دی۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**وَهِيَ حُبْلَى مِنَ الزِّنَا**: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "اَتَتْ فعل کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

أَصَبْتُ حَدًّا: اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: "اَصَبْتُ مَا يُوْجِبُ حَدًّا" یعنی میں ایسا کام کر بیٹھی ہوں جس پر حد واجب ہوتی ہے اور یہ سبب پر مُسَبَّب کے اطلاق کی قبیل میں سے ہے۔ اسی لیے اس خاتون نے بعد میں یہ کہا تھا:

فَأَقِمْهُ عَلَيَّ: کہ اب وہ حد مجھ پر قائم کیجیے۔

فَدَعَا نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ وَلِيَّهَا: مراد وہ شخص ہے جو اس کے امور کا نگران ونگہبان تھا جیسے باپ، خاوند وغیرہ کہ آپ ﷺ نے اس کو بلوایا۔

أَحْسِنْ إِلَيْهَا: اور یہ قول اور فعل دونوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو شامل ہے۔ قول کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ اسے عار نہ دلائے، شرمندہ نہ کرے اور نہ اسے لعنت ملامت ہی کرے۔ کیونکہ وہ عورت تائب ہو کر آئی تھی اور اب اس کا باطنی امر رب تعالیٰ کے حوالہ تھا۔ رہا ظاہری امر تو اس پر حد کا جاری کرنا تھا جس کا آپ ﷺ نے فیصلہ سنا دیا تھا اور وہ اس کے وضع حمل تک موخر تھا۔

اور فعل کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ اس کے نان ونفقہ اور لباس پوشاک وغیرہ میں کمی نہ کرے۔ چنانچہ پھر اس ولی نے ایسا ہی کیا اور جب اس عورت نے بچہ جنم دیا تو اسے لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہو گیا۔

[1] صحیح مسلم: 1696.

فَشُكَّتْ عَلَيْهَا ثِيَابُهَا: "شُكَّتْ" یہ "شُدَّتْ" کے معنی میں ہے۔یعنی رجم کرنے سے قبل اس کے کپڑے اس کے بدن پر کس کر باندھ دیے گئے تا کہ اس کی بے ستری نہ ہونے پائے۔

ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهَا: یعنی نبی کریم ﷺ نے رجم کر دیے جانے کے بعد اس عورت کی نمازِ جنازہ ادا کی۔

أَتُصَلِّي عَلَيْهَا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَقَدْ زَنَتْ: مذکورہ ہمزہ استفہامیہ استعلام کے لیے ہے نہ کہ انکار کے لیے ہے۔یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ جاننے کے لیے استفہام کیا تھا کہ آپ ﷺ نے ایک عورت کے زانیہ ہونے کے باوجود اس کی نمازِ جنازہ کیوں ادا فرمائی۔**وَقَدْ زَنَتْ:** یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "عَلَيْهَا" کی ضمیر مجرور متصل سے حال ہے۔

لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً.....: "تَوْبَةً" میں تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔یعنی اس نے ایک عظیم اور بڑی توبہ کی ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے بعد میں اس توبہ کی یہ صفت بیان فرمائی کہ یہ ایسی مقبول توبہ ہے کہ اگر وہ مدینہ کے ستر لوگوں میں بھی بانٹ دی جائے تو سب کو کافی رہے، یعنی سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے۔

وَهَلْ وَجَدْتُ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلّٰهِ: اس کی تقدیری عبارت یوں ہے:"وَهَلْ وَجَدْتَ شَيْئًا أَفْضَلَ مِنْ هٰذَا".

یعنی کیا تم نے اس سے بھی افضل کوئی بات دیکھی ہے کہ ایک عورت آتی ہے اور اپنے گناہ کا اقرار کرتی ہے۔حالانکہ وہ جانتی ہے کہ اس کے نتیجہ میں اسے رجم کر کے ہلاک کر دیا جائے گا۔لیکن پھر بھی اس نے اس گناہ کا اقرار کیا، اور اس پر اللہ کے لیے اپنی جان دینا اس قدر آسان ہو گیا تھا۔ بلاشبہ یہ بڑا اونچا مقام ہے۔اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس عورت کی نمازِ جنازہ ادا کی تھی۔

مضمونِ حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کا زنا چاہے گواہوں سے اور چاہے اس کے اپنے اقرار سے ثابت ہو گیا ہو جبکہ وہ اس وقت حمل سے ہو تو اس پر حد جاری کرنے کو وضع حمل تک مؤخر کیا جائے گا، چاہے اس کی حد رجم ہو یا جلد۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- آدمی کے لیے اپنے زنا کے ارتکاب کا اقرار کرنا اور اس گناہ سے پاک ہونے کے لیے حد قائم کرنے کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ نے زنا کا اقرار اور اس کی سزا کا مطالبہ کرنے والی اس عورت پر انکار نہ فرمایا تھا۔البتہ افضل اپنے گناہ کی پردہ پوشی ہے۔
- ضرورت کے وقت قابلِ حیا بات کو صراحۃً ذکر کرنا جائز ہے۔
- سبب پر مسبّب کا اطلاق جائز ہے۔جیسے زنا یہ سبب ہے حد قائم کیے جانے کا اور یہاں زنا پر حد کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ یہ مسبّب کے سبب پر اطلاق کے باب میں سے ہے۔
- جو کسی موجبِ حد گناہ کا اقرار کرے، اس کے ساتھ قول وفعل کے ذریعے کسی قسم کا برا سلوک کرنا جائز نہیں۔
- عورتیں اپنے امور میں ناقص ہیں۔اس لیے ہر امر میں ان کا ایک ولی ہونا ضروری ہے۔

◈ حاملہ زانیہ کو بچہ جنتے ہی رجم کر دینا جائز ہے۔ اگرچہ مذکورہ حدیث کا سیاق یہی ہے لیکن نبی کریم ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے غامدیہ کو اس وقت تک رجم نہ فرمایا تھا جب تک بچہ جنم دینے کے بعد اس کے بچے کا دودھ نہ چھڑا دیا گیا تھا اور اہل علم کے ہاں یہی مقرر ہے۔ تب پھر ایک تو حاملہ کو رجم کرنا جائز نہ ہوگا جب تک کہ وہ بچہ نہ جن لے۔ پھر بچہ جن دینے کے بعد اگر تو بچے کے لیے کسی انّا کا انتظام ہو پاتا ہے تو اسے رجم کر دیا جائے گا۔ وگرنہ بچے کے دودھ چھڑائے جانے کے زمانہ تک اس پر حد نہ جاری کی جائے گی۔

◈ معلوم ہوا کہ رجم کیے جانے والے کو گڑھا کھود کر اس میں گاڑا نہ جائے گا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس عورت کے لیے گڑھا نہیں کھودا تھا۔ لیکن سنت میں گڑھا کھودنے اور نہ کھودنے دونوں کا ذکر آتا ہے تب پھر اس بارے میں موقع محل کی مناسبت اور مصلحت کو ملحوظ رکھا جائے۔

◈ اسلام میں سدّ ذرائع کا اعتبار رہے۔ اس کی دلیل "فَشُكَّتْ عَلَيْهَا ثِيَابُهَا" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ کپڑوں کو اچھی طرح کس کر باندھ دینا رجم کے دوران ستر کے کھل جانے کے امکان کو ختم کر دینے کا ذریعہ ہے۔

◈ جس پر زنا یا چوری کی حد جاری کر دی جائے وہ کافر نہیں کہلاتا۔ اس کی دلیل "فَصَلَّى عَلَيْهَا" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اگر رجم کر دینے سے وہ عورت کافر ہو چکی ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس کی نماز جنازہ نہ ادا فرماتے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق بات جاننے کے بے حد حریص ہوتے تھے۔ اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں: "أَتُصَلِّي عَلَيْهَا وَقَدْ زَنَتْ".

◈ گناہ کا اقرار توبہ تائب ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً".

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کے ستر اور شرمگاہ کی بے ستری کی حفاظت مرد سے زیادہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کپڑے باندھ دینے کا حکم جنابِ ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم فرماتے وقت نہ دیا تھا۔

◈ حد یافتہ کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور یہ کہ کبائر کے ارتکاب سے کسی کا جنازہ ساقط نہیں ہو جاتا۔

◈ چھوٹا بڑے کے کسی فعل کی بابت استفسار کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اس رجم کی جانے والی عورت کا جنازہ ادا کرنے کی بابت استفسار کیا تھا اور یہ کہ ایسا استفسار اگر حق بات جاننے کے لیے ہو تو بے ادبی اور مذموم نہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ اس عورت نے زبردست توبہ کی تھی۔ حتیٰ کہ وہ توبہ ستر آدمیوں تک کی مغفرت و بخشش کو کافی تھی۔

◈ قرائن سے استدلال جائز ہے اس کی دلیل: "وَهَلْ وَجَدَتْ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلَّهِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کہ عمل کو خالص اللہ کے لیے کیا جائے۔ اس کی دلیل: "جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلَّهِ" کے الفاظ ہیں۔

رجم کا ثبوت

1211,1212۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضي الله عنهما قَالَ: ((رَجَمَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ، وَرَجُلًا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے قبیلہ اسلم کے ایک مرد کو، اور ایک یہودی کو اور

مِنَ الْيَهُوْدِ وَامْرَأَةً)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

وَقِصَّةُ رَجْمِ الْيَهُوْدِيَّيْنِ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ.

ایک عورت کو رجم فرمایا تھا۔ ❶

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور دو یہودیوں کو رجم کرنے کا قصہ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے موجود ہے۔ ❷

شرح:......قبیلہ اسلم کے یہ صاحب حضرت ماعز رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہودی مرد سے وہ آدمی مراد ہے جس نے ایک یہودن سے زنا کیا تھا۔

جبکہ "امْـرَأَةً" سے مراد یہودن عورت ہے یا مطلق عورت ہے؟ تو بظاہر مراد یہودن عورت ہے۔ اب ایک تو یہ تین آدمی ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے رجم فرمایا تھا۔ جبکہ باقی کے دو دو غامدیہ اور صاحب عسیف کی بیوی ہے۔

کمزور مریض پر سے حد میں تخفیف کرنے کا بیان

1213- وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ رضي الله عنه قَالَ: كَانَ فِيْ أَبْيَاتِنَا رُوَيْجِلٌ ضَعِيْفٌ، فَخَبَثَ بِأَمَةٍ مِنْ إِمَائِهِمْ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: ((اضْرِبُوْهُ حَدَّهُ))، فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّهُ أَضْعَفُ مِنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: ((خُذُوْا عِثْكَالًا فِيْهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ، ثُمَّ اضْرِبُوْهُ بِهِ ضَرْبَةً وَاحِدَةً))، فَفَعَلُوْا.

حضرت سعید بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہمارے گھروں کے بیچ میں (یعنی ہمارے محلے میں) ایک کمزور سا آدمی رہتا تھا۔ اس نے محلّہ کے لوگوں کی باندیوں میں سے ایک ساتھ زنا کرلیا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اس بات کا تذکرہ نبی کریم ﷺ کے حضور کیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسے اس کی حد لگاؤ۔" لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ حد (کے برداشت کرنے) سے بڑا کمزور ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم لوگ کھجوروں کا ایک گچھا لو جس میں سو شاخیں ہوں، پھر اس گچھے کی اسے ایک ضرب لگاؤ۔" (یوں اس کی سو کوڑے والی حد کی سزا پوری ہو جائے گی)۔ پس لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ ❸

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ، لٰكِنِ اخْتُلِفَ فِيْ وَصْلِهِ وَإِرْسَالِهِ.

اس حدیث کو امام احمد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد حسن ہے۔ البتہ اس حدیث کے موصول یا مرسل ہونے میں اختلاف ہے۔

غریب الحدیث:......فِيْ أَبْيَاتِنَا: مذکورہ "فِيْ" ظرفیت کے لیے ہے اور "أَبْيَاتِ" سے مراد محلّہ ہے۔

رُوَيْجِلٌ: یہ "رَجُل" کی تصغیر ہے۔ مراد ایک کمزور اور نحیف سا آدمی ہے۔

---

❶ صحیح مسلم: 1701. ❷ صحیح البخاری: 6841- صحیح مسلم: 1699.

❸ مسند احمد: 222/5- السنن الکبریٰ للنسائی: 7309- سنن ابن ماجہ: 2103- مذکورہ اختلاف کو امام موصوف نے "التلخیص الحبیر" (59/4) میں بیان کیا ہے۔

فَخَبَثَ: مراد زنا کرنا ہے کیونکہ زنا خبث یعنی پلیدی اور ناپاکی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ مُبَرَّءُ وْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ (النور: 26)

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ اس سے بری کیے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور باعزت روزی ہے۔''

بِأَمَةٍ مِنْ إِمَائِهِمْ: بظاہر یہ کسی کی مملوکہ باندی تھی۔

إِنَّهُ أَضْعَفُ مِنْ ذَلِكَ: یعنی وہ حد کی سزا کو جھیل نہیں سکتا۔

اِضْرِبُوْهُ حَدَّهُ: اور وہ سو کوڑے ہیں۔ یہ الفاظ بتلاتے ہیں کہ وہ آدمی غیر محصن تھا۔

عِثْكَالًا: عثکال کھجور کی شاخوں کے گچھے کو کہتے ہیں۔

شِمْرَاخ: اس کی جمع شماریخ آتی ہے۔ یہ گچھے کی شاخوں کو کہتے ہیں۔ جن پر کھجوریں لگتی ہیں۔

ثُمَّ اضْرِبُوْهُ بِهِ ضَرْبَةً وَاحِدَةً: غرض جب اس گچھے کی ایک ضرب اسے لگائی جائے گی جس میں سو شاخیں ہوں گی تو یہ ایک ضرب سو ضربوں سے کفایت کرے گی۔

لَكِنِ اخْتُلِفَ فِي وَصْلِهِ وَإِرْسَالِهِ: اور جب کسی روایت کے موصول یا مرسل ہونے میں اختلاف ہو تو ارجح کو لیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو روایت ارجح کے مخالف ہو وہ اہلِ اصطلاح کے نزدیک شاذ ہوتی ہے اور اگر دونوں روایات قوت میں برابر ہوں، تو موصول کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ اس میں زیادہ علم ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کسی کے ظاہر سے دھوکا نہ کھایا جائے اور نہ کسی کی ظاہری نیک حالت پر اطمینان ہی کیا جائے۔ جیسے یہ کمزور سا آدمی تھا جو لگتا نہ تھا کہ کسی بے گناہ عورت سے بدکاری بھی کر جائے گا۔ اس لیے ہر ایک کی بابت خوب احتیاط سے کام لیا جائے۔
- زانی کی پردہ داری واجب نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے زانی کی خبر دینے والے پر نکیر نہ فرمائی تھی۔
- اقامتِ حد میں توکیل جائز ہے جیسا کہ گزشتہ اوراق میں بھی بیان ہوا۔ اس کی دلیل "اِضْرِبُوْهُ حَدَّهُ" کے الفاظ ہیں۔
- یہ آدمی غیر محصن تھا اس کی دلیل "اِضْرِبُوْهُ حَدَّهُ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اگر وہ آدمی محصن ہوتا تو آپ ﷺ "فَارْجُمُوْهُ" کے الفاظ ارشاد فرماتے۔
- جس آدمی پر حد واجب ہوگئی ہو اور اس میں حد کے تحمل کی قوت نہ ہو تو پھر وہ صورت اختیار کی جائے جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے۔
- معلوم ہوا کہ حدود کے قیام سے پہلا مقصود اذیت اور تکلیف دینا نہیں۔ بلکہ مقصود تادیب اور ڈرانا ہے اور یہ کہ حدود گناہوں کا کفارہ بنیں۔ کیونکہ اگر مقصود اذیت دینا ہی ہوتا تو بیماروں اور کمزوروں پر بھی عام دستور کے مطابق ہی حد جاری کی جاتی۔

لواطت کی سزا

1214- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ فَاقْتُلُوْا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهِ ، وَمَنْ وَجَدْتُمُوْهُ وَقَعَ عَلَى بَهِيْمَةٍ فَاقْتُلُوْهُ وَاقْتُلُوا الْبَهِيْمَةَ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شخص کو تم پاؤ کہ وہ قومِ لوط والا فعلِ (بد) کرتا ہے تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر ڈالو، اور جسے تم پاؤ کہ اس نے چوپائے سے بدفعلی کی ہے تو اسے اور اس چوپائے (دونوں) کو قتل کر ڈالو۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُوْنَ ، إِلَّا أَنَّ فِيْهِ اخْتِلَافًا.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ البتہ اس (مذکورہ حکم) میں اختلاف ہے۔

غریب الحدیث :......**مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ:** یہ خطاب پوری امت کو عام ہے۔ البتہ حدود کو قائم کرنے کی ولایت امام، خلیفہ اور والی کو ہے۔ ہر ایک کو یہ حق حاصل نہیں ہے سوائے آقا کے جو اپنے غلام پر حد قائم کر سکتا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل بیان ہوئی۔

يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ: یعنی وہ مردوں سے بدفعلی کرتا ہو۔ رب تعالیٰ نے اس فعل بد کا نام خبائث رکھا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (الانبياء: 74)

''اور اسے اس بستی سے نجات دی جو گندے کام کیا کرتی تھی۔''

بلاشبہ یہ بدترین برائی ہے جو کئی برائیوں کو جامع ہے، اسی لیے رب تعالیٰ نے اس کو خبائث (جمع کے صیغہ) کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ مردوں کی یہ جگہ کسی بھی حال میں کسی کے لیے بھی مباح نہیں۔ جبکہ عورت کی شرمگاہ نکاحِ صحیح کے ساتھ حلال اور مباح ہو جاتی ہے۔ اسی لیے یہ فعلِ زنا سے بھی بدتر ہے کیونکہ زنا ایک ایسے محل میں کیا جاتا ہے جس کو عقدِ صحیح کے ساتھ مباح کیا جا سکتا ہے جبکہ اِغلام (لواطت اور مردوں کے ساتھ بدفعلی) ایک ایسے محل میں کی جاتی ہے جو کسی بھی حال میں مباح نہیں ہوتا۔

فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُولَ بِهِ: سیاقِ کلام کا مقتضی یہ تھا کہ یہاں اسم ظاہر کی بجائے ضمیر لا کر "اقْتُلُوهُ" کہا جاتا، تاکہ عطف کا حسن برقرار رہتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا کیونکہ اگر یہاں ضمیر لائی جاتی تو تقدیری عبارت "اقْتُلُوهُ وَالْمَفْعُولَ بِهِ" بنتی اور اس عطف کا غیر عمدہ ہونا اہل علم پر عیاں ہے۔

وَمَنْ وَجَدْتُمُوهُ وَقَعَ عَلَى بَهِيمَةٍ فَاقْتُلُوهُ: اس قتل کی علت بھی وہی سابقہ ہے۔ کیونکہ چوپائے کی شرمگاہ بنی آدم

---

❶ مسند احمد: 300/1- سنن ابی داؤد: 4464- جامع الترمذی؛ 1455- السنن الکبریٰ للنسائی: 7338- سنن ابن ماجه: 2564- امام ترمذی: "العلل للقاضی ابی طالب" (ص: 226) میں لکھتے ہیں: میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: عمرو بن ابی عمرو صدوق ہے البتہ وہ عکرمہ سے منکر احادیث روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات پر کچھ نہ کہا کہ عمرو نے عکرمہ سے احادیث سنی ہیں یا نہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ ابو رزین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث سنی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ابو رزین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو پایا ہے۔ جبکہ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابو یحییٰ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ جبکہ ابو حاتم نے ان کی روایت کو منکر کہا ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 455/1.

کے لیے بنی ہی نہیں اور یہ کسی بھی حال میں کسی انسان کے لیے حلال نہیں۔

وَاقْتُلُوا الْبَهِيمَةَ: تا کہ دوسروں کو بھی اس فعل سے زجر اور ڈراوا ہو اور کوئی آدمی ایسا کرنے کی جرأت نہ کرے تا کہ کوئی چوپایہ مرد کے پانی سے ایسا حاملہ نہ ہو کہ جس کو وہ جنے تو وہ کچھ تو انسان جیسا ہو اور کچھ حیوان جیسا، اور بعد میں اس نامراد بدکار کو اس پیدا ہونے والی مخلوق کا عار نہ دیا جائے۔

تب پھر چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنے پر چوپائے کو قتل کر دینے کے تین فوائد ہوئے:

(1) ایسا فعل کرنے کی کسی اور کو ہمت نہ ہو۔

(2) انسانی اور حیوانی خلقت کا کوئی مجموعہ پیدا نہ ہو۔

(3) اور ایسی مخلوق کسی انسان کے لیے باعثِ عار نہ بنے۔

إِلَّا أَنَّ فِيهِ اِخْتِلَافًا: اس حدیث کی بابت علماء میں اختلاف اس حدیث کے ضعیف ہونے کی بنا پر اس پر عمل کرنے کی بابت ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ چونکہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لیے اس حدیث سے حجت پکڑنا صحیح نہیں۔ اس لیے لوطی اور چوپائے سے بدفعلی کرنے والے کی حد میں نظر ہے۔

جبکہ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس کا پہلا طرف جو "فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُولَ بِهِ" تک ہے، وہ صحیح ہے۔

جبکہ ایک قول یہ ہے کہ اس حدیث کے دونوں طرف صحیح ہیں۔ لیکن حدیث کے دوسرے طرف میں علماء کو شبہ ہے اور وہ شبہ اس طرف حدیث کے صحیح ہونے میں علماء کا اختلاف ہے لہٰذا یہ حصہ جس حکم پر مشتمل ہے وہ نافذ نہ ہوگا۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں لواطت کے فعل بد کی قباحت و شناعت اور اس کی سخت ترین سزا کو بیان کیا گیا ہے کہ اس فعل کے فاعل اور مفعول دونوں کو تہِ تیغ کر دیا جائے گا اور جو چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرے اسے بھی اس چوپائے سمیت تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- لوطی واجب القتل ہے چاہے وہ فاعل ہو یا مفعول۔ اس کی دلیل "اقْتُلُوا" کے الفاظ ہیں اور قتل یہ إعدام ہے اور کسی معصوم کا إعدام کسی واجب کے ذریعے ہی جائز ہوگا۔ لہٰذا صحیح قول یہ ہے کہ لوطی واجب القتل ہے۔
- اور یہ کہ لوطی فاعل یا مفعول دونوں واجب القتل ہوں گے چاہے وہ محصن ہوں یا غیر محصن۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ گو اس بات میں اختلاف ہے کہ لوطی کو قتل کیسے کیا جائے۔ لیکن قتل کیے جانے پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔
- چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنے والے کی سزا کی بابت علماء میں اختلاف ہے کیونکہ روایت کے اس حصہ میں شبہ ہے۔ اس بنا پر چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنے والے کو قتل نہ کیا جائے گا۔ البتہ اس کی تعزیر کی جائے گی۔

اور رہا چوپایہ تو اس کو قتل کیا جائے گا۔ البتہ اس کا یہ قتل بطور قتل کے ہوگا۔ لہٰذا اسے جان سے مار دینے کے لیے ذبح نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مثلاً اسے گولیاں مار کر قتل کر دیا جائے گا۔

کنوارے زانی کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی دونوں ہیں

1215۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ضَرَبَ وَغَرَّبَ ، وَأَنَّ أَبَا بَكْرٍ ضَرَبَ وَغَرَّبَ ، وَأَنَّ عُمَرَ ضَرَبَ وَغَرَّبَ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: (کنوارے زانی کو) نبی کریم ﷺ نے بھی کوڑے لگائے اور (ایک سال کے لیے) جلاوطن فرمایا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی (اپنے دورِ خلافت میں کنوارے زانی کو) کوڑے لگائے اور جلاوطن کیا اور جناب عمر رضی اللہ عنہ نے بھی (اپنے دورِ خلافت میں کنوارے زانی کو) کوڑے لگائے اور جلاوطن کیا۔ ❶

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ ، إِلَّا أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِيْ وَقْفِهِ وَرَفْعِهِ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ البتہ اس حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے میں اختلاف ہے۔

کنوارے زانی کی سزا

اس حدیث میں زانی غیر محصن کی سزا بیان کی گئی ہے کہ اسے سو کوڑے بھی لگائے جائیں گے اور جلاوطن بھی کیا جائے گا۔

البتہ اس حدیث میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اس جلاوطنی کی مدت کتنی ہوگی۔ لیکن گزشتہ روایات میں اس بات کا ذکر ہے کہ یہ جلاوطنی ایک سال کے لیے ہوگی۔ اگرچہ اس سزا کی بابت جناب رسول اللہ ﷺ کے مبارک فعل کا حوالہ کافی تھا۔ لیکن جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ کے ان دونوں سزاؤں کے دینے کے ذکر کرنے کے بعد حضرات شیخین کے بھی ان دونوں سزاؤں کے دینے کا ذکر اس لیے کیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے اور مسلمان نبی کریم ﷺ کے بعد بھی اس حکم پر باقی رہے۔ لہٰذا جلاوطنی کی سزا کے منسوخ ہونے کا دعویٰ غیر مسموع ہوگا۔

امام موصوف نے اس حدیث کے مرفوع یا موقوف ہونے میں حضرات محدثین کے ہاں پائے جانے والے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے جو قاعدہ سب کے نزدیک مسلم ہے اس کو گزشتہ صفحات میں بارہا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ہیجڑوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت کا بیان

1216۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ : لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ ، وَقَالَ: ((أَخْرِجُوْهُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے ہیجڑا بننے والے مردوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ ''ان (مخنثوں یعنی ہیجڑوں) کو اپنے گھروں سے نکال دو۔'' ❷

❶ جامع الترمذی: 1438۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 7342۔ امام حاکم (410/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں: اس حدیث کو صحیح کہنا خطا ہے۔ متعدد رواۃ نے اس حدیث کو "عن ابن ادریس عن عبیداللہ عن نافع عن ابن عمر" کے طریق سے روایت کیا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ: ابن ادریس کو اس حدیث میں وہم ہوا ہے چنانچہ کبھی تو وہ اس حدیث کو متصل روایت کرتا ہے اور کبھی مرسل اور ابن ادریس کی حدیث حجت ہے، اس سے حجت پکڑی جا سکتی ہے۔ ابن ادریس ائمہ مسلمین میں سے ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 459/1۔ اور دیکھیں: علل الترمذی: 229/1.

❷ صحیح البخاری: 6834.

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... لَعَنَ: یعنی ان پر لعنت کرتے ہوئے بددعا فرمائی۔ اب یہ لعنت یا ان الفاظ کے ساتھ تھی: ''اے اللہ! ان پر لعنت فرما۔'' یا یہ فرمایا: کہ ''فلاں فلاں بات پر (یا شخص پر) اللہ کی لعنت ہو۔''

غرض آپ ﷺ نے ان دو طبقوں پر لعنت فرمائی۔ ان میں سے ایک طبقہ یہ ہے:

الْمُخَنَّثِينَ: مخنَّث: یہ خالص مذکر اور خالص مونث کے بین بین ہوتا ہے۔ مخنث دراصل وہ مرد ہوتا ہے جس میں زنانہ ادائیں اور زنانہ مزاج رچ بس گیا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بول چال، وضع قطع، لباس پوشاک اور ناز انداز میں عورتوں کی پوری پوری مشابہت اختیار کرتا ہے۔

حتی کہ اگر کوئی مخنث کی صرف آواز سن لے اور وہ اسے دیکھ نہ رہا ہو تو وہ اسے عورت سمجھے۔ اب طبیعت و عادت کے اعتبار سے یہ عورتوں جیسا ہوتا ہے لیکن اس کا جسم مردوں جیسا ہوتا ہے۔ ان کی یہ عادت صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ یہ بلا تکلف لوگوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور عورتیں بھی ان کی عورتوں جیسی ظاہری وضع قطع دیکھ کر ان سے ذرا کھٹکا نہیں رکھتیں لیکن ان میں سے بعض میں مردوں کی سی شہوت بھی ہوتی ہے اور وہ کسی بھی وقت کسی فتنہ کا سامان کر دیتے ہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس بات سے سختی سے منع فرمایا ہے کہ اگر یہ گھروں میں داخل ہوں تو انہیں فوراً باہر نکال دیا جائے۔

الْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ : یہ دوسرا طبقہ ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو اپنا آپ اور اپنا ظاہر بالکل مردوں کا سا بنا کر رکھتی ہیں حتی کہ انہیں چلتے ہوئے، اور گفتگو کرتے ہوئے دیکھنے والا، ان کو بالکل مرد سمجھ بیٹھتا ہے۔ غرض یہ وہ عورتیں ہیں جو خود کو مردوں جیسا بنا کر رکھتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

ایک نحوی نکتہ

"مِنَ الرِّجَالِ" اور "مِنَ النِّسَاءِ" دونوں میں "مِنْ" بیانیہ ہے اور یہ "الْمُخَنَّثِينَ" اور "الْمُتَرَجِّلَاتِ" کے الف لام سے بیان ہے کیونکہ ان دونوں پر داخل الف لام اسم موصول کا ہے۔

أَخْرِجُوهُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ : "أَخْرِجُوهُم" میں "هُمْ" ضمیر "الْمُخَنَّثِينَ" کی طرف راجع ہے۔ چنانچہ گھروں سے نکال دینے کا حکم ان کے لیے ہے کیونکہ گھر کی عورتوں سے ان کے اختلاط میں خطرہ ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت کو اس بات کا از حد اہتمام ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا نظر آئیں۔
- اور آج جو لوگ یورپ کا کھا کر اس بات کا نعرہ لگاتے پھر رہے ہیں کہ مرد اور عورت ایک برابر ہیں، یہ حدیث ان لوگوں کے اس باطل پروپیگنڈے کی پرزور تردید کرتی ہے۔
- عورت پر واجب ہے کہ وہ ایسے لباس سے اجتناب کرے جو مردوں کے لیے خاص ہوتا ہے، اسی طرح مرد لوگ بھی عورتوں کے ساتھ خاص لباس کو پہننے سے گریز کریں۔
- عورتوں پر مردوں کی مشابہت اختیار کرنا اور مردوں پر عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔

◈ اب لباس کی تین قسمیں ہیں:

(1) جو صرف مردوں کے ساتھ خاص ہو۔

(2) جو صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہو۔

ان دونوں لباسوں کا حکم واضح ہے اور مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کا مخصوص لباس پہننے کی اجازت نہیں اور دونوں کا خاص خاص لباس ایک دوسرے پر حرام ہے۔

(3) وہ لباس جو مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترک ہو۔ ایسے لباس کے پہننے میں مردوں اور عورتوں دونوں کو کوئی حرج نہیں۔ جیسے گلے کا مفلر کہ بعض مفلر ایسے ہیں جو مرد اور عورت یکساں طور پر استعمال کرتے ہیں۔

حدود کو شبہات سے دور کرنے کا حکم

1217,1219- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((ادْفَعُوا الْحُدُوْدَ مَا وَجَدْتُمْ لَهَا مَدْفَعًا)).

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ۔

وَأَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ رضي الله عنها بِلَفْظِ: ((ادْرَءُ وا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ)).

وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضًا.

وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ عَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه مِنْ قَوْلِهِ، بِلَفْظِ: ((ادْرَءُ وا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تک تمہیں حدود کو رفع کرنے والا کوئی امر ملتا رہے تم حدود کو ہٹاتے رہو۔'' ❶

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔

اور امام ترمذی اور امام حاکم نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ''تم لوگ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں پر سے حدود کو دور کرو۔'' ❷

یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔

اور امام بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا قول ان لفظوں کے ساتھ روایت کیا ہے: ''حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو۔'' ❸

غریب الحدیث :...... یہ تینوں روایات شبہات کی بنا پر حدود کو دور کرنے کی بابت ہیں اور ان میں سب سے عمدہ روایت سنن بیہقی کی مذکورہ بالا آخری روایت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ان کا قول ہے۔

ادْرَءُ وا الْحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ: "ادْرَءُ وا" یہ "اِدْفَعُوْا" کے معنی میں ہے یعنی شبہ آ جانے پر حد کو ختم کر دو۔

یاد رہے کہ حدود جب امام کے پاس پہنچ جاتی ہیں تو اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کو قائم کرنے سے دور کر دے کیونکہ حدود ''اللہ کا حق'' ہیں۔ نہ تو کوئی ان کو دور کر سکتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے اور نہ معاف ہی کر سکتا ہے اور جو حدود میں سفارش کرتا ہے، یا

---

❶ سنن ابن ماجه: 2545- ابن عدی نے "الکامل" (231/1) میں اس حدیث کو ابراہیم بن فضل کے ترجمہ کے تحت ذکر کر کے ضعیف کہا ہے اور کہتے ہیں کہ ابراہیم کی حدیث سے حجت پکڑنا جائز نہیں ہے اور میرے نزدیک ابراہیم الخوزی اس ابراہیم بن فضل سے زیادہ بہتر ہے۔

❷ جامع الترمذی: 1424- المستدرك للحاكم: 426/4- امام بخاری فرماتے ہیں: یزید بن زیاد دمشقی منکر احادیث والا ہے اور یہ بے قیمت راوی ہے۔ دیکھیں: علل الترمذی: ص: 228 اور یہ زہری سے، وہ عروہ سے اور وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والا ہے۔

❸ سنن البیهقی: 238/8- دیکھیں: الدرایة: 101/2.

کرواتا ہے یا اس کو قبول کرتا ہے، ان سب پر اللہ کی لعنت ہے۔

البتہ جب حد کے ثبوت میں شبہ آ جائے جیسے گواہ پورے نہ ہوں، یا گواہوں کے بیان ایک جیسے نہ ہوں وغیرہ وغیرہ تو دراصل اس شبہ کی وجہ سے حد کے ثبوت میں خلل آ گیا ہے۔ ایسی صورت میں حد قائم کرنا جائز نہ ہوگا۔ تب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول اصح روایت ہے کہ جب حد کے ثبوت میں شبہ آ جائے گا تو ہم حد کے قائم کرنے کو ترک کر دیں گے۔

تب پھر پہلی دو روایات اس اصح قول کے بالمقابل مرجوح اور رد ہوں گی۔ کیونکہ ایک تو دونوں روایات سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہیں اور پھر متن کے اعتبار سے بھی ان میں نکارت ہے، وہ یوں کہ حدیث ابی ہریرہ کا مقتضی یہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی دور کا احتمال بھی ملتا ہے تو ہم حد کو دور کر دیں گے اور اس روایت کی رو سے ہم اس بات کی بقدر استطاعت کوشش کریں گے کہ حد نہ ہی ثابت ہو کیونکہ "مَا وَجَدْتُمْ لَهَا مَدْفَعًا" میں "مَا" یا تو شرطیہ ہے یا پھر ظرفیہ مصدریہ ہے۔ یعنی جب تک تمہیں کوئی دافع ملتا ہے، تم حد کو دور کر دو۔ لیکن یہ امر تو حد کے اسقاط تک جا پہنچا ہے کیونکہ بقدرِ استطاعت حدود کے دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم از خود ایک بعید کا شبہ کھینچ لائیں اور اس کی بنا پر حد کو ساقط کر دیں اور یہی مطلب دوسری روایت کا بھی ہے اور یہ مفہوم اقامت حد کے فریضہ کے سراسر خلاف ہے۔ تب پھر معتمد روایت جناب علی رضی اللہ عنہ کی ہے اور پہلی دو روایات غیر مستقیم ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جب کوئی شبہ آ جائے تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔
- مسلمانوں کی آبروؤں کی حفاظت واجب ہے۔ لہٰذا جب تک ایسا بینہ نہ آ جائے جس میں شبہ نہ ہو، حد قائم نہ کی جائے گی۔

زنا ثابت ہو جانے پر حد زنا قائم کرنا واجب ہے

1220۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((اجْتَنِبُوْا هَذِهِ الْقَاذُوْرَاتِ الَّتِیْ نَهَى اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، فَمَنْ أَلَمَّ بِهَا فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللّٰهِ تَعَالَى، وَلْيَتُبْ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى، فَإِنَّهُ مَنْ يُبْدِیْ لَنَا صَفْحَتَهُ نُقِمْ عَلَيْهِ كِتَابَ اللّٰهِ تَعَالَى)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "ان برے کاموں سے بچو جن سے رب تعالیٰ نے روکا ہے اور جو ان میں سے کوئی برا کام کر بیٹھا تو وہ رب تعالیٰ کی ستاری کی پناہ لے کر چھپے اور رب کی طرف توبہ کرے، کیونکہ جو ہمارے سامنے اپنے عمل کو ظاہر کرے گا، ہم اس پر رب تعالیٰ کی کتاب کو جاری کریں گے۔" [1]

رَوَاهُ الْحَاكِمُ، وَهُوَ فِی الْمُوَطَّإِ مِنْ مَرَاسِيْلِ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ.

اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث "المؤطا" میں زید بن اسلم کی مراسیل میں سے ہے۔

روایة الحدیث:......**رَوَاهُ الْحَاكِمُ:** امام حاکم کا روایت حدیث میں اور حدیث کی تصحیح میں تساہل معروف ہے۔
وَهُوَ فِی الْمُوَطَّإِ: جبکہ مؤطا میں یہ حدیث زید بن اسلم کی مراسیل میں سے ہے اور مرسل حدیث ضعیف کی ایک قسم ہے۔ البتہ ذیل میں ہم اس روایت کے مرفوع یا غیر مرفوع ہونے سے قطع نظر اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا یہ حدیث

---

[1] المستدرك للحاكم: 425/4۔ سنن البيهقي: 329/8۔ المؤطا لمالك: 825/2۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: یہ حدیث ایک جماعت سے مرسل مروی ہے۔ مجھے کسی ایسے طریق کا علم نہیں جس میں یہ حدیث مسند مروی ہو۔ دیکھیں: التمهيد: 321/5.

معنی کے اعتبار سے بھی صحیح ہے یا نہیں۔

غریب الحدیث :......اجْتَنِبُوا هَذِهِ الْقَاذُورَاتِ: قاذورہ یہ ہر اس گندی شے کو کہتے ہیں جس سے طبیعت گھن کھاتی ہو۔لیکن یہاں مراد گناہ اور بے حیائی کے کام ہیں اور اس بات پر کوئی شک نہیں سلیم الفطرت اور قوی الایمان لوگوں کے نزدیک گناہ سے بڑھ کر کوئی گندی اور قابل نفرت شے نہیں۔اسی لیے آگے فرمایا کہ:

الَّتِي نَهَى اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا: یہ وہی گندی باتیں ہیں جن سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔تب یہ پھر صفتِ مقیدہ نہیں بلکہ واقع کا بیان ہے۔کیونکہ گندی اور بے حیائی کی باتیں جتنی بھی ہیں رب تعالیٰ نے ان سب سے روکا ہے نہ کہ یہ مطلب ہے کہ بعض سے روکا ہے اور بعض سے نہیں روکا۔

فَمَنْ أَلَمَّ بِهَا: مراد "أَصَابَ مِنْهَا" ہے۔یعنی الِمام یہ کسی بات میں جا پڑنے اور اس کو کر بیٹھنے کا نام ہے۔

فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللّٰهِ: یعنی جس طرح رب تعالیٰ نے اس کے ارتکابِ گناہ کو چھپایا ہے تو یہ بھی اس کو چھپائے اور رب تعالیٰ کی ستاری میں پناہ لے۔

رب تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے ستاری فرماتا ہے۔لیکن جب ایک بندہ گناہ پر اصرار کرتا چلا جاتا ہے، تو رب تعالیٰ بھی اس کی ستاری ترک فرما دیتے ہیں۔

پہلی امتوں کے گناہوں کے اثرات ان کے چہروں پر عیاں ہو جایا کرتے تھے اور کبھی ان کے دروازوں پر لکھ دیا جاتا تھا۔لیکن الحمد للہ اس امت پر رب تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ یہ معاملہ اس امت کے ساتھ نہیں کیا گیا۔اس لیے جب رب تعالیٰ کسی پر اپنا پردہ ڈال دے تو اسے چاہیے کہ وہ بھی اپنے گناہ کو چھپائے اور لوگوں میں بیان نہ کرتا پھرے۔ایسا شخص مجاہر کہلاتا ہے اور اس امت کا ہر شخص معاف ہے سوائے مجاہر کے اور مجاہر اس شخص کو کہتے ہیں جو برملا گناہ کرے یا اپنے گناہ کا کھلم کھلا اقرار کرے۔کہ ایسے لوگوں کو ہرگز بھی معاف نہ کیا جائے گا۔

بے شمار لوگ ہیں جو گناہ کرنے کے بعد بطور فخر کے اور دوسروں کو بھی گناہ کی ترغیب دینے کی غرض سے جابجا اپنے گناہ کا تذکرہ کرتے پھرتے ہوتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کی پیروی کریں۔لیکن ایک مومن بہرحال ایسا نہیں کرتا۔

وَلْيَتُبْ إِلَى اللّٰهِ: یعنی وہ نادم ہو کر رب تعالیٰ کی طرف لوٹ آتا ہے اور بے پناہ توبہ واستغفار کرتا ہے اور گناہ چھوڑ دیتا ہے۔

فَإِنَّهُ مَنْ يُبْدِ لَنَا صَفْحَتَهُ: صفحہ سے مراد عمل ہے۔کیونکہ صفحہ وہ جانب کہلاتی ہے جس میں کچھ لکھا جاتا ہے۔تب پھر مطلب یہ ہوا کہ جو اپنے عمل کو خود ہمارے سامنے واضح کر دے گا ہم اس پر وہ حد جاری کریں گے جو کتاب اللہ میں موجود ہے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے گناہوں کو چھپائے کیونکہ جب رب تعالیٰ نے اس کی ستاری فرمائی ہے تو یہ بھی اپنی بے ستری نہ کرے اور یہ کہ جو اپنے گناہ کا خود اظہار و اقرار کرے گا، اس پر کتاب اللہ کے مطابق حد جاری کی جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- گناہوں سے بچنا واجب ہے اس کی دلیل "اجْتَنِبُوا هَذِهِ الْقَاذُورَاتِ" کے الفاظ ہیں۔
- جس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے اس گناہ کو لوگوں سے چھپائے اور رب تعالیٰ کے حضور توبہ

تائب ہواور دوبارہ اس گناہ کے قریب نہ جائے۔اس کی دلیل "فَمَنْ أَلَمَّ بِهَا فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔
البتہ اپنے گناہ کو چھپانا واجب نہیں وگرنہ نبی کریم ﷺ زنا کا اعتراف کرنے والے کی ترکِ واجب پر سرزنش فرماتے۔

- گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے،اس کی دلیل "وَلْيَتُبْ" کے الفاظ ہیں۔
- اگر کوئی حاکم اور والی کے سامنے اپنے کسی گناہ کا اقرار کرے تو حاکم اور والی پر واجب ہے کہ وہ اس اقرار کرنے والے کو کتاب اللہ کے مطابق سزا دے۔اس کی دلیل: "مَنْ يُبْدِ لَنَا صَفْحَتَهُ نُقِمْ عَلَيْهِ كِتَابَ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔
- آدمی کو چاہیے کہ وہ پیش آمدہ واقعات کو کتاب اللہ پر پیش کر کے وہاں سے ان کا حکم تلاش کرے اور جب کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو اسے سنتِ رسول ﷺ پر پیش کرے۔اگر وہاں بھی اس کا حکم نہ ملے تو اسے سنتِ صحابہ پر پیش کرے۔ البتہ اس کے بعد دلیلِ عقلی ونظری پر معاملہ کو پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

2۔ بَابُ حَدِّ الْقَذْفِ ......حدقذف کا بیان

قذف یہ کسی پر بدکاری کرنے کی تہمت لگانے کو کہتے ہیں چاہے وہ تہمت زنا کی ہو یا لواطت کی ہو۔ پھر یا تو آدمی دوسرے پر صاف لفظوں میں تہمت لگائے گا یا پھر اشارہ کنایہ اور تعریض سے کام لیتے ہوئے اس پر تہمت لگائے گا۔

صاف تہمت لگانا دوسرے کو یہ کہنا ہے کہ تم زانی، بدکار یا اِغلام باز ہو اور تعریض کے طور پر دوسرے پر تہمت لگانا یوں ہے کہ جیسے کسی سے جھگڑے کے وقت آدمی اسے مخاطب کر کے یوں کہے کہ الحمد للہ! میں زانی نہیں۔جس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ تم زانی اور بدکار ہو۔

اس باب میں حضرات فقہاء نے بے شمار الفاظ ذکر کیے ہیں۔چنانچہ اس باب میں اصولی ضابطہ یہ ہے کہ جو الفاظ صریح زنا یا لواطت پر دلالت کرتے ہوں وہ زنا کی تہمت میں داخل ہوں گے اور جو الفاظ دوسرے معانی کے احتمال کے ساتھ ساتھ زنا اور بدکاری پر بھی دلالت کریں ان کو کنایہ اور تعریض کہا جائے گا۔

قصہ افک

1221۔ عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: ((لَمَّا نَزَلَ عُذْرِيْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ ، وَتَلَا الْقُرْآنَ ، فَلَمَّا نَزَلَ أَمَرَ بِرَجُلَيْنِ وَامْرَأَةٍ فَضُرِبُوا الْحَدَّ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب (رب تعالیٰ کی طرف سے میری براءت اور) میرا عذر نازل ہوا تو نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور (میری براءت اور میرے) اس (عذر) کو (لوگوں کے سامنے) ذکر فرمایا اور قرآن کی (جو آیات میرے عذر کے بارے میں نازل ہوئی تھیں ان کی) تلاوت فرمائی۔ پس جب آپ ﷺ (منبر سے) نیچے اترے تو دو مردوں اور عورت کے بارے میں حکم جاری فرمایا۔ چنانچہ ان لوگوں کو (قذف کی) حد لگائی گئی۔ [1]

---

[1] مسند احمد: 30/6۔ سنن ابی داؤد: 4474۔ جامع الترمذی: 3181۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 7351۔ سنن ابن ماجه: 2567۔ بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث رقم: 4827 میں اس قصہ کی طرف اور اس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ ، وَالْأَرْبَعَةُ ، وَأَشَارَ إِلَيْهِ الْبُخَارِيُّ . اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، جبکہ امام بخاری نے اس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قصۂ حدیث :......افک بڑے جھوٹ کو کہتے ہیں۔ یہ واقعہ افک کا ذکر ہے جس میں سیدہ عفیفہ صدیقہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقوں اور بعض نادان مسلمانوں نے تہمت لگائی تھی۔ رب تعالیٰ نے سیدہ عفیفہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت میں بدن کا رواں رواں لرزا دینے والی دس (10) عظیم آیات نازل فرمائیں۔ یہ آیات بتلاتی ہیں کہ سیدہ عفیفہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اللہ، اس کے رسول ﷺ اور آسمان والوں کی نگاہ میں کیا مقام و مرتبہ ہے۔

یہ ایک سفر کا قصہ ہے اور یہ غزوۂ مریسیع کا سفر ہے۔ جس میں سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھیں اور آپ ﷺ نے اپنی مبارک عادت کے مطابق اس سفر میں سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ہمراہ لیا ہوا تھا۔ واپسی پر جب آپ ﷺ نے ایک رات آخری پہر میں آرام فرمانے کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا تو صبح سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں۔ راستے میں سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر گیا۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس ہار کو تلاش کرنے لگیں جس میں انہیں دیر ہوگئی، ادھر کہاروں نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پالکی یہ سمجھ کر اٹھالی کہ سیدہ اندر تشریف فرما ہیں۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کم عمری اور خفیف البدن ہونے کی وجہ سے کہاروں کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پالکی میں موجود نہیں۔ انہوں نے وہ پالکی اونٹ پر رکھ دی اور قافلہ روانہ ہوگیا۔

ادھر جب سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہار کی تلاش کے بعد اس جگہ لوٹیں تو کیا دیکھا کہ قافلہ تو جا چکا ہے۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بے حد سمجھ دار اور عقل مند بھی تھیں اور بے حد نڈر اور بہادر بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی فہم خدا داد سے اسی جگہ ٹھہرے رہنے کا فیصلہ فرمایا۔ تاکہ جب قافلہ والے انہیں قافلہ میں موجود نہ پائیں تو انہیں تلاش کرتے اسی جگہ آ پہنچیں۔

حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ذمہ قافلہ کے پیچھے رہ کر دیکھتے آنا تھا، تاکہ کسی کی کوئی چیز گری پڑی ہو تو اسے سنبھال لیں۔ حسب دستور آفتاب چڑھے وہ اسی جگہ سے ہوتے ہوئے گزر رہے تھے کہ اچانک انہیں دور سے کسی بدنِ انسانی کے موجود ہونے کا احساس ہوا۔ گیا دیکھا کہ وہ تو ام المومنین سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حکم حجاب کے نازل ہونے سے قبل انہیں دیکھ رکھا تھا۔ اس پر انہوں نے بلند آواز سے انا للہ پڑھا۔ پھر اپنا اونٹ بٹھا دیا اور حرم نبوی کے احترام میں دوسری کوئی بات نہ کی۔

سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی جب دیکھا کہ ان صاحب نے ان کے سوار ہونے کے لیے اونٹ کو تیار کر کے بٹھلا دیا تو آگے بڑھ کر اونٹ پر سوار ہوگئیں۔ اس کے بعد حضرت صفوان رضی اللہ عنہ اونٹ کی مہار پکڑے آگے آگے چلتے رہے تاکہ ان کی نگاہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر نہ پڑے۔ پھر یہ دونوں حضرات اسی پاکیزگی کے ساتھ چلتے ہوئے قافلہ میں جا شامل ہوگئے۔ لیکن افسوس کہ منافقوں نے حرم نبوت پر چھینٹا اڑانے کے لیے اس موقع کو بہت غنیمت جانا اور نبی کریم ﷺ پر زبانِ طعن دراز کرنے میں لگ گئے۔ اب ذیل میں حدیث کے متعلقات پر کلام کیا جاتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

قذف کی حد کیا ہے اور اس پر مرتب ہونے والے احکام

مذکورہ حدیث میں ایک پاک دامن عورت پر تہمت لگائے جانے کا ذکر ہے اور وہ پاک باز خاتون ام المومنین، زوجہ رسول سیدہ عفیفہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ رب تعالیٰ نے ان تہمت لگانے والوں کی سرزنش فرمائی اور ان کو حد لگانے کا حکم دیا۔ چنانچہ

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (النور: 4)

''اور وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لائیں تو انھیں اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان لوگ ہیں۔''

رب تعالیٰ نے قذف پر تین احکام کو مرتب فرمایا ہے:

(1) ان تہمت لگانے والوں کو اسی کوڑے لگائے جائیں۔

(2) یہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادۃ ہوں گے۔

(3) اور یہ کہ یہ تہمت لگانے والے فاسق ہیں۔

اس کے بعد فرمایا:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (النور: 5)

''مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

اس بات پر سب علماء کا اتفاق ہے کہ اس استثناء کا تعلق اخیر والی بات سے ہے نہ کہ پہلی بات سے، البتہ اس بات میں علماء کا اختلاف کہ یہ استثناء دوسری بات کی طرف بھی عائد ہوتا ہے یا نہیں۔

تب پھر اس بات پر سب علماء کا اتفاق ہے کہ توبہ تائب ہو جانے اور اپنی حالت سدھار لینے سے قاذف کا فسق جاتا رہتا ہے اور وہ عادل بن جاتا ہے اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ توبہ واستغفار کرنے سے اور نیکوکار بن جانے سے حد قذف ساقط نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ بندے کا حق نہیں بلکہ اللہ کا حق ہے اس لیے حد توبہ کرنے سے بھی ساقط نہیں ہوتی۔

لیکن کیا توبہ کرنے سے قاذف مقبول الشہادت بھی ہو جاتا ہے یا نہیں۔ علماء کے اس بارے دو اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی شہادت توبہ کرنے سے مقبول ہو جائے گی کیونکہ مذکورہ استثناء تینوں باتوں کی طرف عائد ہے۔ جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی شہادت اب بھی مردود رہے گی کیونکہ استثناء سب سے قریبی مذکور امر کی طرف عائد ہوتا ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ توبہ کر لینے سے اس کی شہادت مقبول ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ردِ شہادت کا سبب اس کا فسق ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ (الحجرات: 6)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لو۔''

لہٰذا جب توبہ کرنے سے وہ فسق جاتا رہے گا جو ردِ شہادت کا موجب ہے تو اب اس کی توبہ اور شہادت بھی مقبول ہو گی۔ تب پھر ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا﴾ کے حکم سے تائب ہو جانے والا مستثنیٰ ہو گا۔ رہی حد قذف تو وہ اسی کوڑے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً﴾ (النور: 4)

''پھر چار گواہ نہ لائیں تو انھیں اسی (80) کوڑے مارو۔''

حد قذف کی شروط

(1) حد قذف کے جاری ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ مقذوف (یعنی جس پر زنا کی تہمت لگائی گئی ہے) وہ محصن ہو۔ چنانچہ اگر کسی محصن پر تہمت لگائی تو حد جاری ہوگی چاہے قاذف نیک ہو یا بد۔

(2) دوسری شرط یہ ہے کہ مقذوف تہمتِ زنا سے بری ہو۔ لہٰذا اگر کسی نے متہم بالزنا پر تہمت لگائی تو اس پر حد قذف جاری نہ ہوگی۔ البتہ اس کی تعزیر کی جائے گی۔

(3) تیسری شرط یہ ہے کہ وہ تہمت مقذوف تک سرایت بھی کرے۔ لہٰذا اگر کسی نے زنا سے عفیف پر تہمت تو لگائی پر وہ تہمت اس تک پہنچی نہیں تو بھی حد قذف جاری نہ ہوگی جیسے کوئی پورے محلے کو زانیوں کا محلہ کہے تو اس پر حد قذف جاری نہ ہو گی۔ کیونکہ پورے محلے کو زانی کہنے سے ان میں کوئی عیب واقع نہ ہوگا۔ ہاں پورے محلے کو زانی کہنے والے کی خود اپنی شخصیت مجروح ہوگی۔ اس لیے اس پر حد نہ آئے گی البتہ اس کی تعزیر کی جائے گی۔

لعان کا بیان

1222۔ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَوَّلُ لِعَانٍ كَانَ فِي الْإِسْلَامِ أَنَّ شَرِيكَ ابْنَ سَحْمَاءَ قَذَفَهُ هِلَالُ بْنُ أُمَيَّةَ بِامْرَأَتِهِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: ((الْبَيِّنَةَ، وَإِلَّا فَحَدٌّ فِي ظَهْرِكَ))، الْحَدِيثَ. أَخْرَجَهُ أَبُو يَعْلَى، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ. وَفِي الْبُخَارِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: اسلام میں پہلا لعان یہ تھا کہ ہلال بن امیہ نے شریک بن سحماء پر اپنی بیوی کی بابت تہمت لگائی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ (یا تو) گواہ (لاؤ) وگرنہ تیری پیٹھ پر حد جاری ہوگی۔ ❶ آگے حدیث ذکر ہے۔
اس حدیث کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اور صحیح بخاری میں ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے بھی ہے۔ ❷

غریب الحدیث :.......**أَوَّلُ لِعَانٍ**: لعان کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے مفصل احکام لعان کے باب میں بیان کیے جا چکے ہیں لعان کا سبب یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے، پھر یا تو وہ اس بات پر چار گواہ لائے تا کہ اس پر زنا کی حد جاری کی جائے۔ یا پھر خود بیوی اپنے زانیہ ہونے کا اقرار کر لے تب بھی حدِ زنا جاری ہوگی۔
یا پھر بیوی خاوند کی تہمت کا انکار کرے گی تب پھر یا تو خاوند لعان کرے گا وگرنہ اس پر حد قذف جاری کی جائے گی اور اگر خاوند لعان کر لیتا تو پھر یا تو بیوی بھی لعان کرے گی وگرنہ اس پر حد زنا جاری کر دی جائے گی۔
بِامْرَأَتِهِ: مذکورہ مضاف الیہ کی ضمیر ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے۔ کہ انہوں نے حضرت شریک بن سحماء رضی اللہ عنہ پر اس بات کی تہمت لگائی تھی کہ وہ ان کی بیوی کے ساتھ ملوث ہیں۔ جب یہ معاملہ خدمت نبوی میں لے جایا گیا اور ان کی بیوی

❶ مسند ابی یعلی: 2824۔ سنن النسائی: 172/6۔ امام ابن حبان (4451) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔
❷ صحیح البخاری: 4747.

نے اس تہمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ہلال بن امیہ اور ان کی بیوی کے درمیان لعان کروایا گیا۔

لیکن اس سے قبل نبی کریم ﷺ نے حضرت ہلال رضی اللہ عنہ سے بینہ پیش کرنے کا مطالبہ فرمایا، چنانچہ فرمایا:

اَلْبَيِّنَةَ: یہ لفظ فعل محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے: "اَقِمِ الْبَيِّنَةَ" یعنی یا تو بینہ لاؤ وگرنہ تم پر حد قذف جاری کی جائے گی وگرنہ پھر لعان کرنا ہوگا۔ جس پر انہوں نے لعان کیا تھا اور یہ اسلام کا پہلا لعان تھا۔

وَإِلَّا فَحَدٌّ: یہ جملہ شرطیہ ہے اور اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: "وَاِنْ لَمْ تُقِمِ الْبَيِّنَةَ فَعَلَيْكَ حَدٌّ فِي ظَهْرِكَ" یعنی اگر تم بینہ قائم نہ کرو گے تو تمہاری پیٹھ پر حد جاری کی جائے گی۔

پس یہاں پر فعل شرط بھی محذوف ہے جو "وَاِنْ لَمْ تُقِمِ الْبَيِّنَةَ" ہے اور جواب شرط میں مبتدا کی خبر بھی محذوف ہے جو "فَعَلَيْكَ" ہے اور "حَدٌّ" اگرچہ یہ نکرہ ہے جس میں عموم ہوتا ہے۔ لیکن مراد حدِ قذف ہے۔ تب پھر یہ عام بول کر خاص مراد لینے کی قبیل میں سے ہے۔

تنبیہ:...... اگرچہ اس حدیث میں لعان کا ذکر نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہاں حدِ قذف جاری کی تھی کیونکہ ابھی تک آیت لعان نازل نہ ہوئی تھی۔

یاد رہے کہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ لفظ ہیں: "اَلْبَيِّنَةَ اَوْ حَدٌّ فِي ظَهْرِكَ."

غلام قاذف کی حد کا بیان

1224- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ: لَقَدْ أَدْرَكْتُ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ رضی اللہ عنہم وَمَنْ بَعْدَهُمْ، فَلَمْ أَرَهُمْ يَضْرِبُوْنَ الْمَمْلُوْكَ فِي الْقَذْفِ إِلَّا أَرْبَعِيْنَ.

رَوَاهُ مَالِكٌ وَالثَّوْرِيُّ فِيْ جَامِعِهِ.

حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد کے لوگوں کو پایا ہے، سو میں نے انہیں قذف (کی حد) میں غلام کو چالیس کوڑے مارتے ہی دیکھا ہے۔ [1]

اس حدیث کو امام مالک رحمہ اللہ نے (اپنی مؤطا میں) اور امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اپنی "الجامع" میں روایت کیا ہے۔

روایۃ الحدیث:...... لَقَدْ أَدْرَكْتُ أَبَا بَكْرٍ: یہ الفاظ محل نظر ہیں کیونکہ موطا میں "أَدْرَكْتُ عُمَرَ، وَعُثْمَانَ رضی اللہ عنہما" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے دورِ صدیقی کو پایا ہی نہیں۔ تب پھر ان کی جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مرسل ہوگی۔ جبکہ امام مالک نے جنابِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔

غلام کی حد قذف

فَلَمْ أَرَهُمْ ...... إِلَّا أَرْبَعِيْنَ: اس اثر میں قاذف غلام کی حد قذف کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ چالیس کوڑے ہے جو آزاد آدمی کی حد قذف سے نصف ہے۔ پس اگر تو یہ اثر ان خلفائے راشدین سے صحیح ہے، تب تو یہ امر واضح ہے۔ کیونکہ حضرات خلفائے راشدین ہمارے لیے اسوہ اور قدوہ ہیں اور اگر یہ اثر صحیح نہ ہو تو قذف کے باب میں غلام بھی دوسرے لوگوں کے جیسا ہوگا اور اس کی سزا بھی اسّی کوڑے ہی ہوگی اور یہاں حد قذف کو حدِ زنا پر قیاس کر کے نصف حد کا قول کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ

---

[1] المؤطا: 828/2۔ مصنف عبدالرزاق عن الثوری: 13793۔ سنن البیهقی: 251/8.

قذف ایک ایسے معنی کی طرف لوٹتا ہے جو غیر مقذوف میں پایا جاتا ہے جبکہ زنا ایسے معنی کی طرف لوٹتا ہے جو زانی کی طرف لوٹتا ہے اور قذف جس معنی کی طرف لوٹتا ہے وہ عار ہے جس میں آزاد اور غلام دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا غلام کے قذف سے لاحق ہونے والا عار ایسے ہی ہے جیسے آزاد کے قذف سے لاحق ہونے والا عار ہے۔

تب پھر قذف کو زنا پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔

غرض اگر تو یہ اثر صحیح ہے تو قاذف غلام کی حد چالیس کوڑے ہوگی اور اگر یہ اثر صحیح نہیں تو اس باب میں غلام اور آزاد دونوں برابر ہیں جیسا کہ ظاہریہ کا قول ہے اور دونوں کی سزا اسّی کوڑے ہوگی۔

1225۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ قَذَفَ مَمْلُوْكَهُ يُقَامُ عَلَيْهِ الْحَدُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِلَّا أَنْ يَكُونَ كَمَا قَالَ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنے غلام پر تہمت لگائی اس پر روزِ قیامت حد جاری کی جائے گی مگر یہ کہ وہ غلام ویسا ہی ہو جیسا کہ اس نے کہا تھا۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **مَنْ قَذَفَ مَمْلُوكَهُ**: مذکورہ ''مَنْ'' یا تو موصولہ ہے یا پھر شرطیہ ہے۔ اگر تو یہ موصولہ ہو تو پھر کوئی اشکال نہیں کیونکہ ''يُقَامُ عَلَيْهِ الْحَدُّ'' کا جملہ مرفوع ہے اور ''مَنْ'' موصولہ مبتداء ہے اور یہ مبتداء بن کر آ تا رہتا ہے۔

لیکن اگر اس کو شرطیہ مانیں تو پھر ''يُقَامُ عَلَيْهِ الْحَدُّ'' میں فعل مضارع کا مرفوع ہونا محل نظر ہے۔ کیونکہ تب پھر یہ جوابِ شرط ہوگا اور جوابِ شرط جب فعل مضارع ہو تو اس کا مجزوم ہونا واجب ہوتا ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب فعل شرط فعل ماضی ہو تو جوابِ شرط کے مضارع ہونے کی صورت میں اس میں رفع اور جزم دونوں جائز ہوتے ہیں جیسا کہ یہاں فعل شرط فعلِ ماضی ''قَذَفَ'' ہے۔ لہٰذا ''يُقَامُ'' کا مرفوع ہونا بھی جائز ہوگا۔

اور مملوک پر قذف یہ اسے زانی یا لوطی کہنا ہے۔

يُقَامُ عَلَيْهِ الْحَدُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: کیونکہ قیامت کے روز ہی عدل قائم ہوگا۔ کیونکہ غلام بسا اوقات اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ نہیں لے سکتا اور نہ اپنے اوپر لگائی جانے والی تہمت کا بدلہ ہی لے سکتا ہے۔

پھر غلام پر لگی تہمت میں ضرر آقا کا ہی ہے کیونکہ اس تہمت سے غلام کی قیمت گر جائے گی۔ اس لیے بھی آقا پر حد جاری نہیں کی جاتی۔ کیونکہ غالب یہ ہے کہ آقا ایسی بات یقین یا غالب گمان کے تحت ہی کرے گا۔ کیونکہ یہ بات ممکن نہیں یا بعید از امکان ہے کہ آقا ایسی بات کرے جس سے اس کے غلام کی قیمت گر جائے۔ غرض ان وجوہات کی بنا پر آقا پر حد قذف تو جاری نہ ہوگی لیکن پھر بھی اگر غلام سچا ہے تو اسے روزِ قیامت انصاف ضرور ملے گا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ غلام پر تہمت لگانا حرام ہے۔ کیونکہ اس پر روزِ قیامت عذاب ہوگا۔

[1] صحيح البخاري: 6858۔ صحيح مسلم: 1660.

◈ جزاء جیسے دنیا میں ملتی ہے، اسی طرح آخرت میں بھی ملے گی۔
◈ قیامت ثابت ہے۔
◈ اگر تو آقا اپنی بات میں سچا ہے تو اس پر کوئی حد نہ جاری ہوگی۔

3۔ بَابُ حَدِّ السَّرِقَةِ ......حد سرقہ کا بیان

سرقہ کی تعریف و تفصیل:......حدِ سرقہ سے یہاں عقوبت مراد ہے نہ کہ حد کی مشہور تعریف۔

سرقہ:...... یہ مالک یا اس کے نائب سے اس کی بے خبری میں مال لے لینے کو کہتے ہیں۔لہٰذا اگر کوئی شے مال نہ ہو تو اس کے چرانے کو شرعاً سرقہ نہ کہا جائے گا۔ کیونکہ جو شے مال نہ ہو، اس کی حرمت نہیں ہوتی۔ جیسے کسی کا آلہ موسیقی چرا لینا شرعاً سرقہ نہ کہلائے گا، مثلاً باجا یہ مال نہیں۔ کیونکہ مالک پر اس کو اپنی ملک میں رکھنا حرام ہے۔لہٰذا اس کے چرانے پر حد سرقہ نہ آئے گی اور مالک کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شے کو غیر مالک سے چرایا تو اس پر بھی حدِ سرقہ نہ آئے گی۔ جیسے ایک چور نے دوسرے چور کا مال چرا لیا جو خود مالِ مسروقہ تھا۔تو اس پر حدِ سرقہ نہ آئے گی کیونکہ پہلے چور کا اس پر ملک برقرار رکھنا ہی حرام تھا۔

اور نائب سے مراد جیسے وہ شخص جس نے کوئی شے کرایہ پر لے رکھی ہو، یا کسی کے پاس کوئی امانت ہو یا کوئی شے گروی ہو۔تو مستاجر، امین اور مرتہن یہ مالک کی طرف سے نائب ہیں۔ ان کے پاس سے بھی کسی شے کے چرانے کا حکم وہی ہے جو اصل مالک کے پاس سے چرانے کا ہے۔

سرقہ کا حکم

یہ کبائر میں سے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سارق پر لعنت فرمائی ہے اور لعنت کبائر پر ہی آتی ہے۔ دوسرے اس لیے بھی کہ اس پر دنیا میں حد آتی ہے اور حد ہمیشہ کبائر پر آتی ہے۔

سرقہ کی دنیاوی سزا یہ ہے کہ اس پر قطع ید واجب ہے۔اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝﴾

(المائدة: 38)

''اور جو چوری کرنے والا اور جو چوری کرنے والی ہے، سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، اس کی جزا کے لیے جو ان دونوں نے کمایا، اللہ کی طرف سے عبرت کے لیے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

''فَاقْطَعُوْۤا'' میں خطاب اگرچہ عام اور پوری امت کو ہے لیکن اس سے مراد والیانِ امر اور حکام ہیں۔

اَيْدِيَهُمَا: اس سے دونوں ہاتھ کاٹنا مراد نہیں بلکہ سرقہ کی سزا صرف ایک ہاتھ کا کاٹنا ہے۔لیکن جب متعدد کی طرف اضافت کی جاتی ہے تو اس میں افصح جمع کا لانا ہے۔

قطع ید کی مقدار کتنی ہے؟

قرآنِ کریم میں مطلق ''یـــد'' کا ذکر ہے لیکن یہ کف یعنی ہتھیلی کے ساتھ خاص ہے۔یعنی سرقہ کی سزا میں صرف ہتھیلی کا کاٹ دینا کافی ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں جب لفظ ید مطلق آتا ہے تو اس سے مراد صرف ہتھیلی ہوتی ہے۔

کون سا ہاتھ کاٹا جائے گا؟

پھر لفظِ ید مجمل یا مبہم بھی ہے کہ اس سے کون سا ید مراد ہے؟ دایاں یا بایاں؟ قرآنِ کریم نے اس کو بیان نہیں کیا۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت اس کی تفسیر کرتی ہے کہ مراد داہنا ہاتھ ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت میں ''فَاقْطَعُوْٓا اَیْمَانَھُمَا'' کے الفاظ آتے ہیں۔ دوسرے اس لیے بھی کہ لینے اور دینے کا اکثر آلہ داہنا ہاتھ ہی ہوتا ہے اور یہی ہاتھ چوری میں بھی ملوث ہوتا ہے۔ اس لیے قطع ید کا حکم داہنے ہاتھ کے ساتھ ہی خاص ہوگا۔

کس مال میں قطعِ ید ہے؟

مذکورہ آیت اس بات کے بیان میں بھی مطلق اور عام ہے کہ وہ مال کتنا ہو؟ تھوڑا یا زیادہ؟ پھر اسے محفوظ مقام سے چرایا ہو یا غیر محفوظ سے؟ مذکورہ آیت ان دونوں باتوں کے بیان میں عام ہے۔ چنانچہ ظاہریہ نے اسی کو لیا ہے، ان کا قول ہے کہ ہر سارق کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور انہوں نے اس باب میں سنت کو مطلق نہیں دیکھا۔ پھر بعض نے اس باب میں صرف سونے کی طرف دیکھا ہے کہ اگر کوئی چور سونے کو بقدرِ نصاب چرائے تو اس پر قطعِ ید کی سزا ہے اور نصاب سے مراد زکوٰۃ کا نصاب نہیں بلکہ قطع ید کا نصاب ہے اور سونے کے علاوہ میں نصابِ قطع کی کوئی شرط نہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ قطع ید کی سزا میں مالِ مسروقہ کا بقدرِ نصاب ہونا شرط ہے۔ اس کا بیان ذیل کی حدیث میں ہے۔

موجبِ قطع مال کا نصاب کیا ہے؟

1226۔ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تُقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ إِلَّا فِيْ رُبُعِ دِيْنَارٍ فَصَاعِدًا)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.
وَلَفْظُ الْبُخَارِيِّ: ((تُقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ فِيْ رُبُعِ دِيْنَارٍ فَصَاعِدًا)).
وَفِيْ رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ: ((اقْطَعُوْا فِيْ رُبُعِ دِيْنَارٍ، وَلَا تَقْطَعُوْا فِيْمَا هُوَ أَدْنَى مِنْ ذٰلِكَ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا مگر دینار کے چوتھائی میں یا اس سے زیادہ (قیمت کے) مال میں۔''
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔ جبکہ صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''چور کا ہاتھ ایک دینار کے چوتھائی یا اس سے زیادہ (قیمت کے مال) میں کاٹا جائے گا۔'' [1]
اور مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''ایک دینار کے چوتھائی (مال کے چرانے) میں تو ہاتھ کاٹو البتہ اس سے کم (قیمت والے مال) میں (ہاتھ) نہ کاٹو۔'' [2]

درایت الحدیث: ...... یہاں تین روایات کا ذکر ہے۔ پہلی روایت میں جو صحیح مسلم کی ہے، یہ الفاظ ہیں: قطع ید ربع دینار میں ہے اور ایک اسلامی دینار کا وزن ایک مثقال ہوتا ہے۔ تب پھر ربع مثقال سونے کی چوری میں قطع ید آئے گا۔ مراد یہ ہے کہ اتنی قیمت کے بقدر مال کے چرانے میں قطع ید کی سزا ہے۔ جبکہ اس سے زیادہ قیمت کے مال کے چرانے میں

---

[1] صحيح البخاري: 6789- صحيح مسلم: 1684.

[2] مسند أحمد: 80/6.

بدرجہ اولیٰ قطع ید کی سزا ہوگی۔ اس کو حدیث میں "فَصَاعِدًا" کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کلمہ حال ہونے کی وجہ سے محذوف ہے اور اس کا عامل سیاقِ کلام کے اعتبار سے محذوف مانا جاتا ہے۔

غرض اس روایت کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ ربع دینار سے کم مالیت والے مال کی چوری میں قطع ید نہیں۔ لہٰذا اگر کسی نے دینار کے چھٹے یا آٹھویں حصہ کے بقدر مالیت کے مال کو چرایا تو اس پر قطع ید کی سزا نہیں آئے گی۔

دوسری روایت صحیح بخاری کی ہے۔ اس میں "تقطع" کا لفظ ہے جو خبر ہے، مگر یہ امر کے معنی میں ہے اور کلامِ عرب میں خبر اکثر امر کے معنی میں آتی رہتی ہے۔

تیسری روایت مسند احمد کی ہے۔ اس میں "اِقْطَعُوا" کا لفظ ہے جو امر ہے اور یہ صحیح بخاری کی روایت کے موافق ہے جبکہ اس روایت کے دوسرے حصہ کے یہ الفاظ ہیں: "وَلَا تَقْطَعُوا فِيمَا هُوَ أَدْنَى مِنْ ذَلِكَ" یہ صحیح مسلم کی روایت کے موافق ہیں۔ تب پھر مسند احمد کی روایت صحیحین کی دونوں روایات کی جامع ہوئی۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ تینوں روایات میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ موجب قطع ید مال کا نصاب کتنا ہے؟ وہ ربع دینار یا اس سے زیادہ قیمت کا مال ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے ربع دینار سے کم قیمت کا مال چرایا تو اس پر قطع ید کی سزا نہ آئے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ رب تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت ہے کہ اس نے معمولی مال کے چرانے میں قطع ید کی سزا نہیں رکھی۔
- قطع ید کی سزا کے لیے نصاب کا ہونا واجب ہے اور وہ ربع دینار یا اس سے زیادہ مالیت کا مال ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے اس نصاب سے کم مالیت کا مال چرایا تو قطع ید کی سزا نہ آئے گی۔
- معلوم ہوا کہ ربع دینار کی مالیت کی چوری ہاتھ کی عصمت کو ختم کر دیتی ہے۔

1227۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَطَعَ فِي مِجَنٍّ ثَمَنُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ایک ڈھال (کی چوری) کی وجہ سے قطع ید کی سزا دی جس کی مالیت تین درہم کے بقدر تھی۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث :......فِي مِجَنٍّ: مذکورہ "فِيْ" سببیہ ہے اور یہاں عبارت محذوف ہے۔ تقدیری عبارت یہ ہے: "فِيْ سَرِقَةِ مَجَنٍّ"۔

مجن:...... یہ ڈھال کو کہتے ہیں۔

ثَمَنُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ: بظاہر یہ حدیث پہلی تین روایات کے خلاف لگتی ہے جن میں ربع دینار سے کم میں قطع ید کی ممانعت ہے۔ جبکہ یہاں تین دراہم کی مالیت کی ڈھال کی چوری میں قطع ید کی سزا کا ذکر ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ روایت پہلی تین روایات کے خلاف نہیں۔ کیونکہ ہمیں یہ قول کرنا واجب ہوگا کہ اس

[1] صحيح البخاري: 6795- صحيح مسلم: 1686.

دور میں تین دراہم قیمت میں ربع دینار کے مساوی تھے۔ یوں سب روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ غرض ربع دینار سے کم میں قطع ید کی سزا نہیں۔

انڈے کی چوری

1228۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَعَنَ اللهُ السَّارِقَ، يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ، وَيَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ أَيْضًا.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ کی لعنت ہو اس چور پر جو انڈا چوری کرتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اس کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور جو رسی چوری کرتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اس کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ...... لَعَنَ اللهُ: یہ خبر بھی ہو سکتی ہے اور بددعا بھی۔ اس کی تفصیل بارہا گزر چکی ہے۔ البتہ چوری پر لعنت خداوندی کی وعید اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی دلیل ہے۔

يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ: بیضہ عربی زبان میں خود کو بھی کہتے ہیں جو جنگی لباس کا ایک حصہ ہے اور اسے جنگ کے دوران سر پر پہنا جاتا ہے اور بیضہ انڈے کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں بیضہ سے کیا مراد ہے، علماء کرام اس لفظ کے دونوں معانی کی طرف گئے ہیں۔ تب پھر بیضہ سے خود مراد لینے میں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ تین دراہم کا ہو۔

جبکہ حبل رسی کو ہی کہتے ہیں اور ایک رسی کی چوری میں قطع ید محل نظر ہے۔ اسی لیے اس مقام پر علماء نے ایک تیسرا قول کیا ہے، وہ یہ کہ چور شروع شروع میں معمولی چیزیں چراتا ہے پھر اس عادت میں پختہ ہوتے ہوتے بڑی بڑی اور قیمتی چیزیں چرانے تک ترقی کر جاتا ہے حتی کہ بس اوقات چوری کرتے ہوئے کسی کو قتل بھی کر دیتا ہے۔ تب پھر یہ لعنت اس کی چوری کی ابتدائی عادت پر ہوگی اور قطع ید کا ذکر مآل کے اعتبار سے ہے کہ بالآخر چوری کرتے کرتے وہ اس تک جا پہنچتا ہے کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- چور پر لعنت کرنا جائز ہے کیونکہ چور پر لعنت خود نبی کریم ﷺ نے بھی کی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا جائز ہوگا کہ چور پر اللہ کی لعنت، قلم چرانے والے پر اللہ کی لعنت، دروازہ چوری کرنے والے پر اللہ کی لعنت وغیرہ وغیرہ۔ البتہ یہ لعنت کسی متعین شخص پر کرنا جائز نہیں، چاہے واقعی وہ لعنت کا باعث بننے والے وصف سے متصف بھی ہو۔
- چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور یہ بندوں پر رحم کھانے کے منافی نہیں اور نہ آج کل کے نام نہاد حقوق انسانیت کے جھوٹے نعرے کے ہی خلاف ہے۔
- عامۃ الناس کی رعایت یہ کسی خاص آدمی کی رعایت کرنے سے اولیٰ ہے۔ اس لیے چور کی رعایت کی بجائے عوام کی رعایت کی جائے گی اور اس کے ضرر سے عوام کو بچانے کے لیے اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔

[1] صحيح البخاري: 6783۔ صحيح مسلم: 1687.

برتنے کو دی چیز کو واپس دینے سے انکار کرنے کا بیان

1229۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ؟)) ثُمَّ قَامَ، فَخَطَبَ، فَقَالَ: ((أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا هَلَكَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک خاتون چور کی سفارش کرنے پر جنابِ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے) ارشاد فرمایا: کیا تم اللہ کی حدود میں سے کسی حد کی بابت (اس کو ختم کر دینے کی) سفارش کرتے ہو؟ پھر آپ ﷺ اٹھے اور (لوگوں میں) خطبہ ارشاد فرمایا: چنانچہ فرمایا: "بے شک تم سے پہلے لوگ اسی لیے ہلاک ہو گئے کہ جب ان میں کوئی عزت دار آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے (اور اسے اس کے اس فعل کی سزا نہ دیا کرتے تھے) اور جب ان میں کوئی کمزور (غریب اور معمولی) آدمی چوری کرتا تھا تو اس پر (چوری کی) حد (یعنی قطع ید کی سزا) کو جاری کرتے تھے۔" [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

وَلَهُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: ((كَانَتِ امْرَأَةٌ تَسْتَعِيْرُ الْمَتَاعَ، وَتَجْحَدُهُ، فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِقَطْعِ يَدِهَا)).

اور صحیح مسلم میں ہی ایک اور طریق سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے کہ: ایک عورت (کا یہ دستور تھا کہ وہ لوگوں سے) برتنے کو چیزیں لے لیتی تھی، پھر دینے سے انکار کر دیتی تھی۔ جس پر نبی کریم ﷺ نے اس عورت کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔

غریب الحدیث:.....أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ: مذکورہ ہمزہ استفہامیہ ہے جو انکار اور توبیخ کے لیے ہے اور تَشْفَعُ یہ کسی پر سے ضرر کے دور کرنے یا اس کو کوئی فائدہ پہنچانے کے لیے بیچ میں واسطہ بننے کو کہتے ہیں۔

اور حد کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے۔ (1) اوامر (2) نواہی اور (3) گناہوں پر دی جانے والی شرعی سزائیں۔ یہاں حد کا یہی تیسرا معنی مراد ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوا کہ کیا تم رب تعالیٰ کی مقرر کردہ ایک سزا کے نہ دینے کی بابت سفارش کرتے ہو۔

قصۂ حدیث:.....اس حدیث کا قصہ یہ ہے کہ بنی مخزوم جو عربوں کا ایک بڑا، معزز اور سردار قبیلہ ہے، کی ایک عورت کا دستور یہ تھا کہ وہ لوگوں سے عاریت کے طور پر کوئی چیز لیتی اور واپس مانگنے پر دینے سے انکار کر دیتی تھی اور صاف کہہ دیتی تھی کہ میں نے تم سے کوئی شے لی ہی نہیں۔

نبی کریم ﷺ کو جب اس عورت کے اس دستور کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم فرمایا۔ یہ خبر قریش پر بے حد گراں گزری کہ کیا بنی مخزوم جیسے شریف قبیلہ کی ایک عورت کے ہاتھ کاٹے جائیں گے کہ اس میں تو اس کی بے حد بے وقعتی اور ذلت ہے۔ غرض انہیں اس عورت کی بے حد فکر ہوئی اور وہ سفارش ڈھونڈنے میں لگ گئے کہ کون جا کر نبی

[1] صحيح البخاري: 6788- صحيح مسلم: 1688.

کریم ﷺ سے اس عورت کے لیے سفارش کرتا ہے تا کہ آپ ﷺ اس عورت کو یہ سزا نہ دیں۔ جنابِ ابوبکر رضی اللہ عنہ، جناب عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر سادات حضرات کو تو خدمتِ نبوی میں لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر قریش کی نظر انتخاب جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ پر پڑی کہ وہ نبی کریم ﷺ کے محبوب اور محبوب کے بیٹے کہلاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جنابِ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس عورت کی سفارش کرنے کے لیے تیار کیا اور انہوں نے جا کر سفارش کر دی۔ جس پر نبی کریم ﷺ جو ارشاد فرمایا وہ اوپر متن حدیث میں مذکور ہے۔

غرض آپ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی بات سنتے ہی اس پر شدید انکار فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ کیا تم اللہ کی حدود میں سے کسی حد میں سفارش کرتے ہو، یہ ناممکن ہے، حد کو ضرور قائم کیا جائے گا اور اس باب میں کسی کی سفارش ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔ کہ یوں اگر حدود میں سفارشیں چلنے لگیں تو حدود کا قیام تو معطل ہو کر رہ جائے گا اور رب تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود بے قیمت اور لوگوں کا کھلواڑ بن جائیں گے۔

ثُمَّ قَامَ فَخَطَبَ: نبی کریم ﷺ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ جب بھی کوئی اہم امر پیش آتا تھا تو آپ ﷺ فوراً لوگوں کو اکٹھا فرماتے اور ان میں خطبہ ارشاد فرماتے۔ پھر بسا اوقات وہ خطبہ خطبۂ راتبہ (جیسے جمعہ اور عیدین وغیرہ کے خطبہ) کے موافق آجاتا تھا اور کبھی وہ خطبہ عارضی ہوتا تھا۔

أَيُّهَا النَّاسُ: یہ مقام بے حد اہم تھا، اس لیے لوگوں کی تنبیہ کے لیے نداء کا اسلوب نہایت مناسب تھا۔

اِنَّمَا هَلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ: ہلاکت سے حسی ہلاکت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ یعنی رب تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک فرما دیا۔ جبکہ ہلاکت سے معنوی ہلاکت بھی مراد ہو سکتی ہے اور وہ معاشرے کی ہلاکت و بربادی ہے۔

أَنَّهُمْ كَانُوا: مذکورہ "اَنَّ" مفتوحہ ہے کیونکہ یہاں حرفِ جر "با" مقدر ہے جو سبب کو بتلاتا ہے پس اس کی تقدیر عبارت "بِأَنَّهُمْ كَانُوا" ہے۔ تب پھر حرفِ جر کے مقدر ہونے کی وجہ سے یہ جملہ تعلیلیہ کہلائے گا کہ یہ ان کے ہلاک ہونے کے سبب کا بیان ہے، جو یہ ہے:

إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ: شریف سے مراد قوم کا سربرآوردہ اور جاہ و منصب والا آدمی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ ایسے چور کو اس لیے چھوڑ دیا کرتے تھے کہ یہ قوم کا شریف اور عزت و رفعت والا آدمی ہے۔

وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ: اور قوم کے کس مپرس، غریب اور کمزور آدمی پر اس لیے حد کر دیتے تھے کہ اسے کوئی پوچھنے والا اور کوئی اس کا حامی و ناصر نہیں اور نہ قوم میں اس کی کوئی عزت ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ رب تعالیٰ کی حدود کو بلا امتیاز سب پر نافذ اور قائم کیا جائے گا اور اس میں شریف و رذیل، امیر فقیر اور قوم کے چھوٹے بڑے کا فرق نہ کیا جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ حدود میں سفارش کرنے والے پر سختی کے ساتھ انکار کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں حدود اللہ کو ساقط کرنا ہے۔ البتہ یہ امر اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ بات حاکم، قاضی اور روالی وغیرہ تک پہنچ گئی ہو۔ البتہ اس سے پہلے سفارش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- ◈ معلوم ہوا کہ حدود کے علاوہ میں سفارش جائز ہے لہٰذا قصاص اور تعزیرات وغیرہ میں سفارش کر سکتے ہیں۔

◈ منکر کے مرتکب پر انکار واجب ہے چاہے وہ اپنا کوئی عزیز، قریبی، دوست یا محبوب ہی کیوں نہ ہو۔
◈ عقوبات کی تحدید شریعت کی حکمتِ عظیمہ میں سے ہے اور اس بات کا ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ شریعت نے ہر جرم کی سزا اس جرم کے عین مطابق مقرر کی ہے اور بلاشبہ یہ عقوبات انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہیں۔
◈ موقع کی مناسبت سے لوگوں میں خطبہ دینا جائز ہے۔
◈ خطبہ کھڑے ہو کر دینا مسنون ہے۔
◈ خطاب میں ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جو دل میں اتر جائے اور دل ودماغ کے مشاعر کو بیدار کر دے۔
◈ حدود کی تنفیذ اور اقامت کی راہ میں رکاوٹ بننا قوموں کی ہلاکت کا بڑا سبب ہے۔
◈ عقوبات سب امتوں کے حق میں برابر تھیں۔
◈ حدِ سرقہ گزشتہ قوموں میں بھی تھی۔
◈ اقامت حدود میں لوگوں میں عدل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا اس باب میں امیر اور غریب میں کوئی فرق نہ کیا جائے گا۔
◈ چوری صرف مجبوری میں ہی نہیں کی جاتی بلکہ خواہش نفس بھی چوری کا ایک سبب ہے۔ چنانچہ جب چوری کرنے کی لت پڑ جاتی ہے تو آدمی غنی اور مالدار ہونے کے باوجود بھی اس ''بد'' عادت سے باز نہیں آتا۔
◈ معلوم ہوا کہ برتنے کی چیز لوٹانے سے انکار کی سزا بھی قطع ید ہے۔ اس کی دلیل صحیح مسلم کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: ''كَانَتِ امْرَأَةٌ تَسْتَعِيرُ الْمَتَاعَ ، فَأَمَرَ'' اور اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ ''فَأَمَرَ'' میں ''فا'' سببیہ ہے۔ یعنی اس عورت کی اس عادت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس کے قطع ید کا حکم ارشاد فرمایا تھا۔
◈ اقامت حدود میں توکیل جائز ہے۔ اس کی دلیل ''فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِقَطْعِ يَدِهَا'' کے الفاظ ہیں۔
◈ اور یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ قطع ید کف یعنی ہتھیلی سے ہوگا نہ کہ کلائی سے۔
◈ حدود کو ساقط کرنے کی سفارش کرنا حرام ہے۔
◈ عاریت: یہ کسی سے برتنے کی چیز اس شرط پر لینے کو کہتے ہیں کہ اس سے منتفع ہونے کے بعد اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ لہٰذا عاریت کو دبا لینا یہ چوری کرنے کے حکم میں داخل ہے۔
◈ حدود میں سفارش پر برملا انکار کیا جائے تاکہ لوگوں کے دلوں میں حدود کی اہمیت خوب اجاگر ہو۔
◈ مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رب تعالیٰ کی سنتیں سب امتوں کے حق میں ایک ہیں چاہے وہ گزشتہ امتیں تھیں اور چاہے وہ موجودہ امت ہے۔
◈ وعظ اور خطاب کے وقت ترغیب وترہیب کی غرض سے امثال دی جا سکتی ہیں۔ اس کی دلیل ''إِنَّمَا هَلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' کے الفاظ ہیں۔
◈ صحیح مسلم کی دوسرے طریق والی روایت بتلاتی ہے کہ عورتیں کس قدر چالباز اور عیار ہوتی ہیں۔ جیسے یہ مخزومیہ عورت تھی کہ جو بڑے طریقے سے لوگوں سے ان کی چیزیں لے کر ان کو دبا لیتی تھی۔
◈ معلوم ہوا کہ شرعی سزائیں یعنی حدود رب تعالیٰ کی مقرر کردہ ہیں۔

◈ دوسروں سے برتنے کو کوئی چیز لینا باعث عار نہیں۔

◈ اگر امام اقامت حدود میں کسی کو وکیل بناتا ہے تو اس کے لیے تنفیذ حد کے وقت غیر موجود رہنا جائز ہوتا ہے۔ جیسے اس حدیث کے ظاہر سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ قطع ید کا حکم فرمانے کے بعد ہاتھ کے کاٹے جانے کے وقت آپ ﷺ موجود نہ تھے۔

اچک لینے اور لوٹ لینے کا حکم

1230- وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((لَيْسَ عَلَى خَائِنٍ وَلَا مُنْتَهِبٍ وَلَا مُخْتَلِسٍ قَطْعٌ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(امانت میں) خیانت کرنے والے، اچک لینے والے اور لوٹ لینے والے کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غرض حدیث:......امام موصوف رحمہ اللہ عاریت کے ذکر کے بعد یہ حدیث اس غرض کے لیے لائے ہیں تاکہ عاریت دینے سے انکار کے حکم میں اور ان تین صورتوں (امانت میں خیانت کرنے، لوگوں سے ان کی چیزیں اچک لینے اور لوگوں کو لوٹ لینے) کے حکم میں فرق ہو جائے۔ اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے اس حدیث کو لانے کی ایک غرض یہ بھی ہے تاکہ جحدِ عاریت کی بنا پر قطع ید کی سزا کی تضعیف کو بیان کیا جا سکے جس کا ذکر صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ صحیح قول پہلا ہی کہ جحدِ عاریت اور ان تین مذکورہ صورتوں کے حکم میں فرق ہے۔

غریب الحدیث:......لَيْسَ عَلَى خَائِنٍ: خائن: یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو تمہاری امانت میں تمہیں دھوکا دے۔ لہٰذا جو امانت کے علاوہ میں دھوکا دے اسے خائن نہ کہا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ خدیعہ یعنی غیر امانت میں دھوکا یہ کبھی تو محمود ہوتا ہے اور کبھی مذموم۔ جبکہ امانت میں خیانت ہر حال میں مذموم ہوتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں خیانت کرنے والے کے ساتھ بھی خیانت کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

وَلَا مُنْتَهِبٍ: انتہاب: یہ کسی شے کو غنیمت سمجھ کر اور اس کے مالک کو دھوکا دیے بغیر لے لینے کو کہتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ بھی لوٹ کی ایک قسم ہے۔

وَلَا مُخْتَلِسٍ: اختلاس: یہ کسی کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اس کے ہاتھوں سے چیز اچک کر بھاگ جانے کو کہتے ہیں۔ ایسا اکثر دو آدمی مل کر کرتے ہیں۔ چنانچہ دو چور دوکان میں گھس جائیں گے، پھر ایک تو دوکاندار کو مشغول کرے گا اور دوسرا آنکھ بچا کر کوئی شے اٹھاتا چلتا بنے گا۔ اسے اختلاس اور اچک لینا کہتے ہیں۔

---

[1] مسند احمد: 380/3- سنن ابی داؤد: 4391- جامع الترمذی: 1448- سنن النسائی: 88/8- سنن ابن ماجہ: 2591- صحیح ابن حبان: 4457- ابن ابی حاتم "العلل" (450/1) میں کہتے ہیں: میں نے اپنے والد ماجد اور ابو زرعہ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا، تو ان دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ ابن جریج نے یہ حدیث ابن زبیر سے نہیں سنی، انہوں نے یہ حدیث یاسین سے سنی ہے۔ اس پر میں نے ان دونوں بزرگوں سے پوچھا: یہ یاسین کیسے صاحب ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ قوی راوی نہیں۔ دیکھیں: علل الترمذی: 232.

فائدہ:......اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سرقہ کا مقامِ حرز سے ہونا لازم ہے۔ یعنی جب کوئی مال کسی محفوظ جگہ سے لیا جائے تو اس کو سرقہ کہا جائے گا۔ چنانچہ سارق اس کو کہیں گے جو آکر پہلے مقامِ حرز کو توڑے پھر وہاں سے مال لے جائے۔ لہٰذا دھوکا سے لیا مال، چھینا مال، غفلت میں لیا مال یا سامنے دھرا اور غیر محفوظ رکھا مال لے لینا سرقہ نہ کہلائے گا۔

قطع ید کی عقوبت کے لازم ہونے کے لیے حرز سے مال لینا شرط ہے

1231- وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا قَطْعَ فِيْ ثَمَرٍ وَلَا كَثَرٍ)).

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''پھلوں (کے چرانے) میں اور کھجور کے گوند (کو چرانے) میں قطع (ید کی سزا) نہیں ہے۔'' (1)

رَوَاهُ الْمَذْكُوْرُوْنَ، وَصَحَّحَهُ أَيْضًا التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو (گزشتہ) مذکورہ ائمہ نے روایت کیا اور اس حدیث کو بھی امام ترمذی اور امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ**: ثمر سے مراد درخت پر لگا پھل ہے۔ جیسے کھجور، انجیر، انگور وغیرہ۔ ان کے چرانے میں قطع ید کی عقوبت اس لیے نہیں کیونکہ یہ پھل مقامِ حرز میں نہیں ہوتے اور کھلے لٹکے ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی بھی ہاتھ بڑھا کر لے سکتا ہے۔

وَلَا كَثَرٍ: کثر: یہ کھجور کے درخت کے گوند کو کہتے ہیں جو چربی کی طرح ہوتا ہے۔ یہ گوند دو طرح چرایا جا سکتا ہے:

(1) چور آئے اور کھجوروں کا پورا خوشہ اور گچھا ہی توڑ لے جس کی اصل یعنی جڑ میں یہ گوند بھی لگا ہوتا ہے۔ یوں کھجوروں کا گچھا چراتے ہوئے اس کا گوند بھی چرالے۔

(2) اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ کھجور کے تنے میں سوراخ کر کے اس میں سے گوند نکال کر چرائے۔ اگر چہ گوند چرانے کی یہ دوسری صورت زیادہ نقصان دہ ہے لیکن قطع ید نہ اس میں ہے اور نہ اُس میں۔

فائدہ:...... یہ حدیث بتلاتی ہے کہ قطع ید کی عقوبت میں حرز شرط ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے درختوں پر لگا پھل توڑ کر چرایا تو اس میں قطع ید نہ آئے گا، لیکن اگر اس پھل کو توڑ کر کسی جگہ جیسے گودام وغیرہ میں محفوظ کر لیا جائے تو اب یہ دوسرے اموال کی طرح مال محترم ہے اور اس کو بقدر نصاب چرانے میں قطع ید کی عقوبت آئے گی۔

سرقہ اقرار کے ذریعے بھی ثابت ہوتا ہے

1232,1233- وَعَنْ أَبِيْ أُمَيَّةَ الْمَخْزُوْمِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: أُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِلِصٍّ قَدِ اعْتَرَفَ

حضرت ابو امیہ مخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کے حضور ایک چور گرفتار کر کے لایا گیا جس نے

(1) مسند احمد: 140/4- سنن ابی داؤد: 4388- جامع الترمذی: 1449- سنن النسائی: 86/8- سنن ابن ماجہ: 2593- ابن عبدالبر نے "التمهيد" (303/23) میں اس حدیث میں انقطاع کی علت بیان کی ہے اور کہتے ہیں کہ محمد بن یحییٰ بن حبان نے اس حدیث کو رافع سے نہیں سنا، اور یہی علت ابو حاتم نے بھی بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: بعض نے محمد بن یحییٰ بن حبان کا رافع سے سماع ثابت کیا ہے کہ وہ ابو میمونہ کے واسطے سے رافع سے حدیث بیان کرتے ہیں۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 456/1.

اعْتِرَافًا ، وَلَمْ يُوجَدْ مَعَهُ مَتَاعٌ ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا إِخَالُكَ سَرَقْتَ قَالَ: بَلَى ، فَأَعَادَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا ، فَأَمَرَ بِهِ فَقُطِعَ ، وَجِيْءَ بِهِ ، فَقَالَ : ((اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ، وَتُبْ إِلَيْهِ)) فَقَالَ: أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فَقَالَ: ((اللّٰهُمَّ تُبْ عَلَيْهِ۔ ثَلَاثًا۔)).

(اپنے چوری کرنے کا) اعتراف (بھی) کرلیا تھا مگر اس کے پاس سے کوئی (مسروقہ) سامان برآمد نہ ہوا تھا۔ پس نبی کریم ﷺ نے اسے ارشاد فرمایا: ”میرا نہیں خیال کہ تم نے چوری کی ہے۔“ اس نے عرض کیا: کیوں نہیں (میں نے چوری کی ہے)۔ نبی کریم ﷺ نے اُس پر (اپنی بات کو) دو یا تین بار دہرایا (اور اس نے ہر بار اپنے چوری کرنے کا اقرار کیا)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر (قطع ید کے بعد) اسے (دوبارہ خدمت نبوی میں) لایا گیا تو آپ ﷺ نے (اسے فہمائش کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ”اللہ سے استغفار کرو اور اس کی طرف رجوع کرو۔“ اس نے عرض کیا: میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ (اس کے لیے دعا کرتے ہوئے) تین بار فرمایا: ”اے اللہ! تو اسے معاف فرما۔“ [1] (اور اس کے اس گناہ کو بخش دے)۔

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ ، وَاللَّفْظُ لَهُ . وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ .

اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام احمد، اور امام نسائی نے روایت کی ہے اور یہ الفاظ سنن ابی داؤد کی روایت کے ہیں اور اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔

وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه ، فَسَاقَهُ بِمَعْنَاهُ ، وَقَالَ فِيْهِ: اذْهَبُوْا بِهِ فَاقْطَعُوْهُ ، ثُمَّ احْسِمُوْهُ)) .

جبکہ امام حاکم نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور اس کے ہم معنی حدیث روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ (نبی کریم ﷺ نے اس چور کے اقرار کرنے پر ارشاد فرمایا): ”اسے لے جاؤ اور اس کے ہاتھ کاٹ دو، پھر اسے (یعنی محل قطع کو خون بہنے سے روکنے کے لیے) داغ دو۔“ [2]

وَأَخْرَجَهُ الْبَزَّارُ أَيْضًا ، وَقَالَ: لَا بَأْسَ بِإِسْنَادِهِ .

اس حدیث کو امام بزار نے بھی روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد میں کوئی حرج نہیں۔ [3]

---

[1] سنن ابی داؤد: 4380۔ مسند احمد: 293/5۔ السنن الکبری للنسائی: 7363۔ سنن ابن ماجہ: 2597۔ اس حدیث کی اسناد میں ایک مجہول راوی ابومنذر ہے جس سے صرف اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ نے ہی روایت کیا ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 66/4۔

[2] المستدرك للحاکم: 422/4۔ حاکم کہتے ہیں۔ یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے۔

[3] رواہ البزار کما فی مجمع الزوائد للهیثمی: 276/6۔ عن شیخه احمد بن ابان القرشی۔ ابن حبان نے اس کو ثقہ کہا ہے جبکہ اس کے باقی کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔

غریب الحدیث:..... بِلِصّ: یہ چور کو کہتے ہیں۔

اِعْتَرَفَ: یہ اقرار کے معنی میں ہے۔

وَلَمْ يُوجَدْ مَعَهُ مَتَاعٌ: یعنی اس کے پاس سے وہ مال مسروقہ برآمد نہ ہو سکا جس کی بابت گمان تھا کہ وہ اس نے چرایا ہے۔

مَا إِخَالُكَ: یہ "مَا اَظُنُّ" کے معنی میں ہے۔

اِسْتَغْفِرِ اللّٰهَ: یعنی اللہ سے مغفرت اور بخشش مانگو۔

وَتُبْ إِلَيْهِ: یعنی اس کی نافرمانی چھوڑ کر اس کی طاعت کی طرف لوٹ جاؤ۔

اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَيْهِ: یہ کلمہ آپ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا: "تُبْ عَلَيْهِ" یعنی اسے معاف فرما۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ سرقہ جیسے بینہ سے ثابت ہوتا ہے ویسے ہی اقرار سے بھی ثابت ہوتا ہے اور ثابت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مالِ مسروقہ بقدر نصاب ہوا تو سرقہ کے اقرار پر قطع ید کی سزا دینا واجب ہوگا۔

◈ سرقہ کے اقرار میں تکرار کے شرط ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سرقہ کے اقرار میں تکرار شرط ہے کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک سرقہ معروف قاعدہ کے مطابق ثابت نہیں ہوتا یعنی سرقہ صرف دو عادل گواہوں سے ہی ثابت ہوتا ہے، جبکہ دیگر معاملات ان طرق سے بھی ثابت ہو جاتے ہیں:

(1) دو عادل گواہ ہوں۔ (2) ایک گواہ اور قسم ہو۔

(3) ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں۔ ... دو عورتیں ہوں۔

لیکن وہ سرقہ جس سے قطع ید کی حد ثابت اور واجب ہو وہ صرف دو عادل مردوں کی شہادت سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ ہاں البتہ اگر مسروق منہ (جس کی چوری ہوئی ہے) وہ اپنے سرقہ پر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنا کر لائے تو اس سے اس کا مال تو ثابت ہو جائے گا لیکن قطع ید کی سزا ثابت نہ ہوگی۔

پھر یہ کہ ان علماء کے نزدیک حدود صرف مردوں کی شہادت سے ہی ثابت ہوتی ہیں، بس! تب پھر اقرار کا تکرار بمنزلہ تعددِ شہود کے ہوگا۔ جبکہ بعض کے نزدیک سرقہ کے اقرار میں تکرار شرط نہیں اور یہ کہ کسی عاقل بالغ کے ایک مرتبہ اقرار سے ہی حکم ثابت ہو جاتا ہے اور یہی ان کا مذہب ہے۔

◈ اقرار کرنے والے پر رجوع کر جانے کو پیش کرنا مستحب ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "مَا إِخَالُكَ سَرَقْتَ" کہ یہ الفاظ اسے اپنے اقرار سے رجوع کر لینے کی تعریض ہیں تاکہ وہ چور یہ کہہ اٹھتا کہ جی ٹھیک اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ کا میرے بارے گمان درست ہے۔ میں نے چوری نہیں کی۔

لیکن علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف [1] ہے کہ امام اور حاکم کا رجوع کے لیے تعریض کرنا مسنون ہے یا نہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ امام کے لیے رجوع کر لینے کی تعریض کرنا مسنون ہے اور یہ کہ رجوع کر لینے سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ یہ تعریض غیر مسنون ... اور یہی قول صحیح ہے۔ البتہ بعض احوال اس تعریض کے مقتضی ہوتے ہیں

[1] دیکھیں: مغنی المحتاج: 176/4.

جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں ایک ایسے چور کو رجوع کرنے کی تعریض کا ذکر ہے جو اپنی چوری کا تو اعتراف کرتا تھا مگر اس کے پاس سے مسروقہ سامان برآمد نہیں ہوا تھا۔ تب پھر یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ شاید یہ چور یہ سمجھ رہا تھا کہ ہر تھوڑی زیادہ شے چرانے پر قطعِ ید آتی ہے۔

◈ پھر تعریض بالرجوع کے مسنون ہونے کے قول کو لیتے ہوئے علماء کا اس مسئلہ میں مزید اختلاف یہ ہے کہ آیا اس کا رجوع مقبول ہوگا یا نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا رجوع مطلق مقبول نہیں ہوگا کیونکہ یہ اپنے خلاف شہادت ہے اور اگر ہم رجوع کو مقبول ماننے لگیں تو دنیا میں کہیں بھی حد قائم نہ کی جاسکے گی۔ کیونکہ یوں تو کوئی بھی رجوع کر کے حد سے بچ سکتا ہے۔

جو علماء رجوع کرنے کے مقبول ہونے کے قائل ہیں، ان کا استدلال مذکورہ حدیث سے ہے۔ کیونکہ اگر رجوع مقبول نہ ہوتا تو رجوع کی تعریض ۔بے فائدہ تھی۔

البتہ راجح قول ان دونوں اقوال کے بیچ کا ہے، وہ یہ کہ اگر تو قرائن بتلا رہے ہوں کہ اس کا رجوع صحیح نہیں تو اس کا رجوع غیر مقبول ہوگا اور اگر ایسے قرائن نہ پائے جائیں تو اس کا رجوع مقبول ہوگا۔

◈ نبی کریم ﷺ کی حکمت کہ آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کو دو یا تین بار چوری کے اعتراف سے رجوع کر لینے کو فرمایا جس کا حال اس بات کو مقتضی تھا کہ اس نے چوری نہیں کی۔ کیونکہ اس کے پاس سے کوئی مسروقہ سامان برآمد نہ ہوا تھا۔

◈ حد قائم کرنے کے بعد آدمی سے استغفار کرنے کو کہنا مسنون ہے۔ کیونکہ اس بات کا امکان بہر حال ہے کہ مبادا وہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب کر بیٹھے۔ البتہ اس میں کہنے والے کا اور سننے والے کا دونوں کا قلبی انشراح ہونا شرط ہے۔

◈ مستدرک حاکم کی روایت میں قطعِ ید کے بعد ''حسم'' کا ذکر ہے۔ اس کا معنی بھی کاٹنا ہے۔ لیکن یہاں کاٹنے سے مراد خون کے بہتے رہنے کو روکنا ہے اور ایسا کلائی کو داغنے سے ممکن ہوتا ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوا کہ چور کے ہاتھ کاٹنے کے بعد اس کو داغ دو تا کہ خون بہنا بند ہو جائے۔

داغنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ برتن یا کڑاہی میں تیل لے کر اسے جوش دیا جائے جب وہ ابلنے لگے تو کٹے ہاتھ کو اس میں زخم کے سرے کے بقدر ڈبو دیا جائے، اس سے کٹ جانے والی رگیں فوراً بند ہو جائیں گی اور مزید خون بہنا بند ہو جائے گا۔

◈ مستدرک کی اس روایت سے قطع ید کے بعد ہاتھ کا داغنا واجب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل وجوب قطع نزیف دم کا ہے، کہ ہاتھ کاٹنے کے بعد خون کے بہتے رہنے کو روکنا واجب ہے، چاہے یہ مقصود کسی بھی طریق سے حاصل ہو، تب پھر واجب داغنا نہیں بلکہ واجب خون کو مزید بہتے رہنے سے روکنا ہے۔ لہٰذا اگر داغنے سے زیادہ سہل اور کم تکلیف دہ کوئی اور طریقہ رائج اور مجرب ہو تو اس کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قطعِ ید سے قبل ہاتھ کو سن کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ مقصود عقوبت کے طور پر عضو کا اتلاف ہے جو ہاتھ کو سن کر کے کاٹنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ مقصود اذیت دے کر عضو کا تلف کرنا ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حدود کے قائم کرنے کی بابت بے حد شرح صدر حاصل تھا، اسی لیے وہ سزاؤں کو شرح صدر کے ساتھ تسلیم کرتے تھے۔

قطعِ ید کے بعد چور مالِ مسروقہ کا ضامن نہ ہوگا

1234۔ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يُغْرَمُ السَّارِقُ إِذَا أُقِيْمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ)).

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جب چور پر حد قائم کر دی جائے (اور چوری کی پاداش میں اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں) تو (اب) وہ (مالِ مسروقہ میں سے کسی شے کا) ضامن نہ ہوگا۔" [1]

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَبَيَّنَ أَنَّهُ مُنْقَطِعٌ، وَقَالَ أَبُوْ حَاتِمٍ: هُوَ مُنْكَرٌ.

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے، اور انہوں نے واضح کیا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے۔ جبکہ امام ابو حاتم نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔

شرح:...... دیکھا جائے تو چور تین خلافِ شرع امور کا مرتکب ہوتا ہے:

(1) ایک یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے مومنوں کے مال کو دوسروں پر حرام کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا اعلان حجۃ الوداع کے خطبہ میں سب کے سامنے فرما دیا تھا۔

(2) دوسرا یہ کہ چور مسروق منہ پر ظلم کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ مسروق منہ کی اجازت، رضا اور علم کے بغیر اس کے مال پر مسلط ہو کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔

(3) اور تیسرا خلافِ شرع امر یہ ہے کہ وہ معاشرے کے امن و سلامتی کو برباد کرتا ہے۔ وہ یوں کہ جب چوریاں اور ڈاکے زیادہ ہونے لگتے ہیں تو ہر شخص خود کو اپنی جگہ غیر محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں اپنی جانوں پر بھی خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔ [2] چنانچہ جو ان سے مزاحمت کرتا ہے یہ چور اس کی جان تک لے لیتے ہیں۔

اب مذکورہ حدیث بتلاتی ہے کہ چور پر جب حدِ سرقہ قائم کر دی جائے تو اب وہ مالِ مسروقہ کا ضامن نہ بنے گا۔ لیکن یہ حدیث سند کے اعتبار سے منقطع جبکہ متن کے اعتبار سے منکر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث قواعد شرعیہ عامہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ کا حق اور شے ہے اور بندے کا حق اور شے ہے۔ بھلا ہاتھ کاٹ کر اللہ کا حق وصول کر لینے سے بندے کو کیا فائدہ پہنچا، اس کا چوری شدہ مال تو اسے نہ مل سکا۔ چنانچہ اگر کسی کے دس لاکھ روپے چوری ہوئے اور چور کے ہاتھ کاٹ دیے گئے اور مسروق منہ کو اس کے بعد ایک پائی بھی نہ ملے تو وہ تو زندگی بھر کی کمائی لٹا بیٹھا جبکہ چور ہاتھ کٹوانے کے بعد وہ دس لاکھ بیٹھ کر کھائے گا اور مزے اڑائے گا۔

تب پھر مذکورہ حدیث کا متن منکر ہے اور جب بھی ہم کسی حدیث کو قواعد شرعیہ کے خلاف دیکھیں تو اس کو جنابِ رسول اللہ کی طرف نسبت کرنے میں ہرگز بھی عجلت سے کام نہ لیں بلکہ خوب حزم و احتیاط اور بحث و تحقیق سے کام لیں۔ اسی طرح یہ

---

[1] سنن النسائی: 92/8۔ امام نسائی فرماتے ہیں: یہ حدیث مرسل ہے، اور ثابت نہیں ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں، یہ حدیث منکر ہے اور مسور کی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 452/1۔ اور علل الدار قطنی: 294/4.

[2] جیسے آج کل چور سو دو سو کی چیز چھیننے کی خاطر گولی مار کر نکل جاتے ہیں۔ نسیم

حدیث بھی ہے۔ جب ہم نے دیکھا کہ اس حدیث کا متن منکر ہے تو تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث تو منقطع ہے۔

پس راجح قول یہ ہے کہ ''سارق'' جو مال بھی تلف کرے گا، وہ اس کا ضامن بنے گا۔

ضمان اور قطع کو جمع کرنے کا حکم

1235۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ التَّمْرِ الْمُعَلَّقِ؟ فَقَالَ: ((مَنْ أَصَابَ بِفِيْهِ مِنْ ذِيْ حَاجَةٍ، غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً، فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ، وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ الْغَرَامَةُ وَالْعُقُوْبَةُ، وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ بَعْدَ أَنْ يُؤْوِيَهُ الْجَرِيْنَ، فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ، فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ)).

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ سے لٹکی کھجوروں (کے لے لینے) کے بارے میں (جب) پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی حاجت مند نے (ان کھجوروں میں سے کچھ) منہ میں ڈال لیں (یعنی توڑ کر ان کو کھا لیا) البتہ ان کو اپنے نیفے میں نہ اُڑسا (اور نیفے میں اڑس کر ان کو چھپا کر نہ لے گیا) تو اس پر کچھ (ضمان) نہ آئے گا اور جو ان کھجوروں میں سے کچھ (چھپا کر، اور نیفے میں اڑس کر) لے نکلا تو اس پر (ان کھجوروں کا) ضمان بھی آئے گا اور عقوبت بھی (آئے گی یعنی وہ ان کھجوروں کی قیمت بھی دے گا اور اُسے تعزیری سزا بھی جائے گی)۔ اور جس نے ان کھجوروں میں سے، ان کو کھلیان میں جمع کرنے کے بعد، کچھ لیا اور وہ کھجوریں ڈھال کی قیمت کو پہنچ گئیں تو اس پر قطع (ید کی سزا) آئے گی۔'' ❶

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:..... **اَلْمُعَلَّقِ**: مراد درخت پر لٹکی کھجور ہے جس کو ابھی تک توڑ کر کسی گودام وغیرہ میں جمع نہیں کیا گیا۔

کھجوریں لے لینے کی صورتیں اور ان کے احکام

نبی کریم ﷺ سے کھجوریں لے لینے کی بابت سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کی تین صورتیں بیان فرمائیں، چاہے وہ کھجوریں لٹکی ہوں یا ذخیرہ ہوں، وہ صورتیں یہ ہیں:

(1) کسی نے اتنی کھجوریں لیں کہ بس وہ منہ میں رکھ کر کھانے کے ہی کام آتی ہوں جیسے ایک دو کھجوریں لے لینا۔ ایسے شخص پر نہ ضمان ہے اور نہ قطع ید۔

(2) اور جو کھجوروں اور پھلوں وغیرہ کو توڑ کر نیفے میں اڑس کر لے نکلے یعنی چھپا کر لے نکلے تو اس پر ضمان آئے گا، البتہ قطع ید کی

---

❶ سنن ابی داؤد: 4390۔ جامع الترمذی: 1289۔ سنن النسائی: 8/89۔ سنن ابن ماجہ: 2596۔ مسند احمد: 2/224۔ المستدرك للحاکم: 4/423۔ امام حاکم کہتے ہیں: ہمارے امام اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں جب راوی عمرو بن شعیب سے روایت کرنے والا ثقہ ہو تو وہ ثقہ ہے اور یہ روایت ''عن ایوب عن نافع عن ابن عمر'' جیسی روایت ہے۔

سزا نہ آئے گی ہاں تعزیری سزا ہوگی۔

(3) تیسری صورت یہ ہے کہ کسی نے پھل کو کھلیان، سٹور یا گودام وغیرہ سے اتنا چرایا کہ اس کی قیمت ڈھال کے برابر تھی تو سزا میں اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ یہ تیسری صورت سب سے اشد ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ کھجوروں کے پاس سے گزرنے والے نے اگر ایک دو کھجوریں بنا پوچھے لے لیں تو اس پر کوئی ضمان واجب نہ ہوگا۔ البتہ ایسا نہ کرے کہ ایک تو منہ میں رکھ لے اور باقی کی جیبوں میں بھر لے یا نیفے میں اڑس لے۔ کہ اس صورت میں تاوان بھی دے گا اور تعزیری سزا بھی کھائے گا۔

البتہ فقہاء کرام نے اس صورت میں ایک اور شرط بھی رکھی ہے کہ وہ باغ ایسا ہو کہ نہ تو اس کی چہار دیواری ہو اور نہ کوئی مالی یا رکھوالا ہی ہو۔ کیونکہ چار دیواری یا باڑ کا ہونا یا کسی مالی یا چوکیدار وغیرہ کا مقرر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ باغ کا مالک اس میں سے ایک کھجور کا دانہ بھی لیے جانے پر راضی نہیں اور یہ بات شرع شریف میں طے ہے کہ کسی بھی مسلمان کا مال اس کی دلی خوشی کے بغیر لینا حلال نہیں چاہے وہ کتنا ہی کم اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ (النسآء: 4)

''پھر اگر وہ اس میں سے کوئی چیز تمھارے لیے چھوڑنے پر دل سے خوش ہو جائیں تو اسے کھالو، اس حال میں کہ مزے دار، خوشگوار ہے۔''

بلاشبہ حضرات فقہاء کرام کی ذکر کردہ یہ شرط ناگزیر اور قواعد شرعیہ عامہ کے عین مطابق اور ان کے مقتضٰی کے عین موافق ہے۔ تب پھر متن حدیث میں مذکور یہ مسئلہ ان درختوں کی بابت ہے جو سڑک کے کنارے ہوں یا باغ کی دیوار اور باڑ سے باہر لٹکی شاخیں ہوں، یا دیوار یا باڑ کے بغیر کوئی باغ ہو اور ان پر کوئی مالی یا چوکیدار بھی مقرر نہ ہو۔

◈ رہا یہ سوال کہ جب کسی باغ یا درخت کی کھجوریں مذکورہ صورت کے مطابق لینا جائز ہو جائے تو کیا پیٹ بھرنے کے بقدر لینا جائز ہوگا یا بقدر حاجت؟

تو اگرچہ حدیث کا ظاہر بقدرِ حاجت کے ساتھ مقید ہے لیکن بعض علماء نے اس کو مطلق بھی رکھا ہے۔

◈ دوسرا مسئلہ اس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ جن کھجوروں یا پھلوں کا لینا جائز ہے ان کو آدمی جیبوں میں ڈال کر، یا چادر کے پلو میں چھپا کر یا نیفے میں اڑس کر ساتھ نہیں لے جا سکتا، ہاں وہیں کھڑے کھڑے بقدر حاجت لے کر کھا سکتا ہے۔ کیونکہ پہلی صورت ''انتفاع'' کی ہے جبکہ یہ صورت تملک کی ہے۔ تب گویا کہ صورتِ مسئلہ یہ ٹھہری کہ جن پھلوں کا لینا جائز ہے، ان سے انتفاع تو مباح ہے البتہ ان کا تملک یعنی مالک بننا جائز نہیں۔ کیونکہ پہلا آدمی اپنی حاجت رفع کرنا چاہتا ہے اس لیے حاجت کے پیش نظر اس کو کھجوریں لینا مباح ہوا۔ جبکہ دوسرا ان کا مالک بننا چاہتا ہے اور مالک سے پوچھے بنا اس کی چیز کا مالک بننا بہر حال حرام ہے چاہے وہ کتنی ہی کم قیمت اور معمولی چیز کیوں نہ ہو۔

ان دونوں صورتوں میں بنیادی فرق یہی ہے۔ اس لیے جیب یا نیفے میں کھجوریں لے کر نکلنے والے پر غرامت بھی آئے گی جسے

وہ باغ کے مالی کو ادا کرے گا اور عقوبت بھی آئے گی جو اسے حاکم یا والی دے گا۔ یہ عقوبت مالی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی۔ اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ اس کی تعیین قاضی کے سپرد ہوگی وہ جس میں مصلحت دیکھے گا، وہی عقوبت نافذ کر دے گا۔

◈ معلوم ہوا کہ سرقہ میں قطعِ ید تب ہے جب مال کو ایک تو حرز سے یعنی محفوظ مقام سے چرایا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی قیمت بقدر نصاب ہو جیسا کہ یہاں بیان ہوا کہ اگر کسی نے گودام، کھلیان یا سٹور سے مال چرایا...... اور یہ مقامِ حرز سے مال چرانا ہے...... اور اس کی قیمت ڈھال برابر بھی ہوئی...... ممکن کہ اس وقت ڈھال کی مارکیٹ ویلیو نصابِ سرقہ یعنی تین دراہم یا ربع دینار کے برابر بنتی ہو...... تو اس پر قطعِ ید کی سزا آئے گی۔ اس کی دلیل: "وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ بَعْدَ أَنْ يُؤْوِيَهُ الْجَرِينُ فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ" کے الفاظ ہیں۔

جَرِين یا جُرْن: یہ کھلیان، غلہ اکٹھا کرنے کی جگہ یا پھلوں کو خشک کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ [1] مراد سٹور یا گودام وغیرہ میں پھلوں کو رکھنا ہے اور یہ مقامِ حرز کا بیان ہے۔

اور ڈھال کی قیمت کو پہنچنا یہ نصابِ سرقہ کا بیان ہے۔ لہٰذا اس پر قطعِ ید واجب ہوگا۔

◈ معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام حکمت کے عین مطابق ہیں، اس لیے مختلف صورتوں کے احکام بھی مختلف ہیں۔

حدود میں سفارش کرنے کا، اور اس کے ضوابط کا بیان

1236- وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ- لَمَّا أَمَرَ بِقَطْعِ الَّذِي سَرَقَ رِدَاءَهُ فَشَفَعَ فِيهِ-: ((هَلَّا كَانَ ذَلِكَ قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ؟)).

حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جب نبی کریم ﷺ نے ان کی چادر چرانے والے کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہوں نے اس چور کی سفارش کرنا چاہی تو نبی کریم نے انہیں ارشاد فرمایا: ''بھلا تم نے یہ کام اس چور کو میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہ کیا؟'' (یعنی جب اسے معاف ہی کرنا تھا تو اسے حاکم یا والی کے سامنے پیش کرنے سے قبل کیوں نہ معاف کیا)۔ [2]

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُودِ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور ابن جارود اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... سَرَقَ رِدَاءَهُ: رداء: یہ بدن کے اوپری حصے پر لینے کے کپڑے کو کہتے ہیں (ہماری اردو زبان میں ایسا کپڑے کو عموماً چادر کہتے ہیں)۔

لَمَّا أَمَرَ بِقَطْعِ الَّذِي سَرَقَ رِدَاءَهُ: یہ امر جنابِ رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا اور "رِدَاءَهُ" کی ضمیر حضرت

---

[1] دیکھیں: القاموس الوحید: 253۔ (نسیم)

[2] مسند احمد: 465/6۔ سنن ابی داؤد: 4394۔ سنن النسائی: 69/8۔ سنن ابن ماجہ: 2595۔ المستدرك للحاكم: 422/4۔ امام بخاری رحمہ اللہ اپنی "التاریخ" (304/4) میں فرماتے ہیں: ہم حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے اس راوی کے سماع کو نہیں جانتے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ "تحفة الطالب" (ص: 262) میں فرماتے ہیں: یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے اور یہ طرق ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں۔ اب بعض نے اس کو مرسل جبکہ بعض نے موصول روایت کیا ہے۔ جبکہ ابن عبدالبر نے "التمهيد" (219/11) میں "طاؤس عن صفوان رضی اللہ عنہ" کے طریق کو راجح قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ طاؤس کا حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے سماع ممکن ہے۔

صفوان رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے۔

فَشَفَعَ فِيهِ: "شَفَعَ" کی ضمیر حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کی طرف اور "فِيهِ" کی ضمیر سارق کی طرف راجع ہے۔

هَلَّا كَانَ ذَلِكَ: "ذَلِكَ" یہ اسم اشارہ ہے اور اس کا مشار الیہ معنوی ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے: "هَلَّا كَانَ شَفْعُكَ".

هَلَّا: یہ کلمہ تحضیض ہے جو دوسرے کو کسی کام پر ابھارنے کے لیے آتا ہے اور اس میں الحاح بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے هلاّ یہ کلمہ عرض نہیں۔ البتہ یہ "لَو" کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ اگر تمہاری یہ سفارش اس سے پہلے ہوتی تو میں اس کو ضرور قبول کرتا۔

قصۂ حدیث :...... قصہ یہ ہے کہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ اپنی چادر کو تکیہ بنا کر سر کے نیچے لیے سو رہے تھے کہ کسی نے ان کی چادر سر کے نیچے سے لے کر چرالی۔ جب چور کو دربار نبوی میں لے جایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا۔

اگرچہ اس بابت رواۃ کا اختلاف ہے کہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کہاں سوئے ہوئے تھے، اس بابت متعدد اقوال ہیں جیسے: (1) مسجد نبوی میں (2) مسجد حرام میں (3) بطحاء میں۔ لیکن یاد رہے کہ مذکورہ اضطراب حدیث کے حکم کے حق میں مضر نہیں کیونکہ مذکورہ حدیث سے جو مقصود ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ حدود میں سفارش جائز ہے لیکن یہ سفارش حدود کے قائم کرنے سے قبل ہو تو مقبول ہوگی۔ البتہ جب حد نافذ کر دی جائے تو اس کی راہ میں سفارشی بن کر حائل ہونا کبیرہ گناہ ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مختلف اموال کی حرز مختلف ہے۔ جیسے چادر اگر سونے والا سر کے نیچے لے کر سویا ہے تو یہ حرز میں ہوگی کیونکہ چادر اور تکیہ کو سونے سے قبول محفوظ کرنا عام طور پر اسی طرح ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی سونے سے قبل اپنے روپوں کا بٹوا سر کے نیچے رکھ کر سویا تو یہ بٹوے کی حرز شمار نہ ہوگی کیونکہ بٹوا اس طرح محفوظ نہیں کیا جاتا۔
غرض معلوم ہوا کہ مختلف اشیاء کی حرز مختلف ہے۔
- حد میں اس کے حاکم یا والی تک لے جانے سے قبل سفارش جائز ہے۔
- مذکورہ چادر میں قطعِ ید کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ وہ چادر نصاب سرقہ کے بقدر قیمت والی تھی۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دورِ نبوی میں چادریں مہنگی اور قیمتی ہوا کرتی تھیں۔

بار بار چوری کرنے والے کا حکم

1237,1238- وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: جِيءَ بِسَارِقٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: ((اقْتُلُوْهُ))، فَقَالُوْا: إِنَّمَا سَرَقَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: ((اقْطَعُوْهُ)) فَقُطِعَ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّانِيَةَ، فَقَالَ: ((اقْتُلُوْهُ))، فَذَكَرَ مِثْلَهُ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّالِثَةَ،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک چور گرفتار کر کے خدمت نبوی میں لایا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے قتل کر ڈالو'' لوگوں نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! اس نے صرف چوری ہی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(تو پھر) اس کے ہاتھ کاٹ دو'' چنانچہ ایک آدمی نے

فَذَكَرَ مِثْلَهُ ، ثُمَّ جِيْءَ بِهِ الرَّابِعَةَ كَذَلِكَ ، ثُمَّ جِيْءَ الْخَامِسَةَ فَقَالَ: ((اقْتُلُوْهُ)).

(آپ ﷺ کے حکم سے اس کے ہاتھ) کاٹ دیے۔ پھر (کچھ دنوں بعد) وہ آدمی دوبارہ (چوری کے جرم میں ہی) گرفتار کر کے لایا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے قتل کر ڈالو۔'' آگے راوی گزشتہ کی طرح مکالمہ ذکر کرتے ہیں۔ پھر (تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ پھر) وہ چوتھی مرتبہ اسی طرح گرفتار کر کے لایا گیا (اور یہی مکالمہ ہوا) پھر وہ پانچویں مرتبہ (جب) گرفتار کر کے لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے قتل کر دو۔'' [1]

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ ، وَاسْتَنْكَرَهُ .

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور امام نسائی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔

وَأَخْرَجَ مِنْ حَدِيْثِ الْحَارِثِ بْنِ حَاطِبٍ نَحْوَهُ .

اور امام نسائی نے حارث بن حاطب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ایسی ہی حدیث روایت کی ہے۔

وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ أَنَّ الْقَتْلَ فِي الْخَامِسَةِ مَنْسُوْخٌ .

اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ پانچویں مرتبہ (گرفتار ہو کر آنے والے چور کے بارے) میں قتل کا حکم منسوخ ہے۔ [2]

غریب الحدیث:...... اسْتَنْكَرَهُ: یعنی انہوں نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔

وَأَخْرَجَ مِنْ حَدِيْثِ الْحَارِثِ...... لیکن ہمیں اس بات پر ذرا خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک یہ حدیث، ثابت نہ ہو ہمیں نسخ کے دعویٰ کی ضرورت نہیں اور چونکہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے تو پھر نسخ کے دعویٰ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

فائدہ:...... یہ حدیث اس لائق ہے کہ اسے صفت نکارت کے ساتھ متصف کیا جائے کیونکہ یہ بات جناب رسول کریم ﷺ سے بے حد بعید ہے کہ آپ ﷺ کسی موجب قتل امر کے متحقق ہو جانے کے بغیر ہی کسی کے قتل کا حکم ارشاد فرما دیں۔ اس لیے ہم نے اس حدیث کو منکر کہا ہے اور یہ حدیث باطل ہے۔ تب پھر ہمیں اس کے فوائد بیان کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ باطل پر مبنی امر بھی باطل ہوتا ہے۔

4۔ بَابُ حَدِّ الشَّارِبِ وَ بَيَانِ الْمُسْكِرِ
شراب پینے والے کی حد کا اور نشہ آور شے کا بیان

شارب اور مسکر کی تعریف:

شارب کا لغوی معنی تو پینے والا ہے لیکن یہاں شراب پینے والا مراد ہے اور مسکر نشہ لانے والی شے کو کہتے ہیں۔ ذیل میں

[1] سنن ابی داؤد: 4410۔ سنن النسائی: 98/8۔ امام نسائی "السنن الکبریٰ" (348/4) میں فرماتے ہیں: یہ حدیث منکر ہے۔ مصعب بن ثابت حدیث میں قوی نہیں اور اس باب میں مجھے کسی صحیح حدیث کا علم نہیں۔

[2] السنن الکبریٰ للنسائی: 7470۔ امام شافعی رحمہ اللہ "اختلاف الحدیث" (ص: 215) میں فرماتے ہیں: پانچویں بار میں چور کے قتل کا حکم منسوخ ہے۔ دیکھیں: تہذیب السنن: 56/12 .

مسکر کی اصطلاحی تعریف ذکر کی جاتی ہے، اسی کے ضمن میں شاربِ خمر کی اصطلاحی تعریف بھی معلوم ہو جائے گی۔

مسکر: یہ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو لذت و مستی کے طور پر عقل پر پردہ ڈال دے، تب پھر آدمی کے پاس عقلی احساس تو باقی نہیں رہتا گو کوئی ضرب لگانے سے درد کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن عقلی وشعوری احساس جاتا رہتا ہے۔

یہیں سے شارب کی اصطلاحی تعریف بھی سمجھ میں آ گئی کہ یہ ہر وہ شخص ہوگا جو لذت و مستی کے طور پر کسی ایسی شے کو پیئے جو اس کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دے کہ اس کا عقلی اور حسی شعور واحساس تو جاتا رہے گو اسے درد و تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اب ذیل میں اس تعریف کی قیود کے فوائد رقم کیے جاتے ہیں:

لذت و مستی کی قید سے بھنگ اور اس جیسی دوسری اشیاء نکل گئیں جو بطور لذت اور مستی کے نہیں پی جاتیں۔ ❶ کیونکہ بھنگ سرے سے نشہ لاتی ہی نہیں اور نہ اس کے پینے سے حواس پر لذت و مستی طاری ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ یہی لذت اور مستی ہی تو ہے جو انسان کی عقل کھو دیتی ہے اور وہ بیدار ہونے کے باوجود دیوانوں جیسا بن جاتا ہے۔

(اور لذت وطرب کے عقل پر پردہ ڈالنے سے بے ہوش کر دینے والی ادویات کا استعمال بھی نکل گیا جو عمل جراحی کرنے کے دوران مریضوں کو دی جاتی ہیں تا کہ مریض کی عقل ایسی ڈوب جائے کہ اسے بدن پر ہونے والے عمل جراحی کی تکلیف کا مطلق احساس باقی نہ رہے۔ اسی طرح لذت وطرب کی قید سے کسی بیماری حادثہ یا جسمانی تغیر کی وجہ سے عقل پر پردہ پڑ جانا نکل جائے جیسے مرگی وغیرہ کے دورے سے طاری ہونے والی بے ہوشی یا بھوک پیاس کی شدت سے طاری ہونے والی بے ہوشی یا موسمی تغیر سے طاری ہونے والی بیہوشی یا کسی تصادم کی بنا پر عقل کے جاتے رہنے کی صورت کہ یہ سب صورتیں بھی خمر وسکر کی تعریف سے نکل جائیں گی ❷)۔

شراب نوشی کا حکم

مے خواری کبائر میں سے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک تو مے خواری پر یہ وعید سنائی ہے کہ جس نے دنیا میں شراب پی، اسے آخرت میں (جنت کی) شراب نصیب نہ ہوگی۔ ❸ دوسرے آپ ﷺ نے مے نوش پر لعنت کی ہے۔ بلاشبہ وعید و لعنت کسی فعل کے کبیرہ ہونے کو مقتضی ہیں۔ چنانچہ مے نوشی سب برائیوں کی جڑ اور ہر شر کی چابی ہے۔ یہ شراب نہ جانے کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے حتیٰ کہ دور نبوی میں جب تک شراب کی حرمت وممانعت نازل نہ ہوئی تھی، اسی شراب نے بے شمار مفاسد، جھگڑوں اور برائیوں کو جنم دیا تھا۔

عصرِ حاضر میں یہ شراب کی لعنت کیسی کیسی خرابیوں کا باعث بن رہی ہے کہ اگر ان کو سپردِ قلم کرنے بیٹھیے تو دفتروں کے دفتر تیار ہو جائیں۔ بہر حال مقصود فقط یہ کہنا ہے کہ مے نوشی کبیرہ گناہ، واجب الحد جرم اور بدترین اخلاقی، سماجی، معاشرتی، دینی اور عقلی برائی ہے۔ اس پر وعید بھی ہے اور لعنت بھی۔ اس سے اجتناب واجب اور ایمان و عقل کا مقتضی ہے۔

رہی اس کی حد اور سزا تو اس کو ذیل کی حدیثوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

---

❶ اس لیے بھنگ پینے پر حد نہیں آتی۔ (شیخ رحمہ اللہ)

❷ هذا ما سنح لی۔ واللہ اعلم۔ (نسیم)

❸ صحيح مسلم: 2003۔ عن ابنِ عمر رضی اللہ عنہما۔

مے نوش کی سزا

1239- عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ﷺ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ، فَجَلَدَهُ بِجَرِيدَتَيْنِ نَحْوَ أَرْبَعِينَ، قَالَ: وَفَعَلَهُ أَبُو بَكْرٍ ﷺ، فَلَمَّا كَانَ عُمَرُ ﷺ اسْتَشَارَ النَّاسَ، فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ: أَخَفُّ الْحُدُودِ ثَمَانُونَ، فَأَمَرَ بِهِ عُمَرُ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی (گرفتار کر کے) لایا گیا جس نے شراب پی رکھی تھی۔ پس آپ ﷺ نے اسے کھجور کی دو شاخوں سے تقریباً چالیس ضربیں لگائیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اور جنابِ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی (اپنے دورِ خلافت میں مے خواروں کے ساتھ) یہی کیا۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے (مے خوار کی سزا کی بابت علم و فضل والے) لوگوں سے مشورہ کیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ سب سے ہلکی حد اسی (80) کوڑے ہے (اگر شرابی کی کوئی مستقل حد مقرر کرنی ہے تو یہ حد مقرر کیجیے) پس حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے (مے خواروں کو) اسی (حد کے لگانے) کا (سرکاری) حکم جاری کر دیا [1] (اور شراب نوش کی سزا اسی کوڑے مقرر فرما دی)۔

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:.....أُتِيَ بِرَجُلٍ: یہ آدمی کون تھا؟ اس کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن نام کے مجہول ہونے سے صحت حدیث پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ مقصود حکم کا بیان ہے۔ اس لیے کسی کا نام معلوم نہ ہونا چنداں اہمیت کا حامل نہیں۔

شَرِبَ الْخَمْرَ: خمر کا معنیٰ تمہید کے تحت مفصل ذکر کر دیا گیا ہے۔

فَجَلَدَهُ: مراد چھڑیاں مارنے کا حکم دینا ہے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے اس بات کا حکم دیا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اٹھ کر اس شرابی کو کھجور کی شاخوں کی ضربیں لگائیں۔

نَحْوَ أَرْبَعِينَ: "نحو" کا کلمہ بتلاتا ہے کہ یہی حد متعین و مؤکد نہیں۔ کیونکہ اگر یہی متعین و مؤکد حد ہوتی تو "جَلَدَهُ أَرْبَعِينَ" کے الفاظ ہوتے۔

وَفَعَلَهُ أَبُو بَكْرٍ: یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں شراب کی حد چالیس ضربیں ہی رکھی۔

فَلَمَّا كَانَ عُمَرُ اِسْتَشَارَ النَّاسَ: یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں لوگوں سے اس بات کا مشورہ کیا کہ شراب کی حد کیا مقرر کی جائے۔

أَخَفُّ الْحُدُودِ ثَمَانُونَ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا اشارہ حد قذف کی طرف تھا کہ وہ اسی کوڑے ہے۔

فَأَمَرَ بِهِ عُمَرُ: یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا حکم دیا کہ شراب پینے والے پر حد قذف کو جاری کیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کی یہ حد اجل صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کے بعد مقرر کی تھی۔

---

[1] صحيح البخاري: 6773- صحيح مسلم: 1706.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک معاشرے میں ایسے منکرات کا وقوع جائے حیرت نہیں۔ چنانچہ دورِ صحابہ میں حتیٰ کہ دورِ نبوی میں بھی زنا، چوری اور سرقہ کے واقعات رونما ہوئے۔ تب پھر پندرہویں صدی میں ان واقعات کا ظہور وشیوع ذرا جائے تعجب نہیں۔ اس لیے ان واقعات کو سن دیکھ کر بجائے رونے دھونے اور غم کرنے اور کڑھنے کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پوری تندہی اور جاں نثاری سے ادا کیا جائے۔

◈ بلاضرورت ناگوار باتوں میں کسی کا نام صراحۃً لینے سے گریز کیا جائے۔ اس کی دلیل "أُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ حکم دینے والے کی طرف کسی بات کی نسبت کر سکتے ہیں گو وہ مباشر بالفعل نہ بھی ہو۔ اس کی دلیل "فَجَلَدَهُ نَحْوَ أَرْبَعِينَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مے نوش کی سزا ''حد'' میں داخل نہیں۔ اس کی دلیل "نَحْوَ أَرْبَعِينَ" کے الفاظ ہیں۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مے خواری کی حد میں اضافہ کیا تھا جبکہ حدودِ شرعیہ میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ جبکہ اس بات کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے سب سے ہلکی حد اسّی کوڑے بتلائی، پس اگر مے خواری کی سزا بھی ''حد'' میں داخل ہوتی تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سب سے ہلکی اور کم حد ''چالیس'' کوڑے بتلاتے۔

◈ معلوم ہوا کہ دورِ نبوی اور دورِ صدیقی میں معاصی کی بے حد قلت تھی جبکہ دوسری طرف فتوحات بھی کم تھیں۔ کیونکہ دورِ صدیقی دو سال اور تقریباً چھ ماہ تک رہا تھا۔

◈ مشورہ کرنا مشروع ہے۔ چاہے آدمی کتنا ہی عاقل اور صاحب بصیرت کیوں نہ ہو۔

◈ سیدنا عمر بے حد متواضع اور منکسر المزاج تھے اور ان کا یہ مشورہ فرمانا ان لوگوں کے منہ میں خاک ڈالنا ہے جو جنابِ عمر رضی اللہ عنہ کو بے حد متکبر اور خودسر ہونے کا الزام دیتے ہیں۔

◈ شراب نجس ہے یا نہیں؟ اس کی مفصل بحث ''انجاس'' کے باب کے تحت ذکر کی جا چکی ہے۔

شراب کی سزا میں چالیس کوڑے بھی سنت ہے اور اسّی کوڑے بھی سنت ہے

1240۔ وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه - فِي قِصَّةِ الْوَلِيدِ بْنِ عُقْبَةَ: جَلَدَ النَّبِيُّ ﷺ أَرْبَعِينَ، وَجَلَدَ أَبُوبَكْرٍ أَرْبَعِينَ، وَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِينَ، وَكُلٌّ سُنَّةٌ، وَهَذَا أَحَبُّ إِلَيَّ.

صحیح مسلم میں ولید بن عقبہ کے قصہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے چالیس کوڑے مارے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے مارے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسّی کوڑے مارے اور یہ سب سنت ہے اور مجھے یہ (اسّی کوڑے کی سزا) زیادہ محبوب ہے۔

وَفِي هٰذَا الْحَدِيثِ أَنَّ رَجُلًا شَهِدَ عَلَيْهِ أَنَّهُ رَآهُ يَتَقَيَّأُ الْخَمْرَ، فَقَالَ عُثْمَانُ: إِنَّهُ لَمْ يَتَقَيَّأْهَا

اور اسی حدیث میں (آگے یہ ارشاد) ہے کہ: ایک آدمی نے ولید بن عقبہ پر اس بات کی شہادت دی کہ اس نے ولید کو شراب کی

حَتَّى شَرِبَهَا.

قے کرتے دیکھا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس نے شراب کی قے تبھی تو کی ہے کیونکہ اس نے شراب پی تھی۔ ❶

غریب الحدیث......هَذَا أَحَبُّ إِلَيَّ: "هَذَا" کا مشارٌ الیہ "ثَمَانِينَ" کا لفظ ہے، کیونکہ ضمیر اور اسم اشارہ میں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ وہ قریب کے لفظ کی طرف راجع ہوتے ہیں اور یہاں "أَرْبَعِينَ" اور "ثَمَانِينَ" کے لفظوں میں سے زیادہ قریبی لفظ "ثَمَانِينَ" ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی کوڑوں کی سزا اس لیے زیادہ پسند تھی کیونکہ اس میں زیادہ عبرت اور سزا تھی۔

إِنَّهُ لَمْ يَتَقَيَّأْهَا حَتَّى شَرِبَهَا: یہ امر معروف ہے کہ اکثر شراب پینے والے قے کر دیتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مے خواری کی سزا میں "چالیس" کوڑوں پر بھی اقتصار کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دلیل "وَكُلٌّ سُنَّةٌ" کے الفاظ ہیں۔ جبکہ چالیس کوڑوں سے زیادہ بھی سزا دی جاسکتی ہے اس کی دلیل "جَلَدَ النَّبِيُّ ﷺ أَرْبَعِينَ، وَجَلَدَ أَبُو بَكْرٍ أَرْبَعِينَ، وَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِينَ" کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ چالیس کوڑے سنت نبوی وسنت صدیقی ہے جبکہ اسی کوڑے سنت فاروقی ہے۔

◈ "وَكُلٌّ سُنَّةٌ" یہ الفاظ بتلاتے ہیں دونوں سزاؤں میں سے ہر ایک پر عمل کرنا جائز ہے۔

◈ اگر لوگ کسی گناہ میں زیادہ آگے بڑھ جائیں تو اس کی سزا سخت کی جاسکتی ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ جو شراب کی قے کرے، اسے شراب پینے کی سزا دی جاسکتی ہے۔

بار بار شراب پینے والے کا حکم

1241,1242- وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ قَالَ فِي شَارِبِ الْخَمْرِ: ((إِذَا شَرِبَ فَاجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ فَاجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الثَّالِثَةَ فَاجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الرَّابِعَةَ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ)).

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (بار بار) شراب پینے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا: "جب کوئی (پہلی بار) شراب پیئے (اور وہ پکڑا جائے) تو اسے کوڑے مارو، پھر جب وہ (دوبارہ) شراب پیئے، تو اسے (اب بھی) کوڑے مارو، پھر جب وہ تیسری بار شراب پیئے، تو اسے (اب بھی) کوڑے (ہی) مارو، پھر جب وہ چوتھی بار شراب پیئے تو (اب کی بار) اس کی گردن ماردو۔" ❷

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَهَذَا لَفْظُهُ وَالْأَرْبَعَةُ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ مسند احمد کے ہیں۔

---

❶ صحیح مسلم: 1707.

❷ مسند احمد: 100/4- سنن ابی داؤد: 4482- جامع الترمذی: 1444- السنن الکبریٰ للنسائی: 5297- سنن ابن ماجہ: 2573- دیکھیں: ناسخ الحدیث: 403/1- علل الترمذی، ص: 232.

وَذَكَرَ التِّرْمِذِيُّ مَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ مَنْسُوْخٌ، وَأَخْرَجَ ذَلِكَ أَبُوْ دَاوُدَ صَرِيْحًا عَنِ الزُّهْرِيِّ.

اور امام ترمذی نے ایسے الفاظ ذکر کیے ہیں جو بتلاتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ جبکہ امام ابوداؤد نے زہری سے اس بات کو صراحت سے ذکر کیا ہے۔ ❶

غریب الحدیث:......اضْرِبُوا عُنُقَهُ: یعنی اس کو قتل کر دو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص پر تین بار حد جاری کی گئی، پر اس کی حالت نہ سدھری، اور آپ ﷺ اس کے سدھرنے سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس لیے اب اس کو جان سے مار دینا ہی بہتر تھا تاکہ مزید زندہ رہ کر گناہوں میں آگے نہ بڑھتا رہے۔

درایت الحدیث:......علماء کا اس حدیث پر عمل کرنے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ خود امام موصوف رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی بابت امام ترمذی نے ایسے الفاظ روایت کیے ہیں جو اس حدیث کے منسوخ ہونے کو بتلاتے ہیں۔ جبکہ امام ابوداؤد نے زہری کے واسطے سے اسی بات کو صریح ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ جبکہ جمہور علماء کا مذہب بھی یہی ہے کہ یہ حدیث یعنی اس میں مذکور حکم منسوخ ہے اور یہ کہ مے خواری کی لت آدمی کے خون کو مباح نہیں کرتی۔ خواہ کوئی دسویں بار بھی شراب پیتا پکڑا جائے۔ البتہ اسے کوڑے ضرور مارے جائیں گے۔

ظاہریہ نے حدیث کے ظاہر کو لے کر اس حکم کو محکم اور غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک چوتھی بار شراب پیتے ہوئے پکڑا جانے والا قتل کیا جائے گا۔ جبکہ اس سے قبل جب بھی پکڑا جائے اسے سزا بھی دی جائے گی۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس باب میں ایک درمیانی موقف اختیار کیا ہے، وہ یہ کہ جو بالکل ہی باز نہ آ رہا ہو، اس کی گردن بے شک ماردی جائے البتہ جو رک جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کا یہ مذہب بلاشبہ صحیح ہے کہ قتل صرف اسے ہی کیا جائے گا جس کے سدھرنے کی امید ختم ہو گئی ہو، البتہ یہ انتہا چوتھی بار تک ہی محدود نہیں ہوگی بلکہ یہ امام اور قاضی کی صوابدید پر ہوگی۔ چنانچہ امام جب بالغور دیکھ لے گا کہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود ایک آدمی اصلاح کی طرف نہیں آ رہا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ غرض راجح قول یہ ہے کہ اگر لوگ بدون قتل کے مے خواری کی لت سے باز نہ آئیں تو ان کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ اب وہ مفسدین فی الارض میں داخل ہو گئے ہیں۔

چہرے پر ضرب لگانے سے گریز کیا جائے

1243۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا ضَرَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَّقِ الْوَجْهَ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے ایک (کسی دوسرے کو کسی شرعی جواز کے تحت) مارے تو وہ (اس کے) چہرے (پر مارنے) سے گریز کرے۔'' ❷

---

❶ سنن ابی داؤد: 4485۔ جامع الترمذی: 2330۔ عن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ، امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ المعجم الاوسط للطبرانی: 5449۔ علامہ منذری نے "الترغیب والترهیب" (126/4) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

❷ صحیح البخاری: 2560۔ صحیح مسلم: 2612۔

مُتَفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......إِذَا ضَرَبَ أَحَدُكُمْ: یہ مارنا عام ہے۔لہٰذا یہ باپ کے اولاد کو تربیت و تادیب کی غرض سے مارنے کو بھی شامل ہے اور استاذ کی شاگرد کو تنبیہ و تعلیم کی غرض سے ضرب کو بھی شامل ہے۔ وعلی ہذا القیاس یہ حکم عام ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی جواز کے تحت دوسرے کو مارا جائے تو چہرے پر مارنے سے گریز کیا جائے کیونکہ چہرہ جملہ محاسن کا مرکز ہے۔ دوسرے اس میں دوسرے کی تذلیل و اہانت بھی ہے۔

یہ مسئلہ بیویوں کی تادیب کے تحت بھی مفصل ذکر ہو چکا ہے۔

مساجد میں حد قائم نہ کی جائے

1244- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تُقَامُ الْحُدُودُ فِي الْمَسَاجِدِ)).

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''حدود کو مساجد میں قائم نہ کیا جائے گا۔''[1]

اس حدیث کو امام ترمذی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔

شرح :......مساجد میں حدود قائم کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کیونکہ بسا اوقات حد کی شدت اور تکلیف کی وجہ سے آدمی کا بول و براز خطا ہو جاتا ہے، اور کبھی آدمی بہت زیادہ چیخ و پکار کرنے لگتا ہے جس میں بسا اوقات گالی گلوچ اور اناپ شناپ بھی شامل ہو جاتی ہے اور یہ دونوں باتیں ہی مساجد کے قیام کی غرض و غایت اور ان کی تعظیم و توقیر کے منافی ہیں۔

شراب پاک ہے یا ناپاک؟

1245- وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: لَقَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ تَحْرِيمَ الْخَمْرِ، وَمَا بِالْمَدِينَةِ شَرَابٌ يُشْرَبُ إِلَّا مِنْ تَمْرٍ.

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: رب تعالیٰ نے (جب) شراب کی تحریم نازل فرمائی تو اس وقت مدینہ میں صرف کھجور سے بنی شراب ہی پی جاتی تھی۔[2]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......لَقَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ تَحْرِيمَ الْخَمْرِ: اس جملہ میں تین تاکیدات ہیں:

(1) لام تاکید (2) قَدْ برائے تاکید

(3) اور محذوف قسم جس پر لام تاکید دلالت کر رہا ہے۔

غرض یہ تینوں تاکیدات خمر کی تحریم میں صریح ہیں جو اس بات کا بیان ہیں کہ ارشاد باری ''فَاجْتَنِبُوهُ''[3] میں امر صریح وجوب کے لیے ہے۔

---

[1] جامع الترمذي: 1401- امام ترمذی فرماتے ہیں: اسماعیل بن مسلم کے حافظہ کی بابت بعض محدثین نے کلام کیا ہے اور ہمیں یہ حدیث صرف اسی کے واسطہ سے ہی مرفوع ملی ہے۔ المستدرك للحاكم: 410/4- ابن عبدالبر ''التمهيد'' (442/23) میں کہتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس حدیث میں کوئی راوی ساقط نہیں۔ جبکہ خود امام موصوف رحمہ اللہ نے ''التلخيص الحبير'' (77/4) میں اس حدیث کے متعدد شواہد ذکر کیے ہیں۔

[2] صحيح مسلم: 1982.

[3] اس میں سورۂ مائدہ کی آیت رقم 90 کی طرف اشارہ ہے۔ (نسیم)

وَمَا بِالْمَدِينَةِ: مذکورہ "با" یہ "فِي" کے معنی میں ہے اور "با" کثرت کے ساتھ "فِي" کے معنی میں آتی رہتی ہے۔

شَرَابٌ يُشْرَبُ إِلَّا مِنْ تَمْرٍ: کھجور سے شراب کا بنایا جانا معروف ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ ایک تو شراب حرام ہے، دوسرے کھجور کی بنی شراب حرام ہے کیونکہ جب تحریم خمر کا حکم نازل ہوا تھا تو وہ اسی کھجور کی شراب کی بابت نازل ہوا تھا جو اس وقت مدینہ میں پی جاتی تھی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ابتداء میں شراب مباح تھی۔ اس کی دلیل "لَقَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ تَحْرِيمَ الْخَمْرِ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ تحریم و تحلیل کا حق صرف رب تعالیٰ کو ہے۔ اس کی دلیل بھی یہی "لَقَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ تَحْرِيمَ الْخَمْرِ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ بسا اوقات ایک پاک چیز بھی نجس اور خبیث بن جاتی ہے جیسے کھجور کہ جو پاکیزہ ترین میوہ ہے لیکن اگر اسی کی شراب بنالی جائے تو یہ خبیث ترین شے بن جاتی ہے کیونکہ شراب کو ام الخبائث کا نام دیا گیا ہے۔
- معلوم ہوا کہ بسا اوقات اوصاف شرعیہ ظاہر نہیں ہوتے، البتہ ہم ان اوصاف کو ان پر مرتب ہونے والے احکام کے واسطہ سے پہچانتے ہیں۔

شراب کتنی چیزوں سے بنتی ہے؟

1246۔ وَعَنْ عُمَرَ ﷺ قَالَ: نَزَلَ تَحْرِيمُ الْخَمْرِ، وَهِيَ مِنْ خَمْسَةٍ: مِنَ الْعِنَبِ، وَالتَّمْرِ، وَالْعَسَلِ، وَالْحِنْطَةِ، وَالشَّعِيرِ، وَالْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: شراب کی حرمت (جب) نازل ہوئی (تو) وہ اس وقت پانچ چیزوں سے بنتی تھی: انگور، کھجور، شہد، گندم اور جو (پھر فرمایا) اور خمر (یعنی شراب) وہ ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے۔ [1]

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

شرح :......اس اثر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اُس دور میں کن کن چیزوں سے شراب بنتی تھی، لیکن شراب کا بنایا جانا صرف ان پانچ چیزوں میں ہی محصور نہیں، اسی لیے آخر میں ایک جامع کلمہ بلکہ ایک قاعدہ کلیہ بیان فرما دیا کہ ہر وہ چیز شراب ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے۔ اس کی تفصیلی بحث باب کی تمہید میں بیان کی جا چکی ہے۔

ہر نشہ لانے والی شے شراب کے حکم میں داخل ہے

1247۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "ہر نشہ لانے والی شے خمر (یعنی شراب) ہے اور ہر نشہ لانے والی شے حرام ہے۔" [2]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5581۔ صحيح مسلم: 3032.

[2] صحيح مسلم: 2203.

شرح :...... مذکورہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا جامع کلمہ ہے جو اس باب سے متعلق ہر شے کو شامل ہے۔ اسی لیے شراب صرف انہی چیزوں کے ساتھ مخصوص نہ رہے گی جو شراب کی حرمت کے نزول کے وقت شراب کے طور پر پی جاتی تھیں۔ کیونکہ اس حدیث میں تعدادِ خمور کی بجائے خمر کی حد کو بیان کیا گیا ہے اور وہ اِسکار یعنی نشہ لانا ہے۔ لہٰذا ہر وہ شے جو نشہ لائے چاہے وہ جو بھی ہو، وہ شراب کے حکم میں داخل اور حرام ہے اور چاہے وہ پی جاتی ہو یا سونگھی جاتی ہو وہ بھی خمر کے حکم میں داخل ہے۔ جیسے عصر حاضر میں بے شمار ایسی چیزیں بھی ایجاد کی جا چکی ہیں جن کو سونگھ کر آدمی پر ہذیان اور طرب و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے ہیروئن، افیم وغیرہ کہ یہ بھی خمر کے حکم میں داخل ہیں بشرطیکہ ان کے استعمال سے عقل پر پردہ پڑ جائے۔

تنبیہ :...... مذکورہ حدیث کا منطوق تو یہ ہے کہ ہر نشہ لانے والی شے خمر اور حرام ہے، تب پھر اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا جو شے نشہ نہ لاتی ہو وہ حلال ہوگی۔

نشہ لانے والی شے تھوڑی ہو یا زیادہ حرام ہے

1248- وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ : ((مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ)) .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شے کی زیادہ مقدار نشہ لاتی ہو، اس کی تھوڑی شے بھی حرام ہے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ: یعنی جس شے کی زیادہ مقدار نشہ لاتی ہو چاہے کم مقدار نشہ نہ بھی لاتی ہو، وہ حرام ہے۔

مذکورہ ''مَا'' موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور شرطیہ بھی۔ لیکن اس کا شرطیہ ہونا اقرب ہے کیونکہ جواب پر ''فا'' داخل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں سد ذرائع کی شرعی حیثیت مذکور ہے۔
- معلوم ہوا کہ اگر کسی شے کی کم مقدار بھی نشہ نہ لاتی ہو اور زیادہ بھی نشہ آور نہ ہو تو وہ حلال ہے اور حرام نہیں ہے۔
- بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر کسی شے میں مسکر کی معمولی مقدار بھی ڈال دی جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کا مذکورہ حدیث کے الفاظ ''مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ'' سے استدلال خطا ہے۔ کیونکہ اس حدیث کا بے غبار مطلب یہ ہے کہ حرام وہ شے ہے جس کی کثرت نشہ لائے تو اس کی کم مقدار چاہے نشہ نہ بھی لائے وہ بھی حرام ہے جیسے اگر خالص شراب کے دس جام سے نشہ چڑھتا ہو، تو پانچ سے نشہ نہ بھی چڑھے یا ایک گھونٹ سے نشہ نہ بھی چڑھے تب بھی

---

❶ مسند احمد: 343/2- سنن ابی داؤد: 3681- جامع الترمذی: 1865- سنن ابن ماجه: 3393- ابن حبان (5382) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ المحلی لابن حزم: 500/7- السنن الکبریٰ للنسائی: 6820- من حدیث عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده- امام ابن حجر ''فتح الباری'' (43/10) میں فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد عمرو تک صحیح ہے۔

اس کا پینا حرام ہوگا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی غیرخمر مشروب میں سواں جز کسی الکحل یعنی شراب کا ڈال دیا جائے تو وہ شے حرام ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ صورت خمر اور غیرخمر کے مخلوط ہونے کی ہے نہ کہ خالص خمر کے پینے کی۔ لہٰذا جب غیرخمر میں خمر ملائی جائے گی تو دونوں کے تناسب کو دیکھا جائے گا۔ پس جو عنصر غالب ہوا اسی کا حکم بھی ہوگا، اگر خمر غالب ہوگی تو یہ خمر کہلائے گی اور اگر غیرخمر غالب ہوگا تو اس کو خمر کا حکم نہ دیا جائے گا۔

پانی یا دودھ میں کشمش ملانے کا حکم

1249۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُنْبَذُ لَهُ الزَّبِيْبُ فِي السِّقَاءِ ، فَيَشْرَبُهُ يَوْمَهُ ، وَالْغَدَ ، وَبَعْدَ الْغَدِ ، فَإِذَا كَانَ مَسَاءُ الثَّالِثَةِ شَرِبَهُ ، وَسَقَاهُ ، فَإِنْ فَضَلَ شَيْءٌ أَهْرَاقَهُ .

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کے لیے مشکیزہ میں کشمش کا نبیذ بنایا جاتا تھا۔ پس آپ ﷺ اس کو اس روز، پھر اگلے دن، پھر اس سے اگلے دن بھی نوش فرماتے تھے۔ پس جب تیسرے دن کی شام ہو جاتی تو خود (بھی) نوش فرماتے اور (دوسروں کو بھی) پلا دیتے پھر اگر کچھ بچ رہتا تو اس کو (انڈیل کر) بہا دیتے تھے۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......**يُنْبَذُ لَهُ الزَّبِيْبُ فِي السِّقَاءِ**: زبیب یعنی کشمش یا منقی یہ خشک انگوروں کو کہتے ہیں۔ یہ خاص قسم کے انگوروں سے تیار کی جاتی ہے۔

سِقَاءِ: یہ دباغت شدہ چمڑے سے بنے مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھا جاتا ہے اور نبیذ یہ انگوروں کو ایک دن کے لیے پانی میں بھگونے سے تیار ہوتا ہے جس سے پانی میٹھا ہو جاتا ہے اور اگر یہ نبیذ مشکیزہ میں تیار کیا جائے تو میٹھا ہونے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔

فَيَشْرَبُهُ يَوْمَهُ، وَالْغَدَ، وَبَعْدَ الْغَدِ: یہ کل تین دن بن جاتے ہیں آج، کل اور پرسوں۔

فَإِذَا كَانَ مَسَاءُ الثَّالِثَةِ.....: یعنی تین دن کے بعد آپ ﷺ اس مشروب کو باقی نہ رکھتے تھے یا ختم فرما دیتے، اور اگر پھر بھی بچ رہتا تو اس کو گرا کر بہا دیتے تھے۔ کیونکہ تین دن گزر جانے کے بعد اب وہ شیرہ یا نبیذ خمر بن جاتا ہے۔ جس کا بسا اوقات آدمی کو احساس تک نہیں ہوتا بالخصوص گرم علاقوں میں نبیذ بڑی جلدی خمر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تین دن پورے ہونے پر آپ ﷺ اس اندیشہ سے اس کو گرا دیتے تھے کہ مبادا خمر بن جائے۔ البتہ آج کل فریج اور فریزر کی سہولت دستیاب ہونے سے یہ ممکن ہے کہ ہم نبیذ کو تین دن سے بھی زیادہ رکھ سکتے ہیں اور اس کے خمر بن جانے کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہوتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ آدمی کے لیے لذیذ مشروبات اور ماکولات تیار کرنا اور ان کو استعمال کرنا جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ بھی نبیذ کا استعمال فرمایا کرتے تھے جو بلاشبہ ایک لذیذ اور فرحت بخش مشروب ہوتا ہے۔ اسی لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بلاشرعی

---

[1] صحيح مسلم: 2004.

عذر کے طیبات کے چھوڑنے کو مذموم قرار دیا ہے اور یہ رب تعالیٰ کی حلال اور پاکیزہ چیزوں سے امتناع کی صورت میں داخل ہے جو مذموم ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ اگر نبیذ اپنی طبعی حالت پر رہے تو تین دن کے بعد اسے استعمال نہ کیا جائے۔

◈ معلوم ہوا کہ شراب کو بہا کر ضائع کر دینا مشروع ہے کہ جب اس مشروب کے گرا دینے کا حکم ہے جس کے شراب بن جانے کا احتمال ہے تو نری شراب کو تو بدرجہ اولیٰ گرا دیا جائے گا۔

پھر یہ کہ جب شراب کی حرمت اتری تھی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن کے پاس بھی شراب تھی انہوں نے اس کو گرادیا تھا۔

حرام شے سے دوا دارو کرنے کا حکم

1250۔ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَ كُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ)). أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک رب تعالیٰ نے تمہاری شفا کو ان چیزوں میں نہیں رکھا جن کو اس نے تم پر حرام کیا ہے۔'' ❶
اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے، جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......**إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَل**: جعل سے پہلے ''جعلِ شرعی'' بھی مراد ہے اور جعلِ تکوینی بھی۔ گزشتہ اوراق میں بارہا اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

شِفَاءَ كُمْ: شفاء: یہ امراض سے صحت یاب ہونے کا نام ہے۔

فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ: تحریم یہاں منع کے معنی میں ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو بندوں پر حرام کیا ہے اور انہیں ان چیزوں کے استعمال سے روکا ہے، ان میں کسی مرض سے شفا بھی نہیں رکھی۔ کیونکہ اگر ان چیزوں میں شفا ہوتی تو ان میں مصلحت بھی ہوتی اور رب تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسی کسی چیز سے منع نہیں فرماتے جس میں مصلحت ہو، پس بندوں پر جو چیز بھی حرام ہے، اس میں لامحالہ مضرت ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حرام چیزوں کے ساتھ علاج معالجہ کرنا حرام ہے، اس کی دلیل ''لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَ كُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ'' کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مباح اشیاء میں شفاء ہوتی ہے۔ کیونکہ جب حرام میں شفاء ہونے کی نفی کر دی گئی تو اس کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ مباح اشیاء میں شفا کا امکان ہے۔

◈ پھر بعض چیزوں میں خود شرع شریف نے شفا رکھی ہے اور ان میں شفا کا ہونا تجربہ سے جانا گیا ہے۔ شرع شریف نے جن

---

❶ سنن البیہقی: 5/10۔ صحیح ابن حبان: 1391۔ اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے معلق روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حجر نے تغلیق التعلیق میں متعدد صحیح طرق سے اس حدیث کو موصول روایت کیا ہے۔ دیکھیں: التغلیق: 31/5.

چیزوں میں شفا رکھی ہے، ان میں سے ایک شہد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾ (النحل: 69)
''ان کے پیٹوں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لیے ایک قسم کی شفا ہے۔''
انہی چیزوں میں سے ایک حبۃ السوداء (کلونجی) بھی ہے، اس میں شفاء مجرب اور معروف ہے۔
اسی طرح پچھنے لگوانے میں شفاء کا ہونا بھی مجرب اور معروف ہے۔

◈ رہا یہ سوال کہ اگر کوئی حرام سے علاج پر مجبور ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حرام سے علاج نہ کروائے۔ کیونکہ ایک تو یہ امر یقینی نہیں کہ حرام شفاء ضرور دے گا، دوسرے یہ امر بھی حتمی نہیں کہ اس حرام کے سوا اور کوئی طریقہ شفا پانے کا نہیں۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ایک شے شفا دیتی ہے، جبکہ وہی شے دوسرے کو شفا نہیں دیتی اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں جن کو رب تعالیٰ کسی دوا دارو کے بغیر ہی شفا دے دیتا ہے۔
تب پھر حرام سے مرض کے جاتے رہنے کا اعتقاد غیر محقق ہے جبکہ حرام میں ملوث ہونے کا مفسدہ محقق ہے۔

◈ بعض جلدی امراض میں حرام جانوروں کی چربیوں سے افاقہ ہوتا ہے، ان کا استعمال جائز ہے البتہ نماز ادا کرنے سے قبل بدن کو اس حرام چربی سے پاک کرنا ضروری ہوگا۔

شراب کے ذریعے علاج کرنے کا حکم

1251- وَعَنْ وَائِلٍ الْحَضْرَمِيِّ، أَنَّ طَارِقَ بْنَ سُوَيْدٍ رضي الله عنه سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الْخَمْرِ يَصْنَعُهَا لِلدَّوَاءِ، فَقَالَ: ((إِنَّهَا لَيْسَتْ بِدَوَاءٍ، وَلَكِنَّهَا دَاءٌ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَغَيْرُهُمَا.

وائل حضرمی سے روایت ہے کہ: حضرت طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اس شراب (کے استعمال) کے بارے میں دریافت کیا جسے وہ دوا کے طور پر بناتے ہیں؟ (کہ آیا اس سے دوا کرنا جائز ہے یا نہیں)؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ شراب (ہرگز بھی) دوا نہیں (ہو سکتی) البتہ یہ (نری) بیماری (ضرور) ہے۔''[1]

اس حدیث کو امام مسلم اور امام ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

شراب میں شفاء نہیں

شرح :...... بعض دوا ساز شراب سے متعدد قسم کی دوائیں تیار کرتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ شراب اور اس سے بنی کسی بھی دوا میں شفا نہیں۔ بلکہ یہ تو نری بیماری ہے کیونکہ یہ حرام ہے اور حرام نری بیماری ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ نے اسی شے کو حرام فرمایا ہے جو مضر صحت ہوتی ہے۔
پھر فرض کیا کہ اگر کسی حرام شے کے استعمال سے کسی کو بدنی مضرت حاصل نہیں ہوتی، تب بھی اس کے استعمال میں شرعی مضرت تو ہے ہی، اور یہ بدنی مضرت سے کہیں زیادہ سنگین امر ہے۔ کیونکہ کسی شے کا حرام ہونا اس کے مطلق استعمال سے متنفر ہونے

[1] صحیح مسلم: 1984- سنن ابی داؤد: 3873.

کو مقتضی ہے نہ کہ صرف اسے دوا کے طور پر استعمال نہ کرنے کو مقتضی ہے۔

تنبیہ:...... مذکورہ حدیث گزشتہ حدیث کی موید ہے لیکن گزشتہ حدیث زیادہ عام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کا علم حاصل کرنے کے بے حد حریص تھے۔
- شراب میں ہرگز بھی شفا نہیں اور نہ اس کو دوا کے طور پر استعمال کرنا ہی جائز ہے۔
- شراب ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی بیماری ہے۔ کیونکہ یہ حرام ہے۔ یہ دلوں کا بھی روگ ہے اور بدنوں کے لیے بھی کسی کینسر سے کم نہیں۔ اس لیے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی مضرتیں اس کے منافع سے کم ہیں۔

5۔ بَابُ التَّعْزِيْرِ وَحُكْمِ الصَّائِلِ
تعزیر کا بیان اور حملہ آور کا حکم

تعزیر کی تعریف:

لغت کے اعتبار سے لفظ تعزیر متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی مدد کرنا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ﴾ (الفتح: 9)

''تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔''

کہ یہاں تعزیر مدد و نصرت کرنے کے معنی میں ہے اور اس کا ایک معنی تادیب ہے اور یہاں یہی معنی مقصود ہے۔

تعزیر کی حد

شرعاً تعزیر کی کوئی متعین حد نہیں۔ اس کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے جیسے:

- ...... پٹائی کرنا۔
- ...... مالی جرمانہ عائد کرنا۔
- ...... نظر بندی کرنا۔
- ...... سب لوگوں کے سامنے شرمندہ کرنا۔ وغیرہ۔

غرض تادیب کی حسب مقتضائے حال کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے جس سے دوسرے کو تنبیہ حاصل ہو اور یہ قاضی کی رائے کے سپرد ہوگا۔ چنانچہ ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے مالِ غنیمت میں غلول کرنے والے کے کجاوے کو جلوا دیا۔ اسی طرح ایک موقع پر سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے شراب کی ایک دکان جلوا دی۔ جو شراب بیچا کرتا تھا۔ [1] تعزیر کی یہ دونوں صورتیں مالی ہیں۔

تعزیر کی غیر مالی صورتوں میں سے ایک سر منڈوانا بھی ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصر بن حجاج کا سر منڈوا دیا تھا۔ [2] یہ بڑا خوبرو نوجوان تھا، مدینہ کی عورتیں اس پر فریفتہ ہوئی جاتی تھیں، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا سر منڈوا دیا، لیکن اس سے اس کا فتنہ اور بڑھ گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ سے شہر بدر کر دیا۔

البتہ یاد رہے کہ کسی کی داڑھی مونڈ کر یا منہ کالا کر کے تعزیر کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ داڑھی مونڈنا از خود حرام ہے اور حرام کو تادیب

---

[1] مصنف عبدالرزاق: 10051۔ الفتاویٰ: 113/28۔

[2] الفتاویٰ: 371/28۔

کا وسیلہ بنانا بھی حرام ہے۔البتہ کبھی کبھی منہ کالا کر کے تادیب کرنا ضرور جائز ہے بشرطیکہ اس کو دستور نہ بنالیا جائے۔

ہاں کسی کو گدھے پر الٹے منہ بٹھا کر شہر میں گھما کر تعزیر کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اس سے مجرم کو شرمندہ کرنا حاصل ہوتا ہے، کیونکہ کل تک جو قیمتی گاڑیوں میں پھرتا تھا، آج وہ گدھے پر سوار نظر آئے تو بلاشبہ اس میں اس کے لیے شرمندگی کا زبردست سامان ہے۔

بہرحال تعزیر کے باب میں یہ قاعدہ یاد رکھا جائے کہ تعزیر میں احوال کا اور لوگوں کے اختلاف کا بڑا دخل ہے۔

صائل:...... یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی جان، مال یا آبرو کو ضرر پہنچانے کے لیے اس پر حملہ کر دے۔

تعزیر کا حکم

کیا تعزیر کا سبب پائے جانے کے وقت اس کی تنفیذ امام پر واجب ہے یا یہ امر اس کی رائے اور اجتہاد کے سپرد ہے؟؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول اس کے وجوب کا ہے اور یہی مذہب بھی ہے [1] اور ایک قول یہ ہے کہ تعزیر واجب نہیں بلکہ یہ امام کی رائے کے سپرد ہے۔لیکن درست یہ ہے کہ تعزیر واجب ہے۔ البتہ اگر تعزیر میں کسی مفسدہ کے زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہو تو امام مصلحت کے پیش نظر تعزیر کو ساقط بھی کر سکتا ہے۔

تعزیر کہاں واجب ہے؟

علماء کا قول ہے کہ تعزیر ہر اس گناہ میں واجب ہے جس میں حد اور کفارہ نہ آتا ہو۔ تب پھر زنا اور سرقہ میں کوئی تعزیر نہ ہوگی کیونکہ ان میں حد مقرر ہے لہٰذا ان میں حد یہ تعزیر کی طرف سے کفایت کرے گی۔ اسی طرح رمضان میں دن میں بیوی کے ساتھ وطی کرنے پر بھی کوئی تعزیر نہ ہوگی، کیونکہ اس میں کفارہ آتا ہے۔

تعزیر کی مقدار اور اس کے ضوابط

اس عنوان پر ہم ذیل کی حدیث کے تحت روشنی ڈالیں گے۔

تعزیر کی مقدار کتنی ہے

1252۔ عَنْ أَبِي بُرْدَةَ الْأَنْصَارِيِّ رضي الله عنه أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا يُجْلَدُ فَوْقَ عَشَرَةِ أَسْوَاطٍ إِلَّا فِيْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ تَعَالَى)).

حضرت ابو بردہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ''(کسی معصیت کی سزا میں) اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے سوا دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں۔'' [2]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **لَا يُجْلَدُ:** مذکورہ ''لا'' نافیہ ہے اس لیے یہ جملہ خبریہ ہے اور ''لَا يُجْلَدُ'' کا فعل مرفوع ہو گا۔ البتہ معنی کے اعتبار سے یہ جملہ طلبیہ اور انشائیہ ہے اور جملہ خبریہ کا طلبیہ کے معنی میں آنا معروف اور شائع وذائع ہے۔

عَشَرَةِ أَسْوَاطٍ: ''أَسْوَاطٍ'' یہ سوط کی جمع ہے یہ کوڑے کو کہتے ہیں۔ یہ بل دیے چمڑے کی رسی کا نام ہے۔ البتہ کبھی اس

---

[1] المبدع: 108/9۔ الانصاف: 156/10۔

[2] صحيح البخاري: 6848۔ صحيح مسلم: 1708۔

لفظ کا اطلاق مطلق عصا پر بھی ہوتا ہے۔

إِلَّا فِي حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ: علماء کا اس بارے اختلاف ہے کہ یہاں حد سے مراد عقوبت شرعیہ ہے جو مقرر ہوتی ہے یا حکم مراد ہے۔ چاہے وہ واجب ہو یا حرام۔ لہٰذا ترکِ واجب پر یا ارتکابِ محرم پر سزا دی جائے گی؟ غرض ان دونوں باتوں میں سے یہاں کون سی بات مراد ہے، علماء کا اس میں اختلاف ہے۔

صحیح یہ ہے کہ یہاں دوسرا معنی مراد ہے اور وہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا اگر تو وہ حکم واجب ہے تو اس کے ترک پر کوڑے مارے جائیں گے یہاں تک کہ وہ واجب کو قائم کر لے، اور وہ کوئی حرام امر تھا تو اس کے ارتکاب پر کوڑے مارے جائیں گے یہاں تک کہ وہ اس حرام کو ترک کر دے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جہاں تادیب مقصود ہو وہاں دس سے زیادہ تھپڑ مارنا حرام ہوگا۔
- اور اگر اس کا تعلق کسی حکم شرعی سے ہو تو اس میں دس سے زیادہ تھپڑ یا کوڑے مارنا جائز ہوگا۔ جیسے زنا اور سرقہ کی حدیں ہیں جو دس سے زیادہ ہیں۔
- البتہ اگر دس کوڑوں سے کسی کی اصلاح نہ ہوتی ہو تو اس کو زیادہ بھی مارا جا سکتا ہے جیسے عورتوں کے ساتھ (صرف) خلوت کرنے والا کبھی دس کوڑوں سے نہ سدھرے گا، اس لیے اسے زیادہ کوڑے مارے جائیں گے۔ البتہ سو کوڑے نہ مارے جائیں گے کیونکہ زنا اس سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اس کے باوجود اس کی سزا سو کوڑے ہے۔
- علماء کا قول ہے کہ تعزیر میں اس حد تک نہ جایا جائے گا کہ وہ حد کو جا پہنچے۔
- اولاد کے ساتھ نرمی ومحبت کہ ان کی تادیب میں انہیں دس سے زیادہ کوڑے یا تھپڑ نہ مارے جائیں گے۔
- اولاد اور بیوی کی تادیب میں انہیں اس طرح نہ مارا جائے گا کہ انہیں سخت تکلیف پہنچے۔ جیسا کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تاکید فرمائی تھی کہ بیویوں کو ایسا نہ مارو کہ انہیں زیادہ تکلیف ہو۔
- غرض تعزیر کی مقدار دس تک ہے تو کیفیت میں اذیت سے کم درجہ کا مارنا ہے۔

غلطیوں کو معاف کرنا اور اس کے ضوابط کا بیان

1253- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((أَقِيلُوْا ذَوِي الْهَيْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ إِلَّا الْحُدُوْدَ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ.

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عزت (وشرافت) والوں کی لغزشوں سے درگزر کرو، سوائے حدود کے۔''[1] (کہ ان میں کسی کی رورعایت نہیں ہے)۔

اس حدیث کو امام ابوداود، امام نسائی اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**أَقِيلُوا:** یعنی معاف کرو اور درگزر کرو۔

ذَوِي الْهَيْئَاتِ: مراد عزت وشرافت والے لوگ ہیں جن کا اپنی قوم قبیلہ میں کوئی مرتبہ ومقام ہو۔ کیونکہ ان لوگوں پر

---

[1] سنن ابی داؤد: 4375- مسند احمد: 181/6- السنن الکبریٰ للنسائی: 7293- سنن البیہقی: 334/8- علامہ عقیلی "الضعفاء" (343/2) میں کہتے ہیں اس حدیث کے متعدد طرق ہیں جن سے کوئی طریق بھی ثابت نہیں ہے۔

برملا سرزنش بے حد اثر کرتی ہے جبکہ دوسرے لوگوں کو اس کی پرواتک نہیں ہوتی۔

عَثَرَاتِهِمْ: "عَثَرَاتِ" یہ عثرۃ کی جمع ہے۔ یہ لغزش اور غلطی کو کہتے ہیں اور لغزش ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کا نہ کرنا ہی مناسب تھا۔

إِلَّا الْحُدُودَ: کہ ان میں کسی کی معافی نہیں۔ ان میں شریف رذیل، آزاد غلام، مرد عورت، کمزور قوی سب برابر ہیں حتی کہ نبی کریم ﷺ نے حدود کے بارے میں یہ تک فرمایا ہے کہ ''اگر (بہ فرضِ محال) فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرے گی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جائیں گے۔''

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ تعزیر کی تنفیذ میں لوگوں کے احوال اور ان کے ظاہری مناصب کی رو رعایت کی جائے گی اور سب کو ایک ترازو میں نہ تولا جائے۔ لہٰذا یہ امر قاضی کی رائے اور مصلحت کے سپرد ہوگا کہ وہ کس کی تعزیر کرے اور کس کی نہ کرے۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ یہ تفریق کسی عظیم مفسدہ کو جنم نہ دے۔ تب پھر سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔
- ◈ ہر ایک کو اس کا مقام و مرتبہ دینا یہ شریعت کی حکمت میں سے ہے۔
- ◈ حدود کے قائم کرنے میں کسی کی معافی نہیں۔

مے خواری کڑی سزا کا مستحق ہے

1254- وَعَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه قَالَ: مَا كُنْتُ لِأُقِيمَ عَلَى أَحَدٍ حَدًّا فَيَمُوتَ، فَأَجِدَ فِي نَفْسِي إِلَّا شَارِبَ الْخَمْرِ فَإِنَّهُ لَوْ مَاتَ وَدَيْتُهُ.

www.KitaboSunnat.com

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایسا نہیں کہ کسی پر حد قائم کروں کہ جس سے وہ مر جائے کہ مجھے اس پر دکھ ہوگا۔ سوائے شراب پینے والے کہ اگر (میں اس پر حد قائم کروں کہ جس کے نتیجہ میں) وہ مر جائے تو (مجھے اس کے مرنے پر کوئی افسوس نہ ہوگا اور) میں اس کی دیت دے دوں گا۔ ❶

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......مَا كُنْتُ لِأُقِيمَ ❷: "لِأُقِيمَ" پر داخل لامِ مکسور یہ نفی کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ یہ لفظاً اس فعل پر داخل ہوتا ہے جس سے قبل "ما كان" یا "لم يكن" ہو اور یہ دونوں اسی اسم کی طرف منسوب ہوتے ہیں جس کی طرف لامِ مکسور کا مدخول علیہ فعل منسوب ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے:

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾ (آلِ عمران: 179)

''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھیں غیب پر مطلع کرے۔''

کہ "مَا كَانَ" کا جو فاعل ہے، اس لام کے مدخول علیہ فعل کی ضمیر بھی اسی کی طرف راجع ہے اور وہ لفظ اللہ ہے، اسی طرح

---

❶ صحیح البخاری: 6778.

❷ دیکھیں: القاموس الوحید: 1441- (نسیم)

مذکورہ حدیث میں "مَا كُنْتُ" کی ضمیر بھی اسی طرف راجع ہے جس طرف "لِأُقِيمَ" کی ضمیر راجع ہے اور وہ سند میں مذکور لفظ "عَلِيّ" ہے جو خلیفہ راشد امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔

فَيَمُوتُ: یعنی حد قائم کرنے سے وہ مر جائے۔

فَأَجِدُ فِي نَفْسِي: یعنی میں ایسا نہیں کہ کسی پر حد کو اس طرح قائم کروں کہ وہ مر ہی جائے۔ ہاں اگر ایسا ہو جائے تو میں اپنے جی میں اس پر قلق وندامت محسوس کروں گا۔

إِلَّا شَارِبَ الْخَمْرِ: فَإِنَّهُ لَوْ مَاتَ وَدَيْتُهُ: ہاں اگر شراب پینے والا حد جاری کرنے کے دوران ہلاک ہو جائے تو مجھے اس پر کوئی قلق وافسوس نہ ہوگا اور میں اس کی دیت ادا کر دوں گا۔

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی منقول ہے: کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے کچھ بھی مسنون نہیں ہے۔ [1]

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- امام پر واجب ہے کہ وہ حدود قائم کرنے میں احتیاط سے کام لے اور اسی طرح حد قائم نہ کرے کہ محدود (جس پر حد قائم کی گئی ہے) مر ہی جائے۔
- اگر محدود اقامتِ حد کے دوران مر جائے تو اس کی جان کا اتلاف غیر مضمون ہوگا۔ کیونکہ حد ماذون فیہ امر ہے۔ یعنی حد قائم کرنے کی اجازت ہے اور امرِ ماذون فیہ پر مرتب ہونے والا نقصان غیر مضمون ہوتا ہے۔ ہاں مضمون وہ نقصان ہوتا ہے جو امر غیر ماذون پر مرتب ہو۔ [2]
- معلوم ہوا کہ شراب پینے والے کو دی جانے والی سزا "حد" میں داخل نہیں۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بات صراحۃً منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے والے کی حد میں کسی بات کو مقرر اور مسنون نہیں ٹھہرایا۔ دوسرے اگر شرابی کی عقوبت حد ہوتی تو جنابِ علی رضی اللہ عنہ کو دیگر حدود کی طرح دل میں کوئی قلق محسوس نہ ہوتا۔
- معلوم ہوا کہ امام سے ہونے والی خطا کا ضمان اسی پر آتا ہے۔ اس کی دلیل "وَدَيْتُهُ" کے الفاظ ہیں۔ لیکن یہ الفاظ اس بابت صریح نہیں کہ اس سے مراد خود اپنے مال سے دیت دینا ہے یا بیت المال سے۔ کیونکہ امام کا بیت المال سے ضمان دینا بھی جائز ہے اور فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حاکم کی خطا کا ضمان بیت المال سے دیا جائے گا۔ [3] کیونکہ حاکم لوگوں کے لیے تصرف کرتا ہے۔ تب پھر وہ اپنے فعل پر مرتب ہونے والے نقصان کا ضامن کیونکر ہو سکتا ہے، پھر یہ کہ وہ اپنے فعل میں مجتہد بھی ہوتا ہے۔

حملہ آور کا حکم

1255- وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ   حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

---

[1] سنن ابی داؤد: 4486- دیکھیں: علل الدار قطنی: 92/4.

[2] المنثور فی القواعد للزرکشی: 163/3- قواعد ابن رجب: 82.

[3] اعلام الموقعین: 226/4.

رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ)).

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو اپنے مال کی خاطر مارا گیا، وہ شہید ہے۔'' ❶

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ قُتِلَ: مذکورہ ''مَنْ'' شرطیہ ہے اور ''قُتِلَ'' اس کا فعلِ شرط ہے اور ''فَهُوَ شَهِيْدٌ'' یہ جوابِ شرط ہے جس میں ''فا'' جزائیہ ہے۔

دُوْنَ مَالِهِ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کا مال چھیننے کے لیے اس پر حملہ کیا اور اس دوسرے نے اپنے مال اور اپنی جان کے دفاع میں اس سے مزاحمت یا لڑائی کی جس کے نتیجہ میں وہ مارا گیا تو وہ عنداللہ اجر کے اعتبار سے شہید ہو گا۔ کیونکہ اس نے حق کی خاطر دفاع کیا تھا اور اگر اس مزاحمت کے دوران وہ حملہ آور مارا گیا تو وہ ہرگز بھی شہید نہ ہو گا بلکہ وہ جہنم میں جائے گا کیونکہ وہ ناحق لڑ رہا تھا۔ اس بارے گزشتہ صفحات میں ایک مفصل حدیث بھی گزر چکی ہے۔

البتہ علماء نے اس باب میں ایک ضابطہ ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ آدمی حملہ آور سے دفاع کے لیے سہل سے سہل طریقہ اختیار کرے اور یہ نہ کرے کہ اِدھر وہ حملہ آور ہوا اور اُدھر اس نے گولی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ چنانچہ پہلے دھمکی دینے سے کام لے، اگر وہ دھمکیوں میں نہ آئے تو پکڑ کر باندھ دینا ممکن ہو تو اس حملہ آور کو باندھ دے اور اسے مارے نہیں۔ اس سے بھی کام نہ چلے تو اسے مارے، لیکن اگر حملہ آور جان لینے پر ہی تل جائے اور اسے مار ڈالنے کے سوا کوئی دوسری صورت نظر نہ آئے تو بلاشبہ اب اس حملہ آور کا خون اور قتل مباح ہو گا۔

البتہ ایک صورت اس تدریجی دفاع سے مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ اگر آدمی کو اندیشہ ہو کہ یہ مجھے فوراً ہی قتل کر دے گا تو وہ بھی اسے بلا تاخیر قتل کر سکتا ہے۔ جیسے چور گھر میں گھستے ہی اسلحہ تان لے اور گمان غالب ہو کہ یہ ابھی گولی چلا دے گا تو بلاشبہ اسے بلا تاخیر مار ڈالے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ آدمی کے لیے اپنے مال کی حفاظت کرنا اور اس کی خاطر لڑنا جائز ہے۔ یہ مسئلہ مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

◈ اپنے مال کا دفاع قابل ملامت نہیں کیونکہ مال کی خاطر مارا جانے والا شہید ہے۔

جان کا دفاع کرنے کا حکم

1256,1257۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ خَبَّابٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِيْ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((تَكُوْنُ فِتَنٌ، فَكُنْ فِيْهَا يَا عَبْدَ

حضرت عبداللہ بن خباب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (ماجد حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ) کو یہ بیان کرتے سنا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا

❶ سنن ابی داؤد: 4772۔ جامع الترمذی: 1418۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ سنن النسائی: 115/7۔ سنن ابن ماجه: 2580۔ امام ابن حبان (3194) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، علامہ ذہبی ''سیر اعلام النبلاء'' (126/1) میں کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد اچھی (صالح) ہے البتہ یہ اسناد منقطع ہے۔ امام دارقطنی نے ''العلل'' (426/4) میں اس کو بیان کیا ہے۔

اللّٰهِ الْمَقْتُوْلَ ، وَلَا تَكُنِ الْقَاتِلَ)) .

ہے: ''(عنقریب ایک کے بعد ایک) فتنے (رونما) ہوں گے تو اے (خباب!) تو ان فتنوں میں اللہ کا مقتول بندہ بننا اور قاتل نہ بننا۔'' ❶

أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي خَيْثَمَةَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ . وَأَخْرَجَ أَحْمَدُ نَحْوَهُ عَنْ خَالِدِ بْنِ عُرْفُطَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ .

اس حدیث کو ابن ابی خیثمہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام احمد رحمہ اللہ نے ایسی ہی حدیث حضرت خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ ❷

غریب الحدیث:...... **تَكُوْنُ فِتَنٌ**: مذکورہ فعل "كَانَ" تامہ ہے۔ یہ اپنے فاعل پر ہی تمام ہو جاتا ہے اور اسے خبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تب پھر "فِتَنٌ" اس کا فاعل ہونے کی بنا پر مرفوع ہو گا۔

فِتَنٌ:...... یہ فتنہ کی جمع ہے۔ یہ ہر اس امر کو کہتے ہیں جو لوگوں کو کسی آزمائش میں ڈال دے۔ یہ آزمائش ان کے دین میں بھی ہو سکتی ہے اور ان کی عزتوں، اخلاق اور جانوں تک میں بھی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ فتنے قولی بھی ہو سکتے ہیں جیسے ایک دوسرے کی تکفیر بازی، اور ایک دوسرے کو بدعتی اور فاسق کہنا، جس سے صرف ایک دوسرے سے دل پھٹتے ہیں اور باہمی نفرت و شقاق ہی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بظاہر یہاں فتنوں سے خون ریزیاں مراد ہیں۔

فَكُنْ فِيهَا يَا عَبْدَ اللّٰهِ الْمَقْتُولَ: لفظ "عَبْدَ" پر یا تو "كَانَ" کی خبر ہونے کی وجہ سے نصب ہے یا پھر منادی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ پس اگر تو یہ "كَانَ" کی خبر ہے تب پھر "الْمَقْتُوْلَ" یہ "عَبْدَاللّٰهِ" کی صفت ہو گا اور "یا" حرف ندا کا منادی محذوف ہو گا اور اگر یہ منادی ہے تو پھر "كَانَ" کی خبر "الْمَقْتُوْلَ" کا لفظ ہو گا۔

دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ جب فتنے اور خون ریزیاں سر اٹھا رہی ہوں تو ان میں مقتول تو بننا، پر قاتل نہ بننا۔ یعنی فتنوں میں اپنی جان کا دفاع نہ کرنا کیونکہ بسا اوقات جان کی مدافعت اور زیادہ فتنے بھڑکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس بات کی سب سے اعلیٰ مثال خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی ہے جنہوں نے باغیوں کے سامنے اپنی جان کا دفاع کرنے کی کوشش نہ کی تا کہ مدینہ رسول اور زیادہ خون ریزی کی آماج گاہ نہ بن جائے۔ اسی لیے اُنہوں نے محافظ پہرے داروں کو بھی لوٹا دیا تھا۔

تنبیہ:...... کیا جان کی مدافعت واجب ہے؟ علماء نے لکھا ہے کہ جان کی مدافعت واجب ہے۔ البتہ فتنوں کے زمانہ میں اگر جان کی مدافعت سے اور زیادہ خون ریزی پھیلتی ہو تو تب جان کی مدافعت واجب نہیں۔ ❸ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فتنہ میں جان کا دفاع حرام ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ مصلحت کو دیکھے۔ لہٰذا اگر تو کسی فتنہ کی جگہ حملہ آور بلوائی کے مار ڈالنے میں فتنہ کا اندیشہ نہیں تو بلا شبہ اس بلوائی کو مار ڈالے اور اگر اس بلوائی کو مارنے میں قبائل کے درمیان فتنہ اور زیادہ شدت اختیار کرتا ہے تب پھر جان کی مدافعت میں بلوائی کو مار ڈالنا واجب نہیں۔ غرض آدمی کو چاہیے کہ وہ مصالح عامہ کو مصالح خاصہ پر مقدم رکھے کہ یہ رب تعالیٰ کی شرع و قدر کے موافق ہے۔

---

❶ سنن الدارقطنی: 132/3۔ مسند احمد: 110/5۔ امام احمد نے یہ حدیث دو سندوں سے روایت کی ہے جن میں سے ایک کے رواۃ ثقہ ہیں۔

❷ مسند احمد: 292/5۔ اس حدیث کی اسناد میں علی بن زید ہے جو ضعیف ہے مگر حسن حدیث والا ہے۔

❸ الكافي في فقه ابن حنبل: 244/4۔ كشاف القناع: 155/6 .

12
كِتَابُ الْجِهَادِ
جہاد کے احکام ومسائل کا بیان

جہاد کی لغوی اور شرعی تعریف

لفظ جہاد یہ "جَاهَدَ يُجَاهِدُ مُجَاهَدَةً" سے مصدر ہے۔اس کا لغوی معنی کسی شاق امر کے حصول کے لیے امکان بھر قوت وطاقت خرچ کرنا ہے۔البتہ مذکورہ باب میں جہاد سے مراد رب تعالیٰ کے کلمہ کو اونچا کرنے کی غرض سے قوت وطاقت کو خرچ کرنا ہے۔تب پھر جہاد کی یہ تعریف اسلحہ کے ساتھ جہاد کرنے کو بھی شامل ہے اور وعظ وبیان کے ساتھ جہاد کرنے کو بھی شامل ہے کیونکہ ایک دین کا طالب علم اس لیے اپنی ہمت اور طاقت کو خرچ کرتا ہے تا کہ رب تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور دین الٰہی امت کا دستورِ عمل بن جائے۔ چنانچہ وہ کتاب وسنت کو پڑھ کر ان کو سمجھتا ہے، پھر ان کے علوم ومعانی اور احکامات کو لوگوں میں پھیلاتا ہے اور لوگوں کو اللہ کی راہ کی طرف بلاتا ہے۔تب پھر ایک طالب علم بھی مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم معرکہ کارزار کے مجاہد کو اور مجلس علم کے مجاہد کو دونوں کو، حقیقت میں اجر کے اعتبار سے برابر دیکھتے ہیں۔

بلکہ بسا اوقات علم کا مجاہد اجر میں آگے بڑھ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم معرکہ کارزار کے مجاہد کو تو مجاہدِ علم کا محتاج دیکھتے ہیں، لیکن مجاہدِ علم کو معرکہ کارزار کے مجاہد کا محتاج نہیں دیکھتے۔

جہاد کی اقسام

جہاد کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

(1) اسلام دشمنوں سے اسلحہ کے ساتھ جہاد کرنا۔

(2) اور علم وبیان کے ذریعے رب تعالیٰ کا کلمہ اونچا کرنے کے لیے جہاد کرنا۔

پھر جہادِ اعداء یعنی پہلی قسم کا جہاد مزید دو قسموں پر مشتمل ہے:

(1) دفاعی جہاد (2) اِقدامی جہاد

پس کافروں میں سے جو ہم پر حملہ آور ہوگا، اس سے کیے جانے والا جہاد دفاعی جہاد کہلائے گا اور جن کافروں سے ہم خود آگے بڑھ کر جہاد کریں گے وہ اِقدامی جہاد کہلائے گا۔ البتہ ہمارا یہ اِقدامی جہاد صرف اس لیے ہوگا تا کہ رب تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، چاہے وہ کافر مسلمان نہ بھی ہوں۔ لہٰذا اِقدامی جہاد کا مقصد کافروں کو تلوار کے بل پر مسلمان بنانا نہیں۔ بلکہ رب تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنا ہے۔ کیونکہ دین میں دوسروں کو داخل کرنے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرة: 256)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔''

بلکہ اِقدامی جہاد کا مقصد دینِ اسلام کا غلبہ اور سیطرت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبة: 33)

''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔''

اور یہی جہاد سے مقصود ہے۔ لہٰذا جب ہم کفار سے جزیہ لینا منظور کر لیں گے اور وہ ذلیل ہو کر جزیہ دینے لگیں گے تو پھر ''بلند کلمہ'' اللہ ہی کا ٹھہرے گا۔

دِفاعی جہاد کا وجوب اور اس کی شروط

دفاعی جہاد بدون تفصیل کے فرضِ عین ہے کیونکہ اپنے دین کا دفاع کرنا ہر ایک پر واجب ہے۔ کیونکہ دفاعی جہاد یہ اپنی جان کا اور بلادِ مسلمین کا دفاع ہے۔ اس لیے دفاعی جہاد واجب ہے حتیٰ کہ جو عورتیں یا قریب البلوغ اس جہاد میں شریک ہو سکتے ہوں وہ بھی ہوں۔ البتہ یہ شرط ہے کہ ہمیں ان کے پسپا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر ہمیں ان کے پسپا ہونے کا اندیشہ ہو تو ہم انہیں جہاد میں شریک نہ ہونے دیں گے۔

علماء نے بیان کیا ہے کہ کفار سے دفاعی جہاد اور قتال چار صورتوں میں واجب اور فرضِ عین ہے، جو یہ ہیں:

(1) **پہلی صورت:**...... جب جہاد کی صف تیار ہو جائے تو جہاد فرض ہو جاتا ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ○ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○﴾ (الانفال: 15-16)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا، ایک لشکر کی صورت میں ملو تو ان سے پیٹھیں نہ پھیرو۔ اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے، ماسوائے اس کے جو لڑائی کے لیے پینترا بدلنے والا ہو، یا کسی جماعت کی طرف جگہ لینے والا ہو تو یقیناً وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔''

پھر یہ کہ جب جنگ لگ جائے تو اس وقت پیٹھ دے کر بھاگنے کو نبی کریم ﷺ نے اُن کبائر میں سے شمار کیا ہے جو ہلاک کر دینے والے ہیں۔ [1]

---

[1] صحیح البخاری: 2766۔ صحیح مسلم: 89 عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ۔

البتہ جب دشمنوں کی تعداد دگنی ہوتو میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی رخصت ہے، چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ٥﴾ (الانفال: 66)
''اب اللہ نے تم سے (بوجھ) ہلکا کر دیا اور جان لیا کہ یقیناً تم میں کچھ کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں سے ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''
اسی لیے دشمنوں کی کثرت کے وقت بھاگ کھڑے ہونے کو علماء نے جائز قرار دیا ہے۔

(2) دوسری صورت:...... دفاعی جہاد کے فرضِ عین ہو جانے کی دوسری صورت اِستنفار کی ہے۔ یعنی جب امام یا حاکم نفیر عام کا حکم دے دے تو ہر ایک پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾
(التوبة: 38)
''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کے راستے میں نکلو تو تم زمین کی طرف نہایت بوجھل ہو جاتے ہو؟''

(3) تیسری صورت:...... تیسری صورت یہ ہے کہ دشمن ہمارے بلاد وامصار پر دھاوا بول دے اور ہمارے کسی شہر کا محاصرہ کر لے تو اب جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اب گویا کہ اہل اسلام معرضِ ہلاکت میں ہیں۔ اس لیے اہل اسلام کا دشمن کے گھیراؤ سے نکالنا اور ان کے محاصرے کو توڑ کر ان کے قدم پسپا کرنا فرض عین ہوگا۔

(4) چوتھی صورت:...... جب کسی خاص متعین شخص کی جہاد میں ضرورت پڑے تو خاص اس شخص کے حق میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ جیسے عصرِ حاضر میں کوئی جدید ترین جنگی جہاز F-16 کی اڑان کا ماہر ہو تو عین جہاد کے وقت اس شخص پر یعنی F-16 کے اڑانے کے ماہر پر جہاد فرضِ عین ہو جائے گا۔

غرض علماء نے جہاد کے فرضِ عین ہو جانے کی یہ چار صورتیں لکھی ہیں، ان کے علاوہ جہاد کی جملہ صورتیں فرضِ کفایہ ہیں۔
جہاد کے بے شمار فضائل ومناقب ہیں جن کا بیان قرآن وسنت میں آیا ہے، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

جہاد میں ''قدرت'' کی شرط اور اس کے ضوابط

یاد رہے کہ ہر واجب میں قدرت کا ہونا شرط ہے۔ قرآن وسنت کی متعدد نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: 286)
''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔''
اور فرمایا:
﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: 16) ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

اور فرمایا:

﴿وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: 78)

''اور اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کا حق ہے۔ اسی نے تمھیں چنا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

غرض جہاد فرض ہو جانے پر جہاد کرنے کی قدرت ہو تو جہاد فرض ہوگا اور اگر قدرت نہ ہو تو حرج مرفوع ہوگا۔ تب پھر جہاد کے فرض ہونے کے لیے قدرت واستطاعت شرط ہے اور سنت سے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

((إِذَا اَمَرْتُكُمْ بِاَمْرٍ فَاْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ)) ❶

''جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو جتنا تم اس میں سے کر سکو اس کو کر ڈالو۔''

یہ ارشاد ہر امر کو عام ہے۔ دوسرے ''بـــامر'' یہ شرط کے سیاق میں نکرہ ہے جو عموم کو متقاضی ہے۔ چاہے یہ امر اور اس کا عموم عبادات سے متعلق ہو یا جہاد سے یا کسی امر سے متعلق ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مکہ میں تیرہ سال تک شدید اذیتیں سہنے کے باوجود جہاد کا حکم نہ ملا کیونکہ اس وقت مسلمانوں میں جہاد کی قدرت واستطاعت نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں امریکہ، روس، اور برطانیہ جیسے ملکوں سے جہاد فرض نہیں کیونکہ ہمارے پاس موجود اسلحہ ان کے اسلحہ کے بالمقابل بمنزلہ چاقو چھری کے ہے۔ اس لیے ان ملکوں سے جہاد فرض ہونے کا قائل احمق ہے، رب تعالیٰ کی حکمت اور خود ہماری شریعت اس کا انکار کرتی ہے۔ البتہ ہم پر جو واجب ہے وہ رب تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرنا ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: 60)

''اور ان کے (مقابلے کے) لیے قوت سے تیاری کرو۔''

اور یاد رہے کہ ہماری سب سے اہم قوت جسے ہم نے دشمنوں کے خلاف تیار کرنا ہے، وہ ایمان اور تقویٰ ہے اور اسی قوت کے بل پر ہم دشمنوں کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوں گے اور خود اپنی سستی، ناامیدی، کاہلی، دنیا کی محبت اور موت سے کراہت جیسی مذموم صفات کو بھی ختم کر سکیں گے۔

بہر حال وجوبِ جہاد کے لیے ''قدرت'' شرط ہے اور عدمِ قدرت کے وقت شرع وقدر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہم پر جہاد بالقتال واجب نہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب

1258۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ مَاتَ، وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو اس حال میں مر گیا کہ نہ تو اس نے (عملاً ہی کوئی) جہاد کیا اور نہ اس کے جی میں اس کا خیال ہی آیا تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مر گیا۔'' ❷

---

❶ صحيح مسلم: 1337. ❷ صحيح مسلم: 1910.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......مَنْ مَاتَ: مذکورہ "مَنْ" شرطیہ ہے اور "مَاتَ" یہ فعل شرط ہے۔ تب پھر دوسرا "مَاتَ" یہ جواب شرط ہوگا۔

وَلَمْ يَغْزُ: مراد بالفعل جہاد نہ کرنا ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے جو "مَاتَ" کی ضمیرِ فاعل سے حال ہے۔

وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ: یعنی نہ اس کے جی میں اس بات کا خیال ہی آیا کہ اگر بالفعل جہاد قائم ہوا تو وہ اس میں ضرور شرکت کرے گا۔

مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ: اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مومن سچا مجاہد فی سبیل اللہ ہوتا ہے جبکہ ایک منافق سب سے بزدل ہوتا ہے۔ اس کے لیے راہِ خدا میں لڑنا اور سر بکف ہو کر میدانِ کارزار میں اترنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ تب پھر ایک منافق میں جہاد فی سبیل اللہ کا خیال کیونکر آ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی ایک تہائی تعداد غزوہ احد میں لوٹ کر مدینہ چلی آئی تھی اور موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر رب تعالیٰ کے پیغمبر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہ لوگ منافق تھے۔ ان کے دلوں میں جہاد کا خیال آ بھی نہیں سکتا کیونکہ جہاد کی غرض وغایت تو رب تعالیٰ کے کلمہ کا سر بلند ہونا ہے جو ایک منافق کا مطمع نظر ہرگز بھی نہیں ہو سکتا۔

اور شعبۃ سے مراد ایک جانب اور ایک پہلو ہے۔

اور رہا نفاق تو اس کی تعریف گزشتہ صفحات میں بارہا بیان کی جا چکی ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے کہ ایک سچے مسلمان کا دل جہاد فی سبیل اللہ کے جذبہ سے ہرگز بھی خالی نہیں ہو سکتا اور وہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے چنانچہ جیسے ہی اسے جہاد میں شرکت کا موقع ملتا ہے، وہ کبھی پیچھے نہیں رہتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- راہِ خدا میں عملاً جہاد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے، اگر اس کا موقع نہ ملے تو کم از کم جی میں اس بات کا جذبہ ضرور ہو کہ اگر جہاد قائم ہوا تو وہ اس میں جان و مال کے ساتھ ضرور شریک ہوگا۔
- نفاق کے کئی شعبے، پہلو اور جوانب ہیں۔ جو چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔ اس کی دلیل "عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی دل میں ایمانی صفات بھی موجود ہوں جبکہ ان کے ساتھ ساتھ کفریہ خصائل بھی ہوں کیونکہ نفاق ایک کفریہ خصلت ہے۔ حضرات اسلاف اور ائمہ اخلاف کا یہی مذہب ہے۔ اہل سنت والجماعت کا بھی یہی مسلک ہے کہ ایک انسان میں ایمانی اور کفریہ خصائل دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

اہل بدعت میں سے ایک طبقہ اس بات کا انکاری ہے۔ ان کے نزدیک یا تو دل میں خالص ایمان ہوگا یا پھر خالص کفر۔ یہ خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اسی طرح مرجئہ بھی اسی اعتقاد کے مالک ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں کے نزدیک ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔ تب پھر مثلاً زانی خوارج کے نزدیک کافر ہے اور دائرہ ایمان سے خارج ہے۔ ان کے نزدیک ایک زانی اور بت پرست دونوں برابر ہیں۔

جبکہ ایک طبقہ اس اعتقاد کا مالک ہے کہ مرتکب کبیرہ نہ تو کافر ہے اور نہ مومن۔ یہ ایمان اور کفر کے درجوں کے درمیان

کے ایک درجہ کے قائل ہیں۔ یہ معتزلہ کا اعتقاد ہے۔ ان کے نزدیک کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے وہ ایمان سے تو نکل گیا لیکن چونکہ مثلاً زنا کفر نہیں اس لیے یہ کفر تک بھی نہیں پہنچا بلکہ ایمان اور کفر کے بیچ بیچ میں پھر رہا ہے۔

لیکن الحمد للہ رب تعالیٰ نے اہل سنت والجماعت کو ہدایت سے سرفراز فرمایا اور صراطِ مستقیم پر چلایا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرتکبِ کبیرہ مومن ہے البتہ اپنے ارتکابِ کبیرہ کی وجہ سے فاسق ہے اور یہی قول مبنی بر عدل ہے۔

مشرکوں سے ہر قیمت پر جہاد کیجیے!

1259۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ((جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ساتھ جہاد کرو۔'' ❶

اس حدیث کو امام احمد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......جَاهِدُوا: یہ فعل امر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے مشرکوں کے معاملہ میں اپنی جانوں، مالوں اور زبانوں کے ساتھ اپنی امکان بھر قوت و طاقت کو خرچ کرو۔

مال خرچ کرنا اپنی جان پر بھی ہوسکتا ہے، کسی مجاہد پر بھی ہوسکتا ہے اور جہاد کے لیے جنگی سامان خرید کر دینے سے بھی ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ جو کسی غازی کو سامانِ جہاد مہیا کرتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے خود جہاد کر رہا ہے۔

جہاد کی دوسری صورت خود جہاد میں عملاً شریک ہونا ہے۔

رہی جہاد کی تیسری صورت تو وہ اپنی زبانوں کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور یہ خطبے دے کر، وعظ کر کے، اشعار کہہ کر جہاد کرنا ہے جن میں مشرکوں کی ہجو بیان کی جائے جبکہ دوسری طرف جہاد کے فضائل سنا کر مجاہدوں کے جذبات کو ابھارا جائے۔

زبانوں کے ساتھ جہاد کرنے کا ایک مطلب ''بیانِ حق'' کا فریضہ ادا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ تب پھر جہاد کی یہ قسم گزشتہ دونوں اقسام سے جدا ہو جائے گی اور اس جہاد سے مراد اہلِ علم کا وہ جہاد ہوگا جو وہ اپنی زبانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ علماء لوگوں کے سامنے رب تعالیٰ کی شریعت بیان کرتے ہیں اور اس کی طرف ان کو دعوت دیتے ہیں۔

غرض ایسے خطبے دینا جو جہاد پر ابھاریں، مجاہدوں کی کمر کسیں، جبکہ کافروں کی کمر توڑیں، ان کی ہمتیں پست کریں اور ان کے حوصلے شکستہ کریں، یہ جہاد باللسان ہے۔ بسا اوقات ترغیب و تحضیض کا ایک کلمہ تلوار سے زیادہ کاٹ رکھتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ جنابِ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مشرکوں کی ہجو کہنے پر ابھارا کرتے تھے۔ اس مقام پر یہ سوال نہ اٹھایا جائے کہ جہاد باللسان سے بیانِ حق مراد لینا اولیٰ ہے یا جہاد کی ترغیب و تحضیض مراد لینا اولیٰ ہے۔ کیونکہ ان الفاظ کو دونوں معانی پر حمل کرنا

---

❶ مسند احمد: 124/3۔ سنن النسائی: 7/6۔ المستدرك للحاکم: 91/2۔ امام حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے۔ سنن ابی داؤد: 2504۔ مسند ابی یعلی: 3875۔ جبکہ امام ابن حبان (4708) نے اور ضیاء الدین نے "المختارة" (36/5) میں اس حدیث کو امام ابو یعلی موصلی کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے۔ ابن حزم "الاحکام" (29/1) میں کہتے ہیں۔ یہ حدیث از حد صحیح ہے۔

ممکن ہے اور دونوں میں کوئی تناقض بھی نہیں۔ تب پھر قاعدہ یہ ہے کہ جب دو امور میں تناقض نہ ہو، اور دونوں کو بیک وقت مراد لینا بھی ممکن ہو تو دونوں کو مراد لینا یہ دونوں میں سے ایک پر اقتصار کرنے سے اولیٰ ہے۔

تب پھر "جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ" سے خاص مشرکوں کو ہی مراد نہ لیا جائے گا بلکہ اس میں کفار و منافقین سے جہاد کرنا بھی داخل ہوگا اور مشرکوں کا ذکر بطور تمثیل کے ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مشرکوں سے جہاد واجب ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے مشرکوں سے قتال میں ہمت طاقت خرچ کرنا واجب ہے۔

◈ جہاد جہاں جان کے ساتھ ہوتا ہے وہیں مال اور زبان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

عورتوں کا جہاد

1260۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيْهِ، هُوَ الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا: اے اللہ کے رسول! (کیا) عورتوں پر (بھی) جہاد واجب ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہاں! (عورتوں پر ایک) ایسا جہاد (واجب ہے) جس میں (اعدائے اسلام سے رُو در رُو) قتال نہیں۔ (اور) وہ حج اور عمرہ ہے۔" [1]

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔

شرح :...... نبی کریم ﷺ نے حج اور عمرہ کو عورتوں کا جہاد قرار دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ حج اور عمرہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے کیونکہ اس میں بھی جان اور مال کو خرچ کیا جاتا ہے۔ حج میں آدمی کو بے پناہ مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے بالخصوص سخت گرمی اور سخت سردی میں۔ تب پھر حج بھی حقیقت میں جہاد ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رب تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (البقرۃ: 195)

"اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

تو اس کے فوراً بعد یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (البقرۃ: 196) "اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔"

---

[1] سنن ابن ماجہ: 2901۔ صحیح البخاری: 2875.

جواس بات کی دلیل ہے کہ حج بھی جہاد فی سبیل اللہ کی ایک قسم ہے۔
حج اور عمرہ کی تعریف اوران کے تفصیلی احکام کتاب الحج میں گزر چکے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تحصیل علم کی حرص۔
- عورتوں میں بھی جہاد کی از حد رغبت۔
- معلوم ہوا کہ عورتوں پر بایں معنی جہاد فرض نہیں کہ وہ معرکہ کارزار میں مردوں کی طرح مشرکوں سے قتال کریں۔ بلکہ حاکم پر واجب ہے کہ وہ عورتوں کو جہاد میں قتال کی غرض سے شریک ہونے سے روکے۔ کیونکہ عورتوں میں مردوں کی سی ہمت، قوت، پامردی، شجاعت اور حوصلہ نہیں ہوتا۔
- تب پھر عورتوں کا جنگی جہازوں کا پائلٹ بننا بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ عورت کسی بھی وقت بزدلی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔
- حج اور عمرہ واجب ہیں۔

والدین کے ساتھ نیکی، حسن سلوک اوران کی خدمت جہاد پر مقدم ہے

1261,1262۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَسْتَأْذِنُ فِي الْجِهَادِ. فَقَالَ: ((أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟'' اس نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب پھر تم ان دونوں (کی خدمت) میں جہاد کرو۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **رَجُلٌ**: یہ آدمی مبہم ہے۔ لیکن صحابی کے نام کے مبہم ہونے سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔ دوسرے اصل مقصود حکم کی معرفت ہے جس کا مدار راوی کی تعیین پر نہیں۔

يَسْتَأْذِنُهُ فِي الْجِهَادِ: یعنی وہ جہاد میں شرکت کی اجازت مانگ رہا تھا۔

أَحَيٌّ وَالِدَاكَ: مذکورہ استفہام یہ استعلام کے لیے ہے نہ کہ انکار کے لیے ''حَيٌّ'' یہ اسم فاعل کا صیغہ صفت ہے جو مبتداء ہے اوراس کا فاعل ''وَالِدَاكَ'' یہ خبر کا قائم مقام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حَي کا صیغہ مفرد ہے جبکہ اس کا فاعل تثنیہ کا صیغہ ہے۔ تب پھر صیغہ صفت کا مبتداء ہونا اور ''وَالِدَاكَ'' کا خبر ہونا متعین ٹھہرا۔ کیونکہ اگر ہم ''وَالِدَاكَ'' کو مبتدا مؤخر کہیں تو وصف مبتداء کے مطابق نہ ٹھہرے گا اور یہ متعذر ہے کہ کسی مبتداء کی خبر وصف ہو اور وہ افراد، تثنیہ جمع میں مبتداء کے مطابق نہ ہو۔

وَالِدَاكَ: مراد ماں اور باپ ہیں، تب پھر یہ تغلیب کے باب میں سے ہے کہ ماں اور باپ دونوں کو والد کہہ دیا۔

نَعَمْ: یہ حرفِ جواب ہے۔ یعنی دونوں زندہ ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 3004- صحيح مسلم: 2549.

فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ: یعنی تمہارا جہاد ان دونوں کی خدمت میں ہے۔"فَفِيهِمَا" میں "فا" عاطفہ ہے جبکہ "فَجَاهِدْ" میں "فا" زائدہ ہے جو تحسین کلام کے لیے ہے۔جیسے "فقط" میں "فا" زائدہ ہے وگرنہ اصل لفظ صرف "قط" ہے۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تک آدمی پر جہاد فرضِ عین نہیں ہو جاتا تب تک جہاد کی دیگر فرضِ کفایہ کی صورتوں کے بالمقابل بوڑھے والدین کی خدمت پہلے واجب اور مقدم ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ والدین کا حق جہاد فرضِ کفایہ پر مقدم ہے۔البتہ یہ تقدیم علی الاطلاق نہیں۔
- جہاد میں جانے کے لیے ولی امر کی اجازت ضروری ہے۔البتہ یہ واجب نہیں، ہاں اولیٰ اور افضل ضرور ہے۔تاکہ جہاد میں کوئی ایسا آدمی نہ چلا جائے جو جہاد کا اہل نہ ہو۔
- نبی کریم ﷺ عالم الغیب نہ تھے اس کی دلیل "أَحَيٌّ وَالِدَاكَ" کے الفاظ ہیں۔
- مفتی کو چاہیے کہ وہ مسئلہ کی بابت پوری طرح پوچھ لے تاکہ مطلق جواب نہ دے۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے جہاد کی اجازت لینے والے سے پوچھا تھا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟
- جواب میں صرف "ہاں" بھی کہہ سکتے ہیں اور سوال کا اعادہ ضروری نہیں۔
- والدین کا حق بلاشبہ جہاد پر مقدم ہے، لیکن یہ تقدیم مطلق نہیں جیسا کہ دوسرے دلائل شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے۔تب پھر اگر تو والدین کا حق واجب ہے کہ جیسے خاص اس کے علاوہ والدین کی خدمت کرنے والا اور ان کے امور کو سنبھالنے والا دوسرا کوئی نہ ہو تو والدین کا حق جہاد پر مقدم ہوگا۔چاہے وہ جہاد فرض عین ہی کیوں نہ ہو سوائے ان چار صورتوں کے جن کا تمہید میں ذکر ہوا۔تب پھر والدین کی خدمت کا وجوب جو خاص ہے، وہ جہاد کے وجوب پر جو عام ہے مقدم ہوگا۔
- والدین کی خدمت کرنا اور ان کے کاموں کو سنبھالنا جہاد فی سبیل اللہ کے قائم مقام ہے۔
- شریعت اسلامیہ ایک گھرانے کو جوڑے رکھنے کی اور اس کے شیرازہ کے نہ بکھرنے کی بے حد حریص ہے۔

وَلِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ: ((ارْجِعْ فَاسْتَأْذِنْهُمَا، فَإِنْ أَذِنَا لَكَ، وَإِلَّا فَبِرَّهُمَا)).

اور مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایسی ہی حدیث مروی ہے۔جس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "واپس جاؤ اور (پہلے) ان دونوں سے اجازت مانگو۔پس اگر تو وہ دونوں تمہیں (جہاد میں جانے کی) اجازت دے دیں (تو ٹھیک) وگرنہ ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔[1] (کہ ان دونوں کی خدمت ہی تمہارا جہاد ہے)

شرح:...... مذکورہ روایت میں یہ اضافہ بتلاتا ہے کہ وہ سائل جہاد میں جانے کا اہل تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے والدین کی خدمت کرنے کو جہاد میں جانے پر ترجیح دی۔اسی لیے تو نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ (جاؤ جا کر پہلے) اپنے

---

[1] مسند احمد: 75/3۔ سنن ابی داؤد: 2530۔ امام ابن حبان (422) اور امام حاکم (114/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ (138/8) نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

والدین سے اجازت لو۔

فائدہ:......اس حدیث سے یہ قاعدہ اور عظیم فائدہ حاصل ہوا کہ جو حکم غیر کے حق کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اگر وہ غیر اس حق کو ساقط کر دے تو وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر بوڑھے والدین محتاج ہونے کے باوجود بیٹے کو جہاد پر جانے کی اجازت دے دیں تو بیٹے کے لیے جہاد پر جانا جائز ہوگا۔ ❶ البتہ اگر بیٹے کو اس بات کا یقینی علم ہو جائے کہ والدین نے اسے مارے شرمندگی اور خجالت کے جہاد پر جانے کی اجازت دی ہے یا انہوں نے اپنی اولاد پر غایت شفقت کی وجہ سے اجازت دی ہے حالانکہ انہیں اولاد کی خدمت کی ضرورت ہے تو ایسی حالت میں اولاد کے لیے والدین کی اطاعت لازم نہیں بلکہ وہ ان کی خدمت کرے گا۔

دارالکفر میں اقامت اختیار کرنے کا حکم

1263- وَعَنْ جَرِيرٍ الْبَجَلِيِّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((أَنَا بَرِيءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ الْمُشْرِكِينَ)).

رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَرَجَّحَ الْبُخَارِيُّ إِرْسَالَهُ.

حضرت جریر بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے بیچ رہتا ہے۔'' ❷

اس حدیث کو ائمہ ثلاثہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔

روایت الحدیث:......أَنَا بَرِيءٌ: یہ براءت سے ماخوذ ہے اور براءت یہ دست بردار ہونے کو کہتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مشرکوں کے درمیان رہنے والے ہر مسلمان سے بری اور دست بردار ہیں۔ چاہے وہ ایک گھر میں مشرکوں کے ساتھ رہ رہا ہو یا ایک شہر میں مشرکوں کے ساتھ رہ رہا ہو۔

فائدہ:......یہ حدیث بتلاتی ہے کہ کسی مسلمان کا مشرکوں کے بلاد و امصار میں رہنا حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسے شخص سے اپنی براءت کا اعلان فرمایا ہے۔ جو اس فعل کے کبیرہ گناہ ہونے کی دلیل ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا یہاں اقامت سے مطلق اقامت مراد ہے یا اقامت مطلقہ، تو مراد اقامت مطلقہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بلاد مشرکین میں تجارتی یا تعلیمی مقاصد کے لیے گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس کو اقامتِ مطلقہ شمار نہیں کیا جاتا یہ تو زیارت

---

❶ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اگر والدین یا دونوں میں سے ایک جہاد پر جانے کی اجازت نہ دیں تو جہاد پر جانا حرام ہے بشرطیکہ والدین مسلمان ہوں۔ فتح الباری: 140/6.

❷ سنن ابی داؤد: 2645- جامع الترمذی: 1604- یہ حدیث "سنن النسائی" (36/8) میں مرسل مروی ہے۔ امام ترمذی "العلل" (ص: 264) میں کہتے ہیں: میں نے اس حدیث کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث قیس بن ابی حازم سے مرسل مروی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ حماد بن ابی سلمہ نے یہ حدیث "عن الحجاج بن ارطاة عن اسماعیل بن ابی خالد عن قیس بن ابی حازم عن جریر رضی اللہ عنہ" کے طریق سے موصول روایت کی ہے تو انہوں نے اس سند کو محفوظ شمار نہیں کیا۔
اس حدیث کو سعید بن منصور نے بھی "السنن" (292/2) میں موصول روایت کیا ہے۔ صاحبِ ''الممام'' کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کو مسند روایت کرنے والا راوی ثقہ ہے لہٰذا ہم محدثین کے قاعدہ کو لیتے ہوئے اس موصول روایت کو مرسل روایت پر ترجیح دیں گے۔ دیکھیں: تحفۃ المحتاج: 514/2.

وعیادت کی قبیل میں سے ہے۔

رہائی زمانہ دیارِ مشرکین میں مسلم ممالک کا سفیر بن کر رہنا تو اگر تو وہ سفیرِ خیر ہے اور حق کو بیان کرتا، اسلام کی دعوت دیتا اور اپنے ملک پر لگنے والی تہمتوں اور جھوٹے الزامات کا جواب دیتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بلادِ مشرکین میں رہنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں بڑی مصلحتیں ہیں۔ کیونکہ عصرِ حاضر میں سفارت صرف اس بات کا نام نہیں کہ سفیر سیاسی امور میں اپنی حکومت کی ترجمانی کر دے بلکہ فی زمانہ سفارت میں اقتصادی اور عسکری معاملات بھی داخل ہیں جن کی لوگوں کو اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے آج کل بلادِ مشرکین میں اسلامی ملک کا سفیر بن کر رہنا جائز ہے اور جو صرف نام کے سفیر ہوں ان کی اقامت ناجائز ہوگی۔

دارالکفر سے ہجرت کرنے کے احکام

1264۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(مکہ) فتح (ہو جانے) کے بعد اب (مکہ سے) ہجرت (واجب) نہیں رہی البتہ جہاد اور نیت (باقی) ہے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......**لَا هِجْرَةَ**: ہجرت: یہ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جانے کا نام ہے۔ یا ایسے شہر سے جہاں بدعات غالب ہوں، ایسے شہر کی طرف انتقال کر جانے کو ہجرت کہتے ہیں، جہاں سنت غالب ہو۔ چاہے وہ بدعتی لوگ خود کو مسلمان بھی کہتے ہوں کہ یہ بھی بلادِ کفر کے لوگوں جیسے ہیں۔ ان کے شہر سے بھی ہجرت کر جانا واجب ہے۔ جب تک کہ آدمی ان میں سنت قائم کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔

مذکورہ "لا" نفی جنس کا ہے۔

بَعْدَ الْفَتْحِ: "الْفَتْحِ" میں الف لام عہد ذہنی ہے۔ مراد فتحِ مکہ ہے۔ تب پھر "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ" یہ "مِنْ مَكَّةَ" کی تقدیر کے ساتھ ہوگا یعنی فتح مکہ کے بعد اب مکہ سے ہجرت واجب نہیں رہی اور یہی معنی متعین ہے۔ کیونکہ فتح مکہ کے، اور دوسرے بلادِ کفار کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دوسرے بلادِ کفر مکہ فتح ہو جانے کے بعد اب بھی اپنے کفر پر باقی ہیں۔ اہل طائف کو ہی لے لیجیے جو مکہ کے بالکل قریب کے رہنے والے تھے۔ مکہ فتح ہو جانے کے بعد بھی اپنے کفر پر باقی تھے۔ تب پھر اس حدیث سے یہ مطلب مراد لینا متعین ہو گیا کہ فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت کر جانا واجب نہیں رہا۔

اس توجیہ سے ان علماء کا اشکال بھی جاتا رہا جو یہ کہتے ہیں کہ بھلا مکہ فتح ہو جانے کے بعد ہجرت کیونکر ختم ہو سکتی ہے حالانکہ ہجرت کا حکم تو قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ نفیِ جنس ایک متعین شہر کی ہے نہ کہ تمام شہروں کی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے مکہ سے ہجرت کر جانے کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

---

[1] صحيح البخاري: 2783- صحيح مسلم: 1353.

وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ: جہاد کا فرد شمنوں سے ہوگا۔ تب پھر جو تو جہاد کی قدرت رکھتا ہے وہ تو جہاد کرے گا اور جس میں جہاد کی قدرت نہیں، وہ جہاد کی نیت ضرور رکھے گا۔ یہی مطلب ہے "وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ" کا۔

اوران دونوں باتوں کا مطلب یہ ہے کہ قدرت والے کا عملاً جہاد میں شریک ہونا اور غیر قادر کا جہاد کی نیت رکھنا یہ مکہ سے ہجرت کر جانے کے اجر کا قائم مقام ہے۔ بلکہ بسا اوقات یہ مکہ سے ہجرت کرنے سے بھی بڑا عمل بن جاتا ہے۔ کیونکہ مجاہد کافروں سے ان کے بلاد میں جا کر قتال کرتا ہے۔ جبکہ مہاجر تو ان کے بلاد کو چھوڑ کر چلا آتا ہے البتہ ان سے قتال نہیں کرتا۔ تب پھر جہاد اجر کے اعتبار سے بڑا ہوا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مذکورہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب مکہ قیامت تک دارالاسلام رہے گا۔ کیونکہ اللہ نہ کرے۔ اگر مکہ دوبارہ دارالکفر بن جائے تو وہاں سے ہجرت کرنا واجب ٹھہرے۔ لیکن اس حدیث میں اس بات کی پیشین گوئی اور بشارت ہے کہ اب مکہ قیامت تک دارالکفر نہ بنے گا بلکہ دارالاسلام ہی رہے گا۔
- معلوم ہوا کہ جہاد یہ ہجرت کا قائم مقام ہے۔ بلکہ یہ ہجرت سے بھی بڑا عمل ہے۔
- معلوم ہوا کہ نیت فعل کا قائم مقام ہوتی ہے۔ اس کی دلیل "وَنِيَّةٌ" کے الفاظ ہیں۔ تب پھر مذکورہ "واو" یہ "اَوْ" کے معنی میں ہوگی۔ یعنی اب جہاد تو قدرت والے کے لیے ہے یا غیر قادر کی نیت ہے۔
- البتہ نیت چند شروط کے پائے جانے کے وقت عمل کی قائم مقام بنتی ہے، جو یہ ہیں:

(1) نیت سچی ہو۔

(2) آدمی نے عملی قدم اٹھالیا ہو لیکن غیر قادر ہونے کی وجہ سے عاجز رہ گیا ہو۔

اب نیت کے صادق نہ ہونے کا مسئلہ بھی واضح ہوگیا کہ ایسی نیت پر سرے سے کوئی اجر ہی نہیں ملتا چہ جائیکہ وہ عمل کی قائم بنے اور جب عملی قدم نہ اٹھایا تو نیت کا تو ثواب ملتا ہے، پر ایسی نیت عمل کی قائم مقام نہیں بنتی۔

- آدمی کو چاہیے کہ جب وہ ایک بات کی نفی کرے تو لوگوں کے سامنے دوسرا دروازہ کھول دے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کرنے سے منع فرمادیا تو خیر کے متلاشیوں کو دو اور دروازے دکھلا دیے۔ ایک جہاد کا اور دوسرا سچی نیت کا۔

جہاد میں اخلاص واجب ہے

1265- وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اس لیے جہاد کیا تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

سببِ حدیث اور قصۂ حدیث :...... مذکورہ حدیث کا قصہ اور اس کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ:

---

[1] صحيح البخاري: 2810- صحيح مسلم: 1904.

⊙ ......ایک آدمی قوم قبیلہ کی حمیت اور تعصب میں لڑتا ہے۔
⊙ ......ایک آدمی بہادر کہلوانے کے لیے لڑتا ہے۔
⊙ ......اور ایک آدمی محض دکھلاوے کے لیے لڑتا ہے۔
تو ان میں سے کون مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: ''جو اس لیے لڑتا ہے تاکہ رب تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اللہ کی راہ کا مجاہد وہ ہے۔'' بلاشبہ یہ ایک جامع مانع کلمہ ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ قَاتَلَ: مذکورہ ''مَنْ'' شرطیہ ہے اور ''قَاتَلَ'' یہ فعلِ شرط ہے۔
لِتَكُونَ: مذکورہ لام تعلیلیہ ہے۔
كَلِمَةُ اللّٰهِ: کلمہ سے مراد رب تعالیٰ کا دین ہے۔ الْعُلْيَا: یعنی اللہ کا دین سب دینوں سے سربلند ہو جائے۔
فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ: مذکورہ ''فا'' جزائیہ ہے اور یہ جملہ جوابِ شرط ہے۔
بلاشبہ یہ ارشادِ نبوی ایک جامع مانع کلام ہے جس کا ایک منطوق ہے تو ایک مفہوم بھی ہے۔ منطوق یہ ہے کہ جو اس لیے لڑا تاکہ اللہ کا دین اونچا ہو تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور جو اس کے علاوہ کسی اور نیت سے لڑے گا وہ مجاہد فی سبیل اللہ نہیں۔
مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جہاد میں اخلاص کی ترغیب۔
◈ جہاد کی مشروعیت کی طرف اشارہ کہ جہاد اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہے نہ کہ لوگوں کو تلوار کے زور پر زبردستی مسلمان بنانے کے لیے ہے۔
◈ جہاد کے باب میں لوگ بہت مختلف احوال کے حامل ہیں۔ سو کوئی کسی غرض سے لڑ رہا ہے تو کوئی کسی اور غرض سے لڑ رہا ہے۔ جبکہ سچا مجاہد وہی ہے جو دین کی سربلندی کے لیے سربکف ہو کر میدانِ جہاد میں اترا ہے۔
◈ معلوم ہوا کہ نیت کا اعمال پر بڑا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔
◈ دین اسلام بے حد قیمتی ہے اس لیے کسی مسلمان کو اس بات پر ہرگز بھی راضی نہ ہونا چاہیے کہ کوئی اور دین دینِ اسلام پر غالب آئے۔

جنگ بندی اور صلح کا جواز

1266- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ السَّعْدِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ مَا قُوْتِلَ الْعَدُوُّ)).

حضرت عبداللہ بن سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تک دشمن سے قتال رہے گا ہجرت ختم نہ ہوگی۔''❶

---

❶ سنن النسائي: 146/7- صحيح ابن حبان: 680- مسند احمد: 270/5- ابوزرعہ رازی کہتے ہیں: حضرت عبداللہ سعدی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث صحیح اور پختہ ہے جس کو ثبت راویوں نے ان سے روایت کیا ہے۔ دیکھیں: الاصابة: 113/4- امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''التفسیر'' (196/2) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ البتہ امام موصوف رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث اصحاب کتب ستہ میں سے کسی نے روایت نہیں کی۔ واللہ اعلم!

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......مَا قُوتِلَ: مذکورہ "مَا" ظرفیہ مصدریہ ہے جس کو علمائے نحو "مَا دَامَ" کہتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم "مَا" کے مدخول کو مصدر میں تبدیل کریں گے تو تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ "لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ مُدَّةَ قِتَالِ الْعَدُوِّ" یعنی جب تک دشمن سے قتال جاری ہے ہجرت باقی رہے گی۔ اب ایک حدیث میں صاف آتا ہے کہ یہ جہاد وقتال قیامت تک جاری رہے گا تب پھر یہ ہجرت بھی قیامت تک جاری رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاد کسی حال میں بھی ساقط نہ ہوگا اور اگر مسلمانوں کے ضعف کی وجہ سے کبھی وقتی طور پر موقوف اور ساقط ہو بھی گیا تب بھی نیت میں تو باقی رہے گا۔ لہٰذا جیسے ہی مسلمانوں کو قدرت حاصل ہوگی جہاد قائم ہو جائے گا۔ البتہ جہاد کو بالکل ختم ہی کر دینا سراسر خلافِ اسلام ہے۔ اس لیے کفار کے ساتھ ایسی کسی شرط پر کوئی صلح جائز نہ ہوگی کہ ہم ان سے کبھی قتال نہ کریں گے چاہے ان کی جنگی قوت ہم مسلمانوں سے دوگنی ہی ہو۔ البتہ ہم ان سے امن اور صلح کا معاہدہ کر سکتے ہیں، اور یہ امن معاہدہ مطلق بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم جہاد کو ختم ہی کر دیں۔ بلکہ ہماری نیتوں میں یہ امر موجود ہونا واجب ہے کہ جب بھی جہاد کی ضرورت پڑی تو ضرور کیا جائے گا۔ کیونکہ ہم پر اپنے دین کی حفاظت وحمایت اور سب ادیان سے اسے سر بلند کرنا واجب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ ہجرت قیامت تک جاری رہے گی۔ اس کی دلیل "مَا قُوتِلَ الْعَدُوُّ" کے الفاظ ہیں اور دشمن سے قتال قیامت تک جاری رہے گا۔
- معلوم ہوا کہ جو بھی غیر مسلم ہے، وہ مسلمان کا دشمن ہے۔ اس کی دلیل "مَا قُوتِلَ الْعَدُوُّ" کے الفاظ ہیں۔
- غیر مسلم دشمن سے مقاتلہ مشروع ہے۔ یہاں تک کہ یا تو وہ اسلام لے آئے یا ذلت کے ساتھ جزیہ دینے پر راضی ہو جائے۔

دشمن کو خبر کیے بغیر دھاوا بول دینے کا حکم

1267۔ وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ: ((أَغَارَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى بَنِي الْمُصْطَلِقِ، وَهُمْ غَارُّونَ، فَقَتَلَ مُقَاتِلَتَهُمْ، وَسَبَى ذَرَارِيَّهُمْ)). حَدَّثَنِي بِذَلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ.

نافع سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے بنی مصطلق پر حملہ کیا جبکہ اس وقت وہ غفلت میں تھے۔ پس آپ ﷺ نے ان کے جنگجوؤں کو تو قتل کیا جبکہ ان کے بچوں (اور ان کی عورتوں) کو قیدی بنایا۔ (نافع کہتے ہیں) یہ حدیث مجھے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کی ہے۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِيهِ: وَأَصَابَ يَوْمَئِذٍ جُوَيْرِيَةَ.

اور اس روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں: اُس روز سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو ملیں (یعنی قیدیوں میں سے آپ ﷺ کے حصہ

---

[1] صحيح البخاري: 2541۔ صحيح مسلم: 1730.

میں آئیں)۔

روایت الحدیث :......نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام ہیں۔امام موصوف یہ حدیث خلافِ عادت اس صیغہ کے ساتھ لے کر آئے ہیں۔کیونکہ یہ حدیث متصل ہے نہ کہ مرسل کیونکہ یہ حدیث نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔لیکن چونکہ امہات کتب میں یہ حدیث اسی طرح مروی ہے تو امام موصوف بھی اس حدیث کو اسی طرح ہی لے آئے ہیں۔

غریب الحدیث :......أَغَارَ : یہ "اِغَارَةٌ" سے ہے۔کسی پر تیزی کے ساتھ حملہ کرنا، دھاوا بولنا، یورش کرنا اور چڑھائی کرنا۔چاہے وہ دوست ہو یا دشمن۔

عَلٰی بَنِیَ الْمُصْطَلِقِ: عربوں کا ایک مشہور قبیلہ۔

وَهُمْ غَارُّونَ: را کی تشدید کے ساتھ۔یہ "غَرَارَةٌ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی غفلت ہے۔یعنی آپ ﷺ نے بنی مصطلق پر ان کی غفلت و بے خبری میں حملہ کر دیا اور انہیں پہلے سے خبر دار نہ کیا۔

مذکورہ جملہ حالیہ ہے اور یہ ''بنی مصطلق'' کے لفظ سے حال ہے۔

فَقَتَلَ مُقَاتِلَتَهُمْ: مُقَاتِلَةٌ یہ مُقَاتِل کی جمع ہے۔یہ جنگجو، لڑاکا، سپاہی اور لڑنے والے کو کہتے ہیں مقاتل کا اطلاق عاقل بالغ اور ایسے نوجوان پر ہوتا ہے جس میں ایسی کہنگی، بڑھاپا، یا مرض وغیرہ نہ ہو جو اسے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے سے اور معرکہ کارزار میں جنگی جوہر دکھلانے سے روک دے۔

سَبَی ذَرَارِیَّهُمْ: ذراری: کم سن اور نابالغ بچے، اسی طرح مطلق عورتوں پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

وَاَصَابَ: یعنی نبی کریم ﷺ نے پایا۔

جَوَیرِیَة: یہ امہات المومنین اور ازواجِ مطہرات میں سے ہیں۔رضی اللہ عنہا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دشمنوں کو خبر دار کیے بغیر بھی ان پر اچانک دھاوا بول سکتے ہیں۔البتہ یہ مسئلہ قدرے تفصیل کا محتاج ہے۔وہ یہ کہ: یا تو دشمن کو دعوت پہنچ چکی ہو گی تو ایسے دشمن کو آگاہ کیے بغیر بھی اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔یا ابھی تک اسے دعوت نہیں پہنچی، تو ایسے دشمن کی بابت واجب ہے کہ پہلے ہم اسے دعوت دیں، پھر اگر وہ نہ مانے تو اس پر حملہ کر دیں۔جیسا کہ اگلی حدیث میں اس کا تفصیلی بیان آرہا ہے۔

◈ جب دشمنوں کو دعوت پہنچ چکی ہو تو ان پر رات کو بھی حملہ کر سکتے ہیں۔اس کی دلیل "وَهُمْ غَارُّونَ" کے الفاظ ہیں۔یعنی وہ ایسی غفلت میں تھے کہ قتال کے لیے تیار نہ تھے۔بظاہر یہ نیند کی حالت کا بیان ہے جو رات کے وقت کو مقتضی ہے۔جس سے دشمن پر رات میں غارت ڈالنے کا جواز بھی معلوم ہو گیا۔

◈ دشمن کے جنگجوؤں کو قتل کیا جائے گا۔رہا یہ سوال کہ کیا ہم انہیں قیدی نہیں بنا سکتے؟ تو اس کا جواب اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ (محمد : 4)

''تو جب تم ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب انھیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو) مضبوط باندھ لو۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (الانفال: 67)

''کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے۔''

لہٰذا اگر تو ہم خوب خون ریزی کر کے دشمن کی قوت وشوکت کو توڑ چکے ہیں تو اب ان کے مقاتلین کو گرفتار کرنے میں اور قیدی بنانے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ ابتداء سے ہی انہیں قیدی بنانے میں مسلمانوں کی ذلت ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ دشمن کی اولادوں اور عورتوں کو قیدی بنانا جائز ہے۔ لہٰذا کم سن، نابالغ، مجنون، کم عقل قتال نہ کر سکنے والوں اور ان کو جن کی کوئی رائے نہ ہو، قتل کرنا جائز نہ ہوگا، ان سب کو قیدی بنایا جائے گا اور قتل نہ کیا جائے گا۔

◈ سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کی از حد فضیلت ومنقبت کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں قیدیوں میں سے چن کر اپنے حرم میں داخل فرمایا اور انہیں ام المومنین بننے کا شرف نصیب فرمایا۔

◈ معلوم ہوا کہ حسب نسب والے کے لیے، غلام بن جانے والے سے، نکاح کرنا درست ہے۔ جیسا کہ سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کہ وہ پہلے آزاد تھیں، پھر گرفتار ہو کر باندی بنیں لیکن آپ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا اور انہیں آزاد کر کے اپنے حرم میں داخل فرمایا۔

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایک ہاشمی کا غیر ہاشمیہ سے نکاح کرنا جائز ہے۔

لشکروں کے امیروں اور جرنیلوں کو نبی کریم ﷺ کی وصیتیں

1268۔ وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ ، أَوْصَاهُ فِيْ خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللّٰهِ ، وَبِمَنْ مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا ، ثُمَّ قَالَ: ((أُغْزُوْا عَلَى اسْمِ اللّٰهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، قَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ ، أُغْزُوْا ، وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا ، وَلَا تُمَثِّلُوْا ، وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا ، وَإِذَا لَقِيْتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ ، فَأَيَّتُهُنَّ أَجَابُوْكَ إِلَيْهَا فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ: ادْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِيْنَ ، فَإِنْ أَبَوْا فَأَخْبِرْهُمْ بِأَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ ، وَلَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِي الْغَنِيْمَةِ

سلیمان بن بریدہ اپنے والد (ماجد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ جب کسی لشکر کا یا کسی فوجی دستے کا کسی کو امیر بناتے تھے تو آپ ﷺ اسے اپنے جی میں رب تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت فرماتے تھے، پھر ارشاد فرماتے:

⊙ ...... اللہ کا نام لے کر اس کی راہ میں جہاد کرو۔

⊙ ...... جو اللہ سے کفر کرتا ہے اس سے لڑو۔

⊙ ...... جہاد کرو اور (مال غنیمت میں) خیانت نہ کرو اور (دشمنوں کے ساتھ) غدر (اور دھوکا) نہ کرو، اور (لاشوں کا) مثلہ نہ بناؤ اور بچوں کو قتل نہ کرو۔

⊙ ...... اور جب تمہارا مشرکوں میں سے اپنے دشمن سے سامنا ہو تو (پہلے) انہیں تین باتوں کی طرف بلاؤ، پس وہ ان تینوں باتوں میں سے تمہیں جس بات کا بھی جواب دیں (اور اس کو قبول کر

وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُجَاهِدُوْا مَعَ الْمُسْلِمِينَ ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا ، فَاسْأَلْهُمُ الْجِزْيَةَ ، فَإِنْ هُمْ أَجَابُوْكَ ، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ عَلَيْهِمْ بِاللّٰهِ تَعَالَى وَقَاتِلْهُمْ ، وَإِذَا حَاصَرْتَ أَهْلَ حِصْنٍ ، فَأَرَادُوْكَ أَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ فَلَا تَفْعَلْ ، وَلٰكِنِ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ ، فَإِنَّكُمْ أَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَمَكُمْ أَهْوَنُ مِنْ أَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّةَ اللّٰهِ ، وَإِذَا أَرَادُوْكَ أَنْ تُنْزِلَهُمْ عَلَى حُكْمِ اللّٰهِ فَلَا تَفْعَلْ ، بَلْ عَلَى حُكْمِكَ ، فَإِنَّكَ لَا تَدْرِيْ أَتُصِيْبُ فِيْهِمْ حُكْمَ اللّٰهِ تَعَالَى أَمْ لَا)) .

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

لیں) تو تم (اس بات کو) ان سے قبول کرلو، اور ان سے (قتال کرنے سے) رک جاؤ، (وہ تین باتیں یہ ہیں):

⊙...... (سب سے پہلے) انہیں اسلام کی دعوت دو، پس اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو تم ان سے (ان کے مسلمان ہو جانے کو) قبول کرلو۔

⊙...... پھر انہیں اپنے دار سے دارالمہاجرین کی طرف منتقل ہو جانے کی دعوت دو، پس اگر وہ (اس بات کے ماننے سے) انکار کر دیں تو انہیں بتلاؤ کہ وہ دوسرے دیہاتی مسلمانوں کی طرح (حقوق والے) ہوں گے اور انہیں مالِ غنیمت یا مالِ فے میں سے کچھ نہ ملے گا ہاں اگر وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کرتے ہیں (تو انہیں بھی غنیمت اور فے میں سے حصہ ملے گا)۔

⊙...... اور اگر وہ (اسلام لے آنے سے) انکار کر دیں تو ان سے جزیہ مانگو، پس اگر تو وہ تمہاری (یہ) بات مان لیں تو ان سے (جزیہ لینا) قبول کرو۔

⊙...... اور اگر وہ (جزیہ دینے سے بھی) انکار کر دیں تو ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور ان سے قتال (شروع) کر (د)و۔

⊙...... اور جب تم کسی قلعہ والوں کا گھیراؤ کرو، اور وہ تمہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیں کہ تم انہیں اللہ کا عہد اور اس کے نبی کا عہد دو تو ایسا مت کرنا البتہ تم انہیں اپنا عہد دو کیونکہ تمہارا اپنے عہدوں کو توڑنا، یہ تمہارا اللہ کے عہدوں کو توڑنے سے زیادہ سہل ہے۔

⊙...... اور جب وہ تمہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیں کہ تم انہیں اللہ کے حکم پر (قلعہ سے) نیچے اتارو، تو ایسا مت کرنا، بلکہ انہیں اپنے حکم پر (نیچے اتارنا)۔ کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تم ان لوگوں میں اللہ کے (صحیح) حکم کو پا لوگے یا نہیں۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا: ”أَمَّرَ“ یعنی امیر متعین ومقرر کرنا۔

عَلَى جَيْشٍ أَوْ سرية: مذکورہ ”أَوْ“ تنویع کے لیے ہے۔ جیش یعنی لشکر اور سریہ یعنی ایک فوجی دستہ اور مجاہدین کی ایک

---

[1] صحيح مسلم: 1731.

ٹکڑی میں یہ فرق ہے کہ جو فوجی دستہ چار سو مجاہدین پر مشتمل ہو اسے جیش کہتے ہیں اور جس کی تعداد اس سے کم ہو اس کو سریہ کہا جاتا ہے۔

أَوْصَاهُ: یعنی آپ ﷺ اس کو پختہ عہد دیتے تھے کیونکہ وصیت یہ دوسرے کو تاکید کے ساتھ کسی بات کا عہد دینے کو کہتے ہیں۔فِي خَاصَّتِهِ: یعنی اپنے جی میں۔

وَبِمَنْ مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا: یعنی آپ ﷺ اس امیر کو اس بات کا بھی پختہ عہد دیتے تھے کہ وہ اپنے مسلمان ساتھیوں یعنی لشکریوں اور مجاہدین کے ساتھ خیر اور نیکی والا سلوک کرے۔ کیونکہ امیر اپنے لشکر کا والی ہوتا ہے لہٰذا اس پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ان کے حق میں اسی بات کو اختیار کرے جس میں وہ خیر اور بھلائی سمجھے۔

بلاشبہ امیر لشکر کو کی جانے والی یہ وصیت الفاظ کے اعتبار سے نہایت مختصر ہے لیکن اپنی معنویت کے اعتبار سے بے حد وسیع ہے کیونکہ تقویٰ کی وصیت ہر نیکی کے کرنے اور ہر بدی کے ترک کرنے کو شامل ہے اور مسلمانوں کے ساتھ خیر کی وصیت ان کے دین و دنیا کی ہر خیر کو شامل ہے۔

اس مختصر مگر بے حد جامع اور وسیع ترین وصیت کے فرمانے کے بعد آپ ﷺ چند عمومی وصیتیں فرماتے جو یہ ہیں:

اُغْزُوا: یہ خطاب لشکر کے امیر اور لشکریوں سب کو ہے۔

عَلَى اِسْمِ اللهِ: یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے "سِرْ عَلَى بَرَكَةِ اللهِ" اللہ کی برکت کے ساتھ چلو مطلب یہ ہے کہ اپنے جہاد کو اللہ کے نام کے ساتھ ملا کر یعنی اللہ کا نام لے کر شروع کرو۔

فِي سَبِيلِ اللهِ: یہ جار مجرور "اغزوا فعل امر کے متعلق ہیں۔یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کو اللہ کا نام لے کر شروع کرو۔ اس میں اخلاص کے ساتھ جہاد کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللهِ: یہ کفر جحود، کفر انکار، شرک اور استہزاء باللہ کی سب صورتوں کو شامل ہے۔چنانچہ ان سب قسموں کے کافروں سے قتال کیا جائے گا۔

اُغْزُوا: یہ گزشتہ مذکورہ "اُغْزُوا عَلَى اِسمِ اللهِ، فِي سَبِيلِ اللهِ" کا تکرار ہے جو تاکید کے لیے ہے۔

وَلَا تَغُلُّوا: غلول یہ مالِ غنیمت سے اس کے تقسیم ہونے سے قبل چپکے سے کچھ لے لینے کو کہتے ہیں۔غرض مالِ غنیمت میں کی جانے والی خیانت کو اور مالِ غنیمت کو چھپا کر اپنے مال میں ملا لینے کو غلول کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ مالِ غنیمت میں سے اس کے تقسیم کیے جانے سے قبل کچھ نہ لو۔

وَلَا تَغْدِرُوا: غدر یہ کسی کے ساتھ کیے عہد کے توڑنے کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ کوئی عہد کر رکھا ہے تو اسے مت توڑو چاہے وہ عہد دشمنوں کے ساتھ ہی کیا ہو۔غرض جنگ کے دوران دشمنوں سے کیے عہد کو بھی نہ توڑا جائے گا۔

وَلَا تُمَثِّلُوا: یہ چوتھا حکم ہے۔مثلہ بنانا یہ لاش کے کان، ہونٹ اور ناک وغیرہ کاٹ دینے کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ اگر دشمن پر فتح حاصل ہو جائے تو فتح کے جوش میں ان کے مقتولوں کی لاشوں کا مثلہ نہ بنایا جائے کیونکہ یہ تغییر فی خلق اللہ میں داخل ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا وَلِيدًا: ولید کم سن اور نابالغ بچے کو کہتے ہیں۔

وَإِذَا لَقِيتَ: یعنی جب دشمن سے آمنا سامنا ہو۔

عَدُوَّكَ: دشمن فرمایا اور یہ نہیں فرمایا کہ جب تمہارا کسی بھی مشرک سے سامنا ہو۔ کیونکہ قتال صرف انہی مشرکوں سے کیا جائے گا جو قتال پر آمادہ ہوں۔ دوسرے اس میں دشمنوں پر ابھارنا بھی ہے۔

مِنَ الْمُشْرِكِينَ: مراد شرک اکبر کے مرتکبین ہیں جو اپنے شرک پر اڑے رہنے کے لیے قتال کریں۔ کہ ان مشرکوں سے قتال کیا جائے۔

فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ: یعنی ان سے ان تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کر لینے کا مطالبہ کرو۔

فَأَيَّتُهُنَّ أَجَابُوكَ إِلَيْهَا، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ: پس اگر وہ یہ باتیں مان لیں تو ان سے قتال موقوف کر دیا جائے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں۔

اُدْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ: اور اسلام سے مراد توحید و رسالت کی شہادت دینا اور نماز روزہ قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور حج کرنا ہے۔

فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ..... إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ: یعنی اگر وہ مسلمان ہونا قبول کر لیں تو ان سے اس بات کا مطالبہ کرو کہ وہ اپنا دار چھوڑ کر دار الہجرت یعنی دار الاسلام منتقل ہو جائیں اور دار الہجرت سے بظاہر مراد مدینہ نبویہ ہے۔ کیونکہ اس وقت لوگ مسلمان ہو کر ہجرت کر کے اسی مدینہ نبویہ کو آ رہے تھے۔ پھر مدینہ ہجرت کرنے میں مسلمانوں کی تکثیر اور وحدت بھی تھی۔ البتہ یہ انتقال اختیاری ہوگا نہ کہ لازمی کیونکہ آگے یہ ارشاد ہے:

فَإِنْ أَبَوْا فَأَخْبِرْهُمْ بِأَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ: پس اگر تو یہ انتقال لازمی ہوتا تو ان سے ہجرت نہ کرنے کو قبول نہ کیا جاتا اور انہیں یہ بھی نہ کہا جاتا کہ اس صورت میں وہ اعرابی مسلمانوں جیسے ہوں گے۔ یعنی جتنے حقوق ان کے ہوں گے اتنے ہی ان کے بھی ہوں گے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

وَلَا يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ: لہٰذا اگر تو وہ اپنے بلاد میں رہتے ہوئے پیش آمدہ جہادی مہموں میں مسلمانوں کے ساتھ ہو کر لڑتے ہیں تو انہیں غنیمت اور فے میں سے حصہ ملے گا۔ غنیمت اور فے میں اصطلاحی اور شرعی فرق یہ ہے کہ غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو قتال کر کے مشرکوں کے اموال میں سے حاصل ہوتا ہے جبکہ فے اس مال کو کہتے ہیں جو بدون قتال کے ہاتھ لگتا ہے۔ جیسے جزیہ، خراج، گم شدہ مال، لا وارث کی دیت کہ ان سب اموال کو بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

(اس اصطلاحی فرق کے باوجود اردو زبان میں دونوں کے لیے مالِ غنیمت کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے اس لیے بندہ عاجز مترجم نے ان کا ترجمہ کرنے کی بجائے ترجمہ میں ان الفاظ کو بعینہ ہی رکھا ہے)۔ [1]

اب تک کی تفصیل اسلام قبول کر لینے کی بابت تھی۔ لیکن اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے، تو اس صورت کا حکم یہ ہے:

فَاسْأَلْهُمُ الْجِزْيَةَ: یہ دوسری بات کا بیان ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو ان سے جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا پس اگر تو وہ جزیہ ادا کرنا منظور کر لیتے ہیں تو ان سے جزیہ لے لیا جائے گا۔

---

[1] دیکھیں: القاموس الوحید، ص: 1264۔ لفظ: الفيئ: مالِ غنیمت۔ (نسیم)

جزیہ

یہ وہ مال ہے جس کو مسلمانوں کا والی مسلمانوں کے زیر عہد کافروں پر مقرر کرتا ہے، تب پھر وہ کافر مسلمانوں کے زیر ولایت وحمایت اپنے دین پر باقی رہیں گے اور مسلمان اس جزیہ کے بدلے ان کے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔ جزیہ ادا کر کے ان کافروں کو جو حقوق حاصل ہوں گے وہ معروف ہیں۔

یہاں تک دو باتوں کا بیان پورا ہوگیا:

(1) ایک یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ (2) دوسری یہ کہ یا پھر وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

لیکن اگر نہ تو وہ اسلام قبول کریں اور نہ جزیہ دینے پر ہی آئیں تو تیسری بات یہ ہوگی۔

فَاسْتَعِنْ عَلَيْهِمْ بِاللّٰهِ: یعنی اب ان کے خلاف رب تعالیٰ سے مدد مانگو اور ان سے قتال شروع کر دو۔ یاد رہے کہ رب تعالیٰ سے ہر کام کے آغاز میں مدد مانگنا مسنون بھی ہے اور مطلوب و مقصود بھی ہے۔

یہاں پر ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ اوپر یہ ارشاد ہے: "**فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ**" جو اس بات کو مقتضی ہے کہ قتال ان تین باتوں کے علاوہ ہے کہ یہاں یہ ارشاد ہے کہ اگر وہ دشمن کافر ان تین باتوں میں سے کسی ایک بات کو قبول کر لیں تو پھر ان سے قتال نہ کیا جائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قتال ان تین خصائل کے علاوہ ہے۔

تب پھر مناسب ہے کہ ہم دوسری خصلت دار الہجرت کی طرف انتقال کو ٹھہرا لیں، تب یہ اشکال جاتا رہے گا۔ اس اشکال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ: "**فَإِنْ أَجَابُوكَ**" سے مراد اکثر کو لیا جائے۔ یعنی اگر وہ تین میں سے زیادہ باتوں کو مان لیں تب بھی ان سے قتال نہ کیا جائے گا۔

وَإِذَا حَاصَرْتَ أَهْلَ حِصْنٍ: "حَاصَرْتَ": یہ حَصْر سے ہے جس کا معنی تنگی کرنا ہے۔ تب پھر "حَاصَرَ" کا معنی کسی کو چاروں طرف سے یوں گھیر لینا ہے کہ وہ زبردست تنگی محسوس کرے حتی کہ اسے کشادگی اور نکل بھاگنے کی کوئی راہ نظر نہ آئے۔

فَأَرَادُوكَ أَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ، فَلَا تَفْعَلْ: یعنی وہ یہ کہیں کہ ہم اس بات پر قلعہ سے اترتے ہیں اور ہتھیار ڈالتے کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ یعنی عہد دیا جائے تو ایسا نہ کیا جائے اور ان کا یہ مطالبہ پورا نہ کیا جائے۔

آگے نبی کریم ﷺ اس ممانعت کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَإِنَّكُمْ إِنْ تُخْفِرُوا ذِمَمَكُمْ أَهْوَنُ مِنْ أَنْ تُخْفِرُوا ذِمَّةَ اللّٰهِ: إِخْفَار: یہ عہد شکنی کو کہتے ہیں۔

أَنْ تُخْفِرُوا: اس میں أَنْ مصدریہ ہے اور أَنْ کا مابعد مصدر میں تبدیل ہو کر "فَإِنَّكُمْ" کی کاف ضمیر سے بدل الاشتمال ہے اور تقدیری عبارت "إِنَّكُمْ خَفْرَكُمْ" ہے۔

خفر الذمة یہ عہد شکنی کو کہتے ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کا اپنے کیے عہد کو توڑنا یہ اللہ کے ساتھ کیے عہد کو توڑنے سے سہل اور خفیف ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے دشمنوں کو اللہ اور اس کے رسول کے عہد پر اتارنے سے منع فرمایا ہے۔

وَإِذَا أَرَادُوكَ أَنْ تُنْزِلَهُمْ...... بَلْ عَلَى حُكْمِكَ: اور جب وہ اللہ کے حکم پر اتارنے کو کہیں تو تب بھی انہیں یہ عہد نہ دیا جائے۔ بلکہ انہیں اپنے حکم پر اتارا جائے۔ حکم سے مراد اپنی رائے اور اجتہاد ہے۔

آگے نبی کریم ﷺ اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي أَتُصِيبُ فِيهِمْ حُكْمَ اللهِ أَمْ لَا: کیونکہ بسا اوقات آدمی اللہ کے حکم تک پہنچنے کی بابت اجتہاد کرتا ہے لیکن وہ اپنے اجتہاد میں خطا کر جاتا ہے اور بسا اوقات وہ اپنے اجتہاد میں درستی وصواب کو بھی پا لیتا ہے۔

یہ حدیث اس باب میں اساس کی حیثیت رکھتی ہے کہ ولی امر کو چاہیے کہ وہ جہاد قائم کرنے والوں کو وعظ ونصیحت کرے اور انہیں اس باب میں جملہ ضروری احکام سے آگاہ کرے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- لشکروں وغیرہ پر امیر مقرر کرنا مشروع ہے۔
- جیوش اور سرایا کو بھیجنا نبی کریم ﷺ کی میرت ہے۔
- امام کے لیے جیوش کو ان باتوں کی وصیت کرنا مشروع ہے جن باتوں کی وصیت نبی کریم ﷺ جیوش کو بھیجتے وقت کیا کرتے تھے۔ ان میں سرفہرست اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت ہے۔
- امیر اور ولی پر واجب ہے کہ وہ اپنے مامورین وغیرہ کے لیے ان باتوں کا انتخاب کریں جن میں ان کی خیر، بھلائی اور بہتری ہو۔
- مجاہدین کو اس بات پر ابھارا جائے کہ وہ اپنے ہر کام میں اللہ سے مدد مانگیں اور اللہ کی رضا کے لیے جہاد کیا کریں۔ اس کی دلیل "عَلَى اِسْمَ اللّٰه" اور "فِي سَبِيْلِ اللّٰه" کے الفاظ ہیں۔
- کافروں سے قتال واجب ہے۔ اس کی دلیل: "قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ اس عموم میں اسی حدیث کے ذریعے اس بات کی تخصیص بھی ہے کہ جو کافر جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں، ان سے قتال نہ کیا جائے گا۔
- مالِ غنیمت میں غلول حرام ہے۔ کیونکہ اس پر اخروی عقوبت کی بھی وعید ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

  ﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (آلِ عمران: 161)

  ''اور جو خیانت کرے گا قیامت کے دن لے کر آئے گا جو اس نے خیانت کی۔''

  اور دنیوی عقوبت بھی ہے چنانچہ ایک غلول کرنے والے کا کجاوہ جلا دیا گیا تھا۔ البتہ حیوان، اسلحہ اور مصحف کے غلول میں کوئی دنیوی عقوبت نہیں۔

اور بیت المال کی چوری اس حکم میں داخل نہیں۔ کیونکہ مذکورہ خطاب مجاہدینِ کارزار کو ہے۔ البتہ بیت المال کی چوری غلول کے مشابہ ضرور ہے۔ لہٰذا بعض کرپٹ اور لالچی لوگوں کا یہ کہنا ہرگز بھی روا نہیں کہ بیت المال اور حکومت کا مال حلال ہے، بلکہ بسا اوقات حکومت کا مال کسی معین شخص کے مال سے زیادہ حرام ہوتا ہے۔

- عہد شکنی حرام ہے، اس کی دلیل: "وَلَا تَغْدِرُوا" کے الفاظ ہیں۔ لیکن مبارزت کے دوران جو آدمی دوسرے کو قتل کرنے میدان میں اترا ہے، اس کے ساتھ کوئی عہد نہیں۔ لہٰذا اس کو دھوکا سے قتل کرنے میں کوئی غدر اور عہد شکنی بھی نہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ''جنگ ایک دھوکا ہے''۔
- جنگ کے دوران دشمنوں کی لاشوں کا مثلہ بنانا حرام ہے۔ اس کی دلیل "وَلَا تُمَثِّلُوا" کے الفاظ ہیں۔ یہ عموم بظاہر اس صورت کو بھی شامل ہے کہ اگر دشمن ہماری لاشوں کا مثلہ بنائیں تب بھی ہم ان کی لاشوں کا مثلہ نہ بنائیں گے۔ کیونکہ اس

عموم میں کسی صورت کا مستثنیٰ مذکور نہیں۔

البتہ یہ عموم بعض دوسرے عمومات کے معارض ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ (البقرة: 194)

''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ (النحل: 126)

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے۔''

دوسرے جب دشمن ہماری لاشوں کا مثلہ بناتے ہیں تو ان کی لاشوں کا مثلہ بنانا انہیں اس کام سے روکنا اور ان کی ذلت و اہانت ہے۔

تب پھر مذکورہ عموم میں دیگر عمومات کی بنا پر تخصیص ہوگی۔

◈ جنگ کے دوران بچوں کا قتل حرام ہے۔ اس کی دلیل: "وَلَا تَقْتُلُوا وَلِیدًا" کے الفاظ ہیں۔ دوسرے بچوں کو قتل کرنے میں مسلمانوں کے حق میں ان کی مالیت کو ضائع کرنا ہے۔ کیونکہ ان قیدی بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ لہٰذا ان کا قتل ان کی مالیت کا ضیاع ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کم سن بچوں کے قبولِ اسلام کے امکانات زیادہ ہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں کافروں کے عمر رسیدہ لوگوں کو قتل کرنے کا اور کم سن بچوں کو قتل نہ کرنے کا حکم ہے۔

◈ دشمنوں سے سامنا ہوتے ہی ان پر اچانک حملہ نہ کر دیا جائے بلکہ مذکورہ وصیت کے مطابق پہلے ان پر ان تین باتوں کو پیش کیا جائے جن کی تفصیل غریب الحدیث کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔

البتہ اگر کافروں کو پہلے اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے تو ان پر اچانک یورش بھی کی جا سکتی ہے جیسا کہ غزوۂ بنی مصطلق والی حدیث میں گزرا ہے۔

◈ مشرکوں سے جزیہ لینا جائز ہے۔ اس کی دلیل: "إِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ......" کے الفاظ ہیں۔

تب پھر یہ جزیہ صرف یہود و نصاریٰ اور مجوس کے ساتھ خاص نہ ہوگا۔

علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جزیہ صرف یہود و نصاریٰ سے ہی لیا جائے گا۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۝﴾

(التوبة: 29)

''لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔''

جبکہ یہود ونصاریٰ کے علاوہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾

(التوبة: 5)

''تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو۔''

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کی اور محمد رسول اللہ کی گواہی دے دیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں۔'' [1]

ان نصوص کی روشنی میں جزیہ صرف یہود ونصاریٰ پر ہوگا جبکہ دیگر اقوام کے لیے یا تو قتال ہے یا پھر اسلام۔

لیکن درست قول یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ سے جزیہ لینا اس بات کی دلیل نہیں کہ دوسروں سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ اس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے خاص اہل کتاب سے جزیہ لیا کیونکہ ان کے پاس نبی کریم ﷺ کے اخیر زمانہ میں مبعوث ہونے کا علم تھا۔ اس لیے ان سے جزیہ لے کر انہیں بلادِ اسلامیہ میں رہنے کا موقع دینے سے اس بات کی قوی امید تھی کہ وہ اسلام لے آتے۔

لیکن فی زمانہ یہود ونصاریٰ اسلام کے بدترین دشمن اور اسلام سے سب سے دور اور نفور ہیں۔ بالخصوص عربی یہودی اور نصرانی کہ وہ اپنے کفر پر از حد عناد کے ساتھ اڑے ہوئے ہیں اور کبھی سننے میں نہیں آیا کہ ان میں سے کسی نے اسلام قبول کیا ہو، جبکہ غیر عرب یہودی اور عیسائی اکثر مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ تب پھر راجح قول یہ ہے کہ فی زمانہ سب کافروں سے جزیہ لیا جائے گا۔

- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام میں داخل کرنے میں کسی پر زور زبردستی نہیں۔ کیونکہ اگر اسلام میں اکراہ ہوتا تو جزیہ قبول نہ کیا جاتا۔
- دشمنوں کو سب سے پہلے اسلام کی طرف بلایا جائے گا۔
- قبولِ اسلام کے بعد لوگوں کو دارالہجرت یعنی دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔ کیونکہ اس میں وحدتِ کلمہ بھی ہے اور معاشرتی وحدت بھی ہے۔ البتہ اگر اہل بادیہ مسلمان ہو جانے کے بعد اپنے علاقوں میں ہی رہنا چاہیں تو انہیں اموالِ غنیمت اور مالِ فے میں سے حصہ نہ ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جہاد میں حصہ نہ لیں گے۔
- جزیہ لینا جائز ہے اور یہ عقوبت نہیں۔ بلکہ یہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ ہے اور اگر اسے عقوبت بھی مان لیا جائے تو بھی شرع شریف میں عقوبت مالیہ کے مقرر کرنے کا جواز معلوم اور معروف ہے اور یہی راجح قول بھی ہے کہ مالی تعزیر جائز ہے۔
- دشمن کا محاصرہ کرنا جائز ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا محاصرہ کرتے ہوئے دشمن کا پانی بھی روکنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اگر تو پانی قطع کرنے میں ان کے ہتھیار ڈال دینے کا امکان زیادہ ہو تو جائز ہوگا وگرنہ نہیں۔ یہی حکم سامانِ رسد، اشیاء خورد ونوش، ادویات، اور دیگر اشیائے صرف کے روکنے کا بھی ہے۔ اسی حکم میں بجلی منقطع کرنا بھی داخل ہے کہ اگر تو ان باتوں سے

---

[1] صحيح البخاري: 25. صحيح مسلم: 20.

ان کے پسپا ہونے کا امکان زیادہ ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
پھر اگر مصلحت پانی وغیرہ کے کاٹ دینے میں ہو اور اس کے نتیجہ میں عورتیں بچے اور بوڑھے وغیرہ ہلاک ہوتے ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اب ان کی ہلاکت بالتبع ہے نہ کہ مقصود۔

- محاصرہ کرنے والے سپہ سالار کے لیے یہ جائز نہیں کہ جب کسی شہر اور قلعہ والے اس کے حکم پر اترنے کو اور ہتھیار ڈالنے کو تیار ہوں تو وہ ان کو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ پر اتارے۔ کیونکہ بسا اوقات دیا ذمہ توڑنا بھی پڑتا ہے۔
- شریعت کا ہر حکم علت کے ساتھ مربوط ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی علت معلوم ہوگی تو کوئی مجہول اور کوئی منصوص ہوگی تو کوئی غیر منصوص۔

اس لیے احکامات شرعیہ بتلانے والے کو چاہیے کہ وہ احکام کی علت بھی ضرور بیان کیا کرے کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ کا مبارک اسوہ یہی ہے کہ آپ ﷺ حکم کو علت کے ساتھ مربوط کر کے بیان فرمایا کرتے تھے۔

- جو حکم اللہ اور اس کے رسول دونوں سے ثابت ہو اس کو لفظ "ثُمَّ" کے بغیر بھی بیان کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل "ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ یہ اشتراک امور شرعیہ میں ہو، چنانچہ امور قدریہ میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو اس طور پر شریک نہ کیا جائے گا جو اشتراک اور تساوی کو مقتضی ہو۔
- معلوم ہوا کہ اعمال کے حسن و قبح میں تفاضل ثابت ہے اس کی دلیل: "أَهْوَنُ مِنْ أَنْ تُخْفِرُوا ذِمَّةَ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔
- محصور قلعہ والوں کو اللہ کے حکم پر اتارنا منع ہے۔ اس کی دلیل "فَلَا تَفْعَلْ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات آدمی کو اس حکم کے منسوخ ہو جانے کا علم نہیں ہوتا۔ یا اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ حکم عام ہے یا نہیں۔
- کسی حکم کو اسلام کی طرف منسوب کرنے سے قبل اس حکم کے محکم ہونے کی خوب تحقیق کر لینی چاہیے مبادا کہ وہ حکم ضعیف ہو۔

جنگ میں توریہ کرنے کا حکم

1269- وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَرَادَ غَزْوَةً وَرَّى بِغَيْرِهَا)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ جب کسی (جانب) غزوہ (پر جانے) کا ارادہ فرماتے تھے تو دوسری جانب کا توریہ فرماتے تھے۔ ❶
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:...... وَرَّى: یہ توریہ سے مشتق ہے۔ "توریہ" یہ کسی شے کی حقیقت کو چھپا کر دوسری بات کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔ تب پھر "وَرَّى بِغَيْرِهَا" کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نبی کریم ﷺ کسی غزوہ پر روانہ ہونے کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی دوسرے غیر مقصود غزوہ کا اظہار فرما کر اصل غزوہ کے ارادہ کو اخفاء میں رکھتے تھے تا کہ لوگوں کو آپ ﷺ کے اصل ارادوں کا علم نہ ہو۔

جیسے مثلاً آپ ﷺ کا غزوہ کا سفر جنوب کی طرف تھا تو آپ ﷺ اس کے بالکل برعکس سمت کے احوال دریافت

❶ صحيح البخاري: 2947- صحيح مسلم: 2769.

فرمانے لگ جاتے جس سے منافق لوگ یہ خیال کرنے لگتے کہ شاید آپ ﷺ بجانب شمال کسی غزوہ پر روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یوں انہیں آپ ﷺ کے اصل ارادۂ غزوہ کی خبر بھی نہ ہو پاتی تھی۔ البتہ غزوۂ تبوک میں درپیش دقتوں، مشقتوں ور پریشانیوں کے تناظر میں آپ ﷺ نے اس غزوہ کا اظہار برملا فرمایا تھا تاکہ ہر ایک اس سفر کی صعوبتوں اور شدائد کو دیکھ کر ن کے مطابق تیاری کر لے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جنگی مصالح کے پیش نظر دشمنوں سے توریہ کرنا جائز ہے۔ تاکہ دشمنوں کو ہمارے جنگی عزائم کی مطلق خبر نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ لشکروں کے انتظام وانصرام اور نظم وتدبیر میں زبردست حکمت سے کام لیتے تھے۔ انہی حکمتوں میں سے ایک یہ توریہ کرنا بھی ہے۔

◈ توریہ جائز ہے اور بسا اوقات مستحب بھی ہے۔ کیونکہ ہر جائز امر کسی صورت میں مسنون ٹھہرتا ہے تو کبھی واجب ٹھہرتا ہے۔ البتہ کبھی حرام یا مکروہ بھی بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مباح کا جائز، مسنون واجب یا حرام اور مکروہ تک ہونا بھی ممکن ہوتا ہے، جس کا مدار دلائل پر ہوتا ہے۔ سو جیسی دلیل ہوگی ویسا ہی حکم بھی ثابت ہو جائے گا۔

◈ یاد رہے کہ توریہ قول سے بھی ہوتا ہے اور فعل سے بھی ہوتا ہے۔

دن کے آغاز اور اختتام پر قتال کا بیان

1270۔ وَعَنْ مَعْقِلٍ، أَنَّ النُّعْمَانَ بْنَ مُقَرِّنٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((شَهِدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِذَا لَمْ يُقَاتِلْ أَوَّلَ النَّهَارِ أَخَّرَ الْقِتَالَ حَتّٰى تَزُوْلَ الشَّمْسُ، وَتَهُبَّ الرِّيَاحُ، وَيَنْزِلَ النَّصْرُ)).

معقل سے روایت ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ (متعدد غزوات میں شریک) رہا ہوں (پس میں نے دیکھا) کہ جب آپ ﷺ دن کے شروع میں قتال نہ فرماتے تھے تو قتال کو موخر فرما دیتے یہاں تک کہ آفتاب ڈھل جاتا اور ہوائیں چلنے لگتیں اور (اللہ کی طرف اللہ کی) مدد (آسمانوں سے زمین پر) اتر آتی۔ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ ثلاثہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔

قتال کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرنا

شرح:...... مذکورہ حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ قتال کے لیے ایسا مناسب وقت منتخب کرنا بھی جہاد کی حکمت و

---

❶ مسند احمد: 444/5۔ سنن ابی داؤد: 2655۔ جامع الترمذی: 1613۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 8637۔ امام ابن حبان (4757) اور امام حاکم (333/3) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث "صحیح البخاری" (3160) میں بھی ہے۔

تدبیر میں سے ہے جس میں فتح ونصرت کا امکان زیادہ ہو۔ جیسے دن کا ابتدائی وقت جب ایک طرف تو رات بھر کی نیند کے بعد بدن میں چستی، قوت، نشاط اور بشاشت ہوتی ہے جبکہ دوسری طرف وہ وقت ٹھنڈا، تازہ، فرحت بخش، اور جاں فزا ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ وقت قتال کے لیے بے حد مناسب ہوتا ہے۔

لیکن اگر کسی وجہ سے یہ وقت چوک جائے تو اب آفتاب کی حدت وتمازت کے وقت قتال ہرگز بھی مناسب نہیں کہ اس میں ضرر ہے۔ اس لیے اب قتال کو زوالِ آفتاب کے بعد تک مؤخر کر دینا چاہیے جبکہ فضا میں قدرے برودت آ جائے اور دن کی حرارت کی شدت ٹوٹ جائے۔ کیونکہ زوال کے معا بعد حرارت کی شدت میں کمی نہیں آجایا کرتی۔ تب پھر زوال آفتاب تک قتال کو مؤخر کرنے سے مراد آفتاب کی حدت میں کمی آ جانے تک مؤخر کرنا ہوگا۔

غریب الحدیث :...... حَتَّى تَزُوْلَ الشَّمْسُ: زوال کی مفصل تعریف نمازوں کے اوقات کی توضیح کے تحت بیان کی جا چکی ہے

تَهُبَّ الرِّيَاحُ: یہ بات معتاد ومجرب ہے کہ دِن کے آخر میں ہوائیں چلنے لگتی ہیں چاہے ان میں تندی ہو یا چاہے نرمی ہو۔ لیکن اللہ کے حکم سے ہوائیں چلتی ضرور ہیں۔ دِن کے آخر میں چلنے والی یہ ہوائیں ٹھنڈی ہوتی ہیں کیونکہ اس وقت آفتاب کی حدت ٹوٹ جانے سے فضا میں ٹھنڈک اور برودت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔

وَيَنْزِلَ النَّصْرُ: اس نصرت سے حتمی اور یقینی نصرت مراد ہے جسے نصرتِ غیبی کہتے ہیں یا مراد نصرت کا گمانِ غالب مراد ہے، کیونکہ وہ وقت بھی بشاشت اور مستعدی کا ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت میں قتال سے فتح یاب ہونے کا امکان غالب ہوتا ہے، تو یہاں ان دونوں باتوں کا ہی احتمال ہے۔ چنانچہ اگر تو یہ مراد ہے کہ رب تعالیٰ کی مدد دن کے آخر میں اترتی ہے تو ان الفاظ کو اسی معنی پر محمول کیا جائے گا۔ یا پھر یہ مراد ہے کہ دن کے آخر میں قتال فتح ونصرت کا باعث ہوتا ہے۔ تب پھر پہلا معنی نصرت کا سبب معنوی ہوگا جبکہ دوسرا معنی نصرت کا سبب حسی ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مناسب یہ ہے کہ قتال دن کے آغاز میں کیا جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ قتال کو دن کے آخر تک تب ہی مؤخر فرماتے تھے، جب کسی سبب سے آپ ﷺ دن کے آغاز میں قتال شروع نہ فرما سکتے تھے۔
- نبی کریم ﷺ قتال کے لیے نہایت مناسب اوقات کا انتخاب فرمایا کرتے تھے جن میں فتح یاب ہونے کا امکان غالب ہو اور خود مجاہدین کے جذبات میں جوش وولولہ اور بدنوں میں چستی ومستعدی اپنی انتہا کو ہو۔
- دن کے آخر میں عموماً ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور آفتاب کی حرارت وتمازت کا ٹوٹ جانا تو بدیہی اور معتاد ومجرب ہے۔
- وقت، موسم اور فضا کی مناسبت کو فتح کے حصول میں طبعی دخل حاصل ہے۔

رات کے حملہ کے وقت عورتوں اور بچوں کے قتل کا جواز

1271- وَعَنْ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ رضي الله عنه قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الذَّرَارِيْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، يُبَيَّتُوْنَ، فَيُصِيْبُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ سے مشرکوں کی ان بستی والوں کے بارے میں پوچھا گیا جن پر رات کو غارت ڈالی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ان

وَذَرَارِيِّهِمْ ، فَقَالَ: ((هُمْ مِنْهُمْ)).

کی عورتیں اوران کے بچے بھی (ان کے ساتھ) مارے جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ (عورتیں اور بچے جن میں یہ مشرک رات کو سوئے ہوتے ہیں) انہی میں سے ہیں۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......عَنْ اَهْلِ الدَّارِ: اہلِ دار سے مراد اہلِ قریہ اور اہلِ منزل ہیں حتی کہ اگر کچھ لوگ ایک خیمہ میں اکٹھے ہوں تو وہ بھی اہلِ دار کہلائیں گے۔ کیونکہ خیمہ کے بقدر جگہ نے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا ہوا ہے۔

يُبَيَّتُونَ: مراد رات کے وقت ان پر غارت ڈالی جاتی ہے۔

فَيُصِيبُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ وَذَرَارِيِّهِمْ: یعنی ان کی عورتیں اور بچے اس حملہ میں مارے جاتے ہیں۔

هُمْ مِنْهُمْ: ''هُمْ'' ضمیر کا مرجع ''النِّسَاء'' اور ''ذَرَارِی'' ہے۔ یعنی وہ ماری جانے والی عورتیں اور بچے ان اہل دار میں شمار ہوں گی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ رات کی یورش کے نتیجہ میں عورتیں اور بچے بھی مارے جائیں گے۔ جبکہ جنگ کے دوران عورتیں اور بچے قتل کرنا جائز نہیں۔ البتہ جو عورت یا بچہ خود عملاً قتال میں شریک ہو، اس کو مارنا جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ مقاتل ہے اور مذکورہ صورت ایک اعتبار سے ان کی جنگ میں شرکت کی ہے۔ اس لیے اگر رات کی یورش میں عورتیں اور بچے بھی مارے جائیں تو یہ جائز ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مشرکوں اور کافروں پر رات کو حملہ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ بسا اوقات جنگی ضرورت اس کو مقتضی ہوتی ہے۔
- مذکورہ حدیث سے علماء کے بیان کردہ اس قاعدہ کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات تبعاً وہ بھی ثابت ہو جاتا ہے جو استقلالاً ثابت نہیں ہوتا۔ ❷ جیسے عورتوں اور بچوں کا قتل جنگ میں ناجائز ہے لیکن رات کی اغارت کے تابع ہو کر یہ جائز ہے۔
- جو آدمی جن کے ساتھ اکٹھا ہوگا وہ ان کے حکم میں داخل ہوگا۔ اسی لیے مشرکوں کی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت آئی ہے۔
- اس حدیث سے بعض علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مشرکوں کی نابالغ اولاد ماں باپ کے تابع ہو کر مشرک کہلائے گی۔ اس کی دلیل: ''هُمْ مِنْهُمْ'' کا عموم ہے۔ تب پھر یہ بچے فطرت پر پیدا ہونے کے باوجود دنیاوی احکام میں تو اپنے والدین کے تابع ہوں گے، البتہ اخروی احکام میں ان کے تابع نہ ہوں گے۔

جنگ میں مشرکوں سے مدد نہ لی جائے گی

1272۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ تَبِعَهُ فِي يَوْمِ بَدْرٍ: ((ارْجِعْ، فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن پیچھے (پیچھے) چلے آنے والے ایک (مشرک) آدمی سے یہ فرمایا: ''لوٹ جاؤ کہ میں ایک مشرک کی مدد ہرگز بھی

---

❶ صحيح البخاري: 3012- صحيح مسلم: 1745.

❷ فتاوى ابن تيمية: 480/29- قواعد ابن رجب: ورق/133.

نہ لوں گا۔'' ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ . اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......فِي يَوْمَ بَدْرٍ: اس میں کفر و اسلام کی سب سے پہلی اور ایک عظیم ترین جنگ کی طرف اشارہ ہے جو جنگِ بدر کہلاتی ہے اور رب تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اس دن کو ''یوم الفرقان'' کے مؤقر لقب کے ساتھ یاد کیا ہے۔ جنگِ بدر کی تفصیلات معروف کتبِ سیرت میں مفصل موجود ہیں۔

بدر یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک معروف جگہ کا نام ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اسی جگہ پر اس جنگ کے واقع ہونے کی وجہ سے اس جنگ کا نام بھی جنگِ بدر ہے۔

اس دن جب آپ ﷺ نکلے تھے تو آپ ﷺ کے پیچھے ایک مشرک بھی ہولیا۔ آپ ﷺ نے اسے یہ ارشاد فرمایا:

اِرْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ: لوٹ جاؤ کہ میں ایک مشرک کی مدد ہرگز بھی نہ لوں گا۔ کیونکہ آپ ﷺ کو اس کافر پر اندیشہ تھا۔ کیونکہ ایک مشرک اعتماد اور بھروسہ کے لائق نہیں ہوتا۔ یہی حکم غیر مشرک یہود و نصاریٰ کا بھی ہے کہ جنگ جیسے نہایت اہم، سنگین اور نازک معاملہ میں ان پر ہرگز بھی بھروسہ نہ کیا جائے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو اس معاملہ میں بے حد سخت تھے حتی کہ وہ کسی نصرانی کو حکومتی امور کا کاتب تک رکھنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ کسی بھی کافر ومشرک سے مسلمان بہرحال بہتر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ (البقرة: 221)

''اور یقیناً ایک مومن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں اچھا معلوم ہو۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مشرکوں سے خوب احتیاط کی جائے اور ان کی معاونت اور ان سے استعانت سے بہرحال بچا جائے۔ اسی لیے جو مشرک ساتھ ہو کر مدد کرنے کو بھی نکلے تو اسے واپس کر دیا جائے۔

◈ البتہ مشرکوں اور کافروں سے مالی استعانت میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں ادھار لی تھیں۔

◈ رہا آپ ﷺ کا ہجرت کے موقع پر عبداللہ بن اریقط مشرک سے مدد لینا تو جنگ میں مدد لینا اور راستہ کی رہنمائی میں مدد لینا کہ ان دونوں باتوں میں واضح فرق ہے۔ چنانچہ حالتِ جنگ میں مدد لینا اور حالتِ امن میں اور وہ بھی رستہ دکھانے کے لیے مدد لینا کہ یہ دونوں باتیں جدا جدا ہیں۔

جبکہ ایک جواب یہ ہے کہ جس کافر ومشرک سے خیانت کا مطلق اندیشہ نہ ہو تو اس سے قتال میں اور جنگی امور میں مشاورت کرنے میں اور مدد لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ حکم کا مدار علت کے عدم اور وجود پر ہے۔ ❷

جنگوں میں عورتوں اور بچوں کا قتل منع ہے

1273- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ایک جنگ میں نبی

❶ صحيح مسلم: 1817. ❷ دیکھیں: البحر المحیط: 243/5- اصول الفقة لخلاف، ص: 40.

رَأَى امْرَأَةً مَقْتُولَةً فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ، فَأَنْكَرَ قَتْلَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کریم ﷺ نے (اختتامِ جنگ پر لاشوں کے درمیان) ایک عورت کو مقتول پایا تو (جنگ کے دوران) عورتوں اور بچوں کے قتل پر (بے حد) نکیر فرمائی۔ ❶

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:......فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ: اِس حدیث میں اُس غزوہ کی تعیین نہیں لیکن حکم کے بیان میں اس ابہام سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ مقصود حکم کی معرفت ہے۔

أَنْكَرَ قَتْلَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ: أَنْكَرَ سے مراد روکنا ہے اور یہ روکنا شدت کے ساتھ تھا۔ کیونکہ انکار یہ نہی سے اشد ہوتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات نہی بدون انکار کے بھی ہوتی ہے لیکن انکار نہی کو ضرور متضمن ہوتا ہے جس میں شدت بھی ہوتی ہے۔

النساء کا مطلق ذکر بالغ عورتوں کو بھی شامل ہے اور صبیان سے مذکر نابالغ مراد ہیں۔ جبکہ مؤنث نابالغ النساء کے عموم میں داخل ہے کہ جب بالغ عورتوں کا قتل ممنوع اور مذموم ہے تو نابالغ عورتوں کا قتل تو بدرجہ اولیٰ ممنوع، مذموم اور حرام ہوگا۔

عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت اس لیے ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کی مالی منفعت کی تفویت اور اس کو ضائع کرنا ہے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- منکر پر انکار واجب ہے چاہے منکر کا مرتکب حکم سے لاعلم ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس عورت کا قاتل بلاشبہ اس حکم سے واقف نہ تھا کہ جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کا قتل منع ہے۔
- جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کا قتل حرام ہے۔
- البتہ اگر دشمن ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کریں تو ہم بھی ان کی قوت دشوکت کو توڑنے اور ان کے دل، ہمت اور حوصلے شکستہ کرنے اور ان کی اہانت وتذلیل کے لیے ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کریں گے چاہے اس میں مسلمانوں کی مالی منفعت کا ضیاع ہی ہو۔ اگر چہ ❷ اس باب میں ان عورتوں اور بچوں کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن اس میں ایک مصلحت ہے اور وہ مسلمانوں کی عزت ووقار کی مصلحت ہے۔ کیونکہ بدلے میں ان کی عورتوں اور بچوں کا قتل نہ کرنے میں مسلمانوں کی ذلت ہے اور مسلمانوں کی عزت اور ان کا وقار مالی منفعت سے زیادہ اہم ہے۔
- اور اگر کفار اور اعدائے اسلام ہماری عورتوں کی عصمت دری کریں تو ہمیں بدلے میں ان کی عورتوں کی عصمت دری کرنے کی اجازت نہ ہوگی کیونکہ یہ فعل بذاتِ خود حرام ہے یعنی یہ فعل دوسروں کے احترام میں حرام نہیں بلکہ خود اپنی ذات میں حرام ہے اور حرام کے ارتکاب کی کسی حال میں اجازت نہیں ہوتی۔ لہٰذا بدلے میں مسلمانوں کو غیروں کی عورتوں کی عصمت دری کی اجازت نہ ہوگی۔

مشرکوں کے بڑی عمر والوں کے قتل کا جواز

1274۔ وَعَنْ سَمُرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

❶ صحیح البخاری: 3014۔ صحیح مسلم: 1744۔ ❷ شیخ رحمہ اللہ پر دورانِ درس کیے جانے والے ایک اعتراض کا جواب۔

اللّٰهِ ﷺ: ((اُقْتُلُوا شُيُوخَ الْمُشْرِكِينَ، وَاسْتَبْقُوا شَرْخَهُمْ)).
رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مشرکوں کے عمر رسیدہ لوگوں کو قتل کر دو، البتہ ان کے نابالغوں کو (زندہ) باقی رکھو۔'' ❶
اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... اُقْتُلُوا: مراد جنگ کے دوران قتل کرنا ہے نہ کہ ہر وقت اور ہر حال میں قتل کرنا مراد ہے اور یہ کہ ہمارے اور ان مشرکوں کے درمیان کوئی عہد بھی نہ ہو۔ لہٰذا اگر ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عہد ہے تو ہمیں ان کا قتل کرنا مباح نہ ہوگا۔

شُيُوخَ: یہ شیخ کی جمع ہے اور یہ چالیس سال سے زائد عمر والے کو کہتے ہیں لیکن یہاں وہ بالغ مراد ہے جو قتال کا اہل ہو۔
شَرْخَهُمْ: "شَرْخٌ" یہ شارخ کی جمع ہے اور نابالغ بچے کو کہتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جنگ کے دوران ہمارا ارتکاز کفار کے مقاتلین پر ہوگا۔ اس کی دلیل: "اُقْتُلُوا شُيُوخَ الْمُشْرِكِينَ" کے الفاظ ہیں۔
- اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرکوں کے نابالغ بچوں کو زندہ باقی رکھنا واجب ہے۔ اس کی دلیل "وَاسْتَبْقُوا شَرْخَهُمْ" کے الفاظ ہیں۔ تب پھر ان کی عورتوں کو بھی قتل نہ کرنا واجب ہوگا۔ کیونکہ جنگ کے دوران جو حکم بچوں کا ہے وہی عورتوں کا بھی ہے۔

جنگوں میں مبارزت یعنی للکارنے اور چیلنج کرنے کا بیان

1275- وَعَنْ عَلِيٍّ ﷺ، أَنَّهُمْ تَبَارَزُوا يَوْمَ بَدْرٍ.
رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.
وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ مُطَوَّلًا.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: انہوں نے بدر کے دن (مشرکینِ مکہ سے) مبارزت کی۔ ❷
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔
جبکہ ابو داؤد نے اس حدیث کو مطول روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... تَبَارَزُوا: یہ مبارزت سے مشتق و ماخوذ ہے اور مبارزت یہ بروز سے ماخوذ ہے، بروز یہ ظہور، سامنے آنے اور عیاں ہونے کو کہتے ہیں۔

جنگی اصطلاح میں مبارزت یہ ایک لشکر کے کسی جوان کا صف سے نکل کر دشمن کو للکار کر اس بات کی دعوت دینا ہے کہ ان میں سے بھی کوئی اس کے جوڑ اور ٹکر کا نکل کر سامنے آئے اور عموی جنگ سے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کے بازو کو آزمائیں

❶ سنن ابی داؤد: 2670۔ جامع الترمذی: 1583۔ مسند احمد: 20/12/5۔ ابن حزم نے "المحلی" (298/7) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کی اسناد میں حجاج بن ارطاۃ ہے جو ضعیف ہے، مزید برآں یہ کہ یہ حسن بصری کی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جن کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے اور اکثر محدثین کے نزدیک حسن بصری کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔

❷ صحیح البخاری: 3965۔ سنن ابی داؤد: 2665.

گے۔جس سے دونوں لشکر اپنے اپنے لشکریوں کی ہمت وقوت اور عزم وحوصلہ کا اندازہ کر لیں گے۔ چنانچہ جو دوسرے کو مار گرائے گا، اس سے اس کے لشکر کا حوصلہ بلند ہوگا جبکہ دوسرے لشکر کی ہمت ٹوٹے گی۔

بلاشبہ یہ بھی فتح ونصرت پانے کا ایک سبب اور جہاد کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ مبارزت کا نتیجہ دشمنوں کے دِلوں کا دہلا دینے کا ایک قوی ذریعہ اور فتح پانے کا ایک زبردست سبب ہے۔ البتہ مبارزت کی یہ شرط ہے کہ اس کے لیے وہی نکلے جس کو مبارزت کے داؤ پیچ سے آگاہی ہو اور اس کی جنگی تربیت، جسمانی قوت اور قلبی شجاعت بھی مطلوبہ معیار پر پوری اترتی ہو تاکہ اس کی شکست لشکر کی رسوائی، پسپائی اور حوصلہ شکنی کا سبب نہ بنے۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ مبارزت جائز ہے البتہ یہ جواز دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے:

(1) ایک یہ کہ مبارز مبارزت کرنے کے طریقہ سے پوری طرح واقف ہو۔

(2) دوسری یہ مبارز ہمت وقوت والا ہو۔

کیونکہ اگر اسے مبارزت کرنے کا طریقہ نہ آتا ہوا تو دھوکا کھا کر مغلوب ہو بیٹھے گا اور طاقتور نہ ہونے کی صورت میں تو مغلوب ہونا بدیہی ہے۔

کفار کی صفوں پر عمومی حملہ کرنے کا اور اس کے ضوابط کا بیان

1276۔ وَعَنْ أَبِيْ أَيُّوبَ ﷺ قَالَ: إِنَّمَا أُنْزِلَتْ هَـٰذِهِ الْآيَةُ فِيْنَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ، يَعْنِيْ قَوْلَهُ تَعَالَى: وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ.

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت، وہ فرماتے ہیں کہ: اے گروہ انصار! بے شک یہ آیت ہمارے بارے میں اتری تھی۔ ان کی مراد یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ: 195) ''اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو''

قَالَهُ رَدًّا عَلَى مَنْ أَنْكَرَ مَنْ حَمَلَ عَلَى صَفِّ الرُّوْمِ حَتَّى دَخَلَ فِيْهِمْ.

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس آدمی پر رد کرتے ہوئے ارشاد فرمائی جس نے رومیوں کی صفوں پر حملہ کر کے ان میں گھس جانے والے پر انکار کیا تھا[1] (کہ اس آدمی نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ یہ تو اپنے آپ کو خود موت کے منہ میں دھکیلنا ہے حالانکہ رب تعالیٰ نے تو اس بات سے منع فرمایا ہے اور اس نے اپنی بات کی تائید میں یہ مذکورہ آیت پڑھی تھی۔ اس پر حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اس شخص پر رد کرتے ہوئے فرمایا کہ سن لو! کہ یہ آیت تو ہم لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی)۔

رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ

اس حدیث کو ائمہ ثلاثہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی، امام

---

[1] سنن ابی داؤد: 2512۔ جامع الترمذی: 2972۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 11029۔ امام ابن حبان (4711) اور امام حاکم (94/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔

والحاکم۔ ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّمَا أُنْزِلَتْ : یہاں مذکورہ آیت کو نازل کرنے والے کا ذکر نہیں کیونکہ وہ معلوم ہے اور وہ رب تعالیٰ کی ذات ہے۔

مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ: لفظ "مَعْشَرَ" یہ منادی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہاں حرف ندا محذوف ہے۔ معشر ایک گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک جماعت کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی نصرت وتائید کرتے ہیں۔

اور انصار یہ مدینہ کے دو مشہور قبیلوں اوس اور خزرج کا نام ہے اور اس نام کے رکھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں قبائل نے نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کر آنے والے مسلمانوں کی زبردست مدد و نصرت کی تھی۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ (الانفال: 74)

''اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔''

وَلَا تُلْقُوا: یہ لا تضعوا کے معنی میں ہے۔ یعنی اپنے آپ کو اس چیز کے سامنے مت ڈالو جو تمہیں ہلاک کر ڈالے۔

بِأَيْدِيكُمْ: مراد "بِأَنْفُسِكُم" ہے اور ید کا نفس کے معنی میں استعمال لغت عرب میں کثیر ہے۔

قَالَهُ رَدًّا عَلَى مَنْ أَنْكَرَ...... : یہ رومیوں کے ساتھ ہونے والی جنگ کا قصہ ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مجاہد رومیوں کی پوری ایک صف پر ٹوٹ پڑا اور ان پر تابڑ توڑ تلوار چلاتے ہوئے ان کی صف میں گھستا چلا گیا، بلاشبہ یہ بڑا دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ اس پر لوگوں میں شور مچ گیا کہ اس نے تو اپنے ہاتھوں خود کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

انہی لوگوں پر رد کرتے ہوئے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے بارے میں اتری تھی جب ہم لوگ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے رک گئے تھے۔ پس مذکورہ آیت میں جس ہلاکت کا ذکر ہے اس سے مراد انفاق فی سبیل اللہ سے رکنا ہے نہ کہ یوں جرأت کے ساتھ دشمنوں میں گھس جانا مراد ہے۔

حَتَّى دَخَلَ فِيهِمْ: یعنی ان کی صفوں میں گھس کر ان سے قتال کرنے لگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بیانِ حق کے لیے ایسی بات بیان کرنا بھی جائز ہے جو خود کہنے والے کے حق میں باعثِ ملامت ہو۔
- اکیلے کا بھی دشمنوں پر حملہ کر دینا جائز ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اس فعل کو برقرار رکھا اور اس پر نکیر کرنے والے پر رد فرمایا۔
- معلوم ہوا کہ مسلمان کفار سے کس جرأت و دلیری اور ہمت و شجاعت کے ساتھ لڑتے تھے حتیٰ کہ ایک مجاہد بھی موت سے بے خوف ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتا تھا۔
- خود کو موت کے حوالے کرنا حرام ہے۔
- ہلاکت یہ حسی بھی ہوتی ہے اور معنوی بھی۔ حسی ہلاکت کا تعلق جسم سے ہے جبکہ معنوی ہلاکت کا تعلق عمل سے ہے۔ کیونکہ

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنھوں نے جہاد میں اہل اسلام کی مساعدت سے دست کش ہو جانے کا ارادہ کیا تھا۔ بلاشبہ یہ وہ معنوی ہلاکت ہے جو عمل سے ہوتی ہے۔ جبکہ ارشاد باری تعالیٰ:

﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النسآء: 29)

''اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔''

میں خود کو جسدی ہلاکت کے حوالے کرنے کی اور خود کو ہلاک کر دینے کی ممانعت ہے۔

دشمن محاربین کے مالوں کو ضائع کر دینے کا بیان

1277۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((حَرَّقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَخْلَ بَنِي النَّضِيرِ وَقَطَّعَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے بنونضیر کے کھجور کے درخت جلوا دیے اور کٹوا دیے۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... بَنِي النَّضِيرِ: مدینہ میں آباد تین یہودی قبیلوں (بنوقریظہ، بنوقینقاع اور بنونضیر) میں سے ایک قبیلہ اور یہی وہ تین قبائل تھے جن کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کر آنے کے بعد وہ معاہدہ کیا تھا جس کو میثاقِ مدینہ کے مشہور نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن ان تینوں قبائل نے عہد شکنی کی اور آپ ﷺ سے خیانت کا ارتکاب کیا۔ جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ نے ان کو جلا وطن بھی کیا اور ان سے مقاتلہ بھی کیا اور ان کا محاصرہ بھی کیا۔ اسی محاصرے کے دوران آپ ﷺ نے انہیں پسپا کرنے اور انہیں ہتھیار ڈالنے یا قلعوں سے باہر نکلنے پر مجبور کرنے کے لیے ان کے درختوں کو آگ بھی لگوائی اور ان کو کٹوایا بھی۔ یہ پورا واقعہ سورۂ حشر میں مذکور ہے۔

حَرَّقَ: ''قَطَّعَ'' یعنی آپ ﷺ نے بعض درختوں کو جلوا دیا تو بعض کو کٹوا دیا۔

یاد رہے کہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے کیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (الحشر: 5)

''جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا۔''

اس لیے یہ کہنا بے جا ہوگا کہ جناب رسول اللہ ﷺ خود تو مالوں کو ضائع کرنے سے روکا کرتے تھے اور اموال کے اتلاف پر نکیر فرمایا کرتے تھے جبکہ یہاں آپ ﷺ خود اموال کو ضائع اور برباد کر رہے ہیں اور ان کافروں نے بھی یہ اعتراض کیا تھا جس پر رب تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی۔

سو جب ایسا اللہ کے حکم سے کیا گیا تو حلال ٹھہرا۔ جیسے قتلِ اولاد کبائر میں سے ہے لیکن جب اسے اللہ کے حکم سے کیا گیا تو رب ذوالجلال کے احکام و اوامر کے امتثال کا سب سے عظیم واقعہ ٹھہرا۔ جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حکم سے اپنے عزیز ترین فرزند ارجمند کے گلے پر چھری چلا دی۔ لیکن رب تعالیٰ کی ازلی مشیت نے غالب آ کر اسباب کی دنیا کو اس کے نتائج مرتب کرنے سے روک دیا اور وہ چھری کند ہو گئی۔

غرض اللہ کا حکم ہو تو قتل اولاد بھی حلال ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 3021- صحيح مسلم: 1746.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دشمنوں کے درختوں کو کاٹنا اور جلانا جائز ہے اور مال کا یہ اِفساد ایک عظیم مصلحت کے لیے جائز ہے اور وہ ہے دشمن کے حوصلے توڑنا اور مسلمانوں کو فتح دِلانا۔

◈ یہیں سے علماء نے ایک عظیم قاعدہ اخذ کیا ہے کہ جہاں مصلحت اور مفسدہ دونوں جمع ہو جائیں تو دونوں میں جو زیادہ قوی ہو اس کو غالب کیا جائے گا اور اگر قوت میں دونوں برابر ہوں تو مفسدہ کا دفعیہ اولیٰ ہوگا اور اس شق کو اس قاعدہ کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ ''مفاسد کو دفع کرنا یہ مصالح کے حصول سے اولیٰ ہے۔''

غلول کی ممانعت کا بیان

1278- وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَغُلُّوْا فَإِنَّ الْغُلُوْلَ نَارٌ وَعَارٌ عَلٰى أَصْحَابِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)).

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(مالِ غنیمت میں) خیانت نہ کرو کیونکہ (مالِ غنیمت میں) خیانت (جہنم کی) آگ (میں داخل ہونے کا ذریعہ) ہے اور خیانت کرنے والوں کے لیے دنیا و آخرت کی رسوائی (بھی) ہے۔''[1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**لَا تَغُلُّوْا**: مذکورہ ''لا'' ناہیہ ہے اور یہ فعل نہی کا ہے۔ غلول کی مفصل تعریف بیان کی جا چکی ہے۔

نَارٌ وَعَارٌ: غلول کا آخرت میں نار ہونا تو بدیہی ہے لیکن دنیا میں اس کے نار ہونے کی توجیہ کیونکر کی جاسکتی ہے؟ تو اس کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ ارشادِ نبوی ''فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ'' صرف ''عار'' سے متعلق ہو، ''نار'' سے متعلق نہ ہو (جیسا کہ بندہ عاجز نے ترجمہ میں اِسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔ [نسیم])۔ چنانچہ یہ غلول آخرت میں تو آتشِ جہنم کا سبب بنے گی جبکہ دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کا سبب الگ سے ہے۔ کیونکہ غلول کرنے والا دنیا میں بھی نشر ہوتا ہے اور آخرت میں تو سب کے سامنے غلول کا مال لے کر حاضر ہوگا، پھر کہاں کی عزت باقی رہ جائے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ غلول حرام ہے۔

◈ غلول کبائر میں سے ہے کیونکہ اس پر آتشِ جہنم اور دنیا و آخرت کی ذلت کی وعید ہے اور جس فعل پر وعید مرتب ہو وہ کبیرہ گناہ ہوتا ہے۔

---

[1] مسند احمد: 316/5- سنن ابن ماجہ: 2850- اس حدیث کی اسناد میں ابوبکر بن ابی مریم ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' (338/5) میں لکھا ہے اور ابن ابی شیبہ (412/7) نے ''ابی خالد الاحمر عن یحییٰ بن سعید، عن عمرو بن شعیب'' کے طریق سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جبکہ امام نسائی نے ''السنن الکبریٰ'' (6515) میں ایک اور طریق سے یہی حدیث ''عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده'' سے روایت کی ہے۔ جبکہ یہ حدیث ''السنن الصغریٰ'' (263/6) میں بھی ہے۔ ابن عبدالبر ''التمہید'' (49/20) میں کہتے ہیں یہ حدیث متصل ہے اور اس کی اسناد عمدہ ہے۔

◈ غلول جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے۔
◈ حرام فعل کی دنیا و آخرت کی سزا سنا کر اسے ڈرانا جائز ہے۔

''سلب'' قاتل کا ہے

1279۔ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ ؓ: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضَى بِالسَّلَبِ لِلْقَاتِلِ)). رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ.

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے اس بات کا فیصلہ فرمایا کہ (مقتول کا) سلب قاتل کا ہوگا۔ ❶
اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔
اور اس کی اصل صحیح مسلم میں ہے۔

غریب الحدیث :......قَضَى: یہ حکم سنانے اور فیصلہ کرنے کے معنی میں ہے۔ پس یہاں قضا سے قضائے شرعی مراد ہوگی۔

بِالسَّلَبِ: سلب یہ مقتول کے چھینے ہوئے مال اسلحہ، سواری وغیرہ کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا فیصلہ فرمایا کہ جو مجاہد جس کافر کو قتل کرے گا تو اس کے بدن پر موجود مال جیسے اسلحہ، کپڑے اور اس کی سواری، یہ اسی قاتل کی ہوگی اور خاص مقتول کے اس سامان کو مال غنیمت میں شمار نہ کیا جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مقتول کا سلب قاتل کا ہوگا چاہے اس کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے۔
◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی کو کوئی دنیاوی لالچ دے کر بھی اسے کسی نیک عمل پر تیار کیا جا سکتا ہے اور دوسروں کو نیکی پر تیار کرنے کے لیے دنیاوی لالچ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

1280۔ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ ؓ - فِيْ قِصَّةِ قَتْلِ أَبِيْ جَهْلٍ۔ قَالَ: فَابْتَدَرَاهُ بِسَيْفَيْهِمَا حَتَّى قَتَلَاهُ، ثُمَّ انْصَرَفَا إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَأَخْبَرَاهُ، فَقَالَ: ((أَيُّكُمَا قَتَلَهُ؟ هَلْ مَسَحْتُمَا سَيْفَيْكُمَا؟)) قَالَا: لَا، قَالَ: فَنَظَرَ فِيهِمَا، فَقَالَ: ((كِلَاكُمَا قَتَلَهُ.)) فَقَضَى ﷺ بِسَلَبِهِ لِمُعَاذِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ابوجہل کے قتل کیے جانے کے قصہ کی بابت روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: پس وہ دونوں نوجوان اپنی تلواروں سے ابوجہل پر لپکے یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا، پھر ان دونوں نے خدمت نبوی میں لوٹ کر نبی کریم ﷺ کو اس بات کی خبر دی۔ پس آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم دونوں میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم دونوں نے اپنی (خون آلود) تلواروں کو صاف (تو نہیں) کر لیا ہے؟'' ان دونوں نے عرض کیا: جی نہیں۔ (ہماری تلواریں اسی طرح خون آلود باقی ہیں)۔ آپ ﷺ نے ان دونوں تلواروں پر ایک نگاہ ڈالی تو ارشاد فرمایا: ''تم دونوں نے ہی اسے قتل کیا ہے اور ابوجہل کے سلب کا فیصلہ معاذ بن عمرو بن جموح کے حق میں کیا۔'' ❷

---

❶ سنن ابی داؤد: 2719۔ صحیح مسلم: 1753.
❷ صحیح البخاری: 3141۔ صحیح مسلم: 1752.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......فِي قِصَّةِ قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ : ابوجہل صنادید قریش میں سے تھا، بعثت نبوی سے قبل اپنی حکمت وتدبر کی وجہ سے ''ابوالحکم'' کنیت کرتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی بدترین مخالفت کرنے کی بنا پر آپ ﷺ نے اس کا لقب ابوجہل رکھا۔

ابوجہل کے قتل کا قصہ یہ ہے کہ جنگ بدر میں حضرت عبدالرحمن بن عوف دونوں جوانوں کے بیچ میں کھڑے قتال کر رہے تھے۔ اتنے میں ان دونوں نے ابوجہل کے بارے میں پوچھا۔ یہ دونوں ابوجہل پر بے حد غصہ تھے اور آج مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے کہ یا وہ خدا کا دشمن نہ رہے گا یا پھر اس کے ہاتھوں ہم زندگی کی بازی ہار جائیں گے۔

اتنے میں ابوجہل سامنے آ گیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا مطلوب وہ رہا۔ یہ سنتے ہی وہ نوجوان ابوجہل پر عقاب کی طرح جھپٹے اور تلواروں کے وار کر کے اسے زمین پر مار گرایا۔ اس کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے آ کر اسے جاں بلب حالت میں دیکھ کر اس کا سر قلم کر دیا۔

ادھر ان دونوں نوجوانوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر ابوجہل کے قتل کرنے کا دعویٰ کر دیا۔ جس پر نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم دونوں میں سے اسے کس نے مارا ہے؟ تا کہ آپ ﷺ قاتل کو اس کا سلب دے دیتے۔ پھر تفتیش پر دونوں کی تلواریں خون آلود برآمد ہوئیں۔ جس سے آپ ﷺ نے جان لیا کہ ابوجہل کو مارنے والے یہی دونوں نوجوان ہیں۔ پس آپ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ ابوجہل کا سلب معاذ بن عمرو بن جموح کا ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شجاعت ایک خداداد جذبہ اور ولولہ ہے۔ یہ اللہ ہی دلوں میں پیدا کرتا ہے اور اللہ چاہے تو یہ جذبہ کم سنوں کے دلوں میں بھی جاگزیں ہو سکتا ہے۔
- اگر کوئی فرض کفایہ کو قائم کر رہا ہو تو دوسرا اس سے پیچھے رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ یہ فریضہ یہ دونوں نوجوان پورا کر رہے ہیں تو انہوں نے کھڑے ہو کر اس کا مشاہدہ کرنے پر اکتفا کیا۔
- قرائن پر عمل جائز ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی تلواروں پر لگے خون سے اندازہ لگا لیا کہ ابوجہل کو انہی دونوں نوجوانوں نے مار گرایا تھا۔
- ایک عمل میں شریک اس پر ملنے والے اجر اور انعام میں برابر کے شریک ہوں گے، اس موقع پر دونوں میں قرعہ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ بشرطیکہ تقسیم ممکن ہو، وگرنہ قرعہ ڈالا جائے گا۔

منجنیق کے ذریعے گولے چلانے کا حکم

1281- وَعَنْ مَكْحُولٍ: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَصَبَ الْمَنْجَنِيقَ عَلَى أَهْلِ الطَّائِفِ)) .

مکحول (تابعی) سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے اہل طائف پر منجنیق نصب کی تھی۔ [1]

[1] مراسیل ابی داؤد: 299۔ الضعفاء للعقیلی: 2/243۔ جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ (2762) نے اس حدیث کو مُعضل روایت کیا ہے اور اس میں مکحول کا ذکر نہیں کیا۔

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيْلِ ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ ، وَوَصَلَهُ الْعُقَيْلِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ .

امام ابوداؤد نے اس حدیث کو اپنی "المراسیل" میں روایت کیا ہے۔اس کے رجال ثقہ ہیں۔جبکہ علامہ عقیلی نے ضعیف اسناد کے ساتھ اس حدیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موصول روایت کیا ہے۔

روایت الحدیث :...... بلوغ المرام کے بعض نسخوں میں مکحول کا ذکر ہے جس سے ان کے صحابی ہونے کا وہم ہوتا ہے۔ حالانکہ مکحول صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے نہیں۔ اس لیے ان کے نام پر ترضی کے صیغہ (رضی اللہ عنہ) کی بجائے ترحم کا صیغہ (رحمہ اللہ) لکھنا زیادہ مناسب ہے۔

غریب الحدیث :...... نَصَبَ الْمَنْجَنِيقَ: منجنیق: قدیم زمانہ کی ایک قلعہ شکن مشین جو لکڑی کے ٹینک کی طرح ہوتی تھی اور اس سے دشمن کے قلعے کی دیواروں پر پتھر مارے جاتے تھے۔ [1]

اس مشین کے ذریعے بڑے بھاری گولے فصیلِ شہر پر برسائے جاتے تھے جو بالآخر مضبوط سے مضبوط دیوار کو بھی توڑ دیتے تھے۔اس مشین سے گولے برسانے کے لیے بڑے طاقتور لوگوں کی ضرورت ہوتی تھی۔فی زمانہ ٹینک منجنیق کا بہترین بدل ہے۔

عَلَى أَهْلِ الطَّائِفِ: کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس یا تیس دن تک طائف والوں کا محاصرہ جاری رکھا تھا بالآخر وہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر قلعہ سے اترنے پر مجبور ہو گئے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- منجنیق اور اس کی قائم مقام مشینوں جیسے ٹینک اور میزائل مارنے والی مشینوں کا جنگ میں استعمال جائز ہے۔
- معلوم ہوا کہ تابع میں ان باتوں کی معافی اور گنجائش بھی ہوتی ہے جن کی استقلالاً اجازت اور گنجائش نہیں۔اس کی دلیل یہ ہے کہ بہر حال منجنیق کے ذریعے گولہ باری سے عورتوں اور بچوں کے ہلاک ہونے کا بھی قوی امکان ہے حالانکہ جنگ کے دوران بھی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں۔لیکن اگر یہی عورتیں اور بچے تبعاً مارے جائیں تو معاف ہوں گے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی بے گناہ کے مارے جانے کے ڈر سے ہمیں موقع اور فرصت کو گنوانا مناسب نہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کا محاصرہ طویل کرنا ممکن تھا لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل طائف پر منجنیق نصب کروادی۔

⊙...... یہ فائدہ حدیث کے صحیح ہونے پر مرتب ہے۔

- اس حدیث کو امام ابوداؤد نے اپنی "مراسیل" میں ذکر کیا ہے۔مراسیل یہ مرسل کی جمع ہے۔مرسل کی انواع اور ان کے احکام کا ذکر بارہا کیا جا چکا ہے۔
- اس کے بعد امام موصوف نے علامہ عقیلی کی مروی ضعیف الاسناد موصول روایت کا ذکر کیا ہے۔تب پھر یہ حدیث یا تو سند کے اتصال کے اعتبار سے ضعیف ہے۔کیونکہ مکحول نے یہ حدیث مرسل روایت کی ہے، یا پھر رواۃ کے اعتبار سے ضعیف ہے۔جیسا کہ امام موصوف نے علامہ عقیلی کی موصول اسناد کے رواۃ کو ضعیف قرار دیا ہے۔

---

[1] القاموس الوحید: 1585۔ (نسیم)

لیکن سند کے اعتبار سے یہ حدیث چاہے ضعیف ہی ہو، لیکن قواعدِ شرعیہ اس کے معنی کو ضرور مقتضی ہیں۔ کیونکہ جس بات کے بغیر کسی واجب کی تکمیل نہ ہوتی ہو، وہ بھی واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی جگہ کے کفار سے غزوہ اور قتال تک اور ان کی خون ریزی تک وصول منجنیق وغیرہ کے استعمال کے بغیر ممکن نہ ہو تو منجنیق کا استعمال بلاشبہ جائز ہوگا۔

مرتد کا حرم میں بھی قتل کر دینا جائز ہے

1282- وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ وَعَلَى رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ ، فَلَمَّا نَزَعَهُ جَاءَهُ رَجُلٌ ، فَقَالَ : ابْنُ خَطَلٍ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ ، فَقَالَ : ((اقْتُلُوهُ)) .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (فتح مکہ کے موقع پر) آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے، اس حال میں آپ ﷺ کے سر مبارک پر ایک خود تھا۔ پس جب (جنگ ختم ہو گئی اور) آپ ﷺ نے اسے (اپنے سر مبارک سے) اتار لیا تو ایک آدمی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا: ابن خطل (جس کے خون کو آپ ﷺ نے مباح فرما دیا ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ وہ جسے جہاں ملے وہ اسے وہیں قتل کر دے، وہی ابن خطل اب) کعبہ کے پردوں سے چمٹا ہوا ہے (گویا کہ وہ کعبہ کے پردے تھام کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے) اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اسے (پھر بھی اور وہیں حرمِ کعبہ میں کعبہ کے پردے تھامے ہوئے) قتل کر دو۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......دَخَلَ مَكَّةَ: یہ غزوۂ فتح مکہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ فتح مکہ کا واقعہ مشہور ومعروف ہے اور کتب سیرت اس کی تفصیلات سے معمور ہیں۔

وَعَلَى رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "دَخَلَ" کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ "مِغْفَر": یہ مِفْعَلٌ کے وزن پر اسم آلہ کا صیغہ ہے، یعنی ڈھانپنے اور چھپانے کا ایک آلہ۔ (ہماری اردو زبان میں اسے خود کہتے ہیں) اسے سر پر پہنا جاتا ہے، اور اس کے ذریعے دشمن کے تلوار کے وار سے اور تیر وغیرہ کی زد میں آنے سے سر کو بچایا جاتا ہے۔

فَلَمَّا نَزَعَهُ: مراد جنگ کے خاتمہ کے بعد خود کو سر سے اتارنا ہے۔

اِبْنُ خَطَلٍ: اس کا نام عبداللہ تھا۔ مشہور گستاخ اور دریدہ دہن آدمی تھا جو آپ ﷺ کا بے حد مخالف بھی تھا اور آپ ﷺ کی بے حد گستاخی بھی کیا کرتا تھا۔

مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ: "أَستار": یہ سِتْرٌ کی جمع ہے۔ ستر یہ پردے کو کہتے ہیں۔ کعبہ کے پردوں سے چمٹ جانا، یہ امن حاصل ہونے کی سب سے زیادہ مؤکد صورت ہے۔

ابن خطل ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں آپ ﷺ نے اس بات کا اعلان فرما دیا تھا کہ سب کو

---

[1] صحيح البخاري: 3044- مسلم: 1349 .

امن ہے مگر ان کو نہیں۔ یہ جہاں بھی ملیں ان کو مار دیا جائے۔ یہ اعلان ابن خطل بھی سن چکا تھا۔ پس اسے اپنی جان بچانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ پھر وہی ہوا۔ اسے کعبہ کے پردوں سے چمٹا دیکھ کر اس آدمی کو ابن خطل کے قتل کرنے میں تردد ہوا۔ اسی لیے وہ اس صورت کا حکم معلوم کرنے خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ مگر آپ ﷺ نے اس صورت میں بھی اس کے قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔

یاد رہے کہ یہ چاشت کا وقت تھا اور آپ ﷺ کے لیے چاشت کے وقت سے لے کر عصر کے وقت تک کعبہ اور اس کا حرم حلال کیا گیا جبکہ اس کے بعد حرم کو دوبارہ قیامت تک کے لیے حرام کر دیا گیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ضرر سے بچانے والے اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سر مبارک پر دشمن کے ضرر سے بچنے کے لیے لوہے کا خود پہن رکھا تھا۔ جبکہ غزوۂ احد میں آپ ﷺ دو زرہیں زیب تن فرما کر دولت کدہ سے باہر تشریف لائے تھے۔ [1]

◈ معلوم ہوا کہ اسباب کی تاثیر ہوتی ہے۔

◈ مکہ عنوۃً یعنی تلوار کے ذریعے قتال کے ساتھ فتح ہوا تھا۔ نہ کہ صلح کے ساتھ۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا سر مبارک پر لوہے کا خود پہننا ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر مکہ کی اراضی غانمین میں کیوں تقسیم نہ کی گئیں تو اس کے دو جوابات ہیں:

(1) ایک کہ غنیمت کی زمینوں کی تقسیم امام کی رائے کے سپرد ہوتی ہیں۔

(2) دوسرا جواب یہ ہے کہ مکہ اور اس کے اردگرد کی زمینیں مشاعر میں سے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ مکہ کی زمینیں تقسیم نہ کی جائیں گی اور یہی اکثر علماء کا قول ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ مدت بعد بھی اگر مکہ داخل ہونے کی نوبت آئے تو احرام باندھنا واجب نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مکہ میں داخل ہوتے وقت خود پہنا ہوا تھا اور ایک محرم کے لیے خود پہننا جائز نہیں۔

یہیں سے اس مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہو گیا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ جو آدمی مباح قتال کے لیے مکہ میں داخل ہو، اس کے لیے احرام باندھنا واجب نہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ ایک مباح قتال کے لیے مکہ میں داخل ہوئے تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے احرام نہ باندھا ہوا تھا۔ کیونکہ اگر مقاتل احرام باندھ لے گا تو مناسک کی ادائیگی اسے قتال سے مشغول کر دے گی۔

اور ایک قول یہ ہے کہ جو پہلے حج اور عمرہ کا فریضہ ادا کر چکا ہو اگر وہ اس کے بعد مکہ داخل ہو تو اس پر احرام باندھنا واجب نہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر سال حج فرض ہونے کی بابت سوال کرنے والے کو آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ اگر میں اس کا جواب ہاں میں دے دوں تو (تم لوگوں پر) حج اور عمرہ (ہر سال) واجب ہو جائے اور تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے (پس) حج (زندگی میں صرف) ایک بار ہے اور اس سے زیادہ نفل ہے۔

"مَا زَادَ" (جو اس سے زیادہ ہو) اس میں "مَا" شرطیہ ہے جو عموم کو مقتضی ہے۔ پس جب آدمی ایک دفعہ حج اور عمرہ کر

---

[1] سنن أبي داؤد: 2590۔ السنن الكبرىٰ للنسائي: 8583۔ مسند احمد: 449/3.

لے تو اس کے بعد جب بھی حج یا عمرہ کرے گا وہ نفل ہوگا چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے تب پھر حج اور عمرہ کر لینے والے پر مکہ میں داخل ہوتے وقت احرام باندھنا واجب نہ ہوگا۔

- مجرم کی خبر دینا نہ تو یہ شکایت ہے اور نہ حرام ہی ہے۔ اس کی دلیل اس آدمی کا ابن خطل کی آ کر خبر دینا ہے۔ گو یہ شکایت تھی لیکن مصلحت پر مبنی بھی تھی۔

وہ یوں کہ ابن خطل مدینہ میں اسلام قبول کر کے مرتد ہو کر مکہ مشرکوں سے جا ملا تھا۔ پھر اس نے دو باندیاں خرید کر انہیں اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ گا گا کر معاذ اللہ نبی کریم ﷺ کی ہجو بیان کیا کرتی تھیں۔ یوں ابن خطل ان جرائم کا مرتکب ہو لیا ہوا تھا۔

(1) ارتداد (2) مشرکوں سے جا ملنا، اور

(3) سب رسالت جو سب جرموں سے بھاری ترین جرم تھا اور پھر وہ کھلے بندوں یہ جرم کیا کرتا تھا۔ غرض ایسے نابکار کی شکایت مذموم شکایت نہ تھی۔

- کافر بھی یہ بات جانتے تھے کہ کعبہ سب کے لیے جائے پناہ ہے۔
- مرتد کو مکہ میں بھی قتل کرنا جائز ہے۔ حرم میں قتل کے جواز کی بابت ایک مفصل مضمون مکہ کے حرم کے تحت گزشتہ میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

قید میں قتل کرنے کا حکم

1283۔ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ رحمه الله ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَتَلَ يَوْمَ بَدْرٍ ثَلَاثَةً صَبْرًا)).

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے (جنگِ) بدر کے دن (قریش کے) تین آدمیوں کو قید میں قتل کیا۔ ❶

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيْلِ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے "المراسیل" میں روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث :......سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ رحمه الله : اصطلاحِ محدثین کی بنا پر سعید بن جبیر کے نام پر ترضی کے کلمات آنے کی بجائے ترحم کے کلمات آنے چاہیں کیونکہ سعید بن جبیر تابعین میں سے ہیں۔

ثَلَاثَةً: یہ تینوں قریشی تھے۔

صَبْرًا: صبراً قتل کرنا یہ کسی کو قید میں رکھ کر قتل کرنے کو کہتے ہیں نہ کہ میدانِ کارزار میں قتل کرنے کو کہتے ہیں۔

فِي الْمَرَاسِيْلِ: اگرچہ امام موصوف نے اس روایت کے رجال ثقہ بتلائے ہیں لیکن جب تک یہ روایت مرسل ہے اس کی صحت محل نظر ہے۔ البتہ اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ سعید بن جبیر صرف صحابی رسول سے ہی ارسال کرتے ہیں تو یہ

---

❶ المراسیل لابی داؤد: 337۔ امام طبرانی نے "المعجم الاوسط" (3801) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ذکر کے ساتھ اس حدیث کو موصول ذکر کیا ہے۔ علامہ ہیثمی کہتے ہیں: اس حدیث میں ایک راوی عبداللہ بن نمیر ہے میں اسے نہیں جانتا۔ جبکہ اس کے باقی کے رجال ثقہ ہیں۔ دیکھیں مجمع الزوائد: 89/6.

حدیث صحیح ہوگی۔البتہ معنی کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ گزشتہ اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ دشمن کو صبراً قتل کر سکتے ہیں جیسا کہ ابن خطل کو قید کر کے قتل کیا گیا نہ کہ میدانِ قتال میں۔

قیدی اور اس کے احوال کا بیان

1284۔ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضی اللہ عنہ ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَدَى رَجُلَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ بِرَجُلٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ)) .

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ ، وَصَحَّحَهُ ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ .

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے دو مسلمانوں کے فدیہ میں ایک مشرک (قیدی) کو دیا۔ [1]

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا۔ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔ اور اس حدیث کی اصل صحیح مسلم میں ہے۔

شرح:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے فدیہ میں کسی مشرک کو دے سکتے ہیں۔یعنی مسلمان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے ان کے فدیہ میں اپنی قید میں موجود کسی مشرک و کافر قیدی کو دے سکتے ہیں جیسا کہ یہاں نبی کریم ﷺ نے مشرکوں کے حوالے ان کا ایک قیدی کیا جبکہ اس کے بدلے اپنے دو مسلمان قیدی چھڑائے۔

قیدی کے احکام

اگر اس روایت کو گزشتہ روایت کے ساتھ ملایا جائے تو قیدیوں کی بابت دو اہم مسائل معلوم ہوتے ہیں:

(1) ایک یہ کہ قیدیوں کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔

(2) دوسرا یہ کہ ان قیدیوں کو اپنے مسلمان قیدی چھڑانے کے لیے فدیہ میں بھی دے سکتے ہیں۔البتہ مشرکوں کو مالی فدیہ لے کر بھی چھوڑ سکتے ہیں جبکہ ان سے کوئی منفعت لے کر بھی چھوڑ سکتے ہیں۔

تب پھر تیسری بات یہ ٹھہری کہ مالی فدیہ لے کر قیدی چھوڑ دیا جائے اور چوتھی بات یہ ہوئی کہ قیدی سے کوئی فائدہ اٹھا کر اسے چھوڑ دیا جائے۔جبکہ پانچویں صورت محض احسان کر کے چھوڑ دینے کی بھی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ (محمد: 4)

''یہاں تک کہ جب انھیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو) مضبوط باندھ لو، پھر بعد میں یا تو احسان کرنا ہے اور یا فدیہ لے لینا۔''

خلاصہ یہ ہے کہ یہ پانچوں صورتیں امام کی رائے اور مصلحت کے سپرد ہیں۔

کافر کا مسلمان ہو جانا اور اس کے نتائج کا بیان

1285۔ وَعَنْ صَخْرِ بْنِ الْعَيْلَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ الْقَوْمَ إِذَا أَسْلَمُوْا أَحْرَزُوْا دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ)) .

حضرت صخر بن عیلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''جب کچھ (کافر) لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں تو انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیا۔'' [2]

---

[1] جامع الترمذی: 1568۔ صحیح مسلم: 1641 .

[2] سنن ابی داؤد: 3067۔ سنن الدارمی: 1673۔ سنن البیهقی: 114/9۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد قوی نہیں۔

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُوْنَ .

اس حدیث کو امام ابو داود نے روایت کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:...... إِنَّ الْقَوْمَ: قوم سے مراد کافر لوگ ہیں۔ اس کی دلیل: "إِذَا أَسْلَمُوا" کے الفاظ ہیں۔

کافروں کے مسلمان ہو جانے کی صورتیں اور ان کے احکام

بظاہر اس حدیث میں عموم ہے لیکن یہ مسئلہ مندرجہ ذیل تفصیل کے ساتھ ہے:

(1) اگر تو کافر قتال سے پہلے اسلام لے آئیں تو ان کی جان و مال محفوظ ہوں گے۔ چنانچہ ان کے کسی بھی قسم کے مال کو لینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اسلام لا چکے ہیں اور اسلام جان و مال کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں یہ مضمون آتا ہے کہ جو اسلام لے آئیں گے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیں گے اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے سپرد ہوگا۔

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ قتال کے بعد اسلام لے آئیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کا جو مال قتال کے دوران اور مسلمان ہو جانے سے قبل لے لیا گیا، وہ مالِ غنیمت شمار ہوگا اور جو رہ گیا وہ ان کا۔

اسی طرح اگر وہ اپنی زمینوں کی شرط پر اسلام لے آئیں کہ وہ انھی کی رہیں گی تو بھی مسلمان ہونے پر ان زمینوں کو غنیمت بنا کر تقسیم نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ انھی زمینوں کی شرط پر مسلمان ہوئے ہیں۔

اور اگر ان کی زمینیں قتال کے بعد مالِ غنیمت بن گئیں اور یہ اس کے بعد اسلام لے آئے تو وہ زمینیں ان کی نہ ہوں گی بلکہ مالِ غنیمت ہوں گی اور امام ان زمینوں پر حسب مصلحت مصالحت بھی کر سکتا ہے۔

احسان کرنے والوں کے احسان کو پہچاننا

1286- وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي أُسَارَى بَدْرٍ: ((لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا ، ثُمَّ كَلَّمَنِيْ فِيْ هٰؤُلَاءِ النَّتْنَى لَتَرَكْتُهُمْ لَهُ)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کہ نبی کریم ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ''(آج) اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں بات کرتا تو میں اس کی خاطر ان کو چھوڑ دیتا۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... فِي أُسَارَى بَدْرٍ : أساری: یہ اسیر کی جمع ہے یعنی قیدی۔ ان کی تعداد ستر تھی۔ غزوۂ بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے تھے اور ستر ہی گرفتار ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ انہیں گرفتار کر کے مدینہ نبویہ میں لے آئے تھے۔

لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا: یہ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کے والد کا نام ہے۔

ثُمَّ كَلَّمَنِي فِي هٰؤُلَاءِ النَّتْنَى: نتنی: یہ نَتِنٌ کی جمع ہے۔ یہ گندی اور سڑی ہوئی ناگوار بو کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کسی گلی سڑی اور بدبودار شے کو بھی نَتِنٌ کہتے ہیں۔ مراد گرفتار ہونے والے یہ مشرکینِ مکہ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو اس وصف کے ساتھ اس لیے پکارا کیونکہ قرآنِ کریم میں مشرکوں کو نجس اور پلید کہا گیا ہے اور نجس شے اکثر بدبودار ہوتی ہے۔

[1] صحيح البخاري: 3139 .

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ (التوبة: 28) ''بلاشبہ مشرک لوگ ناپاک ہیں۔''

لَتَرَكْتُهُمْ لَهُ: ترک یہاں اطلاق یعنی رہا کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ قیدیوں کو کسی معاوضہ کے بغیر محض احسان کر کے چھوڑنے کی صورت ہے۔

نبی کریم ﷺ نے یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی تھی کیونکہ مطعم بن عدی نے ایک بڑے کٹھن موقع پر نبی کریم ﷺ کی زبردست نصرت وتائید کی تھی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب اہل طائف نے آپ ﷺ کی دعوت کو رد کر دیا اور آپ ﷺ بے حد غمگین اور آزردہ خاطر مکہ لوٹے تو انہی مطعم بن عدی نے آپ ﷺ کو اپنی پناہ میں لے کر مکہ میں داخل کیا، پھر اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور اپنے دو بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ آپ ﷺ کے دائیں بائیں چلیں تاکہ کوئی آپ ﷺ کی طرف میلی نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کرے۔ یوں مطعم نے اس از حد نازک موقع پر قریش جیسے ہٹ دھرم، بے رحم اور سنگدل دشمنوں کو آپ ﷺ کا بال بھی بیکا نہ کرنے دیا۔

یہ تھا وہ احسان جو مطعم نے کبھی آپ ﷺ کے ساتھ کیا تھا اور آج اس موقع پر آپ ﷺ کو وہی مطعم بن عدی بڑا یاد آیا حتی کہ فرط جذبات سے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آج ایسا موقع تھا کہ آپ ﷺ مطعم کے اس بے حد بھاری احسان کا بدلہ چکا سکتے تھے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- احسان کا بدلہ دینا ایمانی مروت واخلاق کا تقاضا ہے چاہے وہ احسان کرنے والا کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا مذکورہ بالا ارشاد ہے۔ دوسرے آپ ﷺ کے اس ارشاد کا عموم بھی اس بات کو مقتضی ہے کہ ''جو تمہارے ساتھ کوئی نیکی کرے تو تم اسے (اس کی نیکی کا) بدلہ دو۔'' [1]
- اور اس بات کی دلیل ''لَوْ'' کا کلمہ بھی ہے کہ ''لَوْ'' جہاں خبر محض اور حزن وندامت کے معنی پر دلالت کرنے کے لیے آتا ہے، وہیں تمنا کے معنی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر ''لَوْ'' کے کلمہ کو اس معنی میں استعمال فرمایا ہے اور آپ ﷺ کا مطعم کے احسان کو یاد کر کے اس کے بدلہ دینے کی تمنا فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ محسن کے احسان کا بدلہ دیا جائے چاہے وہ احسان کرنے والا کافر ہی کیوں نہ ہو۔
- قیدیوں کو کسی قسم کا فدیہ لیے بغیر محض احسان کر کے چھوڑنا بھی جائز ہے۔ چاہے ایسا کسی متوقع مصلحت کے پیش نظر کیا جائے اور چاہے کسی گزشتہ احسان کو یاد کر کے کیا جائے۔
- کافروں کی غیبت جائز ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے گرفتار مشرکین مکہ کو ان کی پیٹھ پیچھے، بدبودار سرانڈ کہا۔

گرفتار عورتیں جب تک بچہ نہ جنم دیں یا ان کا استبراءِ رحم نہ حاصل کر لیا جائے ان سے وطی کرنا منع ہے

1287۔وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضي الله عنه قَالَ: أَصَبْنَا سَبَايَا يَوْمَ أَوْطَاسٍ لَهُنَّ أَزْوَاجٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جنگ اوطاس کے دن ہمیں ایسی عورتیں بھی (گرفتار ہو کر) ملیں

---

[1] یہ حدیث آگے کتاب البر والصلة میں آرہی ہے۔

فَتَحَرَّجُوا ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ...... الْآيَةَ﴾

(یعنی ہمارے حصہ میں آئیں) جن کے خاوند تھے۔تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (ان خاوند والی باندیوں سے جماع کرنے میں) حرج سمجھا۔اس پر رب تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (النسآء: 24) [1] ''اور خاوند والی عورتیں (بھی حرام کی گئی ہیں) مگر وہ (لونڈیاں) جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں۔''

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... سَبَايَا: یہ سبیہ کی جمع ہے۔مراد قیدی عورتیں ہیں۔

يَوْمَ أَوْطَاسٍ: یہ غزوۂ حنین کا ہی دوسرا نام ہے۔اس غزوہ کا تعارف گزر چکا ہے۔

فَتَحَرَّجُوا: ''تحرّج'': حرج اور گناہ سمجھنے کو کہتے ہیں۔یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جنھوں نے شادی شدہ اور خاوندوں والی قیدی باندیوں سے صحبت کرنے کو گناہ سمجھا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی جنگ میں قید ہونے والی عورتیں مسلمانوں کی ملک بن جاتی ہیں۔لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اشکال یہ ہوا تھا کہ وہ تو شادی شدہ تھیں، تب پھر بھلا وہ ان کے لیے کیونکر حلال ہو سکتی تھیں۔اس پر رب تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان حضرات کا یہ اشکال دور فرما دیا کہ جب یہ تمہاری ملک اور باندیاں بن گئیں تو اب یہ تمہارے لیے حلال ہیں چاہے پہلے یہ خاوندوں والی ہی تھیں۔البتہ ان کے ساتھ جماع کرنے کے لیے پہلے استبراءِ رحم شرط ہے اور استبراء یہ حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل ہے اور غیر حاملہ ہونے کی صورت استبراءِ رحم یہ ایک حیض کا آنا ہے۔استبراءِ رحم کے مسائل تفصیل کے ساتھ نکاح کے ابواب کے تحت بیان کیے جا چکے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عورت کے قیدی بن جاتے ہی اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے تبھی تو وہ مسلمانوں کے لیے خاوند کے طلاق دیے بغیر حلال ہو جاتی ہے۔
- اشتباہ کے مواقع پر ورع واحتیاط کی راہ اختیار کرنا اولیٰ ہے۔اس بنا پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان قیدی شادی شدہ عورتوں کے ساتھ جماع میں گناہ سمجھا، کیونکہ ابھی تک انہیں اس کے حکم کا علم نہ تھا۔
- قرآن اللہ کا کلام ہے اور آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رب تعالیٰ اوپر آسمانوں میں ہے۔
- قرآن جہاں ابتداءً یعنی از خود نازل ہوتا ہے وہیں کسی سبب سے بھی نازل ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ واقعہ سورۂ نساء کی اس آیت کے نزول کا سبب بنا۔ایسے واقعات کو سبب نزول کہا جاتا ہے۔
- رب تعالیٰ کا کلام اس کی مشیت سے ہے، وہ جب چاہتا ہے کلام فرماتا ہے۔
- رب تعالیٰ کا علم وسیع ومحیط ہے۔کیونکہ رب تعالیٰ جانتے تھے کہ اس بات میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حرج سمجھیں گے چنانچہ رب تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان پر سے حرج کو دور فرما دیا۔

---

[1] صحیح مسلم: 1456.

◈ رب تعالیٰ کی رحمت بندوں پر بے حد وسیع ہے۔اسی لیے مسلمانوں کے قبضہ میں آتے ہی عورت کے گزشتہ نکاح کو فسخ قرار دے دیا گیا وگرنہ تو اس میں شدید حرج واقع ہوتا۔

◈ باندی کے ساتھ صرف ملک یمین کی بنا پر بھی جماع کرنا جائز ہے۔اس کی دلیل سورۂ نساء کی مذکورہ آیت ہے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد مجاہدین کو ''نفل'' (زائد انعام) دینے کا حکم

1288- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَرِيَّةً وَأَنَا فِيهِمْ ، قِبَلَ نَجْدٍ ، فَغَنِمُوْا إِبِلًا كَثِيْرَةً ، فَكَانَتْ سُهْمَانُهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ بَعِيْرًا ، وَنُفِّلُوْا بَعِيْرًا بَعِيْرًا)) .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے نجد کی جانب ایک فوجی مہم روانہ فرمائی جس میں میں بھی شامل تھا۔ان لوگوں کو غنیمت میں بہت زیادہ اونٹ ملے۔ چنانچہ ان مجاہدین (میں سے ہر ایک) کے حصہ میں آنے والے اونٹ تو بارہ بارہ تھے جبکہ انہیں ایک ایک (اضافی) اونٹ انعام میں بھی دیا گیا۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:..... **بَعَثَ**: یہ ''اَرْسَلَ'' کے معنی میں ہے۔یعنی روانہ کرنا اور بھیجنا۔

سَرِيَّةً: چار سو سے کم مجاہدین پر مشتمل فوجی مہم کو سریہ کہتے ہیں اور سریہ کو سریہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ رات کو اپنی مہم پر روانہ ہوتا ہے۔

وَأَنَا فِيهِمْ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ لفظ ''سَرِيَّةً'' سے حال ہے۔رہا یہ سوال کہ ''سَرِيَّةً'' کا لفظ تو نکرہ ہے اور نکرہ کا ذوالحال بنا منع ہے۔لہٰذا اسے موصوف ہونا چاہیے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''وَأَنَا فِيهِمْ'' میں مذکورہ واو اس جملہ کو ''سَرِيَّةً'' کی صفت بننے میں مانع ہے کیونکہ موصوف اور صفت میں واو کا آنا منع ہے۔

رہا سریۃ کا نکرہ ہونا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ''نکرہ'' موصوفہ ہو تو ذوالحال بن سکتا ہے۔پس اس کی تقدیری عبارت ''سرِیّۃَ جهادیّۃً'' ہوگی۔تب پھر اس کا ذوالحال بنا جائز ہوگا۔

فَغَنِمُوا: مذکورہ فعل کی ضمیر فاعل سریۃ کی طرف راجع ہوگی اور ضمیر کا یہ مرجع معنی کے اعتبار سے ہوگا نا کہ لفظوں کے اعتبار سے۔کیونکہ اگر یہاں لفظوں کا اعتبار کیا جاتا تو مذکورہ فعل کا صیغہ لفظ سریہ کے اعتبار سے جو لفظی تانیث کے ساتھ ہے، ''فَغَنِمَتْ'' ہوتا۔لیکن چونکہ سریہ مردوں پر مشتمل ہوتا ہے تو سریہ کے اس معنی کا لحاظ کرتے ہوئے مذکورہ فعل کو بھی جمع مذکر کے صیغہ کے ساتھ لائے ہیں۔

إِبِلًا: یہ اسم جمع ہے اس لیے اس اشتقاق کے ساتھ اس کا مفرد نہیں آتا ہے۔البتہ اس کا مفرد بعیر آتا ہے جو غیر لفظ سے مفرد ہے۔

سُهْمَانُهُمْ: یعنی مجاہدین میں سے ہر ایک کا حصہ بارہ بارہ اونٹ تھے۔

وَنُفِّلُوا بَعِيراً بَعِيراً: تنفیل یہ مقررہ حصہ سے زائد بطور عطیہ اور انعام دینے کو کہتے ہیں۔

---

❶ صحيح البخاري: 3134۔ صحيح مسلم: 1749.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جنگی مہمیں بھیجنا مشروع ہے چاہے ان کو دارالخلافہ سے بھیجا جائے یا بڑے لشکر سے بھیجا جائے۔
- سرایا کو امامِ اعظم بھیجا کرے گا جو امت کا پہلا اور اوّل قائد ہوتا ہے۔ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد حضرات خلفائے راشدین سرایا کو روانہ فرمایا کرتے تھے۔
- غنیمت میں ملنے والے جانور بھی اسی طرح مالِ غنیمت ہیں جس طرح مال اسباب مالِ غنیمت ہوتے ہیں۔
- مالِ غنیمت کو بلا تاخیر تقسیم کرنا مشروع و مسنون ہے۔
- مجاہدین کو اضافی انعام اور عطیہ دینا جائز ہے۔

گھڑ سوار، پیادہ اور گھوڑے کا حصہ

1289۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: ((قَسَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ خَيْبَرَ لِلْفَرَسِ سَهْمَيْنِ وَلِلرَّاجِلِ سَهْمًا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ .

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: أَسْهَمَ لِرَجُلٍ وَلِفَرَسِهِ ثَلَاثَةَ أَسْهُمٍ: سَهْمَيْنِ لِفَرَسِهِ ، وَسَهْمًا لَهُ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے غزوۂ خیبر کے دن گھوڑے کو دو حصے جبکہ پیادے، کو ایک حصہ دیا۔ [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

اور سنن ابی داؤد کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: نبی کریم ﷺ نے مجاہد اور اس کے گھوڑے کے لیے (کل) تین حصے مقرر فرمائے، دو حصے اس کے گھوڑے کے اور ایک حصہ اس کا۔ [2]

شرح: ...... یہ مجاہدین کے درمیان حصوں کی تقسیم ہے۔ سب سے پہلے تو کل مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے جن میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے نام کا ہوگا۔ پھر باقی کے چار خمس مجاہدین میں اس طور پر تقسیم ہوں گے کہ سوار کو تین حصے اور پیادے کو ایک حصہ ملے گا اور سوار کے تین حصوں میں سے دو حصے اس کے گھوڑے کے ہوں گے جبکہ ایک حصہ اس کا ہوگا۔

پیادے اور سوار میں حصوں کی تقسیم کا یہ فرق اس لیے ہے کہ سوار کا فعل کرّ وفر دونوں میں بہ نسبت پیادے کے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ لیکن پیادے کو بھی حصہ ملے گا چاہے دشمنوں پر فتح پانے میں اس کی ضرورت نہ بھی ہو لیکن مجاہدین کے شریک کار ہونے اور دشمنوں پر دھاک بٹھانے میں بہرحال پیادے کا کردار ہے۔ اس لیے پیادے کو مالِ غنیمت کا ایک حصہ ضرور ملے گا۔ لیکن ایک حصہ سے زیادہ نہ ملے گا۔

البتہ اگر تنفیل کی مد میں کچھ اور مل جائے تو جائز ہوگا۔

یاد رہے کہ اونٹ والے کو دو حصے ملیں گے ایک اس کا اور ایک اس کے اونٹ کا کیونکہ دشمنوں پر چڑھائی کرنے میں اونٹ کی قوت واستعداد گھوڑے سے کم ہوتی ہے اور یہی عدل ہے۔

---

[1] صحيح البخاری: 4228۔ صحيح مسلم: 1762.

[2] سنن ابی داؤد: 2733۔ صحيح ابن حبان: 4811.

تنفیل کا حکم

1290۔ وَعَنْ مَعْنِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((لَا نَفَلَ إِلَّا بَعْدَ الْخُمُسِ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الطَّحَاوِيُّ.

حضرت معن بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''نفل (یعنی جنگی انعام) خمس (نکالنے) کے بعد ہی ہوگا۔'' ❶

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام احمد نے روایت کیا ہے جبکہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

1291۔ وَعَنْ حَبِيبِ بْنِ مَسْلَمَةَ رضي الله عنه قَالَ: ((شَهِدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، نَفَّلَ الرُّبُعَ فِي الْبَدْأَةِ وَالثُّلُثَ فِي الرَّجْعَةِ)).

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُودِ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں (اس موقعہ پر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں ایک ربع (مال غنیمت) کو نفل میں تقسیم فرمایا، اور ایک ثلث واپسی میں (نفل میں تقسیم فرمایا)۔ ❷

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے جبکہ ابن جارود، ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

1292۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ: ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُنَفِّلُ بَعْضَ مَنْ يَبْعَثُ مِنَ السَّرَايَا لِأَنْفُسِهِمْ خَاصَّةً، سِوَى قِسْمَةِ عَامَّةِ الْجَيْشِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن سرایا کو روانہ فرماتے تھے، ان میں سے بعض کو خاص طور پر نفل مرحمت فرمایا کرتے تھے جو عام لشکر میں مال غنیمت کی تقسیم کے علاوہ ہوتا تھا۔ ❸

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح: ......علماء کا اس بارے اختلاف ہے کہ نفل خمس نکالنے سے پہلے ہوگا یا بعد میں؟ سو ایک قول یہ ہے کہ پہلے کامل خمس نکالا جائے گا پھر باقی کے چار خمسوں میں سے نفل کو نکالا جائے گا۔

جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ نفل خمس سے قبل نکالا جائے گا یعنی اصل غنیمت میں سے نکالا جائے گا۔ ان دونوں اقوال کی روشنی میں راجح قول یہ سامنے آتا ہے یہ امر امام کی رائے اور اس کے اجتہاد کے سپرد ہے۔ کیونکہ اس بارے روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

⊙ ......ایک روایت ہے کہ نفل خمس کے بعد نکالا جائے گا۔

⊙ ......ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں ایک ربع نفل نکالا اور ایک ثلث واپسی پر نکالا جس سے عیاں ہوتا ہے کہ نفل اصل غنیمت میں سے ہے۔ تب پھر راجح قول یہ ہے کہ یہ امر امام کی رائے اور اجتہاد کے سپرد ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 2753۔ مسند احمد: 270/3۔ مشکل الآثار للطحاوی: 242/3.

❷ سنن ابی داؤد: 2750۔ المنتقی لابن جارود: 1078۔ صحیح ابن حبان: 4835۔ المستدرك للحاكم: 145/2۔ مسند احمد: 160/4۔ الکامل لابن عدی: 269/3۔ ترجمة سليمان بن موسىٰ۔ ابن عدی کہتے ہیں: سلیمان میرے نزدیک صدوق اور ثبت ہے جبکہ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی تخریج میں امام دارقطنی نے شیخین کو لازم پکڑا ہے۔

❸ صحیح البخاری: 3135۔ صحیح مسلم: 1750.

اوراس پر مستزاد یہ ہے کہ نفل نکالنا کوئی ضروری ہی نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ "يُنَفِّلُ بَعْضَ مَنْ يَبْعَثُ مِنَ السَّرَايَا" سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ہر بار میں نفل دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور نہ تھا۔

تب پھر نفل دینا یا نہ دینا، پھر خمس نکالنے سے قبل دینا یا اس کے بعد دینا، یہ سب امام کی رائے اور مصلحت کے حوالے ہوگا۔

تقسیم سے پہلے دشمنوں کے کھانے سے لینے کا حکم

1293- وَعَنْهُ رضي الله عنه قَالَ: ((كُنَّا نُصِيبُ فِي مَغَازِينَا الْعَسَلَ وَالْعِنَبَ، فَنَأْكُلُهُ وَلَا نَرْفَعُهُ)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

وَلِأَبِي دَاوُد: فَلَمْ يُؤْخَذْ مِنْهُ الْخُمُسُ.

وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہمیں اپنے غزوات کے دوران (دشمنوں کا) شہد اور انگور ملتا تھا تو ہم اسے کھا لیتے تھے اور اسے (امیر لشکر کے پاس) نہ بھیجا کرتے تھے۔ ❶

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

اور سنن ابی داؤد کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: اور ان سے (یعنی اس شہد اور انگور وغیرہ سے) خمس نہ لیا جاتا تھا۔ ❷

امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

1294- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رضي الله عنه قَالَ: ((أَصَبْنَا طَعَامًا يَوْمَ خَيْبَرَ، فَكَانَ الرَّجُلُ يَجِيءُ، فَيَأْخُذُ مِنْهُ مِقْدَارَ مَا يَكْفِيهِ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ)).

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُوْدِ وَالْحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: خیبر کے دن ہمیں (کھانے کا) غلہ ملا، پس ایک (ایک کر کے) آدمی آتا اور اس میں سے بقدر کفایت لے لیتا اور لوٹ جاتا۔ ❸

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ جبکہ ابن جارود اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :......ان دونوں روایات میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اموالِ غنیمت میں اس قسم کی چیزوں کو تقسیم سے قبل لے لینا غلول میں داخل نہیں۔ اس کی دلیل "لَا نَرْفَعُهُ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہم ملنے والے شہد اور انگور وغیرہ کو امیر لشکر کے پاس نہ لے جایا کرتے تھے۔ یا یہ مراد ہے کہ ان چیزوں کو مالِ غنیمت میں شمار کرنے کے لیے نہ بھیجا کرتے تھے۔ یہ غلول نہیں کیونکہ لشکریوں کو اس قدر کھانے کی احتیاج ہوتی رہتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ جنگ کے دوران اگر دشمن کے علاقوں میں انگور یا شہد ملتا تھا تو اس کو کھا لیتے تھے۔ یہی حکم رطب کھجور اور کھانے کا بھی ہے۔ البتہ وہ اس کھانے کو ذخیرہ نہ کرتے تھے۔ بقدر کفایت لے کر باقی کا مالِ غنیمت کے حوالے کر دیتے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ ایک آنے والا آتا اور اپنی ضرورت کے بقدر لے لیتا اور لوٹ جاتا تھا۔ تب پھر ان اشیاء کو بھی لے کر ذخیرہ کر لینا غلول میں شمار ہوگا۔

---

❶ صحيح البخاري: 3154.

❷ سنن ابي داؤد: 2701- صحيح ابن حبان: 4825.

❸ سنن ابي: 2704- المنتقى لابن جارود: 1072- المستدرك للحاكم: 137/2.

مالِ فے کی حفاظت واجب ہے

1295- وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رضي الله عنه قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَرْكَبْ دَابَّةً مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ ، حَتَّى إِذَا أَعْجَفَهَا رَدَّهَا فِيْهِ ، وَلَا يَلْبَسْ ثَوْبًا مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ ، حَتَّى إِذَا أَخْلَقَهُ رَدَّهُ فِيْهِ)).

حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جو شخص اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ مسلمانوں کے (مالِ) فے کے کسی جانور کی (اس طرح) سواری نہ کرے یہاں تک کہ جب اسے (چلا چلا کر) کمزور کر دیا تو اسے (مالِ) غنیمت میں واپس کر دیا اور مسلمانوں کے (مالِ) فے سے کوئی کپڑا (اس طرح) نہ پہنے یہاں تک کہ جب اسے (پہن پہن کر) پرانا کر دیا تو اسے (مالِ) فے میں واپس کر دیا۔“ [1]

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ ، وَرِجَالُهُ لَا بَأْسَ بِهِمْ .

اس حدیث کو امام ابو داؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال میں کوئی حرج نہیں۔

غریب الحدیث :......مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَرْكَبْ: خطاب کا یہ اسلوب اگر کسی منفی کلام میں ہو تو مخاطب کو کسی فعل کے نہ کرنے پر ابھارنے کے لیے ہوتا ہے اور اگر کسی مثبت کلام میں ہو تو کسی فعل کے کرنے پر ابھارنے کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والا مامورات کو بجا لائے گا اور مناہی سے اپنا دامن بچائے رکھے گا۔ چنانچہ مذکورہ حدیث میں مالِ غنیمت کے جانور پر اس طرح سوار نہ ہونے پر ابھارنا ہے کہ جب وہ کسی کام کا نہ رہا تو مالِ غنیمت میں واپس کر دیا۔ کیونکہ یہ منافع میں غلول ہے۔ تو جیسے غلول اعیان میں ہوتا ہے، ویسے ہی منافع میں بھی ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال منافع میں غلول کی ہے۔ دَابَّةً: مراد اونٹ اور گھوڑا وغیرہ ہے جو سواری کے کام آتا ہے۔

مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِيْنَ: فے سے یہاں مالِ غنیمت مراد ہے۔

وَلَا يَلْبَسْ ثَوْبًا ..... رَدَّهُ فِيْهِ: یہ مالِ غنیمت میں منافع میں غلول کی دوسری مثال کا بیان ہے کہ ایسا نہ کرے کہ مالِ غنیمت کا کپڑا لے کر اسے پہن کر پرانا کرے تب مالِ غنیمت میں واپس کر دے۔

وَرِجَالُهُ لَا بَأْسَ بِهِمْ: حضرات محدثین کے نزدیک یہ راوی کی تعدیل کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔ جو جرح کے سب ادنیٰ درجہ کے قریب کا درجہ ہے۔ تب پھر اگر یہ کامل توثیق نہیں تو کم از کم جرح بھی نہیں۔ ہاں ادنیٰ درجہ کی تعدیل ضرور ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مالِ غنیمت میں غلول جیسے اعیان میں ہوتا ہے ویسے ہی منافع میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ مالِ غنیمت کی کسی شے کو بایں طور برت کر لوٹانا کہ اس کی منفعت میں کافی حد تک کمی آ گئی ہو کہ یہ بھی غلول میں داخل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مالِ غنیمت کے جانوروں پر تقسیم سے قبل سوار ہونا حرام ہے۔ اس کی دلیل ”فَلَا يَرْكَبْ دَابَّةً“ کے الفاظ ہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 2708- سنن الدارمی: 2488- مسند احمد: 108/4- امام ابن حبان: (4850) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، جبکہ خود امام موصوف نے ”فتح الباری“ (256/6) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

◈ یاد رہے کہ مذکورہ "حَتّٰی" غایت کے لیے نہیں کیونکہ مالِ غنیمت سے سب کا حق وابستہ ہے۔ لہٰذا مذکورہ حدیث کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ اگر کسی نے سواری تو کی پر اتنی نہ کی کہ سواری کو دبلا کر دیا تو یہ جائز ہوگا۔ بلکہ یہاں "حَتّٰی" تعلیل کے لیے ہے۔

◈ البتہ ضرورت پڑنے پر مالِ غنیمت کے جانور کی سواری کر سکتے ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت کے جانور پر سوار ہونا یہ ایمان باللّٰہ اور ایمان بالیوم الآخر کے کمال کے منافی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان کا مقتضی یہ بتلایا گیا ہے کہ آدمی مالِ غنیمت کے جانور پر سوار نہ ہو۔ تب پھر اس مقتضی سے تخلف ایمان میں نقص کا سبب ہوگا۔

◈ بیت المال کی حمایت وحفاظت واجب ہے۔ کیونکہ بیت المال کی اعیان اور ان کے منافع میں غلول کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے اور کبیرہ سے اجتناب واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا بیت المال کی حفاظت وحمایت واجب ہوگی۔

مسلمانوں میں سے ادنیٰ کی پناہ بھی سب مسلمانوں پر چلے گی

1296- وَعَنْ أَبِيْ عُبَيْدَةَ بْنِ الْجَرَّاحِ رضي الله عنه قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((يُجِيْرُ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ)).

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''کسی مسلمان کی دی پناہ سب مسلمانوں پر جاری ہوگی۔'' [1]

أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ وَأَحْمَدُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور احمد نے روایت کیا ہے، اور اس کی اسناد میں ضعف ہے۔

1297- وَلِلطَّيَالِسِيِّ مِنْ حَدِيْثِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ: ((يُجِيْرُ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ أَدْنَاهُمْ)).

اور مسند طیالسی میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں: مسلمانوں میں سے ادنیٰ کی دی پناہ سب مسلمانوں پر جاری ہوگی۔ [2]

1298- وَفِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه قَالَ: ((ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ يَسْعَى بِهَا أَدْنَاهُمْ))

اور صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، ان میں کا ادنیٰ بھی اس ذمہ کے لیے کوشش کرے گا۔'' [3]

زَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ((وَيُجِيْرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ)).

اور سنن ابن ماجہ میں ایک اور طریق سے یہ الفاظ زائد مروی ہیں: اور ان میں کا (عزت وشرف اور قیادت وسیادت میں) سب سے دور (بھی) ان پر (اپنی دی) پناہ کو جاری کرے گا۔ [4]

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ: 509/6۔ مسند احمد: 250/5۔ مسند ابی یعلی: 876۔ مسند البزار: 1288۔ اس حدیث کی اسناد میں حجاج بن ارطاۃ ہے جو ضعیف ہے۔ دیکھیں: مجمع الزوائد: 329/5.

[2] مسند الطیالسی: 1063۔ مسند احمد: 215/2۔ صحیح ابن خزیمۃ: 2280۔ المنتقی لابن جارود: 1052.

[3] صحیح البخاری: 6755۔ صحیح مسلم: 1370.

[4] سنن ابن ماجہ: 2683.

1299۔ وَفِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ هَانِئٍ "((قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ)) ." اور صحیحین میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث (میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد) ہے: ''جس کو تم نے پناہ دی ہم نے (بھی) اس کو پناہ دی۔'' ❶

روایت الحدیث :......امام موصوف نے یہ کل پانچ روایتیں ذکر کی ہیں، جن میں سے پہلی روایت کی اسناد کو امام موصوف نے ضعیف کہا ہے، اور دوسری روایت کی اسناد پر کوئی کلام نہیں کیا البتہ اہل اصطلاح کے نزدیک یہ روایت شاہد کے درجہ میں ہے۔ کیونکہ شاہد دوسرے صحابی سے مروی اس حدیث کو کہتے ہیں جو پہلی ضعیف حدیث کی تائید کرتی ہے۔ جبکہ تیسری روایت بھی بلا شک شاہد ہے اور قوی شاہد ہے کیونکہ وہ صحیحین کی روایت ہے اور ابن ماجہ کی روایت بھی شاہد ہے۔ جبکہ پانچویں روایت جو صحیحین کی روایت ہے، وہ شاہد تطبیقی ہے۔

اب ذیل میں ان روایات کے معانی کو بیان کیا جاتا ہے۔

غریب الحدیث :......**يُجِيرُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ بَعْضُهُمْ**: یعنی ایک مسلمان کسی مشرک کو پناہ دے دے تو وہ باقی مسلمانوں پر بھی اپنی دی اس پناہ کو لازم کر دے گا۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم، بلادِ اسلامیہ میں کسی مسلمان کی پناہ لے کر داخل ہوتا ہے تو وہ مامون ہوگا اور اب کسی کو بھی اس کافر پر تعدی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ کیونکہ سب مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا دیا عہد سب پر لازم ہے۔ لہٰذا مسلمانوں میں کا ادنی بھی اس ذمہ کی کوشش کرے گا۔

ان مشرکوں کو پناہ دینے کے جواز کی اصل غرض و غایت یہ ہے تا کہ وہ بلاد اسلامیہ میں داخل ہو کر اللہ کے دین کا کلام سن سکیں۔ اسی طرح اگر کوئی اسلام کو اور مسلمانوں کی عبادت و معاشرت کو ان کے قریب رہ کر دیکھنا چاہے تو اسے اس کی اجازت دی جائے گی۔ البتہ اگر وہ مسلمانوں کی جاسوسی کرنے کے لیے بلاد اسلامیہ میں داخل ہونے کی اجازت لے رہا ہے اور پناہ مانگ رہا ہے تو ایسے شخص کو پناہ دینا حرام ہوگا۔

يُجِيرُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ أَدْنَاهُمْ: یہ مسند طیالسی کے الفاظ ہیں۔ معلوم ہوا کہ پناہ دینے والے کا کسی شرف وسیادت کا مالک ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اگر وہ قوم کا ادنیٰ آدمی ہے تو وہ بھی پناہ دے سکتا ہے اور اس کی دی ہوئی پناہ کا احترام سب پر لازم ہوگا۔ غرض جس سے بھی یہ عقد صحیح ہے، اسے پناہ دینا جائز ہے۔

ذِمَّةُ الْمُسْلِمِينَ وَاحِدَةٌ يَسْعَى بِهَا أَدْنَاهُمْ: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو صحیحین میں مروی ہے۔ ذمہ سے مراد عہد ہے۔ یعنی جب اجارہ (پناہ دینے) کا عہد ایک مسلمان سے واقع ہو گیا تو اب اس کی پاسداری سب پر واجب ہے۔ اسی لیے بعد میں فرمایا کہ اب اس کے لیے ان میں کا ادنی بھی کوشش کرے گا۔

مذکورہ الفاظ معنی کے اعتبار سے مسند طیالسی کی مذکورہ پہلی روایت جیسے ہیں۔

يُجِيرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ: یہ سنن ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ اَقْصَی یہ اَبْعَد کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ آدمی جو شرافت وسیادت سے دور ہو، اس کی دی پناہ بھی مقبول ہوگی۔

قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ: صحیحین کی یہ روایت گویا کہ گزشتہ روایات کی عملی تطبیق ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 3171۔ صحيح مسلم: 719.

مضمون حدیث :......ان روایات میں ایک مسلمان کے کسی مشرک کو پناہ دینے کا بیان ہے۔ کہ اس کی دی پناہ نافذ و جاری ہوگی اور وہ سب مسلمانوں کی دی ہوئی پناہ کی طرح ہوگی۔ کیونکہ سب مسلمانوں کا ذمہ اور عہد ایک ہے۔ حتیٰ کہ عورت کی دی ہوئی پناہ بھی جاری ہوگی جو قوم کا ادنیٰ فرد ہوتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر جب سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اپنے دو پڑوسیوں کو پناہ دی اور خود ان کے بھائی جناب علی رضی اللہ عنہ اس پناہ کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور معاملہ نبی کریم ﷺ تک جا پہنچا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اے امی ہانی! جسے تم نے پناہ دی ہم نے بھی اسے پناہ دی۔

یہود ونصاریٰ کے جزیرۂ عرب سے نکال دینے کا حکم

1300. وَعَنْ عُمَرَ رضي الله عنه أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ ، حَتَّى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِمًا)).
رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ”میں ان یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال کر دم لوں گا یہاں تک کہ میں (یہاں) سوائے مسلمان کے کسی کو نہ چھوڑوں گا۔“ [1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَأُخْرِجَنَّ :اس جملہ میں تین تاکیدات ہیں:

(1) قسم، جو مقدر ہے (2) لامِ تاکید
(3) اور نونِ تاکید

اَلْيَهُودَ وَالنَّصَارَى: دو مشہور گمراہ اہل کتاب قومیں جن کا نبی کریم ﷺ کی رسالت و نبوت سے انکار کی بابت، تاریخی کردار زبانِ زدِ خلائق ہے۔

مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ: نبی کریم ﷺ نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ آپ ﷺ جزیرۂ عرب میں سے یہود و نصاریٰ کو نکال کر رہیں گے۔ کیونکہ اسلام اسی جزیرہ سے نمودار ہوا تھا، یہیں سے اسلام نے آفتابِ ہدایت کی کرنوں سے آفاقِ عالم کو منور کیا تھا اور اسلام اخیر زمانہ میں لوٹ کر اسی جزیرہ میں سمٹ آئے گا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ: اسلام لوٹ کر مدینہ یوں چلا آئے گا جیسے سانپ لوٹ کر اپنے بل میں چلا آتا ہے۔ [2]

دوسرے یہ کہ اگر جزیرۂ عرب میں اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی نمائندہ قوموں کو رہنے اور پنپنے دیا جائے اور یہاں اسلام کے پہلو بہ پہلو دوسرے ادیان بھی پھلنے پھولنے لگیں تو دین اسلام برباد ہو جائے، اسی لیے ارشاد فرمایا کہ: جزیرۂ عرب میں دو دین اکٹھے نہ ہوں گے۔ [3] پس یہ بات ناممکن ہے کہ جزیرۂ عرب میں شعائرِ اسلام کے ساتھ شعائرِ کفر بھی قائم ہوں۔

رہا یہ سوال کہ جزیرۂ عرب سے کیا مراد ہے، اور اس کی حدود کیا ہیں؟ تو:

---

[1] صحيح مسلم: 1551.

[2] صحيح البخاري: 1876- صحيح مسلم: 147.

[3] المؤطا لمالك: 892/2- عن ابن شهاب مرسلاً: مصنف عبدالرزاق: 9984- من مراسيل ابن مسيَّب، مسند احمد: 257/6 موصولاً عن عائشة رضي الله عنها باسناد جيِّد.

شمال:...... میں یہ جزیرہ شام تک ہے، جو سوریا، فلسطین اور اس کے قرب وجوار کو شامل ہے
مغرب:...... میں یہ جزیرہ بحرِ قلزم تک ہے
مشرق:...... میں عراق تک جنوب:...... میں یہ جزیرہ یمن تک پھیلا ہوا ہے۔

جزیرۂ عرب کا یہ نام بابِ تغلیب سے ہے کیونکہ جغرافیہ دانوں کے نزدیک جزیرہ زمین کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کو چاروں طرف سے سمندر نے گھیرا ہو۔ جبکہ جزیرہ عرب کو سمندر چاروں طرف سے محیط نہیں ہے۔ اسی لیے بعض ماہرین نے جزیرۂ عرب کو ''جزیرہ نما'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

جزیرۂ عرب سے یہود ونصاریٰ کی بے دخلی

بلاشبہ یہ کلامِ رسالت ہے جس میں ان دو قوموں کو جزیرۂ عرب سے نکال دینے کی تاکید کی گئی ہے اور سنن کی ایک روایت میں آپ ﷺ سے اس بات کا امر مروی ہے کہ: ''یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔'' جبکہ آپ ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں امت کو اس بات کی وصیت فرمائی تھی کہ: ان مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کرو۔'' ان دونوں وصایا کی روشنی میں امت پر واجب ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ اور مشرکوں کو جزیرۂ عرب میں سے نکال دیں جس کی حکمتیں ہم نے ابھی بیان کر دی ہیں۔

البتہ ان یہود ونصاریٰ کو ذلیل بنا کر رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے خیبر کے یہود کو بٹائی کے معاہدہ کے ساتھ خیبر کی زمینوں پر رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ پھر جنابِ عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر ان کو بھی جزیرۂ عرب سے نکال دیا تھا جس کے اسباب معروف ہیں، جن میں سرفہرست اس قوم کی عہد شکنی کی صدیوں پرانی خُو تھی۔

پس مذکورہ روایات میں یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب میں رہنے کی جو ممانعت ہے، وہ جزیرۂ عرب کو وطن بنا کر رہنے پر محمول ہے۔ لہٰذا جو یہاں کا مستقل باشندہ بن کر رہنا چاہے، اسے اس کی اجازت نہ دی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ والیانِ امر پر واجب ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب میں مستقل رہنے کی اجازت ہرگز بھی نہ دیں اور مشرکین تو اس بات کے بدرجۂ اولیٰ مستحق ہیں کہ انہیں جزیرۂ عرب سے نکال دیا جائے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جزیرۂ عرب میں صرف اور صرف اسلام ہی ہوگا، اس کی دلیل: "حَتَّی لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِماً" کے الفاظ ہیں۔
- یہود ونصاریٰ کا جزیرۂ عرب سے اخراج واجب ہے۔
- جزیرۂ عرب کا احترام واجب ہے کہ یہی اسلام کی جائے پیدائش ہے۔ اس لیے تقویٰ واستقامت کے اعتبار سے اس جزیرۂ کا احترام لازم ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر قتال کے بغیر یہ یہود ونصاریٰ جزیرۂ عرب سے نہ نکلیں تو ان سے قتال واجب ہوگا۔

بنی نضیر کی مدینہ سے جلاوطنی

1301۔ وَعَنْهُ ﷺ قَالَ: ((كَانَتْ أَمْوَالُ بَنِي حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: بنی [illegible] نے

النَّضِيرِ مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَى رَسُوْلِهِ ، مِمَّا لَمْ يُوْجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ ، فَكَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خَاصَّةً ، فَكَانَ يُنْفِقُ عَلَى أَهْلِهِ نَفَقَةَ سَنَةٍ ، وَمَا بَقِيَ يَجْعَلُهُ فِي الْكُرَاعِ وَالسِّلَاحِ ، عُدَّةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

اموال ان غنائم میں سے تھے جن کو رب تعالیٰ نے اپنے رسول پر لوٹایا تھا۔ (یعنی آپ ﷺ کے ہاتھ لگا دیا تھا) یہ ان مالوں میں سے تھے جن پر مسلمانوں نے نہ تو گھوڑے دوڑائے تھے اور نہ اونٹ۔ پس یہ اموال نبی کریم ﷺ کے لیے خاص تھے۔ آپ ﷺ (ان اموال کو) اپنے گھر والوں پر سالانہ خرچ کے طور پر خرچ کرتے تھے اور (سالانہ خرچ سے) جو بچ رہتا تھا اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا سامان بنا کر گھوڑوں اور اسلحہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ ❶

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث :...... بَنِي النَّضِيرِ : مدینہ میں آباد یہود کے تین مشہور قبائل میں سے ایک۔ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد ان تینوں قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا لیکن ان یہود بے بہبود نے اس معاہدے کو توڑ ڈالا، اسی عہد شکنی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان قبائل کو قتال کے بغیر جلا وطن فرما دیا تھا اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مالِ فے اس غنیمت کو کہتے ہیں جو بدون قتال کے ہاتھ لگے۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے بنی نضیر کے اموال کو فے قرار دیا۔ کیونکہ جلا وطنی کے بعد یہودِ بنی نضیر اور اپنے علاقہ اور گھروں کو چھوڑ گئے تھے البتہ جاتے جاتے کینہ ونفرت کے مارے جتنا ہو سکتا تھا، ان گھروں کو نقصان پہنچا گئے تھے۔

لَمْ يُوجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ: "اوجف" کا معنی ہے چوپائے کو تیز دوڑانا، مراد اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دشمنوں پر حملہ کرنا ہے۔

بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ: "خَيْلٍ" گھوڑے۔ "رِكَاب" یہ رَكْبٌ کی جمع ہے۔ مراد اونٹ ہیں۔

فَكَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خَاصَّةً: کیونکہ یہ اموال قتال سے حاصل نہ ہوئے تھے جبکہ غنیمت وہ مال ہوتا ہے جو قتال وغیرہ سے حاصل ہو، اس میں سب قتال کرنے والوں کا حق ہوتا ہے اور چونکہ اموالِ بنی نضیر قتال سے حاصل نہ ہوئے، اس لیے یہ اموال خاص نبی کریم ﷺ کے تھے، ان میں کوئی مجاہد شریک نہ تھا۔ آپ ﷺ ان اموال سے اپنی ازواج مطہرات کا سالانہ خرچ نکالتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ ﷺ اس میں سے محتاجوں پر بھی خرچ کرتے تھے۔

فِي الْكُرَاعِ وَالسِّلَاحِ: کراع: یہ گھوڑے اور اس کے جنگی ساز وسامان کو کہتے ہیں اور سلاح سے مراد اسلحہ ہے جو معروف ہے۔

عُدَّةً فِي سَبِيلِ اللّٰهِ: "عُدَّةً" کا نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ "الْكُرَاعِ" اور "السِّلَاحِ" سے حال ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جلا وطن کیے جانے والوں کے اموال کو لیا جا سکتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بنی نضیر کو جلا وطن کرنے کے بعد ان کے اموال لے لیے تھے۔ لہٰذا اگر کسی بستی کے لوگ مسلمانوں کے خوف سے اپنی بستی چھوڑ کر بھاگ نکلیں تو ان کے اموال لے

---

❶ صحيح البخاري: 2904۔ صحيح مسلم: 1757 .

لینا جائز ہوگا اور وہ مسلمانوں کے لیے مالِ غنیمت ہوں گے۔

- ◈ بدون قتال کے حاصل ہونے والے اموال امام کی رائے کے سپرد ہوتے ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بنی نضیر کے اموال اپنے لیے خاص فرما لیے تھے۔
- ◈ امام مالِ فے کو اپنے ذاتی خرچ میں بھی لا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مال کو گھر کے اخراجات میں بھی صرف کر سکتا ہے۔
- ◈ امام مالِ فے کو گھر کے اخراجات میں سال سے زیادہ کے لیے بھی خرچ کر سکتا ہے جبکہ عامۃ المسلمین کو اس کی حاجت نہ ہو۔
- ◈ نبی کریم ﷺ کو جہاد کا بے حد اہتمام تھا۔ چنانچہ اپنی ضرورت سے بچ رہنے والے مال کو جہادی ضروریات میں خرچ فرما دیتے تھے۔
- ◈ جہاد کے لیے اسلحہ وغیرہ خرید کر دینا زیادہ بہتر ہے یا لشکر کی قوت بڑھانے کے لیے انہیں نقد رقم دینا زیادہ بہتر ہے؟ تو یہ مسئلہ مصلحت اور امام کی رائے کے سپرد ہے۔

غنائم خیبر کی تقسیم کا بیان

1302۔ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضي الله عنه قَالَ: ((غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خَيْبَرَ، فَأَصَبْنَا فِيهَا غَنَمًا، فَقَسَمَ فِينَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَائِفَةً، وَجَعَلَ بَقِيَّتَهَا فِي الْمَغْنَمِ)).

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: غزوۂ خیبر میں ہم جناب رسول اللہ ﷺ کے شریک تھے۔ پس ہمیں اس غزوہ میں (بے شمار) بکریاں ملیں۔ آپ ﷺ نے (ان میں سے) ایک حصہ ہم میں تقسیم فرما دیا۔ جبکہ باقی کی بکریاں (اموال) غنیمت میں داخل فرما دیں۔ [1]

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ لَا بَأْسَ بِهِمْ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اس کے رجال میں کوئی حرج نہیں۔

غریب الحدیث:...... غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خَيْبَرَ: غزوۂ خیبر سات ہجری میں ہوا تھا۔

فَقَسَمَ فِينَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ممکن ہے کہ یہ بکریاں رفع ضرورت کے لیے تقسیم کی گئی ہوں جبکہ باقی کی بکریوں کو مالِ غنیمت میں داخل کیا گیا ہو۔

جبکہ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اموالِ غنیمت کی تقسیم امام کی رائے کے سپرد ہے، وہ چاہے تو پورے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے ان کو تقسیم کر دے اور چاہے تو تقسیم سے قبل اس میں سے بطور نفل کے کچھ تقسیم کر دے۔ اس کی پوری تفصیل نفل کے بیان میں گزر چکی ہے اور تقسیم کے یہ دونوں طریق درست ہیں۔ چنانچہ اگر لشکر کو کھانے کی احتیاج ہو تو قائدِ لشکر بنا تقسیم کے ان کو اموالِ غنیمت میں سے بقدر حاجت دے سکتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ یہودیوں سے جہاد کرنا مشروع ہے۔ کیونکہ اس وقت خیبر میں صرف یہودی آباد تھے۔

[1] سنن ابی داؤد: 2707۔ سنن الدار قطنی: 82/4۔ سنن البیہقی: 60/9۔ المعجم الاوسط للطبرانی: 2737
حدیث کی اسناد میں اردن کا ایک شیخ ابو عبدالعزیز ہے جو مجہول ہے۔

◈ جہاد کی حکمت میں سے یہ ہے کہ پہلے جہاد قرب و جوار کے لوگوں سے کیا جائے اور ان کے بعد والوں سے جہاد بعد میں کیا جائے۔

◈ نبی کریم ﷺ اموالِ غنیمت کو رب تعالیٰ کے امر سے تقسیم فرمایا کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ نہ تو قاصدوں کو قید کیا کرتے تھے اور نہ عہد شکنی ہی کیا کرتے تھے

1303- وَعَنْ أَبِیْ رَافِعٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((إِنِّیْ لَا أَخِیسُ بِالْعَهْدِ وَلَا أَحْبِسُ الرُّسُلَ))

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''نہ تو میں عہد توڑتا ہوں اور نہ قاصدوں کو قید ہی کرتا ہوں۔''[1]

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِیُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......**إِنِّي لَا أَخِيسُ** :اس جملہ میں صرف "إِنَّ" کے ساتھ ہی تاکید ہے۔ جبکہ مابعد مذکورہ "لَا" نافیہ ہے اور "لَا أَخِيسُ بِالْعَهْدِ" کا معنی ہے کہ میں عہد نہیں توڑا کرتا۔

لَا أُحْبِسُ الرُّسُلَ: "رُسُل": یہ رسول کی جمع ہے، مراد وہ قاصد و پیامبر ہے جو باہمی گفتگو اور بین الممالک امور پر مذاکرات کرنے کے لیے آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ آنے والے ایسے قاصدوں کو قید میں نہ ڈالا کرتے تھے کہ یہ سراسر خیانت ہے، دوسرے اس میں ایک عظیم منفعت کی تفویت اور اس کا ضیاع بھی ہے۔ کیونکہ بسا اوقات کسی امر پر مذاکرات میں دونوں ممالک کے بے شمار فوائد پنہاں ہوتے ہیں۔ تب پھر قاصدوں کے قتل و حبس سے یہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ عہد کو پورا کرنا واجب ہے۔ قرآن و سنت کی متعدد نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (الاسراء: 34)

''اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کا سوال ہوگا۔''

اور سنت میں سے ایک یہی مذکورہ حدیث ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ قتال صرف ان کفار سے ہیں جو معاہد نہ ہوں اور معاند ہوں۔

◈ نبی کریم ﷺ نے عہد شکنی کو نفاق کی ایک علامت قرار دیا ہے۔

◈ غدر کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر عقوبت مرتب ہے۔

◈ نبی کریم ﷺ دشمنوں سے بھی عہد کو پورا فرماتے تھے۔ اس کی دلیل: "إِنِّي لَا أَخِيسُ" کے الفاظ ہیں جو عام ہیں۔

◈ قاصدوں کو قید میں ڈالنا منع اور حرام ہے اس کی دلیل: "لَا أَحْبِسُ الرُّسُلَ" کے الفاظ ہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 2758- السنن الکبریٰ للنسائی: 8674- مسند احمد: 8/6- صحیح ابن حبان: 4877- ان سب مصادر میں "لا احبس الرُّسُل" کی بجائے "لَا أَحْبِسُ الْبُرُدَ" کے الفاظ ہیں۔ (اور مطلب دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔نسیم)

مفتوحہ زمینوں کا حکم

1304۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((أَيُّمَا قَرْيَةٍ أَتَيْتُمُوْهَا فَأَقَمْتُمْ فِيهَا فَسَهْمُكُمْ فِيهَا ، وَأَيُّمَا قَرْيَةٍ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ ، فَإِنَّ خُمُسَهَا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ، ثُمَّ هِيَ لَكُمْ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم لوگ جس بستی میں آؤ اور اس میں اقامت اختیار کرلو تو تمہارا اس (کی زمینوں) میں حصہ ہے، اور جو بستی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے (جس پر اس سے جہاد کرنے کی نوبت آ جائے اور وہ بستی فتح ہو جائے) تو اس کا خمس اللہ اور اس کے رسول کا ہو گا پھر وہ تمہاری ہے۔''[1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**أَيُّمَا قَرْيَةٍ**: ''اَيّ'' یہ اسم شرط ہے۔ اس کا فعل پر داخل ہونا لازم ہوتا ہے۔ تب پھر ''مَا'' زائدہ ہوگا اور ''قَرْيَةٍ'' یہ مضاف الیہ ہے، یوں ''اَيّ'' کے غیر فعل پر داخل ہونے کا اشکال رفع ہو گیا اور قریہ شہر کو کہتے ہیں چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ **فَسَهْمُكُمْ فِيهَا**: مطلب یہ ہے کہ وہ بستی جسے تم فتح کرلو، وہ تمہاری ہے۔

وَأَيُّمَا قَرْيَةٍ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ....: یعنی وہ بستی جو رب کی نافرمانی پر اتری ہے اور اس سے محاربہ وقتال کی نوبت آ گئی ہے جس کے نتیجہ میں وہ فتح ہو جاتی ہے۔ تو

فَإِنَّ خُمُسَهَا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ: یہ مسئلہ معروف ہے کہ مالِ غنیمت کا خمس اللہ اور اس کے رسول کا ہوتا ہے۔ **ثُمَّ هِيَ لَكُمْ**: یعنی خمس کے بعد باقی کے چار اخماس مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے۔ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے اور اس تقسیم میں اگر زمینیں ملیں تو مجاہدین کی ملکیت ہوں گی جس کی دلیل ''ثُمَّ هِيَ لَكُمْ'' کے الفاظ ہیں کیونکہ اس میں لام تملیک کا ہے۔

تنبیہ:......بستی کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایک وہ بستی ہے جو بدون قتال کے فتح ہوئی ہے یا وہاں کے لوگ اسلام لے آئے ہیں تو اس کی زمینوں کو تقسیم نہ کیا جائے گا اور وہ بستی بستی والوں کی رہے گی۔

(2) دوسری قسم وہ ہے جو اپنے کفر پر باقی ہے بلکہ مزید یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کر کے محاربہ وقتال پر اتری ہوئی ہے، ایسی بستی فتح ہونے کے بعد مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم ہو گی جس کا خمس اللہ اور اس کے رسول کا ہو گا جبکہ باقی کے چار حصے مجاہدین کے ہوں گے۔

1۔ بَابُ الْجِزْيَةِ وَالْهُدْنَةِ
جزیہ اور جنگ بندی وصلح کا بیان

جزیہ کا لغوی اور شرعی معنی:

لغت میں جزیہ زمین کے خراج اور لگان کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں جزیہ ذمیوں پر ان کی آمدنی میں سے مقرر کی

[1] صحيح مسلم: 1756.

جانے والی اس رقم کو کہتے ہیں جو ان کی حفاظت وحمایت کرنے اور ان کے بلاد اسلامیہ میں سکونت اختیار کرنے کے عوض میں لی جاتی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ جزیہ صرف ذمیوں پر ہوگا اور دوسرے ان ذمیوں پر ہوگا جو ہمارے بلاد وامصار میں رہتے ہیں اور جزیہ کا مقتضی ان لوگوں کی حمایت وحفاظت ہے۔ جو جزیہ کی رقم ادا کرتے ہیں، اور اس کے بدلے میں ہم ان کو وہ حقوق دیتے ہیں جن کو حضرات علماء کرام نے قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

ہدنہ: یہ دشمنوں کے ساتھ جنگ بندی کرنے کو کہتے ہیں، یہ صلح کے مشابہ ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ ہم ایک معین مدت تک دشمنوں کے ساتھ جنگ کو موقوف کر دیتے ہیں اور یہ کہ اب جنگ ضرورت کی بنا پر ہی کی جائے گی کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کرتا رہوں۔'' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ کوئی جنگ بندی نہ ہوگی۔ البتہ بسا اوقات جنگ بندی کی ضرورت پیش آ جاتی ہے جس کی وجہ مسلمانوں کی عمومی کمزوری بھی ہو سکتی ہے اور عین دشمنوں کے سامنے کی کمزوری بھی ہو سکتی ہے۔

عصر حاضر میں امت مسلمہ کی حالت کمزور ہی ہے، لہٰذا اس بات پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی امت کے ساتھ قتال کریں چاہے وہ امت چھوٹی ہی ہو کیونکہ مسلمان خود تشتت وتفرق اور انتشار اور خلفشار کا شکار ہیں۔ بھلا جو خود بیمار ہو وہ دوسرے کا علاج کیونکر کر سکتا ہے۔ ہم رب تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہیں کہ وہ امت مسلمہ کے ضعف اور نا اتفاقی کو دور فرمائے۔

جنگ بندی کی مدت:

یہ مدت دس سال ہے یا پانچ سال، علماء کا اس میں اختلاف ہے؟ یعنی آیا اس مدت کی کوئی حد ہے یا یہ مطلق ہے؟ تو حنابلہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جنگ بندی دس سال کی مدت کے اندر اندر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے پہلے یہ فرمایا کہ: مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کرتا رہوں۔ جبکہ پھر آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ کے ساتھ دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ تب پھر یہ مصالحت مذکورہ حدیث کی مخصص ہوگی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک امت مسلمہ کمزور ہے، مطلق صلح اور جنگ بندی کا مطلق معاہدہ کیا جا سکتا ہے جس میں سالوں کی قید نہ ہو اور یہ مدت کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ لہٰذا جب بھی مسلمانوں کو قوت نصیب ہو تو ان پر مقاتلہ واجب ہوگا۔ پس مسلمان جب بھی جنگ بندی کا معاہدہ کریں تو مطلق کریں، ہمیشہ کا معاہدہ نہ کریں۔ تب پھر جنگ بندی مطلق ہوگی۔ یہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا مختار قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ حکم کا مدار علت کے عدم یا وجود پر ہوتا ہے۔ تو جب مہادنہ یعنی جنگ بندی کے معاہدہ کا مدار مسلمانوں کا ضعف ہے تو جب بھی ضعف جاتا رہے گا تو جنگ بندی کا معاہدہ لغو قرار پائے گا۔

مجوس سے جزیہ لینے کا حکم

1305- عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رضی اللہ عنہ: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَخَذَهَا- يَعْنِي الْجِزْيَةَ- مِنْ مَجُوسِ هَجَرَ)).

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا تھا۔ [1]

---

[1] صحيح البخاري: 3157.

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ ، وَلَهُ طَرِيقٌ فِي الْمُوَطَّأِ فِيهَا انْقِطَاعٌ .

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کا ایک طریق موطا میں بھی ہے لیکن وہ طریق منقطع ہے۔ [1]

غریب الحدیث :......مِنْ مَجُوسِ هَجَرَ : مجوس ایک وثنی قوم ہے جو آگ کو پوجتی ہے۔ ان کا ایک فرقہ دو خالقوں کا قائل ہے جو ظلمت اور نور ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک ظلمت یعنی تاریکی یہ ہر شر کی خالق ہے جبکہ نور یعنی روشنی یہ ہر خیر کی خالق ہے لیکن اس کے باوجود یہ مجوسی ان دونوں خالقوں کو ایک دوسرے کا ہم پلہ نہیں مانتے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نور ظلمت سے افضل ہے۔ غرض مجوس ایک آتش پرست قوم ہے جو دو الٰہ کے ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے۔ هَجَرَ : یہ مملکت سعودیہ عربیہ کے جنوب میں واقع ایک علاقہ کا نام ہے، یہ موجودہ صوبے احساء اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ یہاں کی اکثر آبادی مجوس پر مشتمل تھی نبی کریم ﷺ نے ان سے جزیہ لینا منظور فرمایا تھا اور انہیں ان کے علاقوں میں رہنے کی اجازت دے دی۔

فائدہ:...... یہ حدیث بتلاتی ہے کہ مجوس سے جزیہ لینا جائز ہے اور اس باب میں ہجر کے یا دوسرے علاقوں کے مجوس کا حکم ایک ہے۔ کیونکہ احکامِ شرعیہ کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہوتے، ہاں اس کا کوئی واضح سبب ہو تو اور بات ہے یہ مسئلہ مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

عربوں سے جزیہ لینے کا حکم

1307-1306- وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ عَنْ أَنَسٍ ، وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي سُلَيْمَانَ رضي الله عنهما : ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيدِ إِلَى أُكَيْدِرِ دُومَةِ الْجَنْدَلِ ، فَأَخَذُوهُ فَأَتَوْا بِهِ ، فَحَقَنَ دَمَهُ ، وَصَالَحَهُ عَلَى الْجِزْيَةِ)) .

عاصم بن عمر حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل کے (حاکم) اکیدر کی طرف روانہ فرمایا۔ چنانچہ یہ لوگ اسے گرفتار کر کے خدمت نبوی میں لے آئے۔ پس آپ ﷺ نے اس کے خون کو محفوظ قرار دیا اور جزیہ (دینے) پر اس کے ساتھ صلح فرمالی۔ [2]

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ .

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......دَوْمَةَ الْجَنْدَل : یہ مدینہ کے شمال مغرب میں واقع ایک مشہور بستی کا نام ہے۔ یہاں کے حاکم کا نام اکیدر تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی طرف ایک مہم روانہ فرمائی جو اسے گرفتار کر کے لے آئی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کے خون کو محفوظ قرار دیا اور جزیہ کی ادائیگی پر اس کے ساتھ صلح فرمالی کیونکہ وہ اپنی قوم کا سردار تھا۔ یہ نہ تو مجوسی تھا اور نہ اہل کتاب بلکہ خاص مشرک عرب تھا۔

فائدہ:...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ یہود ونصاریٰ اور مجوس کے علاوہ سے بھی جزیہ لے سکتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دومۃ الجندل کے امیر اکیدر سے جزیہ لیا تھا جو مشرک تھا۔

---

[1] المؤطا لمالك: 278/1.

[2] سنن ابی داؤد: 3037۔ اس حدیث کی اسناد میں ابن اسحاق کا عنعنہ ہے۔ البتہ ابن ملقن نے "البدر المنير" (359/2) میں اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

ہر بالغ سے لیے جانے والے جزیہ کی مقدار

1308۔ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ، فَأَمَرَنِي أَنْ آخُذَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِينَارًا، أَوْ عَدْلَهُ مَعَافِرِيًّا)).

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے مجھے یمن بھیجا اور مجھے اس بات کا حکم دیا کہ میں ہر بالغ سے (جزیہ کی مد میں) ایک دینار لوں یا اس (کی قیمت) کے برابر معافری کپڑا لوں۔ ❶

أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو ائمہ ثلاثہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ:** نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دس ہجری ربیع الاوّل میں داعی، مبلغ، قاضی اور حاکم بنا کر یمن بھیجا تھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے یمن جانے کا قصہ مشہور ہے۔

مِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِينَارًا: دینار ایک معروف نقدی ہے اور حالم سے مراد بالغ ہے۔

أَوْ عَدْلَهُ معافرياً: معافری: ایک قسم کا یمنی کپڑا اور "عدلہ" سے مراد دینار کی قیمت کے برابر معافری کپڑا ہے۔

فائدہ:...... یہ حدیث بتلاتی ہے کہ جزیہ کی مقدار کیا ہے اور وہ ایک دینار یا اس کی قیمت کے برابر دوسرا سامان ہے چاہے وہ کپڑا ہو یا کچھ اور ہو اور کپڑے کی اور ایک دینار کی قید حکم شرعی نہیں بلکہ حکم مصلحی ہے جس میں مصلحت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لہٰذا جزیہ کی مقدار حسب مصلحت اس سے کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور اس باب میں دینار کی تعیین امام کی رائے اور اجتہاد کے سپرد ہے۔

اسلام کی سربلندی اس پر عمل کرنے سے ہے

1309۔ وَعَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍو الْمُزَنِيِّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((الْإِسْلَامُ يَعْلُو وَلَا يُعْلَى)).

حضرت عائذ بن عمرو المزنی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "اسلام (ہمیشہ) بلند رہتا ہے اور اس پر بلند نہیں ہوا جاتا۔" ❷

أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

مناسبت حدیث:...... مذکورہ حدیث کو "باب الجزية والهدنة" کے تحت لانے میں اس بات کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے جزیہ لینا بھی اسلام کی سربلندی میں سے ایک امر ہے۔ کیونکہ جزیہ ذلت و اہانت ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبة: 29)

---

❶ سنن ابی داؤد: 1576۔ مسند احمد: 230/5۔ جامع الترمذی: 623۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ صحیح ابن خزیمة: 2688۔ جبکہ ابن حبان (4886) حاکم (555/1) اور نسائی (25/5) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے "احکام اهل الذمة" (ص: 37) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

❷ سنن الدار قطنی: 252/3۔ اس کی اسناد حسن ہے۔

''یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔''

غریب الحدیث:......اَلْإِسْلَامُ يَعْلُو ، وَلَا يُعْلَى: اگر چہ یہ خبر ہے لیکن یہ حکم اور امر کو متضمن ہے۔ بے شک اسلام ہی سر بلند تھا اور رہے گا لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ اہل اسلام اس پر عمل پیرا بھی ہوں اور یہ پیروی حقیقی ہو نا کہ محض ظاہری۔ لہٰذا جب اہل اسلام حقیقت میں اسلام پر عامل ہوں گے تو رب تعالیٰ کی مدد ونصرت انہی کے ساتھ ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبة: 33)

''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جانیں۔''

اور جب اہل اسلام اسلام پر عمل پیرا نہ ہوں گے تو قریب ہے کہ ان کا حال یہود ونصاریٰ سے بھی بدتر ہو جائے جن کے بارے میں رب تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعة: 5)

''ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ رکھا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اٹھایا، گدھے کی مثال کی سی ہے جو بڑی کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ جب امت اخلاص اور حقیقت کے ساتھ اسلام پر عمل پیرا ہوگی تو اسلام خود بھی سر بلند ہوگا اور مسلمانوں کو بھی سر بلند کرے گا۔ یہاں تک کہ مسلمان سب لوگوں سے اونچے ہو جائیں گے۔

مذکورہ حدیث کا مفہوم واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ کامل خوشخبری اور بشارت ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے دین اسلام کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔

◈ اس حدیث سے دین اسلام کا مقام ومرتبہ بھی معلوم ہو گیا، اور وہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا دین اسلام پر فائق اور سر بلند نہیں ہوسکتا۔

◈ اگر چہ یہ خبر ہے لیکن یہ خبر متعدد احکام کو متضمن ہے۔ جن کو فقہا نے بیان کیا ہے، جیسے:

⊙ ......کافر لوگ اپنی عمارتوں کو مسلمانوں کی عمارتوں سے اونچا نہ بنائیں گے جبکہ مسلمان اور کافر دونوں ایک شہر میں رہ رہے ہوں۔

⊙ ......مسلمانوں کے لیے کافروں کی نوکری کرنا مکروہ ہے۔ یعنی کسی مسلمان کے لیے کسی کا خاص نوکر یا خادم بننا مکروہ ہے کیونکہ اس میں ایک مسلمان کی ذلت اور ایک کافر کا اس پر سر بلند ہونا ہے۔ اسی لیے علماء نے مسلمان کے لیے کسی کا خادم خاص بننا مکروہ لکھا ہے اور اگر وہ حرام بھی کہتے تو بعید نہ تھا۔

⊙ ......رہا کسی کافر کا مسلمان کو کسی کام پر متعین کر کے خدمت لینا نا کہ شخصی خدمت لینا تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسے کافروں کی کسی کمپنی یا فرم میں کوئی کام کرنا وغیرہ (لیکن اگر کوئی کسی کافر کا ڈرائیور، چوکیدار، خانسامہ، خادمِ خاص، بچوں کی دیکھ

بھال پر مقرر یا معاذ اللہ کافروں کے جانوروں کے نہلانے یا کھلانے پر مقرر ہے تو بلاشبہ یہ نہایت مکروہ بلکہ اسلام کی عظمت کے تناظر میں حرام ہے۔[نسیم] ❶

⊙ ...... کافروں کو سلام میں پہل نہ کرنا بھی اسلام کے عالی ہونے پر مرتب ہونے والا ایک حکم ہے۔ جیسا کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے۔

کافروں کو سلام کرنے کا حکم

1310۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا تَبْدَءُ وا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارَى بِالسَّلَامِ ، وَإِذَا لَقِيْتُمْ أَحَدَهُمْ فِيْ طَرِيْقٍ فَاضْطَرُّوْهُ إِلَى أَضْيَقِهِ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”(ان) یہود و نصاریٰ کو پہلے سلام نہ کرو اور اگر رستے میں تمہارا ان میں سے کسی ایک سے سامنا ہو جائے تو اسے تنگ رستے پر ہو جانے پر مجبور کرو۔“ ❷
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... لَا تَبْدَؤُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى بِالسَّلَامِ: یہاں سلام میں پہل کرنے کی ممانعت ہے البتہ یہ حکم تحیہ کا نہیں کہ اگر تحیہ میں کسی مجبوری سے پہل کرنی پڑی تو جائز ہے جیسے ان یہود و نصاریٰ کو اہلاً وسہلاً کہنا (اسی طرح خوش آمدید، ہیلو، گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ، شب بخیر، صبح بخیر وغیرہ جیسے کلمات کہنا کہ یہ سب کلمات تحیہ میں داخل ہے) کہ ان میں کسی مجبوری میں پہل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ ان لوگوں کو شرع شریف کے مقتضیٰ کے مطابق سلام کرنا جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ پہلے سلام کریں تو ہم انہیں جواب دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ممانعت پہلے سلام کرنے کی ہے، ہاں جواب دینے کی ممانعت نہیں۔

رہا یہ سوال کہ ہم ان کافروں کے سلام کے جواب میں کیا کہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا سلام وہ کریں ویسا ہی ہم انہیں جواب دے دیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ (النسآء: 86)

”اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم اس سے اچھی سلامتی کی دعا دو، یا جواب میں وہی کہہ دو۔“

لہٰذا اگر ایک یہودی صراحتہً ”السلام علیك“ کہے گا تو جواب میں اسے بھی صریح ”علیك السلام“ کہیں گے۔ البتہ اگر وہ بد دعا دیتے ہوئے ”السَّام علیك“ کہے تو ہم جواب میں اسے صرف ”وعلیك“ ہی کہیں گے۔ جیسا کہ ایک یہودی نے جب نبی کریم ﷺ کے ساتھ گستاخی کرتے ہوئے آپ ﷺ کو انہی الفاظ کے ساتھ بات کی تھی تو آپ ﷺ نے جواب میں صرف ”وعلیك“ کہنے پر ہی اکتفاء فرمایا تھا۔

وَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ......: یعنی اگر کوئی کافر رستے میں سامنے آجائے تو اسے رستہ کے تنگ حصہ پر چلنے پر مجبور کیا جائے

---

❶ معاذ اللہ کہ بعض لوگ اس باب میں اس حد تک گر گئے ہیں کہ وہ یورپ کے زیادہ معاوضوں کے لالچ میں ان کے کتوں کی خدمت بھی قبول کر لیتے ہیں۔ "اعاذنا الله من انقلاب القلوب"۔ (نسیم)

❷ صحیح مسلم: 2167.

گا اور اسے کھلی جگہ نہ دی جائے گی چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ چاہے وہ زیادہ بڑی عمر والا، زیادہ مالدار اور زیادہ رتبہ و مرتبہ والا ہی ہو۔ البتہ تنگ جانب ہونے پر مجبور کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے دیوار کے ساتھ چپک جانے پر مجبور کریں گے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہم دائیں بائیں نہ ہوں گے، اور درمیان سے رستہ وہ چھوڑے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل کرنا منع ہے اور مذکورہ نہی تحریم کے لیے ہے۔ کیونکہ کافر کو سلام میں پہل کرنے میں اس کی ایک گونہ تعظیم و تکریم ہے جبکہ کافر کسی اکرام و اعزاز کا مستحق نہیں۔ لہٰذا جب منافقوں نے یہ کہا تھا کہ:

﴿لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ (المنافقون : 8)

''وہ اس میں سے ذلیل تر کو ضرور ہی نکال باہر کرے گا۔''

تو رب تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ﴾ (المنافقون : 8)

''حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے۔''

اس لیے منافقوں اور کافروں کی کوئی عزت نہیں۔

- کافروں کو سلام کا جواب دینا جائز ہے۔ کیونکہ جب پہل کرنا منع ہے تو جواب دینا جائز ٹھہرا۔
- مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی عزت و آبرو اسلام میں تلاش کرے نا کہ اپنی شخصیت، عہدہ اور مرتبہ میں۔
- اگر کافر رستے میں ملیں تو ہم انہیں ایک طرف کو ہو کر رستہ نہ دیں گے۔
- یہود و نصاریٰ کو رستوں میں چلنے دیا جائے۔ کیونکہ ممانعت انہیں کھلا رستہ دینے کی ہے نا کہ رستوں سے نکال دینے کا حکم ہے۔

صلح حدیبیہ کا بیان

1311-1313- وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ- فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِطُوْلِهِ وَفِيْهِ: ((هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ، سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو عَلَى وَضْعِ الْحَرْبِ عَشْرَ سِنِيْنَ يَأْمَنُ فِيْهَا النَّاسُ ، وَيَكُفُّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ)).

حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت مروان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: صلح حدیبیہ کے سال نبی کریم ﷺ (عمرہ ادا کرنے کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کی طرف) نکلے...... آگے طویل حدیث مذکور ہے۔ جس میں (نبی کریم ﷺ کے کفار کے ساتھ صلح کرنے اور اس کے لکھے جانے کا ذکر ہے۔ اس صلح نامہ کی عبارت) یہ ہے کہ: یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ (ﷺ) نے سہیل بن عمرو کے ساتھ صلح کی ہے، جس کی شرطیں یہ ہیں کہ: دس سال تک جنگ بند رہے گی۔ لوگوں کو اس مدت میں امن رہے گا اور وہ ایک دوسرے (پر حملہ کرنے، جنگ کرنے اور اسلحہ اٹھانے) سے رکے رہیں گے۔ [1]

[1] سنن ابی داؤد: 2765۔ صحیح البخاری: 2731.

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔

شرح :...... یہاں سے امام موصوف جنگ بندی سے متعلق احادیث کو بیان کرنے لگے ہیں جس کے تحت انہوں نے سب سے پہلے صلح حدیبیہ کو ذکر کیا ہے۔ صلح حدیبیہ چھ ہجری میں ہوئی تھی جس کا قصہ اور تفصیلات کتب سیرت میں عام اور شائع ہیں۔

آپ ﷺ عمرہ کے ارادہ سے نکلے تھے پر کفار قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور اس بات پر بضد ہو گئے کہ اس حال آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی عمرہ نہ کر سکیں گے۔ ابھی تو لوٹ جائیں گے البتہ اگلے سال تین دن کے لیے آ کر عمرہ ادا کر کے لوٹ جائیں گے۔

اس دوران قریش کے متعدد وفود آتے رہے پر گفتگو اور مذاکرات کسی منطقی انجام تک نہ پہنچ سکے۔ بالآخر قریش نے سہیل بن عمرو کو گفتگو کے لیے بھیجا اور کافی بحث و تمحیص کے بعد چند باتوں پر فریقین میں جنگ بندی کا معاہدہ ہو گیا۔ جس کو ضبطِ تحریر میں لے آیا گیا۔ اسی کو صلح حدیبیہ کا عہد نامہ کہا جاتا ہے۔

اس کی چند شروط اس حدیث میں درج ہیں۔ ابتداء میں آپ ﷺ نے محمد رسول اللہ ﷺ لکھوایا تھا جس کو سہیل نے تسلیم نہ کیا اور اس کی بجائے محمد بن عبداللہ لکھنے پر اصرار کیا۔ آپ ﷺ نے یہ فرما کر سہیل کی یہ بات بھی مان لی کہ: اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں چاہے یہ مجھے جھٹلاتے بھی ہیں، لکھو محمد بن عبداللہ، پس نبی کریم ﷺ نے سہیل کے رسالت پر انکار کرنے پر انکار فرمایا اور اپنے رسول ہونے کو ثابت کیا۔ البتہ آپ ﷺ نے حق کے لیے تواضع اختیار فرمائی تھی تاکہ لوگوں کے لیے۔

غرض یہ عہد نامہ لکھ لیا گیا جس کی متعدد شروط ہیں لیکن امام موصوف رحمہ اللہ نے یہاں صرف ان شروط کے ذکر پر اکتفاء فرمایا ہے جو مذکورہ باب سے مناسبت رکھتی ہیں اور وہ دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کرنا ہے جس میں طرفین کے لوگوں کو امن ہوگا اور اس دوران کوئی کسی دوسرے پر حملہ نہ کرے گا۔ نبی کریم ﷺ نے امن کی خاطر دس سال کا معاہدہ کیا تھا۔

رب تعالیٰ نے اس صلح کو فتح سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا﴾ (الحدید: 10)

''تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی۔''

رب تعالیٰ نے اس صلح کو اس لیے فتح کا نام دیا کیونکہ اس میں لوگوں کو باہم ملنے کا خوب موقع ملا۔ دوسرے اس لیے بھی کہ یہ صلح فتح اعظم فتح مکہ کا مقدمہ بھی تھی۔

وَأَخْرَجَ مُسْلِمٌ بَعْضَهُ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ رضي الله عنه، وَفِيهِ: ((أَنَّ مَنْ جَاءَنَا مِنْكُمْ لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكُمْ، وَمَنْ جَاءَكُمْ مِنَّا رَدَدْتُمُوهُ عَلَيْنَا فَقَالُوا: أَنَكْتُبُ هٰذَا؟ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: ((نَعَمْ، إِنَّهُ

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس صلح کی بعض (دیگر شروط) کو ذکر کیا ہے، جس میں یہ ذکر ہے: (اور) یہ کہ تم (مسلمانو) میں سے جو (دین اسلام کو چھوڑ کر ہمارے پاس) آئے گا، اسے ہم واپس نہ کریں گے اور جو ہم میں سے (مسلمان

مَنْ ذَهَبَ مِنَّا إِلَيْهِمْ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ وَمَنْ جَاءَ نَا مِنْهُمْ فَسَيَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ فَرَجًا وَمَخْرَجًا)).

ہو کر) تمہارے پاس آئے گا اسے تم ہمیں واپس کرو گے۔ اس پر لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آپ ﷺ اس (شرط) کو بھی لکھیں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! (اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ جو تو ہم میں سے (اسلام چھوڑ کر) ان کے پاس چلا گیا تو رب تعالیٰ اسے دور کرے اور جو ان میں سے (مسلمان ہو کر) ہمارے پاس آئے گا (اور ہم اس صلح کے مقتضی کے مطابق اسے ان لوگوں کو واپس کر دیں گے) تو عنقریب رب تعالیٰ اس کے لیے کشادگی اور مخلصی کی راہ نکالے گا۔'' [1]

شرح:......اس حدیث میں صلح حدیبیہ کی ایک اور اہم ترین شرط کا ذکر ہے جو یہ ہے:

مَنْ جَاءَ مِنْكُمْ: یہ بات کہنے والا سہیل بن عمرو تھا۔ اپنے تئیں اس نے یہ بڑی کڑی شرط رکھی تھی۔ کیونکہ بظاہر یہ شرط عدل کے خلاف تھی۔ کیونکہ عدل کا تقاضا تو یہ تھا کہ جیسے وہ مسلمانوں کا آدمی واپس نہ کریں گے ویسے ہی مسلمان بھی ان کا آدمی واپس نہ کریں گے یا پھر اگر مسلمان ان کا آدمی واپس کریں گے تو وہ بھی مسلمانوں کا آدمی واپس کریں گے۔

فَقَالُوا: أَنَكْتُبُ هٰذَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟...... چنانچہ مسلمانوں کا اس غیر عادلانہ شرط کے تسلیم کر لیے جانے پر غم وغصہ کرنا بالکل بجا تھا۔ لیکن رب تعالیٰ کی حرمتوں کی تعظیم کے پیش نظر بظاہر یہ دب کر صلح کرنا ایک عظیم فتح تھی جس میں بے پناہ خیر تھی۔ غرض مسلمانوں نے حقیقت حال جاننے کے لیے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا یہ شرط لکھی یعنی مان لی جائے گی۔؟ تب نبی کریم ﷺ نے اس شرط کے تسلیم فرما لینے کی نہایت دقیق اور غامض وجہ ارشاد فرمائی کہ: جو مسلمان اسلام سے منہ موڑ کر چلا گیا تو ہمیں بھی اس کی ضرورت نہیں، اور اللہ اسے اپنی رحمت سے اور ہمیں اس کے ظاہری و باطنی شر سے دور اور محفوظ رکھے۔ ایسے آدمی کو واپس لینے کی قطعاً ضرورت نہیں، نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے اور نہ اسلام کو، اور جس مسلمان ہو کر آنے والے کو اس شرط کے مطابق ہم واپس کریں گے، رب تعالیٰ اس کے لیے عنقریب سہولت کی کوئی راہ اور مخلصی کی کوئی صورت پیدا فرمائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ کافر بے حد متکبر اور اکڑ باز ہیں، اور وہ مسلمانوں کے دین کی راہ میں حائل ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔
  اس کی دلیل مشرکین مکہ کا مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روکنا ہے۔
- معلوم ہوا کہ جو اللہ کے لیے کسی شے کو ترک کرتا ہے، اللہ اسے اس سے بہتر شے عطا فرماتا ہے۔
- مشرکوں سے جنگ بندی کی صلح کرنا جائز ہے۔
- عقد صلح ہو جانے کے بعد ان کفار پر ظلم وستم جائز نہیں جن کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہوا ہے۔
- صحیح مسلم کی اس مذکورہ روایت میں بیان کردہ شرط پر صلح کرنا جائز ہے اور اس کی علت وہی ہے جو نبی کریم ﷺ نے

[1] صحيح مسلم: 1784.

بیان فرمائی ہے۔اس پر تفصیلی گفتگو غریب الحدیث کے تحت کی جا چکی ہے۔

معاہد کا قتل ناجائز اور منع ہے

1314۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرَحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا)).

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا اور جنت کی خوشبو (تو) چالیس سال کی مسافت سے بھی آتی ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ: یہ شرطیہ ہے اس لیے مابعد مذکور فعل جملہ شرطیہ ہے۔

لَمْ يَرِحْ: یہ جملہ جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔لیکن یہاں فعل مجزوم پر دو عامل اکٹھے ہو گئے ہیں، ایک "مَنْ" شرطیہ اور دوسرا "لَمْ" جازمہ اور یہ دونوں ہی فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔علمائے نحو کا راجح قول یہ ہے کہ جب دو عوامل میں تنازع ہو جائے کہ دونوں میں سے کون عمل کرے گا تو عمل اس عامل کو دیا جائے گا جو معمول کے قریب ہوتا ہے۔اس بنا پر مذکورہ فعل کو عمل تو "لَمْ" جازمہ دے رہا ہے لیکن مذکورہ فعل معنی کے اعتبار سے جوابِ شرط ہے۔

وَإِنَّ رِيحَهَا: مراد جنت کی خوشبو ہے۔لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا: یعنی جنت کے درختوں اور اس کے پھولوں کی، سب کی خوشبو چالیس میل دور تک پھیلی ہوتی ہے۔مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا: مراد قتل عمد ہے۔معاہد کی تعریف بیان ہو چکی ہے۔

مضمون حدیث:......مذکورہ حدیث میں کافروں کے ساتھ کیے عہدوں کی پاسداری کرنے کی از حد بلیغ ترغیب ہے اور اس عہد کے توڑنے پر شدید وعید بھی ہے اور وہ جنت کی خوشبو پانے سے محرومی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کافروں سے کیے عہدوں کو بالخصوص اور عموماً ہر کیے عہد کو پورا کرنا واجب ہے۔کیونکہ عدمِ ایفاء پر جنت سے محرومی کی وعید ہے جو اس کے کبیرہ ہونے کی دلیل ہے اور واجب ہمیشہ کبیرہ کے بالمقابل ہوتا ہے۔
- امان لے کر داخل ہونے والوں کو بلاد اسلامیہ میں قتل کرنا کبیرہ گناہ اور سخت حرام ہے۔
- جنت کی خوشبو ہے جو دور دراز کی مسافتوں تک پھیلی ہوئی ہے۔حتیٰ کہ ایک روایت میں ستر سال [2] کی مسافت تک بھی جنت کی خوشبو کے پھیلے ہونے کا ذکر آتا ہے۔

2۔ بَابُ السَّبْقِ وَالرَّمْيِ
گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کا بیان

مذکورہ باب کی کتاب الجہاد سے یہ مناسبت ہے کہ گھڑ دوڑ کی بعض قسمیں جہاد میں معین و مددگار ہیں۔

سبق:......یہ باء کے جزم اور فتح دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔جب یہ لفظ جزم کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عوض ہے اور

[1] صحیح البخاری: 3166.
[2] دیکھیں: جامع الترمذی: 1403۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 6951.

بائے متحرک کے ساتھ اس کا معنی دوڑ میں مقابلہ کرنا ہے۔ جبکہ رمی یعنی تیراندازی کا معنی واضح ہے۔

گھوڑوں کی دوڑ کا مقابلہ

1315- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: ((سَابَقَ النَّبِيُّ ﷺ بِالْخَيْلِ الَّتِي قَدْ ضُمِّرَتْ، مِنَ الْحَفْيَاءِ، وَكَانَ أَمَدُهَا ثَنِيَّةَ الْوَدَاعِ وَسَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِي لَمْ تُضَمَّرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ فِيمَنْ سَابَقَ بِهَا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

زَادَ الْبُخَارِيُّ "قَالَ سُفْيَانُ: مِنَ الْحَفْيَاءِ إِلَى ثَنِيَّةِ الْوَدَاعِ خَمْسَةُ أَمْيَالٍ، أَوْ سِتَّةٌ، وَمِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ مِيلٌ))

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے مقام حفیاء سے مضمر (یعنی دبلے کیے) گھوڑوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ کروایا اور اس دوڑ کی انتہا ثنیۃ الوداع تک تھی۔ (یعنی یہ مقابلہ حفیاء سے لے کر ثنیۃ الوداع تک تھا) جبکہ آپ ﷺ نے غیر مضمر (جن کو دبلا نہیں کیا گیا تھا) گھوڑوں میں ثنیۃ الواع سے مسجد بنی زریق تک دوڑ کا مقابلہ کروایا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اس دوڑ میں شریک ہونے والوں میں سے تھے۔ ❶

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی روایت میں یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں: سفیان کہتے ہیں: حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک پانچ یا چھ میل کا فاصلہ بنتا ہے جبکہ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک ایک میل کا فاصلہ بنتا ہے۔ ❷

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......اَلْحَفْيَاءِ: ثنیۃ الوداع اور مسجد بنی زریق: یہ تینوں جگہیں مدینہ نبویہ کی معروف اور جانی پہچانی جگہیں ہیں۔

اَلَّتِي قَدْ ضُمِّرَتْ: تضمیر یہ گھوڑے کے دبلا کرنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ عرب گھوڑے کو دوڑ کی تیاری کے لیے ایک عرصہ تک کھڑا کر کے کھلاتے تھے تا کہ وہ ہلکا پھلکا ہو جائے اور پھر اسے دوڑ کے لیے میدان میں اتارا جائے۔ عربوں کے ہاں یہ مدت چالیس دن تھی۔

غرض اس عرصہ میں گھوڑے کو بقدر سدِ رمق چارہ دیا جاتا تھا تا کہ اس کا گوشت ہلکا ہو جائے اور اس میں سبک رفتاری اور تیزی پیدا ہو اور غیر مضمر گھوڑے ظاہر ہے کہ اس کے برخلاف حسب عادت خوب کھاتے پیتے ہیں۔ اس لیے ان کے بدن بھی ہلکے اور چھریرے نہیں ہوتے اور یہ عموماً دوڑ میں نہیں دوڑائے جاتے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے مضمر گھوڑوں میں پانچ یا چھ میل کی دوڑ کروائی جبکہ غیر مضمر گھوڑوں میں صرف ایک میل کا مقابلہ کروایا۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کی حسن رعایت کہ آپ ﷺ نے گھڑ دوڑ کا مقابلہ کروایا کیونکہ اس میں جہاد کے لیے گھڑ سواری کی

---

❶ صحیح البخاری: 420- صحیح مسلم: 1870. ❷ صحیح البخاری: 2868.

عادت ڈالنا ہے۔

◈ گھوڑوں کو بھوکا رکھ کر انہیں دبلا کرنا جائز ہے، گوکہ اس میں ایک گونہ مشقت بھی ہے۔ لیکن اس میں مصلحت ہے اور وہ ہے جہاد کی تیاری۔

◈ دوڑ کے مقابلے میں گھوڑوں کی حالت کے اعتبار سے فاصلہ مقرر کیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مضمر گھوڑوں میں پانچ یا چھ میل جبکہ غیر مضمر گھوڑوں میں ایک میل تک دوڑ کروائی۔

◈ دوڑ کے مقابلوں میں کم عمر نوجوانوں کو شریک کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی اس دوڑ میں حصہ لیا حالانکہ اس وقت تک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما قوت کی عمر کو نہ پہنچے تھے۔

1316۔ وَعَنْهُ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ ، وَفَضَّلَ الْقُرَّحَ فِي الْغَايَةِ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے گھوڑوں میں دوڑ کا مقابلہ کروایا اور آپ ﷺ نے زیادہ دور کے مقابلہ میں سم والے گھوڑوں کو ترجیح دی ہے۔

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ❶

شرح ......**قُرَّح**: یہ قارح کی جمع ہے۔ قارح ہر اس سم والے جانور کو کہتے ہیں جس کے رباعیہ سے متصل دانت کے ٹوٹنے کے بعد اس کی جگہ کچلی نکل آئی ہو۔

اس حدیث میں بھی گزشتہ مضمون ہی بیان کیا گیا ہے کہ گھڑ دوڑ کی مسافت میں آپ ﷺ گھوڑوں کی حالت دیکھ کر فاصلہ طے فرماتے تھے۔ چنانچہ قراح پختہ عمر کے مضبوط گھوڑے کو کہا جاتا ہے جو زیادہ دور تک دوڑ سکتا ہے۔

شرط لگانا کہاں جائز ہے

1317۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((لَا سَبَقَ إِلَّا فِيْ خُفٍّ ، أَوْ نَصْلٍ ، أَوْ حَافِرٍ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''شرط لگانا صرف ٹاپ، انی اور کھر میں ہے۔'' ❷

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو ائمہ ثلاثہ اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام

---

❶ مسند احمد: 157/2۔ سنن ابی داؤد: 2577۔ من طریق احمد۔ صحیح ابن حبان: 4688۔ ان سب نے اس حدیث کو "عقبة بن خالد عن عبیداللّٰه بن نافع عن نافع عن ابن عمر" کے طریق سے روایت کیا ہے۔ علامہ عقیلی عقبہ بن خالد کے بارے میں کہتے ہیں۔ اس کی حدیث کا متابع نہ لایا جائے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں امید کرتا ہوں کہ یہ ثقہ ہے۔ جبکہ ابوحاتم اور نسائی کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

❷ مسند احمد: 256/2۔ سنن ابی داؤد: 2574۔ جامع الترمذی: 1700۔ سنن النسائی: 226/6۔ سنن ابن ماجه: 2878۔ صحیح ابن حبان: 4690۔ ائمہ حدیث نے ابن حبان پر اپنی صحیح میں اس حدیث کو داخل کرنے پر انکار کیا ہے۔ کیونکہ یہ حدیث عاصم بن عمر بن حفص کی روایت سے ہے جو ضعیف ہے جس سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ جبکہ خود ابن حبان نے یہ حدیث "الضعفاء" میں ذکر کی ہے۔ امام دارقطنی نے "العلل" (301/9) میں اس حدیث کی بابت اختلاف کو ذکر کیا ہے۔

ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:..... لَا: یہ نفی جنس کا "لا" ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، اس کی تقدیری عبارت "لا سبق کائن" ہے۔ سَبَقَ: یہ دوڑ جیتنے پر لیے جانے والے عوض کو کہتے ہیں۔

خُفٌّ: یہ اونٹ یا شترمرغ کی ٹاپ یعنی قدم کو کہتے ہیں۔ اس لفظ میں اونٹوں کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ خف والا ہوتا ہے۔

نَصْلٍ: یہ تیر اور نیزے کی انی اور پیکان کو کہتے ہیں۔ اس میں تیر اندازی کے مقابلہ کی طرف اشارہ ہے۔

حَافِرٍ: کھر: اس میں گھوڑوں کی طرف اشارہ ہے۔

مضمون حدیث:..... مذکورہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ان تین صورتوں میں معاوضہ کی شرط پر مقابلہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ جبکہ باقی کے مقابلوں میں شرط رکھنا جائز نہیں۔

بلاشبہ یہ استثناء جوئے سے ہے۔ کیونکہ جو مقابلہ معاوضہ کی شرط پر ہوتا ہے جو جوا بن جاتا ہے کیونکہ اس مقابلہ میں شرط کرنے والا غارم یا غانم میں سے ایک ہوگا، یعنی یا جیت کر نفع میں رہے گا تو غانم کہلائے گا، اور یا ہار کر نقصان میں رہے گا تو غارم بنے گا، اور یہی جوئے کی حقیقت ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شرط لگا کر کوئی مقابلہ کرنا جوا ہے اور منع ہے۔
- اونٹوں اور گھوڑوں کی دوڑ میں اور اسی طرح تیر اندازی کے مقابلوں میں شرط لگا کر مقابلہ کرنے کی رخصت دی گئی ہے اور ان تین صورتوں کا استثناء اس لیے ہے کہ یہ تینوں امور جہاد فی سبیل اللہ میں معین و مددگار ہیں وہ یوں کہ اونٹ مجاہدین کا اسلحہ اور سامان لے کر چلتا ہے۔ جبکہ گھوڑے اور تیر تو نفس جہاد کا بنیادی عنصر ہیں۔ چنانچہ گھوڑے پر سوار ہو کر آدمی دشمنوں پر حملہ کرتا ہے اور خود اپنا دفاع بھی کرتا ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان تینوں باتوں کے علاوہ باقی باتوں میں شرط لگائے بغیر مقابلہ کرنا جائز ہے۔ جیسے کشتیوں کے مقابلے، تیراکی کے مقابلے، وغیرہ۔
- اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان باتوں میں حصہ لینے والے کا خود بھی شرط لگانا جائز ہے۔ جیسے ایک گھڑ سوار دوسرے سے یہ کہے کہ ہم میں سے جو جیت گیا اسے ایک ہزار انعام ملے گا کہ یہ جائز ہے۔ چنانچہ راجح قول کے مطابق جو جیت جائے اسے ایک ہزار لینا جائز ہوگا۔

البتہ یہ تب جائز ہے جب یہ انعام دونوں میں سے ایک رکھے اور تیسرا اس میں شریک نہ ہو جس کو محلل کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مقابلہ خود حلال ہے لہٰذا اس میں کسی محلل کی ضرورت نہیں۔

جبکہ بعض علماء کا قول ہے کہ دونوں میں سے کسی کا انعام مقرر کرنا جائز نہیں لہٰذا یہاں کسی تیسرے محلل کا داخل ہونا لازم ہے جس کا گھوڑا ان دونوں کے گھوڑوں کے برابر کا ہو۔ اس تیسرے سے ہارنے کی صورت میں کچھ نہ لیا جائے گا جبکہ جیت کی صورت میں وہ انعام کا مستحق ہوگا تاکہ دوڑ کی یہ صورت قمار کے ساتھ مشابہت سے نکل جائے۔

لیکن یہ قول بے حد ضعیف ہے۔ کیونکہ جب ان تین صورتوں میں خود شارع نے قمار کی اجازت دی ہے تو پھر محلل کا

مطلق ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ اجازت مصلحت کے غلبہ کی بنا پر ہے اور وہ مصلحت جہاد ہے۔ کیونکہ یہ شریعت مصالح کی تحصیل کے لیے آئی ہے لہٰذا جب مصلحت غالب یا محض مصلحت ہوگی تو مفسدہ کی جانب مغلوب اور ختم ہو جائے گی۔

◈ یاد رہے کہ مقابلہ کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

(1) ایک وہ جو معاوضہ اور معاوضہ کے بغیر دونوں صورتوں میں جائز ہے جیسے یہ تینوں مذکورہ صورتیں۔

(2) دوسرا وہ مقابلہ ہے جو بلا معاوضہ تو جائز ہے البتہ معاوضہ کے ساتھ جائز نہیں۔ یہ مباح امور ہیں جیسے کشتی، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے رکانہ بن یزید کے ساتھ کشتی لڑی تھی، اور جیسے دوڑ کا مقابلہ، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگا کر مقابلہ کیا تھا۔ غرض سب مباح امور میں بلا معاوضہ مقابلہ جائز ہوگا جبکہ معاوضہ کے ساتھ ناجائز ہوگا۔

(3) تیسرا وہ مقابلہ جو غیر مباح عمل میں ہو، جیسے چوسر، شطرنج، لڈو، ویڈیو گیم وغیرہ۔ کہ ان میں مقابلہ ناجائز ہے خواہ معاوضہ کے ساتھ ہو اور چاہے بلا معاوضہ ہو۔

کسی کھیل کے غیر مباح ہونے کا ضابطہ یہ ہے کہ اس میں وقت کا ضیاع زیادہ ہو اور اس کا فائدہ کم ہو۔ البتہ ایسی کھیلیں بچوں کے لیے جائز ہوں گی کیونکہ بچے جہاں عبادات کے مکلف نہیں، وہیں وقت کی محافظت کے بھی مکلف نہیں۔ چنانچہ بچوں کو ان باتوں کی بھی رخصت ہوگی جن کی بڑوں کو رخصت نہیں ہوتی۔ دوسرے بچوں کو کھیلنے کی فطری ضرورت بھی ہوتی ہے۔

گھڑ دوڑ کو حلال کرنے والا

1318- وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ أَدْخَلَ فَرَسًا بَيْنَ فَرَسَيْنِ، وَهُوَ لَا يَأْمَنُ أَنْ يُسْبَقَ فَلَا بَأْسَ بِهِ، فَإِنْ أَمِنَ فَهُوَ قِمَارٌ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے دو گھوڑوں کے درمیان اپنا گھوڑا داخل کیا اور اسے اپنے جیتنے کا اطمینان بھی نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر اسے (اپنے جیتنے کا) اطمینان ہو تو یہ قمار ہوگا۔'' [1]

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے جبکہ سنن ابی داؤد کی روایت کی اسناد ضعیف ہے۔

شرح: ...... یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ مسابقت میں ایک محلل کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ایک آدمی اپنا گھوڑا دو گھوڑوں کے بیچ میں ڈال دے گا تو اب مقابلہ تین گھوڑوں میں ہونے لگے گا۔ پھر اگر تو اس تیسرے کو صرف اپنے جیتنے کا ہی اطمینان نہیں اور اس کے اور باقی کے دو میں سے کسی ایک جیتنے کا احتمال برابر برابر ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر اس تیسرے کو اس بات کا مکمل اطمینان ہو کہ گھوڑا اسی کا جیتے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آگے وہی ہے تو یہ جوا ہوگا۔ کیونکہ اب حقیقت میں مقابلہ باقی کے دو میں ہوگا۔

لیکن اس حدیث کو صحیح تسلیم کر لینے کی تقدیر پر، یہ حدیث اس بات پر ہرگز بھی دلالت نہیں کرتی کہ مسابقت میں ایک محلل کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جب یہ محلل جیتے گا کیونکہ اسے اطمینان ہے کہ وہ ہی جیتے گا کیونکہ اس کا گھوڑا آگے ہے تو انعام کی رقم بھی اسے ہی ملے گی، تب پھر یہ جوا کہاں سے ہوا۔ کیونکہ جوا تو ہار جیت کے درمیان دائر مقابلہ میں ہوتا ہے جبکہ یہاں وہ صرف

[1] مسند احمد: 505/2۔ سنن ابی داؤد: 2579۔ ابو حاتم کہتے ہیں: میری رائے ہے کہ یہ سعید بن مسیب کا کلام ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 318/2۔ علل الدار قطنی: 161/9۔

غانم یعنی جیتنے والا ہی ہے تو پھر یہ جوا کہاں سے ہوا۔ تب پھر یہ حدیث مسابقت میں محلل کے شرط ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اونٹوں گھوڑوں کے دوڑانے میں، اور تیروں کے پھینکنے میں مقابلہ جائز ہے اور اس میں کسی محلل کو بیچ میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں اور محلل یہ وہ تیسرا مقابلہ کرنے والا ہوتا ہے جو غارم نہیں ہوتا بلکہ یا تو وہ غانم ہوتا ہے یا سالم۔

قوت پیدا کرنے کی مشق کرنے یعنی جنگی مشقیں کرانے اور فوجی تربیت دینے کی مشروعیت کا بیان

1319۔ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ ﷺ قَالَ: ((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ: ﴿وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ...... الْآيَةَ﴾ أَلَا! إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ ، أَلَا! إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ ، أَلَا! إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر سنا کہ آپ ﷺ نے (پہلے) یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾ (الانفال: 60) ''اوران کے (مقابلے کے) لیے قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے تیاری کرو، جتنی کر سکو۔'' (پھر آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:) خبردار! (سن لو) کہ قوت یہ تیر اندازی (کا سیکھنا) ہے، خبردار! (سن لو) کہ قوت یہ تیر اندازی ہے، خبردار! (سن لو) کہ قوت یہ تیر اندازی ہے۔ [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ: جناب عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے یہ جملہ دو فائدوں کے لیے بیان فرمایا ہے:

(1) ایک تو یہ بتلانے کے لیے کہ انہیں یہ قصہ اور واقعہ پوری طرح ضبط اور یاد ہے حتیٰ کہ یہ بھی یاد ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بات منبر پر جلوہ افروز ہو کر ارشاد فرمائی تھی۔

(2) دوسرے یہ بتلانے کے لیے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بات برملا اور علی الاعلان ارشاد فرمائی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے منبر پر سورۂ انفال کی مذکورہ یہ آیت تلاوت فرمائی۔

أَعِدُّوا: یہ خطاب اہل ایمان کو ہے۔

لَهُمْ: یہ ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔

مَا اسْتَطَعْتُمْ: یعنی جتنی کی تم میں قدرت ہے۔

مِنْ قُوَّةٍ: لفظ قوۃ یہاں نکرہ ہے جو شرط کے سیاق میں آیا ہے اور نکرہ جب شرط کے سیاق میں ہو تو عموم پر دلالت کرتا ہے۔ پس یہ لفظ قوتِ ایمانیہ کو بھی شامل ہوگا جو رب تعالیٰ پر سچا ایمان، اس کی مدد و نصرت پر پورا بھروسہ اور اس کی ذات پر کامل توکل ہے اور یہ لفظ مادی قوت کو بھی شامل ہے جس میں اسلحہ کی فراہمی، لشکروں کی تیاری، مجاہدین کی جنگی تربیت اور جنگی مہارت و تعلیم وغیرہ سب آ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ لفظ قوتِ غایہ و نہایئہ کو بھی شامل ہے جس میں سرفہرست تیر اندازی کی مہارت ہے اور اس پر مذکورہ نص بھی آ گئی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: 1917.

تیر اندازی کے قوتِ نہائیہ وغایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے آدمی دشمن کو دور سے بھی ڈھیر کر سکتا ہے۔عصر حاضر کے اکثر ہتھیار اسی نوع کے ہیں جن میں گولہ بردار جہاز، دور مار کرنے والے میزائل، بھاری مشین گنیں، ٹینک اور لڑاکا طیارے وغیرہ شامل ہیں کہ ان ہتھیاروں کے ذریعے دشمن پر میلوں دور سے بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

رہا نبی کریم ﷺ کا تکرار فرمانا تو وہ تاکید کے لیے تھا وگرنہ آپ ﷺ کا ایک بار بھی کسی امر کے بارے میں خبر دینا تکرار سے غنی کر دیتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی خبر کی تصدیق واجباتِ ایمانیہ میں سے ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ ہی قرآنِ کریم کے پہلے مفسر اور شارح ہیں۔یعنی آپ ﷺ کا قرآنِ کریم کی تفسیر فرمانا ایک امر واقع ہے جس کی دلیل مذکورہ حدیث بھی ہے۔

◈ ہم مسلمانوں کو رمی کا اہتمام کرنا چاہیے اور رمی ہر زمانہ اور ہر جگہ کے اعتبار سے مختلف ہے۔

چنانچہ دورِ نبوی میں رمی تیر اندازی تھی اور ایک تیر اکثر تین سو گز سے زیادہ دور تک نہ جاتا تھا۔جبکہ آج کل یہ رمی ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک مار کرنے والے میزائلوں کی شکل میں ہے۔اس لیے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ جنگی قوت کی اس نوع کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کریں جو حدیث نبوی کے امر کا عین مقتضی ہے۔

تب پھر میزائل ٹیکنالوجی کا حصول امت پر واجب ہے۔

اسی طرح خف، حافر اور نصل کی بھی تفسیر ہے کہ کبھی اونٹ گھوڑے وغیرہ بہت بڑا جنگی ہتھیار ہوتے تھے لیکن ان کی جگہ اب ٹینک اور اس جیسے دوسرے جنگی آلات نے لے لی ہے۔لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ہم ان آلات کو حاصل بھی کریں، ان کے چلانے کی کمال مشق بھی کریں اور خود ان کو بنانے کے کارخانے بھی اپنے ملکوں میں لگائیں تاکہ ہم اسلحہ کی پیداوار میں خود کفیل ہوں اور ہمیں زمینی، سمندری یا فضائی کسی بھی قسم کا اسلحہ غیر مسلموں سے خریدنا نہ پڑے۔واللہ اعلم!

13

كِتَابُ الأَطْعِمَةِ

کھانے پینے کے احکام ومسائل کا بیان

اَلْأَطْعِمَةِ: یہ طعام کی جمع ہے اور طعام کا اطلاق ماکول اور مشروب دونوں پر ہوتا ہے۔اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ﴾ (البقرة: 249)

''پس جس نے اس میں سے پیا تو وہ مجھ سے نہیں اور جس نے اسے نہ چکھا تو بے شک وہ مجھ سے ہے۔''

کہ یہاں طعام بول کر شراب کو مراد لیا گیا ہے۔

طعام کا حکم:

کھانے پینے کی جملہ اشیاء میں اصل حلت ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (البقرة: 29)

''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔''

غرض متعدد نصوص بتلاتی ہے کہ زمین میں پیدا ہونے والی اور آسمان سے اترنے والی چیزوں میں اصل حلت ہے اور جو بنا کسی دلیل کے کسی چیز کو حرام کہتا ہے، رب تعالیٰ نے اس پر انکار فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف: 32)

''تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں۔''

اس بنا پر اگر دو آدمیوں میں کھانے کی کسی چیز کی بابت اختلاف ہو جائے تو دلیل کا مطالبہ اس سے کیا جائے گا جو اس کی حرمت کا مدعی ہو۔یہی حکم اور تفصیل مشروبات میں بھی ہے۔

غرض ہر شے میں اصل حلت ہے۔اسی طرح ہر شے میں اصل طہارت ہے۔

تحریم کے اصول:

اب ماکولات ومشروبات میں سے ہم تحریم کا حکم کس چیز پر لگائیں گے؟ علماء نے اس کے چند اصول بیان فرمائے ہیں،

جو یہ ہیں:

⊙ ...... ہر وہ شے جو ضرر رساں ہو وہ حرام ہے۔ البتہ ضرر رساں چیزوں کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایک وہ شے جو بالذات مضر ہو۔

(2) دوسری وہ شے جو کسی عارضہ کی بنا پر مضر ہو۔

پس زہر یہ بالذات مضر اور مہلک و قاتل ہے، اس لیے زہر کا استعمال حرام ہوگا۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے خود کو مار ڈالنے سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النسآء: 29)

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔''

اور کسی عارض کی بنا پر مضر چیزوں کی مثال ذیابیطس کے مریض کے لیے حلوے کا استعمال ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی شوگر اتنی زیادہ ہو کہ اسے میٹھی چیز کا کھانا ضرر رساں ہو تو اس کے حق میں اس میٹھی چیز کا استعمال منع اور ناجائز ہوگا۔ چاہے اپنی اصل میں وہ میٹھی شے حلال ہی ہو۔

⊙ ...... دوسرے ہر وہ شے جو نجس ہو اس کا استعمال حرام ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی جدید تحقیق اسے غیر مضر بھی ثابت کر دے تب بھی اس کا استعمال حرام ہی ہوگا کیونکہ وہ نجس ہے۔ رب تعالیٰ نے نجس اشیاء کو ان کے مضر ہونے کی وجہ سے ہی حرام قرار دیا ہے گو ہمیں ظاہر میں ان کا ضرر نظر نہ بھی آتا ہو۔ کیونکہ بسا اوقات ایک شے کا ضرر بے حد خفیف ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اور شدہ شدہ اثر انداز ہوتا ہے۔

یہ تو تھی ماکولات و مشروبات کی تحریم کی تفصیل۔ رہے حیوان تو ان میں بھی اصل حلت ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ان حیوانوں کو ہمارے لیے زمین میں پیدا فرمایا ہے۔ البتہ بعض اسباب کی بنا پر بعض حیوان حرام ہو جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

ہر کچلی والا درندہ حرام ہے

1320-1321۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ فَأَكْلُهُ حَرَامٌ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہر کچلی والا درندہ کہ اس کا کھانا حرام ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

کون سا جانور حرام ہے

شرح:...... اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے کسی جانور کی تحریم کے حکم کو دو قیدیوں کے ساتھ مقید فرمایا ہے:

(1) ایک یہ کہ وہ جانور درندہ ہو۔ (2) دوسرے یہ کہ وہ کچلی والا ہو۔

[1] صحیح مسلم: 1933.

کچلی سے مراد یہ ہے کہ وہ کچلی سے شکار کر کے اسے چیر پھاڑ دیتا ہو۔ جیسے کتا، بھیڑیا، تینددا، شیر، چیتا وغیرہ کہ یہ سب جانور انہی دو قیود کی بنا پر حرام ہیں۔

حرام جانور کی تحریم کی حد

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ان کے کھانے کو حرام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ سرے سے یہ جانور پورے کے پورے حرام ہیں، کیونکہ انہی جانوروں کے بعض اعضاء سے انتفاع حلال اور جائز ہے۔ البتہ ان کے کسی عضو کا کھانا بہر حال حرام ہے۔ چنانچہ ان جانوروں کی کھال، بال ہڈیوں اور دانتوں وغیرہ سے انتفاع جائز ہے۔

قواعد تحریم

خلاصہ یہ ہوا کہ اس حدیث سے مندرجہ ذیل قواعد حاصل ہوئے:

⊙ ...... ہر کچلی والا درندہ کہ اس کا کھانا حرام ہے۔

⊙ ...... جو درندہ نہ ہو، وہ حرام بھی نہیں۔

⊙ ...... اسی طرح جو درندہ تو ہو پر اس کے پھاڑ کھانے والے کچلی کے دانت نہ ہوں تو وہ بھی حرام نہ ہوگا۔ اس بنا پر بجو حلال ہے۔ کیونکہ اس کے پھاڑ کھانے والے کچلی کے دانت نہیں ہوتے اور بجو بڑی مجبوری میں دوسرے جانور پر حملہ کر کے اسے پھاڑ کھاتا ہے وگرنہ نہیں۔

پھاڑ کھانے والے درندے کی تحریم کی حکمت

غذا کا انسانی طبیعت، مزاج، عادت، جذبات اور فطرت پر بلا واسطہ اثر مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسی غذا ہوگی ویسی ہی اسکی فطرت بھی ہوگی۔ تب پھر درندہ خود منتقم مزاج، قسي القلب، سنگدل، بے رحم، سفاک اور سفاح ہوگا اور اسے خون ریزی، مار دھاڑ وغیرہ سے طبعی انس ہوگا۔ اسی لیے درندوں کا کھانا منع ہے کہ مبادا ان کی خون آشام عادات فطرت انسانیہ میں جاگزیں ہو جائیں۔

پنجہ سے شکار کر کے کھانے والا ہر پرندہ حرام ہے

وَأَخْرَجَهُ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما، بِلَفْظِ: ((نَهَى)). وَزَادَ ((وَكُلِّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ.))

اور امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں "نَهَى" کا لفظ روایت کیا ہے (یعنی نبی کریم ﷺ نے کچلی والے ہر درندے کے کھانے سے منع فرمایا) اور اس میں یہ الفاظ زائد ہیں: اور پنجے (سے شکار کر کے کھانے) والا ہر پرندہ [1] (کہ اس کا کھانا بھی حرام ہے)۔

غریب الحدیث: ...... وَأَخْرَجَه: اَخرج کی ضمیر کا مرجع امام مسلم رحمہ اللہ ہیں۔

نَهَى: اگرچہ یہ لفظ بھی تحریم پر دلالت کرتا ہے لیکن دونوں میں سے زیادہ قوی الفاظ "فَاَكْلُهُ حَرَامٌ" کے ہیں۔

وَكُلُّ ذِی مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ: یعنی نبی کریم ﷺ نے پرندوں میں ان کے کھانے کو حرام قرار دیا جو اپنے پنجہ سے شکار کر کے کھاتے ہیں اور مخلب سے یہاں مراد اس کے پنجے کے نوکیلے ناخن ہیں جن کو وہ جانور کے جسم میں گاڑھ کر ان سے

[1] صحیح مسلم: 1934.

شکار کرتا اور ان کو ہلاک کر دیتا ہے۔تب پھر:

⊙...... جو پرندہ اپنے پنجے کے ناخنوں سے شکار کر کے نہ کھاتا ہو، اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے چیل، شکرا، عقاب گدھ وغیرہ کہ اس لیے حرام ہیں کیونکہ یہ اپنے پنجوں سے شکار کر کے کھاتے ہیں۔

⊙...... مرغ وغیرہ حلال ہیں، کیونکہ اگرچہ ان کے پنجے اور ان کے ناخن بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان ناخنوں کو شکار کرنے میں استعمال نہیں کرتے۔

⊙...... اور یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ ہر مڑی ہوئی چونچ والا پرندہ حرام ہے۔ یہ غلط ہے، ہماری نظر سے یہ قاعدہ کتب فقہ میں کہیں لکھا ہوا نہیں گزرا۔ پرندوں کی حلت وحرمت کا مدار ارشاد نبوی ہے جو بیان ہو چکا۔

پس جو پرندہ بھی اپنے پنجے کے ناخنوں کو شکار کے جسم میں گاڑھ کر اسے ہلاک کر دیتا ہو، وہ حرام ہوگا اور جو اپنے پنجوں سے شکار نہ کرتا ہو وہ حلال ہے جیسے کبوتر، چڑیا، طوطا، مینا، مرغ، بٹیر، تیتر، مور وغیرہ اور جس جانور یا پرندہ کی حلت وحرمت میں شک ہو اس میں اصل حلت ہے۔

پالتو گدھوں اور گھوڑوں کے کھانے کا حکم

1322۔ وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ، وَأَذِنَ فِي لُحُوْمِ الْخَيْلِ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: خیبر کے دن نبی کریم ﷺ نے (ہمیں) پالتو گدھوں کے گوشت (کھانے) سے منع فرمایا جبکہ (ہمیں) گھوڑوں کے گوشت (کھانے) کی اجازت مرحمت فرمائی۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: ((وَرَخَّصَ)).

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔ البتہ صحیح بخاری کی روایت میں (أَذِنَ کی بجائے) رَخَّصَ کے الفاظ آتے ہیں (اور مطلب دونوں الفاظ کا ایک ہے)۔

حرام جانوروں کی تیسری

شرح:...... گزشتہ میں دو قسم کے حرام جانوروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ حرام جانوروں کی تیسری قسم کا بیان ہے اور وہ گھریلو یعنی پالتو گدھے ہیں۔ ان کا تفصیلی حکم آگے آ جاتا ہے۔

الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ: حُمُر: یہ حمار کی جمع ہے اور اھلیہ سے مراد گھریلو اور پالتو ہے۔ یہ وصفِ تقیید ہے۔ جس سے حمر و حشیہ یعنی جنگلی گدھے، اس حکم سے نکل گئے، یہ گدھے انسانوں سے مانوس نہیں ہوتے اور وسیع چٹیل میدانوں میں پائے جاتے ہیں۔

رَخَّصَ: یہ ''أَذِنَ'' کے معنی میں ہے۔

www.KitaboSunnat.com

کیا گھوڑے حلال ہیں؟

اس حدیث میں ایک ممانعت کا اور ایک رخصت کا ذکر ہے۔ ممانعت تو گھریلو گدھوں کے گوشت کھانے کی ہے جبکہ رخصت گھوڑوں کے گوشت کھانے کی ہے۔ تب پھر ہمیں دو قاعدے ہاتھ لگے:

---

[1] صحيح البخاري: 4219- صحيح مسلم: 1941.

(1) ایک یہ کہ گھریلو گدھوں کا گوشت حرام ہے۔ لہٰذا گھریلو گدھے حلت کے حکم سے مستثنیٰ ہوں گے۔
(2) دوسرا یہ کہ گھوڑوں کے گوشت کھانے کی اجازت ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا گھوڑوں کی حلت یہ تحریم سے استثناء ہے یا اپنی اصل پر ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گھوڑوں کی حلت کا حکم اپنی اصل پر ہے۔ کیونکہ اس سے قبل ان کی تحریم مذکور نہیں کہ جس سے اب حلت کا استثناء تسلیم کر لیا جائے۔

اور لفظ "رَخَّصَ" یہ "نَھَی" کے بالمقابل ہے، جس کا یہ معنی نہیں کہ یہ پہلے حرام تھا پھر اس کے کھانے کی رخصت دی گئی۔ بلکہ یہ اپنی اصل میں حلال ہے۔ پس جمہور علماء کے نزدیک گھوڑا حلال ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کے کھانے کی اجازت دی تھی جو سنت قولیہ ہے اور سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دورِ نبوی میں ہم نے گھوڑے کو ذبح کر کے کھایا تھا جبکہ اس وقت ہم مدینہ میں تھے۔ ❶ یعنی نبی کریم ﷺ نے گھوڑا ذبح ہوتے اور اسے کھایا جاتا دیکھا پر اس پر نکیر نہ فرمائی تو یہ سنت اقراریہ کہلائی۔ پس گھوڑے کی حلت سنت قولیہ واقراریہ دونوں سے ثابت ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔

گھریلو گدھوں کا حکم:

ان کی تحریم پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اگرچہ بعض اسلاف سے اس بارے اختلاف منقول ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ گھریلو گدھا مطلق حرام ہے۔ البتہ ضرورت واضطرار کے وقت تو خنزیر کھانا بھی مباح ہو جاتا ہے جو بلاشبہ گدھے سے بدرجہا زیادہ خبیث اور پلید ہے۔ لہٰذا اضطرار اور ضرورت کی حالت کے علاوہ گھریلو گدھا دیگر حرام جانوروں کی طرح مطلق حرام ہے۔

ٹڈی کھانے کا حکم

1323۔ وَعَنِ ابْنِ أَبِيْ أَوْفَى رضی اللہ عنہ قَالَ: ((غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ سَبْعَ غَزَوَاتٍ، نَأْكُلُ الْجَرَادَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے سات غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شرکت کی سعادت حاصل کی۔ (جن میں) ہم ٹڈی کو (بھی) کھا لیا کرتے تھے۔ ❷
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث: ......غَزَوْنَا: غزوہ: یہ دشمن سے جہاد وقتال کرنے کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بیس سے اوپر غزوات روانہ فرمائے جبکہ خود اکثر غزوات میں شرکت فرمائی ہے۔ گو سب میں نہیں۔ انہی غزوات میں سے سات یہ غزوات ہیں جن کا مذکورہ حدیث میں ذکر ہے۔

نَأْكُلُ الْجَرَادَ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ "غَزَوْنَا" کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ الجراد یہ ٹڈی کو کہتے ہیں۔ اس کی ٹانگوں میں پنجے ہوتے ہیں یہ معروف جانور ہے اس کی تعریف ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ❸

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے اپنی، زبان، بدن اور قلب سب کے ساتھ جہاد فرمایا۔ کیونکہ لوگوں کے ایمان نہ لے آنے پر

---

❶ اس حدیث کی تخریج آگے آ رہی ہے۔
❷ صحيح البخاري: 5495۔ صحيح مسلم: 1952.
❸ جرادہ کی تصویر کے لیے دیکھیں: المنجد العربی فی اللغة: 85۔ (نسیم)

آپ ﷺ کا قلب مبارک بے حد حزین وغمگین ہو جایا کرتا تھا اور یہی قلب کا جہاد ہے۔ جبکہ لسان وید کا جہاد آپ ﷺ کا بیان حق فرمانا تھا اور غزوات میں عملی شرکت جس کا ذکر اس حدیث میں بھی ہے۔ یہ آپ ﷺ کا بدنی جہاد تھا۔

◈ ٹڈی کھانا حلال ہے۔ اس کی دلیل: "نَأْكُلُ الْجَرَادَ" کے الفاظ ہیں۔

اس کی دوسری دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ: میرے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں۔ پس دو مردار یہ ٹڈی اور مچھلی ہیں، اور دو خون وہ تلی اور کلیجہ ہیں۔ [1]

اگر یہ حدیث مرفوعاً ضعیف ہے لیکن موقوفاً صحیح ہے۔ اس بنا پر ٹڈی کا زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں کھانا حلال ہے اور یہی صحیح قول ہے۔ لہٰذا یہ خود مرے یا آدمی کے فعل سے مرے دونوں حالتوں میں حلال ہے۔

ٹڈی کے حلال ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اس میں دم سائل نہیں ہوتا۔ تب پھر از خود مرنے سے یہ خبیث نہ بنے گی۔ لہٰذا ٹڈی زندہ ہو یا مردہ دونوں صورتوں میں حلال ہے۔

خرگوش کا حکم

1324۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه - فِي قِصَّةِ الْأَرْنَبِ۔ قَالَ: ((فَذَبَحَهَا فَبَعَثَ بِوَرِكِهَا إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَبِلَهُ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے خرگوش کے قصہ میں مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: پس انہوں نے (یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے) خرگوش کو ذبح کیا اور اس کی ایک ران خدمت نبوی میں بھیجی تو آپ ﷺ نے اسے قبول فرمایا [2] (اور اس سے تناول فرمایا)۔

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

قصۂ حدیث:......اس حدیث کا قصہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے مر الظہران میں ایک خرگوش پکڑا پر وہ ان کے ہاتھ سے نکل بھاگا، لوگ اس کے پیچھے لپکے لیکن خرگوش نے سب کو تھکا دیا اور لوگ بیٹھ رہے۔ لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نوجوان تھے، وہ نہ تھکے اور بالآخر اسے پکڑ لیا۔ پھر انہوں نے خرگوش کو ذبح کیا اور اس کی ایک رات خدمت نبوی میں بھی پیش کی۔ بلاشبہ یہ بڑا معمولی تحفہ تھا۔ ایک تو خود خرگوش ایک ننھا سا جانور ہے، پھر اس کی ران بھلا کتنے وزن کی ہوگی؟

لیکن نبی کریم ﷺ نے پھر بھی اس ہدیہ کو قبول فرمایا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس میں سے تناول بھی فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شکار کی غرض سے خرگوش کو اس کے بل سے بھڑکا کر باہر نکلنے پر مجبور کرنا جائز ہے۔ کیونکہ خرگوش ہم بندوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے تب پھر ہم اس کے کھانے کے لیے کوئی بھی وسیلہ اختیار کر سکتے ہیں۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے حد طاقتور تھے حتیٰ کہ خرگوش جیسے سبک رفتار جانور بھی ان کے سامنے اپنی چوکڑی بھول جاتے تھے۔

◈ نبی کریم ﷺ کی بے حد تواضع کہ آپ ﷺ نے اس قدر معمولی ہدیہ بھی بخوشی قبول فرمایا۔

---

[1] یہ حدیث "باب المیاہ" میں گزر چکی ہے۔

[2] صحيح البخاری: 2572۔ صحيح مسلم: 1953.

◈ معلوم ہوا کہ خرگوش حلال ہے اور یہی اس حدیث کو اس باب کے تحت لانے کی اصل غرض و غایت ہے۔

چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور لٹورے کا حکم

1325۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: ((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ قَتْلِ أَرْبَعٍ مِنَ الدَّوَابِّ: النَّمْلَةِ، وَالنَّحْلَةِ، وَالْهُدْهُدِ، وَالصُّرَدِ)). رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے ہمیں چار جانوروں کو مارنے سے منع فرمایا۔ چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور لٹورا۔ [1]

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :...... نَهَى عَنْ قَتْلِ أَرْبَعٍ: اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ ممانعت انہی چار جانوروں کے قتل تک محدود و مقصود ہے چنانچہ اور بھی متعدد ایسے جانور ہیں جن کو مارنے کی ممانعت ہے۔

البتہ نبی کریم ﷺ ایسا حصر کسی مقام کی مناسبت سے لاتے ہیں اور یہ مراد نہیں کہ مذکورہ افراد ماقبی کی نفی کر رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ نہی نہی تحریم ہے یا نہی کراہت ہے۔ تو ایک قول تحریم کا ہے کیونکہ نہی میں اصل تحریم ہے۔ جبکہ ایک قول کراہت کا ہے۔ لیکن اگر ہم اس نہی کو کراہت کے لیے مان بھی لیں تب پھر روزِ قیامت ان چار جانوروں کے قتل کا ہم کیا جواز پیش کریں گے جبکہ نبی کریم ﷺ نے ان کے مارنے کی ممانعت بھی ارشاد فرمادی ہے۔

النَّمْلَةُ: چیونٹی: ایک معروف جانور جس کا شمار حشرات الارض میں ہوتا ہے۔ یہ نہی چھوٹی بڑی ہر قسم کی چیونٹی کو شامل ہے۔ یاد رہے کہ چیونٹی کو مارنے کی ممانعت اس کے احترام کی بنا پر ہے نا کہ اس کو برا جاننے کی بنا پر ہے۔ اس لیے چیونٹی کو مارنا حل اور حرم دونوں میں حرام ہے۔

النَّحْلَةُ: شہد کی مکھی: اس کے قتل کی بھی ممانعت ہے کیونکہ اس کے مارنے میں مال کی بربادی اور خیر کثیر سے محرومی ہے۔ کیونکہ شہد کی مکھی شہد بناتی ہے جس میں لوگوں کی شفا ہے اگر ہم ایک ایک کر کے ان مکھیوں کو مارتے جائیں گے تو ان کے ذریعے پیدا ہونے والا شہد ضائع ہونا شروع ہو جائے گا۔

الْهُدْهُدُ: ایک معروف پرندہ ہے۔ اس کے مارنے کی ممانعت بھی اس کے احترام کی بنا پر ہے۔ کیونکہ ہدہد نے جناب سلیمان علیہ السلام کی ایک زبردست خدمت کی تھی جس کا قصہ سورۂ نمل میں مفصل مذکور ہے جیسے کہ چیونٹی کا قصہ بھی اسی سورت میں مذکور ہے۔

الصُّرَدُ: لٹورا: ایک پرندہ جو کیڑوں کو کھاتا اور چڑیا کا شکار کرتا ہے۔ اس کی تصویر کے لیے دیکھیں "المنجد العربی فی اللغة" [2]۔ یہ چڑیا سے تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے اور چونچ کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ اس پرندے کے قتل کی ممانعت کی علت کیا

---

[1] مسند احمد: 332/1۔ سنن ابی داؤد: 5267۔ من طریق احمد۔ سنن ابن ماجہ: 3224۔ صحیح ابن حبان: 5646۔ امام نووی رحمہ اللہ "المجموع" (284/7) میں فرماتے ہیں: امام ابو داؤد نے اس حدیث کو ایسی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے جو شیخین کی شرط پر ہے۔

[2] شیخ رحمہ اللہ نے جس صفحہ کا حوالہ دیا ہے وہ "المنجد العربی فی اللغة" کا صفحہ: 426 ہے۔ (نسیم)

ہے؟ تلاش بسیار کے باجود ہم اس تک نہیں پہنچ سکے، تب پھر ہمارے لیے یہی علت اور دلیل کافی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور لٹورے کا حکم

ان چاروں جانوروں کو مارنے کی ممانعت ان کے کھانے کی ممانعت کو مستلزم ہے۔ کیونکہ کوئی بھی جانور اس کے ذبح کر دینے کے بعد ہی کھایا جاتا ہے۔ تب پھر ان کو مارنے کی نہی ان کے کھانے کی نہی کو مستلزم ہوگی جس کا صاف نتیجہ ہے کہ یہ جانور حرام ہیں۔

اس حدیث سے ہم یہ قاعدہ اخذ کر سکتے ہیں: ہر وہ شے جس کے مارنے کا شریعت نے حکم دیا ہے وہ بھی حرام ہے جیسے چیل، کوا، کٹ کھنا کتا اور چوہا، اور ہر وہ شے جس کے مارنے سے روکا ہے وہ بھی حرام ہے جیسے چیونٹی وغیرہ۔

تب پھر حلال جانور وہ ہوں گے جن کو رب تعالیٰ نے حلال ٹھہرایا ہے اور ان کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ پھر اگر ان مباح جانوروں کو بھی بجائے ذبح کرنے کے قتل کر دیا جائے جیسے گلا گھونٹ کر یا ڈبو کر یا جھٹکے سے مار دیا جائے تو وہ بھی حرام ہو جائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حلال جانوروں کے سوا جن جانوروں کے قتل کر دینے کا حکم ہے ان کا قتل وجوباً یا استحباباً مشروع ہے اور جن حرام جانوروں کو مارنے کی ممانعت آئی ہے، ان کا مارنا حرام یا مکروہ ہے جیسا کہ علماء کا اس بارے اختلاف ہے۔

رہے وہ جانور جن کی بابت شریعت یعنی کتاب وسنت خاموش ہے ان میں اصل ان کے مار دینے کا جواز ہے۔ لہٰذا وہ تمام جانور جو بچوں کو خوف زدہ کریں، یا نیند خراب کریں یا کھانے پینے کی اشیاء برباد کر دیں جیسے مچھر، پسو، کاکروچ، چھپکلی، چوہا وغیرہ کہ ان کو مار دینا جائز ہے۔ لہٰذا مچھر مار سپرے استعمال کرنا جائز ہوگا۔

بجو ❶ کھانے کا حکم

1326- وَعَنِ ابْنِ أَبِي عَمَّارٍ قَالَ: ((قُلْتُ لِجَابِرٍ رضي الله عنه: الضَّبُعُ صَيْدٌ هِيَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: أَقَالَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ؟ قَالَ: نَعَمْ)).

ابن ابی عمار سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا بجو یہ شکار ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: ہاں! میں نے پوچھا کہ کیا یہ بات نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: ہاں! ❷

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ الْبُخَارِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......قُلْتُ لِجَابِرٍ: ابن ابی عمار تابعین میں سے ہیں کیونکہ انہوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کو پایا ہے۔

---

❶ ایک قسم کا گوشت خور جانور جو دن بھر بلوں میں رہتا ہے اور رات کو باہر نکل کر شکار کرتا ہے۔ (فیروز اللغات اردو: 181) (نسیم)

❷ مسند احمد: 297/3- سنن ابی داؤد: 3801- جامع الترمذی: 851- امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔- سنن ابن ماجہ: 3236- صحیح ابن حبان: 3964- امام بخاری رحمہ اللہ کی تصحیح "علل الترمذی" (ص: 297) میں مذکور ہے۔

الضَّبُعُ صَيْدٌ هِيَ: یہ جملہ استفہامیہ ہے نہ کہ خبریہ۔لہٰذا یہاں حرفِ استفہام محذوف ہے۔
ابن ابی عمار نے بجو کے شکار ہونے کی بابت سوال اس لیے کیا تھا کیونکہ بجو ایک مشہور جنگلی جانور ہے جو سب جانتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ آیا وہ حلال ہے یا حرام تو اس کا جواب اس سوال سے مل سکتا تھا کہ اگر تو یہ شکار ہے تو پھر حلال ہوا اور اگر یہ شکار نہیں تو حلال بھی نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کا جواب ہاں میں دیا۔یعنی بجو حلال ہے اور اس کو شکار کر کے کھا سکتے ہیں۔
قَالَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! بجو کو نبی کریم ﷺ نے شکار ارشاد فرمایا ہے۔یعنی نبی کریم ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ بجو شکار ہے۔تو جب یہ شکار ہے تو محرم پر اس کے شکار کرنے کی وجہ سے ایک بکری کا دم واجب ہوگا اور اگر بجو غیر حلال ہوتا تو اس کے شکار میں کچھ بھی نہ آتا کیونکہ غیر حلال شے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ بات اسلاف اخیار کی سنت میں سے ہے کہ وہ مسائل شرعیہ کی بابت استفسار کیا کرتے تھے۔
- "نَعَمْ" یہ کلمہ جواب میں صریح ہے اور اس کے ساتھ سوال کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔جیسا کہ گزشتہ میں بارہا ذکر کیا جا چکا ہے۔
- آدمی اپنے سے بڑے عالم سے اس کے بیان کردہ مسئلہ کی دلیل پوچھ سکتا ہے۔جیسا کہ ابن ابی عمار تابعی نے صحابی رسول حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ مسئلہ کی دلیل ان سے دریافت کی تھی۔
- بجو حلال ہے اور مذکورہ حدیث کے لانے کی غرض بھی یہی بات بیان کرنا ہے۔علماء کا بجو کے حلال ہونے میں اختلاف ہے، یہ صورت میں بھیڑیے اور لکڑ بھگے جیسا ہوتا ہے اور اختلاف کا منشا یہ ہے کہ اگر یہ حلال ہے تو کیا یہ کچلی والے درندوں کے حکم سے مستثنیٰ ہے یا یہ کچلی والا اور پھاڑ کھانے والا درندہ ہی نہیں۔

چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ اگرچہ یہ ذی ناب ہے لیکن پھاڑ کھانا اس کی عادت نہیں سوائے مجبوری کی صورت کے جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بھی حیوانِ مفترس (پھاڑ کھانے والا درندہ) ہی ہے اور رب تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ جس شے کو چاہے کسی حکم سے مستثنیٰ فرما دے۔
تب پھر پہلا قول محل اشکال ہے کہ یہ تو حیوانِ مفترس ہے جبکہ دوسرے قول میں کوئی اشکال نہیں اور مجادلہ و مناظرہ کے وقت اس قول کو لینا اولیٰ ہے جس میں کوئی اشکال نہ ہو، تا کہ نزاع قطع اور ختم ہو۔ چنانچہ ایک مومن کا اس باب میں یہی جواب کافی ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا قول ہے اور بس!!!

سیہی ❶ کا کھانے کا حکم

1327۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْقُنْفُذِ ﷺ فَقَالَ: ﴿قُلْ لَّا أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا﴾ فَقَالَ شَيْخٌ عِنْدَهُ: سَمِعْتُ أَبَا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (جب) ان سے سیہی کے بارے میں پوچھا گیا (کہ آیا وہ حلال ہے یا حرام) تو انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿قُلْ لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ

❶ قنفذ: ایک خاردار چوہا ہوتا ہے اس کا نام اردو میں "سیہی" ہے۔القاموس الوحید: 1361۔ اس کی تصویر کے لیے دیکھیں: المنجد العربی فی اللغۃ: 661۔ (نسیم)

هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ يَقُوْلُ : ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ : ((إِنَّهَا خَبِيْثَةٌ مِنَ الْخَبَائِثِ)) . فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ : إِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ هٰذَا ، فَهُوَ كَمَا قَالَ)) .

مُحَرَّمًا﴾ (الانعام: 145) ''کہہ دے میں اس وحی میں، جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا۔'' اس پر ان کے پاس بیٹھے ایک بوڑھے شخص کہنے لگے: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: نبی کریم ﷺ کے حضور (اس سیہی کا) تذکرہ ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ خبائث میں سے ایک خبیث (جانور) ہے۔'' اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر تو یہ بات جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے تو پھر یہ بات ویسے ہی ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ [1]

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيْفٌ .

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد ضعیف ہے۔

غریب الحدیث :......اَلْقُنْفُذ: یہ چوہے کے مشابہ ایک معروف چھوٹا جانور ہے اس کے پورے بدن پر من جانب اللہ کانٹے ہوتے ہیں جو بڑے نوکیلے اور سخت زخمی کر دینے والے ہوتے ہیں، یہ ایک عجیب و غریب جانور ہوتا ہے۔

اَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْقُنْفُذِ: یہ سوال اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں تھا۔ اس کے جواب میں جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ نہیں فرمایا کہ سیہی حرام ہے یا حلال بلکہ سورۂ انفال کی مذکورہ بالا آیت تلاوت فرما دی۔

فَقَالَ: یہ "فَقَرَأَ" کے معنی میں ہے، کیونکہ آیت قرآنیہ کسی کا قول نہیں ہوتی۔ (اسی لیے بندہ عاجز نے بھی ترجمہ میں اس امر کی رعایت کی ہے)۔ وہ پوری آیت یہ ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الانعام: 145)

''کہہ دے میں اس وحی میں، جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کہ بے شک وہ گندگی ہے، یا نافرمانی (کا باعث) ہو، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو بے شک تیرا رب بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

قُلْ: یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے۔

لَا أَجِدُ فِي مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ: مراد قرآنِ کریم ہے جو آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔

مُحَرَّمًا: یعنی رب تعالیٰ نے اس کو حرام کیا ہو۔

[1] مسند احمد: 381/2- سنن ابی داود: 3799- امام بیہقی رحمہ اللہ (326/9) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث میں مذکور ''شیخ'' مجہول ہے۔

عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُہِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ: یہ کل چار چیزیں ہیں۔

(1) میتہ: یعنی مردار اور اس سے دو چیزیں مستثنیٰ ہیں ایک ٹڈی اور دوسری مچھلی۔

(2) بہتا خون: اس سے بھی پاک خون مستثنیٰ ہے جو مچھلی کا ہے۔ پھر "مَّسْفُوْحًا" (بہتا ہوا) کی قید سے دمِ غیر مسفوح یعنی غیر سائل خون خارج ہو گیا جو جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کی رگوں میں باقی رہ جاتا ہے کہ وہ خون حلال ہے چاہے اس کی سرخی ظاہر بھی ہو جائے۔ کیونکہ یہ خون غیر مسفوح ہے اسی طرح جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کے دل میں رہ جانے والا خون بھی پاک ہے۔ جبکہ کلیجہ اور تلی خون ہونے کے باوجود پاک ہیں کیونکہ یہ دونوں حرمت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

(3) خنزیر کا گوشت: خنزیر ایک معروف خبیث ترین اور غلیظ ترین جانور ہے۔ اس کی خباثت وغلاظت دو قسم کی ہے:

(1) ایک معنوی (2) اور دوسری حسی

حسّی اور ظاہری خباثت یہ ہے کہ یہ غلاظتیں اور نجاستیں کھاتا ہے اور معنوی خباثت یہ ہے کہ یہ بے حد بے غیرت جانور ہوتا ہے۔

فَاِنَّہٗ رِجْسٌ: "اِنَّہٗ" کی ضمیر کا مرجع گزشتہ مذکورہ تینوں چیزیں ہیں۔ نہ کہ صرف لحم خنزیر۔ کیونکہ یہ ضمیر "اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ" میں "یَکُوْنَ" کی ضمیر مستتر کی طرف راجع ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجھ پر جو وحی کی گئی ہے میں اس میں کسی چیز کو حرام نہیں پاتا۔ "اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ ذٰلِکَ الشَّیْءُ مَیْتَۃً......"۔

سوائے اس کے کہ وہ شے مردار، خون یا خنزیر کا گوشت ہو۔ تب پھر "مَیْتَۃً اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ" یہ "اَنْ یَّکُوْنَ" کی خبر ہوں گے۔ جس کی ضمیر "الشی المطعوم" کی طرف راجع ہے۔ تب پھر "فَاِنَّہٗ" کی ضمیر ماقبل مذکور سب چیزوں کی طرف راجع ہو گی نہ کہ صرف لحم خنزیر کی طرف۔

اور "رِجْسٌ" یہ ناپاک کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ تینوں چیزیں نجاست اور ناپاکی ہونے کی وجہ سے حرام ہیں اور یہ ان تینوں چیزوں کی تحریم کی منصوص علت ہے۔

اس بنا پر ہمیں یہ شرعی قاعدہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر نجس شے حرام ہوتی ہے۔ کیونکہ حکم کا مدار علت کے عدم یا وجود پر ہوتا ہے۔ البتہ ہر حرام شے کا نجس ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ بے شمار حرام چیزیں غیر نجس ہیں جیسے زہر اور سگریٹ وغیرہ۔

اَوْ فِسْقًا: فسق رب تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ شے بھی حرام ہے جو رب تعالیٰ کی نافرمانی کا باعث بنے۔ تب پھر:

اُہِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ: یہ جملہ فسق کا بیان ہو گا۔ کہ فسق وہ شے ہے جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے۔ یعنی اس کو غیر اللہ کے نام پر قربان کیا گیا ہو، ایسی شے بھی حرام ہے چاہے وہ شے اپنی ذات میں خبیث نہ بھی ہو، جیسے غیر اللہ کے نام پر بکری قربان کرنا۔ کہ بکری خبیث نہ ہونے کے باوجود بھی غیر اللہ کے نام پر قربان ہونے کی وجہ سے خبیث بن جائے گی اور اس کا کھانا حرام ٹھہرے گا اور یہ خباثت ذاتی نہیں بلکہ معنوی ہو گی۔ اسی لیے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جانے والے کو "رجس" سے الگ ذکر فرمایا تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ غیر اللہ کے نام ذبح کیے جانے والے جانور کی قذرات ونجاست ذاتی نہیں بلکہ معنوی خباثت کی

وجہ سے ہے۔ حتیٰ کہ بسااوقات ایک پاکیزہ ترین جانور بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کی وجہ سے خبیث اور نجس بن جاتا ہے۔
آمدم برسر مطلب کہ جنابِ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے استدلال فرما کر سیہی کے حلال ہونے کا قول کیا۔ بلاشبہ یہ استدلال بے حد عمدہ تھا کہ مجھے تو قرآن میں سیہی کے حرام کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ حلال ہے۔ لیکن یہ آیت بعد میں حرام کیے جانے والوں جانوروں کی تحریم کے منافی نہیں۔ کیونکہ "مَـا أُوحِـيَ إِلَيَّ" یہ فعل ماضی ہے جو مستقبل کی نفی نہیں کر رہا۔ یعنی ما گزشتہ میں اب تک صرف ان چار چیزوں کی تحریم نازل ہوئی ہے۔ رہا مستقبل تو اس کا معاملہ اور ہے۔
چنانچہ نبی کریم ﷺ نے گھریلو گدھوں کو حرام ٹھہرایا حالانکہ قرآنِ کریم میں اس کی تحریم مذکور نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ہر کچلی والا درندہ اور ہر پنجہ سے شکار کر کے کھانے والا پرندہ بھی حرام ٹھہرایا حالانکہ ان دونوں کی تحریم بھی قرآن میں مذکور نہیں۔ اس بنا پر اس آیت کے بعد کی تحریم اس کی ناسخ نہ ٹھہرے گی کیونکہ مذکورہ آیت حکم کی تعمیم پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ ماضی میں حکم کی تعمیم پر دلالت کرتی ہے۔
فَـقَـالَ شَيْخٌ عِنْدَهٗ: یہ صاحب مجہول ہیں اور ان کی جہالت سے حدیث پر مرتب ہونے والے اثر کو فوائد کے تحت ذکر کیا جائے گا۔
اِنَّهَـا خَبِيْثَةٌ مِـنَ الْـخَبَـائِثِ: نبی کریم ﷺ نے سیہی کو خبیث فرمایا نہ کہ حرام کیونکہ یہ بات سب جانتے تھے کہ ہر خبیث شے حرام ہوتی ہے۔ پس آپ ﷺ نے حکم بیان کرنے کی بجائے حکم کی علت اور وصف کے ذکر پر اکتفاء فرمایا۔
اِنْ كَـانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ هَذَا فَهُوَ كَمَا قَالَ: یعنی اگر نبی کریم ﷺ نے سیہی کو حرام قرار دیا ہے تو بلاشبہ یہ حرام ہی ہے اور قرآنِ کریم کی اس آیت کے ہرگز بھی منافی نہیں کیونکہ مذکورہ آیت میں مستقبل کے اعتبار سے تعمیم کا حصر نہیں۔ بلکہ یہ حصرِ تعمیم ماضی کے اعتبار سے ہے اور مستقبل کی کوئی تحریم اس تعمیم کے منافی نہ ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مدلول کے ذکر کے بغیر دلیل کا ذکر جائز ہے۔ یعنی حکم کو ذکر کیے بغیر حکم کی دلیل ذکر کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا سیہی کے حکم کے سوال پر بجائے اس کا حکم بیان فرمانے کے آیت قرآنیہ پڑھ کر حکم کی دلیل کا بیان کرنا ہے۔
- معلوم میں حصر جائز ہے چاہے اس کے سوا کا احتمال بھی ہو، اس کی دلیل: "قُلْ لَا أَجِدُ......" کے الفاظ ہیں۔
- مردار، خنزیر، بہتا خون اور غیر اللہ کے نام کی دی ہوئی قربانی قطعاً حرام اور خبیث ہیں۔
- مجہول بات کا رد یا قبول حکم کے ثبوت پر متعلق کرنا چاہیے۔ یعنی جس کی طرف سے وہ بات منقول ہے اس سے خبر کے ثابت ہونے پر بات کو رد یا قبول کیا جائے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول: "فَـاِنْ كَانَ الرَّسُوْلُ قَالَ ذٰلِكَ فَهُوَ كَمَا قَالَ" کے الفاظ ہیں۔
- خبائث حرام ہیں بالخصوص جبکہ ان کا ذکر حکم کے بیان کی غرض سے ہو۔ البتہ اس مقام پر یہ قاعدہ یاد رہے کہ ہر حرام شے ضرور ہی خبیث ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر خبیث شے حرام ہی ہو۔

جلالہ کا حکم

1328۔ وَعَـنِ ابْـنِ عُـمَـرَ رضی اللہ عنہما قَـالَ: ((نَهَى حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد

رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْجَلَّالَةِ وَأَلْبَانِهَا)). ہے: ''نبی کریم ﷺ نے جلالہ (کے کھانے) سے اور اس کے دودھ (کے پینے) سے منع فرمایا۔'' ❶

أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ. اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے، اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **اَلْجَلَّالَةِ:** یہ اس چوپائے اور مویشی کو کہتے ہیں جو مینگنی اور لید کھاتا ہے اور جلالہ کو جلالہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ جلات اور گندگیاں کھاتا ہے اور جلات مینگنیوں اور لید کو کہتے ہیں۔ پس جس مویشی کا زیادہ تر چارہ لید مینگنیاں ہوں وہ جلالہ کے حکم میں داخل ہوگا اور اس کا کھانا ممنوع ہوگا۔ اسی طرح ایسے جانور کا دودھ پینا بھی منع ہے۔ کیونکہ دودھ گوشت کے تابع ہوتا ہے اور خون اور گوبر کے بیچ میں پیدا ہوتا ہے۔ تو جب اس کا گوشت کھانا منع ہوگا تو اس کا دودھ پینا بھی منع ہوگا جو گوشت کے تابع ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں ہے کہ اس پر سواری کرنا بھی منع ہے۔ ❷ تاکہ اس سے دور ہی رہا جائے تاکہ آدمی جلالہ کو پاک کرنے کی کوشش کرے اور اس کی نجاستیں کھانے کی عادت کو چھڑائے۔

فائدہ:...... مذکورہ حدیث میں جلالہ کے کھانے اور اس کا دودھ پینے کی ممانعت مذکور ہے۔ علماء کا جلالہ کے حکم میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس حدیث کی بنا پر جلالہ کو حرام کہا ہے۔ دوسرے اس لیے بھی یہ حرام ہے کیونکہ یہ خباثتوں اور غلاظتوں پر پرورش پاتا ہے تو لامحالہ اس کے گوشت میں ان نجاستوں کا اثر ہوگا اس لیے یہ خبیث جانوروں میں شمار ہوگا۔

اور ایک قول اس کے حلال ہونے کا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ غذا معدے میں جا کر خون میں بدل جاتی ہے لہٰذا یہ حلال ہوگا۔ جبکہ اس حدیث کا جواب یہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے لہٰذا یہ حدیث حجت نہیں بن سکتی۔ تب پھر ہم اصل کی طرف لوٹیں گے اور وہ حلت کا حکم ہے۔

جبکہ بعض نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر تو نجاست کا اثر اس کے گوشت اور دودھ میں ظاہر ہوتا ہے جیسے اس میں سے ناگوار بو آ رہی ہو تو اس کا کھانا منع ہوگا وگرنہ نہیں۔ یہی قول زیادہ قریبی ہے۔ لیکن یہ امتیاز دودھ دوہنے کے اور ذبح کرنے کے بعد قائم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر تو جلالہ کو ذبح کرنے کے بعد اس کے گوشت سے بو آئے تو جلالہ کا کھانا حرام ہوگا کیونکہ نجاستوں کا استحالہ (یعنی ان کا ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنا) مکمل نہیں ہوا، اور اگر اس کے گوشت سے بو نہیں آتی تو اس کا کھانا حلال ہوگا۔ غرض حدیث صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قواعد کی رو سے یہ قول اقرب ہے۔

جنگلی گدھا اور گھوڑا حلال ہے

1329- وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ ﷺ - فِيْ قِصَّةِ الْحِمَارِ الْوَحْشِيِّ: ((فَأَكَلَ مِنْهُ النَّبِيُّ ﷺ)). حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے جنگلی گدھے کے (شکار کے) قصہ کی بابت مروی ہے کہ: ''اس میں سے نبی کریم ﷺ نے (بھی)

❶ سنن ابی داؤد: 3785- جامع الترمذی: 1824- سنن ابن ماجه: 3189- جامع الترمذی: 1825- من حدیث ابن عباس، ابو زرعہ نے اس حدیث کو خطا قرار دیا ہے جیسا کہ "العلل لابن ابی حاتم" (23/2) میں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نہیں بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ دیکھیں: علل الترمذی: ص:304۔ علامہ مناوی "فیض القدیر" (305/6) میں لکھتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں محمد بن اسحاق ہے۔

❷ سنن ابی داؤد: 3811- سنن النسائی: 239/7- مسند احمد: 219/2- حافظ رحمہ اللہ نے "فتح الباری" (648/9) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

تناول فرمایا۔" ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

قصۂ حدیث:...... حضرت ابوقتادہ ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھے، پس وہ سب ساتھی تو احرام کے ساتھ تھے لیکن جناب ابوقتادہ کا احرام نہ تھا۔ اتنے میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے ایک جنگلی گدھا دیکھا اور آپس میں اس کی بابت باتیں کرنے لگے۔ حضرت ابوقتادہ سمجھ گئے چنانچہ انہوں نے سواری لی اور نیزہ بھی خود لیا اور جا کر وہ گدھا شکار کر لیا اور لا کر اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھا۔ لیکن انہوں نے کھانے میں توقف کیا۔ چنانچہ جب نبی کریم ﷺ سے اس بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا، یا ان کی معاونت کی تھی یا کوئی بات کی تھی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ جی نہیں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو کھا لو۔

فائدہ:...... جنگلی گدھا حلال ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس سے خود بھی تناول فرمایا اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کو بھی کھانے کی اجازت دی۔ اگر جنگلی گدھا کھانا حرام ہوتا تو آپ ﷺ خود اس کو تناول فرماتے نہ کسی اور کو اس کے کھانے کی اجازت ہی دیتے۔

1330۔ وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَتْ: ((نَحَرْنَا عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَرَسًا فَأَكَلْنَاهُ)).

سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: ہم نے دورِ نبوی میں ایک گھوڑا نحر کیا اور اسے کھایا۔ ❷

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

شرح:...... ایک روایت میں "ونحن بالمدینة" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔

فائدہ:...... گھوڑا حلال ہے اس کی تائید سنت قولیہ و اِقرار یہ دونوں سے ہوتی ہے جیسا کہ گزشتہ میں یہ مسئلہ مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

تنبیہ:...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ گھوڑا بھی اونٹ کی طرح نحر کیا جائے گا۔ نحر اور ذبح میں فرق "کتاب الاضاحی" میں بیان کیا جا چکا ہے۔

گوہ ❸ کھانا حلال ہے

1331۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: ((أُكِلَ الضَّبُّ عَلَى مَائِدَةِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک موقع پر) نبی کریم ﷺ کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی۔ ❹ (مگر آپ ﷺ نے اس کے کھائے جانے پر نکیر نہ فرمائی)۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

---

❶ صحيح البخاری: 2914۔ صحیح مسلم: 1196۔ ❷ صحيح البخاری: 5510۔ صحیح مسلم: 1942۔

❸ ایک چالاک جنگلی جانور جو بل بنا کر رہتا ہے۔ القاموس الوحید: 958۔ (نسیم)

❹ صحيح البخاری: 5536۔ صحیح مسلم: 1947۔

شرح :...... گوہ ایک معروف جانور ہے۔ یہ گندی چیزیں نہیں کھاتا بلکہ گھاس پھوس اور کھیتوں سے کھاتا ہے۔ گوہ حلال ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے اسے کھایا گیا اور آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہ فرمائی۔ اگر گوہ حرام ہوتی تو نبی کریم ﷺ کبھی اس کے کھائے جانے کو برقرار نہ رکھتے۔

تنبیہ:...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کسی شے کو برقرار رکھنے سے، اس شے کے مباح ہونے پر استدلال جائز ہے۔

مینڈک کا حکم

1332۔ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُثْمَانَ الْقُرَشِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ، ((أَنَّ طَبِيبًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الضِّفْدَعِ يَجْعَلُهَا فِي دَوَاءٍ ، فَنَهَى عَنْ قَتْلِهَا)) .

حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان قرشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک طبیب نے نبی کریم ﷺ سے مینڈک کے بارے میں پوچھا کہ (کیا) وہ مینڈک کو (مار کر اسے) کسی دوا (کے بنانے) میں شامل کرے؟۔ تو نبی کریم ﷺ نے (اس طبیب کو) مینڈک کو مارنے سے منع فرما دیا۔ [1]

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَأَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ .

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے (بھی) روایت کیا ہے۔

شرح :...... مینڈک ایک مشہور چھوٹا سا رینگنے والا جانور ہے جو خشکی اور تری دونوں میں یکساں طور پر زندہ رہ سکتا ہے۔ مذکورہ حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مینڈک کو کسی دوا میں شامل کرنے کی بابت سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے مینڈک کو مار ڈالنے سے منع فرمایا جو اس بات کی دلیل ہے کہ مینڈک ایک حرام جانور ہے۔ کیونکہ ہم یہ قاعدہ شرعیہ بیان کر چکے ہیں کہ جس حیوان کو مارنے کی ممانعت ہو وہ حرام ہوتا ہے۔ اس بنا پر مینڈک بھی حرام ہوگا اور اس کو بلا وجہ مارنا حرام ہوگا۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ بعض حیوانات طبی اعتبار سے مفید ہوتے ہیں لیکن اگر وہ حیوان حرام ہیں تو محض کسی طبی فائدہ کی غرض سے اس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان سے بنائے تیل کا استعمال مجرب ومفید ہو تو اس تیل کا استعمال جائز ہوگا۔ یعنی اگر طبی اعتبار سے خنزیر کی چربی سے بنے تیل کا استعمال مفید ہو تو اس سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں۔ رہی وہ حدیث جس میں یہ ذکر ہے کہ رب تعالیٰ نے میری امت کی شفا اس شے میں نہیں رکھی جو اس پر حرام ہے تو اس میں حرام شے کو کھا کر شفا کے حصول کی ممانعت کا بیان ہے۔ جبکہ حرام شے سے بنے تیل کی مالش اس حدیث کے معارض ومنافی نہیں کیونکہ کسی شے کو کھانا اور اس کی مالش کرنا یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ البتہ جب نماز وغیرہ عبادت کا وقت ہو جائے تو بدن کو اس نجس تیل سے پاک کرنا واجب ہوگا۔

1۔ بَابُ الصَّيْدِ وَالذَّبَائِحِ ......شکار اور ذبیحوں کا بیان

الصَّيْدُ: یہ لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، ایک فعل کے معنی میں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: صَادَ يَصِيدُ صَيْدًا۔ (اس

---

[1] مسند احمد: 453/3۔ سنن ابی داؤد: 5269۔ سنن النسائی: 210/7۔ المستدرك للحاكم: 504/3۔ امام بیہقی (317/9) فرماتے ہیں: مینڈک کو مار دینے کی ممانعت کی بابت یہ سب سے قوی روایت ہے۔

نے شکار کیا) اور دوسرے شکار کیے ہوئے جانور وغیرہ یعنی مَصِیْد کے معنی میں۔ تب پھر یہ مصدر بول کر اسم مفعول مراد لینے کے معنی میں ہوگا اور لغت عرب میں مصدر کا اسم مفعول پر اطلاق کثیر ہے۔ جیسے فراش جو مفروش کے معنی میں ہے اور غراس جو مغروس کے معنی میں ہے۔ جبکہ سب سے معروف مثال لفظِ خلق ہے جو مخلوق کے معنی میں ہے۔

تب پھر صید یہ مصید کے معنی میں ہے اور یہ وحشی حیوان کے شکار کرنے کو کہتے ہیں۔

الـذَّبَـائِـح: یہ ذبیحہ کی جمع ہے جیسے صحائف کہ یہ صحیفہ کی جمع ہے۔ ذبیحہ یہ فعیلۃ کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے یعنی ذبیحہ یہ مذبوحہ کے معنی میں۔ جیسے لفظ جریح کہ یہ مجروح کے معنی میں ہے اور لفظ قتیل کہ جو مقتول کے معنی میں ہوتا ہے۔

ذبح:...... یہ اس جانور کا خون بہانے کو کہتے ہیں جس کو قابو میں کر کے ذبح کیا گیا ہو چاہے اسے کسی بھی طرح قابو میں کیا گیا ہو یا کسی بھی طرح اس کا خون بہایا گیا ہو۔ لیکن یہ ذبح کا لغوی معنی ہے جبکہ اس کے شرعی اور اصطلاحی معنی میں چند دیگر قیود و شروط بھی ہیں جن کا بیان آئے آجائے گا۔

شکار کا حکم:

گزشتہ مذکورہ قواعد کی رو سے شکار میں اصل اس کا حلال ہونا ہے۔

کتا رکھنے کا حکم

1333- عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ، أَوْ صَيْدٍ، أَوْ زَرْعٍ انْتُقِصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے کتا رکھا سوائے اس کتے کے جو مویشیوں (کی حفاظت) کے لیے ہو یا شکار کے لیے ہو یا کھیتی (کی حفاظت) کے لیے ہو، تو بلا ناغہ اس کے اجر سے ایک قیراط کم ہو جاتا ہے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غرض حدیث :...... امام موصوف رحمہ اللہ نے باب کے ابتداء میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے کیونکہ کتا شکار کرنے کے آلات و وسائل میں سے ایک ہے۔ اس لیے شکار کا حکم اور اس کی شرط جاننے سے پہلے مناسب تھا کہ شکار کے آلات اور ان کے احکام کو جان لیا جائے اور یہی اس حدیث کو لانے کی غرض ہے کہ پہلے شکار کے آلات اور ان کا حکم جان لیا جائے۔

غریب الحدیث :...... مَنِ اتَّخَذَ: ایک روایت میں "مَنِ اقْتَنَى" کے الفاظ بھی ہیں، دونوں کا معنی ایک ہے۔ یعنی جس نے کتا رکھا اور پالا۔

كَـلْبًـا: یہ لفظ نکرہ ہے جو شرط کے سیاق میں آیا ہے اس لیے یہ عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔ تب پھر یہ حکم ہر قسم کے کتے کو شامل ہے چاہے سیاہ ہو یا سفید، سرخ ہو یا بھورا سب کا حکم ایک ہے۔

إِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ، أَوْ صَيْدٍ، أَوْ زَرْعٍ: معلوم ہوا کہ ان تین اغراض سے کتا پالنے یا رکھنے کا یہ حکم نہیں۔

قِيْرَاطٌ: یہ "أُنْتُقِصَ" کا نائب فاعل ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2323- صحيح مسلم: 1576.

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل بلاضرورت کتا رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بلاضرورت محض شوقیہ کتا رکھنا منع ہے کیونکہ ایسا کرنے سے آدمی کی نیکیوں سے بلاناغہ ایک قیراط کے بقدر اجر کم ہوتا ہے۔ قیراط کا معنی جنازہ میں شرکت والی حدیث کے تحت مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔
- بلاضرورت کتا پالنا حرام ہے کیونکہ ایسا کرنا اجر سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ یہ عقوبت ہے اور عقوبت ہمیشہ کسی کبیرہ پر آتی ہے اور عقوبت جہاں مطلوب کے حصول کے ذریعے ہوتی ہے وہیں محبوب کے فوات کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔
- یہیں سے کتے پالنے کی شوقین کافر قوموں اور ان کے اندھے پیروکاروں کی حماقت وسفاہت کا بھی خوب اندازہ ہو گیا۔
- معلوم ہوا کہ مذکورہ تین اغراض کے لیے کتا پالنا جائز ہے۔ جو یہ ہیں:

(1) مویشیوں کی حفاظت کے لیے۔ مویشی سے مراد اونٹ، گائے اور بکریاں ہیں اور یہ اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ اونٹ اور گائے بیل بھیڑیے وغیرہ سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں اس لیے اکثر لوگ صرف بکریوں کی حفاظت کے لیے ہی کتا پالتے ہیں اور کتا بھیڑیے کو بھگا بھی دیتا ہے۔ البتہ چوروں وغیرہ سے حفاظت کی غرض سے اونٹوں اور گائیوں پر بھی کتا چوکیدار رکھا جاتا ہے۔ کتا پالنے کی یہ صورت ضرر سے حمایت کی ہے۔

(2) شکار کے لیے: کتا پالنے کی یہ صورت جلب منفعت، کمالِ تنعم اور دفعِ حاجت کے لیے ہے چنانچہ کتے کا مالک شکار کر کے اسے بیچتا ہے اور اس کے ثمن سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی حاجت رفع کرتا ہے۔

(3) کھیتی کی حفاظت کے لیے: یہ کتا پالنے کے جواز کی تیسری صورت ہے تاکہ کوئی چور کھیت یا باغ وغیرہ میں داخل نہ ہو بلکہ دیگر چھوٹے موٹے جانور اور حشرات الارض بھی کھیت یا باغ میں داخل ہو کر اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات دوسروں کے گدھے، بکریاں، گائے بھینس کھیت میں گھس کر اس کو برباد کر دیتے ہیں۔ تو کتے کو ان جملہ متوقع مضار یعنی نقصانات سے بچانے کے لیے پالنا جائز ہوگا۔

کتا پالنے کے جواز کی یہ صورت بھی ضرر سے حمایت کی ہے۔

- جب کتے کو مویشیوں اور کھیتوں کی حفاظت کے لیے پالنا جائز ہے تو بیوی بچوں کی حفاظت کے لیے پالنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔
- اسی طرح جاسوس کتے پالنا بھی جائز ہے جو چوروں کا پتا لگاتے ہیں، اور منشیات وغیرہ کی سمگلنگ روکنے کے کام آتے ہیں۔

سدھائے کتے کا شکار حلال ہے

1334۔ وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ، فَإِنْ أَمْسَكَ عَلَيْكَ فَأَدْرَكْتَهُ حَيًّا فَاذْبَحْهُ، وَإِنْ أَدْرَكْتَهُ قَدْ قُتِلَ، وَلَمْ يُؤْكَلْ مِنْهُ فَكُلْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَ مَعَ كَلْبِكَ كَلْبًا غَيْرَهُ وَقَدْ قُتِلَ، فَلَا تَأْكُلْ، فَإِنَّكَ لَا

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا: ''جب تم اپنا کتا (شکار پر) چھوڑو تو اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو، پھر اگر اس نے تمہارے لیے (شکار کو) روکے رکھا اور تم نے اس شکار کو زندہ پا لیا تو اس کو ذبح کر دو، اور اگر تم نے شکار کو اس حال میں پایا کہ وہ (تمہارے شکاری کتے کے ہاتھوں) مارا جا چکا ہے اور اس میں سے کچھ کھایا ہوا بھی

تَدْرِيْ أَيُّهُمَا قَتَلَهُ ، وَإِنْ رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ ، فَإِنْ غَابَ عَنْكَ يَوْمًا فَلَمْ تَجِدْ فِيْهِ إِلَّا أَثَرَ سَهْمِكَ فَكُلْ إِنْ شِئْتَ ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ غَرِيْقًا فِي الْمَاءِ فَلَا تَأْكُلْ)) .

نہیں ہے (یعنی کتے نے وہ شکار تمہارے لیے ہی روک رکھا تھا اور خود اس میں سے کچھ نہ کھایا تھا) تو (وہ تمہارا شکار ہے اور) تم اس کو کھا لو اور اگر تم (شکار کے پاس) اپنے (چھوڑے) کتے کے ساتھ دوسرا کتا بھی پاؤ اس حال میں کہ وہ شکار مارا جا چکا ہو تو (اس شکار کو) مت کھانا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ ان دونوں کتوں میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے اور اگر تم (شکار پر) اپنا تیر پھینکنے لگو تو اس پر رب تعالیٰ کا نام لے لو۔ پھر اگر (تمہارے تیر کا شکار ہونے کے بعد) وہ (زخمی شکار) تم سے ایک دن بھی غائب رہے اور (ایک دن بعد جب وہ تمہیں مردہ حالت میں ملے اور) تم اس میں اپنے تیر کے اثر کے سوا اور کسی شے کا اثر نہ دیکھو تو اگر چاہو تو اس کو کھا لو اور اگر تم اسے پانی میں ڈوب کر مرا ہوا دیکھو تو اسے مت کھاؤ۔" ❶ (کیونکہ تم نہیں جانتے کہ یہ تمہارے تیر سے مرا ہے یا ڈوب کر مرا ہے)۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ؛ وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

شرح:...... مذکورہ حدیث میں بھی شکار کرنے کے آلہ کا ذکر ہے اب اس کی دو قسمیں ہیں: (1) آلہ جارحہ اور (2) آلہ غیر جارحہ: مذکورہ حدیث میں شکار کرنے کے آلہ جارحہ کا ذکر ہے۔

غریب الحدیث:...... **إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ**: کلب سے یہاں کلب معلم مراد ہے جس کو شکار کرنا سکھلایا گیا ہو۔ رہا یہ سوال کہ کتا کب معلم یعنی سدھایا ہوا کہلاتا ہے۔ تو علماء نے اس کی تین شرطیں بیان کی ہیں:

پہلی شرط:...... یہ ہے کہ اگر اسے شکار پر چھوڑا جائے تو اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہو ایسا کتا معلم یعنی سدھایا ہوا کہلاتا ہے۔ لہٰذا جو کتا بھوک ہونے پر تو شکار کے پیچھے دوڑے اور بھوک نہ ہونے پر کھڑا رہے تو یہ کتا ابھی تک معلم نہیں ہے۔

دوسری شرط:...... دوسری شرط یہ ہے کہ روکا جائے تو وہیں رک جائے چاہے شکار کے بالکل سر پر ہی کیوں نہ پہنچ گیا ہو۔ ایسا کتا بھی معلم کہلائے گا لہٰذا جو کتا روکنے پر رکے نہیں وہ ابھی تک معلم نہیں بنا۔

تیسری شرط:...... تیسری شرط یہ ہے کہ جب شکار کو دبوچ لے تو اسے کھائے نہیں اور اگر اس نے شکار دبوچ لینے کے بعد اسے کچھ پھاڑ کھایا ہے تو یہ بھی ابھی تک معلم نہیں۔ اس شرط میں کتے کے بھوکے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی فرق نہیں۔

فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ: کتے پر یہ بسم اللہ اسے عین شکار پر چھوڑتے ہوئے پڑھی جائے گی۔ چاہے خود کتا اس شکار کو پکڑنے میں گھنٹوں بعد ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ پس شکار پر چھوڑتے وقت کی یہ بسم اللہ اس شکار کے حلال ہونے کے لیے کافی ہوگی چاہے وہ شکار کتے کے قابو میں اس کے چھوڑے جانے کے ایک پہر بعد میں ہی کیوں نہ آئے۔

❶ صحيح البخاري: 5475- صحيح مسلم: 1929 .

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی پہلے بسم اللہ پڑھے پھر کتے کو شکار کے پیچھے چھوڑ دے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شکار پر کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے اور جو لوگ اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، ان کا قول ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ قول قرآن وسنت دونوں کے مخالف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ (الانعام: 121)

''اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔''

رب تعالیٰ نے ہر اس شے کو یعنی ذبیحہ کو کھانے سے منع فرمایا جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

فَإِنْ أَمْسَكَ عَلَيْكَ: ان الفاظ سے علماء نے کتے کے شکار کے حلال ہونے کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ خود کتے نے اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو، ہاں شکار کو مار کر ہلاک بے شک کر دیا ہو، اور مالک کے آ جانے تک اسے دبوچ کر رکھا ہو۔ کیونکہ اگر اس نے شکار سے خود کھا لیا تو پھر یہ شکار اس نے اپنے لیے کیا ہے نہ کہ مالک کے لیے۔

فَأَدْرَكْتَهُ حَيًّا فَاذْبَحْهُ: حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ چاہے وہ شکار حیاتِ مستقرہ کے ساتھ ہو یا جان کنی کے عالم میں ہو، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مراد حیاتِ مستقرہ کے ساتھ ہونا ہے۔ لہٰذا اگر شکار جان کنی کے عالم میں ہوا تو وہ کتے کا مارا کہلائے گا اور شکار حلال ہو گا۔

وَإِنْ أَدْرَكْتَهُ قَدْ قُتِلَ وَلَمْ يُؤْكَلْ مِنْهُ فَكُلْهُ: اس شرط کو بیان کیا جا چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے شکار کے حلال ہونے کے لیے اس بات کی شرط رکھی ہے کہ خود کتے نے اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو۔

شکار میں دو کتے شریک ہو جانے کا حکم:

وَإِنْ وَجَدْتَ ..... لَا تَدْرِي أَيُّهُمَا قَتَلَهُ: اگر آدمی اپنے شکار کے پاس اپنے کتے کے ساتھ دوسرا کتا بھی دیکھے تو اب اس شکار کی حلت مشکوک ہے کیونکہ اب ہمیں خود آلہ قتل کی تعیین میں شک ہوا ہے۔ جبکہ ایک آلہ پر تسمیہ پڑھی گئی ہے اور دوسرے پر نہیں۔ تب پھر خود شکار کی حلت میں بھی شک واقع ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسے شکار کو نہ کھائے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی ممانعت کی علت یہ بیان فرمائی ہے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ ان دونوں کتوں میں سے کس نے شکار کو مارا ہے لیکن اگر وہ دور سے دوربین کے ذریعے دیکھ رہا ہے کہ شکار کو اس کے کتے نے ہی مارا ہے اور دوسرا کتا بعد میں آیا ہے تو یہ شکار حلال ہو گا۔ کیونکہ یہاں ممانعت کی علت مفقود ہے اور وہ ہے لاعلمی۔ جبکہ دوربین کے ذریعے اس نے دیکھ لیا ہے کہ شکار اس کے جانور نے کیا ہے۔ البتہ لاعلمی کی صورت میں وہ شکار نہ کھائے۔

رہا یہ سوال کہ یہ شکار کس کا ہو گا؟ تو اقرب یہ ہے کہ شکار کو دونوں میں مساوی تقسیم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہاں یہ معلوم نہیں کہ شکار ایک کتے نے کیا ہے یا دونوں نے مل کر کیا ہے۔

وَإِنْ رَمَيْتَ سَهْمَكَ: یہ شکار کے دوسرے آلہ کا ذکر ہے اور یہ آلہ ''قاتلہ'' ہے جبکہ کتا آلہ جارحہ ہے۔

فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ: اور یہ بسم اللہ تیر کو چھوڑتے وقت پڑھی جائے گی نہ کہ تیر کو کمان میں درست کرتے وقت پڑھی جائے گی۔ یہی حکم بندوق کے ذریعے شکار کرنے کا بھی ہے کہ شکار پر گولی چلاتے وقت آدمی جب اس کا ٹریگر دبانے لگے تو بسم اللہ اس وقت پڑھے۔

لہٰذا اگر تیر چھوڑتے یا گولی چلاتے وقت بسم اللہ نہ پڑھی تو وہ شکار حلال نہ ہوگا۔

فَإِنْ غَابَ عَنْكَ يَوْماً..... فَكُلْ إِنْ شِئْتَ: بے شک یہ رب تعالیٰ کی نعمت میں سے ہے کہ اگر شکار تیر وغیرہ کھانے کے بعد بھاگ نکلے چاہے وہ پرندہ ہو یا کوئی چوپایہ، پھر وہ شکار کچھ عرصہ بعد مرا ہوا ملے لیکن اس کے بدن پر صرف اسی تیر کا اثر ہو جو اسے مارا گیا تھا تو یہ حلال ہوگا۔ کیونکہ حکم ظاہر پر لگتا ہے۔

وَإِنْ وَجَدْتَهُ غَرِيقاً فِي الْمَاءِ فَلَا تَأْكُلْ: یاد رہے کہ یہاں ''غریق'' کا لفظ ارشاد ہے اور یہ ارشاد نہیں ہے کہ تم اسے پانی میں پاؤ تو مت کھاؤ۔ کیونکہ بسا اوقات شکار پانی میں زندہ بھی مل جاتا ہے اور وہ خود کو ڈوبنے سے اور ہلاک ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے اور بعد میں مرتا ہے۔ یا یہ کہ شکار ملتا تو پانی میں ہے لیکن اس کے زخم کا اثر بتلاتا ہے کہ اس کی ہلاکت میں پانی کا کوئی دخل نہیں، جیسے تیر اس کے دل میں پیوست ہوا تھا۔ تب پھر لازمی ہے کہ وہ تیر کی چوٹ سے ہی مرا ہے۔ کہ پانی میں ملنے والا ایسا جانور بھی حلال ہے۔ کیونکہ وہ ملا تو پانی میں ہے لیکن اس کی موت میں پانی کا دخل نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ نے بندوں پر رزق کے دروازے کھول رکھے ہیں اور اس باب میں ان پر بے حد وسعت فرمائی ہے اور تنگی نہیں فرمائی۔ پس ہر وہ طریقہ جو رزق تک پہنچاتا ہو وہ حلال ہے۔ جب تک کہ اس کی تحریم پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔
- امت پر وسعت وکشادگی، کیونکہ شکار کو خود دبوچ کر پکڑنا یا اس کے پیچھے بھاگنا آسان نہیں۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے امت پر یہ تیسیر فرمائی کہ شکار کے آلات کے استعمال کو مشروع فرمایا۔ جیسے کتا اور تیر، اسی طرح بندوق وغیرہ۔
- کتے کے ذریعے شکار کرنا حلال اور جائز ہے۔ اس کی دلیل: "إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ" کے الفاظ ہیں اور کلب کی مرسل یعنی کتا چھوڑنے والے کی طرف اضافت اغلب کے اعتبار سے ہے کیونکہ اکثر شکار کرنے والا ہی کتا شکار پر چھوڑتا ہے۔ دوسرے اس قید سے دوسرے کے کتے کا کیا شکار بھی نکل گیا۔
- دورِ نبوی میں کتے سے شکار اغلب تھا۔ لہٰذا اگر کسی زمانہ میں تیندوے یا چیتے سے بھی شکار کرنا رائج ہو تو انہی مذکورہ شروط کے ساتھ ان کا کیا شکار بھی حلال ہوگا۔
- کتے کو شکار پر چھوڑتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھنا شکار کے حلال ہونے کے لیے واجب ہے۔
- کتے کے عین شکار پر جھپٹتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی قید نہ ہونا بلاشبہ شریعت کی تیسیر میں سے ہے۔
- شکار زندہ ملے تو اس کو شرعی طریق سے ذبح کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل: "فَأَدْرَكْتَهُ حَيًّا فَاذْبَحْهُ" کے الفاظ ہیں۔
- کتے کے کیے شکار کے حلال ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ خود کتے نے اس شکار میں سے کچھ نہ کھایا ہو۔ اس کی دلیل: "وَإِنْ أَدْرَكْتَهُ قَدْ قُتِلَ وَلَمْ يُؤْكَلْ مِنْهُ فَكُلْهُ" کے الفاظ ہیں۔
- کتے کے کیے شکار میں اس کا خون بہانا شرط نہیں۔ اس کی دلیل: "قَدْ قُتِلَ" کے الفاظ ہیں۔ کہ ان الفاظ میں شکار کا خون بہانا شرط نہیں۔ تب پھر کتے نے چاہے شکار کو گلا گھونٹ کر بھی مارا ہو، وہ حلال ہوگا۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ کتے کا کم از کم شکار کو زخمی کر کے مارنا شرط ہے چاہے اس نے شکار کو اس کے بدن کے کسی بھی حصہ سے زخمی کیا ہو۔
- اگر کسی شکار کی حلت میں شک ہو۔ یعنی اس کی حلت کی کوئی شرط مفقود ہو اور اس شرط کے پائے جانے میں شک ہو تو وہ

شکار حلال نہ ہوگا۔اس کی دلیل: "وَإِنْ وَجَدْتَ مَعَ كَلْبِكَ كَلْبًا غَيْرَهُ وَقَدْ قُتِلَ فَلَا تَأْكُلْ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں اس بات کا یقینی علم مفقود ہے کہ شکار کو کس کتے نے مارا ہے۔شکاری کے کتے نے یا دوسرے کتے نے۔تب پھر ہمیں حلت کی شرط میں شک ہو گیا اور شک کی صورت میں اصل حلت کا عدم ہے۔لہٰذا یہ شکار حلال نہ ہوگا۔

- یہیں سے فقہاء نے اپنا یہ مشہور قاعدہ بھی اخذ کیا ہے کہ جب مبیح (یعنی حلال اور مباح کرنے والا) اور حاذر (یعنی مانع) دونوں پائے جائیں تو حاذر کو غالب کیا جائے گا۔ [1] جیسا کہ اس مقتول شکار کے پاس دو کتوں کے پائے جانے کے وقت حذر کی جانب کو مقدم اور غالب کیا گیا۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ حکم کو اس کی علت کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا کرتے تھے تاکہ سننے والے کو شرح صدر ہو جائے اور ایسا ہی ایک مفتی کو کرنا چاہیے کہ وہ مستفتی کو مسئلہ بیان کرتے ہوئے مطمئن کر کے بھیجے۔
- اگر دو کتوں کے پائے جانے کی صورت میں اس بات کا یقینی علم ہو جائے کہ شکار شکاری کے کتے نے ہی کیا ہے تو اس کا کھانا حلال ہوگا۔اس کی دلیل: "فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي أَيُّهُمَا قَتَلَهُ" کے الفاظ ہیں۔لہٰذا اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مارا کس کتے نے ہے تو شکار کی حلت یا حرمت کی تعیین کی جاسکتی ہے۔
- تیر پھینک کر شکار کرنا جائز ہے۔اس کی دلیل: "إِذَا رَمَيْتَ سَهْمَكَ" کے الفاظ ہیں۔کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تیر مارنے کو شکار کی حلت کا سبب ٹھہرایا ہے۔
- معلوم ہوا کہ تیر کے ذریعے شکار کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھنے کا موقع ومحل تیر کو کمان سے چھوڑتے وقت ہے نہ کہ تیر کو کمان میں لٹکانے اور اس کو کھینچتے وقت ہے۔
- تیر کھا کر بھاگ جانے والا شکار اگر کچھ دیر بعد مرا ہوا ملتا ہے اور اس کے بدن پر اس تیر کے سوا اور کسی شے کا اثر دکھائی نہیں دیتا تو وہ جانور حلال ہوگا۔اس کی دلیل: "فَلَمْ تَجِدْ فِيهِ إِلَّا أَثَرَ سَهْمِكَ" کے الفاظ ہیں۔
- اور اگر بعد میں ملنے والے شکار کے بدن پر تیر کے سوا دوسرے اثرات بھی نظر آئیں تو وہ شکار حلال نہ ہوگا۔لیکن یہ مسئلہ مطلق نہیں بلکہ اس میں درج ذیل تفصیل ہے اور یہ تفصیل اس بیان کردہ شرعی قاعدہ پر مبنی ہے کہ دوسری شے کا اثر دیکھ کر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ آیا وہ شکار اسی تیر سے مرا ہے یا کسی دوسرے اثر سے مرا ہے چنانچہ:
  - ......اگر شکاری کا تیر تو دل میں جا لگا ہو جبکہ دوسرے کا تیر اس کے پر یا پیر میں لگا تو وہ شکار حلال ہوگا۔
  - ......اگر دوسری شے کا اثر بھی موت واقع کرنے والا ہو تو وہ شکار حرام ہوگا۔کیونکہ اب ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ شکار کس چیز کے اثر سے مرا ہے۔
- اگر شکار زخمی ہو کر نگاہ سے اوجھل ہو جائے اور بعد میں شکاری کے تیر کے اثر سے ہی مرا ہوا ملے تو اگرچہ وہ حلال ہوگا لیکن شکاری کو اس کے کھانے یا نہ کھانے میں اختیار ہے۔اس کی دلیل: "فَكُلْ إِنْ شِئْتَ" کے الفاظ ہیں اور ایسی صورت میں شکار کو چھوڑ دینا اضاعت مال شمار نہ ہوگا۔

---

[1] دیکھیں: مجموع الفتاویٰ: 262/20۔ المنثور فی القواعد للزرکشی: 337/1۔ القواعد الفقهية لابن قيم: 400۔ الاشباه والنظائر للسبكی: 117/1.

◈ اگر شکار پانی میں ڈوبا ہوا ملے تو اس کو کھانا حلال نہ ہوگا اس کی دلیل ایک دوسری حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ آتی ہے کہ: تم نہیں جانتے کہ اسے پانی نے جان سے مارا ہے یا تیرے تیر نے۔ ❶

◈ یہی حکم جلے ہوئے شکار کا بھی ہے۔ کیونکہ اب بھی ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ جل کر مرا ہے یا تیر کے ذریعے مرا ہے۔

◈ حکم ظاہر پر لگتا ہے اور اگر ظاہر کے خلاف کسی دوسری بات کا احتمال ہو بھی تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور شریعت کے اکثر احکام ظاہر پر ہی مبنی ہیں۔ اس کی دلیل: "إِنْ غَابَ عَنْكَ يَوْماً، فَلَمْ تَجِدْ فِيهِ إِلَّا أَثَرَ سَهْمِكَ، فَكُلْ إِنْ شِئْتَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ تیر چاہے اپنی چوڑان میں لگے یا اس کی دھار لگے دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے کیونکہ حدیث کے ظاہر سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔

نیزے اور بے پر کے تیر ❷ سے مرنے والے شکار کا حکم

1335۔ وَعَنْ عَدِيٍّ ﷺ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ صَيْدِ الْمِعْرَاضِ، فَقَالَ: ((إِذَا أَصَبْتَ بِحَدِّهِ فَكُلْ، وَإِذَا أَصَبْتَ بِعَرْضِهِ فَقُتِلَ فَإِنَّهُ وَقِيذٌ، فَلَا تَأْكُلْ)). رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ سے بے پر کے تیر کے ذریعے شکار کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم نے اس کی دھار سے (شکار کو) مارا تو (اس سے کیے شکار کو) کھالو اور جب تو نے اس کی چوڑان سے (شکار کو) مارا اور شکار مارا گیا تو یہ وقیذ (یعنی چوٹ لگا کر مارے جانے والے شکار کے حکم میں) ہے۔ پس (اسے) مت کھاؤ۔'' ❸

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......اَلْمِعْرَاضِ: یہ ایک لاٹھی سی ہوتی ہے جس کے سرے پر کوئی تیز دھار شے لگی ہوتی ہے۔ لوگ اس کے ذریعے بھی شکار کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ نیزہ ہوتا ہے۔ اسے شکار پر پھینک کر مارا جاتا ہے اب یا تو اس کا تیز دھار سرا جا لگے یا پھر اس کا ڈنڈا جو دراصل اس کی چوڑان ہے۔ اب نبی کریم ﷺ نے دونوں صورتوں کا حکم بیان فرما دیا ہے کہ اگر تو شکار کو اس کا تیز دھار نوکیلا حصہ جا لگے اور شکار ہلاک ہو جائے تو وہ حلال ہے اور اس کا کھانا جائز ہے کیونکہ اس صورت میں وہ زخمی ہوگا اور اس کا خون بھی بہے گا اور اگر اس کا عرض جا لگتا ہے تو یہ ان مردار جانوروں کے حکم میں داخل ہے جن کا ذکر سورۂ مائدہ کی اس آیت میں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ

---

❶ صحيح مسلم: 1929.

❷ مَعَارِض: یہ مِعْرَاض کی جمع ہے۔ یہ بے پر کے تیر کو کہتے ہیں جو درمیان سے موٹا ہوتا ہے اور یہ شکار کو عرضاً جا لگتا ہے نہ کہ نوکیلی دھار کے ساتھ۔ دیکھیں: المنجد العربی فی اللغة: 498۔ (نسیم)

❸ صحيح البخاري: 5486.

تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ (المائدہ: 3)

''تم پر مردار حرام کیا گیا ہے اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے والا جانور اور جسے چوٹ لگی ہو اور گرنے والا اور جسے سینگ لگا ہو اور جسے درندے نے کھایا ہو، مگر جو تم ذبح کر لو، اور جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تم تیروں کے ساتھ قسمت معلوم کرو۔ یہ سراسر نافرمانی ہے۔''

اور یہ شکار موقوذہ (یعنی وقیذ) کے حکم میں داخل اور حرام ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ زخمی نہ ہوگا اور اس کی موت چوٹ کی گرانی سے آئی ہے نہ کہ نیزے کی دھار سے۔

صَيْدِ الْمِعْرَاضِ: یہ کسی شے کی اس کے آلہ یا نوع کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔ یعنی وہ شکار جو نیزے سے مارا گیا ہو۔

إِنَّهُ وَقِيذٌ: یہ فعیل کے وزن پر مفعول کا معنی ہے۔ یعنی "وَقِيذٌ" یہ "مَوْقُوْذ" کے معنی میں ہے۔ وقیذ اس جانور کو کہتے ہیں جسے کسی ثقیل شے کی چوٹ مار کر مارا گیا ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں شکار کے دوسری قسم کے آلہ کا بیان ہے جو غیر جارحہ ہوتا ہے کہ اس سے کیا شکار مردار کے حکم میں ہوتا ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کا علم حاصل کرنے کے بے حد حریص تھے۔
- نیزے اور بے پر کے تیر کے ساتھ شکار کرنا جائز ہے کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ شکار کو اس کا تیز دھار حصہ جا لگے۔
- اگر ضرورت پڑے تو فتویٰ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں مسئلہ دو صورتوں میں منقسم فرما کر مفصل بیان فرمایا ہے۔
- اگر شکار کو نیزے کی چوڑان یعنی ڈنڈی لگے اور آدمی شکار کو زندہ حالت میں پالے اور ابھی اس کی حیات مستقرہ ہو نہ کہ حیاتِ مذبوحہ یعنی وہ جان کنی کے عالم میں نہ ہو تو اس کو ذبح کر کے کھا سکتے ہیں۔
- نیزے کے ڈنڈے سے مارا جانے والا شکار مقتول کہلائے گا نہ کہ شکار یا ذبیحہ۔ اس کی دلیل "فَقُتِلَ" کے الفاظ ہیں۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعلیم کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم کو علت سے ملا کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈنڈی کی چوٹ سے مرنے والے جانور کو کھانے سے منع فرمایا اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ یہ وقیذ کے حکم میں ہے۔
- بیانِ حکم میں اصل یہ ہے کہ پہلے حکم، اور پھر اس کی علت بیان کی جائے۔ لیکن علت کو حکم سے پہلے بھی بیان کر سکتے ہیں اس کی دلیل "فَإِنَّهُ وَقِيذٌ" (یہ علت کا بیان ہے) "فَلَا تَأْكُلْ" (یہ حکم کا بیان ہے) کے الفاظ ہیں کہ یہاں علت کو حکم سے مقدم بیان کیا گیا ہے۔

تنبیہ:...... جب کتا شکار کرتا ہے تو اس کے بھنبھوڑے حصہ کو شکار کے بدن سے دھونا اور پاک کرنا واجب ہے یا نہیں؟ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

ایک قول وہی ہے جو کتے کے جھوٹے کی بابت برتن کو پاک کرنے کا ہے کہ اس جگہ کو سات مرتبہ دھویا جائے گا جن میں سے ایک بار اس جگہ کو مٹی سے بھی دھویا جائے گا اور دوسرا قول یہ ہے کہ دھونے کی ضرورت نہیں اور شکار کے مجروح حصہ کو برتن

کی طرح سات بار دھونا تکلف اور تشدد ہے۔ دورِ نبوی میں اور مابعد کے ادوار میں کتوں کے ذریعے شکار کیا جاتا تھا۔ مگر شکار کے مجروح حصہ کو دھونے کا قول کسی ایک سے بھی مروی نہیں۔

اور یہی راجح قول ہے کیونکہ ایک تو دین میں کوئی حرج نہیں جبکہ گوشت کو یوں دھونا حرج میں داخل ہے، دوسرے بیان کی ضرورت کے وقت کسی بات کو بیان نہ کرنا اس کے غیر واجب ہونے کی دلیل ہے۔ تو جب نبی کریم ﷺ نے اس کو بیان نہیں فرمایا تو لامحالہ یہ امر غیر واجب ہوگا۔ تیسرے اس میں مشقت ہے اور مشقت مرفوع ہے۔

تیر سے شکار کرنے کا حکم

1336۔ وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ ، فَغَابَ عَنْكَ فَأَدْرَكْتَهُ ، فَكُلْهُ ، مَا لَمْ يُنْتِنْ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جب تم نے (شکار پر) اپنا تیر چلایا اور وہ شکار (تیر کھانے کے بعد زخمی ہو کر بھاگ نکلا اور) تم سے (دن بھر یا گھڑی بھر کو) روپوش ہو گیا، پھر تم نے اسے (مردہ حالت میں) پایا تو جب تک اس کا بدن بو نہ چھوڑ گیا ہو، اس کو کھا لو۔“[1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... مذکورہ حدیث کا مسئلہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ والی حدیث جیسا ہے۔ البتہ اس میں یہ بات زائد مذکور ہے کہ بعد میں ملنے والا شکار اس شرط پر کھا سکتے ہیں کہ اس کا بدن بو نہ چھوڑ گیا ہو۔ لہٰذا اگر اس کے بدن سے بو آنے لگی ہے تو اب اس کا کھانا ناجائز ہوگا۔

تب پھر تیر کھا کر زخمی ہونے کے بعد بھاگ جانے والے شکار کے حلال ہونے کی دو شرطیں ہوئیں:

(1) ایک یہ کہ بعد میں جب وہ مردہ حالت میں ملے تو اس کے بدن پر صرف شکاری کے تیر کا اثر ہو، کسی دوسرے کے تیر کا اثر نہ ہو، وگرنہ وہ جیفہ یعنی مردار کے حکم میں ہوگا۔ یہ بھاگ کر غائب ہو جانے والے شکار کے حلال ہونے کی پہلی شرط ہے۔

(2) دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شکار بو نہ چھوڑ گیا ہو، لیکن یہ شکار کے حلال ہونے کی شرط نہیں کیونکہ یہ شکار حلال بھی ہے اور طاہر بھی ہے، بلکہ یہ اس کے استعمال اور اس سے استفادہ کی شرط ہے کہ ایسا گوشت مضر صحت ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلی شرط کو شکار کے حلال ہونے کی حل وضعی کی شرط کہیں گے جبکہ دوسری شرط کو اس کے حل تکلیفی کی شرط کہیں گے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- تیر کھانے کے بعد غائب ہو جانے والے شکار کو ملنے پر اس وقت تک کھا سکتے ہیں جب تک کہ اس نے بو نہ چھوڑی ہو کہ ایسا شکار کھانا صحت کے لیے مضر ہے۔
- بدبودار گوشت کھانا منع ہے۔ پھر اگر تو بو زیادہ ہے تو یہ ممانعت تحریم پر مبنی ہوگی اور اگر بو کم ہے تو یہ ممانعت کراہت پر مشتمل ہوگی۔

یاد رہے کہ بو کی شدت وخفت میں موسمی تغیر کا بے حد دخل ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: 1931.

◈ شریعت اسلامیہ انسانی صحت کی حفاظت کی بے حد حریص ہے۔

جس جانور پر ذبح کے وقت بسم اللہ نہیں پڑھی گئی، اس کو کھاتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم

1337۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ قَوْمًا قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ قَوْمًا يَأْتُوْنَنَا بِاللَّحْمِ لَا نَدْرِيْ أَذَكَرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ، أَمْ لَا؟ فَقَالَ سَمُّوا اللّٰهَ عَلَيْهِ أَنْتُمْ، وَكُلُوْهُ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ ہمارے پاس کچھ لوگ ایسا گوشت لے کر آتے ہیں (جس کی بابت) ہمیں علم نہیں ہوتا کہ اس پر (ذبح کے وقت) بسم اللہ پڑھی گئی ہے یا نہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگ اس پر بسم اللہ پڑھ لو اور (پھر) اس کو کھا لو۔''[1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......أَنَّ قَوْمًا: ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "وَكَانُوْا حَدِيْثِيْ عَهْدٍ بِكُفْرٍ" یعنی وہ آنے والے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے جنہوں نے یہ سوال پوچھا تھا۔

چونکہ یہ لوگ ابھی نئے نئے اسلام لائے تھے، اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ ذبح کے وقت تسمیہ واجب ہوتی ہے۔

ذبح کے وقت تسمیہ شرط ہے:

بعض لوگوں نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ذبح کے وقت تسمیہ شرط نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں سے یہ فرمایا تھا کہ (اگر تمہیں ذبح کرنے والوں کی بابت تسمیہ پڑھنے یا نہ پڑھنے میں شک ہے تو) ''تم تسمیہ پڑھ کر اس کو کھا لو'' حالانکہ ان لوگوں کو اسی بات میں شک تھا اور یہ شک ذبیحہ کی حلت کی شرط میں ہے۔ پس اگر ذبح کے وقت تسمیہ شرط ہوتا تو آپ ﷺ انہیں ایسے ذبیحہ کے کھانے کی اجازت نہ دیتے۔

لیکن یہ استدلال دو اعتبارات سے درست نہیں:

(1) ایک یہ کہ اس حدیث میں اس مذکورہ توضیح کا احتمال ہے نہ کہ یہ احتمال متعین ہی ہے اور جب کسی امر میں احتمال آ جائے تو اس سے استدلال باطل ہو جاتا ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں کھانے کی اجازت اس لیے عنایت فرمائی تھی کیونکہ کسی اہل سے واقع ہونے والے فعل کی بابت اصل یہ ہے کہ وہ فعل صحیح ہی واقع ہوا ہوگا نہ کہ یہ بات تھی کہ ذبیحہ میں تسمیہ شرط نہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے ذبح کے وقت تسمیہ کے شرط نہ ہونے پر استدلال کرنا اصلاً درست نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے تسمیہ شرط ہے۔ کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بارے سوال کیا تھا۔ اگر یہ بات شرط نہ ہوتی تو وہ لوگ اس کا سوال بھی نہ کرتے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ورع کہ مشکوک اشیاء سے حد درجہ اجتناب کرتے تھے۔

---

[1] صحیح البخاري: 5507.

◈ جب کوئی فعل کسی اہل سے واقع ہو تو اصل یہ ہے کہ وہ صحیح ہی واقع ہوا ہوگا۔ تب پھر ایسا سوال بے جا کی شدت اختیار کرنا ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ: تم بسم اللہ پڑھ کر کھا لو۔ گویا کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تم دوسروں کے فعل کے ذمہ دار نہیں۔

◈ کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اس کی دلیل: "سَمُّوا اللّٰهَ عَلَيْهِ أَنْتُمْ، وَكُلُوهُ" کے الفاظ ہیں۔ اگرچہ بعض نے کھاتے وقت تسمیہ کو سنت و مستحب کہا ہے لیکن صحیح قول وجوب کا ہی ہے۔

◈ جن باتوں کو رب تعالیٰ نے مطلق رکھا ہے ان میں خود پر بے جا کی سختی اختیار کرنا غیر مناسب ہے۔

◈ بلاد کفار سے درآمد شدہ گوشت کی بابت یہ دیکھا جائے گا کہ اگر تو وہاں کتابی، مشرک اور ملحد ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں تب پھر ہمارے لیے پوچھنا ضروری ہے کہ اس گوشت کے ذبح کی ذمہ داری کس کو سونپی گئی تھی، کسی مشرک و ملحد کو یا کسی کتابی کو؟ چنانچہ اگر تو یہ معلوم ہو جائے وہاں کے سلاٹر ہاؤسز میں ذبح کی ذمہ واری کسی کتابی کے ذمہ تھی، تب اس گوشت کو حلال کہا جائے گا اور اگر ہمیں معلوم نہ ہو کہ ذبح کرنے والے مشرک، وثنی، ملحد یا کتابی تھے تو احتیاط اس میں ہے کہ ایسے درآمد شدہ گوشت کو کھانے سے گریز ہی کیا جائے۔

شکار کو کنکری اور ٹھیکری پھینک مارنے کی ممانعت کا بیان

1338- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ الْمُزَنِيِّ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْخَذْفِ، وَقَالَ: ((إِنَّهَا لَا تَصِيْدُ صَيْدًا، وَلَا تَنْكَأُ عَدُوًّا، وَلٰكِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ، وَتَفْقَأُ الْعَيْنَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ٹھیکری مارنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: "نہ تو یہ کسی کو شکار کرتی ہے اور نہ دشمن کو زخمی کر کے مار ہی ڈالتی ہے۔ البتہ یہ دانت توڑ دیتی ہے اور (یا پھر کسی کی) آنکھ پھوڑ دیتی ہے۔"[1]
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے اور یہ لفظ صحیح مسلم کے ہیں۔

غریب الحدیث: ......نَهَى عَنِ الْخَذْفِ: خذف: یہ چھوٹی کنکری کو شہادت کی اور درمیانی انگلی پر رکھ کر انگوٹھے کے ذریعے اسے پھینک مارنے کو کہتے ہیں۔ ایسی کنکری اور ٹھیکری کو غلیل یا گوپھن وغیرہ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اس سے منع فرمایا ہے کہ انگلی پر رکھ کر ٹھیکری ماری جائے یا غلیل میں ڈال کر ماری جائے۔

إِنَّهَا لَا تَصِيدُ صَيْدًا: یہ مذکورہ ممانعت کی علت کا بیان ہے اور یہی جملہ مذکورہ حدیث میں محل استدلال بھی ہے کہ امام موصوف رحمہ اللہ اس بات کو بتلانے کے لیے یہ حدیث لے کر آئے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اوّل تو اس سے شکار مرنے والا نہیں اور اگر مر بھی جائے تو وہ حلال نہ ہوگا کیونکہ ٹھیکری کے ذریعے مرنے والا شکار چوٹ سے مرتا ہے نہ کہ زخمی ہو کر مرتا ہے۔

یہ ایک اور آلہ شکار کا بیان ہے جو غیر جارحہ ہے کہ اس کے ذریعے شکار کرنا حلال نہیں۔

وَلَا تَنْكَأُ عَدُوًّا: اَلنَّكَأُ: یہ دشمن کو زخمی کر کے مارنے کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ٹھیکری نہ تو شکار مارتی ہے اور نہ یہ دشمن کو بھگانے کے ہی کام آتی ہے، تب پھر ٹھیکری مارنا ہر اعتبار سے غیر مفید ٹھہرا۔

وَلٰكِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ: اور یہ تب ہے، جب کسی کو جا لگے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5479- صحيح مسلم: 1954.

وَتَفْقَأُ الْعَيْنَ: یہ بھی تب ہی ہے جب کسی کو جا لگے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ بیان کیا گیا ہے کہ ٹھیکری اور کنکری مارنے میں کوئی خیر نہیں، یہ صرف نقصان ہی کرتی ہے تب پھر ٹھیکری مارنے کی ممانعت کی دو وجوہات ہیں:

(1) ایک یہ کہ نہ تو اس سے شکار ہو پاتا ہے اور نہ دشمن ہی بھاگتا ہے، تب پھر یہ عمل نرا لغو اور بیکار ٹھہرا اور اسلام بے کار کے کاموں میں لگنے سے منع کرتا ہے۔

(2) دوسری یہ کہ اس سے یا تو کسی کا دانت ٹوٹ جاتا ہے یا پھر کسی کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے، تب پھر کنکری مارنا مضرت پر مشتمل ٹھہرا جو منع ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کنکری مارنے کی ممانعت زیادہ ظاہر یہ ہے کہ کراہت پر مشتمل ہے جب تک کہ اس کے مارنے سے وہ ضرر متحقق نہ ہو جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے۔ لہٰذا اگر یہ مذکورہ ضرر متحقق ہوتا ہے تو یہ نہی تحریم کو مشتمل ہوگی۔
- کنکری یا ٹھیکری سے مرنے والا جانور حلال نہ ہوگا۔ اس کی دلیل: "لَا تَـصِيدُ صَيْدًا" کے الفاظ ہیں۔ البتہ اگر کنکری مارنے کے بعد شکار زندہ مل جاتا ہے اور اس میں حیاتِ مستقرہ پائی جاتی ہے تو اس کو ذبح کر کے حلال بنایا جا سکتا ہے۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ حکم کو علت کے ساتھ ملا کر ذکر فرماتے ہیں۔
- ہمیں دشمنوں کے سامنے غیر مفید اسلحہ لے کر نکلنا مناسب نہیں۔ کہ یہ ایسی عاقبت نا اندیشانہ جرأت کا مظاہرہ ہے جس کا انجام پسپائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے قوت اکٹھی کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: 60)

"اور ان کے (مقابلے کے) لیے قوت سے تیاری کرو۔"

- دوسرے کو ضرر پہنچانے سے بچنا واجب ہے۔ اس کی دلیل: "وَلٰكِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ، وَتَفْقَأُ الْعَيْنَ" کے الفاظ ہیں۔

کسی جاندار کو زندہ باندھ کر اس پر نشانہ کی مشق کرنا حرام ہے

1339۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لَا تَتَّخِذُوْا شَيْئًا فِيهِ الرُّوْحُ غَرَضًا)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "کسی ایسی شے کو جس میں روح ہو (تیر اندازی اور نشانہ بازی کی مشق کے لیے) آماج گاہ نہ بناؤ۔" [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا: مذکورہ "لَا" نہی کا ہے کیونکہ اس کے مابعد مذکور فعل "تَتَّخِذُوْا" مجزوم ہے۔

فِيهِ الرُّوْحُ: یہ قید کا بیان ہے کہ یہ ممانعت مطلق کسی شے کو نشانہ کی مشق بنانے کو شامل نہیں بلکہ ایسی شے کو آماج گاہ بنانے کی ممانعت کو شامل ہے جو ذی روح ہو۔

---

[1] صحيح مسلم: 1957.

غَــرَضًــا: وہ جگہ یا شے جس کا نشانہ بنایا جائے۔ جیسے کچھ فاصلے پر کسی تختہ کو نصب کر کے اس پر تیراندازی کی گولیاں چلانے کی مشق کرنا وغیرہ۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں کسی زندہ ذی روح شے کو باندھ کر اس پر نشانہ کی مشق کرنے کی سخت ممانعت کا بیان ہے کیونکہ یہ مشق کسی زندہ شے کے علاوہ پر بھی کی جا سکتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ذی روح کو آماج گاہ بنانا حرام ہے۔ کیونکہ اس میں ایک زندہ شے کو بلا ضرورت الم پہنچانا ہے جو حرام ہے۔
- دینِ اسلام حیوانوں کے لیے بھی اتنا ہی رحمت ہے جتنا کہ انسانوں کے لیے ہے۔
- معلوم ہوا کہ کسی مرے ہوئے جانور پر نشانہ کی مشق کرنا جائز ہوگا، کیونکہ وہ اس وقت ذی روح نہیں ہوتا البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ ایسا کرنے میں مالی ضیاع نہ ہو۔ لہٰذا اگر کسی مردہ کو نشانہ بنانے میں مالی نقصان ہو تو بھی ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔
- مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف نہایت بلیغ اشارہ ہے کہ نشانہ پختہ بنانے کے لیے کسی شے کو جیسے تختہ وغیرہ کو نصب کر کے مشق کرنا اولیٰ ہے۔

پتھر کے ذریعے ذبح کرنے اور حیض والی عورت کے ذبح کرنے کا حکم

1340۔ وَعَـنْ كَـعْـبِ بْنِ مَـالِكٍ ﷺ: ((أَنَّ امْـرَأَةً ذَبَـحَتْ شَاةً بِحَجَرٍ ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذَلِكَ ، فَأَمَرَ بِأَكْلِهَا)).

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ایک عورت نے ایک (تیز دھار) پتھر سے بکری ذبح کر ڈالی۔ سو نبی کریم ﷺ سے (جب) اس (بکری) کے بارے دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے اسے کھا لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

قصۂ حدیث:...... امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث اختصار کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس حدیث کا قصہ یہ ہے کہ ایک باندی مدینہ کے قریب ایک ٹیلے پر بکریاں چرایا کرتی تھی۔ وہ ٹیلہ ان دنوں ایک عمدہ چراگاہ بھی تھی۔ ایک دفعہ ایک بھیڑیا اس کی ایک بکری پر حملہ آور ہو گیا۔ عورت پیچھے دوڑی تو بھیڑیا بکری کو شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہ دیکھ کر اس باندی نے ایک تیز دھار پتھر لے کر اس بکری کو ذبح کر دیا۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے اس بکری کے کھا لینے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ پتھر اگر تیز دھار ہو تو اس سے جانور کو ذبح کر سکتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے پتھر سے ذبح کی جانے والی بکری کو کھانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی جو اس فعل کو برقرار رکھنے کی دلیل ہے۔
- عورت بھی ذبح کر سکتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے عورت کے ذبح کرنے کو برقرار رکھا۔
- تب پھر عورت حالت حیض میں بھی ذبح کر سکتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قصہ سننے پر یہ نہ دریافت فرمایا تھا کہ وہ عورت حیض سے تھی یا نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 5504.

یہیں سے علماء نے جنبی کے ذبح کرنے کے جواز کو بھی اخذ کیا ہے۔

- امین مالِ امانت میں مصلحت پر مبنی تصرف کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ عورت باندی تھی جو مالک کی بکریاں چرا رہی تھی اور اس نے زخمی ہو جانے والی بکری میں امانت دارانہ تصرف کیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ بکری کو ذبح نہ کرتی تو وہ بکری ہلاک ہو جاتی اور اکارت جاتی۔
- اگر کسی جانور کو موت کا کوئی سبب نشانہ بنا لے اور دوسرا اسے مرنے سے پہلے ذبح کر دے تو وہ حلال ہوگا جیسے بھیڑیے نے اس بکری کو کچھ چیر پھاڑ دیا تھا لیکن اس باندی نے اسے مرنے سے پہلے پکڑ کر ذبح کر دیا تھا تو یہ بکری حلال ٹھہری۔
- جب فعل کسی اہل سے واقع ہو تو اس کے بارے میں صحتِ عمل کا سوال نہیں کیا جاتا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں یہ سوال نہ فرمایا تھا کہ آیا اس عورت نے بکری ذبح کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھی تھی یا نہیں۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ورع کہ جب تک انہوں نے پوچھ نہ لیا اس بکری کو نہ کھایا۔
- امر کبھی اِذن یعنی اجازت کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ یہاں "فَأَمَرَ بِأَكْلِهَا" میں امر "اذن" یعنی اجازت کے معنی میں ہے۔

ذبح کی شروط کا بیان

1341- وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَا أَنْهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، فَكُلْ، لَيْسَ السِّنَّ وَالظُّفُرَ، أَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ، وَأَمَّا الظُّفُرُ فَمُدَى الْحَبَشَةِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شے (جانور کا) خون بہا دے اور اس (جانور کو ذبح کرتے وقت اس) پر اللہ کا نام لے لیا جائے تو (وہ حلال ہے۔ پس) تم (اسے) کھا لو، البتہ وہ دانت اور ناخن نہ ہو (کہ ان دونوں کے ذریعہ ذبح کرنا جائز نہیں) رہا دانت تو (اس سے ذبح کرنا اس لیے منع ہے کیونکہ) وہ ہڈی ہے اور رہا ناخن تو وہ (اہل) حبشہ کی چھری ہے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......مَا أَنْهَرَ الدَّمَ: مذکورہ "مَا" شرطیہ ہے اور "أَنْهَرَ" یہ فعل شرط ہے اس کا فاعل اس کی ضمیر "هُو" ہے جو "مَا" کی طرف راجع ہے اور "الدَّمَ" یہ مفعول بہ ہے۔

وَذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: یہ فعل شرط پر عطف ہے۔

فَكُلْ: مذکورہ "فا" جزائیہ ہے اور اس "فا" کا لانا واجب ہے کیونکہ جوابِ شرط فعلِ امر ہے اور یہ امر اباحت کے لیے ہے جیسا کہ گزشتہ میں بیان ہوا۔

لَيْسَ السِّنَّ وَالظُّفُرَ: مذکورہ "لَيْسَ" یہاں اداۃِ استثناء کے طور پر ہے اس لیے اس کے اسم کا مستتر ہونا واجب ہوگا۔ کیونکہ جب فعل ناقص "لَيْسَ" حرفِ استثناء کے طور پر آتا ہے تو اس کا اسم اس کی ضمیر ہوتا ہے اور "السِّنَّ" یہ "لَيْسَ" کی خبر ہے اور "الظُّفُرَ" یہ "السِّنَّ" کا معطوف ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 5498- صحيح مسلم: 1968.

أَمَّا السِّنُّ: "أَمَّا" یہ حرفِ شرط وتفصیل ہے۔ تب پھر "السِّنُّ" یہ مبتداء ہوگا اور "فَعَظْمٌ" یہ خبر ہوگی اور یہی ترکیب "وَأَمَّا الظُّفُر: فَمُدَی الْحَبَشَةِ" میں ہے۔

مضمون حدیث :...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو مسائل بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ جو شے بھی خون بہا دے چاہے وہ لوہا، لکڑی، سیسہ، سونا، چاندی وغیرہ میں سے جو بھی ہو، اس کے ذریعے جانور کو ذبح کرنا جائز ہے۔ کیونکہ جملہ اداۃِ شرط جو اسمیہ ہوں وہ عموم کا فائدہ دیتے ہیں۔ اسی عموم سے ہم نے یہ بات اخذ کی ہے کہ خون بہا دینے والی ہر شے سے ذبح جائز ہے چاہے وہ شیشہ ہی کیوں نہ ہو اور اس عموم کی دوسری دلیل ناخن اور دانت کا استثناء ہے کیونکہ استثناء ہمیشہ عموم سے کیا جاتا ہے۔ [1] جیسا کہ علمائے اصول نے بیان کیا ہے اور دوسرا اہم مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے اس پر تسمیہ پڑھنا واجب ہے اس کی دلیل: "وَذُکِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ" کے الفاظ ہیں۔ یہ بسم اللہ کون پڑھے گا؟ تو گزشتہ حدیث میں اس کو بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ فاعل پڑھے گا۔ لہٰذا اگر بسم اللہ ایک پڑھے جبکہ ذبح دوسرا کرے تو یہ جانور بلاشبہ حرام ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اسم اللہ سے مراد خالص اللہ کا نام ہے کیونکہ مقصود رب تعالیٰ کے نام ''اللہ'' سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا شرط ہوگا۔

◈ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے اس کا خون بہانا شرط ہے۔ کیونکہ کھانے کی اجازت خون بہانے پر معلق ہے اور یہ حکم مطلق نہیں کہ بدن کے کسی بھی حصہ سے خون بہا دیا جائے بلکہ خون بہانے کے لیے گردن کی دائیں بائیں کی خون کی رگوں کو کاٹنا ضروری ہے جبکہ حلق اور سانس کی نالی کا کاٹنا ضروری نہیں، گو اکثر وہ ساتھ ہی کٹ جاتی ہیں۔

اب اِنہارِ دَم کی کامل ترین صورت یہ ہے کہ خون کی دونوں دائیں بائیں کی رگیں اور سانس اور خوراک دونوں نالیاں کاٹی جائیں کہ اس سے مادۂ حیات کامل طور پر کٹ جاتا ہے۔

لیکن اگر خون کی دونوں رگیں تو ضرور کٹیں پر ان کے ساتھ سانس یا خوراک کی کوئی ایک نالی کٹے تو یہ ذبح کا دوسرا درجہ ہے اور اگر صرف خون کی نالیاں ہی کٹیں تو یہ ذبح کا تیسرا درجہ ہے اور اگر خون کی صرف ایک رگ کٹے تو یہ ذبح کا چوتھا درجہ ہے۔

لیکن اگر صرف سانس اور خوراک کی نالیاں کٹیں اور خون کی ایک رگ بھی نہ کٹے تو اس ذبیحہ کے حلال ہونے میں اختلاف ہے۔ البتہ حلت کا قول محلِ نظر ہے۔ کیونکہ حدیث میں اِنہارِ دَم کو شرط قرار دیا گیا جو اس صورت میں نہیں پایا گیا۔ پھر یہ کہ ایک روایت میں ایسے ذبح کو شیطانی ذبح قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس صورت میں جانور کی جان نکلنے میں بڑی دیر لگتی ہے اور اگر صرف حلق یا صرف خوراک کی نالی کاٹی تو یہ ذبح کافی نہ ہوگا۔

◈ تسمیہ بھول جانے سے ذبیحہ حلال نہ ہوگا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تسمیہ کو شرط قرار دیا ہے اور شرط نسیان سے ساقط نہیں ہوتی۔ البتہ نسیان سے ''اثم'' یعنی گناہ ساقط ضرور ہو جاتا ہے۔

◈ یہیں سے رب تعالیٰ کے نام کی عظمت بھی معلوم ہوگئی کہ اس کے بغیر جانور حلال نہیں ہوتا۔

---

[1] دیکھیں حاشیة البیجرمی: 106/1- حواشی الشروانی: 177/2- شرح کتاب زید بن رسلان، ص: 33- مغنی المحتاج: 135/1.

- امر کبھی اباحت کے لیے بھی آتا ہے جیسے یہاں کھانے کا امر اباحت کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذبیحہ کو یوں ہی پھینک دینا جائز ہے کہ اس میں اضاعتِ مال ہے جو ناجائز ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ذبیحہ صرف کھانا لازم نہیں چنانچہ آدمی کھا بھی سکتا ہے اور ذبیحہ صدقہ بھی کر سکتا ہے اس طرح بیچ بھی سکتا ہے۔
- ناخن اور دانت سے ذبح کرنا جائز نہیں چاہے آدمی اس حکم سے جاہل ہی ہو۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں ذبح کے غیر شرعی آلات ہیں۔

پھر دانت چاہے آدمی کا ہو یا حیوان کا، بدن سے متصل ہو یا منفصل سب کا حکم ایک ہے۔ کیونکہ لفظ السـن یہاں مطلق ہے اور تخصیص کا کوئی قرینہ مذکور نہیں۔

اور ناخن سے آدمی کا ناخن مراد ہے کیونکہ ناخن سے ایسا کر سکنا تب ہی ممکن ہے جب اس کو تراشا نہ جائے اور ان کو یوں ہی چھوڑ دیا جو سراسر خلافِ فطرت ہے۔ کیونکہ اہل حبشہ اس خلافِ فطرت فعل کے عادی تھے۔ اس لیے ان کا نام لے کر بتلایا گیا کہ یہ ان کا فعل ہے اور یہ منع ہے۔

- ہڈی کوئی بھی ہو۔ اس سے ذبح منع ہے۔ اس کی دلیل: "أَمَّا السِّنُّ: فَعَظْمٌ" کے الفاظ ہیں۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ حکم کو اس کی علت کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا کرتے تھے۔

جانور کو باندھ کر قتل کرنا منع ہے

1342۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُقْتَلَ شَيْءٌ مِنَ الدَّوَابِّ صَبْرًا)).
رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی جانور کو باندھ کر قتل کیا جائے۔ ❶

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... اَلدَّوَابِّ: یہ "دابة" کی جمع ہے اور دابہ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتی ہو چاہے ٹانگوں سے اور چاہے رینگ کر، اور چاہے وہ حلال ہو یا حرام کہ یہ لفظ ان سب کو شامل ہے۔

صَبْرًا: مراد باندھ کر مارنا ہے اور یہ نہی اور ممانعت ذی روح کو آماج گاہ بنا کر مارنے کی ممانعت کی طرح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- دین اسلام حیوانوں کے حق میں بھی رحمت ہے۔
- مال کو ضائع اور برباد کرنا منع ہے۔ کیونکہ جانور کو قید کر کے اور باندھ کر مارنا اسے ضائع کرنا ہے۔
- معلوم ہوا کہ جس جانور کو قابو کر کے ذبح کیا جا سکتا ہو۔ اس کو تیر مار کر مارنا جائز نہ ہوگا۔ شاید کہ امام موصوف اسی فائدہ کے پیش نظر یہ حدیث اس باب کے تحت لے کر آئے ہوں۔ لہٰذا جس جانور کو قابو کیا جا سکتا ہو، اس کو ذبح یا نحر کرنا ضروری ہے اور جو جانور قابو میں نہ آتا ہو، جیسے وحشی جنگلی جانور اور ہوا میں اڑتا پرندہ یا وہ قابو سے نکل جائے جیسے اونٹ بدک جائے۔ تو اس کے بدن کے کسی بھی حصہ کو زخمی کر کے اس کو قتل کرنا جائز ہوگا اور وہ حلال ہوگا۔

---

❶ صحیح مسلم: 1959.

جانور کو مارنے میں بھی احسان کیجیے!

1343۔ وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنے کو لازم کیا ہے پس جب تم قتل کرو تو قتل کرنے کی ہیئت میں بھی احسان کرو، اور جب تم ذبح کرو تو ذبح کرنے میں بھی احسان کرو اور چاہیے کہ تم میں سے ایک اپنی چھری کو تیز کر لے اور چاہیے کہ آدمی اپنے ذبیحہ کو راحت دے۔''[1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... كَتَبَ: یہ فرض کرنے کے معنی میں آتا ہے اور مشروع کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تب پھر یہ احسانِ واجب اور احسانِ مستحب دونوں کو شامل ہے۔

عَلَى كُلِّ شَيْءٍ: "عَلَى" یہاں "فِي" کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے اور استعلاء کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی آدمی دوسرے پر جو بھی فعل کرتا ہے، اس میں احسان کرے کہ یہ اس پر فرض اور لازم ہے۔

فَإِذَا قَتَلْتُمْ ..... الذِّبْحَةَ: قتل اور ذبح، ان دو باتوں کو بطور مثال کے ذکر فرمایا ہے وگرنہ احسان کرنا تو ہر شے میں لازم ہے۔

نبی کریم ﷺ نے قتل اور ذبح کو جدا جدا ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ قتل غیر ماکول میں اور ذبح ماکول میں ہوتا ہے۔ پھر قتل میں احسان سے مراد قتل کرنے میں سہل ترین صورت اختیار کرنا ہے یا شرع کے موافق قتل کرنا مراد ہے؟ تو بظاہر دوسرا قول مراد ہے۔ کیونکہ زانی محصن کا رجم کرنا بظاہر سخت تکلیف دہ ہے لیکن چونکہ حکم شرع کے عین موافق ہے اس لیے یہ قتل بھی قتلِ احسان کہلائے گا حالانکہ اسے تلوار کے ایک وار سے قتل کر دینا اسے رجم کر دینے سے سہل بلکہ اسہل ہے۔

الْقِتْلَةَ: یہ بھی "فِعْلَةٌ" کے وزن پر اسم ہیئت ہے۔ یہی حکم نحر کرنے کا اور تیر مار کر شکار کرنے کا ہے اور اس حکم کا تعلق ماکول جانوروں سے ہے۔ یاد رہے کہ یہ دو مثالیں بطور مثال کے ہیں نہ کہ بطور حصر کے۔

وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ: مذکورہ لام امر کا ہے۔ اسی لیے واؤ کے بعد یہ لازم ساکن آئی ہے کیونکہ واو "ثُمَّ" اور "فا" کے بعد جو لام امر کا ہو وہ ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ان تین حروف کے بعد جو لام تعلیل کا ہوتا ہے وہ ہمیشہ مکسور ہوتا ہے۔

اور شفرہ چھری کو کہتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بڑی چھری کو کہتے ہیں (جس کو اردو میں چھرا کہتے ہیں)۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں نبی کریم ﷺ کی مراد مطلق چھری ہے چاہے بڑی ہو یا چھوٹی اور اس کے ذریعے جانور کو ذبح کیا جا سکتا ہو، چاہے وہ چھری اپنی ہو یا دوسرے کی ہو، دونوں کا حکم ایک ہے۔ کیونکہ اگرچہ "شَفْرَتَهُ" میں اضافت ملک کی طرف مشیر ہے لیکن مانگے کی چھری طرف بھی اضافت کر دیا کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ اضافت ادنیٰ ملابست کی وجہ سے بھی کر دیتے ہیں۔

غرض جب جانور کو ذبح کرنا ہو تو ذبح کرنے کا آلہ تیز دھار ہونا چاہیے نہ کہ اس کی دھار کند ہو کہ اس میں جانور کو زیادہ

[1] صحیح مسلم: 1955.

تکلیف ہے۔اس لیے آگے فرمایا:

وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ: مذکورہ لام بھی امر کا ہے اور "ذَبِيحَةَ" یہ "مذبوحة" کے معنی میں ہے جیسا کہ ابتداء میں بیان ہوا۔ رہا یہ سوال کہ یہ دونوں جملے معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کو لازم ہیں؟ یا مختلف ہیں؟ کیونکہ چھری تیز ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ ذبیحہ کو راحت ملتی ہے اور اس کی جان جلدی نکل جاتی ہے۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ ان دونوں جملوں کا معنی مختلف ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ چھری کی تیز دھار ذبیحہ کو راحت دیتی ہے لیکن دوسرے جملہ میں راحت دینا یہ چھری کے تیز ہونے کے معنی سے زیادہ اعم ہے۔وہ یہ کہ چھری بھی تیز ہو اور ذبح بھی قوت اور شدت کے ساتھ کیا جائے۔کیونکہ ذبح کرنے میں جتنی قوت ہوگی جانور کو اسی قدر موت جلدی آئے گی اور اسے راحت ملے گی۔چنانچہ اگر ذبح کرنے والا کوئی دبلا پتلا اور کمزور آدمی ہے تو چھری تیز ہونے کے باوجود وہ جانور کو ذبح کرتے وقت اس کی تکلیف میں اضافہ کا باعث بنے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ کو احسان کرنا پسند ہے کیونکہ وہ خود بندوں پر احسان کرنے والا ہے۔اس لیے اس نے بندوں پر احسان کرنے کو واجب کر دیا ہے۔اس کی دلیل: "إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ" کے الفاظ ہیں۔
- احسان کرنا ہر شے کو شامل ہے۔حتیٰ کہ اگر ایک آدمی آپ سے منہ چڑا کر ملتا ہے تو آپ کا اسے خندہ پیشانی سے ملنا بھی اس کے ساتھ احسان کرنا ہے۔
- جب کسی پر کسی شے کو قتل کرنا لازم ہو جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اسے قتل کرنے میں سہل ترین صورت اختیار کرے۔ تاکہ اس کے بدن سے اس کی روح جدا ہوتے ہوئے اس کی تعذیب کا سبب نہ بنے۔
- رہا یہ سوال کے قصاص کے مجرم کو تلوار سے قتل کرنا سہل ہے یا دماغ میں گولی مارنا یا پھانسی دینا یا بجلی کے جھٹکے لگا کر مارنا اسہل ہے، تو اس بارے اعتبار ماہرین کی رائے کا ہوگا۔پس جس طریق کو وہ کم تکلیف دہ قرار دیں اس کو اختیار کیا جائے گا اور اس باب میں یہ اعتراض درخور اعتناء نہ ہوگا کہ یہ طرق تو دور نبوی میں نہیں پائے جاتے تھے۔
- اسی طرح اگر کسی کی سزا قطع ید متعین ہو جائے یا قصاص میں اس کا کوئی عضو قطع کرنا متعین ہو جائے تو اس قطع میں بھی احسان اختیار کیا جائے۔لہٰذا قطع سے قبل اگر اس کے ہاتھ وغیرہ عضو کو سن کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔
- ذبح میں احسان یہ ہے کہ جانور کو نرمی کے ساتھ اس کے بائیں پہلو پر گرا دیا جائے بشرطیکہ ذبح کرنے والا داہنے ہاتھ سے ذبح کرتا ہو اور اگر وہ بائیں ہاتھ سے ذبح کرتا ہو تو جانور کو داہنے پہلو پر گرایا جائے۔کیونکہ مخالف جانب گرے جانور کو ذبح کرنا سہل ہوتا ہے۔پھر جانور کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کے سر کو خوب مضبوطی سے تھام لے اور دوسرے ہاتھ سے ذبح کر دے۔
- ذبح سے قبل جانور کے سامنے پانی رکھنا گو احسان میں داخل ہے لیکن یہ تب ہے جب ہمیں اس کے پیاسے ہونے کا اندیشہ ہو وگرنہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ یہ بات کبھی نظر سے گزری نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ذبح سے قبل جانور کے سامنے پانی پیش کیا ہو۔

◈ جانور کی چاروں ٹانگیں جکڑ لینا اس پر احسان نہیں بلکہ اسے تڑپنے کے لیے چھوڑ دینا اس کے ساتھ احسان ہے کیونکہ اس میں اس کی تکلیف میں کمی آتی ہے، دوسرے ایسا کرنے سے خون زیادہ شدت کے ساتھ نکلتا ہے جو ذبح میں مقصود ہے تاکہ اس کی جان جلدی نکلے۔

◈ قبلہ رخ ذبحہ کرنا احسان میں داخل نہیں البتہ مستحب ہے اور وہ بھی اس قربانی میں جو بطور عبادت کے کی جائے جیسے عید قرباں اور مناسک حج کی واجب قربانی۔

◈ آلہ ذبح کا تیز دھار ہونا واجب ہے۔ اس کی دلیل "وَلْيُحِدَّ شَفْرَتَهُ" کے الفاظ ہیں۔

ماں کی ذکاۃ جنین کی بھی ذکاۃ ہے

1344- وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ ذَكَاةُ أُمِّهِ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "پیٹ کے بچے کا ذبح ماں ہی کا ذبح ہے۔" ❶ ❷

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :......**ذَكَاةُ**: یہ ذبح اور نحر کرنے کو کہتے ہیں اور یہ "ذَكَّى يُذَكِّيْ" کا اسم مصدر ہے۔ جس کا معنی ذبح کرنا ہے اور ذبح کو ذکاۃ اسی لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ فعل مذبوح یا منحور کو ذبح کر کے پاک کر دیتا ہے۔ وگرنہ اگر یہی جانور اپنی موت آپ مر جائے تو وہ مردار اور خبیث بن جاتا ہے۔

الْجَنِيْنِ: یہ پیٹ کے حمل کو کہتے ہیں۔ جنین کو جنین اس لیے کہتے ہیں کہ یہ چھپا ہوتا ہے۔ کیونکہ جنین کا مادہ جیم اور نون ہے اور اس کے جملہ تصاریف میں ستر کا معنی پایا جاتا ہے۔ جیسے جُنّہ ڈھال کو کہتے ہیں کیونکہ آدمی ڈھال کے ذریعے خود کو دشمن کے وار سے بچاتا اور چھپاتا ہے اور جنوں کو بھی جِنّہ اسی لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ انسانی نگاہوں سے چھپے ہوتے ہیں اور گھنے باغ کو جُنّہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ درختوں پر لگے پھلوں کو شاخوں کی کثرت کی وجہ سے چھپا لیتا ہے۔

ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ ذَكَاةُ أُمِّهِ: اس جملہ کی ترکیب میں دو قول ہیں:

(1) ایک یہ کہ "ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ" یہ مبتدا ہے اور "ذَكَاةُ أُمِّهِ" یہ خبر ہے۔

(2) جبکہ دوسری ترکیب اس کے برعکس ہے۔

ترکیب کے اس اختلاف سے لامحالہ معنی بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ یوں کہ پہلی ترکیب کی صورت میں یہ جملہ جملہ تشبیہیہ

---

❶ مسند احمد: 39/3۔ صحیح ابن حبان: 5889۔ سنن ابی داؤد: 2827۔ جامع الترمذی: 1476۔ امام نووی رحمہ اللہ نے "المجموع" (119/9) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے اور فرماتے ہیں: امام ترمذی کا قول کہ یہ حدیث حسن ہے شاید اس لیے ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو ایک اور طریق سے روایت کیا ہے اور ان طرق نے ایک دوسرے کی تقویت کر کے حدیث کو حسن بنا دیا ہو۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے (334/9) نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد جید ہے۔ اس باب میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیث مروی ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 157/4.

❷ بندہ عاجز نے حدیث کا یہ ترجمہ "القاموس الوحید: 573" سے لیا ہے۔ (نسیم)

بنے گا اور یہ بڑی بلیغ تشبیہ بنے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ جنین کا ذبح یہ ماں کے ذبح کے جیسا ہے۔ یعنی جیسے ماں کے لیے ذبح شرط ہے، اس طرح جنین کے لیے بھی ذبح شرط ہوگا۔ تب پھر یہاں حرفِ تشبیہ حذف شمار ہوگا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ظاہر یہ اسی طرف گئے ہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک اگر ماں کو ذبح کرنے کے بعد جنین مردہ نکل آیا تو وہ حرام ہوگا۔ کیونکہ اسے ماں کی طرح ذبح نہیں کیا گیا۔

جبکہ دوسری ترکیب کے اعتبار سے مطلب یہ بنے گا کہ جنین کی ذکاۃ یہ ماں کی ذکاۃ کی وجہ سے ہے۔ یعنی جب ماں کو ذبح کر دیا گیا اور وہ حلال ہوگئی تو جنین بھی ماں کی ذکاۃ کی وجہ سے حلال ہو گیا۔ تب پھر اگر جنیں مرا ہوا نکلتا ہے تو وہ حلال ہوگا اور یہ جملہ تشبیہیہ نہ کہلائے گا۔

رہا اس ترکیب پر یہ نحوی اشکال کہ "ذَكَاةُ أُمِّهِ" کے مبتداء ہونے کی صورت میں ضمیر کا مرجع ایسا مقدم ہے جو دراصل متاخر ہے، تو اس میں کوئی ضرر نہیں کیونکہ ضمیر کو ایسے مقدم کی طرف لوٹانا جائز ہے جو لفظوں میں تو مقدم ہو لیکن رتبہ میں موخر ہو۔

اب ذیل میں اس جملہ کے معنوی پہلو پر گفتگو کی جاتی ہے۔

اگر ہم اس جملہ کی پہلی ترکیب کو لیں اور اس جملہ کو جملہ تشبیہیہ قرار دیں تو یہاں دو باتیں ہیں:

(1) ایک یہ کہ اگر ہم یہ کہیں کہ جنین کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ کی طرح ہے تو حدیث بے معنی ہو کر رہ جائے گی کیونکہ ہر زندہ کی ذکاۃ دوسرے زندہ کی ذکاۃ کی طرح ہی ہوتی ہے۔ یوں یہ حدیث بے فائدہ ٹھہرے گی۔

(2) دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم حدیث کے ظاہر کو لیں تو جنین تب تک جنین ہے جب تک وہ ماں کے پیٹ میں ہے، جب وہ باہر نکل آیا تو جنین نہ رہا۔ یہ بات اس کو مقتضی ہے کہ حدیث کا معنی یہ ہو کہ جنین کو جب ماں کے پیٹ میں ذبح کر دیا جائے تو اس کا ذبح ماں کے ذبح کی طرح ہے اور ظاہر ہے کہ حدیث میں یہ معنی مراد نہیں۔ تب پھر جن کے نزدیک جنین تب ہی ذبح شمار ہوگا جب اس کو بھی اس کی ماں کی طرح ذبح ہی کیا جائے، ان کا یہ قول باطل ہے اور مراد وہ دوسری ترکیب اور دوسرا قول ہے اور یہی راجح قول ہے۔ [1]

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- صحیح قول اس باب میں وہی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے کہ ماں کی ذکاۃ یہ جنین کی بھی ذکاۃ ہے لہٰذا اگر وہ مردہ نکلا تو حلال ہوگا۔
- ماں کی ذکاۃ کے بعد جنین کے حلال ہونے کے لیے اس کے پیٹ سے نکلنے کے بعد اس کا اِنہارِ دَم شرط نہ ہوگا۔
- شریعت اسلامیہ تیسیر پر مبنی ہے۔ لہٰذا جو امر بھی شاق ہے اس میں شریعت نے تخفیف کر دی ہے۔ کیونکہ جنین تک ماں کا پیٹ پھاڑے بغیر پہنچنا دشوار ہے۔ اسی لیے ماہ کی ذکاۃ کو اس کی بھی ذکاۃ قرار دے دیا گیا۔
- یہ شریعت بے حد بلند ہے کہ اس نے ہر چھوٹی بڑی شے کو بیان کر دیا ہے۔

ذبح کے وقت تسمیہ بھول جانے کا حکم

1345-1346۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا وحید الزمان قاسمی کیرانوی حنفی دیو بندی رحمہ اللہ نے بھی اسی دوسرے معنی کو لیا ہے۔ دیکھیں: القاموس الوحید: 573۔ (نسیم)

النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((الْمُسْلِمُ يَكْفِيهِ اسْمُهُ ، فَإِنْ نَسِيَ أَنْ يُسَمِّيَ حِينَ يَذْبَحُ فَلْيُسَمِّ ثُمَّ لِيَأْكُلْ)).

ارشاد ہے: ''مسلمان کے لیے اس کا نام ہی کافی ہے۔ پس اگر وہ ذبح کرتے وقت تسمیہ بھول گیا تو (اس جانور کو کھاتے وقت) بسم اللہ پڑھ لے اور پھر اس کو کھا لے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ ، وَفِيهِ رَاوٍ فِي حِفْظِهِ ضَعْفٌ ، وَفِي إِسْنَادِهِ مُحَمَّدُ بْنُ يَزِيدَ بْنِ سِنَانٍ ، وَهُوَ صَدُوقٌ ضَعِيفُ الْحِفْظِ ، وَأَخْرَجَهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ إِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ مَوْقُوفًا عَلَيْهِ .

اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد میں ایک ایسا راوی بھی ہے جس کا حافظہ کمزور ہے اور محمد بن یزید بن سنان بھی اس اسناد میں ہے۔ (اگرچہ) وہ صدوق ہے (لیکن) کمزور حافظہ والا ہے۔ جبکہ عبدالرزاق نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح سند کے ساتھ ان پر موقوفاً روایت کیا ہے۔ ❷

وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ فِي مَرَاسِيلِهِ بِلَفْظِ: ((ذَبِيحَةُ الْمُسْلِمِ حَلَالٌ ، ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا أَوْ لَمْ يَذْكُرْ)) . وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ .

اور امام ابوداؤد کی ''المراسیل'' میں اس حدیث کا ایک شاہد ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''مسلمان کا ذبیحہ (ہر حال میں) حلال ہے چاہے اس نے اس پر بسم اللہ پڑھی ہے اور چاہے نہیں پڑھی۔'' ❸ اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔

درایت و روایت الحدیث:......آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس بارے ذکر کردہ یہ سب روایات بہت زیادہ ضعیف ہیں اور یہ ایک دوسرے کو قوی کرنے کا سبب نہیں بن سکتیں۔ پھر ان ضعیف روایات کا آیاتِ قرآنیہ سے صریح تعارض بھی ہے۔ چہ جائیکہ یہ روایات آیاتِ قرآنیہ کا مقابلہ بھی کریں۔ کیونکہ آیاتِ قرآنیہ تو تسمیہ کے وجوب کو بتلاتی ہیں جبکہ یہ روایات تسمیہ کے عدمِ وجوب کو بتلاتی ہیں۔ اس لیے ان روایات کی دلالت باطل ہوگی۔

مثلاً پہلی روایت کے ایک راوی کا حافظہ کمزور ہے۔ پھر اسی سند میں ایک اور راوی ایسا بھی ہے جو ہے تو صدوق لیکن اس کا حافظہ کمزور ہے۔ یوں پہلی روایت میں دو ضعیف راوی ہوئے۔

دوسری روایت عبدالرزاق کی ہے، اگرچہ یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح اسناد والی ہے، لیکن اس میں موقوف ہونے کی علت ہے، تب پھر یہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی رائے ہوئی اور یہ رائے کتاب وسنت کے مقتضی کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ حدیث نہ تو کتاب وسنت کے معارض آ سکتی ہے اور نہ ان کا مقابلہ ہی کر سکتی ہے۔

جبکہ تیسری روایت میں ارسال کی علت ہے اور مرسل روایت ضعیف احادیث کی ایک قسم ہے۔

غرض سند و متن میں ان باتوں کے ضعف کی بنا پر یہ بات ممکن نہیں رہی کہ یہ روایات کتاب وسنت کی صحیح وصریح نصوص

---

❶ سنن الدار قطنی: 296/4۔ سنن البیہقی: 239/9۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی ''تفسیر القرآن العظیم'' (171/2) میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو مرفوع ذکر کرنا خطا ہے اور اس میں معقل بن عبیداللہ نے خطا کی ہے ان کے صحیح مسلم کے رجال میں سے ہونے کے باوجود سعید بن منصور اور عبداللہ بن زبیر حمیدی نے سفیان بن عیینہ سے، انہوں نے عمرو سے، انہوں نے ابوشعثاء سے انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کے قول کو نقل کیا ہے۔ ان دونوں نے اس حدیث کی اسناد میں ابوشعثاء کو زائد نقل کیا اور اسے ثقہ کہا ہے اور یہ اصح اسناد ہے بیہقی کی اس پر نص ہے۔

❷ مصنف عبدالرزاق: 8535۔ عن معمر بن ایوب عن عکرمۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ یہ سند صحیح ہے۔

❸ مراسیل ابی داؤد: 378۔ عن الصلت: صلت مجہول ہے جیسا کہ علامہ ذہبی نے ''المیزان'' میں کہا ہے۔

کے معارض آسکیں۔ لہٰذا ذبیحہ پر تسمیہ واجب ہوگا۔

رہا ابن جریر کا نسیان کی وجہ سے تسمیہ کے ساقط ہونے پر اجماع کا دعویٰ، تو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا شافی جواب دے دیا ہے کہ ابن جریر یہ سمجھتے ہیں کہ ایک دو کے اختلاف کرنے سے اجماع پر زد نہیں پڑتی، لیکن ان کی یہ رائے ضعیف ہے۔ بالخصوص جبکہ اقل کی رائے کتاب وسنت کے دلائل قاطعہ کو متقاضی بھی ہو۔

تب پھر اس بارے میں سرے سے کوئی اجماع ہے ہی نہیں اور دلائل صرف اور صرف تسمیہ کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ یہی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی ہے۔

2۔ بَابُ الْأَضَاحِيُّ ......قربانیوں کا بیان

اضاحی:...... یہ اضحیۃ کی جمع ہے، یہ ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جن کو قربانی کے دنوں میں رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کیا جاتا ہے اور راجح قول کے مطابق یہ ایام چار دن ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ جو عید کا دن اور گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحجہ کے دن ہیں۔ چنانچہ ان دنوں میں رب تعالیٰ کے قرب کی غرض سے جو جانور بھی ذبح کیا جاتا ہے اس کو اضحیہ (قربانی) کہتے ہیں۔

اس قربانی کو اضحیہ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کو ضُحیٰ (چاشت) کے وقت قربان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان جانوروں کو قربان کرنے کا آغاز نمازِ عید اور اس کے خطبہ کے بعد کیا جاتا ہے اور اس وقت چاشت کا وقت ہو جاتا ہے۔

قربانی کا حکم:

اس کے فرض، واجب یا سنت ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اور سب کے پاس اس کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔ جبکہ ایک قول اس کے سنت مؤکدہ ہونے کا بھی ہے کہ آدمی اس کے ترک پر گنہگار نہ ہوگا۔ ایک قول اس کے سنت ہونے کا ہے اور قادر کے لیے اس کا ترک مکروہ ہوگا۔ [1]

لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ [2] کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی واجب ہے کیونکہ یہ شعائر اسلام میں سے ہے۔ دوسرے اس لیے بھی قربانی واجب ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے قربانی اس شخص کے لیے مشروع کی ہے جو مکہ میں نہیں تا کہ قربانی کرنے میں سب بلاد وامصار کے مسلمان برابر ہو جائیں۔ بے شک یہ رب تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نعمت ہے کہ جب اس نے ان لوگوں کو مکہ پہنچ کر قربانی کرنے سے محروم رکھا تو اس نے ان بندوں کو اپنے اپنے علاقہ میں قربانی کرنے کو مشروع کر دیا۔ تب پھر قربانی واجب اور شعائر اسلام میں سے ہے اور یہ قول بے حد قوی اور دلائل صحیحہ سے موید ہے۔

قربانی کی شروط

1347۔ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ أَقْرَنَيْنِ ، وَيُسَمِّي ، وَيُكَبِّرُ ، وَيَضَعُ رِجْلَهُ عَلَى

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ دو سیاہ و سفید رنگ کے لمبے اور مڑے ہوئے سینگوں والے مینڈھے قربان کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ ان پر تسمیہ پڑھتے اور تکبیر کہتے اور

---

[1] الكافي في فقه ابن حنبل: 475/1۔ تحفة الفقهاء: 81/3.

[2] الفتاوى: 420/21.

صِفَاحِهِمَا . (قربان کرتے وقت) ان کے منہ کے ایک رخ پر اپنا پائے مبارک رکھتے۔

وَفِي لَفْظٍ : ((ذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ)) . اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: آپ ﷺ نے ان دونوں مینڈھوں کو اپنے دست مبارک سے ذبح فرمایا۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي لَفْظٍ : ((سَمِينَيْنِ)) . اور ایک روایت میں: ''سَمِينَيْنِ'' ❷ (دوموٹے مینڈھے) کا لفظ بھی ہے۔

وَلِأَبِي عَوَانَة فِي صَحِيحِهِ : ((ثَمِينَيْنِ)) بِالْمُثَلَّثَةِ بَدَلَ السِّينِ . اور صحیح ابی عوانہ میں ''ثَمِينَيْنِ'' کا لفظ ہے جو سین کی بجائے تین نقطوں والی ''ثا'' کے ساتھ ہے۔ (اور اس کا معنی ہے ''دومہنگے مینڈھے'')۔

وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ : ((وَيَقُوْلُ : بِسْمِ اللهِ وَاللهُ أَكْبَرُ)) . اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور آپ ﷺ (مینڈھوں کو ذبح کرتے وقت) یہ دعا پڑھتے تھے: ''بِسْمِ اللهِ وَاللهُ أَكْبَرُ'' ❸ (اللہ کے نام سے اور اللہ سب سے بڑا ہے)۔

شرح :...... **بِكَبْشَيْنِ**: کبش: یہ بڑے قد کاٹھ اور بڑی عمر والے نرمینڈھے کو کہتے ہیں۔ ایسا مینڈھا خوب عمدہ اور طاقتور ہوتا ہے اور قربانی کے لیے نہایت موزوں بھی ہوتا ہے۔

أَمْلَحَيْنِ: املح: یہ سیاہ وسفید رنگت والے کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھا بے حد خوبصورت ہوتا ہے جس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

أَقْرَنَيْنِ: اقرن لمبے اور مڑے ہوئے سینگوں والے مینڈھے کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ سینگوں والا مینڈھا اس لیے پسند فرماتے تھے کیونکہ سینگوں والا مینڈھا بغیر سینگوں والے مینڈھے سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے سینگ اسکی خلقت کے کمال کو بتلاتے ہیں اور سینگ مینڈھے کی قوت وشدت کو بھی بتلاتے ہیں۔ یوں ایسا مینڈھا ظاہری قوت میں بھی شدید ہوتا ہے اور دشمن کا مقابلہ کرنے میں معنوی کی شدت کا بھی مالک ہوتا ہے۔

وَيُسَمِّي، وَيُكَبِّرُ: دوسری روایت میں اس کی تفسیر ''بِسْمِ اللهِ وَاللهُ أَكْبَرُ'' پڑھنے کے ساتھ آتی ہے۔

تسمیہ قربانی کے حلال ہونے کی شرط ہے، اس کی مفصل بحث گزر چکی ہے۔ جبکہ تکبیر مشروع ومسنون ہے اور تکبیر کا پڑھنا رب تعالیٰ کی تعظیم کے لیے ہے۔ چونکہ یہ قربانی رب تعالیٰ کے تقرب اور اس کی تعظیم کے لیے ہوتی ہے، اس لیے تکبیر پڑھنے سے تعظیم قولی اور تعظیم فعلی دونوں کے درمیان ایک تناسب پیدا ہو جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ: اس کا فعل ہمیشہ محذوف ہوتا ہے اور وہ مقام کی مناسبت سے محذوف مانا جاتا ہے چنانچہ یہاں تقدیری عبارت یہ ہوگی: ''اَذْبَحُ بِسْمِ اللّٰه'' میں اللہ کے نام سے (اس قربانی کو ذبح کرتا ہوں)۔

---

❶ صحیح البخاری: 5565۔ صحیح مسلم: 1966.

❷ صحیح ابی عوانة: 7796.

❸ صحیح مسلم: 1966.

اَللّٰهُ أَكْبَرُ: یہ مبتداء اور خبر ہے۔

وَيَضَعُ رِجْلَهُ عَلَى صِفَاحِهِمَا: یعنی آپ ﷺ ذبح کرتے وقت جب جانور کو لٹا لیتے تھے تو اپنا پائے مبارک اس کی گردن کی ایک جانب پر رکھ دیتے تھے تاکہ آپ ﷺ اس کو تڑپنے اور حرکت کرنے سے قابو میں رکھ سکیں۔ کیونکہ جانور کو اگر عین ذبح کرتے وقت تڑپنے اور حرکت کرنے سے قابو نہ کیا جائے تو مطلوب طریق پر جانور ذبح نہیں ہو پاتا۔ بلکہ بسا اوقات چھری الٹ جاتی ہے۔ اس لیے جانور کو خوب قابو میں رکھنے کے لیے اس کی گردن پر پیر رکھ دینا چاہیے۔

بلاشبہ یہ ہیئت جانور کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک مضبوط اور شدید ہیئت ہے۔

ذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ: یہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں، گویا کہ یہ "يُضَحِّي" کے معنی کی تصریح وتوضیح ہے کہ آپ ﷺ جو دو مینڈھے قربان فرمایا کرتے تھے تو ان کو اپنے دست مبارک سے ذبح کیا کرتے تھے۔ کیونکہ "یضحی" کے کلمہ میں، خود ذبح کرنے کا یا دوسرے کو ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمانے کا، دونوں باتوں کا احتمال ہے۔ تب پھر "ذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ" کے الفاظ سے دوسرا احتمال منقطع ہو گیا۔

سَمِينَيْنِ: یہ سمین کی تثنیہ ہے۔ سمین یہ "اَلسِّمْنَةُ" سے ماخوذ ہے یہ بدن میں گوشت اور چربی کی کثرت کو کہتے ہیں۔

ثَمِينَيْنِ: صحیح ابی عوانہ میں سمین کی بجائے ثمین کا لفظ آتا ہے یہ مہنگے جانور کو کہتے ہیں۔

غالب یہ ہے کہ جانور جتنے زیادہ ڈیل ڈول اور قد کاٹھ کا ہوتا ہے اتنا ہی مہنگا بھی ہوتا ہے، تب پھر لفظ ثمین یہ سمین کی تفسیر ہو گا۔

نبی کریم ﷺ قربانی کے جانور کو کیسے ذبح فرمایا کرتے تھے

1348- وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَمَرَ بِكَبْشٍ أَقْرَنَ، يَطَأُ فِي سَوَادٍ، وَيَبْرُكُ فِي سَوَادٍ، وَيَنْظُرُ فِي سَوَادٍ، فَيُأْتِي بِهِ لِيُضَحِّيَ بِهِ، فَقَالَ لَهَا: ((يَا عَائِشَةُ هَلُمِّي الْمُدْيَةَ))، ثُمَّ قَالَ: ((اِشْحَذِيهَا بِحَجَرٍ)) فَفَعَلَتْ، ثُمَّ أَخَذَهَا، وَأَخَذَ الْكَبْشَ، فَأَضْجَعَهُ، ثُمَّ ذَبَحَهُ، ثُمَّ قَالَ: ((بِسْمِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ، وَمِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ))، ثُمَّ ضَحّٰى بِهِ.

صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے مینڈھے (کو قربان کرنے) کا حکم ارشاد فرمایا جو سینگوں والا ہو، (اور) وہ کالے پیروں کے ساتھ چلتا ہو (یعنی اس کے چاروں پیروں کا اگلا حصہ سیاہ ہو) اور وہ کالے رنگ کے ساتھ بیٹھتا ہو (یعنی اس کا پیٹ بھی سیاہ رنگ کا ہو جس پر وہ بیٹھتا ہو) اور وہ کالے رنگ میں سے دیکھتا ہو (یعنی اس کی آنکھوں کے گرد کا حلقہ سیاہ رنگ کا ہو)۔ چنانچہ ایسا مینڈھا خدمت نبوی میں لایا گیا تاکہ آپ ﷺ اسے ذبح فرمائیں۔ پس آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! چھری لاؤ!'' پھر فرمایا: ''اس کو کسی پتھر پر (رگڑ کر) تیز کرو۔'' چنانچہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کیا۔ پھر آپ ﷺ نے (پہلے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے) چھری کو لیا، پھر (اس کے بعد) مینڈھے کو پکڑا، پھر (تیسرے مرحلے میں) اس کو پہلو کے بل (زمین پر) لٹایا پھر اسے ذبح کرنے لگے، پھر (ذبح کرتے

وقت) یہ دعا پڑھی: بسم اللہ...... (اللہ کے نام سے، اے اللہ! تو (اس قربانی کو) محمد ﷺ سے، اور محمد ﷺ کی آل سے اور محمد ﷺ کی امت کی طرف سے قبول فرما)۔ پھر آپ ﷺ نے اس مینڈھے کو قربان کر دیا۔ ❶

غریب الحدیث :......وَلَهُ: مراد "وَلِمُسْلِم" ہے۔ یعنی یہ روایت بھی صحیح مسلم کی ہی ہے۔ البتہ دونوں روایات میں اس قدر فرق ضرور ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی گزشتہ روایت میں "كَانَ يُضَحِّي" کے الفاظ ہیں جو استمرار کو بتلاتے ہیں جبکہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت بتلاتی ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا صرف ایک بار کیا تھا۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ گزشتہ روایت میں دو مینڈھوں کے قربان کرنے کا ذکر ہے جبکہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت بتلاتی ہے کہ وہ مینڈھا ایک ہی تھا۔

تب پھر دونوں روایات میں یوں تطبیق بتلائی جا سکتی ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ نے دو مینڈھے قربان کیے اور کبھی ایک اور کبھی خود ذبح فرمایا اور کبھی دوسروں کو ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

أَقْرَنَ: یہ لفظ بھی گزشتہ روایت کے لفظ "أَقْرَنَيْنِ" کے موافق و مطابق ہے۔

يَطَأُ فِي سَوَادٍ: "وَطِئَ يَطَأُ" کا معنی پیروں سے روندنا اور کچلنا ہے یہاں مراد چلنا ہے اور "فِي سَوَادٍ" سے مراد یہ ہے کہ اس کے چاروں پیروں کے اگلے حصہ سیاہ ہوں کہ جب وہ چل رہا ہو تو یوں لگے کہ جیسے کسی سیاہ چیز میں چل رہا ہے۔

يَبْرُكُ فِي سَوَادٍ: "بَرَكَ يَبْرُكُ" یہ اونٹ کے پیٹ کے بل بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ تب پھر سیاہی میں بیٹھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کا پیٹ سیاہ رنگ کا ہو کہ جب وہ پیٹ کے بل بیٹھا ہو تو یوں لگے کہ جیسے کسی سیاہ چیز میں بیٹھا ہے۔

يَنْظُرُ فِي سَوَادٍ: مراد یہ ہے کہ اس کی آنکھوں کے حلقے سیاہ رنگ کے ہوں جن میں سے وہ دیکھتا ہو۔

بلاشبہ ایسا مینڈھا بہت خوبصورت، نفیس اور قیمتی ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایک مینڈھا لانے کا حکم ارشاد فرمایا جب اس کی یہ صفت خود سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی ہو یا یہ کہ خود نبی کریم ﷺ نے ایسا مینڈھا لانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا۔ تو اقرب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صرف مینڈھے کا حکم ارشاد فرمایا تھا جبکہ پیش ایسا مینڈھا کیا گیا۔ کیونکہ ایسے نفیس اوصاف والے مینڈھے کا حکم دینا مشقت میں ڈالنا ہے۔ دوسرے رنگوں سے کیا فرق پڑتا ہے چاہے مینڈھا سیاہ ہو یا سفید، رب تعالیٰ تو خلوص کو دیکھتے ہیں۔ اس لیے اقرب یہی ہے کہ آپ ﷺ نے مطلق مینڈھے کا حکم ارشاد فرمایا تھا جبکہ ڈھونڈنے پر ایسا نفیس مینڈھا مل گیا جو لا کر خدمت نبوی میں پیش کر دیا گیا۔ البتہ:

فَأُتِيَ بِهِ لِيُضَحِّيَ بِهِ: کے الفاظ اس احتمال کی بظاہر تائید کرتے نظر آتے ہیں کہ ایسا مینڈھا لانے کا حکم آپ ﷺ نے ہی ارشاد فرمایا تھا۔ واللہ اعلم!

هَلُمِّي: یہ "اَعْطِيْنِي" کے معنی میں ہے۔ یہ "هَلُمَّ" کی تانیث ہے اور یہ اسم فعل ہے۔ کیونکہ ہر وہ کلمہ جو فعل کے معنی پر تو

---

❶ صحيح مسلم: 1967.

ولالت کرتا ہو پر اس میں فعل کی کوئی علامت نہ پائی جاتی ہو اسے اسم فعل کہا جاتا ہے۔ پس "هَلُمِّي" یہ واحد مونث حاضر کا امر کا صیغہ ہے۔

الْمُدْيَةَ: یہ چھری کو کہتے ہیں۔

اِشْحَذِيهَا: یہ "حَدَّدَ" (تیز کرنے) کے معنی میں ہے۔ یعنی اس چھری کو کسی پتھر کی سل پر رگڑ کر اس کی دھار تیز کر دو۔

فَفَعَلَتْ: چنانچہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا ہی کیا۔ اس زمانہ میں گھروں میں ایسی کوئی سل وغیرہ رہتی ہوگی جس پر روز مرہ کی ضروریات میں چھری کو رگڑ کر تیز کیا جاتا ہوگا۔

ثُمَّ اَخَذَهَا: یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے چھری کو ہاتھ میں لیا۔

وَاَخَذَهُ: پھر مینڈھے کو پکڑا۔

فَاَضْجَعَهُ: پھر اسے پہلو کے بل زمین پر لٹایا۔ اولیٰ یہی ہے کہ آدمی جانور کو خود پہلو کے بل لٹائے لیکن اگر اکیلے آدمی سے جانور کے بدکنے اور چھری کے الٹنے کا خدشہ ہو تو دوسرے کو بھی ساتھ ملا لے اور ایسی صورت میں آدمی پہلے جانور کو لٹائے اور چھری ہاتھ میں بعد میں لے۔

ثُمَّ ذَبَحَهُ ثُمَّ قَالَ: بِسْمِ اللّٰهِ: مذکورہ "ثُمَّ" یہاں ترتیبِ ذکری کو بتلانے کے لیے ہے نا کہ ترتیب معنوی کو بتلانے کے لیے ہے۔ کیونکہ تسمیہ بہرحال ذبح سے قبل ہے۔ (دوسری توجیہ یہ ہے کہ "ذَبَحَهُ" کا فعل یہاں شروعِ فعل کے معنی میں ہے، یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذبح کرنے لگے تو "بسم اللّٰه واللّٰه اکبر" کی دعا پڑھی: نسیم)۔ غرض پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا پڑھی پھر چھری چلائی پھر جانور کو ذبح فرمایا پھر یہ دعا پڑھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ.....: اس دعا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) تین بار آیا ہے۔ چنانچہ پہلے "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" سے مراد خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے اور "آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مومن قرابت دار مراد ہیں۔ چنانچہ ابو طالب اور ابولہب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں شمار نہ ہوں گے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں سے ہیں اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ امت ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئی ہے اور اس نے قربانی کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اقتداء کی ہے۔

ثُمَّ ضَحّٰى بِهِ: یہ بھی ترتیب ذکری ہے وگرنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی اس دعا سے قبل فرما دی تھی۔

اب ذیل میں ان دونوں احادیث کے فوائد یکجا ذکر کیے جاتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قربانی کرنا مشروع ہے، اس کی دلیل "كَانَ يُضَحِّي" کے الفاظ ہیں اور قربانی کی مشروعیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن ثلاثہ یعنی سنت قولیہ، سنت فعلیہ اور سنت اقراریہ تینوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی جانور قربان فرمایا، قربانی کرنے کا حکم بھی فرمایا اور قربانی کرنے والوں کے فعل کو برقرار بھی رکھا۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد کریم تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانور کو قربانی کے لیے انتخاب فرماتے تھے۔ اس کی دلیل "بِكَبْشَيْنِ" کا لفظ ہے کہ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو جانور قربان فرماتے تھے، دوسرے یہ کمیت میں کرم ہے اور دوسرے

آپ ﷺ قربانی کے لیے مینڈھا منتخب فرماتے تھے جو کیفیت میں کرم ہے۔

- یاد رہے کہ افضل زیادہ قربانیاں کرنا نہیں بلکہ افضل اتباع نبوی ہے۔ لہٰذا جس قدر وارد ہے اسی پر اقتصار افضل ہے۔
- نبی کریم ﷺ کی چونکہ امت تھی اس لیے آپ ﷺ کا امت کی طرف سے قربانی کرنا جائز تھا۔ لیکن چونکہ ہماری کوئی امت نہیں بلکہ ہم سب کا حکم ایک ہے اس لیے ہمارا پوری امت کی طرف سے قربانی کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا استاذ کا مثلاً اپنے تلامذہ کی طرف سے قربان کرنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ امت پر تو نبی کریم ﷺ کی اتباع واجب ہے جبکہ طلباء پر اپنے استاذ کی اتباع واجب نہیں۔
- جانور اپنی ظاہری خلقت میں جس قدر کامل ہوگا اسی قدر اس کی قربانی افضل ہوگی۔ اس کی دلیل "أَقْـــــرَنَيْـــنِ "اور "أَمْلَحَيْنِ" کے الفاظ ہیں اور سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مینڈھے کے نہایت دلچسپ اوصاف ہیں۔
- تسمیہ اور تکبیر ذبح کرتے وقت پڑھے جائیں گے۔ اس کی دلیل "يُسَمِّي وَيُكَبِّرُ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ تسمیہ جانور کے حلال ہونے کی شرط ہے اور تکبیر سنت ہے جیسا کہ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔
- قربانی کو ذبح کرتے وقت اس کی گردن پر پیر رکھنا مستحب ہے۔ کیونکہ ایسا نبی کریم ﷺ نے کیا ہے۔ دوسرے اس میں جانور کو راحت دینا بھی ہے۔ پھر یہ کہ ایسا کرنے سے جانور ذبح کرنے والے کے خوب قابو میں رہتا ہے۔
- جانور کے پیروں کو جکڑ لینا مسنون نہیں۔ کیونکہ ایسا نہ تو نبی کریم ﷺ نے خود کیا اور نہ ایسا کرنے کا حکم ہی دیا اور اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔
- قربانی کرنے والے کے لیے مناسب تو یہی ہے کہ وہ اپنی قربانی کو خود ذبح کرے۔ اس کی دلیل "ذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ اس میں کمال تعبد (کامل بندگی) کا اظہار ہے کہ یوں بندہ ذکر، فعل اور مال تینوں کے ساتھ رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرے گا۔

ذکر میں تسمیہ وتکبیر آ گئی، مال میں جانور کا خریدنا آ گیا اور فعل میں اپنے ہاتھوں سے جانور کا قربان کرنا آ گیا۔

- قربانی کا جانور فربہ ہونا افضل ہے اس کی دلیل "سَمِينَيْنِ" کا لفظ ہے۔
- رہا یہ سوال کہ دو جانور قربان کرنا افضل ہے یا ایک فربہ جانور جو دو کی قیمت کے برابر ہو، اس کو قربان کرنا افضل ہے؟ تو اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر تو لوگ آسودہ حال ہوں تو فربہ جانور کی قربانی افضل ہے، اور اگر لوگ تنگدست ہوں تو دو جانوروں کی قربانی افضل ہے۔
- مہنگے جانور کی قربانی مستحب ہے۔ اس کی دلیل: "ثَمِينَيْنِ" کا لفظ ہے۔ جو صحیح ابی عوانۃ کی روایت ہے اور اکثر یہی ہے کہ مہنگا جانور عمدہ، فربہ اور نفیس ہوتا ہے۔
- دوسرے کو حکم دینا جائز ہے اور یہ مذموم سوال کے زمرہ میں داخل نہیں بشرطیکہ دوسرے کو اس سے خوشی ہو۔
- قربانی کے جانور میں مینڈھا منتخب کرنا اور اس میں بھی سینگوں والا مینڈھا منتخب کرنا افضل ہے کیونکہ وہ اپنی خلقت میں پورا اور کامل ہوتا ہے۔
- سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکورہ مینڈھا (جس کو ہماری پنجابی زبان میں کلا مینڈھا کہتے ہیں) ڈھونڈ کر ذبح کرنا

مستحب ہوگا۔ لیکن اگر ایسا مینڈھا نہ ملے تو دوسرا مینڈھا قربان کرنا غیر افضل ہرگز نہ ہوگا کیونکہ رنگ کا بہر حال تقرب الی اللہ میں کوئی اثر نہیں۔

◈ ذبح کرنے میں دوسرے سے مدد لینا جائز ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مدد لی تھی۔

◈ مناسب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت چھری خوب تیز ہو، چاہے اسے کسی بھی ذریعے سے تیز کیا جائے۔ کیونکہ اس میں ذبیحہ کو راحت دینا ہے۔ کیونکہ آلہ ذبح جس قدر تیز ہوگا جانور کی جان اسی قدر تیزی سے نکلے گی۔

◈ البتہ چھری وغیرہ کو جانور کی نگاہوں سے چھپا کر تیز کیا جائے تا کہ وہ بے چین نہ ہو۔

◈ بھیڑ کو پہلو کے بل لٹانا مسنون ہے۔ یہی حکم بکری اور گائے بیل کا بھی ہے۔ البتہ اونٹ کو حالت قیام میں نحر کیا جائے گا اور بھیڑ بکری وغیرہ کو لٹانے میں دائیں یا بائیں پہلو میں سے جس میں سہولت ہو، اس پہلو میں لٹا لیا جائے۔

◈ تسمیہ اور تکبیر میں سے صرف تسمیہ پر اکتفاء کر کے بھی جانور ذبح کرنا جائز ہے کیونکہ تسمیہ واجب اور حلت کی شرط ہے جبکہ تکبیر کہنا مسنون ہے۔

◈ قربانی کی قبولیت کی دعا کرنا مسنون ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کی قبولیت کی دعا فرمائی ہے۔ البتہ ایسا ہر عمل میں کرنا مشروع نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے ہر نماز کے بعد قبولیت کی دعا مانگنا منقول نہیں۔ بلکہ آپ ﷺ ہر نماز کے بعد استغفار پڑھا کرتے تھے اور "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلام وَ مِنْكَ السَّلام تَبَارَكْتَ يَا ذُاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَام" والی دعا پڑھتے تھے۔ اس لیے قبولیت کی دعا مانگنے کو اپنے منصوص مورد تک ہی رکھا جائے گا۔

◈ نبی کریم ﷺ کا اپنی امت پر جود و کرم کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ سے اس بات کی دعا مانگی کہ رب تعالیٰ آپ ﷺ کی امت سے اس کے عمل کو قبول فرمائے۔

قربانی کا حکم

1349۔ وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جسے (قربانی کرنے کی) وسعت (و کشادگی) حاصل ہو اور وہ پھر بھی قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے پاس بھی نہ پھٹکے۔" ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ لٰكِنْ رَجَّحَ الْأَئِمَّةُ غَيْرُهُ وَقْفَهُ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کے علاوہ دوسرے

❶ مسند احمد: 321/2۔ سنن ابن ماجه: 3123۔ المستدرك للحاكم: 258/4۔ مرفوعًا وموقوفًا۔ امام حاکم موقوف روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس حدیث کو عبداللہ بن وہب نے موقوف روایت کیا ہے البتہ ثقہ راوی کی زیادتی حدیث میں مقبول ہوتی ہے اور ابو عبدالرحمن المقری تو ثقہ سے بھی بڑھ کر راوی ہے اور اس روایت کے رجال ثقہ ہیں۔ البتہ موقوف زیادہ درست لگتی ہے۔ یہ امام طحاوی کا قول ہے۔ جبکہ ابن عبدالبر نے بھی "التمهيد" (190/23) میں اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح کہا ہے۔ علامہ منذری رحمہ اللہ نے "الترغيب والترهيب" (100/2) میں اسی قول کو لیا ہے۔

ائمہ نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غريب الحديث:.......مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ: سعت سے مراد قربانی کرنے کی قدرت ہے۔ مذکورہ "مَنْ" شرطیہ اور مابعد مذکورہ فعل فعلِ شرط ہے۔

فَلَا يَقْرَبَنَّ: یہ "فا" جزائیہ ہے اور مذکورہ جملہ جواب شرط ہے۔ یاد رہے کہ مذکورہ "فا" کا لانا واجب ہے کیونکہ جب جوابِ شرط امر یا نہی ہو تو اس پر "فا" کا لانا واجب ہوتا ہے۔

مذکورہ "لا" ناہیہ ہے اور مابعد مذکور فعل نہی کا فعل ہے اور یہاں نہی میں اصل تحریم ہے جو ایسے نمازی کو عیدگاہ کے قریب جانے سے منع کرتی ہے۔ کیونکہ جسے وسعت حاصل تھی اور اس نے نماز پڑھ کر قربانی نہ کی تو اس نے رب تعالیٰ کے اس ارشاد کی مخالفت کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ٥﴾ (الکوثر: 2)

''پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔''

کہ یہاں رب تعالیٰ نے نماز کو قربانی کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے۔

روايت الحديث:......اس حدیث کے موقوف یا مرفوع ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ اب ائمہ محدثین کے نزدیک راجح اس روایت کا موقوف ہونا ہے جبکہ امام حاکم نے مرفوع روایت کو صحیح کہا ہے۔ اس بارے حضرات محدثین کا یہ قاعدہ معروف ہے کہ: اگر کسی روایت کے مرفوع یا موقوف ہونے میں اختلاف ہو اور مرفوع روایت کرنے والا راوی ثقہ ہو تو مرفوع روایت کو لیا جائے گا۔

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ علماء کا کلام علی الاطلاق نہیں ہوا کرتا کہ وہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ضرور ہی مسلم ہوگا۔ تب پھر ایک قاعدہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''جب مثبت (کسی شے کو ثابت کرنے والا) اور نافی (کسی شے کی نفی کرنے والا) میں تعارض ہو جائے تو مثبت کے قول کو لیا جاتا ہے'' کیونکہ مثبت ایک زائد شے کو ثابت کر رہا ہوتا ہے۔ رہا نافی تو ممکن ہے کہ وہ بھول گیا ہو یا وہ جانتا ہی نہ ہو۔

بہر حال بسا اوقات علماء کا کلام علی الاطلاق نہیں ہوتا۔ سو یہاں رافع (حدیث کو مرفوع بیان کرنے والا) اور واقف (حدیث کو موقوف بیان کرنے والا) میں تعارض واقع ہے تو اصل تو یہ ہے کہ ہم یہاں رافع کو مقدم کریں کیونکہ ایک تو رافع واقف کے مناقض نہیں ہوتا دوسرے وہ شے زائد کو ثابت کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک قرینہ بتلاتا ہے کہ موقوف روایت مقدم ہے، اور وہ امام ابن حجر رحمہ اللہ کا موازنہ ومقارنہ ہے کہ ائمہ محدثین نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح کہا ہے جبکہ اس کو مرفوع کہنے والے ایک اکیلے امام حاکم ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ ائمہ بہر حال اکیلے امام حاکم سے قوی ہیں۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے والی اور امیر تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے نزدیک قربانی واجب اور مؤکد رہی ہو اور ان کے نزدیک قربانی نہ کرنے والے کو عیدگاہ کے قریب نہ آنا چاہیے۔ لہٰذا انہوں نے ایسے شخص کو بطور تعزیر کے عیدگاہ آنے سے روک دیا ہو۔

غرض یہ دونوں قرینے اس بات کی دلیل ہیں کہ اس روایت کا موقوف ہونا راجح ہے، دوسرے ائمہ محدثین نے بھی اس کے موقوف ہونے کو راجح کہا ہے، پھر اکیلے امام حاکم کی تصحیح بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت موقوف ہی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث قربانی کے واجب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ قربانی نہ کرنے والے کی یہ تعزیر کہ وہ مسجد کے قریب نہ آئے اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ تعزیر ہمیشہ ترک واجب یا کسی حرام کے ارتکاب پر ہی ہوتی ہے۔

اور جن کے نزدیک قربانی واجب نہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ لہٰذا نہ تو یہ حدیث حجت ہے اور نہ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔

لیکن امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک قربانی واجب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

◈ جسے قربانی میسر نہ ہو اس پر واجب بھی نہیں کیونکہ شریعت نے وسعت سے باہر کوئی حکم نہیں دیا۔

◈ طاعت سے محروم رکھ کر بھی تعزیر کی جاسکتی ہے۔ اس کی دلیل: "فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا" کے الفاظ ہیں۔ تعزیر کا مکمل بیان گزشتہ میں گزر چکا ہے۔

قربانی کا وقت

1350- وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ رضي الله عنه قَالَ: شَهِدْتُ الْأَضْحَى مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ، فَلَمَّا قَضَى صَلَاتَهُ بِالنَّاسِ نَظَرَ إِلَى غَنَمٍ قَدْ ذُبِحَتْ ، فَقَالَ: ((مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَلْيَذْبَحْ شَاةً مَكَانَهَا ، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ ذَبَحَ فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ)) .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں (ایک دفعہ) عید قرباں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا۔ پس جب آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھا لی تو ان بکریوں کی طرف نگاہ کی جو ذبح کی جا چکی تھیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نماز سے قبل قربانی کی ہے وہ اس کی جگہ ایک اور بکری قربان کرے، اور جس نے (ابھی تک) قربانی نہیں کی تو وہ قربانی کرے اور وہ اللہ کے نام پر (اللہ کا نام لے کر) قربانی کرے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:...... مذکورہ حدیث کا مضمون اور اس کی لغات واضح ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عیدگاہ کے آس پاس قربانیوں کو ذبح کیا جاسکتا ہے۔ تاکہ قربانی والوں کی نماز زمان اور مکان دونوں اعتبار سے قربانی کے ساتھ مل جائے۔ دوسرے اس میں ایک شعیرہ کا اظہار بھی ہے۔ افسوس کہ ایک زمانہ ہوا اہل اسلام اس سنت کو چھوڑ چکے ہیں۔

لیکن فی زمانہ اگر قربانیوں کو عیدگاہ لے جانے میں نمازیوں کو تشویش ہوتی ہو، پھر خون اور دیگر آلائشوں سے نمازیوں کو اذیت بھی ہوتی ہو جبکہ جانور کی بھیڑ ہو جانے سے جانوروں کے گڈمڈ ہو جانے کا اور اس کے نتیجہ میں باہمی نزاع کا بھی اندیشہ ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ: ''مفاسد کو دور کرنا یہ مصالح کے حاصل کرنے سے اولیٰ ہے۔'' تب پھر قربانیوں کا اپنے

---

[1] صحيح البخاري: 5562- صحيح مسلم: 1960 .

اپنے محل میں کرنا ہی بہتر ہوگا۔

◈ نمازِ عید سے پہلے کی جانے والی قربانی شرعی قربانی نہ ہوگی اور ایسا کرنے والے کو اس کی جگہ دوسری قربانی کرنی ہوگی، اس کی دلیل: "مَكَانَهَا" کے الفاظ ہیں اور یہ بدل لانا واجب ہے اس کی دلیل: "فَلْيَذْبَحْ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ مذکورہ لام امر کا ہے اور امر اصل میں وجوب کے لیے ہی ہوتا ہے۔

اور یہ الفاظ اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ دوسری قربانی پہلی کے مثل ہو، اور اگر اس سے بہتر ہو تو خوب!!!

◈ معلوم ہوا کہ قبل از وقت کی جانے والی عبادت ''وقتیہ عبادت'' کی طرف سے جائز اور کافی نہیں ہوتی چاہے وہ عبادت بے خبری اور لاعلمی میں ہی کیوں نہ کی گئی ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نماز سے قبل قربانی کرنے والوں سے یہ دریافت نہ فرمایا تھا کہ آیا انہیں اس مسئلہ کا علم تھا یا نہیں۔

◈ ذبیحہ پر تسمیہ اس کی حلت کے لیے شرط ہے جیسا کہ یہ مسئلہ مفصل بیان ہو چکا ہے اور یہاں اس کی دلیل "فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ قربانی کو اپنے وقت پر کرنا واجب ہے اور یہ وقت نمازِ عید ادا کر لینے کے بعد سے ہے۔

قربانی کے جانور کے اُن عیوب کا بیان جو قربانی میں مانع ہوتے ہیں

1351۔ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ ﷛ قَالَ: قَامَ فِينَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: ((أَرْبَعٌ لَا تَجُوزُ فِي الضَّحَايَا: الْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا، وَالْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا، وَالْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ضِلَعُهَا، وَالْكَبِيرَةُ الَّتِي لَا تُنْقِي)).

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور (ہمیں قربانی کے جانور کے مسائل بیان کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''چار (قسم کے) جانور ہیں جو قربانیوں میں (ذبح کرنے) جائز نہیں ہیں: (1) کانا جانور جس کا کانا پن واضح ہو۔ (2) بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو۔ (3) لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن واضح ہو۔ (4) اور اتنا بوڑھا جانور کہ اس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، جبکہ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**لَا تَجُوزُ**: یہاں سے امام موصوف ان جانوروں کا بیان شروع کر رہے ہیں جن کو قربانی میں پیش کرنے سے بچنا واجب ہے۔

حدیث کے ظاہر الفاظ کا مقتضی یہی ہے کہ یہ "لَا تَحِلُّ" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ احتمال اس بات کا بھی ہے کہ یہ "لا

---

[1] مسند احمد: 284/4۔ سنن ابی داؤد: 2802۔ جامع الترمذی: 1497۔ سنن النسائی: 215/7۔ سنن ابن ماجه: 3144۔ صحیح ابن حبان: 5919۔ المستدرك للحاکم: 460/1۔ حاکم کہتے ہیں: اس حدیث کے متفرق صحیح شواہد ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیث براء رضی اللہ عنہ صحیح ہے اہل سنن نے حسن اسانید کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: یہ حدیث کیا ہی عمدہ ہے۔ دیکھیں: المجموع: 293/8.

تجزی" (کافی نہ ہونے) کے معنی میں ہو۔لیکن حلت کی نفی حدیث کے ظاہر کے موافق ومطابق ہے۔پھر حدیث کا معنی بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ عیب والے جانور کو رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کی بارگاہ میں پیش کرنا یہ رب تعالیٰ کے ساتھ مذاق کرنے کے مترادف ہے۔تب پھر اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔

الْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا: عوراء: کانا جانور،جس کی آنکھ میں کانے پن کا عیب ہو،اور مطلق کانا پن مراد نہیں بلکہ واضح کانا پن مراد ہے۔جس کا علم جانور کے چلنے سے ہوگا کیونکہ کانا جانور صحیح نظر والے جانور کی طرح مستقیم ہو کر نہیں چلتا۔وہ اپنی نگاہ کو سامنے ٹکانے کے لیے گردن کو قدرے جھکا کر چلتا ہے۔

علماء نے کانے پن کی پہچان کی ایک دوسری صورت یہ بھی بیان کی ہے کہ اس کی آنکھ کا ڈھیلا یا تو بہت ابھرا ہوگا یا بالکل دھنسا ہوگا کہ ایسا جانور بھی بالکل واضح کانا ہوتا ہے۔

الْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا: یہاں بھی مطلق مرض مراد نہیں تاکہ امت مشقت میں نہ جا پڑے کیونکہ بکریاں وغیرہ بیمار ہوتی رہتی ہیں۔بلکہ سخت اور شدید مرض مراد ہے۔جس کی پہچان متعدد طریق سے ہوتی ہے:

(1) جانور کا بدن شدید تپ رہا ہو اور اس کے چھونے سے ہی معلوم ہو جائے کہ جانور سخت بیمار ہے۔

(2) جانور کے لاغر ہونے کے ذریعے سے کہ اعضاء کے سلامت ہونے کے باوجود جم کر چل نہ سکتا ہو۔

(3) کھانا کم کھانے لگے جو جانور کے بیمار ہونے کی دلیل ہے۔

(4) بدن پر کسی بیماری کے واضح نشانات کے پائے جانے کے ذریعے سے،جیسے بدن خارشی ہو جائے،پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں،یا گلنے سڑنے لگے وغیرہ وغیرہ۔

غرض جانور کے بیمار ہونے کی اور بھی متعدد علامات ہیں،مراد یہ کہ وہ ایسا بیمار ہو کہ اس کی بیماری صاف معلوم ہوتی ہو۔

الْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ضِلَعُهَا: وہ لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن صاف معلوم ہو،ضلع یہ ٹیڑھے پن اور لنگڑے پن کو کہتے ہیں۔ پھر یہ لنگڑا پن چاہے ایک پیر میں ہو یا چاہے چاروں پیروں میں ہو،دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے۔

اور لنگڑے پن سے صرف یہی مراد نہیں کہ جب وہ جانور چلتا ہو تو ڈولتا ہو۔بلکہ علماء نے اس کی یہ نشانی بیان کی ہے کہ ایسا جانور صحیح جانوروں کے ساتھ مل کر ان کی طرح نہ چل سکتا ہو،بلکہ ہمیشہ ان سے پیچھے رہتا ہو۔حتیٰ کہ چوکا دینے کے باوجود بھی وہ چلنے میں صحیح جانوروں کا ساتھ نہ دے سکتا ہو۔البتہ جو جانور قدرے ڈگمگا کر تو چلتا ہو لیکن چوکا دینے پر صحیح جانوروں کے ساتھ جا ملتا ہو تو یہ لنگڑا تو ضرور ہے لیکن "بین" لنگڑے پن والا نہیں کہ جس کی قربانی جائز نہ ہوتی ہو۔

الْكَبِيرَةُ الَّتِي لَا تُنْقِي: مراد اتنی بڑی عمر کا جانور ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی ہڈیوں کا گودا بھی ختم ہو گیا ہو۔ البتہ اس بات کا علم جانور کو ذبح کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔لہٰذا اگر تو جانور کو ذبح کرنے اور اس کی ہڈیاں توڑنے کے بعد اس کی ہڈیوں سے گودا نہ نکلا تو اس کی قربانی جائز نہ ہوگی اور اگر اس کی ہڈیوں میں گودا نکل آیا تو اس کی قربانی جائز ٹھہرے گی۔

تب پھر "عمر رسیدہ" ہونے کی شرط بھی ایک اضافی شرط ہوگی اور قربانی کے جواز یا عدم جواز کا مدار ہڈیوں کے گودے کا عدم یا وجود ہوگا۔لہٰذا اگر کسی جوان جانور کی ہڈیوں سے بھی کسی بیماری کی وجہ سے گودا ختم ہو گیا تو قربانی اس کی بھی جائز نہ ہوگی۔

تنبیہ:......یاد رہے کہ یہاں چار کے عدد کا حصر مراد ہے لہٰذا ان چار صفات والے جانوروں کے سوا جانوروں کی قربانی

جائز ہوگی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہ حصر خطاب میں اور سوال کے جواب میں فرمایا ہے۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جن جانوروں کی قربانی جائز نہیں وہ ان چار کے عدد میں محصور ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ امت تک شریعت کے احکامات کو پہنچا دینے کے بے حد شائق تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان احکام کو خطبہ میں ارشاد فرمایا۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ نے ان جانوروں کو حصر کے ساتھ بیان فرمایا جن کی قربانی جائز نہیں کیونکہ آدمی کلامِ محصور کو زیادہ توجہ سے سنتا بھی ہے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ یاد بھی رکھتا ہے۔
- جس جانور کا کانا پن واضح ہو اس کی قربانی جائز نہیں اور جب کانے جانور کی قربانی جائز نہیں تو اندھے جانور کی قربانی تو بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی۔
- شدید مرض والے جانور کی قربانی بھی جائز نہیں۔ البتہ جو جانور ہلکا پھلکا بیمار ہو اس کی قربانی کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی مناسب یہ ہے کہ پہلے حیوانات کے کسی معالج (وٹرنری ڈاکٹر) سے اس جانور کا طبی معائنہ کرا لیا جائے۔ پس اگر تو اس کا مرض موذی نہیں تو وہ جانور قربان کر دے وگرنہ نہیں۔
- جس جانور کو دردِ زِہ شروع ہو گیا ہو، جب تک وہ بچہ جن دے اس کو قربانی میں ذبح نہ کرے۔ کیونکہ ایسا جانور موت کے خطرے میں ہوتا ہے اور بسا اوقات بچہ جنتے ہوئے مر بھی جاتا ہے۔
- جس جانور کا بدہضمی کی وجہ سے پیٹ پھولا ہو جب تک وہ تندرست نہیں ہو جاتا اس کو بھی قربانی میں ذبح نہ کرے کیونکہ ایسا جانور بھی اس حال میں موت کے خطرے میں ہوتا ہے۔ اس لیے جب تک ایسا جانور تندرست نہیں ہو جاتا اس کی قربانی نہ کرے۔
- جس جانور کا لنگڑا پن واضح ہو اس کی بھی قربانی جائز نہیں۔ یہ لنگڑا پن کتنا ہو تو اس کی تفصیل غریب الحدیث کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔
- اور جس جانور کا ہاتھ یا پیر کٹا ہو اس کی قربانی بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی۔
- اسی طرح اپاہج جانور کی قربانی بھی جائز نہ ہوگی اپاہج اس جانور کو کہتے ہیں جو چل نہ سکتا ہو۔
- ایسا عمر رسیدہ جانور جس کی ہڈیوں کا گودا ختم ہو چکا ہو اس کی بھی قربانی جائز نہیں۔ البتہ اگر اس کی ہڈیوں میں گودا ہو تو اس کی قربانی جائز ہوگی چاہے اس کی عمر کتنی ہی زیادہ ہو، اسی طرح جس جانور کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو وہ چاہے جتنا بھی کم عمر ہو اس کی بھی قربانی جائز نہ ہوگی۔
- رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کی بارگاہ میں نکمی، ناکارہ، بے کار اور عیب والی شے پیش کرنا از حد غیر مناسب ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ (البقرة: 267)

''اور اس میں سے گندی چیز کا ارادہ نہ کرو، جسے تم خرچ کرتے ہو، حالانکہ تم اسے کسی صورت لینے والے نہیں، مگر

یہ کہ اس کے بارے میں آنکھیں بند کرلو۔''

یہاں خبیث سے ردّی اور نکمی شے مراد ہے۔ بلکہ رب تعالیٰ کی جناب میں اپنی سب سے عمدہ شے کو پیش کیا جائے کہ یہ ایمان کے کمال کا ذریعہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (آلِ عمران : 92)

''تم پوری نیکی ہرگز حاصل نہیں کرو گے، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔''

غرض یہ حدیث بتلاتی ہے کہ قربانی کے لیے ہر قسم کے عیب سے سلامت اور صحیح جانور کو ذبح کیا جائے۔

قربانی میں مُسِنّہ یعنی دوندے کو ذبح کرنے کا حکم

1352۔ وَعَنْ جَابِرٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَذْبَحُوْا إِلَّا مُسِنَّةً ، إِلَّا إِنْ يَعْسُرَ عَلَيْكُمْ ، فَتَذْبَحُوْا جَذَعَةً مِنَ الضَّأْنِ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(قربانی میں) صرف دوندے جانور کو ہی ذبح کرو، سوائے اس کے کہ تم پر (دوندے کا حصول) دشوار ہو جائے تو بھیڑ کے چھ ماہ کے بچہ کو ذبح کرلو۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... **لَا تَذْبَحُوا**: یہ نہی ہے لیکن یہ نہی مطلق نہیں بلکہ مراد قربانی میں غیر دوندے جانور کے ذبح کرنے کی ممانعت ہے۔

إِلَّا مُسِنَّةً: مُسِنّہ: وہ جانور جس کے سامنے کے دانت نکل آئے ہوں اور یہ ہر چوپائے میں جدا جدا ہے۔ چنانچہ بھیڑ بکری میں مسنہ وہ ہوتا ہے جس کی عمر ایک سال ہوگئی ہو، گائے بھینس میں مسنہ وہ ہے جو دو سال کا ہوگیا ہو جبکہ اونٹ میں مسنہ وہ ہے جو پانچ سال کا ہوگیا۔ پس اس سے کم عمر کے جانور قربانی میں ذبح کرنے جائز نہ ہوں گے۔

إِلَّا أَنْ يَعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوا جَذَعَةً مِنَ الضَّأْنِ: یہ مذکورہ حکم سے استثناء ہے اور یہ استثناء صرف بھیڑ کے ساتھ ہی خاص ہے۔ الضان: یہ بھیڑ کو کہتے ہیں اور جذعہ بھیڑ کے اس بچے کو کہتے ہیں جو پورے چھ ماہ کا ہوگیا ہو۔

غرض مذکورہ حکم سے اس بات کو مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ اگر کسی کو مسنہ یعنی دوندا جانور نہ ملے تو وہ صرف بھیڑ میں سے چھ ماہ کا جانور لے کر قربانی میں ذبح کرسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے ایسے جانور کی مختلف علامات متعین کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن اصل مدار عمر ہی ہے۔ لہٰذا اگر خاص بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ میسر آجائے تو اسے قربان کرسکتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کا جانور مسنہ یا اس سے زیادہ عمر کا ہو۔ اس کی دلیل: ''لَا تَذْبَحُوا إِلَّا مُسِنَّةً'' کے الفاظ ہیں اور ہر چوپائے میں مسنہ مختلف عمر کا ہے جیسا کہ بیان ہوا۔
- بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اسے قربانی میں ذبح کرسکتے ہیں، لیکن یہ حکم عدمِ تیسیر (سہولت نہ ہونے) اور حالتِ تعسیر (تنگی کی حالت) کے ساتھ مشروط ہے اور یہ شرط قربانی کے کافی اور جائز ہونے کی ہے نہ کہ قربانی کے کامل

[1] صحیح مسلم: 1963.

ہونے کی شرط ہے۔ یعنی اگر بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ بھی قربان کر دیا تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بھیڑ کے چھ ماہ کے بچہ کی قربانی کو مطلق مباح کیا ہے اور اسے تعسیر کے ساتھ مقید نہیں کیا۔ تب پھر "إِلَّا أَنْ يَعْسُرَ عَلَيْكُمْ" یہ افضل واکمل کی شرط ہوگی یعنی ایک سال کی بھیڑ یہ چھ ماہ کی بھیڑ سے افضل ہے۔

قربانی کے جانور کے چند مزید عیوب کا بیان

1353۔ وَعَنْ عَلِيٍّ ﷺ قَالَ: ((أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْأُذُنَ ، وَلَا نُضَحِّيَ بِعَوْرَاءَ ، وَلَا مُقَابَلَةٍ ، وَلَا مُدَابَرَةٍ ، وَلَا خَرْقَاءَ ، وَلَا ثَرْمَاءَ)) .

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس بات کا حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھ اور کان کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا کریں اور (یہ کہ) ہم نہ تو کانے جانور کو، اور نہ جس کا کان سامنے سے کٹا ہو اور نہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہو اور نہ جس کے کان میں (کہیں سے بھی) سوراخ ہو، اور نہ اس جانور کو ہی ذبح کریں جس کے دانت ٹوٹے ہوں۔ ❶

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ .

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، جبکہ امام ترمذی، امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... أَمَرَنَا: امر سے یہاں طلبِ فعل مراد ہے اور بظاہر یہ امر استحباب کے لیے ہے۔

أَنْ نَسْتَشْرِفَ: استشراف: یہ کسی شے کے حسن اور خوبی کے طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ تب پھر کان اور آنکھ کے استشراف کا معنی یہ ہوگا کہ ان کی خوبی تلاش کرو۔ یعنی قربانی کا جانور قربان کرتے وقت اس کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال لیا جائے کہ کہیں ان میں کوئی عیب نہ ہو۔

بِعَوْرَاءَ: اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ جس جانور کا کانا پن عیاں ہو اس کو قربان نہ کیا جائے۔

وَلَا مُقَابَلَةٍ: مقابلہ، مدابرہ، خرقاء، یہ تینوں کان میں پائے جانے والے عیوب ہیں۔ مقابلہ اس عیب کو کہتے ہیں جو سامنے سے نظر آئے، یہ کان کی اس پھٹن کو کہتے ہیں جو عرضاً ہو اور سامنے سے ہو۔

وَلَا مُدَابَرَةٍ: یہ کان کی اس پھٹن کو کہتے ہیں جو عرضاً اور کان کے پچھلے حصہ میں ہو۔

وَلَا خَرْقَاءَ: مراد وہ جانور یا خاص بکری ہے جس کے کان کے کسی بھی حصہ میں گول سوراخ ہو یا جس کے کان کا بیچ کا حصہ کنارے کے پاس سے چرا ہو۔

وَلَا ثَرْمَاءَ: ثرماء یہ اثرم کی تانیث ہے۔ اثرم یہ ٹوٹے دانت والے جانور کو کہتے ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اس روایت کا یہ لفظ غیر محفوظ ہو کیونکہ دانت کے ٹوٹنے کا جانور کے معیوب ہونے سے بظاہر کوئی تعلق نہیں۔

مضمون حدیث:...... اس حدیث میں اس بات کی بے حد بلیغ ترغیب دی گئی ہے کہ قربانی کا جانور خوب دیکھ

---

❶ مسند احمد: 108/1۔ سنن ابی داؤد: 2804۔ جامع الترمذی: 1498۔ سنن النسائی: 216/7۔ سنن ابن ماجہ: 3142۔ صحیح ابن حبان: 5920۔ المستدرك للحاکم: 249/4۔ ابن عبدالبر نے "التمہید" (173/20) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

بھال کرلیا جائے۔ بالخصوص ان جگہوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے جہاں موجود عیب عموماً سرسری نگاہ ڈالنے سے نظر نہیں آیا کرتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور کے اعضاء کو خوب ٹٹول لیا جائے حتیٰ کہ اس کے چھوٹے اعضاء کو بھی خوب ٹٹول لیا جائے جیسے کان اور آنکھ وغیرہ۔ تاکہ اچھا اور خوبصورت جانور انتخاب کیا جاسکے۔

رہا یہ سوال کہ یہ حکم بطور وجوب کے ہے یا استحباب کے؟ تو صحیح یہ ہے کہ یہ حکم بطور استحباب کے ہے۔ کیونکہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان چار جانوروں کا ذکر آگیا ہے جن کی قربانی منع ہے، تب پھر مذکورہ عیوب سے اجتناب کا حکم علی سبیل الکمال ہے۔

لہٰذا اگر کسی بکری کا کان آگے یا پیچھے سے، یا اوپر نیچے سے معمولی سا کٹا ہو یا اس میں سوراخ ہو تو بہتر تو یہ ہے کہ ایسا جانور قربان نہ کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی ایسے جانور کی قربانی کر دیتا ہے تو یہ قربانی مکروہ ہوگی۔

◈ اور "ثَرْمَاءَ" کا لفظ صحیح ہونے کی شرط پر ٹوٹے دانتوں والے جانور کی قربانی بھی مکروہ اور غیر افضل ہوگی۔

◈ جس جانور کے سارے سینگ ٹوٹے ہوں اس کی قربانی درست ہے کیونکہ سینگ کھائے نہیں جاتے اور ان کے ٹوٹنے کا جانور کو کوئی ضرر نہیں۔ البتہ اگر سینگ ٹوٹنے سے جانور کا سر زخمی ہوگیا ہو اور وہ بیمار پڑ گیا ہو تو اس کی قربانی جائز نہ ہوگی کیونکہ ایسا جانور "اَلْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا" کی قبیل میں داخل ہے۔ جس کی قربانی منع ہوتی ہے۔

◈ اگرچہ روایات میں دم کٹے جانور کا ذکر اور اس کا حکم نہیں ملتا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ اس کی قربانی مکروہ ہوگی جیسے کن کٹے کی قربانی مکروہ ہوتی ہے۔

◈ اور اگر جانور کی چکتی کٹی ہو تو اس کی قربانی جائز نہ ہوگی کیونکہ چکتی کا گوشت مطلوب و مقصود ہوتا ہے اور اسے کھایا جاتا ہے۔ البتہ جس جانور کی چکتی خلقۃً نہ ہو جیسے بکری اور بھیڑ، اس کی قربانی جائز ہے۔

خلاصہ کلام:......خلاصہ یہ ہے کہ قربانی کے جائز ہونے کی چار شرطیں ہیں:

(1) ایک یہ کہ وہ چوپائے میں سے ہو۔ لہٰذا مرغی وغیرہ کی قربانی جائز نہ ہوگی کیونکہ وہ دو پیروں والا جانور ہے۔

(2) دوسری یہ کہ قربانی والا جانور مطلوبہ شرعی عمر کو پہنچا ہو۔

(3) تیسری یہ کہ وہ قربانی میں مانع عیوب سے سالم ہو۔

(4) اور چوتھی یہ کہ وہ قربانی مشروع وقت میں ہو جس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

قصاب کی اجرت قربانی کے گوشت سے نہ دی جائے

1354۔ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((أَمَرَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ أَقُوْمَ عَلَى بُدْنِهِ، وَأَنْ أُقَسِّمَ لُحُوْمَهَا وَجُلُوْدَهَا وَجِلَالَهَا عَلَى الْمَسَاكِيْنِ، وَلَا أُعْطِيَ فِيْ جِزَارَتِهَا مِنْهَا شَيْئًا)).

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے مجھے اس بات کا حکم ارشاد فرمایا کہ میں آپ ﷺ کے قربانی کے اونٹوں (کے قربان کرنے وغیرہ کے انتظام) کو سنبھالوں اور یہ کہ میں ان کے گوشتوں اور کھالوں اور جھولوں کو مسکینوں میں تقسیم کر دوں اور یہ کہ میں ان کے ذبح

کرنے کی اجرت میں (قصاب کو) ان کے گوشت (وغیرہ) میں
سے کچھ بھی نہ دوں، (بلکہ قصاب کی اجرت الگ سے دوں)۔ ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......عَلٰى بُدْنِهٖ: ''بُدْن'': یہ بَدَنَۃٌ کی جمع ہے۔ یہ قربانی کی غرض سے بیت اللہ روانہ کیے جانے والے اونٹوں کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹ ساتھ لے کر روانہ ہوئے تھے۔ یہ انہی سو اونٹوں کی بابت حدیث ہے۔ جن میں سے تریسٹھ اونٹوں کو آپ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے نحر فرمایا تھا۔ جبکہ باقی کے سینتیس (37) اونٹ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرما دیے تھے کہ ان کے قربان کرنے کا انتظام و انصرام اب وہ کریں گے۔

یاد رہے کہ آپ ﷺ پر ان سو اونٹوں میں سے صرف ایک اونٹ کی ہی قربانی واجب تھی۔ کیونکہ آپ ﷺ قارن تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ سو اونٹ لے کر چلے تھے۔ بلاشبہ یہ آپ ﷺ کے جود و کرم میں سے تھا اور آپ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ کریم تھے۔

لُحُومَهَا وَجُلُودَهَا وَجِلَالَهَا: نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تین کام ذمے لگائے تھے:

(1) ایک یہ کہ باقی کے سینتیس اونٹوں کی قربانی کا انتظام کریں۔
(2) دوسرا یہ کہ ان کے گوشت، کھالیں اور جھول مسکینوں میں تقسیم کر دیں۔
(3) تیسرا یہ کہ قصاب کی اجرت قربانی کے گوشت میں سے نہ دی جائے۔

اب گوشت اور کھال تو واضح ہے۔ رہے جِلَال یعنی جھول، تو جِلَال یہ جَــلٌّ کی جمع ہے یہ اس کپڑے وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو اونٹ کو گرمی سردی سے بچانے کے لیے اس کی پیٹھ پر ڈالا جاتا ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے قربانی کے جانور سے متعلق ہر چیز کو صدقہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا۔

البتہ آپ ﷺ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ قربانی کے ہر اونٹ سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے کر سب کو ایک ہنڈیا میں ڈال کر پکایا جائے۔ پھر آپ ﷺ نے اس ہنڈیا کا شوربا بھی نوش فرمایا اور اس کا گوشت بھی تناول فرمایا۔ تاکہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل ہو سکے:

﴿فَكُلُوا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ (الحج: 28)
''سو ان میں سے کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو کھلاؤ۔''

وَلَا أُعْطِيَ فِي جِزَارَتِهَا مِنْهَا شَيْئًا: یعنی جزار کو اس کی اجرت کی مد میں قربانی کے گوشت میں سے کچھ بھی نہ دوں۔ جزار قصاب کو کہتے ہیں، جو جانور کو ذبح بھی کرتا ہے اور بڑی ہنرمندی اور سلیقے سے جانور کے گوشت کے پارچے اور بوٹیاں بھی بناتا ہے۔

اب سو اونٹوں میں سے تریسٹھ اونٹ تو خود آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے۔ باقی کے سینتیس

---

❶ صحيح البخاري: 1717۔ صحيح مسلم: 1317.

جناب علی رضی اللہ عنہ نے ذبح فرمائے تب پھر جزار کا کام صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ اس نے قربانی کے ان اونٹوں کی کھال اتاری تھی اور ان کا گوشت بنایا تھا۔

جزار کو قربانی سے اجرت دینے کی ممانعت اس لیے ہے کہ یہ گویا کہ اپنے صدقہ سے رجوع کرنا ہے۔ کیونکہ جس قدر گوشت آدمی اجرت میں دے گا اس قدر صدقہ اسے واپس مل جائے گا کہ اتنی رقم سے اس کو فراغت مل گئی۔ اسی لیے جزار کی اجرت الگ سے دینے کا حکم ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قربانی کا گوشت تقسیم کرنے میں توکیل جائز ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کا وکیل بنایا تھا۔
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ومنقبت کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنا نائب بنایا۔
- نبی کریم ﷺ کا بے پناہ جود وکرم کہ آپ ﷺ نے سو اونٹوں کے گوشت، کھالوں اور جھولوں کو مسکینوں میں تقسیم کر دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔
- قصاب کی اجرت قربانی کے گوشت سے دینا جائز نہیں۔ کیونکہ درحقیقت یہ اپنے صدقہ میں رجوع کرنا ہے جو حرام ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا کہ: اپنا دیا صدقہ واپس مت لو۔ [1]
- معلوم ہوا کہ قربانی کے جانوروں کو اجرت لے کر ذبح کر سکتے ہیں۔

ایک اونٹ اور گائے سات آدمیوں کی طرف سے قربان کر سکتے ہیں

1355۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضي الله عنهما قَالَ: ((نَحَرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ الْبَدَنَةَ عَنْ سَبْعَةٍ وَالْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: حدیبیہ کے سال ہم نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سات آدمیوں کی طرف سے ایک اونٹ کو اور سات (ہی) آدمیوں کی طرف سے ایک گائے کو ذبح کیا تھا۔ [2]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

قصہ حدیث:...... حدیبیہ کا قصہ مشہور ہے۔ یہ ذی القعدہ چھ ہجری کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ مگر قریش مکہ آپ ﷺ کے آڑے آ گئے اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو عمرہ کرنے کی اجازت نہ دی اور یہ شرط رکھ دی کہ اس سال تو یہ ہرگز نہ ہو گا۔ البتہ مسلمان اگلے سال تین دن کے لیے آ کر یہ فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس بات پر صلح ہو گئی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو جانور قربان کرنے کا اور دوسروں کو منڈوانے کا حکم دے دیا۔

ان حضرات رضی اللہ عنہم کے ساتھ قربانی کے اونٹ اور گائیں تھیں۔ آپ ﷺ نے ان حضرات رضی اللہ عنہم کو اس بات کا حکم دیا کہ ایک اونٹ اور ایک گائے میں سات سات شریک ہو کر ان کو قربان کر لیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 1489۔ صحيح مسلم: 1620.

[2] صحيح مسلم: 1318.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قربانی کرنے والے یا ہدی لے جانے والے لوگ ایک اونٹ یا ایک گائے میں سات تک شریک ہو سکتے ہیں اور یہ شرکت سات سے زیادہ افراد میں نہ ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ ایک بکری کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔
تب پھر اگر ایک گائے میں سات افراد شریک ہوتے ہیں اور ہر آدمی وہ قربانی اپنے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے کر رہا ہو، اور ہر ایک کے گھر کے افراد دس تک ہوں تو اجر کے اعتبار سے تو یہ ایک قربانی ستر آدمیوں کی طرف سے ہوگی لیکن شخصی شرکت کے اعتبار سے یہ قربانی سات آدمیوں کی طرف سے ہوگی۔

◈ اگر چہ بظاہر یہ حکم حج والی قربانی کی بابت ہے لیکن یہ حکم واجب قربانی کا بھی ہے چاہے شریک ہونے والے یہ سات افراد حج پر نہ بھی گئے ہوں۔

◈ ثواب اور اجر کے حصول میں جسامت کے بڑے ہونے کا اعتبار نہیں کیونکہ گائے بظاہر جسامت میں اونٹ سے چھوٹی ہوتی ہے لیکن اس میں شریک ہونے والے سات افراد کو بھی اونٹ میں شریک ہونے والے سات افراد کے اجر کے بقدر ثواب ملتا ہے۔
تب پھر ثواب اور شعائر کے مسائل امورِ حسیہ پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ یہ شریعت کی طرف سے مقدر ومقرر ہوتے ہیں۔

◈ اگر گائے یا اونٹ کی قربانی کے بعد پتا چلا کہ اس میں شریک افراد تو آٹھ تھے تو اب ایک اور بکری ذبح کر دینا سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ علماء کا یہی قول ہے۔

3-بَابُ الْعَقِيقَةِ ......عقیقہ کا بیان

عقیقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

لفظ عقیقہ یہ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر مَفْعولَةٌ کے معنی میں ہے اور اَلْعَقّ سے مشتق ہے جس کا معنی القطع یعنی کاٹنا ہے تب پھر لفظ عقیقہ یہ مقطوعہ کے معنی میں ہوگا یعنی کاٹا ہوا۔ کیونکہ عقیقہ میں دیے جانے والے جانور کو ذبح کرتے وقت اس کی رگوں کو کاٹا جاتا ہے۔ اس بنا پر عقیقہ کا یہ معنی ادنی ملابست کی بنا پر ہوگا۔ [1]

عقیقہ کا حکم:

عقیقہ کرنا سنت ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے قول اور فعل دونوں سے ثابت ہے البتہ عقیقہ سنتِ موکدہ ہے۔ حتیٰ کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مفلس پر قرض لے کر عقیقہ کرنا پسندیدہ ہے کیونکہ اس طرح وہ ایک سنت کو زندہ کرے گا۔ [2]

امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول اس شخص کے ساتھ مقید ہے جسے امید ہو کہ وہ اپنا قرض اتار دے گا۔ جیسے وہ تنخواہ دار شخص جسے مہینہ کے آخر میں تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن بچہ کی ولادت کے وقت سر دست اس کے پاس کوئی رقم نہ تھی تو وہ قرض لے کر عقیقہ کر دے اور تنخواہ ملنے پر قرض اتار دے۔ البتہ جسے قرض اتار سکنے کی امید نہ ہو وہ قرض لے کر عقیقہ نہ کرے۔

---

[1] شیخ رحمہ اللہ نے عقیقہ کی اصطلاحی تعریف درج نہیں کی۔ اصطلاح شرع میں ''سات روز ہو جانے پر نوزائیدہ بچے کی طرف سے قربانی کرنے کو عقیقہ کہتے ہیں۔'' ''القاموس الوحید: 1106'' وگرنہ عقیقہ کا لغوی معنی نومولود بچے کے پیدائشی بال کاٹنا ہے۔ ایضًا۔ (نسیم)

[2] علامہ مرداوی رحمہ اللہ (160/4) نے امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کو نقل کیا ہے۔

بچہ اور بچی کی طرف سے عقیقہ

1356-1357- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ كَبْشًا كَبْشًا)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے جناب حسن رضی اللہ عنہ اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک ایک مینڈھا کا عقیقہ کیا تھا۔ ❶

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ وَعَبْدُ الْحَقِّ ، لٰكِنْ رَجَّحَ أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ ، وَأَخْرَجَ ابْنُ حِبَّانَ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ نَحْوَهُ .

اس حدیث کو امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، امام ابن خزیمہ، امام ابن جارود اور امام عبدالحق نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے البتہ ابو حاتم نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو راجح کہا ہے اور ابن حبان رحمہ اللہ نے ایسی ہی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ ❷

غریب الحدیث :......عَقَّ: یعنی جنابِ حسنین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک ایک مینڈھا عقیقہ میں ذبح کیا۔ چونکہ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے نواسے تھے اس لیے آپ ﷺ نے ان کی طرف سے عقیقہ فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اولاد کی طرف سے عقیقہ کرنا مستحب ہے، یہ حکم بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کے حق میں یکساں ہے۔
- بچے کی طرف سے عقیقہ میں ایک جانور ذبح کرنا کافی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جنابِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک ایک مینڈھا عقیقہ میں ذبح فرمایا تھا۔
- عقیقہ میں یہ شرط نہیں کہ یہ باپ ہی کرے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ان کے والد ماجد جنابِ علی رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے عقیقہ فرمایا تھا۔
- فضولی کا تصرف جائز ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دوسرے کی طرف سے عقیقہ کرے اور وہ اسے جائز قرار دے دے تو وہ عقیقہ جائز ہوگا۔
- مذکورہ حدیث میں یہ مذکور نہیں ان مینڈھوں کا انہیں ذبح کر دینے کے بعد کیا کیا گیا تھا۔ آیا صدقہ کیا گیا یا گھر والوں نے استعمال کیا۔ تو اس بارے علماء کا قول ہے کہ عقیقہ کا گوشت پکا کر تقسیم کیا جائے اور اس کی دعوت بھی کی جائے۔ بخلاف قربانی کے گوشت کے وہ کچا تقسیم کیا جائے گا۔
- یہ حدیث مرسل ہے جیسا کہ امام موصوف نے اس کی تصریح کی ہے۔

1358-1359- وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا ((أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَمَرَهُمْ أَنْ يُعَقَّ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ بچے کی طرف

---

❶ سنن ابی داؤد: 2841- المنتقی لابن جارود: 911- امام نووی رحمہ اللہ نے "المجموع" (320/8) میں اور ابن حزم رحمہ اللہ نے "المحلی" (530/7) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ابو حاتم مرفوع حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ وہم ہے، زیادہ صحیح اس کا مرسل ہونا ہے۔ دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 49/2.

❷ صحیح ابن حبان: 5309- ابو حاتم نے اس روایت کے بھی مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے جیسا کہ: "العلل لابن ابی حاتم" (49/2) میں ہے۔

مُكَافِئَتَانِ ، وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ)).

دو ایک جیسی بکریاں اور بچی کی طرف سے ایک بکری عقیقہ میں قربان کریں۔ ❶

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے اسے صحیح کہا ہے۔

وَأَخْرَجَ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ عَنْ أُمِّ كُرْزٍ الْكَعْبِيَّةِ نَحْوَهُ.

جبکہ ائمہ خمسہ نے اس جیسی حدیث حضرت ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔ ❷

غریب الحدیث :......**أَمَرَهُمْ**: امر میں اصل وجوب ہے لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ اس بارے راجح قول عقیقہ کے غیر واجب ہونے کا اور اس کے سنت ہونے کا ہے۔

شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ: مکافئۃ : سے مراد ایک جیسی ہے۔ یعنی دونوں بکریاں، عمر، قد کاٹھ اور فربہی میں ایک جیسی ہوں اور اس میں حکمت یہ ہے کہ مبادا ایک قربانی دوسری سے زیادہ عمدہ ہوں، اور آدمی دوسری کا زیادہ اہتمام نہ کرے اور دوسری قربانی کو پہلے کے تابع سمجھ کر ایک ہی قربانی کر کے یہ سمجھ کر نہ بیٹھ رہے کہ جی بس قربانی ہوگئی، اب دوسری قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لیے دونوں قربانیوں کے ایک جیسا رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا تا کہ آدمی دونوں جانوروں کو یکساں اہمیت کے ساتھ قربان کرے۔

البتہ اس برابری میں رنگت میں اور نر اور مادہ ہونے میں برابری شرط نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو جانور عقیقہ میں دینا افضل ہے اور یہ کہ وہ دونوں جانور عمر، قد و قامت اور فربہی میں یکساں اور برابر ہوں۔

◈ معلوم ہوا کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بلند ہے اور عورتیں مردوں کے مساوی نہیں نہ شرعاً اور نہ تقدیراً۔

ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلے گرو ہے

1360- وَعَنْ سَمُرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((كُلُّ غُلَامٍ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ، تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ ، وَيُحَلَّقُ ، وَيُسَمَّى)).

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلے گرو ہے۔ (چنانچہ) اس کی طرف سے اس (کی پیدائش) کے ساتویں دن (ایک جانور عقیقہ میں) ذبح کیا جائے گا اور (اسی روز) اس کا سر مونڈا جائے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا۔“ ❸

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ .

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، جبکہ امام

---

❶ جامع الترمذى: 1513- صحيح ابن حبان: 5310 .

❷ مسند احمد: 381/6- سنن ابى داؤد: 2834- جامع الترمذى: 1519- سنن النسائى: 164/7- سنن ابن ماجه: 3162- امام ابن حبان (5312) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے بھی "المجموع" (320/8) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

❸ مسند احمد: 17/5- سنن ابى داؤد: 2838- جامع الترمذى: 1522- سنن النسائى: 166/7- سنن ابن ماجه: 3165- امام حاکم (264/4) اور امام نووی رحمہ اللہ (المجموع: 326/8) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ابن حزم "المحلى" (525/7) میں کہتے ہیں: حسن بصری کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں سوائے حدیث عقیقہ کے اور یہ اسلاف کی ایک جماعت کا قول ہے۔

ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:..... كُلُّ غُلَامٍ: یہ حکم بچی کو بھی شامل ہے۔

مُرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ: مرتھن: یہ رہن سے مشتق ہے اور رہن حبس یعنی روکنے کو کہتے ہیں۔ تب پھر مطلب یہ بنے گا کہ ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہے اور امام احمد رحمہ اللہ اس کی تفسیر یہ بیان فرماتے ہیں کہ: ہر بچے کو جب وہ مر جاتا ہے، اپنے والدین کی شفاعت کرنے کے لیے روکا جائے گا۔ کیونکہ بچہ جب نابالغی کی عمر میں مر جاتا ہے تو وہ اپنے والدین کے لیے جہنم کی آگ سے حجاب بنتا ہے۔ لہٰذا یہ بچہ اپنے والدین کی شفاعت کے لیے رہن رکھا ہوگا یعنی محبوس ہوگا۔

لیکن ابن قیم رحمہ اللہ کے نزدیک مذکورہ حدیث کی یہ تفسیر محل نظر ہے۔ کیونکہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بچہ خود اپنی مصالح کے بدلے محبوس ہوتا ہے کیونکہ عقیقہ کا بچے کے شعور کی پختگی، شرح صدر، اس کی آزادی، پرورش اور اٹھان میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ کیونکہ عقیقہ اس بچہ کے پیدا ہونے پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے اور رب تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر پر وہ نعمتیں بڑھتی ہیں لہٰذا عقیقہ کرنے پر بچے کی عقل وفہم میں اضافہ ہوتا ہے چاہے وہ بچہ ہو یا بچی اور اس کی برکت سے وہ بچہ ظاہری و باطنی شرور سے محفوظ رہتا ہے۔

تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ: "تُذْبَحُ" یہ فعل مجہول ہے اور اس کا فاعل معلوم ہونے کی وجہ سے مخفی ہے اور وہ بچے کا باپ ہے، کہ بچے کی طرف سے عقیقہ کرنے کا مطالبہ باپ سے ہی ہے۔

یہ عقیقہ کے وقت کا بیان ہے کہ عقیقہ بچے کی پیدائش کے ساتویں روز کیا جائے گا۔ چنانچہ اگر بچہ بدھ کو پیدا ہوا تھا تو ساتواں دن منگل کا بنے گا۔

ساتویں دن عقیقہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس طرح اس بچے پر زمانہ کا ہر دن گزر جائے گا۔ کیونکہ زمانہ کل سات دنوں پر محیط ہے پھر ان کا اضافہ مہینہ سال اور صدی وغیرہ بنتا ہے۔ گویا کہ ساتویں دن عقیقہ کرنے میں بچے کی درازی عمر کے لیے ایک نیک فال ہے۔

وَيُحْلَقُ: یعنی بچے کا سر مونڈا جائے گا اور اس کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی جائے گی۔ البتہ بچے کا سر کوئی ماہر اور محتاط آدمی مونڈے کیونکہ بچے کا سر اس وقت بے حد نرم ہوتا ہے، چنانچہ اناڑی آدمی بچے کا سر زخمی کر سکتا ہے۔ پھر اگر ساتویں دن تجربہ کار سر مونڈنے والا نہ ملے تو آدمی ایک اندازہ کے مطابق چاندی صدقہ کر سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

وَيُسَمَّى: اور بچے کا نام بھی ساتویں دن رکھا جائے گا۔ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نام ساتویں دن ہی رکھا جائے گا چاہے آدمی نام کو اس سے پہلے ہی طے کر لے۔ لیکن ایک حدیث میں آتا ہے کہ: ''آج رات میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور میں نے اس کا نام ابراہیم رکھا ہے۔''[1]

تب پھر ان دونوں روایات میں جمع کی صورت یہ ہوگی کہ اگر تو نام طے ہو جاتا ہے تو اسی دن رکھ لیا جائے تاکہ بچے پر کوئی دن بنا نام کے نہ گزرے اور اگر نام سر دست نہیں ملتا تو کم از کم ساتویں دن ضرور رکھ لیا جائے تاکہ نام عقیقہ کے موافق آ جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عقیقہ کی ترغیب۔ اس کی دلیل: "كُلُّ غُلَامٍ مُرْتَهَنٌ" کے الفاظ ہیں کہ عقیقہ بچے کا رہن چھڑوا دیتا ہے۔
- عقیقہ کوئی بھی کر سکتا ہے لیکن مناسب یہ ہے کہ پہلے وہ عقیقہ کرے جو بچے کے سب سے زیادہ قریب ہے، وہ نہ ہو تو جو اس

[1] صحيح مسلم: 2315- عن انس رضی اللہ عنہ .

کے بعد ہے۔ جیسے باپ کرے، باپ نہ ہوتو دادا کرے، دادا نہ ہو بھائی کریں، ورنہ وہ کریں جن کے ذمہ بچے کا نفقہ ہے۔

- مناسب یہ ہے کہ عقیقہ کرنے والا اگر ذبح کرنا جانتا ہےتو جانور کو ذبح بھی خود کرے۔ وگرنہ کسی دسرے کے سپرد کرے۔
- عقیقہ ساتویں دن کیا جائے اس کی دلیل: "تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ" کے الفاظ ہیں اور اس کی حکمت کو گزشتہ صفحات میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ البتہ ساتویں دن کی تعیین افضلیت کے اعتبار سے ہے، وگرنہ ساتویں دن سے پہلے بھی عقیقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر اگر کوئی ساتویں دن کو عقیقہ نہ کر سکےتو ساتویں کے بعد ہر سات دن بعد کسی موقع پر عقیقہ کرے، جیسے چودھویں دن، یا اکیسویں دن یا اٹھائیسویں دن، هكذا الى آخره۔ کہ حدیث میں اسی طرح آتا ہے اگر چہ اس حدیث کی صحت محل نظر ہے [1] لیکن علماء کا طرز یہی چلا آرہا ہے۔
- ساتویں دن بچے کا سر مونڈنا اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کرنا مسنون ہے کیونکہ ایک ہفتہ گزر جانے پر بالوں کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہوتی ہیں اور اسی دن نام بھی رکھا جائے۔

---

[1] فتح الباری: 594/9.

14
كِتَابُ الأَيْمَانِ وَالنُّذُورِ
قسموں اور نذروں کے احکام ومسائل کا بیان

تمہید:...... امام موصوف نے قسموں اور نذروں کے بیان کو ایک باب کے تحت اس لیے یکجا کیا ہے، کیونکہ ان دونوں باتوں میں التزام کا معنی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قسم کھانے والا بھی اپنے اوپر ایک بات کو لازم کرتا ہے اور نذر ماننے والا بھی ایک بات کو اپنے ذمہ لازم کرتا ہے۔

أیمان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

أیمان: یہ یمین کی جمع ہے۔ یہ قسم اٹھانے کو کہتے ہیں اور قسم یہ کسی معظم نام کو لے کر کسی بات کے موکد کرنے کو کہتے ہیں، چاہے وہ بات ماضی کی ہو یا مستقبل کی۔

اور ''نذور'' یہ نذر کی جمع ہے، یہ مکلّف کا اپنے اوپر ایک ایسی بات کو لازم کرنا ہے جو اس کے ذمہ واجب نہ ہو، چاہے وہ بات عبادت کی قبیل سے ہو یا غیر عبادت کی قبیل سے ہو۔

زیادہ قسمیں کھانا مکروہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ احۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ﴾ (المائدۃ: 89) ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔''

بعض علماء نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ مراد زیادہ قسمیں نہ کھانا ہے اور یہ عمدہ تفسیر ہے، پھر زیادہ قسمیں کھانے میں محلوف بہ (جس کے نام کی قسم کھائی جا رہی ہے) کی بے وقعتی بھی ہے۔ اس لیے کسی اہم ترین شے پر ہی قسم اٹھانی چاہیے۔

قسم اٹھاتے ہوئے ان شاء اللہ ساتھ میں کہنا مستحب ہے:

پھر مستقبل کے کسی امر پر قسم اٹھاتے وقت اس کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا مناسب اور بہتر ہے۔ تا کہ اس سے دو فائدے حاصل ہوں۔

(1) ایک یہ کہ تم پر معاملہ آسان ہو جائے۔

(2) دوسرا یہ کہ حانث ہونے کی صورت میں تم پر سے کفارہ اٹھ جائے۔

اس کی دلیل سیدنا سلیمان علیہ السلام کی یہ قسم اٹھانا ہے کہ وہ ایک رات میں اپنی نوے (90) بیویوں کے پاس جائیں گے (اور ان سے جماع کریں گے) جس سے ان میں سے ہر بیوی ایک بیٹا جنے گی جو راہِ خدا کا مجاہد بنے گا۔ ان سے عرض کیا گیا کہ اس بات پر ان شاء اللہ بھی کہہ لیجے، لیکن انہوں نے اپنے پختہ ارادہ پر اعتماد کرتے ہوئے ان شاء اللہ نہ کہا نہ کہ ان شاء اللہ کو حقیر سمجھتے ہوئے انہوں نے ان شاء اللہ کہنے سے انکار کیا تھا۔ چنانچہ اس رات سیدنا سلیمان علیہ السلام اپنی نوے بیویوں کے پاس گئے اور سب سے جماع کیا لیکن کسی ایک کے ہاں بھی بچہ نہ ہوا سوائے ایک کے کہ اس نے بھی ایک ادھورا بچہ جنا۔ [1] تا کہ رب تعالیٰ ساری مخلوق پر، جن میں سرِ فہرست حضرات انبیائے کرام علیہم السلام ہیں، یہ بات ظاہر فرما دے کہ امر اللہ ہی کا ہے اور یہ کہ انسان عزیمت کے جس درجہ پر ہی کیوں نہ ہو، اسے یہ بات جاننا اور ماننا ضروری ہے کہ امر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی مستقبل کی قسم میں ہمیشہ ان شاء اللہ ساتھ ضرور کہے اور صرف دل میں ہی اس کا خیال نہ کرے بلکہ زبان سے بھی ضرور ادا کرے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا حرام ہے:

یمین سے متعلقہ یہ مسئلہ بھی خوب یاد رہے کہ غیر اللہ کے نام پر قسم کھانا حرام ہے۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

قسم کا کفارہ:

قسم پر کفارہ چند شروط کے ساتھ واجب ہوتا ہے، جو یہ ہیں:

⊙ ...... وہ قسم منعقد ہو سکتی ہو۔ یعنی جس بات کی مستقبل کے اعتبار سے قسم اٹھائی ہے وہ عادۃً ممکن ہو۔ لہٰذا اگر کسی نے قسم کے عقد کا ارادہ ہی نہیں کیا تو وہ قسم منعقد نہ ہوگی اور اس پر کفارہ بھی نہیں آئے گا۔ البتہ اگر وہ اپنی قسم میں سچا ہوا تو اس کی قسم پوری ہو جائے گی اور اگر وہ جھوٹا ہوا تو گنہگار رہو گا لیکن کیا ایسی قسم کو یمین غموس کہتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ یمین غموس اس جھوٹی قسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی کا ناحق مال کھایا جائے۔ جبکہ اس قسم میں آدمی صرف جھوٹا کہلائے گا اور اللہ کے نام پر جھوٹ بولنے کی پاداش میں اسے دوگنا گناہ ملے گا۔

⊙ ...... ماضی کی قسم میں آدمی چاہے جھوٹا ہو یا سچا، اس پر کوئی کفارہ نہیں آتا۔ البتہ اگر وہ سچا ہوا تو گناہ سے سالم رہے گا اور جھوٹا ہونے کی صورت میں گنہگار ہوگا۔

⊙ ...... آدمی نے قسم کے عقد کا ارادہ کیا ہو تب کفارہ آتا ہے۔ اس شرط سے یہ حاصل ہوا کہ اگر کسی نے قسم کے عقد کا ارادہ ہی نہیں کیا تو وہ حانث بھی نہ ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ﴾ (المائدة: 89)

''اللہ تم سے تمہاری قسموں میں لغو پر مؤاخذہ نہیں کرتا اور لیکن تم سے اس پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم نے پختہ ارادے سے قسمیں کھائیں۔ تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

⊙ ...... وہ قسم جس کا قصد نہیں ہوتا، یہ وہ قسم ہے جو گفتگو کے دوران بلا ارادہ زبان سے نکل جائے۔ جیسے کسی نے پوچھا، کدھر جا رہے ہو؟ تو مخاطب نے بے دھیانی میں یہ کہہ دیا کہ: ''اللہ کی قسم! میں ابوبکر کے پاس نہیں جا رہا'' لیکن اس کے بعد چلا

[1] صحيح البخاري: 3424- صحيح مسلم: 1654.

گیا تو اس قسم پر یہ حانث نہ ہوگا اور نہ اس پر کفارہ ہی آئے گا کیونکہ اس نے اس قسم کے عقد کا قصد اور ارادہ ہی نہ کیا تھا اور اس قسم کی قسم کھانا عام ہے۔ جیسے باپ اکثر اپنی اولاد کو کہہ دیتا ہے کہ اگر تم نے فلاں فلاں کام کیا تو میں اللہ کی قسم! تمہاری چمڑی اتار دوں گا۔ بلاشبہ اس کا اس قسم کے عقد کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ تب پھر ایسی قسم لغو شمار ہوگی۔

⊙ ......ممکن کی قید سے یہ مستفاد ہوا کہ اگر کسی نے امر مستحیل کی قسم اٹھائی تو اس پر کفارہ کے آنے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا اس پر اس وقت کفارہ آئے گا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہ کر پائے گا جیسے کوئی یہ قسم اٹھائے کہ میں ہوا میں کھڑا گھر بناؤں گا کہ یہ ناممکن ہے۔ یا یہ کہ اس پر کوئی کفارہ نہ آئے گا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کی یہ قسم لغو اور ہذیان کی قبیل میں سے ہے۔ لیکن اگر ہم ایسی قسموں پر تادیباً کفارہ واجب کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

غیر اللہ کے نام پر قسم کھانے کا حکم

1361- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ أَدْرَكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فِيْ رَكْبٍ ، وَعُمَرُ يَحْلِفُ بِأَبِيْهِ ، فَنَادَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَلَا! إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ ، فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ ، أَوْ لِيَصْمُتْ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک قافلہ میں اس حال میں پایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (کسی بات پر) اپنے باپ کے نام کی قسم اٹھا رہے تھے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں پکار کر فرمایا: ''خبردار! رب تعالیٰ نے تمہیں اس بات سے منع فرمایا ہے کہ تم اپنے باپ دادا (کے ناموں) کی قسمیں کھاؤ۔ پس جس نے قسم کھانی ہی ہے تو وہ (یا تو) رب تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے وگرنہ خاموش رہے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......**أَنَّهُ أَدْرَكَ فِي رَكْبٍ**: مراد یہ ہے کہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک سفر میں تھے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس سفر کا قصہ ہے، اور نبی کریم ﷺ کا ان لوگوں سے کب اور کیونکر سامنا ہوا؟ تو یہ باتیں چنداں اہمیت کی حامل نہیں۔ کیونکہ ان باتوں پر کوئی خاص حکم شرعی مرتب نہیں ہوتا۔

وَعُمَرُ يَحْلِفُ بِأَبِيْهِ: کیونکہ عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنے باپ دادا کے ناموں پر قسمیں کھانے کے عادی تھے اور یہ لوگ اب بھی اس عادت پر باقی تھے۔ اس باب میں اصل یہ ہے کہ آدمی اسی فعل پر باقی رہے جس پر وہ پہلے تھا، جب تک کہ اس کے منع کی یا وجوب کی دلیل نہیں مل جاتی۔

فَنَادَاهُمْ: یعنی آپ ﷺ نے انہیں بآواز بلند پکارا اور بات کی کیونکہ دور سے اونچی آواز میں پکارا جاتا ہے۔

أَلَا إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ: اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے دو تاکیدات بیان فرمائی ہیں:

(1) ایک یہ کہ آپ ﷺ نے حرف استفتاح ''أَلَا'' کا استعمال فرمایا۔ جس کا مقصود مخاطب کو کہی گئی بات پر متنبہ کرنا ہوتا ہے۔

(2) دوسرے آپ ﷺ نے ''إِنَّ'' حرف تاکید کا استعمال فرمایا ہے۔

رہا یہ سوال کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ممانعت کے کون سے الفاظ وحی فرمائے تھے؟ تو ہم ان کو نہیں جانتے،

---

[1] صحيح البخاري: 6646- صحيح مسلم: 1646.

البتہ ہم ان الفاظ کا معنی جانتے ہیں، وہ یہ کہ:

أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ: باپ دادا کے ناموں کی قسمیں کھانا منع ہے۔ لفظ آباء، باپ اور دادا دونوں کو شامل ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم میں دادا کو باپ کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔

فَمَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ: یعنی جو قسم اٹھانے کا ارادہ کرے تو وہ اللہ کے نام کی قسم اٹھائے۔ پس "مَنْ كَانَ حَالِفاً" سے مراد زمانہ ماضی نہیں بلکہ مستقبل میں قسم کھانے کا ارادہ مراد ہے۔

"فَلْيَحْلِفْ" کی لام میں دو اعتبار ہیں:

(1) ایک یہ کہ غیر اللہ کے نام پر قسم اٹھانے کی تحریم کو دیکھا جائے تو یہ لام امر کا ہے اور وجوب کے لیے ہے۔

(2) اور اگر اس اعتبار کو دیکھا جائے کہ رب تعالیٰ کی قسم اٹھانا جائز ہے تو یہ لام اباحت کے لیے ہے۔

أَوْ لِيَصْمُتْ: یہ "لِيَسْكُتْ" کے معنی میں ہے اور مذکورہ "أَوْ" تنویع کے لیے ہے نہ کہ تخییر کے لیے اور مذکورہ لام امر کا ہے جو وجوب کے لیے ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ منکر پر بے حد شدت کے ساتھ انکار فرمایا کرتے تھے۔
- کسی حکم سے جاہل سے مواخذہ نہ ہوگا، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سرزنش بھی نہ فرمائی اور نہ ان کو ڈانٹا۔
- بناء اصل پر کی جاتی ہے اور جب تک آدمی کو کسی بات کے حکم کا علم نہیں ہو جاتا، وہ اپنی گزشتہ حالت پر باقی رہے گا۔ اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے باپ کے نام پر قسم اٹھانا ہے۔
- اہم مسائل میں مناسب ہے کہ ان کو متعدد تاکیدات لا کر بیان کیا جائے۔ جیسا کہ یہاں پر نبی کریم ﷺ نے دو تاکیدات لا کر کلام کو مؤکد فرمایا ہے۔
- جاہلیت میں باپ دادا کی حد سے زیادہ تعظیم معروف تھی۔ اسی لیے وہ لوگ ان کے ناموں کی قسمیں اٹھاتے تھے اور یہ ایک فطری بات ہے۔
- مشروع طریق پر قسم اٹھانا جائز ہے۔ اس کی دلیل: "فَمَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔
- اگر آدمی ایک بات سے منع کرے تو پھر اس کا متبادل بھی ضرور بتلانا چاہیے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے باپ دادا کے نام پر قسم اٹھانے سے منع فرمایا تو ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اگر قسم اٹھانی ہی ہے تو اللہ کے نام کی قسم اٹھائی جائے۔

1362- وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه مَرْفُوعاً: ((لَا تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ، وَلَا بِأُمَّهَاتِكُمْ، وَلَا بِالْأَنْدَادِ، وَلَا تَحْلِفُوْا بِاللّٰهِ إِلَّا وَأَنْتُمْ صَادِقُوْنَ)).

اور سنن ابی داود اور سنن نسائی کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ: "اپنے باپ (داد) دں (کے ناموں) کی، اور اپنی ماؤں (کے ناموں) کی اور بتوں کی قسمیں نہ اٹھاؤ، اور صرف اللہ کے نام کی ہی قسم اٹھاؤ اور اللہ کے نام کی قسم (بھی) تب ہی اٹھاؤ جب تم (اس قسم میں) سچے ہو۔ [1]

[1] سنن ابی داؤد: 3248- سنن النسائی: 5/7- اور امام ابن حبان (4357) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......مَرْفُوعًا: یعنی اس حدیث کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے۔ کیونکہ جب سند کی انتہا نبی کریم ﷺ تک ہو تو وہ حدیث مرفوع کہلاتی ہے اور جب سند کی انتہا صحابی رسول تک ہو تو وہ حدیث موقوف کہلاتی ہے۔

لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ: اس کا حکم وہی ہے جو "إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ" کا ہے۔

وَلَا بِأُمَّهَاتِكُمْ: اگرچہ ماں شفقت ومہربانی کا محل ہے لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ماؤں کے نام کی قسمیں اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔

وَلَا بِالْأَنْدَادِ: "الْأَنْدَادِ" یہ "نِدّ" کی جمع ہے۔ یہ ہم پلہ، ہم سر، مثیل اور نظیر کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد وہ بت ہیں جن کی رب تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کی جاتی ہے، جیسے لات، عزیٰ، ہبل اور منات وغیرہ کہ بتوں کے نام کی قسمیں کھانا بھی منع اور حرام ہے۔

لَا تَحْلِفُوا إِلَّا بِاللّٰهِ: اس جملہ میں جملہ ماسوا اللہ کی قسم اٹھانے کی ممانعت آگئی۔ کیونکہ نفی اور "اِلَّا" حصر اور تاکید کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کے سوا کسی کی بھی قسم اٹھانا منع ہوگا۔

وَلَا تَحْلِفُوا بِاللّٰهِ إِلَّا وَأَنْتُمْ صَادِقُونَ: غیر اللہ کے نام پر حلف اٹھانے کی ممانعت کے بعد اس بات کا بیان باقی رہ گیا تھا کہ رب تعالیٰ کے نام کی قسم کیونکر اٹھائی جائے۔ چنانچہ اس کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نام کی صرف اور صرف سچی قسم اٹھائی جائے۔ کیونکہ جس کے نام کی قسم اٹھائی جاتی ہے وہ اس کی تعظیم کی وجہ سے اٹھائی جاتی ہے جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ قسم اٹھانے والے کے نزدیک محلوف بہ (جس کے نام کی قسم اٹھائی جائے) کی عظمت محلوف علیہ (جس چیز کے لیے قسم اٹھائی جائے) کی عظمت سے زیادہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- باپ دادوں اور ماؤں کے ناموں کی قسم اٹھانا منع ہے اور یہ نہی تحریم کی نہی ہے۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھانے کو کفر یا شرک کہا گیا ہے۔ ❶
- اور بتوں کے نام کی قسم تو اور بھی اشد حرام ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے بتوں کے نام کی قسم کھانے والے کو اس کے بعد "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" پڑھ لینے تک کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "مَنْ قَالَ: وَاللَّاتِ، فَلْيَقُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ بَعْدَ ذٰلِكَ۔ ❷ یعنی "جس نے (اپنی قسم میں) "لات کی قسم" کہا تو وہ اس کے بعد "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" پڑھ لے۔" تاکہ اس کے ایمان کی تجدید ہو جائے کیونکہ بتوں کی قسم اٹھانا یہ ان کی تعظیم ہے، جو شرک ہے۔
- اللہ کے نام کی تعظیم کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے نام کی قسم کسی سچی بات میں ہی اٹھائی جائے۔ اس کی دلیل: "وَلَا تَحْلِفُوا بِاللّٰهِ إِلَّا وَأَنْتُمْ صَادِقُونَ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ اس کے تحت چند امور آتے ہیں، جو یہ ہیں:

(1) یا تو آدمی جانتا ہوگا کہ وہ سچی قسم اٹھا رہا ہے۔

(2) یا وہ جانتا ہوگا کہ وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہے۔

(3) یا اسے اپنے سچا ہونے کا گمانِ غالب ہوگا۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 3251۔ جامع الترمذی: 1535۔ قال النبی ﷺ: مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ.

❷ صحیح البخاری: 4860۔ صحیح مسلم: 1647.

(4) یا اسے اپنے جھوٹا ہونے کا گمان غالب ہوگا، اور
(5) پانچویں صورت یہ ہے کہ اسے اپنا سچے یا جھوٹے ہونے میں شک اور تردد ہوگا۔

پہلی صورت کہ جب آدمی سچا ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ وہاں قسم اٹھانے میں کوئی حرج نہیں اور بسا اوقات ایسی قسم اٹھانا مطلوب بھی ہوتا ہے۔

دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ ایسی قسم اٹھانا حرام ہے جس میں آدمی کو اپنے جھوٹا ہونے کا یقین ہو اور جب ایسی قسم سے کسی کا ناحق مال حاصل کرنا مقصود ہو تو یہ یمین ''غموس'' کے حکم میں داخل ہوگی۔ جو کبیرہ گناہ ہے۔

تیسری صورت کہ جب اپنے سچا ہونے کا گمان غالب ہو، وہاں بھی قسم اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے رمضان میں جماع کر لینے والے صحابی نے نبی کریم ﷺ کے روبرو یہ قسم اٹھائی تھی کہ اللہ کی قسم! ان دو پہاڑوں کے بیچ مجھ سے زیادہ تنگدست کوئی گھرانہ نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان کی قسم کو برقرار رکھا، حالانکہ یہ قسم قطعی نہ تھی بلکہ گمانِ غالب پر مبنی تھی۔ البتہ ایسی قسم کا تعلق دوسرے کے مال سے ہو تو یہ بھی جائز نہ ہوگی جب تک کہ قطعی نہ ہو کیونکہ دوسرے کا مال محترم ہے اور گمانِ غالب کی بنا پر دوسرے کے مال کی حرمت کو توڑنا جائز نہ ہوگا۔

چوتھی صورت بھی حرام صورت ہے۔

اور رہی پانچویں یعنی شک اور تردد والی صورت تو اس میں بھی جب تک اپنے سچا ہونے کا قطعی یقین یا غالب گمان نہ ہو جائے یہ قسم حرام ہوگی۔

تب پھر مذکورہ ارشاد نبوی ﷺ: "وَلَا تَحْلِفُوا بِاللّٰهِ إِلَّا وَأَنْتُمْ صَادِقُونَ" کہ اس میں سے باقی کی چاروں صورتیں نکل گئیں اور صرف ایک سورت ہی باقی رہ گئی، وہ یہ کہ جب قسم کا تعلق کسی دوسرے کے حق سے ہو تو جب تک اپنے سچا ہونے کا یقین نہ ہو، قسم کھانا جائز نہ ہوگا۔

قسم میں قسم اٹھوانے والے کی نیت کا اعتبار ہے

1363- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَمِيْنُكَ عَلَى مَا يُصَدِّقُكَ بِهِ صَاحِبُكَ)).

وَفِي رِوَايَةٍ: ((الْيَمِيْنُ عَلَى نِيَّةِ الْمُسْتَحْلِفِ)).

أَخْرَجَهُمَا مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تمہاری قسم اس بات پر ہے جس پر تمہارا ساتھی (یعنی تم سے قسم اٹھوانے والا) تمہاری تصدیق کرے۔''

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: قسم، قسم اٹھوانے والے کی نیت پر ہوتی ہے۔ ❶

ان دونوں احادیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

صورت مسئلہ

شرح:...... مذکورہ دونوں روایات میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ جب تم نے ایک آدمی کے لیے قسم اٹھائی اور توریہ کرتے ہوئے خلافِ واقع بات کو قسم میں ظاہر کیا تو اس قسم میں قسم اٹھوانے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا جس کو

❶ صحيح مسلم: 1653.

مذکورہ پہلی روایت میں "صَاحِبُكَ" کے لفظ کے ساتھ اور دوسری روایت میں: "اَلْمُسْتَحْلِفِ" کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اور اس میں تمہاری نیت کا اعتبار نہ ہوگا حتی کہ چاہے تم نے ایسی نیت بھی کی ہو جو تمہیں گناہ سے نکال دے تب بھی اعتبار قسم اٹھوانے والے کی نیت کا ہوگا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی تمہیں یہ کہے کہ ''میں تم پر سو روپے کا دعویٰ کرتا ہوں'' اور تم جانتے ہو کہ وہ سچا ہے، پر تم اس کے قسم اٹھوانے پر یہ کہو کہ: "ما عندی لك مائة" اور تمہاری مراد "مَا" سے نفی کا معنی نہ ہو بلکہ ''مَا'' سے مراد "الذِیْ" ہو، یعنی میرے پاس جو ہے اس میں سے سو روپیہ تیرا ہے۔ اب تمہارے ان الفاظ سے وہ نفی سمجھے جبکہ تمہاری مراد "الــذی" کا معنی ہو، تو اب اگر چہ تم اپنی نیت میں مخاطب مدعی کے سو روپے مان رہے ہو اور ثابت بھی کر رہے ہو، لیکن تمہاری نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ بلکہ اعتبار تمہارے مدعی ساتھی کی نیت کا ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ کیا پھر ایسا آدمی اس قسم کی بنی بر توریہ قسم اٹھا کر دوسرے کے مطالبہ سے بری ہو جائے گا؟ تو ظاہر کے اعتبار سے تو حکم یہ ہے کہ اگر معاملہ قاضی تک جاتا ہے تو ایسی قسم اٹھانے سے وہ بری ہو جائے گا۔ کیونکہ قاضی وہی فیصلہ کرے گا جو وہ ظاہر میں دیکھے گا، البتہ رب تعالیٰ کی عدالت سے، جو احکم الحاکمین کی عدالت ہے، یہ شخص بری نہ ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قسم میں اصل یہ ہے کہ اعتبار قسم والے کی نیت کا ہوگا جب تک کہ خصومت نہ پائی جائے اور اگر خصومت پائی گئی تو مدار خصم کی نیت پر ہوگا۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ قسم کے الفاظ میں نیت کا احتمال ہو، لہٰذا اگر قسم کے الفاظ میں نیت کا احتمال نہ ہوا تو نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ جیسے کسی نے قسم اٹھائی کہ اللہ کی قسم میں فراش پر نہ سوؤں گا پھر ریت کے ٹیلے کو تکیہ بنا کر سو گیا اور کہنے لگا کہ فراش سے میری مراد زمین تھی تو یہ نیت درست ہوگی کیونکہ اس لفظ میں اس نیت کا احتمال ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے زمین کو فراش کے لفظ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ (البقرة: 22)

''جس نے تمھارے لیے زمین کو ایک بچھونا بنایا۔''

لیکن اگر کسی نے یہ قسم اٹھائی کہ میں روٹی نہ کھاؤں گا اور روٹی سے کھجور مراد لی تو اس کی یہ نیت معتبر نہ ہوگی کیونکہ روٹی کے لفظ میں کھجور کے معنی کا احتمال نہیں پایا جاتا۔

تب پھر قسم میں اصل حالف کی نیت کا اعتبار ہوگا جبکہ لفظوں میں اس کی نیت کا احتمال بھی پایا جاتا ہو۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ﴾ (المائدة: 89)

''اور لیکن تم سے اس پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم نے پختہ ارادے سے قسمیں کھائیں۔''

یعنی جیسی تم قسم کھاؤ گے اس کے مطابق تم سے مواخذہ ہوگا۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جس کی وہ نیت کرے گا۔'' اسی طرح حدیث الباب بھی اسی بات کو بتلاتی ہے۔ لیکن اگر حالف کی نیت نہ ہو تو ہم اس سبب کی طرف لوٹیں گے جس نے اسے قسم اٹھانے پر ابھارا ہے۔ یہ قسم کا دوسرا مرتبہ ہے۔ جیسے کسی نے کہا کہ

عمرو بدعتی ہے۔ اس کو سن کر زید نے کہا کہ کیا یہ بات صحیح ہے؟ تو بتلانے والے نے کہا کہ ہاں! اس پر زید نے اس بات کی قسم کھالی کہ اب وہ عمرو سے بات نہ کرے گا جب تک کہ وہ اس بدعت کو ترک نہیں کر دیتا۔ لیکن زید کو بعد میں پتا چلا کہ عمرو کی بابت یہ بات غلط تھی۔ تو اس سے بات کرنے پر زید حانث نہ ہوگا۔ کیونکہ زید نے ذکر کردہ سبب کی بنا پر قسم کھائی تھی جو سرے سے تھا ہی نہیں۔ پھر اگر نہ تو نیت پائی جائے اور نہ سبب تب پھر تعیین کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یہ قسم کا تیسرا درجہ ہے اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے ایک آدمی نے ایک سال بھر کے بکری کے بچے کی بابت قسم کھائی کہ وہ اس کا گوشت نہ کھائے گا۔ لیکن جب وہ دو یا تین سال کا ہوگیا تو اس کا گوشت کھالیا۔ تو اس صورت میں یہ قسم کھانے والا حانث ہو جائے گا کیونکہ اسی نے اس بکری کے بچے کو معین کیا تھا۔ غرض قسم اصل میں معانی کے متعلق ہوتی ہے نہ کہ اعیان کے۔ لیکن اگر نیت یا سبب جو کہ معانی ہیں، وہ نہ پائے جائیں تو قسم اعیان کے متعلق ہوگی۔ لیکن اگر نہ نیت ہو، اور نہ سبب اور نہ تعیین ہی ہو تو پھر لفظ کے مدلول کی طرف رجوع کیا جائے اور اس باب میں ہم شرعی، لغوی اور پھر عرفی حقیقت کی طرف لوٹیں گے۔

جیسے مثلاً کسی نے کہا کہ: "واللّٰهِ لا أُصَلِّيْ" پھر وہ نماز پڑھنے لگ گیا۔ اس پر جب ہم نے اسے کفارہ ادا کرنے کو کہا تو وہ کہنے لگا کہ میری مراد صلوٰۃ سے صلوۃِ شرعیہ نہ تھی بلکہ صلوۃِ لغویہ یعنی دعا تھی تو ہم اسے اس کی نیت کے حوالے کر دیں گے کیونکہ لفظ صلوۃ میں اس لغوی معنی کا احتمال ہے۔ لیکن اگر حالف یہ کہے کہ یہ قسم اٹھاتے وقت میری کوئی نیت نہ تھی تو اس لفظ کو اس کے شرعی معنی پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ مسلمانوں میں اس لفظ کا معروف شرعی معنی یہی ہے اور وہ نماز پڑھنے پر کفارہ ادا کرے گا۔ اسی طرح اگر حقیقت عرفیہ اور حقیقت لغویہ میں تعارض ہو جائے تو قسم کے لفظ کو عرف پر محمول کیا جائے گا۔ جیسے کسی نے قسم کھائی کہ وہ "شَاة" (یعنی بکری) کو ذبح نہ کرے گا، جبکہ اس نے "تیس" (نر بکرا) پکڑ کر ذبح کر دیا تو وہ حانث نہ ہوگا۔ کیونکہ اگرچہ لغت میں لفظ شاۃ کا اطلاق بھیڑ بکری کے نر اور مادہ دونوں پر ہوتا ہے لیکن عرف میں شاۃ کا اطلاق صرف مادہ پر اور وہ بھی بکری پر ہوتا ہے۔

اگر قسم توڑنے میں خیر ہو تو اس کو توڑ کر کفارہ دے دے

1364- وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ سَمُرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَى يَمِيْنٍ فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا فَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ وَائْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: ((فَائْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ وَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ)).

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِيْ دَاوُد: ((فَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ ثُمَّ ائْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ)). وَإِسْنَادُهُمَا صَحِيْحٌ.

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "اور جب تم کسی بات کی قسم اٹھاؤ پھر اس کے سوا کو اس سے بہتر دیکھو تو اپنی قسم کا کفارہ دے دو اور اس بہتر کام کو کرلو۔" ❶

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

اور صحیح بخاری کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: "تو تم وہ بات کرو جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ دے لو۔" ❷

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: "تو تم (پہلے) اپنی قسم کا کفارہ دے لو پھر وہ کام کرو جو بہتر ہے۔" ❸

---

❶ صحيح البخاري: 6622- صحيح مسلم: 1652.

❷ صحيح البخاري: 6722. ❸ سنن ابى داؤد: 3278.

غریب الحدیث :......وَإِذَا حَلَفْتَ: مذکورہ "واو" عاطفہ ہے جس کا معطوف علیہ حذف ہے۔ کیونکہ امام موصوف مذکورہ حدیث کا صرف اتنا ہی طرف لے کر آئے ہیں جو ان کا محل استدلال ہے۔

عَلَى يَمِينٍ: اس یمین سے وہ یمین مراد نہیں ہے جس سے قسم منعقد ہوتی ہے بلکہ وہ بات مراد ہے جس کی قسم اٹھائی ہے۔ کیونکہ یمین حقیقت میں قسم کا صیغہ ہوتی ہے، تب پھر یہ کہنا درست کلام نہ بنے گا: "إِذَا حَلَفْتَ عَلَى قَسَمٍ" بلکہ مراد یہ کہنا ہے: "إِذَا حَلَفْتَ عَلَى شَيْءٍ" (جیسا کہ بندہ عاجز نے ترجمہ میں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا ہے۔)

فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا، فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ، وَائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ: رؤیت سے یہاں رؤیت قلبیہ مراد ہے نا کہ رؤیت بصریہ۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم ارشاد فرمایا ہے کہ اگر آدمی ایک بات کی قسم کھا لے، پھر کسی دوسری بات میں خیر دیکھے تو اپنی پہلی قسم توڑ دے اور بہتر بات اپنائے۔ جبکہ اٹھائی قسم کا کفارہ دے دے۔

فَائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ: اس میں مذکور واو ترتیب کے لیے نہیں۔ اگرچہ واو حسبِ دلائل ترتیب کو مستلزم ہوتی ہے لیکن یہ ترتیب لزومی نہیں ہوتی۔

اس متفق علیہ روایت میں پہلے کفارہ دینے کا ذکر ہے، پھر قسم توڑ کر دوسرا کام کرنے کا ذکر ہے۔

یہی بات سنن ابی داؤد کی روایت میں بھی مذکور ہے کہ پہلے کفارہ دے، اور پھر قسم توڑ کر وہ بہتر کام کرے۔

جبکہ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں پہلے قسم توڑنے کا ذکر ہے اور اس کے بعد کفارہ دینے کا حکم ہے۔

اب متفق علیہ روایت میں کفارہ اور حنث کے درمیان ''واؤ'' مذکور ہے، اور واو مطلق ترتیب کے لیے آتی ہے جو لازم نہیں ہوتی جیسا کہ ابھی ذکر ہوا۔

اگرچہ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں پہلے حنث کا ذکر ہے اور پھر کفارہ دینے کا، لیکن یہاں بھی دونوں کے درمیان ترتیب پر دلالت کرنے والا حرف ''واؤ'' ہے جو ترتیب کے لزوم پر دلالت نہیں کرتا۔ تب پھر مرتب اور صریح روایت سنن ابی داؤد کی روایت ہے جس میں تکفیر اور حنث کے درمیان حرف عطف "ثُمَّ" مذکور ہے جو ترتیب لزومی کو مقتضی ہوتا ہے۔

غرض یہ تین قسم کے الفاظ ہیں جن میں سے بعض کو ہم بعض پر ترجیح دیں گے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ خیر کی بات دیکھ کر قسم توڑ دینے کا امر وجوب کے لیے ہے اور خیریت سے خیریت دینیہ اور دنیویہ دونوں مراد ہیں اس کی مثال علماء نے یہ بیان کی ہے جیسے کوئی اس بات کی قسم اٹھالے کہ میں کل کا روزہ نہ رکھوں گا۔ جبکہ کل کا دن سوموار کا دن تھا اور سوموار کو روزہ رکھنا مسنون ہوتا ہے۔ تو ایسے شخص کو یہ کہا جائے گا کہ وہ اپنی قسم توڑ کر اس کا کفارہ دے دے اور سوموار کے دن کا روزہ رکھے۔

اسی طرح کسی کو اس کے چچازاد نے اپنے ولیمہ پر بلایا اور اس نے نہ جانے کی قسم کھالی تو اسے سمجھائیں گے کہ وہ اپنی قسم توڑ کر اس کا کفارہ دے لے اور اپنے چچازاد کے ولیمہ میں ضرور جائے کیونکہ اس کی دعوت کو قبول کرنا صلہ رحمی اور رد کرنا قطع رحمی ہے۔

قسم توڑنے کی اقسام:

علماء نے قسم توڑنے کی پانچ اقسام بیان کی ہیں: ''واجب، حرام، سنت، مکروہ اور مباح۔''

چنانچہ جب قسم توڑنے پر کسی واجب کا امتثال اور حرام کا ترک مرتب ہوتا ہو تو تب قسم توڑنا واجب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اس بات کی قسم کھالے کہ وہ با جماعت نماز نہ پڑھے گا تو اب قسم توڑنے پر ایک واجب کا امتثال اور ایک حرام کا ترک موقوف ہے

کیونکہ قسم توڑنے پر وہ با جماعت نماز پڑھے گا جو واجب ہے اور ترک جماعت سے بچے گا جو حرام ہے۔ سو ایسی قسم کا توڑنا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح باقی کی چار صورتوں کو بھی قیاس کر لیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قسمیں کھانے سے نہ تو کوئی شے واجب ہو جاتی ہے اور نہ حرام ہی ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل: "فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا ، فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ" کے الفاظ ہیں۔ پس اگر قسم کسی شے کو حرام کرتی ہوتی یا واجب کرتی ہوتی تو اس کے مقتضا پر عمل کرنا لازم ہوتا۔

◈ اگر آدمی کو قسم کے سوا دوسری بات میں دین و دنیا کی بھلائی زیادہ نظر آتی ہو تو مناسب یہ ہے کہ آدمی اس قسم کو توڑ دے۔ اس کی دلیل: "فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ مفضول سے افضل کی طرف انتقال جائز ہے چاہے آدمی نے مفضول کو متعین ہی کر لیا ہو۔ اس کی دلیل: "كَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ ، وَائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ لازم ہے۔ اس کی دلیل: "كَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ" کے الفاظ ہیں۔

◈ اگر آدمی نے پہلے کسی جگہ تفصیل بیان کر دی ہو تو اسی بات کو کسی دوسرے موقع پر اجمال کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل: "كَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ" کے الفاظ ہیں جو مجمل ہیں کہ یہاں یہ بیان نہیں کہ وہ کفارہ دینا کیونکر ہے کیونکہ اس کو پہلے کسی موقع پر بیان کیا جا چکا ہے اور یہ تفصیل جناب عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو معلوم تھی۔

قسم میں ان شاء اللہ کہنے کا حکم اور اس کی تحقیق

1365- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : ((مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ ، فَقَالَ : إِنْ شَاءَ اللّٰهُ فَلا حِنْثَ عَلَيْهِ)) .
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس نے کسی بات کی قسم اٹھائی اور (اس کے بعد) ان شاء اللہ (بھی) کہہ دیا تو اس پر کوئی حنث لازم نہ آئے گا۔"[1]
اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شــرح :...... مذکورہ حدیث میں دراصل قسم کو رب تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ملانے کا مسئلہ مذکور ہے چاہے مشیت کو قسم سے پہلے لائے یا بعد میں لائے۔ دونوں صورتوں میں اس پر حنث لازم نہ آئے گا۔ پہلے قسم لانے کی مثال جیسے کوئی یہ کہے کہ اللہ کی قسم! میں فلاں کام نہ کروں گا ان شاء اللہ، اور بعد میں قسم لانے کی مثال جیسے: ان شاء اللہ، اللہ کی قسم! میں فلاں کام نہ

---

[1] مسند احمد: 10/2- سنن ابی داؤد: 3261- جامع الترمذی: 1531- سنن النسائی: 9/7- سنن ابن ماجہ: 2105- صحیح ابن حبان: 4340- امام مالک نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے جیسا کہ "التمھید" (374/14) میں ہے اور ابن قیم نے "تھذیب السنن" (63/9) میں اس کی متابعت کی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نافع کے اصحاب نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تک موقوف ذکر کیا ہے۔ دیکھیں: علل الترمذی، ص: 253.

کروں گا۔ان دونوں صورتوں میں حنث لازم نہیں۔یعنی قسم کے خلاف کرنے پر کفارہ نہ آئے گا۔حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس کا ارادہ چاہے تعلیق کا ہو یا تحقیق کا دونوں باتوں کا حکم ایک ہے۔

تعلیق کا ارادہ ہونا تو واضح ہے۔کہ اگر کوئی آدمی اپنی قسم کو رب تعالیٰ کے ارادہ سے معلق کرتا ہے تو حانث ہونے کی صورت میں اس پر کفارہ نہ آئے گا۔لیکن اگر کسی کی مراد ان شاء اللہ کہنے سے اپنے عزم وارادہ کی تحقیق ہو تو اس صورت میں تعلیق کیونکر نفع دے سکتی ہے۔بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا کہ اگر کسی نے ''ان شاء اللہ'' کہنے سے تحقیق کا ارادہ کیا تو یہ استثناء اور شرط لغو ہوگی کیونکہ اس صورت میں قسم اٹھانے والے کا ارادہ اپنی قسم کو رب تعالیٰ کی مشیت کے سپرد کرنا نہیں بلکہ قسم کو اپنے ارادہ کی قوت کے معلق کرنا ہے۔

لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں عموم ہے اس لیے تحقیق یا تعلیق کا ارادہ کرنا دونوں کا حکم ایک ہے اور دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔دوسرے اس لیے بھی کہ کسی بات کو حقیقت بخشنا آدمی کے بس میں نہیں جب تک کہ رب تعالیٰ کا حکم اور اس کی مشیت شامل حال نہ ہو جائے۔

بلاشبہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا قول درستی کے زیادہ قریب ہے جبکہ پہلا قول قواعد کے زیادہ قریب ہے کہ تحقیق مراد لینے والے کی تعلیق لغو ہوگی۔کیونکہ اس نے مشیت کا ذکر صرف تبرک کے طور پر کیا تھا۔لہٰذا قواعد کو دیکھا جائے تو یہ قول زیادہ درست نظر آتا ہے۔لیکن اگر حدیث کے ظاہر کو دیکھا جائے تو شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا قول زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کن الفاظ کے ساتھ قسم اٹھایا کرتے تھے

1366۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَتْ يَمِيْنُ النَّبِيِّ ﷺ: ((لَا، وَمُقَلِّبِ الْقُلُوْبِ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کی قسم یہ ہوتی تھی: "لا ومقلب القلوب" ❶ (خبردار! اس ذات کی قسم جو دلوں کو پلٹنے والی ہے)۔

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح: ...... یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ انہی الفاظ کے ساتھ قسم نہ اٹھایا کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی آپ ﷺ کی قسم کے یہ الفاظ بھی ہوتے تھے۔"وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ" (اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے)۔جبکہ آپ ﷺ سے "وَرَبِّيْ" (میرے پروردگار کی قسم) کے الفاظ بھی منقول ہیں۔تب پھر "كَانَتْ يَمِيْنُ النَّبِيِّ ﷺ" سے مراد "كَانَتْ مِنْ اَيْمَانِ النَّبِيِّ ﷺ" ہوگا۔یعنی آپ ﷺ سے ثابت جملہ قسموں میں سے ایک قسم، ان الفاظ کے ساتھ بھی ہے۔

لَا وَمُقَلِّبِ الْقُلُوْبِ: مذکورہ "لَا" نافیہ نہیں بلکہ تنبیہ کے لیے ہے کیونکہ قسم ''اثبات'' میں ہوتی ہے۔لہٰذا یہ "لَا" اُس "لَا" کی طرح ہوگا جو رب تعالیٰ کے ان ارشادات میں ہے:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (القيامة: 1)

''نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں!۔''

اور فرمایا:

❶ صحيح البخاري: 6628.

﴿لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِo﴾ (البلد: 1) ''نہیں، میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں!۔''

اور فرمایا:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ﴾ (المعارج: 40) ''پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں کے رب کی۔''

مُقَلِّب:...... مراد بندوں کو ان کے ارادوں سے پھیرنے کی قدرت رکھنے والی ذات ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ بندوں کے دلوں کو پلٹ کر ان کے ارادے بدل دیتا ہے۔ تب پھر دلوں کا پلٹنا رب تعالیٰ کی مشیت کے سپرد ہوگا۔ چنانچہ کبھی تو وہ دل کو شر سے خیر کی طرف پلٹ دیتا ہے کبھی خیر سے شر کی طرف پھیر دیتا ہے جس کی علامت اور سبب یہ ہے کہ آدمی حق بات کو ماننے پر آتا ہی نہیں اور کبھی یہ تقلیب تردد کی صورت میں سامنے آتی ہے چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام: 110)

''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے۔''

یعنی یہ لوگ پہلی بار میں ایمان نہ لائے تھے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ کی صفات کی قسم اٹھا سکتے ہیں۔ اس کی دلیل: "لَا وَمُقَلِّبِ الْقُلُوبِ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ صفت رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہو، جیسے دلوں کا پلٹنا، کہ اس بات پر سوائے رب تعالیٰ کے اور کسی کو قدرت حاصل نہیں۔
- علماء نے اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ اگر تو رب تعالیٰ کی صفت صفاتِ معانی میں سے ہے تو اس کی قسم اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر وہ صفت صفاتِ خبریہ میں سے ہے تو اس کی قسم اٹھانا جائز نہیں۔
- جس بات سے ذاتِ باری تعالیٰ کی تعبیر کی جاتی ہو اس کی قسم اٹھانا بھی جائز ہے جیسے عزۃ اللہ، کلام اللہ، کہ ان کلمات کے ساتھ قسم کھانا جائز ہے۔ جبکہ استواء علی العرش کی قسم نہیں اٹھا سکتے کیونکہ استواء یہ رب تعالیٰ کی ذات کی تعبیر نہیں۔ اسی طرح وجہ اللہ کی قسم اٹھا سکتے ہیں پر "ید اللہ" کی قسم نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ چہرہ سے ذات کی تعبیر کی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (القصص: 88) ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، مگر اس کا چہرہ۔''

اور فرمایا:

﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِo﴾ (الرحمن: 27)

''اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے۔''

یمین غموس کبیرہ گناہ ہے

1367- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضي الله عنهما قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا الْكَبَائِرُ؟- فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر کہا کہ: اے اللہ کے رسول! کبائر کیا ہیں؟ (یعنی کون کون سے گناہ کبیرہ ہیں)......

((الْيَمِينُ الْغَمُوسُ وَفِيهِ قُلْتُ : وَمَا الْيَمِينُ الْغَمُوسُ قَالَ : ((الَّتِي يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ، هُوَ فِيهَا كَاذِبٌ)) .

آگے حدیث ذکر ہے، جس میں یہ ارشاد ہے: (ایک کبیرہ گناہ) ''یمین غموس'' (بھی ہے)۔اس حدیث میں یہ (بھی) ہے۔ میں نے عرض کیا: اور (یہ) یمین غموس کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:'' (یہ) وہ قسم (ہے) جس کے ذریعے کسی مسلمان کے مال کو (اس سے) ہتھیایا جائے جبکہ وہ اس قسم میں جھوٹا ہو۔'' ❶

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......أَعْرَابِيٌّ: یہ دیہات میں رہنے والے کو کہتے ہیں۔عموماً ان لوگوں پر جہالت غالب ہوتی ہے۔

مَا الْكَبَائِرُ: یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ سائل جانتا تھا کہ کبائر اور صغائر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔غرض اس نے کبائر کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کون کون سے ہیں۔جس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے متعدد چیزوں کو گنوایا جن میں سے ایک یمین غموس کا بھی ذکر فرمایا۔

رہا یہ سوال کہ کبائر محدود ہیں یا معدود؟ تو ایک قول ان کے محدود ہونے کا، اور ایک ان کے معدود ہونے کا ہے۔ کبائر کی ایک تعریف علماء نے یہ بھی بیان کی ہے کہ ہر وہ فعل جس پر لعنت، غضب، نفی ایمان یا اللہ رسول کی براءت وغیرہ مرتب ہو، وہ کبیرہ گناہ ہے۔شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے کلام میں مذکور ہے کہ ہر وہ فعل جس پر عقوبتِ خاصہ مرتب ہوتی ہو، وہ کبیرہ ہے اور عقوبت خاصہ سے مراد یہی نفی ایمان، لعنت اور غضب وغیرہ ہی ہے۔

الْيَمِينُ الْغَمُوسُ : "غَمُوس": یہ "فَعُوْلٌ" کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔غمس یہ ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ باندھنے کو کہتے ہیں اور یمین غموس کو اس لیے غموس کہتے ہیں کہ یہ پہلے قسم کھانے کو گناہ سے اور پھر بعد میں آتش جہنم سے باندھ دیتی ہے۔

الَّذِي يَقْتَطِعُ ..... هُوَ فِيهَا كَاذِبٌ : نبی کریم ﷺ نے یمین غموس کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ آدمی اس کے ذریعے اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا مال ہتھیا لے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی اس قسم میں جھوٹا ہے۔

الاقتطاع:...... مال ہتھیانا، اس کی دو قسمیں ہیں:

(1) ایسی چیز کا دعویٰ کرنا جو آدمی کی نہ ہو۔ (2) ایسی چیز کا انکار کرنا جو اس کے ذمے واجب ہو۔

یعنی ناحق لینا یا حق دینے سے انکار کرنا یہ دونوں باتیں اقتطاع (مال ہتھیانے) کے زمرے میں داخل ہیں۔

پہلی قسم کی مثال جیسے دوسرے کی گاڑی اپنی ہونے کا دعویٰ کر دینا حالانکہ وہ جانتا بھی ہے کہ یہ گاڑی اس کی نہیں، اور پھر اس پر گواہ بھی قائم کر دے یا حلف اٹھا جائے جس کی بنا پر گاڑی کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیا جائے کہ یہ یمین غموس کہلائے گی جس کی بنا پر اس نے اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے اس کی گاڑی ہتھیا لی ہے۔

دوسری قسم کی مثال جیسے آدمی اپنے ذمے مثلاً کسی کے ایک ہزار روپوں کا انکاری ہو جائے کہ یہ تو میرے ذمے ہیں ہی نہیں اور اس پر قسم بھی کھا جائے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹی قسم اٹھا رہا ہے، کہ یہ بھی یمین غموس ہے جس کے ذریعے وہ کسی

❶ صحيح البخاري: 692.

کے ایک ہزار روپے دبا رہا ہے اور ان کو دینے سے انکار کر رہا ہے۔
مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کا علم حاصل کرنے کے بے حد حریص ہوتے تھے۔
- معلوم ہوا کہ گناہوں میں تفاوت ہے، چنانچہ کوئی کبیرہ ہے تو کوئی صغیرہ۔
- وہ یمین غموس کبائر سے ہے جس کے ذریعے کسی دوسرے مسلمان بھائی کا مال ہتھیا لیا جائے۔
- اسی طرح اگر کسی نے کسی ذمی، معاہد یا مستامن کافر کا مال بھی یمین غموس کے ذریعے ہتھیا لیا تو یہ کبیرہ گناہ ہوگا۔ تب پھر مسلمان کا ذکر اغلب کے اعتبار سے ہے، وگرنہ جس کی بھی جان مال محفوظ ہے وہ مسلمان جیسا ہے۔
- مبہم بات کے بارے پوچھ لینا چاہیے تاکہ آدمی اس کے برخلاف کوئی بات نہ سمجھ بیٹھے۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یمین غموس کا ذکر فرمانے پر اس اعرابی نے پوچھ لیا کہ اس سے کیا مراد ہے۔

یمین لغو کا بیان

1368۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا فِيْ قَوْلِهِ تَعَالَى : ﴿لا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ﴾ قَالَتْ : هُوَ قَوْلُ الرَّجُلِ : لا وَاللّٰهِ ، وَبَلَى وَاللّٰهِ .

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ (البقرة: 225) ''اللہ تمھیں تمھاری قسموں میں لغو پر نہیں پکڑتا۔'' کی تفسیر میں منقول ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: یہ آدمی کا (موقع بے موقع) "لا وَاللّٰه"، (اور) "بَلَى وَاللّٰه" کہنا ہے۔ [1]

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ ، وَرَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ مَرْفُوْعًا .

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابو داؤد نے اس حدیث کو مرفوعاً روایت کیا ہے۔

روایت الحدیث :...... امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے موقوفاً جبکہ امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع روایت کی ہے۔ یہ حدیث موقوف ہو یا مرفوع بہر حال حجت ہے۔ کیونکہ اگر تو یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے تو یہ تفسیر القرآن بالسنہ کی قبیل میں سے ہوگی اور اگر یہ حدیث سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے تو یہ تفسیر القرآن بقولِ الصحابی کی قبیل میں سے ہوگی اور قولِ صحابی کی بابت صحیح قول یہ ہے کہ اگر وہ کتاب وسنت کے یا کسی اور صحابی کے قول کے مخالف نہ ہو تو وہ حجت اور مقبول ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ یمین لغو وہ ہوتی ہے جس کے عقد کا آدمی نے قصد نہ کیا ہو اور وہ بلا قصد وارادہ آدمی کی زبان پر جاری ہوگئی ہو۔ جیسے "لا وَاللّٰه"، یا "بَلَى وَاللّٰه" کہہ دینا کہ یہ یمین لغو ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے اس قسم کو قرار دیا ہے جو آدمی قصد وارادہ سے قائم کرتا ہے۔ لہٰذا بلا ارادہ منہ سے نکلی قسم لغو ہوگی۔

---

[1] صحيح البخاري: 6663۔ سنن ابی داؤد: 3254 .

◈ تب پھر جن قسموں کا مواخذہ ہوگا یہ وہ قسمیں ہیں جن کو قصد وارادہ سے قائم کیا ہے۔

رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ

1369۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اسْمًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک رب تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو شمار (کر کے یاد) کرلیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَسَاقَ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ الْأَسْمَاءَ، وَالتَّحْقِيْقُ أَنَّ سَرْدَهَا إِدْرَاجٌ مِنْ بَعْضِ الرُّوَاةِ.

(آگے امام موصوف فرماتے ہیں) اور امام ترمذی اور امام ابن حبان نے ان اسماء حسنیٰ کو ذکر کیا ہے۔ پر تحقیقی بات یہ ہے کہ (مذکورہ روایت میں) ان اسماء کو ذکر کرنا بعض رواۃ کی طرف سے ادراج ہے۔ [2]

غریب الحدیث :...... إِنَّ لِلّٰهِ: یاد رہے کہ رب تعالیٰ کی ذات ''وتر'' ہے اور اسے ''وتر'' محبوب ہے۔ اسی لیے رب تعالیٰ کے نام بھی تعداد میں ''وتر'' ہیں۔

تِسْعًا وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا: یہ نام ننانوے ہیں۔ لیکن یہ کون کون سے نام ہیں، روایات میں ان کو مبہم رکھا گیا ہے تاکہ آدمی ان ناموں کے اکٹھا کرنے، شمار کرنے اور یاد کرنے میں خوب کوشش کرے۔

مَنْ أَحْصَاهَا: ''اَحْصَى'' شمار کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد ان کی تعداد کو شمار کرنا ہے۔ کیونکہ إحصاء کا لفظ تعداد کے شمار میں اصل ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَحْصَى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ (الجن: 28)

''اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔''

البتہ اسماء حسنیٰ کی تعداد پوری کرنے کے بعد ان کے معانی کا ادراک بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جو لوگ صرف نام اکٹھے اور یاد کر لیتے ہیں جبکہ ان کے معانی یاد نہیں کرتے تو گویا کہ انہوں نے رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو پایا ہی نہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے قرآنِ کریم کا معنی نہ سمجھنے والوں کو اُمی کے وصف کے ساتھ پکارا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ (البقرۃ: 78)

''اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں، جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے چند آرزوؤں کے۔''

---

[1] صحيح البخاري: 6410- صحيح مسلم: 2677.

[2] جامع الترمذي: 3507- سنن ابن ماجه: 3861- صحيح ابن حبان: 808- علامہ بوصیری رحمہ اللہ ''الزوائد'' میں فرماتے ہیں: ائمہ ستہ میں سے کسی نے اس طریق سے یا کسی اور طریق سے اسمائے حسنیٰ کو روایت نہیں کیا سوائے امام ابن ماجہ کے اور امام ترمذی نے تقدیم و تاخیر کے ساتھ ان اسماء کو روایت کیا ہے اور امام ترمذی کا طریق اس باب میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔

امانی سے مراد قراءت ہے۔ یعنی یہ امی لوگ سوائے قرآن پاک کے پڑھنے کے اس کے معانی کو نہیں جانتے۔ لہٰذا جس نے اسمائے حسنیٰ کو شمار تو کر لیا لیکن وہ ان کے معانی نہیں جانتا تو وہ ان کو شمار کرنے والا شمار نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے حق میں ان اسمائے حسنیٰ کا یاد کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔

رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے احصاء کا تیسرا پہلو ان اسماء کے مقتضٰی کے مطابق رب تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔ چنانچہ جب ایک آدمی جانتا ہے کہ رب تعالیٰ کا ایک نام سمیع بھی ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس اسم مبارک کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات ہر چھوٹی بڑی بات کو سن لیتی ہے تو اب سمیع کے معنی کی معرفت کا مقتضٰی یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ایک بات بھی نہ کہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کے اسم مبارک بصیر کو یاد کرنے اور اس کے معنی کی معرفت کا مقتضٰی یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کی ناراضی والا کوئی معمولی سا فعل بھی نہ کرے، نہ خلوت میں نہ جلوت میں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ نہیں۔

دَخَلَ الْجَنَّةَ: غرض جب بندہ رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے احصاء کے یہ تین مراتب حاصل کر لے گا تو اسے اس کا نہایت قیمتی بدلہ ملے گا، وہ یہ کہ رب تعالیٰ اسے اپنی جنت میں داخل فرمائیں گے اور یہ بات بدیہی ہے کہ اتنا بڑا انعام محض رب تعالیٰ کے ناموں کو شمار کرنے سے حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ انعام اسمائے حسنیٰ کے معانی کی معرفت اور ان کے مقتضٰی پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوگا۔

غرضِ حدیث: ......امام موصوف کے اس مقام پر یہ حدیث لانے کی غرض یہ بتلانا ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے جس نام کی بھی قسم کھائے، یہ جائز ہے۔

اب مناسب تو یہ تھا کہ امام موصوف اس حدیث کو "كَانَتْ يَمِينُ النَّبِيِّ ﷺ: لَا وَمُقَلِّبِ الْقُلُوبِ" والی حدیث کے بعد ذکر فرماتے۔ لیکن لکھتے وقت بسا اوقات آدمی کے ذہن سے ترتیب کا ذہول ہو جایا کرتا ہے۔

وَالتَّحْقِيقُ: اس کے بعد امام موصوف بیان فرماتے ہیں کہ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے ان ناموں کو شمار کیا ہے۔ لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ کسی راوی کا ادراج ہے۔

ادراج:

یہ کسی راوی کا حدیث کے متن میں بنا جتلائے اپنا کلام درج کر دینے کو کہتے ہیں۔ ادراج کا حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے سوائے اس کے اس کلام کا تعلق متعلقہ حدیث کی تفسیر وغیرہ سے ہو۔ وگرنہ بنا جتلائے رسول اللہ ﷺ کے کلام میں اپنا کلام شامل کر کے بیان کرنا جائز نہیں۔

ادراج کی غرض:

یا تو راوی اس لیے ادراج کرتا ہے کہ کسی دوسرے مقام پر اس نے حدیث کو بنا ادراج کے بھی روایت کیا ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قدر کلام مدرج ہے۔ یا پھر وہ راوی تفسیر کی غرض سے وہ کلام لاتا ہے۔ جیسے امام زہری رحمہ اللہ نے غارِ حرا والی حدیث میں "يتحنث" کا معنی "تعبد" بیان کیا ہے۔ چونکہ انہوں نے ایسا حدیث کی شرح بیان کرنے کی غرض سے کیا ہے، اس لیے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

نیکی کرنے والے کے لیے خیر کی دعا کرنا

1370- وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ، فَقَالَ لِفَاعِلِهِ: جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ أَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ)).

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس کے ساتھ نیکی کی گئی اور اس نے (اپنے ساتھ) نیکی کرنے والے کو "جزاك الله خيرا" (اللہ تمہیں اس نیکی کا بہتر بدلہ دے) کہا تو اس نے (اس نیکی کی اور نیکی کرنے والے کی) تعریف کرنے میں (خوب) مبالغہ کیا۔'' (یعنی اس کی خوب تعریف کر دی)۔ ❶

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح:...... شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام موصوف رحمہ اللہ اس حدیث کو مذکورہ باب کے تحت کس بنا پر لائے ہیں وہ وجہ مجھ پر واضح نہیں ہو سکی۔

غریب الحدیث:...... مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ: چاہے وہ نیکی بدنی ہو یا مالی، یا وہ نیکی اپنے عہدہ ومنصب کے واسطہ سے کی ہو، اور چاہے اس کا تعلق تملیک سے ہو یا کسی منفعت کے انتفاع سے ہو، غرض جس آدمی نے بھی کسی دوسرے کے ساتھ جس شکل میں بھی نیکی کی ہے تو اب وہ دوسرا اس بات کا مامور ہے کہ وہ اس نیکی کا اسی کے مناسب بدلہ دے۔

اب کوئی تو اسی طرح کا بدلہ دے سکتا ہے اور کوئی بدلے میں صرف دعا ہی دے سکتا ہے۔ کہ یہ دعا دینا بھی نیکی کا بدلہ دینا ہے، اور انہی دعاؤں میں سے ایک دعا دوسرے کو "جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا" کہنا ہے۔ کہ اللہ تمہیں تمہاری اس نیکی کا اس سے بہتر بدلہ دے اور یہ دعا دینے والے نے گویا اس کی نیکی کی مبالغہ کی حد تک تعریف کر دی ہے۔

تنبیہ:...... فی زمانہ دوسروں کی نیکی پر انہیں دعا دینے کے لیے متعدد کلمات ایجاد کر لیے گئے ہیں، جیسے مہربانی، شکریہ، تھینکس، ویل کم، او کے وغیرہ، یاد رہے کہ ان سب سے افضل، اکمل اور مشروع کلمہ دوسرے کو "جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا" کہنا ہے۔

نذر یعنی منت ماننے کا حکم

1371- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ نَهَى عَنِ النَّذْرِ، وَقَالَ: ((إِنَّهُ لَا يَأْتِي بِخَيْرٍ وَإِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ: ''نذر خیر نہیں لاتی، (ہاں) اس کے ذریعے تو صرف بخیل سے ہی مال نکلوایا جاتا ہے۔'' ❷

---

❶ جامع الترمذی: 2035- امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن، جید اور غریب ہے۔ صحیح ابن حبان: 3413- السنن الکبری للنسائی: 10008- علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں ''ترمذی'' کا لفظ ساقط ہے۔ علامہ طبرانی نے "المعجم الصغیر" (291/2) میں اس حدیث کو مختصر روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ جیسا کہ "علل الترمذی" (ص: 316) میں ہے۔

❷ صحیح البخاری: 6608- صحیح مسلم: 1639.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :......نَهَى عَنِ النَّذْرِ: نذر کالغوی اور اصطلاحی معنی بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ آدمی کا اپنے اوپر ایک غیر لازم شے کولازم کرنے کا نام ہے۔ بہا ہے اسے نذر کے لفظ سے خود پر لازم کیا جائے یا عہد وغیرہ کے لفظ سے کہ دونوں کا حکم ایک ہے۔

اس لیے نذر کی ایک تعریف یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہ مکلف کا اپنے اوپر ایک غیر واجب طاعت کولازم کرنے کا نام ہے اور یہی وہ نذر ہے جس کا پورا کرنا واجب ہے۔

مذکورہ حدیث میں نذر ماننے کی ممانعت آئی ہے اور نہی میں اصل تحریم ہے اسی لیے بعض علماء کا یہ قول ہے کہ نذر ماننا سرے سے جائز ہی نہیں ہے چاہے وہ مطلق ہو یا معلق اور مباح ہو یا غیر مباح

مطلق نذر کی مثال جیسے کوئی یہ کہے کہ: ''میں تین دن کے روزے رکھوں گا'' اور کوئی قید بیان نہ کرے کہ کب رکھے گا تو اسے مطلق نذر کہیں گے۔

معلق نذر کی مثال جیسے کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ نے میرے مریض کو شفا دے دی تو میں تین دن کے روزے رکھوں گا۔ کہ یہ معلق نذر کی مثال ہے اور اگر نذر غیر عبادت کی مانی ہے تو اسے مباح نذر کہیں گے اور اگر وہ غیر طاعت کی ہے تو غیر مباح نذر کہلائے گی اور اگر کسی معصیت کی ہے تو حرام ٹھہرے گی۔

مکلف کی قید سے یہ مستفاد ہوا کہ نابالغ کی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں کیونکہ وہ وجوب کا اہل نہیں۔ چنانچہ جب اس پہ واجب عبادات غیر واجب ہیں تو ایک غیر واجب فعل کیونکر واجب ہوسکتا ہے۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ نذر کی پانچ اقسام ہیں:

(1) نذر طاعت　　(2) نذر معصیت　　(3) نذر مباح

(4) نذر یمین　　(5) بے نام نذر

ذیل میں اختصار کے ساتھ سب کا حکم بیان کیا جاتا ہے:

اوّل:......نذرِ طاعت جیسے کسی نے سوموار کے دن روزہ رکھنے کی منت مانی۔ یہ نذر طاعت ہے کیونکہ روزہ عبادت ہے۔ چاہے یہ کسی شرط کے ساتھ معلق ہو یا مطلق، دونوں طرح جائز ہے لہٰذا معلق نذر کی صورت میں جب بھی شرط پائی گئی، اس نذر کا پورا کرنا واجب ہوگا جیسے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ نے میرے مریض کو شفا دی تو میں تین دن کے روزے رکھوں گا۔ تو جب بھی وہ مرض جاتا رہے گا نذر ماننے والے پر تین دن کے روزے واجب ہو جائیں گے۔

نذرِ طاعت کا حکم یہ ہے کہ اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ: ''جس نے اللہ کی طاعت کی نذر مانی تو وہ اللہ کی طاعت کرے ❶ (یعنی وہ نذر پوری کرے)۔''

دوم: .....معصیت کی نذر: جیسے کوئی شراب خریدنے کی نذر مانے یا اس کے پینے کی نذر مانے تو یہ نذرِ معصیت کہلائے گی جو حرام ہے، اس کا پورا کرنا جائز نہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے کہ: ''اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی تو وہ اللہ کی

❶ یہ حدیث آگے آرہی ہے۔

نافرمانی نہ کرے" (یعنی اس نذر کو پورا نہ کرے)۔

سوم:......نذرِ مباح: جیسے یہ نذر ماننا کہ:"آج رات میں سفید لباس پہنوں گا" یہ مباح نذر ہے۔ کیونکہ سفید لباس پہننا یا نہ پہننا دونوں باتیں مباح ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی گناہ نہیں اور جس بات کا عدم اور وجود دونوں جائز ہوں وہ امر مباح کہلاتا ہے۔ ایسی نذر کے حکم کی بابت علماء کا یہ قول ہے کہ آدمی کو وہ نذر پوری کرنے اور اس کا کفارہ دے دینے میں اختیار ہو گا۔ یعنی چاہے تو سفید لباس پہن کر نذر پوری کر دے اور چاہے تو نذر پوری نہ کرے بلکہ اس کا کفارہ دے دے۔

چہارم:......نذرِ یمین: یہ وہ نذر ہے جس سے مراد یمین ہو۔ جیسے یہ کہنا کہ: اگر میں نے فلاں سے بات کی تو مجھ پر اللہ کے لیے تین روزے ہوں گے۔ کہ یہ "اللہ کی قسم! میں فلاں سے بات نہ کروں گا" کہنے کے بمنزلہ ہے۔ کیونکہ اس کلام سے نذر ماننے والے کا قصد اللہ کی عبادت نہیں بلکہ خود پر اس بات کو لازم کرنا ہے کہ وہ فلاں سے بات نہ کرے گا۔

یہاں بھی نذر اور کفارۂ یمین کے درمیان اختیار ہے۔

پنجم:...... بے نام قسم: جیسے کوئی یہ کہے کہ:"میں نے نذر مانی" اور یہ بیان نہ کرے کہ کس بات کی نذر مانی۔ علماء نے ایسی نذر کا نام "بے نام نذر" رکھا ہے۔ ایسی نذر کا حکم یہ ہے کہ اس پر کفارۂ یمین واجب ہوگا۔

اس تفصیل کے بعد ہم ایک بار پھر حدیث الباب کی طرف لوٹتے ہیں:

أَنَّـهُ نَهَـى عَنِ النَّذْرِ: یہ ممانعت نذر کی مذکورہ ان پانچوں قسموں کو شامل ہے۔ حتیٰ کہ یہ نذرِ طاعت کو بھی شامل ہے۔ تو جب حدیث میں نذر ماننے کی ممانعت آ گئی تو نذر کو سنت کہنا بے محل ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ قُلْ لَا تُقْسِمُوْا﴾ (النور: 53)

"اور انھوں نے اللہ کی قسمیں کھائیں، ایسی پختہ قسمیں کہ اگر واقعی تو انھیں حکم دے تو وہ ہر صورت ضرور نکلیں گے، تو کہہ قسمیں نہ کھاؤ۔"

لہٰذا بعض علما کا یہ قول فاسد ہوگا کہ نفل کی نذر مان لینا مناسب ہے تا کہ وہ ذمے میں لازم یعنی واجب ہو جائے۔ بے شک، یہ قول اس ارشاد باری تعالیٰ کے مخالف ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ عبادات کو بدون اکراہ واجبار کے اپنی مرضی سے کرو۔ تب، پھر ان علماء کا یہ قیاس اور تاویل فاسد ٹھہرے گی۔ کیونکہ رب تعالیٰ تو یہ آگے فرماتے ہیں:

﴿طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ﴾ (النور: 53) "جانی پہچانی ہوئی اطاعت (ہی کافی ہے)۔"

یعنی تم پر بدون یمین کے اور بدون اکراہِ نفس کے معروف طاعت کرنا لازم ہے۔

دوسرے مذکورہ حدیث میں نذر ماننے کی صریح نفی بھی آ گئی۔ بخدا اگر ہمارے علم میں یہ بات نہ ہوتی کہ اس قول کے قائل علماء حضرات مجتہدین ہیں اور اس قول سے ان کا مقصود صرف بیانِ حق ہی تھا گو وہ اس قول میں خطا کر گئے ہیں، تو ہم انہیں ضرور گنہگار کہتے۔ لیکن الحمد للہ کہ اس امت کے خطا کرنے والے مجتہدین بھی ماجور ہیں اور ان کی خطا مغفور ہے۔

إِنَّـهُ لَا يَـأْتِـي بِـخَيْـرٍ: یہ ممانعت کی علت کا بیان ہے کہ نذر ماننے کا منشا یا تو خیر کا حصول ہوتا ہے یا پھر شر کا اندفاع مطلوب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے اس امر کو واضح فرما دیا کہ نذر قضا کو لوٹا نہیں سکتی اور نہ قضا لا ہی سکتی ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو خیر کو لاتی اور شر کو دور کرتی ہے۔ نذر ماننے سے نہ تو شفاء کا حصول متیقن ہے اور نہ مطلوب

کا حصول ہی یقینی ہے۔

إِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ: ہاں یہ ضرور ہے کہ جو بخیل ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر راضی نہیں ہوتا، وہ اپنے کسی محبوب کے مرض کی طوالت سے مضطر ہو کر کچھ خرچ کرنے کی یا اللہ کی راہ میں کچھ دینے کی نذر مان لیتا ہے۔ یوں نذر کی وجہ سے ایک بخیل اِنفاق پر مضطر ہو جاتا ہے اور جو پھوٹی کوڑی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، نذر اس سے بھی مال نکلوا لیتی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نذر ماننا منع ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ ممانعت اور نہی کراہت کی ہے نہ کہ تحریم کی۔ البتہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تحریم کی طرف مائل ہیں [1] اور صاحب "سبل السلام" نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے [2] اور قوی قول تحریم کا ہی ہے۔

◈ نذر قضا کو نہیں لوٹاتی اور نہ خیر کو کھینچ ہی لاتی ہے۔ اس کی دلیل: "إِنَّهُ لا يَأْتِي بِخَيْرٍ" کے الفاظ ہیں۔

◈ بخیل کی مذمت: اس کی دلیل: "إِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ البَخِيلِ" کے الفاظ ہیں۔ بخل ایک بری اور مذموم صفت ہے اس سے بچنا واجب ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بخل سے جان چھڑانے کے لیے الل ٹپ خرچ کرنے لگے، جو اسراف اور تبذیر کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی کا اِنفاق اور خرچ کرنا بخل اور تبذیر و اسراف کے بین بین ہو۔

نذر کا کفارہ

1375-1372۔ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((كَفَّارَةُ النَّذْرِ كَفَّارَةُ يَمِينٍ)).

رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ فِيهِ ((إِذَا لَمْ يُسَمِّهِ)).

وَصَحَّحَهُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''نذر کا کفارہ (وہی ہے جو) یمین کا کفارہ ہے۔'' [3]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: ''جبکہ وہ نذر کا نام نہ لے۔'' [4]

اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :...... كَفَّارَةُ النَّذْرِ: النذر کے الف لام میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ عموم کے لیے ہے یا نذرِ معین کے لیے۔ صحیح قول یہ ہے کہ یہ الف لام نذرِ معین کے لیے ہے اور اگر اسے عموم کے لیے مان بھی لیا جائے، تب بھی اس میں سے طاعت کی نذر کی تخصیص ہے کہ اس کے کفارہ میں یمین کا کفارہ کافی نہیں۔ بلکہ طاعت کی نذر میں اس طاعت کو ہی بجا لانا لازم ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے کہ: ''جس نے رب تعالیٰ کی طاعت کی نذر مانی تو وہ اس طاعت کو بجا لائے۔''

كَفَّارَةُ يَمِينٍ: حدیث کا ظاہر عموم کو مقتضی ہے۔ جو ہر قسم کی نذر کو شامل ہے لیکن جامع ترمذی کی روایت میں بے نام نذر کی تخصیص ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ ''مجھ پر اللہ کے لیے نذر ہے'' اور خاموش ہو جائے اور یہ بیان نہ کرے کہ اللہ کے لیے اس کے ذمہ کس بات کی نذر ہے۔ تو ایسی قسم میں یمین والا کفارہ آئے گا اور شاید اس میں حکمت نذر کے احترام کی ہے تا کہ کوئی

---

[1] الفتاوى: 354/35. [2] سبل السلام: 113/4-114. [3] صحيح مسلم: 1645.

[4] جامع الترمذي: 1528- سنن ابن ماجه: 2127- امام نووی رحمہ اللہ نے "المجموع" (350/8) میں اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

دوبارہ ایسی نذر نہ مانے اور نہ بات بات پر نذر مانتا پھرے۔

فائدہ:......اور کسی نے بے نام نذر مانی تو اس کے ذمہ یمین کے کفارہ والا کفارہ آئے گا۔

گناہ کی اور بساط سے باہر کسی کام کی نذر ماننے کا حکم

1376- وَلِأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما مَرْفُوْعًا: ((مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ ، وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا فِيْ مَعْصِيَةٍ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ ، وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَا يُطِيْقُهُ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ)).

سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ: ''جس نے کوئی بے نام نذر مانی تو اس کا کفارہ (وہی ہے جو) یمین کا کفارہ ہے، اور جس نے کسی گناہ کی بات کی نذر مانی تو اس کا کفارہ (بھی وہی ہے جو) یمین کا کفارہ ہے، اور جس نے کسی ایسی بات کی نذر مانی جو اس کے بس میں نہیں تو اس کا کفارہ (بھی وہی ہے جو) یمین کا کفارہ ہے۔'' [1]

وَإِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ إِلَّا أَنَّ الْحُفَّاظَ رَجَّحُوْا وَقْفَهُ.

اس حدیث کی اسناد صحیح ہے البتہ حفاظِ حدیث نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ نَذَرَ ..... كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ: یہاں تک کی عبارت گزشتہ مذکورہ جامع ترمذی کی روایت کی شاہد ہے جس میں بے نام نذر کی قید مذکور ہے۔

وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا فِيْ مَعْصِيَةٍ ......: یعنی جس نے گناہ کی کسی بات کی نذر مانی، اسے اس نذر کا پورا کرنا حلال اور جائز نہیں کیونکہ گناہ کی بات پر عمل کرنا شرعاً منع ہے۔ چاہے اس معصیت کا تعلق ترکِ واجب سے ہو یا ارتکابِ محرم سے ہو، دونوں کا حکم ایک ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی نے گناہ کی نذر مان لی جیسے یہ نذر ماننا کہ ''میں جمعہ نہ پڑھوں گا'' تو اس پر اس نذر کو توڑ کر جمعہ پڑھنا واجب ہوگا اور وہ اس نذر کا کفارہ، یمین والا دے گا۔

وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَا يُطِيْقُهُ ......: مراد کسی ناممکن بات کی نذر ماننا ہے جیسے یہ نذر ماننا کہ ''میں آسمان پر چڑھوں گا۔'' بلاشبہ یہ نذر ایک ناممکن بات کی ہے۔ ایسا آدمی بھی قسم والا کفارہ دے کر اس نذر کو توڑ دے گا۔ کیونکہ ایسی نذر پوری کر سکنے کا انتظار کرنا بے سود ہے۔

کفارۂ یمین:

یہ کفارہ کیا ہے؟ رب تعالیٰ نے اس کو سورۂ مائدہ کی اس آیت میں بیان کیا ہے:

﴿فَكَفَّارَتُهٗٓ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ أَهْلِيْكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ﴾

(المائدۃ: 89)

''تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، درمیانے درجے کا، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک گردن آزاد کرنا۔''

---

[1] سنن ابی داؤد: 3322۔ سنن ابن ماجہ: 2128۔ ابن حزم نے "المحلی" (6/8) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے جبکہ "مصنف ابن ابی شیبۃ" (69/3) میں یہ روایت موقوف ہے اور یہی زیادہ درست قول لگتا ہے جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباری" (587/11) میں کہا ہے۔

اس کفارہ میں تین چیزوں کا ذکر ہے:

(1) دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا دینا کہ یہ سب سے اسہل ہے، اس لیے رب تعالیٰ نے پہلے اس کو ذکر فرمایا۔

(2) وگرنہ دس مسکینوں کو لباس دینا، یہ بہ نسبت عتقِ رقبہ کے سہل ہے۔

(3) وگرنہ ایک گردن کو آزاد کرنا۔

اور یہ علی سبیل التخییر ہے کہ آدمی تینوں باتوں میں سے جس کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ عتقِ رقبہ، یہ اطعام یا کسوۃ کے مساوی کیونکر ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جب کھانا اور کپڑا غلام سے بھی مہنگا ہوگا اور دوسرا جواب یہ ہے کہ عتق رقبہ کے کفارہ ہونے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حرمت یمین کو توڑنے میں اپنی جان کے مثل کے ساتھ فدیہ دینا ہی لازم تھا لیکن رب تعالیٰ نے بندوں پر تخفیف فرمائی اور کھانے اور کپڑے کو عتق رقبہ کے مساوی قرار دے دیا۔

اور اگر کسی کو یہ تینوں باتیں میسر نہ ہوں تو وہ تین دن کے روزے رکھے جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت میں ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ بے نام نذر صحیح ہے۔ کیونکہ اس پر ایک شرعی حکم یعنی کفارہ کا دینا مرتب ہے۔ کیونکہ جو کام صحیح نہیں ہوتا، اس پر کوئی شرعی حکم بھی مرتب نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف منع ہوتا ہے۔ اس کی دلیل: "فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ معصیت کی نذر منعقد تو ہو جاتی ہے لیکن اس کو پورا کرنا جائز نہیں ہوتا۔ تب پھر وہ اس کا کفارہ دے گا اور جب بے نام نذر کا کفارہ ہے تو گناہ کی نذر کا کفارہ تو بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

◈ ہوائے نفس پر رب تعالیٰ کی طاعت مقدم ہے۔ اس کی دلیل: "فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ" کے الفاظ ہیں۔

◈ ناممکن بات کی نذر بھی منعقد ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل بھی: "فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ" کے الفاظ ہیں۔

◈ قوت و طاقت مختلف لوگوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ چنانچہ کوئی بات کسی کے حق میں ناممکن ہوتی ہے، مگر کسی دوسرے کے حق میں وہی بات ممکن ہوتی ہے۔

◈ ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: 286)

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔''

اس حدیث کا شاہد ہے۔

گناہ کی نذر کا حکم

1377۔ وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رضي الله عنها: ((وَمَنْ نَذَرَ أَنْ يَعْصِيَ اللّٰهَ فَلَا يَعْصِهِ)).

صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: ''اور جس نے اس بات کی نذر مانی کہ وہ رب تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا تو وہ رب تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے۔'' [1]

---

[1] صحيح البخاري: 6700.

وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ عِمْرَانَ ﷺ ((لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةٍ)).

اور صحیح مسلم میں حضرات عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ: ''گناہ کی نذر میں (اس کو) پورا کرنا نہیں ہے۔''❶ (یعنی اسے پورا کرنے کا حکم نہیں)

شرح :......ان دونوں روایات کو لانے کا فائدہ اس بات کی تصریح کرنا ہے کہ معصیت اور گناہ کی نذر پوری کرنا جائز نہیں کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی گزشتہ روایت کی بابت کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں معصیت کرنے یا کفارہ دینے میں بظاہر تخییر لگتی ہے۔ لیکن اس روایت میں منع کی تصریح واضح کرتی ہے کہ گناہ کی نذر پوری کرنا جائز نہیں۔ لہٰذا ہوائے نفس کو رب تعالیٰ کی رضا پر مقدم کرنا جائز نہ ہوگا۔

اور صحیح مسلم کی روایت میں مذکورہ "لا" نفی جنس کا ہے جو نہی کے معنی میں ہے۔ لہٰذا تقدیری عبارت "لَا تُوفُوْا بِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةٍ" ہوگی۔ یعنی ''تم گناہ کی نذر کو پورا نہ کرو۔'' دوسرے صحیح مسلم کی یہ روایت مذکورہ صحیح بخاری کی روایت کا شاہد بھی ہے۔

بیت اللہ تک پیدل جانے کی نذر ماننے کا حکم

1376- وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ ﷺ قَالَ: نَذَرَتْ أُخْتِي أَنْ تَمْشِيَ إِلَى بَيْتِ اللّٰهِ حَافِيَةً، فَأَمَرَتْنِي أَنْ أَسْتَفْتِيَ لَهَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَفْتَيْتُهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((لِتَمْشِ وَلْتَرْكَبْ)).

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میری بہن نے بیت اللہ تک ننگے قدموں چل کر جانے کی نذر مان لی۔ چنانچہ اس نے مجھے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ سے ان (کی اس نذر) کے بارے فتویٰ پوچھوں۔ سو میں نے نبی کریم ﷺ سے فتویٰ پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ (بیت اللہ تک کے اس سفر میں کچھ) چل (بھی) لے اور (کچھ) سوار (بھی) ہو لے۔''❷

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث :......نَذَرَتْ أُخْتِي: اس روایت میں حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی اس بہن کا نام مذکور نہیں۔ البتہ ان کا نام جاننا ضروری بھی نہیں۔

حَافِيَةً: ننگے پیر: یعنی انہوں نے ننگے پیروں بیت اللہ تک چل کر جانے کی نذر مانی اور اس کا سبب واللہ اعلم! ایسا کرنے سے حاصل ہونے والی مشقت کے ذریعے رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا تھا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھی تھیں کہ جتنی زیادہ مشقت ہوگی، اتنا زیادہ رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اس لیے وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے ننگے پیروں چل پڑیں۔

اب اس نذر کے تین پہلو ہیں:

(1) بیت اللہ جانے کا قصد، چاہے حج کا قصد تھا اور چاہے عمرہ کا، بلاشبہ یہ طاعت کی نذر ہے جس کا پورا کرنا واجب ہے۔

(2) اپنے شہر سے مکہ مکرمہ جانے کا قصد، بلاشبہ یہ طاعت کی نذر نہیں ہے۔ بلکہ اس نذر کا معصیت کی نذر ہونا اقرب ہے کیونکہ اس میں خود کو بلاوجہ تھکانا اور مشقت میں ڈالنا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

❶ صحيح مسلم: 1641.

❷ صحيح البخاري: 1866- صحيح مسلم: 1644.

(3) ننگے قدموں چلنے کی نذر ماننا، یہ نذر بھی معصیت کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ اس میں خود کو مشقت میں ڈالنا ہے اور اپنے ننگے پیروں کو کیل کانٹوں پر پیش کرنا بھی ہے جو پیروں کی ایذاء کا سبب ہیں۔

تب پھر نبی کریم ﷺ نے اس منت کے معروف کو تو برقرار رکھا جبکہ اس کے منکر پر انکار فرمایا۔ وہ یوں کہ ان کے بیت اللہ تک جانے کی نذر کو تو صحیح قرار دیا جبکہ اس نذر کے باقی حصوں پر انکار فرمایا۔

لِتَمْشِ وَلْتَرْكَبْ: ان دونوں کلمات میں لام ''لام امر'' ہے۔ البتہ اس کے وجوب یا اباحت کے لیے ہونے میں اختلاف ہے۔ سو ''لْتَرْكَبْ'' میں لام تو اباحت کے لیے ہے کیونکہ انہوں نے ننگے پیر چلنے کی نذر مانی تھی۔ جبکہ ''لِتَمْشِ'' کا کلمہ یہ نذر کے مطابق ہے۔ البتہ ہم دونوں جگہ کے لام کو اباحت کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اس عورت کے لیے یہ نذر مان لینے کے باوجود بھی پیدل چلنا بھی مباح ہے جبکہ سوار ہو کر جانا بھی مباح ہے اور دونوں کا یہ لام طلب کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی کبھی تو وہ سوار ہو اور کبھی پیدل چلے۔ تب پھر حاجت نہ ہونے کی صورت میں وہ پیدل چلے گی اور حاجت کی صورت میں سوار ہو گی کیونکہ اس میں اس نذر کو پورا کرنے کی طاقت نہیں۔

وَلِأَحْمَدَ وَالْأَرْبَعَةِ: فَقَالَ: ((إِنَّ اللّٰهَ لَا يَصْنَعُ بِشَقَاءِ أُخْتِكَ شَيْئًا، مُرْهَا فَلْتَخْتَمِرْ، وَلْتَرْكَبْ، وَلْتَصُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ)).

اور مسند احمد کی اور ائمہ اربعہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کے استفتاء کے جواب میں یہ) ارشاد فرمایا: ''بے شک رب تعالیٰ کو تیری بہن کے مشقت اٹھانے سے کوئی واسطہ نہیں، اسے کہو کہ وہ (سر پر) اوڑھنی بھی لے، اور سوار بھی ہو اور (اس نذر کے کفارے میں) تین دن کے روزے بھی رکھے۔'' ❶

غریب الحدیث :...... فَلْتَخْتَمِرْ: گزشتہ روایت میں یہ الفاظ مذکور نہیں۔ واللہ اعلم کہ امام موصوف نے ایک جگہ سے ان الفاظ کو اس لیے حذف کیا ہے کہ دوسرا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے پس پہلی روایت سے یہ الفاظ حذف ہیں کہ: ''اس نے ننگے سر چلنے کی نذر مانی ہے۔'' اسی لیے جواب میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: کہ وہ اپنے سر پر اوڑھنی بھی لے اور اس کا کفارہ تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہی حکم ننگے پیر چلنے کی نذر ماننے کا بھی ہے کہ وہ جوتے پہن کر چلے اور سواری پر سوار بھی ہو، اور بعد میں بطور کفارہ کے تین دن کے روزے بھی رکھے۔ البتہ یہ حکم عام نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اس عورت کا حال معلوم تھا کہ وہ غلام آزاد نہیں کر سکتی اور اس میں اطعام یا کسوۃ کی استطاعت ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ''وہ تین دن کے روزے رکھے۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ استفتاء میں توکیل جائز ہے، کیونکہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا وکیل بن کر فتویٰ مانگا تھا۔

◈ جو آدمی ایسی بات کی نذر مانے جس کے وصف کی اس میں طاقت نہ ہو تو وہ اصل پر عمل کرے البتہ اس وصف کا کفارہ دے دے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس خاتون کو بیت اللہ تک جانے کی اجازت تو مرحمت فرما دی، البتہ پیدل اور ننگے،

---

❶ مسند احمد: 145/4۔ سنن ابی داؤد: 3293۔ جامع الترمذی: 1544۔ سنن النسائی: 20/7۔ سنن ابن ماجہ: 2134۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (3047) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

سر جانے سے منع فرما دیا اور اس کا کفارہ دینے کا حکم دیا۔ کہ یہاں اصل کو تو پورے کرنے کا حکم ہے البتہ وصف کی طرف سے کفارہ دینے کا حکم ہے۔

◈ نبی کریم ﷺ کا مذکورہ ارشاد ہے کہ: ''رب تعالیٰ کو تمہاری بہن کے اس فعل سے کوئی واسطہ نہیں'' رب تعالیٰ کے اس ارشاد کے عین مطابق ہے:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ﴾ (النساء: 147)

''اللہ تمھیں عذاب دینے سے کیا کرے گا، اگر تم شکر کرو۔''

◈ عورت کو اوڑھنی لینا واجب ہے، اس کی دلیل: "فَلْتَخْتَمِرْ" کے الفاظ ہیں۔

◈ عورت کا سواری پر سوار ہونا جائز ہے۔ اس کی دلیل: "لِتَرْكَبْ" کے الفاظ ہیں۔ گو ان الفاظ سے عورت کے گاڑی چلانے کا جواز اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ سواری پر بیٹھ سکتی ہے تو وہ سواری کو چلا بھی سکتی ہے۔ لیکن ہم عورت کو گاڑی چلانے سے دیگر متعدد بڑے خطرات اور فتن کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔

◈ افعالِ اختیاریہ کا رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہونا جائز ہے۔ اس کی دلیل: "مَا يَصْنَعُ" کے الفاظ ہیں۔

مرنے والے کی نذر پوری کرنے کا حکم

1377۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: اسْتَفْتَى سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ رضي الله عنه رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فِي نَذْرٍ كَانَ عَلَى أُمِّهِ تُوُفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَهُ، فَقَالَ: ((اقْضِهِ عَنْهَا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اپنی والدہ کی اس نذر کے بارے میں فتویٰ پوچھا جس کو وہ پورا کرنے سے قبل ہی وفات پا گئی تھیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''تم اس نذر کو ان کی طرف سے پورا کرو۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

معرفة الصحابة:...... حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے مشہور قبیلہ خزرج کے سردار تھے جبکہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مدینہ کے دوسرے بڑے قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ ان دونوں سعدین کا اسلام میں بڑا مرتبہ و مقام ہے لیکن حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔

غريب الحديث:...... اسْتَفْتَى: یعنی فتویٰ مانگا۔

فِي نَذْرٍ كَانَ عَلَى أُمِّهِ: یہ کس بات کی نذر تھی، اس کو یہاں بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے علم میں آنے سے علم میں اضافہ تو ہوگا پر بیان نہ ہونے سے کوئی ضرر بھی نہیں۔

قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَهُ: یعنی ان کی والدہ اس نذر کو پورا کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئی تھیں۔

اِقْضِهِ عَنْهَا: "اِقْضِ": یہ فعل امر ہے، البتہ یہاں اس کا اباحت کے لیے ہونا اقرب ہے۔ یعنی اگر تم ان کی طرف سے اس نذر کو پورا کر دو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 6698۔ صحيح مسلم: 1638.

سائل کے سوال کا منشا بتلاتا ہے کہ شاید وہ مرنے والے کی طرف سے اس کی نذر کے پورا کرنے میں حرج سمجھتے تھے۔ جس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں والدہ کی رہ جانے والی نذر کو پورا کرنے کی رخصت مرحمت فرمائی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تحصیل علم کے بے حد حریص تھے۔

◈ ماں کی طرف سے اس کی نذر کو پورا کرنا جائز ہے۔

◈ حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ صرف اسی ناذر کی رہ جانے والی نذر کو پورا کیا جائے گا جو اپنی زندگی میں وہ نذر پوری کر سکتا تھا، مگر کر نہ پایا ہو، لہٰذا جسے اپنی زندگی میں مانی نذر کو پورا کرنے کی استطاعت ہی نہ تھی یا وہ نذر ''مالا یطاق'' یعنی ناممکنات میں سے تھی تو اس نذر کو مرنے والے کی طرف سے پورا نہ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل ''تُوُفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَه'' کے الفاظ ہیں۔

معین جگہ کی نذر کا حکم

1378-1379- وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ رضي الله عنه قَالَ: نَذَرَ رَجُلٌ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يَنْحَرَ إِبِلًا بِبُوَانَةَ، فَأَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: ((هَلْ كَانَ فِيهَا وَثَنٌ يُعْبَدُ؟)) قَالَ: لَا قَالَ: ((فَهَلْ كَانَ فِيهَا عِيْدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ؟)) فَقَالَ: لَا، فَقَالَ: ((أَوْفِ بِنَذْرِكَ، فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ، وَلَا فِيْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ، وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ)).

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کے دور میں ایک آدمی نے اس بات کی نذر مانی کہ وہ (مقام) بوانہ میں ایک اونٹ نحر (یعنی قربان) کرے گا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس آدمی سے دریافت فرمایا کہ: ''کیا وہاں (کبھی) کوئی بت تھا کہ جس کی عبادت کی جاتی تھی۔'' اس آدمی نے عرض کیا: جی نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہاں کافروں کی عیدوں (یعنی تہواروں) میں سے کوئی عید منائی جاتی تھی۔'' اس آدمی نے عرض کیا: جی نہیں! اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(تب پھر) تم اپنی نذر پوری کر لو، (اوسنو!) بے شک اللہ کی نافرمانی میں مانی جانے والی نذر کو ہرگز پورا نہ کیا جائے گا اور نہ قطع رحمی کی نذر کو اور نہ ایسی چیز میں (مانی جانے والی نذر کو ہی پورا کیا جائے) جو ابن آدم کے بس میں نہ ہو۔'' ❶

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالطَّبَرَانِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَهُوَ صَحِيْحُ الْإِسْنَادِ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيْثِ كَرْدَمٍ عِنْدَ أَحْمَدَ.

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے، جبکہ یہ لفظ امام طبرانی (کی روایت) کے ہیں اور اس کی اسناد صحیح ہے۔ مسند احمد میں کردم کی حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ ❷

---

❶ سنن ابی داؤد: 3313- المعجم الکبیر للطبرانی: 1341/75/2- امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ایسی صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جو شیخین رحمہ اللہ کی شرط پر ہے۔ دیکھیں: المجموع: 358/8.

❷ مسند احمد: 366/6- سنن ابن ماجه: 2131- امام بوصیری نے "المصباح" میں اس حدیث کو مسند احمد کی طرف منسوب کرنے کے بعد اس کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... نَذَرَ رَجُلٌ: یہ رجل مجہول ہے۔

بُـــوَانَةَ: یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ان صاحب نے خاص اس جگہ اونٹ قربان کرنے کی نذر کیوں مانی؟ کیا اس جگہ کی کوئی خاص فضیلت تھی؟ یا اس کے گھر والوں کی وہاں کوئی حاجت وابستہ تھی؟ یا ان صاحب کے وہاں کوئی رشتہ دار رہتے تھے؟

واللہ اعلم! البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ جگہ اپنی ذات میں کسی خاص فضیلت کی حامل نہ تھی۔لیکن نبی کریم ﷺ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ مبادا اس آدمی نے یہ نذر اس لیے مانی ہو کہ وہ جگہ کبھی کسی بت کا معبد یا کسی مذہبی تہوار کا مرکز رہی ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے ذہن مبارک میں اس بات کا وارد ہونا ایک بدیہی بات تھی کہ آخر ان صاحب نے خاص اس جگہ ہی اونٹ قربان کرنے کی نذر کیوں مانی ہے۔اس لیے آپ ﷺ نے ان صاحب سے دو سوالات کیے:

(1) کیا وہ جگہ کسی بت کا عبادت خانہ تو نہیں رہی۔ (2) یا وہاں کافروں کا کوئی مذہبی تہوار تو نہیں منایا جاتا تھا۔

ان صاحب نے جب دونوں سوالات کا جواب نفی میں دیا تو آپ ﷺ نے اس نذر کو پورا کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

وَثَنٌ يُعْبَدُ: وثن: رب تعالیٰ کو چھوڑ کر پوجی جانے والے ہر شے کو وثن کہتے ہیں، چاہے وہ کسی کی قبر ہو یا بت، کوئی شجر ہو یا حجر۔غرض ہر وہ شے وثن ہے جس کی رب تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہو۔

فَهَلْ كَانَ فِيهَا عِيدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ: یعنی کیا وہاں کوئی سالانہ مذہبی میلہ یا تہوار منعقد ہوتا ہے کہ جس میں شرکت کے لیے لوگ وہاں ہر سال جاتے ہیں۔

غرض جب ان صاحب نے دونوں باتوں کا جواب نفی میں دیا تو نبی کریم ﷺ نے اس منت کے پورا کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی اور فرمایا:

أَوْفِ بِنَذْرِكَ: بظاہر یہ امر اباحت کے لیے ہے جب مقصود اس مکان کی تعیین ہو۔البتہ جب مطلق نذر مراد ہو تو تب یہ امر وجوب کے لیے ہے۔

إِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ: یہ علت کا بیان ہے۔کہ اگر اس جگہ میں کوئی بت یا کوئی شرکیہ تہوار ہوتا تو اس نذر کو پورا کرنا ناجائز ٹھہرتا۔کیونکہ تب یہ نذر نذرِ معصیت کہلاتی جس کو پورا کرنا حرام ہوتا ہے۔

وَلَا فِي قَطِيعَةِ رَحِمٍ: اسی طرح قطع رحمی کی نذر ماننا بھی نذرِ معصیت ہے جس کو پورا کرنا جائز نہیں ہوتا۔جیسے کوئی یہ نذر مانے کہ میں اپنی خالہ سے بات نہ کروں گا۔یہ نذر نذرِ معصیت کہلائے گی اور اس کا پورا کرنا جائز نہ ہوگا۔

ذو رحم رشتہ داروں کی تفصیل کتاب الوقف کے تحت بیان کی جاچکی ہے۔

وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ: یعنی جن باتوں کا آدمی شرعاً یا قدراً مالک نہ ہو، ان میں نذر ماننا جائز نہیں۔جیسے کسی ناممکن بات کی نذر ماننا بھی "وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ" کے زمرہ میں داخل ہے جس کے کفارہ کی تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نذر کے لیے کسی جگہ کو معین کرنا جائز ہے۔البتہ اس میں نذر کی غرض کا شرعاً صحیح ہونا شرط ہے اور یہ کہ وہ جگہ ہر قسم کی معصیت سے بھی خالی ہو۔

◈ بتوں کے سامنے اور ان کے اردگرد اللہ کے لیے بھی جانور قربان کرنا جائز نہیں۔کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کسی جگہ جانور

کے قربان کرنے کی اباحت کو اوثان واصنام کی نفی پر مرتب فرمایا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کسی جگہ بت ہوں تو وہاں اللہ کے لیے جانور قربان کرنا جائز نہیں۔

- اگر کوئی جگہ اور وقت مشرکوں اور کافروں کے کسی مذہبی تہوار کے ساتھ مخصوص ہو تو اس جگہ کی اور اس وقت کی نذر ماننا جائز نہ ہو گا۔اس کی دلیل: "هَلْ كَانَ فِيهَا عِيدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ مشرکوں کے مذہبی تہواروں کی موافقت جائز نہیں۔لہٰذا مشرکوں کے کسی تہوار کے وقت میں قربانی کی نذر ماننا یہ ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کے حکم میں داخل ہے۔
- اگر کسی منکر کے ارتکاب کا احتمال ہو تو مفتی پر سائل سے پوری تفصیل پوچھنا واجب ہوگا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ بوانہ میں قربانی کی نذر ماننے والے سے پوری تفصیل دریافت فرمائی کہ اس نے خاص اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا۔ کیونکہ آپ ﷺ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس جگہ کا تعلق کسی شرکیہ رسم یا بتوں وغیرہ سے نہ ہو۔البتہ اگر کسی منکر کا اندیشہ نہ ہو تو تفصیل پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
- گناہ کی نذر پوری کرنا حرام ہے۔اس کی دلیل: "لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔
- قطع رحمی کی نذر ماننا حرام ہے۔اس کی دلیل: "وَلَا فِي قَطِيعَةِ رَحِمٍ" کے الفاظ ہیں۔البتہ ایسی نذر کا کفارہ واجب ہوتا ہے۔
- جو بات بس میں نہ ہو، اس کی نذر پوری کرنا بھی واجب نہیں۔ چاہے یہ عدمِ ملک شرعاً ہو جیسے آدمی گناہ کرنے کا شرعاً پابند اور مالک نہیں اور چاہے یہ عدمِ ملک قدراً ہو، جیسے ناممکن باتیں آدمی کے بس میں نہیں ہوتیں۔ کہ ایسی دونوں قسم کی باتوں کی نذر ماننا واجب نہیں۔

مفضول نذر سے افضل نذر کی طرف منتقل ہونے کا حکم

1380- وَعَنْ جَابِرٍ ﷺ أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَوْمَ الْفَتْحِ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ نَذَرْتُ إِنْ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَكَّةَ- أَنْ أُصَلِّيَ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ ، فَقَالَ : ((صَلِّ هَاهُنَا)) فَسَأَلَهُ ، فَقَالَ : ((صَلِّ هَاهُنَا)) فَسَأَلَهُ ، فَقَالَ : ((فَشَأْنُكَ إِذَنْ)) .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح (مکہ) کے موقع پر ایک آدمی نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! میں نے اس بات کی نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے آپ ﷺ کو مکہ کی فتح نصیب فرمائی تو میں بیت المقدس میں نماز پڑھوں گا۔اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہاں (حرم مکہ یعنی بیت اللہ میں) ہی (وہ نذر والی) نماز ادا کر لو۔'' (تمہاری نذر پھر بھی پوری ہو جائے گی)۔ اس آدمی نے آپ ﷺ سے (دوبارہ) پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہیں نماز پڑھ لو۔'' اس نے آپ ﷺ سے (سہ بارہ) پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب پھر جو تمہاری مرضی۔'' [1]

---

[1] مسند احمد: 363/3- سنن ابی داؤد: 3305- المستدرك للحاكم: 338/4- امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث امام مسلم کی شرط پر ہے۔الکامل لابن عدی: 45/2- ترجمة بكّار ابی یونس- طبرانی نے یہ حدیث ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس کے رجال ثقہ ہیں۔اگر یہ روایت عطاء بن ابی رباح سے مرسل نہ ہوتی تو اس میں مذکورہ مبہم رجل کا نام مذکور ہوتا۔

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ .

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......یَوْمَ الْفَتْحِ: لفظ "فتح" کو جب روایات میں مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد فتح مکہ ہوتا ہے۔

إِنِّي نَذَرْتُ ...... : مذکورہ الفاظ سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ یہ نذر عبادت کی نذر تھی۔ کیونکہ یہ نماز کی نذر تھی اور نماز ایمان کے بعد سب سے افضل عبادت ہے۔

أَنْ أُصَلِّيَ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ: اس بات کا ہمیں علم نہیں ہوسکا کہ ان صاحب نے خاص بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر کیوں مانی تھی؟ حالانکہ وہ صاحب مدینہ نبویہ میں رہتے تھے جو مکہ مکرمہ کے بعد روئے زمین کی سب سے افضل سرزمین ہے۔ صَلِّ هَا هُنَا: مراد مکہ میں نماز پڑھنا ہے کیونکہ مکہ بیت المقدس سے افضل ہے۔ فَسَأَلَهُ: مراد سوال کا اعادہ ہے۔

شَأْنُكَ إِذًا : تیسری مرتبہ کے سوال پر آپ ﷺ نے ان صاحب کو جواب میں یہ ارشاد فرمایا تھا۔ اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: "اِصْنَعْ شَأْنَكَ" اور "اِذَنْ" یہ "حِيْنَ" کے معنی میں ہے اور اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: "حِيْنَ لَمْ تَقْبَلِ الرُّخْصَةَ اَصْنَعْ شَأْنَكَ" یعنی "جب تو رخصت قبول نہیں کرتا تو پھر جو تیری مرضی ہے تو کر۔"

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جب آدمی نذر مان لے اور وہ نذر طاعت کی ہو تو اس نذر کو پورا کرنا آدمی پر واجب ہوتا ہے۔ اس کی دلیل "صَلِّ هَاهُنَا" کے الفاظ ہیں۔
- نذر معلق کا ماننا صحیح ہے۔ اس کی دلیل: "إِنِّي نَذَرْتُ إِنْ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكَ" کے الفاظ ہیں چاہے یہ تعلیق مطلق ہو اور چاہے عام ہو یا خاص۔
- مفضول نذر سے افضل نذر کی طرف انتقال جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس میں نماز والی نذر کی بابت "صَلِّ هَاهُنَا" فرمایا۔ یعنی اس نذر کو یہاں نماز پڑھ کر پورا کرلو۔ تب پھر مکہ میں نماز کی نذر کو کسی اور جگہ ادا کر کے پورا کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ مکہ روئے زمین کی سب سے افضل جگہ ہے۔
- اگر آدمی نے خیر کے کسی کام میں مال خرچ کرنے کا ارادہ کیا پھر اس سے افضل کام میں پیسہ لگانا چاہا تو اس حدیث کی رو سے اسے ایسا کرنا جائز ہوگا اور اس پر پہلی مفضول نذر پوری نہ کرنے کا کفارہ بھی نہ آئے گا۔
- اگر ایک آدمی خود کو بلاوجہ مشقت میں ڈالنے پر مصر ہو جائے تو ہم اسے اس کے ارادہ کے حوالے کر دیں گے، اس کی دلیل: "شَأْنُكَ إِذَنْ" کے الفاظ ہیں۔

مساجد ثلاثہ کی طرف رختِ سفر باندھنے کا حکم

1381- وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : ((لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ : مَسْجِدِ الْحَرَامِ ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصَى ، وَمَسْجِدِيْ هٰذَا)) .

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "سوائے تین مساجد کے (اور کسی مسجد کی طرف بغرضِ طاعت) رختِ سفر نہ باندھا جائے (اور وہ تین مساجد یہ ہیں): (1) مسجد حرام (2) مسجد اقصیٰ (3) اور

میری یہ مسجد ❶ (یعنی مسجد نبوی)۔"

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ .

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے اور یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

شرح:......اس حدیث پر باب الاعتکاف، میں تفصیلی کلام کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسلمان ہو جانے کے بعد حالتِ کفر کی نذر پوری کرنے کا بیان

1382- وَعَنْ عُمَرَ رضي الله عنه قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنِّي نَذَرْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ أَنْ أَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ قَالَ : أَوْفِ بِنَذْرِكَ)) .

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے (خدمت نبوی میں) عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے جاہلیت میں اس بات کی نذر مانی تھی کہ میں مسجد حرام میں ایک شب اعتکاف کروں گا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم اپنی (یہ) نذر پوری کرو۔" ❷

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي رِوَايَةٍ : ((فَاعْتَكَفَ لَيْلَةً)) .

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک روایت میں یہ الفاظ زائد روایت کیے ہیں: "پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (مسجد حرام میں) ایک شب کا اعتکاف فرمایا۔"

شرح :......اعتکاف اصل میں کسی شے کو لازم پکڑنے کا نام ہے۔ شرع شریف کی اصطلاح میں اعتکاف یہ رب تعالیٰ کی طاعت کے لیے مسجد کو لازم پکڑ لینے کو کہتے ہیں۔

لہٰذا اگر کسی نے مسجد تو لازم پکڑی لیکن اس کا قصد طاعت نہ تھا جیسے صرف سونا وغیرہ تھا تو مسجد کے ایسے قیام کو اعتکاف نہ کہا جائے گا اور اگر کسی نے غیر مسجد میں طاعت کا لزوم کیا تو اسے بھی اعتکاف نہ کہا جائے گا۔ تب پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زمانہ جاہلیت کی یہ نذر اعتکاف کی ہی تھی کیونکہ انہوں نے ایک دن یا رات، علی حسب الروایات، مسجد حرام میں طاعت کی غرض سے قیام کرنے کی نذر مانی تھی جس کے پورا کرنے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا تھا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ خاص مسجد حرام کی نذر کو پورا کیا جائے گا۔ اس کی دلیل: "أَوْفِ بِنَذْرِكَ" کے الفاظ ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی یا کسی اور جگہ اس نذر کو پورا کرنے کا حکم ارشاد نہ فرمایا بلکہ مسجد حرام کی نذر کو مسجد حرام میں ہی پورا کرنے کا حکم دیا۔

◈ نذر کافر کی بھی منعقد ہو جاتی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کفر کی نذر کو برقرار فرمایا۔

◈ تب پھر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کافر نے اپنی نذر زمانہ کفر میں ہی پوری کر دی تو وہ اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی، اسلام لے آنے کے بعد دوبارہ اس نذر کو پورا کرنا لازم نہ ہوگا۔

◈ مسجد میں اعتکاف کے دیگر مسائل کو "باب الاعتکاف" میں مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

---

❶ اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے۔

❷ صحيح البخاري: 2033۔ صحيح مسلم: 1656 .

15
كِتَابُ الْقَضَاءِ
قضاء کے احکام ومسائل کا بیان

تمہید:...... لفظ قضاء کو اللہ اور بندے دونوں کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ یہاں قضاء سے وہ قضاء مراد ہے جو بندے کی طرف مضاف ہو۔

قضی کا لغوی واصطلاحی معنی اور مفتی اور قاضی میں فرق:

قضی کا لفظی معنی حکم دینا اور فیصلہ سنانا ہے، اصطلاح شرع میں قضا حکم شرعی کے بیان کرنے اور اسے دوسرے پر لازم کرنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عدالت میں بیٹھ کر حکم شرعی بیان بھی کرتا ہے اور اسے دوسرے پر لازم بھی کرتا ہے۔ جبکہ مفتی حکم شرعی کو بیان تو کرتا ہے لیکن اس کو دوسرے پر لازم نہیں کر سکتا۔ مفتی اور قاضی میں یہی بنیادی فرق ہے کہ مفتی کسی پر حکم شرعی کو لازم نہیں کر سکتا جبکہ قاضی لازم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی غائب کے خلاف فتویٰ دے سکتا ہے جبکہ قاضی غائب کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔

قضاء کا حکم:

قضا فرضِ کفایہ ہے۔ لیکن اگر ایک ہی آدمی اس کا اہل ہو تو اس کے حق میں قضا فرضِ عین ہو گی۔ کیونکہ لوگوں کے نزاعات میں فیصلہ کرنے والے کسی ایک شخص کا ہونا لازم ہے۔ دوسرے اگر ایسا شخص قضاء کو قبول نہ کرے گا تو نا اہل لوگ اس اہم ترین شرعی شعبہ پر قابض ہو کر لوگوں کے امور کو برباد کر دیں گے۔ قضا سب سے افضل ولایت ہے کیونکہ اس کے ذریعے بندوں میں رب تعالیٰ کے احکام کو جاری و نافذ کیا جاتا ہے۔

رہا بعض اسلاف کا اس عہدہ کو قبول کرنے سے راہِ فرار اختیار کرنا تو وہ اس لیے تھا کیونکہ ان کے وقت میں علماء کی کثرت اور ''اہل'' لوگوں کی بہتات تھی۔ لیکن اگر راسخ علماء کی قلت ہو تو اس عہدہ سے فرار مناسب نہیں اور ظلم کر بیٹھنے کا عذر پیش کرنا مناسب نہ ہو گا۔

پھر قاضی کے ذمہ ہے کہ وہ حق تک پہنچنے کی کوشش کرے، چنانچہ اگر وہ حق تک پہنچ گیا تو اسے دوگنا اجر ملے گا اور خطا کی صورت میں ایک اجر ملے گا۔

قاضی کی صفات:

قاضی صاحب فراست ہو، لوگوں کے احوال اور بدلتے حالات کو بخوبی جانتا ہو، تاکہ کسی کے ظاہر سے دھوکا کھا کر کسی صاحب حق کے خلاف فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ قاضی بیانِ حق میں نڈر ہو اور شرع شریف کے عین مطابق فیصلہ کرے۔

نیکوکار قاضی کی صفت

1383۔ عَنْ بُرَيْدَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ، اثْنَانِ فِي النَّارِ، وَوَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ. رَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضَى بِهِ فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَلَمْ يَقْضِ بِهِ، وَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ لَمْ يَعْرِفِ الْحَقَّ فَقَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ)).

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''قاضی تین (قسم کے) ہیں (اور ان میں سے) دو (قسم کے قاضی تو) جہنم میں جائیں جبکہ (ان میں سے) ایک جنت میں جائے گا۔ (اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ آدمی جس نے حق بات کو پہچانا اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی دیا۔ پس وہ جنت میں جائے گا اور وہ آدمی جس نے حق (بات) کو جانا پر اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا اور اس نے فیصلہ (سنانے) میں ظلم سے کام لیا، پس وہ جہنم میں جائے گا۔ (یہ دوسری قسم کا قاضی ہے) اور (تیسری قسم کا قاضی) وہ آدمی (ہے) جو حق کو نہیں پہچانتا مگر اس نے (پھر بھی) جہالت کے باوجود لوگوں میں (غلط اور ناحق) فیصلہ کر دیا سو وہ (بھی) جہنم میں جائے گا۔''[1]

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......ثَلَاثَةٌ: یہ صنف کے اعتبار سے ہے نہ کہ اشخاص کے اعتبار سے ہے۔

یہ بات نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم میں سے ہے کہ آپ ﷺ اشیاء کو بسا اوقات ان کی اصناف و اقسام میں تقسیم فرما کر بیان فرماتے تھے اور بسا اوقات کسی بات کو عدد کے ساتھ محصور کر کے بیان فرماتے تھے۔

رَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ، فَقَضَى بِهِ، فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ: یہ علم اور عدل کو جمع کرنے کا بیان ہے، چنانچہ حق کی معرفت علم پر اور اس کے مطابق فیصلہ دینا عدل پر دلالت کرتے ہیں۔ ایسا قاضی جو علم و عدل دونوں کا جامع ہو، وہ جنت میں جائے گا۔

رَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ، فَلَمْ يَقْضِ بِهِ، وَجَارَ فِي الْحُكْمِ، فَهُوَ فِي النَّارِ: ''وَجَارَ فِي الْحُكْمِ'' اس کا ''فَلَمْ

---

[1] سنن ابی داؤد: 3573۔ جامع الترمذی: 1322۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5922۔ سنن ابن ماجہ: 2315۔ المستدرك للحاکم: 101/4۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے، اور حاکم ''علوم الحدیث'' (ص: 99) میں کہتے ہیں۔ اس حدیث کی روایت میں خراسانی رواۃ متفرد ہیں اور اس کے رواۃ جرح و تعدیل کے ماہر ہیں۔

یَقْضِ بِهِ" پر عطف ہے اور یہ عطف تفسیری کے باب میں سے ہے۔ کیونکہ جو حق کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ لامحالہ ظلم کا ارتکاب ہی کرے گا۔ غرض جو حق جانتے ہوئے بھی حق کا فیصلہ نہ دے وہ جہنم میں جائے گا۔

رَجُلٌ لَمْ يَعْرِفِ الْحَقَّ..... فِي النَّارِ: یعنی اگر کوئی اپنی ظاہری ہیئت اور حلیہ کی وجہ قاضی بن بھی گیا لیکن اسے حق بات پہچاننے کی معرفت وفراست حاصل نہیں اور بدون معرفتِ حق کے فیصلے کرنے لگا، تو ایسا قاضی بھی جہنم میں جائے گا۔ البتہ جہنم میں جانے والے ان دو قاضیوں میں سے اشد پہلا قاضی ہے کیونکہ اسے معرفت حق حاصل تھی اور وہ عدل تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس نے اس کے باوجود بھی ظلم وجور کا اور ناحق فیصلہ کرنے کا راستہ ہی اختیار کیا تھا۔

تنبیہ:...... رب تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے کہ ایسا قاضی علماء یہود کے مشابہ ہے جو مغضوب علیہم ہیں کیونکہ وہ حق جان کر بھی حق پر نہ چلتے تھے، جبکہ دوسری قسم کے جہنمی قاضی ضالین کے مشابہ ہیں۔ تب پھر لامحالہ ان دو قسم کے جہنمی قاضی میں سے زیادہ برا حال پہلی قسم کے قاضی ہے۔

قضاء قبول کرنے سے بچنا واجب ہے

1384۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ وُلِّيَ الْقَضَاءَ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جسے قضا سونپ دی گئی تو وہ تو بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے، جبکہ امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**مَنْ وُلِّيَ الْقَضَاءَ:** مذکورہ فعل مجہول ہے اور اس کا نائب فاعل اس کی ضمیر مستتر "هُوَ" ہے جو اسم موصول "مَنْ" کی طرف راجع ہے، تب پھر "اَلْقَضَاءَ" اس کا مفعول بہ ثانی ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ جس کو سلطان یا اس کے نائب نے قضا سونپی۔

فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ: بغیر چھری کے ذبح ہونا بے شک بے حد تکلیف کی بات ہے اور یہ مراد نہیں کہ ایسا ذبیحہ مردار اور نجس کے حکم میں ہے۔ کیونکہ جس جانور کو بھی شرعی طریق سے ذبح کر دیا جائے وہ حلال اور طاہر ہوتا ہے۔ البتہ جس کو چھری کے علاوہ کسی لکڑی یا اور کسی تیز دھار شے سے ذبح کیا جائے تو اسے بہ نسبت چھری سے ذبح ہونے کے زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

تب پھر وجہ تشبیہ یہاں تألم یعنی درد والم اور اذیت وتکلیف کا سہنا ہے کہ جیسے چھری کے بغیر ذبح ہونے والا جانور شدید درد والم محسوس کرتا ہے اسی طرح قضا قبول کرنے والا قاضی بھی شدید درد والم سہتا ہے۔ وہ یوں کہ:

اوّل:...... وہ معاملہ کی تحقیق کتاب وسنت سے کرتا ہے۔ یوں ایک قضیہ معینہ میں حق تک پہنچنے میں اسے شدید دقت کا

---

[1] مسند احمد: 230/2۔ سنن ابی داؤد: 3571۔ حافظ عراقی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جیسا کہ "فیض القدیر" (238/6) میں ہے، ابن المدینی نے اپنی "العلل" (ص: 57) میں مقبری کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کو راجح قرار دیا ہے۔ دیکھیں: تهذيب السنن لابن القيم: 352/9۔ جامع الترمذی: 1325۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 5923۔ سنن ابن ماجه: 2308۔ حاکم نے "المستدرك" (103/4) میں اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوم:...... پھر کتاب وسنت کے حکم کی اس قضیہ معینہ پر تطبیق کرتا ہے۔

سوم:......اور تیسرے اسے متخاصمین کے احوال کی جانچ میں بھی شدید دقت اور دشواری جھیلنی پڑتی ہے کہ سچ کون بول رہا ہے اور جھوٹ سے کام کون لے رہا ہے۔

غرض مشقت کی بنا پر ان تینوں مراحل میں قاضی جیسے بغیر چھری کے ذبح ہو رہا ہوتا ہے۔ البتہ ایسا ذبیحہ چونکہ حلال ہوتا ہے، اس لیے اگر ایک قاضی ان تینوں مراحل میں خوب دقتِ نظری، محنت واجتہاد سے کام لے تو اس کا فیصلہ بھی حلال اور جائز ہوگا اور اس حکم کے نفاذ میں وہ گنہگار نہ ہوگا۔

فائدہ:......معلوم ہوا کہ قضا کا منصب ایک کڑی آزمائش ہے، اس لیے ہر ایرے غیرے کو یہ منصب قبول کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور اس منصب پر کسی اہل کو ہی تعینات ہونا چاہیے۔ جس کی تفصیل تمہید کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔

امارت کی مشقتیں اور اس کا انجام

1385۔ وَعَنْهُ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَى الْإِمَارَةِ ، وَسَتَكُوْنُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، فَنِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ ، وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ)) .

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”بے شک تم لوگ عنقریب امارت کی طمع کرو گے، اور روزِ قیامت یہ امارت ندامت بنے گی۔ پس (امارت) کیا ہی اچھی دودھ پلانے والی ہے اور کیا ہی بری دودھ چھڑانے والی ہے۔“ [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّكُمْ: یہ خطاب ساری امت کو عام ہے۔

سَتَحْرِصُونَ عَلَى الْإِمَارَةِ: یعنی عنقریب آگے چل کر تم میں امارت کی حرص پیدا ہو جائے گی اور یہ بات انسانی طبیعت میں غالب ہے کہ وہ سلطنت وولایت کا حریص ہوا کرتا ہے۔ چاہے یہ سلطانی اور قوتِ امارت برحق ہو یا ناحق۔

وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اگرچہ بظاہر یہ الفاظ مطلق ہیں لیکن اس بات کے ساتھ مقید ہیں کہ وہ امارت روزِ قیامت حسرت وندامت بنے گی جو ناحق ہو۔ لہٰذا جو امارت کا حق قائم کرے گا، یہ امارت اس کے حق میں روزِ قیامت نعمت بنے گی اور ایسا امیر جو رب تعالیٰ کے احکام کو بندوں میں نافذ کرتا ہے، وہ عنداللہ ماجور ہوگا اور ماجور کبھی نادم نہیں ہوتا۔

تب پھر یہ وعید دو قسم کے لوگوں کو شامل ہوگی:

(1) ایک وہ آدمی جو امارت کا حق قائم نہ کرے۔

(2) دوسرا وہ آدمی جو کسی شرعی سبب کے بغیر امارت کا حریص ہو، اور وہ لوگوں پر صرف غلبہ اور تسلط ہی چاہتا ہو۔

فَنِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ: کیونکہ جو امیر صرف امارت کے مزے لوٹنے اور عیش کرنے کے لیے امارت پر قابض ہوتا ہے۔ تو یہ امارت اس کے لیے ایک بہت اچھی دودھ پلانے والی یعنی عیش ونعمت میں رکھنے والی ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: 7148.

وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ: لیکن جب یہ امارت آدمی کو ان نعمتوں سے محروم کر دیتی ہے تو اس کی مثال ایک بہت بری دودھ چھڑانے والی کی ہوتی ہے کہ آدمی یکا یک نعمتوں سے قصوں میں جا گرتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کا ارشاد سچ ثابت ہوا اور واقعی کچھ عرصہ بعد ہی اسی امارت کے حصول کے لیے قتل و غارت اور جنگ و جدل کے میدان سج گئے۔

◈ امارت کی حرص سے ڈراوا۔ البتہ یہ تحذیر اور ڈراوا اس بات کے ساتھ مقید ہے کہ آدمی غیر شرعی سبب کے ذریعے امارت کے حصول کا حریص ہو۔

◈ ''روزِ قیامت'' ثابت ہے کہ یہ ضرور قائم ہوگا۔ اس کی دلیل: "وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ جو آدمی صرف عیش و عشرت کے لیے امارت کی طمع کرتا ہے اس کے حق میں انجام کار یہ امارت ندامت و رذالت ہے۔

مجتہد حاکم یا مفتی یا قاضی کا حکم

1386۔ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ)) .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ''جب کسی حاکم نے ایک فیصلہ کیا اور اس نے (صحیح فیصلہ کرنے کے لیے خوب کوشش اور) اجتہاد سے کام لیا، پھر وہ درست فیصلہ تک پہنچا تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور جس (حاکم) نے ایک فیصلہ کیا اور اس میں اجتہاد سے (بھی) کام لیا پھر (بھی) خطا کر گیا تو اسے ایک اجر ملے گا۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......**إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ:** حاکم سے یہاں مراد عام ہے چاہے وہ قاضی ہو یا کوئی غیر۔ البتہ وہ حکم شرع کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرتا ہو اور یہ فیصلہ وہ دو متخاصمین میں کرے یا ایک مفتی کی حیثیت سے فتویٰ مانگنے والوں میں کرے۔

فَاجْتَهَدَ، ثُمَّ أَصَابَ: مذکورہ عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے کیونکہ اجتہاد اور تلاش حق فیصلہ سنانے سے قبل ہے نہ کہ حکم جاری کرنے کے بعد۔

اور اجتہاد سے مراد وصولِ حق میں اپنی پوری کوشش کرنا ہے اور ایسا مندرجہ ذیل امور سے ممکن ہے:

(1) حکم شرعی کی معرفت: لہٰذا جسے حکم شرعی کی معرفت حاصل نہ ہو، اسے حاکم بننا اور دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ سنانا جائز نہیں۔ چنانچہ یا تو وہ رائے سے فیصلہ کرے گا یا پھر کسی اندھے کی طرح اٹکل سے حکم شرعی تک جا پہنچے گا۔

(2) پیش آمدہ واقعہ کا پورا احاطہ۔

(3) اور تیسرا امر واقعہ کی مکمل تحقیق کے بعد حکم شرعی کی تطبیق ہے۔ کیونکہ بسا اوقات آدمی واقعہ کو تو خوب سمجھ رہا ہوتا ہے مگر حکم

[1] صحيح البخاري: 7352۔ صحيح مسلم: 1716 .

شرعی کی اس پر تطبیق سے قاصر ہوتا ہے۔

تب پھر اجتہاد میں ان اجتہادات ثلاثہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

فَلَهُ أُجْرَانِ: ایسے اجتہاد کرنے والے حاکم، قاضی اور مفتی کو دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اجتہاد کرنے کا اور دوسرا حق بات تک پہنچنے کا۔

وَإِذَا حَكَمَ، فَاجْتَهَدَ، ثُمَّ أَخْطَأَ، فَلَهُ أَجْرٌ: یہاں بھی عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ بلاشبہ یہ رب تعالیٰ کا احسان اور اس کا کرم ہے کہ وہ ایسے اجتہاد پر اجر تو دیتا ہے، مگر خطا ہو جانے کو معاف کر دیتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ آدمی کو چاہیے کہ حکم سنانے میں اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے میں خوب کوشش کرے اور حق تک پہنچے تا کہ اسے دوہرا اجر ملے۔

◈ درستی تک پہنچنے والے مجتہد کو دوہرا جبکہ اجتہاد کے باوجود خطا کرنے والے کو ایک اجر ملتا ہے۔ البتہ اس کی خطا کا اسے کوئی گناہ نہیں ملتا۔

غصہ کی حالت میں فیصلہ کرنا منع ہے

1387- وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((لَا يَحْكُمْ أَحَدٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ”کوئی ایک آدمی کسی دو کے درمیان اس حال میں فیصلہ نہ کرے کہ وہ غصہ کی حالت میں ہو۔“ ❶ یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

غریب الحدیث :...... لَا يَحْكُمُ: مذکورہ فعل اگر جزم کے ساتھ ہو تو یہ ”لا“ ناہیہ ہے اور اگر یہ فعل رفع کے ساتھ ہو تو یہ ”لا“ نافیہ ہے۔ ”لا“ کے ناہیہ ہونے میں کوئی اشکال نہیں لیکن اگر یہ ”لا“ نافیہ ہے، تو پھر یہ نفی نہی کے معنی میں ہو گی جو زیادہ بلیغ اور موکد ہوتی ہے گویا کہ یہ حکم ثابت اور ناگزیر ہے۔

وَهُوَ غَضْبَانُ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ ”اَحَدٌ“ سے حال ہے۔ یعنی کوئی آدمی حالت غضب میں کسی دو کے بھی درمیان فیصلہ نہ کرے۔

رہا یہ سوال کہ یہاں غضب سے کیا مراد ہے؟ تو اس سے وہ غضب مراد ہے جس کی حد خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرما دی ہے، وہ یہ کہ:

⊙ ...... یہ ایک انگارہ ہے جسے شیطان ابن آدم کے قلب میں پھینکتا ہے جس سے اس کا خون کھولنے لگتا ہے۔ آگے فرمایا:

⊙ ...... کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ❷

تب پھر جس غصہ میں آدمی کو دو کے درمیان فیصلہ کرنا منع ہے یہ وہ غصہ ہے جس میں خون کھولنے لگے، رگیں پھول

---

❶ صحيح البخاري: 7158- صحيح مسلم: 1717.

❷ شعب الايمان: 310/6- نوادر الاصول: 74/1.

جائیں اور آنکھیں سرخ ہو جائیں۔ یہی وہ غصہ ہے جس میں آدمی کو اپنے اوپر ضبط نہیں رہتا، اور اس کی عقل اڑ جاتی ہے حتیٰ کہ اسے دن رات، زمین آسمان اور اچھے برے کی تمیز جاتی رہتی ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو اہم باتیں مذکور ہیں:

(1) ایک یہ کہ شدید غصہ نہ کیا جائے۔

(2) دوسری یہ کہ ایسی حالت میں کسی دو کے درمیان فیصلہ نہ کیا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قاضی کو شدید غصہ میں کوئی فیصلہ سنانا منع ہے کیونکہ اس حال میں وہ صورت مسئلہ کو کامل طور پر سمجھ نہ پائے گا اور نہ وہ حکم شرعی کی صحیح تطبیق ہی کر پائے گا چہ جائیکہ کہ صحیح اجتہاد کر پائے گا۔

◈ علماء نے غصہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(1) ایک وہ غصہ جس میں اسے اچھے برے کی پہچان نہ رہے اسی بنا پر وہ صورت مسئلہ بھی نہ سمجھ پائے اور حکم شرعی کی تطبیق بھی نہ کر پائے۔ ایسی حالت میں قاضی کو فیصلہ کرنا بالاتفاق منع ہے۔

(2) دوسرا وہ غصہ ہے جو اس کے برعکس ہو کہ آدمی کو صورت مسئلہ کا ضبط بھی ممکن ہو، اور حکم شرعی کی تطبیق بھی ممکن ہو، ایسی حالت میں فیصلہ کرنا منع نہیں۔

(3) غصہ کی تیسری قسم ان دونوں اطراف کے درمیان کی ہے۔ یہ وہ حالت ہے جس میں اگرچہ آدمی کو اپنے اوپر ضبط نہ ہو لیکن اسے اپنی کہی ہوئی بات کا ادراک ضرور ہو۔

علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قاضی نہ تو شدید غصہ میں کوئی فیصلہ کرے اور نہ اس درمیانہ غصہ میں ہی کوئی فیصلہ کرے۔ البتہ اس درمیانی غصہ میں صادر ہونے والے احکام کی تنفیذ میں علماء کا اختلاف ضرور ہے۔ تب پھر معمولی غصہ میں فیصلہ کرنا منع نہ ہوگا کہ قاضی کی مجلس اس سے کم ہی خالی رہتی ہے۔

◈ حاکم کو چاہیے کہ وہ حکم سناتے وقت فارغ البال ہو اور اس کے دل یا دماغ میں کسی قسم کی تشویش نہ ہو اور اس کا دل صرف درپیش مسئلہ کی طرف ہی متوجہ ہو۔

◈ شریعت اسلامیہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی بے حد حریص ہے۔ کیونکہ شدید غصہ کے عالم میں فیصلہ کرنے کی ممانعت اسی لیے تو ہے تاکہ قاضی ایسی حالت میں کوئی غلط فیصلہ کر کے کسی کی جان یا مال کو تلف نہ کر بیٹھے اور فیصلہ کرنے میں خطا یہ عزت و آبرو اور جان و مال میں خیانت سمجھی جاتی ہے۔

◈ شدید غصہ کے عالم میں فیصلہ کرنے کی نہی تحریم کے لیے ہے اور یہی اصح قول ہے۔ کیونکہ نہی میں اصل تحریم ہے۔

قاضی جب تک دونوں متخاصمین کی بات سن نہ لے فیصلہ نہ دے

1388- وَعَنْ عَلِيٍّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا تَقَاضَى إِلَيْكَ رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلْأَوَّلِ حَتَّى تَسْمَعَ كَلَامَ الْآخَرِ ،

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جب کوئی دو آدمی تمہارے پاس کسی بات کا فیصلہ کروانے آئیں تو کسی ایک کے لیے (ہرگز) فیصلہ نہ کرنا یہاں تک

فَسَوْفَ تَدْرِي كَيْفَ تَقْضِي))! قَالَ عَلِيٌّ: فَمَا زِلْتُ قَاضِيًا بَعْدُ.

کہ تم دوسروں کی بات بھی سن لو، سو (ایسا کرنے سے) تم جلد جان جاؤ گے کہ تمہیں کیسے فیصلہ کرنا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سو اس کے بعد میں ہمیشہ (لوگوں میں حق بات کا) فیصلہ کرتا رہا۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَقَوَّاهُ ابْنُ الْمَدِيْنِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے ابن المدینی نے اس حدیث کو قوی جبکہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ الْحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ.

مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ [2]

غریب الحدیث:......**إِذَا تَقَاضَى إِلَيْكَ رَجُلَانِ:** یعنی جب دو آدمی تم سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ تم ان میں ان کے تنازع کا فیصلہ کرو۔ **رَجُلَانِ:** یہ اغلب کے اعتبار سے ہے ورنہ اس باب میں اگر دو عورتیں ہوں، یا ایک مرد اور ایک عورت ہو، سب کا حکم ایک ہے۔ **فَلَا تَقْضِ لِلْأَوَّلِ:** اوّل سے مراد مدعی ہے۔

حَتَّى تَسْمَعَ كَلَامَ الْآخَرِ: دوسرے سے مراد مدعا علیہ ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ مدعا علیہ کوئی ایسی بات پیش کرے جس کی وجہ سے مدعی کا دعویٰ ہی ختم ہو جائے۔ کیونکہ اگر اس کے پاس ایسی بات نہ ہوتی تو وہ مدعی کے ساتھ ہو کر قاضی کے پاس اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے نہ آتا۔

فَسَوْفَ تَدْرِي كَيْفَ تَقْضِي: یعنی دوسرے کی بات سن کر جھگڑے کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

فَمَا زِلْتُ قَاضِيًا بَعْدُ: یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد اور اس کو اپنا زندگی بھر کا دستور العمل بنا لینے کے بعد میں ہمیشہ حق بات کا فیصلہ کرتا رہا۔ کیونکہ ہر وہ آدمی جو کسی بھی جھگڑے کا فیصلہ کرتا ہے وہ قاضی ہی ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- قاضی جب تک مدعی اور مدعا علیہ کی پوری بات نہ سن لے، اس کے لیے کسی بھی خصومت میں فیصلہ دینا جائز نہیں ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیر موجود کے خلاف کسی بات کا فیصلہ سنا دینا جائز نہ ہو گا جس کو اصطلاحِ فقہاء میں القضاء علی الغائب کہتے ہیں۔
- البتہ غیر موجود کے خلاف فتویٰ دے سکتے ہیں جیسا کہ مفصل ذکر ہو چکا ہے۔
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاضیوں کو اس نہایت عمدہ طریق کی طرف متوجہ فرمانا کہ وہ فریقین کی بات سننے کے بعد ہی فیصلہ دیا کریں۔
- اور یہی حکم روزمرہ زندگی کے دیگر معاملات کا بھی ہے کہ جب تک ہم دوسرے کی بات سن نہ لیں کوئی فیصلہ نہ دیں۔

---

[1] مسند احمد: 143/1- سنن ابی داؤد: 3582- جامع الترمذی: 1351- امام ابن حبان (5065) اور امام حاکم (105/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ ضیاء مقدسی نے "المختارة" (388/2) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] المستدرك للحاكم: 99/4- امام حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔

اگر حاکم کا فیصلہ ظاہر دلیل کو دیکھ کر غلط ہو تب بھی محکوم لہ کے لیے وہ فیصلہ جائز نہیں ہو جاتا

1390۔ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ إِلَيَّ ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ ، فَأَقْضِيَ لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ ، فَمَنْ قَطَعْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيْهِ شَيْئًا فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”بے شک تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے سے زیادہ اچھے طریق سے اپنی دلیل پیش کرنے والا ہو، اور میں اس سے جیسی بات سنوں، ویسا فیصلہ کر دوں تو (یاد رکھو کہ) میں نے جس کو اپنے بھائی کے حق سے کچھ فیصلہ کر کے دے دیا تو میں اسے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔“ ❶

یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

غریب الحدیث:...... **إِنَّكُمْ**: یہ جملہ خبریہ ہے جو ”اِنَّ“ حرف تاکید کے ساتھ مؤکد ہے اور یہاں تاکید کی ضرورت مابعد مذکور ارشاد نبوی ”فَمَنْ قَطَعْتُ لَهُ“ کے لیے ہے۔ **تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ**: تخاصم یہ دو خصموں کا آپس میں اس بات پر جھگڑنا ہے کہ دونوں میں سے حق پر کون ہے اور ”تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ“ سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ اپنے جھگڑوں کو میرے پاس لے آنے کی رغبت رکھتے ہو۔ **لَعَلَّ**: یہاں ”لَعَلَّ“ حرف توقع ہے۔

أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ: ”أَلْحَنَ“ سے مراد ”أَفْصَحُ“ ہے۔ اس کی اصل ”اللحن“ ہے جو میلان کے معنی میں ہے۔ تب پھر یہاں لحن کا لفظ ”سلبِ ماخذ“ ❷ کے معنی میں ہے۔ یعنی ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو کجی اور میلان کے بغیر زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ پیش کرنے والا ہو۔

فَأَقْضِيَ لَهُ عَلَى نَحْوِ مِمَّا أَسْمَعُ، مِنْهُ: قضا یہاں حکم کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جس طرح وہ آدمی بات پیش کرے گا میں اس کے مطابق حکم دے دوں۔ کیونکہ اس کی بات میں بظاہر دلیل، حجت اور قوت زیادہ نظر آ رہی تھی۔

فَمَنْ قَطَعْتُ لَهُ ...... مِنَ النَّارِ: حق سے مراد یہاں عام ہے۔ لہٰذا یہ مالی، جنائی اور شخصی وغیرہ سب حقوق کو شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر کسی کے ظاہری قولی دلائل سن کر کسی کے حق میں اس کے بھائی کے کسی حق کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے تو درحقیقت وہ شے اس کی ہو نہیں جاتی۔ جیسے رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ (النسآء: 10)

”بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔“

پس معلوم ہوا کہ کسی کا مال ناحق کھانا یہ پیٹ میں جہنم کے انگارے بھرنا ہے۔ لہٰذا حاکم کے ظاہری دلائل کو دیکھ کر کسی کے حق میں کسی بات کا فیصلہ کر دینے سے وہ شے اس کے لیے حلال نہیں ہو جاتی۔

---

❶ صحیح البخاری: 2458۔ صحیح مسلم: 1713.

❷ بسا اوقات کوئی لفظ اپنے معنی مصدری کے سلب پر دلالت کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس وقت نحوی اصطلاح کے مطابق اسے ”سلب ماخذ“ کا نام دیا جاتا ہے جیسے ”ضرب“ بول کر عدم ضرب مراد لینا سلب ماخذ کہلائے گا۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ ”لحن“ (میلان اور کجی) بول کر عدم لحن مراد لیا گیا ہے۔ یعنی ایسی بات جو کجی سے خالی یعنی فصیح و بلیغ اور درست ہو۔ (نسیم)

مضمون حدیث :......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ رنگ آمیز دلائل کے ذریعے خصومت کا فیصلہ اپنے حق میں کروا لینے سے کوئی شے حلال نہیں ہو جاتی بلکہ باطل ہی رہتی ہے اور باطل مال انجام کار جہنم میں لے جاتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- خصومت، تنازع اور جھگڑا خیر القرون میں بھی ہو جایا کرتا تھا اور یہ کوئی اچنبھے یا حیرت کی بات نہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے جھگڑے خدمت نبوی میں لے کر آیا کرتے تھے۔
- خصومت کو قاضی تک لے جانے سے قبل باہمی صلح کر لینا جائز ہے کہ اس میں سلامتی اور مصلحت بھی زیادہ ہے اور یہ باہمی بغض و عداوت کو بھی قطع کرتی ہے۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے جھگڑے لے کر صرف خدمت نبوی میں ہی حاسر ہوا کرتے تھے۔
- اپنی بات کے بیان اور تعبیر میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں۔ چنانچہ کوئی تو اپنی بات کی تعبیر میں ماہر ہوتا ہے اور کسی کو اپنی بات پیش کرنے کا سلیقہ تک نہیں آتا ہے۔ غرض یہ رب تعالیٰ کی تقسیم ہے۔
- معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں۔ اس کی دلیل: "فَأَقْضِي لَهُ عَلَى نَحْوِ مِمَّا أَسْمَعُ مِنْهُ" کے الفاظ ہیں۔
- قاضی صرف اسی بات کی بنیاد پر فیصلہ دے جو وہ سنے چاہے اس کے گمان میں ''بات'' اس کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔
- البتہ علماء نے لکھا ہے کہ قاضی توریہ اور استدراج کے ذریعے حق بات کی کھوج لگا سکتا ہے۔
- قاضی کی قضاء کسی حرام کو حلال نہیں کر دیتی بلکہ وہ باطل اور حرام ہی رہتی ہے، تب پھر قاضی کی قضا ظاہر میں نافذ ہوتی ہے نہ کہ باطن کے اعتبار سے بھی نافذ ہوتی ہے۔
- ناحق مال کا انجام آتش جہنم ہے۔

عدل کرنے کا اہتمام

1391-1393- وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ : ((كَيْفَ تَقْدُسُ أُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ مِنْ شَدِيْدِهِمْ لِضَعِيْفِهِمْ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''وہ امت کیسے پاک ہو سکتی ہے جس کے تگڑے سے اس کے کمزور کے لیے مواخذہ نہ کیا جا سکے۔'' [1]

رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ .

اس حدیث کو امام ابن حبان نے روایت کیا ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيْثِ بُرَيْدَةَ، عِنْدَ الْبَزَّارِ . وَآخَرُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي سَعِيْدٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ .

اور مسند بزار میں حدیث بریدہ رضی اللہ عنہ سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ [2] جبکہ اس کا دوسرا شاہد سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔ [3]

---

[1] الموارد لابن حبان: 1554- سنن ابن ماجه: 1984 .

[2] مسند البزار: 235/2- اس حدیث کی اسناد میں عطا بن سائب ہے جو ثقہ ہے۔ البتہ اسے اختلاط ہو جایا کرتا تھا۔ دیکھیں: مجمع الزوائد: 208/5 .

[3] سنن ابن ماجه: 2426- مسند ابی یعلی: 1091- اس روایت کے رواۃ ثقہ ہیں۔ علامہ بوصیری رحمہ اللہ نے "مصباح الزجاجة" (68/3) میں اس کی تصریح کی ہے۔

غریب الحدیث:...... كَيْفَ: یہ استفہام کے لیے ہے اور یہاں نفی کے معنی میں ہے۔

تُقَدَّسُ: یہ "تُطَهَّرُ" کے معنی میں ہے اور یہ ذنوب، حروب اور باہمی بغض وکینہ وغیرہ سے پاک ہونے کے سب معانی کو شامل ہے۔ تب پھر مطلب یہ بنے گا کہ وہ امت ان قبائح سے پاک نہیں ہوسکتی جس کی یہ صفت ہو۔

لَا يُؤْخَذُ مِنْ شَدِيدِهِمْ لِضَعِيفِهِمْ: شدید سے مراد قوی اور طاقتور ہے۔ یعنی جس امت کے کمزوروں کے حقوق کو ان کے تگڑوں سے ولوایا نہ جاسکے، وہ امت گناہوں سے اور اسی طرح دوسرے باطنی امراض سے کیونکر پاک ہوسکتی ہے۔

اور قوت سے مالی قوت اور عہدہ واقتدار اور جاہ ومنصب کی قوت دونوں مراد ہیں۔ غرض اس طاقتور کو کمزور پر کبھی تو مالی قوت حاصل ہوگی اور کبھی حکومتی کارندوں تک رسائی اور اثر ورسوخ کے ذریعے قوت حاصل ہوگی۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل کمزوروں کو ان کے حقوق ولوانے کی بے حد بلیغ ترغیب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اگر کوئی قوم کمزوروں کو ان کے حقوق نہیں ولواتی اور طاقتور لوگوں کا قرار واقعی احتساب نہیں کرتی تو اس حدیث میں اس قوم کو نہایت موثر انداز سے اس بات سے ڈرایا اور روکا گیا ہے کہ وہ طاقتور کو کھلے مہار چھوڑ دے اور کمزوروں کا حال تک نہ پوچھے۔

◈ سب میں عدل کرنا واجب ہے چاہے وہ کمزور ہو یا طاقتور۔ اس کی دلیل: "لَا يُؤْخَذُ مِنْ شَدِيدِهِمْ لِضَعِيفِهِمْ" کے الفاظ ہیں۔

قضا کے عہدے کی سنگینی، نزاکت اور عظیم ذمہ داری کا بیان

1394۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: ((يُدْعَى بِالْقَاضِي الْعَادِلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيَلْقَى مِنْ شِدَّةِ الْحِسَابِ مَا يَتَمَنَّى أَنَّهُ لَمْ يَقْضِ بَيْنَ اثْنَيْنِ فِي عُمُرِهِ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''عدل گستر قاضی کو روز قیامت بلایا جائے گا اور وہ حساب کی اس قدر شدت کا سامنا کرے گا کہ (اسے دیکھ کر) اس بات کی تمنا کرنے لگے گا کہ (کاش) اس نے اپنی (پوری) زندگی میں دو آدمیوں کے درمیان بھی (کسی خصومت کا) فیصلہ نہ کیا ہوتا۔'' [1]

رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَلَفْظُهُ ((فِي تَمْرَةٍ)).

اس حدیث کو امام ابن حبان نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی کی روایت میں "فِي تَمْرَةٍ" کے الفاظ ہیں۔ (یعنی کاش میں نے ایک کھجور کی بابت جھگڑے میں بھی کسی دو کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کیا ہوتا)۔

---

[1] صحيح ابن حبان: 5055۔ سنن البيهقي: 96/10۔ مسند احمد: 75/6۔ علامہ ذہبی نے "سير اعلام النبلاء" (170/18) میں اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ جبکہ "تذكرة الحفاظ" (959/3) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ علامہ عقیلی (297/3) نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ یہی قول ابن جوزی کا "العلل" (754/2) میں ہے۔

غریب الحدیث:......**يُدْعَى بِالْقَاضِي الْعَادِلِ**: "يُدْعَى" سے مراد "يُؤْتَى" ہے۔یعنی اسے لایا جائے گا۔ قاضی لوگوں کے درمیان ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والے کو کہتے ہیں جبکہ عادل اسے کہتے ہیں جو ظلم و جور سے کام نہ لیتا ہو اور عدل تب ہی ہوسکتا ہے جب جملہ تنازعات میں حکم شرع کو جاری کیا جائے۔

فَيَلْقَى مِنْ شِدَّةِ الْحِسَابِ: مراد اس کے کیے فیصلوں کا محاسبہ کرنا ہے۔ کہ جو بھی فیصلہ کیا اور جس کے حق میں کیا کیونکر کیا اور کس دلیل سے کیا؟۔

مَا يَتَمَنَّى: تمنا: اپنے لیے کسی ایسی شے کو طلب کرنا ہے جس کا حصول دشوار یا متعذر ہو۔ اس کے بالمقابل رجاء ہے یہ ایسی بات کو طلب کرنا ہے جس کا حصول ممکن اور قریب ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں بھی قضا قبول کرنے کی تحذیر اور ڈراوا ہے۔
- یہ حدیث یا تو باطل ہے یا پھر شاذ ہے کیونکہ یہ حدیث گزشتہ مذکورہ متفق علیہ حدیث رقم (1387) اور حدیث رقم (1384) کے متصادم و متناقض ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس حدیث کو لیں تو کوئی بھی قضاء قبول کرنے کو تیار نہ ہو، حالانکہ قضا کی ذمہ داری اٹھانا فرضِ کفایہ ہے اور لوگوں کا قاضی کے بغیر ہونا سخت منع ہے۔ پھر یہ حدیث اس روایت کے بھی متصادم ہے، جس میں قاضی عادل کو روز قیامت رب کے سائے تلے جگہ دیے جانے کا ذکر ہے۔ تب پھر درست یہ ہے کہ یہ حدیث، شاذ یا باطل ہے۔ اس بنا پر ہمیں اس حدیث سے متعلق مزید فوائد ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے امور عامہ پر عورت کے حاکم بن بیٹھنے کا حکم

1395- وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: ((لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً)). رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے امر کا والی عورت کو بنالیا۔" [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**لَنْ يُفْلِحَ**: یہ فلاح سے مشتق ہے۔ فلاح یہ مطلوب کے حصول اور مرہوب و مکروہ سے نجات کو کہتے ہیں۔ تب پھر فلاح اور فوز کا معنی قریب قریب ہے اور "لَنْ" یہ مستقبل کی نفی کے لیے آتا ہے لہٰذا یہ تمام زمانوں کو عام ہوگا۔ **قَوْمٌ**: یہ نکرہ ہے جو نفی کے سیاق میں آیا ہے۔ تب پھر یہ وعید اور تحذیر ہر قوم کو عام ہوگی۔ کیونکہ نکرہ جب نفی کے تحت آتا ہے تو اس سے عموم مراد ہوتا ہے۔

وَلَّوْا أَمْرَهُمْ: مراد سیاسی، عسکری، اقتصادی اور معاشرتی امور وغیرہ کی تدبیر اور انتظام و انصرام پر عورت کو حاکم اور والی بنا دینا ہے۔ **امْرَأَةً**: یہ بھی نکرہ ہے جو نفی کے تحت واقع ہے لہٰذا یہ ہر عورت کو عام ہوگا۔ چاہے وہ اپنے دور کی جس قدر عقل مند عورت ہی کیوں نہ ہو۔

سببِ حدیث:......حضرات محدثین نے اس حدیث کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تھی کہ

[1] صحيح البخاري: 4425.

ایرانیوں نے کسریٰ کی وفات کے بعد اس کی بیٹی کو اپنا حکمران بنالیا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- عورت کو ولایت عامہ دینا جائز اور درست نہیں کیونکہ عورت کو ولایت عامہ سپرد کرنے کا نتیجہ عدمِ فلاح اور عمومی بگاڑ کی صورت میں نکلتا ہے۔
- معلوم ہوا کہ عورت عقل و تدبیر دونوں میں ناقص ہے اور اس کا ولایت عامہ جیسے امور میں مرد کے ساتھ شریک کار ہونا درست نہیں۔
- عورتیں فہم و ذکاء کے جس درجہ تک بھی پہنچ جائیں تب بھی انہیں ولایت عامہ سونپنے کا نتیجہ عدمِ فلاح کی صورت میں ہی نکلے گا۔
- یہ نفی عام ہے اور صرف ایرانیوں کے ساتھ ہی خاص نہیں اور یہ نفی قیامت تک کے لیے ہے۔ لہٰذا اس نفی کو صرف ایرانیوں کے ساتھ خاص سمجھنا باطل ہوگا۔
- عورت کا وزیر اور مشیر بننا بھی درست نہیں کیونکہ یہاں بھی وہی قصورِ عقل والی علت ہے۔
- عورت جذباتی ہوتی ہے، اس لیے جلد دھوکا کھا جاتی ہے۔
- جب عورت کی ولایتِ عامہ جائز نہیں تو ولایتِ خاصہ تو بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی اور وہ عورت کا مردوں کی امامت کرنا ہے۔ لہٰذا عورت کے لیے مردوں کا امام اور خطیب بننا جائز نہ ہوگا۔
- یہیں سے یہ بھی مستفاد ہوگیا کہ عورت کا قاضی بننا بھی صحیح نہیں۔ چاہے اسے عورتیں ہی کسی نزاع میں حکم اور قاضی بنائیں کہ یہ جائز نہ ہوگا۔
- رہ گیا مدرسہ کی مدیرہ اور منتظمہ بننا تو اگر وہ مدرسہ صرف لڑکیوں کا ہے تو عورت کے مدیرہ بننے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ عورت لڑکوں کے مدرسہ کی مدیرہ نہیں بن سکتی۔

والی کا مسلمانوں کی حاجات سے اوجھل ہو جانا جائز نہیں

1396۔ وَعَنْ أَبِي مَرْيَمَ الْأَزْدِيِّ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ فَاحْتَجَبَ عَنْ حَاجَتِهِمْ وَفَقِيرِهِمْ احْتَجَبَ اللّٰهُ دُوْنَ حَاجَتِهِ)).

أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ .

حضرت ابو مریم ازدی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ نے جسے مسلمانوں کی کسی بات کا والی بنایا اور وہ ان کی حاجت سے اور ان کے فقیر سے اوجھل ہوگیا تو رب تعالیٰ اس کی حاجت کے آگے پردے میں ہو جائے گا۔'' ❶

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

---

❶ سنن ابی داؤد: 2948۔ جامع الترمذی: 1333۔ خود امام موصوف نے "فتح الباری" (133/13) میں اس حدیث کو عمدہ کہا ہے۔ مسند احمد اور معاجم طبرانی میں اس حدیث کے متعدد شواہد ہیں جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ جبکہ مسند احمد کی روایت کے رجال ثقہ ہیں۔ المستدرك للحاكم: 220/2۔ امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط پر ہے۔

غریب الحدیث :......مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ شَيْئًا: ''شَيْئًا'' نکرہ ہے جو شرط کے سیاق میں آیا ہے۔لہٰذا یہ عام ہوگا اور ہر چھوٹی بڑی شے کو شامل ہوگا۔

فَاحْتَجَبَ عَنْ حَاجَتِهِمْ: مراد ان کی حاجات کے فیصلے نہ کرنا ہے اور اس کی صورت چاہے نظروں سے غائب ہوکر ان حاجات کے فیصلے نہ کرنا ہو یا یہ کہ نظروں سے اوجھل تو نہ ہو البتہ خود لوگوں کو اپنے جھگڑے مسئلے اور ضروریات وحاجات لے کر آنے سے روک دے کہ یہ دونوں صورتیں احتجاب یعنی پردے میں ہو جانے کو شامل ہیں۔لہٰذا اگر کوئی آدمی اپنی کرسی پر بیٹھنے کے باجود لوگوں کو اپنے قریب آنے سے منع کرتا ہے تو فی الواقع ایسا شخص احتجاب یعنی پردے میں ہی ہے اور درحقیقت یہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہی ہے۔عَنْ حَاجَتِهِمْ :مراد مسلمانوں کی حاجات وضروریات ہیں چاہے وہ غنی ہوں یا فقیر۔

فَقِيرِهِم: مراد وہ احتیاجات اور ضروریات ہیں جن کا خاص فقیروں اور تنگدستوں سے تعلق ہے فقیر کو بالخصوص اس لیے ذکر فرمایا کہ عموماً یہ والیانِ امر امراء واغنیاء کی بات تو سنتے ہیں لیکن فقیر اور تنگدست کی بات کو قابل شنوائی نہیں جانتے۔اس لیے ان سے ملتے بھی نہیں اور انہیں ملنے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ بلکہ ان سے حجاب میں رہتے ہیں اور تو اور ان کمزور اور فقیروں پر تو حد جاری کرتے ہیں لیکن اغنیاء پر حد جاری نہیں کرتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عادت تھی۔

احْتَجَبَ اللّٰهُ دُونَ حَاجَتِهِ: غرض ایسے والیانِ امر کو رب تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا ملے گی کہ رب تعالیٰ بھی ان کی حاجات سے پردہ فرمائیں گے۔چنانچہ ان کے امر کو آسان نہ فرمائیں گے اور ان کی حاجت پوری نہ فرمائیں گے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جو والی یا حکمران تنگدست اور حاجت مند مسلمانوں کی ضرورت سے حجاب کرتے ہیں، ان کے لیے اس حدیث میں یہ وعید مذکور ہے کہ رب تعالیٰ بھی ان کی حاجت پوری نہ فرمائے گا۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا کسی کو والی بنانا یہ دراصل رب تعالیٰ کے ساتھ اس بات کا عہد کرنا ہے کہ وہ اپنے دست نگروں کی ضروریات وحاجات کو پورا کرے گا۔تب پھر والی بننے کے بعد رعایا کے امور سرانجام نہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آدمی اس منصب کے لائق ہی نہ تھا۔

◈ معلوم ہوا کہ بندے کے ہاتھ میں اپنے امور کی صرف تدبیر ہے نہ کہ وہ اپنے امور کا مالک بھی ہے۔اس کی دلیل: ''مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ'' کے الفاظ ہیں اور ان الفاظ میں مشہور گمراہ اور بدعتی فرقہ قدریہ کا بھی رد ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ انسان اپنے عمل میں مستقل بالذات ہے، اور اُن کا رب تعالیٰ کی ذات سے کوئی علاقہ نہیں اور اللہ کو بندے کے صرف اسی عمل کی ہی خبر ہوتی ہے جس کو وہ ظاہر کرتا ہے اور جو فعل وہ ظاہر نہ کرے رب تعالیٰ کی اس پر کوئی دسترس نہیں۔ مذکورہ حدیث میں اس باطل عقیدہ کا رد ہے۔

◈ اگر کوئی رب تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے مسلمانوں کے امور کا والی بن جاتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ باہر نکل کر مسلمانوں کی خبر گیری کرے اور ان کی حاجات وضروریات کو پورا کرے۔اس کے وجوب کی دلیل احتجاب پر وعید ہے۔

◈ جزا بھی اسی جنس کی ملے گی جیسا کوئی عمل کرے گا۔ چنانچہ جب اس والی نے ضرورت مندوں کی احتیاج سے حجاب کیا تو رب تعالیٰ نے بھی اس کی ضرورت سے احتجاب کیا۔

◈ مذکورہ حدیث میں ''عَنْ حَاجَتِهِمْ وَفَقِيرِهِم'' یہ تخصیص بعد التعمیم کی قبیل سے ہے۔ کیونکہ حاجت مندوں کے عموم

میں فقیر بھی آ جاتے ہیں۔

- اور فقیر پر نص لانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ والیانِ امر امیروں کی بات تو سنتے ہیں لیکن فقیروں کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے۔
- یہی حکم قاضی کا بھی ہے کہ اسے بھی مسلمانوں کی احتیاجات سے پردے میں نہ رہنا چاہیے۔

رشوت، ہدیہ اور قاضی

1397-1398۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: ((لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ فِي الْحُكْمِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے قضاء میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے (دونوں) پر لعنت فرمائی ہے۔ [1]

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن جبکہ امام ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عِنْدَ الْأَرْبَعَةِ إِلَّا النَّسَائِيَّ

اور ائمہ اربعہ کے ہاں سوائے امام نسائی کے، حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی ہے۔ [2]

غریب الحدیث:......لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: یعنی آپ ﷺ نے ایسے آدمی پر لعنت کی بددعا فرمائی ہے۔ لعنت یہ رب تعالیٰ کی رحمت سے دوری اور اس سے دھتکار ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی عقوبت ہے۔

الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ: راشی: رشوت دینے والا، مرتشی: رشوت لینے والا۔ اب رشوت لینے والے کا مستحق لعنت ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ وہ ایک ایسی شے لیتا ہے جس کا لینا اس کے لیے حلال نہ تھا اور راشی اس لیے لعنت کا مستحق ہے کیونکہ وہ ایک گناہ میں دوسرے کا معاون بنا ہے۔ لہٰذا یہ بھی استحقاقِ لعنت میں مرتشی کے حکم میں داخل ہوگا۔

فِي الْحُكْمِ: مراد قضا ہے۔ یعنی قضا میں رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں لعنت کے مستحق ہیں۔

رشوت:

مناسب ہے کہ یہاں رشوت کی تعریف بھی بیان کر دی جائے۔ سو رشوت یہ قضا سے قبل دیے جانے والے مال کو کہتے ہیں تا کہ دینے والا اس مال کے ذریعے اپنے مقصد تک پہنچ جائے۔

لفظ رشوت یہ رشاء سے ماخوذ ہے جو کنویں میں پھینکی جانے والی اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے۔ پس رشوت یہ اسی رسی کی طرح ہے جس کو راشی قضا کے کنویں میں اس لیے پھینکتا ہے تا کہ اس کے ذریعے اپنا مقصد پورا کر سکے۔

مذکورہ حدیث کا مضمون واضح ہے۔

---

[1] مسند احمد: 387/2۔ جامع الترمذی: 1336۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ سنن ابن ماجہ: 2313۔ امام ابن حبان (5076) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

[2] مسند احمد: 164/2۔ سنن ابی داؤد: 3580۔ جامع الترمذی: 1337۔ سنن ابن ماجہ: 2313۔ حاکم (115/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ ابن حزم نے "المحلی" (157/9) میں اس حدیث کو عبدالرحمٰن بن حارث کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث کے متعدد شواہد ہیں۔ دیکھیں: الترغیب والترھیب: 126/3.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ قضا میں رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں اس کی دلیل اس فعل پر لعنت کا مرتب ہونا ہے۔ البتہ باعث لعنت وہ رشوت ہے جس کے ذریعے باطل کام نکلوانا مقصود ہو۔ چاہے وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کر کے ہو یا کسی کے حق کا انکار کر کے ہو۔
جیسے کوئی کسی پر ایک ہزار روپے کا باطل دعویٰ کر دے اور فیصلہ ہونے سے قبل قاضی کو کچھ رقم پیش کر دے تا کہ وہ فیصلہ اس کے حق میں کرے۔
یا کسی کے حق سے انکار کرنے کے لیے قاضی کو عدالت میں جانے سے قبل رشوت دے دے تا کہ قاضی اس کے خلاف دعویٰ کو خارج کر دے۔ غرض باطل دعویٰ کے اثبات یا کسی کے حق کے انکار کی غرض سے دی جانے والی رشوت حرام ہوتی ہے۔ رہی وہ رشوت جو اپنے حق کو پانے کے لیے ہو تو وہ صرف لینے والے کے حق میں حرام ہوگی جبکہ دینے والے کو یہ رشوت دینا حلال ہے کیونکہ اس نے یہ رشوت پیش کر کے کسی کا حق نہیں مارا۔ البتہ اپنا حق وصول کیا ہے اور خود پر سے ظلم کو دفع کیا ہے۔

◈ جس قاضی کے بارے میں مشہور ہو کہ وہ رشوت لیے بغیر کام نہیں کرتا تو اسے رشوت پیش کر کے اپنا جائز کام نکلوانا حلال ہوگا۔

◈ اسی حکم میں والی اور حاکم بھی داخل ہے کہ اگر وہ کسی جائز کام کو رشوت لیے بغیر نہ ہونے دے تو اسے رشوت دینا جائز ہوگا۔

◈ ظاہر یہ ہے کہ قضاء کے علاوہ میں رشوت لعنت کے حکم میں داخل نہیں۔ کیونکہ قضا میں قاضی اور حکومت میں حاکم اپنے حکم اور فیصلے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تب پھر رشوت لے کر کیا جانے والا باطل فیصلہ اللہ اور اس کے رسول پر افتراء ہوگا۔
رہے حقوق کے مسائل جیسے کسی افسر کا چپڑاسی رشوت لیے بغیر افسر سے ملنے نہ دے اور سائل حق والا ہو، تو اگرچہ اپنے حق کے حصول کے لیے اور اس افسر تک رسائی پانے کے لیے اس چپڑاسی کو رشوت دینا جائز ہوگا اور چپڑاسی کو رشوت لینا حرام ہی ہوگا لیکن بہرحال وہ لعنت کا مستحق نہ ہوگا۔

◈ افسوس کہ اس وقت بلادِ اسلامیہ میں رشوت اس قدر رائج ہو چکی ہے کہ الامان والحفیظ۔

قاضی کو مجلس میں متخاصمین کے درمیان برابری کرنا واجب ہے

1399۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ ﷠ قَالَ: ((قَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَاكِمِ)).

حضرت عبداللہ بن زبیر ﷠ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے (خصومات کے باب میں) اس بات کا حکم ارشاد فرمایا کہ دونوں جھگڑے والے (اپنی اپنی بات بیان کرنے کے لیے) حاکم (اور قاضی) کے سامنے (برابر رتبہ میں) بیٹھیں گے۔ [1]

رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام ابو داود ﷫ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم

[1] سنن ابی داؤد: 3588۔ المستدرك للحاكم: 106/4۔ مسند احمد: 4/4۔ امام بیہقی (135/10) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :......اگر چہ اس حدیث میں کلام ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات قاضی کے آداب میں سے ہے کہ وہ خصمین کے درمیان برابری رکھ کر مقدمہ اور خصومت کی سماعت کرے، اور کسی ایک فریق کو دوسرے پر ترجیح یا فوقیت نہ دے۔ چنانچہ اپنی اپنی بات کرنے کے لیے دونوں خصم قاضی کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

علماء نے لکھا ہے کہ قاضی پر یہ بات واجب ہے کہ وہ دیکھنے میں، بات کرنے میں، لفظوں کے انتخاب میں، بٹھانے اور کھڑا کرنے میں دونوں خصموں کے درمیان عدل، مساوات اور برابری کرے۔ کیونکہ اس عدل کرنے کا حکم رب تعالیٰ نے دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ (النحل: 90) ''بے شک اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔''

دوسرے یہ کہ اگر قاضی اور حاکم دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ظلم کرتا ہے تو اس کے دل شکستہ اور دل گرفتہ ہونے کی بنا پر دوسرے کی حجت کی قوت ضائع ہو جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ خصیمن قاضی اور حاکم کے سامنے کہاں برابر بیٹھیں؟ تو وہ دونوں سامنے بیٹھیں یا کھڑے ہوں تاکہ قاضی دونوں پر یکساں نظر ڈال سکے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک گہری نظر بھی حق و باطل کو عیاں کر دیتی ہے۔

1- بَابُ الشَّهَادَاتِ......گواہیوں کا بیان

شہادت کی تعریف اور اس کے ذرائع:

شہادات یہ شہادت کی جمع ہے۔ شہادت یہ آدمی کا کسی دیکھی، سنی، چکھی، چھوئی یا سونگھی شے کی بابت اُس بات کی خبر دینا ہے جو وہ جانتا ہے۔ یعنی جو بات وہ اپنے حواس خمسہ: سمع، بصر، شم، ذوق اور لمس کے ذریعے جانتا ہے، اس کے بتلانے کو شہادت کہتے ہیں اور علم کی قید سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت ظن غالب سے نہیں دی جاتی بلکہ علم قطعی کے ذریعے ہی دی جاتی ہے۔

کسی بات کے علم کا ایک ذریعہ ''استفاضہ'' یعنی اس کی شہرت عامہ اور اس کا زبانِ زدِ خلائق ہونا بھی ہے۔ جیسے کسی کی ولادت، نسب اور وفات کی شہادت دینا حالانکہ ان تینوں مواقع پر ہمارا موجود ہونا لازم اور ضروری نہیں لیکن پھر بھی ہم ایک آدمی کے بارے میں اس بات کی شہادت دے دیتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں ہے اور یہ شہادت استفاضہ یعنی اس بات کے از حد عام اور شائع و ذرائع ہونے کی بنا پر دیتے ہیں، حالانکہ ہم اس کی ولادت کے وقت موجود نہ تھے، ایسا ہی کسی کے مرنے کی تصدیق کرنا ہے حالانکہ اس کی روح نکلتے وقت ہم وہاں موجود نہ تھے لیکن اس کے مرنے کی شہادت اور تصدیق استفاضہ کی بنا پر کرتے ہیں۔

تب پھر مشہود بہ (یعنی جس کے بارے میں شہادت دی جائے) کی بابت علم کے کل ذرائع چھ ہو گئے، حواس خمسہ اور استفاضہ۔

شہادت کا اطلاق اور اس کا حکم:

پھر شہادت کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے: (1) تحمل شہادت (2) اور ادائے شہادت۔

رہا تحملِ شہادت تو یہ فرضِ کفایہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا﴾ (البقرۃ: 282) ''اور گواہ جب بھی بلائے جائیں انکار نہ کریں۔''

جبکہ ادائے شہادت فرض عین ہے اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (البقرة: 283)

''اور شہادت مت چھپاؤ اور جو اسے چھپائے تو بے شک وہ، اس کا دل گناہ گار ہے۔''

شہادت کے ردّ وقبول کا حکم:

پھر بسا اوقات آدمی کسی قضیہ کا گواہ تو ہوتا ہے لیکن اس کی گواہی قبول نہیں کی جاتی جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہوتی ہیں:

(1) گواہ کا فاسق ہونا۔ یا (2) مشہود لہ (وہ آدمی جس کے حق میں شہادت دی جائے) کا قرابت دار ہونا۔ یا (3) مشہود علیہ (جس کے خلاف شہادت دی جائے) کا دشمن ہونا وغیرہ کہ ان عوارض کی بنا پر بسا اوقات گواہ ہونے کے باوجود کسی قضیہ میں آدمی کی گواہی مقبول نہیں ہوتی۔

اور جب ایک کی گواہی رد ہو جاتی ہے تو ان دوسروں پر شہادت دینا فرض ہو جاتا ہے جو اس قضیہ کے وقت حاضر تھے۔

رہا یہ سوال کہ از خود آگے بڑھ کر گواہی دینا اولیٰ ہے یا بلائے جانے پر گواہی دینا اولیٰ ہے؟ تو اس کا جواب ذیل کی دو احادیث میں آ جاتا ہے۔

چند اصطلاحات:

مناسب ہے کہ شہادت سے متعلق چند اصطلاحات کو پہلے بیان کر دیا جائے۔

شہادت:......لفظ شہادت یہ "شَهِدَ شَهَادَةً عِنْدَ الْحَاكِمِ" سے مشتق ہے۔ یہ حاکم کے روبرو کسی قطعی اور یقینی بات کی خبر دینے کو کہتے ہیں جس میں شک اور تردد نہ ہو۔ شرع شریف میں شہادت کسی حال کی خبر دینے کو کہتے ہیں جو اٹکل اور گمان سے نہ ہو بلکہ چشم دید ہو۔ شہادت کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اثباتِ حق کے لیے قاضی کی مجلس میں لفظ شہادت کے ساتھ سچی خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں۔

شہادت کی شرطیں:

یہ دو طرح کی ہیں بعض کا تعلق تحمل شہادت سے اور بعض کا تعلق ادائے شہادت سے ہے یہ شرطیں اپنی پوری تفصیل کے ساتھ کتبِ فقہ میں مذکور ہیں جبکہ کچھ کا بیان آگے آ جائے گا۔

شاہد:......گواہی دینے والا۔

مشہود لہ:......جس کے لیے گواہی دی جائے۔

مشہود علیہ:......جس کے خلاف گواہی دی جائے۔ [1]

اب ذیل میں احادیث اور ان پر کلام ملاحظہ ہو۔

سب سے اچھا گواہ وہ ہے جو گواہی کے مطالبہ سے پہلے خود گواہی دے دے

1400۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ؟ هُوَ الَّذِيْ يَأْتِيْ بِالشَّهَادَةِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا)).

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کیا میں تم لوگوں کو سب سے اچھے گواہ کا نہ بتلاؤں؟ یہ وہ گواہ ہے جو اس سے پہلے کہ اس سے گواہی مانگی

[1] از "معدن الحقائق شرح کنز الدقائق: 115/2۔" (نسیم)

جائے۔خود اپنی گواہی دینے چلا آئے۔“ ❶

رَوَاهُ مُسْلِمٌ . اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......أَلَا : یہ اداۃ عرض یعنی کسی بات کو بلا حث وتحضیض پیش کرنے کا کلمہ ہے۔اس سے مخاطب کی تنبیہ مراد ہوتی ہے۔

أُخْبِرُكُمْ: یہ خطاب حاضرین مجلس کو ہے۔

بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ: خیر سے مراد افضل ہے اور خیر اسم تفضیل کا صیغہ ہے جیسا کہ بارہا بیان کیا جا چکا ہے اور شہداء یہ شہید کی جمع ہے۔یہ وہ شخص ہے جو گزشتہ مذکورہ چھ طریق میں سے کسی ایک طریق کے ذریعہ شہادت دیتا ہے۔

الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ: "الَّذِي" یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے اور وہ "هُوَ" ہے۔چنانچہ تقدیری عبارت یہ ہوگی "هُوَ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ".

قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا : یہ گواہی کون طلب کرے گا، مذکورہ حدیث میں اس کو بیان نہیں کیا گیا۔یہ حاکم بھی ہوسکتا ہے اور مشہود لہ بھی ہوسکتا ہے۔اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس امر کو مبہم رکھا اور یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ اچھا گواہ وہ ہے جو صاحبِ حق کے گواہی طلب کرنے سے قبل خود گواہی دے۔چنانچہ آپ ﷺ نے نہ تو حاکم کے سوال کرنے کا ذکر فرمایا اور نہ صاحبِ حق کے مطالبہ کو ہی ذکر فرمایا۔تاکہ یہ مبہم کلام ان دونوں صورتوں کو شامل رہے۔البتہ غیر متعلقہ کے مطالبہ شہادت کا کوئی اعتبار نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ گواہوں میں بھی باہمی تفاضل ہوتا ہے، چنانچہ کوئی افضل تو کوئی غیر افضل ہوتا ہے۔

◈ سب سے بہتر گواہ وہ ہے جو گواہی کے مطالبہ سے قبل خود گواہی دے دے۔رہی وہ احادیث جن کا ظاہر اس روایت کے خلاف ہے، ان پر کلام ذیل کی احادیث میں آجاتا ہے۔

سب سے بہتر زمانے پہلے تین زمانے ہیں

1401- وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ خَيْرَكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ يَكُونُ قَوْمٌ يَشْهَدُونَ وَلَا يُسْتَشْهَدُونَ، وَيَخُونُونَ وَلَا يُؤْتَمَنُونَ، وَيَنْذِرُونَ وَلَا يُوفُونَ، وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السِّمَنُ)).

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"بے شک تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں، پھر وہ ہیں جو ان کے قریب (یعنی ان کے بعد) ہیں پھر وہ ہیں جو ان کے قریب ہیں، پھر (ان تین زمانوں کے بعد) ایسے لوگ ہوں گے (یعنی ایسے لوگ آئیں گے) جو گواہی دیں گے حالانکہ ان سے گواہی مانگی نہ جائے گی، وہ خیانت کرتے ہوں گے اور انہیں امین نہ سمجھا جاتا ہوگا اور وہ نذریں مانتے ہوں گے پر ان کو پورا نہ کرتے ہوں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا۔“ ❷

❶ صحیح مسلم: 1719 . ❷ صحیح البخاری: 2651- صحیح مسلم: 2535 .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّ خَيْرَكُمْ: یہ خطاب پوری امت کے لیے عام ہے۔ اگر چہ بظاہر اس خطاب کے مخاطب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو اس وقت حاضر خدمت تھے۔

قَرْنِي: قرن زمانہ کو کہتے ہیں۔ اس تفسیر میں متعدد اقوال ہیں، جو دس سے لے کر ایک سو بیس سال تک کے ہیں۔ قرن کی تفسیر میں اختلاف بے حد وسیع ہے۔ البتہ اس روایت میں قرن سے مراد اہل قرن ہیں اور یہ قرنِ صحابہ، قرنِ تابعین اور قرنِ تبع تابعین ہیں۔

رہا یہ سوال کہ تب پھر کب تک ایک زمانہ کے لوگوں کا قرن شمار ہوگا۔ تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں اکثر اہل کا اعتبار ہے۔ لہٰذا جب تک اکثر صحابہ رہے، وہ صحابہ کا قرن شمار ہوگا جو قرنِ رسول ہی ہے اور جب صحابہ کم پڑ گئے اور تابعین کی کثرت ہوگئی تو یہ تابعین کا قرن شمار ہوگا اور جب اکثر تابعین گزر گئے اور باقی کم رہ گئے جبکہ تبع تابعین کی کثرت ہوگئی تو یہ تبع تابعین کا قرن شمار ہوگا۔

اس تفسیر کی بنا پر قرن اور عصر دونوں ایک ٹھہرتے ہیں، اور یہی قول اقرب ہے۔

تب پھر سب سے بہتر لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ہوں گے جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔

ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ: اور جب اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم عالم آخرت کو سدھار گئے تو پھر وہ لوگ سب سے بہتر ہوں گے جو ان کے بعد کے ہیں اور وہ حضرات تابعین عظام رحمہم اللہ ہیں۔

ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ: یہ تبع تابعین ہیں۔ اس حدیث کی رو سے یہ تین زمانے سب سے بہتر ہیں۔ ان میں خیریت تھی اور اس زمانہ کے لوگوں کا قول و فعل برحق اور معیارِ حق تھا اور سنت و بدعت اور ہدایت و ضلالت میں امرِ فارق تھا۔

ثُمَّ يَكُونُ قَوْمٌ: یہاں ”يَكُوْنُ“ فعل تام ہے جو اپنے اسم پر ہی پورا ہو جاتا ہے اور اسے خبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تب پھر لفظ ”قَوْمٌ“ یہ ”كَانَ تَامَّه“ کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔

يَشْهَدُونَ وَلَا يُسْتَشْهَدُونَ: یعنی وہ شہادت دیں گے حالانکہ ان سے شہادت دینے کا مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ یعنی وہ مطالبہ شہادت سے قبل ہی شہادت دینے کو تیار ہوں گے جیسا کہ ایک روایت میں ”قَبْلَ اَنْ يُسْتَشْهَدُوْنَ“ کے الفاظ صراحت کے ساتھ آتے ہیں۔ وَيَخُونُونَ: یعنی ان میں خیانت، دھوکا اور بدعہدی ظاہر ہونے لگے گی۔

وَلَا يُؤْتَمَنُونَ: اور لوگ ان پر اعتماد نہ کریں گے اور اپنی امانتوں کی بابت انہیں امین نہ سمجھیں گے۔ کیونکہ ان کا خائن ہونا عالم آشکارا ہوگا۔

وَيَنْذِرُونَ: نذر سے یہاں عہد مراد ہے چاہے وہ اللہ کے ساتھ کیا ہوگا یا لوگوں کے ساتھ کیا ہو۔

وَلَا يُوفُونَ: یعنی انہیں اپنے عہد پورے کرنے کی مطلق پروا نہ ہوگی۔

وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السِّمَنُ: اس میں دنیا کی فراخی اور وسعت کی طرف اشارہ ہے جس کے نتیجہ میں بسیار خوری ظاہر ہوگی اور بدن فربہ ہونے لگیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کو اپنے بدنوں کی تو فکر ہوگی پر اپنے دلوں کی حیات کی کوئی فکر نہ ہوگی کہ دل مر گئے ہیں یا زندہ ہیں غرض انہیں اس بات کی کوئی پروا نہ ہوگی کہ ان کے جسم کس قدر فربہ اور چربیلے ہوگئے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سب سے افضل زمانہ حضرات صحابہ کرام کا ہے جو پہلا زمانہ ہے اور یہ فضیلت جنس اور قرن کے اعتبار سے ہے نہ کہ ہر ایک کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ بعض تابعین ایسے بھی ہو گزرے ہیں جو اپنے علم، عمل اور جہاد وغیرہ کے اعتبار سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل تھے۔ لیکن جملہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک فضیلت ایسی حاصل تھی جسے کوئی بھی نہیں پا سکتا اور وہ ہے صحابیت کی فضیلت۔ یہ ایسی مطلق فضیلت ہے جسے کوئی بھی نہیں پا سکتا۔

◈ تابعین یہ تبع تابعین سے افضل ہیں۔ یہاں بھی جنسِ تابعین مراد ہے جو جنس تبع تابعین سے افضل ہے اور یہ مراد نہیں کہ تابعین کا ہر فرد تبع تابعین کے ہر فرد سے افضل ہے۔

◈ بن مانگے گواہی دینا مذموم ہے، البتہ ذم کے مدار میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ یہ مذمت تحمل شہادت کے بغیر شہادت دینے کی ہے۔ تب پھر یہ جھوٹے گواہ ہوں گے۔ یوں اس حدیث کا گزشتہ حدیث سے معارضہ جاتا رہتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مذمت سوچے سمجھے بغیر شہادت دینے والوں کی ہے۔ حتیٰ کہ انہیں اپنی شہادت دینے کی صحیح غرض تک کا ادراک نہ تھا۔ بلاشبہ ایک مومن میں تمکین و وقار اور سنجیدگی و بردباری ہونا لازم ہے۔

◈ جھوٹی گواہی دینا سخت منع ہے۔

◈ کسی بات کی خبر دینا یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ عنقریب جھوٹی گواہی دینے والے لوگ پیدا ہوں گے۔ یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جھوٹی گواہی دینا جائز ہے۔ بلکہ ایسی باتوں کے وقوع کی خبر میں ان باتوں کی تحذیر کی طرف اشارہ ہے۔ غرض نبی کریم ﷺ کا کسی غیر شرعی فعل کے وقوع کی خبر دینا اس کے جواز کی دلیل نہیں۔

◈ زمانہ جوں جوں دورِ نبوی سے دور ہوتا جائے گا، بگڑتا جائے گا اور اس میں خیانت، غدر، دھوکا، بے ایمانی وغیرہ جیسی مذموم صفات پیدا ہوتی جائیں گی۔ چنانچہ خیانت کا شیوع یہ زمانہ کے بگڑ جانے کی علامت ہے۔

◈ اسی طرح نقضِ عہد کا شیوع بھی زمانہ کے بگڑ جانے کی علامت ہے۔

◈ مطالبہ کے بغیر گواہی دینا تب افضل ہے جب مشہود لہ کو اس کے گواہ ہونے کا علم نہ ہو۔ تو اس پر گواہی دینا واجب ہو گا چاہے گواہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔

خائن، دشمن اور دست نگر کی شہادت کا حکم

1402۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ، وَلَا ذِيْ غِمْرٍ عَلَى أَخِيْهِ، وَلَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ الْقَانِعِ لِأَهْلِ الْبَيْتِ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”خیانت کرنے والے مرد کی اور نہ خیانت کرنے والی عورت کی اور نہ اپنے بھائی سے کینہ رکھنے والے کی ہی شہادت جائز ہے اور نہ کسی گھر والوں کے خادم کی (ان کے حق میں) شہادت جائز ہے۔“ [1]

---

[1] مسند احمد: 281/2۔ سنن ابی داؤد: 3600۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند قوی ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 198/4۔ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ایک شاہد بھی ہے جس کو ابو حاتم نے منکر کہا ہے۔ العلل لابن ابی حاتم: 476/1۔

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ . اس حدیث کوامام احمد اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ: چاہے یہ خیانت رب تعالیٰ کے حق میں ہو یا بندوں کے حق میں، مذکورہ حکم دونوں کو عام ہے۔ بندوں کے حق میں خیانت ان کی امانتیں دبا لینا ہے اور اللہ کے حق میں خیانت اس کے دین کو قائم نہ کرنا ہے۔ یعنی امانتیں دبا لینے والے اور بے دین کی شہادت غیر مقبول ہوگی وغیرہ۔

وَلَا ذِی غِمْرٍ : یہ لفظ غین کے کسر اور میم کے سکون کے ساتھ ہے۔ بعض نے اس کو "غَمَر" دونوں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے لیکن زیادہ درست "غِمْر" ہی ہے۔ یہ کینہ اور بغض کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس کے دل میں کسی کی بابت کینہ ہو تو اس کی شہادت اس کے خلاف مقبول نہ ہوگی۔ البتہ دوسرے کے حق میں مقبول ہوگی۔

الْقَانِعِ لِأَهْلِ الْبَيْتِ: قانع سے مراد تابع ہے۔ یہ گھر والوں کے خادم وغیرہ کو کہتے ہیں جو گھر والوں کا دستِ نگر ہوتا ہے۔

أَهْلِ الْبَيْتِ: یہ لفظ "شَهَادَةُ" کے بھی متعلق ہوسکتا ہے اور "الْقَانِعِ" کے بھی۔ چنانچہ اگر اہل بیت کا لفظ شہادت کے متعلق ہو تو مطلب یہ بنے گا کہ خادم کی اپنے گھر والوں کے حق میں تو شہادت غیر مقبول ہوگی البتہ وہ ان کے خلاف شہادت دے سکتا ہے۔

اور اگر یہ لفظ القانع کے متعلق ہو تب مطلب یہ بنے گا کہ ایک گھر کے خادم کی ان کے حق میں شہادت غیر مقبول ہوگی اور یہ دونوں مطلب ٹھیک ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ ان مذکورہ لوگوں کی شہادت غیر مقبول ہے۔ تب پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہادت میں چند شروط کا پایا جانا ضروری ہے، جبکہ شہادت کا بعض موانع سے خالی ہونا بھی ناگزیر ہے۔ یعنی شہادت بھی ان امور میں سے ہے جو بعض شروط کے پائے جانے اور بعض موانع کے نہ ہونے پر ہی تمام ہوتے ہیں۔

شروطِ شہادت:

⊙ ...... گواہ مسلمان ہو، لہٰذا کافر کی شہادت مقبول نہ ہوگی۔ مسلمان کے خلاف غیر مقبول ہونا تو ظاہر ہے البتہ اپنے جیسے کافر کے خلاف اس کی شہادت صحیح ہوگی۔ چنانچہ بلادِ کفار میں کام کرنے والی غیر مسلم کمپنیوں کی ایک دوسرے کے حق میں شہادت مقبول ہوگی۔

البتہ بعض علماء نے ضرورت کے وقت مسلمان کے خلاف بھی غیر مسلم کی شہادت کو مقبول قرار دیا ہے۔ چاہے یہ شہادت سفر میں ہو یا غیر سفر میں اور چاہے وہ کافر کتابی ہو یا غیر کتابی اور یہی صحیح قول ہے۔ جیسے کسی کی وصیت کا گواہ صرف کافر ہو، اور ورثاء کی مخاصمت کے وقت اس کافر کی شہادت کی ضرورت پڑے تو وہ مسلمان ورثاء کے خلاف وصیت کی شہادت دے سکتا ہے اور وہ مقبول ہوگی۔

یہ پہلی شرط کا بیان تھا۔

⊙ ...... دوسری شرط یہ ہے کہ گواہ بالغ ہو، لیکن یہ ادائے شہادت کی شرط ہے نہ کہ تحملِ شہادت کی۔ اس بنا پر اگر نابالغی میں تحملِ شہادت کیا تھا اور بالغ ہو جانے پر شہادت ادا کی تھی تو یہ شہادت مقبول ہوگی۔

⊙ ......تیسری شرط عقل ہے۔لہٰذا مجنون کی شہادت غیر مقبول ہوگی اور دیوانگی کے تحمل کا افاقہ کے بعد ادا بھی درست نہ ہوگا۔تب پھر عقل یہ تحمل اور ادا دونوں کے لیے شرط ہے۔

⊙ ......چوتھی شرط عدالت ہے۔چنانچہ عادل گواہ کی شہادت مقبول ہوگی۔اس کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (الطلاق : 2)

''اور اپنوں میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنالو''

علماء نے عادل گواہ کی علامت یہ بیان کی ہے کہ وہ دین اور مروت دونوں میں مستقیم ہو، واجبات کی خبر گیری کرتا ہو، کبائر کا مرتکب نہ ہو، صغائر پر مصر نہ ہو۔لہٰذا اگر کبیرہ کے ارتکاب کے بعد اس نے توبہ نہ کی یا صغائر پر مصر رہا تو اس کی شہادت غیر مقبول ہوگی۔

⊙ ......اس بنا پر ریش تراش کی نہ تو تحملِ شہادت درست ہوگی اور نہ ادائے شہادت ہی درست ہوگی۔کیونکہ وہ ایک کبیرہ کا مرتکب بھی ہے اور اس پر مصر بھی ہے۔

⊙ ......سگریٹ پینے والے کی شہادت بھی ردّ ہوگی کیونکہ وہ ایک صغیرہ پر مصر ہے۔

⊙ ......خلافِ مروت کا مرتکب بھی مردود الشہادۃ ہوگا جیسے بازار میں چلتے ہوئے کھانے والا۔

موانعِ شہادت:

⊙ ......خیانت قبولِ شہادت میں مانع ہے۔اس کی دلیل: "لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ ، وَلَا خَائِنَةٍ" کے الفاظ ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیانت کے ارتکاب سے آدمی کی عدالت جاتی رہتی ہے۔

⊙ ......مشہود علیہ سے بغض وکینہ بھی شہادت کے ردّ ہونے کا سبب ہے۔لہٰذا قبول شہادت میں کینہ سے خالی ہونا شرط ہے۔

◈ احوال کی رعایت یہ اشخاص کی رعایت پر مقدم ہے۔اس کی دلیل: "وَلَا ذِي غِمْرٍ عَلَى أَخِيهِ" کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنی ذات میں ثقہ ہو لیکن مشہود علیہ سے کینہ ہونے کے سبب اس کی شہادت رد ہوگی۔

◈ معلوم ہوا کہ بغض وعداوت اخوتِ ایمانیہ کے خلاف نہیں۔اس کی دلیل: "عَلَى أَخِيهِ" کے الفاظ ہیں۔

دیہاتی کی شہر والے کے خلاف شہادت غیر مقبول ہے

1403- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ بَدَوِيٍّ عَلَى صَاحِبِ قَرْيَةٍ)).

رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: ''کسی دیہاتی کی کسی شہر والے کے خلاف شہادت جائز نہیں۔'' [1]

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

غريب الحديث :......بَدَوِيٌّ: دیہات کے رہنے والے کو اور صاحبِ قریہ شہر میں رہنے والے کو کہتے ہیں۔

بظاہر اس حدیث سے عموم مستفاد ہوتا ہے لیکن عموم اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ وہ بدوی اپنی شہادت میں متہم ہو۔البتہ جب کوئی

---

[1] سنن ابی داؤد: 3602- سنن ابن ماجه: 2367- المستدرك للحاكم: 111/4- حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور امام مسلم کی شرط پر ہے۔

بدوی عادل اور غیر متہم ہو تو اس کی شہادت مقبول ہوگی۔ کیونکہ عمومی دلائل اس کی شہادت کے مقبول ہونے کو بتلاتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ ایک بدوی کی دوسرے بدوی کے خلاف شہادت مقبول ہے۔ البتہ اس شہادت کے قبول کی بھی وہی شروط ہیں۔ جن کا ذکر گزشتہ حدیث میں ہوا ہے۔
- شہری کی شہری کے خلاف مذکورہ شروط کے ساتھ شہادت مقبول ہے۔
- اور شہری کی بدوی کے خلاف بھی شہادت مقبول ہے۔
- ان سب شہادتوں کے رد وقبول کا مدار تہمت کا عدم یا وجود ہے۔ لہٰذا تہمت کے پائے جانے کے وقت شہادت رد ہوگی اور تہمت کا انتفاء قبول شہادت کا ذریعہ ہے۔

گواہ کا عدالت میں اعتبار اس کے ظاہر کا ہے

1404۔ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ﷛، أَنَّهُ خَطَبَ فَقَالَ: إِنَّ أُنَاسًا كَانُوا يُؤْخَذُونَ بِالْوَحْيِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَإِنَّ الْوَحْيَ قَدِ انْقَطَعَ، وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمُ الْآنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ أَعْمَالِكُمْ.

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا: بے شک دورِ نبوی میں وحی کے ذریعے لوگوں کی گرفت ہو جایا کرتی تھی۔ اور بے شک اب وحی آنے کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے، اور بے شک اب ہم تمہارے ان اعمال پر تمہاری گرفت کریں گے جو ہمارے سامنے (ظاہر) ہوں گے۔ [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......أَنَّهُ خَطَبَ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب ان کے دورِ خلافت کا ہے۔ اس کی دلیل: "وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمْ" کے الفاظ ہیں۔ إِنَّ أُنَاسًا كَانُوا يُؤْخَذُونَ بِالْوَحْيِ: اس ارشاد میں دورِ نبوی کے منافقین کی طرف اشارہ ہے جن کو نبی کریم ﷺ جانتے تھے اور آپ ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے نام بھی بتلائے تھے۔ جن میں سرِ فہرست حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا نامِ نامی آتا ہے جن کو 'راز دارِ رسول' کے موقر لقب کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

فِي عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: مراد نبی کریم ﷺ پر رب تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی وحی ہے۔

وَإِنَّ الْوَحْيَ قَدِ انْقَطَعَ: یعنی نبی کریم ﷺ کے وفات پا جانے سے وحی اترنے کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ اس بنا پر نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جو بھی وحی کا مدعی ہوگا وہ دجال، کذاب اور پرلے درجے کا کافر ہوگا۔

وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمُ الْآنَ......: وحی ختم ہو جانے کے بعد کفر وایمان، جھوٹ سچ، نفاق اور اسلام وغیرہ سب کا مدار ظاہر پر ہوگا۔ پس جو جس بات کو ظاہر کرے گا اسی بات کا فیصلہ کیا جائے گا اور باطن رب تعالیٰ کے حوالے ہوگا کسی کے باطن کا علم صرف اللہ کو ہے جس تک بندوں کی رسائی نہیں تب پھر اس کی گرفت بھی ممکن نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ دلوں کی ان باتوں تک کو جانتا ہے جو ہمارے ظاہری اعمال کے بالکل برعکس اور مخالف ہیں۔

[1] صحيح البخاري: 2641.

- رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بعض ان لوگوں کے بارے میں خبر دی تھی جن کا ظاہر ان کے باطن کے خلاف کفر سے معمور تھا۔
- نبی کریم ﷺ کے بعد اب کوئی وحی نہیں۔ البتہ سچے خواب ہیں۔ جن کو بعض قرائن کے ہوتے ہوئے لے لیا جائے گا جو ان خوابوں کے سچا ہونے کو بتلاتے ہیں۔
- لوگوں کے ظاہر اعمال کو لینا واجب ہے۔ اس کی دلیل: "وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمُ الْآنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ أَعْمَالِكُمْ" کے الفاظ ہیں۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ منافقوں کے ساتھ مسلمانوں والا معاملہ کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ ﷺ ان کو قتل کیوں نہیں کروا دیتے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(پھر) لوگ یہ باتیں کریں گے کہ محمد (ﷺ) تو اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے۔''

پس دنیا میں لوگوں کے ساتھ معاملہ ان کے ظاہر کے اعتبار سے ہوگا اور ان کے باطن کا مواخذہ آخرت میں ہوگا۔

جھوٹی گواہی کا بیان

1405۔ وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ عَدَّ شَهَادَةَ الزُّوْرِ فِيْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے جھوٹی گواہی (دینے) کو بڑے کبیرہ گناہوں میں سے شمار فرمایا۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور یہ ایک طویل حدیث کا طرف ہے۔

شرح:...... نبی کریم ﷺ نے جھوٹی گواہی دینے کو کبیرہ گناہوں میں سے بھی بڑے گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔ (جس کو ہم یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ جھوٹی گواہی دینا بڑے بڑے گناہوں میں سے ایک ہے)۔

شہادت زور

لفظ ''زور'' یہ "اِزْوِرَار" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہٹنا اور ٹیڑھا ہونا ہے۔ تب پھر شہادت زور اس شہادت کو کہیں گے جو خلافِ حق اور حق بات سے ہٹی ہوئی ہو۔ پس جو آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کسی بات کی شہادت دے رہا ہے کہ حق اور سچ اس کے خلاف میں ہے تو یہ شاہد زُور ہے۔

شاہد زُور کی اقسام

شاہد زُور دو قسم پر ہے:

(1) ایک وہ جو یہ جانتے ہوئے بھی ایک بات کی شہادت دے دے کہ حق اس بات کے خلاف میں ہے، اور

(2) دوسرا وہ جو یہ نہیں جانتا کہ جس بات کی وہ شہادت دے رہا ہے، حق اس کے خلاف میں ہے۔ چنانچہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق ہی گواہی دے رہا ہے۔

دونوں کی مثالیں معروف اور واضح ہیں اور ظاہر ہے کہ کبیرہ کا مرتکب پہلی قسم کا شاہد زُور ہے۔ جبکہ دوسری قسم کا شاہد معاف ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2654۔ صحيح مسلم: 87.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شہادت زُور بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔
◈ معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ بھی ہوتے ہیں اور صغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہ کس کو کہتے ہیں اس کی تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔
◈ پھر خود کبائر میں بھی باہمی درجہ بندی ہے۔ کہ کچھ بہت بڑے اور کچھ کم بڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکبرالکبائر تو شرک باللہ ہے۔ جبکہ شہادتِ زور بھی اکبرالکبائر میں سے ہے۔

شہادت صرف یقینی، حتمی اور قطعی بات کی ہے یا پھر اس بات کی ہے جو زبانِ زدِ خلائق ہو

1406- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ: ((تَرَى الشَّمْسَ ؟)) قَالَ. نَعَمْ . قَالَ: ((عَلَى مِثْلِهَا فَاشْهَدْ، أَوْ دَعْ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی سے ارشاد فرمایا: ''کیا تم سورج دیکھ رہے ہو؟'' اس نے عرض کیا: جی ہاں! (اس پر) آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسی کسی بات پر ہی شہادت دینا (جو آفتاب کی طرح عیاں، روشن، قطعی اور حتمی ہو) وگرنہ چھوڑ دینا۔'' ❶

أَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ فَأَخْطَأَ.

ابن عدی نے اس حدیث کو ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے، اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہہ کر خطا کی ہے۔

غریب الحدیث :......قَالَ لِرَجُلٍ: مذکورہ رجل مجہول ہے۔ لیکن اس کی جہالت حدیث کی صحت اور مذکورہ حکم کے حق میں مضر نہیں۔

تَرَى الشَّمْسَ: یہ بات معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ جانتے تھے کہ وہ آدمی سورج کو دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ شخص بینا تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے یہ اس لیے ارشاد فرمایا تا کہ مابعد مذکور حکم کی اس بات پر بنا کی جا سکے۔

قَالَ: نَعَمْ: ''نَعَمْ'' یہ حرفِ جواب ہے۔

عَلَى مِثْلِهَا فَاشْهَدْ: ''عَلَى مِثْلِهَا'' یہ جار مجرور ''اِشْهَدْ'' فعل کے متعلق ہیں اور مذکورہ ''فا'' زائدہ ہے جو تحسین کلام کے لیے ہے۔ چنانچہ اگر اس ''فا'' کو حذف بھی کر دیا جائے تب بھی کلام مستقیم رہے گا۔

أَوْ دَعْ: یعنی اگر تو تمہارے سامنے بات اس طرح روشن اور عیاں ہو جیسے یہ آفتاب ہے تو اس بات کی شہادت دو وگرنہ نہ دو۔

روایت الحدیث :......اگرچہ امام موصوف رحمہ اللہ نے اس بات پر جزم کا اظہار کیا ہے کہ اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے لیکن اس کا متن صحیح ہے۔

---

❶ الکامل لابن عدی: 207/6۔ المستدرك للحاکم: 110/4۔ ابن حزم (343/9) کہتے ہیں: اس حدیث کی اسناد صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ حدیث محمد بن سلیمان بن مسمول کے طریق سے ہے جو عبیداللہ بن سلمہ بن وہرام سے حدیث کو روایت کرنے میں ہلاکت میں پڑنے والا ہے۔ جبکہ عبیداللہ بن سلمہ خود ضعیف ہے اور امام بیہقی (156/10) نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ البتہ یہ حدیث معنی کے اعتبار سے صحیح ہے۔

جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ اس بات کی دلیل ہے:

﴿إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (الزخرف: 86)

''مگر جس نے حق کے ساتھ شہادت دی اور وہ جانتے ہیں۔''

دوسرے شہادت کسی یقینی بات کی خبر دینے کا نام ہے لہٰذا اس میں کسی متیقن، قطعی اور حتمی بات کا ہونا لازم ہے۔ جس پر اس طرح یقین ہو جیسے دن چڑھے آفتاب پر اس کے ہونے کا یقین ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- احکام شرعیہ کو امور محسوسہ کے قریب کر کے بیان کرنا عمدہ ہے۔ اس کی دلیل: "تَرَى الشَّمْسَ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ معقول کو محسوس کے قریب کر کے بیان کرنا صناعت تعلیم کی خوبی میں سے ہے۔
- شہادت صرف یقینی بات کی ہی دینا جائز ہے۔ اس کی دلیل: "عَلَى مِثْلِهَا فَاشْهَدْ، أَوْ دَعْ" کے الفاظ ہیں۔
- غلبہ ظن کے ساتھ شہادت دینا جائز نہیں چاہے وہ ظن قوی ہی ہو۔
- امر شہادت بے حد عظیم ہے اور اس میں خوب تحقیق اور چھان بین ضروری ہے۔

قسم اور ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ کرنے کا بیان

1407- وَعَنْهُ رضي الله عنهما: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَضَى بِيَمِينٍ وَشَاهِدٍ)). أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَقَالَ: إِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے (ایک موقع پر) قسم اور ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ فرمایا تھا۔ ❶ اس حدیث کو امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد جید ہے۔

1408- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه مِثْلُهُ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس کو امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ❷

غریب الحدیث:...... قَضَى: یہ "حَكَمَ" کے معنی میں ہے اور قضاء سے قضائے شرعی مراد ہے۔

بِيَمِينٍ: مراد مدعی کی قسم ہے۔

وَشَاهِدٍ: مراد وہ گواہ ہے جو دعویٰ کا گواہ ہو، اور یہ واحد کا اور مذکر کا صیغہ ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے ایک دعویٰ میں مدعی کی قسم اور اس کے پیش کردہ ایک مرد گواہ پر فیصلہ فرمایا تھا۔

---

❶ صحیح مسلم: 1712- سنن ابی داؤد: 3608- السنن الکبریٰ للنسائی: 6011- امام نسائی فرماتے ہیں: یہ اسناد عمدہ ہے اور سیف اور قیس دونوں ثقہ راوی ہیں۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: علل الترمذی، ص: 204.

❷ سنن ابی داؤد: 3610- جامع الترمذی: 1343- امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔ جبکہ امام ابن حبان (5073) اور امام ابوعوانہ (6017) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ السنن الکبریٰ للنسائی: 6014- سنن ابن ماجہ: 2368- مسند ابی یعلی: 6683- ابو حاتم اور ابو زرعہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جیسا کہ: "العلل لابن ابی حاتم" (474/1) میں ہے اور دیکھیں: تهذيب السنن لابن قيم: 21/10.

روایت و درایت :......اگر چہ علماء کا اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے۔لیکن یہ حدیث صحیح ہے۔کیونکہ ایک تو اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے، دوسرے اس کو امام نسائی نے عمدہ کہا ہے۔تب پھر سند کے اعتبار سے اگر چہ یہ حدیث صحیح ہے، لیکن بعض علماء نے اس کے حکم کو غیر مقبول کہا ہے۔کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور قرآن کا ظاہر اس کے معارض ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ﴾ (البقرة: 282)

''اور اپنے مردوں میں سے دو گواہوں کو گواہ بنالو، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔''

اس آیت میں دو آدمیوں کے نہ ہونے کی صورت میں ایک آدمی اور قسم کا ذکر نہیں۔اس بنا پر یہ حدیث قرآن کے معارض ہونے کی وجہ سے غیر مقبول ہوگی۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث سند اور متن دونوں اعتبار سے صحیح اور واجب العمل ہے اور ایسی قضاء قیاس کے پوری پوری موافق ہے۔وہ یوں کہ جب مدعی کے ساتھ ایک گواہ ہوگا تو بے شک اس کی جانب قوی ہو جاتی ہے لیکن بات یہ ہے کہ ایک گواہ حکم ثابت نہیں کرتا۔تب پھر مدعی کی قسم دعویٰ کو اور زیادہ موکد کرتی ہے۔یاد رہے کہ قسم ہمیشہ مدعا علیہ کی جانب ہی ہونا ضروری نہیں بلکہ دونوں دعویداروں میں سے جو زیادہ قوی ہو قسم اس کی جانب ہوتی ہے۔تب پھر اگر کبھی مدعی کی جانب قوی ہو تو قسم اس کی جانب ہو جاتی ہے۔چنانچہ اس مدعی کے پاس ایک گواہ ہے جس کی وجہ سے وہ قوی ہو گیا ہے اس لیے قسم اس کی جانب ہو سکتی ہے۔کیونکہ ایک گواہ کی قوت کو قسم کے ساتھ اور زیادہ مؤکد کیا جا سکتا ہے۔

جیسے گواہ نہ ہونے کی صورت میں مدعا علیہ کی جانب قوی ہوتی ہے اور ہم قسم لے کر مدعا علیہ کو بری قرار دے سکتے ہیں کیونکہ اصل مدعی کے دعویٰ کا ثابت نہ ہونا ہے۔البتہ جب مدعی دو گواہ قائم کر دے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا، چاہے وہ قسم نہ بھی اٹھائے کیونکہ اب شہادت کا نصاب پورا ہے، اس لیے قسم لینے کی ضرورت نہیں۔پس یہ حدیث قیاس کے پوری پوری موافق ہے۔

رہی مذکورہ آیت تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اِشہاد نہیں بلکہ استشہاد کے بارے میں ہے اور استشہاد میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کا لے آنا ہی مطلوب ہے تاکہ بعد میں قسم اٹھانے کی ضرورت نہ رہے۔

اثباتِ حقوق میں شہادت کے مراتب:

آدمی کو چاہیے کہ وہ حق کے اثبات میں شہادت کا اعلیٰ مرتبہ لے آئے اور وہ دو مردوں کی گواہی ہے، پھر اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔وگرنہ پھر ایک گواہ اور مدعی کی قسم ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ایک گواہ اور ساتھ میں مدعی کی قسم ملا کر بھی فیصلہ سنانا جائز ہے۔البتہ گواہ پہلے پیش کیا جائے گا اور قسم بعد میں لی جائے گی کیونکہ قسم تاکید اور تقویت کے لیے ہوتی ہے۔

یہ حکم حقوقِ مالیہ اور غیر مالیہ دونوں کے لیے ہے۔لیکن بعض علماء نے یہ حکم صرف حقوقِ مالیہ کے ساتھ خاص قرار دیا ہے لہٰذا قصاص میں دو مردوں کا ہونا ضروری ہوگا۔

◈ گواہوں میں بینہ کا نصاب کیا ہے؟ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

⊙ ...... وہ بینہ جس میں چار عادل مردوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ زنا اور لواطت اور ان دونوں کے اقرار میں ہے ان دونوں میں چار عادل گواہوں کا ہونا لازم ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْلَا جَاءُوْا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ﴾ (النور: 13)

''وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے، تو جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔''

⊙ ...... وہ بینہ جس میں تین مردوں کا گواہ ہونا لازم ہے۔ یہ اس غنی کی بابت ہے جو پہلے غنی مشہور تھا پھر بعد میں وہ زکوٰۃ مانگنے آئے۔ تو ضروری ہے کہ اس کے مستحق زکوٰۃ ہونے پر اس کے محلہ کے تین عقل مند لوگ گواہی دیں۔ کہ یہاں بینہ کی تعداد تین مرد ہیں۔ جیسا کہ حدیث قبیصہ رضی اللہ عنہ میں آتا ہے کہ ''یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین عقل مند آدمی کھڑے ہو کر گواہی دیں'' کہ یہ آدمی اب واقعی مستحق زکوٰۃ ہے۔

⊙ ...... وہ بینہ جس میں دو مرد ہوں۔ یہ حقوقِ غیر مالیہ میں ہوں گے، جیسے سرقہ، اور قذف کی حد اور قصاص کہ ان میں دو مردوں کا گواہ ہونا لازم ہے۔ اس میں ایک مرد کی جگہ دو عورتیں یا دونوں کی جگہ چار عورتیں جائز نہ ہوں گی۔

⊙ ...... وہ بینہ جس میں دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور مدعی کی قسم ہوتی ہے۔ یہ بینہ حقوقِ مالیہ کا ہے اور یہ سب سے زیادہ وسیع شہادت ہے۔

⊙ ...... صرف ایک آدمی یا صرف ایک عورت گواہ ہو۔ جیسے وہ معاملات جن پر صرف عورتیں ہی مطلع ہوسکتی ہیں جیسے ولادت اور حمل کا استہلال جبکہ وہ ساقط ہوگیا ہو۔

⊙ ...... صرف قسم جبکہ ساتھ قرائن ہوں۔ یہ وہ صورت ہے جس میں مدعی کی جانب قوی ہو۔ جیسا کہ قسامت میں مدعی کے لیے قسم اٹھوائی جاتی ہے۔

2۔ بَابُ الدَّعَاوَىٰ وَالْبَيِّنَاتِ

دعاویٰ اور بینات کا بیان

دَعَاوَىٰ: یہ دعویٰ کی جمع ہے جو ''فَعْلَى'' کا وزن ہے اور اس کی جمع ''فَعَالِى'' کے وزن پر بھی آتی ہے جیسے ''دَعَاوِى'' اور ''فَعَالَى'' کے وزن پر بھی آتی ہے جیسے فتویٰ کی جمع ''فَتَاوَى'' آتی ہے۔ تب پھر امام موصوف کا اس جمع کو ''دَعَاوَى'' کے وزن پر لانا صحیح ہے۔

دعویٰ کی تعریف

دعویٰ یہ آدمی کا غیر پر اپنے کسی حق کی نسبت کرنے کو کہتے ہیں۔ جبکہ اقرار اس کے برعکس ہوتا ہے کیونکہ آدمی اقرار میں دوسرے کے حق کی اپنی طرف نسبت کرتا ہے اور رہی شہادت تو یہ غیر کے حق کی کسی اور غیر کی طرف نسبت کرنے کو کہتے ہیں۔

غرض اگر اپنے کسی حق کی نسبت دوسرے کی طرف ہو تو یہ دعویٰ ہے۔

اور اگر غیر کے حق کی نسبت اپنی طرف ہو تو یہ اقرار ہے۔

اور اگر غیر کے حق کی نسبت کسی دوسرے غیر کی طرف ہو تو یہ شہادت ہے۔

بینات:...... یہ بینہ کی جمع ہے۔ بینہ ہر اس شے کو کہتے ہیں جس سے حق کھل کر سامنے آ جائے۔ چاہے یہ بینہ خارجیہ ہو یا حالیہ جیسے قرائن اور چاہے براءت اصلیہ پر بینہ ہو جیسے منکر کا انکار۔

پھر یہ بینہ شہود بھی ہو سکتے ہیں اور اقرار یا انکار بھی ہو سکتے ہیں۔ غرض ہر وہ بات جو حق کو کھول دے وہ بینہ ہے اور قرائن پر عمل بھی اسی قبیل میں سے ہے۔ جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام کے گواہ نے قرائن پر کہا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ٥ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥﴾ (یوسف: 26-27)

''اگر اس کی قمیص آگے سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے سچ کہا اور یہ جھوٹوں سے ہے۔ اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں سے ہے۔''

مدعی کے ذمہ بینہ لانا ہے اور منکر پر قسم آتی ہے

1409۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعَى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَأَمْوَالَهُمْ، وَلٰكِنَّ الْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر لوگوں کو (یوں) ان کے دعوے دیے جانے لگیں تو لوگ دوسروں کے خونوں اور مالوں (تک) کے دعوے کرنے لگیں، البتہ بات یہ ہے کہ مدعا علیہ پر قسم آتی ہے۔'' [1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:......مراد یہ ہے کہ اگر ایسا ہونے لگے کہ جس نے جس بات کا دعویٰ کر دیا وہ پورا کر دیا گیا تو لوگ تو ایک دوسرے کے خلاف ناحق خون کے دعوے کرنے لگیں، مال کے دعوے تو الگ رہے کہ وہ تو روز کا معمول بن جائے۔ چنانچہ کوئی تو یہ کہنے لگے گا کہ فلاں نے تو میرا بیٹا تک مار ڈالا ہے اور کوئی یہ کہے گا کہ فلاں نے میرے گھر میں چوری کی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسا ہی حقوق کی بابت لوگ ایک دوسرے کے خلاف دعوے پہ دعویٰ کرنے لگیں۔

نبی کریم ﷺ نے خونوں اور مالوں کو اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ اصل ہیں جبکہ حقوق ان کے تابع ہوتے ہیں۔

تب پھر یہ سوال اٹھنا بدیہی ہے کہ کسی کا مبنی برحق دعویٰ کیونکر ثابت ہوگا؟ تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مدعا علیہ قسم اٹھائے گا جس کا ذکر اس حدیث میں ہے، جبکہ مدعی بینہ پیش کرے گا، اس کا بیان درج ذیل حدیث میں آ رہا ہے۔

وَلِلْبَيْهَقِيِّ بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ: ((اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِيْنُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ)).

اور سنن بیہقی میں صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ: بینہ (پیش کرنا) مدعی کے ذمہ ہے جبکہ قسم انکاری (یعنی مدعا علیہ) پر آتی ہے۔ [2]

---

[1] صحيح البخاری: 4552۔ صحيح مسلم: 1711.

[2] سنن البیهقی: 252/10، اس حدیث کی اسناد جید ہے، اور ابن صلاح نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد حسن یا صحیح ہے۔ دیکھیں: شرح القضية من صحيح مسلم: 3/12۔ اور امام ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری: 283/5 میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

شرح :...... یہ کسی دعویٰ کے اثبات کا دوسرا پہلو ہے کہ یا تو مدعا علیہ قسم کھا جائے کہ اس کے ذمہ کسی کا حق نہیں یا پھر مدعی بینہ پیش کرے گا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے۔

دعویٰ کی اقسام

دعویٰ کی مندرجہ ذیل اقسام علماء نے بیان کی ہیں:

(1) ناممکن دعویٰ:

اگر کوئی کسی ناممکن بات کا دعویٰ کرے تو اس کی طرف ہرگز بھی التفات نہ کیا جائے گا اور قاضی فوراً دوسرے فریق کے حق میں فیصلہ دے دے گا۔ جیسے کوئی پچاس سال کا آدمی کسی تیس سالہ شخص کی بابت دعویٰ کرے کہ وہ اس کا بیٹا ہے، یہ دعویٰ ہرگز نہ سنا جائے گا کیونکہ بیٹے کا عمر میں باپ سے بڑا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ اسی وقت خارج کر دیا جائے گا۔

(2) کسی ممکن بات کا دعویٰ:

یہ دعویٰ کی دوسری قسم ہے۔ البتہ ہر دعویٰ میں اصل اس کا عدم ہے اور یہی نبی کریم ﷺ کی مراد ہے کہ جب ایک آدمی کسی دوسرے پر کسی جان، مال یا حق کا دعویٰ کرتا ہے تو ہم پہلے مدعا علیہ سے بات کریں گے کہ کیا تم اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہو؟ پس اگر تو وہ دعویٰ تسلیم کر لیتا ہے تب کوئی اشکال نہیں، اور اگر وہ انکار کرتا ہے تو پھر مدعی سے بینہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر تو وہ بینہ لے آتا ہے تو خوب وگرنہ مدعا علیہ کو قسم اٹھانے کو کہا جائے گا۔ پس اگر تو وہ قسم اٹھا لیتا ہے کہ میرے خلاف یہ دعویٰ غلط ہے تو دعویٰ خارج کر دیا جائے گا۔

یاد رہے کہ سردست قسم صرف قطع نزاع کے لیے ہے۔ لہٰذا اگر بعد میں مدعی کی طرف سے بینہ پیش کر دیا جاتا ہے تو فیصلہ مدعی کے حق میں کیا جائے گا۔ کیونکہ قسم حق کو ختم نہیں کر دیتی بلکہ صرف وقتی جھگڑے کو ٹالتی اور ختم کرتی ہے۔ وگرنہ مدعی کا حق اگر ثابت ہو تو مدعا علیہ پر اب بھی باقی ہوتا ہے۔ اور صحیحین کی روایت کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ہر قسم کے دعاوی میں بینہ نہ ہونے کی صورت میں مدعا علیہ پر قسم آئے گی۔ چاہے وہ دعویٰ مال کا ہو یا جان کا اور چاہے کسی حق کا دعویٰ ہی ہو۔

اب ذیل میں ان دونوں روایات سے حاصل ہونے والے فوائد کو رقم کیا جاتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- فساد کا دروازہ بند کرنا۔ اس کی دلیل "لَوْ يُعْطَى النَّاسُ......" کے الفاظ ہیں، اور یہ بات شریعت کے قواعد عامہ میں سے ہے کہ شریعت جلبِ مصالح اور دفعِ مفاسد کے لیے آئی ہے۔
- حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ہر قسم کا دعویٰ مقبول ہے لیکن یہ بات دعویٰ کے ممکن ہونے کے ساتھ مشروط ہے، لہٰذا ناممکن دعویٰ نہ مسموع ہوگا اور نہ مقبول بلکہ رد اور خارج ہوگا۔
- دعویٰ جو بھی ہو اس کے اثبات کے لیے بینہ پیش کرنا لازم ہے۔
- حدیث میں مطلق بینہ کا ذکر ہے۔ لیکن پیچھے بیان کر دیا گیا ہے کہ اس سے ہر وہ شے مراد ہے جو حق کو کھول دے اور ظاہر کر دے۔

متعدد خصوم کے درمیان قسم کے لیے قرعہ ڈالنا

1410- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے

عَرَضَ عَلَى قَوْمٍ الْيَمِينَ فَأَسْرَعُوا، فَأَمَرَ أَنْ يُسْهَمَ بَيْنَهُمْ فِي الْيَمِينِ، أَيُّهُمْ يَحْلِفُ)).

ایک قوم پر قسم کو پیش کیا تو وہ (سب کے سب قسم اٹھانے کو) جلدی سے لپکے اس پر نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ: "ان میں قسم کے لیے قرعہ ڈالا جائے کہ کون ان میں سے قسم اٹھائے گا۔" [1]

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح :......حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ایک جماعت پر قسم آ رہی تھی اور ان میں سے ہر ایک قسم اٹھانے کو تیار تھا جس پر آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان میں قرعہ ڈالا جائے، اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مراد دو ایسے خصم ہوں جو دعویٰ میں برابر کے ہوں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکتی ہو، یعنی نہ تو کوئی ان میں سے بالتعیین مدعی ہو اور نہ مدعا علیہ ہی ہو۔ تب ان میں سے ہر ایک قسم اٹھانے میں جلدی کا مظاہرہ کرے تا کہ وہ بری ہو جائے۔ البتہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں پہلی صورت کا ہی احتمال ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جس پر قسم آتی ہو اس پر قسم کو پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ قاضی اسے کہے گا کہ تم قسم اٹھاؤ۔

◈ اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کسی نے اس پر قسم کے پیش کیے جانے سے پہلے ہی قسم اٹھالی تو اس کی قسم کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرات فقہاء نے اسی حدیث سے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ اگر منکر نے قاضی کے اس پر قسم پیش کیے جانے سے قبل قسم اٹھالی تو اس کی قسم کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

◈ جب زیادہ مستحق کی تعیین میں اشتباہ ہو جائے تو اس وقت قرعہ ڈالنا جائز ہے۔

◈ جب اموال میں قرعہ ڈالنا جائز ہے تو حقوق میں بدرجہ اولیٰ قرعہ ڈالنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سفر کے ارادے کے وقت اپنی ازواج مطہرات میں قرعہ ڈالا کرتے تھے۔

◈ قرعہ ڈالنے کے متعدد طریق ہیں، جن کا مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

دوسرے کا مال ناحق لینے والے پر اللہ کا غضب ہے

1411۔ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْحَارِثِيِّ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ، وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا يَارَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((وَإِنْ كَانَ قَضِيبًا مِنْ أَرَاكٍ)).

حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس نے اپنی قسم کے ذریعے کسی مسلمان آدمی کا حق ہتھیا لیا تو تحقیق کہ رب تعالیٰ اس پر جہنم کو واجب کر دیں گے اور اس پر جنت کو حرام کر دیں گے۔" اس پر ایک آدمی نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! چاہے وہ کوئی معمولی سی شے ہی ہو؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "چاہے وہ پیلو کی ایک شاخ ہی ہو۔" [2]

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

[1] صحيح البخاري: 2674. [2] صحيح مسلم: 137.

غریب الحدیث: ......مَنِ اقْتَطَعَ: مذکورہ مَنْ شرطیہ ہے۔تب پھر "اقْتَطَعَ" یہ فعل شرط ہے اور "فَقَدْ اَوْجَبَ" یہ جواب شرط ہے۔

حَقَّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ: اس کی دو صورتیں ہیں:

(1) ایک یہ کہ آدمی ایک بات کا مدعی ہو اور اس پر ایک گواہ لے آئے اور اس کے ساتھ ہو کر خود بھی حلف اٹھا لے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ اس صورت میں وہ ایک ایسا حق چھین رہا ہے جس کا وہ مستحق نہیں۔ کیونکہ اس نے دوسرے کے مال کو جھوٹی قسم کے ذریعہ مباح بنانے کی کوشش کی ہے۔

(2) دوسری صورت مدعا علیہ کے جھوٹی قسم اٹھانے کی ہے کہ جب مدعی کے پاس اپنے حق کے اثبات کے لیے بینہ نہ ہو اور نوبت مدعا علیہ کے قسم کھانے کی آئے اور وہ قسم اٹھا جائے تاکہ اس کی مدعی کے جائز دعویٰ سے جان چھوٹ جائے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹی قسم اٹھا رہا ہے۔اس طرح یہ آدمی بھی جھوٹی قسم کے ذریعہ ایک مسلمان کا ناحق مال کھا رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یمینِ کاذب کے ذریعہ دوسرے مسلمان کا مال ہتھیانے اور دبانے کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت ناجائز دعویٰ کی ہے اور دوسری صورت جائز دعویٰ کے تسلیم سے انکار کی ہے۔ان دونوں صورتوں کا حکم یہ ہے:

فَقَدْ أَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ، وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ: یعنی رب تعالیٰ اس کو آتش جہنم کا مستحق بنادے گا، اور اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔ کیونکہ اس نے ایسا بھاری کام کر کے دو حرمتوں کو توڑا ہے:

(1) رب تعالیٰ کی حرمت کہ اس نے رب تعالیٰ کے نام کی جھوٹی قسم اٹھا کر اس کے نام کی حرمت کو توڑا ہے۔

(2) صاحبِ حق کی حرمت۔ اسی لیے اس شخص کو بہت بھاری وعید سنائی گئی ہے کہ ایک تو وہ جہنم میں ضرور جائے گا اور دوسرے جنت سے بھی محروم رہے گا۔

وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا: كَانَ کی ضمیر وہ حق ہے جس کو ہتھیایا گیا ہے۔یعنی چاہے وہ حق جو دوسرے سے چھینا ہے، بڑا معمولی سا ہو تب بھی وہ ان دو بھاری وعیدوں کا مستحق ٹھہرے گا؟۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ چاہے وہ شے پیلو کی شاخ ہی ہو، یعنی ایک ہی شاخ ہو۔تب بھی وہ ان دو سخت ترین وعیدوں کا مستحق ٹھہرے گا۔

پیلو کی شاخ کی تصریح میں شے کی قلت میں مبالغہ کی طرف اشارہ ہے، اور یہ کہ اس آدمی نے اتنی معمولی شے کی خاطر رب تعالیٰ کی حرمت کو توڑنے کی ذرا پروا نہیں کی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بسا اوقات آدمی قسم کے ذریعے بظاہر اپنے لیے کسی شے کے دعویٰ کا مستحق ٹھہرتا ہے لیکن چونکہ اس کی قسم جھوٹی اور دعویٰ باطل ہوتا ہے اس لیے وہ عند اللہ اس مال کا مستحق نہیں بنتا۔
- جھوٹا دعویٰ اور جھوٹی قسم کبائر میں سے ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہوئی ہے۔
- معتزلہ اور خوارج نے اس حدیث سے مرتکب کبیرہ کے مخلد فی النار ہونے پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ استدلال مذکورہ نص کے ظاہر سے اور بقیہ نصوص سے اعراض کرتے ہوئے ہے۔

معتزلہ کے اسی استدلال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ ارشاد بطور وعید کے ہے، اور وعید میں نفس کو کبیرہ سے متنفر کرنے کے

لیے اطلاق جائز ہے۔ تب پھر یہ اطلاق نفس کی تنفیر کے لیے ہے تا کہ وہ اس وعید کو سن کر اس گناہ کے ارتکاب سے دور بھاگے۔

1412۔ وَعَنِ الْأَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ، يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ، هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ، لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی بات پر قسم اٹھائی تا کہ اس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال ہتھیا لے جبکہ وہ اس قسم میں گنہگار (یعنی جھوٹا) ہو تو وہ رب تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غصہ ہوگا۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......عَلَى يَمِينٍ: "عَلَى" یہاں "با" کے معنی میں ہے۔ تب پھر یہ "حَلَفَ بيمينٍ" کی تقدیر میں ہوگا اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب حلف اور یمین دونوں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو یمین سے مراد کسی بات پر قسم اٹھانا ہوتا ہے۔

يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ: اس پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے، اور مسلمان کی قید اغلب کے اعتبار سے ہے وگرنہ مسلمان ہو یا کافر اس کی جان اور مال معصوم ہے۔ لہٰذا ذمی، معاہد، مستامن اور کافر کسی کے ساتھ بھی غدر، دھوکا اور فریب کرنا اور اسی طرح اس کی چوری کرنا اور اس کو لوٹنا سب حرام ہے، تب پھر جھوٹی قسم اٹھا کر کسی کافر کا مال بھی ہتھیانا ناجائز اور حرام ہوگا۔

پھر یہ کہ کسی ذمی یا معاہد و مستامن وغیرہ کو جھوٹی قسم اٹھا کر لوٹنے میں عہد شکنی کے جرم کا ارتکاب بھی ہے۔

هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ: فاجر سے مراد جھوٹا ہے، اور یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ يَقْتَطِعُ کی ضمیر سے حال ہے۔

لَقِيَ اللّٰهَ: مراد روزِ قیامت رب تعالیٰ سے ملنا ہے۔ جبکہ مرنے کے فوراً بعد کی ملاقات بھی مراد ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مرنے کے فوراً بعد آدمی عالم دنیا سے عالم آخرت منتقل ہو جاتا ہے۔ البتہ پہلا احتمال زیادہ ظاہر ہے۔

وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ: "هُوَ" ضمیر کا مرجع لفظ "اللّٰه" ہے۔ جبکہ علیہ کی ضمیر کا مرجع "اَلْمُقْتَطِع" ہے۔

اور یہ جملہ لفظ "اللّٰه" سے حال ہے، اور ''غضبان'' یہ فَعلان کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے اور یہاں یہ رب تعالیٰ کی صفت ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بسا اوقات قسم استحقاق کا ذریعہ بن جاتی ہے چاہے جو ملا ہے وہ حق ہو یا باطل جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔
- رب تعالیٰ سے ملاقات ثابت ہے اور اس امر کو قرآن کریم میں متعدد مواقع پر صراحۃً بیان کیا گیا ہے۔
- رب تعالیٰ کی ملاقات رؤیت کو بھی ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ روزِ قیامت رب تعالیٰ کی رؤیت بھی ہوگی۔
- رب تعالیٰ کے صفتِ غضب ثابت ہے۔ اس کی دلیل "وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ غضب سے مراد انتقام یا ارادۂ انتقام نہیں۔ جیسا کہ بعض گمراہ فرقوں کا عقیدہ ہے۔ اس بارے اہلِ حق اسلاف و اخلاف کا مذہب یہ ہے کہ صفتِ غضب رب تعالیٰ کے لیے ثابت ہے۔ البتہ یہ غضب رب تعالیٰ کی بزرگ و برتر ذات کے شایانِ شان ہے جس کی تعبیر و تفسیر ہم بندوں کے بس میں نہیں، اور رہا انتقام تو یہ رب تعالیٰ کی صفت غضب کے آثار میں سے ہے نہ کہ غضب سے مراد ہی انتقام ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: 2357۔ صحيح مسلم: 2417.

فیصلہ گواہوں کے اعتبار سے ہوگا

1413۔ وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى رضي الله عنه ((أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِيْ دَابَّةٍ، وَلَيْسَ لِوَاحِدٍ مِنْهُمَا بَيِّنَةٌ، فَقَضَى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَهُمَا نِصْفَيْنِ)).

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: دو آدمی ایک جانور میں جھگڑ پڑے جبکہ دونوں میں سے کسی کے پاس بھی بینہ نہ تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں میں اس جانور کو نصف نصف کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَهٰذَا لَفْظُهُ، وَقَالَ: إِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے، اور یہ الفاظ سنن نسائی کے ہیں۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ: اس حدیث کی اسناد جید ہے۔

غریب الحدیث:...... وَلَيْسَ لِوَاحِدٍ مِنْهُمَا بَيِّنَةٌ: اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(1) یا تو وہ جانور دونوں میں سے کسی ایک کے بھی قبضہ میں نہ تھا بلکہ کسی تیسرے کے قبضہ میں تھا البتہ وہ تیسرا نہ تو خود اس جانور کا مدعی تھا اور نہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے اس بات کا مقر ہی تھا کہ یہ جانور فلاں کا ہے، ادر ادھر ان دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی بینہ بھی نہیں تھا۔ اس مسئلہ کی یہ ایک صورت ہے۔

(2) یا پھر وہ جانور دونوں کے قبضہ میں تھا، وہ یوں کہ دونوں میں سے ہر ایک نے اس جانور کو تھام رکھا تھا اور ہر ایک اس جانور کو اپنی طرف کھینچ کر اس بات کا مدعی بن رہا تھا کہ یہ جانور اسی کا ہے۔ جبکہ بینہ یہاں بھی دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں۔ اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس بات کو نبی کریم ﷺ نے اپنے اس فیصلہ میں واضح فرمایا کہ:

فَقَضَى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَهُمَا نِصْفَيْنِ: اس جانور کو ان دونوں میں نصف نصف تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک نے نصف نصف جانور کو تھام رکھا ہے، اور دونوں میں سے ہر ایک اس نصف کا مدعی بھی ہے اور دوسرے کے اعتبار سے اس نصف میں دوسرے کے دعویٰ کا منکر بھی ہے۔ تب پھر ہر نصف میں دعویٰ بھی ہے اور انکار بھی ہے، اور بینہ کسی کے پاس بھی نہیں۔ اب اس کے فیصلہ کی صرف ایک صورت ہے اور وہ ہے ''عدل'' یعنی اس جانور کو دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ مذکورہ خصومت میں کسی ایک کے حق میں وجہ ترجیح موجود نہیں کہ جس کی بنا پر اس جانور کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔

رہی تقسیم کی صورت تو اس جانور کی بازار کی قیمت لگوا کر بیچ دیا جائے گا اور اس کی رقم دونوں میں مساوی بانٹ دی جائے گی، ادراگر وہ جانور حلال ہے اور دونوں اس کے ذبح پر بھی راضی ہوں تو تقسیم کی دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس جانور کو ذبح کر کے دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دیا جائے۔

یہ حدیث اس مسئلہ کی بابت علماء کے مذکورہ ذیل اقوال کے حق میں قول فیصل ہے جو یہ ہیں:

---

[1] مسند احمد: 402/4۔ سنن ابی داؤد: 3613۔ سنن النسائی: 487/8۔ امام نسائی نے اس حدیث کی اسناد کو عمدہ کہا ہے۔ سنن ابن ماجہ: 2330۔ اس حدیث کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ایک شاہد بھی ہے۔ ابن حبان (5068) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم المستدرك: 330/4 میں کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔ دیکھیں: تهذيب السنن لابن قيم: 29/10.

⊙ ...... دونوں میں قرعہ ڈالا جائے۔

⊙ ...... جو قسم اٹھالے جانور اس کا، جبکہ دوسرا قسم اٹھانے سے انکاری ہو۔

⊙ ...... دونوں میں بینہ کے اعتبار سے فیصلہ کیا جائے گا۔ جیسے ایک کے پاس تین گواہ ہوں اور دوسرے کے پاس دو، تو جانور کے پانچ حصے کر کے تین حصے تین گواہوں والے کو ملیں گے۔ جبکہ دو حصے دو گواہوں والے کو ملیں گے۔

لیکن مذکورہ حدیث ان سب اقوال میں فیصلہ کر دیتی ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے، اور قولِ رسول ﷺ کے بعد کسی کا قول بھی مقبول نہیں۔

زمان یا مکان کے ساتھ قسم کو اور زیادہ سخت اور مؤکد کرنے کا بیان

1414۔ وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ حَلَفَ عَلَى مِنْبَرِيْ هٰذَا بِيَمِيْنٍ آثِمَةٍ تَبَوَّأَ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے میرے اس منبر پر کسی بات کی جھوٹی قسم اٹھائی تو اس نے جہنم میں اپنا ایک ٹھکانا بنالیا۔'' [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ

اس حدیث کو امام احمد، امام ابو داؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے، اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... **عَلَى مِنْبَرِي هٰذَا:** "عَلَى" یہاں "عِنْدَ" کے معنی میں ہے۔ البتہ یہ اپنے اصلی معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ چاہے اس نے منبر پر چڑھ کر قسم اٹھائی یا اس کے پاس کھڑے ہو کر قسم اٹھائی۔ تب پھر یہ قاضی کی رائے کے سپرد ہوگا کہ چاہے وہ کسی کو منبر پر چڑھ کر قسم کھانے کو کہے اور چاہے پاس کھڑے ہو کر قسم کھانے کو کہے۔ البتہ اگر کوئی منبر نبوی پر چڑھ کر کسی حق کی قسم اٹھاتا ہے تو بلاشبہ یہ قسم زیادہ بھاری، بڑی اور عظیم ہے۔

بِيَمِيْنٍ آثِمَةٍ: گنہگار یعنی جھوٹی قسم۔ یہ وہ قسم ہے جس کے ذریعے آدمی دوسرے کا مال ہتھیا لے۔

تَبَوَّأَ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ: بظاہر یہ خبر ہے نہ کہ انشاء۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس آدمی نے جھوٹی قسم کے ذریعے جہنم میں اپنا ایک ٹھکانا تیار کر لیا۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک تو جھوٹی قسم کھانا بذاتِ خود بہت بڑا جرم ہے، پھر ایسی قسم کو کسی مقدس جگہ یا زمانہ کے ساتھ پختہ کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ منبر پر بیٹھ کر جھوٹی قسم اٹھانے کی تحذیر، یہ قسم کو مکان کے ساتھ مؤکد کرنے کی مثال ہے۔ پھر قسم کو از خود مغلظ کرنا سخت گناہ ہے۔ جبکہ حاکم یا قاضی کا کسی کو منبر پر چڑھا کر قسم لینا واجب یا مستحب نہیں، ہاں یہ امر قاضی وغیرہ کی رائے کے سپرد ہے۔ کیونکہ یہ حق عیاں کروانے کے باب میں سے ہے۔

◈ قسم کی تغلیظ چار باتوں سے ہوتی ہے:

---

[1] مسند احمد: 375/3۔ سنن ابی داؤد: 3246۔ سنن النسائی: 6018۔ صحیح ابن حبان: 4368۔ المستدرك للحاكم: 329/4۔ صحیح ابی عوانة: 5980۔ ابن حزم نے المحلی: 37/8 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

(1) زمان سے (2) مکان سے۔ (3) ہیئت سے (4) اور صیغہ سے

مکان سے مغلظ کرنے کی مثال مذکورہ حدیث میں آ گئی ہے۔ حرم، مقام ابراہیم، رُکن، حجرِ اسود، چاہ زم زم، منبر، جائے مسجد وغیرہ کہ یہ مقامات قسم کی تغلیظ بالمکان میں داخل ہیں۔ زمان کے ساتھ مغلظ کرنا جیسے نماز عصر کے بعد سے غروب تک میں قسم اٹھوانا۔ کیونکہ اس وقت کی خاص تاکید آئی ہے۔ ہیئت میں تغلیظ کھڑا کر کے قسم اٹھوانا ہے۔ جبکہ صیغہ کے ساتھ قسم کی تغلیظ جیسے میں اللہ ذوالجلال والاکرام کی، اللہ علی وعظیم کی، اللہ جبار وقہار کی قسم اٹھاتا ہوں۔

تب پھر طلاق، عتق اور وقف وغیرہ کی قسمیں اٹھانا جائز نہ ہوگا۔ جیسے یہ کہنا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو میری بیوی کو طلاق۔ یہ بدعتی قسمیں ہیں لہٰذا یہ قسمیں نہ اٹھوائی جائیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جہنم ثابت ہے۔
- منبر نبوی پر قسم اٹھانے سے قسم مؤکد و مغلظ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ منبر نبوی دعوتِ خیر کی جا ہے وہاں ظلم و جور کی قسم اٹھانا بلاشبہ قسم کو مغلظ کرنا ہے۔
- قسم میں تغلیظ چار طرح سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ بیان ہوا۔
- جھوٹی قسم اور بالخصوص منبر نبوی پر جھوٹی قسم اٹھانا کبائر میں سے ہے۔ کیونکہ منبر نبوی کا جو شرف ہے، وہ دوسری مساجد کے منبر کو حاصل نہیں۔

وہ بدنصیب لوگ جن سے رب تعالیٰ روزِ قیامت نہ تو بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا ہی

1415- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: رَجُلٌ عَلَى فَضْلِ مَاءٍ بِالْفَلَاةِ يَمْنَعُهُ مِنَ ابْنِ السَّبِيلِ وَرَجُلٌ بَايَعَ رَجُلًا بِسِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ، فَحَلَفَ لَهُ بِاللّٰهِ: لَأَخَذَهَا بِكَذَا وَكَذَا، فَصَدَّقَهُ، وَهُوَ عَلَى غَيْرِ ذَلِكَ. وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا لَا يُبَايِعُهُ إِلَّا لِلدُّنْيَا، فَإِنْ أَعْطَاهُ مِنْهَا وَفَى، وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ مِنْهَا لَمْ يَفِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تین (قسم کے) لوگ ایسے ہیں کہ جن سے رب تعالیٰ روزِ قیامت نہ تو (کوئی) بات کرے گا اور نہ ان کی طرف (نگاہِ شفقت سے) دیکھے گا اور نہ انہیں (گناہوں سے) پاک ہی کرے اور انہیں دردناک عذاب ملے گا۔ (ایک) وہ آدمی جس کے پاس کسی بے آب و گیاہ جنگل میں زائد پانی ہو (مگر اس کے باوجود بھی) وہ مسافروں (راہ گیروں) کو اس سے روکتا ہو، اور (دوسرے) وہ آدمی جس نے نمازِ عصر کے بعد کسی دوسرے کو (اپنا) سامان بیچا اور اس کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ اس نے یہ سامان اتنے اتنے کا خریدا ہے اور اس دوسرے نے (اس کے قسم اٹھانے کو دیکھ کر) اس (کی بات) کی تصدیق کر دی حالانکہ وہ ایسا نہ تھا۔ اور (تیسرے) وہ آدمی جس نے کسی امام کی بیعت کی اور اس نے صرف دنیا (پانے) کے لیے ہی اس کی

بیعت کی۔ چنانچہ اگر تو امام نے اسے دنیا (کے مال و زر) میں سے کچھ دیا تو وہ (اس کی بیعت کو) وفا کرتا ہے اور اگر وہ امام اسے دنیا میں سے کچھ نہیں دیتا تو وہ (اس کی بیعت کی) وفا نہیں کرتا۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:......اس حدیث پر گزشتہ میں مفصل کلام کیا جا چکا ہے جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

قبضہ شہادت کو راجح بنانے والا اور اس کے موافق ہوتا ہے

1416- وَعَنْ جَابِرٍ ﷺ ((أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِيْ نَاقَةٍ، فَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا: نُتِجَتْ هَذِهِ النَّاقَةُ عِنْدِيْ، وَأَقَامَا بَيِّنَةً، فَقَضَى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَنْ هِيَ فِيْ يَدِهِ)) .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: دو آدمیوں کا ایک اونٹنی میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں میں سے ہر ایک اس بات کا مدعی تھا کہ وہ اونٹنی اس کے ہاں پیدا ہوئی ہے (لہٰذا یہ اونٹنی اس کی ہے) اور دونوں نے (اپنے اپنے دعویٰ پر) بینہ بھی پیش کر دیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس اونٹنی کا فیصلہ اس کے حق میں کیا جس کے قبضہ میں (اس وقت) وہ اونٹنی تھی۔ ❷

غریب الحدیث:......أَنَّ رَجُلَيْنِ: یہ دونوں صاحب یہاں مجہول ہیں لیکن اس سے حدیث کی صحت اور حکم کے بیان پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

نُتِجَتْ: نُتِجَ: یہ فعل ہمیشہ مجہول آتا ہے اور مطلب ''جانور کا پیدا ہونا'' ہے۔ یعنی دونوں میں سے ہر ایک نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ اونٹنی اس کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔

وَأَقَامَا بَيِّنَةً: اور یہ بات معلوم ہے کہ دونوں کا بینہ ایک دوسرے کے مناقض تھا۔ کہ ایک کے بینہ نے زید کے ہاں جبکہ دوسرے کے بینہ نے عمرو کے ہاں اونٹنی کے پیدا ہونے کی شہادت دی۔ جبکہ ایک اونٹنی کا دو کے بطن سے پیدا ہونا ممکن نہیں۔ تب پھر دونوں میں سے ایک بینہ کا غیر صحیح ہونا لازم تھا۔

فَقَضَى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَنْ هِيَ فِي يَدِهِ: معلوم ہوا کہ وہ ناقہ دونوں میں سے ایک کے قبضہ میں تھی۔ تب پھر دونوں میں سے مدعی وہ بنا جس کا اونٹنی پر سر دست قبضہ نہ تھا اور جس کے قبضے میں وہ اونٹنی تھی وہ مدعا علیہ بنا۔

اب مذکورہ صورت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں نے اپنا اپنا بینہ پیش کر دیا ہے اور جب دونوں طرف سے بینہ ہو تو قسم کا محل باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا اس صورت میں دونوں میں سے کسی ایک سے قسم نہ لی جائے گی۔

رہا ایسی خصومت کا فیصلہ تو مذکورہ حدیث میں اس بات پر نص آ گئی ہے کہ فیصلہ قابض کے حق میں دیا جائے گا۔ کیونکہ قبضہ اس بات کی دلیل ہے کہ فریق ثانی کا بینہ قابض کے بینہ کے معارض ہے اور قبضہ قابض کے بینہ کو اور اس کے دعویٰ کو راجح بنا رہا

---

❶ صحيح البخاري: 2358- صحيح مسلم: 108 .

❷ سنن الدارقطني: 209/4- سنن البيهقي: 256/10 .

ہے۔ کیونکہ دونوں بینے تو ایک دوسرے کے معارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہو گئے۔ جبکہ قبضہ نے مدعا علیہ کی جانب کو راجح بنا دیا۔
رہا یہ سوال کہ کیا پھر مدعا علیہ سے قسم بھی لی جائے گی یا نہیں؟ تو حدیث کا ظاہر یہ بتلاتا ہے کہ ایسی صورت میں قابض یعنی مدعا علیہ سے قسم نہیں لی جائے گی۔ یہی اقرب اور راجح قول ہے۔

جب مدعا علیہ قسم نہ اٹھائے تو قسم مدعی سے لی جائے گی

1417- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَدَّ الْيَمِينَ عَلَى طَالِبِ الْحَقِّ)).
رَوَاهُمَا الدَّارَقُطْنِيُّ، وَفِي إِسْنَادِهِمَا ضَعْفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے قسم کو طالبِ حق (یعنی مدعی) کی طرف لوٹایا۔ ❶
(اس حدیث کو اور گزشتہ حدیث) دونوں کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے، اور ان دونوں کی اسناد میں ضعف ہے۔

شرح:...... مذکورہ حدیث میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ مدعی کے پاس بینہ نہیں۔ جبکہ مدعا علیہ نے قسم کھانے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ اب مدعا علیہ کے خلاف نکول کا یعنی قسم کھانے سے انکار کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔
البتہ مدعی کے دعویٰ کی تقویت کی بھی ضرورت ہے اور وہ تقویت یمین سے پیدا ہو گی۔ اسی لیے اب قسم کو مدعا علیہ کی بجائے مدعی پر پھیرا جائے گا۔ لہٰذا اگر تو اس نے قسم اٹھالی تو اس کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا اور اگر اس نے بھی قسم اٹھانے سے انکار کر دیا تو اس کا دعویٰ باطل قرار دے کر خارج کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا قسم کھانے سے انکار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے کیونکہ سچے آدمی کو قسم کوئی نقصان نہیں دیا کرتی۔
لیکن راجح قول یہ ہے کہ یہ امر قاضی کی رائے کے سپرد ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھے تو قسم کو مدعی کی طرف پھیرے گا وگرنہ نہیں۔ رہی یہ حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قسامت میں قسم کو مدعی کی طرف پھیرا تھا کیونکہ آپ ﷺ نے قرائن سے اس کے سچا ہونے کو جان لیا تھا۔

نسب کے ثبوت میں قیافہ ❷ کا اعتبار ہے

1418- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ مَسْرُورًا تَبْرُقُ أَسَارِيرُ وَجْهِهِ فَقَالَ: ((أَلَمْ تَرَيْ إِلَى مُجَزِّزٍ الْمُدْلِجِيِّ؟ نَظَرَ آنِفًا إِلَى زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ، وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، فَقَالَ: هَذِهِ الْأَقْدَامُ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: ایک دن نبی کریم ﷺ میرے پاس بے حد خوش تشریف لائے کہ (فرطِ مسرت سے) آپ ﷺ کی جبینِ مبارک کے خطوط چمک رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم نے مجزز مدلجی کو نہیں دیکھا، اس نے ابھی ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید (یعنی ان دونوں باپ بیٹا) کو (اپنی ماہرانہ نگاہوں کے ساتھ)

---

❶ سنن الدارقطنی: 213/4۔ امام حاکم (113/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام بیہقی رحمہ اللہ (184/10) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کی اسناد میں محمد بن مسروق ایک غیر معروف راوی ہے جبکہ اسحاق بن فرات مختلف فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: التلخیص الحبیر: 209/4۔

❷ قیافہ: ایک علم جس میں چہرے کے خدوخال اور علامات سے بھلا برا پہچان لیا جاتا ہے۔ لہٰذا قائف اس شخص کو کہیں گے جو بچے کے اعضاء اور خدوخال دیکھ کر فراست سے نسب بتانے کا ماہر ہو۔ القاموس الوحید، ص: 1367-1368۔ نسیم۔

دیکھا ہے تو کہنے لگا کہ: یہ قدم تو ایک دوسرے سے ہیں۔ ❶ (یعنی یہ دونوں باپ بیٹا ہیں اس لیے ان کے قدم اور پیروں کے اعضاء ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں)۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... ذَاتَ يَوْمٍ: لفظ ذات لغت عربیہ میں کئی طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ زائدہ بن کر آتا ہے۔ تب یہ تاکید کے لیے ہوتا ہے جیسے ''ذَاتَ يَـوْمٍ'' میں یہ زائد ہے کیونکہ اس کے حذف سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ مذکورہ عبارت کو ''دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمٍ مَسْرُورًا'' پڑھنے سے معنی مستقیم رہتا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں لفظ ''ذَاتَ'' زائدہ ہے۔ اور کبھی یہ لفظ ابہام کی تاکید کے لیے آتا ہے جیسے لفظ یوم نکرہ ہونے کی وجہ سے مبہم ہے اور لفظ ذَاتَ اس کی مزید تاکید کے لیے آیا ہے۔

مَسْرُورًا: یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ لفظ رسول اللہ ﷺ سے حال ہے۔

تَبْرُقُ أَسَارِيرُ وَجْهِهِ: یہ حال ثانی ہے۔ اَسَارِيرُ یہ سِرَارٌ کی جمع ہے یہ ہاتھوں کی لکیروں اور پیشانی اور چہرے کے خطوط کو کہتے ہیں۔ مراد پیشانی کی شکنیں ہیں جو خوشی ملنے پر نمایاں ہو جاتی ہیں اور دمکنے لگتی ہیں۔

أَلَمْ تَرَىْ: یہ ''اَلَمْ تَعْلَمِيْ'' کے معنی میں ہے، اور مذکورہ استفہام حکم واقع کی تقریر کے لیے ہے۔

مُجَزِّزٍ: یہ باب تفعیل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، اور جَزَّ سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا اور مونڈنا ہے۔ یہ اس مدلجی کا لقب تھا کیونکہ یہ اپنے قیدیوں کا سر مونڈ کر انہیں آزاد کر دیا کرتا تھا۔

الْمُدْلِجِيّ: قبیلہ مدلج سے تعلق رکھنے والا۔ یہ عربوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ یہ مدلجی مشہور قیافہ شناس تھا۔

نَظَرَ آنِفًا: اٰنِفًا یہ ظرف زمان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور اٰنِفًا سے مراد قریباً ہے۔ یعنی اس نے ابھی ابھی دونوں باپ بیٹا کو دیکھا ہے۔

زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ: نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام۔ جو سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے زید کو آپ ﷺ کو ہبہ کیا تھا اور آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے اپنا خادم بنالیا تھا۔

أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند اور ایک جلیل القدر صحابی رسول ﷺ۔ دراصل دونوں باپ بیٹے کا رنگ ایک دوسرے مختلف تھا۔ جناب زید رضی اللہ عنہ سفید رنگت والے تھے جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی رنگت سیاہ تھی۔ کیونکہ ان کی والدہ ایک حبشی خاتون تھیں۔ اس پر مشرک انہیں طعنہ دیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور ان کا آپ ﷺ کے ساتھ ایک تعلق تھا۔ اگر یہ کسی اور کے غلام یا آزاد کردہ غلام ہوتے تو ان مشرکوں کو ان کی ذرا پروا نہ ہوتی۔

ادھر جناب رسول اللہ ﷺ کفار اشرار کی ان طعنہ زنیوں سے دل گرفتہ رہتے تھے۔ کیونکہ وہ لوگ کھلے بندوں سے یہ کہتے تھے کہ بھلا ایک سفید رنگت والے باپ کا بیٹا سیاہ رنگت والا کیونکر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ایک دن اس مدلجی کا اُدھر سے گزر ہوا

❶ صحيح البخاري: 3555۔ صحيح مسلم: 1459 .

جو بڑا ماہر قیافہ شناس بھی تھا۔ جب اس نے ان دونوں باپ بیٹے پر ایک نگاہ ڈالی جن کے چہروں پر ایک چادر تھی اور صرف ان کے قدم کھلے تھے تو بے اختیار کہہ اٹھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہیں یعنی یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ نبی کریم ﷺ اس قیافہ شناس کی اس شہادت سے بے حد خوش ہوئے کہ یہ دونوں قدم ایک دوسرے سے ہونے کا صاف مطلب ہے کہ ان میں سے ایک، دوسرے کا باپ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ کے دوسرے بندوں کی طرح خوشی اور غم وغیرہ کے عوارض لاحق ہوتے تھے۔ اس کی دلیل دَخَلَ عَلَیَّ مَسْرُوْرًا کے الفاظ ہیں۔
- ایسی حق بات کے واضح ہونے پر خوش ہونا چاہیے جس سے تہمت جاتی رہے۔
- نبی کریم ﷺ لوگوں کی عزتوں اور آبروؤں کی حفاظت وحمایت کے بے حد حریص تھے۔
- نبی کریم ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ سب سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو جب ایک خوشی حاصل ہوئی تو آپ ﷺ اپنی سب سے چھوٹی زوجہ سیّدہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں خوشی کی یہ خبر سنائی۔
- آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گھل مل کر رہے اور اپنی خوشی غمی میں انہیں شریک کرے۔
- معلوم ہوا کہ والدین اور اولاد کی رنگت میں فرق تہمت کو مستلزم نہیں۔
- قیافہ پر عمل جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قیافہ کو برقرار رکھا اور اس سے بے حد خوش بھی ہوئے۔
- اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تو اموال تک میں قیافہ پر عمل کے جواز کے قائل ہیں اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

16

کِتَابُ العِتقِ

عتق کے احکام و مسائل کا بیان

تمہید: ...امام موصوف رحمہ اللہ عتق کے مسائل کو سب سے آخر میں لائے ہیں تا کہ اس سے دوزخ کی آگ سے نجات اور خلاصی کی نیک فال لی جا سکے۔ بعض علماء نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ وہ کتاب العتق کو سب سے آخر میں لائے ہیں جبکہ بعض نے کتاب العتق کو کتاب المواریث کے بعد ذکر کیا ہے۔ کیونکہ عتق کا مواریث سے ایک گونہ تعلق ہے۔ کیونکہ عتق ولاء کا سبب ہے جو وراثت کے اسبابِ ثلاثہ میں سے ایک ہے۔

غرض ہر ایک مؤلف کا اپنا اپنا نکتہ نگاہ ہے۔ لیکن ہماری اپنے لیے اور سب کے لیے اس بات کی دعا ہے کہ رب تعالیٰ ہم سب کو دوزخ کی آگ سے نجات نصیب فرمائے۔

عتق کی تعریف اور اس کے اسباب:

عتق یہ گردن کے آزاد کرنے کو اور اسے غلامی سے نجات دلانے کو کہتے ہیں۔

رقیت یعنی غلام کی صحیح تعریف تب ہی سمجھ میں آ سکتی ہے جب رقیت کے اسباب کو بیان کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ رقیت کا صرف اور صرف ایک ہی حقیقی سبب ہے، اور وہ ہے کفر، اس کے علاوہ رقیت کا اور کوئی سبب نہیں، اور یہ نہیں کہ فقر و فاقہ اور بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر اگر ماں باپ نے اپنے بچے بیچ دیے تو وہ غلام بن جائیں گے۔ پس جب کفار سے قتال کے بعد ان پر فتح حاصل ہو جائے اور ان کے بیوی بچے قید کر لیے جائیں تو صرف قید کرنے سے ہی وہ سب غلام بن جائیں گے۔ یعنی پہلے یہ لوگ آزاد تھے اور اب یہ مسلمانوں کے مملوکہ غلام بن چکے ہیں۔

رقیت کا دوسرا سبب اولاد جننا ہے۔ چنانچہ جو عورت شرعاً کنیز اور باندی ہو، جو اولاد وہ جنے گی وہ بھی ماں کے تابع ہو کر غلام کہلائے گی۔ البتہ اگر اس کی یہ اولاد اپنے آقا سے ہو تو خود اس کے باندی ہونے کے باوجود اس کی اولاد آزاد کہلائے گی۔ جبکہ آقا کی اولاد جننے سے وہ خود ''ام ولد'' بن جائے گی۔ ام ولد کے تفصیلی احکام آگے آ رہے ہیں۔ پھر اگر ایک آزاد آدمی کسی باندی سے شادی کرتا ہے تو اس کی اولاد بھی باندی کے آقا کی ملکیت ہونے کی وجہ سے غلام ہی کہلائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ

باندی کے ساتھ شادی چند شروط کے ساتھ ہی جائز ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ﴾ (النساء: 25)

''یہ اس کے لیے ہے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈرے۔''

اور یہ کہ اس کے پاس آزاد عورت کو دینے کے لیے مہر نہ ہو۔ اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ آزاد آدمی جب کسی باندی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے تو اس کا نصف بھی غلام بن جاتا ہے کیونکہ اس کی اولاد بھی ماں کی طرح غلام ہی رہتی ہے۔

آزادی کے اسباب:

آزادی کے اسباب متعدد ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اسلامیہ غلاموں کو آزاد کرنے کی بے حد حریص ہے۔ عتق کے متعدد اسباب مقرر کرنے سے غرض غلامی کو حتیٰ الامکان کم کرنا ہے۔ چنانچہ عتق لفظوں سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے آقا غلام کو یہ کہے کہ ''تم آزاد ہو۔'' یہ الفاظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں ان کی وجہ سے غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ یہی حکم تحریر کا بھی ہے۔ اسی طرح غلام کا مثلہ بنانے سے بھی بطور سزا کے وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے اپنے غلام کے کسی عضو کو کاٹ ڈالا جیسے انگلیاں کاٹ دیں یا ہاتھ کاٹ دیا وغیرہ تو وہ غلام بھی اپنے آقا پر آزاد ہو جاتا ہے۔

عتق کی ترغیب

1419-1421- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَيُّمَا امْرِءٍ مُسْلِمٍ أَعْتَقَ امْرَأً مُسْلِمًا اسْتَنْقَذَ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس کسی (آزاد) مسلمان نے کسی (دوسرے غلام) مسلمان کو آزاد کیا تو رب تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کو (جہنم کی) آگ سے آزاد کرے گا۔'' ❶
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......عتق کی تعریف بیان کی جا چکی ہے۔ بلاشبہ کسی مسلمان کو غلامی سے آزاد کرنا افضل ترین عبادت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ٥ وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ٥ فَكُّ رَقَبَةٍ٥ أَوْ إِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ٥ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ٥ أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ٥﴾ (البلد: 11-16)

''پھر (بھی) وہ مشکل گھاٹی میں نہ گھسا۔ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ مشکل گھاٹی کیا ہے؟ (وہ) گردن چھڑانا ہے۔ یا کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلانا ہے۔ کسی قرابت والے یتیم کو۔ یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو۔''

مُسْلِمًا: کی قید بتلاتی ہے کہ یہ خاص فضیلت صرف مسلمان غلام کو آزاد کرنے کی ہی ہے۔ اگرچہ کافر غلام کو آزاد کرنے کی بھی فضیلت ہے۔ لیکن یہ فضیلت اس وعدے اور خوش خبری تک نہیں پہنچ سکتی جس کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

اِسْتَنْقَذَهُ: یہ الفاظ بتلاتے ہیں کہ یہ آدمی پہلے جہنم کا مستحق بن چکا تھا۔ غلام آزاد کرنے پر یہ بشارت اس لیے ہے کیونکہ

❶ صحيح البخاري: 2517۔ صحيح مسلم: 1509.

عتق رقبہ نفوس پر بے حد شاق گزرتی ہے۔ لہٰذا جو اس قدر پر مشقت گھاٹی عبور کر لے گا، اسے یہ اجر ملے گا کہ اس کی گردن اور ایک ایک عضو کو بھی جہنم کی آگ سے آزاد کر دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ''غلام کی شرمگاہ کے بدلے اس کی شرمگاہ کو'' (جہنم کی آگ سے نجات دلائی جائے گی)۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث غلاموں کو آزاد کرنے اور اس کی فضیلت سے متعلق ہے، اور یہ کہ غلام کو آزاد کرنا جہنم سے آزادی کا سبب ہے، اور یہ کہ جب آدمی کسی مسلمان کو آزاد کرتا ہے تو رب تعالیٰ اس آزاد کیے جانے والے غلام کے ایک ایک عضو کے بدلے اس آزاد کرنے والے کے اعضاء کو جہنم سے آزاد کرتے ہیں۔

باندی کو آزاد کرنے کی فضیلت

وَلِلتِّرْمِذِيِّ ، وَصَحَّحَهُ ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ ﷺ: ((وَأَيُّمَا امْرِءٍ مُسْلِمٍ أَعْتَقَ امْرَأَتَيْنِ مُسْلِمَتَيْنِ كَانَتَا فِكَاكَهُ مِنَ النَّارِ)) .

جامع ترمذی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس روایت کو امام ترمذی نے صحیح کہا ہے کہ: جس کسی مسلمان نے دو مسلمان عورتوں کو (غلامی سے) آزاد کیا تو یہ دونوں عورتیں اس کے لیے جہنم سے رہائی (کا سبب) ہوں گی۔ ❶

1422۔ وَلِأَبِي دَاوُد مِنْ حَدِيثِ كَعْبِ بْنِ مُرَّةَ ﷺ: ((وَأَيُّمَا امْرَأَةٍ مُسْلِمَةٍ أَعْتَقَتِ امْرَأَةً مُسْلِمَةً كَانَتْ فِكَاكَهَا مِنَ النَّارِ))

سنن ابی داؤد میں حضرت کعب بن مرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ: جس کسی مسلمان عورت نے ایک مسلمان عورت کو آزاد کیا تو وہ عورت اس کے لیے جہنم سے رہائی (کا سبب) ہوگی۔ ❷

غریب الحدیث: ......أَعْتَقَ امْرَأَتَيْنِ مُسْلِمَتَيْنِ: یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ عورت کو آزاد کرنے کا اجر مرد کو آزاد کرنے کے اجر سے نصف ہے۔ لہٰذا ایک عورت آزاد کرنے پر آدمی کے نصف کو جہنم سے رہائی مل جائے۔ جبکہ عورت عورت کو آزاد کرے تو وہ پوری جہنم سے آزاد ہوگی۔ کہ حدیث ابی امامہ رضی اللہ عنہ کا مفہوم اور حدیث کعب بن مرہ رضی اللہ عنہ کا منطوق یہی ہے۔

مہنگا غلام آزاد کرنا سستے غلام کو آزاد کرنے سے افضل ہے

1422۔ وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ ﷺ قَالَ : سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ : أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ ؟ قَالَ : ((إِيمَانٌ بِاللّٰهِ ، وَجِهَادٌ فِي سَبِيلِهِ)) قُلْتُ : فَأَيُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ ؟ قَالَ : ((أَغْلَاهَا ثَمَنًا وَأَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا)) .

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رب تعالیٰ پر ایمان لانا، پھر اس کی راہ میں جہاد کرنا۔'' میں نے عرض کیا کہ: کون سی گردن (آزاد کرنا) سب سے افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کی قیمت زیادہ ہو اور وہ اس کے مالکوں کے نزدیک بہت عمدہ (بھی) ہو۔'' ❶

---

❶ جامع الترمذی: 1547 .

❷ سنن ابی داؤد: 3947۔ السنن الکبری للنسائی: 4880۔ مسند احمد: 234/4۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری: 147/5 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

❶ صحیح بخاری: 2518۔ صحیح مسلم: 84 .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......أَغْلَاهَا ثَمَنًا: لفظ ثمن تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غلام جتنا مہنگا اور قیمتی ہوگا اس کو آزاد کرنے کا اجر اتنا زیادہ ہوگا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ فضیلت اس وقت ہے جب آدمی ایک ہی غلام آزاد کرنا چاہتا ہو۔ البتہ اگر ایک آدمی ہزار درہم سے غلام خرید کر آزاد کرنا چاہے اور ہزار میں ایک عمدہ غلام جبکہ دو کم درجہ کے غلام ملتے ہوں تو ایسی صورت میں ان دو کم قیمت والے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا زیادہ افضل ہے۔

صاحبِ "سبل السلام" [1] کہتے ہیں: یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ یہ فضیلت لوگوں کے احوال کے مختلف ہونے کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ایک علم و فضل کے مالک غلام کو آزاد کرنا غیر علماء کی ایک پوری جماعت کو آزاد کرنے سے افضل ہوگا۔ تب پھر قاعدہ اور ضابطہ یہ ٹھہرا کہ غلام آزاد کرنے میں زیادہ فضیلت وہاں ہے جہاں غلام زیادہ نفع والا ہو۔

وَأَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا: انفس زیادہ عمدہ، پسندیدہ اور محبوب شے کو کہتے ہیں۔ یہ ارشاد نبوی رب تعالیٰ کے اس ارشاد کے موافق ہے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (آل عمران: 92)

''تم پوری نیکی ہرگز حاصل نہیں کرو گے، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔''

مشترک غلام میں سے اپنے حصہ کے غلام کو آزاد کرنے کا حکم

1423-1424- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ أَعْتَقَ شِرْكًا لَهُ فِيْ عَبْدٍ، فَكَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَ الْعَبْدِ، قُوِّمَ عَلَيْهِ قِيمَةَ عَدْلٍ، فَأَعْطَى شُرَكَاءَهُ حِصَصَهُمْ، وَعَتَقَ عَلَيْهِ الْعَبْدُ، وَإِلَّا فَقَدْ عَتَقَ مِنْهُ مَا عَتَقَ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس آدمی نے غلام میں سے اپنا حصہ آزاد کر دیا اور اس کے پاس غلام کی قیمت کے بقدر مال ہی ہو، تو اس پر اس غلام کی (بازار سے) ایک عادلانہ قیمت لگوائی جائے گی۔ پھر وہ اپنے (دیگر) شرکاء کو ان کا حصہ دے دے گا، اور وہ غلام اس پر آزاد ہو جائے گا۔ وگرنہ اس غلام کا اتنا حصہ آزاد ہو جائے جتنا (اس کے آزاد کرنے سے) آزاد ہوا ہے۔'' [2]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......قِيمَةَ عَدْلٍ: یعنی نہ کم نہ زیادہ بلکہ جتنی اس کی بازار کی قیمت بنتی ہے اتنی قیمت لگوائی جائے گی، اور اس کے پاس جو مال ہے اس میں سے غلام کی باقی کی قیمت اس کے دیگر شرکاء کو دلوائی جائے گی اور وہ غلام پورے کا پورا آزاد ہو جائے گا۔

وَإِلَّا: یعنی اگر اپنا حصہ آزاد کرنے والے کے پاس اتنا روپیہ پیسہ نہ ہو جو غلام کی قیمت کے بقدر ہو۔

فَقَدْ عَتَقَ مِنْهُ مَا عَتَقَ: تو جتنا حصہ اس غلام کا آزاد ہو چکا ہے اتنا ہی آزاد سمجھا جائے گا۔

---

[1] سبل السلام: 598/4. [2] صحیح بخاری: 2522۔ صحیح مسلم: 1501.

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کسی نے مشترکہ غلام میں سے اپنا حصہ آزاد کر دیا تو اس غلام کی قیمت لگوائی جائے گی اور یہ باقی کے شریکوں کو ان کے حصہ کے بقدر غلام کی قیمت دے دے گا جبکہ وہ صاحب استطاعت ہو۔ اور یہ حکم اس لیے ہے کہ غلام کا ایک حصہ آزاد ہو جانے کے بعد دیگر شرکاء پر بھی لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے حصہ کا غلام آزاد کر دیں۔ کیونکہ غلام پر تبعیض (کہ اس کا بعض تو آزاد ہو اور بعض غلام ہو) بے حد دشوار ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بات رب تعالیٰ کی رحمت میں سے ہے کہ اس نے عتق کے پورا اور کامل کرنے کا حکم دیا ہے۔

سعایت کا بیان

وَلَهُمَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ: ((وَإِلَّا قُوِّمَ عَلَيْهِ وَاسْتُسْعِيَ غَيْرَ مَشْقُوقٍ عَلَيْهِ)).

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: وگرنہ اس غلام کی اس پر قیمت لگوائی جائے گی اور اس سے محنت (اور مزدوری) کروائی جائے گی (تاکہ وہ باقی کے شرکاء کو ان کا حصہ خود کما کر دے) البتہ یہ محنت (مزدوری) ایسی نہ ہوگی جس میں اسے مشقت ہو۔ [1]

وَقِيلَ: إِنَّ السِّعَايَةَ مُدْرَجَةٌ فِي الْخَبَرِ.

(امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ) ایک قول یہ ہے کہ: سعایت کا ذکر مذکورہ حدیث میں ادراج ہے۔

غریب الحدیث:......وَلَهُمَا: مراد امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ ہیں۔

اس روایت میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جب مشترکہ غلام میں سے اپنے حصہ کو آزاد کرنے والے کے پاس مال نہ ہو تو اس غلام کی قیمت لگوائی جائے گی۔ پھر وہ غلام باقی شرکاء کے حصہ میں آنے والی رقم کو ادا کرنے کے لیے خود سعایت کرے گا یعنی محنت مزدوری کر کے کمائے گا اور ان شرکاء کو ان کا حصہ ادا کرے گا۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں وہ کوئی سا بھی کام کر کے پیسہ کمائے گا اور باقی کے شرکاء کو ان کے حصہ کی رقم دے گا تاکہ اس کی آزادی کی تکمیل کی جا سکے۔

والدین یا کسی ذی رحم محرم کا مالک بن جانے کا حکم

1425۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَجْزِي وَلَدٌ وَالِدَهُ إِلَّا أَنْ يَجِدَهُ مَمْلُوكًا فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَهُ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی بیٹا اپنے باپ (کے احسانات) کا بدلہ نہیں دے سکتا سوائے اس صورت کے کہ وہ اپنے باپ کو غلام پائے تو اسے خرید کر آزاد کر دے۔'' [2]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

1426۔ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا

---

[1] صحيح بخاري: 2527۔ صحيح مسلم: 1503.
[2] صحيح مسلم: 1510.

قَالَ: ((مَنْ مَلَكَ ذَا رَحِمٍ مَحْرَمٍ فَهُوَ حُرٌّ)).

ارشاد ہے: ”جو کسی ذورحم محرم کا مالک بن گیا تو وہ (اس پر) آزاد ہو (جائے) گا۔“ ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ ، وَرَجَّحَ جَمْعٌ مِنَ الْحُفَّاظِ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ .

اس حدیث کو امام احمد اور ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا یَجْزِی: یہ ”لَا یُکَافِیُٔ“ کے معنی میں ہے۔ جس کا معنی بدلہ دینا ہے۔

فَیَشْتَرِیْهِ فَیُعْتِقَهُ: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ محض خرید لینے سے والدین آدمی پر آزاد نہیں ہو جاتے۔ بلکہ بعد میں انہیں آزاد کرنا ضروری ہے۔ ظاہریہ کا یہی مذہب ہے۔

جبکہ جمہور کا مذہب اس کے برخلاف ہے، وہ یہ کہ محض خرید لینے سے ہی والدین آدمی پر آزاد ہو جاتے ہیں، اور ”فَیُعْتِقَهُ“ کے الفاظ کی جمہور علماء یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ والدین کا خریدنا ہی عتق کا سبب تھا، اس لیے مجازاً عتق کو اس کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

جبکہ دوسری حدیث میں اس بات کو صراحتہً بیان کیا گیا ہے کہ محض خرید لینے سے ہی ذورحم محرم آدمی پر آزاد ہو جاتا ہے اور اسے خریدنے کے بعد مزید آزاد کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات کسی پر مخفی نہیں کہ الفاظ میں اصل ان کا حقیقی معنی ہی ہوتا ہے۔ البتہ یہاں عتق کے حقیقی معنی کو مجاز کی طرف پھیرا گیا ہے۔ والد کے آزاد کر دینے کو اس کے احسانات کا بدلہ اس لیے قرار دیا گیا ہے کیونکہ عتق سے بڑھ کر آدمی کا کسی پر کوئی احسان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح ایک آدمی آزاد لوگوں کے مکمل احوال کا اہل بن جاتا ہے۔ جیسے ولایت، شہادت، قضاء وغیرہ کہ بالاجماع ان باتوں کا اہل صرف آزاد آدمی ہی ہوتا ہے۔ ❷

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ والد اور ذورحم محرم کو خریدتے ہی وہ آدمی پر آزاد ہو جاتے ہیں، اور سب سے بڑے ذورحم باپ اور ماں ہوتے ہیں جبکہ بہن بھائی، اولاد اور خالہ ماموں بھی ذورحم محرم میں داخل ہیں۔

روایت الحدیث: ...... شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے۔ البتہ درست یہ ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے۔ کیونکہ مرفوع روایت کے راوی ثقہ ہیں۔

مرض الموت میں صدقہ خیرات کرنے کا حکم

1427۔ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضي الله عنه ((أَنَّ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے

---

❶ مسند احمد: 220/5۔ سنن ابی داؤد: 3949۔ جامع الترمذی: 1365۔ السنن الکبری للنسائی: 4898۔ سنن ابن ماجہ: 2524۔ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں پانچ علتیں ہیں۔ اس کے بعد امام موصوف نے ان علتوں کو ترتیب وار بیان کیا ہے، جن میں سے ایک علت یہ ہے کہ حسن بصری کے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے۔ دیکھیں: تهذيب السنن: 340/10 .

❷ سبل السلام: 601/4۔ 602 بتصرف .

رَجُلًا أَعْتَقَ سِتَّةَ مَمَالِيكَ لَهُ ، عِنْدَ مَوْتِهِ ، لَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُمْ ، فَدَعَا بِهِمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ، فَجَزَّأَهُمْ أَثْلَاثًا ﷺ : ثُمَّ أَقْرَعَ بَيْنَهُمْ ، فَأَعْتَقَ اثْنَيْنِ وَأَرَقَّ أَرْبَعَةً ، وَقَالَ لَهُ قَوْلًا شَدِيدًا)) .

اپنے مرنے کے وقت اپنے چھ غلام آزاد کر دیے۔ جبکہ اس کے پاس (اس وقت) ان غلاموں کے سوا دوسرا کوئی مال بھی نہ تھا۔ پس نبی کریم ﷺ نے ان غلاموں کو بلوایا اور ان کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا، (یوں یہ چھ غلام دو دو کی جوڑی میں بٹ گئے)، پھر آپ ﷺ نے ان (تین حصوں) میں قرعہ ڈالا اور (جن دو کی جوڑی کے نام قرعہ نکل آیا ان) دو کو آزاد فرما دیا اور (باقی کے) چار غلاموں کو (یعنی دو جوڑیوں کو) غلام ٹھہرایا (یعنی ان کو غلام باقی رکھا) اور اس آدمی کی سخت سرزنش فرمائی۔ ❶ (جس نے مرض الوفات میں سب غلاموں کو آزاد کر کے گویا کہ کل مال صدقہ کر دیا تھا)۔

رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح :...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرض الوفات میں تبرع یہ وصیت کے حکم میں داخل ہے۔ لہٰذا وصیت کی طرح یہ خیرات بھی ثلث مال میں نافذ ہوگی۔ چنانچہ جب اس آدمی کا کل مال ہی یہ چھ غلام تھے اور اس نے کل مال کی گویا کہ وصیت کر دی تھی تو یہ وصیت ثلث مال میں جاری ہوگی اور وہ دو غلام ہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے قرعہ ڈال کر صرف دو غلام آزاد قرار دیے جبکہ باقی کے چار کو، جو دو ثلث ہیں، غلام ہی رکھا۔

امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ البتہ ان حضرات میں یہ اختلاف ضرور ہے کہ ایسی صورت میں غلاموں کے عدد کا اعتبار ہوگا یا ان کی قیمت کا۔ امام مالک رحمہ اللہ قیمت کا اعتبار کرتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک چھ غلاموں کی کل قیمت کے ثلث میں یہ خیرات جاری ہوگی۔ چاہے یہ قیمت کا ثلث صرف ایک غلام سے حاصل ہو یا دو سے یا تین سے۔ جبکہ دوسرے علماء کے نزدیک قیمت کا نہیں بلکہ عدد کا اعتبار ہوگا۔ لہٰذا چھ غلاموں کی صورت میں دو غلاموں میں یہ خیرات نافذ ہوگی۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس گنتی کے چند غلام ہوں اور ان کے علاوہ اور کوئی مال نہ ہو، اور وہ مرض الوفات میں ان سب کو آزاد کر دے یا آزاد کر دینے کی وصیت کرے۔ تو یہ اِعتاق یا وصیت ثلث مال میں جاری ہوگی۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے کل مال میں جو صرف چھ غلام تھے، قرعہ ڈال کر اس کو صرف ایک ثلث میں جاری فرمایا۔

عتق کو معلق کرنے کا حکم

1428۔ وَعَنْ سَفِينَةَ ﷺ قَالَ : ((كُنْتُ مَمْلُوكًا لِأُمِّ سَلَمَةَ ﷺ ، فَقَالَتْ: أُعْتِقُكَ ،

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا غلام تھا۔ پس سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے (ایک موقع پر

❶ صحیح مسلم: 1668 .

وَأَشْتَرِطُ عَلَيْكَ أَنْ تَخْدُمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا عِشْتَ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالْحَاكِمُ.

مجھے) ارشاد فرمایا کہ: میں تمہیں آزاد کرتی ہوں، پر میں تم پر یہ بات شرط رکھتی ہوں کہ تم زندگی بھر نبی کریم ﷺ کی خدمت کرو گے۔ ❶

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔

شرح :...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ غلام کی آزادی کو خدمت کی شرط کے ساتھ مشروط کرنا صحیح ہے اور یہ کہ عتق کو کسی بھی شرط کے ساتھ معلق کر سکتے ہیں، چنانچہ شرط کے پائے جانے کے وقت عتق واقع ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے غلام کو مشروط آزاد کرنے کو برقرار رکھا۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس غلام کا نام سفینہ رضی اللہ عنہ تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت کو لازم پکڑ لیا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شرط رکھ کر غلام آزاد کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں۔

غلام کی ولاء اسی کی ہے جو اسے آزاد کرے

1429۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''ولاء تو اسی کی ہے جو آزاد کرے۔'' ❷

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے، اور یہ ایک طویل حدیث کا طرف ہے۔

شرح :...... اس حدیث پر سیّدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کی آزادی کے قصہ میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کی جملہ تفصیلات کو وہاں دیکھ لیا جائے۔

ولاء کی بیع کا اور اس کو ہبہ کرنے کا بیان

1430۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْوَلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوْهَبُ)).

رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ بِغَيْرِ هٰذَا اللَّفْظِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ولاء بھی نسبی رشتہ کی طرح ایک رشتہ ہے۔ (پس) نہ تو اس کو بیچا جائے گا اور نہ ہبہ ہی کیا جائے گا۔'' ❸

اس حدیث کو امام شافعی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے۔ البتہ وہاں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نہیں۔

شرح :...... کتاب الفرائض اس حدیث پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔ جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

---

❶ مسند احمد: 221/5۔ سنن ابی داؤد: 3932۔ السنن الکبری للنسائی: 4995۔ امام نسائی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام حاکم (232/2) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کی اسناد میں سعید بن جمهان ہے۔ امام احمد اور ابن معین اسے ثقہ جبکہ ابو حاتم اس کو غیر حجت کہتے ہیں۔ حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ صدوق ہے۔ اس کی متعدد متفرد روایات ہیں۔

❷ صحیح بخاری: 2169۔ صحیح مسلم: 1504.

❸ یہ حدیث کتاب الفرائض میں گزر چکی ہے۔

1- بَابُ الْمُدَبَّرِ وَ الْمُكَاتَبِ وَ أُمِّ الْوَلَدِ

مدبر، مکاتب اورام ولد کا بیان

مدبر، مکاتب اورام ولد کی تعریفات مفصل ذکر کی جا چکی ہیں۔

مدبر کا حکم

1431- عَنْ جَابِرٍ ﷺ أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ أَعْتَقَ غُلَامًا لَهُ عَنْ دُبُرٍ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُ، فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: ((مَنْ يَشْتَرِيهِ مِنِّي؟)) فَاشْتَرَاهُ نُعَيْمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بِثَمَانِ مِائَةِ دِرْهَمٍ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک انصاری صاحب نے اپنے ایک غلام کو اپنے مرنے پیچھے آزاد کر دیا جبکہ اس کا اس کے سوا دوسرا کوئی مال نہ تھا۔ یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئی تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کون مجھ سے یہ غلام خریدے گا؟'' اس پر حضرت نعیم بن عبداللہ نے آٹھ سو درہم میں اس غلام کو خرید لیا۔'' ❶ یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَاحْتَاجَ.

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''فَاحْتَاجَ'' (اور وہ محتاج بھی تھا)۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِلنَّسَائِيِّ: وَكَانَ عَلَيْهِ دَيْنٌ فَبَاعَهُ بِثَمَانِ مِائَةِ دِرْهَمٍ، فَأَعْطَاهُ، وَقَالَ: ((اقْضِ دَيْنَكَ)).

اور سنن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اور اس انصاری کے ذمہ قرض (بھی) تھا۔ پس آپ ﷺ نے اس غلام کو آٹھ سو دراہم میں بیچ دیا اور اور وہ دراہم ان انصاری کو عنایت فرما کر ارشاد فرمایا: ''(اس رقم سے پہلے) اپنا قرض ادا کرو۔'' ❷

شرح:...... یہ روایت کتاب البیوع کے اول میں گزر چکی ہے۔ جہاں شیخ رحمہ اللہ نے اس پر شافی اور مفصل کلام فرما دیا ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

مکاتب جب تک مالِ کتابت کو ادا کر نہیں دیتا وہ غلام ہی ہے

1432- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((الْمُكَاتَبُ عَبْدٌ، مَا بَقِيَ عَلَيْهِ مِنْ مُكَاتَبَتِهِ دِرْهَمٌ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مکاتب'' غلام ہی ہے جب تک کہ اس کے ذمہ عقد کتابت کا ایک درہم بھی باقی ہے۔'' ❸

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ

امام ابوداؤد نے اس حدیث کو حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے،

---

❶ اس کی تخریج کتاب البیوع میں گزر چکی ہے۔

❷ مسند الدارمی: 3273- سنن ابن ماجه: 2514- امام ابن ماجہ فرماتے ہیں: میں نے ابن ابی شیبہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ حدیث خطا ہے۔ امام ثوری نے "الفرائض، ص: 44" میں صحیح سند کے ساتھ اس حدیث کو امام شعبی سے مرسل روایت کیا ہے جبکہ امام ابوزرعہ نے اس کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ دیکھیں: "العلل لابن ابی حاتم: 432/2".

❸ سبل السلام: 606/4- سنن ابی داؤد: 3926- جامع الترمذی: 1260- سنن النسائی: 45/8- امام ابن قیم تهذیب السنن: 309/10 میں فرماتے ہیں: یہ حدیث اضطراب سے محفوظ ہے۔ بخلاف حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے، اور عمل بھی حدیث عمرو بن شعیب پر ہے۔

أَحْمَدَ وَالثَّلَاثَةِ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ .

جبکہ اس کی اصل مسند احمد اور سنن ثلاثہ میں ہے، اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مکاتب غلام کے ذمہ جب تک مالِ کتابت کا ایک روپیہ بھی باقی ہے، وہ غلام کے حکم میں ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مکاتب اس وقت آزاد شمار ہوگا جب وہ مالِ کتابت ادا کر دے گا۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی ایک روایت یہ بھی ہے کہ مکاتب جتنی رقم ادا کر دے، اسی قدر وہ آزاد شمار ہوگا۔ لیکن جمہور کا قول درستی کے زیادہ قریب ہے۔ جس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ پھر اس میں سیّد (آقا) کے حق میں احتیاط اختیار کرنا بھی ہے۔ لہٰذا جب تک غلام اتنی رقم دے نہیں دیتا جس کے لینے پر آقا راضی ہوا تھا، اس وقت غلام کو غلام ہی شمار کیا جائے گا۔

جب مکاتب عقد کتابت کے بقدر مال کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد جیسا ہے

1433۔ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله عنها قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((إِذَا كَانَ لِإِحْدَاكُنَّ مُكَاتَبٌ ، وَكَانَ عِنْدَهُ مَا يُؤَدِّي فَلْتَحْتَجِبْ مِنْهُ)) .

سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم (عورتوں) میں سے کسی کا ایک مکاتب غلام ہو اور اس کے پاس اتنا مال (جمع) ہو (جائے) جو وہ (کتابت میں) ادا کر سکتا ہے تو (وہ آزاد کے جیسا اور اجنبی ہے۔ لہٰذا) چاہیے کہ وہ عورت اس سے پردہ کیا کرے۔'' [1]

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ .

اس حدیث کو ائمہ خمسہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :...... مذکورہ حدیث میں دراصل دو مسائل کا بیان ہے۔

پہلا مسئلہ:...... اگر کسی مکاتب غلام کے پاس عقد کتابت کی پوری رقم آ جائے تو وہ آزاد لوگوں کے حکم میں ہوگا۔ لہٰذا اگر تو وہ کسی عورت کا غلام تھا تو چاہیے کہ اب وہ عورت اس سے پردہ کیا کرے چاہے اس نے ابھی تک مالِ کتابت ادا نہیں بھی کیا۔

اگرچہ یہ حدیث گزشتہ مذکورہ حدیث عمرو بن شعیب کے معارض ہے لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نے دونوں احادیث میں یوں تطبیق کی ہے کہ مذکورہ حدیثِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ''ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن'' کے ساتھ خاص ہے اور وہ مکاتب کے پاس مالِ کتابت کے جمع ہو جانے پر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا اس سے پردہ کرنا ہے۔ چاہے اس نے ابھی تک مالِ کتابت دھیلا بھی نہ دیا ہو۔ جبکہ دیگر خواتین کے حق میں یہ مسئلہ ہے کہ مکاتبت جب تک پورا مالِ کتابت ادا نہیں کر دیتا وہ غلام کے حکم میں ہی ہے۔

اور مالِ کتابت کے جمع ہوتے ہی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پردہ کرنے کا حکم سد ذرائع کے طور پر ہوگا۔

دوسرا مسئلہ:...... اور اس دوسرے مسئلہ پر مذکورہ حدیث کا مفہوم دلالت کرتا ہے، وہ یہ کہ مملوک کو اپنی مالکن کی طرف دیکھنا جائز ہے، لہٰذا جب تک وہ اس کا غلام ہے، اس کے لیے اپنی مالکن کو دیکھنا جائز ہے۔

---

[1] مسند احمد: 289/6۔ سنن ابی داؤد: 3928۔ جامع الترمذی: 1261۔ السنن الکبری للنسائی: 9228۔ سنن ابن ماجہ: 2520.

مکاتبت کی دیت کا بیان

1434- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((يُودَى الْمُكَاتَبُ بِقَدْرِ مَا عَتَقَ مِنْهُ دِيَةَ الْحُرِّ، وَبِقَدْرِ مَا رَقَّ مِنْهُ دِيَةَ الْعَبْدِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مکاتب کی دیت جس قدر وہ (مالِ کتابت دے کر) آزاد ہے، آزاد کی دیت سے دی جائے اور جس قدر وہ (مالِ کتابت کی رہ جانے والی رقم کے مطابق) غلام ہے غلام کی دیت سے دی جائے گی۔'' ❶

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث متعدد طُرق سے مروی ہے۔ جن میں سے بعض میں تدلیس ہے جبکہ بعض طرق عمدہ ہیں۔ جیسے مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث عمدہ ہے۔

اور اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب آقا نے مکاتب کی دی رقم کے بقدر اسے آزاد کر دیا تھا اور ابھی باقی رقم ادا نہیں کی گئی تھی کہ وہ قتل ہو گیا تو جس قدر وہ آزاد ہو چکا اس قدر آزاد والی دیت آئے گی اور جس قدر وہ غلام باقی تھا اسی قدر غلام والی دیت آئے گی۔ یاد رہے کہ یہ حدیث گزشتہ حدیث کے معارض نہیں جس میں یہ ذکر ہے کہ جب تک اس کے ذمہ ایک درہم بھی باقی ہے وہ غلام ہے۔ کیونکہ اس صورت میں آقا نے اس کو دی گئی رقم کے بقدر آزاد نہ کیا تھا۔ پس اگر آقا دی گئی رقم کے بقدر مکاتب کو آزاد کر دیتا ہے تو اسی قدر آزادی میں آزاد کی دیت اور باقی کی غلامی میں غلام کی دیت آئے گی۔

نبی کریم ﷺ کے ترکہ کا بیان

1435- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْحَارِثِ۔ أَخِي جُوَيْرِيَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا۔ قَالَ: ((مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عِنْدَ مَوْتِهِ دِرْهَمًا، وَلَا دِيْنَارًا، وَلَا عَبْدًا، وَلَا أَمَةً، وَلَا شَيْئًا، إِلَّا بَغْلَتَهُ الْبَيْضَاءَ وَسِلَاحَهُ، وَأَرْضًا جَعَلَهَا صَدَقَةً)).

ام المؤمنین سیّدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات کے وقت نہ کوئی درہم چھوڑا، نہ دینار، نہ کوئی غلام، نہ کوئی باندی اور نہ کوئی (اور) شے (ہی چھوڑی) سوائے اپنی سفید خچری کے، اور اپنے اسلحہ کے اور ایک زمین کے (ٹکڑے کے) جس کو آپ ﷺ نے صدقہ (یعنی وقف) کر دیا تھا۔'' ❷

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دامن کو دنیا اور اس کی لذات اور نعمتوں سے، آلودہ ہونے سے کس قدر بچا کر رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے قلب و ذہن کو دنیا کی ہر قسم کی آسائشوں اور راحتوں میں لگنے کی دقتوں سے راحت دے رکھی تھی تاکہ آپ ﷺ کا قلب مبارک ہر وقت صرف اور صرف فریضہ رسالت کے ادا کرنے میں مشغول اور مستغرق رہے، اور آپ ﷺ کا قلب مبارک سوائے اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کے اور اس کی عبادت

---

❶ مسند احمد: 222/1- سنن ابی داؤد: 4582- السنن الکبری للنسائی: 5019.

❷ صحیح بخاری: 4461.

کرنے کے کسی اور طرف مطلق مشغول نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں تریسٹھ غلام آزاد فرمائے تھے۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت آپ ﷺ کی ملک میں ایک غلام بھی نہ تھا۔ ❶

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ بے دریغ خرچ فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے پاس ایک درہم یا ایک دینار تک نہ رہنے دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے پاس متعدد ذرائع سے اموال آتے تھے مگر انہیں آپ ﷺ کے قلب مبارک یا دولت خانہ میں ٹھہرنے کو اور تل دھرنے تک کو جگہ نہ ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وفات کے وقت آپ ﷺ کے ترکہ سے سواری کا صرف ایک جانور (سفید خچری) کچھ اسلحہ اور فدک کی ایک زمین کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ وہ زمین بھی مسلمانوں کی مصالح عامہ میں وقف کر دی گئی تھی۔ بلاشبہ اس میں ولی امر کو اس بات کی ترغیب ہے کہ وہ رعایا پر جود و کرم اور سخاوت ورعایت کرے اور رعایا کے ضعیفوں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

ام ولد اپنے آقا کی وفات کے وقت آزاد ہو جاتی ہے

1436۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَيُّمَا أَمَةٍ وَلَدَتْ مِنْ سَيِّدِهَا فَهِيَ حُرَّةٌ بَعْدَ مَوْتِهِ)).

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْحَاكِمُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيْفٍ، وَرَجَّحَ جَمَاعَةٌ وَقْفَهُ عَلَى عُمَرَ رضي الله عنه.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو باندی بھی اپنے آقا سے بچہ جنتی ہے تو وہ اپنے آقا کی وفات کے بعد آزاد (شمار) ہوتی ہے۔'' ❷

اس حدیث کو امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے ضعیف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جبکہ (ائمہ محدثین کی) ایک جماعت نے اس حدیث کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

شرح:...... شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگرچہ اس حدیث میں یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے کہ اپنے آقا سے بچہ جنم دینے والی باندی جس کو ام ولد کہتے ہیں، وہ اپنے آقا کے مرجانے کے بعد آزاد ہوتی ہے۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ محفوظ روایت یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان باندیوں کو آزاد قرار دیا تھا جن کے آقاؤں نے ان سے اولاد حاصل کی تھی۔ اس لیے جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ اپنے آقاؤں کی اولاد جننے والی باندیاں ان کے مرنے کے بعد آزاد ہوتی ہیں اور یہی راجح قول ہے۔

صاحب سبل السلام نے بھی اسی قول کو لیا ہے، اور انہوں نے گزشتہ روایت کے الفاظ "وَلَا أَمَةً" سے استدلال کیا ہے کہ سیدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جو جناب رسول اللہ ﷺ کی ام ولد تھیں اور ان کے بطن مبارک سے نبی کریم ﷺ کے فرزند ارجمند سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ نے جنم لیا تھا، وہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت زندہ تھیں اور انہوں نے دور فاروقی میں وفات پائی تھی جو اس بات کی دلیل ہے کہ سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے انتقال فرماتے ہی آزاد ہو گئیں تھیں۔ ❸

---

❶ صاحب سبل السلام (139/4) نے یہ بات "النجم الوهاج" سے نقل کی ہے۔

❷ سنن ابن ماجه: 2515۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے العلل: 41/2 میں اس روایت کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی اسناد میں حسین بن عبداللہ ایک ضعیف راوی ہے۔

❸ سبل السلام: 610/4.

مکاتب غلام کی اعانت کا اجر وثواب

1437۔ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَنْ أَعَانَ مُجَاهِدًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، أَوْ غَارِمًا فِي عُسْرَتِهِ، أَوْ مُكَاتَبًا فِي رَقَبَتِهِ، أَظَلَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ)).

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جس نے اللہ کی راہ کے کسی مجاہد کی، یا کسی مقروض کی اس کی تنگدستی میں یا کسی مکاتب (غلام) کی اس کی گردن (چھڑانے) میں مدد کی تو رب تعالیٰ اسے اس دن (اپنے) سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔“ [1]

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

شرح :...... شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی صورت یہ ہے کہ ہم مکاتب غلام کے آقا کو اپنی زکوۃ کی رقم سے اسے جنوائے بغیر مالِ کتابت ادا کریں گے اور اس غلام کو آزاد کروالیں گے۔ کیونکہ مکاتب غلام پر زکوۃ خرچ کرنا ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ کے مصداق میں داخل ہے۔

أَظَلَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: روز قیامت میدانِ محشر میں کسی قسم کی کوئی عمارت یا کہسار، کوئی ٹیلہ یا دیوار غرض کچھ بھی تو نہ ہوگا کہ جس کا معمولی سا بھی سایہ بن سکے۔ وہ تو ایک صاف اور چٹیل میدان ہوگا۔ جبکہ سورج عین سروں پر دہک رہا ہوگا، ہاں اس دن اگر کوئی سایہ ہوگا تو رب تعالیٰ کا پیدا کردہ ایک خاص سایہ ہوگا جس کے نیچے ہر کوئی اپنی مرضی سے داخل نہ ہو سکے گا۔ بلکہ جس کو رب تعالیٰ اجازت فرمائیں گے۔ اس سائے کے نیچے جگہ اس کو ملے گی۔

احادیث میں ایسے متعدد لوگوں کا ذکر ہے جو اس دن رب تعالیٰ کے اس عظیم سائے تلے جگہ پائیں گے۔ انہیں لوگوں میں سے ایک مکاتب غلام کی مدد کرنے والا بھی ہے۔ جبکہ مزید لوگوں کا ذکر صدقة التطوع والی روایت کے تحت کیا جا چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ متعدد روایات میں جن جن لوگوں کا ذکر ہے کہ انہیں روز قیامت اس سائے تلے جگہ ملے گی، دراصل ان روایات میں اس بات کی بلیغ ترین ترغیب ہے کہ آدمی نیکی کے ان سب کاموں کا خوب اہتمام کرے جن کی بدولت روزِ قیامت یہ سایہ نصیب ہوگا۔

---

[1] مسند احمد: 487/3۔ کتاب الجهاد لابن ابی عاصم، ص: 93۔ علامہ مناوی رحمہ اللہ نے فیض القدیر: 72/6 میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

17

كِتَابُ الْجَامِعِ

آداب واخلاق اور ذکرو دعاوغیرہ کے احکام ومسائل کو جامع کتاب

1۔ بَابُ الْأَدَبِ ......ادب کا بیان

اسلامی ادب کا معنی اوراس کی اقسام:

امام موصوف رحمہ اللہ نے اپنی مؤقر کتاب "بُلُوْغُ الْمَرَامِ مِنْ اَدِلَّةِ الْاَحْكَامِ" کو "كِتَابُ الْجَامِعِ" پرختم فرمایا ہے۔یعنی اس میں متعدد متفرق ومتنوع باتوں کا بیان ہے اور یہ کتاب کسی ایک خاص باب کے احکام ومسائل کے بیان کے ساتھ مختص نہیں۔امام موصوف نے كِتَابُ الْجَامِع کو 'ادب' کے بیان سے شروع فرمایا ہے۔

ادب لغت میں کسی بات کا اچھا طریقہ،شائستگی اورسلیقہ کو کہتے ہیں۔جبکہ شرع میں ادب شرعی اخلاق وعادات کو کہا جاتا ہے۔

ادب شرعی کی دو قسمیں ہیں: (1) اللہ کے ساتھ ادب۔(2) اللہ کے بندوں کے ساتھ ادب۔

اللہ کے ساتھ ادب یہ ہے کہ آدمی اللہ سے آگے بڑھ کر اس کی حلال کردہ شے کو حرام یا اس کی حرام کردہ شے کو حلال نہ بنائے، یا غیر واجب کو واجب اور واجب کو غیر واجب نہ بنائے۔

اسی طرح خلوت اور جلوت دونوں میں اس کی نافرمانی نہ کرے۔کیونکہ نافرمان انسان اللہ کے ساتھ ادب کو قائم کرنے والا شمار نہیں ہوتا۔

غرض اللہ کے ساتھ ادب یہ ہے کہ اس کی طاعت وتعظیم کو بجالائے اوراس کے احکام سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

یہ بات بھی اللہ کے ساتھ ادب قائم کرنے میں سے ہے کہ آدمی اللہ کے ساتھ بھی وہی ادب اختیار کرے جو وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔چنانچہ رب تعالیٰ کے ساتھ خلوت میں بلاوجہ اپنا ستر نہ کھولے کہ جب آدمی بندوں کے سامنے ستر کھولنے سے حیاء کرتا ہے تو رب تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ بلاضرورت اس کے سامنے بھی ستر نہ کھولا جائے، اور

بندوں کے ادب قائم کرنے میں سے یہ بات ہے کہ آدمی خود کو صفات حمیدہ اور شمائل ستودہ سے مزین و آراستہ کرے اور رذائل اور برے اخلاق سے اپنا دامن صاف رکھے۔ چنانچہ مکارم اخلاق کو اختیار کرنا اور خلاف مروت افعال کو ترک کرنا یہ بندوں کے ساتھ ادب قائم کرنے میں سے ہے۔

ہر قوم کے اخلاق جدا جدا ہیں:

یہ بات عین ممکن ہے کہ ایک بات کسی قوم کے نزدیک ادب شمار ہوتی ہو جبکہ بعض کے نزدیک اس کے ترک سے آداب میں ذرا بھی خلل نہ آتا ہو۔ پھر زمانے زمانے کا بھی اعتبار ہے۔ کبھی کوئی بات خلاف ادب رہی ہو اور اب لوگوں کو اس کی مطلق پروا نہ ہو۔ جیسے کبھی کھوکھے پر چائے پینا خلاف مروت سمجھا جاتا تھا، پر اب یہ بات نہیں رہی۔ چھوٹا بڑا، عالم غیر عالم ہر ایک بلا تکلف کھوکھے وغیرہ پر بیٹھ کر چائے پی لیتا ہے۔ اسی طرح کبھی بازاروں میں کھانا کھانا بے حد برا سمجھا جاتا تھا۔ پر اب لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں رہا۔ لیکن یاد رہے کہ گھر والوں کو ساتھ لے کر جا کر ہوٹلوں پر کھانا کھانا مغرب کی بے جا تقلید اور سخت بری بات ہے، اور جب اس میں عورتوں کی بے پردگی، اغیار کے سامنے آرائش و زیبائش اور اجانب سے اختلاط بھی شامل ہو جائے تو معاذ اللہ اس کی قباحت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بازار سے پکا پکایا لا کر کھانا بھی برا ہے لیکن بازاروں کی رونق بن کر وہاں کھانے سے بہر حال کم برا ہے۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کیا کیا حقوق ہیں

1451ـ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ: إِذَا لَقِيْتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ، وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْهُ، وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ، وَإِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ، وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ)). رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں: (جو یہ ہیں) (1) جب اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کر (2) اور جب وہ تمہیں (کھانے کی) دعوت دے تو اسے قبول کر، (3) اور جب وہ تم سے نصیحت مانگے تو اسے نصیحت کر، (4) اور جب وہ چھینکے اور ''الحمدللہ'' کہے تو اس کی چھینک کا (یرحمك اللہ کہہ کر) جواب دے، (5) اور جب وہ بیمار پڑ جائے تو اس کی عیادت کر، (6) اور جب وہ وفات پا جائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ: یہ حصر کا بیان نہیں۔ البتہ بسا اوقات نبی کریم ﷺ چند متفقہ باتوں کو ایک حکم کے تحت بیان فرماتے ہیں اور ان میں حصر بھی بیان فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ دیگر باتیں بھی اس حکم کے تحت داخل ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہاں بھی چھ کا حصر مقصود نہیں کیونکہ ایک مسلمان کے دوسرے پر اور بھی متعدد حقوق ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: 2162.

اَلْمُسْلِمِ: وہ شخص جو توحید ورسالت اوران کے متقاضیات کا ظاہر و باطن سے قائل ہو۔

إِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ: پہلا حق یہ ہے کہ جب کسی مسلمان سے ملاقات ہوتو اسے سلام کرنے میں پہل کی جائے۔ یہ دوسرے مسلمان کا حق ہے چاہے وہ کھلا گنہگار ہی ہو، جیسے بے نمازی، ریش تراش، سگریٹ نوش، سودخور وغیرہ وغیرہ۔ کہ ان کو سلام کرنا ان کا بھی حق ہے جو ہر حال میں ادا کیا جائے گا۔ **وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ**: دعوت سے یہاں مراد دعوت ولیمہ مراد ہے۔ اس کا تفصیلی بیان کتاب النکاح کے تحت گزر چکا ہے۔

وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْهُ: یعنی جب تمہارا بھائی تم سے نصیحت کرنے کو کہے تو اسے نصیحت کی جائے کہ یہ اس کا حق ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب دوسرا نصیحت کرنے کو کہے تو اسے اس بات کی نصیحت کی جائے جو آدمی خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

إِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ: یعنی جب کسی کو چھینک آئے اور وہ اس پر الحمدللہ کہے تو اس کا حق بن جاتا ہے کہ اسے یرحمك الله کہہ کر جواب دیا جائے۔

وَإِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ: یعنی جب کوئی ایسا بیمار پڑ جائے کہ گھر سے باہر نکلنے سے بھی رہ جائے تو اس کی عیادت کی جائے۔ کیونکہ معمولی مرض جو نماز کے لیے مسجد میں آنے جانے سے اور بازار دکان وغیرہ سے متعلقہ روزمرہ کے کاموں سے نہ روکے اس میں مریض کی عیادت کی ضرورت نہیں۔

وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ: جنازہ میں یہ شرکت واجب ہے یا غیر واجب کتاب الجنائز میں اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مسلمانوں کے ایک دوسرے پر حقوق کا یہ وجوب باہمی روابط کو راسخ اور مضبوط کرنے کے لیے ہے۔
- دوسرے سے ملاقات ہونے پر اس کو سلام کرنے کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ واجب نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تین دن تک دوسرے سے سلام کلام کے چھوڑے رکھنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''ایک مسلمان کے لیے یہ بات حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے۔'' ● یہ حدیث بتلاتی ہے کہ جب تک آدمی حد ہجران تک نہ آ پہنچے سلام میں پہل کرنا واجب نہیں۔
- رہا یہ سوال کہ کیا کسی غیر مسلم کا یہ حق ہے کہ اسے پہلے سلام کیا جائے؟ تو جواب یہ ہے کہ نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے انہیں پہلے سلام کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ یہ مسئلہ مفصل گزر چکا ہے۔
- سلام کرنے کے الفاظ کیا ہیں؟ مذکورہ حدیث میں ان کو بیان نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف کہ لفظ سلام کو نکرہ لانا افضل ہے یا معرفہ، اور کاف خطاب کو مفرد لانا افضل ہے یا جمع؟ زیادہ ظاہر قول "السلام علیك" کے الفاظ کا افضل ہونا ہے۔ یعنی لفظ سلام معرفہ ہو جبکہ کاف خطاب مفرد ہو۔ البتہ مخاطب کی تعظیم یا ان کے ایک سے زائد ہونے کی صورت میں "علیکم" یعنی کاف خطاب کا جمع لانا بھی جائز ہے۔

جبکہ لفظ سلام کو نکرہ لانا بھی جائز ہے کیونکہ متعدد روایات میں یہ لفظ نکرہ بھی وارد ہوا ہے۔ لہٰذا سلامٌ علیك یا سلامٌ علیکم کہنا بھی جائز ہوگا۔

● یہ حدیث آگے آ رہی ہے۔

رہا یہ سوال کہ چھوٹے بڑے میں سے اور پیدل اور سوار میں سے سلام کرنے میں پہل کون کرے؟ تو یہ تفصیل بھی بیان کی جا چکی ہے۔

- ولیمہ کی دعوت کو قبول کرنا بھی ایک مسلمان کا حق ہے۔ اس پر مفصل کلام کتاب النکاح میں ولیمہ سے متعلق احادیث کے تحت گزر چکا ہے۔
- ایک مسلمان کا دوسرے پر یہ بھی حق ہے کہ جب وہ نصیحت مانگے یعنی کسی بات کا مشورہ کرے تو اسے نصیحت کرنا اور مبنی بر حق اور افضل و اکمل بات کا مشورہ دینا واجب ہے۔ لہٰذا فاضل اور افضل امر میں سے افضل کا مشورہ دیا جائے، اور محض سرسری سی بات کر کے اپنے بھائی کو فارغ نہ کر دیا جائے۔ بلکہ اسے مستقبل اور حال کو دیکھ کر مشورہ دیا جائے، اور جس بات میں اس کا ضرر اور نقصان ہو، اس بات سے بچنے کی تاکید کی جائے۔
- اگر کوئی چھینک لینے کے بعد الحمدللہ کہے تو اسے جواب میں "یرحمك الله" کہہ کر دعا دی جائے کہ یہ واجب ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی چھینکنے کے بعد الحمدللہ نہ کہے تو اس کی تشمیت یعنی چھینک کا جواب دینا واجب نہیں۔

پھر یہ حکم تین چھینکوں تک ہے کہ تین چھینکیں طبعی ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب چھینکیں تین سے متجاوز ہو جائیں تو یہ چھینکنے والے کے نزلہ، زکام یا بخار وغیرہ میں مبتلا ہونے کی دلیل ہے، تب پھر زیادہ چھینکیں لینے والے کو عافاك الله کہہ کر دعا دی جائے کہ اللہ تمہیں اس بیماری سے شفا بخشے۔

- حدیث کے ظاہری الفاظ سے تشمیتِ عاطس فرض عین لگتا ہے۔ لیکن راجح اور درست قول یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے۔
- ترکِ واجب اور ترکِ مستحب پر تعزیر جائز ہے۔ جیسے چھینکنے پر الحمدللہ نہ کہنے والے کی تعزیر یہ ہے کہ اس کو "یرحمك الله" کہہ کر دعا نہ دی جائے۔
- بیمار مسلمان کی عیادت کرنا بھی اس کے بنیادی حقوق میں سے ہے۔ اب بعض علماء کے نزدیک یہ سنت ہے۔ لیکن درست قول یہ ہے کہ بیمار کی عیادت فرضِ کفایہ ہے۔ کیونکہ اگر اپنے بیماروں کی بیمار پرسی اور عیادت کو ترک کر دیا جائے گا تو اس سے باہمی اتحاد و اتفاق کا دروازہ بند ہونے لگے گا۔ اس لیے اگر کسی کو اس بات کا علم ہو جائے کہ فلاں بیمار مسلمان بھائی کی کسی نے بھی عیادت نہیں کی، تو اس پر اس بیمار بھائی کی عیادت فرضِ عین ہو جائے گی۔
- البتہ یاد رہے کہ عیادت ایسے مرض میں واجب ہوتی ہے جو آدمی کو صاحب فراش کر دے اور اسے اٹھنے بیٹھنے سے، اور کہیں آنے جانے سے روک کے رکھ دے، جیسے ہاتھ پیر کی ہڈی کا ٹوٹ جانا جس سے وقتی طور پر چلنا پھرنا موقوف ہو جائے، اسی طرح دل کا بڑا آپریشن ہونا جو آدمی کو بستر سے لگا کے رکھ دے، کہ ایسے امراض میں عیادت فرضِ کفایہ ہوتی ہے، اور جو مرض ایسا نہ ہو اور آدمی دفتر، بازار، دکان اور مساجد وغیرہ میں آتا جاتا ہو تو اس میں عیادت بھی لازم نہیں ہوتی۔
- رہی غیر مسلم کی عیادت، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تو اس میں مصلحت ہو تو غیر مسلم کی عیادت کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، جیسے کوئی غیر مسلم اسلام کی طرف مائل ہو اور مسلمان ہونے میں رغبت رکھتا ہو، ایسے غیر مسلم کی تالیف قلب کے لیے اس کی عیادت کرنا جائز ہے، معلوم نہیں کہ اس حال میں اسلام کی دعوت دینے سے اس کا دل نرم ہو جائے اور وہ مسلمانوں کے حسن سلوک کو دیکھ کر مسلمان ہو جائے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا جناب ابو طالب کی ان کی

بیماری میں عیادت کی، اسی طرح مدینہ کے ایک یہودی نوجوان کی عیادت کی، اور وہ آپ ﷺ کے اس حال میں اسلام پیش کرنے پر مسلمان ہوگیا تھا۔

غرض غیر مسلم کے ساتھ اگر تو صلہ رحمی کا تعلق ہو، یا اس کے اسلام کے اور زیادہ قریب آ جانے یا اسلام میں داخل ہی ہو جانے کا امکان ہو تو اس کی عیادت کرنا جائز ہوگا۔

◈ رہا ایک مسلمان کا چھٹا حق کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے جنازہ میں شرکت کی جائے تو اس کی جملہ تفصیل کتاب الجنائز کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔

رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری سے بچنے کا طریقہ

1439- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اُنْظُرُوْا إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوْا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(نعمتوں، آسائشوں اور مصائب و آلام کے باب میں) اس کو دیکھو جو تم سے نچلے درجہ میں ہو، اور اسے نہ دیکھو جو تم سے اوپر کے درجہ والا ہو کہ یہ بات اس کے زیادہ لائق ہے کہ تم اپنے اوپر رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری نہ کرو گے۔'' ❶ یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......اُنْظُرُوا: یہ امر کا صیغہ ہے اور یہاں یہ امر ارشاد کے لیے ہے، اور نظر سے یہاں آنکھ سے دیکھنا مراد نہیں بلکہ بصیرت وعبرت سے دیکھنا مراد ہے۔

إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْكُمْ: مراد نعمتوں میں کم درجہ کا ہونا ہے، اور یہ دیکھنا دینی و دنیاوی دونوں نعمتوں کو شامل ہے۔

وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ: یعنی جس پر رب تعالیٰ کی دنیاوی نعمتوں کی کثرت ہو، اس کی طرف نہ دیکھا جائے تاکہ جو نعمتیں آدمی کو اس حال میں بھی حاصل ہیں، ان کی ناقدری نہ کر بیٹھے۔ جیسا کہ آگے ارشاد فرمایا:

فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری سے بچنے کا یہ ایک نہایت عمدہ اور مجرب طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تعلیم اس لیے دی کیونکہ رب تعالیٰ نے لوگوں کو مختلف اور متفاوت احوال والا پیدا فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (الاسراء: 21)

''دیکھ ہم نے ان کے بعض کو بعض پر کس طرح فضیلت دی ہے۔''

چنانچہ لوگ رب تعالیٰ کی طرف سے ہی عقل، مال، قوت، اولاد، شکل وصورت، رنگ روپ، قد کاٹھ، یہاں تک کہ ہر ہر شے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ روئے زمین پر کوئی دو آدمی بھی جملہ احوال میں ایک جیسے نہیں۔ ضرور بالضرور ان میں متعدد باتوں میں از حد فرق ہوگا۔ اس لیے اگر کسی نے اپنے سے زیادہ نعمتوں والے کو دیکھا تو وہ

❶ صحيح بخاري: 6490- صحيح مسلم: 2963.

ان نعمتوں کی ناقدری کر بیٹھے گا جو اسے حاصل ہیں، اور اگر وہ اپنے سے کم درجہ والے کی طرف دیکھے گا تو اسے ان نعمتوں کا قرار واقعی احساس اور ادراک ہوگا جو اسے حاصل ہیں اور دوسروں کو حاصل نہیں۔

اسی طرح اخلاق و آداب، علم وفضل، ایمان و یقین وغیرہ کا معاملہ بھی ہے کہ ان امور میں بھی آدمی اپنے کم درجہ والوں کو دیکھے اور رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس کو عبادت، زہد، تقویٰ، ایمان اور اخلاق وغیرہ کا وہ درجہ عطا فرمایا ہے جو فلاں فلاں کو حاصل نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر دانی کرنے اور ان پر شکر و امتنان کی کیفیت حاصل کرنے کا ایک نہایت عمدہ ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنے سے کم درجے والے کو دیکھے تاکہ اسے رب تعالیٰ کی نعمتوں کا حقیقی احساس حاصل ہو اور وہ ان کا صدقِ دل سے شکر ادا کرے۔

◈ اور یہ بات بھی نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم میں سے ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ حکم کو اس کی علت کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا کرتے تھے۔

نیکی و بدی اور ان کی ضوابط کا بیان

1440۔ وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ، فَقَالَ: ((الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)).
أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ سے نیکی و بدی کے بارے میں دریافت کیا (کہ یہ کیا ہیں اور ان کی علامت کیا ہے) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نیکی یہ حسن اخلاق ہے، اور بدی وہ ہے جو تیرے جی میں کھٹکے اور تمہیں یہ بات ناپسند ہو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو۔'' [1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......سَأَلْتُ :حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل کرنے کی نیت سے دین کی باتیں پوچھا کرتے تھے نا کہ صرف معلومات اکٹھی کرنے کے لیے۔

اَلْبِرّ: یہ خیر اور نیکی کی بات کو کہتے ہیں اس کی ضد لفظ ''اِثْم'' ہے۔

اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ: یہ جملہ مبتدا اور خبر پر مشتمل ہے اور جب مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو حصر کا فائدہ دیتے ہیں۔ تب پھر یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی متعدد اور بھی باتیں ہیں جو نیکی تو ہیں پر ان کا تعلق حسن اخلاق سے نہیں۔ جیسے توحید ورسالت کا اقرار، نماز، روزہ، صدقہ اور حج وغیرہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسن اخلاق کا ذکر مطلق ہے جو رب تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ مختلف ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کے ساتھ حسن اخلاق یہ ہے کہ آدمی اس کے احکامات و ممنوعات کو پورے شرح صدر اور قلبی سرور کے ساتھ قبول کرے اور ان کو قبول کرتے ہوئے تنگ دل نہ ہوا۔

---

[1] صحيح مسلم: 2553.

جبکہ بندوں کے ساتھ حسن اخلاق یہ ہے کہ ان پر سخاوت کی جائے، انہیں اذیت دینے سے اجتناب کیا جائے اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا جائے۔

بعض کے نزدیک بندوں کے ساتھ حسن اخلاق یہ ہے کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو آدمی اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اَلْإِثْمُ: مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ: جی میں کھٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پر اس بات کو کرنا شدید گراں گزرے، ایک قول یہ ہے کہ جی میں کھٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ جی میں اس کی بابت سخت تردد واضطراب پیدا ہو، اسی کو گناہ کہتے ہیں۔

لیکن یاد رہے کہ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو سلیم القلب اور صحیح الفطرت لوگ ہیں اور انہیں اسلام کے لیے شرح صدر حاصل ہو۔ وہ بدکار، فاجر اور اسلام سے بدظن لوگ مراد نہیں جن کے نزدیک گناہ کرنا ناک پر بیٹھی مکھی اڑا دینے کے مترادف ہے۔ ان لوگوں کا حال رب تعالیٰ نے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے:

﴿أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوْءُ عَمَلِهِ فَرَاٰهُ حَسَنًا﴾ (فاطر: 8)

''تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اسے اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟)''

تو جس کو کھلی برائی بھی خوب اور خوبی نظر آتی ہے، بھلا اس کے جی میں گناہ کیونکر کھٹکے گا؟! معاذ الله من ذلك.

وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ: یہ گویا کہ جی کی کھٹک کی تفسیر ہے، اور یہ حال بھی ایک سلیم القلب انسان کا ہی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احکام شرعیہ کے جاننے کے بے حد حریص تھے تاکہ ان کو اپنی زندگیوں کا دستور العمل بنایا جائے۔
- لوگوں کے ساتھ بھی اور رب تعالیٰ کے ساتھ بھی حسن اخلاق اپنانے کی نہایت بلیغ ترغیب۔
- گناہ وہ ہے جو جی میں کھٹکے اور آدمی کو یہ ناپسند ہو کہ کسی کو اس کی خبر ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جو شبہات سے (بھی) بچ گیا، اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا۔''
- یاد رہے کہ گناہ کی طرف قدم نہ اٹھانے کا نام ورع ہے اور گناہ کی طرف چل پڑنا اثم ہے اور اس کو کر گزرنا ذنب ہے۔
- رب تعالیٰ سلیم الفطرت لوگوں کو اس بات کی فراست عطا فرماتا ہے کہ وہ گناہوں پر کبھی مطمئن نہیں ہوتے، اور انہیں لوگوں پر اپنے معاملات کا عیاں ہونا بھی پسند نہیں ہوتا جبکہ بے حیا کو کسی بات کی بھی پروا نہیں ہوا کرتی۔

کوئی دو، اپنے ساتھ بیٹھے تیسرے کو چھوڑ کر آپس میں کوئی سرگوشی نہ کریں

1441۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ الْآخَرِ ، حَتَّى تَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ ، مِنْ أَجْلِ أَنَّ ذٰلِكَ يُحْزِنُهُ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب (کسی جگہ) تم تین افراد ہو تو کوئی دو اس دوسرے (یعنی تیسرے) کو چھوڑ کر باہم سرگوشی نہ کریں۔ یہاں تک کہ وہ تینوں (اور دوسرے) لوگوں میں مل جل جائیں، کیونکہ ایسا کرنا اس تیسرے کو مغموم کر دیتا ہے۔''●

● صحیح بخاری: 6290۔ صحیح مسلم: 2184.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. یہ حدیث "متفق علیہ" ہے، اور یہ الفاظ صحیح مسلم کی روایت کے ہیں۔

غریب الحدیث: ...... **لَا يَتَنَاجَى:** تناجی: یہ ایک آدمی کا دوسرے کے ساتھ چپکے سے بات کرنے کو کہتے ہیں (ہماری اردو زبان میں اسے سرگوشی کرنا یا کانا پھوسی کرنا کہتے ہیں)۔ جبکہ مناجات پست آواز میں بات کرنے کو اور منادات بلند آواز سے پکارنے اور بات کرنے کو کہتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ جب کسی جگہ تین آدمی ہوں تو کوئی دو تیسرے کو چھوڑ کر آپس میں کوئی خفیہ بات نہ کریں۔

دُونَ الْآخَرِ: مراد دو کے علاوہ کا دوسرا یعنی تیسرا ہے۔

حَتَّى تَخْتَلِطُوا بِالنَّاسِ: ہاں اگر یہ تینوں اور لوگوں میں جا ملیں یا اور لوگ ان سے آملیں تو اب اگر کوئی دو باہم کوئی راز کی بات کرتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اب ان کے سامنے متعدد لوگ بیٹھیں ہیں۔

مِنْ أَجْلِ أَنَّ ذَلِكَ يُحْزِنُهُ: یہ اس بات کی علت کا بیان ہے کہ تین افراد کے ہوتے ہوئے دو کا تیسرے کو چھوڑ کر باہم سرگوشی کرنا منع ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا اس تیسرے کی رنجیدگی کا سبب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ تیسرا خود کو اکیلا اور بے قدرا سمجھتا ہے۔ جبکہ زیادہ آدمی ہونے کی صورت میں اسے دو کے سرگوشی کرنے کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت اسلامیہ ہر اس بات کی بیخ کنی کے درپے ہے جو افرادِ مسلمین میں سے کسی ایک کے بھی دل گرفتہ اور رنجیدہ خاطر ہونے کا سبب ہے۔ اسی لیے تیسرے کو چھوڑ کر دو کا باہم کھسر پھسر کرنا منع ہے تاکہ تیسرے کے دل کو ملال نہ ہو۔
- اپنے مسلمان بھائی کو رنجیدہ کرنا حرام ہے۔ کیونکہ "فَلَا يَتَنَاجَى" میں مذکور نہی بظاہر تحریم کے لیے ہے نہ کہ کراہت کے لیے۔ کیونکہ حزن و ملال ایذاء میں داخل ہے اور ایذائے مسلم حرام ہے۔
- جب افراد چار یا چار سے زیادہ ہوں تو اس صورت میں کسی دو کا باہم سرگوشی کرنا منع نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ سرگوشی دوسرے دو یا زیادہ افراد کی رنجیدگی کا سبب نہیں۔
- اور اگر تین ہونے کی صورت میں دو ایسی زبان میں بات کرنے لگیں جس کو وہ تیسرا نہیں سمجھتا تو یہ بھی حرام ہوگا، چاہے وہ گفتگو جہراً ہی کی جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ تیسرا ان دو کی بات کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے غم محسوس کرے گا۔
- اور اگر اس تیسرے کو ان دو کی گفتگو کی مطلق پروا نہ ہو اور نہ ان دونوں کی سرگوشی اس کی شخصیت کو متاثر بھی نہ کر سکتی ہو، کیونکہ وہ ان کا سردار یا ان سے بے حد طاقتور ہے، تب بھی دو کا تیسرے کو چھوڑ کر سرگوشی کرنا حرام نہ ہوگا۔
- جملہ احکامات شرعیہ علتوں اور مناسبتوں پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے تیسرے کے ہوتے ہوئے دو کے سرگوشی کرنے کو اس لیے منع فرمایا کہ یہ تیسرے کے غم کا سبب ہے۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ ہمیشہ احکام کو ان کی علتوں کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا کرتے تھے۔

مجلس کے آداب واحکام

1442۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "کوئی آدمی کسی دوسرے کو اس کے

مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ، وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوا وَتَوَسَّعُوا)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

بیٹھنے کی جگہ سے نہ اٹھائے کہ پھر خود وہاں بیٹھ جائے، البتہ تم لوگ (مجلس میں) کھل جایا کرو اور کشادگی کر دیا کرو۔“ [1]
یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

غریب الحدیث: ......لَا يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهِ، ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ: یہ جملہ خبریہ ہے اور مذکورہ نفی نہی کے معنی میں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ فعل دلوں میں بغض، کینہ اور عداوت پیدا کرتا ہے۔

الرَّجُلَ: مرد کا ذکر اکثر کے اعتبار سے ہے، اس لیے یہ حکم عورتوں کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا کسی عورت کو جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی مجلس میں اپنی کسی بہن کو اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے۔

وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوا، وَتَوَسَّعُوا: تفسح اور توسع دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ پھر اس جملہ کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:
(1) ایک یہ کہ آدمی مجلس میں جا کر اہل مجلس سے یہ کہے کہ ”تَفَسَّحُوا، وَتَوَسَّعُوا“ (یعنی بھائیو! ذرا کھل جاؤ) تا کہ یہ الفاظ اس ارشاد باری کے موافق ہو جائیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ﴾
(المجادلة: 11)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل جاؤ تو کھل جاؤ، اللہ تمھارے لیے فراخی کر دے گا۔“

(2) دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ خود جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اور امر ہے کہ جب اہل مجلس یہ دیکھیں کہ آنے والے کے لیے جگہ نہیں تو وہ کھل جائیں اور آنے والے کو جگہ دیں۔

حدیث کے ظاہر کے زیادہ قریب یہی دوسرا معنی ہے۔ کیونکہ پہلے معنی میں ہمیں ”قُولُوا“ وغیرہ کلمات کو مقدر ماننا پڑے گا۔ جبکہ ہر عبارت میں اصل یہ ہے کہ وہاں تقدیری معنی نہ ہی مانا جائے۔ تب پھر نصوص کو ان کے ظاہر پر رکھنا واجب ہے۔ جب تک کہ کوئی مانع نہ پایا جائے اور یہاں کوئی مانع پایا نہیں جاتا، اور رہی مذکورہ آیت تو وہ ایک مستقل معنی پر دلالت کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب مجلس میں کوئی آدمی باہر سے آئے اور مجلس بھری ہو تو اس آدمی کو جگہ دینی چاہیے اور کھل جانا چاہیے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کسی کو اس غرض سے اس کی جگہ سے اٹھانا حرام ہے تا کہ وہاں خود بیٹھے۔ کیونکہ یہ دوسرے پر عدوان اور زیادتی ہے جو حرام ہے۔
- جو آدمی پہلے سے جس جگہ بیٹھا ہے، جب تک اس کی حاجت پوری نہیں ہو جاتی، وہی اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے۔ لہٰذا اسے اس جگہ سے اٹھایا نہ جائے گا۔ چاہے آنے والا بیٹھنے والے کا باپ یا استاذ یا پیر ہی کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ آدمی مسجد سے باہر کسی جگہ بیٹھا ہو۔

---
[1] صحيح بخاري: 6269- صحيح مسلم: 2177.

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کسی نے دوسرے کو اس کی جگہ سے کسی حاجت برآری کے لیے اٹھایا نا کہ اس کی جگہ بیٹھنے کے لیے اٹھایا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

◈ حاضرین مجلس کو چاہیے کہ جب انہیں کھل جانے کو اور دوسروں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کو کہا جائے تو وہ کھل جایا کریں۔

کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کو اور برتن کو چاٹ لینا

1443۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ حَتَّى يَلْعَقَهَا أَوْ يُلْعِقَهَا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے ایک کھانا کھا لے تو وہ اپنے ہاتھ کو (دھوئے یا) پونچھے نہیں۔ یہاں تک کہ (پہلے) اس (کی انگلیوں) کو چاٹ (نہ) لے یا چٹوا (نہ) لے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ...... طَعَامًا: مراد وہ کھانا ہے جو کھاتے ہوئے انگلیوں کو لگ جاتا ہو، البتہ جو کھانا انگلیوں کو نہ لگتا ہو، اس کے کھانے کے بعد انگلیوں کے چاٹنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جیسے چھوہارے، کشمش، انجیر وغیرہ کو کھانا جو خشک ہوتے ہیں اور کھاتے ہوئے انگلیوں سے نہیں لگتے لہٰذا ان کو کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے یا چٹوانے کی بھی ضرورت نہیں۔

فَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ: یعنی تولیہ یا کسی صافہ وغیرہ سے صاف نہ کرے۔ اسی طرح دھوئے بھی نہیں۔

حَتَّى يَلْعَقَهَا: مراد انگلیوں کو چوسنا اور ہتھیلی کو چاٹنا ہے تاکہ ہتھیلی اور انگلیوں پر لگا رہ جانے والا باقی کا کھانا بھی کھا لیا جائے۔ کیونکہ آدمی نہیں جانتا کہ اس کے کس کھانے میں برکت ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں یہ مضمون آتا ہے۔

أَوْ يُلْعِقَهَا: ایسا کسی دوسرے کو کہنے سے ہی ممکن ہے۔ البتہ اس میں دو باتیں شرط ہیں:

(1) ایک یہ کہ ایسا کرنا لوگوں میں رائج ہو۔

(2) دوسری یہ کہ جس کو انگلیاں چاٹنے کو کہا ہے، وہ اس میں عار نہ سمجھے بلکہ خوشی محسوس کرے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مناسب یہ ہے کہ کھانا اپنے ہاتھ سے ہی کھایا جائے کہ یہ چھری کانٹے کے ذریعہ کھانا کھانے سے بہتر ہے۔ اس کی دلیل "فَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ" کے الفاظ ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ کھانے کا اصل اور اوّل آلہ ہاتھ ہے۔

◈ چھری کانٹے سے کھانا جائز ہے یا نہیں اس میں تفصیل ہے۔

اگر تو کوئی تکبر اور اتراہٹ کے طور پر یا متکبرین کی مشابہت اختیار کرنے کے لیے چھری کانٹا استعمال کرتا ہے تو یہ مکروہ ہے۔ وگرنہ چمچ وغیرہ کے ذریعہ کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں ہر نئی بات کو بدعت سمجھتا ہوں۔ بعض فقہاء نے اس قول کو لے کر چھری کانٹے کے استعمال کو بدعت قرار دیا ہے لیکن یہ قول محل نظر ہے۔ کیونکہ امام احمد کی اس قول سے مراد دین میں نئی باتوں کو مکروہ جاننا ہے۔ البتہ ضرورت اور ضرر کے وقت چھری کانٹے کا استعمال جائز ہے۔ جیسے کھانا

[1] صحیح بخاری: 5456۔ صحیح مسلم: 2031۔

گرم ہو اور انگلیوں سے کھانے میں تکلیف ہو تو چمچ سے کھا سکتے ہیں۔

- آدمی کو تواضع وانکساری اختیار کرنا چاہیے۔لہٰذا اسے انگلیوں کے چاٹنے میں یا برتن کو صاف کرنے میں عار نہ سمجھنا چاہیے۔
- آدمی کو صاف ستھرا اور پاک ہونا چاہیے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ دورِ نبوی میں لوگ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ کو صاف کر لیا کرتے تھے۔چنانچہ ہاتھوں پر کھانے کے آثار لگے رہنے دینا اور بعد میں ہاتھ کو اچھی طرح صاف نہ کرنا خلافِ مروت ہے۔
- دوسرے کو اپنی انگلیاں چٹوا سکتے ہیں۔بشرطیکہ دوسرا اس میں عار بھی محسوس نہ کرتا ہو اور خود چٹوانے والے کے ہاتھ میں کوئی ضرر بھی نہ ہو۔جیسے ہاتھ پر کوئی زخم اور پھوڑا پھنسی نہ ہو۔کہ ایسے ہاتھ کو چاٹنے سے کسی مرض کے لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہے جو ضرر ہے۔

سلام کے آداب واحکام

1444۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لِيُسَلِّمِ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ، وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ، وَالْقَلِيلُ عَلَى الْكَثِيرِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''چاہیے کہ چھوٹا بڑے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو سلام (کرنے میں پہل) کریں۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ ((وَالرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِي)).

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''اور سوار پیدل چلنے والے کو'' (سلام کرنے میں پہل کرے)۔

غریب الحدیث: لِيُسَلِّمِ: مذکورہ لام، امر کا ہے۔

الصَّغِيرُ: مراد کم عمر والا ہے۔البتہ یہاں مرتبہ میں چھوٹا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

الْكَبِيرِ: مراد بڑی عمر والا ہے، اور بڑے مرتبے والا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

الْمَارُّ: مراد گزرنے والا اور چلنے والا ہے۔

عَلَى الْقَاعِدِ: کیونکہ ماشی اور عابر تجاوز کر جائے گا، اور قاعد بیٹھا رہ جائے گا۔اس لیے سلام کرنے کی ذمہ داری گزرنے والے کی ہے۔

وَالْقَلِيلُ عَلَى الْكَثِيرِ: قلیل اور کثیر عدد کی صفات میں سے ہے۔لہٰذا اگر تین کی جماعت کا پانچ افراد سے سامنا ہو جائے تو سلام کرنے میں پہل تین لوگ کریں گے۔چاہے کم تعداد والے لوگ عمر رسیدہ ہوں اور زیادہ تعداد والے نوجوان ہوں۔

الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِي: کیونکہ سوار پیدل چلنے والے سے اعلیٰ ہے۔اس لیے تواضع کا تقاضا یہ ہے کہ سلام کرنے میں پہل سوار کرے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جب بھی کوئی دو افراد ملیں تو ان کا باہم سلام کرنا مشروع ہے، اس بات پر سب کا اتفاق واجماع ہے اور اسے ایک مسلمان کا دوسرے پر حق قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] صحيح بخاري: 6231۔ صحيح مسلم: 2160.

◈ رہا یہ سوال کہ دونوں میں پہلے سلام کون کرے؟ تو اس کے چند ضوابط ہیں، جو یہ ہیں:

◉ ...... چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

◉ ...... دونوں ہم عمر ہوں تو کم مرتبہ والا بڑے مرتبہ والے کو سلام کرے۔

◉ ...... بڑے مرتبہ والا اگر کم عمر ہو تو وہ بڑی عمر والے کو پہلے سلام کرے۔ لہٰذا کم عمر عالم بڑی عمر کے جاہل کو پہلے سلام کرے گا کیونکہ یہ تواضع کا مقتضی ہے۔

◉ ...... اگر چھوٹا بڑے کو سلام نہ کرے تو بڑا سلام کرنے کو ترک نہ کرے کہ ایک حدیث میں اس بات کی ممانعت آئی کہ دو مسلمان ایک دوسرے سے منہ موڑ کر نہ گزریں۔

◈ شریعت اسلامیہ مراتب ومنازل کی قدر کرتی ہے۔ اس کی دلیل "لِيُسَلِّمِ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ آدمی شرف وفضیلت میں جتنا بڑھتا جائے اسے چاہیے کہ وہ تواضع وانکساری میں اتنا ہی آگے بڑھتا جائے۔

اکیلے کا جماعت کی طرف سے سلام کرنا

1445۔ وَعَنْ عَلِيٍّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((يُجْزِىءُ عَنِ الْجَمَاعَةِ۔ إِذَا مَرُّوا أَنْ يُسَلِّمَ أَحَدُهُمْ، وَيُجْزِىءُ عَنِ الْجَمَاعَةِ أَنْ يَرُدَّ أَحَدُهُمْ)).

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جماعت کی طرف سے، جبکہ وہ (کہیں سے) گزریں یہ بات کافی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک سلام کر دے، اور جماعت کی طرف سے (بھی، جبکہ انہیں کوئی سلام کرے) یہ بات کافی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جواب دے دے۔" ●

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ.

اس حدیث کو امام احمد اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

شرح :...... یہ سلام کے ایک اور ادب کا بیان ہے کہ جب کوئی جماعت کہیں سے گزر رہی ہو تو ان میں سے کسی ایک کا سلام کر دینا کافی ہے، سب کا سلام کرنا ضروری نہیں۔

البتہ یہاں یہ ادب ملحوظ رہے کہ بیٹا باپ کو سلام کرنے کا موقع دے، چھوٹا بڑے کو، جاہل عالم کو غرض کم مرتبہ والا بڑے، مرتبہ والے کو سلام کرنے کا موقع دے۔

اسی طرح ایک جماعت کی طرف سے بڑے مرتبہ والا سلام کا جواب دے۔ جبکہ یہ بات حدیث میں بیان ہو چکی ہے کہ

● امام موصوف رحمہ اللہ سے اس مقام پر اس حدیث کو مسند احمد کی طرف منسوب کرنے میں سبقت قلم ہوگئی ہے کیونکہ فتح الباری میں خود امام موصوف نے اس حدیث کو سنن ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے۔ سنن ابی داؤد: 5210۔ سنن البیهقی: 49/9 من طریق ابی داؤد، مسند البزار: 534۔ مسند ابی یعلی: 441۔ المختارة للضیاء المقدسی: 242/2۔ ضیاء مقدسی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے، اس حدیث کا مدار سعید بن خالد الخزاعی پر ہے جس کو آئمہ محدثین کی ایک جماعت نے ضعیف کہا ہے جن میں ابو حاتم اور ابوزرعہ وغیرہ کا نام آتا ہے۔ امام دارقطنی نے العلل: 21/4 میں اسی قول کو راجح کہا ہے۔ لیکن ابن عبدالبر نے التمهید: 290/5 میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ شاید ابن عبدالبر کا یہ قول اس حدیث کے شواہد کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ اس حدیث کا ایک شاہد امام طبرانی نے حسن بن علی کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں کلام ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا شاہد مرسل ہے جو مؤطا امام مالک میں زید بن اسلم سے مروی ہے۔

جماعت میں سے ایک کا جواب دے دینا سب کی طرف کافی ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ سلام سنت کفایہ ہے نہ کہ سنت عین، اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک کا سلام جماعت کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔لہٰذا ایک کے سلام کر دینے سے سنت حاصل ہو جاتی ہے۔

◈ سلام کا جواب بھی فرض کفایہ ہے۔لہٰذا جماعت میں سے ایک کا جواب دے دینا سب کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے،اور حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاہے یہ جواب وہ دے جس کو سلام کیا گیا تھا یا کوئی دوسرا ہی دے دے۔

اہل کتاب کو سلام کرنے کا حکم

1446۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَبْدَءُوا الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَى بِالسَّلَامِ، وَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُمْ إِلَى أَضْيَقِهِ)).
أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تمہارا راستے میں ان سے آمنا سامنا ہو تو انہیں رستے کے تنگ حصہ کی طرف ہو جانے پر مجبور کرو۔"[1]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تنبیہ:......اس حدیث پر مفصل کلام کیا جا چکا ہے۔یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

چھینکنے والے کو جواب دینا

1447۔ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَإِذَا قَالَ لَهُ: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَلْيَقُلْ لَهُ: يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ)).
أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"جب تم میں سے کسی ایک کو چھینک آئے تو وہ (اس پر)"الحمدللہ" کہے،اور چاہیے کہ اس کا بھائی (جس نے اسے چھینک آنے پر الحمدللہ کہتے سنا ہے) اسے (جواب میں) یرحمك الله کہے۔پس جب وہ اسے (جواب میں) یرحمك الله کہے تو چاہیے کہ چھینکنے والا (بھی) اسے (دعا دیتے ہوئے)"يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ" کہے۔"[2] (یعنی اللہ تمہیں سیدھی راہ دکھائے اور تیرا حال سدھارے)۔
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......**إِذَا عَطَسَ**: عطاس یعنی چھینک معروف ہے۔یہ بدن کے مساموں سے نکلنے والی اس ہوا کو کہتے ہیں جس کا بدن میں باقی رہنا مضر صحت ہوتا ہے۔چنانچہ چھینک آنا یہ بندے پر رب تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔اسی لیے چھینک آنے پر الحمدللہ کہنے کا حکم ہے۔کیونکہ چھینک آنے سے بدن میں نشاط اور مستعدی پیدا ہو جاتی ہے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ: حمد کا معنی کئی بار مفصل بیان کیا جا چکا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: 2167۔ یہ حدیث جزیہ کے بیان کے تحت گزر چکی ہے۔ [2] صحیح بخاری: 6224.

أُخُوهُ: مراد مسلمان بھائی ہے، گونسبی اور حقیقی بھائی بھی مراد ہوسکتا ہے۔ جبکہ چھینک آنے کے وقت وہ پاس موجود ہو، وگرنہ مراد ہر وہ مسلمان ہے جو چھینک آنے کے وقت چھینکنے والے کے پاس موجود ہوتا ہے۔

"اَخُوْهُ" سے مسلمان مراد لینے سے بدیہی طور پر یہ بھی لازم آیا کہ یہ چھینک لینے والا بھی مسلمان ہوگا۔

یَرْحَمُكَ اللّٰهُ: نحوی ترکیب کے اعتبار سے اگر چہ یہ جملہ خبریہ ہے لیکن معنی کے اعتبار جملہ انشائیہ ہے جو طلب یعنی دعا کے معنی میں ہے۔ لہٰذا "یَرْحَمُكَ اللّٰهُ" یہ "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ" کہنے کی طرح ہے۔

رحمت یہ مطلوب کے حصول اور مکروب کے زوال کا نام ہے۔

فَلْيَقُلْ لَهُ: اس فعل کا فاعل عاطس یعنی چھینکنے والا ہے۔ یعنی جب دوسرا "یَرْحَمُكَ اللّٰهُ" کہہ کر جواب دے تو چھینکنے والا بھی اسے یہ دعا دے: "يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحْ بَالَكُمْ"

يَهْدِيكُمْ: یہ بھی خبر ہے اور دعا کے معنی میں ہے اور یہاں ہدایت سے ہدایتِ دلالت اور ہدایتِ توفیق دونوں مراد ہیں۔ یعنی اے اللہ! انہیں سیدھا راستہ دکھا بھی اور اس پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرما۔

وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ: بال سے مراد حال اور روزمرہ زندگی کے جملہ امور ہیں جو دین و دنیا دونوں کے امور کو عام ہیں۔

ادنیٰ تأمل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے والے نے دعا دینے والے سے بہتر دعا دی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ چھینکنے والے کے لیے الحمدللہ کہنا مشروع ہے۔ اس کی دلیل "وَلْيَقُلْ" کے الفاظ ہیں۔

مذکورہ لام امر کا ہے۔ یہ وجوب کے لیے ہے یا استحباب وارشاد کے لیے؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے لہٰذا چھینک آنے پر الحمدللہ کہنا مسنون ہوگا۔ بعض اس کے وجوب کے بھی قائل ہیں کیونکہ مذکورہ امر نعمت کے مقابل ہے۔ دوسرے یہ کہ جب بندہ اس نعمت پر رب تعالیٰ کی حمد بیان نہیں کرتا تو اسے سزا میں دعا سے محروم کر دینے کا حکم ہے۔ کیونکہ جو چھینک آنے پر الحمدللہ نہ کہے اسے دعا میں یرحمك الله کہنے کی ممانعت ہے۔ جو الحمدللہ کہنے کے وجوب کی دلیل ہے۔

بہر حال وجوب کا قول قوی ہے۔

◈ چھینک رب تعالیٰ کی نعمت ہے، اسی لیے اس پر رب تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کا حکم ہے۔

◈ ڈکار آنے پر الحمدللہ کہنا غیر مشروع ہے۔ کیونکہ یہ بات فطری ہے کہ دورِ نبوی میں بھی لوگوں کو ڈکار آیا کرتا تھا اگر اس پر حمد مشروع ہوتی تو روایات میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

◈ معلوم ہوا کہ غیر مسلم کی چھینک پر اسے دعا نہ دی جائے گی۔ اس کی دلیل "فَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ" کے الفاظ ہیں۔ یہود بے بہود حضرت رسالت مآب ﷺ کے پاس اس لیے جان بوجھ کر چھینکتے تھے تاکہ آپ ﷺ انہیں "یَرْحَمُكَ اللّٰهُ" کہیں۔ لیکن آپ ﷺ نے انہیں کبھی یہ دعا نہ دی۔ البتہ جو کافر چھینکنے پر پر "الحمدللہ" کہے اسے هداك الله کہہ کر دعا دی جائے۔

◈ مسلمان چھینک لے کر الحمدللہ کہے تو اسے یرحمك الله کہہ کر دعا دینا واجب ہے۔ البتہ یہ وجوب، علی

سبیل الکفایہ ہے، اور یہ اس کے حمد بیان کرنے کا بدلہ ہے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو کسی عبادت کو بجا لائے، اس کی ہر حال میں حوصلہ افزائی کی جائے۔

◈ چھینکنے والا جواب میں وہی دعائیہ کلمات کہے جن کا ذکر حدیث میں آ گیا ہے اور ان الفاظ سے تجاوز نہ کرے۔

کھڑے ہو کر پینے کا حکم

1448۔ وَعَنْهُ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدُكُمْ قَائِمًا)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی کھڑے ہو کر ہرگز بھی نہ پیئے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:..... لَا يَشْرَبَنَّ: مذکورہ ''لا'' نہی کا ہے اور یہ فعل نہی نون تاکید کے ساتھ مؤکد ہے۔

قَائِمًا: یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ لَا يَشْرَبَنَّ کے فاعل ''اَحَدُكُمْ'' سے حال ہے۔ کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت سے لازم آیا کہ بیٹھ کر یا لیٹ کر پینا جائز ہے۔

اب کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت اس روایت میں آ گئی ہے۔ صحیح مسلم میں ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ: ''نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے والے ایک شخص کو سختی سے ڈانٹا اور روکا۔'' ❷ یہ روایت بتلاتی ہے کہ کھڑے ہو کر پینا حرام ہے۔ البتہ دیگر روایات بتلاتی ہیں کہ یہ نہی تحریم کے لیے نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے ماءِ زم زم کھڑے ہو کر پینا ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ ایک رات آپ ﷺ نے لٹکی مشک کے منہ سے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا تھا۔ ❸ اور اس بات سے معلوم ہوا کہ حرام چیز اتنی معمولی بات کی خاطر مباح نہیں کی جاتی۔ حرام بات تو سخت مجبوری میں ہی مباح کی جاتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ﴾ (الانعام: 119)

''حالانکہ بلاشبہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ۔''

اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے نہ کہ حرام۔ البتہ کھڑے ہو کر پینا سخت مکروہ ہے گو انسان گنہگار نہ بھی ہو گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ اور منع ہے۔ لہٰذا بلا ضرورت کھڑے ہو کر نہ پیا جائے۔ البتہ اگر پانی کی ٹھنڈی ٹینکی اونچی لگی ہو تو کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں۔

◈ شریعت صرف عبادات کے احکام کے بیان تک ہی محدود نہیں۔ جیسا کہ بعض نادان دوستوں کا خیال ہے بلکہ شریعت

---

❶ صحیح مسلم: 2026.

❷ صحیح مسلم: 2024۔ عن انس.

❸ جامع الترمذی: 1892۔ اس حدیث کی پوری تخریج حدیث کبشہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کے تحت گزر چکی ہے۔

اسلامیہ تو بندے کے اکل وشرب تک کے احکام پر محیط ہے۔ چنانچہ حضرت انسان کو معاش و معاد میں فلاح ونجاح کے لیے جس چیز کی بھی ضرورت ہے، شریعت نے اس کو بیان کر دیا ہے۔

پہلے دایاں جوتا پہننا مستحب ہے

1449۔ وَعَنْهُ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِيْنِ، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ، وَلْتَكُنِ الْيُمْنَى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے ایک جوتا پہنے تو پہلے دایاں (جوتا) پہنے اور جب (ان کو) اتارے تو پہلے بایاں (جوتا) اتارے، اور چاہیے کہ دایاں جوتا دونوں میں سے پہلے پہنا جائے اور دونوں میں سے آخر میں اتارا جائے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ إِلَى قَوْلِهِ بِالشِّمَالِ، وَ أَخْرَجَ بَاقِيَهُ مَالِكٌ وَ التِّرْمِذِيُّ وَ أَبُوْدَاوُدَ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔ امام مسلم نے یہ روایت "بالشمال" کے لفظ تک روایت کی ہے۔ جبکہ باقی کی روایت امام مالک، امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کی ہے۔

شرح :...... مذکورہ حدیث میں جوتا پہننے کا شرعی ادب ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ جب جوتا پہننا ہو تو پہلے دایاں جوتا پہنا جائے اور جب اتارنا ہو تو پہلے بایاں جوتا اتارا جائے۔ تاکہ دایاں پہننے میں پہلے اور اتارنے میں آخری بن جائے۔ یعنی جوتا پہننے اور اتارنے میں آغاز بھی داہنے پر ہو اور اختتام بھی داہنے پر ہو۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ کو فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے فضیلت والا ہر کام داہنے ہاتھ سے اور داہنی طرف سے کیا جائے اور ہر وہ کام جس میں نقص کی اور گندگی ہو اس کو بائیں ہاتھ سے اور بائیں طرف سے کیا جائے۔

جوتا پہننا آدمی کے لباس کی تکمیل میں سے ہے اس لیے اس کا آغاز داہنی طرف سے کیا جائے گا جبکہ جوتا اتارنے میں لباس کی تنقیص ہے۔ اس لیے اس کا آغاز بائیں جوتے سے کیا جائے گا۔

وَلْتَكُنِ الْيُمْنَى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ، وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ: یہ جملہ گزشتہ کلام کی تاکید بھی ہو سکتا ہے اور تاسیس بھی، اور علماء اصول کے ہاں یہ قاعدہ معروف ہے کہ جب کوئی کلام تاکید اور تاسیس کے درمیان دائر ہو تو افضل اور اصل اس کا تاسیس کے لیے ہونا ہے۔ کیونکہ تاکید نئے معنی کا فائدہ نہیں دیتی کیونکہ تاکید میں وہی پہلا معنی ہی ہوتا ہے۔ البتہ اعادہ میں اس کی تاکید ہو جاتی ہے۔ جبکہ تاسیس نئے معنی کا فائدہ دیتی ہے۔

تب پھر اولیٰ یہ ہے کہ یہاں تاسیس کو مانا جائے اور یہ کہ اس جملہ میں ایک نیا معنی بیان کیا گیا ہے جو گزشتہ معنی کے علاوہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک تو دایاں جوتا پہلے اتارا جائے اور دوسرے یہ کہ پہلے دائیں جوتے کو اچھی طرح پہنا جائے۔ یعنی اگر وہ تسموں یا بکل والا ہے تو پہلے اس کے تسموں کو اچھی طرح باندھ دیا جائے یا اس کی بکل کو اچھی طرح بند کر دیا جائے۔ تب دوسرے جوتے کو پہنا جائے، اور یہ نہیں کہ پہلے دایاں جوتا پہنا پھر بایاں پہنا، اس کے بعد دونوں جوتوں کے تسموں کو باندھا یا بکل کو بند کیا۔

---

❶ یہ روایت پوری کی پوری امام بخاری رحمہ اللہ (5855) نے اسی طرح پوری روایت کی ہے جیسا کہ یہاں ہے۔ صحیح مسلم: 2097۔ الی قوله: "بالشمال" الموطا: 916/2۔ جامع الترمذی: 1779۔ سنن ابی داؤد: 4139۔ کما هنا۔

پھر اس معنی کے مراد لینے کی وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ دور نبوی میں اکثر جوتے ایسے ہوتے تھے کہ ان کو تسموں وغیرہ کے ذریعے باندھنے کی حاجت ہوتی تھی۔ اسی طرح اگر جوتوں کو جرابیں پہن کر پہننا ہے تو پہلے داہنے پیر کی جرابیں پہن کر اسے جوتے میں داخل کر کے جوتے کو اچھی طرح بند کر لیا جائے تب بایاں جوتا اس ترتیب سے پہنا جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت اسلامیہ عبادات سے لے کر معاملات تک اور معاملات سے لے کر عادات و حاجات تک کے احکام کو شامل، عام اور حاوی ہے۔
- معلوم ہوا کہ داہنی جانب کو بائیں جانب پر برتری حاصل ہے۔ حتیٰ کہ تقدیر باری تعالیٰ بھی شریعت کے موافق ہے کہ رب تعالیٰ نے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے زیادہ طاقتور اور مضبوط بنایا ہے۔
- جوتا پہننا واجب ہے یا غیر واجب؟ مذکورہ روایت ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات پر بھی دلالت نہیں کرتی۔

تو اس بارے علماء کا قول یہ ہے کہ کبھی تو پیر ننگے رکھے جائیں اور کبھی جوتے پہنے جائیں۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ جوتے پہنے رکھنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ کبھی کبھی پیر ننگے بھی رکھے جائیں۔ [1] البتہ اس میں یہ امر ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ کس کو کس بات میں کب اور کس صورت میں زیادہ سہولت ہے۔ لہٰذا تپتی زمین پر، خاردار راستوں میں اور نوکیلے پتھریلے راستوں میں جوتا پہننا افضل ہوگا۔ کیونکہ ایسے مواقع پر جوتا نہ پہننا تعذیب نفس ہے جو ناجائز ہے۔

- آدمی کو چاہیے کہ وہ جو کام بھی کرے خوب مضبوط کر کے کرے، اس کی دلیل "أَوْ لِتُنْعِلْهُمَا" کے الفاظ ہیں، اور ان سے جو معنی مراد ہے اس کو تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

ایک جوتا پہن کر چلنا منع ہے

1450۔ وَعَنْهُ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَمْشِ أَحَدُكُمْ فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ، وَلْيُنْعِلْهُمَا جَمِيْعًا أَوْ لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيْعًا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی ایک جوتے میں نہ چلے اور چاہیے کہ (یا تو) وہ دونوں کو اکٹھا پہنے (اور) یا (پھر) دونوں کو اکٹھا اتار دے۔'' [2]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... لَا يَمْشِ: یہ نہی کا صیغہ ہے جو بظاہر کراہت کے لیے ہے۔

اَوْ: مذکورہ اَو تخییر کے لیے ہے۔ مذکورہ روایت میں جوتا پہننے کا ایک اور ادب ذکر کیا گیا ہے کہ آدمی صرف ایک جوتا پہن کر نہ چلے، یا تو دونوں کو پہنا ہو یا پھر دونوں کو اتار دے۔ غرض صرف ایک جوتا پہن کر چلنا منع ہے۔ چاہے اس میں تھوڑا سا چلے یا زیادہ۔ کہ مذکورہ ممانعت ان دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ حتیٰ کہ اگر دونوں جوتے ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر رکھے ہوں تو ایسا نہ کرے کہ ایک کو پہن کر دوسرے تک، ایک ہی جوتے میں چل کر جائے کہ حدیث کا ظاہر اس بات سے بھی منع کرتا ہے۔

---

[1] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

[2] صحیح بخاری: 5856۔ صحیح مسلم: 2097۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ ایک جوتا پہن کر چلنا منع ہے جس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے۔ البتہ ضرورت و حاجت کی صورت اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔ جیسے ایک پاؤں میں زخم ہو تو اب صرف دوسرے پیر میں جوتا پہن کر چلنا جائز ہوگا۔

◈ رہا یہ سوال کہ صرف ایک جوتا پہن کر چلنے کی ممانعت کیوں ہے؟ تو بعض علماء نے اس کی علت و حکمت یہ بیان کی ہے کہ اس سے دونوں پیروں کے درمیان عدل قائم ہوگا، اور ایک کو دوسرے پر برتری نہ ہوگی۔

◈ معلوم ہوا کہ جہاں جوتا پہننا جائز ہے وہیں جوتا نہ پہننا بھی جائز ہے۔ اس کی دلیل "وَلْيُنْعِلْهُمَا جَمِيعًا، أَوْ لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيعًا" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ یہاں "أَوْ" تخییر کے لیے ہے۔ لہٰذا جوتا پہننا بھی جائز ہوگا اور ننگے پیروں چلنا بھی جائز ہوگا۔

کپڑوں میں اِسبال ❶ کا حکم

1451- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلَى مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ اس شخص کو (نگاہِ رحمت سے) نہیں دیکھتے جو اپنے کپڑے کو تکبر کرتے ہوئے گھسیٹ کر چلتا ہے۔'' ❷

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......لَا يَنْظُرُ: مراد نگاہِ رحمت سے دیکھنا ہے، وگرنہ رب تعالیٰ کی نگاہوں سے اس کائنات کا ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں۔

مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ: ثوب کا ذکر یہاں مطلق ہے۔ جس کا اطلاق شلوار قمیض، تہبند وغیرہ سب پر یکساں ہوتا ہے۔

خُيَلَاءَ: یعنی اکڑتے ہوئے اور اتراہٹ دکھاتے ہوئے گھسیٹ کر چلے، اور دوسروں پر فخر اور ان کی تحقیر کرے۔ بلاشبہ نگاہِ رحمت سے دیکھنے کی نفی تکبر سے کپڑے گھسیٹ کر چلنے کے حق میں ایک وعید ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ رب تعالیٰ کے لیے دیکھنے کا اِثبات۔ کیونکہ ایسی صفت کے ساتھ متصف آدمی سے رب تعالیٰ کے دیکھنے کی نفی اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ایسی صفت والا نہ ہو، رب تعالیٰ اس کو دیکھتے ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ تکبر اور فخر و غرور کے طور پر کپڑے گھسیٹ کر چلنا کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس فعل پر وعید مرتب ہے اور وعید ہمیشہ کبائر پر آتی ہے۔

---

❶ اسبال: یہ کپڑا لٹکانے کو کہتے ہیں (القاموس الوحید، ص: 742) مراد کپڑے کے مختلف حصوں کو ان کی مقررہ شرعی حد سے زیادہ لٹکانا ہے۔ جیسے ازار یا شلوار کو ٹخنوں سے نیچے تک لٹکانا۔ یہ اسبال کہلائے گا کیونکہ شلوار وغیرہ کو لٹکانے کی شرعی حد ٹخنوں سے اوپر تک ہے۔ اس حد سے تجاوز کرنا اِسبال کہلائے گا جو منع ہے۔ تب پھر اسبال لباس کے مختلف حصوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔ نسیم

❷ صحيح بخاري: 5783- صحيح مسلم: 2085.

◈ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو بغیر تکبر کے کپڑے گھسیٹ کر چلے، وہ اس وعید کا مستحق نہ ہوگا۔ کیونکہ جب کوئی حکم کسی وصف کے ساتھ مقید ہو تو اس وصف کے نہ پائے جانے کے وقت وہ حکم بھی منتفی ہو جاتا ہے۔

◈ البتہ اس امر کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے کہ اسبال خود حرام ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب آدمی ازار کو ٹخنوں سے اوپر باندھنے کا عادی بھی ہو اور اس بات کا اہتمام بھی کرتا ہو، تب بھی بلا قصد اسبال ہو جائے تو یہ حرام نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب خدمت نبوی میں یہ عرض کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول! میری چادر کا ایک پلو ڈھلک جاتا ہے البتہ میں اس کا دھیان رکھتا ہوں (اور اسے فوراً سنبھال لیتا ہوں تو کیا یہ بھی اسبال میں داخل ہے) تو اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا کہ: ''تم ان لوگوں میں سے نہیں جو تکبر کے طور پر ایسا کرتے ہیں۔''❶ اور جو جان بوجھ کر اسبال تو کرے لیکن تکبر کے طور پر نہ کرے تو اس پر بھی عقوبت ہے۔ لیکن یہ عقوبت رب تعالیٰ کی نگاہِ رحمت کی نفی سے کم کی ہے، اور اس عقوبت کا ذکر اس حدیث میں ہے: ''جو ازار ٹخنوں سے نیچے ہوگی، وہ جہنم میں جائے گی۔''❷ بلاشبہ یہ بھی عقوبت ہے لیکن رب تعالیٰ کے نگاہِ رحمت سے نہ دیکھنے سے کم ہے۔

◈ غرض یہ کل تین احوال ہوئے:

(1) ایک یہ ازار یا شلوار ٹخنوں سے اوپر ہو تو یہ جائز ہے۔

(2) دوسرا حال یہ ہے کہ شلوار ٹخنوں سے نیچے ہو البتہ تکبر کے طور پر نہ ہو، یہ حرام ہے، اور کبیرہ گناہ ہے۔

(3) اور اگر ٹخنوں سے نیچے شلوار کو بطور تکبر کے باندھا ہوا ہے تو یہی وہ حالت ہے جس پر یہ شدید وعید آئی ہے کہ رب تعالیٰ اسے نگاہِ رحمت سے نہ دیکھے گا۔

بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت کا بیان

1452۔ وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِيَمِينِهِ، وَإِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِينِهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ، وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کوئی کھانے لگے تو چاہیے کہ وہ اپنے داہنے ہاتھ سے کھائے، اور جب پینے لگے تو چاہیے کہ اپنے داہنے ہاتھ سے پیئے، کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور اپنے بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔''❸

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... مذکورہ حدیث میں کھانے اور پینے کا یہ اہم ترین ادب بیان کیا گیا ہے کہ آدمی دائیں ہاتھ سے ہی کھائے اور پیئے۔ یہ سنت ہے جس کا امر ہے، اور اس کی علت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ بائیں ہاتھ سے شیطان کھاتا پیتا ہے اور ہمیں شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهٗ يَأْمُرُ

❶ صحیح بخاری: 3665. ❷ صحیح بخاری: 5787.
❸ صحیح مسلم: 2020.

بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (النور: 21)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو اور جو شیطان کے قدموں کے پیچھے چلے تو وہ تو بے حیائی اور برائی کا حکم دیتا ہے۔'' اور فرمایا:

﴿وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (البقرة: 168)

''اور شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

تو جب شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے تو وہ ہمیں سوائے شر کے اور کسی طرف نہ لے جائے گا۔ انہی امورِ شر میں سے ایک شیطان کا لوگوں کو بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ترغیب دینا ہے کیونکہ وہ خود بھی اپنے بائیں ہاتھ سے ہی کھاتا اور پیتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ داہنا ہاتھ اور داہنا پہلو عزت وتکریم والا ہے، اسی لیے ہمیں داہنے ہاتھ سے ہی کھانے اور پینے کا حکم ہے۔
- معلوم ہوا کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے، تب پھر مذکورہ امر وجوب کے لیے ہوگا۔ لہٰذا دائیں ہاتھ سے کھانا پینا واجب ہوگا، اور واجب کی بابت شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ عجز کے وقت ساقط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کسی مرض کی وجہ سے اپنا داہنا ہاتھ منہ تک نہیں لے جاسکتا تو اس کے لیے ضرورت کی وجہ سے بائیں ہاتھ سے کھانا جائز ہوگا۔
- بائیں ہاتھ سے کھانا اور پینا حرام ہے اور تحریم ضرورت کے وقت ہی مرتفع ہوتی ہے۔ پس جو لوگ کھاتے ہوئے پینے کے لیے بایاں ہاتھ استعمال کرتے ہیں وہ سراسر غلط اور حرام کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں بائیں ہاتھ کے استعمال کی کوئی مجبوری نہیں، اور گلاس وغیرہ کے آلودہ ہو جانے کا عذر بھی عذر لنگ کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ گلاس کو بعد میں دھویا بھی جاسکتا ہے۔
  تب پھر صرف اتنی بات کو عذر بنا کر بائیں ہاتھ سے پینا بالکل جائز نہ ہوگا۔
- کفار سے مشابہت اختیار کرنا منع ہے کیونکہ ہمیں شیطان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے جو سب کافروں کا سرغنہ، سرخیل، سردار اور بڑا ہے۔
- نبی کریم ﷺ امت کے بے حد خیر خواہ تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی ہر خیر والے کام کی طرف رہنمائی فرمائی جبکہ شر والے ہر کام سے امت کو روکا۔ انہی باتوں میں سے ایک بائیں ہاتھ سے کھانا اور پینا بھی ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے نہایت بلیغ سختی کے ساتھ امت کو منع فرمایا ہے۔

اِسراف ہر چیز میں منع ہے

1453- وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كُلْ، وَاشْرَبْ، وَالْبَسْ، وَتَصَدَّقْ، فِيْ غَيْرِ سَرَفٍ وَلَا مَخِيْلَةٍ)).

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(اس طرح) کھا، پی، پہن اور صدقہ کر کہ اس میں نہ تو اسراف ہو ورنہ (تکبر اور) اُتراہٹ ہو۔'' [1]

---

[1] یہ حدیث سنن ابی داؤد میں موجود نہیں۔ مسند احمد: 181/2۔ سنن النسائی: 79/5۔ صحیح البخاری: فی اوّل کتاب اللباس معلّقًا، دیکھیں، فتح الباری: 253/10۔ علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کے رواۃ حضرت عمرو بن شعیب تک ثقہ ہیں اور صحیح بخاری میں ان رواۃ سے احتجاج واستدلال کیا گیا ہے۔ دیکھیں: الترغیب والترھیب: 102/3.

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَحْمَدُ، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ . اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو معلق ذکر کیا ہے۔

غریب الحدیث:......سَرَفٍ: یہ حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔

مَــخِيـلَةٍ: یہ تکبر، اتراہٹ، خود پسندی اور اِترانے وغیرہ کو کہتے ہیں، اور یہی دونوں کلمات (سرف اور مخیلہ) مذکورہ حدیث کا محل استدلال ہیں۔

اب اسراف یہ زیادہ چیز بنانے کا نام ہے یا زیادہ کھانے کا نام ہے؟ تو یہ دونوں معانی ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دو کی دعوت میں بیس آدمیوں کے بقدر کھانا تیار کر لینا اسراف کہلائے گا، اور اتنا پیٹ بھر کر کھانا کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جائے، یہ کھانے میں اسراف ہوگا۔ حتیٰ کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس قدر کھانے کو حرام لکھا ہے۔ کیونکہ اتنا کھانا اسراف بھی ہے اور ایذائے نفس بھی ہے۔ اسراف کا اطلاق لباس پوشاک میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دن میں دو دو جوڑے بدلنا اسراف کہلائے گا۔ اسی طرح زیادہ مہنگے کپڑے سلوانا یا ضرورت سے زائد جوڑے بنوانا بھی اسراف کہلائے گا۔

البتہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ کھانے پینے اور پہننے میں اسراف لوگوں کے اور اوقات کے اختلاف سے مختلف ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے ایک قسم کا کھانا بعض کے حق میں اسراف ہو اور کسی دوسرے کے حق میں اسراف نہ ہو۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ایک لباس کسی کے حق میں اسراف ہو جبکہ کسی اور کے لیے وہ لباس معمولی ہو۔

پھر عورتوں میں زیور کے باب میں بے حد اسراف ہے۔ چنانچہ تجمل کے حصول کے لیے بسا اوقات دو چوڑیاں یا کنگن کافی ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں جب تک درجن بھر چوڑیاں نہ بنوائی جائیں، جی نہیں بھرتا۔ بلاشبہ یہ زیور اور اس کی غرض یعنی تجمل میں اسراف ہے۔

پھر زیادہ زیور بنوانے میں ان عورتوں کی دل شکنی بھی ہے جو زیادہ زیور نہیں بنوا سکتیں۔ پھر انہی باتوں میں جب فخر و غرور اور دکھلاوا بھی آ جائے تو ان کی قباحت و شناعت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

صدقہ میں دکھلاوا معروف ہے اور اسے شرعی اصطلاح میں ریاکاری کہتے ہیں، جس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جبکہ صدقہ میں اسراف یہ ہے کہ آدمی واجب صدقہ میں تو کوتاہی کرے جبکہ نفل اور مندوب صدقہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔

لیکن بعض علماء نے اس کو اسراف قرار نہیں دیا۔ البتہ اسے نفل کو واجب پر مقدم کرنا کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنا سب کچھ صدقہ کر دے۔ جیسا کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر گھر کی ہر ہر چیز لا کر پیش کر دی تھی۔ تب پھر کیا محتاج کو اس کی ضرورت سے زیادہ دینے کو صدقہ میں اسراف کہا جا سکتا ہے؟ یا پھر صحیح توجیہ یہ ہے کہ: "فِي غَيْرِ سَرَفٍ" کے کلمات "تَصَدَّقْ" کی طرف راجع ہی نہیں بلکہ یہ کلمات "كُلْ، وَاشْرَبْ، وَالْبَسْ" کی طرف راجع ہیں؟ صحیح قول یہی دوسرا ہے۔ البتہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ضرور ہے کہ آدمی صدقہ خیرات وغیرہ میں میانہ روی سے کام لے، اور یہ نہ کرے کہ جب رقم ہاتھ میں آئے تو ایک دم سب خرچ کر دے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا﴾ (الفرقان: 67)

''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مذکورہ حدیث میں دینی و دنیاوی دونوں قسم کی ضروریات کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ کھانا پینا اور لباس پوشاک میں دنیوی ضروریات کی طرف اشارہ ہے اور صدقہ میں اخروی ضروریات کی طرف۔ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ: ''ہر آدمی روز قیامت اپنے صدقہ کے سائے تلے ہوگا۔''

◈ اِسراف، تکبر اور اُتراہٹ سے اجتناب واجب ہے۔ اس کی دلیل "مَنْ غَيْرِ سَرَفٍ وَّلَا مَخِيْلَةٍ" کے الفاظ ہیں۔

2۔ بَابُ الْبِرِّ وَ الصِّلَةِ ..... نیکی اور صلہ رحمی کا بیان

تمہید: ...... اَلْبِرّ: نیکی اور حسن سلوک، یہ والدین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

الصِّلَةِ: جبکہ صلہ رحمی قرابتداروں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

چنانچہ بِـرّ یہ بہت زیادہ دینے، خرچ کرنے، نیکی کرنے اور حسن سلوک کرنے کو کہتے ہیں۔ جس کے مستحق صرف والدین ہوتے ہیں، اسی لیے بِر صرف والدین کے ساتھ ہی خاص ہے۔ جبکہ صلہ یہ محض عطاء کرنے کو کہتے ہیں، یہ بِرّ سے کم درجہ کی نیکی ہے اس لیے یہ قرابتداروں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرابت دار کون ہیں؟ تو یہ چوتھی پشت تک کے دادا کی اولاد ہیں۔ لہٰذا جس نے قرابت دار کو صرف دادا یا باپ کی اولاد کو قرار دیا ہے، اس نے قرابتداروں کی تعداد کو بے حد کم کر دیا ہے۔ اسی لیے یہ قول محل نظر ہے، اور جس نے ہر اس آدمی کو قرابتدار قرار دیا ہے جس کا آدمی کے ساتھ ادنی سا بھی تعلق ہو چاہے وہ جتنا مرضی دور پار کا تعلق ہو تو اس نے اس باب میں بے حد وسعت سے کام لیا ہے۔ تب پھر اقرب اور اعدل قول یہ ہے کہ اقارب وہ ہیں جو چوتھی پشت تک کے دادا کی اولاد ہیں۔

صلہ رحمی عمر اور رزق میں برکت کا باعث ہے

1454۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُّبْسَطَ لَهُ فِيْ رِزْقِهِ، وَأَنْ يُنْسَأَ لَهُ فِيْ أَثَرِهِ ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ)).

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جسے یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے اور اس کی موت کو مؤخر کر دیا جائے (یعنی اس کی عمر دراز ہو) تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔'' [1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......مَنْ: یہ شرطیہ ہے۔

أَحَبَّ: یہ فعل شرط ہے۔

فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ: یہ جواب شرط ہے۔ اسی لیے اس پر "فا" داخل ہے۔

أَنْ يُّبْسَطَ: یہ أَنْ يُّوَسَّعَ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں بسط یہ وسعت کے معنی میں ہے۔

ارشاد ہے:

---

[1] صحیح بخاری: 5985.

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ﴾ (الرعد: 26)

''اللہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے۔''

فِي رِزْقِهِ: رزق سے مراد عطا ہے۔ رزق کا متبادر مفہوم ذہن میں بدنی ضروریات کے حوالے سے آتا ہے۔ جیسے کھانا، پینا، لباس، ٹھکانا، بیوی بچے، کاروبار وغیرہ۔ جبکہ رزق یہ ان باتوں کو بھی شامل ہے جو دین کے قائم ہونے کا ذریعہ ہیں۔ جیسے ایمان، علم نافع اور عمل صالح وغیرہ۔

وَأَنْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ: يُنْسَأَ: یہ يُؤَخَّرَ کے معنی میں ہے، اور اثر سے مراد اجل ہے۔ کیونکہ آدمی کے آثار ونشانات اس کی موت کے بعد ہی پائے جاتے ہیں۔

ان دونوں باتوں کا مطلب یہ ہے کہ جو یہ چاہے کہ اس کی دینی و دنیاوی دونوں کی روزی میں برکت اور وسعت و کثرت ہو اور یہ کہ اس کی عمر دراز ہو تو:

فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ: وہ صلہ رحمی کرے۔ یعنی وہ اپنے قرابتداروں کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کرے۔ البتہ یہ نیکی اتنی زیادہ نہ ہو کہ بِر تک جا پہنچے۔

مضمون حدیث: ......اس حدیث میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور قرابتداروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی بے حد بلیغ اور عظیم ترین ترغیب ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ صلہ رحمی رزق میں کثرت اور درازی عمر کا سبب ہے۔ اس کی دلیل "اَنْ يُّبْسَطَ لَهُ فِيْ رِزْقِهِ وَيُنْسَأَلَهُ فِيْ اَثَرِهِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ اسباب کا اثبات۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے صلہ رحمی کو رزق کی کشادگی اور لمبی عمر کا سبب قرار دیا ہے۔

قطع رحمی کی ممانعت

1455- وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ)). يَعْنِيْ قَاطِعَ رَحِمٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''قطع کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' ❶ یعنی قطع رحمی کرنے والا۔

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح: ......یہ ترغیب کے بعد ترہیب کا بیان ہے اور ترغیب کو پہلے ذکر کرنا ہی اولیٰ ہے کہ اس سے طبیعت میں نشاط اور بشاشت پیدا ہو جاتی ہے، اور آدمی عمل کرنے کے لیے مستعد اور چاک و چوبند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ترہیب نفع بھی دیتی ہے۔ چنانچہ ترغیب کے بعد ترہیب سن کر آدمی جان جائے گا کہ اگر وہ خلاف شرع کوئی کام کرے گا تو اسے اجر سے محرومی اور عقوبت کا حصول دیکھنا پڑے گا۔ تب پھر وہ حکم شریعت کی مخالفت سے گریز کرے گا۔ جبکہ اول وہلہ میں ہی ترہیب تنفیر نفرت دلانے کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے اول ترغیب دی جائے پھر تقصیر اور کوتاہی کرنے سے ڈرایا بھی جائے۔

---

❶ صحيح بخاري: 5984- صحيح مسلم: 2556.

تنبیہ:...... مذکورہ حدیث میں قطع رحمی کرنے پر شدید تحذیر ہے کہ یہ جنت سے محرومی کا سبب ہے۔ جیسا کہ قطع رحمی لعنت اور رب تعالیٰ کی رحمت سے محرومی کا بھی سبب ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ٥ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ٥﴾ (محمد: 22 ـ 23)

''پھر یقیناً تم قریب ہو اگر تم حاکم بن جاؤ کہ زمین میں فساد کرو اور اپنے رشتوں کو بالکل ہی قطع کر دو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی۔ پس انھیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔''

قطع رحمی یہ قرابتداروں کے ساتھ نیکی نہ کرنے کو بھی شامل ہے اور انہیں شر اور اذیت پہنچانے کو بھی شامل ہے۔ اگرچہ بدسلوکی کے بغیر قطع رحمی کرنا بھی برا ہے۔ لیکن بدسلوکی کے ساتھ قطع رحمی کرنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ تب پھر بدسلوکی کرنے والا اور قطع کرنے والا دونوں جنت میں داخل ہونے سے محروم رہیں گے۔ البتہ جنت میں داخل ہونے سے محرومی سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ''قاطع'' کافر ہے۔ کیونکہ جنت میں داخل ہونا دو طرح سے ہے:

(1) کامل داخل ہونا کہ اس سے پہلے عذاب نہ ہو۔

(2) مطلق داخل ہونا کہ جس سے پہلے عذاب بھی ہو۔

تب پھر یہاں انتفاء سے دخولِ جنت کی پہلی قسم کا انتفاء مراد ہے کہ وہ جنت میں ایسا داخل نہ ہوگا کہ اس سے قبل عذاب نہ ہو، بلکہ وہ عذاب بھگت کر جنت میں داخل ہوگا۔ جس کی مدت اللہ ہی جانتا ہے۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ قطع رحمی کبائر میں سے ہے۔ کیونکہ اس پر عذاب اخروی مرتب ہو رہا ہے۔

والدین کی نافرمانی منع ہے

1456- وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ ﷺ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الْأُمَّهَاتِ . وَوَأْدَ الْبَنَاتِ ، وَمَنْعًا وَهَاتِ ، وَكَرِهَ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ)) .
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک رب تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو، بیٹیاں زندہ درگور کرنے کو اور روکنے اور دینے کو حرام فرمایا ہے۔ جبکہ تمہارے لیے قیل و قال کو، کثرتِ سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔'' ❶
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

تنبیہ:...... اس حدیث پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔ اس لیے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کے ضوابط کا بیان

1457- وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضي الله عنهما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : ((رِضَى اللهِ فِي رِضَى

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ کی رضا والدین

❶ صحيح بخاري: 5975- صحيح مسلم: 593 .

الْوَالِدَيْنِ، وَسَخَطُ اللّٰهِ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدَيْنِ)). أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی والدین کی ناراضی میں ہے۔" ❶ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......فِي رِضَا الْوَالِدَيْنِ: بظاہر مذکورہ "فی" سببیہ ہے۔ یعنی والدین کی رضامندی رب تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔ جبکہ والدین کی ناراضی رب تعالیٰ کے ناراض ہونے کا سبب ہے۔

رضا یہ آدمی کے کسی شے سے مطمئن ہونے اور اس پر شرح صدر ہونے کا نام ہے۔ لہٰذا جب آدمی والدین کی اطاعت کرے گا تو یہ بات ان کے دل کے مطمئن اور خوش ہونے کا سبب بنے گی، اور والدین کی رضا کو رب تعالیٰ کی رضا کا سبب اس لیے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ آدمی کے حسن سلوک کے سب سے زیادہ مستحق اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مذکورہ حدیث میں والدین کو راضی کرنے کی نہایت بلیغ ترغیب ہے کیونکہ یہ بات رب تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔ البتہ یہ بات مطلق نہیں۔ لہٰذا جو والدین مالِ حرام، فسق و فجور، گناہ اور بے پردگی پر خوش ہوتے ہوں تو ایسی باتوں میں ان کو خوش کرنا لازم نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ باتیں رب تعالیٰ کے ناراض ہونے کا سبب ہیں اور رب تعالیٰ کی رضا ہر شے پر مقدم ہے۔
- رب تعالیٰ کے لیے صفتِ رضا ثابت ہے۔
- والدین کی ناراضی سے بچا جائے کہ اس سے رب تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔
- امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ والدین کی طاعت صرف انہی امور میں ہے جن میں والدین کا تو نفع ہو، البتہ اس پر اولاد کا ضرر نہ ہو۔ لہٰذا اگر ماں بیوی کو طلاق دے دینے کو کہے تو اس بات کو ماننا اولاد پر لازم نہ ہوگا کیونکہ اس میں اولاد کا ضرر ہے۔

پڑوسی کے حقوق

1458- وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: ((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِجَارِهِ أَوْ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے پڑوسی کے لیے وہی پسند (نہ) کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" ❷ یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث: ......وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ: نبی کریم ﷺ ان الفاظ کے ساتھ کثرت سے قسم اٹھایا کرتے تھے۔ گویا کہ آپ ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو رب تعالیٰ میری جان لے لے۔ کیونکہ سب کی جانیں ایک

---

❶ جامع الترمذي: 1899- امام ترمذی نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان (429) اور امام حاکم (168/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

❷ صحيح بخاري: 13- صحيح مسلم: 45.

اکیلے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

جَارِہِ: جَار: پڑوسی۔ وہ شخص جس کا گھر یا ٹھکانا ہمارے گھر کے قریب ہو، خواہ وہ گھر کچا ہو یا پکا، رہا یہ سوال کہ کتنے گھروں تک کسی کو پڑوسی شمار کیا جاتا ہے؟ تو اگرچہ بعض روایات میں اس کی تعداد چالیس گھر تک آتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں عرف کا اعتبار ہے۔ چنانچہ جتنے گھروں کو عرف میں پڑوسی سمجھتے ہیں، وہی پڑوسی کہلائیں گے۔ کیونکہ دورِ نبوی میں گھر چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے، اور اب گھر بڑے بڑے ہوتے ہیں، اور چند گھروں کو بھی جمع کیجئے تو کافی مسافت بن جاتی ہے۔ اس لیے فی زمانہ پڑوسی کی حد میں عرف کا ہی اعتبار ہوگا۔

حَتّٰی یُحِبَّ لِجَارِہِ..... اس روایت میں پڑوسی کا جبکہ بعض روایات میں ''بھائی'' کا لفظ آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے آدمی خود اپنے لیے خیر اور بھلائی کو پسند کرتا ہے، جبکہ شر اور برائی اپنے لیے ناپسند کرتا ہے، ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے پڑوسی کے لیے بھی اس کے یہی جذبات ہوں۔ لہٰذا اگر پڑوسی کے لیے خیر سے محرومی کا جذبہ ہے تو ایسا آدمی کامل مومن نہ ہوگا۔ یا اسے تکلیف پہنچنے کی تمنا ہے تو بھی یہ امر ایمان کے مقتضی کے خلاف ہے، اور اگر بالفعل ایسا کر دکھایا تو ایسا شخص بدترین شخص ہے جو پڑوسیوں کو ستاتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مذکورہ الفاظ (وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ) کے ساتھ قسم اٹھانا جائز ہے۔

◈ دوسرے کے کہے بغیر بھی قسم اٹھا سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس مقام پر نبی کریم ﷺ نے کسی کے بن کہے قسم اٹھائی ہے۔

◈ جو اپنے پڑوسی کے لیے خیر سگالی کے وہ جذبات نہیں رکھتا جو وہ اپنے لیے رکھتا ہے، تو مذکورہ حدیث میں اُس سے ایمان کی نفی بیان کی گئی ہے۔

البتہ اس سے کفر مراد نہیں ہے بلکہ ایمان کے کمال کی نفی مراد ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ کسی شے سے کمال کے منتفی ہونے پر خود اس کی نفی کر دینا جائز ہے۔

◈ جس کے پاس مطلق ایمان ہو، اس سے مطلق ایمان کی نفی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث میں مطلق ایمان کی نفی کی گئی ہے جو دراصل ایمان کے کمال کی نفی ہے۔

اللہ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟

1459۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ؟ قَالَ: ((أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ)) قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: ((أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَأْكُلَ مَعَكَ)) قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: ((أَنْ تُزَانِيَ بِحَلِيْلَةِ جَارِكَ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ کہ تو (کسی کو) اللہ کا ہمسر ٹھہرائے حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔'' میں نے پوچھا: پھر کون سا گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ تو اس ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ مل کر کھائے گی۔'' میں نے پوچھا: پھر کون سا گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ

کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ: جنابِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ علم دین کے حقیقی طلب کرنے والے تھے۔ انہی جیسے جنابِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ سے سب سے زیادہ سوال کرنے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کا سوال کیا کہ: روزِ قیامت آپ ﷺ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ: ''میرا گمان تھا کہ یہ سوال تمہارے سوا کوئی اور مجھ سے نہ کرے گا۔''

اب جنابِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ہی لے لیجیے کہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ عنداللہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ اور انہوں نے ہی ایک موقع پر یہ سوال بھی کیا تھا کہ: ''اللہ کو سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟'' یاد رہے کہ یہ حضرات ایسی باتیں صرف معلومات اکٹھی کرنے کے لیے نہ کیا کرتے تھے بلکہ ان پر عمل کرنے کے لیے یہ باتیں پوچھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ پوچھنا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ اس غرض کے لیے تھا تا کہ اس سے شدید اجتناب کیا جائے۔

أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ: نِدًّا: یہ نظیر، ہم سر، ہم پلہ، ہم رتبہ اور مثل کو کہتے ہیں۔ جس اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے، ماں کے پیٹ میں روزی دی، ہاتھ پاؤں، کان، زبان اور آنکھیں دیں پھر بھی انسان کسی کو اس جیسا قرار دے اور کسی کو اس کا ہم سر اور ہم رتبہ قرار دے تو بلاشبہ یہ کائنات کا سب سے بڑا گناہ ہے، لات، عزیٰ، ھبل اور منات کی عبادت کرنے والے، ان بے بس اور لاچار بتوں کو اُس اللہ کا ہم سر قرار دے دیتے تھے جو سب قدرتوں کا مالک اور سب کا خالق ہے۔ یہ لوگ رب تعالیٰ کی الوہیت میں شرک کے مرتکب ہوئے تھے اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کے بزرگ اور اولیاء اس کائنات میں متصرف و مدبر ہیں، بلاشبہ یہ لوگ رب تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک کرتے ہیں۔

وَهُوَ خَلَقَكَ: یعنی جب اس ایک اکیلے اللہ نے انسان کے پیدا کرنے میں کسی کی مدد نہیں لی، اور کسی کو اس کی تخلیق میں شریک نہیں کیا تو اب چاہیے کہ یہ بندہ بھی اسی خالق و مالک اور رازق کی عبادت کرنے میں اور اس کو الٰہ اور رب ماننے میں کسی کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔

غرض سب سے بڑا گناہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ کسی کو الوہیت اور ربوبیت میں اس کا شریک ٹھہرانا ہے۔

أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ......: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس سوال پر کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: آدمی اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کر دے کہ مبادا وہ اس کے ساتھ مل کر کھائے۔ یہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔ اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، مذکر ہو یا مونث دونوں کا حکم ایک ہے۔ کیونکہ "ولد" کا لفظ ان سب کو شامل ہے۔

أَنْ تُزَانِيَ حَلِيلَةَ جَارِكَ: حلیلہ سے مراد بیوی بھی ہو سکتی ہے اور وہ باندی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ جس کے ساتھ آدمی جماع کرتا ہو، لیکن حلیلہ سے اکثر بیوی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں بھی حلیلہ سے مراد بیوی ہے۔

﴿وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ (النساء: 23)

''اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں۔''

---

❶ صحیح بخاری: 4477۔ صحیح مسلم: 86.

حلائل یہ حلیلہ کی جمع ہے اور مراد بیویاں ہیں۔

تُزَانِیَ: یہ بابِ مفاعلہ کا صیغہ ہے جو فعل میں دو کے اشتراک پر دلالت کرتا ہے، تب پھر یہ مطلب بنے گا کہ چاہے اس بدکاری میں پڑوسن نے خود بھی تعاون کیا ہو، اور چاہے اس نے انکار کیا ہو، پر پڑوسی نے اس سے زبردستی زنا کر لیا ہو، کہ یہ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں، اور بابِ مفاعلہ ان دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بالخصوص جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ دین کا علم حاصل کرنے کے اور کامل ترین اور بڑے بڑے اعمال کا علم حاصل کرنے کے بے حد حریص تھے تاکہ اعلیٰ ترین اعمال اور مکارم اخلاق کو اپنایا جائے اور کبائر سے اور بالخصوص اکبر الکبائر سے سخت اجتناب کیا جائے۔
- معلوم ہوا کہ پیدا کرنے والی ذات صرف ایک اکیلے اللہ کی ذات ہے۔
- اولاد کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ چاہے وہ بیٹا ہو یا بیٹی، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس گناہ کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے۔
- رہا یہ سوال کہ جو لوگ اولاد کو عار وغیرہ کے اسباب کی وجہ سے قتل کرتے ہیں، کیا ان کا گناہ کم درجہ کا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ساتھ کھانے کے ڈر سے قتل کرنے کی قید اغلب کے اعتبار سے ہے کہ اس زمانہ میں زیادہ لوگ اولاد کو اسی ڈر سے قتل کرتے تھے، تب پھر مطلق اولاد کو قتل کرنا ہی سب سے بڑا گناہ ہوگا چاہے اولاد کو عار کے ڈر سے قتل کرے اور چاہے فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل کرے کہ دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے۔
- زنا بذات خود بہت بڑا گناہ ہے، لیکن اگر یہی گناہ پڑوسی کی بیوی کے ساتھ کیا جائے تو اس کی شدت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی تو پڑوسی کو اپنا ایک طرح کا محافظ سمجھتا ہے کہ وہ اس کی عزت کی بھی حفاظت کرے گا اور اس کے مال کی بھی نگہداشت کرے گا۔ چنانچہ پڑوسن کے ساتھ زنا کر کے اس آدمی نے وہاں خیانت کا ارتکاب کیا جہاں اسے امین سمجھا جاتا ہے۔

البتہ جرم کی یہ شدت معنوی اعتبار سے ہے ورنہ سزا اس زنا کی بھی وہی ہے جو دیگر زناؤں کی ہے۔

کسی کے باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے

1460- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ)) قِيلَ: وَهَلْ يَسُبُّ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ، فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ)).

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(یہ بات) کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے۔'' عرض کیا گیا: (اے اللہ کے رسول!) کیا آدمی اپنے والدین کو بھی گالی دیا کرتا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! (ایسا ممکن ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ) آدمی کسی کے باپ کو گالی دے، اور وہ آدمی (جواب میں) اس کے باپ کو گالی دے (یوں وہ آدمی گویا کہ دوسرے کے

باپ کو گالی دے کر خود اپنے باپ کو گالی دیتا ہے) اور یہ دوسرے کی ماں کو گالی دے تو وہ دوسرا اس کی ماں کو گالی دے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ...... مِنَ الْكَبَائِرِ: مذکورہ ''مِنْ'' تبعیض کے لیے ہے، اور کبائر یہ کبیرہ کی جمع ہے۔ کبیرہ گناہ کی حد کیا ہے اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ اسے ذکر کیا جا چکا ہے۔

وَالِدَيْهِ: مراد ماں اور باپ ہیں۔

قِيلَ: وَهَلْ يَسُبُّ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ: گویا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کو بے حد عجیب اور بعید سمجھا کہ بھلا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے جو اس دنیا میں اس کے سب سے بڑے محسن ہوتے ہیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں یہ بات ممکن ہے اور کوئی آدمی ایسا کر سکتا ہے البتہ براہِ راست نہیں، ہاں بالواسطہ طور پر ایسا کر سکتا ہے۔ یعنی وہ اپنے ماں باپ پر گالی پڑنے کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ یوں کہ:

يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ، فَيَسُبُّ أَبَاهُ: یہ دوسرے کے باپ کو گالی دے جس کے جواب میں وہ دوسرا اس کے باپ کے گالی دے، اور یہ دوسرے کی ماں کو گالی دے جس کے جواب میں وہ اس کی ماں کو گالی دے۔ یہ بھی ماں باپ کو گالی دینے کی ایک صورت ہے، گو بالواسطہ ہی سہی۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ جس بات کو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم از حد بعید سمجھتے تھے، وہ آج آئے روز کا قصہ ہے۔ افسوس کہ اب ماں باپ کو رو در رو اور بلا واسطہ گالی دینا عام ہو گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ گناہ دو قسم کے ہیں: (1) صغیرہ اور (2) کبیرہ۔

◈ والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہ اور حرام ہے کیونکہ یہ عقوقِ والدین یعنی ماں باپ کی نافرمانی کرنے کے زمرہ میں داخل ہے۔

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مراجعت کر لیا کرتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو وہ بلا تکلف پوچھ لیا کرتے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خندہ پیشانی سے سوالات سن کر بڑی کشادگی دلی سے اس کا جواب عنایت فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو کھول کر بیان فرمایا کہ ایک آدمی اپنے والدین کو گالی کیونکر دے سکتا ہے۔ چنانچہ جب وہ دوسروں کے والدین کو گالی دے گا تو وہ بھی اس کے والدین کو گالی دیں گے، یوں یہ آدمی بلا واسطہ نہ سہی پر بالواسطہ طور پر اپنے والدین کو گالی دے رہا ہوتا ہے۔

◈ نعم! یہ کلمہ جواب کے لیے کافی ہے، اور معلوم ہوا کہ جواب میں سوال کا اعادہ ضروری نہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ وسائل کا حکم مقاصد کا ہے۔ جیسے دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا جب اپنے والدین کو گالی دینے کا سبب اور وسیلہ تھا تو اسے قصد اور فعلِ مباشر کا حکم دیا گیا۔

---

❶ صحيح بخاري: 5973- صحيح مسلم: 90.

◈ سدِّ ذرائع: چنانچہ جو چیز کسی حرام کا ذریعہ بنتی ہو شریعت اسے بھی منع کرتی ہے۔

دو بھائیوں کے درمیان ترکِ تعلق کیونکر ختم کیا جا سکتا ہے

1461- وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ . يَلْتَقِيَانِ، فَيُعْرِضُ هٰذَا، وَيُعْرِضُ هٰذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین (دن) رات سے زیادہ چھوڑے رکھے کہ (جب) وہ دونوں ملیں تو یہ (اُس سے) منہ موڑے اور وہ (اِس سے) منہ موڑے، اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ......لَا يَحِلُّ: یہ کلمہ کسی شے کے حرام ہونے کو بتلانے کے لیے آتا ہے۔تب پھر تین سے زیادہ دن تک کسی سے بول چال ختم کیے رکھنا حرام ہوگا۔

لِمُسْلِمٍ: بظاہر اس سے وہ شخص مراد ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔البتہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے ظاہری مسلمان یعنی منافق بھی مراد ہو سکتا ہے۔لیکن ''أَخَاهُ'' کا لفظ اس معنی کے مراد لینے میں مانع ہے۔کیونکہ ایک منافق کسی مسلمان کا دینی بھائی نہیں ہو سکتا۔

أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ: یہاں المسلم کی بجائے أَخَاهُ فرمایا جس میں دوسرے مسلمان بھائی کے لیے شفقت ورحمت اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔یعنی ایک مسلمان بھلا کیونکر اپنے مسلمان بھائی سے قطع تعلقی کر سکتا ہے۔

یہاں ہجر سے مراد ترک ہے، اب ترک کی متعدد صورتیں ہیں۔ یہاں ان میں سے کون سی صورت مراد ہے، اس کو نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا:

يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا: یعنی دونوں کا کسی راستے یا مسجد میں ایک دوسرے سے سامنا ہو تو دونوں ایک دوسرے سے منہ موڑ کر گزر جائیں۔

وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ: خَيْرُهُمَا: ''هما'' ضمیر دونوں ملنے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔یعنی ان دونوں ترکِ تعلق کرنے والوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شریعتِ اسلامیہ نے مسلمانوں پر ایسی باتوں کو لازم کیا ہے جن سے باہمی الفت ومحبت کو فروغ ملتا ہے۔ان میں سے ایک اہم بات ایک دوسرے کو سلام کرنا ہے کہ یہ سلام باہمی محبت بڑھاتا ہے اور آپس کے بغض کو دور کرتا ہے۔

◈ اسی لیے سلام کرنے کی ضد کو حرام کیا گیا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ترکِ تعلق کرنا ہے۔

◈ یہیں سے یہ بھی معلوم اہل معاصی (جیسے ریش تراش، سگریٹ نوش، سود خور وغیرہ) سے ترکِ تعلق حرام ہے۔ کیونکہ معصیت اخوت کو ختم نہیں کر دیتی۔حتیٰ کہ قتل عمد کے مرتکب کو بھی شریعت نے بھائی کہا ہے۔

[1] صحيح بخاري: 6077- صحيح مسلم: 2560.

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ﴾ (البقرة: 178)

''پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے۔''

- تین دن تک کسی سے تعلق ترک کیے رکھنا جائز ہے۔ اس کی دلیل "فوق ثلاث" کے الفاظ ہیں۔ وہ اس لیے کہ بسا اوقات دوسرے کے بارے میں جی میں ایک بات آ جاتی ہے۔ یوں پہلا دن تو غصہ میں گزر گیا۔ دوسرے دن میں غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ تیسرے دن طبیعت خالی خالی رہی۔ اب چوتھے دن غصہ رکھنے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ اب غصہ بالکلیہ ختم ہو چکا ہے۔
- سلام میں پہل کرنے والا ہر حال میں بہتر ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔
- معلوم ہوا کہ سلام کرنے سے باہمی ترکِ تعلق ختم ہو جاتا ہے۔
- اِعراض میں اصل ترکِ سلام ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اگر منہ موڑنا بھی داخل ہو جائے تو اس کی شدت و شناعت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

ہر نیکی صدقہ ہے

1462- وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ)). أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہر نیکی صدقہ ہے۔''[1]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح: ...... بلاشبہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد "جوامع الکلم" میں سے ہے۔ جو ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے حتیٰ کہ کسی کو خندہ پیشانی سے ملنا بھی اس حدیث کے مصداق میں داخل ہے۔ کسی کو کچھ دینا، کسی کو راستہ دکھا دینا، معاف کر دینا، دعا کر دینا، غرض معمولی سے معمولی نیکی بھی صدقہ کے حکم میں داخل ہے۔ جبکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو صدقہ ہے ہی۔

تنبیہ: ...... اس ارشاد سے نبی کریم ﷺ کی اپنی امت سے غرض مبارک یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور خیر کے معاملات کریں۔ کیونکہ ہر نیکی صدقہ ہے۔

1463- وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ)).

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''نیکی کی کسی بات کو معمولی نہ سمجھو چاہے یہ بات ہو کہ تم اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملو۔''[2]

(اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے)۔

غریب الحدیث: ...... لَا تَحْقِرَنَّ: یعنی اس کو چھوٹا اور حقیر نہ سمجھو۔

شَيْئًا: یہ نکرہ ہے جو نفی کے تحت آیا ہے، اس لیے عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔ لہٰذا اس کے عموم میں ہر چھوٹی بڑی نیکی داخل ہو گی۔

---

[1] صحیح بخاری: 6021. [2] صحیح مسلم: 2626.

أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ: اَخَاكَ: مراد مسلمان بھائی ہے۔ یہ نیکی کے کم از کم درجہ کا بیان ہے۔

تنبیہ:......آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی بھی نیکی کو معمولی نہ سمجھے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو قلم تھمانا ہے تو یہ بھی نیکی ہے۔ کسی کی گری چیز اٹھا کر دینا بھی نیکی ہے۔ کسی کو راستہ بتلانا بھی نیکی ہے، اور تو اور کسی کو خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی ہے۔ للہذا لوگوں کو منہ بسور کر نہ ملا جائے، البتہ اس میں کوئی شرعی مصلحت ہو تو اور بات ہے۔

پڑوسی کے ساتھ نیکی کرنا، چاہے معمولی سی ہی ہو

1464۔ وَعَنْهُ ﷺ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَكْثِرْ مَاءَ هَا ، وَتَعَاهَدْ جِيْرَانَكَ)).

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تم (کھانا بناؤ اور اس کا) شوربا بناؤ تو اس میں پانی (ذرا) زیادہ کر دو (تا کہ شوربا زیادہ بنے) اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو۔''[1] (چاہے وہ غنی ہو یا فقیر)۔

أَخْرَجَهُمَا مُسْلِمٌ.

(یہ اور گزشتہ حدیث) ان دونوں کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً**: اور یہ شوربا آدمی اپنے اہل خانہ کے افراد کے حساب سے بنا رہا ہو۔

فَأَكْثِرْ مَاءَ هَا: اگرچہ شوربا زیادہ ہو جانے سے کھانے کی لذت اور ذائقے میں فرق آ جاتا ہے لیکن اس پر جو مصلحت مرتب ہوتی ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کام آنے والی ہے۔

تَعَاهَدْ جِيْرَانَكَ: حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسی چاہے مالدار ہی کیوں نہ ہو، ان کا بھی خیال رکھا جائے۔ کیونکہ یہ صلہ کے باب میں سے ہے نہ کہ دفعِ ضرورت کے باب میں سے ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھے اور ان کے ساتھ احسان کرتا رہے۔

◈ اگر کسی چیز میں ملاوٹ کرنے سے اس کی قیمت کم ہوتی ہو، البتہ اس میں کوئی شرعی مصلحت ہو تو یہ جائز ہے۔ جیسے کسی گھر والے دن بھر گزارہ کرنے کے لیے دودھ میں پانی ملا دیں تا کہ دودھ بڑھ جائے اور اگلے دن تک سب بچوں کو کافی رہے تو یہ جائز رہے گا۔

البتہ اس سے مطلق ملاوٹ کا جواز مستفاد نہیں ہوتا۔ للہذا خرید و فروخت میں ملاوٹ حرام ہوگی۔ کیونکہ اس میں دوسرے کے حق غرر بھی ہے اور ضرر بھی ہے۔

◈ شریعت اسلامیہ پڑوسیوں کے حقوق پر بے حد توجہ دیتی ہے، اور یہ کہ پڑوسیوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔

◈ آدمی کو چاہیے کہ وہ محتاط اور ہوشیار رہا کرے۔ اس کی دلیل: "تَعَاهَدْ" کے الفاظ ہیں۔

کسی مسلمان سے کوئی تکلیف دُور کرنے اور اس پر آسانی کرنے کا بیان

1465۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی

[1] صحيح مسلم: 2625.

اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ)).

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی ایمان والے سے دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی تو رب تعالیٰ اس پر سے قیامت کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور فرمائے گا، اور جس نے کسی تنگدست پر آسانی کی تو رب تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، رب تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا، اور رب تعالیٰ (اپنے) بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ نَفَّسَ: نَفَّسَ: یہ وَسَّعَ کے معنی میں ہے۔ یعنی دور کرنا اور کشادہ کرنا۔

كُرْبَةً: یہ تنگی اور تکلیف کو کہتے ہیں۔

مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ: یہ بات سب کو معلوم ہے کہ روزِ قیامت کی تنگیاں، مصیبتیں اور تکلیفیں دنیا کی تکلیفوں اور تنگیوں سے بے حد سخت اور زیادہ ہیں۔ لہٰذا جو کسی سے دنیا کی کوئی تکلیف دور کرے گا، رب تعالیٰ اس پر سے قیامت کی کوئی ایسی مصیبت دور فرمائے گا جو دنیا کی مصیبت سے حد درجہ سخت ہوگی۔

وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ: چاہے یہ سہولت کرنا کسی بھی چیز میں ہو، اور جان مال یا عمل وغیرہ میں سے کسی بھی چیز کے ذریعے ہو، سب اس کے مصداق میں داخل ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی سے صحیح لکھا نہیں جا رہا تو اس کی اس تکلیف کو دور کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: چنانچہ مقروض کو مہلت دینا بھی تیسیر میں داخل ہے جس کے بدلے میں رب تعالیٰ قرض خواہ پر دنیا و آخرت میں سہولت فرمائے گا۔ جبکہ کسی کی اس کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر مدد کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا، سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: یہ جنس عمل سے جزا دینے کی قبیل سے ہے۔ اس میں دوسرے کے گناہوں خامیوں، کمیوں، کوتاہیوں اور عیبوں وغیرہ سب کو چھپانا شامل ہے۔ چنانچہ جو دوسروں کے عیب چھپائے گا رب تعالیٰ بھی اس کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔

وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ: یہ ایک قاعدہ عامہ کا بیان ہے۔ لہٰذا جو بندہ اپنے بھائیوں کی مدد میں لگا رہتا ہے رب تعالیٰ بھی اس کی مدد فرماتے رہتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مسلمان کی تکلیفوں کو دور کرنے کی ترغیب۔
- جیسا عمل ہوگا جزا بھی ویسی ہی ملے گی۔ بلکہ عمل سے بڑی جزا ملے گی۔ چنانچہ دنیا کی تکلیف دور کرنے کی جزا آخرت

[1] صحيح مسلم: 2699.

کی تکلیف دور کیے جانے کی صورت میں ملے گی جو یقیناً دنیا کی تکلیف سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

- تنگدست پر سہولت کرنی چاہیے۔ جبکہ رب تعالیٰ اس کے بدلے میں دوگنا اجر اور بدلہ دے گا کہ دنیا کی تنگی میں سہولت دے گا اور آخرت کی تنگی میں بھی سہولت دے گا۔
- تنگدست پر آسانی کرنے کی دو قسمیں ہیں:

(1) تنگدست کے ذمے کسی کا وہ حق جو وہ ابھی ادا نہیں کر سکتا کہ ایسے حق میں سہولت کرنا واجب ہے۔ چنانچہ جو ابھی قرض ادا نہیں کر سکتا، اس سے قرض کا مطالبہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ بلکہ اسے سہولت اور مہلت دینا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ (البقرة: 280)

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو آسانی تک مہلت دینا لازم ہے۔''

(2) البتہ بعض مواقع میں تیسیر واجب نہیں ہوتی۔ وہاں تیسیر کرنا مستحب ہوگا۔ جیسے غنی سے قرض کے مطالبہ میں تیسیر کرنا اسی قسم میں داخل ہے۔

- مذکورہ حدیث میں مسلمان بھائیوں کی پردہ پوشی کرنے کی از حد بلیغ ترغیب ہے کہ اس کی جزا میں رب تعالیٰ اس کے عیبوں کو دنیا و آخرت میں چھپائے گا۔
- آخرت اور وہاں کی جزا سزا سب ثابت ہے۔
- دوسرے مسلمان کی اعانت کی جائے۔ البتہ اس میں جائز مقصد کا ہونا شرط ہے، اور یہ کہ اس میں دنیا یا آخرت کا کوئی ضرر نہ ہو۔ لہٰذا کسی کی اس کے ناجائز مقاصد میں اعانت کرنا جائز نہ ہوگا۔

نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا نیکی کرنے والے جیسا ہے

1466- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے (دوسرے کی) کسی خیر کی طرف رہنمائی کی، اسے (نیکی اور) خیر کرنے والے کے اجر جیسا (اجر) ملے گا۔''[1]

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح:...... یہ بھی بے حد عظیم اور بلند احادیث میں سے ایک ہے۔

عَلَى خَيْرٍ: اس سے کوئی بھی خیر مراد ہو سکتی ہے۔ لیکن جب:

فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ: فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہاں خیر اور نیکی سے مراد وہ نیکی ہے جو دینی ہو جس پر اخروی اجر بھی مرتب ہوتا ہے۔ پس جس نے کسی دینی خیر کی طرف دلالت کی اسے ویسا ہی اجر ملے گا جیسا اس خیر کے کرنے والے کو ملے گا۔

اب دلالت اور رہنمائی کی دو قسمیں ہیں:

---

[1] صحيح مسلم: 1893.

(1) ایک یہ کہ آدمی بذات خود اس نیکی کی طرف رہنمائی کرے جیسے کسی کو سنن ونوافل کی تفصیل خود بتلائے۔

(2) دوسری یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی ایسے شخص کی طرف رہنمائی کر دے جو اس کی نیکی اور ہدایت کی طرف رہنمائی کر دے گا۔ جیسے کسی کے مسئلہ پوچھنے پر آدمی اسے ایسے کسی عالم کا پتا بتا دے جو اسے صحیح مسئلہ بتا دے۔

پھر ایک اور اعتبار سے بھی دلالت کی دو قسمیں:

(1) ایک قول کے ذریعے دلالت۔

(2) دوسرے عمل کے ذریعے دلالت کہ لوگ قول اور عمل دونوں کے ذریعے دلالت اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ عمل کے ذریعہ زیادہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں کہ لوگ عمل کی پیروی قول سے زیادہ کرتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- خیر کی باتوں پر دوسروں کی رہنمائی کرنے کی زبردست ترغیب۔ چاہے یہ قول سے ہو یا فعل سے۔ چنانچہ خطباء اور واعظین کا منبر ومحراب میں لوگوں کو دینی باتوں کی تعلیم دینا یہ قول کے ذریعے خیر پر دلالت ہوگی، اور صلحاء اور مرشدین کا اپنے افعال کے ذریعے نیکیوں پر رہنمائی کرنا یہ دلالت فعلیہ کہلائے گی۔ غرض خیر پر رہنمائی کے متعدد طریق ہیں۔
- ''اسباب'' مقاصد کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بیان ہوا۔
- یاد رہے کہ نیکی پر رہنمائی کرنے والے کو ملنے والے اجر سے خود نیکی کرنے والے کے اجر میں سے کچھ بھی کم نہ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل "فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ" کے الفاظ ہیں کہ اس کے اجر کے برابر اجر ملے گا۔ نہ کہ اس کے اجر میں سے کچھ کم کر کے رہنمائی کرنے والے کو اجر دیا جائے گا۔

نیکی کا بدلہ دینا

1467- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنِ اسْتَعَاذَكُمْ بِاللّٰهِ فَأَعِيذُوهُ، وَمَنْ سَأَلَكُمْ بِاللّٰهِ فَأَعْطُوهُ، وَمَنْ أَتَى إِلَيْكُمْ مَعْرُوفًا فَكَافِئُوهُ، فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فَادْعُوا لَهُ)).

أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو تم سے اللہ کے نام پر پناہ مانگے تو اسے تم پناہ دو، اور جو تم سے اللہ کے نام پر (کچھ) مانگے تو تم اسے (وہ شے دے) دو، اور جو تمہارے ساتھ کوئی نیکی کرے تو تم اسے (اس کی نیکی کا) بدلہ دو، اور اگر تم (نیکی کا بدلہ دینے کو کچھ) نہ پاؤ تو اس کے لیے دعا ہی کر دو۔'' [1]

اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......مَنِ اسْتَعَاذَكُمْ: یہاں استعاذہ سے مراد کسی شے کی پناہ پکڑنا ہے، مراد یہ ہے کہ جو اللہ کے نام پر پناہ مانگے اسے پناہ دی جائے۔ مثلاً یہ کہے کہ: ''میں اللہ کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتا ہوں''، تو اسے ضرور پناہ دی جائے گی۔ کیونکہ اس نے ایک عظیم پناہ گاہ کو پکڑا ہے اور وہ رب کریم کی ذاتِ مقدسہ ہے۔ البتہ اس میں حدود کی بابت مخلوق کے

---

[1] سنن ابی داؤد: 5109- سنن البیہقی: 199/4- امام ابن حبان (3408) اور امام حاکم (572/1) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے، اور انہوں نے اس حدیث کے متعدد شواہد بھی ذکر کیے ہیں۔

آگے اللہ کے نام کی سفارش کرنا شامل نہیں کہ یہ حرام ہے۔ لہٰذا حقوق کے اسقاط اور حدود اللہ کے معاف کر دینے کی بابت کسی کی سفارش کرنا منع اور حرام ہوگا۔

گو حدیث کے ظاہر سے رب تعالیٰ کے نام کا استعاذہ مطلق معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں حق واجب کا اسقاط شامل نہ ہوگا۔ لہٰذا اگر قرض خواہ اپنا دیا ہزار روپیہ مانگنے آیا اور مقروض نے یہ کہہ دیا کہ میں تم سے رب تعالیٰ کے نام پر پناہ مانگتا ہوں تو اس پر قرض کا مطالبہ نہ کرنا واجب نہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے عامل زکوٰۃ کو اسی طرح کے الفاظ کہہ دیے تو عاملِ زکوٰۃ پر اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ نہ کرنا لازم نہ ہو جائے گا۔

مَنْ سَأَلَكُمْ بِاللّٰهِ فَأَعْطُوهُ: ان کلمات کی تفسیر میں حضرات شارحین رحمہ اللہ کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا اس سے ایسی بات کا سوال کرنا مراد ہے جس کا وہ شرعاً مستحق ہے یا یا مطلق کسی روزمرہ کی چیز کا سوال کرنا مراد ہے؟ تو اس میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ جبکہ شرعی قاعدہ یہ ہے کہ جب قرآن وسنت کی کسی نص میں دو معانی کا احتمال ہو، اور وہ دونوں معانی ایک دوسرے کے منافی بھی نہ ہوں تو اس نص کو ان دونوں معانی پر حمل کرنا واجب ہوگا۔

پس اگر کسی نے ایسی چیز کا سوال کیا جس کا وہ شرعاً بھی مستحق ہے تو اسے وہ چیز دینا لازم ہوگا۔ جیسے کوئی فقیر مالِ زکوٰۃ کا سوال کرے تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ کیونکہ وہ زکوٰۃ کے شرعی مستحقین میں سے ہے۔ البتہ یہ فقیر سوال کر کے اس فقیر سے زیادہ مالِ زکوٰۃ کا مستحق بن گیا جس نے ابھی تک زکوٰۃ کا سوال نہیں کیا۔

تب پھر اگر کسی نے ایسی چیز کا سوال کیا جس کا وہ شرعاً بھی مستحق ہے تو اسے وہ چیز دینا لازم ہوگا۔ جیسے کوئی فقیر مالِ زکوٰۃ کا سوال کرے تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ کیونکہ وہ زکوٰۃ شرعی مستحقین میں سے ہے۔ البتہ یہ فقیر سوال کر کے اس فقیر سے زیادہ مالِ زکوٰۃ کا مستحق بن گیا جس نے ابھی تک زکوٰۃ کا سوال نہیں کیا۔

تب پھر اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ زکوٰۃ کا سوال کرنے والا یہ شخص غنی ہے تو اس کے سوال کا پورا کرنا لازم نہ ہوگا۔

مذکورہ کلمات کی یہ تفصیل ایک تفسیر کے مطابق ہے۔ رہا ان کلمات میں دوسرے معنی کا احتمال کہ جو محض اللہ کے نام پر کچھ مانگ لے، آیا اسے وہ چیز دینا ضروری ہے یا نہیں، تو اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

پس اگر تو کسی نے ایسی چیز کا سوال کیا جو اسے حلال ہی نہ تھا تو اس کا وہ سوال پورا نہ کیا جائے گا۔ جیسے کسی نے آ کر یہ کہا کہ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے یہ سگریٹ خرید کر دے دو، تو اسے سگریٹ خرید کر ہرگز بھی نہ دیا جائے گا۔ البتہ ایسے شخص کو اس سے بہتر شے دی جائے گی اور وہ خیر کی نصیحت کہ ہم اسے سگریٹ نوشی ترک کر دینے کی نصیحت کریں گے۔

اور اگر کسی نے کسی مباح شے کا سوال کیا لیکن وہ خود مسئول کی ضرورت بھی ہو۔ جیسے کسی نے ہاتھ میں گھڑی باندھ رکھی تھی اور دوسرے نے اللہ کے نام پر وہ گھڑی مانگ لی تو ایسی مباح چیز دینا لازم نہ ہو جائے گی۔ چاہے وہ اللہ کے نام پر ہی مانگی گئی ہے۔ کیونکہ خود مسئول کی ضرورت اسی شے سے وابستہ ہے۔ ہاں اگر کسی کے پاس ضرورت سے زائد شے ہو تو دے دے۔ پس اگر یوں ہر ایک کے سوال پر اس سوال کو پورا کرنا لازم کر دیا جائے تو لوگ شدید مشکل سے دوچار ہو جائیں گے۔

تب پھر یہ کہا جائے گا کہ نصوص میں وارد ایسے جملہ اطلاقات شریعت کے معروف و معلوم قواعد کے ساتھ مقید ہوں گے، اور وہ اتباعِ مصالح اور اجتنابِ مفاسد کے مسلّم اصول ہیں۔

وَمَنْ أَتَى إِلَيْكُمْ مَعْرُوفًا فَكَافِئُوهُ: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے صدقہ کر کے یا ہدیہ اور ہبہ کر کے یا کوئی اچھی بات کر کے ہی احسان اور نیکی کی ہے تو اسے اس کی اس نیکی کا بدلہ ضرور دیا جائے۔ چنانچہ اگر کسی نے ایک مجلس میں تمہاری اچھائی بیان کی ہے تو لازم ہے کسی دوسری مجلس میں تم بھی اس کی اچھائی بیان کرو۔ اسی پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیا جائے۔

فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا، فَادْعُوا لَهُ: مثلاً اگر کسی نے ہدیہ دیا اور مَهْدِي اليه (جس کو ہدیہ دیا گیا ہے، اس) میں ہدیہ دینے کی سکت نہ ہو تو وہ مُهْدِي (یعنی ہدیہ کرنے والے) کے لیے دعا ضرور کر دے کہ یہ دعا اس کی نیکی اور ہدیہ کے مقابل ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر کسی جگہ ہدیہ وغیرہ کا بدلہ دینا رائج نہ ہو اور لوگ اسے دیا ہدیہ واپس کرنا شمار کرتے ہیں تو وہاں بھی ایسے ہدیہ کا بدلہ اسے دعا دے دینا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ کے نام کی تعظیم۔ اس کی دلیل "مَنِ اسْتَعَاذَكُمْ بِاللّٰهِ فَأَعِيذُوهُ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ دشمن کے مکر وفریب سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگنا جائز ہے۔ اس کی دلیل بھی یہی مذکورہ بالا کلمات ہیں۔ البتہ جو اپنے ذمہ واجب کے دفعیہ کے لیے رب تعالیٰ کے نام کی پناہ مانگے گا تو اسے پناہ نہ دی جائے گی۔
- جو (غریب الحدیث کے تحت مذکورہ دونوں صورتوں کے مطابق) کسی شے کا سوال کرے گا، اسے وہ شے دی جائے گی۔ البتہ جو شرعی صورت سے ہٹ کر سوال کرے گا اس کا سوال پورا نہ کیا جائے گا۔
- نیکی کا بدلہ دینا چاہیے۔ حدیث کے ظاہر سے اس کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ وجوب بھی استطاعت کے ساتھ مشروط ہے، وگرنہ نیکی کرنے والے کے لیے دعا کر دی جائے کہ یہ بھی بدلہ ہی دینا ہے۔
- نیکی کا بدلہ دینے کی مشروعیت شریعت کی خوبی میں سے ہے کہ اس میں نیکی کرنے والے کی از حد حوصلہ افزائی ہے۔

3۔ بَابُ الزُّهْدِ وَالْوَرَعِ ...... زہد وورع کا بیان

الزُّهْد: زہد ایسی شے کے ترک کو کہتے ہیں جو آخرت میں نافع نہ ہو، چنانچہ زاہد صرف وہی کام کیا کرتا ہے جو آخرت میں کام آئیں، اور وہ ہر اس کام کو ترک کر دیتا ہے جس کا آخرت میں کوئی نفع نہ ہو۔

وَرَع: یہ ان باتوں کے ترک کو کہتے ہیں جو آخرت کا نقصان کرتی ہوں۔ تب پھر زاہد اور متورع میں سے زیادہ کامل حال زاہد کا ہے۔ کیونکہ غیر نافع اور مضر میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ پس جو شے نہ تو نافع ہو اور نہ مضر ہی ہو، زاہد اس کو بھی چھوڑ دے گا۔ ہاں متورع اس کے کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھے گا۔

حلال، حرام اور مشتبہ باتوں کا بیان

1468۔ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ۔ وَأَهْوَى النُّعْمَانُ بِأُصْبُعَيْهِ إِلَى أُذُنَيْهِ۔ ((إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ، وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: یہ بات فرماتے ہوئے جناب نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے اپنی دو انگلیوں کو اپنے کانوں کی طرف بڑھایا...... (کہ): ''بے شک حلال (بھی) واضح ہے، اور حرام (بھی) واضح ہے اور (یہ کہ) ان کے دونوں بیچ میں کچھ

الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ. كَالرَّاعِيْ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوْشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيْهِ، أَلَا! وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا! وَإِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا! وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ)).

مشتبہ چیزیں ہیں جن (کے حلال یا حرام ہونے) کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شبہات سے بچ گیا اس نے اپنی اور اپنی آبرو کی پاکی کو حاصل کر لیا، اور جو شبہات میں جا پڑا، وہ حرام میں جا پڑا، جیسے وہ چرواہا جو چراہ گاہ کے اردگرد (اپنے جانوروں کو) چراتا ہے تو قریب ہے کہ وہ اس میں جا پڑے گا۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، خبردار کہ رب تعالیٰ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ باتیں ہیں، خبردار کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ سدھر جاتا ہے تو پورے کا پورا بدن سدھر جاتا ہے، اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو پورے کا پورا بدن بگڑ جاتا ہے۔ خبردار کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔ [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

تَنْبِيْه:...... یہ حدیث گزشتہ میں گزر چکی ہے۔ وہاں اس پر مفصل کلام کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

دنیا کی محبت سے بچو

1467۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ وَالْقَطِيْفَةِ، إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ، وَإِنْ لَمْ يُعْطَ لَمْ يَرْضَ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دینار درہم اور کپڑے کا غلام ہلاک ہو، کہ اگر اسے ملے تو خوش رہے اور اگر نہ ملے تو ناراض رہے۔'' [2]

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... **تَعِسَ**: ہلاک ہونا اور خائب و خاسر ہونا۔

الدِّيْنَارِ، وَالدِّرْهَمِ: دینار سونے کے اور درہم چاندی کے ڈھلے سکوں کو کہتے ہیں۔ **الْقَطِيْفَةِ**: جھالردار چادر یا کمبل کو کہتے ہیں۔ یہ مخمل جیسا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے۔ مراد عمدہ کپڑا ہے جو عموماً بستر پر بچھانے کے کام آتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ درہم و دینار اور کپڑوں کا بندہ ہونے سے کیا مراد ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس کے لازمی معنی سے اس کو بیان فرما دیا ہے کہ اگر تو اسے درہم و دینار ملتے رہیں تو رب پر راضی رہے وگرنہ ناخوش رہے، یوں یہ ان کا بندہ یعنی غلام بن کر رہ گیا۔ کیونکہ ان چیزوں نے اس کے حواس پر قبضہ جما لیا ہوا ہے۔ یہ ملیں تو کھلے وگرنہ مرجھایا مرجھایا رہے۔ پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہی چیزیں اب اس کی عقل و فہم اور فکر و ارادہ کا مرکز و محور بن کر رہ گئی ہیں، اور یہی ان چیزوں کی بندگی کی

---

[1] صحیح بخاری: 52۔ صحیح مسلم: 1599.
[2] صحیح البخاری: 6435.

حقیقت ہے کہ:

(1) آدمی ان کے آگے ذلت اختیار کرتا ہو۔ وہ یوں کہ اس کی خوشی اور ناخوشی ان کے ملنے یا نہ ملنے کے تابع ہو۔

(2) اور یہ کہ ان چیزوں نے اس کے دل پر قبضہ جما لیا ہوا ہے اور اب یہی چیزیں اس کی فکر وارادہ، حرکت وسکون، عقل وفہم اور غم بن کر رہ گئی ہیں، انہی کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتا ہو، اور انہی کے لیے پڑا رہتا ہو۔ یعنی ان کے حصول کے لیے سرگشتہ اور منتشر رہتا ہو اور مل جانے پر ان میں بدمست اور مستغرق رہتا ہو۔ یہ ہے درہم ودینار کی بندگی کا وہ مطلب جس کو خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادیا ہے، نہ کہ یہ مراد ہے کہ آدمی درہم ودینار اور قیمتی کپڑوں کو سامنے رکھ کر ان کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ جس کی ہمت وارادہ صرف دنیا ہی بن کر رہ گئی ہو وہ خائب وخاسر ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝﴾ (المنافقون: 9)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

- معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت کو دل سے نکال دینے میں ہی فلاح ہے۔ اگر مرنے سے پہلے پہلے یہ حالت نصیب ہو جائے تو زہے نصیب!!!
- اس حدیث میں اس بات کی طرف ایک بلیغ اشارہ بھی ہے کہ جب آدمی کو ماسوا اللہ میں سے کسی چیز سے کامل تعلق ہو جائے تو آدمی اس شے کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔
- اور سب سے بلیغ بات جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، یہ ہے کہ آدمی کی رضا اور ناراضی اور صرف اللہ کی رضا اور ناراضی میں ہی ہو۔

دنیا ایک مسافر خانہ ہے

1470, 1471۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِمَنْكِبَيَّ، فَقَالَ: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ، أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہما يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِسَقَمِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نے میرے دونوں کندھوں کو پکڑا اور فرمایا: ''دنیا میں یوں رہو جیسے تم کوئی پردیسی ہو یا راہ چلتے مسافر۔''[1] اور (نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بعد) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار مت کر، اور جب تو صبح کرے تو شام کا انتظار مت کر، اور اپنی صحت (کے زمانے) سے اپنی بیماری کے (زمانے کے) لیے (کچھ) لے لے

[1] صحيح بخاري: 6416.

اور اپنی زندگی (کے اوقات) سے اپنی موت (کے بعد) کے لیے (کچھ اکٹھا کر) لے۔

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ . اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......بِمَنْكِبِيَّ: یہ منکب کی تثنیہ ہے جو یائے متکلم کی طرف مضاف ہے، منکب یہ کندھے کے ایک کنارے کو کہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جناب ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اُس بات کی طرف متنبہ فرمانے کے لیے ان کے دونوں کندھوں کو پکڑا تھا جو آپ ﷺ نے بعد میں ارشاد فرمائی تھی۔

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ، أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ: نبی کریم ﷺ نے جنابِ عمر رضی اللہ عنہ کو دو باتوں کی وصیت فرمائی:

(1) ایک یہ کہ اس دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی ''غریب'' ہوتا ہے۔ غریب غیر وطن میں ٹھہرنے والے کو کہتے ہیں (جس کو ہماری اردو زبان میں پردیسی کے معروف لفظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں) اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ پردیس میں رہنے والے کو پوری راحت اور سکون نہیں ملتا۔ بلکہ اسے ایک طرح کی بے چینی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ مسجد میں جائے یا بازار میں اسے کوئی شناسا اور اپنا دکھائی نہیں دیتا، نہ اسے کوئی انیس و رفیق ملتا ہے اور نہ کوئی مونس و غم خوار۔

(2) اور دوسری وصیت یہ فرمائی کہ یا پھر دنیا میں یوں رہو جیسے کوئی راہ گیر ہوتا ہے۔ یہ پہلی سے بھی زیادہ اشد صورت ہے۔ کیونکہ ''غریب'' کے پاس چلو کوئی نہ کوئی ٹھکانا تو ہوتا ہے، جبکہ راہ گیر کے پاس تو وہ بھی نہیں ہوتا کہ نہ چھت، نہ چھاؤں، بس چلتے جانا ہے۔

اس انتہائی بلیغ وصیت میں دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک مومن کا دنیا اور دنیا والوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، وہ ان سے دور رہے، بس کسی پردیسی یا راہ گیر کی طرح ہی ان میں اختلاط رکھے جس کا ارادہ وطن تک پہنچنے سے قبل کہیں مستقل قیام کرنا نہیں ہوتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ امت کو مفید سے مفید تر باتوں کی وصیت و نصیحت فرمانے کے بے حد شائق تھے۔
- نبی کریم ﷺ اپنے قول و فعل دونوں سے ایسی باتوں کو استعمال فرماتے تھے جو کلام میں تاکید اور توجہ و التفات میں زیادتی کا سبب بنیں۔ چنانچہ جیسے آپ ﷺ آلا کے کلمہ کو کثرت سے استعمال فرمایا کرتے تھے، اسی طرح یہاں آپ ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے کندھوں کو پکڑا اور یہ فعل کے ذریعے مخاطب کی توجہ کو مبذول کرانا اور اس میں اور زیادہ تنبہ پیدا کرنا ہے۔
- دنیا کی طرف نہ تو جی کو متوجہ کیا جائے اور نہ دنیا کو ٹھہرنے کی جگہ ہی سمجھا جائے۔ اس کی دلیل "كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ، أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی دنیا میں یوں رہو کہ اس میں جی نہ لگے بلکہ کسی راہ گیر کی طرح کا تعلق ہو۔
- ہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس بات کا مطلق حکم نہیں دیا کہ ہم دنیا کو بالکل چھوڑ ہی دیں بلکہ دنیا سے صرف اسی قدر تعلق رکھیں جتنا ایک اجنبی کا پردیس سے اور ایک راہ گیر کا راستے سے تعلق ہوتا ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ دنیا کو ہی اپنا سب سے بڑا غم نہ بنایا جائے وگرنہ دونوں جہانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے کہ دنیا تو چاہنے کے باوجود چھوٹ کر رہے گی جبکہ آخرت ہاتھ نہ آئے گی کہ دنیا میں مستغرق ہونے کی بنا پر اس کے حصول کے لیے سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی تھی۔

◈ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مذکورہ قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ارشاد سے ماخوذ ہے کہ صبح ہو تو شام کا، اور شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کیا جائے، اور اس شخص کی طرح عمل میں لگ جایا جائے جو اپنی مزدوری کے متعین وقت کے شروع ہو جانے پر کسی چیز کا انتظار نہیں کرتا اور کام میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کسی کام کو کل پر نہیں ٹالتا اور نہ فکرِ فردا ہی اسے دامن گیر ہوتی ہے۔

◈ ''صحت کے زمانہ میں بیماری کے دنوں کے لیے کچھ کر لے۔'' بلاشبہ یہ ایک نہایت حکیمانہ قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحت مند کے لیے عمل کرنا آسان ہوتا ہے، تب شرح صدر بھی حاصل ہوتا ہے اور طبیعت میں مستعدی و بشاشت بھی ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس بیمار آدمی کے لیے عمل کرنا دشوار ہوتا ہے، طبیعت میں گرانی اور نفس میں ثقل ہوتا ہے۔ دل گھٹا گھٹا اور مزاج میں ایک گونہ تلخی سی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بیمار لوگوں کو کسی سے بات کرنا پسند نہیں ہوتا۔

تب پھر اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ صحت وتندرستی میں اتنا عمل کر لو کہ بیماری کے ایام میں کوئی حسرت نہ رہے۔

◈ ''زندگی میں موت کی تیاری کرنا'': انسان جب تک زندہ ہے ہر نیکی کے لیے آزاد ہے، لیکن جب مر جائے گا تو عمل کرنے کا اور آخرت کے لیے توشہ اکٹھا کرنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ البتہ تین قسم کے کام جاری رہیں گے:

(1) صدقہ جاریہ۔ (2) علم نافع۔ (3) اور دعا کرنے والی اولاد۔

چنانچہ آج مرنے کے بعد کے لیے زندگی میں عمل کر لیا جائے وگرنہ مرنے کے بعد ایک طویل ترین زمانہ تک قبروں میں یوں ہی بے کار پڑے رہیں گے، اور چاہتے ہوئے بھی معمولی سی بھی کوئی نیکی نہ کر سکیں گے۔

◈ دنیا سے زہد اختیار کیا جائے اور اسے اپنا ٹھکانا، وطن یا جائے پناہ نہ سمجھا جائے۔

◈ ایک محتاط، ہوشیار اور زیرک آدمی کسی موقع اور فرصت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، چنانچہ وہ زندگی کے ہر لحہ کو قیمتی سمجھتا ہے اور صحت و بیماری دونوں میں عمل کے لیے تیار اور چاک و چوبند ہوتا ہے۔

نیکوں جیسا بننے کی ترغیب

1472۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے (شمار ہوتا) ہے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......مَنْ تَشَبَّهَ: مراد ایسا کوئی کام کرنا ہے جس کی وجہ سے وہ اس قوم کے مشابہ بن جائے

❶ سنن ابی داؤد: 4031۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "الفتاوی: 331/25" میں اس حدیث کو عمدہ کہا ہے۔ جبکہ امام موصوف رحمہ اللہ نے "فتح الباری: 271/10" میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

اور مشابہت کسی قوم کے خصائص کو اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مشابہت عقیدہ، عبادت، لباس اور عادت وغیرہ کے ذریعے پیدا ہوگی اور مذکورہ حدیث مشابہت کی ان سب صورتوں کو عام ہے۔ تو جب یہ حدیث عام ہے تو ارشاد نبوی "فَهُوَ مِنْهُمْ" کو دوسرے دلائل کے مقتضا پر اتارا جائے گا۔ مثلاً جس نے عقیدہ میں کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انہی میں شمار ہوگا چاہے اس عقیدہ کا تعلق الوہیت سے ہو یا ربوبیت سے، اور اس کے بعد اگر وہ آدمی ان میں سے ہونے کی نفی کرتا ہے تو اس کا یہ قول تسلیم نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اسے یہ کہا جائے گا کہ تم اس عقیدہ کے باب میں انہی جیسے ہو، اور اس اعتقاد کی بنا پر جو حکم ان کا ہے، وہی تمہارا بھی ہے۔

یہی حکم اعمال وعبادات میں مشابہت اختیار کرنے کا ہے۔ چنانچہ اگر ایک آدمی اہل بدعت جیسے کام کر کے خود کو اہل سنت میں داخل کرنے کی کوشش کرے تو اسے بدعتی ہی کہا جائے گا کیونکہ اس نے اہل بدعت کے اعمال کی مشابہت اختیار کی ہے۔

اسی طرح جو عادات میں کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہی میں سے شمار ہوگا۔ چنانچہ جو کفار اشرار کی طرح بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بزعم خویش اسے تہذیب وتمدن کی ترقی باور کرتا ہے، اسی طرح عورتوں کی بے حجابی کے باب میں پردہ نہ کرنے کو اور غیر قوموں کی طرح لباس پہننے کو ترقی اور شائستگی سمجھتا ہے، وہ انہی میں شمار ہوگا۔

غرض تشبہ صرف انہی امور میں ہوگا جو غیروں کے خصائص ہوں۔ رہا یہ سوال کہ آیا کفار سے تشبہ اختیار کرنے والا کافر ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تشبہ کا حکم جس چیز میں تشبہ اختیار کیا ہے، اس کے اعتبار سے ہوگا۔ پس اگر خالص کفر میں تشبہ اختیار کیا ہے، جیسے بت کو پوجا، تلک لگایا یا زنار باندھا تو یہ کفر میں تشبہ ہونے کی وجہ سے کفر ہوگا۔ جبکہ لباس اور عادت میں تشبہ کا حکم لباس اور عادت کا ہی ہوگا نہ کہ کفر کا، لہٰذا اس کو بدعت اور مکروہ کہا جائے گا یا دیگر دلائل کے حسب منشا حرام کہا جائے گا۔

البتہ یہاں "فَهُوَ مِنْهُمْ" کے اس دقیق پہلو کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ جو ظاہر میں کفار کی مشابہت اختیار کرے گا تو اللہ نہ کرے کہ یہ مشابہت رنگ لے آئے اور شدہ شدہ وہ آدمی باطن میں بھی کفر میں ڈھل جائے۔ والعیاذ باللہ۔

تب پھر ارشاد میں نہایت بلیغ تحذیر بھی ہے کہ کافروں کے ساتھ ہر قسم کی مشابہت اختیار کرنے سے ہر حال میں بچا جائے، چاہے اس مشابہت کا تعلق کسی ادنیٰ سے امر سے ہی کیوں نہ ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ اس حدیث میں صالحین کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کی زبردست ترغیب ہے۔ کیونکہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ، فَهُوَ مِنْهُمْ" پر یہ فائدہ متفرع ہوتا ہے کہ عقیدہ، عبادت اور منہج میں صالحین کی مشابہت اختیار کی جائے۔ تاکہ آدمی انہی میں سے شمار ہو، البتہ جو کام یہ حضرات صالحین بطور عادت کے کرتے ہیں، اس میں ان کی مشابہت اختیار کرنا ضروری نہیں۔ جیسے لباس کہ اس میں اپنے اپنے علاقہ کا رائج لباس پہننا جائز ہوگا۔ جب تک کہ وہ حرام کی حدود میں داخل نہ ہو۔

◈ کفار کی مشابہت کی تحذیر، کیونکہ اس پر "فَهُوَ مِنْهُمْ" کی وعید آئی ہے۔

یہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے جو انہوں نے "اقتضاء الصراط المستقیم" میں اختیار فرمایا ہے کہ تشبہ بالکفار کا کم از کم حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے۔

◈ جب بھی تشبہ حاصل ہوگا تو اس کا حکم بھی ثابت ہو جائے گا اور وہ حکم تشبہ کے اعتبار سے ہوگا۔ لہٰذا اس میں کسی کی قلبی نیت

کا اعتبار نہ ہوگا اور حکم ظاہر پر لگے گا۔ پس اگر کسی نے تشبہ کے ارادہ کے بغیر بھی تشبہ بالکفار کو اختیار کیا تو اس کی نیت غیر معتبر ہوگی اور حکم ظاہر کے اعتبار سے ہوگا۔

◈ مذکورہ حدیث میں اہل بدعت وھواء کی مشابہت کی بھی تحذیر ہے۔

اللہ کی حدود کی حفاظت رب تعالیٰ کی حفاظت کا ذریعہ ہے

1473۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا، فَقَالَ: ((يَا غُلَامُ! احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''ایک دن میں (ایک سواری پر) نبی کریم ﷺ کے پیچھے سوار تھا تو آپ ﷺ نے (مجھے مخاطب کر کے) ارشاد فرمایا: ''اے نوجوان! اللہ کی حفاظت کر کہ وہ تیری حفاظت کرے گا، اللہ کی حفاظت کر تو تو اسے اپنے سامنے پائے گا، اور تجھے مانگنا ہی ہو تو اللہ سے مانگ اور جب تو مدد طلب کرے تو اللہ کی مدد طلب کر۔'' ❶

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ صَحِيحٌ.

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

غریب الحدیث: ...... **كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ:** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پیدل چلتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے پیچھے تھے یا سواری پر ہوتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے پیچھے تھے؟

مذکورہ حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں۔ البتہ بظاہر مراد سواری کے پیچھے سوار ہونا ہے۔

يَا غُلَامُ: چونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کم سن تھے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے انہیں ایسے مشفقانہ الفاظ کے ساتھ مخاطب فرمایا۔

احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ: مراد اللہ کے دین کی حفاظت کرنا ہے نہ کہ رب تعالیٰ کی ذات کی حفاظت کرنا مراد ہے۔ کیونکہ وہ ذات تو سب جہانوں اور سب جہان والوں سے بے نیاز ہے، اور دین کی حفاظت سے مراد رب تعالیٰ کے اوامر کا امتثال، نواہی سے اجتناب، فرائض وواجبات کا قیام اور محرمات کا ترک ہے۔

يَحْفَظْكَ: یہ جواب امر ہے، اور یہ رب تعالیٰ کے دین کی حفاظت کرنے کی جزا اور اس کے ثواب کا ذکر ہے کہ ایسے آدمی کے دین ودنیا دونوں کی حفاظت رب تعالیٰ فرمائے گا۔ چنانچہ اس کی جان ومال اور اہل وعیال سب کی حفاظت رب تعالیٰ فرمائے گا۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں رب تعالیٰ کی حفاظت کا ذکر مطلق ہے نہ کہ مقید۔

تَجِدْهُ تُجَاهَكَ: مراد سامنے پانا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ اس کی خیر کے کاموں کی طرف رہنمائی

---

❶ جامع الترمذی: 2516۔ مسند احمد: 293/1۔ مسند ابی یعلی: 2556۔ یہ حدیث متعدد طریق کے ساتھ مروی ہے جن کو ابن رجب نے جامع العلوم: ح/19 میں ذکر کیا ہے۔ ابن رجب نے ابن مندہ کا قول نقل کیا ہے کہ ان سب طرق میں سب سے صحیح طریق امام ترمذی رحمہ اللہ کا ہے۔

فرمائے گا۔ کیونکہ جو سامنے ہوتا ہے، وہی راستہ دکھاتا ہے۔

وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ: یعنی مانگنا ہے تو اللہ سے مانگ، لوگوں سے نہ مانگ، چاہے جو شے بھی ہو، البتہ سخت ضرورت میں بندوں سے سوال کرنا جائز ہے، اور یہ ایک اور حال ہے۔ لیکن بہر حال سوال صرف اللہ ہی سے کیا جائے، اور جب کوئی یقین و اذعان اور صدقِ نیت کے ساتھ اللہ سے مانگتا ہے تو اللہ اس کی حاجت پوری فرماتا ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: 186)

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔''

وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ: یعنی جب تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو مخلوق کی طرف نگاہ مت دوڑا بلکہ اللہ سے مدد مانگ۔ چنانچہ جو بھی ایمان، یقین اور صداقت کے ساتھ رب تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے، رب تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- جانور پر دو آدمیوں کا سوار ہونا جائز ہے۔ اس کی دلیل "كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ یہ جواز دو باتوں کے ساتھ مشروط ہے:

(1) اس سے جانور کو تکلیف نہ ہو، وگرنہ جائز نہ ہوگا۔

(2) دوسرے اس میں پیچھے سوار ہونے والے کو اپنے گرنے کا خدشہ نہ ہو۔

- نبی کریم ﷺ بے حد متواضع تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ اپنے پیچھے کم سن نوجوانوں کو بھی سوار فرمالیا کرتے تھے۔
- قریب والے کو بھی نداء کر کے بلا سکتے ہیں اس کی دلیل "يَا غُلَامُ" کے الفاظ ہیں۔
- رب تعالیٰ کے دین اور اس کی حدود و شرائع کی حفاظت میں دین و دنیا کی ہر قسم کی حفاظت کا راز پنہاں ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ اس کی جان، مال، عزت آبرو، بیوی بچوں سب کی حفاظت فرمائے گا۔
- جزاء عمل کی جنس سے ہوتی ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کے دین کی حفاظت کی جزا جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی صورت میں ملے گی۔ چنانچہ ہر قسم کی حفاظت کی کنجی رب تعالیٰ کے دین کی حفاظت ہے۔
- یہ بات ایک مومن کی حزم و احتیاط میں سے ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے دین کی حفاظت کی راہ میں کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔
- جو اللہ کے دین کی حفاظت کرے گا، اللہ اس کی رہنمائی فرمائے گا اور اسے ہر چیز کا راستہ دکھائے گا۔ اس کی دلیل "تَجِدْهُ تُجَاهَكَ" کے الفاظ ہیں۔
- بندے کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر ضرورت و حاجت میں رب تعالیٰ کے در پر دستک دے اور ہر بات میں مدد بھی اسی سے مانگے۔

بندہ دوسرے لوگوں میں محبوب کیونکر بنتا ہے؟

1474۔ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضي الله عنه قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! دُلَّنِيْ عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللّٰهُ،

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک آدمی نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! مجھے کسی ایسے عمل کا پتا بتلا دیجئے کہ جب میں اس پر عمل

وَأَحَبَّنِي النَّاسُ ، فَقَالَ: ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ، وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ)).

کروں تو رب تعالیٰ بھی مجھے اپنا محبوب بنا لے اور لوگ بھی مجھے محبوب بنا لیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دنیا سے بے رغبت ہو جا، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا، اور جو لوگوں کے پاس ہے اس سے بے رغبت ہو جا، لوگ تمہیں اپنا محبوب بنا لیں گے۔'' ❶

رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَسَنَدُهُ حَسَنٌ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کی حدیث حسن ہے۔

غریب الحدیث:...... دُلَّنِي: یہ دلالت سے ماخوذ ہے، دلالت کسی شے کی طرف رہنمائی کرنے کو کہتے ہیں۔

عَلَى عَمَلٍ...... : یعنی اس بات پر عمل کر کے میں اللہ اور اس کے بندوں کا محبوب بن جاؤں۔ کہ اس سے اللہ کی محبت بھی حاصل ہو جائے اور مخلوق کی محبت بھی مل جائے، اور یہ بات ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ اللہ کا بھی محبوب بنے اور مخلوق کا بھی۔

اب پہلی بات صرف مومنوں کے ساتھ خاص ہے کہ مومنوں کو ہی اللہ کا محبوب بننے کی فکر ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری بات عام ہے کہ لوگوں میں محبوب بننے کی تمنا ایک مومن کو بھی ہوتی ہے اور کافروں کو بھی ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس عظیم سوال کا یہ جواب عنایت فرمایا:

اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا: دنیا سے زہد کرنے کا مطلب تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے۔

یہ رب تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ دنیا سے زہد آخرت کی رغبت کو لازم ہے اور آخرت کی رغبت ہی بندے کو رب تعالیٰ کی رضا کے کاموں پر چلنے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور یہی بات رب تعالیٰ کے ہاں محبوب بننے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ: یہ لوگوں کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ بلاشبہ یہ بھی ایک عظیم وصیت ہے کہ آدمی لوگوں کے مال پر ہرگز بھی نظر نہ رکھے کیونکہ وہ مال اس کا نہیں، اور لوگوں سے یہی بے نیازی ان کی نظروں میں محبوب بننے کا قوی ذریعہ ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین میں استقامت کے حاصل ہونے کے بے حد حریص تھے۔ اسی لیے وہ اس کے سلب ہو جانے کے اسباب جاننے کے بھی حریص تھے تاکہ ان سے بچ کر استقامت کو قائم رکھیں۔

◈ نبی کریم ﷺ کو ''جوامع الکلمات'' عطا ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک جامع ترین کلمہ ''اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا'' کا بھی ہے جو مال، جاہ و منصب، سواری، پر تکلف مکانات غرض ہر شے سے زہد اختیار کرنے کو شامل ہے۔

---

❶ سنن ابن ماجه: 4102۔ الكامل لابن عدی: 131/3۔ الضعفاء للعقیلی: 11/2۔ المستدرك للحاكم: 313/4۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ''الاربعین'' میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابن رجب ''شرح اربعین'' میں لکھتے ہیں: امام موصوف کا کلام محل نظر ہے کیونکہ خالد بن عمرو القرشی منکر حدیث والا ہے۔

- رب تعالیٰ کے لیے صفتِ محبت ثابت ہے۔
- جو دنیا سے زہد اختیار نہیں کرتا اس کا سب سے بڑا غم دنیا ہی بن کر رہ جاتی ہے۔
- دنیا سے زہد اختیار کرنے کی ترغیب کہ یہ اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے۔
- لوگوں کی محبت حاصل کرنی ہے تو جو کچھ ان کے ہاتھوں میں ہے، اس سے بے رغبتی اختیار کرلی جائے۔
- ہمیں لوگوں کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کے اس سوال کو برقرار رکھا اور اس کا جواب بھی عنایت فرمایا۔

بندہ رب تعالیٰ کا محبوب کیونکر بنتا ہے؟

1475۔ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: ((إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ)) .

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''بے شک رب تعالیٰ اس بندے سے محبت فرماتے ہیں جو (اللہ سے) ڈرنے والا، (اس کے غیر سے) بے نیاز (اور) گم نام ہو۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّ اللهَ: إِنَّ یہ حرف تاکید ہے۔

يُحِبُّ : محبت یہ رب تعالیٰ کی ایک حقیقی اور ثابت صفت ہے، اور وہ اشخاص، ازمان، اماکن اور اعمال میں سے جس سے، چاہے محبت کرتا ہے۔

الْعَبْدَ : مراد وہ بندہ ہے شرعی بندگی کرتا ہو، نہ کہ وہ بندہ مراد ہے جو عبودیت کونیہ کرتا ہو، کہ رب تعالیٰ عبودیت کونیہ کرنے والے کو محبوب نہیں رکھتا۔ جیسے کافر کہ وہ رب تعالیٰ کی عبودیت کونیہ کرتا ہے کہ رب تعالیٰ اس میں جو چاہے تصرف فرماتا ہے اور وہ اس میں رب تعالیٰ کی عبودیت کرتا ہے۔

التَّقِيَّ : جو اللہ سے ڈرنے والا ہو، تو تقویٰ اس عمل کو کہتے ہیں جو بندے کو رب تعالیٰ کے عذاب سے بچائے، اور یہ اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب سے ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ تقویٰ کی جامع ترین تعریف یہی ہے۔

الْغَنِيَّ : مراد غیر اللہ سے بے نیاز ہے، اور یہ وہی شخص ہوسکتا ہے جو رب کے دیے پر قانع اور دوسروں سے سوال کرنے سے مجتنب ہو۔

الْخَفِيَّ : گم نام، مراد وہ شخص ہے جو دوسروں کے سامنے کھل کر آنے کو پسند نہ کرتا ہو۔ بلکہ لوگوں سے مخفی رہنے کو پسند کرتا ہو، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت دوسروں پر عیاں ہونے کو پسند نہ کرتا ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب کا تقویٰ، لوگوں سے بے نیازی، اور گوشہ گیری، پھر رب تعالیٰ کی شرعی بندگی کہ اس حدیث میں ان صفات کو اپنانے کی ترغیب ہے۔

---

[1] صحيح مسلم: 2965 .

- لوگوں کے مال سے بے نیازی اختیار کی جائے۔ بلکہ خود لوگوں سے بھی بے نیازی اختیار کی جائے۔ لہٰذا ان سے مال، مدد، اعانت سفارش وغیرہ میں سے کچھ نہ مانگا جائے۔
- دوسروں سے اوجھل رہنا ہی بہتر ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم لوگوں پر گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کو لازم کر دیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ خود کو نمایاں کرنے کی حرص نہ ہو۔
- رہی عزلت تو اگر تو یہ عزلت دین کے دفاع کے لیے ہو تو ٹھیک ہے وگرنہ وہ مومن جو لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے، وہ اس مومن سے بہتر ہے جو گوشہ گمنامی میں پڑا ہے اور لوگوں کی ایذاؤں پر صبر نہیں کرتا۔

لایعنی باتوں کا ترک اسلام کی خوبی میں سے ہے

1476۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ)).

رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''لایعنی باتوں کا ترک کر دینا (یہ) آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے ہے۔'' [1]

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

غریب الحدیث:......مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ: مذکورہ مِنْ تبعیضیہ ہے اور یہ جار مجرور خبر مقدم ہے۔

تَرْكُهُ: یہ مبتدا مؤخر ہے، اور ''ترکِ'' مصدر یہاں فاعل کی طرف مضاف ہے۔ جبکہ مَا لَا يَعْنِيهِ یہ موصول صلہ ''ترک'' مصدر کا مفعول بہ ہیں کہ "مَا" یہ اسم موصول اور لَا يَعْنِيهِ جملہ جملہ خبریہ اس کا صلہ ہے، اور مصدر اپنے فاعل اور مفعول بہ سے مل کر مبتداء مؤخر ہوا۔

لَا يَعْنِيهِ: سے مراد ہر وہ فعل ہے جو نہ تو اس کے لیے ضروری ہو اور نہ کوئی دینی یا دنیاوی ضرورت ہی اس سے وابستہ ہو۔ پس جو ایسی فضول باتوں کو ترک کر دے تو سمجھ لو کہ اس نے اپنے اسلام کو بہتر اور خوب بنا لیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- معلوم ہوا کہ بعض اسلام حسن اور بعض غیر حسن ہے، اور یہ کہ حسن اسلام کی کچھ علامات بھی ہیں جن میں سے ایک بے فائدہ باتوں کا ترک کر دینا ہے۔
- مذکورہ حدیث میں آدمی کو بے کار کی باتوں کو ترک کر دینے کی بے حد بلیغ ترغیب ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو اسلام کی خوبی قرار دیا ہے۔
- جب لایعنی باتوں کے ترک کی ترغیب ہے تو لامحالہ فائدہ مند اور قیمتی باتوں کی تلاش و جستجو کا حکم بھی ہوگا۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس بات کا حکم ہے کہ یا تو خیر کی بات کہو یا پھر خاموش رہو۔ جب ان دونوں احادیث کو جمع کریں تو مطلب یہ بنے گا کہ اپنے اقوال اور افعال دونوں میں انضباط پیدا کیا جائے۔

---

[1] جامع الترمذی: 2318۔ سنن ابن ماجہ: 3976۔ امام ابن حبان (229) نے اس حدیث کو صحیح جبکہ امام نووی رحمہ اللہ نے الاربعین میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابن عبدالبر (197/9) کہتے ہیں کہ: یہ حدیث ثقہ راویوں سے مروی اور محفوظ ہے۔

کھانے میں اسراف منع ہے

1477۔ وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا مَلَأَ ابْنُ آدَمَ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنِهِ)).

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت مقدام بن معد یکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ابن آدم نے پیٹ سے برا کوئی (اور) برتن نہیں بھرا۔'' [1]

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کر کے حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **مَعْدِيكَرِبَ** رضی اللہ عنہ: یہ مرکب بنائی ہونے کی وجہ سے مبنی بر فتح ہے۔

مَا مَلَأَ: مذکورہ ''ما'' نافیہ ہے، اور مَلَأَ یہ فعل ماضی کا واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔

وِعَاءً: یہ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

شَرًّا: یہ دعاء کی صفت ہے۔

مراد یہ ہے کہ دوسرے برتنوں کی طرح پیٹ بھی ایک برتن ہے۔ اب آدمی اگر کسی برتن میں دودھ بھرے یا کسی میں دوسروں کے لیے کھانا بھرے تو بلاشبہ یہ برتن اچھے ہیں لیکن سب سے برا برتن پیٹ ہے جو آدمی بھرتا ہے۔

پیٹ کو برتن اس لیے فرمایا کہ یہ کھانے اور پینے کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اب پیٹ بھرنے کو اس لیے برا فرمایا کہ شکم سیری غفلت اور نیند کی کثرت کا قوی ذریعہ ہوتی ہے۔ دوسرے پیٹ بھر بھر کر کھانا متعدد بیماریوں کا بھی پیش خیمہ ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- شریعت اسلامیہ نے بدنوں کی دوا بھی بتلائی ہے اور دلوں کی دوا کی بھی خبر دی ہے۔ چنانچہ اعتدال کے ساتھ کھانا یہ بدن کی دوا اور اس کی اصلاح ہے۔
- شریعت اسلامیہ ایذاء کے اسباب سے بچنے کا حکم دیتی ہے۔ تب پھر پیٹ بھر کر کھانا منع ہوگا۔ کیونکہ یہ ایذاء کا سبب ہے۔ حتیٰ کہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس قدر کھانے کو حرام کہا ہے۔

توبہ کی فضیلت اور اس کی شروط

1478۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ)).

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَسَنَدُهُ قَوِيٌّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سارے کے سارے بنی آدم خطا کار ہیں، اور سب سے بہتر خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔'' [2]

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے،

---

[1] جامع الترمذی: 2380۔ مسند احمد: 132/4۔ السنن الکبری للنسائی: 6768۔ سنن ابن ماجہ: 3349۔ امام ابن حبان (674) اور امام حاکم (121/4) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام موصوف نے فتح الباری: 528/9 میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] جامع الترمذی: 2499۔ سنن ابن ماجہ: 4251۔ مسند احمد: 198/3۔ مسند ابی یعلی: 2922۔ الکامل لابن عدی: 207/5۔ اس حدیث کا مدار علی بن سعدہ پر ہے، وہ صدوق تھا مگر اسے وہم ہوتا تھا۔ علامہ ذہبی نے المیزان میں اس حدیث کو علی بن سعدہ کے منکرات میں سے شمار کیا ہے۔ علامہ مناوی نے علامہ عراقی سے امام بخاری رحمہ اللہ کا اس کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

اور اس کی سند قوی ہے۔

غریب الحدیث:...... کُلُّ بَنِی آدَمَ: یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

خَطَّاءٌ: یہ خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔یعنی بہت زیادہ خطا کرنے والا۔خطا کا مدار دو باتوں پر ہے:

(1) ایک ترک واجب۔ (2) اور دوسرے فعل محرم۔

بھلا ہم میں سے کون ہے جو کسی ترکِ واجب سے محفوظ ہو؟؟! اور کون ہے جو کسی حرام کا مرتکب نہ ہوا ہو؟؟ رب تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

وَخَیْرُ الْخَطَّائِینَ التَّوَّابُونَ: توّاب: اپنی خطا سے لوٹ آنے والا۔ چاہے بار بار خطا ہو اور بار بار لوٹے۔ کیونکہ خَطَّاءٌ کا کلمہ کثرت اور تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ تب پھر توّاب اس کو کہیں گے جو خطا ہوتے ہی توبہ کر لے، اور برے خطا کار پھر وہ کہلائیں گے جو خطا ہو جانے پر توبہ نہ کرتے ہوں اور نہ انہیں توبہ کی کوئی پروا یا اس کا اہتمام ہی ہو۔ اس لیے زیادہ خطائیں ہو جانے پر رب تعالیٰ سے مایوس نہ ہوا جائے۔ کیونکہ وہ خطاؤں کو بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے۔

توبہ کی تعریف اور شروط:

توبہ یہ رب تعالیٰ کی نافرمانی کو چھوڑ کر اس کی طاعت کی طرف لوٹنے کو کہتے ہیں۔ علماء نے سچی توبہ کی درج ذیل شروط بیان کی ہیں:

(1) خلوصِ دل سے توبہ کی جائے۔ کہ اخلاص پر عمل صالح کی اساس ہے۔

(2) گزشتہ خطاؤں پر ندامت ہو۔

(3) خطا کا ترک اسی وقت اور فی الفور ہو۔

(4) دوبارہ خطا نہ کرنے کا پختہ عزم ہو۔

(5) اور سب سے آخری شرط یہ ہے کہ توبہ اس وقت سے پہلے پہلے ہو جب توبہ قبول نہ ہوتی ہو۔ یعنی جان نکلنے سے پہلے پہلے توبہ کر لی جائے۔

www.KitaboSunnat.com

تب پھر توبہ کے لیے اخلاص شرط ہے، اور ندامت بھی لازم ہے۔ جس نے بلا ندامت توبہ کی وہ ایسا ہے جیسے اسے گناہ کر بیٹھنے کا کوئی افسوس نہ ہوا ہو۔

اور ترکِ خطا میں حق والوں کے حقوق کا ادا کرنا بھی لازم ہے۔ لہٰذا چوری سے کامل توبہ تب ہوگی جب وہ مالِ مسروقہ کو مسروق منہ (جس کی چوری کی ہے) کو واپس کرے، اور اگر ایسے مال کا مالک نہ ملے تو اسے صدقہ کر دے۔ اسی طرح اگر کسی کی غیبت کی ہے تو غیب کو اس سے حلال کروالے وغیرہ۔

غرض ترکِ خطا میں یہ شرط ہے کہ حقوق والوں کو ان کے حقوق ادا کرے، اور خطا دوبارہ نہ کرنے کا عزم شرط ہونا بدیہی ہے۔

جبکہ ردِّ توبہ کے وقت سے پہلے توبہ کرنا بھی لازم ہے۔ یہ وقت عام بھی ہے اور خاص بھی۔ خاص وقت ہر آدمی کے مرنے کا وقت ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے موت کا وقت آ جانے پر توبہ کی تو وہ توبہ غیر مقبول اور ردّ ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ﴾ (النساء: 18)

''اور توبہ ان لوگوں کی نہیں جو برے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے بے شک میں نے اب توبہ کر لی۔''

رہا ردِ توبہ کا عام وقت تو وہ آفتاب کے مغرب سے طلوع ہونے کا وقت ہے کہ اس کے بعد کسی کی توبہ قبول نہ ہوگی لہٰذا توبہ اس وقت سے پہلے پہلے مقبول ہوگی۔

خاموش رہنے اور کم بولنے کی فضیلت

1479۔ عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الصَّمْتُ حِكْمَةٌ ، وَقَلِيْلٌ فَاعِلُهُ)) .
أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعَبِ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ ، وَصَحَّحَ أَنَّهُ مَوْقُوْفٌ مِنْ قَوْلِ لُقْمَانَ الْحَكِيْمِ .

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''چپ رہنا حکمت ہے، پر ایسا کرنے والے کم ہیں۔'' [1]
اس حدیث کو امام بیہقی نے ضعیف اسناد کے ساتھ شعب الایمان میں روایت کیا ہے، اور اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور حکیم لقمان کا قول ہے۔

غریب الحدیث: ......الصَّمْتُ: یہ سکوت کو کہتے ہیں۔ حِكْمَةٌ: حکمت کسی شے کو برمحل رکھنے کا نام ہے۔
وَقَلِيْلٌ فَاعِلُهُ: یہ جملہ خبریہ ہے جس میں خبر مقدم اور مبتداء مؤخر ہے۔

خاموشی ہی بہتر ہے:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بات کرنے سے خاموش رہنا بہر حال بہتر اور زیادہ سلامتی والا ہے، کیونکہ متکلم دو باتوں کے بیچ کھڑا ہے، یا تو اس کی بات مفید ہوگی یا فضول، اور یہی غالب ہے، اس لیے جو خاموش رہا سلامت رہا۔ اس لیے حکمت خاموشی میں ہی ہے۔

یہ قولِ رسول ﷺ ہے یا قولِ لقمان؟ جیسا کہ امام موصوف نے اس کی تصریح کی ہے، یہ قول لقمان ہے جس سے کم از کم یہ ضرور مستفاد ہوتا ہے کہ یہ قول رسول ﷺ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم صحت کے ساتھ اسے قول لقمان قرار نہیں دے سکتے۔

اس بارے علماء کا یہ متفق علیہ قول ہے کہ گزشتہ امتوں کی کوئی بات جب قرآن وسنت کی نصوص میں نہ ملتی ہو تو اس کو قبول نہ کیا جائے گا۔ البتہ جب وہ بات ہماری شریعت کے موافق ہو تو مقبول ہوگی۔

کیا خاموشی حکمت ہے؟

رہا یہ سوال کہ کیا خاموشی حکمت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خاموشی ہر حال میں حکمت نہیں۔ لہٰذا منکر پر خاموشی جائز نہ

---

[1] شعيب الايمان للبيهقي: 264/4۔ كتاب الزهد لاحمد، ص: 136۔ موقوفاً، كتاب الزهد لابن المبارك، ص: 289۔ امام حاکم (458/2) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان نے اس حدیث کو ''روضة العقلاء'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ تک صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ مناوی رحمہ اللہ کی فیض القدیر: 240/4 میں ہے۔

ہوگی۔ کسی علمی سوال پر خاموشی جائز نہ ہوگی، تہمت کی جگہ بھی خاموشی جائز نہ ہوگی۔ تب پھر یہ قول مطلق نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے۔

قَلِيلٌ فَاعِلُهُ: یعنی اس راہ پر چلنے والے کم ہیں، اور یہ صحیح ہے کہ اکثر لوگ خاموش رہنے کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں اکثر لوگ بے موقع بولتے ہی نظر آئیں گے۔

4۔ بَابُ التَّرْهِيبِ مِنْ مَّسَاوِئُ الْأَخْلَاقِ

برے اخلاق سے ڈرانے کا بیان

کسی بھی بات کی تکمیل تب ہی ممکن ہوتی ہے جب اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو واضح کر دیے جاتے ہیں۔ اسی لیے حضرات علماء کرام رضی اللہ عنہم ترغیب کے ساتھ ساتھ ترہیب کے ابواب بھی قائم کرتے آئے ہیں تاکہ انسان کی سیرت و اخلاق کی تکمیل ہو سکے۔ کیونکہ اخلاق کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلوب اخلاق، ان کی ترغیب دی جاتی ہے، اور دوسرے غیر مطلوب اخلاق کہ ان سے ڈرایا جاتا ہے۔ اسی لیے امام موصوف نے یہ مذکورہ باب قائم کیا ہے۔

حسد منع ہے

1480,1481۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)).
أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ
وَلِابْنِ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ نَحْوُهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''حسد کرنے سے بچو، کہ حسد نیکیوں کو (یوں) کھا جاتا ہے جیسے آگ (سوکھی) لکڑی کو کھا جاتی ہے۔'' [1]
اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔
جبکہ سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی ایک حدیث مروی ہے۔ [2]

غریب الحدیث: ...... إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ: یہ جملہ تحذیریہ ہے۔ اس کی تقدیری عبارت أُحَذِّرُكُمُ الْحَسَدَ ہے (یعنی میں تم کو حسد کرنے سے ڈراتا ہوں) البتہ حسد کے امر کو اہتمام سے بیان کرنے کے لیے ضمیر مفعول کو مقدم لے کر آئے ہیں۔

حسد کی تعریف اور اقسام:

حسد یہ دوسرے کے پاس موجود رب تعالیٰ کی کسی نعمت کے چھن جانے کی تمنا کرنے کو کہتے ہیں۔
علماء نے حسد کی تین قسمیں بیان کی ہیں:
(1) محض دوسرے سے نعمت کے زوال کی تمنا کرنا، چاہے اُس سے چھن کر اِسے ملے یا نہ ملے۔
(2) یا یہ کہ وہ نعمت اُس سے چھن کر کسی دوسرے کو مل جائے۔
(3) یا یہ کہ اُس سے چھن کر اِسے مل جائے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 4903۔ التاریخ للبخاری: 272/1/1۔ اس حدیث کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔ جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" میں اس کی تصریح کی ہے۔
[2] سنن ابن ماجہ: 4210۔ علامہ بوصیری رحمہ اللہ نے "مصباح الزجاجة" میں اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حسد یہ دوسرے کے پاس رب تعالیٰ کی کسی نعمت کو دیکھ کر اسے ناپسند کرنے کا نام ہے۔ لہٰذا اگر کسی دوسرے کے پاس علم یا مال یا اخلاق یا صحت وغیرہ دیکھ کر کسی کو جی میں ناگواری ہوتی ہے تو اسی کیفیت کا نام حسد ہے، اور وہ جان لے کہ اس کے جی میں اس دوسرے کے پاس اس نعمت کے چھن جانے کا ایک مخفی جذبہ موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النساء: 32)

''اور اس چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے، جو انھوں نے محنت سے کمایا اور عورتوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے، جو انھوں نے محنت سے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔''

اسی لیے بجائے اس بات کی تمنا کرنے کے کہ دوسرے کے پاس موجود نعمت اسے مل جائے، خود رب تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کیا جائے جو اُسے بھی دینے کی قدرت رکھتا ہے اور تجھے بھی دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

فَإِنَّهُ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ، كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ: جب لکڑیوں پر آگ بھڑک اٹھتی ہے تو وہ سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ گویا کہ یہ حسد سے ممانعت کی علت کا بیان ہے کہ حسد نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔ جیسے آگ لکڑیوں کو فنا کر دیتی ہے۔

وہ یوں کہ حسد بے شمار برائیاں لاتا ہے جیسے رب تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض، کیونکہ جب حاسد دوسرے پر رب تعالیٰ کی نعمت دیکھ کر کڑھتا ہے تو یہ رب تعالیٰ کی حکمت و تقسیم پر کھلا اعتراض ہوا۔ گویا کہ حاسد یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ آدمی اس نعمت کا مستحق نہ تھا۔

پھر حسد میں عموماً محسود پر زیادتی کرنے کا جذبہ ضرور دل میں جگہ پکڑتا ہے۔ چاہے وہ اس پر زبان سے زیادتی کرتا ہو یا فعل سے تاکہ اس کے پاس سے وہ نعمت جاتی رہے۔

پھر حاسد ہمہ وقت ایک قلق اور اضطراب میں رہتا ہے جس سے اسے راحت نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ اس کے جینے کی لذت ختم ہو جاتی ہے اور جوں جوں محسود کے پاس وہ نعمت بڑھتی جاتی ہے حاسد کے قلق اور آزردگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

غرض حسد کے بے شمار مفاسد ہیں۔ اسی لیے شریعت نے حسد کرنے سے منع فرمایا ہے۔

البتہ اگر کسی کے پاس رب تعالیٰ کی نعمت دیکھ کر محض اس بات کی تمنا کرنا کہ کاش یہ نعمت مجھے بھی مل جائے یہ مذموم حسد میں داخل نہیں بلکہ اس کو اصطلاح میں غبطہ (یعنی رشک کرنا) کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا ہے جس کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے کہ: ''سوائے دو کے کسی سے حسد کرنا جائز نہیں ہے۔''[1] اور یہ وہی غبطہ ہے۔

غصہ کی مذمت

148- وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: (لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''طاقت ور وہ نہیں جو (دوسروں کو)

---

[1] صحيح بخاری: 73۔ صحيح مسلم: 815.

يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ)) .

بہت زیادہ پچھاڑنے والا ہو، طاقتور تو وہ ہے جو غصہ میں خود کو قابو میں رکھتا ہے۔'' [1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......الشَّدِيدُ: مراد طاقتور ہے۔

الصُّرَعَةِ: دوسروں کو بہت زیادہ پچھاڑنے والا۔ یہ فُعَلَةٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جیسے هُمَزَةٌ اور لُمَزَةٌ کہ یہ دونوں بھی مبالغہ کے صیغے ہیں۔

پھر دوسرے کو پچھاڑنا ایک فن ہے جس کے متعدد داؤ ہیں اور یہ محض بازو کی قوت پر موقوف نہیں۔ بسا اوقات ایک زیادہ طاقت والے کو بہترین داؤ لگا کر ایک اس سے کم طاقت والا بھی اسے پچھاڑ دیتا ہے۔

افسوس کہ فی زمانہ لوگ کشتی سیکھنے کے بے حد رسیا ہیں۔ بلاشبہ یہ نرا ضیاع وقت ہے۔ البتہ کشتی سیکھنے کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس سے بدن طاقتور ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ بڑا پہلوان بننے کے لیے زیادہ طاقتور ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ اس فن میں مشاق اور طاق ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ رکانہ کہ جب وہ بیل کی کھال پر کھڑا ہو جاتا تھا تو بڑے بڑے طاقتور اس کے قدموں تلے سے وہ کھال کھینچنے میں ناکام رہتے تھے۔ حتیٰ کہ کھال پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتی تھی پر اس کے پیروں کے نیچے کی کھال نہ کھینچ پاتے تھے لیکن جناب رسول اللہ ﷺ سے بڑی آسانی سے مات کھا گیا اور حسب شرط ایمان بھی لے آیا۔

إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ: غصہ پر قابو پانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی غصہ کے مقتضٰی پر عمل نہ کرے۔ نبی کریم ﷺ نے غصہ کو آگ کا ایک انگارہ قرار دیا ہے کہ اس میں خون جوش مارنے لگتا ہے، اور رگیں پھول جاتی ہیں، اور آنکھیں بھی سرخ ہو جاتی ہیں، اور تو اور آدمی کا بدن غصہ میں لرزنے بھی لگتا ہے۔

غرض غصہ نری آگ ہے، اور اس پر قابو پانے کو بہت بڑی پہلوانی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب ایک آدمی نے آپ ﷺ سے وصیت کرنے کو عرض کیا تو آپ ﷺ نے اسے تین بار غصہ نہ کرنے کو ارشاد فرمایا۔

پچھلے صفحات میں طلاق کے ابواب میں غصہ کی تین اقسام کو مفصل بیان کر دیا گیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- غصہ میں خود کو قابو میں رکھنا محمود ہے۔ اس کی دلیل "إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ" کے الفاظ ہیں۔
- شریعت اسلامیہ میں اشتعال کا سبب پائے جانے کے وقت غیظ و غضب پر قابو رکھنے کی ترغیب ہے۔ کیونکہ بسا اوقات انسان غصہ میں وہ بات اور فعل بھی کر جاتا ہے جو جائز نہیں ہوتا۔
- غصہ میں خود کو قابو میں رکھنے والا، دوسروں کو پچھاڑنے والے طاقتور پہلوان سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ احکام کو اشیائے محسوسہ کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان فرمایا کرتے تھے۔

ظلم اور بخل کی ممانعت

1483۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

[1] صحيح البخاري: 6114- صحيح مسلم: 2609.

اللّٰهِ ﷺ: ((الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) .
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ظلم روز قیامت کی تاریکیاں ہے۔''❶
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

1484۔ وَعَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اتَّقُوا الظُّلْمَ ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، وَاتَّقُوا الشُّحَّ ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ)) .
أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ظلم (کرنے) سے بچو کہ ظلم روز قیامت (کی) تاریکیاں ہے، اور بخل سے بچو کہ اس بخل نے تم سے پہلوں کو ہلاک کر ڈالا۔''❷
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے

غریب الحدیث:......ان دونوں روایات میں ظلم اور بخل کی مذمت وممانعت کو بیان کیا گیا ہے۔

ظلم کی لغوی اور شرعی تعریف:

ظلم کا لغوی معنی کم کرنا ہے۔ اسی معنی میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا﴾ (الكهف: 33)

''دونوں باغوں نے اپنا پھل دیا اور اس سے کچھ کمی نہ کی۔''

یعنی وہ باغ پھل دینے میں کسی قسم کی کمی نہ کرتے تھے بلکہ پورا پورا پھل دیتے تھے۔ کہ یہاں ظلم کا لفظ کمی کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اس لفظ کا لغوی معنی ہے۔

اصطلاح شرح میں ظلم دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو پر زیادتی کرنے کو کہتے ہیں۔ چاہے اس کی صورت واجب میں کوتاہی کرنے کی ہو اور چاہے اس کی صورت اس حد سے آگے بڑھ جانے کی ہو جس سے آگے بڑھنا اس پر حرام تھا۔

مال میں ظلم یہ ہے کہ دوسرے پر ناحق دعویٰ کرکے اور جھوٹے گواہ پیش کرکے اس سے اس کا مال ہتھیا لیا کہ یہ مال میں ظلم ہے۔ یہ ایسی چیز میں حد سے تجاوز کرنا ہے جس کا لینا جائز نہ تھا۔ اسی طرح اگر کسی کے حق واجب کا انکار کیا تو یہ بھی ظلم ہے۔ چوری کرکے یا چھین کے کسی کا مال لے لینا بھی ظلم میں داخل ہے کہ یہ سب صورتیں دوسرے پر زیادتی کرنے کی ہیں۔

جان میں ظلم یہ ہے کہ کسی کو ناحق قتل کر دیا یا اس کا کوئی عضو تلف کر دیا یا زنا یا لواطت کرکے اس کی عزت و آبرو کی اہانت کر ڈالی کہ یہ سب صورتیں جان پر ظلم کرنے کی ہیں۔

آبرو پر ظلم کرنا یہ ہے کہ کسی پر بدکاری کی تہمت لگا دی، یا اس کی غیبت کر لی یا اسے گالی دے ڈالی کہ یہ سب صورتیں آبرو پر ظلم کرنے کی ہیں۔

ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: ظلمات: یہ ظُلْمَةٌ کی جمع ہے، یہ تاریکی، تیرگی اور اندھیرے کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ظلم کرنے کی اخروی سزا یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ ظلم روزِ قیامت نور کے سلب ہو جانے کا سبب بنے گا، اور یہ ظالم ان کفار و منافقین کے بمنزلہ ہوگا جن کو روزِ قیامت کوئی نور نہ ملے گا۔ جبکہ اہل ایمان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے داہنے دوڑتا ہوگا۔

---

❶ صحيح بخاری: 2447۔ صحيح مسلم: 2579 .
❷ صحيح مسلم: 2578 .

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ظلم سے روکنا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ظلم کو روزِ قیامت کی تاریکی ارشاد فرمایا ہے اور یہ وعید ہے، اور وعید یہ نہی کے بیان سے بھی اشد ہوتی ہے۔
- ظلم حرام ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔
- جزا بھی ویسی ہی ملے گی جیسا کہ عمل ہوگا۔ تو جب کوئی دنیا میں لوگوں پر ظلم کرے گا تو رب تعالیٰ بھی روزِ قیامت اس پر تاریکی فرمائے گا۔
- ''روزِ قیامت'' ثابت ہے اور ظلم سے بچنا واجب ہے۔
- ظلم کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔

اب ذیل میں دوسری حدیث پر کلام ملاحظہ ہو:

وَاتَّقُوا الشُّحَّ: اس حدیث میں شح سے بچنے کا حکم ہے جو اس کے حرام ہونے کو مستلزم ہے۔ شح کی تعریف مندرجہ ذیل ہے۔

شح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

لغت میں شح پانی کے کم ہونے، بے حد حریص ہونے، لالچی ہونے، اور کسی چیز کے دینے میں کنجوسی کرنے کو کہتے ہیں۔

جبکہ اصطلاحِ شرع میں شح دوسرے کے مال میں طمع کرنے کو کہتے ہیں۔

اب بخل تو اپنا مال دوسرے کو نہ دینا ہے، جبکہ شح دوسرے کے مال کی بھی طمع کرنا ہے۔ تب پھر شح یہ بخل سے بھی اشد ہوا کیونکہ اپنی چیز نہ دینا یہ دوسرے کی چیز کی طمع کرنے سے سہل ہے۔

فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ: یہ شح کی ممانعت کی علت کا بیان ہے۔ یہ ہلاک کرڈالنا حسّی بھی ہوسکتا ہے اور معنوی بھی۔

شح ایک بہت بڑی دینی خرابی ہے اور یہ شح کی ہلاکت آفرینی کا معنوی پہلو ہے، جبکہ اسی شح کے جذبہ نے گزشتہ قوموں کو باہمی خونریزی اور قتل وغارت پر آمادہ کیا جو شح کی حسی ہلاکت آفرینی [1] ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- گزشتہ قوموں کے احوال ہمارے لیے عبرت ہیں۔ اس کی دلیل "فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- جو فعل گزشتہ قوموں کے لیے باعث عقوبت تھا، وہ اس امت کے لیے بھی باعث عقوبت ہے۔

ریاکاری

1485۔ وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ: الرِّيَاءُ)).

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مجھے تم لوگوں پر سب سے زیادہ جس بات کا ڈر ہے وہ شرکِ اصغر ہے (اور وہ) ریاکاری (ہے)۔'' [2]

---

[1] جبکہ جدید متمدن دنیا کو دو عالمی جنگوں میں جھونکنے والا یہی شح کا جذبہ ہی تھا۔ بلاشبہ یہ دونوں جنگیں دراصل پوری دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنے کی جنگیں تھیں، اور یہی شح کی حقیقت ہے۔ نسیم

[2] مسند احمد: 428/5۔ اس حدیث کے رجال صحیح کے رجال ہیں جیسا کہ علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد: 102/1 میں کہا ہے۔

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

اس حدیث کو امام احمد نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......إِنَّ: یہ حرف تاکید ہے۔ أَخْوَفَ: یہ إِنَّ کا اسم ہے جو مضاف ہے۔

مَا: یہ موصولہ ہے۔ أَخَافُ عَلَيْكُمْ: یہ جملہ خبریہ اسم موصول کا صلہ ہے، اور موصول صلہ مل کر أَخْوَفَ کا مضاف الیہ ہیں اور مضاف مضاف الیہ مل کر إِنَّ کا اسم ہیں۔

الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ: یہ دونوں موصوف صفت إِنَّ کی خبر ہیں۔

الرِّيَاءُ: یہ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ سے بدل الكل فی الكل ہے۔ اس لیے جو اعراب اَلشِّرْكُ کے ہیں وہی اعراب الْأَصْغَرُ کے صفت ہونے کی وجہ سے اور الرِّيَاءُ کے بدل ہونے کی وجہ سے ہیں۔

ریاء کی لغوی اور شرعی تعریف:

الرِّيَاءُ: یہ رَاءَى يُرَائِي سے رِيَاءً مصدر ہے جیسے جَاهَدَ يُجَاهِدُ سے جِهَادًا مصدر ہے۔ اس کا ایک مصدر مُرَاءَاۃً بھی آتا ہے جیسے مُجَاهَدَةً مصدر آتا ہے۔ ریاء کا لفظی معنی دکھلاوا ہے۔ اصطلاح میں ریا کسی کے سامنے خلافِ حقیقت صلاح وتقویٰ کا اظہار کرنے کو کہتے ہیں تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں، اور ریاء کو ریاء اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں آدمی لوگوں کے دیکھنے کی رعایت کرتا ہے۔ اسی حکم میں وہ قول بھی داخل ہے جو آدمی لوگوں سے تعریف حاصل کرنے کی غرض سے بولتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ اپنی امت پر بے حد شفیق تھے، اس کی دلیل "إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ برائیوں میں بھی تفاوت واختلاف ہے کہ بعض زیادہ خطرناک اور بعض کم خطرناک ہیں۔ اس کی دلیل "إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ" کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ شرک کی دو قسمیں ہیں: (1) ایک شرکِ اکبر اور (2) دوسری شرکِ اصغر۔
- شرک اصغر وہ گناہ ہے جو شرکِ اکبر تک پہنچنے کا وسیلہ بنے۔
- شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر میں قاعدہ یہ ہے کہ شرکِ اکبر کے ارتکاب سے آدمی ملت سے خارج اور کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جبکہ شرکِ اصغر کے ارتکاب سے آدمی ملت سے خارج نہیں ہوتا۔ البتہ وہ سخت ترین گناہ اور حرام ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے ریاکاری حرام ہے۔
- ریاکاری ان گناہوں میں داخل ہے جو کفر و شرک کے علاوہ ہیں۔ چنانچہ کفر و شرک کی تو کوئی معافی نہیں، جبکہ باقی کے سب گناہ، چاہے وہ جتنے بھی بڑے ہوں، جن میں یہ شرک اصغر یعنی ریاکاری بھی داخل ہے، رب تعالیٰ کی مشیئت کے تحت داخل ہیں، وہ چاہے تو اول وہلہ میں ہی ان کو معاف کر دے اور چاہے تو سزا دے کر معاف کرے۔

چند منافقانہ عادات

1486,1487- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "منافق کی نشانیاں تین ہیں (جو یہ ہیں: (1) جب بھی بولے جھوٹ بولے، (2) اور جب بھی وعدہ

ائْتُمِنَ خَانَ)). کرے (اس کی) خلاف ورزی کرے، (3) اور جب بھی اس کے پاس (کوئی) امانت رکھی جائے تو (اس میں) خیانت کرے۔" ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما: ((وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)). جبکہ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: اور جب بھی جھگڑے گا تو دشنام طرازی کرے گا۔ ❷

غریب الحدیث: ...... آيَةُ: یہ نشانی کے معنی میں ہے۔ الْمُنَافِقِ: لفظ منافق کی لغوی اور اصطلاحی تعریف گزشتہ صفحات بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔ حَدَّثَ: تحدیث یہ کسی امر واقع کی یا مستقبل میں ہونے والے کسی امر کی بابت خبر دینے کو کہتے ہیں۔

كَذَبَ: تب پھر كَذَبَ کا معنی یہ ہوگا منافق جب بھی کسی بات کی خبر دے گا خلاف واقع ہی دے گا (جس کو ہماری اردو زبان میں غلط بیانی کہتے ہیں)۔ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ: یعنی وہ جب بھی کسی بات کے پورا کرنے کا وعدہ کرے گا اسے پورا نہ کرے گا۔

وَإِذَا ائْتُمِنَ خَانَ: چاہے اس امانت کا تعلق جان و مال سے ہو یا عزت و آبرو سے ہو، جو منافق ہوگا وہ دوسرے کی امانت میں خیانت ضرور کرے گا۔

خیانت:

یہ دوسرے کی چیز تک چھپ کر پہنچنے کو کہتے ہیں۔ پھر اگر وہ شے جان یا مال نہ تھی بلکہ کوئی حق تھا تو اس تک خفیہ طریق سے پہنچنا "مکر" کہلائے گا نہ کہ خیانت، ہاں اگر وہ شے غیرِ حق یعنی جان یا مال ہو تو اس تک خفیہ رسائی کو خیانت کہیں گے۔

خیانت ہر حال میں مذموم ہے، جبکہ مکر نہ مذموم ہے اور نہ محمود ہے۔ لہٰذا اگر تو مکر برمحل ہو تو محمود ہے، اسی لیے رب تعالیٰ نے برمحل مکر کو اپنے لیے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ﴾ (الانفال: 30) "اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا۔"

جبکہ خیانت کو اپنے لیے ثابت نہیں فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ﴾ (الانفال: 71)

"تو بے شک وہ اس سے پہلے اللہ سے خیانت کر چکے ہیں، تو اس نے ان پر قابو دے دیا۔"

کہ یہاں رب تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر انہوں نے خیانت کی تھی تو رب تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ خیانت کی تھی۔

پس مکر اگر برمحل ہو تو محمود ہے جبکہ خیانت ہر حال میں مذموم ہے۔ مذکورہ حدیث میں ان منافقانہ عادات سے بچنے کی ترغیب ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان باتوں کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے جبکہ صحیحین کی ایک اور روایت میں جھگڑے کے وقت گالیاں دینے کو بھی نفاق کی علامت کہا گیا ہے۔ تب پھر یہ چار منافقانہ عادات کا بیان ہوا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جھوٹ بولنا یہ پہلی منافقانہ خصلت ہے۔ حدیث کے ظاہر سے ہر قسم کا جھوٹ اس حکم میں داخل ہے۔ چاہے اس کے ذریعے کسی کا حق مارا جائے اور چاہے دل لگی کے طور پر لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ہی بولا جائے کہ وہ بھی جھوٹ ہی ہے۔ پھر لغت عربیہ میں لفظ کذب کا اطلاق خطا پر بھی کرتے ہیں وہاں کذب سے مراد جھوٹ نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے

❶ صحيح بخاري: 33- صحيح مسلم: 59. ❷ صحيح البخاري: 2459- صحيح مسلم: 58.

جھوٹ کی قسمیں بیان کی ہیں: (1) سفید جھوٹ۔ (2) کالا جھوٹ۔ بلاشبہ یہ تقسیم باطل ہے جھوٹ جھوٹ ہے چاہے کالا ہو یا سفید۔ اور رہا توریہ [1] تو وہ بظاہر جھوٹ لگتا ہے لیکن وہ جھوٹ ہوتا نہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

- وعدہ خلافی حرام ہے کیونکہ یہ نفاق کی علامت ہے۔ چاہے اس وعدہ خلافی سے کسی کا ضرر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں وعدہ خلافی حرام ہے۔
- امانت میں خیانت یہ تیسری منافقانہ خصلت ہے۔ بلاشبہ یہ پہلی دو خصلتوں سے زیادہ اشد اور سنگین خصلت ہے کہ آدمی دوسرے کی امانت دبا جائے۔ خیانت جان، مال اور آبرو تینوں کو شامل ہے جیسا کہ بیان ہوا۔ پس خیانت کرنے والا نفاق کی ایک خصلت کا مالک ہے۔

یاد رہے کہ دوسرے کے راز کو افشاء کرنا بھی خیانت ہے، کسی کی آبرو سے متعلق کسی عار کا افشاء بھی خیانت ہے، اور اجارہ کی مدت میں پورا کام کیے بغیر پوری مزدوری لینا بھی خیانت ہے۔

- جھگڑے میں بدکلامی، بدزبانی اور گالی گلوچ بھی منافقانہ خصلت ہے جو صفتِ ایمان کے مقتضٰی کے خلاف ہے۔

دشنام طرازی کی ممانعت

1488- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”مسلمان کو گالی دینا (رب تعالیٰ کی نافرمانی اور) گناہ ہے اور مسلمان سے قتال (یعنی جنگ) کرنا کفر ہے۔“ [2]
یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

غریب الحدیث: ......سِبَابٌ: یہ سَبَّ يَسُبُّ سَبًّا سے مصدر ہے۔ اس کا معنی گالی دینا ہے۔
الْمُسْلِم: مراد توحید و رسالت کی شہادت دینے والا وہ آدمی ہے جو شریعت کے احکام کا التزام بھی کرتا ہو۔
الْفُسُوقُ: یہ رب تعالیٰ کی طاعت سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ نافرمانی اور گناہ۔
قِتَالُ: اسلحہ اٹھا کر جنگ کرنا۔ كُفْرٌ: ارتداد یا اس کے قریب کا فعل۔

مضمون حدیث: ......اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ مسلمان کو گالی دینے والا فاسق و گنہگار ہے اور اب وہ ایسا عادل نہ رہے گا جو شہادت کا اہل ہوتا ہے، اور اگر وہ مسلمانوں سے قتال کرتا ہے تو کفر کرتا ہے۔ یعنی کافروں والا فعل کرتا ہے۔ کیونکہ ایک سچا مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر اسلحہ نہیں اٹھا سکتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مسلمان کی عزت کا احترام واجب ہے کیونکہ اسے گالی دینا فسق ہے۔ البتہ جو گالی کے جواب میں گالی دے وہ فاسق نہ کہلائے گا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ﴾ (النحل: 126)
”اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے۔“

---

[1] کتاب الجهاد میں توریہ پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔ نسیم [2] صحيح بخاري: 48- صحيح مسلم: 64.

اور نبی کریم ﷺ نے بھی دو گالی دینے والوں میں اصل مجرم پہلے گالی دینے والے کو قرار دیا ہے۔

- معلوم ہوا کہ فسق یہ کفر سے کم درجہ کا گناہ ہے۔
- مسلمان سے قتال کفر ہے۔ البتہ یہ کفر ملت سے خارج کرنے والا نہیں۔
- اور قتل یہ قتال سے اشد ہے۔
- مسلمان کو گالی دینا حرام ہے کہ جب کسی کی پیٹھ پیچھے برائی حرام ہے تو روبرو برائی تو اور بھی زیادہ اشد اور سنگین ہوگی۔

بدگمانی سے بچا جائے

1489۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(برا) گمان کرنے سے بچو کہ بے شک (برا) گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔''[1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث: ...... إِيَّاكُمْ: یہ باب تحذیر میں سے ہے جیسا کہ ''إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ'' کی تفسیر میں بیان ہوا ہے۔
الظَّنَّ: یہ ایسی بات کے اعتقاد رکھنے کو کہتے ہیں جس کی کوئی اصل نہ ہو، چنانچہ آدمی جی میں ایک بات سوچتا ہے لیکن اس کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ظن کو سب سے جھوٹی بات قرار دیا ہے۔ مذکورہ حدیث میں بظاہر عموم مذکور ہے کہ ہر قسم کے ظن سے بچا جائے جبکہ درج ذیل آیت کریمہ بتلاتی ہے کہ ہر گمان سے بچنا ضروری نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (الحجرات: 12)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سے گمان سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہیں۔''

تب پھر مذکورہ آیت حدیث کی قید بیان کرتی ہے کہ اس گمان سے بچا جائے جو گناہ ہو، اور جو گمان گناہ نہ ہو اس سے بچنا واجب نہیں۔ رہا یہ سوال کہ وہ کون سا گمان ہے جو گناہ ہوتا ہے؟ تو یہ وہ گمان ہے جس کے ساتھ کوئی قرینہ نہ ہو جو اس گمان کی تصدیق کرتا ہو، اور جس گمان کی کوئی قرینہ تصدیق کرتا ہو وہ گناہ نہ ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بدگمانی کی تحذیر کہ اس سے بچا جائے، اور بدگمانی اس کو کہتے ہیں جس کی تصدیق کا کوئی قرینہ نہ ہو۔ البتہ جس گمان کی تصدیق کا کوئی قرینہ ہو وہ حرام نہیں ہوتا۔
- جی کے خیال کو حدیث کے لفظ کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل: ''فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ'' کے الفاظ ہیں۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ ہمیشہ حکم کو علت کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

رعایا کو دھوکا دینے کی ممانعت

1490۔ وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((مَا مِنْ عَبْدٍ

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے: ''رب تعالیٰ

[1] صحيح بخاری: 5143۔ صحيح مسلم: 2563.

يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً يَمُوْتُ يَوْمَ يَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ)).

جس بندے کو بھی رعایا کا نگہبان بناتے ہیں اور وہ اپنی موت والے (مقررہ) دن میں اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعایا کے، ساتھ دھوکا کرنے والا ہو (اوران کے بارے میں اپنے جی میں کینہ کپٹ رکھتا ہو) مگر یہ کہ رب تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتے ہیں۔''[1]

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح:...... بلاشبہ یہ ایک عظیم حدیث ہے جو ہر وقت آدمی کے سامنے رہنی چاہیے۔

مَا مِنْ عَبْدٍ: آیا اس سے امام اعظم مراد ہے یا اس کے نائب مراد ہیں یا یہ حکم سب کو عام ہے؟ تو یہ حکم سب کو عام ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔'' چنانچہ آدمی اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اسے رب تعالیٰ نے اپنے گھر والوں کا نگہبان بنایا ہے۔

يَمُوْتُ يَوْمَ يَمُوْتُ، وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ: چنانچہ اگر آدمی کی موت اس حال میں آئی کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ دھوکا کرنے والا ہو۔

إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ: تو رب تعالیٰ اس پر جنت کو حرام فرما دیں گے۔ لیکن افسوس کہ آج ہر ایک کا مطمع نظر صرف اور صرف دوسرے کو دھوکا دینا ہی رہ گیا ہے۔ کیا عوام تو کیا حکام سب ایک جیسے ہیں۔ اس اخلاقی بیماری نے امت کے عقائد و اخلاق کو برباد کر دیا ہے، اور جو اپنے اہل کے ساتھ دھوکا کرتا ہے، اس کا وبال اسے اپنی قبر میں بھگتنا پڑتا ہے۔

اسی لیے شریعت آدمی کو اس بات سے منع کرتی ہے کہ وہ اولاد میں ایسی چیزیں نہ چھوڑ مرے جو ان کے دین و اخلاق اور ایمان و عبادات کو برباد کر دیں کہ یہ بھی اپنے اہل کے ساتھ دھوکا کرنے کے باب میں داخل ہے۔

غرض یہ حکم عام ہے جو اس بیوی تک کو شامل ہے جو اپنے خاوند کا مال اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرتی ہے کہ یہ عورت کا اپنی رعیت میں دھوکا سے کام لینا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ جملہ امور سب کے سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ منصبِ اقتدار تک صرف وہی پہنچتا ہے جسے رب تعالیٰ اقتدار عطا فرمائے۔ اس کی دلیل "يَسْتَرْعِيهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً" کے الفاظ ہیں۔
- ◈ مرنے سے پہلے کی توبہ سب گناہوں کو دھو ڈالتی ہے۔ چنانچہ اپنی رعایا سے دھوکا کرنے والا یہ آدمی اگر مرنے سے قبل توبہ کر لے اور وہ امت کا ناصح اور خیر خواہ بن جائے تو یہ وعید اس کو شامل نہ ہوگی۔
- ◈ اگر رب تعالیٰ کسی کو امت کا والی بنائے تو اس پر رعایا کے ساتھ خیر خواہی کرنا واجب ہوگا۔ کیونکہ خیر خواہی نہ کرنے پر شدید وعید ہے، اور وعید ہمیشہ ترکِ واجب پر آتی ہے۔
- ◈ رعایا کو دھوکا دینا کبائر میں سے ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔
- ◈ رعایا کو دھوکا دینا کفر ہے کیونکہ اس پر حرمانِ جنت کی وعید ہے۔ لیکن یہ کفر ملت سے خارج کر دینے والا نہیں۔ لہٰذا

[1] صحيح البخاري: 7151- صحيح مسلم: 142.

جنت سے یہ حرمان بھی ابدی نہ ہوگا۔

◈ مذکورہ حدیث جنت کے وجود کو ثابت کرتی ہے۔

والی کو حکم ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ نرمی کرے

1491۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَللّٰهُمَّ! مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیّدہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اے اللہ! جو میری امت کے امر (حکومت وخلافت) میں سے کسی بات کا والی بنا اور اس نے ان کو مشقت میں ڈالا تو تو بھی اسے مشقت میں ڈال۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... اَللّٰهُمَّ: یہ کلمہ ''یا اللہ'' کے معنی میں ہے۔

شَیْئًا: یہ شرط کے تحت واقع نکرہ ہے اس لیے عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔ لہٰذا یہ حکومت وخلافت سے لے کر تدبیر منزل تک کے امور کو شامل ہوگا۔ فَشَقَّ عَلَيْهِمْ: یعنی ان پر ایسی ذمہ داریاں ڈالیں جو ان پر گراں تھیں۔

فَاشْقُقْ عَلَيْهِ: ایسے والی کے لیے یہ نبی کریم رحمۃ للعالمین ﷺ کی طرف سے بددعا ہے کہ جس طرح اس نے اپنی رعیت کو مشقت میں ڈالا ہے، رب تعالیٰ بھی اسے مشقت میں ڈالے۔ یہ بددعا عین حکمت ہے اور یہ جنس عمل سے جزا کی قبیل سے ہے کہ جیسا عمل تھا ویسی ہی جزا ملی۔ چنانچہ اس نے امت کو مشقت میں ڈالا تو اسے سزا بھی ویسی ہی ملی کہ اسے بھی مشقت میں پڑنے کی بددعا دی گئی۔

البتہ ان مشقتوں سے وہ باتیں مستثنیٰ ہیں جن کا حکم خود رب تعالیٰ نے دیا ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ کہ یہ باتیں چاہے کسی پر کتنی ہی گراں گزریں، ان کا حکم دیا جائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مسلمانوں کے والی پر واجب ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ حتی الامکان نرمی برتے، کیونکہ جب وہ رعایا کے ساتھ نرمی کرے گا تو رب تعالیٰ بھی اس کے ساتھ نرمی فرمائے گا اور اگر وہ رعایا کے ساتھ سختی کرے گا تو رب تعالیٰ بھی اس کے ساتھ سختی فرمائے گا۔

◈ نبی کریم ﷺ امت پر شفقت کے بے حد حریص تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے سختی کرنے والے کو اپنی بددعا سے ڈرایا ہے۔

◈ جیسا عمل ہوگا جزا بھی ویسی ہی ملے گی۔

◈ آدمی کو ظلم واعتداء کرنے والے سے اپنا حق لینا جائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کمزوروں کے لیے ظالم حکمرانوں کے خلاف بددعا فرمائی ہے جو اپنا حق وصول نہیں کر سکتے۔

چہرے پر مارنا منع ہے

1492۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

[1] صحيح مسلم: 1828.

اللّٰهِ ﷺ: ((إِذَا قَاتَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

"جب تم میں سے کوئی لڑے تو چہرے پر مارنے سے گریز کرے۔"[1]
یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:......**إِذَا قَاتَلَ**: یہ قتالِ اعظم کو بھی شامل ہے جو موت وہلاکت تک لے جاتا ہے اور اس سے کم درجہ کے قتال کو بھی شامل ہے۔ جیسے کہ کتاب الصلوٰۃ میں یہ حدیث گزری ہے کہ اگر کوئی نمازی کے آگے سے گزرنا چاہے تو نمازی اسے روکے اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو اس سے قتال کرے۔" کہ یہ قتال موت سے کم درجہ کا لڑنا ہے۔ نہ کہ نماز کے دوران اسلحہ اٹھا کر لڑنا مراد ہے۔

تنبیہ:......اس حدیث پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔ جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

غصہ کرنے کی ممانعت

1493- وَعَنْهُ رضي الله عنه أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَوْصِنِيْ قَالَ: ((لَا تَغْضَبْ)) فَرَدَّدَ مِرَارًا، وَقَالَ: ((لَا تَغْضَبْ)). أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے (خدمت نبوی میں حاضر ہو کر) عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے (کسی بات کی) وصیت کیجیے! آپ ﷺ نے (اسے وصیت کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: "غصہ نہ کیا کر۔" اس آدمی نے بار بار یہ سوال کیا اور آپ ﷺ نے (ہر بار جواب میں یہی) ارشاد فرمایا کہ: "غصہ نہ کیا کر۔"[2]
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

شرح:......مناسب تو یہ تھا کہ امام موصوف رحمہ اللہ اس حدیث کو "لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ" والی حدیث کے بعد لے آتے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس سائل کو بار بار سوال کرنے کے باوجود ایک ہی بات کی وصیت فرمائی کہ غصہ نہ کیا کر۔ نبی کریم ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ ہر ایک کو اس کے مناسب حال وصیت فرمایا کرتے تھے۔ شاید- واللہ اعلم- کہ آپ ﷺ نے وحی کے ذریعہ یا اس کے ظاہر حال کے ذریعہ یہ جان لیا تھا کہ یہ آدمی سریع الغضب اور جلد طیش میں آ جانے والا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے دیگر متعدد اہم امور جیسے تقویٰ وغیرہ کی وصیت کرنے کی بجائے غصہ نہ کرنے کی وصیت فرمائی۔

غصہ نہ کرنے سے یہ مراد نہیں کہ مطلق غصہ نہ کیا کرے۔ کیونکہ غصہ آنا طبعی امر ہے اور یہ ہر ایک کو آتا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ آپ ﷺ نے اسے اس بات سے منع فرمایا ہو کہ تمہیں غصہ آنا ہی نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ غصہ کے مقتضی کو نافذ نہ کیا کرے۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک ہو سکے غصہ کو دبایا کر، اور آ جائے تو اسے جلدی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کیا کر۔ زیادہ لمبا نہ لے جایا کر۔

غصہ کافور کرنے کی تدابیر:

(1)......غصہ آ جائے تو اول تو اسے دبایا جائے کہ یہ کسی کے طاقتور ہونے کی دلیل ہے۔

(2)......پھر اعوذ باللہ پڑھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو غصے میں دیکھ کر یہی فرمایا تھا کہ: "میں ایک ایسی

---

[1] صحیح بخاری: 2559۔ صحیح مسلم: 2616.
[2] صحیح بخاری: 6116.

بات جانتا ہوں کہ اگر یہ آدمی وہ بات کہہ لے تو اس کا غصہ جاتا رہے اور وہ ((أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ)) (کا کلمہ) ہے۔" ❶

(3)......وضو کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک غصہ بھرے شخص کو وضو کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ ❷ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وضو اعضاء کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

(4)......کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اسی طرح ارشاد فرمایا ہے کیونکہ حالت کے بدلنے سے بھی غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

(5)......اور پانچویں اہم ترین بات یہ ہے کہ آدمی کو جہاں غصہ آیا ہے، فوراً اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے لہٰذا اگر بیوی پر غصہ آیا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے فوراً گھر کو چھوڑ دے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ کی حکمت کہ آپ ﷺ ہر ایک کو اس کے حال کے مطابق وصیت فرمایا کرتے تھے۔
◈ جواب دینے والے کو چاہیے کہ وہ مخاطب کے حال کی رعایت کرے۔
◈ آدمی ایک بات کا خوب اطمینان، تحقیق اور ثبوت حاصل کرنے کے لیے ایک سے زائد بار بھی سوال کر سکتا ہے۔
◈ غصہ کو دبا جانا روز مرہ زندگی کا اہم ترین ادب ہے۔

لوگوں کے مال ناجائز طریق سے ہتھیانا منع ہے

1494۔ وَعَنْ خَوْلَةَ الْأَنْصَارِيَّةِ رضي الله عنها قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ رِجَالًا يَتَخَوَّضُونَ فِي مَالِ اللّٰهِ بِغَيْرِ حَقٍّ، فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)). أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت خولہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "بے شک کچھ لوگ (ایسے ہیں کہ وہ) اللہ کے مال میں (ناحق گھسے جاتے ہیں اور اس میں) غلط تصرف کرتے ہیں، پس انہیں روزِ قیامت (جہنم کی) آگ ملے گی۔" ❸
اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......عَنْ خَوْلَةَ الْأَنْصَارِيَّةِ رضي الله عنها: یہ انصار کی ایک جلیل القدر خاتون ہیں جو ایک شرعی مسئلہ کی خبر دے رہی ہیں۔

خبر واحد میں عورت کا اعتبار:

مذکورہ حدیث سیدہ خولہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ تو کیا ایک عورت کی شہادت مقبول ہوتی ہے۔ جبکہ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ﴾ (البقرة: 282)

"پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔"

---

❶ مسند احمد: 266/4۔ سنن ابی داؤد: 4784.
❷ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ ❸ صحیح بخاری: 3118.

تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث معاملات کے بارے میں نہیں بلکہ اخبار دینی کے بارے میں ہے، اور اخبار دینی میں مرد اور عورت دونوں کا حکم ایک ہے۔ لہٰذا عورت کے آفتاب کے غروب ہو جانے کی شہادت دینے پر مرد کے لیے روزہ کھولنا جائز ہوگا۔

إِنَّ رِجَالاً: رجال یہ نکرہ ہے جو اثبات کے تحت آیا ہے۔ جب نکرہ اثبات کے تحت ہو تو اطلاق کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ عموم کا۔ تو گویا کہ آپ ﷺ نے إِنَّ مِنَ الرِّجَال فرمایا ہے کہ یہاں سب لوگ مراد نہیں بلکہ بعض لوگ مراد ہیں۔

يَتَخَوَّضُونَ: یہ "خوض" سے ماخوذ ہے۔ خوض اس باطل شے کو کہتے ہیں جس میں آدمی اندھا دھند اور بے سوچے سمجھے تصرف کرتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَلْعَبُوْنَ۝﴾ (الطور: 12) "وہ جو فضول بحث میں کھیل رہے ہیں۔"

مال میں تخوض اور تصرف غلط کی دو قسمیں ہیں: (1) ایک سابق تصرف۔ (2) اور دوسرا لاحق تصرف۔ تخوضِ سابق کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے وہ مال خود کمایا ہو چاہے کسی بھی طریقے سے کمایا ہو، چاہے حلال ہو یا حرام۔ غرض اس نے مال خود جمع کیا ہو، یہ بھی ایک قسم کا غلط تصرف اور تخوض ہے لیکن یہ مال کمانے کا تخوض سابق اور گزشتہ غلط تصرف ہے۔

جبکہ مال میں دوسرا تخوض اور غلط تصرف، تخوضِ لاحق ہے۔ یعنی مال کے کمانے کے بعد اس میں کوئی غلط تصرف کرنا، اور یہ غلط تصرف کمائے مال کو ادھر ادھر واہی تباہی کاموں میں خرچ کر کے برباد کر دینا ہے۔

بِغَيْرِ حَقٍّ: یہ صفت کاشفہ ہے نہ کہ صفت مقیدہ۔ کہ اگر اسے صفت مقیدہ مانیں تب پھر مطلب یہ بنے گا کہ خوض کی دو قسمیں ہیں ایک برحق اور دوسری ناحق۔ حالانکہ خوض جیسا بھی ہو، ناحق ہی ہوتا ہے۔ تب پھر یہ صفت کاشفہ ہے نہ کہ صفت مقیدہ، اور صفت کاشفہ تعلیل بیان کرنے کا فائدہ دیتی ہے۔

فِي مَالِ اللّٰهِ: ایک قول یہ ہے کہ اس سے اموال شرعیہ مراد ہیں۔ جیسے زکوٰۃ، فئی، غنیمت، جزیہ، خراج وغیرہ اور وہ مال بھی مراد ہے جو بیت المال میں مصالح مسلمین کے لیے پڑا ہوتا ہے۔

ان الفاظ میں اس معنی کا بھی احتمال ہے جبکہ انفرادی مال مراد ہونے کا بھی احتمال ہے۔ لیکن بہر حال بیت المال وغیرہ میں بے جا تصرف اور خوض اپنے مال میں خوض سے اشد ہے۔

فَلَهُمُ النَّارُ: یہ وعید ہے اور یہاں یہ جملہ سابقہ کلام کے ساتھ "فَا" کے ذریعے جڑا ہوا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مال میں غلط تصرف حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔
- آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے مال میں غلط تصرف نہ کرے، اور یہ اضاعتِ مال کی ممانعت کے معنی میں ہے۔
- آدمی پر واجب ہے کہ وہ صرف حلال طریقے سے ہی مال کمائے۔
- ہمارے ہاتھوں میں جو مال ہے وہ بھی اللہ کا ہی ہے اس کی دلیل: "فِيْ مَالِ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔
- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم، آپ ﷺ ہمیشہ حکم کو علت کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا کرتے تھے۔
- قیامت اور جہنم برحق اور ثابت ہیں۔

رب تعالیٰ نے ظلم کو خود اپنے اوپر بھی اور اپنے بندوں پر حرام کیا ہے

1495۔ وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ۔ فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ۔ قَالَ: ((يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالَمُوا)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جس کو نبی کریم ﷺ اپنے رب سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ، رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے میرے بندو! بے شک میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام ٹھہرایا ہے اور میں نے اسے تمہارے بیچ بھی حرام ٹھہرایا ہے سو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......**فِيمَا يَرْوِيهِ:** یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جس میں سے امام موصوف نے صرف اسی قدر حصہ کو نقل کیا ہے جو ان کا محل استدلال ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا کسی حدیث میں اقتصار کر کے اس کو نقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو راوی اس حدیث کو کسی اصل سے نقل کرتا ہے جیسے صحیح مسلم کہ وہاں اصل حدیث پوری کی پوری موجود ہے اور جو چاہے وہاں مراجعت کر کے پوری حدیث دیکھ سکتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ اس مقام پر امام موصوف رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ لیکن اگر وہ حدیث کو اپنے شیخ سے نقل کر کے امت تک پہنچا رہا ہے تو اس وقت پوری حدیث نقل کرنا واجب ہوتا ہے اور اس میں سے کسی حصہ کو حذف کرنا جائز نہیں ہوتا۔

پھر جہاں حدیث کے بعض کا حذف جائز ہوتا ہے تو وہ جواز بھی تب ہے کہ جب محذوف حصہ کا ماقبل یا مابعد کے ساتھ کوئی ربط اور تعلق نہ ہو، وگرنہ یہ حذف بھی جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس طرح حذف کرنے سے حدیث کے معنی میں خلل واقع ہوتا ہے جو حدیث میں تحریف کے زمرہ میں داخل ہوسکتا ہے۔

حدیث قدسی کی تعریف اور اقسام:

رب تعالیٰ سے یہ روایت کرنے والے جناب رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہ وہ حدیث ہے جس کی سند رب تعالیٰ کی ذات پر جا کر ختم ہوتی ہے اور ایسی حدیث کو حدیث قدسی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تب پھر حدیث قدسی وہ حدیث کہلائے گی جس کو نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ مرتبہ کے اعتبار سے یہ حدیث حدیث سے برتر جبکہ قرآن کریم سے کم درجہ کی ہوتی ہے۔ گویا یہ حدیث، اور قرآن کریم کے بیچ کے درجہ میں ہوتی ہے۔ پھر حدیث قدسی بھی صحیح، حسن، ضعیف حتیٰ کہ موضوع تک بھی ہوتی ہے جبکہ قرآن کریم سارے کا سارا صحیح ہے اور اس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک حرکت متواتر اور ثابت ہے۔

إِنِّي حَرَّمْتُ: یہ منع کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی میں نے ظلم کرنے کو اپنے اوپر منع کیا ہوا ہے۔ رب تعالیٰ جس چیز کو چاہتے ہیں اپنے اوپر منع فرما لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ رب ہے، وہ جو چاہے کرے، اسے کوئی روکنے یا پوچھنے والا نہیں۔

پھر ظلم دو باتوں میں دائر ہوتا ہے۔ (1) دوسرے پر زیادتی کرنا اور (2) دوسرے کا حق نہ دینا یا کم دینا کہ یہ دونوں باتیں ظلم کہلاتی ہیں۔ لہٰذا کسی کا مال چھیننا بھی ظلم ہے اور کسی کا مال نہ دینا بھی ظلم ہے۔

وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا: یہ کلمات امام موصوف رحمہ اللہ کا محل استدلال ہیں، اور ''کُم'' سے مراد الناس ہے۔ تب پھر

[1] صحيح مسلم: 2577.

ظلم جہاں مسلمانوں کے درمیان حرام ہے، وہیں کافروں میں بھی حرام ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حدیث قدسی میں نبی کریم ﷺ بھی سند کے ایک راوی ہوتے ہیں۔ البتہ یہاں نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ سے روایت فرما رہے ہوتے ہیں۔
- رب تعالیٰ کے لیے کلام کی صفت ثابت ہے۔ اس کی دلیل "يَا عِبَادِيْ" کے الفاظ ہیں۔
- ساری کی ساری مخلوق رب تعالیٰ کی "عبد" ہے۔ اس کی دلیل "يَا عِبَادِيْ" کے الفاظ ہیں۔
- رب تعالیٰ جو چاہتے ہیں اپنے اوپر حرام فرماتے ہیں۔ جبکہ ہم بندے رب تعالیٰ پر کسی بات کو حرام قرار نہیں دے سکتے۔
- رب تعالیٰ کے لیے "نفس" ثابت ہے۔ اس کی دلیل "عَلَى نَفْسِيْ" کے الفاظ ہیں۔
- اہل ایمان کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا حرام ہے۔ اس کی دلیل "وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا" کے الفاظ ہیں۔
- ظلم کرنا کافروں پر بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی "عباد" میں داخل ہیں۔

غیبت اور اس کی سختی کے ساتھ ممانعت

1496- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((أَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: ((ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ)). قِيْلَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِيْ أَخِيْ مَا أَقُوْلُ؟ قَالَ: ((إِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهُ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کیا تم لوگ جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(غیبت) تمہارا اپنے بھائی کا ایسی بات کے ساتھ ذکر کرنا ہے جو اسے ناگوار گزرے'' عرض کیا گیا کہ ذرا یہ بتلائیے کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات (واقعی) ہو جو میں کہہ رہا ہوں؟ (تو کیا تب بھی یہ غیبت ہوگی) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تو تم وہ بات کہہ رہے ہو جو (واقعی) اس میں ہے تب تو تم اس کی غیبت کر رہے ہو، اور اگر وہ بات اس میں نہیں تو پھر تم اس پر بہتان لگا رہے ہو۔'' [1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......أَتَدْرُوْنَ: یہ "أَتَعْلَمُوْنَ" کے معنی میں ہے، اور مذکورہ ہمزہ استفہام کے لیے ہے اور یہ استفہامِ استعلام ہے نہ کہ استفہامِ انکار۔ یعنی یہ انکار کرنے کے لیے نہیں بلکہ پوچھنے کے لیے ہے، اور یہ پوچھنا نہ جاننے کی بنا پر نہ تھا کیونکہ نبی کریم ﷺ اس بات کو مخاطبین حاضرین سے پہلے جانتے تھے بلکہ مراد مخاطبین کو ایک اہم امر پر متنبہ کرنا تھی۔

مَا الْغِيبَةُ: لفظ غِيْبَةٌ یہ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے نہ کہ فَعْلَةٌ کے وزن پر جیسا کہ بعض کم علم لوگ یہ لفظ فَعْلَةٌ کے وزن پر بولتے ہیں جو غلط ہے۔ غِيْبَةٌ: یعنی فِعْلَةٌ یہ وزن ہیئت پر دلالت کرنے کے لیے آتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: 2589.

اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ: اس جامع کلمہ کی تشریح گزشتہ میں بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ: یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے جو "هی" ہے۔ مبتداء کا حذف یہاں اختصار کے لیے ہے۔

ذِکْر: یہ مصدر ہے جو اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے اور اَخَاكَ یہ مصدر کا مفعول بہ ہے۔ لفظ "اخ" یہ اسمائے ستہ مکبرہ میں سے ہے جن کے اعراب لفظی آتے ہیں۔ چنانچہ لفظ "اخ" کے اعراب یہاں الف کے ساتھ ہیں، اور یہ اس کی حالت نصبی ہے۔

بِمَا: یہ دونوں جار مجرور "ذکر" مصدر کے متعلق ہوں گے اور "مَا" یہ موصولہ ہے جس کا صلہ "یَکْرَهُ" ہے۔ اب دوسرے کو ناگوار گزرنے والی بات اس کی صورت سے متعلق بھی ہو سکتی ہے اور سیرت سے بھی۔ جیسے یہ کہنا کہ فلاں تو ٹھگنا ہے۔ یا فلاں تو بدزبان ہے وغیرہ۔

نبی کریم ﷺ نے یہاں "مَا" لا کر عموم کی طرف اشارہ فرمایا ہے تا کہ یہ کلمہ سیرت وصورت دونوں سے متعلقہ برائیوں کو شامل ہو جائے۔ فقیل له: یہاں سائل مجہول ہے اور سائل کے نام کی جہالت سے مذکورہ حکم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

أَفَرَأَيْتَ: یہ اَخْبِرْنِیْ کے معنی میں ہے۔ إِنْ كَانَ فِيهِ مَا أَقُولُ: یعنی میں وہ کہوں جو واقعی اس میں ہو، کیا تب بھی غیبت ہے۔ حالانکہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں گا۔ إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ: کہ غیبت یہی تو ہے کہ آدمی دوسرے کی اس خامی کو بیان کرے جو واقعی اس میں ہوتی ہے۔ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَقَدْ بَهَتَّهُ: اور اگر اس میں وہ خامی نہ پائی جائے تب پھر یہ اس پر بہتان ہوگا، اور یاد رہے کہ بہتان یہ غیبت سے بھی اشد ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کی حسن تعلیم کہ آپ ﷺ مسائل خبریہ کو تنبیہ کی غرض سے استفہام کے پیرائے میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کی دلیل "أَتَدْرُوْنَ" کے الفاظ ہیں۔
- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حسنِ ادب کہ وہ ایسی باتوں کے جواب میں ہمیشہ "اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ" کہا کرتے تھے، اور جن شرعی باتوں کا آدمی کو علم نہ ہو ان کی بابت یہ کہنا ہی واجب ہے۔
- کلام میں اختصار کرنا جائز ہے۔ چنانچہ جملہ خبریہ سے حصر کی غرض سے مبتداء کو حذف کر سکتے ہیں کہ ایسے جواب کو یاد کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔
- اَخَاكَ کی تعبیر میں اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور یہاں بھائی سے مسلمان بھائی مراد ہے۔
- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیبت صرف مسلمان کی حرام ہے جبکہ کافر کی غیبت جائز ہے۔ کیونکہ کافر کی غیبت وحرمت مسلمان کی غیبت وحرمت کے جیسی نہیں۔
- غیبت یہ کسی کی صورت یا سیرت میں پائی جانے والے کسی ناگوار بات کرنے کو کہتے ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بات اس کو ناگوار گزرتی ہو جس کی غیبت کی گئی ہے۔ چاہے ویسی ہی بات دوسرے کو ناگوار نہ بھی گزرتی ہو۔ تب پھر اس میں عرف کا اعتبار ہے۔
- پھر اگر کسی کا کوئی ناگوار وصف اس کی پہچان بن گیا ہو تو اس کا ذکر غیبت نہ کہلائے گا۔ جیسے بعض اکابر علماء اعرج (لنگڑا) اَعْمَش (چُندھا) اَحْوَل (بھینگا) وغیرہ کے القاب کے ساتھ مشہور ہو گئے تھے اور یہ اوصاف ان کی پہچان بن گئے تھے۔

اس لیے ایسے اوصاف کا ذکر غیبت نہ کہلائے گا۔ ❶

- نبی کریم ﷺ دوسروں کے مناقشہ کو نہایت کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے سنا کرتے تھے اور علماء عظام اور مفتیان کرام کو بھی ایسا ہی چاہیے کہ وہ دوسروں کی بات وسیع القلبی سے سن کر ان کا شافی جواب دیں۔ اس کی دلیل "أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ" کے الفاظ ہیں۔
- غیبت حرام ہے۔ چاہے مغتاب (جس کی غیبت کی گئی ہے) میں وہ وصف واقعی موجود بھی ہو۔
- مذکورہ حدیث نے بہتان کے حرام ہونے کو بھی بتلا دیا، اور یہ کہ بہتان غیبت سے اشد ہے کیونکہ یہ کسی کے بارے میں ایسی بات کرنا ہے جو اس میں ہوتی ہی نہیں۔
- غیبت، بہتان، چغلی، یہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔
- جب عام معلوم ہو تو اس کو چھوڑ کر خاص کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل: فقد بَهَتَّهُ کے الفاظ ہیں۔ کہ یہاں غیبت کے ذکر کو طے کر کے صرف بہتان کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

مسلمانوں کے درمیان بغض پیدا کرنے کے اسباب کی ممانعت

1497- وَعَنْهُ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ، التَّقْوَى هَاهُنَا))، وَيُشِيْرُ إِلَى صَدْرِهِ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ((بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ)). ❷

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، (محض فریب کے لیے بیع وغیرہ میں) ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر بولی نہ دو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو، اور تم میں سے کوئی، دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے، اور (اے) اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا کا بھائی ہے (چنانچہ) نہ تو وہ اس پر کوئی (ظلم و) زیادتی کرے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے اور نہ اس کی حقارت ہی کرے۔ (یاد رکھو کہ) تقویٰ یہاں ہے۔ (یہ فرماتے ہوئے) آپ ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف تین مرتبہ اشارہ فرمایا۔ آدمی کے برا ہونے کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ آدمی اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے، مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان پر حرام ہے (یعنی اس کے لیے قابل احترام ہے، جیسے) اس کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت، ❷ (کہ کسی مسلمان کو دوسرے کی ناحق جان لینا،

---

❶ جیسے ہمارے ہاں کالو، ٹنڈا، لہولہان، پانڈی، ککڑ، ٹیڈی، پانہ، چھلڑ، لنگڑا، وغیرہ جیسے ناگوار الفاظ جب کسی کا نام اور پہچان بن جاتے ہیں تو ان ناموں سے ان کا ذکر غیبت نہ کہلائے گا۔ (نسیم)

❷ صحيح مسلم: 2564.

یااس کا ناحق مال لینا یااس کی آبروریزی کرنا، سب حرام ہے)۔''

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. اس حدیث کوامام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:..... **لَا تَحَاسَدُوا:** حسد کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔حسد کرنا حرام ہے۔

وَلَا تَنَاجَشُوا: نجش: بیع وغیرہ کی بولی میں بائع کی ہمدردی کی خاطر مبالغہ اور فریب سے کام لیتے اشیاء کی قیمتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کو نجش کہتے ہیں۔ کتاب البیوع میں اس کے تفصیلی مسائل بیان ہو چکے ہیں۔

نجش حرام ہے کہ اس میں دوسرے کا اِضرار بھی ہے اور اسے دھوکا دینا بھی ہے۔

وَلَا تَبَاغَضُوا: ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، اغلب یہ ہے کہ محبت کی طرح بغض (کینہ کپٹ) بھی طرفین سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی سے بغض رکھیں گے تو وہ بھی ہم سے بغض رکھے گا۔

ایک دوسرے سے بغض رکھنا حرام ہے کہ یہ جذبہ باہمی منافرت کو فروغ دے کر آپس کے اتفاق واتحاد کو فنا کر دیتا ہے۔

وَلَا تَدَابَرُوا: تدابر: یہ ایک دوسرے سے منہ پھیرنے کو کہتے ہیں۔ تدابر یعنی ایک دوسرے کو پیٹھ دکھانا یہ حسّی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی۔ حسّی تدابر تو معروف ہے۔ جبکہ معنوی تدابر یہ باہمی افکار ونظریات کا ایک دوسرے کے مخالف ہونا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے کی تکفیر بازی، ایک دوسرے کو بدعتی، فاسق، گمراہ اور فاسق کہنا اسی معنوی تدابر کا نتیجہ ہے۔

اس لیے سب مسلمانوں کی رائے ایک ہونی چاہیے۔

تدابر حسّی ہو یا معنوی دونوں حرام ہیں۔ اسی لیے اہل جنت کا وصف ایک دوسرے کی طرف منہ کرنا بیان ہوا ہے نہ کہ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کرنا۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ۝﴾ (الصافات: 44)

''تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''

وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ: کتاب البیوع میں اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔ دوسرے کے سودے پر سودا کرنا حرام ہے۔ **وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا:** یہ امر کا صیغہ ہے جو وجوب کے لیے ہے۔

عِبَادَ اللّٰهِ: یہاں حرف ندا حذف ہے۔ تقدیری عبارت يَا عِبَادَاللّٰهِ ہے۔ تب پھر یہ کَانَ فعل ناقص اور اس کی خبر اخوانًا کے درمیان جملہ معترضہ ہوگا۔ البتہ یہ ''كُوْنُوْا'' کی خبر بھی ہو سکتی ہے۔ تب پھر عباداللّٰہ خبر اول اور اخوانًا خبر ثانی ہوگی۔

عباداللّٰہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو رب تعالیٰ کی عبادتِ شرعیہ کرتے ہوں، اور یہ اہل ایمان ہیں۔ تب پھر یہ خطاب ایمان والوں کو ہے نہ کہ کافروں کو۔ مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو! ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔

وَلَا يَخْذُلُهُ: خذل: یہ دوسرے کو ایسے موقع پر چھوڑ دینے کو کہتے ہیں جب اسے مدد کی ضرورت ہو، چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والوں کو جب فاسق وفاجر لوگ ستاتے ہیں تو اس پر ان کی مدد نہ کرنا یہ خذلان ہے۔ کسی ظالم کو کسی بے کس پر ظلم کرتے دیکھ کر اس کی مدد نہ کرنا یہ خذلان ہے، اور سچی گواہی کو چھپانا بھی خذلان ہے۔

وَلَا يَحْقِرُهُ: یعنی دوسرے کو حقیر نہ سمجھے یہ حرام ہے۔ چاہے اس تحقیر کا اظہار اپنے قول سے کرے یا فعل سے، یا دل میں اسے معمولی اور حقیر جانے کہ یہ سب حرام ہے۔ بلکہ آدمی پر واجب ہے کہ دوسرے کو اپنے سے برتر جانے بھی اور جنوائے بھی۔

اَلتَّقْوٰی هَاهُنَا: تقویٰ کا معنی بیان کیا جا چکا ہے۔

هَاهُنَا: هُنَا: یہ اسم اشارہ ہے۔ البتہ یہ مکان کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے، اور اس پر "ھا" تنبیہ کے لیے داخل ہے جو اسم اشارہ کا حصہ نہیں۔ **ثَلاثَ مَرَّاتٍ**: یہ تاکید کے لیے ہے۔

بِحَسْبِ: مذکورہ "با" زائدہ ہے اور تحسین کلام کے لیے ہے۔ البتہ لفظوں میں ضرور عمل کر رہا ہے اس لیے اس کی وجہ سے "حسب" مجرور ہے، اور "حسب" یہ "کافِ" کے معنی میں ہے۔ یہ خبر مقدم ہے جبکہ "أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ" یہ مبتدا مؤخر ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: "حُقْرَانُ الْاَخِ الْمُسْلِمِ كَافٍ فِي الشَّرِّ" (مسلمان بھائی کی حقارت کرنا یہ برائی کے لیے کافی ہے)۔

البتہ یہ ترکیب اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلی ترکیب اصل ہے کیونکہ حرف زائدہ کا خبر میں ہونا زیادہ بہتر ہے۔ غرض کسی کے برا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو دل سے برا اور حقیر سمجھے چاہے اپنے قول و فعل سے اس کا اظہار نہ بھی کرے۔

كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: "کل" کی اضافت لام کی تقدیر کے ساتھ ہے یعنی "كُلٌّ لِلْمُسْلِمِ" (مسلمان کی ہر چیز) اور مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان پر حرام یعنی قابل احترام اور حرمت والی ہے، جس کی حرمت کو توڑنا اس کے لیے حلال نہیں ہے۔

دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ: یہ ماقبل کی تفسیر ہے کہ ایک مسلمان کی کون کون سی چیز دوسرے پر حرام ہے۔ یہ اس کی جان، اس کا مال اور اس کی آبرو ہے۔

لہٰذا کسی پر دوسرے مسلمان کو قتل کرنا یا اسے زخمی کرنا، یا اس کا مال چھیننا یا چرانا یا آبروریزی کرنا حلال نہ ہوگا۔ جس کی صورت لوگوں کے سامنے اس کی غیبت کرنا یا اس پر کوئی تہمت لگانا یا اس کی بیوی بیٹی سے زنا کرنا وغیرہ ہے کہ یہ کسی کی آبرو ریزی کرنے کی بدترین صورت ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں روزمرہ زندگی کے نہایت عظیم آداب کو بیان کیا گیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اپنے مسلمان بھائیوں سے حسد رکھنا حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس پر عقوبت بیان کی گئی ہے، اور عقوبت جہاں مکروہ کے حصول کا نام ہے وہیں محبوب اور مطلوب کے فوات کا نام بھی عقوبت ہے۔ چنانچہ حسد کا نیکیوں کو کھا جانا، یہ عقوبت کی دوسری قسم ہے۔ اس لیے حسد حرام ہے۔
- نجش حرام ہے۔ البتہ یہ کبائر میں سے نہیں کیونکہ اس پر کسی عقوبت کا ذکر نہیں۔
- ایک دوسرے سے بغض رکھنا حرام ہے، اور جب مسلمانوں میں باہمی محبت نہ ہوگی۔ ان میں وحدت کلمہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔
- تدابر حرام ہے چاہے حسی ہو یا معنوی۔
- شریعت اسلامیہ کی تکمیل میں سے یہ بات ہے کہ اس نے ہر اس چیز سے منع فرما دیا ہے جو باہمی افتراق کا سبب بنے۔

◈ دوسرے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا کرنا حرام ہے۔اس کی دلیل "وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ" کے الفاظ ہیں۔

◈ باہمی اتفاق واتحاد رکھنا واجب ہے،اس کی دلیل: "كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا" کے الفاظ ہیں۔یہ ارشاد اس بات کو مقتضی ہے کہ ہم متحد رہیں اور متفرق ومنتشر نہ رہیں۔

◈ روزمرہ زندگی میں ہمیں ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو باہمی الفت ومحبت کو فروغ دیں،اور جن سے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی وغم گساری کے جذبات پروان چڑھیں۔اس کی دلیل "الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ" کے الفاظ ہیں۔

◈ مواخات اور بھائی چارہ صرف مسلمانوں میں ہی ہوگا۔اس لیے کسی کافر کو "اے بھائی" کہہ کر بلانا جائز نہ ہوگا۔

◈ باہمی اخوت کا مقتضی یہ ہے کہ حسد، بغض، ظلم، عدوان، خذلان، اور احتقار کے جیسے جذبات کو ختم کیا جائے۔کیونکہ یہ جذبات اخوتِ اسلامیہ کے منافی ہیں۔

◈ مسلمان کی تحقیر کبیرہ گناہ ہے۔کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔

◈ عمل کا مدار دل پر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دل کی طرف اشارہ کرکے تین بار یہ فرمایا تھا کہ تقویٰ یہاں ہے۔

◈ تقویٰ تمام خیرات وحسنات کا منبع ومصدر ہے۔

◈ بات کو دہرانا جائز ہے چاہے وہ ایک کلمہ ہو یا پورا جملہ۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے تین بار یہ دہرایا کہ تقویٰ یہاں ہے۔

◈ مسلمان کی جان، مال اور عزت سب پر حرام ہے،اور حق شریعت کے بغیر کسی کی حرمت توڑنا حرام ہے۔

نبی کریم ﷺ نے برے اخلاق، اعمال اور خواہشات سے پناہ مانگی ہے

1498۔ وَعَنْ قُطْبَةَ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((اللّٰهُمَّ جَنِّبْنِي مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ، وَالْأَعْمَالِ، وَالْأَهْوَاءِ، وَالْأَدْوَاءِ)).

حضرت قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: ((اللّٰهُمَّ جَنِّبْنِي مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ، وَالْأَعْمَالِ، وَالْأَهْوَاءِ، وَالْأَدْوَاءِ)) [1] "اے اللہ! تو برے اخلاق، (برے) اعمال، (بری) خواہشات اور (بری) بیماریوں کو مجھ سے دور فرما۔"

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ امام حاکم (کی روایت) کے ہیں۔

غریب الحدیث:......اَللّٰهُمَّ: یہ یا اللہ کے معنیٰ میں ہے۔

جَنِّبْنِي: یعنی مجھے ان باتوں سے ایک جانب میں کردے۔مراد دور کردینا ہے۔

مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ: یہ صفت کی موصوف کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔مراد یہ ہے کہ اخلاق میں سے جو منکر ہیں ان سے مجھے دور رکھ۔اخلاق یہ خُلُق کی جمع ہے۔یہ عادت، طبیعت، طبعی مزاج اور فطرت وخصلت کو کہتے ہیں۔

تب پھر اخلاق یہ آدمی کی باطنی ومعنوی صورت کو کہیں گے (جس کو ہماری اردو زبان میں سیرت کہتے ہیں جس کے

[1] جامع الترمذي: 3591۔ المستدرك للحاكم: 714/1۔ صحيح ابن حبان: 960.

بالمقابل صورت کا لفظ ہوتا ہے)۔

اَلْأَعْمَالِ: یہ عَمَل کی جمع ہے۔عمل اس فعل کو کہتے ہیں جو اعضاء وجوارح سے کیا جاتا ہے۔تب پھر برے اعمال۔سے مار دھاڑ، قتل وغارت، چوری ڈاکہ، چھینا جھپٹی، اور زنا وبدکاری وغیرہ مراد ہوگی۔ جملہ سیئات اسی قبیل میں سے ہیں۔

اَلْأَهْوَاءِ: یہ هوی کی جمع ہے۔یہ ارادہ کا نام ہے اور مراد برے ارادے اور بری خواہشات ہیں۔

اَلْأَدْوَاءِ: یہ داءٌ کی جمع ہے۔ یہ بیماری کو کہتے ہیں۔ مذکورہ حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ اس سے ایسی بری بیماری مراد ہو جو غیر معتاد ہو، چاہے وہ قلبی امراض ہوں یا جسمانی۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بری صفات برے اخلاق، برے اعمال، بری خواہشات اور بری بیماریوں سے پناہ مانگی ہے۔جس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر قسم کا عمل، خلق، خواہش اور مرض برا نہیں ہوتا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ بھی دوسروں کی طرح رب تعالیٰ کے بندے ہیں اور آپ ﷺ بھی دوسروں کی طرح رب تعالیٰ کے محتاج تھے اور آپ ﷺ کو بھی اپنے نفس کی تکمیل کے لیے اپنے رب کی محتاجی تھی۔

◈ معلوم ہوا کہ اخلاق کی دو قسمیں ہیں: منکر اور معروف۔پس جو خُلق رب تعالیٰ اور اس کے بندوں کے نزدیک محمود ہوگا وہ معروف ہوگا اور جو خُلُق اللہ اور اس کے بندے کے نزدیک مذموم ہوگا وہ منکر ہوگا۔

◈ نبی کریم ﷺ برے اخلاق اور بری خواہشات سے دور رہنے کے بے حد خواہش مند تھے۔

◈ بندے کو چاہیے کہ وہ رب تعالیٰ سے برے اخلاق واعمال اور بری خواہشات سے دور رہنے کی دعا کرتا رہے۔چاہے ان منکرات کا تعلق عبادت سے ہو یا معاشرت سے، اور معاملات سے ہو یا خواہشات سے، سب سے دور رہنے کی دعا مانگے۔

◈ معلوم ہوا کہ اخلاق واعمال کی طرح خواہشات کی بھی دو قسمیں ہیں۔اچھی خواہشات اور بری خواہشات۔پس جو خواہش تو دین وشریعت کے تابع ہوگی، وہ اچھی خواہش کہلائے گی اور جو دین وشریعت اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشا کے خلاف ہوگی، وہ بری خواہش کہلائے گی۔

◈ بندے کا رب تعالیٰ سے اس بات کی دعا مانگنا جائز ہے کہ اسے کوئی بری بیماری نہ لگے۔

مسلمانوں کے درمیان خوش طبعی کرنے اور اس کے ضوابط کا بیان

1499- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تُمَارِ أَخَاكَ، وَلَا تُمَازِحْهُ، وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ)).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''نہ تو اپنے بھائی سے جھگڑا کر اور نہ اس سے مذاق کر اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ ہی کر کہ جس کی تو خلاف ورزی کرے۔''[1]

---

[1] جامع الترمذی: 1995۔ الادب المفرد للبخاری: 394۔ اس حدیث کو علامہ ذہبی اور علامہ عراقی نے لیث بن ابی سلیم کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: فیض القدیر: 421/6.

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ .

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اس کی اسناد میں ضعف ہے۔

غریب الحدیث: ...... لَا تُمَارِ: یہ مُمَارَاۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ ممارات اپنے لیے لڑنے کو کہتے ہیں۔ جبکہ مجادلہ حق کے لیے لڑنے کو کہتے ہیں۔ تب پھر مجادلہ مذموم جھگڑوں میں داخل نہ ہوگا۔

أَخَاكَ: مراد مسلمان بھائی ہے۔ **وَلَا تُمَازِحْهُ**: یعنی اس کے ساتھ اتنا زیادہ ہنسی مذاق نہ کر کہ اسے ایذاء پہنچنے لگے۔ تب پھر مذموم مزاح کی دو قسمیں ہوں گی:

(1) اتنا زیادہ کہ دوسرا تنگدل ہو جائے۔ جیسا کہ بعض لوگ بات بات پر مزاح کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ مزاح کی کثرت آدمی کی ہیبت کو ختم کر دیتی ہے۔

(2) دوسرا وہ جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچے، (جیسے اپریل فول کے نام پر دوسروں سے سنجیدہ مزاح کرنا)۔

مذکورہ حدیث میں ان دونوں معانی کا ہی احتمال ہے۔

وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ: موعدًا یہ نکرہ ہے جو نفی کے تحت آیا ہے۔ اس لیے تعمیم کا فائدہ دے رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی سے بھی ایسا وعدہ نہ کیا جائے جو پورا نہ کیا جا سکے چاہے اس وعدہ خلافی میں دوسرے کا ضرر ہو یا نہ ہو، ایسا وعدہ کرنا دونوں صورتوں میں منع ہے۔ **فَتُخْلِفَهُ**: چونکہ یہ فعل "فا" سببیہ کے بعد آیا ہے، اس لیے منصوب ہے۔

درایت الحدیث: ...... مذکورہ حدیث کی سند ضعیف ہے، اور جس حدیث کی سند کمزور ہو اس کا متن بھی کمزور کہلاتا ہے کیونکہ متن کی صحت اور اس کا ضعف سند کی صحت اور ضعف پر مبنی ہوتا ہے۔ تب پھر اگرچہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن اس کا متن صحیح ہے۔ کیونکہ مذاق کی کثرت باہمی بغض وعداوت کو بھی جنم دیتی ہے اور ایک دوسرے کے وقار کو بھی دل سے نکال دیتی ہے۔

آپس کے جھگڑے ویسے ہی نیکیوں کو کھا جاتے ہیں۔

جبکہ وعدہ خلافی کو صحیح احادیث میں نفاق کی ایک خصلت شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے باوجود یہ حدیث مقبول ہوگی کیونکہ اس کا متن دیگر دلائل صحیحہ اور قواعد شرعیہ سے موید ہے۔

بخل اور برے اخلاق کی مذمت

1500۔ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((خَصْلَتَانِ لَا يَجْتَمِعَانِ فِي مُؤْمِنٍ: الْبُخْلُ، وَسُوءُ الْخُلُقِ)).
أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ .

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دو خصلتیں ایسی ہیں جو کسی مومن (کے دل) میں اکٹھی نہیں ہوسکتیں: (1) بخل (2) اور بداخلاقی۔'' [1]
اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔

---

[1] جامع الترمذی: 1962۔ الادب المفرد للبخاری: 282۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے صدقہ بن موسیٰ کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: المغنی للذہبی، ص: 308.

غریب الحدیث:...... خَصْلَتَان: مراد دو عادات ہیں۔

اَلْبُخْلُ: یہ مال، اور جاہ ومنصب اور عمل میں سے اس چیز کو روکنا ہے جس کا خرچ کرنا واجب ہو۔ بخل کا اصل معنی اس مال کو روکنا ہے جس کا خرچ کرنا واجب ہو، پھر اس لفظ کو اور زیادہ وسعت دی گئی اور اس کو جاہ ومنصب اور عمل تک وسیع کیا گیا۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ذکر ہونے پر درود نہ پڑھنے کو بھی بخل فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی ذاتی وجاہت سے کسی کا کوئی بگڑا کام بنتا ہو اور وہ اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال نہ کرے تو یہ بھی بخل کہلائے گا۔

سُوْءُ الْخُلُقِ: مراد دوسرے کو ڈانٹنا اور جھڑکنا ہے۔ سوا ایسا نہ ہوگا کہ مومن میں یہ دونوں باتیں یکجا ہو جائیں کہ اگر اس کے پاس سائل کو دینے کو کچھ نہ ہو تو سائل کو جھڑکنے بھی لگے۔ بلکہ وہ کوئی بھی بات کہہ کر معذرت کر لے گا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا﴾

(الاسراء: 28)

''اور اگر کبھی تو ان سے بے توجہی کر ہی لے، اپنے رب کی کسی رحمت کی تلاش کی وجہ سے، جس کی تو امید رکھتا ہو تو ان سے وہ بات کہہ جس میں آسانی ہو۔''

لہٰذا جو غنی ہونے کے باوجود ضرورت مند کو نہ دے وہ بھی مومن کہلائے جانے کا حقدار نہیں۔ البتہ جو ہونے کے باوجود سائل کو دوسرے وقت پر ٹال دے وہ بخیل ضرور ہے لیکن بدخلق نہیں۔ البتہ اس کا ایمان ناقص رہے گا۔ پس کامل ایمان والا وہ ہے جو غنا کے ہوتے ہوئے خرچ بھی کرے اور نہ ہونے کی صورت میں سائل کو اچھے طریق سے جواب بھی دے۔

مجرم گالی دینے میں پہلے کرنے والا ہے

1501۔ وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِیءِ مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دو گالی دینے والے جو بھی کہیں، اس کا گناہ (گالی دینے میں) پہل کرنے والے پر ہوگا جب تک کہ خود مظلوم (بھی) ظلم پر نہ اتر آئے۔'' ❶

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... اَلْمُسْتَبَّان: یہ باب افتعال سے اسم فاعل کا تثنیہ کا صیغہ ہے۔ مطلب ایک دوسرے کو گالی دینا ہے۔ چنانچہ مستبان سے مراد ایک دوسرے کو گالی دینے والے ہوں گے۔

مُسْتَبَّان: یہ سبٌّ سے مشتق ہے۔ سبّ یہ مخاطب کو ایسی بات کے ساتھ خطاب کرنا ہے جو اسے ناگوار گزرے۔ گالی اور غیبت میں یہی فرق ہے کہ گالی مخاطب کو ناگوار بات کہنے کو کہتے ہیں اور غیبت غائب کی بابت کسی ناگوار بات کے کرنے کو کہتے ہیں۔ اب استباب کی صورت یہ ہوگی کہ مثلاً ایک نے دوسرے سے یہ کہا کہ تم بخیل ہو، اور اس نے بھی جواب میں کہہ دیا کہ میں بخیل ہوں تو تم بھی بخیل ہو، اسی طرح دونوں ایک دوسرے کو فاسق کہہ دیں تو یہ استباب کہلائے گا۔

رہا یہ سوال کہ جب دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کریں تو اس کا گناہ کس کے ذمہ ہوگا؟ اس کو بیان کرتے

❶ صحیح مسلم: 2587.

ہوئے ارشاد فرمایا:

مَا قَالَا، فَعَلَى الْبَادِئِ: کہ دونوں کی گالی گلوچ کا گناہ اسے ملے گا جس نے پہلے گالی دی تھی۔ کیونکہ دوسرے کے گالی دینے کا سبب بھی یہی بنا ہے۔ چاہے دوسرے نے گالی دے کر اپنا بدلہ لے بھی لیا ہے تب بھی دونوں کی گالی گلوچ کا گناہ پہلے کو ہی ملے گا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ پہلے نے وہ کام کیا ہے جس کی اسے اجازت نہ تھی اور وہ کام اسے منع تھا۔ جبکہ دوسرے نے وہ کام کیا جس کی اسے اجازت تھی۔ کیونکہ گالی کا جواب دینا مباح کی قبیل سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (البقرۃ: 194)

''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

اب الْمُسْتَبَّانِ مبتدا اول ہوگا۔ ''مَا'' موصولہ قَالَا جملہ خبریہ صلہ۔ موصول صلہ مل کر مبتداء ثانی، فعلی البادی جار مجرور مل کر خبر، مبتداء خبر مل کر جملہ خبریہ ہو کر پہلے مبتداء کی خبر، اور مبتداء خبر مل کر جملہ خبریہ ہوا۔

مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ: مراد یہ ہے کہ دونوں کی گالی گلوچ کا گناہ ظالم یعنی ابتداء کرنے والے پر ہوگا، کیونکہ ظالم ہی اس دشنام بازی کا سبب بنا ہے۔ لہٰذا وہ مباشر بھی ہے اور سبب بھی۔ لیکن اگر مظلوم حد سے تجاوز کرتا ہے یعنی ایک کے جواب میں دہری گالیاں دیتا ہے یا ہلکی کے جواب میں اشد گالی دیتا ہے تو ایسی صورت میں اپنے ظلم کا گناہ اسی کے سر ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ایک دوسرے کو گالی دینا مناسب نہیں۔ لہٰذا جو گالی دے اسے کہہ دو کہ میں جواب دے سکتا ہوں لیکن میں تمہیں اللہ کے لیے معاف کرتا ہوں۔
- کسی برائی کا سبب بننے والے کو برائی کرنے والے کا بھی گناہ ملے گا۔ کیونکہ گالی کا جواب دینے والا، مباشر فعل ہے لیکن چونکہ اس کے فعل کا سبب پہلے گالی دینے والا بنا ہے اس لیے اس کا گناہ (یعنی مباشر کا گناہ) متسبب کو ملے گا۔
- اور گزشتہ صفحات میں ضمان کے مسائل کے تحت یہ مسئلہ بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر کسی فعل کی مباشرت سبب پر مبنی ہو تو ضمان متسبب پر آئے گا۔
- مذکورہ حدیث میں جزا اور عدل کی بابت رب تعالیٰ کی حکمت کا بیان ہے۔ اس کی دلیل: ''مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ'' کے الفاظ ہیں۔

علماء نے اس جملہ کے دو معانی بیان کیے ہیں:

(1) ایک یہ کہ اگر دوسرے نے ظلم کیا تو اسے اپنے کیے ہوئے ظلم کا گناہ ملے گا۔

(2) دوسرا یہ کہ اگر دوسرے نے حد سے تجاوز کیا تو پہلے پر سے دوسرے کے گالی کے جواب میں گالی دینے کا گناہ اٹھ جائے گا۔ لہٰذا اب ہر ایک کے سر پر اپنی اپنی گالی کا گناہ باقی رہ جائے گا۔ حدیث کے ظاہر سے یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اب دوسرا بھی اپنی زیادتی کی وجہ سے ظالم بن چکا ہے۔ لہٰذا اس کے ظلم کو پہلا اپنے سر نہ اٹھائے گا۔

مسلمان کو مضرت پہنچانا منع ہے

1502۔ وَعَنْ أَبِيْ صِرْمَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ　　حضرت ابو صرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ ضَارَّ مُسْلِمًا ضَارَّهُ اللّٰهُ ، وَمَنْ شَاقَّ مُسْلِمًا شَاقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ)).

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’جس نے کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا تو رب تعالیٰ بھی اس کو ضرر پہنچائے گا، اور جس نے کسی مسلمان کو مشقت میں ڈالا تو رب تعالیٰ بھی اسے مشقت میں ڈالے گا۔‘‘ ❶

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

اس حدیث کو امام ابو داؤد رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

غریب الحدیث:......مَنْ ضَارَّ مُسْلِمًا: یعنی جان بوجھ کر ایسا کوئی کام کیا جس سے اسے ضرر پہنچا، اور مسلمان کی قید احترازی ہے کیونکہ کافر کو ایذاء پہنچانے میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ مسلمان کی قید اغلب کے اعتبار سے ہے، وگرنہ کافر کو بھی نقصان پہنچانا جائز نہیں۔

ضَارَّهُ اللّٰهُ: یعنی رب تعالیٰ اسے ضرر پہنچائے گا۔

وَمَنْ شَاقَّ مُسْلِمًا: یعنی ایسا کوئی کام کیا جس سے وہ مشقت میں پڑ گیا۔

شَقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ: یعنی رب تعالیٰ اسے مشقت میں ڈالے گا۔

مضمون حدیث:......اس حدیث میں دراصل دو بری خصلتوں سے ڈرایا اور روکا گیا ہے:

(1) مسلمان کو مضرت پہنچانا۔ چاہے اس کی جان کو مضرت پہنچائے اور چاہے اس کے مال یا آبرو کو اور چاہے اس کے اہل وعیال کو مضرت پہنچائے کہ یہ سب حرام اور ناجائز ہے۔

(2) مسلمان کو مشقت میں ڈالنا۔

یہ دونوں باتیں اس لیے منع ہیں کہ ان پر وعید آئی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مسلمانوں کی عزت وآبرو کا احترام واجب ہے۔ کیونکہ کسی کی ہتکِ عزت میں اس کی مضرت ہے جو منع اور حرام ہے۔
- جیسا عمل ہوگا ویسی ہی سزا ملے گی۔ اس کی دلیل: ”ضَارَّهُ اللّٰهُ“ اور ”شَقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ“ کے الفاظ ہیں، اور یہاں رب تعالیٰ کا ضرر پہنچانا مطلق ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے مسلمان بھائی کی بیع پر بیع کر کے اسے نقصان پہنچایا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب اسی بیع میں اسے ضرر پہنچے گا اور اس کا خریدا مال یا حاصل کیا ثمن برباد ہو جائے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو نقصان پہنچانے والا اب معرضِ ضرر وہلاک میں ہے کہ اسے رب تعالیٰ کی طرف سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
- رب تعالیٰ اپنے مسلمان بندوں کی مدافعت اور حفاظت وحمایت خود فرماتا ہے۔
- احکام میں بسا اوقات اغلب کی قید مذکور ہوتی ہے۔ چنانچہ ”مَنْ ضَارَّ مُسْلِمًا“ میں مسلمان کی قید اغلب کے اعتبار سے ہے جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر مسلموں کو ضرر پہنچانا جائز ہے۔ کیونکہ غیر مسلم یا تو حربی ہوگا تو اس کی تو سرے سے کوئی حرمت نہیں۔ یا پھر معاہد، ذمی اور مستامن میں سے کوئی ایک ہوگا کہ ایسے کافر کی حرمت ہے۔ تب پھر مسلمان کی قید

❶ سنن ابی داؤد: 3635۔ جامع الترمذی: 1940۔ سنن ابن ماجہ: 2342۔ مسند احمد: 453/3۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

اغلب کے اعتبار ہے، اور غیر مسلم کو بھی ضرر پہنچانا حرام ہوگا، اور یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ احکام کو مقید ذکر کرنا ان کے مطلق ہونے کے منافی نہیں ہوتا۔

◈ رب تعالیٰ کے علم، حکمت، قدرت، رحمت اور عدل کا اثبات۔ کہ رب تعالیٰ کا انسان کو ضرر پہنچانا اس کے علم کو مستلزم ہے۔ کیونکہ اگر رب تعالیٰ کو علم نہ ہوتو اس پر اس بندے کا حال کیونکر منکشف ہو سکتا ہے۔ پھر وہ حکیم بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

◈ مسلمان پر مشقت ڈالنا حرام ہے۔ کیونکہ اس فعل پر وعید مرتب ہوئی ہے۔

◈ جو لوگوں کے ساتھ سہولت والا معاملہ کرے گا، رب تعالیٰ بھی اس کے ساتھ سہولت والا معاملہ فرمائے گا۔

مسلمان نہ تو بدزبان ہوتا ہے، نہ فحش گو اور نہ لعن طعن کرنے والا ہوتا ہے

1503۔ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيءَ)).

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابو درداء ؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک رب تعالیٰ فحش گو بدزبان کو ناپسند فرماتے ہیں۔''[1]

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... يُبْغِضُ: بغض یہ محبت کی ضد ہے، یہ کراہت اور نفرت سے زیادہ لطیف شے ہے۔ رب تعالیٰ کے بغض کی صفت کے ساتھ متصف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ اس بغض کے ساتھ متصف ہیں جس پر سزا اور عقوبت دینا مرتب ہوتا ہے۔

الْفَاحِشَ: فحش: برے اور گندے قول یا فعل کو کہتے ہیں۔ برے فعل کی مثال جیسے کسی کے کھیت سے گزرتے ہوئے اس کی کھیتی کو ہاتھ یا پیر سے خراب کرتے جانا ہے۔ جبکہ زبان سے بری بات کہنے کا مطلب ظاہر ہے۔ چنانچہ بھونڈی بھدی اور اونچی آواز میں بری بات کرنے کو فحش گوئی کہتے ہیں۔ بلاشبہ فحش گوئی ایک بہت بری خصلت ہے۔

الْبَذِيءَ: بدزبان: جو اپنی بدزبانی سے دوسروں پر زیادتی کرے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ رب تعالیٰ کے لیے صفت بغض ثابت ہے۔ اس کی دلیل: "إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ" کے الفاظ ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے لیے جس طرح صفت محبت کو ثابت کرتے ہیں، اسی طرح صفت بغض کو بھی ثابت کرتے ہیں۔

◈ فحش گوئی اور فحش افعال سے بچا جائے کہ ایک مومن کا دل بھی نرم ہو اور زبان بھی پاک ہو۔

◈ بدزبانی حرام ہے اور اس سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ اس پر رب تعالیٰ کی ناراضی مرتب ہوتی ہے۔ اس لیے ایک مومن ملنسار، خوش گفتار، نرم دل اور مانوس ہونا چاہیے۔

1504۔ وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ۔ رَفَعَهُ: ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلَا اللَّعَّانِ،

جامع ترمذی میں ہی حضرت ابن مسعود ؓ کی ایک حدیث ہے جس کو وہ مرفوع بیان کرتے ہیں کہ ''مومن نہ تو طعنہ زن ہوتا ہے

---

[1] جامع الترمذی: 2002۔ امام ابن حبان (5693) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ سنن البیهقی: 193/10۔ میں یہ حدیث متعدد طریق سے مروی ہے۔

وَلَا الْفَاحِشِ ، وَلَا الْبَذِيْءِ)).

اور نہ لعنت کرنے والا ہوتا ہے اور نہ فحش گو ہوتا ہے اور نہ بدزبان ہی ہوتا ہے۔" ❶

وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ وَقْفَهُ.

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے جبکہ امام دارقطنی نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔

غریب الحدیث :...... رَفَعَهُ: یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر کے بیان کیا ہے۔ راویٔ حدیث نے ان الفاظ کو لا کر گویا کہ اس روایت کی بابت اپنے اس تردّد کا اظہار کیا ہے کہ یا تو یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں یا پھر جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہیں۔

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ: یہ سلبیہ جملہ ہے۔ مومن سے توحید و رسالت پر ایمان رکھنے والا مراد ہے۔ طعان یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے نام و نسب، شکل و صورت اور پیشوں وغیرہ میں طعنہ زنی سے کام لیتا ہو اور ان میں عیب نکالتا ہو۔

وَلَا اللَّعَّانِ: لعان بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مراد بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہے جو بات بات پر لعنت کرنے والا ہو، جیسے یہ کہنا کہ "او لعنتی! ذرا قلم تھمانا، او لعنتی! ذرا کتاب دینا" وغیرہ وغیرہ۔ فاحش اور بذی پر گزشتہ حدیث میں مفصل کلام گزر چکا ہے۔

روایت الحدیث :...... امام دارقطنی نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے تب پھر یہ قول صحابی ہوا۔ لیکن چونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول دیگر نصوص کے موافق و مطابق ہے، اس لیے حجت ہے۔ چنانچہ ایک کامل مومن وہ ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب وہ نہ تو کسی کے نسب، نام، شکل صورت وغیرہ میں طعن کرے اور نہ اس پر لعنت کرے، نہ بدگوئی کرے اور نہ فحش گوئی کرے۔ پس اگرچہ راجح یہی ہے کہ یہ قول صحابی ہے لیکن دیگر نصوص کے موافق ہونے کی وجہ سے حجت ہے۔

مردوں کو برا بھلا مت کہو

1505- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوْا)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مُردوں کو برا بھلا مت کہو، کہ وہ اس تک پہنچ چکے ہیں (اور اس کو پا چکے ہیں) جو انہوں نے آگے بھیجا تھا۔" ❷

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... لَا تَسُبُّوا: یہ خطاب ساری امت کو ہے، گو اس کے اول مخاطب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔

---

❶ جامع الترمذی: 1977- مسند احمد: 404/1- الادب المفرد للبخاری: 312- ابن المدینی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ اس کی اسناد میں محمد بن سابق ہے جس کو ابن معین نے ضعیف کہا ہے۔ جیسا کہ علامہ ذہبی نے "المیزان" (157/6) میں کہا ہے۔ (دیکھیں: علل الدارقطنی: 92/5) امام دارقطنی کہتے ہیں: اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔

❷ صحیح البخاری: 6516.

اَلْأَمْوَاتَ: یہ میت کی جمع ہے۔ یہاں مطلق میت مراد ہے چاہے وہ مرنے والا مومن ہو یا کافر۔
فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا: یہ مُردوں کو گالی دینے کی ممانعت کی علت کا بیان ہے۔لہٰذا مذکورہ ''فا'' تعلیلیہ ہوگا۔
أَفْضَوْا: یہ وَصَلُوا کے معنی میں ہے۔

إِلَى مَا قَدَّمُوْا: مراد وہ اعمال ہیں جو وہ اپنے آگے بھیج چکے ہیں۔ چنانچہ مرنے کے بعد آدمی اپنے کیے دھرے کو اپنے سامنے پالے گا۔ خیر ہوئی تو خیر کو اور شر ہوا تو شر کو پالے گا۔ بلکہ اس خیر یا شر کا مژدہ اسے مرنے سے قبل ہی مل جاتا ہے۔ تب پھر کسی کو انہیں برا بھلا کہنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ چنانچہ اگر وہ خیر کو پہنچ گئے ہیں تو ہمارا برا بھلا کہنا ان کے حق میں بے کار ہے اور اگر وہ شر کو پہنچ گئے ہیں تو اور بھی زیادہ بے کار ہے۔ البتہ اہل بدعت وہواء اور اصحابِ زیغ وضلال کی برائی بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں تا کہ لوگ ان کے مر جانے کے بعد ان کی پھیلائی ہوئی گمراہی سے بچ جائیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مُردوں کو برا بھلا کہنا منع ہے۔ مراد ان کے برے اعمال کا تذکرہ ہے، جیسے وہ تو بڑا ظالم تھا، سود خور تھا وغیرہ وغیرہ کہ ایسا کہنا منع ہے۔ کیونکہ ایسا کہنے کا مطلق کوئی فائدہ نہیں اور بے کار کی باتوں کو چھوڑنا ایک مومن کے ایمان کی خوبی میں سے ہے۔
- البتہ اگر کسی نے مرنے سے قبل کوئی شرعی مسئلہ غلط بیان کیا تھا تو اس کی اس خطا کی تصریح اور تصحیح وتوضیح لازم ہے تا کہ کوئی اس کی کہی لکھی بات سے دھوکہ نہ کھائے۔
- پھر مُردوں کے برے تذکرے سے اس کے لواحقین کو اذیت پہنچتی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں اس بات کا ذکر ہے۔ اس لیے مرنے والوں کو برا بھلا کہنے سے گریز کیا جائے۔
- آدمی کو چاہیے کہ وہ بے کار کی باتوں سے اجتناب کرے کہ یا تو خیر کی بات کہے یا چپ رہے۔

چغلی

1506- وَعَنْ حُذَيْفَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' [1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:......**قَتَّاتٌ:** مراد نمّام یعنی چغل خور ہے۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ: اس سے اول وہلہ کا دخول مراد ہے جو بلا حساب کتاب اور بنا عقوبت کے ہوگا۔ یعنی چغل خور کو جنت میں دخول مطلق حاصل نہ ہوگا جیسا کہ اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

چغلی کیا ہے؟

لفظ نَمِيْمَة یہ نَمَّ الْحَدِيْثَ ''فساد پھیلانے کی غرض سے بات پھیلانا'' سے ماخوذ ہے۔ تب پھر لفظ نَمِيْمَة معنی مَنْمُوْمَةٌ (یعنی فَعِيْلَةٌ بمعنی مَفْعُوْلَةٌ) کے ہوگا (یعنی پھیلائی گئی بات)۔

نَمَّ الْحَدِيْثَ کا معنی ہے بات کو اس کے کہنے والے کی طرف منسوب کرنا اور مراد وہ بات نقل کرنا ہے جس سے لوگوں

[1] صحيح البخاري، 6056- صحيح مسلم: 105.

کے درمیان تفریق پیدا کرنا اوران میں باہم بغض وعداوت کو ہوا دینا مقصود ہو۔ مثلاً کسی کو جا کر یہ کہنا کہ 'فلاں فلاں تو تمہارے بارے میں یہ یہ کہہ رہا تھا" تا کہ وہ بھڑک کے اور عداوت پر اتر آئے۔

اسلام نے چغل خوری سے منع کیا ہے کہ یہ مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرتی ہے۔ اسی لیے غالب یہ ہے کہ چغل خور جھوٹا ہی ہوتا ہے اور جو دوسروں کی بات تم تک پہنچاتا ہے، وہ تمہاری بات بھی دوسروں تک پہنچائے گا۔ چغلی لگانے کا حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے اور یہ ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکانے کا ذریعہ ہے جو علی وجہ التحریم منع ہے۔ البتہ جب ایک کی بات دوسرے تک علی وجہ النصیحہ پہنچائی جائے تو یہ نمیمہ اس وعید میں داخل نہ ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ شریعت اسلامیہ باہمی الفت ومحبت کے رویوں کو فروغ دینے کی داعی اور آپس کے اتفاق واتحاد پر مبنی ہے کیونکہ اسلام نے تفریق پھیلانے پر جنت سے محرومی کی سخت ترین وعید سنائی ہے۔

◈ چغل خوری کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔

طیش پر قابو پانا

1507,1508۔ وَعَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهُ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنا غصہ روک لیا تو رب تعالیٰ بھی اس سے اپنے عذاب کو روک لے گا۔''[1]

أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ- وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ عِنْدَ ابْنِ أَبِي الدُّنْيَا.

اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم الاوسط میں بیان کیا ہے ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے اس کا ایک شاہد بھی ذکر کیا ہے۔[2]

غریب الحدیث:......**مَنْ كَفَّ غَضَبَهُ**: کف سے مراد روکنا اور تھامنا ہے۔ مراد غصہ نہ کرنا نہیں بلکہ غصہ پر مرتب ہونے والے فعل کو روکنا ہے۔ غصہ روکنے کی فضیلت اور خوبی کو گزشتہ صفحات میں مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهُ: یعنی جو آدمی رب تعالیٰ کی طاعت کی غرض سے اپنا غصہ تھامے رکھے گا، یہ بشارت اسے ملے گی۔ البتہ جو نفس کی تربیت کرنے اور خود کو حسن اخلاق کا عادی بنانے کی غرض سے غصہ روکے گا اسے یہ خاص اجر اور ثواب نہ ملے گا۔ یہ ثواب اسے ملے گا جو نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد لَا تَغْضَبْ پر عمل کرنے کے لیے اپنا غصہ روکے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ غصہ روکنے کی نہایت بلیغ ترغیب۔ پس آدمی غصہ کے مقتضی پر اپنے قول یا فعل کے ذریعے عمل نہ کرے۔ چنانچہ نہ تو کسی کو جسمانی تکلیف پہنچائے اور نہ زبان سے برا بھلا ہی کہے۔

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی: 6029۔ المعجم الصغیر للطبرانی: 861۔ مسند ابی یعلی: 4338۔ اس حدیث کی اسناد میں ربیع بن سلیمان ازدی ہے جو ضعیف ہے۔ جیسا کہ علامہ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" (298/10) میں کہا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ "تفسیر القرآن الکریم" (406/1) میں فرماتے ہیں: ''اس حدیث کی اسناد میں نظر ہے۔ ابو حاتم نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ (دیکھیں: العلل لابن ابی حاتم: 141/2).

[2] قضاء الحوائج لابن ابی الدنیا، ص: 36.

◈ غصہ کی تین اقسام پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔
◈ رب تعالیٰ نے اپنی ایک صفت ''روکنا'' بھی بیان فرمائی ہے۔ہم اہل سنت والجماعت رب تعالیٰ کی اس صفت کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کی صفات افعال میں سے ہے۔
◈ اس حدیث کا ایک شاہد بھی ہے۔یادر ہے کہ ضعیف احادیث کوتقویت کی ضرورت ہوتی ہے چاہے یہ تقویت متن کے ذریعے حاصل ہو اور چاہے سند کے ذریعے حاصل ہو۔سو جس حدیث کو متن کے ذریعے تقویت ملے، اس کو شاہد کہتے ہیں۔مراد یہ ہے کہ یہی متن ایک اور اسناد سے بھی مروی ہے اور جب یہ تقویت سند کے ذریعے ہو تو اس کو متابعت کہتے ہیں۔مراد یہ ہے کہ اسی سند کے ساتھ ایک اور اس جیسا متن بھی ثابت ہے۔
◈ مذکورہ حدیث کا ایک شاہد ابن ابی دنیا نے بھی نقل کیا ہے۔

فریب دینے اور بخل کرنے کی مذمت

1509۔ وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ، وَلَا بَخِيْلٌ وَلَا سَيِّءُ الْمَلَكَةِ)).

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جنت میں نہ تو دغا باز داخل ہوگا اور نہ کنجوس اور نہ بدمعاملہ (ہی داخل ہوگا)۔''[1]

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفَرَّقَهُ حَدِيْثَيْنِ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کو دو حدیثیں بنا کر روایت کیا ہے اور اس کی اسناد میں ضعف ہے۔

غریب الحدیث :......عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ رضي الله عنه : قلم ان کی خوبیاں بیان کرنے سے عاجز ہے۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سب خوبیوں کو یہی جملہ بس ہے کہ سب پیغمبروں کے بعد سب انسانوں سے افضل ترین انسان جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

خَبٌّ: دھوکا باز، فریب کار، عیارانہ چال چلنے والا۔
بَخِيْلٌ: بخیل کی مفصل تعریف گزر چکی ہے۔
سَيِّءُ الْمَلَكَةِ: ملکۃ سے مراد معاملہ ہے۔یعنی بدمعاملہ شخص۔
لَا يَدْخُلُ: مراد دخولِ مطلق کی نفی ہے کہ ایسے لوگ اہل وہلہ میں بلا حساب و کتاب اور بنا عقوبت و عذاب کے جنت میں داخل نہ ہوں گے۔یہ وعید ہے جو ان باتوں کے کبیرہ گناہ ہونے کو بتلا رہی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ دھوکہ بازی، فریب کاری، عیاری، مکاری، چالاکی اور چال بازی حرام ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔لیکن یاد رہے کہ یہ

---

[1] جامع الترمذی: 1963۔ امام ترمذی فرماتے ہیں، یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔جامع ترمذی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں 'لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ وَلَا مَنَّانٌ وَلَا بَخِيْلٌ' ''جنت میں نہ تو فریب کار داخل ہوگا اور نہ احسان جتلانے والا اور نہ کنجوس ہی داخل ہوگا۔'' ''مسند احمد'' (1/7) میں یہ حدیث اسی طرح پوری منقول ہے۔''مسند ابی یعلی'' (95) میں بھی یہ حدیث اسی طرح ہے۔''الکامل لابن عدی'' (27/6 ترجمة فرقد السبخي) ابن عدی کہتے ہیں کہ فرقد کثیر الحدیث نہیں ہے۔

خداع امانت کے مقام پر مذموم ہے۔ البتہ برمحل خداع یعنی چال چلنا مذموم نہیں محمود ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (النساء: 142)

''بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ. ❶ ''جنگ ایک دھوکا ہے۔'' پس اگر خداع اور چالبازی اپنے صحیح محل میں ہو تو محمود ہے۔

◈ بدمعاملگی بھی حرام ہے کیونکہ اس پر وعید مرتب ہے۔ البتہ یہ مطلق نہیں۔ لہٰذا جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، تم بھی اس کے ساتھ اسی قدر برا سلوک کر سکتے ہو جتنا اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔

ٹوہ رکھنا اور ٹوہ لگانا حرام ہے

1510- وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ تَسَمَّعَ حَدِيْثَ قَوْمٍ، وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ، صُبَّ فِيْ أُذُنَيْهِ الْآنُكُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)). يَعْنِي الرَّصَاصَ.

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کچھ لوگوں کی بات چھپکے سے سننے کی کوشش جبکہ انہیں اس (آدمی کے اس طرح بات سننے) سے ناگواری ہو تو روزِ قیامت اس کے کانوں میں (پگھلا ہوا) سیسہ ڈالا جائے گا۔'' ❷

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... مَنْ: یہ شرطیہ ہے، اس لیے اس کے مابعد جملہ شرطیہ ہے۔

تَسَمَّعَ: چپکے سے اور ٹوہ لگا کر سننا۔ یعنی چوری چوری سننا۔ وہ یوں کہ آدمی یوں خاموشی سے بیٹھا ہو کہ لوگ سمجھیں کہ اسے کچھ خبر نہیں لیکن وہ سب سن رہا ہو۔ قَوْمٍ: مراد وہ لوگ ہیں جو آپس میں کوئی مخفی بات کر رہے ہوں۔

وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ: یہ جملہ حالیہ ہے اور یہ لفظ قَوْمٍ سے حال ہے۔ اگر اس جملہ سے قبل واؤ نہ ہو تو اسے ''قوم'' کی صفت قرار دیا جاتا کیونکہ وہ نکرہ ہے۔

صُبَّ فِيْ أُذُنَيْهِ: یہ جملہ جوابِ شرط ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس کے کانوں میں روزِ قیامت یہ سیسہ کون ڈالے گا؟ تو یہ وہ فرشتے ہوں گے جنہیں رب تعالیٰ اس بات کا امر فرمائے گا جس کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ إِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝﴾

(الدخان: 47-48)

''اسے پکڑو، پھر اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک دھکیل کر لے جاؤ۔ پھر کھولتے پانی کا کچھ عذاب اس کے سر پر انڈیلو۔''

الْآنُكُ: سیسہ اور سیسہ تب ہی انڈیلا جا سکتا ہے جب وہ پگھلا ہوا ہو، تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ ایسے آدمی کے کانوں میں روزِ قیامت پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔

❶ اس کی تخریج ''کتاب الجهاد'' میں گزر چکی ہے۔ ❷ صحيح البخاري: 7042.

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ جن لوگوں کو یہ ناپسند ہو کہ کوئی دوسرا ان کی بات سنے، ان کی بات کو چپکے سے سننا حرام ہے کیونکہ اس فعل پر شدید وعید آئی ہے۔ چاہے اس کی صورت کوئی بھی ہو، مثلاً کسی برقی آلہ کے ذریعے دُور بیٹھ کر باتیں سننا، دیوار، کھڑکی یا دروازہ کی اوٹ سے سننا، قریب بیٹھ کر بے دھیانی کا تاثر دے کر باتیں سننا کہ یہ صورتیں اس ممانعت اور تحریم میں داخل ہیں۔

◈ دوسروں کی باتیں ان کی بے خبری میں ریکارڈ کر لینا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

◈ دوسروں کی باتیں چپکے سے سننا کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔

◈ اور اگر باتیں کرنے والوں کو کسی دوسرے کے سننے سے کوئی ناگواری نہ ہو تو یہ حرام نہ ہوگا۔

◈ جیسا عمل ہوگا ویسی ہی جزا ملے گی کہ جب اس آدمی نے دوسروں کی ناگواری کے باوجود ان کی باتیں چوری سنیں تو اسے سزا بھی ویسی ہی ملے گی کہ روزِ قیامت سیسہ پگھلا کر اس کے کانوں میں ڈالا جائے گا۔

◈ رب تعالیٰ گناہ کے حساب سے بندے کا محاسبہ و مواخذہ فرماتے ہیں۔

پڑی جب اپنے عیبوں پہ نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

1511- وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((طُوْبٰى لِمَنْ شَغَلَهُ عَيْبُهُ عَنْ عُيُوْبِ النَّاسِ)).

أَخْرَجَهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سعادت ہے اس شخص کے لیے جسے اپنے عیب دوسروں کے عیبوں (کے دیکھنے) سے مشغول رکھتے ہیں۔'' ❶

اس حدیث کو امام بزار نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ...... طُوبٰی: طوبیٰ کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں، جیسے:

⊙ ...... یہ جنت کے ایک درخت کا نام ہے۔

⊙ ...... نیک عادت، تب پھر طوبیٰ یہ طیب سے فُعْلٰی کے وزن پر اسم تفضیل کا صیغہ ہوگا اور مراد اَلْخَصْلَةُ الطُّوْبٰى ہوگی۔ یعنی جو آدمی فلاں فلاں اچھا کام کرے، اس کے لیے سعادت اور نیکی ہے۔

⊙ ...... خیر اور بھلائی۔

⊙ ...... جنت کی ہر خوش گوار چیز۔

⊙ ...... بقاء، لازوال اور سرمدی عزت وغیرہ وغیرہ۔

ان میں دوسرا قول زیادہ عام اور اقرب ہے۔

مضمون حدیث: ...... مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جسے اپنے عیبوں اور خامیوں پر نظر رکھنے کی وجہ سے دوسروں کے عیب دیکھنے کی فرصت نہ ملے بلاشبہ وہ شخص سعادت مند ہے اور اس کے لیے نیک خوش خبری ہے۔ کیونکہ کوئی آدمی بھی عیبوں سے خالی نہیں۔ اس کی دلیل ''کل بنی آدم خطاء'' والی حدیث ہے۔ اس لیے یہ بات کسی بھی طرح

❶ سیر اعلام النبلاء للذهبی: 557/13 من طریق البزار۔ ذہبی کہتے ہیں: یہ واہی یعنی کمزور اسناد والی حدیث ہے اور ابن ابی حاتم کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اس متن کی اسناد صحیح نہیں ہے۔ (دیکھیں: الکامل لابن عدی: 384/1۔ مجمع الزوائد: 229/10)

معقول اور درست نہیں کہ آدمی دوسروں کے عیب دیکھنے میں لگا رہے۔ اگر آدمی اپنے عیبوں کو ہی شمار کرنے بیٹھ جائے تو تھک جائے اور اس کے عیب ختم نہ ہوں۔ اس لیے اولیٰ یہی ہے کہ آدمی ایران طوران کی باتوں میں لگنے کی بجائے اپنے عیبوں کی جستجو اور ان کی اصلاح، درستی اور سدھار کی کوشش کرے۔

عَيْبُ: یہ آدمی کی صورت، سیرت اور عمل میں سے ہر وہ بات ہے جو اس کے لیے عار بنے اور کوئی آدمی بھی عیب کی ان تینوں اقسام سے خالی نہیں۔ اس لیے اپنے عیبوں پر نظر رکھنا ہی عین عقل مندی اور دنیا و آخرت کی سعادت ہے۔

تکبر سے بچو

1512۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ تَعَاظَمَ فِيْ نَفْسِهِ، وَاخْتَالَ فِيْ مِشْيَتِهِ لَقِيَ اللّٰهَ ، وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے جی ہی جی میں خود کو بڑا سمجھا اور چلنے میں اِترایا تو وہ (روزِ قیامت) رب تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غصہ میں ہوگا۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

غریب الحدیث:......**تَعَاظَمَ فِيْ نَفْسِهِ:** یعنی اس نے خود کو عظیم انسان کے درجہ میں اتارا۔ اس بات کا تکبر ہونا ظاہر ہے۔ **وَاخْتَالَ فِيْ مِشْيَتِهِ:** یعنی فخر دغرور کرنے والوں کی سی چال چلنے لگا۔ اس بات کا بھی کبر ہونا ظاہر ہے۔ پس تعاظم یہ دل کے تکبر کا نام ہوگا اور اختیال و افتخار یہ عمل میں تکبر کا نام ہوگا۔

لَقِيَ اللّٰهَ، وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ: اس جملہ کی گزشتہ میں قرار واقعی تشریح ذکر کی جا چکی ہے۔ یہ وعید ہے اور اس کا مستحق وہ ہوگا جس میں یہ دو مذموم خصلتیں جمع ہو جائیں (1) خود کو دوسروں سے بڑا سمجھنا (2) متکبروں کی طرح اِترانا اور چلنا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- خود کو جی میں دوسروں سے بڑا سمجھنا حرام ہے کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔ یاد رہے کہ آدمی جتنا خود کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے، اتنا ہی وہ دوسروں کی نگاہوں سے گرتا جاتا ہے اور جتنا کوئی تواضع اختیار کرتا ہے، اتنا ہی دوسروں کی نظروں میں اونچا ہوتا جاتا ہے۔
- تکبر حق کو ٹھکرانے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے۔
- متکبروں اور فخر کرنے والوں کی سی چال چلنا حرام ہے اور یہ مٹک مٹک کر، کندھے جھٹک کر، گردن اکڑا کر، سینہ تان کر، منہ پھلا کر، تیوری چڑھا کر، آنکھیں گھما گھما کر اور بازوؤں کو ہچکولے دے دے کر چلنے کا نام ہے۔ کہ دیکھنے والے کو اس کی چال میں ایک مستی، رعونت اور اُتراہٹ نظر آئے۔ یہ سب حرام ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان: 18)

''بے شک اللہ کسی اکڑنے والے، فخر کرنے والے سے محبت نہیں کرتا۔''

---

[1] المستدرك للحاكم: 128/1۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔ مسند احمد: 118/2۔ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ جیسا کہ علامہ ہیثمی (98/1) نے کہا ہے۔

◈ رب تعالیٰ سے ملنا ثابت ہے۔اس کی دلیل لَقِیَ اللّٰہَ کے الفاظ ہیں۔
◈ رب تعالیٰ کے لیے صفتِ غضب ثابت ہے۔

جلد بازی کی مذمت

1513۔ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ)).

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

غریب الحدیث:......**اَلْعَجَلَةُ**: یہ بے سوچے سمجھے کسی بات کو کرگزرنے کا نام ہے چاہے یہ جلد بازی اعتقاد میں ہو کہ بے سوچے سمجھے ایک عقیدہ اختیار کرلیا اور چاہے قول وفعل میں ہو کہ بنا تولے جو منہ میں آیا ہانک دیا اور سوچا نہ سمجھا اور کوئی کام کرلیا کہ یہ سب عجلہ یعنی جلد بازی کے زمرہ میں داخل ہے۔

عجلت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (الانبیاء: 37) ''انسان سراسر جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔''

گویا کہ انسان کا خمیر عجلت میں گندھا ہوا ہے اور یہ اس کا وصف لاینفک ہے۔ارشاد ہے:

﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ (الاسراء: 11) ''اور انسان ہمیشہ سے بہت جلد باز ہے۔''

غرض جلد بازی شیطان کی ترغیب کا نتیجہ ہوتی ہے جس کا انجام ندامت کی صورت میں نکلتا ہے۔یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر قسم کی عجلت مذموم ہی نہیں ہوتی بلکہ کوئی عجلت محمود بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جلد بازی اگر برمحل ہو اور وہ نیکیوں میں آگے بڑھنا ہے تو یہ محمود ہے جبکہ بے محل تیزی اور جلد بازی مذموم اور شیطان کی طرف سے ہے۔

تنبیہ:......صحیح ہونے کی شرط پر یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی میں سکون، وقار، سنجیدگی، ٹھہراؤ اور امور میں توقف اور تحمل مزاجی لازمی ہے۔

بداخلاقی براشگون اور منحوس عادت ہے

1514۔ وَعَنْ عَائِشَةَ ﷺ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((الشُّؤْمُ سُوْءُ الْخُلُقِ)).

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بداخلاقی (یہ) براشگون ہے۔'' [2]

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد میں ضعف ہے۔

---

[1] جامع الترمذی: 2012۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے۔ متعدد محدثین نے عبدالمہیمن بن عباس بن سہل میں کلام کیا ہے اور اسے حافظہ کی طرف سے ضعیف کہا ہے۔ (دیکھیں: کشف الخفاء: 350/1).

[2] مسند احمد: 85/6۔ المعجم الاوسط للطبرانی: 4360۔ اس حدیث کی اسناد میں ابوبکر بن ابی مریم ہے، جو ضعیف ہے۔

غریب الحدیث:...... الشُّؤْمُ سُوْءُ الْخُلُقِ: یادر ہے کہ الشُّؤْمُ خبر مقدم ہے کیونکہ تقدیری عبارت اِنَّ سُوْءَ الْخُلُقِ مِنَ الشُّؤْمِ (یعنی "بے شک بداخلاقی یہ براشگون ہے۔") ہے نہ کہ اَلشُّؤْمُ مِنْ سُوْءِ الْخُلُقِ ہے۔(یعنی "نحوست اور بدشگونی یہ برے اخلاق میں سے ہیں۔") ظاہر پہلی ترکیب ہی ہے۔

تَنْبِیْہٌ:...... معلوم ہوا کہ کسی کے اخلاق برے ہونا نیک فال نہیں بلکہ ایک گونہ نحوست ہے اور یہ روزمرہ کا تجربہ اور آزمودہ امر ہے کہ آدمی کو بداخلاقی کے نتیجہ میں نہ جانے کیسی کیسی مصیبتیں، عداوتیں اور الجھنیں سہنا پڑتی ہیں۔ بداخلاقی کئی فتنوں اور شرور کا دروازہ کھولتی ہے۔

یادر ہے کہ یہاں حصر کا بیان نہیں کہ جو بھی بداخلاق ہوگا وہ منحوس ہی ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ بداخلاقی نحوست کی ایک قسم ہے۔غرض اس حدیث سے بداخلاقی کی نہایت بلیغ ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

بہت زیادہ لعنت کرنے سے بچیں

1515۔ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ اللَّعَّانِيْنَ لَا يَكُوْنُوْنَ شُفَعَاءَ، وَلَا شُهَدَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)).

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "بے شک بہت زیادہ لعنت کرنے والے روزِ قیامت نہ تو سفارش کرنے والے ہوں گے اور نہ وہ گواہ ہی ہوں گے۔" [1]

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... اللَّعَّانِيْنَ: کثرت سے اور بات بات پر لعنت کرنے والے۔حتیٰ کہ کوئی بھی بات بغیر لعنت کے نہ کرتے ہوں جیسے ذرا سی تاخیر ہو جانے پر بیوی کو یہ کہنا کہ "تم پر لعنت ہو، چائے نہیں بنی ابھی تک۔"

شُفَعَاءَ ، شُهَدَاءَ: مراد یہ کہ روزِ قیامت نہ تو کسی کے حق میں ان کی سفارش مقبول ہوگی اور نہ ان کی گواہی ہی مقبول ہوگی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- زیادہ لعنت کرنے سے ڈرانا کیونکہ اس پر وعید آئی ہے۔
- زیادہ لعنت کرنا کبیرہ گناہ ہے۔کیونکہ اس پر وعید مرتب ہوئی ہے جو اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی دلیل ہے۔
- روزِ قیامت کا اِثبات۔
- قیامت کے دن پیغمبروں کے علاوہ افراد بھی سفارش کریں گے۔کیونکہ اگر غیرِ رسول کے لیے سفارش وشفاعت ثابت نہ ہو تو لعانین اور غیر لعانین سب برابر ہو جائیں۔
- شفاعتِ عظمیٰ صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور یہ قیامت کے عظیم ترین کرب وغم سے سب کو نجات دلانے کی شفاعت ہے جس کا ذکر قرآن وسنت کی نصوص میں متواتر ہے۔
- اہل جنت کی شفاعت کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں، یہ بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔
- اپنے کافر چچا ابوطالب کے لیے تخفیفِ عذاب کی شفاعت کہ کافروں کو کسی کی شفاعت نصیب نہ ہوگی سوائے نبی

---

[1] صحیح مسلم: 2598.

کریم ﷺ کے کہ آپ ﷺ کی شفاعت اپنے کافر چچا کو نصیب ہو گی کیونکہ انہوں نے دنیا میں آپ ﷺ کی سب سے زیادہ نصرت وحمایت کی تھی حتیٰ کہ موت تک آپ ﷺ کی نصرت پر ڈٹے رہے تھے۔

- جنابِ ابو طالب کے حق میں عذابِ جہنم کی تخفیف کی صورت یہ ہو گی کہ انہیں صرف آگ کے دو جوتے پہنائے جائیں گے۔
- قیامت کے دن گواہ ثابت ہیں اور یہ چار قسم کے ہیں:

(1) فرشتے (2) اللہ کے پیغمبر

(3) علماء (4) اور خود آدمی کے اعضاء و جوارح

- لعنت کی کثرت کرنے والے روزِ قیامت گواہ بننے کی سعادت سے محروم رہیں گے اور یہ ان کے حق میں وعید ہے البتہ جو توبہ کر لے اللہ بھی اسے معاف فرما دیتے ہیں۔

اپنے مسلمان بھائی کو عار دلانے کی ممانعت

1516۔ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتَّى يَعْمَلَهُ)).

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنے (مسلمان) بھائی کو (اس کے) کسی گناہ کا (جو اس سے ہوا ہو) عار دلایا تو وہ نہیں مرے گا یہاں تک وہی گناہ وہ بھی کر لے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَسَنَدُهُ مُنْقَطِعٌ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن کہا ہے، مگر اس کی سند میں انقطاع ہے۔

غریب الحدیث:...... عَيَّرَ: عیب دلانا، عار دلانا۔

بِذَنْبٍ: ذنب، رب تعالیٰ کی نافرمانی، گناہ۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں ذنب گناہ سے زیادہ عام معنی میں ہے۔ لہٰذا یہ صورت اور سیرت میں عار دلانے تک کو شامل ہو گا۔

لَمْ يَمُتْ حَتَّى يَعْمَلَهُ: اور یہ اس جرم کی پوری پوری سزا اور اس کا پورا پورا بدلہ ہے کہ جو کسی کو کسی بات کی عار دلائے گا، مرنے سے پہلے پہلے خود بھی اس میں مبتلا ہو کر مرے گا۔

درایۃ الحدیث :......سند کے اعتبار سے تو یہ حدیث ضعیف ہے ہی۔ لیکن کیا اس کا متن بھی صحیح ہے یا نہیں؟ کیا واقع یہی ہے کہ جو کسی کو کسی بات کی عار دلاتا ہے وہ اس عیب میں مبتلا ہو کر ہی رہتا ہے یا ایسا ہونا لازم نہیں؟

تو واقع یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے کسی کا بھی مشاہدہ لازم نہیں۔ لہٰذا بسا اوقات کسی کو عار دلانے کے باوجود بھی آدمی اس عار میں مبتلا نہیں ہوتا اور بسا اوقات آدمی ایسے عیب اور گناہ میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے جس کی اس نے کبھی کسی کو عار نہیں دلائی ہوتی۔

تب پھر ہم یہی کہیں گے کہ الحمد للہ یہ حدیث ضعیف ہے اور حسن تک کے مرتبہ میں بھی نہیں۔ البتہ اپنے بھائی کو عار دلانا

---

[1] جامع الترمذی: 2505۔ اس حدیث کی اسناد میں حسن بن ابی یزید ہے۔ ابن عدی اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے کے باوجود اس کی حدیث لکھی جائے گی۔ (الکامل لابن عدی: 172/6).

بلاشبہ حرام ہے۔

لوگوں کو ہنسانے کے لیے بھی جھوٹ بولنا حرام ہے

1517- وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((وَيْلٌ لِلَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيْلٌ لَهُ، ثُمَّ وَيْلٌ لَهُ)).

بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہلاکت ہے اس کے لیے جو بات کرے اور (اس لیے) جھوٹ بولے تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو ہنسائے، اس کے لیے ہلاکت ہے، اس کے لیے پھر ہلاکت ہے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ.

اس حدیث کو ائمہ ثلاثہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد قوی ہے۔

غریب الحدیث:...... **وَيْلٌ**: یہ وعید اور بددعا کا کلمہ ہے اسی لیے نکرہ ہونے کے باوجود اس کو مبتدا بنا کر لانا جائز ہے۔ یہ کلمہ عذاب ہے۔ اس کا معنی نزولِ آفت و ہلاکت اور تباہی و بربادی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ البتہ یہ لفظ ان دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تو شخص معین کے عقاب کے تناظر میں دیکھیں تو یہ جہنم کی وادی کا نام ہے اور اگر اس کے معنی کے عموم کو دیکھیں تو یہ بددعا، وعید اور ہلاکت و بربادی کا کلمہ ہے۔

اَلَّذِیْ یُحَدِّثُ: مراد لوگوں سے بات کرنا ہے۔ تب پھر اَلنَّاسَ مفعول بہ یہاں محذوف ہے۔

فَيَكْذِبُ: کذب یہ خلاف واقع کسی بات کی خبر دینے کو کہتے ہیں۔

لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ: یعنی اس کا مقصود صحیح اور سچی بات بتلانا نہیں بلکہ محض لوگوں کو ہنسانا مقصود ہے اور اسی غرض کے لیے وہ ایک بات گھڑ کر سنا رہا ہے۔ ایسے ہی شخص کے لیے نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد کی ابتدا میں بھی ہلاکت و بربادی کی بددعا دی ہے اور حدیث کے آخر میں دوبار پھر بددعا دی ہے۔

مضمون حدیث:...... اس حدیث میں دراصل دروغ بیانی کی سختی کے ساتھ مذمت و ممانعت بیان کی گئی ہے کہ ایک تو خود جھوٹ بولنا بے حد برا کام ہے، پھر محض دوسروں کی دل لگی کے لیے بولنا اور بھی بدتر ہے کہ یہ دوسروں کی وقتی تفریح کے لیے اپنی آخرت برباد کرنا ہے جو بدترین نالائقی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ محض لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولنا حرام ہے۔ بلکہ کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر نہایت سخت وعید آئی ہے۔
- یہیں سے افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری، فلم سازی، اسٹیج ڈراموں وغیرہ کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ یہ سب کے سب کام بدترین حرام ہیں کیونکہ ان سب میں خلاف واقع، غیر واقعی، فرضی اور خودساختہ واقعات بنائے اور دکھائے جاتے ہیں۔

---

[1] سنن ابی داود: 4990۔ جامع الترمذی: 2315۔ السنن الکبری للنسائی: 11655۔ مسند احمد: 5/5۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ "تذکرۃ الحفاظ" (1384/4) میں فرماتے ہیں: یہ حدیث عوالی سے صالح اسناد والی ہے۔

◈ کلام کی تاکید کے لیے اس میں تکرار جائز ہے۔اس کی دلیل وَیْلٌ لَّهُ ، ثُمَّ وَیْلٌ لَّهُ کے الفاظ ہیں اور یہ تاکید لفظی کی قبیل سے ہے جبکہ تاکید لفظی کی طرح تاکید معنوی بھی جائز ہے جس کی امثلہ معروف ہیں۔

غیبت کا کفارہ

1518۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : ((كَفَّارَةُ مَنِ اغْتَبْتَهُ أَنْ تَسْتَغْفِرَ لَهُ)).

رَوَاهُ الْحَارِثُ بْنُ أَبِي أُسَامَةَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ .

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس کی تو نے غیبت کی ہے اس کا کفارہ یہ ہے کہ تو اس کے لیے مغفرت کی دعا مانگے۔'' [1]

اس حدیث کو حارث بن ابی اسامہ (محمد تمیمی) نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:...... كَفَّارَةُ: یہ کسے گناہ کو ڈھانپنے والی شے کو کہتے ہیں۔کفاروں کی تفصیلات ذکر کی جا چکی ہیں۔

مذکورہ حدیث میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ دوسرے کی غیبت کرنے کے گناہ کی بخشش اور کفارہ کی یہ صورت ہے کہ جس کی غیبت کی ہے،اس کے لیے یہ کہہ کر بخشش کی دعا کرے:''اے اللہ! تو اس کی مغفرت فرما۔''

اگر چہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے لیکن اس کا معنی بہرحال درست ہے اور اس میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر تو جس کی ہم نے غیبت کی ہے، اسے غیبت کیے جانے کا علم ہو گیا ہے، تب اس کے پاس جا کر اس کی غیبت کو اس سے حلال کروانا واجب ہے۔البتہ جب اسے علم نہ ہو اور گمان یہ ہو کہ اسے اس کا علم بھی نہ ہو گا تو ایسے شخص کی غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس کے لیے مغفرت و بخشش کی دعا کرے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غیبت کرنے والے نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اس کی جزا یہ ہے کہ اب یہ آدمی مغتاب کے گناہوں کی بخشش کی دعا کرے تا کہ اس کی غیبت کا بدلہ ہو جائے۔

ایسی غیبت کے کفارہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انہی مجالس میں اس کا ذکرِ خیر کرے جن میں اس کی غیبت کی تھی۔یہ صورت اس ارشاد باری تعالیٰ سے اخذ کی گئی ہے:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (هود: 114) ''بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔''

مبغوض ترین آدمی

1519۔ وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَبْغَضُ الرِّجَالِ إِلَى اللّٰهِ الْأَلَدُّ الْخَصِمُ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ شخص وہ ہے جو جھگڑنے میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہو۔'' [2]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

---

[1] مسند حارث بن ابی اسامة محمد التمیمی: 1080۔ زوائد الهیثمی، کتاب الصمت لابن ابی الدنیا، ص: 292۔
علامہ ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" (967/3) میں فرماتے ہیں: یہ حدیث منکر ہے۔

[2] صحیح مسلم: 2668.

غریب الحدیث :......أَبْغَضُ: یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور بغض سے ماخوذ ہے یہ ناپسند کرنے اور کراہت کھانے کو کہتے ہیں۔الرِّجَالِ: یہ بابِ تغلیب میں سے ہے وگرنہ یہی حکم عورتوں کا بھی ہے۔

اَلْأَلَدُّ: ایسی پیچیدہ اور الجھی طبیعت والا آدمی جو ہر بات کا الٹا مطلب لے۔ یہ لَدُوْدَةُ الْوَادِیْ سے ماخوذ ہے۔ یہ وادی کے دونوں اطراف کو کہتے ہیں۔ کیونکہ جب بھی ایسے آدمی کو آپ ایک بات کی طرف لے جانے کی کوشش کریں گے وہ بات کو دوسری طرف لے جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا آدمی کسی کے ساتھ بھی مَیل نہیں کھاتا بلکہ سب سے الجھا رہتا ہے (اسی لیے عموماً اس لفظ کا ترجمہ سخت جھگڑالو کے لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے)۔

الْخَصِمُ: دوسرے سے ناحق جھگڑا کرنے والا۔ تب پھر جو دوسرے سے کسی حق بات پر جھگڑا کرتا ہے وہ رب تعالیٰ کے نزدیک مبغوض نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود پسند اور خود کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھنے والے لوگ دوسروں سے جھگڑتے وقت نہ جانے کیسے کیسے دور پار کے احتمالات لا کر جھگڑتے ہیں، مگر ہار نہیں مانتے اور نہ حق بات کو تسلیم ہی کرتے ہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- کتاب وسنت دونوں کی روشنی میں رب تعالیٰ کے لیے بغض کی صفت ثابت ہے اور یہ بغض متفاوت ہے، چنانچہ کسی کے لیے کم اور کسی کے لیے زیادہ۔اس کی دلیل أَبْغَضُ الرِّجَالِ کے الفاظ ہیں۔
- برے اعمال اپنی قباحت وشناعت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کی دلیل أَبْغَضُ کا لفظ ہے۔
- بات بات پہ جھگڑنے والا رب تعالیٰ کو بے حد مبغوض ہے اور اس بات کا مقتضی یہ ہے کہ اس صفت کے ساتھ متصف ہونا حرام ہے۔
- البتہ حق کی خاطر جتنا بھی لڑا جائے کم ہے اور جان بھی دینا پڑے تو یوں سمجھئے کہ ”حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔“

5- بَابُ التَّرْغِيْبِ فِيْ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ

مکارمِ اخلاق کی ترغیب

برے اخلاق کے بیان کے بعد امام موصوف مکارمِ اخلاق کے باب کو لے آئے ہیں کیونکہ تخلیہ یہ تحلیہ پر مقدم ہے یعنی پہلے خود کو رزائل سے خالی کیا جاتا ہے پھر مکارم وخصائل سے آراستہ کیا جاتا ہے اور دستور بھی یہی ہے کہ پہلے جگہ کو کوڑا کرکٹ سے صاف کیا جاتا ہے، پھر اس کی آرائش وزیبائش کی جاتی ہے۔

سچ کی ترغیب

1520- عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ ، وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا ، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ ،

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ بے شک سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی جستجو میں رہتا ہے یہاں تک کہ رب تعالیٰ کے ہاں ”صدیق“ (بڑا سچا) لکھ لیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ بولنے سے بچو، کیونکہ بے شک جھوٹ گناہ کی طرف لے

وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ، وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

جاتا ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کی جستجو میں رہتا ہے یہاں تک کہ رب تعالیٰ کے ہاں ''کذاب'' (بڑا جھوٹا) لکھ لیا جاتا ہے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... **عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ**: علیکم کا صیغہ اہل نحو کے ہاں صیغۂ اغراء کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اغراء یہ کسی کو شدت کے ساتھ کسی بات کی ترغیب دینے اور اس پر ابھارنے کو کہتے ہیں۔

صِدْق: یہ عقیدہ، قول اور عمل تینوں قسم کے صدق کو شامل ہے۔ عقیدہ میں صدق، یہ ایک اکیلے اللہ کی اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے اور چھپے شرک اور کھلے شرک دونوں سے مکمل طور پر دور رہنے کا نام ہے۔

فعل میں صدق، یہ ہے کہ آدمی کا ہر ہر عمل نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے عین مطابق ہو۔

قول میں صدق، یہ ہے کہ آدمی جو کہے وہ واقع کے عین مطابق ہو۔

فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ: مذکورہ ''فا'' تعلیلیہ ہے، اور یہ جملہ ماقبل ارشاد کی تعلیل کا بیان ہے، یعنی نبی کریم ﷺ نے صدق پر اس لیے ابھارا ہے کیونکہ یہ نیکی جیسی محمود غایت و مقصد تک لے جاتا ہے۔ کیونکہ ''البر'' ایک جامع ترین لفظ ہے جو عقیدہ سے لے کر مباحات تک کو شامل ہے۔

وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ: یہ دوسرے مرحلہ کا بیان ہے جو صدق کے التزام پر مرتب ہوتا ہے کہ آدمی صدق کو لازم پکڑ کر اَبرارِ اَخیار کی صف میں داخل ہو جاتا ہے اور ابرار اخیار ہی جنت میں داخل ہونے کے قرار واقعی مستحق ہیں اور جنت ہر مومن کی اصل اور انتہائی خواہش ہے۔ رب تعالیٰ ہم سب کو جنت کا اہل بنائے۔

وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ، وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ: ما یزال یہ افعال استمرار میں سے ہے۔ یہ فعل ناقص کی ہی ایک قسم ہے، جو بتلاتی ہے کہ اس فعل کی خبر اس کے فاعل کے لیے استمرار کے ساتھ ثابت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب آدمی مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی وہ راستہ چنتا ہے جو غایت ظن تک پہنچا دے حتیٰ کہ آدمی کو اس بات کا غالب گمان ہونے لگے کہ یہی بات سچ ہے۔

حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيْقًا: مذکورہ حتیٰ انتہائے غایت کے لیے ہے یعنی سچ بولتے رہنے اور سچ کی تلاش میں لگے رہنے کا انتہائی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رب تعالیٰ بھی اسے اپنے ہاں سچوں میں لکھ لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ سچا آدمی لوگوں میں مقبول ہوتا ہے اور لوگ بلا تردّد و تفکر اس کے قول کو قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی راست گوئی معروف ہوتی ہے۔ بلاشبہ سچ بولنے کی عادت کا یہ اس دنیا میں نقد نتیجہ ہے۔ **وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ**: یہ جملہ تحذیریہ جس میں جھوٹ بولنے سے روکا گیا ہے، اس کی تقدیر و ترکیب کو إِيَّاكُمْ وَ الْحَسَدَ کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ: مذکورہ جملہ کی نحوی ترکیب اور معنوی تفسیر حسب سابق ہے۔ فجور یہ بر کی ضد کو کہتے ہیں۔ یعنی گناہ اور برائی۔

---

[1] صحيح البخاري: 6094- صحيح مسلم: 2607.

وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِئُ إِلَى النَّارِ: فجار کا ٹھکانا بالآخر جہنم ہی ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ﴾ (الانفطار: 14) ''اور بے شک نافرمان لوگ یقیناً بھڑکتی آگ میں ہوں گے۔''
چنانچہ فجور یہ جہنم تک لے جا کر ہی دم لیتا ہے۔
وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ، وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا: اس جملہ کی بھی ترکیب اور تفسیر حسب سابق ہے۔کاذبوں کا انجام جہنم ہونا قرآن وسنت کی متعدد صریح نصوص سے ثابت ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ مکارمِ اخلاق کی ترغیب وتحضیض کے بے حد حریص تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی ازحد تمنا تھی کہ آپ ﷺ کی امت کا ہر ایک فرد برے اخلاق سے خالی اور مکارمِ اخلاق سے آراستہ ہو۔اس کی دلیل عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ اور وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ کے الفاظ ہیں۔
◈ صدق کی ازحد فضیلت کہ بالآخر صدق جنت کی ابدی نعمتوں تک لے جاتا ہے اور صدیق اللہ اور بندوں دونوں کے نزدیک معتبر اور موقر ومقبول ہے۔
◈ معلوم ہوا کہ نیکیاں ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔اس کی دلیل يَهْدِئُ إِلَى الْبِرِّ کے الفاظ ہیں اور نیکی کی عادت اور مشق طبیعت پر نیکیوں کو سہل کر دیتی ہے۔
◈ جنت ثابت ہے۔اس کی دلیل يَهْدِئُ إِلَى الْجَنَّةِ کا ارشاد ہے۔
◈ جنت تک پہنچانے والے خاص اعمال ہیں جن کا التزام ضروری ہے۔کتاب وسنت نے ان سب کو کھول کر بیان فرما دیا ہے۔
◈ سچ بولنے کا عادی اور اس کی جستجو میں رہنے والا اللہ کے ہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے۔
◈ جھوٹ بولنے کی ممانعت۔اس کی دلیل وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ کے الفاظ ہیں۔
◈ جھوٹ کا انجام دنیا وآخرت کی ذلت ورسوائی ہے۔کیونکہ جھوٹ فجور تک لے جاتا ہے اور فجور جہنم تک لے جاتا ہے اور بالآخر ایسا آدمی بارگاہ الٰہی میں جھوٹا قرار دے کر بے آبرو کر کے وہاں سے نکال دیا جاتا ہے۔جس کے بعد جہنم کے سوا ٹھہرنے کو اور کوئی جگہ نہیں ملتی۔
◈ جب آدمی اپنے تئیں کوشش کر کے سچ بولتا ہے تو بعد میں اگر وہ بات خلافِ واقع ہی نکلے، پر یہ گناہ گار نہ ہوگا۔اس کی دلیل يَتَحَرَّى کے الفاظ ہیں۔

1521- وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(برا) گمان کرنے سے بچو کہ بے شک (برا) گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔''[1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

تَنْبِيه:...... یہ حدیث بَابُ التَّرْهِيبِ مِنْ مَسَاوِئِ الْأَخْلَاقِ میں حدیث رقم (1489) کے تحت گزر چکی ہے اور

[1] صحیح بخاری: 5143- صحیح مسلم: 2563.

وہاں اس پر مفصل کلام بھی کیا جا چکا ہے۔

راستے کے حقوق

1522۔ وَعَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ بِالطُّرُقَاتِ))، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا، نَتَحَدَّثُ فِيهَا، قَالَ: ((فَأَمَّا إِذَا أَبَيْتُمْ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ))، قَالُوا: وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: ((غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ الْأَذَى، وَرَدُّ السَّلَامِ، وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔'' لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری (راستوں کی) مجالس ہمارے لیے ناگزیر ہیں جن میں (بیٹھ کر) ہم باتیں کرتے ہیں۔ (یعنی ہمارا راستوں میں بیٹھ کر باتیں کیے بنا چارہ نہیں)۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اچھا! جب تم نہیں مانتے تو پھر راستے کا حق ادا کرو۔'' لوگوں نے عرض کیا: راستے کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نگاہ پست رکھنا، ایذاء (پہنچانے) کو روکے رکھنا، اور سلام کا جواب دینا اور نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:..... إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ: یہ جملہ تحذیریہ ہے۔

عَلَى الطُّرُقَاتِ: طرقات یہ ''طریق'' کی جمع الجمع ہے۔ طریق یہ عام گزرگاہ اور بازار کو جانے والے راستے دونوں کو شامل ہے۔

الْجُلُوسَ عَلَى الطُّرُقَاتِ: یہ اکیلے بیٹھنے کی اور مجلس لگا کر بیٹھنے کی دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا، نَتَحَدَّثُ فِيهَا: مَا نافیہ ہے۔ لَنَا یہ خبر مقدم ہے اور بُدٌّ یہ مبتدا موخر ہے اور مذکورہ مَا یہ مَا وَ لَا الْمُشَبَّهَتَيْنِ میں سے نہیں جو مبتدا اور خبر میں عمل کرتے ہیں کیونکہ یہاں مَا غیر عاملہ ہے۔ کیونکہ یہاں مبتدا اور خبر غیر مرتب ہیں (یعنی خبر پہلے اور مبتدا بعد میں ہے)۔

بُدٌّ: یہ مَنَاصٌ اور مَفَرٌّ کے معنی میں ہے۔ یعنی ہمیں بیٹھے بنا کوئی جائے پناہ، چھٹکارا اور چارہ نہیں۔

یاد رہے کہ یہ جناب رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تحریم و ممانعت پر اعتراض نہ تھا بلکہ اپنی حاجت کا بیان تھا۔ تاکہ شاید نبی کریم ﷺ کوئی دوسرا حکم بیان فرما دیں جس میں سہولت و آسانی ہو۔ چنانچہ جب نبی کریم ﷺ نے سمجھ لیا کہ ان لوگوں کا راستوں میں بیٹھنا ناگزیر ہے تو ارشاد فرمایا:

فَأَمَّا إِذَا أَبَيْتُمْ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ: یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''اگر تم نہیں مانتے تو پھر تم نافرمان ہو گے۔'' بلکہ یہ فرمایا کہ ''اگر تم نہیں مانتے تو پھر راستے میں بیٹھنے کا حق ادا کرو۔'' یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پہلا امر (یعنی پہلی تحذیر جو إِيَّاكُمْ وَ الْجُلُوسَ میں بیان ہے) وہ ارشاد کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے۔

---

[1] صحیح البخاری: 2465۔ صحیح مسلم: 2121.

أَبَيْتُمْ: مراد رکنا اور نہ ماننا ہے۔یعنی جب تم یہ حکم ماننے سے رکتے ہو اور نہیں مانتے۔

فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ: اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ نے راستوں میں بیٹھنے سے اس اندیشہ کی بنا پر منع فرمایا تھا کہ مبادا لوگ اس کا حق ادا نہ کریں۔ رہا یہ سوال کہ راستوں میں بیٹھنے سے منع کیوں کیا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی راستے میں بیٹھتا ہے تو یہ معرضِ فتنہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ کسی خوبرو عورت کے گزرنے پر اس پر فریفتہ ہو جائے اور فتنہ میں گرفتا ہو جائے، یا کوئی معذور اور اپاہج گزرے تو نفس اس کا مذاق اڑانے پر آمادہ کرے۔ غرض راستوں میں بیٹھنا کئی فتنوں میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔حتیٰ کہ لوگ اسے محلہ کا جاسوس بھی قرار دے سکتے ہیں۔

غَضُّ الْبَصَرِ: جب حضرات صحابہ کرام ﷢ نے راستے کا حق پوچھا تو اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ آدمی نگاہ نیچی کر کے بیٹھے اور گزرنے والوں کو دیکھنے سے احتیاط کرے اور تاکے جھانکے نہیں بلکہ ان سے بے نیاز ہو کر بیٹھے۔ چاہے گزرنے والا مرد ہو یا عورت اور چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ لہٰذا نہ تو گزرنے والے کی طرف التفات کرے اور نہ نگاہوں سے اس کا آخر تک پیچھا کرے۔ کیونکہ گزرنے والے کو گھورنے سے اور اس کے پیچھے نگاہ دوڑانے سے اسے شرمندگی اور خجالت محسوس ہوتی ہے۔

كَفُّ الْأَذَى: اذی تکلیف اور نقصان کو کہتے ہیں۔ مراد دوسرے کو تکلیف نہ پہنچانا ہے چاہے قول سے ہو یا فعل سے ہو۔ جیسے گزرنے والے پر کوئی پھبتی کسنا، کوئی جملہ چست کرنا، تعرض کرنا یا چھینٹا اڑانا کہ یہ قول سے اذی اور تکلیف پہنچانا ہے۔ اسی طرح راستے میں اس طرح ٹانگیں پسار کر بیٹھنا کہ گزرنے کا راستہ تنگ ہو جائے یا اپنی کرسی وغیرہ اس طرح رکھنا کہ گزرنے میں لوگوں کو تکلیف ہو کہ یہ فعل کے ساتھ تکلیف دینا ہے۔ غرض یہ راستے کے دوسرے حق کا بیان ہے کہ آنے جانے والوں کو قول یا فعل میں سے کسی کے ساتھ تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

وَرَدُّ السَّلَامِ: یہ راستے میں بیٹھنے کے تیسرے حق کا بیان ہے کہ اگر کوئی گزرنے والا سلام کرے تو اسے سلام کا جواب دیا جائے۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ راستے کا حق سلام کرنا ہے بلکہ یہ فرمایا کہ سلام کا جواب دینا راستے کا حق ہے کیونکہ بیٹھنے والے کا حق ہے کہ اسے سلام کیا جائے۔ نہ کہ وہ سلام کرے۔ جیسا کہ سلام کے آداب میں یہ مسئلہ مفصل بیان کیا جاچکا ہے۔

وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ: بلاشبہ یہ راستے میں بیٹھنے کا سب سے اہم ترین حق ہے۔ کہ نیکی کا حکم کیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی اذان ہو جانے کے بعد نماز کھڑی ہونے کے وقت مسجد کے دروازے سے آگے کو گزرنے لگے تو اسے مسجد جا کر نماز ادا کرنے کو کہا جائے کہ یہ امر بالمعروف میں داخل ہے اور ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی راستے میں گزرتے ہوئے کسی سے جھگڑتا جا رہا ہو، یا چلتے چلتے کسی کو گالیاں دیتا جا رہا ہو تو اسے ان باتوں سے منع کیا جائے۔ یہ نہی عن المنکر میں داخل ہے۔ راستے کے یہ حقوق علی وجہ الحصر نہیں، راستے کے حقوق ان کے علاوہ اور بھی ہیں، لہٰذا بھولے کو راستہ بتلانا، کسی کی گری چیز اٹھا کر اسے تھمانا، کسی کا بوجھ اٹھانے میں اس کی مدد کر دینا، اسی طرح نابینا کو سڑک پار کرا دینا، کسی بوڑھے کا کام کر دینا وغیرہ کہ یہ سب باتیں بھی راستے کے حقوق میں داخل ہیں۔

تَنْبِيهٌ:......اگرچہ ایاکم و الجلوس میں تحذیر کا بیان ہے لیکن جب آدمی راستے کے حقوق ادا کرے گا تو

مکارمِ اخلاق میں شمار ہوگا، اس توجیہ کی بنا پر مذکورہ حدیث کو مکارمِ اخلاق کی ترغیب کے باب کے تحت لانا درست ہوا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ امت کی سلامتی کے، اور اس کے فتنوں سے دُور رہنے کے بے حد آرزومند تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے بلاضرورت راستوں میں بیٹھنے سے منع فرمایا۔
- دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے سخت گریز کیا جائے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے راستوں میں بیٹھنے سے منع فرمایا کہ کہیں یہ امر دوسروں کو تکلیف پہنچنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔
- اگر کسی بات کی سمجھ نہ آ رہی ہو تو عالم دین سے مراجعت کرنا جائز ہے۔ اسی لیے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب کسی بات کی سمجھ نہ آتی تھی تو وہ بلاتکلف نبی کریم ﷺ سے وہ بات پوچھ لیا کرتے تھے۔
- نبی کریم ﷺ کا حسن اخلاق کہ لوگوں کے انکار کے باوجود آپ ﷺ نے ان کی حاجت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں راستوں میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔
- لوگوں کے احوال کی رعایت کی جائے اور یہ کہ احکام احوال کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جب لوگوں نے یہ عذر بیان کیا کہ ان کا راستہ میں بیٹھنا ناگزیر ہے تو آپ ﷺ نے انہیں راستوں میں بیٹھنے کی رخصت عنایت فرما دی۔
- جب آدمی کسی فتنہ سے دست بردار نہ ہو تو پھر ایسی بات ضرور کرے جس سے اس فتنہ اور مفسدہ میں تخفیف پیدا ہو جائے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''پھر تم راستے کا حق ادا کرو، تاکہ راستے میں بیٹھنے کے مفسدہ میں تخفیف پیدا ہو۔''
- راستوں میں بیٹھتے ہوئے نگاہ پست رکھی جائے اور اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو نگاہ پست رکھنا واجب ہوگا۔
- راہ چلتوں کو تکلیف نہ پہنچانا راستے کا حق ہے اور یہ واجب ہے۔
- سلام کرنے والے کو سلام کا جواب دینا بھی راستے کا حق اور واجب ہے۔
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بذاتِ خود ایک فریضہ ہے جبکہ راستے میں بیٹھنے کا حق بھی ہے۔

دین میں فقاہت پیدا کرنے کی ترغیب

1523۔ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، اسے دین کی فہم (ومہارت) عطا فرماتے ہیں۔''[1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث:...... مَنْ: یہ شرطیہ ہے، اس لیے مابعد مذکورہ جملہ شرطیہ ہے۔
يُرِدْ: یہ جملہ شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔
يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ: یہ جملہ جوابِ شرط ہے، اسی لیے مجزوم ہے۔

مضمون حدیث :......اس حدیث میں یہ عظیم بشارت ذکر کی گئی ہے کہ رب تعالیٰ جس بندے کے ساتھ خیر کا

[1] صحيح البخاري: 71۔ صحيح مسلم: 1037.

ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین کے علوم کا فقیہ اور ماہر بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اسے دین کے جملہ احکام کا فہم سلیم نصیب ہوتا ہے چاہے ان کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات و معاملات سے اور چاہے قول سے ہو یا فعل سے۔ بلکہ اسے دین کی بھی سمجھ عطا فرماتے ہیں، جس کا تعلق دل کے اعمال و احوال سے ہوتا ہے کہ یہ ''فقہ اکبر'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات علماء نے توحید اور عقیدہ سے متعلق علوم کو ''فقہ اکبر'' کا نام دیا ہے۔ کیونکہ فقہ اصغر مکلفین کے افعال و اعمال سے متعلق ہوتی ہے۔ جو فقہ اکبر تک پہنچنے کا وسیلہ ہوتی ہے جس کا تعلق دل کے عقیدہ، عمل اور حال سے ہوتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ کے لیے ارادہ کا اثبات۔ اس کی دلیل مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا کے الفاظ ہیں اور یہ ارادۂ شرعیہ اور ارادۂ کونیہ دونوں کے اثبات کو شامل ہے۔
- یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رب تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔
- آدمی کو چاہیے کہ دین میں فقاہت پیدا کرے تاکہ وہ خیر کا سرچشمہ بنے۔
- دین میں تفقہ پیدا کرنے کی ترغیب۔ کیونکہ یہ اس خیر کے پانے کا وسیلہ ہے جس کا رب تعالیٰ دین میں تفقہ پیدا کرنے پر بندے کے ساتھ ارادہ فرماتے ہیں اور یہ بندے کے لیے رب تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم بشارت ہے۔
- رب تعالیٰ کے خیر چاہنے کی چند علامات ہیں، انہی میں سے ایک رب تعالیٰ کا بندے کو دین میں تفقہ عنایت فرمانا ہے۔
- رہا غیر دین میں تفقہ، تو اگر وہ بات خیر ہے تو وہ تفقہ خیر کہلائے گا ورنہ شر۔

حسنِ اخلاق کی ترغیب

1524- وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا مِنْ شَيْءٍ فِي الْمِيْزَانِ أَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ)).
أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''(روزِ قیامت بندے کی) میزان میں حسنِ اخلاق سے بھاری اور کوئی شے نہیں (ہوگی)۔'' [1]
اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... مَا: یہ نافیہ ہے۔ مِنْ شَيْءٍ: اس میں مِنْ زائدہ ہے اور شَيْءٍ یہ مبتدا اور محلاً مرفوع ہے۔ أَثْقَلَ: یہ خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

مضمون حدیث:...... مذکورہ حدیث میں حسنِ اخلاق کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ کیا حسنِ اخلاق کلمہ توحید سے بھی بھاری ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں یہ بیان کیا گیا کہ لا الہ الا اللہ والی پرچی میزان میں سب سے بھاری رہے گی۔

اس اشکال کا ایک جواب یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کے مقتضی کا اعتقاد رکھنا خود حسنِ اخلاق میں سے ہے۔ کیونکہ حسن خلق

---

[1] سنن ابی داود: 4799۔ جامع الترمذی: 2002۔ مسند احمد: 451/6۔ امام ابن حبان (481) نے اور امام دارقطنی نے "العلل" (222/6) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

جہاں بندوں کے ساتھ ہوتا ہے وہیں رب تعالیٰ کے ساتھ بھی ہے۔ لیکن یہ جواب بھی اشکال دور نہیں کرتا کیونکہ تب پھر پورے کا پورا دین ہی حسن اخلاق ٹھہرے گا، تب پھر سب سے بھاری بات کہاں گئی؟

غرض یہ حدیث مشکل ہے!!

لیکن بہر حال اس حدیث میں حسنِ اخلاق کی زبردست ترغیب ہے۔

حیا

1525۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْحَيَاءُ مِنَ الْإِيْمَانِ)). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''حیا ایمان میں سے ہے۔'' [1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

شرح: ......حیا ایک ایسی خلقی صفت ہے جو آدمی پر طاری ہوتی ہے۔ اس کی حقیقی تعبیر ممکن نہیں۔ البتہ حیا کو اس کے آثار سے جانا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ طاری ہونے والی اس کیفیت کا نام ہے جو آدمی کو بری بات کے کہنے یا کرنے سے روکتی ہے۔ حیا کو نبی کریم ﷺ نے ایمان کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ ایک روایت میں حیا کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا گیا جبکہ یہاں مِنْ تبعیضیہ کے ساتھ حیا کو ایمان میں قرار دیا گیا ہے۔

اب حیا جہاں مخلوق سے ہے، وہیں خالق سے بھی ہے اور رب تعالیٰ سے حیا یہ ہے کہ وہ بندے کو اس جگہ سے غیر حاضر نہ دیکھے جہاں ہونے کا اس نے بندے کو حکم دیا گیا ہے اور وہاں اسے موجود نہ پائے جہاں سے غیر موجود رہنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ تب پھر حیا مامورات کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کو مستلزم ہوگا۔ تب پھر عبادات و فرائض بجالانا اور منکرات و محرمات کو ترک کرنا حیا میں سے ہوگا اور یہی حیا کا اصل مقتضٰی ہے۔ پھر دین سیکھنا مطلوب ہے۔ لہٰذا کسی دینی بات کے پوچھنے سے ہچکچانا حیا نہ کہلائے گا بلکہ اسے نفس و ارادہ کی کمزوری کہیں گے۔ پس حق بات میں حیا بزدلی، کمزوری اور حق بات سے غیر منتفع ہونا کہلائے گا۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً﴾ (البقرة: ٢٦)

''بے شک اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی بھی مثال بیان کرے، مچھر کی ہو۔''

غرض حیا منکرات اور خلافِ مروت امور سے رکنے کا نام ہے نہ کہ حق کے بیان سے پیچھے رہنے کا نام حیا ہے۔

1526۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُوْلَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)). أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''لوگوں نے پہلی نبوتوں کی جن باتوں کو پایا ہے ان میں سے ایک بات یہ ہے: ''جب تو حیا نہ کرے تو پھر جو جی چاہے کر۔'' [2]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث: ......مِمَّا: یہاں مِنْ تبعیض کے لیے ہے اور مَا موصولہ ہے اور تقدیری عبارت إِنَّ مِنَ

---

[1] صحيح البخاري: 24۔ صحيح مسلم: 36. [2] صحيح البخاري: 3484.

الَّذِیْ اَدْرَكَ ہوگی۔

اَلنَّاسُ: مراد عہد جاہلیت کے یعنی پہلی امتوں کے بعثتِ نبوی ﷺ تک کے لوگ ہیں۔

مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰی: اَلْاُوْلٰی یہ مونث کا صیغہ ہے اس کا مذکر اَلْاَوَّلُ ہے۔

حدیث کے ظاہر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ کلمہ پہلی نبوتوں سے متوارث چلا آ رہا ہے اور یہ قول سب انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاں صحیح مانا جاتا رہا ہے۔

اِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ: اِصْنَعْ یہ امر ہے۔اس میں اختلاف ہے کہ یہ امر اباحت کے لیے ہے یا تہدید کے لیے۔ان کلمات میں دو معانی کا احتمال ہے:

(1) ایک معنی یہ ہے کہ جب تم میں حیا نہ ہوگا تو پھر تمہیں کسی کام کے کرنے کی مطلق پروانہ ہوگی۔

(2) جب تو کسی نازیبا بات یا فعل کے کرنے سے حیا نہیں کرنا چاہتا تو پھر کرتا رہ۔

پہلی معنی کی رو سے مذکور امر زجر و توبیخ کے لیے ہوگا اور یہ بے حیائی کے کاموں کے کرنے پر تہدید اور وعید ہوگی جبکہ دوسرے معنی کی رو سے یہ امر اباحت کے لیے ہوگا۔یعنی جو قول و فعل قابل شرم نہ ہو اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حیا کی ترغیب و انگیخت۔البتہ یہ حیا ہی ہو نہ کہ بزدلی اور کم ہمتی۔
- ایمان کے متعدد آثار حمیدہ ہیں جن میں سے ایک حیا بھی ہے۔
- سابقہ پیغمبروں کی متعدد ایسی باتیں ہیں جو آج تک منقول ہوتی آ رہی ہیں اس کی دلیل مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰی کے الفاظ ہیں۔
- منقول چلی آتی باتیں اگر سچ ہوں تو ان کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- جو کام قابل شرم نہ ہو،اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ایسا ہر کام مباح ہوتا ہے۔
- دوسرے معنی کی رو سے جو خلاف مروت کاموں کے کرنے میں حیا سے کام نہیں لیتا اس کا یہ فعل مذموم ہے۔
- معلوم ہوا کہ بسا اوقات امر دو صورتوں میں سے ایک کی خبر بن کر آتا ہے۔جیسا کہ اس حدیث کے امر میں دو صورتوں کی خبر ہے۔

دین میں مضبوطی اختیار کرنے کی ترغیب

1527۔ وعن أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ، وَفِیْ كُلٍّ خَيْرٌ، احْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَلَا تَعْجَزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّیْ فَعَلْتُ هٰذَا كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''طاقتور مومن کمزور مومن سے زیادہ بہتر اور رب تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔البتہ دونوں میں خیر (ہی) ہے۔(اور) جو بات تمہیں (دین و دنیا میں سے کسی بات کا) نفع دے اس کی حرص کر اور اللہ ہی سے مدد مانگ اور (نیکی کی باتوں سے) درماندہ نہ بن،اور اگر تمہیں کوئی بات پہنچے (یعنی کوئی تکلیف

اللّٰهُ، وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ ((لَوْ)) تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ)).	پہنچے) تو یہ مت کہو کہ کاش میں فلاں فلاں بات کر لیتا (تو ایسا نہ ہوتا) البتہ تم یہ کہو: اللہ نے جو مقدر کیا (وہ ہوا) اور جو اس نے چاہا (وہ) کیا۔ کیونکہ ''کاش'' کا کلمہ شیطان کے عمل (کے دروازہ) کو کھولتا ہے۔'' [1]
أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.	اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......**اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ**: مراد ایمان میں قوی مومن ہے نہ کہ جسمانی طاقتور مراد ہے کیونکہ بسا اوقات ایک پہلوان دین کے معاملہ بے حد متساہل اور لا ابالی ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی رب تعالیٰ کو محبوب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہاں ایمان میں قوی مومن مراد ہے کیونکہ القوی یہ وصف ہے جو ماقبل موصوف المومن کی طرف لوٹ رہا ہے۔

دوسرے یہاں الرجل القوی نہیں کہا۔ یہ بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ مراد ایمان میں قوی شخص ہے، نہ کہ جسمانی اعتبار سے طاقتور مراد ہے۔

خَيْرٌ وَ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ: اس ارشاد میں ایک مومن کی دو عظیم خصلتوں کا ذکر ہے۔

(1) ایک یہ کہ وہ بہ نسبت دوسرے کے سراپا خیر ہے۔ (2) دوسری یہ کہ وہ کمزور مومن سے زیادہ رب تعالیٰ کو محبوب ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ: مراد ایمان میں کمزور مسلمان ہے۔

فِيْ كُلٍّ خَيْرٌ: بلاشبہ لوگوں کے ایمانی درجات مختلف ہیں لیکن خیر سے خالی کوئی بھی نہیں۔ یہ جملہ احترازیہ ہے تاکہ قوی مومن کی صفات اور خوبیاں سن کر کسی کے دل میں کمزور مومن کی بابت تخفیف پیدا نہ ہو۔

اِحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ: اِحْرِصْ یہ امر ہے۔ اب چیزوں کی تین قسمیں ہیں:

(1) نافع (2) مضر (3) نہ نافع نہ ضار

تب پھر اس ارشاد میں صرف ان چیزوں کی حرص کا حکم ہے جن میں نفع ہو جو اس بات کو مستلزم ہے کہ مضر باتوں سے اجتناب واجب ہے۔ رہی تیسری قسم کی باتیں تو اگر تو ان کا نتیجہ خیر نکلنے کی امید ہو تو کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رہا یہ سوال کہ کیا پھر خیر کے حصول میں خود پر اعتماد کیا جائے؟ اسی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

وَ اسْتَعِنْ بِاللّٰهِ: ایک اکیلے اللہ سے اس بات میں مدد مانگی جائے گی اور خود پر اعتماد نہ رکھا جائے۔

وَ اِنْ اَصَابَكَ شَيْءٌ: اور اگر اپنی سی کوشش کے بعد اور رب تعالیٰ سے مدد مانگنے بعد کے بھی کوئی تکلیف پہنچ جائے تو

فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّي فَعَلْتُ كَذَا: معلوم ہوا کہ کسی امر کی بابت جملہ شرعی تقاضے پورے کرنے کے بعد بھی اگر نتیجہ حسب منشا نہیں نکلتا تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ اس لیے خلاف توقع نتیجہ کو اپنے طرف منسوب کر کے یہ نہ کہے کہ کاش میں ایسا اور ایسا کر لیتا۔ کیونکہ اگر اللہ چاہتا تو یہ کام ہو جاتا۔ تو جب اللہ ہی نے نہیں چاہا تو وہ کام بھی نہیں ہوا اور نہ وہ بندہ قابل ملامت ہے۔ کیونکہ اس خلاف توقع نتیجہ کا رفع اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وَ لٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَ مَا شَاءَ فَعَلَ: بلاشبہ اس میں نفس کی زبردست تربیت ہے اور وہ ہے رضا بالقضاء نہ کہ رب تعالیٰ

---

[1] صحیح مسلم: 2664.

نے مقدر کیا، اس پر راضی رہے اور ہر امر کو رب تعالیٰ کی طرف موڑے کہ جو ہوا وہ رب تعالیٰ کی قدرت ومشیت سے ہوا اور جو نہیں ہوا اس میں رب تعالیٰ کی قدرت ومشیت شاملِ حال نہ تھی۔

فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ: کہ شیطان اگر مگر اور کاش کے راستے سے بندے کو رب تعالیٰ سے بدظن کرتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ مکارمِ اخلاق کی ترغیب اس کی دلیل فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ کے کلمات ہیں۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس عمل سے شیطان کے لیے دروازہ کھلتا ہو اس سے گریز کیا جائے۔

◈ ایمان میں بھی باہمی درجات اور تفاوت ہے اس کی دلیل اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ اور اَلْمُؤْمِنُ الضَّعِيفُ کے الفاظ ہیں۔

◈ ایمان کی قوت اور ضعف کے اعتبار سے لوگ ایمان میں باہم متفاضل ہیں۔

◈ اگر دو میں تفاضل اور تقابل مقصود ہو اور دونوں میں خیر بھی ہو تو آدمی کو چاہیے کہ وہ تقابل کرنے کے بعد اس بات کی صراحت ضرور کرے کہ ان دونوں میں ہی خیر ہے۔

◈ آدمی ہمیشہ خیر کا حریص رہے اس کی دلیل اِحْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ کے الفاظ ہیں۔

◈ اسباب اختیار کرنے کے باوجود مدد اللہ ہی سے مانگی جائے۔

◈ اسباب کا اختیار کرنا یہ توکل واستعانت اختیار کرنے پر مقدم ہے۔

◈ سستی اور گوشہ گیری مذموم ہے۔ بلکہ آدمی کو ہر وقت خیر کے لیے ساعی اور کوشاں رہنا چاہیے۔

◈ کسی امر کی بابت شرعی تقاضے پورے کرنے کے بعد اگر رب تعالیٰ کی مشیت سے نتیجہ حسب توقع نہ نکلے تو آدمی قابل ملامت نہیں۔

◈ لَوْ یعنی کاش اور اسی طرح اگر مگر وغیرہ جیسے کلمات کہنا منع ہے کہ یہ کلمات رب تعالیٰ سے بدگمانی پیدا کرنے اور شیطان کو قلب وذہن میں در آنے کا راستہ دیتے ہیں۔

◈ معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کی قدرت ومشیت ہر شے پر غالب ہے۔

◈ رب تعالیٰ کے لیے قدرت، مشیت اور تقدیر ثابت ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ بسا اوقات شیطان آدمی پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل فَإِنَّ ((لَوْ)) تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ کے الفاظ ہیں۔

◈ بے شک شیطان بندے کا دشمن ہے جو اس پر ((لَوْ)) کا دروازہ کھولتا ہے۔

تواضع کی ترغیب

1528- وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ اللهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ)).

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "بے شک رب تعالیٰ نے میری طرف اس بات کی وحی کی ہے کہ تم لوگ (ایک دوسرے کے ساتھ) تواضع (اور عاجزی) اختیار کرو یہاں تک کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ

کرے اور کوئی کسی پر فخر (اور بڑائی) نہ کرے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......اَوْحٰی: وحی کا لغوی معنی دوسرے کو کوئی بات بتلانا اور اس کے علم میں لانا ہے۔ جبکہ اصطلاحِ شرع میں یہ اس شریعت کا علم دینا ہے جو رب تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو یا رسولوں کو اپنے خاص وسائل کے ذریعے دیتا ہے۔

أَنْ تَوَاضَعُوْا: اسی معنی میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ (لقمان: 18)

''اور لوگوں کے لیے اپنا رخسار نہ پھلا۔''

حَتَّى لَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ: ایک دوسرے پر سرکشی اور زیادتی کرنے کی یہ ممانعت قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (الشوریٰ: 42)

''راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔''

مراد ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کی ممانعت ہے اور یہ فعل کے ساتھ زیادتی کرنے کو کہتے ہیں۔

وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ: جبکہ ایک دوسرے پر فخر کرنا یہ قول سے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کا نام ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ ''میں تم سے اونچی ذات والا ہوں۔''

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ تواضع کی ترغیب کیونکہ یہ مکارمِ اخلاق میں سے ہے۔
- ◈ ایک دوسرے پر قول یا فعل سے زیادتی کرنے کی ممانعت۔
- ◈ نبی کریم ﷺ کے لیے وحی نازل ہونے کا اثبات۔
- ◈ مکارمِ اخلاق پر مشتمل باتوں کی طرف بے حد توجہ۔

اپنے بھائی کی آبرو کی پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے کی فضیلت

1529,1530- وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ بِالْغَيْبِ رَدَّ اللّٰهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)).

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنے بھائی کی آبرو (کی اس کی غیر موجودگی میں حفاظت کی اور کسی دوسرے کے اڑائے چھینٹے کو اس) سے ہٹایا تو رب تعالیٰ بھی روزِ قیامت اس کے چہرے پر سے جہنم کی آگ کو ہٹائے گا۔'' ❷

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے حسن کہا ہے۔

---

❶ صحیح مسلم: 2865.

❷ جامع الترمذی: 1931- مسند احمد: 450/6- کتاب الصمت لابن ابی الدنیا: 239- السلسلة الصحیحة. 876.

وَلأَحْمَدَ مِنْ حَدِيْثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ نَحْوُهُ. جبکہ مسند احمد میں سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے ایسی ہی ایک حدیث مروی ہے۔ [1]

غریب الحدیث:......**رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ**: مراد کسی کی آبرو کا دفاع کرنا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی کسی دوسرے کی غیبت کر رہا تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ البتہ یہاں یہ ضروری ہے کہ یہ دفاع حق کی خاطر ہو۔

رَدَّ اللّٰهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: یہ کیے ہوئے عمل کی پوری پوری جزا ہے کہ جیسے اس نے دوسرے پر سے اس کی بے آبروئی کو ہٹایا تھا ویسے ہی رب تعالیٰ اس پر سے جہنم کی آگ کو ہٹائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اس حدیث میں اپنے مسلمان بھائیوں کی آبروؤں کے دفاع کی ترغیب ہے۔ البتہ اس میں یہ ضروری ہے کہ وہ آدمی حق پرست حق گو اور برحق ہو، لہٰذا کسی بدعتی، منکر کے عادی اور گمراہ افکار و خیالات رکھنے والے کا دفاع لازم نہ ہوگا بلکہ ان کی گمراہی پر ردّ لازم ہوگا۔
- یہ قابل تحسین دفاع تب ہے جب پیٹھ پیچھے ہو۔ لہٰذا روبرو یہ دفاع اس مذکورہ ثواب کا حامل نہ ہوگا کیونکہ بالمشافہ دفاع میں ریا اور امتنان (یعنی دوسرے پر احسان دھرنا) دونوں کا احتمال ہوسکتا ہے۔
- یہی حکم دوسرے کی آبرو پامال کرنے والے کے خلاف بولنے کا بھی ہے۔
- جیسا عمل ہوگا ویسی ہی جزا بھی ملے گی۔
- قیامت اور جہنم کا اثبات۔
- مسند احمد میں اس حدیث کا ایک شاہد بھی مذکور ہے۔

صدقہ کی ترغیب

1531- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ تَعَالَى)). أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور معاف کر دینے سے اللہ بندے کی عزت ہی بڑھاتا ہے اور جو بندہ بھی اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ اس کو بلند ہی فرماتا ہے۔'' [2]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**مَا**: یہ نافیہ ہے۔ **صَدَقَةٌ**: یہ فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

مِنْ مَالٍ: یہ جار مجرور نَقَصَتْ فعل سے متعلق ہیں۔ یعنی صدقہ مال کو گھٹاتا نہیں بلکہ بڑھاتا ہے۔ ان الفاظ میں نبی کریم ﷺ نے اس بات کی نفی فرمائی ہے کہ صدقہ کرنے سے مال گھٹتا ہے۔ گو حسی کمی دیکھ کر بعض لوگ یہ گمان کر بیٹھتے ہیں

---

1. مسند احمد: 461/6- علامہ منذری نے ''الترغیب و الترھیب'' (333/3) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔
2. صحیح مسلم: 2588.

لیکن حقیقت یہ ہے نقص تو معنوی نقص ہوتا ہے۔ لہٰذا صدقہ سے مال میں معنوی کمی واقع نہیں ہوتی۔

وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا: مذکورہ مَا بھی نافیہ ہے۔ یعنی جو آدمی دوسروں کو اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دیتا ہے، رب تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے۔ اس لیے معاف کر دینے کو ذلت نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں عزت ہے۔

وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ: اللہ کے لیے تواضع اختیار کرنے کا مطلب اللہ کے امر کے آگے تواضع اختیار کرنا ہے۔ چنانچہ یہ رب تعالیٰ کے اوامر کو بجالانے اور اس کے رسول کی طاعت کرنے اور اخلاص کے ساتھ اس کے بندوں کے آگے عاجزی و فروتنی اختیار کرنے کو سب کو شامل ہے۔ کیونکہ ان کلمات میں ان سب معانی کا احتمال ہے۔

إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ: چنانچہ جس مخلوق نے رب تعالیٰ کے امر کے آگے فروتنی اختیار نہ کی وہ ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو گیا۔ جس کی سب سے مشہور مثال شیطان کا آدم کو سجدہ کرنے سے سرتابی کرنا ہے کہ وہ اللہ کے امر کے آگے نہ جھکا تو ذلیل ہو گیا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ◈ صدقہ کی ترغیب۔ اس کی دلیل مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَّالٍ کے الفاظ ہیں۔
- ◈ صدقہ دینے سے ہونے والی کمی ظاہری اور حسّی ہے نہ کہ حقیقی اور معنوی۔
- ◈ صدقہ مال جان عزت و آبرو سب کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔
- ◈ معاف کر دینے کی زبردست ترغیب کہ یہ عزت بڑھنے کا قوی ذریعہ ہے نہ کہ کمزوری اور ذلت کا اظہار ہے۔
- ◈ تواضع کی ترغیب کہ تواضع کرنے پر رب تعالیٰ آدمی کو بلند مرتبہ عطا فرماتا ہے۔
- ◈ صرف مادی امور پر ہی اعتماد نہ کیا جائے۔ اسی لیے صدقہ کی ترغیب ہے کہ بظاہر اس سے مادی اسباب میں کمی آتی ہے لیکن درحقیقت اللہ اسباب کے بغیر کام بنا دیتا ہے۔
- ◈ ہر شے اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

جنت میں داخلہ کیسے؟

153- وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَفْشُوا السَّلَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ)).
أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اے لوگو! سلام پھیلاؤ، صلہ رحمی کرو، کھانا کھلاؤ، راتوں کو نماز پڑھو جبکہ لوگ سو رہے ہوں تو رب تعالیٰ کی جنت میں (عذابِ جہنم سے) سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔'' ❶

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ......يَا أَيُّهَا النَّاسُ! کلام کے آغاز میں خطاب مابعد مذکور بات کی طرف پوری توجہ دلانے کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کلمات سے بعد میں کی جانے والی بات کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ **أَفْشُوا السَّلَامَ:** سلام کے فضائل، آداب اور احکام مفصل

وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ: مراد محتاجوں، مسافروں اور بھوکوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جن کی پرورش و کفالت ہمارے ذمے ہے اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جن کو کفارہ کے کھانے کھلائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ واجب اور مستحب دونوں قسم کے اِطعام کو شامل ہوگا اور کھلانے میں پلانا بھی داخل ہے۔

وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ: راتوں کی یہ نماز فرض، نفل، واجب سب کو شامل ہے۔ فرض نمازوں میں عشاء کی نماز اور فجر کی نماز آ گئی کیونکہ یہ دونوں نمازیں منافقوں پر بے حد بھاری ہوتی ہیں اور وہ بالخصوص انہی دونوں نمازوں کے اوقات میں پڑے سورہے ہوتے ہیں۔ جبکہ نفل نماز میں تہجد کی اور واجب نماز میں وتر کی نماز آ گئی۔

وَالنَّاسُ نِيَامٌ: یہ مبتدا خبر پر مشتمل جملہ خبریہ حالیہ ہے اور یہ صَلُّوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ ناس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے رات کی نمازیں ادا نہیں کیں چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر نہ کہ ہر شخص مراد ہے۔

تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ: تَدْخُلُوا یہ فعل مضارع ہے اور جوابِ امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ کیونکہ گزشتہ میں أَفْشُوا، صِلُوا، أَطْعِمُوا، صَلُّوا یہ سب امر کے صیغے ہیں جن کا یہ جواب ہے اور جنت سے مراد وہ جنت خلد ہے جس کا متقیوں سے وعدہ ہے اور سلامتی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جہنم سے سلامت رہ کر جنت میں داخل ہو جاؤ۔ جبکہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جنت میں داخل ہونے پر تمہیں سلام کیا جائے گا اور یہ سلام کرنے والے فرشتے ہوں گے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اسباب کی مشروعیت کہ یہ مذکورہ افعال جنت میں داخل ہونے کے اسباب ہیں۔
- سلام پھیلانے کی ترغیب۔
- دوسروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب کہ ان دونوں افعال کو جنت میں داخل ہونے کا سبب بتلایا گیا ہے۔
- دوسروں کو کھانا کھلاتے ہوئے اس بات کی نیت کی جائے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا امر ہے۔ راتوں کی عبادت کی فضیلت۔
- اہم بات کا ذکر ایسے کلمات کے ساتھ کرنا چاہیے جو مخاطب میں توجہ اور انتباہ پیدا کریں۔ جیسے یَا أَيُّهَا النَّاسُ! کا کلمہ۔
- کلام میں بے تکلف سجع جائز ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ البتہ اس میں تکلف اور تصنع ناجائز ہے۔

تنبیہ:...... سجع کی تعریف گزشتہ میں بارہا ذکر کی جا چکی ہے۔

اللہ، اس کے رسول اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی

1533۔ وَعَنْ تَمِيمٍ الدَّارِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((الدِّينُ النَّصِيحَةُ))، ثَلَاثًا، قُلْنَا: لِمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((لِلّٰهِ، وَلِكِتَابِهِ، وَلِرَسُولِهِ، وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ)).

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دین (نری) خیر خواہی ہے۔'' (ایسا آپ ﷺ نے) تین بار (ارشاد فرمایا)۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے پیشواؤں کے ساتھ اور ان کی عوام کے ساتھ۔''[1]

[1] صحيح مسلم: 55.

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ . اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :......الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ: یہ دونوں معرفہ ہیں اور جب مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو حصر کا فائدہ دیتے ہیں اور یہ الدِّیْنُ هُوَ النَّصِيْحَةُ کے معنی میں ہے اور دین سے مراد وہ دین ہے جس سے رب تعالیٰ راضی ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(المائدة : ٣)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

تب پھر رب تعالیٰ ہمارے جس دین پر راضی ہے وہ نصیحت ہے۔ جس کا معنی قصد و ارادہ میں اخلاص پیدا کرنا ہے۔

ثلاثًا: یہ قَالَ کے متعلق ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے تین بار یہ فرمایا اور یہ تاکید لفظی کی قبیل میں داخل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ تکرار اور تاکید مذکورہ امر کی اہمیت اور سامع کی تنبیہ کے لیے فرمائی۔

قُلْنَا: لِمَنْ: گویا کہ یہ حضرات نصیحت کا معنی جانتے تھے، اسی لیے یہ سوال کیا کہ نصیحت کس کے ساتھ کی جائے۔ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے پانچ چیزوں کا ذکر فرمایا:

(1) اللہ (2) اس کی کتاب (3) اس کا رسول (4) ائمہ مسلمین (5) اور عامۃ المسلمین

ذیل میں ان سب باتوں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے:

اللہ کے ساتھ نصیحت

اس میں سرفہرست رب تعالیٰ کی بلاشرکت غیرے عبادت کرنا ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا یہ رب تعالیٰ کے لیے نصیحت کے سراسر خلاف ہے۔ پھر رب تعالیٰ کی محبت و تعظیم بھی اس کی نصیحت میں داخل ہے۔ اس کی نعمتوں کا ذکر و شکر بھی نصیحت میں داخل ہے۔ رب تعالیٰ کا آیاتِ کونیہ و شرعیہ میں غور و تدبر بھی رب تعالیٰ کے ساتھ نصیحت ہے۔ اس کے اسماء و صفات کا علم اور ان کے معانی اور مقتضٰی کی معرفت بھی نصیحت میں داخل ہے۔

کتاب کے ساتھ نصیحت

یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ رب تعالیٰ کا برحق کلام ہے۔ اس کے تمام حروف اور معانی برحق ہیں اور رب تعالیٰ نے اس کے حروف و معانی کے ساتھ اس کا تکلم فرمایا ہے۔ پھر اس کے اوامر پر عمل اور اس کی نواہی سے اجتناب کیا جائے۔ اس کی خبروں کو سچا جانا جائے اور اس کے قصص و اخبار سے عبرت و نصیحت لی جائے۔

رسول ﷺ کے ساتھ نصیحت

رسول سے سب رسول بھی مراد ہو سکتے ہیں اور حضرت رسالت مآب جناب محمد ﷺ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی تصدیق کہ آپ ﷺ رب تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، پھر یہ کہ آپ ﷺ رب تعالیٰ کے بندے ہیں اور کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں کہ ان سب باتوں کا پختہ اعتقاد رکھنا نبی کریم ﷺ کے لیے خیر خواہی ہے اسی طرح آپ ﷺ

کی محبت وتعظیم، توقیر واجلال اور طاعت وفرمانبرداری نبی کریم ﷺ کی زبردست خیر خواہی ہے۔ آپ ﷺ کی نصرت واعانت، جو دراصل آپ ﷺ کے دین کی نصرت واعانت ہے اور بدعات ومنکرات کا مقابلہ بھی آپ ﷺ کی خیر خواہی ہے۔

علماء اور والیانِ امر کے ساتھ نصیحت

اَئِمَّة یہ امام کی جمع ہے۔ امام ہر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے لہٰذا یہ امراء وخلفاء کو بھی شامل ہے اور مساجد کے ائمہ خطباء اور علماء ومفتیان کو بھی شامل ہے۔ غرض چاہے کسی کے پاس امامت صغریٰ ہو یا کبریٰ وہ امام ہے اور یہ امامتِ دینیہ وامیر یہ دونوں کو شامل ہے۔

علماء کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ حتی الامکان ان کی علمی لغزشوں کو حسن نیت پر محمول کیا جائے۔ دوسرے اگر رائے میں مناقشہ کی نوبت آ جائے تو اس میں علانیہ یا سری مناقشہ میں سے زیادہ بہتر صورت کو اختیار کیا جائے۔ ان کے وعظ ونصیحت کو قبول کیا جائے۔ ان کے بتائے علمی احکام کی تعمیل کی جائے اور جن منکرات سے وہ روکیں، ان سے باز رہا جائے اور یہ کہ ان کی آبروریزی سے بچا جائے۔ امراء اور والیوں کے ساتھ نصیحت یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کے سوا امور میں ان کی طاعت کو واجب سمجھے۔ کیونکہ اگر وہ ان کی طاعت کو واجب نہ سمجھے گا تو طاعت ہی نہ کرے گا۔

پھر امراء کے ساتھ خیر خواہی میں یہ بات بھی ہے کہ ہم لوگوں کو ان کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ نہ کریں اور اگر کسی دینی اور شرعی مسئلہ میں ان سے خطا ہو جائے تو اس پر خاموش نہ رہا جائے۔ بلکہ ان پر ان کی خطا کو حکمت اور اخفاء کے ساتھ آشکار کیا جائے اور یہ بات بھی امراء کے ساتھ خیر خواہی میں سے ہے کہ ہم ان کے خلاف جھوٹ نہ بولیں اور یہ کہ جو ذمہ داریاں وہ ہمیں سونپیں ان کو پوری دیانت داری سے ادا کیا جائے۔

عوام کے ساتھ نصیحت

عامی آدمی کو نصیحت کے لیے دلائل وعلل کا بیان ضروری نہیں۔ البتہ اگر وہ کسی مسئلہ کی دلیل مانگیں تو اس کو بیان کیا جائے۔ عوام کے ساتھ بشاشت اور خندہ پیشانی سے پیش آیا جائے تا کہ وہ خیر کی بات اور نصیحت کو قبول کریں۔

رب تعالیٰ کے تقویٰ کی ترغیب

1534۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَكْثَرُ مَا يُدْخِلُ الْجَنَّةَ تَقْوَى اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ)).
أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سب سے زیادہ جو چیز جنت میں داخل کرتی ہے، وہ رب تعالیٰ کا تقویٰ اور حسن اخلاق ہے۔'' [1]
اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

تَنبِيه..... تقویٰ اور حسنِ اخلاق پر مفصل گفتگو کی جا چکی ہے۔

حسنِ اخلاق

1535۔ وَعَنْهُ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

[1] جامع الترمذی: 2004۔ صحیح ابن حبان: 476، و صححہ۔ مسند احمد: 442/2.

((إِنَّكُمْ لَا تَسَعُوْنَ النَّاسَ بِأَمْوَالِكُمْ ، وَلٰكِنْ لِيَسَعْهُمْ مِنْكُمْ بَسْطُ الْوَجْهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ)).
أَخْرَجَهُ أَبُوْ يَعْلٰى ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک تم لوگ اپنے مالوں کے ذریعے لوگوں کو پورے نہیں آ سکتے البتہ انہیں تمہاری خندہ پیشانی اور حسن اخلاق سما سکتی ہے۔'' [1]
اس حدیث کو امام ابو یعلی نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

شرح :......اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آدمی اپنے مال سے ہی دوسروں سب کو اپنا نہیں بنا سکتا کہ آخر اس کی داد و دہش سے کتنے لوگ منتفع ہو سکیں گے؟ آدمی کے پاس جتنی بھی دولت ہو وہ سب کو کافی نہیں ہو سکتی۔ تب پھر کیا کیجیے!

نبی کریم ﷺ نے اس کے دو حل بتائے ہیں:
(1) ایک خندہ پیشانی کہ دوسروں کو خوش ہو کر ملا جائے نہ کہ منہ بسور کر۔
(2) اور دوسرا حسنِ اخلاق چاہے قول سے ہو یا فعل سے۔

مومن مومن کا آئینہ ہے

1536۔ وَعَنْهُ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ أَخِيْهِ الْمُؤْمِنِ)).
أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مومن اپنے مومن بھائی کا آئینہ ہے۔'' [2]
اس حدیث کو امام ابو داود نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

شرح :......معنی کے اعتبار سے یہ حدیث بے حد عمدہ ہے کہ جیسے آئینہ آدمی کے حسن و قبح میں سے کسی چیز کو نہیں چھپاتا اور سب کو عیاں کر دیتا ہے، اسی طرح مومن بھی اپنے مومن بھائی کے آگے اس کی اچھائی برائی سب عیاں کر دیتا ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی اچھائی بھی اسے بتلا دے تا کہ اس کی حوصلہ افزائی ہو اور اس کی برائی بھی اسے بتلا دے تا کہ وہ اس سے بچے۔ رہا یہ سوال کہ کہیں برائی کے ذکر سے دوسرا ناراض نہ ہو جائے؟ تو ایسا تب ہو گا جب ہم اس کے سامنے صرف اس کی برائی ہی ذکر کریں گے۔ البتہ جب ہم اس کی خوبیاں گنوا کر اس کی برائی جتلائیں گے تو وہ فوراً مان جائے گا۔

لوگوں میں گھل مل کر رہنا اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنا

1537۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يُخَالِطُ النَّاسَ ، وَيَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الَّذِيْ لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ)).

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''وہ مومن جو لوگوں میں گھل مل کر رہتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے، اس مومن سے بہتر ہے جو نہ تو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور نہ ان کی ایذاؤں پر صبر ہی کرتا ہے۔'' [3]

---

[1] مسند ابی یعلی: 6550۔ المستدرك للحاكم: 212/1۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ (22/8) نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔
[2] سنن ابی داود: 4918۔ الادب المفرد للبخاری: 238۔ علامہ عراقی نے "المغنی" میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ (دیکھیں: فیض القدیر: 252/6)۔
[3] سنن ابن ماجہ: 4032۔ جامع الترمذی، 2507۔ الادب المفرد للبخاری: 388۔ امام موصوف نے "فتح الباری" (512/10) میں اس حدیث کو حسن کہا ہے اور علامہ مناوی (205/6) نے اس حدیث کو جید کہا ہے۔

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ، وَهُوَ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ إِلَّا أَنَّهُ لَمْ يُسَمِّ الصَّحَابِيَّ.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے جبکہ یہ حدیث جامع الترمذی میں بھی ہے۔ البتہ انہوں نے وہاں راوی صحابی کا نام نہیں لیا۔

غریب الحدیث :...... **يُخَالِطُ النَّاسَ**: مرادلوگوں سے ملنا جلنا اوران کے پاس آنا جانا ہے۔ اس کے برخلاف گوشہ گیر اور عزلت پسند آدمی ہے جو کسی سے اختلاط نہیں رکھتا۔

وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ: جب لوگوں سے ملنا جلنا ہوگا تو ان کی طرف سے ناگوار باتیں بھی پیش آئیں گی، انہی پر صبر کرنے پر یہ اجر ہے اور جس کا لوگوں سے اختلاط ہی نہ ہوگا، اسے ان ایذاؤں سے سابقہ کیونکر پڑے گا؟؟

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- لوگ ایمان میں باہم متفاضل ہیں اس کی دلیل خیر کا لفظ ہے۔
- گھل مل کر معاشرتی زندگی گزارنا یہ تجرد کی عزلت پیشہ زندگی گزارنے سے بہتر اور اس پر مقدم ہے۔
- نبی کریم ﷺ نے لوگوں میں مل جل کر رہنے کی ترغیب دی ہے۔
- صحابی کے نام کے غیر مذکور ہونے سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

حسن اخلاق نصیب ہونے کی دعا

1538- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((اللّٰهُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ)).

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ نے یہ دعا مانگی: "اے اللہ! جیسے تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے، سو (اسی طرح) تو میری سیرت بھی اچھی بنا دے۔" [1]

رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے، اور امام ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

شرح:...... یہ حدیث اس لائق ہے کہ اسے صحیح ہونا چاہیے۔

غریب الحدیث:...... **اللّٰهُمَّ**: یہ یا اللہ کے معنی میں ہے۔

كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِيْ: یہ دعا ہر آدمی کو مانگنی چاہیے، چاہے وہ کتنا ہی بدصورت ہو۔ کیونکہ وہ تب بھی خوبصورت ہی ہے کیونکہ رب تعالیٰ کی مخلوقات میں سے انسان سے زیادہ کامل خلقت والا کوئی نہیں۔ رہی ظاہری خوبصورتی اور بدصورتی تو یہ امر نسبتی ہے۔ وگرنہ اصل خلقت میں ہر انسان سب مخلوق سے خوبصورت ہے۔

چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝﴾ (التین: 4)

"بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔"

---

[1] مسند احمد: 403/1۔ صحیح ابن حبان: 959۔ علامہ منذری (275/3) میں فرماتے ہیں: اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔

فَحَسِّنْ خُلُقِيْ: خَلْق اور خُلُق کا معنی بیان کیا جا چکا ہے۔ خُلُق یہ باطنی صورت وسیرت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کے چہرے تو روشن اور حسین ہیں لیکن ان کے باطن تیرہ و تاریک اور بدصورت ہیں۔ پس جسے صورت و سیرت دونوں کی خوبصورتی ملی وہ بہتر انسان ہے۔ لیکن یہ دعا اسے بھی مانگنی چاہیے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- افعال سے توسل جائز ہے۔
- رب تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کر کے رب تعالیٰ کی تعریف کرنا محمود ہے۔
- رب تعالیٰ سے سیرت وصورت دونوں کی خوبی کی دعا مانگی جائے۔

6۔ بَابُ الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ..... ذکر ودعا

امام موصوف رحمہ اللہ کتاب الجامع کو اس عظیم عنوان پر ختم فرما رہے ہیں۔

ذکر کی حقیقت

''ذکر'' یاد کرنے کو کہتے ہیں، یہ زبان سے بھی ہے اور دل سے بھی ہے۔ لہٰذا زبان کے ذکر کو ذکر لسانی اور دل کے ذکر کو ذکر قلبی کہتے ہیں۔ البتہ زبان کے ذکر کو ذال کے کسر کے ساتھ جبکہ قلب کے ذکر کو ذال کے ضم کے ساتھ پڑھنا زیادہ فصیح ہے۔

ذکر کی انواع

ذکر کی تین اقسام ہیں:

(1) زبان سے (2) دل سے

(3) اور اعضاء وجوارح سے۔

ان میں سب سے اہم دل کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (الکھف: 28)

''اور اس شخص کا کہنا مت مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔''

اسی لیے ذکر قلبی کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس لیے آدمی کو ہمیشہ قلبی ذکر کے ساتھ متصف رہنا چاہیے۔ ذکر لسانی معروف ہے جیسے سبحان اللہ و الحمد للہ وغیرہ پڑھنا کہ یہ ذکر لسانی ہے۔ اعضاء کے ساتھ ذکر یہ اعضا کو رب تعالیٰ کی طاعت میں لگانا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (العنکبوت: 45)

''اس کی تلاوت کر جو کتاب میں سے تیری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کر، بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔''

معلوم ہوا کہ جب افعال جوارح اور ذکر دونوں کو ذکر کیا جائے تو ذکر سے مراد ذکر لسان ہی ہوگا۔

دعا کی حقیقت اور قبولیت دعا کی شروط

دعا پکارنے کو کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ سے دعا حال سے بھی ہوتی ہے اور مقال سے بھی۔ چنانچہ: ''اے اللہ! مجھے بخش دے۔'' یہ کہنا زبان سے دعا ہے۔ جبکہ قرآن کی تلاوت کرنا یہ حال سے دعا ہے۔ کیونکہ قاری صرف اجر کا خواہاں ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ ''اے اللہ! مجھے اس قرآن کے پڑھنے کا ثواب دے۔'' دعا مانگنا عبادت ہے۔ تب پھر دعا مانگنا عبادت بھی ہے اور دین بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِي﴾ (غافر: 60)

''اور تمھارے رب نے فرمایا مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔''

دعا کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ بندے کا اپنے خالق پروردگار کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار کرنا ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں اور پریشانیوں میں اپنے رب کا محتاج ہے۔ قبولیت دعا کی چند شروط ہیں، جو یہ ہیں:

(1) بندہ خود کو اللہ کی مدد کے بغیر اپنا مطلوب پا لینے سے عاجز سمجھے کہ یہ قبولیتِ دعا کی سب سے اہم شرط ہے۔ اس لیے خود کو رب سے بے نیاز سمجھنے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(2) یہ اعتقاد ہو کہ اللہ دعا کو رد نہیں فرماتا۔

(3) حرام کے لقمہ سے اجتناب کہ حرام کھانے والے کی دعا مقبول نہیں ہوتی۔

دعا کے آداب

دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جائے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ حیا والے اور کرم والے ہیں، اسے بندے سے اس بات سے حیا آتی ہے کہ جب وہ اس کے آگے ہاتھ اٹھائے تو ان کو خالی لوٹا دے۔'' ❶ اور یہ کہ صرف اپنے لیے ہی دعا نہ مانگے بلکہ جمع کے صیغوں کے ساتھ سب کے لیے دعا مانگے۔

ہمیشہ ذکر کرنے کی فضیلت

1539- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالَى: أَنَا مَعَ عَبْدِيْ مَا ذَكَرَنِيْ وَتَحَرَّكَتْ بِيْ شَفَتَاهُ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب تک وہ میرا ذکر کرتا رہتا ہے اور اس کے لب میرے (ذکر کے) ساتھ متحرک رہتے ہیں۔'' ❷

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيْقًا.

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث معلق ذکر کی ہے۔

غریب الحدیث :......يَقُوْلُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ تَعَالَى: یہ حدیث قدسی کا بیان ہے، اس کی تعریف اور حکم بیان کیا

---

❶ اس کی تخریج آرہی ہے۔

❷ سنن ابن ماجه: 3792- صحيح ابن حبان: 815- فتح الباري: 500/13.

جا چکا ہے۔ مَعَ: یہ مقارنت ومصاحبت کے لیے آتا ہے۔ مَا: یہ ظرفیہ ہے۔ یعنی جتنی مدت تک اس کے ہونٹ رب کے ذکر سے ہلتے رہیں گے رب تعالیٰ کی معیت اسے حاصل رہے گی۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- حدیث قدسی کا اثبات
- ذکر کی فضیلت کہ یہ رب تعالیٰ کی مصاحبت ومعیت کا سبب ہے۔
- معیت سے یہاں معیتِ خاصہ مراد ہے وگرنہ رب تعالیٰ تو ہر وقت اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔
- معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کی یہ معیتِ خاصہ اس وقت حاصل ہوگی جب قلب اور لسان دونوں سے ذکر حاصل ہو۔ اس کی دلیل وَتَحَرَّكَتْ بِيْ شَفَتَاهُ کے الفاظ ہیں۔

ذکر جہنم سے نجات دلاتا ہے

1540- وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ عَمَلًا أَنْجَى لَهُ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ)). أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ وَالطَّبَرَانِيُّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ابن آدم نے اللہ کے ذکر سے بڑھ کر اللہ کے عذاب سے نجات دلانے والا کوئی عمل نہیں کیا۔'' [1]
اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ طبرانی نے اس کو حسن اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

1541- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ فِيْهِ إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ)). أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو لوگ بھی کسی مجلس میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ کہ فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں، رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور رب تعالیٰ ان کا اپنے پاس والوں کے سامنے ذکر فرماتے ہیں۔'' [2]
اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

1542- وَعَنْهُ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا قَعَدَ قَوْمٌ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْهِ، وَلَمْ يُصَلُّوْا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ إِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ)).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو لوگ بھی کسی جگہ بیٹھتے ہیں اور وہاں نہ تو اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور نہ نبی کریم ﷺ پر درود ہی بھیجتے ہیں مگر یہ بیٹھنا روزِ قیامت ان کے لیے حسرت کا باعث بنے گا۔'' [3]

---

[1] المعجم الكبير للطبراني: 20، رقم: 352- مصنف ابن ابی شیبة: 57/6- علامہ ہیثمی (73/10) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔
[2] صحیح مسلم: 2699.
[3] جامع الترمذی: 3380- صحیح ابن حبان: 853- المستدرك للحاكم: 735/1- حاکم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح بخاری کی شرط پر ہے۔

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ ، وَقَالَ : حَسَنٌ .

امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کر کے اسے حسن کہا ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی فضیلت اور معنی

1543۔ وَعَنْ أَبِيْ أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ ﷺ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنْ قَالَ : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ ، لَهُ الْمُلْكُ ، وَلَهُ الْحَمْدُ ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، عَشْرَ مَرَّاتٍ ، كَانَ كَمَنْ أَعْتَقَ أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيْلَ)) .
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جس نے دس مرتبہ یہ دعا پڑھی: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ...... ”اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہی اسی کی ہے، اسی کی تعریف ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔“ تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے اولاد اسماعیل میں سے چار لوگوں کو آزاد کیا۔“ ❶
یہ حدیث ”متفق علیہ“ ہے۔

غریب الحدیث :......**مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ**..... ان کلمات کی تشریح پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے۔ یاد رہے کہ یہاں ان کلمات کو اخلاص کے ساتھ کہنا مراد ہے، نرا زبان سے پڑھ دینا مراد نہیں۔
عَشْرَ مَرَّاتٍ: مابعد مذکور فضیلت صرف دس بار ان کلمات کے کہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ **أَعْتَقَ**: آزاد کرنا۔
أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيْلَ: لفظ انفس یہ نفس کی جمع ہے جو مونث ہے۔ اس اعتبار سے اربعة کا عدد مذکر یعنی اربـع آنا چاہیے تھا۔ لیکن جب نفس سے مراد "رجـل" ہو تو پھر اس کے نو سے کم عدد کو مونث لانا جائز ہوگا جیسے یہاں اربعة انفس کا لفظ ہے۔ سیدنا اسماعیل کا تعارف گزشتہ صفحات میں مفصل ذکر کر دیا گیا ہے۔

اولاد اسماعیل بنی آدم میں سب سے محترم اور معزز ہیں۔ یہ بات قرآن وسنت کی متعدد نصوص سے ثابت ہے۔ آزاد کرنے میں غلام جتنا اعلیٰ ہو، اس کا اتنا زیادہ ثواب ملتا ہے گویا کہ دس بار ان کلمات کے کہنے کا اجر اولاد آدم کے سب سے محترم چار غلاموں کو آزاد کرنے کے اجر کے برابر ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ...... کی فضیلت۔
◈ فضیلت اسی قدر منصوص کلمات کے کہنے پر ہے لہٰذا ان میں نہ تو يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وغیرہ کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے اور نہ کمی کی جائے۔
◈ الوہیت، بادشاہت اور حمد کا سزاوار تنہا ایک اکیلا اللہ بلاشرکت غیرے ہے۔
◈ اہم امور کی تاکید لائی جائے، چاہے یہ تاکید نفی کے ساتھ ہو یا اثبات کے ساتھ جیسے وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ میں وَحْدَهُ کی تاکید لَا شَرِيْكَ لَهُ کے ساتھ ہے جو نفی کے معنی پر مشتمل کلمات ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک معنی کی تاکید نفی کے معنی کے ساتھ لائی گئی ہے۔
◈ رب تعالیٰ کے لیے قدرت کا عموم، اس کی دلیل وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کے الفاظ ہیں۔
◈ عدد کا اعتبار۔ جیسے مذکورہ فضیلت دس بار ان کلمات کو کہنے پر ہے۔

❶ صحيح البخاري: 6404۔ صحيح مسلم: 2693

◈ عربوں پر بھی رقیت طاری ہوئی ہے اس کی دلیل کَمَنْ أَعْتَقَ أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيْلَ کے الفاظ ہیں۔

◈ عربوں کی فضیلت کی طرف اشارہ۔اس کی دلیل مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيْلَ کے الفاظ ہیں جو ان غلاموں کے اعلیٰ وافضل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔جس سے ثابت ہوا کہ اولادِ اسماعیل یعنی عرب سب سے افضل ہیں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ کہنے کی فضیلت اور معنی

1544۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ مِائَةَ مَرَّةٍ، حُطَّتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ)).

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''جس نے سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ'' میں رب تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہوں۔'' کہا تو اس کے قصور معاف کر دیئے جائیں گے اگرچہ وہ (کثرت میں) سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔''[1]

یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث ...... مَنْ: یہ شرطیہ ہے۔**قَالَ**: یہ جملہ شرطیہ ہے اور یہ زبان کے ساتھ کہنے اور دل سے اس بات کا اعتقاد رکھنے دونوں کو شامل ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ: یہ قول کا مقولہ ہے۔ان دونوں کلمات کے معانی متعدد بار بیان کیے جا چکے ہیں۔

مِائَةَ مَرَّةٍ: یہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کا وصف ہے۔اعداد کا یہ اعتبار توقیفی ہے جس کا ہم بندوں کو کوئی علم نہیں اور مراد سو بار ان کلمات کو کہنا ہے۔

حُطَّتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ: یہ جملہ جواب شرط ہے۔

فائدہ...... ان کلمات کو سو بار کہنے کی یہ فضیلت ہے کہ اگر سمندر کی جھاگ کے برابر بھی گناہ ہوں تو معاف کر دیئے جائیں۔البتہ یہ فضیلت صغائر کے لیے ہے وگرنہ کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔

تنبیہ...... مَنْ قَالَ یہ جملہ مشہور گمراہ فرقہ جبریہ پر رد ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ بندے کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔

چار کلمات کی فضیلت

1545۔ وَعَنْ جُوَيْرِيَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ ﷛ قَالَتْ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنَتْهُنَّ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، عَدَدَ خَلْقِهِ، وَرِضَا نَفْسِهِ، وَزِنَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ)).

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا:''میں نے تمہارے بعد چار ایسے کلمات کہے ہیں کہ اگر ان کا تمہارے ان کلمات کے ساتھ وزن کیا جائے جو تم نے دن کے آغاز سے (اب تک) کہے ہیں تو اُن کا وزن اِن سے بڑھ جائے۔(وہ کلمات یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ...... ''میں اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہوں، اس کی ساری مخلوقات کی تعداد کے برابر، اس کی

---

[1] صحيح البخاری: 6405۔ صحيح مسلم: 2691۔

ذات کی رضا کے مطابق اور اس کے عرش عظیم کے وزن کے برابر
اور اس کے کلموں کی (تعداد لکھنے کی) سیاہی کے برابر۔'' ❶

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. اس حدیث کوامام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......عَنْ جُوَيْرِيَةَ: نبی کریم ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ اورام المومنین رضی اللہ عنہا۔

أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ: ایک دفعہ ایسا ہوا کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے تشریف لے گئے تو اس وقت بھی وہ تسبیح کر رہی تھیں اور جب آپ ﷺ لوٹ کر تشریف لائے تو اس وقت بھی وہ تسبیح کر رہی تھیں۔اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ ارشاد فرمایا کہ جتنی دیر سے تم ذکر کر رہی ہو، اگر تم اس کی جگہ ان کلمات کو چار بار کہہ لیتیں تو وقت بھی کم لگتا اور اجر بھی زیادہ ملتا اور گھر کے کام کاج چھوڑ کر اب تک بیٹھے رہنے کی زحمت بھی نہ ہوتی۔کلمہ سے یہاں نحویوں والا کلمہ مراد نہیں بلکہ وہ کلمہ مراد ہے جس میں رب تعالیٰ کا ذکر ہو۔

عَدَدَ خَلْقِهِ: مخلوق سے یہاں وہ مخلوق مراد ہے جو زبانِ حال سے رب تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان کرتی ہے۔نہ کہ پوری مخلوق مراد ہے۔جس کی تعداد کا سوائے اللہ کے اور کسی کو علم نہیں۔

وَرِضَا نَفْسِهِ: اللہ کی رضا کو وہی شے پہنچ سکتی ہے جو بے حد عظیم ہو۔یعنی جب تک اللہ راضی نہیں ہو جاتا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ کہتا رہے، لیکن اس تک پہنچنا کسی کے بس کی بات نہیں۔تب پھر یہ معنی ہوگا: میں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ کہنے پر مامور ہوں یہاں تک کہ اللہ راضی ہو جائے۔

زِنَةَ عَرْشِهِ: عرش کا وزن کوئی نہیں کر سکتا۔اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہ عرش کتنا وزنی ہے۔

مِدَادَ كَلِمَاتِهِ: مِدَادَ سیاہی کو کہتے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ﴾ (الكهف: 109)

''کہہ دے اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا، اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں۔''

تب پھر اللہ کے کلمات کو لکھنے کے لیے کتنی سیاہی درکار ہوگی؟ بے حد عظیم جس کی تعداد کو اللہ ہی جانتا ہے۔تب پھر نبی کریم ﷺ کی یہ تسبیح کمیت میں، کیفیت میں، عدد میں، وزن میں اور نوعیت میں بے حد عظیم ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- بسا اوقات کم الفاظ زیادہ الفاظ سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔
- رب تعالیٰ کے ذکر اور کلام میں بھی باہمی تفاضل ہے۔
- اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا جائے۔
- رب تعالیٰ کی رضا ثابت ہے۔
- رب تعالیٰ کی ذات پر نفس کا اطلاق جائز ہے۔

❶ صحيح مسلم: 2726.

◈ معلوم ہوا کہ عرش کا جسم اور ثقل ہے۔
◈ عرش کی عظمت کہ اسے رب تعالیٰ کی ذات کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔
◈ رب تعالیٰ کے لیے کلام ثابت ہے، اس پر امتِ سنت کا اجماع ہے۔

باقیات صالحات

1546- وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ، لا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلا حَوْلَ وَلا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ)).

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''باقیات صالحات (ہمیشہ باقی رہنے والی نیکیاں) یہ کلمات ہیں: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ...... ''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ اللہ پاک ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے اور سب تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں اور نہیں ہے (گناہ سے باز آنے کی) طاقت اور (طاعت بجالانے کی) قوت مگر صرف اللہ کی مدد سے۔'' ❶

أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث: ...... اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ: گویا کہ ان کلمات سے رب تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے:

﴿وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا﴾ (الکہف: 48)

''اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب میں بہتر اور امید کی رو سے زیادہ اچھی ہیں۔''

سو قرآن کریم میں مذکور باقیات صالحات کی اس حدیث میں تفسیر ہے کہ اس سے مراد یہ کلمات ہیں۔ ان کو باقیہ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ یہ رب تعالیٰ کے ہاں بندے کے لیے اجر و ثواب کا ذخیرہ بن کر اس دن کے لیے باقی رہیں گی جس دن ان جیسی باتوں کے سوا مال اور اولاد میں سے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔ جبکہ ان کو صالحہ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ افضل اور پاکیزہ ترین کلام لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پر مشتمل ہوتا ہے۔

نحوی ترکیب کے اعتبار سے اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ مبتدا اور مابعد مذکور کلمات عطف کی ترکیب کے بعد خبر ہیں۔ جبکہ یہ ترکیب اس کے برعکس بھی درست ہے۔ البتہ پہلی ترکیب زیادہ بہتر ہے کیونکہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ جملہ ہے اور جملہ کا خبر ہونا اس کے مبتدا ہونے سے زیادہ بہتر ہے۔

تنبیہ: ...... مذکورہ تسبیح کے جملہ کلمات کی تشریح و تفسیر مفصل مذکور ہو چکی ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ: لا یہ لائے نفی جنس ہے جو منفی کے جملہ افراد کی نفی کو شامل ہے۔ حَوْلَ یہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال کو کہتے ہیں کہ تنگی سے آسانی، بیماری سے صحت کی طرف سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں لے جا سکتا۔

تب پھر وَ لَا قُوَّةَ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس تحول و انتقال کی قوت بھی صرف اللہ ہی دیتا ہے۔

بلاشبہ یہ جملہ حول اور قوت سے براءت کے اظہار اور تفویض الی اللہ کے اقرار کے باب میں عظیم ترین کلمہ ہے۔

---

❶ عمل الیوم و اللیلۃ للنسائی: 840- المستدرك للحاكم: 1/694- حاکم کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ان اذکار کو اپنا وظیفہ بنا لینے کی ترغیب۔
- آدمی کے پاس جو باقی رہ جائے گا وہ صرف عملِ صالح ہی ہے۔
- قرآن کی سنت سے تفسیر کا اثبات۔
- اللہ ہی الٰہ ہے۔
- وہ ہر عیب سے پاک ہے۔
- وہ سب سے بڑا ہے۔
- حمد کے لائق اور حمد پر مشتمل سارے کام اسی کو ہی سزاوار ہیں۔
- رب تعالیٰ پر توکل وتفویض اور یہ حول اور قوت اللہ ہی کے پاس ہے۔
- فرائض بھی باقیاتِ صالحات میں داخل ہیں۔

رب تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب کلام

1547۔ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَحَبُّ الْكَلَامِ إِلَى اللّٰهِ أَرْبَعٌ، لَا يَضُرُّكَ بِأَيِّهِنَّ بَدَأْتَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رب تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب کلمات چار ہیں۔ تم ان میں سے جس کو بھی پہلے کہہ لو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں (وہ چار محبوب ترین کلمات یہ ہیں:) سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ ...... ''اللہ پاک ہے، سب تعریفیں اس کے لیے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔''[1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :...... أَحَبُّ الْكَلَامِ: یعنی آدمی جو کلمات بولتا ہے ان میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کلمات اور باتیں یہ چار کلمات ہیں۔ حدیث کے ظاہر سے مستفاد ہوتا ہے کہ قرآن کریم اس حدیث کی مراد سے خارج ہے کیونکہ وہ رب تعالیٰ کا کلام ہے نہ کہ بندے کا۔ تب پھر قرآن کریم کی فضیلت ان کلمات سے بہرحال بہت زیادہ ہے۔

أَرْبَعٌ، لَا يَضُرُّكَ بِأَيِّهِنَّ بَدَأْتَ: یہ نبی کریم ﷺ کا حسن تعلیم ہے کہ آپ ﷺ چند باتوں کو حصر کے ساتھ اس لیے ذکر فرماتے تھے تاکہ ان کا سمجھنا اور انہیں یاد رکھنا آسان ہو جائے۔ جیسے یہاں چار میں حصر فرمایا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- رب تعالیٰ کے لیے محبت کا اِثبات۔
- رب تعالیٰ کی محبت اَعمال اور اَشخاص کے اعتبار سے متفاضل ہے۔ چنانچہ کسی سے کم اور کسی سے زیادہ ہے۔
- یہ کلماتِ اربعہ بے حد شرف وفضیلت والے ہیں کیونکہ یہ رب تعالیٰ کو بندے کی باتوں سے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم: 2137.

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کی فضیلت

1548۔ وَعَنْ أَبِیْ مُوسَی الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ قَيْسٍ! أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى كَنْزٍ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ ؟ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ)).
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
زَادَ النَّسَائِيُّ: ((لَا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ)).

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا: ''اے عبداللہ بن قیس! کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کا پتا نہ دوں؟ (تو سنو! کہ وہ) لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ (کے کلمات ہیں)۔'' [1]
یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔
اور امام نسائی رحمہ اللہ نے (اپنی روایت میں) یہ الفاظ زائد روایت کیے ہیں: ''وَلَا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ'' ''اور اللہ سے کوئی جائے پناہ نہیں مگر اسی کی طرف''۔

معرفة الصحابة :......عبداللہ بن قیس مشہور جلیل القدر صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نام نامی ہے۔لیکن وہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔

غريب الحديث :......**يَا عَبْدَ اللّٰهِ**: خطاب سے آغاز کی غرض مخاطب کی تنبیہ ہوتی ہے۔**أَلَا أَدُلُّكَ**: اَلَا جیسا کہ گزرا کہ یہ حرف استفتاح ہے، اس سے بھی مخاطب کی تنبیہ اور مابعد کلام کی طرف التفات کروانا مقصود ہوتا ہے۔
كَنْزٍ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ: یعنی جو ان کلمات کو کہے گا وہ جنت میں داخل ہونے کی قیمت ادا کرے گا اور یہ مراد نہیں کہ یہ جنت کے پھلوں میں سے ایک پھل ہے۔**لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ**: اس کی ترکیب و تفسیر مفصل بیان ہو چکی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- مناسب ہے کہ متکلم مخاطبین کو متوجہ کرنے کے لیے مناسب کلمات ابتدائے کلام میں ہی لے آئے تا کہ مخاطبین متوجہ ہو کر بات سنیں۔ نبی کریم ﷺ کا حسن تعلیم۔
- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی فضیلت کہ انہیں نبی کریم ﷺ کے خصوصی خطاب سے حصہ نصیب ہوا۔
- احباب واصحاب سے نرمی وملاطفت اختیار کی جائے۔
- لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ جنت کا ایک خزانہ ہے اور اس میں اپنے سے تبری اور رب تعالیٰ کی طرف تفویض کا اظہار واقرار ہے۔ یہ ذکر مستحب ہے چاہے کوئی مشقت، پریشانی اور مصیبت نہ بھی ہو۔

دعا بھی عبادت ہے

1549۔ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رضی اللہ عنہما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ)).

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک دعا یہ (بھی) عبادت ہے۔'' [2]

---

[1] صحيح البخاري: 6384- صحيح مسلم: 2704.
[2] سنن ابی داود: 1479- جامع الترمذی: 3247- السنن الکبری للنسائی: 11464- سنن ابن ماجه: 3828- ابن حبان (890) اور حاکم (667/1) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ ، وَصَحَّحَهُ التِّرمِذِيُّ .

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

1550- وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ ﷺ مَرْفُوعًا بِلَفْظِ: ((الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) .

اور جامع ترمذی میں انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث کے یہ الفاظ ہیں: ''دعا عبادت کا مغز ہے۔'' ❶

1551- وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ﷺ ، رَفَعَهُ: ((لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللهِ مِنَ الدُّعَاءِ)) .

اور جامع ترمذی کی (ہی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ''رب تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ قابل تکریم شے اور کوئی نہیں۔''

وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ .

ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ❷

غریب الحدیث:......**إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ**: بظاہر یہ حصر کے کلمات ہیں کہ دعا محض عبادت ہے۔ یعنی ہر انسان جو دعا مانگتا ہے وہ عابد ہے۔ نہ کہ اس بات کا حصر ہے کہ دعا ہی عبادت ہے جو صریح غلط ہے۔ گویا جو بھی رب تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ زبانِ حال سے دعا مانگ رہا ہے۔

تنبیہ:......اس حدیث میں دعا مانگنے کی بے حد بلیغ ترغیب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دعا کو عبادات میں داخل فرمایا ہے۔ تب پھر دعا مانگنے والا دوہرا فائدہ اٹھاتا ہے۔ عبادت بھی کر گزرتا ہے اور اپنی حاجت کا سوال بھی کر لیتا ہے۔

مُخُّ الْعِبَادَةِ: یعنی دعا عبادت کا لب لباب اور مغز و خلاصہ ہے۔ اس روایت کے ان الفاظ کی صحت محلِ نظر ہے۔ البتہ دعا کے باب میں پہلی روایت کے الفاظ کافی ہیں کہ دعا عبادت ہے۔

لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللهِ: مراد بندے کے مطلوبات میں سے سب سے زیادہ قابل تکریم شے دعا ہے۔ کیونکہ دعا مانگنے والے کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کی ذات کریم ہے۔ تب پھر واقعی رب تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کریم کوئی شے نہیں کہ داعی زبانِ حال سے رب تعالیٰ کو کریم کہہ رہا ہوتا ہے۔

اذان کے بعد دعا کی فضیلت

1552- وَعَنْ أَنَسٍ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ لَا يُرَدُّ)) .

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اذان اور اقامت کے درمیان کی دعا رد نہیں کی جاتی۔'' ❸

أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَغَيْرُهُ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَغَيْرُهُ .

اس حدیث کو امام نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان وغیرہ نے اس کی تصحیح بیان کی ہے۔

تنبیہ:..... کتاب الاذان میں اس حدیث پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔

دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے

1553- وَعَنْ سَلْمَانَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

❶ جامع الترمذی: 3371- امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔
❷ جامع الترمذی: 3370- ابن حبان (870) اور حاکم (666/1) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔
❸ اس کی تخریج کتاب الاذان میں گزر چکی ہے۔

اللّٰہ ﷺ: ((إِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيمٌ، يَسْتَحِيِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا)).

أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "بے شک تمہارا پروردگار حیا اور کرم والا ہے اسے اس بات سے اپنے بندے سے حیا آتی ہے کہ جب وہ اس کی طرف (دعا کے لیے) ہاتھ اٹھائے تو وہ انہیں خالی لوٹا دے۔" [1]

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے سوائے امام نسائی کے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... **إِنَّ رَبَّكُمْ**: یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب ہے جو بعد کی ساری امت کو بھی شامل ہے۔

حَيِيٌّ: یہ حَيٌّ کے علاوہ ہے کیونکہ حَيٌّ یہ حیاۃ سے ہے اور حَيِيٌّ یہ حیا سے ہے۔ یعنی رب تعالیٰ صفت حیا والے ہیں۔

كَرِيمٌ: یعنی رب تعالیٰ بے حد عطا والے ہیں۔

يَسْتَحِيِي مِنْ عَبْدِهِ: یہ رب تعالیٰ کی صفت حیا کی ایک مثال ہے اور عبد سے مراد عبادت شرعیہ کرنے والا ہے جیسا کہ بارہا بیان ہوا۔

إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ: یہ دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کا بیان ہے۔ یہاں رفع کی کیفیت مذکور نہیں۔ لہٰذا ہر طرح ہاتھ اٹھانا جائز ہوگا۔ البتہ مناسب یہ ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا رخ سینہ کی طرف رکھ کر دعا مانگی جائے۔

أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا: صفر خالی شے کو کہتے ہیں جس میں کچھ نہ ہو، مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ دعا مانگنے والے کو دیتا ضرور ہے، اور خالی نہیں لوٹاتا لیکن اپنی حکمت کے مطابق دیتا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- اللہ کے لیے ربوبیت کا اِثبات۔
- رب تعالیٰ کے لیے حیا کی صفت ثابت ہے۔
- رب تعالیٰ کریم اور بے پناہ عطا فرمانے والا ہے۔
- رب تعالیٰ کی صفت حیا بسا اوقات اس کے مقتضی کے وقت ظاہر ہوتی ہے اس کی دلیل يَسْتَحِيِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ کے الفاظ ہیں۔
- دعا مانگتے وقت رفع یدین مستحب ہے۔ کہ اس سے دعا قبول ہوتی ہے۔
- دعا کے لیے ایک ہاتھ کے اٹھانے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اگر تو کوئی ازراہِ تکبر ایسا کرتا ہے تو یہ فعل بے فیض اور خیر سے خالی ہے (بلکہ حرام ہے کہ اللہ کے سامنے تکبر اور اکڑ شیطانی فعل ہے) ایسی دعا ہرگز قبول نہ ہوگی۔ البتہ عذر کی بنا پر جائز ہوگا۔
- رفعِ یدین کا اطلاق سینہ کے برابر تک ہوتا ہے۔
- جی کی بات کو فعل کے ساتھ ظاہر کرنا مشروع ہے۔ چنانچہ رفع یدین دل کی حاجت کی طرف اشارہ ہے جس کو وہ دعا میں

---

[1] سنن ابی داود: 1488۔ جامع الترمذی: 3556۔ سنن ابن ماجہ: 3865۔ امام حاکم (479/1) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ جبکہ امام موصوف نے "فتح الباری" (143/11) میں اس کی سند کو عمدہ کہا ہے۔

مانگ رہا ہے۔

◈ دعا میں اصل رفعِ یدین ہے۔ کیونکہ ہاتھ نہ اٹھانے کی تصریح کہیں بھی نہیں۔

دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنا

1554,1555۔ وَعَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا مَدَّ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَرُدَّهُمَا حَتَّى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ)).

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دعا میں اپنے دونوں ہاتھوں کو لمبا کرتے تھے تو ان کو واپس نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ ان دونوں کو اپنے چہرۂ مبارک پر پھیر (نہ) لیتے تھے۔ [1]

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ.

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

لَهُ شَوَاهِدُ مِنْهَا: حَدِيْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ، وَغَيْرِهِ وَمَجْمُوْعُهَا يَقْتَضِي أَنَّهُ حَدِيْثٌ حَسَنٌ.

اس حدیث کے متعدد شواہد ہیں، ان میں سے ایک سنن ابی داود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ ان سب شواہد کا مجموعہ اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ [2]

روایة الحدیث: ......امام موصوف کے الفاظ لَهُ شَوَاهِدُ اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ حدیث کچھ ضعیف ہے۔ کیونکہ اکثر شواہد کی ضرورت تب ہی پڑتی ہے جب حدیث کی صحت کے نقص کو پورا کرنا مقصود ہو۔ مذکورہ حدیث کا یہ شاہد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔

مضمون حدیث: ......مذکورہ حدیث میں دراصل یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ جب دعا سے فارغ ہوا جائے تو اٹھے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر لیا جائے۔ پس حدیث کے ثابت ہونے پر ایسا کرنا بابِ تعبد میں سے ہوگا کیونکہ اگر ایسا کرنا بطور تبرک کے ہوتا تو پھر پورے بدن پر ہاتھ پھیرا جاتا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سوتے وقت پورے چہرے پر اور بدن کے بعض حصہ پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔

رہی دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی حکمت تو اسے اللہ ہی جانتے ہیں البتہ یہ حدیث اپنے تمام شواہد سمیت حسن ہے جیسا کہ امام موصوف نے اس کی تصریح کی ہے۔ البتہ یہ حدیث حسن لغیرہ کہلائے گی۔ اب دعا کے لیے نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر تو متعدد صحیح روایت میں آتا ہے لیکن سوائے اس ایک حدیث کے کسی صحیح حدیث میں دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کا ذکر نہیں ملتا۔ اسی لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنا بدعت ہے اور اس باب میں وارد جمیع شواہد ضعیف ہیں اور ضعیف روایات ایک دوسرے کو قوی نہیں کرتیں۔ اس بنا پر یہ مسئلہ اجتہادی ہوگا۔ لہٰذا جس کے نزدیک یہ شواہد مل کر ضعف کے نقص کی تلافی کر دیتے ہیں اس کے نزدیک دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنا مسنون ہوگا اور جو اس بات کا قائل نہیں اس کے نزدیک یہ مسئلہ غیر مسنون اور بدعت ہوگا۔

---

[1] جامع الترمذی: 3386۔ المستدرك للحاكم: 719/1۔ علامہ ذہبی "تذکرة الحفاظ" (886/3) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت نہیں۔ جبکہ "سیر اعلام النبلاء" (497/4) میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو روایت کرنے میں حماد متفرد ہیں۔

[2] سنن ابی داود: 1485۔ سنن ابن ماجہ: 3866۔

تب پھر نہ تو ہم ایسا کرنے والے پر انکار کرتے ہیں اور نہ اس بات کی دعوت دیتے ہیں اور نہ ایسا کرتے ہی ہیں۔ یعنی چونکہ ہمارے نزدیک اس کا سنت ہونا ثابت نہیں، اس لیے ہم دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ نہیں پھیرتے لیکن جو اُن علماء کی اتباع میں ایسا کرتے ہیں جن کے نزدیک شواہد کی کثرت حدیث کو حسن کے درجہ تک لے جاتی ہے، ہم ان پر انکار بھی نہیں کرتے۔

نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے کی فضیلت

1556- وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً)).

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''روز قیامت میرے سب سے زیادہ نزدیک وہ لوگ ہوں گے جو مجھ پر کثرت سے درود بھیجتے ہیں۔'' [1]

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:...... إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِيْ: مراد شفاعت اور غیر شفاعت میں نبی کریم ﷺ کے سب سے زیادہ نزدیک ہونا ہے۔

أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً: پس جو بھی نبی کریم ﷺ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجے گا، اسے روزِ قیامت نبی کریم ﷺ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہوگا اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کو کثرت سے یاد کرنے والے کے دل میں نبی کریم ﷺ کی یاد بھی کثرت کے ساتھ ہوگی اور اسی صلہ اور تعلق کی قوت کی بنا پر وہ روزِ قیامت نبی کریم ﷺ کے سب سے زیادہ نزدیک بھی ہوگا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- روزِ قیامت نبی کریم ﷺ کے قریب ہونے کے اعتبار سے لوگوں کا حال مختلف ہوگا۔ کوئی زیادہ قریب ہوگا تو کوئی کم قریب ہوگا۔
- روزِ قیامت کا اِثبات۔
- نبی کریم ﷺ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجنا مستحب ہے۔ اس کی دلیل أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً کے الفاظ ہیں۔ البتہ زیادہ محبت رب تعالیٰ سے ہی ہو، اس کے بعد نبی کریم ﷺ سے محبت ہو۔

سید الاستغفار اور اس کا معنی

1557- وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((سَيِّدُ الْإِسْتِغْفَارِ أَنْ يَقُولَ الْعَبْدُ: اللّٰهُمَّ! أَنْتَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي، وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''سید الاستغفار (یعنی سب سے اعلیٰ استغفار) یہ ہے کہ بندہ (رب تعالیٰ کے حضور) یہ کہے: اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ...... ''اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو نے مجھے پیدا کیا ہے، اور

[1] -جامع الترمذی: 484- علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''ضعیف الجامع'' (1821) میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

صَنَعْتُ ، أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي ، فَاغْفِرْ لِيْ ، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ)) .

میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک مجھ (عاجز و ناتواں) سے ہو سکے گا میں تیرے ساتھ کیے ہوئے (ایمانی) عہد و میثاق اور (اطاعت و فرمانبرداری کے) وعدے پر قائم رہوں گا، میں اپنے کیے دھرے کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور مجھ پر تیری جو نعمتیں ہیں، میں ان کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا تیرے حضور اقبالِ جرم کرتا ہوں، پس تو مجھے بخش دے کہ بے شک تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا اور کوئی نہیں۔'' ❶

أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ .

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث :.....**سَيِّدُ الْإِسْتِغْفَارِ** : استغفار بخشش مانگنے کو کہتے ہیں چاہے اس کے لیے جن الفاظ کا مرضی انتخاب کیا جائے۔ چاہے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ، اَللّٰهُمَّ يَا غَفَّارُ وغیرہ میں سے جو بھی کہا جائے، استغفار ہی کہلائے گا۔ ''مغفرت'' کیے گناہ سے درگزر کرنے اور اس پر پردہ ڈالنے کی التجا کو کہتے ہیں۔ سید الاستغفار سے مراد سب سے اعلیٰ داشرف استغفار ہے۔

اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ : ان کلمات میں رب تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت کا اثبات ہے۔

خَلَقْتَنِيْ : یہ ربوبیت کا مقتضیٰ ہے۔ کیونکہ رب ہی خالق و مدبر ہوتا ہے۔

وَأَنَا عَبْدُكَ : اس میں عبدیت شرعیہ وکونیہ دونوں کا اقرار ہے۔ کیونکہ یہ ایک مومن کا اقرار ہے کہ اے اللہ! میں تیرا تکوینی بندہ بھی ہوں، لہٰذا تو میرے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے اور میں تیرا شرعی بندہ بھی ہوں۔ لہٰذا میں تیرے احکام بجالاؤں گا اور تیری ہر قسم کی نافرمانی سے بچوں گا۔

وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ : عہد سے مراد رب تعالیٰ سے اس کی عبادت و طاعت کرنے کا میثاق اور عہد مراد ہے اور وعدہ سے مراد رب تعالیٰ کی اطاعت کرنے پر ملنے والے اجر کا وعدہ ہے۔ چنانچہ لفظِ عہد میں رب تعالیٰ کی طاعت کا عمل کے ذریعے التزام ہے جبکہ وعدہ کے لفظ میں جزا پر ایمان کا اظہار ہے۔ یعنی اے اللہ! تو نے مجھ سے اپنی عبادت و طاعت کا جو عہد لیا تھا، میں اس پر قائم ہوں۔ جس کا علم ہمیں تیرے بھیجے ہوئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور تیری اتاری ہوئی کتابوں کے ذریعے ہوا ہے اور اس طاعت پر تو نے ہمیں جس اجر و ثواب کے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

مَا اسْتَطَعْتُ : مذکورہ ما یا تو یہ ظرفیہ مصدریہ ہے یا پھر شرطیہ ہے۔ اگر یہ ظرفیہ مصدریہ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ جب تک مجھ میں تیری طاعت و فرمانبرداری کی ہمت و طاقت ہے میں تیری طاعت بجالاؤں گا اور شرطیہ ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب بھی مجھے تیری طاعت کی ہمت و طاقت ملے گی میں تیرا مطیع و فرمانبردار ہوں گا۔

أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ : صَنَعْتُ یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے نہ کہ واحد حاضر کا۔ مَا صَنَعْتُ سے مراد کیے گئے گناہ ہیں۔ تب پھر مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! میں تجھ سے اپنے کیے ہوئے گناہوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ ہر گناہ

---

❶ صحيح البخاري: 6306.

شراور عقوبت کا موجب ہے۔ ہاں اللہ ہی ان کو معاف فرما دے تو اور بات ہے۔ أَبُوْءُ: یہ اعتراف کرنے کے معنی میں ہے۔

لَكَ: مراد لِلّٰهِ ہے۔ یاد رہے کہ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ کہنا یہ صرف اَبُوْءُ بِنِعْمَتِكَ کہنے سے زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ لَكَ کا کلمہ رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنے اور اس کی نعمتوں کا اقرار کرنے پر نص اور تخصیص ہے۔

بِذَنْبِيْ: ذنب مصدر ہے اور یہاں اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے اسی لیے جملہ ذنوب کو عام اور شامل ہے۔ گناہ کا اقرار دراصل مغفرت کا سوال ہوتا ہے۔ اسی لیے آگے فرمایا:

فَاغْفِرْ لِيْ: یعنی اے اللہ! مجھے سزا دینے سے درگزر فرما، اور میری پردہ پوشی فرما۔

فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ: یہ اس بات کا اعتراف اور اقرار ہے کہ ساری مخلوق مل کر بھی کسی کے کسی ایک گناہ کو بھی معاف نہیں کر سکتی۔ سب گناہوں کو صرف اللہ ہی معاف فرمائے گا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- استغفار کے مذکورہ بالا صیغے سب سے افضل ہیں اس کی دلیل ''سید الاستغفار'' کے الفاظ ہیں۔
- معلوم ہوا کہ استغفار کے صیغے شرف وفضیلت میں باہم مختلف ومتفاوت ہیں کہ کسی کی فضیلت زیادہ اور کسی کی کم ہے۔
- ان صیغوں کا نام سید الاستغفار اس لیے ہے کیونکہ یہ کلمات ایسی متعدد باتوں کو متضمن ہیں جو اس کے سید الاستغفار ہونے کو متقاضی ہیں۔
- توحید کا اقرار۔ اس کی دلیل لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ کے الفاظ ہیں
- بندے کا تفصیل کے ساتھ اس بات کا اقرار کرنا کہ خالق و پروردگار صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔ اس کی دلیل خَلَقْتَنِيْ کے الفاظ ہیں جن میں الوہیت کا اقرار ہے وَأَنَا عَبْدُكَ میں اسی اقرار کی تفصیل ہے۔
- عہد اَلَسْتُ کی تجدید۔
- رب تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان، ایمان کی تکمیل میں سے ہے۔
- بندہ وہی ہے جو حتی الامکان رب تعالیٰ کی طاعت پر قائم رہے۔
- برائیوں سے پناہ دینے والا صرف اللہ ہی ہے۔
- رب تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف۔
- بندہ کی عاجزی ودرماندگی کا مقتضٰی یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کرے اور ان سے معافی مانگے۔
- اپنے حال کو وسیلہ بنا سکتے ہیں۔
- استغفار اپنے دوسرے مومن بھائیوں کے لیے بھی کر سکتے ہیں، البتہ جن کا کفر پر مرجانا متحقق ہو چکا ہے، ان کے لیے استغفار کرنا جائز نہیں۔
- سید الاستغفار کو اپنا معمول بنایا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کو سب سے اعلیٰ استغفار فرمایا ہے۔

دین، دنیا، اہل اور مال میں عافیت کا سوال

1558۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: لَمْ يَكُنْ　　حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی

رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَدَعُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ حِيْنَ يُمْسِيْ، وَحِيْنَ يُصْبِحُ ((اَللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ، وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ، اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ، وَآمِنْ رَوْعَاتِيْ، وَاحْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ، وَمِنْ خَلْفِيْ، وَعَنْ يَمِيْنِيْ، وَعَنْ شِمَالِيْ، وَمِنْ فَوْقِيْ، وَأَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ)).

کریم ﷺ شام ہونے پر اور صبح ہونے پر ان کلمات کے ساتھ دعا مانگنے کو ترک نہ فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْأَلُكَ..... ''اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین، اپنی دنیا، اپنے اہل (وعیال) اور اپنے مال میں عافیت (عطا فرمانے) کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! میری شرم و عار کی باتوں کی پردہ داری فرما اور میری گھبراہٹوں (کو دور فرما کر مجھے ان) سے امن واطمینان نصیب فرما اور میرے آگے سے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں سے اور میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے میری حفاظت فرما اور میں اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میری بے خبری میں میرے نیچے سے کوئی آفت مجھ پر آ پڑے۔'' [1]

أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اس حدیث کو امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:..... لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَدَعُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ: هٰؤُلَاءِ یہ جمع کے لیے اسم اشارہ ہے جو ذوی العقول کے لیے آتا ہے اور لغتِ عربیہ میں غیر ذو العقول کے لیے اس کا استعمال نادر ہے جیسے یہاں الْكَلِمَاتِ کے لیے اس کا استعمال غیر ذو العقول میں ہے۔

حِيْنَ يُمْسِيْ، وَحِيْنَ يُصْبِحُ: یعنی جب آپ ﷺ شام کے وقت میں اور صبح کے وقت میں داخل ہوتے تھے۔ مراد عصر اور فجر کے اوقات ہیں۔ کیونکہ فجر کی نماز کے بعد آدمی صباح اور عصر کی نماز کے بعد آدمی مساء میں داخل ہو جاتا ہے۔ تب پھر مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ یہ دعا نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ: یہ نبی کریم ﷺ کا اپنے خالق پروردگار سے خطاب ہے کہ آپ ﷺ رب تعالیٰ سے دین میں عافیت کا سوال کر رہے ہیں۔ دین ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس سے رب تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہو۔ اب دین میں عافیت دو باتوں پر مشتمل ہے: (1) شبہات سے عافیت (2) شہوات سے عافیت۔ شبہات سے عافیت، یہ ایسا علمِ نافع اور نورِ ہدایت کا نصیب ہونا ہے جس کی روشنی میں آدمی کو حق و باطل میں آسانی کے ساتھ امتیاز حاصل ہو جائے اور شہوات سے عافیت سے برے ارادوں سے حفاظت نصیب ہوتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ: عَوْرَاتٌ "عَوْرَةٌ" کی جمع ہے۔ عورت برے قول وفعل کو کہتے ہیں اور اس کی ستاری سے مراد لوگوں کی نظروں سے اس کا چھپانا ہے۔ یعنی اے اللہ میرے قول وفعل کی برائی کو لوگوں کی نظروں سے چھپا دے چنانچہ نہ تو وہ میری کسی برائی کو دیکھیں اور نہ اس کو دیکھ ہی پائیں۔

وَآمِنْ رَوْعَاتِيْ: روعات "روعة" کی جمع ہے۔ یہ ڈر، خوف، قلبی گھبراہٹ اور تشویش کو کہتے ہیں۔ اس بات میں کوئی

---

[1] السنن الکبری للنسائی: 145/6۔ سنن ابن ماجہ: 3871۔ المستدرك للحاکم: 517/1.

شک نہیں کہ ہر آدمی کے جی میں ایک طبعی ڈر ہوتا ہے۔ جس کا سبب بسا اوقات کوئی خارجی امر ہوتا ہے اور کبھی کوئی داخلی امر ہوتا ہے۔ ڈر سے امن نصیب فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ ہر قسم کے ڈر کو دُور فرما کر جی کو اطمینان سے بھر دے۔

وَاحْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ .... : ان جملہ میں پانچ جہات کا بیان ہے، آگے، پیچھے اور دائیں بائیں کی جہت اور اوپر کی جہت، جبکہ چھٹی جہت کا بیان ان کلمات میں ہے:

وَأَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ: یہ نیچے کی جانب کا بیان ہے۔ نیچے کی جانب کو الگ سے بیان کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیچے سے آنے والا عذاب اشد اور اعظم ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس عذاب سے رب تعالیٰ کی عظمت کی پناہ مانگی ہے۔

أُغْتَالَ: یہ اِغْتِیَالٌ سے ہے۔ یہ کسی بے خبری میں اور دھوکے سے مار ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یعنی اچانک آ پڑنے والی مصیبت اور عذاب۔ تب پھر عذاب کی یہ قسم اور بھی اشد ہوئی کہ ایک تو یہ نیچے سے آ رہا ہو اور دوسرا بے خبری میں آ رہا ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں ان کلمات کے ذریعے استعاذہ کیا جائے۔
- یہ دعا صبح اور شام کے اوقات میں مانگی جائے کیونکہ اس پر نص آ گئی ہے۔
- ہر آدمی ہر وقت آفات وبلیات کی زد میں ہے۔ جانے کب اور کہاں کس مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ چنانچہ آدمی کو ہمہ وقت اپنے دین ودنیا اور اہل وعیال اور مال ومنال میں خیر وعافیت کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔
- آزمائش جہاں دنیا اور مال ومتاع وغیرہ میں آتی ہے، وہیں دین میں بھی آتی ہے اور یہ شبہات اور شہوات کے راستے سے آتی ہے۔
- ہمیں دین ودنیا دونوں میں عافیت مانگنے کا حکم ہے۔
- مال میں عافیت مانگنا جائز ہے۔
- اہل وعیال میں عافیت مال ومنال میں عافیت پر مقدم ہے۔
- نبی کریم ﷺ وحی ورسالت میں معصوم ہیں البتہ غیر وحی میں نبی کریم ﷺ سے بھی اجتہادی خطا کا وقوع ممکن ہے۔ مگر رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کسی اجتہادی خطا پر باقی رہنے نہ دیا۔ اس لیے آپ ﷺ اُسْتُرْ عَوْرَاتِیْ کی دعا مانگا کرتے تھے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (التوبة: 43)

''اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی، یہاں تک کہ تیرے لیے وہ لوگ صاف ظاہر ہو جاتے جنھوں نے سچ کہا اور تو جھوٹوں کو جان لیتا۔''

- اس دعا کی ایک توجیہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا امت کی تعلیم کے لیے فرمایا تھا کہ وہ رب تعالیٰ سے یہ دعا مانگا کریں۔
- نبی کریم ﷺ کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح طبعی خوف لاحق ہو جایا کرتا تھا جس کی دلیل وَآمِنْ رَوْعَاتِیْ کے کلمات ہیں۔

◈ نبی کریم ﷺ بھی ہر طرف سے رب تعالیٰ کی حفاظت کے محتاج تھے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا وَاحْفَظْنِي مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ...... کے الفاظ ہیں۔

◈ نیچے سے آنے والے عذاب سے بہ نسبت آسمانی بلاؤں کے زیادہ ڈرنا چاہیے۔اس کی دلیل أَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ کی دعا الگ سے مانگنا ہے۔

◈ دعا میں تکلف کے بغیر سجع جائز ہے۔

رب تعالیٰ کی ناراضی سے پناہ مانگنا

1559- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ، وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ، وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ!...... "اے اللہ! میں تیری نعمتوں کے چلے جانے سے اور تیری عافیت کے پلٹ جانے سے اور تیری اچانک سزا دینے سے اور تیری ساری کی ساری ناراضی سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔" [1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث:......**مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ**: یہ دین و دنیا دونوں کی نعمتوں کے زائل ہونے سے پناہ مانگنے کی دعا کو شامل ہے۔

تَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ: جیسے صحت سے بیماری، آسودگی سے بدحالی، آزادی سے غلامی وغیرہ کی طرف منتقل ہونا اور یہ دین و دنیا دونوں کی عافیت کے بدل جانے سے پناہ مانگنے کو شامل ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ اس بات سے بھی پناہ میں رکھے کہ آدمی کسی گمراہ کی دسیسہ کاریوں کی زد میں آ کر عقیدہ بدل بیٹھے۔ غرض ان کلمات میں دین و دنیا کے اچھے حال سے برے حال کی طرف لوٹ جانے سے پناہ مانگی گئی ہے۔

وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ: نِقْمَت یہ سزا اور بدلہ کو کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ بعض دفعہ اپنے نافرمانوں کو اچانک بھی سزا دے دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: 97-98)

"تو کیا بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر راتوں رات آ جائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں۔ اور کیا بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر دن چڑھے آ جائے اور وہ کھیل رہے ہوں۔"

غرض رب تعالیٰ کبھی سوتوں کو اور کھیلوں میں مست لوگوں کو اچانک اپنی گرفت میں لے آتا ہے اور نبی کریم ﷺ کا یہ دعا مانگنا امت کی تعلیم کے لیے تھا۔ وگرنہ آپ ﷺ تو رب تعالیٰ کے سب سے زیادہ طاعت گزار بندے تھے۔

جَمِيْعِ سَخَطِكَ: چاہے یہ ناراضی قولی نافرمانیوں پر ہو یا فعلی نافرمانیوں پر ہو۔ غرض رب تعالیٰ کی ہر طرح کی ناراضی سے

[1] صحیح مسلم: 2739

پناہ مانگی جائے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ بھی اپنے رب کے محتاج تھے۔
- نعمتیں کبھی چھن بھی جاتی ہیں حتی کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی جا سکتی ہیں۔لیکن پیغمبروں اور رسولوں سے صرف دنیاوی نعمتوں کا زوال ممکن ہے نہ کہ دینی نعمتوں کا بھی زوال ممکن ہے۔
- نبی کریم ﷺ نے عافیت جاتے رہنے سے پناہ مانگی ہے۔
- نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے اچانک گرفت فرما لینے سے پناہ مانگی ہے۔
- رب تعالیٰ کے لیے ناراضی ثابت ہے۔اس کی دلیل جَمِیْعِ سَخَطِكَ کے الفاظ ہیں۔

قرض اور دشمن کے غالب آنے سے اور دشمنوں کے خوش ہونے سے پناہ مانگنا

1560۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الْعَدُوِّ، وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ)).

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ...... ''اے اللہ! میں قرض کے غالب آ جانے سے اور دشمن کے غالب آ جانے سے اور دشمنوں کے (اپنی کسی مصیبت پر) خوش ہونے سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔'' [1]

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔جبکہ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ: نبی کریم ﷺ نے قرض کے غلبہ سے پناہ مانگی ہے نہ کہ قرض سے۔ کیونکہ کبھی کبھی نبی کریم ﷺ بھی قرض لے لیا کرتے تھے اور ایسا بھی ہوا کہ کبھی وقت پر وہ قرض ادا نہ ہو سکا۔جیسا کہ وفات کے وقت آپ ﷺ ایک یہودی کے مقروض تھے اور آپ ﷺ کی زرہ اس کے پاس رہن رکھی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ قرض کے ہاتھوں کبھی مغلوب نہ ہوئے تھے، ہاں قرض اٹھایا ضرور تھا۔

وَغَلَبَةِ الْعَدُوِّ: دشمنوں کے غالب آ جانے سے بھی پناہ مانگی جائے۔بے شک دشمنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ غلبہ اور فتح آپ ﷺ کو ہی نصیب ہوا تھا۔

وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ: شماتت یہ دشمنوں کا ہماری مصیبت کو دیکھ کر خوش ہونا ہے۔بے شک دشمنوں کی ہنسی جی جلاتی اور دل دُکھاتی ہے، اسی لیے دشمنوں کے خوش ہونے سے بھی پناہ مانگنے کی تعلیم ہے۔پس قرض کے غلبہ کا مال سے تعلق ہے اور دشمن کے غلبہ کا شرف وسیادت سے اور عزت ووجاہت سے تعلق ہے۔جبکہ شماتت اعداء کا تعلق امر خارجی سے ہے جو مال اور بدن سے متعلق ہو۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ بھی اپنے رب کے محتاج تھے۔

---

[1] سنن النسائی: 265/8۔ المستدرك للحاكم: 713/1۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط پر ہے۔

◈ نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں اس دعا کے مانگنے کا اہتمام کیا جائے۔
◈ صرف قرض لینا مذموم نہیں اور نہ اس میں کوئی حرج ہے۔البتہ قرض تلے دبنے سے بچا جائے۔

الصمد کا معنی

1561۔ وَعَنْ بُرَيْدَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا يَقُولُ: ((اللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ بِأَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، الْأَحَدُ الصَّمَدُ، الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ. فَقَالَ: "لَقَدْ سَأَلَ اللّٰهَ بِاسْمِهِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى، وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ"))

أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو یہ دعا مانگتے سنا: اللّٰهُمَّ! إِنِّي .... كُفُوًا أَحَدٌ. ''اے اللہ! میں تجھ سے اس واسطہ سے دعا مانگتا ہوں کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تو ہی ہے تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔تو یکتا اور صمد (بے نیاز) ہے جو نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا ہم سر ہی ہے۔'' اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اس نے رب تعالیٰ کے اس نام کے واسطے سے دعا مانگی ہے کہ جب اس نام کے واسطے سے مانگا جائے تو وہ عطا فرماتا ہے۔جب اس کے واسطے سے دعا مانگی جائے تو وہ قبول فرماتا ہے۔''[1]

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے جبکہ امام ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث:......**اللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ بِأَنِّي أَشْهَدُ**: یہ رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ توسل اختیار کرنے کا ذکر ہے جو جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان صاحب کے اس فعل کو برقرار رکھا۔جو اس کے جواز کی دلیل ہے۔

بِـأَنِّيْ: اس میں باء مصاحبت کے لیے ہے۔یعنی اے میرے اللہ! میں آپ سے ایک ایسا سوال کرتا ہوں جو میری اس شہادت کے ساتھ ملا ہوا ہے۔یہاں سائل کے سوال کا ذکر نہیں جو اس کی حاجت ہے، لیکن اس کے ذکر نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل دعا مانگنے کا سلیقہ سکھانا مقصود ہے۔

أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ: یہ رب تعالیٰ کے ایک اکیلے الٰہ ہونے کی شہادت ہے۔

اَلْأَحَدُ: وہ یکتا جس کی کوئی نظیر یا مثل نہ ہو۔نہ عظمت میں اور نہ جلال میں اور نہ کسی اور صفت جلالی یا جمالی میں اس میں رب تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت ہے۔

اَلصَّمَدُ: اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں، جیسے:

⊙ ......وہ ذات جو اپنی صفات میں ایسی کامل ہو کہ اس کی ساری مخلوق اس کی محتاج ہو اور اسے کسی کی مطلق ضرورت نہ ہو۔اسی کو بے نیاز کہتے ہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد: 1493۔ جامع الترمذی: 3475۔ سنن ابن ماجه: 3857۔ سنن النسائی: 52/3۔ علامہ منذری رحمہ اللہ کے شیخ حافظ ابو الحسن المقدسی فرماتے ہیں: اس حدیث کی اسناد میں کوئی طعن نہیں ہے اور اس باب میں اس سے زیادہ عمدہ اسناد والی اور کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔دیکھیں: الترغیب والترهیب: 317/2.

⊙ ...... ایسا بڑا جو اپنے علم اور حلم دونوں میں کامل ہو۔

اور یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور اس لفظ میں رب تعالیٰ کی ربوبیت کی شہادت ہے۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ: نہ اس کی کوئی اولاد ہے کیونکہ وہ کامل ہے اور اسے اولاد کی مطلق احتیاج نہیں۔ جبکہ مخلوق اپنے ناقص ہونے کی وجہ سے اولاد کی محتاج ہوتی ہے اور اس کے حصول کے جتن بھی کرتی ہے۔ رب تعالیٰ اس بات سے غنی ہے کہ وہ اولاد جنے، وہ اکیلا کائنات کو چلا رہا ہے اور اس نظام کو چلانے میں اسے اپنے کسی نائب جیسے اولاد وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

وَلَمْ يُوْلَدْ: اور نہ اسے کسی نے جنا ہے کیونکہ سب اس کی مخلوق ہیں، وہ سب کا خالق ہے، تب کوئی اسے کیسے جن سکتا اور بنا سکتا ہے؟؟ غرض یہ دعا ربوبیت والوہیت کی متعدد انواع کے ذکر کو متضمن ہے۔

إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى، وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ: یہ ''کلمات'' دعا اور سوال دونوں کے مستجاب ہونے کے ضامن ہیں۔ دعا میں رب تعالیٰ سے مناجات ہوتی ہیں جبکہ سوال میں کسی چیز کی طلب ہوتی ہے۔ دعا اور سوال میں بنیادی فرق یہی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- ان کلمات کے ساتھ توسل کیا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کلمات کو سراہا ہے۔
- بسا اوقات کسی کو ایسی بات کا بھی الہام کیا جاتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہوتی ہے۔ جیسے اس دعا مانگنے والے نے یہ دعا اپنی طرف سے مانگی تھی جسے نبی کریم ﷺ نے بے حد پسند فرمایا اور یہ رب تعالیٰ کے بھی پسند فرمانے کی دلیل ہے۔
- سچ کہنے والے کی تائید کی جائے چاہے وہ مرتبہ میں چھوٹا ہی ہو۔
- رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ کاملہ سے توسل کرنا جائز ہے۔
- الوہیت، احدیت، ربوبیت صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی ہے۔
- رب تعالیٰ کے لیے کمال کا اثبات اس کی دلیل لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ کے الفاظ ہیں۔
- رب تعالیٰ کے لیے صفاتِ سلبیہ بھی ثابت ہے جس کی دلیل لَمْ يَلِدْ اور لَمْ يُوْلَدْ کے کلمات ہیں۔
- وسیلہ جتنا قوی ہوگا مقصود کا حصول اتنا ہی قریبی اور یقینی ہوگا۔

صبح و شام کی دعائیں

1562- وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أَصْبَحَ يَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ! بِكَ أَصْبَحْنَا، وَبِكَ أَمْسَيْنَا، وَبِكَ نَحْيَا، وَبِكَ نَمُوْتُ، وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ)) وَإِذَا أَمْسَى قَالَ مِثْلَ ذَلِكَ، إِلَّا أَنَّهُ قَالَ: ((وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ)).

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب صبح ہوتی تھی تو یہ دعا مانگتے تھے: اَللّٰهُمَّ! بِكَ أَصْبَحْنَا...... ''اے اللہ! ہم نے تیرے حکم سے ہی صبح کی اور تیرے ہی حکم سے ہماری شام ہوتی ہے۔ ہم تیرے حکم سے ہی زندہ ہیں اور تیرے ہی حکم سے ہمیں موت آئے گی اور ہم تیری طرف ہی اٹھیں گے۔'' اور جب شام ہوتی تو ایسی ہی دعا مانگا کرتے تھے البتہ (شام کی دعا میں وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ کی بجائے) وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ پڑھتے تھے۔ (یعنی: ''اور تیری طرف ہی لوٹ

www.KitaboSunnat.com

کر جائیں گے)۔'' ❶

أَخرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ.

اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے روایت کیا ہے۔

غریب الحدیث ......إِذَا أَصْبَحَ: یعنی جب آپ ﷺ صبح کے وقت میں داخل ہوتے تھے۔ مراد نمازِ فجر کے بعد یہ دعا پڑھنا ہے۔ اللّٰهُمَّ! بِكَ أَصْبَحْنَا: یعنی اے اللہ! تو نے ہمیں اس وقت تک زندہ رکھا جو ہم اس وقت میں داخل ہوئے۔

وَبِكَ أَمْسَيْنَا: اور اللہ ہی کی توفیق سے ہم اس وقت میں داخل ہوئے۔ یعنی اللہ نے ہمیں باقی رکھا جو ہم نے صبح کی اور شام کی اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ ہی نے صبح کی اور اللہ ہی نے شام کی کہ اللہ کے سوا صبح اور شام کو کوئی نہیں لا سکتا۔

وَبِكَ نَحْيَا، وَبِكَ نَمُوْتُ: یعنی صبح اور شام میں اور ان کے درمیانی اوقات میں ہم اللہ ہی کی مرضی سے زندہ ہیں، اور ہمیں موت بھی اللہ کے حکم سے ہی آئے گی۔

وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ: نشور یہ روزِ قیامت سب کا اٹھ کر رب تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کا نام ہے۔ لیکن اس دعا میں نشور کے ذکر کی مناسبت یوں ہے کہ سو کر اٹھنا گویا مر کر اٹھنا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ (الانعام: 60)

''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کمایا، پھر وہ تمھیں اس میں اٹھا دیتا ہے، تا کہ مقرر مدت پوری کی جائے۔''

وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ: یہ شام کی دعا کا اختتامی کلمہ ہے۔ مَصِیر لوٹنے کی جا۔ کیونکہ دن کا آخر دنیا کے آخر اور اختتام کی طرح ہے۔ گویا دن کے آخر میں آدمی نیند والی موت کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے اور یہ موت کے وقت بندے کے رب تعالیٰ کی طرف دنیا سے لوٹنے کی طرح اور اس کے مشابہ ہے۔

فوائد متفرقہ

- مناسب ہے کہ صبح اور شام کے اوقات میں اس دعا کے پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔
- صبح اور شام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
- موت اور حیات پر قبضہ رب تعالیٰ کا ہے۔
- رب تعالیٰ کی ربوبیت صبح اور شام کے سب اوقات پر محیط ہے۔

دنیا اور آخرت میں نیکی ملنے کی دعا

1563۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ: كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: ((رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً، وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ)).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر دعا یہ ہوا کرتی تھی: رَبَّنَا آتِنَا...... ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی نیکی (اور بھلائی) عطا فرما اور آخرت میں بھی نیکی (عطا

❶ سنن ابی داود: 5068۔ جامع الترمذی: 3391۔ السنن الکبری للنسائی: 9836۔ سنن ابن ماجہ: 3868۔ مسند احمد: 354/2۔ صحیح ابن حبان: 964۔ مسند احمد کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ جیسا کہ علامہ ہیثمی (214/10) نے کہا ہے۔

فرما) اور ہمیں آتشِ (جہنم) سے بچا۔" ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. یہ حدیث "متفق علیہ" ہے۔

غریب الحدیث:...... رَبَّنَا: یہ مُنَادَی ہے اور یہاں حرفِ ندا محذوف ہے۔

آتِنَا: یہ اَعْطِ کے معنی میں ہے۔ یہ دو مفعولوں کو نصب دیتا ہے۔ پہلا مفعول یہاں نا جمع متکلم کی ضمیر منصوب متصل ہے۔ جبکہ دوسرا مفعول حَسَنَةً ہے۔

وَقِنَا: اس میں واوٗ عاطفہ قِ فعل امر ہے اور نا جمع متکلم کی ضمیر منصوب متصل ہے اور قِ یہ وَقَی یَقِی سے امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے بچانا۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ نبی کریم ﷺ یہ دعا کثرت کے ساتھ مانگا کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں ہمیں بھی یہ دعا کثرت کے ساتھ مانگنی چاہیے۔

◈ دنیا میں حسنہ: مال و دولت، عمدہ سواریوں، پرشکوہ مکانات و محلات، بیوی بچے، غرض ہر وہ چیز جو دنیا میں اچھی سمجھی جاتی ہے وہ دنیا کی حسنہ کے مصداق میں داخل ہے۔

◈ آخرت کی حسنہ: یہ جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے بچنا ہے۔

◈ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ دعا کو اور لمبا کرنے کی قبیل میں سے ہے ورنہ یہ بات آخرت کی حسنہ میں داخل ہے۔

◈ معلوم ہوا کہ دنیا کی خیر وخوبی مانگنا زہد وورع کے خلاف نہیں۔

◈ آخرت اور جہنم کا اِثبات۔

◈ نبی کریم ﷺ بھی جہنم سے نجات پانے میں رب تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی لیے آپ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

استغفار کے متعدد الفاظ

1564۔ وَعَنْ أَبِیْ مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَدْعُوْ: ((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ خَطِيئَتِیْ وَجَهْلِیْ، وَإِسْرَافِیْ فِیْ أَمْرِیْ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّیْ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ جِدِّیْ وَهَزْلِیْ، وَخَطَئِیْ وَعَمْدِیْ، وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ، وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ، وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّیْ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ، وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيرٌ)).

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ...... "اے اللہ! میری خطا کو اور میری نادانی کو اور اپنے معاملہ میں حد سے تجاوز کو اور میرے ان گناہوں کو بھی تو مجھے معاف فرما جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! تو میری سنجیدگی (کی خطاؤں) کو اور میری ہنسی مذاق (کی خطاؤں) کو اور میری خطا (کے یعنی بے ارادہ گناہوں) کو اور میرے قصد وارادہ (کے گناہوں) کو بھی معاف فرما اور یہ سب (طرح کی خطائیں) میری طرف سے ہیں (جو میں نے کی ہیں)۔ اے اللہ! جو میں نے آگے بھیجا ہے اور جو

❶ صحيح البخاري: 6389۔ صحيح مسلم: 2690.

پیچھے چھوڑ آیا ہوں اور جو چھپ کر کیا ہے اور جو برملا کیا ہے اور جو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے اس کو، (سب کو) مجھے معاف فرما، تو ہی آگے کرنے والا اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے۔ اور تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔'' ❶

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. — یہ حدیث ''متفق علیہ'' ہے۔

غریب الحدیث :...... **اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ**: کیونکہ سب بنی آدمی خطا کار ہیں جیسا کہ گزشتہ میں ایک حدیث میں گزرا ہے۔

وَجَهْلِیْ: جہل یہ خطا کے بالمقابل ہے۔ خطیہ عمداً کی جاتی ہے جبکہ جہل خطا سے ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے عمداً خطا کا صدور ممکن نہیں اس لیے یہ دعا امت کی تعلیم کے لیے ہے۔ البتہ لاعلمی میں خطا کا امکان ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ عالم الغیب نہ تھے۔ ہاں رب تعالیٰ نے آپ کو لاعلمی کی کسی خطا پر باقی نہ رہنے دیا۔

وَإِسْرَافِیْ فِیْ أَمْرِیْ: اسراف یہ حد سے تجاوز کو کہتے ہیں اور امر سے یہاں مراد شان، حالت اور روزمرہ زندگی کے وقائع ہیں۔ یعنی اے اللہ تو میرے جملہ احوال میں اسراف کو معاف فرما یہ نبی کریم ﷺ کی صفاتِ کمال میں سے ہے کہ آپ ﷺ کسی بھی بات میں اسراف کو ناپسند فرمایا کرتے تھے۔

وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّیْ: مراد آدمی کے وہ افعال ہیں جو وہ کر کے بھول گیا ہو اور یہ بات اپنی جگہ بجا حقیقت ہے کہ رب تعالیٰ بندے کو اور اس کے قول و فعل کو اس سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کو نسیان طاری نہیں ہوتا لیکن بندہ بھول جاتا ہے۔ اس ارشاد میں انہی باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

جِدِّیْ: قصد و ارادہ اور سنجیدگی سے کیا کام۔

هَزْلِیْ: بطور مزاح کے کیا قول و فعل۔ مذاق کی عادت بے حد بری ہے، یہ انسان سے کبائر تک سرزد کروا دیتی ہے حتیٰ کہ بسا اوقات یہ مذاق آدمی کو کفر تک لے جاتا ہے۔ غرض گناہ گناہ ہے چاہے سنجیدگی سے کیا ہو یا مذاق سے کیا ہو۔

وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ: یہ بندے کا رب کے حضور اقرار و اعتراف ہے اور اقرار یہ دعا کے بمنزلہ ہے کہ اے اللہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے اس لیے میں تم سے ان سب کے معاف کر دینے اور بخش دینے کا سوال کرتا ہوں۔

اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ، .... أَعْلَمُ بِهِ مِنِّیْ: **مَا قَدَّمْتُ** آگے بھیجے وہ کام جو بخشش و مغفرت کے محتاج ہیں جیسے ترکِ فرائض، تفریطِ واجب، ارتکاب محرم وغیرہ۔

وَمَا أَخَّرْتُ: یعنی وہ کام جو میں نے بعد میں یعنی اخیر زمانہ میں کیے کیونکہ آدمی سابقہ اور آئندہ زمانوں کے درمیان رہتا ہے۔ پس جو سابقہ زمانہ میں کیا وہ مَا قَدَّمَ میں داخل ہے اور جو آئندہ زمانہ میں کیا وہ مَا أَخَّرَ میں داخل ہے۔

وَمَا أَسْرَرْتُ، وَمَا أَعْلَنْتُ: مراد اعلانیہ اور چھپے گناہ ہے۔ البتہ کھل کر گناہ کرنے والا زیادہ برا ہے۔

وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّیْ: اس کی تفسیر بیان ہو چکی ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: 6398۔ صحيح مسلم: 2719.

أَنْتَ الْمُقَدِّمُ ، وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ: مراد چیزوں کو آگے پیچھے کرنا ہے۔ چنانچہ کتنی متوقع باتیں بروقت نہیں ہو پاتیں اور کتنی غیر متوقع باتیں ہیں جو قبل از وقت ہو جاتی ہیں۔ یہ سب باتیں اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں۔

وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: کیونکہ رب تعالیٰ کسی بات سے عاجز نہیں۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ دعا بے حد فضیلت والی ہے۔
- نبی کریم ﷺ سے اجتہادی مسائل میں خطا کا وقوع ممکن ہے مگر رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی کسی خطا پر برقرار نہ رکھا۔
- ''اِسراف'' سزا کا موجب بن سکتا ہے۔ اس کی دلیل وَإِسْرَافِيْ فِيْ أَمْرِيْ کے الفاظ ہیں۔
- رب تعالیٰ بندے کو خود اس سے بھی زیادہ جانتا ہے اس کی دلیل أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ کے الفاظ ہیں۔
- رب تعالیٰ کے علم کی بابت اسم تفضیل کا صیغہ اَعْلَمُ بولنا ثابت ہے۔
- مذاق کبھی گناہ اور مواخذہ کا سبب بھی بن جاتا ہے۔
- ہمیں اپنے اگلے پچھلے سب گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔
- انسان سے کبھی پوشیدہ تو کبھی برملا گناہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ اعلانیہ گناہ زیادہ اشد ہیں۔
- المُقَدِّم اور المُؤَخِّر یہ رب تعالیٰ کے دو صفاتی نام ہیں۔
- قدیر بھی رب تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ہے۔

دارین کی خیر کی دعا مانگنا

1565۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((اللّٰهُمَّ! أَصْلِحْ لِيْ دِيْنِي الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِيْ، وَأَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ، وَأَصْلِحْ لِيْ آخِرَتِي الَّتِيْ إِلَيْهَا مَعَادِيْ، وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ، وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ)).

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللّٰهُمَّ! أَصْلِحْ لِيْ دِيْنِي...... ''اے اللہ! تو میرے لیے میرے اس دین کو درست فرما جو میرے امر کی حفاظت (کا ذریعہ) ہے اور تو میرے لیے میری اس دنیا کو درست فرما جس میں میرا سامان حیات ہے اور تو میرے لیے میری اس آخرت کو درست فرما جو میرے لوٹنے کی جا ہے اور (دنیا کی) زندگی کو میرے لیے ہر خیر میں زیادتی کا باعث بنا اور موت کو میرے لیے ہر شر سے راحت پانے کا ذریعہ بنا۔''[1]

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تنبیہ:...... یہ بھی ایک جامع ترین دعا ہے۔

غریب الحدیث:...... **دِيْنِي:** دین یہ اسلام اور رب تعالیٰ کی عبادت ہے۔ **عِصْمَةُ أَمْرِيْ:** مراد یہ ہے کہ میں اس کے ذریعے جہنم سے پناہ پکڑوں۔ کیونکہ کوئی دین کو مضبوطی سے پکڑے بغیر عذاب جہنم سے بچ نہیں سکتا۔ بے شک دین

[1] صحيح مسلم: 2720.

انسان کے لیے گمراہیوں، خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ رہنے کا قوی ترین اور واحد راستہ ہے۔

مَعَاشِيْ: دنیا کی حقیقت یہی ہے کہ وہ معاش ہے نہ کہ ٹھکانا۔ یہ چند روزہ زندگی گزارنے کی جا ہے۔ اسی لیے معاش کو گزر بسر کے سامان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں جو انسان کی دنیاوی زندگی گزرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پس دنیا کی زندگی چند روزہ سامانِ عیش ہے نہ کہ مستقل ٹھکانا۔

مَعَادِيْ: معاد سے مراد آخری ٹھکانا اور لوٹنے کا آخری مقام ہے اور وہ آخرت ہے لہٰذا قبور عارضی معاد ہیں۔

وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِّيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ: یہاں نبی کریم ﷺ نے لمبی زندگی کی دعا نہیں مانگی بلکہ یہ دعا مانگی کہ یہ دنیا کی زندگی ہر خیر میں زیادتی اور اضافہ کا سبب بنے۔ پس بغیر خیر کے لمبی زندگی شر اور وبال ہے۔ جبکہ خیرات و حسنات کی کثرت کے ساتھ تھوڑی زندگی بھی باعثِ سعادت و نجات ہے۔

وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ: یعنی میری موت میں بھی خیر، بھلائی اور مصلحت ڈال دے اور یہ موت کے بعد کے عذابوں سے نجات کی دعا کو بھی شامل ہے جبکہ خود ایمان پر اور شبہات سے بچ کر اخلاص پر خاتمہ کی دعا کو بھی شامل ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- یہ بھی بے حد عظیم دعا ہے جس کو شب و روز کا وظیفہ بنالینا نری سعادت ہے۔
- انسان کے لیے اس دنیا میں سب سے اہم شے دین ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے دعا کا آغاز دین کی درستی عطا فرمانے سے کیا۔
- یہ دین انسان کو اعتقادی اور عملی ہر قسم کی لغزشوں اور خطاؤں سے بچانے کا ذریعہ ہے۔
- آخرت کی درستی کی دعا مانگنا مطلوب ہے جبکہ دنیا کی درستی کی دعا مانگنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔
- لمبی زندگی کی دعا مانگنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ یہ دعا بھی ضرور مانگی جائے کہ رب تعالیٰ اس دنیا کی زندگی کو خیرات و حسنات کا منبع بنا دے۔
- بسا اوقات موت دنیا کے شرور سے راحت بن جاتی ہے۔ البتہ ایمان پر خاتمہ آخرت کے شرور سے راحت کا سبب بنتا ہے۔

علمِ نافع کی دعا

1566,1567- وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِيْ بِمَا عَلَّمْتَنِيْ، وَعَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ، وَارْزُقْنِيْ عِلْمًا يَنْفَعُنِيْ)).

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالْحَاكِمُ.

وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه نَحْوُهُ، وَقَالَ فِيْ آخِرِهِ: ((وَزِدْنِيْ عِلْمًا،

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِيْ...... ''اے اللہ! تو نے مجھے جو علم بخشا ہے مجھے اس سے نفع عطا فرما اور مجھے وہ علم بخش جو مجھے نفع دے اور مجھے ایسا علم دے جو مجھے نفع دے۔'' [1]

اس حدیث کو امام نسائی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔

اور جامع ترمذی میں ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''اور میرے علم

---

[1] السنن الكبرى للنسائي: 7868- المستدرك للحاكم: 690/1.

الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ)).
وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

میں اضافہ فرما اور ہر حال میں اللہ ہی کی تعریف ہے اور میں جہنم والوں کے حال سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔'' [1]
اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔

غریب الحدیث:......اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ......:اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تین باتوں کا سوال کیا ہے:

(1) اے اللہ مجھے جو علم بخشا ہے اس سے نفع عطا فرما۔ کیونکہ بسا اوقات بندہ علم ہونے کے باوجود اس سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔

(2) مجھے وہ علم عطا فرما جو نفع دے۔ یہ علم میں زیادتی کا سوال ہے البتہ وہ علم فائدہ بھی دے۔

(3) وہ علم عطا فرما جو نفع دے۔ یہ آئندہ کے علم کا سوال ہے کیونکہ پہلے یہ دعا تھی کہ جو علم دیا ہے اس سے نفع دے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ ایسا علم دے جو نفع دے۔

خلاصۂ کلام:......خلاصہ یہ ہے کہ بندہ علم کا محتاج ہے اور اس سے نفع کا بھی محتاج ہے۔ چنانچہ علم نہ ہو تو جاہل اور اگر اس سے نفع مند نہ ہو تو متکبر۔ جامع ترمذی کی روایت میں علم کی زیادتی کی دعا ہے یعنی مجھے پہلے سے حاصل علم سے اور زیادہ علم دے۔ کیونکہ علم میں اضافہ و زیادتی کا ہر انسان محتاج ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی ایک دعا

1568- وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهَا هٰذَا الدُّعَاءَ: ((اللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ، عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ، عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَاذَ مِنْهُ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ، وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ، وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَسْأَلُكَ أَنْ تَجْعَلَ كُلَّ قَضَاءٍ قَضَيْتَهُ لِيْ خَيْرًا)).

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ دعا سکھلائی: اَللّٰھُمَّ! إِنِّیْ أَسْأَلُكَ...... ''اے اللہ! میں تجھ سے سویر کی اور دیر کی ساری خیر کا سوال کرتا ہوں جس خیر کو میں جانتا ہوں اس کا بھی اور جس کو میں نہیں جانتا اس کا بھی (سوال کرتا ہوں) اور میں تجھ سے سویر کے اور دیر کے سارے کے سارے شر سے پناہ مانگتا ہوں، اس سے بھی جس کو میں جانتا ہوں، اور اس سے بھی جس کو میں نہیں جانتا (ہر قسم کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں)۔ اے اللہ! میں تجھ سے اُس خیر کا سوال کرتا ہوں جو تجھ سے تیرے بندے اور تیرے پیغمبر نے مانگی ہے اور تجھ سے اس شر سے پناہ مانگتا ہوں جس سے تیرے بندے اور تیرے پیغمبر نے پناہ مانگی ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا اور اس قول و فعل کا سوال کرتا ہوں جو (مجھے) جنت کے قریب کر دے اور اے اللہ میں تجھ سے جہنم سے اور ہر اس قول و فعل سے پناہ مانگتا ہوں جو (مجھے) جہنم کے قریب کر دے اور میں تجھ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ میرے

---

[1] جامع الترمذی: 3599۔ سنن ابن ماجه: 251۔ اس حدیث کی اسناد میں موسیٰ بن عبیدہ ہے جو ضعیف ہے۔ (دیکھیں: فیض القدیر: 134/2).

بارے تو جو بھی فیصلہ کرے اسے میرے لیے خیر بنا دے۔"❶

أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ. اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ جبکہ امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

غریب الحدیث :...... یہ اہم ترین دعا نبی کریم ﷺ نے اپنی محبوب ترین زوجہ مطہرہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تعلیم فرمائی ہے۔ عَاجِلِهٖ وَ آجِلِهٖ: عاجل نقد کو اور آجل موخر اور ملتوی کو کہتے ہیں، مراد یہ ہے کہ دیر یا سویر سے حاصل ہونے والی ہر قسم کی خیر کا اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ: کیونکہ بسا اوقات انسان کو ایک بات کے خیر ہونے کا علم ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کے خیر ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ جبکہ بسا اوقات آدمی کو ایک خیر کا علم ہوتا ہے اور دوسری خیر سے وہ لاعلم ہوتا ہے۔ یہ خیر کے سوال کی بابت ہے اسی طرح اس دعا میں ہر قسم کے شر سے پناہ مانگنے کی بھی تعلیم ہے چاہے وہ ابھی ظاہر ہو اور چاہے بعد میں اور چاہے اس کا علم ہو اور چاہے اس کا علم نہ بھی ہو۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ......: اب نبی کریم ﷺ نے کس کس خیر کا سوال کیا ہے اور کس کس شر سے پناہ مانگی ہے، یہ دونوں باتیں دوسروں کے حق میں تو مجمل ہیں لیکن رب تعالیٰ تو ان کی خیر کو بھی اور شر کو بھی مفصل جانتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ......: اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے جنت کی اور جنت تک لے جانے والے قول و فعل کے نصیب ہونے کی دعا کرنے کی تعلیم دی ہے جبکہ جہنم سے پناہ مانگنے اور جہنم تک لے جانے والے ہر قول و فعل سے پناہ مانگنے کی دعا کرنے کی تعلیم دی ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

- نبی کریم ﷺ کی اپنے اہل کے ساتھ حسنِ رعایت کہ آپ ﷺ نے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ نافع ترین دعا تعلیم فرمائی۔
- آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر والوں کو ان باتوں کی تعلیم دے جو ان کے دین اور دنیا اور آخرت میں کام آئیں۔
- مناسب ہے کہ اس عظیم دعا کو اہتمام کے ساتھ مانگا جائے۔
- ساری کی ساری خیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور مِنَ الْخَيْرِ میں مِنْ تبعیضیہ لا کر اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اس دنیا میں کسی انسان کو ساری خیریں مل جائیں عادۃً یہ ممکن نہیں ہے۔
- دعا خوب لمبی مانگی جائے کیونکہ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهٖ کہنے کے بعد عَاجِلِهٖ وَ آجِلِهٖ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن یہ دعا کو لمبا کرنے کی قبیل سے ہے۔
- رب تعالیٰ سے مجمل بات کا سوال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی دلیل مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ کے الفاظ ہیں۔ البتہ یہ اجمال خیر کی بابت ہو جیسا کہ أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ میں اس کی تصریح ہے۔
- رب تعالیٰ سے ہر قسم کے شر سے پناہ مانگی جائے۔
- نبی کریم ﷺ کے لیے نبوت و عبدیت دونوں ثابت ہیں۔

❶ سنن ابن ماجہ: 3846۔ صحيح ابن حبان: 869۔ المستدرك للحاكم: 702/1.

◈ رب تعالیٰ سے جنت کا اور اس کے قریب کر دینے والے قول وعمل کا سوال مستحب ہے۔
◈ رب تعالیٰ سے جہنم اور جہنم کے قریب کر دینے والے ہر قول وفعل سے پناہ مانگی جائے۔

دو محبوب کلمے

1569۔ وَأَخْـرَجَ الشَّيْخَانِ عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ، خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ)).

امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''دو کلمے ایسے ہیں جو (رب) رحمان کو بے حد عزیز ہیں زبان پر (ادا کرنے میں) تو ہلکے ہیں (مگر اجر وثواب کے وزن کے اعتبار سے) میزانِ (عمل) میں بے حد بھاری ہیں (اور وہ کلمے ہیں) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ (اور) سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ.'' [1]

غریب الحدیث:...... كَلِمَتَانِ: مراد کلماتِ شرعیہ ماثورہ ہیں نہ کہ کلمہ نحو یہ مراد ہے جیسا کہ بیان ہوا۔

حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ: یعنی رب تعالیٰ ان دونوں کلمات سے محبت رکھتے ہیں۔

خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ: یہ ثَقِيْلَتَانِ کے مقابل کلمہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان کو پڑھنے میں زیادہ تکان نہیں ہوتی اور نہ زبان کو ان سے ثقل وگرانی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر آدمی ان کو دن رات بھی پڑھتا رہے تو زبان پر سہل ہیں۔

ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ: میزان، روزِ قیامت بندوں کے اعمال کو تولنے کی ترازو۔ یعنی اجر وثواب کے اعتبار سے یہ کلمے میزانِ عمل میں بے حد وزنی ہوں گے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ: مذکورہ واؤ معیت کے لیے اور بَا مصاحبت کے لیے ہے۔ یعنی میں رب تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہوں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ: میں عظمت والے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں۔ ان دونوں کلمات میں رب تعالیٰ کی ذات کو ہر اس بات سے پاک اور منزہ قرار دیا گیا ہے جو اس کی شانِ عظمت وجلال کے لائق نہ ہو۔

تَنْبِیْه:...... امام موصوف کو امام بخاری رحمہ اللہ سے بے حد عقیدت تھی۔ اسی لیے امام بخاری کی اقتدا میں امام موصوف نے بھی اپنی اس جلیل القدر کتاب کو اسی حدیث پر ختم کیا ہے جس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب صحیح البخاری کو ختم کیا ہے۔

حدیث سے اخذ شدہ فوائد

◈ رب تعالیٰ کے لیے صفتِ محبت کا اِثبات۔
◈ رب تعالیٰ کے لیے اَلرَّحْمٰن کے عظیم نام کا اِثبات۔
◈ عمل کی ترغیب، جب کسی کے سامنے عمل کو کم کر کے رکھا جاتا ہے تو طبعًا اس کے جی میں اسے کر گزرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا خَفِيْفَتَانِ کہ یہ ہلکا سا عمل ہے۔ اس کو کر گزریے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے روزوں کا ذکر فرمایا تو فرمایا کہ یہ تو چند دن کے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: 6406۔ صحيح مسلم: 2694.

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ (البقرۃ: 184) ''گنے ہوئے چند دنوں میں۔''

◈ میزان کا اِثبات اور یہ کہ روزِ قیامت ہر ہر نیکی تولی جائے گی اور اسی کے بقدر اجر ملے گا اور ساتھ یہ بھی بشارت ہے کہ بظاہر یہ دو خفیف کلمے ہیں مگر ان کا اجر بہت زیادہ ہے۔

◈ کتاب وسنت کی ظاہری نصوص بتلاتی ہیں کہ اعمال تولے جائیں گے۔ اگر چہ اعمال معانی ہیں لیکن رب تعالیٰ ان کو محسوس ابدان عطا فرمائیں گے۔ جبکہ خود معانی کا وزن بھی اب بعید از عقل نہیں رہا۔ کیا آج کل بخار، ہوا، حدت، برودت سب کچھ کا ہی وزن نہیں کیا جا رہا؟ تب پھر اعمال کے تلنے میں کیا اشکال باقی رہ جاتا ہے۔

◈ ترازو کئی ہوں گے جیسا کہ

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (القارعۃ: 8)

''اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے۔''

یہ متعدد ترازو یا تو افراد کے تعدد کے اعتبار سے ہوں گے یا پھر اعمال کی اقسام وانواع کے تعدد کے اعتبار سے ہوں گے۔

◈ بلاشبہ یہ دونوں کلمات بے حد عظیم اور از حد فضیلت والے ہیں۔ کیونکہ ایک تو رب تعالیٰ کو محبوب ہیں دوسرے ان کا اجر بہت زیادہ ہے۔ تیسرے خود نبی کریم ﷺ نے ان کے فضل کی شہادت دی ہے۔

◈ کلام میں سجع جائز ہے جبکہ اس میں تکلف نہ ہو۔

انہی چند گزارشات کے ساتھ کتاب بلوغ المرام کی تشریح اپنے اختتام کو پہنچی۔ رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے۔ آمین

وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

المکتبۃ الرحمانیہ
22073

مطالعاتی نوٹس

www.KitaboSunnat.com

خصوصیات

- آیاتِ قرآنیہ اور متن احادیث کی صحت کا اور ان کے درست اعراب کا اہتمام
- احادیث کی تخریج اور ان کے حکم کے بیان میں رواۃ کے احوال، جرح وتعدیل کی تفصیل اور ائمہ محدثین کا مفصل کلام
- فنی اور اصطلاحی تعریفات کا بیان
- معرفۃ الصحابۃ کے عنوان سے راویانِ حدیث کا تعارف
- حدیث کی لغوی، صرفی نحوی، ترکیبی اور بلاغتی تحقیق
- تفسیری، حدیثی، فقہی اور کلامی تفصیلات
- روایت الحدیث، درایت الحدیث، سببِ حدیث، قصہ حدیث اور مناسبت حدیث کا بیان
- مضمونِ حدیث کے عنوان سے حدیث میں مذکورہ بنیادی مسائل کا بیان
- نفسِ حدیث اور اس کی شرح کے ضمن میں بیان ہونے والے جملہ مسائل کی عنوان بندی
- حدیث کی شرح میں عقائد و مذاہب، ائمہ کے دلائل اور راجح مذہب کا بیان اور اصح قول کا تعین
- احادیث کا سلیس، رواں، شائستہ اور بامحاورہ ترجمہ اور بین القوسین وضاحتوں کے ذریعے متن حدیث کی عمدہ وضاحت
- ہر حدیث سے اخذ شدہ فوائد، مسائل اور احکام کا مفصل بیان
- حالاتِ حاضرہ میں درپیش مسائل اور احادیث نبویہ کے درمیان تطبیق کی نہایت عمدہ کوشش اور مسائل جدیدہ کا بیان
- مسائل کی امثلہ کے بیان میں رائج اور جدید اشیاء کا ذکر
- ایک فن سے متعلقہ مسائل کی تفریق وتفصیل اور ان سے متعلقہ جزئیات کا ایک جگہ اکٹھا بیان

ISBN: 978-969-9861-22-8

DAR-UL-MARIFA
2nd Floor, Al-Fazal Market,
17 Urdu Bazar, Lahore (PAK)

Ph +92-321-4210145 +92-42-37361321 www.facebook.com/darulmarifa darulmarifa@gmail.com

WWW.DARULMARIFA.COM